DUE DATE

Cl No ________________ *Acc No* ________________

Late Fine **Re. 1.00** per day for first 15 days
Rs. 2.00 per day after 15 days of the due date.

اُردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہنامہ

نئی دہلی

آج کل

ایڈیٹر
مہدی عباس حسینی

ٹیلیفون نمبر :- ۳۸۷۰۶۹

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

سرخ چندہ

سالانہ	دس روپیہ	۳ ڈالر	۱ پاؤنڈ
دوسالہ	۱۷ روپیہ	۵ ڈالر	۱٫۷۰ پاؤنڈ
سہ سالہ	۲۴ روپیہ	۷ ڈالر	۲٫۴۰ پاؤنڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	۳۰ سینٹ	۱۰ پنی

سرورق: تصویر چمنی رائے   عمل، جیون اڈلجہ

خواتین نمبر

عورتوں کے بین الاقوامی سال کا نشان

امن کی فاختہ

1975

ترتیب

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

ایمرجنسی کے تیس دن

ملک میں اندرونی بدامنی اور انتشار کے شدید خطرے کے پیشِ نظر ۲۶ جون ۱۹۷۵ء کو صدرِ جمہوریۂ ہند نے آئین کے آرٹیکل ۳۵۲ کے تحت ایمرجنسی کا اعلان کیا تھا کیونکہ بعض دائیں بازو اور بائیں بازو کی طاقتوں نے مل کر دیش کے اندر گڑبڑ اور بدامنی پھیلانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اگر ہنگامی حالات کا اعلان نہ کیا جاتا تو معلوم نہیں آج ہمارے ملک کی کیا حالت ہوتی۔

ایمرجنسی کے اعلان کے موقع پر وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے قوم کے نام جو پیغام نشر کیا تھا اس میں انہوں نے عوام کو ان تمام حالات سے آگاہ کیا تھا جن کے کارن ایسا سخت قدم اٹھانا پڑا۔

یکم جولائی ۱۹۷۵ء کو وزیرِ اعظم نے ریڈیو سے عوام کو مخاطب کرتے ہوئے اقتصادی ترقی کے چند نئے پروگراموں کا ذکر کیا جن سے عوام کو ترقی و خوشحالی حاصل ہوگی۔ وزیرِ اعظم نے فرمایا کہ براہ مہربانی آپ ڈرامائی نتیجوں کی توقعات نہ باندھیں اور نہ ہی یہ سمجھیں کہ کسی جادو سے مشکل حل ہو جائے گی۔ غریبی دور کرنے کا ایک ہی جادو ہے اور وہ ہے سخت محنت۔ اس سلسلے میں ہمارا ذہن بالکل صاف ہونا چاہیئے۔ ہمیں فولادی قوتِ ارادی اور کڑے ڈسپلن سے کام کرنا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنی جگہ صرف اپنے لئے ہی نہیں بلکہ دوسروں کے لئے بھی سخت محنت کرنی چاہیئے۔ فضول خرچی اور فالتو کھپت کو روکنا سرکار کا فرض ہے لیکن اس سلسلے میں شہریوں کی بھی ذمہ داری ہے۔

سب سے بڑا چیلنج قیمتوں کے محاذ پر ہے اور اس سلسلے میں حکومت پیداوار بڑھانے، اناج وغیرہ کی وصولی کو تیز کرنے اور لازمی اشیا کی تقسیم کے لئے بہتر بندوبست عمل میں لائے گی۔

ریاستی سرکاروں سے کہہ دیا گیا ہے کہ وہ قیمتوں کی فہرستیں اور اسٹاک کے بارے میں تفاصیل ٹانگنے کے لئے بیوپاریوں کو ہدایت دیں، نیز ذخیرہ اندوزوں اور ان قواعد کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے۔ سکے کے پھیلاؤ کو روکنے کی کارروائیاں جاری رہیں گی۔

وزیرِ اعظم نے مزید فرمایا۔ ہمیں زمین کی ملکیت کی حد سے متعلق قوانین کو عمل میں لانا چاہیئے اور فاضل زمین کو بے زمین لوگوں میں بانٹنے کا کام تیزی سے کرنا چاہیئے۔ دیہی علاقوں میں رہائشی مکانوں کے لئے زمین دینے کے پروگرام میں خاص توسیع کی جائے گی اور جو بے زمین محنت کش اپنے مالکوں کی زمین پر ایک خاص عرصے سے رہ رہے ہیں انہیں ملکیت دینے کے قانون بنائے جائیں گے۔ علاوہ بریں بے دخلی کی کارروائی کے خلاف سخت قدم اٹھائے جائیں گے اور جبری مزدوری کے وحشیانہ رواج کو منسوخ کیا جائے گا۔ نیز وہ تمام کنٹریکٹ یا انتظامات جن کے بنا کراں کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے ا... جائے گا۔ بے زمین محنت کشوں، دیہاتی کار... کم زمین کے مالک چھوٹے اور مارجنل کسانوں... نئے ادارے قائم کئے جائیں گے اور اس کے سا... قرضے کی وصولی کے لئے مقدمے چلانے ا... روک لگا دی جائے گی۔ (کوآپریٹو اداروں، کمرشل... لئے گئے قرضوں پر اس اسکیم کا اطلاق نہیں ہوگا۔ تو زرعی محنت کشوں کے لئے کم از کم اجرتوں کو بڑھ... کئے جائیں گے۔ زرعی اور صنعتی پیداوار بڑھانے... سپلائی کے لئے بھی مناسب اقدام کئے جائیں گے۔

شہروں میں خالی زمینوں کی ملکیت اور قبضے... زمین کو سرکاری کنٹرول میں لینے اور نئے رہائشی... کی حد مقرر کرنے اور شہری علاقے میں... کو سماجی مقاصد کے نقطۂ نظر سے استعمال میں لا... جا رہا ہے۔

ٹیکس کی چوری کرنے والوں اور اسمگلروں... تیز کر دی جائے گی۔ لائسنس جاری کرنے کے طر... اور لائسنسوں کے غلط استعمال کو روکنے کے اقدا...

انکم ٹیکس سے مستثنےٰ آمدنی کی حد چھ ہزار روپے کر دی جائے گی

غریب طالب علموں کی مدد کے لئے ضرور... دیگر منظور شدہ رہائشی جگہوں پر کنٹرول شدہ قیمت... اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے تمام طلبا کو نصابی... داموں پر فراہم کی جائیں گی اور کتابوں کے بینک...

تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے روزگار... اپرینٹس شپ ایکٹ میں مناسب ترمیم کی جائے...

اگرچہ وزیرِ اعظم نے اقتصادی پروگرام... کہ ان کے پاس کوئی جادو کی چھڑی نہیں جس سے... ہو جائے لیکن تیس دن کی ہنگامی حالت... ایک چھوٹے انقلاب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے... کئے جاتے ہیں:

پچھلے سال جون میں قیمتوں میں اضافہ... عرصے میں تیزی سے دام بڑھنے سے ا... گرانی مصنوعی تھی۔ ملک میں کافی... عناصر دبائے بیٹھے تھے اور کالے دھند...

دھندے والے اور اسمگلروں پر سختی ہوئی اور بازار میں دبا
لیا۔ اتنی تیزی اور آسانی سے باہر آیا کہ جولائی ۱۹۷۵ء میں
کا اشاریہ پچھلے سال کے مقابلے میں ۲٫۲ فیصدی کم ہوگیا۔
پھلی اور گری کے تیل اور وناسپتی کے دام خاص طور پر

یہ جیسا ایکٹ اور ۱۹۷۴ء کے بدیشی سکّوں کے تحفظ اور
ک سے تھام سے متعلق ایکٹ میں ترمیم کردی گئی جس کے باعث
وجہ بتلائے گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ ان کے کیس کو کسی ایڈوائزری
لکھنا ضروری نہیں اور روپوش اسمگلروں کی جائدادیں ضبط
بے بڑے مکانوں کی اصل مالیت آنکی جارہی ہے تاکہ اس سے
پتہ لگایا جاسکے۔

نے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا۔
و پیمانے کے مطابق چھ کروڑ نوّے لاکھ ٹن کی ہوگی اور اچھی
موسمی پیداوار بھی تقریباً ساڑھے گیارہ کروڑ ٹن کی ہوگی۔ لیکن
ہ۔ وہ ایک طرف تو ابھی چھ ماہی میں ۳۵ لاکھ ٹن غلہ درآمد
سال کی پہلی چھ ماہی سے کوئی دس لاکھ ٹن زیادہ۔ دوسری
وصولی بھی تیزی سے کی جارہی ہے کیونکہ اس سال ربیع میں
نشانہ تھا جس میں ابھی تک صرف ۳۶ لاکھ ٹن وصول ہوا ہے
تھ ساتھ صنعتی پیداوار میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس سال
لے سال کے اپریل تا جون کے مقابلے میں صنعتی پیداوار میں
ہے! المونیم ۳۶ فی صد، شکر ۲۸ فی صد، کوئلہ ۱۷ فی صد
فرٹیلائزر فولاد ۱۳ فی صد، پٹ سن کی مصنوعات ۱۰ فی صد
ر بجلی میں اضافہ کے باعث ساری صنعتوں میں مزید

تصادی پروگرام میں اعلان کیا تھا کہ ٹرک سے مال
ل پرمٹیں دی جائیں گی تاکہ ٹرکوں کو ہر ریاست سے
پڑے۔ ساتھ ہی ساتھ ریلوں کی کارگردگی بڑھانے کے لے
کیے گئے ان کے نتیجے میں ۳۰ جولائی تک پچانوے فیصد سے
ت پر چلنے لگی تھیں۔ بلا ٹکٹ سفر کرنے والوں کی سختی سے
کی آمدنی میں بھی اضافہ کیا جارہا ہے
شیائے ضروری کی قیمتیں نمایاں طور پر لگانے
کے سلسلے میں جو سختی کی ہے اس کا بہت خوشگوار
کونسل نے سرگرمی سے کام شروع کردیا ہے۔
و ۰۰۰۵ فروشوں کی دکانوں کے معاینے کرسکتی ہیں۔
بن، ماچس، ٹارچ بیٹری اور ریزر بلیڈ
فی صد حصہ کواپریٹو سوسائٹیاں

کو فروخت کرنے کے لئے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اس طرح ان اشیا کی چور بازاری بھی قصۂ پارینہ ہوجائے گی۔

اب پارلیمنٹ نے آمدنی کی کم سے کم قابل ٹیکس حد چھ ہزار روپے سالانہ سے بڑھا کر آٹھ ہزار روپے سالانہ کرنے کا بل پاس کردیا ہے۔ اس سے متوسط اور تنخواہ دار طبقے کو راحت ملے گی۔ نو ہزار روپے سالانہ آمدنی والے کو ۹۰ روپیہ کی چھوٹ ملے گی۔ دس ہزار روپے سالانہ والے کو ۱۰۵ روپے کی اور گیارہ ہزار سالانہ والے کو ۱۲۲ روپے کی۔

پنجاب اور مغربی بنگال نے قانون کے ذریعے چھوٹے کسانوں اور بے گھر مزدوروں کے لئے گئے قرضہ جات کی ادائیگی پر پابندی لگادی ہے اب یہ قرضے دو سال تک ادا کرنے ضروری نہیں ہوں گے۔ جو لوگ ایسے قرضے ادا نہ کرنے کے باعث جیل میں ہیں انہیں رہا کردیا جائیگا۔ دوسری ریاستوں میں بھی ایسا قانون بننے والا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دیہاتیوں کو آسان شرطوں پر قرضے دینے کے لئے ۵۰ خصوصی بینک کھولے جارہے ہیں۔

تعمیرات سے متعلق مرکزی وزارت نے بے زمین مزدوروں اور کسانوں کو مکان بنانے کے لئے پلاٹ دینے سے متعلق ہدایات واصول وضع کرلئے ہیں۔ زندگی بیمہ کارپوریشن، بہار، مغربی بنگال، اڑیسہ، آسام اور دیگر مشرقی ریاستوں میں کم آمدنی والے طبقوں کے لئے رہائشی مکانات کی کالونی تعمیر کرائے گا۔

اتر پردیش میں ایک آرڈی نینس کے ذریعے بیگار کا خاتمہ کردیا گیا ہے۔

وزیر اعظم کے بیس نکاتی اقتصادی پروگرام پر اسی مستعدی سے کام ہوتا رہا تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری قومی آمدنی میں جو پچھلے سال محض دو فیصد بڑھی تھی اس سال چھ فی صد کا اضافہ نہ ہوجائے۔

خواتین کو خراجِ عقیدت

۱۹۷۵ء کو اقوام متحدہ نے عورتوں کا بین الاقوامی سال قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں جون کے آخر اور جولائی کے شروع میں میکسیکو میں خواتین کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کے ممالک ایک ایسا دس سالہ لائحہ عمل بنائیں جس کے تحت عورتوں کی صحت، رہن سہن اور تعلیم کے معیار کو بلند کیا جائے اور انتظامی امور میں انہیں زیادہ حصہ لینے کا موقع ملے۔ اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق فی الحال دنیا میں ہر آٹھ ان پڑھ مردوں کے مقابلے میں پانچ عورتیں ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں عورتوں کی کل آبادی کا اسّی فی صدی حصہ پچھڑے ہوئے ملکوں میں رہتا ہے جہاں نہ ان کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے اور نہ جائداد کی ملکیت کا۔ ہندوستان اس سے مستثنیٰ ہے۔

بدقسمتی سے یہ دنیا اب بھی مردوں کی دنیا ہے اور مرد عورتوں
کے ساتھ اچھا سلوک بھی کرتے ہیں تو مرحمتِ خسروانہ کے طور پر چنانچہ
اقوامِ متحدہ نے بھی اس سال عورتوں کی کانفرنس کے لئے بجٹ میں
صرف بیس لاکھ ڈالر رکھے تھے جبکہ پچھلے سال بخارسٹ میں آبادی سے
متعلق کانفرنس کے لئے تیس لاکھ ڈالر رکھے گئے تھے۔ پھر عورتوں کی
اس کانفرنس کا صدر میکسیکو کا اٹارنی جنرل، پڈرو اوجیڈا یعنی ایک
مرد تھا (سیکریٹری جنرل فن لینڈ کی ایک ساٹھ سالہ خاتون وکیل
ہلوی سیپلا تھیں) خاتون وزرائے اعظم میں صرف لنکا کی شریمتی
بندارا نائکے موجود تھیں۔ ہماری وزیر اعظم ہنگامی حالات کے پیشِ نظر
اس کانفرنس میں شریک نہ ہو سکیں۔ البتہ متعدد مرد سربراہوں کی
بیویاں کانفرنس میں شریک ہوئیں۔ گو کہ تحریکِ نسواں کی علمبردار
خواتین نے انہیں WIFEY POOS یعنی "لاڈلی بیویوں" کا خطاب
دے کر انہیں محض سامانِ زیب و زینت میں شمار کیا۔ ان بیویوں
میں نصرت بھٹو، لیہہ ربین، جیہان سادات، اِمیلڈا مارکوس
اور مسز کاسترو شامل تھیں۔

مغرب کی جدید ترین تحریکِ نسواں جسے WOMEN'S LIB
کہا جاتا ہے اس نکتۂ نظر پر مبنی ہے کہ صدیوں سے مرد
نے عورت کو آلۂ تفریح بنا رکھا ہے اور اپنی چکنی چپڑی باتوں سے
اسے صنفِ نازک قرار دے کر اس سے اپنی چاکری اور غلامی کراتا
رہا ہے (چنانچہ اُن کی رائے میں عورت کا مقصدِ حیات یہ نہیں کہ
وہ شادی کے بعد بچے پیدا کرے اور گھرداری میں مشغول ہو جائے
یا طوائف کے طور پر مردوں کا دل بہلایا کرے۔ اُن کی رائے میں
عورتوں کی اپنی شخصیت اور انفرادیت ہوتی ہے اور اُن کو اپنی مرضی
کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیئے اور اس امر کی بالکل پروا نہیں کرنی
چاہیئے کہ مرد اُن کے بارے میں کیا سوچیں گے کیونکہ موجودہ اخلاقی
قدریں مردوں کی اختراع کردہ ہیں وہ مردوں سے کسی حیثیت سے کم نہیں
لہٰذا اُن کو زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے برابر حصہ ملنا چاہیئے اور یہ حق ملنا چاہیئے
کہ وہ مردوں کے ساتھ بھی ویسا ہی برتاؤ کریں جیسا کہ مرد صدیوں
سے ان کے ساتھ کرتے آ رہے ہیں۔)

اس کے برخلاف مذکورہ بالا کانفرنس میں فلپائنس کے صدر
کی بیوی مسز مارکوس نے ایشیائی عورتوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا
کہ ہم ابھی نسائیت سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔ اور شریمتی اندرا
گاندھی نے اپنے پیغام میں فرمایا کہ اصلی مسئلہ یہ ہے کہ تمام پچھڑے
ہوئے ملکوں کو ترقی ملے۔ اس طرح ان کی مجموعی آبادی کو جس میں مرد
اور عورت دونوں شامل ہیں، خود بخود ترقی و فروغ حاصل ہوگا۔ اس سے
ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم ایشیا میں ابھی تک WOMEN'S LIB
تحریک کے قدم نہیں جمے۔

"آج کل" کا یہ شمارہ عورتوں کے بین الاقوامی سال کی
اور ہماری جانب سے ہند کی خواتین کی خدمت میں خرا
ہم نے آپ کو ہند میں عورتوں کی صورتِ حال سے روشن
کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر رومیلا تھاپر نے اپنے مضمون
پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر شمیم نکہت نے تح
میں خواتین کے حصے کا جائزہ لیا ہے۔ محترمہ شیا ملا پ
متعلق قوانین اور ان کی خوبیوں اور خامیوں پر تبصر
قرۃ العین حیدر صاحبہ نے ہندوستان کی مسلمان
زوال کا نقشہ کھینچا ہے۔ محترمہ نجمہ آروی نے اسلامی
مرتبے کی تشریح کی ہے۔ بیگم انیس قدوائی نے ح
میں بڑی خدا لگتی باتیں کہی ہیں۔ محترمہ رانی نرمل
میں ہندوستانی عورتوں کی تگ و دو کے بارے میں نف
پہنچائی ہیں۔

ادبی حصہ میں ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ایک بالکل نئے
یعنی اُردو تنقید نگاری میں خواتین کے حصے سے بحث کی
حمیدہ سلطان صاحبہ نے دلی میں خواتین کی ادبی سرگرمیو
ہے اور تخلیقی ادب میں عصمت چغتائی، صالحہ عابد حسین
شکیلہ اختر، جیلانی بانو، آمنہ ابوالحسن، عطیہ پروین ک
سے یہ پرچہ سینت کر رکھنے کے قابل بن گیا ہے

اسی طرح حصہ نظم میں شفیق فاطمہ شعریٰ، ڈاکٹر سا
ڈاکٹر زاہدہ زیدی، عفت بانو زیبا، ذکیہ سلطانہ نیر، بانو طا
ممتاز مرزا، ڈاکٹر اسما سعیدی، عظمت عبدالقیوم، حسنی سرور
زرینہ ثانی، کاظمی بانو ضیا، عابدہ احمد، رباب جعفری، فرزانہ نسر
مسعودہ حیات، کوثر جہاں، عفت زریں وغیرہ کی منظ
شمارے کی زینت کو دوبالا کر رہی ہیں۔

ہم نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ تصاویر کے ذریعہ
لگا سکیں کہ ہمارا ملک کس حد تک عورتوں کا مرہونِ منت
کس طرح زندگی کے ہر شعبے میں کارہائے نمایاں انج
ہیں۔ ہمارے خیال میں دیہات کی سادہ، معصوم
قابلِ احترام ہے تو شہر کی تیز و طرار، علم و فن کے جو
ستائش۔ کیونکہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پہ
زندگی کا بیش قیمت حصہ ہیں۔

امید ہے کہ آپ ہمیں اس شمارے کے بارے میں
کریں گے تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ ہمار
ہو سکی ہیں۔

رہشاریکل اسٹڈیز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دلی

ہند میں خواتین کا مقام

یں خواتین کی حیثیت ودرجہ وکار معروضہ غیر متغیر یا ایک سا
ضمن میں کبھی تو ایسا ہوا کہ انھیں خاصے اختیارات اور آزادی
ہے اور کبھی یہ نوبت پہنچی کہ ان کی حیثیت بڑی حد تک ایک
م کی سی ہوگئی۔ چاروں مہایگوں میں سے زمانۂ اول یعنی کرت
صی طور پر خواتین کو مکمل آزادی حاصل تھی۔ کرت یگ سے
اور کال چک کے آغاز سے ہے۔ اُن کی آزادی کا ذکر ان
ملتا ہے جو بعد کے ادوار میں مثالی دیویوں اور دیوی دیوتاؤں
ے گئے۔ اتر کورو خطے میں جو روایتی لحاظ سے "پاکیزہ صفات"
وردی سرزمین کہلاتا ہے عورتیں مردوں کی مانند آزاد تھیں[1]۔
ں کے بارے میں تو کہا گیا ہے کہ وہ واقعی آوارہ، عیاش طبع
طرح کرت یگ کے بعد کے دور میں کم از کم یہ احساس موجود
کی حیثیت ہمیشہ سے غلامانہ نہیں چلی آرہی تھی۔
کے رتبے اور حیثیت میں تبدیلی کے آثار ان قدیم کتب میں
یں نظریۂ ریاست کی ابتدا کا ذکر ہے۔ (یہ تبدیلی دہقانی
لتی ہے جو زمانۂ عافیت میں تو بقائے باہم اور امن و
بعد میں تشدد اور لاقانونیت کی آماجگاہ بن
راد ایک دوسرے کی بیویاں اور فصلیں چرانے لگے۔
ذ ہوتا ہے کہ عورتیں اور جائداد جھگڑے کی جڑ ہیں۔
نے کے لئے نہ صرف نجی جائداد اور شادی بیاہ کے
تسلیم کیا گیا بلکہ ایک شخص کو منتخب کر لیا جاتا تھا یا

کسی سے درخواست کی جاتی کہ وہ قانونی ثالث بن جاتے اور یوں امن و آشتی کو برقرار رکھے۔ چنانچہ اسی زمانے سے عورتوں کے درجے اور حیثیت میں ابتری کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت قدیم کتب مثلاً بودھ مت کی کتاب "دی گھانکایہ" اور مہابھارت میں بیان کردہ واقعات سے ملتا ہے[2]۔

ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ مختلف سماجی طبقات کی خواتین میں ہمیشہ ایک فرق و امتیاز موجود رہا ہے۔ بدقسمتی سے اوّلین تاریخی ماخذات میں عام طور پر منتخب اور چیدہ طبقوں مثلاً دربار، امرا اور دولت مند تاجروں کی زندگی کا ہی ذکر ملتا ہے۔ سماج کے دیگر طبقوں کی حالت کا اندازہ بڑی حد تک بالواسطہ تذکروں اور حوالوں سے کرنا پڑتا ہے۔ طبقۂ امرا کی خواتین کو شریف و نجیب تصور کیا جاتا تھا کیونکہ وہ مستقبل کے حکمرانوں کی مائیں ہوا کرتی تھیں۔ شادی اکثر سیاسی قرابت اور گٹھ جوڑ کے لئے ایک آڑ ہوتی تھی اور نچلے طبقوں کے لئے یہ کبھی کبھی اونچا اٹھنے کا ایک ذریعہ بن جاتی تھی۔ ماضی کی عظیم ہیروئنیں یعنی پرانوں اور رزمیہ قصّوں کی خواتین یا تو دیوی عورتیں ہوتی تھیں جو مصائب میں مبتلا ہوں (مثال کے طور پر راماین کی سیتا) جن پر عام معیار کا اطلاق نہیں ہو سکتا یا وہ ایسے سماجوں سے تعلق رکھتی تھیں جن پر زبردست قبائلی چھاپ ہوتی تھی (مثلاً مہابھارت کی گاندھاری)۔ عام طور پر طبقۂ اُمرا کی عورتیں گوشہ نشین ہوتی تھیں اُن کی حفاظت کا بخوبی انتظام ہوتا تھا اور انہیں زندگی کے تاریک اور گھناؤنے پہلو سے دور اور الگ تھلگ رکھا جاتا تھا۔ سنہ عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں عزّت دار گھروں کی خواتین پردہ کرنے لگی تھیں (ارتھ شاستر)[3] اور اسلام میں رائج پردے نے تو عورتوں کی گوشہ نشینی کو اور بھی بڑھاوا دیا۔

اس کے برعکس شہری طبقۂ خواص، عورت کو علیحدہ اور گوشہ نشین بنائے رکھنے کے بارے میں اتنا سخت گیر نہ تھا۔ عورتیں منہ پر نقاب ڈالے بغیر آیا جایا کرتی تھیں۔ سنگتراشی کے قدیم نمونوں میں یہ عورتیں بازاروں سے بھی گزرنے والے تہواری جلوسوں کو دیکھنے کی غرض سے گھروں کے چھجوں اور بارجوں میں خوش خوش بیٹھی دکھائی گئی ہیں[4]۔

بودھوں کی اُن قدیم عمارات اور مندروں میں جو متمول تاجروں کے عطیات سے تعمیر کی جاتی تھیں کبھی کبھار عطیہ دینے والے اور اس کی بیوی کے مجسّمے بھی ملتے ہیں[5]۔

شہری ادب میں اُن عورتوں کو قوی کردار و شخصیت کی حامل سا ایک گیا ہے جس سے وہ اپنی زندگی سے بھرپور لطف بھی اٹھاتی تھیں۔

---

[1] مہابھارت، کرن پروان، ۳۷، ۳۰۔
[2] دی گھانکایہ، II، ۹۳، مہابھارت، شانتی پروان۔
[3] ارتھ شاستر، II، ۲۳۔
[4] جیسا کہ مختلف بودھ اور ہندو آثار میں موجود سنگتراشی کے نمونوں سے ظاہر ہے۔
[5] مثال کے طور پر جیسا کہ کرلا گپھاؤں میں دکھایا گیا ہے۔

(باقی صفحہ ...)

کام سوتر کی تہذیب و شایستگی بہرحال محض مردکی انفرادیت پر منحصر نہ تھی۔ بلاشبہ دستکار اور کاشتکار کنبوں کی عورتوں کو سب سے کم آسائش میسر تھی۔ اس کی وجہ سماجی اسباب نہیں بلکہ اقتصادی بقا کی ضرورتیں تھیں۔ گھریلو کام کاج کے علاوہ ان عورتوں کو اپنے مردوں کے کام میں بھی ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ اسی لئے انھیں فرصت کم نصیب ہوتی۔ اس کے باوجود وہ اپنے مردوں کی زندگی میں برابر کی شریک تھیں۔ غالباً اس طبقے کے افراد اپنے ماحول اور جغرافیے سے زیادہ متاثر تھے۔ بلاشبہ غیر زرخیز علاقوں اور غیر محفوظ سرحدی خطوں کے حالات کے باعث مردوں اور عورتوں کی حیثیت زیادہ مساوی ہو گئی لیکن اس سے یہ مقصود نہیں کہ دیگر عورتوں کی نسبت دہقان عورت ہمیشہ زیادہ آزاد رہی ہے (پدری سماج میں دہقان عورت بیشتر شدید قدامت پسند بندشیں رہی ہیں، خاص طور پر اگر اس کا گھرانہ نسبتاً قدرے خوشحال ہو۔ دہقان عورتوں میں شاید وہی زیادہ آزاد رہی ہیں جنہیں ایک نمایاں اقتصادی رول ادا کرنا پڑا ہے۔ مثال کے طور پر ایسی عورتیں جو مقامی منڈیوں میں سامان بیچنے یا بیوپار کرنے کے لئے آتی جاتی ہیں، کیونکہ اس آزادی سے ان کی روزی وابستہ ہوتی ہے۔ شمال مشرقی ہند کے دیہی علاقوں میں آج بھی تقریباً ایسی ہی صورتِ حال پائی جاتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا ممکن نہیں کہ کسی بھی خاص عہد یا زمانے میں عورتوں کا درجہ اور مقام ایک سا تھا۔ یہ مسئلہ آج بھی ملک کے ہر اس حصے میں موجود ہے جہاں مختلف النوع سماجی گروپ، قبائلی، دہقانی اور شہری الگ الگ ماحول اور حالات میں کام کر رہے ہیں۔ ہم تو موٹے طور پر کچھ عام نتیجے اخذ کر سکتے ہیں (مثال کے طور پر یہ کہ شادی کا مقصد یہ تھا کہ جاتی کے افراد کے باہمی روابط کو مضبوط بنایا جائے۔ یہ بنیادی طور پر ایک سماجی اور سیاسی ضرورت تھی اور جہاں کہیں یہ صورتِ حال موجود تھی وہاں شادی کا مقصد جائیداد کا استحکام بھی تھا)

لیکن قانونی کتب دھرم شاستر اور ایسی دوسری کتابوں میں صنف کے لئے محض ایک ہی لفظ "ناری" استعمال کیا گیا ہے چاہے اس کا درجہ یا حسب نسب کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ امر باعثِ دلچسپی ہے کہ ان کتابوں میں جہاں کہیں مردوں کا ذکر آیا ہے تو ان کی درجہ بندی میں بڑی احتیاط برتی گئی ہے اور ان کے امتیازات کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بیان کی گئی ہے جبکہ عورتوں کو عام طور پر ایک ہی زمرے میں رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ صاف طور پر بتا دیا گیا ہے کہ بہ حیثیت ... عورتوں کا درجہ و مقام کیا ہے کیونکہ انہیں غیر مبہم الفاظ میں ... شمار کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ گیتا میں بھی عورت، ویشیا اور شودر کو ... زمرے میں رکھا گیا ہے اور ان سب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "قابلِ حقارت"۔

شہ بھگوت گیتا IX ۳۲

ہیں۔ ایک اور کتاب میں درج ہے کہ عورت اور شودر کی ... ہی سزا ہے۔ سب سے زیادہ اذیت دہ سلوک تو بیوہ سے کیا ... بعض اوقات تو انسانیت سوز حدوں تک پہنچ جاتا ہے اور ... پر اس لئے بھی تکلیف دہ ہے کہ یہ ایک ایسے کلچر کے شاستر میں درج ہے جن میں بڑے بوڑھوں کی نگہداشت اور احترام ... دیا گیا ہے۔ عورتوں کی غلامی و تابعداری کو مجمل طور پر منو ... میں بے کم و کاست بیان کیا گیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ ... آزاد نہیں ہونا چاہیئے۔ بیٹی کے طور پر وہ اپنے والد کی نگرانی ... ہے، زوجہ کے طور پر اپنے شوہر کی اور بیوہ کے طور پر اپنے ...

اس عہد کی ایک اور قانونی کتاب کے مطابق عورت ... جائیداد کا ایک حصہ سمجھا جانے لگا۔ خاص طور پر ملک کے ... جہاں کے خواص کے کلچر میں پدری شجرۂ نسب اور ذاتی ملکیت ... مسلّم ہو چکا تھا۔[۱۱] اس کی بہترین مثال اس بیان میں ہے جس ... گیا ہے کہ عورت گروی رکھی جا سکتی تھی اور رہن پر سود عورت ... ساتواں حصہ لیا جاتا تھا۔ لیکن یہ کہیں بھی واضح نہیں کیا گیا کہ عورت کا اندازہ کیسے لگایا جاتا تھا۔[۱۲] عورت چونکہ موروثی جائیداد کے ... محروم تھی اس لئے اس کا حقِ جائیداد صرف "استری دھن" تک ... "استری دھن" سے مراد وہ دولت ہے جو اس کا کنبہ شادی پر اسے ... اگرچہ نظریاتی لحاظ سے "استری دھن" کو کوئی دوسرا ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ لیکن اس دھن کے باوجود عورت کو کوئی اقتصادی یا دیگر آزادی نہ ہوتی تھی۔[۱۳]

قانونی کتب سے قطعِ نظر تواریخ میں متبادل مثالیں بھی ... جو شاذ و نادر لیکن واضح اور بدیہی ہیں۔ ان میں سے دو مثالیں ... واضح ہیں ذہن میں آتی ہیں پہلی گارگی کی، جو ایک ایسے عہد کی ... آفاق خاتون گزری ہیں جس میں عورتوں پر علم کے دروازے ... کیونکہ انہیں ناپاک سمجھا جاتا تھا، اور دوسری رضیہ سلطانہ کی ... مختصر عرصے تک سہی لیکن ایک ایسے دربار پر حکومت کی جس ... پوری طرح چھائے ہوئے تھے اور وہ بھی خونخوار و جنگ پرست ... یہ مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ قانون میں عورت کو جو حیثیت دی ... کبھی کبھار پوری پیروی نہیں ہوتی تھی۔ اس مسئلے کے کئی ...

[۹] کتابِ قانون از پراشر ۷۱ ۱۶
[۱۰] منوشاستر IX ۳
[۱۱] آریائیں یشرما۔ لائٹ آن ارلی انڈین سوسائٹی اینڈ اکانومی۔ ۲۳
[۱۲] اگنی پران ۲۵۳ ۔ ۶۳، ۶۴
[۱۳] دیکھئے "کین شپ آرگنائزیشن ان انڈیا" از ایراوتی

آتے ہیں مثلاً پدری اور مادری شجرۂ نسب کے پیروکار گروپ
ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ عمل حالیہ برسوں تک
کہنا بہت آسان ہے کہ یہ گروپ بالترتیب آریائی یا غیر آریائی
سے مسئلہ مزید الجھتا ہے کیونکہ آریائی اور غیر آریائی کی
بھی ممکن نہیں۔ لیکن خاندانی اور سماجی تعلقات میں ان
رویوں میں سے کسی ایک کی یا کہیں کہیں دونوں کی پیروی
۔ اور یہی رواج بعض موجودہ خاندانوں میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ
مختلف حصوں میں علاقائی لحاظ سے عورتوں میں جو فرق و اختلاف
ہے اس کا بھی کسی حد تک یہی سبب ہے۔ اس مسئلے کا پیچیدہ ترین
ہے کہ مرد عورت کی بطور دیوی پرستش بھی کرتا ہے۔ آج بھی ہمارے
اور شہروں میں دیوی ماتا یا افزائشِ نسل کی دیوی کی سب سے زیادہ
پرستش ہوتی ہے۔ دیوی کے مختلف مظاہر ہوتے ہیں لیکن چاہے
کے بھونڈے اور نامکمل مجسمے ہوں یا کریم و قاہر دیوتاؤں کی بیویاں یا
کی مخفی و پراسرار شکتیاں، ان سب میں دیوی ماتا ہی کو قوتِ غالب
ہے۔ یہاں تک کہ لنگ کی پرستش میں بھی دیوی ہی کی پوجا مضمر
روایتی لحاظ سے ہندوستان میں دیوی ماتا کی پوجا قبائلی اور دہقانی
پہلے پہل آباد ہونے والے شہروں میں ہوتی رہی ہے۔ رگ

ان اقوام تہذیب پذیر ممالک اور ترقی یافتہ ممالک کے درمیان وسیع
کی کلچر شاید واحد بڑا کلچر ہے اور جنوبی امریکہ میں ۸۰ فیصدی آبادی رہتی
ہے مگر لائب ہے۔ چونکہ جس میں دیوی یا مالی پرستش نمایاں طور
کا غلبہ ... لئے یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ دیوی پوجا کا مسلک افزائشِ نسل سے متعلق ہے،
مزدور سماجوں تک ہی محدود تھا۔ اس کا غلبہ و اثر صنعتی سماج کے قبل
اس کے مسلک کے تنزل کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اس ضمن میں شمال مغربی یورپ میں کنواری
کی پوجا کیوں شروع ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ دیوی
جو ... سے ڈرتا تھا یا اس کی پرستش لاشعوری طور پر ایک اشارۂ تلافی تھی۔ کیا مرد، عورت کو قوتِ تولید کی علامت سمجھ کر
ہندو مذہبی رسوم میں جن کو ادا کرتے وقت عورت کی موجودگی لازم ہے،
ایسی باتیں ملتی ہیں۔
تاریخ ہند کے ہر دور میں سماجی شعور کی یہ مانگ رہی ہے کہ عورتوں
...ت کے بارے میں زیادہ فراخ دلانہ رویہ ہونا چاہیے۔ بحیثیت
مقابلے میں دو بڑے غیر مقلد مذاہب بدھ مت اور جین مت
نے عورتوں کو زیادہ آزادی دینے کی حمایت کی۔ پہلے پہل تو
... نے راہباؤں کا سلسلہ قائم کرنے کی مخالفت کی لیکن بعد
... چیلے آنند کی ایما پر یہ مخالفت ترک کر دی۔ ان دونوں مذاہب
... باؤں کے سلسلوں کے قیام سے اُن عورتوں کو ایک متبادل راستہ
سماج میں عورتوں کے عام اشغال سے کنارہ کش ہونا چاہتی تھیں۔
... نظریۂ فکر مختلف ادوار اور مختلف صورتوں میں بھگتی تحریک کے
... سا کے درگشت

دوران بھی جاری رہا۔ مذہب میں آزاد خیالی کی اس روش نے کہ خدا کے انسانی
روپ کے ساتھ ذاتی رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے، بھگتی تحریک کو جنم دیا جو
بھاگوت روایت کے مطابق تھی۔ اس طرح نہ صرف دینیات اور مذہبی رسوم
کی بندشوں سے آزادی حاصل ہوئی بلکہ مرد اور عورت کے باہمی تعلقات
میں بھی آزادی آئی۔ بھگتی کے ابتدائی اظہار ... الواروں اور نائناروں کی تعلیمات
میں ملتے ہیں نہ صرف ایک شخص کے اپنے دیوتا سے ذاتی عقیدت پر زور دیا گیا
بلکہ اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ عورتوں کو بھگتی کا حق حاصل ہے اور وہ بھی
پوجا سبھاؤں میں شریک ہو سکتی ہیں اور عام طور پر پہلے سے زیادہ آزاد
زندگی بسر کر سکتی ہیں۔ بھگتی رس کے یہ عام فہم گیت فاضلانہ سنسکرت کی
بجائے وسیع پیمانے پر بولی جانے والی پراکرتوں میں نظم کیے جاتے تھے اور
ان میں پیچیدہ مذہبی رسوم کا ذکر بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی جھلک لنگایت
سنتوں کی ابتدائی تعلیمات میں، مہاراشٹر کے سنتوں کی بانیوں میں،
مشرقی ہند میں کسی حد تک چیتنیہ مہا پربھو کی تعلیمات میں اور بڑی حد تک
شمالی ہند کے بھگت سنتوں خاص طور پر کبیر اور نانک کے کلام میں بھی
ملتی ہے چنانچہ یہ امر باعثِ حیرت نہیں کہ بھگتی تحریک نے ہی انڈال،
میرا بائی اور للہ کی سی سنت خواتین کو جنم دیا۔

جلد ہی ایسے ... کر دے۔

... رسیلی ذرائع کو بہتر بنایا
ابتدائی مراحل میں ان غیر مقلد مذاہب کو اور بھگتی تحریک کو ... نہیں ہے ہر ممکن مدد
... سوداگروں اور دستکاروں اور کسی حد تک ... پر مشتمل ماہرین کی کمیٹی بنا دی گئی ہے
جس کی میٹنگ بغداد میں جلد ہی ہوگی۔
کانفرنس کے صدر ... ن شکلا نے اپنی اختتامیہ تقریر میں کہا کہ اس
کانفرنس کے مذاکرات کی بنا پر جو عمل شروع ہوا ہے اس سے ناوابستہ ممالک
کے مابین خبر رسانی کی بنیادی سہولیات کی فراہمی میں بڑی مدد ملے گی
... ممالک کی پریس ایجنسیوں کے پول کے قیام ...
کسانوں اور ایسے ہی طبقوں سے ... زیادہ تر شہری
نصیب ہوئی۔ اگرچہ خواتین دربار اکثر و بیشتر ... آسودہ حال
سرپرست تھیں۔ ان فرقوں کو ... شاہی سرپرستی کبھی کبھار
اُن کے قدم جم گئے۔ حکمرانوں کی حمایت اسی وقت حاصل ہوئی جبکہ بدھ اور جین مذاہب کی سرگرم
کی سرپرستی کرتے وقت بہت سوچ سمجھ سے کام لینا پڑتا تھا۔ حکمرانوں کو سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر مذہبی فرقوں
بدھ اور جین فرقے جن سماجی طبقوں پر مشتمل تھے اُن کے باعث بھی
ان فرقوں میں عورت کی جانب فراخدلانہ رویہ اپنایا گیا۔
حالیہ برسوں میں عورتوں کی جانب رویے میں جو بڑی تبدیلی آئی ہے
وہ قومی تحریکِ آزادی کی مرہونِ منت ہے۔ یہ تحریک انیسویں صدی میں
شروع ہوئی تھی اور اس کے سماجی اثرات اب تک موجود ہیں۔ شروع میں
یہ تحریک بنیادی طور پر متوسط طبقے کی تحریک تھی جس کی جڑیں ملک کے
شہری مرکزوں میں پھیلی ہوئی تھیں لیکن مہاتما گاندھی کی مساعی سے ایک
عوامی تحریک بن گئی۔ اسے عوامی تحریک کا روپ دینے کے لئے آزادی کا
جو نعرہ بلند کیا گیا اس میں کئی پسماندہ گروہوں مثلاً دلت جاتیوں، کسانوں،
کارکنوں اور عورتوں کے حقِ آزادی کو بھی شامل کرنا پڑا۔ قومی تحریک
میں عورتوں کی شمولیت آزادی کے پروگرام کا ایک ضروری حصہ بن
گئی۔ چونکہ مقصد یہ تھا کہ سارے کا سارا کنبہ اس تحریک میں حصہ لے
اس لئے عورتوں کی شمولیت اور بھی ضروری ہو گئی۔ اس سے تحریک آزادی

(باقی صفحہ ...)

شمیم نکہت
ڈی ۵/۱۹۔ ماڈل ٹاؤن، دلی ۱۱۰۰۰۹



آزادیٔ نسواں کی جدوجہد

عورتوں کی آزادی کے مسائل ہمیشہ ہی مہذب دنیا میں بحث کا موضوع رہے ہیں اور اس کی کوشش کی گئی ہے کہ عورتوں کے ساتھ جانب دارانہ سلوک نہ کیا جائے۔ عورتوں کی آزادی کی باقاعدہ جدوجہد شروع ہونے سے پہلے بھی بعض زمانوں میں عورتوں نے اپنے حقوق طلب کئے۔ یہ کوشش منظم اور قانونی نہیں تھی۔ اس کوشش کے باقاعدہ شروع ہونے سے پہلے بھی عورتوں نے علمی و ادبی اور سماجی مشاغل میں نہ صرف یہ کہ اپنی [illegible] نمایاں حیثیت بھی حاصل کی ہے۔)

((عہد وسطیٰ اور مغلیہ دور میں عورتوں کو اپنی صلاحیتوں کو ظاہر کرنے کا کافی ملا ہے اور سیاست، موسیقی اور شاعری میں عورتوں نے نمایاں اہمیت حاصل کی۔ چنانچہ رضیہ سلطانہ، چاند بی بی، تارا بائی، اہلیہ بائی، گلبدن بیگم، نور جہاں، جہاں آرا، زیب النساء وغیرہ کے نام ذہن میں آتے ہیں۔ غلاموں کے زمانے میں مسلسل حملوں نے عورتوں کی سماجی حیثیت کو کافی متاثر کیا۔ جنگ کے اثرات پورے سماج پر خراب پڑتے ہیں۔ لیکن اس سے سب سے زیادہ عورتیں متاثر ہوتی ہیں۔ بار بار کی ان جنگوں سے یہی ہوا کہ عورتوں کی وقعت کم ہونے لگی۔ بودھ زمانے سے عورتوں کا جو تبلیغی سلسلہ چلا آ رہا تھا وہ اُن کی وجہ سے ختم ہو گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ حالات میں تبدیلی آئی۔ صنعتی انقلاب اور انیسویں صدی کی سائنسی ترقیوں نے رفتہ رفتہ اس جنسی تعصب کو بڑی حد تک کم کر دیا جو مردوں میں عورتوں کے لئے پایا جاتا تھا۔ اٹھارویں صدی تک مہذب دنیا میں بھی عورتوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت کر دیا جاتا تھا۔ ۲۲ جولائی ۱۷۹۷ء کے "لندن ٹائمز" میں لکھا ہے کہ عورتوں کی اہمیت اب کافی بڑھ گئی ہے اور بازار میں اب اُن کی قیمت آدھی گنی سے ساڑھے تین گنی ہو گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اٹھارویں صدی کے آخر تک انگلینڈ میں عورتوں کے بیچنے کا عام رواج تھا۔

وولا کلن نے اپنی کتاب "فیمیل کریکٹرز" میں اس قسم کے کئی واقعات کا ذکر کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں اور بیویوں کی فروخت کا اچھا خاصا عام تھا۔ ۱۸۲۳ء میں اس کا کتنا رواج تھا اس کا اندازہ ایچ ایم وی ٹمپرلی کے ایک مضمون سے کیا جا سکتا ہے جس کا نام ہی "سیل آف وائیوز ان انگلینڈ ان ایٹین ٹوئنٹی تھری" ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورتوں کا فروخت کرنا اس زمانہ میں ایک سماجی بیماری کی طرح [illegible]۔ انگریزی کے مشہور نقاد اور ادیب ایمرسن نے بھی ۱۸۵۶ء میں بیویوں کے بیچے جانے کے بارے میں اشارے کئے ہیں۔

میری وول اسٹون کرافٹ انگلینڈ کی پہلی عورت ہے جس نے سب سے پہلے عورتوں کے مسائل کے بارے میں لکھنا شروع کیا اور اُن کی ہمدردی میں آواز اُٹھائی۔ اس نے عورتوں کی تعلیم کے مسائل پر بھی ایک کتاب لکھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورتوں کے حقوق اور اُن کی آزادی کے سلسلے میں اظہار خیال کیا جانے لگا تھا لیکن چونکہ ان کی کوئی تنظیم نہیں تھی اس لئے بہت نمایاں اثر نہیں [illegible]۔

آزادیٔ نسواں کی باقاعدہ جدوجہد انیسویں صدی کے آخری حصے میں شروع ہوئی جس میں عورتوں نے باقاعدہ اپنے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کی۔ رابرٹ اووِن کی شاگرد فرانسس رائٹ (FRANCES WRIGHT) نے عورتوں کی غلامی کے مسئلہ کو حل کرنے کے سلسلے میں عملی اقدامات کئے۔ [illegible] مارٹی نین (HARRIET MARTINEAN) نے اصلاحی بل کو کامیاب بنانے کے لئے ان تھک محنت کی اور آکٹویا ہل (OCTAVIA HILL) نے عورتوں کی سماجی بہبود کے لئے بہت سے کام کئے۔ الزابتھ فرائی نے قیدی عورتوں کی اصلاح کا کام کیا اور اُن کی دیکھ بھال اور فلاح و بہبود کے لئے بہت سی کمیٹیاں بنائیں۔ فلورنس نائٹ انگیل نے جنگ کریمیا کے زمانے میں ملیٹری ہیلتھ سروس قائم کی اور عورتوں کے لئے ایک نئے شعبہ کی بنیاد ڈالی جو آج بھی اسپتالوں میں نرسوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔)

عورتوں کی آزادی اور مساوات کی تحریک رفتہ رفتہ جاری رہی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں یہ تحریک تقریباً دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گئی۔ بین الاقوامی سطح پر اس تحریک کو فروغ دینے میں مس بی [illegible] اور امریکی عورتوں کی مختلف تنظیموں اور اداروں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ مس انتھونی کا کہنا تھا کہ عورتیں ملک [illegible] میں مردوں کے [illegible]

کے انگریزوں تاریخ دانوں، ناول نگاروں، سرکردہ شاعروں کے بارے میں بہت کم واقف ہیں جبکہ ہمیں یورپ اور امریکہ کے معمولی مصنفین اور کالم نگاروں کے بارے میں واقفیت حاصل ہے۔

شریمتی اندرا گاندھی نے آخر میں کہا اطلاعات کے معاملے میں خود انحصاری اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ تکنیکی شعبوں میں خود اعتمادی مجھے امید ہے کہ یہ کانفرنس عزم مصمم کے ساتھ کی جانے والی اُن کوششوں کا آغاز ہے جو نو آبادیاتی نظام کے بچے کھچے آثار کے خاتمے کے لئے کی جائیں گی۔"

اس کانفرنس کے صدر جناب ودیا چرن شکلا نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ اس بات پر غور ہونا چاہیے کہ خبروں سے متعلق موجودہ تعاون میں مزید توسیع کس طرح لائی جائے۔ ناوابستہ ملکوں میں مواصلاتی نظام نو آبادیاتی دور کی دین ہے اور یہ کہ نئی دہلی سے کابل کے مقابلے میں لندن پیغام بھیجنا زیادہ آسان ہے۔

آپ نے مزید کہا یہ سب سے پہلے تو اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ ناوابستہ ممالک خود آپس میں کس طرح سہولتیں بہم پہنچا سکتے ہیں اور دوسرے یہ کہ عالمی اداروں کے سامنے کیا تجویزیں پیش کی جائیں جن سے ترقی پذیر ممالک اپنی موجودہ دشواریوں پر قابو پا سکیں۔"

"... ترقی پذیر ممالک اور ترقی یافتہ ممالک کے درمیان وسیع خلیج موجود ہے۔ ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ میں ۷۰ فیصدی آبادی رہتی ہے مگر ان ممالک میں صرف ۲۶ فیصد روزنامے شائع ہوتے ہیں۔ اخباری کاغذ پر چند صنعتی ملکوں کی اجارہ داری ہے۔ اور اگر ان میں کسی ملک میں مزدور ہڑتال کر دیں جیسا کہ ۱۹۷۴ میں ہوا تھا تو ترقی پذیر ملکوں کے اخبارات کی اشاعت بند ہو سکتی ہے۔

ہندوستان کے ۴۳ رکنی وفد کے لیڈر جناب محمد یونس نے ورکنگ کمیٹی کو کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اطلاعات کے میدان میں ہندوستان کے پاس جو بھی وسائل اور سہولتیں ہیں ان کو غیر مشروط طور پر دیگر ناوابستہ ملکوں کے لئے دستیاب کر دیا جائے گا تاکہ اطلاعات کی دنیا میں جو اجارہ داری قائم ہو گئی تھی اس کو ختم کیا جا سکے۔

ہندوستان کے پاس جو ذرائع و وسائل ہیں، ان کا تذکرہ کرتے ہوئے جناب محمد یونس نے کہا ۱۲ ہزار اخبارات ۵۶ زبانوں میں شائع ہوتے ہیں اور مواصلاتی نظام کا جال بچھا ہوا ہے جو ۵۰۰،۰۰۰ کلومیٹر کے ٹیلی پرنٹر لائنوں پر مشتمل ہے۔ ہندوستانی ریڈیو سے دنیا کے تمام ملکوں کے لئے مختلف غیر ملکی زبانوں میں خبریں نشر کی جاتی ہیں۔ اس وقت ہمارے پاس ٹیلی ویژن کے ٹرانسمیٹر ہیں جن کو بڑھا کر ... کر دیا جائے گا۔ دس ہزار سے زیادہ شہر اور تقریباً پچاس ہزار ... یونیورسٹیوں میں جرنلزم کی تعلیم دی جاتی ہے جن میں چار پوسٹ گریجویٹ سطح کی تعلیم دیتے ہیں۔ آپ نے مختلف شعبے کے تربیتی اداروں کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ ہمارے سارے وسائل اور تجربے ناوابستہ ملکوں کو دستیاب ہوں گے۔

ایک لائحہ عمل تیار کرنے اور مشترک خبر رساں ایجنسی کو عملی شکل دینے کے لئے ذیلی کمیٹیاں بنا دی گئی تھیں خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان نے پالیسی سے متعلق جو مسودہ تیار کیا تھا اُسے معمولی تبدیلیوں کے بعد کانفرنس نے قبول کر لیا اور اجلاس کے آخری دن یہ خوشگوار اعلان کیا گیا کہ ناوابستہ ممالک کے نمائندے ایک نیوز ایجنسیز پول کے قیام پر رضامند ہو گئے ہیں تاکہ اطلاعات کی جو اجارہ داری دنیا کی چند بڑی خبر رساں ایجنسیوں کے ہاتھوں میں ہے اس کا خاتمہ کیا جا سکے۔

پول کا دستور کانفرنس نے اتفاق رائے سے منظور کیا اور ایک ۱۴ رکنی تال میل کمیٹی بنا دی جس کا چیرمین ہندوستان ہے۔ یہ کمیٹی جلد ہی ایسے قدم اُٹھائے گی جس سے یہ پول مختلف مراکز میں کام کرنا شروع کر دے۔

ایک فیصلہ یہ بھی کیا گیا کہ ناوابستہ ملکوں میں ترسیلی ذرائع کو بہتر بنایا جائے اور ایسے ناوابستہ ممالک کو جن کی اپنی نیوز ایجنسی نہیں ہے ہر ممکن مدد دی جائے۔ اس مقصد کے لئے بارہ ملکوں پر مشتمل ماہرین کی کمیٹی بنا دی گئی ہے جس کی میٹنگ بغداد میں جلد ہی ہو گی۔

کانفرنس کے صدر شری ودیا چرن شکلا نے اپنی اختتامیہ تقریر میں کہا کہ اس کانفرنس کے مذاکرات کی بنا پر جو عمل شروع ہوا ہے اس سے ناوابستہ ممالک کے مابین خبر رسانی کی بنیادی سہولیات کی فراہمی میں بڑی مدد ملے گی۔

ناوابستہ ممالک کی پریس ایجنسیوں کے پول کے قیام پر اظہار اطمینان کرتے ہوئے شری شکلا نے کہا کہ اس کانفرنس میں آئندہ تعاون کیلئے ایک لائحہ عمل وضع کرنے اور ایک مؤثر اعلان کو منظور کرنے میں جو کامیابی حاصل کی گئی ہے وہ قابل تعریف ہے۔

شری شکلا نے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ اطلاعات کی عالمی صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے ناوابستہ ممالک کی کوئی اعلیٰ سطحی وزارتی کانفرنس ہوئی ہے۔ وقت کا اہم تقاضہ یہ ہے کہ ناوابستہ ممالک اطلاعات کی فراہمی اور خبر رسانی کے ذرائع کے ضمن میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ اس کانفرنس سے ایک ایسے عمل کا آغاز ہوا ہے جس سے خبر رسانی کے شعبے میں ہماری بنیادی سہولیات کی صورت حال قطعی طور پر بہتر ہو گی۔ اس سے ناوابستہ ممالک کے مابین تعاون کے فروغ میں مدد ملے گی اور ناوابستگی کی تحریک کو بھی تقویت ملے گی۔

یہ چہار روزہ کانفرنس کئی لحاظ سے بے حد اہم تھی اور اس کانفرنس نے بڑے تاریخی فیصلے کئے ہیں۔ خبر رسانی کا ایک مشترک ادارہ ترقی پذیر ملکوں کے لئے بے حد مفید ثابت ہو گا۔ اس طرح قومی خبر رساں ایجنسیاں وجود میں آئیں گی جو دنیا کو صحیح معلومات بہم پہنچائیں گی۔

پیاسی ندی

سکون کے لئے جب پیاروں کی یاد بہت بے قرار کرتی ہے تو سکون کے لئے میں اُن کی آرام گاہ کی طرف چپکے سے چلی جایا کرتی ہوں۔ اسی دن آدھ گھنٹے بعد جب میں باہر نکل رہی تھی تو بائیں جانب تازہ تازہ قبر نظر آئی۔ سرہانے ایک ہری شاخ لگی ہوئی تھی جواب کچھ کچھ سوکھ چلی تھی۔ قبر کی کچی مٹی پر چھڑکاؤ کیا ہوا تھا۔ کچھ پھول بھی پڑے تھے۔ ہفتہ بھر قبل آپا بی یہاں ابدی نیند سونے آئی تھیں۔

میں مُڑی، فاتحہ پڑھی... چند آنسو بے اختیار آنکھوں سے ٹپک پڑے... دو قدم گیٹ کی طرف بڑھی تھی کہ دُور سے "اُن" کی سفید داڑھی نظر آئی۔ میں بے ارادہ ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہو گئی۔ سر کے سفید بال پریشان تھے، ململ کے کرتے کا گریبان کھلا ہوا تھا.... دھیرے دھیرے بہت دھیرے دھیرے وہ آگے بڑھے۔ دونوں ہاتھ بلند کر کے فاتحہ پڑھی اور پھر سر جھکا کر قبر کے سرہانے بیٹھ گئے۔ لگتا تھا جیسے کسی بات کا ہوش ہی نہ ہو... اُن کا ایک ہاتھ قبر کی گیلی مٹی پر دھرا تھا دوسرے سے اُنہوں نے اپنے جھکے سر کو سنبھال رکھا تھا۔ بوڑھی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں قبر کی مٹی پر گر کر جذب ہو جاتی تھیں... آنسو؟ محبت کے؟ پشیمانی کے؟ جدائی کے؟ بے اعتنائی کے؟ بے پروائی کے؟ کاہے کے ہیں یہ آنسو؟

یکایک مجھے ایسا لگا جیسے قبر سے ایک گوری بھری بھری کلائی نکلی.... کلائی جس میں سہاگ کی ہری اور گلابی چوڑیاں اور سونے کے کڑے چھن چھنا رہے ہیں۔ اور ان آنسوؤں کو اپنی چاندی کی انگوٹھیوں بھری انگلیوں سے بڑی محبت سے پاک کرنے لگیں... مگر ــ ارے ــ یہ تو ان کا اپنا ہاتھ تھا۔ میں قریب نہیں گئی۔ ہمدردی کے دو لفظ نہ کہہ سکی۔ آج یہ اس کی قبر پر بیٹھے ہیں۔ زندگی میں کبھی اس کے پاس بیٹھے ہوتے... یہ ہاتھ جو بے قراری سے گیلی مٹی کو رول رہا ہے... کبھی اس کی پشت پر پیار سے رکھا ہوتا ــ سفر پہ ــ وہ سفر جو روز ہوتا تھا ــ جاتے کبھی اس سے رخصت ہونے آئے ہوتے... اور جب انتظار کرتے کرتے وہ تھک جاتی تو واپس آکر اس سے چار باتیں کی ہوتیں، اس کا دکھ سکھ سنا ہوتا۔

بیماری آزاری میں اس کی خیر خبر لی ہوتی... مانا یہ بڑے قابل، بڑے ودوان ہیں اور وہ جاہل تھی، گنوار تھی ــ مگر کیا پچاس سال کی رفاقت، محبت، خدمت ــ بے معنی ہوتی ہے؟ کیا عورت کی ان انمول صفات کا اس کی بے غرض سیوا کی کوئی قیمت کوئی بدلہ ــ کوئی اعتراف ضروری نہیں ــ وہ پچاس سال انتظار کرتی رہی اور انہوں نے کبھی آنکھ بھر کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کی خدمت کی پذیرائی نہیں کی۔ یہ جھوٹے آنسو! یہ اپنے ضمیر کو دھوکا دینے والے آنسو۔ یہ پچھتاوا۔ نہیں مجھے ان سے کوئی ہمدردی نہیں۔ ایسے بے حس بے پروا مرد!!

میں دھیرے دھیرے گھر کی طرف جا رہی تھی اور آپا بی کا ہیولا میرے آگے آگے چل رہا تھا ــ وہی سیدھا سادا ڈھیلا ڈھالا لباس، سستے ریشم کا پاجامہ، چکن کا گھیردار کرتا اور خوب لمبا چوڑا بیل لگا ہوا گلابی کامدانی کا دوپٹہ... بھورے بھورے بالوں کی ــ جن میں سفیدی کی لٹیں بھی شامل ہو چکی تھیں، پٹیاں جمی ہوئی ــ گورا بھبوکا رنگ ــ جس کی تابناکی میں ساٹھ باسٹھ برس کی عمر میں بھی زیادہ فرق نہ آیا تھا ــ ہاں جامہ اصلی کو بڑھاپے کی جھریوں نے تھوڑا سا چُن ضرور دیا تھا...

میں برسوں پہلے ان سے ملی تھی۔ اُس وقت وہ خاصی جوان تھیں اور اپنے بے ڈھنگے لباس اور زیوروں کے باوجود پیاری لگتی تھیں۔ عمر میں مجھ سے پانچ سات سال بڑی ہوں گی مگر ان کی شادی بارہ تیرہ برس کی عمر ہی میں ہو گئی تھی اس لئے وہ بیس بائیس برس کی بیاہی، خاصی پختہ عمر کی بیوی لگتی تھیں۔ کلائیاں بھری چوڑیاں، ناک میں سونے کی بڑی سی کیل، کانوں میں سونے کے لمبے لمبے جھمکے اور گلے میں چمپا کلی... ہاتھوں میں مہندی ہمیشہ ہی نظر آتی تھی ــ کس قدر پیار تھا انہیں اپنے سہاگ اور سہاگ کی ان ساری نشانیوں سے ــ بات چیت میں کچھ کھڑی بولی، کچھ پوربی بولی کی آمیزش اور تشدید کا زور۔ پہلی ہی ملاقات میں ایسے خلوص اور اپنایت سے ملیں جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔ میں اُنہیں احتراماً آپا بی کہتی تھی مگر وہ مجھے اور مجھ سے بھی چھوٹی، اپنی سب ملنے والیوں کو بھابی جی کہتی تھیں۔ دوسروں کا احترام کرنا، اُن سے مرعوب ہو جانا، اپنے کو کم تر سمجھنا اُن کی خصوصیت تھی۔ مگر یہ کمتری انکسار کا ایک مجزو تھی وہ کمتری نہیں جسے آج احساسِ کمتری کہا جاتا ہے۔ ان میں رشک کا جذبہ نہ تھا، حسد کی آگ نہ تھی۔ دوسروں کی خوشیوں یا قابلیت یا سکھ بھری زندگی سے جلنے کی عادت نہ تھی۔ کتنی قانع کتنی سادہ لوح اور نیک دل تھیں وہ!

بارہ تیرہ برس کی عمر میں اُن کا بیاہ ہو گیا تھا۔ اٹھارہ انیس سال کے لڑکے سے جو بی۔ اے میں پڑھ رہا تھا۔ اُن کے گھرانے میں تعلیم کا زیادہ رواج نہ تھا ــ عورتوں کو پڑھانا لکھانا معیوب سمجھا جاتا۔ بس ناظرہ قرآن پاک پڑھا دیا اور نماز روزے کے مسئلے مسائل۔ اُردو اتنی ہی آتی کہ بہشتی زیور یا ایسی ہی دوسری کتابیں پڑھ لیں!

اور میاں نے بی۔ اے پاس کیا۔ ایم۔ اے کیا پھر ولایت چلے گئے کوئی ڈگری لینے۔ ولایت کا کیا مطلب ہے، کون سی ڈگری وہ لے کر آئیں گے یہ سب وہ نہیں جانتی تھیں ــ چپکے چپکے "کون نگریا پیا گئے رے" گنگنایا کرتیں مگر کس سے



وزیرِ اعلا ریاست جموں و کشمیر جناب سید میر قاسم کو مرکزی کابینہ میں شامل کیا گیا ہے جس کو راشٹرپتی بھون میں منعقدہ ایک تقریب میں آپ نے اپنے عہدے کا حلف اُٹھایا۔

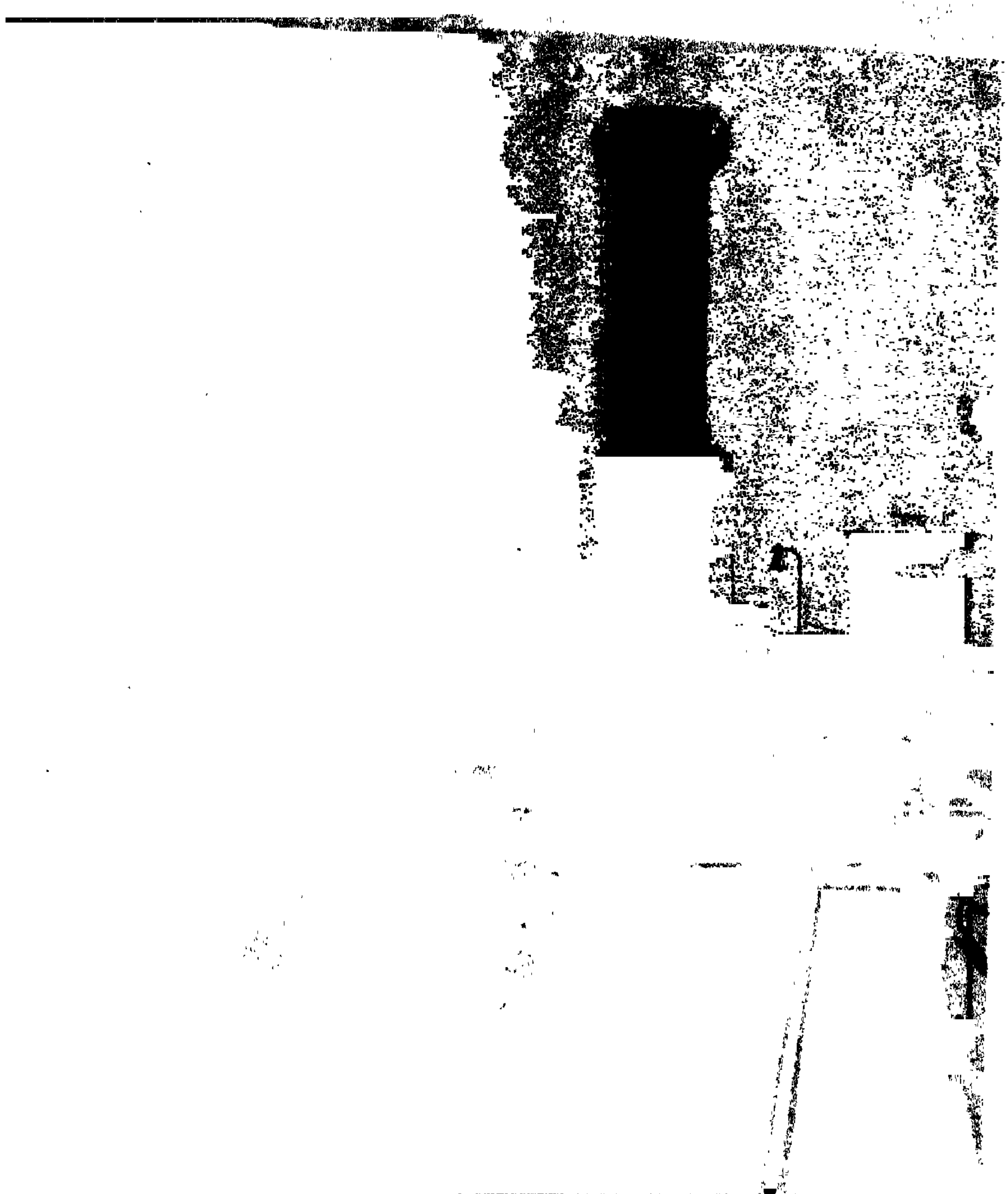


عزت مآب جناب مانیا منیسکو وزیرِ اعظم سوشلسٹ ری پبلک آف رومانیہ ۲۱ مئی ۱۹۷۶ء کو ہندوستان کے سرکاری دورے پر تشریف لائے۔ ہوائی اڈے پر وزیرِ اعظم ہند اور وزیرِ خارجہ نے ان کا استقبال کیا۔

* * *



جنوبی ویت نام کی انقلابی حکومت کی وزیرِ خارجہ مادام تھی بنہ ۲۰ مئی ۱۹۷۶ء کو ہندوستان تشریف لائیں۔ سری یشونت راؤ چوہان، وزیرِ خارجہ حکومتِ ہند نے ہوائی اڈے پر اُن کا سواگت کیا۔



ہند روس دوستی کا ایک سنگ میل ۔ بوکارو کا فولاد ساز کارخانہ ۔

Vol. 34 No. 12 [illegible]LY) July 1976

Published by the Director, Publications [illegible], Patiala House, New Delhi-110001.

Printed by Skylark Printers, [illegible], Id-Gah Road, New Delhi-110055.

پوچھ نہ سکتی تھیں۔ ۔ ۔ بس من ہی من میں پیا کی پوجا کرتی رہتیں! سلامتی کی دعائیں مانگا کرتیں۔ کبھی کبھار اُن کے باپ کے پاس "پیا" کا دو چار سطر کا خط آجاتا۔ "میں خیریت سے ہوں ۔ امید ہے وہاں بھی سب بخیریت ہوں گے!" اور وہ ہفتوں اُن دو سطروں کے نشے میں مخمور رہتیں۔ شاید چند مہینے ہی انہیں اپنے نوعمر دُولہا کی محبت کی چھاؤں نصیب ہوئی تھی۔ ۔ ۔ اس لئے کہ وہ پڑھ رہے تھے اور یہ زیادہ تر میکے میں رہتیں ــ ماں باپ کی اکلوتی لاڈلی بیٹی تھیں نا ــ پھر وہ ولایت چلے گئے ــ کئی سال کے لئے۔ ۔ میکے میں ہر وقت اُن کی نازبرداری ہوتی۔ اللہ آمین ماشاء اللہ بسم اللہ ان کی ہر بات پر کہا جاتا۔ سسرال جاتیں تو وہاں بھی ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں۔ ماشاء اللہ کیا بھرا پُرا گھر ہے اُن کی سسرال کا؟ وہ من ہی من میں خوش ہوتیں۔ چار نندیں، تین دیور، ساس سسر اور کُنبے بھر کے جانے کتنے بچے ۔ ۔ ۔ بڑی خوش رہتیں وہ وہاں۔ اور کیوں نہ رہتیں؟ ساس سسر کی لاڈلی تھیں۔ خاندان کے سب سے بڑے، سب سے ذہین، سب سے قابل فرد کی بیوی تھیں۔ اور پھر جہیز بھی تو کتنا لائی تھیں۔ وہ کوئی کام کرتیں تو سب "ہیں ہیں" کرنے لگتے ارے اس کے پھول سے ہاتھ کملا جائیں گے۔ وہ اس وقت تھیں بھی تو اتنی دھان پان، ننھی منی سی کہ لگتا پھولوں میں تول لو ــ

مگر پھر ۔ ۔ پھر چند سال میں دنیا بدل گئی۔ وہ آئے تو بالکل بدلے ہوئے ــ یوں وہ پیا کے چال چلن کی قسم کھانے کو تیار تھیں مگر ان کی طرف وہ رُخ نہ دیتے تھے۔ ساس سسر اللہ کو پیارے ہوگئے۔ خاندان کے دوسرے افراد نے میاں کی نظریں پھری دیکھیں تو وہ بھی کیوں پروا کرتے؟ میکہ بھی اجڑ چکا تھا ــ جاتیں کہاں ــ اور پھر "لڑکی تو ڈولے پر سوار ہو کر آتی ہے اور کھٹیا پر شوہر کے گھر سے نکلتی ہے" یہ عقیدہ ان کے دل کی گہرائیوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ ۔ ۔ انہوں نے بے حسی کی نقاب اوڑھ لی یا قدرت نے انہیں بے حس بنا دیا ــ کون جانے۔ بظاہر وہ سب کی خدمت، سب کی سیوا میں لگی رہتیں۔

میں جب اُن سے ملی تو وہ ہوں گی کوئی پینتیس برس کی۔ اُن کا جسم اب خوب پھیل گیا تھا۔ چہرے کا بھولا پن تو قائم تھا مگر باہوں، پیٹھ، پیٹ اور کولھوں پر گوشت کی تہیں جم چکی تھیں۔

ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ کیوں نہیں تھی؟ قصور اُن میں تھا یا اُن کے شوہر میں؟ وہ تو اپنا ہی سمجھتی تھیں۔ یہ خیال بھی کبھی ان کے ذہن میں نہیں آیا کہ ان کے میاں نے دوسری شادی کیوں نہیں کی۔ وہ تو اُلٹی ان کی شکر گزار تھیں جو اُن جیسی جاہل گنوار عورت سے "نباہ" کر رہے تھے۔ "نباہ" وہ بچاری "نباہ" کے لفظ کا پورا مطلب سمجھتی ہی کہاں تھیں! ولایت سے آنے کے کچھ عرصے بعد پہلے اُن کا کمرہ الگ ہوا۔ انہیں سکون سے کام کرنے کی ضرورت تھی نا؟ پھر دو چار سال بعد وہ دوسرے گھر میں رہنے لگے۔ ان کے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی۔ ہر وقت لوگ ملنے جلنے کے لئے آتے رہتے تھے۔ "عورتوں کو زحمت ہوگی!" اور انہوں نے اسے بھی خوش دلی سے قبول کر لیا۔ ہاں وہ دن میں ایک بار ضرور اپنے مکان میں آتے تھے اور وہ دُور دُور ہی سے دیکھ کر دل ٹھنڈا کرتیں۔ پجارن کو بھگوان کے درشن سے جو سکون ملتا ہے وہی اُن کو اپنے "مجازی خدا" کے دیدار سے حاصل ہوتا تھا۔ وہ ان سے بے رُخی کیوں برتتے ہیں؟

کبھی بات چیت تک نہیں کرتے۔ اپنا کوئی کام ان سے نہیں کہتے۔ وہ جانتے ہی کیا تھے کہ چاہنے والی بیوی کو شوہر کی خدمت سے کیا راحت ملتی ہے؟

انہوں نے پہلی ہی نظر میں اپنے دل کی ساری محبت ان کے قدموں میں نچھاور کر دی تھی۔ وہ تھے بھی تو کتنے وجیہہ، خوش مزاج، ظریف، کنبہ پرور۔ کتنے اونچے اخلاق کے ہیں وہ، یہ احساس ہی ان کے لئے باعثِ ناز تھا۔ پھر بیوی سے کیوں یہ بے رُخی ہے؟ کیا وہ بدصورت ہیں؟ مگر آئینہ اس کی سختی سے تردید کرتا تھا۔ کیا وہ کاہل، بدمزاج، بددماغ ہیں؟ مگر وہ یہ کیسے مان لیں! اُن کی برسوں کی خاموش خدمت نے اپنوں پرایوں سب کو اُن کا بنا دیا تھا۔ گھر کا ہر مشکل کام وہی انجام دیتی تھیں۔ روٹی پکانا، برتن مانجھنا، جھاڑو بہارو۔ بچوں کی پرورش سبھی تو اُن کے ذمہ تھا۔ بڑی بھابی، بڑی بی بی، بڑی اماں ۔ ۔ ۔ سب کی زبان پر تھیں۔ اس لئے کہ ہر کام کے وقت وہی یاد آتی تھیں۔ ہاں جب "بڑے ابا" گھر آتے تو لڑکیاں اُن کے آگے پیچھے پھرتیں اور بڑی اماں دُور بیٹھی کنکھیوں سے میاں کو نہارتی رہتیں!

اُنھیں کام میں بڑا سکون بڑی راحت ملتی تھی۔ "خدمت میں عظمت ہے" جانے وہ اس مقولے کو جانتی بھی تھیں کہ نہیں ۔ ۔ ۔ مگر عمر بھر اس پر عمل ضرور کرتی رہیں! شاید اس طرح وہ خاندان میں اپنے وجود کی اہمیت منوانا چاہتی ہوں۔ یا شاید دل کے خلا کو پُر کرنے کا یہ تیر بہدف نسخہ اُنھوں نے دریافت کر لیا تھا۔

بس غم تھا تو یہ "وہ" ان کو خدمت کا موقع نہ دیتے تھے ۔ ۔ ۔ وہ دوڑ دوڑ کر گرم گرم روٹی سامنے لاکر رکھتیں اور وہ ہاتھ بڑھا کر ٹھنڈی روٹی اُٹھا لیتے۔ وہ کپڑے نکال کر لاتیں اور وہ منہ پھیر کر کسی بھانجی بھتیجی سے اپنے غسل کی تیاری کے لئے حکم دیتے کیوں؟ آخر کیوں؟ ان کا دل انھیں کچوکے دیتا۔ اور پھر دل بہلانے کے لئے ــ زندگی کو گوارا بنانے کے لئے ایک عجیب و غریب خیال اُن کے ذہن نے قبول کر لیا۔ کچھ آسیبی طاقتیں ہیں جنھوں نے ان کے میاں کے دل کو ان سے ملنے نہیں دیا ــ اور بڑی معصومیت سے وہ اس پر ایمان لے آئیں۔ کبھی بھولے بھٹکے بھولے بسرے وہ ان سے مخاطب ہو جاتے تو خوشی سے پھولی نہ سماتیں۔ سفید رنگ میں سرخی جھلک آتی، پان سے بے نیاز ہونٹوں پر گلابی رنگ نکھر آتا، ویران آنکھوں میں ڈنک پیدا ہو جاتی! اس دن وہ کسی نہ کسی بزرگ کی "نذر" ضرور دلاتی تھیں!

مگر سُونے دن اور تنہا راتیں ان کا مقدر تھیں۔ جب دل بہت پھڑپھڑاتا تو وہ کسی بھانجی بھتیجے کے سوئے بچے کو اپنے بھرپور سینے سے لپٹا کر آنسو بہاتی سو جاتیں۔ اور میٹھی نیند میں جانے کیا سپنے دیکھتیں کہ ہونٹ مسکراتے رہتے!

مگر کبھی کسی نے اس دل میں جھانک کر نہ دیکھا۔ کوئی اور کیا دیکھتا جس نے تیرہ برس کی عمر میں ہاتھ پکڑا تھا وہی بیگانہ بن گیا تو اور کسی کو کیا غرض پڑی تھی؟

اور دن اور رات کا چکر چلتا رہا۔ ماہ و سال بیتتے رہے۔ اور وہ کام ــ کام ــ کام میں اپنی زندگی کے دن گزارتی رہیں!

مگر اس زندگی میں ایک رنگین یاد بھی تھی۔ وہ اُس کو کیسے بھولتیں جب اچانک وہ ان کے اپنے ہو گئے تھے؟

وہ سفر سے واپس آئے تو بخار میں بھن رہے تھے اور پھر میعادی بخار ــ ضیا دھڑتی

اور بے ہوشی کی حالت میں، موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا رہے۔

— دو چار دن وہ دور کی تماشائی رہیں۔ مگر لوگ دو چار دن ہی کی خدمت سے اکتانے لگے تو انہوں نے سب کو ہٹا کر تیمارداری کا سارا بار اٹھا لیا۔ وہ نرسنگ نہیں جانتی تھیں تیمارداری کے نئے اصولوں سے واقف نہ تھیں مگر خدمت اُن کی زندگی اور محبت ان کی رہنما تھی !

آہ! راحت و سکون و مسرت کے یہ انمول دن — یہ سنہرے دن — جب وہ ان کے اپنے تھے۔ اور صرف وہ اُن کی تھیں۔ اُن کی بس ایک ہی دعا تھی۔ جسے رات دن دل دہرایا کرتا تھا "مولا مجھے سہاگن اٹھانا، میں سہاگن مروں۔ وہ اپنے ہاتھ سے مجھے مٹی دیں۔ میں کچھ اور نہیں مانگتی۔ کچھ بھی نہیں!"

خدا نے اُن کی سُن لی۔ وہ صحت یاب ہو گئے۔۔۔ بیماری میں وہ حیرت، پریشانی، پشیمانی سے ان کی دن رات کی خدمت دیکھتے رہتے تھے صحت مند ہونے کے بعد یہ سب جذبے جھنجلاہٹ میں بدل گئے۔۔۔ اور ایک دن وہ پھٹ پڑے۔

"تم سب لوگ آخر کہاں رہتے ہو — دیکھتے نہیں تمہاری بڑی اماں کا کیا حال ہو گیا ہے — مہینوں کی بیمار لگتی ہیں!"

وہ ان لفظوں کے پیچھے چھپے بے نیازی کے جذبے کو کیا پاتیں؟ وہ تو ان شیریں الفاظ کے سحر میں کھو گئیں۔ "تمہاری بڑی اماں اور کیا حال ہو گیا ہے" یہ لفظ اُن کی روح میں اتر گئے۔ وہ انہیں چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے۔ بس شرماتے ہیں!

آہ یہ انسان۔ یہ عورت کیسے کیسے بھلاوے دینا جانتی ہے اپنے دل کو! زندگی پھر پرانے ڈھرے پر آ گئی۔ وہ پھر اپنی مصروفیتوں میں گم ہو گئے اور انہوں نے روٹی ہنڈیا اور بچوں کی سیوا کا کام پھر سنبھال لیا۔ کبھی کبھار وہ ہمت کر کے پوچھ لیتیں "کیسے ہو؟" تو جواب ملتا "اچھا ہوں" اور تیزی سے اپنے کام سے باہر نکل جاتے۔ اس زمانے میں گھر والوں کو بڑی فکر ہو گئی تھی کہ اگر بڑے ابا نے اچھے ہونے کے بعد اُن کو سچ مچ وہ مقام دے دیا جس کی وہ حقدار ہیں تو کیا ہوگا؟ ایسی اچھی، ایسی ایمان دار، بے غرض، جان کھپانے والی خادمہ۔ آپ جانیں کہاں ملتی ہے؟ پھر جب انہوں نے اپنا پرانا کام سنبھالا تو سب نے سکھ کا سانس لیا!

پھر میں چند سال کے لیے باہر چلی گئی۔ واپس آئی تو ان سے بھی ملی۔ وہ کچھ اور بوڑھی، کچھ اور موٹی ہو گئی تھیں۔ مگر سُہاگ — کے کپڑے اور زیور ویسے ہی تھے۔ میں نے دیکھا ان کا سانس بات کرتے پھولتا ہے اور چہرے پر کافی سوجن ہے!

"آپا بی کیسی طبیعت رہتی ہے آپ کی!"

"اچھی خاصی ہوں دیکھو موٹی بھینس ہو رہی ہوں" وہ مسکرا کر بولیں!

"مگر یہ مٹاپا۔ کوئی صحت کی نشانی نہیں ہے۔"

"اے نہیں بھابی جی۔ دل بس زیادہ دھڑکے ہے۔ وہی پرانی دھڑکن کی بیماری اور سانس پھولنے لگے ہے۔ بڑھاپا بھی تو ہے نا۔" ہنس کر انہوں نے کہا۔

"اور آپ کے وہ؟" میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اُن کے چہرے پر وہی لجاتی ہوئی مسکراہٹ بکھر گئی "اچھے ہیں —" ہائے اس عمر میں اُن کا وہ کنواری بالیوں کی طرح لجا کر مسکرانا!

وہ دوا علاج کی قائل نہ تھیں۔ پھر اور کسے فرصت تھی کہ ان کا دوا علاج کراتا۔ اب بھی وہ پہلے کی طرح کام کرتی رہتیں۔ مگر اب وہ پھرتی نہ رہی تھی!

میں اس روز نماز فجر سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ کسی نے دروازہ بھڑبھڑایا کھولا تو ان کے دیور کا پوتا کھڑا تھا۔ آنکھیں سوجی، چہرہ پریشان "رات بڑی اماں چل بسیں"

"ارے۔ کیا ہوا تھا۔"

"بس۔ ہارٹ فیل ہو گیا۔ آدھے گھنٹے میں چٹ پٹ" اس کی آواز رندھ گئی!

"تمہارے بڑے ابا کہاں ہیں؟" بے اختیار مرے منہ سے نکلا

"جی وہ تو کئی ہفتے سے سادھو گئے ہوئے ہیں!"

میں سن کھڑی رہ گئی۔

ایک چارپائی پر وہ ابدی نیند سو رہی تھیں۔ چاروں طرف خاندان والے بیٹھے اور کھڑے رو پیٹ رہے تھے۔ محلے پڑوس کی عورتوں سے گھر کھچا کھچ بھرا تھا۔ بچے بلک رہے تھے۔ مگر وہ سب سے بے نیاز تھیں۔ وہ کسی کے آنسو نہیں دیکھ سکتی تھیں!

کسی نے اُن کا چہرہ کھول دیا۔ فرشتوں کی سی معصومیت اور حوروں کی سی پاکیزگی اس چہرے کا ہالہ کیے ہوئے تھی۔ مگر ان کی آنکھیں۔ آہ! آدھ کھلی تھیں۔ ترچھی نظریں ایک طرف جم گئی تھیں۔ منتظر نظریں! اس وقت بھی انہیں اپنے بے نیاز پتیم کا انتظار تھا!

وہ انتظار کرتے کرتے ختم ہو گئیں۔ شوہر کے ہاتھوں مٹی پانے کی حسرت بھی پوری نہ ہوئی۔

اور اب۔ اب یہ بیٹھے قبر پر آنسو بہا رہے ہیں!

فضا ابن فیضی
مئوناتھ بھنجن (اتر پردیش)

روشنی کا مسیحا

بہت گھنے تھے اندھیرے بہت سیاہ تھی شب
طویل صدیوں سے زندانِ بے یقینی میں
سِسک رہے تھے اُجالے دھواں دھواں تھا چراغ
انہیں ہوا تھا یہاں منصبِ سحر تفویض
جو لوگ ازل سے تھے تیرہ ضمیر و تیرہ دماغ
اُفق سنورتے بھی کیسے کہ آفتاب تھے گرد
کرن اُبھرتی بھی کیسے کہ بے پناہ تھی شب

بہت گھنے تھے اندھیرے بہت سیاہ تھی شب
نفس نفس تھی یہی ایک آرزو سب کو
کوئی تو اُٹھ کے قبا ظلمتوں کی چاک کرے
یہ غم جو قاتلِ جاں ہے اسے ہلاک کرے
تھی روشنی کے مسیحا کی جستجو سب کو
کہ اس سے مل کے کہیں۔
"فریبِ وقت نے گہرا حجاب ڈالا ہے
وہاں بھی شمع جلا دو جہاں اُجالا ہے"
ندائے شاعرِ آشفتہ حال سننا تھی
کہ بطنِ شب سے اک آوارہ سی کرن نکلی
خود آپ اپنے چھلکتے لہو میں ڈوبی ہوئی
مثالِ موجِ گل افشاں، سبو میں ڈوبی ہوئی
چراغ پلکوں کی محراب میں جلائے ہوئے
جبیں پہ رنگ و نوا کے کنول کھلائے ہوئے

چمن سے تا بہ چمن پھول مسکرانے لگے
اُفق سے تا بہ اُفق چاند جگمگانے لگے
اُجالے پھیل گئے۔
اُجالے عزم کے، کردار کی صلابت کے
اُجالے امن کے، انصاف کے صداقت کے
اُجالے سوز و بصیرت کے، عشق و حکمت کے
اُجالے علم کے، آدرش کے، اُصولوں کے
اُجالے لفظوں میں ڈھلتے بلیغ معنوں کے
اُجالے گیتوں کے، آہنگِ نو کے شعلوں کے
اُجالے سُرخ گلابوں کے سبز خوشوں کے
اُجالے کھیتوں میں اُگتی جوان فصلوں کے
اُجالے گاؤں میں پلتی ذہین نسلوں کے
عوامی آرزوؤں، خواہشوں اُمنگوں کے
اُجالے زندہ حقائق، حسین خوابوں کے
اُجالے ذوق و عمل کی عظیم قدروں کے
نئے عقیدوں، بدلتے ہوئے تقاضوں کے
اُجالے ذہن میں جلتی وفا کی شمعوں کے
اُجالے ملّت و قوم و وطن کے جذبوں کے
اقلیت کے لئے لکھے عہد ناموں کے
اُجالے، وقت کے تاریخ ساز عشوؤں کے

بلاؤ تاج و ہمالہ کے شاہزادوں کو
صدا دو، شامِ اودھ کے شفق طرازوں کو
کہو کہ آج تراشیں انہیں اجالوں سے
چراغ اپنے، سحر اپنی، آفتاب اپنے
سجائیں انجمنِ شوق، اعتماد کے ساتھ
کہ ہیں شراب و گل و شاہد و رباب اپنے
یہ گنگناتی شبیں، مسکراتے خواب اپنے
خزاں کے بعد بہاریں ہیں ہم رکاب اپنے

نہ اب گھنے ہیں اندھیرے، نہ اب سیاہ ہے شب
امیرِ قافلۂ مشتری و ماہ ہے شب
زمیں پہ عظمتِ جمہور کی گواہ ہے شب
مناؤ جشن کہ جلووں کی بارگاہ ہے شب

قوم پھر ہمت سے آگے بڑھنے لگی

بہتر ڈسپلن کی طرف

★ ڈسپلن اور وقت کی پابندی میں نمایاں سُدھار

★ سرکاری و پرائیویٹ تنظیموں میں کام جلدی نمٹایا جا رہا ہے۔

★ لوگوں میں زیادہ ذمہ داری و خلوص سے کام کرنے کا احساس۔

★ ایک دوسرے سے مل کر قومی ترقی کے لئے کام کرنے کے جذبے کو تقویت ملی ہے۔

جگن ناتھ آزاد
پریس انفارمیشن بیورو
سری نگر

اقبال کا سفرِ کشمیر

اقبال کے دل میں کشمیر آنے کی خواہش ایک مدت سے تھی۔ ۸ر جون ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں منشی محمد دین فوق کو لکھتے ہیں۔



"رسالہ رہنمائے کشمیر" جو حال میں آپ کے قلم سے نکلا ہے، نہایت مفید اور دلچسپ ہے، طرزِ بیان بھی دلکش ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ عام لوگوں کے لئے نہایت مفید ہوگا۔ افسوس کہ میں نے آج تک کشمیر کی سیر نہیں کی لیکن امسال ممکن ہے آپ کا رسالہ مجھے بھی ادھر کھینچے۔"

اُن کی یہ خواہش چار برس بعد پوری ہوئی اور جون ۱۹۲۱ء میں کشمیر آئے۔ وجہ سفر یہ تھی کہ منشی سراج الدین[1] نے انہیں ایک معاملے میں قانونی مشورے کے لئے بلایا تھا۔ مولوی احمد دین بھی اس سفر میں اقبال کے ہمراہ تھے۔ بقول عبداللہ قریشی اقبال اور مولوی احمد دین قریباً دو ہفتے سری نگر میں رہے۔ مقدمے کے کام سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اقبال اور مولوی صاحب نے بہت سا وقت سیر و تفریح میں گذارا۔

اس سفر کے بارے میں محمد عمر (نور الٰہی) نے یکم اکتوبر ۱۹۴۵ء کے ماہنامہ آج کل دہلی میں ایک بہت دلچسپ چھوٹا سا مقالہ لکھا ہے جس کے آخر میں علامہ اقبال کے دو غیر مطبوعہ اشعار بھی شریکِ اشاعت کئے ہیں جناب محمد عمر[2] (نور الٰہی) کی گراں بہا تحریر آج کل کے شکریے کے ساتھ نیچے دی جاتی ہے

"اگست[3] سنہ ۱۹۲۱ء وہ تاریخی مہینہ ہے۔ جب حضرت اقبال آخری بار اپنے وطن مالوف کشمیر میں تشریف لائے اور اس سرزمین کا درد بھرے دل سے مطالعہ کیا۔ جس کے تاثرات ان کے کلام مبارک میں پائے جاتے ہیں مگر اسی کے پہلو میں آپ نے فضائے کشمیر کے متعلق جہاں گیر کے زاویۂ نگاہ کو نظر انداز نہ کیا ان کے مشاہدہ کا ماحصل یہ تھا کہ . . . .

مناظرِ فطرت کی فراوانی اور آب و ہوا کی شادابی کی رو سے جس نے کہا خوب کہا کہ زمین پر اگر فردوس ہے تو یہی خطۂ کشمیر ہے۔ ان ناقابلِ فراموش ایام میں ایک دن جناب مولوی احمد الدین مرحوم وکیل لاہور، منشی نور الٰہی مرحوم (میرے ازلی شریکِ کار) اور خاکسار نے بڑی جد و جہد کے بعد حضرت والا کو جھیل ڈل کی سیر پر مجبور کیا۔ جنہیں آنحضرت کا شرفِ قرب حاصل ہے۔ اُن پر مخفی نہیں کہ آپ کو کسی جگہ تشریف ارزانی فرمانے پر آمادہ کرنا کس قدر مشکل مہم تھی۔ موٹر کے ذریعے نشاط باغ جا کر ڈل کی بہار دیکھنا آپ نے مصنوعی (خلافِ فطرت) قرار دیا اور ہم تینوں آنحضرت کے ساتھ شکارے (ہلکی سی کشتی) میں بیٹھ کر ڈل کی طرف روانہ ہوئے۔ شالا مار، نسیم، اور نشاط باغ کو پسند کیا اور زہر شکن کا خطاب عطا کیا۔

"کیا جامع تعریف ہے۔ واپس ہوئے تو دونوں وقت مل رہے تھے۔ آفتاب آخر منزل پر پہنچ رہا تھا۔ شفق پھول رہی تھی۔ اور یہ منظر سالم کا سالم ڈل کے شفاف پانی میں تیر رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک صحیفۂ قدرت کے اس سنہری ورق کا خاموشی سے مطالعہ کرنے کے بعد خلاقِ معانی بحرِ فکر میں غوطہ زن ہوئے اور دو دُرِ شہوار نکال لائے۔ جناب کا ارادہ انہیں

---

[1] بقول بشیر احمد ڈار منشی سراج الدین جموں و کشمیر میں افسرِ مال تھے۔ اور بقول ڈاکٹر محمد مصطفٰے (سری نگر) سراج الدین ریذیڈنسی میں میر منشی تھے۔ حکومت کی طرف سے خان صاحب کا خطاب بھی انہیں ملا تھا۔

[2] محمد عمر جموں کے رہنے والے تھے۔ اہلِ قلم تھے۔ آپ نے اپنے وقت میں دل پسند ڈرامے لکھے اور ڈراموں کے متعلق مقالے بھی جموں میں آپ اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ نور الٰہی اس زمانے میں جموں کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ دونوں دوست تھے بلکہ یک جان دو قالب کی مثال تھے اور اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ محمد عمر اپنی ادبی تحریروں میں ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ نور الٰہی کا نام بھی بالالتزام لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ ادبی دنیا میں محمد عمر "محمد عمر نور الٰہی" کے نام سے مشہور ہوئے۔

[3] اگرچہ مفتی جلال الدین بھی (سری نگر) یہی کہتے ہیں کہ اقبال غالباً اگست میں سری نگر آئے لیکن قرائن اس بات کی شہادت نہیں دیتے کیونکہ اقبال نے سری نگر سے واپسی پر جو خط منشی سراج الدین کو لکھا اُس پر ۱۱ر جولائی ۱۹۲۱ء کی تاریخ درج ہے۔ اس سلسلے میں میری محمد امین داراب کاشمیری کے ساتھ بات چیت ہوئی۔ مفتی جلال الدین بھی موجود تھے۔ داراب صاحب نے حافظہ پر زور ڈال کر بتایا کہ اقبال میٹھا محمد کش کے مقدمے سے کچھ مدت قبل یا کچھ مدت بعد بھی کشمیر آئے۔ ظاہر ہے کہ جب صاحبِ بیان خود ہی حقیقت کے بارے کچھ کہنے سے معذور ہو تو اُس کے بیان کو تحقیق کی بنیاد کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ قرائن دشوار اور دستیاب شواہد یہ اس امر کی تصدیق نہیں کرتیں کہ اقبال جون ۱۹۲۱ء سے پہلے یا بعد میں کشمیر تشریف لائے ہوں۔ غالباً مہینہ کے بارے میں محمد عمر صاحب سے سہو ہوا ہے۔ یہی جون ۱۹۲۱ء کا سفر ہی اُن کا پہلا اور آخری سفرِ کشمیر ہے۔

ایک نظم میں منسلک کرنے کا تھا. مگر طبیعت کا رجحان کسی اور طرف کو ہو گیا اور یہ دو اشعار میرے پاس پڑے رہے یہ امانت اب میں آج کل کے حوالے کرتا ہوں.

تماشائے دل کُن کہ ہنگامِ شام   دہد شعلہ را آشیاں زیرِ آب
بشوید ز تن تا غبارِ سفر   زند غوطہ در آب ڈل آفتاب

اس سفر کے متعلق ایک غیر مصدقہ اطلاع یہ بھی ہے. کہ جب مہاراجہ پرتاپ سنگھ والی کشمیر کو معلوم ہوا کہ اقبال سری نگر میں ہیں تو انہوں نے اقبال کو شاہی مہمان بننے کی دعوت دی جسے اقبال نے بخوشی قبول کیا اور وہ دو ایک روز مہاراجہ کے مہمان رہے لیکن ابھی تک کوئی ایسے شواہد نظر سے نہیں گذرے جن سے اس واقعہ کی تصدیق ہو سکے.

اقبال کے اس سفر کا حاصل ان کی مشہور نظم "ساقی نامہ" ہے جو انہوں نے نشاط باغ میں کہی اور جو آج پیامِ مشرق کے اوراق کی زینت ہے

خوشا روزگارے خوشا نو بہارے   نجوم پرن رست از مرغزارے

یہاں اس نظم کے فنی محاسن سے متعلق کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے. اور اقبال کے فنی محاسن پر بحث اس مضمون کے موضوع کا حصّہ بھی نہیں یہاں صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ اقبال نے اگرچہ اس نظم کے آخری اشعار نہایت درد بھرے دل سے کہے لیکن نہ جانے کیوں کشمیر اور کشمیر سے باہر بعض حلقوں میں یہ ایک غلط فہمی کا باعث بن گئے اور اس رائے کا اظہار ہونے لگا کہ اقبال نے اس نظم میں اہلِ کشمیر کی . . . . دل شکنی کی ہے. ہوتے ہوتے یہ افواہ اقبال تک جا پہنچی اور ظاہر ہے کہ انہیں اس سے کتنا دکھ ہوا ہوگا. نظیری نے غالباً ایسے ہی موقع کے لئے کہا ہے.

بجرمِ عشق توام می کُشند و غوغائیست   تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشائیست

چنانچہ اقبال بڑے غمناک لہجے میں میر خورشید احمد کے نام ۲۶ مئی ۱۹۲۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:-

> ساقی نامہ و کشمیر کے متعلق بعض لوگوں کا گلہ سن کے مجھے تعجب ہوا میں نے تو ذکر گزار دیا ہے. اور یہ بات سیاقِ اشعار سے صاف ظاہر ہے جو لوگ میرے اشعار کو کشمیریوں کی ہجو تصور کرتے ہیں وہ شعر کے مذاق اور مقاصد سے بالکل بے بہرہ ہیں. ان کے لئے یہی جواب کافی ہے کہ میرے آبا و اجداد اہلِ خطّہ میں سے ہیں.
>
> مخلص محمد اقبال

پیامِ مشرق میں ایک نظم کشمیر کے عنوان سے بھی ہے.

رخت بہ کاشمر کُشا، کوہ و تل و دمن نگر   سبزہ جہاں جہاں بہ بیں لالہ چمن چمن نگر

لیکن اس کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ نظم اسی سفر کی تخلیق ہے یا اس کے بعد کی لیکن گمان یہی ہے کہ اس نظم کی تخلیق اور اقبال کے سفر کشمیر میں زیادہ زمانہ حائل نہیں رہا ہوگا.

زیرِ نظر مضمون میں میں ایک بار پہلے بھی میں عرض کر چکا ہوں کہ اقبال کے فنی محاسن پر بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے. ورنہ اس نظم کا صوتی آہنگ اس کا کمالِ محاکات اور وہ کیفیتِ رقص جو ہر مصرعے میں پوشیدہ ہے اور پھر آخری شعر میں کشمیر کی سیاست کا نچوڑ اس امر کے متقضی ہیں کہ ان پر سیر حاصل تبصرہ کیا جائے اور اس کا دنیا کی محاکاتی شاعری کے ساتھ ایک تقابلی مطالعہ پیش کیا جائے

یوں تو اقبال نے بانگِ درا میں غنی کاشمیری کے اس شعر

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کُن   کہ نورِ دیدہ اش روشن کُند چشمِ زلیخا را

کی تضمین پیش کر کے غنی کے کمالِ فن کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے. لیکن آپ نے پیامِ مشرق میں کشمیر کے اس نادر شاعر کی زندگی کے ایک واقعے کو نظم کر کے دراصل اپنے فلسفۂ خودی کو اس خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے کہ شاید اُردو اور فارسی ادب میں اس کی نظیر نہ مل سکے

غنی آں سخن گوئے بلبل صفیر   نوا سنجِ کشمیرِ مینو نظیر
چوں اندر سرا بود، در بستہ داشت   چوں رفت از سرا تختہ وا داگذاشت
یکے گفتش اے شاعرِ دل رسے   عجب دارد از کارِ تو ہر کسے
بپاسخ چہ خوش گفت مردِ فقیر   فقیر و بہ اقلیمِ معنی امیر
ز من آنچہ دیدند یاراں رواست   دریں خانہ جُز من متاعِ کجاست
غنی تا نشیند بہ کاشانہ اش   متاعِ گرانے ست در خانہ اش
چو آں محفل افروز در خانہ نیست   تہی تر ازیں ہیچ کاشانہ نیست

لیکن غنی کے فکر و نظر فن اور ہُنر کو اقبال کی طرف سے بھرپور خراجِ تحسین ابھی کچھ اور دیر کے بعد ادب العالیہ کا جزو بننا تھا اور یہ لمحۂ سعید اس وقت آیا جب علامہ "جاوید نامہ" کی تصنیف میں مشغول ہوئے. یہاں اس نظم کے ذکر کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ممکن ہے اقبال نے یہ واقعہ اپنے اسی سفر کشمیر ہی کے دوران سنا ہو کیونکہ یہ نظم اُن کی کشمیر سے واپسی کے تھوڑی مدت بعد ہی منظرِ عام پر آگئی.

اقبال کے سفر کشمیر کی غرض و غایت اقبال کے ان خطوط سے نمایاں ہے جو انہوں نے کشمیر سے واپسی پر منشی سراج الدین کو لکھے. بشیر احمد ڈار جموں اور کشمیر میں افسر مال تھے. اس سلسلے میں ڈار صاحب لکھتے ہیں: شیخ محمد بخش اور سیٹھ کریم بخش کشمیر کے نامور رئیس تھے. لیکن بعد میں ان کی حالت پتلی ہو گئی پنجاب نیشنل بینک سری نگر نے ان کے خلاف عدالت سے ڈگری کرائی اور ہزاروں کی جائداد سینکڑوں میں نیلام کرا دی. اس میں کافی بے ضابطگیاں بھی ہوئیں.

منشی سراج الدین نے جو شیخ محمد بخش مرحوم کے داماد تھے. اقبال کو اس سلسلے میں سری نگر بلایا اقبال اور مولوی احمد دین وکیل تقریباً دو ہفتے اس سلسلے میں سری نگر رہے.

اقبال کے قیامِ کشمیر کی صحیح تاریخیں تو معلوم نہیں ہو سکیں لیکن یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اقبال جون ہی میں دو ہفتے قیام کرنے کے بعد جولائی کے شروع میں لاہور واپس پہنچ گئے. چنانچہ ۱۱ جولائی ۱۹۲۱ء کے خط میں آپ منشی سراج الدین کو لکھتے ہیں.

> مخدومی منشی صاحب،
> السلام علیکم آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے. جس کے لئے

میرا سپاس ہوں۔

آپ سے رخصت ہوکر پانچ بجے شام راولپنڈی پہنچ گئے اور ۶ بجے شام کی ٹرین بھی مل گئی۔ رستے میں بھی خدا کے فضل و کرم سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ آپ کی مستوری، خدمت گزاری اور مہمان نوازی کی تعریف کرتے کرتے منزل ختم ہوگئی۔ فالحمدللہ علی ذالک

میرا خیال تھا کہ آپ کے مقدمہ میں حکم سنا دیا ہوگا مگر سیٹھ کریم بخش صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ جج صاحب بہادر رخصت سے واپس آکر حکم سنائیں گے۔ آپ سیٹھ صاحب کی خدمت میں عرض کردیں کہ اگر وہ اشتہار نیلام جو پنڈت جانکی ناتھ نے پیش کیا ہے مثل پر نہیں ہے۔ تو اس کا کچھ اثر نہ ہونا چاہیے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ وہ مسلمان کی آخری امید ہے۔ سیٹھ صاحب اور بڑے شیخ صاحب سے کہیے کہ درود شریف پڑھنے سے غفلت نہ کریں۔ اس زمانے کے مسلمانوں کے لئے یہ بات خاص کر حلال مشکلات ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ میری طرف سے سب کی خدمت میں سلام عرض کیجیے۔ گرمی کی شدت ہے بارش مطلق نہیں ہوئی اور نہ بظاہر کوئی علامات نظر آتے ہیں۔ خواجہ اسداللہ صاحب (ایڈوکیٹ سری نگر کشمیر) ملیں تو میرا سلام ان سے ضرور کہیے۔

بخدمت شیخ کریم بخش صاحب مضمون واحد

مخلص محمد اقبال لاہور

۱۱ر جولائی ۱۹۲۱ء

اس سلسلے میں ایک اور خط کا مطالعہ بھی ضروری ہے جو اقبال نے ۱۳ اگست کو لکھا۔ یہ بھی منشی سراج الدین ہی کے نام ہے۔ اور اس سے مقدمے کی تفصیل پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

مخدومی منشی صاحب

السلام علیکم۔ آپ کی علالت کی خبر معلوم کرکے تردد ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل کرے۔ نقل فیصلہ مرسلہ سیٹھ کریم بخش صاحب مل گئی ہے۔ اور میں نے فیصلہ بغور پڑھا ہے۔

دفعہ ۷، ۴ کے متعلق جج صاحب بہادر نے جو کچھ لکھا ہے میری رائے میں غلط ہے۔ ہائی کورٹ میں اس کی چارہ جوئی ہوسکتی ہے لیکن اگر عدالت ہائی کورٹ اس امر میں ہم سے متفق نہ ہو تو ہمیں کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے زیادہ ضروری امر واقعات سے متعلق ہے۔

واقعات کے متعلق یہ عرض ہے کہ جج صاحب نے وہی بات لکھی ہے اور اپنے فیصلے کو اسی بات پر مبنی کیا ہے جس کا احساس ہمیں پہلے ہی تھا یعنی یہ بات کہ واقعات اور بے ضابطگیوں سے ڈگری دار کی بدنیتی ثابت نہیں ہوتی۔ میں نے یہ تمام باتیں پہلے ہی عرض کردی تھیں۔ سب سے بڑی کمزوری اس مقدمہ میں یہی ہے۔ مجھے امید نہیں کہ ہائی کورٹ جہاں تک بے ضابطگیوں اور غلطیوں کا تعلق ہے اے۔ ڈی۔ حکیم صاحب (سشن جج) سے مختلف تجویز کرے

شیخ صاحبان اپنی جگہ سوچ لیں اور اس تمام زیر باری کا اندازہ کرلیں جو اپیل وغیرہ کا نتیجہ ہوگی۔ اگر معمولی مالیت کا مقدمہ ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ مقدمہ کی مالیت بھی بڑی ہے اور اخراجات وکلاء وغیرہ بھی اسی حیثیت سے ہوں گے۔ بغرض ان امور کو ملحوظ رکھ کر آخری فیصلہ کرنا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ ان کی زیر باری میں اور اضافہ ہو۔ وجوہات اپیل دو چار روز تک لکھ کر ارسال خدمت کردوں گا۔ اگر آپ کی مرضی ہو تو آپ اپیل دائر کردیں۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ چند ابتدائی غلطیوں کی وجہ سے اس مقدمہ کا فیصلہ آپ کے حق میں نہ ہوسکا۔ مگر خدا تعالیٰ کی درگاہ سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ اگر یہ صورت نہیں تو اللہ تعالیٰ سیٹھ صاحبان کے لئے کوئی اور صورت پیدا کردے گا۔ سیٹھ صاحبان کی خدمت میں اسلام علیکم۔

مخلص محمد اقبال لاہور

۱۳ر اگست ۱۹۲۱ء

کشمیر میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ اقبال اس کے بعد بھی دو تین بار کشمیر آئے لیکن میرے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ مذکورہ سفر اقبال کا پہلا اور آخری سفر کشمیر تھا[1] یہ

---

[1] اقبال کے سفر کشمیر کے بارے میں مفتی جلال الدین اور جناب محمد امین دراب کاشمیری کے بیانات اس سے قبل مقالے میں درج کئے جاچکے ہیں۔ اس سلسلے میں میں مرزا کمال الدین شیدا اور پیر عبدالاحد سے بھی ملا ہوں۔ پیر عبدالاحد کا بیان اقبال کے سفر کشمیر کے ضمن میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ کہتے ہیں ۱۹۲۱ء میں میں اور مفتی جلال الدین شری پرتاپ اسکول میں طالب علم تھے۔ تیرہ چودہ برس کے قریب ہماری عمر تھی۔ اقبال کا نام ہم نے سن رکھا تھا۔ ہمیں جب معلوم ہوا کہ اقبال کشمیر میں آئے ہوئے ہیں تو میرے دل میں انہیں دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ ایک دن مجھے پتہ چلا کہ وہ انجمن ہمدرد اسلام کے دفتر میں بیٹھے ہیں۔ یہ دفتر امیراکدل میں اس جگہ واقع تھا جس کی بالائی منزل پر آج بھارت ہوٹل ہے۔ اسمتھ اینڈ کمپنی کے سامنے پیر صاحب کہتے ہیں کہ اشتیاق دید میں میں امیراکدل گیا اور وہاں بازار ہی میں کھڑے کھڑے ڈاکٹر اقبال کو دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس دفتر سے نکلے اور امیراکدل کے پل کی طرف چہل قدمی کرتے ہوئے روانہ ہوگئے۔

پیر صاحب کہتے ہیں کہ دوبارہ اقبال کے وارد کشمیر ہونے کی اطلاع کبھی میرے کان میں نہیں پڑی۔

مرزا کمال الدین شیدا نے مجھے بتایا کہ اقبال جب کشمیر آئے تو ان کی عمر ۱۸ برس کی تھی۔ انہیں اس وقت صرف اتنا ہی یاد ہے کہ ان کے والد صاحب خان صاحب مرزا غلام مصطفےٰ صاحب نے اقبال کو کھانے کی دعوت دی۔ اور اقبال نے دن کا کھانا غلام مصطفےٰ صاحب کے یہاں کھایا

روایات بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ ایک بار انہوں نے کشمیر آکر بارہ مولہ میں خواجہ عبدالصمد ککڑو کے یہاں جو اُن کے دوست تھے قیام کیا۔ اقبال اور خواجہ عبدالصمد ککڑو کی دوستی میں شبہ نہیں لیکن ہو سکتا ہے اسی جون ۱۹۲۱ء والے سفر ہی میں اقبال دو ایک روز کے لئے بارہ مولہ گئے ہوں اور خواجہ عبدالصمد کے وہاں انہوں نے قیام کیا ہو۔ لیکن جون ۱۹۲۱ء کے سفر کے علاوہ اقبال کے کسی اور سفر کشمیر کی نشان دہی ابھی تک نہیں ہو سکی ہے۔

اس سلسلے میں جو حضرات بارہ مولہ میں قیام اقبال کا تعلق اس مرثیے سے ملاتے ہیں جو اقبال نے خواجہ عبدالصمد کے فرزند کی موت پر لکھا وہ غالباً اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اقبال نے یہ مرثیہ ۱۹۰۲ء میں لکھا اور اُس وقت اُن کا کشمیر میں ہونا بعید از قیاس ہے

اس کے ساتھ ہی مرزا صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ غالباً اقبال ایک بار پھر کشمیر آئے۔

جناب غلام نبی وانی سوگامی کہتے ہیں کہ اقبال جب کشمیر آئے تو میری عمر چار پانچ برس کی تھی۔ اُن کے بیان کے مطابق اقبال ان کے والد کے یہاں سولاب میں مقیم رہے اور اپنے کام کے سلسلے میں سری نگر آتے جاتے رہے۔

مرزا کمال الدین اور غلام نبی سوگامی صاحب کے بیانات میرے موضوع پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالتے۔ علامہ اقبال کا سولاب میں طویل قیام زیادہ قرین قیاس نظر نہیں آتا۔ ممکن ہے وہ سولاب سیر و تفریح کے لئے گئے ہوں اور ایک آدھ دن سوگامی صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوں۔ زیادہ تر وہ سری نگر ہی میں رہے۔

جناب شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ اگرچہ اقبال کے سفر کشمیر سے متعلق میری مفصل گفتگو نہیں ہوئی لیکن ۱۹۷۳ء میں جب میں اقبال نمائش مرتب کر رہا تھا بعض خطوط لے کر جن کے بارے میں شیخ عبداللہ کی اس تحریر نے کہ یہ شیخ محمد عبداللہ کے نام ہیں۔ میرے دل میں بعض شبہات پیدا کر دیئے تھے، میں شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت اگرچہ میرے سوالات ان خطوط ہی تک محدود رہے

تاہم شیخ صاحب کی بات چیت سے جو کچھ ظاہر ہوا وہ یہی تھا کہ اقبال ایک بار کشمیر آئے دوسری بار مجھ سے انہوں نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ ہم نے استقبال کی تیاریاں بھی کر لی تھیں۔ لیکن وہ کسی وجہ سے نہ آئے۔

قیام کے بارے میں مختلف ذرائع سے جو اطلاع حاصل ہوئی ہے وہ یہ ہے۔ اقبال نے غالباً کسی ہاؤس بوٹ میں قیام کیا تھا۔

اسی ضمن میں نشاط انصاری (دلنہ) مجھے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"عبدالصمد ککڑو نے جھیل ڈل کے پانیوں میں ....

ایک شاندار بنگلہ تعمیر کیا تھا۔ جو اب بھی وہاں اپنی شان اور آن بان کے ساتھ موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ نے بھی اسے کبھی دیکھا ہو۔ کہتے ہیں کہ علامہ اقبال جب ۱۹۲۱ء میں وارد کشمیر ہوئے تھے تو وہ خواجہ موصوف ہی کے مہمان بنے تھے اور اسی بنگلے میں مقیم تھے اور یہاں سے وہ وادی لولاب کو بھی دیکھنے گئے تھے۔

مولانا فاروق میر واعظ کشمیر نے ایک دوران گفتگو میں مجھے بتایا کہ اقبال اپنے قیام کشمیر کے دوران میں میر واعظ منزل میں بھی آئے تھے۔ میر واعظ سے اقبال کی ملاقات خارج از امکان نہیں۔ کیونکہ میر واعظ کا انسٹی ٹیوشن کشمیر کے سوا غالباً دنیا کے کسی حصے میں موجود نہیں اور اقبال کے اس شعر

یہ راز ہم سے چھپایا ہے میر واعظ نے — کہ خود حرم ہے چراغِ حرم کا پروانہ

سے گمان ہو سکتا ہے کہ ان کی میر واعظ کشمیر سے ملاقات ہوئی ہو۔[2]

اسی دوران قیام میں اقبال کو ایک اور مقدمہ بھی ملا۔ اور وہ رحمان راہ نامی ایک شخص کا مقدمہ تھا۔ رحمان راہ سری نگر کا رہنے والا تھا اور قتل کے مقدمہ میں ماخوذ تھا۔ یہ مقدمہ اقبال کو سری نگر میں ملا۔ بشیر احمد ڈار لکھتے ہیں کہ یہ شخص پھانسی سے تو بچ گیا لیکن قید ہو گیا۔

میرا خیال ہے کہ اقبال نے اس مقدمے کے محض ابتدائی کاغذات ہی تیار کئے ہوں گے۔ عدالت کے سامنے یہ مقدمہ پیش کرنے کی نوبت نہیں آئی ہوگی۔ یہ مقدمہ اقبال کے تیار کردہ کاغذات کی بنا پر غالباً مقامی وکلاء نے عدالت کے سامنے پیش کیا ہوگا۔ اس مقدمے کے سلسلے میں مجھے کشمیر میں جو کچھ معلوم ہو سکا وہ اس سے زیادہ نہیں ہے۔ جو اقبال کے اپنے ایک خط میں موجود ہے۔ یہ خط بھی منشی سراج الدین کے نام ہے۔ اور یہ ۲۰ر اپریل ۱۹۲۲ء کا خط ہے۔ یہ خط بھی مکمل صورت میں نیچے درج کیا جا رہا ہے۔

ڈیر منشی صاحب

السلام علیکم۔ آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ انشاء اللہ آپ کے ارشاد پر غور کیا جائے گا۔

افسوس کہ رحمان راہ کامل طور پر نہ بچا۔ مگر پھانسی سے بچ گیا ہے۔ لالہ کنور سین صاحب سے لاہور میں میں نے اس مقدمہ کا مفصل ذکر کیا تھا اور تمام بڑی بڑی باتیں اُن کو سمجھا دی تھیں اور یہ بھی درخواست کی تھی کہ مقدمہ کی سماعت جموں میں کریں تو میں بغیر مزید فیس کے بحث کروں گا مگر افسوس کہ وہ مقدمہ کشمیر میں سنا گیا۔

بہر حال میں نے منشی اسد اللہ کی تحریر پر اپنی بحث کے مفصل نوٹ ان کو بھیج دیئے تھے جو عدالت میں پیش کر دیئے گئے تھے۔ لالہ کنور سین صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری بحث کے مفصل نوٹ مثل پر موجود ہیں۔ اس وقت اگر میعاد کا سوال نہ اُٹھایا جاتا تو مقدمہ کا مہاراجہ (سر تاپ سنگھ) کے سامنے ہی غالباً فیصلہ ہو جاتا۔ مگر منشی اسد اللہ صاحب۔ یہ خیال کرتے رہے کہ بار دیگر مقدمہ کونسل کے سامنے پیش ہوگا۔ جہاں رحمان راہ کی

(باقی صفحہ ۴۲)

---

[2] مالک رام کہتے ہیں کہ یہ ایک عام نوعیت کا سفر بھی ہو سکتا ہے اور اسے مذکورہ مکان کی دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

خواجہ حسن ثانی نظامی
حجرہ قدیم درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نئی دہلی ۱۳

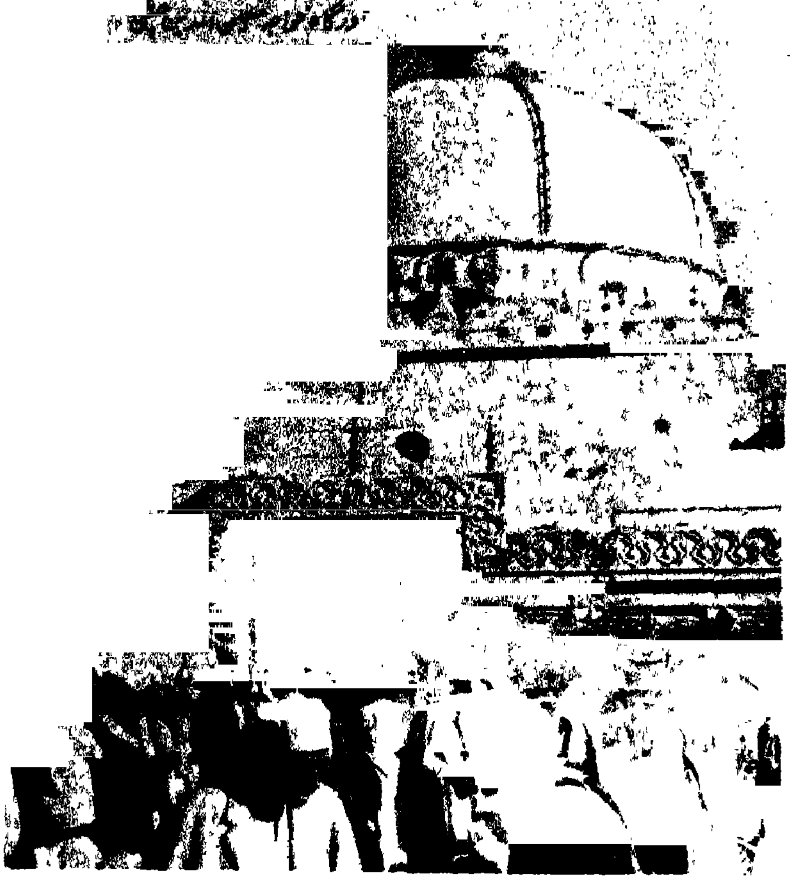
حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح

(حضرت خواجہ اجمیریؒ کا سالانہ عرس ۳۰ ر جون سے ۵ ر جولائی ۱۹۷۶ تک منایا گیا۔ لگ بھگ سوا لاکھ عقیدت مندوں کا اجتماع تھا۔ بنگلہ دیش، پاکستان، افغانستان کے علاوہ دوسرے ملکوں سے بھی زائرین آئے تھے۔)

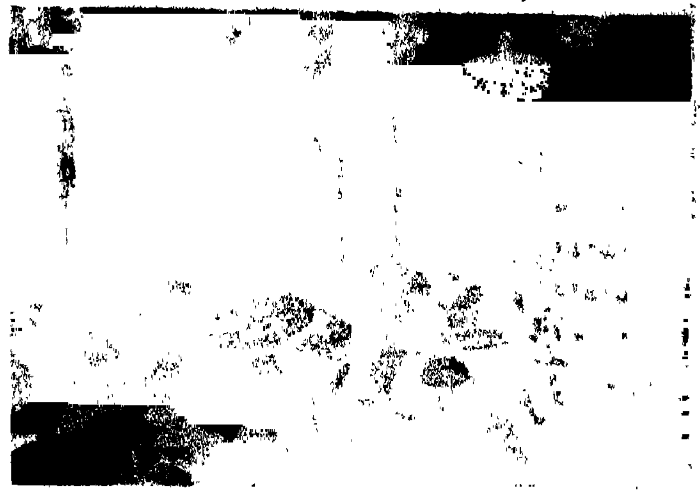
مسلمان صوفیا کی ہندوستان میں آمد و رفت حضرت خواجہ صاحب اجمیری سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی آٹھویں صدی کے مشہور صاحب تصنیف صوفی بزرگ حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو درازؒ کی بارھویں پشت کے دادا دہلی کے قلعۂ لال کوٹ کے باہر "مسجد انار" میں دفن ہوئے تھے۔ اور حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے لاہور میں حضرت سید علی ہجویری داتا گنج بخش کے مزار پر چلّہ کیا تھا۔ لیکن ہندوستان میں تصوف کی بنیادیں صحیح معنی میں حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ کے دست مبارک ہی سے استوار ہوئیں۔

حضرت خواجہ صاحبؒ مہاراجہ پرتھوی راج چوہان کے زمانے میں اجمیر تشریف لے آئے تھے۔ اور نامساعد حالات کے باوجود وہ اپنے مشن میں اتنے کامیاب رہے اور ان کا چشتیہ سلسلہ ہندوستان میں اتنا پھیلا کہ برصغیر کی تاریخ تصوف میں اس کی اور کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس کامیابی کی وجہ اس روحانیت کے ساتھ ساتھ شاید یہ بھی تھی کہ حضرت خواجہ صاحبؒ ہندوستان اور ہندوستانیت کے سب سے بڑے عارف اور قدردان تھے۔ انہوں نے اسلام کو اور تصوف کو ایک اجنبی مذہب اور کسی غیر ملکی سوغات کی طرح پیش نہیں کیا۔ بلکہ یہ بتایا کہ ایک خاص عقیدہ اور خیال اگر کسی بھارتی کے دل کو بھا جائے تو وہ ہندوستانی رہتے ہوئے اور اپنی شاندار تہذیبی اور تمدنی روایات اور اس کے تحت بننے والے مخصوص مزاج اور ذوق کو قائم رکھتے ہوئے اس عقیدے اور خیال کو کس طرح اختیار کر سکتا ہے۔ عرسوں کے اجتماع۔ چھڑیوں کے قافلے۔ قوالی اور سماع اور اسی طرح کی بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جنہوں نے حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ اور ان کے مسلک کو ہندوستان میں اجنبی بنا کر نہیں رکھا۔

خود حضرت خواجہ صاحب کے بارے میں تو مستند تاریخی معلومات



اس تفصیل سے موجود نہیں ہیں جس تفصیل سے ان کی گدی پر یکے بعد دیگرے بیٹھنے والے بزرگوں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ اور حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہیؒ کے بارے میں موجود ہیں لیکن ان جانشینوں کے حالات سے اس بے تعصبی، کشادہ دلی اور یگانگت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے جس کے ساتھ حضرت خواجہ صاحبؒ اور اُن کے جانشینوں نے ہندوستان کو اپنایا تھا۔ ان بزرگوں کے ہاں نہ صرف ہندو عوام کی آمد و رفت رہتی تھی بلکہ مذہبی رہنما اور جوگی وغیرہ بھی آیا کرتے تھے، اور باہم علمی مذاکرے ہوتے تھے۔ چنانچہ حضرت بابا فریدؒ کی خانقاہ میں ایک دفعہ کوئی ہندو یوگی آیا تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے اس سے پوچھا کہ تمہارا اصول اور طریقہ کیا ہے اور جب اس نے بتایا کہ ہم آدمی کے نفس میں دو عالم مانتے ہیں۔ سر سے ناف تک عالم علوی جس میں صدق و صفا اچھے اخلاق، اور اچھے معاملات ہونے چاہئیں اور ناف سے پاؤں تک عالم سفلی۔ جس میں نگہداشت، پاکی اور پارسائی کی ضرورت



درگاہ شریف کا اندرونی منظر

ہے۔حضرت فرماتے ہیں کہ مجھے اس کی یہ باتیں بہت اچھی معلوم ہوئیں۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی سجستان ایران میں پیدا ہوئے تھے اور خراسان میں انہوں نے پرورش پائی تھی۔ ہندوستان میں ان کو سنجری (س ن ج ر ی) کہا جاتا ہے جو اہلِ علم کے نزدیک غلط ہے۔ صحیح لفظ سجزی ہے۔ تاہم یہ غلط العوام لفظ اردو اور ہندی لٹریچر خاص کر شاستری سنگیت میں گائے جانے والے کلام میں اس کثرت سے استعمال ہوا ہے کہ اس کا ترک اس پورے ادبی ورثے کا ترک بن جاتا ہے۔ اس لئے بعض اس کو غلط جانتے ہوئے بھی صحت کی تاویلیں ڈھونڈتے ہیں۔ اور قصبۂ سنجر سے حضرت کا تعلق دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

حضرت کے والد کا نام غیاث الدین تھا اور وہ حضرت کو بہت چھوٹا چھوڑ کر انتقال کر گئے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک مجذوب بزرگ ابراہیم قندوزی نے حضرت کو کچھ تبرک کھلایا تھا جس کے زیرِ اثر حضرت نے کم عمری ہی میں اپنا سب مال متاع خیرات کر دیا اور تحصیلِ علم اور تکمیل تصوف کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور اس وقت کے مشہور علمی مراکز میں جاکر رائج الوقت تعلیم بھی حاصل کی اور علماء اور مشائخ سے بھی ملے۔ اسی دوران وہ چشتی بزرگ حضرت خواجہ عثمان ہرونی سے بیعت ہو گئے۔

بیس برس تک حضرت نے سخت مجاہدات کئے اور پیرو مرشد کی اس طرح خدمت کی کہ سفر و حضر میں ان کا بستر اٹھائے پھرے اور ایک لمحہ بھی غافل نہ ہوئے۔ اس خدمت اور صلاحیت کے پیش نظر پیر و مرشد نے ان کو نعمتِ کامل اور خلافت اور جانشینی سے سرفراز فرمایا۔

ہندوستان آنے سے پہلے حضرت خواجہ صاحبؒ عرصۂ دراز تک اسلامی ممالک کی سیاحت فرماتے رہے اور بے شمار لوگ ان کے ذریعے چشتیہ سلسلے میں داخل ہوئے۔ خواجہ صاحب کے جانشین حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی بھی اسی زمانے میں بمقام بغداد ان سے بیعت ہوئے اور بیعت کے اس جلسے کو جو ۵۲۲ھ میں امام ابو اللیث سمرقندی کی مسجد میں ہوا تھا اس لحاظ سے تاریخی جلسہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور حضرت شیخ اوحد کرمانیؒ اور حضرت شیخ برہان الدین چشتیؒ اور حضرت شیخ محمد صفاہانیؒ جیسے اکابر صوفیا بھی تشریف رکھتے تھے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت خواجہ صاحب اجمیری کی ملاقات کی بھی بعض روایتیں ہیں لیکن ان کی صحت کے بارے میں اختلاف ہے۔

حضرت خواجہ صاحبؒ کی ہندوستان تشریف آوری پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک خاص روحانی اشارہ کی بنا پر ہوئی تھی۔ اس لئے ان کو نائب رسول فی الہند کہا جاتا ہے۔ سب سے پہلے حضرت لاہور گئے وہاں سے دہلی اور جب عقیدت مندوں کا ہجوم ہوا تو اجمیر چلے گئے اور آخر تک وہیں مقیم رہے۔ دہلی میں انہوں نے اپنے خلیفہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو اپنا قائم مقام بنا دیا تھا۔

حضرت ہمہ وقت عبادت اور تعلیم و تربیت کے کام میں مصروف رہنے کے باوجود مریدوں کی نذر نیاز پر انحصار نہیں رکھتے تھے چنانچہ سیاحت کے زمانے کا ایک واقعہ تذکروں میں مذکور ہے کہ حضرت نے حلال روزی کے اہتمام میں تبرکاً لنگک کا انکار کیا۔ اسی طرح اجمیر کے قیام کے زمانے میں ذکر ملتا ہے کہ حاکم اجمیر نے حضرت کے صاحبزادوں کی زمین ضبط کر لی تھی جس میں وہ کھیتی کیا کرتے تھے۔ اس زمین کی واگذاری کے لیے حضرت دہلی آئے اور چاہا کہ سلطان شمس الدین التمش کے پاس تشریف لے جائیں یہ بادشاہ حضرت کے خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے بہت عقیدت رکھتا تھا لیکن وہ نہ کبھی بادشاہ کو اپنے پاس آنے کی اجازت دیتے تھے نہ خود اس کے پاس جاتے تھے۔ لیکن جب انہیں پیرزادوں کی زمین کی ضبطی کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے پیر سے درخواست کی کہ وہ سرکاری اہلکاروں اور بادشاہ کے پاس جانے کی زحمت نہ کریں بلکہ خواجہ قطب صاحبؒ کو اجازت دیں کہ وہ بادشاہ سے مل کر زمین واگذار کرا لیں چنانچہ پیر سے اجازت پاکر وہ بادشاہ کے یہاں تشریف لے گئے۔ التمش کے تو دل کی مراد بر آئی اس نے حضرت کا بڑا اعزاز کیا اور نہ صرف اجمیر کی زمین کی واگذاری کا فرمان لکھ دیا بلکہ نقد نذر بھی پیش کی۔

اس ملاقات کا ایک لطیفہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت سلطان التمش حضرت قطب صاحب سے بات کر رہا تھا۔ اودھ کا حاکم رکن الدین حلوائی بھی اتفاق سے آگیا۔ اور حضرت خواجہ قطب صاحب سے ناواقفیت کی بنا پر ان سے اونچی جگہ بیٹھ گیا۔ التمش کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار دیکھ کر خواجہ قطب صاحب نے مسکرا کر کہا کہ آپ خفا نہ ہوں۔ میرا نام قطب الدین بختیار کاکی ہے (کاک ایک قسم کی خستہ بسکٹ جیسی روٹی ہوتی ہے) اور ان کا نام رکن الدین حلوائی ہے۔ اور حلوا کاک کے اوپر ہی رکھ کر کھایا جاتا ہے۔ اس لیے یہ مجھ سے اونچی جگہ بیٹھ گئے تو کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

عوام و خواص میں درویشوں کی مقبولیت علماءِ ظاہر کے لئے ہر زمانے میں ناگوار رہی ہے۔ چنانچہ علمائے دربار حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ اور اُن کے جانشینوں کے بھی ہمیشہ مخالف اور حریف رہے۔ جب حضرت خواجہ صاحب زمین کے سلسلے میں دہلی تشریف لائے تو اپنے ایک پُرانے دوست شیخ نجم الدین صغریٰ سے بھی ملنے گئے جو اس وقت سلطنت دہلی میں شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز تھے مگر شیخ الاسلام نے قدیم دوست کی طرف کچھ التفات نہ فرمایا تو خواجہ صاحبؒ نے کہا کہ شاید شیخ الاسلامی کے عہدے نے آپ کو مغرور کر دیا ہے۔ شیخ نجم الدین صغریٰ بولے کہ نہیں جناب میں تو ویسا ہی نیاز مند ہوں لیکن آپ نے اپنے مرید خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو یہاں ایسا بٹھا رکھا ہے کہ عام و خاص بادشاہ و رعیت سب انہی کی طرف متوجہ ہیں۔ غریب شیخ الاسلام کو کوئی پوچھتا ہی نہیں! آپ اپنے مرید کو اجمیر لے جائیں تو بڑا کرم ہو۔ حضرت نے یہ دلچسپ گفتگو سنا تو مسکرا کر کہا کہ مولانا آپ ذرا نہ گھبرائیں۔ میں اپنے بختیار کو اجمیر لے جاؤں گا۔ چنانچہ واپس آکر انہوں نے خواجہ قطب صاحب سے کہا کہ میرے ساتھ اجمیر چلو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری مقبولیت کی وجہ سے دہلی میں ایک آدمی بھی رنجیدہ رہے۔ پیر اور مرید کے دہلی سے جانے کی خبر شہر والوں کو ہوئی تو مخلوق دیوانہ وار گھروں سے باہر نکل آئی اور گریہ و زاری کرنے لگی خواجہ صاحب! آپ قطب صاحب کو ساتھ لے کر نہ جائیے۔ دہلی والوں کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جہاں جہاں پیر و مرید قدم رکھتے تھے وہاں کی مٹی لوگ تبرکاً اُٹھا لیتے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ نے قطب صاحب کو دوبارہ دہلی میں رہنے کی اجازت دے دی اور خود واپس اجمیر تشریف لے گئے جہاں ۶/رجب ۶۳۳ھ کو انہوں نے رحلت فرمائی اور قدیم شہر سے باہر اپنی خانقاہ میں مدفون ہوئے۔ مگر آج کل شہر اجمیر حضرت کی درگاہ کے اطراف ہی آباد ہے۔ اور پرانا شہر ویران ہوگیا ہے۔

حضرت خواجہ صاحبؒ نے شادی اجمیر آنے کے بعد ہی فرمائی تھی۔ ان کے خسر کا نام سید حسین مشہدی تھا۔ یہ خاندان خنگ سوار کہلاتا تھا۔ قلعہ تارا گڑھ پر اس خاندان کے بزرگوں کے مزارات ہیں۔

حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ کے خلفاء تو بہت سے تھے لیکن زیادہ شہرت ان کے جانشین حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت صوفی حمید الدین ناگوری سوالی کو حاصل ہوئی۔ آخر الذکر بزرگ نے تصوف کے نکات کو سوال و جواب کی صورت میں لکھا تھا۔ اور ان کی اہمیت کے پیش نظر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے خود اپنے قلم سے ان کا انتخاب تحریر فرمایا تھا۔

حضرت خواجہ کے ملفوظات دلیل العارفین کے نام سے حضرت خواجہ قطب صاحبؒ کے جمع کردہ عام طور پر بازار میں ملتے ہیں لیکن اکثر علماء کا خیال ہے کہ ان ملفوظات کی نسبت حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ اور خواجہ قطب صاحبؒ سے درست نہیں ہے۔ اسی طرح منظومات پر مشتمل جو کتاب دیوان حضرت خواجہ غریب نواز اجمیریؒ کے عنوان سے عام طور پر دستیاب ہے۔ یہ بھی کسی اور معین الدین تخلص معینی کا کلام ہے۔ حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ کا کلام نہیں ہے۔

حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ کی تعلیمات ان کے عقیدت کے ذریعے زبانی اور سینہ بہ سینہ پھیلیں اور کافی عرصہ بعد ملفوظات اور تذکروں میں ان کو تحریری شکل دی گئی۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مرید مولانا امیر خورد کرمانی نے اپنی مشہور کتاب سیر الاولیاء میں خواجہ صاحب کے اقوال درج کئے ہیں جن میں سے چند ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ عرفان الٰہی کی علامت۔ مخلوق سے روگردانی اور معرفت میں خاموش رہنا!

۲۔ محبت والے کا نشان یہ ہے کہ تابعدار رہے نہ کسی سے ڈرے نہ کسی کو ڈرائے!

۳۔ شقاوت یہ ہے کہ گناہ کرے اور مقبول ہونے کی امید رکھے!

۴۔ قیامت کے عذاب سے بچنے کے لئے ایک خاص طاعت کرنی چاہیے اور وہ طاعت یہ ہے کہ مصیبت زدوں کی فریاد سنے۔ ضرورت مندوں کی فریاد سنے۔ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرے اور بھوکوں کو کھانا کھلائے۔

۵۔ جس شخص میں یہ تین خصلتیں ہوں سمجھ لے کہ وہ اللہ کا دوست ہے۔
اوّل: دریا کی سی سخاوت!
دوم: آفتاب کی شفقت!
سوم: زمین کی سی تواضع!

حضرت کے اس آخری قول پر اُن کے جانشینوں نے اس طرح عمل کیا اور اس طرح اس کو اپنی زندگی کا رہنما اصول بنالیا کہ بلاتخصیص مذہب و ملت ہر آدمی ان کا شیدائی ہوگیا۔ آج بھی ان کی درگاہ مرجع خلائق بنی ہوئی ہے۔ سالانہ عرس کے موقع پر اجمیر میں تقریباً ایک ماہ اجتماع رہتا ہے۔ وہ حج کے بعد عالم اسلام کا شائد سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کی بھی بہت بڑی تعداد عقیدت اور شردھا کے ساتھ اجمیر حاضر ہوتی ہے۔ اور منتیں مرادیں مانگتی ہے۔

مغل سلاطین بھی حضرت کی درگاہ کے بڑے عقیدت مند رہے۔ شہنشاہ اکبر نے تو آگرے سے اجمیر پیدل جاکر حاضری دی۔

درگاہ شریف میں جو مراسم ہوتے ہیں وہ بھی ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کے آئینہ دار ہیں۔ مثلاً قدیم یاتراؤں کی طرح عرس کے موقعے پر ہندوستان کے ہر علاقے سے جھنڈا لے کر لوگ پیدل روانہ ہوتے ہیں۔ یہ جھنڈا خواجہ کی چھڑی کہلاتا ہے۔ ساری چھڑیاں ۱۹ رجمادی الآخر تک دہلی میں جمع ہو جاتی ہیں۔ اور ۲۰ رجمادی الآخر کو درگاہ حضرت قطب صاحبؒ میں چھڑیوں کا میلہ ہوتا ہے۔ اور ایک بڑا قافلہ چھڑیوں کے ساتھ پیدل اجمیر جاتا ہے۔ اور سارے راستے گاؤں گاؤں اور بستی بستی اس قافلے کی آؤ بھگت اور خاطر تواضع ہوتی ہے۔ (باقی صفحہ ۔۔ پر)

قومی پیداوار میں ہمت سے آگے بڑھنے کی راہ

۷۵-۱۹۷۶ء

صارفین کا تحفظ

پرچون کی دوکانوں پر اشیاء کی قیمتوں کی فہرستیں لگائے جانے سے قیمتوں میں استحکام پیدا ہوا اور کمزور طبقوں کے افراد کے لئے اشیاء کی فراہمی برقرار رکھی گئی۔

چیزوں کو ایک ریاست سے دوسری ریاست میں لانے لے جانے پر پابندیاں نرم کرنے سے تقسیم کے سرکاری نظام کی کارکردگی میں نمایاں بہتری۔ اس مقصد کے لئے صارفین کے کوآپریٹو اداروں کا تعاون حاصل کیا گیا۔

صارفین کے استعمال کی ضروری چیزیں تیار کرنے والی کچھ اہم صنعتوں میں "سول سیلنگ ایجنسی" کا سسٹم ختم کر دیا گیا۔

دِلّی میں کوآپریٹو اداروں اور دیگر منظور شدہ ایجنسیوں کے ذریعے اشیاء کی منصفانہ تقسیم کے لئے نئی اسکیم نے دوسرے علاقوں کے لئے رہنمائی کا کام کیا ہے۔ کوچین، کوئمبٹور، دُرگا پور اور نینی تال میں ایسے ہی انتظامات کئے گئے۔

اقبال متین
۲۳-۲-۷۸۳ مغل پورہ، حیدر آباد (آندھرا)

کونپل سے پرزے تک

سڑک نے جیسے اس کے قدم پکڑ لئے ــــ مجھے پہچانو ورنہ آگے جانے نہ دوں گی!۔

وہ ٹھٹک گیا۔ پھر کسی سوئی ہوئی یاد نے انگڑائی لے کر چٹکی لی۔

یہ تو وہی سڑک ہے جس پر میرا چھوٹا دادا تارا نگر سے پیلی جوار گدھوں پر لاد کر لے آیا تھا۔ کیوں کہ ان دنوں ہمارے گاؤں میں قحط پڑ گیا تھا۔ میں بھی چھوٹے دادا کے ساتھ تھا۔ اس کی مدد کی تھی۔ اپنے سر پہ ایک ننھی سی گٹھڑی میں نے بھی اُٹھا رکھی تھی۔

جتندرا نے اس سے کہا ــــ تمہیں معلوم ہے اسی سڑک سے ناگپور کے مزدور اپنے ساتھ کئی سو گدھوں کا قافلہ لئے زمین کو ہموار کرنے کے لئے یہاں آئے تھے۔ زمین کھودی جاتی تھی تو مٹی کو دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے وہ اپنے گدھوں سے کام لیتے تھے۔ اور واقعی اس سنگلاخ زمین پر فیکٹری کی بنیاد رکھنے میں ان مزدوروں کا بڑا حصہ ہے۔

وہ چالیس سال کے بعد اپنے گاؤں لوٹا تھا۔

ماضی تو کسی مرحوم دوست کی مانند ہے۔ اس کی قبر پر پہنچو تو اپنی یادوں کو سمیٹ کر جیسے جاگ اٹھتا ہے۔

جب وہ شہر سے چلا تھا تو کتنے ہی چہرے اس کے ذہن میں ہیولی بن کر بیدار ہوئے تھے۔ پھر ان کے خد و خال آہستہ آہستہ واضح ہوئے پھر وہ آنکھوں کے سامنے جیسے مجسّم ہو گئے۔

مچھیا پنتلو، بڑے حضت دادا، کالے اور سیسے کی گولیوں والا ٹپّا، گلّی ڈنڈے والا رحمان ریڈی، ہنوٹ والا پاپیا، جس سے اس کی کٹی دبی تھی، جوان اور خوبصورت لیکن بیوہ ماں اور پیر پھیلوں سے ہرا گھنے سایوں سے ڈھکا چھوٹا سا تالاب، زندہ سید کی اونچی سی قبر ــــ

تم تو ابھی سے اپنے گاؤں والوں میں کھو گئے ہو۔

جتندرا کہہ رہا تھا ــــ یہی جذباتی لگاؤ جو تمہیں گاؤں والوں سے اور گاؤں والوں کو تم سے ہے وہ یقیناً ہماری بات کو مؤثر بنا سکتا ہے ــــ اور وہ اپنے ساتھی کے ہمراہ اپنے گاؤں کے باسیوں کو آزادی کی نعمتیں اور برکتیں بتلانے چلا تھا۔

"من مول" کا سارا گاؤں رام چندرا پورم کے ہیوی الیکٹریکلس پلانٹ کے زیر اثر آ رہا تھا۔ جو تیسرے منصوبے کے دوران میں ایک دوست ملک کے اشتراک سے تیار کیا جا رہا تھا۔ ایک لاکھ ساڑھے بہتر ہزار مربع میٹر کے رقبے پر اس کارخانے کی پوری عمارت مشتمل ہوگی۔ اور فیکٹری کا پورا رقبہ ساڑھے گیارہ لاکھ مربع میٹر سے کچھ زیادہ یعنی تقریباً تین سو اٹھارہ ایکڑ ہوگا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ گاؤں کے ایک ایک فرد کے چہرے پر جگمگاتے مستقبل کی کرنیں ناچتی دیکھے گا۔ انہیں بتلائے گا کہ ہمارا گاؤں ہماری قومی خوشحالی کے بڑھانے کے لئے اپنے ہم وطنوں کے کام آ رہا ہے۔ آندھرا پردیش کی صنعتی ترقی میں یہ پراجکٹ جتنی اہمیت کا حامل رہے گا، اتنی ہی اہمیت "من مول" کے ان نواسیوں کی رہے گی۔ جنہوں نے اپنا گاؤں قوم اور وطن کے لئے خوشی خوشی دے دیا ہے ــــ پراجکٹ کی ابتدائی پلاننگ کے نقشوں میں "من مول" کا نام دیکھ کر آنے والی نسلیں سوچیں گی کہ یہ چھوٹے چھوٹے گھر جن کے صاف ستھرے آنگنوں میں نیم کے درخت ہوں گے، جن کی چھتوں پر پیپل کے سائے ہوں گے، جن کے رسوئی گھروں سے سورج کی پہلی کرن سے پہلے ہی دھواں اُٹھنے لگا ہوگا، جن کے ڈھور ڈنگر شام کو ہی لوٹ آتے ہیں۔ جہاں نوجوان رادھائیں دیپ جلا کر کھیتوں سے لوٹتے ہوئے اپنے متوالوں کی منتظر رہتی ہوں گی۔ جہاں بوڑھی مائیں دعائیں دیتی ہوں گی اور شریر بچے ادھم مچاتے ہوں گے وہ "من مول" اب کیوں نہیں ہے۔ اُس کے باس جہاں بھی انہیں رہنے کے لئے زمین مل سکی ہے۔ منتشر ہو گئے ہیں اور یہ سب کچھ انہوں نے قومی خوش حالی کے لئے کیا ہے۔ یہ بلیدان انہوں نے اپنے وطن کے لئے دیا ہے۔

اپنی تقریر کے لئے ذہن میں مواد جمع کرتا، جب وہ سڑک پر پہنچا تو سڑک نے اس کے قدم پکڑ لئے ــــ مجھے پہچانو ورنہ آگے جانے نہ دوں گی۔ اور جب اس نے سڑک کو پہچان لیا تو اُس نے اپنے ساتھی جتندرا سے کہا کہ "من مول" میں ایک بار قحط پڑا تھا تو میں اور میرا چھوٹا دادا ایک دوسرے قریہ سے پیلی جوار گدھوں پر لاد کر لے آئے تھے، تاکہ گاؤں بھر کی پریشانی عارضی طور پر سہی کوئی دوسرا انتظام ہونے تک دور ہو سکے۔ وہ سماں مجھے یاد ہے۔ راملو جولاہے نے ہمیں گدھوں پر جوار لاتا ہوا سب سے پہلے دیکھ لیا تو وہ بگٹٹ گاؤں میں بھاگا اور لوگوں میں یہ خبر جیسے سوکھی گھاس میں لگی آگ بن گئی۔ اچھے بالے دوڑ پڑے۔ جو نقاہت سے چل نہ سکتے تھے وہ بھی اپنے بڑوں کی گود میں سوار جیوں توں سڑک تک چلے۔ اکثر بوڑھیاں گھروں سے نکل آئیں۔ جوان عورتیں چھتوں پر چڑھ گئیں کہ "چھوٹے حضت" کے جلو میں آگے بڑھتے ہوئے اس

کاروانِ زندگی کو دیکھیں۔ چھنا پنتلو غلہ لا رہا ہے۔ دیکھو وہ دیکھو —
ہمارا گھرانہ بڑا پنتلو (بڑے استاد) اور چنا پنتلو (چھوٹے استاد) کے نام سے مشہور تھا۔ لوگ اسے چھوٹے حضرت اور بڑے حضرت کا گھرانہ بھی کہتے تھے — ہم گاؤں میں پہنچ گئے تو زندہ سید کی قبر کے نیچے پیپل کی گھنی شاخوں کے اُجلے سایوں میں یہ جوار اس طرح تقسیم ہوئی جیسے بچے مولی صدقہ سے نکال کر دیئے جا رہے ہوں۔ میں ہمیشہ کی طرح زندہ سید کے مزار پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور اطمینان سے گھوڑے کی سواری کرنے لگا۔ کتنے ہی بڑے بوڑھے جو مجھے ایسا کرنے پر پھٹکارتے تھے۔ اس سمے چُپ ہو رہے۔ جوار لانے میں میں بھی چھوٹے دادا کے ساتھ ہی جو تھا۔ میں نے اپنی اس برتری کو محسوس ہی کیا تھا کہ امام جی نے للکارا — اُتر مردود کیا ابھی اور تجھ پھیلائے ۴ — میں زندہ سید کی قبر سے کود پڑا۔ لیکن میرا جی چاہا، امام جا جی کو پیپل کی سب سے اونچی شاخ پر چڑھا دوں۔ اور دیکھوں کہ کس طرح اُترتی ہیں۔ یہ میری اپنی دانست میں سب سے کڑی سزا تھی۔
وہ کہتا گیا — مجھے یاد ہے۔ کھیل کھیل میں درخت کی کسی اونچی سی شاخ پر جب میں چڑھ جاتا تو مجھے یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ اُترتے وقت مجھ پر کیا بیتنے والی ہے۔ جب اُترنا چاہتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ بس اب پیر پھسلا، اب ہاتھ چھوٹے، اب شاخ ٹوٹی اور میں زمین پر آ رہوں گا۔ خوف کی بنیادیں اس احساس کے ساتھ ہی اندر ہی اندر گہری ہوتی چلی جاتیں اور میری بے بسی کا عالم دیدنی ہوتا — اللہ میاں بے طرح یاد آتے اور میں دل ہی دل میں توبہ کرتا کہ کبھی اس قدر بلندی پر نہیں چڑھوں گا۔ سودا خاں کے باغ سے نہ امرود چراؤں گا۔ اور نہ نارنگیاں۔ ماں نماز پڑھنا چاہے گی تو وضو کے لئے کنویں سے پانی خود نکال کر دوں گا اور اسے ستاؤں گا نہیں — زندہ سید کی قبر پر کبھی نہیں چڑھوں گا۔
اونچی شاخوں سے آہستہ آہستہ نچلی شاخوں پر آنے میں کامیاب ہو جاتا تو حوصلے بڑھتے اور جب زمین پر پیر ٹِک جاتے تو میں خود کو زمانے بھر کا فاتح محسوس کرتا۔ اس شاخ کو دیکھتا جس پر میں پہنچ گیا تھا تو وہ پہلے تو پہچانی نہ جاتی اور جو پہچانی جاتی تو ایسی اونچی نہ دکھائی دیتی — اور اللہ میاں کی تو اب ضرورت ہی نہ رہتی اور وہ یاد بھی نہ آتے۔
جتیندرا نے اس کو مخاطب کیا — گاؤں کے کسی آدمی کو ساتھ لے لو تاکہ وہ تمہیں اور لوگوں سے ملا سکے۔
اس نے جتیندر کو روک دیا — ذہن میں چالیس سال پرانا لڑکا بیدار ہو گیا ہے۔ ہم خدا اس کی یاد کے سہارے گاؤں بھر کا چکر لگا آئیں — ذرا دیکھیں یہ دس سالہ لڑکا ہمیں کہاں کہاں لئے پھرتا ہے۔
دیکھو — اس نے ٹھٹک کر رُکتے ہوئے کہا — جتیندر یہ ہے زندہ سید کا مزار جس میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ سما گئے ہیں۔ یعنی مرے نہیں ہیں۔ قبر میں زندہ اُتر گئے ہیں تاکہ گاؤں والوں کے اعمال کا احتساب کریں اور وقتاً فوقتاً انہیں مصیبتوں سے نجات دلائیں۔ یہ اطراف میں جو اتنی بہت ساری قبریں ہیں وہ اُس وقت نہیں تھیں — مجھے افسوس ہے کہ میں بہت تاخیر سے پہنچا ہوں — پتہ نہیں کتنے ساتھی زندگی سے منہ موڑ چکے ہیں — کتنے بزرگ ان سے آگے نکل گئے —
آؤ اب بائیں جانب گھوم کر سیدھے اس مسجد کے میناروں کی طرف چلتے ہیں۔ میرا گھر وہیں کہیں تھا۔ سُنا ہے اب ملبہ بھی باقی نہیں رہا ہے — جس کا ہاتھ لگا اُس نے اس سے استفادہ کر لیا — کچھ نشانیاں تو رہ گئی ہوں گی — نیم کا درخت جس کی شاخ جھکا کر بڑا دادا مسواک کے لئے ڈنٹھل توڑ لیا کرتا تھا۔ یقیناً زندہ ہو گا۔ وہ کنواں تو ہو گا ہی جس کی گہرائی میں ڈول پھینک کر میری ماں ٹھنڈا میٹھا پانی اس تیزی سے نکال لیتی تھی جیسے مرحوم اباکی یادوں کی گٹھری اس کنویں میں گر پڑی ہو اور وہ جلد از جلد اس کنویں کو خالی کر دینا چاہتی تھی تاکہ اس گٹھری کو نکال سکے — لیکن چھوٹے دادا میری ماں کا ہاتھ تھام کر پانی نکالنے میں ان کی مدد کرتے تو مجھے محسوس ہوتا کہ جیسے وہ کنویں میں پانی انڈیل کر اس کو لبالب بھر دینا چاہتے ہوں تاکہ میری ماں میرے مرحوم اباکی یادوں کی گٹھری نکال ہی نہ سکے — میں ان باتوں کو سمجھنے لگا تھا۔
اوہ — یہی میرا گھر ہو گا — ذرا رُک جاؤ — بالکل یہی ہے — بے در و دیوار کے اس گھر کو میں پہچان گیا ہوں — وہ دیکھو نیم کھڑا ہے — اب وہ اتنا بلند قامت ہو گیا ہے کہ کوئی بھی ہاتھ بڑھا کر اس کی شاخ کو جھکا نہیں سکتا۔ کنواں وہیں ہو گا۔ جو جنگلی خود رو جھاڑیوں میں چھپ گیا ہے — یہ گھر تو جوں کا توں میرا سامنے کھڑا ہے — بالکل اسی طرح جس حالت میں میں نے اس کو چھوڑا تھا۔ جیسے در و دیوار سانس لے رہے ہوں —
جلا کر طاق میں رکھ رہی ہے۔ وہ دیکھو چھوٹے دادا کے کہنے پر میں شیر کا ناچ ناچ رہا ہوں۔ اور میری ماں دوہری ہو ہو کر ہنس رہی ہے۔
یہ مکان تو بابتیا کا ہے — بابتیا جولاہا — میرا گلی ڈنڈے کا ساتھی —
اور — تم — تم تو بالکل — جی — جی میں بابتیا کا بیٹا ہوں — اچھا — پھر کہاں ہے وہ — وہ کہاں ہے — مر گیا؟ —
ہوں — آؤ تمہیں سے گلے مل لیں۔
جتیندرا نے زبان تک نہیں کھولی — اس نے اجنبی کو اپنے ساتھی کا نام تک نہیں بتایا — وہ ان اشاروں کی، کنایوں کی، آنکھوں کی زبان ہی سمجھتا رہ گیا — ہر بات میں اختصار بھی تفصیل بھی۔
"تو پھر چھوڑ رہے ہو گاؤں۔"
"ہاں"
"بہت اچھے۔ بہت اچھے — کہاں جا رہے ہو"
"ابھی کچھ طے نہیں ہے"
"عام طور سے لوگ کس طرح سوچ رہے ہیں"
"کچھ خوش نہیں ہیں — اپنی زمین چھوٹ رہی ہے۔ گھر بار چھوٹ رہا

وہ کہنے لگا — نہیں اپنے مستقبل کے لئے کچھ تو سوچنا ہی ہوگا — میں یہی باتیں تو تم لوگوں سے کہنے آیا ہوں۔

چلو آگے چلتے ہیں — اس نے چندر کی بانہہ پکڑ کر کہا۔

آؤ اس پیپل کے سائے میں پہنچ کر اس کے سائے کو محسوس کریں۔ — یہ پیپل بڑا پرانا ہے۔ کتنی ہی کہانیاں اس کے گھنے سایوں میں بنی ہیں — ہم تختی پڑھنے کے لئے جب اس مندر کی طرف جاتے تھے۔ اس ٹھنڈے گھنے سائے میں ذرا کی ذرا رک کر دم لینا ضروری تھا — سیسے اور کانچ کی گولیاں صرف لے پھر کے لئے جیبوں سے نکالی جاتیں — پھر لمحہ پھیلتا جاتا۔ کئی کئی منٹ گزر جاتے تھے — شاید کسی ہم جماعت نے پیچھے پنتلو کو مندر کے چبوترے پر چڑھا کر بتلا دیا کہ ہم کھیل رہے ہیں — پنتلو نے وہیں سے پکارا۔

بیٹے کچھ دیر ہی ہے کہ سر کھجا رہا ہے؟۔

ہم اپنی اپنی گولیاں بٹور کر جیبوں میں محفوظ کر لیتے اور بگٹٹ دوڑ کر پنتلو کے آگے پہنچ جاتے — درخت کے سائے سے مندر کے سایوں میں پہنچنے تک یہ بات قطعی ہو گئی ہوتی کہ سبق ختم ہونے پر اس لڑکے کی دُرگت بنائی جائے گی۔ جس نے ہمیں کھیلتا ہوا پکڑوا دیا ہے۔

ایک بار لگان ادا نہ کرنے کے جرم میں پٹیل پٹواریوں نے بہت سارے کسانوں کو پکڑ لیا تھا اور یہاں چاوڑی پر لے آئے تھے۔ جھلستی ہوئی گرمیاں تھیں۔ لُو دیتا ہوا دن۔ تپتے ہوئے بڑے بڑے پتھر ان کے سروں پر لاد دیئے گئے تھے — ہم دو تین ساتھی یہ ساری کارروائی اسی پیپل کی گھنی شاخوں میں چھپ کر جھانک رہے تھے — اس کے بعد موٹی موٹی تنی ہوئی مونچھوں والے پٹیل سے ہمیں نفرت سی ہو گئی تھی اور ہم دل ہی دل میں اس سے ڈرنے لگے تھے۔

آؤ وا ہتی اور گھوم کر اس گلی سے چلیں تو شاید ہم مسجد کے پچھواڑے نکلتے ہیں۔ ٹھیک ہے ہر چیز جوں کی توں ہے۔ گاؤں والے بدل گئے ہیں میں بدل گیا ہوں۔ لیکن گاؤں بالکل نہیں بدلا — پیپل کے سائے سے جو مندر تمہیں نظر آ رہا تھا اس کا دروازہ یہ رہا — اور پھر اسی میدان کا چکر کاٹ کر بائیں جانب مڑ جاؤ تو مسجد میں داخل ہو سکتے ہو — مندر میں ہم سب "اوم ناما" پڑھتے اور مسجد میں گلستاں بوستاں جنہیں پنتلو نہ پڑھاتا تھا۔ اور میرے دادا گلستاں بوستاں پڑھاتے۔ گاؤں کا کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ان دونوں کا شاگرد نہ رہا ہو اور جس کی ان دونوں کے ہاتھوں پٹائی نہیں ہوئی ہو۔

وہ اونچی لال چھت دیکھ رہے ہو — وہ یقیناً رحمن ریڈی کا بنگلہ ہوگا۔ یہ بنگلہ ان دنوں نہیں تھا۔ اور اگر تھا بھی تو ایسا نہ تھا جو آج دکھائی دے رہا ہے۔ رحمن ریڈی میرا ساتھی ہے۔ سنتا ہے میرے ساتھیوں میں صرف وہی ایک زندہ ہے — جمپکار، ہتھوڑی، اور سا ہیا جما اور یہ سب کے سب چل بسے ہیں — ان کی کال اور دیا ہوگی۔ جو مجھے جانتی نہیں۔

وہ گاؤں بھر میں گھومتا رہا — ایک ایک چیز کو دیکھتا۔ یادوں کو سمیٹتا ایک ایک چہرہ کو تکتا — مسجد کے پیچھے شیخو بی بی کا مکان تھا جو پیش امام کی بیوی تھیں۔ پیش امام کو مرے زمانہ ہو گیا تھا — بڑھیا بھی اب کہاں باقی ہوگی۔ اس کے قدم پھر بھی دروازے کی طرف اٹھ گئے۔ اور اس نے کنڈی کھٹکھٹا دی — کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے زور زور سے پھر کھٹکھٹایا۔

"کون ہے رے" — آواز بوڑھی تھی۔

"میں ہوں ماں جی"

"میں کون" — بوڑھی نے دروازہ کھولا تو وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔

"اچھا تو ہے — تو بڑے حضرت کا پوتا ہے نا — مجھے بڑا انتظار تھا تیرا۔"

"ہاں ماں میں آ گیا ہوں"

کیوں آیا ہے ابھی دن اور نہ آتا — اور پھر کیا لے آیا ہے رے ہمارے لیے یہی خوش خبری نا کہ گاؤں چھوڑ دو — اس لیے چھوڑ دو کہ تیرا ملک ترقی کر رہا ہے۔ یہ تیرا ملک ہمارے گاؤں ہی میں کیوں ترقی کر رہا ہے؟ — ہم اپنا گھر بار چھوڑ دیں — کھیت کھلیان چھوڑ دیں۔ مسجد کے کنویں کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی چھوڑ دیں۔ جو ہر ایک کی رگوں میں خون بن گیا ہے۔ یہاں کے سائے چھوڑ دیں — یہاں کی دھوپ چھوڑ دیں۔ اس مندر کو چھوڑ دیں — جہاں تو نے "اوناما" پڑھا تھا — اس مسجد کو چھوڑ دیں جہاں تجھے تیرے دادا نے گلستاں، بوستاں پڑھائی اور تب کہیں جا کر تو نے شہر میں بڑی ڈگریاں لیں — تو تو بھول بیٹھا ہے۔ بچے تو یہ بھی یاد نہ ہوگا کہ جب تو چھوٹا سا تھا تو ہیضے کی وبا میں اللہ میاں کو پیارا ہو گیا ہوتا۔ اگر میرا مولوی تجھے بچا تا — کیسا بے کل تھا وہ رات بھر پلک نہ جھپکی۔ اس کی دن بھر زمین سے پیٹھ نہ لگی۔ منٹ منٹ پر دم کر کے تجھے پانی پلاتا۔ تب کہیں تو نے آنکھیں کھولیں۔ جب کچھ ہاتھ پاؤں نکالے تو شہر کا ہو رہا۔ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ بعد تک نہ لی اور آج چالیس سال بعد تو گاؤں والوں کو سبق پڑھانے آیا ہے کہ خوشی خوشی گاؤں چھوڑ دو۔ مجھ سے یہ کہنے آیا ہے کہ میری ہڈیاں اب میرے مولوی کے برابر دفن بھی نہ ہوں گی — ارے میں نے تو اپنی قبر تک کھدوالی ہے۔ اپنے نام کا کتبہ تک لگوا لیا ہے۔ صرف میری موت کی تاریخ کھدوانی باقی رہ گئی ہے — سو یہ کام تو کر دینا۔ بہت دور سے چل کر آیا ہے تو —"

وہ کہتی گئی — میں نے اپنے ایک ایک بچے سے کہہ دیا ہے کہ گاؤں خالی نہیں ہوگا۔ سرکار بلوا لے۔ ابھی فیکٹری ہماری لاشوں پر۔ جب تک جان کہ آنکھوں میں بینائی ہے میرے گاؤں کا کوئی بچہ مٹی کی ایک کٹیا کو بھی ڈھتے ہوئے نہیں دیکھے گا۔ گھر دیکھو تو تجھے پتہ ہے جب کوئی گھر ٹوٹتا ہے تو آدمی اس کا ملبہ زندگی بھر اپنے کاندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے۔ لیکن گھر نہیں بنتا۔

سنتی ہوں تیری سرکار معاوضہ دے گی — بیٹا چار قران بھولوں کا

معاوضہ کیا ہوگا جو تھنوں سے جسم میں اُتر کر روح بن گئی ہیں — تو نے گاؤں کی ہریت بھلادی ہے۔

مجھے تو اب تک یہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ چالیس سال کے بعد تو نے اپنے گاؤں کی دھرتی پر قدم رکھا ہے۔ لیکن تیرا کوئی ساتھی، تیرا کوئی یار، تیرا کوئی دوست تیرے سواگت کو گاؤں کی سرحد تک بھی نہ آیا۔ ویسے تیرے آنے کی خبر سب کو ہے — یہ کوئی اچھی علامت ہے رہے۔ اور تو دیوانوں کی طرح گاؤں میں اکیلا پھر رہا ہے۔ آخر یہ سب کچھ کیوں ہے۔ تیرے آنے کی میرے بچوں کے دلوں میں خوشی بھی نہیں — آخر کیوں — بچھڑا بھائی اپنے گھر آیا ہے تو کوئی بڑھ کر گلے لگانے والا تک نہیں۔ یہ "من مول" یہ گاؤں یہ تو ایک خاندان ہے، یہ تو ایک گھرانہ ہے اور تو بھی اسی خاندان اس گھرانے کا بیٹا ہے۔"

اور تم اس گھرانے کی ماں ہو — اس خاندان کی ماں ہو — سارے من مول کی ماں ہو — ہو نا؟"

"ہاں ہوں — بالکل ہوں۔"

"کیوں نہیں ہوں — کیوں نہیں ہوں — مگر تو۔"

"مگر تم نے میری بات سنی ہی کہاں۔"

"میں تو اپنی ماں کے لئے اس کی ماں کا پیام لایا تھا — میں تو اپنے من مول کے لئے ہندوستان بھر کی دھرتی کا سلام لایا تھا۔"

میں تو یہ کہنے کے لئے آیا تھا کہ کوئی سرکار ہم سے ہمارا من مول لے نہیں رہی ہے ماں۔ لیکن ہم خود اپنے وطن کو اپنا من مول دے رہے ہیں۔ ہم اپنے مستقبل کو اپنا حال دے رہے ہیں۔ اپنے کل کو آج دے رہے ہیں — تم مان جاؤ ماں — تم مان جاؤ گی تو سارا گاؤں مان جائے گا۔ آنے والی نسلیں ہمیں یاد رکھیں گی ماں۔ جب الکٹریکل پلانٹ مکمل ہو جائے گا ماں تو خوشحالی بڑھے گی۔ تیرے ہی بچے بالے سکھ اور آنند کی زندگی گزاریں گے۔ کتنے ہی لوگوں کو کام مل رہا ہے۔ تو ذرا سوچ تو ماں۔ غفورے نے ابھی بتایا تھا کہ وہ اور اس کے دونوں بھائی پلانٹ ایریا کے اطراف میں بنتے ہوئے بارکیں اور عمارتوں میں مستری کا کام کر رہے ہیں۔ اور انہیں یومیہ ساڑھے دس روپے مل رہے ہیں۔ اس طرح تیرے گھر یومیہ اکتیس روپے آجاتے ہیں اور تو پھر بھی خوش نہیں ہے۔

بہت خوش ہوں، بہت خوش ہوں — یہ چار دن کے اکتیس روپلی نے مجھے خبر ہے مجھ سے کیا کیا چھین لیا ہے۔ ان روپیوں نے کھلیانوں کا سونا چھین لیا۔ ان روپیوں نے دھرتی کی وہ کوکھ چھین لی جس سے ننھی ننھی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ ان روپیوں نے میرے بچوں کا وہ پسینہ چھین لیا جس کی کھاد پی کر سوندھی جوار کے خوشے لہلہاتے تھے۔ ان روپیوں نے بیلوں کی گھنٹیوں کی وہ میٹھی آوازیں چھین لی ہیں جنہیں سن کر تو بیدار ہوتا تھا۔ اور آج ان آوازوں کے سُر مشینوں کی گڑگڑاہٹ کے نیچے دب گئے ہیں — اور ایسے میں تو مجھے عقل سکھانے آیا ہے۔ موٹی موٹی کتابیں پڑھ کر مجھے بتانے آیا ہے کہ سفید بال دھوپ میں پکتے ہیں — میں کہوں — میں کہوں — کوئی کتاب سفید بال سے زیادہ نہیں ہوتی۔

اُس نے بہ غور جتندر کو دیکھا — پھر کچھ اس طرح کہنے لگا۔ جیسے خود اپنی کھوئی ہوئی آواز کو ڈھونڈ رہا ہو۔

"ماں کیا! تجھے وہ دن یاد نہیں ہے جب سرکار نے مجھے جیل میں بند کیا تھا۔ وہ ہماری سرکار نہیں تھی اور تو نے فخر سے کہا تھا کہ اپنے وطن کے لئے لڑنے والا دینا تو ہمارے گاؤں کا بیٹا ہے — کل تو جب اپنے بیٹے کو جیل میں دیکھ کر فخر کر سکتی تھی ماں تو آج اپنا گھر اپنے دیس کے لئے چھوڑتے ہوئے بھی پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے۔

یہ گاؤں مجھے بھی اتنا ہی پیارا ہے ماں — مجھے بھی یہاں کی ایک ایک چیز سے محبت ہے۔ ایک ایک چہرہ میری یادوں میں بسا ہوا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے اپنے من مول کی دھرتی پیاری نہیں ہے — میرے گھر کے کھنڈر بھی یہیں ہیں — میرے باپ دادا بھی یہیں دفن ہیں۔ لیکن ہم جس کے لئے یہ سب چھوڑ رہے ہیں۔ وہ دیس بھی تو ہمارا ہے۔

اپنے گھر میں اپنا کمرہ سب کو پیارا ہوتا ہے۔ اپنے گاؤں میں اپنا گھر سب کو پیارا ہوتا ہے۔ اپنے شہر میں اپنا گاؤں سب کو پیارا ہوتا ہے۔ اپنے صوبے میں اپنا شہر سب کو پیارا ہوتا ہے۔ محبت اور پیار کا یہ تصور اسی طرح وسیع تر ہوتا جاتا ہے ماں — اور جب سارا دیس کسی کو پیارا ہو جاتا ہے تو ساری تفریق مٹ جاتی ہے۔ جب سارے دیس کی دھوپ چھاؤں اپنی ہو جائے تو من مول بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ اس کا پیار بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ اس کی، حدیں، بستیاں، بھریاں پھیل جاتی ہیں"

بوڑھی ماں نے نظریں اُٹھا کر دُور دُور تک دیکھا جیسے من مول کے حدود سے دیس بھر کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو — دوہری ہو کر وہ اپنی چٹائی سے اٹھی — اس نے کہا۔ مجھے نقارے کے میدان تک لے چل دینا۔ میں خود اپنے ہاتھ سے نقارہ پیٹ کر منادی کر دوں گی۔

نقارے پر ہلکی سی چوٹ پڑی۔ پھر آہستہ آہستہ نقارے کی آوازیں فضاؤں میں بلند ہو کر پراجکٹ مشینوں کی آوازوں سے بغل گیر ہو گئیں — اور "من مول" اُڑ کر رام چندرا پورم کی طرف بڑھنے لگا۔

باتیں
کم
کام زیادہ

دیہی زندگی کی تعمیرِ نو

ملک کو آزاد ہوئے انتیس سال ہو چکے ہیں۔ ان برسوں میں بہت کچھ ہوا ہے۔ نوآبادیاتی استحصال کا شکار ایک زرعی ملک عزم و ہمت سے آگے بڑھا اور آج اپنی کوششوں سے ترقی پذیر ملکوں میں سربلند ہے۔ اقوامِ عالم میں اس کی آواز کو توجہ سے سنا جاتا ہے اور اس کے اصولوں اور نظریوں کی قدر کی جاتی ہے۔

سیاسی آزادی کے حصول کے بعد ملک کی تعمیر و ترقی کا عظیم الشان منصوبہ تیار کیا گیا اور ایک پچھڑے ہوئے زرعی ملک کو ترقی یافتہ زرعی اور صنعتی ملک میں تبدیل کر دیا گیا۔ آج ہندوستان کی مصنوعات دنیا کی ہر منڈی میں نظر آتی ہیں۔ اور روز بروز ان کی مانگ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور ٹیکنالوجی میں بھی ہماری پیش رفت قابلِ فخر ہے۔

خشک سالی، سیلاب، اندرونی خلفشار اور متعدد جنگوں کے باوجود ہمارا سفر جاری رہا اور آج جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کتنا لمبا اور صبر آزما سفر طے کیا گیا ہے۔ ایک ایسے ملک میں جو مختلف عقیدوں اور مسلکوں، زبانوں اور رواجوں کا گہوارہ ہے جو صدیوں سے جہالت، غربت اور توہم پرستی کا شکار رہا ہے اور جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے ایک بہت طاقتور مفاد پرست طبقہ سماج میں بالادست رہا ہے وہاں اتنی بنیادی تبدیلیاں لانا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جس پر کوئی بھی قوم فخر کر سکتی ہے۔

کسی قوم کی زندگی میں تیس سال کی مدت کچھ زیادہ نہیں ہوتی بہت کچھ کیا گیا ہے۔ مگر اب بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ وزیرِ اعظم کے بیس نکاتی پروگرام کے نفاذ کے بعد ہم میں ایک نیا ولولہ اور جذبہ پیدا ہوا ہے اور ہمارے کاموں میں تیزی آئی ہے۔ اور ہم پوری لگن کے ساتھ قومی تعمیر میں جٹ گئے ہیں گزشتہ ایک سال میں زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ اور اقتصادی ترقی کی نئی منزلیں طے کی گئی ہیں۔ مگر اصل ہندوستان گاؤں میں بستا ہے اور اسکی ترقی اور خوشحالی پر ملک کی ترقی کا دارومدار ہے۔ اگرچہ دیہی علاقوں کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کچھ کیا گیا۔ مگر جو کچھ کیا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ کرنے کی ضرورت ہے اور خوشی کی بات ہے کہ وزیرِ اعظم کے بیس نکاتی پروگرام میں دیہی علاقوں اور آبادی کے کمزور طبقوں کی ترقی پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے گزشتہ ایک سال میں حیرت انگیز نتائج حاصل ہوئے ہیں۔

دیہی ترقی کے کسی بھی پروگرام میں مختلف قسم کے اقدامات کی ضرورت ہے تاکہ ان کے مناسب تال میل سے ترقی کا ایک مربوط پروگرام بنایا جا سکے جیسے زرعی ترقی کے لئے سینچائی، کھاد، اچھے بیج کھیتی کے بہتر طریقے اور مویشی کے ساتھ ساتھ پیداوار کی مناسب قیمت۔ کھیت مزدوروں کی مناسب اجرت، قرض کی سہولتیں، رہنے کے لئے گھر اور صحت کی دیکھ بھال۔ جیسے پروگراموں کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ گاؤں والوں میں ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کی خواہش اور جذبہ پیدا ہو اور ان کے کام آپس کے صلاح مشورے اور سبھوں کے اشتراک سے طے ہوں اسی لیے گاؤں میں پنچایتی راج کا نظام بروئے کار لایا گیا ہے۔

ہمارے ملک میں تقریباً چھ لاکھ گاؤں ہیں جنکی آبادی تقریباً ۴۸ کروڑ ہے۔ چونکہ بہت سے گاؤں چھوٹے ہیں اس لئے ہر گاؤں میں گرام پنچایت نہیں ہے اس وقت ۲۱۹۸۹۲، گرام پنچایتیں ۳۸۹۳ پنچایت سمتیاں اور ۲۰۱ ضلع پریشد کام کر رہے ہیں۔ گاؤں میں تین سطحی نظام قائم کیا گیا ہے۔ گرام پنچایت، پنچایت یا بلاک سمیتی اور ضلع پریشد یعنی اپنے گاؤں علاقے (بلاک) اور ضلع کے وسائل اور مسائل کا بھرپور جائزہ



گرام پنچایت

لیتے ہیں۔ اور ہر جگہ کے مخصوص حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ترقیاتی منصوبے تیار کرتے ہیں۔ کوشش کی جاتی ہے کہ مقامی آبادی کا زیادہ سے زیادہ اشتراک حاصل کیا جائے یوں تو ان پروگراموں میں سبھی مسائل پر توجہ دی جاتی ہے مگر سب سے زیادہ زور پیداوار بڑھانے پر دیا جاتا ہے۔ پنچایتوں کے ذریعہ دیہی علاقے کی مربوط ترقی کے لئے قدم اٹھائے جا رہے ہیں۔ اور چونکہ اس ادارے میں مقامی افراد شامل ہوتے ہیں اس لئے مسائل اور ان کے حل پر صحیح طریقے سے توجہ کی جاتی ہے۔

پیداوار میں اضافہ کے لئے سب سے بنیادی چیز پانی ہے۔ سینچائی کی سہولتوں کے بغیر کسان موسم کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ اور اگر وقت پر بارش نہ ہو تو ساری محنت برباد ہو جاتی ہے۔ بیس نکاتی پروگرام کے تحت سینچائی کے لئے پانی کی بہم رسانی پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ جو بڑے بڑے ڈیم تعمیر کئے گئے ہیں۔ ان سے یقیناً سینچائی کے لئے کافی پانی ملنے لگا ہے۔ مگر اس کے باوجود بہت بڑا علاقہ اب بھی ایسا ہے۔ جہاں سینچائی کے چھوٹے ذرائع کی مدد کے بغیر پیداوار کو یقینی نہیں بنایا سکتا ہے۔ ندی۔ نالوں۔ تالابوں

ارناکلیم (کیرالا) کے ضلع مجسٹریٹ بے زمین کسانوں کو زمین کے حقوقِ ملکیت کے کاغذات دے رہے ہیں۔



جھیلوں کا پانی کام میں لایا جا رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود ٹیل کنویں اور عام کنویں اہم ہیں خاص کر لاکھوں ٹیوب ویل کی وجہ سے پیداوار میں بہت اضافہ ہوا ہے

دیہی علاقوں میں بجلی پہونچانے کا کام زوروں پر جاری ہے۔ اور اب تک دو لاکھ سے زائد گاؤں میں بجلی پہونچائی جا چکی ہے۔ پنجاب اور ہریانہ جیسی ریاستوں کے ہر گاؤں میں بجلی پہونچ چکی ہے۔ اس سے نہ صرف کسانوں کو روزگار ملتا ہے۔ بلکہ سینچائی کے لئے ٹیوب ویل چلایا جا سکتا ہے ۷۶-۱۹۷۵ء میں سینچائی کی مختلف اسکیموں پر ۲۷۵ ا کروڑ روپیہ سے زائد کی رقم خرچ کی گئی ہے۔ زیرِ زمین پانی کی تلاش زوروں سے جاری ہے اور مختلف قسم کے پروگراموں پر عمل ہو رہا ہے۔ ۷۶-۱۹۷۵ء میں مزید سات لاکھ ہیکٹر زمین کے لئے سینچائی کا انتظام کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا۔ قوی امید ہے

کہ نہ صرف یہ نشانہ پورا ہوگا بلکہ اس سے تجاوز کر جائے گا۔

اس کے علاوہ سینچائی کی بڑی اور اوسط اسکیموں پر عمل درآمد کے ذریعے مزید ۱۱ لاکھ ہیکٹر اراضی کو سیراب کیا جا سکے گا۔

یہ سب اس وجہ سے ممکن ہو سکا ہے کہ نئے معاشی پروگرام میں سینچائی کو بہت فوقیت دی گئی ہے۔

پیداوار میں اضافے کے لئے دوسری ضروری چیز کیمیاوی کھاد ہے۔ کیمیاوی کھاد کے جو کارخانے ملک میں ہیں ان کی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کافی تعداد میں کھاد درآمد کی گئی ہے۔ کھاد کے استعمال کو فروغ دینے کے لئے قیمتوں میں کمی کی گئی ہے۔ یوریا کی خردہ قیمت ۲ ہزار روپیہ فی ٹن سے کم کر کے ۱۷۵۰/- روپے فی ٹن کر دی گئی ہے اِس طرح امونیم نائٹیرو فاسفیٹ کی قیمت ۳۰۸۰ روپے فی ٹن سے گھٹا کر ۲۲۹۵ روپے فی ٹن کر دی گئی ہے کیمیاوی کھاد فروخت کرنے والے ہول سیلروں اور امداد باہمی کی انجمنوں کا منافع بڑھا دیا گیا ہے۔

کھاد کے ڈپو گاؤں کے نزدیک کھل گئے ہیں۔ تاکہ کسانوں کو لانے میں خرچ اور پریشانی نہ ہو۔ اس طرح قرض کی سہولتوں میں اضافہ کیا گیا ہے تاکہ کسان کھاد خرید سکیں۔ ان اقدامات کی وجہ سے کیمیاوی کھاد کا استعمال کافی بڑھ گیا ہے۔ ۷۶-۱۹۷۵ء میں ۱۵ لاکھ ۳۵ ہزار ٹن نائٹروجن کھاد تیار کی گئی جو سال کے شروع میں مقرر کردہ نشانے سے تقریباً ۳۵ ہزار ٹن زیادہ ہے۔

بڑھیا اور زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کی تیاری اور تقسیم کے کام میں بھی بہتری آئی ہے۔ نیشنل سیڈ کارپوریشن اور متعدد ریاستی اداروں اور فارموں میں تیار کردہ اچھے بیج اب وافر مقدار میں دستیاب ہیں نیشنل سیڈ کارپوریشن نے اچھے بیجوں کا ذخیرہ کر رکھا ہے تاکہ کسی بھی اتفاقی ضرورت کو پورا کیا جا سکے۔

پودوں اور فصلوں کی بیماریوں اور کیڑے مکوڑوں سے حفاظت کا کام بھی بے حد ضروری ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ۷۶-۱۹۷۵ء میں ۷ کروڑ ہیکٹر میں لگی فصلوں کو بیماریوں اور کیڑوں سے محفوظ کیا گیا جبکہ اس سے پہلے کے سال میں صرف ۶ کروڑ ۴۰ لاکھ ہیکٹر فصلوں کی حفاظت کی جا سکی تھی۔

ان اقدامات اور دوسری بہت سی اسکیموں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہماری زرعی پیداوار میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ ۷۶-۱۹۷۵ء کے لئے ۱۱ کروڑ ۴۰ لاکھ ٹن اناج (ربیع اور خریف دونوں طرح کی فصلوں کے لئے) پیدا کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے مگر ہماری پیداوار اس نشانے سے زیادہ ہونے کی توقع ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اناج کی قیمتوں میں کمی آئی سرکار نے اس کا بھی خیال رکھا ہے کہ قیمتیں اتنی زیادہ کم نہ ہوں کہ کسانوں کو نقصان پہونچے لہذا مقرر کردہ نرخوں پر سرکاری گوداموں کے لئے لاکھوں من اناج خریدا گیا ہے۔ اور سرکاری اطلاع کے مطابق اس وقت ڈیڑھ کروڑ ٹن اناج سرکاری ذخیرہ میں جمع ہے۔

رُوکشیتر (ہریانہ) میں ایک سرکاری گودام



زرعی پیداوار میں اضافہ اور دیہی ہندوستان کی ترقی اور خوشحالی کے لئے یہ ضروری ہے کہ دیہی علاقوں اور خاص طور سے غریب کسانوں کے لئے خصوصی اسکیمیں شروع کی جائیں نئے معاشی پروگرام میں ان امور پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

گاؤں میں غریب کسانوں اور مزدوروں کا سب سے بڑا مسئلہ قرض اور پھر سود در سود کا لامتناہی سلسلہ تھا وہ مہاجنی قرضے کے چنگل سے نکل ہی نہیں پاتے تھے۔ اس کی سب سے مذموم شکل بندھوا یا غلام مزدور کی تھی۔ پرکھوں کا لیا ہوا قرض نسل در نسل ادا ہوتا رہتا تھا۔ اور بندھوا مزدور کبھی قرضے سے چھٹکارا پا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لعنت کو قانونی طور پر ختم کیا گیا اور کسی کو بندھوا مزدور بنانا اور اس طور پر رکھنا جرم قرار پایا۔ مختلف ریاستوں میں ۵۸۴۰۰ سے زیادہ بندھوا مزدوروں کو آزاد کرایا گیا ہے۔ اور ضلع مجسٹریٹ کو حکم دیا گیا ہے کہ ایسے جو واقعات ان کو نظر آئیں اس کے خلاف سخت قدم اٹھائیں۔ ان رہا شدہ مزدوروں کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لئے مختلف قسم کی امداد دی جا رہی ہے۔ کھیتی کے لئے زمین، گھر بنانے کے لئے زمین اور روپے مختلف قسم کے روزگار اور کام مہیا کئے جا رہے ہیں۔

نئے معاشی پروگرام میں چھوٹے کسانوں، کھیت مزدوروں اور دیہی کاریگروں سے سود خوروں کے قرضوں کی وصولی بالکل روک دینے کی بات کی گئی ہے۔ مختلف ریاستوں میں اس سلسلے میں بنائے گئے قوانین میں یکسانیت لائی جا رہی ہے۔ اس طرح ہندوستان کی دیہی زندگی کا سب سے پرانا ناسور سودی قرضے کا مکمل خاتمہ ہو گیا ہے۔ کسانوں کو اپنے مختلف کاموں کے لئے قرض لینا پڑتا ہے۔ گاؤں میں کوآپریٹو سوسائٹی قرض دیتی ہے اس کا علاوہ اب بڑی تعداد میں دیہی بنک کھولے جا رہے ہیں یہ بنک ایک مخصوص رقم کسی ضمانت کے بغیر قرض دیتے ہیں۔ قومیائے گئے بنکوں نے قصبوں اور گاؤوں میں اپنی شاخیں کھولی ہیں اور وہ آسان شرائط پر قرض دیتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔

کھیت مزدوروں کو ہمیشہ بہت کم مزدوری دی جاتی تھی اس کے لئے کم سے کم اجرت کا قانون پاس کیا گیا اور اس پر صحیح طریقے سے عمل درآمد کے لئے انتظامی مشنری کو بہتر بنایا گیا۔ اس قانون کے تحت اگست ۱۹۷۵ء سے مرکزی حکومت ۵۴۴ روپے سے لے کر ۶۵۰ روپے ماہانہ تک اجرت ادا کرتی ہے۔ بہت سی ریاستوں نے بھی اجرتوں میں اضافہ کیا ہے۔ مثلاً گجرات میں جنوری ۱۹۷۶ء سے تین روپیہ یومیہ کی بجائے پانچ روپیہ یومیہ کیرالا میں ایک روپیہ ۱۵ پیسے یومیہ کا اضافہ اور مدھیہ پردیش میں ایک روپیہ ساٹھ پیسے سے ساڑھے تین روپیہ یومیہ تک کا اضافہ کیا گیا ہے۔

دیہی علاقے میں کھیتی باڑی کا کام سال بھر نہیں ہوتا۔ لہٰذا مختلف سکیموں کے تحت گاؤں والوں کو روزگار مہیا کیا جا رہا ہے۔ جس سے ایک طرف ان کی آمدنی میں اضافہ ہو اور دوسری طرف گاؤں والوں کو مستقل فائدہ پہونچانے والی چیزیں تیار ہو جائیں جیسے اسکول کی عمارت، پنچایت گھر، تالاب، کنواں، سڑک وغیرہ۔

گاؤں والوں کی روزمرہ کام آنے والی چیزوں میں مٹی کے تیل کی بے حد اہمیت ہے۔ بہت سے گاؤں میں ابھی تک بجلی نہیں پہونچی ہے۔ لہٰذا مٹی کا تیل ان کے گھروں کو روشن رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایندھن کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ ۱۹۷۵-۷۶ء کے دوران مٹی کے تیل کی فراہمی میں پچھلے ایک سال کے مقابلے میں ۹،۵ فیصدی اضافہ ہوا ہے جبکہ ۲۸ لاکھ ۳۰ ہزار ٹن تیل فراہم کیا جا چکا تھا۔ ۱۹۷۵-۷۶ء میں روس سے ۶ لاکھ ٹن تیل منگوایا گیا اور ۲۵ لاکھ ٹن تیل اندرون ملک تیار کیا گیا۔ اس تیل کا ۷۰ فیصد حصہ دیہی علاقوں میں استعمال ہوا۔ صارفوں تک تیل پہونچانے کا ایک طریقہ یہ بھی اپنایا گیا کہ پٹرول پمپوں پر بھی ان کی فروخت کا انتظام کیا گیا تاکہ یہ باآسانی دستیاب بھی ہو جائیں اور ان کی قیمتوں پر بھی نگرانی رکھی جائے۔ ان مراکز میں ٹریکٹر کے پرزے ان کی مرمت کی سہولت، بیج، کھاد، کنٹرول نرخ کا کپڑا، سائیکل، ٹائر اور ٹیوب اور گاؤں والوں کے کام آنے والی کئی اور دوسری چیزیں رکھی گئی ہیں۔

جوت کی حد کے قانون کے تحت ۱۰ لاکھ ایکڑ زمین زائد قرار پائی۔ اس میں ۴،۲۵ لاکھ ایکڑ زمین بے زمین افراد کو تقسیم کی جا چکی ہے۔ انہیں کھیتی باڑی شروع کرنے کے لئے بیج، کھاد اور روپے دیئے جاتے ہیں۔ ایک سرکاری اندازہ کے مطابق ہندوستان کے گاؤں میں ایک کروڑ ۹ لاکھ خاندان ایسے ہیں جن کو گھر بنانے کے لئے زمین چاہیئے۔ ان میں سے ۷۱ لاکھ ۱۴ ہزار خاندانوں کو گھر بنانے کے لئے زمینیں دی جا چکی ہیں۔ لاکھوں افراد کو گھر بنانے کے لئے قرضے دیئے گئے ہیں اور اس بات کی زبردست کوشش کی جا رہی ہے کہ صاف ستھرے اور آرام دہ گھر بنانے کے لئے آبادی کے کمزور طبقے کی ہر ممکن مدد کی جائے۔ گاؤں والوں کے معاش کا ایک ذریعہ ہتھ کرگھے کی صنعت ہے۔ ملک میں تقریباً ۳۰ لاکھ ہتھ کرگھے ہیں جن سے تقریباً ایک کروڑ

افراد اپنی روزی کماتے ہیں ہمارے کل سوتی کپڑے کا ایک تہائی حصہ ہتھ کرگھے سے تیار ہوتا ہے۔ نئے معاشی پروگرام کے تحت ان تمام کرگھوں کو امداد باہمی کے دائرے میں لایا جارہا ہے۔ تاکہ ان کی کارکردگی بہتر ہو۔ ہتھ کرگھے کی صنعت کی مزید ترقی کے لئے ایک ترقیاتی کمشنر مقرر کیا گیا ہے۔ جو اس اہم گھریلو صنعت کی طرف توجہ دے گا اور متعلقہ مسائل اور مشکلات کو حل کرے گا۔

ان تمام اقدامات کی تفصیل ایک مضمون میں ممکن نہیں ہے جو دیہی ہندوستان کو بہتر بنانے کے لئے اٹھائے گئے ہیں۔ جو کچھ کامیابیاں ابھی تک حاصل ہوئی ہیں وہ بھی شروعات ہیں جتنی کامیابیاں پہلے سال میں حاصل کی گئی ہیں اس سے کہیں زیادہ آئندہ برسوں میں حاصل کی جائیں گی۔

قومی سطح پر گاؤں والوں کے مسائل کو فوقیت دی جارہی ہے۔ سرکاری ادارے اور عملے دیہی تعمیر نو کی اس عظیم جدوجہد میں جٹ گئے ہیں اور انہیں عوام کا بھرپور تعاون بھی حاصل ہے۔ سرکاری کارکنوں کے رویے میں تبدیلی آئی ہے۔ بدعنوانی اور رشوت ستانی کا قلع قمع کیا جارہا ہے۔ اور ایسا سازگار ماحول پیدا کیا جارہا ہے جس سے گاؤں والوں میں یقین اور اعتماد پیدا ہو گاؤں والوں کی صحت اور ماحول کی صفائی پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ حکومت کی طرف سے ہر بلاک میں ایک ڈاکٹر مقرر کیا گیا ہے۔ زچہ اور بچہ کی خبرگیری کے مرکز کھولے گئے ہیں جہاں طاقت دینے والی گولیاں تقسیم کی جاتی ہیں۔ سماجی کارکن گھر گھر جاکر صفائی اور بہتر ڈھنگ سے رہنے کے طریقے سکھاتے ہیں۔

نیشنل سروس اسکیم کے تحت کالجوں کے طالب علم اور طالبات چھٹیوں میں مختلف دیہی علاقوں میں جاتے ہیں اور سڑک بنانے نالیاں کھودنے اور اس طرح کے دوسرے کاموں میں گاؤں والوں کی مدد کرتے ہیں

خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام گاؤں میں بے حد مقبول ہورہا ہے۔ اب وہ سمجھنے لگے ہیں کہ زیادہ بچوں کی مناسب طریقے سے دیکھ بھال نہیں کی جاسکتی زیادہ بچوں کا مطلب زیادہ خرچ ہے اور پھر بار بار کی زچگی ماں کی صحت کو بھی برباد کردیتی ہے۔ صحت کی سہولتوں میں اضافہ کی وجہ سے بچوں کی شرح اموات میں بھی نمایاں کمی آگئی ہے۔ جہیز کے خلاف جدوجہد اور سماج میں عورتوں کو مردوں کے برابر مقام حاصل ہونے کی وجہ سے اب لڑکے کا پیدا ہونا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ ان باتوں کی وجہ سے کنبہ بندی کا پروگرام اب ان کا اپنا پروگرام بن گیا ہے۔ جو ان کی خوش حال زندگی کا ضامن ہے تقریباً ہر گاؤں میں پرائمری اسکول کھولے گئے ہیں۔ ہائی اسکول بھی کسی نزدیکی گاؤں میں ہیں۔ بڑے گاؤں میں کالج بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ شام کو تعلیم بالغان کی کلاسیں ہوتی ہیں۔ جہاں بالغ افراد کو پڑھنا لکھنا سکھایا جاتا ہے۔ دیہی اداروں کے علاوہ مختلف رضاکار ادارے اس کام میں مدد دیتے ہیں۔ تعلیم کی



خاندانی منصوبہ بندی کا ایک مرکز

روشنی بتدریج ذہن کے اندھیرے کو دور کررہی ہے۔ اس روشنی کو تیز کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ جب انسان کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز بدلتا ہے تب ہی وہ تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے

گزشتہ ایک سال سے ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے ۲۴۰۰ گاؤں میں ٹیلی ویژن کا پروگرام دکھایا جارہا ہے۔ سائٹ کی مدد سے دکھایا جانے والا یہ تفریحی اور معلوماتی پروگرام بہت مقبول ہوا ہے اور گاؤں والوں نے اپنے ملک اور دوسرے ملکوں میں ہونے والی ترقیوں کے بارے میں بہت کچھ جانکاری حاصل کی ہے۔ گاؤں والوں کی ذہنی بیداری میں اس پروگرام نے نمایاں حصہ لیا ہے۔

نوجوانوں کے لئے نہرو کیندر کھولے گئے ہیں۔ پانچویں پلان کی مدت میں تقریباً ہر ضلع میں ایسا ایک کیندر کھل جائے گا۔ اس کیندر کا مقصد نوجوانوں کو نئی باتوں اور طریقوں سے آگاہ کرانا ہے تاکہ وہ نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھال سکیں۔

سڑکوں کی تعمیر، بجلی کی بہم رسانی، تعلیم اور صحت کی سہولتوں نے گاؤں کا نقشہ بدل دیا ہے۔ اب یہ ترقی کے دھارے سے کٹے ہوئے جزیرے نہیں ہیں بلکہ قومی جدوجہد میں برابر کے ساتھی ہیں۔ دیہات اور شہر لازم و ملزوم ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ اب تک جو علاقے اور گاؤں ترقی میں ہمارا ساتھ نہیں دے سکے ہیں ان کی مدد کریں۔ جو اقدامات نئے معاشی پروگرام کے تحت شروع کئے گئے ہیں۔ وہ ایک خوشحال دیہی زندگی کے ضامن ہیں۔ دیہی تعمیر نو کا کام زور شور سے شروع ہو چکا ہے۔ آیئے ہم سب مل کر اس عظیم قومی کام میں بھرپور حصہ لیں۔

شعری بھوپالی
۳۵؍راساؤ تھ ٹی ٹی نگر بھوپال (مدھیہ پردیش)

آج کل

ہنگامہ ہے نہ فتنۂ دوراں ہے آج کل
ہر سمت شمع امن فروزاں ہے آج کل

سننے میں آرہے ہیں مسرت کے واقعات
جمہوریت کا حسن نمایاں ہے آج کل

رشوت ستانیوں کا نہیں ہے وہ زور شور
ہر ظالم اپنے ظلم سے لرزاں ہے آج کل

ماحول جو بنا تھا جمہور کے خلاف
اپنے کیے پہ آپ پشیماں ہے آج کل

جو غنچہ ہے وہ اپنے تبسم میں مست ہے
جو پھول ہے بہار بہ داماں ہے آج کل

نظروں میں اضطراب نہ دل میں کوئی کھٹک
کانٹوں سے پاک صحن گلستاں ہے آج کل

مہنگائیوں کو دیش نکالا دیا گیا
نایاب تھی جو چیز وہ ارزاں ہے آج کل

جاری ہوا ہے بیس نکاتی پروگرام
بھارت اس انتظام پہ نازاں ہے آج کل

کشتی وطن کی بحر ترقی میں ہے رواں
کوئی بھنور ہے اور نہ کوئی طوفاں ہے آج کل

مدت کے بعد آیا ہے آزادیوں کا لطف
افسردہ ہے نہ کوئی پریشاں ہے آج کل

دیپاولی کی رات ہے دن ہے جواب عید
کتنی حسیں گردش دوراں ہے آج کل

بزم تعصبات کا دامن ہے تار تار
شیطان یعنی بے سر و ساماں ہے آج کل

اب اہل کارواں کا بھٹکنا محال ہے
خود میر کارواں ہی نگہباں ہے آج کل

اے کاش دیش میں یہ فضائیں بنی رہیں
ماحول جیسا امن بداماں ہے آج کل

جس انجمن میں جاتے نہ تھے پہلے اہل دل
شعری اسی انجمن میں غزل خواں ہے آج کل

بقیہ ملاحظات قومی خدمات کا اعتراف

نے ان کی بے لوث خدمات اور جذبۂ حب الوطنی کو خراج تحسین پیش کیا۔
اس تاریخی تقریب کی صدارت شری دیوکانت بروا صدر کانگریس نے کی اس موقع پر شری دیوکانت بروا نے جناب محمد یونس سے متعلق جناب علی صدیقی کی تصنیف کردہ کتاب کی رسم اجرا بھی انجام دی۔ یونس صاحب اردو کے ادیب اور شاعر بھی ہیں۔ ان کی تصنیف "قیدی کے خطوط" اردو کے زندانی ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ جیل کے دور کی یہ داستان ۲۵ خطوں پر مشتمل ہے جو مختلف جیلوں سے تین چار سال کے دوران لکھے گئے ہیں۔
ان کی تصنیف "سرحد کی پکار" کو حکومت برطانیہ نے ضبط کر لیا تھا۔
ان کی سیاسی زندگی کا آغاز خاں عبدالغفار خاں اور پنڈت جواہر لال نہرو کی رفاقت میں ہوا پھر وہ پنڈت نہرو کے بہت قریب آگئے۔ ملک کی آزادی کے بعد وہ اعلا عہدوں پر سرفراز رہے اور آج کل وزیر اعظم ہند کے خصوصی سفیر ہیں۔

بقیہ خواجہ معین الدین

درگاہ شریف اجمیر میں یوں تو عقیدت مند ہر قسم کے اعلیٰ کھانے پکوا کر بطور لنگر تقسیم کرتے ہیں۔ لیکن درگاہ شریف کی جانب سے صرف جو کا دلیہ لنگر میں کھلایا جاتا ہے۔ جس کو دیسی گھی اور میوے ڈال کر مزے دار اور قیمتی بنا دیا جاتا ہے۔ تاکہ کسی عقیدت مند آدمی کو درگاہ کا تبرک کھانے اور بھوکے کو پیٹ بھرنے میں تکلیف نہ ہو۔ درگاہ شریف کے برتنوں میں سینکڑوں سال سے گوشت پکا تو کجا لہسن، پیاز قسم کے مسالے بھی نہیں ڈالے گئے۔
لنگر خانے میں دو بہت بڑی دیگیں شہنشاہ اکبر اور جہانگیر کی نذر کردہ ہیں۔ بڑی دیگ میں ایک سو بیس من اور چھوٹی دیگ میں ساٹھ من چاول پکتے ہیں۔ لوگ منت مان کر یہ دیگیں پکواتے ہیں۔ اور دیگوں میں سیڑھیاں لگا کر اس کے میٹھے چاول لوٹے جاتے ہیں۔ دیگوں کا سالن اور لوٹنے کا منظر عجوبہ پسند طبقوں کو بہت متاثر کرتا ہے۔
حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ کی مقبولیت اور مانتا کو دیکھ کر ایک انگریز وائسرائے کو بڑی حیرت ہوئی تھی اور اس نے یہ دلچسپ ریمارک لکھا تھا کہ

"میں نے ہندوستان میں ایک قبر کو حکومت کرتے ہوئے دیکھا!"

خواجہ صاحب اور ان کی قبر کی یہ حکومت آج بھی قائم ہے کیونکہ انہوں نے اپنی ذات پاک کو سخی دریا، شفیق آفتاب، اور متواضع زمین بنا رکھا ہے۔ اور دنیا میں کون ہے۔ جو ان نعمتوں سے محروم ہونا چاہے گا۔ ہندوستان تو ان کا قدر دان ہی نہیں پجاری بنا ہوا ہے!

سلیمان اطہر جاوید
شعبۂ اُردو، اس، وی، یونی ورسٹی، تروپتی



تلگو میں ناول نویسی کی تاریخ کچھ ایسی قدیم نہیں۔ بس یہی لگ بھگ ایک صدی قبل کی بات ہے کہ جنوبی ہند کی اس زبان میں ناول نویسی کی شروعات ہوئی۔ طبعزاد ناولوں کی سمت تو توجہ بعد ہی دی گئی کیونکہ ابتداً بعض ہندوستانی اور مغربی زبانوں کے ناولوں کے ترجمے ہوتے رہے اور اس سلسلے میں خصوصاً بنگالی کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔ سرت چندر چٹرجی، بنکم چندر چٹرجی، رابندر ناتھ ٹیگور، پربھود کمار سانیال اور بھوتی بھوشن، وہ ناول نگار ہیں جن کے ناولوں کو تلگو میں منتقل کیا گیا۔ ہندی اور اردو سے پریم چند کے ناولوں کے ترجمے بھی ہوئے۔ بعض جاسوسی ناولوں کے ترجمے بھی ہوئے جن کو نسبتاً زیادہ قبولیتِ عام حاصل ہوئی — انگریزی کے جن ناولوں کے ترجمے اہمیت رکھتے ہیں اُن میں "THE TALE OF TWO CITIES"، "THE TREASURE ISLAND" اور "OLIVER TWIST" قابلِ ذکر ہیں۔ بعض فرانسیسی، جرمن اور روسی ناولوں کے انگریزی ترجموں کو بھی تلگو میں منتقل کیا گیا۔ عام طور پر مترجمین کو چونکہ دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل نہیں تھی لہذا ان ترجموں کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

طبعزاد ناولوں کا جہاں تک تعلق ہے، سچ پوچھئے تو اس کے پیچھے ادبی مقاصد کی کارفرمائی کم تھی۔ مقصد یہ تھا کہ بایں طور بھی معاشرتی اصلاح کی کوششوں کو تیز تر کیا جائے۔ اس سے قبل کوئی تلگو ناول شاذ ہی تحریر کیا گیا ہو کیونکہ تلگو ادب کے نقادوں نے "راج شیکھر چرترم" کو تلگو کا اولین ناول قرار دیا ہے اور اس کے لکھنے والے کندوکوری ویریش لنگم پنتولو کو تلگو کا اولین ناول نگار — انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں تحریر کردہ اس ناول کو تلگو ادب اور معاشرہ میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ ویریش لنگم کو تلگو کے نہ صرف ادبی بلکہ معاشرتی زندگی کے نشاۃ ثانیہ کا بھی باوا آدم قرار دیا جاتا ہے ان کو تلگو معاشرہ میں وہی مقام حاصل ہے جو بنگالی میں راجہ رام موہن رائے اور اُردو میں سر سید احمد خاں کو حاصل ہے۔ معاشرتی اصلاح کے جذبے کے پیشِ نظر ویریش لنگم نے گولڈ اسمتھ کے مشہور ناول "THE VICAR OF WAKFIELD" کے خطوط پر اس ناول کی تصنیف کی۔ لیکن یہ ہے قطعی طبعزاد ناول۔ اس میں گولڈ اسمتھ کے ناول کی صرف فنی خوبیوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ویریش لنگم کا تعلق علاقۂ راجمندری سے تھا۔ معاشرتی اصلاح کے سلسلے میں انہوں نے بچپن کی شادی، ستی کی رسم، دوشیزاؤں کو شادی کے لئے بوڑھوں کو فروخت کر دینے کی شدید مذمت کی اور بیواؤں کی شادی پر زور دیا۔ "راج شیکھر چرترم" کا پس منظر اور پلاٹ یہی ہے۔ ناول نگار نے متوسط طبقے کے برہمن گھرانے کی داستان بیان کرتے ہوئے اپنے معاشرتی معتقدات کی تبلیغ کی ہے۔ اپنے موضوع اور مقصدیت کے باعث اس ناول کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس طرح بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ریورنڈ مسٹر ہچن سن نے "WHEEL OF FORTUNE" کے عنوان سے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اور "ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ" نے تبصرہ کرتے ہوئے انگریزی ترجمے اور اس کے اصل دونوں کو بے حد سراہا۔

چلکا مارتی لکشمی نرسمہم ایک ناول نویس ہی نہیں، صحافی، ڈرامہ نگار اور شاعر بھی تھے اور معاشرتی اصلاحی تحریک میں ان کو کندوکوری کے دست راست اور معتمد کی حیثیت حاصل تھی۔ چلکا مارتی نے ویریش لنگم کے ناول "راج شیکھر چرترم" سے متاثر ہوکر "راجندرو جیامو" تحریر کیا جس میں عصری تلگو معاشرہ کے مسائل کی پیش کشی کی گئی ہے۔ ۱۸۹۴ء میں اس ناول نے ایک ایوارڈ بھی حاصل کیا۔ ناول نگاری کے اس مقابلے کا اہتمام راجمندری کے این۔ سبا راؤ پنتولو نے کیا تھا۔ ان کے اور دو ناولوں "ہیم لتا" (۱۸۹۶ء) اور "اہلیہ بائی" (۱۸۹۷ء) نے بھی سالانہ مقابلوں میں ایوارڈ حاصل کئے۔ چلکا مارتی کا ایک اور ناول "سندریا تلک" دو سال تک ایک ادبی ماہنامے "سرسوتی" میں بالاقساط شائع ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ خود انہوں نے اپنے جریدہ "دیس ماتا" میں اپنے دو ناول "کرشنا وینی" اور "منی منجاری" شائع کئے۔ دیگر زبانوں کے ناولوں کے ترجموں سے بھی انہوں نے دلچسپی لی۔ چنانچہ رمیش چندر دت کے ناول "THE LAKE OF PALMS" کا ترجمہ "سدھا سر چندرامو" کے عنوان سے کیا۔ نیز بنگال کے مشہور ناول "درگیش نندنی" کا اُن کا ترجمہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ کندوکوری کی طرح چلکا مارتی کے نزدیک ناول نگاری کا صرف معاشرتی مقصد نہیں تھا بلکہ انہوں نے عوام میں ادبی ذوق پیدا کرنے کی سعی کی اور اس میں کامیاب ہوئے۔ ایک مزاحیہ ناول "گنگاپتی" بھی تحریر کیا لیکن اس کا مزاح ہے معمولی۔ بایں وجہ اس کو اونچا مقام نہیں دیا جا سکتا۔

تلگو ناول کا یہ ابتدائی دور تھا۔ اس دور کا ایک اور اہم ناول

Same as above

Same as

"مالاپلی" ہے جس کے مصنف گنٹور کے متوطن اُنّاوا لکشمی نارائن پنتولو ہیں۔ لکشمی نارائن پنتولو بھی سماجی مصلح تھے۔ ان کا یہ ناول بھی مخصوص پس منظر اور مقصد کا حامل ہے۔ ناول نگار کانگریس اور گاندھی جی سے بے حد متاثر ہے۔

اس ناول کا پس منظر ہے جد و جہدِ آزادی، ترکِ موالات، عدم تعاون کی تحریک، برطانوی عہدیداروں کی بدمعاشی اور ہندوستانی عوام سے اُن کا بہیمانہ سلوک ـــ اور اسی کے ساتھ عوام میں سیاسی اور معاشرتی بیداری۔ اُن کی حُب الوطنی، ذات پات کے نظام، چھوت چھات اور سماجی ناانصافیوں کے خلاف مہم وغیرہ! اس پس منظر کی وجہ سے تلگو کے بعض نقادوں نے "مالاپلی" کو گاندھیائی دور کا نثری رزمیہ قرار دیا ہے۔ اپنے وسیع پس منظر کے باوجود اس ناول کا کینوس اس اعتبار سے چھوٹا ہے کہ اس میں ہریجنوں کے ایک گاؤں کی کہانی بیان کی گئی ہے جو ایک ہریجن لڑکی کے گرد گھومتی ہے۔ بے حد فلسفیانہ انداز میں ناول آگے بڑھتا ہے۔ مکالمے برجستہ ہیں اور ناول نگار نے کرداروں کو تصوراتی حد تک خوبصورت بنا دیا ہے۔ اس ناول کی ایک اہم خصوصیت بول چال کی زبان میں اس کی تصنیف اور اس کا پُر تاثیر اسلوب ہے۔ تلگو کی طبعزاد تحریروں میں اس کی زبان اور اسلوب اپنی مثال آپ ہے۔

ایک اور ناول نگار جس نے معاشرتی موضوعات پر ناول لکھے گودی پتی وینکٹ چلم ہے جو اپنے مختصر نام "چلم" سے معروف ہیں۔ چلم تلگو کے متنازعہ فیہ ناول نگار ہیں۔ ان کو صحیح معنوں میں انقلابی کہنا چاہیئے۔ چلم نے مذہبی تصورات اور اخلاقی قدروں پر زبردست تنقید کی ہے۔ سماجی ناانصافیوں، جنسی پابندیوں اور شادی بیاہ کے رسم و رواج کو انہوں نے فرسودہ اور ازکار رفتہ قرار دیا ہے۔ محبت اور اخلاقی آزادی کی پُر زور وکالت کی ہے۔ معاشی اور جنسی حیثیتوں سے حقوقِ نسواں پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ چلم کا کہنا ہے کہ عورت پر ظلم ہو رہا ہے اُس کے حقوق تلف کئے جا رہے ہیں اور وہ مردوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔ چلم نے تلگو معاشرہ میں طلاق کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اُن کے بموجب اگر شوہر اور بیوی ساتھ رہ کر مطمئن زندگی نہیں گزار سکتے تو ان دونوں کا علیحدگی اختیار کر لینا ہی بہتر ہے۔ انسانی محبت کے جنسی پہلو پر چلم نے کئی ناول اور افسانے تحریر کئے ہیں۔ بلزاک، موپاساں، فلابیر، ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور دیگر کئی مغربی مصنفین کو تلگو ادب سے روشناس چلم ہی نے کرایا ہے۔ اپنے انہی نظریات کے باعث کٹر مذہبی اور روایت پرست طبقے نے چلم پر بہت زیادہ اعتراضات کئے ہیں۔ اسی کے ساتھ زبان و ادب کے قواعد دانوں نے چلم کے ناولوں پر تنقید کی کہ ان میں روایتی آداب اور طرزِ بیان سے بغاوت ملتی ہے۔ چلم کے ناول عموماً مختصر ہوتے ہیں لیکن انتہائی متاثر کُن! اُن کے جن ناولوں کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے اُن میں "دیوا چینا بھاریا"، "براہما نیکم"، "ارونا"، "جیوتا درشم" اور "میدانم" لائقِ ذکر ہیں۔ اپنے موضوعات اور اسلوب کے باعث چلم نے نئی نسل کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ اس کے مقلدین میں دھنی کونڈا، ہنمنت راؤ اور بھاردوجا کے بعض ناول قابلِ مطالعہ ہیں۔

کوڈو نی گنتی کوٹبا راؤ نے افسانے بھی لکھے ہیں اور ناول بھی۔ متوسط طبقے کے معاشرتی اور معاشی مسائل کو کوٹبا راؤ نے اپنے ناولوں کے موضوعات قرار دیئے ہیں اور روایتی اقدار اور مروجہ رسوم کے خلاف آواز بلند کی ہے اس کا رویہ انقلابی ہے اور اسلوب پُر کشش۔ ان کے جن ناولوں کی تلگو ادب میں غیر معمولی پذیرائی ہوئی ہے وہ "کلم لینی متی شی"، "اردنو دا ایم"، "تاما" اور "چادو دُدو" ہیں۔

تلگو ناول میں فلسفیانہ رجحانات کو روشناس کرانے کا سہرا ای۔ گوپی چند کے سر ہے۔ ریڈیکل ہیومنسٹ رجحانات کے حامل گوپی چند ہمہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ فلموں کے ہدایت کار کی حیثیت سے بھی انہوں نے اونچا مقام حاصل کیا ہے۔ اگرچہ انہوں نے کئی ناول لکھے ہیں لیکن ان کے پہلے ناول "اسامارتوئی جیویا ترا" (ایک نالائق کا سفرِ زندگی)، نے غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے۔ یہ ایک طرح سے تجرباتی ناول ہے لیکن تلگو کے جدید ادب پر اس کا خاصا اثر ہے۔ اس کا ہیرو ایک متمول گھرانے کا نوجوان ہے جو جھوٹے وقار کا شکار رہتا ہے اور آخر میں خودکشی کر لیتا ہے۔ بے حد خیال انگیز اور متاثر کن ناول ہے۔ انسانی کرداروں کے تجزیے اور زندگی کے حقائق کے بیان میں گوپی چند کو فنکارانہ مہارت حاصل ہے۔ گوپی چند کے اور ناول "چی کٹی گدولو" (اندھیرا کمرہ) اور "پنڈت پرمیشور شاستری ویلونما" ہیں۔

وشواناتھ ستیہ نارائن تلگو کے ممتاز اور عظیم شاعر ہیں کہ اُن کی شعری خدمات کے اعتراف میں اُن کو گیان پیٹھ ایوارڈ عطا کیا گیا۔ قطع نظر اس کے کہ وہ ایک عالمی شہرت کے حامل اور تخلیقی ناول نگار بھی ہیں۔ اُن کے چند ناول بے حد ضخیم ہیں۔ تلگو میں کسی ناول نگار کے ناول اتنی تعداد میں فروخت نہیں ہوئے جتنے ستیہ نارائن کے۔ ستیہ نارائن رجعت پسند، ذات پات کے نظام کے حامی اور قدیم رجحانات کے علمبردار ہیں۔ وہ سماج کو مذہب کے قدیم تصور سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کے بموجب ہندوستان کی نجات اسی میں ہے۔ اُن کے ناولوں کے موضوعات یہی ہیں۔ زبان قدیم اور اندازِ بیان کلاسیکی۔ ستیہ نارائن کی رجعت پسندی سے، ظاہر ہے اتفاق ممکن نہیں لیکن انہوں نے جس عمدگی اور غیر معمولی چابکدستی سے کردار نگاری کی ہے اس کی داد دینی پڑتی ہے۔ اُن کے ایک ناول "ویئی پڈاگلو" (ہزار دستار) کو ۱۹۳۲ء میں باپی راجو کے ناول "نارائن راؤ" کے ساتھ آندھرا یونیورسٹی ناول ایوارڈ کا حامل قرار دیا گیا۔ یہ ایک طویل ناول ہے اور اس کا کینوس بھی کشادہ! اس ناول کو دھارمک ورثہ کے تحفظ کی ادبی کوشش قرار دیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے "ایکا ویرا" (مرکزی نسوانی کردار کا نام یہی ہے) مختصر لیکن جامع اور متاثر کن ہے۔ ترتیب تاریخی، کردار حقیقت پسندانہ، زبان عام فہم اور اسلوب سادہ ہے۔ ناول کے مطالعہ سے مصنف کے زورِ بیان اور گہرے نفسیاتی مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ستیہ نارائن کے اور ناولوں میں "ماں بابو"، "چیلی یالی کٹہ" (سمندر کے کنارے)، "سورگ بنکی نچے نلو" (جنت کی سیڑھیاں)

"دھرما چکرم" اور "گنگولی پریم کتھا" لائقِ ذکر ہیں۔ ستیہ نارائن نے بارہ ناولوں کا ایک سلسلہ "پرانا ویز اگرنتھ مالا" کے نام سے آغاز کیا تھا۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ ان ناولوں کا ماخذ ہے۔ ناول نگار نے پرانوں سے مواد اکٹھا کیا ہے۔ البتہ آج کے قارئین کی دلچسپی کے لئے جہاں تہاں زیبِ داستاں سے کام لیا گیا ہے۔ اپنی مقبولیت کے باوصف، احیاء پسندی کی وجہ سے ستیہ نارائن کو خاصی مخالف تنقیدوں کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔

وشواناتھ ستیہ نارائن کی شراکت کے ساتھ اپنے ناول "نارائن راؤ" پر آندھرا یونیورسٹی ناول ایوارڈ حاصل کرنے والے اَدی وی باپی راجو مبالغہ آمیز لیکن شگفتہ اندازِ بیان مرصع اسلوب، تصوراتی واقعات اور کرداروں اور فنکارانہ مہارت کے لئے منفرد ہیں۔ نارائن راؤ (ناول کے ہیرو کا نام یہی ہے) ایک تصور پرست نوجوان ہے۔ نیکیوں کا مجسمہ، خامیوں سے دُور، حساس طبیعت۔ ان کے دیگر ناول "ہیما بندو"، "کونگی"، "طوفانو" اور "جاجی ملی" معاشرتی اور "گونا گنا ریڈی" تاریخی ہے۔

بچی بابو کا اصلی نام سیوا راجو وینکٹ راؤ ہے وہ مختصر افسانہ نویسی میں شہرت رکھتے ہیں لیکن ناول نگار کی حیثیت سے بھی اُن کا مقام ہے۔ اُن کا پہلا ناول "چی وراکو میگی لیندی" ہے۔ اس کو فلسفیانہ نفسیاتی ناول کہہ سکتے ہیں۔ آج بھی تلگو کے بہترین ناولوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ کیا ٹکنک، کیا موضوع اور کیا اسلوب، ہر زاویہ سے اس کی اہمیت ہے۔ بچی بابو نے اس ناول میں انسانی زندگی کے مختلف مسائل کو پیش کرتے ہوئے ان کا دانشورانہ جائزہ لیا ہے۔ یہاں وجہ کردار بھی زیادہ ہیں۔ اس سے بابو کے انسانی کرداروں سے آگاہی اور اُن کو پیش کرنے کے سلیقے کا اندازہ ہوتا ہے۔ بچی بابو کے اور ناولوں میں "چیتنا سرادتی" اور "موڑ دکو تولو" (تین بندر) معروف ہیں۔ بچی بابو پر سامرسٹ مام کا اثر واضح ہے۔ خود بابو نے کسی ذہنی تحفظ کے بغیر اس کا اقرار کیا ہے لیکن اپنے بلند تخیل، انسانی احساسات کے گہرے مطالعے اور معاشرتی شعور کے باعث بابو کی انفرادیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تلگو کے ناقدوں نے بابو کو تلگو کا پہلا جدید ناول نگار قرار دیا ہے۔

جی۔ وینکٹ کرشنا راؤ اپنے ناولوں میں دیہی زندگی کی عکاسی کے لئے شہرت رکھتے ہیں۔ اُن کا ناول "کیلو بماٹلو" (گڑیا) تلگو کے اہم ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے کہ اس میں ناول نگار نے دیہی معاشرہ کی حقیقت پسندانہ اور ہنرمندانہ عکاسی کی ہے۔

تاریخی ناول نگاری میں لوزی نرسمہا شاستری کا نام بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ آج بھی قدیم تلگو میں لکھتے ہیں۔ اُن کا اسلوب موضوع سے ہم آہنگ، بے حد نکھرا ہوا اور شائستہ ہوتا ہے۔ اس لئے جاذبِ توجہ اور پُرکشش بھی۔ نرسمہا شاستری نے کئی ناول لکھے ہیں، جن میں "ملا ریڈی"، "نارائن بھٹو"، "رُدرما دیوی" اور "کوسرو ابجو مڈو" کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

تلکے گنپتی شاستری نے اگرچہ زیادہ ناول نہیں لکھے لیکن اُن کا ایک تاریخی ناول "وسالنت رامو" خاصا معروف ہے۔ اُن کے ایک اور ناول کا نام "وسالَ نتراو" ہے۔

تاریخی ناولوں کا تذکرہ کرتے ہوئے شیوشنکر شاستری کے ناول "مغلائی دربار" کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دلچسپ ہونے کے باعث تلگو کے بہت زیادہ پڑھے جانے والے ناولوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ شیوشنکر شاستری نے بعض معاشرتی ناولوں کے ترجمے بھی کئے ہیں۔ ٹیگور کے ناول "گورا" کا کیا گیا ان کا ترجمہ پُرتحسین نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

موکاپتی نرسمہا شاستری نے تلگو ناول نگاری میں طنز و مزاح کے میلان کو فروغ دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ قبل ازیں بھی ناولوں میں طنز و مزاح کے عناصر موجود تھے۔ مثلاً چلکا مارتی نرسمہم شاستری اور ینوگنتی لکشمی نرسمہا راؤ نے اپنے ناولوں میں طنز و مزاح کی چاشنی سے کام لیا تھا لیکن موکاپتی کا مزاح انفرادیت رکھتا ہے۔ اُن کے ایک ناول کا نام "بیرسٹر پروتیسم" ہے۔ یہ دراصل اپنے وطن سے لندن تک بحری اور بری سفر کی داستان ہے۔ مختلف کردار اور واقعات سامنے آتے جاتے ہیں اور طنز و مزاح کی دھوپ چھاؤں سے قاری گزرتا رہتا ہے۔

بیسویں صدی کے تیسرے دہے تک انگریزی تعلیم اور مغربی زبانوں کے ادب کی ہندوستان کے مختلف گوشوں اور زبانوں تک رسائی ہو چکی تھی۔ تلگو ناول نگار بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مختلف ادبی تحریکات بھی اور زبانوں کی طرح تلگو میں در آئیں جن میں قابلِ ذکر تصوریت، انسانیت پرستی، اشاریت، ترقی پسندی، عقلیت پسندی، نیز نفسیاتی سائنسی اور شعور اور تحت الشعور کے رجحانات — لیکن جس طرح اور زبانوں میں یہ تحریکات عام طور پر قطعیت کے ساتھ اور بھرپور نہیں ملتیں، تلگو ادب اور بالخصوص ناولوں میں بھی یہی کیفیت ہے۔ ایسے ناول تحریر ضرور کئے گئے لیکن یہ، جیسا کہ ہونا چاہئے تھا عوام میں معروف نہ ہو سکے۔ بہر کیف یہی وہ دَور ہے کہ جس کو تلگو میں نئی ناول نگاری کے آغاز کا دَور قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس دَور کے ایک اہم ناول نگار راجہ کونڈہ وشواناتھ شاستری ہیں۔ اگرچہ انہوں نے معاشرتی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے لیکن اُن کے ناول سیدھے سادے نہیں، معاشرے میں انقلاب لانے کی ایک کوشش بھی ہیں۔ انہوں نے معاشرے کے غریب اور کمزور طبقات کی فلاح و بہبود پر زور دیا اور اونچے طبقے کے خلاف اُن کی حمایت کی ہے۔ اُن کے نزدیک متوسط طبقہ غیر اہم اور بے مقصد ہے اس طبقے پر اعتماد ہی نہیں کیا جا سکتا۔ وشواناتھ شاستری نکسل باری رجحانات کے حامل ہیں۔ اُن کا اہم ناول "الپا جیوی" ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار سُبیا ہے۔ ایک گمنام کلرک، جو زندگی کے سارے دُکھ درد اٹھاتا، اپنے عہدیداروں کی گالیاں کھاتا اور بیوی کی جھڑکیاں برداشت کرتا ہے۔ یہ ایک آوارہ گرد کردار ہے۔ اسی آوارہ گردی میں اُس کے

تعلقات ایک اسکول ماسٹر سے پیدا ہوتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ غرض فریب اور حقیقت اس ناول کے تانے بانے ہیں۔ اپنی حقیقت پسندی اور صاف ستھری زبان کی وجہ سے بھی اس ناول نے اونچا مقام حاصل کیا ہے۔ شاستری کا ایک اور ناول "راجو ہیٹی" ہے۔ یہ ایک معاشرتی نفسیاتی ناول ہے۔ مجموعی طور پر شاستری نے اپنے اسلوب اور اندازِ فکر سے اپنے ہمعصروں اور آنے والوں کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔

تینیتی کونڈا رامیا کے ناول "ما باڈی" (ہمارا مدرسہ) کو قطعی معنوں میں ممکن ہے ناول قرار نہ دیا جائے لیکن اس صدی کے ربع اوّل میں ایک ہائی اسکول کے اساتذہ اور طلبہ کے حالات کو ناول کے روپ میں انہوں نے بے حد خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اب ہم کو تلگو میں ایسے ناول زیادہ ملنے لگتے ہیں جن میں زندگی اور زمانے کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے ــــ بالی ودا کانتا راؤ نے بالخصوص نچلے متوسط طبقے کی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اُن کا ناول "گودا میدا بومّا" (دیوار پر تصویر) میں اس طبقے کی سرگزشت ملتی ہے۔

ساردا تلگو کا جوانمرگ ناول نگار ہے۔ ادب میں اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ اس کی مادری زبان تمل ہونے کے باوجود اُس نے خود کو تلگو زبان و ادب کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اس کے ناول "میچی چیڈو" میں نچلے طبقے کے حالات، اُن کی مسرتوں اور رنج و غم کا حقیقت پسندانہ اور موثر بیان ہے۔

کومودی وینوگوپال راؤ نے افسانہ نگاری میں اونچا مقام رکھتے ہوئے ناول نگاری کی سمت بھی توجہ دی ہے۔ اُن کا ناول "پنکو ٹِلو" (سفالی مکان) لائقِ مطالعہ ہے۔

نئے ناول نگاروں میں ایک اہم نام ویڈیرا چنڈی داس ہے۔ چنڈی داس نے تا حال اگرچہ صرف ایک ناول "ہیما جوالا" (برف میں آگ) لکھا ہے لیکن اسی ایک ناول سے چنڈی داس کی منفرد صلاحیتوں اور تلگو ناول کے نئے امکانات کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنڈی داس یونیورسٹی میں فلسفہ کے استاد ہیں۔ انہوں نے اپنی فلسفیانہ آگہی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس ناول کا پس منظر نفسیاتی ہے اور مصنف نے بے حد فلسفیانہ انداز میں اس کو آگے بڑھایا ہے۔ یوں لگتا ہے محض لکھنے کے لئے یہ ناول نہیں لکھا گیا بلکہ ایک خاص خیال کو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے اور وہ ہے انسانی ضمیر کی آواز ــــ اسلوب بے حد وقیع اور دلنواز ہے۔ "ہیما جوالا" کے مطالعہ سے ناول نگار کی فنکارانہ مہارت ظاہر ہوتی ہے۔ ناول میں کہیں کہیں قدیم روایتی انداز بھی ہے۔ ڈرامائیت بھی۔ ساخت اور بافت میں اجتہاد کے باعث بعض حلقوں میں یہ ناول متنازعہ فیہ حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس کی اہمیت کے سب قائل ہیں۔

بھاسکر بھاٹلہ کرشنا راؤ نے اپنے ناولوں میں نئے افکار اور عصری زندگی کے تقاضوں کو زیادہ جگہ دی ہے۔ اُن کے قابلِ ذکر ناولوں میں "یوگا ستدھی"، "ویلو وا لو پوچی کالو" اور "وِنیتا پراتایم" کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

پوپی کوچی سامبا سیوا راؤ کے ناولوں کا موضوع بھی آج کا انسان، اس کے دکھ درد، اس کی مصائب سے پُر زندگی، ان سب پر قابو پانے کی سعی، ایک خوشگوار مستقبل کی تمنا اور خوشیوں اور مسرتوں کے حصول کی جد و جہد ہے۔ سامبا سیوا راؤ نے اپنے کم و بیش ہر ناول میں مصیبت زدہ عوام ہی کے مسائل کو پیش کیا ہے، اس ایقان کے ساتھ کہ عوام جلد ہی اپنی جد و جہد میں کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔ "اُودایا کرانالو" (صبح کی کرنیں)، "ایرٹ دردہ جوٹو مجی لی" اور "انوشینا" اُن کے اہم ناول ہیں۔

داسرتھی رنگا چاریہ پیشے کے اعتبار سے قانون داں ہیں۔ یہ عموماً تلنگانہ کی مقامی زبان میں لکھتے ہیں۔ اردو اور فارسی پر بھی ان کو عبور حاصل ہے۔ بعض اُردو ناولوں کے انہوں نے تلگو ترجمے بھی کئے ہیں۔ اپنے ناولوں میں جاگیردارانہ نظام اور سابق ریاست حیدرآباد کی شاہی حکومت کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ ریاست حیدرآباد کے انضمام کے بعد موجودہ سیاسی نظام کے خلاف بھی انہوں نے بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے۔ اُن کا میلان باغیانہ ہے۔ اُن کا شہرت یافتہ ناول "چِنا نا دیوڈو" (چھوٹے خدا) ہے جس کو ساہتیہ اکیڈمی انعام مل چکا ہے۔ دیگر ناولوں میں "مایا چلاترو" شہری زندگی اور اس کے مسائل سے متعلق ہے۔ ایک اور ناول "مَدُوپو دُو نُو" ہے۔

علاوہ ازیں تلگو کے چند اہم ناولوں میں کونڈا پوتی لکشمی نارائن کا ناول "کنا تلّی" (حقیقی ماں) میں معاصرانہ زندگی کی مختلف سطحوں کی عکاسی ملتی ہے۔

ڈی۔ ہنمنت راؤ کا ناول "لوکا چترا" بھی عمدہ ہے۔

اس دَور میں عوام کی ناولوں سے بڑھتی ہوئی دلچسپی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف جرائد میں ناول بالاقساط شائع ہونے لگے۔ بعض جریدوں نے ناول نگاری کے سالانہ مقابلوں کا انعقاد کیا۔ اس طرح ناول نگاری کی ہمت افزائی ہوئی اور ناول نگاروں کی تعداد میں اضافہ ہو لیکن اور بات ہے کہ اونچے معیار کے ناولوں کی تعداد زیادہ نہ رہی اور عام معیار بھی اطمینان بخش نہ رہا۔ فارمولا ٹائپ ناول زیادہ لکھے جانے لگے، مقصدیت کا فقدان ہوا۔ سستے جنسی جذبات کو پیش کیا جانے لگا۔ فنی خامیاں بہت زیادہ ہوئیں۔ اس دَور کی ایک اور انفرادی خصوصیت خاتون ناول نگاروں کا زیادہ تعداد میں منظرِ عام پر آنا ہے۔ شاید ہی کسی ہندوستانی زبان میں خاتون ناول نگاروں کی تعداد اس قدر زیادہ رہی ہوگی جتنی تلگو میں ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس عرصہ میں تلگو معاشرہ میں تعلیم نسواں اور خواتین کی بیداری زیادہ رہی۔

بینا دیوی انقلابی ناول نگار کی حیثیت سے متعارف ہوئیں اور پھر انہوں نے معاشرتی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔ اپنے دلکش اسلوب کے باعث ان کے قارئین کا حلقہ وسیع ہے۔ ان کا ناول "مجھ کو جلد پھانسی دیدو" کے عنوان سے ابتداً ایک رسالے میں بالاقساط شائع ہوتا رہا۔ بعد میں بعد

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

اوصاف علی
انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی ۱۱۰۰۱

نوادر ـــــ قومی دولت

مخطوطات، دستاویزات وغیرہ سے متعلق مرکزی قانون

نہ کی کچھ لذتِ افتادگی میں اعتنا میں نے
مجھے دیکھا کیا اُٹھ کر غبارِ کارواں برسوں

اب سے سو سال پہلے جب مشہور مستشرق اشپرنگر SPRENGER نے اودھ کے کتب خانوں کا جائزہ لیا تو اسے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ لاتعداد نوادر بستوں میں بند طاق نسیاں پر رکھے ہوئے ہیں۔ اگر اس کی تفصیلی رپورٹ اب اٹھا کر دیکھی جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں نے اپنے نوادر کی حفاظت کے لئے پوری ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی کچھ زیادہ سرگرمی نہیں دکھائی۔ ایک سے ایک نادر مصور اور مذہب مخطوطے طاق پر رکھے ہوئے ہیں۔ غالباً طاق کے اس نسیان پیدا کرنے والے عیب کی وجہ سے جدید فنِ تعمیر میں اسے کوئی جگہ نہیں ملی۔

ایسے نوادر کی طرف سے اُس غفلت کو دیکھ کر قدر شناس اور علم پرور مغربی ممالک کے باشندوں نے ہماری چیزیں سستے داموں پر خرید کر اپنے اپنے ملک پہنچا دیں جہاں اب وہ کتب خانوں اور نمائش گاہوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ ایک لندن کو ہی لے لیجئے جہاں انڈیا آفس لائبریری، برٹش میوزیم وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم وغیرہ میں کثیر تعداد میں ہمارے نوادر موجود ہیں۔ یہ تمام نوادر انگلستان کے شائقینِ کتب اور دلدادگانِ فن آہستہ آہستہ ہمارے ملک سے لے جاتے رہے۔

مغربی ممالک کے لوگ نوادر کو محفوظ کرنے کی خاطر یا تو اپنی زندگی میں انہیں کسی ادارے کے حوالے کر جاتے ہیں یا اداروں میں انہیں محفوظ کرنے کی وصیت کر جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ جب تک وہ نوادر کو اپنے پاس رکھتے ہیں ان کی دیکھ بھال پر وقت اور پیسہ دونوں صرف کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے ملک کے لوگ عام طور پر نہ نوادر کو کسی ادارے کے حوالے کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں نہ یہ وصیت کر کے پر کہ انہیں ان کے فوت ہونے پر کسی ایسے میوزیم یا کتب خانے میں محفوظ کر دیا جائے، جہاں ان کی دیکھ بھال بھی ہو سکے اور عوام ان سے فائدہ بھی اٹھا سکیں ان نوادر کے مالکان اپنا کتنا وقت اور سرمایہ ان کی حفاظت پر صرف کرتے ہیں یہ اس سے ظاہر ہے کہ عام طور پر ہمارے ملک میں گھروں میں پڑے ہوئے نوادر غبار آلود ہو رہے ہیں اور دیمک اور کتابی کیڑوں کے لئے غذا بن رہے ہیں۔ کاش کہ ان نوادر کے مالکوں کو ہی خدا نے کتابی کیڑا بنایا ہوتا!

اس صورت حال کو دیکھ کر ہمارے وزیر تعلیم جناب سید نور الحسن صاحب جو خود کتابوں اور آرٹ کی چیزوں کے بڑے قدر داں ہیں یہ ضروری سمجھا کہ جو چیزیں ملک میں رہ گئی ہیں ان کی حفاظت کا سامان کیا جائے اور اُن کو ملک سے باہر جانے سے روکا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے پارلیمنٹ میں ایک بل پانچ برس قبل پیش کیا تھا جو پاس ہو گیا اور

ANTIQUITIES AND ART TREASURE ACT 1972

کہلایا۔ اس ایکٹ کا نفاذ سکم کے سوا تمام ہندوستان میں ۵ راپریل ۱۹۷۶ء کے EXTRA-ORDINARY GAZETTE NO. 135 کے ذریعہ ہوا۔

اس گزٹ کے SECTION II میں ANTIQUITIES میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں:

(الف) اہم سکے، مجسمے، پینٹنگس، اشیاء کندہ کاری آرٹ، کاریگری کے نمونے۔

(ب) کسی عمارت یا غار سے علیحدہ کی ہوئی چیز۔

(ج) اشیاء جو ماضی کے سائنس آرٹ، کاریگری، ادب، مذہب رسم و رواج و اخلاقیات، سیاسیات سے متعلق ہوں یا ان پر روشنی ڈالتی ہوں۔ تاریخی دلچسپی کی حامل کوئی شے اگر یہ چیزیں (الف تا ج) سو سال یا اس سے زیادہ پرانی ہوں۔

(د) مخطوطات، دستاویزات وغیرہ جو پچھتر سال یا اس سے زیادہ پرانی ہوں۔

ان تمام اشیاء کا رجسٹریشن اب مندرجہ بالا ایکٹ کے تحت ضروری ہو گیا ہے۔ اور کوئی شخص بغیر لائسنس نہ انہیں خود فروخت کر سکتا ہے اور نہ کسی ادارے کے ذریعے۔

لائسنس حاصل کرنے کے لئے فارم نمبر ۱ پر درخواست بھیجی ہوگی فارم نمبر ۲ پر سیکشن آفیسر لائسنس جاری کریگا۔ فارم نمبر ۳ پر لائسنس حاصل کرنے والے فروخت شدہ اشیاء کی تفصیل ہر مہینہ پیش کرتے رہیں گے۔

فارم نمبر ۷ پر ان تمام افراد اور اداروں کو جن کے پاس ANTIQUITIES (نوادر) کے تحت آنے والی کوئی چیز موجود ہو رجسٹریشن کے لئے درخواست دینی ہوگی اور فارم نمبر ۸ پر رجسٹر کرنے والے افسر سرٹیفکیٹ دیں گے کہ فارم نمبر ۷ میں درج کی گئی چیز کا رجسٹریشن ہو گیا ہے۔ یہ تمام فارم مختلف صوبوں کے مرکزی میوزیم سے یا محکمۂ آثارِ قدیمہ سے حاصل

سکے جا سکتے ہیں۔ اگر کوئی دشواری پیش آئے تو رجسٹر کرنے والے آفیسر یا آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نیو دہلی ۱۱ کو لکھ کر صحیح معلومات حاصل کرنی چاہیئے۔

ابتداً نوادر ([illegible]) کے تحت آنے والی ان تمام اشیا کا جن کی تفصیل اُوپر آ چکی ہے ۴ر جولائی تک رجسٹریشن ضروری تھا۔ لیکن اس قلیل مدت میں رجسٹریشن کی دقتوں کو دیکھ کر ایک نوٹی فیکیشن وزارت تعلیم کی طرف سے ۲ر جولائی ۱۹۷۷ء کو جاری ہوا۔ اس میں نہ صرف رجسٹریشن کی مدت میں تین مہینے کی توسیع کی گئی بلکہ رجسٹریشن کے لئے فی الحال صرف مندرجہ ذیل اشیاء رکھی گئی ہیں جو کم سے کم سو سال پرانی ہوں۔

(الف) پتھر، دھات، ہاتھی دانت، ہڈی اور ٹیرا کوٹا ([illegible]) سے تراشی ہوئی چیزیں۔

(ب) ہر قسم کی پینٹنگ۔

(ج) مخطوطات جن میں تصویریں ہوں یا جو مختلف رنگوں سے مزین کئے گئے ہوں۔

باقی اشیاء کے رجسٹریشن کے متعلق بعد میں اعلان ہوگا تاکہ تمام اشیاء کا رجسٹریشن بتدریج ہو سکے اور قدیم اشیاء کے مالکوں کو یک لخت اپنے ذخیروں کو رجسٹر کرانے میں دشواری نہ پیش آئے۔ رجسٹریشن کے لئے متعلقہ فارم کے ساتھ چار فوٹوگراف بھی داخل کرنا ہوں گے۔

۱۴ر اکتوبر ۱۹۷۷ء تک مندرجہ بالا تینوں قسم کی اشیاء کو رجسٹر نہ کرانا ایکٹ کی دفعہ ۲۵ کے تحت جرم تصور کیا جائے گا جس کی سزا چھ ماہ کی قید یا جرمانہ یا دونوں اور شے متعلقہ کی ضبطی ہے۔

یہ ایکٹ تمام افراد اور اداروں پر محیط ہے۔ صرف گورنمنٹ کی نگرانی میں چلنے والے میوزیم، دفاتر آرکائیوز اور تعلیمی و ثقافتی اداروں کو مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

دفعہ ۱۹ کے تحت حکومت ایسی تمام چیزوں کو اپنی تحویل میں لے سکتی ہے جن کی حفاظت وہ ضروری سمجھے۔ دفعہ ۲۰ کے تحت ان اشیاء کا جنہیں حکومت اپنی تحویل میں لے لے معاوضہ دیا جائے گا۔

دفعہ ۲۷ میں مجسٹریٹ کو اختیار دیا گیا ہے کہ خلاف ورزی کرنے والوں کو اس سزا میں جس کا اوپر ذکر کر چکے ہیں اضافہ کر دے۔

نوادر ([illegible]) کی دیکھ بھال یوں بھی ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ مندرجہ بالا ایکٹ کے نفاذ نے اس ذمہ داری کو دو چند کر دیا ہے کیونکہ اُن کے فوٹو تیار کرانے فارم میں اسی قسم کی تفصیل درج کرنے کہ انہیں کس طرح حاصل کیا گیا، کیا قیمت ادا کی گئی وہ کب بنائے گئے کے ساتھ ساتھ ان کی حفاظت کی ذمہ داری بھی ان کے مالکوں پر عاید ہوتی ہے۔

ان تمام دشواریوں سے نکلنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ افراد جن کے پاس نوادر ([illegible]) ہیں انہیں خوشحال کتب خانوں اور میوزیم کو دے دیں جہاں ان کی پوری طرح دیکھ بھال اور نمائش ہو سکے۔ اگر یہ اشیاء بطور عطیہ دی جائیں گی۔ تو پانے والے ادارے ان کو ان کے معطیین کے نام پر رکھیں گے۔ اگر فروخت کرنا ہو تو بہتر ہے کہ نوادر ([illegible]) رکھنے والے مناسب اداروں سے جلد گفت و شنید کر کے معاملہ طے کر لیں۔ اس طرح انہیں بہت سی پریشانیوں سے چھٹکارا مل جائے گا کچھ رقم بھی ہاتھ آ جائے گی اور ان کی اشیاء محفوظ ہو جائیں گی اور آنے والی نسلوں کو ان سے استفادہ کا موقع ملتا رہے گا۔

بقیہ اقبال کا سفر کشمیر

بریت کی توقع ہے۔ اس واسطے اس وقت التوا کو غنیمت سمجھا گیا ورنہ میں نے تو مہاراجہ صاحب کو بھی کہہ دیا تھا کہ آپ ابھی فیصلہ کر دیں کیونکہ دوبارہ یہاں آنے کا خرچ موکل اپنی غریبی کی وجہ سے نہ اٹھا سکیں گے۔ مگر منشی اسداللہ صاحب کا یہی خیال تھا کہ التوا بہتر ہے مگر افسوس کہ بعد میں ان کا خیال پورا نہ ہو سکا اور کونسل اب تک نہ بن سکی۔ وہ غلطی سے یہ سمجھتے رہے کہ اس فیس میں جو انہوں نے مجھ کو دی تھی میں دوبارہ کشمیر آ جاؤں گا مگر یہ کیونکر ممکن تھا۔

اس کے علاوہ مہاراجہ صاحب کے سامنے میں نے یہ سب کچھ کہہ دیا تھا۔ بہر حال اب میں نے سنا ہے کہ وہ گورنمنٹ آف انڈیا میں لالہ کنور سین صاحب کے فیصلہ کے خلاف اپیل کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے مندرجہ بالا طویل حالات لکھ کر آپ کو تکلیف دی ہے۔ اس کی غرض یہ ہے کہ اگر رحمان راہ کے وارثوں کا ارادہ اپیل کرنے کا مصمم ہو تو میں بغیر کسی مزید فیس کے اپیل لکھ دوں گا آپ یہ امر ان کے گوش گذار کر دیں۔

ایک اور دقت بھی ہے اور وہ یہ کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے مہاراجہ کی طرف سے اگر کسی کو پھانسی کا حکم ہو تو اس کی اپیل گورنمنٹ آف انڈیا میں ہوتی ہے۔ قید کا اگر حکم ہو تو اس کی اپیل نہیں ہوتی۔ بہر حال اگر ان کا ارادہ ہو تو مجھے اس میں کچھ عذر نہ ہوگا۔ اس صورت میں آپ ان سے کہہ دیں کہ میری بحث کے مفصل نوٹ اور دیگر کاغذات بھیج دیں۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

مخلص محمد اقبال

۲۰ ر اپریل ۱۹۲۱ء

نعیمہ جعفری
وارڈنس کوارٹر ایم۔ایم ہال، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ہندوستان کی آئندہ ترقی میں عورت کارول

"گزشتہ دنوں آل انڈیا کمیٹی فار انٹرنیشنل ویمنس ایئر کے زیر اہتمام مضامین کا ایک تحریری مقابلہ ہوا تھا "ہندوستان کی آئندہ دس سالہ ترقی میں عورت کا حصہ" اس مقابلے میں اردو کے لئے انعام زیر نظر مضمون کو ملا تھا۔ یہ انعام ۲ رجون کو وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی کی جائے قیام پر انہیں کے ہاتھوں عنایت ہوا۔"

عورت دنیا کی وہ عظیم مخلوق ہے جس کی کوکھ سے دنیا کے عظیم ترین لوگوں نے جنم لیا ہے۔ وہ پیغمبر ہوں یا اوتار، شہنشاہ ہوں یا قومی رہنما، علما ہوں یا دانشور، اسی کی گود میں تربیت پاکر پتھر سے ہیرے بنے۔ تاریخ گواہ ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے انسانوں کو عظمت کا پہلا درس ماں کی گود میں ملا۔ لیکن تاریخ اس بات کی بھی شاہد ہے کہ اسی عورت کو کبھی اس کا مناسب مقام نہیں ملا۔ اس کو کبھی قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ شاعروں اور ڈرامہ نگاروں نے اسے محبوبہ بناکر رسوا تو کیا لیکن اس پر کبھی زور نہیں دیا کہ اس کے بھی کچھ حقوق ہیں جو اسے ملنے چاہئیں۔ اس کے وجود کو ایک نغمہ اور ایک خوشبو کی طرح تو محسوس کیا گیا لیکن یہ نہیں سمجھا گیا کہ زندگی کی پرخار راہوں پر یہ مردوں کے قدم سے قدم ملاکر بھی چل سکتی ہے۔ آج سے نصف صدی پیشتر بھی عورت کے بارے میں یہی تصور عام تھا کہ یہ گاڑی کا وہ پہیہ ہے جس کا کام گھر کے اندر چلنا ہے اور جس کے فرائض گھرداری کرنے اور بچے پیدا کرنے اور پالنے تک محدود ہیں۔ کبھی اسے ناقص العقل قرار دے کر اور کبھی "گھر کی زینت" اور "چراغ خانہ" جیسے خطابوں سے نواز کر باہر کی دنیا سے دور رکھا گیا۔ ایک طرف تو آدمی چاند پر پہنچنے کی تیاری کررہا تھا اور دوسری طرف اسے گھر سے باہر نکلنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ انگلینڈ اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں عورت کی حالت کچھ زیادہ بہتر نہ تھی۔ انتہا یہ ہے کہ انگلینڈ میں عورتوں کو ووٹ کا حق بھی آج سے تقریباً پچاس سال پہلے ملا ہے۔ یہی حال حق وراثت کا ہے جسے حاصل کئے وہاں کی عورتوں کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔

رفتہ رفتہ عورتوں کو بھی یہ احساس ہوتا گیا کہ اُن کے ساتھ اب تک ناانصافی ہوتی رہی ہے۔ ان کی حیثیت دنیا میں ثانوی ہوکر رہ گئی ہے۔ بیسویں صدی کو اس معنی میں عورتوں کی صدی کہنا چاہیے کہ اس صدی کے اوائل کے ساتھ ہی عورتوں میں یہ احساس بیدار ہونا شروع ہوا کہ انہیں اپنے حقوق کے لئے خود لڑنا ہوگا۔ اور اپنا مستقل وجود تسلیم کرانا ہوگا۔ چنانچہ یہ انہیں کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج عورت ہر میدان میں مرد کے دوش بدوش نظر آرہی ہے لیکن اپنے حقوق منوانے کے ساتھ ہی عورت کے کندھوں پر ذمہ داری کا ایک بڑا بوجھ بھی آپڑا ہے۔ وہ یہ کہ وہ اپنے فرائض کو پہچانے اور اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے ملک و قوم کو ترقی کی راہ میں آگے بڑھنے میں مدد دے۔ یہ صحیح ہے کہ آج ہمارے ملک کی عورتیں سیاسی اور معاشی سطح پر آگے بڑھ رہی ہیں۔ لیکن ایسی تعلیم یافتہ عورتوں کی تعداد کتنی ہے؟ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی کا تقریباً نصف حصہ عورتوں پر مشتمل ہے۔ جن میں سے اسّی فیصدی کے لگ بھگ تعلیم سے محروم ہیں۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہوسکتی کہ ترقی کے دروازے میں داخلہ تعلیم کے حصول کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ عورت کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ہر طبقے کی عورتوں میں تعلیم کا رجحان عام کرے۔ ظاہر ہے کہ ہر طبقے اور ہر گھرانے کی عورتیں اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اور تعلیم کا مفہوم محض اسکولوں والی تعلیم ہے بھی نہیں۔ تعلیم کا بنیادی اصول عوام میں ذہنی بیداری کی لہر پیدا کرنا ہے۔ دیہات اور پسماندہ طبقے کی عورتیں خاص طور پر ہماری توجہ کی مستحق ہیں۔ تعلیم یافتہ عورتوں کو چاہیے کہ وہ ان لوگوں کو عصر حاضر کی ترقیوں، تبدیلیوں اور تقاضوں سے آگاہ کریں۔ اور انہیں تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کا احساس دلائیں۔ جو لوگ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی آج سے سو برس پہلے کے ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔ انہیں جینا سکھائیں، ان میں ترقی کا شعور پیدا کریں اور ان کے ذہنوں کو روح عصر کے ذہنوں سے ہمکنار کریں۔ جب کہ ملک کے اکثریتی طبقے میں بیداری کی لہر نہیں پھیل جاتی ہے ذہنوں پر تعلیم سے جلا نہیں ہوجاتی اور ان میں اپنے فرائض کا شعور نہیں پیدا ہوجاتا۔ ملک کا ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھنا بہت مشکل ہے۔ یوں دیکھا جائے تو آج ہزاروں عورتیں ایسی ہیں جنہوں نے معلمی کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے فرائض کو صحیح طور پر سمجھا جائے۔ آج کے یہی بچے جو ان درس گاہوں میں زیر تعلیم ہیں کل کے ہندوستان کی باگ ڈور سنبھالیں گے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ کل کے ہندوستان کے بنانے یا بگاڑنے کی ذمہ داری انہیں عورتوں کے سر ہے۔ بچوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کا درس دے کر، انہیں تہذیب و شائستگی اور امن و آشتی کا سبق سکھا کر انہیں وسیع النظری اور روشن دماغی کی دولت عطا کرے تاکہ بڑے ہوکر وہ چھوت چھات، اونچ نیچ، ذات پات اور رنگ و نسل کی تفریق مٹا سکیں۔ ان میں تعمیری شعور پیدا کرکے عورت اپنے دیش کے مستقبل کو سنوار سکتی ہے۔ عورت یہ کام زیادہ اچھی طرح اس لئے بھی انجام دے سکتی ہے کہ وہ صرف عورت ہی نہیں ماں بھی ہے جو بچوں کی نفسیات کو بہتر طور پر سمجھ سکتی ہے اور اس کے مطابق ان کی تربیت کرسکتی ہے۔

اور بھی بہت سی راہیں ہیں جن پر چل کر عورت ملک کی ترقی میں اہم رول

ادا کر سکتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اکثر لوگ رشوت ستانی اور بے ایمانی کا شکار محض اپنی بیویوں کی فرمائش کی تکمیل کی خاطر ہو جاتے ہیں۔ گرہستنوں کو چاہیے کہ وہ اپنے طرزِ معاشرت کو زیادہ سے زیادہ سادہ بنائیں اور اپنے شوہروں کو غیر قانونی کارروائیوں کا شکار ہونے سے بچائیں اور عوام کے دلوں میں قانون کا احترام پیدا کریں۔ بہت سی عورتیں جو ملازمت نہیں کر سکتیں ان کی دلچسپی صنعت و حرفت میں پیدا کی جائے تاکہ وہ گھر میں بیٹھ کر بھی نہ صرف ملک کی ترقی میں حصہ لے سکیں بلکہ اپنی مالی حالت بھی سدھار سکیں۔ ملک میں بظاہر چھوٹے لیکن اہم مسائل ایسے ہیں جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں مثلاً جہیز کی لعنت جو کہ خالص عورتوں کا مسئلہ ہے۔ جہیز کے خلاف آواز بلند کر کے اور عملی زندگی میں اس کو اپنا کر عورت سماج کے ایک رستے ہوئے ناسور کا علاج کر سکتی ہے۔ عوام میں یہ تصور بھی عام کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ شادی بیاہ کی تقریبات میں کم سے کم خرچ کریں۔ اس سلسلہ میں مشترکہ شادیوں کا رواج جو کہ بہت سودمند ہے، عام کرنا چاہیے۔ اسی طرح خاندانی منصوبہ بندی کے رجحان کو متوسط اور خصوصاً نچلے طبقے میں فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے عوام کے دلوں میں پیدا شدہ توہم پرستی اور خوف کو دور کیا جائے۔ اور اس کے فوائد پر روشنی ڈالی جائے۔

ترقی کے پروگرام کی اسکیم ادھوری رہ جائے گی۔ اگر اس میں ترقیِ نسواں کی ایک اور اہم جہت کی طرف اشارہ نہ کیا جائے۔ اور یہ ہے طبی سرگرمی۔ یوں ہمارے ملک میں ڈاکٹروں کی کمی نہیں ہے لیکن ایسے کم ہی ہوں گے جو اپنے دل میں ملک کی خدمت کا جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ اکثر سننے میں آتا ہے کہ غیر ممالک کے تعلیم یافتہ ڈاکٹر بیرونِ ممالک میں کام کرنے کو ہی ترجیح دیتے ہیں اور اگر اپنے ملک لوٹ بھی آئیں تو انہیں گاؤں میں کام کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ عورت جو اپنے سینے میں ایک نرم و نازک دل رکھتی ہے۔ ایک ایسا دل جو ہر ایک کے دکھ پر پگھل جاتا ہے۔ اس لئے عورتوں کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ طبی تعلیم حاصل کریں۔ اور اسے حصولِ زر کے ساتھ ساتھ خدمتِ خلق کا ذریعہ بنائیں۔ ہمارے ملک کے دیہاتوں میں کتنے لوگ بغیر طبی امداد کے اس لئے دم توڑ دیتے ہیں کہ ان کے گاؤں میں کوئی اچھا ڈاکٹر نہیں ہے اور اگر ہے تو وہ اس کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ ڈاکٹر عورتوں اور نرسوں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے لئے دیہی علاقوں کو منتخب کریں تاکہ ہزاروں انسانوں کی جان بچا سکیں اور ان میں پھیلنے والی بیماریوں کو روک تھام کر سکیں۔

ان پروگراموں پر عمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایسے ادارے اور تنظیمیں قائم کی جائیں جن کی رضاکار عورتیں دیہات کا دورہ کر کے یہ خدمت انجام دیں۔ ہر عورت کا فرض ہے کہ وہ ذاتی طور پر بھی ترقی کے کاموں میں دلچسپی لے اور اس کے لئے جتنا وقت بھی دے سکتی ہو دے۔ ان پروگراموں کا محض کاغذات کی حد تک محدود رہنا ہی کافی نہیں ہے اور نہ صرف چند عورتوں کی کوشش سے کوئی بات بن سکتی ہے۔ ان تجاویز پر عمل تب ہی ہو سکتا ہے۔ جبکہ ہر تعلیم یافتہ عورت اپنی بساط بھر ترقی کے کاموں میں ہاتھ بٹائے۔ صرف سرکاری کوششوں کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے کام نہیں چل سکتا۔ ملک کو ترقی کی راہ پر آگے بڑھانے میں عورت اس طرح بھی حصہ لے سکتی ہے۔ وزیر اعظم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "خالی باتوں سے کبھی کام نہیں چلا کرتا۔ پیداوار اور ترقی کے لئے سازگار سماجی فضا پیدا کرنا بہت ضروری ہے جو عورتوں کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں"۔ اگر عورت ایسے اور ان جیسے دوسرے افادی پروگراموں پر خلوص دل سے عمل کرے تو یقین ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہمارا ملک ترقی کے میدان میں ایک نمایاں مقام حاصل کرے گا۔

بقیہ: تلگو میں ناول نگاری

"پنیا بھومی کنو تیرو" (مقدس سرزمین کو اپنی آنکھیں کھولنے دو) کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ عنوان ہی سے اس کی انقلابی نوعیت ظاہر ہے۔

تینیتی ہیما لتا دیوی نے "جو لتا" کے مختصر نام سے معروف ہیں اپنی ناول نویسی کے لئے بھی شہرت رکھتی ہیں۔ لتا نے آٹھ سال کے عرصہ میں (۱۲) ناول لکھے۔ ان کا اسلوب خوشگوار ہے۔ اظہار میں وہ جذباتیت سے کام لیتی ہیں لیکن "ساتھی پیلو" جہاں تہاں سستے جنسی جذبات کی حد سے زیادہ کارفرمائی ہے اور یہی چیز کھٹکتی ہے۔ ان کے مقبول ناولوں میں "جیونا سرادمتی" (زندگی کا دھارا) اور "رنگی لندے متی" ہیں۔

رنگا نائیکما نے اپنے ناولوں میں سماجی ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی اور عورتوں کے حقوق اور ان کی آزادی پر زور دیا ہے۔ ان کے مقبول ناولوں کے نام "راجیشوری"، "استری" اور "بلی پیٹھم" ہیں —— اس کے علاوہ سری دیوی کا ناول "کالاتیتا لیک نو" اور سلوچنا رانی کے کئی ناول اپنی عمدہ کردار نگاری کے باعث شہرت رکھتے ہیں۔

خاتون ناول نگاروں کی فہرست اور کہیں طویل ہے۔ جن کے نام زیادہ معروف ہیں ان میں یدونا پوڈی، کوشلیا دیوی، دیوے وٹلا میشوری، سلوچنا، مادی ریڈی، آنندا رانی، وشالا لاکشی، واسی ریڈی سیتا دیوی اور پرمیلا سونیو لائقِ ذکر ہیں۔ خاتون ناول نگاروں کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ ان کے کئی ناول فلمائے جا چکے ہیں اور اب تو کئی محض فلموں کے لئے لکھنے لگی ہیں جن میں کوشیلا رانی، مادی ریڈی اور سلوچنا کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

دیگر ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں تلگو میں اگرچہ افسانہ نگاری کے مقابلے میں ناول کا فن کم ترقی یافتہ ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ اس سے اونچی توقعات وابستہ نہیں کی جا سکیں۔ موجودہ بھیڑ چال کے باوجود بعض ناول نگاروں کی ادبی حیثیت ان کے اور خود تلگو ناول کے روشن مستقبل کی دلیل ہے۔ تلگو میں اچھے، عمدہ اور معیاری ناولوں کی موجودگی کے باوجود یقین کیا جا سکتا ہے کہ اور اچھے ناول لکھے جائیں گے جن سے ہندوستانی زبانوں میں تلگو زبان و ادب کا مقام مزید اونچا ہوگا۔

نئی کتابیں

ندرِ وطن — عثمان عارف صاحب کی وطنی نظموں کا مجموعہ

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے جناب محمد عثمان عارف نقشبندی بیکانیری کی ملی، قومی وسیاسی نظموں کا مجموعہ "ندرِ وطن" شائع کرکے ملک وقوم ونیز زبان ادب کی جو خدمت کی ہے وہ قابلِ صد مبارکباد ہے۔

عارف نے اپنی نظموں میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن میں اعلیٰ وارفع قدارِ زندگی، اصولِ انسانیت، امن وآشتی، مساوات، مذہبی وسماجی رواداری، ملی اخوت اور عظمتِ وطن کے جذبات کی عکاسی ہے۔

عارف دورِ جدید کے ترقی پسند شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں مقصدیت اور افادیت کو اُردو کے قدیم روایتی شعرا کی طرح نظر انداز نہیں کیا بلکہ جو بات کہی کسی مقصد کے تحت کہی ہے تاکہ عوام مستفید ہوں۔ اُن کا تمام کلام اس لحاظ سے "ادب برائے زندگی" کے اصول کا حامل ہے۔ اُن کی کتاب "ندرِ وطن" کے خاص عناصر حب الوطنی، قومی یکجہتی اور انسان دوستی ہیں اور ان کا نقطۂ نظر تعمیری وترقی پسندانہ ہے۔

"ندرِ وطن" کی پہلی نظم "جنت مرے وطن کی" میں ہندوستان کی جغرافیائی، تاریخی اور تمدنی عظمت کے گن گائے گئے ہیں۔

مٹی ہے اس کی سونا ہیرا ہیں اس کے پتھر
کرتی ہے آنکھ خیرہ دولت مرے وطن کی
رشکِ فلک زمیں ہے ذرّے ہیں چاند تارے
تاریخ کہہ رہی ہے عظمت مرے وطن کی
ہے پیار اس کا مسلک امن واماں ہے مقصد
مشہور ہے جہاں میں الفت مرے وطن کی

جون ۱۹۷۵ء کے آس پاس ملک میں جو حالات پیدا ہوگئے تھے اُن کی روک تھام کے لئے سخت اقدام کی ضرورت تھی اور اس کی افادیت کو انہوں نے محسوس کیا ہے۔ ان کی نظمیں "ہنگامی حالات" اور "اندرا گاندھی اور ایمرجنسی" ان ہی خیالات کی مظہر ہیں۔

آندھی کی زد میں بہار چمن روشنی ملی — راحت ملی، سکوں ملا اور خوشی ملی
جوگن رہے تھے سانس انہیں زندگی ملی — مایوس غم زدوں کو کرن آس کی ملی
حسنِ عمل نے آج اُجالا سا کر دیا
تاریکیوں کا گویا صفایا سا کر دیا

نظم "ہمارے منصوبے" میں شاعر نے بہت ہی لطیف اور پُر اثر انداز سے ہمیں اُن ترقیوں کی تصویر دکھائی ہے جو ہم نے مختلف پنجسالہ منصوبوں میں کی ہیں۔

چونکا دیا ہے ولولۂ کامگار نے — گرما دیا ہے ہمتِ مردانہ کار نے
آگے بڑھے جو ہم رُخِ گیتی سنوار دے — بانہیں گلے میں ڈال دیں ہنس کر بہار نے
ذرّے ہیں آفتاب، زمیں آسمان ہے
پربت کی چوٹیوں پر ہمارا نشان ہے
بجلی ہے مٹھیوں میں اشارے پہ ہے ہوا — جس سمت چاہا موڑ کے دریا کا رُخ کیا
یہ گرمیٔ عمل کا کرشمہ تو دیکھئے — پانی کو آگ آگ کو پانی بنا دیا
سیلاب ہم نے روکا ہے عزمِ بلند سے
پوچھو ہمارے حوصلے ریہاند بند سے

اندرا گاندھی کے ساتھ آج سارا ہندوستان ہے دوسری قومیں بھی اُن کے ساتھ ہیں اس لئے کہ اُن کی یہ دلی تمنا ہے کہ

گیان کی ہو روشنی، وگیان کی تنویر ہو
فتنے بن جائیں ستارے اوج پر تقدیر ہو
نقشۂ عالم پہ بھارت کی حسیں تصویر ہو
جس کے منصوبے ہیں یہ اس رہنما کے ساتھ ہیں
ملک اے جان و دل سے اندرا کے ساتھ ہیں

ایسے رہنما کو خراجِ عقیدت پیش کرکے عارف صاحب نے اُردو زبان کے تمام شعراء کی آبرو رکھ لی۔ وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اُن کی کتاب "ندرِ وطن" بہت مقبول ہوگی

ناز مانک پوری

اس کتاب کی قیمت دس روپے ہے

جامع العطیات

مرتبہ: ضیاء الدین احمد شکیب
حسن الدین احمد

قیمت ۱۵/۴۰ روپے — صفحات: ۳۵۸

ناشر: ولا اکیڈمی۔ عزیز باغ حیدرآباد

نواب عزیز جنگ ولاؔ نے اُردو اور فارسی میں تاریخ: شعروشاعری، قانون مال گذاری، نظم ونسق، زراعت، علم الطیر وغیرہ پر متعدد کتابیں تصنیف وتالیف کی تھیں، زیرِ تبصرہ کتاب میں اگرچہ مختلف تالیفات کے اقتباسات لئے گئے ہیں۔ تاہم بنیادی طور سے یہ اُن کی دو تالیفات "عطیات سلطانی"

اور تسیاق دکن میر مبنی ہے۔ اس کتاب کا حصہ اول عطیات سے متعلق ہے اور اس کے آٹھ ابواب میں عطیات کے مسائل یا پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے اس کے بعد سات ابواب پر مشتمل حصہ دوم سیاق سے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی داں طبقے کی سہولت کے لئے ایک ۲۲ صفحات کے دیباچے کے علاوہ بہت سے مشکل اور غیر معروف الفاظ و اصطلاحات کی انگریزی فرہنگ بھی شامل اشاعت ہے۔

آج کے دور میں اس طرح کی کتابوں کا بلاشبہ فقدان ہے۔ اس میں وسطی دور کی ایسی معلومات یکجا کر دی گئی ہیں جو اب عموماً بہت کم دستیاب ہیں۔ قدیم اسناد کا بیان و اسلوب اور گزشتہ چند صدیوں کے مروج اوزان و پیمانوں سکوں اور سال و ماہ کی تفصیلات اس زمانے کے متعلق تحقیق کرنے والوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوں گی

طرحِ نو

علیم صبا نویدی

قیمت: سات روپے

صفحات: ۹۲

ناشر: تامل ناڈو اُردو پبلیکیشنز ایسوسی ایشن
امیر النسا بیگم اسٹریٹ ماؤنٹ روڈ، مدراس

علیم صبا نویدی جدید شاعروں میں خاصے معروف ہیں۔ جدید حسیت عصری تقاضوں سے آگہی اور نیا لب و لہجہ ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ اگرچہ جدید شعرا کی طرح ان کے یہاں بھی کچھ مخصوص الفاظ و تراکیب کا منہج ہے تاہم جدید غزل کے مخصوص انداز اور رنگ و آہنگ کی حدود میں رہ کر بھی انہوں نے اپنے تاثرات کو اس طرح سے پیش کیا ہے کہ اس میں انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً

تاریخ کی چوکھٹ پہ بہت دیر سے کوئی
تھامے ہوئے افکار کی انگلی کو کھڑا ہے

جتنی طویل عمر اندھیروں نے پائی ہے
اتنی طویل ہے مری تنہائی ناپ لو

لوگ پتھر لے کے پھرتے ہیں صبا
آئنہ تو اپنی سوچوں کا سنبھال

مختصراً یہ کہ طرحِ نو کی اشاعت جدید ادب میں ایک اضافہ ہے۔ امید ہے کہ اس شعری مجموعہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا

تدریسِ اُردو

احمد حسین

صفحات ۴۰۰

قیمت: دس روپے

درس و تدریس نہایت مشکل کام ہے۔ اور استاد کو پڑھاتے وقت کئی طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے خصوصاً اس ترقی یافتہ دور میں تعلیم و تدریس کے طریقوں میں بنیادی تبدیلی آگئی ہے اور پڑھانے لکھانے کا عمل میکانکی نہیں رہا ہے بلکہ خود استاد کو متعدد باتوں کو ذہن میں رکھنا ہوتا ہے۔ جیسے طالب علموں کی ذہنی استعداد، ماحول اور نفسیات، موضوع کے پیش کرنے کا طریقہ وغیرہ۔

اُردو میں اس طرح کی کتابیں بہت کم ہیں جن میں تدریسی مسائل پر گفتگو کی گئی ہو خصوصاً اُردو کی تعلیم سے متعلق تو اور بھی کم ہیں کیونکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اُردو مادری زبان ہے اور اس کے تعلیمی مسائل پر زور دینے کی ضرورت نہیں ہے

مرہٹواڑہ کالج کے جناب احمد حسین صاحب نے اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اس موضوع پر زیرِ تبصرہ کتاب لکھ کر اس کمی کو کچھ حد پورا کیا ہے

سازِ دلنوا

مرتبہ: حلقۂ تشنگانِ ادب

قیمت: سات روپے

صفحات: ۲۵۶

ناشر: سکریٹری حلقۂ تشنگانِ ادب ۴/۱۰ اسیکٹر رام کرشنا پورم نئی دہلی

اُردو ادب اور شاعری میں دلچسپی رکھنے والے کچھ سرکاری ملازمین نے اپنے ذوقِ شاعری کی تسکین اور اُردو ادب کے فروغ کے نقطۂ نظر سے ۱۹۲۸ کے اواخر میں رام کرشنا پورم نئی دہلی میں حلقۂ تشنگانِ ادب نامی ادبی انجمن کی بنیاد رکھی تھی۔ گذشتہ آٹھ برس سے اس حلقہ کی باقاعدہ ماہانہ نشستیں ہوتی ہیں جس میں پابندی سے طرحی مشاعرے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض مشاعروں میں دلی کے سربرآوردہ شعرا بھی شریک ہوتے ہیں

حال ہی میں اس انجمن نے سازِ دلنوا کے نام سے ایک شعری مجموعہ شائع کیا ہے جس میں "حلقۂ تشنگانِ ادب" سے منسلک ۲۵ شعرا کا منتخب کلام شامل ہے۔

یہ انتخاب اس لحاظ سے قابلِ ستائش ہے کہ اس سے مرکزی سرکار کے ملازمین کی جن میں اکثر سرزمینِ پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں، اُردو دوستی کا ثبوت ملتا ہے اور نئے فن کاروں کو اُبھرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔

حریمِ فکر

واصف عابدی

قیمت: ۵ روپے

صفحات: ۱۲۸

ملنے کا پتہ: واصف عابدی محلہ انصاریاں، چھوٹا امام باڑہ سہارن پور (اُتر پردیش)

واصف عابدی اُردو کے ایک معروف شاعر ہیں۔ یوں تو انہوں نے تقریباً سبھی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل میں اُن کی دلچسپی اور رجحان کچھ زیادہ ہی ہے۔ غزلوں اور نظموں پر مشتمل زیرِ تبصرہ مجموعۂ کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ انہیں زندگی کے ہر دور میں مصائب و آلام سے واسطہ پڑا ہے، لہٰذا ان کی شاعری میں لطیف افسردگی کا عنصر غالب ہے اور

انہوں نے واردات قلب و نظر کو ہی زیادہ تر نظم کیا ہے۔

عابدی صاحب کے اس شعری مجموعے میں غم جاناں اور غم دوراں کی تصویر کشی کی گئی ہے اور ان کے بعض اشعار تو بے ساختہ اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں مثلاً

کیا غم جو اُلجھے ہیں زمانے کے حوادث
کچھ زیست بھی گرتی ہوئی دیوار نہیں ہے

تم دہر کی تاریک فضا سے ہو ہراساں
تاروں کے لئے ظلمت شب کچھ بھی نہیں ہے

قدرت مجھے ہر دور میں دہراتی رہی ہے
تاریخ کی تکرار ہوں افسانہ نہیں ہوں

بازگشت

مرتبہ: ڈاکٹر نریش

قیمت: سات روپے   صفحات: ۹۶

ناشر: اُردو پریشد ۳۳۶۸ سیکٹر ۱۵ ڈی چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۷

بازگشت اُن شعراء کے منتخب کلام پر مشتمل ہے جو آج چنڈی گڑھ میں مقیم ہیں یا کبھی وہ اس نئے آباد شہر سے وابستہ رہے تھے۔ اس مجموعہ میں ہری چند اختر، منوہر سہائے انور، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، گنگا دھر نسیم رنگی پٹیالوی، بی ایس کنول، تاجور ہرگوبند پوری، سوشیل رتن چرپڑہ۔ شاہد انبالوی۔ سریندر سنگھ ماہی۔ ایس راج رحمٰن اور خود مرتب ڈاکٹر نریش کا کلام شامل ہے۔ لیکن منوہر سہائے انور کے چنڈی گڑھ میں مقیم ہونے کے بارے میں نریش صاحب نے جو تحریر کیا ہے کہ وہ ملازمت کے سلسلے میں ۴۵ تک یہیں مقیم رہے، اس میں وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہوگئے ہیں کیونکہ وہ ان دنوں دہلی میں پنجاب یونیورسٹی کے کیمپ کالج کے شعبۂ فارسی کے صدر تھے۔

مرتب کا یہ اقدام قابلِ تحسین ہے۔ کہ انہوں نے چنڈی گڑھ سے وابستہ شعراء کا مجموعہ کلام شائع کیا۔ اس مجموعہ میں اُردو کے بعض بزرگ شعراء کا کلام شامل ہے انتخاب سلیقے سے کیا گیا ہے جس کے لئے مرتب لائق مبارک ہیں۔

ہماری زندگی

محمد شفیع الدین نیّر

قیمت: دو روپے   صفحات: ۱۸۰

ناشر: نیر کتاب گھر۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

اُردو میں بچوں کے ادب کی ہمیشہ کمی محسوس ہوتی رہی ہے۔ ایک تو بچوں کے لئے لکھنا مشکل کام ہے دوسرے اسے بڑا غیر اہم اور کمتر کام بھی سمجھا گیا یہی وجہ ہے کہ اُردو میں بچوں کے ادیب و شاعر انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔

نیّر صاحب اُن ممتاز ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو بچوں میں کے ادب کے لئے وقف کر دیا ہے آپ بچوں کے لئے سیدھی سادی اور آسان زبان استعمال کرتے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں اُن افراد سے متعلق نظمیں ہیں جو سماج کا ایک اہم حصہ ہیں یا ورچی بہشتی، مہتر، دھوبی، نائی، ڈاکیہ، کمہار، معمار بڑھئی، لوہار، سنار، ایسے متعدد مخصوص پیشے کے افراد پر انہوں نے نظمیں کہی ہیں اور الفاظ میں ان کی چلتی پھرتی تصویریں کھینچ دی ہیں جس سے اس پیشے اور اس سے متعلق خاص الفاظ سیکھنے کے ساتھ ساتھ اُردو زبان بھی سیکھنے میں مدد ملتی ہے۔

اُردو جاننے والے بچوں کے لئے یہ کتاب بڑی کارآمد ہے۔

نذرِ خسرو

مرتبہ: ایس ایس لانبہ

ناشر: ولا اکیڈمی حیدرآباد

قیمت: سات روپے   صفحات: ۱۵۹

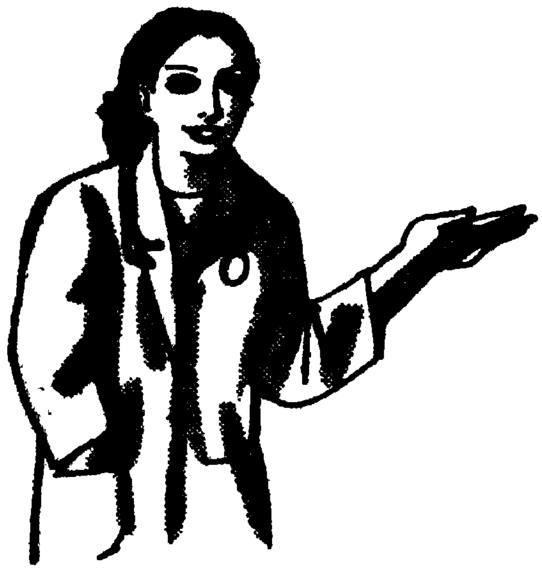
ملنے کا پتہ: کے ۱۲۳ کیرتی نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۱۵

امیر خسرو کی سات سو سالہ تقریبات کے موقع پر ملک میں امیر خسرو سے متعلق جو رسائل و کتب چھپیں زیرِ تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس میں مرتب نے امیر خسرو سے متعلق تقریباً پچاس اُردو اور فارسی شعراء کا کلام یکجا کر دیا ہے۔ اس مجموعے میں برصغیر کے مشہور و معروف شعراء تلوک چند محروم جمیل مظہری، ساغر نظامی۔ ماہر القادری، رئیس امروہوی، شمیم کرہانی، سلام مچھلی شہری وغیرہ کے علاوہ حضرت محبوب الٰہی حضرت بو علی شاہ قلندر، حافظ شیرازی، شیخ سعدی اور عرفی شیرازی کا فارسی میں منظوم خراج عقیدت بھی شامل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی امیر خسرو کے کچھ فارسی کلام کا اُردو ترجمہ بھی آخر میں درج ہے۔

کتابت و طباعت عمدہ اور سرورق دلکش اور جاذبِ نظر ہے۔ لیکن انتخاب کلام اور پروف ریڈنگ پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت تھی۔

یہ مجموعہ اس لحاظ سے مفید ہے کہ اس پر حضرت امیر خسرو سے متعلق تقریباً تمام اہم نظمیں جمع ہوگئی ہیں۔

(نند کشور وکرم)



حمل گرانا جائز ہے

کن حالتوں میں؟

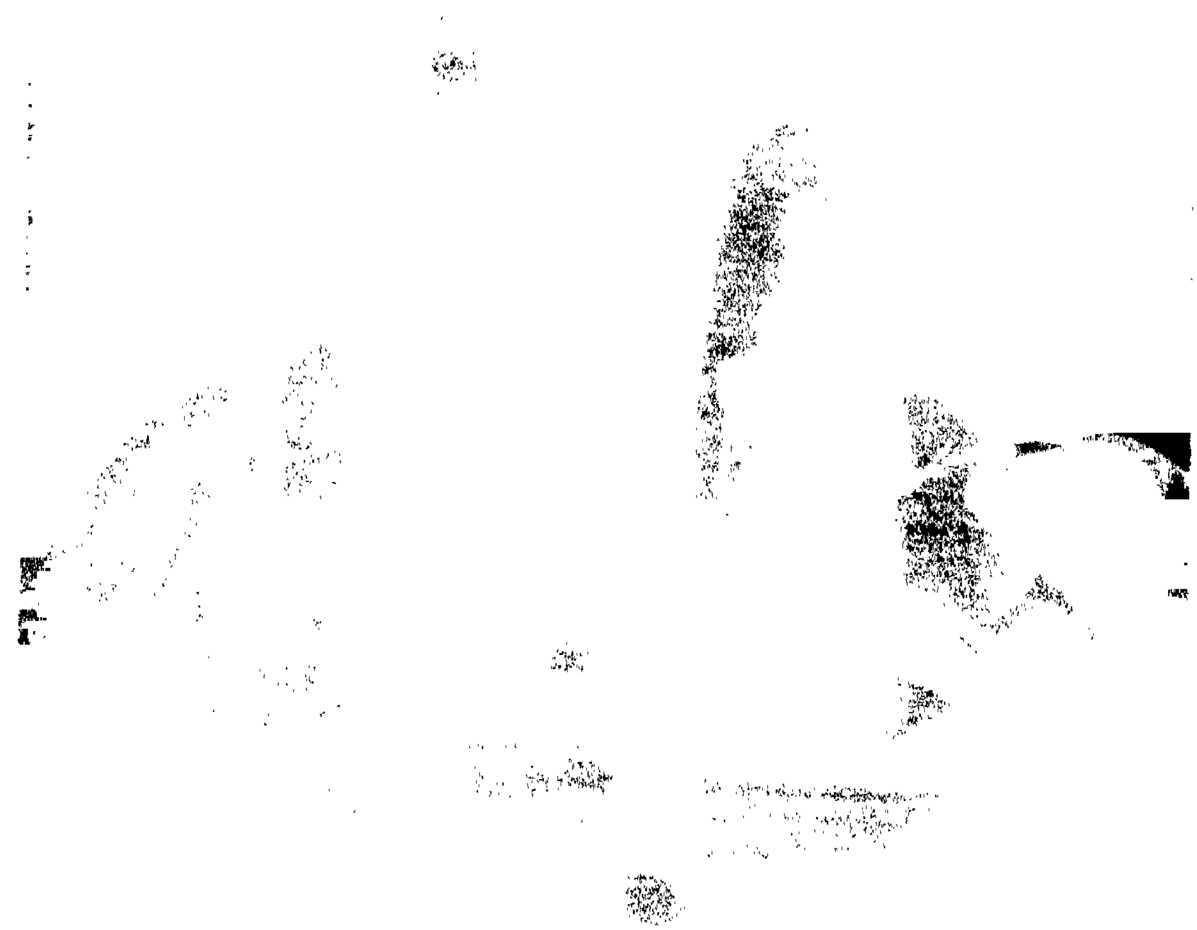
بعض اوقات حمل گرانا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔
جب حمل کا جاری رہنا عورت کی زندگی کے لئے
خطرہ بن جائے یا اس سے اس کی جسمانی یا ذہنی
صحت کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو،

جب اس بات کا خطرہ ہو کہ پیدا ہونے والے بچے کی
نشو و نما میں کوئی شدید جسمانی یا ذہنی نقص رہ جائیگا،
جب حمل عصمت دری کے نتیجے کے طور پر ہوا ہو،
جب معاشی و سماجی حالت دراصل ایسی ہو یا مستقبل
قریب میں ایسی حالت پیدا ہونے کا امکان ہو،
جس سے ماں کی صحت کو نقصان پہنچ سکتا ہو،
جب حمل روکنے کے کسی طریقے کے ناکامیاب
ہو جانے سے حمل ٹھہر گیا ہو،
پہلے بارہ ہفتوں میں حمل آسانی سے
گرایا جا سکتا ہے۔



davp 76/49

مُفت مشورے کے لئے نزدیک ترین سرکاری ہسپتال میں جائیں۔



روشنی تیز کرو تیز کرو

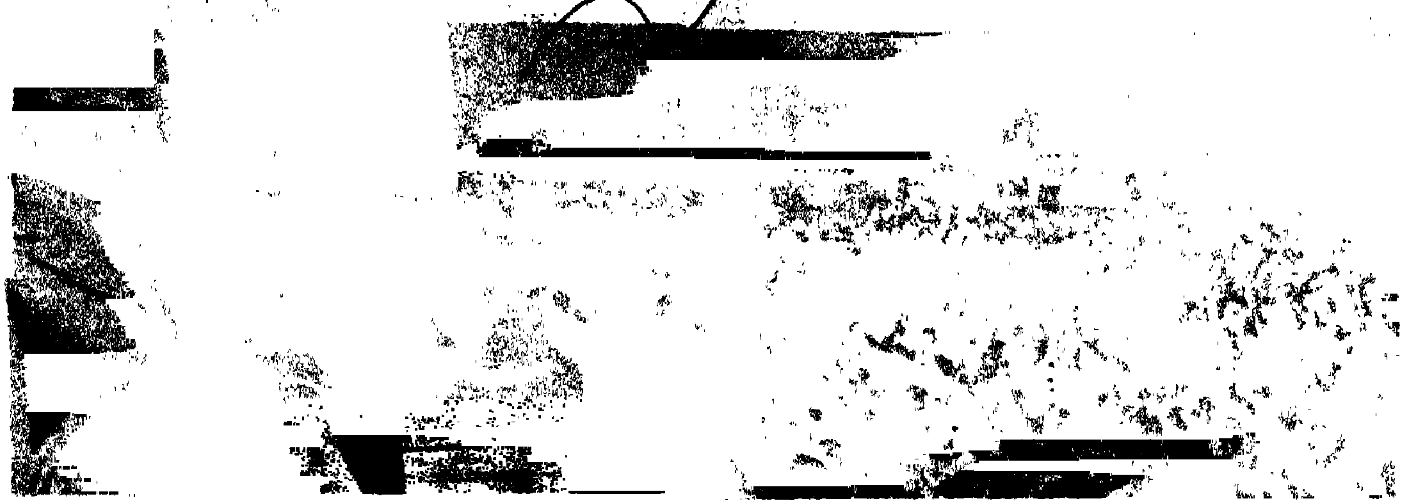
(متعلقہ مضمون صفحہ ۱۳ پر دیکھئے)

Vol.35 No.1 AJKAL(MONTHLY) August 1976

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001.
Printed by Skylark Printers, 11355, Id-gah Road, New Delhi-110055.

Regd. No. D(D)-103

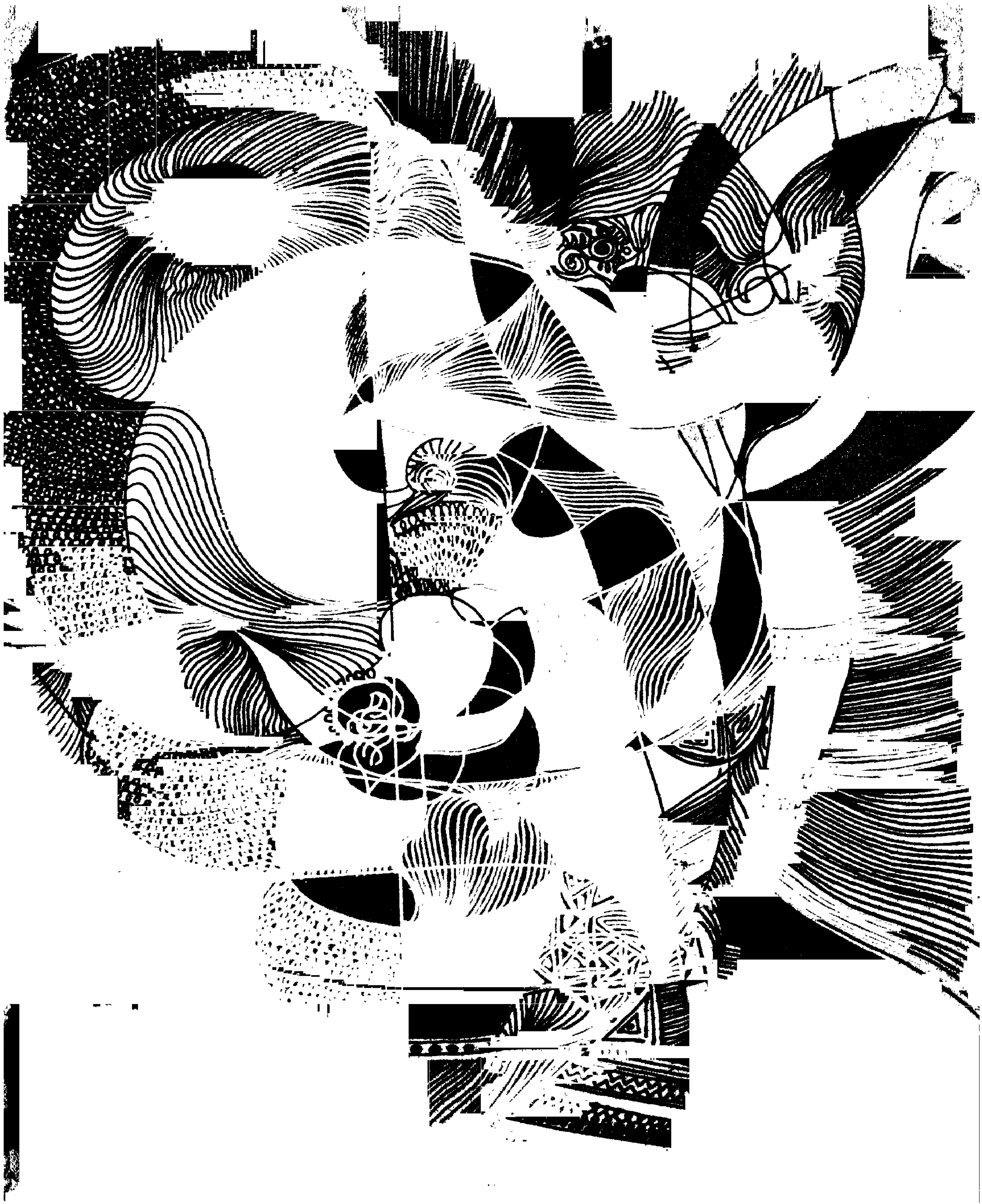
جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک اور افغانستان کا دورہ خیرسگالی



وزیراعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک کے دارالخلافہ برلن میں ۔۔ ہوائی اڈے پر ان کا شاندار استقبال



وزیراعظم ہند کا دورہ افغانستان ۴ جولائی ۱۹۷۶ء کو آپ صدر افغانستان
جناب محمد داؤد سے ملنے گئیں ۔





سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی بدولت ہی ملک آگے بڑھ سکتا ہے۔ اِن شعبوں میں ملک کو خود کفیل بنانے کے لئے متعدد اقدام کئے گئے ہیں
ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی چیزیں دریافت کی جائیں جو گاؤں والوں کے کام آئیں اور ان کے لئے آسانیاں پیدا کریں۔ اس قسم کی
جو چیزیں دریافت ہوئی ہیں، انہیں گاؤں میں رواج دیا جائے اور مقبول بنایا جائے۔
اس مقصد کے لئے نئی دہلی میں ۲۷ جولائی ۱۹۷۶ء کو ایک سمینار، مظاہرہ اور نمائش کا انعقاد کیا گیا۔
(تصویر میں) وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی افتتاح کے بعد نمائش دیکھ رہی ہیں۔

۲۹ جولائی ۱۹۷۶ء کو وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کلکتہ میں سائنس کے فروغ کے متعلق تنظیم کی صد سالہ یادگار عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔



آج کل

ایڈیٹر
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

سرورق : آر. سارنگن

جلد نمبر ۳۵ شمارہ نمبر ۲
ستمبر ۱۹۷۶ء
بھادرا آشون شک سمت ۱۸۹۸

فہرست

"ایمرجنسی ڈسپلن کا دور ہے" ونوبا بھاوے

شرحِ چندہ

سالانہ	دس روپیہ	۳ ڈالر	۱ پاؤنڈ
دوسالہ	۱۷ روپیہ	۵ ڈالر	۱.۷۰ پاؤنڈ
سہ سالہ	۲۴ روپیہ	۷ ڈالر	۲.۴۰ پاؤنڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	۳۰ سینٹ	۱۰ پنی

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آجکل ، منسٹری پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس ، نئی دہلی

ترسیلِ زر کا پتہ
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مُلاحظات

ناوابستہ ممالک کی چوتھی کانفرنس

کولمبو (سری لنکا) میں ناوابستہ ملکوں کے سربراہوں کی چوتھی کانفرنس ۱۶ سے ۱۹ اگست تک ہوئی۔ اس کانفرنس میں لگ بھگ ۸۰ ملکوں کے سربراہوں اور نمائندوں نے شرکت کی۔

ہندوستان کے وفد کی قیادت وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کی۔ اس وفد میں ان کے علاوہ وزیر خارجہ شری چوان وزیر اعظم کے خصوصی سفیر جناب محمد یونس اور وزارتِ خارجہ، وزارتِ مالیات اور وزارتِ تجارت کے اعلا افسران شامل تھے۔

ناوابستگی کا نظریہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کی پیداوار ہے یہ نظریہ بین الاقوامی معاملات میں سب سے زیادہ متحرک ثابت ہوا ہے ناوابستگی کی پالیسی کے اصول اور بنیادی اجزا اب سبھی جان گئے ہیں۔ طاقتوں کے گٹھ جوڑوں سے گریز اور عالمی واقعات کو ان کے حسن و قبح کے معیار پر پرکھنا ناوابستگی کی پالیسی کے بنیادی خط وخال ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ قومی آزادی کو بین الاقوامی شعبے میں توسیع دینے کا بھی ایک پروگرام ہے۔

بانڈونگ (انڈونیشیا) میں ۱۹۵۵ء میں جب افریقی ایشیائی کانفرنس منعقد ہوئی تو اس وقت مذکورہ کانفرنس میں شریک ہونے والے ملکوں میں ناوابستگی کا تصور کافی مقبول ہو چکا تھا۔

ناوابستگی کی تحریک نے یوروپ اور خصوصاً یوگوسلاویہ میں بھی مقبولیت حاصل کی۔ صدر ٹیٹو کی دو عالمی بلاکوں سے بچ کر نکل جانے کی پالیسی نے انہیں ناوابستگی کے تصور سے وابستہ کر دیا ———— ۱۹۵۶ء میں شری نہرو، صدر ناصر اور صدر ٹیٹو کی ایک کانفرنس بریونی میں ہوئی۔ ان رہنماؤں نے دنیا کو بتایا کہ امن دنیا کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہیں بلکہ آزادی کے دائرے کو وسیع کر کے اور ایک ملک کے دوسرے ملک پر تسلط کو ختم کر کے قائم کیا جا سکتا ہے۔

ناوابستگی کی تحریک سے وابستہ ہونے والے ملکوں کی تعداد میں جو بتدریج اضافہ ہوا ہے اس سے اس کی افادیت اور اثر آفرینی کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ تحریک تغیر پذیر عالمی صورت حال کے تقاضوں کو بھی پورا کر رہی ہے۔

۱۹۶۱ء میں بلغراد میں جب پہلی ناوابستہ کانفرنس منعقد ہوئی تو ۲۵ ملکوں نے اس میں شرکت کی۔

اکتوبر ۱۹۶۴ء میں قاہرہ میں دوسری عالمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں ۴۷ ممالک نے شرکت کی تھی۔

لوساکا میں ناوابستہ ممالک کی جب تیسری کانفرنس ہوئی تو اس کانفرنس میں کل ۵۴ ممالک شریک ہوئے تھے۔

اس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کہا تھا "آج کی دنیا خطرات کے باعث متحد ہے اور یہ خطرات محض نیوکلیائی تباہی سے نہیں بلکہ ہمارے ماحول میں روزانہ بڑھتی ہوئی کثافتوں سے بھی لاحق ہیں۔ اس طرح ہمیں خوشحالی اور جذبۂ انسانی کے نکھار اور اس کی ترویج و ترقی میں بھی متحد ہونا چاہیے۔ ناوابستہ ممالک کو آئندہ دنیا کی تشکیل اور زندگی کو مالا مال بنانے کی تحریک میں آگے آنا چاہیے۔"

الجیریا میں متحدہ ناوابستہ ممالک کی کانفرنس میں جس میں تمام ۷۵ رکن ممالک نے شرکت کی تھی، اس بات کی توثیق کی گئی کہ بڑی طاقتوں کے مابین صلح صفائی کا جو سلسلہ چل رہا ہے، اس کے پیش نظر یہ تحریک انتہائی موزوں اور مناسب ہے۔ شریمتی گاندھی نے "فعال ناوابستگی" کے لئے سرگرم عمل ہونے کی دعوت دی۔ انہوں نے کہا کہ ہم صرف اپنے اپنے ملک کے ذمہ دار نہیں بلکہ پورے عالم کے امن اور خوشحالی کے ذمہ دار ہیں۔ اس جذبے کے تحت ہمیں فعال ناوابستگی کے لئے از سر نو متحد ہونا چاہیے۔ الجیریا میں منعقدہ اس کانفرنس کا یہی پیغام ہونا چاہیے۔

ناوابستگی کی تحریک کی ابتدائی منزلوں میں بھی اس کے انتہائی ہمت افزا نتائج برآمد ہوئے۔ یہ ناوابستگی کا تصور ہی تھا جس کی بدولت ۱۹۵۴ء میں جنیوا معاہدہ عمل میں آیا اور انڈو چائنا میں جنگ کا خاتمہ ممکن ہوا۔ معاشی شعبے میں اس تحریک کی سب سے قابل ذکر کامیابی یہ ہے کہ اس کی بدولت اقوام متحدہ کی تجارت و ترقی سے متعلق کانفرنس وجود میں آئی۔

ناوابستہ ممالک کی اقتصادی پالیسی کا مقصد تجارت، صنعت اور دیگر شعبوں میں باہمی تعاون کو فروغ دینا اور عالمی سطح پر تجارتی مشکلات کا مل جل کر مقابلہ کرنا ہے۔

پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر:

۲۳ جولائی ۱۹۷۶ء کو مشہور رہنما اور محبِ وطن اور قومی لیڈر تلک کی ۱۲۰ ویں سالگرہ منائی گئی۔ اس موقع پر ملک کے ممتاز رہنماؤں نے انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

تلک ہماری جنگ آزادی کے اُن نامور قائدین میں سے تھے جنہوں نے کانگریس کو اعتدال پسند گروپ کے اثر سے نکال کر آزادی و انقلاب کی راہ پر ڈالا۔ یہی وہ عظیم رہنما تھے جنہوں نے ملک کو "آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے" کا ملک گیر اور انقلاب آفریں نعرہ دیا جس کی بازگشت سارے ہندوستان میں سنائی دینے لگی تھی۔

اسی طرح آج ہمارا نعرہ ہے "اقتصادی خوشحالی ہمارا پیدائشی حق ہے" ——— اور اسے عملی شکل دینے کے لئے ہماری وزیراعظم اَن تھک محنت کر رہی ہیں۔ ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم اپنے ملک کی تعمیر میں جُٹ جائیں۔

چندر شیکھر آزاد اور بٹکیشور دت ہماری جنگ آزادی کے ایسے عظیم انقلابی مجاہد تھے جنہیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔

کاکوری کیس کے ہیرو آزاد انقلابی نوجوانوں کے سربراہ اور روحِ رواں تھے۔ پولیس نے اُن کی گرفتاری کے لئے ہزاروں کا انعام رکھا تھا لیکن وہ زندگی بھر پولیس کے ہاتھ نہ آئے اور آخر پولیس کا مقابلہ کرتے ہوئے الہ آباد کے الفریڈ پارک میں شہید ہو گئے ——— بٹکیشور دت نے سردار بھگت کے ساتھ دہلی اسمبلی میں بم پھینکا تھا۔ اور دوسری انقلابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا تھا۔ لگ بھگ بیس برس قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد رہا ہوئے تھے۔

ان دونوں شہیدوں کی برسی ۲۳ رجولائی کو سارے ملک میں منائی گئی اور خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔

سائنسی مزاج کی ضرورت

ہمیں ملک اور سماج کو آگے بڑھانے کے لیے ایک ——— ایسا فکری انقلاب لانا ہے جو سائنسی اور معروضی ہو تاکہ صدیوں کی جہالت، پسماندگی اور غربت کی وجہ سے توہمات رسم اور رواج، اور ما فوق الفطرت باتوں پر اعتقاد نے ذہنوں پر جو دبیز پردے ڈال رکھے ہیں انہیں ہٹایا جا سکے۔

ضعیف الاعتقادی، جادو ٹونے اور ٹوٹکے پر ہمارے عقیدے کے مظاہرے آئے دن ہوتے ہیں۔ کوئی صاحبِ "کرامات" روپے یا زیور کو دگنا کرنے کے عمل میں جل دے جاتا ہے اور کوئی گود بھرنے کے "عمل" میں دامنِ عصمت کو تار تار کر دیتا ہے۔ ہسٹریا اور دوسرے امراض میں گرفتار عورتیں "آسیب زدہ" قرار دی جاتی ہیں اور اکثر صحیح علاج نہ ہونے کی وجہ سے سخت اذیتیں اُٹھاتی ہیں۔ نو تعمیر گھروں کے سامنے بدہیئت شکلیں لٹکائی جاتی ہیں اور بچوں کو کالے ٹیکے لگائے جاتے ہیں اور اکثر کام "شبھ گھڑی" دیکھ کر کئے جاتے ہیں۔ جب قوم ایسے خرافات میں کھو جاتی ہے تو اُس کا طرزِ عمل کچھ ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ انسان اپنے کو اشرف المخلوقات نہیں سمجھتا بلکہ وہ نہایت ڈرا اور سہما ہوا نظر آتا ہے جو ہر قسم کی طاقتوں سے خائف ہے۔

جن قوموں نے تسخیرِ کائنات کو اپنا مسلک قرار دیا ہے وہ چاند پر پہونچ چکی ہیں۔ ان کی تلاش اور کھوج نے انسان کی زندگی کو بہتر اور آرام دہ بنانے کے لیے ہزاروں کار آمد چیزیں دریافت کی ہیں اور وہ آج ہمارے مقابلے میں بہت آگے ہیں اور ہم سے بدرجہا بہتر زندگی گزار رہی ہیں۔ مگر ہم بھی ہمیشہ ایسے نہیں تھے۔

دورِ اولیٰ میں ہندوستانی سائنس دانوں اور ماہروں نے انسان کے فکری اِرتقا میں نہایت قابلِ قدر حصہ لیا تھا۔ اس وقت علم یا سائنس کی شاخیں اتنی واضح اور الگ الگ نہیں تھیں پھر ان کے سوچنے کا انداز بھی مختلف تھا۔ وہ پوری انسانی زندگی کو ایک اکائی سمجھتے تھے ان کی کد و کاوش کا مقصد یہ تھا کہ انسانی زندگی زیادہ بھرپور اور مکمل ہو۔ مابعد الطبیعاتی مسائل کو سلجھانے کے عمل میں وہ انسان اور اس کے ماحول سے بالکل الگ تھلگ نہیں ہو گئے تھے اور خدا اور بندے کے رشتے کی موشگافیوں میں مصروف ہو کر بندے کو بھلا نہیں بیٹھے تھے۔

ہڑپا اور موہنجوداڑو میں کھدائی سے جو کچھ ملا ہے وہ ایک ترقی یافتہ تہذیب کی نشان دہی کرتا ہے۔ ویدوں کے زمانے کے لوگ کھیتی باڑی کے کئی بہتر طریقوں سے واقف تھے اور ولیم روکس برگ کے مطابق وہ فصلوں کو ادل بدل کر بوتے تھے تاکہ زمین کی زرخیزی میں اضافہ ہو۔ یہ طریقہ یورپ میں بہت بعد کو رائج ہوا۔ اس کے علاوہ اس زمانے کے لوگوں نے علم ہندسہ، ہیئت و نجوم، دوا سازی، دھات سازی، رنگائی، خوشبویات اور پھولوں کی کاشت کے سلسلے میں بڑی مفید دریافتیں کی تھیں۔ وہ ابتدائی کسور سے واقف تھے۔ جیسے اردھ (½)، تری پد (⅓)، پڈ (¼)، سپھ (⅙)، گستھ (⅛)، اور کال (1/16)۔ جیومیٹری سے متعلق ان کا علم "سلب سُترا" سے ظاہر ہے۔ فلکیات میں وراہ میہر کی سوریہ سدھانت کو نہایت مستند اور معتبر سمجھا جاتا ہے۔

علاج معالجہ کے سلسلے میں ہندوستانیوں نے جو حیرت انگیز ترقی کی تھی اس کی دنیا معترف ہے۔ چرک سمہیتا میں جسم کے اندرونی اعضا کے علاج اور سشرت سمہیتا میں سرجری سے متعلق بیش قیمت معلومات درج ہیں۔

مٹکا بنانے، دھات کی چادریں تیار کرنے اور دھاتوں کو مختلف سانچوں میں ڈھالنے کا فن بھی قدیم ہندوستان میں عروج پر تھا۔ پورس نے سکندرِاعظم کو جو تحفے دیئے تھے (۳۲۶ ق-م) میں اس میں تیغ ہندی بھی شامل تھی۔ دہلی کے نزدیک جو لوہے کا ستون ہے وہ اس کا گواہ ہے کہ قدیم ہند میں یہ فن کتنا ترقی یافتہ تھا۔ سڑکیں بنانے، دو رویہ درخت لگانے، پانی کی نکاسی کے لیے نالیاں بنانے غرضیکہ ایک ترقی یافتہ سماج کے زیادہ تر لوازم اس وقت موجود تھے۔

پروفیسر میکڈانلڈ نے سنسکرت ادب کی تاریخ میں یورپ پر ہندوستان کے احسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے یہ سب سے بڑی حقیقت ہے کہ ہندوستان نے دنیا کو ہندسوں سے روشناس کرایا۔ کسری نظام میں اس کے جو فائدے ہوئے ہیں وہ صرف علم الحساب تک محدود نہیں رہے ہیں بلکہ تہذیب کو آگے بڑھانے میں محد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔

پٹھانوں، ترکوں اور مغلوں کے دور میں بھی فن تعمیر، سنگ تراشی دھات سازی، علم الادویہ، منطق، ہیئت اور نجوم کے بارے میں قابلِ قدر

ترقی ہوئی مگر رفتہ رفتہ جب معاشرہ زوال پذیر ہوا تو حال کی بجائے ماضی کے چرچے ہونے لگے اور تقلید رسوم پرستی اور ضعیف الاعتقادی نے معاشرے کے بڑے حصے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ غلامی نے ان جذبات کو مزید تقویت پہونچائی اور حریت فکر اور آزادیٔ خیال کے تازہ جھونکوں کے لیے سارے دروازے بند ہو گئے۔

بیسویں صدی کا آغاز ہوتے ہوتے فکر و عمل کی اِکا دُکا تازہ لہریں آنے لگیں۔ مغرب کے بڑھتے ہوئے اثرات کے ساتھ ساتھ نئی تعلیم اور سوچنے کا یا انداز بھی آیا ہے۔ اسکول اور کالج کھلے اور ساتھ ہی ذہنوں کے دریچے بھی۔ آزادی کے بعد اس عمل میں تیزی آئی اور جہاں تک سائنسی تعلیم کا تعلق ہے اس میں بہت اضافہ ہوا۔ مگر اس کے باوجود سائنسی ذہن اور مزاج عام نہیں ہوا ہے۔ اکثر تعلیم یافتہ افراد بھی ضعیف الاعتقادی کے حیرت انگیز مظاہرے کرتے ہیں۔

اب ابتدائی درجوں سے سائنس کی تعلیم دی جا رہی ہے نیشنل کاؤنسل آف ایجوکیشن اور ریسرچ نے ایسی درسی کتابیں مہیا کی ہیں جن میں بچوں کو ابتدائی کلاسوں میں ہی سائنس کی مبادیات سے واقف کرا دیا جاتا ہے۔

کالج اور یونی ورسٹی کی سطح پر یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن اور دوسرے ادارے ہر طرح کی امداد دے رہے ہیں۔

قصبوں اور گاؤں میں وگیان مندر کھولے جا رہے ہیں۔ جن کا مقصد دیہی آبادی میں سائنسی طریق کار (خصوصاً زرعی میدان میں) کو اپنانے پر زور دیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بھی مدد کی جا رہی ہے۔

سائنسی مزاج پیدا کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ رنگ و نسل کے تفرقے اور مذہب اور عقیدے کے جھگڑے بے معنی ہو جائیں۔ سائنسی رویہ اپنانے کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ توہم پرستی، چھوت چھات، گندگی اور جہالت کو دور کیا جا سکے۔

ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک میں سائنسی رویئے کو اپنانے کے سوا کوئی دوسرا چارہ بھی نہیں۔ اگر آج کی پیچیدہ اور تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں ہمیں زندہ رہنا ہے اور ایک سربلند قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو ہمیں سائنسی اور معروضی اندازِ نظر اپنانا ہی ہوگا۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے الفاظ میں "سائنس اور ٹکنالوجی کی بدولت ہمیں اعتماد حاصل ہوتا ہے اور ہم میں وہ تخلیقی جذبہ پیدا ہوتا ہے جو مسائل کے حل کی طرف لے جاتا ہے۔"

قیمتوں میں اِستحکام

ہندوستانی معیشت اب مستحکم بنیادوں پر کھڑی ہے۔ خوراک کی پیداوار کا اندازہ ۱۱ کروڑ ۶۰ لاکھ ٹن ہے۔ حکومت کے گوداموں میں ۱۲۰ لاکھ ٹن گیہوں، چاول اور دوسرے اناجوں کا ذخیرہ موجود ہے۔

صنعتی پیداوار میں بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ بجلی، کوئلہ، اسپات اور بھاری صنعتوں کی پیداوار اطمینان بخش ہے۔

بیرونی تجارت میں بھی غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ۱۹۷۶-۷۷ء کے پہلے دو مہینوں میں تجارت کا توازن ہمارے حق میں ہے اور ہم نے ۵۸۰ لاکھ روپے زیادہ کمائے ہیں۔ غیر ملکی زرِ مبادلہ کا ریزرو جون کے آخری ہفتے میں ۱۲۲۰۰ لاکھ تھا۔ غیر ملکی سیکورٹیوں اور سونے کے ریزرو کی قیمت اس کے علاوہ تھی۔

گزشتہ دنوں بعض ضروری اشیا کی قیمتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مگر حکومت ہند کے فوری اور بر وقت اِقدام سے نہ صرف مزید اضافہ رُک گیا بلکہ قیمتوں میں کمی آگئی۔ قیمتوں میں اس غیر مناسب اضافہ کا سبب یہ تھا کہ ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں نے مصنوعی قلت پیدا کرنے کے پرانے حربے کو پھر استعمال کیا تھا۔ مگر حکومت نے نہ صرف یہ کیا کہ چھاپے مار کر ناجائز ذخیروں کو برآمد کیا اور غیر سماجی عناصر کے خلاف سخت کارروائی کی بلکہ کمیاب اشیاء کی درآمد کی آسانیاں پیدا کیں تاکہ ملک کی پیداوار میں اضافہ ہو۔ زیادہ مقدار میں چینی بازار میں لانے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ تہواروں کے موقع پر پیدا ہونے والی زائد مانگ کو پورا کیا جا سکے۔ اِن کوششوں کے نتیجے میں ۱۷ جولائی ۷۶ء کو ختم ہونے والے ہفتے میں تھوک قیمتوں کا اشاریہ ۴ بھی گھٹا۔

اِس طرح قیمتوں میں اِستحکام پیدا کیا گیا ہے۔ حکومت صورتِ حال پر کڑی نگاہ رکھ رہی ہے۔ ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں کو اپنے ناپاک ارادوں میں کسی طرح کامیاب نہ ہونے دیا جائے گا۔

کنبہ بندی کی خصوصی مہم

کنبہ بندی کو قومی پالیسی کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے اور اب سبھی طبقے میں یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ خاندان کو محدود کیے بغیر معیارِ زندگی بلند نہیں ہو سکتا۔ کنبہ بندی کے مختلف طریقوں میں نر دم اور نسبندی کو جو کامیابی حاصل ہوئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوام پوری طرح حکومت کی پالیسی سے متفق ہیں۔ مختلف ریاستوں سے جو اعداد و شمار دستیاب ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً ہر جگہ مقرر کردہ نشانوں سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ مگر اس پروگرام کی ضرورت اور اہمیت کے پیشِ نظر وقتاً فوقتاً خصوصی مہم کا آغاز کیا جاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس کا فائدہ پہنچایا جا سکے۔ اِس مقصد کے تحت ستمبر ۱۹۷۶ء میں بنگال، اُتر پردیش اور آندھرا پردیش میں کنبہ بندی کی ایک خصوصی مہم جاری ہے جو نتائج کے اعتبار سے بے حد کامیاب ہوگی

آج کل نئی دہلی

محمد حسن
ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن، دہلی

اقبال

مذہب اور سائنس

انیسویں صدی میں اِنسان نے اِمکانات پر یقین کی شمع روشن کی ہشین نے عقل پر اعتماد کرنا سکھایا اور ہیومنزم کی وہ رو آئی جس نے انسان کے سر پر خالق کائنات کا تاج رکھ دیا دنیا اِس کے سامنے سربسجود تھی ہوا کی صاعقہ بر دوش راہوار کی باگ اس کی گرفت میں تھی اور زمین سے آسمان تک گویا اس کی نگاہِ التفات کے منتظر تھے۔ مساوات، سماجی انصاف اور عام خوش حالی کے خواب دیکھے گئے ایسا لگا کہ مسرّت نام کی رنگ برنگی تتلی اب انسانی عقل کی دو انگلیوں کی دسترس میں ہے مگر ان خوابوں نے پُرانے سماجی ڈھانچے کو للکارا سماجی انصاف مساوات اور خوش حالی عام ہوگی تو ترقی کے زینے پر اونچ نیچ باقی نہ رہے گی دولت کی تقسیم کا طریق کار بدلنا ہوگا اور دبے کچلے طبقے ابھر کر امارت و ثروت ہی کے نہیں تہذیب و شائستگی کے اجارہ داروں سے اپنا حق مانگیں گے گویا ارمانوں کا وہ طوفان آئے گا جسے اہلِ ثروت اور مفاد پرست طبقے کی زبان میں تراج بلکہ روزِ حشر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس روزِ حشر کا لرزہ بیسویں صدی پر طاری ہوا عقل کی جگہ تشکیک بلکہ عقل سے بیزاری نے لے لی انسان استدلال کے ہتھیار کو کند کر کے جنون اور جذبے کی امان میں جانے لگے۔ اور اب تک کے تہذیبی ڈھانچے کے توازن کو قایم رکھنے کے لئے اس نے ہمدردی، انسان دوستی اور عام خوش حالی کے بجائے قوت و جبروت میں پناہ لینے کی سوچی جو آگ اور خون کی قیمت پر ہی سہی مگر پرانے توازن کو قایم رکھ سکے۔

یہ بیسویں صدی وہ ہے جب صنعتی انقلاب اپنی برکتیں پھیلا رہا تھا بازاروں، منڈیوں اور خریداروں کی تلاش میں مشین اور ان کے مالک پسماندہ ممالک کو کھودے ڈال رہے تھے اور اقتصادی سامراج کی اس دوڑ میں محکوم نوآبادیوں کی تہذیب اِن کے علم و دانش، ان کے شعر و ادب کا رنگ و آہنگ لہجہ اور لے بدلے ڈال رہے تھے اور ان سب لوٹ مار کے بعد بھی اقتصادی بحران عفریت کی طرح ان کے پیچھے لگا ہوا تھا جو ان کے سینے پر سوار ہو کر انہیں ہر اس قدر کی نفی کرنے پر مجبور کر رہا تھا جس کی حمایت اور تحفظ کا انھوں نے بیڑہ اٹھایا تھا۔ جمہوریت کی بنیاد مساوات پر تھی مگر اب یہی جمہوریت نواز سفید فام اور سیاہ فام، یورپی اور غیر یورپی انسانوں کے درمیان امتیاز اور استبداد کی دیوار اٹھا رہے تھے۔ جمہوریت کی بنیاد آزادی پر تھی اور یہی جمہوریت کے قافلہ سالار کروڑوں انسانوں کو غلام بنانے کے ذمّے دار تھے۔ جمہوریت کی بنیاد سماجی انصاف اور پارلیمانی طریقِ حکومت پر تھی اور یہی جمہوریت کے علم بردار سماجی ناانصافی کو روا رکھنے اور پارلیمانی طریقِ حکومت سے روگردانی کرنے پر آمادہ تھے۔

گویا بیسویں صدی اس اژدہے کی مانند تھی جو اپنے بچوں کو کھا جاتا ہے ہر وہ لفظ، ہر وہ اعلیٰ تصور جو تہذیب نے پیدا کیا تھا آج اسی تہذیب کی زد میں تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال پہلی بار یورپ گئے اور فکر کے اس بحران سے فلسفہ اور شعر دونوں سطحوں پر دوچار تھے اقبال کے ردّ عمل کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک تفکر یورپ سے دوچار ہونے سے پہلے اقبال کے ذہنی اور تہذیبی پس منظر کو سمجھ لیا جائے۔ محکوم قومیں جب اپنے سے زیادہ ترقی یافتہ اقوام کی زیرنگیں ہوتی ہیں تو انہیں فوجی اور انتظامی استبداد ہی کا مقابلہ نہیں ہوتا بلکہ تہذیبی اور فکری سطح پر بھی انہیں زندگی اور موت کی لڑائی لڑنی ہوتی ہے ہر لمحہ حکمراں قوم انکے تمام آدرشوں اور اقتدار کو للکارتی ہے اور ان کے ماضی ہی نہیں حال کا بھی جواز طلب کرتی ہے ایسی صورتوں میں محکوم اقوام کے دانشوروں کا ایک طبقہ ضرور اپنے ماضی کے نہاں خانوں کی طرف لوٹتا ہے اور اپنی تہذیب کے ہیرے موتی چنتا ہے امتیازی خصوصیات تلاش کرتا ہے تاکہ ان کے بل پر وہ حکمراں قوم کے آگے سر اٹھا کر کھڑا ہو سکے اور احساس تفاخر قایم رکھ سکے۔

اقبال کے زمانے تک ہندوستان کے دانشوروں کا ایک طبقہ اس بحران میں مبتلا تھا اور ماضی کے انبار سے ہیرے موتی چن رہا تھا ہندوستان کی عظمت پارینہ کی جستجو میں سب سے زیادہ تابناک پہلو روحانیت کا تھا کہ مذہب کا سرچشمہ یہی سرزمین رہی ہے اس لئے اِقبال نے دوسرے متعدد مفکرین کی طرح مذہب کے پیرایۂ اظہار کو اپنایا۔ میرے نزدیک یہ بات اہم ہے کہ مذہب اِقبال کے لئے پیرایۂ اظہار ہے اقبال مذہبی شاعر نہیں ہیں مذہبی پیرایہ اظہار کے شاعر ہیں اس پیرائے میں انکے دور اور ان کی شخصیت میں اقدار و تصوّرات کے کشمکش ظاہر ہوتی ہے گو اس پورے عمل کو اقبال مذہب کے لب و لہجے میں ادا کرتے ہیں اسی وجہ سے اقبال مذہبی فکر کے سلسلے میں بھی تشکیل جدید [illegible] کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

محکوم اقوام کی انانیت مختلف روپ اختیار کرتی ہے اِن میں جغرافیائی تاریخی، مذہبی، لسانی اور دیگر قسم کے عصبیں بھی کارفرما ہوتی ہیں کہیں کہیں

معتدل ہوتا ہے کہیں انتہا پسندانہ۔ اقبال کے ہاں یہ سبھی روپ جابجا ملتے ہیں۔ اقبال نے وطن دوستی سے یہ سفر شروع کیا، جغرافیائی اور علاقائی وابستگیوں سے ہوتے ہوئے وہ تصوّراتی اور فکری سطح تک آئے جہاں فن کا سابقہ روحانیت اور مذہب سے تھا یہاں گرو نانک، رام تیرتھ، شری کرشن اور متعدد دوسرے ہندوستانی فلسفی اور پیشوا دامن گیر ہوئے پھر ان کی نظر مغربی ایشیا مشرقی یورپ اور افریقہ کی تاریخ پر بھی پڑی جہاں اسلام اور عیسائیت کے نام پر لڑی جانے والی مسیحی جنگوں کی وجہ سے میدانِ کارزار گرم رہا تھا۔ ان جنگ و جدل میں ظاہر ہے انکی ہمدردیاں صلیب کی جگہ ہلال کے ساتھ تھیں وجہ اس کی صرف مذہبی یگانگت نہ تھی بلکہ وہ نفسیاتی تسکین بھی تھی جو آج کے حکمراں اقوام کو ماضی کے آئینے میں پسپا ہوتے دیکھ کے میسّر آتی ہے۔ جس طرح عبدالحلیم شرر نے صلیبی جنگوں کے پس منظر میں ناول لکھ کر آج کی شکست کا بدلہ گزرے ہوئے کل کی رزم گاہوں میں لے لیا اسی طرح اقبال کی شاعری نے بھی عظمت پارینہ کے ان افسانوں میں سکون پایا ہوگا۔

اِس رزم گاہ کا ایک سبق اور بھی تھا کل کی یہ فاتح اور ترقی یافتہ قومیں آج ذلیل و خوار تھیں اتفاق یہ کہ اِن کو ذلیل و خوار کرنے والی طاقت ایک ہی تھی اِسی وجہ سے اقبال نے ایک طرف تو اِن تمام مفتوح اور محکوم اقوام کے درمیان یگانگت کا ایک رشتہ محسوس کیا اور اُردو میں یقیناً اور ہندوستانی ادبیات میں غالباً پہلی بار ایشیائی وحدت کا تصوّر پیش کیا دوسری طرف مغربی ایشیا کے ملکوں کی باہمی یگانگت نے انھیں اسلام کی طرف کھینچا جسے وہ ایک متحد کرنے والی قوت تصوّر کرنے لگے۔

ماضی کی صلیبی جنگوں اور حال کی مظلومی اور محکومی نے ایک سوال اقبال کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اقوام کے عروج و زوال کے اسباب کیا ہیں؟ کیا واقعی یہ سب کچھ اتفاقی ہے یا اس کے پیچھے عناصر اور ردعمل کا کوئی مخصوص نظام موجود ہے کیا اس کے پیچھے اسباب و علل کا کوئی سلسلہ ہے اس سوال کا جواب انھیں انسانی علم کے سبھی شعبوں کی مدد سے تلاش کرنا تھا اور فلسفی کی حیثیت سے ان تمام شعبوں کے جزوی اور فروعی اختلافات کے باوجود ان کی فکری وحدت سے نتیجے اخذ کرنا ان کی فکری ڈسپلن کا حصہ تھا۔

اِتفاق سے زمانہ وہ تھا جب سائنس اس سوال کا کسی قدر تسلّی بخش حل تلاش کر چکی تھی۔ ڈارون نے اپنے نظریۂ ارتقا کی بنیاد اسی سوال کے جواب پر قایم کی تھی نسل انسانی خود اسی ارتقا کا نتیجہ تھی اور یہ ارتقا اتفاقی نہ تھا بلکہ جہد للبقا کی زبردست کشمکش پر مبنی تھا۔ ڈارون نے مختلف حیاتیاتی سلسلوں میں سے بعض کے ارتقاء پانے اور بعض کے میٹ جانے کا راز میں تلاش کیا اور جہد للبقا کی بنیاد زندگی کی وہ تڑپ ہے جو بعض حیاتیاتی سلسلوں کو ماحول سے مطابقت اور تسخیر فطرت پر آمادہ کرتی ہے بعض حیاتیاتی سلسلوں میں اس تڑپ نے جگہ پائی اور بعض کے سینے میں یہ چنگاری بجھ گئی یا یہی تڑپ ارتقا کی امین اور راہبر بنی اور اس کا فقدان فنا اور موت کہلایا۔

جہد للبقا کا یہ نظریہ سائنس کے دوسرے نظریوں کی طرح مختلف نظام ہائے فکر کے ہاتھ میں پڑ گیا اور مختلف طبقوں نے اسے مختلف طریقوں سے برتا۔ زمانہ سامراج کا تھا جب ایک ملک کی صنعت منڈی، خام مواد اور سستی اُجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کی تلاش میں پسماندہ ملکوں پر قبضہ کرنے اور انہیں محکوم بنانے کی دوڑ میں لگے ہوئے تھے گویا سرمایہ داری یا صنعتی اجارہ داری کی لوٹ مار بقول لینن اپنے انتہائی اور آخری دور میں داخل ہو چکی تھی اسی لئے سرمایہ دارنہ نظام کے مفکروں کے ہاتھوں جہد للبقا کا اصول انواع کے بجائے اقوام پر بھی نافذ کیا جانے لگا گویا اس کا مطلب یہ نکلا کہ بڑی مچھلی کو چھوٹی مچھلیاں نگل لینے کی پوری آزادی ہے ؏

؏ ہے جُرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

آئینِ فطرت کے مُطابق کمزور اقوام فتح ہونے کے لئے ہیں اور طاقتور اقوام حکمرانی کے لئے۔ رہا افراد کا معاملہ تو عدم مداخلت یا آزادانہ مقابلہ کی میزان عدل گری ہے اور ہر روز جو زندہ رہنے کے اِس مقابلے میں دوسروں کو شکست دے کر اپنے وجود کا ثبوت فراہم کرتا ہے صرف وہی زندہ رہنے کا حق رکھتا ہے۔

سائنس کے ایک معنی اور بھی تھے جو انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے شروع میں جانے پہچانے گئے۔ تکنالوجی اور تکنالوجی صرف مشینوں اور کارخانوں کا نظام نہ تھا بلکہ ان سے پیدا ہونے والے مربوط اور مرتب نظامِ حیات کا نام تھا تکنالوجی صرف ایک مخصوص سماجی تنظیم کا مطالبہ نہیں کرتی بلکہ ایک مخصوص قسم کے معاشرے کو اور ایک مخصوص قسم کے ذہن اور شخصیت رکھنے والے افراد کو جنم دیتی ہے خاص طور پر اس وقت جب مشینوں اور کارخانوں کی طرح تکنالوجی کی باگ بھی بڑی حد تک منافع کے اصول پر کام کرنے والے اجارہ داروں کی ہاتھ میں ہو جن کے نزدیک سماجی ضرورت کے بجائے منافع خوری قدر اول کی حیثیت رکھتی ہو۔ ایسی حالت میں اجارہ داروں کے لئے صنعتی ترقی کی صرف ایک معنویت باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے منافع اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اِن صنعتی اداروں میں کام کرنے والوں کے لئے کام اپنی دلچسپی، اپنا احساس تفاخر، اپنا پندار کمال اور اپنی سماجی معنویت کھو کر محض وسیلۂ روزگار بن جاتا ہے جیسے جیسے یہ نظام بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے یہ بے دلی، بے نمکی اور بیزاری کا احساس کارخانوں میں کام کرنے والوں ہی کو نہیں بلکہ اس سماج کے ہر پیشے اور ہر صف کے لوگوں تک پھیلتا جاتا ہے۔ شاعر اپنے گیتوں کی ترسیل سے محروم ہوتا جاتا ہے دانش ور اپنے کو چھپائی کی مشین اور یونیورسٹیوں کے ڈگری بانٹنے والے ادارے کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے اور زندگی ہر قسم کے معنی سے خالی ہو جاتی ہے بے روح الفاظ ہر طرف بھٹکتے ہیں۔

اقبال کا یورپ اپنے افکار کے انھیں اندھیروں میں گم تھا۔ سرمائے کا اقتصادی نظام اپنا کابوس پیدا کر چکا تھا اور صنعتی ترقی اپنے تضادات میں اسیر

تھی۔ اقبال اس نئی صورت حال سے دوچار تھے مگر یہ فکری چیلنج ایشیا کے غلام ملک ہندوستان کے ایک مسلمان شاعر کو درپیش تھا جو فلسفی بھی تھا اور جو قوموں کے عروج اور زوال کا بھید معلوم کرنے کے لیئے ضمیر کائنات میں غوطہ زن تھا۔ اسی لیئے یورپ کے اس اقتصادی اور فکری بحران میں اس شاعر کو اپنے لیئے امید کی ایک کرن دکھائی دی شاید اس کا وطن، اس کا برِاعظم ایک بار پھر یورپ کے اندھیروں کو روشنی کی مشعل سے دور کر کے عالمی بالادستی حاصل کر لے، شاید ان سوالوں کا حل ایشیا کے پاس ہے جو یورپ کے ضمیر میں کانٹے کی طرح چبھ رہے ہیں مگر ایشیا کی تقدیس تھی تو روحانیت اور مذہب کے شعبوں میں لہذا اچانک ذہن انہی میدانوں کی طرف گیا لیکن اگر ان دونوں شعبوں میں اولیت سے ارتقار کی کلید مِل سکتی تو پھر ایشیا غلام ہی کیوں ہوتا اور اس کی پسماندگی ایسی عبرت ناک شکل کیوں اختیار کرتی لہذا ضرورت تو اس کی ہے کہ روحانیت اور مذہب کی تشکیل نو اس انداز سے ہو جو ان کے فرسودہ اور غلام بنانیوالے عناصر کو خارج کر دے اور ان میں اِرتقار کی تڑپ اور زندگی کی توانائی بھر دے۔

یہاں یہ عرض کرنے کی اِجازت دیجیئے کہ اِقبال اس مہم میں اکیلے نہ تھے اسی دور میں ایک طرف جمال الدین افغانی دوسری طرف آرد بند و گھوش اور رابندر ناتھ ٹیگور اپنے اپنے طریقے پر روحانیت اور مذہب کے مختلف عناصر کی تشکیل نو کر کے اِس میں اِرتقار کی نئی توانائی تلاش کر رہے تھے اقبال نے یہ کام اپنے ڈھنگ سے کیا اور اپنے فلسفیانہ ذہن سے سائنس اور مذہب کے درمیان ایک نیا توازن ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کی۔

ایک نئے توازن کی نوعیت سے بحث کرنے سے قبل اِقبال کی شخصیت کی طرف دوبارہ رجوع کرنا ضروری ہے۔ یورپ کے صنعتی اقتصادی اور فکری بحران سے جو فلسفی شاعر دوچار ہوا وہ کیسا فلسفی اور کیسا شاعر تھا۔ فلسفی کی حیثیت سے اس کا رِشتہ عینیت پسندوں سے بہت گہرا تھا اس کے ہاتھ میں خیال کا دامن تھا اور یہی خیال اور تصوّر اس کے نزدیک نت نئے روپ رنگ بدلتے تھے اور اِرتقار کی نئی نئی شکلیں اِختیار کرتے تھے۔ اِن میں سے تصوّر ایسا تھا جو ہر قسم کی جامع و مانع تعریف کی سرحدوں سے آگے نکل جاتا تھا اور ان تصوّرات کی مجرد اور مطلق شکلیں مابعدالطبیعاتی اور روحانی رنگ اختیار کر سکتی تھیں مادہ اگر کچھ تھا تو اِس کو اوّلیت اور برتری حاصل نہ تھی۔ صداقت تصوراتی تھی اور تصورات مادے کی ساری کائنات سجائے ہوئے تھے انہی تصورات کی بساط پر روحانیت اور مذہب سجائے جا سکتے تھے اور اقبال کا پورا ماضی انہی پردوں میں بول سکتا تھا۔

شاعر ایسا جس کے نزدیک شاعری کا لفظ شعور سے مشتق تھا اور شاعری کے ذریعے گویا صرف اپنی تفہیم ہی نہیں بلکہ کائنات کی تفہیم مقصود تھی اِن رازہائے سربستہ کی جستجو جو ضمیر کائنات میں چھپے ہوئے ہیں اور جن پر اسرار اصول و ضوابط کے ماتحت تاریخ کا سفر جاری رہا ہے شاعری ان کے نزدیک محض ان کی ذات کا سیاق و سباق نہ تھی اور ایک طرف پوری کائنات کے سرگم میں انسانی ذات کا اثبات تھی اور دوسری طرف دورِ عصر کی مکمل بصیرت اور دانش کا نہ صرف جزو بلکہ اس کی خالق اور صورت گر بھی تھی۔ شاعر کا کام محض اظہار نہ تھا بلکہ اپنے دور کی بصیرت میں تبدیلی پیدا کرنا تھا "مرا ذوقِ بصیرت عام کر دے" ان کی آرزو ہے "مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے" —— شاعری کا یہ لب و لہجہ اُردو شاعری میں سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک کی آواز بازگشت کے نام سے بھی پہچانی جاتی ہے جن کے زیر اثر شاعری سماجی اِصلاح اور نئی آگہی کا ذریعہ بن گئی لیکن حالی اور شبلی کے ہاں جو شعری آہنگ وکٹورین اصلاح پسندی کے راستے سے آیا تھا وہ اقبال کے ہاں تک پہنچتے پہنچتے رومانیت کے رنگ ہی سے نہیں رومانی سرمستی اور انانیت کی سرخوشی سے بھی ہو کر گزر چکا تھا۔

ہندوستان کے سیاق و سباق میں دیکھیئے تو پہلی جنگ عظیم کے بعد کے دور میں ایک عجیب و غریب قسم کی رومانی سرمستی اور انانیت کا رواج ہوا تھا۔ یہ وہ دور ہے جب سجاد حیدر، نیاز فتح پوری اور پریم چند کے افسانوں میں خلیق دہلوی اور رسالہ "نقاد" آگرہ کے مضامین میں، ادب لطیف کی نثر اور ابوالکلام آزاد کے خطبات میں انانیت کی لے اونچی اور رومانیت کا رنگ چوکھا تھا۔ سیاست کے میدان میں یہ دور گاندھی واد کے عروج کا تھا جس نے بھی مذہب روحانیت اور سائنس کا آمیزہ تیار کیا تھا بلکہ یوں کہیئے کہ سائنسی دور میں مذہب اور رومانیت میں سیاست کا پیوند لگانے کی کوشش کی تھی اور اجتماعی سیاست میں فرد کی اہمیت کی آواز بلند کی تھی۔ اتفاق سے یہی وہ دور ہے جب چورا چوری کی عوامی تحریک کے انقلابی رُخ اِختیار کرنے پر گاندھی جی نے گویا اِسے "اخلاقی" اسباب کی بنا پر واپس لے لیا۔ نوجوانوں کے ایک گروہ نے انارکزم اور دہشت پسندی کو اپنا شعار بنا لیا۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے فرد کو ایک عظیم الشان CATALYTIC AGENT (محرک قوت) کے رنگ میں دیکھا جو اپنے سے کہیں عظیم تر توانائی کی تحریکوں سے رکاوٹ کے بند کھول سکتا ہے اور ایک نئے سماج کو بنانے والی بے پناہ قوتوں کا در باز کر سکتا ہے۔

قصہ مختصر رومانی آہنگ نے فرد کو ایک نئے رُخ سے دیکھا اِسے خلاصہ کائنات کا خلعت پہنایا گیا اور وہی ہر قسم کے اِجتماعی شعور، اور عمل کا نقطۂ آغاز ٹھہرا۔ اب زور ہیئت اِجتماعی سے فرد پر منتقل ہونے لگا سماج کی اصلاح کا وسیلہ بھی فرد کی اِنفرادی زندگی کی اِصلاح ہی قرار پائی۔ اس پس منظر میں اِقبال کے مردِ کامل یا مردِ مومن کا جنم ہوا جس کا رِشتہ نطشے اور مولانا روم سے کہیں زیادہ اِس دور کے ہندوستان کی فکری جہت سے ہے۔ اِسی مردِ کامل کی پرچھائیاں پریم چند کے ناولوں میں ملتی ہیں خصوصاً "گوشۂ عافیت اور چوگان ہستی" کے کِرداروں میں جہاں ایک فرد کی آواز پورے سماج میں گونجتی سنائی دیتی ہے اسی مردِ کامل کی پرچھائیاں سرور

بھگت سنگھ کے ساتھ پھانسی پاتی ہیں اور دہشت پسندوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

اقبال کے مردِ کامل میں کئی نقادوں نے آمریت اور فاشزم کی نشانیاں دیکھی ہیں لیکن دراصل شاعرانہ سطح پر اقبال اس تصور کے ما تحت سائنس اور مذہب کا نیا توازن قایم کرتے ہیں۔ سائنس سے وہ متجسس ذہن ہمہ وقت بےقرار مضطرب وجود اور ایک سرتاپا عمل انسان کا تصور لیتے ہیں جو اِن کے نزدیک انسانی اِرتقاء کے لئے ناگزیر ہے۔

ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی وہ فلسفیانہ توجیہہ جیسے سامراجی دانشور سفید فام قوموں کے مقدس بوجھ اور پسماندہ اقوام کے استحصال کے جواز میں استعمال کر رہے تھے اسے اِقبال نے محکوم اقوام کے اندر حوصلہ اور تکمیل کا اَرمان پیدا کرنے کے لئے برتا۔ یہ حربہ محکوم ہندوستان میں محض دفاعی حربہ نہ تھا بلکہ محکوم ایشیائی قوموں کے اندر جذبہ خودداری اور احساس اَنانیت کو پیدا کرنے کا وسیلہ تھا جس نے پہلی بار محکوم قوم کے چہرے پر خود اعتمادی کا نور بکھیر دیا۔ قوت اور جبروت کا تذکرہ جب سامراجی اقوام کریں تو اس میں فاشزم کی کھنک ڈھونڈھ نکالنا بےجا نہیں لیکن جب مجبور اور محکوم قومیں اِن الفاظ کو استعمال کریں تو ان کا مفہوم سماجی اِنصاف اور جائز اِنسانی حقوق کے ذیل میں تلاش کرنا چاہیئے کیونکہ اِن کی مراد دوسرے پر قبضہ جمانا نہیں ہوتا بلکہ اپنے آپ کو دوسرے کے قبضے سے آزاد کرانا ہوتا ہے۔

سائنس سے اِقبال نے قوت اور توانائی، عمل اور جہدِ مسلسل کے معنی سیکھے لیکن یہ سبھی تصورات ضمیر سے بےنیاز تھے اِنھیں ضمیر فراہم کرنے کے لئے اقبال نے تہذیب کا سہارا لیا۔ خرد کی بےضمیری اِن کے لئے بھیانک تھی اس لئے اسے اَخلاق سے منوّر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ کہا جا سکتا ہے کہ اِقبال نے روحانیت کو رد کر کے مذہب کو اختیار کیا اور اس مذہب کا دائرہ بھی آخر محض اِسلام تک محدود ہو کر رہ گیا۔

روحانیت کا ماورائے مذہب یا فوق مذہبی تصور تصوف میں پنہاں تھا جسے اِقبال نے رد کر دیا (گو میکش آکبرآبادی کے نزدیک آخری عمر میں وہ پھر تصوف کی طرف مایل نظر آنے لگے تھے) تصوف کو رد کرنے کے اسباب کم و بیش وہی تھے جو تھیٹر اور مصوری کے رد کرنے کے تھے یعنی یہاں منصور کے پردے میں خدا بولتا ہے اور خود منصور کی شخصیت گم ہو جاتی ہے اور ہر وہ فن یا تصور جس میں شخصیت کی انفرادیت اور خودی کو گزند پہنچتی ہو اِقبال کو پسند نہیں۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اِقبال نے روحانیت کے مابعد الطبیعاتی تصور کو مذہب کے حق میں رد کر کے گویا مذہبی، ماورائیت پر سائنسی مرئی پن کی گرہ لگا دی اور عقیدے کو عمل کے دائرے میں اسیر کر لیا۔

مذہب رسوم و قیود سے عبارت تھا عمل، فرائض اور کارکردگی کا تصور رکھتا تھا تصوف سپردگی تھا تو مذہب ضابطہ بندی اور اقبال کو ضابطہ اور عمل، تصور اور سپردگی سے عزیز تر تھے مگر یہاں دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے اقبال کے لئے ایسا مذہب صرف اِسلام ہو سکتا تھا کیوں کہ اِسلام اور عیسائیت ہی دو ایسے مذاہب تھے جنھیں پیدائشی مسلمانوں اور عیسائیوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی قبول کر سکتے تھے باقی مذاہب میں تبدیل مذہب کر کے داخل ہونے کی گنجائش نہ تھی عیسائیت سیاسی اور تاریخی اسباب سے اِقبال کے لئے قابلِ قبول نہ تھی لہٰذا اِسلام ہی کے مذہبی پیرائے کو وہ اپنے لئے منتخب کر سکتے تھے دوسری بات یہ ہے کہ اقبال کا اِسلام روایتی تصور مذہب سے مختلف ہے یہی وجہ ہے کہ اِقبال کے کلام میں ملاؤں پر عرصۂ حیات تنگ نظر آتا ہے اِقبال اِسلام کو اپنا تصور بخشتے ہیں اور اپنے فکری اور فلسفیانہ دائرے میں اسلام کے تصورات کو سمجھتے ہیں۔ یہی کوشش ایک مختلف دور میں سرسید احمد خاں کی تھی اور چونکہ وہ دور برطانوی حکومت اور مغربی فکر کے اِستحکام کا دور تھا لہٰذا اجتہاد اور توجیہہ کی وہ کوشش انقلابی جہت سے محروم ہو کر ناکام رہی اِسی قسم کی کوشش گیتا کے سلسلہ میں تلک نے کی تھی اور گیتا کی ایک علمی کتاب کی حیثیت سے تجدید تلک کی اپنی کوششوں سے ہوئی۔ تلک کی گیتا روایتی گیتا سے مختلف تھی یہی کیفیت اِقبال کے تصورِ اِسلام کی ہے اقبال نے اپنی فکر کے ذریعے توجیہہ کر کے اِسلام کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق پیش کرنے کا ذریعہ بنایا ہے (سید سلیمان ندوی سے اِن کی خط و کتابت اور شبیر احمد خاں غوری کے مضامین کی روشنی میں روایتی تصور اور اقبال کے تصورِ اسلام کا فرق اور بھی واضح ہو گیا ہے)

اِس بحث سے قطع نظر اقبال بےضمیر سائنس (یا خرد) پر اخلاق اور مذہب (یا عشق) کی قدغن لگانا چاہتے ہیں کیونکہ اس قدغن کے بغیر قوت عمل بےلگام ہو سکتی ہے اور انسانی ترقی بےسمت و رفتار ہو کر گمرہی کا شکار بن سکتی ہے انسان کا سینہ آرزو کے نور سے منور نہ ہونا اِقبال کے نزدیک جرم ہے اِس سب سے بڑے جرم سے کچھ ہی کم جرم یہ ہے کہ اِس آرزومندی پر سماجی بہبودی اور اجتماعی فلاح کی حکمرانی نہ ہو۔ گویا فرد کی تکمیل اجتماعی آہنگ ہی کے ذریعے ممکن ہے اور اس کی بےراہ رویوں پر سماج کی بندش اور روح اجتماعی کی قدغن لازم ہے اس نِظام اقدار میں ابلیس سائنس ہے اور فرشتہ مذہب، اِقبال اِن دونوں کے آمیزے سے مردِ مومن یا مردِ کامل کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ فلسفی اقبال تصور پرست اور عینیت پسند تھا اور "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں" قسم کے متعدد مصرعے لکھنے کے باوجود عینیت پرست اقبال کی نظریں سطح کے نیچے ابھرتے ہوئے آج کے کمزور اور کل کے طاقتور عناصر کو پوری طرح نہیں دیکھ پائیں۔ اِس لئے اقبال لینن کو دیکھ سکے مگر اس نظام کو پوری طرح نہ پہچان سکے جو

اِجتماع کو بھیرو کی سی تابناکی عطا کرنے کا منصوبہ رکھتا تھا اقبال نے لینن کو بھی خدا کے حضور میں لے جا کر کھڑا کر دیا اور لینن کی زبان سے وہ بیان صفائی دلا دیا جو ایک طرح خود خالقِ کائنات کے خلاف فردِ جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ "مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات"۔ دنیا اس طرح ظالموں نے آپس میں بانٹ لی اور اس کرۂ ارض پر اب ترے ان گنت بندوں کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی۔ اس قسم کے شکوہ شکایت سے قطع نظر، اِقبال کی نظر "جھوٹی جمہوریت" کے صرف بورژوائی متبادل نظاموں ہی تک محدود رہی ان کی عینیت پسندی انہیں اِن تاریخی قوتوں تک نہ لے جا سکی جو صرف "دہریت اور لامذہبیت" یا اقتصادی خوش حالی کے لئے نہیں بلکہ ایک بہتر اور بلند تہذیبی اقدار کی تشکیل کے لئے برسرِ پیکار تھیں اسی لئے اس جھوٹی جمہوریت کے برخلاف جو یورپ میں مسلک دآئین بن چکی تھی اور نِظام اقدار کو مرتب کر رہی تھی اقبال صرف فاشزم اور اِسلامی جمہوریت ہی کو متبادل نِظام کی حیثیت سے دیکھتے رہے اور اشتراکی نظام سے ہمدردی کے باوجود اس کے تہذیبی منشور اور تعلقات کو انھوں نے گہرائی اور توجہ سے نہیں پرکھا کہ اس میں وہ اُمید پوشیدہ تھی جس کی تلاش وہ ماورائیت اور مذہب میں کر رہے تھے۔

اقبال نے امید، حوصلہ اور جستجو کی یہ ساری دنیا شاعری کے پردے پر آباد کی شاید اسے شاعری ہی کے پردے میں آباد کیا بھی جا سکتا تھا شاعری ہر حساس شاعر سے اِس کی زیست کا جواز طلب کرتی ہے اور کائنات میں اس کی (TERMS OF REFERENCE) (شرائط وجود) کے بارے میں پوچھ گچھ کرتی ہے۔ فلسفے کے علاوہ شاید فنونِ لطیفہ بالعموم اور شاعری بالخصوص اپنے کو ابدیت سے مخاطِب اور ہم کلام پاتی ہے عظیم اور اعلیٰ شاعری کی آواز اس کے وطن اور علاقے اِس کی زبان اور تہذیب حتیٰ کہ اس کے دور کی سرحدیں پار کرتی ہوئی اگلی نسلوں تک جا پہنچتی ہے اِس ابدیت کے پانے کے لئے شاعر اپنے عصری مسایل میں بھی اپنے تجربے اور اظہار سے آفاقیت اور عمومیت پیدا کرتا ہے اس کا بنیادی موضوع بقول عرفی وہ ذرہ ہے جو کائنات کے بے کران خلا میں عالمِ سرشاری میں رقص کر رہا ہے اور اپنی آستین پھیلانے بھر کی وسعت اور فراخی بھی نہیں پاتا۔ اقبال کی شاعری کا موضوع بھی یہی ذرہ ہے اسی لئے انکی شاعری کی امیجری صحراؤں، میدانوں، گلشن اور شاہراہوں سے عبارت ہے بزم اور انجمن کی سجی ہوئی امیجری نہیں یہاں انسانی حُسن سے زیادہ فطرت کا ELEMENTAL حُسن تشبیہات اور استعارے فراہم کرتا ہے اقبال شاید ہمارے پہلے شاعر ہیں جن کی شاعری انسانوں کے باہمی رشتوں کے بارے میں ہونے کے بجائے فطرت اور اِنسانوں کے باہمی رشتے کو معرضِ بحث میں لاتی ہے اِسی لئے اِقبال کی شاعری میں بڑے مسایل کی گونج ہے وہ کلاسیکی جہت ہے جو انسان کی فطرت سے نبرد آزمائی سے پیدا ہوتی ہے اِسی منزل پر تو "شب آفریدی چراغ آفریدم" کا آوازہ بلند ہو سکتا ہے یا "اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک"، کا ترانہ لب پہ آ سکتا ہے اور ہمت مردانہ کو یزداں پر کمند ڈالنے کا مشورہ دیا جا سکتا ہے۔

حسن نعیم

ڈی ۵۸/۷، ساؤتھ ایکسٹنشن، پارٹ ۱، نئی دہلی

غزل

ہر چند کم خیال ہے، آتش نفس تو ہے
ایوانِ لفظ و صوت کا روشن کلس تو ہے

پھوٹے گا ایک آگ سے شاید وہ گل کدہ
ہر سمت اس نواح میں انبارِ خس تو ہے

مجھ بے ہنر کے پاس نہ تنکے، نہ تخم تر
اُس با ہنر کے پاس بہارِ قفس تو ہے

آئیں گی جھوم جھوم کے ساون کی دیویاں
سورج کی اک نگاہ میں اتنی اُمس تو ہے

بے قافلہ ہے یاس کا صحرا حسن نعیم
اس آرزو کے دشت میں شورِ جرس تو ہے

★

فکر تونسوی
روزنامہ ملاپ نئی دہلی

ایک مصرع کا جشنِ اجرا

اور پھر یوں ہوا۔ کہ ایک دن جناب گوہر نامراد آبادی میرے پاس تشریف لائے۔ اور بولے

"فکر صاحب! کیا آپ میری خاطر ایک زحمت گوارا فرمائیں گے؟"

میں نے کہا: "اس ناچیز نے زندگی میں گوارا کرنے کے سوائے اور کیا ہی کیا ہے؟ —— فرمائیے!" ان کا لہجہ بالکل گداگروں ایسا تھا۔ حالانکہ وہ امپورٹڈ کار پر سوار ہو کر آئے تھے۔ اگر گداگر حضرات کار پر بھیک مانگنے نکلیں۔ تو خیرات دینے والے کی پوزیشن ذرا نازک ہو جاتی ہے — انھوں نے ایک دعوتی کارڈ میری طرف اس عاجزی سے بڑھایا جیسے وہ دعوتی کارڈ نہ ہو، کشکول ہو۔ حالانکہ اس کشکول پر سنہری حاشیہ لگا ہوا تھا۔ کہنے لگے: "آپ جانتے ہیں، ناچیز ایک شاعر ہے۔"

میں نے عرض کیا: "جناب! یہ تو میں جانتا تھا کہ آپ شاعر ہیں۔ لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ آپ شعر بھی کہتے ہیں۔"

"ہی ہی ہی! انھوں نے "ہی ہی ہی" یوں کہا۔ جیسے میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہوں۔ مزاح نگار کی بڑی بجڑی یہ ہے کہ لوگ اُس کی ہر بات کو مذاق سمجھ کر ٹال دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ تم بہت ذہین ہو۔ تو وہ فوراً بھڑک اٹھی کہ آپ کو تو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے، بچے سن لیں گے تو کیا کہیں گے؟"

میں نے گوہر صاحب سے کہا: "جواباً ہی ہی ہی عرض ہے، اب آگے فرمائیے" انھیں میرے جواب پر شرمندہ ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن شرمندہ ہونے کا نادر موقع انھوں نے کھو دیا اور بولے: "میں اپنے ایک مصرع کا جشنِ اجرا کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے پوچھا: "مصرعِ طرح کا؟"

"جی نہیں۔ یہ مصرع خالص میری تخلیق ہے۔ مصرعِ طرح نہیں ہے۔"

"اوہ! میں سمجھا، شاید آپ یہ کہنا چاہتے تھے کہ میں مصرعِ طرح پر غزل کہنا چاہتا ہوں۔ مگر غلطی سے آپ غزل کو جشنِ اجرا کہے جا رہے ہیں، خیر، معاف کیجیے —— مگر آپ نے مصرعِ ثانی کیوں نہیں لکھا۔ کم از کم پورا شعر تو بن جاتا۔ میرے خیال میں آپ اس پر گرہ لگا ہی دیجیے، کم از کم ایک شعر کا تو جشنِ اجرا منائیے۔"

وہ آہ بھر کر (یہ آہ سرد تھی) بولے: "فکر صاحب! آپ تو جانتے ہی ہیں، شاعری ایک ریاضت ہے۔ میں نے بھی بہت ریاضت کی۔ مگر ایک مصرع سے بات آگے بڑھی ہی نہیں۔ گرہ لگ ہی نہیں سکی۔ اس لیے میں نے سوچا، فی الحال ایک مصرع کا ہی جشنِ اجرا منا لیا جائے۔"

میں ان کی مجبوری سمجھ گیا۔ اس لیے کہا: "کوئی ہرج نہیں جناب! دو چار برس بعد جب گرہ لگ جائے تو گرہ کا جشنِ اجرا الگ سے منا لیجیے گا۔ ویسے گوہر صاحب! آپ کی حالت بھی میر تقی میر سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔"

"بجا فرمایا.... مگر کیسے؟"

میں نے کہا: "کیونکہ شعر کہنا کوئی آسان کام نہیں۔ میر نے بھی بالکل آپ ہی کی طرح اعتراف کیا تھا کہ ؎

خشک سیروں تنِ شاعر میں لہو ہوتا ہے
جب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

میں نے دیکھا، کہ وہ میر کی اس تصدیق پر کافی مطمئن ہو گئے تھے۔ بولے، "تو پھر کیا ارشاد ہے میرے بارے میں؟"

میں نے کہا، "آپ بالکل میر تقی میر لگتے ہیں۔"

وہ بولے، "آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا: "شرمندگی آپ سامعین پر چھوڑ دیجیے۔ یہ فرمائیے، مجھے کیا کرنا ہے؟"

کہنے لگے "آپ میرے مصرع کے جشنِ اجرا کی صدارت قبول فرمائیے۔"

اس مرتبہ شرمندہ ہونے کی باری میری تھی۔ لیکن میں نے بھی یہ نادر موقع کھو دیا۔ مصرع کا جشنِ اجرا میرے لیے ایک نیا انکشاف تھا۔ معلوم ہوتا تھا میری ادبی معلومات ناقص تھیں یا . . . . یا پھر امپورٹڈ کار کے خوف سے میں انھیں شاعر تو کہہ سکتا تھا۔ لیکن وہ مجھ سے مصرع کے جشنِ اجرا کی صدارت بھی کروانا چاہتے تھے۔ اور مجھے یوں لگا جیسے کوئی کہہ رہا ہو: "فکر صاحب! میں نے لکڑیوں کا ایک ٹال عرض کیا ہے۔ کیا آپ اس پر داد دیں گے؟"

میں نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ "میں حاضر ہو جاؤں گا۔ لیکن بہتر یہ تھا کہ آپ حضرت مجور دہلوی کو صدارت کے لیے مدعو کرتے۔"

وہ بولے: "انھیں فالج ہو گیا ہے۔"

"اور مجھے اس صدارت کے بعد ہو جائے گا۔" میں نے دل میں ہی کہہ دیا۔ زبان

پر یہ فقرہ اس لیے نہیں لایا۔ کیونکہ جب سے گُڑ کے بیوپاری اپنے آپ کو شاعر کہنے لگے تھے، میں نے سچی باتیں کہنا اگلے جنم پر ملتوی کر دی تھیں۔ اور پھر ویسے بھی گوہر صاحب نے ایک مرتبہ مجھے ایک بلیک مارکیٹیے سے سیمنٹ کی ایک بوری کنٹرول ریٹ پر لے کر دی تھی۔ اور یہ پورے ادب عالیہ پر بھاری تھی ——— لہٰذا میں نے صدارت کے لیے حامی بھر لی۔

یہ اُس زمانے کا ذکر ہے، جب شعر و ادب پر کرائسس آ رہا تھا۔ لوگوں نے کتابیں خریدنے کے بجائے نکٹائیاں اور جرابیں خریدنا شروع کر دی تھیں۔ اور یوں بھی اگر نکٹائیاں اور جرابیں شوکیس میں رکھی ہوتیں تو دور سے کتابوں کے "ٹائیٹل پیج معلوم ہوتی تھیں۔

دراصل یہ شعر کا نہیں شو کا زمانہ تھا۔ جو چیز دنیا میں پیدا ہو جاتی، اُسے ثابت کرنے کے لیے شو کیے جاتے تھے۔ فلم شو، بیوٹی شو، فیشن شو، ڈوگ شو ——— حتّٰی کہ کسی کے گھر سوئے اتفاق سے ایک بے بی پیدا ہو جاتی تو بے بی شو کیے جاتے۔ یہ یقین دلانے کے لیے کہ اسے بے بی ہی سمجھا جائے، بلّی یا لومڑی نہ سمجھا جائے۔

ان کی دیکھا دیکھی شاعروں اور ادیبوں نے بھی "بک شو" کرنا شروع کر دیے کیونکہ وہ سوسائٹی کے ثقافتی رہنما سمجھے جاتے تھے، سوسائٹی سے پیچھے کیوں رہتے اور اس بک شو کو جشنِ اجرا کا نام دیا جاتا۔ جونہی کسی ادیب کے بطن سے کوئی کتاب پیدا ہوتی اس کا فوراً جشنِ اجرا کر ڈالتے ——— بلکہ کئی ادیب تو کتاب پیدا بھی نہیں کرتے تھے، صرف چھپوا دیتے اور جشنِ اجرا منا ڈالتے۔

چنانچہ جب گوہر نامرادآبادی نے دیکھا کہ ادب کی امت پر عجب وقت آن پڑا ہے تو انھوں نے اس عجب وقت کو اپنے لیے غنیمت سمجھا۔ انھیں ذرا جلدی تھی۔ ریاضت شاقہ سے وہ ایک مصرع ہی کہہ سکے تھے۔ جب وہ ایک مصرع پر گرہ لگا کر شعر تک پورا نہیں کر سکتے تھے تو دیوان کے مکمل ہونے کا انتظار کہاں تک کرتے۔ انھیں تو اس کے لیے صدیاں چاہئیں تھیں۔ اور پھر انھیں یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر جشنِ اجرا کا یہ نظام کہیں جلدی زوال پذیر ہو گیا۔ تو انھیں تاریخ ادب میں کوئی شاعر ہی تسلیم نہیں کرے گا۔ لہٰذا اسی مصرع کا جشنِ اجرا ہی کیوں نہ منا لیا جائے، اور ویسے بھی اہلِ کتاب اور اہلِ مصرع میں صرف اتنا ہی فرق ہوتا ہے جو روپے اور ریزگاری میں ہوتا ہے۔

———

وعدۂ صدارت کے بعد دو چار دن گذر گئے، تو اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر مجھے صدارت کرنی ہے، تو مصرع کے مصنف سے متعلق کچھ معلومات حاصل کر لینی چاہئیں تاکہ صدارتی تقریر کے کام آ سکیں۔ صدارتی تقریر میں جھوٹ بولنے کی گنجائش تو کافی ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس میں تھوڑے بہت سچ کی ملاوٹ بھی کر دی جائے تو یہ ادب پر احسان ہوگا۔

صاحبِ مصرع کے متعلق میری معلومات صرف ان کے تخلص تک محدود تھیں اور یہ معلومات ناقص تھیں بلکہ سرے سے تخلص ہی ناقص تھا ———

گوہر نامرادآبادی؟ ہونہہ، جگر مرادآبادی کا ناقص چربہ۔

چنانچہ میں نے ان کے ایک قریبی دوست سے رابطہ قائم کیا۔ اور پوچھا "گوہر صاحب کی کوالی فکیشن کیا ہے؟"

وہ بولے "تین کوٹھیاں، چار فیکٹریاں اور پانچ بل ڈاگ"

"کوئی معقول کوالی فکیشن بتائیے"

"ان کی نیم ولایتی بیوی پورا راک اینڈ رول ڈانس کر سکتی ہے"

"ایک آدھ معقولیت اور؟"

"ایک طوطا فرانس سے منگوایا ہے، جو اُن کے مصرع کو فرنچ میں گا کر سنا سکتا ہے"

صدارتی تقریر کے لیے یہ معلومات کافی تھیں۔ مزید معلومات گوہر صاحب نے ٹیلی فون پر بتا دیں، کہ:-

۱۔ ٹیلی فون ڈائرکٹری سامنے رکھ کر ہر تیسرے آدمی کو دعوت نامہ بھجوا دیا گیا ہے۔

۲۔ میرا مصرع ایک لیڈر صاحب ریلیز کریں گے۔

۳۔ لیڈر صاحب وعدہ ایفا نہ کر سکے، تو ایک سیکنڈ ہینڈ لیڈر نے بھی وعدہ کر لیا ہے۔

میں نے انھیں بتایا کہ لیڈر اور سیکنڈ ہینڈ لیڈر میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ کیونکہ لیڈر ر۔۔۔۔۔۔۔، ایک ہی قسم کی تقریر کرتا ہے۔ چاہے ڈبل روٹی کا افتتاح کرے چاہے کتاب کا ——— یہ لیڈر حضرات بڑے دوراندیش ہوتے ہیں۔ حاضرین کو احساس ہی نہیں ہونے دیتے کہ وہ کونسی چیز ریلیز کر رہے ہیں، ڈبل روٹی یا مصرع ———؟

اور اس کے علاوہ گوہر صاحب نے مجھے اس مصرع کی ایک مطبوعہ نقل بھی عطا کر دی۔ مصرع فل اسکیپ سائز کے آرٹ پیپر پر چھپا ہوا تھا۔ آرٹ پیپر کے چاروں طرف ایک انچ رنگا حاشیہ لگایا گیا تھا، جیسے لال قلعہ کی دیواروں پر ہوتا ہے۔

"یہ مصرع تو بالکل لال قلعہ معلوم ہوتا ہے" میں نے تعریف کی

وہ چُپ رہے۔

"اور آپ شاعری کے شاہجہان بادشاہ ہیں"

وہ چُپ رہے۔

"میں اس لال قلعہ کے اجرا کے لیے ضرور حاضر ہو جاؤں گا"

———

جشنِ اجرا اُن کی قرمزی کوٹھی پر تھا۔ جس کے مین گیٹ پر ایک شیر ببر کا مجسمہ مُنہ میں بانسری بجا رہا تھا۔ کوٹھی کو طرح طرح کے ماٹوز، جھنڈیوں اور پھولوں سے یوں آراستہ کیا گیا تھا، جیسے وہ جشنِ اجرا نہ کر رہے ہوں بلکہ اپنے بیٹے کی شادی کر رہے ہوں ——— میں بطور کیننگی پندرہ منٹ دیر سے پہنچا کیونکہ صدر اگر وقت پر پہونچ جائے تو اسے صدر ہی نہیں مانا جاتا، لیکن وہاں جا کر معلوم

ہوا کہ مدعوئین بھی ابھی نہیں پہنچے۔ وہ صدر سے بھی گئے نکلے۔

چند پیرسے مغل لباس زیب تن کیے، اٹن شن کھڑے تھے ——— کوٹھی کے برآمدے میں صاحب مصرع، سوفی صدی استادانہ اچکن لٹکائے ہوئے، تین چار قاتل کٹار قسم کی حسین خواتین کے ہمراہ استقبال کے لیے موجود تھے۔ اور یوں مسلسل ہنس رہے تھے، جیسے استقبالیہ مسکراہٹ کی ریہرسل کر رہے ہوں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ان میں سے گوہر صاحب کی بیگم کونسی تھیں۔ بظاہر تو مجھے سبھی ان کی بیویاں معلوم دے رہی تھیں۔ ان میں سے ہر حسینہ مصرع تر معلوم ہو رہی تھی۔ اور ان سے تو گوہر صاحب کی پوری غزل تیار ہو سکتی تھی۔

"سامعین کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا ———

"انھیں لانے کے لیے چاروں طرف گھوڑے دوڑا دیئے گئے ہیں" کسی نے جواب دیا۔

میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ تاکہ اطمینان سے ٹھنڈی آہیں بھر سکوں کبھی کبھی ٹھنڈی آہیں بھرتے بھرتے اکتا جاتا تو کنکھیوں سے ان تر مصرعوں کی طرف دیکھ لیتا ——— بَیرے شاید میرا دم غنیمت سمجھ کر باری باری میرے پاس آتے۔ مجھے حاضرین سمجھ کر باری باری ایک جام پیش کرتے اور میں باری باری سرِ انکار ہلا دیتا۔ حتیٰ کہ ایک بار ایک کافر ادا حسینہ میرے پاس سرِ تسلیم خم کرنے آئی، تو میں نے سرِ انکار ہلا دیا ———

غرض تضیع اوقات کے لیے میرے پاس کافی سامان تھا ——— ٹھنڈی آہیں، تر مصرعے، سرِ انکار، شیر کی بانسری، بَیروں کی مایوسی ———

اچانک گوہر صاحب نے آکر بتایا کہ لیڈر صاحب تشریف نہیں لا رہے ——— لیڈر صاحب نے وجہ نہیں بتائی۔ البتہ وہ اپنی اہلیہ محترمہ کو بھیج دیں گے (کیونکہ مستقبل قریب میں ان کے بھی لیڈر بننے کا امکان تھا)

آہستہ آہستہ سامعین کاروں پر نمودار ہونا شروع ہوئے، جو ادیب کم اور معززین زیادہ معلوم ہوتے تھے، وہ اپنی کاروں سے لیڈر کی طرح اترتے اور یوں لگتا تھا، جیسے مصرع کا نہیں، لیڈروں کا جشنِ اجرا ہونے والا ہے۔ وہ اپنے ساتھ پھولوں کے بڑے بڑے ہار بھی لائے تھے۔ لیکن جب بالآخر یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ نہ صرف لیڈر، بلکہ ان کی محترم مسز بھی اپنی کُتیا کے اچانک زکام کے باعث تشریف نہیں لا سکیں گی۔ تو کئی سامعین، کسی نہ کسی بہانے ہاروں سمیت کھسک گئے۔ البتہ دو چار حضرات اہلِ ذوق ثابت ہوئے اور انھوں نے بیگم گوہر نامراد آبادی کی ہی صراحی دار گردن میں ہار ڈال دیے اور لوٹ گئے۔

کچھ سامعین، کاروں کی بجائے اسکوٹروں اور بائیسکلوں پر تشریف لائے، وہ پھٹیچر لگنے کے باوجود ادیب لگتے تھے۔ انھوں نے صوفوں پر بیٹھتے ہی بیروں کو اشاروں سے بلایا اور وہسکی کا جشنِ اجرا شروع کر دیا۔

میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک واقعی ادیب سے پوچھا۔ "کیوں جناب! یہ حضرات کاروں کی بجائے بائیسکلوں پر کیوں تشریف لائے۔"

وہ بولے: "جیسے کئی مصرعے وزن سے خارج ہوتے ہیں۔ اسی طرح انھیں بھی وزن سے خارج سمجھیے۔" بہرکیف ہائی پاور کمیٹی کی ایک سرگوشیانہ میٹنگ کے بعد اعلان کیا گیا کہ لیڈر کی بجائے محفل کے چیف گیسٹ سردار ور بھاگیہ سنگھ جی چیرمین ور بھاگیہ ٹرانسپورٹ کمپنی ہوں گے۔ اور جشنِ اجرا کی کارروائی شروع کی جائے۔

چنانچہ ایجنڈا کی ترتیب یوں رکھی گئی:-

۱۔ سردار ور بھاگیہ سنگھ کا تعارف ——— کہ یہ بڑے سخن فہم ہیں۔ انھوں نے اپنی ڈائری میں اکیس[۲۱] شعر قلم بند کر رکھے ہیں (لہٰذا پھولوں کا ہار اور تالیاں)

۲۔ حاضرین میں سے ہر ایک کو آرٹ پیپر کا مصرع پیش کیا گیا (مسلسل تالیاں)

۳۔ مقررین حضرات باری باری اسٹیج پر آئیں، وہسکی کا پیگ بے شک ہمراہ لائیں اور اپنے حق میں تالیاں سنتے جائیں۔

۴۔ ان حضرات کے پیغامات پڑھ کر سنائے جائیں۔ جو زکام یا دردِ سر کے باعث تشریف نہیں لا سکے۔

اسٹیج سکریٹری نے اعلان کیا کہ اب جناب رونق علی رونق ——— رونق افروز ہوں اور گوہر صاحب کے متعلق اپنے خیالات کا حبا مع اظہار فرمائیں۔

جناب رونق نے مائکرو فون پر آکر فرمایا: "حضرات! المختصر یہ کہ ایسا مصرع مجھے تو ادب عالیہ میں کہیں دکھائی نہیں دیا۔ لہٰذا آداب عرض!"

وہ جانے لگے۔ تو سامعین میں سے ایک آواز آئی: "لیکن رونق صاحب! کل تو آپ فرما رہے تھے، کہ یہ مصرع ادب کے ساتھ ایک بھونڈا مذاق ہے!"

"آپ میری تقریر کا بھونڈا ترجمہ کر رہے ہیں!"

اس پر زوردار تالیاں بجائی گئیں۔ کچھ حضرات نے رونق صاحب کے حق میں اور کچھ نے ان کے خلاف بجائیں۔ صاحب صدر یعنی میں نے بھی تالی بجائی اور کافی دیر تک نہیں سمجھ سکا۔ کہ حق میں بجائی یا خلاف ——— اس وقت تک تمام دانش وروں کے معدے میں چار چار پیگ جا چکے تھے اور ہلکی ہلکی رنگ کو منٹری، حرکت، حرارت اور اس عالم میں ایک ادھیڑ عمر مقرر جناب تمکین بدنام پوری نے تقریر شروع کی۔ جس میں تقریر کم اور لڑکھڑاہٹ زیادہ تھی۔ وہ کہہ رہے تھے:-

"——— یہ مصرع؟ میں کہتا ہوں یہ مصرع ہے بھی اور نہیں بھی۔ یہ وجود اور لا وجود اور ہمہ وجود کا تضاد ان ستاروں کی پیچیدہ گہرائیوں میں سے نکلا ہے۔ جن میں بنی نوع انسان کی تہ دار لطافتیں اور کثافتیں ——— کثافتیں جو کائنات کے نصیب میں ہیں۔ صاحبِ صدر! نصیب گوہر، نصیب مصرع یا اس ازلی نغمے کا نصیب ———؟ ذرا داد دینا حضرات! اس تصورِ بے پایاں کی جو مصرع کی پیمبری شان اور عالم وجود کے مظہر ہیں ....."

ایک دانش ور نے دوسرے دانش ور سے کانا پھوسی کی۔۔۔ "زوردار تقریر معلوم ہوتی ہے" اس دوسرے دانش ور نے فوراً مائکروفون پکڑ لیا اور بولا "حضرات! کچھ لوگ اس تقریر پر رائے دے رہے ہیں، مگر جب تک تقریر سمجھ میں نہ آئے یہ فیصلہ نہیں کرنا چاہیے کہ تقریر زوردار ہے یا۔۔۔"

اسٹیج سکریٹری نے مائک چھین لیا "سوری! تقریر کرنے کی باری جناب رنگین کی نہیں ہے، جناب راتب کی ہے"

رنگین صاحب نے کہا "یہ میری توہین ہے"

ایک آواز آئی "توہین شایانِ شان معلوم ہوتی ہے"

اس پر تالیاں بجائی گئیں، اور جناب رنگین اپنے جام سمیت واک آؤٹ کر گئے۔

ان کے واک آؤٹ پر مزید تالیاں بجائی گئیں۔ اسٹیج سکریٹری صاحب ان کے تعاقب میں گئے، مگر خالی ہاتھ لوٹ آئے اور آتے ہی اعلان کیا "اب جناب راتب تشریف لائیں"

ایک بیرے نے اسٹیج سکریٹری کے کان میں آکر کہا۔ کہ جناب راتب برآمدے میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مسلسل مصرع پر مصرع باہر نکال رہے ہیں۔ چنانچہ اسٹیج سکریٹری نے جناب ریاض ثانی کو تقریر کے لیے بلایا۔ مگر اس سے پہلے جناب اضطراب اسٹیج پر چڑھ آئے۔ اور کہنے لگے "یہ مصرع وہ ہے، جسے پڑھ کر مجھے متلی آنے لگی ہے"

"آرڈر! آرڈر!" صاحبِ صدر نے مجبوراً اپنا حکم صادر کیا۔

"مگر میں پہلے بولوں گا" ایک اور صاحب دانش شہسواری نے مائک چھین کر کہا "کیونکہ مجھے اس سے پہلے متلی آرہی ہے"

دانش صاحب کی مجاہدانہ پیش قدمی پر تین چار اور دانش ور اسٹیج پر آگئے اور ایک دوسرے سے مائکروفون یوں چھیننے لگے۔ جیسے وہ مائکروفون نہ ہو، وہسکی کا پیگ ہو ــــــ اب محفل مصرع کی حدود سے نکل کر مائکروفون کی حدود میں داخل ہو گئی تھی۔ اسٹیج سکریٹری نے اپنی خودی اس حد تک بلند کی جس حد تک کر سکتے تھے اور اعلان کیا ــــــ "جشنِ اجرا کی محفل برخاست کی جاتی ہے"

سامعین شکر بجا لائے اور میز پر آراستہ مرغوں کی ٹانگوں پر ٹوٹ پڑے۔ اچانک صاحبِ صدر کو یاد آیا کہ مصرع ریلیز کرنے کی رسم تو ادا ہی نہیں کی گئی۔ چنانچہ انھوں نے ایک ہاتھ میں مرغے کی ٹانگ لے کر دوسرے ہاتھ سے مصرع کا کاغذ ریلیز کر دیا اور گوہر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ گوہر صاحب اتنے سرمست ہو رہے تھے کہ انھوں نے مصرع کی بجائے مرغے کی ٹانگ پکڑ لی، مصرع نیچے گر پڑا۔ اور یوں مصرع کی بجائے مرغے کی ٹانگ ریلیز ہو گئی۔

آخری اطلاع ــــــ

صبح جب گوہر صاحب نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ مصرع کے جو آرٹ پیپر والے کاغذ دانش وروں کی خدمت میں پیش کیے گئے تھے وہ سبھی فرش پر یوں بکھرے ہوئے تھے۔ جیسے سوڈا واٹر اور وہسکی کی بوتلوں کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ آرٹ پیپر کا مصرع کوئی بھی اپنے ساتھ نہیں لے گیا تھا۔ وہ انھیں سوڈا واٹر کی خالی بوتل سمجھ کر چھوڑ گئے تھے ــــــ

عبدالمجید شمس عظیم آبادی مجیدولا، پٹنہ ۶

نعرۂ انقلاب

پھر انقلاب کا نعرہ اُٹھے وطن کے لئے
نئی زمیں کے لئے اور نئے گگن کے لئے
نئی ہوں جراتیں مزدور اور دہقاں کی
نئی ہوں کاوشیں آرائشِ چمن کے لئے
چمن کو خون سے گر سینچنا نہیں آتا
چمن ہمارے لئے ہے نہ ہم چمن کے لئے
بنائیں کوثر و گنگا کا اک نیا سنگم
یہی پیام ہے اب شیخ و برہمن کے لئے
وطن کے دین کا بدلہ نہ دے سکیں گے کبھی
ہم اپنی جان بھی دے دیں اگر وطن کے لئے
حصولِ علم، شعورِ عمل، خلوصِ وطن
جنابِ شمس یہ عنواں ہوں فکر و فن کے لئے

منمتھ ناتھ گپت
ڈی ۱۴۔ نظام الدین ایسٹ نئی دہلی

مجاہدین آزادی

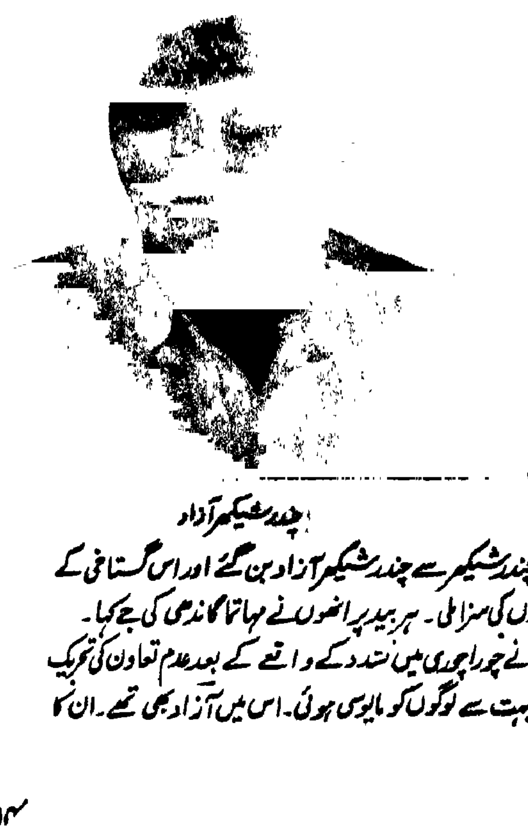
چندر شیکھر آزاد ۔ بٹکیشور دت

آزادی کی جنگ میں لاکھوں افراد نے حصہ لیا۔ نہ معلوم کتنے جیل گئے، سینکڑوں پھانسی پر لٹکائے گئے اور جہنم سے بدتر جگہ کالا پانی بھیجے گئے۔ ان سبھوں کی قربانی کی وجہ سے آج ملک آزاد ہوا ہے۔ ہندوستان ان تمام لوگوں کو یاد رکھے گا جنھوں نے وطن عزیز کی خاطر ہر طرح کی سختیاں جھیلیں۔ وہ لوگ تو خاص طور سے یاد رکھے جائیں گے جنھوں نے اپنی جانیں نچھاور کردیں۔ ان لوگوں میں چندر شیکھر آزاد سر فہرست ہیں۔

مشہور انقلابی چندر شیکھر کا جنم مدھیہ پردیش کے ایک انتہائی پسماندہ گاؤں بھاورا میں ایک بہت ہی غریب گھرانے میں ہوا۔ وہ سنسکرت پڑھنے کے لئے کاشی آئے اور جب ۱۹۲۱ میں گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک شروع کی تو وہ اس میں شامل ہوگئے مگر بعد میں انقلابی بن گئے اور آخرکار پولس سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

چندر شیکھر آزاد اس طرح بنے کہ گرفتاری کے بعد جب انھیں مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا تو اس نے پوچھا:

"تمہارا نام؟"
"آزاد"
"والد کا نام؟"
"آزادی"
"تمہارا گھر؟"
"جیل خانہ"



چندر شیکھر آزاد

اس طرح وہ چندر شیکھر سے چندر شیکھر آزاد بن گئے اور اس گستاخی کے لئے انھیں پندرہ بیدوں کی سزا ملی۔ ہر بید پر انھوں نے مہاتما گاندھی کی جے کہا۔

مہاتما گاندھی نے چوراچوری میں تشدد کے واقعے کے بعد عدم تعاون کی تحریک واپس لے لی جس سے بہت سے لوگوں کو مایوسی ہوئی۔ اس میں آزاد بھی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ آزادی اہنسا کے ذریعہ نہیں مل سکتی۔

اس طرح چندر شیکھر آزاد انقلابی بن گئے۔

بٹکیشور دت بھی لگ بھگ چندر شیکھر آزاد کے ہم عمر تھے۔ ان کی پیدائش غالباً نومبر ۱۹۰۸ میں ہوئی اور وہ کلکتہ میں کچھ کام سیکھ رہے تھے مگر ان کا رجحان بھی سیاسی تحریک کی جانب تھا جیسا کہ مظفر احمد نے لکھا ہے کہ کسی نے انھیں بتایا کہ ایک لڑکا ہے بنگالی مگر ہندی میں تقریر کرسکتا ہے۔ تب مظفر احمد نے انھیں اپنے پاس بلایا اور مزدوروں کی ہڑتال میں انھیں استعمال کرنے لگے۔ بٹکیشور کی سرگرمیوں کی آماجگاہ کانپور بن گیا۔ جب سردار بھگت سنگھ کانپور پہنچے تو پرانے انقلابی سریش بھٹاچاریہ نے ان کا تعارف بٹکیشور دت سے کرایا دونوں دوست بن گئے۔

کاکوری کے نزدیک انقلابیوں نے جو سرکاری خزانہ لوٹا تھا اس وقت بھی چندر شیکھر آزاد موجود تھے اور ان کی نگرانی کی وجہ سے ساری کاروائی ٹھیک طرح سے چلی تھی۔ رام پرشاد بسمل، اشفاق اللہ، روشن سنگھ اور راجندر لاہری کی طرح اس مقدمے میں انھیں بھی پھانسی کی سزا دی گئی تھی مگر آزاد پولس کے ہاتھ کب آنے والے تھے۔

۳۰ راکتوبر ۱۹۲۸ کو لاہور میں سائمن کمیشن آیا اور نوجوان بھارت سبھا نے لالہ لاجپت رائے کی رہنمائی میں اس کا بائیکاٹ کیا۔ نوجوان بھارت سبھا کے ممبران نے لالہ جی کو گھیر رکھا تھا اور ایک ایسی جگہ کھڑا کردیا تھا جو سائمن کے سرکاری جلوس کو روکتا تھا۔ لاٹھی چارج سے لالہ جی کو دھکا لگا اور اس کے نتیجہ میں تین ہفتے کے اندر یعنی ۱۷ر نومبر ۱۹۲۸ کو ان کا انتقال ہوگیا۔ چندر شیکھر اور بھگت سنگھ نے اسے قومی توہین سمجھا اور انھوں نے ۱۵ر دسمبر ۱۹۲۸ کو چار بجے سانڈرس نامی پولس سپرنٹنڈنٹ کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔ اگرچہ سانڈرس راج گورو کی گولی سے مرچکا تھا مگر بھگت سنگھ نے بھی اس پر گولی چلائی۔ جب چندر شیکھر آزاد نے دیکھا کہ چاروں طرف سے پولس والے گھیر رہے ہیں تب انھوں نے پستول سے ایک پولس والے (تھانیدار چنن سنگھ) کو گولی مار کر نوجوانوں کو بڑی کامیابی سے وہاں سے نکالا اور اڈے پر پہنچا دیا۔

بٹکیشور دت بھی انتظار کر رہے تھے کہ انھیں کوئی موقع ملے۔ یہ موقع انھیں ۸ر اپریل ۱۹۲۹ کو ملا۔ یہ طے ہوا کہ بھگت سنگھ اسمبلی میں بم پھینکیں گے۔ اس سلسلے میں بھگت سنگھ نے بٹکیشور دت کو اپنا ساتھی چنا حالانکہ راج گورو کی خواہش تھی کہ وہ اس مہم میں بھگت سنگھ کے ساتھی بنیں۔

بھگت سنگھ اور دت کی یہ ڈیوٹی تھی کہ جوں ہی وائسرائے سے خاص حقوق کے ذریعے بل کو منظور کرنے کی اطلاع دی جائے ویسے ہی بم پھینکے جائیں۔

جوں ہی جارج شسٹر نے مطلع کیا کہ دونوں بلوں کو وائسرائے نے اپنے خاص حقوق کا استعمال کرتے ہوئے منظور کرلیا ہے اسی وقت بھگت سنگھ اور دت کھڑے ہوگئے اور بھگت سنگھ نے آگے بڑھ کر شسٹر کے پیچھے بم پھینک دیا۔ زوروں کا دھماکہ ہوا پھر دت نے آگے بڑھ کر دوسرا بم پھینکا۔ سب لوگ ششدر رہ گئے اور بھگدڑ مچ گئی، جارج شسٹر ڈیسک کے نیچے چھپ گئے اور دوسرے لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے، لیکن وٹھل بھائی پٹیل، موتی لال نہرو،

محمد علی جناح اور مدن موہن مالویہ اپنی اپنی کرسیوں پر ڈٹے رہے۔

اگر بھگت سنگھ اور دت چاہتے تو بھاگ سکتے تھے مگر انھوں نے وہیں کھڑے کھڑے اپنے آپ کو گرفتار کرانے کا فیصلہ کیا لہٰذا وہ اپنا کام کرنے کے بعد چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔

بھگت سنگھ اور بٹکیشور دت کو الگ الگ رکھا گیا اور پھر جیل کے اندر ہی ۷ مئی ۱۹۲۹ کو انگریز مجسٹریٹ مسٹر پول کی عدالت میں ان دونوں پر مقدمہ چلا بعد میں اسپیشل مجسٹریٹ مسٹر مڈلٹن کی عدالت میں مقدمہ چلا۔ ہندوستانی عوام اور اخبارات نے جس شکل میں اس مقدمہ کو دیکھا اور جو اہمیت دی اس کی وجہ سے یہ ایک عظیم تاریخی واقعہ بن گیا۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی جو چاہتے تھے وہی ہوا۔ اس سے ہندوستان اور دنیا کی توجہ انقلابی پارٹی کی طرف مبذول ہوئی۔

بھگت سنگھ اور بٹکیشور دت نے جو بیان دیا اُس سے اُن کی شہرت ساری دنیا میں پھیل گئی کیونکہ انھوں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ انقلابی پارٹی کا مقصد محض آزادی حاصل کرنا نہیں بلکہ سماج واد قائم کرنا ہے۔

ہم اس وقت شریمتی اندرا گاندھی کی رہنمائی میں کئی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا چکے ہیں۔ کئی چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں ہماری جیت ہو چکی ہے مگر ابھی فیصلہ کن جنگ میں ہمیں فتح حاصل کرنی ہے۔

۶ جون ۱۹۲۹ء کو بھگت سنگھ اور بٹکیشور دت نے عدالت کے سامنے بہت بڑا بیان دیا تھا جس میں کہا گیا تھا۔

"عوام کے نمائندوں نے بار بار حکومت کے سامنے اپنے قومی مطالبات کو دہرایا لیکن ان کے مطالبات ردی کی ٹوکری میں پھینک دیے گئے۔ اسمبلی میں جو مناسب اور جائز تجاویز رکھی گئیں ان کو پیروں تلے روندا گیا۔ ساتھ ہی عوام دشمن سمجھاؤ اور تجویزیں عوام کے منتخب نمائندوں کی مخالفت کے باوجود سرکاری مشینری کے ذریعہ بیک جنبش قلم قانون میں تبدیل کر دی گئیں۔"

"ہم اس بات کو دہرانا نہیں چاہتے کہ جن افراد کو اس حادثے میں تھوڑی بہت چوٹیں آئی ہیں ان سے یا اسمبلی کے کسی اور ممبر سے ہمیں کوئی شکایت ہے اور نہ کوئی ذاتی پرخاش۔ ہم تو انسانی زندگی کو اتنا مقدس مانتے ہیں جس کا الفاظ میں بیان ممکن نہیں .... پھر بھی ہم یہ قبول کرتے ہیں کہ ہم نے جان بوجھ کر اسمبلی میں بم پھینکے۔"

اگرچہ یہ بیان بھگت سنگھ اور بٹکیشور دت کی جانب سے دیا گیا تھا مگر چندر شیکھر آزاد اور دیگر لوگوں کا بھی اس میں اتنا ہی ہاتھ تھا جتنا کہ اُن کا۔ یہ ساری پارٹی کا بیان تھا۔ اس بیان میں کہا گیا تھا:

"ہم نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو گرفتار کرایا تاکہ ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کا نتیجہ بھگت سکیں اور سامراجی ظالموں کو یہ معلوم ہو جائے کہ افراد کو کچلنے سے وہ خیالات کو نہیں کچل سکتے۔ صرف دو افراد کو کچل دینے سے پوری قوم کو نہیں کچلا جا سکتا۔ اور تحفظی بل کی گیدڑ بھبھکیوں سے ہندوستان کی آزادی کے شعلے نہیں بجھائے جا سکتے چاہے جتنے بھی سازش کے مقدمے چلائے جائیں یا کتنے ہی نوجوانوں کو جیلوں میں ڈال دیا جائے۔"

بھگت سنگھ نے سیاسی قیدیوں کی لڑائی کو وہیں سے شروع کیا جہاں کاکوری والوں نے چھوڑا تھا۔ انھوں نے سیاسی قیدی ہونے کی وجہ سے خاص سلوک کا مطالبہ کیا۔ ۸ اپریل کو بھگت سنگھ اور دت گرفتار ہوئے تھے اور ۱۲ جون کو اسمبلی میں بم پھینکنے کے جرم میں دونوں کو عمر قید (کالا پانی) کی سزا سنا دی گئی اس کے بعد بھگت سنگھ کو لاہور اور بٹکیشور دت کو میاں والی جیل بھیج دیا گیا۔

بھگت سنگھ عمر قید سے بالکل نہیں گھبرائے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ زندگی کا تھوڑا سا عرصہ بچ گیا ہے اس میں زیادہ سے زیادہ کام کر لیا جائے۔ اس لئے بٹکیشور دت سے ریل کے ڈبے میں ملاقات کے وقت بھگت سنگھ نے ہدایت دی کہ ہمیں جیل میں پہنچتے ہی بھوک ہڑتال شروع کر دینی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۴ جون ۱۹۲۹ کو بھگت سنگھ اور دت نے اپنی اپنی جیلوں میں بھوک ہڑتال شروع کر دی۔

اسی دوران لاہور میں سانڈرس قتل سازش کا مقدمہ چلانے کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اس سلسلے میں گرفتاریاں بھی ہو چکی تھیں۔ بھگت سنگھ اور بٹکیشور کو بھی دلی جیل سے لاہور اسی لئے لایا گیا تھا کہ انھیں بھی اس مقدمے میں سزا دی جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد ازاں سرکار نے فیصلہ کیا کہ دت کے خلاف لاہور سازش کا مقدمہ نہ چلایا جائے۔

۲۳ مارچ ۱۹۳۱ کو بھگت سنگھ، راج گورو اور سکھدیو کو پھانسی دے دی گئی مگر چندر شیکھر آزاد ابھی تک آزاد تھے۔ ان کی گرفتاری کے لئے کئی ہزار روپے کا انعام رکھا گیا تھا۔ ۲۷ فروری ۱۹۳۱ کو دن کے دس بجے چندر شیکھر آزاد الہ آباد کے چوک سے کٹرہ جانے والی سڑک پر سکھدیو راج کے ساتھ گھوم رہے تھے کہ راستے میں وہ ایکا ایک چونک پڑے۔ بات یہ تھی کہ انھوں نے ویربھدر تیواری کو دیکھ لیا تھا۔ یہ ویربھدر تیواری کاکوری کیس میں گرفتار ہوا تھا لیکن کچھ پراسرار اسباب کی بنا پر رہا ہو گیا تھا۔ تبھی سے کچھ لوگ اس پر شک کرتے تھے مگر ویربھدر اتنا تجربہ کار اور چالاک شخص تھا کہ لوگ اس کی باتوں میں آ گئے۔ یہی نہیں بلکہ وہ پارٹی کا ایک اہم رکن بھی بن گیا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اس کا برابر یہی رویہ رہا کہ وہ پولیس سے بھی ملا رہتا اور پارٹی سے بھی۔ آزاد بہت ہی سیدھے آدمی تھے اور وہ اس کے چکمے میں بہت جلدی آ جاتے تھے لیکن کئی بار دھوکہ کھا کر آخر اس کو اپنے ساتھ پارٹی میں نہ رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ویربھدر بھی جانتا تھا کہ وہ کس وجہ سے پارٹی سے نکال دیا گیا ہے۔ لہٰذا الہ آباد میں جب آزاد نے ویربھدر کو دیکھا تو وہ چوکنے ہو گئے۔

آزاد اور سکھدیو راج جا کر الفریڈ پارک میں ایک جگہ بیٹھ گئے۔ اتنے میں پولس افسر وشیشر سنگھ اور ڈال چند وہاں آ گئے۔ ان میں سے ڈال چند آزاد کو پہچانتا تھا۔ ڈال چند نے دور سے آزاد کو دیکھا تو لوٹ کر خفیہ پولس کے سپرنٹنڈنٹ ناٹ بابر کو مطلع کیا۔ وہ اس کی خبر پاتے ہی فوراً ہی بذریعہ موٹر الفریڈ پارک پہنچا۔ آزاد جہاں بیٹھے تھے وہاں سے دس گز کے فاصلے پر موٹر روک کر وہ آزاد کی جانب بڑھا۔ تب دونوں طرف سے ایک ساتھ گولی چلی، ناٹ بابر کی گولی آزاد کی جانگھ میں لگی اور آزاد کی گولی ناٹ بابر کی کلائی پر جس سے اس کا پستول چھوٹ کر گر پڑا۔ اُدھر اور پولس والے بھی

بقیہ صفحہ ۲۴ پر



حرمت الاکرامؔ
رام باغ، مرزاپور

یہ عہد کر رہے ہیں ہم

نشاطِ عزم کار کیا ہے؟ راز یہ بتائیں گے
سجائیں گے جبینِ خاک — چاند تار لائیں گے
شعاعیں گنگنائیں گی چراغ مسکرائیں گے
دلوں کو ہم تپائیں گے گھروں کو جگمگائیں گے
ہم اپنے بازوؤں کا زور آزماتے جائیں گے
یہ عہد کر رہے ہیں ہم

وہ خواب: نازِ انجمن ہیں جن کی جھلملاہٹیں
وہ خواب: بس گئی ہیں دل میں جن کی گنگناہٹیں
وہ خواب: آئی جاتی ہیں قریب جن کی آہٹیں
انھیں فروغِ روز و شب کی آبرو بنائیں گے
ہم اپنے بازوؤں کا زور آزماتے جائیں گے
یہ عہد کر رہے ہیں ہم

حساب لیں گے آب جوؤں کی اک اک لہر کا
ہدف نہ بن سکیں گے کھیت، موسموں کے قہر کا
تھمیں گے بحرِ ارتقا — پئیں گے جام زہر کا
چٹانوں کو کریں گے زیر، جوئے شیر لائیں گے
ہم اپنے بازوؤں کا زور آزماتے جائیں گے
یہ عہد کر رہے ہیں ہم

عظیم صنعتوں کو دیں گے سوز و سازِ آرزو
کریں گے زندگی کے شوخ حوصلوں کو سرخرو
بھلائی سے بوکارو تک کی داستانِ رنگ و بو
حیاتِ نو کی آب و رے کے کو بکو سنائیں گے
ہم اپنے بازوؤں کا زور آزماتے جائیں گے
یہ عہد کر رہے ہیں ہم

کہاں یہ رنگِ سرخوشی کہاں وہ سرگرانیاں
متاعِ امتیاز ہیں ہماری نکتہ دانیاں
لبوں پہ وقت کے ہیں جہد و فکر کی کہانیاں
ہم اِن کہانیوں میں روح کی طرح سمائیں گے
ہم اپنے بازوؤں کا زور آزماتے جائیں گے
یہ عہد کر رہے ہیں ہم

نکھر رہی ہے زندگی سنور رہی ہے زندگی
نشیبِ خاک و آب سے ابھر رہی ہے زندگی
بلندیوں سے ابر سی گزر رہی ہے زندگی
اِس ابر کی اک ایک بوند کو گہر بنائیں گے
ہم اپنے بازوؤں کا زور آزماتے جائیں گے
یہ عہد کر رہے ہیں ہم

یہ تازہ کامرانیوں کی دل نواز روشنی
یہ بیس نکتوں کی مہر و مہ طراز روشنی
طلوعِ نو بہار کا بنے گی ساز روشنی
جو اہلِ فہم ہیں وہ گیت اندرا کے گائیں گے
ہم اپنے بازوؤں کا زور آزماتے جائیں گے
یہ عہد کر رہے ہیں ہم

سعادت نظیر
بلاک ۱۰، فلیٹ ۸، چندولال بیلا کالونی
حیدرآباد

ایک مرحلہ اور

فقط فریبِ نظر تھی سحر کی انگڑائی
کہ ایک رات گئی اور ایک رات آئی
گھٹی گھٹی سی فضا تھی دیارِ امکاں کی
ہر اک زباں پہ کہانی تھی یاس و حرماں کی
نظر کے سامنے حسرت فزا اندھیرا تھا
طرح طرح کی بلاؤں نے ہم کو گھیرا تھا
کہیں تھی کشمکشِ شیخ و برہمن لے دست!
کہیں تھی سازشِ صیاد و راہ زن لے دست!
کہیں پہ گردشِ دوراں، کہیں پہ فتنۂ زر
کہیں پہ قحط کا کھٹکا، کہیں پہ جنگ کا ڈر

مگر تمام مراحل سے ہم گزر آئے
نشانِ منزلِ مقصود کے نظر آئے
زہے کہ راہِ طلب میں وہ موڑ آیا ہے
جہاں شعور کا چھایا ہوا اجالا ہے
پتا چلا کہ وفا کا ہے کون دیوانہ؟
یگانہ کون ہے محفل میں؟ کون بیگانہ؟
اسی مقام پہ جاگ اٹھا ولولہ دل کا
دلیل جادۂ منزل ہے حوصلہ دل کا
کچھ اور آج سے اسلوبِ زندگی ہوگا
نہ خوف و یاس، نہ احساسِ کمتری ہوگا

نظر سے دور یقیں ہے کہ تیرگی ہوگی
طلوعِ صبح سے [illegible] ہوگی

مہدی ٹونکی
مبارک منزل پانچ بتی ٹونک (راجستھان)

لہو کا اُجالا

رام لعل جب بازار سے لوٹے اور گھر کا دروازہ بند کرنے لگے۔ تب اُنھیں یاد آیا۔ انہوں نے پلٹ کر آنگن میں لیٹی بیوی لکشمی سے پوچھا "کیا دیویندر آگیا؟"

"نہ دیویندر آیا نہ نریندر —" لکشمی نے بیزاری سے کہا۔

رام لعل نے کنڈی گرا دی۔ کواڑ بھڑے رکھے اور آنگن میں آگئے کلائی پر سے گھڑی کھولی دیکھا دس بج رہے تھے۔ گھڑی کو سرہانے تکیے کے نیچے رکھ کر کرتا پاجامہ بدلنے کے لئے کمرے میں چلے گئے جب واپس آئے تو بیٹی منورما کو ٹیبل لیمپ جلائے، پڑھتا پایا۔ لکشمی منہ ڈھانکے خاموش لیٹی تھی شاید سو گئی تھی رام لعل پلنگ پر لیٹ گئے آج اُن کے دل و دماغ میں بہت بے چینی تھی ایک ہفتہ سے لگاتار پریشانی کا شکار تھے جب سے ایمرجنسی کا سوال دن منا کر گھر آئے تھے تب سے اُن کے دل و دماغ میں پریشانی کی ریت بکھر رہی تھی۔ ان جانے ہزاروں سوال اُن کے ذہن میں اُبھرتے اور مٹتے۔ ان کے سامنے جب گھر کی حالت گھر سے باہر کی حالت دیش کی حالت بچوں کی حالت اور دوسروں کی حالت گھومتی۔ وہ اور بے چین ہو اٹھتے۔ انہیں لگتا جیسے سب بیمار ہوں اور عنقریب سب پر بھاری مصیبت آنے والی ہے اس مصیبت سے کیسے بچا جائے؟ وہ اسی اُدھیڑبن میں ہر وقت لگے رہتے مگر کوئی حل ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔

"گھرررر — چُوں —"

گردن اُٹھا کر دیکھا نریندر کواڑ کھول کر اندر داخل ہو رہا تھا چہرے پر خوف کی ہلکی سی جھلک تھی۔

"کہاں تھے —" رام لعل نے پوچھا۔

"امتحان قریب ہے ماسٹر صاحب سے حساب سمجھنے گیا تھا" اب اُس کے چہرے سے پریشانی غائب ہو گئی تھی وہ اطمینان سے چلتا ہوا، باپ کے قریب سے نکل گیا۔

رام لعل پھر گہری فکر میں ڈوب گئے کیا نریندر نے سچ کہا ہے کہ وہ ماسٹر صاحب کے پاس پڑھنے گیا تھا؟ آج کل کوئی بھی ماسٹر کسی بھی لڑکے کو اتنی دیر تک کیوں پڑھانے لگا؟ جو لڑکا چھ ماہ تک اسکول میں رہ کر بھی اپنی کمزوری دور نہیں کر سکا بھلا وہ ان چار دنوں میں کیسے دور کر سکے گا؟ کل غفور ہی کہہ رہا تھا کہ تمہارے بیٹے کو دو چار لڑکوں کے ساتھ سینما کے پچھواڑے جوا کھیلتا ہوا دیکھا تھا۔ بھگوان جانے اس وقت کہاں سے آ رہا ہے جب بھی دیر سے آتا ہے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا ہے جھوٹ بولتے بولتے ضمیر بھی ختم ہو گیا۔ اس سے زیادہ خراب حالت بڑے کی ہے وہ تو آتا ہی دیر سے ہے۔ ماں اس کی پشت پناہی کرتی ہے میں اس کو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ بھگوان جانے ان کی قسمت میں آگے کیا لکھا ہے

کھٹ کھٹ کھٹ —

رام لعل چونک پڑے۔ کوئی دروازہ کھٹ کھٹا رہا تھا۔

"ماں — دروازہ کھولو —" دیویندر کی آواز تھی۔ نریندر نے کنڈی لگا دی تھی۔

رام لعل اُٹھے۔ دروازہ کھولا "اتنی دیر کہاں رہے؟"

دیویندر نے چونک کر باپ کو دیکھا پھر پیچھے ہٹتے ہوئے جواب دیا "کالج میں ڈرامے کی تیاری ہو رہی ہے ہیں تھا" بدبو کا ہلکا سا بھبکا رام لعل کے نتھنوں سے ٹکرایا وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئے — تو یہ شراب پی کر آیا ہے!

دیویندر تیزی سے رام لعل کے قریب سے گذر گیا۔ دو منٹ تک دروازہ کھولے خاموش کھڑے رہے تو گھر کی بربادی کے آثار شروع ہو گئے،

وہ دوبارہ پلنگ پر آ لیٹے۔ اُنہیں بستر آگ کا بچھونا معلوم ہونے لگا۔ ڈراؤنے خیالات آنے لگے — دیویندر شراب میں دُھت گالیاں بکتا ہوا سڑک پر اِدھر سے اُدھر ڈولتا دکھائی دیتا۔ آس پاس گھروں کے لوگ اُسے نفرت سے دیکھ کر کہتے "یہ ہے رام لعل کا لڑکا"

رام لعل گھبرا کر کروٹ بدلتے — اُنہیں نریندر ہتھکڑیاں پہنے، گردن جھکائے، سرِ بازار پولس کے گھیرے میں جاتا دکھائی دیتا۔ لوگ دیکھ کر پوچھتے۔ جواب ملتا "— پولس میں اکاؤنٹینٹ ہیں نا۔ رام لعل — اُنہیں کا لڑکا ہے باپ کتنا شریف اور بیٹے کے یہ لچھن! — چور کہیں کا"

رام لعل گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔ سب سو رہے تھے۔ جب ایک دو کش بیڑی کے لئے تو اُنہیں سوچ نے پھر آ دبوچا۔ گھر کی دیواریں گرتی ہوئی معلوم ہوئیں — جب اولاد نکمی نکلتی ہے تو گھر کے برتن بکتے ہیں، دیواریں گرتی ہیں، عزتیں بکتی ہیں، سر کو دابے رام لعل سوچنے لگے مالک کیا کروں؟ کیسے اس گرتے گھر کو بچاؤں؟ میری تو چند سال کی نوکری باقی ہے اس کے بعد گھر کا سارا بوجھ، ساری ذمہ داری انہی بچوں کو سنبھالنا ہے لیکن ان بچوں کا کردار تو ابھی سے خراب ہے۔ یہ کیسے اس گھر کی ذمہ داری کو نبھا سکیں گے؟ — ہے بھگوان کیا کروں؟"

فجر کی اذان جب لاؤڈ اسپیکر سے چاروں طرف پھیلی تو رام لعل اُٹھ بیٹھے زندگی میں پہلی بار وہ علی الصبح اُٹھے تھے۔ اُنہیں کچھ نیا نیا سا لگا مگر اچھا لگا۔ آنگن میں سب سو رہے تھے۔ نہا کر وہ گیتا کا پاٹھ کرنے بیٹھ گئے۔ کبھی دُکھ تکلیف میں ہی رام لعل نے یا لکشمی نے گیتا کو ہاتھ لگایا تھا مگر آج عقیدت کے ساتھ بندگی کا احساس کرتے ہوئے انہوں نے گیتا کا پاٹھ کیا اُنہیں بہت شانتی ملی بہت سکون ملا۔ گیتا پاٹھ کے بعد وہ کچھ دیر تک دھیان گیان میں لگے رہے۔ اس کے بعد آنکھیں کھولیں تو پیلی پیلی دھوپ آنگن میں سوتے لوگوں پر اُتر آئی تھی۔ رام لعل غصہ کر کے رہ گئے دیر سے اُٹھنا گھر کا معمول تھا۔ وہ بھی انہی میں شامل تھے۔ آج اگر یہ جلدی اُٹھ گئے تو کیا ہوا! گھر کے دوسرے افراد سے کہیں تو کیا کہیں؟ لیکن اُن کی نئی زندگی کی پہلی صبح تھی کیونکہ رام لعل نے بے مقصد زندگی کا چکر بدلنے کے لئے کچھ فیصلے کر لئے تھے۔

اور آج پہلی صبح تھی اب اگر وہ گھر والوں پر دیر سے اُٹھنے کی وجہ پر چلّائیں تو یقیناً گھر والے بڑ بڑائیں گے اور یہ نصیحت بے موقع رہے گی۔ اس لئے وہ مصلحتاً خاموش رہے۔ ساڑھے چھ بجے اُنہوں نے نریندر کو جگایا۔

"اسکول جانا ہے یا نہیں؟" آواز میں کرختگی تھی اس لئے نریندر نیند کی وجہ سے آئی جھنجھلاہٹ ظاہر نہیں کر سکا۔ اُسے حیرت ضرور ہوئی۔

نریندر روزانہ بغیر ناشتہ کئے صبح سات بجے گھر سے نکل جاتا تھا چونکہ ناشتہ تیار نہیں ہوتا تھا اس لیے پچاس پیسے روزانہ لے جاتا تھا اس وقت رام لعل کی کرخت آواز سن کر گھر کے افراد جاگ تو اُٹھے تھے لیکن السائے پڑے رہے۔

ٹھیک سات بجے نریندر کے ساتھ رام لعل اسکول پہنچ گیا۔ بچے میدان میں پریڈ کے لئے کھڑے تھے لیکن ابھی تک پورے ٹیچرس نہیں آئے تھے۔ جب پریڈ ختم ہو گئی تب ہیڈ ماسٹر آئے، اکڑے ہوئے۔

اسی لمحے سب کے سامنے رام لعل نے اپنے بیٹے کو آواز دے کر بلایا۔ وہ اپنی کلاس کی لائن سے ڈرتا ڈرتا نکلا۔

"آپ میں سے کون سے ماسٹر صاحب اسے حساب پڑھاتے ہیں" رام لعل نے ٹیچرس کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔

"میں پڑھاتا ہوں" ایک ٹیچر نے حامی بھری۔

"کیا رات کو آپ کے یہاں حساب سمجھنے گیا تھا؟"

"جی نہیں — جب یہ کلاس میں ہی نہیں پڑھتا تو ہمارے پاس رات کو پڑھنے کیا آئے گا؟"

"تو پھر تم رات کو کہاں تھے؟" رام لعل نریندر کی طرف مڑے۔

نریندر نے گردن جھکا لی۔ تمام لڑکے اس ڈرامے کو خاموش کھڑے دیکھ رہے تھے۔ ٹیچرس بھی خاموش کھڑے تھے۔ دوسرے ہی لمحے رام لعل نے نریندر کو پکڑ کر بے تحاشہ پیٹنا شروع کر دیا۔ لڑکے کانپ گئے۔ ایک ٹیچر نے آگے بڑھ کر بلبلاتے اور تڑپتے نریندر کو بچایا۔

اور ایسے میں ضلع افسر کی وہ تقریر کانوں میں گونجنے لگی جو اُس نے ہنگامی حالات کے سوویں دن پر تمام ملازمین کے ایک جلسے میں کی تھی۔ افسر نے کہا تھا۔

"ہمارے ذہن میں، ہمارے دماغ میں دیمک لگ گئی ہے۔ سوچنے میں، فیصلہ کرنے میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ ہم ہاتھ کے اچھے نہیں رہے، ہم بات کے اچھے نہیں رہے، ہم کام کے اچھے نہیں رہے۔ جب کسی ملک کے لوگوں میں ایسے روگ لگ جاتے ہیں تو پوری قوم بے کار ہو جاتی ہے۔ اور دیش ہر طرح سے تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ آج سے تین ماہ پیشتر ہماری، ہمارے دیش کی ایسی ہی حالت تھی۔ ہماری وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے بروقت اس کا علاج کیا ہے۔ ہنگامی حالات کا اعلان کر کے دیش کو بدحالی و بربادی سے بچا لیا ہے۔ یاد رکھئے ایمرجنسی کا مطلب صرف کا غذات کی صحیح کارروائی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مقصد ہمارے ذہنوں کو راہِ راست پر لانا ہے۔ ہمیں بُری باتوں سے بچنا اور بچانا ہے۔ اپنا فرض نبھانا ہے۔ فرض چاہے گھر کا ہو، چاہے دفتر کا، چاہے دیش کا ہمیں اپنا فرض پوری ایمانداری سے نبھانا ہے۔ فرض میں کوتاہی انسان کو خراب کر دیتی ہے۔ فرض سے بے پروائی انسان میں بے پروائی، سستی اور کاہلی بھر دیتی ہے۔ انسان میں ذمہ داری کا احساس کم ہوتا جاتا ہے۔ انسان ناکارہ ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگ دیش کی بربادی کا باعث بنتے ہیں کیونکہ جب وہ اپنے گھر کو ہی بدحالی، بربادی سے نہیں بچا سکتے تو دیش کی حفاظت کیسے کر سکیں گے۔ اور دیش کو ترقی کیسے دے سکیں گے؟ اس لئے آپ لوگوں سے گزارش ہے کہ آپ اپنے فرض کو پہچانیے۔ اور اپنی ذمہ داری کو گھر سے شروع کیجئے۔ کیونکہ گھر دیش کا یونٹ ہے —"

رام لعل کے دماغ میں یہ الفاظ گونجنے لگے۔ بے چینی سے وہ رات ڈھلے تک کروٹیں بدلتے رہے اُن کی آنکھوں کے سامنے کبھی دیویندر گھر کی اینٹیں نکال کر پھینکتا ہوا دکھائی دیتا تو کبھی نریندر کدال لئے گھر کی بنیادیں کھودتا ہوا نظر آتا۔ گھبرا کر وہ اُٹھ بیٹھتے — کیا کروں؟ کیسے روکوں؟

پھر دماغ کے پچھلے حصے سے باریک تیز آواز سرسرائی — فرض سے کوتاہی اپنے جسم سے لے کر گھر تک کو برباد کر دیتی ہے۔ اگر گھر کو بچانا ہے تو اپنے فرض کو پہچانو — ابھی وقت ہے اب بھی وقت ہے، اور وہ پھر سوچتے — سچ تو ہے ہم اپنے بیٹوں سے چھوٹوں سے دوسروں سے تو یہ امید کرتے ہیں کہ وہ ہمارا حکم مانیں، ہمارے وفادار رہیں مگر ہم ان کے لئے کیا ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ فرض کا پورا کرنا چھوٹوں کا ہی کام نہیں، بڑوں کا بھی کام ہے کیا دیویندر اور نریندر کی دیکھ بھال میں میں نے اپنے فرض کو نبھایا؟ کیا کبھی ان کو اپنے پاس بٹھا کر نیک باتوں کی، اچھے کاموں کی تلقین کی۔

اور اِن کے جواب میں آنکھوں کے سامنے صفر ہی صفر گھوم جاتے۔

"اجی صاحب — یہ دیر سے تو آتا ہے پھر بیچ میں کلاس سے بھی غائب ہو جاتا ہے" ہیڈ ماسٹر پھسپھسائے رام لعل بڑے لڑکے کی کلاس سے غیر حاضری، کلاس ٹیچر اور ہیڈ ماسٹر پہ ہے۔ جب ٹیچرس ہی دیر سے آتے ہیں کلاس میں وقت پر نہیں پہنچتے ہیں تو لڑکے کلاس سے نہیں بھاگیں گے تو کیا کریں گے؟ اور اس میں ماسٹروں کا بھی کیا قصور ہے؟ جب آپ ہی وقت پر اسکول نہیں آئیں گے تو ماسٹروں کو تو اور موقع ملے گا۔ آج بھی آپ دیر سے اسکول آئے"

اس صاف بات پر چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ جو ماسٹر وقت پر آتے تھے۔ جو ہیڈ ماسٹر کی ہاں میں ہاں ملانے والے نہیں تھے وہ اس بات پر مسکرا اٹھے۔

تھوڑی دیر تک ہیڈ ماسٹر اور دوسرے ٹیچرس سے بات چیت کر کے وہ گھر لوٹ آئے۔ ہیڈ ماسٹر نے اُن کی خوب خاطر تواضع کی تھی۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے رام لعل نے بیوی سے کھانا مانگا۔ لکشمی حیرت سے دیکھنے لگی "اتنی جلدی؟ ساڑھے دس کے بجائے نو بجے ہی —؟"

"ہاں وقت پر دفتر پہنچنا ہے۔ ایمرجنسی ہے"

"تو کیا ایمرجنسی آج ہی تمہارے پر لاگو ہوگی؟" لکشمی نے طنز کیا۔

"لاگو ہوگی نہیں۔ لاگو ہو گئی — اور میرے پر ہی نہیں اس پورے گھر پر لاگو ہو گئی۔ کل کھانا ٹھیک ساڑھے نو بجے مل جائے — اور ہاں کل سے نریندر ساڑھے چھ بجے ناشتہ کر کے اسکول جائے گا تم سب کو جلدی سے اُٹھ جانا ہے" سخت اور تیز لہجے میں کہہ کر رام لعل تیزی سے گھر سے نکل گئے

رام لعل دیر سے دفتر پہونچنے کے لئے مشہور تھے۔ دفتر میں کسی کو یاد نہیں کہ وہ کبھی وقت پر آئے ہوں آفیسرس بھی جھک مار کر خاموش رہ جاتے۔ اپنی فتح پر رام لعل مسکرا کر سب کو فخر سے دیکھتے۔ ایمرجنسی لاگو ہونے پر بھی اُن کے اس رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

لیکن آج جب وہ ٹھیک دس بجے دفتر پہونچے تو سب کو حیرت ہوئی۔ کئی سوال ان سے پوچھے گئے مگر وہ صرف مسکرا کر رہ گئے۔ اپنی ٹیبل پر بیٹھ کر تندہی سے، خاموشی سے کام کرنے لگے۔ یہ انوکھی بات تھی۔ ان کی خاموشی دیکھ کر ان کے بے تکلف دوست بھی کچھ نہیں کہہ سکے۔ ٹھیک ڈیڑھ بجے لنچ ٹائم میں وہ آفس انچارج سے کچھ دیر کے لئے اجازت لے کر دیویندر کے کالج پہنچ گئے جو قریب ہی تھا۔

پرنسپل کے کمرے میں تمام لیکچررس موجود تھے شاید میٹنگ تھی دیویندر سر جھکائے کھڑا تھا "دیویندر اور کالج کا ڈرامہ!!" ایک لیکچرر نے حیرت سے کہا "محترم آپ کے صاحبزادے تو ہوٹنگ کرنے والوں کے لیڈر ہیں وہ کالج کے ہر فنکشن میں ہوٹنگ کا کام سنبھالتے ہیں۔ لڑائی جھگڑے میں آگے آگے رہتے ہیں وہ ڈرامے میں کیسے کام کر سکیں گے؟"

"پرنسپل صاحب آپ مجھے تو مطلع کرتے" رام لعل نے کہا

"آپ صحیح فرماتے ہیں" پرنسپل نے ٹائی درست کی "مگر مجھے پتہ چلے تب نا؟ مجھ سے کہا ہی نہیں گیا" "بات یہ ہے کہ —" لیکچرر نے گردن آگے بڑھائی "آپ پولس محکمہ میں ہیں۔ ہمیں ڈر تھا کہ کہیں دیویندر ہماری شکایت آپ سے نہ کر دے اور آپ ہم سے ناراض ہو کر —"

"غلط!" رام لعل نے غصے میں بات کاٹی "میں نے آج تک کوئی ایسی بیہودہ حرکت نہیں کی اگر میرے ساتھی اگر ایسا کرتے ہیں تو وہ جانیں۔ یہ تو صرف آپ کا بہانہ ہے۔ دراصل حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کے وائس پرنسپل شراب پیتے ہیں۔ میرے لڑکے سے شراب منگواتے ہیں کیونکہ دوکان دار میرے لڑکے کو کم قیمت پر شراب دیتا ہے مجھے سب معلوم تھا مگر رات کو جب وہ شراب پی کر آیا تو پتہ چلا کہ یہ بھی بگڑ گئے ہیں۔ بتائیے اس کا ذمہ دار کون ہے؟"

سب خاموش تھے۔ رام لعل ایک ایک کو سوالیہ نظروں سے گھورتے رہے۔

"پرنسپل صاحب۔ ایسی پڑھائی سے کیا فائدہ جن سے لڑکوں میں خرابیاں پیدا ہوں۔ مہربانی فرما کر آپ دیویندر کا نام کالج سے کاٹ دیجئے۔ وہ اب پڑھنے نہیں آئے گا۔ اسے آج سے ہی کسی دوسرے کام پر لگاتا ہوں"

"دیویندر —" آنگن میں پیر رکھتے ہی رام لعل نے زور سے آواز دی۔ سامنے رسوئی گھر میں بیٹھی لکشمی اور منورما انہیں دیکھنے لگیں۔

دیویندر ڈرا ڈرا سا اُن کے سامنے آیا۔

"لو —" رام لعل نے جیب سے شراب کی بوتل نکال کر اس کی طرف بڑھائی "تمہیں شراب کا شوق ہے نا — پیئو"

"آج تمہیں ہو کیا گیا ہے" لکشمی جھلاتی ہوئی اُن کے سامنے آکھڑی ہوئی صبح سے بچوں پر جھلا رہے ہو۔ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟

"پوچھو اپنے بیٹے سے کہ رات کو شراب پی کر آیا ہے کہ نہیں؟ پوچھو اپنے دوسرے بیٹے سے کہ وہ رات کو جوا کھیل کر آیا تھا کہ نہیں۔ دونوں نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ تمہارے دونوں لاڈلے اسکول سے کالج سے غائب رہتے ہیں، پارٹی بازی میں لگے رہتے ہیں"

لکشمی خاموشی سے دیویندر کو دیکھنے لگی۔

"میں ان لفنگوں کو اب ہرگز ہرگز اس گھر میں نہیں رکھوں گا۔ ان کا بوریا بستر ان کے حوالے کر دو جہاں ان کا دل چاہے جائیں۔" وہ تیزی سے واپس مڑ گئے

رات کو دیر تک لکشمی رام لعل کے پیر دابتی رہی، راضی کرتی رہی۔ بیٹے دیویندر، نریندر اور بیٹی منورما ان کے پاس خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے رہے

دیوبندر نے قسم کھائی کہ وہ اب کالج میں دل لگا کر پڑھے گا پارٹی بازی میں حصہ نہیں لے گا۔ شراب چھوئے گا تک نہیں۔ نریندر نے وعدہ کیا کہ وہ اب اسکول سے غائب نہیں ہوگا۔ جوا نہیں کھیلے گا۔ اور خوب محنت کر کے فرسٹ ڈویژن پاس ہوگا۔ منورما نے وعدہ کیا کہ وہ اب کتاب کے بیچ میں ناول رکھ کر نہیں پڑھے گی۔ لکشمی نے بھی وعدہ کیا کہ وہ علی الصبح اٹھ کر گھر کا کام کاج کرے گی۔ بچے وقت پر ناشتہ کریں گے اور وقت پر کھانا کھائیں گے۔

رام لعل دیر تک آج کے اس کام پر خوش ہوتے رہے۔ آٹھ دن کی پریشانی اب دور ہو چکی تھی مگر ایک خیال ان کو بار بار آتا ہے۔ "لیکن یہ سب برابر چلتا رہے تب تو ٹھیک ہے لیکن یہ ہو کیسے؟" تب انہوں نے مصمم ارادہ کیا کہ وہ آج کی طرح سے ہر دن علی الصبح اٹھا کریں گے۔ لگن سے پوجا پاٹھ کریں گے۔ وقت پر دفتر پہونچیں گے لگن سے، محنت سے، ایمان داری سے پورے ٹائم کام کریں گے۔ بچوں کی ہر طرح سے دیکھ بھال کریں گے

دوسرے دن شام کو سات بجے رام لعل کو بے چینی شروع ہو گئی اُن کا یہ وقت اپنے دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھ کر گپیں لڑانے کا تھا۔ اب گھر میں کیا کریں؟ دیوبندر، نریندر گھر میں ہی تھے۔ رام لعل سوچنے لگے "اگر میں ابھی گھر سے باہر گیا تو یہ بھی کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے کھسک جائیں گے۔ میری محنت بے کار جائے گی۔ مجھے اس وقت کچھ نہ کچھ کام کرتے رہنا چاہیے!"

انہوں نے الماری سے "گاندھی درشن" کتاب نکالی اور پڑھنے بیٹھ گئے۔ بچوں نے بھی ایک دوسرے کو دیکھا پھر وہ بھی اپنی اپنی کتابیں لے کر پڑھنے لگے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ ہر کام وقت پر ہو رہا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو رہا تھا لیکن ایک پریشانی پیدا ہو گئی۔ دفتر میں پابندی سے، ایمان داری سے کام کرنے کی وجہ سے اُوپر کی آمدنی ماری گئی۔ چونکہ گھر کا خرچ زیادہ تھا اس لئے مصارف پریشان کرنے لگے۔ تنخواہ اتنی تھی نہیں کہ سب کام آسانی سے ہو جائیں۔ یہ پریشانی ان کے لئے بہت بڑی تھی۔ ادھر لکشمی بھی روپئے پیسے کے لئے ہاتھ پھیلاتی پہلے رام لعل کی جیبیں روپیوں سے بھری رہا کرتی تھیں، مگر اب خالی رہتیں۔ لکشمی کو اب یہ فکر کھانے لگا کہ آخر پیسے جاتے کہاں کہاں ہیں؟ اور جب رام لعل اسے بتاتے کہ وقت پر کام کر دینے سے، رشوت نہیں لینے سے پیسے نہیں آتے دوسرے یہ کہ ایمرجنسی کی وجہ سے انہوں نے کسی بھی قسم کا ناجائز پیسہ نہیں لینے کی قسم کھائی ہے تو لکشمی بہت بڑ بڑاتی ایمرجنسی کو کوستی۔ رام لعل بھی اس پریشانی سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے انہوں نے گھر پر ایسا کام شروع کرنا چاہا جو ان کے معیار کے مطابق ہو اور جس سے آمدنی بھی اچھی ہو۔ سوچ وچار کر انہوں نے چھوٹے بچوں کے کپڑوں کی سلائی کا کام شروع کیا۔ منڈی کی ہیڈ کی دکان سے انہوں نے آرڈر لیا۔ رنگ برنگے کپڑے لائے ڈیزائن خود تیار کئے۔ بیوی اور لڑکی نے بیٹھ کر اچھی سلائی اور اچھے ڈیزائن کی سے مانگ بڑھ گئی کام بڑھ گیا۔ آمدنی بھی خوب ہونے لگی۔

پندرہ مئی کو نریندر کا نتیجہ نکلا۔ وہ فرسٹ ڈویژن پاس ہوا۔ پورے اسکول میں اس کی فرسٹ پوزیشن تھی۔ خوش خبری سن کر اُن کے آنسو نکل آئے۔ بے اختیار کرشن جی کے آگے جھک گئے۔

اسی طرح خوشی کے آنسو دوسری مرتبہ آج نکلے جب دیوبندر نے ان کے ہاتھوں میں تین سو روپیہ کے نوٹ رکھے۔ انہوں نے چھٹیوں میں بے کار رہنے کے بجائے بچوں کو کوئی کام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ نریندر اور دیوبندر نے مل کر صابن بنایا اور آج جب کہ وہ ایمرجنسی کی ایک سالہ سال گرہ کے جشن میں حصہ لینے جا رہے تھے کہ دیوبندر نے جمع خرچ کی کاپی اور منافع کے تین سو روپئے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ ایک عجیب سی خوشی سے وہ سرشار ہو گئے۔ نوٹوں کو ہاتھ میں لئے وہ بیٹھ گئے۔ سوچنے لگے "واقعی محنت اور لگن انسان کو خوشحال بناتی ہے۔ انسان محنت کرتا ہے تو اس کا اچھا نتیجہ ضرور ملتا ہے۔ آج میرے گھر میں خوشحالی کا دور دورہ ہے میں خوش ہوں، لکشمی خوش ہے، بچے خوش ہیں۔ اس کی وجہ ایمرجنسی ہے۔ اگر ایمرجنسی فرض شناسی کا راستہ نہ بتاتی تو میں ویسا کا ویسا ہی بگڑا رہتا۔ بچے اور خراب ہو جاتے گھر واقعی برباد ہو جاتا۔ یقیناً میرے گھر کی طرح میرا دیش بھی بربادی سے بچا ہے۔ واقعی فرض کو پورا کرنے میں ہر ایک کو فائدہ ہے اگر ہر ایک آدمی فرض شناسی سے ذمہ داری سے کام کرے تو اُس کا گھر تو شاد و آباد رہے گا ہی، ساتھ ہی دیش بھی ترقی کرے گا۔ پھلے گا پھولے گا۔ تب ہی تو ونوبا بھاوے نے کہا تھا کہ ایمرجنسی کا مطلب ہے نظم و ضبط۔ اس میں اپنے آپ کو سُدھارنے کا موقع ملا ہے۔"

رام لعل کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک آئے۔

ذہین طلباء کی بینک کی طرف سے امداد

کنارا بینک نے دیہاتی علاقوں کے ذہین طلباء کو بعد از میٹرک کورسوں کے لئے امداد دینے کی ایک اسکیم شروع کی ہے۔ اس اسکیم کے تحت ان طلباء کو قرضے دیئے جائیں گے جنہوں نے میٹرک میں نہ صرف فرسٹ کلاس حاصل کی ہو بلکہ انہوں نے اپنے اسکول کے کامیاب طلباء میں پہلی تین پوزیشنوں میں سے ایک حاصل کی ہو۔

شہباز حسین



لوکمانیہ تلک

رات کے نو بج رہے تھے۔ بمبئی ہائی کورٹ کے ایک اجلاس میں فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔ جج صاحب نے دوپہر میں ہی کہہ دیا تھا کہ میں دیر تک بیٹھوں گا اور فیصلہ سنا کر جاؤں گا۔

جج صاحب کی مدد کے لئے ۹ جیوری مقرر تھے۔ ۷ یوروپین اور دو ہندوستانی۔ ملزم پر بغاوت کے سنگین الزام تھے۔ ٹھیک ۹ بجکر ۲۰ منٹ پر جیوری نے اپنا فیصلہ سنایا۔ "قصوروار" صرف دو ہندوستانی جیوریوں نے "بے قصور" ٹھہرایا۔ جج صاحب نے جیوری کے فیصلے سے اتفاق کرتے ہوئے ملزم سے کہا کہ کیا اسے اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے۔

ملزم نے بڑے باوقار انداز میں کہنا شروع کیا :

"میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جیوریوں کی رائے کے باوجود میں خود کو بے گناہ سمجھتا ہوں۔ انسانوں اور قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والی ایک اعلا اور برتر طاقت بھی ہے ہو سکتا ہے کہ ایشور کی یہی مرضی ہو کہ جس مقصد کے حصول کے لئے میں جدوجہد کر رہا ہوں وہ میرے آزاد رہنے کے بجائے دکھ جھیلنے سے زیادہ کامیاب اور بار آور ہو۔"

یہ باغی بال گنگا دھر تلک تھے جنھیں چھ سال کی سزا سنائی گئی تھی اور ملک بدر کیا گیا تھا یعنی مانڈلے (برما) میں قید رکھا گیا تھا۔

لیکن اس واقعے کے ۸۴ سال بعد بمبئی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس محمد کریم چھاگلہ نے تاریخ کا ناگزیر فیصلہ سناتے ہوئے کہا:

"اسی کمرے میں بارہ سال کے عرصے میں دو بار تلک کٹہرے میں ملزم کی حیثیت سے لائے گئے اور دونوں بار انہیں قید کی سزا دی گئی۔ انہیں اس لئے سزا دی گئی تھی کہ وہ اپنی زندگی اور آزادی سے زیادہ ملک سے محبت کرتے تھے۔ جو فیصلہ ہمارے معاصرین ہمارے بارے میں سناتے ہیں یا جو فیصلہ وقت کرتا ہے وہ کچھ زیادہ اہم نہیں ہوتا۔ ہمیں ہمیشہ تاریخ کے ناگزیر فیصلہ کا انتظار کرنا چاہیئے اور تاریخ تلک کو ملنے والی سزاؤں کو آزادی اور حب الوطنی کو کچلنے کی کوشش کی حیثیت سے یاد رکھے گی۔ تلک ہر لحاظ سے حق بجانب تھے کیونکہ اپنے ملک کے لئے لڑنے کا ہر فرد کو حق حاصل ہے۔"

یہ الفاظ تلک کی صد سالہ جینتی (۱۹۵۶ء) کے موقع پر عدالت کے اسی کمرے میں لگی ہوئی تختی (جس پر تلک کے کہے ہوئے الفاظ کندہ تھے) کی نقاب کشائی کرتے ہوئے کہے گئے تھے۔

ہندوستان کی تاریخ میں بال گنگا دھر تلک، جسے لوگ محبت اور عقیدت سے لوکمانیہ کہنے لگے تھے، کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔ یہ ہندوستان کے ان نایہ ناز سپوتوں میں تھے جنھوں نے تن من دھن سے ملک کی خدمت کی اور جن کا مشہور نعرہ "سوراج ہمارا پیدائشی حق ہے اور ہم اسے حاصل کر کے رہیں گے" سارے ہندوستان میں گونج اٹھا اور "سوراج" ہندوستان کی جنگ آزادی کا منتہائے مقصود بن گیا۔

تلک کی پیدائش ۲۳ جولائی ۱۸۵۶ء کو رتنا گری میں ہوئی تھی۔ ان کے والد پرائمری اسکولوں کے انسپکٹر تھے ابھی تلک سولہ سال کے ہوئے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ماں ۶ سال پہلے ہی مر چکی تھیں۔

ان کی تعلیم پونا میں ہوئی۔ وہیں سے انہوں نے میٹرک پاس کیا اور دکن کالج میں پانچ سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ کالج کے پہلے سال میں ان کی ساری توجہ جسمانی طاقت کو بہتر بنانے میں صرف ہوئی۔ اس طرح وہ ایک تندرست اور مضبوط نوجوان تو بن گئے مگر کالج کے پہلے سال میں فیل ہو گئے۔ ۱۸۷۷ء میں انہوں نے امتیاز کے ساتھ بی۔ اے پاس کیا اور دو سال کے بعد وکالت کی سند حاصل کی۔ مگر قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی انہوں نے اپنی زندگی کا راستہ متعین کر لیا تھا اور یہ راستہ تھا دکھ اور مصیبت کا، ملک کی خدمت کا، آزادی کی جدوجہد کا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ تعلیم عام کیجائے اسکول اور کالج کھولے جائیں۔ اپنے دوست آگارکر کے ساتھ مل کر انہوں نے پونا میں نیو انگلش اسکول کھولا، اور دکن ایجوکیشن سوسائٹی کی بنیاد رکھی جس نے بعد میں مہاراشٹر میں اسکولوں اور کالجوں کا جال بچھا دیا۔

دو اخبار جاری کئے مرہٹہ (انگریزی) اور کیسری (مرہٹی) دونوں اخبارات چل نکلے۔ کولہاپور کے نابالغ مہاراجہ کی حمایت اور سازشی دیوان ایم۔ ار بار وے کے خلاف بعض خطوط کی اشاعت کی وجہ سے دیوان نے مقدمہ کر دیا اور تلک اور اگارکر کو ۴ مہینے قید کی سزا دی گئی۔ اس طرح تلک پہلی بار "شاہی مہمان" بنے اور پھر یہ شرف انہیں کئی بار حاصل ہوا۔

تلک نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے سماج سدھار اور سیاسی اصلاحات کے لیے زبردست کوششیں کیں۔ عوام میں بیداری پیدا کرنے کے لئے انہوں نے گنپتی پوجا اور شیواجی سے متعلق تقریبات منعقد کیں جو مہاراشٹر میں بے حد مقبول ہوئیں۔

مہاراشٹر میں زبردست قحط پڑا اور پونا میں طاعون کی وبا پھیلی۔ ان دونوں موقعوں پر تلک نے بہت کام کیا۔ اسی زمانے میں ایک حادثہ ہوا کہ دو انگریزوں مسٹر رینڈ اور مسٹر آیرسٹ کو پونا میں کسی نے ۲۲ جون ۱۸۹۷ء کو قتل کر دیا۔ قاتل کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا اور اس کے لیے ۲۰ ہزار روپے کا انعام مقرر کیا گیا تھا۔ حکومت تلک کی تحریروں سے خوش نہیں تھی۔ لہذا تلک پر یہ الزام لگایا کہ وہ عوام کو ورغلا رہے ہیں اور حکومت کے خلاف بھڑکا رہے ہیں۔ انھیں دفعہ ۱۲۴۔الف کے تحت ۲۷ جولائی ۱۸۹۷ کو بمبئی میں گرفتار کر لیا گیا۔ بغاوت پھیلانے کا الزام پہلی بار کسی پر لگایا گیا تھا۔ تلک کے بہت سے دوستوں نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مگر عوام نے ان کی بھرپور حمایت کی۔ ان کے مقدمے کے اخراجات کے لئے ۵۰ ہزار روپیہ جمع ہو گیا۔ کلکتہ سے دو مشہور بیرسٹر ان کے مقدمے کی پیروی کرنے آئے۔ تلک کا قتل سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ان کی تحریریں ہی اشتعال انگیز تھیں مگر حکومت وقت کو انہیں سزا دینی تھی اس لئے ۷ ستمبر کو فیصلہ سناتے ہوئے جج نے انہیں ڈیڑھ سال کی قید بامشقت کا حکم سنایا۔ فیصلے کے خلاف اپیل بھی کی گئی مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

اس زمانے میں جیلوں کی درجہ بندی نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی سیاسی قیدیوں کو کسی قسم کی مراعات حاصل تھیں۔ انہیں ناریل کے ریشوں کو صاف کرنے کا کام دیا گیا تھا۔ دوسری طرح کی مشقت بھی کرائی جاتی تھی۔ تلک ہنسی خوشی سب کام کر رہے تھے مگر جیل کا کھانا ان کے بس کا نہ تھا اور ۴ مہینے میں ان کا وزن ۳۰ پاؤنڈ کم ہو گیا۔ ہندوستان اور انگلینڈ میں تلک کی رہائی کی زبردست مہم شروع ہو گئی اور رائے عامہ کے دباؤ کے تحت حکومت نے ۶ ماہ پہلے رہا کر دیا۔

یہ زمانہ آزادی کی جدوجہد کا ابتدائی زمانہ تھا۔ برطانوی حکومت سخت گیری کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ جائز اور ناجائز ہر طریقے سے وہ ہر مخالفت کو کچلنے پر آمادہ تھی۔ کانگریس دو گروہوں میں منقسم تھی۔ اعتدال پسندوں کے گروہ کے رہنما سر فیروز شاہ مہتہ اور گوپال کرشن گوکھلے تھے۔ اور انتہا پسندوں کی قیادت تلک کے ہاتھ میں تھی۔ تلک نے بہت کوشش کی کہ دونوں گروہوں میں مصالحت ہو جائے مگر ایسا نہ ہو سکا بالآخر ۱۹۰۸ء میں کانگریس کے سورت اجلاس کے موقع پر دونوں گروہوں کے درمیان خلیج زیادہ وسیع ہو گئی۔

قبل اس کے کہ تلک اور آربند گھوش جیسے انتہا پسند اعتدال پسندوں کے خلاف کوئی محاذ قائم کرتے تلک کو جولائی ۱۹۰۸ء میں ۶ سال قید کی سزا دی گئی اور ہندوستان سے جلاوطن کر کے مانڈلے (برما) میں قید تنہائی میں رکھا گیا۔

ہوا یوں کہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۸ء کو خودی رام بوس اور پرفلا چکی نے ڈسٹرکٹ جج کنگس فورڈ پر بم پھینکا۔ کنگس فورڈ سیاسی قیدیوں کو انتہائی سخت سزائیں دیتا تھا جس کی وجہ سے ہندوستانی اس سے سخت نفرت کرتے تھے۔ مگر کنگس فورڈ تو بم کا نشانہ نہیں بنا مگر دو یوروپین خواتین اس کی زد میں آکر ہلاک ہو گئیں۔ اس واقعہ پر ہنگامہ مچ گیا۔ حکومت نے نہایت سخت قوانین پاس کئے۔ اینگلو انڈین پریس نے ہندوستانیوں کو دبانے اور کچلنے اور گولی کا نشانہ بنانے کی مانگ کی۔ بغاوت کے الزام میں اندھا دھند مقدمے چلائے گئے۔

تلک حکومت کی نظروں میں خار کی طرح کھٹک رہے تھے۔ کیسری کی ۲۴ جون ۱۹۰۸ء کی اشاعت میں تلک کا مضمون شائع ہوا تھا "ملک کی بدقسمتی" اسی کو بنیاد بنا کر انہیں ۲۴ جون کو ہی گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں ایک دوسرا مضمون "یہ علاج دیرپا نہیں ہے۔" بھی شامل کر لیا گیا تاکہ تلک کے بچاؤ کی صورت باقی نہ رہے۔

خفیہ سرکاری کاغذات اور دستاویزات جو آزادی کے بعد ملے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ تلک کی گرفتاری کی اصل وجہ کیا تھی۔ گورنر بمبئی لارڈ سڈنہم نے لارڈ مورلے وزیر ہند کے نام ایک خط میں لکھا تھا "تلک ہندوستان میں برطانوی حکومت کا بہت بڑا مخالف ہے۔ گنپتی کا تہوار، شیواجی تقریبات، پیسہ فنڈ، نیشنل اسکول سب کا ایک ہی مقصد ہے۔ ہند سے برطانوی راج کا خاتمہ۔"

ضمانت کی درخواست چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ نے نامنظور کر دی محمد علی جناح نے جسٹس ڈاور کے اجلاس میں ضمانت کی درخواست پیش کی مگر وہ بھی نامنظور کر دی گئی۔ ۱۳ جولائی سے مقدمے کی سماعت ہوئی۔ انہوں نے اپنے مقدمے کی پیروی خود کی اور ۵ دنوں میں ۲۱ گھنٹے بولے۔ انہوں نے جیوری کے ممبروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "آج میں ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوں اگر آپ اصلاح چاہیں گے تو کل آپ بھی اسی کٹہرے میں ہوں گے۔ حکومت کی غلطیوں کی نشاندہی کرنا یا انتظامیہ میں اصلاحات کا مطالبہ کرنا بغاوت نہیں ہے۔ لوگوں کی آزادی کے لیے لڑنا اور حکومت کی تبدیلی کے لئے جدوجہد کرنا ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔"

وہ آزادی کا حق مانگ رہے تھے یہی ان کا سب سے بڑا جرم تھا جس کی سزا انہیں دی گئی۔ مانڈلے میں انہوں نے قید تنہائی میں ۶ سال گزارے

۱۶ جون ۱۹۱۴ء کو آدھی رات میں دو پولیس افسروں نے انہیں پونا میں ان کے گھر پہونچا دیا۔ قید کی مدت ختم ہو چکی تھی۔ یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ حکومت کا خیال تھا کہ اتنی دور اور اتنی دیر تک عوام سے الگ رہنے کی وجہ سے ان کا اثر ختم ہو گیا ہوگا مگر ان کے اعزاز میں جو استقبالیہ جلسہ ہوا وہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ان کی مقبولیت میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

تلک شدت سے اس بات کی مانگ کر رہے تھے کہ ہندوستان کا انتظام ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں ہونا چاہیئے جس طرح انگلستان کا انتظام انگریزوں کے ہاتھ میں ہے۔

اپنے اس خیال کو عملی شکل دینے کے لیے انہوں نے ۲۸ اپریل ۱۹۱۶ء کو ہوم رول لیگ کی بنیاد ڈالی۔ اور اپنے مقاصد کے پرچار کے لئے ہندوستان کے مختلف حصوں کا دورہ کیا۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں کانگریس کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا اور واجد علی شاہ کے قیصر باغ میں سینہ چاکان چمن آملے۔ انتہا پسندوں اور اعتدال پسندوں میں مفاہمت ہوگئی اور کانگریس نے ہوم رول سے ایک قدم آگے بڑھ کر سوراج کا مطالبہ پیش کیا۔ مگر ان سب کے جواب میں حکومت کی طرف سے جو مراعات دی گئیں وہ توقع سے کہیں کم تھیں۔

ملک میں سیاسی سرگرمیاں زوروں پر تھیں مگر تلک کو انگلستان جانا پڑا۔ سرویلنٹائن کیرول نے "انڈین ان ریسٹ" نامی کتاب میں تلک پر طرح طرح کے بہتان لگائے تھے۔ تلک نے اس کے خلاف انگلستان کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ وہ ۲۴ ستمبر ۱۹۱۸ء کو انگلستان روانہ ہوئے اور ۲۷ نومبر ۱۹۱۹ء کو وطن واپس آئے۔ سرویلنٹائن کیرول کو برطانوی حکومت اور بیوروکریسی کی حمایت حاصل تھی۔ لہٰذا تلک مقدمہ ہار گئے۔ مگر اس طرح برطانیہ کی انصاف پسندی کا پول بھی کھل گیا تھا۔

ہندوستان واپسی کے بعد وہ زیادہ دنوں زندہ نہیں رہے۔ کانگریس کے امرتسر کے اجلاس میں شریک ہوئے اور کارروائیوں میں سرگرم حصہ لیا۔

جولائی ۱۹۲۰ء میں بیمار ہوئے، بخار آیا اور مرض میں پیچیدگی پیدا ہوتی گئی اور بالآخر یکم اگست ۱۹۲۰ء کو یہ مہان سپوت اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔

لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک ملک کے چند عظیم رہنماؤں میں سے تھے۔ پہلے تلک اور پھر مہاتما گاندھی نے یہ ثابت کیا کہ ملک کی آزادی اسمبلی اور کونسل میں تقریروں، دستوری اصلاحوں اور اخباری بیانوں سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے قید و بند کی سختیاں جھیلنے اور ہر طرح کے ذاتی آرام و آسائش کی قربانی دینے کی ضرورت ہے۔

اردو کے ممتاز شاعر اور مجاہد آزادی مولانا حسرت موہانی نے انہیں منظوم خراج تحسین پیش کیا ہے۔ چند شعر پیش ہیں۔

تجھ سے قائم ہے بنائے آزادی بے باک کی — تجھ سے روشن اہل اخلاص و صفا کی انجمن
سب سے پہلے تو نے کی برداشت اے فرزند ہند — خدمت ہندوستاں میں کلفت قید محن
تو نے خودداری کا پھونکا ہے تلک ایسا فسوں — یک قلم جس سے مٹی خوشامد کی رسم کہن

چکبست نے وطن کا راگ گایا

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے — نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

اور یہ ترانہ سارے ہندوستانیوں کی دل کی آواز بن گیا۔

آج ملک آزاد ہے۔ اور یہ تلک جیسے رہنماؤں کا فیض ہے کہ ہم ایک آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی قربانیوں کو یاد رکھیں

بقیہ مجاہدین آزادی

خصوصاً ٹھاکر وشیشر سنگھ آزاد پر گولی چلا رہے تھے۔ ناٹ باور ہاتھ سے پستول چھوٹتے ہی ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گئے۔ آزاد بھی رینگ کر ایک درخت کی آڑ میں آگئے۔ آزاد کے پاس ہمیشہ کافی تعداد میں گولی رہتی تھی اور اس موقع پر انھوں نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا۔ آزاد نے اپنے ساتھی کو بھاگنے کا حکم دیدیا تھا اور سکھدیو راج نے ان کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ آزاد آخر کب تک لڑتے پھر بھی انھوں نے وشیشر سنگھ کے جبڑے پر ایسی گولی ماری جس سے وہ زندگی بھر کے لئے ناکارہ ہو کر رہ گیا اور اس کو وقت سے پہلے ہی پنشن لینی پڑی۔ ناٹ جس درخت کی اوٹ میں تھا آزاد جیسے اس پیڑ کو چھید کر اسے ہلاک کر دینا چاہتے تھے۔

ایسے ہی لڑتے لڑتے یہ عظیم مجاہد گر پڑا اور پھر ہمیشہ کے لئے سو گیا۔ لیکن جب آزاد شہید ہو چکے تھے تب بھی پولس کو ان کے پاس جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ وہ ڈرتے تھے کہ وہ مر کر بھی زندہ نہ ہو جائے اور ان پر گولی نہ چلا دے۔ جب آزاد کا جسم بڑی دیر بے حس و حرکت پڑا رہا تو وہ آزاد کی طرف بڑھے تاہم آگے بڑھنے سے پیشتر انھوں نے ان کے پاؤں میں ایک گولی مار کر اطمینان کر لیا کہ وہ مر گئے ہیں یا نہیں۔

آزاد کی لاش عوام کے حوالے نہیں کی گئی اور جب لوگوں نے ہندوستانی رسم و رواج کے مطابق اس درخت پر پھول چڑھانے شروع کر دیئے جن پر آزاد نے شہادت کے دن نشانہ بازی کی تھی تو برٹش سامراج نے اس درخت کو کٹوا کر اس نشان کو بھی مٹا دیا۔

بٹکیشور دت لگ بھگ دس سال جیل میں رہنے کے بعد رہا ہوئے اور ان کی وفات ۲۰ جولائی ۱۹۶۵ء کو دہلی میں میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں کینسر کے مرض سے ہوئی۔



بٹکیشور دت آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی میں

مگر وہ آخر دم تک بہت خوش رہے۔ انقلابی نے موت کو ہمیشہ زندگی کا ایک حصہ سمجھا ہے اور خوشی خوشی موت کو گلے لگایا ہے۔

ملک کے ان جاں نثاروں کے واقعات ہمارے لئے روشنی کا مینار ہیں۔ ان کی دیش بھگتی قربانی اور جذبۂ حریت ایک روشن اور تابناک حقیقت ہے جو صدیوں آنے والی نسلوں کو راستہ دکھاتی رہے گی۔

عبدالمجید درد بھوپالی
نزد بدھ واڑہ، بھوپال

بتیس نکات" (نظم) ۱۳ر مئی ۱۹۷۶ء کو وزیر اعظم ہند کی خدمت میں پیش کی گئی (تصویر میں) عبدالمجید درد صاحب نظم "بتیس نکات" پیش کر رہے ہیں۔

بتیس نکات



مُلک اور قوم کی آواز ہے اندرا گاندھی
بزمِ ہستی کا نیا ساز ہے اندرا گاندھی
یہ حقیقت ہے کہ اعجاز ہے اندرا گاندھی
اک نئی صبح کا آغاز ہے اندرا گاندھی

نخلِ احساس کی ہر شاخ میں پھل آئے ہیں
لوگ خم ٹھوک کے میداں میں نکل آئے ہیں
نوجوانوں سے ہے اس طرح وطن کی زینت
"جس طرح غنچہ و گل سے ہو چمن کی زینت"

تنگ ہو جائے نہ اک روز یہ بھارت کی زمیں
چار افراد کا کنبہ ہو تو گھر خلد بریں
ہم کو جینے کا یہ انداز سکھایا کس نے
امن و راحت کا یہ پیغام سنایا کس نے

سود کے بوجھ سے جو لوگ دبے رہتے تھے
ساہوکاروں کے شب و روز ستم سہتے تھے
اُن کو قرضوں سے سبکدوش کرایا کس نے
یہ نئے دور کا قانون بنایا کس نے

آ گیا مال چھپایا ہوا بازاروں میں
گھٹ گئے نرخ بڑھا جوش خریداروں میں
تاک کر تیر نشانہ پہ لگایا کس نے
ہم غریبوں کو لٹیروں سے چھڑایا کس نے

بات آئی ہے نئے قافلہ سالاروں میں
بے زمیں آج نظر آئے زمینداروں میں
پست طبقوں کو بلندی پہ چڑھایا کس نے
مذہب و نسل کے جھگڑوں کو مٹایا کس نے

کوئی بیگار کی لعنت سے پریشاں نہ رہا
آج مزدور کوئی چاک گریباں نہ رہا
جبر کے پنجۂ خونیں سے چھڑایا کس نے
دشتِ بے روح کو گلزار بنایا کس نے

موت کی طرح مسلط تھا غریبوں پہ جہیز
نبضِ احساس نہ تھی اہلِ نظر کی یوں تیز
رسمِ پارینہ کے راون کو جلایا کس نے
ظلم کی قید سے سیتا کو چھڑایا کس نے

وقت کے ساز کا سنگیت ہیں یہ "بیس نکات"
ہے نیا رنگ نیا روپ نئے ہیں دن رات
مفلسی ختم ہوئی دیش میں خوشحالی ہے
دن کو ہے عید ہر اک رات میں دیوالی ہے

بن گئی درد کے ماروں کا سہارا اندرا
ہند کی ڈوبتی نیا کا کنارا اندرا
شانتی آئی تشدد کا چلن ختم ہوا
رہنما جاگ اٹھے دورِ کہن ختم ہوا

کنور لال شرما کنول
آتما رام سناتن دھرم کالج نئی دہلی

آج کل

رشکِ چمن ہر ایک بیاباں ہے آج کل
کیا اہتمامِ فیضِ بہاراں ہے آج کل
قبضے میں اپنے عالمِ امکاں ہے آج کل
دنیا یہ حال دیکھ کے حیراں ہے آج کل
ہر سُو مفادِ عام نمایاں ہے آج کل
گُل کی طرح غریب بھی خنداں ہے آج کل
ہر سمت انبساط کا ساماں ہے آج کل
جس کو بھی دیکھیے وہی شاداں ہے آج کل
راہیں بھی کھل گئی ہیں ترقی کی ہر طرف
دشوار جو تھا کام وہ آساں ہے آج کل
اب دیکھنے کو بھی تو نہیں تیرگی کہیں
ہر ایک گھر میں جشنِ چراغاں ہے آج کل
صد شکر اپنی بھول کا احساس تو ہوا
جو دشمنِ وطن تھا پشیماں ہے
سچ پوچھیے تو ختم ہے اب غفلتوں کا دور
بے دار ہر مقام پہ انساں ہے آج کل
ہم اقتصادیات سے بھی پُر امید ہیں
یہ مصلحت بھی کار نمایاں ہے آج کل
اُس کی سلامتی میں ہے اپنی سلامتی
کیا خوب ہے جو اپنا نگہباں ہے آج کل
گُل پر شباب ہے تو کلی پر نکھار سے
صحنِ چمن بہار بداماں ہے آج کل
ہر سمت دل پذیر فضاؤں کو دیکھ کر
پھر نغمہ زن ہر ایک سخن داں ہے آج کل
پھولوں سے آبروئے چمن اے کنول ہی
کانٹوں کو بھی شعورِ گلستاں ہے آج کل

قوم پھر ہمت سے آگے بڑھنے لگی ہے

۱۹۷۵-۷۶ء

دستکاروں اور مزدوروں کو امداد

★ ہتھ کرگھوں پر تیار کپڑے کے جمع شدہ ذخیرے کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے ۲،۴ لاکھ روپے کی رقم فراہم کی گئی۔

★ ہتھ کرگھے کی صنعت کی ترقی اور اسے نئی زندگی دینے کے لئے ۳۱ ترقیاتی منصوبے اور برآمد کو فروغ دینے کے لئے ۲۰ مراکز زیر تشکیل ہیں

★ "جنتا" کپڑے کی کوالٹی اور دستیابی میں سدھار ہوا ہے۔ جولائی ۱۹۷۵ء سے اب تک کپڑے کی پرچون سپلائی کے مراکز کی تعداد بڑھ کر ۴۶۶۹۴ ہو گئی ہے۔ ان میں سے ۸۰ فیصد مراکز دیہی علاقوں میں ہیں۔

★ ملک بھر میں سڑکوں کے راستے ضروری اشیاء کی نقل و حمل کو آسان بنانے کے لئے ۱۱۸۱ سے زیادہ قومی پرمٹ جاری کئے گئے۔

★ صنعتوں میں مزدوروں کی شرکت کو قابل عمل بنانے کے لئے ۶۱۷ سے زیادہ اداروں، جن میں مرکزی پبلک سیکٹر کے ۷۴ ادارے بھی شامل ہیں، میں "شاپ کونسلوں" اور مشترکہ کونسلوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔

م۔ک۔ مہتاب
لکھمی پوری، روہتک روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۳

گذارشِ ما ہے

یہ انسانی فطرت ہے کہ آدمی اپنے ہر مطالبے کو جائز سمجھتا ہے۔ میں اس محلہ سے کمیٹی کا ممبر ہوں میرے پاس بہت سے لوگ آتے ہیں۔ اُن سب کے مطالبے ہوتے ہیں۔ جنہیں وہ جائز سمجھتے ہیں اور مجھے انہیں مطمئن کرنا پڑتا ہے

ہاں تو وہ باپ بیٹا دونوں میرے دروازے پر بیٹھے سردی سے کانپ رہے تھے۔ دونوں غربت اور عاجزی کی منہ بولتی تصویریں۔ باپ کے چہرے پر غربت نے وقت سے پہلے ہی جھریاں ڈال دی تھیں۔ اور بیٹے کی مسکین صورت، ویسے ہی قابلِ رحم تھی۔

باپ کے ہاتھ میں ایک مُڑا ہوا کاغذ تھا جو اُس کے ہاتھوں کے کانپنے کے ساتھ ساتھ لرز رہا تھا۔ لباس دونوں کا ہی ایک جیسا تھا یعنی سردیوں میں گرمیوں کا لباس۔ وہ دونوں ایک گھنٹے سے میرے دروازے کی دہلیز پر بیٹھے مجھ سے بات چیت کر رہے لوگوں کے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ جب میرے دوسرے ملاقاتی چلے گئے تو وہ باپ بیٹا میرے پاس آگئے اور میں نے اُن سے پوچھا۔

"ہاں بھئی ضمیر احمد کیا بات ہے؟"

"جناب! مُلّا کی دوڑ مسجد تک۔ آپ کے پاس بھی نہ آئیں تو پھر کہاں جائیں۔ یہ منظور آپ ہی بچہ ہے چوہدری صاحب۔ اس غریب کی کچھ مدد کر دیجئے میں ایک غریب کلرک ہوں۔ اس کا کیا بنا سنوار سکتا ہوں۔ میں تو اسے پڑھا بھی نہیں سکا۔ یہ اس کی درخواست ہے چوہدری صاحب۔ اس پر دو حروف سفارش کے لکھ دیجئے۔ میں اور میرے بچے عمر بھر آپ کے بچوں کو دعائیں دیتے رہیں گے۔

اور یہ کہتے ہوئے ضمیر نے درخواست میری میز پر رکھ دی۔ درخواست کمیٹی کے ایگزیکٹو آفیسر کے نام تھی۔ میں کمیٹی میں محلہ کا نمائندہ ہوں۔ محلّے کے کتنے ہی لوگ روز ایسی درخواستیں میرے پاس لاتے ہیں۔ اگر ضمیر احمد اپنے بیٹے کی درخواست لے آیا تھا تو اس میں کوئی بُرائی نہیں تھی مگر نہ جانے کیوں مجھے یہ درخواست اچھی نہیں لگی جیسے اس میں سے کوئی بدبو اُٹھ رہی ہو۔ میرا دل چاہا کہ یہ درخواست پھاڑ کر سردی سے کانپ رہے اس شخص کے منہ پر دے ماروں اور اُسے دھکے مار کر کمرے سے باہر نکال دوں بے شرم کسی جگہ کا کیا مسکین بن کر بیٹھا ہوا ہے جیسے اس کی ساری مصیبت میں نے یا کمیٹی نے ہی کھڑی کی ہو۔ اور عرضی بھی کیا مجھے دار زبان میں لکھ کر لایا ہے۔ جیسے عرضی کا ایک ایک حرف آنکھوں پہ ہی ہاتھ رکھ کر آنسو بہا رہا ہو۔

میں نے درخواست پر سفارش کے صرف دو حروف ہی لکھنے تھے کہ اس نوجوان کی حالت واقعی قابلِ رحم ہے اور درخواست ایگزیکٹو افسر کو بھیج دینی تھی۔ مگر میرے قلم نے یہ دو حروف بھی لکھنا گوارا نہ کیا۔ میں پھر درخواست پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

عزت مآب، غریب نواز۔

دست بستہ عرض ہے کہ میں ایک غریب باپ کا مسکین بیٹا ہوں، میٹرک تک تعلیم یافتہ ہوں میٹرک کا امتحان نہیں دے سکا کیونکہ میرے باپ کے پاس تعلیم کا خرچہ برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ اس کے سات بچے ہیں۔ وہ ایک معمولی درجے کا سرکاری ملازم ہے۔ بچوں کے لئے دو وقت کی روٹی کا انتظام بہت مشکل سے کرتا ہے۔ اس غربت اور بدحالی میں میں اپنے ماں باپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کمیٹی باغ کے قریب خالی زمین کا ایک ٹکڑا کرائے پر الاٹ کیا جائے۔ جہاں میں پان سگریٹ کی دکان چلا کر ان چھوٹے چھوٹے غریب بچوں اور اپنے ناتواں ماں باپ کی روزی روٹی میں کچھ مدد دے سکوں۔ اس مہربانی کیلئے اور ہمارے کنبے کے سب افراد آپ کے عمر بھر شکرگزار رہیں گے۔

عرضی فدوی

منظور احمد

ولد

ضمیر احمد

میں نے غصہ میں عرضی اٹھا کر ضمیر احمد کے منہ پر دے ماری۔

"لے جا اسے میں اس پر کوئی سفارش نہیں کر سکتا۔" ضمیر نے درخواست اٹھالی۔ وہ دونوں ہاتھ باندھے سردی سے کانپ رہا تھا اور آب دیدہ ہو کر کہہ رہا تھا۔

"حضور غریب نواز۔ ہم سے کیا قصور ہوا ہے۔ ہم بہت غریب آدمی ہیں۔ خدا اور آپ کے سوا ہمارا اور کونسا سہارا ہے۔ چوہدری صاحب ہم غریبوں کا آپ کو ہی خیال رکھنا ہے۔ ہم اور کس کے در پر جا سکتے ہیں۔ یہ ہماری زندگی موت کا سوال ہے۔ مہنگائی نے ہماری کمر توڑ دی ہے۔ بچے کئی بار رات کو بھوکے ہی سو جاتے ہیں۔ خدا کے لئے ان غریبوں کے سر پر اپنی شفقت کا ہاتھ رکھیے۔ منظور میٹرک نہیں کر سکا۔ اُسے کہیں ملازمت نہیں مل سکتی اسے کمیٹی کی زمین کا ایک ٹکڑا الاٹ کرا دیجئے۔ میں اسے وہاں کرایہ کا ایک اسٹال بنوا دوں گا۔ ہماری روٹی کا وسیلہ بن جائے گا چوہدری صاحب۔ بچے پیٹ بھر کر کھائیں گے آپ کے بیوی بچوں کو دعائیں دیں گے۔

(بقیہ صفحہ ۲۹ پر)

کے۔ آر۔ پوری
گورنر ریزرو بنک آف انڈیا، بمبئی۔

بنک ـــــ عوام کی امیدوں کا مرکز

جولائی ۱۹۶۹ء میں ۱۴ بڑے بنکوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا تھا اس کے بعد سے بنکوں کے کام اور اُن کے نقطۂ نظر میں بنیادی تبدیلی آئی اور معیار اور تعداد دونوں لحاظ سے ان میں نمایاں ترقی ہوئی۔ بنکوں کی نئی شاخیں جس تیز رفتاری سے ہندوستان میں کھلی ہیں اتنی کسی اور ملک میں نظر نہیں آتیں۔ ہمارے ملک میں روزانہ اوسطاً پانچ نئی شاخیں قائم کی گئی ہیں۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۶ء کے دوران مجموعی طور پر کل ۷۷ ۱۲۶ نئی شاخیں کھولی گئی ہیں جن میں سے ۵۹۰۰ شاخیں ایسے مقامات پر کھولی گئی ہیں جہاں بنک کی کوئی سہولت دستیاب نہیں تھی۔

بنکوں کی زیادہ تر شاخیں دیہی علاقوں میں کھولی گئی ہیں جن سے بنکوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی نئی ذمہ داریوں کا پتہ چلتا ہے۔ اپریل ۱۹۷۶ء کے اختتام تک دیہی علاقوں میں واقع بنکوں کی مجموعی تعداد تقریباً ۷۰۵۰ تک پہونچ چکی تھی جبکہ جون ۱۹۶۹ء میں دیہی بنکوں کی کل تعداد ۱۸۳۲ تک محدود تھی۔ تجارتی بنک عوام کی زندگیوں میں کس قدر سرایت کر چکے ہیں اس کا اندازہ ان بنکوں میں کھولے گئے قرض کھاتوں کی تعداد سے لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں قرض کھاتوں کی کل تعداد صرف دس لاکھ تھی جو اب بڑھ کر ۶۵ لاکھ کے قریب پہونچ چکی ہے۔ اسی طرح ان بنکوں میں ڈپازٹ کھاتوں کی تعداد اس وقت پانچ کروڑ ہے جبکہ جون ۱۹۶۹ میں یہ تعداد محض ایک کروڑ تھی۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے بیس نکاتی اقتصادی پروگرام میں جن شعبوں اور سرگرمیوں کی نشاندہی کی گئی ہے ان کو مالی امداد مہیا کرنے کے ضمن میں پہلے ہی کافی پیش رفت حاصل کی جا چکی ہے۔ اشیائے ضروریہ کی حصولیابی اور تقسیم کے لئے امداد، زمین پانے والے بے زمین مزدوروں کی معاونت، آزاد کئے گئے بندھوا مزدوروں کی مدد، دیہی علاقوں میں مہاجنی قرضے کی وصولی پر پابندی کی وجہ سے قرض کے ضمن میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کو پُر کرنے کے لئے قرض کی سہولیات، بنکروں اور قومی سڑک ٹرانسپورٹ کے پرمٹ پانے والوں کی امداد، غریب طلبہ کو رہائشی خرچوں پر کتابیں وغیرہ فراہم کرنے کی غرض سے مالی امداد ـــ یہ تمام تر ذمہ داریاں ہمارے قومی بنک انجام دے رہے ہیں۔

بچت کے فروغ کے سلسلے میں بھی تجارتی بنکوں نے نمایاں پیش رفت حاصل کی ہے۔ جون ۱۹۷۶ء کے اختتام کے وقت ان بنکوں میں مجموعی طور پر ۱۵۰۰۰ کروڑ روپے سے بھی زیادہ رقم جمع تھی جبکہ سات سال قبل بنکوں میں جمع شدہ رقم صرف ۴۶۰۰ کروڑ روپے تک محدود تھی اس کا مطلب یہ ہے کہ اس عرصے میں بنک میں جمع شدہ رقم میں ۲۲۵ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ شیڈولڈ تجارتی بنکوں کی فی کس ڈپازٹ کی حد جو جون ۱۹۶۹ء میں ۸۶ کروڑ روپے تھی، اس وقت بڑھ کر ۲۴۵ کروڑ روپے تک پہونچ چکی ہے۔ قومی آمدنی میں ان بنکوں میں جمع شدہ رقوم کا حصہ (موجودہ قیمتوں کی سطح پر) ۱۵ فیصد سے بڑھ کر اب ۲۵ فیصد ہو گیا ہے۔ اسی طرح بنکوں سے قرضوں کی فراہمی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ جون ۱۹۶۹ء میں تجارتی بنکوں کی طرف سے کل ۳۶۰۰ کروڑ روپے کے قرضے فراہم کئے گئے تھے جبکہ جون ۱۹۷۶ء تک بنکوں کی طرف سے دیئے گئے قرضوں کی رقم ۱۱۵۰۰ کروڑ کے قریب پہونچ چکی ہے۔ ان بنکوں نے ترجیحی اور دوسرے شعبوں کو جن سے پہلے بے اعتنائی برتی جاتی رہی تھی، مثلاً زراعت، چھوٹی صنعتوں اور اس طرح کے دیگر شعبوں کو مالی امداد مہیا کرنے میں کافی پیش قدمی کی ہے۔ جون ۱۹۶۹ء میں ان شعبوں کو مجموعی طور پر کل ۴۴۰ کروڑ روپے کے قرضے دیئے گئے تھے جبکہ اپریل ۱۹۷۶ء میں ان شعبوں کو فراہم کئے گئے قرضوں کی رقم ۲۷۰۰ کروڑ روپے کے قریب پہونچ چکی ہے یعنی اس عرصے میں ان شعبوں کے لئے قرضے کی فراہمی میں پانچ گنا اضافہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ برآمدات کے لئے بھی ۱۰ فیصد کی حد تک قرضے فراہم کئے گئے ہیں جن میں ۹۸۰ کروڑ روپے واجب الادا قرضے اور خوراک کی سرکاری وصولی کے لئے ۱۵۷۵ کروڑ روپے کی مالی امداد شامل ہے۔

زراعت: گزشتہ سات برسوں کے دوران زرعی کاموں کے لئے دیئے گئے قرضوں میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ جون ۱۹۶۹ء میں زراعتی شعبے کو کل ۱۸۸ کروڑ روپے کے قرضے فراہم کئے گئے تھے جو بنکوں کی طرف سے فراہم کئے گئے مجموعی قرضوں کے ۵٫۲ فیصد کے برابر تھے۔ اپریل ۱۹۷۶ء میں اس شعبے کو کل ۹۸۰ کروڑ روپے کے قرضے دیئے گئے جو بنکوں کی طرف سے فراہم کئے گئے مجموعی قرضے کے ۹٫۴ فیصد کے برابر ہیں۔ تجارتی بنک ابتدائی زرعی کریڈٹ سوسائٹیوں کو بھی مالی امداد دیتے ہیں۔ مارچ ۱۹۷۶ء کے اختتام کے وقت ان سوسائٹیوں کو مختصر مدتی اور وسط مدتی نوعیت کے کل ۲۷ کروڑ روپے کے قرضے مہیا کئے گئے۔ اگرچہ تجارتی بنکوں نے مقررہ مقاصد کے حصول میں کامیابی حاصل کی ہے تاہم ملک کی معاشی ترقی کا ایک موثر ذریعہ بننے میں ابھی وقت لگے گا۔ دیہی مرکزوں میں کافی بڑی تعداد میں بنک کے نئے دفاتر اور ۴۷ علاقائی دیہی بنکوں کے قیام کے باوجود دیہات میں ابھی ایسے بہت سے علاقے باقی ہیں جہاں بنک کی

سہولیات کا انتظام کرنا ہے۔ چنانچہ دیہی علاقوں میں بنکوں کی نئی شاخوں کے قیام کا کام اور بھی بڑے پیمانے پر شروع کیا جانا چاہیئے۔ اس کام کی انجام دہی میں تجارتی بنکوں اور ریاستی سرکاروں کو مل جل کر کوشش کرنی ہوگی۔

چھوٹے اور غریب کسانوں نیز زرعی مزدوروں کے لئے قرضے کی سہولیات کو فروغ دینے کی کافی گنجائش ہے۔ ۲۰ نکاتی اقتصادی پروگرام کے پیش نظر یہ کام اور بھی اہم ہے کیونکہ اس پروگرام میں ہمارے دیہی سماج کے کمزور طبقوں کی فلاح وبہبود پر خاص زور دیا گیا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے زرعی زمین کی حد ملکیت، فاضل زمین کی فوری تقسیم، زمین سے متعلق ریکارڈ کی درستگی، بے زمین اور کمزور طبقوں کو مکان بنانے کے لئے زمین کی فراہمی، بندھوا مزدوروں کی آزادی وغیرہ کے لئے مؤثر اقدامات کئے گئے ہیں۔ ان اقدامات پر مؤثر عمل درآمد اسی وقت ممکن ہے جب چھوٹے اور غریب کسانوں نیز بے زمین مزدوروں کے لئے قرضے کی سہولیات میں مناسب اضافہ کیا جائے۔

صنعت: نئی سماجی اور معاشی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے وقت بنکوں کو تجارت وصنعت کے پہیے کو مسلسل متحرک رکھنے کی بنیادی ضرورت سے غافل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لئے ضروری ہے کہ صنعتی اور تجارتی شعبہ کے لئے قرضے کی سہولیات بڑھائی جائیں تاکہ پیداوار میں اضافہ کیا جا سکے۔
چنانچہ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم پیداواری سرگرمیوں کے لئے خواہ وہ چھوٹے پیمانے کی ہوں یا بڑے پیمانے کی زیادہ سے زیادہ قرضے کی سہولت مہیا کریں۔

تجارتی بنکوں کے شانے پر اس وقت نئی اور اہم ذمہ داریوں کا جو بوجھ آن پڑا ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک انتہائی تربیت یافتہ افرادی قوت کی ضرورت ہے۔ ۱۹۷۰ء میں تجارتی بنکوں کے عملے کی مجموعی تعداد دو لاکھ ۳۰ ہزار کے قریب تھی جو دسمبر ۱۹۷۴ء تک بڑھ کر تین لاکھ ۴۷ ہزار ہوگئی۔ بنک سے متعلق کمیشن کے اندازے کے مطابق ۱۹۸۰ء تک بنک کے ملازمین کی تعداد بڑھ کر ۴ لاکھ ۹۰ ہزار ہو جانے کی امید ہے۔

بنکوں کی مدد سے بازار پر خریداروں کا اثر ہی بنک کاری کی موجودہ پالیسی کا مقصد ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسے یوں کہا جاسکتا ہے کہ خریداروں یا صارفوں کے مفاد کا تحفظ کیا جائے اور قیمتی مال تیار کرنے والوں اور فروخت کرنے کے رحم وکرم پر نہ ہوں۔ اس کے لئے قیمتوں سے متعلق پالیسی نیز منافع اور پیداوار سے متعلق حکمت عملی میں کافی مطابقت پذیری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے پیداوار کے سبھی عناصر یعنی سرمایہ، محنت اور حکومت کو موثر طور پر کام کرنا ہوگا۔ ایسی صورت میں بنک منصوبوں میں مطابقت پذیری کے عمل میں سرگرمی سے ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ بنکوں کو روایتی انداز سے ہٹ کر ان اداروں کے جن کو وہ مالی امداد دیتے ہیں، مالی صلاح کار خدمات انجام دینی چاہئیں۔ اس طرح تجارتی بنک مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں۔

بقیہ گزارش ہے

اور اُس نے پھر عرضی میرے سامنے رکھ دی۔ وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ آنکھوں میں سچے آنسو بھی تھے۔ مگر مجھے اُس کی اِس بے بسی پر کوئی رحم نہیں آ رہا تھا۔ میں نے عرضی اُٹھا کر پھر اُس کی طرف پھینک دی۔

"لے جا اِسے"

"سرکار ہم سے کیا قصور ہو گیا ہے؟ آپ تو محلے کے تمام لوگوں کے کام کر دیتے ہیں۔ ہم غریبوں پر بھی رحم کیجئے۔ یہ چھوٹے چھوٹے بچے آپ کو دعائیں دیں گے۔ خدا آپ کا اقبال بلند کرے گا۔"

"چوہدری صاحب! اگر زمین نہیں مل سکتی تو مجھے کمیٹی میں کوئی اور کام ہی دلا دیجئے۔ میں کمیٹی کا حقیر سے حقیر کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ہم بہت بُری حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں چوہدری صاحب" اب منظور ہاتھ جوڑے عرض کر رہا تھا۔
"ضمیر احمد بات سنو،" میں نے اس لڑکے کے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"مجھے سفارش کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر میں اس درخواست پر سفارش نہیں کر سکتا،"

"کیا ٹائپ کرا کے لاؤں؟"
"نہیں نئی عرضی لکھ کر لاؤ"
"آج صبح دفتر سے لکھ کر لے آؤں گا"
"نہیں نہیں۔ یہاں ہی میرے سامنے لکھو" تم نہیں تمہارا بیٹا خود لکھے تو میں اس پر سفارش کر دوں گا۔ یہ لو کاغذ اور یہ میرا قلم لے لو"
"مگر چوہدری صاحب اسے عرضی لکھنی نہیں آتی ہے"
"کوئی بات نہیں۔ میں لکھواتا ہوں۔ لکھو منظور اٹھاؤ قلم اور کاغذ"
منظور نے قلم اٹھا لیا اور درخواست لکھنے لگا۔ لکھو۔
"گزارش ہے۔
کہ میں ایک میٹرک تک تعلیم یافتہ بے کار نوجوان ہوں مجھے کام کرنے کی لگن ہے اور میں اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو کر آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ مگر میرے پاس اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے ذرائع نہیں ہیں۔ میرے باپ نے صرف غریبی کی جائیداد وراثت میں دی ہے۔ وہ دنیوی دولت اکٹھی کرنے کی بجائے اولاد کی دولت جمع کرتا رہا ہے۔ وہ مجھے تعلیم نہیں دلا سکا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں وہ غلطی نہیں کروں گا جو میرے باپ مسمّی ضمیر احمد نے کی ہے۔ میں اپنے بہن بھائیوں کی مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھ میں کام کرنے کی ہمت ہے اور میں محنت سے غربت کی وہ زنجیر کاٹ دینا چاہتا ہوں جو میرے باپ نے میرے پاؤں میں ڈال دی ہے۔ میں اسے سماج کا مجرم سمجھتا ہوں۔
مجھے کمیٹی کی زمین کا ایک ٹکڑا الاٹ کیا جائے۔ جہاں میں کوئی چھوٹا موٹا کام شروع کر سکوں۔ مہربانی ہوگی۔
فدوی۔ منظور احمد
میں منظور کی عرضی پر پُر زور سفارش کے الفاظ لکھ رہا تھا۔ اور ضمیر احمد پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔

قوم پھر ہمّت سے آگے بڑھنے لگی ہے

1975-76

بجلی کی پیداوار میں اضافہ

7,97,640 لاکھ یونٹ بجلی پیدا کی گئی، پہلے کبھی اتنی بجلی تیار نہیں ہوئی۔
ایک دن میں 2,600 لاکھ یونٹ بجلی تیار کرنے کا نیا ریکارڈ۔

25 نئے بجلی گھروں میں 1,800 میگا واٹ بجلی تیار کی گئی۔ ان میں سے 20 بجلی گھروں میں ستمبر 1975 اور مارچ 1976 کے درمیانی عرصے میں بجلی تیار ہوئی۔

اس سال مزید 20,50,000 ہیکٹر رقبہ زمین کے لیے سینچائی کی سہولتیں میسر آنے کی توقع ہے۔

6,356 دیہات میں بجلی مہیّا کی گئی جس سے بجلی والے دیہات کی گنتی 1,74,079 ہو گئی۔ 1,40,000 پمپ سیٹ چالو کیے گئے

خان غازی کابلی
کوچہ رحمان۔ دہلی ۶

میری تصانیف:
۱۔ محمد امین بخاری ۲۔ ظفر علی خاں کی گرفتاری ۳۔ حیاتِ بخاری
۴۔ حیاتِ افضل حق ۵۔ تحریک خدائی خدمتگار
شعری مجموعے:
۱۔ جے ہند ۲۔ خروشِ عشق ۳۔ سرخ پھول

"پسِ محملِ غبار میں"

[پیدائش ۱۸۸۵ء موضع "دراگی" ضلع خوست، پاکتیا، افغانستان۔ والد کا نام ملک عبدالرحیم خان۔ قومی شاعر، سیاسی کارکن، ۱۹۱۹ء کے "رولٹ ایکٹ" ایجی ٹیشن میں حصہ لیا۔ ۱۹۲۱ء کی تحریک ترک موالات میں شامل رہے۔ ۱۹۳۰ء کی نمک ستیہ گرہ میں شریک ہوئے۔ ۱۹۳۳-۳۴ء کی تحریک سول نافرمانی میں پیش پیش رہے۔ ۱۹۳۹ء میں جنگ کے خلاف احرار ایجی ٹیشن میں شامل تھے۔ ۱۹۴۲ء کی تحریک "ہندستان چھوڑو" میں بھی شامل ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں گرفتار ہوئے۔ اٹک، راولپنڈی اور میاں والی کی جیلوں میں ایک سال قید و بند کی مصیبت جھیلی۔ ۱۹۲۱ء میں شہزادہ ویلز کی آمد پر ٹیکسلا اور حسن ابدال کے درمیان ٹرین سے ایک سال کے لیے گرفتار ہوئے ایک ماہ کے بعد چھوڑ دیے گئے۔ پھر ۱۹۳۲ء میں دردو نی میران شاہ (ٹوچی پولیٹکل ایجنسی) میں گرفتار کیے گئے اور ایک سال کی قید عیدک فورٹ، پھر بنوں، ڈیرہ اسماعیل اور ٹانک کی جیلوں میں کاٹی۔ ۱۹۳۵ء میں سیاسی سرگرمیوں کے جرم میں کوئٹہ سے اخراج عمل میں آیا۔ ۱۹۳۹ء کے دوران روپوش رہے اور احرار تحریک چلاتے رہے۔ بعد میں آزادیِ مادرِ وطن کے لیے طلبا کی کانفرنس میں شامل ہو کر کام کیا۔"
(ہمواز ہند ص ۲۱۲ مؤلفہ پربھا چوپڑہ شائع کردہ دہلی انتظامیہ ۱۹۷۴ء]

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی ایک کتاب کا نام "غبارِ خاطر" فارسی کے ایک شعر سے مستعار لیا تھا۔ اور میں نے اپنے ایک شعر کی بنا پر اپنی کتابِ زندگی کا نام "پسِ محملِ غبار میں" رکھا ہے۔ شعر یوں ہے:-

لیلیٰ کو دشتِ نجد میں تنہا نہ جانیے
مجنوں بھی ہے نہاں پسِ محمل غبار میں

چنانچہ اس مضمون کو اسی پسِ محمل غبار کا ایک باب سمجھنا چاہیے۔

افغانستان کے تمام افغانی دو بڑے گروہوں میں تقسیم ہیں ایک گروہ کا نام "غلجہ" ہے اور دوسرے کا نام "کرلا" ہے۔ میرا تعلق دوسرے اہم اور بڑے گروہ "کرلا" سے ہے جس سے وابستہ قبیلے "کرلانی" کہلاتے ہیں۔ میں افغانوں کے جس قبیلے سے ہوں اس کا نام "تنی" ہے اور یہ کرلانی قبیلوں میں سے سب سے کم تعداد قبیلہ ہے۔

میری پیدائش دراگی میں کب ہوئی اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ تنیوں میں حیات و موت کے اندراج کا کوئی رواج نہیں۔ مشہور ہے کہ ایک ہندوستانی برٹش سرکار کی ملازمت کے گناہ میں تنیوں کا اسیر یا خوش قسمتی سے قیدی بنا اور اپنی سالگرہ کے موقع پر اپنے تنی آقاؤں سے درخواست کی کہ چونکہ آج اس کا جنم دن ہے اس لیے اسے منانے کی غرض سے آج کے لیے آزاد کر دیا جائے۔ اس کے جواب میں تنیوں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ آج تمھاری پیدائش کا دن ہے کیا تم اپنے پیدا ہونے کے دن سے لے کر اب تک کے دن شمار کیا کرتے تھے۔

اس طرح مجھے بھی معلوم نہیں کہ میں کب پیدا ہوا تھا اور اب کب اور کہاں مرنا ہے ہاں اتنا معلوم ہے کہ جب میں نے ہوش سنبھالا تھا تو افغانستان داخلی خلفشار کا شکار رہا۔ انگریز براہ ٹوچی دراگی



شری رادھا رمن چیف ایگزیکٹو کاؤنسلر دہلی، جناب خان غازی کابلی کو تامر پتر پیش کر رہے ہیں

اور افغانستان پر حملوں کے منصوبے بنا رہے تھے اور تنی بہادری کے گیت رباب پر اور تلواروں کے رقص کے ساتھ گایا کرتے تھے۔

اس زمانے کے اندازے سے اور قیاس سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری پیدائش ۱۸۸۵ء کے آس پاس ہوئی ہوگی

میرے والد کا نام ملک عبدالرحیم خان عرف خان پیر احمدی ہے اور والدہ کا نام لونگہ نیازی ہے۔ والد نے حبیب الرحمٰن نام رکھا تھا لیکن میری والدہ میری آنکھوں کی خوبصورتی کی نسبت سے مجھے "شاہ نین" کہہ کر یاد کیا کرتی تھیں۔ لیکن جب میرا تعلق وزیرستان کے مشہور مجاہد غازی موسیٰ خان مسعود کے غازیوں سے ہوا تو اپنے ساتھیوں میں غازی کہلانے لگا اور جب ہندوستان آیا تو خوبان ہند اور مجاہدین آزادی نے میرے نام کے ساتھ "خان اور کابلی" کے لفظوں کا بھی اضافہ کر دیا۔ اور اب والد اور والدہ کے رکھے ہوئے ناموں سے مجھے کوئی نہیں جانتا اور شعر و ادب اور سیاسی دنیا میں "خان غازی کابلی" کے نام سے مشہور ہوں بقول مولانا حسرت موہانی :

عشق نے جب سے کہا حسرت مجھے
کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

پہلے میرے چچا اور پھر میرے والد ملک عبدالرحیم خان مستقل طور پر قادیان ہجرت کر گئے تھے۔ اور میرا بھی اکثر قادیان آنا جانا ہوتا تھا میری والدہ امیر عبدالرحمٰن کے عہد میں ہی فوت ہو گئی تھیں۔ میرے چھوٹے بھائی کا نام مولانا خلیل الرحمٰن مولوی فاضل ہے۔ اور ان دنوں پشاور میں ہیں۔ لیکن میں ہمیشہ ہی سرکش رہا اور میری اس سرکشی کا میرے والد کو مرتے دم تک غم اور افسوس رہا لیکن اس کے باوجود انھیں مجھ سے بڑی محبت تھی اور کہا کرتے تھے کہ میرا نام ہمیشہ اس جاہل اور سرکش بیٹے کی بدولت ہی زندہ و پائندہ رہے گا۔

غازی موسیٰ خان مسعود کی رفاقت میں ایک مرتبہ انگریزوں سے لڑتے ہوئے گرفتار ہو کر جیدک کے قلعہ میں بند ہوا تو بظاہر رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی لیکن قلعہ میں ایک انگریز لڑکے مسٹر فریزر سے دوستی قائم ہوئی تو قلعہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا اور جب اپنے وطن جا رہا تھا تو یاغستان کے وزیریوں کے ایک گروہ کے ہاتھ لگا جو اس زمانے میں "ماچاڑ" کہلاتا تھا

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اُڑنے نہ پایا تھا کہ گرفتار پھر ہوا

"ماچاڑ" اور خوست کے تورکندی قبیلے "سال خیل" سے تینوں کی ہمیشہ دشمنی رہی ہے اور میری یہ گرفتاری اسی دشمنی کے سبب عمل میں آئی تھی۔ ایک احاطے میں لکڑی میں میرا پاؤں پھنسا دیا گیا تھا جس کی وجہ سے قیدی ہل جل نہیں سکتا تھا۔ چونکہ میری آنکھیں بے حد خوبصورت تھیں چنانچہ اپنی خوبصورت آنکھوں اور اپنی قومی روایات کی بدولت دوران قید ایک "ماچاڑنی" سے دوستانہ روابط قائم ہوئے اور ایک دن جب "ماچاڑ" کہیں باہر گئے ہوئے تھے اس نے میرا پاؤں لکڑی سے نکالا۔ اور میں بھاگ کر اپنے وطن دراگی پہنچا۔ یہ ماچاڑنی "خود کو شرینو" اور مجھے "مومن خان" کہا کرتی تھی۔ "شرینو" اور "مومن خان" کی محبت کا افسانہ افغانی افسانوں میں لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے افسانوں کی طرح شہرت رکھتا ہے۔

افغانوں کو "سپاہ فرنگ" یعنی انگریزوں سے سخت نفرت تھی اس لیے غازی موسیٰ خان کے مجاہد اُن سے جہاد کرنا اور انھیں ہر ممکن ذریعہ سے نقصان پہنچانا اسلامی فریضہ سمجھتے تھے بلکہ افغانی غیرت کا نشان و تقاضا بھی جانتے تھے۔ اس کے مقابلے میں افغانی ہندوؤں کو اپنی عزت اور ناموس کا نشان سمجھتے تھے کوئی کسی ہندو کے متعلق معاندانہ رویہ کا اظہار کرتا تھا تو اس کے جواب میں دوسرا افغان کہتا "چپ شہ دا لیسہ زاد مینگ ہندو دی" "زبان کو بند کرو دیکھو یہ ہمارا ہندو ہے"۔ میں نے اپنے بچپن میں دیکھا ہے کہ دراگی کے بازار میں تنی جلوس کی صورت میں تلواروں کا رقص کرتے اور ڈھول بجاتے آ رہے ہیں۔ ایک ہندو جو سر پہ کیسری رنگ کی پگڑی باندھے تھا اور اس کے گلے میں نرگسوں کے پھولوں کے ہار تھے، جلوس میں رواں دواں تھا۔ تنی اسے کئی جوانوں کی قربانی دے کر دشمنوں کی قید سے چھڑا کر لائے تھے یہ جلوس اسی خوشی میں نکلا تھا پاکتیا میں ہندوؤں کا رنگدار لباس ہوا کرتا تھا افغانوں کا روغنی اور سلیٹی رنگ کا اور مولویوں کا لباس بالکل سفید ہوا کرتا تھا اور ہاں اس زمانے میں افغانستان کا روپیہ بھی ایک ہندو دیوان نند رام کی نسبت سے "نند رامی" کہلاتا تھا لیکن عہد امانی میں رنگ اور لباس کے امتیاز سب ختم ہو گئے تھے اور روپیہ بھی افغانی کہلانے لگا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران جب راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ بھوپالی براہ ہرات افغانستان آئے تو مجھے احساس ہوا کہ افغانستان اور تمام ایشیائی ملکوں کی آزادی کا راز ہندوستان کی آزادی میں مضمر ہے اس احساس کے ساتھ میں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے سوچنا شروع کیا۔ یاد رہے کہ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس زمانے میں مولانا حسرت موہانی جیسے سر پھرے لوگ انقلابی آزادی کے لیے سرگرم تھے مولانا برکت اللہ اور راجہ مہندر پرتاپ کا تعلق ان ہی سر پھروں سے تھا اور میں نے ان ہی "سر پھروں" سے تحریک حاصل کی تھی۔ یہ زمانہ ۱۹۱۴ء کا یعنی پہلی جنگ عظیم کا تھا۔

راجہ مہندر پرتاب جن کا شمار ان دنوں اگلے وقتوں کے لوگوں میں ہوتا ہے اُس زمانے میں ایشیا اور ہندوستان کی آزادی کے نہایت پرجوش مجاہد تھے انھوں نے افغانستان میں ہندوستان کی عارضی آزاد حکومت بھی قائم کی تھی۔

میں دوسری جنگ عظیم کے دوران جب مہاراجہ مہندر پرتاپ اور ہندوستانی انقلابیوں کی مجاہدانہ سرگرمیوں سے تحریک حاصل کر کے ہندوستان آیا تو پشاور میں گھنٹہ گھر کے قریب پیر مقبول شاہ کے ہاں مقیم ہوا۔ دو مرتبہ حسن ابدال اور پنجہ صاحب میں گرفتار ہوا۔ دونوں مرتبہ ہی اٹک قلعہ راولپنڈی

اور میاں والی جیل کی سیر کی پیٹک کے قلعہ میں ایک مرتبہ میرے رفیق گوروں کے بارک میں کامریڈ لکھی چند مہرہ سرحدی بھی تھے۔ جو ان دنوں لاجپت نگر میں رہتے ہیں۔ تامر پتر والے مجاہد ہیں اور پنشن پا رہے ہیں۔ جب میں گرفتار ہو کر اٹک کے قلعہ میں پہنچا تھا تو مجھ سے پہلے مہرہ صاحب موجود تھے اور ان سے پشتو میں گفتگو شروع ہوئی۔ ہم نے قلعہ میں دریائے سندھ کی جانب سوراخ کر کے بھاگنے کی سازش کی جس کا بہت جلد حکام کو پتہ چل گیا۔ اس وجہ سے مجھے راولپنڈی اور پھر میانوالی بھیجا گیا اور پھر کچھ عرصے کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ میانوالی جیل میں جب دوسری مرتبہ لے جایا گیا تو اس وقت اگرچہ میں اردو لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتا تھا اور جیل میں میری حیثیت ایک وحشی کی سی تھی تاہم اس جیل میں جو مجاہد تھے وہ سیاست کے ساتھ ادب کا مذاق بھی رکھتے تھے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا احمد سعید دہلوی کا "آشفتہ حالوں" میں شمار ہوتا تھا اور مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا اختر علی خاں کا شمار شاہدان نازک خیالاں میں۔ اس محفل خوباں میں میری حیثیت "برہم زن محفل" کی سی تھی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میری پہلی جیل یاترا جنگ کے زمانے میں ہوئی تھی اور رہائی کے وقت جشن فتح منایا جا رہا تھا۔ میری جیل سے رہائی کے بعد امیر حبیب اللہ خاں جلال آباد میں ہلاک کر دیئے گئے اور غازی امان اللہ خاں تخت کابل پر جلوہ افروز ہوئے تھے۔ اور اس وقت افغانستان برٹش اقتدار سے آزاد ہو کر عروس آزادئ کامل سے ہمکنار ہوا۔

اگرچہ میرے خیال میں ہندوستان کی آزادی تمام آزادیوں سے مقدم تھی لیکن میں نے افغانستان کی آزادی میں بھی میرام شاہ اور شمالی وزیرستان کے محاذوں پر حصہ لیا اس لیے کہ افغانستان کی آزادی سے ہندوستان کی تحریک آزادی کو تقویت حاصل ہوتی تھی۔ افغانستان آزاد ہوا تو انگریز اور افغان نمایندوں کی پہلی ملاقات راولپنڈی میں ہوئی جس کے قائد مرحوم سردار علی احمد جان تھے اور اس وفد میں سردار نرنجن داس بھی تھے۔ انگریزوں نے سردار نرنجن داس کی شمولیت پر کچھ برہمی کا اظہار کیا لیکن غازی امان اللہ خاں نے کہا کہ یہ افغانی ہیں اور ان کے بغیر گفتگو مصالحت بے معنی ہے۔ دوسری ملاقات مئی ۱۹۲۰ء میں بمقام مسوری ہوئی۔ اس وفد کے قائد سردار محمود طرزی وزیر خارجہ تھے اور دوسرے ارکان خان غلام محمد خاں وزیر تجارت، دیوان نرنجن داس، عبدالہادی خاں مدیر "امان افغان" اور کرنیل پیر محمد خاں تھے۔ اس زمانے میں پنڈت جواہر لال نہرو مسوری میں تھے، میں بھی آوارہ گردی کرتے ہوئے مسوری پہنچا تھا۔ اس افغانی وفد کی تفریح طبع کے لئے نواب جان چتلی آف علی گڑھ کے رقص کا ایک ہزار روپیہ شب کی فیس پر انتظام ۱۹ر مئی ۱۹۲۰ کو کیا گیا تھا۔ وفد کے ایک رکن خان غلام محمد خان وزیر تجارت نے جو نہایت ہی صوفی منش تھے نواب جان کی زبانی صوفیانہ غزلیں سن کر اس کی خواہش پر ایک تمغہ بھی پیش کیا دوسرے روز محمد حسین نگینہ والے کو بلایا گیا اور تیسرے روز خورشید لکھنو والی آ پہنچی۔ اسی دوران انگریزوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو مسوری خالی کرنے کا حکم دیا تھا۔ اخبار "رعیت" نے حکام مسوری کی اس حرکت پر ایک لطیفہ لکھا جس کا عنوان تھا "پنڈت سے کہا جاؤ رنڈی سے کہا آؤ"۔ اس زمانے میں پنڈت جواہر لال نہرو یا مہاتما گاندھی کا پیغام بھی افغان وفد کو اخبارات کے ذریعہ پہنچا تھا۔

"حکومت حاضرہ ہندوستان کی ۳۲ کروڑ باشندوں کی نمایندہ نہیں ہو سکتی، انگریز ایک سرمایہ دار قوم ہے اور ہندوستان کے اغراض و مقاصد کو اپنے مفاد پر قربان کر دیتی ہے۔ اس سے ہرگز صلح نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ اس صلح سے انگریزوں کا اقتدار روز بروز بڑھتا چلا جائے گا اور قومی آزادی اور بھی پابند سلاسل ہو جائے گی"۔

بہرحال افغانستان آزاد ہوا تو اس کی آزادی کو بھنگ کرنے کے لئے کئی سازشیں ہوئیں۔ غالباً ۱۹۲۲ء میں ایک افغان نظر بند سردار کو براستہ میران شاہ افغانستان بھیجا گیا تھا اور اس کے ذریعہ خوست میں بغاوت برپا کی گئی۔ اس زمانے میں میں بھی خوست پہنچا تھا۔ اس بغاوت میں خان بیرک، خان محمد حسین خان اور صدیق اللہ خاں رشتین کے والد مولوی سلطان محمد شہادت کا جام نوش کر گئے تھے اس کے علاوہ "گنڈ ملا" کی بغاوت بھی برپا ہوئی۔ سب سے آخر میں حبیب اللہ کوہ دامنی عرف بچہ سقہ کی بغاوت ہوئی تھی۔

ہندوستان کے سرحدی علاقے میں جب انگریزوں کے شہہ پر فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دی جانے لگی تو میں نے سرائے نورنگ ضلع بنوں میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے کام شروع کیا۔ سرحد کے چیف کمشنر کے حکم سے سرائے نورنگ سے مجھے محمد حیات خان آف غزنی خیل سے گرفتار کر کے بنوں کے کیپٹن مظفر شاہ خاں کے سامنے پیش کیا جس نے کچھ عرصہ رکھا۔ پھر یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ یہ سرزمین بے آئین ہے، یہاں سے افغانستان بھاگو، لیکن میں بنوں سے پھر سرائے نورنگ آگیا۔

۱۹۳۰ء میں کانگریس نے سول نافرمانی کا بگل بجایا تو ہزار کوشش کے باوجود میری گرفتاری عمل میں نہ آ سکی۔ آخری گول میز کانفرنس ناکام ہوئی تو میں "عبدالرحمن کلی" میں سرگرم عمل تھا کہ انگریزی پولیس نے گاؤں کو گھیر لیا اور میں گھیرا توڑ کر گاؤں سے نکل کر "درہ کیتو" میں گھس گیا۔ دوسرے دن وزیرستان کے خشک پہاڑوں میں فرنگی فوجیوں کے گشتی دستے سے مقابلہ ہوا۔ لیکن یہاں بھی میں پہاڑوں میں چھپ گیا۔ ایک رات دریائے کیتو کے قریب ایک چشمہ پر گذاری۔ رات گذارنے کے بعد جب دوسرے دن درۂ حر خوئی (خوڑ) پہنچا تو مجھے ایک بندوق بردار شخص آدمی ملا۔ اس نے کہا کہ اچھا ہوا کہ آپ مجھے مل گئے اور میں آپ کے ساتھ بخیریت اپنے گھر پہنچ جاؤں گا۔ لیکن یہ شخص اصل میں انگریزی مخبر تھا جو افغانستان سے مخبری کر کے برٹش علاقے میں آیا تھا۔ اس نے مجھے میران شاہ کے قریب بمقام "دردونی" انگریز فوجیوں کے حوالے کیا۔ اس طرح میں عیدی قلعہ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خاں کی جیلوں میں رہا۔ بغیر مقدمہ چلائے عرصہ تک قید رہا آخر ایک دن اسسٹنٹ جیلر نے جن کا نام غالباً محسن تھا مجھے ایک کمشنر کے سامنے پیش کیا۔ یہ احمدی تھے۔ انھیں جب میری گفتگو سے

یہ معلوم ہوا کہ میں ملک عبدالرحیم احمدی کا بیٹا ہوں تو انھوں نے مجھے قادیان بھیج دیا۔ لیکن مجھے جلد ہی قادیان چھوڑنا پڑا۔ وہاں سے پہلے لاہور اور پھر کوئٹہ بلوچستان جا کر سریاب روڈ میں مقیم ہوا اور معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ یہاں سے زلزلہ کوئٹہ سے چند روز قبل ہی مجھے سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر خارج کر دیا گیا اور لاہور میں "رونقِ مجلس احرار اسلام" ہوا۔ اور کئی محاذوں پر مورچے سر کئے۔ ۴۲-۱۹۴۱ء میں پشاور پہنچا اور وہاں سے سرحدی شخصیتوں کے حالات لاہور کے اخبارات میں بھیجتا رہا۔ اگست ۱۹۴۲ء میں سرحد میں جن لوگوں کے خلاف وارنٹ جاری ہوا ان میں میں بھی تھا لیکن پشاوری خدائی خدمتگاروں کے مشورے پر روپوش ہو گیا اور پنجہ صاحب (حسن ابدال) کے گوردوارے کو مرکز بنا کر کوہاٹ، بنوں اور کیمبل پور میں "ہندوستان چھوڑ دو" کا پرچار شروع کیا۔ ۱۹۴۴ء میں مستقل طور پر "پرتاپ" کے ادارے میں شامل ہو کر نظم و نثر کے ذریعے سامراجی قلعوں پر بم برساتا رہا۔ اور سٹوڈنٹس کانگریس میں کام شروع کیا۔ پنجاب میں میری سب سے پہلی سیاسی نظم "ہندوستان خالی کرو" تھی جس کے چند اشعار یوں ہیں :

سو رہی دیش کی قسمت جگانا چاہیئے زور سے "جے ہند" کا نعرہ لگانا چاہیئے

کہہ دو انگریزوں سے اب ہندوستاں خالی کرو میہمانی ہو چکی میرا مکاں خالی کرو

جس زمانے میں میں قادیان اور مینڈھو میں ہوا کرتا تھا میری زندگی بالکل عاشقانہ زندگی ہوا کرتی تھی۔ اور اس زمانے میں میں نے جو اشعار کہے ہیں ان کو سن کر میرے استاد مولانا احسن مارہروی اور شمس بالپوری، صوفی تصور حسین بریلوی جیسے اکابر پھڑک جایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ساغر نظامی کے لحنِ داؤدی سے ہندوستان کی حریت پرست محفلیں گونجا کرتی تھیں۔ میں مینڈھو سے ساغر نظامی سے شرفِ نیاز حاصل کرنے علی گڈھ پہونچا تھا اور ان سے ملنے کے بعد جب رات منٹو سرکل میں اپنے دوست کنور حامد علی خاں شارب سے ملنے گیا تو حسنِ اتفاق سے اس رات کو مولانا احسن مارہروی کی صدارت میں طرحی مشاعرہ تھا۔ مصرع تھا ؎ جنگ ہے تدبیر کی تقدیر سے

مشاعرے میں پہلے طلبا نے اپنی غزلیں سنائیں ان کے بعد پروفیسر خاوری لاہوری، پروفیسر حاذق اور خود صدر محترم کو اپنی غزلیں سنانی تھیں۔ لیکن جب اچانک صدر مشاعرہ کی نظر مجھ پر پڑی تو استاد احسن نے اعلان کیا کہ اب میرے افغان شاگرد مصرعِ طرح پر اپنی غزل سنائیں گے۔ چنانچہ میں نے برسبیل ارتجال مصرعِ طرح پر ذیل کے اشعار سنائے :

اس قدر ہے دل پہ رعبِ حسنِ یار آنکھ تک ملتی نہیں تصویر سے
لکھنے بیٹھا جب انھیں سوزِ فراق جل گیا کاغذ میری تحریر سے
تو نے اے قاتل محبت دیکھ لی دل جدا ہوتا نہیں ہے تیر سے
دل میں رکھا ہے تمنا کی طرح یہ محبت ہے تمھارے تیر سے

اس قسم کے داغ کے انداز کے اشعار جب طلبا نے سنے تو داد کے شور و غل سے ہال گونج اٹھا اور استاد احسن نے اپنی طرحی غزل کی بجائے غیر طرحی غزل سنائی۔ مشاعرے کے خاتمے پر علی گڈھ کے شوخ و شنگ طلبا نے ایسا گھیرا کہ شاعر کی زبان میں کہنا پڑا کہ

جب چمن میں آیا تو شاخوں نے گھیرا مثلِ گل
میں چمن کے واسطے جانِ گلستاں بن گیا

سیاسی شخصیتوں میں مجھے مولانا مظہر علی اظہر، چودھری افضل حق اور مولانا حسرت موہانی سے بے حد عقیدت رہی ہے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایک آتش بار خطیب ہونے کے ساتھ ایک ایسی شخصیت تھے کہ ان کی گالیوں پر بھی "شیریں سخنی" کا گمان ہوتا تھا اور انھیں سن کر دشمن بھی بے مزا نہیں ہوتے تھے۔ مہمان نوازی میں مولانا حسین احمد مدنی کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مولانا محمد علی جوہر میرے نزدیک بڑے بہادر تھے۔

قدیم شعرا میں سے مجھے آتش و تسلیم اور اس کے بعد حسرت سے عشق ہے۔ نظم میں جوش ملیح آبادی کا قائل ہوں۔ اختر شیرانی اور عدم بھی میرے محبوب شاعر ہیں۔ پسِ محمل غبار میں کئی پردہ نشین بھی ہیں اس لئے شاعر کی زبان میں یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں :

داورِ حشر میرا نامۂ اعمال نہ پوچھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

تقسیم کے وقت میں بریڈلا ہال لاہور میں منقار زیر پر محبوس تھا کہ ایک شب کو بہن مردولا سارابھائی آئیں اور مجھے پنڈت نہرو کے حکم سے لاہور سے دہلی لائیں۔ یہ بات غالباً شروع جنوری ۱۹۴۸ء کی ہے۔ ہندوستان آ کر کبھی میری بے چین طبیعت کو چین نہ آیا۔ نابھہ، پٹیالہ، سرہند، جالندھر، قادیان، بمبئی، احمد آباد، بنگلور اور عظیم آباد تک ادبی اور سیاسی سفر کئے۔ بے شمار ہنگامے سر کئے اور بے شمار ہنگامے خود برپا کئے۔ ہندوستان میں پختون قیادت کا مسئلہ آیا تو اس سلسلے میں زر دار قیادت سے مقابلے کئے۔ ۱۹۵۵ء میں احمد آباد گجرات میں پختون کنونشن کی صدارت کا اعزاز حاصل ہوا۔ ہندوستان میں پختونوں کی قیادت کا شرف بھی حاصل رہا۔ ۱۹۶۴ء میں دہلی سے کابل گیا . . . . جہاں میں نے افغان بادشاہ محمد ظاہر شاہ اور دوسرے افغان مشاہیر سے ملاقاتیں کیں اور اپنے گاؤں دراگی کی زیارت سے بھی مشرف ہوا۔ قندھار، غزنی، قلعہ بست اور میدان میوند کو بھی دیکھا جہاں امیر ایوب خاں نے انگریزوں کو شکست دی تھی۔ یہ وہی میدان ہے جس کے متعلق افغانی روایات ہیں ملالہ کا ذکر آتا ہے اور پشتو کا یہ مشہور شعر افغانوں کی زبان پر اکثر آیا کرتا ہے ؎

کہ پہ میوند کے شہید نشوی د بے ننگی نمک دی رانشی تر وطنہ

میوند سے تمھارے شہید ہونے کی خبر تو آئے مگر بے غیرتی کی خبر ہرگز نہ آنے پائے۔

جنوری ۱۹۴۸ء میں بریڈلا ہال لاہور سے اڑن کھٹولے میں بیٹھ کر نئی دہلی کے کانسٹی ٹیوشن ہاؤس کرزن روڈ پہنچا تو سب سے پہلے مردولا سارابھائی کے ساتھ مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، رفیع احمد قدوائی اور مولانا آزاد کی ملاقات سے سرفراز ہوا۔ وہ مجھے مولانا آزاد کی کوٹھی پر لے گئیں۔ مولانا آزاد کے

پرائیوٹ سیکرٹیری بے حد محتاط قسم کے پٹھان تھے۔ ویسے ان کا اسم گرامی اجمل خاں تھا انھوں نے فرمایا کہ آپ مولانا سے کیوں اور کس لئے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے علامہ تاجور خاں نجیب آبادی کا شعر سنا دیا

سبب ہر ایک مجھ سے پوچھتا ہے مرے رونے کا
الٰہی ساری دنیا کو میں کیسے راز داں کر لوں

اجمل خاں صاحب نے فرمایا کہ اچھا آپ شاعر بھی ہیں۔ میں نے کہا صرف شاعر نہیں بلکہ "شاعر خان" ہوں ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ مردولا سارا بھائی آگئیں۔ کہا مولانا سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے کہا ہاں ہو گئی حالانکہ کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد رفیع احمد قدوائی کے بنگلے پر پہنچے ان کے ایک سکریٹری شری جے نارائن نے فوراً قدوائی صاحب سے ملوایا۔ ان کی ملاقات سے میں بہت خوش ہوا۔ پنڈت نہرو کی زندگی ان دنوں بیحد مصروف تھی۔ اس لئے ان سے زیادہ گفتگو نہ ہو سکی۔ انھوں نے فرمایا کہ مجھے کچھ یاد پڑتا ہے کہ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے —— میں نے یہاں بھی ایک شعر پڑھا:

مجھے کچھ یاد پڑتا ہے کہیں پرتم کو دیکھا ہے
خدا جانے یہ سچ ہے یا مری آنکھوں کا دھوکہ ہے

اس پر پنڈت جی نے سنبھل کر فرمایا آپ نے مجھے کہاں دیکھا ہے۔ میں نے عرض کیا سرور ریاب سرحد میں، لاہور کے کپورتھلہ ہاؤس میں اور مہاشہ کرشن کی کوٹھی پر دیکھا ہے۔ اس پر پنڈت جی مسکرائے اور مردولا سارا بھائی کے ساتھ میرے بارے میں گفتگو کی۔ تیسرے روز کانسٹی ٹیوشن کلب سے بھاگ کر میں مہاشہ کرشن کی کوٹھی پر پہنچا۔ وہ مجھے دیکھ کر سخت گھبرائے اور فرمایا کہ لاہور سے کیسے اور کیوں آئے۔ میں نے کہا شوق کے پروں سے اڑ کر آیا ہوں تاکہ "پرتاپ" کی فوجوں کی حکیم خاں سوری بن کر کمان کروں اور وقت کے سامراجیوں سے ٹکر لوں۔ یہ جواب سن کر مہاشہ جی بے حد خوش ہوئے اور فرمایا "پرتاپ" کو سنبھالو مگر "خان غازی کابلی" کی بجائے کوئی ہندوانہ نام رکھ کر مضامین لکھا کرو، اس پر میں نے "خرافات کا پلندہ" ان کے منہ پر رسید کیا اور کوٹھی سے باہر نکل گیا۔ جب ذرا آگے نکل آیا تو مہاشہ جی کی آواز کانوں میں پڑی۔ مڑ کر دیکھا تو مہاشہ کرشن جی ننگے سر اور ننگے پاؤں بھاگے آرہے ہیں۔ میں کھڑا ہو گیا اور مہاشہ جی مجھے پکڑ کر اور یہ کہہ کر اپنی کوٹھی پر لائے کہ میں نے تو صرف مذاق کیا تھا۔ آپ نے میرے مذاق کو سچ کیسے سمجھ لیا۔ جائیے پرتاپ میں کام کیجئے اور جس نام سے جی چاہے لکھیے۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ اب تو میں "اورنگ زیب خاں" کے نام سے پرتاپ میں لکھا کروں گا۔ اس پر انھوں نے پھر فرمایا جس نام سے آپ کا جی چاہے لکھیے۔ ہائے کیسے کیسے محبت نواز بزرگ ہوا کرتے تھے جن کی خاک گنگا جمنا میں بہہ گئی۔

بعض لوگوں نے مہاشہ کرشن پر فرقہ پرست ہونے کا الزام لگایا تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کو بھی متعصب قرار دیا تھا۔ اب ڈاکٹر بھارگو کا افسانہ بھی سماعت فرمایئے۔ پرتاپ میں ابھی مجھے چند ہی روز ہوئے تھے کہ ایک صبح میرے مکان پر مولانا بشیر احمد امام جماعت احمدیہ دہلی تشریف لائے اور کہا کہ

مجھے آپ سے ایک کام ہے مگر بتاتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ آپ احراری ہیں اس لیے شاید میرا کام نہ کریں۔ میں نے کہا کہ احراری اور احمدی کی بات چھوڑیئے۔ آپ کام بتایئے اگر ہو سکا تو آپ کا کام ضرور کروں گا۔ انھوں نے کہا کہ دو سو احمدیوں کو ایک جگہ سے قادیان منتقل کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر گوپی چند بھارگو پنجاب کے وزیر اعلیٰ مدد کر سکتے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر بھارگو کو شملہ ٹیلی فون کیا۔ ٹیلی فون پر میرے دوست شری ویریندر ایم اے "آف پرتاپ" جالندھر ان دنوں ان کے سیکرٹیری تھے تشریف لائے۔ میں نے ان سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب سے پرائیوٹ بات کرنی ہے انھیں ٹیلی فون دیجئے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب تشریف لائے۔ میں نے ان سے کہا کہ جو بات مجھے کرنی ہے وہ ٹیلی فون پر مناسب نہیں، میں شملہ آنا چاہتا ہوں تاکہ زبانی گفتگو کروں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ حالات بہت خراب ہیں اور میں آپ کو شملہ آنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ صبح کو دہلی آرہا ہوں اور اپنے بھائی پنڈت ٹھاکر داس بھارگو ممبر پارلیمنٹ کی کوٹھی پر ٹھہروں گا۔ وہاں تشریف لا کر مجھ سے گفتگو کیجئے۔ اس پر دوسرے دن مولانا بشیر احمد کو ساتھ لے کر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے مجھے اور مولانا بشیر احمد کو دیکھا تو مسکرائے اور فرمایا آگ اور پانی کا اتحاد کیسے؟ میں نے عرض کیا کہ مولانا مجھ احراری کے پاس اپنے کام کے لیے آئے ہیں اور اس کو میں اپنی فتح سمجھتا ہوں اب آپ کی مرضی کہ میری فتح کو شکست میں بدل دیں یا فتح ہی رہنے دیں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنے "خان بھائی" کی فتح کو شکست میں بدل دوں۔ میں خان غازی کابلی کی ضرور "جے" بلواؤں گا۔ یہ کہہ کر مولانا بشیر احمد جو چاہتے تھے وہ سب کچھ ڈاکٹر صاحب نے کیا اور پنجاب کے ہوم سکریٹری کو ٹیلی فون کے ذریعہ ہدایت دے دی

مشرقی پنجاب مسلمانوں سے خالی ہو چکا تھا کہ "مالیر کوٹلہ سے 'بچن لال جین' نے تار کے ذریعہ کرایہ بھیجا اور اپنی شادی میں شرکت کا دعوت نامہ ارسال کیا۔ برات مالیر کوٹلہ سے نابھ جانے والی تھی۔ میں تنہا دہلی ریلوے اسٹیشن پر ایسی حالت میں پہنچا جبکہ مسلمان بلی ماروں اور جامع مسجد کے علاقہ سے باہر نہ جا سکتے تھے اور نہ آسکتے تھے۔ ان دنوں شاید کوتوالی کے انچارج پنڈت مانک چند تھے۔ انھوں نے بہت ہاتھ جوڑے کہ غازی صاحب آپ پنجاب نہ جائیں اگر کوئی درگھٹنا ہو گئی تو ہماری سخت بدنامی اور رسوائی ہوگی مگر میں نے ان کی کسی بات کی پروا نہیں کی۔ گاڑی رات کو جاکھل پہنچی۔ مالیر کوٹلہ کے لئے دوسری گاڑی بدلنی تھی۔ میں دوسری گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے دیکھ کر لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا اور ہر ایک دوسرے سے کہتا کہ یارو اس مُسلے کو دیکھتے کیا ہو۔ اتنے میں گاڑی آگئی اور میں اچک کر ایک ڈبے میں گھس گیا۔ اتفاق سے یہ ڈبہ سکھ سپاہیوں اور تباہ و برباد رفیوجیوں سے بھرا تھا۔ ایک سپاہی نے مجھے گلے سے پکڑا اور کہنے لگا "ہالی کُشی ایتھے سُھر دیو" میں نے جواب میں اس کے گریبان میں ہاتھ ڈالا دھکم پیل میں ہم دونوں ڈبے سے نیچے آن گرے۔ اس نے کتاب نکالی اور کہا پرمٹ دکھاؤ اور نام بتاؤ۔ میں نے کہا مجھے پرمٹ کی ضرورت نہیں میں آزاد ہندوستان کا مالک ہوں اور میرا نام خان غازی کابلی ہے

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر)

ہماری کتابیں

سرسید احمد خاں (پروفیسر خلیق احمد نظامی) ۵ روپے

(ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی، تعلیمی اور ثقافتی زندگی پر سرسید اور اُن کے رفقا کے کارناموں کا زبردست اثر پڑا ہے۔ پروفیسر نظامی نے بڑے عالمانہ انداز میں ان کی شخصیت اور کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔)

ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر (ڈاکٹر محمد عمر) ۲۰ روپے

(ڈاکٹر تارا چند نے اپنی مشہور تصنیف میں ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ ڈاکٹر محمد عمر نے اپنی اس محققانہ کاوش میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوستانی تہذیب مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔)

ہم ایک ہیں (عرش ملسیانی) ۱۰ روپے

(ہندوستان مختلف زبانوں، عقیدوں اور طریقوں کا ملک ہے اور چمن کو اسی اختلاف سے زیب و زینت حاصل ہے۔ مگر ہر رنگ و بوکے یہ پھول ایک گلدستے میں بندھے ہوئے ہیں اور ہماری قومی زندگی کو تاب و توانائی بخشتے ہیں۔)

ابوالکلام آزاد (عرش ملسیانی) ۵ روپے

(ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے معماروں میں ہیں۔ جدوجہد آزادی کی کوئی بھی تاریخ مولانا آزاد کی خدمات کے اعتراف کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی)

روشنی کے مینار (شہباز حسین) ایک روپیہ ۵۰ پیسے

(سماجی مصلحین، مذہبی رہنما اور سیاسی قائدین کے سوانحی خاکے جو آسان زبان میں ہائی اسکولوں کے طلبا کے لیے لکھے ہیں۔)

جواہر لال نہرو کی کہانی تصویروں کی زبانی ۳ روپے ۵۰ پیسے

(محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو کی زندگی کے دلچسپ واقعات رنگین تصویروں میں۔ بچوں اور طالب علموں کے لئے ایک عمدہ تحفہ)

پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے ۲ روپے ۵۰ پیسے

(گھریلو ضرورتوں کے جام، جیلی، مربہ، مارملیڈ، چٹنی، شربے اور آچار وغیرہ بنانے کے متعدد طریقے تصویروں کے ذریعے بتائے گئے ہیں جس سے بڑی آسانی سے آپ گھر بیٹھے اپنی من پسند چیزیں بنا سکتے ہیں)

"آج کل" کے خریداروں کو ۲۰ فی صد کی رعایت محصول ڈاک ہمارے ذمے

پانچ روپے سے کم قیمت کی کتابیں بذریعہ وی۔ پی نہیں بھیجی جاتیں۔ پوسٹل آرڈر بھیجئے یا وی پی طلب کیجئے۔

(ملنے کا پتہ) **بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی**

غزلیں

شیدا رومانی

معرفت اودے پرنٹرز، رائچور (کرناٹک)

جو کرب روح میں شامل ہے مار ڈالے گا
اکیلا دل ہے کہاں تک مجھے سنبھالے گا

جو بات ہونی ہے ہوتی ہے ہو کے رہتی ہے
بھلا بتاؤ تو ہونی کو کون ٹالے گا

بہت ہی سہل ہے گھر سے نکالنا لیکن
تو اپنے دل سے اُسے کس طرح نکالے گا

تجھے ملیں گے مرے یار گوہرِ اخلاص
تو میرے دل کا سمندر اگر کھنگالے گا

بچے بچتے تھے بے داغ سارے لوگوں میں
کسے یقین تھا کیچڑ وہی اُچھالے گا

حیات ضبطِ الم کا ہے امتحاں شیدا
جو اشک پی نہ سکے گا وہ زہر کھالے گا

سحر سعیدی

۱-۱۸-۱۷، لوٹی کی مسجد، جیلی پورہ، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

اک عمر سے احساس کی سُولی پہ ٹنگا ہوں
انسان ہوں جینے کی سزا کاٹ رہا ہوں

ٹوٹا نہ تھا جب تک تو میں پتھر کی طرح تھا
ٹوٹا تو کسی کے لیے آئینہ بنا ہوں

میں حرفِ تمنا کے خد و خال پہ جیسے
چھپتے ہوئے احساس کی بوسیدہ قبا ہوں

پیاسا کوئی مجھ سا بھی زمانے میں نہ ہوگا
میں اپنے ہی زخموں کا لہو چوس رہا ہوں

وہ لمس کی لہروں میں مجھے ڈھونڈ رہا ہے
میں جسم کے جلتے ہوئے صحرا میں کھڑا ہوں

کیا مجھ کو ڈرائے گی سحر موجِ حوادث
میں روزِ ازل ہی سے حوادث میں پلا ہوں

نصر قریشی

۴۷، بنیا بہادر گنج، الٰہ آباد (اتر پردیش)

مجھے کب سے اپنی تلاش ہے، کوئی آئینہ مرے ہات دے
یہ حصارِ ذات ہے آتشیں، مجھے اب تو راہِ نجات دے

ترا نام دل کی کتاب سے نئے پیکروں نے مٹا دیا
مرا پیرہن ہے پھٹا پھٹا، مجھے پھر سے غم کی زکات دے

یہ بلند و پست کے مرحلے، یہ طویل راہوں کے فاصلے
مرا کارواں ہے تھکا تھکا، مرے ساتھ میں دو ہات دے

غمِ بیکسی کی لیے چبھن، کبھی اپنے آپ پہ خندہ زن
مرے آدھے ادھورے وجود کو، کوئی ذات والا صفات دے

کئی ادھوری سی کوئی داستاں، کوئی ترجماں ہے نہ ہمزباں
یہ لفظ و معنی ہے بیکراں، مرے حرفِ جاں کو حیات دے

یہ عجیب اور یہ کھائیاں، شب و روز دل کی تباہیاں
الغرض سب سے سامنا، مجھے دے تو اپنے ثبات دے

میں غزل کی روپ میں مرثیہ، مرے نغمے ٹوٹے رباب کا
مری شاعری ہو عظیم تر، مجھے شاعرانہ صفات دے

اوم پرکاش بجاج

E-۲۰۰ گورنمنٹ کوارٹرز، قرول باغ، نئی دلّی

تسکینِ دل نہیں کہیں آرامِ جاں نہیں
پھر بھی یہ زندگی ہمیں بارِ گراں نہیں

منزل کا شوق، عزم جواں، ہمتِ بلند
تنہا رواں ہوں ساتھ میرے کارواں نہیں

کیسے کٹے گی زندگی تیرے فراق میں
یہ میرا امتحاں ہے تیرا امتحاں نہیں

ہم اپنے دل کی کس سے کہیں کس طرح کہیں
محرم کوئی نہیں ہے کوئی رازداں نہیں

کیوں جاؤں ڈھونڈنے تجھے صحرا و دشت میں
دل میں نہیں نظر میں نہیں تو کہاں نہیں

اے چشمِ یار ہم پہ بھی الفت کی اک نظر
تو مہرباں نہیں تو کوئی مہرباں نہیں

جلتے رہے بجاج سلگتی ہی دھوپ میں
سایہ کہیں نہیں ہے کوئی آشیاں نہیں

شجاع فاروقی

۲۲-۷-۳۰، چھتا بازار، حیدرآباد (آندھرا پردیش)

زلفِ پُرخم کی ہوا تھی شاید
یا تو رنگین فضا تھی شاید

ہر نظر نے جو سکوں لوٹ لیا
فتنہ گر کی یہ ادا تھی شاید

عارضِ مہ سے آنچل نہ ہٹا
اس میں تقصیرِ حیا تھی شاید

شمع پہ ٹوٹ پڑے پروانے
منتظران کی قضا تھی شاید

ہنس پڑے پھول تمناؤں کے
اس میں تحریکِ صبا تھی شاید

زیرِ لب کوند گئی بجلی سی
اس حیا میں بھی قضا تھی شاید

ہم شجاع خود کو سمجھ ہی نہ سکے
اس میں اپنی ہی خطا تھی شاید

کاظم علی خاں

۲۰۱ وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ

مرزا دبیر کے بعض نادر قلمی آثار

مشہور مرثیہ نگار مرزا سلامت علی دبیر (متوفی ۳۰ محرم ۱۲۹۲ ہجری مطابق ۹ مارچ ۱۸۷۵ء) کی منظوم و منثور تخلیقات کی ایک بڑی تعداد شائع ہو کر منصۂ شہود پر آچکی ہے لیکن اس کے باوجود دبیر کے قلمی آثار میں ابھی متعدد ایسے نوادر بھی موجود ہیں جو منظرِ عام پر آنے سے محروم رہے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں مرزا دبیر کے بعض ایسے قلمی آثار پیش کیے جاتے ہیں جو راقم الحروف کی نظر سے مطبوعہ صورت میں نہیں گزرے ہیں اور جن کے غیر مطبوعہ ہونے کا قوی امکان ہے۔ اس مضمون میں دبیر کے قلمی آثار کے علاوہ دو ایسے فارسی خط بھی شامل ہیں جن کے کاتب دبیر تو نہیں البتہ مکتوب الیہ ضرور ہیں۔

۱۔ مرزا دبیر کی ایک غیر معروف غزل

مرزا دبیر صفِ اوّل کے مرثیہ نگار تھے لیکن ان کے قلمی آثار میں مرثیہ کے علاوہ بعض دوسرے اصنافِ سخن کے بھی نمونے ملتے ہیں جن میں صنفِ غزل شامل ہے۔ دبیر کے سوانح نگار اس بات پر متفق ہیں کہ مشقِ سخن کے ابتدائی دور میں مرزا صاحب نے کثرت سے غزلیں کہی تھیں مگر کچھ عرصہ بعد انھوں نے غزل گوئی ترک کر دی اور اپنی غزلوں کو شہرت نہ دی۔ مرزا دبیر کی غزلیں اُن کے ایامِ شباب کی یادگار ہیں۔ بعض تذکروں اور کتابوں میں مرزا صاحب کی محض چند مطبوعہ غزلیں ہی ملتی ہیں جو دبیر کے غزلیہ کلام کی کم یابی کی مظہر ہیں اور جن پر راقم السطور اپنے ایک طویل تحقیقی مضمون "مرزا دبیر کی غزل گوئی" میں مفصل بحث کر چکا ہے۔ ان مطبوعہ غزلوں کے علاوہ ایک قدیم قلمی بیاض میں مجھے مرزا دبیر کی ایک ایسی غزل بھی ملی ہے جو میری نظر سے مطبوعہ شکل میں نہیں گزری ہے۔ عجب نہیں کہ یہ غزل مرزا صاحب کے غیر مطبوعہ قلمی آثار کی حیثیت رکھتی ہو۔ مرزا دبیر کی نو دریافت غزل ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

تل نمایاں ہے نہیں عارضِ جاناں کے تلے   ہے ستارا کہیں روشن مہِ تاباں کے تلے

کیا ہی بے چین ہوئے نالۂ بلبل سن کر   ٹھہرے اک دم جو کسی نخلِ گلستاں کے تلے

چاکِ سینہ کو مرے دیکھ کے ناصح بولا   دکھوں ہی داغ ہیں یاں تیرے گریباں کے تلے

ہم تو چھٹنے کے نہیں ہم دموں اس دام سے تو   اب تو دل جا کے پھنسا زلفِ پریشاں کے تلے

ہاتھ چھاتی پہ مری رکھ کے یہ حکما نے کہا   دل نہیں آگ ہے یاں سینۂ سوزاں کے تلے

اِس کو مت برق سمجھ یہ جو فلک پر ہے چمک
ہے دبیر آہ تری گردشِ دوراں کے تلے

دبیر کی یہ غزل مجھے ایک قدیم قلمی بیاض میں ملی ہے جس کا نام "غزلیات (انتخاب از متفرق شعراء)": سلیماں قدر ہے۔ مذکورہ بیاض کا قلمی نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور لائبریری میں [نمبر کے تحت] موجود ہے۔ اس مخطوطے کے اوراق کی تعداد ۱۷۳ ہے اور عام طور پر اوراق کے دونوں رُخ مختلف شعراء کی غزلیں درج ہیں۔ اس طرح مخطوطہ ۲ × ۱۷۳ = ۳۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ نسخے میں کاتب کا نام، سنہ کتابت اور ترقیمہ موجود نہیں۔ مرزا دبیر کی محولۂ بالا غزل بیاض کے اوراق ۱۷۰/۱۷۱ پر درج ملتی ہے۔ اس قلمی نسخے میں متعدد دوسرے شاعروں کا کلام بھی موجود ہے جن میں مندرجہ ذیل شعراء شامل ہیں:

۱۔ میر (۲) مصحفی (۳) لطف (۴) نظیر (۵) آباد (۶) ترقی (۷) سلیمان وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ مرزا دبیر کا ایک غیر معروف مرثیہ

ریاستِ محمود آباد، اتر پردیش کے کتب خانے میں مرزا دبیر کے ایک ایسے مرثیے کا قدیم قلمی نسخہ موجود ہے جو مطبوعہ صورت میں میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ اِس قلمی نسخے کے بارے میں ضروری تفصیلات ذیل میں درج ہیں:

۱۔	مرثیے کا مطلع :	اے خالقِ سبحان تو مری عقل رسا کر
۲۔	مرثیے کا مقطع :	مقدور دبیر آگے زباں کو نہیں اصلا
۳۔	تعداد بند :	ایک سو چھ (۱۰۶)
۴۔	کاتب کا نام :	فضل علی
۵۔	زمانۂ کتابت :	ربیع الاوّل ۱۲۶۲ ہجری

مرزا دبیر کا متذکرۂ بالا مرثیہ رسول مقبول حضرت محمد مصطفےٰ کی بیٹی صدیقۂ طاہرہ حضرت فاطمہ زہرا کے حال میں ہے۔ مرثیے کے ابتدائی دو بند ذیل میں ملاحظہ ہوں:

اے خالقِ سبحان تو مری عقل رسا کر   اے حاکمِ نیساں دُرِ الہام عطا کر

اے صیقلِ ایماں تو مرے دل کو جلا کر   اے سرمۂ عرفاں مری آنکھوں کی ضیا کر

منظور نظر عصمتِ زہرا کی ثنا ہے   جس پہ دو گواہ ایک نبی ایک خدا ہے

عصمت کا اشارا ہے زباں بھی نہ لے نام   عفت کا تقاضا ہے قلم سے نہ کرا رقام
اس مدح کے آغاز کا پھر کیوں کر ہو انجام   اب خالق اکبر کی طرف سے یہ ہے الہام
اس نام کو تو عرش پہ خالق نے لکھا ہے
خالق نے لکھا اور فرشتوں نے پڑھا ہے

اِس مرثیے کا آخری بند ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

اب فاطمہ کے دفن کا احوال کہوں کیا   اب سوئے بقیعہ ہو بس اس طرح سے گویا
مقدور دبیرؔ آگے زباں کو نہیں املا   یا فاطمہ یا سیّدہ یا حضرتِ زہرا
باللہ کہ منصورہ ترا نام ہے سب میں
اب کیجے نصرت مری اندوہ و تعب میں

زیرِ تبصرہ مخطوطے کے بارے میں مختصراً یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ اس کی کتابت چوں کہ ۱۲۶۲ ہجری میں ہوئی ہے اس لحاظ سے یہ نہ صرف قدیم ہے بلکہ دبیر (متوفی ۱۲۹۲ ہجری) کا معاصر قلمی نسخہ ہونے کا شرف رکھتا ہے۔ مخطوطہ مجلد ہے اور قدامت کے باوجود اچھی حالت میں ہے۔ اس میں سرورق سمیت آٹھ اوراق یا سولہ صفحات ہیں، مرثیہ سرورق کی پشت (ص ۲) سے شروع ہو کر ورق نمبر آٹھ یا صفحہ نمبر پندرہ پر ختم ہوتا ہے۔ ورق نمبر آٹھ کی پشت یعنی صفحہ نمبر سولہ سادہ ہے۔ ورق نمبر دو تا سات کے دونوں جانب مرثیہ تحریر ہے۔ میں جناب امیر حیدر خاں صاحب مہاراج کمار ریاست محمود آباد کا انتہائی ممنون و متشکر ہوں کہ موصوف نے نہ صرف مرثیے کے بعض اجزا نقل کرنے کی اجازت دی بلکہ مخطوطے اور مرثیے کو ادبی حلقوں سے متعارف کرانے میں بھی پس و پیش نہ فرمایا۔ مرزا دبیر کے اِس مرثیے کا غیر مطبوعہ ہونا خارج از امکان نہیں۔

۳۔ مرزا دبیرؔ کا ایک غیر معروف فارسی قطعۂ تاریخ

کٹرا ابو تراب خاں لکھنؤ کا ایک قدیم اور مشہور محلہ ہے جہاں خانِ علامہ نواب تفضل حسین خاں (متوفی ۱۵ شوال ۱۲۱۵ ہجری مطابق یکم مارچ ۱۸۰۱ء) کے فرزند نواب تجمل حسین خاں مرحوم کے نام سے موسوم ایک قدیم امام باڑا ہے۔ اس عزاخانے کے مشرقی دالان کی جنوبی دیوار میں نصب سنگِ مرمر کی ایک پرانی لوح پر راقم السطور کو مرزا دبیر کا ایک فارسی قطعۂ تاریخ کندہ ملا ہے۔ یہ سنگی لوح عرصے سے سفیدی کی تہوں میں دبی ہوئی تھی۔ خانوادۂ میر انیس کا ایک فرد میر ہادی صاحب لائق کی توجہ دہانی پر مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۷۵ء کو عزاخانۂ مذکور جا کر راقم الحروف نے جب چونے کی تہوں کو کھرچا تو دیوار میں نصب سنگِ مرمر کی لوح نظر آئی۔ اس لوح پر مرزا سلامت علی دبیر کا جو فارسی قطعۂ تاریخ کندہ ہے وہ خانِ علامہ نواب تفضل حسین خاں کے خاندان کا ایک فرد نواب ارتضیٰ حسین خاں کے سنہ وفات سے متعلق ہے اور سنگی لوح کے جملہ مندرجات کے ساتھ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

۷۸۶

یا غفار   تاریخِ اوجِ فکر مرزا دبیر مدظلہٗ   یا ستار

بست و پنجم و یک شنبہ از جماد دوئیم
چہ شد کہ زلزلہ افگند ہنگ شیون و شین
مگر بہ خاک نہاں گشت ماہِ برجِ کمال
کہ بود مطلعِ مہرِ امیرِ بدر و حنین
جناب خان بہادر رئیسِ اعظمِ ہند
فلک شکوہ زمیں زیب رونقِ کونین
قدر بہ کلکِ قضا ارتضیٰ حسین نوشت
خطابِ عالی او با ہزار زینت و زین
ملک بسالِ وفاتش بگفت با دل صاف
بقصرِ اولِ جناں شد ندیمِ بزمِ حسین

۱۲۹۱ ہجری

یہ قطعۂ تاریخ قطعی طور پر ارتضیٰ حسین خاں کی وفات یعنی ۲۵ جمادی الثانی ۱۲۹۱ ہجری کے بعد کہا گیا ہے اور چونکہ خود مرزا دبیر کی تاریخ رحلت ۳۰ محرم ۱۲۹۲ ہجری ہے لہٰذا یہ قطعۂ تاریخ یقینی طور پر دبیر نے اپنی وفات سے محض چند ماہ قبل کہا ہے۔ گویا اس فارسی قطعۂ تاریخ کو مرزا دبیر کی عمر کے آخری دور کا کلام ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مرزا دبیر کے مجموعۂ کلام دفترِ ماتم کی بیسویں جلد میں مرزا صاحب کا متفرق کلام شائع ہوا ہے۔ دفترِ ماتم کی اِس بیسویں جلد میں مسجدِ عظیم آباد کے متعلق دبیر کا ایک فارسی قطعۂ تاریخ ضرور ملتا ہے[1] مگر مندرجہ بالا قطعۂ تاریخ موجود نہیں۔ تلاش کے باوجود دبیر کا مندرجہ بالا قطعۂ تاریخ مجھے مطبوعہ شکل میں کہیں نہیں مل سکا ہے۔ عجب نہیں کہ یہ دبیر کا غیر مطبوعہ کلام ہو۔

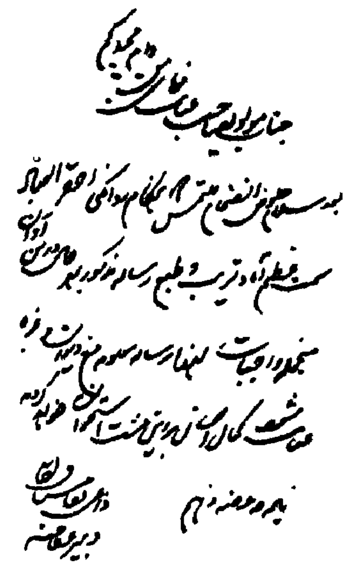
۴۔ دبیرؔ کا ایک فارسی مکتوب

دبیر کے متعدد فارسی مکاتیب شائع ہو چکے ہیں اور راقم کی نظر سے گزرے ہیں مگر راقم الحروف کو مرزا دبیر کا ایک ایسا فارسی خط بھی ملا ہے جس کے غیر مطبوعہ ہونے کا قوی امکان ہے۔ یہ خط خود دبیر ہی کی تحریر میں ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس خط کے مکتوب الیہ مولوی کمال الدین کا خط بھی ملا ہے جو دبیر کے نام ہے۔ یہ دونوں خطوط ایک ہی کاغذ پر لکھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں خطوط مجھے اپنے کرم فرما برادرم سید باسط حسن صاحب ماہر لکھنوی سے ملے ہیں اور میں اُن کے لیے موصوف کا انتہائی ممنون و متشکر ہوں۔ ذیل میں مکتوبِ دبیر بہ خطِ دبیر کا عکس اور اِس فارسی مکتوب کا اُردو مفہوم پیش کیا جاتا ہے۔

---

[1] دفترِ ماتم جلد ۲۰: مرزا سلامت علی دبیر، مطبع دبدبۂ احمدی لکھنؤ ۱۸۹۷ء، ص ۲۴۸۔

عکس مکتوب دبیر بہ خط دبیر



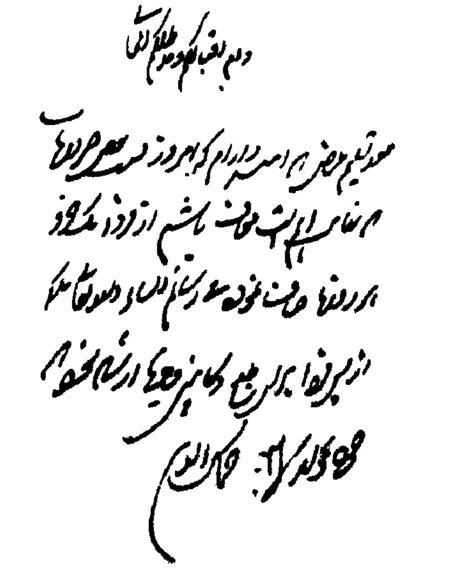
دبیر کے فارسی خط کا اردو مفہوم

جناب مولوی صاحب عنایت فرمائے من دام مجدکم

بعد سلام خلوص انضمام التماس ہے کہ میرے عظیم آباد جانے کے وقت ہی رسالۂ مذکور کی ترتیب و طبع نہایت ضروری ہے۔ لہٰذا رسالۂ مذکور مع دیوان وغیرہ عنایت ہو تو اس مشت استخوان پر بہت احسان ہوگا۔ زیادہ کیا تحریر ہو۔

عکس مکتوب مولوی کمال الدین بنام دبیر

دبیر کے محولہ بالا خط کے مکتوب الیہ مولوی کمال الدین نے دبیر کو جو فارسی خط لکھا تھا اس کا عکس ملاحظہ ہو :



دونوں مکاتیب تاریخ تحریر سے محروم ہیں مگر مرزا دبیر نے اپنے خط میں عظیم آباد جانے کا ذکر کیا ہے۔ مرزا صاحب کے سوانحی حالات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہی سے دبیر نے سال بہ سال عظیم آباد سفر کرنا شروع کیا تھا۔ اِن امور کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں خطوط ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد لکھے گئے تھے۔ دبیر کے خط میں جس رسالے اور دیوان وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے اُس کے بارے میں ابھی تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔

۵۔ میر ضمیر کا ایک فارسی خط اپنے شاگرد مرزا دبیر کے نام

دبیر کے استاد میر مظفر حسین ضمیر کے بارے میں اُردو تحقیق کی سمت و رفتار کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں۔ راقم الحروف کو میر ضمیر کا ایک فارسی مکتوب مِلا ہے جس کے مکتوب الیہ ضمیر کے شاگرد رشید مرزا دبیر ہیں۔ سطور ذیل میں دبیر کے نام اُن کے استاد میر ضمیر کا فارسی مکتوب کا اُردو مفہوم پیش کیا جاتا ہے [1]

میری دلیل، میری سند، میرے قوت بازو اور میرے اعتماد سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد اشتیاقِ دیدار فرحت آثار واضح ہو کہ پانچ روز سے گلے کا ورم ٹھوڑی تک پہنچ گیا ہے اور بخار کی شدت اور درد کے تکالیف اِس حد تک ہیں کہ قابلِ تحریر نہیں۔ ملاقات کے وقت آپ خود ہی ملاحظہ کرلیں گے۔ چونکہ ۲۴ تاریخ آپ ہی کی مقرر کردہ ہے لہٰذا اب اُس میں کوئی ردّ و بدل نہ ہو اور اسی وقت ثواب حاصل کرلیں۔ جمعہ کے دن ملاقات نہ ہونے سے بہت صدمہ ہوا۔ سلامی علیکم و قلبی لدیکم۔

(رقیمہ ضمیر عفی عنہ)

میر ضمیر کے اِس خط پر تاریخ تحریر درج نہیں لیکن خط کے مندرجات بتاتے ہیں کہ یہ خط ضمیر نے اپنی علالت کے دوران لکھا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خط ضمیر نے اپنے آخری زمانے میں لکھا ہو۔ میر ضمیر کا سنہ وفات ۱۲۷۲ ہجری مطابق ۱۸۵۵ء متعین کیا گیا ہے [2] اس لحاظ سے یہ خط ۱۸۵۵ء یا اس سے قبل لکھا جا چکا تھا۔

میر ضمیر کا یہ فارسی خط کئی اعتبار سے اہم قرار دیا جائے گا۔ اوّل تو یہ خط میر ضمیر کی اُس فارسی نثر کا نمونہ ہے جس کے بارے میں ہمارے پاس مواد کی قلت ہے۔ دوسرے یہ خط میر ضمیر کے بعض امراض کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ خط ضمیر اور دبیر یعنی استاد اور شاگرد کے باہمی تعلقات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ انہی وجوہ کے باعث اِس خط کی اہمیت ضمیر اور دبیر دونوں ہی کے مطالعے کے لئے مسلّم ہے۔

---

[1] بہ حوالہ فارسی کتاب شمس الضحیٰ: مصنفہ مولوی صفدر حسین۔ مطبع اثنا عشری (لکھنؤ ۱۲۹۸ ہجری) ص ص ۱۶۴/۱۶۵۔ ملحوظ رہے کہ یہ فارسی کتاب اب کم یاب ہے۔ راقم الحروف نے اس کا ایک بوسیدہ نسخہ مرزا دبیر کے حقیقی پرپوتے جناب مرزا محمد صادق صاحب صادق لکھنوی کے پاس دیکھا ہے میں اِس خط کے لیے موصوف کا شکر گزار ہوں۔ کاظم علی خاں۔

[2] ر۔ک۔ اُردو مرثیے کا ارتقا: ڈاکٹر مسیح الزماں۔ کتاب نگر، لکھنؤ ۱۹۶۸ء۔ ص ۲۴۹۔

روشن آرا
ریسرچ اسکالر (فلسفہ) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اِحساس کا رِشتہ

میں نے پھولوں سے اپنے ہاتھوں کو سجایا ہے اور پھولوں سے اپنے بالوں کو سنوارا ہے اور املتاس کے کپاسی پھولوں سے اپنے گلے کا سنگھار کیا ہے۔ آج کے دن میرا بیاہ ہوا تھا۔ اس دن بھی املتاس کا پیڑ کپاسی پھولوں کے بوجھ تلے جھکا ہوا تھا۔ آج بھی کوئل کی کوک مجھے اس گھڑی کی یاد دلا رہی ہے۔ اُفق اسی طرح گلابی آسمانی اور کیسری رنگوں سے نکھری ہوئی تھی۔ بالکل ایسے ہی ہر سُو ہریالی تھی۔ کیا یہ وہی لمحہ ہے دس برس بعد بھی اُسی طرح محفوظ؟ کیا یہ ممکن ہوسکتا ہے؟ لمحہ برابر تبدیل ہوتا ہے حتیٰ کہ گزرے ہوئے لمحہ سے اُس کا کوئی تعلق بھی نہیں رہتا۔ ہر لمحہ کی اپنی ایک انفرادیت ہے۔ گزرے ہوئے لمحہ کو واپس لانا ممکنات میں سے ہرگز نہیں ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے جس سے گریز فضول ہے۔

دس برس پہلے کے لمحات میں پہنچ کر مجھے ایک ابدی مسرت کا ایک انجانی خوشی کا اور ایک بے پایاں سکون کا احساس ہو رہا ہے اپنی اس طفلانہ سعی کا مجھے خود بھی احساس ہے۔ پھر بھی اس لمحہ کی ہر شے کو اسی لمحہ کی مانند تصوّر کرکے میں اپنے آپ کو تسلّی دینے میں کامیاب ہوگئی ہوں۔

برسوں پہلے کی وہ نکھری صبح مجھے اچھی طرح یاد ہے جب احمد نے میرے بالوں کو پھولوں سے سنوارا تھا اور املتاس کے کپاسی پھولوں سے میرے گلے کا سنگھار کیا تھا۔ اُس دن بھی املتاس کا پیڑ کپاسی پھولوں کے بوجھ تلے جھکا ہوا تھا اور جب احمد نے ہلکے سے ہاتھ کے اشارے سے ُاسے ہلا دیا تھا تو مانوں میرے اُوپر پھولوں کا مینھ برس پڑا تھا۔ احمد نے جھک کر مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہا تھا کہ آج میرا بیاہ اس سے ہوا ہے کیونکہ اُس نے اپنے ہاتھوں سے مجھے دلہن بنایا ہے۔

آج مجھے احمد کیوں اس درجہ یاد آرہا ہے؟ شاید اسی لئے کہ آج کا دن میری زندگی کی تاریخ کا اہم ترین دِن ہے جس کا احمد دوسرا خصوصی کردار ہے۔ پھر تو ذہن کے دریچہ میں اُس کا ہیولیٰ ابھرنا ایک بیحد فطری سی بات ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے گویا وہ میرے نزدیک بیٹھا ہوا ہے اور اُس کے سگار کی تیز خوشبو میرے نتھنوں میں محسوس ہو رہی ہے اُس کے اپنے جسم کی خوشبو فضا میں بیحد رچی ہوئی ہے۔ اس کی آواز دس برس پہلے سنی ہوئی ہونے کے باعث کسی دور کے صحرا سے نہیں بلکہ اس کا رَس میرے کانوں میں اب بھی گھُلا ہوا ہے۔ اس کے جوتوں سے بنے ہوئے نشان دس برس پہلے کی مٹّی نے دھندلائے نہیں ہیں۔ مجھے وہ اب بھی بالکل اُسی طرح دِکھائی دے رہے ہیں۔

لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ خیالوں کا تیز دھارا اس حد تک رواں ہے کہ میں بدحواس ہوئی جارہی ہوں۔ ہاں میں سوچ رہی ہوں کہ میں جو اس انہماک اور توجہ سے بیتے ہوئے لمحات اور دس سال پہلے دیکھے ہوئے شخص کو بالکل اسی طرح محسوس کرنے کی انتھک کوشش میں مصروف ہوں کیا میرا اپنا وجُود میری اپنی خودی وہی ہے جو دس سال قبل تھی میری یہ کوشش ایک طِفلانہ سعی سے کسی قدر بہتر نہیں ہے جو کبھی اپنے عکس کو پکڑنے کی ہوتی ہے اور کبھی کھڑکی سے اندر آتی ہوئی گرد کی لکیر کو صرف یہ ہی حقیقت نہیں ہے کہ زمانے کے ظالم ہاتھوں نے مجھے جوانی سے ڈھلتی عمر کی جانب دھکیل دیا ہے یہ تو ایک بیحد عام تبدیلی ہے جسے ہر انسان محسوس کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ زمانے کے سرد و گرم نے مجھے اسقدر تبدیل کردیا ہے اتنا اُجاڑ دیا ہے کہ اگر میں اس عرصہ میں اپنے وجود میں رونما ہونے والی بے شمار تبدیلیوں کے بارے میں سوچنے بیٹھوں تو اس مختصر زندگی کا باقی ماندہ حصّہ بھی گزر جائے۔

آج شدت کے ساتھ مجھے جوانی کا وہ زمانہ یاد آرہا ہے جب بیحد بے فکری کے دِن ہوا کرتے تھے۔ زندگی بیحد سُبک روی کے ساتھ گزرتی تھی لیکن اُسی کے ساتھ دن ہَوا کے دوش پر اُڑے چلے جاتے تھے جس میں ایک خنکی تھی جو ایک عجیب سی فرحت بخشتی تھی ایک باس تھی جو بیحد مسحور کُن تھی۔ زندگی کے اس مختصر دور میں ایک جوش تھا اور ایک ولولہ۔

دس سال اُفوہ دس سال یہ ایک طویل عرصہ ہے جو مجھے آج بہت عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔ اور وقت میرے اوپر خنداں ہے کیونکہ وقت کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتا اور وقت کے ظالم ہاتھوں سے سب لوگ ستائے جاتے ہیں۔ یہی وقت مجھے تمسخر سے یاد دلا رہا ہے کہ میں ایک دفعہ نہیں بلکہ ایک ہزار دفعہ جنم لے چکی ہوں۔ کیوں کہ انسان ہر لمحہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اور پہلے والے انسان کو یہ انسان اتنا انوکھا اور نیا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حیرت سے اور کبھی خوف سے اس نئے انسان کا جائزہ لیتا ہے انسان کے کتنے روپ ہیں یہ کون جانے؟ وہ تو ہر لمحہ ایک نیا وجود بن جاتا ہے اپنے پہلے وجود سے بے نیاز اور سراسر مختلف۔ پھر یہ میرا وجود جسے میں اپنا کہتے ہوئے بھی اب جھجک رہی ہوں یہ کیسی طفلانہ

سعی میں منہمک ہے۔

احمد نہ جانے کہاں سے پھر میرے تخیّل میں ایک ہیولیٰ کی طرح اُبھرتا ہے۔ میں اُسے بغور دیکھتی ہوں۔ اس احمد میں اور دس سال پہلے کی شبیہہ میں ہر طرح کی مماثلت عیاں ہے۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ میری آنکھوں کو ضرور دھوکا ہو رہا ہے۔ لیکن ایسی تو کوئی بات نہیں ہے میری بینائی بالکل درست ہے۔ میں اپنے پورے ہوش و حواس میں ہوں۔ دس سال پہلے کا احمد مجھے آج بھی اُسی طرح کیوں نظر آرہا ہے۔

زندگی کی ڈگر پر میں بڑی بے لطفی سے چل رہی تھی کہ اچانک مجھے احمد کسی بھٹکے ہوئے راہی کی طرح گامزن نظر آیا۔ میں نے ایک ساعت کے لئے اُسے دیکھا۔ اس کی چال میں بڑی شکست خوردگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ کرب تھا۔ اس کے لبوں پر گہرے دُکھ کی مہریں ثبت تھیں اور اس کے چہرے پر غم و اندوہ کے مہیب سائے تھے۔ میں ٹھٹھک کر کھڑی ہوگئی۔ اُس نے شاید مجھے نہ دیکھا یا جان بوجھ کر دیکھنے کی زحمت نہ کی۔ میں نے اُسے روک لیا اور بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

"آپ اتنے MISANTHROPE (مردم بیزار) کیوں ہیں؟"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے" اُس نے پورے اعتماد کے ساتھ مجھے یقین دلایا۔ اس کی آواز بڑی المناک تھی۔

"ہاں" اوہ دوبارہ گویا ہوا۔ "میں انسانوں کی اس بھیڑ کے زبردست سمندر میں اپنے وجود کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔ بیحد تنہا"

میں نے جب اس کی بے انتہا اُداسی کی وجہ دریافت کی تو پہلی بار وہ بڑے حزیں انداز سے مسکرایا۔ اس کے اس تبسّم سے میں سرتاپا لرز اٹھی "یہ محض میری ذات کا دُکھ نہیں ہے بلکہ پوری نسلِ انسانی کا دُکھ ہے جو مجھے ہمہ وقت مضطرب رکھتا ہے ابھی آپ نے پوچھا تھا کہ کہیں میں مردم بیزار تو نہیں ہوں۔ ایسا بیشک نہیں ہے لیکن میں اس پاگل دنیا سے نجات چاہتا ہوں جہاں ہر طرف دُکھ ہی دُکھ ہے اور مسرت کا احساس محض بے معنی اور مضحکہ خیز ہے"

اس پہلی ملاقات کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے میں احمد کو جنم جنم سے جانتی ہوں پہچانتی ہوں۔

احمد عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ اُسے ادب سے گہری اُنسیت تھی۔ مصوّری کا وہ دلدادہ تھا اور موسیقی سے اُسے دیوانگی کی حد تک عشق تھا۔ وہ خود اپنے آپ کو ہیجان پسند کہتا اور تخیّل کی دنیا میں زندہ رہنے والے انسان کو عملی زندگی بیحد خام لگتی ہے۔

احمد اپنے سینہ میں شیشہ جیسا دل رکھتا۔ گھنٹوں وہ فٹ پاتھ پر پڑے فقیروں اور کوڑھیوں کو دیکھتا۔ پہروں اُن کے بارے میں سوچتا۔ حتیٰ الامکان اُن کی مدد بھی کرتا۔ سردی کے موسم میں نوعمر بچوں کو محض ایک کرتے میں ٹھٹھرتے دیکھ کر اُس کا دِل بھر آتا اُس کے اضطراب کو دیکھ کر میں اکثر اُس سے کہتی۔

"احمد خدا کے لئے اتنا مت سوچا کرو ورنہ تم پاگل ہو جاؤ گے"

"کاش میں پاگل ہی ہو سکتا۔" وہ اپنی آواز میں بے پناہ درد کو سمیٹ کر کہتا "میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ زندگی میں اسقدر افلاس اتنی بے بسی اور ایسے دُکھ بھی ہو سکتے ہیں۔ ساکیہ منی کی طرح میں دکھ کا سبب نہیں کھوج سکتا اور نہ سات سال ریاضت کرکے کوئی اصول بنا سکتا ہوں جس سے دُکھ کا یہ لامتناہی سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ اسلیئے کہ یہ کام صرف پیغمبر ہی کر سکتے ہیں۔ میں تو صرف محسوس کر سکتا ہوں۔ بہت کچھ محسوس کر سکتا ہوں۔ تم نہیں جانتیں کہ میں ہر وقت کیسی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہتا ہوں۔ ہر لمحہ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کسی ذہنی حادثہ سے دوچار ہو جاؤں گا۔ میں جب ہنستا ہوں تو فوراً ہی خوف سے کانپ جاتا ہوں۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ دوسرے ہی لمحہ کسی سانحہ کا شکار ہو جاؤں گا جو مجھ سے ہمیشہ کے لیے میری ہنسی چھین لے گا"

یوں ہی ڈرتے لرزتے ڈگمگاتے اُس نے زندگی کے تیس سال گزار دیئے۔

جب احمد نے مجھ سے شادی کی پیشکش کی تو میں نے اُسے منظور کرلیا۔ لیکن میں یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ احمد اِسقدر پاگل بھی ہو سکتا ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ ہم عام قانون کے مطابق شادی نہیں کریں گے۔ جب ہم ایک دوسرے کو اتنی اچھی طرح جانتے ہیں سمجھتے ہیں اور شاید محبت بھی کرتے ہیں تو پھر صرف کاغذات پر دستخط نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔

"یہ صرف انسان کے بنائے ہوئے قوانین ہیں۔ انھیں چاہے تو انسان توڑ بھی سکتا ہے"

"یہ بربریت ہے احمد" میں نے بیحد قطعیت کے ساتھ کہا تھا۔

"نہیں تم صرف سماج کی غلام ہو۔ انسان بالکل آزاد ہے۔ اُس کی آزادی کوئی نہیں چھین سکتا۔ خدا بھی نہیں"

اُس دِن سے پہلے میں نے احمد کو کبھی اتنا جذباتی ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ "زندگی صرف محسوس کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ سماج کا بندھن اس احساس کو چکنا چور کر دیتا ہے"۔ اس کی آواز کی لرزش میں محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس دِن شاید اس نے بے تکان بولنے کا تہیہ کرلیا تھا اور وہ زندگی کا مکمل پروگرام میرے سامنے رکھ دینا چاہتا تھا۔

اُس نے مزید کہا۔ پھر جب ہمارا دل زندگی سے بھر جائے گا تو ہم خودکشی کرینگے۔ اُس لمحہ کا احساس تمہیں اُس وقت ہوگا۔ وہ لمحہ ابدی ہوگا اس لمحہ کی پوری لذت ہم محسوس کرسکیں گے۔ کیوں کہ ہمارا انجام ایک ہوگا۔ ہم ایک دوسرے کے بے حد نزدیک ہونگے۔ وہ لمحہ بے حد پُرمسرّت ہوگا۔ جانتی ہو اسی لئے تو جان کیٹس نے جب نائٹنگیل کا گانا سنا تھا تو وہ اسے ابدی بنانا چاہتا تھا اور اس نے کہا تھا وہ اس گانے کو سن کر مرجانا چاہتا ہے کیوں کہ وہ گانا اُس لمحہ اُسے بے حد مسرت بخش رہا تھا لیکن کیوں کہ وہ ایسا نہ

(بقیہ صفحہ ۴۵ پر)

عارف سہیل لیکچرر میکانیکل انجینیرنگ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کالا سونا

زمین کی گہرائیوں میں چکنے اور بدبودار مادّے کی شکل میں چھپا قدرت کا یہ خزانہ جس نے ملکوں اور قوموں کی قسمت بدل دی ہے آج جس اہمیت کا حامل ہے اس کے لحاظ سے "کالا سونا" کی ترکیب اس پر صادق آتی ہے اس کالے سونے کا اصلی نام پیٹرولیم ہے جسے خام تیل یا پیٹرول کہا جاتا ہے۔

پیٹرولیم کے لغوی معنی "چٹان کا تیل" ہیں جو لاطینی لفظ پیٹرا (PETRA) بمعنی چٹان یا پتھر اور اولیم (OLEUM) بمعنی تیل سے مِلکر بنا ہے۔ یہ کرۂ ارض کی سطح کے نیچے مختلف شکلوں میں دور دور تک پھیلا ہوا ہے مثلاً گیس، رقیق، نیم جامد یا جامد مادّے کی شکل میں یا ایک ہی جگہ پر ایک سے زیادہ شکلوں میں۔ خام تیل دراصل چند نامیاتی اور غیر نامیاتی کیمیائی مادّوں کا نہایت پیچیدہ مرکّب ہے۔ اس میں موجود نامیاتی مرکبات میں وافر مقدار مختلف اقسام کے ہائیڈروکاربن کی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ غیر نامیاتی مادوں کی قسم میں گندھک، آکسیجن اور نائٹروجن کے مرکبات بھی ایک قلیل مقدار میں شامل ہوتے ہیں۔ پیٹرولیم گیس جسے عرف عام میں قدرتی گیس کہا جاتا ہے ہائیڈروکاربن گیسوں سے مِل کر بنتی ہے۔ جامد یا نیم جامد پیٹرولیم کے لئے بہت سارے نام ابتک وضع کئے گئے ہیں ان میں ایسفالٹ اور بٹومن زیادہ مستعمل ہیں۔

پیٹرولیم کی ارتقاء کی تاریخ بڑی دِل چسپ ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ ماضی میں جتنا پیچھے جھانک سکے ہیں انھیں تاریخ کے ہر دور میں پیٹرولیم کے آثار ملے ہیں۔ قدیم ترین آثار میں عراق میں دریائے فرات کے کناروں پر بنی ہوئی چھ ہزار سال پرانی وہ عمارتیں ہیں جن میں ایسفالٹ کا گارا استعمال کیا گیا تھا۔ ایسفالٹ کتھئی مائل کالے رنگ کا جامد مادہ ہے جو تقریباً کوئلے کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ کبھی یہ سطح زمین پر بھی مِل جاتا ہے ورنہ پیٹرولیم کو صاف کرتے بہ بچ رہتا ہے۔ قدیم شہروں کش، نینوا، لون لینو او غیرہ کی کھدائی سے اس قسم کے ثبوت ملے ہیں کہ اس زمانہ میں ایسفالٹ غسل خانوں اور کشتیوں وغیرہ میں پالش کے لئے استعمال کیا جاتا تھا تاکہ ان کو سڑنا دے۔ اس کے علاوہ برتن بنانے اور دیواروں پر روغن کرنے میں بھی استعمال ہوتا تھا۔ عراق میں ایسفالٹ کے ذخائر یوں تو کئی جگہ تھے مگر ایک اہم ذخیرہ بغداد سے سو میل جنوب میں تھا۔ اس کے علاوہ تیل اور ایسفالٹ کے ذخائر دریائے سندھ کے کناروں پر بھی تھے جو اس زمانے میں وادیٔ سندھ کے انسانوں کی ضروریات پوری کیا کرتے تھے۔ قدیم مصری باشندے ایسفالٹ کی درآمد فلسطین سے کرتے تھے جہاں اس کے سب سے زیادہ ذخائر موجود تھے۔ چین کی قدیم تہذیب جو دریائے زرد کے کناروں پر پھیلی ہوئی تھی پیٹرولیم کے استعمال میں ماہر تھی۔ آج سے تقریباً دو ہزار سال قبل یہ لوگ پیٹرولیم کو آگ اور روشنی پیدا کرنے کے لئے استعمال کرتے اور اسے نمک کے کنوؤں سے حاصِل کرتے تھے جن سے نمک کے پانی کے ساتھ ہی پیٹرولیم بھی نِکل آتا تھا۔ انجیل مقدس کے مطابق کشتی نوحؑ بھی پیٹرولیم کی ہی وارنش سے پوتی گئی تھی۔ یونانی، رومی اور فارسی تاریخ میں بھی پیٹرولیم کا ذِکر ملتا ہے۔ یونانیوں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے دشمن کے ایک بحری بیڑے کو سمندر پر تیل ڈال کر اور اسے آگ لگاکر تباہ کیا تھا۔ آتش یونان جسے وہ بطور ہتھیار استعمال کرتے تھے اور جسے پانی نہیں بجھا پاتا تھا گندھک، پوٹاش، چونا اور ایسفالٹ کو ملاکر پیدا کی جاتی تھی۔ پہلی صدی کے رومی مورخ پلنی کی رپورٹ کے مطابق جوپیٹر کے مندروں میں تیل ہی کے چراغ جلاکرتے تھے۔ ایک رومی جنرل نے اپنے دشمن کو بڑے ہی دلچسپ طریقہ سے شکست دی تھی۔ اس نے سوروں پر تیل مل کر اور آگ لگاکر دشمن کی فوج کی طرف ہنکا دیا اور دشمن اس متحرک آگ کی تاب نہ لاکر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ساتویں صدی میں شہنشاہ فارس نے بھی اسی وجہ سے ایک ہاتھی بردار ہندوستانی فوج کو شکست دی اس نے لوہے کے کھوکھلے گھوڑے بنوائے اور انھیں پہیوں والی گاڑیوں پر کسوا دیا، پھر ان میں تیل بھر کر اور آگ لگاکر ہندوستان فوج کی طرف دھکیل دیا گیا۔

جیسے جیسے تہذیب ترقی کرتی گئی انسان کو جہاں بھی تیل اور ایسفالٹ کے ذخائر ملے وہ انہیں استعمال کرنے کے نئے نئے ڈھنگ نکالتا رہا۔ جہاں مقدار زیادہ ہوتی وہاں تیل کی مقامی صنعت فروغ پاجاتی۔ اس کی ایک مثال روس کے ایک مقام باکو کی تیل کی تجارت ہے۔ ایک ہزار سال قبل مسیح آتش پرست اس تیل کو مقدس آگ جلانے میں صرف کرتے تھے۔ تیرھویں صدی میں مارکو پولو نے باکو کے تیل کو جانوروں کے لئے بطور دوا استعمال ہوتے دیکھا۔ سولھویں صدی تک یہ تیل اور ایسفالٹ پورے فارس میں تقسیم ہوتا تھا۔ پھر جب شہنشاہ پیٹر نے فارس فتح کیا تو اس تیل کو روس بھیجنے کا انتظام کیا۔ باکو آج بھی دنیا کا ایک اہم تیل کا خطّہ ہے۔ ۱۵۲۱ء میں جب پزارو اسپین کے باشندوں کو لے کر نئی دنیا فتح کرنے نکلا تو پیرو میں اس نے ایسفالٹ کی باقاعدہ تجارت ہوتے دیکھی۔ ریگستان میں ایک قدیم

جگہ جسے اسپین کے باشندوں نے لابری نام دیا تھا، ریڈ انڈین عجیب طریقہ سے تیل نکالیتے تھے۔ وہ مخصوص اون سے بنے کمبل تیل کے چشموں میں پھینک دیتے۔ اِن کمبلوں کی یہ خاصیت تھی کہ یہ تیل کو تو جذب کر لیتے تھے مگر پانی کو چھوڑ دیتے تھے۔ اِن کمبلوں کو باہر نکال کر نچوڑا جاتا اور مٹی کے پیپوں میں تیل اِکٹھا کر لیا جاتا۔ پھر اس تیل کو پکایا جاتا یہاں تک کہ خوب گاڑھا الیسفالٹ بن جاتا جسے وہ اپنے مُردوں کے جسم پر لگا کر انھیں محفوظ کر لیتے اور مٹی کے برتنوں پر پالش کرتے۔ مٹی اور لوہے کے پیپے لابری میں آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ گوروں میں تیل کی دریافت سب سے پہلے ۱۶۲۷ء میں ایک پادری نے کی۔ جہاں آج کیوبا جھیل ہے وہاں اس نے پیٹرولیم اور پانی کا مِلا جُلا چشمہ دریافت کیا جس میں تیل کے بجائے پانی کی مقدار زیادہ تھی اور یہ تیل کی دنیا میں سب سے الگ مثال ہے۔ اس لیے کہ اس کے بعد پورے امریکہ اور کناڈا میں ایک بھی ایسا چشمہ دریافت نہ ہوا جس میں پانی کی اتنی مقدار ملی ہوئی ہو۔ گوروں سے پہلے نوا اسکاشیا سے کیلیفورنیا تک پھیلے ہوئے انڈین پیٹرولیم کو زیادہ تر بطور دوا استعمال کرتے تھے۔ جب گورے یہاں آئے تو انہوں نے بھی یہی کیا کہ پیٹرولیم درد، موچ، کھانسی اور خراش وغیرہ کی بے مثال دَوا ہے۔ مختلف بیماریوں میں پیٹرولیم کی مسیحائی کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۰۱ء تک کی کتابوں میں پیٹرولیم کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے" بلاشبہ یہ حقیقت ہے کہ آج کے زمانے میں اور بیماریوں کے علاوہ گلے کی بیماریوں کے علاج کے واسطے پیٹرولیم کا کوئی ثانی نہیں"۔

۱۹ویں صدی کی اِبتدا تک پیٹرولیم کا استعمال علاج کی حد سے آگے نہیں بڑھا اور روشنی کے لئے چربی کی شمعیں اور وھیل مچھلی کا تیل اِستعمال ہوتا تھا۔ مگر انیسویں صدی کے وسط میں وھیل مچھلیاں ختم ہونے لگیں اور جلانے کے لئے نئے ایندھن کی ضرورت نے انسان کا ذہن پھر پیٹرولیم کی طرف موڑا۔ سائنس داں جانتے تھے کہ پُرانے لوگ پیٹرولیم اور ایسفالٹ سے روشنی پیدا کرنے کا کام بھی لیتے تھے اس لئے اسی جانب خصوصی توجہ دی گئی اور آخر کار کناڈا کے ڈاکٹر ابراہیم گیسنر نے سب سے پہلے کوئلہ اور السفالٹ سے کیروسین جسے آج ہم مٹی کا تیل کہتے ہیں بنایا۔ چونکہ سب سے پہلے کیروسین کوئلہ سے نکالا گیا اِس لئے اِسے کوئلہ کا تیل بھی کہا گیا اور یورپ میں کچھ لوگ اسے اب تک اسی نام سے پکارتے ہیں۔ کیروسین کی دریافت کے بعد ایندھن کا مسئلہ تو کسی حد تک حل ہو گیا تھا مگر پیٹرولیم اَب بھی صاف بچ گیا مگر کب تک؟ ۱۸۵۵ء میں امریکہ کے پیٹسبرگ میں سیموئل کیر نامی ایک شخص نے پیٹرولیم کو مقطّر کر کے چراغوں میں جلنے کے قابل تیل بنا ہی لیا۔ حالانکہ کیر کا بنایا ہوا تیل زیادہ کامیاب نہ ثابت ہوا مگر یہ ثابت ہو گیا کہ پیٹرولیم کو مقطّر کر کے چراغوں کے لئے تیل نکالا جا سکتا ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہی خصوصاً کناڈا اور امریکہ کے لوگوں نے پیٹرولیم کی تلاش بڑی سرگرمی سے شروع کر دی

تاریخ کا سب سے پہلا تیل کا کنواں ولیم نامی ایک شخص نے اینس کلن (ENNISKILLEN) میں جو آج کل آئرلینڈ میں ہے کھودا۔ یہ کنواں صرف ۴۹ فٹ گہرا تھا اور اس سے ولیم نے اتنا تیل نکالا کہ باقاعدہ تیل صاف کرنے کا کارخانہ لگا کر تجارت شروع کر دی۔ اِدھر امریکہ میں ڈریک نامی ایک شخص نے پنسلوانیا اسٹیٹ میں ۱۸۵۸ء میں اپنا کنواں زمین میں دھنسانا شروع کیا۔ پورے ایک سال بعد ۲۸ اگست ۱۸۵۹ء کو جب کہ اس کا کنواں ۶۹ فِٹ گہرا جا چکا تھا یکایک تیل بہت تیزی سے تقریباً سطح زمین تک چڑھ آیا۔ اس کنویں سے تقریباً تیس بیرل پیٹرولیم روزانہ نکلتا تھا۔ تیل کے اِن دو کنوؤں کے بعد یہ یقین ہو گیا کہ زمین کے نیچے تیل کا خزانہ موجود ہے۔ اس کا نتیجہ اس تلاش کی صورت میں ظاہر ہوا جس کی بدولت صرف ایک سال کے عرصہ میں امریکہ میں پانچ اور جگہوں پر تیل دریافت ہوا۔ ان کامیابیوں کے بعد تیل کی تلاش ایک کبھی نہ ختم ہونے والی مہم بن گئی جو آج بھی جاری ہے۔

اب تک پائے جانے والے ذخائر کے مُطابق دنیا کے کچھ حصوں میں تیل کی غیر معمولی مقدار موجود ہے اور کچھ حصوں میں نہایت قلیل مثلاً آسٹریلیا اور افریقہ میں ابتک بہت ہی کم تیل دریافت ہوا ہے۔ دنیا کے ان دو حصوں کو جو تیل کے معاملہ میں انتہائی مالدار ثابت ہوتے ہیں قطبین تیل کہا جاتا ہے۔ اِن میں سے ایک علاقہ مشرق وسطیٰ کا ہے جسے ہم مغربی ایشیا کہتے ہیں اور دوسرا علاقہ خلیج میکسکو کا ہے۔ خلیج میکسکو کے علاقہ میں کولمبیا، وینیزویلا اور ٹرینیڈیڈ وغیرہ آتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے علاقہ میں ایران، عراق، کویت، سعودی عرب اور کچھ حصہ روس کا آتا ہے۔ دنیا کے دو تہائی تیل کے ذخائر ان دو حصوں میں ہی ہیں۔ اس سے کم مگر خاصی مقدار کے ذخائر شمالی امریکہ میں کیلیفورنیا وغیرہ اور کناڈا میں دریافت ہو چکے ہیں۔ یورپ میں پولینڈ، شمالی جرمنی کے میدانی علاقے، رومانیہ، وادیٔ فرغانہ اور روس میں دریائے والگا کے علاقہ اور مشرقِ بعید میں جاوا، سماٹرا، نیوگانئا، برما اور جاپانی جزائر میں بھی تیل کے ذخائر دریافت ہوئے مگر انکی وہ اہمیت نہیں جو قطبین کی ہے۔

مشرقِ وسطیٰ میں تیل کی پیداوار میں پہل کرنے کا سہرا ایران کے سر ہے ۱۹۰۸ء میں یہاں کوہ زاگرس کے دامن میں مسجد سلیمان نامی مقام پر پہلی بار تیل دریافت ہوا۔ اس ہمت افزا دریافت کے بعد سرگرم تلاش کا نتیجہ ۴۳ سال میں ہفت کل، گچساران، نفت سفید، آغاجاری اور لالی وغیرہ کے ذخائر کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ۱۹۷۱ء تک ایران میں تیل کی پیداوار ۱۷ کروڑ ٹن سالانہ پہونچ گئی تھی۔ ایران کے بعد عراق نے تیل کے میدان میں کامیابی حاصل کی جب پہلی جنگ عظیم کے بعد یہاں کرکوک نامی مقام پر تیل دریافت ہوا۔ سعودی عرب بہت بعد میں میدان میں آیا مگر بہت جلد عراق سے بازی لے گیا۔ ۱۹۳۶ء میں یہاں دمام نامی مقام پر پہلا تیل کا کنواں دریافت ہوا۔ بعد میں غوار میں تیل کے خطے دریافت ہوئے۔ غوار کا ۱۲۰ میل لمبا علاقہ آج دنیا کا سب سے بڑا تیل کا خطہ کہا جاتا ہے۔ کویت میں تیل کی پیداوار ۱۹۳۶ء میں شروع ہوئی۔ قدرت نے اس چھوٹے سے مُلک کو وہ خزانہ عطا کیا کہ ۱۹۵۳ء میں وہ ایران اور سعودی عرب کو پیچھے چھوڑ کر مشرق وسطیٰ میں اوّل درجہ کا تیل پیدا کرنے والا بن گیا۔ اس کے بعد خلیج فارس کی ریاستوں میں تیل ڈھونڈھا

گیا اور مندرجہ بالا ممالک کے بعد ابوظہبی، عمان، قطار، بحرین اور مصر وغیرہ میں بھی کافی مقدار میں تیل کی پیداوار ہونے لگی۔ ان سب میں لیبیا قابل ذکر ہے جو حالانکہ بعد میں آنے والوں میں ہے مگر پیداوار کے لحاظ سے اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ دنیا کے ان علاقوں سے حاصل ہونے والی تیل کی یہ کثیر مقدار انسان کی کن کن ضروریات کو پورا کرتی ہے اس کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ استعمال کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ ۱۹۶۲ء میں دنیا میں تیل کا کل خرچ ساڑھے چار کروڑ پیپے روزانہ تھا اور اندازہ ہے کہ ۱۹۸۰ء میں یہ بڑھ کر آٹھ سے دس کروڑ پیپے روزانہ ہو جائیگا۔ ان اعداد و شمار کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ۹ کروڑ پیپے تیل کا مطلب ہے تین ہزار میل لمبی تیل سے بھری ایک ریل گاڑی۔ تیل کے خرچ میں تیز رفتار اضافہ کار کے انجن کی ایجاد کے بعد سے اور یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد ہوا پیٹرول اور ڈیزل انجن جب بازار میں آئے اور ان کا استعمال تقریباً زندگی کے ہر شعبہ میں ناگزیر ہو گیا تو تیل کی پیداوار بھی اسی رفتار سے بڑھی۔ ان انجنوں کے سارے استعمال اگر گنائے جائیں تو صفحات بھر جائیں گے بس اتنا سمجھ لیجیے کہ جہاں بھی کوئی مشین یا گاڑی حرکت کرتی ہے وہاں اسی فیصد امکان اسبات کا ہے کہ اس حرکت کے پیچھے جو توانائی کام کر رہی ہے وہ پیٹرولیم سے حاصل کی گئی ہوگی اور یہ انجن اس کا خاص ذریعہ ہیں۔ پیٹرولیم کو صاف کر کے پیٹرول، ڈیزل مٹی کا تیل، چولہوں کا تیل، جلنے والی گیس مشینوں کے پرزوں میں ڈالنے والا تیل، موم، مختلف اقسام کے محلل، گریس اور ایسفالٹ وغیرہ نکالے جاتے ہیں۔ اور ان سب کے استعمال کا اندازہ ہر شخص خوب لگا سکتا ہے

پیٹرولیم سے بنائی جاتے والی سب سے جدید چیزیں وہ کیمیائی اشیاء ہیں جنہیں پیٹروکیمیکلس کہا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم سے قبل دوائیاں، ربر، پلاسٹک، آتش گیر اور اس قسم کے کیمیائی مرکبات کوئلہ وغیرہ سے بنائے جاتے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں جب جنگ شروع ہوئی تو امریکہ میں یہ ساری چیزیں پیٹرولیم سے بنائی جانے لگیں۔ اس کے بعد اس صنعت میں ترقی ہی ہوتی گئی اور آج ربر، پلاسٹک، آتش گیر مادے، دوائیاں، ہزاروں قسم کے کیمیائی مرکبات، کریم، لپ اسٹک اور میک اپ کا تقریباً اسّی فیصد سامان، کپڑے صاف کرنے کا پاؤڈر، فوٹو کھینچنے کی فلمیں، وارنش اور پینٹ، ڈی ڈی ٹی اور کیڑے مارنے کی دوائیں، کپڑوں میں اورلون، ٹیریلین، ڈیکرون، نائلن، ریان، پولی ایسٹر وغیرہ وغیرہ سب پیٹرولیم پر ہی مختلف عمل کر کے بنائے جاتے ہیں۔

یہ تھی پیٹرولیم کی مختصراً تاریخ اور اس کی اہمیت کی ہلکی سی جھلک۔ اب مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پیٹرولیم کے پنجے ہی اس زندگی میں اتنے گہرے گڑ چکے ہیں کہ اب اس سے فرار تقریباً ناممکن ہے۔ اگر توانائی کا کوئی دوسرا کامیاب ذریعہ ڈھونڈ بھی لیا گیا تب بھی پیٹرولیم سے کنارہ کشی ممکن نہیں۔ یہ کالا سونا شاید زمانہ کے کسی بھی دور میں مٹی نہ بن پائے گا۔

بقیہ احساس کا رشتہ

کرسکا اس لئے اُس نے اپنے جذبات اور احساسات کو محفوظ کرنے کے لئے ایک نظم کی تخلیق کی تھی۔

لیکن میں احمد کا کہا نہ مان سکی کیوں کہ میرا بہر حال ایک مذہب تھا جسکی پابندی میں پورے خلوص کے ساتھ کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ احمد کو میں نے اس روز سے پہلے کبھی اتنا اُداس نہ دیکھا تھا میں نے کہا "احمد میں تم سے محبت کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی لیکن نظریات کے اس فرق کو مٹانے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے"۔

"اِس لئے کہ تم سماج کی غلام ہو" اُس نے تڑپ کر کہا تھا۔

"جو بھی تم سمجھو" میں نے پورے سکون کے ساتھ کہا تھا۔

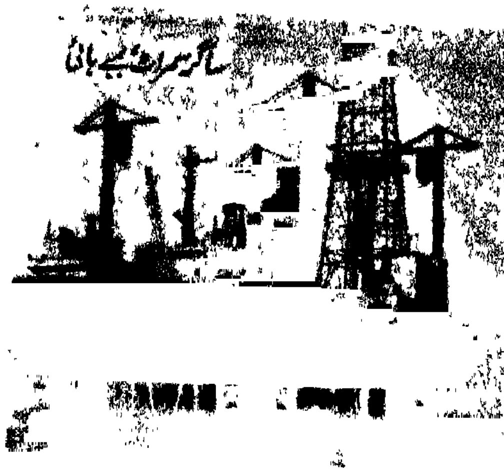
میں نے اپنا نقطۂ نظر اس کے سامنے رکھا لیکن وہ میرا ہم خیال نہ ہو سکا۔ پھر اُس نے ایک بیحد معصوم سی التجا مجھ سے کی۔ اُس نے کہا کہ چلو تخیّل ہی میں سہی میں تمہیں اپنی دلہن کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور میں اُس کی اس ادنیٰ سی خواہش کو رد نہ کر سکی۔ اُس نے پھولوں سے میرے ہاتھوں کو سجایا اور پھولوں سے میرے بالوں کو سنوارا اور املتاس کے کپاسی پھولوں سے میرے گلے کا سنگھار کیا کیونکہ دھات کے گہنوں سے اُسے نفرت تھی اور بھاری کپڑوں کا بوجھ اسے برا لگتا تھا اس نے پھر ہاتھ کے ہلکے سے اشارے سے املتاس کے پیڑ کو ہلایا تھا جسکے نتیجہ میں میرے اوپر پھولوں کا مینھ برس پڑا تھا۔ اُسنے میرے اُوپر جھک کر سرگوشی کے انداز میں کہا تھا کہ آج میرا بیاہ اُس سے ہوا ہے کیوں کہ اُس نے اپنے ہاتھوں سے مجھے دلہن بنایا ہے۔

اُس کے بعد احمد ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔ اُس نے اپنا کوئی پتہ مجھے نہیں دیا کیوں کہ اُس کا کہنا تھا کہ وہ ایک لاپتہ انسان ہے۔ اُس نے مزید کہا کہ میں اُسے کبھی نہیں پا سکوں گا۔ اس کا کہنا سچ ثابت ہوا کیونکہ اُس دن کے بعد میں نے اُسے پھر کبھی نہ دیکھا۔ احمد چلا گیا لیکن میرے لئے ایک کبھی نہ پُر ہونے والا خلا چھوڑ گیا۔

میری شادی کمال سے ہو گئی۔ یہ وہ شادی تھی جو سماج کی نظر میں ایک جائز بات تھی۔ میرا شوہر ایک بزنس مین ہے۔ جو ہر وقت کاغذوں کے انبار کے درمیان دکھائی دیتا ہے۔ وہ ظاہر ہے بہت عملی آدمی ہے اور بقول احمد کے بہت غیر مہذب بچہ ہے۔ شئے لطیف سے بالکل بے نیاز ہے اور شاعری سے متعلق پوچھتا ہے کہ یہ نظمیں کیسے بنائی جاتی ہیں۔

زندگی میں متضاد چیزوں کا ہونا بیحد لازمی ہے۔ ہر شئے کا تضاد دنیا میں موجود ہے۔ میں قدرت سے سوال کرتی ہوں کہ یہ ستم ظریفی کیسی؟ لیکن میری آواز آوازِ بازگشت بن جاتی ہے اور میرے سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا۔

ہندوستان میں پٹرول کی تلاش



ہندوستان میں پٹرول کی دریافت ۱۸۶۷ء میں ہوئی جب آسام میں مرگھریٹا کے نزدیک ماکم میں تیل کا پہلا کنواں کھودا گیا۔ اس کے بعد تلاش اور جستجو کا جو سلسلہ شروع ہوا اس کے نتیجے میں آسام اور گجرات کے متعدد مقامات کے علاوہ بمبئی ہائی میں پٹرول کا ذخیرہ ملا ہے آئل اینڈ نیچرل گیس کمیشن نے ساحلی علاقوں میں ۱۲۴۵ کنووں کی کھدائی کی ہے زمینی علاقے پر جو کھوج کی گئی ہے اس سے اب تک ۱۲۳۰ لاکھ ٹن تیل کے ذخیرے اور ۳۰۰ لاکھ مکعب میٹر قدرتی گیس کا ذخیرہ ملا ہے۔ اپنے قیام سے لے کر نومبر ۱۹۷۵ء کمیشن نے ۳۹۲ لاکھ ٹن خام تیل نکالا ہے۔ آئل انڈیا لمیٹڈ نے اپنے قیام سے لے کر اکتوبر ۱۹۷۵ء تک ۳۵۴ کنووں کی کھدائی کی ہے اور ۳۴۷ لاکھ ٹن کچا تیل نکالا ہے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ ۷۶-۱۹۷۵ء کے درمیان آئل اور نیچرل گیس کمیشن ۵۱ لاکھ ٹن خام تیل پیدا کرے گا اور آئل انڈیا لمیٹڈ کی ۳۰ لاکھ ٹن سالانہ کی پیداوار برقرار رہے گی۔

سرکاری کارخانوں کے علاوہ آسام آئل کمپنی (نجی ادارہ) بھی ستر ہزار ٹن سالانہ تیل پیدا کرتا ہے۔

۱۹۵۰ء تک ڈگبوئی (آسام) میں تیل صاف کرنے کا صرف ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا۔

اس وقت ہندوستان میں ۲۷۰ لاکھ ٹن تیل صاف کرنے کی صلاحیت ہے اور سات کارخانے موجود ہیں۔ ۱۔ گوہاٹی (آسام) ۲۔ بررونی (بہار) ۳۔ کویالی (گجرات) ۴۔ کوچین (کیرالا) ۵۔ مدراس (تامل ناڈو) ۶۔ بمبئی، ۷۔ ہلدیا (مغربی بنگال)

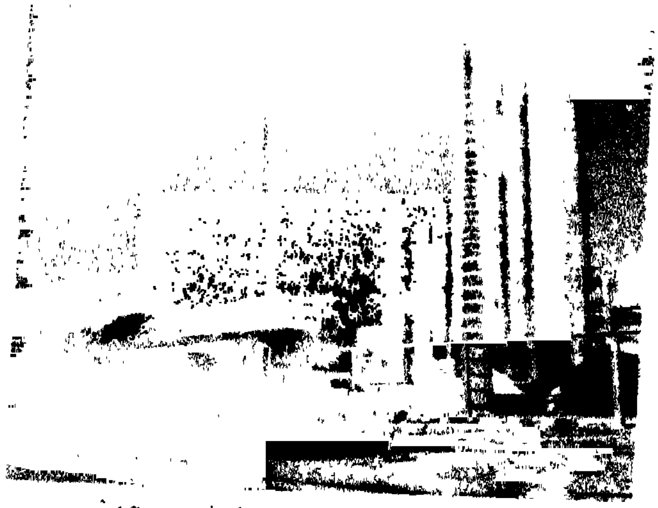
نجی علاقے میں تیل صاف کرنے کے دو کارخانے ہیں۔ آسام آئل کمپنی ڈگبوئی اور کالٹکس (وشاکھاپٹنم)۔ ایسو (ESSO) اور برما شیل دو نجی کمپنیوں کو سرکاری ملکیت میں لے لیا گیا۔ اس طرح پٹرول کی پیداوار اور تقسیم کا تقریباً ۹۰ فی صد حصہ حکومت کے ہاتھوں میں آگیا ہے۔

متھرا (یو۔پی) میں تیل صاف کرنے کا ایک کارخانہ قائم کیا جا رہا ہے۔ اس کی صلاحیت ۶۰ لاکھ ٹن سالانہ ہوگی۔ تیل صاف کرنے کا دوسرا کارخانہ بنگائی گاؤں (آسام) میں قائم کیا جا رہا ہے۔ یہاں دس لاکھ ٹن سالانہ تیل صاف ہوگا۔ کویالی کی صلاحیت میں ۳۰ لاکھ ٹن سالانہ کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ ان اقدامات سے ۸۱-۱۹۸۰ء تک ملک میں ۳۷۰ لاکھ ٹن سالانہ تیل صاف ہو سکے گا۔

ہندوستان خام تیل کی پیداوار کے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا ہے بمبئی کے گہرے سمندر میں جو پہلے دو کنوئیں کھودے گئے تھے ان سے تیل نکالنے کا کام شروع ہو گیا ہے اب یہاں سے خام تیل کی پیداوار بتدریج بڑھتی جائے گی۔ اس سال کے اختتام تک ہمیں بمبئی کے گہرے سمندر سے سالانہ ۲۰ لاکھ ٹن تیل ملنے لگے گا۔ امید ہے کہ ۱۹۸۰ء تک اس کی مقدار ایک کروڑ ٹن تک ہو جائے گی۔

گزشتہ دو تین برسوں کے اندر ہمیں مہنگائی اور جن دوسری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کا بنیادی سبب یہی تھا کہ تیل کی قیمتوں میں ایک دم سے تین گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس وقت ہندوستان میں گجرات اور آسام کے تیل کے کنوؤں سے سالانہ تقریباً ۸۲ لاکھ ٹن تیل نکلتا ہے یہ ہماری کل ضروریات کا صرف ۳۸ فیصد ہے ۷۷-۱۹۷۶ء میں ہمیں تیل کی درآمد پر لگ بھگ بارہ ارب روپے کی لاگت کا غیر ملکی زرمبادلہ خرچ کرنا پڑے گا۔ ہم اپنی سب درآمدات پر جو زرمبادلہ خرچ کرتے ہیں یہ رقم اس کا بہت بڑا حصہ ہے اگر اسے بچا کر دوسری چیزوں پر خرچ کیا جائے تو ہماری ترقی کی رفتار یقیناً بہت زیادہ تیز ہو سکتی ہے۔ اندازہ ہے کہ آئل اینڈ نیچرل گیس کمیشن کو آئندہ پانچ برسوں کے دوران آٹھ ارب روپے کی مالیت کی غیر ملکی زرمبادلہ درکار ہوگا۔ یہ ایک بہت بڑی رقم ہے مگر تیل کے معاملے میں اگر ہمیں خود کفیل ہونا ہے تو اتنا پیسہ خرچ کرنا ہی پڑے گا۔ اس سلسلے میں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ تیل کی تلاش کے لئے بہت سا ساز و سامان باہر سے منگوانا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر ساگر سمراٹ نام کا جہاز جس کی مدد سے بمبئی کے گہرے سمندر میں کنوئیں کھودے گئے، جاپان سے درآمد کیا گیا تھا۔ اسی طرح کے دو اور جہاز بھی ہم نے باہر سے منگوائے ہیں۔ آج کل چونکہ بہت سے ملک تیل کی تلاش کر رہے ہیں۔ اس لئے ایسا سامان مہنگا بھی ہو گیا ہے اور کمیاب بھی۔ ان سب مشکلات کے باوجود ہند سرکار نے تیل کی کھوج کے کام میں کسی طرح کی سستی نہیں آنے دی ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ ہندوستان کی زمین کے نیچے تیل ہی تیل ہے، مگر اس کی تلاش کے لئے شدید محنت، قوتِ برداشت اور سرمایہ چاہئے یہ کام ایسا ہے کہ بعض اوقات بہت کچھ کرنے کے بعد بھی کامیابی نہیں ہوتی۔ مگر ہم نے اب تک جو کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ انھیں دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۰ء تک اگر ہم تیل کے معاملے میں خود کفیل نہیں ہوئے تو اس منزل کے قریب ضرور پہنچ جائیں گے۔



انکلیشور (گجرات) میں تیل صاف کرنے کا کارخانہ

نئی کتابیں

بیاض مریم

۔ مجموعہ کلام، سکندر علی وجد۔ شائع کردہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی صفحات ۱۳۶، قیمت :- بارہ روپے

بڑی دیدہ زیب اور خوب صورت ملک کے مشہور مصور ایم۔ ایف حسین ی کھینچی ہوئی "خطوطی" تصویروں سے مزین۔ شاعر کے دستِ خاص سے لکھی ہوئی غزلوں اور نظموں کے عکس سے عبارت یہ چھوٹی سی کتاب سکندر علی وجد کی غزلوں اور نظموں کا مختصر سا گل دستہ ہے۔

سکندر علی وجد ہمارے اِن چند شاعروں میں ہیں جنھوں نے شاعری و فنونِ لطیفہ کا حصہ سمجھ کر اپنایا اور زندگی کو فنونِ لطیفہ کا حصہ سمجھ کر گزارا انکی شاعری بں مصوری۔ سنگیت۔ فنِ تعمیر اور بُت گری سبھی فنون سے لطف لینے، اس طف کو شاعری میں ڈھالنے اور اپنے اشعار کے ذریعے ان کیفیات کو راج عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اجنتا اور ایلورا پران کی نظمیں بلِ نظر سے داد وصول کر چکی ہیں اس مجموعے میں بھی ایم۔ ایف حسین کی سویروں ہی پر نہیں بلکہ سارنگی، اُستاد امیر خاں کو نذرانۂ عقیدت (نغمے کی موت)، دین سلطانہ۔ میرلن منرو اور صبح شالامار تک سبھی کچھ ہے جن سے لطفِ ندگی عبارت ہے اور جو ابھی تک ہمارے ملک کے گنے چنے چند کھاتے پیتے گھرانوں اور مرفہ الحال اربابِ نظر کی میراث ہے اور جس کے بارے ں بقول اقبال یہ دعا کی جاسکتی ہے "مرا ذوقِ بصیرت عام کر دے"

ان غزلوں اور نظموں کو سرسری طور پر پڑھنے والا بھی یہ جان لے گا کہ بیتی ان کا جُزوِ غالب ہے ہلکی پھلکی رواں اور مترنم بحریں ہیں اور شاعری میں انیہ رنگ غالب ہے اور روایتی انداز سے وجد ہنوز دامن نہیں چھڑا سکے۔ قدیم طرزِ سخن کے بعض اچھے رسیلے اور رواں نمونے ان کی غزلوں میں بجا طور پر پائے جاتے ہیں۔

یہ مجموعہ اِس کا مستحق ہے کہ حسن طباعت، دیدہ زیبی اور خوش ذوقی کے ثبوت کے طور پر لوگ اسے اپنے کتب خانوں میں رکھیں۔

(محمد حسن)

کالی دھرتی کی غزلیں:

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ غزلوں کا مجموعہ ہے۔ دوسری کتابوں سے ایک طور مختلف یوں ہے کہ اِس میں ایک کی بجائے آٹھ شعرا کی غزلیات کا انتخاب ہے۔ شعرا کے نام بالترتیب اِس طرح ہیں: آمر صدیقی، شانِ بھارتی، رونق گیاوی، نجم عثمانی، شوکت نظمی، منظر سلطان پوری، عابد عزیزی اور جمالِ انور۔ ہر ایک کی دس دس غزلیں شاملِ مجموعہ ہذا ہیں۔ یہ تمام شعرا فی الوقت دھنباد میں اقامت پذیر ہیں۔ دھنباد کوئلے کی کانوں کا مرکز ہے۔ اِس رعائت سے ہی شاید کتاب کا نام "کالی دھرتی کی غزلیں" رکھا گیا ہے۔

اِن میں سے کئی نام ایسے ہیں کہ جو ادبی رسائل میں نظر آتے رہتے ہیں اور متعارف ہیں جیسے رونق گیاوی، نجم عثمانی اور منظر سلطان پوری۔ ان کے اور شان بھارتی کے لہجہ پر جدید غزل کا ٹھپہ ہے۔ ان کی شاعری کو روایتی اور ترقی پسند شاعری سے متمائز کیا جاسکتا ہے۔

اس مختصر تبصرے میں ان تمام حضرات کی شاعری کا الگ الگ جائزہ تو ممکن نہیں ہے البتہ اتنا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے بعض سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں خاص طور پر نجم عثمانی اور رونق گیاوی کے اشعار غیر مبہم اور معنی کے حامل نظر آتے ہیں اِن تمام شعرا کے یہاں روایتی لفظیات سے دامن بچانے کی شعوری کوششوں کا نشان ملتا ہے۔ کہیں کہیں اس سے تازگی پیدا ہوتی ہے مگر بیشتر اشعار نئے لفظوں کے انبار بن گئے ہیں۔

روایتی طرزِ ادا کی رو میں سب سے بڑی دلیل یہی تھی کہ اسکی لفظیات "کلی شیز" کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں اور اِس سے بامعنی کی بجائے محض رسمی شاعری کی تخلیق کرتی ہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جدید شاعری کی لفظیات بھی "کلی شیز" بنا رہی ہے اور معنی کھوتی جا رہی ہے پھر بھی چونکہ اس لفظیات کی عمر ابھی کم ہے اس لئے کچھ نہ کچھ مزہ دے جاتی ہیں اسی طرح کا موہوم سا ذائقہ ان غزلیات میں ہے۔

(انوار رضوی)

انجمن:

مصنف حسن الدین احمد

ملنے کا پتہ: ولا اکیڈمی، عزیز باغ

سلطان پورہ، حیدرآباد۔ حیدرآباد

حسن الدین احمد اُردو کے ممتاز ادیب اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں زیرِ کتاب ۲۶ خاکوں کا مجموعہ ہے جس میں صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد

امیر خسرو، محسن الملک اور عماد الملک میر اکبر علی خاں جیسے اکابر، پروفیسر ہارون خاں شیروانی اور ڈاکٹر سید عبد اللطیف جیسے مورخ اور ادیب کے ساتھ ساتھ ایسے ایسے افراد بھی شامل ہیں جو اتنے نامور تو نہیں مگر اپنے دائرہ کار میں ضرور منفرد ہیں۔

مختلف شخصیتوں کا یہ مرقع دلچسپ بھی ہے اور معلوماتی بھی اُردو کے سوانحی ادب میں بلاشبہ یہ ایک اضافہ ہے۔

کتابت اور طباعت گوارہ ہے۔ ۲۱۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت ۱۵ روپے ہے۔

اُردو اور قومی ایکتا:

مصنف: قیوم خضر

ملنے کا پتہ: دفتر اشارہ پٹنہ۔ ۷

صفحات: ۱۲۰، قیمت: دس روپے

قیوم خضر بہار کے مشہور صحافی ہیں اور سیاسی و سماجی کارکن بھی۔ ان کی یہ مفید کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں اُردو کے مسائل کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے۔ ماضی میں اُردو کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں تھیں ان پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ان تمام مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً اردو کے بارے میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔

آخری باب اس لحاظ سے زیادہ مفید ہے کہ اس میں حکومت کے علاوہ خود اُردو والوں کو بھی بڑے اچھے مشورے دیئے گئے ہیں کہ وہ خود اُردو کی ترقی اور فروغ کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ کوئی بھی زبان اپنے برتنے والوں کی سرپرستی اور خدمت سے ہی پروان چڑھتی ہے

مومن کے بہتر نشتر

مرتب: سرور مرزاپوری

ملنے کا پتہ: آل انڈیا مومن اکیڈمی جی۔ ۹۷ مورلینڈ روڈ بمبئی ۸، قیمت: ۳ روپے۔

مومن کے ۷۲ مشہور اشعار کا انتخاب۔ ہر صفحے پر ایک شعر درج کیا گیا ہے۔

سازِ رگ جان:

کرشن مراری کا مجموعۂ کلام

قیمت: دس روپے صفحات: ۱۲۰

کرشن مراری کا یہ مجموعہ غزلوں نظموں دوہڑوں اور قطعات پر مشتمل ہے لیکن ان کی طبیعت کو غزل زیادہ راس آئی ہے کیونکہ اس مجموعہ کا غالب حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔

اُردو غزل اپنی عشوہ طرازیوں کے لئے مشہور رہی ہے۔ زبان، تخئیل و جدت کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی اور تازگی فکر کی دولت ہر شاعر کو نصیب نہیں ہوتی لیکن خوشی کی بات ہے کہ کرشن مراری کے بہت سے اشعار غزل کے اچھے اشعار میں شمار کئے جائیں گے۔ ڈاکٹر یوسف حسین نے ان کی ایک خصوصیت کی طرف اشارا کیا ہے۔ جس کا ذکر ضروری ہے۔

"کرشن مراری کی شاعری میں زبان و بیان اور ہیئت کا نیا تجربہ بھی نظر آتا ہے۔ وہ جس طرح فارسی کی اضافتوں کو برتتے ہیں، اسی طرح ہندی کے سرل شبدوں کے برمحل استعمال پر بھی انہیں قدرت حاصل ہے۔ محبت میں صنف نازک کی طرف سے مخاطب کرنے کا جو طریقہ ہندی شاعری میں ہے وہ اپنے اندر خاص جاذبیت رکھتا ہے۔۔۔۔"

"اس طریق تخاطب سے اُردو شاعری میں زیادہ وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہو جائے گی")

(شہباز حسین)

بقیہ پس محمل غبار میں

اس پر وہ گاڑی میں یہ کہہ کر بیٹھ گیا' کابلی جی معاف کرنا میرے کو بڑی غلطی ہوگئی۔ گاڑی چل پڑی اس کے بعد دوسری گاڑی آئی اس نے دوسرے دن فیروزپور پہنچا دیا۔ یہاں سے گاڑی میں بیٹھ کر نابھہ پانچ بجے پہنچا۔ نابھہ شہر سے اسٹیشن کافی دور تھا۔ اسلئے جب شہر کی طرف پیدل روانہ ہوا تو لوگ حیرت سے دیکھتے تھے کہ یہ دیوانہ مسلمان کہاں سے اکیلا آرہا ہے۔ شہر نابھہ کے قریب پہنچا تو ایک سنیما نظر آیا۔ خیال آیا کہ سنیما دیکھنے کے بعد بچن لال جین کی برات کا پتہ لگاؤں گا۔ چنانچہ سنیما کا ٹکٹ خریدنے لگا تو چند سکھ "بے ریش و بروت" نوجوانوں نے کرپانیں دکھا کر کہا " ہم نے تمہارا ٹکٹ خرید لیا ہے چلو اندر"۔ میں نے سمجھا کہ اب غازی کے "شہید" ہونے کا وقت آگیا ہے۔ لیکن جب سنیما ہال میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ سکھ نوجوان میرے مداح تھے اور سکھ نیشنل کالج لاہور کے سٹوڈنٹس تھے۔ انٹرول میں بچن لال جین اور ان کے براتی ساتھی بھی ملے۔ اور میری دلچسپ داستان سن کر سب ہی ہنس ہنس کر ناچنے لگے۔

زندگی کے واقعات اور حادثات کا ایک تسلسل ہے کہاں تک لکھا جائے۔ اس بات کی خوشی ہے کہ جب میری زندگی کی رات آگئی ہے تو ہندوستان کے مطلع پر روشنی کی ایک نئی کرن پھوٹی ہے۔ لہٰذا ہم وطنوں کو میرا یہی مشورہ ہے۔

پناہِ زندگی آئی ہے بن کر بے پناہوں میں
بچھا دو اپنی آنکھیں اندرا گاندھی کی راہوں میں

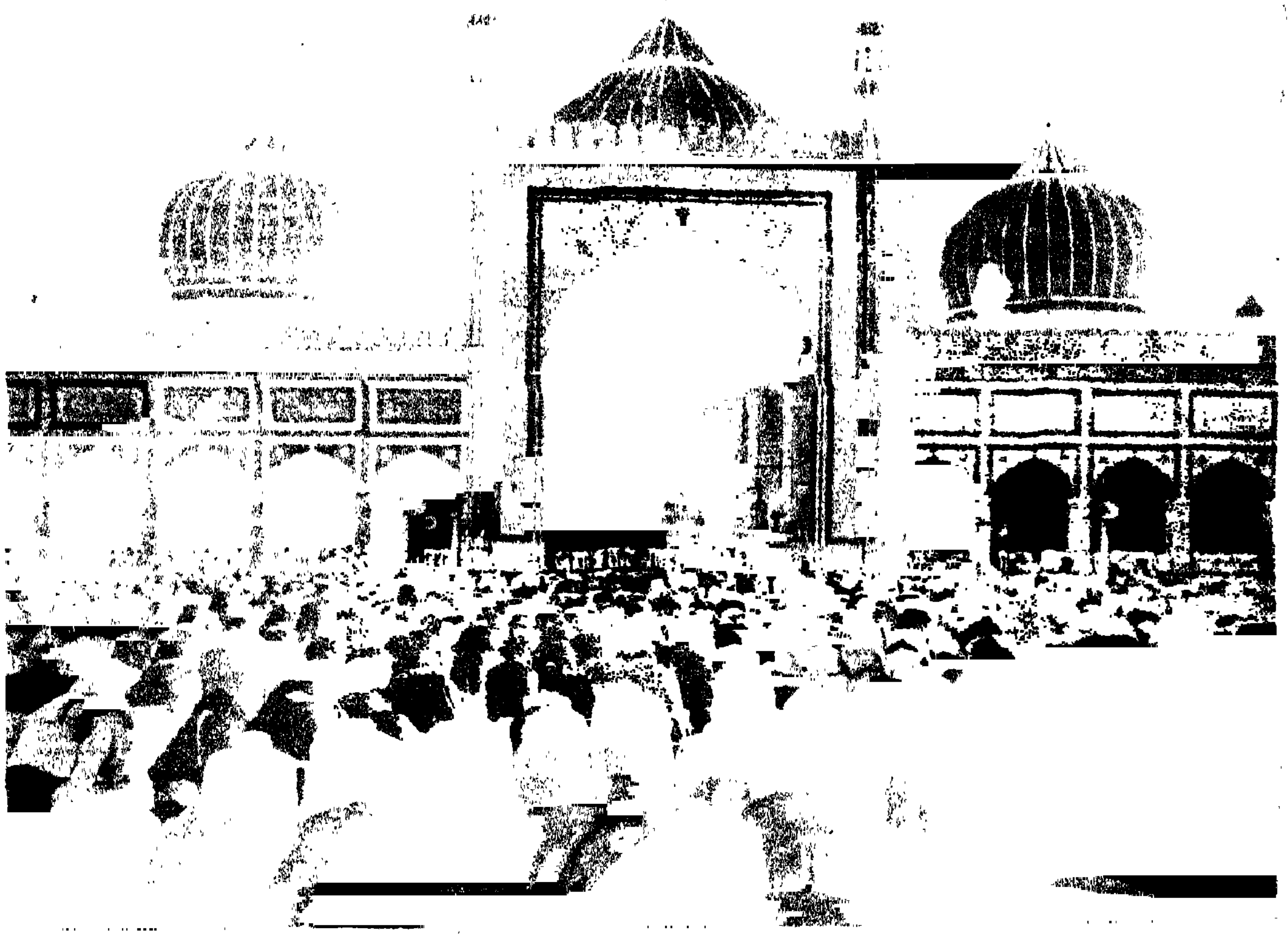


اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سفیر جناب سید فدا حسن
۲۴ جولائی ۱۹۷۶ء کو راشٹرپتی بھون نئی دہلی میں
صدرِ جمہوریہ ہند جناب فخرالدین علی احمد کو اسنادِ سفارت
پیش کر رہے ہیں۔



ہندوستان نے جناب کے ایس باجپائی
کو پاکستان میں اپنا سفیر مقرر کیا ہے
۲۱ جولائی کو وہ اپنا عہدہ سنبھالنے
کے لیے اسلام آباد روانہ ہوئے۔
تصویر میں شری باجپائی (وسط میں)
نئی دہلی کے پالم ہوائی اڈے پر۔

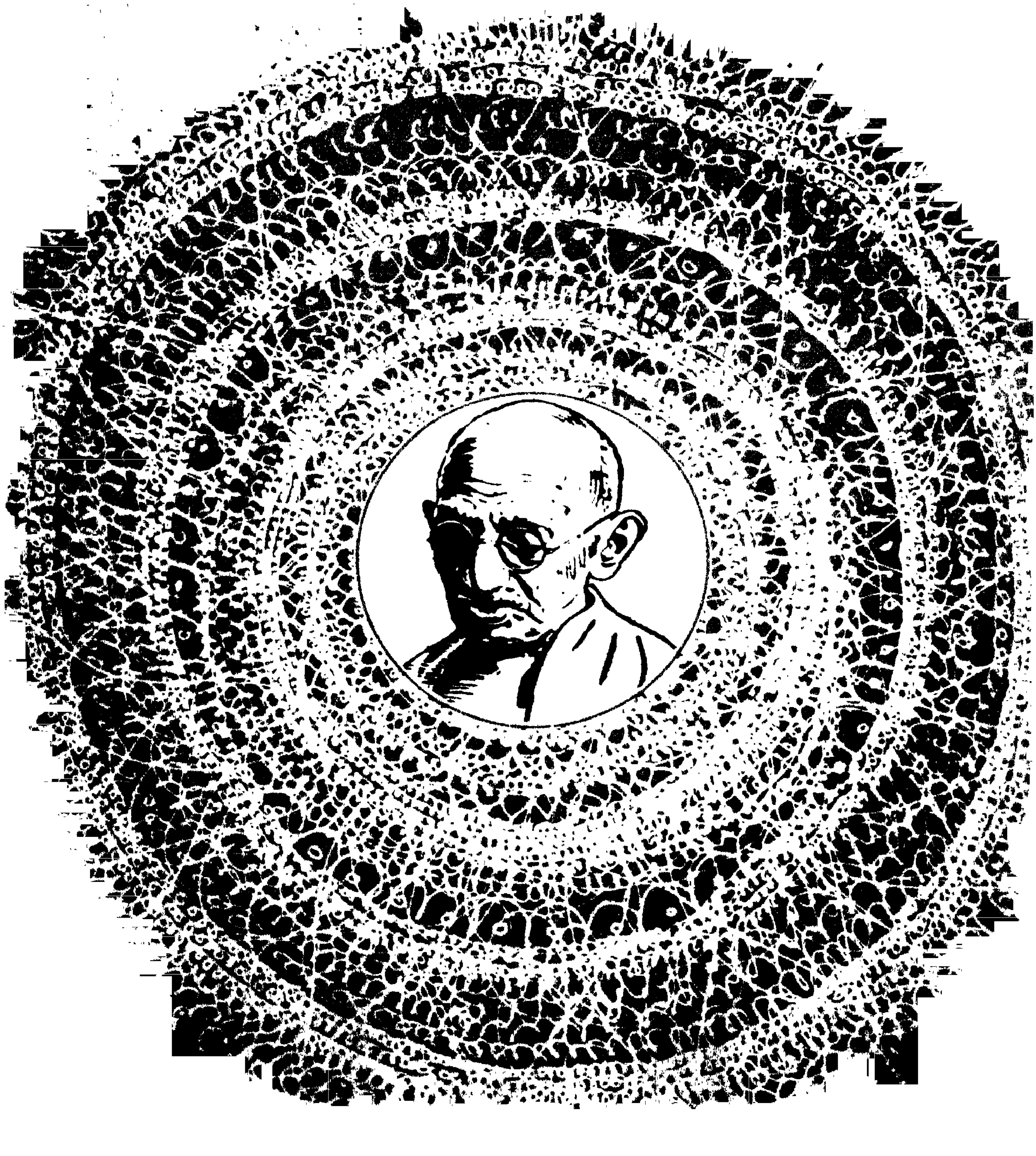
Regd.No.D(D)103



جامع مسجد دہلی میں نمازِ عید

Vol.35 No.2 AJKAL(MONTHLY) September 1976

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355, Idgah Road, New Delhi-110055.





موریتینیا کے صدر عالی جناب مختار الدداسر کاری دورے پر ہندوستان تشریف لائے۔ نئی دہلی کے پالم ہوائی اڈے پر صدر جمہوریہ ہند جناب فخرالدین علی احمد اور وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ان کا خیر مقدم کیا

۲۸ تا ۳۰ اگست ۱۹۷۶ء کو دوسری بین الاقوامی ہندی کانفرنس ماریشس میں منعقد ہوئی۔ اس میں ہندوستانی وفد کی قیادت ڈاکٹر کرن سنگھ وزیر صحت نے کی (تصویر میں) ڈاکٹر کرن سنگھ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے۔



اُردو کا مقبول عام مصوّر ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

آنریری ایڈیٹر
شہباز حسین

معاون ایڈیٹر
نند کشور وکرم

سرورق عمل
آر۔ سارنگن

جلد ۳۵ شمارہ ۳

اکتوبر ۱۹۷۶ء

بھادرآشون شک سمہ ۱۸۹۸

ٹیلیفون نمبر :- ۳۸۷۰۶۹

ترتیب

شرح چندہ

سالانہ	دس روپے	۲ ڈالر	۱٫۵۰ پاؤنڈ
دوسالہ	۱۷ روپے	۵ ڈالر	۲٫۵۵ پاؤنڈ
سہ سالہ	۲۴ روپے	۷ ڈالر	۳٫۶۰ پاؤنڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	۳۰ سینٹ	۱۵ پنی

ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آجکل، پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

ملاحظات

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہمارا ملک آزاد ہوا۔ آزادی کے بعد ملک کی تعمیر نو کی جدوجہد شروع ہوئی۔ صدیوں کی غربت، جہالت اور توہمات کے خلاف جدوجہد شروع ہوئی۔ سماجی اور معاشی انصاف، مذہبی رواداری اور یکساں مواقع کے حصول کے لیے پُرخلوص کوششیں کی گئیں۔ ان انتیس (۲۹) برسوں میں قوم بہت سے اُتار چڑھاؤ سے گزری۔ بہت کچھ کیا گیا اور بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ذیل میں صدر جمہوریہ ہند کی نشری تقریر اور وزیر اعظم کی لال قلعہ کی فصیل سے کی گئی تقریر کے اقتباسات دیئے گئے ہیں جو ان راہوں کا تعین کرتے ہیں جدھر ہمیں جانا ہے۔

محنت اور لگن سے کام کرنے کی ضرورت

یوم آزادی کے موقع پر قوم کے نام ایک پیغام نشر کرتے ہوئے صدر جمہوریۂ ہند جناب فخرالدین علی احمد نے فرمایا:

"قوم کی تاریخ میں ۲۹ برس کا عرصہ کوئی طویل عرصہ نہیں ہے۔ تاہم یہ مناسب ہے کہ ہم اپنی کامیابیوں اور کوتاہیوں کا بے لاگ تجزیہ کریں۔

ہم نے نہایت اہم کام انجام دیئے ہیں اور خصوصاً گذشتہ برس ہماری معیشت نے واضح طور پر تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے۔ اناج کی ریکارڈ پیداوار ہوئی ہے اور صنعتی پیداوار میں نمایاں بہتری آئی ہے۔ افراطِ زر کا مقابلہ کرنے میں ہمیں زبردست کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس سے ہم کو اپنی معیشت اور اپنے عوام کی امکانی قوت میں اعتماد پیدا ہوا ہے۔

ایمرجنسی کے فوائد، نظم و ضبط اور کام کے لحاظ سے، ہر شعبے میں اور خصوصاً تعلیمی اداروں اور صنعت میں، سبھی نے عام طور سے تسلیم کیے ہیں اور ان کا خیر مقدم کیا ہے۔ ان فائدوں کو از خود اپنی زندگی کا زرّیں اصول بنا کر ہمیں محفوظ رکھنا ہے۔ رضاکارانہ طور پر جس نظم و ضبط کو ہم نے اختیار کیا ہے اس کا یہ نیا دور کامیابی کی منزلیں تبھی طے کر سکتا ہے جب تمام لوگ عام طور سے ایک ضابطۂ اخلاق کی پیروی کریں۔ ہمارا مدتوں کا یہ تجربہ ہے کہ عام فائدوں کے متفق پروگراموں پر مل جل کر کام کرنا عوام میں یکجہتی اور اتحاد پیدا کرتا ہے جب کہ محض بحث و مباحثہ آپس میں اختلافات پیدا کرتا ہے۔

ہمیں بے فکر نہیں ہونا ہے اور یہ نہیں بھولنا ہے کہ ہم کو ابھی غربت بے روزگاری اور جہالت پر قابو پانا ہے۔ ان مسئلوں کا پھیلاؤ اتنا زیادہ ہے کہ جب تک اس صورتِ حال کی وجوہ نہ معلوم کرلیں اور اپنی انتھک کوششوں سے ان کا حل تلاش نہ کرلیں، تب تک کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوگا۔ غریبی دور کرنے، زندگی کا معیار بہتر بنانے اور اقتصادی ترقی سے فائدہ اٹھانے میں سب سے بڑی رکاوٹ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی ہے۔

آبادی پر قابو پانے کے ساتھ ساتھ میں سمجھتا ہوں کہ امداد باہمی کی تحریک کے ذریعے ہی اقتصادی ترقی اور سماجی تبدیلی میں تیزی لائی جاسکتی ہے۔ امداد باہمی کی تحریک کو ہمارا فلسفۂ حیات ہونا چاہیے اور پیداوار اور تقسیم کے نظام میں اس کو پوری طرح چھا جانا چاہیے۔ ہم منافع خوروں کو ختم کرنے، بنیادی ضرورت کی اشیاء کو مناسب قیمتوں پر مہیا کرانے، صنعتی اور زرعی پیداوار کے مناسب تبادلے اور دیہات اور شہروں میں مناسب توازن قائم رکھنے میں تبھی کامیاب ہوسکیں گے، جب زراعت، صنعت اور مارکیٹنگ، امداد باہمی کی بنیاد پر ہو۔

حال ہی میں چیزوں کی قیمت کا بڑھ جانا نہ صرف ہم کو بے فکری کے خلاف آگاہ کرتا ہے بلکہ اس کا واضح ثبوت ہے کہ وہ طاقتیں جو عوام کی مصیبتوں سے فائدہ اٹھاتی ہیں ان پر اس وقت تک قابو نہیں پایا جاسکتا جب تک کہ زندگی کی ضروری اشیا کی تقسیم کا کام امداد باہمی کے ادارے اپنے ہاتھ میں نہ لے لیں۔ عوام کی بھرپور مدد سے ہی ان سماج دشمن طاقتوں کو کچلنے کی سرکاری کوششیں کامیاب ہوسکتی ہیں۔ اس لیے میں خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ آگے آئیں اور ہر گاؤں اور شہر کے ہر محلّے میں امداد باہمی کے ادارے قائم کرلیں۔

مجھے یقین ہے کہ زراعت اور زراعت پر مبنی صنعت کے فروغ سے ہی بے روزگاری کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ گاندھی جی کی اس تعلیم کے باوجود کہ گاؤں ہی بھارت کا اصلی روپ پیش کرتا ہے ـــــ گاؤں کی ترقی کس ڈھنگ سے ہونی چاہیے۔ اس بنیادی سوال کو ابھی تک پوری اہمیت نہیں دی گئی ہے اب بھی جب کہ دیہات کی ترقی کے لیے کئی اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔ ہمیں اس بات پر خاص توجہ دینی ہوگی کہ گاؤں میں رہنے والوں کو جن کے لیے یہ اسکیمیں وضع کی گئی ہیں، پورا فائدہ پہنچے۔

ٹیکنالوجی کو گاؤں تک پہنچانے پر جو زور دیا جا رہا ہے۔ اس کی اہمیت ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم وہ مقامی طور طریقے اور روایتی دانائی ہے جس پر یہ مبنی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ترقی بالخصوص گاؤں کی ترقی

مقامی ذرائع اور ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہونی چاہیے ۔ زراعت پر مبنی صنعت اور زراعت کی جدید کاری کے لیے بیرونی اشیا کی زیادہ ضرورت نہیں ۔ قدرت کی نعمتوں کو استعمال کرکے نیز افرادی قوت کو بروئے کار لاکر ہم اپنے دیہات میں ایک نئی زندگی کی ابتدا کرسکتے ہیں ۔

یہ معلوم کرکے مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ ہمارے نوجوانوں نے پیڑ لگانے کا کام بڑی لگن سے شروع کررکھا ہے ۔ تاہم اس پروگرام میں ایسے درختوں کی شجرکاری پر خاص توجہ دینی ہوگی جو جلد اُگتے ہیں اور جو ایندھن کے کام میں آتے ہیں ۔ مجھے امید ہے کہ ان پروگراموں میں تیزی آئے گی اور انھیں قومی سطح پر عمل میں لایا جائے گا

ایمرجنسی کے نفاذ کا مقصد نہ تو آئین میں دیئے ہوئے اختیارات سے زیادہ اختیارات حاصل کرنا ہے اور نہ ہی ایک نظام کی جگہ دوسرے نظام کو نافذ کرنا ہے بلکہ اس کا مقصد ایسی برمحل اور ضروری اقتصادی، سماجی اور سیاسی تبدیلیاں لانا ہے جو بھارت کے لوگوں کے حق میں مفید ہوں ۔ موجودہ حالات میں پرانی خامیوں کو وطن پرست لوگوں بالخصوص نوجوانوں کی شرکت اور انتھک محنت کے بغیر دور نہیں کیا جاسکتا ۔ اقتصادی اور سماجی تبدیلی لانے کے لیے شاید مخلص لوگوں کی ایک جماعت کا وجود میں آنا مناسب ہے اور اس سے بھی زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ جو لوگ تعلیم اور تربیت کے پروگراموں کو چلانے کے ذمہ دار ہیں وہ سماجی انصاف اور اتحاد کے اصولوں سے بے خبر نہ ہوں ۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ میں انتظامیہ اور لا اینڈ آرڈر کے ذمہ دار لوگوں کی توجہ اس طرف دلانا چاہوں گا کہ انھیں ایمانداری، غیر جانب داری نیز عوام کی بہبود کے کاموں کی انجام دہی میں اعلیٰ ترین مثال قائم کرنا چاہیے ۔

انتظامیہ کو عوام کی ضروریات کا پورا احساس ہونا چاہیے ۔ انتظامیہ، ماہرین اقتصادیات اور ماہرین عمرانیات سے میری اپیل ہے کہ وہ عوام کی دشواریوں کے حل کے لیے ایک ایسا ہمہ گیر نظریہ اپنائیں ، جس سے ان کو عوام کا اعتماد حاصل ہوسکے ۔

ملک کے سامنے اب وزیر اعظم کا ایک واضح اور ٹھوس ترقیاتی پروگرام ہے ۔ ہمیں امید ہے کہ اس پروگرام کی کامیابی سے ہم نہ صرف اپنی اندرونی پریشانیوں اور رکاوٹوں پر قابو پائیں گے بلکہ اس سے ہمیں ملک کے روشن مستقبل کی امید اور اعتماد حاصل ہوگا ۔ اس کے لیے ہم سب کو کڑی محنت اور ڈسپلن سے کام کرنا ہے ۔ آئیے ہم سب اس مبارک دن کے موقع پر کام میں جٹ جانے کا عہد کریں "

ہندوستان آج جتنا مضبوط ہے اتنا پہلے کبھی نہ تھا

۱۵ راگست ۱۹۷۶ء کو لال قلعہ کے فصیل سے عوام کو مخاطب کرتے ہوئے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے فرمایا :

"جب بھی میں یہاں جھنڈا لہراتی ہوں تو اس دن کی یاد آتی ہے جب پہلی بار آزاد بھارت کا پرچم شری جواہر لال نہرو نے یہاں لہرایا تھا ۔ اس موقع پر مجھے یہ یاد آتا ہے کہ کس مصیبت، دشواری اور قربانی سے یہ ملک گذرا ہے اور کن اُمیدوں کو لے کر ہم نے اپنا جھنڈا لہرایا ۔ آج جب ہم پیچھے دیکھتے ہیں اور ان برسوں پر غور کرتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو راستہ ہم نے اپنے سامنے رکھا تھا، اس پر کافی دور تک ہم آگے بڑھ گئے ہیں ۔ ساتھ ہی ساتھ ہم سے کچھ بھول بھی ہوئی ہے ۔ کچھ غلطیاں بھی ہوئی ہیں ، کام میں کمی بھی ہوئی ہے ، اور جتنا ہم آگے بڑھے ہیں ، اتنا ہی ہم نے محسوس کیا ہے کہ ابھی ہمیں بہت زیادہ راستہ طے کرنا ہے ۔ ہم نے یہ دیکھا کہ ہر ایک قدم سے دشواریاں کم ہونے کی بجائے اور بڑھتی ہیں ۔ ہم نے یہ دیکھا کہ کچھ مانگیں اگر پوری ہوتی ہیں تو نئی مانگیں کھڑی ہوجاتی ہیں، لیکن زندگی کا راستہ ایسا ہی ہوتا ہے ۔ ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ جو آدرش ہمارے عظیم رہنماؤں نے ہمارے سامنے اور ہمارے ملک کے سامنے رکھے، اسی راستے پر ہم قدم آگے بڑھاتے رہیں ۔

آزادی کئی طرح کی ہوتی ہے ۔ ہم نے جان بوجھ کر مکمل آزادی کے لیے جد و جہد کی اور اسے حاصل کیا ۔ مکمل سوراج کے معنی ہیں کہ سوراج کے فائدے گھر گھر پہنچیں، ان لوگوں تک پہنچیں جن کی آواز نہیں اُٹھ سکتی، ان لوگوں تک پہنچیں جن کو شاید ٹھیک سے یہ معلوم بھی نہیں ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں ۔ ان لوگوں تک پہنچیں جو آج تک تمام سہولتوں سے محروم رہے ہیں ، ایسے ہی سوراج کی طرف ہم ملک کو آگے لے جانے کی کوشش کررہے ہیں ۔ ہم چاہتے ہیں کہ سب کی زندگی میں سدھار آئے ، چاہے وہ بڑے سے بڑا ہو ، چاہے چھوٹے سے چھوٹا ہو ۔ لیکن اگر آپ سوچیں تو آپ کو خود یہ محسوس ہوگا کہ جس کے پاس آج بھی سب کچھ ہے ، اس کو اگر اور زیادہ مل جاتا ہے تو جس کے پاس نہیں ہے اس کو کیسے کچھ مل سکے گا ۔ یہی سبب ہے کہ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ سب بھارتیوں کے لیے اور خصوصاً ان طبقوں کے لیے زیادہ فراہم کیا جائے جو کمزور کہلاتے ہیں چاہے وہ کسی بھی وجہ سے کمزور ہوں ، ذات کے سبب ، اقتصادی بدحالی کے سبب یا ملک کے کسی پچھڑے ہوئے علاقے میں رہنے کے سبب ۔

آج مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ پچھلے برس میں ہمارے دیش نے بہت زیادہ ترقی کی ہے ۔ ایک پروگرام ہم نے عوام کے سامنے رکھا اس میں کچھ سرکار کے اور کچھ جنتا کے فرائض تھے ۔ نظم و ضبط کی ایک نئی فضا قائم ہوئی ۔ امید کا ایک نیا احساس عوام کے دلوں میں پیدا ہوا ۔ ہم سب نے اس کام میں اپنا تعاون دیا ۔ میں یہ نہیں کہتی ہوں کہ یہ کام پورا ہوگیا یا اتنا ہوگیا جتنا ہم سمجھتے تھے اور چاہتے تھے ۔ ایسا نہیں ہوا لیکن پھر بھی ٹھوس اور زوردار قدم اٹھائے گئے ہیں اور کام جاری ہے ۔ سب جگہ برابر تو نہیں ہے لیکن جہاں بھی عوام میں جتنی بیداری ہے ، جہاں کے کارکن مستعد اور پُرعزم ہیں وہاں یہ کام تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے ۔ آپ سب کو معلوم ہے کہ پیداوار میں کتنا اضافہ ہوا ہے ۔ غریبوں کو گھر دینے کا جو ہمارا پروگرام تھا اس کے تحت ۷۰ لاکھ کنبوں کو مکانات ملے ہیں ؛ بجلی کی پیداوار دو ہزار میگا واٹ تک بڑھی ہے

سینچائی کا پروگرام تیزی سے بڑھا ہے اور ہمیں امید ہے کہ یہ اور تیزی سے آگے بڑھے گا۔ زمینی اصلاحات کا پروگرام بھی جتنا ہم چاہتے تھے اتنا ابھی نہیں ہوا ہے۔ اس لیے ہر سال جہاں جہاں بھی میں بولتی ہوں، میں اس بات پر زور دیتی ہوں کہ جب تک عوام نہ چاہیں گے، چاہے وہ کسان ہوں، مزدور ہوں، غریب ہوں، شہری ہوں، جب تک وہ خود اس کو ہاتھ میں نہیں لیں گے جہاں بھی ناانصافی ہے، اس کی طرف دھیان نہیں دلائیں گے، اس وقت تک اس پروگرام میں کامیابی نہیں ہوگی۔ صرف شکایت کی صورت میں نہیں بلکہ سجھاؤ کی صورت میں وہ یہ دھیان دلائیں کہ یہاں پہ غلطی ہوئی ہے۔ اس طرح ہم اور آپ مل کر غلطی کا سدھار کر سکتے ہیں۔ اس خیال کی تھوڑی بہت بنیاد پڑی ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ پچھلے سال میں ہمیں عوام کا جو تعاون ملا، جو عوام میں بیداری آئی وہ پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ لیکن میں یہ نہیں کہنا چاہتی ہوں کہ پہلے کبھی کام نہیں ہوا ہے۔ اگر زراعت اور صنعت کے شعبے میں پہلے سے مضبوط بنیاد نہ ڈالی گئی ہوتی تو گذشتہ سال ہم یہ ترقی نہیں کر سکتے تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی سچ ہے کہ یہ بنیاد ہوتے ہوئے بھی اگر نظم و ضبط کا ماحول نہ بنا ہوتا اور عوام کے دل میں تعاون اور خدمت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا تو بنیاد خواہ کتنی بھی مضبوط ہو، ہم اس سے مستحکم بھارت کی تعمیر نہیں کر سکتے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس سے پہلے کتنی بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ خواہ اسکول اور کالج ہو۔ خواہ کارخانے ہوں یا ہمارے شہروں کی سڑکیں ہوں ہر جگہ انتشار اور پراگندگی کا عالم تھا۔ اس سے ہمارے کام میں رکاوٹ پیدا ہوئی اور اقتصادی مشکلات کے زمانے میں ان اشیائے ضروریہ کی قلت میں اور شدت آئی، جن کی دستیابی پہلے سے ہی کم تھی۔ ایسا اس لیے ہوا کیونکہ پیداوار رُک گئی اور ہر طرف ہڑتال کے نعرے بلند ہونے لگے، انقلاب کے نعرے لگائے جانے لگے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم بھی انقلاب میں یقین رکھتے ہیں۔ گاندھی جی اس ملک کے ایک عظیم ترین انقلابی تھے لیکن ان کے انقلاب کا راستہ تھا عدم تشدد کا، دوستی کا، امن پسندی کا۔ اگر ہم ان کے راستے سے بھٹک جاتے اور اس زمانے میں بھی جو تھوڑے سے لوگ تھے خواہ وہ کتنے ہی بہادر اور لائق کیوں نہ رہے ہوں، اگر وہ لوگ بھی اس راستے سے بھٹک جاتے تو شاید آج بھی بھارت آزاد نہیں ہوتا۔

لیکن چونکہ گاندھی جی کے راستے پر ثابت قدمی سے گامزن رہے ہیں اس لیے اس ملک کو آزاد بنا سکے اور جمہوریت کی داغ بیل ڈال سکے۔ ہم نے صنعت کاری کے عمل کو تیزی سے آگے بڑھایا اور ہر لحاظ سے ملک کی مضبوطی اور اس کے استحکام کو تقویت بخشی ہے۔ خواہ لوگ کتنے ہی الزامات لگائیں، کتنی ہی مذمت کریں لیکن دنیا میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آج بھارت ہر لحاظ سے جتنا مضبوط ہے اتنا پہلے کبھی رہا ہے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس طاقت کے بغیر بھارت آگے بڑھ سکتا ہے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ بغیر طاقتور بنے ہم اپنی صنعتوں کو فروغ دے سکیں گے یا اپنے عوام کو سُکھ اور آرام دے سکیں گے۔

ہم نے یہ سمجھا تھا کہ ایک بار آزادی کی لڑائی لڑی تو ہم ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی کبھی ہم پہ ہونے والے فوجی حملوں سے بھی زیادہ خطرناک وہ حملے ہیں جو خفیہ طور پر کیے جاتے ہیں اور جو دکھائی نہیں دیتے۔ ویسے تو پہلے بھی ہم بہت سی آوازیں سنتے رہے ہیں لیکن گذشتہ سال بہت سی آوازیں بڑے صاف طور پر اٹھی ہیں۔ کچھ سرکاروں اور کچھ لوگوں نے اس وقت بھی بھارت کا ساتھ نہیں دیا جب یہاں کوئی پابندی نہیں تھی۔ کسی کو گرفتار نہیں کیا گیا تھا کسی اخبار پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس کے برعکس ان لوگوں نے ان ملکوں کی مدد کی جہاں یا تو فوجی حکومت تھی یا دوسری قسم کی ایسی حکومت تھی جس کے دور میں عوام کی آواز نہیں اٹھ سکتی تھی ایسی حکومتوں کی مدد ہوئی ہے۔ اس وقت کسی نے آواز نہیں اٹھائی کہ کہاں پر قتل ہوا۔ قتل ایک آدمی کا نہیں، دو آدمیوں کا نہیں، بلکہ کہیں سینکڑوں کہیں ہزاروں اور کہیں لاکھوں کی تعداد میں ہوا۔ اور وہی لوگ آج بھارت کو آنکھیں دکھاتے ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ایسا کوئی پہلی بار نہیں ہوا ہے جب گاندھی جی زندہ تھے تو ان کے بارے میں بھی کئی طرح کی باتیں کہی جاتی تھیں۔ ان کے بعد جواہر لال نہرو کے بارے میں بھی کہی جاتی تھیں اور ان کے بعد میرے بارے میں کہی جاتی ہیں۔ میرے اوپر ابھی حملہ شروع نہیں ہوا تھا تو یہ باتیں بھارت کے بارے میں کہی جاتی تھیں۔ بھارت نے نیوکلیائی دھماکہ کیوں کیا ہے۔ اس سے ساری دنیا کو بڑا بھاری خطرہ لاحق ہو گیا مگر دوسرے ملک خواہ بم پر بم بنا کر جمع کرتے جائیں خواہ اربوں روپے خرچ کریں اُن سے کوئی خطرہ نہیں پیدا ہوتا۔ ان کی مذمت نہیں کی جاتی۔ اس کے برعکس مزید یہ کوشش ہو رہی ہے کہ ان کے ہتھیار بیچے جائیں۔ لیکن اگر ہم اپنی معاشی حالت کی بہتری کے لیے کچھ کرتے ہیں تو وہ غلط کام ہوتا ہے۔

جب ہمارے ملک میں فولاد کی صنعت شروع ہوئی تو یہ کہا گیا کہ ایک غریب ملک میں جہاں دیہات میں اتنی مشکلات ہیں، وہاں اس ملک کو لوہے اور فولاد کی کیا ضرورت ہے۔ اب آپ جانتے ہیں کسی بھی جدید ملک کی بنیاد فولاد پر ہے۔ اس سے کسان کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، کارخانوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور ہزار طریقوں سے عوام کی مانگیں پوری ہوتی ہیں۔

جواہر لال نہرو نے اگر یہ بنیاد نہ ڈالی ہوتی تو ہم سب دوسرے ملکوں کے دست نگر ہوتے۔ لیکن بہت سی چیزوں کی آج بھی ضرورت ہے، پھر بھی ہم کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔

کچھ ہی سال پہلے لوگ کہتے تھے کہ بھارت اپنے عوام کو کبھی نہیں کھلا سکے گا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ بارہ کروڑ ٹن اناج پیدا ہوا ہے اور اس سال ہمارے لیے مسئلہ یہ نہیں تھا کہ اناج نہیں ہے بلکہ یہ تھا کہ اسے رکھیں کیسے اور کہاں پر رکھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ بارش اچھی ہوئی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر سرکاری امداد نہیں ملتی اور اگر ہمارے محنتی کسان بھائی یہ امداد لینے اور نئے طریقے اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوتے تو یہ پیداوار حاصل نہ ہوئی ہوتی۔ کچھ جگہ بارش کی کمی ہوئی

ہے، سوکھا پڑا ہے خصوصاً جنوب میں تامل ناڈو میں، اور کچھ جگہوں پر ضرورت سے زیادہ بارش ہو رہی ہے۔ اس سے ہمارے کسانوں کو بڑی دشواری ہوئی ہے۔ میری تمام ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں لیکن ہم کو یقین ہے کہ وہ اس کا مقابلہ کریں گے۔

اس سال ہمارے پبلک سیکٹر کے کارخانوں میں سے بہت سے کارخانوں نے بہت منافع کمایا ہے، حالانکہ ہمارے اخبارات میں ان کی بڑی برائی ہوا کرتی تھی۔ ہمارے بڑے بڑے صنعت کار ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ سرکار سے تو یہ کارخانے چل ہی نہیں سکتے۔ ان میں تو نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔ ہماری پیداوار میں جو اضافہ ہوا ہے وہ انھیں پبلک سیکٹر کے کارخانوں کے ذریعے سے ہوا ہے۔ ہمیں پوری امید ہے کہ جو تھوڑے سے کارخانے ایسے ہیں جہاں پر کام ابھی تسلی بخش طریقے پر نہیں ہو رہا ہے وہ بھی اب اپنے کام میں سدھار لائیں گے اس کے لیے ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔ میں اپنے مزدور بھائیوں اور بہنوں کو مبارکباد دینا چاہتی ہوں کیونکہ ان کے کام میں سدھار سے یہ ترقی ہوئی ہے۔

کچھ ہی گھنٹے بعد آج ہی شام کو میں یہاں سے سری لنکا جا رہی ہوں آپ کو معلوم ہے کہ وہاں پر ناوابستہ ممالک کی ایک بڑی کانفرنس ہو رہی ہے اور وہاں بھی ہم سب کے سامنے یہی اہم سوال ہے کہ ہم اپنی آزادی کو کیسے محفوظ رکھیں۔ آزادی صرف سرحدوں کی نہیں ہوتی بلکہ آزادی اپنے نظریات کی ہوتی ہے۔ آزادی سے مراد ہر سمت میں بڑھنے کی آزادی، اپنے کو مضبوط کرنے کی آزادی، اور اپنے ملک میں خوش حالی اور ترقی لانے کی آزادی سے ہے۔ یہ اہم چیز ہے کیونکہ ہم سب کے سامنے ایک ہی سے مسائل ہیں۔ اگر ہم ایک دوسرے کی امداد کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں تو یہ ایک بہت زبردست طاقت بن جاتی ہے۔

آپ نے یہ تو پچھلے برسوں میں دیکھا ہی ہے کہ جب بھی ہم پر حملے ہوئے، ہم ان سے دبے نہیں۔ جب بھی ہم پر بھونچال کی طرح ہمارے اوپر لوگ ٹوٹ پڑے، ہم نے ان کا مقابلہ کیا اور ہم آگے بڑھے۔ ہمارے دیش بھارت کی تاریخ ایک جد و جہد کی تاریخ رہی ہے مصیبتوں کی تاریخ رہی ہے اور ہمارا بھارت ضبط و تحمل اور امن کا ملک رہا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ یاد رکھیں کہ یہ بہادر ملک بھی رہا ہے اور اس نے عزم و استقلال کا ثبوت دیا ہے۔ یہ آدرشوں کا ملک رہا ہے۔ آج ہر شہری کو ملک کی یہ تاریخ یاد رکھنی ہے۔ ہمیں یہ سوچنا ہے کہ جو نئے بھارت کے نمائندے ہیں، نئے بھارت کی علامت ہیں، نئے بھارت کے نشان ہیں، چاہے ہمارے ہونہار بچے ہوں، چاہے بڑے، چاہے بوڑھے۔ ہمارے سامنے ایک ہی سوال ہے کہ ہم اپنے ملک کو کس راستے پر آگے بڑھا سکتے ہیں، خواہ کسی کو اچھا لگے یا بُرا۔ ہمیں اسی نقطۂ نظر سے آگے بڑھنا ہے۔ اگر ہمارے خوبصورت بچے ٹھیک سے نہیں پڑھیں گے کھیل کود میں دلچسپی نہیں لیں گے تو نہ ان کا جسم مضبوط ہو سکتا ہے اور نہ ہی ان کا ذہن پختہ بن سکتا ہے۔ اگر نوجوانوں کی یہ نسل مضبوط نہیں ہوئی، تعمیری کام میں نہیں لگی، اگر ان میں ملک سے پیار، ملک سے عقیدت کا جذبہ پیدا نہیں ہوا تو یہ ہمارے ملک کی سب سے بڑی کمزوری، سب سے بڑا نقصان ہوگا۔

تو ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ ہم کس طرح آگے بڑھ رہے ہیں۔ بہت برسوں بعد پہلی بار غریبوں کے لیے پروگرام شروع ہوئے ہیں اور یہ پروگرام کامیابی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ حالانکہ ہم جتنی تیزی سے انھیں آگے بڑھانا چاہتے تھے اتنی تیزی سے یہ آگے نہیں بڑھے ہیں۔ اتنے بڑے ملک میں جہاں کروڑوں عوام رہتے ہیں اگر ۷۰ لاکھ خاندانوں کو گھر ملے تو یہ تعداد بہت چھوٹی ہے لیکن جہاں پہلے ایک کو بھی گھر میسّر نہیں تھا وہاں ۷۰ لاکھ کی یہ تعداد بڑی بھی ہے۔

یہ وقت ایسا ہے کہ ہمیں ان چیزوں پر گہرائی سے غور کرنا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ سرکار کی طرف سے یا کسی تنظیم کی طرف سے کسی پر کوئی زور دیا جائے اور ہم نے اس کی بھی کوشش کی ہے حالانکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر فرد اپنے دل سے سوچ کر نظم و ضبط کی پابندی کرے، ملک کی خدمت کرے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ گاندھی جی ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ کوئی بھی حق ایسا نہیں ہے جو فرض سے نہ نکلتا ہو۔ اس قسم کے حقوق جن کا استعمال لوگ اپنے احساسِ فرض کے تحت کریں تبھی سچی جمہوریت قائم ہو سکے گی۔ ایک ایسی جمہوریت جس میں غریب سے غریب کی آواز سنی جائے، جس میں کوئی بھی فرد محض اپنے اقتصادی اور سماجی بل بوتے کے سبب دوسروں پر حاوی نہ ہو، جس میں ہر ایک فرد یہ محسوس کرے کہ ہمارے جتنے حقوق ہیں اتنے ہی حقوق ہمارے غریب بھائی اور بہن یا پچھڑے غریب بھائی اور بہن کے بھی ہیں نیز جہاں ہمیں اپنے حقوق کے لیے لڑنا ہے۔ وہاں ان کے حقوق کے لیے بھی لڑنا ہے۔ جب یہ جذبہ پیدا ہوگا تبھی سب کے حقوق مل سکتے ہیں۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کچھ لوگوں کو حقوق ملنے چاہئیں، کچھ لوگوں کی آوازیں اٹھنی چاہئیں خواہ دوسروں کا کچھ بھی ہو، تو اسی طرح سے ہم نے اپنی آزادی کھوئی تھی اور اس بھول میں ہمیں پھر نہیں پڑنا ہے۔

میں آپ سے یہی کہوں گی کہ ہمیں ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بھارت ایثار و قربانی کی سرزمین ہے۔ آج ہمیں اس قسم کی قربانی نہیں چاہیے بلکہ یہ ہمت چاہیے کہ ہم اپنے ملک کے لیے عزم و استقلال کے ساتھ جئیں، ایک نئی زندگی کی تعمیر کریں اور یاد رکھیں کہ ملک کے معنی زمین یا پیڑ یا پہاڑ نہیں ہیں حالانکہ ہم ان سے بھی پیار کرتے ہیں اور ان کو حسین بنانے، ان کو سدھارنے میں لگے ہیں۔ جب ہم ملک کہتے ہیں تو اس کا مطلب ملک کے کروڑوں عوام کو اوپر اٹھانا ہے۔ ان کے گھروں میں سکھ اور آرام پہنچانا ہے۔ ان کے بچوں کو ہر طرح کی خوبصورتی سے ہمکنار کرنا ہے۔ اس سفر میں آپ ہمارے ساتھ قدم سے قدم کندھے سے کندھا ملا کر چلیں، آج کے دن آپ سے میری یہی آرزو ہے۔

میں آپ کو اس دن کی مبارکباد دیتی ہوں اور مستقبل کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتی ہوں۔"

جیون بیمہ کے بیس سال

بھارت کی لائف انشورنس کارپوریشن کو اس وقت ملک میں ایک ایسے قومی ادارے کی حیثیت حاصل ہے جو ایک طرف تو عوام میں سلامتی اور تحفظ کا احساس پیدا کرتا ہے اور دوسری طرف ملک کی تعمیر و ترقی میں سرگرمی سے ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس کا یہ سلوگن کہ "آپ کی فلاح و بہبود ہماری ذمہ داری ہے"! بیشتر افراد کے ذہنوں میں محفوظ ہے۔

۲۰ سال قبل جب یہ کارپوریشن قومی تحویل میں لی گئی تھی۔ ملک میں کل ۲۴۵ بیمہ کمپنیاں تھیں۔ ان کے صدر دفاتر بڑے بڑے شہروں میں واقع تھے۔ اور ان کی بیشتر پالیسیاں بمبئی یا کلکتہ میں طے پاتی تھیں۔ لائف انشورنس کارپوریشن نے باقاعدہ طور پر ستمبر ۱۹۵۶ء میں کام کرنا شروع کیا تھا۔ اس وقت اس کے کل صرف ۱۶۸ مرکز اور ۲۰۹ دفاتر تھے۔ مگر آج ملک کے تقریباً ہر ضلع میں اس کا ایک برانچ یا ذیلی آفس موجود ہے اور اس طرح اس وقت اس کے دفاتر کی مجموعی تعداد ۷۶۶ ہے۔

۱۹۵۷ء میں اس کارپوریشن نے کل ۲۸۳ کروڑ روپے کا کاروبار کیا تھا جو ۷۶-۱۹۷۵ء تک بڑھ کر ۵۴۵۸ کروڑ روپے تک ہوچکا ہے۔ قومیانے کے بعد اس کی جاری پالیسیوں کی کل تعداد صرف ۸۰ لاکھ تھی جواب بڑھ کر ۱۹۷ لاکھ کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اس کی گروپ اسکیموں سے تقریباً ۲۷ لاکھ افراد فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

کارپوریشن نے اب اپنے ضابطۂ کار میں کافی بہتری پیدا کرلی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اب کلیموں کا تصفیہ بڑی تیزی سے انجام دیا جارہا ہے اس وقت کارپوریشن روزانہ اوسطاً ڈیڑھ ہزار کلیموں کی ادائیگی کرتی ہے۔ ۱۹۵۶ء سے لے کر اب تک اس کارپوریشن نے کل ۱۳۰۰ کروڑ روپے کے کلیموں کی ادائیگی کی ہے۔

۱۹۵۸ء میں کارپوریشن نے دیہی علاقوں کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ اور اپنے پروگرام کو مقبول بنانے کے لیے چلتی پھرتی گاڑیوں، نمائشوں اور پبلسٹی کے مختلف طریقوں کو استعمال کیا گیا جس کے باعث دیہی علاقوں میں ملنے والے کاروبار میں زبردست اضافہ ہوا۔ آج دیہات سے ۵۷۰ کروڑ روپے کا بزنس مل رہا ہے جب کہ ۱۹۵۹ء میں صرف ۱۸۰ کروڑ روپے کا بزنس ملا تھا۔

جیون بیمہ نے اپنا سرمایہ مختلف قومی اسکیموں میں لگایا ہے جیسے سرکاری سیکورٹیاں، مکانوں کی تعمیر، پانی کی فراہمی وغیرہ۔ اس طرح سے یہ ادارہ ملک کی تعمیر و ترقی میں نہایت اہم حصہ لے رہا ہے۔

طلبا کو رعایتی شرح پر کتابیں

۲۰ نکاتی اقتصادی پروگرام کے اعلان کے بعد پبلیکیشنز ڈویژن کے سیلز امپوریموں کے توسط سے اسکولوں اور کالجوں کے طلبا کو ۷۶ لاکھ روپے کی مالیت کی کتابیں رعایتی نرخ پر فروخت کی گئیں۔

وزارت اطلاعات و نشریات کے پبلیکیشنز ڈویژن کی طرف سے چلائی گئی اسکیم کے تحت نئی دلی، کلکتہ، بمبئی میں واقع اس کے امپوریموں نے بارہ سے زیادہ سرکاری ایجنسیوں کی طرف سے شائع کردہ کتابوں کو فروخت کیا جن میں وزارت تعلیم، تینوں اکیڈمیاں، سنٹرل ہندی ڈائرکٹوریٹ، نیشنل بک ٹرسٹ، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ ایسے ادارے شامل ہیں۔

کنبہ بندی کی مقبولیت

کنبہ بندی کا پروگرام بے حد مقبول ہورہا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اپریل، مئی، جون اور جولائی میں ملک میں ۱۱۲۳۸۵۹ نسبندی آپریشن کرائے گئے جو اپنی جگہ ایک ریکارڈ ہے۔ یہ ریکارڈ سال گذشتہ کے مماثل عرصے کی تعداد کے مقابلے میں تین گنا ہے۔

وفیات

بنگلہ زبان کے مشہور شاعر و ادیب قاضی نذرالاسلام کا ۲۹ اگست ۱۹۷۶ء کو ڈھاکہ میں انتقال ہوگیا۔ وہ ۱۹۴۲ء سے فالج میں مبتلا تھے جس کی وجہ سے قوت گویائی سے محروم ہوگئے تھے۔

قاضی نذرالاسلام ۲۲ مئی ۱۸۹۹ء کو مغربی بنگال کے ضلع بردوان کے گاؤں چرلیا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد قاضی فقیر محمد چار بچوں کو چھوڑ کر چل بسے تھے۔ اسی لیے نذرالاسلام کا بچپن انتہائی عسرت میں گزرا۔ وہ فوج میں بھرتی ہوگئے۔ اور جب ان کی رجمنٹ ۱۹۲۰ء میں ٹوٹ گئی تو وہ کلکتہ آگئے۔ اسی زمانے میں ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ ان کی پہلی نظم "مکتی" ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی۔ ان کی مشہور نظم "ودروہی" سے ان کی شہرت اور مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ان کی جوشیلی اور شعلہ بار نظموں، گیتوں اور اداریوں سے پورا بنگال گونج اٹھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے انہیں "دھرتی ماتا کا باغی فرزند" کہا اور سبھاش چندر بوس نے کہا کہ آزادی کی جنگ ہو یا قید و بند کی سختیاں ہم نذرل کے نغمات گاتے رہیں گے۔ انھوں نے دو اخبارات جاری کیے مگر انگریزوں کے عتاب کی وجہ سے انھیں بند کردینے پڑے۔ ان پر بغاوت کا مقدمہ بھی چلا اور قید بامشقت بھی دی گئی۔ مگر مادرِ وطن کی آزادی کے لیے ان کی لگن اور تڑپ کو دبایا نہ جاسکا۔

ان کے سانحہ ارتحال پر جاری کیے گئے اپنے تعزیتی پیغام میں وزیراعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی نے کہا ہے کہ مجھے ان کی موت سے بہت رنج پہنچا ہے .... انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بنگلہ ادب میں ان کا نام زندہ جاوید بنانے کے لیے کافی

(بقیہ صفحہ ۳۲ پر)



اسلام کنبہ بندی کے خلاف نہیں

صدر جمہوریہ ہند کے خیالات

حال میں صدر جمہوریۂ ہند شری فخرالدین علی احمد نے سلطان پور کے ایک جلسۂ عام میں ملک کی تعمیر و ترقی سے تعلق تقریر کرتے ہوئے کنبہ بندی کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا ظہار کیا۔ آپ نے فرمایا:

"ہمارے ملک میں جتنی ترقی ہو رہی ہے، اس سے زیادہ لوگ ہمارے ملک میں پیدا ہو رہے ہیں۔ جس وقت ہمارا ملک آزاد نہیں ہوا تھا ر پاکستان کے لوگ بھی ہمارے ساتھ شامل تھے، اس وقت سارے ندوستان کی آبادی بیالیس کروڑ کے قریب تھی یا اس سے کچھ کم تھی۔ س کے بعد ہندوستان آزاد ہوا، پاکستان بنا اور اب اس وقت ساٹھ کروڑ سے اوپر ہمارے ملک کی آبادی ہو گئی ہے۔

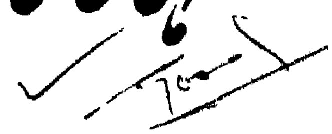
میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں، خاص طور سے کسانوں سے اور دوروں سے، کہ ہمارے طبقے میں جو بڑے بڑے لوگ ہیں اور اپر مڈل کلاس کہلاتے ہیں، جو بڑی خوشحالی کے ساتھ رہتے ہیں ان کی طرف بھی تو آپ نگاہ اٹھا کر دیکھیے، کسی کے ہاں دو یا ن بچوں سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ زیادہ تر بچے اس وقت گاؤں ، ہوتے ہیں۔ لیبر طبقے میں ہوتے ہیں .... اس طرح مڈل کلاس ے لوگوں کی تو خوشحالی بڑھتی چلی جا رہی ہے اور آپ لوگوں کی بت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے آپ کو دیکھنا ہے کہ کس طرح ، فیملی پلاننگ کے ذریعے سے آپ اس غربت کو، اس بیکاری م کرنے کی کوشش کریں۔ یہ بات غلط ہے کہ ہمارا مذہب اس کے ف ہے۔ دیکھیے میں آپ سے کسی اور مذہب کے متعلق تو کہہ ں سکتا۔ لیکن اسلام مذہب کے متعلق میں آپ سے ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے قرآن شریف میں کہیں یہ نہیں لکھا ہوا ہے کہ فیملی پلاننگ کے خلاف ہمارے رسول کو ہدایت دی گئی تھی کہ اس کے متعلق کچھ کہا جائے۔ اس وقت تو یہ سوال ہی نہیں تھا۔ اُس وقت تو یہ سوال تھا کہ عرب کے ملکوں میں جو لڑکیاں پیدا ہوا کرتی تھیں، ان کے پیدا ہوتے ہی اُس وقت کے لوگ جو تھے، اُن لڑکیوں کو دفن کر دیا کرتے تھے۔ وہ یہ اچھا نہیں سمجھتے تھے کہ کوئی لڑکی پیدا ہو۔ اس لیے ہمارے رسولؐ سے کہا گیا کہ اس طرح کا جو قتل ہے اس کو بند کرو۔ اگر اس کے بارے میں آج کے عالم آپ سے یہ کہیں کہ یہ فیملی پلاننگ کی مخالفت (کا ثبوت) ہے تو یہ بالکل غلط چیز ہے وہ تو اس قسم کا قتل بند کرنے کے لیے تھا۔

اس کے علاوہ عربی میں ایک اور لفظ ہے "عزل" (کنبہ بندی کا ایک طریقہ)، اس طرح سے آپ خود ضبط سے کام لیں اور بچے نہ پیدا کریں۔ اس کے لیے آپ کوشش کیجیے۔ "عزل"، کا ذکر ہمارے قرآن شریف میں نہیں تو حدیث میں ہے اور سنت میں ہے۔ اس کے لیے ہمارے یہاں کثرت رائے ہے اور علماء نے بہت سے فتوے وغیرہ بھی دیئے ہیں۔ تمام اسلامی ممالک جیسے ترکی، ایران، پاکستان اور مصر وغیرہ میں سب لوگ اس پر عمل کر رہے ہیں تو آج ہمارے یہاں کس طرح سے مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ ہمارے اسلام اور شرع کے خلاف ہے۔ میں آپ سے یہ کہوں گا کہ ان غلط راستوں پر آپ کبھی مت جائیے۔ اگر آپ ان چیزوں کا، ان باتوں کا خیال رکھتے ہیں اور رکھ کر آپ اس پر عمل کرتے ہیں تو ضرور آپ کو، آپ کے علاقے کو اور آپ کے صوبے کو فائدہ ہوگا۔"

مہاتما گاندھی

محمد عثمان عارف
۴۰۔ ساؤتھ ایونیو۔ نئی دہلی





(۱)

اے مسیحا ہند کے امن و اماں کے پاسباں
تیرا احساں بھول ہی سکتا نہیں ہندوستاں
مرہم زخم جگر تھا، چارۂ دردِ نہاں
آفریں ہمت تری، صد آفریں عزمِ جواں
جذبۂ حُبّ وطن سے معرکہ وہ سر کیا
پرچم آزادیٔ ہندوستاں لہرا دیا

(۲)

تیری حکمت اور سیاست تھی جہاں میں انتخاب
ظلم کا دیتا رہا اپنے اہنسا سے جواب
ملک بھر میں ایسے گونجے نعرہ ہائے انقلاب
جاگ اُٹھے جو تھے پابندِ غلامی محوِ خواب
یوں ہوئے تیار مٹنے کو وطن کی آن پر
گولیوں کے سامنے آئے وہ سینہ تان کر

(۳)

ظلم کی ماری ہوئی انسانیت کے چارہ گر
جب ہوئے ہنگامہ ہائے قتل و غارت شور و شر
راہ سے بھٹکے ہوئے بھارت کا تو تھا راہبر
اتحاد و امن کا پیغام لے کر بے خطر
رام دھن گاتا ہوا حقانیت کے ساز پر
آگ کے طوفاں میں پہنچا دُکھ بھری آواز پر

(۴)

خدمت خلق خدا تھا تیرا دستورِ حیات
دل میں ممتا کی بسی تھی اِک مکمل کائنات
تیرے مشرب میں تھی لعنت فرقہ بندی ذات پات
تو دلانا چاہتا تھا سب کو غربت سے نجات
غم کا مارا جو بھی ہو وہ شاد ہو مسرور ہو
کوٹھیوں میں کیا اندھیرے جھونپڑوں میں نور ہو

(۵)

جذبۂ انسانیت دل میں تھا کتنا موجزن
پاس تک بھٹکے نہیں تیرے سیاسی مکر و فن
کیسا ہندو کیا مسلماں، شُدر کیا، کیا برہمن
تیری نظروں میں برابر تھے سبھی اہل وطن
آتما پرماتما کا اصل رشتہ جوڑ کر
رکھ دیئے چھوٹے بڑے کے تو نے بندھن توڑ کر

(۶)

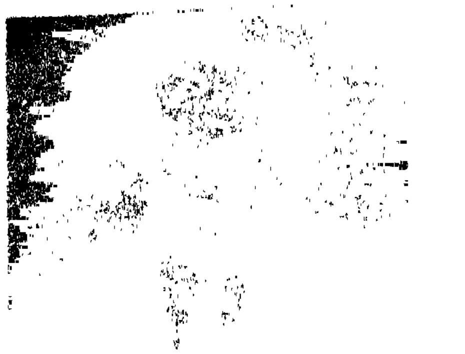
ایک ہی تھے ایشور اللہ تیرے گیان میں
ایک ہی جوتی نظر آئی ہر اک انسان میں
ایک ہی پرماتما کا روپ رکھا دھیان میں
وید میں، اِنجیل میں، گیتا میں اور قرآن میں
سارے دھرموں کا خلاصہ یہ ترا پیغام ہے
دھرم مذہب اصل میں انسانیت کا نام ہے

(۷)

ذات تیری کس قدر بے لوث تھی بے نفس تھی
خاکساری سادگی ایثار کی حد ہو گئی
ایک دھوتی، ایک لاٹھی کائنات زندگی
دیکھ کر حیراں تھی جس کو شوکتِ شاہنشہی
تھا سلیقہ پیار سے لاکھوں دلوں پر راج کا
بادشاہِ ملک تھا بے تخت کا بے تاج کا

جاں نثار اختر

خواجہ احمد فاروقی
۲۸ کیولری لائنز
دہلی یونی ورسٹی، دہلی



ع قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

۱۸ اگست ۱۹۷۶ء میری زندگی کا سب سے منحوس دن تھا۔ اس روز میرے عزیز دوست اور میرے عزیز شاعر جاں نثار اختر نے اس دنیا سے رحلت فرمائی۔ اور کیسے ناشاد و نامراد گئے ہیں وہ۔ یہ کہانی بڑی غم انگیز اور دل دوز ہے؛ ایک قطرۂ بے اختیار، ایک نقشِ فریادی، ایک شمعِ خیر شب۔ لیکن وہ غم کی باگیں تھامے رہے اور ایک لمحہ کو امید اور یقین کی دولت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ؎

در عشق غنچہ ایم کہ لرزد ز بادِ صبح
در کارِ زندگی صفتِ سنگِ خارا ایم

یہ لطیفہ بھی قابل ذکر ہے کہ جب میں نے علامہ اقبال کا یہ شعر جاں نثار کے سامنے پڑھا تو وہ تڑپ اٹھے، بار بار پڑھوایا اور اسے اپنے مجموعہ "... اور داں" کا عنوان بنایا جواب نایاب ہے۔



جاں نثار ایک خوش نوا اور سحر کار شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک مخلص دوست، ایک ہمدرد ساتھی اور ایک شریف النفس انسان بھی تھے۔ ان کی وضع عاشقانہ، دل کی کلابی سے سرشار و سرمست، بالوں کا وہ انداز جو بگڑنے میں بھی سنور جائیں، ان کی ذکاوت اور ذہانت، سادگی اور معصومیت ان کا حافظہ، ان کا مشاہدہ، ان کی چہل، ان کے لطیفے، مزے مزے کی باتیں اور حکایتیں ایسی نہیں جو بھلا دی جائیں۔

ع مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

جاں نثار کو آخری زمانہ میں نہرو اوارڈ اور یوپی اور مدھیہ پردیش سے انعام واکرام بھی ملے، کبھی کبھی قلم والوں نے بھی مدد کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ع بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے۔ بقول آزاد: "ان کبھی کبھی کی قدردانیوں سے خاندان تھوڑی پلتے ہیں"۔ اگر یہ حق ناشناسی اور بے انصافی نہ ہوتی تو وہ شاید اور جیتے ۔ ع کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور۔

جاں نثار سے میرے تعلقات کم و بیش ۳۵ برس کے تھے۔ میں نے ان کو "ہر رنگ" میں دیکھا تھا۔ طالب علم کی حیثیت سے جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پڑھتے تھے ——— اللہ اللہ کیسے کیسے جوہر قابل اور نامی رہنما اُن کے ساتھی اور دوست تھے: شان الحق حقی مجاز ردولوی، رشید مودودی، معین احسن جذبی، صدیق احمد صدیقی خواجہ احمد عباس، اختر الایمان، شاہد لطیف، علی سردار جعفری، نور الحسن ہاشمی، اختر حسین رائے پوری، سبط حسن۔ اسی یونی ورسٹی سے انھوں نے ایم اے کیا۔ اُردو میں، اور فرسٹ کلاس میں۔ آج یہ جنس ارزاں ہے لیکن اس زمانہ میں مقابلہ سخت تھا اور دانتوں پسینہ آجاتا تھا۔ اس کے بعد پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا لیکن اسے مکمل نہ کر سکے۔ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر رہے اور بڑے دلکش نمبر نکالے۔ رسالہ اُردو میں مضامین لکھے۔ سید اور مضطر خیرآبادی پر جو مضامین چھپے ان کی ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے بھی دل کھول کر داد دی۔

جاں نثار کا تعلق خیرآباد کے مشہور خانوادہ علم و ادب سے تھا جن میں غالب کے مجاہد دوست اور غمگسار حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی کا نام نامی سرفہرست ہے۔ دیوان کی ترتیب اور حادثۂ اسیری میں ان کی مدد خاص طور پر لائق ذکر ہے۔ یہ کالے پانی بھیج دیے گئے تھے اور وہیں آسودۂ خواب ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے "مولانا" سید سلیمان

اشرف مرحوم ناظم دینیات مسلم یونی ورسٹی علی گڈھ نے مولوی عبدالحق خیرآبادی المنطقی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا، جو مولانا فضل حق کے صاحبزادے تھے۔ ایک روز جاں نثار مولانا سلیمان اشرف کی خدمت میں پہنچے اور ان سے اپنے ماموں کی ہدایت کے مطابق ملّا علی قاری کے حالات معلوم کیے۔ مولانا کو یہ عجیب سی بات معلوم ہوئی اور بے رخی سے فرمایا "آپ انٹرمیڈیٹ کے طالب علم۔ آپ کو ملّا علی قاری سے کیا واسطہ؟" عرض کیا: ماموں صاحب کا ارشاد ہے۔" پوچھا "وطن کہاں ہے؟" کہا: خیرآباد۔ یہ سننا تھا کہ مولانا کھڑے ہو گئے۔ ایسے ادب سے جیسے غلام آقا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ اور جاں نثار کو زبردستی بٹھائے رکھا اور فرمایا کہ تم تو میرے استاد اور پیر و مرشد سے نسبت رکھتے ہو۔ تمھارا احترام میرے اوپر واجب ہے۔" اس کی صراحت ضروری ہے کہ مضطر، مولانا فضل حق خیرآبادی کے نواسے تھے۔ ان کی والدہ سعیدالنسا المتخلص بہ حرماں علم حدیث، فقہ، منطق اور فلسفہ میں غیر معمولی لیاقت رکھتی تھیں۔ انھوں نے ہی مضطر کو پڑھایا تھا اور ان کے اشعار پر اصلاح دی تھی۔

جاں نثار علی گڈھ کی صحبتوں میں بہت جلد مقبول ہو گئے۔ شعر و شاعری کی وجہ سے ہر ایک ان کو آنکھوں پہ بٹھاتا تھا۔ استاد، لڑکے، لڑکیاں۔ یہ دولت ان کو ارثاً اپنے والد حضرت مضطر خیرآبادی سے ملی تھی جن کی ٹھمریاں اور ہندی گیت آج بھی دیہاتوں میں گائے جاتے ہیں اور جس کے اشعار زبان زدِ خلایق ہیں:

اسیرِ پنجۂ عہدِ شباب کرکے مجھے
کہاں گیا مرا بچپن خراب کرکے مجھے

نہ کسی کے آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا سرور ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

مضطر ریاست گوالیار میں مجسٹریٹ تھے ۔۔۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے فرو ہو جانے کے بعد داغ حیدرآباد چلے گئے اور مضطر گوالیار۔ دونوں اقلیم زبان پر حکمرانی کرتے تھے۔ اور حریفانہ چشمک رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ نواب صاحب رام پور نے مضطر کی زود گوئی اور طبّاعی کا امتحان لیا اور میر سوز کا یہ مطلع پڑھا ؎

دعویٰ کیا تھا گل نے اس رُخ سے رنگ و بو کا
دھولیں صبا نے ماریں، شبنم نے منہ پہ تھوکا

مدعا یہ تھا "جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو ان کو" نواب صاحب نے کاغذ و قلم مضطر کے آگے رکھ دیا۔ انھوں نے فرمایا: دوات قلم لے کر تو خیرآباد کی لڑکیاں شعر کہتی ہیں۔ وہاں کے شعرا تو فی البدیہہ کہتے ہیں۔" اور اس کے بعد میر سوز کی زمین میں فر فر گیارہ شعر کی پوری غزل سنا دی۔ جاں نثار بھی ایسے ہی پُر گو تھے۔ عنیزہ کے نام نظم "آخری لمحہ" انھوں نے بارہ برس میں بھی کہی اور بارہ گھنٹے میں بھی۔ اس کے ابتدائی شعر اس وقت کہے تھے جب وہ ایک سال کی تھی بڑے ہو کر اس نے اصرار کیا کہ وہ نظم مجموعہ میں شامل کر دی جائے چنانچہ بارہ گھنٹے میں ۸۲ شعر کہے اور لاجواب کہے۔

جاں نثار کی طالب علمی کے زمانے میں علی گڈھ میں ایک شعری مقابلہ ہوا۔ عنوان تھا "بگولہ"۔ جاں نثار کی نظم اول ٹھہری ملاحظہ ہو۔ یہ میری نوٹ بک میں جاں نثار کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے

بگولا

جون کا تپتا مہینہ، تمتماتا آفتاب
ڈھل چکا ہے دن کے سانچے میں جہنم کا شباب
دوپہر اک آتشِ سیال برساتی ہوئی
سینۂ کہسار میں لاوا سا پگھلاتی ہوئی

وہ جُھلستی گھانس، وہ پگڈنڈیاں پامال سی
نہر کے لب خشک سے ذرّوں کی آنکھیں لال سی
چلچلاتی دھوپ میں میدان کو چڑھتا بخار
آہ کے مانند اٹھتا ہلکا ہلکا سا غبار

دیکھ وہ میدان میں ہے اک بگولا بے قرار
آندھیوں کی گود میں ہو جیسے مفلس کا مزار
چاک پر جیسے بنائے جا رہے ہوں زلزلے
یا جنوں طے کر رہا ہو گردشوں کے مرحلے

ڈھالنا چاہے زمیں جس طرح کوئی آسمان
جیسے چکّر کھا کے نکلے دھوپ کے منہ سے دھواں
ل رہا ہو جس طرح جوشِ بغاوت کو قرا
جنگ چھڑ جانے پہ جیسے ایک لیڈر کا دما

خشمگیں ابرو پہ ڈالے خاک آلودہ نقاب
جنگلوں کی راہ سے آئے سفیرِ انقلاب
یوں بگولے میں ہیں تپتے سُرخ ذرّے بے ق
جس طرح افلاس کے دل میں بغاوت کے شرا

کس قدر آزاد ہے یہ روحِ صحرا یہ بھی دیکھ
کس طرح ذروں میں ہے طوفان برپا یہ بھی دیکھ
اُٹھ بگولے کی طرح میدان میں گاتا نکل
زندگی کی روح ہر ذرے میں دوڑاتا نکل

۱۹۳۹ء

زلف کھلی ہے - تیری چشم پر بل کھائی ہوئی -
آفت تری کافر جوانی ڈسنے میں آئی ہوئی -

علی گڑھ کی سوسائٹی روایتوں میں جکڑی ہوئی ہے لڑکوں کی قسمت میں بس دور کا جلوہ ہے اور لڑکیوں کے ہنسنے بولنے پر بڑی سخت پابندی ہے۔

ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

جب گرلز کالج نے ایک لاری خریدی اور لڑکیاں اس میں کالج آنے جانے لگیں تو یہ سخن سرائی کا موضوع بن گئی۔ جاں نثار کی گرلز کالج کی لاری۔ اس اچھوتے عنوان پر عجب نظم ہے جو لڑکیوں کی محفل میں بار بار سنی جاتی تھی۔

جاں نثار کا سب سے پہلا مجموعہ سلاسل تھا جس میں گرلز کالج کی لاری، نگرا کے کنارے اور کون سا گیت سنوگی انجم، اس قسم کی رومانی نظمیں ہیں۔ انجم اور ناہید فرضی نام ہیں لیکن ان کا وجود اصلی ہے۔ انجم ہندوستان میں ہیں۔ ناہید ماموں زاد بہن تھیں جن کا پاکستان میں ایک حادثہ میں انتقال ہوگیا۔ فاطمہ بیگم زبیر مومن خاں مومن دہلوی کی عزیز تھیں۔ سلاسل ان ہی کے نام سے معنون ہے جاں نثار نے ان کے نام کے نیچے میرے عرض کرنے پر اقبال کا یہ مصرع لکھا تھا:

از رموزِ فطرتِ من محرمے

بڑی با محبت خاتون تھیں۔ ابھی چند سال ہوئے انتقال ہوا ہے۔ میں ۱۹۶۲ء میں گوالیار گیا اور وزارت مآب سید حکیم احمد نقوی مرحوم کے یہاں ٹھہرا ان کو اطلاع ہوئی تو مجھے دہلی خط لکھا "کیا مشکل تھا اگر آپ کھڑے کھڑے میرے پاس بھی ہو جاتے۔ میری مجبوری آپ کو معلوم ہے۔ ع

نہ ربط اس سے، نہ یاری آسماں سے

ایک مرتبہ وکٹوریہ کالج گوالیار کے پرنسپل نے فرمائش کی کہ بزم ادب ایک ڈراما اسٹیج کرے اور اس کے لئے ۵۵۰ روپے کی رقم عنایت فرمائی جو اس زمانہ میں اچھی خاصی معقول رقم تھی۔ بہت سے ڈرامے پڑھے لیکن اسٹیج کے خیال سے کوئی نہ جچا۔ جب صرف آٹھ نو دن رہ گئے تو جاں نثار نے کہا آیئے فاروقی صاحب ایک ڈرامہ مل کے لکھ ڈالیں ورنہ یہ پیسے مارے جائیں گے۔ لڑکوں نے کہا کہ "اگر وہ ہمیں کل تک نہ ملا تو ہم تیاری نہیں کر سکیں گے۔" چنانچہ طے کر لیا کہ آج کی رات ڈرامہ لکھ ہی ڈالیں۔ فاطمہ بیگم زبیر ساری رات جاں نثار کے لئے مردانہ میں پان اور میرے لئے سگریٹیں بھیجتی رہیں اور صبح سویرے اذان کے وقت یہ ڈرامہ مکمل ہو گیا۔ ؎

موذن مرحبا بر وقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

جن لوگوں نے اسے اسٹیج پر دیکھا انھوں نے تعریف کی اور سنا ہے کہ بمبئی میں بھی کھیلا گیا اور دیکھنے والوں نے اسے سراہا۔ واللہ اعلم

دہلی کے وصی اشرف صاحب سلاسل کے پبلشر تھے۔ جاں نثار جب دہلی آتے تو وصی اشرف صاحب کی دوکان پر بھی آتے جو اردو بازار میں واقع تھی اور جہاں ادیبوں اور شاعروں کا جمگھٹا سا رہتا تھا۔ ایک روز وہ ایسے وقت پہنچے جب وصی اشرف کھانا کھا رہے تھے اتنے میں خواجہ محمد شفیع آ گئے انھوں نے کہا: "آیئے قبلہ! کھانے میں شرکت فرمایئے۔" خواجہ صاحب نے فرمایا "میں کھا کے چکا ہوں۔" جاں نثار اختر نے ہر چند کہ پہلی ملاقات تھی بڑی شدت سے اعتراض کیا "حضرت یہ محاورہ طبیعت پر گراں ہے۔" خواجہ صاحب نے بڑے تحمل سے فرمایا "آپ مجھے اردو پڑھا دیجئے یا پھر میں پڑھا دوں۔" جاں نثار نے بے ساختہ دوکان میں سے ایک کتاب کھینچ لی نام تھا 'اشتالیت' اور مصنف کا نام نخشب جارچوی۔ اور نہایت معصومیت سے کہا لیجئے یہ پڑھا دیجئے۔" جان نثار گوالیار میں نومبر ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے تھے اور گوالیار وہ جگہ ہے جس کی زبان کو خان آرزو نے سند مانا ہے پھر مضطر کے بیٹے تھے جہاں ہر وقت زبان کا کھوٹا کھرا پرکھا جاتا تھا۔

علی گڑھ میں اس سے بھی دلچسپ معرکے ہوئے۔ ایک صاحب شعبہ میں نئے نئے استاد ہو کر آئے اور اقبال کا یہ شعر جو والدہ مرحومہ کی یاد میں ہے پڑھا رہے تھے ؎

دل مگر غم مرنے والوں کا جہاں آباد ہے
حلقۂ زنجیرِ صبح و شام سے آزاد ہے

استاد نے جہاں آباد کو ایک مرکب لفظ قرار دیا اور اس کے معنی شاہ جہاں آباد دہلی بیان کئے۔ جاں نثار نے کہا "میرے خیال میں جہاں الگ ہے۔ آباد الگ یعنی جس جگہ غم آباد ہے۔" انھوں نے لاجواب ہو کر فرمایا "ہاں یوں بھی معنی لے سکتے ہیں۔"

ان ہی استاد سے ایک اور معرکہ ہوا۔ ایک طالب علم نے موصوف سے پوچھا اس مصرع کے کیا معنی ہیں:

دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں، میری نہیں

فرمایا شاعر کا مقصد یہ ہے کہ زمین کا مالک خدا ہے اور کوئی نہیں۔ لڑکے نے کہا میری دشواری یہ ہے کہ مجھے "دہ خدایا" کے معنی نہیں معلوم۔ فرمایا یہ تو کلمۂ تعجب ہے جیسے بار خدایا۔ بار الہا۔ پھر جاں نثار سے تصدیق چاہی "کیوں اختر صاحب آپ کو بھی اتفاق ہے۔" عرض کیا "دہ خدا کے معنی ہیں زمین دار، زمین کا مالک۔" فرمایا "اقبال نے یہ لفظ کہیں اور استعمال نہیں کیا۔ میرے لئے یہ معنی ناقابل قبول ہیں۔ جان نثار نے بڑی معصومیت سے جیسے ان کی عادت تھی کہا "استعمال تو کیا ہے۔ ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہو گیا لیکن اس آزادی کی جلو میں تباہی بھی بہت آئی۔ سامراجی حکومت نے چلتے چلاتے اس جام میں زہر کی ایک بوند بھی ملا دی اور ملک تقسیم ہو گیا۔ ہزاروں لاکھوں گھر سے بے گھر ہو گئے۔

جاں نثار کا پورا گھرانا گوالیار میں تھا۔ اس خانوادے نے پاکستان جانا پسند نہیں کیا اور سب چھوٹے بڑے بھوپال آ گئے جو اس زمانہ میں مرکز کے زیر انتظام تھا

بھوپال آنے سے پہلے جاں نثار کی شادی مجاز کی بہن صفیہ سے ہو چکی تھی۔ وہ بڑی ذہین اور لائق خاتون تھیں ان کا تمام کیریئر فرسٹ کلاس رہا تھا اس لئے ان کو فوراً بھوپال کے حمیدیہ کالج میں نوکری مل گئی۔ یہ واقعہ اکتوبر ۱۹۴۲ء کا ہے لیکن جولائی ۱۹۴۳ء میں جاں نثار بھی اسی کالج میں صدر شعبہ اردو و فارسی مقرر ہو گئے ان کی بے روزگاری کا زمانہ بڑا صبر آزما تھا۔ آٹھ مہینے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا اس لئے کہ صفیہ کے پیسے سے مے نوشی انھیں گوارا نہ تھی۔ اور صفیہ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے جاں نثار کی دوست انجم کی فیس تک اپنی سونے کی چوڑیاں بیچ کر ادا کی تھی۔ جب تقرر کا پروانہ آگیا اور دونوں تنخواہیں یکجا ہو گئیں تو جاں نثار نے صفیہ سے شراب کی فرمائش کی۔ کہنے لگیں "میرے شاعر! مجھے یہ شکایت رہے گی کہ تم نے میرے پیسے کو اپنا نہیں سمجھا"۔

جاں نثار ابتدا ہی سے انجمن ترقی پسند مصنفین سے گہری دلچسپی رکھتے تھے بھوپال میں آکر اس کے صدر ہو گئے۔ لیکن یہ صدارت حکومت کو گوارا نہ ہوئی اور ان سے سخت بازپرس کی گئی۔ اس زمانہ میں اور آج کتنا فرق ہے! جاں نثار نے فاقہ کرنا پسند کیا لیکن انجمن ترقی پسند مصنفین سے علیحدگی گوارا نہ کی۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۴۹ء میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور آخر وقت تک اپنے ترقی پسندانہ خیالات پر قائم رہے۔

جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

وفاداری اور استواری کی ایسی مثال اُردو میں کم ملے گی۔

میں نے عرض کیا ہے کہ جاں نثار نے بڑی کڑیاں جھیلیں، اور فاقہ کرنا پسند کیا۔ یہ لفظاً اور معناً درست ہے۔ بھوپال کے بعد وہ بمبئی میں رہنے لگے جو تجارت اور فلم کا بڑا مرکز ہے۔ اور جہاں وہ صبح سے لے کر شام تک دو وقت کی روٹی کی جدوجہد میں لگے رہتے تھے۔ اس بڑے صنعتی شہر کی بے مروتی، بے گنہ کشی اور حق ناشناسی جاں نثار جیسے شریف النفس انسان اور ذکی الحس شاعر کی برداشت سے زیادہ تھی۔ ؎ داغ، دامن پہ نہیں، دل پہ لیا ہے میں نے

لیکن وہ ہر حال میں اختر صاحب ہی رہے، وہی پاسِ وضع، وہی نگاہِ شرم، وہی رکھ رکھاؤ وہی عاشقانہ انداز وہی صبر و ضبط وہی شگفتہ متانت۔ پھر نہ رنجِ گراں نشیں کی شکایت نہ صبرِ گریز پا کی حکایت۔ تہذیبِ الم کا ایسا محرم میں نے نہیں دیکھا۔

جاں نثار مدتوں تک آر۔ کے ٹیا بلڈنگ رحمت اللہ روڈ بمبئی کے ایک حجرہ میں مقیم رہے۔ یہاں گوالیار کے ایک نسبتاً خوش حال دوست خلیل احمد صاحب ان کی مدد کرتے تھے اور خاموشی سے قرض دیتے تھے۔ حساب دیوار پر لکھا جاتا تھا اس طرح ۵ + ۸ + ۱۰ + ۷۔ ایک ڈاکٹر پاکستان جانے سے پہلے مریضوں کے دیکھنے کی ایک میز اور کپڑے کی ایک پارٹیشن وال بخش گئے۔ خلیق ابراہیم جو ساتھ رہتے تھے وہ اسی میز پر سوتے تھے۔ جاں نثار کے حصے میں ایک چارپائی آئی جو اب جھلنگا ہو گئی تھی۔ اور جس پر وہ پہلو بدل بدل کے بیٹھتے اور شعر کہتے تھے۔ ایک روز خلیل صاحب پیسے دے کر نہیں گئے۔ جاں نثار کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ خلیق ابراہیم کے پاس چار آنے تھے۔ کہیں سے جا کر آٹھ آنے اور قرض لئے۔ اور اس طرح چھ چھ آنے کا دونوں نے کسی بھٹیار خانے میں کھانا کھالیا۔ ایک آنہ کی خمیری روٹی اور دو آنے میں سبزی کی پلیٹ۔ وہ آج دو دو لے لیں۔ مہینوں اسی طرح گزر بسر ہوتی رہی۔ دونوں اس چھ آنے والے بھٹیار خانہ کی دریافت پر بہت خوش تھے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب صفیہ بیمار ہوئیں اور دق میں جاں بحق ہو گئیں۔ ان کے خطوط جو "زیرِ لب" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں مکتوباتی ادب میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں جو سوزِ دل ہے اس کا جواب مشکل سے ملے گا۔ اس کا ہر جملہ خون کی ایک بوند ہے اور اس کا ہر نقش فریادی:

استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں

ان میں ضبطِ نفس ہے، دردمندی ہے۔ محبت کی دھیمی دھیمی آنچ ہے، جینے کی خواہش ہے، جاگیری نظام کی بے انصافیوں پر فتح پانے کا حوصلہ ہے اور ایک بہتر سماج کے قیام پر یقین ہے۔ ان خطوں میں صفیہ کی شخصیت حل ہو گئی ہے وہ عصرِ حاضر کی تاریخ بھی ہیں اُردو کا المیہ بھی۔ ذہن کا دریچہ بھی۔ دل کی کہانی بھی۔

صفیہ کا یہ غم جاں نثار کے تحت الشعور میں پیوست ہو گیا اور درد بن کر رگ رگ میں سما گیا لیکن اس نے ان کے عزم و عمل کو نئی توانائی بخشی اور ان کے تخلیقی حسن کو نکھار دیا۔ درد کی اس دھیمی دھیمی آنچ میں ان کی بعض رباعیاں غزلیں اور نظمیں ڈھلی ہیں۔ صفیہ کی یاد میں انھوں نے "خاکِ دل" اور "خاموش آواز" کے عنوان سے جو نظمیں لکھی ہیں وہ عصرِ جدید کی نہایت خوب صورت اور پُرسوز نظمیں ہیں۔ ان کی تاثیر میں کبھی کمی نہیں ہوگی۔ وہ ہمیشہ اپنی مقدس آگ سے ہمارے عزائم کو چمکاتی رہیں گی۔

اُردو میں جو شخصی مرثیے مومن، غالب اور حالی نے لکھے ہیں وہ اپنی ندرت اور غم انگیزی میں منفرد ہیں لیکن جاں نثار کی نظموں نے المیہ کی تخلیقی سرحدوں کو چھو لیا ہے۔ ان میں مرکز اور محیط کی دوئی مٹ گئی ہے اور غمِ جاناں، غمِ دوراں سے ہم آہنگ ہو گیا ہے۔ ذاتی غم کا یہ تعمیری پہلو کہ وہ ہمیں غمِ آفاق کے اٹھانے میں مدد دے، معمولی بات نہیں ہے۔

گھر آنگن میں بھی جاں نثار نے زیادہ تر صفیہ ہی کو عینی اور مثالی طور پر پیش کیا ہے ان یادوں کے جھرمٹ میں کہیں کہیں خدیجہ کی بھی جھلک نظر آجاتی ہے لیکن اس کا رنگ و آہنگ مختلف ہے۔ اور اسے مختلف ہونا چاہیئے اس لئے کہ وہ دو مختلف شخصیتیں ہیں۔

قدیم یونان کی طرح اردو شاعری میں بالعموم محبوب کا تعلق اربابِ نشاط یا شاہدانِ شیریں سے رہا ہے۔ اس کے تصور میں رفعت اور بلندی نہیں ہے۔ کرۂ رقیب اور رشکِ غیر زیادہ ہے۔ جاں نثار کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے گھر آنگن میں بیوی کو عاشق و معشوق کی حیثیت سے پیش کیا جس کی طرف اردو میں آج تک کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔ وہ برہن بھی ہے، گرہستن بھی، گوری بھی۔ اسی وجہ سے اس میں وہ خیر و برکت ہے جس سے دل میں ٹھنڈک پڑ جائے۔ وہ چراغ ہے جس سے اندھیرے گھر میں اُجالا ہو جائے، وہ نیکی ہے جو ہمیں دیوتاؤں سے قریب کر دیتی ہے، وہ ادا ہے جس کی بدولت زلیخا نے اپنا ہاتھ کاٹ لیا تھا، اس میں جسم کا وہ جمال، جنس کی وہ مہک، وصل کی وہ تقدیس ہے جس سے

کنارک اور کھجوراہو کے مندروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

اردو کی جدید شاعری کے آسمان پر بہت سے شاعر چمکے لیکن عصری تاریخ میں کوئی شاعر ہندوستانی تہذیب کا ایسا محرم اور ہندوستانی مزاج کا ایسا نبض شناس نہیں ہے جیسے جاں نثار ہیں۔ مغرب صنعت و حرفت کی جنت سہی لیکن اس میں گھر کے سارے رشتے کمزور پڑتے جاتے ہیں اسی لئے وہاں اطمینان اور خوشی ناپید سی ہے۔ ہندوستانی تہذیب میں جو تابندگی ہے اس میں عورت کے پیار، اس کے تیاگ اور گھریلو زندگی کی حسین راحتوں کو بھی دخل ہے۔ جاں نثار اس سوز و ساز کے رمز شناس تھے۔ انھوں نے عورت کی عاشقی اور محبوبی دونوں سے اپنے نگارخانۂ دل کو سجایا تھا لیکن وہ اس رنگ و بو کے سیلاب میں بہہ نہیں جاتے آنگن آنگن اس خوشبو کو عام کرنا چاہتے ہیں۔ ؎

بس اپنے ہی گھر کا سکھ تو کچھ بھی نہ ہوا
ہر گھر کو ملے گی گھر کی راحت کس دن
کس روز ہر اک صحن میں مہکیں گے گلاب
آنگن آنگن بسے گی جنت کس دن

گھر آنگن کے علاوہ، جاں نثار نے ہندوستانی تہذیب کی جو تصویر امن نامہ میں پیش کی ہے وہ بھی بڑی دلکش ہے: ؎

سلامت رہیں اپنے دشت و دمن — رہے گنگناتا ہمارا اگگن
نگاہیں ہمالہ کی اونچی رہیں — سدا چاند تاروں کو چھوتی رہیں
رہے پاک گنگوتری کی پھبن — مچلتی رہے زلفِ گنگ و جمن
رہے جگمگاتا یہ سنگم کا روپ — چمکتی خنک چاندنی، نرم دھوپ
جھلکتی رہے، یہ اشوکا کی لاٹ — یہ گوکل کی گلیاں، یہ کاشی کے گھاٹ
لٹاتی رہیں اپنے نینوں کا مدھ — یہ صبح بنارس، یہ شام اودھ
حسیں راکھیاں جھل جھلاتی رہیں — جھاجھم ستارے لٹاتی رہیں
رہے اپنے بھائی پہ بہنوں کو ناز — یہ معصوم نرمی، یہ میٹھا گداز
گھروں کا تقدس رہے برقرار — یہ بیٹوں کے ماتھے پہ ماؤں کا پیار
رہے شاد و آباد صحنوں کی دھوم — رہیں آنگنوں میں "چہکتے نجوم"
سلامت رہے دلہنوں کی پھبن — سلامت رہیں دل میں کھلتے چمن
سلامت رہے الھڑیوں کی حیا — سلامت رہے گھونگھٹوں کی ادا
سلامت رہے روپٹوں کی بہار — سلامت جواں آنچلوں کا وقار

خاکِ دل میں رومانی نظمیں بھی ہیں لیکن وہ بھی انقلابی نغموں سے خالی نہیں۔ انھوں نے قدیم ورثۂ شاعری کو صیقل کر کے آئینۂ حیات بنا دیا ہے اور اسے فطرت اور زندگی کی نکہتوں سے معمور کر دیا ہے۔ جب زمانہ میں ترقی پسند شاعری میں نعرے زیادہ شامل ہو گئے تھے، اور وہ صحافت سے قریب ہو گئی تھی اور اس میں ہیجان، جوش اور برہمی کا مظاہرہ اس طرح کیا جاتا تھا ؎

ریشمی بانہوں کو انگاروں پہ بھونا جائے گا — اور ہر اک بھوک کا بیمار اُن کو کھائے گا
راستے پر بکھرے بالوں کو بچھایا جائے گا — اور خوانی گوشت کتوں کو کھلایا جائے گا

اس وقت بھی جاں نثار نے شعریت اور حسن نہاری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ ان کے یہاں چاہنے اور چاہے جانے کی فطری آرزو ہے لیکن ذہنی ہیجان، جذبات کی شدت اور نفسی فکر و انتشار میں بھی وہ شاعری کے اعلیٰ منصب سے بے خبر نہیں رہے۔ آخری لمحہ میں بھی ان کی نظر حقیقتوں پر جمی ہوئی ہے۔

دریا کی تند باڑھ بھیانک سہی مگر — طوفاں سے کھیلتا ہوا تنکا حسین ہے
صحرا کا ہر سکوت ڈراتا رہے تو کیا — جنگل کو کاٹتا ہوا رستا حسین ہے
دہشت دلا رہی ہیں چٹانیں تو کیا ہوا — پتھر میں جو صنم ہے وہ کتنا حسین ہے

وہ اس رقصِ بتانِ آذری کو منزلِ آخر نہیں سمجھتے۔ ۱۹۴۲ء میں ایک نظم لکھی تھی ابھی نہیں اس میں بھی اگرچہ ان کی نظر ستاروں پر جمی ہوئی ہے لیکن قدم مضبوطی سے زمین پر قائم ہیں۔ لکھتے ہیں ؎

بہار ہے تو کیا، حرام ہے نشاطِ گلستاں — ابھی تو خود ہی سینۂ چمن میں آگ ہے نہاں
یہ جشنِ گل ابھی نہیں، یہ رنگ و بو ابھی نہیں
ابھی تو چرخِ زندگی پہ ظلمتوں کا دور ہے — ابھی تو بجلیوں کی زد پہ خرمنِ وجود ہے
نظارہ سوز مہوشوں کی آرزو ابھی نہیں
ابھی تو تلاطمِ حیات ہے کمالِ اوج پر — ابھی سفینۂ بشر ہے ظلمتوں کی موج پر
چراغِ ماہتاب و سیرِ آبِ جُو ابھی نہیں

جاں نثار کے اسلوب میں جو نرمی و ترنم، جو احساسِ جمال، جو تعبیر شاعرانہ، جو کنایہ کا حسن، جو لفظی ہم آہنگی، جو دھیمی دھیمی موسیقی اور پیکر تراشی ہے وہ اردو شاعری کے لئے باعثِ نازش ہے۔ انھوں نے تجربات، موضوعات، تصورات، تشبیہات اور لفظیات کی ایک نئی دنیا ہمارے سامنے پیش کر دی ہے جو تاریخ سے ہم آہنگ بھی ہے اور مستقبل کے لئے فالِ نیک بھی۔ پچھلے پہر کی غزلوں میں جو سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں ہندوستانی تہذیب کی بھینی بھینی خوشبو ہے، کچھ ایسی، جو پہلے چھینٹے کے بعد زمین سے نکلتی ہے۔ یہ غزلیں، ایران کی غزلوں سے اپنی معنویت اور لب و لہجہ کے اعتبار سے مختلف ہیں اور پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ان کی تخلیق ہندوستان میں ہوئی ہے جہاں عورت محبت کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہے، جہاں انسان کی بڑائی دولت سے نہیں، دردمندی اور سوز دروں سے پہچانی جاتی ہے، جہاں تہذیبِ جسم کو تقدیس حاصل ہے، جہاں ساجن کا انتظار اور پپیہے کی آواز شعور کی پہنائیوں میں بسی ہوئی ہے۔

جاں نثار نے بڑی کڑیاں جھیلیں اور بہت سی تکلیفیں اٹھائیں اور کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے رومانوں سے اپنے دل کو بہلایا اور تخلیق کو مہمیز کیا لیکن شدید ناکامی اور محرومی کے باوجود ان کی شاعری پر غم کی گھٹا اس طرح نہیں چھائی کہ وہ نہ کھلے اور نہ برسے بلکہ جب اس پر تلخی کی چھوٹ پڑ جاتی ہے تو وہ زندگی کے عناصر کو چمکا دیتی ہے اور ایک بہتر فردا کی تلاش میں مدد دیتی ہے۔

بلاشبہ جاں نثار کی ناگہانی موت سے اُردو کو بڑا نقصان پہنچا ہے — اور جدید اُردو شاعری کا تو ایک ستون گر گیا:

مصائب اور تھے پر اس کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے



تخریب سے تعمیر تک

جگن ناتھ آزاد

پریس انفارمیشن بیورو
ریذیڈنسی روڈ
سرینگر

۱

ہمنشیں اس ملک پر ٹھونسی ہوئی جنگوں کے بعد
راہزن کچھ اس طرح سے رہنما بن کر اُٹھے
قحط سالی نے بھی جب ہم کو ہراساں کر دیا
ہم کو جن کی رہنمائی نے پریشاں کر دیا

۲

زندگی کی آرزو سینوں میں دب کر رہ گئی
اک بشر ہی تھا کہ قیمت جس کی گرتی ہی گئی
روحِ انساں ہو گئی گم، جسمِ انساں تھک گیا
ورنہ جو بھی شے تھی اُس کا دام گردوں تک گیا

۳

زندگانی کی ضرورت جو بھی تھی نایاب تھی
زندگی کیسے بتائیں کس قدر دشوار تھی
آ نہیں سکتا ہے لفظوں میں یہ رُخ تصویر کا
صبح کرنا شام کا لانا تھا جوئے شیر کا

۴

رہنماؤں کا عمل اس حکم تک محدود تھا
حوصلے ان شور بختوں کے فزوں تر ہو گئے
توڑ دو دریا کا پُل پٹڑی اُکھاڑو ریل کی
مشرقِ وسطیٰ میں قیمت بڑھ گئی جب تیل کی

۵

کارخانہ ملک میں کوئی کہیں چلنے نہ پائے
نذرِ آتش ہوں جو ریلیں چل رہی ہیں ملک میں
رہنمائی کے کچھ ایسے طور ایسے ڈھنگ تھے
کیا بتائیں رہبری کے کیسے کیسے رنگ تھے

۶

درس گاہوں کا تھا کیا ماحول کل کی بات ہے
اک فسانہ بن چکی تھی آبرو اُستاد کی
مشورے ملتے تھے کیا کیا طالبانِ علم کو
کیا کرے کوئی اب ایسی داستانِ علم کو

۷

ریل گاڑی ہو یا اسٹیمر ہو یا طیارہ ہو
جس کی لاٹھی تھی اُسی کی بھینس تھی، مقصد یہ تھا
وقت پر ان میں سے کوئی بھی کہیں چلنے نہ پائے
ہند کے گلشن میں نخلِ آرزو پھلنے نہ پائے

۸

قعرِ پستی میں وطن کو دیکھ کر گرتا ہوا
بیس شمعیں اُس نے روشن کیں دیارِ ہند میں
دخترِ نہرو اٹھی اس کو بچانے کے لیے
اس اندھیرے کی فضا کو جگمگانے کے لیے

۹

دیکھتے ہی دیکھتے تھا دَورِ ہڑتالوں کا ختم
جو بھی حملے ہو رہے تھے دفتروں پر رُک گئے
کوئی ہنگامہ رہا باقی نہ کوئی توڑ پھوڑ
اک فسانہ بن گئے اغیار کے سب جوڑ توڑ

۱۰

چھوڑ کر ہنگامہ بازی کی بھیانک زندگی
کیوں نہ گلشن میں رہے، صحرا میں کیوں بھٹکتا رہے
قوم کے اطفال نے رستہ لیا اسکول کا
کام کیا صحراؤں کی دنیا میں آخر پھول کا

۱۱

اے وطن والو! گئے تخریب کے اب دن گئے
جو اندھیرے کے زمانے تھے وہ افسانے ہوئے
اب جو ہے نظروں کے آگے دَور ہے تعمیر کا
اب جو خاکہ ہے تجلّی کا ہے اور تنویر کا

۱۲

اور اس خاکے کی ہے یہ بات اے اہلِ وطن
محض دعووں کا نہیں بیکار باتوں کا نہیں
اس طرح سے اس کی اب تکمیل کرنا ہے ہمیں
اس میں اب حسنِ عمل کا رنگ بھرنا ہے ہمیں

مہیپ سنگھ
شعبہ ہندی۔ خالصہ کالج
دہلی یونیورسٹی دہلی

پانی اور پُل

گاڑی نے لاہور اسٹیشن چھوڑا تو اچانک میری روح کانپ اٹھی۔ اب ہم لوگ اس جانب جا رہے تھے جہاں انتیس سال پہلے ایسی آگ لگی تھی جس میں لاکھوں جل گئے تھے اور لاکھوں پر جلنے کے نشان اب تک بنے ہوئے ہیں۔ مجھے لگا ہماری گاڑی گہری لمبی تاریک غار میں داخل ہوتی جا رہی ہے اور ہم اپنا سب کچھ اس تاریکی کو سونپ رہے ہیں۔

ہم سب لگ بھگ تین سو مسافر تھے۔ عورتوں اور بچوں کی تعداد بھی ہم میں کافی تھی۔ لاہور میں ہم نے سبھی گردواروں کی زیارت کی۔ وہاں ہماری جس طرح خاطر تواضع ہوئی اسے پنجہ صاحب کے سفر میں لوگوں کی تواضع میں فرق آئے گا کسی طرح کے آثار نہیں تھے مگر ہاں ! انسان کا ضمیر کب جاگ اٹھے کون جان سکتا ہے ؟

یہی سب سوچتے سوچتے میں نے ماں کی جانب دیکھا۔ ہتھیلی پر منہ ٹکائے کہنی کو کھڑکی کا سہارا دیئے وہ مسلسل باہر کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ کھیت کٹ چکے تھے۔ دور دور تک سپاٹ زمین دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے لگا ماں کی آنکھوں میں سے اتر کر یہ سپاٹ پن ان کے دل میں پوری طرح چھا گیا ہے پھر میں نے اپنے ڈبے سے دوسرے مسافروں کی طرف دیکھا۔ ان پر بھی گہری مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یکایک ایسی مایوسی سب پر کیوں مسلط ہو گئی تھی ؟

"تمہیں تو یہ راستہ اچھی طرح یاد ہوگا ؟" میں نے ماں کا دھیان بٹاتے ہوئے پوچھا۔ "سیکڑوں مرتبہ آنا جانا ہوا ہوگا تمہارا۔"

ماں میری جانب دیکھ کر مسکرائیں۔ وہ مسکراہٹ سب کچھ کھو کر پائی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ بولیں "مجھے تو اس راستے کا ایک ایک اسٹیشن تک یاد ہے لیکن آج یہ علاقہ کتنا بیگانہ بیگانہ سا لگ رہا ہے آج انتیس سال بعد ادھر سے جا رہی ہوں۔ پہلے بھی ایسے ہی جاتی تھی۔ لاہور پار کرتے ہی عجیب سی امنگ رگ رگ میں دوڑ جاتی تھی۔ سرائی (ہمارا گاؤں) جیسے جیسے نزدیک آتا جا رہا

کی ایک ایک شکل میرے سامنے سے گذر جاتی، اسٹیشن پر کتنے لوگ آئے ہوتے......"

ماں کی آنکھوں میں انتیس سال پہلے کی یاد امنڈ رہی تھی۔ والد صاحب نے اپنا روزگار اتر پردیش میں جما لیا تھا۔ والد صاحب تو شاید سال میں ایک آدھ مرتبہ ہی پنجاب آتے تھے۔ مگر ماں سے دو تین چکر ضرور لگ جاتے تھے۔ ہم میں جو چھوٹا ہوتا وہ ماں کے ساتھ جاتا اور جب سے مجھے یاد ہے میری چھوٹی بہن ہی ان کے ساتھ جایا کرتی تھی۔

ان دنوں جب پنجاب تقسیم ہو چکا تھا۔ پنجاب کی پانچوں ندیوں کا پانی زہریلا بن چکا تھا۔ ماں نے پھر پنجاب جانے کا فیصلہ کیا تھا سبھی نے ایسی مخالفت کی کہ ایسا لگا گویا جلتی آگ میں کودنے جا رہی ہوں اور وہ حقیقتاً آگ میں کودنے کی مانند تھا۔ مگر والد صاحب اور ہم تمام یہ جانتے تھے کہ ماں کو اپنے ارادے سے ہلانا کوئی آسان نہیں۔ انھوں نے سب کی باتوں کو ہنس کر ٹال دیا۔ بیس بائیس دنوں میں وہ واپس آگئیں۔ گاؤں کے گھر کا بہت سا سامان وہ بُک کرا آئی تھیں۔ ساتھ میں وہ اپنا پرانا چرخہ اور دہی متھنے کی بڑی متھانی لے آئی تھیں۔

پھر سارے پنجاب میں آگ سی لگ گئی۔ گھر کے گھر گاؤں کے گاؤں اور شہر کے شہر اس آگ میں جلنے لگے، آگ رکی تو لگا، پشاور تک سپاٹ پھیلی ہوئی زمین امرتسر اور لاہور کے درمیان سے پھٹ گئی ہے اور اس پار کا پھٹا ہوا حصہ درمیان میں گہری سی کھائی چھوڑ کر نہ جانے کتنا ادھر کھسک گیا ہے ہم سب بھول سے گئے، کہ اس گہری کھائی کے اس پار ہمارا اپنا گاؤں تھا، پکی سڑک کے کنارے پیچھے کی جانب ایک نہر تھی۔ اور پاس ہی جہلم ندی آوارہ لڑکی کی طرح اچھلتی کودتی بہتی تھی۔

آج میں ماں کے ساتھ اس کھائی پر سے گذر کر اس دوسرے ملک کی جانب جا رہا تھا جو کل کتنا اپنا تھا اور آج کتنا پرایا ہے ؟

میں ایک کتاب کے صفحات الٹ رہا تھا ماں نے پوچھا "یہ گاڑی سرائی اسٹیشن پر رکے گی ؟"

میں نے کچھ سوچا پھر کہا " ہاں شاید رکے۔ لیکن پہنچے گی رات کے دو بجے ہم لوگ گہری نیند سو رہے ہوں گے۔ اسٹیشن کب آکر نکل جائے گا پتہ بھی نہیں لگے گا۔ اور اب اپنا رکھا ہی کیا ہے وہاں ؟"

ماں کے چہرے پر کھسیاہٹ سی دوڑ گئی۔ بولیں "تمہارے لئے پہلے ہی وہاں کیا رکھا تھا ؟"

میری بات سے ماں کو چوٹ پہنچی تھی اور کچھ بولے بغیر میں سر جھکائے اپنی کتاب میں کھو گیا۔

دھیرے دھیرے اندھیرا چھانے لگا۔ ماں نے پوٹلی کھول کر کھانے کے لئے کچھ نکالا۔ میرے ایک دور کے ماموں جان بھی ساتھ تھے۔ تینوں نے مل کر کھایا۔ اور سونے کی تیاری کرنے لگے۔ ماموں جان تو دس منٹ میں خراٹے

بھر سو گئے۔ میں بھی ایک طرف لڑھک گیا۔ ماں ویسی ہی بیٹھی رہی۔

کچھ دیر بعد یکایک میری آنکھ کھلی تو دیکھا ماں ویسی ہی باہر پھیلے ہوئے اندھیرے کی طرف دیکھتی ہوئی بیٹھی ہیں۔ گھڑی دیکھی ساڑھے دس بج رہے تھے میں نے کہا " ماں تم بھی لیٹ جاؤ نا "۔

" اچھا " ان کے منہ سے نکلا اور وہ نیم دراز سی ہو گئیں۔ میں نے کچی نیند کی حالت میں کوئی خواب دیکھا ہو ایسا تو مجھے یاد نہیں آتا لیکن اس نیند میں بھی کچھ گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ کوئی لال سی چیز مجھے اپنے چاروں طرف پھیلتی محسوس ہوتی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا اس لال سی چیز پر میرے پیر پھچ پھچ پڑ رہے ہیں۔ پھر اچانک ہڑبڑا اٹھا۔ ماں مجھے جھنجھوڑ رہی تھیں۔ عجیب سی گھبراہٹ سے ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

" کیا ہے ؟ "

میں نے باہر جھانک کر دیکھا، ہماری گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ پلیٹ فارم پر لیمپ پوسٹوں کی ہلکی ہلکی روشنی تھی اور عجیب اضطراب وہاں چھایا ہوا تھا۔ اچانک میری روح کانپ اٹھی۔ انتیس سال پہلے کے بہت سے سنے سنائے حادثات بجلی بن کر کوند گئے۔ جب فسادیوں نے کتنی گاڑیوں کو جہاں تہاں روک کر لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالا تھا۔ ماموں بھی جاگ کر میرا کندھا ہلا رہے تھے۔

" ارے کیا بات ہے ؟ "

تبھی میرے کانوں میں آواز پڑی۔ اس بھیڑ میں کوئی چلا رہا تھا " اے اس گاڑی میں کوئی سرائی کا ہے ؟ "

" یہ کون سا اسٹیشن ہے " میں نے ماں سے پوچھا

ماں نے کہا " سرائی ..... اپنے گاؤں کا اسٹیشن "

باہر سے پھر آواز آئی " اے اس گاڑی میں کوئی سرائی کا ہے ! "

میں نے ماں کی جانب دیکھا۔ ان کے چہرے پر مایوسی تھی۔

میں نے ان سے پوچھا " کیا بات ہے ؟ "

میں نے کھڑکی سے گردن نکالی بہت سے لوگ گھومتے گھومتے پکار رہے تھے۔ " اے کوئی سرائی کا ہے ؟ "

نزدیک سے جاتے ہوئے ایک آدمی کو بلا کر میں نے پوچھا " کیا بات ہے جی ؟ آپ میں کوئی اس گاؤں کا ہے ؟ "

" ہاں ! ہم ہیں اس گاؤں کے ! ... ماں آگے نکل کر بولیں۔

" تم سرائی کی ہو " اس آدمی نے زور دے کر پوچھا

" ہاں جی "

ماں کے اتنا کہتے ہی اسٹیشن کے چاروں جانب شور مچ گیا۔ ادھر ادھر سے گھومتے ہوئے بہت سے آدمی ہمارے ڈبے کے آگے جمع ہو گئے۔ کسی کی آواز آئی۔ " تم کس کے گھر سے ہو ؟ "

ماں نے میری جانب دیکھا میں نے کہا " میرے والد صاحب کا نام سردار مولا سنگھ ہے یہ میری ماں ہے "۔

" تم مولا سنگھ کے بیٹے ہو ؟ " کئی لوگ ایک ساتھ چلائے " تم مولا سنگھ کی بیوی ہو ..... کھیل سنگھ کی بھابھی ؟ "۔

" کیسے ہیں سب ؟ " کہتے کہتے کئی ہاتھ ہماری جانب بڑھنے لگے۔ لوگ ہمارے رشتہ داروں کی خیریت پوچھتے ہوئے اپنے ہاتھ کی پوٹلیاں مجھے اور ماں کو پکڑاتے جا رہے تھے۔ ان میں بادام، اخروٹ، کشمش وغیرہ سوکھے میوے بندھے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں اور ماں گم سم بنے انھیں لیکر اپنی نشست پر رکھتے جا رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے ہماری برتھ کپڑوں کی چھوٹی چھوٹی پوٹلیوں سے بھر گئی۔

میں سکتہ سا ہو کر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ماں اپنے سر کا کپڑا بار بار سنبھالتی ہوئی ہاتھ جوڑے تھی خوشی سے ان کے ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے منہ سے کچھ بھی نہیں نکل رہا تھا اور لگتا تھا آنکھیں ابھی ٹپک پڑیں گی۔

وہیں پر کھڑے گارڈ نے ہری لالٹین اوپر اٹھائی اور کوٹ کی جیب سے سیٹی نکالی۔ میں نے دیکھا تین چار آدمیوں نے اسے پکڑ سا لیا۔

" اوئے بابو ! دو چار منٹ اور کھڑی رہنے دینا گاڑی کو۔ دیکھتا نہیں یہ بی بی اسی گاؤں کی ہے ..... اور ایک نے اس کا لالٹین والا ہاتھ پکڑ کر نیچے کر دیا۔

بھرجائی سردار جی کیسے ہیں ؟ انھیں کیوں نہیں لائی پنجے صاحب کی زیارت کرانے ؛ ایک بوڑھے مسلمان نے پوچھا۔

ماں نے دونوں ہاتھوں سے سر کا کپڑا اور آگے کر لیا، ان کے منہ سے دھیرے سے نکلا۔ " سردار جی نہیں رہے ..... "

" کیا ... ؟ مولا سنگھ گذر گئے کیا ہوا ان کو ؟ "

ماں چپ رہی میں نے جواب دیا " ان کے پیٹ میں رسولی ہو گئی تھی ایک دن اچانک پھوٹ گئی اور دوسرے دن گذر گئے "

" اوہ ! بڑے نیک بندے تھے، خدا انھیں جنت عطا فرمائے "

ان میں سے ایک نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا، کچھ لمحے کے لئے سب میں خموشی طاری ہو گئی۔

" بھرجائی تیرے بچے کیسے ہیں ؟ "

" واہے گرو کی کرپا ہے سب اچھے ہیں۔ ماں نے دھیرے سے کہا

" اللہ ان کی عمر دراز کرے " کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں۔

" بھرجائی تم اپنے بچوں کو لیکر آجاؤ " کسی نے کہا اور کتنوں نے دہرایا " بھرجائی تم لوگ واپس آجاؤ ..... واپس آجاؤ "

پلیٹ فارم پر کھڑی کتنی آوازیں کہہ رہی تھیں

" واپس آجاؤ "

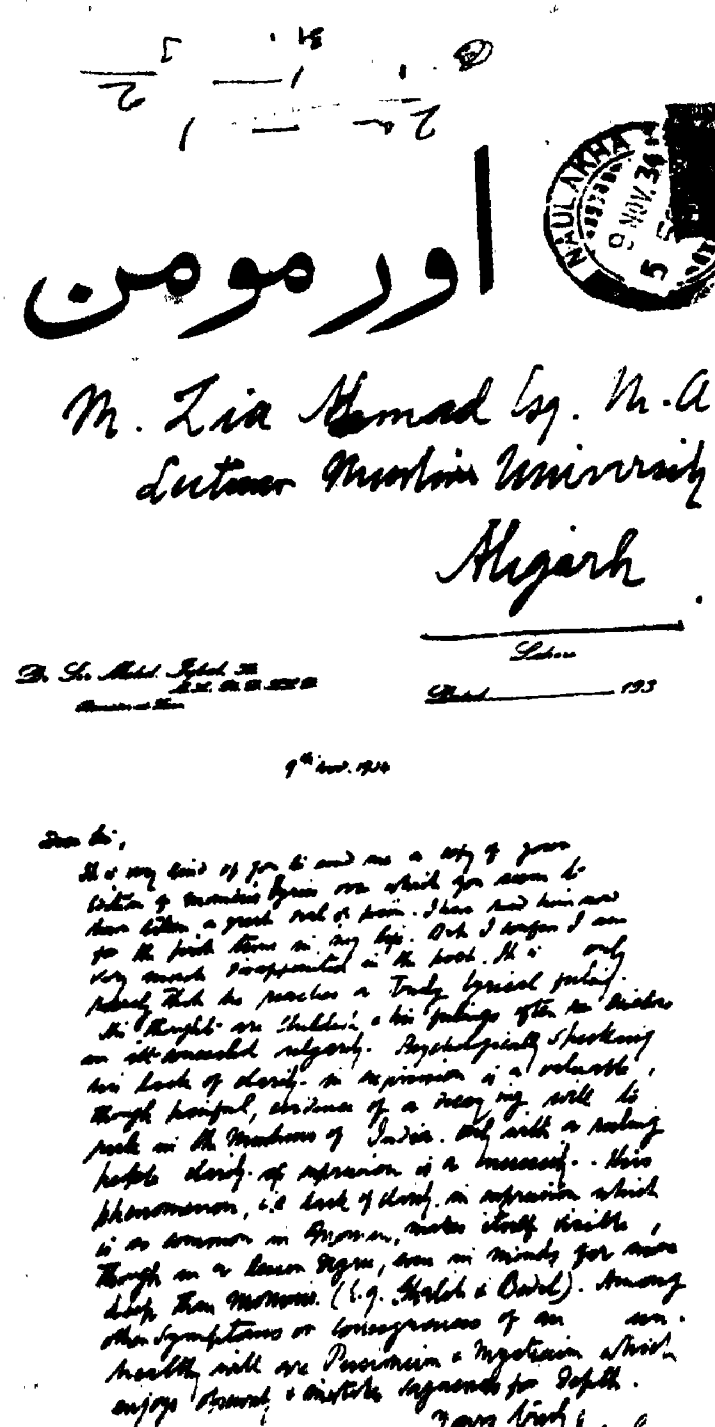
" واپس آجاؤ "

میں نے سنا میرے پیچھے کھڑے ماموں کراہتے ہوئے کہہ رہے تھے

(بقیہ صفحہ ۴۳ پر)

ظہیر احمد صدیقی
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

اقبال اور مومن



علامہ اقبال کے خط کا ترجمہ

جناب من!

آپ کی نوازش ہے کہ آپ نے اپنی مرتبہ "غزلیات مومن" کا ایک نسخہ مجھے ارسال فرمایا جس کی تدوین و ترتیب میں آپ نے بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔ میں نے مومن کو اپنی زندگی میں پہلی بار پڑھا ہے اور مجھے افسوس ہے کہ ان کی شاعری سے مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ شاذ و نادر ہی وہ تغزل کے کسی حقیقی جذبہ تک پہنچ سکے ہیں۔ ان کے خیالات طفلانہ ہیں اور وہ اپنے جذبات کے سوقیانہ پن کو چھپانے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں وضاحت کی کمی سے نفسیاتی طور پر اس افسوسناک امر کی شہادت ملتی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا جذبۂ حکمرانی انحطاط پذیر ہو چکا تھا، گو یہ ابہام اس لحاظ سے قابلِ قدر بھی ہے کہ وہ اِس رجحان پر روشنی ڈالتا ہے۔ بیان کی وضاحت حکمران قوم کا خاصہ اور لازمہ ہوتا ہے۔ یہ کیفیت یعنی وضاحت کی کمی جو مومن کے یہاں اس قدر عام ہے۔ قدرے کم حد تک مومن سے کہیں زیادہ عمیق ذہنوں مثلاً غالب و بیدل میں بھی نظر آتی ہے۔ اس مریض ذہنیت کی دیگر علامات یا نتائج میں قنوطیت اور تصوف بھی شامل ہیں۔ جو ابہام سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور عدمِ وضاحت سے گمراہ ہو کر اسے معنویت کا درجہ دیتے ہیں۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال

علامہ اقبال کا یہ خط ۹ نومبر ۱۹۳۴ء کو پروفیسر ضیا احمد بدایونی مدظلہ کے نام روانہ کیا گیا جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ قبلہ مرحوم نے اپنا مرتبہ دیوانِ مومن' علامہ کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کے بارے میں ان کی رائے بھی دریافت کی ہو۔ جس کے جواب میں علامہ نے مومن کی شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کتاب کی تدوین اور مؤلف کے مقدمہ کے بارے میں اقبال اس خط میں خاموش نظر آتے ہیں البتہ یہ بات صاف ہے کہ قبلہ نے اس خط کی اشاعت کو شاید اس لیے پسند نہیں کیا کہ کہیں مومن کی حیثیت پر حرف نہ آ جائے اور وہ ذہن جو علامہ اقبال کے پرستار ہیں کہیں مومن کی شاعری کے منکر نہ ہو جائیں۔

مومن سے پہلی مرتبہ متعارف ہونے کا اعتراف اقبال نے اپنے اس خط میں کیا ہے البتہ انھوں نے مومن کے بارے میں جو رائے قائم کی اور جن الفاظ میں کی وہ ایسے ناقدانہ ذہن رکھنے والے شاعر کے شایانِ شان نہیں ہے۔ مومن کی شاعرانہ بصارت یا بصیرت کے بارے میں جو بھی رائے قائم کریں اس کا حق انھیں حاصل تھا۔ لیکن اُردو کے بڑے شاعر اور داغ کے شاگرد یا معتقد کی حیثیت سے ان کے لیے مناسب تھا کہ وہ اُردو کے ان "انحطاط پذیر" اور "زوال آمادہ" رجحانات کا بھی ذکر فرماتے۔ جنھوں نے مومن کو مقبولیت بخشی۔

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

مومن کی شاعری کے بارے میں اقبال نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اقبال کی شاعری کا یہ وہ زمانہ ہے جب وہ ذہنی طور پر اپنے مقصدی اور اصلاحی مشن کی تکمیل کے قریب تھے۔ بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کے خیالات ان کے دل و دماغ پر حاوی ہو چکے تھے کہ اچانک ان کے سامنے ایک تغزل پسند شاعر کا دیوان آجاتا ہے۔ مجموعی طور پر وہ مومن سے ناواقف تھے جس کا اعتراف اس خط میں اس طرح کرتے ہیں کہ میں نے مومن کو اپنی زندگی میں پہلی بار پڑھا اس لیے کہہ سکتے ہیں:

"شاذ و نادر ہی وہ تغزل کے کسی حقیقی جذبہ تک پہنچ سکے ہیں۔ ان کے خیالات طفلانہ ہیں، وہ اپنے جذبات کے سوقیانہ پن کو چھپانے میں ناکام نظر آتے ہیں"

تعجب ہے کہ غالب تو مومن کی نفسیاتی بصیرت اور حقیقی جذبہ سے متاثر ہو کر اس کے ایک شعر پر اپنا دیوان نچھاور کرنے کو تیار رہے اور اقبال کو تغزل کا حقیقی جذبہ بھی نظر نہیں آتا۔ اگر ان کی مراد حقیقی جذبہ سے کسی سماجی، سیاسی یا مذہبی عقیدے کی تبلیغ کرنا ہے تو یہ تنقید کا غلط اصول ہے اور وہ نقاد جو کسی تعصب (خواہ سماجی ہو یا مذہبی، انفرادی ہو یا اجتماعی) سے کسی کلام کا جائزہ لیتا ہے تو وہ منصب نقد سے گر جاتا ہے۔ ناقد کا فرض ہے کہ شاعر کے محاسن اور عیوب پر غیر جانبدارانہ نظر ڈالے۔ محاسن کی تشریح پیش کرے اور عیوب پر ہمدردانہ روشنی ڈالے اگر معیارِ فکر وہ قائم کیا جائے جو خود اقبال کا تھا تو سوال یہ ہے کتنے شعرا کے نام اس فہرست سے خارج کرنے پڑیں گے۔

اقبال کا یہ کہنا ہے کہ مومن شاذ ہی تغزل کے حقیقی جذبے تک پہنچے ہیں حقیقت سے انحراف ہے۔ مومن کی شاعری میں جو سب سے بڑی قوت ہے وہ عشق اور تغزل کے جذبات ہی ہیں۔ اور ناقدین اس پر متفق ہیں کہ تغزل میں وہ اپنے ہمعصروں سے ممتاز ہیں۔ یہاں اقبال سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ جذباتِ تغزل کا مخصوص معیار لے کر مومن کی شاعری کو جانچتے ہیں اور اس کے خلاف فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جذباتِ محبت ہر شاعر کے کلام میں اس کی شخصیت اور انفرادیت کے سانچے میں ڈھل کر ظاہر ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہر شخص کا رنگ جداگانہ ہوتا ہے۔ غالب سے میر کے لب و لہجہ کی تلاش اور میر کے یہاں سودا کا انداز پایا جانا ممکن نہیں۔ اسی طرح مومن کا تغزل بھی ایک مخصوص انفرادیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے جذبات خلوص سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ صرف جذباتِ محبت میں اپنی ذہانت کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ جیسے غالب کے یہاں محبوب سے تخاطب کا انداز سپاہیا ہے اسی طرح مومن کے تخاطب میں ان کی ذہنی برتری اور پیچیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔ بعض لوگ ان کے اس اندازِ بیان سے اُلجھ کر اُن کے جذبات کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکے۔

مومن کے کلام پر اعتراضات کی فہرست خاصی طویل ہے مگر یہ بات آج تک کسی نے نہیں کہی کہ ان کے خیالات طفلانہ ہیں۔ یہ اعتراض بھی دراصل اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے یعنی وہ خیالات اور تصورات جو نہایت خلوص دل سے اقبال نے شاعری کے لیے قائم کیے تھے۔ مومن کے کلام میں ان کو نہ دیکھ کر مایوسی ہوئی مگر مومن پر اس تنقید کو ان کے نظامِ فکر میں کوئی خاص جگہ نہیں دی جاسکتی۔ اس کی مثال اقبال کی وہ تنقید ہے جو انھوں نے حافظ پر کی ہے۔ تعلیم گوسفندی کے طنز کے شدید وار کے باوجود حافظ کی عظمت پر حرف نہیں آتا۔ لطف یہ ہے کہ فانی کو اقبال کو شاعر ماننے میں تامل تھا وہ ان کو ناظم کہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اقبال نے صرف ایک شعر کہا ہے اور اس شعر پر فانی سر دُھنتے تھے:

چناں پیش حریم او کشیدم نالۂ دردے
کہ دادم محرماں را لذت سوزِ جدائی ہا

پھر یہ بات بھی صاف نہیں کہ انھوں نے مومن کے کلام کو طفلانہ کس بنیاد پر کہا ہے۔ اگر یہ مراد ہے کہ مومن کی شاعری میں انسان کے فطری اور بنیادی جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور اس میں خارجی ملمع نہیں ہے تو یہ کوئی نقص نہیں ہے بلکہ یہ خصوصیت تو ان کو فطری شاعری سے قریب تر کر دیتی ہے۔ اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ مومن کا پیرایہ اظہار ناپختہ اور حُسن سے عاری ہے تو یہ اعتراض خلاف حقیقت ہے اس لیے کہ مومن اپنے سادہ جذبات محبت کو بھی عقل اور ذہن کی پُرکاری کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جس طرح وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں وہ کسی اوسط درجہ کے ذہن کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ اس کے سمجھنے کے لیے بھی پختگی اور تجربہ کی ضرورت ہے۔

انھوں نے مومن کی کوتاہیِ بیان کو ہندوستانی مسلمانوں کے عہدِ حکمرانی کے انحطاط سے ملایا ہے۔ یہ سارا مضمون یہاں غیر مؤثر ہونے کے ساتھ بے محل بھی ہے اپنے اشعار میں اقبال اس کی وضاحت زیادہ سلیقہ سے کر جاتے ہیں:

نہ فقر کے لیے موزوں نہ سلطنت کے لیے
وہ قوم جس نے گنوائی متاعِ تیموری

اقبال کے اس ریمارک پر بھی تعجب ہے کہ مومن سوقیانہ پن کے چھپانے

میں بھی ناکام رہے ہیں۔ مگر اس کے برخلاف وہ داغ کی شاعری کے رطب اللسان نظر آتے ہیں جب کہ اس فیصلہ میں دو رائیں نہیں ہیں کہ مومن کی شاعری کا درجہ داغ کی شاعری سے کہیں بلند ہے۔ اقبال کا یہ کہنا کہ مومن قادر البیان نہیں شاید اس امر کا اظہار ہے کہ شارح نے اپنی کامیاب شرح میں اس کے یہاں جو کمالات بیان کیے ہیں وہ صرف جوشِ عقیدت پر مبنی ہیں۔ تخلیقی صلاحیت کے فقدان سے اگر مراد یہ ہے کہ مومن اس سے یکسر محروم تھے تو یہ حقائق سے چشم پوشی ہوگی اور اگر اس کو درست مان بھی لیا جائے تو بھی اقبال کو الفاظ کے انتخاب میں احتیاط کی ضرورت تھی۔ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ مومن کے حالاتِ زندگی نے اور ان کی مقابلتاً مختصر عمر نے ان کے ادبی ارتقا کو محدود اور ناکافی بنا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ کیٹس KEATS اگر طویل عمر پاتا تو شکسپیر کا ہمسر ہوتا۔ اگر بات کو اس طرح کہا جائے تو کیا شکسپیر کے معتقدین ان دو شاعروں کے تقابل کو گستاخی سے تعبیر کریں گے۔

ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ اقبال مومن کی شاعری پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ سوقیانہ پن کو چھپانے میں ناکام رہے ہیں۔ دوسری جگہ ان کو وضاحت کی کمی کا مجرم بھی ٹھہراتے ہیں۔ ان دونوں الزاموں پر نظر ڈالی جائے تو ایک چھپا ہوا تضاد نمایاں ہے۔ سوقیانہ پن سے اقبال کی مراد جذبہ کی عریانیت سے ہے تو یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شاعری ایک تہذیبی عمل ہونے کی بنا پر جذبہ کے عریاں اظہار کی روادار نہیں ہو سکتی اور نہ یہ عریاں اظہار شاعرانہ حسن کا حامل ہوگا۔ اسی لیے شاعری میں تشبیہات استعارات اور اشاروں کنایوں سے کام لیا جاتا ہے اور انہی سے شعری حُسن پیدا ہوتا ہے۔ مومن وضاحت کی کمی سے یہی کام لیتے ہیں۔ اپنے ذہنی عمل سے یہ باریکیاں اور چیستانی انداز پیدا کرتے ہیں جن سے پڑھنے والا لطف اندوز ہوتا ہے اور وقتی طور پر جذبہ کی عریانیت یا سوقیانہ پن سے بچ جاتا ہے۔ پڑھنے والا چیستاں کو حل کرنے اور شاعر کی ذہانت سے لطف اور تسکین محسوس کرتا ہے۔ مومن کے یہاں کشش اور جاذبیت کا یہی راز ہے۔

اقبال نے یہ کلیہ پیش کیا ہے کہ بیان کی وضاحت حکمراں قوم کا خاصہ ہے تو اس میں کچھ حد تک صداقت ضرور ہے مگر اس قسم کے کلیے موجودہ سائنسی مذاق کے منافی ہیں۔ یہ کہہ دینا کہ غلامی کے دور میں انسان کا ذہن اس طرح عمل کرتا ہے اور فلاں شخص یا فلاں شاعر غلامی کے دور کا شاعر ہے اس لیے اس کے یہاں بھی اسی طرح کا عمل نظر آئے گا، درست نہیں ہے پھر کلیے میں مستثنیات بھی ہوتے ہیں اور زیرِ بحث شاعر مستثنیات میں آتا ہے۔ اقبال نے مومن کی شاعری کو مسلمانوں کے جذبۂ حکمرانی کے انحطاط کا ثبوت خیال کیا ہے لیکن ہمارے خیال میں مومن کے یہاں غالب اور دوسرے شعرا کے مقابلہ میں یہ ثبوت کم درجہ میں پایا جاتا ہے اس لیے کہ مومن کی شخصیت میں نفسیاتِ غلامی اور دورِ انحطاط کے وہ شواہد نظر نہیں آتے جو دوسرے شعرا کے یہاں ہیں۔ مثلاً اس دور کی سب سے بڑی تحریکِ آزادی سے وابستگی غیر مقلد ہونا، خانوادۂ عزیزیہ سے تعلق، ریاکاری کا وجود نہ ہونا، جرأت اور بے باکی، آستانۂ شاہی سے بے نیازی یہ سب سیرت اور شخصیت کے گوشے بتا رہے ہیں کہ یہ سب زوال آمادہ ذہنی انحطاط کی نشانیاں نہیں ہیں۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اقبال تصوّف اور قنوطیت کو قوموں کی زندگی میں سب سے زیادہ زہر قاتل خیال کرتے تھے۔ اور مومن کی شاعری میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔

اقبال، مومن کو غالب اور بیدل کے مقابلے میں کم عمیق ذہن والا سمجھتے ہیں۔ یہ بھی ان کی مومن سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ جن لوگوں نے مومن کی سوانح کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ مومن ریاضی، طب، ہیئت، رمل، جفر، نجوم، موسیقی کے عالم تھے۔ شطرنج کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ ذہنی قوت اور استدلال کے اعتبار سے اپنے ہمعصروں میں کسی سے کم نہ تھے۔ اقبال کو غلط فہمی اس وجہ سے ہوئی کہ وہ مومن کے کمالات سے واقف نہیں تھے اور جب ان کی شاعری کو روایتی فلسفہ اور تصوّف سے خالی پاتے ہیں تو ان کو کم عمیق ذہن کا حامل خیال کرتے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مومن کی طبیعت کی یک رنگی اور خلوص کسی ریاکاری کی متحمل نہیں۔ اور ان کا معیار شاعری ان کی زندگی کا ترجمان ہے۔

جو لوگ غالب کے معتقد ہیں انھیں یہ دیکھ کر کوفت ہوتی ہے کہ ذوق یا مومن جیسے شاعر کو غالب کے ساتھ جگہ ملتی ہے کیا یہ ضروری ہے کہ غالب کی عظمت اسی وقت تسلیم کی جائے جب مومن اور ذوق کو کمتر شاعر ثابت کر دیا جائے۔ بہرحال اس سلسلہ میں اعتدال کی رائے یہ ہے:

(الف) اُردو شاعری کے نجی پیمانوں سے غالب اور اس کے یہ معاصر ساتھ ہی ساتھ جگہ پاتے ہیں۔

(ب) لیکن اُردو شاعری کو جو بین الاقوامی کمالات میسّر آئے ان کی مثال صرف غالب کے یہاں ملتی ہے۔ مومن یا ذوق کو اس سے کوئی نسبت نہیں۔

(ج) اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس "زوال آمادہ" دور میں اپنے عہد کے سماجی کرب و بلا کا جو احساس مومن کے یہاں ہے وہ غالب اور ذوق کے یہاں نہیں ملتا۔

جہاں تک غالب پر کوتاہیِ بیان کے الزام کا تعلق ہے تو اس کا ہم کو جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خود غالب سے اس کا جواب سُن لیجیے:

رُخ کشودند و لبِ ہرزہ سرایم بستند
دل ربودند و دو چشمِ نگرانم دادند

چودھری رام سیوک
وزیر مملکت برائے صحت اور کنبہ بندی، حکومت ہند

ہریجنوں کی فلاح وبہبود

نئی منزل نئے نشانے

اب وہ وقت آگیا ہے کہ تمام اچھے اور روشن خیال شہری اور سماجی مصلح اتحاد قائم رکھنے کی مشترک نظریے کے ساتھ سماجی برائیوں کو دور کرنے کے کام میں لگ جائیں اور ملک سے چھوت چھات پسماندگی، تعصبات اور دیگر سماجی برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ ملک کے مقتدر دانشوروں کو آگے بڑھ کر ان برائیوں کو دور کرنا چاہیے۔ ہمارے عوام کو متوازن غذا، مناسب کپڑا، مناسب مکان، تعلیم کی سہولتیں ملنی چاہئیں۔ اس کے ساتھ ہی ہریجنوں اور پسماندہ طبقات کی بہبود پر توجہ دینی چاہیے۔ پوری دنیا اس بات کی گواہ ہے کہ جب کبھی بھی سماجی برائیوں کے خلاف صف آرا ہونا پڑا ہے تو قربانی اتحاد، جوش و خروش اور مشترکہ مقصد کو بنیاد بنا کر ہی آگے بڑھا جا سکا ہے۔

ملک سے چھوت چھات کی لعنت ختم کر دی گئی۔ گرچہ کہیں کہیں یہ پھر بھی پائی جاتی ہے۔ مگر اس جرم کے مرتکب افراد کو سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ غریبی ہٹانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ مخصوص مفادات کو ختم کرنے کے لیے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

ہمارے رہنماؤں اور سماجی مصلحوں نے ہر قدم آئین کے مطابق اٹھایا ہے اور ہر وہ قدم اٹھایا ہے جس سے ہریجنوں کو فائدہ پہنچے۔ بھارت میں پچھلے ۲۵ برسوں میں جو کچھ ہوا ہے وہ بھارت کی تاریخ میں گزشتہ ۲۵۰۰ برسوں میں نہیں ہو سکا ہے۔ ہریجن اب سرکار میں اور دیگر اداروں میں اعلیٰ ترین مقام حاصل کیے ہوئے ہیں۔ مگر کچھ لوگ ذہنی امراض کے باعث ابھی تک چھوت چھات میں یقین رکھتے ہیں حالانکہ سرکاری احکامات کی یہ صریح خلاف ورزی ہے۔ ملک کے بہت سے حصوں سے ایسی شکایات ملتی رہی ہیں کہ جہاں ہریجنوں کو اس لیے نقصان اٹھانا پڑتا ہے کیونکہ وہ ہریجن ہیں۔ ہریجنوں کو چاہیے کہ وہ اس طرح کے معاملات سرکار کے نوٹس میں لائیں۔ سرکار مجرموں کو قرار واقعی سزا دے گی۔ البتہ ہمیں سماجی اصلاح کے پہلو کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے مہاتما گاندھی کے الفاظ میں ہمیں گناہ سے نفرت کرنی چاہیے نہ کہ گناہ کرنے والے سے۔ ہمیں ذہنوں کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے دلوں میں تبدیلی آنی ضروری ہے لیکن اس کی تکمیل کے لیے وقت درکار ہے۔

اس وقت ملک میں انتظامیہ کے ذمہ دار، دانشور، ماہر عمرانیات اور سماجی کارکن ہریجنوں کی حالت بہتر بنانے کے طریقوں پر غور کر رہے ہیں۔ سوامی دیانند سرسوتی نے بھی ہریجنوں کے کاز کی حمایت کی۔ ڈاکٹر امبیدکر نے ان کی حالت بہتر بنانے کے لیے ہر ممکن تدبیر کی۔ مہاتما گاندھی نے اس کام کو نئی سمت عطا کی۔ وہ ہریجنوں کی طرح رہتے تھے۔ ان کی طرح ہی کپڑے پہنتے تھے اور کم سے کم کھانا کھاتے تھے۔ وہ غریبوں، کوڑھیوں اور نام نہاد اچھوتوں کی خدمت میں لطف محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے سادہ زندگی کو ایک بلند مقام عطا کیا۔ وہ بھنگی کالونی میں رہا کرتے تھے اگرچہ بھارت کے اس فقیر نے قصر بکنگھم کو فخر بخشا اور یہ خبر دنیا کے تمام اخبارات میں شاہ سرخی بنی۔ جب انھوں نے وفات پائی تو اقوام متحدہ کے دفتر پر دنیا کے تمام ملکوں کے جھنڈے سرنگوں کر دیے گئے۔ جب ان کے جسم میں گولی لگی تو رام کا نام ان کی زبان پر آخری بار آیا۔ وہ خود کو بھارت میں ہریجن اول کہنے میں فخر محسوس کرتے۔ وہ خود سنڈاس صاف کر دیتے اور اس طرح انھوں نے عوامی خدمت کو عظمت بخشی۔ جب بھارت کے اس اولین ہریجن نے وفات پائی تو ان کا قاتل بھی ان کی ارتھی کے عظیم اجتماع کو دیکھ کر آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکا۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کہا ہے کہ ہر ممکن طریقے سے چھوت چھات کے بدنما داغ کو دھو دیا جائے۔ ۲۰ نکاتی اقتصادی پروگرام کے تحت انھوں نے بنیادی نوعیت کی اصلاحات آراضی کو عملی جامہ پہنایا ہے اور جبریہ محنت (بندھوا مزدوری) کا طریقہ ختم کیا ہے۔ قرضوں سے نجات دلائی ہے۔ غریبوں سے قرضوں کی وصولی پر روک لگا دی گئی ہے۔ زرعی مزدوروں کی کم سے کم اجرتوں کو مقرر کر دیا گیا ہے۔ خالی زمین کی ملکیت کی بالائی حد مقرر کر دی گئی ہے۔ بنکوں سے قرضوں کی سہولت دی گئی ہے نیز دیہی علاقوں میں ترقی پر خاص زور دیا جا رہا ہے۔ ہمیں وزیر اعظم کے اس اقتصادی پروگرام کو کامیاب بنانے کی ہر ممکن کوشش کرنی ہے۔ ہریجنوں کو محض اپنے مطالبات ہی پیش نہیں کرنے چاہئیں بلکہ انھیں اپنے فرض کی ادائیگی کی طرف دھیان دینا ہے ہریجن ہمیشہ سماج کے رحم و کرم پر زندگی نہیں گزار سکتے۔ ہریجنوں کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ان کا مستقبل تابناک ہے۔

ہمیں ایک ایسی تاریخ مقرر کر دینی چاہیے جب کہ بھنگی کے نظام کا خاتمہ ہو جائے۔ یہ ۱۹۸۱ء یا ۱۹۸۵ء کوئی بھی سال ہو سکتا ہے۔ تاہم اس کے حصول کے لیے ایک واضح پروگرام وضع کرنا ہوگا۔ قومی بنیاد پر مضبوط کوآپریٹو سوسائٹی بن جانی چاہیے۔ جو جدید قسم کے صفائی کے برتن تیار کرے۔ ہر قصبے اور ہر شہر میں زمین دوز نالیوں کے ذریعے گندگی کا بہاؤ ہونا چاہیے۔ اس عمل سے ہی

(بقیہ صفحہ ۴۷ پر)

شاذ تمکنت
۱۷۲ معظم پورہ، حیدرآباد

آدھی رات، پورا چاند

بھلا یہ کون دستک دے رہا ہے

یہ آدھی رات، پورا چاند، آنگن
رم آہو مری عمر گریزاں
یہ زخم آگہی یہ شورش جاں
یہ وجدانِ نظر، ادراکِ گلشن
میں شبنم سے شرر کو چھو رہا ہوں
یہ لمحوں کی کشیدہ مئے، یہ بوندیں
زباں کی نوک سے یوں چو رہا ہوں
رگوں میں چاندنی سے گھل رہی ہے
مجھے خود اپنی آہٹ رل رہی ہے

بھلا یہ کون دستک دے رہا ہے

نظارے رفتہ رفتہ کھل رہے ہیں
فضا ہم راز ہوتی جا رہی ہے
کہیں اب آسماں جھکنے لگا ہے
زمیں کافر سہی ایماں لا رہی ہے
لگن اُوسر نہیں ہے، بیج بوئیں
کوئی مستقبلِ شاداب کاٹیں
سنو فصلِ شعور اب پک چلی ہے
چلو تعبیر لائیں خواب کاٹیں
مجھے امکاں کی پہنائی ملی ہے
صدا دیتی ہیں سیاروں کی نبضیں
خلاؤں کی مسیحائی ملی ہے

بھلا یہ کون دستک دے رہا ہے
کوئی غم، کوئی ماضی، کوئی افسوں
کسی بے جسم سائے کی صدا ہے
زوالِ عمر ہے یا موت! کیا ہے
کوئی کہہ دے کہ میں گھر پر نہیں ہوں

آج کل نئی دہلی

محمود ایاز
۲۸۳ کیولری روڈ، بنگلور

دُعا

جلالِ شامِ ابد، اے جمالِ صبحِ ظہور
ترے ہی پرتوِ روشن سے مہر و ماہ میں نور
تجھی کو ڈھونڈنے نکلا تھا شوقِ آوارہ
تجھی پہ ختم ہوئی آرزوئے نظارہ
ترے ہی جلوؤں سے روشن چراغِ خانہ ہے
حریمِ دل کو ترا آئینہ بنایا ہے
میں پیچ و تابِ خرد سے نکل چکا پھر بھی
جنوں کے ہاتھ سے دل کی گرہ نہیں کھلتی
خدنگ جستہ ہوں میرا ہدف نہیں ملتا
گہر کی آب ہوں لیکن صدف نہیں ملتا
مری نوا کو شرف دے فلک مقامی کا
مری دعا کو ملے اِذن ہم کلامی کا

★

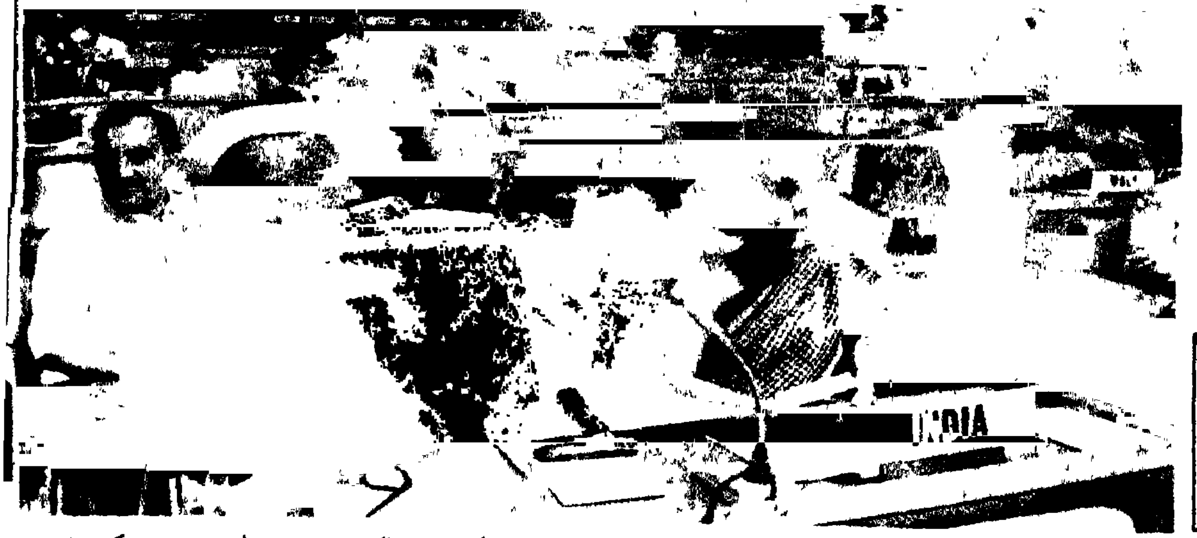
رام کرشن مضطر
روزنامہ "ملاپ" نئی دہلی

عرفانِ محبّت

ہر برگِ گلِ تازہ میں رقصاں ہے محبت
روحِ چمن و جانِ بہاراں ہے محبت
دنیا کے ہر انسان کا ایماں ہے محبت
سب کے لیے اک شمع فروزاں ہے محبت
ایثار کے ہر باب کا عنواں ہے محبت
دیباچۂ تاریخِ شہیداں ہے محبت
پرتو ہیں محبت کے شب و روز جہاں کے
مانندِ مہ و مہرِ درخشاں ہے محبت
دنیا کی ہر اک شے پہ محبت کا ہے قبضہ
یہ کس نے کہا بے سروساماں ہے محبت
قائم ہے محبت ہی سے یہ نظمِ جہاں بھی
شیرازۂ عالم کی نگہباں ہے محبت
ہر بیکس و مظلوم کو سینے سے لگا لو
ہر بیکس و مظلوم کا ارماں ہے محبت
ہر قافلۂ زیست کی ہے رہبر و ہادی
ہر راہ میں قندیلِ فروزاں ہے محبت
کیا غم عصبیت ہے اگر صحرا بہ صحرا
اے دوست! گلستاں بہ گلستاں ہے محبت
ہر گام ہے جو بادِ مخالف کے مقابل
وہ ہمتِ اربابِ چراغاں ہے محبت
ہر زہر کا تریاق ہے ہر غم کا مداوا
دُنیا ہے اگر درد تو درماں ہے محبت
گہ مستی و آشفتگیِ شیفتگاں ہے
گہ شوخیِ چشمانِ غزالاں ہے محبت

مضطر مرا دل سازِ حیاتِ ابدی ہے
ہر تارِ رگِ جاں پہ غزل خواں ہے محبت

ناوابستہ ممالک کی پانچویں چوٹی کانفرنس



احتشام قریشی
ٹائمز آف انڈیا
نئی دہلی

ہندوستانی وفد کی قائد شریمتی اندرا گاندھی وزیر خارجہ شری وائی۔ بی۔ چوان اور ان کے پیچھے وزیر اعظم کے خصوصی سفیر محمد یونس

ان دنوں کولمبو شہر دلہن کی طرح سجا ہوا ہے۔ ہر طرف رونق ہے خلاف معمول چہل پہل بھی۔ سڑکیں، بازار اور ہوائی اڈہ خاص طور پر مہمانوں کے استقبال کا اعلان کرتے ہیں۔ اور مہمان بھی کوئی معمولی شخص نہیں۔ مختلف ممالک کے سربراہ اور وزرائے اعظم کا اجتماع ہے۔ ایک دو نہیں۔ بہتیرے خصوصی مہمان ایسے ہیں جن کی سلامی کے لئے توپیں داغی جاتی ہیں۔ اور موقع بھی تو اسی قدر اہم ہے نا وابستہ ممالک کے سربراہوں کی چوٹی کانفرنس ہے جس میں ایشیا، افریقہ، یورپ اور لاطینی امریکہ کے لگ بھگ ۸۶ ممالک شریک ہیں۔ خود کولمبو کے لئے یہ ایک تاریخی کانفرنس ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ایشیا کے کسی ملک میں ناوابستہ ممالک کی چوٹی کانفرنس ہو۔ آج سے پندرہ سال پہلے جب ناوابستگی کی تحریک کا جنم ہوا تو جواہر لال نہرو، جمال عبدالناصر اور مارشل ٹیٹو نے پہلی چوٹی کانفرنس کیلئے یوگوسلاویہ کی راجدھانی بلگریڈ کو منتخب کیا تھا۔ یہی تین ہستیاں اس نئی تحریک کی بانی تھیں اور انھیں داد دیجئے کہ انہوں نے برسوں پہلے دنیائے سیاست کا مزاج تاڑ لیا تھا اور اسباب کا اندازہ لگایا تھا کہ سیاسی افق پر کیا کیا تبدیلیاں ظہور میں آئیں گی اور اس نئے اور بدلتے دور میں ایشیا اور افریقہ کے عوام کا کیا نیا رول اور کیا اہمیت ہوگی؟

آج سے بیس سال پہلے یہ تصور ناممکن تھا کہ بڑی طاقتوں کے بیچ چھوٹے، غریب اور فوجی اعتبار سے کمزور ممالک کی آواز بھی کوئی معنی رکھے گی۔ اس وقت کا تو دستور ہی یہ تھا کہ چند بڑی طاقتیں تھیں جنہوں نے اپنے آپ کو باقی دنیا کا نگراں اور سرپرست بنا رکھا تھا۔ دو ہی طرح کے ملک تھے۔ حلیف یا حریف کوئی ملک ایک کا ساتھی اور معاون تو لازمی طور پر دوسرے کا مخالف یا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ دنیا دو کیمپوں میں بٹی ہوئی تھی۔ بیشتر ممالک مالی اعتبار سے اپنے کیمپ کے لیڈر ملک کے دست نگر تھے۔ چھوٹے اور غریب ممالک بڑی طاقتوں کے فوجی اڈے بنے ہوئے تھے جہاں نہ صرف جنگی ساز سامان دوسرے ملک کا ہوتا بلکہ غیر ملکی فوجی افسران اور ماہرین بھی مقیم رہتے۔ دونوں حریف طاقتوں کے بیچ سرد جنگ کا بازار گرم رہتا اور جو ملک اپنے کیمپ کی بڑی طاقت کی جسقدر حمایت اور وفا شعاری کرتا اتنا ہی اسکو مالا مال کیا جاتا۔ یہ احسانات ایک سیاسی مقصد کے تحت ہوتے تھے اور بڑی طاقتوں کا واحد منشا اپنے حلقہ، اثر و اقتدار کو وسیع کرنا تھا۔ کچھ ایسی بیچارگی کا عالم تھا کہ اکثر ممالک نام کو تو آزاد اور خود مختار تھے لیکن ان کی اپنی کوئی خارجہ پالیسی نہیں تھی۔ ہر معاملہ میں دوسروں کی طرف دیکھتے اور جیسا اشارہ مل جائے ویسا ہی رویہ اختیار کرتے۔

لیکن آج بڑی طاقتوں کا یہ طلسم کافی حد تک ٹوٹ چکا ہے۔ دنیا کے ممالک کی دو بلاکوں میں تقسیم فرسودہ خیال بن کر رہ گئی ہے۔ شہنشاہیت، آمریت اور خداداد صلاحیت اور حق کے نام پر دوسروں پر حکمرانی ماضی کی داستان بن گئی۔ کل جو خواب تھا وہ آج حقیقت بن کر سامنے آگیا۔ ایشیا اور افریقہ کے غلام اور پسماندہ عوام نے کروٹ لی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک ایک کر کے طوق غلامی اتار پھینکنے لگے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی نے سامراجی نظام کے خاتمہ کی رفتار اور تیز کر دی۔ اب ایشیا آزاد ہے۔ جو ممالک سیاسی طور پر خود مختار ہیں لیکن ابھی تک کسی طاقتور ملک سے وابستہ ہیں تو وہاں کے عوام بھی اب اس بات کو ناپسند کرنے لگے ہیں۔ قدیمی سامراج کے نشان مٹ رہے ہیں۔

ادھر افریقہ کے ممالک برابر آزاد ہو رہے ہیں۔ کہیں حالات سے

مجبور ہوکر سامراجی طاقت عزت سے رخصت ہو رہی ہے اور کہیں عوام کی بڑھتی ہوئی بیداری انگولا کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ سامراجی طاقتوں کے خلاف نبرد آزمائی اسی عزم کی مظہر ہے۔ کل کا "کالا" آدمی آج گوری جلد والے کے ساتھ بیٹھ کر برابری کی بات کرتا ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ جنوبی افریقہ اور روڈیشیا میں بھی سامراج کو منہ کی کھانی پڑے گی۔ اور لاطینی امریکہ کے ممالک بھی دوسروں کے سیاسی چنگل سے نکل رہے ہیں اور قومی حمیت اجاگر ہو رہی ہے۔ اب وہاں Munroe Doctrine کا نام لینے والا نہیں۔

اس طرح ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے آزاد ممالک کی ایک نئی طاقت ابھر کر آئی ہے۔ یہ ایک دوسرے کے دکھ درد کو خوب پہچانتے ہیں۔ ان کے درمیان اشتراک و تعاون کی ایک مضبوط قدر مشترک ہے اور سب ہی اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ آپسی اتحاد و تعاون کے ذریعہ ہی عوام خوشحال ہو سکتے ہیں۔ اس خواب کو پورا کرنے کے لئے جو تحریک ہے اسی کا نام ناوابستگی ہے۔ ان ممالک کو ہی اب تیسری دنیا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ نام تو مناسب نہیں لیکن اس سے پتہ لگتا ہے کہ دنیا کے ایوانوں میں اب ان ممالک کی آواز بھی کوئی اہمیت رکھتی ہے اور ان کی مجموعی طاقت اپنا لوہا منوانے لگی ہے۔ ان ممالک کو سیاسی وقار حاصل کرنے میں عرب ممالک سے بھی مدد ملی جو ناوابستہ گروپ میں ہیں اور جن کی سرزمین پیٹرولیم کے روپ میں سونا اگلتی ہے۔

ناوابستہ تحریک کو گذشتہ پندرہ سال میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اول تو خود نو آزاد ممالک کے دلوں میں شبہہ تھا کہ کسی بھی فوجی اور سیاسی بلاک سے الگ رہ کر آخر کس طرح ان کا وجود قایم رہ سکے گا اور بڑے و مال دار ممالک کی سخاوت کے بغیر رہ سکیں گے۔ اسی وجہ سے جب بلگریڈ میں پہلی کانفرنس ۱۹۶۱ء میں ہوئی تھی تو مشکل سے ۳۰، ۲۵ ممالک اس وقت ناوابستگی کی پالیسی اپنانے پر آمادہ ہوئے تھے۔ پھر بڑی طاقتوں کی مذمت اور دھمکیاں بھی سہنی پڑیں۔ ایک زمانہ تھا کہ اس آزادی کو "بد ترین بد اخلاقی اور گنہگاری" سمجھا گیا تھا۔ بات بھی ایسی ہی تھی! آخر کوئی محسن، اور وہ بھی سیاسی محسن، یہ بات کیسے آسانی سے برداشت کر لیتا کہ اتنے سارے ممالک یکچند "لیڈروں کے" "بہکاوے" میں آکر خود داری کی بات کہنے لگیں۔ ایشیا اور افریقہ کے ممالک میں پھوٹ ڈالنے کے لئے نت نئے جتن کئے گئے۔ مگر اس کے باوجود ناوابستہ ملکوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

آخر ناوابستہ پالیسی کا مطلب کیا ہے؟ اور اس میں کون سا ایسا جادو ہے کہ آزاد ممالک کا یہ حلقہ برابر بڑھتا جا رہا ہے۔ آخر اس کا کیا راز ہے کہ سامراجی طاقتوں کی نامہربانی کے باوجود یہ تحریک نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس نے ایک مقام پا لیا ہے، ایسا مقام جہاں اب اسکو للکارنا بیکار و بے سود ہے۔ اس نظریہ کے پانچ بنیادی ستون ہیں۔ ان کی اصل اور روح یہ ہے کہ نہ کوئی ملک بڑا ہے نہ چھوٹا، سب برابر ہیں اور ہر ملک دوسرے کو برابر گردانے گا یعنی ایک دوسرے کی آزادی، خودمختاری اور سالمیت کا احترام کرے گا۔ اس سے ایک قدم آگے یہ کہ سیاسی اور معاشی معاملات میں ایک دوسرے سے تعاون کرے گا۔ ساتھ ساتھ کسی کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا۔ دوستی کو مستحکم کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ناوابستہ ممالک اپنے قومی وقار کی خاطر اپنی پالیسی آزادانہ طور پر متعین کریں گے اور ان تمام باتوں کی مخالفت کریں گے جن میں سے جنگ اور کشیدگی کے امکانات پیدا ہوتے ہیں نیز علاقائی اور عالمی امن کے استحکام کی خاطر مشترکہ تعاون کریں گے۔



ناوابستہ ممالک کی پانچویں چوٹی کانفرنس —— یہ کانفرنس پہلی بار ایک ایشیائی ملک سری لنکا کی راجدھانی کولمبو میں منعقد ہوئی (تصویر میں) ہندوستانی وفد کی قائد وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی سری لنکا کی وزیراعظم شریمتی سری ماوو بنڈار نائیکے کے ساتھ

★ ★

دنیا کا رنگ ہی اس طرح کا تھا کہ سیاست زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھی۔ اسی وجہ سے بڑی مدت تک ناوابستہ گروپ کے ممالک بھی آپسی رشتہ کو مستحکم کرنے کے لئے بین الاقوامی سیاست میں اشتراک و تعاون پر ہی توجہ مرکوز کئے رہے۔ اس سے فائدہ بھی ہوا۔ اقوام متحدہ کے مختلف ایوانوں اور شعبوں میں اس گروپ کی بات مانی جانے لگی اور اب ایشیا اور افریقہ کو نظر انداز کر کے ان کی قسمتوں کے فیصلے کرنا ناممکن ہے۔ اس سیاسی رشتہ کی مضبوطی ہی نے ناوابستہ ممالک کے درمیان دوستی اور باہمی تعاون کی جڑوں کو مستحکم کیا اور اب سیاسی تعاون سے آگے بڑھ کر معاشی اور تکنیکی تعاون کے پلان بن رہے ہیں۔

کولمبو کانفرنس کی اصل اہمیت یہی ہے کہ ناوابستہ ممالک کے سربراہ اور دیگر ارباب اختیار کے سامنے معاشی تعاون کے مسئلے کو اہمیت حاصل رہی۔ اِسکی ابتدا لیما کانفرنس میں ہوئی جب ناوابستہ ممالک نے متفقہ طور پر معاشی تعاون کا بنیادی خاکہ منظور کیا۔ اس کانفرنس میں ہندوستانی وزیر خارجہ شری وائی۔بی۔چوان نے ایک بروقت انتباہ دیا تھا کہ "اگر ہم ایک دوسرے کی مالی اور تکنیکی مدد نہیں کرینگے تو پھر ہم کیسے مالدار قوموں سے مدد یا تعاون کی امید کر سکتے ہیں"۔ اس کانفرنس میں بیشتر ممالک نے اس بات پر زور دیا تھا کہ ناوابستہ گروپ کے ترقی یافتہ ممالک کا یہ فرض ہے کہ وہ مقابلتاً کم ترقی یافتہ دوستوں کی مالی مدد کریں۔ چنانچہ لیما کانفرنس میں اتفاق رائے سے یہ بھی طے پایا تھا کہ ناوابستہ ممالک کے معاشی اشتراک و تعاون کی طرف ٹھوس قدم یہ ہو کہ اس میدان میں تعاون کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ مالدار ممالک اسکیموں اور منصوبوں کے لئے سرمایہ فراہم کریں اور تکنیکی طور پر ترقی یافتہ ممالک ماہرین مُہیا کریں اور ان ممالک کا ہاتھ بٹائیں جو ابھی کم ترقی یافتہ ہیں۔ افریقہ کے ممالک تو خاص طور پر قدرتی ذخائر سے بھرے پڑے ہیں۔ دھرتی کے سینہ میں چھپے اس خزانہ سے فائدہ اٹھانے کی یہ ایک اچھی صورت ہے۔

اسی طرح کولمبو کانفرنس کے ایجنڈہ میں اہم بات یہ بھی ہے کہ ناوابستہ ممالک سائنسی تحقیقات کے میدان میں بھی اشتراک و تعاون کے جذبہ سے کام لیں اور اپنی معلومات کا ایک دوسرے سے تبادلہ کریں۔ آج کی دنیا میں سائنسی معاملات میں ترقی و تحقیق ہی تمام تر ترقی کی کنجی ہے۔

ناوابستہ ممالک کے رشتوں کو مضبوط کرنے کے لئے اشتراک و تعاون کی ایک اور راہ نکلی ہے۔ حال ہی میں دہلی میں ان ممالک کے وزرائے اطلاعات کی کانفرنس ہوئی تھی جس میں چھ دن کی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ ان ممالک کی خبر رساں ایجنسیوں کا ایک مشترک ادارہ (پول) قایم کیا جائے۔ اِس پول کا ایک سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ان ممالک کو ایک دوسرے کے حالات اور معاملات کی صحیح جانکاری حاصل ہوگی ——— کہ ممالک کس طرح معاشی ترقی و خوشحالی کی جدوجہد میں مصروف ہیں، کس طرح ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں، کس کس عنوان سے عالمی امن کے استحکام کو فروغ دے رہے ہیں تاکہ انکی ترقی اور خوشحالی کے منصوبے پورے ہو سکیں۔ اس پول کے قیام کی ایک دین اور بھی ہوگی۔ آج بھی متعدد افریقی ممالک جدوجہد آزادی میں جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ ناوابستہ ممالک ان کی اخلاقی اور دیگر مدد کرنا لازمی سمجھتے ہیں۔ یہ جب ہی ممکن ہے جبکہ ان بہادر قوموں پر جو بیت رہی ہے اس کا صحیح علم ہو سکے۔

ایسا طرح جو کارواں پندرہ سال پہلے صرف اس محدود مقصد سے چلا تھا کہ ہمسفر ممالک ایک دوسرے کے ساتھ امن و دوستی سے رہیں اور ایک دوسرے کے اختلافات کو برداشت کریں، آج ان کا مقصد وسیع تر اور مثبت ہے۔ ان کے تعلقات بقائے باہم کی منزل سے بڑھ کر اشتراک و تعاون تک آ پہنچے ہیں۔ سیاسی طور پر بھی وہ یہ چاہتے ہیں کہ بڑی طاقتوں کے درمیان جو کشیدگی اور تناؤ کی بجائے مفاہمت کی فضا ہے ناوابستہ ممالک بھی اسکی برکتوں سے فیض یاب ہوں بڑی طاقتیں اب ایشیا اور افریقہ کو اپنے فوجی اڈے اور سیاسی اکھاڑے نہ بنائیں۔ یہ دو براعظم امن و سلامتی کا گہوارا رہیں۔ بڑی طاقتوں کی کشمکش کم کرنا اور ہو سکے تو ان میں صلح و سمجھوتہ کرانا۔

کولمبو کانفرنس کی شروعات کچھ مسائل سے ہوئی ہے سب سے بڑا مشکل اور پیچیدہ سوال تھا نئے ممبروں کا داخلہ۔ ناوابستہ گروپ کی بڑھتی ہوئی سیاسی اور معاشی اہمیت کے پیش نظر اب ان ملکوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے جو باقاعدہ اس گروپ کے ممبر بننا چاہتے ہیں۔ یہ بات ناوابستہ ممالک کے لئے قابل اطمینان اور فخر ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ چند ایسے ممالک بھی ناوابستہ گروپ میں آنا چاہتے ہیں جو بظاہر اسکے حقدار نہیں۔ ناوابستہ ممالک نے بلگریڈ میں اتفاق رائے سے یہ طے کیا تھا کہ اگر کوئی ملک کسی فوجی بلاک میں شامل ہے (مثلاً NATO, CENTO, WARSAW PACT.) تو وہ ناوابستہ پالیسی کو اختیار نہیں کرتا اور اس طرح وہ اس گروپ کا ممبر نہیں بن سکتا۔ ہندوستان اور چند ممبر ممالک کا رویہ آج بھی یہی ہے۔ لیکن بعض ممبر ممالک اس معاملہ میں لچک اور نرمی کے حق میں تھے۔ اگر ایک طرف سعودی عرب اور اس کے ہم خیال ممالک یہ چاہتے تھے کہ پاکستان کو کم از کم مشاہد یا مہمان کی حیثیت سے ہی ناوابستہ ممالک کی کانفرنس میں شرکت کا موقع دے دیا جائے تو دوسری طرف الجزائر اور چند ممالک اس بات کے حق میں تھے کہ رومانیہ اور شمالی کوریا پوری طرح ناوابستہ ممالک کی پالیسی کے حامی ہیں لہٰذا ان کو اس گروپ کی شمولیت سے محروم نہ رکھا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی کشمکش اور آزمائش کا سوال تھا۔ اور اگر ذرا سی بھی غیر دانشمندی کا دخل ہوتا تو اسی ایک سوال پر ناوابستہ ممالک کے درمیان زبردست پھوٹ پڑ جاتی اور پوری تحریک کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کا خطرہ پیدا ہو جاتا۔ لیکن صبر و ہوشمندی نے ساتھ دیا اور گتھی اس طرح سلجھ گئی کہ رومانیہ کو تو مہمان کی حیثیت سے اس گروپ میں داخلہ مل گیا۔ لیکن پاکستان کو اس کا مستحق نہ سمجھا گیا۔ ناوابستہ ممالک کے آپسی تعلقات کی اصل روح یہ ہے کہ اگر کوئی ملک کسی مسئلہ پر اختلاف بھی محسوس کرتا ہے تو

باہمی اتحاد کی خاطر اسکو برداشت کرے اور اکثریت کی رائے مان لے۔ ہندوستان حالانکہ اس معاملہ میں بلکہ اصول کا حامی ہے لیکن بقول وزیر داخلہ شری چوان، ہندوستان نے اس امید پر رومانیہ کی شرکت کو تسلیم کرلیا ہے کہ شاید اب رومانیہ رفتہ رفتہ فوجی بلاک سے علیحدگی اور قطعی ناوابستہ پالیسی کو اپنانے کی کوشش کرے گا۔

ناوابستہ ممالک کے سربراہوں نے کچھ ٹھوس فیصلے بھی کیے جو اس تحریک کو ایک نیا رخ دیں گے۔ کانفرنس کے اختتام پر جو اعلانیہ جاری کیا گیا اس سے چند باتوں کا صاف اندازہ ہوتا ہے۔ اول تو یہ کہ ۸۶ ممالک نے ایک آواز ہوکر سامراجیت کے خلاف ایک بار پھر آواز بلند کی اور مطالبہ کیا کہ نام نہاد بڑی طاقتیں اپنی فوجی اور سیاسی ریشہ دوانیوں سے باز رہیں۔ جہاں جہاں ان کے فوجی اڈے ہیں ان کو ختم کریں۔ ڈیگو گارشیہ کے بحری اڈے کو بھی ختم کیا جائے۔ اس مطالبہ کے پیچھے ایک بنیادی بات یہ ہے کہ ناوابستہ ممالک اب اپنی سیاسی اہمیت کو اچھی طرح پہچانتے ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ سیاسی اور فوجی معاملات میں ان کو خود ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور کسی طرح کی مداخلت یا ان کے امن وسکون کو درہم برہم کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ چنانچہ سربراہ کانفرنس نے واضح طور پر یہ مطالبہ بھی کیا کہ بحرِ ہند اور دیگر سمندری علاقوں کو امن کا علاقہ یا خطہ تسلیم کیا جائے ساتھ ہی ساحلی ممالک سے بھی یہ اپیل کی کہ وہ بڑی طاقتوں کے دام میں نہ پھنسیں اور اس مغالطہ میں نہ رہیں کہ ان کا تحفظ بڑی طاقتوں کی فوجی ضمانت یا ان سمندری علاقوں میں ان کے قوی ہیکل بحری بیڑوں کی موجودگی پر ہی منحصر ہے۔ اس اعلانیہ میں اسبات پر زور دیا گیا ہے کہ ناوابستہ ممالک، جو مقابلتاً کم ترقی یافتہ ہیں ان کو چین کا سانس لینے کی مہلت درکار ہے اور عالمی امن کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ بڑی طاقتیں اسلحہ بندی اور فوجی اکھاڑ پچھاڑ کی پالیسی سے گریز کریں۔ اسی اعلانیہ میں ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ فرانس کو متنبہ کیا گیا کہ اگر اس نے جنوبی افریقہ کے ساتھ نیوکلیائی سودا کیا تو عرب ممالک اس کو پٹرول کی سپلائی بند کردیں گے۔ اس انتباہ کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما ہے کہ اب سامراجی طاقتیں اپنے آپ کو دنیا کا آقا اور مالک سمجھنا چھوڑ دیں، ایشیا اور افریقہ کے عوام کے جذبات کا احترام کرنا سیکھیں۔ یہ ممالک اب مجبور محض نہیں بلکہ سامراجیت کو جواب دینا بھی جانتے ہیں۔

کولمبو کانفرنس کا ایک اور اہم کارنامہ یہ ہوا کہ پہلی بار ان ممالک نے ایک جامع اقتصادی پروگرام مرتب کیا۔ ایک طرف یہ اسبات کا مظہر ہے کہ ناوابستہ ممالک سیاست سے آگے بھی کچھ سوچ رہے ہیں اور باہمی امداد وتعاون کے جذبہ کو فروغ دینے کیلئے ایک نئی ٹھوس راہ پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس اقتصادی پروگرام میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ ناوابستہ ممالک اپنے تجارتی لین دین اور مالی امداد کے پروگراموں کے لئے ایک الگ کرنسی اپنائیں اور اپنا ایک الگ بینک بھی ہو۔ ناوابستہ ممالک میں اگر ایک طرف وہ مالدار ممالک ہیں جن کو قدرت نے پٹرول کے ذخائر سے مالا مال کیا ہے تو دوسری طرف ایسے ممبر بھی ہیں جو اپنے ترقیاتی کاموں کے لئے دوسروں کی مالی امداد پر بھروسہ کرتے ہیں۔ مغربی ممالک کے ہاتھ میں ایک یہ بھی ہتھیار رہا ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے عوام کی غربت سے ناجائز فائدہ اٹھاکر ان کو مالی امداد کی آڑ میں اپنی سیاسی اور فوجی رسہ کشی کی آماجگاہ بنا لیتے ہیں اس استحصال کو ختم کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ مالدار ناوابستہ ممالک اپنی برادری کے غریب ممبروں کی مدد کریں۔ اس ٹھوس سات نکاتی پروگرام نے مغربی ممالک کو بھی حیران کردیا ہے اور اب پہلی بار ان کو یہ محسوس ہوا کہ ناوابستہ ممالک نے جینے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے، ضرورت پڑنے پر وہ انکو دھتکار بھی سکتے ہیں۔ دنیا کے ان نام نہاد ناخداؤں کو اب اپنی اس غلطی کا احساس ہونے لگا ہے۔ جس کی بنا پر وہ ناوابستہ تحریک کا ہمیشہ مذاق اڑاتے تھے اور اس کو محض نشستند و گفتند و برخاستند تصور کرتے تھے۔ آج اس گروپ کا مزاج اور اس کی افادیت اقوام متحدہ کے لئے قابلِ رشک بنتی جا رہی ہے۔

غرض کولمبو کانفرنس نے ناوابستہ ممالک کو ایک نیا عزم، ایک نیا حوصلہ اور ایک وقار بخشا ہے۔ یہ سب دین ہے اس جذبۂ اتحاد اور باہمی تعاون کی جو ہر موڑ پر سربراہوں کے کام آیا۔ آج اس گروپ میں ۸۶ ممالک ہیں جن میں وہ ممالک بھی ہیں جہاں آج بھی شہنشاہیت زندہ ہے، وہ بھی جہاں پارلیمانی طرزِ حکومت ہے اور عوام کی رائے مختارِ کل ہے، وہ ممالک بھی اس کے ممبر ہیں جہاں سونا پٹرول بن کر بہتا ہے اور وہ بھی جہاں بھوک اور افلاس کا بھیانک مسئلہ وبالِ جان بنا ہوا ہے۔ ایک عجیب متضاد گروپ ہے۔ ایسا گروپ جس میں باہمی مسائل بھی ہیں۔ ایک ممبر ملک دوسرے ممبر ملک سے شدید اختلافات رکھتا ہے مثلاً صحارا کا مسئلہ بھی جس پر حال ہی میں دو ناوابستہ ممالک کے درمیان تصادم بھی ہوچکا ہے۔ مصر اور شام بھی اس کے ممبر ہیں۔ بنگلہ دیش جیسے ممالک نے ان باہمی مسائل کو اٹھایا بھی۔ لیکن سربراہان ممالک کے وقار اور سیاسی بصیرت نے پورے ناوابستہ گروپ کے اتحاد اور مضبوطی کو برقرار رکھنا ایک عظیم مقصد تصور کیا۔ اگر اتنے ہی مختلف النوع ممالک کسی اور گروپ میں ہوتے تو شاید وہ آپسی اختلافات کا شکار ہو جاتا۔ کوئی واک آؤٹ ہوتا تو کوئی بائیکاٹ۔ لیکن ناوابستہ ممالک کے سربراہوں کی ہوشمندی کی داد دیجئے کہ کانفرنس کامیاب رہی اور آپسی اتحاد وتعاون مزید مضبوط ہوا۔ بقول شریمتی اندرا گاندھی، کولمبو کانفرنس کا یہی ایک کارنامہ کچھ کم نہیں۔

عبدالمغنی
مواساتی کنج
عالم گنج پٹنہ

فن اور ناقد

فن کی کئی قسمیں ہوتی ہیں جن میں ایک فنِ لطیف ہے، اور فنِ لطیف کی بھی اتنی قسمیں ہوتی ہیں کہ ان کے لئے جمع کا صیغہ، فنونِ لطیفہ استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح تنقید کی بھی اتنی ہی قسمیں ہوتی ہیں جتنی فن کی، اس لئے کہ تنقید فن ہی کی ہوتی ہے۔ لہٰذا جتنا اور جیسا فن آتنی اور ویسی ہی تنقید، چنانچہ جس طرح ہر فن کے تقاضے اور طریقے مختلف ہوتے ہیں اسی طرح اس کی تنقید کے معیار اور مطمحِ نظر بھی مختلف ہوتے ہیں۔

بہرحال فن کوئی بھی ہو اس کے ساتھ تنقید کا تعلق بالکل قریبی اور فطری ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ لیکن اس معاملے میں بڑی بحثیں کی گئیں ہیں کہ فن کے ساتھ ناقد کے تعلق کی نوعیت، حیثیت اور اہمیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں سب سے پہلا اور بنیادی سوال تو یہی ہے کہ کیا فن کے لیے نقد ضروری ہے؟ جو لوگ یہ سوال کرتے ہیں ان کے پیشِ نظر عام طور پر یہ بات ہوتی ہے کہ ناقد فنکار سے الگ اور باہر ایک شخص ہوتا ہے جو خواہ مخواہ فن پر روک ٹوک کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بلا وجہ دخل در معقولات کرتا ہے۔ اس طرح سوچنے والوں کا خیال یہ ہے کہ فن ایک فطری جذبہ ہے جب کہ تنقید ایک مصنوعی پابندی ہے، چنانچہ حقیقی فن ناقد سے بے نیاز ہوتا ہے اور تنقید سے محفوظ رہ کر ہی اس فن کی تازگی اور عمدگی برقرار رہ سکتی ہے۔ فن اور ناقد کے رشتے کے متعلق یہ نقطۂ نظر بالکل غلط ہے اور ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ناقد کی سب سے پہلی قسم وہ ہے جو فن کار کے باہر اور اس سے الگ نہیں، اس کے اندر اور اس کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ ایک ہی شخص بیک وقت فن کار بھی ہوتا ہے اور ناقد بھی، یعنی خود فنکار اپنا ناقد آپ ہوتا ہے اس لئے کہ کوئی اچھی اور بڑی تخلیق تنقید کے عمل سے گزرے بغیر بروئے اظہار نہیں آتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ایک سچے فن کار کا جذبہ بالکل فطری ہوتا ہے اور یہ مان لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ وہبی ہوتا ہے، یعنی کچھ لوگ قدرت کی طرف سے ایک خاص صلاحیت لے کر پیدا ہوتے ہیں، ان کی مزاج میں ایک خاص میلان ہوتا ہے ان کی طبیعت بعض خاص کاموں کے لئے موزوں اور مناسب ہوتی ہے چنانچہ ہمارے سماج میں ایک مشہور مقولہ ہے کہ شاعر تلمیذ رحمان ہے اشعار اس پر الہام کی طرح نازل ہوتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا خدا کا یہ شاگرد اپنی خاص زبان کے قاعدوں اور محاوروں کے خلاف شاعری کر سکتا ہے؛ بلکہ کیا اپنی شاعری کے عروض سے روگردانی کر کے شاعر بن سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ زبان اور عروض کے علاوہ بھی کیا ایک شاعر کے دل میں جو بھی خیال آتا ہے اور جس طرح آتا ہے اس کو وہ اسی طرح شعر میں ڈھال دیتا ہے؟ اس سوال کا جواب بھی نفی ہی میں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک شاعر خواہ وہ کتنا ہی وارفتہ مزاج ہو اپنی زبان اور اس کے ادب کے قواعد، محاورات، استعارات اور تلمیحات سے واقف ہوتا ہے اور شعر گوئی کے وقت ان کو ملحوظ رکھتا ہے۔ پھر وہ اپنے دل میں آنے والی ہر بات کو فوراً شعر نہیں بنا دیتا بلکہ سوچ سمجھ کر کچھ خاص باتوں ہی کا اظہار اپنے کلام میں کرتا ہے اس لئے کہ وہ ایک باشعور مخلوق اور ایک سماج کا بہت ہی مہذب فرد ہوتا ہے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ فن کے ساتھ ہی ساتھ نقد کا عمل بھی فن کار کے ذہن میں رونما ہوتا ہے اور جو بات بھی فن کی کسی ہیئت میں ظاہر کی جاتی ہے کافی غور و فکر اور جانچ پرکھ کے بعد بروئے اظہار ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر بات کے کچھ آداب ہوتے ہیں اور فن کی کچھ روایات ہوتی ہیں۔ کوئی فن کار کتنا ہی منفرد اور اوریجنل ہو ان آداب اور روایات سے بیگانہ ہو کر نہ کوئی معقول اظہار کر سکتا ہے اور نہ اپنا کوئی اعتبار قائم کر سکتا ہے۔ ہر فن کار کا ایک ذہن اور ضمیر ہوتا ہے اور یہی ذہن و ضمیر اسے لامحالہ ناقد بھی بنا دیتا ہے۔ فن میں ذہن و ضمیر کی اس کارفرمائی کو ہم فن کی اندرونی تنقید کہیں گے۔ یہ تنقید کا ایک پوشیدہ عمل ہے؛ جو فن کا جزو ترکیبی ہے اور اس طرح فن میں شامل ہے، اس کا ایک لازمی عنصر اور بنیادی عامل ہے۔

رہی یہ بات کہ بہتیرے شاعروں نے ایسے بیانات دئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فن میں نقد کے قائل نہیں۔ مولانا روم کا مشہور شعر ہے اشعر می گویم بہ از قند و نبات ؛ من ندانم فاعلاتن فاعلاتن فاعلات۔ اسی طرح اقبال نے کہا : مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو ؛ کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی۔ غور کرنے کی بات ہے کہ آخر یہ عظیم فن کار کہنا کیا چاہتے ہیں؟ کیا یہ کہ وہ شاعری میں سرے سے عروض اور معانی و بیان کے اصولوں اور طریقوں کے قائل بلکہ ان سے واقف تک نہیں یا یہ کہ وہ شاعری ان چیزوں کو سامنے رکھ کر اور ان کے پیمانے سے ناپ تول کر نہیں کرتے بلکہ شعر گوئی کے وقت اپنے وجدان پر اعتماد کرتے ہیں؟ پہلی صورت ناممکن ہے؛ مولانا روم اور اقبال دونوں ہی علوم و ادبیات کے ماہر تھے اور انہوں نے اپنے فن پر کافی ریاض کیا تھا لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ دونوں کی شاعری میں وجدان کا عنصر غالب اور نمایاں ہے۔ مولانا روم قند و نبات سے بہتر شعر کہنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اقبال اپنے کلام میں فطرت کے ذریعہ لالۂ حسن کی حنا بندی کا اعلان کرتے ہیں؛ جب کہ رومی فاعلاتن فاعلات کا مذاق اڑاتے ہیں اور اقبال حسنِ معنی میں مشاطگی کی ضرورت سے انکار کرتے ہیں۔ ان دونوں باتوں

کو ملا کر دیکھئے تو واضح ہوگا کہ مذکورہ عظیم فن کار صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ فن میں تصنع اور تکلف نہیں ہونا چاہیے اور یہ کہ شاعری کاریگری کا نام نہیں، اس کے لئے تخلیقی جذبے اور فطری وجدان کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہ جذبہ و وجدان کتنا ہی تخلیقی اور فطری ہو بہرحال اپنے اظہار سے پہلے اسے تنقید اور ریاض کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے ایک اچھے فن کار کا ذہن تربیت یافتہ ہوتا ہے اور تربیت اس کے اندر ایک ملکۂ شعری ایک فنی رسوخ پیدا کر دیتی ہے، جس کے بعد وجدان اور ریاض ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہوتے ہیں کہ تخلیق اور تنقید کا فرق مٹ جاتا ہے، فن کار اور ناقد دونوں ایک ہی شخصیت بن جاتے ہیں۔ اسی حقیقت پر اقبال نے ایک بار اپنے اس بیان میں روشنی ڈالی تھی کہ وہ عروض کی تمام باریکیوں سے واقف ہیں، لیکن شعر گوئی میں اس واقفیت سے کوئی کام نہیں لیتے۔ آخر کیا وجہ تھی کہ ایک مصرع کہنے کے بعد میر بعض وقت دوسرے مصرع کی فکر میں کئی کئی دن گزار دیتے تھے؟ یہ دراصل ایک بڑے فن کار کا بہت ہی بالیدہ تنقیدی شعور تھا جو اسے ایک ایک مصرع کی فکر میں گھنٹوں اور دنوں پریشان رکھتا تھا۔ دیوان مرتب کرنے کے لئے، بہ قول میر، لختِ جگر جمع کرنے پڑتے ہیں۔ فن کار کے لئے دل پرخوں اور خونِ جگر کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ فن کی اتنی کڑی تیاری زبردست تنقیدی حس کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

دوسری قسم کا ناقد وہ ہے جو فن سے باہر اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے عام طور پر ناقد سے مراد یہی خارجی تنقید نگار ہوتا ہے اس قسم کے ناقد کے متعلق بہتیرے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ وہ فن کا طفیلی ہے اس کی اپنی کوئی ہستی نہیں ہوتی اور فن کے ساتھ اس کا رشتہ محض مصنوعی اور زبردستی کا ہے، بلکہ وہ فن کے لیے سراسر مہلک ہے، وہ ایک امر بیل ہے جو فن کے پودے پر اُگ اور اس کا رس چوس کر بالآخر اسے مرجھا دیتی ہے۔ یہ ناقد کے خلاف سب سے انتہاپسندانہ نقطۂ نظر ہے۔ لیکن ناقد کی موافقت میں جو سب سے معتدل نقطۂ نظر ہے وہ بھی ناقد کو فن کے مقابلے میں دوسرے درجے سے زیادہ کوئی حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق تنقید کبھی تخلیق کے برابر نہیں ہو سکتی اور بہرحال فن کی تخلیق پہلے ہوتی ہے تنقید بعد میں آتی ہے، یہاں تک کہ تنقید کا معیار بھی اعلیٰ قسم کی تخلیقات ہی کے نمونوں پر مبنی ہوتا ہے۔ چنانچہ تنقید کا سارا سر و سامان تخلیق کا بخشا ہوا ہے لہٰذا ناقد فن کا پابند ہے فن ناقد کا پابند نہیں اور فن کے لئے ناقد کا کام بس ایک وفادار خدمت گزار کا کام ہے۔

فن اور تنقید کے باہمی رشتے کے متعلق یہ خیالات کچھ نیم صوری سچائیاں ہیں اور کچھ مغالطے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فن کو تنقید کے مقابلے میں ایک زمانی اور تاریخی اولیت حاصل ہے۔ بہرحال فن کی تخلیق پہلے ہوئی اس کے بعد اس کی تنقید کی نوبت آئی اور ضرورت محسوس کی گئی اور یہ بھی صحیح ہے کہ تنقید کا موضوع فن ہے جبکہ فن کا موضوع تنقید نہیں ہے، یعنی شعوری طور سے تنقید فن ہی پر کی جاتی ہے جبکہ فن تنقید کو بالقصد سامنے رکھ کر نہیں تخلیق کیا جاتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ناقد فن کے تابع اور غلام ہے، اگرچہ آج کے محاورے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فن کا خادم ہے، اس معنی میں کہ فن کی جانچ اور پرکھ کر کے وہ اس کی ایک اہم خدمت انجام دیتا ہے۔ اس حقیقت کو ایک عام فہم اور بالکل سامنے کے محاورے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ فن کے ساتھ ناقد کا تعلق ٹھیک ویسا ہی ہے جیسا باغ کے ساتھ مالی کا ہوتا ہے۔ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ باغ کے بغیر مالی کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا لیکن کیا کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ مالی کے بغیر باغ کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے باغ کے معنی و مطلب پر غور کر لینا چاہیے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ باغ درختوں کے اس مجموعے کو کہتے ہیں جس کی باضابطہ دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ اس کے گرد ایک چار دیواری لگائی جاتی ہے، اس میں درختوں کو ایک سلیقے کے ساتھ اُگایا جاتا ہے، پھر ہر پودے کی سینچائی اور ستھرائی کی جاتی ہے، اس کی شاخوں اور ٹہنیوں کو ضرورت کے مطابق کاٹا اور چھانٹا جاتا ہے، پودوں کی جڑوں میں کھاد بھی دی جاتی ہے اور ان کی پتیوں پر دوائیں بھی چھڑکی جاتی ہیں اگر اس طرح درختوں کی حفاظت، صفائی، تراش و خراش، سیرابی اور تربیت و تنظیم نہیں کی جائے تو پھر باغ تو نہیں بن سکے گا، صرف خودرو پودوں کا ایک جنگل کھڑا ہو جائے گا

اس مثال سے واضح ہو جاتا ہے کہ فن کے لئے ناقد کی کیا اہمیت ہے۔ اس مثال کا مزید تجزیہ کرنے سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ ناقد ایک مالی کی طرح باغ فن کی محض رکھوالی نہیں کرتا، بلکہ اس کی پرورش اور آرائش بھی کرتا ہے، اور اس کام کے لئے ظاہر ہے کہ وہ تربیت اور تزئین کا ایک خاص تصور، ایک معیار اور نقشۂ کار رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مالی نے یہ تصور، معیار اور نقشۂ کار درختوں ہی کا مطالعہ کر کے حاصل کیا ہو، لیکن کیا یہ مطالعہ کسی ایک باغ کا پابند ہو سکتا ہے اگر ایسا سمجھا جائے تو پھر اس باغ کی تربیت و تنظیم کیسے ہوگی؟ تب تو ایک باغ میں جو کچھ اور جیسا کچھ ہے بس اسے ہی معیار تسلیم کر کے درختوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا ہوگا۔ لہٰذا ناقد اپنے موضوع فن سے اپنی تنقید نگاری کے لئے جو بھی تصور حاصل کرے، اسے بہرحال اس تصور پر اپنے عام مطالعے کی روشنی میں غور و فکر کرنا پڑے گا۔ ایک باغ نہیں بہت سے باغوں کو سامنے رکھنا ہوگا ایک دو نہیں بہتیرے درختوں کا مطالعہ کرنا ہوگا، درختوں کی فطرت اور خصوصیات کی واقفیت حاصل کرنی ہوگی، خواہ اس کے لئے باغوں سے نکل کر جنگلوں کی بھی خاک کیوں نہ چھاننی پڑے اور درختوں کی دنیا سے نکل کر کارخانوں کا چکر کیوں نہ لگانا پڑے۔ مطلب یہ کہ ناقد کا کام فن کار سے کم مشکل نہیں ہوتا اور تنقید اپنی جگہ فن سے کم اہم نہیں ہوتی۔

اس سلسلے میں بہت ضروری نکتہ یہ ہے کہ ایک چیز فن ہے یا نہیں، اس کی جانچ تو یقیناً خالص فنی معیار اور ہر فن کی مخصوص ہیئت کے اصولوں کے مطابق ہوگی لیکن اگر ایک چیز فن ہے تو کس درجے کا فن ہے، اس کی پرکھ محض فن کے معیار اور ہیئت کے اصولوں کے مطابق نہیں ہوگی بلکہ اس کے لئے ماورائے فن کچھ فکری تصورات اور انسانی اقدار کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ ناقد اپنا یہ اہم ترین فریضہ فن سے ایک قدم آگے بڑھ کر ہی انجام دے سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اسے علوم جدیدہ اور فلسفۂ اخلاق کا مطالعہ کر کے زندگی اور انسانیت کے اعلیٰ ترین اصولوں سے ایک

معیارِ فکر، ایک مطمحِ نظر اخذ کرنا ہوگا، تاکہ وہ اس بلند تر نقطۂ نظر سے ایک فنی عہد کا تجزیہ کرکے اس کی عظمت یا عظمت کے فقدان یا اس سلسلے میں پائی جانے والی کوتاہیوں کی تشریح کر سکے۔ یعنی وہ تشریح ہے جس کے دوران ناقد کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ فن کی تربیت و تنظیم کے لئے ایسے بیش قیمت اور کارآمد خیالات پیش کرے جن سے ایک طرف تو عام قاری کے ذوق کی پرورش اور درستگی کا سامان ہو اور دوسری طرف خود فن کاروں کا شعور زیادہ سے زیادہ بیدار ہو۔ اس طرح اعلیٰ تنقید کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ فن کی ترقی کے لئے ایک مناسب اور مفید فکری فضا پیدا کرے۔

یہی وہ تنقید ہے جس کو تخلیقی تنقید کہا جاسکتا ہے، اس لئے کہ یہ صرف فن کے عناصرِ ترکیبی کا جائزہ نہیں لیتی بلکہ خود فن کو حیات و کائنات کے بلند تر عناصر کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ فن کار کے سامنے فطرت و انسانیت کے اعلیٰ ترین اصول و اقدار رکھتی ہے اور بہتر فن کی تخلیق پر اُبھارتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی تنقید اپنے فنی موضوع کے علاوہ کچھ تخلیقی مقاصد رکھتی ہے اور جس طرح فن زندگی کے خام مواد سے لطیف ہیئتیں تراش کر تزئین کائنات کا سامان کرتا ہے اسی طرح یہ تنقید مواد فن کو انسانیت کی آرائش و زیبائش کے لیے استعمال کرتی ہے یعنی تنقید فن کے ساتھ ایک بلند تر تخلیقی عمل میں شریک ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے فن کا ناقد فن کا تابع اور غلام نہیں ہوتا، اس کا رفیق اور دستگیر ہوتا ہے اور بعض حالات میں رہبر کا کام بھی کرتا ہے۔ بہر حال اس کا یہ مطلب نہیں کہ تنقید فن سے الگ اور اُس کے اُوپر کوئی چیز ہے۔ ناقد تو کسی فن ہی کا ہوتا ہے اور اس کی ہستی فن ہی کے حوالے سے ثابت ہوتی ہے اس طرح فن کے ساتھ ناقد کا تعلق بالکل ناگزیر اور لازمی ہے اور چونکہ وہ عناصرِ فن کے علاوہ تصورات سے بھی کام لیتا ہے اس لئے اسے فن کا پابند بھی نہیں کہا جاسکتا۔ لہٰذا ناقد اور فن کار کے درمیان جو رشتہ ہے وہ برابری اور برادری کا ہے، دونوں ہی ایک شغلِ مشترک میں ایک دوسرے کے معاون ہیں، حیات و کائنات کی تزئین دونوں کا مطمحِ نظر ہے، جس کے لیے ان میں ہر ایک اپنے اپنے طور پر کام کرتا ہے۔

اب دیکھنا چاہیے کہ خارجی ناقد بھی دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو ناقد ہونے کے ساتھ ساتھ فن کار بھی ہوتا ہے، دوسرے وہ جو صرف ناقد ہوتا ہے۔ پہلی قسم کا ناقد اپنے فن پر بھی تنقید کرتا ہے اور دوسروں کے فن پر بھی، اگرچہ اپنے فن کی وہ عموماً صرف تشریح اور وضاحت ہی کر سکتا ہے، اس کے اجزا و عناصر کا تجزیہ کرکے پڑھنے والوں کو اس کے متعلق کچھ ضروری معلومات مہیا کر سکتا ہے تاکہ وہ مطالعے کے دوران تمام حقائق کو سامنے رکھیں اور آسانی سے فن کے معرّات کو سمجھ لیں جب کہ دوسروں کے فن پر وہ اسی طرح تنقید اور اس کے خوبی و خامی کی جانچ کر سکتا ہے جس طرح دوسرے اس کے فن کے متعلق کرتے ہیں۔ لیکن دونوں ہی صورتوں میں فن کار ناقد کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے مخصوص فن کے لئے تنقید کا مفید استعمال کرے، جس معیارِ فن کو اس نے اختیار کیا ہے اس کی وکالت کرے، اپنے فن کی روایات کی وضاحت کرے، بلکہ فن کی پوری تاریخ کی تعبیر اپنے پسندیدہ فنی اصولوں کی روشنی میں کرے، تاکہ فن کی روایات میں اس کی اپنی انفرادیت کا مقام واضح ہو سکے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صفِ اول کا ناقد وہی ہوتا ہے جو فن کار بھی ہو، اس لئے کہ فن کی باریکیوں پر پورا عبور اسی کو ہوتا ہے اور وہی فن کے حقائق اور گہرائیوں سے پورے طور پر آگاہ ہوتا ہے، لہٰذا اس کی ہوئی تنقید ہر جہت سے مکمل اور معتبر ہوتی ہے۔ تھوڑے غور سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ جب ناقد فن کار سے الگ ایک وجود رکھتا ہے اور تنقید کا کام فن سے مختلف ہے تو پھر قدرِ اول کا ناقد ہونے کے لیے فنکاری کی شرط لغو اور مہمل ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ایک فنکار کے لیے اعلیٰ درجے کا ناقد ہونا ہی بہت دشوار ہے اگر تنقید خاص کر ایک معروضی اور غیر شخصی چیز ہے تو کسی فن کار کے لئے اپنے فن کے بارے میں تنقیدی اظہار سخت مشکل بلکہ تقریباً محال ہے وہ اگر فن کاری میں بھی ایک نقطۂ نظر کے مطابق معروضیت پر عمل کرتا ہے، تو داخلی تنقید کے بعد ایک خارجی تنقید کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے فن کا جو نمونہ سوچ سمجھ اور جانچ پرکھ کے بعد ظہور پذیر ہوا ہو اس کی مزید پرکھ خالقِ فن خود بالکل غیر جانب دار ہو کر کیسے کر سکتا ہے۔ اور کیوں کرے گا، سوا اس کے کہ اس کا مقصد اپنی تعریف آپ ہو۔ اس طرح دوسروں کے فن پر بھی اس کی جو تنقید ہوگی اس کا ایک بہت بڑا محرک اپنے عمل کے لئے جواز پیش کرنا ہوگا اور بہر حال یہ تنقید فن کار کے فنی تعصبات ہی کی روشنی میں ہوگی۔ اس قسم کی تنقید کے لئے جو بہتر سے بہتر تعبیر اختیار کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک فن کار اپنے عملی تجربات کے لئے اور انہی پر مبنی کچھ نظریات و تصورات اور منطقی دلائل فراہم کرتا ہے، اور اگر بدترین تعبیر کی جائے تو کہا جائے گا کہ ایسی تنقید بس ایک سیلز مین شپ ہے اپنے مال تجارت کو زیادہ سے زیادہ خوشنما بنا کر فروخت کرنے کے لئے، یعنی یہ ایک خود اشتہاری ہے بہر حال اس سلسلے میں متوازن نقطۂ نظر یہ ہوگا کہ فن کار بھی اسی طرح ایک ناقد ہو سکتا ہے جس طرح غیر فن کار لیکن صرف فن کار ہونے کی وجہ سے تنقید میں اسے دوسروں پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہوگی تنقید میں کسی بھی ناقد کا مرتبہ خالص تنقیدی کارناموں اور کمالات کی بنا پر متعین کیا جائے گا، کسی غیر تنقیدی دائرے کی طرف کوئی نسبت دیئے بغیر

رہا خالص ناقد تو اس کے دو مقاصد ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ پیشِ نظر نمونۂ فن کی ترجمانی اور اس پر تبصرہ کرکے لوگوں کو یا تو اس کی طرف مائل کرکے یا اس کے خلاف متنبہ کرکے، دوسرے یہ کہ چند اصولوں اور قدروں کی روشنی میں نمونۂ فن کی جانچ اور پرکھ کرکے ساتھ ساتھ عام مطالعہ کرنے والوں کو بتائے کہ فن کے علاوہ زندگی کے وسیع تر پس منظر میں نمونۂ فن کی کیا خوبی و خامی ہے۔ اس کی کیا اہمیت اور افادیت ہے اور اسے کس طرح سے بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ مفید و موثر بنایا جاسکتا ہے، فن کار کے سامنے تخلیق کا کیا معیار رہنا چاہیے، قاری کو کس نقطۂ نظر سے تخلیق کا مطالعہ کرنا چاہیے، المختصر فن کے متعلق مجموعی طور پر کیا تصورات ہونے چاہئیں اور فن کار سے کیا توقعات کی جانی چاہئیں اور ان تصورات و توقعات کے لحاظ سے انسانی زندگی اور سماجی تہذیب میں ایک فنی تخلیق کی کیا جگہ بنتی ہے یہ تخلیقی اور اعلیٰ ترین تنقید ہے جو فن کے آخری مسائل سے بحث کرتی ہے۔

بقیہ صفحہ ۳۸ پر

ساحر ہوشیارپوری
۸۸۲۸ نیا محلہ پل بنگش، دہلی ۶

منوّر بستوی
سمریاواں بازار، بستی

نذیر بنارسی
پانڈے حویلی، وارانسی

غزلیں

پھول بکھرے ہیں زمیں پر یہ تماشا کیا ہے
شمِ بینا، یہ حقیقت ہے تو دھوکا کیا ہے

کھائے سوز خم، تو اک پھول تبسّم کا ملا
تم نہ سمجھو گے مرے شوق کی دنیا کیا ہے

ٹ جائے گا یہ احساس کی اک ٹھوکر سے
ٰ مٹی کا گھروندا ہے، تمنّا کیا ہے

کوئی موسم ہو کبھی دل کا کنول کھل نہ سکا
زندگی ! اور ترا مجھ سے تقاضا کیا ہے

ت جوانی کی جو بیتی تو سمجھ میں آیا
ملتے سورج سے چڑھے چاند کا رشتا کیا ہے

چند سانسوں کی مہک، چند خیالات کی ضو
اور ہم اہلِ کرامت کا اثاثہ کیا ہے

لولے میں ہیں سو گوشے سکونِ دل کے
سمندر ہے محبّت کا یہ صحرا کیا ہے

تم اندھیروں میں بھی روشن ہو اُجالوں کی طرح
لاکھ پردوں میں بھی عُریاں ہو، یہ پردا کیا ہے

ُسن خود ہیں کو بتا دے کوئی اتنا ساحر
ہے بگڑنا ہی مقدّر تو سنورنا کیا ہے

بے وفا دہر میں پابندِ وفا ہے کوئی
عشق کی راہ کرے میری طرح طے کوئی

آپ کے حُسن کی تمثیل کہاں سے لاؤں
آپ کے عشق کے مانند نہیں شے کوئی

پے بہ پے دل کے دھڑکنے کی صدا تھی لیکن
اس میں پایا کوئی نغمہ نہ ملی لَے کوئی

شوق سے آپ چھڑا لیجیے دامن اپنا
وادیِ درد میں پھرتا رہے تا کَے کوئی

بیخودی پر بھی جہاں تہمتِ ہشیاری ہے
گم ہے اس انجمنِ نازمیں ہے ہے کوئی

اس جگہ پر ہو مسرّت کا تصوّر کیوں کر
ہو منوّر جہاں غم دینے کے درپے کوئی

گھٹا چھائی فضا مہکی زمیں بھیگی ہوا سن کی
خبر لو چل کے دیوانو ذرا صحرا کے دامن کی
بہاریں رنگ لے آئی ہیں رُت آئی ہے ساون کی
ہوائیں کیوں نہ بدلیں گی فضا بدلی ہے گلشن کی
نسیمِ فصلِ گل سے کم نہیں رفتار مالن کی
قدم کے ساتھ شادابی بڑھی جاتی ہے گلشن کی
جو ہوتی دیر ہر گل پیرہن جلتا نظر آتا
گریباں تک چلی آئی تھی بڑھ کر آگ دامن کی
ہزاروں قسمتوں کی روزیاں ایک ایک دامن میں
نہ کیوں دھجّی اُڑا دی جائے ایسے ایسے دامن کی
وہاں چند آشیانوں کے اُجڑ جانے پہ کیا روئیں
جہاں اک ساتھ پڑتی ہو بِنا لاکھوں نشیمن کی
یہ کس نے سینۂ دشت و جبل میں بجلیاں بھر دیں
یہ کس نے آ کے صدیوں کی شبِ تاریک روشن کی
پسینے نوجواں مزدور کے یوں جگمگاتے ہیں
جوانی مسکرائے جس طرح چوتھی کے دولہن کی
کسان اب اس طرح کرتے ہیں کھیتوں کی نگہبانی
حفاظت کر رہا ہو جیسے دہقاں اپنے خرمن کی
ذرا ہندوستاں کی اب ادائے دلکشی دیکھو
زمانہ آ رہا ہے آرزو میں نے کے درشن کی
اکیلے کی خوشی مجھ کو نہ راس آئی نہ آئے گی
جو ہوگی سب کے من والی وہی ہوگی مرے من کی
بہاروں کو بھی رستہ چاہیے گلشن میں آنے کا
کھلیں اتنے ہی غنچے اب زمیں جتنی ہے گلشن کی

یقیناً اے نذیر اک روز کہتے تم بھی جاگے گے
یہ ہے پیشین گوئی ایک خوش کے برہمن کی

شراب بُری چیز

آپ کو اور
آپ کے کُنبے کو
برباد کر دیتی ہے



ایس ایس چاولہ
۱۴۳ بی ایم آئی جی فلیٹس
کے کے نگر، مدراس
۶۰۰۰۷۸

اپنی چتا

سردار سوہن سنگھ لاہور کے شاہی قلعہ میں سیاسی قیدی تھا۔ ایس پی چودھری منظور قادر نے مجھے بتایا کہ راج کمار تم نئے نئے ڈی۔ایس پی بن کر آئے ہو سو میں یہ کیس خاص طور سے تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ سردار سوہن سنگھ اچھے گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ جوانی کا پہلا قدم ہی اس نے بغاوت اور موت کی راہ پر رکھا ہے۔ ہمیں معتبر ذرائع سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کا تعلق اس انقلابی پارٹی سے ہے جو تشدد کے ذریعہ انگریزی حکومت کا تختہ الٹ دینا چاہتی ہے۔ اور۔ میں نے اس نوجوان کی زبان کھلوانے کے لئے ہر طرح کا تشدد استعمال کر کے دیکھ لیا ہے۔ میں نے اسے گھنٹوں برف کی سلوں پر لیٹنے پر مجبور کیا ہے۔ اس کے جسم کے ہر حصّہ کو ہر طرح کی اذیت دی گئی ہے مگر مجھے تو یہ نوجوان گوشت پوست کا بنا ہوا انسان ہی نہیں لگتا ہے۔ اس کے جسم کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ بدن کے کئی حصوں سے مسلسل خون بہتا رہا ہے۔ مگر اس کے منہ سے نہ تو کوئی فریاد نکلی ہے نہ ہی آنکھ سے ایک قطرہ آنسو۔ بلکہ اس نے اُف تک نہیں کی ہے۔ اور جب میں نے سردار سوہن سنگھ کو پہلی دفعہ چودھری صاحب کے ساتھ جا کر دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا سانس رک گیا ہو۔

ارے یہ تو میرا بچپن کا دوست۔ ساتھی اور یار۔ سوہنا تھا۔ اگر چودھری صاحب پاس نہ ہوتے تو میں ضرور اس سے لپٹ کر ملتا۔ سوہنے نے مجھے وردی میں دیکھا اور ایک بانکی دل فریب مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے گوشوں پر ابھری۔ جس کو اس کے انقلابی جذبے نے فوراً مٹا دیا۔ اس طرح ہم دونوں نے دوستی کی پہچان کو ہی مار دیا۔ بعد میں جب میں نے چودھری صاحب کو تمام حالات سے آگاہ کیا تو انہوں نے مجھے تاکید کی کہ میں پیار اور نرمی سے تمام حالات جاننے کی کوشش کروں۔

اور میں نے بھی اپنے پیار کے۔ دوستی و نرم رویہ کے تمام ہتھیار آزما کے دیکھ لئے۔ مگر سوہنا تو ہمالیہ پہاڑ کی طرح اٹل نکلا۔ وہ بار بار یہی کہتا تھا کہ یہ بات تو سچ ہے کہ تم میرے دوست ہو، یار ہو، بلکہ بھائی ہو مگر اب تم ایک ذمہ دار افسر بھی ہو۔ اور میں حکومت کی نظر میں اس کا دشمن اور باغی ہوں۔ سو ہمارے فرض کا ٹکراؤ ضروری ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہم فرض کے ٹکراؤ کے وقت دوستی کو بھول جائیں۔ مگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہونا چاہتا تھا۔ سو میں برابر زور ڈالتا رہا۔ کہ دیکھو دوست! تم اپنی عمر دیکھو، جوانی کی اُمنگوں کو دیکھو، یہ دن تو تمہارے موج اڑانے، عیش کرنے اور محبوب کی گلیوں میں گھومنے کے ہیں۔ سیاسی کاموں کے لئے تو تمام عمر پڑی ہے۔ اور پھر ان کاموں میں پڑ کر تمہیں فائدہ بھی کیا پہونچے گا؟ اس نے کہا کہ راجے بھائی، یہ دل کی باتیں ہیں اور دل کی باتیں دلیلوں اور وجوہ کو تلاش نہیں کرتی پھرتیں۔ اب تم ہی مجھے بتاؤ کہ رانجھا ہیر پر، مہیوال سوہنی پر اور پنوں سسی پر کیوں مرمٹے تھے؟ کیا یہ تینوں لڑکیاں اپنے وقت کی حسین ترین یا امیر ترین لڑکیاں تھیں؟ میرے دوست۔ یہ زندگی بار بار نہیں ملتی۔ پھر جوانی میں تو سختی جھیلی جا سکتی ہے جو عمر کے کسی دوسرے دور میں ممکن نہیں ہو سکتی۔ ہم سب سختی اور نرمی کر کے ہار گئے۔ مگر سردار سوہن سنگھ ہمالیہ پربت کی طرح اٹل ہی کھڑا رہا تھا۔ پہلے میر تبدیلی ہو گئی اس کے بعد جنگ ختم ہو گئی۔ اور پھر ہندوستان دو ٹکڑوں میں بٹ کر آزاد ہو گیا تھا۔

وقت گزرتا گیا اب میں ڈی آئی جی تھا۔ کالے بالوں میں سفیدی آگئی تھی جسم کچھ فربہ ہو گیا تھا۔ لڑکیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ لڑکے اپنے کاموں میں لگ گئے تھے۔ اور میں چند برسوں بعد ریٹائر ہونے والا تھا۔

ایک دن دفتر میں بیٹھے مجھے ایک جگہ زبردست فساد کی اطلاع ملی، حالات کچھ اس طرح کے بتائے گئے تھے کہ ٹھاکروں، جاٹوں اور برہمنوں کی اکٹھی طاقت کو وہاں کے ایک ڈھابہ نما ہوٹل کے مالک نے للکارا تھا۔ ہوٹل تو سب کے لئے ہوتے ہیں مگر ان لوگوں نے ہوٹل کے مالک کو کہا تھا کہ وہ ہریجنوں کو اپنے ہوٹل میں بالکل نہ گھسنے دے۔ اور خاص طور پر اس وقت جب یہ اونچی ذات کے لوگ کھانا کھا رہے ہوں۔ ہوٹل کے مالک نے جواب دیا اس کے لئے سب گاہک ایک جیسے ہیں اس لئے وہ کسی کو منع نہیں کر سکتا۔ کئی دفعہ بحث و مباحثہ بھی ہوا مگر اس نے کہا کہ مجھے کوئی دھرم گرنتھ ایسا بتاؤ جہاں انسان کو جنم سے نیچا کہا گیا ہو، ہر دھرم انسان کے کرم کو دیکھتا ہے جنم کو نہیں۔ ہمارے اپنے شری گورو گرنتھ صاحب میں تو صاف لکھا ہے کہ سب انسان ایک نور سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے کون اچھا ہے اور کون بُرا ہے؟

جب اونچی ذات والے لوگ بحث میں نہ جیت سکے تو انہوں نے ہوٹل کا بائیکاٹ کرنے کی دھمکی دی۔ اسی دوران کئی لیڈر آئے۔ انہوں نے لمبے چوڑے لکچر دیئے اور چلے گئے مگر وہ اپنی سوچ کا رُخ نہ بدل سکے اور اپنی ضد پہ اڑے رہے۔ ان لوگوں کے جب سب ہتھیار کامیاب نہ ہوئے اور ہوٹل مالک اپنی ضد پہ اڑا رہا تو ان لوگوں نے ہوٹل کو ختم کر دینے کی دھمکی دی۔ اور جب ایک دن اس ہوٹل میں خوب بھیڑ تھی اور بیشتر تعداد ہریجنوں

کی تھی تو انہوں نے کرائے کے غنڈوں کے ذریعہ پٹرول ڈلوا کر ہوٹل کو آگ لگوادی۔ تین انسانی جانیں نفرت اور چھوت چھات ماننے والوں کی وجہ سے ضائع ہوگئیں۔ کئی اور آدمی بُری طرح سے زخمی ہوئے، ہوٹل کے مالک نے اپنی گدی سے اٹھنے سے انکار کر دیا تھا اور آخر اس کے بُری طرح جلے اور جھلسے جسم کو زبردستی گھسیٹ کر باہر نکالا گیا۔ اسی وقت اونچی ذات کے لوگوں اور ان کے کرائے کے غنڈوں نے ہریجنوں کے گھروں پر بھی حملے شروع کر دیئے تھے۔ میں موقع واردات پر پہنچا، وہاں سے فارغ ہو کر میں ہسپتال آیا۔ زخمیوں میں سب سے نازک حالت ہوٹل کے مالک کی تھی۔ اور اس کا جسم سر و چہرہ بہت بری طرح جل گیا تھا میں اسے دیکھ کر پلٹنے ہی لگا تھا کہ ایک انسپکٹر نے مجھے مخاطب کر کے کہا کہ حضور۔ یہ صاحب آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں میں پھر پلٹا۔ بڑی صاف اور ٹھہری آواز میں اس جھلسے چہرے سے آواز ابھری "راجے! اس آخری وقت میں تم بھی مجھ سے دور ہو جاؤ گے؟" میرے دماغ پر ہتھوڑے پڑنے لگے تھے۔ تو کیا اس بُری طرح جھلسے بدن میں میرا یار سوہنا پڑا ہے؟

میں اپنا عہدہ اپنی ڈیوٹی سب کچھ بھول گیا۔ میں نے اس کا جلا جھلسا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور بڑے پیار سے پوچھا۔ سوہنیا! یہ کیا ہو گیا؟ یہ تم نے اپنے آپ کو کیا کر لیا؟

اس نے صاف اور مضبوط آواز میں کہا کہ راجے یہ دل کی باتیں ہیں۔ جو وجہ اور دلائل تلاش نہیں کرتی پھرتیں۔ جوانی میں مجھے وطن کی آزادی سے عشق ہو گیا تھا۔ کیوں؟ مجھے معلوم نہیں۔ ! وطن آزاد ہوا تو میں خوش ہو گیا پھر میں نے یہ دیکھا کہ اس ملک کے لوگ باقی تمام ملکوں کے لوگوں سے بھگتی سب سے زیادہ کرتے ہیں۔ اپنے بھگوان، خدا، واہگرو، یسوع کو خوش کرنے کے لئے کیا کیا نہیں کرتے۔! مگر یہی لوگ خدا کی بنائی ہوئی خلقت کے ایک حصے سے ہمیشہ نفرت کرتے چلے آئے ہیں۔ ایسے نفرت کرنے والے لوگوں کے خلاف میرے جسم کا رواں رواں کانپ اٹھا تھا اور میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ چھوت چھات کو ہٹانے کی پوری کوشش کروں گا۔ اونچی ذات والوں کو میری بات پسند نہ آئی۔ سو انہوں نے وہی کیا جو وہ لوگ صدیوں سے کرتے آ رہے ہیں۔ اب اس کی آواز میں خوشی کی جھلک تھی۔ اس نے کہا راجے! میں نے سوچا کہ ہر شخص کی آرزو ہوتی ہے کہ وہ چار کندھوں پر اپنا آخری سفر اختیار کرے۔ اور میں چار کندھوں کی تمنا کہاں سے لاتا؟ میرا اس دنیا میں یہاں پر کون تھا؟ سو میں نے سوچا کہ سردار سوہن سنگھ اس آخری عمر میں کسی کو کیوں تکلیف دی جائے۔ سو میں خود ہی اپنی چتا پر آپ ہی بیٹھ گیا تھا۔

زیادہ بولنے سے کمزوری بڑھ چکی تھی۔ سوہنے کی نبض جلد جلد ڈوبتی جا رہی تھی۔ اور پھر میرا دوست۔ اپنی زندگی۔ اور وطن اور خدا کی خلقت کی خدمت پوری کر کے واپس اپنے مالک کے چرنوں میں ہمیشہ کے سکھ و چین حاصل کرنے کے لئے چل دیا۔ میں نے حیران نظروں سے پہلے تو اسے دیکھا اور پھر چاپیوں طرف نظر ڈالی۔ اور تب میں نے زندگی کا سب سے عجیب نظارہ دیکھا۔

جن اونچی ذات والوں نے سردار سوہن سنگھ کو مار ڈالنے کی کوشش کی تھی وہ بنجر پہاڑوں کی طرح اس کی موت دیکھ کر بھی ویسے ہی بے جان اور بے حس کھڑے تھے۔ اور انھیں صرف اپنی اونچائی پر ناز تھا۔

اور جن ہریجنوں کے لئے سردار سوہن سنگھ اپنی چتا پر خود ہی بیٹھ گیا تھا اُن کے آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے دور آسمان میں ستارے ٹمٹما رہے ہوں یا کسی بہت ہی قیمتی ہار سے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہوں۔

اور خود سردار سوہن سنگھ کا جلا جھلسا اور بے جان چہرہ اب ایسا لگ رہا تھا جیسے اندھیروں کی ظلمت کو چیر کر سورج نے باہر نکل کر ہر طرف ایک عجیب روشنی پھیلا دی ہو۔

اور میں ایک سنگدل پولیس افسر جو اپنے ماں باپ کی موت پر بھی نہ رویا تھا اب بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا۔

بقیہ ملاحظات

ہے ان کی قوم پرور شاعری نے لاکھوں دلوں کو گرمایا ہے۔ ان کی موت ہندوستان اور بنگلہ دیش دونوں کا نقصان ہے۔

اُردو کے ممتاز شاعر جناب جاں نثار اختر کا ۱۸ اگست ۱۹۷۶ء کو بمبئی میں انتقال ہو گیا۔ ان کی موت بلاشبہ اُردو شاعری کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ ادارہ اس غم میں ان کے پسماندگان کا شریک ہے۔ جاں نثار اختر سے متعلق پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا مضمون اس شمارے میں شامل ہے۔

۱۲ اگست ۱۹۷۶ء کو حیدرآباد میں اردو کے ممتاز شاعر پادری ہینسن ریحانی لکھنوی کا انتقال ہو گیا۔ وہ گذشتہ تین ماہ سے فالج کی وجہ سے سکندرآباد میں زیر علاج تھے۔

ریحانی ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اُردو صحافت و ادب کے ساتھ ساتھ شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ اور وہ اثر لکھنوی کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ ان کا بیشتر کلام غزلیات پر مشتمل تھا۔ اور ان کا ایک مجموعہ "موجِ گل" بھی شائع ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے "ریگ زار" "نوائے ازل" اور "پیغامِ حیات" میں مسیحی شعرا کے تذکرے اور ان کا کلام بھی مرتب کیا تھا۔

ریحانی صاحب مسیحی شعرا کو منظرِ عام پر لانے اور انھیں ادبی حلقوں میں متعارف کرانے میں ہمیشہ کوشاں رہے۔ ان کی موت اُردو کے ایک مخلص کارکن کی موت ہے۔

توحید عالم
شعبہ اُردو و فارسی
آر، ڈی، ایس کالج مظفرپور

فارسی کے ہندو تذکرہ نگار

فارسی زبان سے ہندوؤں کی دلچسپی عہدِ مغلیہ کے ابتدائی دور یعنی عہدِ اکبری ہی سے ظاہر ہونے لگی، انہوں نے فارسی زبان اور ادب کو آہستہ آہستہ پوری طرح اپنا لیا۔ مغل شہنشاہیت کی آخری دو صدیوں میں ہندو فارسی زبان و ادب میں پوری طرح ماہر اور باکمال ہو گئے۔ انہوں نے شعر و شاعری میں بھی دلچسپی لی اور سچ تو یہ ہے کہ آخری دو صدیوں میں بڑے اچھے اچھے ہندو شعرا رونما ہوئے۔ اسی طرح نثری ادب میں بھی ہندوؤں نے بیشمار کتابیں تاریخ، تذکرہ، داستان، لغت اور انشا کے فن میں لکھیں جن میں سے کئی کتابیں مابعد کے عہدوں میں بے حد مقبول ہوئیں۔ اور ان سے مسلسل استفادہ کیا جاتا رہا ہے۔ یہاں پر ان ہندو قلم کاروں کے اور ان کی کتابوں کا تعارف پیش کرنا مقصود ہے جنہوں نے فارسی زبان میں فارسی شاعروں کے تذکرے لکھے۔

کشن چند اخلاص۔ ہندوؤں میں جس باکمال نے سب سے پہلے فارسی شاعروں کا تذکرہ تالیف کیا وہ کشن چند ہیں جن کا تخلص اخلاص ہے۔ اخلاص اچل داس کا لڑکا اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے مشہور و معروف استاد فارسی شاعر عبدالغنی بیگ قبول کا شاگرد تھا وہ ذات کا کھتری یعنی کایستھ تھا اور دہلی کا باشندہ۔ احمد شاہ کے عہدِ حکومت (۱۱۶۱ — ۱۱۶۷ھ) میں اس کی وفات ہوئی۔

اخلاص کے حالاتِ زندگی اس سے زیادہ دستیاب نہیں کہ اس نے فارسی شاعروں کا جو تذکرہ تالیف کیا اس کے نام "ہمیشہ بہار" ہے۔ بلاشبہ فارسی شاعروں کا یہ پہلا تذکرہ ہے جسے ایک ہندو نے مرتب کیا۔ تذکرے کی ترتیب حروفِ تہجی کے اعتبار سے کی گئی ہے اور جہانگیر سے لے کر محمد شاہ کے جلوس (۱۱۳۱-۱۷۱۹) یعنی تقریباً سوا سو سال کے اندر پیدا ہونے والے فارسی شاعروں کا ذکر اس میں ملتا ہے۔ کچھ شعرا ایسے بھی ہیں جن کا تعلق دراصل عہدِ اکبری سے ہے۔ شاعروں کی مجموعی تعداد دو سو ہے۔ اس میں ان شاعروں کے مختصر حالات اور منتخب نمونہ ہائے کلام درج ہیں۔ تذکرہ کی تالیف کا سال ۱۱۳۶ھ — ۱۷۲۳ء ہے۔

"ہمیشہ بہار" کی وقعت اس کی تالیف کے وقت جو بھی رہی ہو لیکن یہ تذکرہ اپنے مابعد یا ہمعصر تذکروں کے مقابلے میں معمولی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں شعرا کے جو حالات دیئے گئے ہیں وہ بہت ہی مختصر اور تشنہ ہیں۔ کلام کے نمونے بھی زیادہ نہیں۔ اکثر معاصر شاعروں کے حالات بھی فراہم نہیں کئے گئے اور صرف شاعروں کے نام گنا دینے اور دو تین اشعار قلم بند کر دینے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

"ہمیشہ بہار" کا صرف ایک قلمی نسخہ ہندوستان میں دستیاب ہے جو کتب خانۂ مشرقیہ بانکی پور پٹنہ میں موجود ہے۔

بندرابن داس خوشگو۔ خوشگو ہندو تذکرہ نگاروں کی فہرست میں اپنے مشہور ترین تذکرہ "سفینۂ خوشگو" کی وجہ سے جگہ پاتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی حیثیت امتیازی ہو جاتی ہے کہ اس کا تذکرہ مابعد کے عہدوں میں بے حد مقبول رہا ہے۔

خوشگو اپنے عہد کا مشہور شاعر اور نثر نگار تھا، حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اس نے اپنے تذکرہ میں خود اپنا ہی ذکر نہیں کیا۔ دوسرے ذرائع سے حاصل شدہ معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ خوشگو کا باپ (نام معلوم نہیں) عالمگیر کے عہد (۱۰۶۸ - ۱۱۱۹ھ) میں شاہی ملازمت سے وابستہ تھا اور اس کا چچا سدانند بے تکلف (متوفی ۱۱۲۹ھ) اعظم شاہ کے حرم قدسیہ جہاں زیب بانو بیگم کی سرکار سے متعلق تھا۔ بے تکلف کا وطن خوشگو نے لکھنوتی (سہارن پور) تحریر کیا ہے۔ اس لئے شبہ ہوتا ہے کہ خوشگو کا بھی یہی وطن ہوگا لیکن خوشگو کے وطن کے بارے میں شفیق اورنگ آبادی نے لکھا ہے کہ اس کا وطن متھرا تھا خود خوشگو بھی بیدل کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتا ہے۔

"دو مرتبہ در متھرا کہ وطن فقیر است دیدہ شد"

لیکن "سفینۂ خوشگو" کے مرتب پروفیسر سید شاہ عطاء الرحمن عطا کاکوی کا خیال ہے کہ خوشگو کا اصل آبائی وطن لکھنوتی (سہارنپور) ہی رہا ہوگا، البتہ بعد میں اس نے متھرا کو وطن بنا لیا ہوگا۔

خوشگو کی ولادت کا سال معلوم نہیں، البتہ اپنے تذکرہ میں مرزا بیدل کا حال لکھتے ہوئے رقم طراز ہے۔

"فقیر دریں مدت عمر کہ پنجاہ و شش مرحلے طے کردہ ..... الخ"

ظاہر ہے کہ سفینہ کی تالیف ۱۱۳۷ھ اور ۱۱۴۷ھ کے درمیان میں ہوئی اس لئے خوشگو کی ولادت کا سال ۱۰۷۸ھ اور ۱۰۸۸ھ کے درمیانی زمانے میں رہا ہوگا۔

خوشگو، حکم چند ندرت، میاں صادق القا، بیغم بیراگی، حاتم بیگ حاکم اور سدانند بے تکلف کے ذکر میں ان سے علمی اور فنی استفادہ کا اعتراف کرتا ہے۔ اکتساب علم و فن سے فارغ ہو کر خوشگو نے ملازمت شروع کی۔ عمدۃ الملک امیر خاں انجام ناظم صوبہ الٰہ آباد کی طرف سے اس کی شہادت کے وقت (۱۱۹۵ھ) تک ندر روپیہ یومیہ خوشگو کو ملا کرتا تھا۔ نواب زین الدین خاں بہادر ہیبت جنگ کے دیوان لالہ کرت چند کے ساتھ خوشگو کی گہری وابستگی تھی اور لالہ مذکور خوشگو کے بہت ہی مخلص اور مشفق سرپرست تھے۔ راجا رام نرائن موزوں صوبہ دار

عظیم آباد سے بھی خوشگو کا ذاتی رشتہ قائم تھا اور اسی کی وساطت سے خوشگو کو نواب ہیبت جنگ تک رسائی حاصل ہوئی اور نواب مذکور کی ملازمت بھی ملی خوشگو بہت جلد ملازمت سے کنارہ کش ہو کر تارک الدنیا ہو گیا اور فقیرانہ زندگی بسر کرنے لگا۔

فقیری اور درویشی کا یہ دور خوشگو کی عمر کا آخری حصہ تھا، اس زمانے میں وہ اکثر الہ آباد، بنارس اور عظیم آباد وغیرہ میں رہا کرتا تھا۔ "مجمع النفائس" مولفہ سراج الدین علی خاں آرزو کی تالیف کے وقت (۱۱۶۱ھ) وہ عظیم آباد اور بنارس میں تھا۔ شفیق اورنگ آبادی مولف "تذکرہ گل رعنا" رقم طراز ہے کہ عظیم آباد ہی میں ۱۱۷۰ھ میں خوشگو کی وفات ہوئی۔

خوشگو کا شمار اپنے عہد کے با مذاق شاعروں میں ہوتا تھا۔ محمد افضل سرخوش متوفی (۱۱۲۶ھ) مولف "کلمات الشعراء" سے ۱۴ سال کی عمر سے اس نے شعر پر اصلاح لینا شروع کر دیا تھا۔ سرخوش نے ہی اسے اپنا تخلص خوشگو کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ بعد میں خوشگو نے خان آرزو سے بھی استفادہ کیا اور تقریباً ۲۵ سال تک ان کی شاگردی میں رہا۔ اس عہد کے دوسرے نامور استاد شاعر شیخ سعد اللہ گلشن اور بیغم بیراگی سے بھی شاعری میں استفادہ کا اعتراف خوشگو نے کیا ہے۔ لیکن ان تمام باکمالوں کے مقابلہ میں خوشگو کی عقیدت سب سے زیادہ مرزا عبدالقادر بیدل سے وابستہ تھی۔ مرزا بیدل کے بیان میں لکھا ہے کہ ہر روز ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اور اپنی عمر میں تقریباً ہزار بار سے زیادہ ان کی خدمت سے مستفید ہوا تھا۔ خوشگو کا کوئی دیوان اب دستیاب نہیں ہے جس کی اس کی شاعری کی قدر و قیمت متعین کی جاسکے۔ اس کی جن تالیفات کا علم ہوتا ہے ان کے نام یہ ہیں:۔

(۱) سفینۂ خوشگو

(۲) مرقع۔ خوشگو نے خود اس تصنیف کا ذکر کیا ہے لیکن اب یہ نایاب ہے۔

(۳) ملفوظات بیدل۔ یہ بھی اب نایاب ہے اس کا ذکر خوشگو نے بیدل کے بیان میں کیا ہے۔

اس طرح خوشگو کی تالیفات میں سے اس کی واحد تصنیف "سفینہ" ہی اب دستیاب ہے۔ اور یہی وہ کتاب ہے جس کی وجہ سے خوشگو کا نام فارسی ادب کی تاریخ سے لافانی ہو گیا۔ سفینہ متقدمین، متوسطین اور معاصرین شعراء کا ضخیم تذکرہ ہے جو ۱۱۳۷ھ سے ۱۱۴۷ھ کے درمیانی زمانے میں لکھا گیا۔ درج ذیل شعر کے پہلے مصرع سے سال آغاز اور دوسرے مصرع سے سال انجام کا اظہار ہوتا ہے۔

آغازش در سفینۂ خوشگو بود	انجامش در سفینۂ خوشگوی است
۱۱۳۷ھ	۱۱۴۷ھ

سفینہ کی ترتیب شعرا کی ولادت یا ان کی موت کے سال کے اعتبار سے ہوئی ہے۔ اس کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ۳۶۲ متقدمین شعرا کا ذکر ہے۔ پہلا شاعر رودکی اور آخری کاتی ہے۔ دوسرے حصے میں ۱۱۸ متوسطین شعرا ہیں۔ ان میں پہلا جامی اور آخری شکوہی ہے۔ تیسرا حصہ ہم عصر شاعروں کا ہے، اس کا واحد قلمی نسخہ بانکی پور کتب خانۂ مشرقیہ میں موجود ہے۔ اس حصے کا پہلا شاعر فطرت اور آخری شفیعا اثر ہے۔

"سفینۂ خوشگو" بہت ہی ضخیم اور مفصل تذکرہ ہے۔ مولف نے اپنے ماخذوں کی فہرست نہیں دی ہے لیکن شعراء کے حالات میں جن کتابوں سے استفادہ کی خبر دی گئی ہے ان کی تعداد تقریباً ۲۱ ہے۔

سفینہ کے تیسرے حصہ کو مقدمہ، تصحیح و تحشیہ کے بعد پروفیسر سید شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی نے ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ سے شائع کر دیا ہے۔

فارسی شاعروں کے جس قدر تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں "سفینۂ خوشگو" کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ خاص طور پر اس کا تیسرا حصہ چند گوناگوں خصوصیتوں کی وجہ سے دوسرے بہت سے تذکروں کے مقابلے میں ممتاز ہے۔ یہی سبب ہے کہ مابعد کے زمانے میں اس کی اہمیت تسلیم شدہ ہے۔

درگا داس عشرت:۔ درگا داس عشرت اٹھارہویں صدی عیسوی کا ایک ایسا شاعر اور تذکرہ نگار ہے جس کی زندگی کے حالات کہیں دستیاب نہیں۔ تذکروں میں بھی اس کا حال موجود نہیں۔ اس کے وجود کا علم اس کی واحد دستیاب تصنیف "سفینۂ عشرت" سے ہوتا ہے۔

"سفینۂ عشرت" ۱۱۷۵ھ۔ ۱۷۶۱ء میں لکھا گیا اور یہی اس کا تاریخی نام ہے اس تذکرہ میں قدیم و جدید فارسی شاعروں میں سے ۴۵۵ شاعروں کا بیان حروف تہجی کی ترتیب سے ہوا ہے۔ اس کا واحد قلمی نسخہ کتب خانہ مشرقیہ بانکی پور (پٹنہ) میں موجود ہے۔ مخطوطہ کا آخری حصہ ناقص ہے اور حرف "س" پر ختم ہو جاتا ہے۔ دستیاب مخطوطہ کے مطابق پہلا شاعر اسدی طوسی اور آخری حاجی فریدون سابق ہے۔

عام طور پر شاعروں کا حال اور ان کے اشعار کے نمونے بہت مختصر اور کم ہیں۔ بعض بعض شاعروں کی زندگی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور ان کے کلام کے نمونے بھی زیادہ ہیں۔ بیدل اور خان آرزو کے حالات اور کلام کے نمونے نسبتاً سب سے مفصل اور زیادہ ہیں۔

موہن لعل انیس:۔ موہن لعل انیس بھی اٹھارہویں صدی عیسوی کا مشہور شاعر اور تذکرہ نگار ہے۔ انیس کا باپ تولارام سرکار خیر آباد میں پرگنہ گوپاموں کا قانون گو تھا۔ اور ذات کا کایستھ تھا۔ اس کے دادا دیوان اودیراج نے اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی اور اسی جگہ انیس کی ولادت اور اس کی نشوونما ہوئی۔ فارسی علوم و فنون میں تحصیل انیس نے اس عہد اور شہر کے مشہور مدرس اور عالم کریم داد خاں آزولق سے کی۔

انیس کے تفصیلی حالات دستیاب نہیں، خود اپنے تذکرہ میں بھی اس کے حالات بہت تشنہ اور غیر تسلی بخش ہیں حالانکہ اس کے بیان کے مطابق تذکرہ کی تالیف کے وقت (۱۱۹۷ھ) اس کی عمر پچاس سال سے تجاوز کر چکی تھی اور وہ صوبہ اودھ کی حویلی لکھنؤ کی خدمت پر مامور تھا۔

انیس نے فارسی شاعروں کا حال ایک تذکرہ کی صورت میں مرتب کیا جس کا نام "انیس الاحبا" ہے۔ اس تذکرہ کی وجہ سے انیس کا نام بھی فارسی ادب کی تاریخ میں زندہ ہے۔ شاعری میں بھی انیس ہم عصروں میں ممتاز تھا۔ بھگوان داس ہندی مولف "سفینۂ ہندی" لکھتا ہے کہ انیس کو شاعری سے فطری لگاؤ تھا، پہلے خستہ تخلص کیا کرتا تھا۔ پھر بیتاب تخلص کیا مگر بعد میں انیس تخلص کرنے لگا۔ شاعری میں انیس نے اپنے عہد کے نامور استاد مرزا فاخر مکیں کی شاگردی اختیار کی چنانچہ اپنے تذکرہ میں بھی انیس نے اس بات کا خصوصی التزام رکھا ہے کہ اس میں وہ شعراء بیان کئے جائیں جو دبستان مکیں سے وابستہ ہیں۔

"انیس الاحبا" ۱۱۹۷ھ میں لکھا گیا، اس کے خاتمہ میں درج اس قطعہ سے سال تالیف برآمد ہوتا ہے:۔

این نسخہ کہ رشک باغ بی سعی جلیس	چوں ساخت انیس از گل شعر نفیس
سالش زچمن طراز دانش جستم	فی الفور بگفت "این بود باغ انیس"

۱۱۹۷ھ

تذکرہ کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے مولف لکھتا ہے کہ وہ اپنے استاد مرزا فاخر مکیں اور ان کے شاگردوں کا حال اور نمونۂ کلام کو ترتیب دینے کی غرض سے مواد جمع کرنے میں مشغول تھا کہ مہاراجا تکیت رائے نے اسے "بلا کر تذکرۂ شیخ علی حزیں کی طرز میں ایک تذکرہ مرتب کرنے کا حکم دیا اور اسی کی تعمیل میں یہ تذکرہ تیار ہوا۔

"انیس الاحبا" بہت ہی مختصر تذکرہ ہے۔ اس میں فاخر مکیں اور ان کے پچاس سال کے شاگردوں کا حال اور ان کے نمونۂ کلام بغیر کسی مخصوص ترتیب کے صرف ۸۰ صفحات میں درج ہیں۔ بغرض تبرک و تیمن عظیمائے اکسیر اصفہانی کا بھی ذکر اس لئے کیا ہے کہ وہ فاخر مکیں کے استاد تھے۔

لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی: "لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی اخری اٹھارہویں صدی اور ابتدائی انیسویں صدی عیسوی کا ایک مشہور و معروف شاعر اور اہل قلم گذرا ہے۔ اس کا تذکرہ "گل رعنا" اور "شام غریباں" کے ناموں سے قبولیت عام حاصل کر چکا ہے۔"

لچھمی نرائن ماتھر قوم کا کھتری تھا اور اپنا تخلص شفیق کرتا تھا، اس کا دادا بھوانی داس عالمگیر (۱۰۶۹-۱۱۱۸ھ) کی لشکر کے ساتھ لاہور سے دکن گیا اور اورنگ آباد کو اپنا وطن مالوف بنا لیا۔ یہاں وہ غازی الدین خاں کی ملازمت سے منسلک رہا۔

بھوانی داس کا منجھلا لڑکا منسارام جو شفیق کا باپ تھا ابھی صرف دس سال کا تھا کہ بھوانی داس کا انتقال ہو گیا۔ جسونت رائے جو ہم قوم بھی تھا اور ہم کنبہ بھی منسارام کا مربی ہوا۔ بڑا ہو کر منسارام نواب آصف جاہ (۱۱۴۲-۱۱۶۱ھ) کی سرکار میں دکن کی چھ ریاستوں کی صدارت کل کے عہدہ پر فائز رہا۔ اور "گل رعنا" کی تالیف کے وقت (۱۱۸۲ھ) اس کی ملازمت کا چالیسواں سال تھا۔ نواب صمصام الدین شاہ نواز خاں نے اپنی وکالت کے زمانے (۱۱۶۷-۱۱۷۰ھ) میں آزاد بلگرامی کی سفارش پر منسارام کو سابق عہدہ کے ساتھ ساتھ دکن کے بخشی الممالک کی پیشکاری کا عہدہ بھی دیا۔ ۱۲۰۴ھ میں وہ دیوان کے عہدہ پر فائز تھا۔ منسارام ایک اعلیٰ منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مصنف تھا، اس نے ۱۲۰۰ھ میں "مآثر نظامی" اور ۱۲۰۵ھ میں "دربار آصفی" نام سے دو کتابیں تالیف کیں۔

شفیق اسی لائق باپ کا بیٹا تھا، شفیق کی ولادت ۱۱۵۸ھ میں بمقام اورنگ آباد ہوئی۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی جیسے نامور اہل علم اور اہل قلم کے سایۂ عاطفت میں شفیق کی تربیت ہوئی۔ بڑا ہو کر نواب نظام علی خاں (۱۱۷۵-۱۲۱۸ھ) کی ملازمت سے منسلک ہوا اور نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کے عہد میں "دولت چند" کے منصب اور لقب سے نوازا گیا۔

سخنوران بلند فکر (اردو) کے مولف نے شفیق کا سال وفات ۱۲۰۱ھ لکھا ہے لیکن یہ درست نہیں کہ اس کی ایک تالیف "بساط الغنائم" ۱۲۱۴ھ کی تالیف ہے اور ظاہر ہے کہ اس وقت تک بقید حیات تھا۔ "گل رعنا" (مطبوعہ حیدرآباد دکن) کے فصل دوم کے سرورق پر یہ عبارت تحریر ہے "تالیف شفیق متوفی ۱۲۲۳ھ" لیکن اس کا ماخذ موجود نہیں، البتہ اس تاریخ کی تصدیق اور تائید شفیق کے ایک شاگرد غلام مصطفےٰ خاں سخن کے دیوان میں موجود ایک قطعہ سے ہو جاتی ہے۔ یہ قطعہ سخن نے شفیق کے وفات پر لکھا اور اس میں سال وفات ۱۲۲۳ھ ظاہر کیا ہے۔

اوستاد شفیق من افسوس	از سپنج سرائے فانی رفت
روی دل از کسی نمی بینم	مایۂ لطف و مہربانی رفت
از حلاوت گذشت نظم و نثر	نمک از شعر و شعر خوانی رفت
از جہاں برفت استاد قدر کمال	عالم علم نکتہ دانی رفت
سال رحلت رقم نمود سخن	"دائی شاطر معانی رفت"

۱۲۲۳ھ

شفیق کے سال وفات سے متعلق شاید یہ پہلا تاریخی قطعہ ہے جو دستیاب ہے اور اس سے صاف طور پر نمایاں ہے کہ شفیق کی وفات ۱۲۲۳ھ میں واقع ہوئی۔

شفیق کی شہرت اور مقبولیت کا ذریعہ اس کی شاعری بھی تھی مگر اب اس کا دیوان دستیاب نہیں۔ گیارہ سال کی عمر میں وہ شعر گوئی میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ میر عبدالقادر مہربان نے جو شفیق کا استاد تھا۔ پہلے صاحب تخلص دیا۔ بعد ازاں میر غلام علی آزاد بلگرامی کی صحبت میں گیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ فارسی میں شفیق تخلص رکھو، البتہ اردو میں صاحب ہی رہنے دو۔ فارسی میں شفیق آزاد کے تلامذۂ خاص میں سے تھا۔ آزاد بلگرامی اور دوسرے ارباب قلم کی آرا کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعری میں بھی شفیق کا رتبہ بہت بلند رہا ہوگا۔ البتہ اس کی مورخانہ حیثیت شاعرانہ حیثیت سے برتر ہے اور اس طرح شفیق دوسرے درجہ کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔

شفیق ایک طومار نویس مصنف تھا، اس نے اردو اور فارسی دونوں

زبانوں میں کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی فارسی تصانیف یہ ہیں :۔

(۱) حقیقتہائے ہندوستان	مولفہ سال	۱۲۰۴ھ	(تاریخ)
(۲) تنمیق شگرف	مولفہ سال	۱۲۰۰ھ	(")
(۳) مآثر آصفی	مولفہ	۱۲۰۸ھ	(")
(۴) مآثر حیدری	مولفہ ؟		(")
(۵) بساط الغنائم	مولفہ	۱۲۱۳ھ	(")
(۶) حالات حیدر آباد		۱۲۱۴ھ	(")
(۷) خلاصۃ الہند	مولفہ ؟		(")
(۸) چمنستان شعرا	مولفہ	۱۱۷۵ھ	(اُردو شعرا کا تذکرہ بزبان فارسی)
(۹) شام غریباں	مولفہ	۱۱۸۲ھ	(فارسی شعرا کا تذکرہ)
(۱۰) گلِ رعنا	مولفہ	۱۱۸۱-۸۲ھ	(")
(۱۱) سوسن دہ زباں	مولفہ	۱۲۱۳ھ	(مترادفات زبان)

فارسی کی ان تصانیف کے علاوہ شفیق کی چار تالیفات اُردو میں بھی ہیں ۔[1] فارسی تالیفات میں اس کے دو تذکرے ابدی اور لازوال شہرت کی حامل ہیں۔ ایک تذکرۂ "گلِ رعنا" اور دوسرا تذکرہ "شامِ غریباں" یہ دونوں فارسی شاعروں کے تذکرے ہیں۔ ان میں "گلِ رعنا" کی اہمیت و مقبولیت نسبتاً بہت زیادہ ہے۔ "شامِ غریباں" اس کے مقابلے میں کم تر درجہ کی چیز ہے۔

"گلِ رعنا" کی تالیف ۱۱۸۱ھ میں شروع ہوئی اور ایک سال بعد ۱۱۸۲ھ میں یہ تذکرہ مکمل ہوا۔ آغاز اور انجام کا الگ الگ تاریخی سال یہ ہے :۔

آغاز تالیف

نوک قلم لالی بحر سخنوران — از قوم مسلمین و فریق ہنود سفت
تاریخ این صحیفۂ رنگین سحر گہی — از باغ طبع سر زدہ "رعنا گل شگفت"
۱۱۸۱ھ

اختتام تالیف

این کتاب مناقب شعرا — بچہ اسلوب تازہ شد مرقوم
از پئے ختم این صحیفۂ شوق — گفت تاریخ "نامۂ مختوم"

مولف نے ۱۳ کتابوں اور تذکروں سے استفادہ کیا ہے جس کا ذکر دیباچہ میں موجود ہے۔

"گلِ رعنا" ان فارسی شاعروں کا تذکرہ ہے جو ہندوستان میں رہتے تھے خواہ وہ یا ان کے اسلاف باہر سے ہندوستان آکر مقیم ہوئے۔ اس کی دو فصلوں میں سے پہلی فصل مسلمان شعرا کی ہے جس میں سب سے پہلا شاعر غلام علی آزاد بلگرامی ہیں اور آخری میر یوسف بلگرامی۔ دوسری فصل میں ہندو شعرا ہیں اور اس کا پہلا شاعر اچل داس اور آخری بنز (گمان رائے) ہے۔

شعرا کا حال اور ان کے اشعار کا انتخاب اکثر مفصل تحریر کیا ہے۔ اور کبھی کبھی مختصر بھی۔ اپنے استاد آزاد بلگرامی کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اسی طرح اکبر بادشاہ اکبر اعظم کا حال بھی بڑی وضاحت کے ساتھ تقریباً ۴۸ صفحات میں درج کیا ہے لیکن صاف نمایاں ہے کہ یہ حصہ مشہور مورخ ملاّ عبد القادر بدایونی کی تاریخ سے اخذ کیا ہے (حالانکہ مولف نے اس تاریخ کا نام اپنے ماخذ کی فہرست میں نہیں لیا ہے۔) کیونکہ وہی تعصب، حسد و رشک کے جذبات یہاں بھی جھلکتے ہیں جو بدایونی کی تاریخ میں موجود ہیں۔ یہی نہیں بلکہ فیضی کا حال بھی بدایونی کی تاریخ کی نقل ہے۔

"گلِ رعنا" کی طرز نگارش سادہ نثر میں ہے مگر مقدمہ میں کہیں کہیں تصنع بھی موجود ہے۔ اس تذکرہ کی دوسری فصل یعنی ہندو شعرا کا حصہ انجمن ترقی اردو حیدر آباد (دکن) کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔

شفیق کا دوسرا تذکرہ "شامِ غریباں" بھی ۱۱۸۲ھ میں لکھا گیا، ہندوستان میں اس کا واحد قلمی نسخہ بابائے اردو مولوی عبد الحق کے پاس تھا جس کی روشنی میں موصوف نے "شامِ غریباں" کے متعلق یہ رائے دی ہے :۔

"یہ تذکرہ ان ایرانی شعرا کا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے ہندستان میں وارد ہوئے۔ نام بھی مضمون کی مناسبت سے رکھا ہے اگرچہ حالات بہت مختصر ہیں مگر کتاب دلچسپ ہے اور اشعار کا انتخاب خوب ہے۔ لطائف و ظرائف سے خالی نہیں۔ بعض بعض اشعار کے متعلق خاص نکات بھی بیان کر دیتے ہیں۔"

(مقدمہ چمنستان شعرا مطبوعہ حیدر آباد)

"شامِ غریباں" کا کوئی مخطوطہ ہندوستان میں دستیاب نہیں۔ البتہ رسالہ اُردو سہ ماہی پاکستان میں جناب اکبر الدین صدیقی نے اپنے ذاتی مخطوطہ کی بنیاد پر مختصر تعارف کے ساتھ اس تذکرہ کو دو تین قسطوں میں شائع کرایا ہے۔[1]

بھگوان داس ہندی — اس عہد کا مشہور شاعر اور ادیب بھگوان داس ہندی فارسی ادب کی تاریخ میں اپنے تذکرہ "سفینۂ ہندی" کی وجہ سے زندہ جاوید ہے۔ بھگوان داس ابتدا میں سبل تخلص کرتا تھا، بعد میں ہندی اختیار کیا۔

بھگوان داس ولیت داس بن ہر بنس رائے کا دوسرا لڑکا تھا اور ذات کا کایستھ تھا۔ اس کے خاندان کا اصلی وطن کالپی تھا مگر یہ لوگ سوندھا (کالنجر) میں رہتے تھے۔ ولیت داس اپنے باپ کے ساتھ اپنے چچا بلاقی داس کی دعوت پر نواب برہان الملک بہادر (متوفی ۱۱۵۱ھ) کے زمانے میں (غالباً سوندھا سے) لکھنؤ گیا (اس سفر میں بھگوان داس کا خاندانی استاد حق داد خاں پدر کریم داد خاں رونق کا خاندان بھی ان لوگوں کے ساتھ تھا۔) اور نواب موصوف کے زمانے سے نواب آصف الدولہ بہادر (۱۱۸۹-۱۲۱۲ھ) کے آخری دور تک سرکاری ملازمت میں اعلیٰ عہدہ پر فائز رہا۔

---

[1] رسالہ آج کل (ماہ اپریل ۱۹۶۱ء) میں ثمینہ شوکت صاحبہ کا مضمون ملاحظہ ہو

[1] رسالہ اردو سہ ماہی (پاکستان) ج ۴۳، ۴۵ ش ۳، ۴ (جولائی تا دسمبر ۱۹۶۹ء)

بھگوان داس کی ولادت ۱۱۶۴ھ میں صید پور (سیک) میں اپنے نانا لالہ رام غلام (قانون گو) کے گھر ہوئی۔ "صبی جوان بخت" مادہ سال ولادت ہے۔ دو ہی سال بعد اس کو اپنے والد دلپت رائے کے پاس لکھنؤ لے جایا گیا جہاں اس کی نشو و نما ہوئی۔ اس کی ابتدائی تعلیم اور کتب متداولہ کی تحصیل کا کام اسی جگہ مولوی سید یوسف سہارنپوری کے نزدیک پورا ہوا اور اسی زمانے میں اس نے شاعری بھی شروع کی۔

بھگوان داس اپنی جوانی کے زمانے میں "میر بحر" کے عہدہ پر فائز تھا اور الٰہ آباد کا پورا صوبہ نواب مختار الدولہ بہادر کی طرف سے اس کے ماتحت تھا۔ اس کے بعد نواب آصف الدولہ کے زمانے میں راجہ ندھی سنگھ بہادر کا دیوان مقرر ہوا۔ اور پانچ سو سوار اس کے سپرد تھے۔ راجا ندھی سنگھ بہادر کی موت کے بعد بھگوان داس ٹیڑا چند بہادر کا مصاحب ہوا اور راجا مذکور کی وفات پر بہار اجا ٹکیت رائے عزیز رد (متوفی ۱۲۱۵ھ) کا مصاحب بنا۔ اس کے بعد راجا جیے سنگھ رائے نے بھگوان داس کی بڑی عزت افزائی کی۔ اور قدر دانی فرمائی۔ اور اس کے مراتب بلند کر کے لطف و عنایت کا سلوک کیا۔

بھگوان داس سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں (نائب آصف الدولہ) کی ملازمت سے بھی منسلک رہا اور دیوانی کے عہدہ پر فائز تھا۔

بھگوان داس نے ابتدائے شباب ہی سے شاعری شروع کر دی تھی۔ اور اس دور کے مشہور فارسی شاعر مرزا فاخر مکیں (متوفی ۱۲۴۱ھ) کا شاگرد ہوا اس سے زیادہ بھگوان داس کا حال دستیاب نہیں ہے "انیس الاحبا" مولفہ موہن لعل انیس اور خود نوشت تذکرہ "سفینۂ ہندی" کے علاوہ بھگوان داس کا حال کسی دوسری جگہ نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی زندگی کے آخری ایام کے حالات معلوم نہیں ہو پاتے۔

بھگوان داس کی جن تصنیفات کا علم ہو سکا ہے ان کے نام یہ ہیں:—

۱. مثنوی سلسلۃ المحبت — مولانا جامی کی مثنوی "سلسلۃ الذہب" کے وزن میں ایک ہزار اشعار پر مشتمل ایک مثنوی، اس میں چیت کمت (جسے فلک معاذ کہتے ہیں) کے حالات امیر خسروؒ کی مثنوی قرآن السعدین کے وزن میں تحریر ہوئے ہیں۔

۲. مثنوی مظہر الانوار — نظامی گنجوی کی مثنوی "مخزن الاسرار" کے وزن میں۔

۳. مثنوی بجاگوت — اس کا نام "مہر ضیا" ہے جو جامی کی مثنوی "یوسف زلیخا" کے وزن میں ہے۔

۴. فارسی کا دو دیوان — ایک دیوان کا نام "شوقیہ" اور دوسرے کا "ذوقیہ" رکھا ہے

۵. تذکرۂ حدیقۂ ہندی — فارسی شعرا کا تذکرہ جو نایاب ہے۔

۶. رسالہ سوانح النبوۃ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بارہ اماموںؑ کی سوانح پاک

۷. تذکرۂ سفینۂ ہندی — فارسی شعرا کا تذکرہ۔

مندرج بالا تصانیف میں سے "سفینۂ ہندی" کے علاوہ کوئی تالیف اب کہیں دستیاب نہیں۔ یہاں تک کہ دونوں دیوان کا بھی کوئی نشان و پتہ نہیں۔

"سفینۂ ہندی" ۱۲۱۹ھ میں لکھا گیا، اس کا قطعۂ تاریخ یہ ہے:—

این باغچہ یافت حسن اتمام | یارب نرسد گہی زد السخن
گلہائی خرد در وشگفتہ | شد "باغچہ بہار" سالش
۱۲۱۹ھ

تذکرہ اگرچہ ۱۲۱۹ھ میں مکمل ہو گیا مگر مولف نے اس کے بعد بھی کئی اضافے اس میں کئے۔ مثال کے طور پر حسن علی خاں ذہین کے سلسلے میں مولف نے یہ عبارت اضافہ کی ہے:—

"بعد از تالیف این صحیفہ بتاریخ ہشتم شہر جمادی الاول سنہ یکہزار دو صد و بیست ہجری وفات یافت۔"

تذکرہ کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے مولف نے لکھا ہے کہ اس سے قبل سنہ ۱۲۱۰ھ میں تذکرہ "حدیقۂ ہندی" کے نام سے ایک تذکرہ لکھا تھا جس میں ماضی اور حال کے ان شعرا کا ذکر تھا جن کی ولادت اور نشو و نما سر زمین ہند میں ہوئی۔ یہ حدیقۂ جانفزا اور تالیف دلکشا ہے اور اب جبکہ سال ۱۲۱۹ھ ہے اور شاہ عالم ثانی کے جلوس کا ۴۷ واں سال تو ایک تذکرہ اور تالیف کیا ہے جس میں محمد شاہ کی حکومت کے آغاز (۱۱۳۱ھ) سے سال تالیف تک معاصر شاعروں کے احوال درج ہیں۔

بھگوان داس نے اپنے ماخذوں کا نام نہیں لیا ہے لیکن متن کتاب میں "مجمع النفائس"، "ریاض الشعرا"، "ید بیضا"، اور "تذکرۂ معاصرین حزیں" کے نام آئے ہیں جن سے استفادہ کیا ہے۔

"سفینۂ ہندی" میں ۳۳۵ فارسی شاعروں کا بیان حروف تہجی کی ترتیب سے کیا گیا ہے یہ تمام شعرا وہ ہیں جن کا ظہور محمد شاہ کے سال جلوس (۱۱۳۱ھ) سے ۱۲۱۹ھ (سال تالیف) تک ہندوستان کی سر زمین پر ہوا ہے۔ پہلا شاعر ابو المظفر عالی گوہر آفتاب اور آخری محمد اشرف یکتا ہیں۔

سفینۂ ہندی ایک مختصر تذکرہ ہے اور مطبوعہ کتاب (مرتبہ سید شاہ عطاء الرحمٰن و شائع کردہ ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ) کے اعتبار سے اس میں کل ۲۶۶ صفحات ہیں۔ شاعروں کے حالات عام طور پر نصف صفحہ سے زیادہ میں نہیں اور ان کے اشعار کی تعداد بھی تین چار سے زیادہ نہیں شاعروں کے حالات میں ان کی ولادت یا وفات کا سال بھی بہت کم دیا ہے لیکن ان خامیوں کے باوجود بھی اس تذکرہ کو جو اہمیت حاصل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اکثر شعرا مولف کے معاصرین تھے اور مولف کو ان سے ذاتی ملاقات اور قربت کا شرف حاصل تھا۔ اس کے علاوہ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں دور آخر کے فارسی شعرا کا اتنا مکمل اور بھرپور تذکرہ کوئی دوسرا نہیں لکھا گیا۔

"سفینۂ ہندی" صرف ادبی اور سوانحی حیثیت سے ہی اہم نہیں، بلکہ اس سے چند تاریخی حالات و واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اکثر ایسے شاعروں ہنرمندوں اور فنکاروں کا ذکر ہے۔ جو مغلوں کے آخری زمانے میں یہاں ایران سے ہندوستان آئے۔ ان لوگوں کے ذکر میں ضمنی طور پر اس عہد کی سیاسی

تاریخ بھی زیر بحث آتی ہے۔

اس تذکرہ میں ہندوستانی فارسی شاعروں میں سے بہت سے ایسے شاعروں کا ذکر ہے جن کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی طور پر بھی اہل زبان فارسی الاصل سے کم فارسی داں نہیں تھے۔ مولف نے جو اشعار منتخب کئے ہیں وہ سبک ہندی کے نمونے ہیں۔ اور انتخاب کلام سے خوش ذوقی کا ثبوت ملتا ہے۔

کنور رتن سنگھ زخمی — اس عہد کے آخری دور کے شاعروں اور قلم کاروں میں کنور رتن سنگھ زخمی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ زخمی سکسینہ کایستھ تھا اور اس کا خاندان بریلی کا باشندہ تھا۔ یہ خاندان کئی پشتوں سے شاہان اودھ کی سرکار سے وابستہ تھا۔ زخمی کا دادا راجا بھگوان داس نواب آصف الدولہ بہادر (۱۱۸۹ھ-۱۲۱۲ھ) کا دیوان اور اتالیق رہا اور بعد میں بریلی کا ناظم بھی ہوا۔ اس کا باپ رائے بالک رام مجبوری تخلص کرتا تھا اور مہاراجا جھاؤلال کے نائب کی حیثیت سے نواب آصف الدولہ بہادر کی سرکار میں میر آتش کے عہدہ پر فائز تھا۔ (لکھنؤ میں ابھی تک اس کے نام پر نواب خانہ بالک گنج مشہور ہے)۔ یہ آصف الدولہ کا دیوان بھی رہا۔ اور ۱۲۱۱ھ میں عظیم آباد (پٹنہ) گیا۔ اس کے فوراً بعد نواب آصف الدولہ کی وفات واقع ہوئی۔ (۱۲۱۲ھ) اور بالک رام نے شاہی ملازمت ترک کردی۔ اور ہندوستان کے مختلف شہروں اور مقامات پر پریشانی اور بدحالی کی صورت میں سرگرداں و آوارہ رہ کر ۱۲۶۰ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

رتن سنگھ زخمی کی ولادت ۲۳ محرم ۱۱۹۷ھ میں بمقام لکھنؤ ہوئی۔ آغاز شباب میں تحصیل علوم کی تمنا شدید ہوئی اور فارسی، عربی، ہندی کے علاوہ انگریزی زبان کی تحصیل بقدر ضرورت کرکے ان زبانوں کے دیگر علوم و فنون سے بھی آشنائی حاصل کی۔

زخمی نے ہندوستان کے اکثر شہروں کی سیر کی۔ سب سے پہلا سفر اس نے لکھنؤ سے بریلی کا کیا۔ اس کے بعد ۱۲۱۸ھ میں کلکتہ گیا اور وہاں کئی سالوں تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے وابستہ رہا۔ ۱۲۳۰ھ میں زخمی لکھنؤ واپس آکر شاہ اودھ کی سرکار میں ملازم ہوگیا۔ غازی الدین حیدر (۱۸۱۴-۱۸۲۷ء) اور اس کے بیٹے نصیر الدین حیدر (۱۸۲۷-۱۸۳۷ء) کے عہد میں زخمی منشی الملوکی کے لقب سے ملقب ہوکر اس خدمت پر مامور ہوا اور اس کے بعد محمد علی شاہ کے زمانے میں (۱۸۳۷-۱۸۴۲ء) ریاست کا دیوان ہوکر "مہاراجا" کے لقب سے نوازا گیا۔ اس کے بعد وزارت کے اعلیٰ عہدہ پر بھی فائز ہوا۔

زخمی کی وفات ۱۲۶۷ھ میں واقع ہوئی۔

دور آخر کے مشہور فارسی شاعروں میں شمار ہوتا تھا اس کے دیوان کا واحد مخطوطہ لاہور یونیورسٹی (پاکستان) کی ملکیت ہے جس میں غزلیات، مخمسات اور رباعیات ہیں۔

زخمی کی جن تالیفات کا علم ہوتا ہے وہ یہ ہیں:۔

۱۔ جام گیتی نما، ۲۔ حدائق النجوم، ۳۔ شرح گل کشتی، ۴۔ سلطان التواریخ مولفہ ۱۱۵۸ھ، ۵۔ دیوان فارسی، ۶۔ انیس العاشقین (تذکرہ)،

مذکورہ بالا کتابوں میں سے زخمی کی سب سے مشہور تالیف اس کا تذکرہ "انیس العاشقین" ہے جو زخمی کی شہرت اور مقبولیت کی ضامن ہے۔ اس کی تالیف ظاہراً ۱۲۳۵ھ میں ہوئی لیکن درحقیقت یہ تذکرہ ۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۲۴ء میں لکھا گیا۔

تذکرے کے دو حصے ہیں۔ دونوں میں شعرا کی مجموعی تعداد دو ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ ترتیب باعتبار حروف تہجی ہے۔ مقدمہ میں نصیر الدین حیدر شاہ کی مدح ہے اور اسی کے نام کتاب منسوب ہے۔ پہلی جلد کی ابتدا آبرو سے ہوئی ہے، اور آخری شاعر ضیائی ہے۔ دوسری جلد میں پہلا شاعر طالب جاجرمی اور آخری یونس ابہری ہے۔

شعرا کے حالات اور اشعار بہت مختصر ہیں اور اکثر جامع ہیں۔ اپنے اشعار کا انتخاب ۳۷ صفحات میں یعنی تمام شاعروں کے مقابلے میں زیادہ ہے جیسا کہ مقدمہ میں مولف نے لکھا ہے اکثر اشعار غزلوں اور رباعیوں سے ہی لئے گئے ہیں۔ کہیں کہیں قصیدہ اور مثنوی کے بھی اچھے اشعار منتخب ہوئے ہیں۔

بقیہ فن اور ناقد

لیکن تخلیقی تنقید کے متعلق میں یہاں ایک عام غلط فہمی دور کردینی چاہتا ہوں۔ بہتیرے ناقد تخلیقی تنقید کے بارے میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اقدار کی تخلیق کرتی ہے۔ یہ دعویٰ بہت ہی مبالغہ آمیز اور مغالطہ انگیز ہے۔ ناقد بہ حیثیت ناقد اس معنی میں کوئی مفکر یا فلسفی نہیں ہوتا کہ اس نے کوئی مستقل نظریہ فکر یا نظام فلسفہ مرتب کیا ہو، بلکہ فی الواقع ناقد کسی مفکر یا فلسفی کے افکار و خیالات سے استفادہ کرتا ہے اور اسی استفادہ کے نتائج کا اطلاق وہ اپنی تنقید میں کرتا ہے یعنی ناقد قدروں کا خالق نہیں، مبلغ ہوتا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہوگی کہ کوئی ناقد بامنابطہ فلسفی بھی ہوجائے یا کوئی فلسفی ناقد بن جائے۔ بہرحال فلسفہ اور تنقید کے عمل ایک دوسرے سے مختلف اور علاحدہ ہوں گے اور دونوں کے درمیان اشتراک صرف ایک شخصیت کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے جو محض ایک اتفاق ہوگا۔ ناقد کے لئے بہرحال ناقد ہونا کافی ہے، اسے فلسفی بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن کسی نظام فکر سے اس کی وابستگی تنقید اور فن دونوں کے لئے مفید ہوگی اس لئے کہ اس سے مطالعے کا ایک معیار ایک مرکز تصور، ایک محور فکر (فریم آف ریفرنس) حاصل ہوجائے گا، جس کے بغیر مطالعہ و تبصرہ بس ایک پریشانی افکار ہوگا۔ ناقد کے لئے ضروری ہے کہ نظر کے ساتھ ایک نظریہ بھی رکھتا ہو، ورنہ وہ نظر یا تو ترچھی ہوگی یا آوارہ، کسی چیز کا منظم مطالعہ ایک منظم نظریے ہی کے ذریعے کیا جاسکتا ہے اور نظریے ہی سے وہ نظر بھی ملے گی جو فن کی مربوط، واضح اور موثر تنقید کرسکتی ہے گرچہ تنقید میں نظریے کے اظہار کے لئے ضروری ہے کہ وہ تنقید کے آداب کے مطابق اور اسی معاملات میں ہو، فلسفیانہ مقولات اور مباحث کی شکل میں نہ ہو ورنہ تنقید بجائے تخلیقی ہونے کے تقلیدی ہوکر رہ جائے گی۔

عبدالمتین
سی، ایم، پی، ایف آفس آسنسول (مغربی بنگال)

مُجرم

سارے لوگ چلے گئے اور وہ تنہا رہ گیا

اب چاند نکل آیا تھا اور چاندنی کی چادر میں لپٹی ہوئی نئی قبر بہت ہی پراسرار کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ اس نے غور سے قبر کو دیکھا۔ اُوپر چاندنی کی دودھیا چادر تھی اور اندر اُسے محسوس ہوا جیسے کسی نے کلیجہ کو مَسل دیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مگر درد میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور کلیجہ کو مسلے جانے کی کیفیت جاری تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں کی رگوں میں تناؤ محسوس کرنے لگا اور ہاتھ چھوڑ کر دھڑام سے اوندھے منہ قبر پر گر گیا۔ اس کے منہ سے ایک دل سوز آواز نکلی "نیلو، میری نیلو!" آواز پل بھر میں فضائے بسیط میں کھو گئی اور پھر سکوت کا عالم طاری ہو گیا۔ آواز کے نکلنے کے بعد وہ قدرے سکون محسوس کرنے لگا۔ لہٰذا وہ اسی طرح سے پڑا رہا۔ پہلے، نظروں میں چاندنی کی دودھیا پن کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ پھر اس میں قوس و قزح کے رنگ اُبھرنے لگے اور خاموش ماحول میں شہنائی اور عورتوں کے گیت گھلتے محسوس ہوئے۔ پھر سوچ کی اُبھرتی اور پھیلتی ہوئی لہروں نے زماں و مکاں کے قیود توڑ دیئے اور وہ ایک سجے سجائے کمرے میں کھڑا تھا۔ سامنے پھولوں کے ہار سے لدی مسہری پر سُرخ کپڑوں میں لپٹی گٹھری کی صورت میں وہ بیٹھی تھی۔ وہ جیسے جیسے اس کی طرف قدم بڑھا رہا تھا سُرخ ملبوسات سے نکلتی ہوئی خوشبوئیں اس کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔ وہ اس کے پاس مسہری کے کنارے بیٹھ گیا اور اس کے چہرے سے گھونگھٹ ہٹاتے ہوئے بولا!

"پیاری نیلو آنکھیں کھولو، میری طرف دیکھو"

اس نے آنکھیں کھول دیں، مگر وہ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں وہ حیرت میں پڑ گیا۔

"ارے یہ آنسو؟ میں نے تو سُنا تھا کہ تم مجھ سے شادی سے بہت خوش ہو مگر....."

"ہاں میں تو خوش ہوں، بہت خوش ہوں"

"تو پھر یہ آنسو؟"

نیلو نے رونی سی صورت بنا کر کہا "آپ اس کی وجہ پوچھتے ہیں آپ سمجھتے نہیں ہیں؟"

"ہاں! میں نہیں سمجھتا ہوں"

"بھولے نہ بنیئے"

اس جملے پر اسے پیار آ گیا اور اس نے اسے اپنی آغوش میں دبوچ کر کہا

"اب بتاؤ"

وہ خاموش رہی۔ اس نے گرفت سخت کر دی اور نیلو بیکل ہو کر بول اٹھی۔

"پہلے آپ چھوڑیئے تو میں بتاؤں گی"

اس نے اپنی گرفت ڈھیلی کرتے ہوئے کہا

"اچھا تو کہو"

نیلو نے اپنی آنکھوں میں شریر سی چمک پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"بھلا، ان کو معلوم نہیں ہے، جو پوچھتے ہیں؟"

پھر اس نے اپنی گرفت سخت کرنی چاہی تو وہ بول اٹھی

"اچھا سنیئے...... آپ اتنے بے رحم کیوں ہیں؟"

"میں بے رحم؟" اس نے کچھ بوکھلاہٹ میں کہا۔ نیلو اس کی بوکھلاہٹ دیکھ کر بے ساختہ ہنس پڑی۔

"ہاں بے رحم" پھر اس کے چہرے پر کسی پوشیدہ کرب نے سنجیدگی پھیلا دی اور اس گمبھیر لہجے میں کہا

"آپ نکاح کے وقت جو ریڈیو، سائیکل اور روپئے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اُس وقت آپ نے پَل بھر کے لئے بھی سوچا تھا کہ میرے ابا کتنے مجبور اور کتنے......"

"ارے یہ تو میرا معاملہ ہے۔ تمہیں اس میں سر کھپانے کی ضرورت نہیں"، یہ کہہ کر اس نے بات ٹالنی چاہی۔ کیونکہ نیلو کے پیراہن کی خوشبو اور اس کے بدن کا گداز اس کے دل و دماغ پر ایسی مسحور کن کیفیت طاری کر رہا تھا کہ اُسے اَخلاقی قدروں کی حامل باتیں بھی پھیکی معلوم ہو رہی تھیں۔ پھر دونوں پیار و محبت کی دُنیا میں کھو گئے۔

شادی ہوتے ہی خوش قسمتی سے اسے شہر میں ایک سرکاری ملازمت مل گئی اور چند مہینوں کے بعد ایک خوب صورت کوارٹر بھی الاٹ ہو گیا۔ نیلو اس کے دل و دماغ پر چھائی رہتی اور اس کی جدائی ہر وقت ستاتی رہتی۔ چنانچہ وہ نیلو کی رخصتی کرا کر شہر لے آیا اور کوارٹر میں رہنے لگا۔ نیلو جتنی حسین تھی، اتنی ہی سلیقہ مند تھی۔ اس نے کوارٹر کے دریچوں میں

اپنی پسند کے پردے لگائے۔ ہر چیز کو قرینے سے سجایا اور نہایت پرسکون اور محبت سے معمور زندگی کا آغاز کیا۔ اس کا تقرر اپر ڈویژن کلرک کی پوسٹ پر ہوئی تھی۔ تنخواہ معقول تھی، جو آسودہ حالی کے لئے کافی تھی۔ ایک سال کے بعد اختر پیدا ہوا اور گھر کی رونق بڑھ گئی۔ مسکراتا بچہ، اس کے کھلونے اور بے بی فوڈ کے ڈبے گھر کے حسن کو افزوں کر رہے تھے۔ جب اختر چلنے پھرنے لگا تو تنہائی دور کرنے کے لئے فطرت نے سیما کو بھیجا۔ اختر سیما کی آمد پر بہت خوش تھا۔ گھر جنت کا نمونہ بن گیا۔ مگر اسے احساس نہ تھا کہ مسرت کو دیرپا بنانے کے لئے نظم و ضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے انسان کے سامنے یہ مسئلہ درپیش رہا ہے کہ وہ اپنے محدود ذرائع سے زیادہ سے زیادہ مسرتیں کس طرح حاصل کرے۔ اس نے اس حقیقت سے چشم پوشی کی اور دو سال کے اندر ہی اس کا تیسرا لڑکا اظہر پیدا ہوا۔ اظہر کی پیدائش کے بعد دونوں میاں بیوی عجیب سی گھٹن محسوس کرنے لگے۔ قلیل آمدنی اور تین بچے؟ اب انہیں ہمیشہ فکر رہتی کہ مہینہ کس طرح سے گذرے؟ اشیاء خوردنی میں کس کی کمی کر دی جائے؟ فکر و تردد اور غیر متوازن خوراک نیلو کی صحت اور حسن کو گھن لگانے لگی۔ اقتصادی بدحالی نے ان کے مزاج پر اثر ڈالا اور بات بات پر تو تو میں میں ہونے لگی۔ مگر کشیدگی کی فضا دن بھر تک قائم رہتی۔ رات ہوتے ہی وہ موم کی طرح نرم ہو جاتا اور اس کو منانے کے لئے سارے جتن کرتا۔ اس پیار و محبت کے نتیجہ میں گھر میں چوتھے فرد کی آمد کا سائرن بجنے لگا۔ اس بار نیلو پہلے کی طرح صحت مند نہ تھی۔ ولادت کا دن جیسے جیسے قریب آ رہا تھا، اس کے ہاتھ پاؤں متورم ہو رہے تھے اور اختلاج کی کیفیت بھی ہو جاتی۔ اس نے ڈاکٹر سے معائنہ کرایا تو اس نے ولادت کے لئے اسپتال میں داخلہ کے لئے مشورہ دیا۔

ڈاکٹر کے مشورے نے دونوں میاں بیوی کو ذہنی اذیت اور کرب میں مبتلا کر دیا۔ اب ان کے سامنے ہر وقت یہ معاملہ زیر غور رہتا کہ نیلو کے اسپتال جانے کے بعد بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ کھانا کون پکائے گا؟ آفس کا کیا ہوگا؟ ۔ انہی غور و فکر میں دردِ زہ شروع ہو گیا۔ شروع میں نیلو اسپتال جانے کے لئے رضامند نہ تھی۔ مگر تکلیف کی شدت نے اسے مجبور کر دیا۔ اسپتال میں نیلو کے داخلہ کے کچھ دیر بعد سپرنٹنڈنٹ نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ ہانپتا کانپتا وہاں گیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے اسے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا سپرنٹنڈنٹ نے عجیب تلخی سے پوچھا

"آپ ہسبنڈ ہیں"

"جی"

"اور آپ جی کہتے ہیں؟"

وہ بوکھلا گیا اور بدحواسی میں کہہ اٹھا "تو آپ جو کہہ لیجئے"

سپرنٹنڈنٹ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولی "جناب! آپ پڑھے لکھے ہیں۔ آپ کو تو اپنی بیوی کی ہیلتھ کا اندازہ ہوگا۔ پھر یہ ظلم؟"

اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "جی"

سپرنٹنڈنٹ قدرے سنجیدہ ہو کر بولی "خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب آپ بتلا دیجئے کہ آپ نے ان کا بلڈ ٹیسٹ کرایا تھا"

"جی ہاں"

"ہیموگلوبین کتنے پرسنٹ ہے"

"6 %"

"او مائی گاڈ! ہوپ لیس رپورٹ۔ اس کے علاوہ بلڈ پریشر بھی ہے خدا خدا کر کے ڈیلیوری ہو جائے تو آپریشن کرا دیجئے اور بچہ پیدا ہونے کا مطلب اس عورت کی موت ہوگا۔ لیجئے، اس فارم پر دستخط کر دیجئے"

"جی، مجھے اپنے لوگوں سے مشورہ کرنے کا موقع دیجئے"

"جناب! 'اپنے لوگ' آپ کے کام نہیں آئیں گے۔ یہ جرم ہوگا اس کے ذمہ دار خود آپ ہوں گے"

"میڈم! مجھے مہلت دیجئے۔ آپریشن تو ڈیلیوری کے بعد ہوگا۔ میں ضرور فارم بھر دوں گا۔ یقین رکھیئے، مگر مجھے اپنے لوگوں سے ...."

"اچھا تو جایئے، مشورہ کر لیجئے۔ میرا کام سمجھانا تھا، میں نے سمجھا دیا۔ آپ جانئے اور آپ کا کام" یہ کہہ کر سپرنٹنڈنٹ نے فارم اپنے ڈرا میں رکھ لیا اور اس سے کہا "اب آپ جا سکتے ہیں"

ڈیلیوری بخیر و خوبی ہو گئی اور آپریشن کے مشورے اور اپنے وعدے کو فراموش کر گیا۔ چند دنوں کے بعد نیلو کو ہوسپٹل سے ڈسچارج کر دیا گیا، مگر وہ بے حد کمزور اور ناتواں ہو گئی تھی۔ اس کی صحت یابی کے لئے اچھی غذائیں اور مقوی دواؤں کی ضرورت تھی اور اچھی غذائیں اور مقوی دواؤں کے لئے روپے کی ضرورت تھی، جو اس کے پاس نہیں تھے۔ ایک طریقہ تھا اور اس لئے اسے بروئے کار لایا۔ اس نے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لیا اور نیلو کا علاج شروع کر دیا۔ نیلو کی حالت سدھر گئی اور وہ اس لائق ہو گئی کہ خانہ داری کا بوجھ برداشت کر لے۔ پراویڈنٹ فنڈ کے قرض کی ادائیگی میں اس کے مشاہیرہ کی ایک کثیر رقم وضع کر دی جاتی تھی اور نتیجتاً ضروریاتِ زندگی کے لئے اس کی تنخواہ ناکافی ہو گئی۔ وہ ایک مالی بحران میں مبتلا ہو گیا مفلوک الحالی در و دیوار سے ٹپکنے لگی۔ بچوں کے چہرے سے شگفتگی غائب ہو گئی۔ گھر بے رونق ہو گیا۔ دریچے، جن پر کبھی رنگین پردے آویزاں رہتے تھے، بے پردہ ہو گئے۔ ہر طرف بے ترتیبی اور ویرانی پھیلی ہوتی تھی۔ ایسے میں بھی جنسی جبلت اس پر غالب آ گئی۔ اس بار نیلو کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اور پھر وہ دن آ پہنچا، جب وہ آپریشن تھیٹر میں موت سے نبرد آزما ہونے کے لئے پہنچا دی گئی۔ مگر وہ کھوکھلی ہو چکی تھی، کب تک مقابلہ کرتی۔ آندھی میں ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی طرح

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر)

شبیر احمد
۵۶۰ - تیمار پور - دہلی

کارخانہ کے انتظام میں مزدوروں کی شرکت

ترقی پذیر ممالک میں اس بات کا بڑا چرچا ہے کہ کارخانوں کے انتظام میں مزدوروں کی شرکت ضروری ہے ہمارے ملک میں بھی ایک عرصے اس بات پر غور کیا جارہا تھا اب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے بیس نکاتی پروگرام کی روشنی میں اس بات نے اہمیت اختیار کرلی اور اس کے لیے عملی اقدام اٹھائے جارہے ہیں۔ ۱۹ مئی ۱۹۷۶ء کو وزیر خزانہ جناب سبرامانیم نے لازمی جمع کی گئی ایک ہزار کروڑ کی رقم کے مصرف کے بارے میں "مزدور سیکٹر" WORKER'S SECTOR قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے یہ تجویز اس سمت میں ایک اہم قدم ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مزدوروں کی شرکت کے بارے میں جو کچھ کیا جارہا ہے اُس پر نظر ڈالی جائے اور دیکھا جائے کہ اس کے کیا فائدے ہیں۔ ابتدائی دور میں صنعت کا مالک خود ہی کارخانہ دار یا مالک ہوا کرتا تھا مگر صنعتی انقلاب پونجی کی فراوانی اور دوسرے عناصر کے ظہور میں آجانے کی وجہ سے اس نے کارخانہ کے روزمرہ کاروبار کو چلانے کے لیے ایک خصوصی طبقہ کو ملازم رکھا جس کا کام کارخانہ یا کاروبار کا نظام سنبھالنا تھا اور اُسے اپنی اِس خدمت کے صلہ میں اجرت یا مشاہرہ ملتا ہے انھیں عام فہم زبان میں منتظمان یا مینجمنٹ کا نام دیا جاتا ہے۔ مزدور کا تعلق ٹکراؤ اور واسطہ اِسی بیچ والے طبقہ سے ہوتا ہے جسے ہم مینجمنٹ کے نام سے پکارتے ہیں۔

موجودہ دور میں منتظمین کا بھی مقصد وہی ہے جو کہ مزدوروں کا ہے یعنی کہ بیوپار کو فروغ دیا جائے تاکہ کارخانہ یا کاروبار میں کام کرنے والے تمام لوگوں کو اس سے فائدہ پہونچے لیکن بیوپار میں کمائی ہوئی آمدنی کے تقسیم کے سوال پر ناانصافیاں ہوتی ہیں کہ کتنا حصہ ملازمین کو تنخواہ کی صورت میں اور کتنا حصہ کے خریداروں کو اور کتنا سرمایہ بیوپار کے بڑھانے کے لیے لگایا جائے۔

منتظمین کا کام تین امور کی دیکھ بھال ہے یعنی مزدور مال اور مشین ——— فی زمانہ ان کاموں کو انجام دینے کے لیے خصوصی عملہ مقرر ہوتا ہے۔ انجینیرز مشینوں کی دیکھ بھال کے لیے اور محاسب رقمی معاملات کی دیکھ بھال کے لیے اور مال کی خرید و فروخت کے عملہ کا کام یہ ہوتا ہے کہ کچا مال خریدے اور تیار شدہ مال فروخت کرے اس طرح سے پرسنل آفیسر اور لیبر افسر اور لیبر ویلفیر آفیسر کا یہ کام ہوتا ہے کہ ملازمین کی ملازمت و دیگر مسائل کو حل کرنے کے لیے قدم اٹھائے۔ ایک محاسب کسی انجنیر کو یہ نہیں بتلا سکتا کہ وہ کیا کام انجام دے اور اس طرح سامان فروخت کرنے والا آفیسر محاسب کے کام میں مدد نہیں کرسکتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مزدور کے لیے یہ ممکن ہے کہ انتظام کے اس پیچیدہ کام میں شریک ہوسکے؟ کیا مزدور یہ تبلا سکتے ہیں کہ کمپنی یا کارخانہ کا زائد سرمایہ کس طرح لگایا جائے کیونکہ مزدوروں کو عموماً شیئر مارکیٹ کی کارکردگی کا تجربہ یا واقفیت نہیں ہوتی۔ اس معاملہ میں مالی مشینری اور کمپنی کو ماہرانہ رائے دے سکتی ہے۔ پہلے یہی تھا مگر یہ بات بھلادی جاتی تھی کہ تجربہ اور ماہرانہ لیاقت موقع ملنے سے ہی پیدا ہوتی ہے۔

منتظمین کا کام یہ ہے کہ سرمایہ، مشینیں اور مزدوروں کو اکٹھا کریں تاکہ خریداروں کی ضرورت و پسند کی چیزیں تیار ہوں اور فروخت ہوں۔ منتظمین کا روزمرہ کام یہ ہوتا ہے کہ مختلف شعبہ جات کے لیے ملازمین اور مال حسبِ ضرورت فراہم کریں اور تیاری کے بعد مال گودام میں محفوظ رکھنے کے لیے روانہ کریں اور پھر بلاکسی تاخیر کے ان اشیاء کو بازار میں فروخت کے لیے بھیجدیں۔ منتظمین کا طویل مدت کے لحاظ سے اہم کام یہ ہے کہ وہ معلوم کریں کہ مارکٹ میں عوام کیا اور کس قسم کی اشیاء طلب کرتے ہیں اور اس کے بموجب اشیاء تیار کرنے کا فیصلہ کریں۔ اِس کام کے لیے پہلے منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے کہ کس طرح خام مال حاصِل کیا جائے اور فیکٹری اور مشینری کو مناسب حالت میں رکھا جائے۔ اِس کے علاوہ یہ بھی دیکھیں کہ کارخانہ میں عام ماحول، مزدوروں اور دوسرے کام کرنے والوں کی صحت و سلامتی کے لیے مناسب اِنتظامات موجود ہیں ان تمام کاموں کو انجام دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اعلیٰ سطح پر کچھ لوگ عام پالیسی کے متعلق فیصلے کریں نچلی سطح پر ان کو روبہ عمل لائیں۔

نچلی سطح پر کام کرنے والے مزدور عموماً کارخانہ کے روزمرّہ کے کاموں میں دخل نہیں دیتے تھے۔ وہ صرف اسی صورت میں آواز اٹھاتے تھے جب کوئی خِلاف معمول یا غلط بات واقع ہو جیسے اُن پر کام کا بوجھ غیر معمولی طور سے یا غلط طریقہ سے بڑھایا جارہا ہے۔ یا اُن کے کام کرنے کے اوزار اور مشینیں وغیرہ موزوں نہیں ہیں یا اسکے علاوہ کسی قسم کی سہولت یا سلامتی کے متعلق بھی ملازمین اپنے خیالات کا اظہار کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابتدا سے یعنی کارخانہ کے انتظام کو چلانے اور پالیسی مرتب کرنے والی سطح سے درمیانی منتظمین اور سب سے نچلی سطح تک مزدوروں کو کس طرح شریک کیا جائے جس سے کہ مزدوروں میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہو۔ انھیں یہ محسوس ہو کہ وہ فقط ایک مقررہ رقم حاصل کرنے کے لئے کچھ مقررہ گھنٹوں کے ملازم نہیں بلکہ یہ صنعت اُن کی ہے انکے ملک کی ہے اور اس صنعت کی ترقی اور خوشحالی پر خود اُن کی انکے سماج اور ملک کی خوشحالی کا دارومدار ہے۔ ان میں اِس بات کا احساس دلانا لازمی ہے کہ اُن کا مفاد اپنی نوکری کے دائرۂ عمل سے ہی وابستہ نہیں بلکہ وہ بھی جمہوری طریقہ کار کے ایک اہم اداکار ہیں اور اُن کی دِلچسپی اور محنت کی بنیاد پر صنعتی جمہوریت کا قیام وجود میں آسکتا ہے۔

یہ خیال ایک عرصہ سے ہندوستان میں مقبول ہو رہا تھا اور پنج سالہ منصوبوں کی کامیابی کے لئے یہ ضروری سمجھا جا رہا تھا کہ مزدوروں کو صنعت کے اِنتظام میں خاطر خواہ حصہ دیا جائے۔ اب سے تقریباً بچیس سال پہلے بطور تجربہ حکومت ہند نے انڈین لیبر کانفرنس میں دونوں متعلقہ فریق یعنی ملازمین و منتظمین کے نمائندوں سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد جوائنٹ مینجمنٹ کونسل کا قیام کیا۔ اس سے قبل ۱۹۴۷ کے انڈسٹریل ڈسپوٹ ایکٹ کے تحت ہر اس کارخانہ میں ورکس کمیٹی بنانے کے لئے کہا گیا جہاں سو یا زیادہ مزدور کام کرتے ہوں مگر اُن کے کام کی حد محض مزدوروں کی بہبودی تک محدود تھی۔ یہ جوائنٹ مینجمنٹ کونسل اس ورکس کمیٹی سے کچھ افضل درجہ پر رکھی گئی۔ اس کونسل کو مندرجہ ذیل کام دیئے گئے۔

وہ امور جن پر جوائنٹ مینجمنٹ کونسل مکمل بحث کر کے نتائج پر پہونچ سکتی ہے۔

(۱) مزدوروں کی بہبودی کے کام (۲) حفاظتی تدابیر
(۳) پیشہ ورانہ فنون کی تربیت اور ملازموں کی تربیت کی اِسکیمیں۔
(۴) اوقات کار وقفے اور تعطیلات کی فہرستیں۔ (۵) ملازمین کی جانب سے قیمتی مشوروں کے لئے انعامات۔

امور جن سے متعلق جوائنٹ مینجمنٹ کونسل صرف ایک مشیر کی حیثیت سے صلاح دے سکتی ہے جب کہ آخری فیصلہ کا اختیار اعلیٰ سطح پر منتظمین کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

۱۔ قائم احکام (اسٹینڈنگ آرڈرس) پر عمل درآمد۔
۲۔ پیداوار کے طریقوں میں جدید طریقوں کا اِستعمال۔
۳۔ مختلف کارروائیوں میں کمی بیشی کے معاملات جن میں قانونی اور مالیہ سے متعلق سوالات ہوں اور منتظمین کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ ان کے اقدامات حکومت کے قواعد کی روشنی میں اُٹھائے گئے ہیں۔

وہ معاملات جن کے متعلق جوائنٹ مینجمنٹ کونسل فقط معلومات حاصل کرنے اور ان کی بابت بحث کرنے اور تجویزیں پیش کرنے کا حق رکھتی ہے۔
۱۔ کاروبار کا عام معاشی موقف
۲۔ مارکٹ کی حالت پیداوار اور فروختگی کے پروگرام
۳۔ انتظامیہ اور کارخانے کی عام کارکردگی
۴۔ وہ حالات جس سے کارخانے کا معاشی موقف متاثر ہوتا ہے
۵۔ پیداوار اور کام کے طریقے
۶۔ سالانہ بجٹ اور منافع و نقصان کا تخمینہ اور بیلنس شیٹ اور دوسرے معاملات۔
۷۔ آئندہ کے توسیعی منصوبے اور دوبارہ ملازمتیں فراہم کرنے کے پروگرام وغیرہ۔

اس طرح سے مختلف اُمور کی تقسیم کی گئی کہ مزدور اُن مسئلوں یا معاملات پر جن سے اُس کی براہ راست دِلچسپی ہوتی ہے ان پر آزادانہ طور سے بات چیت کریں۔ دوسرے معاملات پر انھیں مشورہ دینے کا حق ہے جو کہ براہ راست اثرانداز نہیں ہوتے اور تیسرے ایسے ٹیکنیکل مسائل جو کارخانے کی کارکردگی سے متعلق ہوتے ہیں اُنکے بارے میں معلومات فراہم کرے۔

مندرجہ بالا اسکیم کو تجربہ کے طور پر عمل میں لایا گیا جس کے نتائج اچھے رہے اور اُن صنعتی اداروں کی تعداد میں اِضافہ ہوا جو اس اسکیم کو اپنا رہے تھے مگر تھوڑے عرصہ بعد دلچسپی کم ہونے لگی اور مزدوروں کی کارخانہ یا کاروبار میں شرکت محض ایک نعرہ اور خیال بن کر رہ گئی۔

ہماری وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے اپنے بیس نکاتی پروگرام میں مزدوروں کو کارخانے کے کاروبار میں اسطرح شریک کرنے کے لئے جس سے پیداوار اور پیداآوری (Productivity) میں اضافہ ہو۔ اسکی بنیاد پر حکومت ہند کی وزارت محنت نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو ایک مفصل اسکیم شائع کی جس سے کہ مزدور کسی کارخانہ کے مختلف شعبوں میں شریک کیئے جاسکیں گے۔ اس اسکیم کے بموجب ہر اُس سامان تیار کرنے والی اور کان کی صنعت میں جہاں کہ پانچ سو یا اس سے زیادہ مزدور کام کرتے ہوں خواہ وہ پرائیویٹ سیکٹر ہو مگر سرکاری سیکٹر ہو کو آپریٹو سیکٹر ہو اس اسکیم کو لاگو کیا جائے گا۔ اس اسکیم کا خاص مقصد یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیداوار اور پیداآوری کو بڑھانے کے لئے اور مزدوروں میں یہ احساس پیدا کرنے کے لئے کہ وہ بھی ملک کی ترقی میں برابر کے شریک ہیں اس اِسکیم کو لاگو کیا جائے۔ اس اسکیم کا مزدوروں اور مالکوں نے بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا ہے۔

مرکزی وزیر محنت کے الفاظ میں یہ اسکیم بیس نکاتی پروگرام کے معاشی اور سماجی فلسفہ سے بہت ہی قریبی تعلق رکھتی ہے۔ یہ نیا معاشی پروگرام

سماج کے ڈھانچے کو وقت کی ضرورت کے بموجب ڈھالنے میں پورا اُترے گا۔ اِسکا مقصد ہے کہ پرانے معاشرتی نظام اور ڈھانچے کی جگہ نئے معاشرتی نظام کو مناسب بنیادوں پر دوبارہ بنایا جائے۔

مزدوروں اور مالکوں کے اس اشتراک سے مندرجہ ذیل نتائج کی توقع کیجاتی ہے۔

۱۔ پیداوار اور پیداآوری میں ہر ممکن اِضافہ۔

۲۔ مزدوروں کی ہنرمندی میں اضافہ اور اس کے لئے مناسب ٹریننگ کا بندوبست۔

۳۔ کچے مال کا ہر ممکن اِستعمال اور پیدا کیجانے والی شے بہتر سے بہتر تیار کرنا۔

۴۔ مزدوروں کی فلاح و بہبود اور انکی حفاظتی تدابیر کا بہتر سے بہتر طریقہ کار نکالنا۔

۵۔ کارخانہ کے ہر شعبہ میں نظم و ضبط۔

اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۸ پبلک سیکٹر کے کارخانوں نے اس اِسکیم کو اپنایا ہے۔ آندھرا پردیش اور پنجاب نے یہ اسکیم اُن اِداروں میں بھی لاگو کی ہے جہاں کہ ۵۰ سے بھی کم مزدور کام کرتے ہیں۔ کرناٹک، کیرالا، میگھالیہ، پنجاب، اُتر پردیش، مرکزی علاقے جیسے چنڈی گڑھ، انڈمان و نکوبار کے جزائر میں یہ اسکیم صد فیصد لاگو کر دی گئی ہے۔ اب تک ۷۰۰ سے زیادہ اِداروں میں یہ اسکیم لاگو ہو چکی ہے جن کی تفصیل اِس طرح ہے۔

نمبر	ریاستیں / مرکزی علاقہ	اداروں کی تعداد
۱	آندھرا پردیش	۵۶
۲	بہار	۹۲
۳	ہریانہ	۳۸
۴	مدھیہ پردیش	۴۳
۵	مہاراشٹر	۴۲
	پنجاب	۷۰
	پانڈیچری	۱
	اترپردیش	۱۰۱
	تامل ناڈو	۱۴۴
	گجرات	۸۷
	راجستھان	۳۰
	انڈمان نکوبار	۲
	دہلی	۶

اس اِسکیم کے ذریعے مزدور اور منتظمان ایک دوسرے سے قریب تر پیداوار اور پیداآوری کو فروغ دے سکتے ہیں۔ کچے مال کا پورا پورا اِستعمال کر سکتے ہیں۔ اور پیداوار کی بہترین قسم لا سکتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مزدور کی بہبودی اور حفاظتی تدابیر کو پوری طرح لاگو کر سکتے ہیں۔

اِس قسم کی اسکیم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ بتدریج مزدور اِس لائق ہو جائے گا کہ وہ نظام کے اعلیٰ سطح تک پہونچ سکے اور جمہوریت کا خواب پورا ہو۔

بقیہ: پانی اور پُل

"ہوں!.... بدمعاش کہیں کے! پہلے تو مار مار کر یہاں سے نکال دیا۔ اب کہتے ہیں واپس آجاؤ۔"

لیکن پلیٹ فارم پر کھڑے لوگوں نے ان کی بات نہیں سنی تھی وہ کہہ رہے تھے۔ "بھرجائی تم اپنے بچوں کو لے کر آجاؤ۔ بو بو بھرجائی! کب آؤگی"؟ اپنا گاؤں تمہیں یاد آتا ہے؟ بھرجائی واپس آجاؤ......"

ماں کے منہ سے کچھ نہیں نکل رہا تھا وہ سر پر کپڑا سنبھالتے ہاتھ جوڑے جا رہی تھیں۔ دور گارڈ کھڑا ہری لالٹین دکھاتا ہوا سیٹی بجا رہا تھا۔

انجن نے سیٹی دی۔ گاڑی چھک چھک چھک چھک کرتی ہوئی چلدی۔ بھیڑ کی بھیڑ ہمارے ڈبے کے ساتھ چلدی۔

"اچھا بھرجائی سلام..... اچھا بیٹے سلام..... کھیل سنگھ کو ہمارا سلام کہنا..... سب کو ہمارا سلام کہدینا۔"

ماں کے ہاتھ جُڑے ہوئے تھے اور منہ سے دھیمی آواز میں کچھ نکل رہا تھا دھیرے دھیرے گاڑی کچھ تیز ہو گئی ہم دونوں کھڑکی سے سر نکالے ہاتھ جوڑے رہے۔ بھیڑ کے لوگ وہیں کھڑے ہاتھ جوڑے چلا رہے تھے"...................."

لیکن گاڑی اسٹیشن کے باہر نکل آئی تو میں نے برتھ سے پوٹلیاں ہٹا کر ایک جانب کیں اور ماں سے کچھ کہنے کے لئے ان کی جانب دیکھا۔

ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی تیز دھارے بہے جا رہے تھے وہ بار بار دوپٹے سے آنکھیں پونچھے جا رہی تھیں لیکن ٹوٹے ہوئے باندھ کا پانی بہتا ہی جا رہا تھا۔

ہماری گاڑی جہلم کے پل پر آگئی تھی۔ بھیانک رات میں کھڈر... کھڈر کی تیز آواز آرہی تھی میں کھڑکی سے جھانک کر جہلم کا پُل دیکھنے لگا۔ میں نے سنا تھا جہلم کا پُل بہت مضبوط ہے پتھر اور لوہے کے بنے اس مضبوط پُل کو اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ میری نظر اور نیچے کی جانب بھی جا رہی تھی۔ جہاں گھور اندھیرا تھا لیکن میں جانتا تھا وہاں پانی ہے۔ جہلم ندی کا کل کل چھل چھل کرتا ہوا صاف اور شفاف پانی جو اس پتھر اور لوہے کے بنے پُل کے نیچے سے بہہ رہا تھا۔

(ترجمہ) محمد خورشید سحر

ہماری کتابیں

سرسید احمد خاں (پروفیسر خلیق احمد نظامی) ۵ روپے
(ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی، تعلیمی اور ثقافتی زندگی پر سرسید اور اُن کے رفقا کے کارناموں کا زبردست اثر پڑا ہے۔ پروفیسر نظامی نے بڑے عالمانہ انداز میں ان کی شخصیت اور کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔)

ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر (ڈاکٹر محمد عمر) ۱۰ روپے
(ڈاکٹر تارا چند نے اپنی مشہور تصنیف میں ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ ڈاکٹر محمد عمر نے اپنی اس محققانہ کاوش میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوستانی تہذیب مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔)

ہم ایک ہیں (عرش ملسیانی) ۱۰ روپے
(ہندوستان مختلف زبانوں، عقیدوں اور طبقوں کا ملک ہے اور جس کو اسی اختلاف سے زیب و زینت حاصل ہے۔ مگر ہر رنگ و بو کے یہ پھول ایک گلدستے میں بندھے ہوئے ہیں اور ہماری قومی زندگی کو تاب و توانائی بخشتے ہیں۔)

ابوالکلام آزاد (عرش ملسیانی) ۵ روپے
(ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے معماروں میں ہیں۔ جدوجہد آزادی کی کوئی بھی تاریخ مولانا آزاد کی خدمات کے اعتراف کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی)

روشنی کے مینار (شہباز حسین) ایک روپیہ ۵۰ پیسے
(سماجی مصلحین، مذہبی رہنما اور سیاسی قائدین کے سوانحی خاکے جو آسان زبان میں پرائمری اسکولوں کے طلبا کے لئے لکھے ہیں۔)

جواہر لال نہرو کی کہانی تصویروں کی زبانی ۲ روپے ۵۰ پیسے
(محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو کی زندگی کے دلچسپ واقعات رنگین تصویروں میں۔ بچوں اور طالب علموں کے لئے ایک عمدہ تحفہ)

پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے۔ ۲ روپے ۵۰ پیسے
(گھریلو ضرورتوں کے جام، جیلی، مربہ، مارملیڈ، چٹنی، شربے اور آچار وغیرہ بنانے کے متعدد طریقے تصویروں کے ذریعے بتائے گئے ہیں جس سے بڑی آسانی سے آپ گھر بیٹھے اپنی من پسند چیزیں بنا سکتے ہیں)

آجکل کے خریداروں کو ۲۰ فی صد کی رعایت۔ محصول ڈاک ہمارے ذمے

پانچ روپے سے کم قیمت کی کتابیں بذریعہ وی۔ پی نہیں بھیجی جاتیں۔ پوسٹل آرڈر بھیجئے یا وی پی طلب کیجئے۔

(ملنے کا پتہ) **بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی**

عرش صہبائی
۱۳۵۔ صہبائی اسٹریٹ۔ کچی چھاؤنی۔ جموں

تم سے بچھڑوں تو نہ جینے کی کوئی شکل رہے
اتنا چاہو نہ مرے چاہنے والو مجھکو
اپنی ہی ذات میں گم ہوں میں بڑی مدت سے
اِن خلاؤں سے کسی طور نکالو مجھکو
ایک درویش ہوں دن رات دعائیں دونگا
دل کی اُجڑی ہوئی بستی میں بسالو مجھکو
تم جو چھولوگے تو بڑھ جائے گی قیمت میری
گیلی مٹی ہوں کھلونا ہی بنالو مجھکو
دل پہ کیا بوجھ ہے ہر وقت جو رہتے ہو اُداس
کیوں پریشان ہو ہمراز بنالو مجھکو
پھر تم سے ہوئی ہو نہ اگر کوئی خطا
تم کو یہ حق ہے کہ نیزوں پہ اُچھالو مجھکو
عرش اس چشم فسوں ساز سے یہ کون کہے
لڑکھڑا جاؤں گا محفل میں سنبھالو مجھکو

حیات لکھنوی
امامیہ ہال، چکوتیاں روڈ، نئی دہلی

زباں سے نکلے ہوئے لفظ بے صدا نہ کرو
نہ سُن رہا ہو کوئی بات جب کہا نہ کرو
ہر ایک شے پہ ہو تنقید و نظر کی تیشہ زنی
شعور اتنا بصیرت سے آشنا نہ کرو
تمام عمر کی کوشش بھی رائگاں جائے
طویل اتنا مرادوں کا سلسلہ نہ کرو
خود اپنے زخموں سے ہر شخص چور ملتا ہے
کسی کو اپنے مصائب میں مبتلا نہ کرو
بس بن گیا ہوں تمھارے خیال کی تصویر
اب اس کے بعد مرے واسطے دعا نہ کرو
ادا ادا پہ زمانے کا خوف طاری ہے
اب اس طرح سے ہو ملنا تو یوں ملا نہ کرو
خود اپنا جشن مناؤ برائے چارہ گری
ادب نواز حقیقت پہ اکتفا نہ کرو

ظہیر ناشاد دربھنگوی
۱۱۔ واٹ گنج اسٹریٹ کوارٹر نمبر ۳۸۔ خضر پور، کلکتہ

رہِ وفا میں نہ رہزن کے ڈر سے راہ بدل
چلے نہ ساتھ اگر کوئی تو اکیلا چل
بہت دنوں پہ تم آئے مرے تصور میں
بہت دنوں پہ کہی میں نے آج ایک غزل
جو آنکھ والے ہیں دریا کی لہر گنتے ہیں
کہے یہ کون حبابوں سے موج بن کے اچھل
کچھ اس خلوص سے ہم سے ملے وہ مقتل میں
گمان ہم کو یہ گذرا کہ ٹل گئی ہے اجل
یہی تو ایک "رفاقت" ملی ہے ورثے میں
بدل سکے گی "رقابت" نہ میرا طرزِ عمل
چلو وہیں پہ گلے مل کے پھر بچھڑ جائیں
بنائے عشق رکھی تھی جہاں پہ پہلے پہل
جو فکر مشقِ سخن ہے غزل کہو ناشاد
کہ ابتدا بھی غزل ہے اور انتہا بھی غزل

غزلیات

عشرت قادری
۱۱۔ بدھوارہ۔ بھوپال

آنکھوں سے اُٹھ گئے جو لوگ حبابوں کی طرح
یاد آتے ہیں وہ بھولے ہوئے خوابوں کی طرح
ان گنت یادیں ہتھیلی پہ لئے عصرِ رواں
ٹوٹتا جاتا ہے ہر لمحہ حبابوں کی طرح
آفرینش سے عناصر کے بکھر جانے تک
خود نمائی کا تسلسل ہے نقابوں کی طرح
دشت در دشت لئے پھرتی رہی تشنہ لبی
تا نظر پھیلے سمندر تھے سرابوں کی طرح
پڑھنا چاہو تو کوئی لفظ نہیں پڑھ سکتے
اور چہرے نظر آتے ہیں کتابوں کی طرح

خالد رحیم
بخشی بازار، کٹک

سر کشیدہ کوہسارو! اپنی عظمت کو بچاؤ
کاٹ کر پتھر کو لے جاتا ہے پانی کا بہاؤ
رات بھر شبنم کے آنسو رو چکا گلشن بہت
روشنی سورج کی پھیلی شاخسارو! مسکراؤ
تیرگی کی لاش کو دے دو اُجالوں کا کفن
بے حسوں کے شہر میں احساس کی مشعل جلاؤ
لو کتاب زندگی کا میں اُلٹتا ہوں ورق
رو نہیں سکتے جو تم مجھ کو ذرا ہنس کر دکھاؤ
موڑ دو بہتے ہوئے دریا کے رُخ کو موڑ دو
سوچتے کیا ہو چلو آگے بڑھو بڑھتے ہی جاؤ
ڈر کے وہ اشکوں کے چھینٹے سے دُبکتے ہیں آپ سے
جب بھڑک اُٹھتا ہے خالد تیری یادوں کا الاؤ

کشن دت طوفان
احاطہ ٹھاکر داس، نیو روہتک روڈ، نئی دہلی

کسی کے کام دُنیا میں نہ کوئی چارہ گر آیا
بشر اپنے عمل سے خود عروجِ بام پر آیا
نہ جانے کونسی راہوں سے میں منزل پہ پہنچا ہوں
مرے نقشِ قدم کو ڈھونڈتا خود راہبر آیا
خزاں کے دور کی ویرانیوں سے دل پریشاں تھا
بہاروں میں خیال زینت برق و شرر آیا
ہزاروں لالہ و گل بانکپن سے مسکرا اُٹھے
وہ کیا آئے خزاؤں میں بہاروں کا اثر آیا
عجب یہ ماجرا طوفان ہے مگر محبت میں
جو ڈوبا جان و دل سے ایک دن آخر اُبھر آیا

نئی کتابیں

An Anthology of classical Urdu love lyrics.

D.J.Mathews and C. Shekle

ڈی جے میتھیوز اور سی شیکل
این انتھالوجی آف کلاسیکل اردو لَولیرکس
(انتخاب اردو غزلیات مع انگریزی ترجمہ)
آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس دہلی۔ ۱۹۷۲۔ صفحات ۲۸۳ قیمت ۲۵ روپے

میتھیوز اور شیکل، لنڈن کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں علی الترتیب اُردو اور اُردو و پنجابی کے لیکچرر ہیں۔

موجودہ کتاب ایسے طلبا کو جن کی مادری زبان اُردو نہیں انگریزی ذریعۂ تعلیم کی مدد سے اُردو غزل سے روشناس کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ لہٰذا اسے ایک درسی کتاب کہا جاسکتا ہے۔ گوکہ مولفین نے مرحوم راجا صاحب محمود آباد سے بھی استفادہ کیا ہے جو پاکستان کے بانیوں میں تھے لیکن قیام پاکستان کے بعد زیادہ تر عراق و انگلستان میں مقیم رہے، لیکن تعجب ہے کہ مولفین کے مقدمے میں جا بجا تسامحات ہیں۔ مثلاً مرثیہ کو واقعۂ کربلا سے متعلق سہ اشعاری نظم طویل بتایا گیا ہے جو نہ تو ہیئت کے اعتبار سے تسلی بخش تعریف ہے کیونکہ اس سے اول چار مصرعوں کے ہم قافیہ ہونے اور بیت کے مختلف القافیہ ہونے کی صراحت نہیں ہوتی اور نہ اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ معنوی اعتبار سے صنف مرثیہ محض واقعۂ کربلا تک محدود نہیں ہے اور نہ اس کی ہیئت ہی متعین ہے۔ ملاحظہ ہو "مرثیہ غالب" از حالی۔ اسی طرح ہندوستان کے فارسی شعرا کا ذکر کرتے ہوئے مولفین نے محض خسرو، فیضی، بیدل اور اقبال کو قابلِ ذکر سمجھا ہے جو عرفی اور غالب کے ساتھ زیادتی کہی جاسکتی ہے۔

جہاں تک اُردو غزل کا تعلق ہے مولفین نے داغ کے بعد محض حالی، اقبال اور حسرت کا ذکر اور انتخاب کیا ہے اور یگانہ، جگر، فانی، آرزو، اصغر وغیرہ سے اجتناب کیا ہے۔

اُردو غزلیہ شاعری کا انگریزی میں ترجمہ کرنا کوہ کندن وکاہ برآوردن کے مصداق ہے۔ ایڈورڈ فٹز جیرالڈ نے 'رباعیاتِ عمر خیام' کا مفہوم (ترجمہ نہیں) اپنی زبان میں پیش کیا، فرانسس وآلی نے چینی شاعری کے کامیاب ترجمے کئے اور وکٹر کیرنن نے اقبال اور فیض کے ترجمے میں خاصی کامیابی حاصل کی۔ دراصل جہاں تک شاعری میں فکر و معنی کا تعلق ہے وہ دوسری زبان میں بڑی حد تک منتقل ہوسکتے ہیں لیکن جہاں تک محاورہ، روزمرہ، صنائع و بدائع اور صوتی ترنم کی بات ہے جو اُردو غزل کے بنیادی ستون ہیں، اُن کا ترجمہ ممکن ہی نہیں۔ غزل کا ہر لفظ ایک ستار کی مانند ہوتا ہے جس کے بالائی تاروں کے نیچے زیریں تار بھی ہوتے ہیں اور ان زیریں تاروں کی جھنکار یا تحتی معنی و ترنم کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کی کوشش سعی لاحاصل ہے۔ چنانچہ اُردو غزل کا انگریزی میں ترجمہ کرنے والا قدم قدم پر ایسی ہی ٹھوکریں کھائے گا جیسی میتھیوز اور شیکل کو درپیش آئی ہیں۔

مثال کے طور پر میتھیوز اور شیکل نے غالب کا یہ شعر ؎

نیند اس کی ہے، دماغ اسکا ہے، راتیں اس کی ہیں ✦ تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

یوں ترجمہ کیا ہے:

To him comes sleep and self respect,
to him belong the nights,
On whose arms your locks are scattered.

اس ترجمے میں یہ خوبی تو ضرور ہے کہ ایک مصرع کا مفہوم ایک لاین میں ادا ہوگیا، لیکن نہ صرف "دماغ" کا ترجمہ 'self-respect' اور 'پریشاں ہوگئیں' کا ترجمہ 'are scattered' محلِ غور ہے بلکہ پہلے مصرع کی بات ہی نہیں بن پاتی۔ کیونکہ مصرع میں اُس کی، اُس کا اور اُس کی کی تکرار سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ انگریزی ترجمے میں مفقود ہے اور شاید اس کا سبب پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کا وہی کلیہ ہے کہ جو شعر کو درست طور پر پڑھ نہیں سکتا وہ اس کا درست مطلب بھی نہیں نکال سکتا۔ کوئی اُردو کا مزاج داں شاید اس شعر کا یوں ترجمہ کرتا۔

Only he can enjoy sleep and feel elated,
Only he can claim the nights belong to him,
On whose arms thy tresses may lie scattered.

اس سے یہ مراد نہیں کہ یہ کتاب کارآمد نہیں یا یہ کہ اگر کوئی ایسا انگریزی داں جس کی مادری زبان اُردو ہے، اُردو غزل کو انگریزی میں ترجمہ کرنے بیٹھے تو وہ بھی ایسی ٹھوکریں نہیں کھائے گا۔ دراصل کامیاب ترجمہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو دونوں زبانوں کو مادری یا پدری زبان کے طور پر بولتے اور لکھتے ہوں یا ایسے دو لوگوں کے اشتراک سے ممکن ہے جو اپنی اپنی زبانوں کے ماہر ہوں اور ایک دوسرے کی زبان میں اچھا درک رکھتے ہوں۔

مولانا جلال الدین محمد رومی
مثنوی دفتر دوم
ترجمہ و مقدمہ از قاضی سجاد حسین
سب رنگ کتاب گھر۔ دہلی۔ ۶ (تاریخ اشاعت درج نہیں) مقدمہ مورخہ یکم فروری ۱۹۷۶۔ صفحات ۳۶۰۔ قیمت ۱۸ روپیہ۔

مولانا روم نے اپنی مثنوی کا دفتر دوم دو سال کی تاخیر کے بعد اس شعر سے شروع کیا تھا۔

مدتے ایں مثنوی تاخیر شد ✦ مہلتے بایست تا خوں شیر شد

(ایک مدت تک مثنوی لکھنے میں تاخیر ہوگئی) ✦ (کچھ وقت چاہئے کہ خون سے دودھ بنے)

اگر اس شعر میں 'مثنوی' کی جگہ 'تبصرہ' رکھ دیا جائے تو بھی شعر حسبِ حال رہتا ہے۔ کیونکہ بعض کتابیں چکھنے کی ہوتی ہیں، بعض محض سرسری دیکھنے کی اور بعض بغور پڑھنے اور ہضم کرنے کی۔ اس کتاب کے بارے میں یہی عذر شرعی پیش کیا جاسکتا ہے کہ تبصرہ نگار واقعی 'مثنوی' ترجمہ اور مقدمہ کے بغور پڑھنے میں مصروف تھا۔ مشکل یہ آن پڑی تھی کہ فارسی اصل کا جادو اس کی روانی اور نغمگی قدم قدم پر دامن گیر ہو جاتی تھی اور قاضی سجاد حسین صاحب کے لئے دل

سے دمانکلتی تھی کران کے توسط سے رومی کی بانسری کا نغمہ تبصرہ نگار جیسے فارسی سے نابلد اُردو والوں تک پہنچ سکا۔ قاضی صاحب نے نہ صرف لغوی ترجمہ مہیا کیا ہے بلکہ حواشی میں ضروری تلمیحات و اشارات کی وضاحت بھی کردی ہے۔ سب رنگ کتاب گھر نے اپنی طباعت کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا ہے۔

(مہدی عباس حسینی)

"پوشکن"

پبلشر:۔ ترقی اُردو بورڈ، وزارت تعلیم حکومت ہند، راما کرشنا پورم، نئی دہلی

صفحات:۔ ۲۳۲ قیمت ۱۲ روپے (۱۲/۴۵)

یہ اچھوتی کتاب، جو آفسٹ پر بڑے اہتمام سے شائع کی گئی ہے بلا مبالغہ اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہے۔ نثر کے لحاظ سے دیکھئے تو اتنا کہنا کافی ہوگا کہ یہ ڈاکٹر ظ۔ انصاری کی تصنیف ہے اور بلحاظ نظم یہ روسی زبان کے سب سے بڑے شاعر کے کلام سے آراستہ ہے منظوم ترجمے کو پڑھتے وقت یہی گمان ہوتا ہے کہ یہ اردو کے کسی ایسے کلاسیکی شاعر کا کلام ہے جس نے روس میں رہ کر روس کے متعلق لکھا ہے۔

مصنف نے کتاب کی تقسیم دس ابواب میں کی ہے اور تعارف کے طور پر "پہلا ورق" میں بتایا ہے۔

"پوشکن کی مختصر سی، لیکن بھرپور، رنگا رنگ، بے قرار اور مردانہ وار زندگی کے ساتھ اس کے فن کا، کاوشوں اور سازشوں کا مطالعہ کرتے وقت دراصل ہم پورے ایک دور کی تہذیبی زندگی اور ذہنی پیچ و تاب سے روشناس ہو جاتے ہیں۔ اور ہم ایک بڑے شاعر یا اس شاعری و طرز بیان سے ہی آگاہ نہیں ہوتے بلکہ اس پس منظر میں بھی جھانک لیتے ہیں جس پر اگلی نسلوں نے سوانگ رچایا"

دیباچے کا یہ بیان آگے کے دو سو بتیس صفحات میں پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے۔ پوشکن غالب کا ہم عصر تھا اور اسی کی طرح بے تاب اور تمنا کا آخری قدم تلاش کرنے کا عادی، اس کے کلام میں آزادی کی لہر اتنی اونچی اٹھتی ہے کہ مطالعہ کرنے والے کے جسم و جان میں لرزش پیدا کر دیتی ہے۔ ظ۔ انصاری نے اس کتاب میں پوشکن کی صرف سات چھوٹی اور تین طویل نظموں کو شامل کیا ہے۔

شاعر اعظم پوشکن کی زندگی اور اس کے فن کو جس منطقی تسلسل، تاریخی پس منظر اور شگفتہ و رواں پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ تو اپنی مثال آپ ہے ہی مگر وہ ضمیمہ جو شخصیات کے عنوان سے شامل کتاب ہے اس کی داد دیئے بغیر بھی رہا نہیں جا سکتا کیونکہ حقیقتاً وہ روس کی ذہنی تاریخ میں ایک دریچہ کھولا گیا ہے۔ مصنف نے شیکسپیئر سے لیکر پوشکن کے عزیز دوستوں تک تمام اہم ہستیوں سے ہماری بے تکلفانہ ملاقات کرا دی ہے۔

پوشکن پر یہ اہم تصنیف جو پہلی بار کسی ہندوستانی زبان میں شائع ہوتی ہے اردو۔ کتابت کی کچھ فروگذاشتیں اور خرابیاں بھی رکھتی ہے مگر چند نادر تصویریں اس کی پورتی کر دیتی ہیں اور کتاب کے حسن و وقعت کو بڑھا دیتی ہیں۔

امید ہے کہ یہ کالج کے طلباء، شعراء، ادیبوں کے شوق کو تسلی دے گی اور ہر قسم کے قاری کے ذہنی افق کو وسیع کرنے میں مفید ثابت ہوگی۔

(حسن عباس فطرت)

غزل

رونق گیاوی
کول گھر۔ جھریا

دھوپ کی گود میں تا دیر جو شبنم ٹھہرے
پھر مرے شہر میں تفریح کا موسم ٹھہرے
تنگ کرے کی گھٹن آپ سے دیکھی نہ گئی
[redacted]
میرے احساس کے آنگن میں بہت کم ٹھہرے
تجربہ کوئی ہو شعلوں میں نہاں ہوتا ہے
وقت نے گھاؤ دیا تھا ہمیں مرہم ٹھہرے
نقش برآب سہی گزرے زمانے کا عتاب
عہدِ حاضر تو مرے خواب کا پرچم ٹھہرے
وقت کی دھوپ میں زہراب پیا ہے اس نے
آج پھر کیسے گھنی چھاؤں میں گوتم ٹھہرے
[redacted]

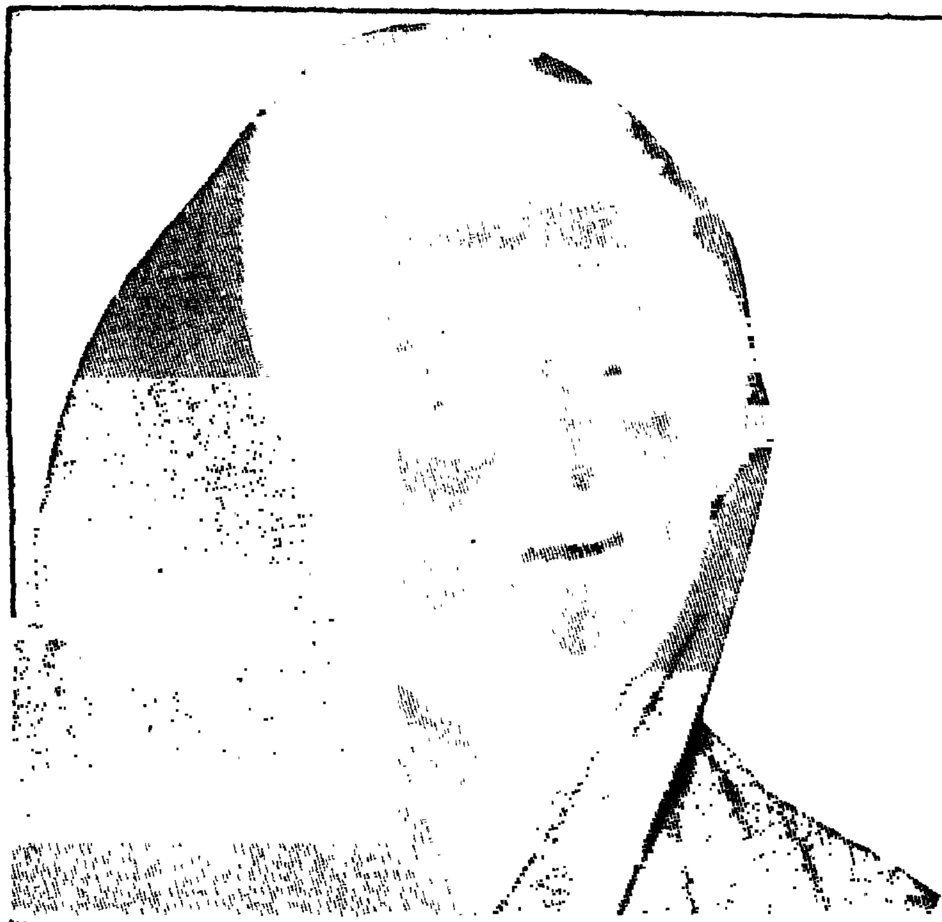
بقیہ مجرم

بجھ کر رہ گئی۔

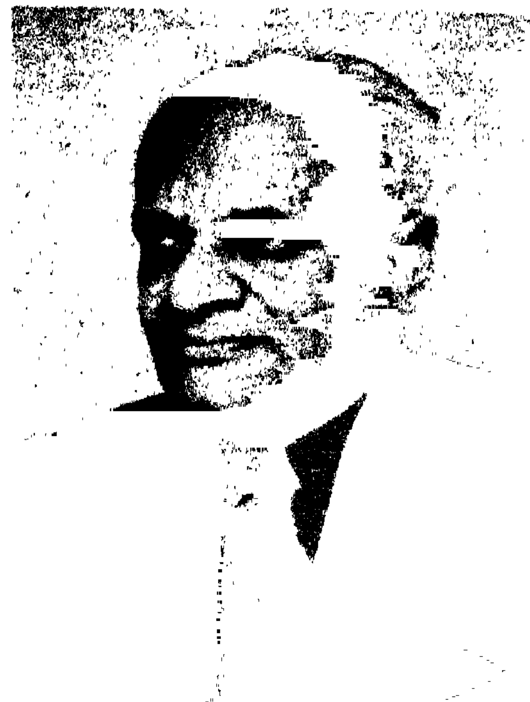
یک بیک اس نے اپنی پیٹھ پر ایک ہاتھ رکھا ہوا محسوس کیا اس نے سر اٹھایا اور گھور کر دیکھا۔ گورکن کھڑا کہہ رہا تھا "بابو! کب تک یہاں پڑے رہو گے۔ جاؤ گھر جاؤ۔ بچے انتظار کر رہے ہونگے"۔ اس کا دل اس جگہ سے ہٹنے کا نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر بچوں کا خیال آتے ہی وہ بجلی کی سی سُرعت سے اُٹھا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے بچوں کو چوکی پر بے بسی کی حالت میں پڑے پایا۔ اختر اور سیما بلک بلک کر کہنے لگے "ابا جان! اماں کو کہاں چھوڑ آئے"، اختر اور سیما کو روتے دیکھ کر اظہر بھی زور زور سے چیخنے لگا اور سب سے چھوٹا نحیف و لاغر بچہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر سسکنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا اور وہ غیر شعوری طور پر بڑبڑانے لگا "میں مجرم ہوں میرے بچو!... اُف یہ جُرم کیسا ہے؟ مجرم میں ہوں اور سزا بچے بھگتیں... .." یہ کہہ کر اس پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے اپنی قمیض پھاڑ دی اور اپنے بالوں کو نوچنے لگا۔ باپ کی ہسٹریائی کیفیت دیکھ کر بچے چلا چلا کر رونے لگے "ابا! ایسے نہ کیجئے۔ ابا ایسے نہ کیجئے، ابا میرے ابا......"

ہریجنوں کی فلاح و بہبود — بقیہ صفحہ

نہیں کہ ہاتھ کے ذریعہ گندگی ڈھونے کا طریقہ ختم ہوسکے گا بلکہ فضا میں کثافت بھی کم ہو جائے گی۔ نیز اس طرح تیار کیے گئے کھادوں کے سبب کھادوں کی تیاری پر بوجھ بھی کم ہو سکے گا۔ صفائی کے محکمے کا کام بھی آسان ہو جائے گا اور ہریجنوں کو سماج میں ایک نیا مقام حاصل ہوگا۔ ہریجنوں کو خاندانی منصوبہ بندی کے پروگراموں کو بھی سختی سے اپنانا ہوگا۔ اس کے بغیر غربت دور نہیں ہو سکتی۔



غالب ایوارڈ پانے والے



قاضی عبدالودود



کرشن چندر



محمد حسن



معین احسن جذبی

Regd. No. D(D)-103



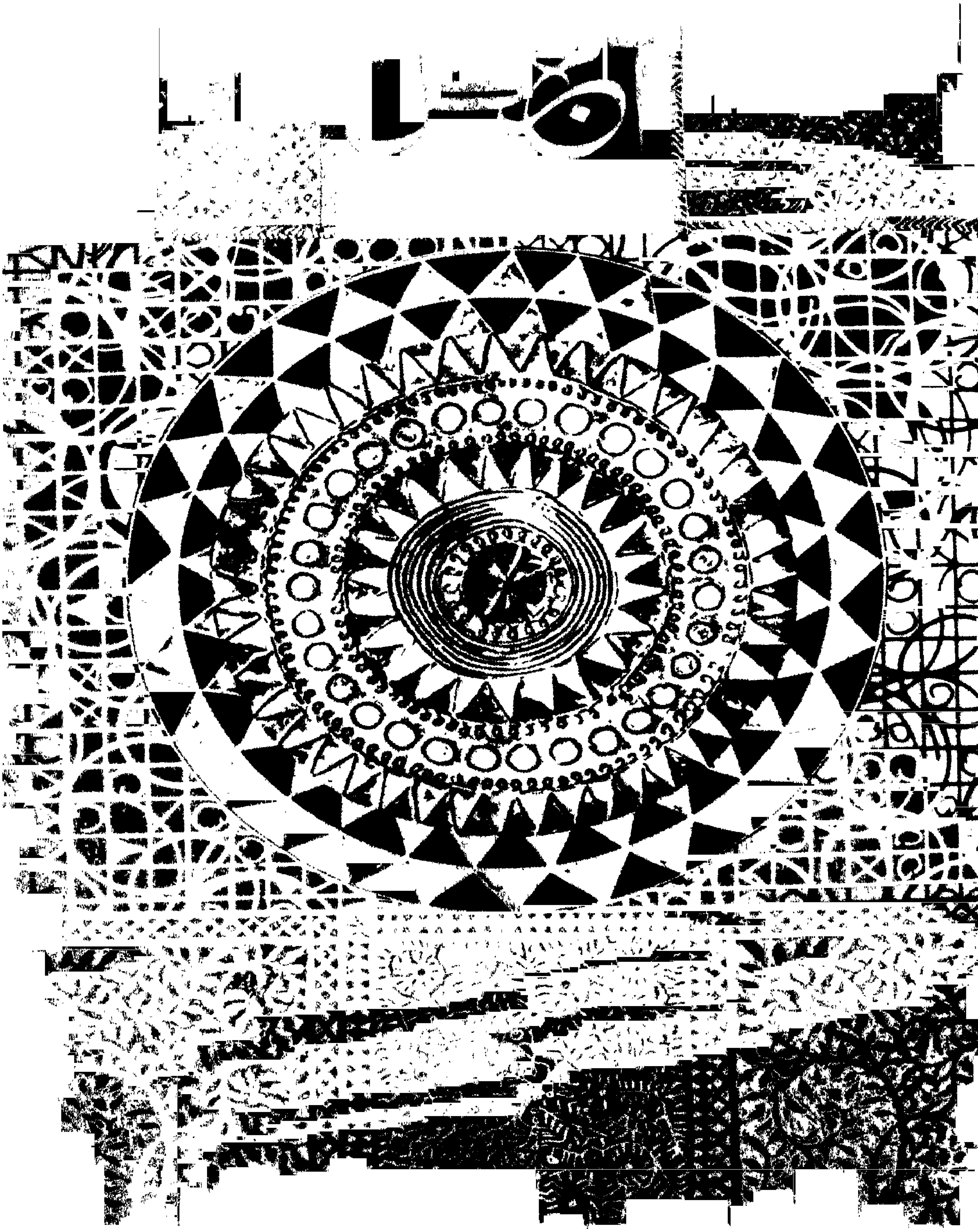
قاضی نذرالاسلام

[۲۴ مئی ۱۸۹۹ء ـــــــ ۲۹ اگست ۱۹۷۶ء]

Vol.35 No.3 AJKAL (MONTHLY) October 1976

Published by thr Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001.

Printed by Skylark Printers, 11355, Id-[illegible] Road, New Delhi-110055.





گاندھی جینتی

۲ اکتوبر [illegible] کو پوری قوم نے مہاتما گاندھی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقع پر دہلی میں متعدد تقاریب ہوئیں مہاتما گاندھی کو خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں صدرِ جمہوریہ اور وزیرِ اعظم کے علاوہ متعدد قومی رہنما شامل تھے۔



صدرِ جمہوریہ
شری فخرالدین علی احمد
مہاتما گاندھی
کی سمادھی (راج گھاٹ) پر ہار
چڑھا رہے ہیں

وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی مہاتما گاندھی کی سمادھی پر پھول چڑھا رہی ہیں



اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

آج کل
نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

سرورق عمل: آر سارنگن

جلد نمبر ۳۵ شمارہ نمبر ۴

نومبر ۱۹۷۶ء

کارتک اگر ہائن شک سمت ۱۸۹۸

شرح چندہ

سالانہ	دس روپیہ	۳ ڈالر	۱٫۵۰	پاؤنڈ
دوسالہ	۱۷ روپیہ	۵ ڈالر	۲٫۵۵	پاؤنڈ
سہ سالہ	۲۴ روپیہ	۷ ڈالر	۳٫۶۰	پاؤنڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	۳۰ سینٹ	۱۵	پنی

ترتیب

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آج کل" معرفت پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱

ملاحظات

پانچویں پنج سالہ پلان کی منظوری

۲۴ اور ۲۵ اگست ۱۹۷۶ء کو نئی دہلی میں قومی ترقیاتی کونسل کا اجلاس ہوا۔ جس میں پانچویں پنج سالہ پلان کو منظوری دی گئی۔ مسودہ ۱۹۷۴ء میں پلان کے آغاز کی بنیاد پر تیار کیا گیا تھا۔ اس پلان کے تحت سرکاری زمرے میں ۲۹۳۰۳ کروڑ کی سرمایہ کاری ہوگی۔ اور اگر اس میں متفرق اخراجات کو جوڑ دیا جائے تو سرکاری زمرہ کی سرمایہ کاری بڑھ کر ۴۲،۳۰۰ کروڑ ہو جائے گی۔ منصوبے کے آخری دو برسوں یعنی آئندہ دو برسوں میں سرکاری زمرے کی سرمایہ کاری ۱۹،۹۰۲ کروڑ روپے ہوگی۔

منصوبے میں ۷۹-۱۹۷۴ء کے دوران فی سال ۴ر۳۷ فی صد کے حساب سے شرح پیداوار مقرر کی گئی ہے۔

کونسل نے یہ منصوبہ اس وقت منظور کیا ہے جب کہ اس کی مدت کے دو سال بیت چکے ہیں۔ یہ دو برس کا دور معاشی بحران اور افراط زر کا دور تھا مگر ان امور پر قابو پا لیا گیا ہے۔ ملکی معاملات میں نظم وضبط کا ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے لہٰذا امید ہے کہ آئندہ دو برسوں میں اس منصوبے پر زیادہ تیزی سے پیش رفت ہوگی اور ملک مزید ترقی سے دوچار ہوگا۔

کونسل سے خطاب کرتے ہوئے وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اس بات پر زور دیا کہ پبلک مفاد کے سرکاری کاروبار کو اس طرح سے چلایا جائے کہ اس میں لگے ہوئے سرمایے پر منافع حاصل ہو۔ اس سلسلے میں وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے فرمایا تھا کہ سرکاری ادارے کوئی فلاحی یا خیراتی ادارے نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ بات اصولی طور پر صحیح ہے کہ ان سے منافع حاصل ہونا چاہیے لیکن یہ مقصد کفایت شعاری، خوش انتظامی سے حاصل کرنا چاہیے نہ کہ آبیانہ اور محصول بڑھا کر۔ تاہم بڑے کارخانوں اور فارموں کے لیے پانی اور بجلی کی سپلائی کے نرخ بڑھائے جاسکتے ہیں۔

وزیراعظم نے اجرتوں کی "قومی پالیسی" کی تیاری میں تاخیر پر بھی اظہار تشویش کیا اور ریاستی وزرا اعلیٰ کو ہدایت کی کہ وہ انتہائی محتاط رہیں اور اشیا کی قیمتوں اور مارکٹنگ مثلاً چاول، گیہوں اور خوردنی تیل وغیرہ کے سلسلے میں ایسے فیصلے نہ کریں جن سے قومی مارکیٹ کی کارکردگی متاثر ہو۔ انھوں نے فرمایا کہ قیمتوں میں اضافہ، اجرتوں اور سامان کی پیداوار کی قیمت میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ قوم کی ترقی کے لیے منصوبہ بندی کے پروگراموں میں عوام کی شرکت لازمی ہے۔ دیہی علاقوں میں سڑکوں، پلوں اور اسکول کی عمارتوں کی تعمیر اور امداد باہمی کے اداروں میں تعاون کے لیے انھوں نے منصوبہ بندی کمیشن، وزارت خزانہ اور ریزرو بنک کو ہدایت کی کہ وہ دیہی علاقوں میں اس مقصد کے لیے رہنمایانہ پالیسی تیار کریں۔

سرمایہ کاری

	کروڑ روپے
پہلا پنج سالہ پلان	۲۰۶۹
دوسرا پنج سالہ پلان	۴۶۷۲
تیسرا پنج سالہ پلان	۸۵۷۷
چوتھا پنج سالہ پلان	۱۶۱۶۰



وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی اور وزیر خزانہ شری سبرامنیم قومی ترقیاتی کونسل کے اجلاس میں

آجکل نئی دہلی

وزیر اعظم نے قیمتوں کے محاذ پر بروقت چوکنا رہنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ملک کی تمام دشواریاں پوری طرح سے دور نہیں ہوئی ہیں ۔ افراط زر پر قابو پا لیا گیا ہے لیکن اس کا خاتمہ نہیں ہوا ہے ۔ کرنسی کا پھیلاؤ اب بھی تیز ہے ۔ اور اس پر قابو اس وقت تک نہیں پایا جا سکتا جب تک کہ مرکز اور ریاستی حکومتیں دونوں اپنے اخراجات پر سختی سے کنٹرول نہ کریں ۔ آپ نے مزید کہا کہ اگر قیمتوں کو بڑھنے دیا گیا تو منصوبے کے حقیقی مقصد کو نقصان پہنچے گا ۔ اس پلان کے بڑے اہم مقاصد یہ ہیں کہ ملک معاشی طور پر خود کفیل ہو سکے اور غربت دور ہو ۔

وزیر اعظم نے اس نئے معاشی پروگرام کی نمایاں کامیابیوں کا ذکر کیا جو گزشتہ سال سے شروع کیا گیا ہے ۔ آپ نے کہا کہ اناج کی پیداوار ہمیشہ سے زیادہ ہوئی جو ۱۱ کروڑ ۸۰ لاکھ ٹن ہے ۔ بجلی گھروں کی کارکردگی کوئلے ، فولاد ، اور کیمیاوی کھاد کی پیداوار میں نمایاں اضافہ ہوا ہے ۔ اور بمبئی ہائی میں تیل کی دریافت سے غیر ملکی زر مبادلہ میں بھی کافی بچت ہوئی ہے ۔ پانچویں پنج سالہ پلان کی منظوری ایک "حوصلہ افزا قدم" ہے جس سے ملک کی معیشت میں نمایاں پیش رفت ہوگی ۔

یونسکو کے تیس سال

۴ نومبر ۱۹۷۶ء کو اقوام متحدہ کے معاشی تہذیبی اور سائنسی ادارے "یونسکو" کو قائم ہوئے ۳۰ سال ہو گئے ۔ اس قلیل عرصہ میں اس عالمی ادارے نے دنیا کے تمام ممالک خصوصاً پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کی تعلیمی سائنسی اور معاشی میدان میں غیر معمولی خدمات انجام دیں جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا ۔

اس ادارے کے قیام کا مقصد اقوام عالم کی معاشی نابرابری کو دور کرنا ، سائنسی تعلیمات کے فروغ کے ذریعہ توہم پرستی کا خاتمہ کرنا ، اور تہذیبی لین دین کے ذریعہ مختلف تہذیبوں اور قوموں کے درمیان رواداری پیدا کرنا ہے جس سے انسانی زندگی کی بہتری و خوشحالی کا راستہ ہموار ہو سکے ۔

یہ ادارہ تعلیم کو بڑی اہمیت دیتا ہے ۔ ناخواندگی کو ختم کرنا ، ابتدائی اور لازمی تعلیم کو فروغ دینا اور تعلیمی معیار کو بلند کرنا اور جدید تعلیمی طریقۂ کار سے زیادہ سے زیادہ ممالک کو روشناس کرانا اس کا نصب العین رہا ہے اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے گزشتہ تیس برسوں میں تعلیم سے متعلق اس ادارے نے متعدد سیمینار منعقد کیے ، اساتذہ کو تربیت دی اور تبادلے کے طور پر مختلف ممالک میں بھیجا ۔ نصاب کی کتابوں کو جدید ڈھنگ سے تیار کیا اور کم ترقی یافتہ ممالک کے اسکولوں اور کالجوں اور سائنسی اداروں کی ضروریات کو پورا کیا ۔

اسی طرح سے ان ممالک کو بھی سائنسی معلومات ، تحقیقات اور انکشافات سے روشناس کیا ، جو سائنسی تحقیق و جستجو میں کثیر رقم خرچ نہیں کر سکتے ۔ اس طرح ان ممالک میں سائنسی بصیرت پیدا ہوئی جس میں جدید دور کی ترقی کا راز مضمر ہے ۔

اس کے علاوہ اس ادارے نے تہذیبی لین دین کا ایک بہت بڑا پروگرام شروع کر رکھا ہے جس کے تحت فنون لطیفہ کے ماہر جیسے شاعر ، ادیب ، موسیقار ، مغنی ، فن کار ایک دوسرے ملکوں میں آتے جاتے رہتے ہیں جس سے دوسرے ممالک کی تہذیبی اقدار و روایات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے ۔ اسی طرح یہ ادارہ مختلف ممالک کی تہذیب ، زبان ، ادب ، اور رسم و رواج سے مختلف قوموں کو روشناس کراتا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کے قریب آئیں اور ان کے درمیان اجنبیت اور غیریت کی حائل خلیج دور ہو سکے ۔

شرت چندر چٹرجی



۱۵ ستمبر ۱۹۷۶ء کو ملک بھر میں بنگلہ کے عظیم ناول نویس شرت چندر چٹرجی کی صد سالہ جینتی منائی گئی ۔

شرت چندر چٹرجی کی پیدائش آج سے سو برس پیشتر بنگال کے ایک چھوٹے سے گاؤں دیوانند پور کے ایک غریب برہمن گھرانے میں ہوئی ۔ ۱۸۹۴ء میں انھوں نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور پھر ۱۹۰۳ء میں تلاش معاش میں برما چلے گئے ۔ وہاں لگ بھگ بارہ برس مختلف دفاتر میں کام کرتے رہے اور جب بحیثیت ادیب ان کی شہرت

یادوں کے گلاب – جواہرلال نہرو



جواہرلال نہرو
۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء – ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء

شعلے گو وقت نے برسائے بہت کچھ لیکن
آج بھی مہکے ہوئے ہیں تری یادوں کے گلاب

آج بھی تیرے تبسّم کی ہے بارش دل پر
آج بھی چھائے ہوئے ہیں تیرے اشکوں کے سحاب

آج بھی ہیں متجسس ترے قد کے سائے
آج بھی وجد کناں ہیں در و بام و محراب

نمِ شبنم بنی جب دھوپ کبھی تیز ہوئی
ہوگئے اور شگفتہ تیرے قدموں کے گلاب

کچھ اثر طولِ سفر کا نہیں اُس کے رخ پر
آج بھی شیب کے چہرے پہ دمکتا ہے شباب

لاکھ طوفاں سہی طوفانوں سے کیا ہوتا ہے
آج بھی راہ نما ہے لبِ دریا گرداب

جب کیا امن کی راہوں میں کبھی یاد تجھے
ذرّے ذرّے میں اُبھر آئے کنول کے تالاب

اب بھی ہے گھور اندھیرے میں اُجالا اِن سے
آج بھی نقشِ قدم ہیں تیرے رشکِ مہتاب

سفر اپنا ہے دراز اور بھی ہو جائے دراز
کشتی اپنی ہے رواں توڑ کے قیدِ گرداب

ہم رہِ شوق میں بھٹکے ہیں نہ بھٹکیں گے کبھی
رہنما آج بھی ہے تیری تمنّا ترے خواب

اے سراپائے چمن، جانِ چمن، شانِ چمن
آج بھی مہکے ہوئے ہیں تیری یادوں کے گلاب

اور بجتا ہی رہے گا تری یادوں کا رباب
اور مہکتے ہی رہیں گے تیری یادوں کے گلاب

شمعِ محفل ہے کبھی مشعلِ منزل ہے کبھی
آج بھی تیرے مہکتے ہوئے سینے کا گلاب

ساغر نظامی
ڈی ٹو ۳۵۹ پنڈارہ روڈ، نئی دہلی

اعجاز صدیقی
قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

آٹھ شعر

سالگرہ
کے موقع پر
شریمتی اندرا گاندھی کی نذر



یہ جگر کاوی، یہ فکر انگیزیِ عزم و عمل
بھر رہی ہو خونِ دل سے قوم کا پیمانہ تم

اس کا مستوں کو مگر وہم و گماں تک بھی نہ تھا
یوں لگا دوگی یکایک نعرۂ مستانہ تم

اس کا ہر کردار مستقبل کا ہوگا آئینہ
کر رہی ہو جو مرتب اک نیا افسانہ تم

گوشہ گوشہ جگمگا اٹھے گا اب تاریخ کا
یوں بڑھانے پر تلی ہو رونقِ کاشانہ تم

ہے نظر افروز شیشوں میں شرابِ نو بہ نو
اور ان کے درمیاں ہو، حاصلِ میخانہ تم

تم پہ پروانوں کی صورت ہو رہے ہیں سب نثار
بن گئی ہو اپنی ضو سے شمعِ محفل خانہ تم

سن رہے ہیں جس کو ذوق و شوق سے محفل میں لوگ
عصرِ نو کا ہو وہ جیتا جاگتا افسانہ تم

میرا شیشہ مے سے خالی ہے تو اس کا غم نہیں
ہے خوشی اس کی کہ ہو رنگینیِ خمخانہ تم

عرشؔ ملسیانی
ایف ۱۱/۴، ماڈل ٹاؤن ، دہلی

باقیاتِ جوشؔ ملسیانی

فصیح الملک مرزا داؔغ مرحوم سے سلسلۂ تلمذ ایک عزیز کے استفسارات[1] کے خط مورخہ ۸ جولائی ۱۹۶۰ء سے ظاہر ہو جائے گا۔ والد صاحب نے اس کا ذکر تفصیل سے کر دیا ہے اس خط کا اقتباس آگے درج ہے۔

اسی خط میں ۱۹۰۹ء میں اپنی خانہ تلاشی کا ذکر کیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس زمانہ میں ان کے ایک ہم جماعت لالہ رونق رام شاؔد تھے۔ یہ بھدوڑ ریاست پٹیالہ (حال ضلع سنگرور) کے رہنے والے تھے۔ ان پر پٹیالہ سرکار نے سڈیشن کے جرم میں مقدمہ چلایا۔ والد کی خط و کتابت ان کے گھر سے برآمد ہوئی۔ ان کی بھی تلاشی ہوئی اور پولیس ادبی اثاثہ بھی لے گئی جس میں ادبی خطوط حضرت داغ کی اصلاح کردہ غزلیں اور کلام کی بیاضیں بھی شامل تھیں۔ شاؔد صاحب سے ان کی دوستی اور استوار ہو گئی۔ ان کا انتقال ہوئے تو ایک زمانہ ہو گیا۔ افسوس کہ یہ مخلص دوست طالب علمی کے زمانہ کے بعد پھر کبھی نہ مل سکے۔ ان کے صاحبزادے نے خطوط کا ایک پلندہ میرے پاس والد کی وفات کی خبر سن کر بھیجا۔ اس میں بہت سا غیر مطبوعہ کلام بھی ہے۔ ایک دلچسپ نظم بھی ہے۔

خط کا اقتباس

"حضرت داغ کے ہندو تلامذہ میں جو نام آپ نے شامل کیے ہیں۔ ان میں پروفیسر نارائن پرشاد مہرؔ گوالیاری کا نام شامل نہیں ہے۔ منوہر سہائے انورؔ[2] انھیں کے فرزند ہیں۔ مہرؔ صاحب کا نام اساتذہ میں شامل ہے۔ کلام کا مجموعہ شعاعِ مہرؔ کے نام سے مکمل ہو چکا ہے۔

ان کے علاوہ رعدؔ گوالیاری ہیں۔ نام یاد نہیں رہا۔ قصبہ بھنڈ مشمولہ ریاست گوالیار میں رہتے تھے۔ یہ قصبہ وادی چنبل میں بڑے بڑے ڈاکوؤں کی پناہ گاہ ہے

[1] ۲۰ جنوری ۱۹۶۰ء

[2] اب موصوف بھی مرحوم ہو چکے ہیں

تیسرے صاحب حضرت زارؔ دہلوی ہیں۔ جو بفضلہ بقید حیات ہیں۔ گلزارؔ دہلوی انھیں کے فرزند ہیں۔

میرا سلسلۂ تلمذ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۴ء کے اخیر تک ہے۔ ۱۹۰۵ء غلط ہے۔ اس سال کے دوسرے مہینے میں تو ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ احسن صاحب نے خطوط بھی مانگے تھے اور اصلاحات بھی۔ خط میرے پاس نہیں آتے تھے۔ صرف اصلاح شدہ غزل ہی واپس آتی تھی۔ میں بھی درخواست اصلاح ہر غزل کے ساتھ رسمی نیازمندی ہی لکھ کر بھیجتا رہا تھا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ حضرت داغ اصلاح کا کام ہمیشہ خود کرتے تھے۔ اور کسی ہم صحبت شاگرد پر اس کام کا بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ ۱۵ - ۲۰ خطوط اصلاح طلب انھیں روزانہ وصول ہوتے تھے۔ وہ کسی عزیز سے کلام سنتے جاتے اور اصلاح لکھواتے جاتے تھے۔ نوحؔ صاحب، سائلؔ صاحب، احسنؔ صاحب اکثر ان کے ہم صحبت رہے ہیں۔

اصلاح شدہ غزلیات چالیس کے قریب تھیں۔ مہینے میں صرف ایک دفعہ میں انھیں یہ تکلیف دیتا رہا ہوں۔ مگر یہ خطوط بھی میرے پاس محفوظ نہیں ہیں۔ پٹیالہ سڈیشن کیس میں ایک دوست گرفتار ہوا۔ اس کے گھر میں سے بہت سے خطوط نکلے۔ اس لیے گرفتار شدہ کے خطوط حاصل کرنے کے لیے میرے خلاف وارنٹ خانہ تلاشی جاری ہوا، اور پولیس میرا قلمی مجموعہ اور ہر قسم کے خطوط خواہ وہ رشتہ داروں ہی کے تھے، اٹھا کر لے گئی۔ اور کوئی چیز بھی مقدمہ ختم ہونے کے بعد واپس نہ ملی۔ ایک کتاب کی جلد پر پولیٹکل اکانومی لکھا تھا۔ یہ بھی اٹھا کر لے گئی۔ یہ واقعہ ۱۹۰۹ء ماہ ستمبر کا ہے۔

احسن صاحب کی خدمت میں بھی تفصیل لکھ بھیجی تھی۔ زبانی جو آٹھ دس اصلاحیں یاد تھیں وہ بھی بھیج دی تھیں۔ ایسی چند اصلاحیں جو میرے پہلے مجموعہ کلام "بادۂ سرجوش" میں درج ہیں وہ بھی زبانی یادداشت کی مرہون منت ہیں۔

سب سے پہلی غزل جو میں نے بھیجی تھی۔ اس کا مصرع اوّل یہ ہے:

بندہ مہر بہ لب ہوں میں ثنا خواں تیرا

استاد کی وفات کے بعد نسیمؔ بھرت پوری (سید شبیر حسن) سے زبان اور فن کے شکوک رفع کرنے کے لیے خط و کتابت حسب سابق جاری رہی۔ مگر یہ اصلاح کے مقصد سے نہیں تھی۔ صرف استفساروں ہی کی صورت میں تھی۔ سلسلۂ تلمذ سے پہلے بھی میری خط و کتابت نسیمؔ صاحب سے ہوتی رہی تھی۔ اور اسی بنا پر انھوں نے مجھے اپنے استاد سے اصلاح لینے کا مشورہ دیا تھا اور اسی مشورہ کی بنا پر میری استدعا کے مطابق انھوں نے میری سفارش بھی کی تھی جو استاد نے بخوشی منظور کر لی تھی۔

میرے تمام استاد بھائی میرے ساتھ ہمیشہ مخلصانہ برتاؤ کرتے رہے ہیں۔ تنگ دلی کا برتاؤ کسی نے بھی میرے ساتھ نہیں کیا۔ ابھینندن گرنتھ

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)



نازش پرتاب گڈھی
بیگم وارڈ، پرتاب گڈھ

ہم جاگتے رہیں

تاریخ زندگی کو ہے اس بات کی خبر   بھارت رہا ہے امن و سکوں کا پیامبر
ہندوستان، قافلۂ دل کا راہبر   ہر دور میں چلا ہے اہنسا کی راہ پر
اس راہ سے کبھی کبھی ہم دور بھی ہوئے
راون ملے تو جنگ پہ مجبور بھی ہوئے

لایا ہے وقت ہم کو پھر ایسے ہی موڑ پر   میدانِ جہد میں ہے جہاں ایک اک بشر
تیغ و تبر کی طرح ہوئی تیز ہر نظر   خنجر بنی جو شاخ تو نیزہ بنا شجر
آہن کی طرح سخت ہوا پھول کا مزاج
تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے آج

کل ہم پہ فرض تھا کہ رہیں موم سے بھی نرم   لازم ہوا ہے آج کہ ہو جائیں سخت و گرم
اپنا کوئی بھی روپ نہیں ہم کو وجہ شرم   وہ بھی ہمارا دھرم تھا یہ بھی ہمارا دھرم
نغمہ بہ لب تھے امن و محبت کے واسطے
ہیں سخت گیر قوم کی عزت کے واسطے

نشاط ساز و سوزِ گلو بن رہے ہیں ہم   صبح بہار و جوشِ نمو بن رہے ہیں ہم
میخانۂ جہاں میں سبو بن رہے ہیں ہم   تاریخ کی رگوں میں لہو بن رہے ہیں ہم
اٹھے جو ہم دلوں میں ارادہ سنبھال کر
دھرتی نے دے دیا ہے کلیجہ نکال کر

اہلِ دماغ و اہل و نظر دیکھتے رہیں   لازم ہوا ہے سارے بشر دیکھتے رہیں
آنکھیں ہوں لاکھ بند مگر دیکھتے رہیں   کیا کر رہا ہے کون کدھر دیکھتے رہیں
پھولوں کی آڑ لے کے کہیں آگ چھپ نہ جائے
اپنی ہی آستیں میں کوئی ناگ چھپ نہ جائے

ہاں اہل حرب و اہل ادب جاگتے رہیں   کیا اعتبار فتنۂ شب، جاگتے رہیں
راہی، چراغ، راستے سب جاگتے رہیں   ہم لوگ جاگ اٹھے ہیں تو اب جاگتے رہیں
بھارت کی عظمتوں کو سنبھالے ہوئے بڑھیں
اپنے وطن کا نام اجالے ہوئے بڑھیں

لہ ایمرجنسی کا نفاذ (نازش)

جوگندر پال
ڈی ۱۰۹۵، نیو فرینڈس کالونی، نئی دہلی ۱۴

مقامات

سوتے سوتے آدمی اگر مرا نہ ہو تو پو پھٹنے سے پہلے یا بعد جاگ ہی پڑتا ہے۔ بہت دیر سے سہی، جمال نے بھی آنکھ کھول لی ہے۔ اُس کا خواب ٹوٹ گیا ہے لیکن ابھی تک اس کی آنکھوں میں دَھبے ناچ رہے ہیں۔

امی ــــ امی ــ ی! ــ وہ ننھا منا سا ہے اور کھویا ہوا ہے اور رو رو کر اس کی ہچکی بندھی ہوئی ہے اور اپنی ناک کی سیدھ میں چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتے ہوئے وہ اور کھوتا جا رہا ہے۔ کسی نے بھی اُسے روک کر نہیں پوچھا ہے، اُدھر کہاں جا رہے ہو بالک؟ ــــ مگر وہ بلک بلک کر جواب دے رہا ہے، امی کے پاس! ــــ اور پھر ایکدم دو باہوں نے کہیں سے کوند کر اسے لپک لیا ہے اور اپنی امی کو دیکھے بغیر اُسے پتہ چل گیا ہے کہ وہ امی ہے، اور ــــ اور امی کی پیشانی پر سے راستہ سیدھا اُن کے گھر کو ہی جاتا ہے ــــ آؤ!

جمال کے سپنے کے بکھرتے ہوئے گالے پھر ایک دوسرے کی طرف کھنچ آئے ہیں اور اس کی آنکھیں مندنے لگی ہیں ــــــ

پڑھو، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ــــ بسم اللہ ــــ

بسم اللہ

الرحمٰن الرحیم

الرحمٰن ــــ

الرحیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

مولوی صاحب، لوگوں کے دس دس ہوتے ہیں پر میرا ایک ہی دس سے کم نہیں، میرے جمال کو جلدی جلدی قرآن حفظ کروا دیجئے، پورے دس کا نذرانہ پیش کروں گی۔

پڑھو ــــ

پڑھ تو رہا ہوں مولوی صاحب۔

نہیں، دل سے پڑھو! خدا کے نام کو دل سے پڑھو گے تو تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی۔ جمال نے آنکھیں کھول لی ہیں اور کھلی آنکھوں سے بھی اُسے کچھ دِکھائی نہیں دیا ہے تو اُسے یقین آگیا ہے کہ وہ ابھی سویا ہوا ہے۔

ابھی ابھی تو امی ہمارے ساتھ تھی، کہاں گئی؟ ــــــ

امی ــــ ی! ــــ جاؤ خورشید، دیکھو امی کہاں رہ گئی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں موتیا اتر ہوا ہے، جاؤ ہاتھ پکڑ کر لے آؤ ــــ امی ــــ ی! "امی آپ کی نظروں سے اوجھل ہو جائے تو آپ کو کوئی اور نظر ہی نہیں آتا۔"

جاؤ خورشید، امی بیچاری کہیں ٹھوکر کھا کر گر جائے گی۔

مجھ بیچاری کی طرف بھی آپ کیوں نہیں دیکھتے؟ جب سے شادی ہوئی ہے ٹھوکریں کھا رہی ہوں۔ جاؤ خورشید ــــــ

جاؤ خورشید ــــــ

آپ کی بیوی بننے سے تو یہی اچھا تھا کہ میں بھی آپ کی ماں ہی ہوتی۔

اچھا، تم نہیں ٹھہرو، میں خود ــــــ

نہیں، میں گھر جا رہی ہوں۔

خورشید ــــــ!

نہیں ــــــ!

نہیں! ــــ نہیں! ــــ نہیں!! ــــ نصف شب کو ایک پاگل بُڑھیا جمال کے سونے کے کمرے کا دروازہ زور زور سے پیٹ رہی ہے۔ میں پاگل نہیں ہوں جمال ــ جما ــ ل!

سو جاؤ امی۔

نہیں بیٹے، دروازہ کھولو اور میرے پاس آکر بیٹھو بیٹے ــــ

کھٹ ــ کھٹ ــ ٹھڑ!

جمال نے بڑی بے بس نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا ہے۔

سونے کی ایک اور گولی دے آؤں خورشید؟

مارنا چاہتے ہیں تو دے آئیے۔ پہلی گولیاں دیئے ابھی پورا گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔

کھٹ ــ ٹھڑ ٹھڑ ــ کھٹ ــ ٹ!

سو جاؤ امی، کل سویرے آفاق کا اِمتحان ہے۔ خدا کے لئے سو جاؤ۔

چپ چاپ لیٹے رہیئے۔ زیادہ توجہ دیں گے تو امی کا پاگل پن بڑھے گا۔

نہیں، میں پاگل نہیں ہوں، بہو۔ دروازہ کھولو ــ مجھے بھی اپنے پاس بٹھا لو بیٹے۔ میں کچھ نہیں بولوں گی، چپ چاپ بیٹھی رہوں گی ــــ کھولو! ــــ کھٹ ــــ ٹھڑ!

افوہ ! خدارا اپنی پاگل ماں کو پاگل خانے بھیج دیجیے یا ہم سب کو ــــ وہ دیکھیے، آفاق بھی جاگ پڑا ہے ۔ ابھی ابھی سویا تھا ۔

جمال ــــ جما ــــ کھٹ کھٹ ــــ ٹھ !

جمال نے دیوانہ وار اُٹھ کے دروازہ کھولا ہے اور ماں کو تیزی سے کھینچ کر چارپائی پر پٹخ دیا ہے ۔ وہ چیخنے لگی ہے اور ــــ اور جمال کے کانپتے ہوئے ہاتھ اس کے گلے کی طرف بڑھتے ہوئے اکڑنے لگے ہیں، اکڑ اکڑ کر آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے ہیں ــــ اور پھر اچانک سنبھل کر وہ رک گیا ہے ــــ نہیں !

ــــ نہیں ! نہیں !! جمال اپنی مرحوم ماں کے خالی بیڈ روم میں بیٹھا ہوا ہے اور اس کی آنکھوں میں اپنی ماں کی صرف ناک یا صرف سر یا ماتھا یا کوئی اور حصہ گھوم رہا ہے، اب اس کی صرف آنکھیں جھپک رہی ہے، اب ہونٹ ہل رہے ہیں، اب ٹھوڑی ــــ جمال اس کے ان سارے انگوں کو جوڑ جوڑ کر اس کی پوری شبیہہ بنانا چاہتا ہے ــــ یہ ماتھا ــــ اور یہ آنکھیں اور ــــ لیکن ماتھا آنکھوں کی جگہ پر سرک آتا ہے ــــ نہیں، اب وہ کبھی اپنی ماں کی صورت کو نہیں دیکھ پائے گا، اپنی ماں کی صورت اس کے دل و دماغ میں ٹوٹ پھوٹ گئی ہے ــــ نہیں !

جمال کے خوابیدہ چہرے پر جنبش سی ہوئی ہے جیسے کوئی مردہ مچھلی نیچے سے اوپر آ رہی ہو اور تالاب کی ساکن سطح پر ہلکا سا ارتعاش ہوا ہو ۔

وہ تو پاگل تھی خورشید، اسے کیا معلوم، وہ کیا کر رہی تھی ؟ ــــ اس کی کل کائنات ایک میں ہی میں تھا اور جب میں نے بھی اس سے منھ موڑ لیا تو باؤلی اور باؤلی کیوں نہ ہو جاتی ؟ ــــ تمھیں معلوم ہے خورشید ؟ اوپر اوپر سے تو میں اس کا علاج کروا رہا تھا لیکن اندر ہی اندر اس کی موت کی دعائیں مانگا کرتا تھا ۔ ایک بار ڈاکٹر نے اس کی تکلیف دیکھ کر جب مجھ سے کہا، خدا سے دعا کرو کہ تمھاری ماں کو اٹھا لے، تو میں بہت خوش ہوا ــــ نہیں، یہ غلط ہے کہ میں اس کی اذیت سے پریشان تھا، مجھے دراصل اپنی اذیت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی پڑی ہوئی تھی ۔ ــــ میں ــــ میں اپنی ماں کے قتل کا مرتکب ہوا ہوں خورشید ــــ ہاں، میں ہی اسے موت کی طرف ڈھکیلتا رہا ہوں لیکن پاگل ہو کر بھی ماں کو کبھی اپنے بیٹے پر شبہہ نہیں گزرا ۔ اور خورشید، مرنے سے چند گھڑیاں پہلے ــــ تم نے دیکھا ؟ ــــ وہ ایسی ہو گئی جیسے کبھی پاگل تھی ہی نہیں ــــ میں نہ کہتا تھا پگلی کو معلوم ہی نہ تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے ؟ چپ چاپ ہم سب سے باری باری پیار کیا ۔ میں سب سے آگے تھا لیکن مجھ سے وہ سب کے بعد ملی ــــ جو ہمیں سب سے عزیز ہوتا ہے خورشید اس سے بچھڑنا ہم پل پل ٹالتے جاتے ہیں ــــ ہے نا ؟ ــــ وہ مجھے کس کر بھینچ لینا چاہتی تھی لیکن ہڈیوں کے گچھے میں اپنی باہیں اٹھانے کا بھی دم نہ رہا تھا ۔ میں اس کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اسے بازوؤں میں جکڑ کر روک لینا چاہا لیکن ــــ لیکن ــــ

بادل کے ٹکڑے آسمان میں یکجا ہو ہو کر نیچے اترنے لگے ہیں اور اُتر اُتر کر انھوں نے زمین کو چھو لیا ہے اور بہنے کے انداز میں اُڑنے لگے ہیں ۔ اور جمال ان میں غوطے کھائے جانے کے باوجود ڈوب نہیں رہا ہے ۔ ان کے ساتھ ساتھ بہتا جا رہا ہے اور ایک پُل کے نیچے سے بہہ گیا ہے تو پھر وہی پُل آ گیا ہے اور پھر بہہ گیا ہے تو پھر وہی پُل ــــ پھر وہی ــــ پھر ــــ اور اس نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو اس طلسم سے آزاد کرنا چاہا ہے ــــ شاید وہ جاگ پڑا ہے ؟ ــــ نہیں، ابھی نہیں ــــ

ایک بات سنو خورشید، سنو گی تو ہنس دو گی ــــ امی کو مرے کتنے سال ہو گئے ہیں ؟ ــــ پانچ ــــ نہیں، چھ، مگر مجھے خیال آ رہا ہے کہ امی مری نہیں، ہمیں یوں ہی وہم ہو گیا ہے کہ وہ مر چکی ہے ــــ ذرا سوچو، ماں مر جائے، ہماری زمین ہی مر جائے تو ہم کیونکر اپنے پیروں پر کھڑے رہ سکتے ہیں ــــ نہیں، خورشید، ماں ہمیشہ زندہ رہتی ہے ۔ کونسی ماں چاہے گی کہ اس کے لہلہاتے ہوئے معصوم پودے ایک دم کھڑے کھڑے سوکھ جائیں ؟ قدرت معصوموں کے ساتھ بے انصافی نہیں برتتی ــــ ماں ہمیشہ زندہ رہتی ہے ہمیشہ !

اسی اثنا میں اچانک جمال کا چھوٹا بچہ رفو ساتھ کے کمرے میں رونے لگا ہے اور بچے کی ماں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف بھاگی ہے ــــ اور ــــ اور جمال کو لگ رہا ہے کہ یوں ہی والہانہ بھاگتی جا رہی ہے لیکن وہیں کی وہیں ہے ــــ ٹھہرو آفاق، میں آ رہی ہوں ــــ رفو گھبراؤ نہیں، آفاق کو دیکھ کر ابھی آئی ہوں ــــ اسی طرح بھاگتے ہوئے اُسے کئی سال بیت گئے ہیں، اسی ایک لمحے میں کئی سال بیت گئے ہیں اور پھر اس نے یکبارگی رک کر پیچھے مڑ کے دیکھا ہے ــــ وہی ! ــــ وہی باؤلا سا چہرہ، دودھیلی ممتا میں چھپی چھپی جھریاں، تشویش ــــ امی ۔ می ! ــــ اتنی رات ہو گئی ہے آج پھر آفاق نہیں آیا ــــ آفاق کے ابا، سن رہے ہو ؟ آفاق ابھی تک کیوں نہیں آیا ؟ ــــ اور آفاق کا ابا اس کی طرف ایک ٹک دیکھنے لگا ہے اور دیکھتے دیکھتے چھوٹا سا نکل آیا ہے ــــ یہ تو ــــ یہ تو ــــ نہیں خورشید، ماں ہمیشہ زندہ رہتی ہے ــــ جائیے، پتہ کیجیے آفاق ابھی تک کیوں نہیں آیا ؟ ــــ آفاق ! آفاق ! ــــ کیا صرف آفاق ہی آفاق ہے ؟ ــــ میں نہیں ہوں ؟ ــــ آفاق کے ابا، آج میں آفاق کے لیے چاند کا ٹکڑا دیکھ کے آئی ہوں ــــ آفاق ! ــــ آفاق بیٹا، ذرا ٹھہرو، تم تو میرے پاس ایک منٹ بھی نہیں بیٹھتے ۔ بیٹا، میں تمہارے لیے دُلہن دیکھ کے آئی ہوں ! ــــ نہیں ماں، شادی میری ہے، آپ لوگوں کی نہیں ــــ دراصل ــــ میری شادی ہو چکی ہے ۔ اگر آپ لوگوں نے چاہا تو میں اسے یہاں لے آؤں گا، نہیں تو ہم دونوں الگ رہیں گے ــــ الگ رہیں گے ؟ ــــ آفاق کے ابا چپ کیوں ہو ؟ سن رہے ہو ہمارا بیٹا ہم سے الگ رہے گا ــــ مجھے چکر آ رہا ہے آفاق کے ابا ــــ مجھے

تھام لو —— اچھی طرح تھام لو، نہیں تو میں دھڑام سے گر جاؤں گی ——
آؤ بہو —— آؤ بیٹی —— تم تو میرے لاڈلے کی دلہن ہو۔ میں تم دونوں سے الگ کیسے رہ سکتی ہوں —— آؤ !

پھر وہیں پُل آگیا ہے اور جمال غوطے کھا کھا کے بے اختیار اس کے نیچے سے بہہ گیا ہے اور پھر اس نے بمشکل سر اٹھا کے اپنے آگے دیکھا ہے کہ تاحدِ نظر وہی پُل۔ ایک کے بعد ایک کھڑا ہے اور وہ بہ یک وقت ہر پُل کے نیچے سے لڑھکنے کے انداز میں بہہ رہا ہے۔

دیکھیے امی، آپ اپنے بیٹے کی طرف کم توجہ برتا کیجیے۔

یہ کیا کہہ رہی ہو بہو۔ میں نے تو اندھی باؤلی ہو ہو کر اپنے آفاق کو اونچا کیا ہے۔

لیکن اب میں اونچا ہو گیا ہوں نا امی۔

لیکن مجھے تو اب بھی ویسے ہی لگتے ہو بیٹے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ ——

نہیں امی، میں اب دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں۔ آپ کے اس قدر پیار اور توجہ سے مجھے پریشانی ہوتی ہے۔

بادل دھرتی کو سوکھا چھوڑ کے آسمان کی طرف اٹھنے لگے ہیں ——
برس جاؤ، خدا کے لیے برس جاؤ !

آفاق کے ابا ! —— آفاق کے ——

ہاں بھئی، کہو۔ اتنا گھبرائی ہوئی کیوں ہو ؟

بہو نے میکے سے کہلوا بھیجا ہے کہ وہ ہم سب کے ساتھ نہیں رہیگی۔ جب تک آفاق الگ رہائش کا بندوبست نہیں کر لیتا وہ اپنے میکے سے نہیں آئے گی —— اب کیا ہوگا آفاق کے ابا —— یہ کیا ہو رہا ہے خدایا ! —— میرا خون پانی ہو رہا ہے لیکن تم کچھ بھی نہیں کر رہے ہو آفاق کے ابا ——

وہ آفاق جا رہا ہے —— آفاق —— آفاق ! —— ادھر آؤ بیٹا —— یہاں بیٹھو —— نہیں بیٹا، جلدی میں بھی ہو تو تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاؤ میں تمھارا زیادہ وقت نہیں لوں گا —— کیا یہ سچ ہے کہ تم ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتے ؟

اس میں ہرج ہی کیا ہے ابا ؟ آپ سمجھتے کیوں نہیں ؟ ہمیں اپنی زندگی جینا ہے۔

ہمیں کون بیٹا ؟ —— تم اور تمھاری بیوی —— ہے نا ؟ مگر بیٹا، تمھاری ماں کی اور ہم سب کی یہ خواہش ہے کہ ہمیں بھی اپنوں میں شامل کیے رکھو، ذرا آرام سے میری بات سنو —— ہماری ساری کی ساری محبت صرف ایک شخص کے لیے ہی ہو تو دراصل ہماری اس محبت میں وہ ساری محبتیں کام کر رہی ہوتی ہیں جو ہمیں اوروں سے بھی ہوں —— ہاں، بیٹا، ماں یا بہن سے پیار کیے بغیر کوئی اپنی محبوبہ سے پیار نہیں کر سکتا ——

ہاں، بیٹا، جو سب سے پیار کرتا ہے وہی صرف ایک سے پیار کر سکتا ہے۔

تمھیں معلوم نہیں بیٹا، کہ کوئی پائدار رشتہ الگ سے وجود میں نہیں آتا بلکہ سب رشتوں کا —— ساری زندگی سے ہمارے رشتوں کا ایک آپسی تال میل ہوتا ہے، نہ ہو تو کوئی محبوب ترین رشتہ بھی نہ ہو —— اب جاؤ، خدا تمھاری مدد کرے —— !

باہر سے کھٹکھٹاہٹ سی محسوس کر کے جمال کے ماتھے کے نیچے دونوں کواڑ ذرا سے ہلے ہیں اور کوئی آواز کیے بغیر چوپٹ کھل گئے ہیں اور وہ ابھی کواڑوں کے اندر باہر ہی ہے کہ اُسے پیرسال ممتا کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی ہے —— آفاق کے ابا ! —— آفاق کے —— وہی ! —— ! ——
اس نے بڑی گہری، تھکی ہوئی نظر سے بے تاب آواز کی پرچھائیں کو دیکھا ہے اور پھر بے اختیار آگے بڑھ کر اُسے بھینچ لیا ہے۔ میں تمھیں کبھی نہیں چھوڑوں گا ماں ! —— کچھ بھی ہو جائے۔

—— • —— • ——

بقیہ باقیات جوش ملسیانی

میں بھی اس کے بہت سے ثبوت موجود ہیں۔ میں وقعت دیتا ہوں تو مشاہیر کے اظہار رائے کو —— جن میں استاد بھائیوں کے علاوہ دوسرے نکتہ شناس اساتذہ بھی شامل ہیں۔ مثلاً دلؔ شاہ جہانپوری۔ کیفیؔ دہلوی، اثرؔ لکھنوی، سالکؔ بٹالوی، حفیظؔ جالندھری، مولانا غلام رسول مہرؔ، سکندر علی وجدؔ وغیرہ
استاد بھائیوں کی رائے بھی ابھی نیرنگ گزشتہ میں مل سکتی ہے مثلاً نوحؔ ناروی، ناطقؔ گلاؤٹھی، نواب سائلؔ، بیخودؔ دہلوی وغیرہ ان سب اصحاب کا ہم صحبت بھی بارہا رہا ہوں۔

مجھے مبینہ تنگ دلی کی شکایت کبھی نہیں ہوئی۔ بعض مسلمان اہل قلم نے اس کی یہ وجہ بھی بتائی ہے کہ جب کلام فن اور زبان کے معیار پر پورا اترے تو تنگ دلی بلاشبہہ قابلِ ملامت ہے مگر یہ وصف نہ ہو اور پھر بھی تنگ دلی کی شکایت کی جائے تو یہ ادبی عصبیت اور بجائے خود تنگ دلی ہے۔ اتنا تجربہ تو مجھے ذاتی طور پر بھی ہے کہ بعض اصحاب زبان فن اور پختہ گوئی کے معیار پر پورا نہ اترنے کے باوجود تنگ دلی کے شاکی پائے جاتے ہیں ان کی باتیں سنتا ہوں اور خاموش رہتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ استاد مرحوم کے کچھ ہندو تلامذہ اور بھی ہوں گے جنہیں میں نہیں جانتا۔ اب تو ان کے ہندو مسلمان تلامذہ کی تعداد بھی (جو بقید حیات ہیں)، چھ سات سے زیادہ نہ ہوگی۔

میرا خیال ہے کہ میں نے ہر ایک استفسار کا جواب لکھ دیا ہے۔ یاد آوری کا شکریہ۔ زیادہ دعائیں۔

۸ر جولائی ۱۹۶۰ء
نکودر ضلع جالندھر

جوشؔ ملسیانی

جعفر رضا
شبستان ۲۱۸ شاہ گنج الہ آباد (اتر پردیش)

عصری آگہی کا مسئلہ

اردو ادب کی جدید عصری آگہی کا تجزیہ کرنے میں کئی طرح کی غیر فطری پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ترقی پسندوں کا ایک حلقہ ادبی کاوشوں کو تحریکی محاذ بندی کے معیار پر دیکھتا ہے، انھیں ادبی تجربات کی افادیت تنظیمی آہنگ میں نظر آتی ہے۔ دوسری طرف "جدیدیت" کے مبلغین کو اصرار ہے کہ ادبی آگہی کو ایک خاص طرح کی جدیدیت کے رجحان تک محدود سمجھنا چاہیئے۔ ان کے خیال میں تمام ادبی تخلیقات کو ادبی معیاروں پر ہی پرکھنا چاہیئے۔ اس کے مخالفین اور موافقین نے گذشتہ چند برسوں میں شدت کے ساتھ اپنی باتوں پر اصرار کیا ہے۔ دونوں طرف سے موقع پرستوں نے ادبی مباحث کو ذاتیات کی کیچڑ میں ڈالنے سے بھی گریز نہیں کیا اور منفی رویوں کے ڈھنڈورے پیٹ کر لوگوں کو روکنے کی کوشش کی گئی ہے جس کے اثرات بسا اوقات معکوس ہی ہوئے ہیں۔ کیونکہ صرف شور غل کرنے سے ادبی رویئے تبدیل نہیں کئے جا سکتے۔ ادب کو نئے تقاضوں نے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ اس کے حدود و امکانات خود ہی تجزیہ و تفہیم کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ جدید شعری آگہی کو سمجھنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے عناصر اور عوامل پر گفتگو کر لی جائے۔

اگرچہ تخلیق ادب میں تاریخی و سماجی شعور اور اس کی پیدا کردہ طاقت کو نظروں سے اوجھل نہیں کیا جا سکتا اور انسان کا ابتدائی شعور اور اس کے ذاتی تجربات، جو ذہنی افق کو وسعت، گہرائی اور توانائی عطا کرتے رہتے ہیں، اس کی سماجی ذمہ داریوں کے مطابق بدلتے رہتے ہیں بلکہ مادی جد و جہد میں انسان اپنی ارتقا کی نئی منزلوں کا احساس کرتا رہا ہے اور سماجی حالات کو جھیلنے میں ہی اس کی تاریخی نشو و نما ہوئی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ارتقائی کیفیات میں انسان کے کردار و شخصیت، افکار و خیالات اور عزم و عمل کے حدود بدلتے رہتے ہیں۔ مذہب، جنس، فن، ادب اور سائنس کے سلسلہ میں زندگی کے مختلف پہلو اپنے انگنت شکلوں میں سامنے آتے ہیں۔ ساختی نظام میں حکمراں یا بادشاہ نے شعوری طور پر کوشش کی ہو یا نہ کی ہو لیکن ان کے نظام حکومت کے معیاروں کے آوردہ فنی نقوش کی پرکھ اور علامتوں اور تمثیلوں میں ان کے طبقاتی رویے کا احساس ہوتا ہے۔ تاریخ کی دوسری شکلیں عوامی زندگی سے توانائی حاصل کرتی رہیں تو اُس کی "ریختہ" تخلیقات بھی فن، ادب، مذہب اور سائنس کے ادھورے تصور اور ناپختہ شعور کی ترجمان رہیں۔ اسی طرح ادب کو انسانی تاریخ سے وابستہ کر کے دیکھنے پر ہی زندگی کے رموز کی نقاب کشائی ہو سکتی ہے۔

تخلیقِ ادب اور شاعری کو انفرادی جذبات تک محدود قرار دینے والوں کا خیال ہے کہ بڑے تاریخی واقعات ادب کا موضوع نہیں بن سکتے یا ان میں فن کار کی تخلیقی قوتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ اس طرح کے مفروضات کو بنیاد بنانا، ادبی و فنی ذمہ داریوں سے دامن کشیدہ رہنا ہے اور دنیا کی تغیر پذیر زندگی سے بیزار ہو کر انفرادیت کے خول میں بند ہو جانا ہے۔ یہ بنیادی اہمیت کی بات ہے کہ زندگی سے امید افزا ہونے کے بجائے مایوسی و قنوطیت کا سہارا لے کر بڑے ادب کی تخلیق نہیں کی جا سکتی کیونکہ انسان تغیر پذیر مخلوق ہے۔ اس کے تصوراتی و ذہنی بصیرت کے بارے میں سپاٹ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تخلیق کار کا سماجی و سیاسی ماحول ہی اس کے داخلی و خارجی جذبات کو متحرک کرتا ہے۔ انسان کسی طے شدہ ذہنیت کے ساتھ جنم نہیں لیتا بلکہ وقت، حالات اور افراد سے متاثر ہو کر اپنے کردار و شخصیت کی تشکیل کرتا ہے، وہ داخلی اور خارجی ہونے کے علاوہ سماجی اور ذاتی زندگی کے معیاروں سے اپنا آپ ناقد بھی ہوتا ہے، اسی سے اس کے تجربات میں وسعت، گہرائی اور رموز آفرینی پیدا ہوتی ہے، جس میں بادی النظر میں اسرار انگیزی اور روحانیت کا احساس ہوتا ہے لیکن اگر اس کے فکری رجحان کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھا جائے تو اس میں سماجی زندگی کو خوش گوار بنانے کی کوششیں نظر آئیں گی۔ شاعری میں شعور اور لاشعور کی لہروں پر قابو پانے کی جو غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے، اسی کو مدِ نظر رکھ کر یونانیوں نے کہا تھا کہ صرف خدا اور شاعر ہی تخلیق کر سکتے ہیں۔

موجودہ صدی میں انسانی ارتقا کا کارواں بڑی تیزی سے آگے بڑھا ہے۔ آج کے انسان کے تجربات پیچیدہ تر ہو گئے ہیں اور اس پیچیدگی کے ساتھ ہی انسانی برتاؤ کے تماش (Pattern of Behaviour) تجربے کی سطحیں Levels of Experience اور ذرائع اظہار Idioms of Expression میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ ان کے سماجی و سیاسی اسباب ہیں، جن میں فرد ایک ہی سطح سے خاندان، ملک اور کائنات کو دیکھ رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ فرد ایک ہی وقت میں مقامی و ذاتی تجربات سے دوچار ہو گیا ہے۔ اس سے فن کی سماجی ذمہ داری کا دائرہ وسیع تر ہو گیا ہے۔ وہ سماج کا بے زبان مخلوق نہیں بنتا بلکہ اس کی آواز کی گھن گرج بن کر انسانی زندگی کی دائمی اقدار کی حفاظت و ترویج کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ اس میں اُسے ہر شخص کی حمایت حاصل ہوتی ہیں۔ مساوات، رواداری اور یکجہتی کے جذبات اور سائنس کی نئی نئی

ایجادات نے اسے کائنات کے تمام انسانوں سے پہلے سے بھی زیادہ قریب کر دیا ہے۔ سائنس کی برکتوں کی بدولت اسے دنیا کے کسی حصہ کی خبریں چند لمحوں میں حاصل ہو جاتی ہیں۔ عالمِ انسانیت کی بڑی برادری کا رکن ہونے کی بنا پر نقطۂ نظر میں بین الاقوامیت ابھر اٹھی ہے۔ شاعر یا فنکار اپنے ملک کے حالات کو پھیلنے کے ساتھ ہی ساتھ دنیا کے تمام انسانوں کے لئے جو اپنا پن محسوس کرتا ہے، اس کو اپنی تخلیقات میں جگہ دیتا ہے۔ انسانی شعور کی لہریں کسی فرد ملک یا زمانہ تک محدود نہیں رہ گئی ہیں بلکہ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک انسانی شعور کی لہریں یکساں طور پر حاوی نظر آتی ہیں۔ انسان انسان کی حیثیت حاصل کرلیتا ہے اور جغرافیائی حد بندیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ حالات کے تناظر میں سماج کی پرانی اکائیاں جو اب تک زندگی کی تہذیب و تنظیم کرتی تھیں، ٹھہراؤ میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ اس لیے سماجی معیاروں کے پیمانے بھی بدل رہے ہیں اس لیے آج کے رجعت پسند اور سامراجی رویے سے متاثر تخلیقات کی افراط میں زندہ انسانی اقدار کو مہمیز کرنا ہی شاعر، فنکار اور مفکر کا بنیادی مقصد ہو جاتا ہے۔ موجودہ صنعتی دور میں انسان کئی طرح کی حد بندیوں سے آزاد ہونے کے باوجود اپنے ہی مسلط کردہ احساسات کی دلدل میں پھنس رہا ہے۔ اس کی زندگی منتشر ہو کر بکھرنے لگی ہے۔ ان اکائیوں کو جوڑنے کے لیے دنیا کے تمام بیدار شاعروں کی طرح اردو شعرا بھی کوشش کر رہے ہیں اور آدمی کو مجبوریوں کی دلدل سے نکالنے اور اس کے آزاد سماجی وجود کو تسلیم کرانے کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں۔

اسی انتشار کے ضمن میں غنائیت کے مزاج کے زوال (END OF LYRICAL TEMPER) کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے لیکن اگر زندگی میں ٹھہراؤ یا قنوطیت کو لمحاتی قرار دینے کے بجائے اس کی تغیر پذیر اور ارتقائی رجحان کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس کی بنیادوں کے مطالبات بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ کائنات کے مختلف پہلوؤں کو ایک ساتھ رکھنے میں ماضی اور مستقبل کے امکانات کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ ذاتی تجربہ کی بنیاد پر اس تصور کا خاکہ تیار کرنے میں فرق پڑ سکتا ہے لیکن انسانی نظریے دونوں مطالبات یکساں رہتے ہیں۔ اس لیے غنائیت کے مزاج کے انسانی رویے میں تبدیلی ممکن ہو سکتی ہے لیکن اس کے خاتمہ کی امید نہیں کی جا سکتی، کیونکہ اس کا سلسلہ بھی نسلِ انسانی کے ارتقا کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ جدید عصری تناسبات میں غنائیت کی نشوونما بالکل مختلف انداز میں ہو رہی ہے، جو روایتی شاعرانہ اسلوب میں نئی روایتوں کا آغاز کرتی ہے۔

انسان کے درد و آلام کو سماجی اور سیاسی زندگی کے مفروضات سے الگ رکھ کر صرف ذہنی اور دماغی سطحوں پر قبول کرنے سے متعدد غلط فہمیاں پیدا کرنے، افسردگی کی ترویج، مایوسی، موت اور انتشار کے بجائے توانا، متحرک، امید افزا اور پُرحوصلہ انسانی اقدار کو تاریخی پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے، بلکہ حسبِ ضرورت تخلیقات کا تجزیہ کرنے میں شاعرانہ اظہار کی متعدد کامیابیوں کا ذکر کرنا ہوگا۔ شاید الفاظ، محاوروں یا ترکیبوں کے متعدد تجربات کی کوری فہرست دینے کے بجائے ان کے بنیادی ارتقا کو سمجھنا ہوگا۔ ادب میں دس پانچ برسوں میں بھی لسانی تجربات ہو سکتے ہیں لیکن صرف انھیں کی بنیادوں پر خیالات کی ندرت یا روایتوں سے بری اسلوب کے ایجاد کا اعلان کرنا، لسانی ارتقا پذیری اور صدیوں کی ترقی کی کوششوں کی نفی کر دینے سے زیادہ نہیں ہے۔ لسانی توڑ پھوڑ کا رجحان صرف نئے تناسبات کو پیش کرنے میں ہی ضروری ہوتا ہے۔ ان نئے تناسبات کی تفہیم بھی علم و سائنس کے تجربات اور ایجادات کے معیاروں پر کرنا ہی مناسب ہوگا۔ صرف اوپر سے مسلط کردہ تجربات کے مطابق نہ تو لفظوں کی ندرت ختم ہوتی ہے، نہ ترکیبوں کی تیزی میں زنگ لگتا ہے اور نہ محاورے ہی بے جان ہوتے ہیں۔ اردو کے جدید شعری ادب کے تجزیہ و تفہیم میں ان مسائل سے لازمی طور پر دوچار ہونا پڑے گا۔

بقیہ ملاحظات

تمام بنگال میں پھیل گئی اور انھیں یقین ہو گیا کہ وہ اس کے ذریعے اپنی روزی کما سکتے ہیں۔ تو ۱۹۱۶ء میں وہ واپس کلکتہ آگئے اور بقیہ زندگی انھوں نے ادب کی خدمت میں گزار دی۔

شرت بنگلہ کے مقبول ترین ناول نویس ہیں۔ ان کی شہرت صرف بنگال اور ہندوستان تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ غیر ممالک میں بھی پھیل گئی۔ ان کے ناولوں کے ترجمے ہندوستان کی لگ بھگ تمام علاقائی زبانوں کے علاوہ روسی، انگریزی اور فرانسیسی میں بھی ہو چکے ہیں۔

شرت عوامی ادیب تھے اور انھوں نے زندگی کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات کے بعض کردار، جیسے دیوداس، پاروتی، راجیہ لکشمی، شری کانت، اننا دیدی، ساوتری وغیرہ زندۂ جاوید ہو چکے ہیں اور ان سے معمولی ادبی ذوق رکھنے والا بھی بخوبی واقف ہے۔

شرت صحیح معنوں میں حقیقت نگار ناول نویس تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے کروڑہا افراد کے خیالات و جذبات کی ترجمانی کی، اور اس عہد کے مسائل کو بڑی خوش اسلوبی سے اپنے ناولوں اور کہانیوں میں پیش کیا۔ سماج میں عورت کی پسماندگی اور بے چارگی کے علاوہ توہم پرستی اور فرسودہ رسم و رواج کے خلاف بھی انھوں نے بڑی جرات و دلیری سے آواز بلند کی۔

ہندوستان اپنے اس مایۂ ناز ادیب کو کبھی فراموش نہیں کر پائے گا۔ اور صدیوں اس کی تخلیقات سے تحریک و تشویق پاتا رہے گا۔

ساجدہ زیدی
گل برگ، سول لائنز دودھ پور، علی گڑھ

داستان وجود و عدم مختصر ہے

لمس کی تند خوشبو میں ہر چیز لپٹی ہوئی
ہونٹ کیفیتوں کے سمندر میں ڈوبے ہوئے
مرمریں اجلے بوسوں کی لہروں پہ
سارا بدن موجزن
کسمسائی رگوں میں لہو نیش زن

درد کی شاخ پر پھوٹتی
آرزو کی شگفتہ کلی
گرم نظروں کے بے خواب تارے
چشمِ وا میں سمیٹے
زمین و زماں کے نظارے

آتشِ وصل و کیفِ پذیرائی و لذّتِ دید سے باخبر
وہ جواں رات تاروں کی گردش میں کھوئی گئی

ہوا اپنے کاندھوں پہ کوہِ گراں درد کا
نرم آنچل کی مانند، اٹھائے
غم سے سرشار لمحوں کی وارفتگی
اپنے قدموں کی آہٹ میں
بیتے زمانے چھپائے
روح کی سطح پر تیرتے
کیف و رنج و مسرت کے نمناک سائے

دید و نادید کے رنج سے ماورار
یہ بہک رات بھی وقت کے تند ریلے میں بہہ جائے گی

داستانِ وجود و عدم مختصر ہے
کا دشِ تند رو ـــــــ
ذرّہٗ رہگذر ہے

”تیرا صنم“

خدائے برتر
تیری یہ دنیا
مرے لیے چیستاں نہیں ہے . . . .

میں اس کے اسرار
اپنی سانسوں کی آمد و شد میں جی رہی ہوں
میں اس کے معنی کے نرم نغمے
ہر ایک ساعت کے
رمز و رفتار و رقص و حرکت میں سن رہی ہوں

میں تیری گیرائیِ زماں میں
عجیب گل ہائے نو بہ نو
شاخِ صوت و نغمہ پہ
خونِ دل سے کھلا رہی ہوں

میں شوق کے شعلہ بار ہونٹوں سے
قلب انسان و رنگِ فطرت کے درمیاں
نورِ عرفاں کی ایک زنجیر بن رہی ہوں

مگر وہ تیرا صنم . . . . !
کہ جس پر تھا ناز
تیری بھی آذری کو
جو تیری تخلیق بے نہایت کا
تند مرکز تھا . . . . .
جس کی خلاقیوں کو تو نے
ہزار امکان سے نوازا تھا
جس کے سینے میں
دیپ الفت کا رکھ دیا تھا

اسی کی حیلہ طرازیوں نے
سلاخِ گرم ایک میرے سینے میں گاڑ دی ہے

بشر نواز
گھاٹی، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

بکھراؤ

میں وقت کی مملکت کا باسی
خود آپ اپنے کو جمع کرنے میں ریزہ ریزہ بکھر رہا ہوں
میں جیسے میداں ہوں، اس لڑائی کا
روزِ اوّل سے مجھ میں اور مجھ میں جو بپا ہے
کمان کھینچی کسی نے ایسے
کہ اس کے دونوں سروں کی پہچان مٹ گئی ہے
وہ لمحہ، جس کو میں خود سے منسوب جانتا ہوں
پتہ نہیں کیوں
ہر ایک دل میں دھڑکنے لگتا ہے
دُور افق پر ستارہ جیسے
پرایا ہوتا ہوں جس گھڑی میں
اسی گھڑی آپ اپنے اندر مچلنے لگتا ہوں
جیسے نبضوں میں خون کی گردش
جو اپنے تنہا وجود کا کوئی جز و کاٹوں
تو ایسے لگتا ہے، وقت کی لمحہ لمحہ بنتی طویل چادر کے
تانے بانے بھی کٹ رہے ہیں
کمان کھینچی کسی نے ایسے
کہ اس کے دونوں سروں کی پہچان مٹ گئی ہے
تمام سمتیں ـــــ سبھی مناظر
وجود میں میرے دھیرے دھیرے پگھل کے شکل
اپنی کھو رہے ہیں
حواس سارے
حدود اور فاصلوں کی میت پہ رو رہے ہیں
میں بیکراں وسعتوں میں بے سمت بے تحاشہ
ہوا ہوں شاید
افق سے تا بہ افق بھٹکتی صدا ہوں شاید

صادق
پیپلز کالج کیمپس، ناندیڑ

اردو کا اولین افسانہ

اردو افسانہ اب دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھ ملانے کے قابل ہوگیا ہے وہ زمان و مکان کی حدوں کو توڑ کر بہت آگے نکل چکا ہے۔ اسے ہندوستان کی کسی بھی زبان کے ادب کے مقابلے میں بڑے فخر کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ اردو افسانہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے افسانوں سے بہت آگے ہے ——— وغیرہ وغیرہ جیسی باتیں کہہ لکھ کر بغلیں بجانے والے خوش فہموں کی قطاروں میں سب سے آگے جو چہرے نظر آتے ہیں ان میں میرے ہم پیشہ قلم کاروں کی تعداد زیادہ ہے۔ سچ مچ کے نقادوں کی افسوسناک کمی کا فائدہ اٹھا کر راتوں رات نقاد بن جانے کی سہولت کچھ ان ہی لوگوں کو حاصل ہے جو بار بار سنی لکھی باتوں کو دہرانے یا معلوم حقائق کو تلاش کر لینے میں بہت زیادہ سرگرمی دکھاتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک ہندوستان کے اردو ادب میں افسانہ کی تنقید سے متعلق شائع ہونے والی سنجیدہ اور معیاری کتابوں کی تعداد ایک سے بھی کم ہے اور آزادی سے پہلے شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد اس سے کچھ زیادہ نہیں۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے جو زبان پر آتی ہے تو منہ کا مزا بگاڑ جاتی ہے اور ایسے موقعوں پر اکثر لوگ وقار عظیم کی تین کتابوں کے حوالے دے کر اس فقدان کی تلافی کرنے کی سعیٔ رائگاں کرتے نظر آتے ہیں۔ ان تین کتابوں میں سے ایک "فنِ افسانہ نگاری" ہے جو بقول فاضل مصنف ان کے زمانۂ طالب علمی کی یادگار ہے اور اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ کتاب کالج کمپوزیشن کی سطح کو تو کسی نہ کسی طرح چھو ہی لیتی ہے لیکن تنقید کا جو معیار پیش کرتی ہے وہ لکھنے کی بات نہیں۔ دوسری کتاب "داستان سے افسانے تک" ہے۔ یہ پوری کتاب جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے صرف افسانہ سے متعلق نہیں اور افسانہ سے متعلق اس میں جو کچھ بھی ہے اس کی نوعیت ایک جائزے کی سی ہے تیسری کتاب "نیا افسانہ" ہے۔ اس کے تقریباً نصف حصے میں لفظ بہ لفظ وہی صفحات نقل کر دیے گئے ہیں جو وقار عظیم اس سے پہلے "داستان سے افسانے تک" میں پیش کر چکے تھے۔

بہر حال یہ سچ ہے کہ اردو میں افسانہ کی تنقید بہت کم ہوئی ہے۔ اور شاعری کی بہت زیادہ۔ نتیجتہً کئی ایک نقادوں نے موقع پا کر یہ منادی کرا دی کہ افسانہ ادب کی کوئی اہم صنف نہیں۔ اس کا رتبہ شاعری سے بہت کم ہے اس کا استعمال پروپگنڈہ اور اشتہار بازی وغیرہ جیسے کاموں کے لیے ہی موزوں ہوسکتا ہے۔ افسانہ کا مستقبل تاریک ہے۔ ... اور یہ بھی کہ نیا اردو ادب اب تک کوئی پریم چند پیدا نہیں کر سکا ہے۔

جب افسانہ پر لگائے گئے الزامات منظرِ عام پر آئے تو افسانہ اپنی پیروی کے لیے ایک نقاد بھی فراہم نہ کرسکا اور بے چارے افسانہ نگاروں ہی کو قلم ہاتھ میں لے کر میدان میں آنا پڑا۔ جذباتیت اور جانب داری کا لیبل تو خیر ان پر لگنا ہی تھا سو لگ کے رہا۔ لیکن پھر بھی کوئی نتیجہ خیز بات سامنے نہ آسکی۔ ہم اپنے محققین سے میر کے دانتوں کی تعداد اور غالب کی ٹوپی کا سائز معلوم کر لینے کی توقع تو کر سکتے ہیں لیکن افسانہ کی تنقید کے میدان میں کوئی زبردست کارنامہ سر انجام دینے کی ہرگز نہیں۔

ادب کے بہت سے سکہ بند نقادوں نے اردو افسانہ کو مغرب کی دین قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ناول و افسانہ کا فن انگریزی زبان و ادب کے توسط سے ہمارے ادب میں داخل ہوا۔ کئی ایک تنقیدی کتابیں یہاں تک ہماری ادبی تاریخیں تک اس بات پر صاد کرتی ہیں۔ اس طرح اردو افسانہ کے آغاز سے متعلق ایک ایسا مضبوط اور بلند قامت جھوٹ تعمیر ہوگیا ہے جسے توڑنے کے لیے چھوٹے چھوٹے سچ کند اور ناکافی ثابت ہوتے ہیں ——— اگر افسانہ لکھنا ہم نے مغرب سے سیکھا ہے تو لگے ہاتھوں یہ بھی مان لینا چاہیے کہ زندگی کرنا بھی ہم نے مغرب ہی سے سیکھا ہے اور زندگی کے تجربات بھی ہمیں مغرب ہی سے ملے ہیں۔ ہماری اپنی ادبی روایتیں بانجھ ہیں۔

اردو ادب میں کہانی، افسانہ، داستان، سیر، حکایت، قصہ، سرگزشت احوال، روایت، جگ بیتی، آپ بیتی وغیرہ نئی چیزیں نہیں ہیں۔ ان کا وجود ہمارے ادب میں بہت زمانے سے ہے۔ ادب کی وہ نئی صنف جسے افسانہ کا نام دیا گیا ہے دراصل انھیں کی وہ ترقی یافتہ شکل ہے جو عالمی ادب میں پائی جانے والی ایک صنف SHORT STORY سے مماثلت رکھتا ہے اور فنی لحاظ سے ایک جامع، واضح اور مستحکم شکل اختیار کر چکا ہے۔ افسانہ اردو میں اجنبی کی سی حیثیت ہرگز نہیں رکھتا لیکن اس کی عمر بھی بہت زیادہ نہیں ہے اس کے باوجود وہ ایک مستقل صنف کی حیثیت سے غیر معمولی اہمیت و مقبولیت حاصل کر کے ہمارے ادب میں ترقی کی اتنی بہت سی منزلیں طے کر چکا ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

افسانہ کو اردو ادب کی قدیم صنف ثابت کرنے کی دُھن میں داستانوی

لہ اس مضمون میں یہ لفظ فکشن کے وسیع معنی میں استعمال نہیں کیا گیا ہے

عہد کی مختصر کہانیوں کو افسانہ قرار دینے کی کوشش کے علاوہ دو چار آوازیں ایسی بھی اٹھائی جا چکی ہیں کہ انشا اللہ خاں انشا (۱۷۵۶ - ۱۸۱۸) کی تخلیق "رانی کیتکی کی کہانی" اردو کا اولین افسانہ ہے اور انشا ہمارے پہلے افسانہ نگار۔ "رانی کیتکی کی کہانی" کا سن تصنیف ۱۸۰۸ء کے لگ بھگ ہے۔ "رانی کیتکی کی کہانی" کے علاوہ انشا نے "سلک گوہر" کے عنوان سے ایک کہانی اور بھی لکھی ہے جس کا مسودہ رامپور کی رضا لائبریری میں پڑا اپنی اشاعت کے دن کا انتظار کر رہا ہے۔ "رانی کیتکی کی کہانی" میں انشا نے عربی فارسی الفاظ کا استعمال کیے بغیر کہانی لکھنے کا تجربہ کیا تھا اور کہانی کے آغاز ہی میں دعویٰ بھی کیا تھا کہ :

یہ ہے وہ کہانی جس میں ہندی اچھٹ
کسی اور بولی کا نہ میل ہے اور نہ پٹ

"سلک گوہر" میں انھوں نے ایک دوسرا ہی تجربہ کیا ہے۔ یہ کہانی بے نقط لکھی گئی ہے۔ لیکن دونوں کہانیاں اپنی ادبی، تاریخی اور لسانی اہمیت کے باوجود افسانہ کی کسوٹی پر کھری نہیں اترتیں کیونکہ یہ داستانوی انداز کی چیزیں ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد (۱۸۳۲ - ۱۹۱۰) کے "نیرنگ خیال" کے مضامین کو مالک رام نے "اردو میں افسانے کے سب سے اولین نقوش" کہا ہے۔ آزاد نے یہ مضامین ۱۸۷۵ء سے لکھنے شروع کیے تھے۔ ان میں سے بعض "انجمن مفید عام" کے ماہانہ پرچہ "رسالہ" میں ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۷ء کے درمیان شائع ہوئے تھے۔ کتابی شکل میں اس کا حصۂ اول سب سے پہلے ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا۔ دوسرا حصہ مولانا محمد حسین آزاد کی وفات کے بعد شائع کیا گیا۔ حصۂ اول کے دیباچہ میں آزاد لکھتے ہیں۔

"اب وہ زمانہ بھی نہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو ایک کہانی طوطے یا مینا کی زبانی سنائیں۔ ترقی کریں تو چار فقیر لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائیں یا پریاں اڑائیں، دیو بنائیں اور ساری رات ان کی باتوں میں گنوائیں۔ اب کچھ اور وقت ہے اس واسطے ہمیں بھی کچھ اور کرنا چاہیے۔"

آزاد کے ان الفاظ کو کہ کچھ اور کرنا چاہیے ۔ آسانی کے ساتھ ویسے معنی بھی پہنائے جا سکتے ہیں جیسے مرزا غالب کے مصرع "کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے" کو پہنا دیے گئے تھے اور تقریباً تین دہائیوں تک یار لوگ الفاظ بدل بدل کر یہی بات ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ اس "کچھ اور چاہیے وسعت" سے غالب کا اشارہ آزاد نظم کی ضرورت کی طرف ہے۔ آزاد کے اقتباس سے یہ تو ظاہر ہے کہ ان کا منشا داستان یا قصے کہانیوں سے الگ کسی اور صنف ادب کی تلاش تھا لیکن وہ صنف افسانہ ہی ہوگی ایسا کہنے کے لیے کوئی بنیاد تو چاہیے۔ محض قیاس کے نقلی پروں کے سہارے آخر کتنی دیر اڑا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ نیرنگ خیال کے بیشتر مضامین تخلیقی درجہ رکھنے کے باوجود اخذ و ترجمہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ افسانویت کے حامل اور مختصر ہونے کے باوجود وہ افسانے قرار نہیں دیے جا سکتے۔

مطبع نول کشور لکھنؤ کے "اودھ اخبار" میں دسمبر ۱۸۷۸ء سے دسمبر ۱۸۷۹ء تک قسط وار چھپنے اور بعد میں ۱۸۸۰ء میں پہلی مرتبہ کتابی صورت میں منظر عام پر آنے والا، پنڈت رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۶ - ۱۹۰۲) کا "فسانۂ آزاد" کچھ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے افسانوں کی لڑیوں سے مل کر ترتیب پاتا ہے جنھیں علیحدہ علیحدہ کر کے افسانے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ غلط نہیں کہ منشی پریم چند کو افسانے لکھنے کی ترغیب "فسانۂ آزاد" ہی سے ملی تھی۔ خود پریم چند نے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن "فسانۂ آزاد" ناول ہے۔ اس کے کچھ حصوں کو علیحدہ کر کے افسانے ثابت کر دکھانے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا۔

مولانا راشد الخیری (۱۸۶۸ - ۱۹۳۶) سلطان حیدر جوش (۱۸ - ۱۹۵۴) سجاد حیدر یلدرم (۱۸۸۰ - ۱۹۴۳) اور منشی پریم چند (۱۸۸۰ - ۱۹۳۷) کے نام بھی اردو کے اولین افسانہ نگاروں کے طور پر لیے گئے ہیں۔ ان تینوں قلم کاروں کا تعلق ایک عہد سے ہے لیکن بیشتر نقادوں نے پریم چند ہی کو اردو کا اولین افسانہ نگار تسلیم کیا ہے۔ پریم چند کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوزِ وطن" ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا تھا اور برطانوی حکومت نے اسے اپنے مفاد کے خلاف تصور کرتے ہوئے بحق سرکار ضبط کر لیا تھا۔ "سوز وطن" کے افسانے کتابی صورت میں چھپنے سے پہلے منشی دیا کشن نگم کے رسالہ "زمانہ" (کان پور) میں شایع ہو چکے تھے اگر "سوز وطن" ہی کے افسانوں کی بنیاد پر پریم چند کو اردو کا اولین افسانہ نگار مانا جا سکتا ہے تو پھر انشا اللہ خاں انشا کو پہلا افسانہ نگار قرار دینے والوں کی بات پر بھی غور کرنا ضروری ہوگا کیونکہ "سوز وطن" کے افسانوں پر داستانوی رنگ اور انداز غالب ہے اور یہ وہی رنگ و انداز ہے جس میں انشا نے "رانی کیتکی کی کہانی" اور "سلک گوہر" لکھی ہیں۔ ظاہر ہے منشی پریم چند کو اردو کا اولین افسانہ نگار قرار نہیں دیا جا سکتا۔

قمر رئیس اپنے ایک تحقیقی مضمون "اردو افسانہ کی ایک صدی" میں لکھتے ہیں :

"اردو میں مختصر افسانہ کا آغاز ہی ادب میں زندگی یا حقیقت کی تفسیر و ترجمانی کے رجحان کا مظہر تھا۔ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں ناول، تمثیل، سفرنامے، افسانے، مکاتیب اور روزنامچے سب اسی رجحان کی بشارت تھے۔ اس لحاظ سے منشی پریم چند کو اردو میں مختصر افسانہ کا بانی یا ایجاد کار کہنا صحیح نہیں ہے۔"

اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے وہ آگے لکھتے ہیں :

پریم چند سے قبل جن ادیبوں نے مغربی افسانہ کے فن اور تصور سے اردو کو روشناس کرایا ان میں فیض الحسن بی۔ اے

علی محمود (بانکی پور) عبدالحلیم شرر، سجاد حیدر یلدرم
سلطان حیدر جوش، راشد الخیری اور عزمی دہلوی کے نام خصوصیت
سے قابلِ ذکر ہیں۔

ان سب ناموں اور ان کی تخلیقات کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے ہم جس قلم کار کو اردو کا اولین افسانہ نگار قرار دے سکتے ہیں وہ معروف مصلحِ قوم اور ادیب سرسید احمد خاں (۱۸۱۷-۱۸۹۸) ہیں۔ اب تک کے دریافت شدہ افسانوں میں ان کی تخلیق "گزرا ہوا زمانہ" اردو کا اولین افسانہ ہے جو پہلی بار یکم صفر ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۰ء کے لگ بھگ) کے "تہذیب الاخلاق" میں شائع ہوا تھا اور اس کے بعد سے سرسید کے مضامین کے تقریباً ہر انتخاب میں جگہ پاتا رہا ہے۔ "گزرا ہوا زمانہ" نہ تو داستانوی انداز کی تحریر ہے اور نہ ہی قصہ، اسے نہ تو تمثیل کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے اور نہ مضمون ہی کہا جا سکتا ہے۔ اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود یہ اردو کا اولین افسانہ ہے ویسے اسے افسانہ کا نام دیتے ہوئے ہلکی سی ہچکچاہٹ بھی محسوس ہو سکتی ہے کیونکہ اردو افسانہ نے جس برق رفتاری سے ترقی کی راہیں طے کی ہیں اور آج ہم اسے جس منزل پر دیکھ رہے ہیں، "گزرا ہوا زمانہ" اس سے کہیں پیچھے، بہت پیچھے نظر آتا ہے۔ اس کے اور آج کے افسانے کے بیچ قریب قریب ایک صدی کا فرق و فاصلہ ہے۔ اس ایک صدی میں افسانہ کی تعریف اس کی شکل و صورت، اس کی زبان، اس کی تکنیک سبھی کچھ تجربوں اور تبدیلیوں سے دوچار ہوئے ہیں۔ افسانہ کا ٹرینڈ ہی بدل گیا ہے۔ سب کچھ بدل گیا ہے، زمانہ ہی بدل گیا ہے، پھر بھی "گزرا ہوا زمانہ" میں بیج کے روپ میں وہ چیزیں موجود ہیں جو اسے داستانوں، تمثیلوں، قصوں اور مضمونوں سے الگ کر کے افسانہ ثابت کرتی ہیں۔

یہ حقیقت بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے سرسید کا ذکر اس سے پہلے کبھی اور کہیں نہیں کیا گیا کیونکہ "گزرا ہوا زمانہ" ان کا پہلا اور آخری افسانہ ہے۔ اسی افسانہ میں غالباً پہلی بار ہماری اپنی دنیا کا ایک عام آدمی افسانہ کا مرکزی کردار بنا ہے۔ چاہے وہ ایک بچہ ہی کیوں نہ ہو۔

سرسید احمد خاں سے پہلے اردو نثر تکلف اور تصنع کا شکار تھی، مرصع مسجع نثر لکھنا اس زمانے کا مقبول فیشن تھا۔ سرسید نے اس طلسم کو توڑ کر سیدھی سادی نثر لکھنے کا رواج ڈالا۔ میرامن کی "باغ و بہار" اور غالب کے خطوط کے بعد سرسید کی نثر اردو ادب میں بڑی اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے ان کا افسانہ "گزرا ہوا زمانہ" رجب علی بیگ سرور کے "فسانۂ عجائب" کی طرح چیستانی زبان میں نہیں بلکہ اس سادہ، بے تکلف رواں اور عام فہم زبان میں لکھا گیا ہے جس کی بنیاد پر سرسید نئی اردو نثر کے بادا آدم کہلاتے ہیں۔

کہا جا چکا ہے کہ سرسید احمد خاں سب سے پہلے ایک مصلح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "تہذیب الاخلاق" کے سارے مضامین انھوں نے ایک خاص مقصد کے تحت، اصلاح اور بیداری کی خاطر لکھے تھے۔ "افسانہ گزرا ہوا زمانہ" میں بھی مصلح سرسید آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس افسانہ پر مقصدیت اتنی حاوی ہو گئی ہے کہ افسانہ کا فن اس کے بوجھ تلے دبا نظر آتا ہے۔ ——

گزرا ہوا زمانہ

سرسیّد احمد خاں

برس کی اخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی ڈراؤنی ہے، اندھیری ہے گھٹا چھا رہی ہے: بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے، آندھی بڑے زور سے چلتی ہے، دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے۔ مگر اس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے، نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر، اور نہ برس کی آخیر رات پر، وہ اپنے پچھلے زمانے کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے، اتنا ہی زیادہ اس کا غم بڑھتا ہے۔ ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے، اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے جب کہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپے اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر ماں باپ، بھائی بہن اس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لیے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لے کر مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چلا اٹھتا تھا "ہائے وقت، ہائے وقت! گزرے ہوئے زمانے!! افسوس کہ میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا۔"

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سرخ سفید چہرہ، سڈول ڈیل، بھرا بھرا بدن، رسیلی آنکھیں، موتی کی لڑی سے دانت، امنگ میں بھرا ہوا دل، جذبات انسانی کے جوشوں کی خوشی اسے یاد آتی تھی۔ اس آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانے میں، ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتاتے تھے اور یہ کہتا تھا کہ "اُہ ابھی بہت وقت ہے" اور بڑھاپے کے آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لیے تیار رہتا۔ آہ وقت گزر گیا! اب پچھتائے کیا ہوتا ہے۔ افسوس میں نے آپ اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ ابھی وقت بہت ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر، کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی، دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہے۔ اندھیری گھٹا چھا رہی ہے، بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے، ہولناک آندھی چل رہی ہے۔ درختوں کے پتے اڑتے ہیں اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں، تب وہ چلّا کر بولا " ہائے ہائے میری گزری ہوئی زندگی بھی ایسی ڈراؤنی ہے جیسی یہ رات، یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا یاد آئے جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے۔ یہ کہتی ہوئی کہ ہائے بیٹا وقت گزر گیا۔ باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اس میں یہ آواز آتی ہے کہ کیوں بیٹا ہم تمھارے ہی بھلے کے لیے نہ کہتے تھے۔ بھائی بہن دانتوں میں انگلی دیے ہوئے خاموش ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔

ایسی حالت میں اس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی تھیں جو اس نے نہایت بے پروائی اور بے مروّتی اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا، باپ کو ناراض کرنا، بھائی بہن سے بے مروت رہنا، دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا اور اس پر ان گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا اس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا اور یہ کہہ کر چلّا اٹھتا تھا کہ ہائے وقت نکل گیا، ہائے وقت نکل گیا۔ اب کیوں کر اس کا بدلہ ہو!

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا لڑکھڑاتا کھڑکی تک پہنچا۔ اس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے پر رات ویسی ہی اندھیری ہے اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑپن یاد آیا جس میں کہ وہ جوانی رہی تھی اور نہ وہ جوانی کا جوبن، نہ وہ دل رہا تھا اور نہ دل کے ولولوں کا جوش اس نے اپنی اس نیکی کے زمانے کو یاد کیا جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا، نمازیں پڑھنی، حج کرنا، زکوٰۃ دینی، بھوکوں کو کھلانا، مسجدیں اور کنویں بنوانا یاد کر کر اپنے دل کو تسلی دیتا تھا فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی، اپنے پیروں کی جن سے بیعت کی تھی اپنی مدد کو پکارتا تھا، مگر دل کی بیقراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے ذاتی اعمال کا اسی تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں، مسجدیں ٹوٹ کر یا تو کھنڈر ہیں اور یا پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔ کنوئیں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر اور نہ فقیر، کوئی اس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے اس کا دل پھر گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا۔ جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا۔ یہ پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی، اب کچھ بس نہیں چلتا اور پھر یہ کہہ کر چلّا اٹھا" ہائے وقت، ہائے وقت! میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا؟

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے، آندھی تھم گئی ہے، گھٹا کھل گئی ہے تارے نکل آئے ہیں ان کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لیے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکایک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دیتی اور اس میں ایک خوبصورت دلہن نظر آئی۔ اس نے ٹکٹکی باندھ اسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا وہ قریب آتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس آ گئی۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہو گیا اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجے سے پوچھا کہ تم کون ہو وہ بولی کہ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔ اس نے پوچھا کہ تمھاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے۔ وہ بولی ہاں ہے، نہایت آسان پر بہت مشکل جو کوئی خدا کے فرض اس بدوی کی طرح جس نے کہا کہ " واللہ لا ازید ولا الشی" ادا کر کر انسان کی بھلائی اور اس کی بہتری میں سعی کرے اس کی میں مسخر ہوتی ہوں دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے، انسان ہی ایسی چیز ہے جو اخیر تک رہے گا پس جو بھلائی کہ انسان کی بہتری کے لیے کی جاتی ہے وہی نسل در نسل اخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اسی تک ختم ہو جاتا ہے اس کی موت ان سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ مادّی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں، مگر انسان کی بھلائی اخیر تک جاری رہتی ہے میں تمام انسانوں کی روح ہوں، جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے انسان کی بھلائی میں کوشش کرے۔ کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں دل و جان و مال سے ساعی ہو۔ یہ کہہ کر وہ دلہن غائب ہو گئی اور بڈھا پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اب پھر اس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی قومی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔ اس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کیے تھے ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کیے تھے۔ خاص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اس دلفریب دلہن کے ملنے سے مایوس ہوا۔ اپنا اخیر زمانہ دیکھ کر آئندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کی حالت میں بے قرار ہو کر چلّا اٹھا " ہائے وقت، ہائے وقت، کیا پھر تجھے میں بلا سکتا ہوں؟ ہائے میں دس ہزار دیناریں دیتا اگر وقت پھر آتا اور میں جوان ہو سکتا" یہ کہہ کر اس نے ایک آہ سرد بھری اور بے ہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اس کی پیاری ماں اس کے پاس آ کھڑی ہوئی، اس کو گلے لگا کر اس کی بتی لی۔ اس کا باپ اس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس کے گرد آ کھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا کہ بیٹا کیوں برس کے برس دن روتا ہے؟ کیوں تو بے قرار ہے؟ کس لیے تیری ہچکی بندھ گئی ہے؟

(بقیہ صفحہ ۲۲ پر)

ہماری کتابیں

سرسید احمد خاں (پروفیسر خلیق احمد نظامی) ۵ روپے
(ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی، تعلیمی اور ثقافتی زندگی پر سرسید اور اُن کے رفقا کے کارناموں کا زبردست اثر پڑا ہے۔ پروفیسر نظامی نے بڑے عالمانہ انداز میں ان کی شخصیت اور کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔)

ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر (ڈاکٹر محمد عمر) ۲۰ روپے
(ڈاکٹر تارا چند نے اپنی مشہور تصنیف میں ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ ڈاکٹر محمد عمر نے اپنی اس محققانہ کاوش میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوستانی تہذیب مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔)

ہم ایک ہیں (عرش ملسیانی) ۱۰ روپے
(ہندوستان مختلف زبانوں، عقیدوں اور طریقوں کا ملک ہے اور چمن کو اسی اختلاف سے زیب و زینت حاصل ہے۔ مگر ہر رنگ و بو کے یہ پھول ایک گلدستے میں بندھے ہوئے ہیں اور ہماری قومی زندگی کو تاب و توانائی بخشتے ہیں۔)

ابوالکلام آزاد (عرش ملسیانی) ۵ روپے
(ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے معماروں میں ہیں۔ جدوجہد آزادی کی کوئی بھی تاریخ مولانا آزاد کی خدمات کے اعتراف کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی)

روشنی کے مینار (شہباز حسین) ایک روپیہ ۵۰ پیسے
(سماجی مصلحین، مذہبی رہنما اور سیاسی قائدین کے سوانحی خاکے جو آسان زبان میں ہائی اسکولوں کے طلبا کے لئے لکھے ہیں۔)

جواہر لال نہرو کی کہانی تصویروں کی زبانی ۳ روپے ۵۰ پیسے
(محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو کی زندگی کے دلچسپ واقعات رنگین تصویروں میں۔ بچوں اور طالب علموں کے لئے ایک عمدہ تحفہ)

پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے۔ ۲ روپے ۵۰ پیسے
(گھریلو فرد توں کے جام، جیلی، مربہ، مارملیڈ، چٹنی، سربے اور آچار وغیرہ بنانے کے متعدد طریقے تصویروں کے ذریعے بتائے گئے ہیں جس سے بڑی آسانی سے آپ گھر بیٹھے اپنی من پسند چیزیں بنا سکتے ہیں)

"آج کل" کے خریداروں کو ۲۰ فی صد کی رعایت۔ محصول ڈاک ہمارے ذمے

پانچ روپے سے کم قیمت کی کتابیں بذریعہ وی۔ پی نہیں بھیجی جاتیں۔ پوسٹل آرڈر بھیجئے یا وی پی طلب کیجئے۔

(ملنے کا پتہ) بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

باقی
۲/۴۵ راجندر نگر، نئی دہلی

آکاش سے احساس تک

دُھند کا
شور کا
گرد کا
ایک گنبد سا تھا، توڑ کر جس کو ہم
عزم کی قوتیں، وسعتیں اپنے سینوں میں لے کر
نکل آئے ہیں
ہم کو معلوم تھا
کوئی ہے، جو ہمارے سفر میں
اندھیرا بچھانے میں معروف ہے
ہم کو معلوم تھا
کوئی ہے، جو اُبھرتے ہوئے دن کے چہرے پہ
تاریکیاں لیپ کر
اِک سیہ شب کا منظر بنانے میں مصروف ہے
ہم کو معلوم تھا
کوئی ہے، جو ہمیں خاک روشن سے انکار
کرنے پر مائل کرے گا
طلائی اُفق کی طرف دیکھنے والی آنکھوں میں
کہرا بھرے گا
ہمیں سب یہ معلوم تھا
اس لیے ہم پہ لازم بھی تھا
ہم دلوں کے چمکتے ہوئے آئینوں کی طرف
گرد آنے نہ دیں
ایک تصویر جو نسلِ نو کی نگاہوں میں ہے
اس پہ ہم بے بسی اور مایوسیوں کی گھٹاؤں
کو چھانے نہ دیں
ہم نے منظر سے
ایسے دھوئیں کو الگ کر دیا
تو بُرا کیا کیا

ورنہ تاریخ، کل ہم کو مجرم بنا کر
یہی پوچھتی
تم، کہ بیدار تھے
وقت کی اندھی، گمراہ کروٹوں سے
ہوا کی غلط آہٹوں سے
خبردار تھے
تم، کہ بیدار تھے
تم نے تہذیبی قدروں کی تخریب پر
آنکھ کیوں بند کی

دُھند کا
شور کا
گرد کا
ایک گنبد جو تھا
اس کو توڑا نہیں کس لیے
یعنی، تاریخ، کل ہم کو مجرم بنا کر
یہی پوچھتی
کیوں نہیں آسمانوں میں نیلاہٹیں
اور خالی ہے ہریالیوں سے زمیں کس لیے
اور معصوم نسلیں
طلب کرتیں ہم سے جواب
اپنی مٹھی میں کیوں کوئی خوشبو نہیں
اپنی مٹھی میں کیوں کوئی جگنو نہیں
اپنی باتوں میں کیوں کوئی جادو نہیں
اس لیے

دُھند کا
شور کا
گرد کا
ایک گنبد جو تھا، توڑ کر اس کو ہم
عزم کی قوتیں، وسعتیں اپنے سینوں میں لے کر
نکل آئے ہیں

اب ہمارے قدم
بڑھ رہے ہیں
نئی منزلوں کی طرف

روشنی پھیلتی جا رہی ہے
کہ آکاش سے زینہ زینہ
اُترتی ہوئی
شہرِ احساس تک
روشنی پھیلتی جا رہی ہے
چلو، تم بھی اپنے جہازوں
کے لنگر اٹھاؤ
کہ اب
زندگی کا
یہ پھیلا سمندر
بُلاتا ہے تم کو
نئے ساحلوں کی طرف
رشتۂ باہمی کی
عمل خیز تازہ ہوا
آئی ہے ایک پیغام بن کر
ہمارے دلوں کی طرف!

اعجاز شفیع
مکان نمبر ۲۱-۲۰/۳۱۲ پٹیلہ بُرج - حیدرآباد ۲

اقبال کا سماجی شعور

ڈاکٹر سر محمد اقبال شاعری، قانون، سیاسیات، ادب اور فلسفہ کے علاوہ دیگر مشرقی و مغربی علوم پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے اس کا اندازہ سبھوں کو ہے۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جن دنوں میں اقبال کی شاعری و دیگر تصانیف کا بڑے شوق سے مطالعہ کر رہا تھا یہ بات نظر سے گذری کہ اقبال نے معاشیات پر ایک کتاب لکھی تھی جو آج بھی اس موضوع پر نہایت وقیع تصور کی جاتی ہے۔ معاشیات کے طالب علم کی حیثیت سے میری یہ دلچسپی بالکل فطری بات تھی۔ بڑی تلاش کے بعد مجھے اقبال کی تصنیف "علم الاقتصاد"[۱] دستیاب ہوئی۔ آج سے پچھتر سال پہلے کی اس تصنیف میں علامہ اقبال نے ملک کے موجودہ معاشی مسائل کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے اور اس کی پیش قیاسی کی کہ ملک مستقبل میں آبادی اور خاندانی منصوبہ بندی جیسے سنجیدہ مسائل سے دوچار ہوگا۔ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی اور قلتِ وسائل کا تذکرہ اقبال نے جس انداز میں کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی دوررس نگاہیں مستقبل کا حقیقی مشاہدہ کر رہی تھیں۔ شاید اسی یقین و بصیرت ہی نے اقبال کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا ؎

کھول کر آنکھیں تو میرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

خاندانی منصوبہ بندی، فیملی پلاننگ یا ضبطِ تولید حکومت کے لئے ایک نہایت گمبھیر مسئلہ بنا ہوا ہے اور حکومت کے تمام ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل میں ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی، قلتِ وسائل اور بے روزگاری سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال کی پیغمبرانہ نظر اور جدتِ فکر و بصیرت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے معاشی مسائل کا ذکر کرتے ہوئے آبادی اور خاندانی منصوبہ بندی پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اور معاشیات کے ماہرین کی ذہنی غفلت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :

"بعض حکمار یہ سمجھتے ہیں کہ صرفِ دولت کی بحث مضامین اقتصاد میں داخل نہیں ہے مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ مؤرخین کے لئے اس علم کا مطالعہ صرف اسی لحاظ سے مفید ہو سکتا ہے کہ اس کے اصول اور مسائل، ان اسباب پر روشنی ڈالیں جن کے عمل سے مختلف اقوام عالم کا عروج و زوال ظہور میں آتا ہے اور اس جزر و مد کے بواعث معلوم نہیں ہو سکتے جب تک کہ اقوامِ عالم کی دولت اور اس کو صرف کرنے کے مروج طریق نہ معلوم کئے جائیں۔ علیٰ ہذا القیاس ہم اپنی آیندہ نسلوں کی دولت کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب تک ہم کو یہ معلوم نہ ہو کہ ہم خود کس قدر صرف کرتے ہیں اور کس طرح صرف کرتے ہیں۔ کسی قوم کی آیندہ عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ امر ضروری نہیں ہے کہ اس قوم کی موجودہ دولت کا اندازہ کیا جائے بلکہ زیادہ ضروری اس بات کا معلوم کرنا ہے کہ وہ قوم اپنی موجودہ دولت کو کس طرح صرف کرتی ہے اور اس کی عادات کس قسم کی ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنی دولت کو اس طرح استعمال کرے کہ اس کے دستکاروں کا ہنر اور ان کی محنت کی کارکردگی روز بروز بڑھتی جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنی دولت کو اس طرح صرف کرے کہ اس کے افراد کی تعداد روز بروز بڑھتی جائے جس سے مفلسی اور بیماری اور دیگر نتائج بد پیدا ہوتے جائیں۔ باوجود ان صریح دلائل کے ہمیں تعجب ہے کہ بعض حکمار اس بحث کو مضامین اقتصاد میں داخل نہیں سمجھتے۔"

ڈاکٹر اقبال نے دولت کے استعمال، انسان کی ابتدائی زندگی اور تمدن کے حقیقی سلسلہ پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے ماہرین معاشیات کی توجہ ان پہلوؤں کی طرف مبذول کروائی ہے جو اس دور کے دانشوروں کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ وہ کہتے ہیں۔ "دولت کا پہلا استعمال یہ کہ اس کی وساطت سے دستکار کو سامانِ معیشت، لباس اور جائے رہائش ملتی ہے۔ تمدن کے ابتدائی مراحل میں دیگر حیوانات کی طرح انسان بھی صرف نباتات اور قدرتی پھل پھول پر گذارہ کرتا تھا مگر انسان کے تمدن کا حقیقی سلسلہ اس دن سے شروع ہوتا ہے جب اس نے آگ کے خواص اور اس کے طریق استعمال معلوم کر کے اپنی خوراک کو پکانا شروع کیا۔ علیٰ ہذا القیاس رفتہ رفتہ تمدنی ترقی اس امر کی مقتضی ہوئی کہ انسان برہنہ پہاڑوں، غاروں اور درختوں کے پتوں کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہے اور بجائے ان کے لباس، جھونپڑیوں، چمڑے کے خیموں اور مکانوں کا استعمال سیکھے۔"

وہ لکھتے ہیں :-

"دولت کا دوسرا استعمال یہ ہے کہ اس کی وساطت سے دستکار

۱؎ جس کا معروف نام علم سیاست تمدن ہے۔ شائع کردہ اقبال اکادمی کراچی

رشتۂ ازدواج استوار کرتا ہے۔ بی بی کی خواہش ایک فطری خواہش ہے اور یہ بالعموم ان خواہشوں کے پورا ہو چکنے کے بعد پیدا ہوتی ہے جن کا پورا ہونا انسان کے جسمانی بقا کے واسطے انتہا درجے کا ضروری ہے مگر بی بی انسان کے بعض قدرتی تقاضوں کو ہی پورا نہیں کرتی بلکہ ابتدار تمدن میں خاوند کو اپنے کاروبار میں مدد دیتی ہے اور اس طرح اس کی پیدادارِ محنت پر بڑا اثر کرتی ہے۔ اکثر قدیم قومیں ایک سے زیادہ بیبیاں کرنا مستحسن تصور کرتی تھیں اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ ہر قبیلہ اپنے افراد کی تعداد کو زیادہ کرنا چاہتا تھا تاکہ اس سے جنگ و جدل میں جو تمدن کے ابتدائی مراحل کا خاصہ ہوتا ہے دیگر قبائل پر غلبہ رہے۔ تاہم یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اقتصادی لحاظ سے تعدد ازدواج تمدن کی ہر صورت میں مستحسن ہے کیونکہ اس سے آبادی بہت بڑھتی ہے جو بسا اوقات قوموں کے افلاس کا باعث ہوتی ہے۔

۳۔ صرفِ دولت کی تیسری صورت دستکار کے بچوں کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت ہے۔ جس طرح بی بی کا ہونا دستکار کو محنت کی تحریک کرتا ہے اسی طرح بچوں کا پیدا ہونا بھی اس کے لئے ایک مزید محرک ثابت ہوتا ہے۔ بچے کی محبت ایک فطری تقاضہ ہے پس باپ کا اپنے بچوں کو پرورش کرنا یا ان کی تعلیم و تربیت پر روپیہ خرچ کرنا کچھ اس خیال سے نہیں ہوتا کہ وہ بڑے ہو کر روپیہ کمائیں گے یا قوم و ملک کے استحکام کا باعث ہوں گے بلکہ اس کی محبت ایک طبعی جوشش ہے جس کو کوئی شے دبا نہیں سکتی ۔"

ڈاکٹر اقبال ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد کہتے ہیں کہ چھوٹا کنبہ ہی خوشحالی اور پُرمسرت زندگی کا ضامن ہے۔ چنانچہ وہ آگے چل کر کہتے ہیں :-

"اس صریح اصول کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جس قدر کسی باپ کے بچوں کی تعداد زیادہ ہوگی اسی قدر اس کے وسائلِ آمدنی پر اثر پڑے گا اگر کسی شخص کی آمدنی قلیل ہو اور اس کی اولاد بڑھتی جائے تو صاف ظاہر ہے کہ اس خاندان کی فارغ البالی وہ نہ رہے گی جو پہلے اسے حاصل تھی۔ موجودہ آمدنی تمام افراد کے گذارے کے لئے کافی نہ ہوگی اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خاندان کی جسمانی حالت میں فرق آجائے گا اور وہ پس انداز بھی جو کسی آڑے وقت کے لئے جمع رکھا ہوگا خرچ ہو جائے گا بلکہ قلتِ معیشت کی وجہ سے خاندان مذکور میں بعض ایسی بیماریاں پیدا ہوں گی جن کا اثر نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا جائے گا۔"

اقبال کو اس کا اندازہ تھا کہ مستقبل میں ملک ان مسائل سے دوچار ہوگا اور حکومت کو بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کے لئے خاندانی منصوبہ بندی پر عمل پیرا ہونا پڑے گا اسی لئے وہ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

"یاد رکھنا چاہیئے کہ افزائشِ آبادی کو روکنے کی خواہش زیادہ زور کے ساتھ اسی صورت میں عمل کرتی ہے جبکہ زمین کی کاشت نقطۂ تقلیل تک پہنچ گئی ہو یا بالفاظ دیگر جب انسان کو یہ خیال ہو کہ سامانِ معیشت کی مقدار کافی طور پر مہیا نہ ہو سکے گی ان اصول کی رو سے تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کس امر کا تقاضہ کرتی ہے۔ ہمارے ملک میں سامانِ معیشت کم ہے اور آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ قدرت قحط اور وبا سے اس کا علاج کرتی ہے مگر ہمیں بھی چاہیئے کہ بچپن کی شادی اور تعدد ازدواج کے دستور کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں۔ اپنے قلیل سرمائے کو زیادہ دوراندیشی سے صرف کریں، صنعت و حرفت کی طرف توجہ کر کے ملک کی شرح اجرت کو زیادہ کریں اور عاقبت بینی کی راہ سے اپنی قوم کے انجام کی فکر کریں تاکہ ہمارا ملک مفلسی کے خوفناک نتائج سے محفوظ ہو کر تہذیب و تمدن کے ان اعلیٰ مدارج تک رسائی حاصل کرے جن کے ساتھ ہماری حقیقی بہبودی وابستہ ہے ۔"

ان سطور سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال کو مسائل کا کتنا صحیح اندازہ تھا۔ اگر اقبال کے خیالات کو قرار واقعی اہمیت دی جاتی تو اس وقت آبادی کا مسئلہ اتنی سنگین صورت اختیار نہ کرتا۔ وہ آخر میں اس طرح رقمطراز ہیں :-

"اقتصادی لحاظ سے انسان کی بہبودی اسی میں ہے کہ وہ حتی المقدور اپنی حیوانی خواہشوں کو پورا کرنے سے پرہیز کرے اور جہاں تک ممکن ہو بچوں کی کم سے کم تعداد پیدا کرے یہ مطلب بڑی عمر میں شادی کرنے یا بالفاظ دیگر شرحِ پیدائش کو کم کرنے اور نفسانی تقاضوں کو بالعموم ضبط کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے ۔"

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ سب سے پہلے آبادی اور خاندانی منصوبہ بندی پر اپنے مضامین اور تصانیف میں علامہ اقبال ہی نے اظہارِ خیال فرمایا ہے اور اس موضوع کی اہمیت دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ علامہ اقبال کی تصنیف "علم الاقتصاد" کے پیش لفظ میں جناب ممتاز حسن صاحب کے اس خیال سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ "اس حقیقت کا اعتراف لازم ہے کہ اس برصغیر میں اس کی (تحدید نسل اور خاندانی منصوبہ بندی) قیادت کا سہرا اقبال کے سر ہے۔"

ڈاکٹر اقبال نے نہ صرف روشن حقیقتوں کو بے نقاب کیا بلکہ اہلِ علم و دانش اور ماہرینِ معاشیات کی توجہ ان پہلوؤں کی طرف مبذول فرمائی جنھیں نظر انداز کرنے کے بعد صحیح نتائج تک رسائی ممکن نہیں۔ چنانچہ ماہر معاشیات جناب انور اقبال قریشی نے "علم الاقتصاد" کے مقدمہ میں اقبال کی وسعتِ فکر و نظر، رائے کی پختگی اور عالی دماغی کا اعتراف کرتے ہوئے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ اقبال کو نہ صرف یہ کہ معاشیات پر عبور تھا بلکہ انھیں اس موضوع پر ایسی دسترس حاصل تھی کہ وہ رائج الوقت نظریوں پر ناقدانہ نظر ڈال سکتے تھے۔ چنانچہ ماہرینِ معاشیات کے فرائض بیان کرتے ہوئے جن امور کی طرف

انھوں نے اشارہ کیا ہے جس پر ماہرین معاشیات نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اور یہی وجہ ہے کہ عملی نتائج خاطر خواہ نہیں نکلے۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال کو اس کا صحیح اندازہ تھا کہ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کا تناسب شرح پیداوار سے کہیں زیادہ ہے اور یہی وجہ ملک میں قلت وسائل کی بنا پر بے روزگاری اور مفلسی کے نہایت برے نتائج کا پیش خیمہ ہوگی۔ چنانچہ انھوں نے تمام ہندوستانیوں کو بالعموم اور ہندوستانی مسلمانوں کو بالخصوص مخلصانہ مشورے دیئے ہیں کہ ایک اچھے شہری اور وطن کے بہی خواہ ہونے کا ثبوت دینا اسی طرح ممکن ہے کہ تمام ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل میں پورا پورا عملی تعاون کریں۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ اقبال نے وقت سے بہت پہلے حکومت کو اس طرف توجہ دلائی اور تمام ابنائے وطن کو بھی قوم و ملک کی ترقی کے لئے ہمہ جہتی کوشش کی ترغیب دی۔ اقبال کو اندازہ تھا کہ مسلمانوں کی جانب سے اعتراضات بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے انھوں نے نہایت واضح اور غیر مبہم انداز میں خاندانی منصوبہ بندی کے لئے بڑی عمر میں شادی، تعدد ازدواج سے گریز اور ضبطِ تولید کی تلقین کی ہے۔ اقبال کی نظر میں ضبطِ تولید قابل اعتراض نہیں ہے۔ چنانچہ رسالہ "الحکیم" لاہور نومبر ۱۹۳۶ء میں اقبال کا ایک نہایت وقیع مضمون شائع ہوا تھا جسے رسالہ "ہمدرد صحت" دہلی نے جولائی ۱۹۳۹ء کے "ضبطِ تولید نمبر" میں نقل کیا ہے علامہ اقبال نے اپنے متذکرہ مضمون میں آبادی کی افزائش اور ضبطِ تولید کے مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں :-

> "شریعتِ اسلامی نے اجتماعی مسائل میں مصالحِ امت کو نظر انداز نہیں کیا ہے اور اس کے تصفیے کو اہلِ علم پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ حالات اور مقتضائے وقت کے مطابق ان کا فیصلہ کریں۔ اس لئے حفظِ نفس مقصود نہ ہو، حقیقی ضرورت موجود ہو اور فریقین رضامند ہوں تو جہاں تک میرا علم رہنمائی کرتا ہے شرعاً ضبط تولید قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ اصولِ شرعی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاوند اپنی بیوی کو اگر وہ اولاد کی خواہشمند نہ ہو اولاد پیدا کرنے پر باکراہ مجبور نہیں کر سکتا۔ لیکن دنیا میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اس کا بیشتر حصہ حفظِ نفس پر مبنی ہے اور محض حفظِ نفس کے لئے ایسا کرنا میرے نزدیک حرمت کے درجہ تک پہنچتا ہے۔ شرعی پہلو سے جو میں نے رائے دی ہے وہ ماہرِ شریعت کی حیثیت سے نہیں دی محض اپنے علم و مطالعہ کی بنا پر دی ہے۔"

علامہ اقبال کے بے باکانہ اظہار خیال کے بعد اس کا اعتراف لازم ہے کہ اقبال کی بصیرت اس دور کے آنے والے دور کے مفکرین اور دانشوروں کے لئے ایسی مشعلِ راہ ہے جس سے منزل کے سمت کا تعین ہی نہیں بلکہ رہنمائی ہوتی ہے۔ اور اس سے اس امر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال کا سماجی شعور کس قدر ترقی یافتہ تھا۔

بقیہ گزرا ہوا زمانہ

اُٹھ منہ ہاتھ دھو، کپڑے پہن، نوروز کی خوشی منا۔ تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں۔ تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڈھا ہو گیا تھا اس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا اس نے سن کر اس کو جواب دیا کہ بیٹا بس تو ایسا مت کر جیسا کہ اس پشیمان بڈھے نے کیا، بلکہ ایسا کر جیسا تیری دلہن نے تجھ سے کہا۔

یہ سن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکارا کہ او یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے، میں کبھی اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤں گا اور ضرور اس دلہن کو بیاہوں گا جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔ او خدا، او خدا تو میری مدد کر۔ آمین۔

پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو! اور اے میری قوم کے بچو، اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو، تاکہ آخیر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے، آمین ◆◆

صدیق مجیبی
لکچرار شعبۂ اردو۔ ایس ایس میموریل کالج
کانکے روڈ، رانچی

اک قدم اور اُجالے کی طرف

فروزاں چہرۂ ہستی ہوا جن آبگینوں سے
ہوئی گلنار تہذیبِ جہاں جن رہ نشینوں سے
عبادت سے ہوئی روشن نہ طاعت کی جبینوں سے
اگر جنت بنی دنیا تو محنت کے پسینوں سے

حقائق ثبت ہیں پتھر کی دیرینہ کتابوں پر
ہویدا ہے لہو مزدور کا سارے گلابوں پر

دیا تہذیب کے عریاں بدن کو پیرہن جس نے
بنایا جنگلوں کو کاٹ کر رشکِ چمن جس نے
سجایا حسن سے معمورۂ گنگ و جمن جس نے
جلایا خون سے اپنے چراغِ انجمن جس نے

اسی معمار کو دنیا نے زخموں کی ردا بخشی
برہنہ موسموں کو جس نے پھولوں کی قبا بخشی

وہی معمار جس نے دی قطب کو شانِ یکتائی
وہی فنکار جس نے تاج کو دی حسن و رعنائی
وہی صانع اجنتا کو عطا کی جس نے برنائی
وہ خالق دی الورا کے بتوں کو جس نے انگڑائی

خدا کی پیدا کردہ یہ زمیں اک حرفِ مہمل تھی
اگر ہوتا نہ یہ خالق تو دنیا نامکمل تھی

یہ جبر و ظلم کا شیوہ، یہ اندازِ جہاں بانی
یہ استحصال کی لعنت، یہ استبدادِ انسانی
اجارہ داریاں ان کی بنامِ ظلِ سبحانی
پریشاں حال محنت کش بہ فیضِ جورِ سلطانی

ستم ٹوٹے ہزاروں سال یوں مزدور و دہقاں پر
بجائے اجرتوں کے رکھ دیا نشتر رگِ جاں پر

یہ مزدوروں سے جبری کام کی لعنت مٹی آخر
بدستِ اندرا گاندھی چلو بدعت مٹی آخر
جبینِ محنت و مزدور سے ذلت مٹی آخر
نئے قانون سے قانون کی خفت مٹی آخر

مورخ بھول سکتا ہے کبھی اُس سن چہتر کو
بدل ڈالا ہے جس نے کامگاروں کے مقدر کو

انجم عرفانی
شعبۂ اردو، ایم۔ ایل۔ کے پوسٹ گریجویٹ کالج
بلرام پور۔ گونڈہ

نذرِ اندرا گاندھی

مادرِ ہند پہ کیا وقت کڑا آیا تھا   آفتاب امن کا کچھ ان دنوں گہنایا تھا
غنچہ غنچہ چمنِ زیست کا مرجھایا تھا   جیسے جنگل کی حکومت کا سماں چھایا تھا
کھیل اک گندی سیاست کا یہاں تھا جاری
جھوٹے نعروں کا ہر اک سمت فسوں تھا طاری

دھرم کے نام پہ یہ پاپ کمانے والے   امن کے نام پہ یہ لوٹ مچانے والے
لوٹ کے مال کی خیرات کھلانے والے   گھر جلا کر کے یہ دیوالی منانے والے
جام میں ان کے غریبوں کے لہو کی تھی شراب
دفن گوداموں میں جنتا کی تمناؤں کا خواب

اس قیامت کی گھڑی میں وہ دلاور آئی   مثلِ دریائے عمل، عزم کی پیکر آئی
پارِ دشواریوں کا کرتی سمندر آئی   دُکھ غریبوں کے سمجھنے کو وہ گھر گھر آئی
ناخدا بن گئی وہ ڈوبتی کشتی کے لیے
کام کیا کیا کیے بھارت کی ترقی کے لیے

قوم کو ایک نئی راہ دکھائی اُس نے   زندگی کی نئی تصویر بنائی اُس نے
اونچ اور نیچ کی تفریق مٹائی اُس نے   راہ میں آئی جو دیوار گرائی اُس نے
بے زمینوں کو زمیں دی، دیا بے گھر کو گھر
دیش کا اُس سے زمانے میں ہوا اونچا سر

ایسے ہی چند خطا کار، ہوس کے بندے   ملک اور قوم کے غدار، وہ دل کے گندے
چور بازاری، ملاوٹ ہی ہیں جن کے دھندے   ہر طرف پھینکنے کو دوڑے وہ کالے پھندے
چند ہارے ہوئے ناکام سیاسی مہرے
وقت بے وقت لگانے لگے جھوٹے نعرے

اور جب ہونے لگا سر سے بھی اونچا پانی   ہر طرف چھوٹے بڑے کرنے لگے من مانی
جب کہا فوج سے کہ وہ کرے نافرمانی   چھوٹ اب اور بھی دینا تھی بڑی نادانی
کتنا بر وقت و صحیح اس نے یہ اقدام کیا
کر کے اعلان ایمرجنسی کا کیا کام کیا

قوم کو بیس نکاتی نیا منصوبہ دیا   پھر سے دم توڑتی جمہوریت کو زندہ کیا
ملک کی گرتی ہوئی ساکھ کو بھی تھام لیا   دامنِ زیست کے ہر چاک کو دم بھر میں سیا
مطلعِ ہند پہ چھائی ہوئی کالی آندھی
چھٹ گئی سامنے جب آ گئی اندرا گاندھی

اندرجیت لال
ڈی ۱۴۱ گل مہر پارک، نئی دہلی ۴۹

سی۔ وی۔ رمن

ہندوستانی سائنس کا ایک درخشاں ستارہ

ایک مشہور ماہر سماجیات نے ایک بار ہندوستانیوں کے متعلق کہا تھا کہ "ان (ہندوستانی سائنس دانوں) کو اپنی لیبارٹریوں میں مصروف رہنے کے بجائے عوام میں آنا چاہیے۔" ڈاکٹر رمن نے بالکل اس کے برعکس کہا ہے کہ "ترقی کی طرف لے جانے والے لوگ ہمیشہ تحقیق و تجربات کے کاموں میں اپنے گوشوں ہی میں ملیں گے اور یہی لوگ ہیں جن کی انسانیت ہمیشہ احسان مند رہے گی۔" اور رمن اپنے قول کے مطابق زیادہ تر اپنی لیبارٹری (بنگلور میں واقع رمن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ) ہی میں وقت گزارا کرتے تھے اور عمر کے آخری دس سال میں تو تقریباً وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے "میں تنہائی کے گوشہ میں سائنسدانوں کی طرح عمر بسر کرنے کے حق میں ہوں۔ میں صرف کام کرنے کا شیدائی ہوں میرا بنیادی ذوق سائنس ہی میں ہے اور مجھے سائنسی کاموں سے سکون و مسرت ملتی ہے۔"

چندر شیکھر وینکٹا رمن ۷ر نومبر ۱۸۸۸ء کو ترو چراپلی میں پیدا ہوئے بچپن ہی سے وہ بلا کے ذہین اور لکھنے پڑھنے کے شوقین تھے۔ ترو چراپلی میں تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ اس لیے رمن کے والد چندر شیکھر آئر انھیں گاؤں سے ترچناپلی لے آئے۔ جہاں رمن نے بی اے پاس کیا۔ رمن کے والد ہونہار بچے کو گھر پر سائنس اور ریاضی پڑھایا کرتے تھے اور اسکول میں پرنسپل انھیں انگریزی میں خاص طور پر وقت نکال کر پڑھایا کرتے تھے۔ رمن نے تیرہ برس کی عمر میں مدراس کے پریذیڈنسی کالج میں داخلہ لے لیا۔ جب رمن بی اے میں پڑھتے تھے۔ تو ان کے استاد نے ایک دن بھری جماعت میں ان سے پوچھا کہ کیا آپ واقعی بی اے کے طالب علم ہیں تو جواب ملا "جی ہاں" "آپ کی عمر کتنی ہوگی؟" استاد نے دوسرا سوال کیا "تیرہ برس جناب" رمن نے جواب دیا۔ استاد بڑا حیران ہوا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اتنی کمسنی میں رمن اپنی لکھائی پڑھائی کے ساتھ ساتھ ایک مضمون بھی لکھ رہا ہے (جو بعد میں ایک بین الاقوامی جریدے میں شائع ہوا) تو استاد تو کیا سارا کالج حیران رہ گیا اور رمن کی ذہانت کی دھاک بندھ گئی۔ اسی زمانہ میں رمن نے ایک بصیرت افروز مضمون لکھا جو لندن کے "فلاسفیکیل میگزین" میں شائع ہوا۔ اس سے بھی رمن کی عزت بہت بڑھ گئی۔ دو سال بعد رمن نے ایم اے (طبیعیات) اول درجہ میں پاس کیا اور انھیں ایک سنہری، تمغہ انعام میں ملا۔ رمن ۱۹۱۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر تعینات ہو گئے۔ اور دو سال بعد انڈین انسٹی ٹیوشن آف سائنس کے سکریٹری چن لیے گئے۔

رمن ۱۹۲۱ء میں ایک کانفرنس میں آکسفورڈ شرکت کے لیے گئے اور تین برس بعد ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے فرینکلن گئے۔ آپ نے چار ماہ کیلیفورنیا میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا اور اس کے ساتھ ہی ایک بین الاقوامی انجمن (رائل سوسائٹی) کے فیلو بنا دیئے گئے۔ رمن نے ۱۹۲۶ء میں ہندوستان سے ایک رسالے "انڈین جرنل آف فزکس" کا بطور ایڈیٹر اجرا کیا۔ ۱۹۲۹ء میں حکومت نے انھیں "سر" کے خطاب سے سرفراز کیا اور ۱۹۳۲ء میں آپ کو بین الاقوامی انعام "نوبل انعام" سے نوازا گیا۔

ڈاکٹر رمن نے ۱۹۳۳ء میں بنگلور کے ایک ادارے میں سائنسی کاموں کا عہدہ سنبھال لیا۔ ایک سال بعد جب ہندوستان میں انڈین اکاڈمی آف سائنس کی بنیاد پڑی تو رمن کا اس میں بہت بڑا حصہ تھا۔ ۱۹۵۱ء میں بنگلور میں رمن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا اور ڈاکٹر رمن مرتے دم تک اس ادارے کے روحِ رواں رہے۔ ۱۹۵۴ء میں آپ کو "بھارت رتن" اور روس سے لینن انعام سے نوازا گیا۔ لینن انعام کے اعلان پر رمن نے اپنے جذبات کا یوں اظہار کیا "لینن انعام کے لیے سب سے پہلے مجھے منتخب کیا گیا ہے صرف اس لیے نہیں کہ میں ایک سائنس دان ہوں لیکن اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ میں نے کوئی سائنسی تحقیق اپنی ذاتی ترقی یا جنگ یا تخریب کے لیے نہیں کی بلکہ میری ہر دم یہ خواہش رہی ہے کہ سائنسی تحقیق دنیا کی ترقی و امن کے لیے کی جائے۔"

ڈاکٹر رمن کی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ چند سالوں میں ان کی دھاک دنیا

بھر میں بٹھ گئی۔ پیرس، گلاسکو، فریبرگ، بمبئی، کلکتہ، بنارس، مدراس اور ڈھاکہ یونیورسٹیوں نے انھیں اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔ آپ عمر بھر یورپ کی کئی سائنسی انجمنوں کے ممبر رہے اور خصوصاً پیرس فرانس اور روس کی سائنسی اکاڈمیوں کے بیرونی رکن کئی برس تک رہے۔ علم و تحقیق کی یہ لَو ۲۱ نومبر ۱۹۷۰ء کو ہمیشہ کے لیے گل ہو گئی۔ لیکن ہندوستانی سائنس دانوں میں اور دنیا کے سائنس دانوں میں ڈاکٹر رمن کا نام ہمیشہ امر رہے گا۔

سابق صدر جمہوریہ ہند نے رمن کی موت پر بڑے قابلِ قدر الفاظ میں یوں کہا۔ رمن ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ ان میں تحقیق و تجسس کی بڑی لگن تھی، جو دوسرے سائنس دانوں کو دعوتِ فکر دے سکتی ہے۔ ان کی موت سے ہندوستان ہی کا نہیں بلکہ دنیا سے ایک عظیم سائنسدان اٹھ گیا ہے۔"

ڈاکٹر رمن کے لیے کام زندگی تھا اور سائنس ان کی نظروں میں خدا کا درجہ رکھتی تھی۔ آخری دنوں میں جب وہ بہت بیمار ہو کر کمزور ہو گئے تو ڈاکٹروں سے کہا کرتے تھے میں اس بیکار زندگی کا کیا کروں جس میں میں ایک فیصدی کام کرنے کا اہل تک نہیں ہوں۔ رمن وقت کی بڑی قدر کرتے تھے اور اپنے تحقیق کے کاموں میں ہمہ تن منہمک رہتے تھے وہ کہا کرتے تھے زندگی بے حسی کا نام نہیں۔ جب تک سانس ہے تب آس کے جذبہ کے ساتھ کام کرتے رہنا چاہیے اور بڑھاپا کوئی تھکن یا مایوسی نہیں پیدا کر سکتا۔

ڈاکٹر رمن کو فنونِ لطیفہ، سنسکرت، ادب اور موسیقی سے دلچسپی تھی۔ وہ اپنے لکچروں میں بار ہا سنسکرت کے ادب یعنی کالیداس وغیرہ ...... کے کلام کے حوالے دیا کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے اپنے دل کی بات یوں کہی "میں طویل عمر کا خواہش مند ہوں۔ اس لیے نہیں کہ کچھ زیادہ عرصہ عیش و عشرت کر سکوں بلکہ اس لیے کہ میں موسیقی کی ان جھنکاروں سے فیضیاب و لطف اندوز نہیں ہو سکا جس سے ہونا چاہتا ہوں۔" آپ وائلن اور مردنگ پر فرصت کے اوقات صرف کیا کرتے تھے۔ بنگلور میں ایک دوکان ساز سنگیت کے سامان کی ہے جہاں رمن اکثر جایا کرتے تھے۔ دوسرے ان کے گھر میں کئی طبلے وائلن مردنگ، نادسور وغیرہ پڑے رہتے تھے۔ جو انھوں نے اپنی طویل عمر میں دور دراز سے خرید کر جمع کر رکھے تھے۔ آپ نے ایک کتاب "موسیقی کے ساز " پر بھی لکھی۔

ڈاکٹر رمن ہندوستانی سائنس کے ہمیشہ شدید نکتہ چیں رہے۔ ان کی شکایت تھی کہ ہندوستان نے بین الاقوامی سطح کا ایک بھی سائنس دان نہیں پیدا کیا۔ ہاں ہندوستان کی رسدگاہوں میں جو کروڑوں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے ڈاکٹر رمن اس کے حق میں رہے۔ بلکہ وہ کہا کرتے تھے کہ سائنس کی صحیح خدمت لیبارٹریوں ہی میں ہو سکتی ہے۔ مغل بادشاہ شاہ جہاں نے تاج محل اپنی بیوی کے نام پر تعمیر کرایا اور ہماری رسدگاہیں ہمارے سائنسی اوزاروں و ساز و سامان کی تاج محل ہیں۔

رمن ہندوستان میں ایک کامیاب سائنس دان رہے۔ انھیں ملک و قوم اور حکومت نے بڑی عزت و اعزاز دیا۔ صرف اس لیے کہ رمن ایک عام سائنس داں نہ تھے بلکہ اپنی ذات میں ایک انجمن اور ہندوستان کی ایک قابلِ قدر شخصیت تھے۔

ڈاکٹر رمن کا تحقیقی کام رمن ایفکٹ (RAMAN EFFECT) کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت کا باعث بنا۔ آپ کو روشنی کے موضوع سے خاص دلچسپی تھی اسی موضوع پر انھیں عالمی شہرت نصیب ہوئی۔ اس کام کو دنیا کے مشہور سائنسدان آئین سٹائین نے بڑی گرم جوشی سے قبول کیا۔ اور سائنس کی دنیا میں رمن کا ایک ریکارڈ قائم ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رمن ہندوستانی سائنس کے فلک پر لگ بھگ ساٹھ برس ایک درخشاں ستارے کی طرح چمکتے رہے۔

رمن ایفکٹ کے متعلق سائنس کی دنیا میں ایک کہانی مشہور ہے کہتے ہیں ایک بار رمن ہوائی جہاز میں بیٹھ کر غیر ملک کی سیاحت کے لیے جا رہے تھے اس وقت ان کا جہاز سمندر کے اوپر سے پرواز کر رہا تھا۔ رمن نے سمندر کے پانی کی سطح پر نگاہ دوڑائی تو انھوں نے محسوس کیا کہ سمندر کے پانی کا رنگ کچھ مختلف نظر آ رہا تھا وہ اس مسئلے یا معمے پر خوب غور کرتے رہے جو بعد میں رمن ایفکٹ کے نام سے ایک سائنسی تحقیق بن کر سامنے آئی۔

ڈاکٹر رمن سائنسی موضوعات کے ایک اچھے انشا پرداز تھے۔ آپ کے ایک انشائیے "پانی۔ ایک آب حیات" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"انسان نے مقدس امرت یعنی آب حیات کی تلاش میں کئی صدیاں گزار دیں لیکن زندگی کا اصلی امرت ہمارے سامنے پڑا ہے اور یہ سب سیال مادّوں میں سب سے زیادہ عام ہے۔ اس کا نام ہے "پانی" اس پانی کی بدولت حیوانات اور نباتات کی زندگی جاری و ساری ہے۔ اس اعتبار سے اس کی ضرورت ہے کہ پانی کے خواص پر بھرپور تحقیق کی جائے۔ اور اسے سائنس کی نگاہ سے مقدم کھوج کا نشانہ بنایا جائے۔ اس موضوع میں کھوج کی گنجائش بھی ہے اور اس پر تحقیقی کام از بس ضروری بھی۔"

ڈاکٹر رمن نے "سائنس کے چند پہلو" کے عنوان سے آل انڈیا ریڈیو مدراس کے لیے کچھ تقریریں بھی لکھیں۔ جو آج کی سائنس کے مختلف موضوعات پر بھرپور روشنی ڈالتی ہیں۔ ان موضوعات میں "روشنی اور رنگ" "دیہاتی علاقے کی طبیعیات" "جدید طبیعاتی تصورات" "طبیعات کا مستقبل" اور "سائنسی نقطۂ نظر" قابلِ ذکر ہیں۔ آخری مضمون میں ڈاکٹر رمن لکھتے ہیں:-

"..... بڑے بڑے انکشافات بڑی حد تک نوجوان ذہنوں نے کیے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دوسری چیزیں اگر برابر بھی ہوں تو بھی سائنسی تحقیقات میں کامیابی کے لیے ضروری چیز علم کی پختگی نہیں ہوتی (جو عمر اور تجربہ کے ساتھ حاصل ہوتی ہے)، بلکہ نقطۂ نظر کی تازگی ہوتی ہے۔ یہ نوجوان ذہنوں میں بخوبی پائی جاتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اعلیٰ خیالات نوجوان ذہنوں میں آسانی سے آتے ہیں۔" رمن آگے چل کر سائنس کی تشریح یوں فرماتے ہیں: "سائنس کا عالم فطرت

(باقی صفحہ ۳۵ پر)

طاہر محمود
شعبۂ قانون دہلی یونیورسٹی، دہلی

اسلام اور کنبہ بندی

ہندوستان کی آبادی میں بجلی کی رفتار سے مسلسل اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ اس روز افزوں اضافہ کے نتیجہ میں ملک وقوم کے مستقبل کے لئے جو خطرات لاحق ہوگئے ہیں ان کے پیش نظر قومی لیڈر یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں کہ اب خاندانی منصوبہ بندی کا عوامی سطح پر اختیار کیا جانا ہماری فلاح وبہبود کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ سے عوام کو خاندانی منصوبہ بندی کے لئے مختلف طریقے اپنانے کی ترغیب دینے کی زبردست جدوجہد کی جارہی ہے۔

ہمارے ملک میں کیونکہ ہر چیز کو مذہب کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے اس لئے ہمارے لیڈروں کے لئے لوگوں کو یہ سمجھانا بھی ضروری ہوگیا ہے کہ کنبہ بندی کی پالیسی کسی مذہب کے اصولوں سے متصادم نہیں ہے۔ چنانچہ ۱۸ راگست کو کلکتہ میں منعقدہ ایک سمینار میں بولتے ہوئے صدر جمہوریہ عزت مآب جناب فخرالدین علی احمد نے فرمایا کہ کسی بھی مقدس کتاب میں یہ نہیں لکھا ہے کہ بے سوچے سمجھے بچے پیدا کئے جائیں اور انھیں اس باعث تباہ وبرباد ہونے کے لئے چھوڑ دیا جائے کہ والدین ان کی مناسب کفالت نہیں کرسکتے۔" مذہب اور کنبہ بندی کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہ ہونے کی بات دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے علاوہ مسلمانوں کو بھی سمجھائی جارہی ہے۔ لیکن اس ملک کے مسلمان عوام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف اس چیز کو بخوشی اختیار کرنے پر رضامند ہوتے ہیں جس کی ان کے دین میں صریح اجازت دی گئی ہو۔ صرف یہ دلیل کہ کسی خاص چیز کی مذہب میں صاف طور پر ممانعت نہیں ہے انھیں اس چیز کی طرف آسانی سے راغب نہیں کرتی۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ اسلام کی دینی اور فقہی کتابوں کا مطالعہ کرکے یہ معلوم کیا جائے کہ آیا ان میں کہیں خاندانی منصوبہ بندی کے جائز ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ زیر نظر مقالہ وقت کی اس اہم ضرورت کی تکمیل کی طرف ایک ادنیٰ کوشش ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اپنی معروضات پیش کریں یہ ذہن نشین کرنا بے حد ضروری ہے کہ اصول کنبہ بندی ایک چیز ہے اور اس کے لئے اختیار کئے جانے والے طریقے ایک دوسری چیز۔ ان دونوں کو مترادف نہیں قرار دیا جاسکتا۔ چنانچہ ہم پہلے کنبہ بندی کے ذرائع سے قطع نظر اسلام میں کنبہ بندی کی اصولی حیثیت کا جائزہ لیں گے اور اس کے بعد اس پر غور کریں گے کہ اس مقصد کے لئے جو طریقے رائج ہیں ان کے سلسلہ میں مسلمانوں کا کیا رویہ ہونا چاہئے۔

آیئے پہلے قرآن مجید کو لیجئے جو کہ یقیناً اسلامی ثقافت اور قانون دونوں کے لئے بنیادی چارٹر کا درجہ رکھتا ہے۔ دین اسلام کے ایک عظیم المرتبت فقیہ امام شافعیؒ کی بیان کردہ تفسیر کے مطابق خاندان کو بہت وسیع نہ کرنے کا مشورہ "خود کلام پاک میں موجود ہے۔ قرآن حکیم کی آیت تعدد ازدواج سے ہم سب واقف ہیں جس کے تحت مرد کو بیک وقت چار شادیاں کرنے کی اجازت دی گئی ہے بشرطیکہ وہ سب بیویوں کے ساتھ مکمل طور پر مساوی برتاؤ کرنے پر قادر ہو۔ یہ بات بھی لوگ عموماً جانتے ہیں کہ اس مشروط اجازت کے ساتھ ہی قرآن حکیم میں ایک ہی بیوی پر قناعت کرنے کی صلاح بھی دی گئی ہے۔ امام شافعیؒ کی تفسیر کے مطابق اس صلاح کی حامل قرآنی آیت کا ترجمہ اور مفہوم یہ ہے "بہتر تو یہی ہے کہ تم اپنے اہل وعیال اتنے زیادہ نہ بڑھاؤ کہ جن کی پرورش تم پر بار بن جائے۔" گویا اس عظیم فقیہ کی رائے میں مسلمانوں کا "نسخۂ کیمیا" یعنی قرآن پاک اپنے ماننے والوں کو تعدد ازدواج کی مشروط اجازت دیتے ہوئے یہ صلاح بھی دیتا ہے کہ وہ اس کی شرطوں کو پورا کرنے کی قدرت ہوتے ہوئے بھی خاندان کو محدود رکھنے کی خاطر اس اجازت سے استفادہ نہ کریں۔ امام شافعیؒ کی بیان کردہ یہ تفسیر بعد میں کئی اور بزرگوں نے بھی اختیار کی تھی جن میں فقہا بھی شامل تھے اور مفسرین بھی۔ مثال کے طور پر کسائی، صاحب روح المعانی اور تاج المصادر کے مصنف کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ امام شافعیؒ کے علاوہ دیگر اماموں میں سے اکثر کے نزدیک ایک ہی بیوی پر قناعت کرنے کی قرآنی صلاح کا منشا یہ تھا کہ کیونکہ بیویوں کے درمیان مکمل عدل کی شرط بے حد مشکل ہے اس لئے ایک مخصوص دینی اجازت کی شرائط پوری کرنے سے قاصر رہنے کے وبال سے بچنے کی خاطر بہتر ہوگا کہ اس اجازت سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ لیکن امام شافعیؒ کی تفسیر کو، جس کو کسائی وغیرہ نے بھی اختیار کیا تھا، یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور نہ کوئی مسلمان اسے غلط کہنے کی جرأت کرسکتا ہے۔ اور پھر جیسا کہ معلوم ہے کسی ملک کے مسلمان، خواہ وہ عموماً کسی مخصوص امام کے پیرو ہوں، حسب ضرورت کسی بھی دیگر امام کے مسلک پر آزادی سے عمل کرسکتے ہیں کیونکہ دین وفقہ کی نظر میں سب اماموں کا درجہ برابر ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ امام شافعیؒ کی مذکورہ تفسیر کو خود ہندوستان میں بعض مشاہیر نے صراحتاً اختیار کیا ہے۔

بعض قرآنی آیات کی جس تفسیر کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اس میں ہمیں بے شک اصول کنبہ بندی کا جواز ملتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ فقہی کتابوں میں ایسے صریح مسائل موجود ہیں جو ضبط تولید کے ضرورتاً اختیار کئے جانے کے جواز کی دلالت کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں عالم اسلام کے مشہور ومعروف فلسفی فقیہ امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم

اور ہندوستان کے مایۂ ناز عالم و مصلح شاہ عبدالعزیز کی تفسیر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کتابوں میں جو متعلقہ مسائل ملتے ہیں ان سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ان کے "جائز مقاصد" کے لئے اسلام میں ضبطِ تولید کی پوری اجازت ہے۔ ان میں کسی بھی کتاب میں "جائز مقاصد" کی کوئی جامع فہرست نہیں ملتی صرف ان مقاصد کی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ بات انتہائی اہم ہے کہ امام غزالی اور شاہ عبدالعزیز دونوں نے عورت کی صحت یا حسن کے تحفظ کو ضبطِ تولید کا ایک جائز مقصد قرار دیا ہے۔ ان بزرگوں کا یہ فتویٰ ہمیں موجودہ زمانہ کے حالات کے پیشِ نظر یہ طے کرنے میں مدد دیتا ہے کہ اور کیا مقاصد کنبہ بندی کے لئے اسلام میں جائز ہو سکتے ہیں۔ اسلام کے جیسا دینِ کامل جو اپنے مسائل کی حکمت اور بالغ نظری کی بنا پر بے شک "دینِ فطرت" کہلانے کا حقدار ہے۔ ان مشکلات کی طرف سے بھلا کیسے آنکھ بند کر سکتا ہے جو کسی ملک یا سماج کو کسی مخصوص زمانہ میں آبادی کے بے حساب اضافہ کے باعث پیش آ رہی ہوں۔ اگر کوئی ملک اپنے باشندوں کی ایک غیر محدود اور برق رفتاری سے بڑھتی ہوئی تعداد کو زندگی کی روزمرہ ضروریات فراہم نہ کر پا رہا ہو تو وہاں آبادی کو مزید بڑھنے سے روکنے کے لئے ضروری اقدامات کا کیا جانا اسلام میں کنبہ بندی کے جائز مقاصد کے دائرہ سے کسی طرح بھی خارج نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ ان حالات میں ضبطِ تولید کی تدابیر اختیار کرنے والا ملک اپنے شہریوں کی کسی جماعت کو ان کے مذہب کے خلاف چلنے پر مجبور کر رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک کنبہ بندی کے اصولی جواز کا سوال ہے اسلامی مسائل میں اس کا جواب اثبات میں ملتا ہے۔ "جائز مقصد" کی شرط ضرور ہے مگر ان مقاصد کا تعین ہر ملک اور ہر زمانہ کے حالات کے مطابق کیا جائے گا۔ البتہ یہ سوال بالکل مختلف ہے کہ کنبہ بندی کے جو ذرائع آج کل رائج ہیں وہ اسلامی دین و ثقافت میں کیا مقام رکھتے ہیں۔ اسلام کی دینی و فقہی کتابوں میں خاندان کو محدود رکھنے کے دو طریقوں کا ذکر ملتا ہے۔ ایک تو جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں بعض فقہا و مفسرین کی بیان کردہ تفسیر کے مطابق قرآن حکیم میں اہل و عیال زیادہ نہ بڑھانے کی خاطر ایک مخصوص اجازت یعنی تعدّدِ ازدواج سے استفادہ نہ کرنے کا طریقہ مذکور ہے۔ دوسرے صحیح مسلم، موطا امام مالک اور حدیث کی کچھ اور کتابوں میں "عزل" کا ذکر ملتا ہے۔ ان حدیثوں کے مطابق عہدِ رسالت میں کچھ لوگ اس عمل کو اختیار کرتے تھے اور رسولؐ نے ان کے استفسار پر صراحتاً ایسا کرنے کی اجازت عطا فرمائی تھی۔ اسقاطِ حمل کے معاملہ میں قرآن حکیم کی ان آیات کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے جن میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ "مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔" زمانہ قبل اسلام میں بعض قبائل اپنی اولاد کو پیدا ہونے کے بعد ان کی کفالت کے بار سے بچنے کے لئے قتل کر دیا کرتے تھے اور مذکورہ آیت کریمہ کا اصل مقصد اس ظالمانہ رواج کو ختم کرنا تھا۔

خلفائے اسلام حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ وغیرہ کی رائے میں "بچوں کا قتل" جس کا ذکر آیات ۶ : ۱۵۲ اور ۱۷ : ۳۱ میں آیا ہے خارج از بحث ہے۔ جب تک وہ بچہ سات مراحل پورے نہ کرے — قرآن پاک ان سات مرحلوں کا ذکر آیات ۲۳ : ۱۲-۱۴ میں سائنٹیفک طریقہ پر کرتا ہے یعنی:

(۱) منی کا خلاصہ نکلنا (۲) رحم کے اندر نطفہ (۳) لوتھڑا بننا (۴) گوشت کا ٹکڑا (۵) ہڈیاں بننا (۶) ہڈیوں پر گوشت چڑھنا۔ اور آخر کار (۷) روح پھونک کے نئی ہستی کا وجود میں آجانا۔

فقہا نے اس سے یہ مراد لیا ہے کہ جب تک حمل انسانی بچہ کی شکل اختیار نہ کرے اسے گرانا جائز ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قرارِ حمل کے ۱۲۰ دن بعد بھی لوتھڑا انسانی وجود نہیں ہوتا۔ حنفی اور مالکی جیسے کٹر فقہا اور دوسرے فقہا بھی بچہ میں روح کے نفوذ سے پہلے ضیاعِ حمل کو جائز قرار دیتے ہیں۔ خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ بھی قرارِ حمل کے بعد ۱۲۰ دنوں میں حمل گرانے کو بچوں کا قتل قرار نہیں دیتے اس لئے قرارِ حمل سے پہلے مادۂ تولید کو ضائع کرنا انسانی وجود کے قتل کے مترادف نہیں ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اسقاطِ حمل سے متعلق ہندوستانی قانون (یعنی طبی اسقاطِ حمل ایکٹ ۱۹۷۱ء) کے تحت اگر طبی مشورہ کے مطابق عورت کی جسمانی یا دماغی صحت کے لئے اسقاطِ حمل ضروری ہو تو قرارِ حمل کی تاریخ سے بارہویں یا زیادہ سے زیادہ بیسویں ہفتہ کے پورا ہونے سے قبل اسقاط کی اجازت ہوگی اس کے بعد نہیں۔ اور یہ مدت پہلی صورت میں تین ماہ کے قریب اور دوسری صورت میں پانچ ماہ سے کم ہوگی۔ البتہ میاں بیوی نے ضبطِ تولید کا کوئی طریقہ استعمال کیا ہو اور اس کے بے اثر رہنے کے باعث خلافِ نیت قرارِ حمل ہو گیا ہو تو زوجین کے کہنے پر اس صورت کو عورت کی دماغی صحت کے لئے نامناسب قرار دے کر ڈاکٹر اسقاطِ حمل کی سفارش کر سکتا ہے۔

اسقاطِ حمل بہرحال کنبہ بندی کا کوئی مقبول طریقہ نہیں ہے۔ کنبہ بندی کا مطلب تو حمل کو قرار پانے سے ہی روکنا ہے نہ کہ قرار پانے کے بعد اس کا ضائع کرنا۔ چنانچہ کنبہ بندی کے جو طریقے آج کل زیادہ رائج ہیں وہ ہیں مانعِ حمل چیزوں مثلاً نرودھ وغیرہ کا استعمال اور نسبندی۔ اسلامی کتابیں ان طریقوں کے جواز کے سلسلہ میں خاموش ہیں جس کی وجہ ظاہر ہے۔ لیکن "عزل" کے فرسودہ طریقہ کے جدید بدل ہونے کی حیثیت سے ہمیں ان طریقوں کے جواز کی طرف سے خوامخواہ کے شک و شبہ میں نہیں پڑنا چاہئے۔ قدیم عرب میں زخموں کو داغنے کا جو فرسودہ طریقہ رائج تھا اس کی جگہ اگر جدید سرجری کو جائز طور پر اپنایا گیا ہے تو "عزل" کی جگہ کنبہ بندی کے ان جدید طریقوں کو اپنانا بھی مسلمانوں کے لئے جائز ہی ہونا چاہئے۔ دونوں صورتوں میں ہونے والی تبدیلی سے دین و مذہب کے اصول کی نفی نہیں ہوتی۔ ایران اور پاکستان جیسے اسلامی ممالک میں، جو کہ دستوری طور پر اسلامی مسائل کے پابند ہیں، کنبہ بندی کی تحریک وسیع پیمانہ پر اسی باعث چل رہی ہے کہ وہاں کے عوام اور حکومتیں قدیم طریقوں کی جگہ جدید طریقے اختیار کئے جانے کی پالیسی کو مذہب سے متصادم نہیں سمجھتی ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی کے کسی مخصوص طریقہ کے دینی جواز پر غور کرتے وقت ہمیں پوری وسعتِ نظر سے کام لینا چاہئے۔ بیسویں صدی میں ایجاد کئے گئے طریقہ کے مثبت و صریح جواز کی قدیم فقہی کتابوں میں تلاش بجائے خود غلط ہے۔ ہمیں [illegible]

[illegible]

غزلیں

واجد سحری
A-۱۳ طبیہ کالج، قرول باغ، نیو دہلی ۵

وہ قتل کرکے مجھے ناز سے یہ کہتا ہے
زمانہ میں مرا کردار کتنا اونچا ہے
نیاز مانہ ہے کرچیں بکھیر شیشوں کی
ستم کی طرز بدل خار کیوں بچھاتا ہے
سہاگنیں یہ بتائیں کہ ہے کنواری کون
لبوں پہ سب کے ہے لالی جبیں پہ بندیا ہے
کسک پہنچتی ہے احساس کو مروت سے
عبث گلی گلی تیرے ستم کا چرچا ہے
وہ جانتا ہے گلوں کا ہے شیفتہ واجد
یہ سوچ کر ہی تو کلیوں کو اس نے مسلا ہے

شکیب ایاز
اورینٹل کالج، پٹنہ ۶

مرا جسم ہے، میرا چہرہ نہیں ہے
کہیں آئینہ بھی تو جھوٹا نہیں ہے
مری شخصیت سے یہ انکار کیسا
یہ پتھر نہیں ہے، یہ شیشہ نہیں ہے
بہت دن سے خالی حویلی پڑی ہے
کوئی نام تختی پہ لکھا نہیں ہے
ابھی میرے شیشے میں مے ناچ رہی ہے
ابھی ترکِ غم کا ارادہ نہیں ہے
ابھی روشنائی نہ کاغذ پہ پھیلے
ابھی ماجرا دل کا لکھا نہیں ہے

ستیہ نند جاوا
اسکول آف فارن لینگویجز، ویسٹ بلاک IV
راما کرشنا پورم، نئی دہلی

جو دور سے ہمیں اکثر خدا سا لگتا ہے
وہی قریب سے کچھ آشنا سا لگتا ہے
کبھی ہماری نگاہوں سے دیکھ لے اس کو
پھر اس کے بعد بتا تجھ کو کیسا لگتا ہے
تمام رات جلے دن کو سرد مہری سے
بدن کا شہر بھی شہرانا سا لگتا ہے
وہ اس کی سہمی سی چاہت جفا کی چلمن میں
وہ بے وفا بھی ہمیں باوفا سا لگتا ہے
صلیب ودار پہ چڑھ کر ہوئے ہیں لافانی
یہ دست مرگ بھی دست دعا سا لگتا ہے

ظہیر انور
ماہنامہ صبح نو، پوسٹ بکس ۲۴۴، پٹنہ

تلخیاں لیتا چلوں، رسوائیاں لیتا چلوں
یعنی اس کی قربتوں کے ارمغاں لیتا چلوں
تاکہ آنکھوں میں لگے اور اشک بن کر بہہ سکے
اپنی جلتی خواہشوں سے کچھ دھواں لیتا چلوں
کیا خبر اس سرزمیں پر دھوپ کتنی تیز ہو
سر چھپانے کے لئے اک آسماں لیتا چلوں
شاید اس کے روبرو دینا پڑے اپنی شناخت
کوشش ناکام، عمر رائیگاں لیتا چلوں
کوئی بیٹھا ہے پس ایقان انور آج بھی
اک ذرا ابہام، کچھ گرد گماں لیتا چلوں

حمید عظیم آبادی
سبزی باغ، پٹنہ ۴

خوشی کا نام ہے باقی مگر خوشی تو نہیں
وجود زیست تو ہے لطفِ زندگی تو نہیں
کرے خودی کو مری بیخودی سے ہم آغوش
ابھی وہ مے مرے ساقی مجھے ملی تو نہیں
سنا ہے ذکر وفا پر ہوئے وہ مجھ سے خفا
مگر یہ بات کوئی وجہِ ناخوشی تو نہیں
ملی نگاہ تو ساقی نے مسکرا کے کہا
نظر جھکا کے کہ یہ طور میکشی تو نہیں
عبث ہے حسرت و ارماں کا یہ ذکر حمید
کہ میری شمعِ تمنا کبھی جلی تو نہیں

محمد غلام رسول اشرف
تکیہ معصوم شاہ مومن پورہ ناگپور ۱۸

میں ہوں کنکر یا گہر بعد میں بولے کوئی
پہلے آکر تو ذرا مجھ کو ٹٹولے کوئی
ہر کوئی تلخ کلامی کا ہے گویا عادی
اب تو شاید ہی یہاں پیار سے بولے کوئی
مدتوں سے ہیں پڑے بند دریچے دل کے
اب تو امید نہیں کہ انھیں کھولے کوئی
انگلیاں شوق سے سب مجھ پہ اٹھائیں لیکن
بے خطا کون ہے اس شہر میں بولے کوئی
تیری خوش فہمی ہے یہ اور نہیں کچھ اشرف
تو اگر چاہے ترے ساتھ بھی ہو لے کوئی

آج کل نئی دہلی

محمد یعقوب
۶۴۲۶/۲، قصاب پورہ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

سودا کے ادبی معرکے

سودا کے ادبی معرکوں نے اپنے زمانے میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی تھی۔ اُردو شعرا کا کوئی ایسا تذکرہ نہیں جس میں ان کی ہجو گوئی اور معرکہ آرائیوں کی داستانیں مذکور نہ ہوں۔ جن لوگوں کے ساتھ اُن کے معرکوں کا ذکر ملتا ہے ان میں میر تقی میر، مرزا فاخر مکیں، قیام الدین قائم چاندپوری، میر غلام حسین ضاحک، فدوی، ندرت کاشمیری، بقا اکبرآبادی، جعفر علی حسرت، اور میر تقی مرثیہ گو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ میر تقی میر

میر سودا کی شاعرانہ صلاحیتوں اور اُن کے استادانہ منصب کے معترف تھے۔ انھوں نے اپنے تذکرے میں سودا کا جس خلوص کے ساتھ ذکر کیا ہے، وہ ان کی دوست داری کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ 'نکات الشعرا' میں تحریر ہے کہ "سودا خوش خلق، خوش گو، گرم جوش، یار باش اور شگفتہ رو جوان ہیں۔ غزل و قصیدہ اور مثنوی و قطعہ، مخمس و رباعی سب خوب کہتے ہیں۔ چنانچہ ریختہ کی ملک الشعرائی انہیں زیب دیتی ہے" اس کے علاوہ نظم میں بھی ان کی فنی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں اپنا ہم پلہ قرار دیا ہے۔

ایک دو ہی ہوتے ہیں خوش طرز و طور   اب چنانچہ میر و مرزا کا ہے دور

میر کے شاگرد اور معتقدین اپنے استاد کے اس اخلاق کی وجہ سے سودا کا احترام کرتے تھے اور ان کی تعظیم کو ہر طرح ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ شاید سودا میر کی دوستی اور اُن کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی زیادہ محتاط نہ رہے بلکہ ان کے بہت سے شاگرد اور دوست بھی، جو شوخ مزاج اور بذلہ سنج تھے، میر سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں عار محسوس نہ کرتے تھے۔ اور یہ نوبت یہاں تک اس لئے بھی پہنچی تھی کہ میر نے اپنے ہم عصر شاعروں کی سرزنش کے لئے ایک مثنوی "اژدر نامہ" مشاعرے میں پڑھی تھی۔ جس میں انھوں نے اپنے آپ کو "اژدر" اور دوسرے شعراء کو کیڑے مکوڑوں سے تشبیہ دی تھی۔ طرفہ تماشہ یہ ہوا کہ انھیں دنوں تذکرہ 'نکات الشعرا' بھی وجود میں آیا۔ جس میں انھوں نے بہت سے شاعروں کو نظر انداز کر دیا تھا اور بہت سوں کو نہایت سخت اور بے جا تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے میر کے خلاف ایک محاذ بن گیا یقیناً اور دوسرے شعرا کے مداحین اور تذکرہ نگاروں نے انھیں تختۂ مشق بنانا شروع کر دیا۔ 'اژدر نامہ' کو چھوٹے بڑے سبھی شاعروں نے خوب خوب اُچھالا اور ہر طرف سے ان پر طنز و تعریض اور ہجو و یاوہ گوئی کی بارش ہونے لگی۔ عین ممکن ہے کہ کچھ اس ماحول کی وجہ سے اور کچھ اپنے ظریفانہ لاأبالی پن کی وجہ سے سودا بھی میر کے خلاف کچھ کہہ گئے ہوں اور اس طرح تعلقات کے بگاڑ میں پہل سودا کی طرف سے ہوئی ہو۔ ہمارے خیال کو مندرجہ ذیل اشعار کی ترتیبِ مضامین سے بھی تقویت پہنچتی ہے۔

سودا۔   سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

میر۔   طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں
یوں ہی سودا کبھی ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

موخر الذکر شعر میں میر کی صراحت اس حقیقت کی غماز نظر آتی ہے۔ اب اس چشمک کا بتدریج مطالعہ کیجئے۔

غالباً میر کی طرف سے کہا گیا ہوگا کہ سودا قصیدے کے شاعر ہیں۔ غزل نہیں کہہ سکتے۔ اس پہ میر نے اپنی ایک غزل بطور دعویٰ پیش کی ہوگی۔

کہتے ہیں وہ جو ہے سودا کا قصیدہ ہی خوب
ان کی خدمت میں لئے میں یہ غزل جاؤں گا

لیکن جب اس رنگ کی داد نہیں ملتی تو کہتے ہیں۔

نہ پڑھیو یہ غزل سودا تو ہرگز میر کے آگے
وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا سمجھے

اس کے بعد یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

سودا کو تم سمجھتے تھے کہہ نہ سکے گا یہ غزل   آفریں ایسے وہم پر صدقے میں اس گمان کے

یہ روئے سخن سوائے میر کے اور کس کی طرف ہو سکتا ہے؟ کس کو جرأت تھی کہ اس زمین میں غزل کہہ کے سودا کو للکارے۔ پھر سودا بھی میر کے سوا اور کس کو جتانے کے لئے یہ غزل تیار کرتے۔

میر و سودا کے معرکوں میں بعد کو جو گرمی پیدا ہوئی اس میں بڑی حد تک میر کی غلط فہمیوں کو دخل تھا۔ سودا اپنی خوش خلقی اور ملنساری کی وجہ سے کثیر الاحباب تھے۔ شاگردوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ اس زمانے میں بہت سے ایسے شاعر جو میر پر کیچڑ اچھال رہے تھے، سودا کے دوست بھی تھے اور شاگرد بھی۔ میر کو اس بات کا شبہ تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ سودا ان لوگوں کے نہ صرف قریب ہیں بلکہ وہ اُن کی پشت پناہی کر رہے ہیں اور ان کے حوصلے بڑھاتے ہیں۔ چونکہ میر کے پاس اس بات کا کوئی واضح ثبوت نہ تھا، اس لئے کھل کر تو کچھ کہہ نہ سکے، البتہ اس بات کا شکوہ ضرور کیا کہ وہ کم قوم لوگوں کو اپنا بنا کر شاعری جیسے فن شریف کو برباد کر رہے ہیں۔

شاید اس نصیحت کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ بلکہ سودا کے شاگرد میر کے خلاف باقاعدہ ہجویں کہنے لگے۔ قائم[1] نے ان کی سیادت کا مذاق اڑایا۔ مجذوب[2] نے اپنے اہل ہنر اور خلفِ سودا

۱۔ روٹی کے لئے کھاتے تم میر جی میر
کہتے تو بجا ہے آپ کو میر فقیر

۲۔ اے میر مت کہیو مجذوب کو اور سا
ہے وہ خلفِ سودا اور اہلِ ہنر بھی ہے

ہونے کی دھمکی دی۔ محمد امان نثار[1] نے جو حاتم کے شاگردی کے ناتے سودا سے قریب تھے، بھری محفل میں میر کی تحقیر کی۔ ان سب باتوں سے ان کی غلط فہمی یقین کی حد تک پہنچ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ میر نے جب ان لوگوں کی ہجویں لکھیں، تو ان میں سودا کو بھی لپیٹ لیا۔ اور میر سودا کو "ملک الشعرا" لکھ کر بھی اپنی زبان سے "جاہل" کہہ گئے لیکن سودا میر کو اُستادِ فن ٹھہرانے کے بعد براہِ راست اِن کے کلام کی تنقیص نہ کر سکے۔ البتہ ایک ہجو میں بہ پیرائے تمثیل ایک کاتب کی زبانی ان کی "اصلاح" کو ناقص قرار دیا ہے۔ یہ قطعہ ان کے کلیات میں بعنوان "ہجو میر تقی میر" موجود ہے۔ آخری دو شعر یہ ہیں۔

ہے جو کچھ نظم و نثر دنیا میں   زیرِ ایرادِ میر صاحب ہے
ہر ورق پر ہے میر کی اصلاح   لوگ کہتے ہیں سہوِ کاتب ہے

میر نے اپنی سماجی برتری کا نعم البدل اپنی "سیادت" میں تلاش کیا تھا۔ سودا نے ذاتی سطح پر پہلا وار اسی پر کیا۔ جس کا حال آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے۔

بیٹھے تنورِ طبع کو جب گرم کر کے میر   کچھ شیرمال سامنے کچھ نان کچھ پنیر
میری کے اب تو سارے مسالے ہیں مستعد   بیٹا تو گندنا بیٹے اور آپ کو تھو میر

یعنی سودا کے خیال میں میر سید نہیں تھے بلکہ نانبائی کی اولاد تھے۔

میر سودا کے فن اور ان کی ذات میں کوئی ایسا مضحکہ خیز پہلو تلاش نہ کر پائے، جو انھیں ادبی اور سماجی سطح پر مجروح کر سکتا تھا۔ البتہ سودا کے کُتّے پالنے کے شوق نے انھیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ ہجو کلیات میر میں "ہجو عاقل کہ بہ سگاں اُنسے تمام داشت" کے عنوان سے ملتی ہے۔ اگرچہ اس میں کہیں سودا کا نام نہیں لیا گیا۔ میر کُتّوں کے شائق کی ہیئت کذائی اس طرح بیان کرتے ہیں۔

کُتّے ہیں پاس کُتّے ہیں جیب و کنار میں   کُتّے ہیں آستینوں میں کُتّے ازار میں
آیا جو ایک روز وہ بے تہ چلا ہوا   کُتّا ازار اس کے سے نکلا بندھا ہوا

سودا نے اس کے جواب میں دس بند کا ایک مخمس لکھا جو کلیات سودا میں موجود ہے۔ اس کا عنوان "مخمس در جواب طعن میر تقی کہ فی الحقیقت میر شیخ بودہ است" ہے۔ سودا نے اس ہجو میں میر کے اعتراض کا جواب دیا ہے۔ اور ساتھ ہی ان کے زہد و تقویٰ کی خبر لی ہے۔

میر اور سودا کے معرکے کے سلسلے میں یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ یہ تنہا میر و سودا کا مقابلہ نہ تھا۔ بلکہ سودا کے ساتھ وہ تمام شاگرد بھی تھے جو موقع بہ موقع میر کو نشانہ بناتے رہتے تھے۔ میر تن تنہا تھے۔ اور اکیلے ہی ان سب کا مقابلہ کر رہے تھے۔ بظاہر ان معرکوں میں سودا کا پلّہ بھاری نظر آتا ہے۔ لیکن اسے میر کی عظمت تدبّر کہئے، کہ یہ سلسلہ آگے نہ بڑھا۔ پھر بھی ایک دوسرے کے خلاف ان دونوں استادوں کی نوکِ قلم پر جو کلمات آئے وہ ان کے منصب کے پیشِ نظر ہرگز مناسب نہ تھے۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ معرکے اس وقت ظہور میں آئے جب سودا لکھنؤ کی فضا میں پہنچ چکے تھے۔ اور اس کی دلیل میں میر کی ہجو کا یہ مصرع پیش کیا جاتا ہے ؎

دلّی میں تھی کُتیاں کہیں لے کے پالیاں

لیکن اس مصرع سے سودا کا ترکِ وطن ثابت نہیں ہوتا۔ قرینِ قیاس یہی امر ہے کہ یہ معرکے اس وقت ہوئے ہوں گے جب دونوں حضرات دلّی کے اندر موجود تھے۔

میر اور سودا کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں حضرات نے ایک دوسرے کی کمی کو شدّت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ اور وہ غبار کدورت جو کبھی کھٹک بن کر دلوں کے اندر رہا ہوگا، اب فراق کی کسک بن کر دلوں کو بے قرار کرنے لگا۔ ترکِ وطن کے بعد سودا نے اپنے وطن اور اہلِ وطن کو یاد کیا ہے۔ لیکن جن اشعار میں میر صاحب کا ذکر کرتے ہیں ان سے ان کے انتہائی خلوص و محبت کا پتہ چلتا ہے۔

ہمیں لے آئی ہے شہرِ غریب جس دن سے   کبھی انھوں کی طرف سے نہ نامہ و پیغام
علی الخصوص تغافل کو میر صاحب کے   کہوں میں کس سے کہ باوصف اتحادِ تمام
لکھا نہ پرچۂ کاغذ ہی اتنی مدّت میں   کہ بے قراروں کو تا ہووے موجبِ آرام

۲۔ مرزا فاخر مکیں

سودا کے رسالے "عبرت الغافلین" سے سودا اور مکیں کی معرکہ آرائی کی بہت سی تفصیلات معلوم ہو جاتی ہیں۔ اشرف علی خاں اشرف سودا کے پُرانے جاننے والوں میں سے تھے۔ انھوں نے شعرائے فارسی کا ایک ضخیم تذکرہ مرتب کیا تھا۔ جسے بغرضِ اصلاح مرزا فاخر مکیں کے پاس لے گئے۔ جس میں سے فاخر مکیں نے اکثر اساتذہ کے اشعار قلم زد کر دیئے اور بہت سے استادوں کے کلام میں اصلاحیں کر دیں تو بہت سٹپٹائے۔ اور جس طرح بنا ان سے تذکرہ واپس لے لیا۔ وہاں سے آکر انھوں نے سودا کو یہ تمام قصّہ سنایا اور ان کی فرمائش پر یہ تذکرہ ان کے پاس چھوڑ گئے۔ سودا نے جب مسلم الثبوت اساتذۂ فن کے اشعار پر اصلاح دیکھی، اور بہت سے اشعار کو قلم زد پایا، تو ناگوار گزرا۔ انھوں نے فاخر مکیں کی اصلاحوں کا جائزہ لے کر تمام اعتراضات کا مدلّل جواب لکھا۔ اور اسے "رسالۂ عبرت الغافلین" کا نام دے کر یکجا کر دیا۔ اس رسالے میں انھوں نے ایک خاص فصل کے اندر فاخر مکیں کے اشعار پر بھی اعتراض وارد کئے۔

عجیب بات یہ ہے کہ مرزا فاخر مکیں نے اپنے ایک خط میں جو انھوں نے قاضی لطف اللہ خاں ناطق کے نام لکھا ہے، اشرف علی خاں کے تذکرے کو وجہ مخاصمت نہیں بتایا۔ ان کا کہنا ہے کہ سودا ان کی شاگردی میں آنا چاہتے تھے۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ اسی وجہ سے وہ بدظن ہو گئے۔

یہ محض فاخر مکیں کی الزام تراشی ہے۔ سودا جیسے مشہور و معروف اور قادر الکلام شاعر کے لئے ان کا تلمذ اختیار کرنا کوئی فخر کی بات نہ تھی۔ بالفرض اگر سودا ان کی شاگردی کی خواہش ظاہر کرتے بھی، تو فاخر مکیں ہرگز انھیں انکار نہ کرتے بلکہ اسے اپنے لئے باعثِ عزت سمجھتے۔ صحیح بات وہی ہے جو سودا کی طرف سے کہی گئی ہے۔

محمد حسین آزاد نے اس معرکہ کا حال بیان کرنے کے بعد لکھا ہے۔

"یہ جھگڑا تو رفع دفع ہوا، مگر دور دور سے ہجووں میں چوٹیں چلتی رہیں، لطف یہ ہے کہ مرزا فاخر کی کہی ہوئی ہجویں کوئی جانتا بھی نہیں، سودا نے جو کچھ ان کے حق میں کہا وہ ہزاروں کی زبان پر ہے۔"[1]

بات آگے نہ بڑھتی، اگر فاخر مکیں نے سودا کے اشعار کو فارسی کا چربہ نہ بتایا ہوتا۔

---

[1] چھدر کر اسے وہ زور بخشا ہے نشتر   ایک پل میں ملا کریں اژدر کے کلّے چیر کر

[1] معاصر، حصہ ۱۹، مئی ۱۹۶۳ء سے مکیں کے خطوط کے حوالے لئے گئے ہیں۔

سودا نے اپنے ایک ہجویہ مخمس "کامل فن سخن کہتے ہیں اس کو اکمل" میں بڑی خشونت کے ساتھ اس "حریف" کا پردہ فاش کیا ہے۔ اس مخمس سے یہ بات بھی صاف ہوجاتی ہے کہ سودا اسی بات پر چراغ پا ہوئے تھے۔ ملاحظہ کیجیے۔

عالم ربط میں تھا ان سے تو میرا یہ معاش — جائے دشنام کہا شعر میں ان کا شاباش
لیکن اب کیونکہ انھوں کا نہ کروں پردہ فاش — مبتذل کرنے کو جب ریختہ میرا بہ تلاش
پڑھیں اس فارسی میں وہ جو نہ ہو مستعمل

اس بند سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ انھوں نے اب تک جو کچھ لکھا تھا اس میں کسی قسم کی عداوت کو دخل نہ تھا۔ بلکہ یہ صرف ایک ادبی تنقید تھی۔ لیکن مکیں نے جب ان کی شاعری کو فارسی کا چربہ و سرقہ قرار دیا تو اب وہ بھی ان کی پردہ فاشی پر اتر آئے۔ اس معرکے کی فاخر مکیں کی ایک ہجو زیادہ مشہور ہوئی۔ جس کا پہلا اور آخری شعر درج ہے۔

نہ دیداز خود فروشی دشمنِ ما جنس بہبودے
بیا زار جہاں دارد عبث سودلے بے سودے
سخن با ہر کس از بیش و کم من در میاں دارد
ز دلالی دل او ہیچ آیا شرم نہ نمودے

بہرحال نوبت یہاں تک پہنچی کہ مکیں کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ راغب کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"آتش در خانہ ناہنجار رفتہ کہ دریں تازگی خیلے با من کج باخت، بتاریخ دوازدہم شہر ذی قعدہ روز سہ شنبہ خود را از دست کشمکش عزیزاں اینجا خلاص نمودہ، ارادہ گرم روی کردم، آخر در عین ہوائے ابر بہ خانہ دوستے نقل مکان کردم باوجودیکہ شب بہ شدت بارش شد و صبح کمال برودت و ابر بود روانہ شدہ بہ بجنور رسیدم و گوشہ گزیدم"۔ [1]

معلوم نہیں اس کا سودا پر کیا اثر ہوا ہوگا۔

محمد حسین آزاد کی روایت کے مطابق فاخر مکیں نے اپنے شاگرد بقاء اللہ خاں بقا کو بیچ میں ڈال کر سودا کے پاس بھیجا تھا۔ لیکن فاخر مکیں کی وکالت کرنے کے باوجود صلح صفائی کرانے میں کامیاب نہ ہوسکے تھے۔ اس کے بعد آزاد نے جو قصہ بیان کیا ہے۔ اس سے اہل نظر واقف ہیں۔ یہ جھگڑا تو رفع دفع ہوا مگر دور دور سے ہجووں میں چوٹیں چلتی رہیں۔

اگرچہ کچھ لوگوں نے شیخ زادوں کے متعلق آزاد کے بیان کو صحیح قرار نہیں دیا کیونکہ ان کا لکھنؤ میں جو اثر و رسوخ تھا اس کے پیش نظر ایسا حکم دینا سیاسی اعتبار سے بعید از قیاس ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے نفاذ کی ضرورت کہاں پیش آئی۔ سودا نے خود ہی اس کے لئے معذرت پیش کردی تھی۔ بہرحال اس واقعہ کا مکیں پر اتنا زبردست اثر ہوا کہ انھیں لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور بجنور جا کر گوشہ نشین ہوگئے۔

۳۔ <u>قیام الدین، قائم چاندپوری</u>

سید احمد یکتا نے قائم کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے انھیں اس قدر سراہا ہے کہ بعض اعتبار سے انھیں میر و سودا دونوں پر ترجیح دی ہے۔ (دستور الفصاحت)

قائم کے فن کا اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی اعتراف کیا ہے۔ لیکن قائم کو اپنی ان تمام صلاحیتوں کے باوجود اپنے استاد سے ایک گونہ محبت و عقیدت تھی۔ انھوں نے سودا کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا۔ جو ان کے دیوان (نسخہ انڈیا آفس) میں موجود ہے۔ سودا کی وفات پر انھوں نے غزل کے ایک شعر میں اپنے تاثرات غم کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

پڑھیے کس کا سخن کہ دل سے مٹے — داغ مرزا رفیع سودا کا

لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس تمام عقیدت و ارادت کے باوجود ایک موڑ ایسا بھی آیا کہ جب استاد سے اُن کی ناچاقی ہوگئی۔ دراصل قائم کے مزاج کا تلوّن اور ان کا غرورِ فن انھیں چین نہ لینے دیتا تھا۔ قدرت اللہ قاسم نے ان کے دو معرکوں کا ذکر کیا ہے۔

قائم کا پہلا معرکہ اپنے استاد اوّل ہدایت اللہ خاں ہدایت کے ساتھ ہوا۔ کچھ عرصے تک انھوں نے ان سے اصلاح لی۔ بعد میں یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ اس کے بعد انھوں نے خواجہ میر درد کا تلمذ اختیار کرلیا۔ قرینہ ہے کہ ہدایت اللہ خاں ہدایت سے اختلاف بڑھنے کی وجہ سے ان کا رشتۂ شاگردی ختم ہوگیا ہوگا۔ کیونکہ جیسے ہی یہ خواجہ میر درد کی خدمت میں پہنچے ہیں، انھوں نے ہدایت اللہ خاں ہدایت پہ حملہ کیا ہے۔

شاعری کا اُسے آیا ہے بہت سا غرّا — جو یہ کہتا ہے وہ اوستاد زماں سُنتے ہو
امر ہووے تو ہدایت کو کروں میں سیدھا — وہاں سے ارشاد ہوا یوں کہ میاں سُنتے ہو
راست ہوتے ہیں کسی سے بھی کہیں کج طینت — تیر ہوتی ہے کہیں شاخ کماں سُنتے ہو

قدرت اللہ قاسم جو قائم سے بہت خفا معلوم ہوتے ہیں، اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ اس شخص نے نہ صرف اپنے مربی قدیم سے انحراف کیا بلکہ ان کی شان میں ہتک آمیز قطعہ بھی لکھا جس سے اس کی بے سعادتی کا پتہ چلتا ہے۔ ساتھ میں انھوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ اس قطعہ کا آخری شعر محمد طاہر غنی کے شعر کا کھلا سرقہ ہے۔ شعر یوں ہے۔

کج را بہ تکلف نتواں راست نمودن — کے تیر تواں ساختن از شاخ کماں را

ہدایت اگرچہ درویش صفت انسان تھے۔ لیکن بتقاضائے بشریت وہ بھی شاگرد کی شرارت پہ چراغ پا ہوگئے۔ انھوں نے اس قطعہ کا منہ توڑ جواب دیا۔ انھوں نے قائم کے پندارِ شاعری پر طنز کرکے چیلنج کیا کہ اگر وہ مقابلہ چاہتے ہیں تو میدان میں آئیں اور اس غزل میں معرکہ سر کریں:

چشم انصاف سے دیکھو تو میاں قائم تم — چاہیے یوں کہ ہدایت کو اب استاد کرو
اور جو کچھ شاعری کا دل میں تمہارے ہو گھمنڈ — کہہ چکے ہم تو غزل بارے تم ارشاد کرو

یہ معرکہ کچھ آگے بڑھایا نہیں، اس سلسلے میں تمام تذکرے خاموش ہیں۔

قائم کا دوسرا معرکہ قاضی عبدالفتاح متخلص قاضی کے ساتھ ہوا۔ قاسم نے انھیں قصبہ سنبھل کا باشندہ کہا ہے اور ان کی شاعری کے بارے میں صرف اتنا بتایا ہے کہ بیشتر فارسی میں شعر کہتے ہیں لیکن کبھی کبھی ریختہ بھی کہہ لیتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اس چشمک کی صراحت یوں کی ہے کہ یہ دونوں صاحبان ایک ہی ضلع میں بود و باش رکھتے تھے۔ اس لئے قائم نے غالباً انھیں قاضی کی ہجو میں یہ رباعی کہی تھی۔

قاضی شیخی ہے یہاں تو کاڑھی تیری — تدبیر یہ اور ہم نے کاڑھی تیری
گو حشر کو دامن کو نہ پہنچے گا ہاتھ — واللہ کہ ہم ہیں اور داڑھی تیری

قاسم نے یہ نہیں لکھا کہ قاضی نے اس کا کیا جواب دیا اور قائم کے ساتھ ان کے کیسے روابط تھے۔ حالانکہ انھوں نے ذاتی طور پر ان کو دیکھنے کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] معاصر حصہ ۱۹، ص ۵۵

قائم چاندپوری نے اپنے تذکرے مخزن کفایت میں ایک واقعہ بیان کیا ہے۔

"ایک دن خاکسار اور سودا مرتضیٰ قلی کے یہاں موجود تھے۔ چونکہ میر اور خاکسار کے تعلقات بہت خراب تھے اس لئے خاکسار بے موقع میر کا شکوہ لے کر بیٹھ گئے اور حاضرین مجلس سے اصرار کیا کہ وہ بھی میر تقی میر کی ہجو کہیں۔ اگرچہ لوگوں کو یہ بات پسند نہ آئی لیکن سودا نے ذیل کا مطلع کہہ کر ان کے حوالے کر دیا۔

میر کا مکھڑا ہے بے نتھا گل زنبق سا ہے   پیٹ بھی اس کا جو میں دیکھا سو کچھ صنبق سا ہے

مطلع کو سن کر سب لوگ ہنس پڑے۔ خاکسار بھی محظوظ ہوئے۔ لیکن جب لوگ برابر ہنستے رہے تو انہیں کچھ شک ہوا اور اپنے پیٹ پر نظر ڈال کر سارے معاملے کو سمجھ گئے۔ تب بہت بگڑے اور ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس دن سے سودا اور خاکسار کی ملاقات ترک ہو گئی۔

سودا کی یہ شغول اور شوخی بزرگوں، دوستوں اور چھوٹوں سبھی کے ساتھ تھی۔ ہو سکتا ہے قائم کے ساتھ بھی ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہو۔ بہرحال دونوں استاد شاگرد میں بگاڑ پیدا ہو گیا۔ تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ سودا کی مثنوی جو فوقی سے منسوب چلی آتی ہے، اصل میں قائم کی ہجو ہے۔ جب دونوں حضرات میں صلح ہو گئی تو بعد میں سودا نے یہ فرضی تخلص بطور عنوان قائم کر دیا تھا۔

بعد میں قائم کی طرف سے اُستاد کو راضی کرنے کے اشارے ملنے لگے۔

قائم ترے سخن کو شوخی میں مانتا ہے   ظاہر میں تجھ سے ناخوش گو ہے ہزار سودا

شاید سودا کچھ زیادہ ہی کبیدہ خاطر ہو گئے تھے جو ان کی صفائی سننے کو تیار نہ ہوئے۔ قائم اپنی عذرخواہی پیش کرتے رہے یہاں تک کہ آخر میں اس امر کے ملتجی ہوئے کہ گزشتہ باتوں کو بھول کر پھر سے خوشگوارانہ تعلق قائم کیا جائے۔ لیکن اس استدعا میں بھی بعض شعر کا تیور کچھ ایسا تیکھا ہو گیا کہ بنتی ہوئی بات بگڑ گئی۔ معذرت خواہی میں انھوں نے جو قطعہ سودا کو لکھ کر بھیجا تھا وہ قابلِ توجہ ہے۔ اس قطعہ سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ سودا کا کوئی قصور نہ تھا بلکہ غلطی قائم کی تھی۔ قطعہ کے آخری تین شعر درج ہیں۔

کچھ تاسف کی جگہ مجھ کو نہیں ترک کے بعد   کیونکہ کیا خوب تھا باہم ہوں سخن پست و بلند
پروہی باتیں جو پھر بھاتی ہیں حضرت کے تئیں   پھر وہی بے مزہ کی آتی ہے خاطر کو پسند
ما بہ آں معتمد عالی نہ توانیم رسید   ہم مگر لطفِ شما پیش نہد گامے چند[1]

قائم نے معذرت پیش کر کے اپنی غلطی کا تدارک تو ضرور کر لیا۔ لیکن قطعہ کا آخری حصہ اس قدر تیکھا اور کاٹ دار ہے کہ یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے سودا نرم ہوئے ہوں گے۔ پھر بھی جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، دلوں کی کدورتیں بھی ختم ہونے لگیں۔ قائم کی ایک غزل کے ان اشعار سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

قبولِ عذر تو واں ہے جہاں ملال بھی ہو   یہ جان پاک صفا ریاں جو کچھ خیال بھی ہو
قصورِ خدمتِ احباب اس قدر قائم   کچھ آدمی کو ہے لازم کہ انفعال بھی ہو

مذکورہ بالا غزل اصل میں ایک قطعہ ہے۔ قرینہ کہتا ہے کہ استاد کی طرف سے صلح و صفائی کی بات چل ہو گی اور کچھ شکایتوں کا ازالہ ہو گیا ہو گا۔ بلکہ سودا نے ہی تجدیدِ تعلق کا اشارہ دیا ہو گا۔ قائم کے لئے اتنا بہت کافی تھا۔ انھوں نے بڑی سعادت مندی کے ساتھ شاگردی کے رشتہ کا حق ادا کیا۔ غرضکہ اس قطعہ کے بعد پہلی جیسی یگانگت پھر قائم ہو گئی اور یہ معرکہ آرائی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

۴۔ میر غلام حسین ضاحک

سودا کے ساتھ جن لوگوں کے معرکے رہے ان میں میر غلام ضاحک کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اپنی نوعیت کا یہ پہلا معرکہ ہے جس میں کسی بھی اخلاقی تکلف کا خیال کئے بغیر طرفین نے نہایت سوقیانہ پن کا ثبوت دیا ہے۔

پرانے تذکروں میں 'خوش معرکہ زیبا' ہی ایسا تذکرہ ہے جس میں اس معرکے کو پوری تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ صاحبِ تذکرہ لکھتا ہے :

جب نواب شجاع الدولہ بہادر نے سنا کہ مرزا رفیع فرخ آباد میں آیا ہے، شقہ خاص اس کی طلب میں قلمی فرمایا۔ سبحان اللہ کیا وضعداری تھی کہ نواب کے شقہ کے جواب میں یہ رباعی لکھی :

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک   آوارہ ازیں کوچہ باں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نا کہ تا دنیا ہو   بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

حضور پر نور اس رباعی سے خیلے گراں خاطر ہوئے۔ میر غلام حسین بہ تخلص ضاحک کہ نمک خوار اور ہم مجلس و ہم صحبت تھے واسطے رفع ملال کے بول اُٹھے اگر وہ حضور کے شقہ سے نہیں آیا، غلام بے طلب کھینچ بلاتا ہے۔ قصیدہ سالگرہ کا نواب عماد الملک غازی الدین خاں کی تعریف میں سودا کا کہا ہوا تھا، تمام اسے مصنف کی مذمت میں الٹا۔ جب وہ مزخرفات سودا نے سنے بہ حکم آنکہ دیوانہ، روانہ لکھنؤ کا ہوا۔"

ناصر نے جس طرح یہ واقعہ بیان کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سودا اور ضاحک لکھنؤ کی اس ملاقات سے پیشتر ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ لیکن دہلی میں سودا جیسے مشہور و مقبول شاعر سے وہاں کے شاعروں کی ذاتی ملاقات نہ ہونا نہ صرف یہ کہ عجیب لگتا ہے بلکہ بعید از قیاس ہے۔ ندرت کاشمیری کا وہ معرکہ جس کے ہر طرف چرچے تھے اور جس کے نتیجے میں انھیں دلی کو ہی خیرباد کہنا پڑا، میر ضاحک کی افتادِ طبع کو دیکھتے ہوئے یقین نہیں آتا کہ وہ ان سے نہ ملے ہوں۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اس معرکے کی پہل سودا کی طرف سے بتائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سودا کا وہ ترجیع بند جس کا مصرع ہے "ریم سوزاک پدر ہے تو شریر" سودا و ضاحک کے باقاعدہ معرکوں سے پہلے بطور تنبیہ لکھا گیا تھا۔

محمد حسین آزاد نے سودا اور میر ضاحک کی چھیڑ چھاڑ کے متعلق ایک اور واقعہ بیان کیا ہے جو مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے متعلق ہے۔

"سودا کے دیوان میں میر ضاحک مرحوم کی یہ ہجو جب میں دیکھتا تھا۔

"یارب یہ دعا مانگتا ہے تجھ سے سکندر"   تو حیران ہوتا تھا کہ سکندر کا یہاں کیا کام

میر مہدی حسن فراغ کو خدا مغفرت کرے انھوں نے بیان کیا کہ ایک دن حسبِ معمول مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں پائیں باغ میں تخت بچھے تھے۔ صاحب عالم خود مسند پر بیٹھے تھے۔ شرفاء و شعراء کا مجمع تھا۔ مرزا رفیع اور میاں سکندر مرثیہ گو بھی موجود تھے کہ میر ضاحک تشریف لائے۔ اتفاقاً صاحب عالم نے مرزا رفیع سے کہا کہ کچھ ارشاد فرمائیے .. سودا نے کہا میں نے

---

[1] یہ قطعہ عمدۂ منتخبہ ص ۵۱۰ سے لیا گیا ہے۔

توان دنوں میں کچھ کہا نہیں۔ میاں سکندر کی طرف اشارہ کیا کہ انھوں نے ایک مخمس کہا ہے۔ صاحب عالم نے فرمایا کیا؟ سودا نے پہلا ہی بند پڑھا تھا کہ میر ضاحک مرحوم اٹھ کر میاں سکندر سے دست و گریباں ہو گئے۔ سکندر بیچارے حیران کہ نہ واسطہ نہ سبب یہ کیا آفت آگئی۔ سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں صاحبوں کو الگ کیا اور سودا کو دیکھئے تو کنارے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ اس مخمس کا پہلا بند یہ ہے۔

"یارب تو مری سن لے یہ کہتا ہے سکندر ضاحک...... کسی بن میں قلندر
گھر اس کے تولد ہو اگر بچہ بندر گلیوں میں نچاتا پھرے وہ بنگلے کے اندر
روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر"

واقعات مذکورہ سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ اس معرکہ میں سودا کی طرف سے پہل ہوئی تھی اور کچھ عجب نہیں کہ اس کی ابتدا دِلّی میں ہوئی ہو۔ اور لکھنؤ اس معرکہ کا نقطۂ عروج ہو۔

اس معرکے کی درمیانی کڑیاں گم ہو جانے کی وجہ سے تدریجی ارتقا معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ ان حریفوں نے جو کچھ کہا اس کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔

میر ضاحک

آنا آگے کبھو سودا نہ ہوا تھا سو ہوا بنگلے میں بیٹھ کے رسوا نہ ہوا تھا سو ہوا
گو کہ در ماہہ ہوا بیش و لے عزت کم شاعروں بیچ چو تھیلا نہ ہوا تھا سو ہوا

ایک ہجو میں سودا کے کتوں پر طنز ہے۔

اس کا سارے سگوں سے ناتا ہے ایک سفرہ پہ ساتھ کھاتا ہے
کلوا اور جھبرا، لینڈی اور تازی سب شریک طعام و ہم بازی
کلوا کلہ چبائے جاتا ہے او جھبڑی جھبرا ساتھ کھاتا ہے

کلیات سودا میں درج ذیل ہجویات ضاحک کی شان میں موجود ہیں۔

(۱) مثنوی در ہجو میر ضاحک: یہ ننانوے اشعار کی مثنوی ہے۔

(۲) ترجیع بند در ہجو ضاحک:

اس میں ۸ بند ہیں۔ جس کا ذکر گذشتہ صفحات پر ہو چکا ہے۔

(۳) مخمس در ہجو اہلیہ میر ضاحک:

ضاحک کی اہلیہ نے جب ڈھول گھر دھرایا بے وجہ رات ساری ہمسایوں کو جگایا
بیٹھک میں بیٹھ بوڑھے چونڈے کو جب بلایا تب شیخ سدو اس پر اساک کھا کے آیا
بولا کہ کیوں بے ضاحک بکرا کوئی منگایا

اس مخمس کے ۵ بند ہیں۔

مصحفی کے اس بیان سے کہ "مزاجش بطرف ہزل گوئی بیشتر راغب و با مرزا رفیع او را مکابرہ ہم در پیش آمدہ۔ چیزے او و چیزے او در حق یک دیگر از قسم ہجویات جاوید ند۔" [۱] ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں حریفوں کی ہجووں کا لوگوں میں کافی چرچا رہا ہوگا۔ لیکن خوش معرکۂ زیبا کا مصنف اس کی تائید نہیں کرتا۔

"جب میر حسن شاگرد مرزا رفیع سودا کے ہوئے جو مزخرفات ان کے والد کے متعلق

[۱] تذکرۂ ریاض الفصحا ص ۱۸۰

تھا دھو ڈالا۔ اس سے وہ مشہور نہ ہوا" [۲]

۵۔ فدوی

اسے فدوی کی بدقسمتی کہیے یا حالات کی ستم ظریفی کہ کسی تذکرہ نگار نے ان کے کردار و شخصیت کو اچھا نہیں کہا۔ کئی لوگوں نے ان کی قوتِ شعر گوئی اور کثرتِ مشق کا اعتراف کیا ہے، لیکن جہاں ان کی عادت و خصلت کا ذکر آیا ہے، وہاں ان کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔ قائم نے اپنے تذکرے 'مجموعۂ شعر' میں سودا اور فدوی کے جھگڑے کی طرف واضح اشارے گئے ہیں۔ اور سودا کی مدافعت کرتے ہوئے انھیں کافی سخت و سست کہا ہے۔

ناصر نے اسی معارضہ کی کچھ اور زیادہ تفصیل دی ہے۔

"مرزا محمد رفیع سودا نے کہ "قصہ بوم او ر بقال" کا اس کی ہجو میں بیان کیا ہے اس سے اشارہ دعویٰ شاعری کا اس کے دماغ میں حد سے زیادہ اور مرتبہ شاعری سے گزر کر قدم جادہ امرد پرستی پر آمادہ تھا... جب مرزا رفیع نے یہ بند مخمس کا اس کے بالمشافہ پڑھا ؎

جہاں میں کون بناتا ہے اُتو بنیے کا کسی سے بن کوئی آتا ہے اتو بنیے کا
بہت ہی جان لُبھاتا ہے اُلو بنیے کا بنا مجھی کو یہ آتا ہے اُلو بنیے کا
کہ فدوی جگ میں کہا جاتا ہے اُلو بنیے کا

چونکہ یہ مصرع پڑھنے والے کی طرف عاید ہوتا ہے، فدوی نے کہا اللہ مبارک کرے۔ یہ فقرہ نثر کا سودا کی نظم پر اس وقت غالب آیا" [۳]

صاحب تذکرۂ مسرت افزا نے اس معارضہ کا سبب فدوی کے رشک و حسد کو قرار دیتے ہوئے فدوی کے متعلق لکھا ہے۔

"اپنی یاوہ گوئی اور بر خود غلطی کی وجہ سے مرزا رفیع سودا کی گرم بازاری دیکھ کر کالے دانے کی طرح جلے اور مقابلے کا ارادہ کیا۔ اپنے نام اور رسم کے خلاف مجلسوں میں جاتے اور مرزا کو برا بھلا کہتے اور ان کے اشعار پر اصلاحیں دیتے۔ مرزا کی غلطیاں پکڑتے اور ان سنگلاخ زمینوں میں کہی ہوئی غزلوں کا فوراً جواب دیتے۔ فدوی کی ان حرکتوں کو دیکھ کر مرزا اور ان کے شاگرد انھیں ذلیل کرنے پر اتر آئے۔ انھوں نے فدوی کی ہجویں کہیں۔ جو زبان زد خلق ہو گئیں۔ آخر اس شہر میں رہنے کی ہمت نہیں رہی۔ وطن کی طرف لوٹ گئے۔" [۵]

فدوی کی کہی ہوئی ہجویں اب کہیں نہیں ملتیں۔ 'آبِ حیات' میں البتہ فدوی کے تین ہجویہ مصرعے درج ہیں۔

محمد حسین آزاد نے لکھا ہے۔

"ایک شعر ہے کہ فدوی کی طبع موزوں سے مرزا صاحب کی شان میں واقع ہوا ہے۔"

کچھ کٹ گئی ہے پینی کچھ کٹ گیا ہے ڈورا دم داب سامنے سے وہ اڑ چلا لٹورا

ع۔ بھڑوا ہے مسخرا ہے سودا اُسے ہوا ہے

[۲] خوش معرکۂ زیبا تلخیص عطا کاکوی ص ۱۱۴

[۳] صاحب تذکرۂ مسرت افزا نے اس مثنوی کو شیدا شاگرد سودا کی تصنیف بتایا ہے۔ شیخ چاند اور دوسرے محققین نے بھی اس کو شیدا کی تصنیف ہونے سے اتفاق کیا ہے تفصیل کے لئے دیکھئے۔ سودا ــ شیخ چاند۔ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، دکن ۱۹۳۶ء ص ۱۱۲

[۴] خوش معرکۂ زیبا تلخیص ص ۶۰ [۵] تذکرۂ مسرت افزا، مرتبہ مجیب قریشی ص ۱۸۱

مرزا محمد رفیع سودا کے مصنف ڈاکٹر خلیق انجم کا کہنا ہے کہ "سودا کے فرخ آباد چھوڑنے کے بعد تک یہ معرکہ جاری رہا۔" [1] حالانکہ صاحب تذکرۂ مسرت افزا کے قول کے مطابق، جو اس سے پہلے مذکور ہو چکا ہے احوال واقعہ اس طرح ہے۔

"آخر اس شہر میں (فدوی کو) رہنے کی ہمت نہیں رہی۔ وطن کی طرف لوٹ گئے۔"

۶۔ نُدرت کاشمیری

ندرت اور سودا کی چشمکوں کے بارے میں قدرت اللہ قاسم اور سعادت خاں ناصر کی روایتیں موجود ہیں۔

سعادت خاں ناصر نے اسے ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

" شاہجہاں آباد کہ پایۂ تخت اور اہل فضل وکرام سارے زمانے کے وہاں فراہم تھے کوئی اس سے عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ مولوی ندرت کاشمیری کہ فاضل اور علامۂ عصر تھا اس کے مقابلے سے ایسا شرمندہ ہوا کہ سوائے ترک دہلی اس سے بن نہ آیا۔ ایک شعر مولوی ندرت کی غزل کا کہ سودا کی مذمت میں ہے، لکھا جاتا ہے ؎

خود بخود در جنگ باشد آں رفیع پست قدر

سر بسر سودائے خود از جہل صفرا ریختہ

خان آرزو کے کہے ہوئے مذکورہ بند اور سودا کی دوسری ہجویات میں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کو ناموزوں اشعار کہنے کا مرتکب قرار دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مرزا بیدل کے عُرس میں جو غزلیں پڑھی جاتی تھیں، ان میں سے کوئی شعر خارج از بحر ہو گیا ہو اور اس غلطی کی بنا پر بعد میں ان لوگوں نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہو۔ حالانکہ ناصر کو انھیں فاضل اور علامۂ عصر لکھنے میں کوئی تامّل نہیں۔"

اس کے علاوہ کلیات سودا میں مخمس اور مسدس کی شکل میں دو ہجویں اور ہیں۔ ایک مخمس مولوی ندرت کی ہجو میں ہے اور ایک مسدس دختر ندرت کی ہجو میں۔ ندرت کی ہجو میں ان کی غزل گوئی اور شعر ناموزوں کی اس طرح پردہ فاشی کی ہے۔

ایسی غزل کا عرس میں تم سے جو انصرام ہو بحریں جس کی ہر طرح شبۂ خاص وعام ہو
تقطیع اس کی جس کنے صبح سے تا بہ شام ہو اس کی طرف سے آخرش تم کو یہی پیام ہو

گھوڑے کو دو نہ دو لگام منہ کو تنک لگام دو

ایک رُباعی میں پھر ندرت کے ناموزوں اشعار کو نشانۂ طنز بنایا ہے۔

گر ہجو پہ سودا کے اسے رغبت ہے ہونے دو کہ گیدی کے تئیں رجعت ہے
موزوں نہ کرے شعر کو اپنے احمق کرتا پھرے ہجو لوگوں کی یہ ندرت ہے

عجیب بات ہے کہ سودا نے ندرت کے ساتھ، اُن کی دُختر کی بھی مذمت کی ہے۔

غرضکہ یہ میدان بھی سودا کے ہاتھ رہا۔ اور ندرت بیچارے اس معرکے کی تاب نہ لا سکے اور انھیں دہلی ہی کو خیر باد کہنا پڑا۔

۷۔ بقا اکبر آبادی

بقا نے میر تقی میر اور مرزا سودا دونوں کی ہجویں ایک ساتھ کہی ہیں۔ کلیات سودا میں ان کے متعلق کوئی ہجو نہیں ملتی۔ غالباً سودا نے انھیں قابل اعتنا نہ سمجھا تھا اس لئے ان کی ہجو سے باز رہے۔

بقا کی غزلوں کے مشکل ترین ردیف و قوافی دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے سودا سے ٹکر لینے کی کوشش کی ہے۔ سودا اور بقا کی اکثر غزلیں ایک ہی ردیف و قافیہ میں نظر آتی ہیں جس سے اس خیال کو مزید تقویت پہنچتی ہے۔ اور یہ گمان ہوتا ہے کہ سودا اور بقا نے یہ غزلیں خاص طور پر اپنی استادی اور فوقیت کے اظہار کے لئے کہی تھیں۔ بالاخر ان غزلوں کے مقطعوں سے اس راز کی غمازی ہو کر ہی رہتی ہے۔

غزل سودا

یارو میں کیا عہد اسے مانیو تم سچ پھر دل نہ کہیں دوں اگر اب کی رہے جی بچ
ہر بیت رکھے ہے یہ غزل ایسی ہی مضبوط سودا کوئی جوں ریختے کے گھر پہ کرے پچ

غزل بقا

مے خون کی جا اپنی تو رگ رگ میں رہی رچ زاہد ہی کوئی خشک ہے جو اس سے گیا بچ
ہے جیسی بقا کی غزل، ایسی نہ ہو مضبوط سودا جو کوئی ریختے کے گھر پہ کرے پچ

مقطع سے صاف ظاہر ہے کہ سودا کے مقابلے پر غزل کہی گئی ہے۔ اور ان کے دعوے کو اپنی غزل سے باطل قرار دیا ہے۔

مطلع سودا۔

کس کے ہیں زیر زمیں دیدۂ نمناک ہنوز جا بجا سوت ہیں پانی کے تہہ خاک ہنوز

بقا۔

ہے تپاں زیر زمیں کون جگر چاک ہنوز کہ تزلزل میں رہے ہے کرۂ خاک ہنوز

ان لوگوں کے کچھ مقطعے اور دیکھئے۔

تو نے وہ سودا زبانِ ریختہ ایجاد کی پڑھ کے اک عالم اٹھاتا ہے ترے اشعار فیض

یہ مرا ریختہ، رشکِ غزلِ سودا ہے لیکن اس پر بھی بقا کو یہ گماں ہے کہ نہیں
مرزا و میر باہم دونوں تھے نیم مُلّا فن سخن میں یعنی ہر ایک تھا ادھورا
اس واسطے بقا اب ہجوؤں کی ریسماں سے دونوں کو باندھ باہم میں نے کیا ہے پورا

ان مثالوں سے یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ انھوں نے سودا کا اپنے طور ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔ اگر سودا کے کلیات میں ان کی ہجو نظر نہیں آتی، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے ان کے متعلق کچھ کہا ہی نہ ہو۔ یہ عین ممکن ہے کہ انھوں نے بقا کی ہجو لکھی ہو، یا ان کی شاعری پر اعتراض کئے ہوں اور وہ کلیات میں شامل نہ ہو سکے ہوں۔ بہر حال بقول مصحفی ان کی معرکہ آرائی لکھنؤ میں ہوئی اور یہیں پر ختم ہو گئی۔

۸۔ جعفر علی حسرت

حسرت اور سودا کے معرکوں کی تفصیل زیادہ نہیں ملتی۔ لیکن سودا کی ہجویات دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ معرکے کافی دلچسپ رہے ہوں گے۔ فدوی کی ہجو میں سودا نے جو اشعار کہے تھے، ان میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

حسرت سے دھول دھپا اگر تا ہے شاعری پر یاں تک کہ فخر اپنا کرتا ہے یہ بلا

اس شعر کے مطابق جس زمانے میں سودا فرخ آباد میں تھے، حسرت بھی یہیں ہوں گے۔

---

[1] مرزا محمد رفیع سودا، ص ۳۰۰

جب تمام ہندوستان میں سوداؔ کی شہرت ہوئی اور حسرتؔ کا بازار ٹھنڈا رہا تو اس نے مرزا رفیع پر اعتراض کرنا شروع کیا۔ سوداؔ نے نواب شجاع الدولہ بہادر کی مدح میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا ایک مصرع ہے۔

نورِ خورشید ہو جس طرح سے شب کو زائل

بہ سبب ریاضی دانی کے اُس پر یہ اعتراض کیا کہ نورِ خورشید کا شب کو زائل نہیں ہوتا۔ اس مکابرہ میں تفضل حسین خاں مدعی اور مدعا علیہم ہوئے۔ خان صاحب نے کہا نورِ خورشید کا زائل تاریکی شب سے ثابت اور فروغ کوکب اس پر حجت ہے۔ ایک دن میر سوز نے مرزا رفیع سوداؔ سے کہا کہ ہم حسرتؔ کو آپ کی طرف سے ناصاف اور ہر بات میں خلاف پاتے ہیں لیکن ہجو سے اس کو مالش دیا چاہیے اور معترف اپنے قصور کا اُسے کیا چاہئے۔ سوداؔ نے فرمایا میں اس کی ہجو کرتا ہوں جو شاعر ہو نہ کہ ایسے شاعر کی۔ یہ رُباعی تمہارے نام سے کہی جاتی ہے۔ اس کی تنبیہہ کو کافی ہوگی۔

کیوں سوزؔ پہ حسرتؔ کا نہ دل ہوئے سپند   ہے شعر کی گرمی کا دھواں اس کی بلند
حسرتؔ اُسے کیوں نہ ہووے شاعر بے سوز   عطار کا لونڈا ہے وہ ماکھو گل قند

اس کے علاوہ سوداؔ نے حسرتؔ کی ہجو میں ایک غزل بھی لکھی تھی۔ جس کا مطلع یہ ہے۔

بھڑانے کا آندھی سے اُڑا ڈھیر ہوا پر   ہر مُرغ اسے کھا کے ہوا سیر ہوا پر

غالباً انھیں ابیات پر یہ معرکہ ختم ہوا۔

۹۔ میر تقی مرثیہ گو

میر تقی ایک مرثیہ گو شاعر تھے۔ دہلی ان کا وطن تھا۔ مرثیہ گوئی میں ان کی شہرت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سوداؔ نے انھیں احترام کے ساتھ مخاطب کیا ہے۔ اور کہیں ان کی ذات پر کوئی چھینٹا نہیں پھینکا۔ ادبی مباحثوں کی سنجیدہ حدود میں رہ کر سوال و جواب ہوئے۔ 'سبیل ہدایت' کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اوّل میر تقی نے سوداؔ کے کلام خصوصاً ان کے مرثیوں پر اعتراضات وارد کئے تھے۔ سوداؔ نے ان اعتراضات کا جواب دیا۔ اور پھر میر تقی کے ایک مرثیے اور ایک سلام پر تنقیدی نظر ڈالی۔ "سبیل ہدایت" کے کچھ منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

معارضہ کا سبب:

لیکن اب آپ سے کئی اک عرض   کرنی مجھ کو ہوئی ہیں واجب و فرض
آپ کے ہوتے جب کسی کے حضور   مرثیہ کہنے کا ہوا مذکور
واں یہ بولی زبان سحر طراز   حق میں اس بے زباں کے بندہ نواز
ریختے کی جو وہ کہے ہے غزل   لفظ و معنی میں اس کے کم ہے خلل
مرثیوں کے سنے جو کتنے بند   بندش ان کی نہ آوے اپنے پسند
معنی ان کے تب آویں فہم کے ہاتھ   شرح لکھ دے جو مرثیے کے ساتھ

یقیناً میر تقی کے اعتراضات اور مرثیہ نگاری میں ان کا غرور و پندار سوداؔ کو ناگوار گزرا ہوگا۔

متن میر تقی کا سلام:

اے تصدق پہ پدر مادر و سو مہر پک   ختم ہے تم پر یہ سب صاحب کمالی السلام

میر تقی کے پورے سلام کی تنقید و تنقیص کے بعد سوداؔ نے نثر میں بھی ان نقائص کو اجاگر کیا ہے۔

"پس لازم ہے کہ مرتبہ مد نظر رکھ کر مرثیہ کہے تاکہ گریہ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے۔"

اس کے بعد میر تقی کے مرثیہ پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ایک مثال اس کی بھی دیکھئے۔

متن میر تقی:

شہ دیں یہ فرما کے ان کو چلے ہیں   سب اہل حرم سینہ کوباں کھڑے ہیں
بلائیں وہ چاروں طرف لے رہے ہیں   کہ دیدار اب تیرا پھر ہم کو کب ہے

محاکمہ سوداؔ:

تمہیں اپنے پر شاعری کا یقیں ہے   پر اتنا نہ سوجھا ہزار آفریں ہے
چلے ہیں کے کہنے کی یہ جا نہیں ہے   روا ماضی میں حال کا ذکر کب ہے
چلے اور کھڑے قافیہ جو کیا ہے   یہ معیوب فن سخن میں لیا ہے
بلائیں لئے سے نہ نکلا یہ کہنا   کہ دیدار اب تیرا پھر ہم کو کب ہے

شاید میر تقی کی طرف سے ان اعتراضات کا جواب نہ بن پڑا۔ یا انھوں نے اس کا جو ردِّ عمل ظاہر کیا ہوگا وہ ابھی پردۂ اخفا میں ہے۔ بہر حال یہ معرکہ یہیں اختتام پذیر ہوتا ہے۔

بقیہ سی دی رمن

کا ایک طالب علم ہوتا ہے اور فطرت ہی سے الہام حاصل کرتا ہے۔ سائنسدان اپنے ذہن میں اپنے خیالات کے غیر محسوس واسطے کے ذریعہ قدرت کی تصویریں بناتا ہے یا ان کا نقش اتارتا ہے۔ وہ قدرت کی لامحدود پیچیدگیوں کو چند سادہ اصولوں یا قدرت کے کلیوں کی شکل میں حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش میں سائنس کا عالم دوسرے فنون کے ترجمان کی طرح اپنے آپ کو ایک سخت ضابطے کا پابند بنا لیتا ہے اس کے قواعد وہ خود ہی تیار کرتا ہے اور اس کو وہ منطق کہتا ہے۔ فطرت کی تعبیر کے لیے انسان کے جمالی اور ذہنی عمل کام میں لائے جاتے ہیں اور سائنس میں یہ دونوں قسم کے عمل کام کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے سائنس تخلیقی فن کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔

مہاتما گاندھی ڈاکٹر رمن کی بڑی قدر کرتے تھے۔ وہ خاص طور پر رمن کی سادہ مزاجی اور ہندوستانی طرزِ زندگی کے قدردان تھے۔ رمن اپنی سادہ مزاجی اور انکساری کو ساری عمر نبھاتے رہے۔ وہ ہندوستانی طرز کی پگڑی سے پہچانے جاتے ہیں۔ بلکہ یہ پگڑی ان کی شخصیت کا ایک ممتاز نشان رہی۔ انھیں اپنی ہندوستانیت پر بڑا ناز تھا۔ اور اس کا اقبال انھوں نے گاندھی جی کے روبرو بھی کیا۔ گاندھی جی کے سوال پر "طبیعات نے آپ کو کیا دیا" ڈاکٹر رمن کا جواب بڑا سادہ اور مدلل تھا۔ "طبیعیات کی دلچسپی سے مجھے خدا کی ایک گونہ جھلک نصیب ہوگئی تھی"

عطیہ پروین
معرفت منیجر لینڈ ڈولپمنٹ بنک
لال گنج، رائے بریلی (اتر پردیش)

اب نہیں.....!

ایک بٹا دو ، دو بٹے چار ، نہیں بٹا ہے نہیں بٹے گا...."
ممّی ڈیڈی کا پیار ، ممّی ڈیڈی کا پیار....."

دونوں بچے ناچ ناچ کر گا رہے تھے اور ہنس رہے تھے ۔ پیاری پیاری آوازیں پیاری ہنسی اور.... اور پیاری پیاری صورتیں ۔

ننھی شالو نے سفید بلاؤز پر سرخ اسکرٹ پہن رکھا تھا ۔ سرخ موزے اور سیاہ جوتے تھے ۔ گھنگھریالے بال پونی ٹیل کی صورت میں سرخ ربن میں بندھے ہوئے تھے ۔ جب وہ پھیرا لیتی تب اس کا اسکرٹ پھول کر گلاب کا پھول بن جاتا ۔ اور گھنی پونی ٹیل لہرانے لگتی ۔ بادامی آنکھیں جگمگانے لگتیں ۔ راجو اس سے کوئی ۵ برس بڑا ہوگا !

گورا چٹا تندرست لڑکا ! جس کے رخساروں پر گلاب کھلے تھے اور گہری گہری آنکھوں میں اتنا نور تھا کہ سارا گھر روشن ہوگیا تھا ۔ اس نے گہری نیلی شرٹ اور سفید نیکر پہن رکھی تھی ۔ پیروں میں لال جوتے اور سفید موزے تھے سفید دودھ جیسے موزے جو اس کی پُر گوشت ٹانگوں پر منڈھ گئے تھے ۔

ماں باپ کھلے جا رہے تھے ، صدقے ہوئے جا رہے تھے ۔

"ذرا دیکھنا ان شیطانوں کو" ! اس کا دوست بار بار اس سے کہتا ۔ اور وہ زبردستی مسکراتا اپنے اوپر جبر کر کے ، بچوں کو دیکھتا اور چمکارتا ۔ زبردستی ہی تو !

وہ تو اوب چکا تھا ، سیر ہو چکا تھا بچوں سے ! بچوں کی ہنسی سے ۔ بچوں کے کھیل کود اور آوازوں سے !!!

وہ دیر سے اپنے دوست شکلا اور مسز شکلا کو باری باری دیکھ رہا تھا ۔ آخر اس قدر ہنسنے اور کھلے جانے کی کیا ضرورت ہے ۔ باپ تو وہ بھی ہے ۔ اس کے بھی تو بچے ہیں ۔ ہاں مگر.... ایک فرق ہے زبردست فرق [illegible]

اس کے بچے اس طرح نہیں ہنستے ، اس طرح نہیں کھلکھلاتے یوں چہک چہک کر نہیں گاتے ۔

شکلا کے گھر اس کے خوبصورت صاف ستھرے ڈرائنگ روم میں گدگدے صوفے کے اوپر بیٹھے ، گرین لیبل چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے راجو اور شالو کو دیکھتے ہوئے اس کو اپنے بچے یاد آنے لگے ۔ ایک ایک کر کے یاد آنے لگے ۔

ڈبّو ، ریتو ، پپّو ، گڈّو ، مینتو اور... ارے اس کو تو بھول ہی گیا چھوٹے سے گپّتو کو ! دو ماہ کا گپو... پتلا ، دبلا ، کالا کالا سا چھچھڑا ۔ ! بلا کا رونا ۔ رات رات بھر ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا ہے اس کی بیوی کو ۱۰ منٹ کی نیند بھی نہیں لینے دیتا....

بھابھی جی اب ٹھیک رہتی ہیں نا ؟ مسز شکلا پوچھ رہی تھیں ۔ وہ چونکا ، مسز شکلا کی طرف دیکھا ۔

ٹھیک بھی ہیں اور نہیں بھی.... وہ رکا مسز شکلا کے سراپا کو آنکھوں میں رکھتا ہوا بولا ۔ روز ہی کوئی نہ کوئی مرض لگا رہتا ہے ۔ مسز شکلا کچھ کہتے کہتے رک گئیں ، شکلا کی طرف دیکھا اور ہنس پڑیں ۔ وہ بھی مسکرایا ۔

در اصل پھر الجھ گیا ، اپنے آپ میں ، اپنے خیالوں میں ۔ آخر میں کیوں اس طرح نہیں مسکرا پاتا ۔ میری بیوی اس طرح کیوں نہیں ہنس پاتی ، جس طرح ، جس طرح ــــــ اس کی نظر مسز شکلا پر گڑ کر رہ گئی ــــــ

دو بچوں کی ماں ہونے کے باوجود ، شادی کے کوئی ۱۵ برس گزر جانے کے بعد بھی اتنی ہی تر و تازہ اور تندرست ، بلکہ اب جسم اور بھی گداز ہو گیا تھا ۔ اس کے بدن میں ایک خوبصورت گدگدا پن اور انوکھا سا وقار ۔ سرخ و سفید رنگ ، جگمگاتی آنکھیں مسکراتے لب ۔ مسز شکلا کے مسکراتے رسیلے لبوں کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں میں دو لب ناچنے لگے ۔ بے رس ، پھیکے پھیکے لب جن کا گلابی رنگ اب سڑی ہوئی پیاز کے رنگ میں ڈھل گیا تھا ۔ بے زاری سے کھنچے ہوئے لب ، غصے سے بھنچے ہوئے لب ، بچوں کو کوستے ہوئے جلدی جلدی چلتے لب ، بسورتے ہوئے لب ، سکڑتے ہوئے لب ، اور یہ لب تھے اس کی بیوی سشما کے ۔ کتنا فرق تھا اس کی بیوی اور شکلا کی بیوی میں ــــــ سشما میں یہ گداز پن ، یہ وقار ، یہ کشش اب کہاں رہ گئی تھی ۔ چھ بچوں اور گرہستی کی چکی میں پس کر وہ اپنا سب کچھ کھو چکی تھی ، حسن ، جوانی ، کشش ، ہنسی اور زندگی کی امنگ ــــــ اب ، اب وہ برف کا ایک تودہ رہ گئی تھی..... وہ بھی بکھرا ہوا ، کئی حصوں میں بٹا ہوا ، اس کا اپنا تو اب کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا ، کچھ بھی نہیں ، کچھ بھی نہیں ۔

کیا سوچ رہے ہو یار.... چائے پیو " شکلا کہہ رہا تھا ، وہ پھر چونکا جیسے نیند سے چونکا ہو جلدی سے چائے کی پیالی اٹھاتا ہوا بولا ۔

یار میں تو سشما کی روز روز کی بیماری سے عاجز آگیا ہوں ــــــ پہلے ہی گرہستی کے چکر نے پاگل بنا رکھا ہے اس بیماری کے چکر سے تو میں سمجھتا ہوں

بہت جلد مرجاؤں گا۔"

"بھگوان نہ کرے . . . مسز شکلا نے کپکپا کر شکلا کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ایسا مت کہیے بھائی صاحب۔ آپ کے دم سے بھابی کا سہاگ اور بچوں کا سہارا ہے۔"

"سچ کہتا ہوں بھابی! میں بہت پریشان ہوگیا ہوں"۔ اس نے اپنے دل و دماغ کا سارا دکھ اور سارا بوجھ ان دونوں کے سامنے الٹ کر کھول کر رکھ دیا۔

ششما کی سرد مہری اور بے رحمی کا بوجھ! بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی کمی کا دکھ، تنخواہ کے گنے چُنے نوٹوں کا دکھ، ۱۵ تاریخ سے ہی گھر میں اور کچن میں خاک اڑنے کا دُکھ، آفس کے گاڑی بھر کام اور ہمالیہ سے اونچے پہاڑ میں لگی ہوئی فائلوں کا دُکھ، ششما کی بیماری کا دکھ!!!

وہ دونوں سنتے رہے، ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ مسز شکلا بیچ بیچ میں بول اٹھنے کے لیے پہلو بدلتی رہی۔ وہ چپ ہوا اور اپنی ٹھنڈی سی چائے کو ایک ہی گھونٹ میں پی کر رومال سے ہونٹ خشک کرنے لگا۔ تب مسز شکلا اس کے لیے تازہ گرم چائے بناتی ہوئی بولی۔

"بُرا نہ مانیے بھائی صاحب تو ایک بات کہوں"!

"کہیے بھابی، ضرور کہیے۔ وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔ ہاں اور کیا! مسکرانے کے لیے بھی اس کو اب اپنے آپ کو تیار کرنا پڑتا ہے۔

بھابی جی اور گھر کے سورگ کو اس حال میں پہنچانے کے ذمّہ دار آپ ہیں ــــــ!"

میں ؟ ؟ ؟

جی۔ آپ۔ مسز شکلا نے بھاپ اُڑاتی سنہری چائے اس کی طرف بڑھائی۔ لیجیے چلئے پیجیے!"

اس نے حیرانی کے سمندر میں غوطہ زن ہوتے ہوئے بھی اس مہکتی ہوئی چائے کا ایک بھرپور گھونٹ لیا اور ایک عجیب سا سرور انوکھا سا مزہ اس کی رگ رگ میں سمانے لگا ــــ! کتنا عرصہ بیت گیا تھا اس کو کیتلی میں دم دی ہوئی اور ٹی کوزی سے ڈھکی ہوئی پھر اہتمام کے ساتھ پیالی میں ڈھالی گئی چائے پیے ہوئے۔ اب تو اس کے یہاں صبح شام چائے بنتی بھی ہے تو دیگچی میں پانی کھولا کر اور چورا چائے آدھی پیالی دودھ اور گنتی کے چمچے شکر جھونک کر۔ آج نہ شکلا اس کو ملتا نہ یہ حسین ماحول اس کو نصیب ہوتا، نہ یہ پھول سے بچے دیکھنے کو ملتے، نہ یہ گداز جسم والی مسکراتی ہوئی عورت دل کو گدگداتی، اور نہ اتنی عمدہ چائے پینے کو ملتی۔

شکلا اور وہ کلاس فیلو رہ چکے تھے، پھر جب سروس کا چکر چلا تو دونوں الگ ہوگئے۔ نوکری ملی تو ماں کو بہو لانے کا ارمان چرآیا۔ بہو آئی تو آنچل میں نیچے باندھ کر لائی! نیچے! نیچے اور نیچے! ہر سال بعد بچہ!!! لوگ کہتے "پریوار نیو جن، ڈھیر سا بھوجن"۔ ماں کہتی "بارہ ہاتھ بارہ کمائی . . . ."

اور یوں ہاں، نا، کی چکی میں پستے پستے ورما اور اس کی بیوی دونوں ہی پس کر رہ گئے۔ ۵ سو تنخواہ اور ۶ بچے! گھر کا کرایہ، دودھ، راشن، کپڑا، دوا، بچوں کی فیس، ڈریس . . . . انگلیوں پر کا حساب تھا ــــــ! اور انگلیوں کے اس حساب نے میاں بیوی میں بے حساب رنجشیں ڈال دی تھیں۔ ششما اپنے نصیب کا رونا روتی اور ورما اپنی بے وقوفی پر ماتھا پیٹتا۔ ماں کا کہنا کیوں مانا! شادی کیوں کی ششما چلاتی "میں نہ آتی کوئی دوسری آجاتی اور ڈھیر سے بچے بھی پیدا کر دیتی . . . . تیری کوکھ اتنی ہریالی ہے کہ کیا کہوں ــــــ وہ اس کے علاوہ بہت سارے نازیبا کلمات کہہ دیتا اور ششما کبھی روتی، کبھی بچوں کو بے خطا دھوں دھوں پیٹ کر غبار نکالتی اور کبھی میکے جانے کی دھمکی دے کر کام کاج سے ہاتھ اٹھا کر اٹواٹ کھٹواٹ لے لیتی۔ لیکن کب تک، بچے بھوکے چلاتے، گھر کی نحوست اور بڑھ جاتی، ورما خالی پیٹ آفس چلا جاتا . . . . تب ششما کا دل پھٹنے لگتا . . . . ! اب میل ہوتا، اور دلوں میں کچھ اُمنگیں اُٹھتیں بھی تو ایک . . . ایک نیا اضافہ! اُف! ورما نے ماتھا پکڑ لیا۔

مسز شکلا اُٹھ کر چلی گئی تھیں، بچے تھک کر صوفے پر آ بیٹھے تھے۔ شکلا ولس فلٹر کا مہکتا ہوا دُھواں اُگل اُگل کر کچھ سوچ رہا تھا۔ ورما نے "اُف" کہا تو اس نے ورما کو دیکھا اور بولا۔

"ہاں دوست! خطا وار تم بھی ہو اور بھابی بھی ــــــ کاش کہ تم نے ہم دونوں سے سبق لیا ہوتا ــــــ ورما احمقوں کی طرح اس کا منہ تکنے لگا تو وہ مسکرا کر بولا۔

"یار ہزاروں طریقے، ہزاروں آسانیاں ہوتے ہوئے بھی تم . . . . . آبادی میں اضافہ کر کے دردِ سر پیدا کرتے رہے ــــــ حد ہوگئی پڑھ لکھ کر ڈوب گئے ــــــ!"

"مگر . . . . ."

"مگر وگر کیا! شکلا تیزی سے بولا۔ ہمیں دیکھو، ہمارے بھی بزرگ ہیں، پرانے خیالات رکھتے ہیں، اب کیا ہم ان کو بتاتے رہے کہ ہم کیا طریقے اپنا رہے ہیں . . . سب یہی سمجھتے رہے کہ شوما کی کوکھ میں بس یہی دو گنے چُنے بچے تھے . . . ارے بھئی پالنا ہم کو ہے، سوچنا ہم کو ہے۔ لوگ صرف زبان ہلاتے ہیں اور عقل کی بجائے جذبات کے ہاتھوں ناچتے ہیں۔ اب دیکھو نا! جتنی تمھاری تنخواہ ہے، اتنی میری ہے، جتنے سال تمھاری شادی کو ہوئے اتنے ہی میری شادی کو ہو رہے ہیں . . . ."

سچ کہتے ہو شکلا . . . .!

بھابی جب بیاہ کے آئی تھیں تو میں انھیں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ تمھاری قسمت پر رشک آنے لگا تھا مگر آج . . . . آج وہ اپنی پرچھائیں بھی نہیں رہ گئیں۔

ششما کی مرجھائی ہوئی پتلی دُبلی شبیہ ورما کی آنکھوں تلے جھولنے لگی ہمدردی، رحم اور . . . . محبت کی ایک لہر اس زور سے دل میں اٹھی کہ ساری

(بقیہ صفحہ ۴۲ پر)

یامین پرویز
انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
پنچکوئیاں روڈ، نئی دہلی

جہیز

چند دن ہوئے ہم نے اپنے پڑوس کے مکان کی چھت سے دھواں اُٹھتے دیکھا۔ چاروں طرف سے آگ آگ کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ دوڑے خاندان کے دوسرے افراد اپنے اپنے گھریلو کاموں میں مشغول تھے لیکن اُوپر انسانیت نذرِ آتش ہو رہی تھی۔ پورا بدن جل رہا تھا۔ گوشت جلنے کی بدبو چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ درد اور تکلیف سے وہ چیخ رہی تھی۔ جلتا بدن کبھی اِدھر کبھی اُدھر دوڑتا رہا۔ پھر وہ لاش گر گئی۔ کبھی سر ٹپکتی، کبھی ہاتھ اور کبھی ٹانگ۔ جب وہ جان بے جان ہو گئی۔ بدن کا سارا کا سارا گوشت جل کر ہڈیوں سے جدا ہو گیا تو چھت پر آنے والا دروازہ ٹوٹا۔ اب ڈاکٹر کو بلانا بیکار تھا۔ وہ تو مر گئی۔ مگر کیوں ؟

اس لئے کہ چند مہینے قبل یہ خوبصورت ۱۸ سالہ نوجوان پڑھی لکھی لڑکی جب بڑی دھوم دھام سے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ان کے آرام اور راحت کے لئے ٹیلیویژن، فرج، اسکوٹر، ٹیبل فین، کولر، ٹرانسسٹر، ریڈیوگرام، ٹیپ ریکارڈر، بیڈ روم اور باورچی خانے کا سب سامان لے کر آئی تھی تب اس کے باپ نے جہیز میں مزید رقم دینے کا وعدہ کیا تھا تاکہ اس کا داماد اپنا کلینک کھول لے۔ بدنصیب باپ کو قرض نہیں ملا۔ بچاری نے ساس، نند اور خاوند کی ذہنی و جسمانی تکلیفوں سے تنگ آ کر مٹی کا تیل ڈال کر خود کو بھسم کر دیا۔

گذشتہ سال کمیٹی فار اسٹیٹس آف وومن (COMMITTEE FOR STATUS OF WOMEN) نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ "انتہائی افسوس کی بات ہے کہ ۱۹۶۱ء کا جہیز کا قانون اس لئے پاس کیا گیا تھا کہ جہیز کی لعنت ختم ہو جائے مگر یہ قانون اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں قطعی ناکام رہا۔ باوجود جہیز کے لین دین کے مزید اضافے کے اس کے خلاف کوئی رپورٹ درج نہیں کرائی گئی"۔

نوجوان رہنما شری سنجے گاندھی نے پنجاب میں تقریر کرتے ہوئے کہا "جب تک جہیز کی یہ لعنت دور نہیں ہوگی اس وقت تک عوام اپنی اقتصادی حالت بہتر نہیں بنا سکتے"۔

جہیز کے لفظی معنی (WEBSTERS' DICTIONARY) میں نقد رقم، اشیاء جائداد جو کہ ایک عورت شادی کر کے اپنے خاوند کے گھر لاتی ہے۔ یا کسی شخص کی طرف سے دلہن کو جائداد کا تحفہ۔

لسان العرب میں اس کے معنی تیاری اور اسباب و سامان مہیا کرنے کے آتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے وہ جائداد (مال) جو کوئی عورت اپنی شادی کے موقع پر ساتھ لائے یا اس کو شادی کے موقع پر دیا جائے۔

لیکن مختلف لوگوں، طبقوں، معاشروں میں اس کے معنی مختلف ہیں جیسے ٹیکا۔ جوڑا۔ گھوڑا۔ دہیز۔ کنیادان۔ استری دھن۔ تھالی (نقد رقم پلیٹ میں رکھ کر دینا)

اس بنیاد پر ہندوؤں، مسلمانوں۔ عیسائیوں، پارسیوں اور سکھوں میں جہیز کسی نہ کسی شکل میں لیا اور دیا جاتا رہا ہے۔

جہیز کی عام طور سے تین شکلیں نظر آتی ہیں۔ اوّل دولہا کی حیثیت اور خاندانی وقار کو دیکھتے ہوئے نقد رقم دینا۔ دوم۔ لڑکی کو اشیاء کی شکل میں گھریلو ضروریات کا سامان دینا جیسے فرج، ٹیلیویژن وغیرہ۔ تیسرے سماج میں زیادہ وقار حاصل کرنے کے لئے بارات کا شاندار استقبالیہ زیادہ سے زیادہ رقم خرچ کر کے شاندار ہوٹل میں شاندار طریقے سے دینا۔

جہیز کا تاریخی مطالعہ بھی بڑا بحث طلب رہا ہے۔ وثوق سے یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ جہیز کا آغاز کب ہوا تھا؟ جہیز کا رواج انتہائی قدیم زمانے سے جاری ہے۔ قدیم قوموں کے معاشرتی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہیز کی قدیم تہذیبوں میں دو شکلیں رہی ہیں یا تو لڑکی اپنے ساتھ کچھ لاتی رہی ہے یا لڑکا کچھ ادا کرتا رہا ہے۔ العرب قبل الاسلام کا مؤلف جرجی زیدان لکھتا ہے کہ بابلی تہذیب (۲۴۶۰ ق م) میں یہ رسم بڑی حد تک موجود تھی۔ مرد کے ذمہ مہر ہوتا تھا اور عورت مال و دولت اپنے ساتھ لاتی تھی اور جو کچھ وہ اپنے ساتھ لاتی تھی وہ لڑکی کی ملکیت ہوتا تھا۔

یونانی تہذیب میں عورت کی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے لیکی لکھتے ہیں "البتہ وہ اپنے ساتھ جہیز ضرور لاتی تھی اور اپنی لڑکیوں کو شادی کے وقت جہیز دینا فرائض میں داخل تھا"۔ لیکی رومن معاشرہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "ان میں جہیز یا دلہن کے والد کو نذرانہ دینے کی رسم نہ تھی"۔ جہاں تک جرمن معاشرہ کا تعلق ہے اس میں لڑکی والے یا لڑکے والے شادی کے وقت کچھ لیتے اور دیتے نہیں تھے بلکہ شادی کے دوسرے دن کی صبح شوہر بیوی کے ہاتھ میں کچھ رقم دیتا تھا۔ یہی رقم آگے چل کر جہیز کی شکل اختیار کر گئی۔ ہسٹری آف یوروپین مارلس کا مؤلف لکھتا ہے کہ دنیا کی قدیم تہذیبوں میں شادی بیاہ باقاعدہ خرید و فروخت کی صورت میں ہوتا تھا۔ لڑکی کا ہونے والا شوہر اپنے خسر کو ایک معین رقم دیتا تھا یہ رقم لڑکی کی قیمت سمجھی جاتی تھی اور لڑکی مرد کی زر خرید کنیز بن جاتی تھی۔

العرب قبل از اسلام سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عربوں کی جاہلی تہذیب کے دوران جہیز کے نام سے کوئی رسم موجود نہیں تھی کیونکہ اس زمانے میں عرب عورت کے سماجی حقوق نہیں تھے۔

مسلمانوں میں جہیز کی رسم کی موجودگی غیر اسلامی تہذیب و تمدن سے متعلق ہے۔ جیسے جیسے اسلام پھیلتا گیا، ویسے ویسے دوسری قوموں کے رسم و رواج اسلامی معاشرہ کا جز بنتے گئے۔ لہٰذا موجودہ جہیز کا رواج قطعی غیر اسلامی ہے۔ لیکن کچھ لوگوں نے اس کو اسلامی معاشرہ کا جز بنا لیا ہے۔

مفتی محمد رفیع اللہ اپنے ایک مدلل مضمون "جہیز کی شرعی حیثیت" میں لکھتے ہیں۔ حضرت محمدؐ نے اپنی صاحبزادی فاطمہؓ کو جہیز میں ایک لحاف، ایک چمڑے کا گدا جس میں بجائے روئی کے درخت کی چھال بھری ہوئی تھی، دو چکیاں، ایک مشکیزہ اور دو مٹی کے گھڑے دیے تھے اور ان کی رخصتی شادی کے گیارہ ماہ بعد ہوئی۔ جب حضرت علیؓ نے حضرت حارثؓ بن نعمان کا مکان کرائے پر لیا اور حضرت فاطمہؓ کو رخصت کرا کر لائے۔"

مفتی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ یہ چیزیں حضرت فاطمہؓ کو اس لیے دی گئی تھیں کہ حضرت علیؓ کے پاس نہ تو مکان تھا اور نہ ہی گھریلو سامان۔ اس لیے ان کو انتہائی ضروری سامان دیا گیا جس کی تعداد ناقابل ذکر ہے۔ میرے خیال میں اس بات سے مسلمانوں کو جہیز، ٹیکہ، جوڑا، گھوڑا وغیرہ کی لعنت کا جواز پیدا کر لینا قطعی درست نہیں

یہ بات قابل غور ہے ۲ھ میں حضرت فاطمہؓ کے نکاح بعد ۳ھ میں حضرت محمدؐ نے حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عثمان غنیؓ سے کیا تھا اور حضرت ام کلثوم کو آنحضرتؐ نے کچھ نہیں دیا تھا۔ اگر جہیز اسلام میں ضروری خیال کیا جاتا تو دوسری صاحبزادی کو بھی جہیز دیا جاتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جہیز کا تعلق اسلام سے نہیں ہے۔

ویدوں میں جہیز کی تشریح نہیں کی گئی ہے۔ منو شاستر (باب ۹، ۹۸) میں ہے "شودر کو بھی نہیں چاہیے کہ بیٹی دیتے وقت روپیہ لے کیونکہ جو روپیہ لے کر بیٹی دیتا ہے وہ بیٹی کو بیچتا ہے۔" ویدوں نے ضابطہ کی پابندی کے لیے یہ انتظام کیا کہ لڑکی کو دینے کے قبل ایک معقول عطیہ لیا جائے (مثلاً ایک رتھ یا سو گائیں) لیکن عطیہ معطین کو واپس کر دیا جاتا تھا۔ دراصل ہندو مذہبی علماء نے نئے شادی شدہ جوڑے کو شادی کے وقت ہی معاشی طور سے خود کفیل کرنے کے لیے اس قسم کے احکامات کا اجرا کیا تھا۔

مسٹر جان۔ ڈی۔ مین "قانون و رواج ہنود" (ص ۱۲۰، جلد ۱) میں لکھتے ہیں "بالآخر یہ دکھائی دیتا ہے کہ وہ تحائف جو دولہا دیا کرتا تھا دلہن کے فائدے کے لیے قبول کیے جانے لگے اور اس کا جہیز بن گئے۔"

اتھروید میں جہیز کا ذکر موجود ہے کہ شاہی والدین کی طرف سے شاہی دلہنوں کو شادی کے بعد تحائف دیے جاتے تھے۔ لیکن عام لوگوں میں یہ کنیادان کی رسم بن گیا۔ مگر ایسی لڑکیاں جو کسی قسم کا جسمانی عیب رکھتی تھیں یا بد صورت ہوتی تھیں ان کو روپیہ دے کر رخصت کیا جاتا تھا۔

صدیوں بعد سماج میں والدین پر اس قسم کی پابندیاں عاید کر دی گئیں کہ لڑکیوں کی شادیاں ایک خاص معین عمر میں کر دی جائے۔ یہ ایک مذہبی فریضہ تھا جس کا پورا کرنا ضروری تھا چنانچہ والدین دولہا کی تلاش تیزی سے کرتے تھے اور آسانی سے لڑکا حاصل کرنے کے لیے کچھ سامان یا رقم پیش کرنے لگے۔

گذشتہ ۲۵ برس کے دوران ہمارے ملک کی اجتماعی دولت کا بڑا حصہ جن لوگوں نے ناجائز طور سے ہڑپ کر کے اسمگلنگ، رشوت اور منافع خوری وغیرہ سے لاکھوں روپے کمائے وہ اپنی بیٹیوں کو اعلیٰ درجہ کے شوہر فراہم کرنے کے لیے لاکھوں کے جہیز کا مطالبہ قبول کر لیتے ہیں۔ کیونکہ ناجائز دولت کے اخراج کا آسان ذریعہ صرف یہی ہے۔ ان میں اعلیٰ خاندانی اور خوش حال طبقہ اور کاروباری طبقہ شامل ہے اور وہ لوگ بھی جن کو سماجی عزت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے سماج نے جہیز کو دراصل مذہبی معاشی سماجی فریضہ کا روپ دے دیا ہے۔ جہیز لینے اور دینے والے اس انداز سے بھی سوچتے ہیں کہ انھوں نے اپنے لڑکے کی تعلیم و تربیت پر جو کچھ خرچ کیا ہے لڑکی اتنی ہی رقم ضرور لے کر آئے۔ کیونکہ اگر وہ یہ رقم لڑکے پر خرچ نہیں کرتے تو اس رقم کو اپنے بڑھاپے کے لیے وہ محفوظ رکھ سکتے تھے اور ان کو اپنے بڑھاپے کی گذر بسر کے لیے بہرحال روپیہ چاہیے۔ پھر کسی لڑکی کو وہ اپنے گھر میں پناہ دے رہے ہیں جو ایک غیر پیداواری عنصر ہے۔ اس کو زندگی بھر رکھنے کے لیے بھی رقم ملنی ہی چاہیے۔ لڑکی پڑھی لکھی ہو یا ان پڑھ وہ جو کچھ بھی جہیز میں لائے گی تو اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ نئے شادی شدہ جوڑے کی معاشی حالت بدل جائے گی

ہندوستان میں تمام مذہبی لسانی اور قبائلی طبقوں میں بیٹی کو پرائے گھر کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے ہر باپ یہ چاہتا ہے کہ اس کی بیٹی پرائے گھر میں سکھ و چین سے رہے۔ اس لیے وہ داماد کو نوٹوں کے ہار پہناتا ہے، بیٹی کو سونے کے زیورات اور گھریلو استعمال کا سامان دیتا ہے۔ اس کے سکون کی خاطر خود اپنا سکون برباد کر دیتا ہے۔ قرض دار ہو جاتا ہے یا اپنی جائداد اور قیمتی اشیاء فروخت کرتا ہے۔

گذشتہ زمانے میں جہیز کو شاید زندگی بیمہ سمجھا جاتا ہوگا۔ ایسی بھی مثالیں دیکھنے میں آئی ہیں کہ خاوند کے اچانک مر جانے کے بعد عورتیں اپنے زیورات سے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کر لیتی ہیں۔ ایک بوڑھی عورت نے بتایا کہ جب وہ ۲۸ سال کی تھی تو اس کا خاوند مر گیا تھا۔ "میرے کانوں کی بالیوں کی بدولت میرے لڑکے نے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا اور ہاتھ کی چوڑیوں سے لڑکیوں نے بی۔ اے مکمل کیا۔"

حال ہی میں مشہور صحافی منور سلطان نے اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکے اور لڑکیوں کے ایک گروپ سے جہیز کے سلسلے میں گفتگو کی تھی۔ ان میں انجینیئر، ڈاکٹر، افسر چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ، فرم ایگزیکیٹو شامل تھے۔ سب ہی برسر روزگار اور غیر شادی شدہ تھے۔ ان کے ساتھ کچھ نوجوان لڑکیاں ملازمت پیشہ اور غیر ملازمت پیشہ تھیں۔

یہ لوگ بہت آزاد خیال تھے ۔ مگر جہیز کے معاملے میں انتہائی قدامت پسند۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ جہیز کے ساتھ ہوئی شادیاں ان کی ازدواجی زندگی کو خوشیوں سے بھر دیتی ہے ۔ قیمتی زیورات ۔ بہترین کپڑے ۔ فرنیچر ۔ برتن اور گھریلو ضروریات کا دوسرا سامان اور ہنی مون منانے کے لیے معقول رقم سب ایک ساتھ مل جائیں تو ازدواجی زندگی کا آغاز بہت ٹھوس اور سُکھی ڈھنگ سے ہوتا ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ جہیز ایک پرانی ریت ہے ماں باپ اپنی اولاد کے لیے اسی طرح قربانی دیتے آئے ہیں ۔

لیکن آج کی جدید زندگی میں من چاہا جہیز نہ ملنے پر شادی کے بعد لڑکی کو تنگ کیا جاتا ہے اور مزید مال لانے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے ۔ ان کے مطالبے پورے نہ ہونے پر لڑکی کو ایسی ایسی ذہنی و جسمانی اذیتیں دیتے ہیں کہ اس کی زندگی وبال جان ہو جاتی ہے ۔ اس جہنمی زندگی سے تنگ آکر وہ اپنی زندگی بالآخر ختم کر دیتی ہے یا اس کو یہ آزاد خیال لوگ مار ڈالتے ہیں اس کے والدین کے آنے سے قبل لڑکی کی آخری رسومات پوری کرلی جاتی ہیں تاکہ یہ پتہ نہ چل سکے کہ اس بیچاری پر کیا بیتی ۔

دراصل جہیز زہریلا کینسر ہے جس نے ہندوستان کے سارے سماجی و معاشی ڈھانچے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے ۔ جہیز کے لالچ میں لوگ لڑکی کے والدین کا جینا دوبھر کر دیتے ہیں ۔ لاکھوں کی تعداد میں غریب اور متوسط گھرانوں کی بیٹیاں اس لیے غیر شادی شدہ ہیں کہ ان کے ماں باپ اس نئی سماجی بیماری کے علاج کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتے ۔ کم جہیز لے جانے والی لڑکیوں کی ازدواجی زندگی بربادی کے دہانے پر کھڑی رہتی ہے ۔ جہیز ایک طرف تو قومی بچت کو نقصان پہنچاتا ہے تو دوسری طرف مفت خوری کے جذبے کو پروان چڑھاتا ہے ۔ جہیز نے شادی بیاہ کو سودے بازی یعنی بازاری چیز بنا دیا ہے ۔ اس سودے بازی میں معاشی قوانین طلب و رسد کی نہ صرف خلاف ورزی ہوتی ہے بلکہ ان کے عمل میں رکاوٹ ڈالی جاتی ہے ۔

ماضی کی اسی بداخلاق رسم نے آج ہماری جدید تہذیبی زندگی کو موت اور زندگی کا کھیل بنا دیا ہے ۔ انتہائی حیرانی کی بات ہے کہ عورتوں کی اموات کی شرح مردوں کے مقابلے میں دو اور ایک ہے جو جلنے کی وجہ سے ہوتی ہیں اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ مرنے والیوں میں ۱۰ میں سے ۹ر۹ عورتیں گھر کی بہوویں ہوتی ہیں نہ کہ نند اور ساس ۔ چنانچہ ۱۹۷۳ء میں ۳۲۵۹ لڑکیوں نے جہیز کم لے جانے کی وجہ سے خودکشی کی یا ماردی گئیں ۔ سچ تو یہ ہے کہ لڑکیوں کی خودکشیوں کا تعلق کسی نہ کسی طرح جہیز سے ہی ہوتا ہے ۔

دو جگہ خودکشیوں پر تحقیقات کی گئی ۔ ایک گجرات میں جس کو مکمل ہونے میں چار سال کا عرصہ لگا ۔ دوسری بمبئی میں جو تین سال میں مکمل ہوئی ۔ رپورٹ میں درج ہے کہ ہندوستانی سماج میں انسانوں کی قربانی دی جا رہی ہے اس بربریت کے تحت نوجوان دوشیزاؤں کو سونے کے دیوتا کی قربان گاہ پر قتل کر دیا جاتا ہے ۔ سونا جو ہندوستانی سماج کے ہر طبقے ہر علاقے اور ہر مذہب میں مقبول ہے ۔

گجرات میں ۸۱٪ خودکشیاں شادی شدہ لڑکیاں معاشی و معاشرتی مسائل کی وجہ سے کرتی ہیں ۔ ۶٪ لڑکیاں غیر شادی شدہ ہوتی ہیں ۔ اور ۱۳٪ بیوہ عورتیں ہوتی ہیں ۔ بمبئی میں ۳۲٪ خودکشیوں کی اہم وجہ شادی کے مسائل ہیں زیادہ تر خودکشی کرنے والیوں کی عمر ۲۹ - ۱۵ کے درمیان ہوتی ہے ۔

جہیز کی یہ لعنت صرف شادی ہونے کے بعد ہی ختم نہیں ہو جاتی ۔ بلکہ کچھ نہ کچھ دینے کا سلسلہ جاری رہتا ہے ۔ شادی کے وقت جہیز کی رقم دی جاتی ہے ۔ شادی ہونے کے بعد پہلے سال میں جو بھی تہوار آتے ہیں تو کچھ نہ کچھ تہواری بھیجنی پڑتی ہے ۔ اور جب بچہ ہوتا ہے تو چھٹی چھوچک کے نام پر نہ معلوم کتنی رقم خرچ ہوتی ہے ۔ اگر ان رواجوں پر تحفے تحائف نہ بھیجے جائیں تو سسرال والے سخت ذہنی اذیتوں سے لڑکی کا جینا حرام کر دیتے ہیں اور پھر وہ لڑکی سوائے خودکشی کے کچھ نہیں کر سکتی ۔

مغربی بنگال میں ۱۰۰,۰۰۰ : ۱۵ کی نسبت سے خودکشیاں ہوتی ہیں ، حالانکہ پورے ملک میں اوسط ۱۰۰,۰۰۰ : ۸ ہے ۔ ہر تیسری خودکشی ازدواجی رشتہ کی وجہ سے ہوتی ہے ۔ آندھرا پردیش ۔ گجرات ۔ تامل ناڈو جہاں جہیز کا عام رواج ہے خودکشیوں کی رفتار اسی اوسط سے ہے ۔ راجستھان ۔ پنجاب ۔ یوپی میں خودکشیاں اتنی بڑی تعداد میں نہیں ہوتیں ۔ جہیز کی یہ لعنت موت کا کھیل بن گئی ہے ۔

ضرورت یہ ہے کہ اس بدعت کے خلاف اور اس قسم کی دوسری بدعتوں کے خلاف سماج میں جذبہ پیدا کیا جائے ۔ سماج اور دیش کا بھلا چاہنے والے لوگ چاہے ان کا تعلق کسی مذہب ، فرقے یا علاقے سے ہو اس معاملے میں ایک ہو کر ملک بھر کے اندر ایک مہم چلائیں اور لوگوں کو بیدار کریں ، جب تک یہ بات نہیں ہو گی تب تک جہیز کی بدعت ختم ہو جائے گی ایسی امید قائم کرنا بیکار ہے ۔

مستقل شادی گھر بنا کر ان میں اجتماعی شادیوں کا بندوبست کیا جائے ۔ ان سے شادی اور جہیز کے خرچ میں کمی آئے گی ۔ عام طور سے عشقیہ شادیاں بھی جہیز کے بغیر ہوتی ہیں ۔ عشقیہ شادیوں سے ذات پات کی تقسیم ختم ہوتی ہے ، اور قومی یکجہتی کو بڑھاوا ملتا ہے ۔

جہیز لینے اور دینے والوں کا سماجی بائیکاٹ ہونا چاہیئے ۔ یہ بات قابل تعریف ہے کہ یوتھ کانگریس کی رہنمائی میں اس لعنت کو ختم کرنے کے لئے زبردست کوششیں کی جا رہی ہیں ۔

جہیز کے ساتھ ساتھ مہر کی رقم پر بھی دھیان دینا چاہیئے ۔ جب جہیز لیا اور دیا نہیں جا رہا تو مہر اتنا زیادہ کیوں ہے ۔ مہر کی رقم کو بھی گھٹایا جائے جو آج بڑھ کر ایک لاکھ روپے تک پہنچ چکی ہے ۔ بڑے شہروں میں لوگ مہر کی رقم شادی سے قبل پیشگی بھی حاصل کرتے ہیں اور اس پیشگی رقم سے اپنی لڑکی کی شادی کا انتظام کرتے ہیں ۔

بعض برادریوں میں یہ رواج قائم ہے کہ وہ مہر کی رقم کم طلب کرتے ہیں بلکہ چڑھاوا زیادہ چاہتے ہیں۔ مثلاً مہر ۵ ہزار روپے مگر زیورات جو لڑکے کو شادی کے موقع پر دینے ہوتے ہیں ۲۰ یا ۲۵ ہزار روپے کے۔ یہ زیورات قطعاً لڑکی کی ملکیت ہوتے ہیں اور لڑکی جو کچھ سامان اپنے ساتھ لاتی ہے وہ بھی لڑکی کی ملکیت ہوتا ہے۔ اگر معاملہ کسی وجہ سے طلاق تک پہنچ جائے تو لڑکے کو مہر دینا پڑتا ہے اور چڑھاوے میں دیئے ہوئے زیورات اور کپڑے وغیرہ سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ جرمانہ بھی دینا پڑتا ہے جو مجسٹریٹ یا برادری کا صدر لگادے۔

آج کل کے نئے تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے نوجوان ملازم پیشہ لڑکیوں سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور جہیز کا مطالبہ نہیں کرتے۔ جہیز کا مطالبہ تو صرف ان کے ماں باپ یا رشتہ دار کرتے ہیں۔ اگر لڑکی ملازمت پیشہ ہے تو شادیاں بھی جہیز کے بغیر ہو سکتی ہیں۔ اس لیے لڑکیوں کی تعلیم کو بہتر کیا جائے اور ان کو سماج میں برابری کا مقام دیا جائے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر اتنا خرچ کیا جائے جتنا لڑکوں پر کیا جاتا ہے تو جہیز کی لعنت ختم ہو جائے گی۔

جہیز کی لعنت عام ہے۔ جہیز اور شادی کے ناجائز خرچ کی اصل ذمہ داری عورتوں پر عائد ہوتی ہے۔ جو رسومات سختی سے قائم ہیں۔ برکشہ۔ منگنی۔ تلک۔ ٹیکا۔ گھوڑا۔ جوڑا وغیرہ اور شادی کے بعد ہر تہوار پر کچھ نہ کچھ لڑکے کے گھر بھیجنا۔ بچہ ہونے پر چھٹی چھوچھک کرنا۔ اس طرح کے اخراجات ساری زندگی اپنے اوپر لادے رکھتی ہیں۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ دوسری سماجی برائیوں میں پھنس جاتے ہیں۔ جہیز کی یہ لعنت معاشی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ کیونکہ لوگ اپنی بچت کو بجائے کھیتی اور صنعت میں لگانے کے شادی بیاہ کی نذر کر دیتے ہیں۔ بچت کا یہ استعمال قطعی غیر پیداواری ہے اور اس سے سوائے نقصان کے کچھ نہیں ملتا۔

جہیز ایک ایسے ملک میں جو ترقی کی راہ پر گامزن ہے انتہائی غیر سوشلسٹ طریقہ ہے۔ یہ امیروں اور غریبوں کے درمیان جو فرق قائم ہے اس میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ غریبوں کی زندگی میں اس سے تناؤ پیدا ہوتا ہے۔ آسائشی چیزوں کے استعمال میں اضافہ کرتا ہے۔ اور جب غریب ان آسائشی اشیاء کو دیکھتے ہیں اور ان کو حاصل نہیں کر پاتے تو امیروں کے لیے ان کے دل میں نفرت بڑھ جاتی ہے۔ جہیز کی وجہ سے سونے اور چاندی کا غیر پیداواری استعمال ہو رہا ہے۔ یہی سونا اور چاندی ملک کی قسمت بدل سکتا ہے۔

انڈیا ٹوڈے، مئی ۱۵، ۱۹۷۶ء کے شمارے میں جہیز سے متعلق کچھ انٹرویو شائع ہوئے ہیں۔ محترمہ رضیہ خاں۔ پرنسپل ویمین کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ جہیز کا مقصد نئے شادی شدہ جوڑے کو نئی گھریلو زندگی قائم کرنے میں راحت فراہم کرنا تھا مگر آج یہ تجارت کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں اس کا رواج ہے۔ مگر روپے کی صورت میں نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قانون سے یہ مسئلہ آسانی سے حل نہیں ہوگا جب تک سماجی ذہن میں انقلابی تبدیلی نہ لائی جائے۔ ان کی رائے ہے کہ جہیز والی شادیوں میں شرکت نہ کی جائے اور لڑکیوں کو چاہیئے کہ وہ ایسے لڑکوں سے قطعی شادی نہ کریں جو جہیز طلب کریں اور لڑکوں کو بھی چاہیے کہ وہ جہیز لینے سے انکار کریں۔

کبیر مصطفائی کہتے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ گھر بنانے کے لیے کچھ تو روپیہ ہونا ہی چاہیے۔ لیکن یہ ان کی سسرال کی طرف سے جہیز کی صورت میں نہیں بلکہ وہ قرض لینا چاہیں گے۔ جو بعد میں ہلکے ہلکے ادا کر دیں گے اور اگر ممکن ہوا اور بیوی کو ملازمت کرنا پسند ہو تو پھر کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

۱۵ سالہ سرلا جگموہن جو صحافی ہیں کہتی ہیں کہ تعلیم اور نئی دولت نے جہیز کی رسم کو مزید بڑھاوا دیا ہے آج تعلیم یافتہ لڑکے سسرال والوں سے رقم حاصل کر کے اپنا پرائیویٹ کاروبار شروع کرتے ہیں یا مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے غیر ملکوں کا خرچ حاصل کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ جہیز سے لڑکیوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا۔

راجستھان کی ۵۰ سالہ کلاوتی کے پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جہیز مخالف مہم کے بارے میں سنا تو ہے مگر ان کے گاؤں میں جہیز کے انسداد کیلئے کچھ بھی نہیں ہوا۔ جہیز آج بھی وہاں قابل فخر کارنامہ ہے۔ جتنا زیادہ دو اتنی ہی زیادہ عزت پاؤ۔ کلاوتی اپنی ساری زندگی بیٹیوں کا جہیز جمع کرنے کے لیے بچت کرتی رہی ہے۔ اور اس نے جہیز دیا ہے تو اب وہ جہیز کیوں نہ لے۔ اگر وہ جہیز نہ دیتی تو لڑکیوں کے لیے اچھا گھر نہیں ملتا۔ کلاوتی کو یقین ہے کہ اگر جہیز کا رواج ختم ہو جائے تو سارے غریب خوش حال ہو جائیں۔

ایک عرصے سے ماہر سماجیات جہیز کے خلاف بہت کچھ کہتے رہے ہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے ایمرجنسی کی بدولت اس مسئلہ پر خاص طور سے نگاہ ڈالی گئی اور سیاست دانوں کو مسئلے کی شدت کا احساس ہوا انھوں نے نہ صرف جہیز مخالف مہم میں حصہ لیا بلکہ قانون ساز اسمبلیوں کے ذریعہ جہیز مخالف قوانین پاس کیے۔ مرکزی سرکار نے فیصلہ کیا کہ اگر مرکزی ملازمین جہیز لیں یا دیں گے تو ان کے خلاف کارروائی ہوگی۔ زیادہ تر ریاستوں نے جہیز مخالف قوانین پاس کر دیئے ہیں اور جہیز کے لینے دینے کو قابل سزا تسلیم کر لیا ہے۔

سماچار کے قومی سروے اور اسٹیٹسمین کے سروے سے پتہ چلتا ہے کہ جہیز کی جڑیں ملک کے تمام طبقوں میں موجود ہیں۔ دلہنوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے والدین قرض لینے کے عادی ہو گئے ہیں۔ قرض کے پھیلاؤ کی وجہ سے سود خور مہاجنوں کے کاروبار میں خوب ترقی ہوئی ہے۔ قومی بچت اسکیموں کے تحت لوگوں نے جو بچت کی وہ زیادہ تر جہیز کی نذر ہوئی ہے۔

جہیز کا مسئلہ بڑا جذباتی اور پریشان کن ہے۔ اسمگلر۔ کالے دھن کے مالک سرمایہ دار اور رشوت خور ملازمین اس لعنت کو برداشت کر سکتے ہیں اور وہ اس کو اپنا ذاتی مسئلہ سمجھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس قسم کی رسمیں جاری رہیں۔ لیکن کچھ لوگ جو ان لوگوں کی دیکھا دیکھی اس رواج پر عمل کرتے ہیں وہ برباد ہو جاتے

ہیں۔ ان کی بربادی کو روکنا بہرحال حکومت کے لیے ضروری ہے۔ کیونکہ یہ ملک کی معیشت اور معاشرت دونوں کو تباہ کر رہی ہے۔ انسان اس لعنت کی وجہ سے ذہنی طور پر اتنا زیادہ پریشان ہے کہ اس سے کسی بھی تعمیری کام کی توقع کرنا بے کار ہے۔ نتیجہ میں غریب مزید غریب اور امیر مزید امیر ہوتا چلا گیا۔

اس لعنت کے خلاف تحریک کا آغاز مہاتما گاندھی نے کیا تھا۔ اور انھوں نے کوشش کی کہ اس لعنت کو ذہنوں میں تبدیلی کر کے ختم کر دیا جائے لیکن یہ تحریک آزادی کے بعد ٹھنڈی پڑ گئی۔ علاقائی طور پر سینکڑوں تنظیمیں اس کے خلاف کھڑی ہوئیں لیکن کامیابی ان کے مقدر میں نہیں تھی اور اس لعنت نے اپنی جڑوں کو مضبوط سے مضبوط تر کر لیا۔ سادگی کے نام پر بڑے بڑے عالیشان ہوٹلوں میں شادیوں کا اہتمام ہونے لگا جہاں ۵۰ روپے سے لے کر ۸۰ روپے تک فی کس خرچ ہوتے ہیں۔

مشہور صحافی منور ہادیوان نے بالکل ٹھیک کہا ہے "جب تک ہماری سماجی قدریں اور روایات نہیں بدلتیں تب تک ہم جہیز اور اس جیسی دوسری لعنتوں سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔"

ہندوستان میں پچھلے برس ہنگامی صورتِ حال کے اعلان کے بعد لوگوں میں ایک نیا نظم، سماجی اور سیاسی شعور پیدا ہوا ہے۔ ملک میں پھیلے ہوئے ڈھکوسلے اور غلط رواجوں کے خلاف تیزی سے کارروائی ہوئی اور نوجوانوں اور خواتین نے قابلِ تعریف عمل کیے ہیں۔ ہر طبقے اور مذہب کے لوگ جو ترقی اور خوشحالی اور صحت مند ماحول پر یقین رکھتے ہیں ان برائیوں کا ختم ہونا ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی وقتاً فوقتاً ان برائیوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہتی رہتی ہیں۔ انھوں نے توجہ دلائی ہے کہ عورتوں کے لیے لازمی ہے کہ ان کے سوچنے اور کام کرنے کے ڈھنگ پرانے گھسے پٹے طریقوں سے آزاد ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ جہیز خاندان اور معاشرہ پر بوجھ ہے اس بوجھ نے ملک کی شہری اور دیہاتی زندگی کو خراب کر دیا ہے۔ اسی طرح مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ ایک شخص جو شادی پر جہیز طلب کرتا ہے وہ تعلیم کی توہین کرتا ہے اور عورتوں کی توہین کرتا ہے۔

دراصل جہیز کی لعنت کو ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ رائے عامہ کو اس کی برائیوں اور نقصانات سے آگاہ کر کے بیدار کیا جائے۔ رائے عامہ اس وقت آسانی سے بیدار نہیں ہو سکتی جب تک قانون اور حکومت کی مدد حاصل نہ ہو۔ قانون اور حکومت کی سرپرستی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب تک کوئی طاقتور منظم جماعت کسی تحریک کی حامی بنے۔ یہ مسئلہ درحقیقت نوجوانوں کا مسئلہ ہے۔ اس لیے اس مسئلہ کو اگر نوجوان خود ہی حل کریں تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ چنانچہ انڈین یوتھ کانگریس جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ نوجوانوں کی تنظیم ہے اور جس کا مقصد نوجوانوں کے مسائل کو حل کرنا ہے۔ اس لعنت کے خلاف ملک گیر تحریک چلائی ہے، ۵۰ لاکھ سے زیادہ نوجوانوں نے حلف اٹھایا ہے کہ وہ جہیز نہیں لیں گے۔ اس تنظیم کے تحت شریمتی سنجے گاندھی نے اپنی بے مثال جرأت اور قیادت سے نوجوانوں کی بے پناہ طاقت اور صلاحیتوں کو تعمیری کاموں اور اقتصادی خوشحالی کی طرف موڑ دیا ہے اور معاشرتی برائیوں سے نوجوانوں کو بچا لیا ہے۔ جہیز کے خلاف ان کے پرامن اقدامات نے پورے ملک میں انقلاب پیدا کر دیا ہے اور اس کے قابلِ قدر نتائج نکلے ہیں۔

بقیہ اب نہیں

بے زاری، بے حسی بہہ نکلی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سشما کو پھر اس روپ میں دیکھنا چاہا، جس روپ میں وہ اس کے ساتھ سات پھیرے لے کر آئی تھی۔

"انکل جی سو گئے کیا؟" شالو چہکی۔

"نہیں بیٹی۔ وہ آنکھیں کھول کر ہنسا۔ خواہ مخواہ ہنسا۔ نہیں بیٹی — جاگ گیا ہوں ..." پھر اس نے کھڑے ہو کر اپنے بہت عرصے پہلے کے انداز میں ہانک لگائی۔

"بھابی جی۔ میں تو چلا گھر.... سشما راہ دیکھتی ہوگی!" اور سائیکل کو ہوائی جہاز کی طرح اُڑاتا ہوا گھر کی طرف اڑتا ہوا وہ سوچ رہا تھا۔

بس.... اب نہیں.... بالکل نہیں..... ننھے گپتو کے بعد اب اس پالنے کو کھلوا کر چھت پر ٹانگ دوں گا.... سارا قصور اسی کمبخت کا معلوم ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنی سوچ پر ہنسا اور گنگنانے لگا۔

"نہیں ٹلا ہے، نہیں ٹلے گا....."

بقیہ اسلام اور کنبہ بندی

یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ کسی مقصد اور اس مقصد کے حصول کے لئے اختیار کئے جانے والے ذرائع میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ فیصلہ کن بات یہ ہے کہ اسلام اصولی طور پر کنبہ بندی کی اجازت دیتا ہے یا نہیں۔ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ملتا ہے تو کنبہ بندی کے مقصد کے حصول کے لئے عہد حاضر میں رائج طریقوں میں سے ہر ایک کا جواز قرآن و حدیث میں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام جیسا دین کامل صرف قانون و ثقافت کے اصول مرتب کر سکتا تھا۔ اس نے قدیم زمانہ میں رائج طور طریقوں میں اپنے اصولوں کو محدود کبھی نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس اپنے اصولوں پر عمل کے لئے انسان کی سماجی و علمی ترقی کے ساتھ ساتھ دریافت ہونے والے طریقوں کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھتے ہیں۔ جہاں تک کنبہ بندی کے اصول کا سوال ہے، جیسا کہ ہم نے اس مقالہ میں مختصراً بیان کیا ہے، وہ نہ تو کوئی غیر اسلامی چیز ہے اور نہ مسلمانوں کے دین و ثقافت کے لئے کوئی اجنبی شے ہے۔ مخصوص حالات میں اسلام اصولی طور پر کنبہ بندی کے جواز کو تسلیم کرتا ہے۔ جو معاشرتی اور معاشی حالات آج کل ہمارے ملک میں ہیں ان حالات میں اسلام کنبہ بندی کی صریحاً اجازت دیتا ہے۔ اور ان حالات میں خاندان کو چھوٹا رکھنے اور آبادی کو بڑھنے سے روکنے کے لئے اختیار کئے جانے والے تمام معقول ذرائع دینی جواز کی کسوٹی پر ہر طرح پورے اتریں گے۔

دیش چترکار
۴۷/ 8 E اندر پوری، نئی دہلی

مٹی بھی چراغ بھی

سدھیر آج بے حد پریشان تھا۔ اُسے کسی پل بھی چین نہ تھا۔ اس کا دماغ اگر ایک لمحہ دلیل کی نپی تلی راہ پر دوڑتا، تو دوسرے لمحہ سوچ کی نئی رَو میں بہنے لگتا۔ حال ہی میں اس نے ایک ایسا قدم اٹھایا تھا جس کی وجہ سے ایک مخصوص دھارے پر بہہ رہی اس کی زندگی میں ایک ہلچل سی پیدا ہوگئی تھی۔ ایک تلاطم سا بپا ہوگیا تھا۔ اُس کے بحرِ سکون و چین میں۔ کبھی کبھی تو اسے اپنے اس فعل و فیصلہ پر کوفت ہونے لگتی۔ اس کا دل کہتا ــــ "یہ قدم اٹھا کر تم نے بلاوجہ اپنی زندگی پر ایک غیر ضروری بوجھ سا لاد دیا ہے۔ جذبات کی رو میں بہہ کر جلد بازی میں اٹھایا گیا یہ قدم محض ایک غلطی ہے تمھاری، جس کا ردِعمل تمھاری کشتیِ حیات کو سمندر کی ان موجوں کے حوالے کر دینے کے بموجب ہوگا، جو ممکن ہے تمھیں ایک گھڑی کے لیے بھی چین سے نہ جینے دیں ــــــ اور کبھی اس کا ضمیر اسی فعل کی داد دینے لگتا ــــــ شاباش، سدھیر! یہ ایک ایسا منصوبہ ہے جس پر عمل پیرا ہونا انسان کی حقیقی عظمت کو روشن کرنا ہے۔ یہ ایک بہترین فعل ہے ملک اور قوم کے ہر بشر کو اس کی نقل کرنے میں رشک محسوس کرنا چاہیے۔ کتنا ہی اچھا ہو، کہ تمھارا یہ قدم دوسروں کے لیے مشعلِ راہ بن سکے ......!"

گذشتہ چند دنوں سے سدھیر اسی قسم کے ذہنی تذبذب میں مبتلا تھا اس دن بھی اس کا دماغ ایک ایسے ہی تذبذب میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک انجانے میں ان واقعات کا تسلسل اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگا جو کہ اس تمام تر پریشانیوں کا باعث تھا۔

موسم سرما کے دن تھے۔ وہ اوڈین میں ایوننگ شو دیکھ کر لوٹا تھا تازہ ہوا کے لیے جونہی اس نے سروجنی نگر میں اپنے سرکاری کوارٹر کی مین روڈ پر کھلنے والی کھڑکی کو کھولا، اس کی نگاہیں سامنے سڑک پار لیمپ پوسٹ پر مرکوز ہوکر رہ گئیں۔ اس نے دیکھا کہ رات کی تاریکی کو چیرتی ہوئی بجلی کے بلب کی روشنی میں ایک بچہ محوِ مطالعہ ہے۔ اس وقت سدھیر نے اس منظر کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ لیکن جب لگاتار تین دن تک اس نے منظر میں کوئی تبدیلی نہ دیکھی، تو چوتھے دن اس نے سوچا کیوں نہ کیفیت کا قریب سے جائزہ لیا جائے! اس کا یہ سوچنا تھا کہ چند منٹ بعد ہی نائٹ گون پہنے ٹھٹھرتی سردی میں وہ اس لیمپ پوسٹ کے پاس جا پہنچا۔

اس نے دیکھا ــــ اس کے تجسس کا مرکز آٹھ برس کی عمر کا ایک لڑکا ہے، جو اِکّے دُکّے راہ گیر کے پاؤں کی آہٹ سے بے خبر اپنا بستہ کھولے بڑے انہماک سے محوِ مطالعہ ہے ــــــ کم از کم لباس میں ملبوس اس لڑکے کی تمام تر توجہ سامنے کھلی پڑی کتاب پر مرکوز تھی۔ مطالعہ میں اس کی محویت کا یہ عالم تھا کہ تین چار منٹ تک سدھیر کے وہاں کھڑے رہنے کے باوجود لڑکے نے کتاب سے نگاہیں نہ ہٹائیں۔ اس کم سن بچے کی حصولِ تعلیم میں اس قدر گہری دلچسپی اور لگن سے سدھیر بہت متاثر ہوا تھا۔

"کیوں، بیٹا؟ کیا نام ہے تمھارا؟" آخر لڑکے کی توجہ میں دخل انداز ہوتے ہوئے سدھیر نے پوچھا تھا۔

سدھیر کو خوب یاد ہے کہ اس لڑکے نے ایک لمحہ کے لیے کتاب پر سے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"راجو!" لڑکے کا جواب مختصر تھا۔ اور اس کی نظریں دوبارہ کتاب کتاب پر جم گئی تھیں۔

"اتنی سردی میں اور اس طرح اکیلے یہاں کیوں بیٹھے ہو، بچے؟" تجسس آمیز لہجہ میں سدھیر نے پوچھا تھا۔

اب لڑکے نے کھلی کتاب پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور بولا "ایک مجبوری ہے، ساب!" اور پھر تھوڑی دُور ہی ریلوے لائن کی طرف انگلی اٹھا کر وہ بولا تھا۔

"میں لائن پار اُن جھگیوں میں رہتا ہوں۔ ایک سال ہوا میرے ماں باپ مر گئے۔ اب چچا کے پاس رہتا ہوں۔ وہ بہت ہی اچھے ہیں۔ لیکن ہم لوگ بہت ہی غریب ہیں، ساب!"

"لیکن دن کی روشنی اور دھوپ میں بیٹھ کر کیوں نہیں پڑھتے بیٹا؟" بے اختیار سدھیر نے پوچھا تھا۔

"دن کو پہلی شفٹ میں اسکول جاتا ہوں، ساب! اسکول سے چھٹی پانے کے بعد سائیکلوں کی ایک دکان پر کچھ کام کر لیتا ہوں۔ وہاں سے فراغت پاتے پاتے شام ہو جاتی ہے۔ ادھر شام کو گھر پر اتنا شور و غل ہوتا ہے اور روشنی کا بھی انتظام نہیں ہو پاتا اس لیے مجبوراً یہاں بجلی کے اس بلب کے نیچے آ بیٹھتا ہوں۔

راجو کے ان الفاظ میں چھپی مجبوری، غربت اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے استعمال کی جا رہی تحمل مزاجی نے سدھیر کے انسانی ہمدردی کے جذبات کو جھنجھوڑ دیا تھا۔

"لیکن کیوں؟ یہ سب کچھ کیوں کرتے ہو"؟ سدھیر نے پھر سوال کیا۔

"ہاں، ساب! اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ ایک بار اسکول میں دیدی نے بتایا تھا کہ تعلیم اور محنت، یہ ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو بڑا بنا دیتی ہیں اور میں بڑا بننا چاہتا ہوں۔۔۔۔" اور اس کے ساتھ راجو ملتجی لہجے میں بولا تھا "اچھا، ساب! اگر آپ برا نہ مانیں اور اجازت دیں تو میں۔۔۔ دراصل۔۔۔۔ مجھے ابھی حساب کے دس سوال کرنا باقی ہیں۔۔۔۔۔"

سدھیر کو یاد آیا کہ راجو کے ان الفاظ نے اُسے لاجواب کر دیا تھا۔ اور قدرے نادم بھی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ عزم و استقلال کی کس قدر پختگی ہے اس کم سن بچے کے ننھے سے دل میں!

وہ چُپ چاپ اپنے کوارٹر میں لوٹ آیا تھا۔

اگلے دن پہلے کی نسبت سردی کافی زیادہ تھی۔ لیکن خلاف توقع رات کو معین وقت پر سدھیر نے راجو کو اپنی مخصوص جگہ پر موجود پایا تھا۔ کچھ دیر تک غور سے دیکھنے کے بعد سدھیر نے محسوس کیا کہ راجو کے ہاتھ پاؤں، کسی بھی عضو میں کسی قسم کی بھی کوئی حرکت نہیں ہے۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ لیمپ پوسٹ کے عین نیچے راجو نہ بیٹھا ہو بلکہ کپڑوں کی کوئی ساکن گٹھری پڑی ہو۔

سدھیر کے دماغ میں اچانک ایک خدشہ سر ابھارنے لگا ــ خدانخواستہ کہیں۔۔۔۔؟ ایک کمبل لے کر وہ فوراً راجو کی طرف دوڑا۔

قریب جا کر دیکھا، راجو گہری نیند میں سویا پڑا ہے۔

سدھیر نے آہستہ سے راجو پر کمبل ڈال دیا۔ اس کے بعد کچھ منٹوں کے لیے وہ وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ پھر نا معلوم کس جذبے کے تحت اس نے راجو کو اتنی احتیاط سے باہوں میں اٹھا لیا کہ بچے کی نیند اچاٹ نہ ہونے پائے اور اسے اپنے کمرے میں لا کر پلنگ پر لٹا دیا۔

جانے کتنی دیر تک سدھیر سرہانے بیٹھا نیند میں کھوئے راجو کے پرسکون چہرے کو تکتا رہا۔

بالآخر جب راجو نے آنکھ کھولی تو بڑبڑا کر اس نے پوچھا ـــــ "آپ، آپ مجھے یہاں کیوں لے آئے؟"

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں، بیٹا!" سدھیر نے جواب دیا تھا "اسے بھی اپنا ہی گھر سمجھو"

"لیکن۔۔۔۔" پیشتر اس کے کہ راجو آگے کچھ کہتا سدھیر نے اسے بتایا تھا "تمہارے گھر والوں کو ابھی اطلاع دے دی جائے گی۔ لیکن اس وعدہ پر کہ اب تم میرے پاس ہی رہو گے۔ یقین کرو، یہاں میرے پاس رہتے ہوئے تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔۔۔۔۔"

"لیکن۔۔۔۔ لیکن، ساب! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔۔؟ میں۔۔۔۔ میں۔۔۔"

"سب کچھ ہو سکتا ہے، بچے!"

اور سدھیر جانتا ہے کہ اس دن سے لے کر راجو اس کی سرپرستی میں اس کے پاس ہی رہ رہا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے سارے انتظامات مکمل کر لیے ہیں۔ راجو کی پرورش اور دیکھ بھال کے لیے ایک بوڑھی خادمہ بھی ملازم رکھ لی گئی ہے۔

ننھے راجو کے کردار اور اس کی ہستی نے سدھیر کو اس بات کا احساس کرا دیا تھا کہ سماج اور قوم کے وسیع چمن زار میں ناموافق حالات کے تھپیڑوں کی گرفت میں پھنسے کچھ ایسے بھی بدقسمت پودے ہوتے ہیں جو گمنام، انجانے اور بے سہارا رہ کر گمنامی کے ملبے میں دبے رہ جاتے ہیں۔ ان کی طرف کسی کی توجہ تک نہیں جاتی۔ باغباں کی مناسب دیکھ بھال اور نگہبانی کی نعمت سے محروم رہ کر وہ بے وقت ہی مرجھا جاتے ہیں، سوکھ جاتے ہیں، فنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن کسی کو خبر تک نہیں ہو پاتی۔ ان میں جینے کی تمنا اور ولولہ نہ ہو، یہ بات نہیں۔ لیکن ان کے تئیں سماج کی لاپروائی و بے اعتنائی کے کارن ان میں نہاں اہلیت اور قابلیت خاموشی کی غاروں میں مدفن ہو کر رہ جاتی ہے۔

سدھیر کو اس بات پر مسرت ہو رہی تھی کہ اُسے کم از کم ایک تو ایسے ہونہار پودے کا باغبان بن کر پروان چڑھانے کا موقع ملا ہے۔ لیکن ملال بھی تھا۔ وہ سوچتا ـــــ ان دوسرے ان گنت پودوں کا کیا حشر ہوگا جنھیں ہمارا سماج اور ہماری قوم فراموش کیے بیٹھی ہے؟ اس کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں ایک وہم سا سر اُبھارنے لگتا ـــــ ایسے بے شمار بدقسمت پودوں میں سے فقط ایک کو ہی پروان چڑھانے کی کوشش سماج کے لیے کہاں تک مفید ثابت ہوگی؟ پھر خیال آتا ـــــ یہی خیال تو معاشرتی اصلاح کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر سبھی ریفارمر اور بہی خواہ یہی سوچ کر چُپ رہ جائیں تو مسئلہ کا حل کیسے ہوگا؟ آخر کہیں سے اور کسی کو تو پہل کرنا ہے!

دوسری طرف اپنی زندگی سے راجو کی وابستگی نے سدھیر کے لیے ایک نہایت ہی پیچیدہ مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔ یہ تو ایک طے شدہ حقیقت تھی کہ جلدی ہی رچنا اس کی زندگی کا ایک اہم جُز بننے والی تھی۔ رچنا اس کی منگیتر تھی۔ سدھیر کی زندگی سے راجو کی زندگی کی وابستگی کا مطلب تھا، بچے کی رچنا اور سدھیر دونوں کی ازدواجی زندگی سے گہرا تعلق۔

سدھیر نے ایک خط کے ذریعہ رچنا کو اپنے نئے منصوبے اور فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ اب اسے رچنا کے جواب کا شدت سے انتظار تھا۔ رچنا کا ردِ عمل اس کے لیے بہت اہم تھا۔ نہ جانے رچنا کا جواب کیسا ہو؟ اب تو نہ وہ راجو کو کسی بھی حالت میں چھوڑنے کو تیار تھا اور نہ ہی رچنا سے کنارہ کشی ممکن تھی ـــــ رچنا جو اس کی زندگی کے حسین خواب کی تعبیر بن چکی تھی۔۔۔۔!

یہی تو تھیں وہ ذہنی پریشانیاں جن کی وجہ سے آج اس کے دل کا سکون درہم برہم ہوا جا رہا تھا۔

آخر جس لمحہ سدھیر کو رچنا کا جواب ملا، اس کی عجیب حالت تھی۔ لفافے کو چاک کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں پھوٹنے لگیں۔ دل کی دھڑکن پر کچھ حد تک قابو پا لینے کے بعد اس کی سہمی سہمی نگاہیں خط کے مضمون پر اس طرح تھرکنے لگیں ——

جانِ من!

تمہارا خط ملا۔ یہ واجب ہی ہے کہ تم نے اپنی زندگی میں اٹھائے گئے ایک نئے اہم قدم اور منصوبے سے متعلق میری رائے طلب کرنا چاہی ہے جواباً عرض ہے کہ تم نے جو قدم اٹھایا ہے اس نے بلاشبہ ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے جس کا ہم دونوں کی باہمی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔

یقین جانو، میں تمہارے اس فعل اور منصوبے کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ اتنا مفید اور تعمیری قدم ہے کہ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

تم نے جاننا چاہا ہے کہ ہماری زندگی سے راجو کی وابستگی میرے لیے خاص طور سے ناگوار تو نہ گذرے گی؟ عرض ہے کہ یہ کیفیت ہمارے لیے وردان سے کم نہ ہوگی۔ اپنے لیے تو ہر کوئی جی لیتا ہے، سدھیر! زندگی کا حقیقی لطف تو جب ہے کہ اوروں کے لیے جیا جائے۔ میں پوچھتی ہوں، کتنے ہیں ایسے لوگ جو دوسروں کے لیے جینے کی زحمت گوارہ کر پاتے ہیں؟ میں تو صرف اتنا کہوں گی کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ بھگوان نے ہمیں راہِ حیات پر ایک ساتھ روانہ ہوتے ہی زندگی کا ایک مخصوص مقصد عطا کر دیا ہے۔ بلا مقصد کی زندگی بھی بھلا کوئی زندگی ہوتی ہے!

مطمئن رہو۔ زندگی میں آنے والے ہر طوفان اور انقلاب کا مقابلہ کرنے کے لیے تم رچنا کو ہمیشہ اور ہر دم اپنے ساتھ پاؤ گے۔ اور کیا لکھوں ——؟

تمہاری ہی

رچنا

خط کو پڑھ کر سدھیر کا چہرہ ایک حقیقی مسرت سے دمک اٹھا۔

عین اسی وقت جونہی اس کی نگاہیں سامنے سڑک پار لیمپ پوسٹ کی طرف اٹھیں۔ لیمپ پوسٹ کے نیچے راجو کو کھڑے پایا۔ وہ چست نیکر اور دودھ جیسی سفید قمیص میں ملبوس، کندھے پر بستہ لٹکائے اسکول سے واپس آ رہا تھا۔ اور اس انتظار میں کھڑا تھا کہ کب ٹریفک اسے سڑک کو پار کرنے کی اجازت دیتی ہے۔

سدھیر کے لیے اب راجو وہ پہلے والا راجو نہ تھا جسے وہ کچھ عرصہ پہلے رات کی تاریکی میں لیمپ پوسٹ کے نیچے بیٹھا دیکھا کرتا تھا۔ اب راجو کی زندگی پر چھائے محرومی کے بادل چھٹ چکے تھے اس کی زندگی باہمی تعاون کے نور سے منور ہو چکی تھی۔

آنچل نئی دہلی

پونم وہرہ بی ۱۶۳ ڈی II موتی باغ، نئی دہلی

کس کی جیت؟

اسکول میں کھیل کے پیریڈ میں جب کبھی دوڑ ہوتی تو میں ہمیشہ پیچھے رہ جایا کرتی۔ آج بھی، بسوں میں چڑھتے، اترتے، دکان سے سودا خریدتے یا پھر ڈگریاں حاصل کر کے اونچے عہدوں تک پہنچتے ہوئے میں سب سے پچھڑ جاتی ہوں۔ ہر کوئی آگے، بہت آگے نکل جاتا ہے اور میں گر پڑتی ہوں، رُک جاتی ہوں، یا شاید ٹھٹک جاتی ہوں۔

میرے دوست اسے میری کمزوری، میری سستی، میری کمسنی کہتے ہیں۔ لیکن جب کبھی میں کوئی کام جلدی میں کرتی ہوں، کام خراب ہی ہوتا ہے۔ ہاتھ کٹ جاتا ہے، پیالہ ٹوٹ جاتا ہے، سیاہی اُلٹ جاتی ہے، گویا دل و دماغ مضطرب ہو جاتے ہیں۔

بے شک آج کے دورِ ترقی میں سبھی کو چلتے رہنے کی، سب سے آگے نکل جانے کی ہوس ہے۔ لیکن کیا راستے میں پل بھر بیٹھ جانا، پیڑ کے سائے میں ذرا دم لے لینا، رُک جانا تو نہیں ہے؟ یقیناً ٹھٹھکنے والا شخص تبھی تو آگے بڑھ سکتا ہے!

جو زندگی میں ہار گئے ہیں، پچھڑ گئے ہیں، وہ بیوقوف اور نادان سہی لیکن ان کی بھی کوئی کہانی ہے۔ اسے دوسرے لوگ شاید نہیں سمجھ سکتے۔ ٹھٹھکنے والا ہو سکتا ہے راستے میں سوندھی مٹی کی خوشبو سونگھنے رک گیا ہو۔ چڑیوں کے چہچہاٹ کے لیے مڑ گیا ہو۔ شاید کسی بڑھیا کو سڑک پار کرا رہا ہو۔ یا زندگی کے کسی پہلو پر غور کرنے بیٹھ گیا ہو۔ یا کہ وہ مجبور تھا، سینے میں کوئی درد تھا، کوئی آگ بھڑک رہی تھی؟

آج ہم لوگ جس رفتار سے لپکتے، دوڑتے بھاگے چلے جا رہے ہیں، گویا اتنی ہی جلدی ہماری زندگی ایک بوجھ، ایک اکتاہٹ میں بدلتی جا رہی ہے کسی کو نہ کوئی تہوار منانے کی فرصت ہے، نہ ہنسنے رونے کی۔ ہر دن ایک سا ہے کیلنڈر کا ہر سال ایک جیسا۔

دسہرے کے روز نہ راون کے جلنے مرنے کی خوشی ہوتی ہے، نہ دیوالی پر رام کے واپس آنے کی۔ ساون تو آیا ہے پر کسی کو جھولا جھولنا ہی نہیں۔ ملہار کون گائے؟

بس ہر چیز بے حد جلدی میں ہونا چاہیے۔ کھانا پریشر کوکر میں پکتا ہے، اور گیس پر۔ کپڑے اس صابن میں دُھلتے ہیں جو فوراً اثر کریں۔ چاہے آدمی اور بھی تنہا ہو جائے، اور ایک دوسرے سے بے زار بھی۔

نہیں نہیں!! مجھے تو انگیٹھی کا ہی دھواں پسند ہے۔ گھوڑے، تانگے کی ٹپ ٹپ، بیل گاڑیوں میں بجتے بیلوں کی گھنٹیاں من کو بھاتی ہیں۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی ہریالی پسند ہے

برہان حسین
ریجنل ریسرچ لیبارٹری، حیدرآباد

اینٹی بائیوٹکس

حقیقت ہے کہ ساری دنیا میں انسانوں کی عمروں کے اوسط میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ امریکہ میں ۱۸۴۰ء میں عمروں کا اوسط ۴۱ سال تھا جو ۱۹۵۴ء میں بڑھ کر ۷۱ سال ہو چکا تھا۔ اسی طرح ہندوستانیوں کی اوسط عمر ۲۳ سال سے بڑھ کر ۳۴ سال ہو چکی ہے۔ زچہ اور بچہ کی اموات اب محض حادثہ کی بات ہو چکی ہیں۔ لوئی پاسچر کی جراثیم کی دریافت نے جراثیم کش ادویات اور مانع امراض ٹیکہ کو جنم دیا۔ ۱۹۳۵ء میں حیرت انگیز ادویات (یعنی گندھک کی دوائیوں) اور عمل جراحی کی ترقی نے عمروں کے اوسط میں دس تا تیس سال کا اضافہ کیا۔

پچھلی صدی میں خلیہ کی دریافت نے جانوروں اور پودوں کے فرق کو ختم کر دیا۔ آج خلیہ، ماہر علم حیاتیات کے نزدیک دنیا کا پیچیدہ ترین کیمیائی کارخانہ ہے۔ جو تقریباً دو ہزار اقسام کے مختلف کیمیائی مرکبات تیار کرتا ہے۔ یہ مرکبات اس غذا سے تیار کیے جاتے ہیں جو جاندار استعمال کرتا ہے۔ غذا جاندار کے جسم میں بڑی سرعت کے ساتھ ہضم ہوتی ہے دراصل جاندار کے جسمانی خلیے ننھے ننھے مادے پیدا کرتے ہیں جو تماسی عامل (catalyst) کی طرح عمل کرتے ہیں اور غذائی سالمات کو جوڑ جوڑ کر سینکڑوں اقسام کے مرکبات تیار کر دیتے ہیں۔ ان تماسی عامل کو انزائم کہا جاتا ہے۔ جسم میں ہزاروں اقسام کے کیمیائی مرکبات کی تیاری اس بات کی علامت ہے کہ انزائم بھی ہزاروں اقسام کے ہوتے ہیں۔

ہزاروں سالوں سے انسان جڑی بوٹیوں، درختوں کی جڑوں، چھالوں اور معدنی نمکوں کا استعمال دواؤں کے طور پر کرتا آیا ہے۔ لیکن یہ سوال شاید کبھی انسانی دماغ میں نہیں آیا کہ آخر کسی خاص درخت کی چھال کے استعمال سے میعادی بخار یا ملیریا کیوں اتر جاتا ہے۔۔۔۔ لیکن آج اس کیوں کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ اسی کیوں کے جواب کی تلاش نے علم طب کو تجربہ خانوں میں پہنچا دیا اور دورِ جدید کے اطبا یا فزیشین کو دواؤں کی دریافت اور تیاری سے کوئی تعلق نہ رہا اور ان کو دواؤں کے عملی استعمال اور آزمائش ہی پر اپنی تمام تر توجہ صرف کرنی پڑتی ہے۔ اب دواؤں کی دریافت سائنسدانوں کا کام ہے جو خود اس دوا کو کبھی استعمال نہیں کرواتے۔

یہ جاننا ضروری ہے کہ دوا سے کس طرح شفا ہوتی ہے۔۔۔ پروٹین زندگی کے ابتدائی سالمات ہوتے ہیں۔ پروٹین اور انزائم، جرثومہ یا خورد بینی جراثیم جانداروں میں موجود ہوتے ہیں۔ جرثومہ پروٹین سے زندہ رہتا ہے۔ اگر جرثومہ کو پروٹین سے محروم کیا جا سکے تو جرثومہ کی ہلاکت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ دوا بیماری کے جرثومہ کو کارآمد سالموں کی بجائے ایسے سالمے مہیا کرتی ہے۔ جو شکل و جسامت میں کارآمد سالمات جیسے ہی ہوتے ہیں، لیکن جرثومہ کے لیے بیکار ہوتے ہیں۔ جرثومہ ان ناکارہ سالمات کو حاصل کر لیتا ہے اور برباد ہو جاتا ہے۔

جتنی بھی بیماریاں ہیں وہ جراثیم ہی سے پھیلتی ہیں۔ جراثیم کو بیکٹیریا مولڈس اور پروٹوزوا میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ بیکٹیریا اور مولڈس نباتی زندگی کی ابتدائی شکلیں ہیں۔ یہ تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ان سے پھوڑے پھنسیاں، زخموں کے سپٹک، نمونیا، ڈپتھیریا، دق اور ہیضہ پھیلتے ہیں۔ پروٹوزوا، حیوانی زندگی کی ابتدائی ترین شکل ہے جو ملیریا، امیبک پیچش اور سفلی امراض پھیلاتا ہے۔ وائرس، جانداروں اور بے جان اشیاء کے درمیان کی چیز ہوتی ہے جو فضا میں ایسی ہی بے جان ہوتی ہے جیسے کہ نمک کی کنکری، لیکن موزوں حالات کے ملتے ہی اس میں جان پڑ جاتی ہے۔ اس سے پولیو، گوبری، چیچک، انفلوئنزا، نزلہ زکام پھیلتے ہیں۔

خلیہ کی سطح پر پروٹین کے بڑے بڑے سالمات ہوتے ہیں پروٹین کے سالمات کی سطح پر مختلف شکل اور جسامت کے سوراخ ہوتے ہیں۔ اس سطح پر کروڑوں کی تعداد میں ہر جسامت و شکل کے سالمات کودتے، اچھلتے رہتے ہیں تاکہ موزوں سوراخ ملتے ہی اس پر جم جائیں۔ جب ان کو ایسی جگہیں مل جاتی ہیں تو یہ اس پروٹین کا ایک حصہ بن کر اس کی نشو و نما میں حصہ لینے لگتے ہیں۔ اب اگر کوئی پروٹین کسی مرض کے بیکٹیریا کا حصہ ہوتا ہے تو اس پر بھی یہ سالمے جم جاتے ہیں اور اس پروٹین کی نشو و نما میں حصہ لینا شروع کر دیتے ہیں۔ اب دوا استعمال کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم اس مرض کے پروٹین کا ایسے سالمے مہیا کرتے ہیں جو اس کی سطح پر کے سوراخوں میں جم تو جاتے ہیں لیکن اس کے لیے محض بیکار ہوتے ہیں اس طرح مرض کا (پروٹین ناکارہ ہو جاتا ہے اور) بیکٹیریا بھوکوں مر جاتا ہے۔ اسی لیے دوا سے انسان کے اپنے خلیوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

بیکٹیریا کا انحصار کیوں کہ انزائم پر ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو تباہ کرنے کے لیے محض انزائم سے اس کو محروم کر دینا کافی ہوتا ہے۔ اس

مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہم کو انزائم کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہونی چاہیے . . . . کہ ان کی کتنی ترتیبیں ہیں۔ ان کی خود کی بقا کا انحصار کن کن کیمیائی مرکبات پر ہوتا ہے۔ اس وقت ہم انزائم کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ خلیوں کی کثافت کے متعلق بھی ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ نہ ہی یہ علم ہے کہ خلیوں کو کن کن کیمیائی مرکبات کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا مستقبل میں دوا کو حسب ذیل باتوں کو ملحوظ رکھ کر بنانا پڑے گا :

۱۔ زیادہ سے زیادہ مخصوص دوا۔ زیادہ سے زیادہ مخصوص حالات کے لیے اور اس پیشگوئی کے ساتھ کہ اس کے مضر اثرات خلیوں کی کیمیائی ضرورتوں پر کیا ہونگے۔

۲۔ دوائیں امراض کے خلیوں پر اثر کریں لیکن جسم کے لیے ضروری خلیوں کو صحت مند حالت میں رکھیں۔

۳۔ اگر ہم ایسی دوائیں بنا سکیں جو صرف منتخبہ خلیوں کو ہلاک کر سکیں تو ہم یقیناً سرطان کا علاج کر سکیں گے تب ہم چند عضلات اور غدودوں کی زائد از ضرورت کارکردگی کو بھی روک سکیں گے جیسے تھیورائڈ غدود وغیرہ۔

دوائیں ایسے امراض کے لیے جو جراثیم کی وجہ سے نہیں ہوتے جیسے ضعیفی اور کمزوری اور عضلات میں انتشار۔ اور دوائیں جو جسم میں غیر ضروری مادوں کی تیاری کو روکیں جن کو سرجری کی بجائے استعمال کیا جا سکے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اینٹی بایوٹکس مندرجہ بالا شرائط کو پورا کرتی ہیں۔ ایک طویل عرصہ تک گندھک کے مرکبات (سلفا ڈرگس) اس ضرورت کو پورا کرتے رہے لیکن ان میں نباتی بیکٹیریا کو ہلاک کرنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مرکبات کی موجودگی کے باوجود کئی امراض کا علاج ناممکن ہی رہا۔

ایک اور دلچسپ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ عام لوگوں اور پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں میں بھی بیکٹیریا اور جرثومہ (مائکروب) کا تصور صرف یہی ہے کہ یہ انسانیت کے لیے تباہی اور بربادی کے پیش خیمہ ہیں حالانکہ حقیقت اس کے برخلاف نہیں تو بڑی حد تک مختلف ضرور ہے یہی دیکھیے کہ بیکٹیریا ہمارے لیے روٹی تیار کرتے ہیں۔ وٹامنس تیار کرتے ہیں۔ اور کئی امراض کے بیکٹیریا کے خلاف ہماری حفاظت پر کمربستہ رہتے ہیں۔ ہم سانس کے ذریعہ چھونے اور نگلنے سے ہر لمحہ بیکٹیریا کی کثیر تعداد اپنے جسم میں داخل کرتے رہتے ہیں۔ یہ بیکٹیریا ہمیں محض اس لیے نقصان نہیں پہنچا سکتے کہ ان کا مقابلہ ہر جگہ ان بیکٹیریا سے ہوتا جو کسی بیرونی جاندار کو اپنے وطن (جسم) میں برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ بیکٹیریا یا تو ان بیرونی مداخلت کاروں کو غذا سے محروم کر دیتے ہیں یا پھر ماحول کو خطرناک مرکبات سے پُر کرتے یا اینٹی بایوٹیکس پیدا کر کے ان کو ہلاک کر دیتے ہیں۔

۱۹۲۸ء کی ایک صبح انگریز ماہر حیاتیات (مسٹر) الگزنڈر فلیمنگ اپنے حجرہ میں بیکٹیریا کی فصلوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس نے ایک بیکٹیریا کی پیٹ ڈش پر ایک سنہری کائی جمی دیکھی جو شاید کسی ہوا کے جھونکے کی دین تھی۔ اور پھول پھل کر نمایاں دھبّہ کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اور یہ طب کے سنہری دور کی ابتدا تھی۔

فلیمنگ کے روشن دماغ نے یہ غور کیا کہ اس کائی کے اطراف کے علاقہ میں کسی بیکٹیریا کا وجود باقی نہ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اُس کائی سے کوئی زہریلا مادّہ خارج ہوا تھا جس نے اس زندگی کے آثار ہی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ صدیوں سے اس قسم کی کائی میووں پر، روٹی پر اور پنیر پر جمتی رہی ہے۔ لیکن انسان نے سوائے اس پر غم و غصہ کے اظہار کے اور پھینک دینے کے کچھ اور نہ سوچا۔ فلیمنگ پہلا انسان تھا جس نے اس کا استعمال سوچا اس نے اسے "پنسلین"، یعنی برش کا نام دیا جو اسی شکل سے مناسبت رکھتا ہے۔ فلیمنگ نے اس کائی کو بڑی مقدار میں اگایا اور اس کے رس کو نچوڑ کر بذریعہ انجکشن ان چوہوں میں داخل کیا جن کو "اسٹرپ ٹو کاکسی" کے جراثیم سے متاثر کیا گیا تھا۔ وہ چوہے صحت یاب ہو گئے۔ جون ۱۹۲۸ء کے برٹش جنرل آف اکسپری منٹل پتھالوجی میں فلیمنگ نے اپنا یہ کام شائع کیا۔ اس نے پرچہ میں کہا کہ پنسلین کو اینٹی سپٹک کے طور پر ایسے حصوں پر انجکشن کے ذریعہ دیا جا سکتا ہے جو کہ ایسے جراثیم سے متاثر ہوں جن پر پنسلین اثر کر سکتی ہے۔ فلیمنگ اور اس کے پرچہ کو کوئی داد نہ مل سکی۔ کیونکہ اس زمانہ میں جڑوں، چھالوں اور پتیوں کو اُبالنا اور اس سے علاج کرنا معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ اس طرح یہ دوا برسہا برس تک محض فلیمنگ کے کاغذات میں ہی پڑی رہ گئی۔

اس کے کئی سال بعد آکسفورڈ کے فلوری اور آرنسٹ چین نے پھر سے پنسلین کی فصلوں کو اگانا شروع کیا۔ ۱۹۴۱ء میں ایک ایسے نوجوان کو پنسلین دی گئی جس نے اپنا چہرہ شیونگ کے دوران زخمی کر لیا تھا جس سے سپٹک ہو گیا تھا وہ سرعت سے صحت یاب ہونے لگا لیکن اس وقت پنسلین کا اسٹاک ختم ہو گیا اور اس نوجوان کو بچایا نہ جا سکا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران ضرورت نے امریکہ اور برطانیہ کی دوائیں بنانے والی تمام کمپنیوں فائنزر، اسکوئب، لیڈرلے، مرک اور دوسری سولہ کمپنیوں کو پنسلین بنانے پر مجبور کر دیا۔ فلیمنگ، فلوری اور چین کو اس سلسلہ میں نوبل انعام بھی ملا۔

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ بیماریاں پھیلانے والے بیکٹیریا کو دو بڑی جماعتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ڈنمارک کے ماہر حیاتیات کرسچن گراہام نے معلوم کیا کہ بعض بیکٹیریا کو رنگا جا سکتا ہے اور بعض رنگ قبول نہیں کرتے چنانچہ ایسے بیکٹیریا جنھیں رنگا جا سکتا ہے "گراہم پازیٹو" اور دوسری قسم کو "گراہم نگیٹو" کہلاتے ہیں۔ پنسلیں گراہم پازیٹو بیکٹیریا کے لیے مفید ہے جبکہ

گراہم نگیٹو بیکٹیریا پر بے اثر ہوتی ہے۔ گراہم پازیٹو بیکٹیریا کے نتیجہ میں مہلک امراض جیسے نمونیا، ٹائیفائڈ، لال بخار، غددِ حلق کی بیماریاں ہوتے ہیں کان کی بیماریاں حادثہ کا سیپٹک، حلق کی خرابیاں، زچگی کا بخار اور زخموں کے سپٹک۔ گراہم نگیٹو میں صرف دو امراض پر پنسلین موثر ہے سوزاک اور جریان۔ ان دونوں امراض کے جرثومے حیوانی دنیا سے متعلق ہیں۔

پنسلین کے طریقہ عمل کے بارے میں نظریہ یہ ہے۔ ہر خلیہ کے مرکزہ میں پیچیدہ کیمیائی پروٹین ہوتے ہیں۔ جو مرکزہ کے ترشے (یا نیوکلی اِک ایسڈ) کہلاتے ہیں۔ یہی وہ اہم ترین اشیاء ہیں جن پر ہماری یا کسی بھی جاندار کی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ اس مرکزہ کو خود اس کی بقا کے لیے رائی بونیو کلی اِک ایسڈ (RNA) کی ضرورت ہوتی ہے۔ پنسلین کے خلیے بالکلیہ طور پر شکل اور جسامت میں اس ایسڈ کے خلیہ کے مماثل ہوتے ہیں۔ چنانچہ مرض کے جرثومہ کے خلیے اس ایسڈ کے دھوکہ میں پنسلین کو حاصل کر لیتے ہیں اور برباد ہو جاتے ہیں۔ دوسرا نظریہ ای۔ پی۔ گیل کا ہے کہ پنسلین جرثوموں کو گلوٹامک ترشہ کا راستہ بند کر دیتی ہے اور خلیے بھوکوں مر جاتے ہیں۔

فلیمنگ پہلی کامیاب اینٹی بایوٹک کا موجد ہے لیکن سب سے پہلی اینٹی بایوٹک راک فیلر انسٹیٹیوٹ کے ڈیوبوس نے بنائی تھی۔ اس نے اس کا نام "جرمنی سائڈ" رکھا تھا۔ گویہ گراہم نگیٹو اور پازیٹو دونوں قسم کے جراثیم پر موثر تھی لیکن یہ خون میں پہنچ کر مہلک ثابت ہوئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ڈیوبوس نے اپنا پرچہ پیش کیا تھا تو فلیمنگ سامعین میں موجود تھا۔ ویک من، نامی سائنسدان طویل عرصہ تک مٹی سے مختلف جرثوموں کو حاصل کر کے مطالعہ کر رہا تھا۔ ۱۹۱۵ء میں اس نے ایک گروپ "اسٹرپٹو مائسس گری سیس" رپورٹ کی تھی۔

۱۹۲۹ء میں ویک من کے شاگرد ڈیوبوس کی ٹائرو تھرسن کی دریافت نے ویک من کو پھر ایک مرتبہ مٹی سے جرثوموں کو حاصل کرنے اور ان کی فصلیں اگانے پر اکسایا۔ ویک من نے دنیا کے گوشہ گوشہ سے مٹی کے دس ہزار نمونے منگوائے۔ ان میں سے ہی دس ایسی فصلیں حاصل ہوئیں جن کو آگے مزید مطالعہ کے لیے چُنا گیا۔ ان ہی میں سے ایک "اسٹرپٹو تھری سن" تھی، جو بعد میں "اسٹرپٹو مائی سن" بنی — یہ ۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے۔ یہ پہلی دوا تھی جو گراہم نگیٹو اور پازیٹو دونوں اقسام کے جرثوموں پر موثر تھی۔ اس کا سب سے بڑا کمال دق کے سخت جان جراثیم کو ہلاک کرنے کی صلاحیت ہے اس کے علاوہ گردوں کا پس، متاثرہ پتّے، پلیگ اور ایک خاص قسم کے نمونیا اور انڈیولنٹ بخار پر بھی موثر ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ 'اسٹرپٹو مائی سن' قدرت کا انسانیت کو تحفہ ہے اور اس کو خاص موقعوں کے لیے اٹھا رکھنا چاہیے۔ جب کہ دوسری دوائیں کارگر ثابت نہ ہوں۔ ویسے بھی اس کے پیہم استعمال سے اس کی زود اثری متاثر ہو جاتی ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے دو ایسی وجوہات ہیں جو اس کے بے ضرورت استعمال پر پابندی عائد کئے ہوتے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ بذریعہ انجکشن دی جاتی ہے۔ دوسرے یہ کان کے اعصاب پر اثر کر کے سماعت کو متاثر کرتی ہے۔ اس سے غنودگی کے دورے بھی پڑ سکتے ہیں۔ اس قسم کی دواؤں کو "براڈ اسپکٹرم" بھی کہا جاتا ہے یعنی ان کا دائرۂ اثر وسیع ہوتا ہے۔

عام طور پر اینٹی بائیوٹکس نقصان دہ نہیں ہیں۔ لیکن کسی بھی چیز کا کثرتِ استعمال برا ہوتا ہے۔ مثلاً دودھ کی افادیت مسلمہ ہے لیکن کثرتِ استعمال سے جسم میں کیلشیم کے جمع ہو جانے کے خطرہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اسی طرح پانی، آکسیجن اور نمک ہیں۔ اینٹی بائیوٹکس گو بے ضرر ہیں لیکن ان کی توانائی کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ پنسلین کو بعض صورتوں میں طویل عرصہ تک مسلسل استعمال کیا جا سکتا ہے مگر اس سے جسم میں "مزاحمت" پیدا ہو سکتی ہے جس کا شدید ردّ عمل ہوتا ہے ویسے جلد کا پھٹنا اور تڑخنا بھی ممکن ہے۔ برا مائی سن، کلورو مائی سن اور آرو مائی سن غنودگی، ہاضمہ کی خرابی اور بھوک کو ختم کرنے کی ذمہ دار بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ان کو دودھ کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔ بعض اینٹی بائیوٹکس آنتوں میں موجود مفید بیکٹیریا کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات جسم کے سفید جسیمے برباد ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے جسم کی قوت مدافعت ختم ہو جاتی ہے اور کسی بھی مرض کا حملہ نہ صرف آسان ہو جاتا ہے بلکہ نہایت شدید بھی ہوتا ہے۔

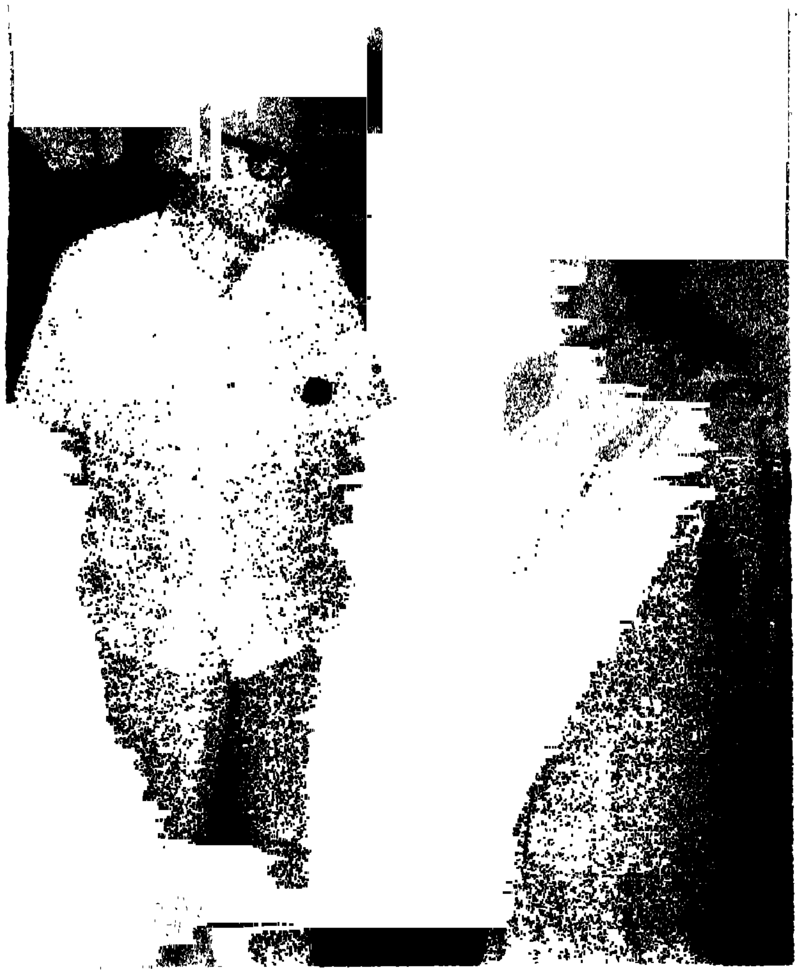
اینٹی بائیوٹکس کو ایک کورس کی شکل میں استعمال کیا جاتا ہے مثلاً اگر پنسلین کے دو انجکشن لگوانے سے مرض جاتا رہے تب بھی اس کا پورا کورس مکمل کرنا ضروری ہے۔ ورنہ جسم میں کورس سے کم پنسلین پہنچنے سے بیکٹیریا مزاحمت پیدا کر لیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی حادثہ، سپٹک یا شدید امراض کی صورت میں انسان پنسلین یا اینٹی بائیوٹکس جیسی نعمت سے مستفید نہیں ہو سکتا۔ اینٹی بائیوٹکس کا ایک اور استعمال یہ ہے کہ اس کے استعمال سے مرغیاں زیادہ اور جلد انڈے دینے لگتی ہیں۔ دودھ دینے والے جانور زیادہ دودھ دیتے ہیں اور جن جانوروں کا گوشت استعمال کیا جاتا ہے وہ خوب موٹے ہو جاتے ہیں

مختلف اینٹی بائیوٹکس ادویات بنانے کے لیے ۱۹۶۱ء میں انڈین ڈرگس اینڈ فارمیسٹیکل لمیٹڈ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کمپنی کے تین یونٹ رشی کیش، حیدرآباد اور مدراس میں ہیں۔ رشی کیش کا اینٹی بائیوٹکس پلانٹ دوسری دواؤں کے علاوہ پنسلین، سٹرپٹو مائیسین، ٹیٹرا سائیکلین، نسٹے ٹن تیار کرتا ہے۔ اس کارخانے نے ۷۵-۱۹۷۴ء میں ۱۴۴۵۵۳ ارب یونٹ دوائیں تیار کیں۔

ہندوستان اینٹی بائیوٹکس لمیٹڈ (پونے)، ۱۹۵۴ء میں قائم ہوا۔ ادریہ پنسلین، سٹرپٹو مائیسین، ہمی سن اور وٹامن سی کی بنیادی تیاری کا کام انجام دیتا ہے۔



۲ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو مرحوم وزیراعظم لال بہادر شاستری کا جنم دن منایا گیا۔ اس موقع پر صدر اور وزیراعظم نے وجے گھاٹ میں پودے لگائے



آنریبل مائیکل فوٹ لارڈ پریسیڈنٹ آف دی کانسل اور لیڈر ہاؤس آف کامنز ہندوستان کے سرکاری دورے پر تشریف لائے۔ ۲ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو آپ نے وزیراعظم ہند سے ملاقات کی۔

۔۔۔یر میں وزیراعظم
۔۔۔ر الگا رہی ہیں شریمتی
۔۔۔تا شاستری بھی پاس
۔۔۔ی ہیں۔

۔۔۔م یادگار انیس کمیٹی
۔۔۔ ار ستمبر ۱۹۷۶ء کو
۔۔۔لب اکیڈمی نئی دہلی
۔۔۔یں یوم حضرت علیؓ منایا۔
۔۔۔کی صدارت وزارت
اطلاعات ونشریات کے
۔۔۔ریٹری جناب سید
۔۔۔ر حسین برنی نے کی۔



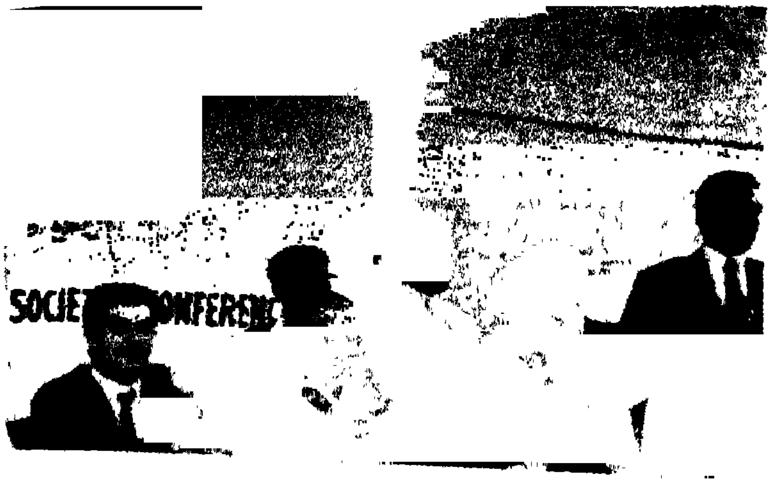
(دائیں سے بائیں)
خواجہ حسن ثانی نظامی
سید علی حسین جعفری
سید مظفر حسین برنی
اور مولانا سید
فیروز حیدر عابدی ۔۔۔



جنگلی جانوروں کا تحفظ ایک قومی فریضہ ہے۔ اس کام کی اہمیت اور افادیت کا احساس دلانے کے لیے یکم اکتوبر سے
سارے ملک میں جانوروں کے تحفظ کا ہفتہ منایا گیا۔ اس موقع پر محکمہ ڈاک وتار نے خوشنما رنگوں میں چار ٹکٹ
جاری کیے ہیں۔ یہ تصویر ان جانوروں کی ہے جو اب کمیاب ہوتے جا رہے ہیں۔

Vol. 35 No.4 AJKAL(MONTHLY) November 1976
Published by Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001.


آجکل





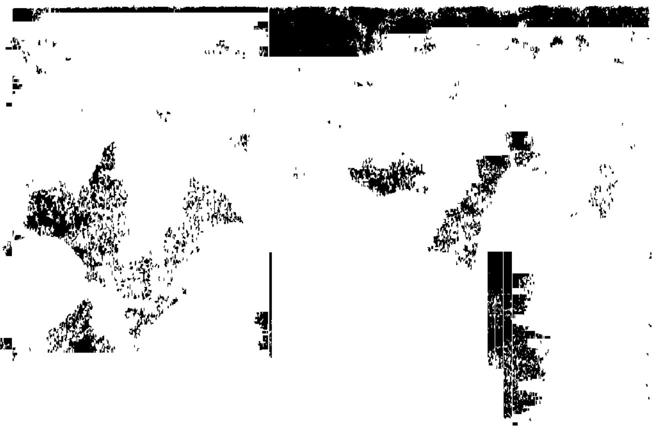
آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کی چھٹی کانفرنس - حیدرآباد

۳۰ اکتوبر - یکم نومبر ۱۹۷۶ء

۳۰ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو حیدرآباد میں چھٹی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے صدر جمہوریۂ ہند نے فرمایا: نبی کریم صلعم کو خدا کا جو پہلا حکم پہنچا وہ یہ تھا کہ پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے مخلوقات کو پیدا کیا اور جس نے ان چیزوں کی تعلیم دی جس کا انسان کو علم نہ تھا۔ ایک طرف اسلام میں تعلیم پر اتنا زور دیا گیا ہے اور دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ مسلمان تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے ہیں . . . . . جہالت اور پسماندگی کے اندھیروں میں بھٹکنے کی نہ تو اسلامی روایات اجازت دیتی ہیں اور نہ ہندوستانی روایات۔ ہندوستان کی قدیم روایات کے مطابق علم کو تمام امور پر فوقیت حاصل ہے۔

صدر نے فرمایا کہ دورِ جدید میں مسلمانوں نے جہالت اور پس ماندگی سے خود کو غیر ضروری طور پر وابستہ کر لیا ہے اس لئے تعلیمی انجمنوں اور عوام کو نئی راہیں تلاش کرنی چاہئیں تاکہ جہالت کا خاتمہ ہو سکے۔ یہ ایک قومی اہمیت کا پروگرام ہے جس کی ہر گوشے سے تائید ہونی چاہیے۔ مسلمانوں کی خوشحالی اور بہتر مستقبل اس عظیم ملک کی خوشحالی سے وابستہ ہے۔ اس ملک کے ملے جلے کلچر کے لیے مسلمانوں نے بہت کچھ کیا ہے۔ ان تمام عظیم روایات کے مستقبل سے خود ان کا عظیم مستقبل وابستہ ہے لہٰذا ان کا فرض ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور دوسروں کے دوش بدوش پوری قوم کی خوشحالی کے لیے کام کریں۔





اُردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہنامہ

آج کل نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد نمبر ۳۵ | شمارہ نمبر ۵

دسمبر ۱۹۷۶ء

اگرہائن پوش سمہ ۱۸۹۸

سالانہ	دس روپیہ	۳ ڈالر	۱٫۵۰ پاؤنڈ
دوسالہ	۱۷ روپیہ	۵ ڈالر	۲٫۵۵ پاؤنڈ
سہ سالہ	۲۴ روپیہ	۷ ڈالر	۳٫۶۰ پاؤنڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	۳۰ سینٹ	۱۵ پنی

ترتیب

سرورق عمل : بلرام منڈل

ٹیلیفون نمبر :- ۳۸۷۰۶۹

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آج کل اردو پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ملاحظات

سودمند اور کامیاب دورہ

وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی کا تین افریقی ممالک کا حالیہ دورہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ زمبیا، تنزانیہ اور مارشیس گئیں اور وہاں کے رہنماؤں سے تبادلۂ خیال کیا۔ آج کل روڈیشیا اور جنوبی افریقہ کے عوام آزادی اور جمہوریت کے لیے اپنی جدوجہد کے جس دور سے گزر رہے ہیں اسے دیکھتے ہوئے تنزانیہ، زمبیا اور مارشیس کے رول کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ مارشیس کے وزیر اعظم افریقی اتحاد کے ادارے کے صدر بھی ہیں اور زمبیا و تنزانیہ کے صدر جنوبی افریقہ کے معاملات میں جو اہمیت رکھتے ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں۔ علاوہ ازیں لوساکا میں آپ نے ان رہنماؤں سے بھی ملاقات کی جو آزادی کی لڑائی میں مصروف ہیں۔ ہندوستان نے ہر قدم پر افریقی عوام کی جدوجہدِ آزادی میں ان کا ساتھ دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے خلاف سب سے پہلے مہاتما گاندھی نے ہی آواز اٹھائی تھی۔ اس وقت جب کہ روڈیشیا اور جنوبی افریقہ کی گوری حکومتوں کے نسلی امتیاز کا دور ختم ہونے کو ہے شریمتی گاندھی کا جدوجہد کرنے والے رہنماؤں سے تبادلۂ خیال کرنا بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ سرکاری سطح پر بھی افریقہ کے ان تینوں ملکوں سے ہندوستان کے بہت گہرے اور دوستانہ تعلقات ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں بھی پردھان منتری زمبیا اور مارشیس کا دورہ کر چکی ہیں۔

مارشیس

مارشیس کے ساتھ بھارت کے قدیمی روابط ہیں اور گزشتہ چند برسوں کے دوران میں دونوں ملکوں کے درمیان تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا ہے ۷۰-۱۹۶۹ء میں بھارت نے مارشیس کو ۱۱۲ لاکھ روپے کی مالیت کی مختلف قسم کی اشیا برآمد کی تھیں اور اس کے مقابلے میں ۷۶-۱۹۷۵ء میں مارشیس کو ہمارے ملک نے ۶۰۲۷۴۳ لاکھ روپے کا مال برآمد کیا۔

مارشیس انجنیرنگ کی مصنوعات، کپڑے، سیمنٹ، کیمیادی کھاد اور



وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو مارشیس کے دورے کے دوران مارشیس یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی گئی۔ تصویر میں وزیر اعظم، مارشیس کے وزیر اعظم سر رام غلام کے ساتھ کانووکیشن میں شرکت کے لیے جا رہی ہیں۔

چمڑے سے متعلق صنعتیں قائم کرکے اپنی معیشت کو متنوع بنانے کا خواہشمند ہے۔ اس لیے بھارت اس ملک میں مشترکہ کارخانے قائم کرکے دونوں ملکوں کے درمیان تجارت کو مزید وسعت اور ترقی دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ گزشتہ چھ برسوں میں بھارت نے مارشیس میں ۱۲ مشترکہ کارخانوں کے قیام کے پراجیکٹ منظور کیے ہیں۔

تکنیکی اور اقتصادی تعاون کے بھارتی پروگرام کے تحت ہمارا ملک مارشیس کو مختلف شعبوں میں ترقیات کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے متعدد ماہرین کی خدمات فراہم کر رہا ہے۔ بھارت نے مارشیس کو ہندی، اردو اور مراٹھی کے اساتذہ مہیا کیے ہیں نیز وہاں کے اسکولوں کے لیے لیبارٹری اور لائبریری سے متعلق ساز و سامان فراہم کیا ہے۔

۲۲ اپریل ۱۹۷۶ء کو بھارت اور مارشیس کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے مطابق بھارت نے مارشیس میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو فروغ دینے کے لیے امداد دینے پر رضامندی ظاہر کی ہے۔

تنزانیہ

ہندوستان اور تنزانیہ کے تعلقات انتہائی خوشگوار ہیں۔ دونوں ملکوں میں گہرے تجارتی روابط بھی قائم ہیں۔ ہندوستان سوتی اور ریشمی کپڑے، لوہا، فولاد، پٹ سن اور دھات کی مصنوعات، بجلی نیز ٹرانسپورٹ سے متعلق سامان بھیجتا ہے اور کاجو، لونگ، موتی، قیمتی پتھر، تانبہ اور کوکو درآمد کرتا ہے۔ اس کے علاوہ تکنیکی سطح پر بہت سے منصوبوں کے لیے ہندوستان امداد فراہم کر رہا ہے کان کنی، پٹرولیم کی کھوج اور قدرتی گیس کی تلاش میں ہندوستانی ماہرین مدد کر رہے ہیں۔ ریل کے انجن اور ڈبے بھی ہندوستان سے جائیں گے اور وہاں ریلوں کو بہتر بنانے اور عملے کی تربیت دینے کے اقدام بھی کیے گئے ہیں۔ ہندوستان

کا ایک سائیکل ساز کارخانہ دارالسلام میں کارخانہ قائم کرے گا جس میں سالانہ ڈیڑھ لاکھ سائیکلیں تیار ہوں گی۔ زرعی آلات تیار کرنے والے ایک کارخانے کے قیام پر بھی غور ہو رہا ہے۔ حکومتِ ہند نے تنزانیہ کو چینی کا کارخانہ قائم کرنے کے لیے پانچ کروڑ روپے قرض دینے کا وعدہ کیا ہے۔ ہندوستان کا صنعتی ترقیاتی بنک بھی اس مقصد کے لیے مزید ۵ کروڑ قرض فراہم کرے گا

روڑکی کی انجینئرنگ یونی ورسٹی میں تنزانیہ کے ۱۳۲ طلبا زیرِ تعلیم ہیں۔ تنزانیہ کے ریلوے عملے کے ۵۰ نمائندوں کو تربیتی سہولتیں پہلے ہی فراہم کی جا چکی ہیں۔

اس وقت تنزانیہ میں ۶۰۰ بھارتی ماہرین خدمات انجام دے رہے ہیں یہ زیادہ تر اکاؤنٹنٹ، انجینیر، ڈاکٹر، آرکیٹکٹ اور ماہرین شماریات ہیں۔ بھارت اور تنزانیہ کے درمیان اشتراکِ عمل سے متعلق کمیشن کے قیام سے دونوں ملکوں کے مابین تکنیکی سائنسی اور اقتصادی تعلّقات نے مزید استحکام حاصل کیا ہے۔

زمبیا

دونوں ملکوں میں گہرے دوستانہ مراسم ہیں۔ لہٰذا جب وزیرِ اعظم ہند سہ روزہ دورے پر لوساکا پہنچیں تو مارشس اور تنزانیہ کی طرح یہاں بھی ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ صدر کینتھ کونڈا نے خوش آمدید کہا اور ہوائی اڈے سے قیام گاہ تک کے ۲۹ کلومیٹر کے فاصلے پر راستے کے دونوں طرف ہزاروں



۱۴ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو زمبیا کے صدر ڈاکٹر کینتھ کونڈا وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا لوساکا ہوائی اڈے پر خیر مقدم کر رہے ہیں۔

افراد نے پرتپاک سواگت کیا۔

دورانِ قیام میں وزیرِ اعظم نے افریقہ کی موجودہ صورتِ حال کے علاوہ عالمی دلچسپی کے مسائل پر گفتگو کی اور افریقیوں کو یقین دلایا کہ ہندوستان ہمیشہ ان کی خواہشوں اور امنگوں کی تکمیل کے لیے کوشاں رہا ہے اور رہے گا

گیان پیٹھ انعام

تمل کے ممتاز ناول نویس اکلا ناڈن کو ان کے سماجی ناول چترا پوائی پر ۱۹۷۵ء کے لیے گیان پیٹھ انعام عطا کیا گیا ہے۔ یہ انعام ایک لاکھ روپے کا ہے

ناول چترا پوائی میں حصولِ آزادی کے پہلے دہے کے تمل ناڈو کے سماجی حالات کی بڑی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔

اکلا ناڈن جو اکلن کے نام سے مشہور ہیں، لگ بھگ چالیس کتابوں کے مصنّف ہیں۔ انھوں نے کہانیاں، ناول، اور ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کی کچھ تصانیف کا غیر ملکی زبانوں مثلاً روسی اور جرمن میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کے دو ناولوں پر فلم بھی بن چکی ہے۔



تمل کے ممتاز ناول نویس شری اکلا ناڈن جنھیں ایک لاکھ روپے کا گیان پیٹھ انعام دیا گیا ہے

اکلن نے زمانۂ طالب علمی میں جنگِ آزادی میں حصّہ لیا تھا انھوں نے ہندوستان چھوڑو تحریک کے دوران طلبا کو منظم کیا اور گرفتار ہوئے ۵۷ - ۱۹۴۵ء کے دوران وہ ریلوے میل سروس میں سارٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان دنوں وہ آل انڈیا ریڈیو میں پروڈیوسر ہیں۔ تمل اکاڈمی ایوارڈ کے علاوہ ۱۹۶۴ء میں ان کے تاریخی ناول وینگاین میڈان پر انھیں ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

وزیرِ اعظم کے ارشادات

گزشتہ دنوں میں وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے بعض نہایت اہم قومی معاملات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ذیل میں چند اقتباسات درج کیے گئے ہیں۔

قیمتیں بڑھنے نہ پائیں

سان فرانسسکو کے اخبار "دی سن رپورٹر" کے نمائندے سے

بات چیت کرتے ہوئے آپ نے قیمتوں سے متعلق کہا :

سوال : جب آپ نے ۲۰ نکاتی اقتصادی پروگرام پر عمل درآمد شروع کیا تو ایک خاص مقصد یہ تھا کہ قیمتوں میں کمی کی جائے لیکن اس کے ساتھ ہی آپ نے فرمایا کہ ہمارا نظام ایسا ہے کہ ہم براہ راست ہر چیز پر کنٹرول نہیں کر سکتے۔ پیداوار کے بہت سے شعبے نجی ہاتھوں میں ہیں اور پھر منڈیوں کے رجحانات بھی اپنا اثر دکھاتے ہیں۔

وزیراعظم : یہ سچ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ضروری اشیا کی قیمتوں پر خاص دھیان دے رہے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی ہم سمجھتے ہیں کہ جان بوجھ کر ایسا کیا گیا ہے زیادہ تر کوشش یہی ہے کہ قیمتیں بڑھنے نہ پائیں۔

دستور میں ترمیم کا مقصد عوام کی بھلائی

سوال : بھارت میں ایک بحث چل رہی ہے جو آئین میں تبدیلیوں سے متعلق ہے۔ سرکار نے مختلف سیاسی پارٹیوں سے اس موضوع پر مشورے کیے ہیں۔ آپ کی رائے میں ان ترامیم میں کس بات پر زور دیا گیا ہے ؟

وزیراعظم : اصل زور کارکردگی کو بہتر بنانے پر ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں عدلیہ اور انتظامیہ الگ الگ ہیں۔ لیکن ہو یہ رہا تھا کہ عدالتیں جس طرح قانون کا مطلب لے رہی تھیں اسسے سرکار کی کارکردگی میں رکاوٹ پڑ رہی تھی اور پھر بھارت میں رٹ پٹیشنوں کا مسئلہ آگیا تھا۔ بنگال میں ایک وقت میں جب کہ وہاں خوراک کی کمی تھی اور مختلف علاقوں میں غذائی اجناس کو بھیجنا ضروری ہو گیا تھا اس وقت وہاں نو ہزار رٹ پٹیشنیں داخل تھیں اور ہم لیوی کا چاول حاصل نہیں کر سکے۔ اس کے نتیجے میں مارکیٹ میں قیمتیں چڑھ گئیں۔ کہیں کہیں جو آپ چاہتے وہ کسی قیمت پر نہیں ہو سکتا تھا۔ فرض کیجیے کہ ایک نااہل یا رشوت لینے والے افسر کو بدلنا ہے یا ہٹانا ہے لیکن وہ حکم امتناعی حاصل کر لیتا تھا اور احکامات کی تعمیل نہیں ہو پاتی تھی۔ اس طرح کی باتیں اور رکاوٹیں تھیں جن پر ہمارے آئین سازوں نے بالکل غور نہیں کیا تھا۔ یہ محض وضاحتوں اور تشریح سے تعلق رکھتا ہے اس خامی کو دور کرنا ضروری تھا اور یہ دیکھنا ضروری تھا کہ سماجی قانون کی راہ میں جو کہ ملک کے وسیع تر مفاد میں ہے کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو سکے۔

سوال : بنیادی حقوق کے باب اور ریاستی پالیسی کے رہنمایانہ اصولوں کے درمیان کیا کوئی گمشدہ کڑی ہے ؟

وزیراعظم : درحقیقت اس طرح کی کوئی کڑی گمشدہ نہیں ہے بنیادی طور پر سوال املاک کے بارے میں ہے۔ ہم املاک کے مخالف نہیں ہیں کیونکہ ایک چھوٹی سی چراگاہ، ایک چھوٹی سی جھونپڑی بھی املاک کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم سماج کے کمزور طبقوں کو یا متوسط طبقے کو ان کی املاک سے محروم کرنا نہیں چاہتے لیکن ہم سوچتے ہیں کہ ان کا ضرورت سے بہت زیادہ املاک رکھنے کا طریقہ رک جانا چاہیے اور یہ کام ہم ٹیکسوں اور چند دیگر اقدامات کے ذریعے انجام دے رہے ہیں۔

سوال : اس کے ساتھ ہی آپ کو ٹیکسوں کی چوری اور کالے دھن کے مسائل پیش تھے۔

وزیراعظم : جی ہاں۔ لیکن پچھلے سال ہم نے پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ ٹیکس وصول کیا۔ اس طرح بہت سا کالا دھن برآمد کیا گیا۔

سوال : اور اسمگلنگ کے بھی مسائل پیش تھے۔

وزیراعظم : اسمگلنگ پر بھی روک لگا دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں بھی بہت سے مسائل درپیش ہیں۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ہم ان معاملات کو عدالتوں میں کیوں نہیں لے گئے۔ لیکن اس حال میں جب کہ دہشت پسندی چل رہی تھی۔ کوئی بھی شخص گواہی دینے کو تیار نہ تھا۔ کسی کو قتل ہوئے سینکڑوں لوگوں نے دیکھا لیکن کوئی بھی شخص بڑھ کر یہ کہنے کو تیار نہ ہوا کہ میں نے ایسا ہوتے ہوئے دیکھا۔ اگرچہ نجی محفلوں میں انھوں نے کہا کہ میں نے ایسا ایسا دیکھا۔ یہی بات اسمگلنگ کے معاملے میں تھی۔ اسمگلر اس قدر طاقتور ہو گئے تھے کہ وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے انصاف کو چلنے نہیں دے رہے تھے۔ معمولی شخص کو پکڑا جا سکتا تھا لیکن اصل مجرم ہاتھ نہیں آتا تھا۔

ان ترامیم کا مقصد پارلیمنٹ کے اقدار کو مستحکم بنانا ہے اور ایسی رکاوٹوں کو دور کرنا ہے جو قانون کو مؤثر بنانے کی راہ میں حائل ہیں۔

اقلیتوں پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت

۲۳ر اکتوبر کو نئی دہلی میں آل انڈیا اینگلو انڈین ایسوسی ایشن کی صد سالہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کہا کہ حکومت اقلیتوں کی بھلائی کی خواہاں ہے اور ان پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہماری تعلیمی اور نوکریوں سے متعلق پالیسی نے بہت سی ذاتوں اور قبیلوں کی مشکلات کو ختم کرنے میں بہت مدد کی ہے اور قدیم زمانے سے چلی آرہی ناانصافیوں کو ختم کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ جو لوگ خوب شور و غل مچاتے ہیں ان کی بجائے ہم ان لوگوں کی مدد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو واقعی ضرورت مند ہیں۔ آپ نے کہا : ہم ایک ایسے ہندوستان کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں جن میں پرانے تعصبات، توہمات اور معذوریوں کا عمل دخل نہ ہو اور جہاں سب بالکل برابر ہوں اور جس کی بنیاد ایک دوسرے کے لیے رواداری اور احترام پر ہو۔ آپ نے زور دیا کہ سب کو یکساں مواقع ملنا چاہییں۔ آپ نے کہا کہ اقلیتی فرقے نے قوم کی قسمت بنانے میں نہایت اہم حصہ لیا ہے اور اینگلو انڈین طبقے نے ہندوستان کی ترقی میں ہاتھ بٹایا ہے۔

آپ نے کہا کہ ہندوستان ایک ایسا کپڑا ہے جس میں طرح طرح کے دھاگے اور رنگ شامل ہیں جو اس کو خوبصورت اور خوش رنگ بناتے ہیں۔ یہ کوئی پگھلانے

والا برتن نہیں ہے جس میں تمام اجزا پگھل کر ایک ہو جاتے ہیں اور اپنی انفرادیت اور شناخت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے ہندوستان میں مختلف نسلی، مذہبی اور لسانی طبقات میں بنیادی طور سے ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

آپ نے کہا کہ اب قومی زندگی میں متحارب اور متصادم رویہ ترک کر دینے اور مل جل کر کام کرنے اور تعمیر کرنے کا طریقہ سیکھنے کی ضرورت ہے۔

بابا گورو نانک کی ۵۰۷ ویں جینتی

۶ نومبر ۱۹۷۶ء کو ملک بھر میں گورو نانک دیو کا یوم ولادت بڑی شان و شوکت سے منایا گیا۔ اس موقع پر دہلی میں منعقد تقریب میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے بھی شرکت کی اور قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار کو خراج عقیدت پیش کیا۔



وزیر اعظم گورو نانک جی کے یوم ولادت کے موقع پر گرو گرنتھ صاحب پر پھول چڑھا رہی ہیں

وزیر اعظم نے فرمایا کہ بھارت بہت سے ایسے سنتوں، صوفیوں اور مہاتماؤں کی سرزمین ہے جن کا پیغام دنیا کے کونے کونے میں پہنچا ہے۔ گورو نانک دیو جی کی تعلیمات پر زور دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ انسانیت کو بہت سے مسائل کا سامنا اس لیے کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ بہت سے لوگ اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتے ہیں۔ اور وہ دنیا کو ایک تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن صدیوں پہلے گورو نانک دیو نے ان مسائل کو حل کرنے کے لیے راستہ دکھایا تھا۔ انھوں نے بتایا تھا کہ انسانوں میں مساوات قائم کی جا سکتی ہے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ہم گورو نانک دیو جی کی تعلیمات کو یاد رکھیں اور انھوں نے جو سکھایا اس پر عمل درآمد کریں۔ گورو جی کے آدرشوں نے ملک کے وقار کو بلند کیا اور اگر ان آدرشوں کی پیروی کی جائے تو ملک کا وقار بڑھے گا۔

حیات اللہ انصاری ترقی اردو بورڈ کے نئے چیرمین

اردو کے مشہور افسانہ نگار، ناول نویس اور صحافی جناب حیات اللہ انصاری کو ترقی اردو بورڈ وزارت تعلیم حکومت ہند کا چیرمین مقرر کیا گیا ہے۔



چیرمین ہونے کے ساتھ ساتھ آپ اُردو کے معاملوں میں حکومت ہند کے مشیر بھی ہوں گے۔ ہم حکومت ہند کے اس مستحسن فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ انصاری صاحب کے تقرر سے ترقی اردو بورڈ مزید ترقی کرے گا

ادارۂ اقوام متحدہ کے ۳۱ سال

دنیا میں امن قائم کرنے، برادرانہ جذبات کو فروغ دینے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لیے ۳۱ سال پہلے ادارۂ اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس وقت اس ادارے کے صرف ۵۱ ممبر تھے۔ اب ان کی تعداد ۱۴۶ ہے۔

ہندوستان شروع ہی سے اس ادارے کا ممبر ہے اور اس دوران انھوں نے قیام امن کی مختلف کوششوں سے بھرپور تعاون کیا ہے۔ نسلی امتیاز اور جنگ و خونریزی کی مذمت کی ہے۔ قیام امن کے لیے اپنی فوجیں بھیجی ہیں اور اس بات کی بڑے خلوص سے کوششیں کی ہیں کہ ایک ایسی دنیا قائم ہو جس میں سب برابر ہوں۔ امیری اور غریبی کا فرق مٹے، کوئی کسی کا استحصال نہ کرے اور سب مل جل کر ایک خوشگوار اور بہتر دنیا کی تعمیر میں جٹ جائیں۔

گزشتہ تیس برسوں میں اس ادارے نے بہت سے کارنمایاں انجام دیے ہیں۔ ضرورت ہے کہ دنیا کے تمام ممالک اور خصوصاً بڑے ممالک اس ادارے کو موثر اور کامیاب بنانے میں پورا پورا تعاون دیں۔

ضبط تولید اور اسلام

برتھ کنٹرول کے معاملے میں شرع مداخلت نہیں کرتی

آج سے چالیس سال پہلے مولانا آزاد نے ضبطِ تولید کے مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کیا تھا جو رسالہ الحکیم لاہور کی نومبر ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ ذیل میں اس کا ایک اقتباس درج ہے :

"بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ برتھ کنٹرول کے معاملے میں شرع مداخلت کرے۔ یہ ایک خالص طبی اور اجتماعی مسئلہ ہے۔ اگر اصحابِ علم محسوس کریں کہ سوسائٹی کے مصالح کے تحفظ کے لیے اس کی ضرورت ہے تو ضرور اس کے حق میں رائے دے سکتے ہیں۔ اس طرح کی تمام باتوں کو مصالح مُرسلہ میں سمجھنا چاہیے اور ان کا دروازہ پوری طرح باز ہے۔ مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے صرف یہ بات کہی گئی ہے کہ اگر برتھ کنٹرول کے طریقے عام ہو گئے تو غیر شادی شدہ عورتوں کو جو اندیشہ ہوتا ہے وہ جاتا رہے گا۔ لیکن یہ اعتراض چنداں وقیع نہیں معلوم ہوتا محض اس اندیشے کی دیوار پر اخلاقی روک قائم نہیں رہ سکتی۔ بلاشبہہ ضبطِ نفس اصل آئیڈیل ہے لیکن معلوم ہے کہ وہ عملاً چل نہیں سکتی۔ کم از کم اس وقت تک کا انسانی تجربہ یہی ہے۔ ایسی حالت میں جو لوگ طبی، خاندانی، اجتماعی اور اقتصادی مقتضیات پر زور دیتے ہیں یقیناً ان کے دلائل کی قوت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

عزل کے متعلق دونوں طرح کی روایتیں موجود ہیں۔ اور تطبیق کی صورت یہی نکالی گئی ہے کہ اصل جواز ہے بشرطیکہ کوئی ایک فریق ہی نہیں بلکہ فریقین رضامند ہیں"

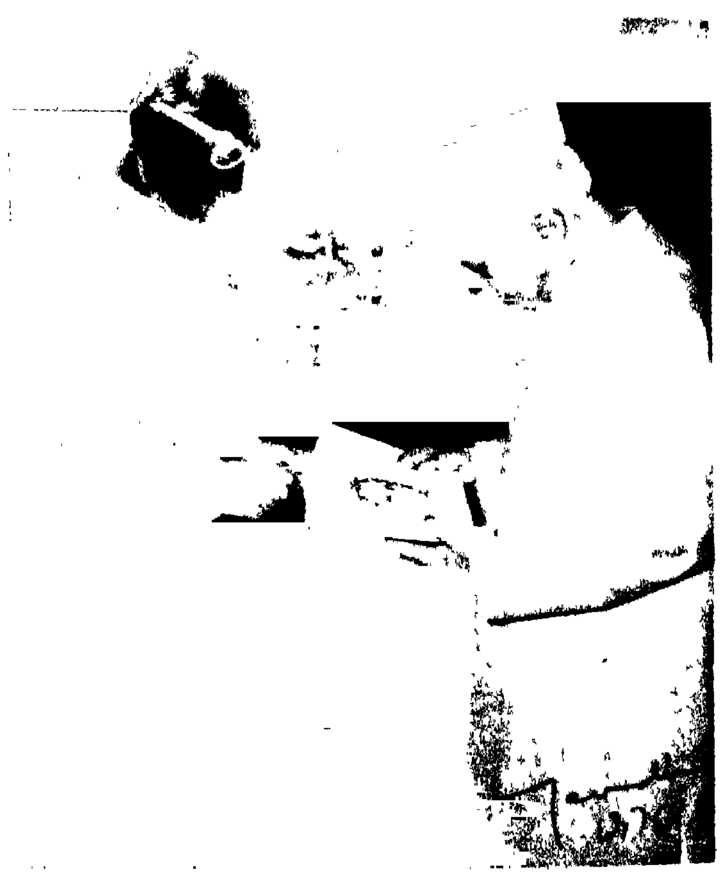
آج کل نئی دہلی

یہ مسئلہ شرعی گنجائشوں سے خالی نہیں

دارالعلوم، دیوبند کے مہتمم اعلیٰ حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے آل انڈیا ریڈیو کے نمائندے جناب مصطفےٰ علی اکبر سے بات چیت کرتے ہوئے فیملی پلاننگ کے بارے میں حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے :

آج فیملی پلاننگ کو گورنمنٹ نے ملک کے معاشی اور اقتصادی مصالح کے عنوان پر بطور قومی پالیسی اپنا رکھا ہے۔ گزشتہ دور میں یہ مسئلہ روشن نہ ہونے کی وجہ سے مسئلہ کا منفی پہلو ہی سامنے رکھا جاتا رہا ہے جو عام مسلمانوں کے ذہن میں نقش ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اسلام کی ہمہ جہتی تعلیمات سے مسئلہ کے دوسرے پہلو بھی خالی نہ تھے جن پر سلف صالحین اور علمائے صادقین نے انسانی معاشرت کے نقطۂ نظر سے کلام بھی فرمایا ہے۔ یہ مسئلہ منصوص نہیں بلکہ اجتہادی ہے اس لیے قدرتی طور پر اربابِ نظر علما مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کی طرف متوجہ رہے جو بذاتِ خود اس کی تفسیر ہے کہ شرعی گنجائشوں سے یہ مسئلہ خالی نہیں۔ بحالاتِ موجودہ حضرات علمائے کرام سے بطورِ خاص میری درخواست ہوگی کہ وہ آج کی تباہ کُن مشکلات میں سابق علما کی طرح مسئلہ کے مثبت پہلو کی طرف بھی توجہ فرمائیں۔ اگر ان خطرناک حالات میں بھی مسئلہ کے دونوں رخوں کو سامنے لا کر اس کی لچک سے فائدہ نہ اٹھایا گیا اور قوم کو اس کشمکش سے نہ نکالا گیا تو پھر ان گنجائشوں سے فائدہ اٹھانے کا آخر اور کونسا وقت ہوگا؟ تقاضائے وقت اور حالات کے پیشِ نظر احقر نے دارالعلوم کے حضرات مفتیان کرام سے بھی درخواست کی ہے کہ وہ اس مسئلہ کی مثبت جزئیات جمع کر کے اس پر غور فرمائیں۔"

ایک یادگار تصویر



مرحوم وزیراعظم شری جواہر لال نہرو جناب سکندر علی وجد کا مجموعۂ کلام "اوراقِ مصوّر" ملاحظہ کرتے ہوئے۔ اس کتاب کی رسم اجرا ان کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔
اس تصویر پر وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کے دستخط ہیں۔

سکندر علی وجد
۵۵ ۔ ساؤتھ ایونیو، نئی دہلی

غزل

حسیں یادوں سے خلوت انجمن ہے
خموشی نغمہ زارِ صد سخن ہے

نگارِ گلبدن، گل پیرہن ہے
دھنک رقصاں چمن اندر چمن ہے

ہوا میں کیف صہبائے کہن ہے
فضا آئینہ دارِ فکر و فن ہے

یہی شہری غزالوں کا وطن ہے
نیستانِ غزل، ارضِ دکن ہے

بنے ہیں آج دل کے داغ شعلے
بہت مانوس بوئے یاسمن ہے

مری دیوانگی پر ہنسنے والو
یہاں فرزانگی دیوانہ پن ہے

مبارک رہروِ راہِ تمنا
وطن غربت میں ہے غربت وطن ہے

ڈرا سکتے نہیں خونیں اندھیرے
نگاہِ بے دلاں ظلمت شکن ہے

خوشی ارزاں ہے بازارِ جہاں میں
بہائے غم، متاعِ جان و تن ہے

ازل سے وجدؔ ہر قطرے کے دل میں
قیامت خیز طوفاں موجزن ہے

حسن ثانی نظامی
بستی نظام الدین اولیاء، نئی دہلی

حضرت خواجہ حسن نظامی کی ادبی زندگی

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ایک خط میں خواجہ صاحب سے شکایت کی ہے کہ اصرار کے باوجود خواجہ صاحب نے ان کے ہاں قیام کیوں نہیں کیا۔ اور پھر یہ لکھا ہے کہ "عقیدت کیشوں کی معیت میں میری بے تکلفیاں شاید آپ کو خوف دلاتی ہوں گی۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو برتاؤ ہم اپنے کسی دوست سے میخانے کی چھت پر کرتے ہوں۔ اسی کو سجادے پر بھی روا رکھا جائے۔ میں خود قبائے رندی و گلیم درویشی کو ایک ساتھ اوڑھنے پہننے کا مجرم ہوں!

جن لوگوں نے حضرت خواجہ حسن نظامی کو قریب سے دیکھا ہے وہ گواہی دیں گے کہ خواجہ صاحب کے بارے میں مولانا کا اندیشہ درست نہیں تھا۔ سجادہ ہو یا میخانے کی چھت یا اخبار اور کتاب کے صفحات خواجہ حسن نظامی سب جگہ ایک ہی نظر آتے تھے۔ ان کی سادہ، آسان اور دل نشین زبان، اچھوتا اسلوب، سوز و گداز کی کیفیات صرف تحریر و تقریر تک محدود نہ تھیں بلکہ ان کی ذاتی اور نجی زندگی بھی انھی خصوصیات کی آئینہ دار تھی۔

بیسویں صدی کی ابتدا سے لے کر جب کہ خواجہ صاحب نے ادبی میدان میں قدم رکھا۔ ۱۹۵۵ء کی عید تک جب کہ انھوں نے ملا واحدی دہلوی کو" دل کے دیس میں بسنے والے پردیسی واحدی" کے القاب سے اپنی زندگی کا آخری ادبی خط لکھوایا۔ تقریباً نصف صدی تک خواجہ صاحب مسلسل لکھتے رہے۔ اور اتنا لکھا کہ اردو میں شاید ہی کسی ایک آدمی نے اتنا لکھا ہو۔ اس پورے دور میں خواجہ صاحب کی زندگی نے مختلف اتار چڑھاؤ دیکھے۔ اور اس اتار چڑھاؤ کا اثر ان کی تحریر میں نمایاں ہوتا رہا۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء تک کی تحریروں میں سوز و گداز اور جذبے کی جو شدت پائی جاتی ہے اور آفاقیت کا جو احساس طاری ہے وہ خواجہ صاحب کی خانگی زندگی کا ایک پرتو بھی ہے اور ابتدائے عمر کی ان شاقّ ریاضتوں کا ثمرہ بھی جن کی خاطر خواجہ صاحب نے برسوں فقیروں و سادھوؤں کے لباس میں پیدل ہندوستان کا کونا کونا جھانکا۔ یہاں تک کہ ویدانت کے شوق میں انھوں نے



حضرت خواجہ حسن نظامی

ہندوؤں کے تیرتھ استھان بھی نہیں چھوڑے اور اس کے انعام میں ڈیڑھ سو مولویوں کے دستخطوں سے کفر کی سند پائی۔

اس سیاحت کے بعد انھوں نے متاہلانہ زندگی کی شروعات اس طرح کی کہ مضمون نویسی کی قلیل آمدنی کے سہارے درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی بے محنت یافت سے دست کش رہے جس کے نتیجے میں انھوں نے فقر و فاقے کے تماشے دیکھے اور پیرزادہ ہونے کے باوجود زندگی اپنے سنگین حقائق کے ساتھ ان کے سامنے آگئی۔ اسی زمانے میں انھوں نے حلقہ مشائخ قائم کرکے خانقاہوں کی اصلاح کا کام شروع کیا اور تصوف کو نئے زمانے کی ضروریات کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے لکھنے، بولنے اور برت کر بھی دکھانے لگے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے علی گڑھ تحریک کا بھی ساتھ دیا۔ اور ان کی تحریروں میں تصوّف کا وہ رنگ بڑی شدّت سے ابھر آیا جو صرف عبادت ریاضت اور خدا ترسی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ انسانی معاشرے کی ہر ضرورت اور ہر تقاضے پر حاوی ہے۔ ان سب محرکات نے بقول جمیل مہدی خواجہ صاحب کو نئی ترقی پسند تحریک کا ایک پیشرو نقیب اور پیغامبر بنا دیا۔ "ان کتے گلاب تمھارا اکیکر ہمارا" قسم کے مضامین اس کی نشان دہی کرتے ہیں۔

پہلی بیوی کے انتقال (۱۹۱۵ء میں) اور دوسری شادی کے بعد ان کی گھریلو زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ خواجہ صاحب کی دوسری بیوی ایک طرف لکھنے پڑھنے کی شوقین تھیں ادبی مشاغل میں خواجہ صاحب کا ساتھ دیتی تھیں اور دوسری طرف بقول ملاّ واحدی دہلوی قسمت بھی اچھی لے کر آئی تھیں۔ ان کے گھر میں قدم رکھتے ہی خواجہ صاحب کے ہاں روپے کی ریل پیل ہوگئی اور انھوں نے رسالوں اور اخباروں میں مضامین لکھنے کے ساتھ کتابوں کی طرف بھی

توجہ کی اور دیکھتے دیکھتے کتابوں کے ڈھیر لگا دیے۔ خواجہ صاحب کی یہ کتابیں شگفتہ، دل نشین اور نئے اسلوب عام فہم زبان اور اپنی ندرت کی وجہ سے بے حد مقبول ہوئیں۔ اِدھر کتاب چھپتی تھی اُدھر ایڈیشن ختم ہوجاتا تھا۔ ہر کتاب کے دسیوں ایڈیشن نکلے۔ اس آسودگی نے خواجہ صاحب کی تحریروں میں ایک نئی شگفتگی پیدا کردی اور ۱۸۵۷ء سے متعلق کتابوں اور مضامین کے علاوہ کہ ان کا موضوع ہی غمناک تھا۔ خواجہ صاحب کی دوسری تحریروں میں سوز و گداز کی فطری کیفیت کے ساتھ زندہ دلی اور کسی قدر طنز و مزاح کا عنصر بھی شامل ہوگیا اور ان کی نثر اکثر غالب کی یاد دلانے لگی۔ خواجہ صاحب کے مضامین چٹکیاں گدگدیاں اسی دور کی یادگار ہیں۔ کچھ اثر ان میں حضرت اکبر الٰہ آبادی کے فیضِ صحبت کا بھی ہے۔ جن سے تعلقات تو قدیم سے تھے لیکن ۱۹۱۵ء کے بعد تو ربط و ضبط بہت بڑھ گیا تھا۔ اور ان کا قُرب خواجہ صاحب کی طبیعت کو بہت متاثر کرنے لگا تھا۔

عالم اور پیرِ طریقت ہونے کے باوجود خواجہ صاحب پر تقشّف اور زاہدانہ خشکی کا غلبہ کبھی نہیں ہوا۔ حکیم اجمل خاں مرحوم نے اپنے صاحبزادے حکیم جمیل خاں کی شادی کی تو برکت کے خیال سے سہرا خواجہ صاحب سے بندھوایا۔ باندھتے وقت سہرا کچھ الجھ گیا تو مولانا محمد علی مرحوم نے دُور سے ہانک لگائی

"خواجہ صاحب! آپ کو سہرا باندھنا نہیں آتا"

خواجہ صاحب نے برجستہ جواب دیا "کیا کروں، حکیم صاحب نے یہ ترکیب استعمال ساتھ نہیں رکھا!"

یہ خاصی پرانی بات ہے لیکن ۱۹۳۰ء کے بعد تو ان کی روزمرّہ کی زندگی اور تحریر دونوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کھِلی پڑتی ہیں۔ حالانکہ عمر کے لحاظ سے یہ ان کا وہ دور تھا جب آدمی پر بزرگی اور سنجیدگی چھانے لگتی ہے اور مزاج میں چڑچڑاپن آجاتا ہے۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب کو خود بھی اپنی زندہ دلی کا احساس ہوتا تھا، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"بچپن غم آلود، جوانی بے سود، بڑھاپا خوش حال و خوش خیال"!

یہ اسی خوش حالی اور خوش خیالی کا ذکر ہے کہ ایک مرتبہ افغانستان کے وزیرِ اعظم ہندوستان آئے اور ایک پارٹی میں انھوں نے خواجہ صاحب کو افغانستان آنے کی دعوت دی تو خواجہ صاحب نے جواب میں کہا کہ "جی ہاں! میرا اب آخری وقت ہے اچھا ہے قبر افغانستان میں بن جائے!" راجہ غضنفر علی خاں مرحوم پاس بیٹھے تھے وہ بولے کہ خواجہ صاحب میں نے سنا ہے کہ آپ نے یہاں بھی اپنے لیے قبر تیار کرا رکھی ہے اس کا کیا ہوگا؟ خواجہ صاحب نے فوراً جواب دیا، جی! وہ آپ کی نذر ہے۔

اس قسم کے جوابات ابتدائے عمر میں وہ کسی کو نہ دیتے اور جامِ شریعت اور سندانِ عشق کا حق ادا کرنے کی صلاحیت کے باوجود رگبن اور سلوچنا جیسی فلم ایکٹریسوں کے فلمی چہرے بھی شاید نہ لکھتے۔ اسی زمانے کا ایک اور دلچسپ واقعہ سننے کے قابل ہے۔ غالباً حافظ وصی اشرف صبوحی نے اپنی تاجرانہ فہرست کتب کے ساتھ شاعروں اور ادیبوں کا ایک مختصر مصور تذکرہ شائع کیا تھا۔ اس تذکرے میں خواجہ صاحب اور مسز حجاب امتیاز علی کی تصاویر اس طرح آمنے سامنے اور متصل شائع ہوئیں کہ خواجہ صاحب کے عقیدت مندوں اور حافظ وصی اشرف صبوحی کے حریف تاجروں کو یہ چیز ناگوار گزری اور انھوں نے ایک مجمع میں جہاں حافظ اشرف صبوحی اور خواجہ صاحب دونوں موجود تھے خواجہ صاحب کو حافظ صاحب موصوف کی مبینہ حماقت کی طرف توجہ دلائی اور غم و غصے کا اظہار کیا۔ مگر خواجہ صاحب نے مسکرا کر کہا کہ ارے بھئی بُرا کیوں مانتے ہو! میرے علاوہ اور کسی ادیب اور شاعر پر حافظ صاحب کو اعتماد نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے کسی اور کی تصویر مسز حجاب امتیاز علی کے ساتھ شائع نہیں کی۔

خواجہ صاحب بے شمار مریدوں کے پیر تھے۔ اور ان مریدوں میں عام خاص ہر طرح کے آدمی تھے۔ حیدرآباد کے وزیرِ اعظم مہاراجہ کشن پرشاد اور ان جیسے بہت سے امراان کے بے آنکھیں بچھاتے تھے۔ خواجہ صاحب کی ذاتی محنت کی آمدنی بھی کچھ کم نہ تھی۔ لیکن انھوں نے ایک متوسط درجے کے ہندوستانی کی طرح ساری زندگی گزاری۔ متعدد نوکروں کے موجود ہوتے ہوتے وہ سارے کام اپنے ہاتھ سے کر لیتے تھے۔ اچھے کھانوں کے قدرداں ضرور تھے لیکن اچھے کھانوں کا شوق انھیں کبھی نہیں رہا، لباس صاف ستھرا پسند کرتے تھے لیکن قیمتی لباس سے کبھی دلچسپی نہیں ہوئی۔ وہ ان ادیبوں اور شاعروں میں نہیں تھے جن کی نجی اور خانگی زندگی میں ادب و شعریت کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ خواجہ صاحب اپنے ادب کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ جو سادگی اور پرکاری ان کی زبان اور ان کے بیان میں نظر آتی ہے، وہی ان کی زندگی میں تھی۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جملے قناعت کی زندگی کے آئینہ دار ہیں اور آسان زبان البیلا انداز اس رنگیلے صوفی کی یاد دلاتے ہیں جس تک سب کی پہنچ ہو اور جو سب کا دل موہ لینے والا ہو۔ ان کو قریب سے دیکھنے والے بے پڑھے لکھے لوگ بھی ان سے اسی طرح متاثر ہوتے جس طرح دور بیٹھ کر ان کی تحریریں پڑھنے والے متاثر ہوتے۔ خواجہ صاحب نے "بجو کھاؤ بجو کی رنگت بن جاؤ" مضمون اس وقت لکھا تھا جب خود ان کو بجو کی روٹی کھاتے ہوئے برسوں گزر چکے تھے۔ وہ جس طرح رہتے تھے، اسی طرح سوچتے تھے، اسی کے مطابق بولتے اور لکھتے تھے۔ ان کے مسودات میں کانٹ چھانٹ نہ ہونے کے برابر نظر آئے گی۔ بے انتہا پان کھانے کے باوجود کبھی کسی نے ان کے کپڑوں پر لال دھبے نہیں دیکھے۔ ان کا اگالدان موٹر تک میں ساتھ رہتا تھا۔ ان کی پیک نے کبھی کسی راہ چلتے کو آلودہ نہیں کیا۔ ان کی بے شمار ادبی و سیاسی چشمکوں کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ انھوں نے کبھی پہل نہ کی۔ ان کا قلم جب بھی اٹھا جواب میں اور مدافعت میں اُٹھا۔

۱۹۲۱ء سے خواجہ صاحب کا روزنامچہ اخباروں میں چھپنا شروع ہوا۔

اردو میں ایک نئی چیز تھی۔ ذاتی اور خانگی حالات کو جب خواجہ صاحب کے قلم نے ادب، سیاست و تصوف کا جامہ پہنا کر پیش کیا تو روزنامچہ نویسی کی تاریخ میں اس نے ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کر لی۔ ان کا روزنامچہ اس قدر مقبول ہوا کہ ایک علاحدہ اخبار ہی روزنامچے کے نام سے نکلنے لگا۔ خواجہ صاحب کا روزنامچہ ایسی چیز ہے کہ اگر وہ اور کچھ نہ لکھتے تو ان کو زندہ رکھنے کے لیے صرف یہ روزنامچہ ہی کافی تھا۔ ان کا روزنامچہ تیس پینتیس برس مسلسل شائع ہوا اور اس نے صرف خواجہ صاحب کی ذات ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی معاشرتی، سیاسی، اور ادبی تاریخ کو ایک دل چسپ خاکے کی شکل میں محفوظ کرایا۔

روزنامچے کے بے شمار حصے ایسے ہیں جن سے مضامین کے متعدد مجموعے مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر قلمی چہروں کا سلسلہ تو اس میں ایسا ہے جس کی نظیر نہیں مل سکے گی۔ ابتدا میں خواجہ صاحب اپنے ملنے جلنے والوں کا مختصر حال روزنامچے میں لکھا کرتے تھے۔ پھر انھوں نے قلمی چہرے کے عنوان سے تفصیل کے ساتھ خاص خاص لوگوں کی صورت و سیرت کے نقشے کھینچنے شروع کر دیے۔ ان قلمی چہروں کی ہمہ گیری کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ میاں سے پیغمبروں اور شیطان تک اور گاندھی جی اور مسٹر جناح اور ابوالکلام آزاد سے لے کر فلم ایکٹریس گہر اور سلوچنا تک کے قلمی چہرے انھوں نے لکھ ڈالے۔

خواجہ صاحب کی شخصیت بڑی جامع الفصاحت اور پہلو دار تھی، وہ ادیب بھی تھے، تاجر بھی تھے، صوفی بھی تھے اور موافق مخالف عینکوں سے خبر نہیں کیا کیا نظر آتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نے تو ان کی زندگی ہی میں کہہ دیا تھا کہ

صوفی بھی ہیں فقیر بھی ہیں اور ملنگ بھی
اور جانتے ہیں خواجہ تجارت کے ڈھنگ بھی

لیکن اس رنگا رنگی کے باوجود ان کی تمام صفات آپس میں اس طرح ملی جلی اور مربوط تھیں کہ ایک کو دوسرے سے علاحدہ کر کے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ مثال کے طور پر خواجہ حسن نظامی تاجر میں ادبیت اسی طرح رچی ہوئی تھی، جس طرح خواجہ حسن نظامی ادیب میں تصوف جاری و ساری تھا۔ خواجہ صاحب نے بحیثیت تاجر فن اشتہار کو جو فروغ دیا اور اردو زبان کے دامن کو اس فن سے جتنا مالا مال کیا اس کا جائزہ لینے سے پتہ چلے گا کہ ان کا ہر اشتہار ایک ادب پارے کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ ایک دن کوئی من چلا ان اشتہاروں سے ان کا ایک نیا اور اچھوتا مجموعۂ مضامین بھی مرتب کر ڈالے۔ خواجہ صاحب اپنے مضامین کے عنوان مقرر کرنے اور کتابوں کے نام رکھنے میں بڑی محنت کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ عنوان ایسا ہونا چاہیے کہ جو جاذب نظر ہو، جس کی کتابت اچھی ہو سکے، جس سے مضمون واضح ہو جائے اور جو نیا ہو۔ ان کی اس رائے میں جہاں خواجہ حسن نظامی تاجر جھلکنے لگتے ہیں وہاں جب ان کی تجارتی دواؤں کے نام "خوشس ایام" "کندن بدن" "کایا پلٹ" اور "گل بکاؤلی" جیسے نظر آتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تجارت خواجہ حسن نظامی ادیب کی ہے۔

خواجہ صاحب نے بچپن میں اپنی والدہ سے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی داستانیں اور انگریزوں کے ظلم و ستم کا حال سنا تھا۔ اور اس سے وہ اتنے متاثر تھے کہ قلم سنبھالتے ہی انھوں نے بہت سے مضامین اور کتابیں ۱۸۵۷ء سے متعلق لکھیں۔ غدر کی یہ کہانیاں ایسی ہیں کہ آج بھی جو انھیں پڑھتا ہے، آبدیدہ ہو جاتا ہے۔ یہ اثر صرف خواجہ صاحب کے سحر کار قلم ہی کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ لکھنے والے کی اپنی دلی کیفیت کا بھی ایک پرتو ہے۔ یہ کہانیاں بار بار چھپتی تھیں اور جب جب خواجہ صاحب تصحیح کے لیے کاپیاں دیکھتے تھے اور پروف پڑھتے تھے خود ان کا روتے روتے بُرا حال ہو جاتا تھا، اور صحت کا کام رک جایا کرتا تھا۔

۱۹۱۱ء میں انگریزوں نے دلی میں دربار کیا اور یہ طے پایا کہ انگریز بادشاہ لال قلعے کے جھروکے میں بیٹھیں اور ان کے سامنے سے ہندوستان کے علماء اور مشائخ ہاتھیوں پر سوار ہو کر سلام کرتے ہوئے گزریں۔ اس جلوس کا بلاوا خواجہ صاحب کے پاس بھی آیا۔ بلاوا لانے والے ایک مغل شہزادے تھے جو برٹش سرکار میں کہیں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ خواجہ صاحب نے ان کو جواب دیا کہ صاحب عالم! مجھے اس جلوس کی شرکت سے معاف رکھیں۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ جائے گا کہ جہاں آپ کے بزرگ بیٹھ کر اپنی ہندو مسلم رعایا کو درشن دیا کرتے تھے، وہاں ایک غیر ملکی حکمراں بیٹھا ہو۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے اس جلوس میں شرکت نہیں کی اور جلوس کے بعد ایک طنزیہ مضمون اپنے رسالے نظام المشائخ میں "بھیّے اور عمامے کی کورنش" کے عنوان سے لکھا جس میں ہاتھی نشین علماء و مشائخ پر "اصحاب فیل" کی پھبتی کسی تھی۔

مرنجاں مرنج ہونے کے باوجود قومی معاملات میں خواجہ صاحب کسی کے ساتھ رعایت کے قائل نہ تھے۔ انگریزوں کے زمانے میں ایک دفعہ مقابلے کا کوئی امتحان عین عید کے دن رکھ دیا گیا۔ ہندوستان کے دوسرے ہندو مسلم لیڈروں کے ساتھ خواجہ صاحب نے بھی اس پر احتجاج کیا۔ سروس کمیشن کے بڑے افسر صاحب نے احتجاج کو اس دلیل کے ساتھ رد کرنا چاہا کہ تعلیم اور نوکریاں ایک جنگ ہیں اور جنگ عید کے دن بند نہیں ہوا کرتی! خواجہ صاحب نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ آپ کا کہنا بالکل درست ہے۔ مگر آپ اس جنگ کو اتوار کے دن کیوں بند کر دیتے ہیں۔ جب اتوار کو جنگ بند ہوتی ہے تو اسے عید کے دن بھی بند ہونا چاہیے، اس کے بعد بھی امتحان ملتوی نہ کیا گیا تو خواجہ صاحب نے ہندوستان کے مشہور اخباروں میں اس افسر کا مزاحیہ خاکہ اور قلمی چہرہ "نئی روشنی کا فرعون" کے عنوان سے نام ظاہر کیے بغیر لکھا اور اعلان کر دیا کہ جو شخص یہ بتا دے کہ یہ کس کا قلمی چہرہ ہے، اس کو پانچ ہزار روپے انعام میں دیے جائیں گے۔ اس مضمون کے چھپنے کے بعد اس افسر کا گھر سے نکلنا دشوار ہو گیا تھا، کیوں کہ وہ جہاں جاتا تھا انگلیاں اٹھتی تھیں اور لوگ کہتے تھے۔ یہی ہے نئی روشنی کا فرعون!

خواجہ صاحب نے اردو کو عام فہم بنانے اور اس کو پھیلانے کا جو عظیم الشان کام کیا اس سے اکثر اردو داں واقف ہیں لیکن وہ محض تعداد

بڑھانے کے قائل نہ تھے بلکہ اس بات کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے کہ لوگ صحیح اُردو بولیں اور لکھیں۔ اپنی اولاد کے لیے بے حد شفیق باپ تھے لیکن زبان کی صحت کے معاملے میں اولاد کے ساتھ بھی رعایت نہ برتتے تھے۔ ان کے سب بچوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم پائی جہاں دیس بدیس کا پنچھی آتا ہے اور بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں، ایسے ماحول میں زبان کا بگڑ جانا لازمی ہے۔ چنانچہ ہم لوگوں کی زبان پر بھی وضع وضع کے الفاظ و محاورے چڑھے ہوئے تھے جن پر خواجہ صاحب سختی سے ٹوکتے تھے اور اگر کسی بات پر ہمیشہ ناراض رہتے تھے تو وہ یہی تھی کہ غلط بول چال سے ہم ان کو تکلیف بھی پہنچاتے تھے اور ان کی بدنامی کا باعث بھی ہوتے تھے۔

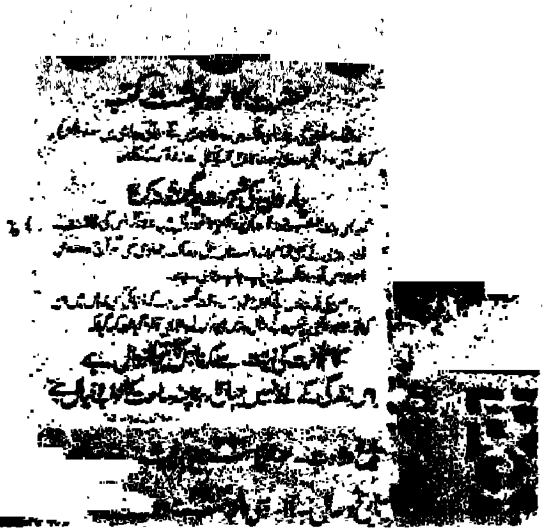
ہمارے یہاں امروہے کے ایک منشی کام کرتے تھے جن کی ساری عمر خواجہ صاحب کے ساتھ گزری تھی، وہ جانتے تھے کہ چینی اور شکر کو ہمارے یہاں قند کہا جاتا ہے، چنانچہ حساب لکھتے وقت وہ قند ہی لکھا کرتے تھے لیکن اپنے گھر میں وہ قند کو چینی یا شکر بولتے ہوں گے۔ اس لیے ایک روز خواجہ صاحب کو حساب سنانے لگے تو قند اور چینی میں جو تذکیر و تانیث کا فرق ہے اس کو بھول گئے اور کہنے لگے کہ "اتنی رقم کی قند آئی" خواجہ صاحب اپنے اوپر بڑا قابو رکھتے تھے لیکن "قند آئی" سنتے ہی ان کا غصہ برداشت سے باہر ہوگیا۔ منشی جی پر تو خیر ناراض ہوئے ہی، خود بھی سارا دن اذیت محسوس کرتے رہے بار بار کہتے تھے کہ افسوس اس شخص نے ساری عمر میرے ساتھ کام کرتے ہوئے گزاری، جب یہ بھی "قند آئی" بولے گا تو لوگ سمجھیں گے کہ حسن نظامی بھی یہی بولتا ہوگا۔

خواجہ صاحب نے اردو املا کے سلسلے میں جس طرح بولتے ہیں اسی طرح لکھنے کی تحریک بھی بڑے زور شور سے چلائی تھی۔ اس مہم کی نفسیات کا مطالعہ بھی اسی نتیجے پر پہنچائے گا کہ خواجہ صاحب ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی جیسی اصطلاحیں ایجاد ہونے سے بہت پہلے مودب زندگی اور اس کے لٹریری اظہار کے نقیب تھے۔

خواجہ صاحب نے اپنی تحریروں میں بہت کم الفاظ استعمال کیے ہیں لیکن ان گنے چنے الفاظ کا استعمال وہ خاص اہتمام سے کرتے ہیں۔ الفاظ کے آہنگ اور صوتی کیفیات کا وہ بڑا خیال رکھتے تھے اور ان کے بعض انشائیوں کی نثر نظم کی سی نغمگی رکھتی ہے۔ ملا واحدی دہلوی نے ان کے مجموعہ مضامین "سی پارہ دل" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ خواجہ صاحب نے مضامین لکھنے کے لیے خاص طور پر گراموفون خریدا تھا۔ گراموفون پر کسی گانے یا ساز کا ریکارڈ بجایا جاتا تھا اور خواجہ صاحب ریکارڈ سنتے جاتے تھے اور مضمون لکھتے جاتے تھے۔ اور اکثر کہا کرتے تھے کہ جتنا اچھا ریکارڈ ہوگا اتنا ہی اچھا مضمون میں لکھ سکوں گا۔

ان کے مضامین کی کیفیات پر غور کرتے وقت یہ چیز بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان میں سے اکثر مضامین رات کے پچھلے پہر لکھے گئے ہیں۔ خواجہ صاحب کی کاروباری اور سماجی مصروفیات اتنی تھیں اور مریدوں اور عقیدتمندوں کی آمد و رفت ان کے پاس اس قدر رہتی تھی کہ دن کے وقت لکھنے پڑھنے کا کام وہ بہت کم کر سکتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ رات کو بہت جلد سو جاتے تھے اور پھر دو تین بجے رات کو بیدار ہو کر اور نماز تہجد سے فراغت پا کر تحریری کام کرتے تھے۔ البتہ آخری زمانے میں جب کہ لکھنا ان کے لیے طبیعت ثانیہ بن گیا تھا۔ وہ دن کو بھی برابر لکھواتے رہتے تھے۔ آنے والوں سے برابر بات بھی کرتے اور املا نویس کو مضامین بھی لکھواتے۔ ان کا ذہن اتنا مرتب تھا کہ کچھ لکھنے اور لکھوانے کے لیے انھیں کسی خاص اہتمام یا غور و فکر کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ قلم برداشتہ لکھتے اور بے تکلف بول کر لکھواتے۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ خواجہ صاحب کا ذہن ایک خاص خداداد الماری ہے جس میں سب چیز ترتیب اور سلیقے سے سجی ہوئی ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب بس اس الماری کے پٹ کھول کر سب کو تماشا دکھا دیتے ہیں۔ لیکن اس ترتیب اور نظم اور لکھنے کی مہارت کے باوجود ان کی ابتدائی زمانے کی تحریروں اور آخری دور کے مضامین میں کچھ فرق ضرور ہے اور یہ فرق ذاتی حالات اور لکھنے کے وقت نے پیدا کیا ہے۔

خواجہ صاحب کی ادبی زندگی کے بارے میں سوچتا ہوں تو ان کا ایک واقعہ یاد آجاتا ہے۔ کوئی صاحب صوفیوں کا لباس پہنے مرید ہونے کے لیے ان کے پاس آئے۔ خواجہ صاحب نے پوچھا تم مرید کیوں ہونا چاہتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا خدا کی تلاش ہے، خواجہ صاحب بولے "تلاش میں وردی پوش پولیس والا بہت کم کامیاب ہوتا ہے، اور کامیاب ہوتا ہے تو بہت دیر میں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس سی آئی ڈی والا جو سادہ اور عام لباس پہنتا ہے جلد اپنے مقصد کو حاصل کر لیتا ہے۔ "لہٰذا تم بھی اپنی وردی اُتار کر خدا کو تلاش کرو!" خواجہ صاحب کا ادب وردی پوش ادب نہیں ہے، تصنع اور بناوٹ سے دور ہے، لباسِ عام میں ہے، اس کو خدا کی تلاش ہے، خدا کے بندوں کی تلاش ہے، اور اس تلاش میں جس طرح خواجہ صاحب کامیاب تھے اسی طرح ان کا ادب بھی کامیاب ہے۔



غلام ربّانی تاباںؔ
جامعہ نگر، نئی دہلی

غزل

کھلائے شعلے نسیمِ سحر سے دور نہیں
سوادِ رنگ سوادِ شرر سے دور نہیں

نہ جانے کب مرے خوابوں کو جسم مل جائے
کوئی کمال مذاقِ ہنر سے دور نہیں

لپٹ کے گرد کی چادر میں چین سے سو جائے
یہ بے رخی تو کسی رہگزر سے دور نہیں

شکستہ ہوں تو کسی عہد کی زباں بن جائیں
طلسمِ سحر سہی بام و در سے دور نہیں

ہوا کی زد پہ جلے شمعِ رہگزر کی طرح
یہ معجزہ کسی آشفتہ سر سے دور نہیں

اگر نصیب ہو عرفانِ زندگی تاباںؔ
غمِ چمن بھی غمِ بال و پر سے دور نہیں

کرشن موہن
بی، ۱۲۴ - پنڈارہ روڈ نئی دہلی

غزل

انا کی تصویر بن گیا ہوں — خود اپنا نخچیر بن گیا ہوں
عمل کی تفسیر بن گیا ہوں — جوازِ تقصیر بن گیا ہوں
جنوں کی تخریب کے سہارے — خرد کی تعمیر بن گیا ہوں
ہوئی نہ آوارگی کی جرأت — وفا کی زنجیر بن گیا ہوں
جمود سے ہے ستیز مجھ کو — شعورِ تغیر بن گیا ہوں
جو مجھ سے روٹھا مرا مقدر — تو عجزِ تدبیر بن گیا ہوں
بزعمِ خود کہہ کے چند غزلیں — ادب کی جاگیر بن گیا ہوں
قلمروِ فکر کا قلم تھا — عمل کی شمشیر بن گیا ہوں
غرورِ تقریر بن نہ پایا — سرورِ تحریر بن گیا ہوں
عجب تھا وہ خواب کرشن موہن
میں جس کی تعبیر بن گیا ہوں

آمنہ ابوالحسن
۲۷، پٹودی ہاؤس، نئی دہلی

چھوٹی سی بات

رچنا بہت خوش تھی کیونکہ پورے سات سال بعد وہ اپنی بہن مسز کیشب سے ملنے جا رہی تھی۔ سات سال پہلے اس کی بہن بیاہ کر اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی تھی۔ پھر ان سات سالوں میں صرف ایک بار وہ رچنا اور ماں سے ملنے گھر آئی تھی اور بس ایک مہینہ رہ کر لوٹ گئی تھی۔

یوں اس نے کئی بار رچنا کو لکھا تھا کہ وہ ضرور اس کے پاس آکر رہا کرے مگر ماں کا خیال تھا کہ رچنا کو وہاں زیادہ نہیں آنا جانا چاہیئے۔

بڑی مشکل سے ماں نے اس بار اجازت دی تھی اور رچنا اپنے کالج کی چھٹیوں میں اپنی بہن کے پاس جا رہی تھی۔ اس نے سنا تھا اس کی بہن بڑی زبردست سوشل ورکر رہی ہے اور اب تو اپنے مسلسل کام اور نام کی وجہ سے سماج سدھار سمیتی کی صدر بھی بن چکی ہے۔

اس کے جیجا مسٹر کیشب خود بڑے عہدے دار تھے اور یہ سب رچنا کے لئے بے حد خوشی اور عزت و افتخار کا باعث تھا کیونکہ وہ دونوں ملک و قوم کی خدمت کر رہے تھے اور رچنا کے خیال میں اپنے اپنے انداز میں تعمیری زندگی گزار رہے تھے۔

سفر ختم کر کے جب رچنا پر رونق اسٹیشن پر اتری تو اپنی بہن کا خوبصورت، شگفتہ و شاداب چہرہ دیکھ کر نہال ہوگئی۔

اتنے دنوں میں اس کے خد و خال اور بن سنور چکے تھے۔ کچھ ایسے ہوگئے تھے جیسے کئی چاند ایک جگہ جمع ہو کر جگمگا رہے ہوں۔

دونوں بڑی گرمجوشی اور محبت سے ملیں۔ پھر اپنی بہن کے گھر پہنچ کر رچنا کی خوشی دوبالا ہوگئی کیونکہ گھر بھی بے حد آرٹسٹک تھا۔ ہر کمرا صرف ضرورت کی چیزوں سے لیس جیسے یہاں فالتو کچھ نہ تھا۔ ضرورت سے زائد اور بیکار کچھ نہ تھا۔ صرف نمائشی کچھ بھی نہ تھا۔

دن آرام اور مسرت سے گذرنے لگے۔

سیر، تفریح، دعوتیں۔ !!!

پرسکون خاموشی اور ہنگامہ پرور تقریبیں۔ !! کہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا۔

اس روز مسز کیشب ایک اہم میٹنگ سے ابھی ابھی لوٹی تھیں اور انھوں نے خود کو آرام کرسی میں گرا دیا تھا پھر اس سے بھی قبل کہ رچنا اُن سے کوئی بات کرتی ان کا منشی سیوارام حاضر ہوا تھا۔

شام کا جھٹپٹا ختم ہو چکا تھا۔ روشنیاں سلگ رہی تھیں اور باہر کے اندھیرے نے گھروں میں سلگنے والی روشنیوں کو اور زیادہ چمکا دیا تھا۔

آہٹ پر مسز کیشب نے نگاہ اٹھا کے سیوارام کو یوں دیکھا جیسے پوچھتی ہوں "سب ٹھیک تو ہے۔؟"

سیوارام نے جھک کر سوال کیا پھر ان کے خاموش سوال کے جواب میں خود ہی بولا۔

"سب ٹھیک ہے میم صاحب۔ اس ہفتے سارے نوکر کام پر حاضر رہے۔ سب نے اپنی اپنی ڈیوٹیاں بخوبی انجام دیں۔ البتہ، اگلے کل مالی نے چھٹی مانگی ہے اور خانساماں بتا رہا تھا کہ برتن صاف کرنے والے لڑکے نے آج دو پیالے اور پرچ توڑ دیئے ہیں۔"

سیوارام نے بات ختم کی تو مسز کیشب نے نگاہ اٹھائے بغیر کہا۔

"جس نے برتن توڑے ہیں ان کے دام اس کی تنخواہ سے کاٹ لو اور مقررہ چھٹی کے علاوہ اگر مالی زائد چھٹی مانگتا ہے تو اسے بتا دو کہ اس چھٹی کی تنخواہ بھی اُسے نہیں ملے گی۔ کوئی اور بات۔؟"

"جی نہیں۔" سیوارام نے اپنی ڈیوٹی ختم کی، دوبارہ سلام کیا اور رخصت ہوگیا۔

دیوان پر بیٹھی اپنے ناخن رنگتی ہوئی رچنا حیران ہوگئی اور یکایک پیدا ہونے والی اس حیرت اور بدمزگی دور کرنے کے لئے بولی۔

"مگر دیدی۔ یہ تو زیادتی ہے۔"

مسز کیشب نے گھوم کر اپنی چھوٹی بہن کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کیسی زیادتی۔"

رچنا بولی۔ "یہی کہ ٹوٹے ہوئے برتنوں کے دام ملازم کی تنخواہ سے وصول کئے جائیں۔ اس نے جان بوجھ کر نہ توڑے ہوں گے اور برتن تو ہم سے بھی ٹوٹ سکتے ہیں نا دیدی۔ پھر غریب آدمی کماتے ہی کتنا ہیں جو اس میں بھی نقصان بھریں۔"

"ڈسپلن اِز ڈسپلن ڈیر۔ اور پھر یہ باتیں تمہارے سوچنے کی نہیں، میں جو موجود ہوں۔ صحیح غلط سب سمجھتی ہوں۔"

مسز کیشب کا لہجہ ایسا تھا کہ رچنا کو کچھ اور کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اس نے ایک قسم کی بے قراری محسوس کی لیکن اسے خاموش رہنا تھا۔

اُسے خوب یاد تھا کہ پچھلی دعوت میں بے حد نشے کی حالت میں جب مسٹر مدھولم نے وہسکی کے قیمتی گلاس توڑ دیے تھے تو دیدی نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ ان گلاسوں کے دام ادا کر جائیے بلکہ مسکرا کر کہا تھا۔ "کوئی بات نہیں۔"

اور آج ۔ صرف دو پیالے اور پرچ ۔!

آخر ان کے دام کتنے ہوں گے۔؟

اس نے "کیوٹکس" کی بوتل بند کرکے بازو والی تپائی پر رکھ دی اور یوں ہی اپنے ناخنوں کا شیڈ دیکھنے لگی۔

ابھی کھانا لگنے میں کچھ دیر تھی۔ اُس کے جیجا جی نہیں آئے تھے اور کمرے کی گمبھیر فضا سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ کئی دن سے اپنی بہن کے ساتھ رہ رہی تھی اور یہ ساتھ بڑا خوشگوار تھا۔ مگر کبھی کبھی کچھ لمحے ایسے بھی آجاتے تھے جب رچنا محسوس کرتی وہ اور دیدی دور دور ہیں۔ بہت دور دور۔ نامعلوم فاصلے ان کے درمیان حائل، اور ایسے لمحوں میں جس کرب سے اسے گزرنا پڑتا اس سے وہ بے حد خائف

ایسے لمحوں میں اُس نے ہمیشہ کہنا چاہا۔ دیدی۔ دیدی ....۔ اور اس وقت بھی یہی کہنا چاہتی تھی مگر مسز کیشب کا چہرہ بتا رہا تھا۔ ان کی ہر حرکت اٹل ہے اور اس وقت وہ رچنا کو دیکھنا بھی نہیں چاہتیں۔

ایسے میں گاڑی کا ہارن بجا اور مسٹر کیشب مسکراتے ہوئے اندر آئے۔

ہیلو۔ ہیلو۔!! انھوں نے اپنے خوش وخرم انداز میں کہا اور کرسی گھسیٹ کر مسز کیشب کے پاس بیٹھ گئے۔

"ہوگئی میٹنگ ۔؟

کیا کیا فیصلے ہوئے۔؟

کس قدر پروگریس۔؟

کام ٹھیک تو چل رہا ہے نا۔؟

کوئی میری مدد وغیرہ ...."

ان چھوٹے چھوٹے فقروں کو ادا کرتے ہوئے ان کے لہجے میں اپنا پن نہیں تھا۔ سپاٹ پن بھی نہیں تھا مگر کچھ ایسا ضرور تھا جو بہت اچھا محسوس ہوتا تھا۔

رچنا نے نگاہ اٹھا کے اپنے جیجا کو دیکھا اور اسے لگا اُن کی شخصیت دیدی سے کہیں زیادہ بھاری اور اصلی ہے۔ وہ اچھے افسر بھی ہیں اچھے انسان بھی۔ ہمیشہ خوش ہمیشہ کھرے۔ اور اُن کے جینے کے عمل میں کہیں کوئی جھول، کوئی شگاف، کوئی مصلحت نہیں، وہ مسز کیشب کو بہت چاہتے ہیں۔ رچنا کو بھی اپنی بہن کی طرح مانتے ہیں۔ رچنا سے کہتے ہیں۔

"اپنا کیریئر اونچی بنیاد پر بنانا رچنا۔ ایسے سہاروں سے نہیں جو اگر ٹوٹ جائیں تو تم خود بکھر جاؤ۔ سہارے غیر محفوظ ہوسکتے ہیں مگر اچھے انسان بے حد محفوظ ۔۔!" اور جب وہ یہ کہتے ہیں تو رچنا سوچتی ہے۔ وہ یہ بات اس سے کیوں کہتے ہیں۔ دیدی سے کیوں نہیں۔؟

کیا وہ دیدی سے ڈرتے ہیں ۔؟

یا ان کا دل دُکھانا نہیں چاہتے ۔؟

اور عجیب بات تھی کہ اس شعوری ملاقات میں وہ اپنی دیدی سے خائف تھی اور جیجا جی سے بے حد مرعوب۔

پچھلی چھٹی پر جب وہ سب دوستوں کے ہمراہ پکنک پر گئے تھے تو اتنے سنجیدہ عہدے دار جیجا جی بالکل بچہ بن گئے تھے۔ اتنا ہنسے تھے، اتنی دھوم مچائی تھی کہ رچنا حیران رہ گئی۔ وائلین یوں بجایا تھا جیسے وہ صرف وائلین بجانے کے لیے پیدا ہوئے ہوں۔ کبھی ماضی میں۔ ذمہ دارانہ زندگی سے پہلے سنا کہ وہ بڑے شوق اور پابندی سے یہ ساز بجایا کرتے تھے مگر جب سے ملازمت اور گھر گرہستی کے چنگل میں پھنسے انھوں نے ساز ہاتھ سے رکھ دیا۔ پھر تو کبھی کبھار پکنک پارٹیوں یا بے حد گھریلو تقریبوں میں ہی انھیں اس ساز کی یاد آتی ورنہ کوئی ان کی مصروف شخصیت سے کسی ساز کا رشتہ جوڑ بھی نہ سکتا۔ اس کے برخلاف دیدی پکنک میں بھی بے حد ریزرو رہیں۔ انھیں اپنے لباس کا، اٹھنے بیٹھنے کا، گفتگو کرنے کا، ہنسنے نہ ہنسنے کا، مجموعی رکھ رکھاؤ اور خیال کا اتنا احساس رہا کہ یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ پکنک منانے آئی ہیں بلکہ رچنا ہر وقت یہی محسوس کرتی رہی کہ وہ اپنی کسی ضروری میٹنگ میں بیٹھی احکام جاری کر رہی ہیں۔ منصوبے منظور نا منظور کر رہی ہیں۔

اور پھر ایسے ہی کئی واقعات۔

ٹھیک آٹھ بجے خانساماں نے اطلاع دی کہ کھانا میز پر لگ گیا ہے تو وہ تینوں میز پر جا بیٹھے۔ کھانے کے دوران ہنستے بولتے بھی رہے۔ اور جب کھانا ختم ہوا تو میز سے اٹھتے ہوئے مسز کیشب نے بتایا۔ انھیں چند دوستوں کے ساتھ لیٹ شو دیکھنے جانا ہے۔ ایک مشہور پکچر چل رہی ہے جسے وہ مس کرنا نہیں چاہتیں۔ دوستوں کا اصرار بھی ہے۔

یہ سن کر مسٹر کیشب بیڈ روم میں چلے گئے۔ مسز کیشب تیار ہونے ڈریسنگ روم میں گھس گئیں۔ رچنا نے ایک ناول اٹھا لیا اور اپنے بستر پر آلیٹی۔ رات کی "واک" مسز کیشب کے نہ ہونے سے کینسل ہو چکی تھی۔ لیکن رچنا پڑھ نہ سکی۔ وہ سوچتی رہی۔ اتنے پیار اور وابستگی کے باوجود اس کے جیجا اور دیدی میں اپنی زندگی کے لئے بے ساختگی اور والہانہ پن کیوں نہیں۔ وہ اپنی اپنی زندگیاں اس طرح کیوں گذارتے ہیں جیسے دو الگ الگ زندگیاں ہوں۔ دونوں کی زندگی بالکل جڑی ہوئی کیوں نہیں؟ کیا یہ مصروفیتیں ہیں جنھوں نے دونوں کو جڑنے نہیں دیا ہے یا کچھ اور ....

دوسرا خیال تکلیف دہ تھا۔ وہ یکسوئی سے سوچ بھی نہ سکی۔

اگلی صبح مسز خان چند لوگوں کے ساتھ آئیں اور مسز کیشب کو بتایا کہ شدید برسات نے ان بیچارے لوگوں کے خستہ گھر منہدم کر دیے ہیں انھیں فوری مدد کی بے حد ضرورت ہے تو مسز کیشب نے فوراً سمیتی کے سکریٹری کو فون کیا اور اُن بیچارے لوگوں کے لئے ضروری امداد منظور کروادی۔

اس کارِ خیر کے بعد جب مسز خان چلی گئیں تو ورکنگ کمیٹی کے کچھ ممبر آگئے۔ مسز کیشب بے حد اطمینان اور انہماک سے ان کی گفتگو سنتیں اور ان کے مسائل سلجھاتی رہیں۔

پھر محلہ کمیٹی کے کچھ لوگ کسی تقریب کے لئے چندہ وصول کرنے آگئے مسز کیشب نے انھیں بھی معقول رقم دے دی۔

اس موقعے پر رچنا کو پھر گھر کے دونوں ٹوٹے ہوئے پیالے اور پرچ یاد آئے۔ اس نے عجیب تلخی سی محسوس کی۔ جانے یہ پیالے اور پرچ اس کے ذہن سے چپک کر کیوں رہ گئے تھے۔

دیدی کے اٹل فیصلے کے بعد اگلے ہی روز اس نے برتن دھونے والے لڑکے کو چپکے سے بلا کر دس روپے بھی دے دیے تھے پھر بھی یہ پیالے اور پرچ اس کے ذہن سے چپٹے ہوئے تھے۔ محو نہ ہو رہے تھے۔ اور تبھی سے وہ ایک جھنجٹ میں پھنسی تھی۔

سب کہتے تھے مسز کیشب بہت دریا دل، غریب پرور ہیں۔ گھر گھر، محلہ محلہ بھلائی کے چراغ جلایا کرتی ہیں۔ اپنے قیمتی وقت کو غریبوں کی غریبی ہٹانے اور ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے وقف کیا ہوا ہے لیکن سیوا رام سے اس شام کی گفتگو کے بعد باہر اور بھیتر کا جو فرق رچنا کے سامنے آیا۔ اپنی بہن کے کردار کی جو کمزوری اور ناہمواری نظر آئی اُس نے رچنا کو گھبرا دیا۔ بات چھوٹی سی تھی لیکن کتنی تلخ حقیقتوں کی نمایندہ —!

رچنا ہولاتی رہی۔ وہ اپنی بہن سے نفرت کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جس مسرت اور جن تصورات کے ساتھ وہ یہاں آئی اُنہی کے ساتھ لوٹنا چاہتی تھی مگر لگتا تھا دکھ اور کرب کے ساتھ، الجھن کے ساتھ اسے لوٹنا پڑے گا۔ دیدی اس کی نہیں سنیں گی اور اگلے سال تو رچنا کو ڈگری لیکر خود اپنی زندگی میں داخل ہو جانا تھا۔ اپنی راہ پر نکل جانا سب سے بچھڑ کر ایک راستہ بنانا اور خود کو پانا۔

اِس دنیا میں رشتے ناطے، دوستیاں، ملاقاتیں کتنی اہم ہوتی ہیں مگر خود اپنی ذات کا دائرہ ان سے بھی ایسا اہم کہ جب آدمی خود اپنا سفر شروع کرتا ہے تو زندگی سے بے حد گتھی ہوئی چیزوں کو بھی ترک کر کے آگے بڑھ جانا پڑتا ہے۔ پھر ایسے میں اتنی مہلت کہاں کہ اپنوں کے دامن کے پھول یا کانٹے بھی فرصت سے چنے جا سکیں۔

اور تذبذب کی منزل سے گذر کر اس یقین کے بعد کہ دیدی کی بے پناہ شہرت و مقبولیت کے باوجود اُن کی اپنی ذات میں جو جھول جو عدم توازن ہے وہ کتنا پشیمان کرنے والا، رچنا کبیدہ خاطر ہو گئی۔

بے شک دیدی اپنے اِس مزاج اِس تضاد کو گھر کے دائرے سے باہر نکلنے نہیں دیتیں۔ یہ فرق، یہ تضاد، یہ عدم توازن قید ہیں اور دیدی آزاد مگر یہ سب کتنا غیر حقیقی اور پریشان کن —!

رچنا کتنی افسردہ، خوفزدہ —!! اس کا جی چاہتا وہ اپنی بہن کو بچالے۔ انھیں ان کے خول سے باہر کھینچکر کھری انسانیت کی اصلیت کی طرف لے آئے مگر کیونکر۔ کیسے۔ جبکہ سماج سدھار سمیتی کی مشہور و معزز صدر کے لئے یہ سب سوچنا شاید ضروری نہ تھا۔ انھیں زندگی کے سارے پہلوؤں کو سمیٹنا شاید ضروری نہ تھا۔ اُن کا شاید ایک ہی فرض تھا کہ جس مقام پر وہ کھڑی ہیں اس کی حفاظت کریں اور اپنے نام اور کام کو بگڑنے نہ دیں۔

گھر کی دنیا تو چھوٹی سی ہوتی ہے۔ گھر میں تو سب کچھ چل سکتا ہے۔

مگر باہر کی دنیا ایسا تمغہ جو ایک بار سینے سے اتر جائے تو شاید پھر حاصل نہ ہو۔

اور تمغے کتنے چمکدار بھی تو ہوتے ہیں۔

کتنے قیمتی —!

کتنے محترم —!

خواہش مند خود کو سجا سنوار کر یہ تمغے حاصل کر لیتے ہیں لیکن جیباجی کتنے پگلے، جنھیں کسی تمغے کسی مقام کی فکر نہیں۔ جو اپنا ہر کام یوں کرتے ہیں جیسے زندگی کو خراج پیش کر رہے ہوں۔

اور رچنا شاید اُن سے بھی بے وقوف جو ڈرتی رہتی ہے۔ گھبرایا کرتی ہے۔ سوچ سوچ کر ہلکان ہو جاتی ہے مگر کھل جانے کی ہمت نہیں کر پاتی۔

اور ٹرین میں دیدی کے گھر سے اپنے گھر لوٹتے ہوئے پر رونق شہر، دیدی کا خوبصورت چہرہ، سیر، تفریح، دعوتیں سب پس منظر میں چلی گئی ہیں۔ رچنا اپنی خوشی کہیں پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ بہت اداس، بہت رنجیدہ ہے کہ زندگی کے اتنے بڑے ڈرامے میں انسان کا رول کتنا چھوٹا، مصلحت آمیز، وقتی ہوتا ہے۔

جانے کہاں کہاں، کس کس روپ میں۔!

کاش انسان کائنات سے بلند ہو سکتا۔

بلند ہوتا —!!





شنکر گھوش
وزیر مملکت منصوبہ بندی، حکومت ہند

ہمارے جنگلاتی وسائل کی منصوبہ بندی

پودے زندگی کو قائم رکھتے ہیں۔ جنگلات کا وجود اور ان کا پھیلاؤ انسان کے لئے حیات بخش فضا اور صحت پرور ماحول کا ضامن ہے۔

ٹکنالوجی کی ضمنی پیداواروں کی وجہ سے لوگوں کی صحت اور مسرت کو ایک سنگین خطرہ درپیش ہے۔ ماحول سے متعلق پالیسی بھی آج اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی کہ اٹھارہویں یا انیسویں صدی میں طبی سائنس کی اہمیت تھی۔ اب ہم اپنے ماحول کے متعلق یہ فرض نہیں کر سکتے کہ یہ اپنے آپ صاف ستھرا رہے گا۔ ٹکنالوجی کی آلودگیوں سے محفوظ رہنے کے لئے ہمیں قدرتی ماحول کے تحفظ کو اپنی تہذیب کا اولین جزو بنالینا چاہیئے۔

ہمارے اجداد نے اپنی فطری ذہانت کی بدولت یہ سمجھ لیا تھا کہ ماحول کے توازن کو پوری طرح برقرار رکھنے میں جنگلات کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ درختوں کے تعلق سے یہی نقطۂ نظر وہ واحد رویّہ ہے جو ہماری نسل کی طاقت اور سلامتی کو یقینی بنا سکتا ہے۔

جنگلات عظیم ترین اور قابلِ تجدید قدرتی وسیلہ ہیں جو ہمیں حاصل یں۔ اپنی حیاتیاتی خصوصیتوں کی بدولت وہ پیداوار دیتے ہوئے جذب رنے کی اور جذب کرتے ہوئے پیداوار دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ س لئے یہ دائمی طور پر مفید ہو سکتے ہیں۔

تیسرے منصوبے کے دوران ہم نے جنگلات کی طویل المدتی ترقی کے لئے زیادہ جامع پالیسی اختیار کی۔ ہم نے اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش ں کہ جنگلاتی پیداوار کا ایسا معقولیت پسندانہ استعمال کیا جائے کہ یہ قومی آمدنی یں اضافے کا باعث ہو سکے۔ تیسرے منصوبے میں ہم نے صنعتی لکڑی، ایندھن ا لکڑی اور دوسری جنگلاتی پیداوار میں خود مکتفی بن کر خاطر خواہ مقام ماصل کرلیا۔ اقوام متحدہ کے خصوصی فنڈ (یونیسف) اور ادارۂ خوراک و راعت (الف اے او) نے ہمیں اپنے جنگلاتی وسائل کا ایک سروے عمل میں لانے میں مدد دی۔ ہم نے جنگلات کی ترقی کے لئے ماہرین کو بھرتی کیا اور انھیں تربیت دی۔ تیسرے منصوبے کے دوران مجموعی خرچ تقریباً ۳۴۶۰ ملین (۳۴۶ کروڑ) روپے رہا۔

۱۹۶۶ء سے ہم نے درختوں کی جلد بڑھنے والی اقسام لگانے اور اپنی شجرکاری کی تکنک کو عصری بنانے پر زیادہ زور دیا۔ چوتھے منصوبے کے دوران جنگلات سے متعلق ہماری حکمت عملی کے تین اہم پہلو قرار دیے گئے۔

(الف) جنگلات کی پیداواری قوت بڑھانا (ب) جنگلات کی ترقی اور جنگلات پر مبنی صنعتوں میں ایک رابطہ قائم کرنا اور (ج) جنگلات کی ترقی کو دیہی معیشت کی ترقی کے ساتھ ہم آہنگ بنانا۔ چوتھے منصوبے کے دوران رقمی خرچ ۸۹۰ ملین (۸۹ کروڑ روپے) تھا۔ پانچویں منصوبے میں ۲۲۰۰ ملین (۲ ارب ۲۰ کروڑ روپے) کا خرچ عارضی طور پر منظور کرلیا گیا ہے۔

۱۹۵۲ء میں جنگلات سے متعلق قومی پالیسی کا جو اعلان کیا گیا اس میں یہ تجویز تھی کہ ملک کا ایک تہائی رقبہ جنگلات سے ڈھکا ہوا رہے گا، پہاڑی علاقوں کا ۶۰ فی صد اور میدانی علاقوں کا ۲۰ فی صد رقبہ۔ مرکزی حکومت کے زمین کی اصلاح و ترقی کے پروگرام کے تحت دس سال کے عرصے میں ۲۰۰ ملین (۲۰ کروڑ) درختوں کی تنصیب کا نشانہ مقرر کرلیا گیا ہے۔

ون مہاتسو کی قومی تحریک وسیع پیمانے پر شجرکاری کا ایک ذریعہ سمجھی جاتی ہے تاکہ ہمارے قومی مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔ شجرکاری کے سالانہ تیوہار، ون مہاتسو کا آغاز پہلی دفعہ ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ یہ محض ایک رسم نہیں بلکہ عمل کا ایک جامع پروگرام ہے۔

ہمارے عوام میں قومی معیشت کے لئے درختوں کی اہمیت کا احساس پیدا کرنا ہوگا۔ ہمیں یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ درختوں کی طرف سے لاپروائی ایک غیر ذمہ دارانہ عمل ہے۔ اور یہ قوم کی معاشی فلاح و بہبود سے مکمل بے حسی کا اظہار کرتی ہے۔

آج نوجوانوں نے جو پروگرام بنایا ہے کہ ہر نوجوان ایک پودا لگائے گا اور اسے پروان چڑھائے گا، اس نئے عالمی نقطۂ نظر کا جو نئی نسل میں تقویت پا رہا ہے ایک واضح اظہار ہے۔ یہ ایک عالمی رائے ہے جس کی بنا پر، ان ذرائع و وسائل کی حفاظت اور بقا جو انسانی نسل کی زندگی کو قائم رکھتے ہوں، ضروری قرار پاتی ہے۔ شجرکاری کی تحریک کی اہمیت اسی واقعے سے ظاہر ہے کہ آج انسانیت کو ایک خطرہ جو لاحق ہے وہ ماحول کی گندگی کا خطرہ ہے۔ اس خطرے کو فراموش کرجانا گویا اپنی تہذیب کے حشر سے بے پروا اور غافل رہنا ہے۔

شجرکاری کے پروگرام کو قومی پیمانے پر شروع کرنا پڑے گا۔ درخت

ایک ایک بھی، جھنڈ اور پٹیوں کی شکل میں بھی، پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں بھی لگائے جانے چاہئیں۔ یہ پروگرام صرف اسی صورت میں آگے بڑھ سکتا ہے جبکہ اس میں سرکاری اور غیر سرکاری اداروں اور نوجوانوں کی انجمنوں کا پر خلوص اشتراک حاصل کر لیا جائے۔ یہ بات بھی ستائش کے قابل ہوگی، اگر بعض متحدہ سرمایے کی تنظیمیں، ادارے اور صنعتی گھرانے دیہات کے ایک ایک گروپ کو چُن لیں، جہاں شجر کاری کے قابل زمین کا کافی رقبہ حاصل ہو سکتا ہو۔ اور وہ ان رقبوں میں نرسریاں اگانے، درختوں کے بن لگانے اور ان کے اچھی طرح جم جانے تک اُن کی دیکھ بھال کے ذمہ دار بنے رہیں۔

ہمیں جنگلات کی منصوبہ بند تنصیب کے لئے اپنی سرگرمیاں بڑھانی پڑیں گی۔ جنگلات کی مزید کاٹ چھانٹ کو جس کے نتیجے میں ماحول میں ابتری پیدا ہو جاتی ہے، روکنے کے لئے ہر طرح کوشش کرنی ہوگی۔

ایسے بہت سے رقبے جواب چٹیل میدان بنے ہوئے ہیں، ماضی قریب تک درختوں اور دوسرے نباتات سے سرسبز و شاداب رہے ہیں۔ اس لئے شجر کاری کی ایک عوامی اجتماعی پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

نوجوانوں کی تنظیمیں، خواتین کی انجمنیں، رفاہی سوسائٹیاں سب کی سب شجر کاری کے اس قومی کام میں ہاتھ بٹا سکتی ہیں۔ شجر کاری کے کلب اور دوسری ایجنسیاں بھی اس کام میں قابل لحاظ حصہ لے سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ شجر کاری کے "وارڈن" بھی مقرر کرنے ہوں گے جو رضا کارانہ بنیاد پر اس پروگرام کی عمل آوری کی نگرانی کریں گے۔

اگر ہم یہ عہد کر لیں کہ ہم ہر سال کم سے کم ایک ایک درخت ہی لگائیں گے تو مجھے یقین ہے کہ ہماری زندگی مادی طور پر اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے بھی، دونوں طرح سے مالا مال ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں میرا ذہن اس رواج کی طرف منتقل ہوتا ہے جو کیرالا کے بعض طبقوں میں پایا جاتا ہے۔ وہاں ہر گاؤں والے کے متعلق یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ پانچ درخت لگائے گا دو خود کے لئے، دو اپنی اولاد کے لئے اور ایک اس کی وفات پر لکڑی مہیا کرنے کے لئے۔

حکومت نے منصوبہ بند شجر کاری کے شعبے میں جو سرمایہ لگایا ہے وہ ذیل کے گوشوارے سے ظاہر ہوگا۔

منصوبے کی مدت	سرمایہ کاری: جنگلات کے شعبے میں (ملین روپے)	سرمایہ کاری: شجر کاری میں (ملین روپے)	جنگلات کے شعبے کے مقابلے میں شجر کاری میں لگائے گئے سرمائے کا فیصد تناسب	شجر کاری۔ مجموعی رقبہ (ہیکٹر)
پہلا منصوبہ ۱۹۵۱-۵۶ء	۸۵	۱۳	۱۵	۵۰۰۲۳
دوسرا منصوبہ ۱۹۵۶-۶۱ء	۲۱۲	۶۹	۳۲	۲۱۷۳۹۷
تیسرا منصوبہ ۱۹۶۱-۶۶ء	۴۶۰	۲۰۶	۴۵	۳۲۴۸۶۰
سالانہ منصوبے ۱۹۶۶-۶۹ء	۴۲۱	۲۲۶	۵۳	۳۱۹۸۶۰
چوتھا منصوبہ ۱۹۶۹-۷۴ء	۸۹۰	۴۴۵	۵۰	۵۹۰۰۴۰
پانچواں منصوبہ (مسودہ) ۱۹۷۴-۷۹ء	۲۲۰۵ (تخمینہ)	۷۹۰	۳۵	۱۷،۰۰۰۰۰ (نشانہ)

منظم شجر کاری کے کام کے لئے بھاری سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ بیج جمع کرنے، نرسریاں اُگانے، بن لگانے اور انھیں آگ اور دوسرے قدرتی حادثوں سے بچانے کے لئے خاص کوششیں اور محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ ہم اپنی معیشت کے تحت جس میں سرمایہ کم یاب ہے، ایسے ہی درختوں کو ترجیح دیں گے جن سے قلیل مدت میں پیداوار حاصل ہونے لگے۔ ساگوان، یوکلپٹس، بانس، بے پھل پودوں، درختوں کی مختلف ملی جلی اقسام، دیودار اور اسی قبیل کے درختوں کی پیداواری معاشیات کے کئی جائزے لئے جا چکے ہیں۔

ہماری حکمت عملی ایسی ہونی چاہئے کہ ہمارے استعمال کئے ہوئے اجزا کا زیادہ سے زیادہ بدل مل سکے اور ہمارے پاس ایسے درخت زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہوں جن کی بار آوری کی مدت مختصر سی ہو اور ان کے ساتھ ہی ساتھ دیر سے بڑھنے والے درخت بھی ہونے چاہئیں۔ ایسی حکمت عملی ہی اس بات کو یقینی بنا سکے گی کہ جنگلات کے شعبے میں کی گئی سرمایہ کاری کا بدل قومی سطح پر مطلوب شرح سے کم نہ ہو۔ کن اقسام کے درخت لگائے جانے چاہئیں، اس کے فیصلے کسی رقبے کی آب و ہوا، زمین کی سطح اور اس کی معاشی ضروریات پر مبنی ہونے چاہئیں۔ ایسے فیصلوں میں عوام کو بھی شریک کرنا پڑے گا۔ اسی لئے حکومتوں کی اسکیموں میں عوام کی کوششوں کا بھی اضافہ ہونا چاہئے۔

مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتیں جنگلات کے شعبے کو عصری بنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ بیجوں کی دریافت کی گئی نئی اقسام سے پیداوار بڑھانے کے لئے کام لیا جا رہا ہے۔ مخلوط اقسام کے پودے اگانے کا طریقہ بھی اختیار کیا جا رہا ہے تاکہ بالیدگی کی شرح تیز تر ہو جائے، لکڑی میں بہتر خواص آجائیں اور یہ روگوں اور کیڑوں کے حملوں کی مزاحمت بھی کر سکیں۔ ہم اس کی بھی کوشش کر رہے ہیں کہ مخلوط اقسام کے پودے جنگلاتی پیداوار میں بہتری اور اضافے کا باعث ہو سکیں۔ اگر ہم جنگلاتی شعبے میں جدید انداز نظر سے کام لیں تو اس سے ملک کو بہت فائدہ ہوگا۔

اعلیٰ پیداواری منطقوں کا تعین کرنے کے لئے کچھ سروے بھی ضروری ہوں گے تاکہ جنگلاتی شعبے میں سرمایے کی پیداوار کی شرح بڑھ جائے۔

جنگلات ہماری قومی آمدنی میں اضافے کا ایک بڑا ذریعہ ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جنگلات کا وجود انسان کے لئے صحت بخش ماحول کی ناگزیر شرط ہے۔ درختوں کی فکر رکھنا، اپنی قوم کی فلاح و بہبود اور بنی نوع انسان کی بقا سے اپنے تعلق خاطر کا اظہار ہے۔



معذور افراد کے لیے امید کی کرن

پیدائشی نقص، حادثہ اور بیماری انسان کو معذور اور مفلوج بنا دیتی ہے۔ جسم کا کوئی عضو بے کار ہو جائے تو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ جو کسی وجہ سے معذور ہو جاتے ہیں۔ ان کی اپنی زندگی تو نہایت کٹھن حالات میں بسر ہوتی ہی ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ خاندان کے لوگوں کو بھی سخت ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ایسے لوگ سماج پر بوجھ بن جاتے ہیں اور اکثر نہایت بے بسی کے عالم میں زندگی گزارتے ہیں۔

یہ خالص انسانی مسئلہ ہے اور حکومت کا فرض ہے کہ ان کی دیکھ بھال کرے اور ان کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں مدد دے۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے اس سلسلے میں متعدد اقدام کیے ہیں اور بہت سی رضاکار انجمنیں بھی حسب استطاعت کام کر رہی ہیں۔ مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ پورا سماج ان کے تئیں ہمدردی کا اظہار کرے، ترس کھا کر نہیں بلکہ ان میں خود اعتمادی پیدا کرکے۔ دیکھا گیا ہے کہ ایسے لوگ بڑے محنتی، ایماندار اور نیک ہوتے ہیں۔ اگر ان کو مناسب اور موزوں کام پر لگایا جائے تو یہ بڑے اچھے کارکن ثابت ہوتے ہیں۔

ملک میں بصارت سے محروم افراد کے لیے ۱۴۰ مرکز ہیں۔ دہرہ دون میں قومی مرکز قائم ہے۔ جہاں نابینا بچوں کا ماڈل اسکول، نابینا بالغوں کے لیے تربیتی مرکز، پڑھائی لکھائی کے ساز و سامان کی تیاری، محفوظ ورکشاپ، بریل کی کتابیں اور پریس اور ایک قومی لائبریری موجود ہے۔ اس کے علاوہ کلکتہ، دہلی، بمبئی اور مدراس میں اساتذہ کو تربیت دینے کے مرکز قائم ہیں۔ جہاں سے ہر سال تقریباً ۵۰ اساتذہ کو ٹریننگ دی جاتی ہے۔

بہروں کے لیے حیدرآباد میں ایک قومی مرکز قائم کیا گیا ہے۔ یہاں بالغوں کے لیے ایک ٹریننگ سنٹر اور جزوی طور پر بہرے بچوں کے لیے اسکول قائم ہے۔ یہاں مختلف حرفوں کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ مختلف ریاستوں میں بھی گونگے اور بہرے بچوں کے لیے اسکول قائم ہیں۔

جسمانی طور پر معذور افراد کے لیے کلکتہ میں ایک قومی مرکز قائم کیا جا رہا ہے۔ یہاں تحقیقات، عملے کی ٹریننگ اور آباد کاری کے مسائل پر خاص توجہ دی جائے گی۔

دماغی طور پر کمزور بچوں کے لیے دہلی میں ایک ماڈل اسکول قائم ہے اس میں چھ سے پندرہ سال کی عمر کے بچے داخل کیے جاتے ہیں۔ انھیں حرفے بھی سکھائے جاتے ہیں۔ رضاکار انجمنوں کو مدد دی جاتی ہے۔ ۱۹۷۴-۷۵ء میں ۸۲ر۸۵ لاکھ روپے کی امداد دی گئی تھی۔ جسمانی طور پر معذور افراد کے لیے ملک میں روزگار کے ۱۳ خصوصی دفتر کھولے گئے ہیں۔ پانچ ایسے دفتر جلد ہی قائم کیے جائیں گے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۴ء تک ان دفاتر کے ذریعے ۱۳،۲۰۰ معذور افراد کو ملازمت دلائی گئی تھی۔ مرکزی حکومت کا سماجی بھلائی کا محکمہ اندھے بہرے اور معذور طالب علموں کو عام اور ٹیکنیکل تعلیم کے لیے وظیفہ دیتا ہے۔ ۱۹۷۴-۷۵ء میں ۵۰۵۰ وظیفے جاری کیے گئے تھے۔

جو معذور کارکن نہایت اچھے اور کارکرد قرار دیے جاتے ہیں انھیں قومی ایوارڈ دیے جاتے ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں ایسے ۱۶ افراد کو یہ ایوارڈ دیے گئے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ آج ہمارے ملک میں معذور افراد کی بہتری و بہبود کے متعدد پروگرام چل رہے ہیں۔ انھیں تعلیم و تربیت کے بعد روزگار فراہم کیے جا رہے ہیں، انھیں وظیفے اور مالی امداد دی جا رہی ہے۔ تاہم ابھی اس سلسلے میں اور زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ یہ بدنصیب لوگ سماج میں باعزت زندگی بسر کر سکیں۔

معذور افراد کو مصنوعی اعضا کی تیاری سے بہت مدد ملی ہے ہاتھ اور پیر سے محروم افراد ان مصنوعی اعضا کی مدد سے نارمل زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ نئی دہلی میں آرٹی فیشل لمز مینوفیکچرنگ کارپوریشن کے علاوہ پونا، کان پور اور کلکتہ میں بھی اس طرح کے ادارے موجود ہیں جہاں مصنوعی ٹانگیں، ہاتھ، بیساکھیاں خاص قسم کی گاڑیاں اور کرسیاں اور دیگر سامان تیار ہوتا ہے۔

کانپور کا مرکز نومبر ۱۹۷۳ء میں قائم ہوا ہے اور اس کا سنگ بنیاد شریمتی اندرا گاندھی نے رکھا تھا۔ اس کارخانے میں ۸۷ قسم کی چیزیں تیار ہوں گی جو مصنوعی اعضا میں استعمال ہوتی ہیں۔ کارپوریشن کے چیرمین ملک کے نامور ڈاکٹر آر سنکرن ہیں۔ ان کی نگرانی میں یہ ادارہ بے حد مفید کام کر رہا ہے۔ بہت جلد اس ادارے میں ایسے اعضا تیار ہونے لگیں گے جو سستے اور مفید ثابت ہوں گے۔



پونا میں مصنوعی اعضا تیار کرنے کا کارخانہ

مصوّری کی بد

انیس فاروقی

للت کلا اکاڈمی، رابندر بھون، نئی دہلی میں ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو کل ہند قومی نمائش کا افتتاح صدر جمہوریۂ ہند جناب فخرالدین علی احمد کے دست مبارک سے ہوا۔ افتتاح کے موقع پر للت کلا اکاڈمی کے چیرمین جناب رام نواس مردھا نے جناب صدر کا شکریہ ادا کرتے ہو للت کلا اکاڈمی کی سالانہ کارروائیوں پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی اور گورنمنٹ کے سامنے بہت سی تجاویز پیش کرتے ہوئے جناب صدر سے ان معاملات میں ذاتی دلچسپی لینے کی درخواست کی۔ حالیہ قومی نمائش کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اس نمائش میں ۹۴۷ فنکاروں کے ۱۵۹۸ فن پارے موصول ہوئے۔ جناب جے سوامی ناتھن، جناب کشن کھنہ اور جناب جیرم پٹیل پر مشتمل جیوری نے اپنی چار دنوں کی بیٹھک میں ۱۹۷ فنکاروں کی ۱۷۰ تصادیر، ۶۵ گرافکس اور ۳۶ مجسموں کا انتخاب کیا جنھیں نمائش کے لیے پیش کیا گیا۔ مجسموں کی نمائندگی اس بار بھی نسبتاً کم ہی رہی۔ جیوری نے سات نوجوان فنکاروں کو اکاڈمی کا قومی ایوارڈ عطا کیا۔ فنکاروں کے نام یہ ہیں۔ پربھاکر باروے کی تصویر "بلیو کلاوڈ" (نیلا بادل)، امی تواداس کی تصویر "ریڈ کلاوڈ، اے" (لال بادل، ا)، امرت پٹیل کی تصویر "پینٹنگ ا" نسرین محمدی کی "ڈرائنگ ا" گوردچرن کی "ڈرائنگ ۶" مرنالنی مکھرجی کا مجسمہ المتاش سیپلنگ (پودا)، اور ناگجی پٹیل کا مجسمہ "پنک بسٹ" (گلابی دھڑ)۔ ہر فن کار کو مبلغ ۵ ہزار نقد اور سرٹیفکٹ دیے گئے۔

جیوری نے دوسرے ۴۴ فنی شاہکاروں کا خصوصی طور سے تذکرہ کرتے ہوئے ایک نئی روایت کا آغاز کیا ہے۔ اس بار انعامات تقسیم کرتے وقت جیوری کے ایک ممبر کشن کھنہ نے اسٹیج پر انعام حاصل کرنے والے فنکاروں کی سوانح حیات کا خاکہ پیش کرتے ہوئے ان کے متعلقہ فنی شاہکاروں اور ان کے تجربوں پر بھی مختصر الفاظ میں روشنی ڈالی۔ صدر جمہوریہ نے اپنی افتتاحی تقریر میں فنکاروں کو مبارکباد دیتے ہوئے ہندوستان کے فنی ارتقا پر اپنی مسرت کا اظہار کیا لیکن ایک بڑی اہم بات بھی کہی جس کا لب لباب یہ ہے کہ فنکاروں کو اپنے فن کو سے قریب سے قریب تر لانے پر توجہ دینی چاہیے۔

جیوری نے اس نمائش میں حصہ لینے والے مصوروں، فن کاروں پر مختصراً مگر مختلف زاویے سے تبصرہ کیا ہے۔ بہر حال ان کے اس نظریے سے ضرور اتفاق کیا ہے کہ اس نمائش میں گو کہ نوجوان فنکاروں کی زیادہ نمائندگی ہے۔ لیکن اس نمائش میں کہنہ مشق فنکاروں کے شاہکار بھی ہوتے تو ہندوستان کی ہمعصر مصوری اور مجسمہ ساز صحیح اندازہ ہو سکتا تھا۔ بہر حال اگر ہم پوری نمائش کا تاریخ کی روشنی میں تنقیدی جائزہ لیں آتا ہے کہ کم و بیش سبھی فن پارے مستند بین الاقوامی جدید طرز یا نظریۂ فکر سے یا تو اخذ کیے گئے ان کا زبردست تاثر ملتا ہے۔ کہیں کلی، کہیں ڈومیے، کہیں ایلس کا گاوا کہیں جنزد، کہیں فن تو کہیں "منی مل آرٹ" کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ عام طور سے فنی حلقہ میں اس بات کیا جارہا ہے کہ للت کلا اکاڈمی کے زیر اہتمام جو ہر تین سال بعد بین الاقوامی نمائش ٹرینے منعقد ہوتی ہے اس کی زبردست چھاپ ہماری سالانہ قومی نمائش میں دیکھنے کو ملتی ہے کی نظر میں ہو سکتا ہے کہ ایسے اقدام قابل قبول ہوں لیکن میرے خیال میں یہ تقلیدی ذہنیت ملک کی تخلیقی اور اختراعی کاوشوں کی صحیح عکاسی نہیں کر سکتی۔ اس ذہنیت کو پروان چڑ



ریڈ کلاوڈ "A" عمل: امی تواداس



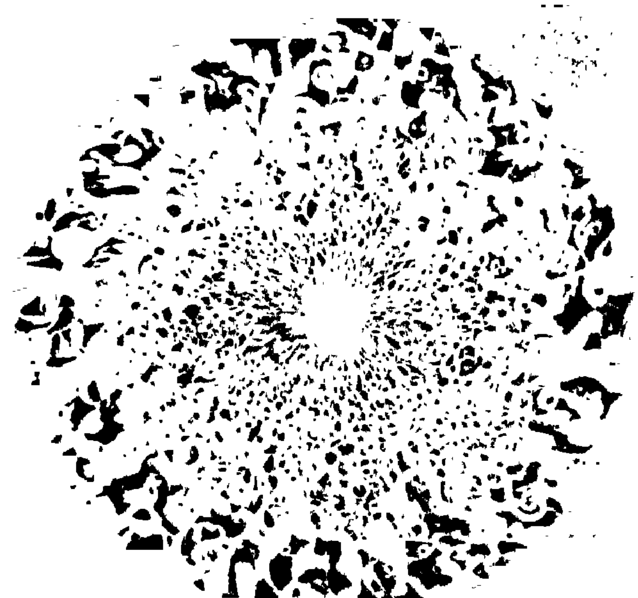
پنک بسٹ
عمل: ناگجی پٹیل

نیشنل گیلری آف ماڈرن آرٹ، جے پور ہاؤس، نئی دہلی

سنہ ۱۹۷۶ء کی قومی نمائش

ذداری زیادہ تر ہمارے فنی قائدین اور خصوصاً ان حضرات پر عائد ہوتی ہے جو قومی نمائش میں ال کیے جانے والے فنکاروں کا انتخاب کرتے ہیں اور ایوارڈ کی سفارش کرتے ہیں۔ میرے یال میں فنکاروں کی اس تقلیدی ذہنیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کیونکہ مستند مغربی اور ریہ فنی گھرانوں کی تقلید ہندوستان میں علی الاعلان کی جاتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ملک کی آزادی ے آج ۲۹ سال بعد بھی جدید مصوری و مجسمہ سازی میں بین الاقوامی سطح پر کوئی انفرادی مقام حاصل یں کرسکے۔ بین الاقوامی فنی میلوں میں کہیں کہیں ہندوستانی فنکاروں کو انعام مل جانے سے بھلے ہم اپنے دل و دماغ کو تسکین دے لیں لیکن حقیقت چشمۂ سراب سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

میرے خیال میں وہ فنکار داد تحسین کے زیادہ مستحق ہیں جو ان حالات میں بھی ایک ایسے لوں کے اختراع کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں جس میں کم از کم کسی حد تک ہندوستانی انفرادیت کی لک ملتی ہے۔ ریڈیپا نائڈو، پی۔ ٹی ریڈی، جی آر سنتوش، گوتم وگھیلا، جانکی رام چند ایسے موہی فنکار ہیں جن کی فنکارانہ کوششوں سے ایک خوبصورت فنی مستقبل کی امید کی جاسکتی ہے ں میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے فنکار میڈیم (محلل) اور میٹیریل (فنی ساز و سامان) کو استعمال کرنے ن بخوبی جانتے ہیں اور کسی بھی بین الاقوامی شہرت یافتہ یا مستند فنکار سے ان کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے لن نہیں کیا مصور کرنا چاہیے ان کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے یہ مسئلہ ابھی تک وہ حل نہیں کرسکے۔ اسی لیے ہری قومی نمائش دیکھنے کے بعد ہمارے دماغ میں کوئی خاص تاثر نہیں پیدا ہوتا۔



ڈرائنگ VI عمل : گورچرن سنگھ

اس نمائش میں بہرحال کچھ ایسی اشیا ضرور ہیں جو عام انسانوں کے لیے چند لمحوں کے لیے کشش کا باعث بن سکتی ہیں مثلاً چندر کانت بھٹ کا گھومنے والا مجسمہ "کانسٹرکشن" قابلِ ذکر ہے حالانکہ اس قسم کے مجسمے مشہور فنکار امرناتھ سہگل پہلے ہی تخلیق کرچکے ہیں۔ یہ اڑتی ہوئی ایک چڑیا کے پنکھ کی ساخت لیے تجریدی مجسمہ ہے جو بجلی کے ایک پنکھے کے سامنے رکھا ہوا ہے جس کی ہوا کے زور سے یہ دھیرے دھیرے گھومتا رہتا ہے۔ اس کے قریب ہی مکل بنوار کا ایک مجسمہ ہے جس میں لوہے کا پائپ ویلڈنگ کرکے انسان جیسی شکل دکھائی گئی ہے جو عوام کے لیے دلچسپی کا باعث ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ "جوڑ توڑ" کا فلسفہ جدید فن کی تاریخ میں ۷۰ سال پرانا ہوچکا ہے۔ پیرس اور بعد ازآں امریکہ میں اس صدی کے اولین سالوں میں اس طرز پر کافی طبع آزمائی کی جاچکی ہے۔

اسی طرح تصاویر کے گروپ میں پرمجیت سنگھ کی دو تصاویر (کیٹلاگ نمبر ۱۵۴، ۱۵۳) "پینٹنگ ۱" اور "پینٹنگ ۲" میں روشنی کے مختلف اثرات کو سامنے رکھ کر پرکشش منظر مصور کیے گئے ہیں یہاں کچھ استعجابیت کا شائبہ تو ہے لیکن بات پھر وہیں آکر رک جاتی ہے کہ مونے نے جس خوبصورتی سے روشنی کے اثرات کا خاکہ اپنے فن میں کھینچا ہے اس کا کوئی یہاں مقابلہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔



المائش سیلنگ
عمل : مرنالنی مکھرجی

ویدنائر کے تین کمپوزیشن جو کم و بیش تجریدی ہیں بجس نما انداز میں پیش کیے گئے ہیں لیکن اگر ہم ریمانڈ ویڈلک موسان اور جنین موبخلا کے مشہور بجس کمپوزیشن دیکھیں جنھیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے تو ویدنائر کے ان تخلیقوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی بات اتنی کہنے کی ہے کہ فن کی دوڑ میں آنا تو ہو کہ پہلے جو ہوچکا ہے اس سے اچھا کرکے دکھایا جائے یا پھر واقعتاً کوئی تخلیق یا اختراع ہو جو پہلے کسی نے نہ کی ہو چاہے وہ فلسفیانہ پہلو رکھتی ہو یا بصری دو جہتی یا سہ جہتی شکل لیے ہوئے ہو ـــــ اب اگر صرف خط اور رنگ ہی کی زبان کے

باقی صفحہ ۱۱

فلسفہ کو سامنے رکھ کر (جسے جدید فنی تنقیدی فلسفہ کی معراج کہا جاتا ہے) اس قومی نمائش کا جائزہ لیا جائے تو بھی حالت زیادہ اطمینان بخش نظر نہیں آتی۔ ایسا لگتا ہے کہ اس مغربی فنی فلسفہ نے دورِ حاضر کے ہندوستانی فنکاروں کو کافی پریشان کر رکھا ہے۔ جو کچھ بھی یہاں نظر آتا ہے اس سے یہ گمان قوی ہو جاتا ہے کہ ہمارے فن کار یا تو ان بنیادی اصولوں کے صحیح فنکارانہ استعمال اور اس کی رمزیت سے ناواقف ہیں اور اس فلسفہ کی آڑ لے کر اندھیرے میں بے معنی تیر چلا رہے ہیں۔ یا پھر اس فلسفہ کو وقت کی فقط پکار یا تقاضے کے تحت تجربہ برائے تجربہ پیش کر رہے ہیں کیونکہ ان کے سامنے کوئی لائحہ عمل نہیں ہے۔ مغرب میں جس وقت اس تجریدی فلسفہ کی بنیاد رکھی گئی تو اس کے پیچھے ایک خاص لائحہ عمل تھا جس کی رو سے ہم مغربی شاہکاروں سے خصوصی پیغام حاصل کرتے ہیں جہاں سطحی بیانی کیفیت نہیں ہوتی بلکہ رمزیت اور اشاریت سے بدرجہ اتم کام کیا جاتا ہے۔ وہ اشارے ایک مسلمہ حقیقت اور خالص کیمیائی نتائج کی طرح ہمارے سامنے آج بھی ۷۰ سال بعد زندہ ہیں۔ اگر ہم خطوط اور رنگوں کے کرداروں کو محض ڈیزائن کے اسٹیج پر ہی لاکر کھڑا کر دیں گے اور ان سے کوئی بامعنی ڈائیلاگ نہ کہلوائیں گے تو یہ صرف کٹھ پتلی کے تماشہ سے زیادہ کچھ نہ ہو سکے گا جس سے وقتی اور سطحی طور پر اطمینان بھلے ہی ہو جائے لیکن دیرپا تاثر پیدا نہ ہو سکے گا۔ قاضی شبیر حسن، اوم پرکاش، منو پارکھ، ہمت شاہ، اور نند کٹیال جیسے نوجوان فنکار اگر اپنے فن میں کوئی معنی پہنا سکیں تو خالص فن کے نظریہ کو ہندو   بڑی تقویت ملے گی۔

کم و بیش یہی بات استعمابیت پر عمل پیرا فنکاروں پر بھی عائد ہوتی ہے۔ یہ وہ نظریہ فن ہے جو ۱۹۱۶ء میں یورپ میں شروع ہوا لیکن ہندوستان میں اسے ساتویں دہائی میں شروع کیا گیا۔ بہ حال اس نمائش میں بکش بھٹا چارجی اور لکشما گوڈ کی تصاویر جو اس نظریۂ فن کی نمائندگی کرتی ہیں قابل ذکر ہیں۔

اس نمائش سے متعلق اعداد و شمار کا جائزہ لینے پر واضح ہو جاتا ہے کہ تقریباً ایک ہزار فنکار ہندوستان میں کام کر رہے ہیں۔ اور ہمیں یہ امید کرنا چاہیے کہ ہمارے ملک کے قومی فنی وقار کو بڑھانے میں ان کی فنکارانہ صلاحیتیں دن بدن اجاگر ہوں گی اور ہم ایک دن مغربی ذہنیت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار دیں گے۔

بقیہ رشید احمد صدیقی

عدم صلاحیت بے راہ روی یا کج ایمانی کو زندہ کرداروں کے آئینہ میں ترچھی نظر سے دیکھا ہے اور زمانے کی نبض پر ان کا اس طرح ہاتھ رہا ہے جیسے کسی فلسفی طبیب کا ہو جو نشتر چلانے سے پیشتر مرض کی شدت سے بخوبی واقف ہونے کی وجہ سے مریض کی دلجمعی کے لیے مسکرا کر اسے حوصلہ دلا رہا ہو۔

رشید احمد کا ماحول کبھی ایک زندہ طنز ہے۔ کچی بارک پر بارش برسے یا کھچڑی پکے، شعر و سخن کی انجمن سجے یا الیکشن ہوں۔ پکی بارک سے لفظی چپقلش ہو یا علمی مباحثے سبھی زندہ ماحول کی تازگی اور شگفتگی کا سامان مہیا کرتے ہیں اور ایک خاص تہذیب اور بود و باش کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں علی گڑھ اپنی تمام تابناکیوں اور پیاری پیاری کوتاہیوں کے ساتھ رشید صاحب کے ہاں زندہ ہو گیا ہے یا یوں کہیے کہ انھوں نے تاریخ و تمدن کی طویل داستان ایک ہلکے پھلکے یاد رہنے والے انداز میں بیان کر دی ہے۔ سنجیدہ ہو جائیے تو کئی کروٹیں بدلنے گا اور نہ سمجھ میں آئے تو یہ کہہ کر گذر جائیے گا کہ "یہ پرانے لوگ ہیں یہ"۔ یہی نہیں رشید صاحب نے اُردو ادب پر ایک اور احسانِ عظیم بھی کیا ہے۔ وہ غالباً پہلے باخبر مزاح نگار ہیں جنھوں نے طنز و مزاح کو ایک باقاعدہ فن کی اہمیت دی ہے۔ رشید صاحب سے قبل کی طنز و مزاح کی تاریخ کوئی بہت طویل تو نہیں۔ لے دے کے سودا، مصحفی، انشا، غالب اور اکبر رہ جاتے ہیں یا ان کے ہم عصروں میں ملا رموزی، سرشار، فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی وغیرہ ہیں۔ لیکن کسی فنکار نے اپنے فن کے مختلف پہلوؤں پر اس قدر گہری نظر نہیں ڈالی جس قدر رشید صاحب نے ڈالی ہے۔ رشید صاحب کی "طنزیات و مضحکات" طنز و مزاح کا حق ادا کرتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر رشید صاحب اردو ادب کے ایک ایسے مزاح نگار ہیں جو اس فن کو محض رونقِ محفل بننے یا دوسروں کو خوش کرنے کے لیے نہیں بلکہ سماج، سیاست، مذہب اور ادب میں ایک خاص نظر پیدا کرنے کے لیے بروئے کار لائے۔ ان کی یہ شعوری کوششیں انھیں اس خاص صنفِ سخن میں ایسے مقام پر لے جاتی ہیں جہاں کسی کا گذر نہیں ہوا۔

بقیہ علامہ اقبال

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا   مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

چوتھے شعر پر آنکھیں نم آلود ہو گئیں اور پانچویں پر اطفال اشک حلقہ چشم سے امنڈ پڑنے کو بے قرار سے

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام   اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں
کہہ گئیں رازِ محبت پردہ داریہائے شوق   تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں

اور جب اس شعر پر پہنچے سہ

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک   جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

تو آنسو عرصہ رخسار طے کر کے دامن میں گرنے لگے تھے۔ رقت کے باعث شعر صاف نہ پڑھا گیا مگر پڑھا اور پھر شدت جذبات میں گم اسے دُہرانے لگے اور اس کے بعد سنبھل گئے۔ ماحول کا اثر کہیے یا خلوص جذبہ کا جادو کہ ہم نشینوں میں سے اکثر کے آنسو تیر گئے۔

ڈاکٹر صاحب کے فسونِ نغمہ سے اثر لے کر ہم نے بھی ان کے قافیہ اور ردیف کی پابندی سے غزلیں کہیں۔ تاثیر کا کوئی شعر یاد نہیں، اپنے لغو ہیں اور پنڈت کے واقعی سننے کے قابل سہ

ذہن میں قومیت، احساس محبوس وطن   وائے نادانی قفس کو آشیاں سمجھا تھا میں
ہاتھ شل ہوتے رہے بہر دعا اٹھتے رہے   تیری بے مہری کو اپنا امتحاں سمجھا تھا میں
سستی ایماں کا کچھ باعث ہے ورنہ ایک ن   آتش نمرود کو بھی گلستاں سمجھا تھا میں
آہ سوداگر ہی تھے وہ دوست بھی اختر جنہیں   بے نیاز کاوش سود و زیاں سمجھا تھا میں

ممی اتنی خوش ہوئیں کہ اس کے ڈاکٹر ہونے کا اعلان کر ڈالا۔ اس اعلان پر بٹن پھولی نہ سماتی تھی۔ لیکن جب سائنس کی کتابیں کھلیں تو بٹن نے محسوس کیا کہ لوہے کی چنے چبائے نہ جائیں تو تھوکے تو جا سکتے ہیں۔ لیکن کیمسٹری، بیالوجی، نہ چبائی جاتی ہے، نہ نگلی جاتی ہے۔ رہ گیا آخ تھو کر کے تھوک دینا، سوا سے ممی نے ناممکن بنا دیا تھا۔ کہاں ممی اس لفظ کو ڈکشنری سے نکال لے چلی تھیں کہاں اس لفظ کو بٹن کی زندگی میں ٹانک کر رکھ دیا۔

پہلے ہی امتحان میں وہ ناکام ہو گئی۔ سوالات کے پرچے عفریت بن کر ڈراتے تھے۔ سفید سفید جوابات کی کاپیاں بٹن کے قلم کے لمس کو ترستی تھیں اور بٹن کے دماغ میں سرکس کے جوکر کی الٹی ٹوپیوں کی طرح اڑنے والے بگولے سائیں سائیں کرتے گھستے تھے۔ بٹن چاہتی تھی کہ رو پڑے لیکن امتحان ہال گھر کا گوشہ تو تھا نہیں اور اسی لیے بٹن رو نہ سکی۔ پرچہ دے کر گھر لوٹی تو ممی نے پوچھا۔

"کیسا کیا بٹن؟"

کہنے لگی "بہت اچھا کیا ہے، بہت اچھا۔"

گھر میں چمگادڑیں اڑتی پھریں تو کیسا لگتا ہے۔ بٹن جب ممی سے کہہ رہی تھی کہ پرچہ بہت اچھا کیا تو یوں لگا کہ سینے میں چمگادڑیں اڑ رہی ہیں اور ابا میاں اڑاتے پھر رہے ہیں۔ یہ ابا میاں ایک ہی منحوس آدمی ہیں۔ اڑتی چمگادڑیں یوں گن لیتے ہیں جیسے سب کی سب انھیں کی چھوڑی ہوئی ہیں۔

ممی نے پکارا۔ رحیمن ذرا بٹن کے لیے دودھ لانا، ہارلکس لانا ـــــ میں سب سے پہلے رحیمن کا علاج تم سے کرواؤں گی ڈاکٹر ـــــ" دو تین گولیاں ایسی دینا کہ اس کے جوڑوں کا درد بھری جوانی کی امنگیں بن جاتے۔"

"ہاں بیٹا جلد سے جلد بن جاؤ ڈاکٹر۔ یہ امتحان کامیاب کر لوگی تو گولیاں دوگی نا مجھے؟"

"اور سنو، ڈاکٹر بی بی۔ ذرا میرا بھی خیال رکھنا۔ مفت لال ہوں۔ سو سب دوا مفت لوں گا ـــــ" دروازہ میں داخل ہوتا ہوا لانڈری والا بٹن کے دھلے اجلے کپڑے ممی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہتا۔"

عظو آنٹی تاک میں رہتیں۔ مکان جو سامنے ہی تھا، کھڑکی کھلتی اور چق ہٹا کر وہ آواز دیتیں ـــــ "بٹن کی ممی ـــــ بٹن کی ممی۔"

"ہاں آپا ـــــ"

"بٹن کی ممی وہ پلا دیا تھا نا بٹن کو؟"

"ہاں آپا پلا دیا تھا۔"

"آیت پڑھ کر پھونکی تھی نا؟"

"ہاں آپا ـــــ پچپن بار ورد کرنے کو کہا تھا نا تم نے۔"

"کیسے کیسے پرچے اس نے؟"

"بہت اچھے کیے ہیں، خوش خوش آئی ہے۔"

بٹن مسکرا مسکرا کر یہ سب سنتی۔ لیکن کون جانتا تھا کہ بٹن مسکرا نہیں رہی ہے، بس سینے میں پھڑ پھڑاتی چمگادڑیں اڑا رہی ہے۔

بابا آتا ہوا نظر آتا تو بٹن جل کر رہ جاتی۔ الجھی الجھی، بھٹکی بھٹکی نظریں چہروں پر ڈال کر چپ کے سے گزر جانے والا بابا کچھ کہے سنے بغیر غم اور خوشی کے درمیان خطوط کھینچتا پھرتا تھا۔ بٹن مسکرانا بھول جاتی تھی۔ اس کو وحشت سی ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مسکرائے گی تو بابا چیخ پڑے گا۔

مسکرا رہی ہو بٹن کہ زخموں پر نمک چھڑک رہی ہو۔

اور وہ منہ پھیر لیتی۔ کتنی ہی چمگادڑیں بابا ہنکاتا ہوا لاتا اور سب کی سب بٹن کے سینے میں چھپ جاتیں۔ اس لیے کہ بٹن کے سینے میں بہت زیادہ اندھیرا ہوتا اور وہ ٹہوکا لگا کر اپنی امی سے کہتی ـــــ "ممی ممی، بابا آ رہے ہیں۔"

"تو آنے دے۔ ـــــ پچپن بار تو کیا ہے۔ ایک سو پچیس بار آیتیں ورد کر کے پھونکوں گی۔ خدا کا کلام ہے۔ کچھ ان کا الٹا سیدھا لکھا تو ہے نہیں۔"

"وہ تو پھونک لینا ممی ـــــ پر وہ اگر پوچھیں کہ پرچے کیسے کیے تو پھر میں کیا کہوں؟"

بٹن کو اپنی کہی ہوئی بات کا فوراً ہی احساس ہو جاتا۔ جب وہ مطمئن ہے جب اس نے پرچے اچھے کیے ہیں تو اس میں ممی سے پوچھنے کی کیا بات ہے۔

"کیسے کیے پرچے بٹن؟"

بٹن کو یوں لگتا جیسے بابا کہہ رہا ہے۔ میں جانتا ہوں تم نے پرچے خراب کیے ہیں۔ وہ بے دلی سے ٹال جاتی ـــــ ٹھیک ہی کیے ہیں۔"

ٹھیک ویک نہیں، بہت اچھے کیے ہیں ـــــ کہتی کیوں نہیں راجہ۔ ممی اس طرح بجلی بن کر گرتیں کہ سارے میں آگ لگ جاتی۔

بابا دبی زبان میں کہتا ـــــ "تم بگڑو مت بھئی ـــــ بہت اچھے پرچے کر کے کم بتلانا دانش مندی ہے۔"

اجی چھوڑیے بھی یہ دانش مندی کسی اور کو سکھائیے ـــــ وہ دراصل آپ سے گھبراتی ہے۔ آپ کو دنیا بھر کی باتوں کا تو یقین آتا ہے لیکن جھوٹی ہے تو بٹن ہے ـــــ جھوٹی ہوں تو میں ہوں۔ آپ ہماری بات پر یقین کب کرتے ہیں ـــــ اب وہ کیا خاک بتلائے گی کہ اس نے بہت اچھے پرچے کیے ہیں۔ اچھے پرچے تو بس آپ کے خاندان کی لڑکیاں ہی کرتی ہیں۔"

بابا کھڑا مٹ مٹ کبھی بٹن کا، کبھی ممی کا چہرہ تکتا۔ یوں لگتا جیسے اس کی آنکھوں میں کوئی سمندر رکھڑا ہے جو ابل پڑے گا تو سب کو لے ڈوبے گا۔

بٹن کو بابا کے اس ہارے ہوئے وجود سے گھن آتی اور وہ ممی کے زانو پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیتی۔

بابا کچھ کہے سنے بغیر لوٹ جاتا اور بٹن اسے واپس جاتا ہوا دیکھ کر ممی سے چمٹ جاتی۔

بابا کتنا خطرناک آدمی ہے بٹن سوچتی۔ مستقبل کی یوں نشان دہی کرتا ہے جیسے ہماری ہتھیلیوں کی لکیریں اسی کے قلم کی رہین منت ہیں ـــــ کھڑا کھڑا چپ چپ سا، یوں دور دور تک دیکھتا جیسے آنے والے دنوں کو دیکھ رہا ہو۔

جی چاہتا ہے اس کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔

بیر بہوٹی کو چھو لیں تو کس طرح پیر سکیڑ لیتی ہے۔ کسی لمس سے واسطہ نہیں چھونے والے انسانی ہاتھ ہوں یا سوکھے ڈنٹھل۔

بٹن سوچتی میری روح بیر بہوٹی کی طرح پیر سکیڑ کر کہیں میرے اندر ہی بیٹھ گئی ہے۔ اس روح کو بابا نے پہلی بار اس وقت چھوا تھا جب میں ساتویں جماعت میں فیل ہوئی تھی۔ لیکن ممی آڑے آئیں۔ اور مجھے ایک دم سے میٹرک میں بٹھا دیا ——— کیسا اچھا لگتا تھا جب میں اپنی سہیلیوں سے کہتی تھی میں میٹرک میں پڑھتی ہوں۔

ممی کہتیں ——— "بٹن تو میٹرک کا امتحان دے رہی ہے"

اماں میری ——— "اتی سی جان اور میٹرک کا امتحان"

کوئی کہتا ——— "تو میٹرک کا امتحان دے گی بیٹا؟"

مجھے لگتا ممی کیسی پیاری سی ہیں۔ کیسی میری اہمیت خاندان بھر میں بنا کر رکھ دی ——— بابا نے بہت سر پیٹا کہ میں اپنے اسکول سے نکلوں، اسی کلاس میں پڑھوں جس میں فیل ہوئی ہوں، لیکن ممی نے وہ آڑے ہاتھوں بابا کو لیا کہ اس کی ایک نہ چلنے دی اور وہ بھی بیر بہوٹی بن بیٹھا، مجھے کتنی خوشی ہوئی، لیکن پاؤں سکیڑ کر چپ رہتے رہتے بابا نے ایک کینہ پن یہ کیا کہ میرے مستقبل کے بارے میں بغیر زائچہ دیکھے بہت کچھ کہہ گیا۔ ممی لیکن اس سے ڈری نہیں۔ ممی تو بابا کی ہر بات کو چیلنج سمجھ کر قبول کر لیتی تھی۔ وہ گھگھیا جاتا تھا۔ پھر بیر بہوٹی بن جاتا تھا ——— اور میں ——— میں تو دل ہی دل میں تالیاں بجاتی تھی۔

جی چاہتا تھا چلا کر کہہ دوں ——— دیکھو دیکھو یہ بابا ہے یا بیر بہوٹی۔

لیکن دن گزرتے گئے تو میں سوچنے لگی ——— یہ بابا بیر بہوٹی تھا یا کاتبِ تقدیر تھا۔ اور میری روح میں کوئی چیز تیزی سے سکڑ گئی ——— اور بابا آہستہ آہستہ میری تعلیم سے بے تعلق ہوتا گیا۔ ممی جو چاہے کرتی رہیں۔ کون کہتا ہے کہ اس نے میرے لیے برا کیا ——— ایک دن ممی نے کسی کتاب میں پڑھا تھا۔ "سچ برداشت نہیں ہوتا ہے" وہ پڑھ رہی تھیں۔ میں سن رہی تھی۔ جانے کیوں میرا خیال بابا کی طرف چلا گیا۔

اور جب ممی نے آگے پڑھا کہ سچ کبھی مر نہیں سکتا ——— تو میں نے کتاب جھپٹ لی اور پھینک دی۔ ممی نے برہم ہو کر مجھے دیکھا ——— میں اس سے لپٹ کر ہنستی رہی۔

میں کیسے پوچھ سکتی تھی کہ ——— کہ ——— کیا بابا کبھی نہیں مر سکتا تھا۔

بٹن یوں ہی اندر سے ٹوٹتی رہتی، کبھی کبھی اس کا جی چاہتا ——— ممی کے زانو پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو لے اور پھر آہستہ سے اس سے کہہ دے ممی بابا ٹھیک ہی کہتا ہے ہم کیوں ضد کریں ——— میٹرک میں۔ میں نے سائنس نہیں پڑھی۔ اب پی۔ ایم۔ ٹی۔ میں یہ لوہے کے چنے مجھ سے چبیں گے نہیں لیکن میں جانتی تھی کہ امی ہارنے والی نہیں ہیں۔ یہ ان کی پرسٹیج کا مسئلہ ہے، اور ان کی پرسٹیج میری اپنی پرسٹیج ہے۔ بابا کہتا ہے۔ بٹن کی ممی تم ہر بات میں ضد کیوں کرتی ہو۔ اس میں بھلا ضد کی کیا بات ہے۔ کوئی ماں اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانا چاہتی ہے تو برا کیا ہے۔ بابا کہتا ہے ہم خود فریبی میں کیوں مبتلا رہیں۔ وہ دھوکا جو آدمی خود کو دے لیتا ہے سب سے خطرناک دھوکا ہے۔ واقعی ہم اس مسئلہ کو اپنی پرسٹیج کا مسئلہ کیوں بنائیں، لیکن بعض وقت آدمی خود کو دھوکہ نہ دے لے تو زندہ رہنا دشوار نظر آتا ہے۔

"جی ہاں ہم دھوکے باز ہیں، جھوٹے ہیں، خطرناک ہیں ———" بابا کی کہی بات پر ممی کا ردِ عمل توانائی بخشتا ——— لیکن جب بٹن دوسرے سال بھی فیل ہو گئی تو بابا اس طرح خاموش تھا جیسے وہ سب کچھ جانتا تھا ——— جیسے پرچے اسی نے سیٹ کیے تھے، اسی نے جانچے تھے اور اسی نے فیل کیا تھا۔

اور اب تو مسٹنڈا بلو دھن تہمد سے ہاتھ پونچھ رہا تھا، روشنیاں بھکا بھک جل رہی تھیں، کوری صحنک میں عود جل رہا تھا اور بٹن کو تیسری بار امتحان میں شریک ہونا تھا اور بلو دھن کہہ رہا تھا ——— میں نے گرفت کر دی ہے اس کے حدود متعین کر دیے ہیں، شیخ سدو بڑا بد ہوتا ہے، نہایت خبیث، بڑی مشکل سے قابو میں آتا ہے۔"

بٹن سوچنے لگی، مجھے تماشہ بنانے والوں کے منہ پر ایک چانٹا جڑ کر چلانے لگوں کہ اندھو ——— وہ شیخ سدو نہیں ہے ——— وہ میں خود ہوں۔ مجھے خود مجھ سے کیسے جدا کرو گے ——— لیکن یہ ساری باتیں کہنے کی نہیں تھیں۔

بٹن، اس کی امی، اس کے بابا جب حویلی میں اٹھ آئے تھے تو اپنی ضروریات کے مطابق دو کمرے انھوں نے لے رکھے تھے۔ لیوٹری سے متصل ایک کمرہ بند پڑا تھا اور ساری حویلی تو سدا کی بند تھی۔ دور دور تک دیواروں پر ویرانی تھی چھتوں پر مکڑیوں کے اتنے جالے تھے کہ بٹن کو صفائی کے خیال ہی سے وحشت ہوتی تھی۔ بانس کو جھاڑو لگا کر اس نے ہلایا نہیں کہ مکڑیاں کود پڑیں گی۔ اس کے کانوں میں، ناک میں، آنکھوں میں مکڑیاں، مکڑیوں کے جالے اور دیکھتے ہی دیکھتے کوئی شخص اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جس کی آنکھوں میں، ناک میں، کانوں میں، بالوں میں مکڑیاں ہی مکڑیاں تھیں، ان کے جالے تھے اور اس شخص کا چہرہ پہچانا نہ جاتا تھا۔ بٹن نے غور سے تصور میں لاتے ہوئے اس آدمی کو دیکھا، پہچاننے کی کوشش کی لیکن چہرہ ذرا سی جھلک دکھا کر کہیں چھپ جاتا تھا۔

یہ تو تمہاری ممی ہیں۔

نہیں نہیں تم خود ہو۔

بٹن نے زور لگا کر جب تصور میں آئے ہوئے ان دونوں چہروں کو ہٹا دیا اور مکڑیوں سمیت چہرے پر سے ان کے جالے نوچ پھینکے تو علانیہ بابا کھڑا تھا ——— بٹن کو کیسا سکون ہوا، یہ سوائے بابا کے اور کون ہو سکتا ہے۔

سارا دلدر بابا کے ساتھ چلتا ہے، کائی جمی دیواریں، مردہ چت پڑے مینڈک، بھٹکتی چمگادڑیں، جالوں میں لپٹی مکڑیاں، بابا چلتا پھرتا کھنڈر ہے، ہلتا جھولتا ویرانہ ——— اب ہم ماں بیٹیاں اس ویرانے کو کیا بسائیں گی ——— وہ تو ننھے ہیں جو چیخ چیخ کر اپنی آوازیں سارے میں پھینکتے پھرتے ہیں۔ ورنہ ایسے

ویرانے میں جینا دشوار ہو جاتا۔

بِٹّن کرید کرید کر اس ویرانی کو جو اس کی روح کے گھورے میں چھپی پڑی تھی نکال لاتی اور اسے باہر کی ویرانیوں میں پھینک کر سکون کی تلاش میں نکل جاتی، ان سب باتوں کا امتحان سے کیا تعلق ہے۔ بِٹّن سوچتی یہ امتحان بیچ میں کس طرح آجاتا ہے۔ پرسوں رکشا میں جاتے ہوئے جب میں نے جنازہ دیکھا تھا تو مجھے سر پر کھڑا امتحان یاد آیا۔ اور میں "انا للہ وانا الیہ راجعون" تک پڑھنا بھول گئی ـــــ کھڑکی کے سامنے کوڑے کی ڈھیر پر مری سورنی کے چھ سات بچے جب اس کی سوکھی چھاتیاں پچھوڑ رہے تھے تو مجھے امتحان کے خیال سے وحشت ہو رہی تھی ـــــ وہ مہردین حوض کا پانی نرخرے تک پہنچا کر جب بکرا ذبح کرنے لگا تو میری نظریں ذبح ہوتے بکرے کی پتھرائی ہوئی آنکھوں پر پڑیں۔ مجھے خیال آیا یہ آنکھیں تو میری ہیں۔ پھر میں نے توبہ کی، اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیں بہتوں سے اچھا رکھا، لیکن میرا جی کہہ رہا تھا، امتحان سے تو اس طرح ذبح ہو جانا بہتر ہے۔ اللہ میں کیا کروں۔

اس دن بھی بِٹّن روز کی طرح مردہ مردہ سی تھی، دن گزرتا تو شام ہوتی اور رات ڈھلتی تو دن۔ یہ بات تو کوئی نئی بات تھی نہیں۔ ہر ایک جانتا تھا۔ لیکن بِٹّن کی طرح دن رات کو اتنی اہمیت دینا کہ جیسے انھیں ٹکتے نہ رہیں تو پہچان مشکل ہو گی کس کے بس میں تھا۔

اور سرِ شام جب بِٹّن نہا دھو کر نکلی تھی تو بھی اخباروں کی ان خبروں کا بوجھ اس کے ذہن پر جوں کا توں تھا جو صبح میں اس نے پڑھی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ ایمرجنسی نے سارے الٹے سیدھے ایجی ٹیشن خالی خولی دماغوں کے ڈبوں میں بند کروا کے رکھ دئے ہیں، بلوے، ہنگامے، جو بغض و عناد کا اشتہار تھے اب تاریک اور ویران سپنوں میں سکڑے سمٹے اپنی موت مر رہے ہیں۔ لوگ چلتے ہوئے ادھر بیناروں پر کھڑے چلاتے نہیں ہیں۔ خاموشی سے کام کرتے ہیں۔ کیسی کایا پلٹ ہے۔ ایسا سکون کبھی دیکھا ہی نہ تھا، اللہ بچائے، اب کالج بھی چلے گا امتحان بھی ہوگا، پھر میں کیا کروں گی، بہت دن پہلے بھی تو ایسا کچھ ہوا تھا۔ ایک ایجی ٹیشن تلنگانہ بغل میں دبا کر راجمندری میں جا گھسا تھا اور بربھاجی تالیاں بجا بجا کر سڑکوں پر ناچنے لگے تھے اور طالب علم گردن جھکا جھکا کر کتابوں میں الفاظ ڈھونڈنے لگے تھے اور بِٹّن نے جب اپنے گیلے کھلے بالوں کو باندھنا چاہا تو اس پر غشی طاری ہو گئی۔ دیوار کا سہارا لے کر وہ سنبھلنا چاہتی تھی لیکن دیوار کسی نے وہاں سے ہٹالی اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گئی تو دھڑاک سے دروازہ کھلا اور ممی بھاگیں اور چلانے لگیں ـــــ میری بچی، میری بچی۔

اب وہ زمانہ کیا ہوا، وہ بھی دن تھے جیسے زندگی سڑکوں پر بکھری بکھری بھاگ رہی ہو، چرمر کی آواز آتی تو سڑکوں کے ٹوٹے بلب، دکانوں کے ٹوٹے شیشے کانوں میں چرمراتے اور آنکھوں میں دھنس جاتے تھے۔ اب تو تلوے بھی زخمی نہیں ہوتے۔

ایک رات بِٹّن نیند سے چیختی ہوئی اٹھی ـــــ "مجھے بچاؤ، وہ مجھے کہیں لے جا رہے ہیں۔ میں نہیں جاؤں گی ممی، میں نہیں جاؤں گی۔"

بابا اپنے کمرے سے دیوانوں کی طرح بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے دیکھا بِٹّن اسے پاگلوں کی طرح تک رہی ہے۔ کتنی وحشت تھی، ان آنکھوں میں۔ اور ممی بے چاری آیتیں پڑھتی جا رہی تھیں اور بِٹّن کے سینے پر پھونکتی جا رہی تھیں، کچھ دیر بعد بِٹّن نے جب بے ہوشی اور ہوش کے ملے جلے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا تو اس نے کہا ممی، وہ کالا بلا یہیں کھڑکی میں بیٹھا مجھے تک رہا تھا، پھر بڑا ہوتا گیا ممی، اور اتنا بڑا ہو گیا کہ اپنا السیشین اس کے پیچھے چھپ گیا۔ پھر وہ بلا میری طرف بڑھنے لگا۔ اپنا پولی دم دبا کر تخت کے نیچے جا چھپا، بھونکنا بھول گیا تھا وہ۔ وہ بلا کتنا کالا تھا ممی۔ ممی وہ جھپٹ کر میرے بہت قریب آگیا تھا۔ جب تم نے مجھے سینے سے لگا کر کہا کہ بِٹّن تو نے کوئی الٹا سیدھا خواب دیکھ لیا ہے بیٹی۔ یہاں کوئی نہیں ہے کہ اتنے میں بابا آگیا۔

ممی، یہ بابا اپنے ساتھ چمگادڑیں، مردہ مینڈکیاں، بیر بہوٹیاں، مکڑیاں اور ان کے جالے یہ سب کچھ لیے لیے کیوں پھرتا ہے۔ اس سے کہہ دو کہ کالا بلا بھی اگر یہاں وہی لے آیا ہے تو خدارا اسے کہیں اور چھوڑ آئے۔ ممی ہم اپنے ہی کسی جھوٹ کی سزا تو نہیں پا رہے ہیں۔ میں ڈر گئی تھی تو بابا اپنے کمرے سے کیسے چلا آیا۔ اس کو کیا خبر کہ میں ڈر گئی ہوں۔ اور جب بابا آیا ہے تو وہ بلا اس کے قدموں میں لوٹ رہا تھا۔ پھر وہ اس کے قدموں ہی میں کہیں غائب ہو گیا۔ لیکن ممی یہ جو سینے پر ایک بھاری پتھر سا ہم نے رکھ لیا ہے اس کو سرکانے کے لیے بابا نے تو بہتراز ور لگایا تھا لیکن جب اس کی ایک نہ چلی تو پھر وہ، چمگادڑیں اور مکڑیاں وغیرہ لے آیا۔ ہم نے اس کے ساتھ سلوک بھی اچھا نہیں کیا ممی ـــــ جب وہ ہمارے سینے پر دھری پتھر کی سِل دیکھتے کے دیکھتے امتحان بن گئی ـــــ اور امتحان کو لے اڑے۔ ایجی ٹیشن، اسٹرائک اور کیا کیا الم غلم۔ میں کیسی چین کی نیند سوتی تھی ممی، شہر بھر میں گولیاں چلتی تھیں۔ طالب علم مرتے تھے، لیکن میں چین کی نیند سوتی تھی۔ یہ کوٹھی اتنی ویران نہ تھی جب ـــــ اب چاروں طرف امن ہے، کوئی بھی نہیں مرتا، لوگ بازاروں میں گھومتے ہیں۔ تفریح گاہوں میں، سنیما ہالوں میں ہجوم بڑھتا جا رہا ہے۔ زندگی اسی طرح چلتی رہی تو کالج وقت پر کھلیں گے بھی، وقت پر بند بھی ہوں گے پھر اپنا کیا ہوگا۔ اور بِٹّن قہقہہ مار کر ہنسنے لگی، کیسی وحشت تھی اس کی آنکھوں میں، کیسی وحشت ـــــ اور جب ممی نے گیارہ نام پڑھے، آیت الکرسی پڑھی تو پھر وہ نڈھال ہو کر ممی کی گود میں ڈھیر ہو گئی۔

دوسرے دن ڈاکٹر مایا نے کہا "ہسٹریائی فٹس ہیں۔"

ممی نے کھلے بندوں اعلان کر دیا کہ ہسٹریا وسٹریا کچھ نہیں ہے۔ یہ بھائیں بھائیں کرتی منحوس حویلی چھوڑ دینی چاہیے۔ وہ دایا سچ ہی کہتی تھی، اس دھوبن نے بھی تو بتایا تھا کہ یہاں روحیں فرغل پہن کر منڈلاتی ہیں۔ اور میرے بچے، راہ چلتے لوگ جنھیں نظر لگاتے ہیں، میری بِٹّن جب ڈاکٹر بنے گی تو ایسی اوٹ پٹانگ تشخیص نہیں کرے گی ـــــ اٹھا کر کہہ دیا آسانی سے کہ ہسٹریا ہے۔ واہ جی۔

باقی صفحہ ۴۴ پر

غزلیں

★ عشق کی شعلہ مزاجی خود ہی برساتی ہے آگ — بانس کے جنگل میں اپنے آپ لگ جاتی ہے آگ
جان لینے کے طریقے کس قدر دلچسپ ہیں — زہر برساتی ہے شبنم پھول برساتی ہے آگ
حرف جب آتا ہے ناموس و وقارِ عشق پر — شدتِ احساس سے رگ رگ میں لہراتی ہے آگ
ناموافق دور میں اپنے بھی ہو جاتے ہیں غیر — خشک موسم ہو تو دیواروں میں لگ جاتی ہے آگ
دیکھنے والے ذرا نزدیک جاکر دیکھتے — دور سے خوش رنگ خوش پیکر نظر آتی ہے آگ

آتشِ جذبات سے روشن ہے دنیائے مشیر
جسم کے آذر کدے میں نور بن جاتی ہے آگ

★★ جگر ہے سوز بھرا قلب ہے تپاں اپنا — ہے آج گرمِ عمل عزمِ بیکراں اپنا
مچل رہا ہے رگ و پے میں گرم گرم لہو — ہر ایک حوصلہ ہے تازہ و جواں اپنا
تمام بگڑی ہوئی قسمتیں بنیں گی ضرور — ہوا ہے جذبۂ تعمیر کامراں اپنا
یہاں سے منزلِ مقصود کوئی دور نہیں — اب ایسے موڑ پہ آیا ہے کارواں اپنا
یہ نظم و ضبط کا جادو عجیب جادو ہے — دکھا رہا ہے اثر یہ کہاں کہاں اپنا
یہ صرف ذوقِ جنوں کی کرشمہ سازی ہے — کہ لوہا مان چکی گردشِ زماں اپنا

لبوں پہ ان کے ہے نشا ترانۂ ہستی
جو کہہ رہے تھے کہ جینا ہوا گراں اپنا

★★★ کس قدر اجنبی ہے نظر اب تیری — دیکھ کر بھی جو شاید نہیں دیکھتی
زلف رخ پر ترے جو مچلتی رہی — کچھ اجالے اندھیرے رہی بانٹتی
کیا ترے لمس سے آج محروم ہے — چل رہی ہے صبا آج بہکی ہوئی
تھی سراپا قیامت مرے سامنے — یاد ہے یاد ہے یاد ہے وہ گھڑی

ایک لمبے سفر کی تھکن کو لیے
مسکراتی رہی رات بھر چاندنی

★ مشیر جھنجھانوی
۱۴۷۸۔ پہاڑی راجان۔ بازار چتلی قبر، دہلی

★★ نشارالرحمٰن خاں نشا
اسٹار کی ٹاؤن ــــ ناگپور

★★★ کرشن مراری
۴۔سی، اروِن روڈ، نئی دہلی

اعلان

اردو کے ادبا اور شعرا کے لئے

ادارہ "آج کل" نے فیصلہ کیا ہے کہ اگلے سال ماہ فروری سے ہر ماہ تین منتخب افسانے اور چھ طرحی غزلیں شائع کی جائیں گی اور ان کا معاوضہ دیا جائے گا۔

افسانے

منتخب شدہ افسانوں پر، بہ لحاظِ معیار، علی الترتیب، ایک سو پچیس روپئے، ایک سو روپیے اور پچھتر روپیے معاوضہ دیا جائے گا

افسانے کم از کم دو ہزار اور زیادہ سے زیادہ چار ہزار الفاظ پر مشتمل ہوں۔ موضوع کی کوئی قید نہیں لیکن ان افسانوں کو بامقصد تعمیری اور عصری زندگی کا عکاس ہونا چاہیے۔

غزلیں

منتخب شدہ چھ طرحی غزلوں پر علی الترتیب چالیس روپئے، پینتیس روپئے اور بقیہ چار پر تیس تیس معاوضہ دیا جائے گا۔

مصرع طرح

برائے فروری ۱۹۷۷ء
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

برائے مارچ ۱۹۷۷ء
زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی، زندگی رنگ گل کا بیاں دوستو

برائے اپریل ۱۹۷۷ء
لاکھوں چراغ خونِ شہیداں سے آئے ہیں

آخری تاریخ

فروری، مارچ اور اپریل ۱۹۷۷ء کے لیے منتخب کی جانے والی تخلیقات علی الترتیب ۲۰ دسمبر ۱۹۷۶ء، ۲۰ جنوری ۱۹۷۷ء اور ۲۰ فروری ۱۹۷۷ء تک ادارے کو موصول ہوجانی چاہئیں۔ تخلیق گم ہوجانے یا تاخیر سے پہنچنے کی صورت میں ادارہ پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوگی۔

دیگر شرائط

۱۔ ہر تخلیق کے ساتھ "آج کل" میں شائع شدہ تصدیق نامہ بھی منسلک ہونا چاہیے کہ یہ تخلیق غیر مطبوعہ اور طبع زاد ہے۔

۲۔ انتخاب اور معاوضے کے بارے میں ادارہ کا فیصلہ قطعی اور حتمی ہوگا اور اس سلسلے میں کوئی مراسلت نہیں کی جائے گی۔

میں تصدیق کرتا ہوں کہ میرا افسانہ بعنوان ______
میری غزل مصرع ______
طبع زاد اور غیر مطبوعہ ہے

نام ______
پتہ ______

دستخط مع تاریخ

اپنی تخلیقات مع تصدیق نامہ حسب ذیل پتے پر بھیجیں:

مدیر "آج کل" پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دلی ۱۱۰۰۰۱

ہماری کتابیں

سر سید احمد خاں (پروفیسر خلیق احمد نظامی) ۵ روپے

(ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی، تعلیمی اور ثقافتی زندگی پر سر سید اور اُن کے رفقا کے کارناموں کا زبردست اثر پڑا ہے۔ پروفیسر نظامی نے بڑے عالمانہ انداز میں ان کی شخصیت اور کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔)

ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر (ڈاکٹر محمد عمر) ۲۰ روپے

(ڈاکٹر تارا چند نے اپنی مشہور تصنیف میں ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ ڈاکٹر محمد عمر نے اپنی اس محققانہ کاوش میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوستانی تہذیب مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔)

ہم ایک ہیں (عرش ملسیانی) ۱۰ روپے

(ہندوستان مختلف زبانوں، عقیدوں اور طریقوں کا ملک ہے اور چمن کو اسی اختلاف سے زیب و زینت حاصل ہے۔ مگر ہر رنگ و بو کے یہ پھول ایک گلدستے میں بندھے ہوئے ہیں اور ہماری قومی زندگی کو تاب و توانائی بخشتے ہیں۔)

ابوالکلام آزاد (عرش ملسیانی) ۵ روپے

(ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے معماروں میں ہیں۔ جدوجہد آزادی کی کوئی بھی تاریخ مولانا آزاد کی خدمات کے اعتراف کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی)

روشنی کے مینار (شہباز حسین) ایک روپیہ ۵۰ پیسے

(سماجی مصلحین، مذہبی رہنما اور سیاسی قائدین کے سوانحی خاکے جو آسان زبان میں ہائی اسکولوں کے طلبا کے لیے لکھے ہیں۔)

جواہر لال نہرو کی کہانی تصویروں کی زبانی ۲ روپے ۵۰ پیسے

(محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو کی زندگی کے دلچسپ واقعات رنگین تصویروں میں۔ بچوں اور طالب علموں کے لئے ایک عمدہ تحفہ)

پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے۔ ۲ روپے ۵۰ پیسے

(گھریلو ضرورتوں کے جام، جیلی، مربہ، مارملیڈ، چٹنی، مربے اور آچار وغیرہ بنانے کے متعدد طریقے تصویروں کے ذریعے بتائے گئے ہیں جس سے بڑی آسانی سے آپ گھر بیٹھے اپنی من پسند چیزیں بنا سکتے ہیں)

"آج کل" کے خریداروں کو ۲۰ فی صد کی رعایت محصول ڈاک ہمارے ذمے

پانچ روپے سے کم قیمت کی کتابیں بذریعہ وی۔ پی نہیں بھیجی جاتیں۔ پوسٹل آرڈر بھیجئے یا وی پی طلب کیجئے۔

(ملنے کا پتہ) بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

شاہد ماہلی
سی ۷/۹۴، صفدر جنگ ڈویلپمنٹ ایریا
حوض خاص، نئی دہلی

آئین میں ترمیم — قومی ضرورت

ہندوستان کا آئین ایک متوازن دستاویز ہے جس میں یہاں کے عوام کی روایات اور خواہشات منعکس ہیں، آئین کا ایک زندہ دستاویز ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ بدلتے ہوئے سماج کا ساتھ دے سکے۔ آئین کو ان مسائل کا حل پیش کرنا ہے جو ماضی کا ورثہ ہیں، جو حال میں جاری وساری ہیں اور وہ جن کے مستقبل میں پیدا ہونے کے امکان ہیں، کسی بھی زندہ سماجی آلے کے لیے لچک اور حالات کے مطابق ڈھلنے کی صلاحیت سب سے اہم ہے۔ ہندوستان کے آئین کے مرتبین کو بہت پہلے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمارا آئین نہ صرف تبدیلی کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ ہمارے عوام کی جمہوری خواہشات و مطالبات اور وقت کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے، جواہر لال نہرو نے اسی وقت یہ بات واضح کر دی تھی کہ "جب دنیا میں بدامنی پھیلی ہوئی ہو اور وہ ایسے بحرانی دور سے گزر رہی ہو، ہم جو آج کر سکتے ہیں، شاید کل کے لیے موزوں نہ ہو۔" اسی وجہ سے ہمارے آئین میں پارلیمنٹ کے ذریعہ ترمیم کی گنجائش رکھی گئی۔

آئین کی تشکیل کے ایک سال کے اندر ہی کچھ تبدیلی کرنی پڑی تاکہ زمینداری کے خاتمے کی پالیسی کے عمل میں ناکامی نہ ہو۔ اپریل ۱۹۵۴ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے آئین میں تبدیلی کرنے کے سوال پر غور کرنے کے لیے جواہر لال نہرو کی قیادت میں ایک سب کمیٹی بھی مقرر کی تھی۔

کانگریس کے گذشتہ اجلاس میں ایک قرارداد میں کہا گیا "اگر سماج کے غریب اور دکھی افراد کی تکالیف کو ختم کرنا ہے تو سماجی اقتصادی نظام میں کافی تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ ہمارا آئین نہ تو کوئی جامد شے ہے اور نہ ہی کوئی ساکت دستاویز۔ اسے عوام کے احساسات اور اقتدار کی تشکیل، کرنے والے ایک محرک کا کام انجام دینا ہے۔ اسے ان مسائل کا حل پیش کرنا ہے جو ماضی کا ورثہ ہیں جو حال میں جاری وساری ہیں اور وہ جن کے مستقبل میں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ وہ آئین جن میں عوام کے جذبات اور وقت کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے مطابق تبدیلی کی گنجایش نہیں ہوتی اچانک حادثے کے دباؤ سے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔"

صدر کانگریس نے اس کے بعد ہمارے آئین میں ترمیم کرنے کے سوال پر غور کرنے کے لیے سردار سورن سنگھ کی صدارت میں ایک دس رکنی کمیٹی مقرر کی، کمیٹی کی متعدد بار میٹنگیں ہوئیں اور اس سوال پر بہت سے لوگوں سے نجی طور سے اور نمائندگی کی بنیاد پر تبادلۂ خیال ہوا۔ اور "سماجی اقتصادی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے جذبے سے" سورن سنگھ کمیٹی نے آئین میں ترمیم کے لیے بیس اہم قراردادوں کا مسودہ پیش کیا۔ یہ قراردادیں مختصراً اس طرح ہیں۔

۱۔ نظام حکومت:۔ ہمارے ملک کے لیے پارلیمانی نظام سب سے بہتر ہے اور صدارتی نظام یا کوئی اور نظام حکومت کے مقابلے میں اسے چھوڑ دینا غیر ضروری ہوگا۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جہاں علاقائی اختلافات موجود ہیں، پارلیمانی نظام ملک کے اتحاد اور سالمیت کو بہتر طور سے قائم رکھ سکتا ہے۔ اور عوام کی خواہشات اور مطالبات کو بہتر طور سے پورا کر سکتا ہے۔

۲۔ تمہید:۔ کمیٹی کا خیال ہے کہ سیکولرزم اور سوشلزم کا مفہوم آئین میں واضح طریقے سے بیان کیا جانا چاہیے۔ تمہید میں ترمیم کی سفارش کی گئی اور کہا گیا ہے کہ اس جملے "با اقتدار عوامی جمہوریہ ہوگا" میں سیکولرازم اور سوشلزم کا اضافہ کیا جائے اور یہ جملہ اس طرح ہو۔ "با اقتدار عوامی سیکولر اور سوشلسٹ جمہوریہ ہوگا"

۳۔ شہریوں کے بنیادی فرائض:۔ کمیٹی نے آئین میں شہریوں کے آٹھ بنیادی فرائض کا اضافہ کرنے کی سفارش کی۔ وہ بنیادی فرائض یہ ہیں:۔

(۱) آئین و قوانین کی تعمیل و احترام (۲) ملک کی خود مختاری کو برقرار رکھنا اور اس ڈھنگ سے عمل کرنا کہ اس کی ایکتا اور سلامتی میں مضبوطی آئے۔ (۳) ان جمہوری اداروں کا احترام جن کی ضمانت آئین میں دی گئی ہے اور کوئی ایسا کام نہ کرنا جن سے ان کے احترام یا اختیارات پر کوئی ضرب پڑے (۴) ملک کا دفاع، اور طلب کیے جانے پر قوم کی خدمت، جس میں فوجی خدمت شامل ہے، سر انجام دینا (۵) کسی بھی طرح کی فرقہ پرستی سے گریز کرنا (۶) ریاستی پالیسی کے ہدایتی اصولوں پر عمل درآمد اور عوام کی عام بھلائی کو فروغ دینے میں، ملکی حکومت سے تعاون کرنا تاکہ سماجی و اقتصادی انصاف کے تقاضے پورے ہوں (۷) تشدد سے گریز اور پبلک جائیداد کا تحفظ کرنا اور ہر ایسی بات سے احتراز کرنا جس سے نقصان یا تباہی ہو اور (۸) قانون کے مطابق ٹیکس کی ادائگی۔

۴۔ ہدایتی اصول:۔ موجودہ دفعہ ۳۱ سی کے دائرے کو اس طرح وسیع کرنا کہ کسی یا تمام ہدایتی اصولوں کے عمل درآمد کے لیے قانون وضع کرنا

اس کے تحت آجاتے اور ان قوانین کو بنیادی حقوق پر ضرب کے نام پر کسی طرح کا چیلنج نہ کیا جاسکے۔

ہدایتی اصولوں میں تین نئے اصول جوڑے جائیں (۱) خاندانی منصوبہ بندی (۲) مفت قانونی امداد (۳) صنعتوں میں مزدوروں کی شرکت۔

۵۔ آئین کی ترمیم : آئین کی دفعہ ۳۶۸ کے تحت پارلیمنٹ کو آئین میں ترمیم کرنے کی آئینی حقوق پر نہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے اور نہ ہی چیلنج کیا جاسکتا ہے۔ آئین ملک کا سب سے اعلیٰ قانون ہے اور اس میں کسی قسم کی ترمیم اسی طرح کا بنیادی قانون ہے جس طرح آئین کا باقی حصہ۔ اگرچہ دفعہ ۳۶۸ کی زبان جیسی کہ اس وقت لکھی ہوئی ہے، واضح اور سلسلہ وار ہے۔ پھر بھی یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ دفعہ ۳۶۸ میں ایک نئی دفعہ جوڑی جائے جس کا اثر یہ ہو کہ اگر آئین میں ترمیم مندرجہ بالا دفعہ میں ضرورت کے مطابق کی جائے تو اس کی بنیاد پر کسی بھی عدالت میں چیلنج نہ کیا جائے۔

۶۔ عدالتی جائزے کا اختیار :۔ پارلیمنٹ کے ذریعہ وضع کیے گئے کسی بھی مرکزی قانون کی آئینی معقولیت کو صرف سپریم کورٹ میں ہی چیلنج کیا جاسکتا ہے۔ ہائی کورٹوں میں نہیں جیسا کہ ابھی تک کیا جارہا ہے۔

کمیٹی نے دفعہ ۲۲۶ میں تین ترمیمات کی سفارش کی ہے۔ جن کے ذریعے کسی ہدایت، آرڈر یا رٹ حقوق کو محدود کیا گیا ہے۔

ملازمتوں کے معاملوں میں انتظامی ٹریبونل صنعت ولیبر کے تنازعہ میں آل انڈیا لیبر اپیل ٹریبونل اور ریونیو، زمینی اصلاحات، اناج کی وصولی و تقسیم سے متعلق تنازعات کے تصفیے کے لیے بھی ٹریبونل منظم کیے جانے کی سفارش کی گئی ہے۔ اس طرح کے ٹریبونل ایک رکنی نہیں ہوں گے۔

۷۔ عدالت عالیہ :۔ سپریم کورٹ کو یہ اختیار ہوگا کہ کسی معاملے کو ایک ہائی کورٹ سے دوسرے ہائی کورٹ میں منتقل کرسکے۔ مساوی سوالوں پر منحصر کوئی معاملہ ایک سے زیادہ ہائی کورٹوں میں چل رہا ہو تو اٹارنی جنرل کی درخواست پر سپریم کورٹ ان معاملوں پر اپنے یہاں غور کرسکتا ہے۔ قابل قدر قانون داں حضرات کو ہائی کورٹوں میں بھی جج مقرر کیا جاسکتا ہے۔ ابھی تک یہ طریقہ سپریم کورٹ تک ہی محدود ہے۔

۸۔ ممبر بننے کی نااہلیت۔ ۹۔ کام کے قواعد وضوابط۔ ۱۰۔ راجیہ سبھا اور ریاستی لیجسلیٹو کونسلوں میں نامزدگی۔ ۱۱۔ حلقہ ہائے انتخابات کی حلقہ بندی۔ ۱۲۔ کورم سے متعلق آئین کی دفعات میں ترمیم کی سفارش کی گئی ہے۔

۱۳۔ دو یا دو سے زیادہ ریاستوں کی منظوری سے ان کے لیے قانون بنانے کا پارلیمنٹ کو اختیار —— دفعہ ۲۵۲ میں اس طرح ترمیم ہونی چاہیے کہ اگر دو یا دو سے زیادہ ریاستوں کی اسمبلیاں قرارداد کے ذریعہ انھیں کسی قانون میں ترمیم کا حق دیں تو پارلیمنٹ بعد میں اس قانون میں ترمیم کرسکتی ہے۔

۱۴۔ ملازمتیں :۔ دفعہ ۳۱۱، ملازمتوں کے معاملے عدالتوں کے اختیار سے باہر رہیں گے۔ اور ان کا فیصلہ انتظامی ٹریبونل کریں گے۔ اس کے لیے دفعہ ۳۱۱ میں ترمیم کیا جانا چاہیے۔ دفعہ ۱۳۶ کے تحت سپریم کورٹ میں اپیل کا اختیار باقی رہے گا۔

۱۵۔ ہنگامی حالات :۔ دفعہ ۳۵۲، اس دفعہ میں اس طرح ترمیم کی جائے جس سے یہ واضح ہوسکے کہ اگر صدر مملکت چاہیں اور اگر وہ مطمئن ہوں تو ہنگامی حالات کا اعلان ہندوستان کے کسی علاقے کے اس حصے تک محدود کردیں جس کا اعلان نامے میں ذکر ہو۔ یہ بھی گنجایش رکھی جائے کہ صدر مملکت اگر چاہیں تو ہندوستان کے کسی علاقے کے کسی حصے سے ایمرجنسی ہٹادیں۔

۱۶۔ مرکز۔ ریاست کا رابطہ۔ (۱) سماجی اقتصادی تبدیلیوں کے حصول کے لیے ملک کی تیز رفتار ترقی میں زراعت اور تعلیم ابتدائی اہمیت کا موضوع ہے ان دونوں موضوع کے متعلق کل ہند پالیسیوں کی وسعت کی ضرورت پر جس قدر زور دیا جائے کم ہے اس لیے یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ تعلیم اور زراعت کو متوازی فہرست میں شامل کردیا جائے۔ (۲) جب کسی ریاست میں قانون اور نظم وضبط کے معاملے میں سنگین صورت حال پیدا ہوتی ہے تو اکثر مرکز سے امداد طلب کی جاتی ہے۔ اگر مرکز ایسی صورت میں ریاستوں کو موثر امداد دیتا ہے تو اسے اس بات کا بھی اختیار ہونا چاہیے کہ وہ پولیس اور ایسی دوسری خدمات کو کسی ریاست میں اپنی ذاتی نگرانی اور کنٹرول کے تحت تعینات کرسکے۔ اس مقصد کے لیے آئین میں مناسب گنجایش رکھی جائے۔

۱۷۔ خاندانی منصوبہ بندی کو متوازی فہرست میں شامل کیا جانا چاہیے اس فہرست کی بیسویں سطر میں اس طرح ترمیم کی جانی چاہیے "اقتصادی سماجی منصوبہ، خاندانی منصوبہ بندی کے ساتھ"۔

۱۸۔ بنیادی حقوق کے غلط استعمال سے حفاظت :۔ آئین کی دفعہ ۱۹ میں مذکورہ بنیادی حقوق کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے پارلیمنٹ کو ایسے قانون بنانے کا اختیار ہونا چاہیے جس سے اس طرح کے معاملوں پر سزا یا جرمانے کا انتظام ہو۔

۱۹۔ عدالتی تاخیر :۔ کمیٹی کے مباحثے میں عدالتوں میں ہونے والی تاخیر پر کافی زوردار بحث ہوئی۔ کمیٹی چاہتی ہے کہ حکومت اور عدالت اس پر سنجیدگی سے فوراً توجہ دیں۔ اور اس کے لیے موثر قدم اٹھائیں، جس سے کہ حالات میں اصلاح ہوسکے۔ جب عدالتوں میں کارروائی ہوجاتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انصاف حاصل نہیں ہوتا اور متعلقہ گروہوں پر خرچ کا بوجھ الگ سے پڑتا ہے۔

۲۰۔ عام معاملات :۔ (۱) کمیٹی نے جو سفارش کی ہے اس کی وجہ سے آئین کی دوسری دفعات میں کچھ ترمیم کرنی پڑے گی۔ اس طرح سے کچھ معاملات میں ٹریبونلوں کی خصوصی حق سماعت دینے کی سفارش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ متعلقہ قوانین میں بھی ترمیم کرنی پڑے گی۔ عدالتوں میں جو مقدمے داخل ہیں ان کے بارے میں بھی مناسب گنجایش رکھنی ہوگی۔

(۲) کمیٹی نے یہ محسوس کیا کہ آئین میں کچھ دوسری دفعات ہیں جن میں

انتظامی یا عمل کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ترمیم کرنی ضروری ہے۔ آئین میں کچھ ایسی دفعات بھی ہیں جو فرسودہ ہو چکی ہیں یا بے کار ہو گئی ہیں اور اس لیے انھیں نکالا جا سکتا ہے، اس سلسلے میں الگ سفارش کی جائے گی۔

سورن سنگھ کمیٹی کی رپورٹ کے اعلان کے فوراً بعد آئین میں ترمیم کے لیے سرگرمیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ مذاکروں اور تبادلۂ خیالات کے بعد مرکزی وزیر قانون شری گوکھلے نے ۲۵ر اکتوبر کو پارلیمنٹ کے خصوصی اجلاس میں آئین میں ۴۴ ویں ترمیم کا مسودہ پیش کر دیا جس میں سورن سنگھ کمیٹی کی بعض سفارشوں میں ترمیم کی گئی ہے اور بعض چیزوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔

اس مبسوط ترمیمی بل میں پارلیمنٹ کی بالادستی کو تسلیم کیا گیا ہے اور سماجی و معاشی انقلاب کی راہیں ہموار کی گئی ہیں۔ یہ ترمیمی بل ۵۹ دفعات پر مشتمل ہے۔ ۲ نومبر کو لوک سبھا نے اس ترمیم کو منظور کر لیا ہے اور اب یہ راجیہ سبھا میں زیر غور ہے۔

لوک سبھا نے بنیادی طور سے سورن سنگھ کمیٹی کی سفارشات کو قبول کر لیا ہے۔ بعض سفارشوں میں ترمیم کی گئی ہے اور بعض چیزوں کا اضافہ کیا گیا ہے مثلاً کمیٹی نے آٹھ بنیادی فرائض کی سفارش کی تھی مگر ترمیمی بل میں ان کی تعداد دس کر دی گئی ہے۔ کمیٹی نے ہدایتی اصول میں خاندانی منصوبہ بندی کو بھی شامل کرنے کی سفارش کی تھی مگر بل میں اسے شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی بجائے بچوں کی صحت اور ان کی فلاح و بہبود پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ بنیادی فرائض کی عدم ادائیگی کے سلسلے میں کسی سزا یا جرمانے کو بھی بل میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ یہ کہا گیا کہ فی الحال فرائض کا احساس ہی پیدا کرانا مقصود ہے۔

ہندوستان کا دستور دنیا کا نہایت ہی جامع تحریری دستور ہے چوالیسویں ترمیم، جو دراصل بیالیسویں ترمیم ہے (کیونکہ دستور کی دو ترمیمیں پارلیمنٹ کے زیر غور تھیں اور ان پر عمل درآمد نہ ہو سکا ہے) کے ذریعے دو نئے حصے (A-۴، A-۱۴) اور نو نئی دفعات (A-۳۹، A-۴۳، A-۴۸، A-۱۳۱، A-۱۳۹، A-۱۴۴، A-۲۲۵، A-۲۲۸، اور A-۲۵۷) کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اب ہمارے دستور میں ۴۰۴ دفعات ہونگیں۔ دفعات ۱۰۳، ۱۵۰، ۱۹۲، اور ۲۲۶ کو یکسر بدل دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تمہید اور دفعات C-۱۳۱، ۳۹، ۵۵، ۷۴، ۷۷، ۸۱ تا ۸۳، ۱۰۰، ۱۰۲، ۱۰۵، ۱۱۸، ۱۶۶، ۱۷۰، ۱۷۲، ۱۷۹، ۱۹۱، ۱۹۴، ۲۰۸، ۲۱۷، ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۲۸، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۳۰، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۶، ۳۶۸، K ۳۷۱ اور ساتویں شیڈول میں ترمیم کی گئی ہے۔

دستور میں ترمیم کی ضرورت بہت دنوں سے محسوس کی جا رہی تھی کیونکہ کسی ملک کا دستور کوئی جامد چیز نہیں ہوتا۔ دستور کو عوام کی امنگوں اور خواہشوں کے ساتھ ساتھ بدلنا چاہیے۔ اس ترمیم نے بہت سے مباحث کا خاتمہ کر دیا ہے۔ بہت دنوں سے یہ بحث جاری تھی کہ پارلیمنٹ کو دستور میں ترمیم کا حق حاصل نہیں ہے اور صرف دستور ساز اسمبلی کو ہی ترمیم کا حق حاصل ہے۔ اس کے جواب میں شریمتی اندرا گاندھی نے لوک سبھا میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اس قسم کے خیالات کا اظہار اس وقت بھی کیا گیا تھا جب دستور بنایا جا رہا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر امبیدکر نے دلائل پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ دستور ساز اسمبلی جس نے دستور کا مسودہ کیا گیا وہ محدود حق رائے دہندگی کی بنیاد پر منتخب ہوئی تھی، جب کہ دستور کے تحت ملک کی پارلیمنٹ کا انتخاب بالغوں کی رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوا ہے۔ یقینی طور پر ایسی پارلیمنٹ کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے حقوق کم ہوں گے۔

دوسرا پریشان کن مسئلہ عدلیہ اور مقننہ کے آپسی ٹکراؤ کا تھا۔ معاشی ترقی اور سماجی بھلائی کے بہت سے قوانین عدالتوں کے ذریعے کالعدم قرار دیے جاتے تھے جس سے اصلاح و ترقی کی تمام کوششیں رک جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک وقت یہ بھی تھی کہ ایک قانون کو ایک ہائی کورٹ دستور کے مطابق قرار دیتا تھا تو دوسرا ہائی کورٹ اسی کو غیر آئینی ٹھیراتا ہے۔ اب ان تمام مشکلات کو حل کر دیا گیا ہے۔ ہائی کورٹ صرف ان ہی قوانین کے بارے میں غور کر سکتا ہے جو متعلقہ ریاست کے ہوں اور سپریم کورٹ مرکزی قوانین کو۔ مگر یہ کارروائی اب صرف ضابطے کے سلسلے میں ہوگی اور پارلیمنٹ کے ترمیمی اختیار کو چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔ یک طرفہ حکم امتناعی کی وجہ سے بہت سے مفید کام رک جاتے تھے۔ ان کا سدباب بھی کیا گیا ہے۔ مختلف قسم کے ٹریبونل قائم کیے گئے ہیں جن سے ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ پر کام کا دباؤ کم ہوگا اور جو مقدمات برسوں فیصل نہیں ہوتے تھے اب ان کا فیصلہ جلد ہو سکے گا۔ ان ٹریبونل کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کا حق دیا گیا ہے۔ اس طرح عدلیہ کی اعلیٰ حیثیت کو برقرار رکھا گیا ہے۔ دستور سے متعلق کسی فیصلے کو اکثریت کے فیصلے کے تابع کیا گیا۔ ان صورتوں میں کم از کم سات ججوں پر مشتمل بنچ ہوگا جن کا فیصلہ تین چوتھائی اکثریت سے ہونا چاہیے۔

دوسرا اہم قدم یہ اٹھایا گیا ہے کہ صدر کو اختیار دیا گیا ہے کہ دستور کی ترمیموں پر عمل درآمد ہونے میں اگر کوئی رکاوٹ پیدا ہوئی تو وہ ان کو دور کرائیں۔ اس کے علاوہ پارلیمنٹ کے ممبروں کی نااہلی یا معذوری کے سلسلے صدر جمہوریہ آخری فیصلہ دیں۔

دستور میں سب سے بنیادی اور اہم فیصلہ شہریوں کے لیے بنیادی فرائض کا اضافہ ہے۔ حق کے ساتھ کوئی فرض وابستہ ہوتا ہے۔ مگر زیادہ تر لوگ صرف صرف حقوق کی بات کرتے ہیں اور اپنے فرائض سے غافل ہیں۔ آئین میں جن دس فرائض کو شامل کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

ہندوستان کے ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ

۱ - آئین کو تسلیم کرے، اس کا احترام کرے، قومی پرچم اور قومی ترانے کا احترام کرے۔

۲ - ان اقدار کو مشعل راہ بنائے جن کی بدولت ہندوستان کی جنگ آزادی میں تحریک و تشویق ملی تھی۔

۳ - ہندوستان کے اقتدار اعلیٰ، اتحاد اور سالمیت کو تسلیم کرے اور اس کی حفاظت کرے۔

بقیہ صفحہ ۴۸ پر

دیا پوار
۱۰۰/۳، سدھارتھ نگر، گورے گاؤں (مغربی) بمبئی ۶۲،

اَچھُوت

پچھلی دیوالی کی بات ہے۔ گھر گھر مٹھائیاں بنی ہوئی تھیں۔ میری بیوی نے بھی بچوں کے لئے لذیذ کھانے بنائے تھے۔ میں ابھی کھا کر اُٹھا تھا۔ زبان پر مٹھاس اور بدن میں کسالت محسوس کر رہا تھا، لہٰذا کچھ سستانے کے لئے لیٹ گیا۔ جرائد کے دیوالی خصوصی نمبروں پر نظریں دوڑا رہا تھا —— باہر پٹاخے چھوٹ رہے تھے اور میں "دلت ادب" پر مراٹھی کے مشہور ادیب جیونت دلوی کا مضمون پڑھ رہا تھا —— چار پانچ سال پہلے اس ادب کو بالکل ہی الگ سمجھا جاتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح مرے ہوئے چوہے کو الگ پھینک دیا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے آج کل اس کی قسمت کھل گئی ہے۔ اسی لئے میں بہت پُرسکون ہوں۔ ادبی اور فنی قدروں کی تبلیغ کرتے کرتے دلوی اب سماجی مسائل کی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ سفید پوش اور صف اوّل کے ادیب اپنی تخلیقات اور مذہبی برتری کے بل بوتے پر "دلتوں" کی صاف ستھری تصویر کشی کر سکتے ہیں —— وہ کہتے ہیں جہاں میں رہتا ہوں وہیں پوار بھی رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں ہم دونوں کا معیار زندگی یکساں ہے۔ ہم دونوں ایک ہی معیار پر جی رہے ہیں۔ بس! یہیں آکر میں اڑ جاتا ہوں اور ان کی اور میری مخالفت ہو جاتی ہے "کہاں کا یکساں معیار؟ کیسا ۔۔۔۔؟"

●●

"اٹھاؤ یہ تھال۔ چلو اٹھاؤ۔ بھکاری سمجھ رکھا ہے ہمیں؟"

بیوی کے تلخ و تیز الفاظ سنائی دیتے ہیں اور میرے خیالات کا تانا بانا ٹوٹ جاتا ہے۔

میں اندر جھانکتا ہوں "کیا دیکھتا ہوں؟" کہ بیوی مارے غصے کے کانپ رہی ہے اور اُس کے سامنے کھڑی ہے ہماری پڑوسن شریمتی دیشمکھ، سونے کے کنگن سے دمکتے ہوئے ہاتھوں میں مٹھائی کا تھال

"کیا ہوا؟ یہ ڈانٹ پھٹکار کیسی ۔۔۔۔؟" میں ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

کچھ دیر بعد بیوی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں اور وہ ہچکیوں کی گونج میں پورا واقعہ بیان کر دیتی ہے۔

اس کاسمو پولٹن بستی میں آئے ہوئے ہمیں دو مہینے گذر چکے ہیں۔ ہاؤسنگ بورڈ کی مہربانی سے ہمیں یہ گھر ملے ہیں ورنہ پچھلے پندرہ برسوں سے ہم بمبئی میں ذیلی کرایہ کی حیثیت سے کبھی یہاں کبھی وہاں بھٹکتے رہے ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے ہم موتی لال نگر میں رہتے تھے جو گورے گاؤں (بمبئی) کا مشہور مہار واڑہ ہے۔ بیوی بہت خوش ہے کہ بچے یہاں گالیاں نہیں سیکھیں گے۔ ایک طرف گجراتی پڑوسن ہے، دوسری طرف مراٹھا، عیسائی، دھوبی اور برہمن۔ بھارت کے تمام مذاہب کی ایک چھوٹی سی شکل و صورت —— ہمارے گھر میں لگی ہوئی بابا صاحب امبیڈکر کی تصویر ہماری ذات کا ڈھنڈورہ پیٹ رہی ہے۔ تمام متوسط طبقے کے لوگ ہیں۔ سبھوں کی مالی حالت تقریباً ایک جیسی ہے —— یہ تصور بھی نہیں تھا کہ ہماری ذات یہاں بھی قیامت برپا کر دے گی۔ سویرے ہی سے ایک دوسرے کے گھروں میں مٹھائی کے تھال آ جا رہے ہیں۔ میری بیوی بھی دیشمکھ کے ہاں تھال لے جاتی ہے۔ دیشمکھ خاندان اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان ہے اور اسے اپنی ذات پر ناز ہے —— وہ فرماتے ہیں "ارے یہ تھال کس لئے؟ یہاں تو مٹھائی کا ڈھیر پڑا ہوا ہے۔ لے جایئے آپ کے بال بچوں کے کام آئیگا۔" میری بیوی تھال واپس لے آتی ہے۔ بے عزتی کی یہ کسک اُسے کچھ کے دیتی رہتی ہے۔ غصہ اندر ہی اندر لاوے کی طرح کھولتا رہتا ہے۔ ستم بالائے ستم دوپہر کو شریمتی دیشمکھ اپنا تھال لے آتیں اور سمجھانے والے انداز میں کہتی ہیں "بہن تھال لوٹایا نہیں جاتا۔ بہن ۔۔۔۔"

اناج کو بھگوان ماننے والی شریمتی دیشمکھ کا تھال لوٹا دیا جاتا ہے۔ وہ اپنا سا منہ لئے تھال سمیت لوٹ جاتی ہیں۔ دہکتے ہوئے انگاروں جیسا یہ تجربہ میری جانب سے کی گئی ہمدردی کی وجہ سے مزید دہک اٹھتا ہے۔ ع۔ گھر گھر میں دیوالی ہے میرے گھر میں اندھیرا۔

ایسا لگتا ہے سارا ملک ایک وسیع پیرام ہے اور اس کے اندر گھنے اندھیروں میں، میں بے جان ممی کی طرح سڑ رہا ہوں۔ کیا دلوی کو کبھی ایسا تجربہ ہوا ہوگا؟ اُن کے لئے تو چھوا چھوت ایک کلنک ہے لیکن میرے لئے ماں کے دامن کا بدنما داغ ہے۔ اسے کس طرح مٹایا جا سکتا ہے؟ کیسے ۔۔۔۔؟

—— آزادی کی سلور جوبلی بڑی دھوم دھام سے منائی جا چکی ہے۔ پچھلے پچیس[۲۵] برسوں میں نہ معلوم کتنی باتیں بدل گئیں، کتنے سدھار آئے اس داغ کو مٹانے کیلئے قانون بنا لیکن قانون کیا اس طرح کے واقعات کو روک سکتا ہے! لوگوں کے من کو بدل سکتا ہے۔ اور پھر آج کا یہ واقعہ!!! اسے گناہ بھی کہیں تو کس طرح؟ غیر صنعتی شہروں کا رنگ روپ تبدیل ہو گیا لیکن یہ داغ نہ مٹ سکا۔ برداشت کیا ہوا ماضی ناسور بنکر رستا رہا۔ ایک پھوڑا جو جان لیوا درد کیساتھ پھوٹتا رہا۔ گذرے ہوئے دنوں کے ساتھ ساتھ کھویا ہوا ماضی ۔۔۔۔ میرا بچپن یاد آگیا۔ آزادی سے پہلے کا ہندوستان۔

ہم لوگ مہاراشٹر کے مشرقی علاقے کے رہنے والے، اندر دھنی ہوئی سیہ یادری کے درجات امرت واہنی پرورہ[۱]، کلسو بائی کی فلک بوس چوٹیاں[۲]۔ لیکن اس تاریخی عظمت سے ہمارا سر کبھی بلند نہیں ہوا۔ اس گاؤں میں بھی ہر گاؤں کی طرح مہار واڑہ تھا۔ ہمارے شاعروں نے بچپن کی آزادیوں، رنگ رلیوں اور سرمستیوں کے خوب خوب گیت گائے ہیں اور لکھے ہیں۔ لیکن میں اپنا بچپن یاد کر کے بُری طرح لرز جاتا ہوں۔ شعر کہنے لائق یہاں تھا ہی کیا؟

ہاں! ایک حادثہ ہے جس کے یاد آتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مہار واڑہ میں سنتر کا انقلابی جلسہ ہو رہا تھا۔ اُس وقت کچھ بات ہی اور تھی۔ ایسے ہزاروں جلسوں نے بیداری کی شمع روشن کی تھی۔ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کا بھاشن ایک ایک کٹیا تک پہنچایا گیا۔ وہ مہار جاتی کے لئے باعث افتخار تھے۔ سنتر کا وہ جلسہ دیکھنے کے لئے گاؤں کے مراٹھا لوگ مہار واڑے میں آئے تھے۔ اُن کے بیٹھنے کا خاص انتظام کیا گیا تھا —— ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ جلسے کا

[۱] ایک ندی کا نام   [۲] پہاڑ

کا آغاز ہوا۔ یہ آغاز اپنے انداز کا نرالا آغاز تھا۔

ڈراما شروع ہوتا ہے۔ ڈرامے کی گوپیوں کے قدم متھرا کے بازار کی طرف اُٹھتے ہیں جہاں نہیں جانا تھا تاسک کالارام مندر کے ستیہ گرہ میں شامل ہونے۔ جلسہ اپنے شباب پر ہے۔ پجاری مندر میں داخلے کی مخالفت کر رہے ہیں مگر گوپیاں اپنی بات پر اڑی ہوئی ہیں۔ وہ مندر میں داخلے کے لئے بضد ہیں کہ اچانک مراٹھا تماشائی شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس خوف سے کہ کہیں گوپیاں مندر میں گھس کر بھگوان کو ناپاک نہ کر دیں۔ گاؤں کے پٹیل مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے گرج اُٹھتے ہیں۔

"بند کرو یہ تماشہ تھوڑی دیر کے لئے۔"

"پٹیل یہ تماشہ نہیں ہے۔ اسے جلسہ کہتے ہیں۔" مہار واڑہ کا لیڈر جادوجی جواب دیتا ہے۔

"اِن گوپیوں کو روکو نہیں تو یہ بھگوان کو بھرشٹ کر دیں گی۔"

"یہ ہماری بستی ہے۔ نہیں دیکھا جاتا تو اپنا راستہ ناپو۔" جادوجی گرجتا ہے۔

گاؤں والے گاؤں کی جانب چل دیتے ہیں اور جلسہ پھر شروع ہو جاتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ــــ دوسرے دن جلسے والوں کا ڈیرہ اُٹھ جاتا ہے لیکن گاؤں میں غم و غصہ کی تیز لہر دوڑ جاتی ہے۔ مخالفت کے شعلوں کی لپٹیں لپلپانے لگتی ہیں۔ گاؤں والوں کا بائیکاٹ کر دیا جاتا ہے۔ مزدوری نہیں ملتی۔ کنویں کا راستہ جو گاؤں سے ہو کر گذرتا ہے، بند کر دیا جاتا ہے۔ گاؤں میں آنا جانا بند ہو جاتا ہے۔ مگر مہار لوگ بھی اپنی ضد کے پکّے کسی طرح اپنی ہار نہیں مانتے۔ گاؤں اور مہار واڑے کی سرحد پر پتھر رکھ دیئے جاتے ہیں اور اُن پر مہار عورتیں آکر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ مرد لاٹھیوں پر گنڈاسے باندھ لیتے ہیں۔ تقریباً دو سو گنڈاسے چمکنے لگتے ہیں۔ گاؤں میں ایسی دہشت ناک افواہیں پھیل جاتی ہیں جنھیں سُن کر خون خشک ہونے لگتا ہے ــــ آخر کار کافی غور و خوض کے بعد مہاروں کو بُلوایا جاتا ہے ــــ ننگ دھڑنگ کالے جسم، چمکتے گنڈاسے لئے ہنومان مندر کے رُو برُو آ کھڑے ہوتے ہیں ــــ

مندر سے آواز بلند ہوتی ہے "کون ہو تم؟"

"ہم راجہ ہیں۔" چھ فٹ لمبا کاشی رام آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیتا ہے ــــ "مہار کچھ نہیں سنیں گے۔" اس ڈر سے کہ خون خرابہ نہ ہونے پائے گاؤں والے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔

●●

اب بھی کبھی گاؤں جاتا ہوں تو جادوجی ملنے کے لئے آتا ہے۔ اب بوڑھا ہو چلا ہے بے چارہ۔ اُس نے اِس حادثے کے سمجھوتے والے کاغذات بڑے جتن سے رکھے ہیں جیسے مُہروں کی تھیلی ہو۔

ــــ پتاجی کو میں نے بچپن میں دیکھا تھا۔ لانبا قد، چھریرا کالا جسم، مسکراتا چہرہ، سر پر ململ کی اونچی دیوار والی کالی ٹوپی اور ہمیشہ سفید لباس زیب تن کئے۔ پڑھے لکھے تو تھے نہیں لیکن فاؤنٹین پن ہمیشہ جیب کی شان دوبالا کرتا رہتا ــــ

●●

پتاجی گودی سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ ہم لوگ حال ہی میں گاؤں لوٹے ہیں۔ بمبئی کی تمام ہڑ جگماہٹیں ختم ہو چکی ہیں ــــ اب کہیں کھیتوں میں مزدوری کرتے ہیں یا لکڑیاں

توڑتے ہیں ــــ ہاں! شادی بیاہ کے زمانے میں ہماری قسمت کھل جاتی ہے۔ آس پاس کے گاؤں کے چار سازندے اکٹھا کر کے چار پیسے کما لیا کرتے جو دو نفیری بجایا کرتے تھے۔ انھیں چونکہ ڈراموں کا شوق تھا اس لئے شام کو مہار واڑے کے نوجوانوں کو جمع کر کے لاؤنیاں (عشقیہ گیت) گایا کرتے تھے ــــ ڈھولک پر مسالہ بھرنے میں اپنا جواب آپ۔ کبھی کبھی گاؤں سے اور ٹھا کر واڑے سے مسالہ بھرنے کے لئے ان کے پاس ڈھولکیں آیا کرتیں، مردنگ بھی آتے ــــ ان کے مسالہ بھرے ڈھولک اور مردنگ تو مندر میں بجائے جاتے مگر خود انھیں مندر میں داخل نہیں ہونے دیا جاتا ــــ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا تھا، تاہم میرے پتاجی بھلی اور بُری کئی باتوں کا پٹارہ تھے ــــ گاؤں کا اکھاڑہ مہاروں کے لئے بند تھا اس لئے انہوں نے اپنے ہی گھر میں زمین کھود کر اکھاڑہ بنا لیا تھا۔

میں اکثر سازندوں کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ سمبل کی تال پر جھک کر اور ما تھا ٹیک کر سکّا اٹھانا میں نے اُنھیں سے سیکھا تھا۔ باراتوں میں وہ لاؤنی گایا کرتے تھے۔ سازندوں کی ٹولی میں ایک سٹوا نام کا آدمی تھا۔ بے حد مزاحیہ۔ بات بات پر ہنسایا کرتا تھا۔ کانڈ ایسا بجاتا تھا کہ سننے والا محوِ رقص ہو جاتا تھا ــــ ایک دفعہ میں نے اُسی سے پوچھا "سٹوا ماما! تم کانڈ تو اتنا اچھا بجا لیتے ہو لیکن تمہارے کھانے کی تھالی گھورے پر کیوں رہتی ہے؟ یہ کیا بات ہے سٹوا ماما؟"

"میں ان کی ماں کی شادی میں ناچوں ۔ ۔ ۔" (یہ اُس کی مخصوص گالی تھی) اس کی اِس بے پرواہ ہنسی میں کئی لال پیلی لپٹیں نکلتیں۔

"دیکھو ان کو گالیاں دیتا ہوں ــــ" اور وہ کانڈ میں گالیاں بجانے لگتا اور براتیوں کے سامنے بجاتا ہوا کھڑا ہو جاتا۔ باراتی واہ۔ واہ کرتے اور مجھے اُس میں گالیاں سُنائی دیتیں۔

ــــ ایک اور واقعہ ذہن میں گردش کر رہا ہے۔ ایک دفعہ تمام باراتی بیل گاڑیوں میں بیٹھ کر جا رہے تھے۔ دوپہر کی کڑی اور چلچلاتی دھوپ میں سازندے گھسٹتے چل رہے تھے۔ سٹوا ماما میرے لئے لوگوں سے منت سماجت کر رہا تھا کہ "اِسے بیل گاڑی میں بٹھلا یا جائے۔" لیکن کوئی کیونکر سُنتا؟ میں کبھی پتاجی کے کاندھے پر بیٹھ جاتا اور کبھی سٹوا ماما کے۔ منزلِ مقصود تک پہونچتے پہونچتے مجھے بڑی تیز بھوک لگ آئی تھی مگر مہار لوگوں کو تمام باراتیوں کے کھا چکنے سے پہلے کیسے کھانا مل جاتا؟ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا جائے؟ سب پریشان!

ہماری ٹولی میں ایک سُدام بُوا تھے جو سُنکری بجایا کرتے تھے ــــ سر پر لال پگڑی، کانوں میں سونے کے بالے اور ماتھے پر سیندور کا بڑا سا ٹیکہ ــــ ان کے پھٹے ہوئے کوٹ کی جیب میں چیتھڑوں کی بنی ہوئی ایک گڑیا ہمیشہ ہوا کرتی تھی جسے وہ "خالہ" کہا کرتے تھے۔ بالوں کا چھوٹا سا جوڑا اور پیر میں بجتے ہوئے گھنگھرو۔ لوگ سمجھتے تھے کہ سُدام بُوا ٹونہ ٹوٹکا کرتے ہیں ــــ ہاں! مگر وہ خالہ انھیں کسی بات کی کمی نہیں محسوس ہونے دیتی تھی اور اِس بار بھی یہی ہُوا ــــ ماتھے پر سیندور کا بڑا سا ٹیکہ لگائے اور ایک گھٹیا سی ساڑی میں لپٹی ہوئی ایک عورت سُدام بُوا کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی ــــ "سُدام بُوا میری گود خالی ہے۔ بچہ نہیں ہوگا تو میرا پتی دوسری عورت لے آئے گا ــــ"

"اچھا! یہ تو بڑی آسان بات ہے۔" سُدام بُوا نے جیب سے گُڑیا نکالی اور

اُس عورت کے سر پر گھما کر کہا — "اب دیکھو! صدقہ دینا پڑے گا گھی میں تلے ہوئے بارہ انڈے اور بارہ پراٹھے۔ وہ جو آم کا درخت دکھائی دے رہا ہے نا! وہیں رکھ آنا۔" وہ چامی بھر کر چلی جاتی ہے۔ اِدھر ستّو آ ماما اور سُدام بُوا خوشی سے تالی بجانا شروع کر دیتے ہیں — کچھ دیر بعد صدقہ آجاتا ہے — ہم لوگ پہلے ہی سے وہاں چُھپے بیٹھے تھے۔ اُس عورت کے ہٹتے ہی ہم لوگوں نے انڈوں اور پراٹھوں پر دھاوا بول دیا —

— میرے ہوش سنبھالتے سنبھالتے تک گاؤں کے یہ سب سہارے اس جہانِ فانی کا سفر پورا کر چکے ہیں۔ بھائی بھائی میں جھگڑے شروع ہو گئے اور ہم اس ستائی ہوئی دنیا کے گئے گزرے لوگ دُکھ درد اٹھانے کے لئے رہ گئے۔ پتاجی کا سایہ سر سے اُٹھ چُکا ہے۔ اُن کا 'شراب' کا بڑھتا ہوا چسکا جس نے انھیں ہم سے ایکدن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جُدا کر دیا ہے۔

ہر جانب سے ذلّت' بے عزتی' جھڑکیاں' دُھتکار' ڈانٹ پھٹکار......

مگر ماں کسی طرح حالات کو سنبھال لیتی ہے — وہ نہ ہوتی تو ہم حالات کے پیروں تلے اِس قدر روندے جاتے کہ ہمارے وجود کا پتہ ہی نہیں چلتا — مرے ہوئے گائے بیلوں کا بوجھ ڈھونا۔ کسی کی موت کی خبر گاؤں میں گھر گھر پہونچانا' ماں کو یہی کام ملتے تھے۔ اس میں بھائی بند حصّہ دار ہو جاتے تھے۔ بسر اوقات مشکل تھی — لکڑیاں توڑنا اور بیچنا۔ نہ جانے کیسے کیسے کام کر کے وہ ہمیں پالتی رہی اور پڑھاتی رہی —

— گاؤں کے سکول سے میں نے چوتھی جماعت پاس کر لی تھی۔ پانچویں سے تعلقہ کے سکول میں جانا پڑتا تھا۔ یہاں بیوہ عورت کے بچّے کا پڑھنا لکھنا کسی کو پھوٹی آنکھ نہیں بھاتا تھا — لوگ ماں کو مشورہ دیتے "کیوں ری سکھو؟ برہمن کی طرح اسے پڑھا لکھا رہی ہے۔ ارے! کسی کے بیل ہی چرانے بھیجدیا کر' نمک مرچ کا خرچ تو نکل ہی آئے گا۔" لیکن ماں نے کبھی کسی کی ایک نہ سُنی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا بچّے کو پڑھانا بیحد ضروری ہے اس دوزخ نما دنیا سے نپٹنا ضروری ہے۔ معلوم نہیں اس میں اتنی سمجھ کہاں سے آگئی تھی؟ تعلقہ میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے اور ایسے تلخ تجربات ہوئے کہ جن کی یاد آتے ہی کلیجہ مُنہ کو آنے لگتا ہے۔ گاؤں کے کچھ مراٹھا لڑکے ساتھ پڑھتے تھے...... دل میں نئی اُمنگیں کروٹیں لے رہی تھیں۔ دل مایوسیوں کے گھٹن بھرے اندھیروں سے باہر نکل رہا تھا۔ میں اندر ہی اندر بہت خوش تھا — کلکرنی ماسٹر مجھے بچّوں کے سامنے کھڑا کر کے کہتے "دیکھو یہ مہار کا لڑکا ہے۔ لیکن کیسا صاف ستھرا رہتا ہے۔ پڑھائی لکھائی میں بھی تیز ہے۔ جلسوں میں تقریریں کرتا اور ڈراموں میں بھی حصہ لیتا ہے۔ یہ تعریفیں سُن کر میں پھولا نہیں سماتا۔ من کا پنچھی اڑانیں بھرنے لگتا۔ دُور۔ بہت دُور۔ بلند۔ اور بلند۔

لیکن دوپہر کے کھانے کے وقت مجھے اپنی اصلی جگہ کا علم ہو جاتا ہے۔ میں دھم سے زمین پر گر پڑتا ہوں —

"یہ کیوں؟ آخر ایسا کیوں؟ آخر مجھ میں ایسی کون سی کمی ہے؟"

اونچی ذات کے لڑکے مجھ سے دُور ہٹ کر بیٹھ جاتے ہیں — ان کا اچار' چٹنی میری روٹی پر آسکتی ہے لیکن میرا اچار وہ کبھی نہیں کھاتے — میں ندی کا پانی بہاؤ کی طرف جا کر پیا کرتا —

ایک دن میں جی کڑا کر کے اپنی چٹنی انھیں دینے لگتا ہوں — بس قیامت آجاتی ہے — وہ سمجھتے ہیں میں نے اُن کی سخت بے عزتی کی ہے۔

"ڈھیڈ' مہار! نیچ کہیں کا —" گالیاں برسنے لگتی ہیں۔

"تم میری چٹنی نہیں کھاتے تو میں بھی تمھارا اچار نہیں کھاتا۔" میں اُن کا دیا ہوا اچار ندی میں پھینک دیتا ہوں۔

"اچھا! یہ بات ہے!!! یہاں تو یہ گھمنڈ اور گھر پہ؟ وہاں ہمارے دیئے ہوئے ٹکڑے توڑتے ہو — وہ بھی آٹھ آٹھ دن کے باسی ٹکڑے —"

میرا دماغ جھنجھنا اُٹھتا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اچانک میرے ہاتھ پاؤں کی قوت سلب ہو گئی ہو۔

وہاں سے بہت دور نکل آتا ہوں — آنکھیں زار و قطار آنسو بہانے لگتی ہیں۔ دیر تک ندی کنارے بیٹھا روتا رہتا ہوں۔ یہ امرت لٹاتی ندی — اِسے میری آنکھوں کے کھاری پانی سے کچھ لینا نہ دینا —

پھر ایک دن سوناؤ نے ماسٹر صاحب مجھے اپنے کمرے میں بُلواتے ہیں اور کہتے ہیں — "گاؤں کے بورڈنگ کے لئے تمہارا انتخاب ہو گیا ہے' چھٹی جماعت سے تم وہاں پڑھنے جاؤ گے —"

میں خوشی سے جھوم اُٹھتا ہوں۔ اِن طعنے کسنے والے ہم جماعتوں سے دور چلا جاؤں گا — اور ماں کا کچھ بوجھ بھی ہلکا کر سکوں گا — اپنا بستر لیکر بورڈنگ میں چلا جاتا ہوں۔ لیکن یہاں پہلے ہی دن ساری خوشیوں پر پانی پھر جاتا ہے — لوکل بورڈ کا بورڈنگ ہے۔ تمام لڑکے مہادیو کولی (مچھیرے) میں پہلا اور تنہا مہار طالب علم۔ اِسی کا چرچا ہونے لگتا ہے — کوئی مجھ سے بات نہیں کرتا — میں اپنی تھالی اور لُٹیا لئے کھانا کھانے جاتا ہوں تو بورڈنگ سپرنٹنڈنٹ مجھے سمجھانے لگتے ہیں — "تم مہار ہو! یہیں دروازے کے پاس کھانا کھایا کرو۔ اندر گھسنے کی کوشش کرو گے تو سب بچّے مل کر تمہیں پیٹ ڈالیں گے —"

اپنے سے فاصلہ رکھکر بیٹھے ہوئے لڑکوں کی طرف میری نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سب لڑکے میری جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں قیدی ہوں بیڑیوں اور ہتھکڑیوں سے جکڑا ہُوا قیدی جس کے سر پر تلوار لٹک رہی ہو۔ اگر اپنی جگہ سے ذرا بھی ہلا تو تلوار سر پر گر پڑے گی اور کھٹاک کے ساتھ سر تن سے الگ ہو جائے گا۔

— دھیرے دھیرے جان پہچان بڑھنے لگتی ہے۔ ہر سنیچر کو ہنومان کی پرارتھنا اور بھجن ہوتے ہیں ۔ وِشنوُ جن تو تے نے کہیئے جو پیر پرائی جانے رے۔ میری آواز چونکہ اچھی تھی اس لئے اکثر بھجن گانے کے لئے مجھے سب سے آگے کھڑا کیا جاتا لیکن پرساد تقسیم کرتے وقت تھال ہمیشہ کسی دوسرے کو تھما دیا جاتا — میں حسرت و یاس سے اپنے ہاتھوں کو دیکھا کرتا "کہیں میں کوڑھی تو نہیں ہوں —" جی میں آتا کہ خوب چیخوں' خوب چلّاؤں۔ چُپ چاپ گردن جھکا کر یہ ذلّت کیوں سہی جائے؟ اِس سے تو بہتر تھا کہ میں کسی کے بیل چرانے چلا جاتا —

— کوئی شری خیرات بورڈنگ میں آیا کرتے تھے۔ وہ بہت اچھی طرح پیش آتے تھے اور میرے تئیں بڑی ہمدردی رکھتے تھے — وہ ہارمونیم پر بھجن گایا کرتے تھے۔

—کبھی کبھی ان کے ساتھ چرچ چلا جایا کرتا تھا اور چرچ میں بھگوان کے قدموں تک پہونچ جاتا تھا لیکن یہاں جس دھرم کا ٹیکہ لگا کر پیدا ہوا ہوں اُس میں بھگوان کے در کی سیڑھیاں چڑھنا گناہ ہے۔ میرا دھرم تو چیونٹیوں کو شکر کھلاتا ہے۔

اور ایک دن ہمت کر کے میں مندر میں داخل ہو ہی گیا —— بات دراصل یہ تھی کہ میں چھٹیوں میں ننھیال جایا کرتا تھا۔ وہاں ہریجنوں کو پانی ملنا دشوار تھا۔ ہریجن عورتیں پانی کی بھیک مانگنے گھنٹوں کنویں کے پاس کھڑی رہتیں۔ اگر پانی بھرنے والی عورتوں میں سے کسی کو رحم آ ہی گیا تو انھیں ایک آدھ گھڑا پانی مل جاتا۔ ایسے دردناک اور روح فرسا مناظر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ جی میں تو بس یہی آتا کہ کنویں کے پانی میں گندگی گھول دوں ——

ایک روز میں یوں ہی اپنے خیالات میں گم بیٹھا تھا کہ قریب کے ہنومان مندر میں بھیڑ بھاڑ نظر آئی۔ میں اُسی سمت چل دیا۔ کیا دیکھتا ہوں ؟ کہ ایک شخص ہنومان کی مورتی کے آگے اول فول بک رہا تھا۔ اس کی زبان سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ میرا خیال ہے کوئی "ستیہ شودھک" سماج کا رکن ہوگا لیکن گاؤں والے اُسے پاگل قرار دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آگے چل کر یہ کسی پر پتھر پھینکے گا۔ جب وہ بکتا یا مورتی کے سامنے دوڑتا۔ لوگ قہقہے لگانے لگتے — میں نے تو بس یہی محسوس کیا کہ اگر ایک آدمی بھگوان کے سامنے ایسی حرکتیں کر سکتا ہے تو میرے مندر میں داخلہ سے کیا فرق پڑ سکتا ہے ؟

میں چونکہ گاؤں کے لئے نیا تھا اس لئے پہلے تو کسی نے پہچانا نہیں —— پھر کسی نے پوچھا "کون ہو ؟"

"کیسے کے ہاں آیا ہوں۔ وہ میرے ماما جی ہیں —" میں نے جواب دیا۔

"یعنی مہار !!! چل اُٹھ مہار کہیں کا — سب بھرشٹ کر دیا۔ گندہ کر دیا۔ مندر کو ؟"

یہ خبر گاؤں میں بجلی کی لہر کی طرح دوڑ گئی۔

"بکٹر دسالے کو' اِن لوگوں کو بڑا گھمنڈ ہو گیا ہے —"

مجھے کھمبے سے باندھ دینے کی تجویز رکھی گئی۔ میرے ہاتھ پیروں سے پسینہ چھوٹنے لگا۔ لوگوں کی سُرخ سُرخ آنکھیں مجھے گھورنے لگیں اور پھر چٹاخ سے ایک تاٹے دار تھپیڑ' میرے نرم و نازک گال پر پڑتا ہے۔ میری نگاہیں بھگوان سے لڑنے والے آدمی کو تلاش کرتی ہیں لیکن اب وہ کہیں دکھائی نہیں دیتا ——

کچھ دیر بعد کسی طرح نانی مجھے آزاد کرا لیتی ہیں —

●●

ساتویں پاس کر لینے کے بعد یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ اب کیا کیا جائے ؟

کوئی مشورہ دیتا ہے کہ "سکول ماسٹر بن جاؤ —" لیکن مجھے تو آگے پڑھنا ہے — ٹپڑدس کے تعلقہ میں اچھوتوں کا بورڈنگ ہے۔ میں وہاں داخلہ کی کوشش میں لگ جاتا ہوں اور کامیاب بھی ہو جاتا ہوں۔ تھالی' لٹیا اور صندوق لئے پہونچ جاتا ہوں۔ بمبئی سے آئے ہوئے ٹرسٹی انٹرویو لیتے ہیں۔ میری ٹوپی اور کھادی کے کرتے پاجامے کا چرچہ ہونے لگتا ہے۔ میرا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اصلی بات تو یہ تھی کہ یہ کپڑے مجھے پہلے والے سرودیہ سکول سے مفت میں ملے تھے۔

"تمہاری ذات ؟" مجھ سے سوال کیا جاتا ہے

"ہریجن" میں جھجکتے ہوئے جواب دیتا ہوں۔

"بیٹا! ایسا نہیں کہتے۔ اپنے آپ کو مہار کہو بیٹا۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ پہلے پرائمری سکول کے برہمن ماسٹر نے مجھ سے کہا تھا "تم ہریجن ہو —"

اور یہاں یہ دستور !!! خیر مجھے سکول میں داخلہ مل جاتا ہے — اور پھر یہاں میرا تعارف ہوتا ہے۔ لوگوں کے ملاحظات عجیب انداز سے پڑھنے میں آتے ہیں — ایک روز امبیڈکر جینتی پر میری ٹوپی جلا دی جاتی ہے۔ معلوم نہیں کیوں ؟ لیکن مجھے اس کا کوئی افسوس بھی نہیں ہوتا —— آس پاس کے گاؤں سے آئے ہوئے پچاس طالب علم ہوتے ہیں۔ تین چمار۔ دو مہادیو کولی (مچھیرے) ایک مانگ اور باقی سارے کے سارے مہار — یہ پہلے سکول والے لڑکوں کی طرح رُعب نہیں جماتے۔ مہار لڑکوں کی اکثریت کی وجہ سے سب بھیگی بلی بنے رہتے ہیں۔ بس مجھے اسی بات کا سکون ہوتا ہے اور میں اطمینان سے پڑھنے لگتا ہوں۔

میں دیوالی کی چھٹیوں میں گھر جاتا ہوں تو ماں کی حالت مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔ قحط کی سی صورتحال ہوتی ہے مہار اب چمڑا اتراشنا جیسا کام نہیں کرتے۔ اب ماں گذر اوقات کرے تو کس طرح ؟ اسی فکر اور الجھن میں لوٹ آتا ہوں۔

اتفاق سے بورڈنگ میں کھانا بنانے والی بائی کام چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ مجھے فوراً اپنی ماں کا خیال آتا ہے میں سکول کے ذمہ دار لوگوں سے گفتگو کر کے ماں کو بُلوا لیتا ہوں۔

لیکن ماں کے آتے ہی میرا جینا دوبھر ہو جاتا ہے — تمام لڑکے اسی ٹوہ میں رہتے ہیں کہ کہیں اس کی ماں چوری سے اِسے کھلا تو نہیں رہی ؟ میں ماں سے ملنا جُلنا ترک کر دیتا ہوں — وہ بھی کام کے بوجھ تلے دبی رہتی ہے — جب کھانا کھانے بیٹھتے ہیں تو رسوئی کی بُرائی شروع ہو جاتی ہے — "کیسا کھانا ہے ؟ دال ہے کہ پانی . . . . . ؟"

مجھے یہ باتیں بچھو کے ڈنک کی طرح لگتی ہیں — کبھی کبھی یہ لوگ خود جا کر مٹھی بھر بھر کے نمک ڈال آتے ہیں اور شور مچ جاتا ہے کہ موجودہ بائی کو کھانا پکانا نہیں آتا۔

ویسے گاؤں کے سنار' درزی اور برہمنوں کے لڑکوں کا برتاؤ میرے ساتھ اچھا تھا — وہ مجھے اکثر گھر لے جاتے اور کھلاتے پلاتے۔ شاید یہی ایک بات تھی جس نے مجھے بکھرنے نہیں دیا۔

لیکن ایک جان لیوا واقعہ آج بھی ذہن و دل میں تازہ ہے۔ اُس طرف خیال جاتے ہی اچانک دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ سارا جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا ہے آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے —— ماں کو بورڈنگ میں آئے تقریباً پندرہ روز ہو چکے تھے ——

سکول سے لوٹ کر اپنی تھالی اور لٹیا لیکر کھانے کے دالان میں پہونچتا ہوں — تمام لڑکے بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں جن کی پروسنے کی باری ہے وہ پروس رہے ہیں مگر مجھے دیکھتے ہی چیخ پڑتے ہیں۔ میں حیران رہ جاتا ہوں کہ آخر بات کیا ہے ؟ — پیار تھمنا ختم ہو جاتی ہے لیکن کوئی کھانے کے لئے راضی نہیں ہوتا —

سب سب بار چلاتے ہیں ــــ بورڈنگ سپرینٹنڈنٹ آتے ہیں۔ وہ بھی نہیں سمجھ پاتے کہ معاملہ کیا ہے؟ کوئی کچھ پھوٹتا ہی نہیں ــــ میں رسوئی گھر میں جھانکنے لگتا ہوں۔ ماں مجھے دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ جاتی ہے اور زاروقطار رونے لگتی ہے۔

"آخر ہوا کیا؟" میں پوچھتا ہوں۔

کافی دیر تک ماں کی ہچکیاں بند ہی نہیں ہوتیں بہ مشکل یہ الفاظ ادا ہوتے ہیں ــــ "میں اس وقت رسوئی تک جانے کے قابل نہیں ہوں ــــ میں رسوئی نہیں چھو سکتی۔" میرا رُواں رُواں سلگ اٹھتا ہے ــــ ایسا لگتا ہے جیسے سارے جسم میں تیزاب کی بے شمار دھاریں بہہ رہی ہوں۔ بس یہی دل کہتا ہے کہ اپنی کالی صورتیں لئے زمین میں سما جائیں ــــ ہم یہاں کیوں پیدا ہوئے؟ کیوں نہ برف سے ڈھکے کسی سنسان ملک کے باشندے بنے؟ وہاں یہ باتیں تو نہیں ہوں گی! میں ساری رات زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتا رہا، تڑپتا رہا۔

●●

میری چھ سالہ لڑکی مجھے جگا رہی ہے۔ میں ماضی کا بوجھ اتار کر اُٹھ بیٹھتا ہوں۔

"دادا آپ رو رہے ہیں؟" وہ مجھے تعجب خیز نگاہوں سے دیکھ رہی ہے کیونکہ میری آنکھیں بھیگی ہوئی ہیں۔ "گرد چلی گئی تھی آنکھوں میں بس اور کچھ نہیں ــــ"

"دادا مجھے مناچے شلوک کتاب لا دیجئے" ہمارے ماسٹر صاحب نے کہا ہے۔"

مجھے رام داس کا شلوک یاد آتا ہے .... مجھے یاد آتا ہے ....

ــ اس ناپائیدار جسم کی صرف سطحی جلد خوبصورت ہے
اس گوری اور خوبصورت جلد کے اندر دوزخ جیسی گندگی بھری ہوئی ہے
لہٰذا اس دنیا کے بہلاوے میں نہ آؤ
اُس دنیا کو پہچانو جہاں تمہیں ہمیشہ کے لئے جانا ہے
انسان کے تئیں یہ کیسا تنفر؟

میں تو کڑوے گھونٹ نگل گیا اور نہ معلوم میری کتنی پشتوں نے نگل لئے ہوں گے! اور اب میری یہ بچی اسی روایت کی ایک کڑی ہے۔
کیا اسے بھی ایسے ہی کڑوے گھونٹ پینے پڑیں گے؟

ترجمہ: دور سیٹھی

۴۸ - نو پاڑہ باندرہ ایسٹ بمبئی ۵۱

بقیہ بیر بہوٹی

بِٹّن دن بھر کیسی ڈھال ڈھال سی رہی۔

بابا نے سر پر ہاتھ پھیر کر جب اسے سمجھانا چاہا کہ بیٹا، کوئی خوف ہے جو تیرے دل میں کہیں بس گیا ہے، اسے نکال پھینک۔ تو سائنس پڑھتی ہے۔ اسپوٹنک ایج میں جب کہ آدمی چاند پر جا چکا ہے، یہ بدروحیں، یہ شیاطین بھلا کس پر رعب جما سکیں گے، سو بے چارے اپنی موت آپ مر گئے ہیں۔ جب ان سے ڈرنے والا ہی کوئی نہیں رہا تو وہ خاک جئیں گے۔ جہاں سائنس نے ترقی کی شیطان مرا بے چارہ۔

ممی بیچ میں کود پڑیں۔

"گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہسٹریا ہی ہے۔ میں تو کہوں گی جن ملکوں نے سائنس میں ترقی کی ہے وہاں سے نکلے ہوئے شیطان بھی ہندوستان میں آ بسے ہیں اور پھر کتابوں میں آیا ہے لوگوں کو بدروحیں تنگ کریں گی، شیاطین راستہ بھٹکا دیں گے۔"

ممی جب میدان میں آئیں تو بابا کی گھگھی بندھ گئی ــــ بہ مشکل اتنا کہا کہ بِٹّن کو کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ ہسٹریا نہ سایہ سپٹ ــــ وہ کچھ اندر سے ٹوٹ سی گئی ہے، میری بات مانو تو۔

"میری بات" ممی نے میدان میں جنگ کا اعلان کر ہی دیا ــــ "ڈاکٹروں کی ڈاکٹری سچی نہیں، کتابوں کا لکھا سچا نہیں۔ بِٹّن کو کچھ بھی نہیں ہے، وہ تو ڈھونگ رچا رہی ہے۔ اب آپ ہی کا علاج کیوں نہ کریں، نئی بیماری جو بتلا دی آپ نے، اندر سے ٹوٹ رہی ہے ــــ وہ کوئی چینی کی گڑیا ہے جو اندر سے یا باہر سے ٹوٹے گی ــــ خود ڈاکٹر بن رہی ہے، سب جان جائے گی۔"

کھڑکی سے تیز ہوا کا جھونکا آیا تو پاس پڑی ہوئی فزکس کی بوسیدہ کتاب سے دو چار ورق لے اڑا۔

بِٹّن نے کتاب کے ورق اڑتے دیکھے تو منہ پھیر لیا۔

بابا نے کن انکھیوں سے بِٹّن کو دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھرے بغیر اس کی ممی کو اِدھر اُدھر کی دوسری باتوں میں لگائے رکھنے کی کوشش کرنے لگا ★

پھول والوں کی سیر

پھول والوں کی سیر کا میلہ ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار ہے۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی یہ میلہ (۴ سے ۱۱ اکتوبر ۷۶ء) روایتی شان و شوکت سے منایا گیا۔ جس میں صدر جمہوریہ ہند جناب فخرالدین علی احمد نے بھی شرکت کی ــــ

اس موقع پر اپنے پیغام میں وزیراعظم ہند نے کہا کہ ایسی تقریبات کی زیادہ سے زیادہ ہمت افزائی کی جانی چاہیے تاکہ مختلف مذاہب کے لوگ آپس میں ملیں اور ملک میں اتحاد و ہم آہنگی کی فضا پیدا ہو۔



پھول والوں کی سیر کے میلے کا ایک منظر

غزلیں

اقبال فرید
نمبر ۱، نظر آباد مسجد، میسور

جام و سبو ہیں، سائے ہیں دامانِ یار کے
دنیا میں ہیں ہزار بہانے فرار کے

کچھ دیر جھوم اٹھے گا اہلِ قفس کا دل
صیاد ہی سے سن لیں فسانے بہار کے

وعدہ تو کرلو آج، وہ جھوٹا ہی کیوں نہ ہو
گر کچھ نہیں تو آئیں مزے انتظار کے

آجائیں سوئے میکدہ اب شیخ و برہمن
جھگڑوں سے تو نجات ملے بار بار کے

خود پر جو اعتماد تھا، وہ اب نہیں رہا
کیا کیا نہ گل کھلائے گی، صدقے بہار کے

پتھر بنے ہوئے ہیں فرید اہلِ انجمن
احوال کیا سنائیں دلِ بے قرار کے

اسعد بدایونی
سرائے چودھری، بدایوں

بڑے نادان تھے ہم ریت کو آبِ رواں سمجھے
کھجوروں کے درختوں کو گھنیرا سائباں سمجھے

چمن میں میرے آنسو تھے جنھیں شبنم کہا سب نے
فلک پر میری آہیں تھیں جنھیں سب کہکشاں سمجھے

کبھی تجھ کو غبارِ رنگ میں کوئی کرن جانا
کبھی تجھ کو گرفتِ سنگ میں جوئے رواں سمجھے

کئی بے مہر صبحوں کو عطا کی روشنی ہم نے
کئی نامہرباں راتوں کو بھی ہم مہرباں سمجھے

خزاں کے شہر میں بس میں بہاروں کی علامت تھا
مرے زخموں کو سب پھولوں کی نازک پتیاں سمجھے

سبھی کو دے رہا تھا وہ دعا جینے کی صدیوں تک
ہمارے شہر کے سب لوگ اس کو بدزباں سمجھے

تھکے بیٹھے تھے کچھ پنچھی لبِ دریا جنھیں اسعد
ہم اپنی پر شکستہ خواہشوں کا کارواں سمجھے

ظہیر انور
ٹیکری روڈ، پتھر کی مسجد، پٹنہ ۶

تلخیاں لیتا چلوں، رسوائیاں لیتا چلوں
یعنی اس کی قربتوں کے ارمغاں لیتا چلوں

تاکہ آنکھوں میں لگے اور اشک بن کر بہہ سکے
اپنی جلتی خواہشوں سے کچھ دھواں لیتا چلوں

کیا خبر اس سرزمیں پر دھوپ کتنی تیز ہو
سر چھپانے کے لیے اک آسماں لیتا چلوں

تیرہ پیوندِ قبا سے روشنی اُگنے نہ دوں
اپنے مخلص دوستوں کا امتحاں لیتا چلوں

کوئی بیٹھا ہے پسِ ایقان انور آج بھی
اک ذرا ابہام، کچھ گردِ گماں لیتا چلوں

اعجاز اعظمی
پورٹ ڈکسن، ملیشیا

سکوں نواز، طرب خیز، خواب ناز مرا
حقیقتوں کے کھنڈر میں بھٹک رہا ہوگا

سلگ سلگ کے جلا عمر تک بھلا ہی ہوا
ہوا کے دوش پہ ابرِ بہار بن کے پھرا

تڑپ رہا ہوں میں صدیوں سے اک صدا کے لیے
خیال ہے کہ کسی نے مجھے پکارا تھا

خدا گواہ ہے ہر موڑ پر خدا ہی ملے
خدا کی راہ میں اک بندۂ خدا نہ ملا

وہ جس کے دم سے تھی اعجاز رونقِ محفل
حصارِ جسم میں تنہا اداس اداس ملا

خلیل سیمابی کولاری
نیشنل ٹائپنگ آفس، ایم اے روڈ، کولار

دل کو آئینہ بنا، جوہرِ ایمانی دے
پھر مجھے دعوتِ صد جلوۂ نورانی دے

تلخیاں صبر کی یارب ہیں گوارا مجھ کو
ہاں مگر ان کو بھی احساسِ پشیمانی دے

باوضو بندگی کرنی ہے ادب سے ان کی
چشمِ تر! خون دے ہرگز نہ مجھے پانی دے

تا ابد زندہ رہے نام ترا ہستی میں
ایسی اک بار کبھی جان کی قربانی دے

حسنِ اول سے فقط اتنی گذارش ہے مری
آئینہ دل کو بنا، آنکھوں کو حیرانی دے

بانٹ دے میری خوشی سب کو اے خلاقِ جہاں
پھر مجھے سارے زمانے کی پریشانی دے

ایک مدت سے یہی دل کی تمنا ہے خلیل
درد ایسا ملے جو دولتِ عرفانی دے

خالد رحیم
بخشی بازار، کٹک

میں گردِ راہ گذر ہوں تو پھر اڑا مجھ کو
بلندیوں کی فضا بھی ذرا دکھا مجھ کو

میں تھک گیا ہوں زمانے کو روشنی دے کر
سیاہ رات! تو پلکوں میں اب چھپا مجھ کو

یہ کون مجھ کو بلاتا رہا ہے صدیوں سے
ہر ایک موڑ پہ ملتی ہے اک صدا مجھ کو

یہ راہ کونسی ہے، یہ مجھے خبر تو نہیں
کہ لے چلا ہے کہیں ترا نقشِ پا مجھ کو

تو میرا یار سہی دشمنوں کے شہر میں پھر
جھٹک کے آستیں اپنی بھی تو دکھا مجھ کو

میں تیرے شہر میں پہنچا تو کیا کہوں خالد
ہر ایک شخص یہاں گھورنے لگا مجھ کو

نئی کتابیں

مخدوم علی مہائمی (حیات، آثار و افکار)

از جناب عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی
ناشر نقشِ کوکن پبلیکیشن ٹرسٹ بمبئی ۹
صفحات ۳۱۲+۸ سائز ۱۸ × ۲۲ / ۸
اشاعت اول : جنوری ۱۹۷۶ء
ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

یہ کتاب آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) کے ایک عالم اور درویش مخدوم علی مہائمی کی حیات اور افکار و آثار کا ایک مفصل جائزہ پیش کرتی ہے جسے مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی نے لکھا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو دس ابواب میں تقسیم کردیا ہے۔ پہلے باب میں مہائم کا تاریخی پس منظر بیان ہوا ہے اور دوسرے میں مخدوم صاحب کی زندگی اور تعلیم و تربیت وغیرہ کا حال ہے۔ تیسرے باب میں اُن کے صوفیانہ مسلک سے بحث کی گئی ہے۔ چوتھے باب کا عنوان 'کشف و کرامات'، پانچویں کا 'معمولات' اور چھٹے کا 'وفات' ہے ساتویں باب میں اُن کے تصنیفی کارنامے بیان ہوئے ہیں۔ آٹھواں باب 'تفسیر مہائمی' کے تفصیلی جائزے کے لئے وقف ہے۔ نویں باب میں فلسفۂ وحدت الوجود اور اس کی تعبیر و تشریح بیان کرتے ہوئے نہ صرف شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کے نظریے کو وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ اس موضوع پر حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے مسلک کو بھی واضح کیا ہے اور دونوں نظریات کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے بعض اُن غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو نظریۂ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے باہمی فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے رائج ہوگئی ہیں۔ یہ اس کتاب کا سب سے زیادہ جاندار اور قابلِ قدر حصہ ہے۔ دسویں باب میں مخدوم علی مہائمی کے صوفیانہ افکار اُن کی تصانیف کی روشنی میں پیش کئے گئے ہیں۔ آخر میں فہرست کتابیات ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلاحی صاحب نے اس کتاب کی تصنیف کے سلسلے میں عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی ۵۰ کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ اسماء و اعلام کا اشاریہ بھی موجود ہے اور مخدوم کی درگاہ وغیرہ کی تصاویر بھی درج کی گئی ہیں

مخدوم علی مہائمی کا زمانہ حضرت نظام الدین اولیاؒ، اور حضرت نصیر الدینؒ چراغ دہلی کے بعد کا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب دکن میں حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ اور شمال میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ، مشرق میں حضرت سید اشرف سمنانیؒ گجرات میں حضرت شیخ احمد مغربی عرف شیخ احمد کھٹوؒ نے عوام الناس کی خدمت اور اصلاحِ احوال کے لئے خانقاہیں کھول رکھی تھیں اور صوفیاء کی تحریک اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔ مخدوم علی مہائمی نے اپنا مرکز ماہم میں بنایا تھا اس لئے شمالی ہند میں آج اُن کی عالمانہ اور صوفیانہ شخصیت سے اچھے خاصے تعلیم یافتہ افراد کو بھی اتنی واقفیت نہیں ہے جتنی ہونی چاہئے۔ یہ بات خاص طور پر توجہ طلب ہے کہ ابتدائی دور کے درویش محض اوراد و اعمال ہی میں بند نہیں رہتے تھے بلکہ صاحب تصانیف ہوتے تھے۔ دسویں صدی ہجری تک ہندستان میں تفسیر اور فقہ کا چرچا زیادہ رہا اور حدیث کی طرف التفات مغلوں کے زمانے سے شروع ہوا۔ مخدوم صاحب کی تصانیف کے موضوعات بھی فقہ، تفسیر، کلام اور تصوف ہیں۔ انہوں نے قرآن شریف کی ایک تفسیر بھی "تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنّان" کے نام سے لکھی تھی جسے بھوپال کے وزیر جمال الدین نے چھپوادیا تھا۔ اصلاحی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ تفسیر دو ضخیم جلدوں میں ہے (ص ۱۳۱) لیکن مولانا عبدالحیؒ رائے بریلوی نے اسے "فی اربعہ مجلدات کبار" (چار ضخیم جلدوں میں) بتایا ہے۔ تفسیر کے علاوہ فقہ اور تصوف کے موضوع پر مخدوم علی مہائمی نے گراں قدر تالیفات چھوڑی ہیں۔ تصوف میں لمعاتِ عراقی "فصوص الحکم"، اور "عوارف المعارف" کی شرحیں بہت اہم ہیں۔ ان میں سے بہت سی کتابیں ابھی تک شائع نہیں ہوئیں اور کتنی ہی ضائع ہوگئیں۔ یقین ہے کہ تلاش و جستجو سے اور بھی تصانیف مخدوم کی ملیں گی۔ وقت کی ضرورت یہ ہے کہ مولانا عبدالرحمٰن اصلاحی جیسا صاحب علم اور خوش سلیقہ انسان ان کتابوں کو مرتب کرے اور نقش کوکن ٹرسٹ، یا دوسرے سماجی ادارے ان تصانیف کو محض اس نیت سے چھاپیں کہ یہ ہمارے قدیم ترین متون ہیں اور انہیں آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ ہونا چاہیئے۔

کتاب اپنی ترتیب اور مباحث کے اعتبار سے بہت سے اُن تحقیقی مقالوں سے بہتر ہے جو ہماری دانش گاہوں میں داخل کیے جاتے ہیں۔ کتابت معمولی ہے اور کتابت کی غلطیاں بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ اس کتاب کے قدردان وہی حضرات ہوسکتے ہیں جو ہندستان میں تصوف اور علوم اسلامیہ کے نشو و ارتقار کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اُن کے لیے یہ کتاب ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔

(نثار احمد فاروقی)

تم کون ہو؟

آمنہ ابوالحسن
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدر آباد۔ ۱۹۷۴ء
صفحات : ۱۲۷ قیمت : چھ روپے

آمنہ ابوالحسن اردو فکشن میں ایک خاص مقام حاصل کرچکی ہیں۔ ان کا نیا ناول "تم کون ہو؟" ان کے پچھلے ناول اور بیشتر افسانوں

کی طرح نہ صرف موجودہ متوسط طبقے کے خانگی تعلقات، اس کی ذہنی کشمکش، جذباتی ناآسودگی اور گرتی ہوئی اقدار کی عکاسی کرتا ہے، بلکہ تلاشِ ذات کا مسئلہ بھی اٹھاتا ہے۔

انسان بہ یک وقت شیطان بھی ہے اور فرشتہ بھی۔ لیکن کوئی نہ کوئی مقصد، نظامِ اقدار یا محض شخصیت کا توازن اسے ہم آپ جیسا معمولی انسان بنائے رکھتا ہے۔

آمنہ ابوالحسن کا ہیرو نعیم مقصدیت درومانیت کی کشمکش کا شکار ہے۔ یوں تو وہ کسی انقلابی (؟) تخریبی (؟) خفیہ جماعت کا کارکن ہے لیکن وہ ایک متمول گھرانے کی لڑکی انیسہ پر محض اس لئے عاشق ہوجاتا ہے کہ اس کی شکل "سبیتا دیوی" نامی مشہور ایکٹریس سے ملتی جلتی ہے جو ہیرو کے عنفوانِ شباب کا محبوب آئیڈیل رہ چکی ہے۔ کسی نہ کسی طرح نعیم و انیسہ کی شادی ہوجاتی ہے۔ پھر دونوں کی شخصیتوں کا تضاد، انحطاط اور شکست و ریخت سامنے آتی ہے۔ نعیم کی شخصیت آسکر وائیلڈ کے مشہور ناول Picture of Dorian Grey اور گوئٹے کی ڈاکٹر فاسٹ کی یاد دلاتی ہے۔ اس کی شخصیت کے تدریجی زوال اور ہوسناکی کے ساتھ تین عورتوں کی کہانی بھی وابستہ ہے جو مظلوم تو ہیں لیکن ٹیپیکل مظلوم عورتیں نہیں۔ انیسہ آخر وقت تک اپنی شخصیت کو منوانے کی کوشش کرتی ہے اور اس کی شکست اور المیہ یہ نہیں کہ وہ اپنی شخصیت کو اپنے شوہر سے نہیں منوا سکتی بلکہ یہ ہے کہ اسے خود اپنی شخصیت اور اقدار کے کھوکھلے پن کا احساس و ادراک ہوجاتا ہے۔ شوہر کو شکست دینے کے لئے اس نے جو بھی طریقے اختیار کئے ان میں سے کوئی بھی اسے اطمینانِ قلب نہیں دے سکتا۔

"تم کون ہو؟" ایک نفسیاتی ناول ہے جس میں خارجی واقعات کے بجائے داخلی کیفیات وحسیات اور انسان کے باہمی رشتوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ الفاظ آمنہ ابوالحسن کی قوت بھی ہیں اور کمزوری بھی۔ چنانچہ اس کتاب کے پیش لفظ میں وہ خود اعتراف کرتی ہیں: "لکھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے اندر کوئی دفینہ ہے جو ہمیشہ اپنا منہ فراخ دلی سے کھول دیتا ہے کہ لو جتنا چاہے لے لو، بے دریغ خرچ کرلو، میں کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ میں تمھارا منبع ہوں، تمھاری شخصیت کا سرچشمہ، تمھارے محسوسات کا خزانہ اور پھر جمیل کیفیات اور تشکیل الفاظ میرے اندرون سے ترش ترش کر ابھرنے لگتے ہیں۔"

لیکن الفاظ کی بھرمار سے ایک نقصان بھی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ہر کردار، مصنفہ کی مکمل تشریح کے ساتھ قاری کے سامنے آتا ہے اور قاری کو خود اپنے ذہن یا تخیّل پر کوئی زور نہیں دینا پڑتا۔

اس ناول سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ آمنہ ابوالحسن کو الفاظ پر قدرت حاصل ہے لیکن الفاظ کے کفایت کے ساتھ استعمال پر نہیں اور نہ اس خاموشی پر جس کے بارے میں کہا گیا ہے:

ع خموشی معنیٔ دارد کہ در گفتن نمی آید

صالحہ عابد حسین

بحیثیت ناول نگار — صفحات ۱۲۸

نزہت فاطمہ — قیمت پانچ روپے

فرنگی محل۔ لکھنؤ ۴ ۱۹۷ء

اردو کی ممتاز ناول نگار صالحہ عابد حسین پر ایک ناقدانہ نہیں بلکہ پرستانہ نظر ڈالی گئی ہے نزہت فاطمہ اردو ادب کی طالبہ ہیں اور جہاں تک محترمہ صالحہ عابد حسین کی زندگی اور ان کے ادبی تخلیق اور کاوشوں کا ذکر ہے نزہت فاطمہ کی یہ کوشش قابلِ ستائش ہے لیکن اس کتابچہ میں اردو ناول کے ارتقا کے متعلق ایک باب ہے جو ذرا الجھا ہوا ہے اور جس میں ناول کے ارتقا اور اردو ناول نویسوں اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات کی تاریخ اور اشاعت کے بارے میں جا بجا غلطیاں پائی جاتی ہیں جس میں مصنفہ نے ناول اور افسانہ نگاروں کی تصنیفات کی تاریخِ اشاعت، ناول کی ابتدا، ارتقا و عروج کے ادوار کے بارے میں ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا ہے۔

انھوں نے لکھا ہے "ادھر پاکستان میں دو افسانہ نگاروں کو زیادہ شہرت ملی اور ان کے دو ناول سامنے آئے۔ ایک تو شوکت صدیقی کا "خدا کی بستی" اور دوسرا جمیلہ ہاشمی کا "تلاش بہاراں"، ممتاز مفتی کا ناول "علی پور کا ایلی" بھی ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ناول نگار جن کا ذکر اردو ناول نگاری کے باب میں ناگزیر ہے۔ اس میں اے آر خاتون کا "شمع"، "افشاں"، "ہالہ" اور "چشمہ"، رئیس احمد جعفری کا "طوفان"، عابد علی عابد کا "شمع" ضیا سرحدی کا "تاحدِ نگاہ" اور قرۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا" مشہور ہیں

اگر پاکستان کے مشہور ترین اور مقبول ترین ناولوں کا ذکر ہو تو کیا عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں"، اور خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" کا ذکر نہ کرنا ممکن ہے اے آر کا خاتون کا "شمع" کیا ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا؟ کیا یہ اس زمانے کی تصنیف ہے ایسے ہی بہت سے سوالات اس بات کے پڑھنے کے بعد ذہن میں سر اٹھاتے ہیں۔

ہمیں امید کرنی چاہیے کہ دوسرا ایڈیشن ان کوتاہیوں سے پاک ہوگا۔

(ک۔ س)

تنکے کا سہارا

اور دوسرے ناولٹ — نصرت پبلشرز۔ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ۳

شکیلہ اختر — قیمت آٹھ روپے

یہ کتاب شکیلہ اختر کے تین مختصر طویل افسانوں کا مجموعہ ہے یہ افسانے پرکشش ہیں اور دلچسپ بھی۔ ان کو پڑھ کر یہ نہیں محسوس ہوتا کہ ہم نے وقت ضائع کیا۔

ان افسانوں میں دو خوبیاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل تو ان میں دیہاتی زندگی کی مصوری بڑی خوبی سے کی گئی ہے۔ پریم چند کے افسانوں کے بعد سے یہ رجحان اردو میں بہت مقبول رہا ہے اس کی وجہ سے ہمارے افسانوں میں سادگی معصومیت اور اصلیت کا عنصر داخل ہوا۔ اس روایت کو سب سے زیادہ جس شخص نے آگے بڑھایا وہ بیدی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی افسانہ نگاروں نے دیہاتی زندگی، اس کے مسائل اور دکھ سکھ کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ شکیلہ اختر کے افسانے بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں۔

دوسری خوبی جو ان کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہے یہ ہے کہ ان کے نسوانی کردار بڑے دلکش اور جاندار ہوتے ہیں۔ ان میں ہندوستانی عورت کی بھرپور جھلک دکھائی دیتی ہے اس میں کمزوریاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی۔ وہ ٹوٹ کر محبت کرتی ہے اور چاہے جانے کی تمنا بھی رکھتی ہے۔ اور اس جذبہ کی تسکین کی خاطر وہ کبھی کبھی راستہ سے بھٹک بھی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ ان کے نسوانی کردار رومانیت مثالیت اور حقیقت کے امتزاج سے تراشے گئے ہیں۔

ان کے یہاں ایک مخصوص فلسفہ حیات بھی ملتا ہے۔ محبت ان کے نزدیک مذہب کا درجہ رکھتی ہے اور بھٹکی ہوئی زندگیوں کو مشعل دکھا کر منزل کی طرف گامزن کر دیتی ہے زندگی کو وہ ایک میدانِ عمل سمجھتی ہیں۔ جہاں غلطیوں کی سزا ضرور ملتی ہے مگر اصلاح نفس کے بعد یہ انعام میں بھی بدل جاتی ہے۔

ان کا اندازِ بیان زیادہ پرزور اور خوبصورت نہیں ہے لیکن اس کی سادگی اور بے ساختگی سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک خامی جو ان کے افسانوں میں کھٹکتی ہے ان کی بے جا طوالت ہے۔ "تنکے کا سہارا" میں مسز لال کی ذہنی کیفیت کے اظہار کے لیے جس تفصیل سے کام لیا گیا ہے یا کیپٹن زاہدی کی طالب علمانہ زندگی کی جن تفصیلات کا ذکر کیا گیا ہے ان کو مختصر کر کے وہ اس الزام سے بچ سکتی تھیں۔ بحیثیت مجموعی یہ افسانے کامیاب اور حقیقت سے قریب تر ہیں۔

(افتخار بیگم صدیقی)

لفظوں کی لکیریں

غلام حسین ایاز

ملنے کا پتہ

عشرت کدہ

صفحات ۱۶۰ قیمت دس روپے اے/۲۹ پام ایونیو کلکتہ ۷۰۰۰۱۹

زیر تبصرہ شعری مجموعے میں اگرچہ کچھ نظمیں اور رباعیات بھی شامل ہیں تاہم اس کا بیشتر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے اور ان میں آج کے دور کے انسان کے کرب و اضطراب اور ذہنی انتشار کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اکثر جدید شعرا کی طرح ان کے بیشتر اشعار بھی چند مخصوص الفاظ کے محدود دائرے میں مقید ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کا کلام جدید اور کلاسیکی لب و لہجہ لیے ہوئے ہے۔ مثلاً

لوگ پتھر لیے پھرتے ہیں یہاں ہاتھوں میں
دیکھ اس شہر میں شیشے کا کوئی گھر نہ بنا

شہر میں ہر سمت ہے بیگانگی پھیلی ہوئی
کوئی تو ایسا ملے ہم کو جسے اپنا کہیں

ماہنامہ "سوبرس"

ایڈیٹر: نشتر خانقاہی

مینجنگ ایڈیٹر: مودود صدیقی

قیمت: دو روپے ۲۵ پیسے ۔ سالانہ: ۲۵ روپے

ملنے کا پتہ: سرائے خلیل، صدر بازار ۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

ماہنامہ سوبرس کا اجرا اردو صحافت میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ اس کی مقبولیت سے پتہ چلتا ہے کہ اردو رسالے کے قارئین موجود ہیں بشرطیکہ ان کے مذاق اور معیار کو ملحوظ رکھا جائے۔

اب تک چھ شمارے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ اور ہر شمارے کو پہلے سے بہتر بنانے کی سعی و کوشش نمایاں نظر آتی ہے۔

اس نئے جریدے میں کہانیوں، غزلوں کے علاوہ فلم، صحت، نفسیات، شخصیات، طنز و مزاح ایسے موضوعات شامل ہیں۔ سوبرس کو ملک کے ممتاز ادبا و شعرا کا تعاون بھی حاصل ہے۔ باتصویر فیچر اور ادیبوں اور شاعروں کی تصاویر نے اسے مزید دلچسپ بنا دیا ہے۔

امید ہے نشتر خانقاہی اور مودود صدیقی کی کوششوں اور کاوشوں سے یہ رسالہ مزید ترقی کرے گا۔ (نند کشور وکرم)

بقیہ آئین میں ترمیم ــــ قومی ضرورت

۴ ۔ جس وقت حکم دیا جائے ہندوستان کے دفاع کے لیے تیار ہو جائے اور ملک کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کرے۔

۵ ۔ مذہب، علاقے اور لسانی بنیادوں پر ملک کے تمام رہنے والوں میں تفریق نہ کرے بلکہ سب کو ایک برادری سمجھے، خواتین کی عزت کا پاس کرے۔

۶ ۔ ملک کی مشترکہ میراث کی حفاظت اور قدر کرے۔

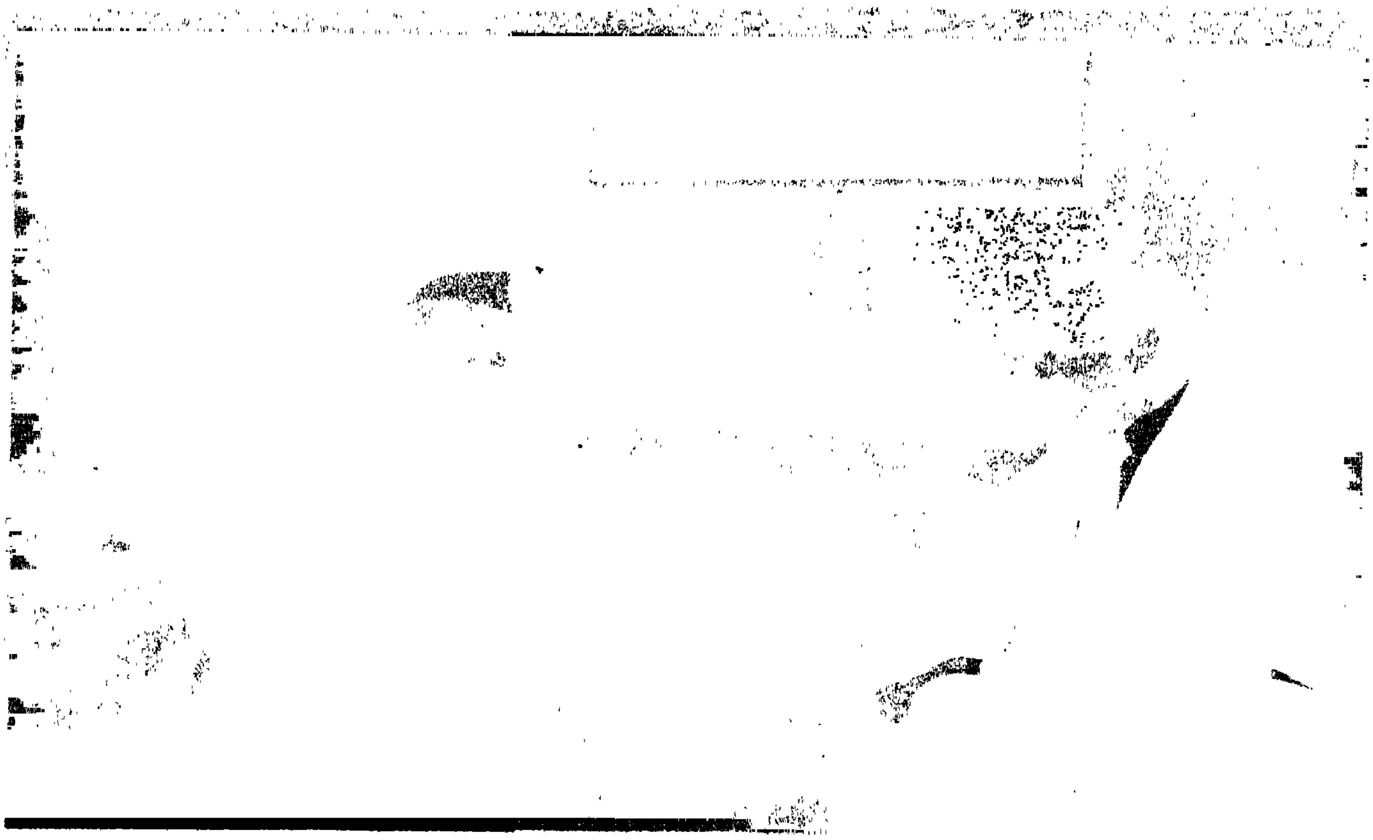
۷ ۔ قدرتی ماحول اور وسائل جیسے جنگلوں، جھیلوں، ندیوں اور حیوانوں کا تحفظ کرے اور ان کی توسیع و ترقی میں مدد دے۔ جانداروں کے لیے ہمدردی کا جذبہ رکھے۔

۸ ۔ اپنے اندر سائنسی نقطۂ نظر اور انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا کرے اور اصلاح و جستجو کی عادت ڈالے۔

۹ ۔ تشدد سے احتراز کرے اور عوامی املاک کا تحفظ کرے۔

۱۰ ۔ انفرادی اور سماجی زندگی میں خوب سے خوب تر کی تلاش میں کوشاں رہے تاکہ ملک ترقی کی منزلوں کی طرف بڑھتا رہے۔

اس طرح ملک میں ذمہ داری کا ایک نیا احساس پیدا ہوگا جو قومی ترقی کے لیے بے حد ضروری ہے۔



وزیر خارجہ شری یشونت راؤ چوان اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل مسٹر کرٹ والڈھائم کے ساتھ ۔ شری چوان حال میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اکتیسویں اجلاس میں شرکت کے لیے نیویارک تشریف لے گئے تھے ———— ہندوستان شروع سے ہی اقوام متحدہ کا ایک رکن ہے اور امن عالم کے قیام کی کوششوں میں پیش پیش رہا ہے ۔

(تصویر، بشکریہ اقوام متحدہ)



ادب کا نوبل انعام

شکاگو یونیورسٹی (امریکہ) کے انگریزی کے پروفیسر مسٹر سال بیلو کو ۱۹۷۶ء کا ادب کا نوبل انعام دیا گیا ہے ۔

سال بیلو کے حسب ذیل ناول شائع ہو چکے ہیں :

Dangling Man (1944) , Seize the Day (1956),

The Adventures of Angle Manch(1953), The Victim(1947)

Mr. Sammler's Planet (1970), Hergog(1964)

Henderson the Rain King (1959), Humbold's Gift(1975)

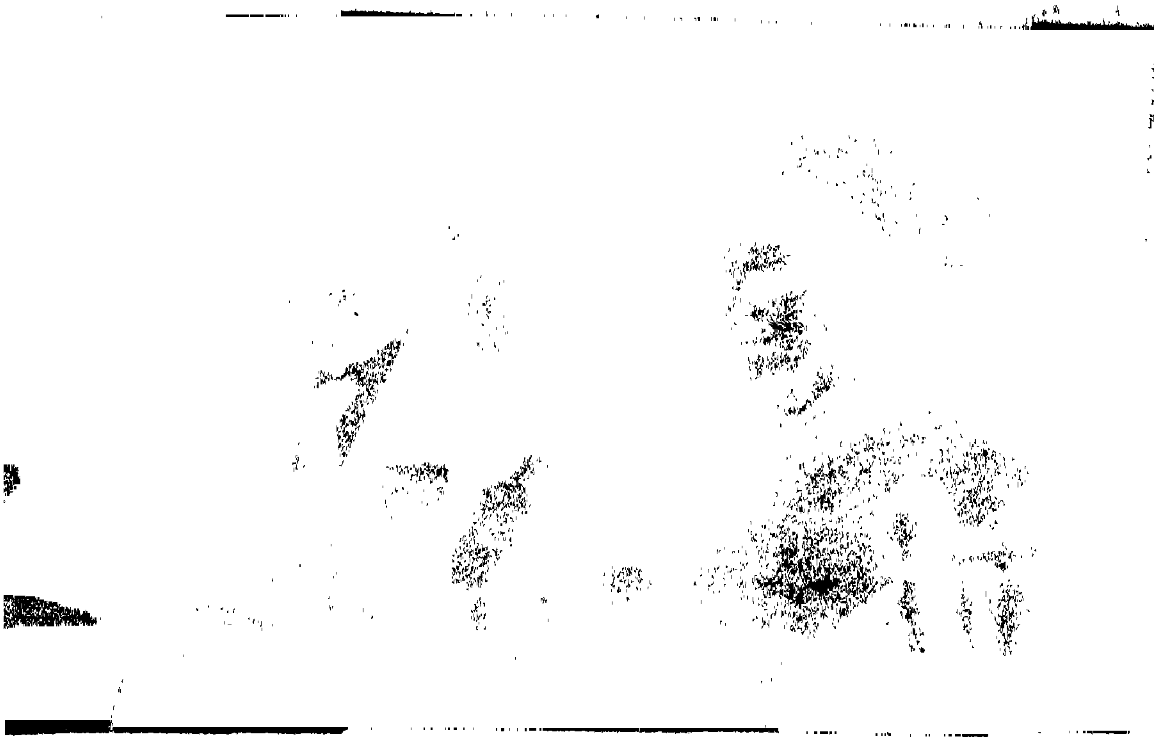
آپ کی عمر ۶۱ سال ہے ۔ ادبی حلقوں میں آپ کی تصنیفات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔ ایک اور امریکی نوبل انعام یافتہ جان اسٹین بک نے اس امر کی پیشین گوئی بھی کی تھی کہ بیلو کو نوبل پرائز ملے گا ۔

ان کے ناول فرد بمقابلہ جماعت، فرد بمقابلہ خود اور جدید زندگی کی کشاکش کے عکاس ہیں ۔

۲۳ اکتوبر ۱۹۷۶ کو وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی اجمیر شریف گئیں جہاں آپ کا شاندار استقبال کیا گیا۔ آپ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح کی درگاہ بھی گئیں جہاں درگاہ کمیٹی کے عہدہ داروں اور خادموں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر خادم پنچایت کے صدر جناب معین الدین حسن نے ان کی خدمت میں شال پیش کی۔ اس کے علاوہ درگاہ کمیٹی اور سجادہ نشین کی جانب سے بھی وزیر اعظم کو تحائف دیے گئے۔ (تصویر میں) وزیر اعظم راجستھان کے وزیر اعلیٰ جناب ہردیو جوشی، سجادہ نشین اور درگاہ کمیٹی کے اراکین کے ساتھ۔



AJKAL (MONTHLY) December 1976
Vol. 35 No. 5
Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by Skylark Printers, 11355, Idgah Road, New Delhi-110055



یونین پبلک سروس کمیشن کی گولڈن جوبلی

مرکزی حکومت کے اعلیٰ عہدوں اور کل ہند سروسوں کے لیے مناسب اور با صلاحیت عملہ منتخب کرنے کے لیے اکتوبر ۱۹۲۶ء میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن کا قیام عمل میں آیا تھا۔ آزادی کے بعد اس کا نام یونین پبلک سروس کمیشن ہوا۔ گولڈن جوبلی کی تقاریب کے موقع پر تمام ریاستوں کے پبلک سروس کمیشن کے چیرمین کی کانفرنس بھی بلائی گئی تھی ——— ۱۵ نومبر ۱۹۷۶ء کو اس کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر اعظم ہند نے کہا کہ حکومت کے بڑھتے ہوئے دائرۂ کار کی وجہ سے انتظامیہ کا بوجھ بڑھتا جا رہا ہے۔ ہماری سول سروس کو کارکرد اور غیر جانبدار ہونا چاہیے اور سرکاری افسروں کو مہارت، خوش اخلاقی اور ذمہ داری سے اپنے فرائض کو انجام دینا چاہیے ———

(تصویر میں) وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی اور یونین پبلک سروس کمیشن کے چیرمین پروفیسر اخلاق الرحمٰن قدوائی

کتب بندی اور ترسیل کے مسائل

۴ دسمبر ۱۹۷۶ء کو غالب اکیڈمی نئی دہلی میں پریس ایشیا انٹرنیشنل اور یونانی طبی کانفرنس نئی دہلی کے اشتراک سے کنبہ بندی اور ترسیل کے مسائل" پر ایک سیمینار جس کی صدارت پروفیسر اے ایم خسرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کی ——— اپنی افتتاحی تقریر میں وزیر صحت حکومت ہند ڈاکٹر کرن سنگھ نے بڑھتی ہوئی آبادی اور کنبہ بندی کی اہمیت اور افادیت کا تذکرہ کرتے ہوئے آبادی سے متعلق قومی پالیسی کا ذکر کیا اور کہا کہ حکومت ہند نہایت واضح طور پر اعلان کرتی ہے کہ اس معاملے میں کسی جبر سے کام نہ لیا جائے۔

(تصویر میں) ڈاکٹر کرن سنگھ سیمینار کا افتتاح کر رہے ہیں



اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

آج کل نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین
سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد نمبر ۳۵ | شمارہ نمبر ۶

جنوری ۱۹۷۷ء

پوش ماگھ شک سمہ ۱۸۹۸

سرورق: بلرام منڈل

شرح چندہ

سالانہ	دس روپیہ	۳ ڈالر	۱٫۵۰	پاؤنڈ
دو سالہ	۱۷ روپیہ	۵ ڈالر	۲٫۵۵	پاؤنڈ
سہ سالہ	۲۴ روپیہ	۷ ڈالر	۳٫۶۰	پاؤنڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	۳۰ سینٹ	۱۵	پنی

ترتیب



یوم جمہوریہ کی پریڈ کا ایک منظر

ٹیلیفون: ۳۸۷۰۶۹

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آج کل، سمعہ پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ملاحظات

ہم ہر طرح سے اردو کی ترقی چاہتے ہیں ـــ صدر جمہوریۂ ہند

۶ نومبر کو لکھنؤ میں اردو اکادمیوں کی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے صدر جمہوریۂ ہند جناب فخرالدین علی احمد نے فرمایا کہ ملک کی مرکزی اور ریاستی سطح کی قیادت کو نہ صرف اردو سے ہمدردی ہے بلکہ وہ اس کے فروغ کی ہر ممکن اور بھرپور کوشش کرنا چاہتی ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ ہم تعلیم، روزگار اور علمی ادبی سرگرمیوں کے میدان میں ہر رُخ پر اردو کا فروغ چاہتے ہیں۔ صدر جمہوریہ نے خواہش ظاہر کی کہ اکادمیاں اُردو ادیبوں اور شاعروں کو وظیفے کی شکل میں مالی امداد دیں تاکہ ان کے کاموں سے زبان اور ادب کو فائدہ پہنچے۔



اس موقع پر وزیر اعلیٰ اتر پردیش سری نرائن دت تیواری نے ایک خصوصی فنڈ قائم کرنے کا اعلان کیا جس کا نام فخرالدین علی احمد فنڈ ہوگا۔ اس فنڈ میں پہلی قسط کے طور پر حکومت اتر پردیش ۵ لاکھ روپے کا عطیہ دے گی۔ جو سرمایہ کے طور پر جمع رہے گا اور اس کی آمدنی سے اکادمی مصنفوں کو کتابوں کی اشاعت میں مدد دے گی۔ وزیر اعلیٰ نے یہ بھی اعلان کیا کہ آئندہ برس اکادمی کی گرانٹ بڑھا کر دس لاکھ کر دی جائے گی۔

"اُردو ایک جاندار اور نفیس زبان ہے" ـــ وزیر اعظم ہند

۱۴ نومبر کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جلسہ تقسیم اسناد میں خطبہ دیتے ہوئے شریمتی اندرا گاندھی نے فرمایا: "ہمارا آئین تمام علاقائی زبانوں اور لپیوں کا محافظ ہے۔ ہم سبھی زبانوں کی مدد کر رہے ہیں تاکہ علم کی روشنی سے دور دراز مقامات کے لوگ فائدہ اٹھا سکیں .....

..... ہماری کوشش یہ ہے کہ ۱۴ سال سے کم عمر کے جو بچے اردو پڑھنا چاہیں انھیں اس کی سہولت دی جائے۔ اس بات کی پوری کوششیں جاری ہیں کہ ہائی اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کے موجودہ انتظام کو زیادہ بہتر بنایا جائے اور اس زبان کو زیادہ ترقی دی جائے۔ اردو ایک جاندار اور نفیس زبان ہے۔ ہمارے ملک کے سبھی حصوں کے لوگ اس زبان سے دلی لگاؤ رکھتے ہیں۔ ہم اس زبان کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔ ہندوستانی ادب میں اردو کی خدمات ہماری رنگا رنگ تہذیب کو مالا مال کرتی ہیں۔"

فرقہ وارانہ اتحاد کے لیے بھرپور اور جرأتمندانہ اقدام

فرقہ وارانہ اتحاد، جذباتی ہم آہنگی، مختلف علاقوں میں ملک کی وحدت اور سالمیت کا احساس اور ساتھ ہی ساتھ ہریجنوں اور دوسرے کمزور طبقوں کے لیے سماجی اور معاشی انصاف وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ صنعتی ترقی بلاشبہ معیار زندگی کو بلند کرتی ہے مگر پُر مسرت زندگی تناؤ اور تشدد کے ماحول میں نہیں گزاری جا سکتی ــــــــــ حال میں نئی دہلی میں قومی ایکتا ورکنگ گروپ کا اجلاس ہوا تھا جس میں سیاسی قائدین کے علاوہ ممتاز عالم اور دانشور بھی شریک تھے۔ اس گروپ نے متعدد سفارشیں کی ہیں جن پر عمل درآمد سے اس مسئلے کو سلجھانے میں مدد ملے گی۔

۲۷ نومبر ۱۹۷۶ء کو اس جلسہ کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی نے اس مسئلے کے تمام اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے اور بالکل واضح انداز میں کہا ہے کہ ماضی میں اس طرح کے بہت سے جلسے ہوئے اور تجویزیں منظور کی گئیں مگر ان پر عمل درآمد کے معاملے میں پوری توجہ نہیں کی گئی۔ اس لیے خاطر خواہ نتائج حاصل نہ ہو سکے۔ آپ نے زور دیا کہ اس موقع پر جو تجاویز منظور کی جائیں ان کی عمل آوری پر پوری توجہ کی جائے۔

آپ نے فرمایا: "انتہائی فرقہ پرست جماعتوں کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے مگر اس کے باوجود ان کی خفیہ سرگرمیاں جاری ہیں۔ بعض علاقائی جماعتوں نے علیٰحدگی پسندی کو ترک نہیں کیا ہے اور علیٰحدگی کا پرچار کر رہی ہیں، گو علانیہ طور پر نہیں۔ بعض "سینائیں" بظاہر خاموش ہیں مگر علاقہ پسندی کے جذبات کو بھڑکانے میں مصروف ہیں۔ ہندوستان جیسے ملک کے لیے جو تعمیر و ترقی کے بے شمار مسائل سے دوچار ہے، مذہبی جنون، نفرت اور تشدد سے اجتناب بے حد ضروری ہے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔"

آپ نے کہا کہ ملک کی راجدھانی دہلی میں بعض پارٹیاں خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کے سلسلے میں حکومت کو محض اس لیے بدنام کرنے کے درپے ہیں کہ انھیں آئندہ انتخاب میں سیاسی فائدے حاصل ہوں۔ آپ نے مزید فرمایا: "کچھ دنوں پہلے میں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ لوگوں میں "ہندوستانیت" ہونی چاہیے۔ کچھ پارٹیوں نے میرے مفہوم کو توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ کوئی گروپ اپنی انفرادیت کو ختم کر کے اکثریت میں جذب ہو جائے میرے کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ مختلف مذاہب پر عمل پیرا ہونے کے باوجود ہمیں بعض ان بنیادی قدروں اور آدرشوں

کا حامل ہونا چاہیے جو آج نہیں صدیوں سے ہندوستان کا مطمح نظر رہے ہیں۔"

آپ نے ہریجنوں اور اونچی ذات کے ہندوؤں میں ہونے والے جھگڑوں کا بھی ذکر کیا اور یہ بھی کہا کہ بعض علاقوں میں ملازمت کے سلسلے میں لوگوں کو اس طرح ورغلایا جاتا ہے کہ چونکہ وہ مقامی ہیں اس لیے کارخانوں وغیرہ میں "اس زمین کے بیٹوں" کا حق ہونا چاہیے۔

قومی یک جہتی کے سلسلے میں آپ نے پریس کے رول کا بھی ذکر کیا اور کہا "پریس پر جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں ان سے ایسی تحریروں میں کمی آئی ہے جو جذبات کو مشتعل کرتی ہیں۔ آپ نے کہا ان بندشوں میں کافی نرمی لائی گئی ہے لیکن جب یہ پابندیاں بالکل ختم ہو جائیں گی تو بھی پریس ایسی ہی ذمہ داری کا ثبوت دیں گے یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔"

آپ نے نصاب کی کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے اور کہا کہ ان کے مواد میں تبدیلی آئی ہے۔ آپ نے کہا کہ سیاسی پارٹیاں اگر اپنے محبوب مشغلوں میں غرق رہنے کی بجائے ایک دن میں چند لمحوں کے لیے ملک کی بھلائی کے بارے میں سوچیں تو ہمارا ملک بہت ترقی کر جائے گا۔

اس جلسے میں وزیر اعظم ہند کا استقبال کرتے ہوئے وزیر داخلہ سری برہمانند ریڈی نے فرقہ وارانہ اتحاد کے لیے اجتماعی کوشش کی اپیل کی اور کہا کہ کوشش میں ملک کے ہر طبقے کو بھرپور حصہ لینا چاہیے۔ آپ نے کہا کہ ایمرجنسی کے نفاذ سے ہمہ جہت ترقی ہوئی ہے اور نظم وضبط کا ایک نیا دور شروع ہوا ہے لہذا اب "قومی یک جہتی کا ایک بہت بڑا اور جرأت مندانہ پروگرام" شروع کیا گیا ہے۔ دستور کی تمہید میں اشتراکی اور سیکولر کے لفظ کے اضافے سے اس کام میں مدد ملے گی۔

تاریخ کے اس موڑ پر قومی یک جہتی کے لیے کوشش کرنا قوم کا نہایت اہم اور عمدہ مقصد ہونا چاہیے۔ اس بات پر زور دیتے ہوئے آپ نے کہا کہ انتشار پسند طاقتیں سر اٹھانے کے لیے موقع کی تاک میں ہیں اور غیر قومی اور غیر سماجی عناصر وقت ضرورت آپس میں فوراً گٹھ جوڑ کر لیں گے تاکہ کچھ فائدہ اٹھا سکیں لہذا ان طاقتوں کو قومی زندگی میں پھر سے داخل ہونے سے روکنے کی بہترین ضمانت یہی ہے کہ ہم اتحاد اور سالمیت کا کام کرکے اپنی قومی بنیادوں کو اتنا مضبوط بنالیں کہ یہ طاقتیں بے اثر ہو کر رہ جائیں۔ آپ نے کہا قومی یک جہتی سے متعلق دو گروپ کا قیام وزیر اعظم ہند کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس طرح قومی اہمیت کے حامل ایک نہایت اہم مسئلے کو نئی تحریک حاصل ہوئی ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ وزیر اعظم کی فعال اور متحد کرنے والی قیادت اس مقصد کے حصول کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگی۔

ورکنگ گروپ نے قومی یک جہتی کے لیے بہت سی سفارشیں کی ہیں اور طویل مدتی اور قلیل مدتی تدابیر اختیار کرنے کی سفارش کی ہے۔ اس بات پر کافی زور دیا گیا ہے کہ خواہ یونی ورسٹی کیمپس ہوں یا ٹریڈ یونین کے جلسے یا ملکی سیاست تشدد سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ یہ سفارشات حکومت کو بھیج دی گئی ہیں تاکہ ان کی روشنی میں عمل کی راہیں متعین کی جائیں۔ سفارشات کی خاص خاص باتیں یہ ہیں:

- **فرقہ وارانہ ہم آہنگی**

سماج کے بعض طبقات پر انتہا پسند اور ظلمت پسند عناصر کی گرفت توڑی جائے اور خبری ذرائع کو پوری طرح چوکس بنایا جائے۔

جدید زندگی کے مثبت عناصر کی حوصلہ افزائی تمام شعبوں میں کی جائے اور گمراہ عناصر کو جنونی عناصر کے پنجہ سے نکالا جائے۔

اقلیتوں کے سلسلے میں اکثریتی فرقہ کے رویہ میں مثبت تبدیلی ہو تاکہ اول الذکر کے تمام اندیشے دور ہوں اور وہ قومیت کے خاص دھارے میں شامل ہو سکیں۔

مختلف مذہبی عقائد اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے بچے آزادی کے ساتھ گھلیں ملیں۔ ہر قسم کی گروہ بندی کا خاتمہ کیا جائے اور اس کام میں ترقی پسند لیڈروں کی خدمات سے کام لیا جائے۔

- **طلبا کا تشدد**

سیاسی جماعتیں طلبا کو غیر علمی سرگرمیوں میں شریک کرنے سے باز رہیں وزیر اعظم کے بیس نکاتی پروگرام پر سرگرمی سے عمل ہو اور تعلیمی میدان میں طلبا کے جائز مطالبات پر غور کرکے انھیں منظور کیا جائے۔

- **صنعتی انقلاب**

مزدوروں اور منتظمہ کی مشترکہ کونسلوں کے قیام اور بیٹھکی اور تالہ بندی کو روکنے کا قانون بن جانے کا مفید اثر ضرور ہوا ہے تاہم پیداوار میں اضافہ کرنے اور تشدد کا خاتمہ کرنے کے مفاد میں کوشش یہ ہونا چاہیے کہ ایک صنعت میں ایک ہی یونین ہو۔

- **انتہا پسند تشدد**

قبائلی علاقوں کی ترقیات پر نئے رُخ سے زور دیے جانے سے اس قسم کے تشدد کی گنجائش کم ہوگئی ہے لیکن ان علاقوں میں متشدد سرگرمیوں کے مرکز رہے تھے۔ لہذا ناکافی ترقیات کے مسئلہ سے نپٹنے کے لیے خصوصی تدابیر اختیار کی جائیں۔

پولیس اور انتظامیہ کی مشینری کو ہر قسم کے فرقہ وارانہ، انتہا پسندانہ اور دیگر اقسام کے تشدد سے نپٹنے کے لیے کافی چاق و چوبند بنایا جائے اور اس قسم کے مظاہر کے تدارک کے لیے طویل میعاد حل وضع کیا جائے۔

- **اقلیتیں اور ان کے لیے روزگار**

اقلیتی فرقوں کے طلبا کو مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ وہ نامور اور ترقی پسند تعلیمی اداروں میں داخلہ لے سکیں اور انھیں ایسے اداروں سے دور رکھا جائے جو مخصوص فرقوں کی ضرورتیں پوری کرتے ہوں۔

- **حوصلہ افزائی**

غیر فرقہ وارانہ تنظیموں کی حوصلہ افزائی کی جاسکتی ہے کہ وہ حکومت میں روزگار کے واسطے رجسٹریشن نیز سروس کمیشنوں کی جانب سے بھرتی میں ان طلبا کی

ذکریں۔ جن صنعتوں پر اکثریتی فرقہ والوں کا کنٹرول ہو ان کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے یونٹوں میں اقلیتوں کو روزگار دیں۔

اسکولوں اور کالجوں میں مسلمانوں اور غیر مسلموں سمیت مختلف فرقوں کے لوگوں کے ملنے جلنے کے مواقع زیادہ ہوں۔ اقلیتوں کے خلاف تفریق برتی جائے تو سخت کارروائی ہو۔

- ہریجنوں پر مظالم

ورکنگ گروپ نے اس بات پر پسندیدگی ظاہر کی ہے کہ ہریجنوں کی بہبود پر پہلے منصوبہ میں اخراجات صرف ۸ کروڑ روپے تھے اور پانچویں منصوبے میں یہ اخراجات ڈیڑھ ارب روپے تک پہنچ گئے ہیں اور یہ کہ مسز گاندھی کے ۲۰ نکاتی پروگرام میں بھی خاص زور ہریجنوں کے سماجی اور معاشی حالات بدلنے پر دیا گیا ہے۔ گروپ کی رائے ہے کہ خبری ذرائع کو چوکس بنایا جائے تاکہ عوام کے روایتی رویہ میں تبدیلی لائی جاسکے۔

گروپ نے ہریجنوں کو ستائے جانے کے واقعات کی روک تھام کے لیئے ایک ۸ نکاتی منصوبہ تجویز کیا ہے ان میں سے بعض نکات یہ ہیں۔ تدارک کی کارروائیاں ہوں۔ مقدمات کی فوری تفتیش ہو۔ ہریجنوں کو تنگ کرنے والے سخت سزا پائیں۔ تعزیری جرمانے کیے جائیں اور مظلوموں کو قانونی امداد دی جائے اور اعداد و شمار کے سہارے مرکز کو واقعاتی معلومات فراہم کی جائیں کہ ریاستی حکومتوں نے اس سلسلے میں کیا کارروائیاں کی ہیں اور کیا بندوبست کر رہی ہے۔

- قبائل مندرجہ فہرست

قبائلی ترقیات کے لیے ایسی حکمت عملی اختیار کی جائے جس کے دائرے سے معترض عناصر بھی باہر نہ رہنے پائیں۔ اس سے اونچی ذات والوں کی جانب سے ان کے استحصال کے تدارک میں خاصی مدد ملے گی۔

- علاقائی ہم آہنگی

ورکنگ گروپ کا خیال ہے کہ چوتھے منصوبے میں اور اس سے پہلے والے منصوبوں میں کی جانے والی خصوصی کوششوں کے باوجود معاشی ترقی میں علاقائی عدم توازن موجود ہے اور ریاستوں کے درمیان نابرابری کا سلسلہ جاری ہے۔ گروپ کی سفارش ہے کہ متعلقہ ریاستی حکومتوں اور منصوبہ بندی کمیشن کو اس مظہر کے اسباب کا جائزہ لینا چاہیے۔

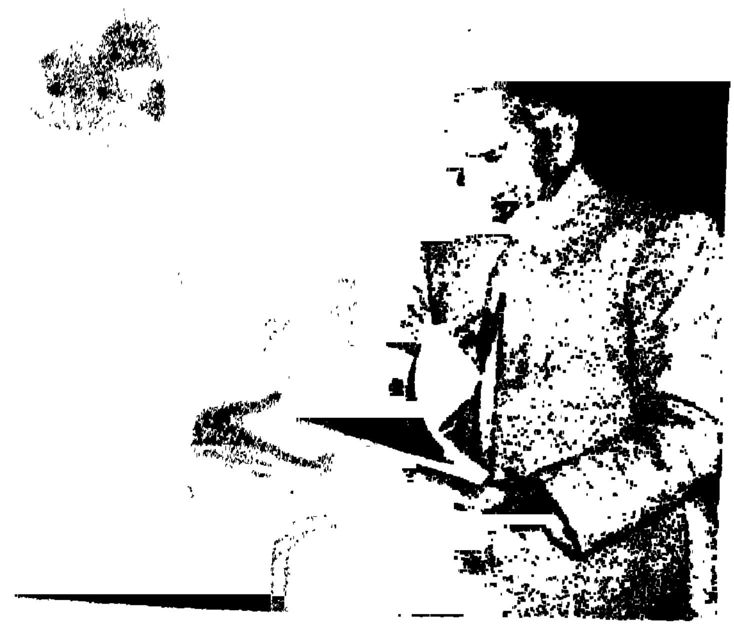
متعلقہ ریاستوں کو چاہیے کہ وہ پس ماندہ علاقوں میں انتظامی مشینری کی نئی شیرازہ بندی کریں اور مرکز کے عملہ اور انتظامی اصلاحات کے محکمہ کو بھی چاہیے کہ وہ ان ریاستوں کے تنظیمی ڈھانچہ کی کمزوریوں کا خصوصی مطالعہ کریں۔ خصوصی پروگرام وضع کیے جائیں تاکہ ان علاقوں کی بنیادی ڈھانچے کی ترقی تیز رفتاری سے ہو سکے۔

خبری ذرائع سے پورا کام لینا چاہیے تاکہ پس ماندہ خطوں کی ترقیات سے متعلق موجودہ مواقع کا پرچار ہو سکے اور اس مسئلہ پر عوام کے جذبات بھڑکانے کی کوششوں کا بھی توڑ ہو سکے۔ علاقائی ہم آہنگی کی حصول کے لیے پرچار خصوصیت کے ساتھ نوجوانوں میں ہو تاکہ ان کے جلد متاثر ہونے والے ذہن جھوٹے پروپگنڈے سے بگڑنے نہ پائیں۔

توقع ہے کہ ان سفارشات پر عمل درآمد سے ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کو مزید تقویت پہنچے گی۔ اور ملک ترقی و خوشحالی سے دوچار ہوگا۔

قابل ستایش جذبۂ خدمت

۲۴ نومبر ۱۹۷۶ کو راشٹرپتی بھون نئی دہلی میں منعقد ایک تقریب میں صدر جمہوریہ ہند جناب فخرالدین علی احمد نے وزیراعظم کے خصوصی نمائندہ جناب محمد یونس سے متعلق ایک یادگاری کتاب کی رسم اجرا انجام دی۔ ۱۶۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مسٹر علی صدیقی ایڈیٹر اندرا پردرشنی پبلی کیشنز نے مرتب کی ہے۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے صدر جمہوریہ نے یونس صاحب کے جذبۂ خدمت اور محنت کی ستائش کی اور کہا کہ وہ وزیراعظم کی جانب سے تفویض کردہ کاموں کو بڑی تندہی کے ساتھ سرانجام دے رہے ہیں اور وزیراعظم کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ صدر جمہوریہ نے غیر جانبدار ممالک کی خبر رساں ایجنسیوں کے پول کی رابطہ کمیٹی کے صدر نشین کی حیثیت سے بھی ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ اور کہا کہ انھوں نے جواہر لال نہرو کو غیر جانبدار تحریک اور پُرامن بقائے باہم کے اصول کو مستحکم بنانے میں بے حد مدد دی تھی اور اب نہ صرف ملکی بلکہ عالمی امور میں شریمتی گاندھی کے معاون بنے



ہوئے ہیں۔ صدر نے امید ظاہر کی کہ جناب محمد یونس اپنی زندگی نہ صرف ہندوستانی بلکہ تمام دنیا کے امن پسند ممالک کے عوام کی خدمت میں گذاریں گے

عیسائی اور کنبہ بندی

آج ہمارے ملک میں کنبہ بندی کا پروگرام بتدریج مقبول و کامیاب ہو رہا ہے اور اسے ہر فرقہ و مذہب کا تعاون حاصل ہو رہا ہے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، سکھ، پارسی، جین سبھی اس پروگرام میں حصہ لے رہے ہیں۔

گذشتہ دنوں نئی دہلی میں منعقد ایک پریس کانفرنس میں کنبہ بندی کے بارے میں رائے دیتے ہوئے آرک بشپ آف کنٹربری ڈاکٹر ڈونلڈ کوگان نے فرمایا کہ ہندوستان کے سماجی، تعلیمی اور خوراک کے بڑھتے ہوئے مسائل کو حل کرنے کے لیے بڑھتی آبادی کو روکنا ضروری ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایسے اقدام کرنے چاہییں جو مناسب ہوں اور یہاں کے عوام کو قابلِ قبول ہوں، کنبہ بندی کی مہم کی کامیابی کی دعا کرتے ہوئے ڈاکٹر کوگان نے امید ظاہر کی کہ اس مہم کے نتیجے میں شرح پیدائش میں کمی واقع ہو جائے گی۔

اسی طرح ایک اور عیسائی رہنما پادری ٹی ایس جوزف نے جو جنوبی ہند چرچ کے بشپ ہیں آل انڈیا ریڈیو ترونلرم کے نمائندے سے بات چیت کرتے ہوئے فرمایا کہ عیسائی مذہب میں ذمہ دار والدین ہونا بہترین آدرشوں میں سے ایک ہے۔ لہذا تمام عیسائیوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے کنبے کو منصوبہ بند بنائیں اگر بائیبل کنبہ بندی کے بارے میں خاموش ہے تو اس لیے کہ اس زمانے میں کثیر آبادی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

نیشنل فلم فسٹیول ایوارڈ

۱۲ نومبر ۱۹۷۶ کو وگیان بھون نئی دہلی میں صدر جمہوریہ ہند جناب



دھیرن گنگولی کو دادا صاحب پھالکے ایوارڈ دیا جا رہا ہے

فخر الدین علی احمد نے ۲۳ ویں نیشنل فلم فسٹیول ایوارڈ کی تقاریب میں بہترین ہدایت کاری، اداکاری، موسیقی اور کہانی وغیرہ پر فلمی فن کاروں کو انعامات تقسیم کیے اور انھیں سماجی و معاشی ترقی سے ہم آہنگ فلمیں تیار کرنے کی تلقین کی۔ صدر نے ہندوستانی فلم صنعت کی نمایاں خدمات انجام دینے پر دادا صاحب پھالکے ایوارڈ برائے ۱۹۷۵ء بنگال کی بزرگ فلمی ہستی دھیرن گنگولی کو عطا کیا۔ اس کے علاوہ شری ستیہ جیت رے کو بنگلہ فلم "جانا آرانیا" کے لیے بہترین ہدایت کاری کا ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۷۵ء کی بہترین قومی فلم کی حیثیت سے کنڑ فلم "چومنا ڈوڈی" کو طلائی کنول دیا گیا۔ ہدایت کار گلزار کی ہندی فلم "موسم" کو دوسری بہترین فلم قرار دیا گیا۔ اور اس فلم میں اداکاری کے جوہر دکھانے پر شریمتی شرمیلا ٹیگور کو سال کی بہترین اداکارہ کا اور کنڑ فلم "چومنا ڈوڈی" میں عمدہ کام کرنے پر ایم وی واسدیوراؤ کو بہترین اداکار کا ایوارڈ دیا گیا۔ وانی جے رام کو سال کی بہترین پلے بیک سنگر کی حیثیت سے، عوامی پسندیدگی کے نقطۂ نظر سے ہندی فلم "تپسیا" کو بہترین ہندی فلم کی حیثیت سے شیام بینگل کی فلم "نشانت" کو اور "متیالوگو" کو بہترین تلگو فلم کا اعزاز دیا گیا۔

وفیات

بیگماتی زبان، روزمروں اور محاوروں کے ماہر جناب آغا حیدر حسن کا ۶ نومبر ۱۹۷۶ء کو حیدرآباد میں انتقال ہو گیا۔ آپ سے متعلق ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب کا مضمون اس شمارے میں شامل ہے

مشہور نقاد سید وقار عظیم کا ۱۷ نومبر ۱۹۷۶ء کو لاہور میں انتقال ہو گیا۔ وقار عظیم اردو کے ممتاز ناقد اور نثر نگار تھے اور ان کا خصوصی میدان فکشن تھا۔

آپ دسمبر ۱۹۱۰ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ اور الٰہ آباد اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ دو برس تک جامعہ ملیہ اسلامیہ اور پانچ برس تک گورنمنٹ آف انڈیا پالی ٹکنک میں بطور استاد کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۶ء تا ۱۹۴۷ء میں "آج کل" کے مدیر رہے۔ اس کے بعد پاکستان چلے گئے اور حکومت پاکستان کے سرکاری ماہنامہ "ماہِ نو" کے مدیر مقرر ہوئے بعد ازاں پنجاب یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ وظیفہ یاب ہونے کے بعد مختلف علمی اور ادبی کاموں میں مصروف تھے۔

ممتاز مصنف اور نثر نگار سید ریاست علی ندوی ۱۴ نومبر کو گیا (بہار) میں وفات پا گئے۔ آپ کی تصانیف میں "تاریخ صقلیہ (سسلی)" دو جلدوں میں، "تاریخ اندلس" اور "ہندوستان میں اسلامی تعلیم" قابلِ ذکر ہیں۔

آپ بہت دنوں تک دار المصنفین سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد مدرسہ شمس الہدیٰ (پٹنہ) کے پرنسپل مقرر ہوئے تھے۔

ان ادیبوں کی موت اردو کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

غزل

فراق گورکھپوری

۸/۴ بنک روڈ، الٰہ آباد

مری نوا سے جل اٹھتے تھے بحر و بر پہ چراغ
کہاں سے لاؤں عزیزو مگر وہ دل وہ دماغ

یہ نرم نرم ہوا، جھلملا رہے ہیں چراغ
ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ

بدن جہانِ تبسم ہے سر سے تا بہ قدم
جہاں سے دیکھیں اسے مسکرا رہے ہیں چراغ

ترے جمال سے دنیائے عشق رنگا رنگ
ترے خیال سے سینوں میں لہلہاتے ہیں داغ

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی
کہ جھلملا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ

جھلکتی ہے کھنچی شمشیر میں نئی دنیا
حیات و موت کے ملتے نہیں ہیں آج دماغ

حریفِ سینۂ مجروح و آتشِ غمِ عشق
نہ گل کی چاک گریبانیاں نہ لالے کے داغ

وہ جن کے حال میں، لَو دے اٹھے غمِ فردا
وہی ہیں انجمنِ زندگی کے چشم و چراغ

تمام شعلۂ گل ہے تمام موجِ بہار
کہ تا حدِ نگہِ شوق لہلہاتے ہیں باغ

سرے سے بزم میں انگڑائیوں کا یہ عالم
یہ بادِ صبح کی موجیں یہ جھلملاتے چراغ

نئی زمین، نیا آسماں، نئی دنیا
سنا تو ہے کہ محبت کو ان دنوں ہے فراغ

جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اٹھے ہیں چراغ

جو تہمتیں نہ اٹھیں اک جہاں کو ان کے سمیت
گنا ہگارِ محبت نکل گئے بے داغ

مری نظر میں ہیں، سب جلوہ ہائے ظلمت و نور
نہ ہر اندھیرا اندھیرا، نہ ہر چراغ چراغ

مجھے بہار و خزاں کیا ہے کچھ نہیں معلوم
میں کہہ رہا ہوں غزل اور کھلتے جاتے ہیں باغ

لگاؤ کان کہ عیسیٰ نفس ہے سازِ غزل
ہر ایک شعر سے جلتا ہے زندگی کا چراغ

وہ سر سے تا بہ قدم ہے بہار کا عالم
وہ عضو عضو گلستاں بغل میں سیکڑوں باغ

جلا گیا تھا انھیں کب تبسمِ پنہاں
کہ زخم زخم ہیں اب تک یہ تھرتھراتے چراغ

تلاشِ دوست میں ہیں ازل سے سرگرداں
اسی تلاش سے پانے لگا ہوں اپنا سراغ

یہاں کسی کو بھی ملتا نہیں پتہ اپنا
میں ہوں وہاں کہ خود اپنے کو ڈھونڈتے ہیں چراغ

گناہِ عشق کی معصومیاں جزاک اللہ
سیاہ نامۂ اعمالِ عشق ہیں بے داغ

شراب خانہ کی مٹی سے ہے سرشت مری
کہ ذرّے ذرّے سے میرے جھلک رہے ہیں ایاغ

مرا کلام سراسر ہے صبحِ نَو کی نوید
کہ اب تو لینے لگے ہچکیاں فسردہ چراغ

ملا لو شاعرِ آوازِ درد سے آواز
اس اک چراغ سے تم بھی جلا لو اپنے چراغ

دیارِ ہند ہے یا کوئی مرکزِ دریافت
کہ پا سکی ہے یہیں زیست زندگی کا سراغ

جہاں رانہ ہوئی جا رہی ہے آنچ تری
کچھ اس طرح وہ دلوں کا لگا رہی ہے سراغ

تمام جسم میں عالم یہ جگمگاہٹ کا
کہ عضو عضو میں پیہم لہک رہے ہیں چراغ

زمانہ کود پڑا آگ میں یہی کہہ کر
کہ خون چاٹ کے ہو جائے گی یہ آگ بھی باغ

نگاہیں مطلعِ نَو پر ہیں ایک عالم کی
کہ مل رہا ہے کسی پھوٹتی کرن کا سراغ

دلوں میں داغِ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

رہے گی یاد دلوں کو یہ نرمیِ گفتار
بجھائے سے نہ بجھیں گے یہ جھلملاتے چراغ

فراقؔ بزم چراغاں ہے محفلِ ساقی
سجے ہیں پگھلی ہوئی آگ سے چھلکتے ایاغ

خواجہ احمد فاروقی
۲۸ کیولری لائنز، دہلی یونیورسٹی

آغا حیدر حسن دہلوی

ایک دور — ایک تہذیب

آج اُردو کا گریبان صبر پھر چاک چاک ہے۔ اس لیے کہ دہلی مرحوم کی آخری نشانی، اس اُجڑے نگر کا ٹمٹماتا چراغ، تہذیبِ قدیم کا امین، بیگماتِ قلعہ کی زبان کا محرم، علمِ مجلسی کا اداشناس، اقلیمِ عاشقی کا رہ نورد، دیارِ درد کا سفیر، زبانِ اُردوئے معلیٰ شاہ جہاں آباد کا تاجدار، جس کو دنیا عام طور پر آغا حیدر حسن دہلوی کے نام سے پکارتی تھی، اس دنیا سے رخصت ہوا۔

میں نے بچپن سے آغا صاحب کا نام سُنا تھا۔ اُس وقت میرے اندر ان کے مضامین کے سمجھنے کی اہلیت نہیں تھی۔ میرے بھائی پروفیسر عبدالباسط مرحوم نے اُن کے پہلے اور آخری مجموعۂ مضامین پسِ پردہ کو ترتیب دے کر اُس کا دیباچہ لکھا تھا۔ یہ ۱۹۲۶ء میں مسلم یونی ورسٹی پریس علی گڑھ سے شائع ہوا۔ اس کا کاتب نہایت اعلیٰ ہے اور چھپائی تو ایسی ہے کہ آنکھیں روشن ہو جائیں۔ باسط بھائی آغا صاحب کو "آپا حیدر حسن" کہا کرتے تھے اس لیے کہ بیگماتِ قلعہ کی زبان لکھنے میں ان کو کمال حاصل تھا۔ زبان کا تعلق تہذیب سے ہے۔ وہ بیگماتی زبان ہی کے ماہر نہیں تھے بلکہ اس دہلوی تہذیب کے بھی رمز شناس تھے جس نے اس زبان کو سنوارا تھا۔

آغا صاحب نے آخر عہدِ مغلیہ کے ذہن و ذوق اور روش و روایت کی جو ترجمانی علی گڑھ منتھلی کے مضامین میں کی ہے، وہ درد اور دلکشی سے خالی نہیں ہے۔ ان کی بے مثل بازآفرینی، ان کا بے پناہ مشاہدہ، ان کا غیر معمولی حافظہ، جزئیات پر گہری نظر، ان کا احساسِ جمال، ان کی فراخ دلی، انسان اور کائنات کے رموز تک رسائی معمولی خصوصیات نہیں ہیں۔ پھر دہلوی زبان کی ٹھیٹ الفاظ اور مناسب محاورات کو اس سلیقہ سے آب و رنگ میں سمویا ہے کہ وہ آسان نثر کا اعجاز معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ان کی نثر زیبائی اور اثر آفرینی کا خوب صورت نمونہ ہے۔

آغا صاحب کی صورت شناسائی کا موقع پورے بیس سال کے بعد نومبر ۱۹۴۶ء میں حاصل ہوا تھا۔ جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی جوبلی ہو رہی تھی۔ ذاکر صاحب نے اس کا سر و سامان بڑے پیمانے پر کیا تھا اور ایک ایک ہمدرد کو دعوت دی تھی۔ میں بڑی کوشش اور دقّت سے حافظ محمد صدیق مرحوم سے پچاس ہزار کا چیک حاصل کر کے جامعہ ملّیہ کے لیے لایا تھا۔ ذاکر صاحب نے مجھے بڑی شفقت کے ساتھ جامعہ کے اس کمرے میں ٹھہرایا جس میں سید اسد اللہ کاظمی اور آغا حیدر حسن دہلوی مقیم تھے۔ عرض نہیں کر سکتا یہ چند روز جو ساتھ گزرے کس لطف کے تھے اب نہ ذاکر صاحب ہیں، نہ کاظمی صاحب، نہ آغا صاحب۔ رہے نام اللہ کا۔ ان کے اٹھ جانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم و ہنر پر زوال آگیا اور کارواں کی متاعِ گراں بہا ہم سے چھین لی گئی۔ ان بزرگوں کی موت پر صبر ایک قسم کی بے دردی اور بے وفائی ہے جس کو روا نہیں رکھتا:

زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

اس قیام میں معلوم ہوا کہ آغا صاحب ننہیالی اور ددھیالی دونوں رشتوں سے بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار دہلی کے عزیز تھے۔ اور ان کی پرورش اور تربیت بیگماتِ قلعہ کے قدیمی ماحول میں ہوئی تھی۔ ان کے علی گڑھ کے ہم جماعت اسد اللہ کاظمی صاحب بیان کرتے تھے کہ آغا صاحب کی والدہ ان سے اتنی محبت کرتی تھیں کہ جب تک وہ کلاس سے فارغ نہیں ہو جاتے تھے وہ پالکی میں بیٹھی رہتی تھیں اور گھر اپنے ساتھ لے کر جاتی تھیں۔ آغا صاحب کی باتیں ہم سب لڑکوں کو بہت پسند تھیں۔ ایک روز والدہ کی اجازت سے اُن کی دعوت کی اور رات گئے تک اُن کی میٹھی میٹھی باتیں سنتے رہے۔ سوتے وقت میں نے اُن کو اپنا کھدر کا کرتہ پجامہ دیا خلافت کا زمانہ تھا جو انھوں نے خوشی سے پہن لیا لیکن وہ ریشم کے عادی تھے صبح کو تمام جسم پر پتّی سی اُچھل آئی۔ مجھے اس بات کا یقین نہیں آیا لیکن جب میں نے اُن کی رضائی کو اپنی آنکھ سے دیکھا تو یقین آیا۔ اس میں بجائے روئی کے کبوتروں کی گردن کا رُواں بھرا ہوا تھا۔ بلا کی نرم اور گرم۔ ہلکی اتنی کہ مُٹھی میں آجائے۔

عبدالاحد صاحب اُن کے ایک اور ہم جماعت بیان کرتے ہیں کہ آغا صاحب کو علی گڑھ انٹر کالج میں بہروپ بھرنے اور نئی نئی دعائیں دینے میں کمال حاصل تھا۔ ایک مرتبہ فقیر کا لباس پہنا اور ایک ایک کمرے میں جاکر بھیک مانگی۔ کوئی طالب علم ایسا نہیں تھا جو اُن کی کہانی کو سُن کر پسیج نہ گیا ہو، رو نہ دیا ہو اور روپیہ آٹھ آنے نہ دے دیئے ہوں بعض نے پانچ دس روپے بھی دیئے۔ صبح کو آغا صاحب نے نقاب الٹ دیا۔ پچاس ساٹھ روپے کی مٹھائی منگائی اور سب نے کئی دن تک خوب مزے لے لے کر کھائی۔

جس زمانے میں جامعہ کی سلور جوبلی ہو رہی تھی ملک میں بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے۔ ہر شخص کی زبان پر یہی ایک ذکر تھا۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسائے دیتی تھی اور جشن بندی کا یہ سارا کام احمق پن معلوم ہوتا تھا۔ جب کان سنتے سنتے پک گئے تو آغا صاحب کہنے لگے :

"میاں کچھ لگاوٹ کی باتیں کرو۔"

آغا صاحب بڑے وطن پرست تھے۔ ان کی انسانی ہمدردی، بُرائی سے بیزاری اور نیکی کی پسند ہمیشہ یاد رہے گی۔ آزادی کی تحریک سے اُن کا تعلق پُرانا تھا۔ حیدرآباد کی ریاست میں رہ کر اس قسم کی دلچسپی کا اظہار دبی زبان سے بھی ہمت والے ہی کر سکتے تھے۔ پس پردہ کے بعض مضامین میں یہ رجحان صاف معلوم ہوتا ہے بلکہ بعض جگہ یہ شراب چھلک گئی ہے جس کے نشے میں خمارِ چشمِ ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ حیدرآباد میں بلبلِ ہند مسز سروجنی نیڈو نے جن لوگوں کو متاثر کیا اُن میں نواب میر اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی و اڑیسہ، پروفیسر فضل الرحمن سابق پرو وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور آغا حیدر حسن دہلوی خاص طور سے لائق ذکر ہیں۔

آغا صاحب قلمی تصویریں کھینچنے میں کمال رکھتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا ہے یہ تصویریں قلم سے نہیں، مو قلم سے کھینچی ہیں۔ مسز سروجنی نیڈو کا سراپا کوثر میں دُھلی زبان میں کھینچا ہے:

"اب جلسے کی جان مسز سروجنی نیڈو کی بابت سنو۔ ٹھمکا ٹھمکا، بوٹا سا قد، گول گول گدرایا ہوا ڈیل۔ کھلتی ہوئی چمپئی رنگت، کتابی چہرہ، کھڑا کھڑا نقشہ، چہرے سے متانت اور سنجیدگی ہویدا ہے مگر ساتھ ہی اُس کے خوش خلق اور ہنس مکھ بھی ضرور ہیں۔ خوب خوب، گہری گہری، کالی کالی، جٹی بھویں۔ جٹ کے اوپر چھوٹا سا خوب گہرا سرخ کسوم کا ٹیکہ، بڑی بڑی نرگسی آنکھیں، کچھ جھکی جھکی سی... پتلیاں خوب سیاہ اور بڑی بڑی، جس کی چاروں طرف بڑے بڑے مڑے ہوئے سیاہ گنجان پلکوں کا جنگلا ہے جس میں یہ وحشی ہر وقت رم کرتے رہتے ہیں۔ بھلا کہیں اس جنگلے سے یہ کالے شیرازی کبوتر رکتے ہیں۔ آنکھیں کیا بتاؤں۔ موتی کوٹ کوٹ کر بھر دیے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ان سے حجاب و شرم و حیا اور عصمت و عفت پڑی برستی ہے۔ چھپ تختی بڑی پیاری ہے جس کے سبب جامہ زیبی اور پھبن غضب کی ہے۔ کان موزوں ہیں اور لویں نیچے کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ جھکی ہیں۔ بال بڑے گھن دار کالے بھونرا سے ہیں۔ اور انگریزی موجودہ طرز کے موافق کنپٹیوں پر جھکا کر اور کانوں پر سے لے جا کر پیچھے جوڑے کی صورت میں لپیٹ دے کر کالی کنگھیاں لگائی گئی تھیں جن میں ہیرے کی طرح چمکتے ہوئے سفید نگ جڑے ہوئے تھے جو مہین بنارسی ساڑی کے اندر سے پٹ بیجنوں کی طرح جھم جھم کر رہے تھے۔ بالوں کی وضع گئی تو انگریزی، مگر ہماری محمد شاہی پٹیوں اور سادی بریوں سے کچھ کچھ ملتی جلتی ہے۔ بائیں رخسارے پر ذرا کچھ اُوپر ہٹ کر ایک ننھا سا ہلکے سیاہ رنگ کا تل ہے کہ جب ہنستے وقت گال اوپر کی طرف بڑی خوبصورتی سے تلاطم پیدا کرتے ہوئے چڑھتے ہیں تو شامت زدہ آنکھوں میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔ سیدھے رخسارے میں ہلکا سا گڑھا پڑتا ہے جس کی بابت دلّی والیوں کا خیال ہے کہ ساس پر بھاری ہوتا ہے... کنارے دار ہلکے موتیائی رنگ کی بنارسی ساری۔ کنارے پر دھنیے کی بیل۔ اور متن پر برف کی بوٹیاں پڑی تھیں... جس وقت سروجنی نیڈو بول رہی تھیں... سارے لوگوں پر وہ سناٹا جیسے اگن چھکے اور سارے پرند چپکے ہوکر بیٹھ رہیں[۱]۔

یہاں بطور جملہ معترضہ اس واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ مسز سروجنی نیڈو سے راقم الحروف کی سب سے پہلی ملاقات دہلی میں ہوئی۔ میں اس وقت اینگلو عربک کالج میں لکچرار تھا۔ ان سے گزارش کی کہ آپ ہماری یونین کا افتتاح فرمادیں۔ انھوں نے فوراً بلا تامل درخواست قبول فرمالی۔ میں نے جاکر پرنسپل سے اپنے کارنامہ کا ذکر کیا۔ وہ بے حد برہم ہوئے اور کہا حضرت آپ کو کچھ خبر بھی ہے یہ لیگی کالج ہے۔ نواب زادہ اس کے چیرمین ہیں۔ فوراً اس پروگرام کو ملتوی کروائیے۔ میں دوبارہ حاضر ہوا اور پورا واقعہ سنایا۔ انھوں نے فرمایا "میں تو آپ کی منتظر تھی۔ اس میں ایک بات بھی میرے لیے تعجب کی نہیں۔ اور یہ آپ کی آواز کیوں بھرائی۔ چھوڑیئے اس قصے کو۔ مٹھائی کھائیے آپ ــ

ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں

یوں کہیں مردوے بھی روتے ہیں"

پس پردہ میں مہاتما گاندھی، ڈاکٹر انصاری، آصف علی، مولانا عبدالباری، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی، شوکت علی سب کا ذکر ہے۔ علی برادران کے خیر مقدم کا ذکر کرتے ہیں ــ "گھر گھر روشنی اور گلی گلی روشنی۔ خوشی کے مارے آدمی پھٹے پڑتے تھے۔ بس نہیں تھا کہ محمد علی شوکت علی کو دل میں بٹھالیں۔ آنکھوں پر رکھ لیں۔ ان کے قدم قدم پر دل قربان اور آنکھیں نثار ہوتی تھیں۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ بس اکبر شاہ کا جلوس ایسے جوش اور خلوص سے نکلا تھا" اسی طرح سید حسین مرحوم کا ذکر بڑے مزے لے کر کیا ہے۔ اس تذکرہ سے خود آغا صاحب کے خیالات بھی ظاہر ہوجاتے ہیں۔

"سید حسین: بمبئی کرانیکل کوئی اخبار ہے اس کے نائب مدیر، یہ دانش گاہ (علی گڑھ) میں پہلے پڑھ چکے ہیں۔ ولایت پڑھنے گئے تھے وہاں سے خاصے انگریز ہوکر آئے ہیں۔ بڑے قابل اور روشن خیال ہیں۔ معلوم نہیں شادی ہوگئی یا ابھی تک کنوارے ہیں۔ چہرے سے تو عمر کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ کوئی چھبیس بھر کے، شاید ستائیسوں لگا ہو۔ سرو سا قد، چھریرا ڈول، گورا رنگ مگر ٹھنڈا ٹھنڈا، ستواں شواسی ناک، پتلے پتلے خوبصورت نتھنے، بیچ کی راس کی بادامی آنکھیں سیاہ پتلیاں جن میں موئی وحشت انگریزوں کی سی، جو کبھی رام ہی ہونا نہ جانیں حرکات و سکنات بھی ہم سے جدا، بالکل نگوڑے فرنگیوں کی سی، جن سے کچھ عجیب بے قراری ٹپکتی تھی... بتیسی اچھی۔ بولتے میں کچھ عجیب مزے سے نیچے کا پتلا ہونٹ سکیڑ لیتے ہیں جو بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ داڑھی مونچھ کا صفایا جس سے چہرے کی حیثیت نکل آئی ہے اور نرم نرم بھولا بھالا معلوم ہوتا ہے۔"

آغا صاحب کو فرنگی تہذیب سے بیر تھا۔ پس پردہ میں جا بجا اس پر طنز اور تعریض کی ہے:

"بیٹی ذات اور گیند بلا دیکھو۔ کولھے پہ ہاتھ رکھ کے ناچنا، تھرکنا،

۱؎ پس پردہ ص ۱۳-۲۵

پھد کنا دیکھو ۔ فرنگن زادی ۔ نگوڑے چہرے پر ابھی سے ٹھیکرے ٹوٹنے لگے ۔ یہ کرسٹانیوں کی صحبت کا اثر ہے ۔ نہ آئے کی شرم، نہ گئے کا لحاظ۔ دیدے کا پانی ہی ڈھل گیا ۔ انگریزن بچی ۔ شہدن ۔ بے شعور ۔ دور ہو چل ۔ اندر جا کے بیٹھ ۔ کام پہ دیدہ ہی نہیں تھا میری ملکہ وکٹوریا کا۔"

اسی مضمون میں ایک اور جگہ لکھا ہے :

"میں نے اس علامہ کا کیا بگاڑا تھا جو مجھے اُن نے انگریز کہا ۔ ہم تو اسے چاہیں ۔ رتی میں سے رتی دیں ۔ حلق کا نکال کے کھلائیں ۔ اس پہ یہ ہمیں انگریز کہے ۔ تم ہی منصفی سے کہنا ۔ میں حرام خور ہوں ۔ سور کھاتا ہوں ۔ پھر کیوں کہا اِن نے "

ذیل میں فرنگیوں کی اس حرکت کو کہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کس خوبی سے بیان کیا ہے ۔ آزادی کی تحریک اور خلافت کا زور ہے اس وقت عوام کے جذبات کی تصویر کشی کی ہے ۔ دل کی یہ دھڑکنیں تاریخ کی کتابوں میں نہیں مل سکتیں ۔

"شرفاً کہنے لگی کہ بیگم اُس دن سے میں نے تو کوئی چیز آج تک فرنگی کے ہاتھ کی لی نہیں ۔ کمبل بٹتے تھے ۔ سردی میں اکڑی ۔ لیکن نہ لیے ۔ غریبی میں میرا یہ حال ہے ۔ امیر جانے ہوتے ساتے کیوں یہ خلعت لے آتے ہیں ۔ ان کے دل میں ذرا خوفِ خدا نہیں ۔ ہم چاہیں تو کمبل کا خلعت ہم بھی لے لیا کریں لیکن بیگم دل لرزتا ہے کہ اسے ہے بدن سے لگا اور کوڑھ چوئی ۔ خطاب لیا اور کوئی مخاطب کرنے والا نہ رہا ۔ نسل تک غارت ہو جائے گی ۔ اسی مارے بڑے حکیم صاحب نے اپنا خطاب لوٹا دیا ۔ اور آصف علی میاں، ڈاکٹر انصاری اور سب بڑے بڑوں نے کدیشی مال جلا کر خاک سیاہ کر دیا ۔ نواب محسن الملک کے چھوٹے بھائی سید امیر حسن کا سارے کا سارا گھرانا، کیا مرد، کیا عورت، سب گاڑھا پہننے لگے اور سارے کپڑے جلا ڈالے ۔ کان گنہگار ہیں ۔ کہتے ہیں کہ اس میں مہاتما جی کی چال ہے کہ مسلمانوں کے پاس اور دھرا ہی کیا ہے سوائے چار اجلے چیتھڑوں کے ۔ ایسی ترکیب نکالو کہ چار انگل کی لنگوٹی کو ترسیں اور میسر نہ آئے ۔ بیوی! یہ بات مجھے بڑے تحصیلدار صاحب نے سمجھائی ہے اور وہ بڑے صاحب سے سن کر آئے تھے[1]

پس پردہ میں تحریک آزادی کے سلسلے کا بیش قیمت مواد موجود ہے ۔ موپلوں کی بغاوت ہماری تاریخ کا نہایت اہم حصہ ہے ۔ لیکن عام تاریخیں اس کے ذکر سے عاری ہیں ۔ آغا صاحب نے "محل سرا کی گلخپ" میں اس کی تصویر کھینچی ہے لیکن آج کے پڑھنے والے کو آغا صاحب کی ان مجبوریوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جن میں یہ مضمون لکھا گیا ہے :

آوازِ حق بلند شود، دار می شود

آغا حیدر حسن صاحب کا ایک محبوب موضوع غدر یا ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہے اس موضوع پر خواجہ حسن نظامی، مولانا راشد الخیری، سید ناصر نذیر فراق دہلوی کئی حضرات نے خامہ فرسائی کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنے طرز کا مالک ہے ۔ لیکن آغا صاحب اس طرح لکھتے ہیں جیسے خود اس قلزم خون کے شناور ہوں :

"اے ہے میاں غدر کی للّٰہ نہ پوچھو ۔ اے اللہ دشمن کو نہ دکھائیو ۔ برس دن ست ہی ست پر گزری ۔ استانی کے ہاں میں تھی کہ اتنے میں میرے ابا جن کا نام الٰہی بخش تھا اور قلعے میں کبوتروں کو دانہ دینے پر نوکر تھے، ہانپتے کانپتے بھاگے ہوئے آئے، کنڈی کھٹ کھٹائی اور مجھ سے کہا جلدی گھر چل ۔ شہر میں بلوا ہو گیا ہے ۔ قلعہ میں ہنگامہ ہے ۔ بادشاہ سلامت کو قید کر لیا ہے اور سارے محلوں کو گھیر لیا ہے اللہ ہی ہے جو خیر ہو ۔ گھر میرا لاہوری دروزے صفیلوں میں تھا ۔ تھوڑے دنوں تو وہیں رہے لیکن پھر جو گولا پڑا تو میرے نانا جن کا نام خدا بخش ہے آئے ۔ مجھے اور میری اماں جن کا نام افضل النساء تھا، لے کے چتلی قبر اعظم خاں کی حویلی میں اپنی بہن لاڈو خانم کے ہاں چھوڑ گئے . . . . ہمارے پچھواڑے شہزادے جواں بخت کی سسرال تھی گورے غارتی رات بھر ان کے دروازے کی زلفیاں کاٹتے رہے اور ہر کھٹاکے کے ساتھ ہمارے دم نکلیں ۔ اماں ۔ نانی اور ساری گھر کی عورتیں ۔ مردوے کا نام تو چڑیا کا بچہ تک نہ تھا ۔ قرآن شریف کھولے گھڑی چھت پر چڑھتیں اور گھڑی نیچے اترتیں ۔ سب پڑھ پڑھ کے چاروں طرف دستک دیں اور بال کھول کھول کے دعائیں مانگیں کہ الٰہی مردوں کی جانیں اور عورتوں کی آبرؤں کا تو ہی والی ہے ۔ میں زار قطار روؤں ۔ سامنے پہاڑی پر گولیاں سائیں سائیں جائیں ۔ دھنا دھن ۔ ٹھوں ٹھائیں ٹھنا نا نا کی آوازیں کلیجے نکالے دیں ۔ کس کا کھانا ۔ کس کا پانی ۔ جانوں اور آبرؤں کے لالے پڑے وے ۔ اور میاں اعمالوں کی شامت دیکھو کہ پہلے اچھے خاصے نکل گئے تھے ۔ سنا تھا کہ بادشاہ جا رہے ہیں ۔ ساری خلقت شہر سے ان کے ساتھ نکل رہی ہے ۔ ہم عورتیں گھر سے حق تو حق تو کرتی نکلیں ۔ ٹیا محل کے بازار سے لے کر جامع مسجد کی سیڑھیوں تک آدمیوں کا وہ حال کہ میں تجھ پر اور تو مجھ پر ۔ تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی ۔ جہاں پناہ بچارے تام جھام میں سوار، ایک ایک آنکھ سے ہزار ہزار آنسو جاری ۔ بہ بہ کے نورانی مقیش سی داڑھی پہ آئیں ۔ آپ رومال سے انھیں صاف کرتے ہوئے . . . . . ہوش نہ تھا کہ کہاں جاتے ہیں ۔ بازار لاشوں سے پٹے ۔ جگہ بہ جگہ خون کے تھتے کے تھتے ۔ قدم قدم پر سر اور دھڑ پڑے ہوئے ۔ دروازے سے باہر جو نکلے ۔ پہرے داروں نے جو جس کے پاس تھا سب دھروا لیا ۔ اوڑھنے کے کپڑے تک چھین لیے . . . . تین دن میں مرتے گرتے تغلق آباد پہنچے ۔ وہاں نگوڑے گنواروں نے ظلم توڑے ۔ سب کو پکڑ لیا اور کہا کہ جب تک آدمی پیچھے، روپیہ نہ لے لیں گے، نہ چھوڑیں گے ۔ یہاں کیا خاک دھری تھی جوان کے دیدوں میں جھونکتے ۔ سارے دن، ساری رات بند رہے بیٹھے رہے ۔ کھائے ہوئے تیسرا دن تھا ۔ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو اور پانی کے ایک ایک گھونٹ کو ترسیں اور میسر نہ آئے ۔ آخر خدائی خواروں نے مار جھٹک مار چھوڑ دیا "

---

[1] پس پردہ : ص ۱۰۵

آغا صاحب نے اس کہانی کو اپنے پیارے دوست حضرت خواجہ حسن نظامی کے نام نامی معنون کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ دہلی کی زبان اور محاورے کا حق ادا کر دیا ہے۔ درد اور تپش سوا ہے۔ آغا صاحب کی نظر اس بات پر بھی ہے کہ اس بغاوت میں چھوٹے بڑے سب شریک تھے اور یہ اس وقت رونما ہوئی جب ملک کا جام صبر بھر گیا تھا اور فرنگی بیزاری انتہا کو پہنچ گئی تھی۔

آغا صاحب سے میری دوسری ملاقات حیدرآباد میں ان کے در دولت پر ہوئی۔ جب وہ نظام کالج کی پروفیسری سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ ان کا مکان کیا عجائب خانہ تھا اس کے نوادرات کی نمائش غالب صدی کے موقع پر ہوئی تھی۔ سکے، تیغے، تسبیحیں، قرآن پاک کے نسخے، فرامین، قلمی کتابیں سب ہی عجیب و غریب تھیں کہ آدمی بس دیکھے ہی جائے۔ اسی موقع پر انھوں نے قصۂ مہرافروز و دلبر کا مخطوطہ بھی دکھلایا جو اب چھپ چکا ہے۔ آغا صاحب کا خیال تھا کہ یہ نواب عیسیٰ خاں کی تصنیف ہے جو جہانگیر اور شاہ جہاں کا معاصر ہے اور جس کی ایک اور تصنیفِ نثر نصیحت نامہ بھی ان کے کتب خانہ میں محفوظ تھی۔

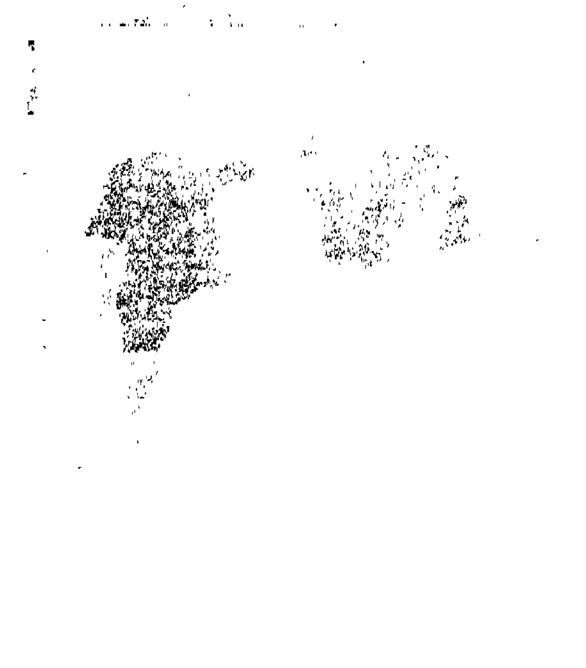
آغا صاحب سے ایک ملاقات پیرس میں بھی ہوئی جہاں میں ذاکر صاحب کے حکم کے مطابق غالب صدی کے لیے یونسکو کی مدد حاصل کرنے گیا تھا۔ آغا صاحب پیرس میں اپنی صاحبزادی اور داماد کے ساتھ مقیم تھے جو یونسکو میں عہدہ دار تھے اور جنھوں نے غالب صدی کے سلسلے میں میری بڑی مدد کی تھی۔ آغا صاحب کی دہلوی وضع۔ چہرے پہ نورہی نور۔ پیرس کی خواتین جلو میں:

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف

میرا حال الف لیلہ کے ابوالحسن کا سا تھا۔ آغا صاحب کا تصوف بہت بڑھ گیا تھا۔ یہ وضع قطع اور تصوف کے گہرے نکات سب اُن پر سجتے تھے۔ فرانس جو دوسری لڑائی کے بعد زخموں سے چُور تھا سکون کو ڈھونڈھ رہا تھا اور آغا صاحب کے پاس اسی درد کے درماں کے لیے حاضر ہوا تھا۔

۱۹۶۹ء میں جشنِ غالب کے موقع پر آغا صاحب سے دہلی میں ملاقات ہوئی اور انھوں نے ازراہِ کرم دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ایک لاجواب مضمون بھی پڑھا جس کا عنوان تھا " مرزا نوشہ تھا اور دلی برات "۔ طرفہ لطیفہ ہے کہ اس عنوان سے ۱۸۶۹ء کے اعداد نکلتے ہیں جو مرزا غالب کا سالِ وفات ہے یہ مضمون رسالہ اُردوئے معلی دہلی یونی ورسٹی کے تیسرے غالب نمبر میں شائع ہوا ہے اور تیرہ صفحات پر محیط ہے۔ اسی نمبر میں غالب کی دلی پر سر پرسی ول اسپیر کا بھی نہایت اعلیٰ تاریخی مضمون ہے۔ دونوں کا ایک موضوع ہے لیکن آغا صاحب کا مضمون جیتا جاگتا، زندگی سے بھرپور ہے۔ اور ایسے شخص کے قلم سے لکھا گیا ہے جو اس تہذیب میں پلا بڑھا ہے اور جس نے ساری زندگی اسی دشت کی سیاحی میں گزاری ہے۔

آغا حیدر حسن صاحب سے میری آخری ملاقات ۱۴ اپریل ۱۹۷۰ء کو دہلی میں ہوئی۔ میں نے فرمائش کی کہ " آغا صاحب ایک شب میرے گھر بھی بسر کیجیے اور صبح کو مجھے دہلی کی سیر کرا دیجیے۔ دہلی میں اتنا وقت صرف کیا ہے اور دہلی نہیں دیکھی۔ پروفیسر خسرو کو بھی ساتھ لے لیں گے "۔ میں نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے ایک بچہ اپنے باپ سے فرمائش کرتا ہے۔ وہ فوراً راضی ہو گئے۔ واقعی ان کا سلوک بھی وہ تھا جو آبا اپنی اولاد کے ساتھ کرتے ہیں۔



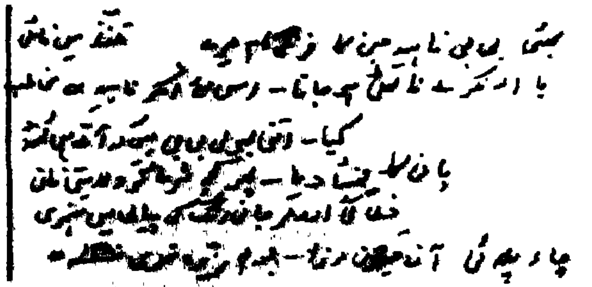
پروفیسر اے ایم خسرو، آغا حیدر حسن، خواجہ احمد فاروقی

آغا صاحب بڑی رونق کے بزرگ تھے۔ ان کے قیام سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری خیر و برکت میرے حصہ میں آگئی ہے۔ بات بات میں جدت۔ بات بات میں لطیفہ۔ زبان تو ایسی کہ:

فتاد سامعہ در موجِ کوثر و تسنیم

میں نے نٹی باجی کا تعارف کرایا۔ انھوں نے فرمایا "یہ آپ نے ژاں نٹی کی بیڑھ لگائی ہے۔ میں ناہید کہوں گا"۔ پھر یہی بات اپنے قلم سے ہماری مہمانوں کی کتاب میں لکھی:

" بھیئی بی بی ناہید، جن کا فرنگی نام میرے تلفظ میں ناٹی یا اللہ نہ کرے ناٹھی[1] ہو جاتا۔ اس لیے ان کو ناہید سے مخاطب کیا۔ اتنی بھولی بی بی ہیں کہ آتے ہی ٹھنڈے پانی کا چھینٹا دیا۔ پھر کچھ شرما کر ولایتی نان خطائی اور مرجانی رنگ کی پیالی میں سنہری چار پلائی۔ (دستخط) حیدر حسن مرزا جمعہ ۱۳ تیرہ تیزی ۱۳۸۰ھ "



[1] بمعنی نگوڑی۔ جس کا کوئی رشتہ دار نہ ہو

ہم تینوں (آغا صاحب، میں اور پروفیسر خسرو) ۱۵ راپریل کی صبح کو ۶ بجے موٹر میں گھر سے چلے۔ سب سے پہلے برکت کی خاطر حضرت امیر خسرو اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزار پر گئے اور فاتحہ پڑھی۔ اس کے بعد انھوں نے موسیٰ خاں، عیسیٰ خاں اُمرائے افغانان بیچ گنبدی کا مقبرہ دکھلایا جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس کے بعد کناٹ سرکس کے ایچ بلاک میں آئے اور حضرت شاہ سعد اللہ گلشن مجددی (متوفی ۱۱۵۲ھ-۱۷۴۰ء) کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ یہ مزار مسجد پنجابیاں کی پشت پر برٹش انڈیا پریس کے قریب واقع ہے۔ مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ اُردو کے اتنے بڑے محسن اور مجددی سلسلے کے اتنے معروف بزرگ کا مزار عین کناٹ پلیس میں واقع ہے۔ مرقد مبارک کے چاروں طرف لوگوں نے رہائش اختیار کرلی ہے اور گھر کے سامانوں کا انبار لگا ہوا ہے۔ آغا صاحب نے فاتحہ پڑھی۔ ان کی چوقبی ٹوپی۔ ریشمی شیروانی۔ دہلی کے کام کی جوتیاں۔ پھر نورانی دیدار و چہرہ۔ تمام سکھ مرد عورت اور بچے حلقہ کر کے کھڑے ہو گئے اور ان کو تکنے لگے۔ فاتحہ کے بعد انھوں نے کہا کہ آپ لوگ جانتے ہیں۔ یہ مجدد صاحب کے سلسلہ کے بزرگ ہیں اور اُن کا گرو نانک جی سے قریبی تعلق ہے۔ یہ سننا تھا کہ سب سجدے میں گر گئے۔ کوئی مٹھائی لایا، کوئی لسّی، کوئی کوکا کولا۔ کہنے لگے فاروقی صاحب وَلی جب دکن سے دہلی آئے ہیں تو حضرت سعد اللہ گلشن سے ملے اور اپنا کلام سنایا انھوں نے فرمایا یہ فارسی کے مضامین جو بیکار پڑے ہیں ان کو اُردو میں منتقل کرو۔ اس کے بعد سے اُردو شاعری کا رُخ ہی بدل گیا۔ اچھے شاعر ہی نہیں تھے۔ بڑے اللہ والے بھی تھے۔ ظاہری اور باطنی کمالات اور زہد و تقویٰ و تجرید میں جواب نہیں رکھتے تھے۔"

اس کے بعد آغا صاحب شاہ عبدالسلام صاحب چشتی فخری کی درگاہ میں لائے جو حضرت کالے صاحبؒ کے داماد ہیں اور جن کا مزار لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج کی پشت پر واقع ہے۔ اسی دلکشا احاطہ میں خان بہادر شمس العلما مولوی ذکاء اللہ کا مزار ہے جن کا انتقال ۱۳۲۸ھ-۱۹۱۰ء میں ہوا اور جو اپنے زمانے کے اکابر فضلا میں شمار ہوتے تھے۔

یہاں ایک بزرگ چٹائی کی گول ٹوپی اور نین سکھ کا صاف کلف دار کرتہ پہنے ہوئے بیٹھے تھے۔ انھوں نے آغا صاحب سے بہت اخلاق کیا اور پھر میری طرف متوجہ ہوئے شاید آپ کو معلوم ہو کہ آخری زمانے میں یہ مشہور ہوگیا تھا کہ منشی ذکاء اللہ، ماسٹر رام چندر کے زیر اثر کرسٹان ہوگئے ہیں۔ وہ مرنے سے تین سال پہلے کالے صاحب کے حضور میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ مجھے دستِ حق پرست پر بیعت کرلیجیے انھوں نے یہ باتیں سُن رکھی تھیں فرمایا کہ "منشی صاحب آپ کہاں اس جھمیلے میں پڑیں گے ایک ہفتہ اور سوچیے، پھر آیئے۔" وہ پھر گئے اور مُرید ہونے پر اصرار کیا۔ انھوں نے کہا: "تین دن اور سوچیے پھر آیئے۔" وہ پھر گئے اور کہا کہ سوچ لیا اب یہ شرف عطا ہو۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ (جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں) انھوں نے مرید کرلیا اور فرمایا: یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (خدا کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں پر ہے) مولوی ذکاء اللہ نے کہا مجھے کچھ پڑھنے کے لیے بتا دیجیے۔ کہا روزانہ صرف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ (کوئی نہیں ہے بجز اللہ کے)

مغیث الدین فریدی
سی-۱۲- ماڈل ٹاؤن، دہلی ۹

تاریخِ وفات
مرزا آغا حیدر حسن

ہم سے رخصت ہوئے آغا حیدر حسن — جن سے روشن تھی تہذیب کی انجمن
وہ مجسّم شرافت سراپا خلوص — سادگی میں بھی اُن کی تھا اک بانکپن
وہ تھے دہلی کی محفل کے تنہا چراغ — شخصیت اُن کی تھی آبروئے وطن
ان کی ذاتِ گرامی تھی ہر رنگ میں — روحِ تہذیب، جانِ ادب، شانِ فن

نام سے اُن کے تاریخِ رحلت ملی
"آہ جنت مقام آغا حیدر حسن"
۱۹۷۶ء

کہہ لیا کرو لیکن پوری معنویت کے ساتھ۔ خوب سوچ سمجھ کر۔ مجھے پانچ دن کے بعد مطلع کرو۔ پوچھا "کہا؟" عرض کیا "حضرت ایک دفعہ بھی نہیں کہا گیا۔" اسی طرح پانچ دفعہ پانچ پانچ دن کے بعد آئے اور کہا کہ حضرت ایک دفعہ بھی ورد نہیں کرسکا فرمایا "اچھا تین دفعہ کہو۔" یہ بھی نہیں کہا گیا۔ پھر دو دفعہ کردیا۔ غرض مرنے سے پہلے صرف ایک دفعہ کہہ سکے اور جاں بحق ہوگئے۔

اُس کے بعد ہم اجمیری دروازہ آئے۔ آغا صاحب نے نواب قمرالدین خاں کی حویلی کا ذکر کیا۔ مبارک بیگم کی مسجد دکھلائی جو بقا والوں کے پاس واقع ہے۔ یہ اخترلونی کی داشتہ تھیں اور اپنے زمانے میں بہت شہرت رکھتی تھیں۔ اُس کے آگے چل کر نواب موسیٰ خاں کی محل سرا دکھلائی جس میں آغا صاحب جمعہ کے دن ۱۲ محرم الحرام ۱۳۱۰ھ یعنی ۴ اگست ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوئے تھے۔ فرمایا "یہ ہی وہ محل سرا ہے جہاں کرنل ڈاکٹر ذوالنون[1] احمد کی شادی نواب زادی رقیہ سلطان بیگم بنت نواب زادہ باقر علی خاں سے ہوئی تھی۔ اس محل سرا کے پھاٹک پر غالب کی کہی ہوئی تاریخ ہے اس کے سنگ مرمر کے اجارے دار حماموں کی توصیف میں غالب کی فارسی قطعات کندہ ہیں اور اس کی چھت کی تعریف میں غالب نے دستنبو میں خوب گل فشانی کی ہے۔

آغا صاحب نے غازی الدین خاں کی محل سرا اور اکرام اللہ خاں کا پھاٹک دکھلایا جہاں مولانا حالی نے مناجات بیوہ لکھی تھی اور جس کی زبان کو سُن کر مہاتما گاندھی نے فرمایا تھا کہ ہندوستان کی اگر کوئی مشترک زبان ہوسکتی ہے تو وہ یہ ہے۔

آج نہ وہ منقش چھتیں ہیں، نہ وہ محل سرائیں، نہ وہ کتب خانے، نہ وہ ڈیوڑھیاں، نہ وہ سنگ باسی کی نہریں اور فوارے ؎

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں — یاں کبھو سرو و گل کے سایے تھے

حد یہ ہے کہ اب کوئی اس کہانی کو سُنانے والا بھی نہ رہا۔
اک شمع رہ گئی تھی، سو وہ بھی خموش ہے

[1] صدر محترم عزت مآب فخر الدین علی احمد کے والد ماجد۔

عرش ملسیانی
ایف ۱۱/۴۴ ماڈل ٹاؤن، دہلی

آزادیِ جمہور

آج زیبا نہیں کرنا دلِ رنجور کی بات
روزِ روشن میں نہ کر تو شبِ دیجور کی بات
مجھ سے کیوں پوچھتا ہے قیصر و فغفور کی بات
آ سُناؤں تجھے آزادیِ جمہور کی بات
آ گئے رحمتِ خوش وقت و خوش انجام کے دن
عامّۃ النّاس کی بہبود کے آرام کے دن

آؤ تعظیم سے لیں ہاتھ میں قومی پرچم
جو قدم آگے بڑھائیں وہ قدم ہو محکم
بے سہاروں پہ کرم کرتے رہیں ہم پیہم
نہ رہے ملک پہ اب کہتر و مہتر کا بھرم
دلِ ہر فرد سے کافور ہو آفات کا نام
ثبت ہر قلب پہ ہو جائے مساوات کا نام

تلخیاں دور ہوئیں اور ملے قند و عسل
مہرباں سب پہ ہوا آج سے قسّامِ ازل
رامش و رنگ میں مصروف ہیں افراد و ملل
کس کی طاقت ہے کہ اب ڈالے مسرت میں خلل
محفلِ عیش و طرب محفلِ جم ہے گویا
میرا گلزارِ وطن باغِ ارم ہے گویا

وادیاں جاگ اٹھیں دشت و دمن جاگ اُٹھے
گلستاں جاگ اٹھے، سرو و سمن جاگ اُٹھے
نوجواں جاگ اُٹھے، مردانِ کہن جاگ اُٹھے
جو تھے سوئے ہوئے یارانِ وطن جاگ اٹھے
اس طرح خواب ہوئی بختِ نگوں سار کی بات
ہر طرف ہوتی ہے اب طالعِ بیدار کی بات

زینۂ بامِ ترقی پہ چڑھے خورد و کلاں
دستِ آدم میں ہے ہر چار عناصر کی عناں
برق کے فیض سے ہر سو ہیں تجلّی کے نشاں
سچ تو یہ ہے کہ ہیں قابو میں زمین اور زماں
بھٹیاں گرم ہوئیں لوہا بھی سیّال ہوا
کارخانے بھی بڑھے، ملک بھی خوشحال ہوا

زندگی سازِ خوشس آواز ہوئی ہے یارو
زندگی طاقتِ پرواز ہوئی ہے یارو
زندگی عیش بہ انداز ہوئی ہے یارو
زندگی عشرتِ دمساز ہوئی ہے یارو
کوئی سنتا ہی نہیں جاہل و مردود کی بات
ہر طرف ہونے لگی قوم کی بہبود کی بات

ٹوٹا ہوا آدمی

نعیمہ جعفری
وارڈنس کوارٹر، ایم۔ ایم۔ ہال، مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

بوڑھے مہیش چندر سے نوجوان مہیش چندر نے کئی بار پوچھا۔ "یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟ اس مقام سے میری یہ اجنبی سی شناسائی بڑی تکلیف دہ ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اپنی عزیز بیوی سے طلاق کے کئی سال بعد اچانک سرِراہ سامنا ہو گیا ہو۔ تمہیں یہاں آنے کی کیا سوجھی تھی۔ کیا اور کوئی منزل نہ ملی تھی تمہیں؟ جب تم میرے اندر چھپے بیٹھے تھے تو میں نے تمہیں کیا کچھ نہیں دیا تھا، ہر وہ شے جس کی کوئی بھی دنیا میں تمنا کر سکتا ہے۔ اور اب جبکہ میں تمہارے بس میں آگیا ہوں تو مجھے یوں ذلیل و خوار نہ کرو۔"

بوڑھے مہیش چندر نے ایک سرد سی آہ کے ساتھ اپنے تھکے ہوئے قدموں کی طرف دیکھا جن میں اب کسی اور منزل کی تلاش کا نہ حوصلہ تھا اور نہ سکت یہیں تک آتے پاؤں میں چھالے پڑ چکے تھے۔ وہ مسکرا پڑا۔ ایک بے معنی سی بے بس سی مسکراہٹ اس نے سرگوشی کی۔ "میں ٹوٹ چکا ہوں مہیش چندر۔ بری طرح ٹوٹ گیا ہوں پیشتر اس کے کہ بکھر جاتا میں نے اپنے وجود کو QUICK FIX سے جوڑ لیا ہے۔ ایک جڑے ہوئے آدمی سے تم اس سے زیادہ توقع کر بھی کیا سکتے ہو۔ میں تم سے شرمندہ ہوں لیکن مجبور ہوں۔"

دروازے پر چندر کانت سکسینہ کے نام کی پیتل کی تختی پر سورج کی شعاعوں کے ساتھ اژدہوں کی سرخ زبانیں لپلپا رہی تھیں۔ دروازے پر کھڑے نیپالی نے پوچھا۔ "تم کس سے ملنا مانگتا ہے۔" مہیش چندر نے کہا "یہ میرا گھر ہے بھائی۔" نیپالی حقارت سے ہنس دیا۔ "بڈھے میرے کو لگتا ہے۔ تیرے دماغ میں کوئی اسکریو ڈھیلا ہے یہ تو ہمارے صاحب کا مکان ہے۔ ڈاکٹر چندر کانت جی کا۔" مہیش چندر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جوڑوں پہ لگا لوشن پگھلنے لگا ہو۔ اپنی ساٹھ سالہ زندگی میں سیکڑوں آدمیوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنانے والا مہیش چندر اپنے آپ کو چور چور محسوس کرنے لگا۔ آسمان جو ہمیشہ اس کی پہنچ کے اندر رہا تھا۔ آج بہت دور نظر آ رہا تھا جسے چھونے کی تمنا بھی دیوانے کی بات سے زیادہ نہیں ہوتی۔ زمین جو اس کے قدموں تلے ہمیشہ نرم رہی تھی آج کچھوے کی طرح سخت اور بچھو کی طرح زہریلی ہو گئی تھی۔ اس نے گھبرا کر پاؤں اٹھا لیا۔ لیکن دوسرا قدم بہرحال پھر اسی جگہ پر رکھنا پڑا جو ہر قدم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ سیڑھیوں پر بیٹھ کر اس نے رومال سے اپنی آنکھوں کو ڈھانک لیا۔ باہر کی یہ چکاچوند روشنی جو اس کے روح کے اندھیروں سے ہم آہنگ نہیں تھی، اس کی برداشت سے باہر تھی۔ لیکن کب تک وہ آنکھوں پر پٹی باندھے اس روشنی سے بچتا رہے گا۔ جینے کے لئے یہ دو عملی تو کرنی ہی پڑے گی کہ اندر کی کوٹھری میں چاہے روشنی کی کرن تک نہ پہنچے لیکن باہر چراغاں ہوتا رہے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ان سیڑھیوں پر ڈھیر سا تھوک کر چل دیا ہوتا مگر اب بات اور تھی۔ اب وہ ٹوٹ چکا تھا اور ہر لمحہ اسے اپنے جوڑ کھل جانے کا اندیشہ تھا۔ دفعتاً اپنے پشت پر کھنکتا ہوا سا قہقہہ سنائی دیا جیسے پوجا کی تھالی ٹوٹ کر گر گئی ہو۔ اس نے مڑ کر دیکھا شوخ بنتی پربھا کانت کہہ رہی تھی۔ "یہ آپ ہیں بابوجی! راما کہہ رہا تھا ایک بڈھا باہر سیڑھیوں پر بیٹھا ہے"۔ وہ پھر ہنسی۔ مہیش چندر سر جھکا کر تیزی سے اپنے جوڑوں پر لوشن کی تہہ چڑھانے لگا۔ نیپالی کی آواز پیلے پیلے دانتوں کے درمیان سے بدبودار سانس کے ساتھ آئی "ہم کیا جانتا تھا میم صاحب کہ یہ بڈھا صاحب ہمارے صاحب جی کا باپ لگتا ہے۔"

بڈھا صاحب
بڈھا صاحب
بڈھا صاحب

مہیش چندر ایک بہت گہری کھائی میں پڑا یہ آواز سنتا رہا۔ یہ آواز جو آسمان سے برس رہی تھی، زمین سے آ رہی تھی، در و دیوار سے نکل رہی تھی "انسپکٹر جنرل پولیس مہیش چندر سکسینہ جس کے آگے بڑے بڑوں نے سر جھکایا تھا۔ اور یہ بڈھا صاحب۔ نوجوان مہیش چندر نے بوڑھے مہیش چندر کے منہ پر اپنے مضبوط ہاتھ سے ایک زوردار طمانچہ مارا اور نیلی نیلی پانچ انگلیاں اس کے دل پر ابھر آئیں۔ وہ پانچ نیلی لکیریں جو ساری فضاؤں میں رقص کر رہی تھیں اور جنہوں نے کائنات کو نیلگوں کر دیا تھا۔

اور ایک دن سے پربھا کانت کہہ رہی تھی "بابوجی یوں خالی پڑے پڑے آپ کی صحت گر جائے گی۔ میں نے مالی کی چھٹی کر دی ہے۔ آج سے باغیچہ کی دیکھ بھال آپ کیا کیجئے۔"

بڑے زور کی گرج ہوئی۔ بجلی کا ایک کوندا سا لپکا اور اس کی چمک میں اس نے دیکھا سبھی پربھا اس کے پاؤں چھو رہی تھی۔ وہ گھبرا کے پیچھے ہٹا تو اس نے کہا "چھو لینے دیجئے بابوجی۔ ان چرنوں کے نیچے تو ہمارا سورگ ہے" اور اس کا سینہ اڑتیس انچ سے بڑھ کر چالیس انچ ہو گیا تھا۔ آج وہی سینہ چھتیس انچ سے گھٹ کر چونتیس انچ رہ گیا۔ اب وہ سورگ بھی شاید پاؤں کے چھالوں کے ساتھ بہہ نکلی تھی۔

کدال ہاتھ میں لیتے ہوئے مہیش چندر نے دیکھا کہ ساری زمین پر پانچ نیلی انگلیاں ابھری ہوئی ہیں۔ وہ کدال سے ان لکیروں کو مٹانے کی کوشش کرتا رہا لیکن جوں جوں مٹی ہٹتی جاتی تھی اندر سے وہ لکیریں اور زیادہ واضح اور گہری ہوتی جاتی تھیں۔ اس کے انگ انگ سے چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں کنپٹیوں کی رگیں تن

(بقیہ صفحہ ۱۹ پر)

عبدالحق
شعبۂ اردو
دہلی یونیورسٹی دہلی

شاہ حاتم کا نایاب کلام

تاریخ ادب میں ناگزیر حیثیت رکھنے کے باوجود اگر ایسے شعراء کی فہرست بنائی جائے جو زیادہ مشہور اور معروف نہیں ہیں تو شاید شاہ حاتم اس میں سرِ فہرست نظر آئیں گے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ مگر ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے تخلیقی اکتسابات پر ابھی تک خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی ہے۔ وہ ہماری ادبی تاریخ کے ان معماروں میں سے ہیں جن سے شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ شمالی ہند کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ انھوں نے ۱۱۴۴ھ میں اپنا دیوان مرتب کیا۔ اس سے پہلے کسی اردو دیوان کی جمع و ترتیب کا پتہ نہیں چلتا۔ قاضی عبدالودود کی تحقیقات نے دیوانِ فائز کی اولیت مشتبہ کر دی ہے۔ یوں بھی وہ فارسی دیوان کا ایک جز ہے۔ لیکن حاتم کا قدیم دیوان صحیح معنوں میں شمالی ہند کا پہلا اردو دیوان ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں تقریباً چار ہزار اشعار موجود تھے۔ دیوان فائز کے بعد پروفیسر محمد حسن نے دیوان آبرو کو اولیت دی ہے۔ مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ جب تک حاتم کا قدیم دیوان دستیاب نہیں ہوتا۔ قدیم دیوان کی دریافت کے بعد آبرو کی اولیت ختم ہو جاتی ہے۔

شاہ حاتم نے تقریباً ستر برس تک اردو شعر و ادب کی خدمت کی۔ وہ ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۹۷ھ میں سرزمین دہلی ہی میں سپردِ خاک بھی ہوئے۔ اس طویل مدت میں اردو کے عروج و ارتقا کا صرف مشاہدہ ہی نہیں کیا بلکہ برابر کے شریک بھی رہے۔ ایہام گوئی ان کے دور سے شروع ہوئی اور تقریباً تیس برس بعد اس کے خلاف آواز اٹھانے میں پیش پیش بھی رہے۔ زبان کا فطری اور ابتدائی رنگ ان کے کلام میں موجود ہے لیکن جب اردو کو "موافق محاورۂ شاہ جہان آباد" کی تحریک نے فارسی سے قریب کیا تو شاہ حاتم بھی ہندی و دکنی اثرات کو نظر انداز کر کے فارسی اسلوب و اظہار سے قریب تر ہو گئے۔ زبان و اسلوب کے یہ مختلف رنگ و روپ اور بدلتی ہوئی صورتِ حال کا جتنا بھرپور ادراک حاتم کے کلام میں ملتا ہے۔ دوسری جگہ ناپید ہے۔ تاریخی حیثیت سے قطع نظر اردو شاعری میں ان کے نام و نسب کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ سودا جیسے ہونہار شاگرد انھیں کی تربیت سے فیضیاب ہوئے ہیں۔ شاہ حاتم کے کلام میں عصری آگہی و بصیرت کا بار بار اظہار ملتا ہے۔ ان کا فن سماجی کوائف کا ترجمان نظر آتا ہے۔ اس دور کے سیاسی اور سماجی نشیب و فراز کا جو دل دوز ذکر حاتم کے ہاں ملتا ہے، دوسری جگہ نظر نہیں آتا۔ اس کے علاوہ ان کی شخصیت میں اس عہد کا نمائندہ انسان دکھائی دیتا ہے۔ جو قلندری و بے نیازی کے ساتھ بانکپن بھی رکھتا ہے۔ وہ اسلوبِ زندگی کی دل کشی سے پیار کے ساتھ دنیا کے فکر و غم سے دامن کشاں بھی رہے ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شمالی ہند میں صوفیانہ شاعری کی روایت انھیں سے شروع ہوتی ہے۔ دہلی میں دیوان ولی کی آمد (۱۱۳۲ھ) سے پہلے وہ شاعری شروع کر چکے تھے۔ ان کے مختلف بیانوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی شاعری کی ابتدا ۱۱۲۸ھ کے لگ بھگ ہوئی۔ اردو شاعری کے ابتدائی دور میں شاہ حاتم کو فن کی تخلیق اور اس کے ارتقائی عمل کا جو شعور ہے وہ کسی دوسرے فنکار کو نہیں۔ انھوں نے دیوان زادہ کی ترتیب کے وقت ہر غزل کا سنہ تخلیق، وزن اور زمینِ طرح کا اندراج کیا۔ اور بڑی فراخیٔ نظر کے ساتھ ان شعرا کا نام لکھا جن کی زمینوں پر حاتم نے غزلیں کہیں۔ انھوں نے معاصرین بزرگوں، عزیزوں اور شاگردوں کی طرحی زمینوں پر غزلیں لکھیں اور کھلے دل سے سب کا اعتراف کیا ہے۔

دیوان زادہ کے مختلف نسخوں کے مطالعہ کے بعد تقریباً پچیس شعرا کی زمینیں ملتی ہیں۔ اس اعتراف سے ہم ان شاعروں کی غزلوں کی تخلیق کے ماہ و سال اور کلام کا سراغ لگا سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ سوداؔ (۱۲) اور ولی (۱۱) کی زمین طرح ملتی ہے۔

اس تقلید سے انھیں نقصان پہنچا۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ان طرحی زمینوں میں حاتم کا انفرادی رنگ و آہنگ دوسرے فنکاروں کی سایہ نشینی سے معدوم ہو گیا ہو۔ حاتم ایک مخلص فنکار تھے۔ اپنی دل گداز طبیعت کے اظہار اور عمرِ عزیز کے خوشگوار لمحوں کو گذارنے کے لیے شاعری کرتے رہے۔ حاتم کا کلام دراصل اپنے زمانہ کا ایک شفاف آئینہ ہے۔ جس میں ہر طرح کی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ فن اور سماج کا اتنا شدید احساس رکھنے کے باوجود وہ اپنی زندگی کے کوائف قلم بند نہ کر سکے۔ غالباً یہ ان کی بے نیازی اور قلندری کا نتیجہ ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر کہیں کہیں اشارے ضرور ملتے ہیں۔ تذکروں میں بھی زیادہ معلومات موجود نہیں ہیں۔

شیخ ظہور الدین حاتم شاہ مبارک آبرو، یک رنگ، ناجی وغیرہ کے معاصر ہیں۔ ان کا کلام اس دور کے سوز و ساز کا ترجمان ہے۔ ادب و زبان کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی وجہ سے انھوں نے اپنے کلام پر نظرِ ثانی کی اور ۱۱۶۹ھ میں دیوان زادہ مرتب کیا۔ جس کے متعدد نسخے لاہور، لندن، لکھنؤ، رام پور، علی گڑھ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ دیوان زادہ میں قدیم دیوان کا ایک مناسب حصہ شامل ہے مگر اصلاحات و اضافوں کے ساتھ۔ قدیم دیوان کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو دیوان زادہ میں شامل نہیں ہے، بلکہ اسے حذف کر دیا گیا ہے۔

میں یہاں ایک طویل مسدس پیش کر رہا ہوں جو دیوان زادہ کے نسخوں میں موجود نہیں ہے۔ بلکہ قدیم دیوان کا ایک حصہ ہے۔ بستاسی اشعار پر مشتمل

یہ طویل مسدس ایک انتخاب سے ماخوذ ہے۔ جس کا خطی نسخہ میری تحویل میں ہے اور دیوان زادہ کی ترتیب نو سے تقریباً دس پندرہ سال پیشتر لکھا گیا ہے۔ اس کی حیثیت ادبی بھی ہے اور تاریخی بھی۔ اسی لیے زبان کی، املا کی صورت کو من وعن برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آپ کی یاد کر خدا کی قسم   جان و دل شاد کر خدا کی قسم
غم کوں آزاد کر خدا کی قسم   عشق پر صاد کر خدا کی قسم
پیر و استاد کر خدا کی قسم
سب کوں ارشاد کر خدا کی قسم

بادشاہِ جہاں خدا کوں جان   جن نے پیدا کیا زمین و زمان
اس کی قدرت کو دیکھ کر پہچان   کہ وہی ہے تیری پناہ و امان
اس سیتی یار ہو خدا کی قسم
سب سوں بیزار ہو خدا کی قسم

تخت و تاجِ جہاں کا ہے وارث   ملک و مالِ جہاں کا ہے وارث
عاجز و بیکساں کا ہے وارث   سب مکاں، سب کی جاں کا ہے وارث
سب کا رکھوال ہے خدا کی قسم
دم بدم نال ہے خدا کی قسم

ثابت ہو گر تو اوس کی راہ میں آ   کہ ترا ثابتی میں ہے گا بھلا
ثابتوں کے نہیں ہے خوف ورجا   وہ سدا ایک سیں لگے ہے سدا
ثابت ہے توں اگر خدا کی قسم
تو دوئی دور کر خدا کی قسم

جیو سوں اس سیں سدا ہے پیار مجھے   رات دن اس سے ہے گا پیار مجھے
شوق ہے اس کا آشکار مجھے   کیوں کہ اس بن ہووے قرار مجھے
طالبِ وصل ہوں خدا کی قسم
عاشق اصل ہوں خدا کی قسم

حمد اوس کی کا کچھ نہیں ہے شمار   یہو مرا سب ہنر کا ہے کرتار
غافلا چشم کھول ہو بیدار   دیکھ ارض و سما کا ہے معمار
کہیں ہے گلستاں خدا کی قسم
کہیں ہے باغباں خدا کی قسم

خالق خلق صانع مطلق   رازق رزق ہادیٔ برحق
چھوڑ کر علم حکمت و منطق   میں پڑھتا ہوں عاشقی کا سبق
مرد ہوشیار ہوں خدا کی قسم
پر طلب گار ہوں خدا کی قسم

دل ہے تج دید کا سدا مشتاق   رات دن ہے انیس درد و فراق
زالِ دنیا کوں میں دیا ہے طلاق   سب کیا دور دل سیں بغض و نفاق

دل کوں کر کے صفا خدا کی قسم
ایک سو ہو گیا خدا کی قسم

ذات تیری کا آشنا ہے دل   ہر ادا پر ترے گدا ہے دل
میرا ہر آن رہنما ہے دل   بلکہ یہ خانۂ خدا ہے دل
اس کوں تو مت بسر خدا کی قسم
کہ ترا ہے وہ گھر خدا کی قسم

رد کیا دل سیں میں سماحت کوں   جا بلا ڈھونڈھ کر قناعت کوں
سر نوایا ہے تیری طاعت کوں   چاہتا ہوں تیری عنایت کوں
بجز خاطر جمع خدا کی قسم
اور نہیں کچھ طمع خدا کی قسم

از در و زر سیں ہوں بہت بیزار   احمدی دین میں کیا ہے قرار
دل کے گل زار میں ہوئی ہے بہار   فرقِ عار میں پلے دم بدم ہے زار
صاحب تاج ہوں خدا کی قسم
گرچہ محتاج ہوں خدا کی قسم

سرور اولیا محمدؐ ہے   مقصدِ انبیا محمدؐ ہے
وہ بر و رہ نما محمدؐ ہے   شاہِ روز جزا محمدؐ ہے
اس پہ ہوں گا فدا خدا کی قسم
دل سوں ہوں مبتلا خدا کی قسم

شاد رہتا ہوں عشق میں ہر دم   کچھ نہ رکھتا ہوں فکر شادی و غم
عشق کے بحر میں مثال قلم   چلا جاتا ہوں میں قدم بہ قدم
کہ ملوں یار سیں خدا کی قسم
اپنے دلدار سیں خدا کی قسم

صاحب ذوالفقار ہے حیدر   شاہ دُلدُل سوار ہے حیدر
مظہرِ آشکار ہے حیدر   پنج مشکل کے یار ہے حیدر
وو مرا جان ہے خدا کی قسم
سب کا ایمان ہے خدا کی قسم

ظلِ حضرت حسین ہے مجھ اوپر   خوف محشر سوں میں ہوا ہوں نڈر
خاک اوس پاؤں کی ہے کحل بصر   جگ میں سردار ہے حسن سرور
سب کے ہیں مقتدا خدا کی قسم
بادشاہ رہ نما خدا کی قسم

غافلا کیوں ہے بے خبر کیوں غافل   کر تو اپنے سفر کا ساہ سجل
جب تلک ہیں کے نام کا تحصیل   ورنہ اوس وقت ہوگی تجھ مشکل
باش تو حیدری خدا کی قسم
شاخ دل ہے ہری خدا کی قسم

فاخرِ دل مرا اڑا ہے باز   شہ کی اولاد سیں کیا ہے ساز
عرض کرتا ہوں اپنا راز و نیاز   کچھ نہیں جانتا نشیب و فراز

باغِ حیدر میں ہوں خدا کی قسم
عیش کے گھر میں ہوں خدا کی قسم

عشقِ حضرت حسین میں ہوں مست — کیوں نہ ہوں مست میں ہوں بادہ پرست
ہے ازل سیں میری یہی بربست — بادۂ عشق کوں لیا ہوں بدست

عشق میں ہوں گرم خدا کی قسم
رکھ لے میری شرم خدا کی قسم

غالب ہے دل میں حبِ زین عباد — رات دن اس میں ہے یہی فریاد
کہ میری دے جہاں میں داد و مراد — قیدِ غم سوں کرے مجھے آزاد

کہ وو ہے جا بہ جا خدا کی قسم
نور حاجت روا خدا کی قسم

فیض باقر ہے جگ منے مشہور — اس سخن بیچ کچھ نہیں قصور
عشق اوس کے میں دل ہوا معمور — اس سیں کرتا ہوں عرض سب کے حضور

کر نگاہِ عطا خدا کی قسم
بخش میری خطا خدا کی قسم

قدر جعفر کوں جان لے نادان — قایم اوس کے کرم سوں ہے گا جہان
دو ہے بے شک جہان کا سلطان — چاہتا ہوں ہمیشہ اس کی امان

مجھ کوں ہے گا یقیں خدا کی قسم
کہ وو ہے شاہِ دیں خدا کی قسم

گل باغِ علی کا ہے کاظم — ملکِ شرعِ نبی کا ہے ناظم
سب بزرگی کے بیچ ہے اعظم — نام اس کا ہے دافعِ ہر غم

ورد وہ نام ہے خدا کی قسم
جس سیں سب کام ہے خدا کی قسم

لطف کر مجھ پہ یا علیؑ رضا — توں ہے کان و بحرِ عطا
تجھ کنے ملتجی ہے شاہ و گدا — کہ تجھ میں ہے سب جہاں کا کام روا

مرتضیٰ کے جگر خدا کی قسم
مہر سوں کر نظر خدا کی قسم

متقی ہے نقی امام و ولی — جگ میں کہتا ہوں میں خفی و جلی
وہ صدا ہے ہمیشہ مجھ کوں بھلی — جس سیں ہووے کشادہ دل کی کلی

خوش ہوا یہ چمن خدا کی قسم
جس کوں کہتے ہیں تن خدا کی قسم

نام پاک نقی کا ہے روشن — جس سے روشن ہوا زمین و زمن
اس کی تعریف میں نہیں ہے سخن — جن نے مجھ کوں دیا ہے غم سوں امن

اس کا ہوں آشنا خدا کی قسم
دل سوں ہو خاکِ پا خدا کی قسم

واقف اسرارِ حق کا ہے عسکر — کفر کوں جنے کیا ہے زیر و زبر
خال اس پاک ہے نقش جگر — مر گیا جل کے خارجی اب تر

سن تو میری صدا خدا کی قسم
کلہم مدعا خدا کی قسم

ہے گا مہدی امامِ خیر و شر — امتِ مصطفیٰ کا ہے رہ بر
مجھ کوں ہرگز نہیں ہے خوف و خطر — مجھ اوپر کی اونو نے نیک نظر

پیرِ مطلق ہے وہ خدا کی قسم
شاہِ برحق ہے وہ خدا کی قسم

لافتا صدق سوں ہمیشہ پڑھو — ورد نامِ علی کا دھیان دھرو
پیروی دینِ احمدی کی کرو — شوق اوس کے میں دل کا جام بھرو

وہ ہے حق کا ولی خدا کی قسم
نام اوس کا علی خدا کی قسم

یا الٰہی مجھے توں دے توفیق — کہ کروں راہِ حیدری تحقیق
خوب ہے جگ کے بیچ اوس کا طریق — حاتم اس سا نہیں ہے کوئی شفیق

دھیان میں بوجھ لے خدا کی قسم
گیان میں سوجھ لے خدا کی قسم

بقیہ ٹوٹا ہوا آدمی

گئیں چہرہ سرخ ہوگیا۔ بڈھے صاحب کا ہاتھ انسپکٹر جنرل نے تھام لیا۔ وہ لگاتار کدالیں چلاتا رہا اور لکیریں گہری ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ کدال کسی چیز سے ٹکرا کر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ یہ اسے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا سر کیوں چکرا رہا ہے۔ دل کیوں تیز تیز دھڑک رہا ہے۔ ٹانگوں کی طاقت کیوں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ ہاں شاید بلڈ پریشر پھر بڑھ گیا ہے۔ وہ بلڈ پریشر جو سرکاری ڈاکٹر ہر ہفتہ آکر چیک کرتا تھا کس مپرسی کی حالت میں تھا۔ اب جبکہ اس کی ضرورت تھی کہ اسے کنٹرول کیا جائے وہ خود ہی بڑھ جاتا اور خود ہی گھٹ جاتا ——— پھر اسے اس چیز کا خیال آیا جس سے ٹکرا کر اس کی کدال چھوٹی تھی۔ دو فٹ گہرے گڑھے سے مٹی ہٹا ہٹا کر اس نے پیتل کا ایک چوکور ٹکرا باہر نکالا جس کا سارا حسن اڑ دہے چاٹ چکے تھے اور جس پر الو کے پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ "مہیش چندر سکسینہ۔ آئی۔جی۔ پولیس"۔ اس کے ماتھے پر لگے کدال کے زخم کو اس نے اپنے کرتے کے دامن سے صاف کرنا چاہا لیکن گھاؤ بہت گہرا تھا اور بڑھاپے کے گھاؤ بھرا نہیں کرتے۔ اس نے پربھا کانت سے کہا تھا "بہو۔ اگر تم مناسب سمجھو تو اس تختی کو بھی دروازے پر لگا دو۔ اب میں یہاں آگیا ہوں تو لوگوں کو پتہ تو چل جائے" پربھا کانت نے اپنی چھوٹی سی ناک اتنا سکیڑا تھا کہ ہیرے کی لونگ اس کی سلوٹوں میں کھو گئی تھی۔ "اب آپ کی حیثیت ہی کیا ہے۔ آپ سے ملنے اب کون آئے گا"

مہیش چند کو محسوس ہوا کہ اس کے سارے جوڑ کھل گئے ہیں اور وہ بکھرا ہی چاہتا ہے۔ اس نے گھبرا کر QUICK FIX کی ٹیوب پر ہاتھ ڈالا لیکن ٹیوب خالی ہو چکی تھی۔ اس کے وجود کے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر گرنے لگے۔ اور وہ بے بسی سے کھڑا دیکھتا رہا۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے کے ساتھ وہ فضاؤں میں اس طرح بکھر گیا کہ پھر جڑنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔

سبط محمد نقوی
اکبر پور۔ فیض آباد (یوپی)

میر ضمیر اور مرزا دبیر کے دو معراج نامے

معراج نبوی کے حال میں مرزا دبیر مرحوم کی مثنوی ممتاز نامہ سے عہد حاضر کو روشناس کرانے کا سہرا ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی مرحوم کے سر ہے۔ اس مثنوی کا مخطوطہ مرحوم نے ناظمیہ عربی کالج لکھنؤ کے مکتبے میں دیکھا اور ایک بسیط العارفی مضمون کاروانِ حیات بمبئی کے مولا علی نمبر میں لکھ کے اس کی نشان دہی کی۔

ڈاکٹر فاروقی اگرچہ "مرثیہ کی طرز ضمیر" کی مقبولیت کا باعث مرزا صاحب کو قرار دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں: "لیکن مرزا صاحب محض مرثیہ گو نہیں تھے۔ انھوں نے دوسرے اصناف ادب میں بھی کافی بڑا اور قابل قدر ذخیرہ چھوڑا ہے" اس سے مترشح ہوتا ہے کہ میر ضمیر کی مثنوی ریحان معراج ڈاکٹر فاروقی کی نظر سے نہیں گزری۔ اپنے تحقیقی مقالہ میں، جو دبستان دبیر کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے وہ میر ضمیر کی مثنوی منظر العجائب کا ذکر فرماتے ہیں۔ نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کی فرمائش چہاردہ بند کا ذکر کرتے ہیں لیکن ریحان معراج کا نام نہیں لیتے اگرچہ ممتاز نامہ اور ریحان معراج میں نہ صرف اس لئے کہ ایک ہی موضوع پر استاد و شاگرد کی تخلیق ہیں بلکہ اس لئے بھی بڑا قریبی تعلق ہے کہ یہ ایک عہد میں ہی ایک ہی دربار کی فرمائش سے منصۂ وجود پر جلوہ آرا ہوئیں۔ اگرچہ مرزا صاحب مرحوم نے ممتاز نامہ کے وقت تصنیف کو تعیین کے ساتھ نہیں بتایا ہے یا ڈاکٹر صاحب سرسری مطالعہ کے باعث اسے نوٹ نہیں کر سکے ہیں پھر بھی یہ تو معلوم ہی ہے کہ ممتاز نامہ عہد نصیر الدین حیدر شاہ (۳۷-۱۲۴۷ھ) میں ان کی ملکہ ممتاز الدہر ملکہ زمانی کی فرمائش پر لکھی گئی اور ممتاز الدہر کی رعایت سے ان کے نام سے منسوب ہو کے ممتاز نامہ نام پایا۔ مرزا دبیر وجہ تصنیف میں نظم کرتے ہیں ؎

بفرمودۂ بیگم خوش خصال — کہا تو نے معراجِ مولا کا حال
ہے ملکہ زمانیہ ممتازِ دہر — یہ نامِ مبارک ہے مشہورِ شہر
یہی ہے زمانہ میں اس کا نشاں — اسی نام سے چن لے نامِ کتاب

میر ضمیر نے منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کی معرفت بادشاہ کے ارشاد پر مثنوی نظم کی۔ مگر اس کا نام ریحان معراج رکھا البتہ فیضان شاہ' سے سال تصنیف (۱۲۴۷ھ) مستخرج کیا۔ میر ضمیر بھی 'باعث تالیف کتاب' بتاتے ہیں ؎

یہ ہے حکم شاہنشہِ نیک نام — کہ معراج نامہ رقم کر تمام
سنا جب کہ حکمِ شہِ تاجدار — ہوا گھر میں آتے ہی مشغولِ کار

یہ وہ زمانہ ہے جب کہ منتظم الدولہ کی کشاکش صاحبات محل سے بہت تیزی پر ہے اور صاحبات محل میں ملکہ زمانی پیش پیش ہیں۔ اس کا انجام تھوڑے ہی دنوں میں وزیر کی سبکدوشی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مصنفِ سوانحات سلاطین اودھ کا بیان ہے۔

"نواب ملکہ زمانیہ سے سب سے زیادہ ناموافقت ہوئی۔۔۔ اس جہت سے سب کے سب در پے تخریب ہوئے کس واسطے کہ ہر ایک کی جاگیر بادشاہ کو سمجھا کے ضبط کی تھی پس جب ایسے امور نسبت صاحبات محلات سرزد ہوئے نواب گورنر جنرل کو بھی استعجاب ہوا۔" ج ا ص ۳۱۷

ظاہر ہے کہ شجاع الدولہ بہادر کے بکسر میں ہزیمت پا جانے کے بعد اودھ میں کوئی وزیر نواب گورنر جنرل کے استعجاب کے بعد کہاں ٹھہر سکتا تھا آخر ۱۲۴۸ھ کی چوتھی جمادی الثانی کو روشن الدولہ کو خلعت وزارت سے سرفرازی ہوئی اور منتظم الدولہ حکیم مہدی علی اس سے قبل ہی الگ ہو گئے تھے؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ میر ضمیر کی مثنوی حکیم مہدی کے آخر دور کی ہے۔

بدنصیبی سے یہ زمانہ ایسا تھا کہ استاد و شاگرد کے تعلقات بھی بہت خراب ہو گئے تھے۔ اس کی مختصر روداد مرزا صاحب مرحوم کے سرگزشت نگار افضل حسین ثابت لکھنوی کی زبان قلم سے ملاحظہ فرمائیے:۔

"افتخار الدولہ مرحوم نے،... جن کے یہاں شبوں کی مجلس میں اول مرزا دبیر بعد میر ضمیر صاحب پڑھا کرتے تھے دونوں صاحبوں سے انیسویں (رمضان) کو اصرار بلیغ کیا کہ اکیسویں کو آپ دونوں صاحب نیا مرثیہ کہہ کر پڑھیں.... مرزا صاحب کی مشق سخن ان کے شباب کی طرح زوروں پر تھی۔ رات بھر میں ایک نیا مرثیہ کہا جس کا مطلع روشن و مشہور یہ ہے۔

؎ "ذرہ ہے آفتاب درِ بوتراب کا"

بیسویں کو حسب معمول علی الصباح میر ضمیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا "حضور نے کچھ فکر فرمائی؟" فرمایا "مجھ کو اتنی فرصت کہاں! ایک مرثیہ پہلے کا کہا ہوا ہے اسی میں مطلع اور چند بند کہہ کر لگا دیے ہیں" مرزا صاحب نے اپنا نیا مرثیہ پیش کیا.... دیکھ کر بہت خوش ہوئے.... مرزا صاحب نے عرض کی.... "اسے آپ پڑھیں میں کچھ عذر کر دوں گا" میر ضمیر صاحب نے انکار کیا۔ میر عابد علی صاحب بشیر بولے "میں مرزا صاحب کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں بے شک یہ بات نامناسب ہے کہ شاگرد نیا مرثیہ پڑھے اور استاد پرانا" میر ضمیر صاحب بولے "ایسی باتیں میرے ذہن میں نہیں ہیں۔ خیر تم کہتے ہو تو یونہی سہی" پھر ایک مرتبہ مرثیہ دیکھ کر کہا "اچھا اور یہ کا ٹکڑا جس میں فضائل ہیں تم پڑھو... اخیر کا حصہ جس میں مصائب ہیں میں پڑھوں گا"... جہاں تک استاد نے حکم دیا تھا وہ ورق پھاڑ لئے باقی مرثیہ وہیں چھوڑ دیا... منبر پر گئے حسب معمول دیر تک ناتحہ پڑھتے

رہے۔ ادھر میر عابد علی بشیر نے میر ضمیر صاحب سے سرگوشی کی اور کہا کہ "اول ساختہ بہت چست اخیر کا سست ہے میں مرزا صاحب کو منع کئے دیتا ہوں کہ یہ مرثیہ نہ پڑھیں اور کوئی مرثیہ پڑھ دیں۔" میر صاحب نے فرمایا "اب یہ مناسب نہیں" مگر یہ کب مانتے تھے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی آنکھ کے اشارہ کر چکے تھے کہ ذرا ٹھہرے ... میر بشیر نے قریب منبر پہونچ کر مرزا صاحب کے کانوں کے قریب اپنے ہونٹ لے جاکر آہستہ آہستہ کہا "استاد فرماتے ہیں تم کوئی اور مرثیہ پڑھ دو۔" مرزا صاحب نے کہا "میں اور کوئی مرثیہ نہیں لایا۔ بایں ہمہ اگر استاد کی یہی مرضی ہے تو وہ خود مجھے آنکھ سے اشارہ فرما دیں تمھارے کہنے کا مجھے اعتبار نہیں۔" انھوں نے میر ضمیر صاحب کے کان میں کہا "سلامت علی کہتے ہیں" آج ہی تو مجھ کو استاد کا امتحان منظور ہے دیکھوں میرے بعد وہ کیا کرتے ہیں؟" میر ضمیر صاحب یہ سن کر آگ بگولا ہو گئے۔ ادھر مرزا صاحب ناکردہ گناہ بار بار استاد کا منہ دیکھتے ہیں۔ وہاں اشارہ کیسا برافروختگی کے سبب سے سرزانو پر ہے۔ ناچار مرزا صاحب نے کچھ دیر کے بعد چند رباعیاں پڑھ کر وہی نیا مرثیہ شروع کیا جہاں تک استاد کا حکم تھا پڑھا ... منبر سے اترے میر ضمیر صاحب تشریف لے گئے۔ فاتحہ پڑھ کر یہ فرما کر کہ یہ مرثیہ انہیں کا ہے کسی پرانے مرثیے کے چند بند اور کچھ نثر کے فقرے پڑھے اور منبر سے اتر آئے۔ مجلس کے بعد دو خلعت آئے۔ میر ضمیر کا غصہ اس وقت تک نہ اترا تھا اپنے خلعت پر ٹھوکر مار کر فرمایا اٹھا لے جاؤ اور اٹھ کھڑے ہوئے ادھر مرزا صاحب نے یہ کہہ کر کہ جو استاد کے فائدے پر اپنے فائدے کو مقدم رکھے وہ ملعون ہے اپنا خلعت بھی پھیر دیا۔" (حیات دبیر ج ۱ ص ۳۲-۳۴)

اس صورت حال نے بڑی طوالت اختیار کی۔ استاد کے یہاں کی حاضری بھی بند کرنی پڑی، بیس سال یا کچھ زیادہ کے بعد اس وقت کے وزیر اودھ حضور عالم سید علی نقی کی مجلس میں صفائی کا موقع آیا۔ گو مذکورۂ بالا اقتباس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ یہ ناگوار واقعہ کب پیش آیا لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناگوار واقعہ افتخار الدولہ مہاراجہ میوا رام کے یہاں کی مجلس میں پیش آیا اور یہ معلوم ہے کہ مہاراجہ مرحوم کو منتظم الدولہ نے آتے آتے معطل کر کے خانہ نشین کر دیا تھا اور وہ ۱۸۴۷ء میں برسر منصب آ گئے تھے اس لئے قیاس کا قرینہ کہتا ہے کہ خانہ نشینی کی حالت میں اتنے اہتمام سے مجلسیں کرنا شاید مہاراجہ کے لئے ممکن نہ رہ گیا ہو اور اگر ممکن بھی ہو تو مصلحت یقیناً نہ رہی ہوگی اس لئے یہ سمجھنا چاہئے کہ مرزا صاحب کی یہ تصنیف بھی استاد سے ناچاقی کے دور کی ہے اور انھیں ملکہ زمانی کی مہربانی سے جو فائدے دربار اور محل سے ہوتے تھے ان کی طرف ضمیر صاحب کے یہ مدحیہ شعر صاف اشارہ کرتے ہیں خاص طور سے وہ شعر جس میں میر ضمیر اپنی سیادت پر زور دیتے ہیں۔ ملکہ زمانیہ کے ساتھ وزارت پناہ کی پرخاش کو دیکھتے ہوئے یہ بہت ممکن ہے کہ ان کے مقربہ مرزا دبیر کا زور توڑنے کے لئے میر ضمیر مرحوم کو مثنوی کہنے پر آمادہ کیا گیا ہو۔ مثنوی جس سرعت سے نظم کی گئی ہے وہ بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے۔ بہرکیف آپ یہ ابیات ملاحظہ فرمائیں ؎

سخن اس طرح کا کہیں ہے سنا ... کہ شاعر کو بیش از سخن دے صلا
شب و روز ہے اس دعا میں ضمیر ... سلامت رہیں بس یہ شاہ و وزیر
میں ہوں مرثیہ گوئے سبطِ رسول ... ادھر بھی اٹھا اک نگاہِ قبول
یہ معراج نامہ جو لایا ہوں میں ... نبی کے وسیلے سے آیا ہوں میں
یہ میرا وسیلہ نہ رد کیجیو ... میں سید ہوں میری مدد کیجیو

اسی کے ساتھ وجہ تصنیف میں مرزا صاحب جس عاجزی اور فروتنی سے کام لے رہے ہیں اسی پر قناعت نہیں فرماتے صاف "بندگی بے چارگی" کا اظہار کرتے ہیں ؎

بفرمودۂ بیگمِ نام دار ... کہ جس سے زمین و فلک کا وقار
دیا اس نے حکمِ اطاعت شیم ... کہ معراج کا حال کر تو رقم
اک ادنیٰ دعا گو ہے اس کا دبیر ... نحیف و غریب و ذلیل و حقیر
بجا لایا فی الفور ارشادِ خاص ... اطاعت ہے سب نوکروں کا خواص

پھر کبھی یہ اشارہ کرتے ہیں کہ اگر موضوع معراج کا نہ ہوتا تو وہ تامل کرتے ؎

تامل میں کرتا تو یہ کیا مجال ... کہ معراجِ ختمِ رسل کا تھا حال
ثواب اس کی تصنیف میں تھا ... اُسے بھی ثواب اور مجھے بھی ثواب

بادشاہ کی مدح اور وزیر کی ستائش کے بعد حمد و نعت، مدح ائمہ علیہم السلام اور ساقی نامہ ہے۔ مجھے استاد و شاگرد کا موازنہ مقصود نہیں اس لئے تبصرے کی ضرورت نہیں بس مختلف مقامات کی چند ابیات نذر ناظرین ہیں پہلے میر ضمیر کے اور بعد میں مرزا دبیر کے یہاں سے کیونکہ راقم کی ناقص رائے میں، جیسا کہ عرض بھی کیا گیا ترتیب تصنیف اسی طرح ہے۔

حمد باری

میر ضمیر

کروں حمدِ پروردگارِ قدیر ... کریم و رحیم و سمیع و بصیر
وہی خالقِ ظلمت و نور ہے ... دلوں سے قریں چشم سے دور ہے
یہ قمری اسی کی ہے تسبیح خواں ... شہادت کی انگشت سروِ رواں

مرزا دبیر

لکھوں پہلے وصفِ جہاں آفریں ... ہے جس کا لقب ارحم الراحمیں
طلسماتِ قدرت ہویدا کئے ... کہا کُن تو کونین پیدا کئے
ہمیں معرفتِ حق کی ہو کیا حصول ... کہے ماعرفناک جس کو رسول

نعت

میر ضمیر

اسی نے ہے بھیجا بلطفِ عمیم ... ہدایت کی خاطر رسولِ کریم
امینِ خدا ہادیِ جزو و کل ... نبی قریشی و ختمِ رسل
شرف سب اسی نورِ احمد کا تھا ... مَلک نے جو آدم کو سجدہ کیا

مرزا دبیر

جنابِ محمد شفیعِ انام　　علیہ الصلوٰۃ و علیہ السلام
خدا کی طرح سے ہے یہ بھی رحیم　　خدا بھی کریم اور نبی بھی کریم
کہاں جنبشِ تیغ کا یہ اثر　　ہوا اُس کی انگلی سے ٹکڑے قمر

منقبت امیر المومنین علیہ السلام

میر ضمیر

ولی خدا شاہِ دُلدُل سوار　　امیرِ عرب صاحبِ ذوالفقار
سخاوت شجاعت میں اتنا بے دریغ　　بیکدست بخشش بیکدست تیغ
اسی کی ستائش میں نازل ہوا　　کہیں لافتیٰ اور کہیں ہل اتیٰ

مرزا دبیر

علی ولی شیر پروردگار　　وصیٔ نبی مالکِ ذوالفقار
نہ بندہ کوئی خلق ایسا ہوا　　کہ اللہ کے گھر میں پیدا ہوا
جسے کہتے ہیں سب خدا کا علی　　علی ہے علی ہے علی ہے علی

اب آپ اصل مثنوی کا آغاز اور اس کا ساقی نامہ نامور استاد اور باکمال شاگرد کے افکار میں دیکھیں۔

ریحان معراج

وہ ساغر پلا ساقی ہوشمند　　کہ بامِ فلک پر لگاؤں کمند
بلندی مری طبع کو آج ہو　　کہ موزوں جو سب حالِ معراج ہو
جو مضموں کرے سرکشی کو پسند　　کروں بندشِ شعر میں پائے بند
رہے ہاں مجھے وہ نشہ جب تلک　　تو لے آئے جنت سے رضواں گزک
نشے کا ادھر چشم میں ہو طلوع　　ادھر کو ہو تصنیفِ تازہ شروع
بنامِ خدا و بنامِ نبی　　بنامِ بتول و بنامِ علی

ممتاز نامہ

بیا ساقیٔ عرش مسکن بیا　　بیا ساقیٔ پاک دامن بیا
گنہ کی نجاست سے ہوں تلخ کام　　شرابًا طہورا کے دے بھر کے جام
پلا وہ شرابِ ترقی اثر　　کہ بے زینہ چڑھ جاؤں میں عرش پر
تو ظرفِ گلی میں نہ لانا شراب　　ہو خورشید کے جام میں آفتاب
دکھا عرش کی سیر اے خوش خصال　　خدا و نبی کا میں دیکھوں گا حال

ڈاکٹر فاروقی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کی زیرِ نظر مثنوی ۷۷ ابیات پر مشتمل ہے۔ میر ضمیر کی مثنوی میں ایک صفحہ پر ۲۴ ابیات ہیں۔ جس صفحے پر نثری عنوانات آگئے ہیں وہاں ابیات کی تعداد کم ہو گئی ہے اگر ۲۵ بیت فی صفحہ کا اوسط مان لیا جائے تو ابیات کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زاید ہوتی ہے۔ اس مثنوی کو مرزا علی خلف حاجی حسن علی نے مرتب کر کے مطبع محمدی وزیر گنج لکھنؤ میں چھپوا کر باہتمام قاسم علی خاں ۱۲۸۱ھ میں شائع کیا۔ مگر سرورق، پس ورق، خاتمہ کہیں پر بھی میر ضمیر مرحوم کا نام نہیں آیا ہے۔ جب تک متن کتاب پر نظر نہ ڈالی جائے یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ یہ مثنوی میر ضمیر کے زورِ فکر کا نتیجہ ہے۔

مرزا دبیر کے لئے شہرت ہے کہ وہ مدح امرا و اغنیا سے محفوظ رہے۔ اس مثنوی کی دریافت نے اس رجحان کو گزند پہونچائی۔ مرحوم فاروقی صاحب صفائی میں رقم طراز ہیں:

"... ان کے سوانح نگاروں نے بالاتفاق یہ لکھا ہے کہ انھوں (مرزا دبیر مرحوم) نے کبھی محمد و آلِ محمد علیہم السلام کے علاوہ کسی دوسرے کی تعریف نہیں کی۔ لیکن اس مثنوی میں انھیں کے قلم سے نصیر الدین حیدر کے ثنا و صفت موجود ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس بادشاہ نے عزاداری کو جو مرزا صاحب کو جان سے زیادہ عزیز تھی فروغ دیا اور شاید یہ وجہ ہو کہ ابھی تک مرزا صاحب ایک مرثیہ گو کی حیثیت سے نہیں ابھرے تھے اور اپنی منزل کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ جس وقت سے انھوں نے باقاعدہ مرثیہ گو کی حیثیت اختیار کر لی اس وقت سے عام انسانوں کی مدح ترک کر دی۔ واللہ اعلم"

یہ تمام ملاحظات محلِ نظر ہیں۔ مرزا صاحب نے عام انسانوں کی مدح کی ہے۔ دفترِ ماتم جلد اول کے پہلے مرثیے میں جس کا مطلع ہے:

"طغرا نویسِ کن فیکوں ذوالجلال ہے"

امجد علی شاہ مرحوم کی مدح موجود ہے۔ اس میں مرزا علی، ولی علی عصر کا زمن کی زبانی امام عصرؑ کی طرف سے جناب سلطان العلما سید حسین اور مدرسہ سلطانیہ کی مقبولیت کی بشارت کا واقعہ نظم کیا ہے۔ غالباً یہی مرزا علی ہیں جنہوں نے "ریحان معراج" کی ترتیب و اشاعت کی۔ مرزا دبیر عہد نصیر الدین حیدر شاہ مرحوم میں مرثیہ گو کی طرح سے اپنی جگہ بنا چکے تھے۔ رجب علی بیگ سرور کی "فسانۂ عجائب" اسی دور کے آغاز کی تخلیق ہے۔ اس میں مرثیہ گو شعرا کے ساتھ دبیر کا نام آیا ہے۔ خود ڈاکٹر فاروقی معترف ہیں:

فسانۂ عجائب کی یہ بات مشہور ہے کہ "مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر، صاف باطن نیک ضمیر، خلیق، فصیح، مردِ مسکیں بصورت گدا، بطالع سکندر، مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا، ناظم خوب ادبیر مرغوب بارِ احسان اہل دول کا نہ اٹھایا"　　دبستان دبیر ص۱۴۱

اتنا ہی نہیں ڈاکٹر صاحب بڑی وضاحت سے فرماتے ہیں:

"نصیر الدین حیدر کا زمانہ آیا تو مرزا صاحب شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کے چمک رہے تھے۔ شاہزادے اور شاہزادیاں بھی ان کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو چکے تھے۔ ملکہ زمانیہ ان کی قدردان خاص تھیں"

دبستان دبیر ص۱۴۲

ان اعترافات پر مستزاد خود مرزا دبیر وجہِ تصنیفِ مثنوی میں فرماتے ہیں؎

؎ یہ درس گاہ جامعہ سلطانیہ اور مدرسۃ سلطان المدارس کے ناموں سے اب بھی لکھنؤ میں قائم ہے اور شاہی وقف حسین آباد ان کا کفیل ہے۔



نہ تھا مرثیے سے مجھے انفراغ　　جو ہو طبع کو شوقِ گلگشتِ باغ

ان شواہد کے پیشِ نظر یہ دعویٰ قابلِ پذیرائی نہیں ہے کہ مرزا صاحب نے کبھی عام انسانوں کی مدح ترک کر دی تھی بات دراصل یہی ہے کہ ضمیر ہوں یا دبیر و انیس یہ بادشاہ کے سیرت نگار یا سلطنت کے مورخ نہ تھے۔ مرثیہ گو تھے۔ امام حسینؑ پر رونے اور رلانے کو سرمایۂ دنیا و آخرت سمجھتے تھے۔ غمِ حسینؑ سے جو جس قدر متاثر ہوتا ان حضرات کو اتنا ہی محبوب ہوتا اور اسی اعتبار سے لائقِ مدح و ستائش۔ پھر شخصی حکومت کا درباری ماحول، اس میں مدح گوئی و ستائش گری سے بچنے کے لئے میر و آتش کی شوریدہ سری و آشفتہ مزاجی کی ضرورت تھی وہ ان حضرات کو میسر نہیں آئی اس لئے اس پہلو پر بہت زور دینا حقائق سے نظریں چرانا ہے۔ میر انیس کا واجد علی شاہ مرحوم کی مجلس میں یہ مطلع

غنیِ مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر　　مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر

یا مرزا صاحب کا یہ رباعی پڑھنا

ناداں کہوں دل کو کہ خردمند کہوں　　یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں

اک روز خدا کو منہ دکھانا ہے دبیر　　بندہ کو میں کس منہ سے خداوند کہوں

یہ وقتی و لمحاتی تاثرات تھے۔ میر انیس کے کلام میں اگر ہم ایسے عناصر کم پاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اودھ سے بمشکل تیرہ چودہ سال پہلے لکھنؤ آئے تھے بادشاہ و ملکہ یا وزیر کا کیا سوال ہے نوابین و امرا تک میں رسائی نہیں تھی۔ حد یہ ہے کہ حضراتِ علما تک مرزا دبیر کے کلام پر فریفتہ تھے۔ جب میر صاحب کے کمالِ فن نے اپنا سکہ جمایا تو سلطنت کا سکہ کھوٹا ہو چکا تھا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کسی ماتم دار کی ستائش میں چاہے وہ شاہ ہو یا گدا ان حضرات کو عار نہ تھا۔

ڈاکٹر فاروقی کا قول ہے کہ "مرزا صاحب اردو کے سب سے بڑے مرثیہ گو تھے"۔ اس قول کو انیسیوں کی طاقت و جماعت نے کبھی استقرار نہ ہونے دیا۔ مولانا شبلی کے "موازنۂ انیس و دبیر" کے بعد تو اس میں اور کوئی دم نہیں رہ گیا۔ البتہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کا یہ ارشاد حقیقتِ جاوید کی حیثیت رکھتا ہے کہ "اگر ضمیر نہ ہوتے تو دبیر کا وجود ہوتا نہ انیس کا" (دکن میں مرثیہ و عزاداری بحوالہ شاہکار انیس نمبر)

کرامت علی کرامت
گورنمنٹ کالج۔ سندر گڑھ (اڑیسہ)

ایمرجنسی کیا ہے؟

شہابِ زیست کی تنویر ہے ایمرجنسی
جبینِ وقت کی تنویر ہے ایمرجنسی
سراپا امن کی تصویر ہے ایمرجنسی
ہمارے خواب کی تعبیر ہے ایمرجنسی
اک انقلابِ حسیں کی دعائیں مانگی تھیں
انھیں دعاؤں کی تاثیر ہے ایمرجنسی
جو اچھے لوگ تھے پابندیوں میں ہیں آزاد
بُروں کے پاؤں کی زنجیر ہے ایمرجنسی
قلم کیا ہے سروں کو غرور و نخوت کے
میانِ عدل کی شمشیر ہے ایمرجنسی
سراپا جہدِ مسلسل، سراپا طرزِ عمل
سراپا لمحۂ تدبیر ہے ایمرجنسی
غریب بھی ہے اگر شاد تو امیر بھی خوش
ہر ایک شخص کی جاگیر ہے ایمرجنسی
اسی سے ہم کو ملی نظم و ضبط کی تعلیم
کتابِ زیست کی تفسیر ہے ایمرجنسی
بہایا دخترِ نہرو نے اس کو تیشے سے
کہ تلخ گھونٹ نہیں شیر ہے ایمرجنسی

عشرت ظہیر
۳۶، سوراج پوری روڈ
گیا

صحت مند آدمی

کسی نامعلوم خوف اور بے چینی کی سرسراہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے اپنے پورے بدن میں لرزش محسوس کی اور اضطراری حرکت کیساتھ اس نے بڈ سوئچ آن کر دیا۔ کمرے میں زرد، مدھم اور اداس روشنی بکھر گئی ــــ اس کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ اُسے لگا، کہیں کوئی چھپا بیٹھا ہے۔ جو اسے بے چین اور خائف کئے دے رہا ہے ــــ اُس نے تکیہ اُٹھا کر دیکھا، بستر کے اوپر اور نیچے دیکھا، مسہری کے نیچے دیکھا، کہیں اُسے کوئی نہ ملا۔ تب خوف کے سائے کو اس نے اور بھی بڑھتے اور پھیلتے محسوس کیا، اُسے لگا یہ سائے اُسے گھیر لینا چاہتے ہیں ــــ بہت دیر تک وہ اُداس گم سم اور خائف سا چاروں طرف دیکھتا رہا، کہاں کیا چھپ گیا ہے؟ وہ کون ہے؟ وہ چاہتا کیا ہے؟ اور کیوں اس کے اندر اور باہر، پورے وجود کو بے رحمی سے کچلے دے رہا ہے۔

بہت ڈرا ڈرا سا اور سہما ہوا، وہ مسہری سے اُتر آیا، اُس نے کمرے کی زیادہ روشنی والا بلب جلایا، کمرے میں تیز روشنی کے بلب نے زرد، مدھم اور اداس روشنی والے چھوٹے سے بلب کے وجود کو اپنے آپ میں ضم کر لیا۔ تب اُسے خیال آیا، ہر روشن، چمک دمک والی اور طاقتور چیز، اپنے سے چھوٹی اور کمزور چیز کو کھا جایا کرتی ہے ــــ جیسے وہ ــــ اپنے ٹیبل پر آئے ہوئے ہر فائل کو اپنے وجود سے چپکا کر بے حقیقت کر دیتا ہے، اس حد تک جب تک کہ اس کی جیبیں پھول نہ جائیں جب اس کی ہوس کی بھٹی اس تیز اور روشن بلب کی طرح دہک اٹھتی ہے تو وہ اُس بے جان نیم مردہ فائل کو چھوڑ دیتا ہے، اس پر چند نوٹ لگا کر پرے کر دیتا ہے۔

فائل کی بات اس کے ذہن میں آتے ہی اُسے خیال آیا، جب وہ کسی فائل کو ڈیل کرنے کے لئے محرک طور پر کسی پارٹی سے کوئی مطالبہ کرتا ہے تو خوف اور بے کلی کی ایسی ہی لہر اس کے پورے وجود کو اندر سے باہر تک جھنجھوڑ ڈالتی ہے ــــ اُس دن جب وہ شرما جی سے دو سو روپے لے رہا تھا تو اس نے اپنے اندر کتنی ہلچل محسوس کی تھی! یہ بے نام سی خوف زدہ کر دینے والی لہر اس کے اندر کہاں سے در آئی؟

"تو کیا یہ لہر میری آنکھوں کی نیند بھی چھین لے جائے گی۔" اس نے سوچا اور اپنے دل کی رفتار میں غیر معمولی شدت محسوس کی۔

پھر اس نے تکیہ کے نیچے سے گھڑی نکال کر دیکھی، سوا دو بجے تھے۔ اس نے سوچا ابھی صبح ہونے میں بہت دیر ہے، کیا کروں، کس کو جگاؤں؟ لیکن کہوں گا کیا؟ پھر اُس نے اُٹھ کر لائٹ آف کی۔ اچانک زرد، مدھم اور اُداس روشنی کا جال سا کمرے میں پھیل گیا۔ اس نے زرد روشنی بھی گل کر دی اور بستر پر لیٹ گیا۔ آنکھوں کو بند کر لیا بہت دیر تک وہ آنکھیں موندے پڑا رہا۔ لیکن نیند؟ نیند تو خوف اور بے کلی کی لہروں میں کھو گئی تھی ــــ اس نے ایک کروٹ بدلی اور بائیں پہلو ہو کر سونے کی کوشش کرنے لگا ــــ اچانک درد سے وہ کراہ اُٹھا۔ اس نے اپنے گردن کی بائیں طرف ہاتھ رکھا، ابھرا ہوا گول سا گلینڈ، اس نے ٹٹول کر محسوس کیا۔ کئی ماہ سے یہ گلینڈ اس کے وجود سے عذاب کی صورت چپکا ہوا تھا۔ بائیں پہلو وہ سو نہیں سکتا، جبکہ بائیں پہلو سونے کا وہ عادی تھا۔ اور تکلیف دہ بات یہ تھی کہ یہ گلینڈ اس کے ذہن سے چپک گیا تھا ــــ "کتنا بدنما لگتا ہے یہ۔" وہ سوچتا اور کڑھتا رہتا۔

"دواؤں سے اگر تحلیل نہ ہوا تو آپریٹ کر کے نکال دوں گا۔" ڈاکٹر نے کہا تھا لیکن وہ آپریشن کے نام سے خائف تھا۔

"ڈاکٹر صاحب، میں آپریشن نہیں کراؤں گا، کسی طرح اسے ......"

"دیکھئے ...... میں کوشش کر رہا ہوں ...... پھر بھی اگر ضرورت ہوئی تو آپ کو آپریشن کرانا ہوگا، یہ اچھی چیز نہیں ...... یہ آپ کو کھوکھلا کر دے گی ...... ٹی بی گلینڈ ہے یہ۔"

اچانک اُسے سگریٹ کی خواہش ہوئی، اس نے اُٹھ کر ایک سگریٹ جلایا اور سوچنے لگا، کیسے کیسے روگ ہیں میری جان کو، کہاں تک سامنا کروں ...... کل ہی میٹنگ میں بڑے صاحب کہہ رہے تھے ...... پورے ملک میں متوازن زندگی کے لئے جدوجہد جاری ہے ...... ہم آپ بھی اس جدوجہد میں شامل ہیں۔ میں اپنے سارے اسٹاف سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ ڈسپلن کو اپنائیں ...... یہ لہر جو دیش کے کونے کونے میں چل پڑی ہے، یہ ہماری تمام بیماریوں کو دھو ڈالے گی، اس سے آپ نے فائدہ اٹھایا تو یہ اچھی بات ہے ...... ورنہ ہم پوری مشنری کا آپریشن کریں گے، جہاں بھی ہم کسی گندے عناصر، غدود اور جراثیم کو پائیں گے، کاٹ کر پھینک دیں گے ......"

"کاٹ کر پھینک دیں گے ...... کاٹ کر پھینک دیں گے ...... آپریشن کریں گے ...... آپریشن کریں گے ......"

پورے کمرے میں یہ آوازیں اُسے گونجتی ہوئی سنائی دینے لگیں، اس نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں ــــ اس کا پورا جسم خوف سے کانپنے لگا ...... اُسے لگا، جیسے بہت سارے لوگ نشتر لئے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں ...... وہ خوف سے چیخنا چاہتا ہے ...... لیکن حلق میں آواز اٹک گئی اور اس کا سارا جسم پسینے پسینے ہو گیا۔ اپنی غیر متوازن سانسوں کو درست کرنے کے لئے اس نے اپنی ساری قوت یکجا کی ــــ لیکن ــــ چت پڑا، وہ ــــ بالکل بے دست و پا اور بے بس محسوس کر رہا تھا ــــ اس نے چھت سے لٹکے ہوئے پنکھے کو دیکھا، جو اپنی تیز رفتار کے ساتھ گردش کر رہا تھا، اُسے لگا، پنکھے کے تینوں بلیڈ، اس کے سینے کے پار

ہو جائیں گے'، اُسے خطرہ محسوس ہو رہا تھا لیکن مسہری سے اُٹھنے کی ذرا بھی طاقت نہیں تھی اُس میں۔ وہ اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے پنکھے کی گردش کو گھور رہا تھا اور منتظر تھا کہ بلیک کب اس کا خاتمہ کرتے ہیں ـــ!

دوسرے دن لوگوں نے اسے سرسامی کیفیت میں دیکھا۔

کئی دنوں تک وہ بخار سے پھنکتا رہا اور اول فول بکتا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے اس کی حالت سنبھلتی گئی۔ جب بخار کی تپش سے اس نے نجات پائی، تب بھی اُسے لگ رہا تھا کہ اس کا سارا وجود تپ رہا ہے، دہک رہا ہے۔ پھر اس نے سوچا اس تپتے وجود پر اگر ایک ہلکی اور چچی تلی ضرب لگائی جائے تو اس کا سارا دکھ ختم ہو جائے گا، اس کے وجود سے لپٹی ہوئی عذاب کا ہر ہند لوٹ جائے گا ـــ لیکن یہ ضرب؟ پھر اس نے بہت سوچا اور فیصلہ کر لیا، اپنے گلینڈز کا وہ بہتر علاج کرائے گا اور بات آپریشن تک نہ پہونچنے دے گا، ایسا فیصلہ کر کے اس نے اطمینان محسوس کیا۔

اگلے دن، صبح پانچ بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اُس میں صبح کی ٹھنڈی ہوا میں ٹہلنے کی خواہش جاگ اٹھی۔

باہر آ کر اس نے دیکھا، دور تک دھند پھیلی ہے اور نظر اور حد نظر میں ایک قریبی رشتہ قائم ہو گیا ہے ـــ سڑک کے دونوں جانب جگہ جگہ شجر کاری کے لئے زمین کھودی گئی ہے، جن کی قطاریں سنسنا رہی ہیں۔ اُسے لگا، جیسے دونوں جانب ہرے ہرے پیڑ کھڑے اس کا سواگت کر رہے ہوں۔ اس نے اپنے اندر بے پناہ خوشی محسوس کی۔

فرصت کے بعد جب اس نے اپنی ڈیوٹی جوائن کی۔ اُسے معلوم ہوا، شرما جی اُسے کئی دنوں سے تلاش کر رہے ہیں ـــ لنچ ٹائم سے کوئی ایک گھنٹہ قبل شرما جی اپنی مخصوص مسکراہٹ کا جال پھیلائے آ پہونچے۔

"آداب"

"آداب"

"آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ کچھ ٹانک وغیرہ کھائیے۔"

"جی نہیں۔ اس بیماری نے مجھے ذہنی، اخلاقی اور جسمانی طور پر صحت مند بنا دیا ہے۔ آپ کو زحمت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔!"

●●

"بھارت میں بنی ہوئی
چیزوں پر اور بھارتی
کاریگروں کی مہارت پر
ہمیں ناز ہونا چاہیے"

ـــ شریمتی اندرا گاندھی

صالح مالیگانوی
۲۷۸/ ساتویں گلی، نیا پورہ، مالیگاؤں (ناسک)

رہبرِ قافلۂ امن و اماں ....

آج ہر کشتیٔ دل کو ملا طوفاں سے مفر — آج ہر فرد لٹاتا ہے مسرت کے گہر
گرمیٔ آتشِ الفت بھی ہے کیا خلد اثر — مرحبا! چشمِ جواہر کا یہ فیضانِ اثر
یہ بہاروں کی برات اور یہ مرادوں کا نگر
امن کے پھولوں سے مہکی ہوئی ہر راہ گذر
دستِ فطرت نے الٹ دی ہے نقابِ ہستی — مل گئی راہ نئی، کھُل گیا بابِ ہستی
نغمہ بر دوش ہوئے چنگ و رُبابِ ہستی — آج پوچھے نہ کوئی ہم سے جوابِ ہستی
اے خوشا! لطفِ نظر سے ہوا سامانِ حیات
بھر گیا گوہرِ مقصود سے دامانِ حیات
خوش نصیبی ہے جو اندرا کی قیادت پائی — کور چشموں نے بھی اب چشمِ بصیرت پائی
ملک نے دولتِ اسرارِ حقیقت پائی — قوم نے جرأتِ اخلاق و مروّت پائی
قوتِ بازوئے ملّت کا نشاں زندہ باد
رہبرِ قافلۂ امن و اماں زندہ باد
عزتِ نفس کی دھڑکن لیے سینے جاگے — درک و احساسِ فرائض کے قرینے جاگے
عقل و دانش کی کتابوں کے خزینے جاگے — جسدِ خاک کی محنت کے پسینے جاگے
متحد ہو کے کھڑے ہو گئے مزدور و کسان
بن گئے پیر و جواں عظمتِ قومی کے نشان
قوتِ بازوئے ملّت کا نشاں زندہ باد
رہبرِ قافلۂ امن و اماں زندہ باد

ماہر منصور ×
بالمقابل مسجد، ونوبا نگر، تمکور

بندھوا مزدور

زباں سے خون رستا تھا
پڑے تھے پاؤں میں چھالے
ہتھیلی کی لکیریں مٹ چکی تھیں
وہ جس کی روح آلودہ ہوئی تھی
سنو یہ کہہ رہا ہے آج
گمشتہ لکیریں لوٹ کے آئی ہیں اس کے سخت ہاتھوں میں
کسی کو کیا خبر تھی
بدل جائیں گی تقدیریں !!

نائب حسین نقوی
زیدی ولا - جامعہ نگر - نئی دہلی ۲۵

بمبئی کا سفر
اور ڈرامہ "خورشید" کی بازیابی

ڈرامہ خورشید کچھ عرصہ سے اکابرینِ ادب[1] نیز بعض جرائد[2] کے لیے بحث و تفحص کا موضوع بنا ہوا ہے۔

لیکن درحقیقت خورشید کی تلاش و تحقیق، اس کے دیباچہ کی جستجو، اس کی بازیافت کے منازل، ترجمہ اور رسم الخط کی تبدیلی کے پُر اسرار مسائل، ترتیب کے مدارج اور متن کی بنیادی تصحیح سے تنہا میری ذات وابستہ ہے، جس کا ذکر سید امتیاز علی تاج نے اپنے پیش لفظ میں کر دیا ہے۔

خورشید ڈرامہ یہاں شائع ہوا، اس پر بحثیں چھڑیں، اور میں خاموش رہا، لیکن اس طرف کچھ دن ہوئے محمد نعیم صاحب[3] صدیقی اور پروفیسر سید[4] حسن صاحب نیز دوسرے بعض لوگوں نے اپنے مقالات میں خورشید کی تحقیق اور ترجمہ کے سلسلہ میں میرا نام شامل کر دیا، چنانچہ میرا فرض ہو گیا حقائق کا انکشاف کر دوں تاکہ اُردو ادب، اس کے مضمرات سے تشنہ نہ رہ جائے۔

ڈاکٹر نامی سے لے کر اب تک جن صاحبانِ ذوق و تحقیق نے اس کے ترجمہ اور عہدِ تصنیف کے تقدم و تاخر کے سلسلہ میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے، ان کو زیرِ نظر انشائیہ[5] سے بعض ناقابلِ قیاس امور کا انکشاف ہوگا۔ اور درست و راست حقائق سامنے آئیں گے۔

میرے پاس وہ تمام براہین موجود ہیں جن سے ثابت ہوگا کہ یہ ڈرامہ (زبان اُردو میں) عوام الناس کے سامنے سب سے پہلے اسٹیج ہوا اور کم و بیش یہ وہی اصل ڈرامہ ہے، جس کا گجراتی نام تھا سونا نا مولنی کُمر سیلا اس کو محض چند اضافات اور معروف شعرا نیز مثنویوں کے اشعار[6] کے شمول کے ساتھ اردو داں طبقہ کے سامنے کھیلا گیا۔

ڈاکٹر نامی نے دیباچہ کو سامنے رکھ کر مکمل ڈرامہ پر بحث کی ہے۔ ڈرامہ کا متن ہنوز شائع نہیں کیا۔

ڈاکٹر مسیح الزماں ہم سے بچھڑ چکے ہیں، لہٰذا اب ان کا ذکر ہی کیا۔[7] ڈرامہ کی دست یابی کے بعد، اس کے رسم الخط کی تبدیلی، بعض مقامات کا ترجمہ، حواشی اور ترتیب کی تکمیل کے بعد لکھنؤ واپس ہوا۔ اور سب سے پہلے پروفیسر سید حسن صاحب کو اطلاع کی، ساتھ ہی بہ خیال خود زیرِ نظر انشائیہ کے ساتھ اشاعت کے لیے تاج صاحب کو لکھ بھیجا، اس لیے کہ بغیر انشائیہ کے ڈرامہ کی صحیح تحقیق، عصرِ تصنیف اور ترجمہ و متن کے پردے چاک نہیں ہو سکتے تھے، لیکن پروفیسر سید حسن صاحب نے لکھا۔ یہ ڈرامہ آپ نے تاج[8] صاحب کی پیش کش اور فرمائش پر تحقیق کیا ہے، کیا حرج ہے کہ ان کو بھیج دیا جائے، بل کہ اشاعت کے حقوق بھی ان کو دے دیں۔

دوسری طرف تاج صاحب نے مبارک باد کے تار کے ساتھ ڈرامہ طلب فرما لیا۔ ڈرامہ موصوف کے پاس پہنچا، تو خط ملا، جس کے چند جملے پیش خدمت ہیں:

> آپ کو معلوم ہے کہ سولہ برس سے اس ڈرامہ کی تلاش میں ہوں
> اور آپ مجھ سے حتمی وعدہ فرما چکے ہیں، پھر یہ لیت و لعل کیوں؟
> میری تمام جلدیں مکمل ہیں لیکن محض خورشید کی وجہ سے سب
> کام معطل ہو گیا ہے . . . آپ کی اجازت ضروری ہے اگر کہیں

---

[1] ڈاکٹر نامی، ڈاکٹر مسیح الزماں، ڈاکٹر میمونہ دلوی، ڈاکٹر محمد حسن، خواجہ احمد فاروقی، ابراہیم یوسف، سید احتشام حسین، عشرت رحمانی، ڈاکٹر خلیق انجم اور دوسرے بعض صاحبانِ ذوق نے خورشید کے سلسلہ میں کم و بیش لکھا ہے۔

[2] رسالہ آج کل ڈرامہ نمبر ۱۹۵۹ء بمبئی میں اُردو، ہماری زبان ۱۵ اگست ۷۴ء، ۲۲ فروری ۷۵ء، ۸ فروری ۷۶ء، ۱۵ مارچ ۷۶ء کی اشاعتوں میں خورشید پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

[3] ہماری زبان اشاعت ۸ فروری ۷۶ء۔

[4] آپ سے اس زمانے میں مختلف ڈراموں کی نقول اور تراجم کے سلسلہ میں خط و کتابت ہو چکی ہے۔ چنانچہ اب آپ نے ایک مقالہ میں میرا ذکر فرما دیا ہے۔

[5] موجودہ انشائیہ اس ڈرامہ کے حقائق کو اجاگر کر سکے گا، نیز اس کی تلاش میں میری صعوبات و مشکلات کا بھی اندازہ ہوگا۔

[6] مترجم نے مثنوی میر حسن اور دوسری بعض مثنویوں کے اشعار اور اردو کے بعض فقرات کا اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے، گجراتی الفاظ جوں کے توں شائع ہوئے ہیں، ان کا کوئی ترجمہ نہیں کیا گیا۔ وہ ترجمہ میں نے خود کرایا تھا۔ بعد میں بعض الفاظ تاج صاحب نے منتقل کرائے۔

[7] بمبئی سے واپسی پر سب سے پہلے یہ ڈرامہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کو دکھایا تھا، اتفاق سے ڈاکٹر صفدر بھی وہاں مقیم تھے بعض گجراتی الفاظ کے معنی بھی پروفیسر صاحب مرحوم کو بتلائے تھے۔

[8] تاج صاحب نے محض اس ڈرامہ کے لیے ہندوستان کے ۲ سفر کیے تھے لیکن ناکام واپس ہوئے تھے۔

تو اپنے ڈراموں کا سرخیل بنالوں . . . جہاں آپ نے دوسرے متعدد ڈرامہ اور منشی احسن[9] کے حالات بھیج کر نوازش فرمائی وہاں اس کی اجازت بھی دینا ہوگی۔"

تاج صاحب میرے بزرگ، اور محسن تھے، لہٰذا انکار کی جسارت نہ کر سکا، ڈرامہ چھپ گیا، میرے انشائیہ کا شمول اس میں نامناسب تھا۔ چنانچہ رہ گیا۔ لیکن مرحوم موصوف نے نہایت دیانت سے میرا ذکر فرما دیا ہے۔

اس کے بعد ہی سید احتشام حسین نے ریڈیو نشریہ میں تذکرہ کیا۔ خورشید ڈرامہ نقوی صاحب نے بمبئی کی خاک چھان کر ڈھونڈ نکالا[10]۔

اس پس نوشت کے بعد، انشائیہ ملاحظہ فرمائیے۔

▲ ۱۹۶۳ کی بات ہے کہ تاج صاحب نے درمیان گفتگو ایک کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا تھا "مجھے اُردو کے اولیں عہد کے چند ڈراموں کی اشد ضرورت ہے، جن کی فہرست یہ ہے۔"

معاً خیال آیا کہ تاج صاحب جیسی ہستی کو جن ڈراموں کی تلاش ہو سکتی ہے وہ یقیناً کم یاب، نایاب بل کہ عنقا ہوں گے۔ ڈرامے کی دنیا میں موصوف کی وسیع معلومات، شہرت، تعلقات، اثرات، مساعی، جستجو، تحقیق و تلاش اور حتی الامکان کد و کاوش کے بعد میرے لیے یہ حکم یقیناً اس امر کا غماض تھا کہ ان ڈراموں کی مزید تلاش اور جستجو کے نتائج خاطر خواہ نہ نکل سکیں گے۔

یہ تصور ابھرا اور بھنور کے پانی کی طرح اپنی جگہ جذب ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ وہ فہرست جیب میں رکھتے ہوئے عرض کیا۔ بہتر، انشاء اللہ۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ خط و کتابت کے ذریعہ تقاضوں کی تجدید ہوتی رہی، حتیٰ کہ دو سال بیت گئے ـــــــ اور اتفاق سے دوبارہ نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا۔

اس بار لہجہ میں تلخی، چہرے پر سرخی اور پیشانی پر شکنیں تھیں ـــــ فرمایا:

آپ کو معلوم ہے، ڈراموں کی نو جلدیں مرتب کی ہوئی میرے پاس تیار ہیں۔ اور اب مجھے صرف "خورشید" ڈرامہ کی ضرورت ہے۔

یہ اُردو کا وہ اہم ڈرامہ ہے، جو سب سے پہلے عوام کے سامنے اسٹیج ہوا۔ ساتھ ہی موصوف نے فرمایا: خورشید ڈرامہ کا ذکر ڈاکٹر نامی نے اپنی ببلو گرافی اور دوسرے بعض تحقیقی مضامین میں کیا ہے، بلکہ اس کا دیباچہ بھی شائع کیا ہے، لیکن اصل ڈرامہ کی ہوا بھی نہیں دینا چاہتے۔

میں نے بغیر عواقب پر نظر کیے پھر وعدہ کر لیا: "خورشید ڈرامہ حاضر کر دونگا۔" میرا جملہ ابھی ناتمام سا تھا کہ تاج صاحب کے چہرہ پر نامعلوم سی مسکراہٹیں کھیلنے لگیں۔ ایک لمحہ میری طرف غور سے دیکھا اور نگاہیں میز کے کاغذوں پر جم گئیں۔

تاج صاحب کی وہ مسکراہٹیں بڑی قیامت خیز تھیں، جن میں لاتعداد تمسخر اور طعن مضمر تھے جس کے بعد محسوس ہوا، گویا میرا یہ دعویٰ موصوف کے خیال میں میری نادانی، کم علمی، حقیقت کے خلاف، ناقابل عمل یا ان کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔

اس کے بعد سے وقتاً فوقتاً بعض ڈراموں کی نقول براہ راست اور بعض کی محترم پروفیسر سید حسن صاحب[1] کے ذریعہ بھیجتا رہا۔ لیکن خورشید ہنوز نایاب رہا۔ برصغیر کی جس لائبریری کو چھانا۔ جس شخص سے دریافت کیا اور جس کو خط لکھا، اس نے جواب دیا۔

تاج صاحب کو اس ڈرامہ کی عرصہ سے تلاش ہے، لیکن ان کو آج تک نہ مل سکا، تو پھر آپ . . . گویا کہ یہ میری بضاعتی کا تمسخر تھا۔

مگر میں پروفیسر سید حسن صاحب اور تاج صاحب کو برابر تسلیاں دے رہا تھا۔

آخر ڈاکٹر نامی سے خط و کتابت شروع ہوئی جوابات ملتے رہے لیکن بالآخر میرے مطالبات بیجا سے تھک کر موصوف نے جواب دیدیا۔

ڈاکٹر نامی کے خط کا اقتباس[2]:

جو لوگ محض عیاشی کی بنا پر خورشید ڈرامہ چاہتے ہیں، میں ان کو اس کی اجازت نہ دوں گا . . . . ڈرامہ میرے پاس ہے . . . اُردو میں ہے . . . لیکن اتنی طویل خط و کتابت سے میں نے اور آپ نے وقت ہی ضائع کیا۔

اب بہ ظاہر تمام وسائل اور ذرائع مفقود ہو چکے تھے، تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ لیکن ایک وعدہ، دوسری طرف بعض اعتراضِ ذاتی اور آخر میں قدردوں کا تصور تازیانہ بنے ہوئے تھے۔

چناں چہ ایک آخری صورت تحت الشعور سے اُبھری کہ ـــــ تن بہ تقدیر بمبئی جا کر قسمت آزمائی کیجیے۔ میرے اس عزم کو ایک عقلی ثبوت تقویت پہنچانے لگا کہ جب ڈرامہ معرض وجود میں آیا، تو نہ ملنا کیا معنی ـــــ چناں چہ بمبئی کے لیے رختِ سفر باندھ دیا۔ مدت سفر کے طول و عرض سے بے خبر تھا، لہٰذا بیگم کو بھی ساتھ لے لیا ـــــ اور (جوزر صاحب[3]) کے ذریعہ ہوٹل کے ایک کمرے میں مدتِ نامعلوم کے لیے بستر کھول دیا۔ صبح ہوئی اور اللہ اللہ کرتا ہوا جلدی سے تیار ہو کر بھنڈی بازار[4] کے فٹ پاتھ پر آ کھڑا ہوا، ابھی کھڑا ہی تھا کہ جوزر صاحب سامنے سے آتے دکھائی دیے، مگر میں برف کی طرح اپنی جگہ منجمد تھا، وہ قریب آ گئے۔ سلام خیریت خیر صلاح کے بعد، موصوف دکان پر لے گئے۔ میں نے بمبئی کا سبب ورود بیان کیا، کہنے لگے، اس ڈرامہ کی تلاش میں متعدد لوگ آتے

---

[1] پروفیسر سید حسن صاحب پٹنہ یونیورسٹی (پٹنہ)، اور تاج صاحب کی طرف سے تقاضوں کے متعدد خطوط آئے۔ اور مجھے آپ کی خدمت میں اسی وقت سے نیاز حاصل ہے۔

[2] یہ خطوط ڈاکٹر صاحب موصوف کے میرے پاس محفوظ ہیں۔

[3] علوی بک ڈپو محمد علی روڈ بمبئی کے جنرل منیجر۔

[4] اُردو کتب کی بیشتر دکانیں اسی بازار کے ارد گرد ہیں۔

[9] منشی احسن لکھنوی کے حالات بھی راقم الحروف ہی نے دست یاب کیے تھے۔

[10] تبصرہ، ۲۰ اپریل ۷۱ء پونے نو بجے شب آل انڈیا ریڈیو (الٰہ آباد)

ہیں۔ آپ نے کبھی عرصہ ہوا مجھے خط لکھا تھا ــــ لیکن اس کے لیے مزید کوشش کرنا بے سود ہے۔ ملتا تو مجھے کیوں نہ مل جاتا۔

یہ پہلا جواب تھا، جو بمبئی کی سرزمین پر قدم رکھ کر موصول ہوا، اگرچہ جوزر صاحب بیشتر نایاب کتب ہی کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔

یہ جواب سُن کر میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی، نجیب اشرف ندوی[1] (مرحوم) شہاب الدین صاحب دسنوی، ظ۔ انصاری، علی جواد زیدی[2]، سردار جعفری اور ڈاکٹر نامی کے پتے دریافت کیے۔

وہاں سے قریب ترین مکان ڈاکٹر فاروقی کا تھا

چناں چہ پہلی ملاقات انھیں سے ہوئی، کمرے میں بُلا لیا گیا، اپنی کہانی کہی، ڈاکٹر نامی کا نام بتایا۔ فاروقی صاحب کے چہرے پر شکنیں ابھری اور پانی کے گرداب کی طرح معدوم ہوگئیں۔

فرمانے لگے، مشکل ہے، بل کہ یہ کہوں کہ ناممکن ہے، لیکن میں ایک ایسی ہستی سے آپ کو متعارف کرائے دیتا ہوں، جو ڈراموں سے معمور، تین الماریوں کے مہیا کرانے میں نامی صاحب کے ممد و معاون رہی ہے۔

ساتھ ہی سامنے بیٹھے ہوئے ایک بزرگ سے مخاطب ہو کر کہا،

رحمٰن بھائی! نقوی صاحب سے ملیے . . . میں نے از سرِ نو واقعہ دہرایا

عبدالرحمٰن صاحب پچاس سال سے بمبئی میں مقیم تھے، ایک زمانے تک اخبارات کے رپورٹر رہے، کانگریس کے پُرانے رکن تھے، جیل بھی ہو آئے تھے، ڈرامہ کی دنیا میں بمبئی بھر میں معروف تھے اور بمبئی میں ڈرامہ سے دل چسپی رکھنے والی کوئی شخصیت ایسی نہ تھی جو رحمٰن بھائی سے متعارف نہ ہو۔

فرمانے لگے، آپ کو ــــ آن[4] ــــ ملا دوں گا ــــ لیکن۔

پھر فرمانے لگے ــــ ہاں اتنا یقین دلا دوں کہ میں آخری آدمی ہوں کہ اگر نامی صاحب نے ڈرامہ نہ دیا تو آگے قطعی ناممکن ہے۔

نامی صاحب سے ملاقات کا وقت رات کو نو بجے معین ہوا، دن، دوپہر، سہ پہر، شام، رات کے انتظار میں گزر گئی۔

نامی صاحب اس عمارت کی پانچویں منزل پر مقیم ہیں۔ زینہ کی کم و بیش اسّی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک جگہ رحمٰن بھائی رک گئے۔ سامنے تختی لگی تھی، کیپٹن، پروفیسر، ڈاکٹر عبدالعلیم نامی، ناظم . . . . اندر پہنچے، مکمل تعارف، خاصے با اخلاق انسان۔

باتیں شروع ہوئیں ــــ آخر میں فرمایا ــــ یہ الماریاں ڈراموں سے معمور ہیں۔ میں نے ایک پارسی سے وہ ڈرامہ لیا تھا، اور نقل کرلیا تھا۔ میرا سامان کئی جگہ منتشر ہے۔ نہیں کہہ سکتا کہ وہ مخطوطہ کہاں ہے۔ قصہ مختصر ــــ میرے خیال سے ملنا مشکل ہے ــــ ممکن نظر نہیں آتا ــــ اور معذوری ہی سمجھیے۔

میں نے عرض کیا الماریوں میں دیکھ لوں گا، ریاست جاورہ جا سکتا ہوں، سندیلہ لکھنؤ سے قریب وہاں آپ کے دولت کدہ پر دیکھ لوں گا۔ نامی صاحب نے جواب میں فرمایا۔ اس کے بعد بھی ملنا مشکل ہے، آپ کی محنت رائیگاں نہ جائے یاسیت نے میرے ہر رگ و ریشہ کو مفلوج کر دیا۔ میں نے عرض کیا شکریہ۔ اور رحمٰن بھائی کے ساتھ دو گھنٹے کی ملاقات کے بعد واپس آگیا۔

اب ڈاکٹر نجیب اشرف سے نیاز حاصل کیا۔ پتہ نشان کچھ نہ ملا۔

کتب فروشوں کی دکانیں، لائبریریاں، شخصیات، ذاتیات، علمی دنیا والوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، اور ہر آدمی میری بے سود سعی پر ہنستا رہا۔

عجب تماشہ یہ تھا کہ جس شخص سے ملتا وہ دس دس پانچ پانچ پتے مزید بتا دیا کرتا حتیٰ کہ میرے پاس ۸۰، ۹۰ پتے جمع ہو گئے۔ اور تقریبًا ہر پتے پر جاتا رہا۔

لیکن ان تمام ناکامیوں کے با وجود میرے عزائم میں استقلال تھا، پختگی تھی۔

اُردو، ہندی، انگریزی کتب فروشوں کے بعد گجراتی کتب خانوں اور کتب فروشوں کی چھان بین کی۔

سہراب مودی سے ملا۔ بلراج ساہنی کو تاج صاحب کا خط دیا۔ یہ لوگ بڑے تپاک سے پیش آئے اور ان کے بلند اخلاق سے متاثر ہوا۔ مگر اصل مقصد سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

ایک روز رحمٰن بھائی نے فرمایا: ایک پتہ اور دیتا ہوں، اگر آپ ان سے مل لیں تو شاید کوئی نشان مل سکے، میں نے گھبرا کر پتہ پوچھا۔

معلوم ہوا کہ یہ صاحب مصنّف بھی ہیں، ڈرامہ نویس بھی، اور گجراتی اخبار "جام جمشید" کے مالک و ایڈیٹر بھی۔ ان کا مصنفہ ڈرامہ بمبئی میں جس روز کھیلا جاتا ہے، اس روز شائقین کے علاوہ عمائدین و اکابرین، سیاسی شخصیتیں، حکامِ شہر سب دیکھنے آتے ہیں۔

رحمٰن بھائی نے کہا، لیکن آپ سے ملاقات مشکل ہے۔ وہ بھلا آدمی کسی سے ملتا نہیں۔

میں نے عرض کیا، اگر وہ انسان ہی ہے تو میں ضرور مل لوں گا۔

صبح اٹھا اور سیدھا اس پتہ پر پہنچا۔ چپراسی کو نام بتایا، اس نے کہا یہ لفٹ لگی ہے تیسری منزل پر جائیے، چنانچہ دیکھا کہ ایک معقول صورت، وجیہ اور شائستہ انسان بغور مجھے دیکھ رہا ہے۔

میں شیروانی میں ملبوس تھا۔ ایک نئی ہیئت کا آدمی دیکھ کر ہی غالبًا اس نے کھڑے ہو کر میرا خیر مقدم کیا ہوگا۔ میں گجراتی سے ناواقف وہ ٹوٹی پھوٹی ہندی بول پاتے مجبورًا انگریزی کا سہارا لیا۔ اور اپنا مقصد بیان کر دیا، کہنے لگے: میرے دادا نے کبھی کوئی ڈرامہ نہیں لکھا، پردادا لکھتے تھے، باپ لکھتے تھے، میں لکھتا ہوں۔ میں نے کہا، مگر انھوں نے اردو کا سب سے پہلا ڈرامہ لکھا ہے۔

---

۱ اب مرحوم ہو چکے ہیں۔
۲ بمبئی یونیورسٹی کے اردو پروفیسر۔
۳ موصوف اس زمانے میں بمبئی میں تعینات تھے۔
۴ ڈاکٹر نامی کی طرف اشارہ تھا۔

جواب دیا اگر مجھے معلوم ہو جائے تو میں آپ کا بہت مشکور رہوں گا۔ حیرت ہے کہ لکھنؤ سے ان کے ڈرامہ کی تلاش میں آپ یہاں تک آئے ہیں اور مجھے اس کی معلومات تک نہیں۔

میں نے کہا، وقت کا انتظار کیجئے۔

اس جستجو کے نتیجے میں اتنا ضرور ہوا کہ بمبئی کی تقریباً ستر لائبریریوں کی مکمل فہرستیں نظر سے گزر گئیں، ان میں تقریباً چالیس کارپوریشن سے متعلق ہیں جو صبح و شام دونوں وقت مطالعے کے لیے کھلی رہتی ہیں، بمبئی کی جامع مسجد کی لائبریری بھی قابلِ ذکر ہے جس میں اُردو، فارسی، عربی اور گجراتی زبانوں کی کتب مختلف موضوعات پر ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ سات لائبریریاں پارسیوں کی مشن کی طرف سے قائم ہیں، جو بڑے سلیقہ سے آراستہ کی گئی ہیں۔

وہاں کا ایک آدمی برابر میرے ساتھ رہا جو گجراتی کتب کے نام پڑھ پڑھ کر مجھے بتاتا رہا۔ ان کے علاوہ وہاں کا ہندی تحقیقاتی ادارہ ساحلِ سمندر پر سربہ فلک عمارت میں واقع ہے۔ وہاں کے چیف لائبریرین نے بھی میری بہت کچھ امداد کی۔ خصوصاً ان کی قائم مقام ایک محترمہ مستقل چار روز تک گجراتی ڈراموں کے نام اور تذکرے پڑھ پڑھ کر بتاتی رہیں۔ اس لائبریری میں گجراتی کے تقریباً دو ہزار ڈرامے موجود ہیں، ساتھ ہی پارسی ڈرامہ نویسوں کی دو سو سال تک کی مکمل تاریخ بھی موجود ہے۔ مگر اس تاریخ میں بھی "خورشید" کا نام شامل نہ تھا۔ البتہ ایڈل جی کھوڑو کا نام مل سکا۔

اس عرصہ میں میرا ٹائم ٹیبل بن چکا تھا۔ صبح سات بجے سے دس بجے تک کتابوں کے بازار میں فٹ پاتھ پر کباڑیوں کے لگائے ہوئے ڈراموں کو دیکھنا، دس بجے سے لائبریریوں میں جستجو کرنا، سہ پہر کو تین بجے سے شام کے سات بجے تک پھر فٹ پاتھ پر گھومنا۔ اس کے بعد کسی اہم شخصیت سے ملاقات۔

بمبئی کی سب سے بڑی لائبریری میں اُردو کی ہزار ہا کتب ڈھیری صورت میں پڑی ہیں۔ ان سب کو تین آدمیوں کی امداد کے باوجود چار روز میں دیکھ سکا، لیکن خورشید کہیں ہو تو ملے۔ وہاں کے گجراتی ڈراموں کی فہرست میں بھی کوئی سراغ نہ مل سکا۔

اب بمبئی کے قیام کو ۲۰ دن ہو گئے، اب ڈاکٹر فاروقی اور رحمٰن بھائی کارپوریشن کے الیکشن میں مشغول ہو چکے تھے۔ گویا کہ یہ دونوں ہستیاں بھی ہاتھ سے نکل چکی تھیں۔

لیکن ڈاکٹر نجیب اشرف صاحب، امیر صاحب اور جوزر صاحب برابر ہمت بڑھاتے رہے۔

فٹ پاتھ کی گردشیں برابر جاری تھیں، دل میں کبھی خیال آتا کہ بمبئی میں شیروانی پہنے ہوئے ایک اجنبی سا آدمی مبادا مشکوک نہ خیال کیا جا رہا ہو، دوسری طرف گجراتی سے عدم واقفیت کی نالائقی بھی ساتھ تھی۔ فٹ پاتھ والے ہندی و بول سکتے تھے، اور میں گجراتی نہ سمجھ پاتا تھا، اور وہاں انگریزی بھی بیکار تھی، اس لیے کہ ان میں سے کوئی انگریزی داں بھی نہ تھا۔ حد یہ تھی کہ بعض آدمی ہندی کا ایک لفظ بھی نہ بول پاتا، نہ سمجھ پاتا۔ میں گھٹ گیا، تو ایک ترجمان اپنے ساتھ لیا، اس میں سے بعض تجربہ کار تجارت پیشہ لوگوں نے متواتر میری مشغولیات اور ضرورت تاڑ کر نئے نئے راستہ بتانا شروع کیے۔ چناں چہ ایک اتوار کو ڈراموں کا پورا ڈھیر لا کر میرے سامنے ڈال دیا۔

میں نے کہا، یہ پڑھے گا کون؟ جواب دیا میرا لڑکا موجود ہے، آج اس کی چھٹی ہے۔

چناں چہ اس نے پڑھنا شروع کیے، اُن میں الف خاں جناب، منشی کریم الدین، رونق بنارسی کے نام بھی آئے۔ اور وہ سب ڈرامے میری فہرست میں شامل تھے میں اُن کو الگ رکھتا گیا۔ آخر میں اندر سے اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو وہ بھی نامکمل تھے، ان میں گانے زائد تھے۔

مجبوراً صبر کرنا پڑا ——— اب قدم میں لغزش آ گئی تھی۔ تقریباً بارہ سو روپے صرف کر چکا تھا۔

اب جیب میں ۲۹۶ پتے جمع ہو چکے تھے، ان میں سے بیشتر جگہوں سے انکار ہو چکا تھا۔ گلی کوچوں میں، کباڑیوں کے گھروں پر، فٹ پاتھ پر بازاروں میں ہر جگہ حتی المقدور دیکھ بھال کی۔ مگر خورشید ناپید تھا ہر طرف غور و فکر کے بعد خیال ہوتا تھا کہ یہ ڈرامہ معرضِ وجود میں آیا بھی کہ نہیں۔

لیکن ناجی صاحب خورشید کا مکمل دیباچہ شائع کر چکے تھے، اس کے بعد ڈرامہ کا وجود نہ ہونا کیا معنی؟ ڈرامہ کی تفصیلات و کردار کی اشاعت ہو چکی تھی پھر وہ وہم اپنی ناکامی کی نشان دہی پر ختم ہو جاتا۔ رحمٰن بھائی، فاروقی صاحب ڈاکٹر نجیب اشرف نے مایوس کر دیا تھا۔ ڈاکٹر فاروقی کے ہمراہ ڈاکٹر ندوی سے آخری ملاقات ہوئی تو زبان سے نکلا۔ اب بمبئی اسی وقت چھوڑوں گا، جب خورشید ہاتھ میں ہو گا۔ اس لیے کہ اب تک اس کے پیچھے بہت کچھ کھو چکا ہوں۔ میری اس بات کا جواب دونوں نے ہلکی مسکراہٹوں اور ایک دوسرے کو خاموشی سے گردن ہلاتے ہوئے دیا۔

چناں چہ واپسی کے وقت پھر میرے اعصاب میں ایک نئی روح اور نیا ولولہ پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن وہ رات میرے اوپر سخت کرب و بے چینی سے کٹ سکی، سوچتا تھا تاج صاحب، پروفیسر سید حسن صاحب، ڈاکٹر نجیب اشرف ندوی اور ڈاکٹر فاروقی، پہلے صرف دو شخصیتیں میرے اوپر ہنستی تھیں، اب دو اور دو مل کر چار ہو گئیں۔ صبح اٹھتے ہی بیگم کہنے لگیں۔ اب واپسی کا کرایہ باقی ہے، اگر چلنا ہے تو آج چلیے، ورنہ یہ ایک نئی پریشانی لاحق ہو گی، اب روپیہ کی فکر ہو گئی۔

علوی بک ڈپو پہنچا، جوزر صاحب سے روپیہ لیا بیگم کو اطمینان دلایا اور آج بڑے بڑے بک سیلروں کے یہاں کا عزم کیا، جو بمبئی کے دیرینہ پبلشر تھے۔ دن بھر بڑی بڑی دکانوں پر گیا، اور ہر جگہ بتایا گیا آپ این ایم ترپاٹھی کی دکان پر جائیے، ان کے یہاں پُرانی اور نایاب کتب کا الگ ایک شعبہ ہے ممکن ہے

ٍ رائٹرز امپوریم کے منیجر۔

کہ کہیں گرا پڑا مل جائے۔
انجام کار سات بجے شام کو این ایم ترپاٹھی پبلشر کی دکان کا رُخ کیا، پوچھتا پاچھتا پہنچا، باہر چوکیدار نے کہا شاب (صاحب) اب دُکان بند ہوگیا۔
میں نے چوکیدار سے لجاجت کے لہجہ میں کہا، مجھے صرف ملنا ہے، کچھ خریدنا نہیں ہے۔
اس نے کہا، جاؤ شاب (جاؤ صاحب)
اندر پہنچا ــــ بڑا وسیع ادارہ ــــ ہر آدمی اپنا کام جلدی جلدی سمیٹ رہا تھا۔ میں درمیان میں کھڑا ہوگیا، کسی کو سلام کیا کسی کو نمستے۔
ایک آدمی نے میرے لباس کو دیکھ کر پوچھا ــــ ہندوستانی ہے؟
میں نے کہا جی ہاں، لکھنؤ سے آیا ہوں۔
وہ بھلا مانس کھڑا ہوگیا، کاہے کو آنا ہوا۔
میں نے کہا کچھ ڈراموں کی ضرورت ہے۔
اس نے چپراسی کو اشارہ کیا۔ ان کو اندر لے جاؤ، اور زبان سے کہا منیجر کے پاس۔ میں اس کے اشارے کے ساتھ ساتھ اندر، اور اندر چلتا چلا گیا۔ چپراسی اشارہ کرتا جا رہا تھا۔ آخر میں ایک کمرے میں چپراسی داخل ہوا میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔
ایک مشینی آدمی دستخط کرنے میں مشغول نظر آیا، مجھے دیکھ کر قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔
"بیٹھیے" میں سلام کرکے بیٹھ گیا اور ایک سانس میں اپنا پورا مدعا بتاتا چلا گیا۔
منیجر نے پوچھا۔ ڈرامے نئے چاہییں یا پُرانے۔
یاسیت میں کچھ امید پیدا ہوئی ــــ سوچا، اخاہ پرانے ڈرامے بھی ملتے ہیں۔
میں نے عرض کیا مجھے بہت پُرانے ڈراموں کی ضرورت ہے۔
منیجر نے کہا" یہاں ہر زبان کے ڈرامے ملیں گے۔ لیکن اردو کے ڈرامے بہت کم ہیں بلکہ نہ ہونے کی برابر ہیں۔ ان کی یہ فہرست ہے ــــ اس فہرست کے دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا، اس میں خورشید نہیں ہے۔
میں نے پوچھا ــــ اور۔
ہندی اور گجراتی کے ڈرامے کل آکر دیکھیے۔ اس شعبے کے انچارج ہمارے شاستری صاحب ہیں اور وہ پانچ بجے چلے جاتے ہیں۔ گیارہ بجے آتے ہیں۔
مگر ہاں ــــ سامنے کھڑے ہوئے چپراسی سے کہا۔
نئی جلدیں جو ابھی جلد ساز دے گیا ہے، اُٹھا لا۔
وہ پانچ چھ موٹی موٹی جلدیں لے کر کمرے میں داخل ہوا۔
میں نے دُور سے دیکھتے ہی بصد لجاجت عرض کیا یہ ڈرامے ہیں؟
جواب دیا ایک ایک کتاب میں دس پندرہ اور بیس تک کی ایک جگہ جلدیں بندھوا لیتے ہیں۔
مگر ہم بغیر شاستری جی کی اجازت کے فروخت نہیں کر سکتے۔
میں نے کہا دیکھ لینے کی اجازت تو دیں گے۔
کہا، ضرور ساتھ ہی چائے لانے کے لیے چپراسی سے کہا۔ پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ آٹھ بجے دکان بند ہو جاتی ہے۔ مگر آپ لکھنؤ سے آئے ہیں ہمارے مہمان ہیں۔ آرام و اطمینان سے دیکھیے میں بیٹھا رہوں گا۔
اوپر کی جلد کھولی، وہ سب گجراتی تھی، اب میں بھی ٹوٹی پھوٹی گجراتی پڑھنے لگا تھا۔
منیجر سے عرض کیا، یہ گجراتی کے ڈرامہ ہیں اور میں۔
ہاں یہ آدمی آپ کو سب کے نام پڑھ پڑھ کر بتا دے گا۔ ساتھ ہی سامنے کھڑے ہوئے آدمی کو اشارہ کیا، تم پڑھ کر سنا دو۔ اس نے جلد کھولی، ایک، دو، تین، چار، دس ڈرامے ــــ خورشید ندارد۔
لیکن اس جلد میں عہدِ اولیں ہی کے ڈرامے تھے۔ رونق بنارسی، ایڈل جی کھوڑ وا ور حباب وغیرہ کے۔ پھر دوسری جلد کھولی، چپراسی کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ میرے دل کی حرکت تیز ہوتی جاتی ــــ یا اللہ ــــ کسی طرح خورشید کا نام بھی اس کی زبان پر آجاتے۔ چنانچہ دوسری کے بعد تیسری اور چوتھی جلد اٹھائی ــــ یہ جلد سب سے ضخیم تھی۔
ہر ڈرامہ کا نام پڑھنا شروع کیا۔ میں ہر سطر پر انگلی رکھ کر ایک استاد کی طرح اس سے باز پرس کر رہا تھا یہ کیا لکھا ہے، یہ کیا ہے، اب کون سا ہے؟
ایک بار اگلے ڈرامے کا سرورق کھولا، اور . . . . .
لیجیے خورشید مل گیا۔
اس نے پڑھا، سونا نا، مولنی، گھر سید۔ میں نے پھر پڑھوایا، پھر پڑھوایا۔
میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ دکان کی الماریاں، کتابیں، منیجر کی میز، کرسی، سب ناچنے لگے۔
سرورق کا اندرونی صفحہ کھلوایا ــــ اور پڑھوایا، وہ ڈرامہ حقیقتاً خورشید ہی تھا جس کی مکمل نشان دہی میرے پاس موجود تھی۔ اس کے کردار وہی تھے سین وہی تھے۔ پوری فہرست اصل سے مطابق تھی، صرف نام دوسرا تھا، میں نے کتاب بند کر دی ــــ پوچھا ــــ اس جلد کی کیا قیمت ہوگی۔
منیجر نے کہا اس کے لیے کل شاستری جی سے ملیے، وہ بتائیں گے، یہ اُن کے قبضے کی بات ہے۔
میری زبان سے نکلا ــــ کل ــــ منیجر نے کہا، ہاں کل گیارہ بجے کے بعد۔
بہت خوب، منیجر کو سلام کرتے ہوئے کھڑا ہوگیا لیکن گوشۂ چشم سے برابر اس شخص کی طرف دیکھ رہا تھا کہ یہ شخص جلد کہاں رکھے گا۔ اس نے الماری کے ایک درجہ میں نہایت بے دردی سے پٹک دی، وہ جھلّایا ہوا تھا۔ دیر ہو جانے کی وجہ سے اس پر جھنجھلاہٹ سوار تھی۔ میرے دل سے یہ آواز نکلی، ارے بدبخت ہزاروں روپے کی کتاب کو اس طرح پٹک رہا ہے۔
اس کے بعد فٹ پاتھ پر آکر کھڑا ہو گیا۔ ہر آدمی پر نگاہ رہی کہ وہ جلد بغل میں دبائے نہیں نکل رہا ہے، حتیٰ کہ دکان میں تالے ڈال دیے گئے اور میں آخری

آدمی تھا کہ دوکان کے فٹ پاتھ سے ہٹا۔

رات بڑے آرام سے گزاری، مگر صبح آٹھ ہی بجے جائے قیام سے نکل گیا۔ ڈر یہ لگ رہا تھا کہ کہیں کوئی دوسرا شخص وہ جلد نہ خرید لے جائے۔ ایک دن پہلے کا سب سے آخری اور آج کا سب سے پہلا گاہک مجھے ہونا چاہیے، خدا خدا کرکے دوکان کھلی۔ گیارہ بجے، ساڑھے گیارہ بجے تو شاستری جی تشریف لائے ان سے ملا، کتاب نکلوائی، نہایت اخلاق سے پیش آئے۔ وہ پہلے مدارات کرنا چاہتے تھے، اور مجھے اس جلد کی قیمت ادا کرکے اس پر قبضہ کرنے کی عجلت تھی، دل دھڑک رہا تھا، مبادا کوئی آکر منع کر دے۔ یہ کتاب فروخت کرنے والی نہیں ہے۔

مگر ان کی مہمان نوازی قبول کرنا پڑی اور پورے ایک گھنٹہ بعد ڈرامہ کے کردار پڑھوائے، مختلف مقامات سے عبارتیں پڑھوائیں، پیش لفظ پڑھوایا، کردار وہی تھے، کہانی وہی تھی، جو ڈاکٹر نامی نے اپنے مضمون میں لکھے تھے لیکن مترجم اور مصنف کا نام کہیں نہ ملا۔ بات سمجھ میں نہ آئی، قلب مطمئن نہ ہوا۔ مزید اطمینان کے لیے شاستری جی سے عرض کیا۔

اس ڈرامے پر مترجم کا نام نہیں۔

شاستری جی نے پیش لفظ سنایا — اس میں لکھا تھا، اس کا مصنف بڑا کروڑپتی آدمی ہے، اپنے نام و نشان کا اظہار نہیں چاہتا، لہٰذا اس کا نام شامل نہیں کیا گیا۔

اب ڈرامہ کا شائع شدہ دیباچہ نگاہوں کے سامنے آگیا — یا اللہ نامی صاحب نے یہ طول طویل دیباچہ کہاں سے لکھ دیا — اور اب بغیر اس کے اس ڈرامہ کا ثبوت ہی کیا۔ اس کا وجود و عدم برابر ہی ہوگا۔

شاستری جی ٹوٹی پھوٹی ہندی بول رہے تھے۔ ڈرامہ کی ہر بات بھادی، متعدد اشعار سناتے۔ میں سوچتا رہا، اب اس کے دیباچے کی کیا سبیل کیا جائے۔ معاً ذہن میں ایک سوال ابھرا، اور زبان پر آگیا —

میں نے پوچھا۔ شاستری جی آپ کے پاس ڈراموں کے کچھ تذکرے ہوں گے،

جواب ملا نکوی صاحب (نقوی صاحب) میرے پاس ہے۔ دکھاؤں آپ کو، اس ڈرامہ کا اس میں ذکر موجود ہے اور دیباچہ بھی ہے۔

میں نے عرض کیا ضرور دیکھوں گا، نگاہیں روشن ہوگئیں، قلب مطمئن ہوگیا۔ کامیابی اور کامرانی نے مبارک بادیں دینا شروع کیں۔

شاستری جی نے بہت سی کتابیں تہ پٹ کرکے ایک کتاب ہاتھ میں لے کر کہا یہ میری ذاتی اور ضرورت کی کتابیں ہیں، آپ کو دوں گا نہیں، صرف پڑھ لیجیے، دیکھ لیجیے، نقل کر لیجیے۔

میں خاموش تماشائی کی طرح اس کتاب کی طرف دیکھتا رہا، آخر کو شاستری جی نے خورشید کا نام اور اس کا دیباچہ نکالا۔ اس کی فہرست اس طرح پڑھوائی جیسے کوئی ان پڑھ باپ اپنے بیٹے کا خط پڑھواتا ہے۔ وہ پڑھتے رہے، ایدل جی کھوڑ کا نام انھوں نے پڑھا، میں نے وہیں ہاتھ رکھ دیا۔

ستیہ پرکاش مہتاب پسروری
شاہدرہ۔ دہلی

نیا پروگرام

ا	ارادے ہیں پکے یہ سرکار کے	ضرورت کی چیزوں کی قیمت گرے
ن	نیا اور بہتر طریقہ بنے	کہ جس سے اناج اور زیادہ اُگے
د	دن اور رات حاجت ہو جس چیز کی	نہ محروم اس سے رہے اب کوئی
ر	رہے بس کفایت کی جانب قدم	حکومت کا خرچہ بھی ہو کم سے کم
ا	اصولاً زراعت کی ہے جو زمیں	مقرر ہو اس کی بھی حد ہمنشیں
گ	گذشتہ حساب اس کا سب ساتھ ہو	کسی کو زمیں حد سے زیادہ نہ دو
ا	اگر کوئی مزدور ہے بے زمیں	یا کمزور پس ماندہ طبقہ کہیں
ن	نہ محروم کوئی مکاں سے رہے	مکاں کے لیے پھر پلاٹ اک ملے
د	دباؤ یا پٹے کی مزدوریاں	ہو قانون کی رُو سے جرمِ گراں
ھ	ہو قرضہ جو مزدور پر گاؤں کے	نجات ایسے قرضے سے اس کو ملے
ی	یہ قانون اب سخت اتنا بنے	نہ قرضہ کسی کاریگر پر رہے

یہ صفحہ نکالیے شاستری جی۔

شاستری جی نے پڑھنا شروع کیا۔

گجراتی رسم الخط میں اردو کا بعینہٖ وہی دیباچہ تھا، جو ڈاکٹر نامی نے شائع کیا تھا۔

اب محسوس ہوا کہ خورشید ڈرامہ کی دستیابی بغیر اس تذکرے کے لاحاصل ہوتی، اس لیے کہ اردو کے بنیادی ڈرامہ خورشید کے مصنف کا نام، حالات اس تذکرے سے شامل کیے جا سکتے ہیں۔ اور اگر اصل ڈرامہ خورشید کسی کے پاس نہ ہو تو محض اس تذکرے کی روشنی ہی میں ڈرامہ کے متعلق تمام معلومات مہیا کر سکتا ہے۔ شاستری جی سے بہت ردّ و قدح کے بعد وہ تذکرہ حاصل کر پایا۔ دونوں کی قیمت ادا کی اور سلام کرکے واپس ہوا۔ اب مجھے اس کی فکر لاحق ہوئی کہ ڈرامہ کے جو لاتعداد الفاظ گجراتی تھے ان کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے کسی ایسے انجان آدمی سے امداد لی جائے جو ڈرامہ کی دنیا سے نابلد ہو۔

چناں چہ ایک صاحب جو پریس کے مالک ہیں، ان سے امداد لی اور مکمل ڈرامہ کو اردو میں منتقل کیا، اس کے بعد شاستری جی سے بعض حواشی میں مدد لی۔ اس طرح ڈرامہ مکمل ہو سکا۔

مگر تاج صاحب کے اصرار سے مجبور تھا۔ ان کی بزرگی اور شفقتیں میری خاموشی کا سبب بن گئیں۔ ڈرامہ مکمل شائع ہوا، لیکن افسوس کہ بعض لوگوں نے میرا تذکرہ تک نہیں کیا اور اپنے نام سے ہمارے برِصغیر میں بھی شائع کر دیا۔

یہ ہے خورشید کی کہانی۔

آزادی کا ترانہ
"بندے ماترم"

آج ہم آزاد اور ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ وزیر اعظم کے بیس نکاتی پروگرام نے ملک میں ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے۔ اس بات کی زبردست کوششیں کی جا رہی ہیں کہ ترقی اور خوش حالی کا فائدہ عوام کے ہر طبقے کو پہونچے۔

لیکن اس آزادی کے حصول میں کتنی قربانیاں دی گئی ہیں، قید و بند کی صعوبتیں جھیلی گئی ہیں اور پھانسی کے پھندوں کو گلے کا ہار بنایا گیا ہے اس کا اندازہ شاید آج کے نوجوانوں کو پوری طرح نہ ہو۔

آزادی کے لیے تڑپ، لگن اور ولولہ پیدا کرنے میں بنکم چندر چیٹرجی کا ترانہ "بندے ماترم" سر فہرست ہے۔

اگرچہ رابندر ناتھ ٹیگور کے ترانے "جن من گن" کو قومی ترانہ قرار دیا گیا ہے مگر 'بندے ماترم' کو بھی مساوی حیثیت دی گئی ہے۔

مہاتما گاندھی نے ۱۹۳۹ء میں لکھا تھا: "یہ (بندے ماترم) لاکھوں دلوں کی آواز ہے، بنگال اور بنگال سے باہر لاکھوں دلوں کو حب الوطنی کے جذبے سے سرشار کرتا ہے۔" مشہور مورخ ڈاکٹر آر۔ سی مجمدار کے الفاظ میں، "۱۹۰۵ سے ۱۹۴۷ء تک کی طویل اور کٹھن جد و جہد آزادی کے زمانے میں بندے ماترم ہندوستانی محبانِ وطن کا نعرۂ اتحاد تھا۔ ان میں ہزاروں برطانوی پولیس کی لاٹھیوں کی تاب نہ لا کر چل بسے یا بندے ماترم گنگناتے ہوئے تختۂ دار پر چڑھ گئے۔" ۱۹۴۸ء میں جواہر لال نہرو نے کہا تھا: "بندے ماترم ہماری عظیم قومی روایت سے وابستہ ہے اور ہندوستان کا قومی ترانہ بن گیا ہے۔"

"بندے ماترم" کے معنی ہیں، "ماں میں تجھے سلام کرتا ہوں"۔ یہ اس گیت کا پہلا مصرع ہے جو بنکم چندر چٹرجی کے بنگلہ ناول آنند مٹھ میں شامل ہے۔ اگرچہ آنند مٹھ ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترانہ بہت پہلے لکھا گیا ہوگا۔ کتابی شکل میں شائع ہونے سے پہلے آنند مٹھ قسط وار ماہنامہ "بنگ درشن" میں شائع ہوتا رہا۔ مارچ، اپریل ۱۸۸۱ء کے شمارہ میں صفحہ ۵۶-۵۵۵ پر ناول کی پہلی قسط میں چھپا تھا۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ یہ گیت علیحدہ طور پر ۱۸۷۵ء میں لکھا گیا تھا۔ اس کی تصدیق اربندو گھوش کی ایک تحریر سے بھی ہوتی ہے۔

اس ترانے کے خالق بنکم چندر انیسویں صدی کے بنگال کے سب سے زیادہ درخشندہ ستاروں میں سے ایک تھے۔ وہ بڑے قابل اور عالم ہونے کے ساتھ ساتھ مشہور ناول نگار بھی تھے۔ ان کا شمار جدید ادب کے بانیوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ شاعر بھی تھے اور سماجی فلاسفر بھی۔ وہ قوم پرستی کے جذبہ کی تبلیغ کرنے کے ساتھ ساتھ قدیم ہندوستان کے ثقافتی ورثہ پر بھی فخر کرتے تھے۔ اپنی تحریروں میں قوم پرستی کے جذبہ کو اُبھارنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے کورانہ عقیدت اور توہّم پرستی کے خلاف بھی لکھا ہے۔

بنکم کے نظریات لاکھوں عوام کے دلوں میں اچھی طرح گھر کر گئے تھے اور ان سے پوری ایک نسل کے نظریات میں تبدیلی آگئی اور اس نے ان کی پیروی کی۔ تاہم ان کی سب سے اہم خدمت "بندے ماترم" گیت کا تحفہ ہے جس کے ذریعہ ملک کو مادرِ وطن کا نظریہ ملا جسے ماں کی صورت میں پیش کیا گیا۔

مادر وطن کے پیغام کو بطور مشن اور اس جذبے کی پرچار کی غرض سے ۱۹۰۵ء میں شمالی کلکتہ میں بندے ماترم تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔ ہر اتوار کو انجمن کے ممبر بندے ماترم گاتے ہوئے جلوس کی شکل میں جاتے تھے اور عوام کی جانب سے مادر وطن کی آزادی کے لیے عطیات قبول کرتے تھے۔ بعض مرتبہ اس تنظیم کے جلوسوں میں رابندر ناتھ ٹیگور بھی شامل ہوئے۔

۲۰ مئی ۱۹۰۶ء کو باری سال (یہ اب بنگلہ دیش میں ہے) میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک بے مثال جلوس بندے ماترم گاتا ہوا شہر کے اہم راستوں سے گزرا۔ اس جلوس میں لاکھوں افراد شریک تھے۔

بندے ماترم کے ترانے اور گانے کے اثر سے گھبرا کر اس وقت کے برطانوی حکمرانوں نے اسے پھیلنے سے روکنے کے لیے انتہائی ظالمانہ اقدامات کرنے شروع کر دیے۔ نئے قائم شدہ مشرقی بنگال کے صوبے کی حکومت نے گشتی مراسلے بھیجے، جن میں اسکولوں اور کالجوں میں یہ نعرہ لگانے پر پابندی عاید کی گئی تھی۔ سیاسی تحریکوں میں شامل ہونے والے طلبار کو سرکاری ملازمت حاصل کرنے پر پابندی لگانے کی دھمکی دی گئی تھی۔

نومبر ۱۹۰۵ء میں رنگ پور (بنگال) کے ایک اسکول کے دو سو طلبار پر بندے ماترم کا نعرہ لگانے کے الزام میں پانچ روپے فی کس کے حساب سے جرمانہ عاید کیا گیا۔ بنگال کی تقسیم اور سودیشی تحریک کا جلد ہی پورے ہندوستان میں ردِ عمل ہوا اور پورے ملک میں حب الوطنی کے جذبات بھڑک اُٹھے۔

حقیقت یہ ہے کہ بنکم کو پہلے ہی سے اس امر کا علم ہو گیا تھا کہ ایک دن ان کا ترانہ بندے ماترم اہم رول ادا کرے گا۔ [کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی سب سے بڑی بیٹی سے کہا تھا کہ ایک دن ان کا ترانہ پورے ملک میں انقلاب پیدا کر دیگا]۔

نومبر ۱۹۰۶ء میں دھولیا (مہاراشٹر) میں ایک بڑی میٹنگ کا اہتمام کیا گیا

تھا۔ یہاں بھی بندے ماترم کی صدائیں بلند ہوئیں۔ ۱۹۰۸ء میں بیلگام (کرناٹک) میں لوکمانیہ تلک کو مانڈلے (برما) میں منتقل کیے جانے والے دن بھی ایک زبانی حکم کے تحت یہ نعرہ لگانے پر پابندی عاید کی گئی تھی، اس کی خلاف ورزی کرنے پر پولیس نے بہت سے بچوں کو زدوکوب کیا اور بے شمار افراد کو گرفتار کر لیا۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں بندے ماترم کا گیت باغیانہ ہندوستانی قوم پرستی کا نعرہ بن گیا تھا۔ گرودیو ٹیگور نے ۱۸۹۶ء میں کانگریس اجلاس کے موقع پر بندے ماترم گایا تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے ہی اس گیت کی موسیقی دی تھی۔ ٹیگور نے ۱۹۰۶ء کے کلکتہ کانگریس اجلاس میں بھی اس گیت کو دوبارہ گایا۔ ۱۹۰۵ء کے بنگال میں تقسیم مخالف اور سودیشی تحریکوں کے طوفانی ایام میں بھی یہ گیت اپنی کشش سے پورے ہندوستان میں نہایت تیزی سے پھیلا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے وارانسی اجلاس میں اس نغمہ کی دوسری سطر کو سات کروڑ بنگالیوں سے تیس کروڑ ہندوستانیوں میں تبدیل کر کے تمام ہندوستانی تقاریب کے لیے منتخب کر لیا گیا۔

بندے ماترم کو شاید سیاسی نعرے کی حیثیت سے پہلی بار ۷ اگست ۱۹۰۵ء میں اس وقت استعمال کیا گیا تھا جب عام طبقوں پر مشتمل ہزاروں طلبا بندے ماترم اور دوسرے فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے ایک جلوس کی شکل میں کلکتہ ٹاؤن ہال کی جانب روانہ ہوئے تھے جہاں ایک عظیم الشان تاریخی میٹنگ منعقد ہو رہی تھی۔ اسی میٹنگ میں بنگال کی تقسیم مخالف تحریک کا آغاز کرتے ہوئے غیر ملکی اشیاء کے بائیکاٹ کی مشہور قرارداد بھی پاس کی گئی تھی۔ اس کے بعد جو واقعات بنگال میں رونما ہو رہے تھے اس سے کل ہندوستان میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ ۱۹۰۶ء میں نئے تشکیل شدہ مشرقی بنگال صوبہ کے باری سال مقام پر بنگال صوبائی کانفرنس ہوئی تھی تو اس وقت عوامی مقامات پر بندے ماترم کا نعرہ لگانے میٹنگ کے انعقاد پر پابندی عائد کر دی گئی تاہم مندوبین نے پھر بھی بندے ماترم کے نعرے بلند کیے اور پولیس کے ظلم و ستم کا سامنا کرنے کو ترجیح دی۔ ایک مشہور قوم پرست رہنما منورنجن گوہا ٹھاکرتہ کے بیٹے چترنجن کو پولیس نے بے رحمی سے زدوکوب کیا اور اسے ایک تالاب میں پھینک دیا لیکن وہ اس وقت تک بلا خوف بندے ماترم کا نعرہ لگاتا رہا جب تک کہ وہ بے ہوش نہیں ہو گیا۔

لاہور میں مئی ۱۹۰۷ء میں نوجوانوں نے راولپنڈی میں سودیشی تحریک کے رہنماؤں کی گرفتاری کے خلاف احکامات کی پروا نہ کرتے ہوئے بندے ماترم کے نعرے لگا کر احتجاج کیا اور پولیس کے بے رحم ہاتھوں سے ظلم و ستم کا مقابلہ کیا۔

تیوتی کرن (تامل ناڈو) کورل ملز کے ایک ہزار کارکنوں نے ۲۷ فروری ۱۹۰۸ء کو سودیشی اسٹیم نیویگیشن کمپنی کی ہمدردی اور کارکنوں کے تئیں حکام کے ظالمانہ اقدامات کے احتجاج کے سلسلہ میں کام کرنا بند کر دیا۔ اس کمپنی کو برطانوی ملکیت والی شپنگ کمپنیوں سے سخت مقابلہ کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا تھا۔ کارکن رات گئے تک بندے ماترم کا نعرہ لگاتے ہوئے گلیوں میں گھومتے رہے۔ نئی دہلی کی گلیوں میں مشتعل ہجوم نے برطانوی کمپنیوں کو گھیر لیا اور انھیں بھی بندے ماترم کا نعرہ لگانے والوں میں شریک ہونے پر مجبور کر دیا۔ جون ۱۹۰۸ء میں لوکمانیہ تلک کے مقدمہ کے دوران ہزاروں افراد بمبئی کے پولیس کورٹ کے سامنے جمع ہو گئے اور انھوں نے بندے ماترم کے نعرے لگائے۔ ۲۰ جون ۱۹۱۴ء کو نظربندی سے رہا ہونے پر لوکمانیہ تلک کو پونے میں ایک پُرتپاک استقبالیہ دیا گیا، حاضرین تلک کے بیٹھنے کے کئی منٹ بعد تک بھی مسلسل بندے ماترم کے نعرے لگاتے رہے۔

اس طرح بندے ماترم کا نعرہ اور نغمہ ہندوستانی قوم پرستی کا ایک نعرہ بن گیا تھا۔ موتی لال نہرو نے ۱۶ نومبر ۱۹۰۷ء کو اپنے بیٹے جواہر لال نہرو کے نام جو کہ اس وقت ہیرو انگلستان میں زیر تعلیم تھے، لکھا تھا "ہم برطانوی ہندوستانی تاریخ کے ایک نہایت نازک دور سے گذر رہے ہیں۔ بندے ماترم الہٰ آباد تک میں دعا و سلام کا ایک عام ذریعہ بن گیا ہے۔ اگر یہ تحریک اسی طرح جاری رہی تو تم اپنی واپسی پر اس ہندوستان سے جس کو تم نے چھوڑا تھا ایک بالکل مختلف ہندوستان پاؤگے۔"

جولائی ۱۹۰۹ء میں مشہور انقلابی مدن لال ڈھینگرا کو ایک برطانوی کو گولی سے اڑا دینے کے جرم میں انگلستان میں پھانسی دے دی گئی تھی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ اس نے ہندوستانی نوجوانوں کی ظالمانہ جلاوطنی اور انھیں پھانسی دینے کے خلاف یہ ایک ادنیٰ احتجاج کیا ہے۔"

ڈھینگرا نے اپنی سزا سے پہلے جو الفاظ کہے وہ یہ تھے "اے بھگوان میری تجھ سے صرف یہی پراتھنا ہے کہ میں اس ماتا سے دوبارہ جنم لوں اور پھر میں اس مقدس مقصد کے لیے دوبارہ اپنی جان دوں۔" اور جب وہ پھانسی کے تختہ پر چڑھے تو ان کے لبوں پر آخری الفاظ تھے "بندے ماترم"۔

اس گیت کو لکھے ایک سو برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ مگر اب بھی دلوں کو گرما دیتا ہے۔ اس نغمے کا پہلا بند یوں ہے:

بندے ماترم
سجالم سپھلام، ملایا جا شیتلام
شسیہ شیاملم، ماترم
شبھرا جیوتسنا، پُلکت یا منم
پھل کسومت، دُرم دلا شوبھم
سہاسنم سمدھر، بھاشنم
سکھدام وردام ماترم!

عظیم اقبال
گنج ا، بتیا (بہار)

اندیشہ

آخرکار رخصتی کا وقت آگیا۔

نشاط کی گھڑیاں ختم ہوگئیں۔ ماتم کے شادیانے بج اٹھے۔ سکینہ کو عورتوں نے گھیر لیا۔ اماں نے اسے گلے سے لگایا۔ ان کا نحیف جسم کانپ رہا تھا، لہجے میں سارے جہاں کا درد سمٹ آیا تھا۔

"وہی تمہارا خدا ہے، اسی کے قدموں کے نیچے تمہاری جنت ہے۔ اس کی رضا، اس کی خوشنودی کو اپنا ایمان بنانا، میری بچی! اپنے سرتاج کو ہمیشہ خوش رکھنا۔"

گلوگیر آواز میں اماں دعائیں دے رہی تھیں۔ سکینہ کا بلکنا کم نہیں ہو رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بہنیں دامن سے لپٹ گئیں۔ سہیلیوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ اپنے پرائے سب کے چہرے اداس ہو گئے۔ گانے والیوں نے بابل کا گیت چھیڑ دیا۔ یہ رشتہ اماں کے لیے راحتِ جان بن گیا۔ سکینہ کے ابا کچھ جھجک رہے تھے، لیکن بیگم کے سامنے ان کی ایک بھی نہ چلی۔

"شادی بیاہ قسمت کی بات ہے، پروردگار کی مرضی کے خلاف ایک پتہ تک نہیں ہل سکتا۔ مستقبل کا اللہ مالک ہے۔ واہیات خرافات سوچ کر ہلکان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ لڑکی سیانی ہو گئی۔ اسے کب تک کلیجہ پر بٹھائے رکھیں گے۔ پھر یہ معاملہ یہیں ختم تو نہیں ہوتا، اور بھی بیٹیاں ہیں۔ ان کی فکر بھی کرنی ہے۔"

جب سکینہ اپنے نئے گھر کی چوکھٹ میں داخل ہوئی۔ مشکل سے اس کی عمر سوا سترہ کی ہو گی۔ فاروق کی یہ تیسری شادی تھی، پہلی بیوی اپنی کوئی نشانی چھوڑے بغیر داغِ مفارقت دے گئی۔ دوسری سے پانچ بچے پیدا ہوئے۔ کچھ رینگتے ہوئے راہِ عدم سدھارے۔ باقی ہنس بول کر دعاؤں تعویذوں کے اثر سے فیروز بچ گیا تھا۔ فاروق کی دوسری بیوی کی یادگار۔ سکینہ چھوٹے سے فیروز کو پاکر کافی نہال ہوئی۔ کوئی اور غم گسار تو وہاں تھا نہیں۔ سارے ماحول پر گھٹن چھائی تھی، آنگن سونا سونا تھا، دیواریں ویران تھیں، اکیلا پن محسوس ہوتا تھا۔ شروع میں ماں باپ سے بچھڑنے کا بہت رنج ہوا تھا اسے۔ لڑکیوں کی یہی تو قسمت ہے۔ سب کا پیار، سب کی محبت چھوڑ کر سسرال آنا پڑتا ہے۔ بچپن میں سکھیوں کے ساتھ اگنت بار کتنے چاؤ سے گڑیوں کا بیاہ رچاتی تھی وہ، گھروندے بجتے تھے، باجے گاجے کے ساتھ بارات نکلتی تھی، خوب دھما چوکڑی مچتی، اور جب اس کی اپنی شادی ہوئی تو اس کی آنکھوں سے گنگ وجمن کی دھاریں مچلتی اٹھلاتی اس کے رخساروں پر رواں رہیں۔ فاروق کی بانہوں میں آکر سہمی سہمی سی وہ پلکیں موندے ہوئے کانپتی رہی تھی۔ فاروق نے اس کی ٹھوڑی اٹھائی۔ اسے پیار کیا، گدگدایا، ہزار قسمیں دلانے پر اس نے پلکوں کی چلمن ہٹائی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ لڑکیاں وقت سے پہلے ہی باشعور ہو جاتی ہیں۔

پھر بھی عجیب سا لگتا کہ فیروز جیسے اس کے اپنے چھوٹے چھوٹے بھائی تھے جن کے ساتھ وہ اچھلتی کودتی رہتی تھی۔ فیروز اسے اماں کہہ کر پکارتا تو وہ چونک جاتی، پیچھے مڑ کر دیکھنے لگتی گویا اسے نہیں کسی اور کو مخاطب کیا گیا ہو۔ اپنی اس نادانی پر اکثر ہنس پڑتی تھی۔ فاروق کی داڑھی مونچھوں میں سفیدی کی لکیریں پھیل رہی تھیں۔ انھیں خضاب سے چھپانا پڑتا۔ سر میں گنجے پن کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ جانے کیوں فاروق کی باتوں سے سکینہ کو محبت کی بجائے شفقت کی مٹھاس ملتی۔ ان کے سامنے خود کو وہ بالکل بے بس پاتی، ان کی کسی بات سے انکار کر دینا ممکن ہی نہ تھا۔ بے چون وچرا ان کی ہر تجویز مانتی رہتی۔ مرد کو عورت سے اور کیا چاہیے۔ فاروق اس کے بھولپن پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتے۔ سکینہ کی قربت میں اس کی پچھلی ازدواجی زندگی کے سارے نقوش دھندلے ہوتے گئے۔ البتہ فیروز کو دیکھ کر یادوں کے چراغ جھلملا اٹھتے تھے۔ سکینہ خود معصوم تھی۔ فیروز کی پیاری پیاری باتوں میں کھو جاتی۔

"آپ میری نئی امی ہیں نا؟ وہ امی تو روٹھ کر چلی گئیں، مجھے کتنا پیار کرتی تھیں۔" اس کی آواز بھرا جاتی۔

"میں بھی تو تمہیں بہت پیار کرتی ہوں بیٹے!" وہ اسے آنچل میں چھپا لیتی۔

"تم نہیں روٹھو گی نا؟" وہ سسک کر پوچھتا۔

"نہیں میرے لال!" وہ کلیجہ مسوس لیتی۔

نئی ماں کے ساتھ فیروز گھل مل گیا۔ سکینہ ہر طرح سے اس کی دلجوئی کرتی۔ اپنے ہاتھوں سے اسے کھلاتی پلاتی، بناتی سنوارتی، فاروق سکینہ کی یہ محبت دیکھ کر بے حد خوش تھے۔ سوچتے ماں بیٹے کا پیار کاش یونہی برقرار رہے۔ سوتیلی ماں کتنی بدنام ہوتی ہے۔ فیروز کی یہ ماں کتنی مختلف ہے۔ لگتا ہے اس کی اپنی کوکھ نے اسے جنم دیا ہے۔

سکینہ گھر کا سارا کام کاج خود کرتی تھی۔ رات میں دیر تک فاروق کے پیر دابتی رہتی۔ فاروق صبح سے شام تک کمانے کی دھن میں لگے رہتے بازار میں تیل مسالہ کی ان کی چھوٹی سی دکان تھی۔ دن بھر گاہکوں کے ساتھ سر کھپانے کے بعد آرام کے یہ اوقات بڑی نعمت تھے۔ سکینہ کے ہاتھوں کی لوچ، حرارت، نرمی سب فاروق کے پیروں میں تحلیل ہونے لگتی۔ اس گھڑی سکینہ کے ذہن میں اماں کی باتیں ــــــ انہیں کے قدموں کے نیچے تیری جنت ہے، بار بار گونجتی رہتیں۔ وہ اور چاؤ سے انگلیوں کو جنبش دیتی۔ فاروق اسے اپنے پہلو میں گھسیٹ لیتے۔

شادی کے سال بھر بعد سکینہ کو چاند سی بچی پیدا ہوئی، اسے دیکھ کر وہ کھل اٹھی، اس کا رواں رواں ناچنے لگا۔ کون جانتا تھا یہ خوشی کی گھڑیاں کبھی کبھی کس قدر پُر فریب ثابت ہوتی ہیں۔ دو ماہ بعد ہی بچی دارِ فانی سے کوچ کر گئی۔ سکینہ بین کرتی رہی، سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ فاروق بھی غمزدہ تھے لیکن سکینہ کا بلکنا نہ دیکھ سکے۔ اسے سمجھانے لگے۔

"زندگی اور موت پر کس کا اختیار ہے پگلی! جس نے دیا تھا، اس کی امانت تھی، اس نے واپس لے لیا، روتی کیوں ہو؟ اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اس نے چاہا تو تیری گود کبھی خالی نہیں رہے گی۔"

اور پھر یوں ہوا کہ ہر سال، ڈیڑھ سال، دو سال بعد سکینہ کی گود بھرنے لگی۔ سب کی سب لڑکیاں ہی تھیں، گھر میں چیخم دھاڑ مچی رہتی، کوئی ادھر رو رہا ہے، کوئی ادھر چلا رہا ہے، اس نے اسے مارا، وہ گر پڑی، پیشانی پر سخت چوٹ لگی، خون نکل آیا، اسے نہلانا ہے، اس کے کپڑے صاف کرنے ہیں، وہ بیمار پڑی ہے، دوا پلانی ہے، پرہیزی پکانا ہے، کبھی کبھی سکینہ رو پڑتی، قسمت کو کوسے دیتی، بچوں کو پیٹنے لگتی، خود کئی طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو گئی تھی، سر ہمیشہ دکھتا رہتا، آنکھوں کی روشنی بھی کم ہو چلی تھی، نگاہوں میں دھندلاہٹ سمائی رہتی، انگ انگ ٹوٹتا رہتا، ہسپتال میں کئی بار دکھایا تھا، ڈاکٹرنی کہتی تھی زنانہ مرض ہے۔ بچوں والی ماں کو ہوتا ہی ہے۔ مزے میں کھاؤ پیو، ٹھیک ہو جاؤ گی۔ فاروق کبھی چپکے سے دو تین نارنگیاں لا دیتے۔ وہ چھیل کر بچوں میں تقسیم کرنے لگتی۔ اس کے حصے میں چند قاشیں ملتیں۔ فاروق کو سکینہ کی یہ عادت پسند نہ تھی۔ اکثر تنبیہ کر چکے تھے۔

سکینہ کہتی۔

"یہ مجھ سے نہیں ہو گا جی! میں کچھ کھاؤں اور بچے منہ تاکتے رہیں۔"

"ان کے سامنے کھاتی ہی کیوں ہو؟"

"چھوڑیے جی! یہ اپنے ہی جگر کے ٹکڑے تو ہیں۔ پچھلی بار آپ نے خضاب کب لگایا تھا، داڑھی سے بڑھاپا جھانک رہا ہے۔" شرارت سے وہ مسکرانے لگتی، فاروق پشیمان ہو جاتے۔

اٹھائیس، انتیس برس کی عمر میں سکینہ کے چہرے پر جھریاں پڑنے لگی تھیں، کام سے اب جلد ہی تھک جاتی، دم پھولنے لگتا، ذرا دیر کو بیٹھتی تو ریڑھ کی ہڈی میں چنگاریاں سلگ اٹھتیں، ہاتھ پاؤں جلتے رہتے، کھانستی بھی تھی، اس کے بطن سے چھ لڑکیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ سب سے بڑی لڑکی جمیلہ دس گیارہ سال کی تھی۔ ماں کا دکھ درد محسوس کرتی تھی، ساتھ ساتھ کام کاج کرتی تھی، چھوٹی بہنوں کا بھی خیال رکھتی تھی۔ سکینہ کو کچھ راحت ملتی، سوتے بیٹھتے اسے جمیلہ کی شادی کی فکر ستاتی تھی۔ جمیلہ کے اعضا تیزی سے بڑھنے لگے تھے۔ ماں کے کندھے کے برابر اس کا قد ہو گیا تھا۔ بڑے چاؤ سے سکینہ اس کی چوٹی گوندھتی تھی۔ سوچتی میری بیٹی اب پیا کے گھر جانے کے لائق ہو گئی ہے۔ اکثر اسے سمجھانے لگتی۔

"سسرال جا کر ساس سسر کی خدمت سے نہ چوکنا، شوہر کے قدموں کے نیچے تیری جنت ہے۔ اس کی رضا، اس کی خوشی کا سدا خیال رکھنا، عورت ذات مرد کی سیوا کے لیے ہی بنائی گئی ہے۔ اپنے مرد کو کبھی ناراض نہ کرنا۔"

جمیلہ چپ چاپ ماں کی باتیں سنتی رہتی۔ اس کا جی چاہتا پوچھے۔

"یہ شادی کیوں ہوتی ہے؟ لڑکیاں پرائے گھر کیوں جاتی ہیں؟ ماں تمہیں چھوڑ کر میں کیسے جا سکوں گی، مجھے مت الگ کرنا۔ میں تو تمہاری خدمت کروں گی، تم بیمار رہتی ہو، کمزور ہو گئی ہو، گھر کا اتنا سارا کام تم سے اکیلے نہیں ہو سکے گا۔"

دم سادھے وہ بیٹھی رہتی۔ ذہن میں خیالات کی لہریں نمودار ہوتیں، پھیلتیں اور معدوم ہو جاتیں۔

فاروق ذرا چڑچڑے ہو گئے تھے، بات بات میں بگڑ جاتے، دکانداری اتنی چلتی نہیں تھی، آمدنی کم ہوتی تھی، اخراجات روز بروز بڑھتے جا رہے تھے، کھسیانے ہوتے تو خوب چیختے۔

"ایک آدمی کمانے والا، ایک درجن کھانے والے، مجھے مار ڈالو، یہ بوجھ مجھ سے نہیں اٹھایا جاتا ــــــ یا اللہ رحم کر!"

مستقبل کی ساری امیدیں فیروز سے وابستہ تھیں۔ فیروز امسال گریجویٹ ہو رہا تھا۔ اس کے بعد معاش کی ترددات یقیناً کم ہو جائیں گی اٹھتے بیٹھتے فیروز کی درازیٔ عمر کے لیے فاروق دعائیں مانگتے رہتے۔ سکینہ نے بھی نفلیں پڑھ کر دعائیں مانگیں تھیں۔ فیروز بہت سمجھداری سے حالات کا جائزہ لیتا تھا۔ ارد گرد جب وہ پراگندگی دیکھتا، اس کی طبیعت مضمحل ہو جاتی۔ عجیب عجیب طرح سے سوچتا تھا وہ، کیوں اور کیسے کی کھوج اسے لگی رہتی تھی۔ اس کے عزائم میں پختگی تھی، مضبوط قوتِ ارادی کا مالک تھا۔ بہنوں سے اسے خاص لگاؤ تھا۔ فرصت نکال کر انہیں پڑھاتا لکھاتا تھا۔ سکینہ کا احترام جی جان سے کرتا تھا، وہ بھی اسے بہت عزیز رکھتی تھی، پھر بھی اس کی ایک دیرینہ تمنا تھی اس کی اپنی کوکھ سے ایک لاڈلا پیدا ہو۔

"بیٹیاں تو اتنی ساری پیدا ہو گئیں۔ اے مولا ایک بیٹا بھی دے۔ اپنی بخششوں سے مجھے مایوس نہ کر۔" اکثر عاجزی سے خدا کے حضور وہ گڑگڑاتی

تھی۔

اس بار ساون کی گھٹائیں خوب منڈلا کر آئیں۔ سوکھے علاقے میں بارش جھما جھم ہوئی۔ اُداس چہروں پر رونق آ گئی۔ یہ پروردگار کی رحمت کی جانب اشارہ تھا۔ انھیں دنوں سکینہ کے ناتواں جسم نے ایک سُرخ سپید بچہ تخلیق کیا۔ سکینہ نہال ہو گئی۔ برسوں کی اس کی آرزو پوری ہو گئی تھی۔ بچہ کو اچھال اچھال کر اس نے دیکھا۔ کیسا سندر مکھڑا تھا۔ چوڑے ماتھے پر گھنگھرالے بالوں کے گچھے جھکے پڑ رہے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ یہ سوچ کر اس نے جمیلہ کو آواز دی تھی۔

"ننھے کو کاجل کا ایک ٹیکہ لگا دینا بیٹی!"

ننھے کی پیدائش کے سوا مہینے بعد وہ گھر گرہستی میں لگ گئی۔ جمیلہ منع کرتی لیکن سکینہ کو کام کرنے کی عادت تھی۔ اس کے بغیر چین ہی نہیں ملتا تھا۔

اُس رات گرمی زوردار تھی، ہوا بالکل بند تھی، اُمس نے گھٹن پھیلا رکھی تھی۔ شدت سے چاہتے ہوئے بھی سکینہ پہلو نہ بدل سکی۔ ابھی ابھی ننھے نے رونا بند کیا تھا اور اس پر غنودگی چھائی تھی۔ سکینہ دھیمے سروں میں لوریاں گاتی جا رہی تھی۔ ننھا اس کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ اسے تھپکیاں دے رہی تھی۔ ننھا زیادہ روتا بسورتا تھا۔ دوسرے بچوں نے سکینہ کو اتنا تنگ کبھی نہ کیا تھا۔ پھر بھی ننھے کے لیے سکینہ کا پیار اُمڈتا رہتا۔ اس کے لیے کیسے کیسے خواب وہ دیکھ چکی تھی۔ ایک کروٹ پڑے پڑے گھنٹوں گزر جاتے۔ کمر اکڑ جاتی۔ تھپکیوں سے اس کے ہاتھ دکھنے لگتے۔ مسلسل لوریاں سنانے سے حلق میں کانٹے چبھنے لگتے۔ پانی کے چند گھونٹ پینے کی خواہش ہوتی، لیکن خدشہ رہتا کہ ہلنے ڈلنے سے ننھا جاگ اٹھے گا۔ ذرا سا کسمسانے کا موقع بھی نہیں مل پاتا۔ کبھی اسی عالم میں رات کٹ جاتی، صبح میں تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں موندتی۔ گہری سانسیں لیتی، اعضا ڈھیلے پڑ جاتے، بوجھل ذہن کو سکون ملتا، اور پھر دیکھتے دیکھتے ننھا کُلبلانے لگتا۔

صبح دم اس کی آنکھ لگی تھی، یک بیک شور و غل ہوا، ننھا جاگ پڑا، وہ بھی اٹھ گئی۔ آفتاب کی کرنیں ہر طرف پھیل رہی تھیں، ننھا چیخنے لگا، وہ چُپ کرانے لگی۔ جمیلہ دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی۔

"اماں! اٹھیے، اٹھیے، بھائی جان پاس کر گئے!" مسرت سے اس کی آواز کانپ رہی تھی، اس کا تنفس تیز ہو گیا تھا۔ پیچھے لپکتے ہوئے فیروز آیا، دو اور بہنیں آئیں۔ فیروز نے جھک کر ننھے کو گود میں لے لیا۔ وہ بدستور روئے جا رہا تھا۔

"جمیلہ! ننھے کو باہر لے جاؤ، تم ادھر آؤ، بیٹھو بیٹا!"

شفقت سے سکینہ نے فیروز کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"تم ہی تو اب ہماری امید ہو، کمانے لگو گے تو تمہارے ابا کا بوجھ کم ہو جائے گا۔ بوڑھے ہو گئے ہیں، محنت کر نہیں سکتے۔ تمہاری کامیابی کے لیے ہم نے کتنی دعائیں کی تھیں!"

فیروز سر جھکائے خاموشی سے بیٹھا رہا۔

"ہماری سب سے پہلی ذمہ داری جمیلہ کی شادی کرنی ہے۔ جلد سے جلد اس فرض سے سبکدوش ہونا ہے۔ کئی جگہ ذکر کر چکی ہوں۔ تم کہیں نوکری دھر لو تو بات بنے۔"

ایک پل کے لیے فیروز نے سر اٹھایا۔ اس کے لب ہلے۔

"اماں! گھبرانے کی کیا بات ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے جمیلہ کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔ بارہ، تیرہ سال سے زیادہ کی نہیں ہو گی۔ اتنی کم عمری میں بیاہ کے بارے میں سوچنا بے کار کی بات ہے۔"

"نہیں بیٹے! تم نہیں سمجھو گے، یہ صرف ماں کا دل جانتا ہے۔ اس کی اسی سال ہو جاتے تو اچھا ہو۔"

"نہیں نہیں! وہ ابھی پڑھے گی لکھے گی۔ میں اُسے دوزخ میں ڈھکیلنا نہیں چاہتا۔"

"کیا مطلب؟"

"اماں!"

یک لخت وہ خاموش ہو گیا، لیکن اس کی خاموشی کی زبان گویا کہہ رہی تھی ــــ "آئینہ میں اپنی صورت دیکھیے، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہیں، گال دھنس گئے ہیں، جھریوں کا جال بنتا جا رہا ہے۔ زمانہ کی کتنی کربناک نشانیاں یہاں ابھا گر ہیں۔ کیا آپ چاہتی ہیں آپ کی طرح جمیلہ بھی سکھ کے سپنے تک دیکھنا بھول جائے، جیتے جی اس کی زندگی عذاب بن جائے؟ ذرا سوچیے نا! یہ آپ کی زندگی کسی جہنم سے کم ہے کیا؟"

اسی دم سکینہ کو ایسا محسوس ہوا اس کی دکھتی رگیں فیروز نے پکڑ لی ہوں۔ اب تک اس کی جانب دیکھتی رہی، وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن کیا؟ وہ نہیں سمجھ رہی تھی کیا کہے، کیا جواب دے، شاید اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی تھی۔

"میں بچپن کی شادی کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ بچپن کی شادی کا رواج اخلاقی اور جسمانی لحاظ سے ایک برائی ہے۔"

ــــــــــ (مہاتما گاندھی)

"دیہاتوں میں بچپن کی شادی کے رواج کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے"

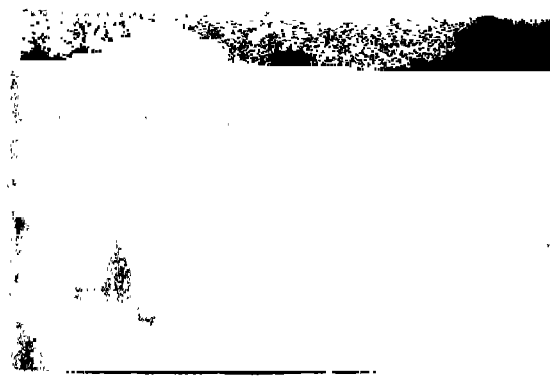
ــــــــــ (شریمتی اندرا گاندھی)

گاؤں میں شہروں کے مقابلے میں بچپن کی شادی کا رواج زیادہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۹۷۱ء میں گاؤں میں جتنی شادیاں ہوئی تھیں ان میں ۱۹.۳ فی صد لڑکیوں کی عمر ۱۰ سے ۱۴ سال کے درمیان تھی۔ شہری علاقوں میں یہ تناسب ۱.۴ فی صد تھا۔

عزیر احتشام الرحمن، شعبۂ انگریزی دیش بندھو کالج، نئی دہلی

انسان اسکول — ایک تجربہ

[اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کچھ جیالے لوگ شاہراہِ عام سے ہٹ کر اپنی الگ راہ بناتے ہیں۔ ابتدا میں ایسے لوگوں کو نیک نامی ملتی ہے اور نہ ہی ان کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ مگر یہ دھن کے پکے اپنے راستے پر چلتے جاتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ان کا طریقہ زیادہ اچھا تھا ہمارے سامنے ایسے بہت سے ادارے ہیں جو شروع میں بظاہر معمولی اور غیر اہم دکھائی دیتے تھے مگر اب وہ قوم کے عظیم کارناموں میں شمار ہوتے ہیں۔ انسان اسکول کا تجربہ ایسے ہی امکانات کا حامل ہے۔
اگر آپ کے علاقے میں ایسے ادارے ہوں تو ان کے بارے میں لکھیے ہم شائع کریں گے ——— (ایڈیٹر)]



انسان اسکول کیمپس کا ایک حصہ

"ملک میں تعلیم کو گھر گھر پہنچانا ہے۔ ساتھ ہی اس کے معیار کو اونچا بھی کرنا ہے۔ یہ کام بہت بڑا اور مشکل ہے۔ اس راہ میں صرف حکومت کی کوششیں کافی نہیں ہیں۔ حکومت کی کوششوں کے ساتھ ساتھ دوسرے افراد اور جماعتوں کو بھی رضاکارانہ طور پر سرگرم ہونے کی ضرورت ہے۔ ہمارے خیال میں ہر اچھے شہری کو تعلیم کی توسیع اور اس کا انتظام اپنا فرض سمجھنا چاہیے۔" یہ جملے ڈاکٹر سید حسن نے مارچ ۱۹۶۶ء میں کہے تھے۔ اپنے ایک بلیٹن کے ذریعہ جو "تعلیمی برادری" کے نام سے شائع کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں بہت سارے خطرات سے آگاہ کیا تھا تعلیم کا معیار گر رہا ہے۔ ہمارا تعلیمی ڈھانچہ ہماری ضرورتوں کے مطابق نہیں، تعلیم یافتہ افراد ہاتھ سے کام کرنے کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اچھی تعلیم بڑے شہروں اور مرکزوں میں محدود ہو گئی ہے۔ تعلیم صرف حکومت کی کوششوں سے نہیں پھیل سکتی۔ اس طرح کی بہت سی باتوں کے بارے میں ڈاکٹر حسن اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ آپ نے لکھا تھا —— "ذی علم، ذی حیثیت، انسان دوست اور قوم پرست حضرات! ہماری تعلیمی حالت آپ کی توجہ چاہتی ہے۔ تعلیم کا مسئلہ بہت گمبھیر مسئلہ ہے۔ صرف حکومت سے آس نہ لگایئے۔ صرف اس کا سہارا نہ ڈھونڈھیے۔ یہ ہم سب کا مسئلہ ہے۔ ہمیں اپنے مسئلے کا حل خود بھی تلاش کرنا چاہیے۔" ڈاکٹر حسن کی اس التجا میں کوئی تصنع نہ تھا اس لیے خود آگے بڑھے اور ایک مثال قائم کی۔

فروسٹ برگ امریکہ کے ایک کالج کی آرام و آسائش اور معقول تنخواہ کو تج کر انہوں نے کشن گنج، پورنیہ، بہار کو محور مان کر تعلیم و تربیت کے میدان میں تجربہ کرنے کی ٹھانی ہے۔ تعلیم کے سلسلہ میں سوتے ہوئے احساس کو جگانا ہے۔ اسی انفرادی عزم کا نتیجہ ڈاکٹر سید حسن کی پورنیہ کی سکونت ہے۔ اسی رضاکارانہ کوشش کی عملی شکل 'انسان اسکول' ہے — خواب اور حقیقت کی ملی جلی شکل۔ ایک ایسا خواب جو ۲۵ سال قبل دیکھا گیا تھا۔ ۱۴ نومبر ۱۹۶۶ء کو یومِ اطفال کے موقع پر ایک پسماندہ علاقے میں بچوں کو سب سے عمدہ تحفہ۔ تعلیم و تربیت دینے کا کام شروع ہوا۔ بے سروسامانی کا عالم تھا۔ پڑھنے پڑھانے کے لیے نہ کوئی جگہ تھی اور نہ کوئی فرنیچر۔ بس ایک دل کی لگن تھی سو وہی کام آئی۔ وقت بدلتا ہے۔ حالات بدلتے ہیں۔ انسان اسکول جو کل تھا وہ آج نہیں ہے

سید حسن کے بچپن کا ایک حصہ بہار کے ایک پسماندہ دیہات میں گذرا۔ اس کا بیشتر حصہ دہلی کے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ماحول میں گذرا جہاں اُن کے شفیق اساتذہ میں سرِ فہرست ڈاکٹر ذاکر حسین (مرحوم) رہے۔ ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب وغیرہ نے بھی اپنے اس شاگرد کی طرف خاص توجہ کی۔ میٹرک پاس کرتے ہی سید حسن نے جامعہ میں پڑھانا شروع کر دیا۔ ۴۶ء میں بی اے کیا، پھر مدراس جا کر ۴۹ء میں وائی ایم سی اے کالج آف فزیکل ایجوکیشن سے ڈپلوما لیا۔ ۵۵ء میں امریکہ کی لنکن یونیورسٹی سے ۴۷ کریڈٹ پوائنٹس حاصل کیے۔ پھر سدرن الی نوائے سے ۵۷ء میں ایجوکیشن میں ایم ایس اور ۶۵ء میں تعلیم کے میدان میں ہی پی ایچ ڈی مکمل کی۔ اسناد کی اس فہرست کے علاوہ سید صاحب کو پڑھانے کا تجربہ تقریباً ساری عمر کا ہی ہے جامعہ کے ابتدائی سے لیکر امریکہ کے ایم ایس تک کے طلبا نے آپ سے استفادہ کیا ہے۔ انتظامی تجربہ جامعہ کے علاوہ امریکہ کے فروسٹ برگ کالج کا بھی ہے۔ ہند پاک کی تقسیم سے جو فسادات ہوئے اس میں آپ مقبرۂ ہمایوں کے پناہ گزین کیمپ کے خاص والنٹیر تھے۔ استاد کی حیثیت سے آپ نے امریکہ میں فروسٹ برگ کالج کا "سال کے بہترین استاد" کا اعزاز حاصل کیا۔ اس طرح تین سال تک پڑھنے پڑھانے کا کام کرنے کے بعد طے کیا "میں تعلیم و تربیت کے تجربوں میں آزادانہ طور پر لگنا چاہتا ہوں۔" تعلیمی مشن کو قائم کرنے کے بعد سید صاحب نے ایک بلیٹن میں لکھا تھا:

"مجھے تعلیم و تربیت کے کام سے دلچسپی ہے۔ چاہتا ہوں کہ 'سند یافتہ' کی بجائے 'تعلیم یافتہ' شخصیتیں سامنے آئیں۔ علم کو عمل سے واسطہ ہو۔ تعلیم سے سیرت میں نکھار آئے اور سماج میں سدھار ہو۔ اس معاملہ میں نہ 'مشرق' کا پیرو رہنا ہے اور نہ 'مغرب' کا دلدادہ بننا ہے۔ مسئلہ کا حل 'مشرق' اور 'مغرب' کی خوبیوں میں وقت، جگہ اور لوگوں کے لحاظ سے تال میل پیدا کرنے میں نظر آتا ہے۔ تجربہ شرط ہے۔"

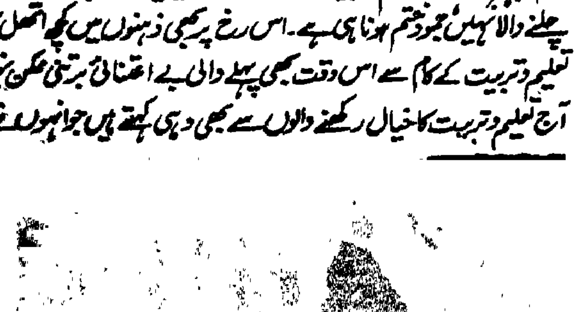
انسان اسکول تجربہ کی اسی شرط کو پورا کرتا ہے۔ کشن گنج میں واقع یہ اسکول بنگال بارڈر کے قریب اور نیپال اور بنگلہ دیش سے بھی زیادہ دور نہیں ہے ۱۴ نومبر ۱۹۶۶ء کو ۳۶ لڑکوں اور دو اساتذہ سے یہ اسکول ایک کرایے کی عمارت میں شروع ہوا اور آج ۱۹۷۶ء میں اس کے پاس لگ بھگ بندرہ بیگھا زمین ہے اور بچائے ۳۶ کے ۳۰۹ لڑکوں کے اب اساتذہ کی تعداد ۳۶ ہے۔ لڑکے بہار کے مختلف اضلاع کے علاوہ یوپی اور دہلی کے بھی ہیں۔ یہاں

لڑکے کی تعلیم کے علاوہ اس کی سیرت اور شخصیت پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔ لڑکے کی فطری صلاحیتوں کو معلوم کرنے اور اُبھارنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اُستاد کو ٹیوشن پڑھانے اور لڑکوں کو ٹیوشن پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہاں کی تقریبات بھی ذریعۂ تعلیم ہیں۔ ان کا ایک اور مقصد بھی ہے عوام میں تعلیم کی اہمیت کا احساس پیدا کرانا۔ عوام کو بیدار کرنا، انہیں بالواسطہ تعلیم دینا اور نئے خیالات کو مشتہر کرنا۔ دراصل اگر تعلیم کے ذریعہ انسان کی خداداد صلاحیتوں کے معلوم کرنے اور اُبھارنے کا عمل نہیں ہوا تو پھر وہ تعلیم بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ ڈاکٹر حسن ماہر نفسیات ہیں۔ امریکہ میں انہوں نے تعلیمی نفسیات، عام نفسیات، بچوں، نوجوانوں اور اجتماعی ہر طرح کی نفسیات کا علم اور تجربہ حاصل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اسکول کے بچوں کو اور دوسرے اسکول کے بچوں سے سیکھنے کا زیادہ موقع فراہم ہوتا ہے اور اُن کے شخصیت کی نشوونما پر بانیٔ انسان اسکول کا پورا دھیان ہوتا ہے۔ یہاں کے تقریباً ہر عمل میں لڑکوں کی شرکت ضروری ہے اساتذہ کا انتخاب یہاں بڑے دلچسپ طریقے سے کیا جاتا ہے اور پانچ دنوں تک اُمیدواروں کے ہر عمل پر نظر ہوتی ہے اُن کا امتحان، انٹرویو بھی کچھ ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ انسان اسکول کے بچوں کے ساتھ انہیں شہر کی سیر کرائی جاتی ہے ورائٹی پروگرام ہوتے ہیں جن میں اُمیدوار حصہ لیتے ہیں۔ اُن کی مختلف صلاحیتوں کو پرکھا جاتا ہے اور تب جاکر کہیں آخری دن ڈاکٹری معائنے کے بعد اُن کو نتیجوں سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

مقصد صاف ظاہر ہے۔ تعلیم و تربیت کا کام بڑا نازک ہے۔ ننھے بچے اور کم بڑی عمر کے بچے جو ملک کا مستقبل ہیں کسی ایسے ویسے استاد کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑے جا سکتے۔ کم عمری میں ذہن زیادہ اثر قبول کرتا ہے۔ لہٰذا اسی وقت انہیں خراب اثر سے محفوظ رکھنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ پھر اگر ایسے لوگ اُن سے منسلک ہوں جن میں مختلف قسم کی صلاحیتیں ہوں اور جن سے بچوں کی خداداد صلاحیتوں کو اُبھارا جا سکے تو پھر ایسی تعلیم و تربیت کے کیا کہنے۔

———— یہ کہنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ انسان اسکول محض ایک اسکول نہیں ایک تحریک ہے۔ یہ اسکول جس کیمپس میں ہے اُس کا نام 'شکشا نگر' ہے۔ یہاں کی سڑکوں کا نام اُن لوگوں کے نام پر ہے جن سے ہندوستان کسی نہ کسی انداز میں جانا جاتا ہے، جن کے نام سے ملک کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے، جو دیس کے رتن ہیں۔ جیسے ٹیگور، ٹینزنگ، غالب اور دھیان چند وغیرہ..... 'شکشا نگر' میں اس وقت تقریباً ستر جھونپڑے ہیں۔ انہی جھونپڑوں میں اسکول بھی ہے اور بورڈنگ ہاؤس بھی ہیں اساتذہ حضرات بھی رہتے ہیں اور اس پوری تحریک کے بانی بھی۔ آہستہ آہستہ کچھ پختہ کمرے بھی تعمیر کئے جا رہے ہیں۔ اس وقت تک چار کمرے تعمیر ہو چکے ہیں نگر میں بجلی پہونچ چکی ہے صفائی ستھرائی میں یہ نگر اپنی مثال آپ ہے۔ چپراسی اور دوسرے ایسے ملازمین کی تعداد بیس ہے۔ سڑکیں کشادہ اور کھیل کا میدان بڑے ہی سلیقہ کا ہے۔ مالی وسائل کی کمی کو سلیقہ اور بے پناہ محنت نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ۱۲ ہوسٹل میں تقریباً ۲۰۰ طلبا رہتے ہیں۔ غیر مقیم طلبا کی تعداد تقریباً ۲۰۰ ہے۔ مقیم طلبا سے ہر ماہ ۱۳۰ روپے لئے جاتے ہیں اس میں ہر طرح کے اخراجات شامل ہیں۔ یہ دعویٰ نہیں ہے کہ انسان اسکول ہندوستان کا سب سے اچھا اسکول ہے۔ مگر یہ سمجھنا درست ہے کہ بہترین تعلیم و تربیت کا یہی بہترین طریقہ ہے۔ دراصل انسان اسکول کی افادیت ہمارے ملک کے پس منظر میں بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ہماری تین چوتھائی سے بھی زیادہ آبادی دیہی علاقوں میں بستی ہے۔ ملک کے ہر لڑکے کی بڑے شہروں کے بہترین اسکولوں تک رسائی ممکن نہیں پھر مسئلہ یہ بھی ہے کہ روایتی تعلیم کا طریقہ کس حد تک ہمارے لئے موزوں ہے۔ ہمارے اسکولوں سے فارغ ہونے والے طلبا دفتری کاموں کے لئے کسی حد تک موزوں ہوتے ہیں، مگر وہ اچھے کاشتکار، کاریگر اور صناع نہیں بن پاتے۔ تشویش ناک پہلو تو یہ ہے کہ روایتی تعلیم کے بعد ہمارے نوجوانوں میں ہاتھ کے کاموں سے ایک طرح کا نفور پیدا ہو جاتا ہے۔ ان سوالوں پر غور کرنے سے انسان اسکول جیسے اداروں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اسکول کو محض ایک اسکول سمجھنا ناانصافی ہوگی یہ ایک تحریک ہے ملک میں بہتر طریقۂ تعلیم کو رواج ڈالنے کی ایک سنجیدہ اور پُرخلوص کوشش ہے۔

انسان اسکول میں شروع سے ہی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت پر خاص دھیان دیا جاتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ کم عمری میں بچہ توجہ کا زیادہ محتاج ہوتا ہے۔ ڈاکٹر حسن FROM KNOWN TO UNKNOWN کے سنہری اصول میں یقین رکھتے ہیں۔ جانی چیزوں سے انجانی چیزوں کی طرف بڑھئے۔ نصاب تعلیم میں تین زبانوں کے فارمولے کو جگہ دی گئی ہے —— مادری، قومی، بین الاقوامی۔ اپنی مدد آپ کرنا اور پہل کرنے پر یہاں بہت زور دیا جاتا ہے۔ بنی بنائی راہ پر چلنے سے بہتر ہے کہ راہ بنانے والے بن جائیں۔ تعلیم اور تربیت کا تصور الگ الگ نہیں بلکہ انہیں لازم وملزوم سمجھا جاتا ہے لہٰذا اخلاق اور عادات واطوار کا سنوارنا اس کے نصاب کا ایک اہم جز ہے۔ سید صاحب چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مقامی باصلاحیت طلبا اور مقامی وسائل کو بروئے کار لانا چاہیئے۔ انسان اسکول میں انہوں نے خود بھی اس بات کا اہتمام کیا ہے اور یہی بات ہمارے ملک کے پس منظر میں بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اگر مقامی ذرائع استعمال کر کے ہم تعلیم و تربیت کے کام کو بہتر بنا سکے تو تعلیم و تربیت کے میدان میں یہ ایک انقلابی عمل ہوگا۔ کام بے توجہی سے چلنے والا نہیں جمود ختم ہونا ہی ہے۔ اس رخ پر بھی ذہنوں میں کچھ اتھل پتھل ہونی چاہیے تعلیم و تربیت کے کام سے اس وقت بھی پہلے والی بے اعتنائی برتنی ممکن نہیں شاید اقبال آج تعلیم و تربیت کا خیال رکھنے والوں سے بھی وہی کہتے ہیں جو انہوں نے سو سال پہلے کہی تھی



ایک تقریب کے موقع پر بچے گانا سنا رہے ہیں

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

ڈاکٹر سید حسن ملک کے تعلیمی نظام کو اس انقلاب سے دوچار کرانا چاہتے ہیں
انسان اسکول اسی تعلیمی انقلاب کی ایک عملی شکل ہے

غزلیں

رونق دکنی سیمابی
کراس روڈ نمبر ٦، جمشید پور

بنامِ پیکرِ خاکی نہ گرد بن جاؤ
میانِ شہر نہ صحرا نورد بن جاؤ

بگولا بن کے اٹھو، بیٹھ جاؤ بن کے غبار
بکھر کے حاصلِ صحرائے گرد بن جاؤ

ہے اجتماعِ عناصر سے زندگی کی نمود
اور اقتضائے قضا! فردِ فرد بن جاؤ

رگِ حیات کو گرماؤ گرمیِ خوں سے
یہ کیا کہ وقتِ عمل، جسمِ سرد بن جاؤ

نگارخانۂ ہستی کا ساتھ دو رونق
خوشی کے سامنے تصویرِ درد بن جاؤ

محمد نعیم صبا
محلہ نور محل، بھوپال

ذہن سے سایۂ افکار ہٹا دے کوئی
دامنِ دل مرا الجھن سے چھڑا دے کوئی

اس سے پہلے کہ مجھے جشنِ مسرت بخشے
زرد چہروں کو شفق رنگ بنا دے کوئی

گردشِ میں محدود رہوں میں کب تک
میرے ذرات ہواؤں میں اڑا دے کوئی

غم کی یہ آگ ہے وہ شے جو بجھائے نہ بجھے
اب تو اس آگ کو اے کاش ہوا دے کوئی

میرے گرنے پہ صبا کیوں تھی ہنسی چہروں پر
کیا میں اوتار ہوں! اتنا تو بتا دے کوئی

انوار رضوی
ترقی اردو بورڈ، آر، کے پورم، نئی دہلی

کس سے کہوں دل کی باتیں کس سے کہوں دل کے راز
کس امید پہ در در پھریئے، کون یہاں ہے ہم آواز

کس کو فرصت ہے اس جگ میں دوجے کا دکھ درد بٹائے
سب اپنے میں گم ہیں پیارے کس کو کہوں ہم دمساز

وسعت دیکھ کے جی للچایا، سورج کا ماتھا چومیں
تشنہ تشنہ جاتے ہیں ہم، ہائے شکستِ پر کا راز

کس کو کہیے غیر کسے اب اپنوں میں شامل کیجے
اپنا غم خود ہی سہنا ہے، لاکھ بنے کوئی ہم راز

غم میں کیوں شامل ہے لذت، لذت کیسی جان ہے یہ
اور نکھرتی ہیں آوازیں، ٹوٹے ہے جب دل کا ساز

شفاعت ترنم
ہمدرد آفس، مظفر پور

جس پر گماں مجھے تری آوازِ پا کا تھا
سینے کو چومتا ہوا جھونکا ہوا کا تھا

ہر لمحہ مجھ کو خوفِ سزا و جزا کا تھا
لیکن خطائیں کی ہیں کہ پتلا خطا کا تھا

ناآشنا کا تھا نہ کسی آشنا کا تھا
رسوائیوں میں ہاتھ مرے نقشِ پا کا تھا

گھلتا رہا ہے کرب کی لہریں تمام رات
اک یہ بھی کام میرے دلِ مبتلا کا تھا

اللہ خیر پھر ہے نگاہوں کے سامنے
منظر جو صبح و شام کبھی کربلا کا تھا

کس غم نے لا بٹھایا اُسے میکدے میں آج
کل محفلوں میں تذکرہ جس پارسا کا تھا

کیوں دل کی بات آج ترنم زباں پہ ہے
وہ کیا ہوا جو فیصلہ صبر و رضا کا تھا

چندر بھان خیال
٥٧٦ بھائی پرمانند کالونی، دہلی

پربت سے اُتر کر چلی جنگل میں ہوا تیز
میں بھی اسی رفتار سے کچھ دور چلا تیز

پھر دھوپ میں سایوں کے ہوئے سینکڑوں ٹکڑے
پھر وقت کی تلوار کو سورج نے کیا تیز

آتی ہے مرے شہر کے کانوں میں دبے پاؤں
صحراؤں کے سینوں سے سمندر کی صدا تیز

الفاظ کو معنی کی سرنگوں میں بچھا کر
احساس کے آسیب نے کی تیغِ جفا تیز

برگد کے تلے بیٹھ کے آتی ہے کسے موت
مرنے کے لیے جینے کی رفتار ذرا تیز

جب سینۂ سوزاں میں اٹھے عزم کے شعلے
چلنے لگا انگاروں پہ ہر آبلہ پا تیز

ہر سانس ہے جیسے کوئی خنجر سرِ مقتل
ہر آنکھ میں جلتی ہے مناظر کی چتا تیز

برق موسوی
سی آئی بی (٢٥٣) کاچی گوڑا گڈس، حیدر آباد

آ کہ آنکھیں ہیں ستاروں کی جھپکنے کے قریب
سہمے سہمے ہوئے آنسو ہیں ٹپکنے کے قریب

اور بھی ہو گیا پردہ ترا گہرا مجھ سے
جب کہ پردہ من و تو کا ہے سرکنے کے قریب

کٹ گئی زیست کی شب صبح ہوا چاہتی ہے
طاقِ ارماں پہ ہے اک شمع بھڑکنے کے قریب

ہائے یہ سرد ہوا اور یہ بھیگی راتیں!
پھر ہے کجلائی ہوئی آگ دہکنے کے قریب

میں نے سینچا ہے جسے خونِ جگر دے دے کر
اب کہیں جا کے وہ گلشن ہے لہکنے کے قریب

مجھ کو میخانے سے ساقی نے اٹھایا بھی تو کب
جب کہ تھے ساغرِ امید کھنکنے کے قریب

اُس کی باتوں سے تو پیدا ہیں جنوں کے آثار
پھر ترا برق ہے اِس رُت میں بہکنے کے قریب

اعلان

اردو کے ادبا اور شعرا کے لئے

ادارۂ "آج کل" نے فیصلہ کیا ہے کہ اگلے سال ماہ فروری سے ہر ماہ تین منتخب افسانے اور چھ طرحی غزلیں شائع کی جائیں گی اور ان کا معاوضہ دیا جائے گا۔

افسانے

منتخب شدہ افسانوں پر، بہ لحاظ معیار، علی الترتیب، ایک سو پچیس روپئے، ایک سو روپیے اور پچھتر روپیے معاوضہ دیا جائے گا

افسانے کم از کم دو ہزار اور زیادہ سے زیادہ چار ہزار الفاظ پر مشتمل ہوں۔ موضوع کی کوئی قید نہیں لیکن ان افسانوں کو بامقصد تعمیری اور عصری زندگی کا عکاس ہونا چاہیے۔

غزلیں

منتخب شدہ چھ طرحی غزلوں پر علی الترتیب چالیس روپئے، پینتیس روپئے اور بقیہ چار پر تیس تیس معاوضہ دیا جائے گا۔

[illegible]

برائے فروری ۱۹۷۷ء
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

برائے مارچ ۱۹۷۷ء
زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی، زندگی رنگِ گل کا بیاں دوستو

برائے اپریل ۱۹۷۷ء
لاکھوں چراغ خونِ شہیداں سے آئے ہیں

آخری تاریخ

فروری، مارچ اور اپریل ۱۹۷۷ء کے لیے منتخب کی جانے والی تخلیقات علی الترتیب، ۲۰ دسمبر ۱۹۷۶ء، ۲۰ جنوری ۱۹۷۷ء اور ۲۰ فروری ۱۹۷۷ء تک ادارے کو موصول ہو جانی چاہئیں۔ تخلیق گم ہو جانے یا تاخیر سے پہنچنے کی صورت میں ادارہ پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوگی۔

دیگر شرائط

۱۔ ہر تخلیق کے ساتھ "آج کل" میں شائع شدہ تصدیق نامہ بھی منسلک ہونا چاہیے کہ یہ تخلیق غیر مطبوعہ اور طبع زاد ہے۔

۲۔ انتخاب اور معاوضے کے بارے میں ادارہ کا فیصلہ قطعی اور حتمی ہوگا اور اس سلسلے میں کوئی مراسلت نہیں کی جائے گی۔

میں تصدیق کرتا ہوں کہ میرا افسانہ بعنوان
میری غزل مصرع
طبع زاد اور غیر مطبوعہ ہے

نام ____________

پتہ ____________

دستخط مع تاریخ

اپنی تخلیقات مع تصدیق نامہ حسب ذیل پتے پر بھیجیں:

مدیر "آج کل" پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دلی ۱۱۰۰۰۱

غیاث اقبال
شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، گڑیاتم
(تمل ناڈو)

تمل کے چند ممتاز شعرا

دراوڑی زبانوں میں سب سے قدیم زبان تمل ہے۔ زبان کے ساتھ اس کا ادب بھی گرانمایہ ہے۔ ترووتور کی شہرہ آفاق تصنیف 'تروکرل' جس کا اب تک دنیا کی بیالیس زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے اس گرانمایہ ادب کے ثبوت میں بلا تامل پیش کی جاسکتی ہے۔

تمل لفظ کرل کے معنی "مختصر قول" کے ہیں۔ 'ترو' 'اقدس' یا 'مقدس' کو کہتے ہیں۔ اس رو سے 'تروکرل' کا مفہوم قول مقدس ہوتا ہے۔ چنانچہ آج کے تمل احباب جو تمل زبان کو "مقدس ماں" جیسے رسیلے لفظ سے یاد کرتے ہیں کرل کو بہت اونچا درجہ دیتے ہیں۔

ترووتور نے دو ہزار سال پہلے کرل کی تصنیف کی تھی۔ اس میں ۱۳۳۰ دوہوں کی طرح 'سبع لفظی' دوہے موجود ہیں۔ جن کے اندر موسیقی کا آہنگ موجود ہے۔ کرل تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ اسباب کی علل و معلول پر سیر حاصل بحث کرتا ہے۔ دوسرے حصہ میں سیاست کے راز اور نکتے بیان کئے گئے ہیں اور تیسرا حصہ 'حسن و دل' یعنی کام کے لئے وقف ہے۔

کرل کے سبع لفظی دوہے مختلف عنوانوں کے تحت لکھے گئے ہیں۔ ان میں غیر اخلاقی عناصر نہیں ہے۔ لیکن پند و نصائح اور ہدایات کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ اس رو سے بلا تامل کرل کو اخلاقی شاہکار کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ اب تک کرل کا کافی وسیع مطالعہ کیا گیا ہے۔ تمل ادب کرل کے سبع لفظی دوہوں کے حوالوں سے بھرا پڑا ہے۔ ان دوہوں کی نت نئی تاویلات پر کئی کتابیں حوالۂ قلم کی جاچکی ہیں۔ یہاں کی اکثر یونیورسٹیوں میں 'کرل چیئر' کے نام سے ایک الگ شعبہ قائم کیا گیا ہے جس کی سرپرستی میں کرل پر تحقیق و تنقید کا کام اعلیٰ پیمانہ پر کیا جارہا ہے۔

کرل کے بعد آلنگو کی لکھی ہوئی سلپدی گارم ۱۸۰۰ سال قدیم تصنیف ہے۔ ردیف و قافیہ کی پابندی اس شعری تصنیف میں نہیں ملتی بلکہ آج کے جدید طرز یا تکنیک کو جسے 'معریٰ نظم' کہتے ہیں ۱۸۰۰ سال قبل تمل ادب میں استعمال کی جاچکی ہے۔ سلپدی گارم کافی طویل تصنیف ہے جو رزمیہ عناصر سے بھرپور ہے۔ یہ ایک طویل رزمیہ ڈرامہ ہے جس کے مشہور کردار نشدو نچڑین تمل ادب میں علامت کی طرح مستعمل ہیں۔ کوولن، کنگی، مادھوی اس ڈرامہ کے مشہور ہیرو اور ہیروئن ہیں۔ کنگی کا کردار عصمت و عفت کی بلندی کے لئے مشہور ہے۔ تمل میں مباحثہ کی طرز پر 'پٹی منرم' منعقد کئے جاتے ہیں تو ان میں سلپدی گارم کے کرداروں کی افادیت اور رفعت پر مباحثہ ہوتے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مادھوی اور کنگی میں کون نسوانی کردار عصمت و عفت کے میدان میں کافی مشہور تھا؟

'رامائن' کی طرز پر کمبر نے 'رامائنا' لکھی ہے جو سنسکرت زبان میں لکھی ہوئی رامائن کا لگ بھگ ترجمہ ہے۔ 'رامائنا' کی مجالس میں کمبر کی تصنیف کو پڑھا جاتا ہے اور سنسکرت کے استعمال کے بغیر رامائنا کی مجالس منعقد کی جاتی ہیں۔

عمر پلور اٹھارویں صدی کے مشہور مسلم تمل شاعر ہیں جن کی رقم کردہ 'سیرا پرانم' کافی مشہور تصنیف ہے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر تصنیف کردہ طویل منظوم تخلیق ہے۔ 'سیرا' 'سیرۃ' کا اختصار ہے۔ 'پرانم' 'مقدس' کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ اس میں حضورؐ کی ولادت سے وفات تک کے تمام حالات، واقعات اعلیٰ اور شستہ تمل زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس تصنیف کا اصل مقصد حضورؐ کی زندگی کو تمل زبان بولنے والے مسلم طبقہ کے سامنے پیش کرنا تھا۔ اسی لئے اس میں کافی الفاظ عربی زبان کے یونہی مستعمل ہیں جیسے نکاح، مہر، نبی، رسول، طیبہ وغیرہ، عمر پلور نے 'سیرا پرانم' میں تمل ردیف و قافیہ کی پابندی کی ہے (تمل میں قافیہ مصرعہ کا دوسرا لفظ ہوتا ہے)

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں تمل شاعری کا لہجہ بڑی حد تک حب الوطنی کے عناصر سے پُر تھا۔ سبرامنیم بھارتی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے تمل شاعری میں سب سے پہلے انقلابی تصورات کو موضوع بنا کر پیش کیا تھا۔ بھارتی تمل کے اقبال اور جوش ہیں۔ ۱۸۸۰ سے ۱۹۲۱ تک کا زمانہ عہد بھارتی کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے وطن کی شان میں کافی گیت لکھے ہیں۔ وطنیت، انقلاب اور قومیت کے موضوع کے علاوہ بھارتی نے دیگر موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے جن میں کوئل پاٹو، کوئل کا گیت، پانچالی سبدم، پانچالی کا چیلنج (پانچالی پانڈوؤں کی بیوی کا عام فہم لقب ہے) وغیرہ کافی مشہور ہیں۔ یہ تمام نظمیں کافی طویل ہیں۔ اس کے علاوہ بھارتی نے مختصر نظمیں بھی کافی تعداد میں رقم کی ہیں۔ یہ جنگ آزادی کے بھی سپہ سالار رہ چکے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے تجربات کو شاعری میں بیان کیا۔

تمل ادب میں بھارتی کو بھارتیار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے (تمل ناموں کے آخر میں 'آر' کا اضافہ ادیب و شاعر کی عزت کے لئے کیا جاتا ہے) بھارتی ۱۸۸۱ء میں پانڈیچری میں پیدا ہوئے۔ تمل شاعری کو قومی اور وطنی عناصر سے آشنا کرانے والوں میں سرفہرست بھارتی ہیں۔ ان کے کئی شاگرد تھے۔ مگر بے انتہا عقیدت رکھنے والوں سبو رتنم کا نام نامی سرفہرست ہے جو آگے چل کر بھارتی داسن کے نام سے مشہور ہوئے۔ بھارتی داسن کے لغوی معنی "بھارتی کا غلام" ہوتے ہیں۔ بھارتی داسن نے اپنے استاد کا حق ادا کیا ہے اور جو کچھ بھی قومی اور وطنیت کے عناصر بھارتی نے تمل شاعری کو عطا کئے تھے ان میں بھارتی داسن نے روح پھونکنے کی کوشش کی ہے۔ بھارتی داسن کی اکثر نظمیں ایپک کا درجہ رکھتی ہیں۔ بھارتی داسن رام سامی نائکر کی تحریک سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ رام سامی نائکر کو تمل احباب 'پریار' یا تندئی پریار' یعنی 'مقدس باپ' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ بھارتی داسن کی اکثر تخلیقات میں جسٹس پارٹی اور دراوڑ کزگم کے سیاسی، سماجی اور معاشی تصورات کی بازگشت ملتی ہے۔

بھارتی داسن نے بھارتی پر "شاعر انقلاب" کے عنوان سے ایک طویل نظم رقم کی ہے جو ایک ایپک کا درجہ رکھتی ہے۔ ذات پات، فرقہ اور نسل کے امتیازات کے خلاف جہاں پریار نے اپنی پرجوش تقاریر کے ذریعہ مخالفت کی، وہاں بھارتی داسن نے اپنی نظموں میں ان موضوعات کو اپنایا اور ان بنیادوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ عورتوں کے حقوق، ان کی آزادی اور تعلیم کے تحفظ کو بھی موضوع بنا کر بھارتی داسن نے نظمیں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ 'جمہوریت' 'فرض یا محبت' 'تمل عورت کا چاقو' 'خاندان کا چراغ' 'حسن کا قہقہہ' جیسی نظمیں کافی مشہور ہیں۔ مناظر فطرت پر بھارتی داسن کا قلم ورڈزورتھ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ فطری حسن، سیلاب، پہاڑ، دریا، سورج اور چاند جیسے موضوعات پر بھی ان کی نظمیں کافی مشہور و معروف ہیں، اور زبان زد۔

تمل ادب میں "تمل زبان" ایک اہم موضوع کی شکل رکھتی ہے۔ تمل زبان کہیں "ماں" کہیں "دیوی" اور کہیں "عزیز از جان تمل" کا لقب پاتی ہے اور مستقل نظمیں 'تمل زبان' کے اس منفرد تصور پر رقم کی گئی ہیں۔ بھارتی داسن نے 'تمل زبان' کو ایک علامت کی طرح استعمال کیا ہے اور اس پر کافی شگفتہ اور بہترین نظمیں رقم کی ہیں۔ بایں ہمہ بھارتی داسن کی نظموں کا ایک تاریک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے ایک مخصوص طبقہ کو ہدف ملامت گردانا ہے اور اس طبقہ کے خلاف اپنے جذبات تنفر کو اپنی نظموں میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا اہم سبب رام سامی نائکر کی 'براہمن مخالفت' تحریک ہے۔ ان تصورات کی اصلیت، غرض و غایت پر بحث سے قطع نظر بھارتی داسن کا فن کافی ارفع ہے۔

دیسک ونائگم پلے بھی ادیب کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں۔ ایڈون آرنلڈ کی مشہور نظم لائٹ آف ایشیا کا انھوں نے منظوم ترجمہ کیا ہے جو "ایشیا جودی" کے نام سے مشہور ہے۔ فٹز جیرلڈ کی انگریزی کتاب عمر خیام کی رباعیات کا تمل میں ترجمہ ونائگم پلے کا مرہون منت ہے۔ ان کی طبعزاد نظموں میں مشہور ہجویہ نظم "مرومگل وژی مانیم" بھی ایک ہے۔ اودیار کلاسکی تمل شاعرہ بچوں کے ادب کے لئے کافی مشہور ہیں۔ ونائگم پلے نے بچوں کے ادب پر بھی کافی نظمیں لکھی ہیں اور یہ بیسویں صدی کے مشہور شاعر ہیں جنھوں نے اودیار کے بعد بچوں کے ادب پر قلم اٹھایا ہے۔

کنا داسن (اصل نام متیا) موجودہ تمل ادب کے شہنشاہ سخن ہیں۔ بھارتی داسن کے طرز کو انھوں نے اپنانے کی کوشش کی ہے اسی لئے تخلص بھی 'داسن' رکھتے ہیں۔ کنا داسن کے معنی "داسن کا نور نظر" ہے۔ چوں کہ ان کا تعلق بھی دراوڑ کزگم کی تحریک سے رہ چکا ہے ان کی ابتدائی نظموں میں دہریت کے عناصر کا پتہ چلتا ہے۔ دراوڑ کزگم سے قطع تعلق کے بعد رفتہ رفتہ دہریت کے عناصر ان کی شاعری سے زائل ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

کنا داسن کا فن کافی بلند ہے۔ یہ خود ایک منفرد مضمون کے موضوع بن سکتے ہیں۔ تمل کے بسیار گو شاعروں میں کنا داسن سرفہرست ہیں۔ چوں کہ فلمی حلقوں سے ان کا تعلق کافی گہرا ہے تمل کی اکثر فلموں میں ان کے لکھے ہوئے گیت ہی استعمال کئے جاتے ہیں جو ادب کی چاشنی لئے ہوتے ہیں۔ ان کے اشعار کی تعداد لگ بھگ بیس ہزار ہے۔ جمالیاتی، رومانی اور مذہبی عناصر کا امتزاج حسین طریقہ پر کنا داسن کے اشعار میں دستیاب ہے۔

'ابہام' اور 'ہزل گوئی' آج بھی تمل شاعری پر چھائے ہوئے ہیں۔ انھیں معیوب نہیں تصور کیا جاتا۔ کنا داسن کے اشعار میں 'ذومعنویت' کافی رچی بسی ہے۔ 'ابہام' کی تکنیک کے ذریعہ ابتذال کے عناصر تمل شاعری میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ مختلف مفہوم کو لفظوں کی الٹ پھیر سے تمل ادب میں ابہام اور ہزل گوئی کمال فن سمجھا جاتا ہے تمل میں چالاکی اور بڑی چابک دستی سے ان عناصر کو باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بہر کیف تمل شاعری ہو یا نثر، سیاست اور علاقائیت سے جتنی متاثر ہے جنوب کے دیگر ادب اس حد تک متاثر نہیں ہیں۔ موجودہ دور کے جدید شعراء میں کرونا ندھی، عبدالرحمٰن، شردا، کامراسن، میرا، محمد مہتاب کافی مشہور ہیں۔ جن کے فن پر کافی سیر حاصل بحث کی جا سکتی ہے۔ یہاں اس کی گنجائش باقی نہیں۔

ہیئت کے تجربے، نئے موضوعات کی فراوانی، آہنگ شعر میں تبدیلیاں اور جدت طبع کے باوجود تمل ادب پر علاقائیت کافی حد تک سوار ہے۔ مستقبل کے بدلتے ہوئے حالات ہی اس تصور میں آفاقیت کا رنگ بھر سکتے ہیں۔

مشرقی خطّے کی ترقی کے لیے اقدامات



میزو بچے جن کا مستقبل روشن ہے

ملک میں جس وقت سے منصوبہ بندی کا عمل شروع ہوا اس وقت سے سرمایہ کاری کو بڑھایا جا رہا ہے۔ اس سرمایہ کاری کے نتیجے میں مشرقی خطے کی اقتصادی اور صنعتی ترقی کے امکانات روشن ہوتے۔ اس کے ساتھ ہی شمال مشرقی خطے میں اقتصادی ترقی کے لیے بنیادیں مضبوط ہوئیں۔ صنعتی اور اقتصادی ترقی کے لیے بنیادی عناصر کو اور زیادہ مستحکم کیا جا رہا ہے مشرقی خطے میں آسام، میگھالیہ، ناگالینڈ، تری پورہ، منی پور، میزورم اور اروناچل پردیش شامل ہیں۔ یہ علاقے شمال مشرقی خطے میں واقع ہیں جب کہ مغربی بنگال، بہار اور اڑیسہ جنوب مشرقی خطے میں ہیں، اس کے علاوہ سکم مشرقی خطے میں ہے۔ یہ خطہ وسائل کے اعتبار سے مالا مال ہے۔ خاص کر معدنیات، جنگلات اور بجلی کے لیے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ ان وسائل سے بھرپور کام لینے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔

اس خطے میں شامل ریاستوں کی آبادی ۳ لاکھ سے لے کر ۵ کروڑ ۶۰ لاکھ تک ہے۔ شمال مشرقی خطوں میں تمام ریاستیں اور مرکز کے زیر اہتمام علاقوں کی آبادی مقابلتہً کم ہے اس خطے کے مختلف علاقوں میں آبادی کا دباؤ مختلف ہے۔ مغربی بنگال میں ایک مربع کیلومیٹر پر ۵۰۰ افراد کی آبادی کا دباؤ ہے جب کہ اروناچل پردیش میں ایک مربع کیلومیٹر پر صرف ۶ افراد بستے ہیں۔

شمال مشرقی خطہ

یہ خطہ قدرتی وسائل کے لحاظ سے مالا مال ہے، ان میں جنگلاتی دولت بجلی اور معدنیات شامل ہیں، ان وسائل کی ترقی نہیں ہو سکی ہے جس کے مختلف اسباب ہیں۔ پہلا یہ کہ قدرتی وسائل کو پوری طرح کام میں لایا نہیں جا سکا۔ بہت سے علاقے الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے ترقی کے فائدوں سے محروم رہے۔ کہیں کہیں آبادی کا دباؤ کم ہونے سے ترقیاتی پروگراموں کو نہیں چلایا جا سکا۔ کہیں کہیں ماہرانہ صلاحیت دستیاب نہ ہونے کے سبب ترقیاتی پروگراموں کو شروع نہیں کیا جا سکا۔

اس خطے میں ریاستوں کے مالی وسائل کم ہیں۔ پانچویں پنج سالہ منصوبے میں اس علاقے کے مخصوص مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف شعبوں کے لیے وافر رقوم مختص کی گئی ہیں۔

آسام اس خطے میں مقابلتہً بہتر طور پر ترقی یافتہ ہے۔ اس خطے میں آسام کے لیے مرکزی سرکار کی سرمایہ کاری کی میزان مارچ ۱۹۷۳ء کے اختتام تک ۱۴۰ کروڑ روپے رہی۔ یہاں چائے کی کاشت خاص طور پر ہوتی ہے۔ اس کی قیمتوں پر چائے کی عالمی منڈیوں کے اثرات کے تحت اُتار چڑھاؤ آیا کرتے ہیں۔ بہت سے چائے کے باغات پُرانے ہیں۔ ان میں جدید طریقوں کو لاگو کرنے کی ضرورت ہے۔ اس خطے کی دیگر ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں زیادہ تر آبادی کھیتی پر گزارہ کرتی ہے اور اس وجہ سے وہ لوگ غریبی اور بے روزگاری کا شکار ہیں، میدانوں اور پہاڑی علاقوں میں زمین کی پیداواری صلاحیت بڑھانی ہوگی۔ سیلابوں پر قابو پانا ہوگا، زمین کا تحفظ کرنا ہوگا، فصلیں اُگانے کے طریقے بہتر بنانے ہوں گے، پہاڑی خطوں میں کھیتی باڑی روایتی طریقوں سے کی جاتی ہے اور وہاں زراعت کے علاوہ دیگر کام دھندے مفقود ہیں اور بڑھتی ہوئی آبادی

کی ضرورتیں اس علاقے میں پوری ہونی دشوار ہیں۔

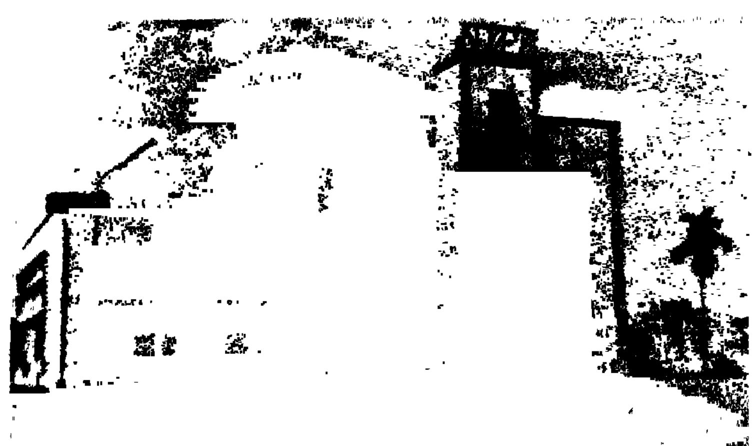
بہ حیثیت مجموعی اس خطے کو فروغ دینے کے لیے ایک جامع انداز کے مشترک منصوبے کی ضرورت محسوس کی گئی، جس کے تحت مواصلاتی نظام، بجلی، آب رسانی، سیلابوں کی روک تھام، مٹی کے تحفظ، نئی فصلوں کو اگانے اور جنگلاتی دولت سے صنعتی بنیادوں پر فائدہ اٹھانے کے کام میں معروف مختلف اداروں کے کام میں تال میل قائم کیا جاسکے۔

اس سلسلے میں ۱۹۷۱ء میں ایک بڑا قدم اٹھایا گیا اور شمال مشرقی کونسل تشکیل دی گئی، اس کونسل کو اب علاقے کے لیے ایک مربوط اور متوازن پروگرام تشکیل دینے کا کام سونپا گیا۔

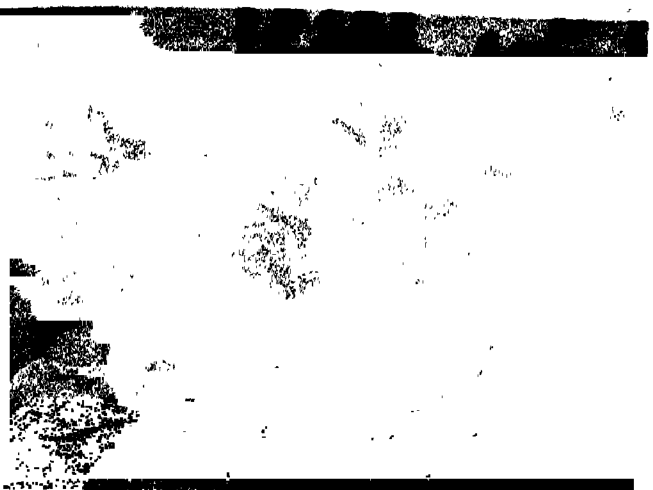
پانچویں پنج سالہ منصوبے میں اس کونسل کے ذریعے انجام دی جانے والی علاقائی اسکیموں کے لیے ۹۰ کروڑ روپے کے اخراجات مختص کیے گئے۔ اس رقم سے زراعت، بجلی اور مواصلات کو فروغ دیا جا رہا ہے، اس میں سے ۲۸ کروڑ روپے منصوبے کے پہلے تین برسوں میں خرچ کیے جانے تھے اور باقی دو برسوں کے لیے یعنی ۱۹۷۷ء سے ۱۹۷۹ء تک کے لیے ۶۲ کروڑ روپے کے اخراجات مختص کیے گئے ہیں۔

مشرقی خطہ

مشرقی خطے کا دوسرا حصہ یعنی مغربی بنگال، بہار اور اڑیسہ ایک معدنی پٹی ہے جہاں لوہے اور کوئلے کے زبردست ذخیرے ہیں۔ یہاں مقامی ضرورتوں کی ہم آہنگ بہت سی ترقیاتی حکمت عملیوں کو وضع کیا گیا ہے۔ اس طرح سے کلکتہ میٹروپولیٹن ایریا، دامودر گھاٹی کے علاقے، دریائے گنگا کے زیریں میدان، ڈیلٹا اور ساحلی علاقے چھوٹا ناگ پور اور شمالی اڑیسہ کا پلیٹو مغربی بنگال کے شمال میں پہاڑی علاقہ اور اڑیسہ میں جنوبی پہاڑیاں اور پلیٹو، ان سب علاقوں کے اپنے مخصوص مسائل ہیں، اور ہر ایک کے لیے الگ الگ انداز نظر اپنانے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔



کامروپ (آسام) کا تھرمل پراجکٹ ـــــ زیادہ بجلی، زیادہ پیداوار



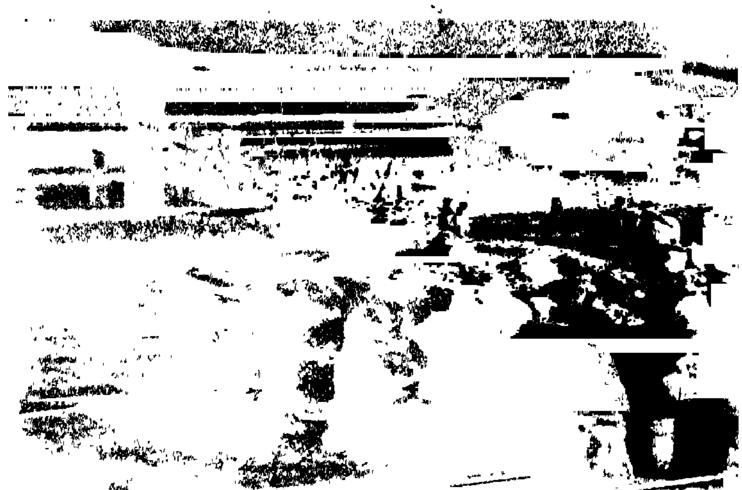
میگھالیہ کے بچے لکھنا پڑھنا سیکھ رہے ہیں۔

اگرچہ اس خطے کے چند مسلمہ مراکز پر صنعتی ترقی دیکھنے کو ملی ہے لیکن یہ علاقہ زیادہ تر جزیرہ نما کی صورت میں رہے ہیں۔ البتہ اس عرصے میں جس قدر سرمایہ کاری کی گئی، اس سے اقتصادی اور صنعتی ترقی کے لیے بنیادیں استوار ہوئی ہیں۔

پانچویں پنج سالہ منصوبے میں قبائلی اور پہاڑی علاقوں کے لیے امداد کا خصوصی پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کا عام پروگرام شروع کیا گیا جس سے ان علاقوں کے مسائل کو حل کرنے میں کافی مدد ملے گی۔ اس خطے میں ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کی ضرورتوں اور خصوصی مسائل کا خاص طور پر مطالعہ کیا گیا ہے اور ان کو حل کرنے کے لیے چوتھے پنج سالہ منصوبے اور پانچویں پنج سالہ منصوبے کے پہلے تین سالہ منصوبوں میں خصوصی اقدامات کیے گئے ہیں۔

مرکزی امداد دینے کے سلسلے میں ایک عام اصول یہ ہے کہ خصوصی مسائل رکھنے والی ریاستیں یا ایسی ریاستیں جہاں کہ فی کس آمدنی کم ہو یا جہاں فی کس ٹیکس کی ادائیگی کی قوت کم ہو، مرکزی امداد کی مستحق قرار پاتی ہیں۔ اس اصول کی بنیاد پر مرکزی امداد کا کافی حصہ ان ریاستوں کو ملا۔ آسام کی ریاست بشمول میگھالیہ (جو چوتھے پنج سالہ منصوبے میں قائم کی گئی تھی) اور ناگا لینڈ کو مرکز کی طرف سے خصوصی امداد دی گئی۔

مشرقی خطے کی ریاستوں، بالخصوص آسام، بہار، اڑیسہ اور مغربی بنگال نے غیر منصوبہ جاتی امداد حاصل کی۔ اس مد کے تحت ۴۴ کروڑ روپے چوتھے منصوبے میں دیے گئے تاکہ وہ اس رقم سے سیلابوں کی روک تھام، آب رسانی، بجلی اور شہری ترقی کے پروگراموں کو بروئے کار لاسکیں۔ آسام، بہار، اڑیسہ اور مغربی بنگال کو مارچ ۱۹۷۳ء کے اختتام تک صنعتی پراجیکٹوں کے لیے مرکزی سرمایہ کاری کا کافی حصہ ملا۔ مرکزی سرکار نے ۵۵ ارب ۲۰ کروڑ روپے کی مجموعی سرمایہ کاری کی جس میں سے ان ریاستوں کی سرمایہ کاری ۲۵ ارب ۲۰ کروڑ روپے تھی، گویا کہ ۴۵ فیصد حصہ۔



آبی نقل وحمل کے ذرائع میں بہتری

مرکزی سرکار، آسام، میگھالیہ اور ناگالینڈ کے پہاڑی علاقوں کو امداد دینے کے سلسلے میں یہ فارمولا اپناتی ہے کہ امدادی رقوم کا ۹۰ فی صد حصہ گرانٹ ہوتی ہے جب کہ اس میں دس فی صد حصہ قرض ہوتا ہے۔

مرکزی سرکار نے مشرقی خطے کی ریاستوں کو ۳۶۲ کروڑ روپے کی امداد دی تاکہ اس رقم سے وہ بجٹ کے وسائل میں پائے جانے والے غیر منصوبہ جاتی ترقی کو پورا کر سکیں۔ جب کہ ہندوستان کی تمام ریاستوں کو اس مقصد کے لیے بہ حیثیت مجموعی ۹۵۴ کروڑ روپے دیئے گئے۔

مارچ ۱۹۷۳ء کے اختتام تک مرکزی سرکار نے مغربی بنگال، بہار اور اڑیسہ میں پبلک سیکٹر کے صنعتی پراجیکٹوں پر ۲۳ ارب ۷۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی۔ اس کے نتیجے میں چند صنعتی مراکز قائم ہوئے لیکن یہ ترقی یکساں طور پر نہیں ہو سکی۔

اڑیسہ اور بہار میں قبائلی آبادی کے لیے جو ذیلی منصوبے وضع کیے گئے ہیں ان میں قطعات اراضی اور قرضہ کی سہولتوں کے ضمن میں پائی جانے والی نابرابریوں کو ختم کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی زراعت اور دیگر متعلقہ سرگرمیوں کو مستحکم بنانے پر زور دیا گیا ہے۔

پانچویں پنج سالہ منصوبے میں اس خطے کی مختلف ریاستوں کے لیے اخراجات اس طرح ہیں۔

آسام	۴ ارب ۷۳ کروڑ ۸۴ لاکھ روپے
بہار	۱۲ ارب ۹۶ کروڑ ۲ لاکھ روپے
منی پور	۹۲ کروڑ ۸۶ لاکھ روپے
میگھالیہ	۸۹ کروڑ ۵۳ لاکھ روپے
ناگالینڈ	۸۳ کروڑ ۶۳ لاکھ روپے
اڑیسہ	۵ ارب ۸۵ کروڑ ۲ لاکھ روپے
سکم	۳۹ کروڑ ۶۴ لاکھ روپے
تری پورہ	۶۹ کروڑ ۶۸ لاکھ روپے
مغربی بنگال	۱۲ ارب ۴۲ کروڑ ۸۳ لاکھ روپے
اروناچل پردیش	۳۰ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے

۲۰ نکاتی اقتصادی پروگرام کو بروئے کار لانے کے لیے ۷۹-۱۹۷۸ء میں مجوزہ پلان کے دو برسوں میں مصارف اس طرح پر ہیں:-

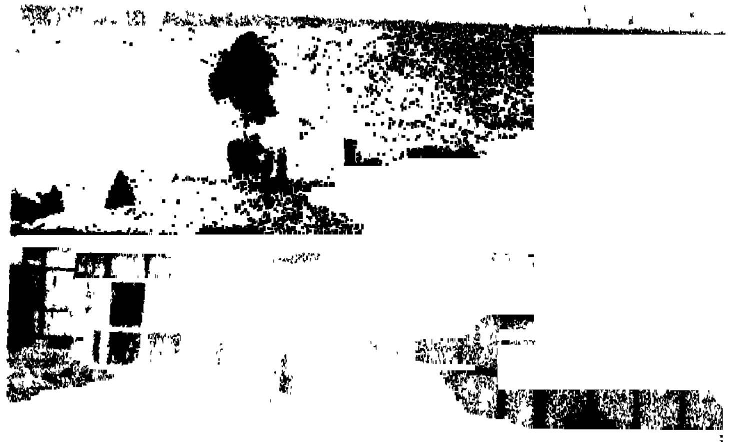
آسام	۷۸ کروڑ ۹۲ لاکھ روپے
بہار	۳ ارب ۶۸ کروڑ ۷۶ لاکھ روپے
منی پور	۱۳ کروڑ ۹۳ لاکھ روپے
میگھالیہ	۱۰ کروڑ ۷۳ لاکھ روپے
ناگالینڈ	۴ کروڑ ۶۱ لاکھ روپے
اڑیسہ	۱ ارب ۸۶ کروڑ ۳۹ لاکھ روپے
سکم	۳ کروڑ ۹ لاکھ روپے
تری پورہ	۷ کروڑ ۹۷ لاکھ روپے
مغربی بنگال	۳ ارب ۱۵ کروڑ ۷۶ لاکھ روپے
اروناچل پردیش	۵ کروڑ ۶۹ لاکھ روپے
میزورم	۴ کروڑ ۷۲ لاکھ روپے

۷۹-۱۹۷۷ء کے عرصے میں ۲۰ نکاتی اقتصادی پروگرام پر عمل درآمد کے لیے مجموعی اخراجات جو اس خطے میں کیے جائیں گے، دس ارب آٹھ کروڑ پچاس لاکھ روپے ہوں گے۔

بھارت سرکار پس ماندہ علاقوں کی ترقی سے متعلق پروگراموں کے تحت شمال مشرقی خطے میں صنعتوں کے قیام پر خصوصی توجہ دے رہی ہے۔ ملک میں پس ماندہ علاقوں کی ترقی کو اعلیٰ ترین ترجیح دی گئی ہے۔ ان علاقوں کی صنعتی ترقی سے متعلق حکمت عملی کو صاف طور پر واضح کیا گیا ہے۔ چند اضلاع کو صنعتی طور پر پس ماندہ قرار دیا گیا ہے۔ ان علاقوں میں رعایتی شرح سود پر قرضے کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ مالیاتی اداروں نے ان اضلاع میں صنعتوں کے لیے قرضے فراہم



سلک مل — جوگی روڈ



قبائلی نوجوانوں کا ہوسٹل —— شیلانگ

ہے، خطہ پس ماندہ علاقوں میں نئی صنعتوں کے قیام کے لیے سرمایہ کاری پر ۱۵ فی صد امداد دینے کی گنجائش رکھی گئی۔ خام مال کی نقل و حمل پر آنے والے اخراجات پر ۵۰ فی صد کی امداد کی گنجائش فراہم کی گئی۔ اس کے علاوہ درآمدات کے ضمن میں بھی سہولتوں کو نرم کر دیا گیا۔

شمال مشرقی خطے میں اروناچل پردیش اور میزورم کے تمام علاقے پسماندہ قرار دیے گئے ہیں۔ یہ علاقے مرکزی امدادی رقوم اور رعایتی شرائط پر مالی امداد کے مستحق ہیں۔ شمال مشرقی خطے کے باقی حصے ہیں جس میں آسام، میگھالیہ، منی پور، ناگالینڈ، تری پورہ اور سکم شامل ہیں۔ ۱۲۸ اضلاع کو رعایتی بنیادوں پر مالیات فراہم کرنے کے لیے پس ماندہ قرار دیا گیا ہے۔ ٹرانسپورٹ کے سلسلے میں جو امداد فراہم کی جاتی ہے اس کے لیے شمال مشرقی تمام خطہ مستحق ہے۔ سکم کو بھی یہ رعایت دینے کے سوال پر غور کیا جا رہا ہے۔

بھارت کے صنعتی ترقیاتی بینک ایسے تمام نئے اور موجودہ صنعتی اداروں کو رعایتی نرخ پر براہ راست مالی امداد دیتا ہے جو پیداوار بڑھانے کے لیے اپنے کارخانوں کو وسعت دینے کے خواہش مند ہیں۔ یہ بینک تجارتی بنکوں اور ریاستی مالیاتی کارپوریشنوں کی طرف سے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے منظور شدہ قرضوں کے لیے مالیات فراہم کرنے کی اسکیم میں بھی مدد دے رہا ہے۔ ۱۹۷۱ سے ۱۹۷۵ء کے دوران صنعتی ترقی کے بنکوں نے ۲۴ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے کے بقدر قرضے رعایتی شرحوں پر دیئے ہیں۔ آسام، منی پور، میگھالیہ، ناگالینڈ اور تری پورہ کے بہت سے صنعتی اداروں نے ان قرضوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔

خطہ پس ماندہ علاقوں میں موجودہ صنعتی اداروں کی توسیع پیداوار کو متنوع بنانے کے پروگرام اور کارخانوں کو جدید لائنوں پر آراستہ کرنے کے پروگرام کو بروئے کار لانے کے لیے بھارت سرکار مستقل جات کے ۱۵ فیصد کے بقدر امداد دیتی ہے جب کہ نئے صنعتی اداروں کے لیے یہ امداد دس فی صد ہے۔ ۷۱-۱۹۷۰ء اور ۷۵-۱۹۷۴ء کے عرصے کے درمیان سرکار نے اس مد کے تحت آسام، میگھالیہ، منی پور اور ناگالینڈ کو ۲۶ لاکھ روپے کی امداد منظور کی۔

اس خطے میں پس ماندہ علاقوں کی ضرورتوں کو پورا کرتے نیز ترقیاتی عمل کو متوازن بنانے کے لیے پانچویں پنج سالہ منصوبے میں ۲۰ برانچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیے جانے کی تجویز ہے، ان شاخوں کے ذریعے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی کے لیے تکنیکی و اقتصادی امداد اور اشیا کی فروخت کے کام میں تعاون کی ضرورتیں پوری کی جا رہی ہیں۔

اس خطے میں پس ماندہ علاقوں کی ترقی کے لیے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں سے متعلق سروس انسٹی ٹیوٹ واقع گوہاٹی اور اس کی شاخوں میں تعینات افسروں کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو ترقی دیں۔ ہر افسر کے ذمے چند اضلاع کی ترقی کا کام ہے۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی سے متعلق تنظیم نے منتخبہ اضلاع اور علاقوں میں اس بات کے لیے سروے کیے جانے کے بعد ایسے منصوبے وضع کیے ہیں — جن سے نئی صنعتیں قائم ہو سکیں اور موجودہ صنعتوں کو مستحکم بنایا جا سکے۔

ایجل (میزورام) کا سول ہسپتال —— صحت کی بہتر دیکھ بھال



شمال مشرقی خطے میں ۱۸ پس ماندہ اضلاع میں ایسی مہمیں شروع کی گئی ہیں جن کے ذریعے نئے صنعت کاروں کی حوصلہ افزائی ہو سکے اور انھیں ضروری امداد اور مہارت بہم پہنچائی جا سکے۔

شمال مشرقی خطے میں دیہی صنعتوں کے فروغ سے متعلق پروگرام بھی شروع کیا گیا ہے۔ دیہی دست کاروں کی امداد کا پروگرام اس کے علاوہ ہے دیہی صنعتوں کو ترقی دینے کا پروگرام ایک توسیعی پروگرام ہے جس کے ذریعے موجود اور نئے صنعت کاروں کو بہ حیثیت مجموعی امداد دی جاتی ہے وہ اس امداد سے چھوٹے پیمانے کی نئی صنعتیں قائم کرتے ہیں یا موجودہ صنعتی اداروں کی توسیع عمل میں لاتے ہیں۔ اور ان پراجیکٹوں کے لیے رہنمائی اور امداد فراہم کی جاتی ہے۔ یہ رہنمائی ٹکنالوجی کے انتخاب تکنیکی توسیعی سروسوں اور ضروری سامان کے لیے دی جاتی ہے۔ دیہات میں دست کاروں کی امداد کے پروگرام کے ذریعے زرعی مزدوروں کو مختلف پیشہ ورانہ کاموں کی تربیت دی جاتی ہے۔

نئی کتابیں

زبان اور قواعد

رشید حسن خاں

ناشر : ترقی اردو بورڈ، وزارت تعلیم، حکومتِ ہند

قیمت : ۱۷ روپے ۵۰ پیسے

پچھلے دو سال میں رشید حسن خاں کی دو اہم کتاب شائع ہوئی ہیں۔ پہلی اُردو املا، دوسری زبان اور قواعد۔ دونوں کتابیں ترقی اُردو بورڈ کے زیراہتمام چھپی ہیں۔ "زبان اور قواعد" ابھی حال میں شائع ہوئی ہے۔ ۵۰۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مندرجۂ ذیل نو مقالے ہیں :

۱ - صحت الفاظ	۲ - مشترک الفاظ
۳ - لغت اور استعمالِ عام	۴ - ملائی - بالائی
۵ - ترکیبِ مہنّد	۶ - سقوطِ حروفِ علّت
۷ - اعلانِ نون	۸ - مختاراتِ امیر مینائی
۹ - بحرالبیان	

"زبان اور قواعد" درحقیقت مصنّف کی پہلی کتاب اُردو املا کا تکملہ اور تتمّہ ہے۔ کسی زبان کو سیکھنے میں پہلا مسئلہ یہ سامنے آتا ہے کہ اس کے الفاظ کو کس طرح لکھا جائے اور آیا ان الفاظ کے املا کے لیے کوئی منطقی اصول موجود ہے یا نہیں ؟ املا یا لفظ کی ظاہری شکل متعین ہونے کے بعد اس کے تلفّظ کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے پھر لفظ کی ساخت اور اس کی تذکیر و تانیث کا تعین کرنا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ نکتہ بھی معرضِ بحث میں آتا ہے کہ کس لفظ کا اصلی مفہوم کیا تھا اور اب کس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ "زبان اور قواعد" میں انھیں بنیادی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔

اردو زبان نے فارسی اور ترکی کے سیکڑوں الفاظ اپنائے ہیں۔ ان میں بہت سے الفاظ اپنا اصلی تلفظ بدل چکے ہیں۔ بعض ایسے الفاظ بھی ہیں جن کا اصل تلفّظ صرف خواص یا ادبی زبان تک محدود ہے، عام لوگ اسے دوسری طرح بولتے ہیں اول الذکر گروہ میں مثلاً "تشنہ" اور "تشنگی" ہیں جو فارسی میں مفتوح ت کے ساتھ ہیں، یا ترکی میں "بابر" کی دوسری ب مضموم ہے۔ اسی طرح عربی میں "عظمت" کی ظ مفتوح ہے ساکن نہیں۔ "بنفشہ" میں نون مضموم ہے۔ "درخشاں" کے پہلے دونوں حروف پر ضمہ ہے۔ یہ سارے الفاظ اُردو میں اپنا اصل تلفظ کھو چکے ہیں اور ان کا دوسرا تلفظ عوام اور خواص میں رائج ہو چکا ہے۔ اب اگر لغت میں ان الفاظ کا اندراج کیا جائے تو کیا طریق کار ہو؟ اس سلسلے میں رشید حسن خاں کا نظریہ ملاحظہ ہو :

فارسی اور عربی کے جن لفظوں میں حرکات کی تبدیلی ہوئی ہے ان کی صورت بدل گئی ہے یا قیاس کے واسطے سے کچھ نئی صورتیں معرضِ وجود میں آئی ہیں تو یہ ساری تبدیلیاں اُردو کے مزاج اور ہندوستانی لہجے کے اقتضا سے خود بخود عمل میں آتی ہیں۔ یہ عمل زبان کی حقیقی صلاحیت کا مظہر ہوتا ہے اور اس کا ثبوت کہ وہ زبان زندہ ہے اور متحرک ہے۔ جس زبان میں یہ صلاحیت باقی نہیں رہتی وہ ترقی کے امکانات سے محروم ہو جاتی ہے . . . عربی و فارسی کے جن لفظوں میں حرکات کی تبدیلی ہوتی ہے وہ یہاں کے لہجے کی تقاضوں کی آئینہ داری کرتی ہے جیسے سیّد، جیّد، میّت، طیّب؛ کہ عربی میں یہ سب لفظ بکسر یائے مشدّد ہیں۔ مگر اردو میں ان کو عام طور پر بہ فتح یائے مشدّد بولا جاتا ہے۔ یا جیسے فرشتہ، فریب، بہشت کہ فارسی میں یہ لفظ بکسر حرفِ اول ہیں مگر اردو بول چال میں بہ فتح حرفِ اول ہیں؛ اردو والوں کے لہجے کے اعتبار سے یہ تلفّظ بالکل صحیح ہے بلکہ اب فصاحت کی سند اسی تلفّظ کو حاصل ہے۔" (ص ۱۱ - ۱۲)

تلفّظ کے سلسلے میں دوسرا گروہ ایسے دخیل الفاظ کا ہے جن کے دو تلفّظ خواص اور عوام میں رائج ہیں۔ بہ الفاظِ دگر ایک ہی لفظ کا ایک معیاری اور ادبی تلفّظ ہے اور دوسرا غیر معیاری یا عوامی۔ مثلاً صبح، شمع، دفع، رفع؛ یہ سب الفاظ بہ سکونِ حرفِ دوم ہیں، شعر میں اسی طرح نظم کیے جائیں گے مگر بول چال میں بہ فتحِ حرفِ دوم مستعمل ہیں۔ ہمارے لغت نویسوں نے عموماً اس قبیل کے الفاظ کا صرف معیاری تلفّظ درج کیا ہے اور عوامی تلفّظ کی سرے سے نشان دہی نہیں کی ہے رشید حسن خاں کا یہ خیال ہے کہ ایسے الفاظ کے عوامی یا غیر معیاری تلفظ کا ذکر بھی ضروری ہے البتہ :

استعمال عام کی نچلی سطح پر تلفّظ میں جو مختلف قسم کی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں وہ سب لازماً قابلِ قبول نہیں ہوتیں۔ ان تبدیلیوں کو قابلِ قبول سطح تک آنے کے لیے اور اپنی جگہ بنانے کے لیے ایک طویل وقفے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہت سی تبدیلیوں میں سے کچھ تبدیلیاں ہی قابلِ قبول سطح تک پہونچ کر اپنی جگہ بنا پاتی ہیں۔ اور اسی صورت میں وہ لغت کے لیے قابلِ قبول ہو سکتی ہیں" (ص ۱۹۳)

کوئی زبان جب ارتقا کی منزلیں طے کرتی ہے تو الفاظ اور لغات کا ذخیرہ دن بدن بڑھتا جاتا ہے۔ زبان میں کوئی نیا لفظ دو طرح سے داخل ہوتا ہے۔ کبھی کبھی چند خواص بیٹھ کر ایک لفظ وضع کرتے ہیں اور اسے عوام میں رائج کرنے کی کوشش کرتے ہیں کبھی کبھی ایک نیا لفظ عوام سے ابھر کر آتا ہے اور پھر خواص اسے قبول کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن بعض ثقہ اساتذہ اس میں صرفی و نحوی یا کوئی اور لفظی نقص نکال کر اسے مردود قرار دیتے ہیں۔ مثلاً لفظ "تلاشی" ہے ہم نے عربی قاعدے کے قیاس پر تلاشی بنا لیا حالانکہ "تلاش" عربی لفظ نہیں ہے۔ "فرق البحرک"، "فی زمانہ"، "مرضی"، "اندازاً"، "نمونتاً" یہ تمام الفاظ قواعد کی رو سے غلط ہیں مگر عام زبانوں پر دراصل یہی آ گئے ہیں

ہم اردو لغت میں شامل کرسکتے ہیں یا نہیں۔ اگر آپ کا جواب نفی میں ہے، تو کیا آپ کے خیال میں اس سخت گیری کے ساتھ اردو زبان وسیع اور لچک دار ہو سکتی ہے؟

بات صرف مفردات تک محدود نہیں، مرکبات کا مسئلہ بھی اتنا ہی اہم ہے بقول رشید حسن خاں "مرکبات زبان کا اہم حصہ ہوتے ہیں، ادب خصوصاً شاعری کو ان کی خاص طور پر ضرورت ہوتی ہے۔" ترکیب کی عام صورت یہ اختیار کی گئی کہ مرکب لفظ کے دونوں جز عربی فارسی ہوں، ایک لفظ عربی فارسی اور دوسرا دیسی ہو تو عموماً ایسے مرکب کو علمائے قواعد نے غلط بتایا ہے۔ اس لیے "سنسنی خیز" اور "سمجھ دار" کو بہت سے حضرات غلط سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اساتذہ اور شعرا نے ایسے بہت سے مرکبات استعمال کیے ہیں جن کا ایک جز عربی فارسی ہے اور دوسرا دیسی۔ مثلاً: بسنتی پوشش، امام باڑا، دھوکے باز وغیرہ۔ یا اسی طرح فارسی اضافت اور صفت موصوف کا مسئلہ ہے کہ یہاں بھی ہم دونوں جز کے فارسی عربی ہونے پر اصرار کرتے ہیں اور اس لیے "پس چلمن" کو غلط کہتے ہیں۔ یہ بحث نازک ہے۔ فاضل مصنف نے ترکیب مہنّد کے ذیل میں ان مسائل سے بحث کی ہے۔

"زبان اور قواعد" میں مشترک الفاظ کے ذیل میں مصنف نے ایسے چھے الفاظ سے بحث کی ہے جن کی تذکیر و تانیث میں اختلاف ہے۔ یہ الفاظ ہیں آب، صاد، الاپ، ایجاد، آغوشش اور املا۔ ان الفاظ کے ذیل میں مصنف نے جو بحث کی ہے اور اساتذہ کے کلام سے جو مثالیں دی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بقول ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم "جنس یا تانیث و تذکیر کا اختلاف ہر دور میں رہا ہے اور یہ اختلاف مکان اور زمان دونوں پر مبنی ہے۔" مکانی اختلاف میں عموماً لکھنؤ اور دہلی کا نام لیا جاتا ہے۔ رشید حسن خاں نے ان چھے لفظوں کی بحث میں یہ بتایا ہے کہ عموماً غلط طور پر یہ مشہور ہو گیا ہے کہ فلاں لفظ لکھنؤ میں مؤنث ہے اور دہلی میں مذکر یا اس کے برعکس۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ تذکیر و تانیث کی بحث بیشتر مفروضات پر مبنی ہے۔

"زبان اور قواعد" میں ایک بہت ہی عالمانہ مقالہ "مختارات امیر مینائی" کے عنوان سے ہے۔ اردو والوں نے امیر مینائی کو عموماً شاعر کی حیثیت سے جانا اور پہچانا ہے اور اسی حیثیت سے ان کا مقابلہ اور موازنہ داغ سے کیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیر مینائی ایک ماہر زبان اور باکمال لغت نویس بھی تھے۔ انھوں نے اپنے خطوط میں (جن کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا) زبان، قواعد اور لغت کے بعض اہم مسائل پر بحث کی ہے۔

"زبان اور قواعد" میں دو اور دلچسپ بحثیں ہیں، ایک ملائی اور بالائی سے متعلق ہے، دوسری "بحر البیان" پر ہے۔ موخر الذکر سحر لکھنوی کا رسالہ ہے جسے اس کتاب میں شامل کر دیا ہے اور اس پر ضروری حواشی لکھے گئے ہیں۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ "زبان اور قواعد" اپنے موضوع پر آخری کتاب ہے۔ زبان اور ادب کی بحثیں چلتی رہتی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ رشید حسن خاں نے جن اہم مسائل پر قلم اٹھایا ہے ضرورت ہے کہ اردو کے اساتذہ ان پر مل کر غور کریں اور ان مسائل کا کوئی آخری حل نکالنے کی سعی فرمائیں۔ (نور الحسن انصاری)

لمحوں کا حصار (مجموعہ کلام)

آفتاب شمسی   قیمت پانچ روپے   ضخامت ۱۱۲

پیش نظر کتاب غزلوں اور نظموں کا ملا جلا مجموعہ ہے۔ اس میں نظمیں آزاد یا معریٰ اور مختصر ہیں یعنی محض تین مصرعوں پر مشتمل۔ اس مجموعہ کی نظمیں ہلکی پھلکی اور دوہے کے انداز کی ہیں۔ میری رائے میں آزاد نظم کو ہلکی سی پیچیدگی اور پُراسراریت ہی راس آتی ہے۔ بعض نظموں میں کوئی واقعہ یا مشاہدہ بیان کیا گیا ہے مگر نظم ابلاغ کی سطح پر ناکام ہو کر عموماً ایک سطحی ہو گئی ہے۔ بہرحال آفتاب شمسی کے مزاج میں دردمندی اور سماجی انصاف کی چاہت کا دخل ہے۔ ان کی بعض نظمیں اس کی شاہد ہیں۔

آفتاب شمسی کی غزلیں ان کی نظموں سے کہیں زیادہ بلیغ اور جدید احساسات سے پُر ہیں۔ ہم عصر زندگی کی پیچیدگیوں میں فرد کی اکائی گم ہو گئی ہے، احساسِ تحفظ کی جگہ خوف اور سراسیمگی نے لے لی ہے۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سائنس نے زندگی کے سارے اسرار حل کر دیے ہیں مگر سائنس کی تباہ کاریوں نے زندگی کو از سر نو نئے اسرار میں الجھا دیا ہے اور آدمی حیران و پریشان ہے۔ آفتاب شمسی کی غزلوں میں ہم عصر زندگی کے احساسات کامیابی کے ساتھ قلم بند ہوئے ہیں۔ وہ اپنے قاری کے ساتھ ترسیل کا رابطہ قائم کر لیتے ہیں۔

"لمحوں کا حصار" بیس تیس سولہ سائز پر چھپی ہے۔ اس کی کتابت اغلاط سے پاک، طباعت شفاف اور گٹ اپ صاف ستھرا ہے۔ ٹائٹل کور آرٹسٹک ہے۔

مجموعۂ خیال

نازش سکندر پوری

قیمت پانچ روپے   ضخامت ۹۶ صفحات

ادب کی تاریخ گواہ ہے کہ ادب کی دنیا میں کوئی رجحان یا انداز بیان یکسر ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ ضرور ہے کہ کچھ دن گزرنے پر ادب میں نئے اسالیب کی تلاش ہوتی ہے۔ طباع اور اختراعی ذہن اپنی بات کہنے کا ڈھنگ بھی نیا اختیار کر لیتے ہیں۔ تازگی کے متلاشی نسبتاً کم طباع ذہن اظہار کے نئے اسالیب کی جانب لپکتے ہیں اور پرانے سے دامن کشی اختیار کرتے ہیں مگر نئے اسالیب اظہار کی اس تگ و دو میں بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو قدامت اور روایت کو جان سے عزیز رکھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں جب تک کوئی اسلوب خوب استعمال ہو کر ایک ماڈل یا ڈیزائن کی شکل نہیں اختیار کر لیتا قابلِ اعتنا نہیں ہوتا۔ یا پھر بہت سے ادیب ادب اور ادبی روایت کو ہم معنی سمجھ لیتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں روایت سے انحراف گویا ادب کے دائرے سے اخراج ہوتا ہے یا پھر جو لوگ بعض ادبی روایات کو اپنے اندر اس طرح رچا بسا لیتے ہیں کہ پھر اس کو چھوڑنا ان کے لیے

ناممکن ہوجاتا ہے اور وہ روایتی طرزِ اظہار سے برابر منسلک رہتے ہیں۔ نازش سکندرپوری ایسے ہی روایتی اور کلاسیکی طرزِ اظہار کے شاعر ہیں۔

پیشِ نظر کتاب ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ صفحات تین حصوں میں تقسیم کیے گئے ہیں۔ یعنی دورِ اوّل (۳۲ غزلیں)، دورِ ثانی (۲۵ غزلیں) اور نظمیں (۹) دورِ اول اور ثانی کی غزلوں میں کوئی خاص یا بنیادی تفاوت نہیں ہے البتہ دورِ ثانی کی غزلوں میں روایتِ لفظی، اجتماعِ ضدّین اور بالکل سامنے کے مضامین نسبتاً کم ہیں گوکہ شاعر کی انفرادیت یا اپنا پن ان میں بھی ابھر کر سامنے نہیں آیا تا۔ نازش سکندرپوری کی غزلوں پر مشاعرہ کی مُہر ثبت ہے۔ ان کے اشعار میں لفظوں کی بندش ایسی ہے کہ جو مشاعرہ میں فوری داد حاصل کرسکتی ہے۔ ان کی لفظیات اکثر و بیشتر سبھی سجائی اور نستعلیق قسم کی ہے اور طویل مشقِ سخن کی غماز ہے۔ نظمیں پابند مختصر اور رسمی انداز کی ہیں۔

"مجموعۂ خیال" کی کتابت اور طباعت بہت اچھی ہے۔ ٹائیٹل سادہ مگر جاذبِ نظر ہے۔

(انوار رضوی)

یادوں کے سائے

ممتاز مرزا

مکتبۂ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دلی۔ ۱۹۷۵ء

صفحات: ۲۰۲ قیمت: بیس روپے

کچھ یادوں کے سایے بڑے تلخ ہوتے ہیں اور کچھ بہت لطیف اور حسین۔ ممتاز مرزا کی "یادوں کے سائے" کی کتابت، سرورق اور کاغذ دیکھ کر یقین آتا ہے کہ اگر ان سایوں میں تلخی بھی تھی تو امتدادِ زمانہ کے باعث اب وہ شیریں ہوگئی ہے۔ اس خوبصورت کتاب کے اندر کچھ بڑی دلکش یادیں ہیں، غزلیں جو سادہ، دلنشیں اور روایتی انداز میں لکھی گئی ہیں۔ دھیمے دھیمے مسکراتے لہجے میں پڑھی گئی ہیں۔ لیکن غمِ دوست میں کہیں کہیں غمِ دنیا بھی شامل ہوگیا ہے جس سے شاعرہ کی ذہنی وسعت کا پتہ چلتا ہے:

الجھے دھاگوں کا ہے اک ڈھیر یہ دنیا تیری
وہ مسائل کہ نہ حل جن کے کتابوں میں ملیں

مہر و اخلاص و وفا دوستی و لطف و کرم
یہ وہ الفاظ ہیں جو صرف کتابوں میں ملیں

قدم بڑھا تو دیے ہیں بشر نے اے ممتاز
مہ و نجوم سے آگے خدا ملے نہ ملے

ایک اور شعر جس کی سادگی دامن گیر ہوتی ہے:

بچھڑ کے ہم سے تمھاری بھی آنکھ پُر نم تھی
یوں ہی خیال سا اک بار بار گزرے ہے

اور یہ معصوم سا احساس:

ہزاروں چاند ستارے نکل کے ڈوب گئے
مگر میں دل کے سدا جھٹپٹا سا رہتا ہے

ممتاز مرزا کی غزلیں روایتی درد کی کسک، غمِ عشق کے انتظارِ لازوال اور ہر جفا کے بعد بھی باوفا رہنے والے دل کی ترجمان ہیں ــــ اور بقول خود ان کے:

غمِ حیات کی روداد تھی مگر ممتاز
سمجھ لیا اسے لوگوں نے شاعری میری

آتشِ سیّال

ساجدہ زیدی

مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دلی۔

صفحات: ۲۱۶ قیمت: آٹھ روپے

اردو شاعری میں اس مفکّر شاعرہ کی آواز چونکا دینے والی ہے۔ ساجدہ زیدی کی "آتشِ سیّال" کو جرعہ جرعہ پینے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس عہد کی جیتی جاگتی عورت ہے جس کے ذہن کے دریچوں میں ہر سمت کی ہوائیں آئی ہیں اور جس کے ادراک نے ہر مکتبِ فکر کو جانا اور سمجھا ہے اور اسے اپنی مٹھی میں سمیٹ کر آتشیں الفاظ کے جامے پہنائے ہیں۔ ساجدہ زیدی کے یہاں فرسودہ رومانیت نہیں، مایوسی بھی نہیں۔ جذبے کی بھرپور شدّت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی بلکہ عورت کی شخصیت کا پورا احساس ہے گو ان کے کلام میں سارتر کی پرچھائیاں جابجا نظر آتی ہیں۔ لیکن اس تاثر نے انھیں وجودیت میں بالکل ضم نہیں کردیا۔ اسی طرح کافکا بھی ان کے شعروں میں اکثر جھلکتا ہے مگر یہ جھلک کسی کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش نہیں، یہ ویسا ہی تاثر ہے جیسا کہ ہر صحت مند اُجلا ذہن دوسرے درخشاں ذہن کے عکس سے قبول کرتا ہے۔

ہندوستانی عورت یا عورت کے متعلق ان کی نظم "میں وہ تصویر نہیں" اتنی حقیقی اور سچی ہے کہ یہ چھوٹی سی نظم عورت کی پوری تاریخ کہی جاسکتی ہے۔ "LIVING MOMENT TO MOMENT" کی پوری تفسیر ان کے "لمحۂ وجود" میں نظر آتی ہے۔

آؤ اس ایک لمحے میں زندہ رہیں
جس میں دو مختلف سمت سے آتے دھارے
باہم مل کے تحلیل ہوں
ایک ہستی کی مانند ایک کل کی صورت میں
آؤ اس ایک لمحے کی لذت میں
ہر آرزو کو سمو دیں
ہر آسودگی سے ملائیں نگاہیں۔

ساجدہ زیدی کی زبان خوبصورت، غیر معمولی اور انفرادی ہے۔ "آتشِ

سیالی یقیناً اردو ادب کے میخانے میں وہ اضافہ ہے جس کے قدرداں اور پارکھ اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

دھرتی کا لمس

ناہید زیدی

۲۲ ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ اگست ۸۵ء

صفحات : ۱۲۴ قیمت : ۱۲ روپے

اردو شاعری میں زاہدہ زیدی کا نام نیا نہیں۔ یہ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ "زہرِ حیات" میں جو بھرپور گرفت اور آگہی و دروں بینی نظر آتی ہے وہ موجودہ مجموعے میں قدرے کم ہے۔ "دھرتی کا لمس" میں ان کی چھوٹی خوبصورت نظمیں ہیں۔ جن میں جنس کا جذبہ زیادہ غالب معلوم ہوتا ہے "تم" میں ہیئت کا ایک نیا تجزیہ ہے جو ایک لحاظ سے کامیاب ہے۔ زاہدہ کے یہاں احساس کا درد ہے اور اس درد کو وہ الفاظ کی چادر میں اس طرح ملبوس کرتی ہیں کہ وہ یوسف کا پھٹا ہوا دامن بھی نظر آئے اور دروپدی کی چیر بھی ——

ادھورے احساس کے گداگر\
جراحتوں کے لباس پہنے\
سہمی ہوئی\
امیدوں کے ہاتھ پکڑے\
روز کی طرح بازارِ غم میں آئے

اور

ادھوری انسانیت کے تاجر\
عجب متانت سے کھولے کواڑ\
ادھوری بصارتوں کے\
ادھوری اقدار کا\
مول کر رہے تھے۔

اس مجموعے کے آخر میں کچھ غزلیں بھی ہیں جن میں روایتی انداز بھی ہے اور نئے تفکر کی آمیزش بھی۔

ٹوٹے ہوئے افکار کے ٹکڑوں کو اٹھالو\
پھر نشترِ احساس سے اک جسم تراشو\
ہم تم کو سمجھتے ہیں سجو کوئی بھی ملبوس\
فرسودہ روایات کی اکڑی ہوئی لاشو\
مندا ہے یہ بازار دکاں اپنی بڑھاؤ\
مانگے کے خیالات کے تجار مہاشو

اور روایتی انداز میں ملاحظہ کیجئے:

شہر آشوب میں یہ عمر گراں پائی ہے\
سنگِ بیداد سے زخموں کی زباں پائی ہے

ایوانِ غزل

جیلانی بانو

ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

صفحات ۴۶۲ قیمت ۱۷ روپے

تقریباً ساڑھے چار سو صفحات پر پھیلی یہ کہانی حیدرآباد کے ایک خاص طبقے کی کہانی ہے مگر اس کی عورتیں سارے ہندوستان کی عورتیں ہیں۔ مری کچلی ہوئی بے زبان خاموش جلنے والی عورتیں۔ جنھیں دیکھ دیکھ کر سینہ جلنے لگتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ یہ صنفِ مردہ جسے عورت کہا جاتا ہے اسے صفحۂ ہستی سے مٹا کیوں نہ دیا جائے —— جیلانی بانو کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ وہ ان کرداروں کے ساتھ ہمدردی کرنے اور ان کے ساتھ آنسو بہانے کے جذبے کو بیدار کرنے کے بجائے ان سے نفرت اور بغاوت سکھاتی ہیں —— پورے ناول میں کوئی مرد ایسا نظر نہیں آتا جو واقعی پیار کرنے کے قابل ہو —— سب مُردار خور گدھ ہیں —— اپنی ذات کی لذتوں اور جھوٹی انا کے حصار میں گرفتار سڑے مرے گدھ —— کوئی زندہ جیتا جاگتا مرد نہیں ہے —— لیکن سب حقیقی ہیں، کوئی کردار فرضی نہیں معلوم ہوتا —— حیدرآباد کے نوابوں کی تہذیب، ان کا عروج، ان کی گراوٹ، ان کی پستی جیلانی بانو نے ایک رئیلسٹک مصوّر کی طرح پیش کر دی ہے —— مردوں میں صرف دو کردار آتے ہیں جو گدھ نہیں بلکہ انسان معلوم ہوتے ہیں ایک ہے سنجیوا ریڈی اور دوسرا شاہین —— لیکن شاہین بھی ساری بغاوت صرف اپنی ذات اور انا ہی کے لئے کرتا ہے، کسی دوسرے کے لئے نہیں —— !

سیاسی پس منظر کو جیلانی بانو نے سرسری نگاہ سے دیکھا ہے، زیادہ گہرائی سے نہیں۔ لیکن جن کرداروں اور ماحول کو وہ ساتھ لے کر چلی ہیں ان کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے گو کہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ کردار بہت جانے پہچانے ہیں۔

ایوانِ غزل —— وہ ناول ہے جو اردو ادب کے ایوان میں ایک اچھا اضافہ ہے —— کاش کہ اس کی کتابت اور طباعت بھی اور بہتر ہو سکتی۔

(ک۔س)



جلسۂ تقسیم اسناد جامعہ ملیہ اسلامیہ ۱۳ نومبر ۱۹۷۶ء

(تصویر میں) خطبہ دینے کے لیے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے چانسلر جناب ہدایت اللہ صاحب سابق چیف جسٹس ہندوستان اور پروفیسر مسعود حسین خاں وائس چانسلر جامعہ ملیہ کی معیت میں ڈائس کی طرف تشریف لے جا رہی ہیں۔

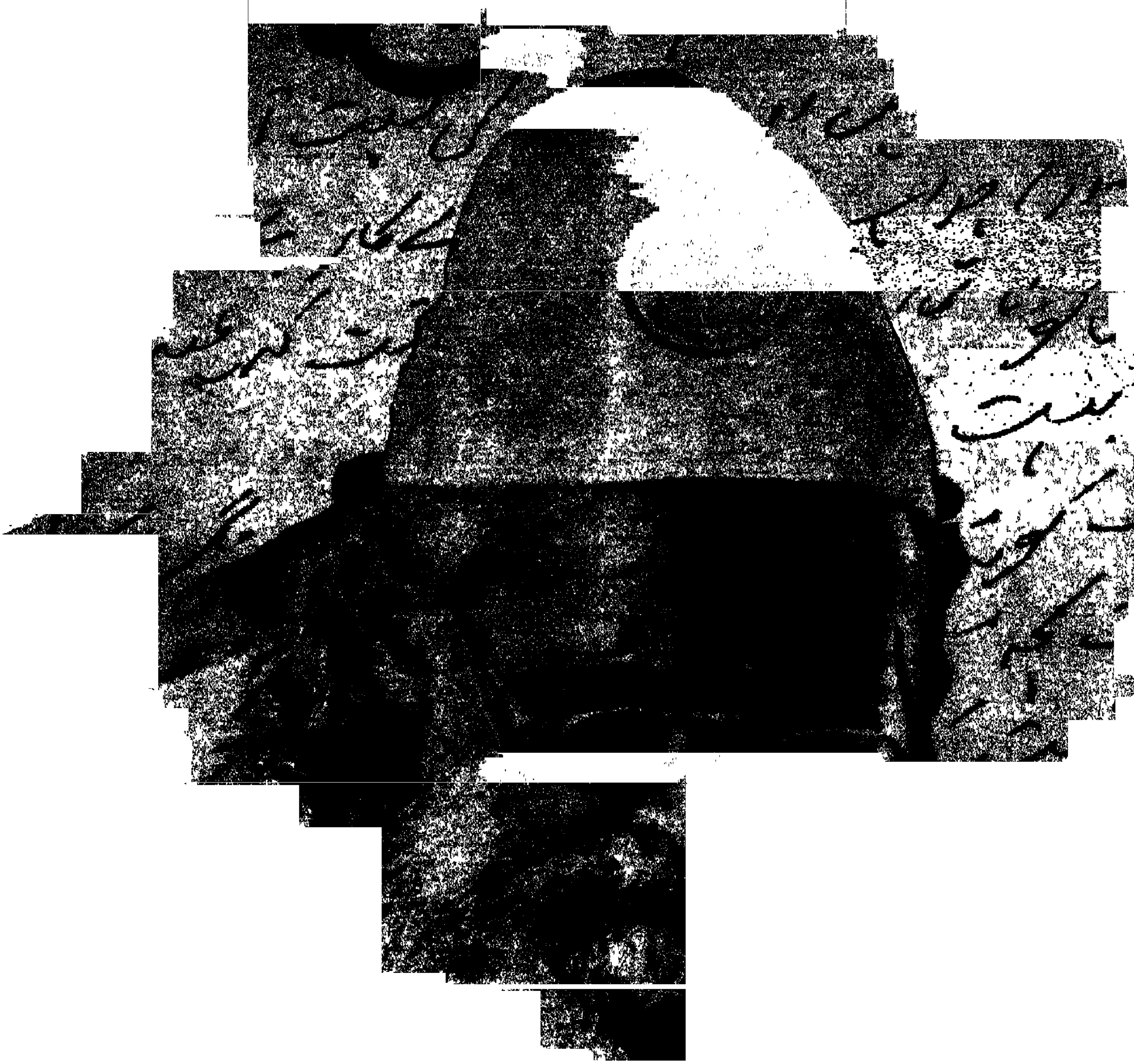
اردن
کے ولی عہد
ہز ہائی نس شاہزادہ
حسن بن طلال
اور
ہر ہائی نس شہزادی
ثروت
ہندوستان کے سرکاری
دورے پر تشریف لائے تھے
ایک ہفتے کے قیام (۲۴ نومبر
تا یکم دسمبر ۱۹۷۶ء) کے
دوران آپ نے ملک کے مختلف
حصوں کا دورہ کیا۔ آپ نے کہا کہ
ہندوستان اور اردن کے باہمی
[illegible]

آجکل

فروری ۱۹۷۷ء

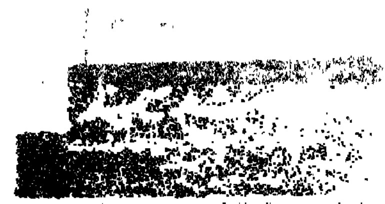
ایک روپیہ







جناب محمد شفیع قریشی
وزیر مملکت
نے
اس سیمینار کا افتتاح
کیا



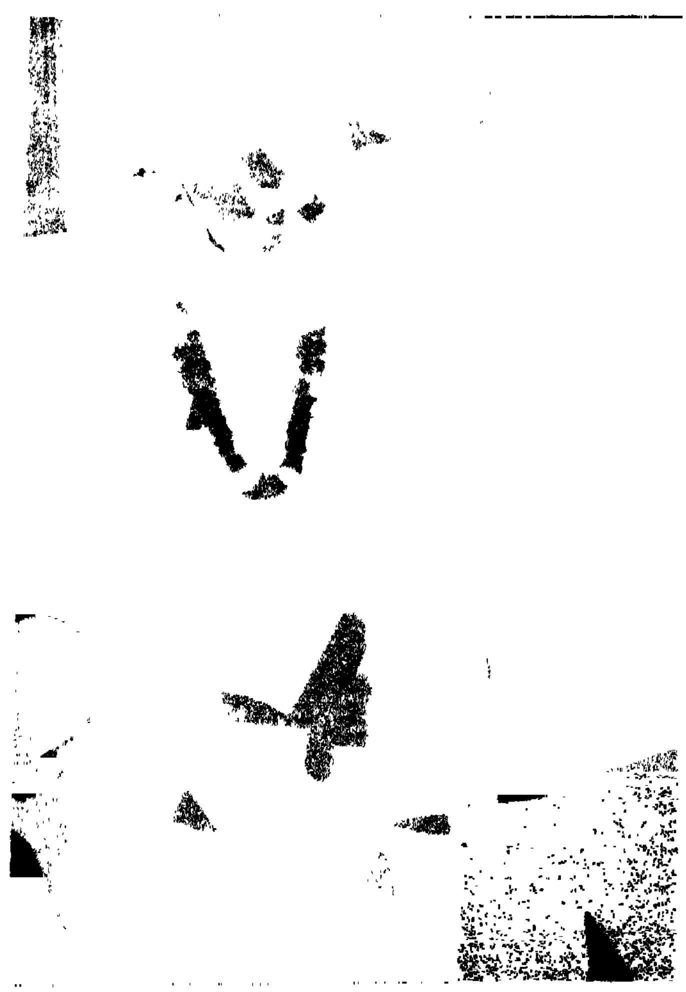
کل ہند سیمینار

حضرت خواجہ حسن نظامی حیات اور خدمات

۱۱ دسمبر ۱۹۷۶ء

صدر جلسہ سید مظفر حسین برنی سکریٹری وزارت اطلاعات ونشریات، حکومت ہند
کا استقبال

اس سیمینار میں حضرت سید محمد محمد الحسینی سجادہ نشین درگاہ خواجہ گیسو دراز
گلبرگہ شریف نے بھی شرکت کی (تصویر میں داہنی طرف)





اُردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہنامہ

آج کل
نئی دہلی

ایڈیٹر:
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۳۵ شمارہ ۷
فروری ۱۹۷۷ء
ماگھ پھالگن شک ۱۸۹۸

شرح چندہ

سالانہ	دس روپیہ	۳ ڈالر	۱ پاونڈ
دوسالہ	۱۷ روپیہ	۵ ڈالر	۱.۷۰ پاؤنڈ
سہ سالہ	۲۴ روپیہ	۷ ڈالر	۲.۴۰ پاؤنڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	۳۰. سینٹ	۱۰ پنی

خواجہ حسن نظامی نمبر

ترتیب

ضروری اطلاع

یکم جنوری ۱۹۷۷ء سے طلبا اساتذہ اور لائبریریوں کو آج کل اور پبلیکیشنز ڈویژن کی دیگر مطبوعات کی خریداری پر ۲۵ فیصد کمیشن کے بجائے دس فیصد کمیشن کی رعایت دی جائے گی۔

ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر "آج کل (اُردو)" پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ:
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ملاحظات

فکر اسلامی کی تشکیل جدید

صدر جمہوریہ ہند جناب فخر الدین علی احمد نے ۲۶ دسمبر ۱۹۷۶ء کو ذاکر حسین اسلامک اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید کے عنوان سے ایک سہ روزہ سیمینار کا افتتاح کیا تھا۔ ذیل میں ان کے خطبے کے اقتباسات دیے گئے ہیں:

مجھے خوشی ہے کہ ذاکر صاحب کے نام سے منسوب اس انسٹی ٹیوٹ نے فکر اسلامی کی تشکیل جدید جیسے اہم مسئلے کو غور و بحث کا موضوع قرار دیا مجھے توقع ہے کہ تین دن بحث و مباحثہ کے بعد وہ ضرور کسی ایسے نتیجے پر پہونچیں گے جو موجودہ، سائنٹیفک ماحول میں مفید اور کارآمد ثابت ہو، قرآن ایک باضابطہ قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی تعلیم مکمل ہے، ہر ملک کے لیے، ہر قوم کے لیے، ہر فرد کے لیے اور ہر زمانے کے لیے دراصل ہماری تعلیم نامکمل ہے، اگر ہم کسی شک و شبہ میں پڑ جاتے ہیں تو وہ ہمارے ذہن کی کمزوری ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اب ہم آزاد ملک کے شہری ہیں۔ اضطراب اور مایوسی کا دور گزر چکا ہے۔ آج ملک بھر میں نئی تعمیر کا جو ولولہ پایا جاتا ہے وہ مسلمانوں کے دلوں کو بھی گرما رہا ہے انھیں اس عظیم ملک کے برابر کے شہری ہونے کی حیثیت سے اس اہمیت کا احساس ہے جو ترقی پذیر ممالک کے درمیان اسے حاصل ہے، لازم ہے کہ یہ احساس نئی امنگوں کو جنم دے اور وہ بھی جرأت اور حوصلہ کے ساتھ ملک اور انسانیت کی تعمیر نو میں حصہ لینے پر کمربستہ ہو جائیں۔ اس کے لیے انھیں فکر اسلامی سے حیات تازہ حاصل کرنی ہوگی انھیں انفرادی، خاندانی اور ملکی ترقی کا دھیان رکھنا ہوگا اور جذبات کی رو میں بہہ کر کسی مسئلہ پر سطحی طور پر غور نہ کرتے ہوئے اس کے دور رس نتائج پر نگاہ رکھنی ہوگی۔ مثلاً آپ اس سے واقف ہیں کہ اس وقت نہ صرف ہندوستان میں بل کہ پوری دنیا میں بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ درپیش ہے۔ اس کی روک تھام کے لیے ہماری حکومت نے اقدام کیے تو کچھ لوگوں نے بلا کسی جواز کے مخالفت کا نعرہ بلند کر دیا جو نہ صرف قومی اعتبار سے بل کہ مذہبی اعتبار سے بھی مفید نہ تھا۔ جہاں تک مجھے علم ہے اسلام نے محدود چھوٹے کنبہ کی کہیں بھی اور کبھی بھی مخالفت نہیں کی ہے۔ دنیاوی لحاظ سے بھی سوچیے کہ ایک بچہ کی صحیح تربیت اور تعلیم کے لیے کتنی جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر بچے زیادہ ہوں تو تصور کیجیے کہ کیا حالت ہوگی۔ اس مسئلہ کا ذکر میں نے ضمناً اس لیے کیا کہ آج یہ مسئلہ انفرادی حیثیت سے ہٹ کر قومی اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس کو بھی زیر بحث لائیں گے اور مسلمانوں کو مذہبی نقطہ نظر سے واقف کرائیں گے اور انھیں اس میں بلا جھجک تعاون کرنے کی ترغیب دیں گے بل کہ انھیں اس جذبہ کو اپنی زندگی کا لازمی جُز بنانے پر آمادہ کریں گے۔

ہندوستانی مسلمان ہوں یا دنیا کے دوسرے ممالک میں بسنے والے مسلمان، سب عالمی انسانی برادری کے جزو ہیں۔ ان کے لیے یہ تبدیلیاں بہت اہمیت رکھتی ہیں کہ اب دنیا سنجیدگی کے ساتھ ایک نئے نظام کی تشکیل میں مصروف ہے۔ تہذیبی نظر ثانی، نئے عالمی اقتصادی نظام کی تلاش اور قوموں کے ساتھ بڑھتے ہوئے رابطے اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ اسلامی فکر کی تشکیل جدید کا کام کسی محدود قومی دائرے میں نہیں بل کہ عالمی انسانی دائرے میں عمل میں آئے۔ جدید اسلامی فکر وہ ہوگا جو جدید انسان کی ذہنی الجھنیں دور کرے اور اس کی روحانی پیاس بجھائے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہو اور انسانی شخصیت کو اس کا کھویا ہوا توازن واپس مل جائے جس سے تعمیری ولولے کو تقویت ملے۔ تسخیر کائنات میں اس کے حوصلے بلند ہوں اور ایک ایسے عالمی نظام کی تعمیر میں اس کی رہنمائی ہو جس میں افراد اور قومیں اخوت اور محبت کی بنیاد پر امن و آشتی کے ساتھ پڑوسی بن کر رہ سکیں جو قوموں کے اندر اور قوموں کے مابین عدل و مساوات کا ضامن ہو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سو سال

۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو مسلم اینگلو اورنٹیل کالج کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اس کا سنگ بنیاد لارڈ لٹن وائسرائے ہند نے رکھا تھا۔ اس موقع پر سرسید احمد خاں بانی یونیورسٹی نے جو تاریخی الفاظ کہے تھے وہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئے۔ آپ نے کہا تھا:



سرسید احمد خاں

"آج جو بیج ہم بو رہے ہیں اس سے ایک نہایت تناور درخت اُگے گا، جس کی جڑیں برگد کی جڑوں کی طرح زمین میں مضبوطی سے پیوست ہوں گی اور اس سے نئی نئی شاخیں پھوٹیں گی۔ یہ کالج بڑھ کر ایک یونیورسٹی بنے گا اور یہاں کے سپوت ملک کے طول و عرض میں، آزادانہ چھان بین، وسیع القلبی، رواداری اور اخلاق کا پرچار کریں گے۔"

آج مسلم یونیورسٹی نہ صرف ایک مرکزی یونیورسٹی بل کہ قومی اہمیت کا حامل ادارہ ہے جس نے ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

آج اس یونیورسٹی میں لگ بھگ ۱۱ ہزار طلبا ہیں جن میں ڈیڑھ ہزار کے قریب لڑکیاں ہیں۔ آٹھ فیکلٹیوں کے تحت تقریباً ۷۰ شعبے ہیں۔ بہت سے اساتذہ علمی میدان میں بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔

مسلم یونیورسٹی نے ہر میدان میں قابل ذکر اور نمایاں افراد پیدا کیے ہیں جن کی فہرست بہت طویل ہے۔ چند افراد کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

مجاہدین آزادی میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حسرت موہانی، راجہ مہندر پرتاپ، سید حسین، رفیع احمد قدوائی، محمد یونس، ڈاکٹر ذاکر حسین، نواب احمد سعید خاں چھتاری، شیخ عبداللہ، غلام محمد صادق، سید میر قاسم اور عبدالغفور قابل ذکر ہیں۔

علمی اور ادبی شخصیتوں میں ڈاکٹر عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈی، ڈی، کوسمبی، کے۔ ایم۔ پانیکر، ہارون خاں شیروانی، بابر مرزا، خواجہ غلام السیدین، ہادی حسن اور پروفیسر محمد حبیب علی گڑھ کی دین ہیں۔

شاعروں میں فانی، علی سردار جعفری، جوش ملیح آبادی، جذبی، مجاز اور جاں نثار اختر کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

ادیبوں میں راجہ راؤ، شبیر احمد صدیقی، قاضی عبدالغفار، ظفر علی خاں، سجاد حیدر یلدرم، رضا علی، ولایت علی بمبوق، ظفر عمر، آغا حیدر حسن دہلوی اور آل احمد سرور کا نام لیا جا سکتا ہے۔

کھیل کے میدان میں بھی مسلم یونیورسٹی پیچھے نہیں رہی۔ کرکٹ کے مشہور کھلاڑی لالا امرناتھ، سی۔ ایس۔ نائیڈو، مشتاق علی، وزیر علی، نذیر علی، ٹینس میں غوث محمد، ہاکی میں محمد جعفر، مسعود منہاس، علی سعید، گووندا اور انعام الرحمن علی گڑھ کی دین ہیں۔

سرسید کے خوابوں کی تعبیر ایک ایسے درخشندہ ستارے کی صورت میں ضوفگن ہے جس کی تابانی آنے والی نسلوں کو راستہ دکھاتی رہے گی۔

خواجہ حسن نظامی اور دوسرے خصوصی نمبر

اردو کے منفرد انشاپرداز، ادیب، صوفی اور صحافی خواجہ حسن نظامی کے صد سالہ یوم ولادت کے موقع پر نئی دلی میں ایک کل ہند سیمینار منعقد کیا گیا تھا جس میں خواجہ صاحب سے متعلق بڑے اچھے مقالے پڑھے گئے تھے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب کی عنایت سے ہمیں وہ مضامین مل گئے جسے ہم خواجہ حسن نظامی نمبر کی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔

یہ طے کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے متعلق خصوصی نمبر شائع کیے جائیں جن میں اس ریاست کا تاریخی، جغرافیائی، لسانی، تہذیبی اور ادبی جائزہ لیا گیا ہو اور ساتھ ہی ساتھ صنعتی اور معاشی ترقی کی نشان دہی بھی کی گئی ہو۔ اس طرح مختلف ریاستوں کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہوگا۔ اور اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو دوسری علاقائی زبانوں کے ادب سے واقفیت بھی حاصل ہوگی۔ اس سلسلہ کا پہلا شمارہ "تامل ناڈو نمبر" ہوگا۔

وفیات

عالم کی موت



مایہ ناز عالم اور مفکر مولانا عبدالماجد دریابادی کا ۶؍جنوری ۷۷ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوگیا۔ موصوف بہت دنوں سے علیل تھے۔

مولانا عبدالماجد متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کا خاص میدان فلسفہ اور اسلامیات تھا۔ ان کی تفسیر ماجدی کو ہندوستان اور بیرون ہند میں بے حد سراہا گیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریاباد ضلع بارہ بنکی میں ۱۶؍مارچ ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوئے تھے۔

ان کی موت ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔

نواب علی یاور جنگ

نواب علی یاور جنگ، گورنر مہاراشٹر کی موت سے ہندوستان ایک ماہر تعلیم سیاست داں اور تجربہ کار منتظم سے محروم ہوگیا ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میں متعدد عہدوں کو افتخار بخشا اور ملک کے لیے بڑی نمایاں خدمات انجام دیں۔

وہ ۱۶؍فروری ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے۔ وہ جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ارجنٹائن، مصر، فرانس اور امریکہ میں ہندوستان کے سفیر رہے۔ ۱۹۷۰ء سے مہاراشٹر کی گورنری کے عہدے پر فائز تھے۔

۱۱؍دسمبر ۷۶ء کو ان کی طبیعت خراب ہوئی۔ طبی امداد کے باوجود حالت سنبھل نہ سکی۔ اور تقریباً ۱۱ بجے انتقال ہوگیا۔

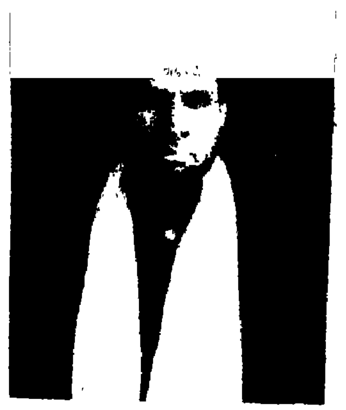
یشپال

۲۶ دسمبر ۱۹۷۶ء کو ہندی کے ممتاز ادیب اور مشہور انقلابی شری یشپال لکھنؤ میں انتقال کرگئے۔

سینکڑوں کہانیوں اور درجنوں ناولوں کے خالق یشپال پنجاب کے ضلع فیروز پور میں پیدا ہوئے۔ جنگ آزادی میں حصہ لینے کی وجہ سے ۱۹۳۲ء میں گرفتار ہوئے اور ۱۴ سال کی سزا ہوئی۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں جب ملک میں کانگریسی وزارتیں بنیں تو وہ رہا کر دیے گئے۔

یشپال کو جدید ہندی، ناول اور افسانے کا معمار کہا جاتا ہے۔ ان کی کہانیوں اور ناولوں کا محور سماجی اور سیاسی مسائل ہوتے تھے۔ ان کے دو ناولوں ـــ دادا کامریڈ ـــ اور ـــ جھوٹا سچ ـــ کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی اور ان کی کئی تخلیقات کا ترجمہ غیر ملکی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

یشپال کی موت سے ہندوستانی ادب کا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔



حسن ثانی نظامی
درگاہ حضرت نظام الدین،
نئی دلی۔

سلسلۂ عالیہ چشتیہ نظامیہ
کا
مختصر تعارف

سلسلہ: سلسلہ زنجیر کو کہتے ہیں۔ جس طرح زنجیر کی ایک کڑی دوسری کڑی سے پیوستہ ہوتی ہے۔ اسی طرح صوفی بزرگ ایک کے بعد ایک اپنے پیروں اور مرشدوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ہر پیر اپنے بے شمار مریدوں میں سے ایک یا چند ایسے اشخاص کا انتخاب کرتا ہے جو اس کے نزدیک دینی اور رُوحانی تعلیم پاکر کامل اور مکمل ہو چکے ہوں اور بالکل اسی طرح تعلیم و تربیت کا کام کر سکتے ہوں جس طرح اس پیر نے خود کیا تھا۔ ان منتخب اشخاص کو صوفی مشن کا پرچار کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ پیر کی اجازت حاصل کئے بغیر کسی کو مرید کرنا اور رُوحانی تعلیم و تربیت کے کام کو اختیار کرنا بالکل اسی طرح غلط سمجھا جاتا ہے جیسے مادی دنیا میں ڈاکٹری اور طبابت کی سند حاصل کئے بغیر میڈیکل پریکٹس درست نہیں سمجھی جاتی۔

پیری مریدی کی اس اجازت اور سند کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ کڑی کو کڑی سے ملاتی ہوئی بغیر کسی رخنے کے پیغمبر اسلام حضور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور اللہ تعالےٰ تک پہنچ جاتے۔ مثال کے طور پر امام المشائخ شمس العلما حضرت خواجہ حسن نظامی کا شجرۂ طریقت ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ ترتیب وار ان میں سے ہر بزرگ کو دوسرے سے اجازت اور سند ملتی رہی۔

١۔ حضرت خواجہ حسن نظامیؒ
٢۔ حضرت پیر مہر علی شاہ چشتی نظامی گولڑہ شریف
٣۔ حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی چشتی نظامیؒ
٤۔ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی چشتی نظامیؒ
٥۔ حضرت خواجہ نور محمد مہاروی چشتی نظامیؒ
٦۔ حضرت مولانا فخرالدین محب النبی چشتی نظامیؒ
٧۔ حضرت خواجہ نظام الدین اورنگ آبادی چشتی نظامیؒ
٨۔ حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی چشتی نظامیؒ
٩۔ حضرت شیخ یحییٰ مدنی چشتی نظامیؒ
١٠۔ حضرت خواجہ شیخ محمد چشتی نظامیؒ
١١۔ حضرت شیخ حسن محمد چشتی نظامیؒ
١٢۔ حضرت شیخ جمال الدین عرف جمن میاں چشتی نظامیؒ
١٣۔ حضرت شیخ محمود عرف شیخ راجن چشتی نظامیؒ
١٤۔ حضرت شیخ علم الدین چشتی نظامیؒ
١٥۔ حضرت شیخ سراج الدین چشتی نظامیؒ
١٦۔ حضرت شیخ کمال الدین علامہ چشتی نظامیؒ
١٧۔ حضرت مخدوم شیخ نصیرالدین چراغ دہلی چشتی نظامیؒ
١٨۔ سر سلسلہ نظامیہ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء چشتی محبوب الٰہیؒ
١٩۔ حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر چشتیؒ
٢٠۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی چشتیؒ
٢١۔ حضرت خواجہ خواجگان نائب رسول فی الہند خواجہ معین الدین حسن چشتی اجمیریؒ
٢٢۔ حضرت خواجہ عثمان ہرونی چشتیؒ
٢٣۔ حضرت خواجہ حاجی شریف زندنی چشتیؒ
٢٤۔ حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ
٢٥۔ حضرت خواجہ ناصرالدین چشتیؒ
٢٦۔ حضرت خواجہ ابو محمد چشتیؒ
٢٧۔ حضرت خواجہ ابو احمد چشتیؒ
٢٨۔ سر سلسلہ چشتیہ حضرت خواجہ ابو اسحاق شامی چشتیؒ
٢٩۔ حضرت خواجہ ممشاد علو دینوریؒ
٣٠۔ حضرت خواجہ امین الدین ابو ہبیرۃ البصریؒ
٣١۔ حضرت خواجہ سدیدالدین حذیفۃ المرعشیؒ
٣٢۔ حضرت خواجہ ابراہیم ادہم بلخیؒ
٣٣۔ حضرت خواجہ فضیل ابن عیاضؒ
٣٤۔ حضرت خواجہ عبدالواحد بن زیدؒ
٣٥۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ
٣٦۔ سر سلسلہ ہائے جملہ خواجگان سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ
٣٧۔ سیدالمرسلین پیغمبر اسلام حضور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

مرید ہونے والا جب اپنے پیر کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گناہوں سے توبہ اور نیکی کا عہد کرتا ہے تو دراصل یہ توبہ اور یہ عہد ہاتھ میں ہاتھ دے کر خود خدا کے سامنے ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہدایت کا راستہ اور تعلیم و تربیت کا طریقہ خود خدا ہی کا بتلایا ہوا ہے جو اس نے پیغمبر کے ذریعے بتلایا۔ اس راستے اور اس طریقے کے سوا جو بھی طریقہ ہوگا اس کی کوئی سند نہیں ہے۔

لفظ صوفی: لفظ صوفی کی اصل کے بارے میں لوگوں نے مختلف باتیں کہی ہیں بعض اس کا جوڑ لفظ "صفا" بمعنی صفائی اور پاکیزگی سے ملاتے ہیں۔

بعض اس کو لفظ " صوف " یعنی اون اور پشینے سے متعلق سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ ایک زمانے میں صوفی اون سے بنے ہوئے موٹے جھوٹے کپڑے اور کمبلی میں گذارا کیا کرتے تھے۔ کچھ کے نزدیک صوفی کی نسبت " اصحاب صفہ " کی طرف درست ہے۔ اصحاب صفہ رسول اسلام ؐ کے وہ مخصوص صحابہ تھے جو اکثر گھر گرہستی سے آزاد نبیؐ کی مسجد میں رہتے بستے تھے۔ اور تھوڑا سا وقت محنت مزدوری میں لگا کر بس اس قدر روزی کمانا کافی سمجھتے تھے کہ اس سے جان و تن کا رشتہ قائم رہے اس کے علاوہ ان کا سارا وقت دین کو سیکھنے اور سکھانے میں صرف ہوتا تھا۔

علی ہٰذا القیاس بہت سے نظریے لفظ صوفی کی اصل کے بارے میں پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن ایک بات طے شدہ ہے کہ اس لفظ کا استعمال بالکل ابتدائی دور یعنی پیغمبر اسلام اور ان کے فوراً بعد کے زمانے میں شائد نہیں تھا۔ یا تھا تو اتنا کم تھا کہ اس کا کوئی ثبوت باقی نہیں رہا۔ اس دور میں لفظ صوفی کی غیر موجودگی بعض حضرات کو یہ سوچنے کا موقع دیتی ہے کہ تصوف دراصل کوئی اسلامی چیز نہیں ہے بلکہ ایران اور ہندوستان کی پیداوار ہے۔ لیکن یہ حضرات اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ تصوف کی اصطلاحیں تو پچھلے تیرہ سو سال میں بے شمار ایجاد اور متروک ہوئیں۔ لیکن تصوف کے اصولوں اور فلسفے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس لئے کسی زمانے میں لفظ صوفی یا کسی اور اصطلاحی نام کا نہ پایا جانا اس بات کا ثبوت اور علامت نہیں ہے کہ یہ فلسفہ بھی اس زمانے میں ناپید تھا۔

تصوف : ان پڑھ اور ناواقف لوگوں کے طرزِ عمل اور دعووں سے قطع نظر اہل تصوف نے ہر زمانے میں شد و مد سے اس بات پر زور دیا ہے کہ طریقت، شریعت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے۔ تصوف عین اسلام ہے۔ صوفیا اپنے ہر قول و فعل کی سند قرآن و حدیث سے لاتے ہیں۔ البتہ ان کا یہ کہنا ضرور ہے کہ اسلام کے ارکان کی ظاہری پابندی ہی کافی نہیں ہے۔ اس کی روح کو حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر وہ پیغمبر اسلام کی اس حدیث کو پیش کرتے ہیں جو حدیث احسان کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس میں کہا گیا ہے کہ خدا کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر اس درجے اور مرتبے پر نہ پہنچ سکو تو کم از کم اتنا تو ہو کہ عبادت کے دوران تم یہ یقین محسوس کرو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔ خدا کی دید اور معیت کا یہ احساس ہی صوفیوں کے نزدیک خدا کے اور بندوں کے حق کی ادائیگی اور انسانی زندگی کی کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اس کو تصوّف کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔

صوفیا کہتے ہیں کہ ہمارا مشن اسلام سے الگ نہیں ہے۔ علماء صرف اسلام کے ظاہر کو پیش کرتے ہیں۔ ہم اسلام کے ظاہر و باطن دونوں کے علم بردار ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت خواجہ نظام الدّین اولیاء کا ایک قول خاص طور پر قابلِ ذکر ہے ان سے کسی نے پوچھا تھا کہ صوفی اور عالم میں کیا فرق ہوتا ہے۔؟ حضرت نے جواب دیا تھا کہ کوئی فرق نہیں ہوتا۔ صوفی بھی عالم ہی ہوتا ہے۔ البتہ علماء جو بات صرف جانتے ہیں اور محض زبان سے کہتے اور قلم سے لکھتے ہیں۔ صوفی اس پر عمل بھی کر کے دکھاتا ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے ایک اور جگہ پیر و مرشد کے لئے علم، عشق اور عقل کی تین شرطیں ضروری قرار دی تھیں۔ اور فرمایا تھا کہ جس پیر میں یہ تین چیزیں ہوں گی وہ نہ خود خلاف شریعت جائے گا نہ مُرید کو لے جائے گا۔

دو لفظوں میں بات کہنی ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے عہد اول میں سب ہی سچے مسلمان صوفی تھے۔ اس لئے کوئی علیحدہ لفظ وضع کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ لیکن حضرت علی کے بعد جب مسلمانوں میں ملوکیت اور بادشاہت آگئی اور اسلامی اصول ایک کے بعد ایک ترک کئے جانے لگے اور ابن الوقت علماء کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جس کا کام دربار داری اور بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملانا تھا۔ اس وقت سچے مسلمانوں نے اور خاص طور پر ان لوگوں نے جن کو رسول اللہ صلعم کی طرف سے دین سیکھ لینے کی سعادت ملی تھی اور جن کو دین سکھانے پر مامور بھی کیا گیا تھا۔ یہ ضروری سمجھا کہ اپنے آپ کو دربار اور درباراروں سے علیحدہ کرلیں اور سیاسی اثرات سے محفوظ ہو کر صحیح دینِ اسلام کو پیش کریں تاکہ اسلام کا روحانی نظام تربیت اپنے اصلی خدو خال کے ساتھ سب کے سامنے آجائے۔

ہندوستان میں انتظام و انصرام اور خیر و برکت کے لحاظ سے علاء الدین خلجی کے عہد کو بہترین سمجھا جاتا ہے۔ لیکن صوفیاء عرصہ دراز تک سرکار دربار سے دوری کو کتنی اہمیت دیتے رہے اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے اپنے ایک ایسے چہیتے مرید سے جس کی آمد پر وہ تعظیم دینے کے لئے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ محض اتنی سی بات پر ناراض ہو کر مُرید کرنے کا اجازت نامہ واپس لے لیا تھا کہ ان مُرید کے پاس علاء الدین خلجی کی طرف سے اودھ کے قاضی القضاۃ یعنی چیف جسٹس کے عہدے کی پیش کش آئی تھی اور وہ بھولے سے پیر کے پاس یہ پوچھنے آگئے تھے کہ میں اس کا کیا جواب دوں۔؟

خدا کی دید اور معیت جن کا ذکر حدیث احسان کے سلسلے میں اوپر آچکا ہے۔ ایسی چیزیں ہیں جو محبت کے بغیر ظہور میں نہیں آسکتیں۔ محبت ہی کا نتیجہ معیت اور قرب ذاتی کی صورت میں نکلتا ہے جس کو تصوف کی اصطلاح میں معرفت کہتے ہیں۔

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں لکھا ہے کہ " قرآن نے دینی عقائد اور اعمال کا جو تصور قائم کیا ہے اس کی بنیاد بھی تمام تر رحمت و محبت پر رکھی ہے کیونکہ وہ انسان کی روحانی زندگی کو کائنات فطرت کے عالمگیر کارخانے سے کوئی الگ اور غیر متعلق چیز قرار نہیں دیتا۔ بلکہ اسی کا ایک مربوط گوشہ قرار دیتا ہے۔ ... چنانچہ قرآن نے جابجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ خدا اور اس کے بندے کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے۔ اور یہی عبودیت اسی کی عبودیت ہے جس کے لئے معبود صرف معبود ہی نہ ہو بلکہ محبوب بھی ہو "

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے ایک خط میں تحریر فرمایا تھا کہ اصحاب طریقت اور اربابِ حقیقت کا اس بات میں ارشاد ہے کہ انسان کی پیدائش کا اہم مطلوب اور بڑا مقصود رب العالمین کی محبت ہے۔!"

خدا سے محبت ہو جائے اور خدا کے لئے آدمی جینے لگے تو اس کی زندگی میں ایک انقلاب آجاتا ہے۔ رسولِ اسلام ؐ کے ایک صحابی حضرت سعدؓ نے ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ اپنی ساری دولت راہ خدا میں صرف کر دیں۔ آنحضرت صلعم نے حضرت

سعد سے کہا ۔ اے سعد جو کچھ اس نیت سے خرچ کرو کہ اس سے خداوند تعالےٰ کی ذات مقصود ہے ۔ اس کا ثواب تم کو ملے گا یہاں تک جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں دو اس کا بھی ثواب ہے ۔!

اس تعلیم کی روشنی میں آدمی کا ہر کام عبادت بن جاتا ہے ۔ نیت کا خلوص باطن کی اصلاح کرتا ہے روحانی ترقی کے دروازے کھولتا ہے ۔ اور خالق اور مخلوق کا حق ادا کرنا سکھاتا ہے ۔ یہی چیز صوفی کو سچا ہوا بھی بناتی ہے اور تصوف کو "خدمت خلق" سے بھی اسی کی بدولت تعبیر کیا جاتا ہے ۔

پروفیسر محمد حبیب کے بقول تصوف ہم کو سب سے پہلے اپنشدوں میں نظر آتا ہے ۔ اسلام چوں کہ کوئی نیا مذہب نہیں ہے ۔ بلکہ اپنے دعوے کے مطابق تمام سابق آسمانی مذاہب کی خالص اور اصلی شکل ہے ۔ اس لئے اس کی تعلیمات میں سابقہ مذاہب کی تعلیمات کی جھلکیاں جگہ جگہ نظر آتی ہیں ۔ اسلامی تصوف میں بھی عجم اور ہندوستان کا جو روپ ہے وہ اس کے غیر اسلامی ہونے کی علامت نہیں ہے ۔ قرآن صاف کہتا ہے ۔

مایقال لک الا ما قد (اے محمدؐ تجھ سے (اس کتاب میں) وہی کہا گیا ہے جو تجھ سے
قیل للرسل من قبلک پہلے پیغمبروں سے کہا گیا ۔

فلسفہ وحدت الوجود سے لے کر جس کی بنیاد یہ قرآنی آیت ہے ۔

وہی اول ہے اور آخر ہے اور ظاہر ہے اور باطن ہے اور وہی ہر شے کا علم رکھتا ہے ۔

صوفیوں کے روزمرہ اعمال اشغال تک سب چیزیں قرآن و حدیث ہی سے ماخوذ ہیں ۔ البتہ صوفیوں نے اپنے ذہن کے دریچے اچھے خیالات کی طرف سے چاہے وہ کسی کے بھی ہوں کبھی بند نہیں کئے ۔ حضرت بابا فریدؒ کی خانقاہ میں کوئی جوگی آیا تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے اس سے پوچھا کہ تمہارے ہاں کام کی اصل کیا ہے ؟ اس جوگی نے کہا ہمارے ہاں آدمی کے نفس میں دو عالم بتاتے گئے ہیں ۔ ایک عالم علوی دوسرا عالم سفلی ۔ پیشانی سے ناف تک عالم علوی ہے جس میں صدق و صفا اچھے اخلاق اور اچھے معاملات ہونے چاہئیں اور ناف سے قدم تک عالم سفلی ہے جس میں نگہداشت اور پاکی و پارسائی ضروری ہیں ۔ حضرت خواجہ فرماتے ہیں کہ مجھے جوگی کی یہ بات بہت پسند آئی ۔

چشتیہ سلسلہ: صوفیوں کے بہت سے سلسلے ہیں ۔ ان کی تعلیمات تقریباً ایک ہی ہیں ۔ بانیاں سلسلہ کے پیغمبر اسلام حضور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے میں بعض لوگ ان سلاسل کا مطالعہ چار پیر چودہ خانوادوں کے عنوان سے کرتے ہیں ۔ یعنی آنحضرت صلعم نے حضرت علیؓ کو اجازت و سند دی اور انھوں نے اپنے بعد چار بزرگوں حضرت امام حسن علیہ السلام حضرت حسین علیہ السلام حضرت خواجہ کمیل ابن زیادؒ اور حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو اجازت اور سند دے کر تعلیم و تربیت کے کام پر مامور فرمایا ۔ یہ چار پیر ہوئے اور انہی چار پیروں سے چودہ الگ الگ خانوادے وجود میں آئے ۔

چشتیہ سلسلہ حضرت خواجہ حسن بصریؒ سے جاری ہوا ۔ اور اس کا نام چشتیہ عرصہ دراز بعد خراسان کے ایک مقام چشت کی مناسبت سے چشتیہ پڑا ۔ اس سلسلے کے ایک بڑے بزرگ حضرت خواجہ ابواسحاقؒ (جن کا اسم گرامی اوپر دیئے ہوئے شجرے میں (۲۸) نمبر پر درج ہے) شام کے رہنے والے تھے ۔ لیکن انھوں نے خراسان کے مقام چشت میں روحانی تعلیم و تربیت کا ایک ایسا عظیم الشان مرکز قائم کیا تھا کہ وہ خود اور ان کے بعد ان کے جانشین اس مرکز کی مناسبت سے چشتی کہلانے لگے ۔

چشتیوں کی ہندوستان میں آمد: چشتی سلسلے سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد اور بزرگ اس برصغیر میں وقتاً فوقتاً آتے رہے ۔ اسلامی حکومت قائم ہونے سے بہت پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کی بستیاں بس چکی تھیں اور چشتیوں کی آمد جاری تھی ۔ لیکن سلسلے کو باقاعدہ قائم اور جاری فرمانے والے بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ہیں ۔ انھوں نے ہندوستان میں اسلام کی ایسی صحیح نمائندگی فرمائی اور دیکھتے دیکھتے ایسی زبردست کامیابی اپنے مشن میں حاصل کی کہ کچھ سو برس پہلے ہی ان کو تاریخوں اور تذکروں میں نائب رسول فی الہند کے لقب سے یاد کیا جانے لگا تھا ۔ سہروردیہ قادریہ اور نقشبندیہ وغیرہ سلسلوں کے بزرگ بھی بڑی شان سے ہندوستان تشریف لاتے رہے اور جگہ جگہ انھوں نے خانقاہیں قائم کیں ۔ لیکن جو وسعت اور ہمہ گیری اور مقبولیت چشتیہ سلسلے کو حاصل ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے ۔ شاید اس کامیابی کو دیکھ کر ہی مغلیہ دور میں آنے والے نقشبندیہ سلسلے کے سب سے بڑے بزرگ حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے سرزمین ہند کو "برکت آگیں" کہا تھا ۔ اپنے سلسلے کا ذکر کرتے ہوئے وہ تحریر فرماتے ہیں ۔

" این تخم پاک را از سمرقند و بخارا آوردیم و در زمین برکت آگین ہند کشتیم !

"ہم اس پاک بیج کو سمرقند و بخارا سے لائے اور ہندوستان کی برکت آگیں زمین میں بویا ۔!"

یوں تو صوفی جہاں بھی گئے کامیابی نے ان کے قدم چومے ۔ لیکن ہندوستان میں خصوصیت کے ساتھ صوفیوں اور سلسلہ عالیہ چشتیہ کو بڑا فروغ ہوا ۔ اس کی کئی وجوہ ہیں ۔ سب سے بڑی چیز تو یہ کہ صوفیا فلسفہ وحدت وجود میں یقین رکھتے ہیں عوام کے سامنے اس کے بیان سے احتراز کے باوجود چونکہ ہر صوفی خود اس فلسفے پر عامل ہوتا ہے ۔ اور ہر چیز میں ذات حقیقی کا جلوہ دیکھتا ہے اور اس کے لئے کوئی غیر رہتا ہی نہیں ۔ اس لئے اس کی یہ وسیع النظری اور کھلا دلی اسے ہر حلقے میں مقبولیت عطا کرتا ہے ۔ علاوہ ازیں ہندوستان خود زمانہ قدیم سے اس فلسفے کا مرکز رہا ہے ۔ اس لئے یہاں تو اور بھی ہر صوفی گویا اپنے آپ کو گھر میں محسوس کرتا ہے ۔

وحدت وجود پر عقیدہ رکھنے والے صوفی سرتاپا جذبہ محبت میں ڈوبے ہوتے تھے ۔ اس لئے اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد بھی انھوں نے حاکمانہ غرور کو پاس تک نہ پھٹکنے دیا ۔ اسلامی حکومت کے پس منظر میں صوفی کی یہ تعریف خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ

"صوفی وہ جو خدا کے سوا نہ خود کسی سے
ڈرے نہ کسی کو ڈرائے "

صوفی کی زندگی پاکبازی، ایثار و قربانی اور خدمت کا نمونہ ہوا کرتی تھی اپنے پرائے کی اس کے ہاں کوئی قید نہ تھی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی پرتھوی راج کے زمانے میں اجمیر آ گئے تھے اور پرتھوی راج کے بعض درباری تک ان کے معتقد تھے۔ چھوت چھات کے اس دور میں انھوں نے انسانی مساوات، ہمدردی اور خدمت کا جو سبق دیا وہ سب کے جی کو لگا۔ انھوں نے طریقہ کار بھی ہندوستانیوں کے مزاج کے موافق اختیار کیا اور یہاں کے رسم و رواج سے اجنبیت نہیں برتی۔ انکی خدا ترسی حکومت سے علیحدگی اور دنیا سے بے رغبتی سب چیزیں ایسی تھیں کہ ہندوستان کے عوام کو ان میں اپنے سنت سادھوؤں کی سی شان نظر آئی۔ اور ہندو رعیت نے اپنا حاکم سمجھنے کے بجائے ان کو ہمیشہ اپنا ساتھی، ہمدرد اور مددگار خیال بھی کیا۔ اور پایا بھی۔

حضرت خواجہ صاحب اجمیری نے اپنے بہت سے مریدوں کو خلافت اور اجازت عطا فرمائی لیکن ان کے سلسلہ کو چلانے والے سب سے بڑے جانشین حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی چشتی ہوئے۔ اور حضرت بختیار کاکی نے یہ مسند حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کو سونپی۔ بابا صاحب کا پنجابی کلام حضرت گرونانک صاحب نے گرو گرنتھ صاحب میں درج کیا ہے۔ حضرت بابا فرید الدین کے بعد دو بزرگوں کے ذریعے چشتیہ سلسلہ سب سے زیادہ پھیلا ایک سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی چشتی رح اور دوسرے حضرت علاء الدین علی احمد صابر کلیری چشتی رح ان دونوں بزرگوں سے چشتیہ سلسلے کو ایسی عظمت اور وسعت میسر آئی کہ ان کے بعد آنے والے لوگ فخریہ اپنے ناموں کے ساتھ چشتی کے علاوہ نظامی اور صابری کے الفاظ بڑھانے لگے۔

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے تو ایک زبردست تبلیغی نظام اپنے سامنے ہی قائم فرما دیا تھا اور بے شمار لوگوں نے براہ راست ان سے فیض پایا۔ اور ہزاروں افراد ان سے سند اور اجازت پا کر دنیا کے ہر حصے میں مشن کے پرچار کے لیے پہنچے۔ لیکن صابریہ سلسلے کو وسعت عرصہ دراز بعد حضرت صابر صاحب کے جانشینوں کے ذریعے ملی۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے نامور خلفاء میں حضرت معین الدین عثمان معروف بہ حضرت اخی سراج رح نے بہار اور بنگال اور آسام میں سلسلے کو پھیلایا اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلی نے مغربی وسطی شمالی اور جنوبی ہندوستان کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ حضرت چراغ دہلی کے جانشین بھی حضرت کمال الدین علامہ رح اور حضرت سید محمد بندہ نواز رح گیسو دراز جیسے نامور بزرگ بنے۔ اور آخری دور میں مغل سلطنت کے زوال کے وقت حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی اور حضرت نظام الدین اورنگ آبادی اور خاص کر حضرت مولانا فخر الدین محب النبی نے چشتیہ نظامیہ سلسلے کو ایک نئی زندگی عطا کی اور ان کے خلفاء حضرت نور محمد مہاروی رح اور حضرت شاہ نیاز بریلوی رح نے ایک دفعہ پھر پرانے زمانے کی یاد تازہ کر دی اور روحانی تربیت کا کام ایسے وسیع پیمانے پر کیا اور اتنی زیادہ تعداد میں اپنے اجازت یافتہ مشنری تیار کرائے کہ چشتیہ نظامیہ سلسلے کا غلغلہ ایک دفعہ پھر شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک ہو گیا۔

ابتدائی زمانے میں صوفیا کا دستور تھا کہ وہ بے شمار بزرگوں کی صحبت کا فیض پاتے تھے لیکن مرید کرنے اور تعلیم دینے کی اجازت کسی ایک ایسے بزرگ ہی سے حاصل کرتے تھے۔ اور وہ بالعموم خود ان کا پیر ہی ہوا کرتا تھا۔ لیکن بعد کے زمانے میں اپنے پیر کے علاوہ دوسرے بزرگوں سے اجازت حاصل کرنے کا رواج بھی ہو گیا۔ اور بیک وقت ایک بزرگ چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ وغیرہ متعدد سلسلوں میں مجاز ہونے لگا۔ اور خود اپنے سلسلے کی اجازت بھی اس کے پاس ہر شاخ سے الگ الگ آنے لگی۔ مثلاً شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی رح حضرت پیر مہر علی شاہ سے بیعت تھے اور انہی سے ان کو سلسلہ چشتیہ نظامیہ نصیریہ فخریہ میں مرید کرنے کی اجازت حاصل تھی۔ لیکن نظامیہ سلسلے کی دوسری شاخ نصیریہ کے علاوہ سراجیہ ہے جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے بنگالی مرید اخی سراج سے جاری ہوئی اور جس کی ایک گدی پھلواری شریف پٹنہ بہار میں ہے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کو سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی اس سراجیہ گدی سے بھی بیعت لینے کی اجازت ملی اور پھلواری شریف کے سجادہ نشین حضرت شاہ بدر الدین پھلواری نے نظامیہ سراجیہ کے علاوہ قادریہ نقشبندیہ، سہروردیہ وغیرہ بہت سے سلاسل میں بیعت لینے کی اجازت خواجہ صاحب موصوف کو دی۔ اس کے علاوہ رفاعیہ سلسلے کی اجازت مدینہ منورہ کے شیخ المشائخ حضرت سید حمزہ رفاعی (جن کے صاحبزادے حضرت سید احمد رفاعی آج کل مدینہ منورہ میں حرم نبوی رح کے نگراں اور مہتمم ہیں) اور شاذیہ سلسلے کی اجازت حضرت شیخ محمد ابراہیم ابن شمس الدین محمد مکی شاذی نے عطا فرمائی۔ اس طرح کی متعدد اجازتوں اور خلافتوں کے باوجود ہر بزرگ پر غلبہ اپنے ہی پیر کے سلسلے کی نسبت کا رہتا ہے اور اسی سے وہ جانا پہچانا جاتا ہے۔ سلاسل کے اس طرح جمع ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ رقابت کے احساس نے امتداد زمانہ کے باوجود کہیں جگہ نہیں پائی ہے۔ اور ایک سلسلے کا مخصوص مزاج دوسرے سلسلے کو متواتر متاثر کرتا رہا ہے۔ چنانچہ چشتیوں کی قوالی اب سہروردیوں اور قادریوں میں بھی بار پا گئی ہے اور بعض سہروردی اور قادری بزرگ محض اس وجہ سے دھوم کے ساتھ قوالی سننے لگے ہیں کہ ان کے پاس چشتیہ سلسلے کی اجازت بھی ہے اور چشتیوں میں اس روحانی غذا نے ایک علامت کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادیؒ کی مشہور کتاب کشکول اس یک جہتی کا بہترین نمونہ ہے جس طرح درویش کے کشکول میں گھر گھر کی روٹی ہوتی ہے اسی طرح انھوں نے اس کتاب میں سب بزرگوں کی تعلیمات جمع کی ہیں۔ اور ہر مضمون کا عنوان "لقمہ" رکھا ہے۔ تصوف بھی شائد ایک سلامی کشکول ہے جس میں ہر مذہب کی حلال اور پاک پوتر روحانی غذا جمع ہے۔

بقیہ کرشن کتھا

حاکموں سے رکھتی ہے۔ قیامت تک کے لیے مجسمہ بنا کر کھڑا کر دیا۔
جسودھا نے اپنی بیٹی کو چھری کے تلے رکھ دیا اور دنیا والوں سے کہہ گئی کہ ہندوستان والے اپنے بادشاہ پر یوں اولاد نچھاور کیا کرتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ رعایا پر اپنے محافظ حاکم کے بڑے بڑے حق ہیں۔ اور جان و مال کی قربانی بھی ان میں سے ایک ہے اسی واسطے اس نے اپنی بیٹی دیو کی کے راج کنور پر فدا کر دی ہے۔
جسودھا نے اس مثال میں یہ بھی کہا ہے کہ ہندوستانی عورتیں بے کسوں اور مظلوموں کی حمایت میں ایسے کام کر سکتی ہیں جو دوسرے ملکوں کے مردوں سے بھی دشوار ہیں۔ زندہ باشس نام جسودھا۔

(کرشن بیتی، صفحہ ۵۵-۵۷)

مہدی نظامی

درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیارؒ۔ نئی دہلی

حضرت خواجہ حسن نظامی ذاتی اور خاندانی حالات

نام: سید علی حسن عرف حسن نظامی۔ علاّمہ اقبال نے خواجہ حسن نظامی لکھنا شروع کیا۔ اور اس کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

مصور فطرت، امام المشائخ عوامی خطابات ہیں۔ جنوری ۱۹۴۶ء میں حکومت کی طرف سے شمس العلمار کا خطاب دیا گیا۔

تاریخ پیدائش: ۲ محرم ۱۲۹۶ھ (مطابق ۸۰-۱۸۷۹ء) بستی حضرت خواجہ نظام الدین اولیار دہلی میں ولادت ہوئی۔

والد کا نام حافظ سید عاشق علی نظامی اور والدہ کا نام سیدہ چہیتی بیگم تھا۔ خواجہ صاحب گیارہ سال کے تھے کہ ماں باپ دونوں ایک سال کے اندر انتقال کر گئے اور بڑے بھائی سید حسن علی شاہ نے ان کی سرپرستی کی۔

خاندانی حالات: خواجہ صاحب کے اجداد مہاراجہ پرتھوی راج چوہان کے زمانہ میں بخارا سے ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے تھے۔ اور قدیم تاریخوں اور تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مہاراجہ کے دربار میں رسوخ حاصل تھا۔ ایک بزرگ خواجہ سید بدرالدین اسحٰقؒ بہت بڑے عالم اور صاحب تصنیف تھے۔ ان کی شادی حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کی صاحبزادی حضرت بی بی فاطمہؒ سے ہوئی۔ اور بابا صاحبؒ نے ان کو خلافت بھی دی حضرت خواجہ نظام الدین اولیار اجودھن (موجودہ پاک پٹن ضلع ساہیوال پاکستان) گئے تھے تو خواجہ بدرالدین اسحٰقؒ کے پاس ہی ٹھیرے تھے۔ اور دونوں میں ایسا تعلق تھا کہ حضرت بابا صاحبؒ اور حضرت بدر اسحٰق رحؒ کا وصال ہو گیا تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیار نے ان کے دونوں کم سن لڑکوں خواجہ سید محمد امام رحؒ اور خواجہ سید موسیٰ رحؒ کو اپنے پاس دہلی بلا لیا۔ اولاد کی طرح پرورش کی اور ایسی خلافت عطا فرمائی کہ لوگ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا سے مرید ہونے آتے تو وہ انھیں خواجہ سید محمد امام نظامی کا مرید ہونے کا حکم دیتے۔ اپنی مجلس میں سب سے اونچی جگہ انھیں بٹھاتے اور باہر کی دعوتوں میں اپنا قائم مقام بنا کر بھیجتے۔ اور نماز میں ان کو امام بناتے۔ خواجہ سید محمد امام نظامی کی اولاد کی شادیاں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی بہن کی اولاد سے ہوئیں۔ حضرت خواجہ حسن نظامی انہی خواجہ سید محمد امام نظامی کی اولاد میں تھے اور ان کا خاندان درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیار رحؒ سے متعلق چار خاندانوں میں فریق اوّل نبیرگان کہلاتا ہے خواجہ صاحب کا شجرہ نسب یہ ہے

۱۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ، ۲۔ حضرت امام حسین علیہ السلام
۳۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام، ۴۔ حضرت سید عمر اشرف رحؒ
۵۔ حضرت سید زکریا اصغر محدّث رحؒ ۶۔ حضرت سید قطب الدین عمر شجری رحؒ
۷۔ حضرت ابو عبداللہ محمد رحؒ ۸۔ حضرت سید علی صدرالدین رحؒ
۹۔ حضرت سید حسن جلال الدین رحؒ ۱۰۔ حضرت سید احمد فتح اللہ رحؒ
۱۱۔ حضرت سید محمد رحؒ ۱۲۔ حضرت سید احمد رحؒ
۱۳۔ حضرت سید محمد رحؒ ۱۴۔ حضرت سید محمود رحؒ
۱۵۔ حضرت سید احمد رحؒ ۱۶۔ حضرت سید منہاج الدین رحؒ
۱۷۔ حضرت سید اسحٰق رحؒ ۱۸۔ حضرت خواجہ سید علی لالہ رحؒ
۱۹۔ حضرت مولانا سید بدرالدین اسحٰق رحؒ ۲۰۔ حضرت خواجہ سید محمد امام نظامی رحؒ
۲۱۔ حضرت خواجہ سید داؤد نظامی رحؒ ۲۲۔ حضرت خواجہ سید علیم الدین نظامی رحؒ
۲۳۔ حضرت خواجہ سید حسین نظامی رحؒ ۲۴۔ حضرت خواجہ سید مبارک نظامی رحؒ
۲۵۔ حضرت خواجہ سید محمد نظامی رحؒ ۲۶۔ حضرت سید خواجہ نظامی رحؒ
۲۷۔ حضرت خواجہ سید جلال الدین نظامی رحؒ ۲۸۔ حضرت خواجہ سید ایوب نظامی رحؒ ۲۹۔ حضرت خواجہ سید ابو محمد نظامی رحؒ ۳۰۔ حضرت خواجہ سید عبداللہ نظامی رحؒ ۳۱۔ حضرت خواجہ سید عبدالقادر نظامی رحؒ
۳۲۔ حضرت آغا سید فضل علی نظامی رحؒ ۳۳۔ حضرت خواجہ سید ہدایت علی نظامی رحؒ ۳۴۔ حضرت خواجہ سید حسین علی نظامی رحؒ ۳۵۔ حضرت حافظ سید عاشق علی نظامی رحؒ ۳۶۔ حضرت خواجہ حسن نظامی رحؒ

تعلیم: ابتدائی تعلیم بستی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا میں حضرت مولانا اسمٰعیل کاندھلوی، حضرت مولانا محمد میاں کاندھلوی اور حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی (والد ماجد حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم) سے حاصل کی۔ صرف ایک دن کے لیے انگریزی اسکول میں بھی گئے دہلی میں مولوی وصیت علی صاحب مرحوم مولوی عبدالعلی محدّث دہلوی، مولوی حکیم

الہ دین پنجابی اور مولوی حکیم رضی الحسن صاحب کاندھلوی سے بھی پڑھا اور آخر میں حضرت مولانا محمد یحییٰ خواجہ صاحب کو حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے مدرسے میں گنگوہ لے گئے اور وہاں انھوں نے ڈیڑھ سال تک تعلیم پائی۔

پہلی شادی گنگوہ سے واپسی پر ۱۸ سال کی عمر میں خواجہ صاحب کی پہلی شادی ان کے چچا سید معشوق علی کی لڑکی سیدہ حبیب بانو سے ہوئی۔ چند سال بعد رمضان ۱۳۳۰ھ میں پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا۔

ارادت گیارہ سال کی عمر میں خواجہ صاحب کو ان کے والد نے حضرت شاہ اللہ بخش صاحب تونسوی رح کا مرید کرادیا تھا۔ مگر ان کا جلدی وصال ہوگیا۔ اس کے بعد بڑے بھائی نے پنجابی زبان کے مشہور شاعر بزرگ حضرت خواجہ غلام فرید صاحب رح سے بیعت کرادیا۔ مگر انھوں نے بھی رحلت فرمائی اور ۲۴ سال کی عمر میں خود اپنے ارادے اور حضرت بابا فرید رح کے روحانی اشارے کی بنا پر خواجہ صاحب نے حضرت پیر مہر علی شاہ چشتی نظامی رح سجادہ نشین خانقاہ گولڑہ شریف ضلع راولپنڈی سے بیعت کی اور خلافت پائی۔

تیرتھ یاترا : ۶-۱۹۰۵ء میں اپنے نومسلم مربی غلام نظام الدین صاحب خاکسار کے شوق دلانے پر سادھوؤں کے لباس میں تمام ہندو تیرتھوں کی یاترا کی اور فلسفہ ویدانت سیکھا۔ اپنا سفرنامہ "تیرتھ یاترا" کے نام سے لکھا۔ جس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ کفر کا فتویٰ لگا۔

پہلا مضمون : پہلا مضمون انڈیا کی نازک حالت کے عنوان سے انڈیا گزٹ بمبئی میں لکھا، پھر پیسہ اخبار لاہور، وکیل امرتسر، سر عبدالقادر کے مخزن اور پنڈی بہار الدین کے رسالہ صوفی وغیرہ میں مسلسل لکھتے رہے۔

پہلی کتاب : پہلی کتاب "مفلسی کا مجرب علاج" لکھی۔

حلقہ نظام المشائخ کا قیام : ۱۹۰۸ء میں درگاہوں اور خانقاہوں کی اصلاح اور تعلیمات تصوف کی ترویج و اشاعت کے لیے حلقہ نظام المشائخ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس حلقے کے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی نعمانی اور حضرت شاہ سلیمان پھلواروی جیسے بہت سے مشاہیر ممبر تھے۔

پہلا رسالہ : ۱۹۰۹ء حلقہ نظام المشائخ کے آرگن کی حیثیت سے ملا واحدی صاحب کی شرکت میں رسالہ نظام المشائخ جاری کیا۔

اسلامی ممالک کا سفر : حلقہ نظام المشائخ کے مقاصد کی اشاعت کے لیے ۱۹۱۱ء میں مصر، شام، فلسطین، حجاز وغیرہ اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ اور سفر کے دوران مولوی برکت اللہ وغیرہ انقلابیوں سے بھی ملے۔ اور خفیہ رپورٹوں کی بنا پر سفر سے واپسی پر مسلسل چھ برس تک پولیس کی نگرانی رہی اور متعدد بار حراست میں لیا گیا۔

اخبار توحید : ۱۹۱۳ء میں میرٹھ سے اخبار توحید جاری ہوا جس کے خواجہ صاحب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں کان پور کی مسجد کا ہنگامہ ہوا اور خواجہ صاحب نے میرٹھ کی جامع مسجد میں "کہو تکبیر" کے نام سے انگریزوں کے خلاف ایک تقریر کی۔ اس تقریر کی اشاعت پر اخبار توحید ضبط کرلیا گیا۔

دوسری شادی : ۱۹۱۶ء سیدہ محمودہ خواجہ بانو سے خواجہ صاحب کی دوسری شادی ہوئی

تصنیف و تالیف : دوسری شادی کے بعد خواجہ صاحب نے کتابیں لکھنے کی طرف توجہ کی اور چھوٹی بڑی کئی سو کتابیں اور رسالے تصنیف و تالیف کیے متعدد روزانہ، دو وقتہ، سہ روزہ، ہفتے وار اور ماہانہ اخبار رسالے جاری کیے۔ رسالہ منادی ۱۹۲۶ء سے چھپنا شروع ہوا۔ اور سب سے طویل مدت تک خواجہ صاحب نے اسی رسالے کو ایڈٹ کیا۔

رحلت : ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ کا دن گذرنے کے بعد مغرب اور عشا کے درمیان رحلت فرمائی۔ عیسوی تاریخ ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء اتوار اور پیر کی درمیانی شب تھی۔ اپنی قبر انھوں نے پچاس برس پہلے ہی بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نئی دہلی میں تیار کرا رکھی تھی، اسی میں دفن ہوئے۔

افسانوں اور غزلوں کا انتخاب

مصرع طرح برائے اپریل ۱۹۷۷ء

لاکھوں چراغ خونِ شہیداں سے آئے ہیں

اپریل ۱۹۷۷ء کے لیے منتخب کی جانے والی تخلیقات ۲۰ فروری ۱۹۷۷ء تک ادارے کو موصول ہوجانی چاہئیں۔

۱۔ ہر تخلیق کے ساتھ "آج کل" میں شائع شدہ تصدیق نامہ بھی منسلک ہونا چاہیے کہ یہ تخلیق غیر مطبوعہ اور طبع زاد ہے۔

۲۔ انتخاب اور معاوضے کے بارے میں ادارہ کا فیصلہ قطعی اور حتمی ہوگا اور اس سلسلے میں کوئی مراسلت نہیں کی جائے گی۔

میں تصدیق کرتا ہوں کہ میرا افسانہ بعنوان ______

میری غزل مصرع ______

طبع زاد اور غیر مطبوعہ ہے

نام ______

پتہ ______

دستخط مع تاریخ

اپنی تخلیقات مع تصدیق نامہ حسب ذیل پتے پر بھیجیں :

ایڈیٹر آج کل معرفت پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

خواجہ حسن نظامی

کرشن کتھا

(اقتباس)

سناؤنی جسودھا کی گود راجکمار سے آباد ہوئی۔ رات گئی۔ سچائی کا سویرا نمودار ہوا۔ جسودھا دیکھتی تھی کہ یہ بچہ نور کا پُتلا ہے۔ اس کے گھر میں آتے ہی صبح کا نور نکل آیا۔ اپنے نئے مہمان کے چاؤ چوچلے میں لگی ہوئی تھی دودھ بھی نہ بلویا تھا کہ متھرا سے ایک سناؤنی آئی۔ جس خبر کے سننے کا جسودھا کو یقین نہ تھا۔ سورج نکلتے ہی کان میں پڑی کہ اس کی بیٹی کو کنس نے دیوکی کے بیٹے کے عوض مار ڈالا۔ وہ سمجھتی تھی نجومیوں نے کنس کو بیٹے کی خبر دی ہے۔ جب وہ دیکھے گا کہ یہ لڑکا نہیں لڑکی ہے تو چپ ہو جائے گا۔ نجومیوں کی غلط بیانی پر غصہ کرے گا اور میری ایک دن کی معصومہ کو چھوڑ دے گا۔ توقع انسان کو تکلیف دیا کرتی ہے۔ اگر جسودھا یہ توقع نہ کرتی تو اس کو اپنی لڑکی کے مارے جانے کا اتنا صدمہ نہ ہوتا۔ کیونکہ اس کا دل پہلے سے اس غم کے لیے آمادہ اور تیار ہو جاتا۔ لیکن کرشن جی نے سب سے پہلا سبق اپنی دائی کو دیا۔ بچے بنے ہوئے چپکے پڑے رہے اور جسودھا کو بتا دیا کہ انسان کو ہر وقت دنیا سے بے توقع رہنا چاہیے۔ جسودھا نے باوجود اپنی بڑی قربانی کے ایک بشری امید کا تسمہ لگا رکھا تھا۔ قدرت نے اس کو کاٹ ڈالا اور عورت جسودھا کو میدان عشق کا پورا مرد بنا دیا۔

جس وقت جسودھا نے سنا کہ اس کی بیٹی کنس کے ہاتھوں ایسی بے دردی سے ماری گئی تو وہ بے اختیار ہو گئی۔ اس نے کرشن کو چھاتی سے لگا کر دبوچ لیا۔ ان کے منہ پر اپنا منہ رکھ دیا۔ اور زبان حال سے یہ کہنے لگی:

"دیوکی کے پُتر! میری پُتری مر گئی۔ باسدیو کے دل جانی! میری جان بے جان ہو گئی۔ سنتا ہے؟ تیرے ماموں نے مجھ غریب کو لوٹ لیا۔ میں نے سانچ کی آنچ پر اپنی دلاری کو بھینٹ چڑھا دیا کلیجے کی کور کو خود کٹوا دیا۔ آنکھ کی پتلی میں آپ ہی تنکا مار لیا"

"میرے کنور اٹھ! اور اپنی ستم رسیدہ دائی کا بدلہ اس پاپی سے لے۔ جس نے میرے باغ کا ننھا پھول توڑ لیا۔ دیکھ! میری گائے اپنی بچھیا کو دودھ پلاتی ہے۔ اور وہ بچھیا بے دودھ پیے مر گئی جس کو مجھ گئو نے جنا تھا۔ اس جان ہار کو یہ خبر نہ ہو گی کہ اس کی قصائی ماں اس کو حلال کرانے بھیجتی ہے۔ وہ دنیا میں رہنے کو آئی تھی۔ میں نے اس کو نہ رہنے دیا۔ اس کے دل میں کچھ دیکھنے کے ارمان تھے۔ میں نے کچھ نہ دیکھنے دیا۔ اس کے ارمانوں کو خاک میں ملا دیا۔

"اولاد والیوں سے پوچھنا میرے دل کی آگ کی جلن وہ بتائیں گی اور کہنا کہ جسودھا کی بیٹی قتل ہو گئی ہے۔ جسودھا اس کا کیوں کر ماتم کرے۔ جسودھا دوسرے کی ممتا کو پال رہی ہے۔ ایسا نہ ہو اپنی ممتا کے غم میں اس بچے کی بدشگونی ہو جائے۔

"دیوکی! تو کچھ خیال نہ کیجیو۔ جسودھا صبر کی بندی ہے۔ اس نے کلیجے پر پتھر رکھ لیا۔ وہ ہنستی رہے گی اور دل کے رونے کو چھپائے گی۔ تو اپنے لال کا فکر نہ کر۔ میری لاڈلی لوٹ گئی۔ لوٹ جانے دے یہ گود کا ہیرا سلامت رہے تو میں اپنے آنکھ کے موتی کو بھول جاؤں گی۔

"باسدیو! آ میرے پتی (شوہر) نند کو سمجھا وہ اپنی بچی کے فراق سے بے اختیار ہوا جاتا ہے۔ میں کلیجے کو مسوسوں تیرے بچے کو تھاموں یا نند کو سنبھالوں۔

وہ چلا جان چلی دونوں برابر کھسکے
اس کو تھاموں کہ اسے، پیر پڑوں کس کس کے"

جسودھا کی گود حرب کی زندگی کی پہلی رتھ تھی۔ جس کی رتھ بانی کرشن نے کی۔ اس وقت وہ چپ تھے اور بنے ہوئے غافل تھے یا ناسمجھ بچے تھے۔ مگر قدرت ان کا لیکچر ان کا اپدیش، ان کا خطبہ، ان کی تقریر جسودھا کو اسی طرح سنا رہی تھی جس طرح بڑے ہو کر انھوں نے ارجن کو اس کا رتھ بان بن کر مہابھارت کے وقت وعظ سنایا تھا۔

قدرت کی خاموش اسپیچ نے جسودھا کا دل مطمئن کر دیا۔ جیسا کہ ارجن کا دل گرمایا گیا تھا جسودھا کو اپنا فرض یاد آگیا۔ جیسا ارجن کو اس کا فرض یاد دلایا گیا تھا۔

خدا کے پیام کو ہمیشہ پہلے عورت نے مانا ہے۔ فرعون کی بیوی آسیہ حضرت موسیٰؑ پر مردوں سے پہلے ایمان لائیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ خاتون محترم حضرت محمد مصطفیٰؐ (صلعم)، نے سب سے اول اپنے خاوند کا دین اسلام قبول کیا۔

اسی طرح ہندوستان کے اس فلاسفر کے فلسفۂ حیات و فرائض پر جس ہستی نے سب سے پیشتر سر جھکایا وہ بھی عورت تھی اور اس غمگین کا نام جسودھا تھا۔

جسودھا نے ہندوستان کی غریب رعایا کی اس محبت کو جو اپنے

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

انور صدیقی
شعبۂ انگریزی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

خواجہ حسن نظامی

حیات اور خدمات

ایک سیمینار

خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام ۱۱ دسمبر ۷۶ء کو ایک سیمینار کیا گیا جس کا موضوع تھا: "خواجہ حسن نظامی ۔ حیات اور خدمات" موضوع جامع بھی تھا اور وسیع بھی ۔ اس لیے کہ خود خواجہ حسن نظامی کی زندگی اور کارنامے ہمہ جہت تھے ۔ ان کی شخصیت پہلو دار تھی اس کے تمام تر ابعاد کا احاطہ کرنا، اتنا آسان نہیں جتنا نظر آتا ہے ۔ سیمینار کا اہتمام و انتظام کرنے والوں نے اس بات کی پوری کوشش کی تھی کہ جو مقالے پڑھے جائیں یا تقریریں کی جائیں وہ خواجہ صاحب کی شخصیت اور کارناموں کے کم از کم کسی ایک پہلو کو ضرور نمایاں کریں ۔ چنانچہ کچھ مقالے خواجہ صاحب کے تصوف اور مذہبی تصورات سے متعلق تھے ۔ کچھ ان کی صحافت کے بارے میں اور کچھ ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں ۔ اس طرح یہ سیمینار بھی خواجہ صاحب کی شخصیت کی طرح متنوع اور رنگا رنگ تھا ۔ اس میں شریک ہونے والوں میں ارباب تصوف بھی تھے، مذہبی اور تہذیبی امور کے نکتہ رس بھی اور وہ بھی جن کی ادبی اور لسانی بصیرت ممتاز و معتبر ہے ۔

دراصل ہر نسل اپنے بزرگوں کے کارناموں کو اپنے طور پر جانچتی اور پرکھتی ہے اور ان سے روشنی اور بصیرت حاصل کرنے کی خاطر نئے وسائل پر بھروسہ کرتی ہے ۔ یہ سیمینار اس مطالبے کے پیش نظر کیا گیا تھا اور اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ خواجہ صاحب کے کاموں اور کارناموں کو ایک معروضی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے اور انھیں ادبی اور تہذیبی روایات کے پس منظر میں رکھ کر ان کا حقیقت پسندانہ تعین کیا جائے ۔ ان مقاصد کی تکمیل کے سلسلے میں یہ سیمینار ایک اہم قدم تھا جس کے لیے خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی کے اراکین خصوصی مبارکباد کے مستحق ہیں ۔

۱۱ دسمبر کو ساڑھے دس بجے سیمینار کی کارروائی کا آغاز ہوا ۔ خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی کی طرف سے بہزاد دکن فیاض الدین صاحب نے سیمینار کے شرکا اور مندوبین کا استقبال کیا ۔ خواجہ صاحب کے بڑے بیٹے حسین علی نظامی خاص طور سے ہانگ کانگ سے آئے تھے انھوں نے مہمانوں کی گلپوشی کی خواتین ڈیلی گیشن کی گل پوشی محترمہ مریم نقی بلگرامی صاحبہ نے فرمائی ۔ جناب محمد شفیع قریشی صاحب وزیر مملکت ریلویز نے اپنے افتتاحیہ خطبے میں فرمایا مصور فطرت، حضرت خواجہ حسن نظامی صرف ایک نثر نگار ہی نہیں تھے ۔ محض ایک بلند پایہ صحافی اور انشا پرداز کی حیثیت سے وہ نمایاں نہیں ہوئے ۔ نظامی فیضان نے انھیں ایک ایسا صوفی بزرگ بھی بنایا جس نے بیشمار انسانوں کی تربیت کی ۔ جو ان گنت لوگوں کے دل کی تسکین بنا جس نے اصلاح معاشرت کا عظیم الشان کام کیا اور اس کے ساتھ ساتھ صحافت و انشا پردازی، تاریخ و تذکرہ نگاری، ترجمہ و تفسیر نویسی ہر شعبے میں ایک انوکھے آسان، دل نشین اور اچھوتے اسلوب کا بانی ہوا، اور اس نے اپنی تحریروں کے ایسے ڈھیر لگائے اور زندگی میں اتنا کام کیا کہ اپنی ذات سے ایک فرد نہ رہا بلکہ ایک ادارہ بن گیا ۔

افتتاحی تقریب کے بعد رسالہ منادی کے ان دو شماروں کی رسم اجرا ادا ہوئی جو خواجہ صاحب کی شخصیت اور کارناموں کو نمایاں کرنے کی غرض سے شائع کیے گئے تھے ۔ اس کے بعد سیمینار کا پہلا اجلاس جناب سید مظفر حسین برنی سکریٹری وزارت اطلاعات و نشریات کی صدارت میں شروع ہوا ۔ سب سے پہلے علامہ انور صابری نے خواجہ صاحب کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا ۔ اس اجلاس میں سعید احمد اکبرآبادی نے خواجہ صاحب سے اپنے ذاتی تعلق کی بنیاد پر ان کی شخصیت کے چند نمایاں نقوش ابھارے اور زبان و ادب کے سلسلے میں ان کی خدمات کا تذکرہ کیا ۔ ان کے لسانی رویوں کی بنیاد پر خواجہ صاحب کے ادبی اسلوب کے منفرد گوشوں کو نمایاں کرتے ہوئے انھوں نے اسے "کوثر و تسنیم میں دُھلا ہوا اسلوب" قرار دیا ۔ محترمہ سلطانہ شرف الدین نے خواجہ صاحب کی انشا پردازی کو اپنا موضوع بنایا ۔ اور انھیں اردو کا بہترین انشائیہ نگار قرار دیا اور ان تمام عناصر کا ذکر کیا جو ان کے انفرادی اسلوب کی تشکیل کرتے ہیں ۔ ڈاکٹر خلیق انجم سکریٹری انجمن ترقی اردو نے خواجہ صاحب کے ادبی کارناموں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے قلمی چہروں کو بڑی اہمیت دی جو یقیناً اپنے ایجاز کے اعجاز، ژرف نگاہی، عرفان حیات، مہذب حس مزاح اور مصورانہ فن کاری اور ہنرمندی کی وجہ سے اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہیں ۔ خلیق انجم صاحب نے یہ تجویز رکھی کہ خواجہ صاحب کے قلمی چہروں کو مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کیا جائے ۔ یہ کام فوری توجہ کا مستحق ہے ۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ سیاست، حیدرآباد نے خواجہ صاحب کی صحافت نگاری کا جائزہ لیا اور اردو صحافت میں ان کی کالم نویسی کو بڑی اہمیت دی اور اسے ان کی صحافت کا امتیازی وصف قرار دیا ۔ جناب سید حامد صاحب آئی ۔ اے ۔ ایس نے خواجہ صاحب کی گنگا جمنی شخصیت کے موضوع پر مقالہ پڑھا اور اس میں انھیں وسیع المشرب، زندگی کا ایک اثباتی نقطۂ نظر، عملی سوجھ بوجھ اور تدبر کے نقش بہت نمایاں نظر آئے ۔ خواجہ صاحب کی مختلف تحریروں کے اقتباسات کے ذہین انتخاب نے ان کے مقالے کو جہاں ایک طرف آراستہ کیا وہیں اس



پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی



حکیم عبدالحمید پروفیسر علی محمد خسرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کا استقبال کر رہے ہیں

نے خواجہ کے ذوق و ذہن تک رسائی میں سننے والوں کی رہنمائی کی۔

پہلے اجلاس کے صدر جناب مظفر حسین برنی نے خواجہ کی بعض اہم تصانیف کی دوبارہ اشاعت کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے خواجہ صاحب کو ایک درویش ایک موحد، انسان دوست اور طالب مولیٰ شخصیت قرار دیا۔ ان کے خیال میں خواجہ صاحب کا تصوف جامد نہیں متحرک تھا۔ انھوں نے اپنے پاؤں ہمیشہ مضبوطی سے زمین پر رکھے۔ زندگی کو اس کی بھیڑ میں گھل مل کر دیکھا، چکھا اور بھگتا۔ انھوں نے ادیب کی حیثیت سے خواجہ صاحب کو انشائیہ کی صنف کا بانی قرار دیا اور ان کے انشائیوں کو اردو ادب کا ایک لازوال حصہ۔ آخر میں برنی صاحب نے خواجہ صاحب کی مختلف حیثیتوں پر علیحدہ علیحدہ تحقیقی کام کی ضرورت کا احساس دلایا کہ یہی ایک صورت ہے خواجہ صاحب کے پہلودار کارناموں کے احساس و ادراک کی۔ —— دوسرا اجلاس سہ پہر ساڑھے تین بجے پروفیسر علی محمد خسرو، وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صدارت میں شروع ہوا۔ پہلے جناب ساغر نظامی نے خواجہ صاحب کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا جو خواجہ کے شایان شان تھا۔ اس اجلاس میں جن حضرات نے تقریریں کیں ان میں پروفیسر گوپی چند نارنگ جناب رضا فرنگی محلی، مولانا سید کلب عابد اور صاحبزادہ فضل المتین اجمیری شامل تھے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اسلوبیات کے ماہر ہیں۔ انھوں نے خواجہ صاحب کے ادبی اسلوب کے مختلف عناصر کا تجزیہ کیا اور اس کی لسانی خصوصیات کی نشاندہی کی۔ ان کی رائے تھی کہ خواجہ صاحب کے اسلوب کو لسانی اعتبار سے محمد حسین آزاد سے زیادہ میر امن سے نسبت ہے

۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے خواجہ صاحب کی نثر کے بنیادی اوصاف سے بحث کی۔ انھوں نے اس کے آہنگ کا بڑی خوبی سے تجزیہ کیا اور اس کی تقطیع کر کے اسے شعری آہنگ سے قریب کی چیز قرار دیا۔ ان کا خیال تھا کہ خواجہ صاحب کی نثر شاعری ہی کی طرح وجدان، تخیل اور جذبے پر بھروسہ کرتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کا بنیادی آہنگ شعر کے آہنگ سے مماثلت رکھتا ہے۔ مگر یہاں مسئلہ یہ ہے کہ کیا خواجہ صاحب کا ایک اسلوب ہے یا ان کے یہاں مختلف اسالیب پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کی کثرت ہے اور اس کثرت کے اعتبار سے ان کے اسلوب کی بھی کئی سطحیں ہیں۔ ایک اچھے اسلوبیاتی مطالعے میں ان امور کا عرفان ضروری ہے بالخصوص خواجہ صاحب کا اسلوب ایسے عرفان کا ضرور مطالبہ کرتا ہے۔ پروفیسر مشیر الحق نے خواجہ صاحب کی تفسیر نگاری کے اصولوں کا بسوط جائزہ لیا اور اس ضمن میں خواجہ صاحب کی خدمت کے اعتراف کا مطالبہ کیا۔ ڈاکٹر علی محمد خسرو نے اپنی سابقہ مصروفیات کی روشنی میں اجلاس کے دوران ہی صدارتی تقریر کی۔ انھوں نے خواجہ صاحب کی ادبی اور تہذیبی شخصیت کا اپنے مخصوص دل نشیں اور دل نواز انداز میں تذکرہ کیا اور خواجہ صاحب کے متصوفانہ افکار کی عصری معنویت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ملک کی تہذیبی شیرازہ بندی میں تصوف کی قدریں اپنی وسیع المشربی کی وجہ سے مثبت کردار ادا کر سکتی ہیں۔ پروفیسر خسرو کے بعد پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ اس اجلاس کی خوبی یہ تھی کہ اس میں خواجہ صاحب کے ادبی کارناموں کے ساتھ ان افکار و اقدار کو بھی اہمیت دی گئی جن کی اشاعت کو وہ اپنی تمام تر کوششوں کا مرکز و محور تصور کرتے تھے۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے خواجہ صاحب کی ان کوششوں کو سراہا جو انھوں نے خانقاہی نظام کی اصلاح کے سلسلے میں ساری عمر کیں۔ خواجہ صاحب کی تحریروں میں جو جذب و اثر ہے اور جو سحر آفریں تاثیر ہے اس کے اسباب کی تلاش کے سلسلے میں انھوں نے فرمایا کہ اس کی بنیاد "وہ گداز قلب" ہے جس کی تخلیق پر تصوف زور دیتا ہے۔ خواجہ کو "گداز قلب" کی یہ "دولتِ بیدار" تصوف کی قدروں کو تجربہ بنا لینے کی وجہ سے نصیب ہوئی۔ فاروقی صاحب نے فرمایا کہ خواجہ حسن نظامی کی شخصیت کو تصوف کے اس عنصر سے علیحدہ کر کے سمجھنے کی کوشش کرنا، ان کے ساتھ اور ان کے مشن کے ساتھ ناانصافی ہے۔

سیمینار کے میر مجلس نثار احمد فاروقی تھے انھوں نے جس خوبی اور خوبصورتی سے جلسے کی کارروائی کو مرتب کیا۔ وہ یقیناً قابل داد تھی۔ انھوں نے جس انداز سے مقررین اور ان کے موضوعات کو متعارف کرایا، وہ ان کی شخصیت کے بھرپور پہلو کا اظہار تھا۔ سیمینار خواجہ حسن ثانی نظامی کے، شکریے پر جو اس کے روح رواں تھے، ختم ہوا



خطبۂ استقبالیہ

فیاض الدین بہزاد دکن نظامی
"الحمرا" بنجارہ ہلز - حیدر آباد

معزز خواتین و حضرات! یہ میرا نہایت خوشگوار فریضہ ہے کہ میں آپ سب کا دلی شکریہ کے ساتھ خیر مقدم کروں۔ آج ہم شمس العلما امام المشائخ حضرت خواجہ حسن نظامی رح کے ۲۲ ویں عرس اور جشن صد سالہ کے موقع پر یہ ادبی سمینار منعقد کر رہے ہیں۔ جس کا مقصد خواجہ صاحبؒ کی عجیب و غریب شخصیت کے متعلق جنھوں نے اپنی زندگی کو علمی، ادبی اور مذہبی نشو و نما کے لیے وقف فرما دیا تھا معلومات حاصل کرنا اور آنے والی نسلوں تک پہونچانا ہے تاکہ وہ اپنی زندگیوں کو مفید اور خوشنما بنائیں۔

خواجہ صاحبؒ کے علمی مشاغل ہوں یا ادبی۔ مذہبی ہوں یا سماجی، ان میں سے ہر ایک کو مختلف عنوانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ یہ مقالے جو بڑے بڑے دانش وروں اور ادیبوں کے قلم اور افکار کے شہپارے ہیں، ہم سب کے لیے اور دنیائے ادب کے لیے ایک کار آمد اور بیش بہا اثاثہ ثابت ہوں گے۔ اور خواجہ صاحب کے شایانِ شان خراج عقیدت بھی۔ خواجہ صاحب کے علمی مذاق اور ادبی کارناموں پر مدتوں سمینار اور ادبی محفلیں ہوں گی اور خراجِ عقیدت پیش ہوتے رہیں گے اور جب بھی ان کی تحریریں پڑھی جائیں گی ایک کیفیت سرمدی بخشیں گی اور اپنے نرالے رنگ و روپ کے باعث ہر زمانے میں اپنے لکھنے والے کی غیر معمولی صلاحیتوں اور ہمہ جہتی خصوصیتوں کی یاد دلاتی رہیں گی۔

خواجہ صاحب قدرتی طور پر نہایت ذہین، ثابت قدم اور سنجیدہ واقع ہوئے تھے۔ ان کی زندگی ہر بڑے آدمی کی طرح ہمیشہ ہنگاموں سے دوچار رہی۔ مخالفتوں کے طوفان اور دشمنوں اور حاسدوں کے حملوں سے ان کا مقابلہ رہا۔ لیکن انھوں نے کسی وقت بھی شائستگی، تہذیب، شرافت اور بردباری کو ہاتھ سے جانے نہ دیا، جن کی وجہ سے دشمن ان کا بال بیکا نہ کر سکے۔

خواجہ صاحب اپنے طرز کے آپ موجد تھے۔ زبان سادہ، لیکن شگفتہ۔ بیان میں روانی اور اچھوتا پن اور اس میں مذہبیت اور روحانیت کا اثر۔ تصوف تو ان کے گھر کی چیز تھی۔ صوفیوں اور مشائخ کی تنظیم اور اصلاح کے لیے حلقۂ نظام المشائخ قائم کیا — اللہ غریق رحمت کرے، ملّا واحدی صاحب خواجہ صاحب کے اس تنظیم میں دست راست تھے، خواجہ صاحب کا درویشی رنگ نہایت عالی حوصلہ تنگ نظری اور بناوٹ سے پاک تھا۔ اس لیے تعلیم یافتہ طبقہ میں آپ بے حد مقبول تھے۔ آپ لاتعداد کتابوں کے مصنف اور مولف تھے۔ جن میں آپ کی ذہانت اور طبیعت کی لطافت ہر کتاب اور ہر تالیف سے عیاں ہے، خواہ وہ غدر کے افسانے ہوں یا نظامی بنسری۔ سیپارۂ دل ہو یا چٹکیاں اور گدگدیاں۔ روزنامچے ہوں یا آپ بیتی۔

خواجہ صاحب بڑے نباض اور آدم شناس تھے۔ خواہ کوئی سن رسیدہ عالم ہو یا طالب علم، سب کو ان کے مزاج اور ذہنی شعور کے مطابق بہتر سے بہتر مشورے دیتے تھے، جو ان کی اپنی زندگی میں نہایت مفید ثابت ہوئے۔

خوش قسمتی سے مجھے آج سے ۵۵ برس قبل خواجہ صاحب کے حلقہ بگوش ہونے کا شرف حاصل ہوا جب کہ میں طالب علم تھا۔ خواجہ صاحب نے میرے فنِ تعمیر کے شوق کو پہچان لیا اور فرمایا کہ اگر تم کو موقع ملے تو ممالک ہسپانیہ، مصر، ایران اور ترکی ضرور جاؤ اور وہاں کی قدیم عمارتوں کا بغور مطالعہ کرو۔ اور ہندوستان کی قدیم عمارتوں کا بھی جائزہ لو اور پھر ایک ایسی طرزِ تعمیر ایجاد کرو جو جدید اور قدیم فن تعمیر کا بہترین امتزاج ہو جو ہر طرح ہمارے ملک کے لیے خوبصورت اور مفید ثابت ہو۔

عجیب بات ہے کہ میری یورپ کی تعلیم ختم ہونے کے بعد انگریز اساتذہ نے بھی یہی مشورہ دیا کہ مغربی ممالک کے فنِ تعمیر کی اندھی تقلید سے بچو جو تمہارے ملک کے لیے ہر طرح غیر موزوں ثابت ہوگی۔ اور کہا کہ تمہارے مُلک میں فنِ تعمیر کے بہترین نمونے موجود ہیں، ان سے ضرور استفادہ کرو۔ چنانچہ لندن سے مجھے اسپین اور اٹلی بھجوایا گیا تاکہ میں ان عمارتوں کا گہرا مطالعہ کروں، یہ تھا خواجہ صاحب کی اعجاز نما دور اندیشی کا عالم، جس نے میری فنی زندگی کی کایا پلٹ دی۔



رفیعہ سلطانہ، سلطانہ شرف الدین، مریم بلگرامی، مہر چند داور، ضیاء الحسن فاروقی، ملک رام، یوسف حسین خاں

محمد شفیع قریشی   وزیر مملکت برائے ریلوے، حکومت ہند

افتتاحی خطبہ

حضرات !

آج کی یہ پُر رونق محفل دیکھ کر امیر خسرو کا یہ مشہور شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

اشک ریز، آمد ابرو بہار
ساقیا، گل بریز و بادہ بیار

حضرت نظام الدین اولیا کی اس تاریخی بستی میں جس کو کبھی غیاث پور کہتے تھے۔ سات سو سال پہلے لوگوں نے ایک خاص پس منظر میں جس سے آپ سب واقف ہیں۔ حضرت امیر خسرو کے اس شعر کی بازگشت سنی تھی آج اسی تاریخی بستی میں آپ سلسلۂ چشتیہ کی شاندار روایات کے امین و علمبردار حضرت خواجہ حسن نظامی پر ایک مجلس مذاکرہ کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ تو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ حضرت امیر خسرو اور حضرت خواجہ حسن نظامی دونوں میں فکر و عمل کے اعتبار سے کس درجہ مماثلت تھی۔ دونوں صوفی و درویش تھے۔ دونوں اہل قلم و اہل دانش تھے۔ دونوں عوامی شخصیت تھے اور عوام کے دلوں کی دھڑکنوں کے ترجمان دونوں نے زندگی کے ہر رنگ و روپ کو دیکھا تھا۔ دونوں نے زندگی کی پست ترین سطح کا بھی مشاہدہ و تجربہ کیا تھا اور اعلیٰ ترین سطح کو بھی دیکھا اور پرکھا تھا۔ خسرو پہلے اہل قلم تھے جنھوں نے عوام کی زبان میں لکھنے کی ابتدا کی۔ خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں بھی اسی عوامی زبان کا رنگ غالب ہے۔

خسرو مختلف درباروں میں اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔ خواجہ حسن نظامی کو بھی اپنے دور کے تمام بڑے لوگوں تک رسائی حاصل تھی۔ انھیں شمس العلما کا خطاب ملا۔ خسرو دربار کے ندیم خاص تھے۔ خواجہ صاحب نوابوں اور مہاراجاؤں کی محفل میں ایک باعزت مہمان کی حیثیت سے شریک ہوتے تھے۔

محترم دوستو!

یہاں بہت سے اہل علم و دانش حضرات جمع ہیں جو خواجہ صاحب کی تہ دار علمی و ادبی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر عالمانہ بحث کریں گے۔ ان کے علمی و ادبی کمال کا جائزہ لینا نہ میرا منصب ہے اور نہ میں اپنے کو اس کا اہل ہی سمجھتا ہوں لیکن جو کچھ تھوڑا بہت میں نے ان کے بارے میں پڑھا اور سنا ہے اس سے ان کی ذات کی ایک بڑی دلنواز و خوبصورت تصویر ابھرتی ہے۔ ان کی ذات ایک انجمن تھی۔ ان کی تحریروں کے مطالعے سے دل و دماغ کو تقویت ملتی ہے۔ آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوتی ہے کہ انھوں نے عملی زندگی کا آغاز ایک معمولی حیثیت سے کیا تھا۔ اور ترقی کر کے شمس العلما، مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی بن گئے۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے اور ادنیٰ سے ادنیٰ کام کو بھی حقیر نہیں سمجھتے تھے۔

انھوں نے درگاہ کے دروازے پر جوتوں کی حفاظت کا کام کیا۔ جلد سازی کی کتابیں و رسالے بیچنے کا کام کیا۔ اپنا رسالہ نظام المشائخ پھیری لگا کر بیچتے تھے۔ باؤلی میں کود کر پیسہ حاصل کرتے تھے۔ ان پر ایسا بھی وقت گذرا جب گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا اور انھیں فاقے سے رہنا پڑتا تھا۔

اس سطح سے وہ اوپر اٹھے۔ اپنی ذاتی کوششوں کے سہارے ایک ممتاز صحافی، ادیب اور عالم کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت حاصل کی سینکڑوں کی تعداد میں کتابیں لکھیں۔ امیر خسرو کی طرح ان کی تحریروں میں شگفتگی، جدّت اور نکتہ آفرینی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے ہر موضوع پر طبع آزمائی فرمائی۔ ان کی کتاب "بیگمات کے آنسو" سے لے کر ان کے روزنامچوں تک انھوں نے زندگی کی معمولی سے معمولی جزئیات کو اپنی تحریروں میں سمیٹ لیا ہے۔ ان کی جدت پسندی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان کی چند کتابوں کے نام ملاحظہ فرمایئے۔ سی پارۂ دل، کانا باتی، نظامی بنسری، محمد گیان وغیرہ

خواجہ صاحب ایک بلند پایہ ادیب کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب تاجر بھی تھے۔ ان کی تجارتی دواؤں میں بھی ان کی جدت پسندی کی جھلک کارفرما ہے۔ چند دواؤں کے نام سنیے۔ خوشش ایام، کندن بدن، کایا پلٹ، گل بکاؤلی، کہا جاتا ہے کہ اردو بازار اور اردو پارک انھیں کے دیے ہوئے نام ہیں۔ ایک زمانہ میں انھوں نے اردو بازار میں ایک بسکٹ فیکٹری کھولی تھی۔ اس کا نام بھی انھوں نے اردو بسکٹ فیکٹری رکھا تھا اور اس فیکٹری میں جو بسکٹ تیار ہوتا تھا اس کا نام بھی اردو بسکٹ تھا۔ اور جو کتب خانہ قائم کیا اس کا نام بھی اردو بک ڈپو رکھا۔ شاید اسی وجہ سے ان کا نام تک خواجہ اردو پڑ گیا تھا۔

معزز حاضرین ! میں یہ سمجھتا ہوں اور آپ بھی میرے اس خیال سے

(بقیہ صفحہ ۳۹ پر)

خطبۂ صدارت



مظفر حسین برنی، سکریٹری وزارتِ اطلاعات و نشریات حکومتِ ہند

معزز خواتین و حضرات!

سب سے پہلے مجھے خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ اس نے حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم کی حیات اور تصانیف کے موضوع پر اس آل انڈیا سیمینار کی صدارت کا اعزاز مجھے بخشا۔ اس عزت افزائی کے لیے تہِ دل سے ممنون ہوں۔

حضرت خواجہ حسن نظامی کے انتقال کو دیکھتے دیکھتے ۲۲ سال گذر گئے ہیں۔ اتنی مدت میں دو نسلوں کا وقفہ حائل ہو جاتا ہے۔ خواجہ صاحب کی زندگی میں جو حضرات ان سے قریب رہے یا ان کی تصانیف اور دوسرے علمی، سماجی یا سیاسی کارناموں کے وسیلے سے ان کو جانتے تھے وہ بھی اس چوتھائی صدی میں آہستہ آہستہ اٹھتے جا رہے ہیں۔

خواجہ صاحب کی تصانیف بھی جو ان کی زندگی میں بار بار چھپتی تھیں اور گھر گھر پہنچتی تھیں بازار سے غائب ہوتی جا رہی ہیں اور نئی نسل کو ان کتابوں سے بھی فیض حاصل کرنے کے مواقع کم ملتے ہیں۔ اس لیے یہ بہت ضروری ہو گیا تھا کہ خواجہ حسن نظامی کی یاد کو تازہ کیا جائے۔ ان کی سبق آموز زندگی اور بصیرت افروز علمی تصانیف کی اہمیت اور افادیت سے سب کو روشناس کرایا جائے۔

مجھے امید ہے کہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی نے اپنے مقاصد میں یہ بھی ضرور پیش نظر رکھا ہوگا کہ خواجہ صاحب کی سب نہیں تو چیدہ چیدہ اور زیادہ اہم کتابوں کو نئے سرے سے ایڈٹ کرانے کے بعد تعارفی مقدمہ اور جدید طرز کی ترتیب کے ساتھ خوبصورت اور یونیفارم سائز میں پیش کیا جائے۔ یہ کام بہت ضروری ہے اور خاصی طویل مدت کا ریاض اور محنت چاہتا ہے۔

اس سیمینار کا انعقاد در اصل وقت کے بہت ہی اہم تقاضے کی تکمیل کرتا ہے۔ خواجہ صاحب کی زندگی اور تصانیف کے بارے میں آپ نے بہت سے پُر مغز اور معلومات افزا مقالات اور تقریریں ابھی سُنی ہیں اس لیے آپ کو ضرور اندازہ ہوا ہوگا کہ وہ کیسی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اور ان کی محنت، عزم، اعتماد اور خلوص و دیانت سے بھرپور زندگی میں آج بھی ہمارے لیے کیسے کیسے سبق موجود ہیں۔ میں نے خواجہ صاحب کو کبھی نہیں دیکھا۔ ایک دوست نے ایک نوجوان پاکستانی شاعر کا یہ شعر جو کہ علامہ اقبال کے متعلق تھا سُنایا،

میں وہ بدبخت کہ میں تیرے زمانہ میں نہ تھا
تو وہ خوش بخت کہ تو میرے زمانہ میں نہیں

میری بدبختی تو مُسلّم کہ میں ان کے زمانے میں تھا لیکن کبھی شرفِ ملاقات حاصل نہ ہوا لیکن خواجہ صاحب آج بھی زندہ ہوتے تو اس زمانہ کو خوش بختی عطا فرماتے اس لیے کہ وہ ایک زمانہ ساز اور عہد آفریں شخصیت تھے، وہ اپنے دوست اکبر الٰہ آبادی کے اس خیال کے حامی نہ تھے کہ،

پہن لے سایہ مری جاں اُتار کر پشواز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز!

بلکہ وہ علامہ اقبال کے ہم خیال تھے۔ ع

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز!

میں نے جب بچپن میں خواجہ صاحب کے غدر کے افسانے پڑھے اور ہر گھسیارن کے چہرہ میں دودمانِ تیموری کی کسی بدنصیب شہزادی کے خدوخال تلاش کرنے لگا اسی وقت سے ان کو دیکھنے اور ان سے ملنے کی آرزو تھی لیکن،

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بہرکیف مجھ جیسے محروم لوگوں کے لیے خواجہ صاحب کی تحریریں اور تصانیف موجود ہیں جن سے ان کی شخصیت کی کرنیں پھوٹی پڑتی ہیں ۔ وہ ایک تنہا ایسے ادیب ہیں کہ ان کی تصانیف اور بالخصوص ان کے روزنامچوں سے ان کی شخصیت اور ان کے کردار کی مکمل تصویر مرتب ہوجاتی ہے ۔ ؏

قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا!

خواجہ صاحب بنیادی طور پر ایک صوفی تھے ۔ ایک درویش، ایک موحّد، انسان دوست، طالبِ مولا مگر تارکِ دنیا نہیں ۔ ان کا تصوّف جامد نہیں متحرک تھا۔ انھوں نے اپنے پاؤں ہمیشہ مضبوطی سے اسی زمین پر رکھے۔ زندگی کو اس کی بھیڑ میں گھُل مل کر دیکھا، چکھا، بھگتا اور اس کے ہر پست و بلند سے گذرے، ہر خوب و زشت کا تجربہ اور سرد و گرم کا مقابلہ کیا۔ مگر ان ہنگاموں میں بھی ان کی لَو خدا سے ہی لگی رہی۔ انھوں نے اپنی زندگی سے عملی طور پر یہ ثابت کردیا کہ تصوف کا مطلب زندگی سے کنارہ کشی نہیں بلکہ "دل بیار و دست بکار" ہونا ہی ایک صوفی کی شان ہے ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ آج کی دنیا بھی روحانیت سے بالکل بے نیاز نہیں بلکہ اس کی بھوکی ہے ۔ مگر اسے ایسے ہی تصوف کی اور ایسے ہی صوفیوں کی ضرورت ہے جو زندگی کو بھگتنا سکھائیں اس سے بھاگنا نہ سکھائیں ۔

خواجہ صاحب کردار ہی کے غازی نہ تھے بلکہ گفتار کے بھی غازی تھے ۔ وہ ایک صاحبِ طرز انشاپرداز تھے ۔ قدیم زمانے میں انشاپردازی کا مفہوم یہ تھا کہ مشکل اور مرصّع زبان لکھنے پر جسے قدرت حاصل ہو اُسے منشی کہا جاتا تھا۔ مغربی ادب میں ایسے (Essay) کی صنف نے اس کا مفہوم کچھ اور کردیا ہے ۔ اردو ادب میں خواجہ صاحب ہی انشائیہ یا Essay کے بانی ہیں ۔ انگریزی ادب میں یہ فنِ انشاپردازی اٹھارویں صدی میں ڈاکٹر جانسن، ایڈیسن سے شروع ہوکر ۱۹ویں صدی میں ولیم ہیزلٹ اور چارلس لیمب کے زمانہ میں اپنے شباب کو پہنچا اور آج بھی ایک ممتاز صنفِ سخن ہے اور ای ۔ وی ۔ لوکس اور رابرٹ لنڈ اور کتنے ہی نامور Essayists یا انشائیہ نگار اس صدی میں گذرے ہیں، حتّٰی کہ برٹرنڈ رسل جیسا جید فلسفی اور ریاضی داں بھی اس سے اپنا دامن نہ بچاسکا۔ اور اس کے Essays کے کئی مجموعے مقبولِ عام ہیں جن میں of Idleness and other Essays بہت ہی مشہور رہے ۔ مگر یہ صنف غزل کی طرح بڑی جان لیوا ہے ۔ معمولی سے معمولی شئے پر حسین ترین شاہکار تیار کیا جاسکتا ہے ۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے بھی دیا سلائی سے لے کر مچھر تک ہر موضوع پر طبع آزمائی کی، اور وہ دلنواز اور دلچسپ انشائیے لکھے جو اردو ادب میں شہرت دوام اور قبول عام حاصل کرچکے ہیں ۔

خواجہ صاحب کا ذہن نئے اور اچھوتے خیالات کا خزانہ تھا اور وہ بقول انیس مضامینِ نو کے انبار لگاتے رہتے تھے جن سے اکثر ان کے حریف خوشہ چینی کرتے تھے ۔ چنانچہ "منادی" کے مقابلے میں "جمادی" "سنادی"، "ازادی" وغیرہ پرچے نکلنے لگے لیکن دو اور تین ہی نکل کر بند ہوگئے ۔ اسی طرح مجھے صحیح طور پر یہ تو معلوم نہیں کہ آیا روزنامچہ لکھنے کی ابتدا خواجہ صاحب نے کی یا نہیں، یہ تو اہلِ علم و فضل ہی ریسرچ کرکے بتائیں گے لیکن میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ خواجہ صاحب کے روزنامچے اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں وہ نہ صرف خواجہ صاحب کی حیات، کردار، معمولات اور مشغولیات کی نشان دہی کرتے ہیں بلکہ اس دور کی کلچرل اور سوشل تاریخ کا وہ خام مواد بھی ہیں جن کی آئندہ سوشل مورخین کو ضرورت ہوگی ۔ خواجہ صاحب کے روزنامچوں میں بھی ان کی اُپج اور ندرت جگہ جگہ نمایاں ہے، چنانچہ انھوں نے اپنا روزنامچہ لکھتے لکھتے اللہ میاں کا بھی روزنامچہ لکھدیا اور ان کے قلم میں اتنی قدرت تھی کہ وہ مشکل سے مشکل مسئلے کو آسان ترین انداز اور اسلوب میں پیش کرسکتے تھے ۔ انھوں نے اپنے اسلوب میں اپنی علمیت کا سہارا نہیں لیا۔ اسے اپنی شخصیت سے سنوارا ہے ۔ اور جو لوگ اسٹائل کی حقیقت کے شناسا ہیں وہ اس نکتے کو خوب سمجھیں گے کہ اسلوب انسان کی شخصیت کا ایک آئینہ ہوتا ہے ۔ انھوں نے اپنی باتوں کو، اپنے خیالات کو زیادہ سے زیادہ پڑھنے والوں تک دل نشیں، مانوس، دلچسپ اور اثرانگیز انداز میں پہنچایا اور اسی لیے وہ اپنے عہد کے سب سے زیادہ ہردلعزیز ادیب اور انشاپرداز بن گئے ۔

خواجہ صاحب ہر معنی میں کثیرالاولاد تھے ۔ اپنی اولاد، ذہنی اولاد اور روحانی اولاد، ان کے مریدین اور معتقدوں کی ایک بڑی تعداد آج بھی اس برصغیر ہند و پاک کے گوشہ گوشہ میں موجود ہے ۔ انھوں نے تقریباً پانچ سو کتابیں چھوڑی ہیں اور اس پر مستزاد حسن ثانی نظامی صاحب ! اگر میں فلسفۂ تناسخ کا قائل ہوتا تو کہتا کہ خواجہ صاحب مرحوم کی روح پاک نے حسن ثانی نظامی صاحب کے روپ میں جنم لیا ہے لیکن اب بقول غالب خدشہ یہ ہے، ؏

قطع ہوجائے نہ سررشتۂ ایجاد کہیں !

اس لیے میری اور آپ حاضرین کی جانب سے ان سے دلی، پُرخلوص اور والہانہ اپیل ہے کہ وہ اب "سلسلۂ اہلِ بیت" میں داخل ہوجائیں ۔ لیکن میں ان کی ذہین اور شریر آنکھوں میں اس کا جواب دیکھ رہا ہوں' ان کا جواب وہی ہوگا جو جارج برنارڈ شا نے اس حسین اداکارہ کو دیا تھا جس نے اس سے شادی کی پیش کش کرنے کی وجہ جواز یہ دی تھی کہ ہماری اولاد میں آپ کی ذہانت اور میرا حُسن ہوگا تو اس نے کہا تھا کہ اگر کہیں ان میں آپ کی ذہانت اور میرا حُسن ہوا تو ؟ ۔۔ لیکن سلسلۂ نظامیہ کی بقا کا تقاضہ ہے کہ خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب اب اس ساحری قلعہ میں داخل ہوجائیں جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ جو اندر ہیں وہ باہر آنے کے لیے بیقرار ہیں اور جو باہر ہیں وہ اندر جانے کے لیے بیتاب ہیں ۔ بہرکیف عراقی کی زبان میں، ؏

تو برونِ درچہ کردی کہ درونِ خانہ آئی !

خواجہ صاحب کی شخصیت یک رُخی نہیں ہے اس کے بہت سے پہلو ہیں اور ہر پہلو اہم ہے ۔ خواجہ صاحب کے بارے میں صرف ایک تحقیقی مقالہ یا تھیسس کافی نہیں ہوسکتا ۔ انھیں ایک صوفی، ایک صحافی، ایک انشاپرداز، ایک روزنامچہ

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

ساغر نظامی
ڈی ٹو ۲۵۹، پنڈارہ روڈ، نئی دہلی

خواجہ حسن نظامی



اے ہم نشینِ دائرۂ قدسیاں سلام
اے آبروئے بارگہِ نوریاں سلام

کہسارِ زندگی کی دہکتی چٹان سے — تو نے تراشے تیشۂ فکرِ جوان سے
اپنا زمانہ، اپنی زمیں اپنا آسماں — اپنی حیات اپنا جہاں اپنے بام و در
اک درس گاہ جہد و ریاضت تھی تیری ذات — مزدِ شبی سے تو نے کیا شام کو سحر
معمارِ زیست و عاقبت کامراں سلام
اے آفتابِ گوشۂ محنت کشاں سلام

تیرے مجاہدات کا ہے کارگہ عریض — میدان تیرے فکر و عمل کا دراز تر
تو زیست کے ہجوم میں تھا صدرِ اصفیا — تو صوفیوں کی بھیڑ میں تھا پیرِ باہنر
وہ زندگی ہو، دین ہو، دنیا ہو یا ادب — ہر مورچے پہ تو نے لڑی جنگ بے خطر
تیرا تصور آکے یہ کہتا ہے بار بار — انساں کی مٹھیوں میں ہے دنیائے بحر و بر
تیری زباں کے آگے نسیمِ سحر تھی گنگ — تیرے بیاں کے سامنے خاموش نغمہ گر
نباضِ کائنات تری یاد پر نثار — رمز آشنائے زندگیِ بیکراں سلام
تیرے خرام سے تھی معطر گلی گلی — تیرے تبسمات سے خنداں نگر نگر
دہلی کی خلدِ حسن کے سرو رواں سلام

ساقی جو تجھ سے اٹھتے رہیں اس زمین سے — بے کیف ہو کبھی نہ یہ مے خانۂ بشر
خم خانۂ حیات کے پیرِ مغاں سلام
اے ہم نشینِ دائرۂ قدسیاں سلام

جو تیرے قلب و روح میں تھا مشعلِ حیات — اب پیکرِ حسن میں دہکتا ہے وہ شرر
روشن کیے ہوئے تھی جو تیرے وجود کو — موتی میں آ چکی ہے وہی تابشِ گہر
دستِ فنا سے جس کا مٹایا گیا نہ نام — سینے پہ زیست کے ہے تو وہ نقش کالحجر
سنتا رہے گا تیرا فسانہ ہر ایک عہد
کہتا رہے گا وقت تری داستاں مدام
اے ہم نشینِ دائرۂ قدسیاں سلام

انور صابری
گلی سرخ پوشان، چوڑیوالان، دہلی

مصوّرِ فطرت

ادیبِ خوش نظر و نکتہ دانِ علم کلام
ترے دماغ کو حاصل تھی منزلِ الہام
قلم کو جوہرِ حسنِ سخن دیا تو نے
زباں کو سہل نگاری کا فن دیا تو نے
جمالیات کی رعنائیاں پناہ میں تھیں
مشاہدات کی باریکیاں نگاہ میں تھیں
ہزار زخم نصیبِ دلِ حیات رہا
لبِ لطیف گہر بارِ کائنات رہا
عجیب سینۂ الفاظ کو گداز دیا
نگارشات کو سوزِ دروں کا ساز دیا
صداقتوں کے حقائق سے جب بھی کام لیا
وفا نے دامنِ محبوب بڑھ کے تھام لیا
نظر مصورِ فطرت کی شاہکارِ جمال
جبیں میں جذبۂ مشیت کا عکسِ نورِ خیال
مزاج حضرتِ خسرو کے اوجِ یاب مقام
ادا ادا میں سمیٹے ہوئے ادائے نظام
فنا کے جادۂ غم سے گذر نہیں سکتا
بقا کا درس دیا جس نے مر نہیں سکتا

قسم خدا کی وہ پائندہ دوامی ہے
تہِ مزار بھی زندہ حسن نظامی ہے



خواجہ حسن نظامی میری نظر میں

سعید احمد اکبرآبادی

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، تغلق آباد، نئی دہلی

حضرت خواجہ صاحب کی ذاتِ گرامی عجیب و غریب صفات و کمالات کی جامع تھی جو فی زمانہ کسی ایک شخص میں مشکل سے مجتمع نظر آسکتی ہیں۔ وہ اُردو زبان کے صاحبِ طرز انشا پرداز و ادیب تھے۔ بہت بڑے صوفی اور بزرگ تھے، مصنف اور مؤلف بھی تھے اور جرنلسٹ بھی۔ سوشل ورکر بھی اور روحانی مرشد و رہنما بھی۔ ان کی زندگی سراپا عمل تھی، انھوں نے معمولی حالت سے اُبھر کر غیر معمولی ترقی کی اور بڑی عظمت و ناموری حاصل کی۔ یہ سب کچھ ان کی ذاتی محنت، شوق، لگن، عظیم قوتِ ارادی اور اعلیٰ درجہ کی ذہانت و فطانت اور بصیرت و فراست کا نتیجہ تھا۔ ان میں خود اعتمادی بلا کی تھی۔ انھوں نے زندگی میں ہزاروں آدمیوں کو سہارا دیا، ان کی زندگیاں بنادیں۔ یہ لوگ خود اپنے جوہرِ طبعی سے آشنا نہیں تھے اور اگر تھے بھی تو اسے ضائع اور برباد کر رہے تھے۔ حضرت خواجہ صاحب کی جوہر شناسی اور ساتھ ہی انسانی ہمدردی و خیر اندیشی کا یہ عالم تھا کہ ان لوگوں کے جوہرِ طبعی کو چمکایا، اُبھارا اور سہارا دیا اور یہ لوگ خاک کمتری سے اُٹھ کر اوجِ کہتری پر پہنچ گئے، غربت زدہ اور افلاس کے مارے تھے خوشحالی کی زندگی بسر کرنے لگے، لیکن خواجہ صاحب نے کسی کا سہارا نہیں لیا۔ وہ قطعی طور پر سیلف میڈ ـــــ یعنی خود ساختہ و پرداختہ تھے، نہایت شیریں زبان اور خندہ جبیں تھے، گفتگو کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے اور قلم اُٹھا لیتے تو موتی برسنے لگتے تھے۔ غرض کہ یہ واقعہ ہے کہ کم از کم میں نے اپنی زندگی میں خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسی متنوع اور کمالاتِ گوناگوں کی جامع شخصیت اس عہد میں کوئی اور نہیں دیکھی۔

اوّل اوّل جب حضرت خواجہ صاحب کے خامۂ سحر طراز کا غلغلہ ہوا تو یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اُردو زبان و ادب کے قلمرو میں سر سید احمد خاں، مولانا محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی اور مولوی نذیر احمد کے علم و فن اور ان کی نثر کا سکہ چلتا تھا اور ان حضرات کی ادبی عظمت کے سامنے بڑے بڑے اربابِ قلم کے سر خم تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی بعد میں آئے، لیکن اس شان اور ادا سے کہ ملک کی ادبی فضا پر چھا گئے اور شہرت و ناموری کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ بہ ظاہر یہ محسوس ہوتا تھا کہ اب ادب و انشا میں کوئی ایسی نئی راہ باقی نہیں رہی جس پر رواں دواں ہو کر کوئی ادیب اپنے لیے انفرادیت کا طغرا دعلم حاصل کر سکے، اور اب آئندہ نسلوں کے لیے انھیں بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ ہوگا۔ لیکن خواجہ صاحب اس بزم میں ایسی آن بان اور سج دھج سے آئے کہ اہلِ بزم کی نگاہیں ان کی طرف بے ساختہ اُٹھ گئیں اور تحسین و آفریں کے ہاتھ آگے بڑھ کر ان کی بلائیں لینے لگے۔

اُردو زبان میں بے شبہ خواجہ صاحب کی نثر سہل ممتنع کا بہترین شاہکار کہلانے کی مستحق ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ دلّی نے اردو زبان کے جو بہترین نثر نگار پیدا کیے ہیں وہ میرے نزدیک دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو دلی کی ٹکسالی زبان لکھتے ہیں ان کو یہاں کے محاورات اور کہاوتوں پر عبور ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی تحریریں گنگا جمنی ہوتی ہیں، کیونکہ وہ دلی کے محاورات و ضروب الامثال کے ساتھ عربی فارسی کے ثقیل الفاظ بھی بے تکلف استعمال کرتے جاتے ہیں، اس طرح گویا نثر کے رُخِ زیبا و مصفّا پہ چیچک کے داغ نہ سہی اِدھر اُدھر گرمی دانے نظر آنے لگتے ہیں۔ مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کے زورِ قلم، کمالِ فن اور قدرتِ کلام کا منکر کون ہوسکتا ہے؟ لیکن ان کی نثر خالص اور بے میل دلّی کی زبان کا نمونہ پیش نہیں کرتی۔ علاوہ ازیں کوئی محاورہ یا کہاوت کیسی ہی عمدہ، برجستہ اور طرفہ ہو بہرحال اس کا ایک محلِ وقوع اور موقع ہوتا ہے۔ شرفا کی گفتگو میں اگر کوئی سوقیانہ محاورہ استعمال کر دیا جائے، یا بازاری لوگوں کی بات چیت میں شرفا کا کوئی محاورہ بولا جائے تو یہ کلام مرتبۂ بلاغت سے گر جائے گا اور اسے بے محل کہا جائے گا۔

ایک واقعہ یاد آیا، دلّی کے مشہور زبان دان ناصر نذیر فراق صاحب کے صاحبزادے ناصر خلیق نگار دہلوی میرے دوست تھے، اکثر ان سے لطفِ صحبت و مجلس رہتا تھا۔ ایک مرتبہ یاد نہیں کیا بات ہو رہی تھی، میری زبان سے نکلا "رنگ میں بھنگ" موصوف کو اس سے سخت تکلیف ہوئی، انھوں نے انگلی دانتوں میں دبالی اور بولے سعید صاحب یہ بازاری محاورہ ہے، ہم شرفائے دہلی ایسے موقع پر "کلیل میں غلیل" بولتے ہیں۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم اس معاملہ میں کچھ زیادہ محتاط

نہیں ہیں۔ وہ بعض مرتبہ محاورات یا ٹکسالی زبان کے الفاظ بے محل اور بے موقع بول جاتے ہیں، جس کے باعث موضوعِ سخن مرتبۂ ثقاہت سے گر جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک زمانہ میں ان کی کتاب "امہات المؤمنین اور ترجمہ قرآن مجید" پر بعض حلقوں میں بڑا ہنگامہ ہوا۔

دلی کی زبان لکھنے والوں کا ایک دوسرا اسکول وہ تھا جس کے نمایاں اور نامور علمبردار جناب ناصر نذیر فراق دہلوی مصنف "لال قلعہ کی جھلکیاں" ناصر علی اڈیٹر صلائے عام، آغا حیدر حسن اور بعض اور اصحاب تھے۔ لیکن اول تو ان حضرات کا دائرہ محدود تھا۔ ناول، افسانہ، تذکرہ نگاری اور تاریخ یہی چند موضوعات تھے جن میں وہ اپنے فنِ زباندانی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ پھر ان کے استعمال کیے ہوئے محاورات اور کہاوتیں بعض مقامات پر اس درجہ غامض اور تہہ دار ہوتے تھے کہ ہر شخص انھیں لغت کی مدد کے بغیر نہیں سمجھ سکتا تھا۔

دلی کی ٹکسالی زبان لکھنے کے یہ دو اسلوب یا دو اسکول تھے کہ حضرت خواجہ صاحب افقِ تحریر و انشا پر طلوع ہوئے اور اس شان سے کہ :

اُف ترے حسن جہاں تاب کی پُر زور کشش
نور سب کھینچ لیا چشمِ تماشائی کا

خواجہ صاحب نے بہت لکھا اور تاریخی، ادبی، اصلاحی، اخلاقی، متصوفانہ، تخیلی، سیاسی، معاشرتی، مذہبی، سوانحی، سنجیدہ اور ظریفانہ غرض کہ ہر قسم کے مضامین اور مقالات کا انبار لگا دیا۔ انھوں نے کسی کی تقلید اور پیروی نہیں کی، بلکہ اپنا ایک الگ اسلوب اور طرزِ نگارش پیدا کیا۔ اس اسلوب کی خصوصیات حسب ذیل ہیں :

۱۔ زبان بہت ہلکی پھلکی اور رواں دواں ہوتی تھی اور اس درجہ لطیف اور نازک کہ کوثر و تسنیم کے پانی سے دُھلی نظر آتی تھی۔

۲۔ یہ زبان اگرچہ صاف سپاٹ اور سلیس و سہل ہوتی تھی، لیکن جگہ جگہ دلی کے عام فہم محاورات اور کہاوتوں میں پیوندکاری اس درجہ صنّاعی سے ہوتی تھی کہ پورا مضمون آورد نہیں آمد معلوم ہوتا تھا۔

۳۔ عبارت حشو و زوائد سے پاک اور ما قلّ و دلّ جو بلاغت کا کمال ہے' اس کی مصداق ہوتی تھی۔

۴۔ طبیعت حد درجہ جدّت آفریں اور نکتہ سنج واقع ہوئی تھی۔ اس لیے بات سے بات پیدا کرنا اور معمولی اور پیش پا افتادہ چیزوں سے اہم اخلاقی اور روحانی، علمی و ادبی نتائج نکالنا خواجہ صاحب کا خاص فن تھا۔ وہ اس طرح بے زبانوں کو بھی گویا کر دیتے اور خود ان کی زبان سے ان کی آپ بیتی سنواتے تھے۔ چنانچہ ان کی کتاب "سیپارۂ دل" اسی قسم کے مضامین اور انشائیوں کا مجموعہ ہے جو میرے خیال میں اُردو کے سرمایۂ نثر میں اپنی نوعیت کی منفرد شے ہے۔

۵۔ عربی اور فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ خواجہ صاحب کی چڑ تھے۔ اسی لیے انھوں نے الہلال اور البلاغ کے مضامین کے پیشِ نظر ایک مرتبہ مولانا ابوالکلام آزاد پر ایک چبھتا ہوا فقرہ چُست کر دیا تھا۔ حالانکہ مولانا حسرت موہانی نے اس کی داد اس طرح دی تھی :

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
شعرِ حسرت میں وہ مزا نہ رہا

۶۔ وہ ہندی بھاشا کے ہلکے پھلکے الفاظ برابر استعمال کرتے ہیں اور اس سے زبان میں ایک خاص قسم کی لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔

۷۔ تحریر کا آہنگ دل نشیں اور مؤثر ہوتا ہے، جس کا سبب عبارت کی شگفتگی کے ساتھ منطقی طریقۂ استدلال ہے۔

جس طرح سرسید احمد خاں نثر میں ایک طرزِ نو کے موجد تھے جو اگرچہ نثر عاری تھی مگر بڑی مؤثر اور دلآویز تھی۔ سرسید احمد خاں کی اس نثر نے ان کے ہم عصروں کو اور آئندہ نسلوں کو بڑا متاثر کیا اور ان کا طرز مستقل ایک اسکول بن گیا۔ اسی طرح خواجہ صاحب کا اسلوب صرف ان کی ذات تک محدود نہیں رہا، بلکہ اس نے لکھنے والوں کی ایک نسل پیدا کر دی۔ مُلّا واحدی، عزیز حسن بقائی، اور مرزا فرحت اللہ بیگ اس اسلوب کے نمایاں علم بردار اور پیرو تھے۔

خواجہ صاحب کے متعلق بعض لوگ کہتے تھے کہ انھیں عمل تسخیر آتا ہے، میں عرض کرتا ہوں کہ ایک انسان کا حسنِ عمل، حسن اخلاق، اخلاص اور محبت، بے لوث جذبۂ خدمتِ خلق، سچی ہمدردی اور غم گساری' یہ سب اوصاف و کمالات ہزار اعمال کے ایک عملِ تسخیر ہیں۔ خواجہ صاحب ان اوصاف و کمالات کے پیکر تھے، ان سے کسی کی مصیبت اور تکلیف برداشت نہیں ہوتی تھی۔ ان کے ہاں ہندو اور مسلمان، امیر اور غریب، کالے اور گورے کا کوئی فرق اور امتیاز نہیں تھا۔ ضرورتمندوں کی دل کھول کر مقدور بھر مدد کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی امداد سے سینکڑوں بے روزگاروں کو روزگار مل گیا، جو غریب تھے وہ خوشحال ہو گئے، بیمار، تندرست اور دل گرفتہ و پریشان مطمئن ہو گئے۔ جن کے گھر اُجڑ گئے تھے اُن کے گھر پھر سے بس گئے۔ ان کی باتوں میں رس تھا اور آنکھوں میں کشش، چہرہ ہمیشہ متبسم رہتا تھا۔ جس شخص سے وہ بات کرتے ہمہ تن متوجہ ہو کر کرتے اور جو کوئی ان سے بات کرتا وہ اس کی بات کمال یکسوئی سے سنتے۔ ان کی زندگی نہایت باقاعدہ و باضابطہ اور صاف ستھری تھی۔ معمولی معمولی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔

حضرت مرحوم اپنی ذات سے ایک چمن اور انجمن تھے۔ انھوں نے تنِ تنہا وہ کام کر دکھائے جو ادارے کرتے ہیں۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

شوکت علی فہمی
ماہنامہ دین دنیا، چھتہ شیخ منگلو، جامع مسجد، دہلی

خواجہ حسن نظامی بحیثیت صحافی

دُنیا میں بڑے بڑے مفکر ہوئے ہیں۔ مؤرخ ہوئے ہیں۔ ادیب ہوئے ہیں۔ نامور صحافی ہوئے ہیں۔ نکتہ رس شاعر ہوئے ہیں۔ لیکن حضرت خواجہ حسن نظامی کی ذات میں جو گوناگوں صفات اور رنگا رنگی پائی جاتی ہے وہ آپ ہی اپنی مثال ہے۔ وہ ایک صاحب دل درویش بھی تھے۔ بلند پایہ مؤرّخ بھی تھے۔ مایۂ ناز مفکر بھی ۔ صاحب طرز ادیب بھی اور ایک حق گو صحافی اور مقرّر بھی۔

یہ امتیازی خصوصیت صرف خواجہ حسن نظامی ہی کو حاصل ہے کہ اُن کی ذات میں بیک وقت اتنے کمالات جمع ہوگئے ہیں جن کا احاطہ کرنا ایک بڑا دشوار کام ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص خواجہ صاحب کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا ہے تو وہ یہ سوچ کر حیران رہ جاتا ہے کہ وہ خواجہ صاحب کی رنگا رنگ زندگی کے کس پہلو پر روشنی ڈالے۔

ایک ریسرچ اسکالر جب حضرت خواجہ حسن نظامی کے دینی، روحانی، تاریخی، علمی، ادبی اور صحافی کارناموں کا جائزہ لیتا ہے تو اُسے پتہ چلتا ہے کہ آپ ایک بے مثال مفسرِ قرآن ہیں۔ روحانیات کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ بے مثال مؤرّخ ہیں۔ مغل تاریخ کو آپ نے حیاتِ نو عطا کی ہے۔ اور ایک ایسے صاحب طرز ادیب ہیں جنھوں نے کہ اپنے نگارش کے نہایت ہی دلکش انداز سے اردو لٹریچر کو مالا مال کر دیا ہے۔ آپ ایک بے مثال مفکر ہیں اور ایک ایسے صحافی بھی ہیں جنھوں نے کہ صحافت میں حق گوئی کو اوّلیت دی ہے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کے علمی اور ادبی پہلوؤں پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر صحافی زندگی پر بہت ہی کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس پر ایک ہلکی سی روشنی ڈال دوں۔

حضرت خواجہ حسن نظامی کی صحافی زندگی کی ایک مستقل تاریخ ہے جو نصف صدی سے بھی زیادہ مدّت میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا کامل احاطہ تو بہت دشوار ہے لیکن میں اس سلسلہ میں صرف اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ صحافت کے میدان کے بھی شہنشاہ تھے۔ آپ کی سرپرستی میں اس ملک میں جتنے اخبارات اور جرائد شائع ہوئے ہیں اس کی کوئی دوسری مثال پورے ملک میں موجود نہیں۔ اور شاید اسی لیے آپ کو ہندوستان کا لارڈ نارتھ کلف یعنی اخبارات کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی کی صحافتی زندگی کی ابتدا ۱۹۰۲ء میں "حلقۃ المشائخ" کے قیام سے ہی شروع ہوگئی تھی۔ حلقۃ المشائخ کے نام سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس ادارہ کی سرگرمیاں صرف دینیات اور روحانیات ہی تک محدود ہوں گی لیکن اس ادارہ کے ذریعہ حضرت خواجہ حسن نظامی کے جو مقالات مختلف اخبارات اور جرائد میں شائع ہوئے ہیں وہ دینی بھی تھے۔ تصوّف کا رنگ لیے ہوئے بھی تھے اور ان میں سیاسی اور ثقافتی رنگ بھی موجود تھا۔

پھر اس حلقۃ المشائخ سے ۱۹۰۹ء میں ملّا واحدی کی ادارت میں اور حضرت خواجہ حسن کی نگرانی میں "نظام المشائخ" کے نام سے جو ماہانہ جریدہ شائع ہوا تھا وہ ایک ایسا جریدہ تھا جس میں کہ سیاسیات، دینیات، تصوف، ادب اور سب کچھ تھا۔ اور یہ جریدہ پورے ہندوستان میں اپنے اعلیٰ اور پاکیزہ معیار کے اعتبار سے منفرد شمار کیا جاتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ صحافی میدان میں نظام المشائخ کا اِجرا خواجہ صاحب کا پہلا اور نہایت ہی اہم قدم تھا۔ نظام المشائخ ایک ایسا جریدہ تھا جس کے ذریعہ حضرت خواجہ حسن نظامی نے بالکل نئے انداز سے تعمیری اور اصلاحی لٹریچر سے اس ملک کو روشناس کیا تھا۔

صحافت کے میدان میں حضرت خواجہ حسن نظامی کا دوسرا اہم قدم "توحید" جیسے بیباک ہفتہ وار اخبار کا اِجرا ہے جو غالباً ۱۹۱۲ء میں میرٹھ سے جاری ہوا تھا۔ "توحید" کے اجرا کے محرک خود خواجہ حسن نظامی تھے جن کے ایما اور منشا پر خواجہ صاحب کے ایک مدّاح اور مخلص ساتھی بھیا شیخ احسان الحق نے اس اخبار کو جاری کیا تھا۔ "توحید" ہندوستان کا پہلا اخبار تھا جس پر کہ حضرت خواجہ حسن نظامی کا نام بحیثیت ایڈیٹر درج کیا گیا تھا۔

انگریز خواجہ حسن نظامی سے خوش نہیں تھے کیونکہ اُنھوں نے غدر ۱۸۵۷ء کے دردناک واقعات پر متعدد کتابیں لکھ کر پورے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف نفرت و حقارت کی آگ بھڑکا دی تھی۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر جن کتابوں پر انگریز برافروختہ تھے 'وہ تھیں' غدر دہلی کے افسانے۔ بہادر شاہ کا مقدمہ۔ غدر دہلی کے اخبار اور اسی سلسلہ کی تین چار دوسری کتابیں جن کے بارے میں سرکار پرست طبقہ کی یہ رائے تھی کہ یہ ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ بھلا ایک ایسا شخص جو انگریز کی نظر میں معتوب ہو

اس کے اخبار "توحید" کو کیوں کر گوارہ کیا جاسکتا تھا۔ انگریز اس اخبار کے خلاف پہلے ہی سے منصوبے بنا رہا تھا اور اُسے جلد ہی اس اخبار پر ہاتھ ڈالنے کا موقع بھی مل گیا۔ چنانچہ توحید کے اجرا کے فوراً ہی بعد جب کانپور کی مسجد کا ہنگامہ کھڑا ہوا۔ اور اس مسجد کے سلسلے میں حضرت خواجہ حسن نظامی کا تاریخی مقالہ "کہو تکبیر" شائع ہوا تو اس مقالہ نے پورے ہندوستان میں ہلچل مچادی اور کہو تکبیر جیسے باغیانہ مضمون کی بنا پر توحید کا وہ پرچہ جس میں کہ یہ مضمون شائع ہوا تھا حکومت نے ضبط کرلیا۔ لیکن اس پرچہ کے ضبط ہونے کے باوجود حضرت خواجہ حسن نظامی نے اس ضبط شدہ پرچہ کی ہزاروں کاپیاں راتوں رات طبع کراکے سارے ہندوستان میں پھیلادیں۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب تحریک خلافت کا زور دن بہ دن بڑھ رہا تھا اور انگریزوں کے خلاف مسلمانوں میں غیر معمولی غصہ تھا۔ اس نازک وقت میں اخبار توحید نے ہندوستان کی تحریک آزادی کو مضبوط کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ لیکن خواجہ صاحب کے اس اخبار توحید کے خلاف حکومت کے جذبات بُری طرح بھڑکے ہوئے تھے۔ آخر حکومت نے اس اخبار کو بند کراکے ہی دم لیا۔

اخبار توحید کے بند ہونے کے کئی سال بعد حضرت خواجہ حسن نظامی نے غالباً ۱۹۱۹ء میں "رعیت" کے نام سے ایک نہایت ہی شاندار روزانہ اخبار جاری کیا۔ یہ اخبار بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے آپ ہی اپنی مثال تھا۔ خواجہ صاحب کی صحافتی پالیسی روز اول ہی سے یہ رہی ہے کہ اخبار کو حق گو ہونا چاہیے۔ اُسے ملک کی کسی بھی سیاسی پارٹی کا آلۂ کار نہ بننا چاہیے۔ جو سیاسی پارٹی عوام اور ملک و وطن کی خدمت کرے اُسے سراہنا چاہیے اور جس سیاسی پارٹی کی سرگرمیاں ملک و وطن کے خلاف ہوں اس کی کھل کر مذمت کرنی چاہیے۔ یہی اخبار رعیت کی پالیسی تھی۔ خواجہ صاحب کی اس حق پسند پالیسی کو بے حد سراہا گیا اور رعیت کو ملک میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ خواجہ حسن نظامی کا شروع ہی سے یہ طریقہ کار رہا ہے کہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو آگے بڑھانے کی ہرممکن کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ اخبار رعیت میں اُن دنوں سردار دیوان سنگھ مفتون کام کرتے تھے۔ خواجہ صاحب نے خود ہی تو سردار دیوان سنگھ کو اخبار نویسی کی تربیت دی اور خود ہی انھیں ابھارا۔ اور خواجہ صاحب ہی کی تربیت کا یہ نتیجہ تھا کہ آگے چل کر سردار دیوان سنگھ اس ملک کے ایک ممتاز صحافی ثابت ہوئے اور بعد میں انھوں نے خود اپنا اخبار ریاست نکال کر بڑی شہرت حاصل کی۔

ماہنامہ "دین دنیا" جو آج سے ۵۶ سال قبل جاری کیا گیا تھا اس کی بنیاد بھی ۱۹۲۱ء میں حضرت خواجہ حسن نظامی ہی نے رکھی تھی۔ یہ جریدہ بھی اخبار توحید کی طرح بھیا احسان الحق کی معیت اور عبدالانوار صاحب ہاشمی کے زیر اہتمام جاری کیا گیا تھا۔ ابتدا میں ماہنامہ دین دنیا کے ساتھ ہی حضرت خواجہ صاحب کا جریدہ پیر بھائی بھی شائع کیا جاتا تھا جس میں کہ حضرت خواجہ صاحب کا وہ مشہور زمانہ روزنامچہ ہوتا تھا جسے اس ملک کے کونے کونے میں غیر معمولی ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل تھی۔

دین دنیا میں حضرت خواجہ حسن نظامی کے پُر کیف اور والہانہ مضامین بڑی پابندی سے شائع ہوتے تھے۔ اس جریدہ کی ادارت کے فرائض ابتدا میں ملک کے مشہور ادیب، شاعر اور صحافی مولانا سید ظہور احمد شاہجہاں پوری انجام دیتے رہے مگر ۱۹۲۵ء سے یعنی گزشتہ پچاس برس سے اس کی ادارت کی ذمہ داریاں راقم الحروف سنبھالے ہوئے ہے۔ دین دنیا اپنے مخصوص رنگ کا ماہنامہ ہے جو دینی اور پُر جوش تاریخی مضامین خاص طور پر شائع کرتا ہے۔ دین دنیا کی پالیسی بھی حضرت خواجہ حسن نظامی کی پالیسی کی طرح حق پسندانہ اور غیر جانب دارانہ ہے۔ اور اس جریدہ کو ملک میں آج بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔

روزنامہ رعیت کے بعد حضرت خواجہ حسن نظامی نے دو اور بھی روزانہ اخبارات جاری کیے تھے، جن میں سے ایک "غریبوں کا اخبار" تھا اور دوسرا "روزنامہ عادل"۔ غریبوں کا اخبار اپنے زمانہ کا سب سے ارزاں اخبار تھا جس کی قیمت صرف دو پیسے تھی۔ یہ اخبار شُدھی کی تحریک کے خلاف جاری کیا گیا تھا۔ اور اس نے نہایت اہم خدمات انجام دی ہیں۔ غریبوں کے اخبار کے بعد حضرت خواجہ حسن نظامی نے ۱۹۲۹ء میں عادل کے نام سے ایک اور قابل ذکر روزنامہ جاری کیا تھا۔ عادل کو اس ملک کے روزانہ اخبارات میں امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ روزنامہ عادل کی امتیازی حیثیت یہ تھی کہ اس کے صفحہ اول پر روزانہ ملک کی کسی نہ کسی ممتاز شخصیت کا قلمی چہرہ ضرور شائع کیا جاتا تھا۔ خواجہ صاحب کے لکھے ہوئے قلمی چہروں کی خصوصیت یہ تھی کہ اُن کے مطالعہ کے بعد نہ صرف شخصیتوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی بلکہ اس میں ان کے کردار کی بھی پوری جھلک موجود ہوتی تھی۔ اس روزنامہ کی ادارت کی ذمہ داریاں بھی راقم الحروف ہی کے سپرد تھی۔

حضرت خواجہ حسن نظامی نے جو متعدد ماہنامے اور اخبارات جاری کیے ہیں ان میں پندرہ روزہ "درویش" کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ جریدہ ۱۹۲۴ء میں جاری کیا گیا تھا۔ یہ بھی اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اپنے دور کا ایک منفرد جریدہ تھا۔ اس میں اسلامیات، روحانیات، ادبیات یہاں تک کہ سیاسیات پر بھی قابل قدر مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس جریدہ میں حضرت خواجہ حسن نظامی کا حکمت و موعظت سے بھرا ہوا روزنامچہ پابندی سے شائع ہوتا تھا اور یہ بھی ہندوستان کے دور دراز گوشوں تک پھیلا ہوا تھا۔

پندرہ روزہ درویش کے علاوہ حضرت خواجہ صاحب کے ہفتہ وار اخبار "منادی" کو بھی پورے ملک میں ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہ اخبار حضرت خواجہ صاحب نے ۱۹۲۶ء میں جاری کیا تھا۔ یہ صرف ہندوستان ہی میں مقبول نہیں تھا، بلکہ بیرونی ممالک میں بھی اسے کافی ہر دلعزیزی حاصل رہی ہے۔ خصوصیت سے برّاعظم افریقہ میں یہ تمام اردو جرائد میں سب سے زیادہ مقبول تھا۔ حضرت خواجہ حسن نظامی جب تک حیات رہے، یہ بڑی پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ خواجہ صاحب کی وفات کے بعد سے یہ ایک بلند پایہ ماہنامہ کی صورت میں حضرت خواجہ صاحب کے لائق صاحبزادے اور جانشین خواجہ حسن ثانی کی ادارت میں آج تک بڑی پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی کے روحانی اور ادبی حلقہ سے شائع ہونے والے جرائد میں ماہنامہ آستانہ کو بھی بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ جریدہ حضرت خواجہ

(بقیہ صفحہ ۲۲ پر)

حمیدہ سلطان
علی منزل ۔ کوچہ پنڈت ۔ دہلی



خواجہ حسن نظامی

گندمی رنگ ، موزوں نقشہ ، لانبا قد ، ایک خاص قسم کی ٹوپی اور درویشانہ جُبّہ ، زار و نزار جسم میں ایک بہت مستعد روح ، یہ تھے 'خواجہ حسن نظامی'۔ بے شمار کتابوں کے مصنّف اور دلّی کے ایسی البیلی زبان لکھنے والے ادیب تھے ۔ جن کا حریف پھر دلّی پیدا نہ کر سکی ۔ ان کی کوئی کتاب بھی آپ دیکھیں معلوم ہوگا کہ آپ کتاب نہیں پڑھ رہے بلکہ کسی دلّی والے سے باتیں کر رہے ہیں ۔ سادگی و پُرکاری خواجہ صاحب کی تحریر کی خصوصیت ہے ۔ انھوں نے اردو ادب میں نئے عنوانات دے کر اس کی راہیں بہت فراخ کر دیں ۔ خواجہ صاحب کے لکھنے کا طرز منفرد اور اندازِ بیان اچھوتا تھا ۔ انھوں نے شہزادوں اور امرا کے قصّے ہی نہیں سنائے ، آدمیوں ہی کا صرف ذکر نہیں کیا ۔ جھینگر اور مچھر جیسے حقیر کیڑوں پر بھی مضمون لکھے ۔ اور ایسے دلآویز انداز میں کہ ان کی تحریر کی خوبی پر غالب کا یہ مصرع ذہن میں آجاتا ہے ۔

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا

یوں تو محبوبِ الٰہی کے قرب کی وجہ سے خواجہ صاحب پیرزادے ، صوفی ، و درویش تھے اس لیے ان کا احترام کیا جاتا ہے لیکن اگر وہ یہ کچھ بھی نہ ہوتے صرف ادیب ہی ہوتے جب بھی ان کے دلکش اندازِ تحریر کو خراجِ عقیدت یونہی پیش کیا جاتا ، اس لیے کہ انھوں نے اردو ادب کی تزئین و آرائش اس سادگی سے کی ہے کہ ہر اُردو جاننے والے کا دل موہ لیتا ہے ، تمام اردو دنیا میں ان کا ڈنکا بج رہا ہے ۔ مجھے خواجہ صاحب کی وہ کتابیں بہت پسند ہیں ، جن میں انھوں نے ۱۸۵۷ء کی خونچکاں داستانیں بیان کی ہے ۔ ان کتابوں [illegible]ھ کر وہ سب واقعات سامنے آجاتے ہیں ۔ جس نے ہمارے ملک اور قوم کو ایک طویل مدّت تک غلامی کا طوق پہنائے رکھا ۔ اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قصور اس میں غیروں سے زیادہ اپنوں کا تھا ۔ اگر ہمارا ملک منظم ہوتا ، ہماری تحریک جمہوری ہوتی تو صورت حالات مختلف ہوتی ۔ اس دور میں ان کتابوں کا مصنّف معمولی دل و دماغ کا آدمی نہیں ہو سکتا تھا ۔ خواجہ صاحب کی ہمّت و عقل کی داد دینی چاہیے کہ فرنگی کے قاہرانہ دبدبے سے نہیں ڈرے ۔ اور بہت سوجھ بوجھ سے کام لے کر وہ سب کچھ لکھ ڈالا جو یقیناً ان کے بعد کی نسل میں کوئی نہیں لکھ سکتا تھا ۔ اگر وہ اور کچھ نہ لکھتے صرف شہر آشوب کے درد انگیز واقعات تک ہی ان کی تصانیف ہوتیں جب بھی ان کو شہرتِ دوام کا درجہ مل جاتا ۔

خواجہ صاحب کا روزنامچہ بھی بہت کام کی چیز ہے ، اس زمانے کی سیاسی ، ادبی ، سماجی حالت ، طرزِ معاشرت ، ادنیٰ اور اعلیٰ کاروباری اور اربابِ اقتدار ، رؤسا و امرا ، سب لوگوں کے کردار کا مکمل عکس اس روزنامچے میں موجود ہے ۔ اگر کوئی اس دور کی تاریخ لکھنا چاہے تو یہ روزنامچہ اس کے لیے کافی کارآمد ثابت ہوگا ۔ خواجہ صاحب دلّی والے تھے ۔ اور دلّی کے ایسے والہ و شیدا کہ آخری دم تک اس کی ہر ہر ادا کا بیان کرتے رہے ۔

مجھ پر خواجہ صاحب بہت شفقت فرماتے تھے اور ہر یوم غالب میں تازیست شرکت کرتے رہے ۔ ۱۹۵۰ء میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے میرے بہت اصرار پر یوم غالب کا افتتاح فرمایا تھا ۔ اس وقت جب مولانا تشریف لائے تو انھوں نے خواجہ صاحب کو دیکھتے ہی ان کو اپنے پاس بلا لیا بہت مسکرا کر ان سے مصافحہ کیا اور اپنے پاس بٹھا لیا ۔ پھر ان دونوں بزرگوں کی باتیں میں نے سُن کر سمجھا کہ کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی اُردو اس زبان کو ہی کہا جاتا ہے اب نہ مولانا ابوالکلام آزاد ہیں نہ خواجہ حسن نظامی ۔ لیکن ان لوگوں کا اندازِ تحریر ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے ۔

بقیہ : خواجہ حسن نظامی بحیثیت صحافی

حسن نظامی کے سچّے عقیدت مند صاحبزادہ محمد محسن فاروقی نے ۱۹۴۷ء میں بڑی آب و تاب اور اہتمام سے جاری کیا تھا ۔ ماہنامہ آستانہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اسے ہمیشہ ہی حضرت خواجہ حسن نظامی کی سرپرستی حاصل رہی ہے ۔

مندرجہ بالا اخبارات اور جرائد کے علاوہ اور بھی متعدد رسائل حضرت خواجہ حسن نظامی کے حلقے سے شائع ہوتے رہے ہیں ۔ جن میں سے عورتوں کا اخبار گورو سیوک سیاسی دنیا ۔ نسوانی دنیا ۔ پیشوا ۔ علمی دنیا ۔ اور ماہنامہ مولوی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کی دیگر امتیازی خصوصیات کے علاوہ جب ہم محض آپ کی صحافتی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کی گذشتہ سینکڑوں برس کی تاریخ میں کوئی فرد ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے کہ اس قدر کثیر تعداد میں روزانہ ، ہفتہ وار اور ماہانہ جرائد شائع کیے ہوں یا ان کی سرپرستی کے فرائض انجام دیے ہوں ۔

گوپی چند نارنگ

شعبۂ اُردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی



خواجہ حسن نظامی کی نثری ارضیت

خواجہ حسن نظامی کا نام اُردو کے ان ادیبوں میں ہمیشہ احترام کے ساتھ لیا جائے گا جو اُردو کی اُردوئیت کے رمز شناس تھے اور جنھوں نے اپنے زورِ قلم سے اردو کے حسن کو نکھارا اور اس کی کشش کو سب سے تسلیم کرایا۔ ان کی تصانیف کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ وہ صُوفی صافی اور درویش دلریش تھے اور انھوں نے جو کچھ بھی لکھا، معاشرے کی دینی، اخلاقی اور رُوحانی اصلاح کے لیے لکھا۔ وہ تصوف کی ایک ایسی مہتم بالشان روایت کے امین تھے جس کے فیوض و برکات برصغیر کی تہذیبی اور روحانی تاریخ کا ایک حصّہ ہیں۔ اور جس کے نورِ ہدایت سے کروڑوں دلوں کو باطنی سکون کی دولت نصیب ہوئی۔ روحانیت کی یہ روایت صدیوں تک دانشوری کی بھی روایت رہی ہے، اور اردو زبان و ادب پر اس کا گہرا اثر رہا ہے۔ صوفیہ کا رابطہ چونکہ عوام سے تھا، اِس لیے انھوں نے ہمیشہ عوام کی زبان کو ترجیح دی اور اُردو کے سادہ اور سہل اسلوب کو اختیار کیا تاکہ اپنے مطالب کو عوام کے دلوں تک پہنچا سکیں۔ خواجہ حسن نظامی نے بھی سلیس اور عام فہم زبان کو اپنایا۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے "ہمارے مخاطب جاہل لوگ ہیں۔ ہم کو ان کی زبان میں بات کرنی ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کو سمجھانے کے لیے ہزاروں پڑھے لکھے عالم فاضل موجود ہیں، مگر ان غریبوں کا کوئی نہیں۔" مولوی عبدُالحق اس معاملے میں ان سے بھی آگے تھے۔ خواجہ صاحب کا مسئلہ تو ان کے قارئین اور ارادت مندوں کا تھا۔ مولوی صاحب سادگی اور سہولت کا رشتہ اُردو کے لسانی مزاج سے جوڑتے ہوئے لکھتے ہیں "آج کل اپنی جہالت چھپانے یا اپنی علمیت جتانے کے لیے خواہ مخواہ بعض لوگ عربی فارسی ترکیبوں اور مشکل اور دقیق الفاظ کا بوجھ بے چاری اُردو کی گردن پر ڈالتے ہیں کہ وہ اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہ اُردو کی ترقی نہیں تنزلی ہے۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اُردو مقبول ہو، مگر ان کی تحریروں سے وہ مردود ہوتی ہے۔ جو فصاحت سادگی میں ہے، وہ ان پیچیدہ تحریروں میں کہاں۔ یہ گُر کوئی خواجہ صاحب سے سیکھے"

خواجہ صاحب نے سادہ و سلیس زبان کو تو اپنایا، لیکن ان کا اصل کمال یہ ہے کہ انھوں نے نثر میں ایسا طرز اور ایسا پیرایۂ بیان اختیار کیا کہ خشک اخلاقی و رُوحانی و اصلاحی مباحث کو مذہب یا تصوف کے دائرے سے نکال کر ادب میں لے آتے۔ ان کی تحریروں کا غالب محرک شاید یہی جذبہ ہے کہ ان کی آواز دِل سے اٹھے اور دل پر اثر کرے۔ خود انھوں نے اعتراف کیا ہے "یہ تحریریں ان کے لیے ہیں جو دل رکھتے ہیں۔" مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ "خواجہ حسن نظامی کی عبارت میں چونچلا ہے جو سیدھی سادی بات کو پھول کی طرح شگفتہ کر دیتا ہے۔" لیکن یہ خوبی ان کی سب تحریروں میں یکساں نہیں ملتی۔ خواجہ حسن نظامی نے دینی مضامین بھی لکھے، قصّے کہانیاں بھی لکھیں، تاریخی واقعات بھی لکھے، اخبار نویسی اور صحافت بھی کی لیکن ان کی عبارت کے جوہر ان چھوٹے چھوٹے مضامین ہی میں کھلتے ہیں جن میں سیدھی سادی باتوں کو انھوں نے اپنے "چونچلے" یعنی نثر کی تخلیقیت سے "پھول کی طرح شگفتہ" کر دیا ہے۔ یہی وہ تحریریں ہیں جن کے ذریعے انھوں نے صوفیانہ مضامین کو تصوف سے نکال کر ادبی سطح پر پیش کیا۔ یہ مضامین چھوٹی چھوٹی معمولی چیزوں پر ہیں مثلاً دیا سلائی، لالٹین، کوئلہ، مچھر، مٹی کا تیل، مکھی، اوس، رزوٹی، سُوئی، پسینہ، ہچکی۔ ایسی تحریریں میں بات سے بات پیدا کرتے ہوئے جس طرح تمثیل اور تجسیم کے پیرایے میں خواجہ صاحب نے بذلہ سنجی کا حق ادا کیا ہے، دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اُردو میں مضمون یعنی انشائیے کا وجود تو پہلے سے تھا اور تمثیلی مضامین یا کہانیاں بھی لکھی جا چکی تھیں لیکن اس نوعیت کے عارفانہ انشائیے جن میں تصوف و ادبیت کا امتزاج ہو، اس سے پہلے نہ تھے۔ اس رنگ کی ابتدا کرنے والے خواجہ صاحب ہی تھے، اور یہ انھیں کے ساتھ ختم بھی ہو گیا، اگرچہ بہتوں نے تقلید کی کوشش کی لیکن یہ کسی سے نبھ نہ سکا۔ خواجہ صاحب کی کاروباری دینی اور صحافتی تحریروں کے مقابلے میں معمولی چیزوں پر لکھے گئے یہ چھوٹے چھوٹے مضامین ہی ان کا اصل ادبی کارنامہ ہیں، اور یہی اُردو ادب میں ان کی شہرت اور بقا کے ضامن بھی ہیں۔ پال والیری نے زبان کے ادبی استعمال کے بارے میں بڑی پتے کی بات کہی ہے کہ زبان کا مقصد چونکہ ترسیل ہے اس لیے عام زبان معانی کی ترسیل کے ساتھ ساتھ تحلیل ہو جاتی ہے، یعنی الگ سے اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ اور اگر وجود باقی رہے یعنی زبان اپنی حیثیت سے قائم بالذات رہے تو یہی اس کی ادبیت کی پہچان ہے۔ خواجہ صاحب کے مضامین اس اعتبار سے ادبی امتیاز کے حامل ہیں کہ ان میں مطالب کی ترسیل کے ساتھ ساتھ زبان کی اپنی حیثیت بھی برقرار رہتی ہے

ان مضامین کو انشائیہ ان کی زبان کی اس خوبی نے بنایا ہے جس کی شیرازہ بندی فکری ندرت، بات میں بات پیدا کرنے کے ملکہ، اور سامنے کی چیزوں میں رُوحانی جہت دیکھنے کی صلاحیت سے ہوتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے اسلوب کی سلاست و لطافت اور روزمرے و محاورے کی سب نے داد دی ہے، لیکن ان کی نثر کا نسب نامہ جس طرح محمد حسین آزاد یا غالب سے ملایا جاتا ہے، اسلوبیاتی اعتبار سے وہ مناسب نہیں ہے۔ اگرچہ خواجہ صاحب نے محمد حسین آزاد کو اپنا معنوی استاد تسلیم کیا ہے، لیکن ایسا صرف تجسیم و تمثیل کے انداز کی حد تک ہے جو بہر حال خواجہ صاحب کے یہاں بڑے پیمانے پر نہیں ملتا۔ خواجہ صاحب کی نثر کا مزاج محمد حسین آزاد کی نثر سے جو انتہائی فرین اور جمیل نثر ہے، بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اس طرح جن لوگوں نے خواجہ حسن نظامی اور غالب کی نثر کا ذکر ایک سانس میں کیا ہے، اور کہا ہے کہ بس فرق صرف اتنا ہے کہ غالب کی طنز و ظرافت کی جگہ خواجہ صاحب کے یہاں سوز و گداز نے لے لی ہے، تو یہ بھی کچھ صحیح نہیں، کیونکہ اسلوب شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے اور دونوں کی شخصیتوں میں قطبین کا فرق ہے۔ کہاں غالب کی انانیت اور کہاں خواجہ صاحب کی سپردگی! کہاں امارت کی خو بو اور کہاں عوام سے خطاب کی ضرورت۔ مکالمے کے استعمال سے البتہ دھوکا ہو سکتا ہے۔ غالب کے یہاں مکالمے کا استعمال ذاتی وجاہت کے اظہار اور ایک نئے ادبی طرز کی طرح ڈالنے کے لیے ہے، جبکہ خواجہ صاحب کے یہاں یہ عوام کے دل تک پہنچنے کے لیے ہے۔ چنانچہ اس سوال کو بعد میں لیا جائے گا کہ اگر خواجہ حسن نظامی کے اسلوب کا رشتہ کسی سے ملانا ہی ہے تو اس انداز کی نثر کا جد امجد کون ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی نثر کی ایک نمایاں خوبی اس کی وارفتگی اور سپردگی ہے۔ انکے بیشتر مضامین میں ایک مقام پر پہنچ کر مناجات کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سطح پر انکی نثر کے جوہر کھلتے ہیں۔ ملّا واحدی نے تصدیق کی ہے کہ خواجہ صاحب کو مضامین تین حالتوں میں سوجھتے تھے۔ گانے یعنی سماع میں، تھیٹر یعنی ڈرامے میں یا کسی آشفتہ حال عاشق کو دیکھنے سے۔ اس سے غالباً ان کے حساس دل پر چوٹ سی لگتی تھی اور یہی چوٹ نثر کی تخلیقیت میں اپنی تطہیر کی راہ تلاش کر لیتی تھی۔ ذیل کے اجزا میں احساس کی محویت ملاحظہ ہو:

"|| میری بیٹی حور بانو نے پاؤ پارہ قرآن شریف کا صبح سے شام تک یاد کر لیا || پکانے والی نے آٹا گوندھا تھا || اب روٹی پکا رہی ہے || مگر میں اس کو کعبہ کی کالی چادر میں | مدینہ کے سبز غلاف میں | اجمیر کے صندل میں | دہلی کے نظام الدین میں | نماز کے سجدے میں | بیوہ کی آہِ سرد میں | یتیم کی چشم تر میں | مظلوم کی مایوسی میں | ظالم کی خود فراموشی میں | ڈھونڈ چکا || ہر دروازہ کی کنڈی بجا چکا || آنسو بھی بہائے | ہاتھ بھی پھیلائے | لیکن اسکا دامن نصیب نہ ہوا || میں نیا گرفتار نہیں ہوں || میری اسیری پُرانی ہے || مگر اب بھی مجھ کو فریاد کرنی نہیں آتی || اس کی ناز برداریاں نہیں جانتا || کوئی ہے جو مجھے بتائے کہ میں اسے کیوں کر پاؤں ||"

(کعبے والے خدا کو کیوں کر پاؤں)

" || موسیٰ کے زمانہ کا چرواہا ہوتا | تو تجھ کو اپنے گھر بلاتا | پاؤں دباتا | سر دھلاتا | ٹھنڈا دودھ پلاتا | تو سوتا | تو پنکھا جھلتا | تو سنتا | تو گانا گاتا | روتا رلاتا | جاتا تو روکتا | پیروں پڑتا | ہاتھ جوڑتا ||

داتا تو کہاں ہے || میرے من کی بپتا کے دکھین ہار | مولا | مولا | سن | الجھوں | میں ہوں | گردشوں میں ہوں || بے قراری دیکھ | آہ و زاری دیکھ | اشکباری دیکھ ||

|| آنسو دے | ان میں نہاؤں | سوزش دے | تڑپوں | لوٹوں | تجھ کو پاؤں | بلال کا دل دے | در آستاں پر سر ٹکراؤں || عزت تجھ سے ہے | ذلت تجھ سے ہے | میرے پربھو بھگوان || اپنے بھگت کے بس میں آ جا | دے جا | دلا جا ||

|| یہ رات کیونکر کٹے || تو یاد آتا ہے | کلیجہ مُنہ کو آتا ہے || اپنے داس کو درشن دے | رُوپ دکھا | جلوہ افروز ہو | آنکھ بے ہوش | اور من سنتوش ہو || کس کا بلقان | کیسا ایران | تیری رحمت کا چشمہ | اور اس میں اشنان | اس میں ہیں دونوں جہان || دین اندھیری | بدلی کالی | رستہ بھاری || دشمن سر پر | غفلت دل میں || ہاتھ پکڑ | بھگوان | میں قربان | تجھ کو دیکھوں | اور نہ دیکھوں کوئی | سب ہوں گم | تو کہے ہم تم ||

شوکت والے | طاقت والے | توپوں اور سنگینوں والے | زخموں اور مرہم والے | دُکھ کے کرتا سکھ سروپ | تیرے بھوکے | تیرے پیاسے || یہ ہے اچھا | تو ہو پاس | پھُول بھی تو | خار بھی تیرا | نور بھی تو | نار بھی تیری | آنکھیں میری | سب کچھ تیرا | اور زمین کے اندر ڈیرا تیرا | بس میں آ بھگوان ||

// سر ہے حاضر کھینچے کٹاری / عشق کی اگنی چتا ہماری // مست پکاریں / بُت بن جائیں / جزو کو تیاگیں / کُل ہو جائیں / یثرب پہنچیں / مکہ دیکھیں / بیچ سمندر جھنڈا گاڑیں / مہدی باپو گونجیں گرجیں / ان کے آگے چل کر کڑکیں || تیر چلیں سب سینوں پر / دشمن چھدے سنگینوں پر ||"

(بھگت کے بس میں آ بھگوان)

یہ نثر تخیل کی سرشاری کا پتہ دیتی ہے، اس لیے وارفتگی کے ساتھ اس کی اہم خوبی اس کا صوتی آہنگ اور متوازی کلموں کا غیر ارادی و غیر شعوری استعمال ہے۔ سیموئل لون (SAMUEL LEVIN) نے زبان کے ادبی حسن کی ایک پہچان COUPLINGS کے استعمال کو قرار دیا ہے، یعنی ایسے کلموں یا صرفی و نحوی اجزا کی ہم آہنگی یا تکرار جن میں صوتی، صرفی یا نحوی مطابقت ہو۔ خواجہ صاحب کی نثر میں قدم قدم پر اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ علم بدیع میں سجع و ترصیع کا تصور پایا جاتا ہے، لیکن دونوں کی بنیاد حروف یا وزن کی محدود اور جامد مطابقت پر ہے، جبکہ COUPLINGS کا تصور اس سے کہیں زیادہ متحرک، وسیع اور جامع ہے اور یہ ہر طرح کی صرفی و نحوی اور صوتی مطابقت اور متوازیت پر حاوی ہے۔ مثلاً کلمۂ اسمیہ کی جگہ اسمیہ خواہ وہ ایک لفظ کا ہو دو کا یا زیادہ کا یا فعلیہ کی جگہ فعلیہ۔ نیز مطابقت صرف حروف کی نہیں، صوتی نظام کی یا پورے اجزائے کلام کی بھی ہو سکتی ہے۔ خواجہ صاحب کے یہاں جگہ جگہ پر یہ چیز فطری طور پر پیدا ہو گئی ہے۔ اوپر جو اقتباس پیش کیا گیا، اسے اس نظر سے ایک بار پھر ملاحظہ کر لیا جائے۔ دو آڑی لکیروں کے درمیان جتنے کلمے ہیں ان میں باہمدگر متوازیت ہے۔ یہ متوازیت کئی قسم کی ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ صرف ایک نظر دیکھ لینے ہی سے اس کا احساس ہو گا کہ اس نثر کی موسیقیت اور ادبیت میں اس غیر ارادی متوازیت اور مطابقت کا گہرا ہاتھ ہے۔

ان تمام جملوں میں خطاب کی کیفیت ہے۔ خواجہ صاحب کی تحریروں میں خطاب کہیں خدا سے ہے کہیں بے جان اشیا سے اور کہیں ہزاروں لاکھوں ارادت مند انسانوں سے۔ اس نثر میں مکالمے سے کام لینے کا جواز بھی یہی ہے۔ اسلوبیاتی اعتبار سے لے مکالماتی

نثر کا نام دینا نامناسب نہ ہوگا۔

خواجہ حسن نظامی کے مکالماتی اسلوب نے کہیں کہیں بیگماتی زبان سے بھی فیضان حاصل کیا ہے۔ غدر کے افسانے، بیگمات کے آنسو اور مضامین میں موقع و محل کی رعایت سے دہلی کی عورتوں کی زبان اور روزمرے کی چمک دیکھی جا سکتی ہے،

"یہ غریب نہیں، بڑی قطامہ ہے۔ میں نے آواز دی کہ ذرا بچے کو سلا دے تو کانوں میں بول مار کر چپ ہو گئی اور سُنی ان سُنی کر دی۔"

(بیگمات کے آنسو)

"تہور خان کی بیوی آخر کا فقرہ سن کر جل کر کباب ہو گئیں اور دانت پیس کر بولیں اللہ اللہ اس بلّی کی سی آنکھوں والی کو یہ دن لگے۔ اگر اس کی چوٹی پکڑ کر بھری محفل میں جوتیاں نہ لگوائیں تو میرا نام پلٹ کر رکھ دینا۔"

(اولاد کی شادی)

"کیا اس کی میّا مرتی ہے یا کانوں سے بہری ہے جو بچے کے بلکنے کی اسے خبر نہیں ہوتی یا قصائی ہے کہ ننھی سی جان کو بھوکا رکھا ہے۔"

(بیوی کی تعلیم)

اِس نثر کی ایک اور خوبی اس کا پراکرتی احساس ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے کئی مضامین کے عُنوانات یوں ہیں "ہردواری گنگا کے کنارے" "چنتامن مورتی" "رس کے بھرے تورے نین" "ہم ہیں بالک ایک پتا کے" "بھگت کے بس میں آ بھگوان" "پردیسی پیتم دیکھی تہاری پیت" "گیان کتھا" "شملہ کی دیبی ماتا" "من کہ ایک دھوبی، کاغذی گھاٹ پر" "رام اُپدیشں" "ایکو برہم دوتیو ناستی" لیکن ان عنوانات سے یہ قیاس نہیں ہونا چاہیے کہ خواجہ حسن نظامی کی پراکرتیت صرف انھیں مضامین تک محدود ہے۔ یہ چونکہ ان کے تخلیقی مزاج کا حصّہ ہے، اس کی جھلک ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہے، اور اس کا معنوی اور اسلوبیاتی رشتہ لوک ساہتیہ کی اِس عظیم روایت سے مل جاتا ہے جو صوفیہ حضرات کی عوامی وابستگی کے طور پر ہر دور میں کم و بیش موجود رہی ہے۔ ہندوستانی ادبیات اور یہاں کے لوک ساہتیہ میں صوفیہ کا جو بیش بہا حصّہ ہے، وہ دھرتی کے اسی احساس کی ترجمانی کرتا ہے۔ اِسی روایت کا ایک سرا عہدِ وسطیٰ کے ہندوستانی سنگیت سے اور دوسرا ادبیات سے جڑا ہوا ہے۔ کہیں یہ احساس راگ راگنیوں میں ڈھل کر اُبھرتا ہے، اور کہیں یہ ہولیوں، ٹھمریوں، دادرے و سہیلیا اور بسنت کے بول بن کر کانوں میں رس گھولتا ہے۔ قدیم صوفیہ حضرات سے ہندوی کے جو کلمات، اجزا یا ریختہ غزلیں منسوب ہیں۔ وہ بھی اِسی کیفیت کی تصدیق کرتی ہیں کہ صُوفیہ کا رشتہ ہندوستانی زبان کی لوک روایت یعنی عوامی روایت سے کبھی منقطع نہیں ہوا۔ حضرت بابا فرید گنج شکر ہوں یا حمید الدین ناگوری، شرف الدین بو علی قلندر ہوں، نظام الدین اولیا ہوں یا برہان الدین غریب، بندہ نواز گیسو دراز یا بہاء الدین باجن ہوں، ہندوستانی زبان کے لوک ساہتیہ کے اوّلین نقوش انہیں حضرات کے یہاں ملتے ہیں۔ امیر خسرو اسی روایت کی نہایت واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔ امیر خسرو کو اگر اس کا نقطۂ آغاز تسلیم کیا جائے تو خواجہ حسن نظامی اس کا نقطۂ ارتقا ہیں۔ آج سے چھ سات سو سال پہلے کی بات اور تھی۔ اس وقت زبان ناپختہ اور ان گھڑ تھی، اور صوفیہ حضرات عوام سے خطاب کرنے کے لیے ملی جلی زبان کو اختیار کرنے پر مجبور تھے لیکن بیسویں صدی میں جب زبان کے معیار اور اسالیب ترقی کی کئی منزلیں طے کر چکے ہیں، یہ غور طلب ہے کہ خواجہ صاحب کو معیار

زبان میں بولی ٹھولی کی آمیزش کی کیا ضرورت تھی۔ بات دراصل اردو کے عوامی مزاج کی اس کے نسلی تقاضوں کی اور اپنی دھرتی پر پیر رکھنے کی یعنی لاکھوں کروڑوں لوگوں سے ان کے شعوری اور غیر شعوری احساسات کی سطح پر ان سے ہم کلام ہونے کی ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی نثر سے ظاہر ہے کہ ان کے عوامی تقاضوں کی ارضیت کے اس راز کا عرفان تھا۔ ان کی تحریر میں اکثر جگہ ان کا پراکرتی احساس بے تابانہ ابھر کر سامنے آتا ہے اور پھر پورے کے پورے اجزا اسی کیفیت میں ہو جاتے ہیں۔ ہم نے شروع میں کہا تھا کہ خواجہ حسن نظامی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے رُوحانی اور اخلاقی مسائل کو مذہب یا تصوّف کے دائرے سے نکال کر ادب میں داخل کیا۔ اِس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ادبیت کو پراکرتی احساس سے جِلا دی، اور اس کا رشتہ لوک ساہتیہ کی صدیوں پُرانی اس تاریخی روایت سے جوڑ دیا جس کی کارفرمائی قدیم صوفیہ کے یہاں ملتی ہے، اور جس نے تصوف اور بھگتی تحریک دونوں سے فیضان حاصل کیا تھا۔ خواجہ حسن نظامی کو ان کی ارضیت اور پراکرتی احساس کی بنا پر اگر اردو نثر کا نظیر اکبر آبادی کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ دونوں رسمیات سے بالاتر تھے دونوں کی زندگی بے لوث اور بے ریا تھی، دُنوں عوام کے لیے لکھتے تھے، دونوں کی ترغیبِ ذہنی کا تعلق عوام کے تقاضوں سے تھا اور دونوں کی طاقت اور تخلیقیت کا راز ان کی عوامی وابستگی میں پوشیدہ ہے۔ دونوں نے ایسی اصناف کو اپنایا جن کا اس وقت زیادہ رواج نہیں تھا یعنی نظیر نے نظم کے مختلف سانچوں کو اور خواجہ حسن نظامی نے مضمون نگاری کو، اور دونوں نے اپنی تخلیقی اور لسانی غذا معمولی آدمی سے اور دھرتی کے سینے سے حاصل کی۔

لوک روایت سے صوفیہ کی وابستگی میں اور خواجہ حسن نظامی کی وابستگی میں ایک ہلکا سا فرق ہے۔ وہ یہ کہ جن صوفیہ کے یہاں کرشن جی اور دوسرے ہندوستانی اساطیر و علائم کا ذکر ملتا ہے۔ وہاں اکثر و بیشتر ہندوستانی احساس اور اسلامی احساس کی دو الگ الگ سطحیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس خواجہ حسن نظامی کے یہاں یہ دونوں سطحیں گھل مل کر ایک ہو گئی ہیں، اور ان کی تخلیقیت ایک طرح کے رموز و علائم سے دوسری طرح کے مفاہیم کو شدتِ تاثیر اور دل کو چھو لینے والی کیفیت کے ساتھ ادا کرنے پر قادر ہو جاتی ہے۔ اساطیری اور تاریخی رموز و علائم کا تہذیبی اختلاط، نیز معنوی توسع پسندی اور ہم آہنگی اتنے بڑے پیمانے پر اردو نثر میں کہیں اور دکھائی نہیں دیتی۔ اس طرح خواجہ حسن نظامی نے ان رموز و علائم کو جن کا تعلق دھرتی کے رشتوں اور نسلی تقاضوں سے ہے، ایک نئی معنوی جہت عطا کی ہے جو بجائے خود ایک تخلیقی شان رکھتی ہے۔ بعض مضامین پورے کے پورے اس رنگ میں ہیں بعض کو وہ ایک رنگ میں شروع کرتے ہیں، پھر دوسری کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور بالآخر دونوں کیفیتیں گھُل مل کر ایک مخلوط کیفیت کو راہ دیتی ہیں۔ مثلاً "مست الست کی دُعا" یوں شروع ہوتی ہے:

> "بجلی میں چمکنے والے، چاند میں جھلکنے والے، رات کے اندھیرے، سُورج کی روشنی، آسمان کی بلندی، دریا کی روانی، جنگل کی سنسانی، دلگیری و دِل داری کے مالک عرش کی اقامت میں جُدا، دِل کے گھر لنے میں خدا، ہم تیرے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ اگر تو عرش پر ہے تو ہم کو سربلند کر، فرش میں ہے تو وسعت و ثابت قدمی عطا فرما۔ اگر تو ہر جگہ ہے تو ہم کو بھی ہر جگہ پہنچا۔"
>
> عین اس کے بعد یہ دوسری کیفیت ابھرتی ہے۔

" ہے پربھو پرشوتم، پرم آتما، اگر تو درگن ہے تو ہم کو سوگن بنا دے۔ نراکار ہے تو ہماری شکلیں بھی مٹا دے۔ سگن بن جا، ساکار ہو جا اور اپنی پریم شکتی کو دُنیا میں پرگٹ کر۔ ہم کس سے فریاد کریں۔ تیرے سوا کس کو دیکھیں۔ اے مکہ کے سیاہ پوش مکان پر نظرِ خاص رکھنے والے۔ ... اے ہردوار کے دوارے رہنے والے ہم یقین دلاتے ہیں کہ تو ہی ہے اور کوئی نہیں۔ تو نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ اور جو کچھ ہے، کچھ بھی نہیں تو ہی تو ہے اور بس۔"

اسی طرح ایک مضمون جو "منظرِ فراق" یعنی وفات الرسول کے بارے میں ہے، یُوں شروع ہوتا ہے۔

"پتی کے ستی بی بی عائشہ کی افسردگی دیکھی نہیں جاتی۔ ست پتا کی جائی ست پتی کی من موہنی، برج کائنات کے سب سے بڑے شام سُندر کی منظورِ نظر، صدیق کی گود میں پلنے والی، کیسی اُداس، نڈھال سرِ رسول کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ آج اس کی راجدھانی اس کے ہاتھوں سے چھن رہی ہے۔ آج اس کا دھنی دنیا سے مُنہ موڑ رہا ہے۔"

"اچھی بابل کیا لاڈلی بیٹی کو بھول گئے"، ایک خط کے پیرایے میں لکھا گیا ہے جس میں اُمت کی سسرال کی طرف سے مدنی میکے سے خطاب کیا گیا ہے۔ سارا مضمون زمینی احساس کی منتقلی اور توسیع پر مبنی ہے۔ چند جُملے ملاحظہ ہوں۔

ہائے بابل وہ دن یاد آتا ہے جب میں آپ کی انگنائی میں کھیلتی پھرتی تھی اور آپ مجھ کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتے تھے۔ میں بگاڑتی تھی۔ آپ سنوارتے تھے۔ میں رُوتی تھی آپ آنسو پونچھتے تھے۔ میں ضد کرتی تھی آپ ناز برداری کرتے تھے۔ میری فکر میں آپ نے رات کو سونا چھوڑ دیا تھا۔ سات سات دن فاقے جس کے لیے ہوتے تھے، وہ یہی پھوٹی قسمت کی کنیز ہے۔

اچھی بابل میرا بیاہ رچا دو، اچھی بابل مجھے مہندی منگا دو، اچھی بابل میرا منڈھا چھوا دو، سب پربتوں کے بانس کٹواؤ، سب باغوں کے پھُول پتے منگواؤ، مجھے سُہاگ کی چوڑیاں پہناؤ، اپنی لاڈلی کو بھُول نہ جاؤ۔ وہ تم ہی پر آسرا رکھتی ہے۔"

"مدنی شام سُندر کی مرلی" میں بھی خواجہ حسن نظامی کی اس اسلوبیاتی اختلاط کو عروج پر دیکھا جا سکتا ہے۔

/ زلفوں والے یتیم پیارے / یثرب باسی / موہن کنہیا کی بانسری کے ہاری / حجازی پربت میں کھڑے ہو کر ایسی بجائی / کہ جنم جنم کے دکھ کلیش دُور ہو گئے / رُوح، آتما، جیو، شریر سب کو سرشار و پرکیف بنا دیا //

/ مگر اب زمانہ گذر گیا / راتیں بیت گئیں / شیام سندر کی مُرلی کی آواز سنائی نہیں دیتی / جنگل کے ہرن / باغوں کے مور / آم کی ٹہنی / سب اس پیاری اور سُریلی صدا کی راہ دیکھ رہے ہیں / جس کی کوک کلیجہ میں ہوک پیدا کرتی ہے // برسات کا موسم قریب آیا / کالی گھٹائیں امنڈ امنڈ کر آئیں گی اور کرشن کنہیا کی بانسری کو ڈھونڈھیں گی / کوئی چاتر سمجھدار سکھی سہیلی ایسی نہیں جو شام سندر کو سندیسہ لے جائے /"

یہ مضمون یوں ختم ہوتا ہے۔

/ آہا / وہ دیکھو / شیام سُندر مرلی لیے بن سے نکلے / وہ ہمارے سیتاپتی تیر کمان سنبھالے نمودار ہوئے / اب کوئی دم میں مرلیا باجے گی / اور نین کی بدلی برسے گی / ندی نالے سُوکھے تھے / گنگا جمنا پیاسی تھیں / گھٹ کے تیرتھ سونے تھے / بھگتی کا تھا کال پڑا / ست کے گلے جنجال پڑا //

/ اب ہرگ کی ترشنا دور ہوئی / اور چنتامن کافور ہوئی / اب ہر کی آمد آمد ہے / اب ہر کی آمد آمد ہے / سنسار کا داتا آتا ہے / اور ہر کا جھنڈا لاتا ہے / بانس کی مرلی صور ہے یہ / اور پتنگ کا مسطور ہے یہ /

اِس اقتباس میں اور اس سے پہلے جو اجزا پیش کیے گئے ان میں اس صرفی و نحوی وصوتی مطابقت و متوازیت کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی نثر کے اس مطالعے کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک منفرد اسلوب اور طرزِ خاص کے مالک تھے جس میں دہلوی زبان کا چٹخارہ اور روزمرّے اور محاورے کا لُطف، سادگی اور سلاست، بانکپن و شگفتگی اور بے تکلفی و بے ساختگی کی جملہ خوبیاں تو تھیں ہی، لیکن ان کا کارنامہ یہ ہے کہ جہاں انھوں نے خشک مذہبی اور اصلاحی مباحث کو تصوف کے دائرے سے نکال کر ادب میں داخل کیا، وہاں اس کا رشتہ ہندوستانی لوک ساہتیہ کی پراکرتی روایت سے بھی جوڑ دیا۔ اس رنگ کی تقلید کی کوشش بیسیوں نے کی لیکن کوئی اسے پا نہ سکا۔ خواجہ حسن نظامی کی نثر کا نسب نامہ محمد حسین آزاد یا غالب سے ملانا مناسب نہیں، البتہ اگر اس کا رشتہ ملانا ہی ہے تو اس کا سُراغ اس سے بھی پہلے کے زمانے میں لگانا چاہیے۔ چنانچہ زمینی احساس کی اس نثر کا اگر کوئی جدِ امجد ہو سکتا ہے تو وہ میرامن دہلوی ہیں۔ دونوں کے یہاں دھرتی کی بُو باس ہے۔ دونوں کے یہاں دہلوی زبان بغیر کسی تصنع کے سامنے آتی ہے۔ دونوں کے یہاں سارا زور لطف و تاثیر پر ہے۔ دونوں کی عبارت میں بولی ٹھولی، کہاوتوں اور دوہوں کے اجزا تحلیل ہو گئے ہیں، اور اس طرح میرامن کے زمینی احساس کا سیدھا رشتہ خواجہ حسن نظامی کی ارضیت سے مل جاتا ہے۔ دہلوی اُردو کو سنوارنے، نکھارنے اور اس کے سجل رُوپ کو پیش کرنے والوں کا جب جب نام لیا جائے گا، خواجہ حسن نظامی کا ذکر احترام سے کیا جائے گا۔

"انھوں نے کسی کا رنگ اڑایا اور نہ کسی کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا۔ ان کے معاصر ایک سے ایک بڑے ادیب اور انشا پرداز۔ ان کے پیش رو جادو نگار و سحر طراز۔ لیکن خواجہ اپنی انفرادیت میں سب سے ممتاز۔ ان کا رنگ اگلوں اور پچھلوں سب سے نرالا۔ یہ نہ کسی کے شاگرد اور نہ کسی کے مقلّد۔ ادب و انشا کو ایک قسم کی فقہ قرار دیا جائے تو یہ پکے غیر مقلّد۔" (عبدالماجد دریا آبادی)

خواجہ حسن نظامی کی افسانہ نگاری

رفیعہ سلطانہ
شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی
حیدرآباد

ہندوستان میں جب بھی اردو نثر کے نشاۃ ثانیہ کی تاریخ لکھی جائے گی، تو شاید خواجہ حسن نظامی کا نام سرفہرست رہے گا۔ اس لیے کہ ان کے کارنامے معیار و مقدار ہر دو اعتبار سے اردو نثر کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ خواجہ صاحب کی شخصیت کے گرد عظمت و تقدس کا ایسا ہالہ کھنچا ہوا ہے اور ان کے شخصیت پر اتنے نقاب پڑے ہوئے ہیں کہ ان کے "فن" پر لوگوں کی نظر کم جاتی ہے۔ وہ دبستان دہلی کے آخری علمبردار تھے مشہور ہے کہ بابائے اُردو عبدالحق سے کسی نے سوال کیا تھا کہ میں اچھی اُردو سیکھنا چاہتا ہوں کیا پڑھوں؟ انھوں نے جواب دیا "اگر تم صاف ستھری اور نکھری ہوئی اُردو اور دلّی کی اصل زبان پڑھنا اور سیکھنا چاہتے ہو تو خواجہ حسن نظامی کی تحریر پڑھو کہ زبان کے مزے کے ساتھ دلی کیفیات اور جذبات کا بھی لطف آئے"۔

خواجہ صاحب کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا۔ وہ انشائیہ نگار تھے، بے مثل صحافی تھے۔ انھوں نے تاریخی مضامین لکھے اُردو میں روزنامچہ نویسی کا آغاز کیا، خاکہ نگاری کی بنیاد ڈالی، تاریخی سفرنامے و مذہبی رنگ لیے ہوئے افسانے لکھے لیکن ان کے اسلوب کی چاشنی نے فن کی ان دیواروں کو ڈھادیا اور وہ صرف صاحب طرز انشا پرداز کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ اسی وجہ سے اُردو افسانہ کے کسی نقاد نے اُردو افسانہ نگاری میں ان کا مقام اور منصب متعین کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ خواجہ صاحب کے افسانوں کے مجموعے بالخصوص بیگمات کے آنسو، غدر دہلی کے افسانے یا دلّی کی جان کنی، جگ بیتی کہانیاں، طمانچہ بہ رخسار یزید، یزید نامہ، میلاد نامہ اردو افسانہ میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ یوں تو اردو میں افسانہ کی ابتدا کا سہرا پریم چند کے سر باندھا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پریم چند کے دیگر ساتھیوں سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، سدرشن، اعظم کریوی، نیاز فتحپوری کے ساتھ خواجہ حسن نظامی نے بھی اردو افسانہ کے ارتقا میں خاصا اہم حصہ لیا ہے۔ اُردو افسانہ کے نقادوں ــــــ مجنوں، وقار عظیم، جمیل احمد، پروفیسر آل احمد سرور وغیرہ نے پتہ نہیں کن وجوہ کی بنا پر اردو افسانہ کے ارتقا کے ضمن میں خواجہ حسن نظامی کے افسانوں کا تذکرہ نہیں کیا اور اسے تاریخی اور نیم تاریخی قصوں سے تعبیر کیا۔

ایک کامیاب مقرر کی طرح افسانہ نگار پہلے ہی فقرے سے ناظر کی توجہ اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور جوں جوں افسانہ بڑھتا جاتا ہے ناظر کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ کلائمکس پر پہونچ کر افسانہ اس طرح ختم ہوجاتا ہے کہ وہ تاثر جو اپنے ناظر پر ڈالنا چاہتا ہے یا وہ افسوں جو اپنے ناظر پر پڑھتا ہے



وہ تمام تر شدت کے ساتھ قاری کے دل و دماغ پر مسلط ہوجاتا ہے۔

خواجہ صاحب اس رمز سے آشنا تھے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے مجموعوں بالخصوص بیگمات کے آنسو، دہلی کی جان کنی اور جگ بیتی کہانیوں میں اسی گر کو آزمایا ہے۔ خواجہ صاحب کے افسانوں کے موضوعات دو ہیں۔ ایک کا تعلق سلطنت مغلیہ کے زوال یعنی غدر دہلی کے واقعات سے ہے اور دوسرے کا اسلامی تاریخ سے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اول الذکر یعنی غدر دہلی خواجہ صاحب کا دل پسند موضوع ہے وہ خود اس دریائے خون کے شناور تو نہیں تھے لیکن انھیں اپنے بچپن میں ان شخصیتوں کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا تھا بیگمات کے آنسو ان ہی کرداروں کے خونچکاں مرقع ہیں۔ یہ درد انگیز و پُرسوز مرقع شنیدہ نہیں دیدہ ہیں۔ جیسا کہ میں بیان کر چکی ہوں انھوں نے ان واقعات کو کتابوں سے اخذ نہیں کیا اور نہ محض تصوّری گھوڑے دوڑا دیئے بلکہ قرب کی لذّت سے آشنا ہیں۔ مرزا بلاقی، بہادر شاہ ظفر کی بیٹی کلثوم، زمانی بیگم ظفر سلطان شہزادہ گل اندام، مرزا تیغ جمال، قسمت بیگ، تخیّل کی پیداوار ہیں۔ گوشت پوست کی وہ خواتین اور ان کے کردار تاریخ کے سنگین حقائق ہیں۔ اپنے افسانوں میں مغل شہزادوں اور شہزادیوں کی جس طرح تصویر کشی کی گئی ہے ان سے نہ تو تاریخ کا سینہ داغدار ہے نہ کسی شخصیت کا دامن تار تار۔ خواجہ حسن نظامی نے افسانہ کو انسان دوستی اور وطن پرستی کے حربہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ساتھ ہی فن کے پورے آداب و لوازم ملحوظ رکھے ہیں، ملاحظہ کیجیے ان کا افسانہ "جب ساقی کے ہاتھ میں جام تھا" یہ افسانہ بمشکل ڈیڑھ صفحے پر محیط ہے جس کے چند سطروں کے چار قطعے ہیں لیکن فنّی اعتبار سے اس کی نوک پلک درست ہے۔ ابتدا، ارتقا، انتہا میں ایک ربط اور ہم آہنگی ہے افسانہ کا جو تاثر خود قبول کرتا ہے وہی تاثر دوسروں تک بھی پہنچا دیتا ہے۔ پہلا ٹکڑا چھ سطری ہے جس میں شہزادہ گل اندام کے پیرائے میں مغلیہ خاندان کی عیش کوشی اور

لہو ولعب کو بیان کیا ہے۔ افسانہ یوں شروع ہوتا ہے۔

"جب ساقی کے ہاتھ میں جام تھا اور شمع بھی روشن تھی اور گل اندام بھی زندہ تھے ایک مے خوار نے جھوم کر کہا تھا "یارو! یہ آخری رات ہے غنیمت جانو، یہ چند ہم خیال اور ہم صورت جمع ہیں، کل یہاں کچھ بھی نہ ہوگا اس وقت شہزادہ گل اندام نے انگڑائی لے کر جواب دیا، کل کی فکر میں آج کی بزم کو کیوں مکدر کرتے ہو مانا کہ بہادر شاہ قلعہ چھوڑ کر چلے گئے اور صبح انگریز پہاڑی کے مورچے سے شہر کے اندر آجائیں گے مگر جو وقت میسر ہے اس کو غنیمت جانو اور دو گھڑی غم ایام سے دل کو دور رکھو۔ لاؤ میاں ساقی ایک جام اور دے دو! پی لیں اور اس آخری شمع کو ایک دفعہ جی بھر کر اور دیکھ لیں۔

دوسرے ٹکڑے میں اسی عیش کوشی کا ایک اور جلوہ ہے۔ تیسرے میں چند سطروں میں گل اندام کی اور کو روانگی کا حال ہے۔ آخری ٹکڑا جو چند سطروں پر محیط ہے۔ گل اندام کی پھانسی پانے کی تفصیل ہے۔ لیکن کتنے موثر انداز میں لکھتے ہیں:

"چاندنی چوک سنہری مسجد کے سامنے کرسیاں بچھی ہوئی تھیں انگریز عورت مرد بیٹھے ہوئے تھے سامنے پھانسیاں گڑی ہوئی تھیں۔ قیدی مشکیں بندھے کھڑے تھے۔ ایک ایک کو لاتے تھے اور پھانسی پر لٹکاتے تھے۔ گل اندام کو بھی لائے ان کا وہی ٹھاٹھ ہے۔

" ململ کا کرتا، ٹاٹ بانی کی جوتی، گوری رنگت، چوڑا سینہ، سرمئی بڑی بڑی آنکھیں، پتلی کمر، سرو قد، چہرے پر تبسم کا انداز، حاکم نے کہا، شہزادہ گل اندام تم پر بغاوت میں حصہ لینے کا الزام ہے اس لیے تم کو پھانسی دی جاتی ہے۔ گل اندام نے گردن اٹھا کر حاکم کو دیکھا اور کہا:

" مجھے حکومت کی بغاوت واطاعت سے کوئی سروکار نہ تھا البتہ خدا کا گناہ ضرور کرتا تھا، پیتا تھا پلاتا تھا۔ اور ہر وقت غم ایام سے دور رہتا تھا۔ تم کہتے ہو میں نے بغاوت میں حصہ لیا۔ ہاں سچ ہے میں نے خدا سے بغاوت کی تھی اور میں ہر سزا کا مستحق ہوں۔"

ان کے اشہب قلم کی دوسری جولان گاہ تاریخ اسلام ہے۔ یزید نامہ، طمانچہ بر رخسار یزید وغیرہ واقعات خواجہ صاحب نے مستند عربی تواریخ سے اخذ کیے ہیں یہ انگریزی کے ACTIVITY PLAYS یعنی مذہبی تمثیلوں کی یاد دلاتے ہیں۔ جن کے ذریعے حضرت عیسیٰ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دکھایا جاتا تھا۔ طمانچہ بر رخسار یزید ایک فرضی قصہ ہے لیکن اس قصے کے کردار وہ اشخاص ہیں جو ہر مسلمان کے دل و دماغ میں بسے ہوتے ہیں تاس کی تکنیک افسانہ سے زیادہ ڈرامہ سے قریب ہے۔ یہاں کنٹری کے شہرۂ آفاق مصنف راجہ راؤ کے ان خیالات سے اتفاق کرنا پڑتا ہے جو انھوں نے افسانے کے بارے میں کہے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ادب کی سب سے کٹھن صنف افسانہ ہے یہ ناول سے کہیں زیادہ مشکل ہے ڈرامے سے کہیں زیادہ دقت طلب ہے اور شاعری سے کہیں زیادہ شاعرانہ افسانہ میں ادب کی سب ہی اصناف اپنے خالص روپ میں شامل ہوگئی ہیں ایک اچھا افسانہ اختصار کے بغیر مختصر ہوتا ہے شاعری کے بغیر شعریت سے بھرپور نہیں ہے۔ تمثیل بنے بغیر تمثیلی ہوتا ہے۔"

اس افسانہ میں حضرت امام حسین کا کردار بڑی دل سوزی سے پیش کیا گیا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے ان دو بڑے فنکاروں یعنی میر انیس اور خواجہ حسن نظامی نے عرب کو ہندوستان میں منتقل کر دیا بقول حیات اللہ انصاری

" ہندوستان کا کلچر اتنا با اثر ہے کہ اس نے مسلمانوں کے نبی کے خاندان والوں تک کو ہندوستانی جامہ پہنا دیا۔ اُردو کے مشہور شاعر میر انیس نے اپنے رزمیہ کلام میں خاندان رسول کا رہن سہن لباس طرز گفتگو وغیرہ کی جو تصویر کشی کی ہے وہ خالص ہندوستانی ہے۔"

میر انیس نے نظم کے ذریعہ جو کارنامہ انجام دیا ہے خواجہ حسن نظامی نے اسے نثر میں وہی آہنگ دیا۔ سی پارۂ دل گوان کے انشائیوں کا مجموعہ ہے لیکن اس میں بعض انشائیے افسانوی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ اچھے بابل کیا لاڈلی بیٹی کو بھول گئے اور "منظر فراق" یعنی وفات الرسول خواجہ صاحب کے بے مثل اسلوب ہی کے غماز ہیں۔ اس کی زبان بھی گنگا جمنی ہندی کی چاشنی لیے ہوئے ہے۔ جذباتی اعتبار سے یہ ہند و عرب کا خوشگوار امتزاج ہے۔ جہاں اسلام کا جلال، ہندوستانی کلچر کے جمال، سے ہم آغوش ہے۔ ملاحظہ کیجیے یہ سطور" پتی کی ستی عائشہ ہم تیرے ست کے قائل ہیں تو سچی صدیقہ ہے ایک دفعہ جل کر مرجانا آسان ہے مگر ساری عمر پتی کے کام میں لگا رہنا اور اس کو انجام پر پہنچانا تیرا ہی حصہ تھا۔ رسول کے خانگی حالات جن پر ہزاروں کاموں کا انحصار تھا تو نے ہی بنائے اور پربھو پرشوتم کے پیارے شوہر کے نام پر اپنی زندگی کا عیش و آرام نثار کر کے جلا ڈالا۔

خواجہ صاحب کے افسانوں کی تیسری قسم تخیلی ہے جیسے دلی کی عیدیاں، شیخ چلی کی ڈائری وغیرہ۔ ان کا شمار میرے خیال میں انشائیوں میں کیا جانا چاہیے قدرت نے خواجہ صاحب کو افسانہ نویسی کا پیدائشی ملکہ ودیعت کیا تھا۔ ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو ہے۔ انھوں نے تاریخ، روایت اور تصور کی دکھائی ہوئی روشنی میں نئے نئے جہان آباد کیے۔ بقول شاعر اس طرح کہ:

غزالے بہ صحرائے جاں می گذشت

"چند دن کی بات ہے دنیا کے سرکش دولت مند تباہ و برباد ہونے والے ہیں۔ ان میں وہی سلامت رہیں گے جو اپنی محنت سے روپیہ کماتے ہیں یا محنت سے بزرگوں کا روپیہ بچاتے اور جائز کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ باقی سب کا زوال آنے والا ہے۔"
"آپ بیتی"

سید حامد سی II/ ۹۶ موتی باغ، نئی دہلی

گنگا جمنی طلسم

نفسیات کی ایک اصطلاح ہے Sublimation، مولوی عبدالحق نے جس کا مترادف "تہذیب"، "تصعید"، اور "ارتفاع" کو ٹھہرایا ہے۔ اس اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ ارادہ اور کوشش سے کسی جذبہ یا قوت کو ادنیٰ سے اعلیٰ میں بدلنا۔ تہذیب اور انسانی ترقی بڑی حد تک اسی عملِ ارتفاع کی رہینِ منّت ہے۔ فرد کی شخصیت کو یہ عمل نہ صرف بلندی بلکہ تموّل اور کشش بھی عطا کرتا ہے۔ شخصیت جس قدر تہ دار ہو، اسی قدر اس عملِ ارتفاع سے بہرہ مند نظر آئے گی۔ اس عمل کی ایک نشانی تناؤ یا داخلی کشمکش ہے یا وہ کیفیت جسے گنگا جمنی کہتے ہیں۔ جمنا کے تٹ کے باسی خواجہ حسن نظامی کی شخصیت اور ان کے انداز بیان میں وہ گنگا جمنی کیفیت جلوہ گر ہے جس پر لغوی طور پر دلّی کے بجائے پریاگ کا حق زیادہ ہے۔ لیکن پریاگ سے خواجہ صاحب کا رشتہ کم استوار نہیں تھا۔ اکبرالٰہ آبادی سے جو تعلقِ خاطر انھیں تھا اور جس قدر احترام وہ ان کا کرتے تھے وہ مشاہیر کے باہمی روابط کا ایک دلکش باب ہے۔ اور پریاگ سے تعلق کا ایک عنوان تیرتھوں کی وہ یاترا بھی تھی جس پر خواجہ حسن نظامی کفن سر سے باندھ کر نکلے۔ مقلّد کی اس بدعت پر کوئی کم لے دے نہیں ہوئی۔

لیکن خواجہ صاحب کو مُقلّد کیوں کہئے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں بارہا اس بات کا اعلان کیا ہے کہ وہ مزاجاً تقلید سے نفور تھے۔ انھیں پیہم نئی راہیں نکالنے کی جستجو رہتی۔ ملّا واحدی نے "سی پارۂ دل" کے دیباچہ میں بہت پتے کی بات لکھی ہے کہ :

"خواجہ صاحب مقلّد ہیں اور حنفی مشرب رکھتے ہیں لیکن انشا پردازی میں تقلید سے ان کو اتنی ہی چڑھ ہے۔ خواجہ صاحب نے اردو میں جو نئی راہ نکالی ہے، جس کا ہر انشا پرداز کو اقرار ہے۔ اس کا راز یہی غیر مقلّدی ہے۔ ایک بات کسی شخص نے ایک پیرایہ سے بیان کی اور خواجہ صاحب کو منظور ہوا کہ اس کی تائید کریں تو وہ کبھی اس کے بیان کردہ پیرایہ کی نقل نہیں کریں گے بلکہ ایک ایسے انداز کی تلاش میں رہیں گے جو سابق لکھنے والے سے علٰحدہ ہو اور بالکل ایک نئی مستقل بات بن جائے۔ اس کوشش میں وہ ہفتوں معروف رہتے اور مضمون نہیں لکھتے جب تک جدّت ان کے قبضہ میں نہ آجائے۔"

اس وصف سے اندازہ ہوتا ہے خواجہ صاحب کی مضبوط اور نمایاں انفرادیت



کا یہ کشیدہ قامت انسان ہر مجمع میں سر بلند رہنا چاہتا تھا۔ خواہ وہ عام انسانوں کا مجمع ہو، خواہ اہلِ طریقت کا، خواہ انشا پردازوں کا۔ اسد اللہ خاں غالب کی طرح خواجہ حسن نظامی کو روشِ عام سے شدید انحراف تھا۔ ظاہر ہے کہ غالب کے تخیل تک ہمارے نثر نگار کی رسائی کہاں ہوتی لیکن خواجہ حسن نظامی کی تحریر میں جا بجا اس دل کش ندرت کا چہرہ جھلکتا ہے جو تخیل کی کنیز ہے۔ خواجہ صاحب کی سادہ اور سلیس اور بظاہر پیادہ رو نثر، ذرا کھرچ کر اور ٹٹول کر دیکھیے تو شعری اور تخیلی عناصر سے مالا مال نظر آئے گی۔ ان میں سے ایک چھوٹے سے عنصر کا مشاہدہ اس اقتباس میں کیجیے، روزنامچہ نما سفرنامے میں مصری عورتوں کے متعلق لکھتے ہیں :-

"مصری عورتیں منہ پر ایک سیاہ کپڑا باندھ لیتی ہیں، جس میں تھوڑی سی ناک بھی ڈھکی رہتی ہے۔ باقی آنکھوں اور ان کے نیچے اوپر کے حصے کو نشانہ بازی کے لیے کھلا رکھتی ہیں۔ یہ سیاہ کپڑا اس قدر باریک ہوتا ہے کہ ہونٹوں کی سُرخی صاف جھلکتی نظر آتی ہے گویا دکھاتی ہیں کہ پتلے ابر میں چاند ایسا ہوتا ہے اور آسمان میں چاند ایسا ہوتا ہے۔ اور آسمان میں چاند کی بہار دیکھنی ہو تو ذرا نگاہ تھوڑی سے اور اوپر کر لو اور دیکھ لو۔

آنکھیں ایک تو ہوتی ہی ہیں عموماً سیاہ، اس پر سُرمے کی سان پلکوں کی نوک کو اور تیز کر دیتی ہے۔ اندر ایک سایہ سا ہوتا ہے جس کے اوپر سیاہ ریشمی چادر۔ چلتی ہیں تو لچکتی ہوئی، چادر کو دانستہ پھسلاتی ہوئی اور بناوٹی گھبراہٹ سے اِدھر اُدھر دیکھ کر اُسے سمیٹتی ہوئی۔ نوجوان اس تماشہ کی آرزو میں جگہ جگہ بنچوں پر موجود رہتے ہیں۔

سبز گھاس پر جا کر تو ان کی اٹکھیلیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں، دوڑتی ہیں، ایک دوسرے سے الجھتی ہیں، ہنستی ہیں اور زمین کی طرف جھکی پڑتی ہیں، گویا نشے میں بے قابو ہیں، یا گھاس کترنے کی قینچی ہیں جس کو یورپ کا تمدن چلا رہا ہے اور گھاس کے ساتھ ایمان

اور تقدس کے بے خطا پودوں کو بھی کترتا چلا جاتا ہے۔"

غور کیجیے اس مختصر سی عبارت میں کشش اور انحراف، مشاہدہ اور تخیل، نیم ستایش اور تبرا، حسن شناسی اور زُہد، صنم آشنائی اور تورّع کے تصادم نے گنگا جمنی بوقلمونی طلسم تیار کر دیا ہے۔ یہ عبارت اس عملِ ارتفاع کی نشان دہی بھی کرتی ہے جس کا ذکر میں نے آغازِ داستان میں کیا تھا۔ یہی عملِ ارتفاع دراصل تصوف کا سنگ بنیاد ہے یعنی مجاز سے حقیقت کی طرف سفر۔ اسے ہی طریقت کہتے ہیں۔ سفلی جذبہ کو علوی بنانا، حیوانی طاقتوں پر انکش لگانا، جذبات و رجحانات کو فرش سے اُٹھا کر عرش تک پہونچا دینا، تہذیب اور انسانی تسخیرات اسی عملِ ارتفاع سے عبارت ہیں۔ اسی عمل ارتفاع کو سب سے خوبصورت خراج اقبال نے اپنی اس نظم میں ادا کیا ہے جو انسان اور یزداں کے درمیان مکالمے کے روپ میں ہے :

بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

اس تحریر میں اس جملہ کی طرف بھی نگاہ کیجیے "گھاس کے ساتھ ایمـ اور تقدس کے بے خطا پودوں کو بھی کترتا چلا جاتا ہے۔" 'بے خطا' کی خامو ترکیب کس قدر بلیغ ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی سہل ممتنع سادہ رواں دوا میں اس قسم کی چونکا دینے والی تراکیب ہر موڑ پر مل جائیں گی۔ علاوہ بریں آخری میں وہ انداز ہے جسے قصیدہ کی اصطلاح میں "گریز" کہیں گے۔ گل بانو کا "کانا باقی" میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"سولہویں سال میں قدم رکھا تو شباب نے بچپن کی ضد اور شرارتیں تو رخصت کر دیں مگر دلربائی کی شوخیاں اس قدر بڑھا دیں کہ محل کا بچہ بچہ گل بانو سے پناہ مانگتا تھا۔ گل بانو سنہری چھپر کھٹ میں دوشالہ تانے سویا کرتی تھیں۔ شام کو چراغ جلے اور بانو کو نیند آئی اور سیدھی چھپر کھٹ میں پہنچیں۔ ماں کہتی "چراغ میں بتی پڑی اور لاڈو پلنگ چڑھی"۔ تو گل بانو مسکراتی اور جمائی لے کر سر کے بکھرے ہوئے بالوں کو ماتھے سے سمیٹ کر کہتی اچھا بی تم کو کیا! سوتے ہیں وقت کھوتے ہیں، تمہارا کیا لیتے ہیں۔ تم ناحق کو بلیوں پر لوٹی جاتی ہو۔"

غور کیجیے کہ ایک شہزادی کے الڑھ اور ناز پروردہ شباب کی رعنائیوں کی تصویر کـ ہمارے صوفی انشا پرداز نے کس خوبی کے ساتھ کی ہے! یہ بھی مدِ نظر رہے کہ تصویر کشی مـ تصویر کشی کے لیے نہیں ہے۔ فنکار نے ایک تصویر آغازِ داستان میں کھینچ کر رکھ دی تصویر کھینچتے ہوئے بھی اس کے ذہن میں اس دوسری تصویر کا خاکہ تھا جس پر کہانی ختم ہوئی :

"درگاہ حضرت چراغ دہلی کے ایک کونہ میں ایک قبول صورت عورت پھٹا ہوا کمبل اوڑھے رات کے وقت خاک کے بستر پر پڑی ہائے ہائے کر رہی تھی.... تیز ہوا کے جھونکوں سے بارش کی بوچھاڑ اس جگہ کو تر کر رہی تھی جہاں یہ عورت نمونیہ کے سخت بخار میں بے ہوش لیٹی تھی۔"

یہ انجام اس ناز پروردہ حسین شہزادی کا ہوا جو کبھی لال قلعہ کی جان تھی اور باد کی آنکھوں کا تارا۔ مصنف نے لیل و نہار کی اس گردش پر کوئی تبصرہ نہیں کیا، صرف تصو کو گویائی عطا کر دی۔ تقابل اور تضاد، توازن اور تناسب سے تاثیر کی تعمیر میں حسـ مدد لی، پھر بھی اسلوب کی سادگی کے دامن پر تصنع اور تکلف کے چھینٹے نہیں پڑنے د

اس پہلو کی طرف حاضرین کرام کا دھیان اس لیے دلایا گیا کہ خواجہ حسن نظا کی زود نویسی، پُر نویسی اور زیادہ نویسی اور طرزِ بیان کی ظاہری سادگی پر نہ جائیں ان کی عبارت کی تشکیل فنکاری کے اصولوں پر ہوئی ہے۔ ایک سطح تو ان کی تحریر کی وہ جو ہر خاص و عام کو لُبھاتی ہے یعنی سادہ، سلیس، ستھری، خوبصورت، البیلی ا بامحاورہ زبان، وہ زبان جس کے غیر معمولی صوتی حسن کا اندازہ ان سطور سے بخوبی ہو ہوگا جنھیں میں نے دُہرایا ہے۔ دوسری سطح وہ ہے جس میں نگاہ حروف بین کو لعل

جواہر ملتے ہیں۔ جہاں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ آمد کتنی بڑی ریاضت، کتنے طویل اور مختلف النوع تتبع کا ثمر ہے، اور ایک کتنی عظیم اور خود ساختہ شخصیت کے ان تھک جتن اور آہنی عزم کا مظہر اور لبِّ لباب ہے، لیکن یہ پیروی نقالی نہیں تسخیر ہے۔

ہماری ادب نوازی کا ایک دَور تھا جب ہر اہلِ قلم پر کوئی لیبل لگا دیا جاتا تھا مثلاً علامہ راشد الخیری مصوّرِ غم، خواجہ حسن نظامی مصوّرِ فطرت، حسرت موہانی رئیس المتغزلین۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ نازیبا رسم اب متروک ہو گئی۔ وہ اہلِ قلم یقیناً تہی مایہ ہوگا ایک لیبل جس کی شخصیت اور تحریر کا حق ادا کر دے۔ اہلِ قلم کے امام شیکسپیر پر نگاہ ڈالیے، ہر نصف صدی اس کے آثار کے نئے نئے پہلوؤں کو معرضِ انکشاف کرتی چلی آئی ہے۔ خواجہ حسن نظامی کو مصوّرِ فطرت کہکر مطمئن ہو جانے سے کام نہیں چلے گا۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کی نگارش بھی متمول اور تہ دار ہے۔ صلح کا یہ پیامی اور تصوّف کا یہ مُبلّغ شطرنج کا ایک ماہر کھلاڑی بھی تھا۔ شطرنج وہ اسی اہتمام کے ساتھ اور اسی طرح ہمہ تن استغراق ہو کر کھیلتا تھا جیسے لڑائی لڑی جاتی ہے۔ بساط کے ایک طرف وہ تھا اور دوسری طرف قارئیں جنھیں اپنے بے خطا اور بے ضرر حربوں سے دام میں گرفتار کر کے ہی وہ دم لیتا تھا۔

اس کی نثر کی معصوم سطح کے نیچے اَن گِنت جالیں چھپی ہوئی ہیں۔ قیاس کیجیے بحری سفر کی ڈائری سے چُنی ہوئی ان سطور کی بنا پر:

> "جی گھبرایا تو چھتری پر چلا گیا۔ ایک پارسی ایک فرانسیسی سے شطرنج کھیل رہا تھا۔ پارسی کے مہرے سیاہ تھے، فرانسیسی کے سفید۔ میں نے دیکھا کہ سفید مہرے سیاہ مہروں پر چھائے جاتے ہیں۔ بے ساختہ کہہ اُٹھا فرزین کو بچاؤ۔ فرانسیسی فارسی جانتا تھا، بولا آپ آئیے۔ میں دس برس سے شطرنج کا تارک۔ ذرا ہچکچایا۔ مگر فرانسیسی نے اصرار کیا، مجبوراً مقابلہ میں اترنا پڑا۔
>
> میدان ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ بساط میں کامل ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ کی حفاظت کا کوئی سامان نہیں تھا۔ لشکر بے قاعدگی سے حرکت کر رہا تھا اور حریف بڑی دانائی سے مورچوں پر چھایا ہوا چلا آتا تھا۔ میں نے "اَلْحَرْبُ خَدْعَةٌ" پر عمل کیا۔ دانستہ رُخ کو پیدل کے منہ میں دے دیا۔ فرانسیسی نے رُخ کو مار لیا اور مجھے ناتجربہ کار سمجھ کر مطمئن ہو گیا۔ غنیم کا شاہ میسرہ کے قلعہ میں بالکل محفوظ تھا۔ میں نے میمنہ کی طرف اپنا لشکر بڑھایا تاکہ حریف اُدھر جھکے اور میسرہ کا محاصرہ ٹوٹ جائے۔ جوں ہی میمنہ کی جانب میری یورش دیکھی حریف اپنے سب مہروں کو ترتیب کے ساتھ نکالتا ہوا ادھر جھک آیا اور قلعہ شاہی میں چند رخنے پڑ گئے۔ یہی میں چاہتا تھا۔ فوراً دو گھوڑے معرکے سے جدا کیے اور انھیں شاہ کی طرف جھونک دیا۔
>
> اب دشمن سمجھا اور غضب ناک ہو کر قلعہ کی طرف پلٹا مگر یہاں کام ہو چکا تھا۔ گھوڑے فصیل کود کر شاہ کو محاصرے میں لے چکے تھے اور پیدل کی ایک چال پر قسمت کا فیصلہ رہ گیا تھا۔ حریف سے اور چال بن نہ آئی۔ فرزین کو قربان گاہ بھیج دیا۔ پیدل نے آگے بڑھ کر شہ دی۔ فرانسیسی مات کھا گیا۔"

پیرایۂ بیان کی دل کشی کے علاوہ آپ نے صاحبِ تحریر کی حکمتِ عملی اور مبارزہ طلبی اور نبرد آزمائی اور داؤ پیچ کے تیور بھی دیکھ لیے۔ فرانسیسی شاطر کی طرح ہندوستانی قاری ہمارے انشا پرداز کے اسلوب کی ظاہری سادگی سے مات کھاتا چلا آرہا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی فنکاری کا تنقید اور تحقیق پر دیرینہ قرض ہے، دیکھیے کب یہ چکایا جاتا ہے۔ ریسرچ کے لیے نہ معلوم کتنی راہیں ان پانسو کتابوں اور کتابچوں سے نکل سکتی ہیں جو اردو ادب کو خواجہ کی دین ہیں۔ سامنے کی بات ان اہلِ قلم کی کھوج ہے خواجہ صاحب نے جن سے اخذِ فیض کیا۔ عبدالحلیم شرر اور محمد حسین آزاد سے استفاضہ کے خواجہ صاحب خود معترف تھے لیکن ان کے تانے کے ساتھ بے شمار دوسرے بانے بھی گتھے ہوئے ہیں لیکن انداز نقّالی کا نہیں فتحمندی کا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ سعدی شیرازی اور میر امّن دہلوی کے پیرایۂ بیان کا بھی خواجہ صاحب کے اسلوب پر نمایاں اثر ہے۔

خواجہ حسن نظامی کے آثار کی مقبولیت دلربائی اور توانائی کا ایک بڑا راز ان کا مشاہدہ اور ان کی ارضیت ہے۔ جس صوفی صافی کا فلک سیر تخیل عرش کی خبر لاتا تھا وہ خود زمین پر پیر گاڑے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کی ایک آنکھ ارض پر تھی اور دوسری عرش پر۔ چنانچہ مضمون کتنا ہی متصوّفانہ یا مَا بَعْدَ الطَّبِیْعَاتی ہو وہ اس کا رشتہ ارضی تشبیہات اور عام انسان کے مشاہدات اور تجربات سے جوڑتا تھا اس لیے جو بات وہ کہتا تھا وہ دل نشیں ہو جاتی تھی۔ اس امر میں اس حد تک اردو کا کوئی اہلِ قلم اس کا حریف نہیں ہے۔

مشاہدہ کی ایک چھوٹی سی مثال سُنیے۔ نقشہ چتوڑ کے ریلوے اسٹیشن کا ہے:

> "ایک میلا کچیلا حلوائی جس نے دھوتی کے پچھلے حصے کو اس بدسلیقگی سے اُڑسا تھا کہ آدھے گز کے قریب کپڑے کا گُپھا دُم کی مانند اوپر نکلا ہوا تھا۔ حلوائی چلنے میں نیچے کے جسم کو اس طرح حرکت دیتا تھا کہ وہ کپڑے کا گپھا گت بھرتا معلوم ہوتا تھا۔"

ایسا مشاہدہ عرفِ عام میں صرف کسی ممتاز ناول نگار یا فسانہ نویس سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے مزار پر جا کر ہمارے کلیم الانبیا نے ان سے جو گفتگو کی اس میں تشبیہ کی اس مثال پر غور کیجیے جو خواجہ حسن نظامی کی تقریر و تحریر کی دلپذیری کا ایک وسیلہ ہے اور جس کا منبع مشاہدہ کی باریکی اور تجربہ کی وسعت میں ملے گا:

> "اے مقدس باپ! اب نبوی تجلی کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ پروردگار سے کہیے کہ وہ آپ کے اُس دین کو محفوظ کر دے جس میں صرف رسمِ ختنہ اور قربانی کے سوا کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ اسلامی رجسٹری کے لفافے پر ابراہیمی مہریں سالم ہیں لیکن اندر کے قیمتی نوٹ غائب ہو گئے۔"

مشاہدہ کا ایک اور موتی مرقدِ بلال کے بیان سے تعلق رکھتا ہے۔ سُنیے،

> "جوں ہی مرقدِ بلال پر نگاہ پڑی آنسو سامنے آگئے اور پلکوں کو ہلانے لگے۔"

مشاہدہ تشبیہ اور تمثیل کا قریبی رشتہ دار وہ ڈرامائی انداز ہے جو خواجہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس میں تصوّر بھی ہے، تجسیم بھی۔ خطابت بھی ہے تعلیم بھی۔ مراقبہ بھی ہے، مکالمہ بھی۔ تعبیر بھی ہے، تاثیر بھی :

"اٹھو بلال اٹھو بابا جان تک لے چلو۔ جاگو بلال جاگو اذان کا وقت ہو گیا۔ میں تمہاری چادر کھینچ لوں گا۔ میں تمہارے پاؤں میں گدگدیاں کروں گا، سونے نہیں دوں گا۔ آنکھیں کھولو تمہارے آقا کا نواسہ تم کو جگا رہا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑو اور اس گھر تک پہنچا دو جہاں صبح صبح نور کے تڑکے آواز دیا کرتے تھے "اَلصَّلٰوۃ اَلصَّلٰوۃ یا رَسُول اللّٰہ" میرے آقا بلال، میرے مولیٰ بلال، میرے سیّد بلال۔ قدم دو انھیں چوموں، جوتیوں کی خاک دو سر پر رکھوں، آنکھوں میں ڈالوں۔"

ارضیت اور دل نشیں محاوروں کے چور دروازہ سے بھی آثارِ خواجہ میں داخل ہوئی ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی اردو دہلی کی ٹکسالی اردو ہے۔ مقامی رنگ کہاوتوں اور محاوروں کی شکل میں ان کی عبارت میں داخل ہوا ہے۔ کہاوتوں اور محاوروں میں قرنہا قرن کے انسانی تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اس سرچشمہ سے خواجہ نے اپنے خیابانِ تصانیف کو سیراب کیا ہے۔ میں نے ذوق کی حق تلفی کی طرف قارئین کو متوجہ کرتے ہوئے کبھی لکھا تھا کہ ذوق کے کلام کی توانائی اور بقا اور ارضیت کے ضامن وہ محاورے ہیں جنھیں انھوں نے اپنے کلام میں صرف کیا ہے۔ اس بارہ میں وہ غالب پر فائق ہیں۔ خواجہ حسن نظامی بھی اپنی ارضیت، محاورہ بندی اور اُن تشبیہات اور تمثیلات کی بدولت جس کو انھوں نے مرئی اور غیر مرئی، دنیا اور ماورا، مجاز اور حقیقت کے درمیان پُل بنایا ہے مولانا ابوالکلام آزاد پر فائق ہیں۔

ابوالکلام آزاد کی نثر کے شکوہ اور معنویت اور ادبیت کے پرستار اٹھتے جا رہے ہیں کیونکہ فارسی اور عربی سے واقفیت معدوم ہو رہی ہے۔ لیکن خواجہ حسن نظامی کی بظاہر ہلکی پھلکی اور نسبتًا پیادہ رو نثر کو آبِ حیات سے سینچا گیا ہے۔

تصوّف اور تعقل کی آمیزش اور آویزش خواجہ کے یہاں مسائل بھی پیدا کرتی ہے اور لُطف بھی۔ انھوں نے تصوّف کی ترجمانی کی اور تبلیغ دلائل اور براہین کے ساتھ کی۔ زاویے بدل بدل کر وہ اپنے نقطۂ نظر کو ذہن نشیں کراتے ہیں۔ ان کے صفحات میں عشق اور عقل کا فصل مٹتا نظر آتا ہے۔

وہ کسی ایسی پرواز کے قائل نہیں جس میں وہ عوام کو ساتھ نہ لے جا سکیں۔ ان کی نثر کا حُسن تشریح اور صراحت کا حُسن ہے۔ اُلجھی ہوئی باتوں کو ان کی نوکِ خامہ بہ آسانی سُلجھا دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو مثال کے طور پر ان کا وہ مضمون جو واقعۂ کربلا کے متعلق آکاش وانی سے نشر ہوا تھا۔ لیکن تشریح کی راہ پُر خطر بھی ہے جس میں اطناب اور طولِ کلام کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی ذات اور آثار میں وہ مقناطیسی کشش ہے جو ان مشاہیر کو بھی کھینچتی رہی اور ان قارئین کو بھی کھینچتی رہے گی جن کو خواجہ کے مسلک سے شدید اختلاف رہا ہے۔ علامہ اقبال اور مولانا محمد علی جیسے اکابر خواجہ کے زمرۂ احباب میں شامل تھے۔ تصوّف کی راہ میں بعض جگہ خواجہ نے غلو کا وہ پہلو اختیار کیا جس کا ساتھ عامۃ المسلمین نہیں دے سکتے تھے۔ مثلاً مُرشد کو سجدۂ تعظیم کا جواز۔ ان انحرافات سے قطع نظر خواجہ نے اپنے زرخیز اور پُرتاثیر قلم کو قوم کی اصلاح اور بہبود اور تصوّف اور صلح مندی کی تلقین اور مزاروں کی تہذیب میں صرف کیا۔

اگرچہ خواجہ حسن نظامی کو اس رائے سے شدید اختلاف تھا جو اقبال نے روایتی تصوّف کے تباہ کن اثرات کے متعلق ظاہر کی تھی اور جس کی لپیٹ میں حافظ شیرازی بھی آ گئے تھے۔ تاہم اگر غور کیجیے تو خود خواجہ صاحب اسرارِ خودی کے آشنا رموزِ بے خودی سے کم نہ تھے۔ ان کی شخصیت میں توانائی اور استیلا کی صلاحیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ملّا واحدی سوانح عمری میں لکھتے ہیں :

"خواجہ صاحب نے آپ بیتی میں لکھا ہے کہ میری قوم کے اندر بھی فاتح بننے اور حکومت کرنے کا مادّہ موجود ہوتا تو میں اپنی جبلّی خواہش اور قوم کے مادّہ کو ضائع نہ جانے دیتا اور قطعی کہیں نہ کہیں کا بادشاہ ہو جاتا۔۔۔ خواجہ صاحب کی تصویر روپے پیسے پر تو نہیں چھپ سکی، مگر خواجہ صاحب کا نام دلوں پر نقش ہو گیا۔"

گویا خواجہ حسن نظامی نے تصوّف میں بھی ایک نئی راہ نکالی اور خود گدازی کے ساتھ ساتھ خود افرازی کا طریق بھی اپنایا۔ یہی توانائی، خود افرازی اور آرزومندی چھَن چھَن کر ان کی تحریر میں مترشح ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ اعتراضات اور انحرافات سے اغماض برتنے کے بجائے قلمی مباحثہ کے لیے تیار رہتے تھے۔ ان کی غیرتِ عقاید نے انھیں خاموش بیٹھنے نہیں دیا اور ان کے مزاج کی آرزومندی اور ان کے عزائم کی بلندی نے دشوار سے دشوار موڑ پر انھیں سرِ تسلیم خم کرنے سے روکا۔ ہمعصر اکابر سے کبھی وہ مرعوب نہیں ہوئے۔ خواجہ کے طرزِ نگارش کی تشکیل میں ان کی خود اعتمادی کو بڑا دخل ہے۔ ان کے تصوّف کے دلکش تموّل اور ان کے پیرایۂ بیان میں ایک عجیب شگفتگی اور تابانی آ گئی ہے۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ خواجہ صاحب اپنے مفہوم کی وضاحت اور اپنے مقصد کی تکمیل اور بیان کی تاثیر کے لیے ڈرامائی یا محاکاتی پیرایۂ بیان اکثر اختیار کرتے۔ روضۂ نبوی پر حاضر ہو رہے ہیں :

"اس سبزی کی جھلک نے جو کہرام گاڑی میں مچایا وہ دیکھنے کے قابل تھا کلیجے پھٹے جاتے تھے، ہاتھ گریبانوں پر تھے، دل تھامتے تھے، کرتے چاک کرتے تھے، گردنیں کھڑکی سے باہر تھیں آنکھیں ٹکٹکیاں باندھ رہی تھیں، دل دھڑک رہا ہے۔ اسے سنبھالوں۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ ہے۔ جسم کی توانائی نے جواب دے دیا۔ کیا کروں؟ لوگو میرا ہاتھ پکڑنا، میں چلا۔ سہارا دینا میں گرا۔"

اگلی ہی سطر میں نُدرت کی مثال ملے گی :

"پلیٹ فارم کے سنگریزوں نے پاؤں سے مصافحہ کیا اور عبدالجواد آفندی نے ہاتھوں سے۔"

زبان اور محاورہ کو تشبیہ کے راستے خواجہ صاحب بڑے پُرلُطف لیکن بے صدا انداز سے نیا موڑ دے دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں :

"ہماری تعداد دنیا میں ریل کی سڑک کی طرح پھیل رہی ہے۔"
بیان کے مرئی انداز کی مثالیں ہر ورق پر آنکھوں کی پذیرائی کرتی ہیں:
"اُمّت کے بیماروں کی طرف سے طبیب الکل کی گنڈی کھٹکھٹا رہا ہوں۔" "ان انگریزوں کے وہم کی رگ بار بار پھڑکتی تھی۔"
اپنی آرزو مندی اور بے خوفی کا ذکر خواجہ صاحب نے خود بھی کیا ہے:

"میں اپنے جبلی ولولے سے بے خوف اور نڈر ہو کر بے سوچے جو کام کرجاتا ہوں .... اگر ان دونوں کی احتیاطیں ... مجھ کو مقید نہ رکھتیں تو میں یا تو پھانسی پا چکا ہوتا یا نظر بندانِ ہند کے ساتھ کسی جگہ قید ہوتا۔"

انوکھی بات ہے، مرشد کے سامنے سجدہ کو جائز سمجھنے والا یہ صوفی انقلابی اور باغیانہ مزاج لایا تھا جسے اس نے بڑے جتن سے طریقت اور اطاعت کی طرف موڑا۔ یہ اسی عمل ارتفاع کی کرشمہ سازی ہے جس کا ذکر آغازِ داستان میں آچکا ہے۔ اور شخصیت اور اسلوب کی وہ گنگا جمنی کیفیت ہے جسے میں نے داستان کا عنوان بنایا ہے:
—— ان کی کتابیں نگار خانوں پر مشتمل ہیں ——

"وہ مسجد جس کے سامنے ہمارے بوڑھے بزرگوں کی لاشیں تڑپ تڑپ کر گریں اور ان کی سفید داڑھیاں خون سے لال ہو گئیں۔"

خواجہ صاحب کی جگہ یہی بات اگر کوئی اور لکھتا تو شہیدوں اور زخمیوں کی تعداد گناتا — تذکرہ کانپور کی اس مسجد کا ہے جس کے ایک حصہ کو انگریز حاکم نے سڑک کی توسیع کے لیے شہید کردیا تھا۔

خواجہ حسن نظامی کے ایک مضمون کا عنوان ہے "جُبّہ اور عمامہ کی کورنش"

"۱۹۱۱ء کے دربار کا ایک پروگرام، مشائخ و علماء، سادھوؤں اور پنڈتوں کے سلام کا بھی تھا۔ شہنشاہ جارج پنجم اپنی ملکہ کے ساتھ لال قلعہ کے جھروکوں میں بیٹھ گئے تھے اور قلعہ کی دیوار کے نیچے ہندو مسلمان دینی پیشواؤں نے بہ یک وقت جمع ہو کر انھیں سلام کیا تھا اور دعائیں دی تھیں۔"

اس مضمون سے خواجہ صاحب کی حمیت کے علاوہ ان کی عنوان تراشی اور نعرہ تراشی کی غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کے تجربے، روابط، مشاہدے اور موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ سفر و حضر میں وہ لاکھوں آدمیوں سے ملے۔ ان کی دل چسپیاں لامحدود تھیں۔ ان کی نگاہ تیز تھی۔ ان کی معلومات وسیع اور مشاغل گوناگوں تھے۔ اور یہ سب کچھ ان کی تحریروں میں منعکس ہوا۔ وسعت یا ریج میں کم اہل قلم ان کے حریف ہوں گے۔ نظیر اکبر آبادی جن سے خواجہ صاحب کا موازنہ کیا جاتا ہے، ان کو نہیں پہونچتے۔ پُر گو دونوں ہیں، دونوں کا مشاہدہ وسیع ہے، دونوں کے یہاں مقامی رنگ ہے۔ لیکن خواجہ صاحب کا کینوس زیادہ وسیع ہے اور ان کا اندازِ بیان نظیر اکبر آبادی کی طرح بے محابا نہیں بلکہ فنکارانہ مساعی کا نتیجہ ہے۔

تصوّف کی بدولت خواجہ حسن نظامی کی نگاہ ہر گام پر کثرت میں وحدت کا جلوہ دیکھتی ہے اور انمل بے جوڑ چیزوں میں بھی وہ شباہت ڈھونڈ لیتے ہیں، ناتہ جوڑ لیتے ہیں۔ بے جان چیزیں انھیں جاندار نظر آنے لگتی ہیں۔ یہ اندازِ نظر اور یہ پیرایۂ بیان ان کی تحریروں کو خواص و عوام کے لیے دلکش بنا دیتا ہے۔ اپنے مضمون "بندوق" میں لکھتے ہیں:

"بندوق متوالی آنکھ کی پری ہے، نازک بدن ہے، نازک کمر ہے۔ اس کے جسم کو دیکھ کر معشوق کی نازک کلائی یاد آتی ہے۔ اس کی نال کا مُنہ ہرنی کی آنکھ سے مشابہ ہے، وہ ہرنی جس کی آنکھ کی مشابہت رسیلی، کٹیلی آنکھوں سے دی جاتی ہے۔"

خواجہ حسن نظامی کی زبان ہلکی پھلکی اور شیریں ہے۔ اس میں ثقالت کا شائبہ بھی نہیں۔ ان کی نثر کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت اس کی روانی ہے، اور ان کی عبارت کا صوتی حُسن ایک نغمگی کا حامل ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملے لکھتے ہیں جو دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ بقول مُلّا واحدی:

"خواجہ صاحب کی آنکھوں میں موہنی تھی، خواجہ صاحب کی زبان میں موہنی تھی، خواجہ صاحب کی شخصیت میں موہنی تھی، خواجہ صاحب ازسرتاپا موہ لینے والے تھے۔"

ان کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑی جان ہے۔ چھوٹا جملہ جاندار کیوں نہ ہو کہ اس کا "فعل" مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور اسماء اور صفات کے جامد بوجھ کے نیچے جملہ کو دبنے نہیں دیتا۔

انگریزی انشا پرداز سوئفٹ نے کہا تھا کہ صفت اسم کی دشمن ہے۔ خواجہ حسن نظامی بھی بالعموم صفت کے وافر استعمال سے گریز کرتے ہیں لیکن وزن اور ترصیع کے لیے وہ مترادفات اور ہم قافیہ الفاظ کا استعمال جائز رکھتے ہیں، ایسے مترادفات کا بھی جو مفہوم کو آگے نہ بڑھا رہے ہوں۔

اجازت دیجیے کہ میں گفتگو کے پایان میں اُسی تصعید یا ارتفاع کا ذکر کروں جس سے میں نے ان سطور کی تمہید اُٹھائی تھی۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنے خد و خال کے حُسن کا ارتفاع اپنے قلمی حُسن پاروں کی شکل میں کیا ہے۔ انھوں نے اپنی انفرادی آرزو مندی اور انقلاب، استیلا اور بغاوت کے رجحانات کو تصوّف سے زیر کیا۔ اور تصوّف اور جذبۂ سرافرازی کے قِران کو تحریر و تقریر کے ذریعہ قوم کی اصلاح اور خانقاہوں کے سُدھار اور انسان دوستی کی تبلیغ کے لیے استعمال کیا۔

انھوں نے دین و دنیا، اکابر و اصاغر، شریعت و طریقت، تصوّف اور تعقّل، انکسار اور استیلا، ماضی و مستقبل، کثرت و وحدت، متانت و شگفتگی، صحافت و ادب، نثر اور شعریت، تجزیہ اور تخیُّل، قدامت اور پیش بینی کو اپنی تخلیقات میں سمو کر ایک گنگا جمنی طلسم تیار کردیا۔

♣

عابد علی خاں

روزنامہ سیاست حیدرآباد

خواجہ حسن نظامی اردو کے منفرد صحافی

حضرت خواجہ حسن نظامی کی حیات اور ان کی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر اس علمی مجلس میں تاثرات پیش کیے جا رہے ہیں۔ خواجہ صاحب ایک سجادہ نشین صوفی مصلح مضمون نگار تذکرہ نگار مصنف و مورخ ہی نہیں تھے بلکہ اپنی سماجی خدمات اور سیاسی بصیرت کے باعث اپنے دور کی ایک اہم اور ممتاز شخصیت تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سیمینار میں ان کی مکمل شخصیت کے تمام روپ سامنے آئیں گے اور یہ سیمینار اس متفقہ رائے کو بھی پیش کرے گا کہ خواجہ صاحب اس صدی کے اردو کے بہت بڑے مضمون نگار صحیفہ نگار اور خصوصیت سے اردو صحافت کے صاحب طرز منفرد کالم نگار بھی تھے۔ بلا اختلاف یہ تسلیم بھی کیا گیا ہے محمد حسین آزاد، نذیر احمد دہلوی اور مولانا آزاد نے اردو نثر کو جو مقام اور پیراہن عطا کیا ہے حسن نظامی صاحب نے اسے ایک نیا اور عام فہم روپ دیا۔ انھوں نے اردو کو ایک عوامی زبان بنایا۔ وہ اردو کے پہلے اور اب تک بھی تنہا ایسے مضمون نگار یا ESSAYIST ہیں جن کا اسلوب دلی کی مخصوص زبان کے علاوہ دلنشین بھی تھا۔ ان کی شخصیت مکمل اور پہلو دار تھی۔ وہ مشائخ صوفی معلم اور ادیب کے مختلف اوصاف کا مجموعہ تھے۔ ان پہلوؤں کو آج اجاگر کرنے سے مولانا کی صرف علمی و ادبی مذہبی اور سماجی خدمات کو خراج تحسین ہی پیش کرنا نہیں ہے بلکہ مولانا کی زندگی کا جو مشن تھا اور جس کو وہ اپنی جان سے عزیز سمجھتے تھے۔ اس کو بھی سامنے لانا ہے۔ وہ ہمارے مشترکہ کلچر و تمدن قومی یک جہتی اور اردو کے تحفظ اور ارتقا کے اعلیٰ مقاصد اور نصب العین کے علمبردار تھے اس اجتماع کے ذریعہ خواجہ صاحب کے ان اعلیٰ مقاصد کو آگے بڑھانے میں بھی یقیناً مدد ملے گی۔

اتفاق سے ان خدمات پر یہ جائزہ ایسے وقت لیا جا رہا ہے جب کہ ہمارے ملک کی سیاسی فضا قومی یک جہتی اور تہذیبی اتحاد کے لیے کئی اہم اور عہد ساز اقدامات کر رہی ہے۔ اور ایسا مستقبل بنانے کی سعی کر رہی ہے جو ماضی قریب میں ہمارا سرمایہ تھا۔ خواجہ حسن نظامی نے ادیب اور اخبار نویس کی حیثیت سے اپنے زمانہ میں قلمی جہاد کیا آج ہم اسی مقصد کے حصول کے لیے نصابی کتابوں، قومی یک جہتی کے مسائل اور ہمارے مشترک تمدن پر مضامین لکھوانے پر زور دے رہے ہیں۔ اور تعمیری و افادی صحافت کی بنیادی ضرورت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سیمینار متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ خواجہ صاحب کی تحریرات تصانیف اور ان کے رسائل اس مقصد کے لیے ایک طاقتور اور جاندار مشن کی حیثیت رکھتے تھے۔

میں خواجہ صاحب کی صحافتی خدمات کا اس موقع پر ذکر کرنا چاہتا ہوں خواجہ صاحب نے جس دور میں مضمون نگاری شروع کی ہمارے ملک میں اردو زبان ہی میں سب سے بااثر اخبارات نکلا کرتے تھے۔ ان دنوں انگریزی اخبارات کی سرکاری اہمیت تھی۔ لیکن میں عرض کروں گا کہ رائے عامہ کی ترجمانی اور عوام سے ربط کا سب میں موثر ذریعہ اُردو اخبارات ہی تھے ان دنوں لاہور دلی اور کلکتہ اردو کے صحافتی مراکز تھے۔ جن کا مقصد ملک کی سیاسی تحریکات کی ترجمانی اور رائے عامہ کی تشکیل تھا۔ اردو کے اخبارات اردو صحافت کی شاندار بنیادیں اور معیار کا نمونہ بھی تھے۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے دوران —— علاقائی زبانوں کے اخبارات کا دور شروع ہوا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو صحافت کو ہر وقت ترجیحی اہمیت حاصل رہی اس دوران میں خواجہ حسن نظامی نے اپنی نگارشات سے کئی اخباروں کو نوازا —— متعدد رسائل کے لیے مسلسل لکھتے رہے —— خود بھی رسائل نکالتے رہے اور بے شمار رسائل کے سرپرست بھی رہے۔

دور حاضر کی اصطلاح میں وہ کارکن صحافی کا بے مثال نمونہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اپنا پرچہ وہ خود مرتب کرتے اور تصحیح سے لے کر اس کی تقسیم اور روانگی تک کا کام انھوں نے بذات خود انجام دیا۔ ہمارے ملک کے ایک ممتاز صحیفہ نگار قاضی عبدالغفار جنھوں نے روزانہ اردو اخبار کے معیار کو بہت اونچا کیا اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ اردو کا ایڈیٹر خود کوزہ خود کوزہ گر اور خود گل کوزہ ہوا کرتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے بھی اپنے رسائل کی گٹھری کو ڈاک خانہ کے سپرد بھی کیا۔ ایڈیٹری کے سارے مراحل انھوں نے شخصی طور پر انجام دیئے اور کسی کام کو معیوب نہ سمجھا۔ اس لیے ان کی صحیفہ نگاری بھی ہمہ جہتی پہلو رکھتی ہے۔ وہ اخبارات کے لیے مضمون نگار بھی تھے مخصوص کالم نگار بھی اور خود کئی اخبارات مثلاً نظام المشائخ، جبلیع نسواں

اسکول گزٹ، نظام گزٹ، رعیت اور درویش کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ان کے رسالہ منادی کو جو اہمیت اور ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ تعلیم و ترقی کے اس دور میں آج بھی کسی رسالہ کو شاید حاصل نہیں ہے۔ طباعت کی سہولت اور رسائل کی تعداد میں اضافہ کے اس دور میں برصغیر ہند و پاک میں آج بھی ایسا کوئی رسالہ نہیں کہ اس کے کسی مخصوص کالم کو پڑھنے کے لیے خاندان کا ہر فرد بے چینی سے انتظار کرتا ہو۔ خواجہ صاحب غریبوں کا اخبار، عادل، آزاد، طاقت، حریت، مولوی، پیشوا، آستانہ، جنگ، مرشد، دین دنیا وغیرہ کی بخوشی سرپرستی کرتے تھے۔ ان رسائل کے وہ قلمی معاون تھے۔ اور ان کی اکثر و بیشتر مالی امداد بھی کرتے تھے۔

خواجہ صاحب مختلف رسائل کے ایڈیٹر رہے۔ اور اپنی پختہ فکر و شگفتہ تحریر کے ذریعہ جہاں انھوں نے اقلیتوں کے مسائل کو پیش کیا وہیں انھوں نے قومی یک جہتی کو مستحکم بنانے کی سعی کی۔ اُردو ادب میں نظیر اکبرآبادی اور علامہ اقبال کے بعد وہ واحد ادیب ہیں جنھوں نے ہندو اوتاروں اور ان کے تہواروں پر مضامین لکھے۔ رام چندر جی، کرشن جی اور گرو نانک پر خواجہ صاحب کے مضامین اقبال کی نظموں کی طرح عقیدت و احترام کے مظہر ہیں۔ انھوں نے جہاں مغل دربار کے آخری دنوں کو اپنے قلم کی سحر آفرینی سے زندہ تاریخ بنا دیا وہیں انھوں نے اپنے مضامین کے ذریعے ہمارے مشترکہ کلچر اور تمدن کو مستحکم بنانے میں اپنے حسن بیان اور شیرینی زبان سے دائمی ادب کا درجہ دیا۔

خواجہ صاحب فقیر منش اور صوفی تھے لیکن ان کی دوربین نظر آنے والی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اگرچہ کہ ان کا ذہن سوشلزم سے واقف نہ تھا مگر وہ اس آنے والی تبدیلی کو محسوس کرتے تھے۔ اس خصوص میں ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے:

"چند دن کی بات ہے دنیا کے سرکش دولت مند تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ وہی سلامت رہیں گے جو اپنی محنت سے روپیہ کماتے ہیں۔ اور محنت سے بزرگوں کا روپیہ بچاتے ہیں اور جائز کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ باقی سب کا زوال آنے والا ہے۔"

وہ اُردو کے ایسے حساس اور باشعور ادیب تھے جسے آنے والے دور کا عرفان تھا انھوں نے نہ صرف زبان کو آسان اور اپنے مخصوص دلنشیں اسلوب سے آراستہ کیا بلکہ یہ بھی محسوس کیا کہ سلیس ہندی کو بھی اہمیت دی جانی چاہیے۔ انھوں نے قرآن مجید کا ہندی میں ترجمہ کیا اور اپنے مضامین میں جو قومی شخصیتوں سے متعلق ہیں ہندی کے آسان عام فہم اور ایسے شیریں الفاظ استعمال کیے جو اردو سے قریب اور ایک مشترکہ زبان کا نمونہ ہیں۔

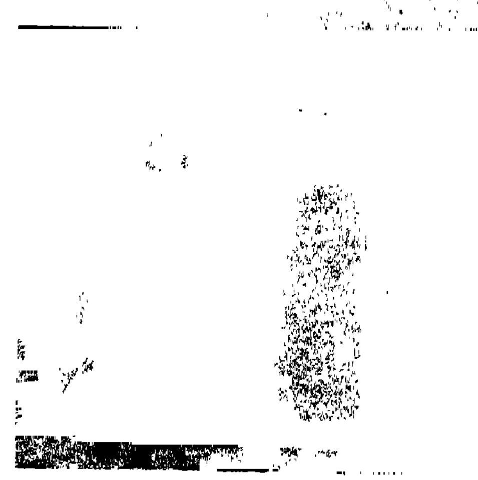
خواجہ صاحب کی کثیر شخصیت میں یہ تعین کرنا کہ وہ ادیب و مضمون نگار کس حد تک تھے اور کہاں سے ان کے صحافی ہونے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یقیناً یہ بڑا مشکل کام ہے۔ چونکہ ان کی سراپا علمی اور صبح و شام کی معروف زندگی میں وہ مذہبی رہنما صوفی معلم اور دلی کی ممتاز شخصیت کے تمام روپ میں نظر آتے تھے۔ وہ اپنے عہد کی ایسی ممتاز شخصیت بن گئے تھے کہ مہاتما گاندھی بھی انھیں عزیز رکھتے تھے۔ مولانا محمد علی سے بھی ان کے معرکے رہے۔ اپنے اخبار "غریبوں کا اخبار" میں وہ مولانا محمد علی کے اخبار "ہمدرد" کا جواب دیا کرتے تھے۔ اور یہ صحافتی نوک جھونک شخصیات سے بالاتر ہو کر مسائل پر مبنی رہتی تھی۔

مولانا سیاسی شخصیت نہیں تھے لیکن ملک کے حال و مستقبل کو وہ ہمارے ماضی کی شاندار و مشترکہ روایات سے آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ ایک ادیب اور مصلح کی حیثیت سے ان کی خدمات کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہوگی کہ قومی اتحاد و یگانگت کے لیے ہمیشہ ان کا ذہن کام کرتا رہا اور رواں دواں ان کا قلم چلتا رہا۔ اگر اس ذہن و فکر کی یہ سیمینار تشریح کر سکے تو یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ یہ ایک شخص یا فرد کے افکار نہیں تھے بلکہ ہمارے ملک کے ان دانشوروں کی فکر کی ترجمانی تھی جو پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی عرصے میں مشترکہ تمدن ملی جلی زبان اور تہذیب کے لیے جہاد کرتے تھے۔

مولانا کی صحافتی خدمات کے موضوع پر اگر میں محدود ہو جاؤں تو ماہنامہ 'منادی' ہی میرا موضوع ہو جائے گا۔ کیونکہ یہی رسالہ ان کی صحافتی زندگی کا مستقل ساتھی رہا ہے ان کا روزنامچہ صرف ان کی شخصی سرگرمیوں اور روزمرہ کی مصروفیتوں کا حامل نہیں تھا بلکہ ملک بھر میں پھیلے ہوئے ان کے دوستوں سے ان کے تعلقات کا اظہار اور قومی مسائل پر ان کے بے لاگ تبصروں سے بھرا ہوا بھی رہتا تھا۔ اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ مولانا اپنے روزنامچہ میں لالہ کرم چند ایڈیٹر پارس لاہور کا ایک سے زائد مرتبہ ذکر کر چکے تھے۔ رنگون کی ایک ممتاز شخصیت کشفی شاہ نظامی کسی کام سے لاہور آئے انھوں نے لاہور میں بطور خاص ایڈیٹر پارس سے ملاقات کی اور بتلایا کہ لالہ صاحب کے بارے میں وہ منادی میں خواجہ صاحب کے تذکرے پڑھ چکے ہیں۔ اس لیے لالہ صاحب سے ملاقات کو انھوں نے ضروری سمجھا۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا کے روزنامچے کتنے موثر ہوتے تھے اور کس قدر دلچسپی سے ہر مقام پر پڑھے جاتے تھے۔ مولانا کے ان روزنامچوں کو آج کی صحافت کی تعریف میں میں کالم نویسی قرار دوں گا۔ انگریزی اور دوسری زبانوں کے اخبارات کے کئی ممتاز کالم نویس ہیں۔ افسوس ہے کہ اردو صحافت میں کالم نویسی کے فن میں مولانا حسن نظامی نے جو جگہ چھوڑی تھی وہ خلا باقی ہے اور جسے اب تک پُر نہیں کیا جا سکا ہے یہ اردو زبان اور اردو صحافت کی بڑی خامی یا کمی ہے۔

خواجہ صاحب سے میرا پہلا تعارف ہائی اسکول کی جماعت میں مولوی عبدالحق مرحوم کی مرتبہ کتاب نصاب اردو میں شامل 'دیا سلائی' کے مضمون سے ہوا۔ دیا سلائی جیسے معمولی موضوع پر ہمارے ادب میں ایسا دلچسپ مضمون یا [redacted] اس لیے ایک غیر معمولی قابل ذکر بات ہے کہ ہنوز اردو ادب میں [redacted] کی صنف نے کوئی ترقی نہیں کی۔ اگر یہ کہا جائے کہ خواجہ صاحب نے [redacted] کو جہاں چھوڑا تھا وہ اب بھی وہیں ہے، تو یہ غلط نہیں ہوگا۔

مولانا نے اردو کو ایک مشترکہ کلچر کی بنیاد قرار دیا اور اس کے تحفظ کے



لیے اسے آسان بنانے کی عمر بھر کوشش بھی کی مستقبل کا مورخ یقیناً ان کی ان خدمات کا اعتراف کرے گا۔ منشی پریم چند نے جس طرح اپنی تحریرات سے اردو کو ارتقا بخشا۔ مولانا حسن نظامی نے اس زبان کو عوام سے بہت قریب کر دیا۔ یہی وہ اہم وجہ تھی کہ آسان زبان اور ان کے خاص اسلوب نے ان کے رسائل کو اپنے وقت کی پسندیدہ صحافت بنا دیا۔ آج بھی اگر منادی کے پرانے پرچے پڑھنے کو مل جاتے ہیں تو ہماری نظروں میں اس دور کے حالات کی تصویر متحرک ہو جاتی ہے۔

۔ انگریزی اور علاقائی زبانوں میں کالم نویسی بجائے خود ایک معیاری صنف ہے مگر بدقسمتی سے اردو میں کالم نویسی کو کوئی مقام حاصل نہ ہو سکا۔ منادی کی اگر آج بھی شہرت ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ خواجہ صاحب کی روزمرہ کی ڈائری تھی بلکہ اس کے اندر مسائل بھی ہوا کرتے تھے اور اب بھی اس عصر کے افراد اس جہان میں موجود ہیں جو ان ڈائریوں کے بین السطور میں درج کیے ہوئے حالات و واقعات کا مطلب سمجھتے ہیں اور جن شخصیتوں کا ان کالموں میں تذکرہ پوشیدہ اور چھپا ہوا ہے ان کو پہچانتے ہیں۔ انگریزی صحافت میں آج کالم نویسی نے جو غیرمعمولی ترقی کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کالم نویسی اندازِ فکر اور اسلوب بیان کی خوبیوں کے ساتھ خبر اور تبصرہ دونوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اردو صحافت میں کالم نویسی کا یہ دلچسپ فن ہنوز آدم نو کے انتظار میں ہے۔

خواجہ صاحب اخبارات کی حفاظت سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ خواجہ حسن ثانی اگر خواجہ صاحب کے اپنے تمام اخبارات اور اس عہد کے دیگر اخبارات و رسائل کو اچھی طرح سے محفوظ کرنے کی کوشش کریں تو یہ نہ صرف آرکائیوز کا کام دیں گے بلکہ آنے والی نسلوں کو ان سے یہ ثبوت ملتا رہے گا کہ دوسری جنگ عظیم تک اس ملک کی اہم صحافت صرف اردو زبان ہی کی رہی ہے۔ جسے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔ ویسے بھی یہ اخبارات حال اور مستقبل کی نسلوں کو ہمیشہ یاد دلاتے رہیں گے کہ ترقی کے اس دور میں پھر اردو صحافت کو مولانا آزاد جیسے اداریہ نگار قاضی عبدالغفار جیسے ایڈیٹر اور خواجہ حسن نظامی جیسے کالم نویس کا انتظار ہے تاکہ اردو صحافت کا معیار اپنے ماضی سے کسی طرح کم نہ رہے۔

بقیہ افتتاحی خطبہ

اتفاق کریں گے کہ اگر ہم ان کے عہد کی دلی کی تہذیبی، ادبی، سماجی اور سیاسی زندگی کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ تو خواجہ حسن نظامی کی زندگی اور تصنیفات کا پہلے مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ خاص طور پر ان کے روزنامچوں میں اس زمانہ کی دلی کی جیتی جاگتی تصویریں ہمیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان روزنامچوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں وہ معمولی معمولی اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی حکمت و دانائی کے پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ ایسے واقعات جن کو ہم قطعی غیر اہم سمجھ کر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ان میں وہ نکتہ آفرینی کے جوہر دکھاتے ہیں۔ میں یہاں چند مثالیں آپ کے ملاحظے کے لیے پیش کرنا چاہوں گا۔

۲۲ اگست ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کو درحقیقت یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ ان کے جسم پر بھی زخم پڑے ہوئے ہیں۔ ورنہ وہ بھی اسی طرح بے قرار رہتے جس طرح میں رات بھر مجازی زخموں سے بے قرار رہا۔ اور انھیں بھی راتوں کو نیند نہ آتی اور ان کی غفلت کی نیندیں جاتی رہتیں جو وقت آگے آنے والا ہے وہ مجھے بہت خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ معلوم نہیں مسلمانوں کی غریب قوم کا اس ملک میں کیا انجام ہوگا جس کے رہنما خطرے سے غافل ہیں۔ اور جس کے افراد بےخبر پڑے سوتے ہیں۔ مجھ جیسے اس سرزمین پر ہزاروں کیڑے پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ میں بھی ایک دن ختم ہو جاؤں گا۔ لیکن آئندہ نسلیں یاد کریں گی کہ حسن نظامی نے کیا کہا تھا۔"

ایک دوسرے روزنامچے میں لکھتے ہیں:

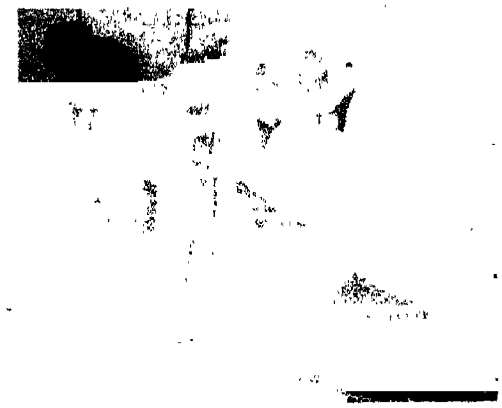
"تانگے میں سواریاں زیادہ تھیں۔ تانگے والے نے کہا کوئی سپاہی نہ ٹوکے۔ میں نے سوچا کہ تانگے والے کو بھی قانون کا ڈر ہے کیا حال ہوگا ان لوگوں کا جو اللہ کے قوانین کا لحاظ نہیں کرتے۔ مجھ سے تو یہ تانگے والا اچھا ہے جو قانون سے ڈرتا ہے اور جو اپنے گھوڑے کو اور تانگے کو اور اپنی سواریوں کو سڑک کے گڑھوں سے بچاتا ہے۔"

ان کی زندگی کے ایسے بیشمار دلچسپ گوشے ہیں جن کے بارے میں ابھی آپ تفصیل سے سنیں گے۔ خواجہ حسن ثانی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے یہ مذاکرہ علمیہ منعقد کیا۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کی ادبی و علمی زندگی کے بہت سے پہلو تاریکی میں لپٹے ہوئے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آج کے اس مذاکرہ میں ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی۔ یہ محض ایک شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرنا نہیں بلکہ اردو زبان و ادب کی اہم خدمت بھی ہے۔

اس مذاکرہ کی اہمیت اپنی جگہ۔ لیکن اس سے زیادہ اہم اس مذاکرہ میں کیے گئے فیصلوں اور تجویزوں کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ حضرت خواجہ صاحب کی بیشتر تحریریں بکھری ہوئی ہیں۔ بہت سی کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ ان کی ترتیب اور اشاعت کی جانب بھی اس مذاکرہ میں توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

خواجہ حسن نظامی بحیثیت انشاپرداز

خلیق انجم
اردو گھر، راؤز ایونیو،
نئی دہلی



خواجہ حسن نظامی جب تک زندہ رہے۔ ان کے پڑھنے والوں کا حلقہ بہت وسیع رہا۔ اہل اردو ان کی تحریروں کے ایسے عاشق اور دلدادہ تھے کہ ان کی بعض تصنیفات کے دس دس بارہ بارہ اڈیشن شائع ہوئے لیکن خواجہ صاحب کی وفات کے بعد ان کے عاشقوں اور مدّاحوں کا حلقہ محدود سے محدود تر ہوتا چلا گیا۔ اور اب یہ حالت ہے کہ ہر اُردو اسکالر، نقاد اور ادیب خواجہ صاحب کی فنی عظمت کا تو قائل ہے۔ لیکن جب پوچھو کہ اس نے خواجہ صاحب کی کتنی کتابیں پڑھی ہیں تو بغلیں جھانکنے لگتا ہے۔ میں یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ آج سے سال ڈیڑھ سال پہلے تک میرا شمار بھی ان بغلیں جھانکنے والے ادیبوں میں تھا۔

یہ مقالہ لکھتے ہوئے میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا۔ کیا خواجہ صاحب کی تحریریں صرف ان کے ہم عصروں کے لیے افادیت اور دلچسپی رکھتی تھیں۔ اور کیا آج نئی نسل کے لیے خواجہ صاحب کی تحریروں نے اپنی معنویت کھودی ہے؟ جس نے بھی خواجہ صاحب کی پانچ سو سے اوپر تصنیفات میں سے صرف تین چار کا بھی مطالعہ کیا ہے وہ میرے اس خیال سے اتفاق کرے گا کہ خواجہ صاحب کی اگر سب نہیں تو بیشتر تحریروں میں ہر نسل کے لیے دلچسپی کا سامان موجود ہے۔

پھر خواجہ صاحب کی ادیب کی حیثیت سے پہلی جیسی مقبولیت کیوں باقی نہیں رہی؟ میرے خیال میں اس کے تین چار وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ جس درسے انھیں عظمت اور شہرت ملی تھی۔ ان کی زندگی بھر کی کمائی اُسی در کی نذر ہو گئی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تصوّف نے انھیں ایک عظیم انسان اور ایک عظیم فنکار بنایا تھا۔ ان کی وفات کے بعد خواجہ صاحب کے وارثین اور ہم جیسے معتقدین کی تمام تر توجہ خواجہ صاحب کی شخصیت کے مذہبی پہلو پر ایسی مبذول ہوئی کہ ہم ان کی شخصیت کے باقی تمام پہلوؤں کو یکسر فراموش کر بیٹھے ہر سال پابندی کے ساتھ عرس تو منایا جاتا رہا لیکن ان کے ادبی وقار کو برقرار رکھنے کے لیے ہم نے کچھ نہیں کیا۔ میں خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے گزشتہ سال سے خواجہ صاحب پر سیمینار کی روایت قائم کی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ خواجہ صاحب جب تک زندہ تھے۔ خود ہی اپنی تصنیفات کی اشاعت کا اہتمام کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی ادبی تصنیفات کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا۔ اگر میں غلط نہیں ہوں، تو خواجہ صاحب کے بعد ان کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نئی نسل ان کی تحریروں سے بالکل محروم رہ گئی۔

آخری اور سب سے بڑی اور سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ ہر بڑے فنکار کو ہر نئی نسل تک پہنچنے کے لیے ایک ایسے نقاد کی ضرورت ہوتی ہے جو نئی بدلتی ہوئی سماجی اور ادبی قدروں کے سیاق میں فنکار کو متعارف کراتا ہے۔ جیسے حالی نے غالب کو ایک نئی نسل سے متعارف کرایا۔ اور پھر اس کے بعد کی نسل سے غالب کا تعارف ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے کرایا۔ غالب خوش نصیب ہیں کہ انھیں ہر نسل میں نقاد ملتے رہے۔ خواجہ صاحب کو ابھی تک کوئی ایسا نقاد نصیب نہیں ہوا ہے۔

ہم سب خواجہ صاحب کے مجرم ہیں۔ اور اپنے جرم کی تلافی صرف اس صورت میں کر سکتے ہیں کہ ایک ایسی لائبریری بنائیں جس میں خواجہ صاحب کی ہر کتاب اور ہر تحریر محفوظ ہو۔ تاکہ جب کوئی خواجہ صاحب پر کام کرے تو اسے تمام چیزیں یکجا مل جائیں۔ ان کی ہر کتاب کا شائع کرنا فی الحال ممکن نہیں لیکن بعض اہم کتابیں اور ان کی بعض تحریروں کے انتخابات شائع کرنا ضروری ہے۔

میں آج خواجہ صاحب کی جن تحریروں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں وہ منادی اور کائنات بیتی میں شائع ہوئے تھے۔ ان مضامین میں خاکے اور انشائیے دونوں شامل ہیں۔

ان نثر پاروں کی سب سے بڑی خوبی ان کا اسلوب بیان ہے۔ ان میں سادگی، بے تکلفی، اور بے ساختگی ہے۔ تکلف اور آورد کا نام و نشان تک نہیں ایسا لگتا ہے جیسے کوئی اپنے دوستوں سے بے تکلف باتیں کر رہا ہے۔ اُردو میں دو نثر نگاروں کی تحریر کا یہ وصف ہے۔ ایک غالب اور دوسرے خواجہ صاحب۔ غالب نے یہ کمال اُردو خطوط میں دکھایا ہے۔ خطوط میں کوئی ایک شخص مخاطب ہوتا ہے۔ اور مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کی ذات سے متعلق کچھ ایسے واقعات

ہوتے ہیں جو موضوعِ سخن بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس انشائیے میں مخاطب ایک نہیں سینکڑوں اور ہزاروں آدمی ہوتے ہیں اور موضوع ایسا ہوتا ہے جس میں صرف مکتوب نگار کے علم، تخیل آفرینی اور جدت اور طرزِ بیان کو دخل ہوتا ہے اور پھر غالب کے مکتوب الیہ پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگ ہیں۔ اس کے برعکس خواجہ صاحب جن لوگوں سے خطاب کرتے ہیں ان میں بہت پڑھے لکھے، کم پڑھے لکھے اور بہت کم پڑھے لکھے غرض ہر ذہنی سطح کے لوگ شامل ہیں۔ اس لیے انھوں نے ایک ایسا اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے جو ہر ذہنی سطح کے آدمی کے لیے دلکشی رکھتا ہے۔

خواجہ صاحب کا اسلوبِ بیان سرسید اور محمد حسین آزاد کے اسالیب کی درمیانی چیز ہے۔ اس میں سرسید کی سادگی اور سلاست اور محمد حسین آزاد کی شگفتہ بیانی اور سجیلا پن ہے۔ سرسید کی طرح خواجہ صاحب کی نثر بہت صاف اور سادہ ہے۔ لیکن وہ تشبیہات اور استعارات کے سہارے نثر کو بہت خوبصورت بنا دیتے ہیں۔ یہاں ایک بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ خواجہ صاحب محمد حسین آزاد کی طرح شاعری کی تشبیہات اور استعارات نثر میں استعمال نہیں کرتے، بلکہ وہ اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی زندگی سے سچی اور کھری تشبیہات کا انتخاب کرتے ہیں۔ آزاد یقیناً صاحبِ طرز انشا پرداز ہیں۔ لیکن ان کی نثر میں جو معنی آفرینی، رنگینی اور شعریت ہے، وہ شاعری اور خاص طور پر "غزل" سے مستعار ہے۔ اس کے برعکس خواجہ صاحب جو لکھتے ہیں۔ وہ نثر اور صرف نثر ہوتی ہے۔ ان کی مرقع کشی میں جو تشبیہات استعمال ہوئی ہیں وہ اُردو کی روایتی تشبیہات نہیں بلکہ خواجہ صاحب کی اپنی زندگی کی حقیقتیں ہیں۔ دیکھیے ماڈرن معشوق کا نقشہ کن الفاظ میں کھینچا ہے۔

> "قد ایسا جیسا اخبار کا کالم، بال ایسے جیسے تنخواہوں کی تخفیف، پیشانی ایسی جیسے وہائٹ پیپر، بھویں ایسی جیسے اسمبلی ہال، پلکیں لکھنے کا باریک نب، آنکھیں ایکشا منرون کے ننھے ننھے دو گلاس، نگاہیں کنزرویٹو گورنمنٹ کی پالیسی، رخسار بالشویک یا سرحدی سرخ پوش، ٹھوڑی برٹش ڈپلومیسی، ہونٹ انگریزی کھانے کی لال جیلی، کمر ہندوستان کا اتفاق، بالوں کی کتر شامیانہ کی جھالر۔ ایسا ضدی جیسے پولس کا سپاہی، ایسا بے وفا جیسے دیسی لیڈر، ایسا ہرجائی جیسے تمباکو اور ایسا منہ چڑھا جیسے چاء کی پیالی، چلتا ہے تو سگریٹ کے دھوئیں کی طرح بل کھاتا ہوا، دیکھتا ہے تو خوردبین بن جاتا ہے، بولتا ہے تو پیانو معلوم ہوتا ہے۔"

اس مختصر سے نثر پارے میں کیا کچھ نہیں ہے، گرد و پیش کی زندگی کا غیر معمولی علم، تخیل کی بلند پروازی، حسنِ انتخاب، شگفتگی، طنز، مزاح، ہم عصر زندگی کے سماجی حالات پر تبصرہ۔ خواجہ صاحب دلّی کے دبستانِ نثر کے سب سے اہم اور بڑے نمائندے ہیں۔ انھیں اُردو زبان پر بھرپور قدرت ہے۔ اپنے مفہوم کی ادائیگی کے لیے انھیں عربی و فارسی کے غیر مانوس الفاظ اور اُردو فارسی کے اشعار استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ زبان پر عبور، علم اور قوتِ مشاہدہ۔ ان تین عناصر کے بل پر انھوں نے بہترین نثر لکھی ہے۔

کسی ایسے مسلمان سے ناراض ہیں جو مسلم دشمن ہے۔ جو غالباً سرکاری ملا ہے اور جس کی ہمدردیاں برٹش گورنمنٹ کے ساتھ ہیں۔ خاکے کا عنوان ہے "نئی روشنی کا فرعون" دیکھیے ان کی جدتِ فکر نے کیسے کیسے ہیرے تراشے ہیں۔

> "ٹھگنا قد جیسے ورزش کا مگدر، موٹا بدن جیسے ڈنلاپ ٹائر کی اشتہاری تصویر، رنگ نہ گورا نہ کالا، نہ گندمی نہ سانولا، نہ پھیکا نہ میٹھا، نہ کڑوا نہ کسیلا بلکہ کالے سفید تلوں کی ملی ہوئی بھوسی کی رنگت ہے۔ چہرہ سلولائٹ ساخت کے کھلونوں سے مشابہ ہے۔ نہ گول نہ کتابی۔ دیکھنے میں انسانی صورت ہے مگر فرشتوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی نہیں بلکہ شداد نے اپنی بہشت بناتے وقت کسی کمہار سے بنوائی ہوگی۔ آنکھیں مگر مچھ کی طرح چھوٹی چھوٹی، نیچے کی طرف جھکی ہوئی۔"

اسے جزئیات نگاری کہتے ہیں اور یہ غیر معمولی قوتِ مشاہدہ کے بغیر ممکن نہیں۔ ان تشبیہات سے ہندوستان کی مٹی کی خوشبو آتی ہے۔ کیونکہ یہ سو فیصد ہندوستانی تشبیہات ہیں۔ ان خاکوں کی بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ خواجہ صاحب انتہائی اختصار اور ایجاز سے کام لیتے ہیں۔ دوسرے لوگ سو صفحے لکھ کر وہ تاثر پیدا نہیں کر سکتے جو خواجہ صاحب ایک ڈیڑھ صفحے کے خاکے میں کر دیتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ شخصیت کے صرف ان چند پہلوؤں کا انتخاب کرتے ہیں جو اُسے عام انسانوں سے مختلف بناتے ہیں۔

خواجہ صاحب کے موضوعات میں اتنا تنوع ہے کہ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اُردو میں کسی نثر نگار نے اتنے مختلف موضوعات پر نہیں لکھا ہے۔ سماجی، اخلاقی، فلسفیانہ مسائل سے لے کر چھوٹی چھوٹی چیزیں تک ان کا موضوع ہوتی ہیں۔ انھیں زندگی سے بے پناہ محبت ہے۔ اپنے گرد و پیش کی ہر چیز سے وہ پیار کرتے ہیں۔ وہ عالم تھے اس لیے ان کا علم وسیع تھا۔ آنکھیں اور دماغ کھلا رکھتے تھے اس لیے مشاہدہ غیر معمولی تھا۔ وہ گوشہ نشین نہیں تھے۔ بلکہ خدا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے والے تھے۔ اس لیے اُن کا تجربہ بے پناہ تھا اب ذرا ان کے موضوعات کا تنوع ملاحظہ ہو:

تاریخی شخصیتوں میں چنگیز خاں، ابولہب، ابوجہل، قارون، فرعون، نمرود اور نوح وغیرہ

غیر مسلم مذہبی شخصیتوں میں رام، سیتا، رادھا، کرشن، گرو نانک وغیرہ

آلاتِ حرب میں تلوار، تیر، کمان، خنجر، ڈھال، بندوق، پستول وغیرہ

جدید سائنس کی ایجادات میں ٹیلیفون، بجلی، لفٹ، ریل کے خطرے کی زنجیر، ٹرام، تار برقی وغیرہ

ذاتی چیزوں میں چادر، لوٹا، لحاف، آبخورہ، بیفس، ہاتھ کی بید

موٹر وغیرہ۔

عام چیزوں میں درانتی، کٹی کاٹنے کی مشین، کھرپا، ہل کی پھالی، گھاس کاٹنے کی قینچی، سوئی، سلائی کی مشین، رندہ، آری وغیرہ

سیاسی رہنما، مختلف فنون کے فنکار، سرکاری ملازم، دوست، رشتہ دار، ملازم وغیرہ

خواجہ صاحب نے مختلف مذاہب اور مختلف صوبوں کے لوگوں کی خصوصیات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے ہندو، مسلمان، سکھ، یوپی والے، پنجابی اور دلی والے جیسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے۔

ان موضوعات کو دیکھ کر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ خواجہ صاحب کے مخاطب عوام تھے۔ نظیر اکبرآبادی کی طرح وہ بھی خواص سے زیادہ عوام میں رہنا پسند کرتے تھے۔ اسی لیے ان کی دلچسپی کی چیزوں کو اپنا موضوع بناتے تھے۔

خواجہ صاحب قلم کے سچے تھے۔ کبھی کسی مصلحت سے مجبور ہو کر حق اور صداقت سے روگردانی نہ کرتے۔ وہ ہر شخص کے بارے میں بہت سوچ سمجھ کر اپنی رائے بناتے اور پھر نتائج کی پروا کیے بغیر بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کر دیتے۔ ان کی بے باکی اور حق گوئی کئی بڑے معرکوں کا سبب بنی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بھک سے اڑ جانے والی ایک قسم کی انسانی بارود ہیں۔ ان کی بول چال میں تحریر میں پنجابی اثر مطلق نہیں ہوتا۔ مگر ان کی اُردو عرب سے بن کر آتی ہے اور فارس کے راستے یہاں پہنچتی ہے۔"

وہ نفع و نقصان کی پروا کیے بغیر سرکاری افسران کے متعلق جو محسوس کرتے تھے لکھ دیا کرتے تھے۔ کسی ہندوستانی سرکاری افسر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"انگریز سرکار کے عشق میں قیس عامری ہیں۔ فرق یہ ہے کہ قیس کو عشق بے نتیجہ نے لاغر کر دیا تھا۔ اور یہ نتیجہ خیز سبب سے فربہ ہو گئے ہیں کہ جس رخ سے دیکھو مساوی نظر آتے ہیں۔"

خواجہ صاحب کو ہر فن سے عشق تھا۔ اس معاملے میں وہ بہت آزاد خیال تھے۔ دہلی کے سید عبدالمتین کے بارے میں لکھتے ہیں:

"انھوں نے یورپ میں فلم کا کام سیکھا ہے۔ اور ہندوستان میں بھی یہ کام کیا ہے۔ مگر اب وہ اسے ظاہر کرتے ہوئے شرماتے ہیں۔ میں نے کہا یہ ایک فن ہے اور مسلمانوں کو حریف قوموں کے فلمی حملوں سے بچانے کے لیے میں خود فلموں میں کام کر کے اس کا دروازہ کھول دینا چاہتا ہوں۔"

آغا حشر کاشمیری کے متعلق لکھا ہے اور یہ بات خواجہ صاحب ہی لکھ سکتے تھے:

"آنے والے ہندوستانی ان کو شیکسپیر سے زیادہ اُونچے درجے پر بٹھائیں گے۔ لیکن ایسا کرنے والے ہندو ہوں گے۔ کیونکہ مسلمان تو یہی سوچتے رہ جائیں گے کہ ڈرامہ نویس کی عزت اور قدر کرنی جائز بھی ہے یا نہیں۔"

خواجہ صاحب فنکاروں کے قدردان تھے۔ انھوں نے بعض فلم ایکٹرسوں کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اداکاری کے فن پر ان کی گہری تنقیدی نظر تھی۔ کجن کے فن پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کی ایکٹنگ میں شوخی و شرارت نہیں ہے۔ بلکہ ایک وقار اور معنوی متانت ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی رفتار اور گفتار میں ایک سلیقہ اور تمیز ہے۔"

سلوچنا کا مرقع ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"میانہ قد، خوب گوری، گداز بدن، چہرہ کتابی، آنکھیں رسیلی، کالی پتلی والی اور بڑی بڑی۔

اس کے حسن کی داد ان الفاظ میں دیتے ہیں:

"وہ انکم ٹیکس لگانے کے قابل ایک دولت ہے اور نیلام کرنے اور شراب فروشوں کو ٹھیکے پر دینے کے لائق دیسی شراب ہے۔ وہ مجسم جوا ہے، ایسا جوا جہاں ہار کے سوا جیت کبھی نہیں ہوتی۔ وہ ایک ایسی قانون شکنی ہے جس کی روک تھام کے لیے کوئی آرڈیننس نہیں بن سکتا۔

خواجہ صاحب کا زمانہ وہ ہے جب مذہب کے نام پر فرقہ پرستی کے شعلوں نے اچھے سے اچھے صاف ذہنوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ خواجہ صاحب کبھی ان شعلوں کی زد میں نہیں آئے۔ کیونکہ انھیں ورثے میں ہندوستان کے عظیم ترین صوفیائے کرام کی وسیع المشربی، انسان دوستی اور رواداری ملی تھی۔ اپنی تحریروں کے ذریعے وہ مذہب کے نام پر جلائی ہوئی اس آگ کو بجھانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے لیکن ان کی آواز ہندوستان کی کروڑوں کی آبادی میں ایک مخصوص حلقے تک پہنچ سکتی تھی اور اس حلقے کی حد تک وہ کامیاب رہے۔ وہ دوسرے مذاہب اور ان کے پیشواؤں کا دل سے احترام کرتے تھے۔ اور اپنی تحریروں کے ذریعے عقیدت کے پھول نچھاور کرتے تھے۔ گرو نانک جی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"سچے خدا کا سچا ولی، توحید کا سمندر، حقانیت کا طوطی، ہزار داستان، پانچ دریاؤں کے ملک میں حواسِ خمسہ کو شیریں گفتار سے درس وحدت دینے والا، سکھ فرقے کا بانی، مگر فرقہ پرستی سے پاک۔"

کرشن جی کے خاکے کے اختتامیہ الفاظ ملاحظہ ہوں:

"رسیلی آنکھ والے، نظر اٹھا، اور نگاہ کا ایک تیر اپنے داس کو بھی کہ وہ بے تابانہ پکارتا ہے۔ اک تیر پھینکتا جا بانکی کمان والے۔"

خواجہ صاحب کا کوئی فلسفہ نہیں تھا۔ ان کے پاس کوئی پیغام نہیں تھا وہ مصلح قوم نہیں تھے۔ وہ تو صرف انسان تھے اور انسان دوستی ان کا مذہب تھا۔ انھوں نے جو کچھ سوچا اور جو کچھ لکھا وہ کسی ایک مذہب یا کسی ایک طبقے کے لوگوں کے لیے نہیں بلکہ ہر انسان کے لیے ہے۔

♣ ♣

مشیر الحق　شعبۂ اسلامک و عرب ایرانین اسٹڈیز　جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

خواجہ حسن نظامی مترجم و مفسّرِ قرآن

خواجہ صاحب دنیائے ادب میں ایک صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں انھوں نے اگرچہ ادب کو "ابلاغ" کے ایک ذریعہ کے طور پر اپنایا تھا، لیکن ان کے معاملہ میں ہوا یہ کہ جو درحقیقت "ذریعہ" تھا وہی آگے چل کر "اصل" قرار پایا حالانکہ اصلاً وہ ایک مبلغ تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی رہے اور جس حال میں بھی رہے اپنے کو مبلغ سمجھتے رہے۔ خواجہ صاحب نے مختلف مذہبی عنوانات پر چھوٹے بڑے، بھاری ہلکے ہر قسم کے مضامین لکھے۔ تصوف کے مسائل حل کیے۔ بخاری شریف کے چند پاروں کو اردو میں منتقل کیا۔ لیکن درحقیقت مذہبی لٹریچر کے میدان میں انھوں نے جو اپنی جگہ بنائی ہے وہ اصلاً قرآن کے ترجمہ اور تفسیر کی وجہ سے ہے

اس صدی کے دوسرے دہے کی ہندوستانی سیاست سے باخبر حضرات اس بات سے واقف ہیں کہ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ایک ایسا دور بھی آیا جب شدھی اور تبلیغ کا غلغلہ مچا ہوا تھا۔ اس موقع پر خواجہ صاحب نے محسوس کیا کہ مذہب سے متعلق بہت سی باتیں محض ناواقفیت کی وجہ سے کہی جاتی ہیں۔ اسی لیے انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ اسلام کے اصل اصول یعنی قرآن کو عام فہم اردو اور ہندی میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا جائے تاکہ لوگ جزوی باتوں میں الجھنے کے بجائے خود اصل کو اپنی زبان میں پڑھ کر سمجھ سکیں۔ ایسا نہیں ہے کہ خواجہ صاحب سے پہلے لوگوں نے قرآن کا ترجمہ نہیں کیا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت کے رائج اردو ترجمے یا تو قدیم زبان میں تھے اور ان میں قرآنی الفاظ کی تراکیب کا اس حد تک خیال رکھا جاتا تھا کہ وہ عام فہم نہیں رہ جاتے تھے یا پھر اتنی بامحاورہ اردو میں تھے کہ پڑھنے والے کو زبان کا لطف بھلے ہی آتا ہو لیکن الفاظ قرآنی سے قربت باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ خواجہ صاحب نے ان دونوں رجحانات کے بین بین راستہ اختیار کیا اور ایک ایسی زبان میں ترجمہ کیا جو لفظی ہونے کے ساتھ ساتھ بامحاورہ بھی تھا۔

قرآن شریف کا ترجمہ کرنے کا خیال خواجہ صاحب کے ذہن میں کیوں آیا۔ اسے انھیں کی زبان میں سنیے۔ اپنی عام فہم تفسیر القرآن کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں:

"میں حسن نظامی، مٹھی بھر خاک، علم و عمل سے تہی دست، عقل و دین سے ہاتھ خالی، میری کیا مجال تھی جو قرآن شریف کے ترجمہ یا تفسیر کا ارادہ کرتا، لیکن مسلمانوں کی موجودہ حالت، اور عام جہالت اور اسلام سے ناواقفیت دیکھتے دیکھتے کلیجہ پک گیا۔ اور یہ خیال بار بار دل میں چٹکیاں لینے لگا کہ کل قیامت کے دن اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ اولیا اللہ رحمہم اللہ جنھوں نے ہندوستان کے کروڑوں آدمیوں کو مسلمان کیا تھا مجھ سے یہ سوال فرمائیں کہ ہزاروں مسلمان ہندوستان میں مرتد ہو گئے اور او بے غیرت تو چپ چاپ بیٹھا رہا .... تو اس وقت میں کیا جواب دوں گا اور مجھے کیسی سخت شرمندگی ہوگی۔"[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شرمندگی سے بچنے اور جوابدہی کے احساس نے انھیں ترجمہ و تفسیر کے کام پر لگا دیا۔ اس وقت کی مروجہ تفسیروں اور ترجموں سے وہ مطمئن نہیں تھے اس لیے انھوں نے "سب خرابیوں کو محسوس کرنے کے بعد ایک تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا اور طے کر لیا کہ میری مخاطب عورتیں ہیں، بچے ہیں، کم لیاقت کے مسلمان ہیں جو تمام مسلمانوں کی تعداد میں آدھے سے بھی زیادہ ہیں، مجھ کو ایسی تفسیر لکھنی چاہیے جو آج کل کی صاف اور سلیس زبان میں تو ہو مگر زباندانی کے محاورے لکھنے کی تلاش میں قرآن شریف کے مفہوم کی ادائگی فوت نہ ہو جائے۔ نہ اس میں بہت زیادہ طوالت ہو، نہ بہت زیادہ اختصار ہو، بلکہ ایسا پیرایہ ہو کہ تفسیر کے الفاظ صرف قرآن شریف کے مطالب اور مقاصد اور احکام اور قوانین کو عام فہم بنا دیں۔"[2]

خواجہ صاحب ہر میدان میں منفرد رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ ترجمہ قرآن کے میدان میں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت پورے طور سے باقی رکھی ہے۔ اس وقت تک ترجمہ اور تشریحی نوٹوں کا رواج اس طرح تھا کہ بین السطور میں تو اردو ترجمہ دیا جاتا تھا اور حاشیوں پر تفسیر و تشریح ہوتی تھی۔ خواجہ صاحب نے اس کے

[1] خواجہ حسن نظامی، عام فہم تفسیر، درویش پریس دہلی ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء ص ۲

[2] ایضاً ص ۵

برخلاف ایک نئی طرز اپنائی وہ پہلے قرآن کی ایک آیت لکھتے ہیں اس کے نیچے شاہ رفیع الدین صاحب کا اردو ترجمہ دیتے ہیں جو اپنی صحت کے اعتبار سے سند کا درجہ رکھتا ہے، اس کے نیچے اپنا ترجمہ دیتے ہیں اور ترجمہ کی عبارت کے ساتھ ہی ساتھ جہاں ضرورت سمجھتے ہیں۔ تفسیری نکات کو قوسین میں لکھتے چلے جاتے ہیں۔ شاہ صاحب کا ترجمہ شائع کرنے کی اصل وجہ تو یہ رہی ہوگی کہ اگر چہ وہ عربی جانتے تھے اور لغت کی مدد لیے بغیر قرآن شریف کا "بے تکان قلم برداشتہ ترجمہ" کر سکتے تھے پھر بھی وہ اپنے کو "مستند اور ضابطہ کا مولوی" نہیں سمجھتے تھے اس لیے احتیاطاً انھوں نے یہ سوچا ہوگا کہ شاہ صاحب کا ترجمہ ان لوگوں کی زبانوں کو بند کر دینے کے لیے کافی ہوگا جو ان کے ترجمہ پر بعد میں "ضابطہ کا مولوی" نہ ہونے کے باعث اعتراضات کی بوچھار کرتے۔ بہر حال جو وجہ بھی رہی ہو۔ یہ خصوصیت انھوں نے ضرور برتی ہے کہ اپنے ترجمہ کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب کا ترجمہ دے کر پڑھنے والوں کو وہ دو ایسے ترجموں سے بیک وقت متعارف کرتے ہیں جن میں ایک صدی سے زیادہ کا فصل ہے۔ میں اس موقع پر صرف ایک آیت کے دونوں ترجمے پیش کر رہا ہوں تاکہ آپ کے سامنے خواجہ صاحب کا طرز انشا پوری طور سے آجائے۔ قرآن شریف میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ اہالیان مکہ کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ رسول خود قرآن کے مصنف ہیں تو تم بھی تو اہلِ زبان ہو ایک سورۃ تصنیف کرکے لاؤ تو ذرا۔ اس آیت کا ترجمہ شاہ صاحب کے الفاظ میں یوں ہے۔

"اور اگر ہو تم بیچ شک کے، اس چیز سے کہ اتاری ہم نے اوپر بندے
اپنے کے، پس لے آؤ ایک سورۃ مانند اس کے، اور پکارو شاہدوں
اپنوں کو، سوائے اللہ کے، اگر ہو تم سچے"

آیت کا ترجمہ دینے کے بعد خواجہ صاحب خود اپنا ترجمہ دیتے ہیں۔ پہلے میں آپ کو صرف ترجمہ سناؤں گا۔ اس کے بعد اسی ترجمہ کو ان کی اس تفسیر کے ساتھ جسے انھوں نے جگہ جگہ قوسین میں بڑھایا ہے سناؤں گا، اس طرح آپ تینوں کے فرق کو بخوبی دیکھ سکیں گے۔ صرف ترجمہ تو یوں ہے:

"اور جو ہم نے اپنے بندہ پر اتارا ہے اس کی نسبت اگر تمھیں
شک ہے تو اس جیسی ایک سورۃ تم لے آؤ اور خدا کے سوا اپنے
مددگاروں کو بلا لو، اگر تم سچے ہو"

اب اسی ترجمہ کو تفسیر کے ساتھ ساتھ سنیے:

اور جو (کلام) ہم نے اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر اتارا ہو
اس کی نسبت اگر تمھیں شک ہے (کہ یہ انھوں نے خود تصنیف
کر لیا ہے خدا کا اس سے تعلق نہیں تو ایک فیصلہ رہا۔ محمد بھی
انسان ہیں اور تم بھی انسان ہو اور یہ ان پڑھ ہیں اور تمھاری
ہمہ دانی کے دعووں کا کچھ ٹھکانا نہیں)، تو اس جیسی (صرف)
ایک (چھوٹی سے چھوٹی) سورۃ تم (بھی بنا کر) لے آؤ اور (تم اکیلے
ہی نہیں)، خدا کے سوا اپنے (کل) مددگاروں (یا معبودوں) کو
(بھی) بلا لو (کہ تمھارا ہاتھ بٹائیں)، اگر تم سچے ہو (تو مقابلہ
میں آؤ) [1]

شاید صوفی ہونے کے ناطے خواجہ صاحب نے یہ بھی طے کیا کہ ہر پارہ کے اخیر میں اس پارہ کی آیات و کلمات کے وہ سینہ بسینہ اور پوشیدہ اعمال و اذکار درج کیے جائیں جو تمام سلاسل کے بزرگان تصوف اور خود ان کے اپنے تجربہ میں آچکے تھے اور جن کا مجموعی انکشاف خواجہ صاحب کے بقول، کسی جگہ اور کسی کتاب میں نہیں ہوا تھا۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ یہ اعمال ہر پارہ کے آخر میں بطور ضمیمہ کے لگا دیے جائیں تاکہ عام فہم تفسیر کے سلسلہ میں وہ خارج نہ ہوں۔

معلوم نہیں کیوں خواجہ صاحب اپنے خیال کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ صرف پہلے پارہ کے آخر میں ۸ صفحات کا ایک ضمیمہ لگایا جس میں سورۂ فاتحہ اور لفظ الف لام میم کے خواص اور اعمال درج کیے ——— لیکن اس کے بعد جو پارے شائع ہوئے ہیں ان میں سے کسی میں بھی ایسا ضمیمہ نہیں ہے۔ خواجہ صاحب نے جب ہر پارہ کے آخر میں اس پارہ کی آیات کے خواص و اعمال کو دینا چاہا تھا تو بعض مشائخ نے انھیں اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی کیونکہ ان کے خیال میں یہ چیزیں عام کرنے کی نہ تھیں۔ اس وقت خواجہ صاحب ان کے خیال سے متفق نہ تھے۔ ممکن ہے پہلے پارہ کے بعد اپنے ہم عصر مشائخ کے اصرار سے مجبور ہو کر انھوں نے اس سلسلہ کو بند کر دینا ہی مناسب سمجھا ہو۔

خواجہ صاحب نے اس تفسیر کو ۶ سال میں مکمل کیا تھا۔[2] ان کے عزیز ترین مرید، ملا محمد واحدی مرحوم نے ۱۹۲۴ء میں جب پہلی بار اس ترجمہ و تفسیر کو شائع کیا تو اس کا نام "عام فہم تفسیر" تھا۔ لیکن ۲۲، ۲۳ برس بعد جب ۱۹۴۶ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن دفتر منادی سے شائع ہوا تو لفظ "ترجمہ" کا اضافہ کرکے اسے "عام فہم ترجمہ اور تفسیر" کے نام سے شائع کیا گیا۔

خواجہ صاحب نے اسی ایک ترجمہ پر بس نہ کیا، اس ترجمہ کے دوران ہی انھوں نے "ہندی جاننے والے مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے"[3] ۱۹۲۲ء میں قرآن شریف کے ایک ہندی ترجمہ اور تفسیر کا کام شروع کر دیا تھا، ۷ برس تک وہ اس ترجمہ پر کام کرتے رہے۔ اس طرح ۱۹۲۹ء میں یہ کام مکمل ہوا۔ جسے پہلی بار ابن عربی کا رکن حلقہ مشائخ دہلی نے ۹۰۰ صفحات پر مشتمل بڑے سائز کی دو جلدوں میں شائع کیا تھا۔ اس ترجمہ میں خواجہ صاحب نے یہ انداز اختیار کیا کہ ہر صفحہ پر ایک گوشہ میں قرآن کا متن دیا اور اس میں بھی یہ ندرت رکھی کہ متن اس "حمائل سائز" قرآن کا فوٹو ہو جو اورنگ زیب کی طرف منسوب ہے۔ اسی متن قرآن کے سامنے انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے مشہور اردو ترجمے کو ناگری رسم الخط میں شائع کیا اس کے ساتھ ساتھ نیچے خود اپنا ترجمہ و تفسیر دی جسے ایک نو مسلم فاضل پنڈت مولانا غلام محمد صاحب (فاضل دیوبند) اور متعدد مسلم و غیر مسلم اہل علم کی مدد سے ہندی میں منتقل کیا گیا تھا[4]

۱؎ ایضاً ص ۱۹
۲؎ نیا ترجمہ خواجہ حسن نظامی (پارہ عم)، دفتر منادی ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء ص ۲۶
۳؎ ہندی ترجمہ قرآن (پارہ عم) کے سرورق کی عبارت۔
۴؎ جائزہ تراجم قرآنی مرتبہ مولانا محمد سالم قاسمی وغیرہ، مجلس معارف القرآن، دارالعلوم دیوبند، ۱۹۶۸ء ص ۱۲۹

ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ کو اردو محاوروں کی بیاض کہا جاتا ہے ۔اس لیے اگر دیکھا جائے تو صرف اس کا رسم الخط بدل دینے سے کوئی فائدہ نہ تھا، لیکن جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا ہے خواجہ صاحب ہر چیز میں کوئی نہ کوئی نیا رخ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔ اپنے اردو ترجمہ میں انھوں نے شاہ صاحب کے اور اپنے ترجمہ کو یکجائی طور سے دیکھ اردو زبان کے ایک صدی کے سفر کی طرف اشارہ کیا تھا تو یہاں ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ کو ہندی رسم الخط میں شائع کر کے ہندی داں طبقہ کو محاوراتی اردو "سے روشناس کرایا ۔

ہندی ترجمہ کے علاوہ خواجہ صاحب نے ہندی زبان میں ایک مفصل تفسیر شائع کرنے کا بھی پروگرام بنایا تھا، انھوں نے اس سلسلے میں ایک ماہر ہندی داں کی خدمات بھی حاصل کرلی تھیں ۔ دو سال کے عرصہ میں سورہ بقرہ کی تفسیر مکمل ہوئی لیکن ضخامت اس قدر بڑھ گئی کہ مصارف کے پیش نظر خواجہ صاحب نے اس کی اشاعت ملتوی کردی اس طرح یہ ہندی تفسیر صرف سورہ بقرہ تک لکھی جاسکی اور وہ بھی ہنوز غیر مطبوعہ ہے[1]

ان دو ترجموں کے علاوہ خواجہ صاحب نے اردو میں ایک اور ترجمہ بھی شائع کیا تھا جسے وہ "لفظی با محاورہ نیا ترجمہ" کہتے تھے ۔اس سلسلے میں انھوں نے لکھا تھا ۔

"میں نے اس ترجمہ میں تحت اللفظ ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے مگر با محاورہ رہنے کا خیال بھی رکھا ہے اور یہ بہت زیادہ دشوار اور مشکل کام تھا، کیونکہ کلام الٰہی ایسی اعلیٰ عربی زبان میں ہے جس کی ہمسری ملک عرب کے فصیح و بلیغ اہل زبان نہ کرسکے تھے ۔ عربی زبان میں عموماً اور قرآن مجید میں خصوصاً طرز ادا کا ایک خاص انداز ہوتا ہے جس کا ترجمہ ناممکن ہوجاتا ہے . . . . الغرض ترجمہ کہیں لفظی ہے، کہیں با محاورہ ہے، ایک روش کی پابندی نہیں ہے "[2]

اس ترجمے میں خواجہ صاحب نے یہ ندرت کی ہے کہ تحت اللفظ ترجمہ کو بین السطور میں شائع کرنے کے بجائے متن قرآن کے چند الفاظ اور ان کے ترجمہ کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں لکھا ہے تاکہ ہر ہر لفظ کا ترجمہ ٹھیک اسی لفظ کے نیچے بآسانی معلوم کیا جاسکے ۔ انھوں نے ایک جدت یہ بھی کی تھی کہ اردو کے الفاظ پر اعراب لگادیے تھے تاکہ جو لوگ اچھی طرح اردو نہیں جانتے وہ بھی اعراب کی مدد سے بآسانی ترجمہ کو صحت تلفظ کے ساتھ پڑھ سکیں ۔

اس مختصر سے مضمون میں خواجہ صاحب کی خدمت قرآنی پر تفصیل سے روشنی ڈالنی ممکن نہیں ہے ۔لیکن اگر چند الفاظ میں ہم اُسے سمیٹنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے مختلف اوقات میں جتنے بھی ترجمے شائع کیے ان میں کوئی نہ کوئی ندرت ضرور رکھی ۔ اپنے ترجموں کی خصوصیات کو نمایاں کرنے کے لیے ساتھ ہی ساتھ ایسے ترجمے بھی شائع کیے جو اپنی طرز میں ایک دوسرے کے بالکل متضاد تھے ۔ رواجی حاشیوں کے بجائے تفسیری تشریحات کو ترجمہ کے ساتھ ساتھ قوسین میں دینے کا رواج ڈالا کہ دونوں الگ الگ بھی رہیں اور پڑھنے میں اکتاہٹ بھی نہ ہو۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب انھیں اپنے ترجموں کی خامیاں نظر آئیں اور انھیں یہ محسوس ہوا کہ مروجہ ترجموں سے قرآن کا مفہوم محدود ہوگیا ہے تو انھوں نے ایک ایسا ترجمہ بھی شائع کیا جس میں قرآن کے اس دعویٰ کو پوری طرح اجاگر کرنے کی کوشش کی کہ قرآن ہر ملک اور ہر زمانہ کے لوگوں کے لیے ہے اور انسانوں کی علمی اور ذہنی صلاحیتوں میں جس قدر اضافہ ہوتا جائے گا قرآن کے نئے نئے معانی ان پر کھلتے چلے جائیں گے ۔

---

[1] جائزہ تراجم قرآنی (مذکورہ بالا) ص ۱۲۳

[2] پارہ عم "قرآن آسان" از خواجہ حسن نظامی مطبوعہ دفتر اخبار منادی ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء، ص ۲۶ ۔

بقیہ خطبۂ صدارت

نگار، ایک مورخ اور ایک تہذیبی علامت کے طور پر تفصیل سے پڑھا جائے اور ان پہلوؤں پر علیحدہ علیحدہ ریسرچ کی جائے تب ان کی رنگارنگ شخصیت کی تہیں کھلیں گی اور ہم جان سکیں گے کہ خواجہ صاحب واقعی کیا کیا تھے ۔ اسی جامعیت اور رنگا رنگی کی وجہ سے ابھی تک خواجہ حسن نظامیؒ کے بارے میں کوئی اچھی تھیسس نہیں لکھی جاسکی ۔ ان کی تصانیف کی کثرت اور موضوعات کے تنوع کو دیکھ کر ابتدا ہی میں طلبا کی ہمت جواب دینے لگتی ہے ۔ خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی کو یہ بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ ان کے بارے میں ریسرچ کے کام کو آگے بڑھایا جائے اور اس کے راستے میں ایسی سہولتیں پیدا کی جائیں کہ تحقیق کرنے والوں کا جی نہ چھوٹے ۔

خواجہ صاحب دہلی کی تہذیب کا سانس لیتا ہوا نمونہ تھے ۔ انھیں دیکھ کر مشرقی تہذیب اور اس کی وضعداری اور سلیقے سے محبت پیدا ہوتی تھی ۔ انھوں نے بھی اس تہذیب کے رکھ رکھاؤ کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس طرح رچا بسا لیا تھا جیسے پھول میں خوشبو یا نسیم سحر میں روانی یا لالۂ صحرا میں شادابی ۔ اس تہذیب کی نمایاں خصوصیات میں وضعداری، سلیقہ، رواداری، انسان دوستی، اخلاقی اقدار پر پختہ یقین، غم گساری، بھائی چارہ اور صلح جوئی ہوتی تھی ۔ خواجہ صاحب ساری عمر اپنی زبان سے اور اپنے قلم کی توانائی سے ان نیکیوں کو عام کرتے رہے ۔ وہ ایک خانقاہی آدمی اور مذہبیات کے عالم تھے مگر ان کے ملنے والوں میں ہر مذہب و ملت کے افراد تھے اور اپنے ہندو، سکھ یا عیسائی معاصرین سے بھی ان کے تعلقات ایسے خلوص، شرافت اور انسان دوستی پر مبنی تھے کہ ان کے قصے سُن کر آج بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ وہ محبتیں، وہ اخلاص، وہ بے نفسی اور ایثار پیشگی، وہ دیانت اور وہ شرافت پھر زندہ ہوجائے، پھر عام ہوجائے ۔اس لیے بھی ہمیں خواجہ صاحب کی زندگی اور تصانیف کے مطالعہ کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے کہ آج ہمارے ملک کو ان اچھی تہذیبی قدروں کی، اس یک جہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہے ۔

مجھے امید ہے کہ اس سوسائٹی کے کارکنوں کی صلاحیت اور ان تھک محنت سے حسن نظامی میموریل سوسائٹی علمی اور تہذیبی اہمیت کے اچھے کام کرے گی اور اس نوعیت کی دوسری انجمنوں کے لیے ایک نمونہ بن جائے گی ۔

عنوان چشتی

شعبۂ اُردو۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی۔

خواجہ حسن نظامی کا اُسلوب

ہر فن پارہ ادیب کی شخصیت، اُس کے ماحول اور میڈیم کی تخلیقی نمود سے وجود میں آتا ہے۔ اگر استعارے کی زبان میں بات کہنے کی اجازت ہو تو میں کہوں گا کہ تخلیق ایک تلوار ہے۔ حُسنِ بیان تلوار کی دھار اور انفرادیتِ حسنِ بیان اس کی دھار کی آب ہے۔ آب تلوار کی دھار کی ہو یا موتی کی بہرحال آب ہوتی ہے۔ اور یہی اسلوب ہے۔

اسلوب پر مصنف کے مقصد، مزاج، مخاطب، موضوع اور مواد کا اثر بھی ہوتا ہے۔ یہ سب عناصر اور عوامل کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر اسلوب کو متاثر کرتے ہیں۔ رینے ویلک اور آسن ویرن نے اسلوب کے محرکات اور عوامل کے باہمی رشتوں کے تناظر میں بحث کر کے اسلوب کی درجہ بندی کی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ لفظ اور موضوع کے رشتوں کے مطابق، اسلوب کو تصوراتی اور حسیاتی، واضح اور مبہم، ایجازی اور اطنابی، جوشیلا اور پُرسکون، ادنیٰ اور اعلیٰ، نیز سادہ اور آرائشی کہا جاسکتا ہے ـــ الفاظ کے باہمی رشتوں کے مطابق، اسلوب کو چُست اور ڈھیلا، چکنا اور کھُردرا، کرخت اور غنائی، رنگین اور بے رنگ قرار دیا جاسکتا ہے۔ الفاظ اور زبان کی باہمی تنظیم کے رشتوں کے مطابق اسے زبانی اور تحریری، روایتی اور منفرد کہا جاسکتا ہے۔ الفاظ اور مصنف کے باہمی رشتوں کے تناظر میں اِسے خارجی اور داخلی اسلوب کا نام دیا جاسکتا ہے۔ غرض ہر قسم کے لسانی اظہار کو اس پر اثر انداز ہونے والے عناصر، عوامل اور محرکات کے پیشِ نظر پہچانا جاسکتا ہے اور اس کی غالب خصوصیت کو سامنے رکھ کر کوئی نہ کوئی نام تجویز کیا جاسکتا ہے۔

لیکن بعض صورتوں میں ایسا کرنا آسان نہیں ہوتا خصوصاً جہاں سارے عناصر پُراسرار طور پر ایک دوسرے سے اشتراکِ عمل کرتے ہوں۔ یا بہت سے عوامل بیک وقت اثر انداز ہوں تو اس قسم کی درجہ بندی مشکل ہو جاتی ہے۔ ایک بات کے حق میں جتنی دلیلیں دی جاسکتی ہیں، اس کے رد میں اس سے زیادہ دلیلیں فراہم کی جاسکتی ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں ایسی ہی استثنائی صورت نظر آتی ہے۔ انھیں جس رُخ سے دیکھیے نیا رنگ نظر آتا ہے۔ اُن کے اسلوب کے سلسلے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ اس پر کس عنصر یا محرک کا غالب اثر ہے۔ اب یہ نقاد پر منحصر ہے کہ وہ خواجہ صاحب کی تخلیق کا آئینہ کس رُخ سے پکڑتا اور ان کے جلوۂ اسلوب کا کون سا نظارہ کرتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں بلا کی وحدت ہے۔ ان کی تحریروں میں مواد اور ہیئت کی دوئی اسی طرح شرک ہے جس طرح وحدت الوجود میں وہم غیریت۔ ان کی تحریروں میں ظاہر و باطن کی یک رنگی اور یکسانیت ہے۔ مگر ان کی یک رنگی کے بہت سے شیڈ اور یکسانیت کے کئی ابعاد ہیں۔ خاکہ ہو یا قلمی چہرہ، روزنامچہ ہو یا خط، مقالہ ہو یا شذرہ سب میں یہی بنیادی خصوصیت جلوہ گر ہے۔ اُردو کے ممتاز صاحبِ طرز ادیبوں میں، خواجہ حسن نظامی اپنے اسلوب کے مخصوص رنگ، مہک اور ذائقے کے سبب بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

خواجہ صاحب کو زبان پر زبردست قدرت حاصل تھی۔ مگر یہ قدرت ہتھکنڈا نہیں کرشمہ تھی۔ کرشمہ اس لیے کہ زبان ان کے یہاں مقصود بالذات نہ تھی بلکہ ذریعہ تھی۔ بلکہ مُؤثر ذریعہ کہیے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے زبان کے نئے امکانات کو تلاش کیا۔ ایک طرف فصاحت و بلاغت کے روایتی تصور کو بدلا اور دوسری طرف زبان کے نئے مزاج کو دریافت کیا۔ انھوں نے عوام اور خواص کی زبان کے فرق کو مٹایا۔ خواص کی باتیں عوام کی زبان میں کیں۔ اور عوام کی زبان کو خواص تک پہنچایا۔ ادبی زبان کے ساتھ بول چال کی زبان کے ذخیرۂ الفاظ سے استفادہ کیا۔ اور مجازی زبان کی بیشتر خصوصیات کو جذب کرلیا۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے زبان کے تمام رنگوں کو ایک دوسرے میں تحلیل کر کے ایک نیا کیفِ مرکب تیار کیا جو ان سے اور صرف انھیں سے مخصوص ہے۔

خواجہ حسن نظامی کے اسلوب اور ان کی زبان کو سادہ، سلیس، عام فہم یا فطری کہنے سے بات نہیں بنتی۔ جیسے جادو کو نیلا، پیلا، کالا کہنے سے کام نہیں چلتا۔ جادو جادو ہے اور کچھ نہیں۔ اسی طرح خواجہ صاحب کی زبان اور اندازِ بیان خواجہ صاحب کا ہے اور بس۔ انھوں نے چھوٹے لفظوں سے بڑے اور معمولی فقروں سے غیر معمولی کام لیے۔ لیکن ایک فنکارانہ خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ ـــ یہ حُسن، زبان کے تخلیقی استعمال کا حُسن ہے۔ وہ اپنے پڑھنے والے کو زبان کی سادگی اور خیال کی رفعت سے اتنا مسحور کر لیتے ہیں کہ نظر اُن کے اسلوبیاتی حربوں تک پہنچ ہی نہیں پاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں بیشتر شعری

محاسن موجود ہیں۔ مگر ایک خاص شعورِ نثر کے ساتھ۔

خواجہ صاحب کے مفرد الفاظ، ان کے مخصوص دروبست، چھوٹے چھوٹے فقروں میں ایک دھیما دھیما ترنم ہے۔ یہ ترنم حروف کی غنائیت، الفاظ کی موسیقیت، تکرار، تجنیس اور مقفیٰ الفاظ کے آہنگ پر مشتمل ہے۔ خواجہ صاحب کے بارے میں اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ وہ "سماع" کے رسیا تھے۔ ریڈیو کی دھنوں پر دادِ تخلیق دیتے تھے۔ موسیقی کا یہی جادو اُن کی تحریروں کی جان ہے۔ یہ آہنگ ان کی تحریروں میں الفاظ کے انتخاب اور فقروں کے دروبست سے اُبھرتا ہے۔ وہ تخلیقی رو میں، کئی کئی پُرآہنگ فقرے مسلسل لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اور بعض اشعار بھی نوکِ قلم پر جاری ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ جذبے کی شدت اور خیال کے بہاؤ کا فطری نتیجہ ہوتے ہیں، آرائشی نہیں۔ مثلاً خواجہ صاحب نے "بھگت کے بس میں آ بھگوان" میں لکھا ہے؛

"شوکت والے۔ طاقت والے۔ توپوں اور سنگینوں والے
دُکھ کے کرتا، سُکھ کے سروپ، تیرے بھوکے تیرے پیاسے
یہ ہے اچھا تُو ہو پاس، پھول بھی تو خار بھی تیرا۔ نور
بھی تو نار بھی تیری، آنکھیں میری سب کچھ تیرا۔ نین کے
اندر ڈیرا تیرا۔ بس میں آ بھگوان"۔[1]

قطع نظر اس سے کہ اس اقتباس میں مقفیٰ الفاظ کا متواتر آہنگ ہے۔ مگر اس میں نثری آہنگ سے زیادہ نمایاں آہنگ بھی موجود ہے۔ عروضی اصطلاح میں اس کو فعلن فعلن یا فعل فعولن کی تکرار کا آہنگ کہا جا سکتا ہے۔ پورا اقتباس اسی نوعیت کا ہے۔ "مدنی شیام سُندر کی مرلی" کا آغاز اس طرح ہوا ہے؛

"شام نے مُرلی بجائی کس طرح — بج گئی گھر گھر دہائی کس طرح
ہر کی مُرلی ہر کے اندر باجتی — ہر کی ہے ہر سے رسائی کس طرح
زلفوں والے پیتم پیارے یثرب باسی موہن کنہیا کی بانسری کے
بلہاری۔ حجازی پربت پر کھڑے ہو کر ایسی بجائی کہ جنم جنم کے
دکھ کلیش دور ہو گئے"۔[2]

یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ ان اقتباسات میں جو "باقاعدہ آہنگ" اور اشعار ملتے ہیں وہ کسی شعوری کاوش کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ جذبے کے دباؤ، خیال کے بہاؤ اور لاشعور کی تُھمک کا نتیجہ ہیں۔ اور اسی لیے ان کی نثر کے مزاج سے بُنیادی طور پر ہم آہنگ ہیں۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ اُس کا ناگزیر حصہ ہیں۔

ہر فن پارہ پُراسرار تخلیقی عمل سے گزر کر وجود میں آتا ہے۔ فن کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اُس سے محرکاتی عناصر بڑی حد تک غائب ہو کر ادراکی عناصر کو جنم دیتے ہیں۔ ادراک، جذبے اور تخیّل کی لہروں میں تبدیل ہو کر فن کو فن بناتا ہے، خواجہ صاحب کی تحریروں میں جذبات کا وفور اور تخیّل کا نور ہے۔ جذبے سے فن میں گرمی اور روشنی پیدا ہوتی ہے۔ تخیّل سے گہرائی اور گیرائی۔ افکار کی تازگی کے لیے جذبہ ضروری ہے اور اس کی بالیدگی کے لیے تخیل۔ تخیّل ادراک اور جذبے کی لہروں کو نئی صورتیں عطا کرتی اور نئے سانچوں میں ڈھالتی ہے۔ چنانچہ خواجہ صاحب کے اسلوب میں جذبے کا وفور اور تخیّل کا نور تخلیقی زبان کی صورتوں میں جلوہ گر ہے۔

ان کے یہاں اپنی بے پناہ ترسیلی قوت کے باوجود، زبان ایک طرف قواعد کے سخت اصولوں سے بے نیاز ہے اور دوسری طرف تشبیہوں، استعاروں، کنایوں، پیکروں اور علامتوں کا گہوارہ ہے۔ بادی النظر میں یہ سارے حربے شاعری کے حربے ہیں۔ خواجہ صاحب کا کمال یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں میں الفاظ کا لوہا موم کی طرح پگھلنے لگتا ہے اور اظہار کے خالص شعری سانچے نثری سانچے بن گئے ہیں۔ ان کے بیان کی سادگی اور زبان کی معصومیت ان شعری لوازمات کی طرف متوجہ ہونے نہیں دیتی۔ جو بنیادی طور پر اُن کے اُسلوب کی دِل کشی اور انفرادیت کی اساس ہیں۔ "کانا باتی" کے دیباچے میں اپنی تحریروں کے بارے میں لکھا ہے:

"بجلی کی کلیں، لہروں کے پروں پر، میری آواز کو بٹھا کر ساری دنیا میں پھیلا دیتی ہیں۔ پہاڑوں میں، دریاؤں میں، شہروں میں، ہر جگہ میری آواز جاتی ہے۔ میری آواز سورج کی دُھوپ اور چاندنی اور ہوا کی طرح ہر جگہ پہنچ جاتی ہے۔
اپنی آواز کو ہر جگہ پہنچتا دیکھ کر مجھے ماننا پڑتا ہے کہ خدا بھی ہر جگہ موجود ہو سکتا ہے۔"

اس اقتباس میں لہروں کے پروں پر آواز کا بیٹھنا اور اس کا دھوپ اور چاندنی بن جانا خالص استعاراتی اظہار ہے۔ مگر یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ انھوں نے غیر شعوری طور پر شعری استعاروں اور نثری استعاروں کے فرق کو ملحوظ رکھا ہے۔ ان کی تحریروں میں جو استعارے اور تشبیہیں ہیں، وہ مبہم اور دُھندلے نہیں۔ شفّاف اور مائل بہ وضاحت ہیں۔ اور جزوی طور پر آرائش کا کام بھی کرتے ہیں۔ استعاروں کا یہ نثری استعمال ان کے شعورِ اسلوب اور مزاجِ تحریر کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

خواجہ صاحب زبان، (الفاظ) سے رنگوں کا کام لینے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں منظر نگاری کو محاکات اور محاکات کو متحرک اور مسلسل پیکروں کے ذریعہ مصوری سے آگے پہنچایا ہے۔ ان کے ایک مضمون "سمندر چاند میں" کا ایک منظر نامہ اس طرح ہے؛

"میاں سمندر کی ہوس دیکھو چاند کو آغوش میں لینے کی خاطر کیا کیا نشیب و فراز دکھا رہا ہے۔ بیچاری بھولی بھالی چاندنی دام میں آ کر قریب آتی ہے تو وہ ایک لمبا سانس لے کر پکڑنے کو لپکتا ہے۔ وہ بچ کر بھاگتی ہے، تو آپ جوش میں بھرے ہوئے پیچھے دوڑتے ہیں۔ مگر وہ ہاتھ نہیں آتی، اور چمکتی جھلکتی صاف نکل جاتی ہے۔"

یہاں سمندر کو اژدہا اور چاندنی کو چڑیا کہا گیا ہے۔ یہ خالص استعاراتی اندازِ بیان ہے۔ اور تمثیلی بھی۔ سمندر کا اپنی ہوس کی تسکین کے لیے تعفن آمیز لمبا سانس لینا اور جوش میں بھر کر اُس کے پیچھے دوڑنا اور بھولی بھالی چاندنی کا اس کے دامِ ہوس سے بچ کر بھاگنا اور چمکتی جھلکتی ہوئی صاف بچ کر نکل جانا ایک ایسا منظر نامہ ہے جو زنجیر کی کڑیوں کی طرح پیکروں کو ایک خاص لڑی میں پرو دیتا ہے۔ ان پیکروں کی

---

[1] سی پارۂ دل، ص ۴۸۔ [2] سی پارۂ دل، ص ۱۰۲۔

نوعیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ متحرک اور رنگین ہیں - اور ان کا مزاج تیز عمل خالص شعری نہیں بلکہ نثری ہے ــــــ یہ بات غور طلب ہے کہ یہاں سمندر اور چاندنی کیا واقعی محض سمندر اور چاندنی ہیں ؟ اگر اتنی سی بات ہے تو کوئی خاص بات نہیں ــــــ واقعہ یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے سمندر اور چاندنی کو ذی روح اشیا کے افعال اور اوصاف سے متصف کیا ہے اس لیے یہ دونوں دو متضاد کیفیتوں اور قوتوں کے نمائندے ہیں - سمندر ہوس اور ظلم کی، چاندنی معصومیت اور شرافت کی نمائندگی کرتی ہے - خارجی سطح پر ان کے جو معانی ہیں وہ تو ہیں ہی۔ مگر داخلی سطح پر معانی کی ایک اور زیریں لہر ہے جو دراصل فنکار کے بنیادی مقصد کی ترجمان ہے - اور جو قاری کے ذہن پر تلازموں کی مدد سے ایسے دروازے کھولتی ہے جہاں سے خیر و شر کی کشمکش صاف نظر آتی ہے - خواجہ صاحب کے اسلوب کا کمال یہ ہے کہ اس سے ایک طرف ذہن کو جمالیاتی انبساط اور دوسری طرف بصیرت حاصل ہوتی ہے - ایسی بصیرت جو شر سے نفرت دلاتی اور خیر کی طرف مائل کرتی ہے۔

خواجہ صاحب کے اسلوب کا کمال وہاں نقطۂ عروج کو پہنچتا ہے جہاں انھوں نے اسرارِ معرفت کو رنگ مجاز میں پیش کیا ہے اور تصوف کے حال کو مقام اور مقام کو حال بنا دیا ہے - شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے جس فلسفے کو علمی انداز میں پیش کیا تھا - خواجہ صاحب نے اس کو تخلیقی رنگ میں پیش کیا ــــ تصوّف کا ایک خاص مسئلہ وجود اور موجود کی نسبت کی نوعیت کا ہے - مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ وحدت الوجودی نقطۂ نظر کے تحت یہ رشتہ عالم و معلوم، خالق و مخلوق کا ہوتے ہوئے بھی "عینیت" کا ہے - اگرچہ وجود اور موجود ایک سے زیادہ نہیں - مگر موجود تنزّلات اور تعینات کی صورت میں نمودار ہے - اس لیے نظری ہی سہی دوری اور جُدائی لازم ہے - جدائی بہرحال جدائی ہے - خواجہ صاحب نے مجازی اور حقیقی جدائی کا تقابل کرتے ہوئے "الف خالی" میں لکھا ہے :

> "آہ اب خالی ہوں - بچے بھی خالی کہہ کر پکارتے ہیں - اس کی دو قسمیں ہیں - پہلی قسم اس ہجر کی ہے جس میں آرزوے وصل ہوتی ہے - اور دوسری وہ ہے جو وصل کے بعد پیش آتی ہے - یہ بہت سخت اور ناقابلِ برداشت ہے - پہلی قسم میں شوق اور اشتیاق ہوتا ہے، ارمانوں کے ولولے طوفان اٹھاتے ہیں، آنکھوں کو رُلاتے ہیں - آنسو برساتے ہیں، دل میں تڑپ ہوتی ہے، امیدیں پھڑکتی ہیں، مگر یہ تکلیف نہیں ہوتی جو وصل کے بعد پیش آتی ہے - وہ گزشتہ شوق کو سامنے لاتا ہے - تخیّلات و تصورات کے نقشے بنواتا ہے - اُن کے ہاتھوں میں چھُریاں دیتا ہے - اور دل و جگر پر چرکے دلواتا ہے۔" [6]

ظاہر ہے کہ یہاں ہجر کی پہلی صورت مجازی اور دوسری حقیقی ہے - ہجر کی حقیقی صورت تصوف کی اصطلاح میں مرتبہ تنزّلات و تعینات ہے - یہ مرتبۂ ذات سے مرتبۂ صفات کا سفر ہے - جسے عارفوں نے جسم، دل اور روح کی منزلوں سے اور بعض نے عالم ناسوت، عالم جبروت، عالم لاہوت اور عالم ہاہوت کے مقامات سے تعبیر کیا ہے۔

۶ سی پارۂ دل، ص ۲۶۸،

خواجہ صاحب نے مرتبۂ صفات جسم اور ناسوت کی منزل کو ہجر قرار دے کر موجود کا وجود سے رشتۂ عینیت ظاہر کیا ہے اور انسان کو "عشق الٰہی" کا درس بھی دیا ہے - مجاز کے آئینے میں حقیقت کی تصویریں سجانا خواجہ صاحب ہی کا کام ہے - خواجہ صاحب نے "الف خالی" ہی میں ایک اور جگہ لکھا ہے :

> "حروف جتنے ہیں سب اپنے حال میں مست ہیں - ایک دوسرے کا کوئی شریک نہیں - الف کو ب سے غرض نہیں - ب، ت سے سروکار نہیں رکھتی - ت، ج اور دال سے بے تعلق ہے - لیکن مکانی مقابلہ پیش آتا ہے تو یہ سب حروف آپس میں مل جاتے ہیں اور موقع موقع کی کمین گاہوں میں پرے جما کر نمودار ہوتے ہیں۔" [7]

یہاں ذرا سا غور کرتے ہی معانی کی کئی تہیں نمودار ہوتی ہیں - اس کا سبب یہ ہے کہ اس اقتباس میں الف - ب محض الف - ب نہیں بلکہ علامتیں ہیں - ان حروف کا علامت ہونا اس امر سے بھی ظاہر ہے کہ یہاں یہ نہ لغوی معانی رکھتے ہیں، نہ ہی دلالتِ وضعی کے تحت آئے ہیں - بلکہ یہ بعض روحانی، ماورائی اور وجدانی تصورات کی نمائندگی کرتے ہیں ــــــ پہلی نمائندگی تصوف کی سطح پر اور دوسری سماجی احساس کی سطح پر ــــــ تصوف کی سطح پر الف - ب - ج - د - ل "تکثر کی نشانیاں ہیں۔" لیکن مکانی مقابلہ پیش آتا ہے تو حروف آپس میں مل جاتے ہیں" 'وحدت' کی طرف اشارہ ہے - گویا خواجہ صاحب نے اپنے خاص رنگ میں وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کی طرف اشارہ کیا ہے ــــ سماجی احساس کی سطح پر الف - ب - ج د مختلف افراد ہیں لیکن "امکانی مقابلہ" کے موقع پر "پرے جما کر نمودار ہوتے ہیں" تو ایک عظیم الشان انسانی معاشرے کو جنم دیتے ہیں - ا - ب - ج - د - ل طلسمی حروف بن گئے ہیں جو اقتباس کے مخصوص سیاق و سباق میں تلازموں کی ایک دلکش قوسِ قزح بناتے ہیں -

خواجہ حسن نظامی کا فن مواد اور ہیئت کی ایک ایسی ناقابلِ تقسیم اکائی ہے جس میں جذبات کا وفور اور تخیّل کا نور ہے - اسلوب کے سارے عناصر اور عوامل ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئے ہیں۔ جس سے جمالیاتی کیفیت اور روحانی بصیرت حاصل ہوتی ہے ــ اور اسلوب کی لسانی سطح پر خواجہ صاحب کا اسلوب شعری حربوں یعنی استعاروں، پیکروں، علامتوں اور تمثیلی انداز کا آئینہ دار ہے - مگر نثر کی بے پناہ ترسیلی قوت کے ساتھ ــ

آخر میں اپنی گفتگو خواجہ صاحب کے ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں :-

> "میں مضامین کے عنوان اور کتابوں کے نام رکھنے میں کمال رکھتا ہوں۔ اگرچہ میرے بعض مضامین کے عنوان اور کتابوں کے نام چھچھورے کہے جاتے ہیں، اور بھاری بھرکم اور باوقار لوگ ان کو وقعت سے نہیں دیکھتے - مگر میں ان کے وقعت کرنے کا محتاج ہونا نہیں چاہتا - وہ وقعت کریں یا نہ کریں - میں جس آنے والے زمانے کے لیے یہ جدّتیں کرتا ہوں وہ ان چیزوں کی وقعت کرے گا۔" [8]

کیا یہ پیشین گوئی اس سیمینار کی موجودگی میں حرف بحرف صحیح ثابت نہیں ہو رہی ہے ؟ ●●

۷ سی پارۂ دل، ص ۲۸۴ - ۸ کانا باتی (دیباچہ)

سلطانہ شرف الدین احمد اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن ، حیدر آباد

خواجہ حسن نظامی ایک صاحب طرز ادیب

یہ ۱۹۵۴ء کی بات ہے وہ اپنے ایک معتقد کے ڈرائنگ روم میں تشریف فرما تھے ۔ زرد چغہ ، مخروطی ٹوپی ، سیاہ وسفید زلفیں ، ریش دراز اور اچھے نقوش والے ، کتابی چہرے پر عینک ۔ مجھ پر بڑا رعب پڑا ، شاید اس لیے کہ مجھے کبھی کسی مرشد سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا تھا ۔ اور پھر یہ بھی خیال تھا کہ مرشدوں کے آگے عورتیں نہیں جاتیں ۔ میں ہچکچاتی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی کہ کچھ اور خواتین نظر آئیں جو خواجہ صاحب کے آگے سر ڈھانکے مودّب بیٹھی ہوئی تھیں ۔ میں سہمی سہمائی اس خالی نشست پر بیٹھ گئی جو اتفاقاً بالکل سامنے ہی تھی ۔ مجھے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ خواجہ صاحب کی گفتگو میں سارے جہاں کے موضوعات شامل تھے ۔ سماجی ، ادبی ، سیاسی اور ظریفانہ ۔ وہ خالص دہلی والوں کے مہذب اور شائستہ لب و لہجہ میں بات چیت کر رہے تھے ۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہر فرد سے مخاطب ہوں ۔ میری جان میں جان آئی ۔ ورنہ سوچ رہی تھی روحانیت ، تصوف اور مذہب کے دقیق مسائل پر اظہار خیال ہو رہا ہوگا اور بھلا مجھ سے طفل مکتب کے کیا پلے پڑیں گی ساتھ ہی وہ ہنستی ہوئی تحریر یاد آگئی جو " جھینگر کے جنازے " کے نام سے نصاب میں شامل تھی ۔ بے اختیار وہ مصرعہ بھی ذہن میں جاگ اٹھا " جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے " ۔ یہ مصرعہ اس زمانے سے میرے حافظہ میں محفوظ تھا ۔ جب عاشق اور اس کے ہر دل عزیز جنازے کا مفہوم حاشیۂ خیال میں بھی نہ آ سکتا تھا ۔

اس دور کے ادیب اور انشا پرداز عالموں اور ذہنی لحاظ سے بلند ہستیوں کے لیے لکھا کرتے تھے ۔ ان کا مخاطب سماج کا وہ مخصوص طبقہ تھا جنھیں صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے ۔ جن موضوعات سے یہ تحریریں تعلق رکھتی تھیں وہ علمیت اور فلسفیانہ عناصر کی حامل تھیں جنھیں عوام سمجھنے سے قاصر تھے ۔ عوام کی سطح فکر پیش نظر رکھ کر لکھنے والے آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھے ۔ مگر خواجہ صاحب نے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی زندگی ہی سے اپنی تحریروں کے لیے مسالہ فراہم کیا ۔ وہ حقیر اور کم قدر اشیا جنھیں کوئی بڑا اہل قلم لائق اعتنا ہی نہ سمجھتا تھا خواجہ حسن نظامی کو دعوتِ تحریر دیتی رہیں اور ان کے قلم کی گرفت میں ایسی آئیں کہ انھیں لافانی بنا دیا ۔ جیسے مچھر ، لال ٹین ، پسینہ ، جھینگر ، فٹ بال ، سوئی ، اُلّو ، اوس ، مکھی وغیرہ

ایسے کم حقیقت عنوانات پر قلم اٹھا کر خواجہ صاحب نے ادیبوں کے لیے وسیع اور نئی راہیں کھول دیں ۔ ادب کو سینکڑوں نئے عنوان عطا کیے ۔ اور بے شمار کم حیثیت اشیا کو اپنی طرز نگارش سے سرفرازی عطا کی ۔

ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی خواجہ صاحب نے وہ تفصیل بتائی ، ان میں وہ نکات پیدا کیے ۔ مطالعہ کی گہرائی اور مشاہدہ کی وسعت اور باریکی کا ایسا ثبوت دیا کہ قلم کار انگشت بدنداں رہ گئے ۔ ملاحظہ کیجیے مضمون لالٹین سے ایک اقتباس :

> " ایک رات میں نے لال ٹین سے پوچھا " کیوں بی ، تم کو رات بھر کے جلنے سے کچھ تکلیف تو نہیں ہوتی ۔ بولی آپ کا خطاب کس سے ہے ؟ بتی سے ، تیل سے ، ٹین کی ڈبیہ سے ، کانچ کی چمنی سے یا پیتل کے اس تار سے جس کو ہاتھ میں لے کر لالٹین کو لٹکائے پھرتے ہیں میں تو بہت سے اجزا کا مجموعہ ہوں ۔ لالٹین کے اس سوال سے دل پر ایک چوٹ لگی ۔ یہ میری ایک بھول تھی اگر میں پہلے اپنے وجود کی لال ٹین پر غور کر لیتا تو ٹین اور کانچ کے پنجرے سے یہ سوال نہ کرتا "

معمولی معمولی چیزوں پر قلم چلتے چلتے ایسے موتی بکھیرنا ، ایسے نکات کا بیا جن میں انسانوں کے لیے اخلاقی درس ہوتا ، کوئی پند و نصیحت کی بات ہوتی اور یہ پنا نصائح انسانی فطرت کے گہرے مطالعہ ، ان کے اپنے ہر جہتی طویل تجربۂ حیات او غور و فکر کا حاصل تھیں ۔ جن کا اصلی منشاء اصلاح " تھا نصیحتیں صبر آشنا طبیعتو پر بھی بار گزرتی ہیں ۔ مگر خواجہ صاحب جس پیرائے میں کڑوی سے کڑوی بات کہ جاتے ہیں جس انداز میں سبق پڑھا جاتے ہیں ۔ وہ انسانوں کی خود پرستی پر ناگوا نہیں گزرتا ۔ کیونکہ شکر میں لپٹی گولیاں بدمزہ نہیں محسوس ہوتیں ۔ بس قلم ہے نکتہ سے نکتہ اور بات سے بات نکالتا ہوا آگے بڑھا چلا جاتا ہے ۔ اتنے معنی نکالتے ہوئے خواجہ صاحب آگے بڑھتے ہیں کہ نصیحت تاثیر لے آتی ہے اور دما کچھ نہ کچھ سوچنے اور عمل کرنے پر راضی سا دکھائی دینے لگتا ہے " گلاب تمھار کیکر ہمارا " میں رقمطراز ہیں ۔

> " کیکر کا پھول گلاب کے پھول سے لاکھ درجہ اچھا ۔ گلاب کا پھول ایک دن کی تیز دھوپ میں کمھلا اور مرجھا جاتا ہے اور کیکر کا

پھول ہنستوں سورج کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور آج کل تعریف اس کی
ہے جو دشمن کے مقابلے میں زندہ سلامت رہے۔"

خواجہ صاحب کی تحریر بآوازِ بلند کہتی ہے کہ میں ایک بے لوث صوفی بزرگ کی ہم نشین رہ چکی ہوں۔ اس پر صوفیانہ چھاپ نمایاں ہے۔ تصوف کا رنگ چوکھا دکھائی دیتا ہے۔ صوفیوں جیسی متانت، سنجیدگی، بردباری جیسے خواجہ صاحب کے مزاج کا خاصہ تھی وہی تحریر کے مزاج میں بھی داخل ہے۔ آپ صوفیانہ نکتے اسی انداز میں بیان فرماتے ہیں۔ مثلاً اپنے مضمون "من کر ایک دھوبی" میں ارشاد فرماتے ہیں:

"کپڑے دھوتے۔ ساری عمر دریا کے کنارے گزر گئی۔ مگر اپنا
آپا میلا کا میلا رہا۔ صاف ستھرے اور اچھے پیا کی نظروں میں
میری کیا قدر ہوگی۔ اور اس تک کیونکر پہنچنا نصیب ہوگا۔"

خواجہ صاحب کا دور ایک دم توڑتی ہوئی تہذیب کا دور تھا۔ اقتدار چھن چکا تھا۔ عیش و راحت کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ شہزادے، امراء اور جاگیردار مصیبتوں کی زد میں آچکے تھے۔ شبستان ویران ہوئے جا رہے تھے نیا تمدن جنم لے رہا تھا۔ لباس، تعلیم، معاشرت اور اخلاق کی پرانی قدریں ناپسندیدگی کی حد کو پہنچ گئی تھیں۔ سوچ، بچار اور طرزِ فکر میں انقلابات دکھائی دے رہے تھے۔ خواجہ صاحب ڈوبتی تہذیب کی افسردہ کہانیاں۔ محلوں کی غمناک تصویریں اور شہزادوں کی عبرتناک بدحالیاں قریب سے دیکھ رہے تھے۔ بجھتے ستاروں کے ڈوبتے اجالے ان ہی کے پاس سے گزر رہے تھے زوال کا روپ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ ان سے آنکھیں نہ بند کر سکتے تھے۔ وہ حساس شخصیت کے مالک تھے۔ ہر طرف منتشر حالات سے وہ جذباتی اور ذہنی لحاظ سے متاثر تھے اس کے علاوہ وہ خود بھی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بھگت چکے تھے۔ بہت کچھ کھکھیڑیں اٹھائی تھیں۔ اس لحاظ سے بھی وہ غم آشنا تھے۔ ان سب ذاتی تجربات اور شخصی مشاہدات کا اثر تھا کہ ان کی تحریریں احساسِ درد و غم سے مملو نظر آتی ہیں۔ راشد الخیری اس صفت میں ان کے شریک نظر آتے ہیں۔ یہ ان کے قلم کی سحر طرازی تھی کہ "بیگمات کے آنسو" اور غدر دہلی کے افسانوں میں سوز و اثر سمو دیا ہے۔ ان کے افسانے مغلیہ خاندان کے افراد کی مصائب سے بھرپور داستانیں، ادب اردو میں غیر معمولی مقام رکھتی ہیں۔ سچ پوچھیے تو ان ہی اثر انگیز افسانوں کی وجہ سے خواجہ صاحب کو بہت زیادہ مقبولیت نصیب ہوئی۔

خواجہ صاحب کے زمانے میں ایک نئی معاشرت وجود میں آرہی تھی۔ ایک ایسی تہذیب و سیاست کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا جس نے ڈوبتی کرنوں میں شفق کی سرخی ہی نہ دیکھی تھی اس سیاسی انقلاب سے ابھرنے والے نتائج اور دور رس اثرات تک بھی ان کی نظر پہنچتی ہے وہ اس پر بھی غور و فکر فرماتے۔ اسی لیے خواجہ صاحب کے مضامین میں آنے والے زمانے کے حالات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ وہ قیامت کی چال والے زمانے کے تیور بھی خوب پہچانتے تھے



قدیم تہذیبی قدروں پر قائم رہتے ہوئے بھی انھوں نے انقلاب کا ساتھ دیا۔ ادب اور زندگی سے خلوص برتنے والے انشا پرداز کی تحریروں میں ایسی حقیقتوں کی جھلکیاں لازمی طور سے دکھائی دیتی ہیں جن کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے۔

سارے ہندوستان میں خواجہ صاحب کے روزنامچوں کی بڑی دھوم تھی وہ عوام میں اس قدر مقبول تھے کہ بن پڑھے لکھے لوگ بھی دوسروں سے پڑھوا کر سنتے اور لطف اٹھاتے۔ اردو ادب میں روزنامچے کی ایجاد کا سہرا خواجہ صاحب کے سر ہے۔

بڑی شخصیتوں کے قلمی چہروں کو بڑی عمدگی سے لفظی تصویر کا لباس پہنایا ہے جنھیں پڑھ کر ان حضرات کے چہرے مہرے، شخصیت اور مزاج کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اردو ادب میں یہ بھی ایک بے مثل اضافہ ہے۔ مہاتما گاندھی، علامہ اقبال اور مولانا آزاد کے علاوہ اور بہت سے معاصرین کے حلیے اوراقِ کتاب میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ تخیل کی آنکھ ان کی جیتی جاگتی اور بولتی شخصیتوں کو دیکھ لیتی ہے۔ ادب کی تاریخ اس نایاب اضافے سے خواجہ صاحب کی ہمیشہ مشکور رہے گی۔

خواجہ صاحب نے اردو ادب کو ایک منفرد طرزِ تحریر عطا کی۔ اظہارِ خیال کا ایسا انداز ایجاد کیا جس کی آج تک کوئی پیروی نہ کر سکا۔ سیدھے سادے الفاظ، مختصر سے جملے، واضح خیال۔ ہر قسم کی تحریریں یہی سہل ممتنع اسلوب بیان نمایاں ہے سفرنامے، روزنامچے، آپ بیتی، مضامین، افسانے، خطوط اور داستانیں آپ کی تحریر کا سرمایہ ہیں۔ جن کی تعداد لگ بھگ پانچ سو تک پہنچتی ہے۔ قلم برداشتہ لکھتے اور کثرت سے لکھتے۔ شعبۂ حیات کے سب ہی پہلو آپ کے قلم کی زد میں آگئے۔ ان کے لکھنے کا فن اکتسابی سے زیادہ وہبی تھا۔ اسی لیے سمندری موجوں کی سی آمد دکھائی دیتی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی طرح عبارت کی رنگینیوں میں حقائق گم نہیں کر دیتے۔ اور نہ مولانا آزاد کی طرح بلندیوں سے گرتے ہوئے آبشاروں کا پُرشکوہ نغمہ سنائی دیتا ہے۔ آپ کی موثر طرزِ نگارش اور حسین ٹکسالی زبان سادگی کا آنچل اوڑھے ایسی دلکش معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی چپکے سے بھی نظر اٹھالے تو متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بقول نصیر الدین ہاشمی "اس اسلوب کے خواجہ خود موجد تھے اور اپنی منفرد شان رکھتے تھے۔ آپ کے اسلوب بیان کی حلاوت، لوچ، سادگی، رنگینی، بانکپن، ندرت، لطافت اپنی آپ نظیر ہے کسی کے اسلوب میں اتنی ساری باتیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں اور پھر یہ کہ کوئی اس کی نقل بھی نہیں کر سکتا۔"

فضل المتین چشتی

درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح۔ اجمیر

خواجہ حسن نظامی

دلّی، جو ہندوستان کا دِل ہے، اِس دِل کی بستیوں میں ایک بستی ۔ بستی نظام الدین بھی ہے۔ یہ کبھی غیاث   پور کہلاتی تھی، مگر آج دِلّی کے دولہا کی سیج کے سبب اُس دولہا کے نام کی مناسبت سے اس کی بستی کہلاتی ہے اِس بستی میں جن لوگوں نے بستی بسائی ہے ان سے آشنائی پیدا کرنا، فضلِ خداوندی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جملہ عروسی محبوبِ الٰہی اور دربارِ دُربار امیر خسرو، کی اہمیت مسلّم —— سب ہی واقف —— مگر ذرا اِس بستی کے ایک گوشہ چبوترۂ یاران کا رُخ کیجئے۔ قدم قدم پر رُوح کانپ جاتی ہے۔ پاؤں رکھنا روا نہیں معلوم ہوتا، جی چاہتا ہے سر کے بل چلا جائے۔

اِسی متبرک، مقدس اور محترم بستی میں ایک برادری آباد ہے (خدا اسے آباد و شاد رکھے) یہ وہ برادری ہے جس کے اجداد کا تعلق اس بستی کے بسیا سے تھا اور آج جن کی اولاد اس بستی کے بسیا کی آرامگاہ سے اپنا تعلق برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اِسی برادری میں ۲۵ دسمبر ۱۸۷۸ء مطابق ۲ محرم ۱۲۹۶ھ میں ایک بچّے نے جنم لیا۔ گھر کے لوگوں نے علی حسن نام رکھا، مگر دنیا والوں نے اسے خواجہ حسن نظامی کے اسمِ گرامی سے جانا۔ اِس بچّہ نے بچپن سے بڑھاپے تک اپنی زندگی کے طویل دور میں عسرت و تنگدستی سے لے کر فارغ البالی اور عیش و عشرت کے عجیب عجیب رنگ دیکھے۔ نفرت و حقارت اور چاہت و پرستش کے نئے نئے جذبات کا اندازہ کیا۔ اور اپنے احساسات کے سہارے کامیاب زندگی کے صبر آزما اور دلربا راستوں کی صعوبتوں اور راحتوں سے گذرتے ہوئے آخر ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء کے وقت اس منزل کو پا لیا جو ایک مردِ مومن کا مقصودِ حقیقی ہوتی ہے وہ اپنی زندگی میں کبھی بے حیثیت تھا اور کبھی اس کی اہمیت تھی، مگر آج اس کی آخری آرام گاہ اس کے سبب مرکزِ عقیدت ہے، اس مرکزِ عقیدت پر جشنِ عرس منایا جاتا ہے۔ منایا جا رہا ہے۔ منایا جاتا رہے گا۔

میں نے خواجہ صاحب کی مستقل تصانیف اور مضامین سے زیادہ ان کے خطوط اور روزنامچوں کو پڑھا ہے۔ خطوط اور روزنامچوں میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ دونوں کی حیثیت نجی یادداشت اور نجی گفتگو کی ہوتی ہے۔ نجی گفتگو جاننے اور نجی یادداشت معلوم کرنے میں ایک خاص لُطف ملتا ہے اور یہ لطف کا تقاضہ ہی تھا کہ میرے لیے خواجہ صاحب کے خطوط کے بعد خواجہ صاحب کے روزنامچوں کی اہمیت تھی اور میں ان کے روزنامچوں کا متلاشی رہتا تھا۔ جہاں اور جب ملے پڑھنے کی کوشش کی اور معلومات حاصل کیں۔

خواجہ صاحب کے روزنامچے اپنی انفرادیت اور ندرت کے اعتبار سے اہم ہیں بظاہر ان سے متعلق ہیں۔ لیکن ان کی ذات سے متعلق یہ روزنامچہ اپنا رشتہ کائنات سے قائم کئے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان میں ذات و کائنات کے مظاہر جلوہ گر ہیں۔ خواجہ صاحب کی خلوت و جلوت کے تذکرے بہت سوں کی رُوداد سُناتے ہیں، ان کی اپنی باتیں، سب ہی کی باتیں ہیں۔ اِن کے مسائل، معاملات اور غم ہمارے اور آپ کے سب ہی کے مسائل معاملات اور غم ہیں۔ اس لیے ان کے روزنامچوں سے وہ روشنی ملتی ہے جو ہمارے اندھیرں کو اجالا بخشتی ہے۔ ان کے روزنامچے ان کی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔

میری نظر میں ان کی تمام تحریروں میں ان کے روزنامچے قدرِ اوّل کی چیزیں ہیں۔ اِن کے روزنامچوں میں ان کی انشاء نگاری، وسعتِ نظر، طرزِ فکر، ہر ایک کی آئینہ داری اِن کی ذات کے وسیلہ سے کائنات کے اظہار کے ساتھ ہوئی ہے۔ اور اس طرح وہ ایک بےمثال انفرادیت لیئے ہوئے ہمیں دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے زندگی کو ہر رنگ میں دیکھا تھا۔ دکھ سکھ جھیلے تھے، نشیب و فراز سے گذرے تھے، یہی سبب ہے کہ انہوں نے زندگی کو جان لیا تھا پہچان لیا تھا مسلسل سفر، تفکر اور مشاہدے نے اور تصوّف کے ذریعے مذہب کی اقدار کے مطالعے نے انہیں ہوشمند، غیور، دردمند اور انسان و کائنات سے محبت کرنے والا بنا دیا تھا، ذہین طباع اور حسّاس نظر آتے تھے۔ وہ خوبیاں جو ان میں تھیں اور پیدا ہو گئی تھیں اور وہ ذرائع جو انہیں حاصل ہوئے تھے ان کے سبب اگر وہ چاہتے تو سیاست کی دنیا میں اپنا ایک اہم مقام حاصل کر سکتے تھے۔ یا پھر ان کے حالات انہیں اس راہ پر ڈال سکتے تھے۔ جو منزل تصوف کی مخالف سمت جاتی ہے مگر ایسا نہیں ہوا، ان کے گھرانے کی روایت اور آستانہ محبوب الٰہی سے وابستگی نے انہیں اس راستہ پر چلایا جو تصوف کی منزل کو جاتا ہے اس راستہ پر ان کے نقوشِ قدم آج بھی کتنے ہی انسانوں کی رہنمائی کر رہے ہیں۔

خواجہ صاحب کی زندگی عجیب امتزاج اور تضاد کی حامل تھی۔ ایک طرف حلقۂ ذکر و فکر کی مجلسیں تھیں۔ تصوف کی تعلیم و تلقین کا سلسلہ تھا۔ وہ پیرِ طریقت تھے، دوسری طرف دنیاداری کے جھمیلے تھے، کامیاب تجارت کے تقاضے تھے۔   تاجر تھے۔ ایک طرف وہ ادیب تھے، صحافی تھے، خطیب تھے۔ دوسری طرف کسی نے انہیں اخبار سے پہچانا اور ایک انشاء پرداز کی حیثیت سے جانا۔ کسی نے انہیں تاجر سمجھا اور کسی نے انہیں پیرِ طریقت مانا۔ ان کی رنگارنگ شخصیت کے متضاد پہلوؤں میں مطابقت پیدا کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ترکِ دنیا کے لیے انہوں نے وہ راہ اپنائی جو ان کے آقائے ولی نعمت اور ان کی محبوب شخصیت حضور محبوبِ الٰہی کی تعلیمات اور عملی زندگی سے سامنے آتی ہے۔ خواجہ صاحب نے رُوحانیت اور مادیت کے تقاضوں کی تکمیل اس طرح کی تھی کہ ان کی زندگی دنیا کے لیے بھی تھی اور دین کے لیے بھی، وہ سب کے ساتھ تھے مگر اپنا نصب العین پیشِ نگاہ رکھے ہوئے اپنی انفرادیت لیے ہوئے۔ اسی لیے وہ ہر مجلس کی رونق تھے، ہر ایک کی توجہ کا مرکز تھے۔ ان کا رنگ بہت سے افراد نے اختیار کیا مگر کسی کا رنگ ان پر نہیں چڑھا۔ وہ اپنے رنگ کے آپ نمائندہ تھے۔

Sixth International
Film Festival of India
New Delhi

ہندوستان کا چھٹا
بین الاقوامی فلمی میلہ

جس میں ۵۸ ملکوں کے نمائندوں
نے شرکت کی۔ اور تقریباً ۲۵۰
فلمیں دکھائی گئیں

۳ جنوری ۱۹۷۷ء کو وگیان بھون میں چھٹے فلمی میلے کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر اطلاعات ونشریات سری ودیا چرن شکلا نے کہا کہ فلم ایک نہایت طاقتور وسیلہ ہے جس کے ذریعے ہم تجربے، کامیابیاں اور ناکامیاں، غم اور خوشی کا اظہار کرسکتے ہیں۔ یہ محض تفریح کا ذریعہ نہیں۔

(تصویر میں دائیں سے بائیں) سری ستیہ جیت رے، چیرمین آف دی جیوری۔ سری ودیا چرن شکلا، وزیر اطلاعات۔ سری سید مظفر حسین برنی، سکریٹری وزارت اطلاعات، اور جیوری کے دوسرے ارکان

چھٹے بین الاقوامی فلمی میلے
میں شرکت کرنے والے
غیر ملکی مندوبین

Regd. No. D(D)103



"دہلی سے دور لیکن دل سے قریب"

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ۲۶ دسمبر کو تین روزہ دورے پر جزائر لکادیپ گئی تھیں۔ (تصویر میں) انڈروتھ کے عوام کے ساتھ۔ یہاں تقریر کرتے ہوئے آپ نے عوام سے کہا کہ بھلے ہی آپ دہلی سے دور ہیں مگر دل سے قریب ہیں۔ یہاں آپ رفاعی سلسلے کے بزرگ صوفی سید عبیداللہ الرفاعی کے مزار پر تشریف لے گئیں جو ساتویں صدی ہجری میں یہاں آئے تھے۔

Vol.35 No.7 A J K A L (Monthly) February 1977

Published by the Director Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001.
Printed by Skylark Printers, 11355, Idgah Road, New Delhi-110055.



صدر جمہوریۂ ہند جناب فخر الدین علی احمد مرحوم کے جنازے کے جلوس کا ایک منظر



ماتم

فخرِ قوم و وطن کا ماتم ہے
نازشِ انجمن کا ماتم ہے

گل فسردہ ہیں غنچہ اُداس
باغبانِ چمن کا ماتم ہے

بلبلیں چپ ہیں قمریاں خاموش
روحِ سرو سمن کا ماتم ہے

آسمانِ وطن ہے گردآلود
آفتابِ وطن کا ماتم ہے

بجھ گیا اک چراغ دیدہ وری
فکر کے بانکپن کا ماتم ہے

روحِ غالب سے آرہی ہے صدا
قدردانِ سخن کا ماتم ہے

بزم کی بزم سوگوار ہے آج
رونقِ انجمن کا ماتم ہے

آدمیت کو ناز تھا جس پر
اسی فخرِ وطن کا ماتم ہے

حق پرستی شعار تھا جس کا
اسی باطل شکن کا ماتم ہے

—— رفعت سروش ——

ترتیب

سرورق : مرحوم فخر الدین علی احمد صدر جمہوریہ ہند

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۳۵ ــــ شمارہ ۸

مارچ ۱۹۷۷ء

پھالگن چیت شک ۹۹-۱۸۹۸

شرح چندہ

سالانہ	دس روپیہ	۳ ڈالر	۱٫۵۵ پاؤنڈ
دوسالہ	سترہ روپیہ	۵ ڈالر	۲٫۵۵ پاؤنڈ
سہ سالہ	۲۴ روپیہ	۷ ڈالر	۳٫۶۰ پاؤنڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	۳۰ سینٹ	۱۵ پنی

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آجکل معرفت پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ایک روشن دیا تھا نہ رہا

صدر جمہوریہ ہند جناب فخرالدین علی احمد ۱۱ فروری ۱۹۷۷ء کو صبح ۸ بجکر ۵۲ منٹ پر انتقال کر گئے۔ انھیں دل کا دورہ پڑا تھا۔ بروقت طبی امداد کے باوجود وہ جانبر نہ ہوسکے۔ اور اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کی عمر ۷۱ برس کی تھی۔

وہ ۱۳ مئی ۱۹۰۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے ان کے والد ذوالنور علی احمد پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے انڈین میڈیکل سروس کا امتحان پاس کیا تھا۔ آپ کی والدہ رقیہ سلطان بیگم نواب زین الدین خاں عارف کی پوتی تھیں۔ وہ اپنے والد کے ہمراہ چار سال گونڈہ (یوپی) رہے اور پانچویں سے آٹھویں تک وہیں تعلیم حاصل کی۔ والد کے تبادلے کے بعد دہلی آئے اور یہیں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ سنٹ اسٹیفن کالج دہلی سے ایف۔ اے کیا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے کیمبرج (انگلستان) چلے گئے۔ ۱۹۲۷ء میں ہسٹری میں ٹرائی پاس کیا اور ۱۹۲۸ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ چونکہ ان کے والد آسام کے تھے اور ان کی آبائی جائداد وہاں تھی اس لیے کلکتہ اور گوہاٹی ہائی کورٹ میں پریکٹس کرنے لگے۔ ۱۹۳۱ء میں کانگریس میں شامل ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں مسلم لیگ کے خلاف آسام اسمبلی کا الیکشن لڑے اور کامیاب ہوئے۔ ۱۹۳۷۔۴۵ء تک کانگریس کے ٹکٹ پر آسام کی ریاستی اسمبلی کے رکن رہے۔ ۳۹۔۱۹۳۸ء میں گوپی ناتھ باردولی کی وزارت میں وزیر مالیات مقرر ہوئے۔ وزارت کے ساتھ آپ بھی مستعفی ہوئے۔ انفرادی ستیہ گرہ میں حصہ لیا۔ ایک سال کی سزا ہوئی۔ گاندھی جی کی تحریک "کرو یا مرو" کے تحت گرفتار ہوئے اور اس مرتبہ ۳½ سال جیل میں رہے رہائی کے فوراً بعد انھیں دوبارہ آسام کا وزیر مالیات مقرر کیا گیا۔ اسی زمانے میں آپ کی شادی بیگم عابدہ احمد سے ہوئی جو اسعد کے مشہور افسانہ نگار جناب سلطان حیدر جوش کی صاحبزادی ہیں۔

آپ کی ایک لڑکی بیگم ثمینہ خان اور دو لڑکے پرویز علی احمد اور بدر دُرریز علی احمد ہیں۔

۲۹ جنوری ۱۹۶۶ء کو مرکزی کابینہ میں وزیر آبپاشی اور بجلی مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں کے لیے وزیر تعلیم رہے۔ تین سال تک وزیر صنعت رہے جون ۱۹۷۰ء میں وزیر زراعت و خوراک مقرر ہوئے۔

۲۴ اگست ۱۹۷۴ء کو جمہوریہ ہند کے پانچویں صدر کی حیثیت سے آپ نے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔

ملک میں کھیل کود کو بڑھاوا دینے میں آپ نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

انھیں اردو زبان و ادب سے بے حد دلچسپی تھی۔ غالب صدی تقریبات کی کامیابی میں آپ کا بہت ہاتھ تھا۔ غالب کی شایانِ شان یادگار "ایوانِ غالب" آپ ہی کی رہینِ منت ہے۔

آپ کی موت کی خبر سنتے ہی سارا ملک رنج و غم میں ڈوب گیا۔ دنیا کے بہت سے ملکوں سے تعزیتی پیغامات موصول ہوئے اور درجنوں ملکوں کے نمائندوں نے صدر مرحوم کے جنازے میں شرکت کی۔

آپ کو نئی دہلی کی جامع مسجد نزد پارلیمنٹ ہاؤس کے پاس دفن کیا گیا

ان کی موت ایک عظیم قومی سانحہ ہے۔ وہ نہایت عظیم و شریف انسان سچے محبِ وطن اور فرض شناس اور انسان دوست شخص تھے۔ اور اپنی نیکی اور حسنِ اخلاق کے لیے برسوں یاد رہیں گے ؎

ایثار، اتحاد، محبت، خلوص، پیار
اک زندگی تھی کتنی علائم کی پاسدار

"عظیم ہندوستانی، شریف انسان اور سچے مسلمان"

وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا:

"مجھے سخت صدمہ پہنچا ہے اور میں دفورِ غم سے اتنی نڈھال ہوں کہ اپنے جذبات کے اظہار سے قاصر ہوں۔ صدر احمد کی موت سے ہندوستان کے عوام اور حکومت کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔

وہ ایک عظیم ہندوستانی، نہایت شریف انسان اور سچے مسلمان تھے اور ہماری روایات کے بہترین مظہر تھے اور ایک انسان دوست، مہذب اور منکسر مزاج شخص تھے۔ ذاتی طور پر میں ایک دوست اور ساتھی سے محروم ہو گئی ہوں جس نے ہماری قومی زندگی میں امتیازی حصہ لیا ہے۔"

ریڈیو سے اپنی نشری تقریر میں بھی وزیر اعظم نے صدر مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور کہا کہ وہ بڑے اونچے اصولوں کے حامل تھے۔ انھوں نے بڑی وفاداری سے اور بہت دنوں تک ملک کی خدمت کی۔ وہ ایک سچے مسلمان تھے اور مذہب کے ان اعلیٰ اقدار کے حامل تھے جو تمام مذاہب کی روح ہیں۔ وہ سیکولرازم کی روشن مثال تھے۔ ادھر کچھ دنوں سے ان کی صحت ٹھیک نہیں تھی اور جب بھی میں نے تشویش کا اظہار کیا تو انھوں نے ٹال دیا اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں جٹے رہے۔ حالیہ غیر ملکی دورے میں ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی مگر جب وہ واپس آئے تو بڑے بشاش لگتے تھے۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا آخری وقت اتنا نزدیک ہے۔

وزیر اعظم نے فرمایا کہ ان کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ انتخابات پُرامن اور خیرسگالی کے ماحول میں ہوں تاکہ ہمارا جمہوریہ ہر لحاظ سے مضبوط اور طاقتور ہو۔

ساغر نظامی
ڈی ۲/۰ - ۳۵۹ پنڈارہ روڈ، نئی دہلی

انسان دوستی کا پیمانہ

(مرحوم صدر جمہوریہ ہند)

وہ آبروئے شہر حکیمانہ چل بسا
آئینہ دارِ بزمِ ادیبانہ چل بسا
وہ آبروئے طرزِ غریبانہ چل بسا
قائم تھی جس سے شانِ کریمانہ چل بسا
اب حل کرے تو کون کرے زیست کے نکات
محکم تھی جس کی طرزِ فقیہانہ چل بسا
ہر سانس جس کی شانِ وطن پر نثار تھی
ماتم ہے ہر طرف کہ وہ پروانہ چل بسا
پھولوں میں رنگ و بو ہے نہ سبزے میں تازگی
جانِ بہار و طلعتِ ویرانہ چل بسا
پرتو سے جس کے خاکِ وطن بھی گلاب تھی
جنت تھا جس کے لمس سے ویرانہ چل بسا
پیاسوں کو جس نے جامِ اخوت عطا کیا
بادہ کشو وہ ساقیٔ میخانہ چل بسا
تھی جس کی ہر نگاہ مئے سرمدی کا جام
وہ آرزوئے ساقی و میخانہ چل بسا
تھا جو سرورِ مہر و محبت کا جامِ جم
انسان دوستی کا وہ پیمانہ چل بسا
دیوانگی کو جس کے تفکّر پہ فخر تھا
دیوانے کہہ رہے ہیں وہ فرزانہ چل بسا
فرزانگی کو جس کی فراست پہ ناز تھا
ہر سمت شور ہے کہ وہ دیوانہ چل بسا
اک داستانِ درد ادھوری ہی رہ گئی
کہتا ہوا وہ شوق کا افسانہ چل بسا

ساغرؔ جس سے روپ تھا بادہ میں جس سے کیف
وہ آبروئے ساغر و پیمانہ چل بسا

حسن نعیم
ڈی ۵۵/۶، ساؤتھ ایکسٹنشن، پارٹ ۱، نئی دہلی

مثنوی: فخر الدّین علی احمد

زمینِ شور میں گُل کا وجود، اُس سے ہے
نسیم عشق و بہارِ سجود، اُس سے ہے
وہی دلوں میں شرارِ خیال رکھتا ہے
تمام حسن میں اپنا جمال رکھتا ہے
کسی کو خاک، کسی کو نگیں بناتا ہے
ہر ایک شخص کو کب فخرِ دیں بناتا ہے
بہت سے اور بھی خوش بخت زندگی لائے
مگر نہ سینۂ احمد کی روشنی لائے
اس اک ستون سے تھے کتنے سائباں آباد
اس اک درخت سے تھے کتنے آشیاں آباد
چمک رہے تھے در و بامِ دلّی و آسام
وہ کیا گیا کہ ہوئی شامِ دلّی و آسام
وہ نیکیوں کا پیمبر، شبیہِ شفقت تھا
دیارِ ہند کی خوشبو، صبائے ملّت تھا
سخن میں، طرز میں، کچھ ایسی جاں نوازی تھی
وہ صدر تھا تو ہر اک سر کی سرفرازی تھی
خموشیوں میں تحمّل کی نغمگی ضم تھی
ملی جو دادِ قیادت وہ ہر طرح کم تھی
وفا کے لفظ کو توقیر دی سیاست میں
جنوں کا رنگ دکھایا قبائے رحلت میں
اب اس کی یاد سے روشن ہے شعر کا قالب
جہانِ فکر ہے "ایوانِ میرزا غالب"

ملاحظات

دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت

اٹھائیسویں یوم جمہوریہ کے موقع پر صدر جمہوریہ ہند جناب فخرالدین نے آل انڈیا ریڈیو سے قوم کو آخری بار مخاطب کیا تھا۔ ذیل میں اس کے اقتباسات درج کیے گئے ہیں۔

"بھارت کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ٹھیک ہی کہا گیا ہے۔ ہمارے وطن میں جمہوریت کی جڑیں بڑی گہری اور مضبوط ہو چکی ہیں، ہماری جمہوریت اپنی کامیابی کے راستے میں ایک اور منزل طے کرنے والی ہے۔ لوک سبھا کے چناؤ جلد ہونے والے ہیں۔ پارلیمانی جمہوریت کو اس کے اختیارات اور حقوق عوام کی مرضی سے حاصل ہوتے ہیں جنھیں سرکار چننے کا پورا اختیار حاصل ہے۔ ہماری جنتا نے ہر مرتبہ اپنی سیاسی پختگی کا ثبوت دیا ہے۔ ہمارے چناؤ کا نظام غیر جانب داری اور دیانت داری کے اعلیٰ معیار کے لیے مشہور ہے۔ میں سبھی سیاسی پارٹیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ الیکشن کے دوران تلخی اور نفرت کے جذبات سے دور رہیں اور ملک میں امن اور شانتی کا ماحول قائم رکھنے میں مدد کریں۔ تشدد اور بدنظمی جمہوریت کے اصول کے متضاد ہے۔

ہم نیا سال امید اور بھروسے کے ساتھ شروع کر رہے ہیں۔ سرکار کے مضبوط اور طے شدہ اقدام اور جنتا کے پرجوش تعاون سے ملک کے تمام شعبوں میں بہت ترقی ہوئی ہے۔ اناج کا تسلی بخش وافر اسٹاک موجود ہے۔ کالے دھن اور اسمگلنگ کے خلاف اور صنعتی صلاحیت کے پورے استعمال، اناج کی موثر وصولی اور برآمدات کے بڑھانے کے لیے لگاتار کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ صنعتی پیداوار کی شرح اس سال دس فی صد بڑھی ہے جو اب تک سب سے زیادہ ہے۔ اس سے بھی زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ بجلی پیدا کرنے، کوئلے، فولاد، کھاد، نیوز پرنٹ، سیمنٹ اور المونیم جیسی ضروری صنعتوں کو بڑھاوا دینے میں کافی ترقی ملی ہے۔ پبلک سیکٹر میں خاص طور پر نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ ان سب سے افراطِ زر کے دباؤ پر قابو پانے میں بہت مدد ملی ہے جب کہ دنیا میں افراطِ زر میں اضافے کا عام رجحان ہے۔ دیش واسی اس کامیابی پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس کے علاوہ دیش اس شعبے میں بھی کافی آگے بڑھا ہے جو اب تک زیادہ ترقی یافتہ ملکوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا تھا۔

ہمارے دیش نے منصوبہ بند ترقی کا راستہ اپنایا ہے۔ منصوبہ بندی کا صحیح مقصد یہ ہے کہ وسائل کو اچھی طرح سوچے سمجھے پروگراموں میں لگایا جائے میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ اپنی منصوبہ بندی پر نظرثانی کی جائے اور اس کی بنیاد زیادہ سے زیادہ اپنے وسائل پر مبنی ہو۔ کیوں کہ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے عوام اور سماج کے کمزور طبقوں کے معیار زندگی کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ایسے پروگراموں کی تکمیل کے لیے افرادی قوت اور دیگر وسائل سے کام لینا ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ فضول خرچی کو سختی سے روکا جائے۔ ترقی، انصاف اور خود کفیلی جو ہماری منصوبہ بندی کے آدرش ہیں تبھی حاصل ہو سکیں گے جب کہ ان میں نہ صرف سچی لگن اور شرکت ہو بل کہ سب کو برابر کے مواقع بھی لازمی طور پر حاصل ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ملک کو مناسب اور مبنی بر انصاف سماج کی طرف لے جانے کے لیے یہ مواقع پوری طرح میسر ہوں گے۔

آج کی نسل پر یہ تاریخی ذمہ داری آتی ہے کہ وہ سبھی کے دلوں میں خواہ وہ کسی مذہب، علاقے یا فرقے کے ہوں، تحفظ اور خود اعتمادی کا احساس پیدا کرے۔ حب الوطنی کا صحیح جذبہ جس میں نفاق پیدا کرنے کے رجحان کے لیے کوئی جگہ نہ ہو۔

ملک کی وسعت اور گوناگونی کے باوجود عرصۂ دراز سے بھارت نے اپنی ایکتا اور انفرادیت کو بنائے رکھا ہے اور مختلف تہذیبی عناصر کے میل جول سے، صحت مند اور خوش گوار قومی جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اپنے دیش واسیوں سے کہوں گا کہ وہ اس عظیم روایت کو برقرار رکھیں اور اسے فروغ دیں اور بھارت کو ترقی یافتہ اور خوش حال بنائیں۔"

اردو کتابوں کی اشاعت

ایک اندازے کے مطابق ۱۹۷۶ء میں اردو کی لگ بھگ چار سو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ یہ تعداد ہر لحاظ سے امید افزا ہے۔ حسب سابق سب سے زیادہ تعداد میں شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ اور شعری مجموعوں میں سب سے زیادہ غزلیات کا حصہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں غزلیں کتنی مقبول ہیں۔

ناول اور افسانوں کے مجموعے بہت کم شائع ہوئے ہیں۔ تنقیدی اور تحقیقی کتابوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اور ایسی کتابیں تو انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں جو برسوں کی محنت اور غور و فکر اور تلاش و تحقیق کا نتیجہ ہوں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے ارباب فکر و دانش اس روایت کو آگے بڑھائیں۔ غزلیں ضرور شائع ہوں مگر اس کے ساتھ ساتھ طویل نظمیں، تمثیلیں اور منظوم ڈرامے بھی شائع ہوں۔ تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ

کسی ایک موضوع پر جامع کتابیں لکھی جائیں تحقیق کے نام پر جو تحقیقی مقالے شائع ہوتے ہیں ان میں سے اکثر اعلا معیار کے حامل نہیں ہوتے۔ ہمارے پورے کلاسیکی ادب کے از سر نو جائزے کی ضرورت ہے۔ رسائل اور سمینار کے مضامین اکثر موضوع کا حق ادا نہیں کرتے۔

سائنسی اور علمی موضوعات پر بہت کم کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ترقی اردو بورڈ، مختلف اکادمیوں اور اداروں کو اس طرف خصوصی توجہ کرنی چاہیے نصابی ضرورتوں سے قطع نظر عام آدمیوں کے لیے مفید اور معلوماتی کتابیں بھی شائع کرنی چاہییں۔

ایسا نہیں ہے کہ اردو کی کتابیں بکتی نہیں ہیں۔ علمی اور ادبی کتابیں اب شائع ہو رہی ہیں تو ان کی مانگ بھی بڑھ رہی ہے۔ مگر ایسی کتابوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اردو کے ناشرین اور قارئین دونوں کو چاہیے کہ اردو کو ایک علمی اور سائنسی زبان بنانے اور ان موضوعات کی کتابوں کو اردو میں مقبول بنانے میں اشتراک کرلیں

پبلیکشنز ڈویژن کی پانچ ہزارویں کتاب

پبلیکشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات و نشریات، حکومت ہند گزشتہ ۲۲ برس سے کتابیں شائع کر رہا ہے۔ اس دوران اس نے ۵ ہزار کتابیں شائع کی ہیں جو انگریزی، ہندی اور اردو کے علاوہ ہندوستان کی تقریباً تمام علاقائی زبانوں میں ہیں۔

جدید ہندوستان کے معماروں کا ایک سوانحی سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کے تحت ممتاز افراد کی زندگی اور کارناموں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ کی ۴۴ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ہماری ۵ ہزارویں کتاب مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ عرش ملسیانی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب کا اجرا نائب صدر جمہوریہ ہند سری بی۔ ڈی۔ جتی کے ہاتھوں ۸ فروری ۱۹۷۷ء کو عمل میں آیا۔

۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا آزاد کا انتقال ہوا تھا۔ ان کی انیسویں سالگرہ کے موقع پر ہمارا خراج عقیدت ہر لحاظ سے مناسب تھا۔

پبلیکشنز ڈویژن مہاتما گاندھی کی تمام تحریروں کی یکجائی اور اشاعت ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر رادھا کرشنن، سری وی۔ وی۔ گری، ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت جواہر لال نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی کی تقریروں کی اشاعت، حوالے کی کتابیں جیسے ریفرنس اینوئیل اور گزیٹر آف انڈیا، ہندوستان کی آزادی کی تاریخ جیسی کتابوں کی اشاعت میں مصروف ہے جو ہماری قومی زندگی میں ہمیشہ اہمیت کی حامل رہیں گی۔ ان کے علاوہ مفید اور معلوماتی کتابیں اور بچوں کی کتابوں کی اشاعت بھی کی گئی ہیں۔ مصوری، رقص، ڈراما اور موسیقی کے بارے میں گراں قدر کتابیں شائع کی گئی ہیں۔

بہت دنوں سے اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ حکومت کے مختلف محکموں کی کتابیں ایک جگہ سے دستیاب ہوسکیں۔ اس ڈویژن نے اب اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے اور مختلف سرکاری اداروں کی کتابیں یہاں سے دستیاب ہوسکتی ہیں۔

طرحی غزلیں اور افسانے

ہمیں خوشی ہے کہ اس سلسلے کو پسند کیا گیا اور بہت بڑی تعداد میں غزلیں اور افسانے موصول ہوئے۔ چوں کہ فروری کا شمارہ خواجہ حسن نظامی نمبر تھا اس لیے یہ غزلیں، افسانے فروری میں شائع نہ ہوسکے۔

جو چھ غزلیں ہمیں پسند آئی ہیں وہ اس شمارے میں شامل ہیں، جن تین افسانوں کا انتخاب کیا گیا ہے ان کے نام دیمک، کٹڈی وارڈ، اور جوتے ہیں جو اس شمارے میں شامل ہیں۔

دوسری طرحی غزلیں، افسانے آئندہ شمارے میں شامل ہوں گے اپریل کے بعد یہ سلسلہ ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اگر قارئین کا اصرار ہوا تو یہ سلسلہ دوبارہ شروع کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی

۱۵ جنوری ۱۹۷۷ء کو پروفیسر رشید احمد صدیقی کا انتقال ہوگیا۔ وہ ۸۱ برس کے تھے۔ ان کی موت واقعی ایک سانحہ عظیم ہے۔ وہ نہ صرف ایک بلند پایہ انشا پرداز، طنز نگار اور صاحب طرز ادیب تھے بل کہ نہایت مخلص، شریف اور درد مند انسان تھے۔ وہ ان اعلا تہذیبی اقدار کے حامل تھے جن کے نمونے اب خال خال نظر آتے ہیں۔

اس شمارے میں رشید صاحب سے متعلق ایک مضمون شامل ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ رشید صاحب اور مولانا عبدالماجد دریابادی سے متعلق خصوصی شمارے شائع کریں۔ مزید تفصیلات کا بعد میں اعلان کیا جائے گا۔

تاریخ رحلتِ بے ہنگام

۱۹۷۷ء

محبِ اسلام حضرت عبدالماجد دریابادی

۱۹۷۷ء

عالمِ دیں، مفسرِ قرآں
مردِ حق محرمِ رموزِ حیات
اپنے خالق سے جا مِلا آخر
چھوڑ کر یہ جہانِ مکروہات
بے "کم و بیش" ہے یہی تاریخ
۳۷۸
پاک دل، پاک ذات پاک صفات

۱۷۷۵
۳۷۸
۱۳۹۷

(مغیث الدین فریدی)

اسلوب احمد انصاری
شعبۂ انگریزی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

رشید احمد صدیقی

۱۵ر جنوری ۱۹۷۷ء کی منحوس سہ پہر کو اردو زبان کے منفرد انشا پرداز رشید احمد صدیقی نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

وہ نصف صدی سے زیادہ مدت تک گیسوئے اردو کو سنوارتے رہے۔ اس چمن کی آبیاری کرتے رہے۔ جو انھیں اپنی مادر درسگاہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرح دل وجان سے عزیز تھا۔ ان کے انتقال سے تہذیب وثقافت کا ایک دور ختم ہوگیا۔ سیر چشمی اور شائستگی کی ایک روایت تمام ہوگئی۔ اس جوش وجنون کا سلسلہ منقطع ہوگیا، جس کا مورد زبان وادب ہی نہیں تھے۔ وہ آداب بھی تھے، جن کے برتنے سے زندگی خیر کثیر کی طرف بڑھتی ہے۔ اور اس میں توازن، اعتدال اور خوش ذوقی نمو پاتی اور قائم رہتی ہے۔

رشید احمد صدیقی مرحوم اوّل اوّل اپنی ان مزاحیہ تحریروں کے ذریعے روشناس ہوئے، جو علی گڑھ منتھلی وغیرہ رسائل میں شائع ہوئیں۔ ان کا جادو خواص پر زیادہ چلا کہ وہی ان کے مخاطب تھے۔ ان کی حسِ ظرافت تیز، سریع الاثر اور برجستہ اور بے محابا تھی۔ اور اس کا براہ راست تعلق اس عام سوجھ بوجھ اور لاتعلقی سے تھا، جس کے ذریعے وہ چشم زدن میں اشیا اور اشخاص کے مضحک پہلوؤں کا احاطہ کرسکنے پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ ان کی مزاحیہ اور طنزیہ نگارشات میں ایک وزن، وقار اور ایک گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے۔ وہ سادہ اور بے میل ہنسی کی تحریک نہیں کرتیں، قہقہہ لگانے پر بھی مائل نہیں کرتیں۔ بلکہ خندۂ زیرلبی کی دعوت دیتی ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے مشاہدات کو تفکر کا محور بناتے۔ ذہانت کو اپیل کرتے اور مہذب اور کڑھے ہوئے جذبات کو آسودہ کرنے کی طرف میلان رکھتے ہیں

رشید احمد صدیقی اپنی مزاحیہ تحریروں میں ہر اس شے پر نظریں مرکوز کردیتے ہیں، جس میں انھیں کوئی اَن مِل، بے جوڑ پہلو نمایاں طور پر محسوس ہو۔ بہ الفاظِ دیگر عدم مطابقت، یا لچک کی کمی (INELASTICITY) یا غیر آہنگی کا وجود (INCONGRUITY) انھیں برابر اس امر کی دعوت دیتا اور اس پر اکساتا رہتا ہے کہ وہ مشاہدے کے معروضی یا کسی خاص موقع محل کو اس کے اندرونی تضادات کے ساتھ نظروں کے سامنے کھول کر رکھ دیں۔ رشید صاحب مرحوم نے اپنے طویل دورِ حیات میں ہر قسم کے نرم وگرم، سخت وسست اور نشیب فراز کا تجربہ کیا تھا اور زندگی کو ہر ہر سطح پر برتا تھا۔ تجربات کی یہی فراوانی اور ان میں بصیرت ان کے فن کے لیے مواد فراہم کرتی رہی۔ وہ زندگی کے ہنگاموں پر ایک تماشائی کی حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں۔ اور اس مزاج اور افراتفری میں سے بعض مظاہر کو الگ کرکے انھیں اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ایک تخلیقی عمل کی کارفرمائی ملتی ہے۔ اپنے بعض پیشروؤں کے برعکس، جو محض ہنسوڑ ہیں، رشید صاحب زندگی کے طربیہ کو ایک اچھے فن کار کی طرح اس کے صحیح تناسب باطنی کے اندر رکھ کر پیش کرتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی یہ تحریریں مزاح نگاری کی صنف میں ایک اہم اضافے کا درجہ رکھتی ہیں۔

رشید احمد صدیقی بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں۔ طنز ان کے یہاں ایک فنی وسیلہ ہے جسے وہ مزاحیہ نقوش کو تیکھا بنانے کے لیے استعمال میں لاتے ہیں۔ مزاح نگار مصلح نہیں ہوتا، وہ نہ اعمال کا احتساب کرتا ہے، نہ انقلاب کی دعوت دیتا ہے اور نہ کوئی رویائے (وژن) خیر وشر پیش کرتا ہے۔ بلکہ وہ اپنے منارۂ ذہن میں دلجمعی کے ساتھ بیٹھا انسانی فطرت کی عجوبہ زائیوں پر زیرِ لب مسکراتا اور ہمیں اس میں شرکت کی دعوت دیتا رہتا ہے، ہجو نگار Satirist کے برعکس وہ کیا ہونا چاہیے سے زیادہ کیا ہے میں دلچسپی رکھتا ہے، اور اکثر یہ کہتا سنائی پڑتا ہے کہ زندگی میں یہی سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ اس پر ہمیں دل گرفتہ یا چراغ پا ہونے سے آخر کیا حاصل ہوگا؟ مزاح نگار کا سب سے اہم وظیفہ تفننِ طبع کے ذریعے، اور بغیر کسی تصنع اور بناوٹ کے، جذبات واحساسات کی ایک غیر شعوری تہذیب اور تنقیح کرنا ہے۔ ہجو نگار در وبام کو ہلا دینا چاہتا ہے، مزاح نگار مسکراہٹ کے خفیف سے ارتعاش سے زندگی پر پڑے ہوئے پردے کو سرکاتا ہے۔ اور المیہ کا خالق جیسا کہ مشہور امریکی نقاد نارتھ روپ فرائی نے کہا ہے، اولوالعزمی ہیروازم کو ضعف پہنچاتا ہے اور ادراک میں لطافت پیدا کرتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہمت کا رس بھی نچوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ مزاحیہ تحریروں میں صرف وہ زندگی منعکس نظر آتی ہے، جو ہمارے گرد وپیش کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جس میں ہر طرح کے تضادات ہیں، جانبداریاں ہیں، بے تکا پن ہے، اور عقل وخرد کی وہ کمی Un-reason ہے، اور جوش وجذبے Enthusiasm کی وہ بہتات ہے، جس سے ہماری بصارت اور بصیرت دونوں کہر آلود ہوجاتی ہیں۔ مزاح نگار ہر طرح کی کجی، ہٹ دھرمی اور خود فریبی پر کھلے دل سے ہنستا اور انھیں اپنی ظرافت کا ہدف بناتا ہے۔ ہر اس منظر سے اس کے دل میں گدگدی پیدا ہوتی ہے، جو بے ڈول، غیر منضبط اور عقل وخرد کا نقیض معلوم ہو۔ شکسپیر کے کردار کی طرح اسے یہ پوری دنیا ایک اسٹیج کی طرح نظر آتی ہے جس پر مختلف کردار کچھ دیر کے لیے جمع ہوتے، اور اپنے اپنے کرتب دکھا کر نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔ مزاح نگار کی سب سے بڑی چوٹ اس میکانکیت پر پڑتی ہے۔ جو انسانی برتاؤ

کے سانچے میں اسے نظر آتا ہے ۔ اور وہ بغیر کسی ذہنی پس و پیش کے اسے نمایاں کرنا چاہتا ہے ۔ میکانکی انسان ظاہر ہے مضحک ہوتا ہے، کیونکہ اس کے خارجی عمل اور باطنی محرکات کے درمیان کوئی ربط نہیں ہوتا ۔ مزاح نگار زندگی کے ہر نقش اور ہر شخص کی ذات میں اس کے غیر ذات Anti-self کو تلاش کرتا اور اسے پالیتا ہے ۔ رشید احمد صدیقی کی مزاحیہ تحریروں میں بھی مختلف قسم کے کرداروں کا ایک انبوہ کثیر نظر آتا ہے ۔ ان کی حماقتیں اضطراری اور بے سرو پا حرکتیں ان کی محدود انائیں، ان کی شخصیت کے گرد چڑھے ہوئے خول ان میں اعتدال اور توازن کی کمی اور ان کے رویوں کا غیر عقلی Irrational ہونا، یہ سب ان کی حس ظرافت کو مہمیز کرتے رہتے ہیں ۔ رشید احمد صدیقی نے ان سب کو بڑی خوبی، ہنرمندی اور اپنی فنی حکمت عملیوں کو بروئے کار لاکر نمایاں کیا ہے ۔

رشید احمد صدیقی کی مزاحیہ تحریروں کا دائرہ بہت وسیع ہے وہ بہت سے امور میں اکبر الٰہ آبادی کے مقلد اور پیرو ہیں ۔ انھوں نے موجودہ مغربی تہذیب کے اقدامات اور ان کی نمایاں خامیوں کو اکبر ہی کی طرح اپنے طنز یہ واروں کا نشانہ بنایا ہے ۔ گو پوری طرح انصاف سے کام نہیں لیا ۔ ان کی تحریروں میں مقامی رنگ بہت غالب ہے جس سے ان کی آفاقیت اور عمومیت ایک حد تک مجروح ہو جاتی ہے ۔ علی گڑھ کی زندگی، اور یہاں کی فضا میں رچنے بسنے والوں کے معمولات اور ذہنی اور جذباتی ردعمل کو انھوں نے جگہ جگہ برتا ہے ۔ یہ کردار جو ایک مخصوص تہذیب کے نمائندہ اور اس کی تخلیق ہیں ان کے صفحات میں ہر جگہ چلتے پھرتے اور سانس لیتے نظر آتے ہیں ۔ لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ انھوں نے قومی اور ملی زندگی کے آداب آدرشوں اور ذہنی جذباتی رجحانات کے مدوجزر کا بھی جائزہ لیا ہے گواہ ، وکیل ، مولوی ، قومی کارکن ، خطیب اور واعظ ، ڈپٹی کلکٹر ، سول سروس کے نمائندے ، اور دانش گاہوں کے ارباب سیاست ، اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ان کے مضامین میں اپنی جھلکیاں دکھاتے ہیں ۔ رشید احمد صدیقی کی نظر میں ان تمام مظاہر کے اندرون میں نفوذ کر جاتی ہے ۔ جو ظاہری مشاہدے سے اکثر چھوٹ جاتے ہیں ۔ وہ پوری سماج اور اس کے افراد کے سامنے ایک آئینہ رکھ دیتے ہیں جس میں وہ اپنا چہرہ دیکھ سکیں ۔ اور اس کے ذریعہ حسب دلخواہ اپنا محاسبہ کر سکیں ۔ وہ خود کوئی فیصلہ صادر کرنے سے احتراز کرتے ہیں ۔ مزاح نگار کی یہی لاتعلقی، جو اس کی عدم دلچسپی کی نشانی نہیں ۔ اسے اپنے اور اپنے مدرکات کے درمیان وہ جمالیاتی فاصلہ پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے جو تناسب باطنی قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے ان کے معروف اور منفرد مضامین میں 'شیطان کی آنت'، 'پاسبان'، 'ارہر کا کھیت'، 'گھاگھ'، 'گواہ'، 'آمد میں آورد'، اور 'چارپائی' وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے ۔

"مضامین رشید" کے علاوہ ایک دوسرا مجموعہ 'خنداں' بھی ہے جس میں ریڈیو پر نشر کی گئی تقریریں یکجا کر دی گئی ہیں ۔ مزاحیہ تحریروں میں اپنا ایک امتیاز رکھتا ہے ۔ دونوں مجموعوں میں کیف و کم کا فرق بدیہی ہے ۔ 'خنداں' میں طنز و مزاح کے وار اتنے چست دلنشیں اور دعوت فکر دینے والے نہیں، جیسے "مضامین رشید" میں یہاں اس پختگی بالغ نظری اور ذکاوت اور نکتہ سنجی Wit کی بھی کمی نظر آتی ہے جو بات میں بات پیدا کرنے اور تجربے کے متضاد پہلوؤں کو یک لخت مشاہدۂ باطنی میں اسیر کر لینے سے عبارت ہے لیکن ایک شے دونوں میں مشترک ہے ۔ بلکہ "خنداں" میں "مضامین رشید" سے بڑھ کر ہے ۔ وہ یہ کہ اس مجموعے میں کردار نگاری کی طرف ایک واضح میلان ملتا ہے ۔ انگریزی مصنف اور مزاح نگار ایڈیسن کی طرح رشید احمد صدیقی بھی ناول نگار یا افسانہ نگار نہیں ہیں ۔ لیکن ایڈیسن ہی کی طرح غیر شعوری لیکن یقینی طور پر کردار نگاری کی جبلت ان کے اندر موجود ہے اور یہ کردار محض منقش تصویریں نہیں ہیں ۔ جنھیں صفحات کی کھونٹیوں پر آویزاں کر دیا گیا ہو ۔ یہ بے جان مبیاں نہیں ہیں ۔ بلکہ ان میں حرکت اور تغیر اور تنفس کا احساس ہوتا ہے ۔ رشید احمد صدیقی کی روشن ، ذہین اور تیز نظریں زندگی کی ہما ہمی اور اس کے بے کراں ذخیرے میں سے چند جاذب لفظوں کو چن لیتی ہیں اور انھیں گھٹا بڑھا کر ان میں رنگ اور روشنی بھر کر انھیں پڑھنے والوں کے سامنے پیش کر دیتی ہیں قلب ماہیت کا یہ عمل جو تخیل اور عقل کی کیمیا گری کی بدولت ظہور پذیر ہوتا ہے ۔ ہر مزاح نگار اور طنز نگار کے یہاں مل جائے گا ۔

مضامین اور تقریروں کے علاوہ جن میں ہم عمومی اور بے نام کرداروں سے متعارف ہوتے ہیں ۔ رشید احمد صدیقی کا ایک منفرد کارنامے وہ قلمی مرقع ہیں جو "گنجہائے گرانمایہ" اور "ہم نفسانِ رفتہ" کے عنوانات سے مجموعوں کی شکل میں سامنے آچکے ہیں ۔ ان کے علاوہ کچھ اور مرقعے بھی ہیں ، جو جہاں تہاں اخبارات اور رسائل میں بکھرے پڑے ہیں ۔ یہ سب مرقعے اردو زبان میں خلعے کی چیز ہیں یہاں کردار مجہول الاسم Anonymous نہیں ، بلکہ یہ سب ان دوستوں اور بزرگوں کی قلمی تصویریں ہیں ۔ جنھیں رشید احمد صدیقی نے قریب سے دیکھا ، برتا اور پرکھا تھا ۔ ان سب میں ان کے خونِ جگر کی کشید نظر آتی ہے ۔ ایک طور سے یہ مضامین سے منسلک ہیں جس طرح مضامین میں منطق ترتیب ، سلسلے وار اور سیدھے خطوط میں Linear ارتقا کی بجائے جذباتی رو اور مدور Circular پر پیچ تنظیم اور غیر تسلسل Discontinuity کا اصول برتا گیا ہے ۔ ویسے ہی یہ مرقعے بھی سوانحعری کے بندھے ٹکے اور سپاٹ نمونے نہیں ہیں ۔ بلکہ تخیلی باز آفرینی کے عمل کا مظاہرہ ہیں ۔ یہاں یادوں کے خزانوں کو کھنگالا گیا ہے ۔ اور شخصیت کی اکائیوں کو تحلیل کر کے انھیں وقت یا دوران کے جلوۂ گزراں کے وسیلے سے شعور کو گرفت میں لانے کی کوشش کی گئی ہے ۔ مولانا محمد علی ، ڈاکٹر انصاری ، اصغر گونڈوی ، سجاد حیدر یلدرم حسرت موہانی ، مولوی ابوبکر شیث ، ڈاکٹر اقبال اور فاروق دیوانہ کے مرقعے خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں ۔ مولانا محمد علی کے بارے میں یہ جملے دیکھیے :

"کس بلا کے بولنے اور لکھنے والے تھے ۔ بولتے تو معلوم ہوتا ابوالہول کی آواز اہرام مصری سے ٹکرا رہی ہے ۔ لکھتے تو معلوم ہوتا کرپ کے کارخانے میں توپیں ڈھل رہی ہیں یا پھر شاہجہاں کے ذہن میں تاج کا نقش مرتب ہو رہا ہے ..... اسٹیج پر محمد علی جس طرح جھومتے بل کھاتے پہنچتے جس کڑک، تڑپ، غرلو اور غلبہ سے بولتے، وہ میں نے دیکھا ہے ۔ وہ بولنے میں تلوار اور گرز دونوں

سے کام لیتے، وہ دنیا کے ہر حربے کا جواب اپنی تقریر سے دے سکتے تھے۔"

اپنے ممدوحین میں سے اکثر شخصیتوں کو رشید احمد صدیقی نے لازوال بنا دیا ہے۔ اور یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ ایسے مرقعے اردو میں اب تک نہیں لکھے گئے۔ گو اچھے مرقع نگاروں میں فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کے نام بھی بھلائے نہیں جا سکتے۔ رشید احمد صدیقی کے یہاں ان قلمی تصویروں میں تخیل زرخیزی، نرمی اور دلآسائی اور انسان دوستی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ یہاں مصوّر کا موقلم اور گل کاری اور افسانہ نگار کا بے جھپک مشاہدہ باہم دگر آمیز کر دیے گئے ہیں۔ یہ ایک ایسے ذہن کا عکسِ جمیل ہیں، جسے زندگی کی اونچ نیچ پر نظر رکھنے کی وجہ سے ایک طرح کی خلاّقانہ دانش اور بصیرت سے سرفراز کیا گیا ہو۔ ان مرقعوں میں ان اقدارِ حیات کا انعکاس بھی صاف جھلکتا ہے۔ جو انھیں دل و جان سے عزیز تھیں اور اس طرح ان سے خود رشید احمد صدیقی کے دل کا معاملہ بھی کھلتا ہے۔

رشید احمد صدیقی کے ذہن پر غالب کی گرفت ہمیشہ بہت مضبوط رہی۔ اور اقبال سے انھیں والہانہ عقیدت تھی "گنجہائے گراں مایہ" میں اقبال پر ان کا مرقع ان کی اس عقیدت کی غمازی کرتا ہے۔ اقبال پر اس طرح کا نجی خاکہ اس سے بہتر شاید ہی کسی نے لکھا ہو۔ غالب کی شخصیت اور شاعری پر وہ نظام خطبات بھی بہت دلچسپ ہیں جو انتقال سے چند سال قبل ہی انھوں نے دہلی یونیورسٹی کی دعوت پر دیے تھے۔ یہ خطبات بھی ان کی بیشتر تحریروں کی طرح تاثراتی انداز کے ہیں۔ لیکن چونکہ انھیں غالب کے کلام سے ہمیشہ انتہائی شغف رہا اور یہ خطبات اس زمانے میں لکھے گئے تھے، جب وہ اپنی تخلیقی کارکردگی کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکے تھے اس لیے ان میں بلاشبہ ان کے مطالعے، مشاہدے اور بصیرت کا عطر کھنچ آیا ہے۔ غالب سے ان کا باطنی ربط تفکر کے اس رجحان کی وجہ سے تھا، جو غالب کے مزاج اور شاعری کا امتیازی نشان ہے اور اقبال سے ان کی عقیدت اور جذباتی وابستگی کی ایک بڑی وجہ علاوہ اقبال کے اعلیٰ درجے کے مفکر اور ــــــ تخلیقی فن کار ہونے کے" اس ایمان و ایقان کی وجہ سے تھی جو اقبال اور رشید احمد صدیقی دونوں کو اسلام کے روحانی اور اخلاقی نظام اقدار سے تھی۔ اکبر الٰہ آبادی سے رشید احمد صدیقی کی شیفتگی کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اس اخیر عمر میں انھوں نے سرسید کے تعلیمی اور اخلاقی مشن اور اس حیرت انگیز تجربے کے بارے میں بہت کچھ لکھا، جسے انھوں نے علی گڑھ کی سرزمین پر سرانجام دینے کا جتن کیا اور جس کے ذریعے ہندوستان کے مسلم سماج میں ایک نشاۃ ثانیہ کے نقیب، اور نغمہ سنج اور معمار بنے۔ رشید احمد صدیقی کو علی گڑھ، بانیِ دانشگاہ علی گڑھ اور اردو کے مسئلے سے جو گہری وابستگی اور جنون کی حد تک محبت تھی، اس کی مثال حامیان یونیورسٹی اور عاشقانِ اردو کے درمیان تلاش کرنا غالباً فعلِ عبث ہوگا۔ رشید احمد صدیقی نے ایک تاثراتی مضمون مضامینِ رشید میں ایک بھرپور مقالۂ فکر و نظر میں اور ایک پوری کتاب ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت کے بارے میں لکھی۔ جنھیں وہ محبت اور عقیدت کے ساتھ "مرشد" کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔ سرسید، غالب، اکبر اور اقبال سے انھیں جو ذہنی، روحانی اور جذباتی نسبت اور لگاؤ اور ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم پر جس طرح وہ اپنی محبت و الفت اور شیفتگی اور سرشاری کے پھول نچھاور کیا کرتے تھے، ان کی روشنی میں ان اقدار کا تعین شاید دشوار نہ ہو، جنھیں ان کی زندگی میں مرکزیت حاصل تھی۔

رشید احمد صدیقی کی طنز و ظرافت کے نمونے اردو میں اپنی تازگی، طرفگی اور بلاغت کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کے قلمی مرقعے اس صنف ادب میں خاصے کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں کردار نگاری کا ایک فطری اور جبلّی ملکہ تھا۔ ان کی تحریروں میں توانائی، کشش اور دلآویزی پائی جاتی ہے اس کا سرچشمہ فارسی شعر و ادب پر ان کی بغایت دسترس اور اسلوب بیان کے وسائل پر ان کی برجستہ اور محکم قدرت میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ان کی انشا پردازی میں تازگی اور لطافت کے پہلو بہ پہلو ایک طرح کی صلابت بھی پائی جاتی ہے۔ وہ انسانوں میں غیر معمولی بصیرت رکھتے تھے، اور ان کے مزاج میں ایک نوع کا توازن، گہری ملاطفت ہمدردی اور انسان دوستی تھی۔ وہ خاصے مجلسی انسان تھے۔ اور ان کی گفتگو زعفران زار ہوتی تھی۔ غالب کی طرح وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو خط بھی بڑی تعداد میں لکھتے

مغیث الدّین فریدی
سی، ۱۲ ماڈل ٹاؤن، دہلی-۹

تاریخِ وفاتِ دردناک

۱۹۷۷ء

رحلتِ پروفیسر رشید احمد صدّیقی

۱۹۷۷ء

دل ظرافت کا سوگوار ہے آج — طنز کی آنکھ اشک بار ہے آج
اُٹھ گیا ناقدِ حیات و ادب — قلبِ اردو کا داغ دار ہے آج
گُل فشاں تھے جہاں رشید احمد — رخصت اس باغ سے بہار ہے آج
قدرِ تہذیب ان کے دم سے تھی — رُوحِ تہذیب بے قرار ہے آج
جس زباں میں وہ بات کرتے تھے — اُس زباں کا جگر فگار ہے آج
دفن ہوتا ہے لطفِ طنز و مزاح — بذلہ سنجی تہہِ مزار ہے آج
نکتہ دانی کا آج ماتم ہے — ذوقِ تنقید اشک بار ہے آج
کان میں گونجتی ہے ان کی صدا — دامنِ ہوش تار تار ہے آج

"آہ" کے ساتھ لب پہ ہے تاریخ
"رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج"

۱۹۷۱ء
۶
۱۹۷۷ء

تھے اور ان میں ان کی طبیعت کے جوہر اور زیادہ کھلتے تھے یہ خطوط اگر شائع ہو گئے تو بلا خوف اردو ادب میں غالب کے خطوط کے بعد ان کا مرتبہ سب سے زیادہ بلند ہوگا۔ رشید احمد صدیقی کے مضامین، قلمی مرقعوں اور نجی خطوط میں ایک حیرت انگیز وحدت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک ہی مزاج اور ذہن کا عکس ہیں ان کی بعض تحریریں دفع الوقتی قسم کی بھی ہیں۔ عام طور پر اپنی تحریروں میں وہ چیسٹرٹن کی طرح قول محال Paradox اور ہم آواز الفاظ کی تکرار Alliteration سے جگہ جگہ کام لیتے ہیں جہاں ان دونوں کا استعمال مناسب حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔ وہاں وہ رعایت لفظی کے درجے کو پہنچ جاتا ہے اور بے مزہ لگنے لگتا ہے۔ ان کے یہاں بعض اوقات عربی اور فارسی کی گراں بار اور بوجھل ترکیبیں بھی مستعمل ہوئی ہیں۔ آخر آخر میں ان کا انداز ضرورت سے زیادہ ناصحانہ بھی ہو گیا تھا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہ آخری عمر میں مذہب اور اخلاق کی طرف بہت زیادہ مائل ہو گئے تھے۔ مجموعی حیثیت سے ان کی تحریریں ایک فعال، تنومند اور جدت پسند ذہن کا کارنامہ ہیں جن میں الفاظ ذو معنی بھی ہوتے ہیں اور مختلف سمتوں میں کھلنے کی طرف رجحان بھی رکھتے ہیں۔ ان میں ایک طرح کی پرکاری، لوچ Suppleness اور تیکھا پن پایا جاتا ہے اور وہ زبان کی مخفی قوتوں سے کام لینے کا راز خوب جانتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی مرحوم علی گڑھ یونیورسٹی کے ایسے فرزند تھے جن پر دانشگاہ ہمیشہ ناز کرے گی کہ اس کے افق پر ایسے ایسے مہر و مہ ابھرے اور چمکے، جن کی درخشانی نے ہر طرف پھیل کر اس سرزمین کو چار چاند لگا دیے۔ انھوں نے اردو کی مختلف ادبی اصناف میں گرانقدر اضافے کیے۔ انھوں نے اپنی انشا پردازی کی لطافت، نزہت اور استحکام اور ایمائیت سے جو جادو جگایا وہ اس زبان کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔ ان کی ایک عجیب و غریب خصوصیت کا ذکر شاید یہاں بے محل نہ ہوگا اور وہ یہ کہ وہ نہ اپنی تحریروں کا کبھی ذکر کرتے تھے، اور نہ ان کی اشاعت کے بعد ان پر دوبارہ نظر ڈالتے تھے۔ راقم السطور سے ایک بار خود انھوں نے اس امر کا اظہار کیا کہ کسی تحریر کے لکھ چکنے کے بعد مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں اپنی تحریر سے اوپر اٹھ گیا ہوں۔ اور اس لیے اسے درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔ خوب سے خوب تر کی یہ جستجو ہی دراصل ایک سچے فنکار کی علامت ہے۔ وہ اپنے آپ کو کبھی نہیں دہراتا۔ اپنے کسی کارنامے کو آخری کارنامہ نہیں سمجھتا۔ اس کی نظر ہمیشہ بلندی اور رفعت کی طرف جاتی ہے۔ یہ عقاب نگہی اور پیہم ناصبوری کی حالت اسے نئے نئے امکانات کے حصول کی طرف مائل کرتی رہتی ہے۔ اور رشید احمد صدیقی کے اعلیٰ تخلیقی فنکار ہونے میں کسے شبہ ہو سکتا ہے ۔۔

قرۃ العین حیدر
آشیانہ۔ نوروجی گماڑیا روڈ بمبئی ۲۶

سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات

سب سے پہلے میں ربُّ الارباب اور عیسٰی ابن اللہ کی حمد و ثنا کرتی ہوں جس نے مجھے مُردوں میں سے جگایا اور اب دوبارہ روزِ محشر تک سُلانے والا ہے اور اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کا اقرار کرتی ہوں اور بخشش کی طالب ہوں۔ خُدائے قدوس تو خوب واقف ہے کہ میں لاعلم تھی کہ یہ کون سی صدی ہے، کون سا مہینہ اور دن میں اپنے کھُلے تابوت میں خوابیدہ تھی جب ترے کسی فرشتے کا رو پہلا پر میری ہڈیوں سے ٹکرایا اور میں اٹھ بیٹھی۔ میری کھوپڑی پائنتی پڑی تھی نیچے بڑھا کر اُسے اٹھایا۔ اس کی گرد جھاڑی اور گردن میں فِٹ کیا۔ گھُپ اندھیرا تھا۔ کھوپڑی غلط فِٹ ہوئی اور مجھے آگے کے بجائے پیچھے دکھائی دینے لگا۔ بمشکل اسے ٹھیک سے لگایا۔ الٰہی ربِ کریم میں اعتراف کرتی ہوں کہ اس لمحے میری اوّلین آرزو یہ تھی کہ آیئنے میں دیکھوں کیسی لگتی ہوں۔ چاروں طرف نظر ڈالی۔ اِس تاریک بوسیدہ، زمین دوز حجرے میں سات آٹھ سنگی تابوت ہڈیوں اور کھوپڑیوں سے لبریز دیواروں سے لگے رکھے تھے۔ مجھے بہت ڈر لگا۔ میں اپنے تابوت کے کنارے بیٹھی خوفِ خُدا سے لرز رہی تھی کہ اچانک کھڑکی روشن ہوئی اور وہ سیلانی فرشتہ پھر نمودار ہوا۔ کہنے لگا۔ ”میں اپنی تسبیح یہاں بھول گیا۔ تم کون ہو۔؟“

”سینٹ فلورا سابینا آف جارجیا۔“

”خُداکی برکت ہو تم پر۔“ اس نے جواب دیا اور تسبیح ڈھونڈھنے میں جُٹ گیا۔ کہکشاں کے ستاروں سے بنی وہ تسبیح مجھے ایک تابوت کے پیچھے پڑی نظر آگئی۔ میں نے فوراً کہا ”ضیاء گستر، پیارے فرشتے۔ اگر وہ تسبیح ڈھونڈوں تو مجھے کیا دوگے؟“ وہ بیحد پریشان اور سراسیمہ نظر آتا تھا۔ کمسن فرشتہ تھا۔ کہنے لگا۔ ”مجھے سینٹ پیٹر کے دفتر میں ایک ایک دانے کا حساب دینا پڑتا ہے۔ میں ایک جھلکڑ فرشتہ ہوں۔ اسی جھلکڑپن کی وجہ سے مجھے ستر ہزار برس تک ایک TRAINEE فرشتہ رہنا پڑا۔ اب جاکر مجھے اپنا ہالہ عطا کیا گیا ہے۔“ اس نے فخر و مسرت سے اپنے نور کے ہالے کی طرف اشارہ کیا۔ ”لیکن اب میں نے اپنی تسبیح گنوادی۔“

”کیا دوگے۔؟“

”کیا چاہتی ہو۔؟“

”میں جواں سال مری تھی۔ اٹھارہ برس کی تھی جب میرے باپ نے مجھے سُوریا کے ایک کانونٹ میں بند کر دیا۔ اگلے پچیس برس میں نے خانقاہوں میں محبوس رہ کر گذارے۔ میں ذرا۔ دُنیا دیکھنا چاہتی ہوں۔ اور اچھے کپڑے پہننے کی آرزومند ہوں۔“

”میں تم کو گوشت پوست اور خون عطا کرنے کا مختار نہیں۔ ایسا صرف روزِ قیامت ہوگا۔ فقط ایک سال تک ذی رُوح رہنے کی اجازت دلوا سکتا ہوں۔ تسبیح لاؤ۔“

”پیارے کرم کار فرشتے۔ میرا خشک پنجر ایک سال تک اس اجنبی دنیا میں تنہا کس طرح اور کہاں مارا مارا پھرے گا۔ کسی دلچسپ مُردے کو میری دو سراتھ کے لیے زندہ کر دو۔“

”دلچسپ مُردہ کیسا ہوتا ہے؟“

”میرا مطلب ہے ——“

”اچھا۔ پہلے تسبیح لاؤ۔“

”نہیں۔ پہلے ایک مُردہ زندہ کرو۔ کہو قُم باذنِ عیسٰی ——“

”جب تم خود ولیہ ہو تو کیوں نہیں ایک عدد معجزہ دکھاتیں۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

”میں ایسا نہیں کر سکتی۔ اِس کی ایک ٹیکنیکل وجہ ہے۔ کہو قُم ——“

فرشتہ دو زانو جھک کر مصروفِ دُعا ہوا۔

دفعتاً میرے پہلو کے تابوت میں کھڑکھڑاہٹ شُروع ہو گئی۔ اور دوسرا ڈھانچہ اٹھ بیٹھا۔ فرشتے نے مجھ سے کہا —— ”صرف سال بھر کے لیے آیندہ سال یہی مہینہ۔ یہی تاریخ اور یہی وقت ساڑھے گیارہ بجے رات —— اس کو بھی اچھی طرح سمجھا دینا۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ خدا حافظ ——“

میں نے تسبیح اٹھا کر اُسے دی اور وہ پھُر سے غائب۔

زمین دوز ہڑواڑ میں اب پھر اندھیرا تھا۔ لیکن میں خوفزدہ نہیں تھی۔ دوسرے ڈھانچے نے تابوت میں بیٹھے بیٹھے دایاں پنجہ اس طرح بڑھا کر سرہانے کچھ ٹٹولا گویا عادتاً جاگنے کے بعد شمع جلا کر کتاب اٹھانا چاہتا ہو۔ میں نے جلدی سے اسے مخاطب کیا اور پورا واقعہ گوش گذار کیا اور اپنا نام بتایا۔ ”سینٹ فلورا سابینا آف جارجیا ——“

”فادر گریگری اوربلیانی آف جارجیا۔“

”خداکی برکت ہو تم پر مقدس باپ۔“

”آپ ولیہ ہیں —— ؟“ فادر گریگری گھبرا کر تابوت سے نکلا اور میرے سامنے گھٹنے ٹیکنے چاہے لیکن لڑکھڑا کر گر گیا۔ اس کے گھٹنوں کی چپنیاں بے انتہا بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ میں نے خدایا تجھ سے دُعا مانگی۔ کہ اے دو جہاں کے مالک اگر تو نے مجھے ایک سال کے لیے یہ ESCORT عطا کیا ہے تو اسے ایک ثابت و سالم و معقول پنجر بنا دے۔ فادر گریگری فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی میں سے تیز سرد ہوا اندر آکر ہماری ہڈیوں کو کاٹے ڈال رہی تھی۔ اس نے کہا ”بہت سردی ہے۔ پہلے الاؤ کا انتظام کیا چاہیئے۔“

”اگر کہیں چقماق مل جائے۔“ میں بولی۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ جہاں پائن کے جھنڈ سائیں سائیں کر رہے تھے۔

آج کل نئی دہلی

"فادر ادھر آجاؤ۔ ورنہ زکام ہوجائے گا۔" میں نے تشویش کے ساتھ کہا۔ وہ آکر اپنے تابوت کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ میں کھڑکی بند کرنے کے لیے اٹھی۔ کھڑکی کا ایک پٹ ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ دوسرے پٹ کی طرف ہاتھ بڑھانے کے لیے باہر جھانکا۔ پہاڑی کے عین نیچے چوڑا دریا بہہ رہا تھا جو کوہستانِ قفقاز سے نکل کر بحیرۂ اسود میں گرتا تھا۔ مجھے یاد آگیا میں اس پہاڑی والی خانقاہ میں کئی برس رہ چکی تھی پھر اس دریا پر ایک شاندار چہار منزلہ سفید رنگ کا جگمگاتا محل نمودار ہوا۔ اور ایک مہیب آواز — صورِ اسرافیل — میں فوراً سجدے میں گر گئی۔ اور بہت افسوس ہوا کہ دنیا میں سال بھر رہنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ دوبارہ صورِ اسرافیل — سہ بارہ — تب فادر گریگری کھڑکی میں آیا۔ اور باہر جھانک کر مجھ سے کہا۔

"مقدس ولیہ — یہ ایک دخانی جہاز ہے۔ اور اپنا سائرن بجاتا ہے۔ اٹھو۔"

میں کھڑی ہو گئی اور باہر جھانکا۔ نیچے دریا کے کنارے ایک خیمہ گاہ نظر آئی جس میں جگہ جگہ الاؤ جل رہے تھے اور ساز بجائے جا رہے تھے اور ہنسی اور قہقہوں کا شور۔ خداوندا میرا جی چاہا کہ میں بھی جا کر اس جشن میں شامل ہو جاؤں۔ تب فادر کی آواز نے مجھے چونکایا جو کہہ رہا تھا "آؤ باہر چل کر آگ تلاش کریں۔"

ہم دونوں ٹٹولتے ٹٹولتے اس سرداب سے نکل کر ایک سرنگ میں پہنچے جس کی سیڑھیاں اوپر باغ میں کھلتی تھیں۔ دروازے پر جھاڑیاں اور گھاس اگی ہوئی تھی۔ ڈیزی کے تختے لہلہا رہے تھے۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، درختوں کی جھاڑیاں پھلانگتے، باغ میں آئے جس کے سامنے ایک بڑا چرچ استادہ تھا اور اوک اور پائن کے جھرمٹ۔ ایک درخت کے نیچے کاغذی پلیٹیں گلاس اور نیپکن پڑے نظر آئے۔ میں لکڑیاں چننے لگی۔ فادر نے اس کاٹ کباڑ کو اکٹھا کیا۔ ایک ڈبیا ملی اس میں تیلیاں سی تھیں۔ فادر نے ایک تیلی ڈبیا پر رگڑی۔ آگ پیدا ہوئی۔ فادر نے کہا "یہ ماچس ہے۔ کوئی پکنک منانے والی ٹولی یہاں چھوڑ گئی۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔"

ہم نے الاؤ جلا کر تاپنا شروع کیا۔

خدایا۔ میں چنلی نہیں کھاتی مگر ولی قسطنطین کی قسم۔ اس لمحے میں نے دیکھا کہ فادر گریگری اور بیلیانی کے نتھنوں سے دھواں نکل رہا ہے۔ میں بے طرح گھبرائی۔ دھوئیں کے مرغولوں کے پیچھے ایک ننھا سا انگارہ اس کے منہ میں روشن تھا۔ الٰہی۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ دھواں اور آگ کی لپٹیں صرف اخوان الشیاطین کے منہ سے نکلتی ہیں۔ میں نے فوراً تیری صلیب کا نشان بنایا اور سوچا کہ یقیناً کوئی بدروح اس کے پنجر میں آگھسی ہے۔ یا پھر فرشتے کی غلطی ہے جس نے کسی عابد و زاہد کے بجائے کسی خبیث ——

اچانک فادر ہنسنے لگا اور بولا۔ "ڈرو مت۔ یہ سگریٹ کہلاتا ہے۔ جو سیاح یہاں پکنک کے لیے آئے تھے ماچس کے ساتھ ایک پیکٹ سگریٹ بھی یہاں بھول گئے۔ مجھے ابھی پتوں میں پڑا ملا۔"

میں نے کہا "تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ یہ شے سگریٹ کہلاتی ہے اور اسے جلا کر منہ سے دھواں اگلتے ہیں۔ یہ صریحاً ایک طاغوتی، ابلیسی فعل ہے —"

فادر نے نرمی سے سمجھایا "بی بی قلورا — امریکن سائنسدانوں نے حال ہی میں ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جسے رات کو سرہانے فٹ کرکے انسان سو جاتا ہے اور سوتے میں اس آلے کے ذریعے مختلف علوم ذہن نشین کر لیتا ہے۔ تو کیا تم اس قادرِ مطلق کی قدرت میں شک کر سکتی ہو جس نے ساڑھے تیرہ سو برس کی طویل نیند کے دوران میں گرد کو میں مجھے آج تک کے متعدد علوم اور جدید زبانوں اور دوسرے معاملات سے آگاہ کر دیا۔ ایک حد تک تم خود بہت سی باتوں سے واقف ہو چکی ہو۔ اس کا تجربہ تمہیں اس ایک برس میں خود ہو جائے گا بلکہ ابھی ابھی اسی لمحے سے ہو جاتا ہے۔ ذرا کان لگا کر سنو۔"

نیچے وادی میں جو ساز بج رہے تھے میں فوراً سمجھ گئی کہ وہ گٹار، بیلالیکا — اکارڈین اور سیکسوفون کہلاتے ہیں اور وہ نوجوان روسی اور چار جین زبانوں کے گیت گا رہے تھے۔

پھر ہوا کے ریلے کے ساتھ وادی کی آوازیں ہمارے کانوں میں پہنچیں۔ نیچے خیمہ گاہ میں ایک نوجوان گٹار بجاتے بجاتے ایک لڑکی سے کہہ رہا تھا — "نتاشا! دیکھو اوپر بھی الاؤ جل رہا ہے۔ کچھ لوگ بالک وہاں پہلے سے کیمپنگ کر رہے ہیں۔" پھر ہوا کا رخ بدل گیا اور وہ آوازیں مدھم پڑ گئیں۔

تب فادر نے کہا "مقدس ولیہ —"

"اگر تم مجھے اس لقب سے مخاطب نہ کرو تو بہتر ہوگا۔ اس کی وجہ ابھی بتا دوں گی۔"

"کیا وجہ ہے؟۔ اچھا ٹھیک ہے۔ ہم دونوں کو سال بھر اکٹھے رہنا ہے۔ مناسب یہی ہے کہ اپنا اپنا احوال ایک دوسرے کو بلا کم و کاست بتا دیا جائے۔ تاکہ آئندہ کسی غلط فہمی کا امکان نہ رہے۔ میں گرینڈ ڈیوک آف طفلس کا بیٹا تمہاری خدمت میں حاضر ہوں۔"

الٰہی! میں ONE - UPMANSHIP نہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن لامحالہ مجبوراً بتلانا پڑا کہ میرے والد سفیرِ بازنطیم برائے ایران ہیں۔

"سچ —" اس نے تصحیح کی "قسطنطنیہ سے شمالی گرجستان کے اس دور افتادہ پہاڑ پر کیسے آپہنچیں —"

"ہم جب باسفورس سے چلے" میں نے کہنا شروع کیا "سمندر پرسکون تھا اور ہوا ساز گار —"

"لیکن باسفورس سے ایران جانے کے لیے بحیرۂ اسود کا رخ کیوں —؟ تمہارے جہاز کا کپتان پاگل تھا —؟"

فادر گریگری نے سگریٹ کا کش لگا کر میری بات کاٹی۔

"نہیں۔ سنو تو، اچھا شروع سے بتاتی ہوں۔ تمہیں تو معلوم ہوگا — ہم بازنطینی کتنے شاندار لوگ تھے۔ قسطنطنیہ سرکاری طور پر روم ثانی کہلاتا تھا۔ جسٹینین نے کلیسائے سانتا صوفیہ تعمیر کرنے کے بعد کہا تھا — خداوندا — میں تیرے بادشاہ سلیمان سے بازی لے گیا — جسٹینین، تھیوسوڈیس اور آرکیڈیس کے دور کے علوم و فنون، اولمپک کھیل — اور ہمارا لاثانی آرٹ —"

"تھیوڈورا کو گول کر گئیں —!" فادر نے چوٹ کی۔

"خیر وہ بھی تھی — ایک کلوپٹرا ایک تھیوڈورا — ان دو نے ذرا علوہمتی دکھائی تو وہ تم مردوں کے حلق سے آج تک نہ اتریں — خیر جب ساسانیوں نے زور پکڑا اور ہمارے صوبہ شام پر قبضہ کرکے یروشلم سے خداوند کا اصلی صلیب اٹھا کر تیسفون لے گئے ہمارا ہرکلیس ان سے لڑ بھڑ کے یروشلم لے آیا۔ — ، جب عربوں نے یروشلم فتح کیا تو وہ صلیب ہمارا ہرکلیس قسطنطنیہ لے آیا۔"

"طفلس میں میں نے بھی اپنے والد کے ساتھ عرب لشکر کا مقابلہ کیا تھا۔ مگر ناکام وہ دنیا کی نئی عالمگیر طاقت تھے — جیسے آج کل روس اور امریکہ — فادر اور بیلیانی

نے خفگی سے کہا۔

"ہم بازنطینی ریشہ دوانیوں کے بیحد شایق تھے اور ہمارے دربار کی سازشیں سیاسی قتل، شہزادیوں کے معاشقے شہزادوں کے اسکینڈل، ساری دُنیا میں مشہور تھے۔ عام دستور یہ تھا کہ ہمارے بادشاہوں کو ان کی ملکائیں یا بیٹے زہر دے کر مار ڈالتے تھے۔ کلیسا کا حکومت پر گہرا دباؤ تھا۔ مگر پادری لوگ خود آپس میں مذہبی مسائل میں بال کی کھال نکال کر سب کا وقت برباد کرتے تھے۔ میرے والد اشیفن بونوریس حکومت کے ایک اہم وزیر تھے۔ والدہ آئرینا ملکہ کی خاص لیڈی۔ اِن۔ ویٹنگ۔ بڑا بھائی الگزنڈر سلوریس شاہی دستے کا افسرِ اعلیٰ ہم لوگ بڑے ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ سارا کنبہ درباری سازشوں میں مشغول بڑے مزے سے گزرتی تھی۔ تھیٹر۔ اولمپک کھیل۔ گلیڈی ایٹرز کے مقابلے۔ ہمارے پڑوسی سرجیس پیلاگیس ابا کے گہرے دوست تھے۔ سالونیکا میں ان کے تاکستان تھے۔ بحیرہ اسود میں اپنے تجارتی جہاز چلتے تھے۔ ان کے لڑکے تھیوڈورک گیلاس سے میری شادی ہونے والی تھی۔ وہ بیحد شکیل اور ہوشمند تھا۔ اس نے ایک دن مجھ سے کہا۔ میں بازنطینی ہائی سوسائٹی کی اس انتہائی کرپٹ زندگی میں شامل نہیں ہونا چاہتا۔ شادی کے بعد میرے ساتھ سالونیکا چل کر رہو۔ آرام سے اپنے تاکستان میں بیٹھ کر میں فلسفہ پڑھا کروں گا تم بربط بجانا اور کشیدہ کاری کرنا لیکن فادر میں اس ہائی لائف کی از حد شوقین تھی۔ روز شام کو والدین کے ساتھ درباری تقریبات میں جاتی۔ رقص کرتی۔ ایک سے ایک بڑھیا پوشاکیں پہنتی۔ اس وقت میری عمر صرف سولہ سال کی تھی۔ گلیڈی ایٹرز کے تماشوں کی میں جتنی عاشق تھی۔ تھیوڈورک ان سے اتنا ہی متنفر تھا۔ کہتا ہم لوگ عیسائی ہو گئے۔ مگر رومنوں کو ان بے رحم وحشیانہ کھیل تماشوں کا شوق نہیں گیا۔ خود گلیڈی ایٹرز کے تماشائی دو مخالف فریقوں میں بٹے ہوئے تھے سبز پوش اور کبود پوش کہلاتے تھے اور ایک دوسرے سے کٹے مرتے تھے۔ میرے تینوں بھائی سبز پوش پارٹی میں شامل تھے۔

"ہماری شادی سینٹ صوفیہ کے کلیسا میں بڑی دھوم دھام سے ہونے والی تھی۔ شہنشاہ میرا گوڈ فادر تھا۔ مہینوں پہلے سے میرے کپڑے سیے جا رہے تھے۔ بہترین زیورات تیار کیے گئے تھے۔ شادی سے چند دن قبل تھیوڈورک کے والد نے یہ خوشخبری سُنائی کہ قیصر نے شادی کے تحفے کے طور پر تھیوڈورک کو اپنا صاحبِ خاص مقرر کر لیا ہے۔ یہ سُنتے ہی تھیوڈورک گھبرایا ہوا میرے پاس آیا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی جہیز کی ایک TAPESTRY میں آخری ٹانکے لگا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ غضب ہو گیا۔ میں اور قیصر کا حاجب؟ میں رات ہی کو بندرگاہ جا کر گال روانہ ہونے کا انتظام کرتا ہوں شادی کے فوراً بعد میرے ساتھ چپکے سے نکل چلنا فادر اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ تھیوڈورک ان نوجوانوں میں سے تھا جنہیں AGNOSTIC اور "باغی" کہا جاتا ہے۔

"فادر۔ میں ماں باپ اور بھائیوں کی لاڈلی اور بیحد ضدی لڑکی تھی۔ میں نے کہا وحشیوں کے ملک جاتی ہے میری پاپوش میں تو یہیں رہوں گی اور تمہیں بھی یہیں رہنا ہوگا اس نے کہا سُنو۔ مجھے تمہارے شہنشاہ، اس کے خاندان، لاٹ پادری، ساری بازنطینی حکومت سے نفرت ہے۔ میں اور اس دربار کی ملازمت کروں؟ ناممکن ہم دونوں میں کافی تکرار ہوئی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا باغ کی دیوار پھلانگ کر اپنے گھر چلا گیا۔

"فادر۔ اب خالص بازنطینی روایات کے مطابق میری والدہ کی ایک کنیز حریری پردے کے پیچھے چھپی یہ سارا مکالمہ سُن رہی تھی۔ وہ بلغاری کنیز بھی دراصل حاکم کی جاسوسہ تھی اس نے جا کر سارا قصہ بادشاہ سے جڑ دیا۔ دوسرے دن تھیوڈورک کو گرفتار کرنے کا حکم خاص میرے بھائی الگزنڈر سلوریس ہی کو دیا گیا۔ ساتھ ہی یہ تاکید تھیوڈورک کو شراب میں زہر ملا کر پلا دیا جائے۔ میرا بھائی شاہی حکم کی تعمیل کے لیے ہو گیا۔ ورنہ اس کو بھی قتل کر دیا جاتا۔ تب میں اسی رات کلوک اوڑھ، خنجر اور اشرفیوں تھیلی قبا چے میں چھپا، تھیوڈورک کے مکان پر پہنچی۔ اس کے باغ کے دیوار کے عین سمندر تھا اور ہم لوگ عموماً یہیں ملا کرتے تھے۔ تھیوڈورک کو اس حکم کی اطلاع نہیں تھی، خوش خوش گلاب کی کیاری پھلانگتا دیوار پر آیا۔ میں نے اسے اس منحوس خبر سے آگاہ کیا۔ بھونچکا رہ گیا۔ میں نے کہا میں اپنی حماقت اور غلطی پر نادم ہوں۔ اب ساتھ چلنے کو تیار ہوں آؤ فوراً بھاگ نکلیں ورنہ صبح ہوتے ہی میرا بھائی تمہیں گرفتار کر لے گا۔ فادر۔ جانتے ہو تھیوڈورک نے کیا کہا؟ وہ دیوار پر سے کود کر سمندر کے رُخ کھڑا ہو گیا۔ بازو پھیلائے بولا — اے زر پرست، عیش پسند بازنطینی رئیس زادی — اس چال سے مجھے پکڑوانے آئی — ؟ خُدا حافظ — " اور پانی میں کود گیا۔

"میں ہکا بکا کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس وقت، حالانکہ میں کم عمر اور کم عقل تھی مجھے دفعتاً احساس ہوا کہ ایک فاسد، فسق پذیر معاشرے میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب انسان کا انسان پر سے اعتبار مکمل طور پر اٹھ جاتا ہے۔ میں تھیوڈورک کے ساتھ اپنی جان پر کھیل کر بھاگنے کے لیے تیار تھی۔ ہم لوگ بلغاریہ جا سکتے تھے۔ کارپیتھین پہاڑوں میں چھپ سکتے تھے۔ کہیں بھی جا سکتے تھے۔ لیکن اس نے مجھ پر بھی شک کیا — اور تنہا غائب ہو گیا۔

"بعد میں سُنا گیا کہ وہ گال پہنچا وہاں سے برطانیہ۔ وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ نکلا خُدا کرے اسے برطانوی وحشی کھا گئے ہوں —" میں نے آنسو پونچھے۔ فادر گریگری نے نرمی سے کہا "بی بی فلورا سابینا۔ برطانوی نیم وحشی ہیں۔ آدم خور نہیں۔ پھر کیا ہوا؟"

"خدا کا شکر ہے کہ والد پر عتابِ قیصری نازل نہ ہوا۔ مگر حکم ملا کہ جلد از جلد قسطنطنیہ سے روانہ ہو کر ٹیسیفون میں سفارت خانے کا چارج لیں۔ یہ بھی ایک قسم کی سزا تھی۔ کیونکہ شہنشاہ جانتا تھا کہ مدائن پر عنقریب عربوں کی وجہ سے آفت آنے والی ہے۔ اس میں ہم سب مارے جائیں گے۔ چنانچہ چند روز بعد ہمارے کنبے نے جہاز پر سوار ہو کر بحیرۂ روم کا رُخ کیا۔ سمندر پُرسکون تھا اور ہوا ساز گار —

"جہاز انطاکیہ کے کنارے میں لنگر انداز ہوا۔ ہم لوگ بندرگاہ کی مرمریں سیڑھیاں چڑھے۔ شہر کے میوزیم میں ملکۂ مصر کا مرمریں پورٹریٹ دیکھا جو ایک رومن سنگتراش نے کلوپٹرا کو اپنے سامنے بٹھا کر بنایا تھا۔ سچ کہتی ہوں فادر۔ اور میں ہرگز CATTY نہیں ہوں۔ مگر کلوپٹرا قطعی حسین نہ تھی۔ نجانے اسے اس قدر خوبصورت کیوں مشہور کر دیا گیا ہے۔ خاصی موٹی بھدی ناک۔ اُوپر کا ہونٹ موٹا۔ نیچے کا پتلا۔ مردانہ کرخت چہرہ اسے وجیہہ اور قبول صورت ضرور کہہ سکتے ہیں۔ پری جمال ہرگز نہیں — ہم لوگ انطاکیہ سے CYRRHUS، وہاں سے ایڈیسہ اور نسی بس (NISIBUS) کے راستے مدائن پہنچے۔ دجلہ کے کنارے جہاں والد نے چند روز بعد قصرِ خسروی میں سفارتی کاغذات شاہ دارا حشم کو پیش کیے۔ وہ تھا تو سائرس و دارا کا جانشین۔ مگر اب تک

یہاں بھی ہماری طرح بید ڈیکیڈینٹ ہو چکے تھے۔ یہاں بھی قسطنطنیہ کی طرح درباری سازشوں اور شاہی خاندان میں ایک دوسرے کے قتل خون کا بازار گرم تھا۔ اور عیش وعشرت کی فراوانی۔ شاہ کی گلشن سرائے میں روز جشن منعقد ہوتے

تیسفون میں ایک رومن جنرل گرویدہ ہوا۔ لیکن وہ کیتھولک۔ ہم لوگ گریک اورتھوڈوکس۔ ابا اس سے شادی کے لیے راضی نہ ہوئے حالانکہ میں تیار تھی۔ قسطنطنیہ میں میں سنا تھا کہ عجمی گھنگریالے داڑھیوں والے خشمناک آتش پرست اپنی عورتوں کو پردے میں مقید رکھتے ہیں اور بہت وحشی لوگ ہیں۔ مگر وہ ہم بازنطینیوں سے بڑھ چڑھ کر مہذب پُرتکلف اور خوش ذوق نکلے۔ اور ہماری طرح خوش شکل اور وہ ——— موبدان موبد کا فرزند ——— دستورزادہ منوچہر پیروز ——— " میں کچھ یاد کرکے اُداس ہوگئی۔ فادر گریگری نے کنفش سننے والی آواز میں کہا "بی بی کہے جاؤ۔ میں سُن رہا ہوں۔"

" فادر منوچہر ——— والمی منوچہر تھا۔ اور اس نے میرے نام کا ترجمہ اپنی زبان میں گل بانو کیا تھا۔ وہ مجھ سے کہتا ——— گُل بانو ——— گُل چہرے ——— غنچے ——— گُل بدن پیغمبر آباد کی قسم ——— تم نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں دجلہ میں کُود کر جان دیدوں گا۔ چلو ہم لوگ آتش بہرام کی گواہی میں چپکے سے بیاہ کرلیں۔ میں راضی ہوگئی۔ اس شام ہم دجلہ کے کنارے ایک کنج میں بیٹھے یہ اسکیم بنا رہے تھے۔ شومیٔ قسمت۔ شاید یہاں ایک رومانی جاسوس گلبن میں چھپا بیٹھا تھا۔ پالکیا۔ بجرے پر سوار ہوکر شام کو جب میں اپنے مکان پہنچی مجھے فوراً میری غنودگاہ میں مقفل کر دیا گیا۔ میں کبھی کمبخت تھیوڈورک کو یاد کرکے روتی کبھی رومن جنرل لوسی لیس اگنیشس کو اور کبھی دستورزادہ منوچہر پیروز کو ——— تیسرے روز صبح والدہ سُرخ آنکھیں لیے کمرے میں آئیں اور کہا بیٹی سفر کے لیے تیار ہو جاؤ ہم شاید بازنطیم واپس جاتے ہیں۔ فوراً عرق گلاب سے مُنہ دھویا۔ گرتابہ میں جاکر نہائی کپڑے بدلے۔ باہر آئی۔ لیکن مجھے دیکھ کر سب گھر والے بالکل خاموش۔ بلغاری غلام اور کنیزیں بھی، کچھ پتہ نہ چلا کہاں جا رہے ہیں۔ شاید سمندر میں ڈبونے کو لیے جاتے ہوں۔ ابا اپنی سخت گیری اور سنگدلی کے لیے مشہور تھے۔ میں تھر تھر کانپتی دروازے سے نکلی۔ والدہ مجھ سے لپٹ کر خوب روئیں۔ مگر وہ بھی خاموش۔ کنیزوں نے مجھے کجاوے میں سوار کرایا۔ اونٹنی ہل جل کر اٹھی میں تمہی زلزلہ آگیا۔ چلنے لگی ——— ڈر لگا کہ اب گری کہ گری۔ والد اور دونوں بھائی تازی گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ رُوز بانوں نے وہ چوبی صندوق جن میں میرے جہیز کا زر و جواہر اور طلائی اور نقرئی ظروف قسطنطنیہ سے ساتھ آئے تھے رواحل پر لادے۔ والدہ دروازے میں کھڑی روتی رہیں۔ کارواں روانہ ہوا تیسفون کی شہرپناہ سے نکل کر شام کا رُخ کیا۔ دمشق پہنچے۔ راستے میں جہاں جہاں فرودگاہوں میں قیام کیا والد اور بھائی چپ۔ مجھے اب اچھی طرح احساس ہو چکا تھا کہ ایک کافر مجوسی سے عشق کی سزا والد کے نزدیک موت سے کم تو کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔

دمشق سے کافی دُور جا کر ایک راس الجبل پر زیتون کے درختوں میں چھپی ایک گریک اورتھوڈوکس خانقاہ نظر آئی۔ اس کے پھاٹک پر پہنچ کر قافلہ رکا۔ ابا نے گھوڑے سے اتر کر خانقاہ کے گھنٹے کا رسّہ تین مرتبہ ہلایا۔ کچھ دیر بعد مہیب چوبی پھاٹک چرچراتا ہوا کھلا اور ایک یونانی تارک الدنیا ضعیفہ نے جھانکا۔ چند منٹ بعد دوسری یونانی ضعیفہ ہم لوگوں کو اندر لے گئی۔ ایک بڑے کمرے میں سرد بھُورے پتھروں کا فرش۔ سرد پتھریلی دیواریں۔ دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی۔ دو کھُردری نشستیں۔ یہ ضعیفہ خانقاہ کی ایبس اور پہلے ایک بازنطینی شہزادی تھی۔ دوسرے کمرے میں جاکر والد نے اس سے بہت دیر تک باتیں کیں۔ پھر مجھے بلایا اور اتنے دنوں بعد پہلی مرتبہ بولے۔ کہنے لگے "دیکھو بیٹی۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے خداوند یسوعؑ کی پناہ اور امان میں دیدوں۔"

"جی۔ ابا۔" میں نے سر جھکا کر کہا۔ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

والد دوسرے کمرے میں آئے۔ رُوز بانوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے اشرفیوں وغیرہ سے لبریز صندوق مدر سُپریر کے سامنے رکھے۔ جو ابا نے دستور کے مُطابق بطور میرے "آسمانی جہیز" خانقاہ کی نذر کیے۔ اس کے بعد ابا نے مجھے گلے لگایا۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ آنسو ضبط کیے۔ بھائیوں نے بھی اپنی آنکھوں کی نمی خشک کی۔ اب میں یسوعؑ کی دُلہن بننے والی تھی۔ وہ تینوں، میرا باپ اور میرا بھائی میرے سامنے احتراماً دوزانو جھکے۔ اور کہا: "ہمارے لیے دُعا کرنا۔" اور اُٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ میرا جی چاہا دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ ہمّت سے کام لے کر سلاخوں والی کھڑکی میں سے جھانکا۔ وہ تینوں پھاٹک سے نکلے۔ گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ سر جھکائے پہاڑی راستے پر اتر گئے۔ اور رات کے دھندلکے میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اور ان کے پیچھے پیچھے وہ کوتل اونٹ۔ ایک پر خالی محمل دوسرے پر باربرداری کے شتر جو میرے سابقہ دنیاوی جہیز کا مال متاع میرے مستقبل کی رُوحانی جائے پناہ میں لے کر آئے تھے اب خالی واپس جا رہے تھے۔ یونانی ضعیفہ نے باہر جاکر پھاٹک میں تالہ چڑھا دیا اور کنجیوں کا گچھا جھنجھناتی شمع ہاتھ میں لیے واپس آئی اور کہا "چلو"۔ میں ایک تاریک سرد گیلری میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ وہ ایک حجرے میں داخل ہوئی۔ سرد پتھریلی دیواریں سرد فرش۔ ایک چھوٹی سی سلاخوں دار کھڑکی۔ مسہری کی بجائے چوبی تختہ جس پر بکری کی اون کا کلیم بچھا تھا۔ اس پر بھیڑ کی اُون کا کھُردرا لبادہ میرے لیے تیار رکھا تھا ایک تسبیح سیاہ سرہانے ایک شمعدان۔ دیوار پر سیاہ صلیب اور موزیک کا ایک چھوٹا سا بازنطینی آئیکن۔ تپائی پر ایک سنگی پیالہ ایک رکابی۔ لکڑی کا ایک چمچہ۔ بوڑھی راہبہ گیلری میں چلی گئی۔ میں نے مروارید سے مرصع ارغوانی اطلس کا قباچہ اتارا۔ کھُردری ردا پہنی۔ قباچے کا بنڈل بنا کر راہبہ کو تھما دیا۔ دروازہ اندر سے بند کرکے یسوعؑ کے آئیکن کے سامنے دوزانو جھک گئی۔"

میں نے بات ختم کی۔ فادر اس اثنا میں سگرٹوں کا آدھا پیکٹ پھونک چکا تھا۔

"اس کے بعد ——؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"وہ بڑا پُرآشوب زمانہ تھا۔ ہمارا شہنشاہ ہرقلیس مستقل عربوں سے جا بھڑتا۔ اور بُری طرح ہار جاتا تھا۔ ہمارے چند بزرگ پادریوں کا کہنا تھا کہ ہم لوگ اس قدر گمراہ اور گنہ گار ہو چکے ہیں کہ خدا ہم سے خفا ہے۔ ہمارے تیسفون آنے سے چند سال قبل ہی وہ لرزہ خیز واقعہ ہوا تھا جب صحرائے عرب سے نکل کر دو فقیر نما ایلچی ایک بے انتہا اہم مراسلہ لے کر شاہِ ایران کے پاس آئے تھے۔ جس طرح کا مراسلہ ایسے ہی درویش نما ایلچی ہمارے قیصر کے پاس لائے تھے۔ اور جیسا تحقیر آمیز سلوک اس نے ان کے ساتھ کیا تھا اسی طرح شہنشاہ خسرو پرویز نے استہزار کے ساتھ وہ خط پڑھا اور ایلچیوں کو دربار سے نکال دیا۔ اس کے چند برس بعد ہی دولت ساسانیہ ہمیشہ کے لیے نیست و نابُود ہو گئی۔ جب ہم لوگ مدائن میں تھے وہ شاہ خسرو کے آخری جانشین کا دور تھا۔ وہ اب بھی اپنی طلائی کرسی پر پردے کے پیچھے اکڑا ہوا بیٹھا رہتا تھا۔

"خانقاہ میں محبوس، بیرونی دُنیا سے میرا کلی قطع تعلق ہو چکا تھا۔ کچھ عرصے بعد

دمشق سے آنے والے چند پادری یہ خبر لائے کہ شاہ نے جو لشکر کچھ عرصے سے عربوں کے خلاف کلاڈینہ بھیج رکھا تھا اس کے جوابی حملے میں کیلیف کی فوجوں نے تیسفون ہی کا صفایا کر دیا۔ ابا اس جنگ سے فوراً قبل قسطنطنیہ واپس بلا لیے گئے تھے۔ شام و مصر ہمارے ہاتھوں سے نکلے۔ ایران آلِ ساسان نے کھویا۔ مجھے ابا کی طرف سے بڑی فکر تھی۔ اور تینوں جوان فوجی بھائی۔ جانے اب ان کو کس کشتن گاہ میں بھیج دیا جائے۔ میں صبح شام دعائیں مانگا کرتی۔ عبادت کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔

" لیکن عجیب بات یہ تھی کہ مسیٰ حکومت نے ہمارے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا۔ سُنا گیا وہ کہتے تھے کہ وہ اپنے پروفٹ کے اس چارٹر پر عمل کر رہے ہیں جو انہوں نے خانقاہ سینٹ کیتھرین کے راہبوں کو دیا تھا۔

" غروب آفتاب کے بعد جب ہم میں سے کوئی راہبہ برجی کے چلّی چراغ میں قندیل روشن کرنے کے لیے اُوپر جاتی تو لبنان اور فلسطین اور مصر کی سمت جانے والے کارواں گھنٹیاں بجاتے اپنے اپنے حُدی خوانوں کی قیادت میں پہاڑی راستے پر سے گذرتے نظر آتے۔ کبھی کبھی ان میں سے کوئی آواز دیتا — بنی عیسیٰ روح اللہ کی اُمّت والیو۔ تم پر سلامتی ہو۔ جواباً ہم دیر تک قندیل اٹھائے بُرجی میں کھڑے رہتے یہاں تک وہ ابنُ السبیل دھندلکے میں کھو جاتے۔

" دمشق اور یروشلم کی عیسائی امیرزادیاں اپنی خواصوں اور غلاموں کے ساتھ ہمارے عبادت کدے میں مدفون ولی شمعون کے مزار پر بیش قیمت چادریں[1] چڑھانے آتیں اور میں بڑے رشک سے ان کی زرق برق پوشاکیں دیکھا کرتی۔

" ایک صبح میں چھت پر کبوتروں کو دانہ کھلا رہی تھی جب دُور سے ایک قافلہ آتا دکھائی دیا۔ آگے آگے سفید گھوڑے پر ایک شہزادی سوار تھی۔ باقاعدہ سنہرا تاج سر پہ بائیں ہاتھ میں سینٹ جارج کا پرچم۔ گورنمنٹ کے دو عرب افسر گھوڑوں پر سوار اس کے دائیں بائیں آ رہے تھے۔ میں نے حیرت سے سوچا کس ملک کی ملکہ ہے۔ — وہ گرجستان کی شہزادی کاتنکا تناتن تھی — "

جوں ہی میں نے یہ نام لیا فادر گریگری چونک پڑا اور جلدی جلدی سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ میں نے قصہ جاری رکھا — ،

" وہ اتنی دُور دراز کی مسافت طے کر کے ولی شمعون کے مزار کی زیارت کرنے آئی تھی۔ امیر المومنین کے افسروں نے اس کو خانقاہ تک احترام سے پہنچایا۔ بڑی البیلی شاندار منچلی شہزادی تھی۔ جو بانکے مسلمان شہسوار اسے پھاٹک تک چھوڑنے آئے تھے اُن سے اتنی دیر تک میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہی کہ ہم لوگ جو اس کے لیے استقبال کے لیے نکلے تھے کھڑے کھڑے تھک گئے۔

" ہم چار راہبات اس کی میزبانی پر مامور کی گئیں۔ شہزادی ہمارے ہاں ایک ماہ مہمان رہی۔ خانقاہ اور گرجا کو زر و جواہر نذر کیا۔ ولی کے مزار پر مچھرزر بفت کی چادر چڑھائی جس کے کناروں پر یاقوت اور زمرد سے گل صنوبر کی بیل بنائی گئی تھی۔

" چلتے وقت شہزادی نے ہماری ایبس سے درخواست کی کہ اس نے اپنی ریاست میں ایک نئی خانقاہ اور پرستش گاہ تعمیر کی ہے اس کی دیکھ بھال کے لیے چند تجربہ کار راہبات کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔ ایبس نے مجھے اور تین لڑکیوں کو حکم دیا کہ شہزادی کے ساتھ جارجیا روانہ ہوں۔ میں بخوشی تیار ہو گئی۔ باقی راہبات میں سے دو تو راستے میں ہی مر گئیں۔ وہ دونوں بے چاریاں قبطی لڑکیاں تھیں، راستے میں پہاڑوں کی شدید سردی برداشت نہ کر سکیں۔ تیسری لڑکی یونانی تھی اس کے باپ نے اسے بھی زبردستی خانقاہ میں ٹھونس دیا تھا۔ وہ طربزون کے قریب قافلے سے بچھڑ گئی اور کہنے والے کہتے ہیں کسی عرب یا بازنطینی تاجر کے ساتھ بھاگ گئی۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔

" اسی شہزادی نے اس پہاڑی پر یہ رباط تعمیر کروایا تھا۔ یہ سامنے والا گرجا بہت بعد میں بنا ہو گا۔ میں مرتے دم تک یہاں رہی۔ اکثر مجھے اپنے گھر والوں کی یاد آتی اور فکر ستاتی بازنطین سے جارجیا تاجر اور پادری مستقل آیا جایا کرتے تھے۔ ان سے وہاں کی خبریں معلوم ہوتی رہتیں ضوابط کے مطابق میں اپنے ماں باپ سے خط و کتابت نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اب وہ سب میرے لیے اجنبی تھے۔ میرا رشتہ صرف خُدا سے تھا۔ بازنطیم سے آنے والے پادری بتایا کرتے قسطنطین دوئیم کو اس کے بیٹے تھیوڈوسس نے قتل کیا۔ پھر اس کے بیٹے قسطنطین پوگونے ٹس نے اپنے بھائیوں ہرقل اور ثانی بیریس کی ناکیں ہی کاٹ ڈالیں چھری سے۔ اور بیشمار پادری مصلوب کیے گئے۔ پھر ایک خانہ بدوش نے جو یہ جانتا تھا میں کون ہوں، باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ پچھلی خانہ جنگی میں جو قتل عام ہوا اس میں وزیر شہنشاہ ہونوریس اور اس کے تینوں بیٹے ہلاک ہوئے۔ لیڈی آئرینا مدّت ہوئی بہت پہلے قضائے الٰہی سے گذر چکیں۔

" اس رات میں اپنے حجرے میں رات بھر بلک بلک کر مسلسل زار و قطار روئی برف کے پانی سے آنکھیں دھو کر فجر کی عبادت میں شامل ہوئی۔ اس کے بعد میں نے شجرستان اور گلگدے کے درختوں، پھول پتوں، چرندوں، پرندوں، تیتریوں سے بھی اپنا دِل ہٹا لیا کہ یہ سب مظاہر قدرت کسی نہ کسی طور سے دِل کو راحت بخشتے تھے۔ اور مسرت کی علامت تھے۔ محض الم — خالص اندوہ اور کرب میرا حصّہ تھے۔ اور وہ مجھے پوری طرح ملا۔ میں گھنٹوں سجدے میں پڑی رہتی۔ مسلسل روزے رکھتی۔ ٹاٹ اوڑھ کر سر پر راکھ ڈال کر اپنے پچھلے کردہ اور ناکردہ دانستہ اور نادانستہ گناہوں کی معافی چاہتی — لیکن فادر گریگری۔ ہم یونانیوں کے ہاں جو کتھارسس کا تصور ہے وہ بالکل لغو ہے۔ کتھارسس کوئی چیز نہیں۔ کرب دائم ہے۔ خداوند مسیح کا صلیب پر سہا ہوا کرب حقیقت کی بنیادی حقیقت ہے۔

" اب میرے زہد و تقویٰ، حلم و مسکینی و فروتنی کی شہرت کوہستان قفقاز میں دور دور تک پھیل گئی۔ لوگ میرے پاس دعا اور ورد کے لیے آنے لگے۔ اتفاق اور خدا کی رحمت سے ایسا ہوا کہ بہت سے مریضوں کے لیے میں نے دُعا کی اور وہ اچھے ہو گئے۔ اپاہج اور بوڑھے ڈولیوں میں بیٹھ بیٹھ کر میرے پاس آنے لگے۔ پھر ایک چھوت لگنے والی خطرناک بیماری کا مریض آیا۔ میں نے اس کی تیمارداری میں دِن رات ایک کر دیا۔ وہ تو اچھا ہو گیا میں اسی مرض میں مبتلا ہو کر مر گئی۔ اب مجھے یاد نہیں وہ کیا مرض تھا۔ مرتے وقت میری عمر ۴۵ برس کی تھی۔ میرا تابوت دستور کے مطابق اسی خانقاہ کے تہ خانہ میں رکھ دیا گیا۔

" بہت حسین تھیں ؟ "

" بیحد — "

" میں بھی — "

---

[1] اولیا کے مزارات پر چادریں EPITHAPION چڑھانے کی رسم مسلمانوں نے قرونِ اولیٰ کے عیسائیوں سے سیکھی تھی۔ ح

اِس وقت خُدایا۔ معاف کرنا میرے دِل میں ایک خیال آیا — یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش جب یہ زندہ تھا اور فادر نہیں بنا تھا۔ اور سیر گرینڈ ڈیوک اف طبلسی کا بیٹا تھا اور میں سفیر بازنطیم کی خوُرلقا لڑکی۔ اس وقت اگر ہماری ملاقات ہوتی — مگر تیری مصلحتیں تو ہی جانے — میں نے فادر کو اپنے قصے کے انجام سے آگاہ کیا۔ "میرے مرنے کے بعد زائرین یہاں آنے لگے۔ چند معجزے مشہور ہو گئے۔ صدیاں گذرتی گئیں ۱۸۷۲ء میں کلیسا نے فیصلہ کیا کہ کسی برگزیدہ بندے یا بندی کو سینٹ قرار دینے کے لیے درجۂ ولایت کی جن شرائط کو پورا کرنا لازم ہے مثلاً چند مصدقہ مُستند معجزے۔ مُستند حالاتِ زندگی وغیرہ۔ اگر میرے کوائف ان شرائط کو پورا کرتے ہوں تو مجھے سینٹ بنا دیا جائے گا۔ برسوں یہ تحقیقات چلا کی۔ جب مکمل۔ میرا کیس ماسکو کے اسقفِ اعظم کے پاس بھیج گیا۔ بالآخر فیصلہ کیا گیا کہ ۲۵ نومبر ۱۹۱۲ء کے روز مجھے سینٹ فلورا سابینا بنا دیا جائے گا۔ اس روز میرا جشن منانے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ مگر اسی تاریخ سے چند روز قبل یہ چرچ اور خانقاہ ہی بند کر دی گئی۔ لہٰذا آفیشیل طور پر میں سینٹ فلورا نہیں ہوں۔ ویسے شاید ہوں — فادر اب تم بتاؤ تم نے ترکِ علایق کیوں کیا۔ دنیا صرف مردوں کے لیے بنائی گئی ہے۔ وہ خانہ فروشی کیوں کرتے ہیں؟ کیا وہی پُرانا قصہ — محبُوبہ کی بے وفائی —؟" وہ چُپ رہا۔

"خداوندا — میں انتہائی عجز سے اقرار کرتی ہوں کہ عورت کی فطرت — ساڑھے تیرہ سو برس موت کی نیند سونے کے بعد بھی نہیں بدلتی۔ میں نے بڑی دلچسپی سے کُریدا — "فادر گریگری — کیا شہزادی کاتنکا تان ہی تمہاری بے وفا محبوبہ تو نہیں تھی؟ کیونکہ خُدا بخشے وہ بڑی دِل پھینک اور عاشق مزاج خاتون مشہور تھی — کیا اس کی وجہ سے تم خانہ برانداز ہوئے؟"

فادر نے تُرشی سے جواب دیا۔ "لیڈی فلورا۔ کیوں تم گڑے مُردے اکھیڑتی ہو۔"

"ہاہاہا" — میں نے اس کے سنس آف ہیومر کی داد دی۔ بلکہ بلیک ہیومر۔ اس نے مضطرب انداز سے ایک اور سگریٹ سُلگایا۔

میں نے کہا — "فادر — زیادہ تمباکو نوشی تمہارے پھیپھڑوں کیلئے نقصاندہ ہے" — مُعاً خیال آیا — یہ بھی بلیک ہیومر ہے۔

"برسبیلِ تذکرہ۔ تمہاری اس بے حد دیندار تاتنکا نے جارجیا پر عرب تسلط کے فوراً بعد طفلس کے ایک عرب جنرل سے بیاہ رچا لیا تھا" فادر نے خشکی سے کہا۔

"ارے — " میں بھونچکی رہ گئی۔

"ظاہر ہے یہ تمہاری وفاتِ حسرت آیات کے بعد کا واقعہ ہے۔ میں لاکھ گرینڈ ڈیوک کا بیٹا سہی مگر عرب تسلط کے بعد میری کیا حیثیت تھی۔ میں تو اپنی جاگیر کے معاملات سے بھی بے نیاز سارا وقت طفلس کے دارالمخطوطات میں گذارتا تھا۔ شہزادی تاتنکا ہوا کا رُخ پہچانتی تھی۔ زمانہ اب عربوں کے ساتھ تھا۔ میں سیاست سے متنفر اور تاتنکا سیاسی داؤ پیچ کی اُستاد۔ مجھے پہلے پہلے بہت صدمہ ہوا۔ جذباتی اور ذہنی۔ پھر میں نے سوچا میاں گریگری اور سلیمانی۔ عورت ذات اس لائق نہیں کہ اس کیلئے رو یا دھویا جائے۔ تضیعِ اوقات۔ رہیں حسین لڑکیاں۔ تو ان کی کہیں کمی نہیں۔ وہ کونسی ناقابلِ حصوُل اشیا ہیں؟ چنانچہ میں نے کتابوں میں جی لگایا۔ مگر طبلسی کے اسکرپٹوریم میں مستقل ریسرچ کے لسان راہبوں کے سلسلے میں شامل ہونا ضروری تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ راہب بھرتی ہو گیا۔ چند ماہ بعد قرطاجنہ چلا گیا۔ اور خاص اس مدرسے میں کام کیا جہاں سینٹ آگسٹین نے پڑھا تھا۔ پھر روما گیا۔ ایتھنز گیا۔ تمہارے وطن قسطنطنیہ گیا۔ نہیں۔ اپنی سیاحت کے دوران تمہارا عقیو ڈورک گیلاس مجھے کہیں نہیں ملا۔ کہیں مر مرا چکا ہوگا۔"

"خدا نہ کرے" میں بے ساختہ بول اٹھی۔ فادر ہنسنے لگا۔ "پھر بحیرۂ اسود کے راستے گرجستان واپس آیا۔ نہیں۔ میں شہزادی کاتنکا کے کانونٹ بھی کبھی نہیں آیا۔ وہ سامنے جو نیلگوں سلسلۂ کوہ دیکھتی ہو نا — اس کے دامن میں ایک رباط خانہ فروشاں موجود تھا۔ حملہ آوروں کی وجہ سے اس کی قلعہ بندی کی گئی تھی۔ چند راہبوں نے فرازِ کوہ میں پتھر کاٹ کر اپنے پوشیدہ حُجرے تعمیر کئے تھے۔ بہت سے نوجوان خانہ فروش غار روں میں رہتے تھے۔ میں نے ایک الگ تھلگ چوٹی کے غار میں اپنا مسکن بنایا۔ سامنے پتھروں کی دیوار چُن کر اس پر خوش رنگ پھُولوں کی بیلیں چڑھائیں۔ عبادت کے لیے ہم لوگ وادی کے کیتھیڈرل میں جایا کرتے تھے اور کھانا مل جُل کر رباط کے ہال میں کھاتے تھے۔ ہم میں سے بہت سے خانہ برانداز اسکالر رہ چکے تھے۔ رات کو اکثر علمی معاملات پر بحثیں ہوتیں۔ کوئی شامت کا مارا نسطوری ماوراالنہر سے آنکلتا تو اس سے جھائیں جھائیں کرتے وہ کہتا عذرا مریم مادرِ یسوع ہیں۔ مادرِ خدا نہیں۔ ہم کہتے ہیں — تمہارے پاس کیا ثبوت ہے۔ وہ کہتا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟ — کوئی سیرین پادری آ پہنچتا اس سے جھڑپ رہتی وہ کہتا مسیح کی وحدتِ فطرت کے قائل ہو جاؤ۔ ہم کہتے ہرگز نہیں ہوں گے۔ ان جھگڑوں سے تنگ آ کر کئی راہب طفلس پہنچے اور مُسلمان ہو گئے۔

"غرضیکہ بڑا اچھا وقت گذر رہا تھا۔ عید میلادالمسیح سے دو روز پہلے کی بات ہے میں صُبح منہ اندھیرے باورچی خانے کے لیے لکڑیاں کاٹنے جنگل میں گیا۔ سارا جنگل برف پوش تھا۔ وادی میں کلیسا کے سُریلے گھنٹے بج رہے تھے۔ اور خرگوش اور گلہریاں میرے چاروں طرف دوڑتی پھر رہی تھیں۔ سینٹ گریگری کی ایک کونٹا کیا گنگناتے گنگناتے میں نے زور سے کلہاڑی جو درخت کے تنے میں ماری وہ آ کر میرے پاؤں میں لگ گئی۔ میں نے فوراً تھوڑی سی برف سے زخم صاف کر کے ہرے پتوں کی پٹی باندھی۔ لکڑیاں کاٹ کر خانقاہ واپس آیا۔ اور روزمرہ کے مشاغل میں مصروف ہو گیا۔ رات کو اپنے حجرے میں جا کر سونے سے پہلے حسبِ معمول موم بتی جلائی اور سینٹ آگسٹین کے اعترافات کا مُطالعہ شرُوع کیا۔ کلہاڑی کا زہر بادِ صبح تک ختم ہو چکا تھا۔ وقتِ رحلت سن شریف ۴۵ سال تھا مجھے معلوم نہیں اس مرقد میں کب اور کیوں منتقل کیا گیا؟"

شاید شہزادی کاتنکا نے تابوت یہاں منگوا لیا ہو۔ میں نے سوچا لیکن خاموش رہی —

الاؤ بجھ چکا تھا۔ سرد ہوا میں ہمارے ڈھانچے کھڑکھڑانے لگے۔ فادر گریگری نے کہا "آؤ چل کر کہیں سے گرم کپڑے تلاش کریں۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔"

صنوبروں کے جنگل سے گذر کر ہم دونوں تیسرے ایک گرجا میں پہنچے جو نسبتاً بہت جدید تھا یعنی گرجستان کی ملکہ گوران دُخت نے گیارہویں صدی میں بنوایا تھا۔ یہ شاید ایک "فنکشننگ چرچ" تھا کیونکہ اندر تیسرے مُرصّع طلائی آئیکنوں کے سامنے اونچے شمع دان روشن تھے اور معبدِ عذرا کا دروازہ کھُلا پڑا تھا۔ ہم اندر گئے۔ گیلری میں ایک الماری نظر آئی جس میں پادریوں کے سیاہ چوغے لٹک رہے تھے۔ پادری شاید اپنے

مکان میں موجود ہے تھا۔ فادر گریگری نے الماری میں سے دو لبادے مع نقاب چرائے جو ہم دونوں نے فوراً پہن لیے۔ جان میں جان آئی عین اسی وقت الماری کے پیچھے ایک پرچھائیں دکھلائی دی۔ ایک شخص، چارخانہ کوٹ، براؤن پتلون، سر پہ گھنے کھچڑی بال، موٹے شیشوں کی عینک۔ وہ بھی ایک چوغہ چرانے میں مصروف تھا۔ ہمیں دیکھ کر الماری کے پیچھے دُبک گیا۔ ہم دونوں فوراً باہر آگئے اور اس شخص کے ڈر سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ڈگمگاتے کھڑکھڑاتے پہاڑی اترنے لگے۔ چند منٹ بعد پلٹ کر دیکھا وہ شخص بھی ایک خانہ فروش کے سیاہ لبادے میں ملفوف ہمارے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ ہم نے جلدی سے خیمہ گاہ کا رُخ کیا۔ تاکہ وہاں کے مجمع میں کھوجائیں۔ لیکن وہاں سے لڑکے اور لڑکیاں اب اپنے اپنے پیک اٹھائے جہاز کے سمت بڑھ رہے تھے جو نزدیک جیٹی پر کھڑا تھا۔

ایک لڑکا اور لڑکی باتوں میں محو ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ان کی پشت پر جو بیگ بندھے ہوئے تھے ان میں دو دو جوڑی چمڑے کے دستانے آویزاں تھے۔ فادر گریگری نے فوراً ہاتھ کی صفائی دکھائی۔ اس کے بعد وہ ایک خالی خیمہ میں گھس گیا اور وہاں سے دو جوڑ فل بوٹ اور دو مفلر اُڑا لایا۔ ایک اور خیمے سے سیاہ چشمے دو عدد پار کیے اب ہم دونوں نے ایک درخت کے پیچھے جا کر فل بوٹ سموری استر والے چرمی دستانے پہنے گوگلز سے آنکھیں اور مفلر سے گردنیں چھپائیں اور بیسویں صدی کے پچھترویں سال کا مقابلہ کرنے کے لیے کمربستہ ہوئے۔ اب ہمیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ دو مرتے جا رہے ہیں۔ ہمارے چہرے ہُڈ میں چھپے ہوئے تھے۔ آنکھیں گوگلز میں۔ جیتے جاگتے راہب اور راہبہ معلوم ہو رہے تھے۔

اب پو پھٹنے والی تھی۔ دریا پر گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ جہاز نے روانگی کا بھونپو بجایا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کا غول گاتا بجاتا گینگ وے پر چڑھنے لگا۔ وہ کئی سو طلباء تھے۔ ہم بھی ان کی بھیڑ میں جا گھسے اور جہاز پر چڑھ گئے۔ دُھند لکے اور بھیڑ بھڑکے میں ہمیں کسی نے نہیں دیکھا۔ جہاز پر پہنچ کر اب جو پلٹ کر دیکھتی ہوں تو وہ شخص پُراسرار موجود۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ چڑھ آیا تھا۔ ہماری طرح سیاہ چوغے اور سیاہ عینک میں رُوپوش۔ ہم خاموش رہے۔ وہ ساتھ ساتھ لگا رہا۔ ہم پھرتی سے ایک اندھیرے کونے میں دُبک گئے وہ بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ جہاز نے لنگر اٹھایا اور جنوب کی سمت روانہ ہوا۔

ہم دونوں بھوک پیاس اور نیند سے بے نیاز تھے۔ اس تیسرے پر کیا گذر رہی ہوگی اس کا اندازہ ہمیں نہیں ہوا۔ لیکن وہ بالکل چپکے بیٹھا رہا۔ دوسری رات جہاز بالٹومی پر لنگر انداز ہوا۔ خوش وخرم اور صحت مند، تر وتازہ، گاتے بجاتے نوجوانوں کے جم غفیر کے ساتھ ساتھ ہم تینوں جہاز سے اتر کر ساحل پر آگئے۔ اور جلدی جلدی ایک طرف کو چلنے لگے پتہ ہی نہیں تھا کدھر جا رہے ہیں۔ غرض محض بھاگنے سے تھی۔ سال بھر کے ایڈونچر کی خواہش جو تجھ سے کی تھی۔

چلتے چلتے ہم لوگ ایک جگہ پہنچے جہاں بہت ساری کشتیاں کھڑی تھیں۔ ابھی سُورج نکلنے میں بہت دیر تھی اور ساحل سنسان پڑا تھا۔ فادر گریگری نے ایک موٹر بوٹ کا رسّا اس کے کھونٹے سے علیحدہ کیا اور تیرا نام لے کر اس میں کود گئے۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے سوار کرایا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ وہ تیسرا کنارے پر موجود۔ یا اللہ۔ سُنا تھا کہ موت زندگی کا تعاقب کرتی ہے۔ یہاں اُلٹا حساب تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا ہلا کر زور سے کہا — مجھے بھی ساتھ لے چلو — مجھے بھی۔ اس نے پہلی دفعہ بات کی تھی۔ فادر نے اشارے سے اس کو بوٹ میں بُلا لیا۔ اور انجن اسٹارٹ کیا۔ اس مہارت سے گویا ساتویں صدی عیسوی کے دنیا گرد آپ موٹر بوٹ ہی پر طفلس آیا جایا کرتے تھے۔

وہ شخص نامعلوم آکر ہمارے برابر بیٹھ گیا۔ فادر گریگری نے یکدم پروفیشنل آواز میں دریافت کیا — "پیارے بیٹے۔ تمہیں کیا تکلیف ہے۔ تم ملکہ گوران درخت کے گرجا سے لے کر یہاں تک ہمارا تعاقب کیوں کر رہے ہو —؟"

مجا مجھے مخاطب کیا — "یہ جیٹ کشتی ہے —" پھر اس آدمی کی طرف متوجہ ہوئے "ہاں۔ تو پیارے بیٹے تمہیں کیا تکلیف ہے —؟"

اس نے اپنے منہ پہ ہاتھ رکھ کر دھیرے سے کہا "فادر۔ میں ایک ڈسی ڈنٹ انٹلکچوئیل ہوں۔ ویسٹ کو ڈی فیکٹ کر رہا ہوں۔ میری مدد کرو۔"

"ویسٹ —؟ فادر نے فوراً کشتی کا رُخ مغرب کی طرف کر دیا۔ "بلغاریہ کی کونسی بندرگاہ جانا چاہتے ہو اس لمحے فادر گریگری اور بلیتانی کی کھوپڑی سے علوم حاضرہ اور معلوماتِ عامہ شاید عارضی طور پر غائب ہو چکی تھی یا ان کی کھوپڑی اس وقت کہیں اور تھی۔ بہرحال۔ اس شخص نے گھبرا کر کہا — "فادر شاید آپ ۱۶۴۵ء کے بعد اپنی خانقاہ سے باہر نہیں نکلے —"

"۱۶۴۵ء میں میں طلبی میں تھا" — فادر بولا۔ مگر شکر ہے موٹر کے شور میں اس شخص نے یہ بات نہیں سُنی۔ وہ کہتا رہا۔ "فادر۔ ویسٹ اب دیوارِ برلن کے دوسری طرف سے شروع ہوتا ہے —"

خُداوندا۔ میں بھولی بھالی حوّا کی ناقص العقل بیٹی۔ میں بول اٹھی "دیوارِ چین تو میں نے بھی سُنی ہے — سدِ سکندری اور دربند ہمارے کوہستان قفقاز ہی میں موجود ہیں — یہ دیوار برلن کہاں ہے؟"

فادر نے مجھے ٹھوکا دیا کہ چپ رہوں۔ اس لحظے فادر گریگری کی ساری عصری حسّیت واپس آچکی تھی۔ انہوں نے موٹر بوٹ کا رُخ ترکی کی طرف کر دیا۔ کشتی کھلے سمندر میں فرّاٹے بھرتی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ فادر نے اس ڈسی ڈنٹ انٹلکچوئیل سے کہا "پیارے بیٹے۔ خُدا کو یاد کرو۔ جس نے یونس علیہ السلام پیغمبر کو بچایا۔ ہمارا بھی حافظ و ناصر ہے۔ اور سمندروں کا ستارہ — عذرا مریم ہماری رہنمائی کرنے والی ہیں —"

"آمین —" میں نے کہا۔ "پیارے بیٹے۔ خُداوند کریم بادبانی جہازوں اور کاروانوں کے رہبر کو یاد کرو۔ میں اُمید کرتی ہوں کہ تم صحیفہ اولیاء اور مسیحی شہیدوں کے احوال، پابندی سے پڑھتے ہوگے۔"

اس نے جواب دیدیا: "میں صرف ملارمے، کافکا، اور بودلیئر کا مطالعہ کرتا ہوں"

خُدایا۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے ان اولیاء کے نام پہلے نہ سنے تھے۔ ربُّ العالمین — اس کے بعد کا سارا احوال تجھ پر روشن ہے۔ ہم کس طرح کن ایڈونچرز کا سامنا کر کے بالآخر وی آنا پہنچے۔ وہاں کس طرح ہمارا خیر مقدم ہوا۔ ڈسی ڈنٹ انٹلکچوئیل نے کس طرح پریس کانفرنس بلائی۔ ٹی۔ وی اور پریس سے انٹرویو کتابوں کے کنٹریکٹ۔ دعوتیں اور عصرانے۔ میں اور فادر گریگری ہر جگہ ساتھ۔ لیکن وی آنا پہنچتے ہی فادر نے ڈسی ڈنٹ انٹلکچوئیل سے کہہ دیا تھا کہ تم سب کو اچھی طرح سمجھا دو ہم میں اور مدر فلورا دونوں کلیسائے گرجستان کے ایک ایسے قدیم ترین آرڈر سے تعلق رکھتے ہیں جس کے اراکین مرتے دم تک مکمل طور پر خاموش رہنے کا عہد کر چکے

ہیں۔ لہٰذا ہم دونوں کو انٹرویو دینے سے معاف رکھا جائے۔ روزمرہ کی ضروریات کے متعلق ہم دونوں ایک پرچی پر چند الفاظ لکھ دیا کریں گے۔ علاوہ ازیں ہم تصویریں بھی نہیں کھنچوائیں گے کہ یہ اظہار خود ستائی و خود نمائی ہے۔ انشلکچوئیل نے یہ پیغام صحافیوں کو دیدیا۔ ایک تہلکہ مچ گیا۔ اب ورلڈ پریس میں سرخیاں چھپیں۔ "فادر گریگری اور مدر فلورا کا ہمیشہ کے لیے خاموش رہنے کا عہد۔" اس کے بعد پریس میں ایک صحافی نے اصرار کیا: "میرے سوالات کا جواب پرچے پر لکھ کر دیدیجئے۔" فادر نے جواباً لکھا۔ "میں بوجوہ کچھ نہیں کہنا چاہتا"۔ چنانچہ مزید سرخیاں: "فادر گریگری کا بیان۔ وہ بوجوہ کچھ کہنا نہیں چاہتے۔"

پیرس سے ہم لوگ لندن لے جائے گئے۔ وہاں بھی یہی ہنگامہ رہا۔ اب ہمارا معمول یہ تھا کہ انشلکچوئیل میڈیا کے نمائندوں میں گھرا رہتا۔ فادر گریگری کتب خانوں میں وقت گذارتا۔ میں ونڈو شاپنگ کرتی پھرتی۔ ہم لوگ بہترین ہوٹلوں میں ٹھیرائے گئے۔ پریس نے ہماری خواہشات کا احترام" کر کے مجھے اور فادر کو بالکل تنہا چھوڑ دیا تھا۔ ہمارے میزبان بھی اگلے دن کے پروگرام کے متعلق جو کچھ کہنا ہوتا ڈسی ڈنٹ انشلکچوئیل کو بتا دیتے تھے۔

ایک مہینے بعد، یا غفور و رحیم۔ تجھے بخوبی علم ہے کہ ہم تینوں امریکہ مدعو کئے گئے۔ جہاں پروگرام کے متعلق ہم تینوں مستقل سکونت اختیار کرنے والے تھے۔ انشلکچوئیل اب بے طرح مصروف تھا۔ اپنی کتاب اور سلسلہ وار مضامین کے لیے نہایت کثیر رائلٹی پیشگی وصول کر چکا تھا اور عیش کر رہا تھا۔ ہم لوگ ملٹن میں ٹھیرائے گئے۔ اب یہاں مجھے اور فادر کو اسی مسئلے کا سامنا کرنا پڑا جس نے ہم کو مغربی یوروپ اور انگلینڈ کے ہوٹلوں میں پریشان کیا تھا۔ الٰہی۔ تو واقف ہے کہ ہم دونوں بھوک، پیاس، نیند اور باتھ رُوم جانے کی حاجتوں سے بے نیاز تھے۔ لہٰذا ہم اپنے کمروں میں نہ بریکفاسٹ منگواتے۔ نہ کھانا۔ نہ کھانے کے لیے نیچے جاتے۔ نہ رُوم سروس کو کسی ضرورت کے لیے فون کرتے۔ لیکن سب سے بڑا معاملہ باتھ رُوم تھا۔ کموڈ پر بندھے کاغذی ربن جوں کے توں سلامت رہتے۔ تولیہ، صابن، واش بیسن ہر چیز UNTOUCHED صبح کو میڈ صفائی کے لیے آتی تو متحیر ہوتی۔ فادر سے اس سلسلے میں بات کرتے مجھے شرم آتی تھی۔ آخر ایک دن میں نے اس سے کہا، وہ بولا — "عورت واقعی ناقص العقل ہے۔ یہ تو بڑی آسان بات ہے۔ میں کاغذی ربن علیحدہ کر دیتا ہوں۔ واش بیسن کے آس پاس پانی چھڑک دیتا ہوں۔ ذرا سا چھینٹا صابن پر ڈال دیتا ہوں۔ یہ کوئی پرابلم نہیں۔" کھانے پینے کے متعلق ہم نے دی آنا ہی میں اپنے میزبانوں سے کہہ دیا تھا کہ ہم دونوں مسلسل روزے رکھتے ہیں اور رات کو محض جَو کی روٹی پیاز پنیر اور سادے پانی سے افطار کرتے ہیں چنانچہ نہایت پُر تکلف نقرئی کشتیوں اور بڑھیا برتنوں نیپکن سے ڈھکی "افطاری" ہمیں شام کے وقت ہمارے کمروں میں پہنچا دی جاتی تھی جسے ہم کاغذی بیگ میں رکھ کر صبح کو باہر لے جاتے اور سڑک کے کنارے کسی ڈسٹ بن میں ڈال آتے۔ لیکن ملٹن میں قیام کے چوتھے روز فادر نے مجھ سے کہا — "ہمارے میزبانوں نے ہمیں ویسٹ کوسٹ کے گریک اور تھوڈکس، خانقاہوں میں بھیجنے کا انتظام کیا ہے۔ نیچے آؤ تو میں تم سے مشورہ کروں۔"

میں گھبرائی ہوئی نیچے گئی۔ فادر نے کہا — "میں نے ابھی ابھی کمپنی کے سکریٹری سے بات کی ہے اور اس سے کہا ہے۔ ہم پہلے اپنے چند جارجین رشتے داروں سے ملنے فلاڈلفیا جائیں گے اس کے بعد کچھ عرصہ نیویارک میں چند عزیزوں کے ساتھ قیام کرینگے کیونکہ یہاں کتب خانوں میں تھوڑا سا کام کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے مجھے ایک خطیر رقم اس عرصے کے اخراجات کے لیے دیدی ہے۔ کل صبح یہاں سے چیک آوٹ کر جائیں۔

لہٰذا دوسرے روز ہم ڈسی ڈنٹ انشلکچوئیل اور اپنے میزبانوں کو خدا حافظ کہہ کر ملٹن سے کھسک لیے۔ فادر نے ایک معمولی بورڈنگ ہاؤس میں دو کمرے کرائے پر لیے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ فادر سائنس اور ٹیکنولوجی اور عالمی سیاست پر تازہ ترین کتابیں خریدتا میں فیشن میگزین۔ وہ کتب خانوں میں وقت گذارتا۔ میں ونڈو شاپنگ کرتی ایک روز، ایک بک شاپ میں میں نے کیا دیکھا کہ فادر پلے بوائے کا بغور مطالعہ کر رہا ہے مجھے دیکھ کر جھینپ گیا۔ بولا۔ اس رسالے میں انٹرویو بہت عمدہ چھپتے ہیں۔ میں سال بیلو پر ایک مضمون پڑھ رہا تھا۔

فادر کتب خانوں سے ایک آدھ کتاب چرا بھی لاتا تھا اور سگریٹ نوشی کی لت ایسی پڑی تھی کہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر مسلسل سگریٹ پیتا تھا۔ پبلک میں سگریٹ پی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کے لیے بڈ میں چھپا ہوا چہرا کھولنا پڑتا۔

سال بھر کی مہلت تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ مہرگان آچکا تھا۔ ہر طرف درختوں میں سرخ پتے جھلملا رہے تھے۔ میری بڑی تمنا تھی کہ کم از کم ایک خوبصورت لباس خرید کر اپنے کمرے میں اسے پہن لوں۔ فادر پکا MALE CHAUVINIST تھا، میری اس تمنا کو لاپروائی سے نظر انداز کرتا رہا، بلکہ میرے حصے کے ڈالر بھی اپنی کتابوں پر خرچ کر ڈالے۔ اکثر جا کر سینما اور تھیٹر دیکھتا۔ مجھ سے کہہ جاتا۔ تمہارے کمرے میں ٹی۔ وی ہے اسے دیکھو۔ اور پھر عبادت کرو۔

ہائے اللہ۔ میں یہ تو بتانا بھول ہی گئی۔ میں نے تیرے بھلکڑ فرشتے سے پوچھا تھا، فرض کرو ہم وقتِ مقررہ پر خاص اس مرقد میں نہ پہنچ سکے تو کیا ہوگا۔ اس نے جاتے جاتے جواب دیا تھا کہ تم جہاں بھی ہو کسی نزدیک ترین قبرستان چلے جانا اور دو خالی قبروں میں جا پڑنا یہ سال ختم ہونے والا تھا۔ خدایا تیری اتنی بڑی، اتنی دلچسپ کشمکش اور اتنی ترقی یافتہ دنیا میں ہم تو ابھی کچھ بھی نہ دیکھ پائے۔ فادر نے قبرستان تلاش کرنے کا کام بھی مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ خود سیر سپاٹے کے لیے نکل جاتا اور میں گورستانوں کے چکر لگاتی کہ کہیں دو خالی قبریں دکھلائی دے جائیں تو انہیں نظر میں رکھوں۔

واپسی کے لیے اب صرف چند روز باقی رہ گئے تھے۔ پیسہ قریب الختم تھا۔ فادر اس کے لیے تیار نہ تھا کہ میزبانوں کو فون کر کے مزید ڈالر مانگے۔ وہ پوچھتے تم لوگ ابتک یہاں کیا کر رہے ہو، ویسٹ کوسٹ کی خانقاہ کیوں نہیں گئے۔ باقیماندہ ڈالروں سے (جو میرے حصے ہی کے تھے) میں اپنی پہلی اور آخری خواہش — ایک گاؤن خریدنا چاہتی تھی۔ لیکن فادر اس رقم سے عرب آئل کی اقتصادیات اور یوروپین کامن مارکیٹ پر دو کتابیں خرید لایا۔ میں رو پڑی اس نے کہا "وقت بہت کم رہ گیا ہے دن رات لگ کر یہ پڑھوں گا۔" پھر مجھے بہلانے کے لیے بولا۔ "ذرا یہ تو سوچو ہمارے انڈر گراؤنڈ ہو جانے پر ساری دنیا میں کس قدر تہلکہ مچے گا۔" (میں نے "انڈر گراؤنڈ" کی فوراً داد دی) "امریکن اور روسی دونوں یہ سمجھیں گے کہ ہم ڈبل ایجنٹ تھے اور بے چارے ڈسی ڈنٹ انٹلکچوئیل پر آفت آئے گی۔ مگر صورتِ حال ایسی ہے کہ ہم اس غریب کی کسی طرح مدد نہیں کر سکتے۔ آؤ ذرا ٹہل آئیں۔"

ہم گھومنے نکلے۔ ایک عالیشان دوکان میں کرسچین دیور کی تازہ ترین تخلیقات

کی نمائش ہو رہی تھی۔ میں فادر کو دوکان میں گھسیٹ لے گئی۔ فیشن شو شروع ہو چکا تھا۔ اس دوکان کا مالک کوئی کیتھولک تھا۔ ہمارے سیاہ لبادے دیکھ کر کسی نے کچھ نہیں کہا۔ ہم جا کر ایک پچھلی قطار میں بیٹھ گئے۔ میں ملبوسات کو اور فادر گریگری ماڈل لڑکیوں کو دیکھتا رہا۔ اچانک میں حیرت زدہ رہ گئی۔ ایک ماڈل لڑکی ارغوانی اطلس کا گاؤن پہنے سامنے سے گذری جس کے کنارے اور پیٹی پر موتی ٹنکے تھے۔ تقریباً اسی وضع کا بازنطینی قبا چہ میں نے اس رات صحرائے سُوریا کی خانقاہ کے حجرے میں آخری بار اتار کر راہب کی کھردری ردا پہنی تھی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ نہایت بیش قیمت لباس تھا۔ کئی ہزار ڈالر کا رہا ہوگا۔

فادر نے چپکے سے پوچھا۔ "لیڈی فلورا سابینا۔ کیا تم بھی وہی سوچ رہی ہو جو میں سوچ رہا ہوں"؟ میں نے کہا "ہاں۔ فادر گریگری" وہ چپ رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا "تم اب گھر چلی جاؤ۔ میں رات کو آؤں گا" میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔

رات کے دو بجے فادر بورڈنگ ہاؤس پہونچا۔ اس کا کمرہ میرے کمرے کے پہلو میں تھا۔ میں نے کھٹپٹ کی آواز سنی۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے کواڑ کھولا۔ اس نے اپنے کلوک کے اندر سے ایک پیکٹ نکال کر مجھے تھما دیا۔ اطمینان سے کہا ——

"بھیڑ بھڑکے میں ایک بیک روم میں جا گھسا۔ یہ گاؤن سامنے ہی ہینگر پر موجود تھا۔ خدا ہمارے ساتھ ہے" وہ اپنے کمرے میں جا کر آئل کراس پر کتاب پڑھنے میں مشغول ہوا میں نے گاؤن پہنا۔ اس میں PADDING کی کافی سے زیادہ ضرورت تھی۔ دوسرے روز میں دوکان سے مطلوبہ سامان خرید لائی۔ پھر دو دن کمرے میں بیٹھ کر سارے گاؤن کے نیچے روئی کا موٹا استر لگایا۔ اب جو پہنا تو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا ایک ڈھانچے نے زیب تن کیا ہے۔ تیسرے پہر کو فادر میرے کمرے میں آیا، مجھے اس لباس میں دیکھ کر سیٹی بجائی۔ ہم لوگ پارک میں جا کر اپنی پسندیدہ بنچ پر بیٹھ گئے۔ فادر اداسی سے مجھے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے سیاہ لبادے کی جیب سے ایک کتاب برآمد کی اور آہستہ سے بولا۔ "آج میں لائبریری سے آئرلینڈ کے شاعر ڈبلیو، بی، ایٹس کی کتاب چرا لایا ہوں" ہمارے چاروں طرف شاہ بلوط کے خزاں زدہ سُرخ پتوں کی بارش ہو رہی تھی۔ سورج ڈوبنے والا تھا اور تاریکی چھا رہی تھی۔ فادر گریگری اور بیلیانی نے کہا "اس نظم کا عنوان ہے SAILING TO BYZANTIUM سنو" اس نے گمبھیر آواز میں آہستہ آہستہ پڑھنا شروع کیا۔

وہ سرزمین ضعفا کی نہیں۔ شادماں نوجواں۔ طائرانِ چمن۔ مرتے جاتے ہیں جو اور ہیں مولمن۔ یم بہ یم مچھلیوں کے وہ سیمیں شنا، مرغ دماہی وانسان، ہر جاندار جشنِ جاں میں ہے مشغول وقتِ ثمر۔ جو شش دم کی رامشگری میں مگن، بھول جاتے ہیں ہم نقش ہائے کہن، ذہن جاوید کے معجزاتِ جلیل۔

ہے حقیر و تہی ایک مرد کہن۔ چوبِ دستی پہ لٹکا ہوا پوستیں۔ اگر جوش سے روح نہ ہو نغمہ زن، خاکی پوشش کے ہر خستہ جاں کے لیے۔ شعر و نغمہ کی کوئی روایت نہیں، کاملوں سے کرے جو نہ کسب ہنر، اپنی عظمت کی تعظیم جو خود وہ کرے۔ تو قلزم پر آرام

میں بازنطیم کے بلادِ مقدس میں وارد ہوا ہوں۔

نقش دیوار کی پچی کاری کے سونے کے مانند۔ شعلۂ قدس میں مستمرِ عاقلو۔ آتشِ پاک سے باہر آؤ ذرا

[وقت و تار سح کی] گردش مستعلی —— رقص اس میں کرو۔ پیر نغمہ بنو تم مری روح کے۔ پھونک ڈالو یہ دل۔ راکھ اس کو کرو کثرتِ آرزو سے جو ہے مضمحل جاں بلب جانور سے بندھا ہے اور خود اپنی حالت سے واقف نہیں —— مجھے ابدیت کی صنعت کی آغوش میں کیوں نہ لے لو

اک بار فطرت سے ہو ماورا۔ میں، پیکر میں اپنا پھر اس سے نہ لوں گا مگر ایسا پیکر جو یونان کے کسی استاگر نے ورق طلا سے بنایا ہوا ایسا، غنودہ شہنشاہ جگائے جو رکھے۔ یا اک شجر زریں پہ میں بیٹھ جاؤں۔ اور بازنطیم کے امیروں کی خاطر، فلک مرتبت مہ جبینوں کی خاطر۔ میں گیت گاؤں۔ گاؤں میں اس کا۔ گذر جو چکا ہے، گذر اب رہا ہے، یا ہونا ہے باقی۔

میں پھل پھل رو رہی تھی۔ فادر نے کتاب بند کر کے ایک لمبی سانس لی اور کہا چلو آخری بار ڈاؤن ٹاؤن ہو آئیں۔ ہم دونوں پارک سے نکلے۔ ٹیکسی پر شہر پہنچے۔ راستے میں ایک شاندار ہوٹل پر لکھا نظر آیا "اسرائیل فنڈ کے لیے ماسک بال" فادر نے مجھے دیکھا۔ میں نے اسے۔ ہم ایک ڈپارٹمنٹ اسٹور پر اتر گئے۔ پارک سے چلتے وقت میں نے اپنا سیاہ لبادہ اپنے گاؤن کے اوپر پہن لیا تھا۔ حسبِ معمول سیاہ چشمے، اور ہڈ میں روپوش ہم نے دوکان میں جا کر دو ماسک خریدے۔ اور سنہرے وِگ۔ زنانے اور مردانے کلوک روم میں جا کر ہم دونوں تیار ہوئے۔

فادر چلتے چلتے اپنے لیے ایک بڑھیا اسکارف خریدنے لگا۔ تب میں نے اسے پھر یاد دلایا "آج ہماری مہلت کا آخری دن بلکہ آخری شام ہے ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ہمیں انڈر گراؤنڈ ہونا ہے۔ جو قبرستان میں نے تلاش کیا ہے ہمارے جائے قیام سے کافی دور ہے۔ سارے پیسے مت خرچ کر دو۔ قبرستان جانے کے لیے ٹیکسی کرنی ہوگی" پھر بھی اس نے قیمتی سگریٹ کا ایک پیکٹ خرید لیا۔ ہم بھاگم بھاگ ہال میں پہنچے۔ داخلہ بذریعہ ٹکٹ تھا۔ ہم نے سب سے کم قیمت کے دو ٹکٹ خریدے۔ صدر دروازے پر فٹ مین نام اناؤنس کر رہا تھا۔ فادر نے (جو اپنے سیاہ لبادے میں تھا صرف چہرے پر ماسک پہن لیا تھا) متانت سے کہا۔

"پرنسس کاتنکا تناتن آف جارجیا، گرینڈ ڈیوک اور بیلیانی آف طبلسی۔"

ہوٹل کا چوبدار ہمیں انقلاب کے بعد آئے ہوئے سفید روسی سمجھا۔ اندر جا کر ہم دیوار کے قریب ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ بڑا شاندار رنگا رنگ مجمع تھا۔ آرکیسٹرا "بلیو ڈینوب" بجا رہا تھا۔

چند منٹ بعد فادر سگریٹ پینے کے لیے باتھ روم چلا گیا۔ میں وہاں چپ چاپ بیٹھی سوچتی رہی۔ اب صرف دو گھنٹے بعد قیامت تک قبر کی تنہائی اور تاریکی۔ تب دفعتاً مجھے وہ دکھلائی دے گیا۔ تھیوڈورک گیلاسِس —— وہی سنہرے گھنگریلے بال، لمبا اونچا، پورا۔ یونانی ناک۔ وہ ایک رومن سینیٹر کا بھیس بدلے ایک "ہسپانوی رقاصہ"

لہ ایٹس کا نظریہ تھا کہ انسان اگر تکمیلِ فن میں مصروف رہے تو اسے زندگی سے کنارہ کش ہونا پڑتا ہے۔ آرٹ اور زندگی کی DICHOTOMY ایٹس کا خاص مسئلہ ہے

لہ بازنطینی موزیک کی لازوال دیواری تصاویر جو گویا شاعر کی مثالی سامعین ہیں کیونکہ مرگ و فنا سے ناآشنا ہیں (ق۔ ح)

کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ یہ کس طرح ممکن ہے۔ کیا یہ بھی ایک معجزہ ہے۔ فلورا میں بالکل بوکھلا گئی۔ وہ کئی بار ناچتا ہوا میرے سامنے سے گذرا اور شاید مجھے اپنی طرف متوجہ پاکر رقص کے بعد خود میرے پاس آیا اور اپنے ساتھ ناچنے کی درخواست کی۔ میں نے ہڑبڑا کر کہا۔" میرے پاؤں میں موچ آگئی ہے تھیوڈورک ——"

اس نے صرف آنکھوں پر سیاہ ماسک پہن رکھا تھا۔ وہ اتارا۔ وہ کوئی اور تھا —— میرے تھیوڈورک سے ہلکی سی مشابہت ضرور تھی۔ لیکن کوئی اور تھا۔ بھلا وہ کیسے ہوسکتا تھا۔ مگر مجھ سے رہا نہ گیا انتہائی حماقت سے پوچھا" معاف کیجئے کیا آپ کا نام تھیوڈورک گیلاسس تو نہیں ہے؟" اس نے کہا" جی نہیں۔ میں رچرڈ کوہن ہوں، کولمبیا میں پڑھتا ہوں" پھر دو چار باتیں کر کے چلا گیا۔ چند منٹ بعد فادر سگریٹ پی کر واپس آیا۔ صوفے پر بیٹھتے ہی دیوار کے کلاک پر نظر ڈالی —— اور کہا" لیڈی فلورا —— اب چلنا چاہئے —— دس بج چکے ہیں —— چلو۔ اٹھو ——"

تب اس وقت معًا ایک دہشتناک خیال میری کھوپڑی میں آیا۔ میں نے بوکھلا کر کافی اونچی آواز میں بزبانِ انگریزی کہا —— (ہم دونوں جب سے لندن پہنچے تھے اور وہاں سے امریکہ، اب مستقل انگریزی میں ایک دوسرے سے بات کرتے تھے۔ فادر کی تاکید تھی —— کہ اس طرح ایک نئی زبان بولنے کی پریکٹس رہے گی۔ میں چڑ کر اس سے کہتی فادر ہمیں صرف چند مہینے اس دنیا میں اور رہنا ہے۔ میں کیوں اپنی کھوپڑی کھپاؤں تو وہ جواب دیتا لیڈی فلورا —— انسان عام طور پر حد سے حد ساٹھ ستر سال دنیا میں زندہ رہتا ہے۔ بعض دفعہ اس سے بھی بہت کم۔ لیکن اس احساس کے باوجود کہ اس کی عمر کی مدت بہت مختصر ہے، وہ زندگی کا آدھا حصہ حصولِ علم میں صرف کرتا دماغ کھپاتا ہے محنت کرتا ہے۔ اور اپنی ساری تعلیم، علمیت تجربے خود آگاہی وغیرہ کے باوجود ایک روز پٹ سے مر جاتا ہے۔ اب چاہے ایک شخص کو دس سال اور جینا ہو یا ایک سال۔ بات تو ایک ہی ہے۔" اللہ فادر بڑا جھکی تھا ——)

بہر حال۔ تو ہم لوگ ہمیشہ سرگوشی میں گفتگو کرتے تھے لیکن اس وقت کلاک پر نظر پڑتے ہی میں گھبرا کر اونچی آواز میں بزبانِ انگریزی بول اٹھی" ہمیں جو وقت بتایا گیا تھا کیا وہ گرینچ مین ٹائم تھا ——؟ روس کے اور یہاں کے وقت میں تو کم از کم اٹھارہ گھنٹے کا فرق ہوگا —— اور —— اس نے تو پرانے روسی کیلنڈر کے حساب سے ۲۳ر ستمبر کہا تھا ——"

اس پر فادر گریگری بھی ہڑبڑا کر بولا —— ارے ——" اب کیا ہوگا ——؟"

" اب —— یہ ہوگا ——" ایک پولیس افسر نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ہم دونوں دہشت زدہ ہو کر صوفے سے کھڑے ہو گئے۔ ہمارے گرد ناچنے والوں کا مجمع لگ گیا۔ پولیس افسر کے ساتھ دو سپاہی موجود تھے۔ اس نے فادر کو درشت آواز میں مخاطب کیا —— " فلاں ڈپارٹمنٹ اسٹور سے یہ گاؤن جو تمہاری گرل فرینڈ نے پہن رکھا ہے تم چرا کر بھاگے تھے۔ پولیس اس رات سے تمہاری تلاش میں مصروف ہے —— یہ گاؤن جیکلین اوناسس کی فرمائش پر خاص طور پر تیار کیا گیا تھا۔ مختلف لائبریریوں سے بھی ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ایک شخص راہب کے بھیس میں نادر کتابیں چراتا

غزل

بسمل سعیدی، شفا منزل ٹونک (راجستھان)

ہنگامۂ ہمرہاں نہیں ہے
منزل ہے تو کارواں نہیں ہے

سجدوں سے جبیں نہیں ہے محروم
شرمندۂ آستاں نہیں ہے

ہے عشق کی زندگی میں اک موت
وہ سانس کہ جاوداں نہیں ہے

اک راز ہے دل کا عشق بھی خود
دل کا کوئی رازداں نہیں ہے

عنوانِ ستم سے ہے جو محروم
وہ عشق کی داستاں نہیں ہے

کیوں ہم میں ہے فصل ساحلوں کا
دریا کوئی درمیاں نہیں ہے

ملتے تھے ستارے اپنے جس پر
شاید یہ وہ آسماں نہیں ہے

ساحل پہ کہاں سفینۂ دل
جب عشق کا بادباں نہیں ہے

کیوں ابرِ بہار کے برستے
شادابیِ گلستاں نہیں ہے

ساحل پہ ملے تھے جس کے ہم تم
دریا بھی وہ اب رواں نہیں ہے

محرومیِ دردِ عشق ہے درد
ہے درد وہاں جہاں نہیں ہے

اے شدتِ تابِ مہر بس کر
سر پر کوئی سائباں نہیں ہے

ملتا نہیں جن کو وہ کہیں بھی
کہتے ہیں کہ وہ کہاں نہیں ہے

ہے دور قفس جس آشیاں سے
بلبل کا وہ آشیاں نہیں ہے

جائیں جو دو عالم ان کی خاطر
ایسا تو کوئی زیاں نہیں ہے

آنا اگر ان کا ہے بہتا خیر
کیا موت بھی ناگہاں نہیں ہے

ایک ایک ادا جواں ہے اس کی
ہر چند کہ وہ جواں نہیں ہے

بر خود غلط اس قدر نہ ہو عشق
اتنا تو وہ مہرباں نہیں ہے

کچھ کہنے کو مجھ سے مت کہو تم
کہنے میں مری زباں نہیں ہے

اے عشق یہ میں ہی چل رہا ہوں
آنسو تو کوئی رواں نہیں ہے

جتنے ہیں بلند میرے سجدے
اتنا ترا آستاں نہیں ہے

کیوں ہو یہ صدا، صدا بصحرا
ناقوس کوئی اذاں نہیں ہے

کیا ہے یہ نفس کی آمد و شد
خنجر تو کوئی رواں نہیں ہے

ہے اپنے یقیں سے بدگماں عشق
کچھ حسن سے بدگماں نہیں ہے

تم اور مجھے امتحاں کی سوچو
یہ قتل تو امتحاں نہیں ہے

ہے عشق کی ایک ایک رگ میں
وہ خون جو رائگاں نہیں ہے

اللہ رے بند و بستِ قاتل
خنجر بھی تو خوں چکاں نہیں ہے

اخفا تو ہے خود دلیلِ افشا
یاں راز کوئی نہاں نہیں ہے

جیسی کہ وہ رہگزر ہے بسمل
ایسی تو یہ کہکشاں نہیں ہے

پھر رہا ہے۔ لیکن یہ بیش قیمت گاؤن —— تم دونوں کو ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔"

تب فادر گریگری اور بلیانی نے مجھے دیکھا اور میں نے فادر گریگری اور بلیانی کو۔ ہم دونوں نے پہلے اپنے دستانے اتارے۔ اپنے پنجے اپنے چہروں کی طرف لے گئے۔ سیاہ چشمے الگ کئے اور اپنے اپنے ماسک اتارے —— ■■

فکر تونسوی
روزنامہ ملاپ نئی دہلی

مکان نمبر سی ۵۰۴

ایک دن میں اپنے گھر میں بیٹھا تھا۔ میں عام طور پر گھر میں اس لیے بیٹھتا ہوں کیونکہ لوگ کہتے ہیں گھر میں جنّت ہوتی ہے (جنّت کی دو چارپائیاں ٹوٹی ہوئی ہیں)۔

پہلے میں اپنے گھر کو (چارپائیوں سمیت) غریب خانہ کہا کرتا تھا مگر آج کل خانۂ خدا کہتا ہوں کیونکہ میری بیوی نے گھر کے ایک کونے میں چھوٹا سا خدا بنالیا ہے ـــــ بہرکیف جنّت تھی، غریب خانہ تھا یا خدا خانہ ـــــ اس سے میرے گھر کے بنیادی کیریکٹر میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور ہیں ..... ؟ مگر خیر، آپ کیریکٹر وغیرہ کے چکر میں مت پڑیئے، میری تو عادت ہے بات کو خواہ مخواہ طول دینا۔ قصّہ مختصر یہ کہ میں اس وقت اپنے کمرہ میں تنہا بیٹھا تھا اور تنہائی سے فائدہ اٹھا کر ہنس رہا تھا کیونکہ کل کافی ہاؤس میں ایک دوست نے ایک لطیفہ سنایا تھا۔ جس پر تین چوتھائی ہنسی تو اسی وقت ادا کردی تھی ایک چوتھائی ہنسی باقی تھی۔ جسے اب ہنس رہا تھا۔ لطیفہ کچھ یوں تھا کہ ایک صاحب راشن کے دفتر میں داخل ہوئے اور راشن انسپکٹر سے کہنے لگے: "جناب! میرا سولھواں بچّہ پیدا ہوگیا ہے لہٰذا میرے راشن کارڈ میں اس کا نام درج کر دیجیے"

راشن انسپکٹر نے تعجب سے پوچھا: "او مائی گاڈ! سولھواں بچّہ۔ بھائی صاحب! آپ کام کیا کرتے ہیں؟" صاحب مذکور نے جواب دیا: "بس جی! یہی بچے پیدا کرنے کا کام کرتا ہوں!"

میری ہنسی ابھی سو فی صدی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ میرے تین بچوں کی اکلوتی ماں داخل ہوئی۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ہمارے یہ تین بچے فیملی پلاننگ تحریک سے پہلے کے بچّے ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد لال تکون کا رواج پڑگیا جسے ہم نے بھی کالی ہانڈی کی طرح باہر لٹکادیا اور اس کے بعد میری بیوی ان بچوں کے پوترے دھونے اور انھیں گالیاں وغیرہ دینے میں اتنی مصروف ہوگئی کہ اسے بچے تخلیق کرنے کے لیے ٹائم ہی نہیں ملا۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے مجھے ڈاک سے آیا ہوا ایک لفافہ لاکر دیا میرے ہر لفافے کے متعلق وہ سمجھتی ہے کہ اس میں ضرور کوئی چیک آیا ہوگا یا اس کے بھائی کے گھر کوئی بچہ پیدا ہونے کی خبر ہوگی۔ اسی لیے وہ میرے ہر لفافے میں ذاتی دلچسپی لیتی ہے۔ لفافہ کھول کر میں نے کہا: "سوری میڈم! یہ تو کسی مسٹر گرودر کا خط ہے اس نے مجھے ڈنر پر مدعو کیا ہے۔ اس میں چیک نہیں ہے۔

وہ مایوس ہوگئی۔ بولی "آج کل آپ کو بڑے واہیات خط آنے لگے ہیں"۔
میں نے کہا "کلجگ ہے نا میڈم"

بہرکیف وہ نہ جانے مجھے یا گرودر صاحب کو گالیاں (جس کی قسمت میں بھی لکھی تھیں) دیتی ہوئی لوٹ گئی ـــــ یہ گرودر صاحب وہ تھے جنھیں اس سال پندرہ روپے ترقی ملی تھی اور جیسا کہ ہم ہندوستانیوں میں دستور ہے کسی کی بھی خوشی پر مٹھائی کا مطالبہ ضرور کرتے ہیں بلکہ آپ کو اگر دو روپے سالانہ ترقی ملے تو احباب بیس روپے کی مٹھائی ضرور کھا جائیں گے۔ گرودر صاحب کو گذشتہ برس بھی دس روپے کی ترقی ملی تھی۔ لیکن انھوں نے مجاہدانہ رسم شکنی کرکے مٹھائی نہیں کھلائی تھی۔ وہ شاید اس دستور کو اپنے آئینی حقوق پر چھاپہ سمجھتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا آئینی حق تو برقرار رہا۔ لیکن ان کے مکان کی دیوار گرگئی۔ جس کی مرمت پر ڈیڑھ سو روپے اٹھ گئے۔

دوسرے سال پندرہ روپے ترقی ملی۔ تو میں نے ان کے کان میں کہا۔ "جناب! اس مرتبہ ذرا اپنی دوسری دیوار کا خیال رکھیے گا۔ کیونکہ سنا ہے، دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں"

چنانچہ دیوار کو محفوظ رکھنے کی خاطر انھوں نے مجھے لفافہ بھیج کر ڈنر کی دعوت دی تھی۔ گرودر صاحب شاعری بھی کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ (شاید مہنگائی سے بچنے کے لیے) اسکوٹروں کی بلیک بھی کرتے تھے۔ شاعری میری کمزوری تھی اور بلیک ان کی۔ چنانچہ میں ان کے دیئے ہوئے پتے مکان نمبر سی پانچ سو چار سیتا کالونی کی طرف روانہ ہوگیا۔

بڑے شہروں میں اپنے گھر سے نکلنے کے بعد دو پرابلم پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ایک دوست دوسرے دوست سے ملنے کے لیے اس کے گھر جائے تو گھر کے باہر لکھی ہوئی ایک چٹ ملتی ہے کہ وہ تیسرے دوست سے ملنے کے لیے گیا ہوا ہے اگرچہ اس تیسرے دوست کے گھر پر بھی بالکل ایسی ہی چٹ لگی ہوتی ہے جو بڑی نیچرل ہوتی ہے ـــــ بہرکیف یہ چٹیں چوروں کو تو سوٹ کرتی ہیں، دوستوں کو نہیں۔

اور دوسری پرابلم یہ ہوتی ہے کہ اگر آپ کسی اسکوٹر ڈرائیور سے کہیں "چاندنی چوک چلوگے؟" تو وہ ہمیشہ یہی جواب دے گا: "جی نہیں! انڈیا گیٹ کہیے تو لے چلوں گا"۔ چنانچہ میں نے اس نسخے کو قدرے الٹ دیا۔ ایک اسکوٹر ڈرائیور کو آواز دی "انڈیا گیٹ چلوگے!"

وہ بولا: "نہیں صاحب! سیتا کالونی چلنا ہو تو چلیے"
نسخہ تیر بہدف نکلا اور اسکوٹر ڈرائیور شاید مجھے بے وقوف سواری سمجھ کر

چل پڑا اور مجھے سیتا کالونی کے سرے پر جاکر چھوڑ دیا۔ اسکوٹر کا میٹر جو یقیناً بے ایمانی پر منحصر رہتا ہے، دو روپے اسی پیسے بتا رہا تھا۔ میں نے تین روپے دیے اور آلوؤں کی طرح باقی بیس پیسے لینے کے لیے کھڑا رہا۔

اسکوٹر ڈرائیور نے کہا "صاحب میرے پاس ریزگاری نہیں ہے" ان حضرات کے پاس ریزگاری عام طور پر نہیں ہوتی۔ میں نے بھی سوچا کہ کمزور طبقے کو اوپر اٹھنا چاہیے۔ چاہے بیس پیسے کی بے ایمانی کے توسط سے اٹھے۔ اس کی بے ایمانی کا شکریہ ادا کیا۔ اور مکان نمبر سی پانچ سو چار کا دروازہ جاکر کھٹکھٹایا۔

کھٹ کھٹ سن کر ایک محترمہ برآمد ہوئیں۔ جو سرتاپا غزل مسلسل معلوم دے رہی تھیں۔ میں نے کنکھیوں سے ان کے چہرے کو دیکھا۔ جو مجھے ایک مصرع طرح سا لگا۔ اور پھر مصرع طرح پر گرہ لگاتے ہوئے عرض کیا۔ "کیا گرو ور صاحب تشریف رکھتے ہیں؟"

وہ مصرع طرح کو ہی وزن سے خارج کرتے ہوئے بولیں "یہاں کوئی گرو ور ستر ور نہیں رہتا۔ یہ تو رستوگی جی کا مکان ہے۔

میں نے رستوگی جی کی خوش نصیبی پر رال ٹپکائی۔ جو اس حسین و جمیل غزل میں تخلص کی طرح آنکا ہوا تھا۔ اور پھر پوچھا "کیا یہ مکان نمبر سی پانچ سو چار نہیں ہے؟"

اور اس نے جیسے مقطع فرماتے ہوئے کہا۔ جی نہیں، یہ مکان نمبر سی بٹہ دو، پانچ سو چار ہے۔"

"سوری! آپ کو خواہ مخواہ ڈسٹرب کیا" میں نے کہا۔ حالانکہ جی چاہ رہا تھا گرو ور صاحب کا مکان ملے نہ ملے۔ اس قتالہ کو برابر ڈسٹرب کیے جاؤں۔ میں اسے کہنا چاہتا تھا کہ کیا آپ کے رستوگی صاحب کی پندرہ روپے سالانہ ترقی نہیں ہوئی۔ اگر ہوئی ہو تو آپ ذرا اپنی دیوار کا خیال کیجیے اور مجھے ڈنر پر اندر بلا لیجیے ——— لیکن وہ فوراً کواڑ بند کرکے اندر چلی گئی۔ اور اپنے پیچھے اپنا دل رُبا آہنگ اور میری حسرتیں چھوڑ کر اندر چلی گئی۔

میں آگے بڑھ گیا۔ سی بٹہ دو کی پوری لمبی قطار طے کر ڈالی۔ پھر سی بٹہ تین پھر سی بٹہ چار ——— مگر خالص سی کی قطار کہیں ملی ہی نہیں۔ ایک دو آدمی سے انسانیت کا واسطہ دے کر پوچھا بھی مگر صرف ایک صاحب نے اتنی انسانیت دکھائی کہ سی بلاک اس کالونی میں ہے ہی نہیں۔ اور اس انسانیت نے مزید بتایا کہ سی بلاک اس کالونی کے سرے پر گندے نالے کے پاس ہے۔ اگرچہ اب وہاں نہ نالا رہا ہے نہ گندگی، صرف گندے نالے کا نام باقی رہ گیا ہے۔

ایک اور صاحب نے جو شاید ایک ریٹائرڈ بوڑھا تھا اور سوائے کھانسنے اور کھانسنے سے اگر اتفاقاً کچھ ٹائم بچ جائے۔ تو نشکام سیوا کے اسے اور کوئی کام نہیں رہا تھا۔ کانپتے کانپتے ہاتھ سے میرے کندھے کی بین بجاتے ہوئے بولا "آپ کونسی کالونی میں یہ مکان ڈھونڈنے نکلے ہیں"

میں نے کہا "سیتا کالونی میں"

مگر یہ تو سبیتا کالونی ہے۔ اور سیتا اور سبیتا دو الگ الگ عورتوں کے نام ہیں۔ اور ہاں سبیتا کالونی میں واقعی ایک سی بلاک موجود ہے۔ آپ وہاں جاکر معلوم کیجیے"

"سبیتا کالونی کہاں ہے"؟ میں نے پوچھا

"جہاں سیتا کالونی ختم ہوتی ہے وہاں سبیتا کالونی شروع ہوجاتی ہے"

یہ کہہ کر اس نے پھر کھانسنا شروع کردیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ جب بھی میری کھانسی ختم ہوجائے گی۔ سیتا کالونی بھی ختم ہوجائے گی ——— اب آپ یہ مت پوچھیے کہ سیتا کالونی کہاں ختم ہوئی۔ ختم ہوئی بھی کہ نہیں اور جب سبیتا کالونی شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ تو اس کا ایکس ٹینشن ایریا ہے۔ اصلی سبیتا کالونی ان کھنڈروں کے پاس ہے جنھیں مغل بادشاہ اپنے زوال کی نشانی کے طور پر چھوڑ گئے تھے۔ بہرکیف جوئندہ یابندہ۔ جب میں سی بلاک کے مکان گنتے گنتے مکان نمبر پانچ سو تین تک پہنچا۔ تو بلاک ختم ہوگیا۔

اور مجھے مکان نمبر پانچ سو چار چاہیے تھا۔

ایک اور صاحب سے پوچھا "جناب! اس سی بلاک کا بقیہ حصہ کہاں ہے؟"

وہ بولا "ڈی بلاک کے عقب میں۔ یہاں سے قریباً تین فرلانگ کے فاصلے پر۔"

چنانچہ میں چل پڑا۔ اور نہ جانے میں نے پچھلے جنم میں کسی اندھے فقیر کو سڑک پار کرائی تھی۔ یا کسی پیاسے آدمی کو دیکھ کر خود بھی پانی پینے سے انکار کر دیا تھا کہ میں صحیح مکان تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اندر سے ایک محترمہ باہر نکلیں جو کافی بے وزن شعر معلوم دے رہی تھیں۔ پوچھا "گرو ور صاحب تشریف رکھتے ہیں؟"

وہ بولیں "جی نہیں، وہ سی پانچ سو آٹھ والے کے ہمراہ ذرا تھانے تک گئے ہیں۔ کیونکہ ان کا مالک مکان کے ساتھ جھگڑا ہوگیا تھا۔ اسے سلجھانے گئے ہیں"

"مگر جی! انھوں نے مجھے لنچ پر بلایا تھا"

ارے ہاں ہاں، وہ سی پانچ سو دس والے سے کہہ رہے تھے کہ آج میرے گھر میں ایک بہت بڑا ادیب کھانے پر آرہا ہے۔ آپ تشریف لائیے، میں ابھی اس سی پانچ سو ایک والے سے کہہ کر مچھلی منگاتی ہوں۔ ان کے آنے تک کھانا تیار ہوجائے گا"

میں اندر تو چلا گیا۔ لیکن وہاں بیٹھ کر حیرت سے سوچتا رہا کہ یہ پانچ سو دس نمبر والا کون ہوگا اور پانچ سو ایک والا کون؟ ان کے اصلی نام کیا ہیں یا پانچ سو دس اور پانچ سو ایک ہی ان کے اوریجنل نام ہیں۔ آج کل کیسے انسان پیدا ہو رہے ہیں جو اپنے ناموں سے نہیں بلکہ مکان کے ناموں سے پہچانے جاتے ہیں ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ سامنے گرو ور صاحب کھڑے ہیں بلکہ یہ کہ مکان نمبر پانچ سو چھ والے کھڑے ہیں ——— اجی نہیں، مکان نمبر پانچ سو دس والے گرو ور صاحب اور ہیں، وہی جنھیں مکان نمبر پانچ سو پانچ والے نے دھمکی دی ہے کہ اگر آپ نے مکان نمبر چھ سو والے کے حق میں گواہی دی تو سی پانچ سو سات والا، اپنے سی پانچ سو آٹھ وا

بہنوئی کو ساتھ لے کر سی پانچ سو گیارہ والے کے پاس شکایت لے کر پہنچ جائے گا جس نے آپ سے دو سو روپے قرض لیا تھا۔ گواہی دی تو قرضہ ڈوب جائے گا۔

اس لیے آپ کسی انسان کا نام لیں۔ مگر اس نام سے کوئی چہرہ نہیں ابھرے گا لیکن اگر مکان کا نمبر پکاریں تو تصویر ابھر آئے گی۔ کہ اچھا اچھا، اس مکان کے نمبر والے وہ صاحب ہیں۔ جن کی ناک پکوڑے ایسی ہے اور اگلا دانت ٹوٹا ہوا ہے۔ اور اسی کا نام گرووَر ہے ـــــ مگر صرف گرووَر کہنے سے کبھی پورے خط و خال نہیں ابھرتے۔ کیونکہ مکان نمبر پانچ سو چار میں جو گرووَر رہتا ہے۔ وہ شاعر ہے۔ پانچ سو آٹھ والا گرووَر اپر ڈویژن کلرک ہے اور مکان نمبر پانچ سو پندرہ والا گرووَر چرس کا دھندا کرتا ہے ـــــ غرض ماڈرن دور میں مکان انسان سے زیادہ اہمیت اختیار کر چکے ہیں۔ مکان اور بےجان چیز ہو گئے ہیں۔ انسان صرف اس کا ترجمہ بن کر رہ گئے ہیں۔

ابھی میں گرووَر صاحب کے انتظار کی لذت اٹھا کر، انسان اور مکان کے جدید تعلقات پر ٹھنڈی آہیں بھر ہی رہا تھا۔ کہ میرے میزبان گرووَر صاحب واقعی تشریف لے آئے۔ علیک سلیک کے بعد بولے "فکر صاحب! میرا مکان ڈھونڈنے میں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ہے؟"

میں نے اپنا زہر خند چھپا کر عرض کیا "مکان تو ڈھونڈ لیا۔ مگر آپ کو ڈھونڈنے میں بڑی تکلیف ہوئی۔ کاش! آپ انسان کی بجائے مکان ہوتے تو آسانی سے مل جاتے۔"

وہ ہنسے، میرا مطلب ہے، میرے فقرے کے نازک مفہوم کو سمجھے بغیر ہنسے اور ابھی وہ سی پانچ سو چار والی عورت یعنی اپنی بیوی سے یہ پوچھ رہے تھے کہ مچھلی منگائی گئی یا نہیں۔ کہ اچانک ڈاکیہ نمودار ہوا۔

اور جیسا کہ عام طور پر رواج ہے۔ ہر ڈاکیے کو دیکھ کر غم اور خوشی کے جذبات انسان کے جسم میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ گرووَر صاحب نے بھی ملے جلے لہجے میں پوچھا "کیا لائے ہو؟"

"آپ کے نام ایک ٹیلی گرام ہے۔"

"ٹیلی گرام لرزتے ہاتھوں سے کھولا گیا۔ لکھا تھا "آپ کے انکل انتقال فرما گئے ہیں"

ٹیلی گرام پڑھ کر گرووَر صاحب نے ماتھے پر دوہتڑ مارا۔ اور ان کی بیوی نے دوہتڑ کی آواز پر مچھلی کو فوراً نظر انداز کر دیا اور ایک چٹائی لا کر بچھا دی اور پھر ہم سب اس چٹائی پر بیٹھ گئے۔ اور ماتم پرسی کے لیے آنے والوں کا انتظار کرنے لگے۔ اس کے بعد پندرہ بیس منٹ تک سیاپے وغیرہ کی مانوس اور سکہ بند صدائیں ابھاری گئیں ـــــ میں کھسکتے کھسکتے چٹائی کے آخری کونے پر پہنچ گیا تاکہ موقع ملتے ہی فرار ہو جاؤں۔ گیا تھا پنج کھانے، الٹے سیاپے گلے پڑا۔

آدھ گھنٹہ تک رونے دھونے کے بعد اچانک وہی ڈاکیہ پھر نمودار ہوا اور بولا "معاف کیجیے، وہ ٹیلی گرام غلطی سے آپ کو دے گیا۔ دراصل وہ مکان نمبر سی پانچ سو چوراسی کا تھا۔ آپ کے مکان کا نمبر تو سی پانچ سو چار ہے۔ آپ کے نام کا تو ایک منی آرڈر ہے، ٹیلی گرام واپس کر دیجیے اور یہ منی آرڈر لے لیجیے۔"

اور یوں گرووَر صاحب کے مکان کا رونا دھونا، مکان نمبر پانچ سو چوراسی کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور گرووَر صاحب کے آنسو مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئے۔ اور وہ بیوی سے بولے "اب فکر صاحب کے لیے فوراً مچھلی لاؤ۔"

میں نے بھی مسکرا کر کہا "اب صرف مچھلی پر قناعت نہیں کروں گا۔ کباب بھی منگوائیے۔ سیاپہ بھی میں نے بھگتا ہے۔ تو منی آرڈر بھی مجھے ہی بھگتنے دیجیے اور ذرا جلدی بھیجیے۔ ورنہ ان مکانوں کے نمبروں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کب مچھلی کھاتے کھاتے دوبارہ سیاپہ شروع ہو جائے۔"

▬ ▬

حق اعظمی
۱۹، انوگرہ پوری کالونی، گیا (بہار)

نئی سمت کا بلاوا

ہزار جہد پہ، پھر طائفہ اجالوں کا
اندھیری دھرتی پہ اترا نئے پیام کے ساتھ
سجائی جائے گی پھر بزم اہتمام کے ساتھ
ہر ایک باب ہوا واحسیں خیالوں کا
کسی نظر سے بھی حسرت کی بو نہ آئے گی
نہ روح بھٹکے گی صحرائے نا امیدی میں
نفس نفس ہوا مسرور خوش نویدی میں
چتا نہ خواہشوں کی اب جلائی جائے گی
بکھرتے صبحوں کو اب انتشار کا ہے نہ غم
پڑے ہیں حوصلے سب پست وحشی جھونکوں کے
قدم قدم سے ملے ہیں نئے ارادوں کے
نہ امتیاز کی رہ میں ہے کوئی بیش و کم
عروس صبح کی آنچل سے نور چھلکا ہے
زمیں کی آنکھوں سے پیہم سرور چھلکا ہے

زکی انور
مندر روڈ، گاندھی نگر، جمشید پور

ایک مثلث کا چوتھا زاویہ

کل اور آج میں بڑا فرق تھا۔

اور اس فرق کو صرف ہیڈ کلرک رنجنا ستیہ پال نے ہی نہیں محسوس کیا بلکہ دفتر کے دوسرے لوگوں نے بھی دیکھا کہ کل اور آج میں کس قدر فرق تھا۔

کل کی بات یہ تھی کہ پرنسپل مسز دروپدی شاستری خود اپنے چیمبر سے اٹھ کر کالج کے دفتر میں چلی آتی ہیڈ کلرک رنجنا ستیہ پال کی میز کے سامنے کی کرسی کھینچتی اور کچھ ایسی بے تکلفی کے ساتھ بیٹھ جاتی جیسے یا تو وہ کالج کی پرنسپل نہیں ہو یا رنجنا ستیہ پال ایک معمولی ہیڈ کلرک نہیں ہو۔ وہ دو تین منٹ تک باتیں کرتی رہتیں پھر جیسے مسز دروپدی کی تیسری آنکھ یہ دیکھ لیتی کہ دفتر کے دوسرے لوگ آنکھوں آنکھوں میں نہ جانے کیا کچھ کہنے سننے لگے ہیں، وہ اٹھ کھڑی ہوتی اور رنجنا ستیہ پال کو ساتھ آنے کا اشارہ کرکے آگے بڑھ جاتی اور پھر کالج کے دفتر کی ہیڈ کلرک کی کرسی اس وقت تک خالی رہتی جب تک پرنسپل کے کسی کلاس کا وقت نہ ہو جاتا یا چھٹی کی گھنٹی بجنے میں صرف دس پندرہ منٹ باقی نہ رہ جاتے۔

ان کی زندگی کی دوستی نے دفتری زندگی کی آقائیت اور خادمیت کا کچھ اس طرح خاتمہ کر دیا تھا کہ ایک بار کالج کی سکریٹری مادام سکینہ عبداللہ نے مسز دروپدی شاستری کو پورے آدھ گھنٹے تک دفتر کی ڈسپلن پر لکچر پلایا تھا یہ اور بات ہے کہ مسز دروپدی شاستری پر اس لکچر کا قطعاً کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

لیکن کل اور آج میں بڑا فرق تھا۔

اور آج کی بات یہ تھی کہ پرنسپل کے چیمبر کی ملازمہ، جو خود کو پرنسپل سے کم ہرگز نہیں سمجھتی تھی اور جسے لڑکیوں نے ایک فلمی ویمپ کا نام دے رکھا تھا اپنی مخصوص چال سے پاؤں پٹک پٹک کر چلتی ہوئی آئی تھی اور رنجنا ستیہ پال کی میز کے سامنے کھڑی ہو کر بڑے وقار کے ساتھ اس نے پرنسپل کا پرزہ اس کی میز پر رکھ دیا تھا۔ پرزے پر لکھا تھا۔

"پلیز کم ود بجٹ فائل۔"

"جاؤ میں آتی ہوں۔" رنجنا ستیہ پال نے ملازمہ سے کہا تھا۔

اور ملازمہ نے دھونس جمانے کے سے انداز میں کہا تھا۔

"میم صاحب نے جلدی بلایا ہے۔"

اور تب رنجنا ستیہ پال نے کوئی جواب نہیں دیا تھا البتہ وہ ملازمہ کو کھا جانے والی نظروں سے ایک نظر دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

کل اور آج کا یہ فرق رنجنا ستیہ پال کے سارے جسم میں رعشہ پیدا کرنے لگا تھا اور تب اس کی تیسری آنکھ نے یہ دیکھ لیا تھا کہ دفتر کے دوسرے لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں پتہ نہیں کیا کچھ کہنے سننے لگے تھے۔ اور تب اس کے تیسرے کان نے یہ سن لیا تھا کہ دفتر کے دوسرے لوگ اتنی بلند آواز سے قہقہے لگا رہے تھے کہ کالج کی چھت اڑ جانے کو تھی۔ اور تب وہ جلدی جلدی بجٹ فائل کے کاغذات درست کرنے لگی تھی۔ اور تب اس کے اندر کی رنجنا ستیہ پال بھی اس پر قہقہہ لگاتے ہوئے کہنے لگی تھی۔

"بات تو ہے میم صاحب قہقہہ لگانے کی۔ کہاں آپ سے کالج کی لکچرر تو لکچرر پروفیسر اور وائس پرنسپل تک ڈرتی تھیں اور کہاں آج ٹکے کی نوسا بڑھیا آنکھ دکھا کر چلی گئی۔"

کل اور آج کے اس فرق نے رنجنا ستیہ پال کو تلملا کر رکھ دیا۔

اس نے جیسے تیسے بجٹ فائل کے کاغذات درست کئے اور کچھ عجیب اوٹ پٹانگ چال کے ساتھ دفتر سے باہر نکل گئی۔ اور تب دفتر کے لوگوں نے جس میں عورتیں بھی تھیں، مرد بھی تھے، چپراسی بھی تھے سب نے مل کر قہقہہ لگایا تھا۔

کل اور آج کے بیچ کی دیوار اس دن اٹھی تھی جب پرنسپل دروپدی شاستری اپنا چھٹا بچہ جننے کے لئے کلدیپ نرسنگ ہوم میں داخل ہوئی تھی اور رنجنا ستیہ پال اس کے ساتھ اس کے بیڈ پر بیٹھی کسی دلچسپ فلم پر باتیں کرتے کرتے اچانک رک گئی تھی کیونکہ پرنسپل دروپدی شاستری شدید درد سے بے چین ہونے لگی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اب وہ بے ہوش ہو جائے گی اور پھر اس کی حالت کچھ ایسی ہو جائے گی جیسے قلب کی حرکت آہستہ آہستہ بند ہو رہی ہو۔

اور یہی ہوا وہ بے سدھ سی ہو کر لیٹ گئی اور پھر اس پر غشی طاری ہو گئی اور پھر اس کی حالت خراب ہونے لگی۔ رنجنا ستیہ پال ان حالات سے واقف تھی اس لئے وہ گھبرائی تو نہیں لیکن مسز دروپدی شاستری کا کرب دیکھ کر وہ آنسو نہ روک سکی اور اب کہ جب اسے ہوش آیا تو اس نے جی کڑا کر کے لیکن رکتے رکتے اور ہچکچاتے ہچکچاتے کہہ ہی ڈالا تھا۔

"میڈم کبھی آپ نے اپنی صحت کا بھی خیال کیا ہے؟ میں تو کہتی ہوں بھگوان کے لئے اس بار تو آپ اس کرب سے چھٹکارہ پا ہی لیں۔"

مسز دروپدی شاستری ہنس پڑی اور اس کی رگ رگ سے واقف رنجنا ستیہ پال نے صاف دیکھ لیا کہ اس کی ہنسی بہت ہی زہریلی تھی۔ وہ بولی تھی۔

"ڈاکٹر کلدیپ بھی یہی کہہ رہی تھی اس کا خاوند بھی یہی مشورہ دے رہا تھا اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ شاستری صاحب بھی آج دو گھنٹوں تک یہی لکچر پلا کر گئے ہیں۔ معاشیات کے آدمی ہیں نا کہنے لگے — "دروپدی! اگر ہم خود آبادی پر روک نہیں لگائیںگے تو پھر قدرت روک لگانے لگے گی اور وہ روک بڑا اچھا تنک ہوگا۔ کوئی اور ہوتا تو پھر

میں ملی کٹی سناتی بھلا" باپ خود ہی اپنے بچوں کو کوس رہا تھا تو میں کیا کہتی۔"

"آپ بھی کمال کرتی ہیں میڈم۔" رنجنا ستیہ پال بولی تھی۔ "بھلا کوئی باپ بھی اپنے بچوں کو کوس سکتا ہے انھوں نے تو ٹھیک ہی کہا تھا کتابوں میں تو یہی ہے۔"

"ہوگی تم لوگوں کی کتابوں میں یہ بات۔" مسز دروپدی شاستری نے پھر ہنستے ہوئے کہا تھا۔ "میں تو صرف اس قدر جانتی ہوں کہ بچے بھگوان کی دین ہیں اور یہ کہ جو پیدا کرتا ہے وہی کھلاتا ہے میں کیوں فکر کروں۔" پھر وہ چند لمحوں تک اکھڑی اکھڑی سانسیں لیتی رہی اور پھر حد سے زیادہ جلے کٹے انداز میں بولی۔ "رنجنا! تم فکر نہ کرنا میری بہن اگر میرے بچوں کو کھانے کو نہیں مل سکے گا تو وہ تمہارے گھر کبھی بھیک مانگنے نہیں جائیں گے۔"

اور رنجنا کو ایسا لگا تھا جیسے بہت بلندی سے وہ انتہائی پستی کی طرف پھینک دی گئی ہو اور نیچے گر کر شیشے کے برتن کی طرح جھنا کے کے ساتھ چکنا چور ہو گئی ہو۔

اور شیشے کا ایک تیز نوک کا ٹکڑا اس کے کلیجے میں چبھتا ہوا سا محسوس ہونے لگا تھا اور تب اس کے سینے میں دبی ہوئی کوئی بات اس کے لبوں تک آ کر لبوں کو تھرتھرا کر واپس ہونے لگی اور بڑی ہمت کر کے وہ کہنے لگی تھی۔

"میڈم! بات صرف کھانے اور کھلانے کی نہیں ہے.... باتیں اور بھی ہیں.... اور بھی باتیں ہیں میڈم....؟"

"اور کیا بات ہے؟" مسز دروپدی شاستری نے بہت غصے سے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں میڈم۔" رنجنا ستیہ پال کو پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ وہ اپنی آقا سے باتیں کر رہی تھی اور اس نے بوکھلاتے ہوئے کہا تھا۔ "کچھ نہیں میڈم.... کچھ نہیں.... بس یہی کہ آپ کی صحت....!"

صحت، صحت، صحت۔" وہ چیخ اٹھی تھی۔ "میں مر جاؤں گی زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا.... مت گھبراؤ رنجنا میں اپنا ایک بھی بچہ تمہارے سپرد نہیں کروں گی.... باپ بھی اگر نہیں دیکھ بھال کرے گا تو سب کے سب یتیم خانے میں پلیں گے یا پھر فٹ پاتھ پر، جہاں کروڑوں بچے فٹ پاتھ پر پل رہے ہیں اب چھ اور ہو جائیں گے....!"

"معاف کر دیجیے میڈم۔" رنجنا ستیہ پال منمنائی۔ "مجھ سے غلطی ہو گئی۔"

شیشے کا وہ نوکیلا ٹکڑا پھر رنجنا ستیہ پال کے سینے میں چبھنے لگا تھا اور وہ چاہ رہی تھی کہ کم سے کم صرف اس قدر کہہ ڈالے کہ — میڈم! صحت کی خرابی کی آخری منزل صرف موت ہی نہیں ہوا کرتی.... موت سے بھی بری کوئی منزل ہوتی ہے میڈم.... ہاں میڈم اس منزل پر پہنچنے کے بعد تو موت ایک نعمت بن جاتی ہے اور وہ نعمت مل نہیں پاتی....!

لیکن وہ ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکی تھی، صرف ٹکر ٹکر اس دیوار کو دیکھے جا رہی تھی جو کل اور آج کے درمیان اٹھ رہی تھی۔

کالج کے سالانہ بجٹ کے بارے میں ضروری باتیں سمجھانے کے بعد رنجنا ستیہ پال نے بہت ہی سہمی سہمی آواز سے کہا۔

"میڈم! میں کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔"

"کہو۔" مسز دروپدی شاستری نے بڑے روکھے پن سے کہا۔

"آج سے دو ماہ پیشتر جب بے بی پیدا ہونے کو تھیں میں نے آپ کی صحت کے بارے میں کچھ کہا تھا۔" وہ بولی "اور آپ نے فرمایا تھا کہ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ میں مر جاؤں گی۔"

"بے شک — ظاہر ہے صحت کی خرابی کا لازمی نتیجہ موت کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔" مسز دروپدی شاستری نے کہا "اور میں اپنی موت سے ہرگز ہراساں نہیں۔"

"لیکن میڈم.... لیکن میڈم.... وہ بوکھلانے لگی.... اف.... مجھے ایسا کیوں لگتا ہے جیسے.... جیسے میں نے شیشے کے ڈھیر سارے نوکیلے ٹکڑے نگل لئے ہیں اور وہ ٹکڑے میرے کلیجے میں چبھ رہے ہیں.... میڈم میں.... میڈم۔"

مسز دروپدی شاستری ہنس پڑی۔

"شاید اب تم نے شاعری بھی شروع کر دی ہے"؟

"نہیں میڈم۔" رنجنا ستیہ پال نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی۔ "یہ شاعری نہیں یہ ایک کرب ہے جو مجھے مجبور کرتا رہتا ہے کہ میں شیشے کے ڈھیر سارے ٹکڑے نگل لوں.... لیکن میری زندگی میری اپنی ہے ہی کہاں؟.... مجھے تو مسٹر ستیہ پال کے لئے جینا پڑے گا.... مجھے تو اپنے ڈبو کے لئے جینا پڑے گا.... مجھے تو اپنی ریتا کے لئے جینا پڑے گا.... کاش میں آپ سے کچھ کہہ سکتی یا پھر کاش میں آرام سے مر ہی سکتی....

رنجنا ستیہ پال رو پڑی۔

"تم اس قدر جذباتی ہو رنجنا؟" مسز دروپدی شاستری کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور اس نے اپنے آنسو پی جانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "جاؤ کام کرو۔"

اور وہ بھاری بھاری قدم اٹھاتی ہوئی پرنسپل کے چیمبر سے باہر نکل گئی۔

اسی دن شام کے سات بجے مسز دروپدی شاستری نے کل اور آج کے بیچ اٹھی ہوئی دیوار کو ڈھا دیا اور اس کے ملبے کو روندتی ہوئی پہلے کی طرح رنجنا ستیہ پال کے گھر پہنچ گئی۔

رنجنا ستیہ پال کے دونوں بچے باہر کھیل رہے تھے۔

مسز دروپدی شاستری نے ریتا کو گود میں اٹھا کر پوچھا۔

"بے بی تیری ممی کہاں ہیں؟"

"وہ انکل سے جھگڑا کر رہی ہیں۔" ریتا نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔ "روز ہی جھگڑا ہوتا ہے۔"

"کون سے انکل بے بی رانی؟" مسز دروپدی شاستری نے پوچھا۔

"ارے وہی انکل آنٹی جو آپ کے گھر رہتے ہیں۔" ریتا بولی۔ "وہ.... وہ.... وہ....!"

"آنٹی۔" ڈبو بول اٹھا۔ "آنٹی یہ کچھ نہیں جانتی.... آنٹی وہ شاستری انکل ہیں.... مینا کے پاپا....!"

پر ممی سے نہ کہنا آنٹی کہ میں نے آپ کو بتایا ہے۔"

مسز دروپدی شاستری کو ایسا لگا جیسے یک لخت ساری دھرتی اتھل پتھل ہو گئی ہو۔ وہ کھڑی نہ رہ سکی اور پاس ہی پڑے اسٹول پر بیٹھ گئی اور پھر اپنے آپ کو سمیٹنے کی کوشش کرنے لگی اور جب وہ بڑی جدوجہد کے بعد اپنے حواس درست کر چکی تو اس نے ریتا کو گود

سے اتارتے ہوئے کہا۔

"اچھا بچو اب تم دونوں لان میں جا کر کھیلو ورنہ تمہاری ممی سمجھ جائے گی کہ تم نے ہی مجھے شاستری انکل کا نام بتایا ہے ..... ہے نا ..... جاؤ ..... واہ واہ کتنے پیارے بچے ہو تم دونوں ..."

بچے چلے گئے تو مسز دسوپدی شاستری دبے پاؤں اس کمرے کے دروازے تک پہنچی جہاں سے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ اور پھر اس نے دروازے کے شگاف سے اندر دیکھنا چاہا لیکن اندر کے سنگار میز کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آ سکا لیکن اندر سے آواز آئی۔

"میں جاتا ہوں بچوں کو ذرا جلدی سلا دینا۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے آپ بچوں سے بھی ڈرتے ہیں؟"

"تم پاگل ہو رنجنا، بچوں کا کیا ٹھکانہ وہ دسوپدی سے کبھی کہہ سکتے ہیں اور کیا عجب ہے ستیہ پال کے واپس آنے تک بھی انہیں ہمارا جھگڑا یاد رہ جائے اور وہ کہہ دیں۔"

"وہ تو تین چار مہینے میں بھول بھی سکتے ہیں لیکن میں تو ستیہ پال کو بتاؤں گی ہی کہ تم تو نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے اور میں بھی نوکری کو بچانے کے لئے راہ سے بھٹک گئی۔"

"پھر وہی پاگل پن کی باتیں؟"

"پاگل تو آپ ہیں ..... کیا آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ میڈم مجھ سے آٹھ سال چھوٹی ہیں بھلا ان کے مقابلے میں آپ مجھے پسند کر رہے ہیں یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے ..... کتنی خوبصورت ہیں وہ ..."

"ہیں نہیں ..... تھیں ..... وہ کل کی باتیں ہیں اور کل اور آج میں بڑا فرق ہے ..... اب تو وہ ..... اب تو وہ ..."

"تو گویا آپ نے یہ طے کر لیا ہے کہ میرے دونوں بچے یتیم خانے میں پلیں۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے رنجنا ..... میں تم سے ..... میں تم سے پیار کرتا ہوں۔"

مسز دسوپدی دروازے سے الگ ہو گئی اور بڑے اطمینان سے گھر سے باہر نکلی اور برآمدے میں رنجنا کے بچوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگی۔

اور جب مسٹر شاستری باہر نکلے تو اس نے اور بھی اطمینان سے کہا۔

"چلئے کافی دیر ہو گئی ہے۔" اور پھر اس نے رنجنا کی بچی کو گود میں اٹھا کر چومتے ہوئے کہا۔ "اب تیری ممی اور انکل جھگڑا نہیں کریں گے۔"

مسٹر شاستری نے تو تلاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن مسز دسوپدی شاستری نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور دوسرے ہاتھ سے رنجنا ستیہ پال کو ٹا ٹا کیا اور پھر نئے جوڑے کی دلہن کی طرح اٹھلاتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

کمال جائسی

کرنیل گنج کانپور

"غالب آشفتہ سر"

درِ حیات پہ زندہ دلی نے دستک دی
جو آج جشنِ بہاراں سے لوٹ کر آئی
دریچے ذہنوں کے مہکے جواں ہوا احساس
پیامِ "غالبِ آشفتہ سر" صبا لائی

وہ خوش نگاہ کہ جس کے خیال کی رو سے
ہر اک حسیں کو ملا تازہ رنگِ پیراہن
سحر نژاد ہے جس کی غزل کا ہر مطلع
ہر ایک شعر ہے خورشید آگہی کی کرن

وہ ایک شاعرِ فطرت نگار تھا کہ جسے
شفق نے رنگ دیا تھا شبابِ فن کے لیے
گلوں نے نذر کیا تھا جمالِ صبحِ بہار
صبا نقیب بنی جس کی انجمن کے لیے

حدودِ نظم میں جب عشوؤں کے جلوس آئے
اُسی کی فکر کا اُڑتا ہوا غبار ملا
ادب کے چہرۂ زیبا کو حسنِ معنیٰ کو
اسی کی طبعِ سخن تاب سے نکھار ملا

پھر اس کی یاد کی قندیل جگمگا اٹھی
یہ لمحے خاص ہیں یارانِ نکتہ داں کے لیے
وہ اک مفکر و مہتاب آفرین خیال
ستارے جس نے دیے فن کے آسماں کے لیے

گزر گیا وہ دیارِ ادب سے خندہ بلب
حریف و خود سر و بدبیں کو مات دیتا ہوا
ہوا روانہ شکستہ دلوں سے مل کے گلے
ہر ایک نقشِ وفا کو ثبات دیتا ہوا

وہ اپنے فن میں جو یکتائے روزگار ہوا
سرِ سخن پہ محبت کا تاج رکھتا تھا
وہ فخرِ عرفی و بیدل وہ نازِ طبعِ کلیم
لباسِ فقر میں شاہی مزاج رکھتا تھا

اطہر شیر
ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ

ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ

ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ میں ایک عظیم علمی ادارہ ہے جو عربی و فارسی کی اعلیٰ تعلیم اور تحقیقی کام کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اسے حکومت بہار نے ۱۹۵۵ء میں انسٹی ٹیوٹ آف پوسٹ گریجوٹ اسٹڈیز اینڈ ریسرچ ان عربک اینڈ پرشین لرننگ

INSTITUTE OF POST-GRADUATE STUDIES AND RESEARCH IN ARABIC AND PERSIAN LEARNING

کے نام سے قائم کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے۔

عربی و فارسی زبان سے ہندوستان کا رشتہ سیکڑوں برس سے قائم ہے۔ خاص کر مغل عہد میں فارسی زبان سرکاری زبان تھی۔ عربی بھی مختلف مدارس میں لازمی طور پر پڑھائی جاتی تھی۔ پھر ایران و عرب کے ہندوستان سے ہمیشہ ثقافتی، تمدنی اور تجارتی رشتے بہت گہرے رہے ہیں اس لیے یہ زبانیں ہندوستان کی کلاسیکی زبانوں میں شامل ہو گئیں۔ آزاد ہندوستان میں بھی حکومت ہند کے کلچرل اور تجارتی روابط ایران و عرب ممالک سے بہت گہرے اور دوستانہ ہیں۔ اس لیے حکومت ہند نے ان زبانوں کو فروغ دینے کے لیے مختلف یونیورسٹیوں میں خصوصی توجہ دی ہے۔ ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی بھی انہی روابط کو ملحوظ رکھ کر قائم کیا گیا ہے۔

حکومت بہار نے اس کے انتظامیہ کو چست اور موثر بنانے کے لیے تین طرح کی کمیٹیاں بنائی ہیں۔ جن میں جنرل کانسل، اکزیکٹیو کمیٹی، اور ایڈوائزری بورڈ ہیں۔ ان کمیٹیوں کے اراکین ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں کے نامور ادیب محقق اور دانشور نامزد کیے گئے ہیں۔ جنرل کانسل ۴۲ ممبروں پر مشتمل ہے جس کے چانسلر ریاست بہار کے گورنر ہوتے ہیں۔ موجودہ کانسل میں چند اہم شخصیتوں میں وزیر تعلیم بہار، محکمۂ تعلیم کے کمشنر، وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی، پروفیسر کلیم الدین احمد وغیرہ ہیں۔ اسی طرح ایڈوائزری بورڈ میں ۱۵ ممبران ہیں جن میں ڈاکٹر نذیر احمد، صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ڈاکٹر مختار الدین احمد، صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دار المصنفین اعظم گڑھ، ڈاکٹر عطا کریم برق، صدر شعبۂ فارسی کلکتہ یونیورسٹی اور مشہور محقق قاضی عبدالودود پٹنہ جیسی نامور شخصیتیں ہیں۔ اسی بورڈ کے ڈاکٹر عبدالمعید مرحوم حیدرآباد اور ڈاکٹر عبدالعلیم مرحوم سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھی رکن تھے۔ یہ دونوں جگہیں ابھی پُر نہیں ہوئی ہیں۔ اکزیکٹیو کمیٹی کے صدر ڈائرکٹر آف ایجوکیشن حکومت بہار ہیں۔ اس میں ممبروں کی کل تعداد (گیارہ) ہے۔ جن میں پروفیسر کلیم الدین احمد قاضی عبدالودود، پروفیسر حسن عسکری اور ڈپٹی سکریٹری محکمۂ تعلیم، بہار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ادارہ کا افسرِ اعلیٰ ایک ڈائرکٹر ہوتا ہے جس کی گوناگوں ذمہ داریاں ہیں۔ مثلاً درس و تدریس کا انتظام، تحقیقی کاموں سے متعلق دیکھ بھال، عربی و فارسی کے نادر نسخہ جات کی اشاعت و طباعت۔ تحقیق سے متعلق عربی و فارسی کی قدیم و جدید کتابوں کی ادارہ کی لائبریری میں خریداری، طلبا اور ان کی درسی و غیر درسی سرگرمیوں کی نگرانی اور ان کے نظم و ضبط میں دلچسپی وغیرہ۔ انتظامیہ میں ڈائرکٹر کے تعاون کے لیے دوسرا سب سے سینیر پروفیسر رجسٹرار ہوتا ہے۔ جس کا کام درس و تدریس کے علاوہ دفتری انتظامات کی دیکھ بھال ہے۔ وہ مختلف کمیٹیوں میں ڈائرکٹر کے معاون کی حیثیت سے رہتا ہے اور اس کی حیثیت مستقل ممبر کی ہوتی ہے۔

اس ادارہ کے سب سے پہلے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید احمد مرحوم تھے جو بعد میں پٹنہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ عربی ہو کر چلے گئے تھے۔ ان کے بعد پروفیسر سید حسن رہے جنھیں گذشتہ سال فارسی زبان و ادب میں اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے سرٹیفکٹ آف آنر ملا ہے۔ ان کے بعد پروفیسر شاہ عطا الرحمٰن آئے۔ انھیں بھی صدر جمہوریہ سے علمی خدمات کے سلسلے میں سرٹیفکٹ آف آنر مل چکا ہے۔ ان کے بعد علی حیدر نیّر عارضی طور پر ادارہ کے ڈائرکٹر رہے ان کے بعد پروفیسر فیاض الدین حیدر ڈائرکٹر ہو کر آئے جو ال، ایس، کالج مظفر پور کے پرنسپل ہو کر کچھ مدت کے لیے چلے گئے تھے۔ اب پھر اس عہدے پر واپس آرہے ہیں۔ اس وقت ڈاکٹر محمد صدیق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی عارضی طور پر ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں

یہاں درس و تدریس سے متعلق عربی و فارسی میں ایک ایک بہار ایجوکیشن سروس درجہ اول کی جگہ ہے اور ایک ایک درجہ دوم کی۔ دو لکچرار کی جگہیں ٹیچرس ٹریننگ سنٹر میں درجہ دوم کی ہیں اور ایک لکچرار درجہ دوم کی جگہ اسپیشل بی اے کورس انگریزی کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ ایک جگہ ریسرچ اسسٹنٹ کی ہے۔ ایک لائبریرین ہیں۔ دفتر سے متعلق ایک کلرک اور چار چپراسی۔

تعلیمی اعتبار سے یہاں عربی و فارسی کے فاضل کے کلاس ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی ٹیچرس ٹریننگ اور اسپیشل بی اے کورس کی تعلیم ہوتی ہے۔ تحقیقی کام کے لیے کامل اور پی ایچ ڈی کے اسکالرس کام کرتے ہیں۔ جنھیں حکومت بہار کی طرف سے وظائف ملا کرتے ہیں۔ اب تک ، طلبا کو پی ایچ ڈی اور ۱۷ کو کامل کی ڈگریاں مل چکی ہیں۔

چند طلبا پی ایچ ڈی اور کامل کی ڈگری کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ذیل کے موضوعات پر پی ایچ ڈی کے لیے کام ہو چکا ہے۔

۱ - حجاج بن یوسف (عربی) مرتبہ سید وصی احمد (ٹکنیکل اسسٹنٹ خدابخش لائبریری پٹنہ (حال میں مستعفی ہو گئے ہیں)

۲ - احوال و آثار مرزا معز فطرت (فارسی) مرتبہ متین احمد صبا (لکچرر فارسی ال ایس کالج مظفرپور)

۳ - تذکرہ ہمیشہ بہار مصنفہ کشن چند اخلاص (فارسی) مرتبہ زبیر احمد قمر (ایضاً)

۴ - احوال و آثار ظہور الحق تپاں (فارسی) مرتبہ سید ارتضیٰ حسین رضوی (لکچرر فارسی سہرسا کالج، سہرسا)

۵ - حیات اور کلام حضرت احمد لنگر دریا بلخی (فارسی) مرتبہ حسن امام (ریسرچ اسسٹنٹ، شعبۂ مخطوطات پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ)

۶ - دیوان خواجہ حسین ثنائی (فارسی) مرتبہ محمد حبیب المرسلین (لکچرر فارسی، شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ)

۷ - حیات و کلام حسین نوشاہ توحید (فارسی) مرتبہ شاکر احمد یحییٰ (لکچرر فارسی و اردو متھلا کالج، دربھنگہ)

اسی طرح ذیل کے موضوعات پر کامل کے لیے کام ہو چکا ہے:

۱ - حضرت خالدؓ کے احوال اور کارنامے — مرتبہ عبدالواسع

۲ - فاتحان اندلس — طارق بن زیاد و موسیٰ بن نصیر — مرتبہ محمد نثار احمد کیفی

۳ - خلفائے بنی عباسیہ کے دور میں علم کلام کا تدریجی ارتقا اور علمائے متقدمین — مرتبہ محمد یحییٰ ابدالی

۴ - احوال و آثار حضرت شاہ شرف الدین احمد یحییٰ منیری — مرتبہ عبدالقیوم

۵ - رقعات فارسی در قرن دوازدہم — مرتبہ محمد علی حسن صدیقی

۶ - رسالہ المعیار القضاۃ مصنفہ غنی ابن محمد البغدادی الحنفی — مرتبہ عبداللہ تبسم

۷ - جمع النہایۃ فی بدء الخیر و غایتہ (مختصر احادیث البخاری مصنفہ ابو عبداللہ ابن ابی جمرۃ الازدی) — مرتبہ منظور الحق

۸ - التعلیقات الی الہدایۃ مصنفہ ذکریا بن بیرم آفندی — مرتبہ محمد طیب صدیقی

۹ - احوال و آثار شاہ محمد یحییٰ ابوالعلائی عظیم آبادی — مرتبہ محمد توحید عالم

۱۰ - سیرۃ العلامۃ الشوق النیموی و خدمات الادبیہ — مرتبہ محمد رضوان الحق

۱۱ - ہادی القلوب الی لقاء المحبوب — مرتبہ فضل کبریا صدیقی

۱۲ - احوال و آثار نظام الدین صانع بلگرامی — مرتبہ محمد غفار صدیقی

۱۳ - شاد عظیم آبادی کی فارسی شاعری — مرتبہ محمد قمر الہدیٰ

۱۴ - احوال و آثار ناصر علی سرہندی — مرتبہ ظہیر الحسن صدیقی

۱۵ - احوال و آثار شعرائے فارسی منیری — مرتبہ محمد نظام الدین

۱۶ - سوانح ابن حجر عسقلانی — مرتبہ محمد بدیع الزماں

۱۷ - مختصر شعب الایمان — مرتبہ احمد حسین آزاد

عام طور پر ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں میں کلاسیکل عربی و فارسی کی تعلیم ہوتی ہے جن کی علمی افادیت اپنی جگہ پر۔ مگر یہ چیز جدید تقاضوں کو پورا نہیں کرتی ہے۔ جدید عربی و فارسی زبانیں کلاسیکل ادب و زبان سے بہت مختلف ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ان ممالک سے ہمارے کلچرل روابط بہت تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ ہمارے ڈاکٹر، انجینیر، صنعت گر، فنکاروں اور اساتذہ کی ان ممالک میں بہت زیادہ مانگ ہے۔ ان ممالک میں جانے سے قبل ان ملکوں کی تکلمی زبان سے واقفیت ضروری ہے ان تقاضوں کو محسوس کیا جا رہا ہے اور جدید عربی و فارسی میں درس و تدریس کے لیے حکومت بہار کے نزدیک ایک جامع پروگرام زیر غور ہے۔ توقع ہے کہ بہت جلد اس سمت میں بھی یہاں کام شروع ہو جائے گا۔ کچھ جدید طرز پر دوسری نوعیت کے کام شروع بھی ہو چکے ہیں۔ مثلاً ٹیچرس ٹریننگ کلاس کا سیکشن ۱۹۶۳ء سے کھلا ہے اب تک گیارہ بیچ نکل چکے ہیں۔ یہ ٹریننگ ہندوستان میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہے۔ یہاں ہائی اسکول کے عربی فارسی اور اردو کے اساتذہ بہار سرکار کی طرف سے بھیجے جاتے ہیں۔ یہ ایک سال کا کورس ہے۔ اور اس کا کورس تقریباً وہی ہے جو بہار کی دوسری یونیورسٹیوں میں بی۔ ایڈ کا کورس ہے لیکن اسے یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ بی۔ اے اسپیشل برائے انگریزی کا درجہ گذشتہ سال کھلا ہے جن میں فاضل کے طلبا کا داخلہ ہوتا ہے۔ یہ امتحان پاس کر لینے کے بعد طلبا اورینٹل مضامین میں براہ راست ایم۔ اے۔ میں داخلہ لے سکتے ہیں۔

کسی بھی اچھے ادارہ کے لیے ایک اچھی لائبریری کا ہونا ضروری ہے اس ادارہ کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ یہاں کے ریسرچ اسکالر کے لیے ایک اچھی لائبریری کی ضرورت شروع سے محسوس کی گئی۔ اور جلد ہی ایک لائبریری کا قیام عمل میں آیا۔ ہر سال کتابیں خریدی جانے لگیں۔ چنانچہ اس وقت عربی، فارسی، اردو اور ٹریننگ سیکشن کی الماریوں میں (بہ شمول انگریزی) تقریباً دس ہزار کتابیں ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ عربی اور فارسی کی بعض نادر مطبوعات موجود ہیں۔ یہ کتابیں حوالہ جات کے لیے بے حد مفید اور اکثر و بیشتر عرب اور ایران کی مطبوعہ ہیں۔ اس کے علاوہ عربی و فارسی کے جدید رسائل ہند اور بیرون ہند سے بھی منگائے جاتے ہیں۔ ریسرچ اسکالرس کو اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔ دوسرے ادارہ کے طلبا بھی یہاں آکر استفادہ کرتے ہیں۔

اس ادارہ میں نشر و اشاعت کا بھی سلسلہ جاری ہے جو یہاں کی امتیازی خصوصیت ہے اس کی ترتیب و تالیف یہاں کے اساتذہ کا ذمہ ہے۔ چنانچہ اب تک

جن نادر مخطوطات کو ترتیب دے کر شایع کیا گیا ہے ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے :

۱ ۔ سفینۂ ہندی (تذکرہ) مصنفہ بھگوان داس ہندی
مرتبہ سید شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی

۲ ۔ مجموعۂ اشعار (نظم) مصنفہ برہان الدین مظفر شمس بلخی مرتبہ سید حسن

۳ ۔ کتاب الوصایا (مواعظ و اخلاق) مصنفہ ابو محمد عبداللہ بن احمد بن قدامہ المقدسی
مرتبہ ڈاکٹر سید احمد

۴ ۔ سفینۂ خوشگو (تذکرہ) مصنفہ بندرا بن داس خوشگو
مرتبہ سید شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی

۵ ۔ دیوان رکن الدین صائن مصنفہ رکن الدین صائن مرتبہ سید حسن

۶ ۔ عروض الہندی مصنفہ شیخ محمد عابد دل عظیم آبادی مرتبہ سید علی حیدر نیّر

۷ ۔ رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان (تذکرہ) مصنفہ عنایت خاں راسخ
مرتبہ سید علی حیدر نیّر

۸ ۔ آصف نامہ (نظم) مصنفہ میر فرزند علی موزوں مرتبہ سید علی حیدر نیّر

۹ ۔ دیوان قاسم ارسلان طوسی مصنفہ قاسم ارسلان طوسی مرتبہ سید علی حیدر نیّر

۱۰ ۔ اشعار پریشاں مصنفہ حکیم عبدالحمید پریشاں مرتبہ سید علی حیدر نیّر

۱۱ ۔ دیوان خواجہ امین مصنفہ خواجہ امین الدین امین عظیم آبادی مرتبہ عطا کاکوی

۱۲ ۔ نشتر عشق تذکرہ مصنفہ آقا حسین قلی خاں عظیم آبادی
مرتبہ عطا کاکوی

۱۳ ۔ تذکرۂ شورش مصنفہ سید غلام حسین شورش عظیم آبادی
مرتبہ عطا کاکوی

اس کے علاوہ تقریباً نصف درجن کتابیں اسی سلسلے کی زیرِ اشاعت ہیں۔ مخطوطات اور حوالے کے لیے خدا بخش لائبریری سے استفادہ کرنے میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں کے اساتذہ اور طلبا کا اس لائبریری سے گہرا تعلق ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس ادارہ میں پوسٹ گریجویٹ کی تعلیم بھی ہوتی ہے اور دوسری طرف ٹریننگ اور ریسرچ کا کام بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ ادارہ دو قسم کی سرگرمیوں اور جدوجہد کا مرکز ہے۔ ایک طرف ٹریننگ اور ریسرچ کے طلبا کی متانت، سنجیدگی اور ذوقِ مطالعہ ہے۔ دوسری طرف پوسٹ گریجویٹ کے طلبا کا جوش و خروش، ہنگامہ آرائی اور درسی نیز غیر درسی جدوجہد ہے۔ طلبا کے مزاج کے اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے لیے دو طرح کے ہوسٹل کا انتظام ہے ایک مدرسہ شمس الہدیٰ کا شیش محل ہوسٹل جس میں پوسٹ گریجویٹ کے طلبا رہتے ہیں دوسرا شریف کالونی ہوسٹل ہے جس میں ٹریننگ کے طلبا رہتے ہیں۔ ان دونوں ہوسٹلوں کی نگرانی ایک ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ کے ذمہ ہے جو اساتذہ میں سے ہوتے ہیں۔

یہاں طلبا کے تین طرح کے غیر درسی مشاغل ہیں۔ ایک مجلس ادب ہے جس کے اندر سیمینار، سمپوزیم، مشاعرے وغیرہ ہوتے رہتے ہیں۔ طلبا بین المدارس مباحث میں حصہ لیتے ہیں اور نمایاں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ ادارہ کے اندر بھی ایک سالانہ جلسہ و مشاعرہ ہوتا ہے جس میں مقامی و بیرونی شعرا و ادبا شریک ہوتے ہیں۔ سیمینار اور سمپوزیم میں شہر اور بیرونِ شہر کے ممتاز ادیب اور دانش ور کسی خاص موضوع پر مقالہ پیش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی طلبا بھی اپنے مقالات پیش کرتے ہیں جس پر تنقید کی جاتی ہے اور تبصرے ہوتے ہیں۔ کبھی کوئی مقتدر علمی ہستی بیرونِ ہند سے یہاں آجاتی ہے تو اس ادارہ کو بھی میزبانی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ ان کے لکچرس کا انتظام ہوتا ہے جس میں مختلف علمی اداروں کے لوگ شریک ہوتے ہیں اس وقت تک مندرجہ ذیل حضرات یہاں کے طلبا کو خطاب کر چکے ہیں۔

۱ ۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا — استاد دانش گاہ، تہران
۲ ۔ ڈاکٹر سید حسین نصر — استاد دانش گاہ، تہران
۳ ۔ کلوڈس مقصود — ہندوستان میں عرب لیگ کے نمایندہ
۴ ۔ عبدالفتاح — وزیرِ تعلیم حکومت شام

اور ان کے علاوہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے عربی و فارسی کے اساتذہ اور مشاہیر کی لمبی فہرست ہے۔

ادارہ میں دوسرا شعبہ اسپورٹس کا ہے جس میں طلبا کے درمیان سالانہ مقابلہ ہوتا ہے۔ کامیاب طلبا کو انعامات دیئے جاتے ہیں۔ عام طور پر یہاں کے طلبا فٹ بال، والی بال اور انڈور گیمس میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ تیسرا شعبہ کامن روم کا ہے جس میں انڈور گیمس کا انتظام ہے۔ ساتھ ہی اس کی اپنی ایک لائبریری ہے جس میں مختلف موضوعات پر کتابیں ہیں اور ہر سال مزید کتابیں خریدی جاتی ہیں۔ یہ تینوں شعبے ادارہ کے مختلف پروفیسروں کی صدارت اور نگرانی میں کام کرتے ہیں۔ طلبا میں جمہوری شعور برقرار رکھنے کے لیے ہر سال الکشن ہوا کرتا ہے اور الیکشن میں کامیاب طلبا مختلف شعبوں کے عہدیداروں کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔

اس طرف طلبا میں انگریزی تعلیم کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے چنانچہ یہ طلبا مختلف ریاستی اور مرکزی مقابلوں کے امتحانوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اور کامیاب ہوتے ہیں۔ آج وہ بعض ممتاز سرکاری عہدوں پر بھی فائز ہیں۔ اس طرح وہ ملک کے لیے مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔

بقیہ نیند سے تبدیلیِ صنف تک

ادھا درست ہے۔ رچرڈ رانی بن گیا۔ لیکن اس تبدیلیِ صنف کا ٹینس کورٹ سے کیا تعلق۔ عورت بن جانے پر اس کی بہت سی مردانہ اشیا مثلاً وجاہت جسامت طاقت وغیرہ میں ظاہر ہے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ میں نے تو کا ڈاکٹر تم بہک رہے ہو۔ ابے نہیں میں بالکل نہیں بہک رہا ہوں۔ اس مسئلے کا نیند سے گہرا تعلق ہے۔ اس ٹینس کھلاڑی نے کتنوں کی نیند حرام کر دی ہے۔ وہ شاید حالی نے کہا ہے نا۔

نیندیں اچاٹ دینی تیری کہانیاں ہیں۔ یہ فریبی شخص ہے۔ میں نے کہا۔ ڈاکٹر اگر اسے عورت کھلاڑی بننے کا موقع نہیں دیا گیا تو وہ ڈبلز میں کس کا پارٹنر بنے گا۔ بلی کنگ کا یا امرت راج کا بولے ہاں۔ اس مسئلے کا یہ بھی ایک پہلو ہے اور بہت نازک ہے۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ ہم دونوں اس مسخرے کے لئے اپنی نیندیں خراب کریں۔


21 سال کی
عمر سے پہلے
شادی نہ کیجئے
قانون اِس کی مُمانعت کرتا ہے۔
davp 76/676

غزلیں

مسعودہ حیات
۹۹۲ بازار چتلی قبر، دہلی

وفا کا رنگ اور حسنِ بتاں میں
بڑی تاثیر ہے دل کی زباں میں
تجاہل بھی ہے اک طرزِ محبت
ہمارا ذکر ہے اس داستاں میں
وہی دل جو شہیدِ آرزو ہے
اسی کا نام ہے کون و مکاں میں
تلاشِ دجلہ و دریا سے حاصل
ڈبو دے خود کو بحرِ بیکراں میں
ہر اک لمحہ یہاں شیشہ گری ہے
نظر درکار ہے کارِ جہاں میں
پھر اس نامہرباں کی مہربانی
وفا کی خیر ہو اس امتحاں میں
حیات اب دل کو پتھر ہی بنا لو
اگر جینا ہے اس بزمِ جہاں میں

ظفر حمیدی
ہری سبھا چوک، مظفرپور

الٰہی بخش دے ندرت بیاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
حجابوں کے کرشموں کے علاوہ
نظر آیا نہیں کچھ بھی جہاں میں
تلاطم خیز موجِ لامکاں تھی
سرابوں کا کھنڈر تھا ہر مکاں میں
نہ جانے کون سی ہے اس کی منزل
میں صدیوں سے ہوں شامل کارواں میں
بس اتنی آگہی حاصل ہوئی ہے
میں گم ہوں ایک روحِ بیکراں میں
ظفر کی جاں کی قیمت بھی لگائیں
جو ہیں الجھے ہوئے سود و زیاں میں

منظورہ اختر
رعنا واری، سری نگر

سکوں کا عکس ہے اشکِ رواں میں
چھپی ہیں راحتیں دردِ نہاں میں
تڑپ مضمر تھی جو برقِ تپاں میں
بجھا کر رکھ رہی ہوں آشیاں میں
نہیں ہے جستجوئے غنچہ و گل
تلاشِ دیدہ ور ہے گلستاں میں
عطا ہو بس سکوں کا ایک لمحہ
رکھا ہے کیا حیاتِ جاوداں میں
جو منزل آشنا ہیں پا ہی لیں گے
نشانِ راہ، قدموں کے نشاں میں
ہے کہنا رہبروں سے احتیاطاً
چھپے ہیں راہزن بھی کارواں میں
ستم پر ہے ستم منظور ہم پر
مزاجِ دشمنی ہے آسماں میں

سیف الحق سیف بجنوری
اسکول روڈ، بجنور (یوپی)

لہو دل کا نہیں باقی زباں میں
تعلق کیا رہا فکر و بیاں میں
پتا کچھ ہے تو ہے موجِ ہوا کو
روانی کتنی ہے ریگِ رواں میں
نشاں ڈھونڈو کسی آشفتہ سر کا
مزاجِ سنگ، وضعِ دوستاں میں
بنی خانہ نشینی خود اسیری
دریچہ کوئی رکھتا تھا مکاں میں
چراغِ گل سرِ محرابِ گردوں
زمیں پھیلی ہوئی ہے آسماں میں
کھلا آکر یہ اپنے سائباں میں
کہ ہم اب تک تھے بے سایہ مکاں میں
کبھی صحرا جو دیکھا یاد آیا
کہ ہم بھی سیف تھے آوارگاں میں

قطب الدین مونس
۱۱۲۵ محلہ کشن گنج (تیلی واڑہ) دہلی

بلا کا سوز ہے قلبِ تپاں میں
دیے روشن ہیں محرابِ فغاں میں
غبارِ راہ کی صورت ہیں ہم بھی
ہمیں بھی کر لو شامل کارواں میں
بڑی گہرائیاں ہیں دل کے اندر
کبھی اترو تو بحرِ بےکراں میں
نہ سمجھے آج تک ہم رازِ ہستی
الجھ کر رہ گئے سود و زیاں میں
جسے سننے پہ آمادہ نہیں تو
وہی ٹکڑا حسیں ہے داستاں میں
جدھر جائیں وہیں نفرت کے شعلے
محبت اب کہاں ڈھونڈیں جہاں میں
غزل کہنے کو سب کہتے ہیں مونس
کوئی ندرت تو ہو طرزِ بیاں میں

چرخ چنیوٹی
۳- شیواجی روڈ، آزاد مارکیٹ، دہلی

ہیں مرگ و زیست ہم پہلو جہاں میں
نہیں دوری یہاں میں اور وہاں میں
برائے نام اپنی داستاں ہے
تمہیں تم ہو ہماری داستاں میں
نہ لو احسان سر پر بجلیوں کا
لگا دو آگ اٹھ کر آشیاں میں
بھٹکتا پھر رہا ہے خضر اب تک
رکھا کیا ہے حیاتِ جاوداں میں
جو رستہ روکتے ہیں منزلوں کا
کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کارواں میں
فلک رتبہ مکانوں کے مکینو
اماں دو بے اماں کو جہاں میں
عمل سے قوتِ بازو ہے اے چرخ
ملے گی منزلت ہم کو جہاں میں

یوسف ناظم
وائی ۳ - ۳۹ بی ڈبلیو ڈی کالونی ۔ باندرا بمبئی ۵۱

نیند سے تبدیلی صنف تک

میں نے کہا، وہ لوگ کتنے خوش قسمت ہیں جنہیں بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے۔

ڈاکٹر حنان بولے ان سے زیادہ وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو دفتر میں کرسی پر بیٹھتے ہی سو جاتے ہیں بلکہ بعض لوگ تو وقت سے پہلے ہی دفتر پہنچ جاتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ سو سکیں۔ ڈاکٹر حنان اصل میں ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں اعتراض کئے بغیر چین نہیں آتا حالانکہ خود ان کی شخصیت اور حیثیت بلکہ ذات، قابل اعتراض ہے۔ وہ کسی لحاظ سے بھی ڈاکٹر نہیں لیکن پورا شہر ان کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ ایک مرتبہ وہ دہلی کے کسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے (کسی اور کے خرچ پر)۔ ہوٹل کے ایک کمرے میں کوئی حادثہ ہوگیا اور فوری طبی امداد کی ضرورت پیش آگئی۔ ہوٹل کا رجسٹر الٹا پلٹا گیا کہ شاید کوئی ڈاکٹر موجود ہو تو ان کا نام نامی پایا گیا۔ استقبالیہ کلرک (ریسپشنسٹ) نے انھیں فون کیا اور پوچھا آپ ڈاکٹر حنان ہیں؟ انھوں نے پہلے تو ریسپشنسٹ کی آواز میں شعلے کی لپک پر ایک سکنڈ عش عش کیا اور پھر ریشہ خطمی ہو کر جواب دیا جی میں ڈاکٹر حنان ہوں۔ میرے لائق کوئی خدمت؟ لڑکی نے کہا۔ دیکھئے ہمارا یہاں ایک حادثہ ہوا ہے فوری طبی امداد چاہیے۔ اگر آپ زحمت کریں تو مہربانی ہوگی۔ ڈاکٹر حنان پھر ایک سکنڈ تک ریشہ خطمی ہوتے رہے اور بولے جی معاف کیجئے میں ڈاکٹر تو ہوں لیکن موسیقی کا پھر بھی آپ کہیں تو آسکتا ہوں۔ خود استقبالیہ کلرکوں کے بارے میں ڈاکٹر حنان کا خیال ہے کہ اس قدر خطرناک استقبالیے کی وجہ سے نہ صرف کنواروں بلکہ شادی شدہ لوگوں کا مستقبل بھی خطرے میں پڑ سکتا ہے (گویا شادی شدہ لوگوں کا بھی کوئی اور مستقبل ہوتا ہے)۔ ان سے کہا جائے کہ انھیں آپ استقبالیہ کلرک کیوں سمجھتے ہیں۔ یہ تو انکوائری کلرک ہوتی ہیں تو وہ فرمائیں گے۔ لوگ ان سے صرف انہی کے بارے میں انکوائری کیا کرتے ہیں۔

میں نے ان کا ریمارک سن کر کہا ڈاکٹر میں دفتر میں سونے والوں کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ نیند کے موضوع پر بات کرنا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر نے کہا ہاں ہاں میں سمجھ رہا ہوں (ڈاکٹر حنان کو ایک غلط فہمی ہے کہ وہ ہر بات سمجھ جاتے ہیں) نیند کے موضوع پر خود میں نے کافی پڑھا بلکہ لکھا ہے۔ موصوف ہر مسئلے کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ پھر بولے نیند اصل میں اس لئے ایجاد کی گئی تھی کہ ایک تو لوگ بدگوئی، غیبت اور دیگر جرائم سے بچے رہیں اور دوسرے عمدہ خواب دیکھا کریں لیکن اب نیند کی اہمیت اس لئے کم ہوگئی ہے کہ لوگ دن میں بھی خواب دیکھنے لگے ہیں۔ اور کچھ لوگ اس لئے نہیں سوتے کہ وہ اسے تضیع اوقات سمجھتے ہیں کہتے ہیں کیوں نہ اتنا وقت سازشوں اور فتنہ پردازیوں میں صرف کیا جائے۔

میں نے کہا، ڈاکٹر تم کسی موضوع پر ٹھیک سے بات نہیں کر سکتے۔ اصل میں یہ ہے کہ تم موسیقی کے ڈاکٹر ہو اس لئے نیند کے بارے میں تم ایسے ناقص خیالات رکھتے ہو۔ نیند تو صحت کے لئے بہت ضروری ہے۔ بولے صحت کے بارے میں لوگ ہمیشہ سوتے ہی رہتے ہیں اور اس وقت جاگتے ہیں جب نیند کا وقت آجاتا ہے۔ پھر جن لوگوں کو اپنی محبوبہ اور صحت عزیز ہوتی ہے وہ کبھی صبح سویرے نہیں اٹھتے۔ سونے میں ان سے عجلت ہو جائے تو ہو جائے سو کر اٹھنے میں وہ کبھی عجلت نہیں کرتے۔

میں نے کہا دیر سے اٹھنا کبھی صحت کی نشانی نہیں ہوتی یہ تو کاہلی ہوتی ہے اور یہ بیچ میں محبوبہ کہاں سے آگئی۔ فرمایا جن کی کوئی محبوبہ ہوتی ہے وہ رات میں جلد نہیں سو سکتے۔ پھر بڑے رازدارانہ انداز میں گویا ہوئے۔ میرے ایک کرم فرما ہیں۔ منشی میر مظہر علی۔ انھوں نے کبھی بچپن میں سورج کو نکلتے دیکھا ہو تو دیکھا ہو ورنہ اب جب کہ وہ عمر کے پینسٹھویں سال میں ہیں ان کی نیند کی اشتہا کم اور کھانے کی تمنا زیادہ ہوگئی ہے وہ صبح زیادہ دیر تک نہیں سو سکتے۔ دو چار سال پہلے جب انھوں نے سورج کو نکلتے دیکھا تو انھیں یاد آیا کہ سورج نکلا بھی کرتا ہے اور نکلتے وقت اس کا نقشہ ایسا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر حنان کو باتوں باتوں میں وہ شعر یاد آگیا جس میں شاعر نے کہا ہے کہ ہمارے ایمان لانے کے لئے رسول نہ بھی آتے تو صرف صبح کافی تھی بولے شاعر نے شعر ضرور کافی عمر رسیدہ ہونے کے بعد کہا ہوگا۔ میں نے کہا۔ کسی شعر سے بھی شعر کہنے کی تاریخ نہیں نکلا کرتی۔

بولے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اردو کے کتنے شاعر ہوں گے جنہوں نے سورج کو نکلتے دیکھا ہوگا۔ صبح کے بارے میں ہیں کتنے شعر ہمارے یہاں۔ پھر اپنے شبہہ کا یوں اظہار کیا کہ میں تو سمجھتا ہوں مومن خاں مومن کو بھی کبھی سورج کے طلوع ہونے کا منظر دیکھنا نصیب نہ ہوا ہوگا۔

میں نے پوچھا کیوں خیریت۔ مومن سے آپ کو کیا شکایت ہے۔ فرمایا۔ شکایت کیا ہوگی۔ میرا خیال ہے جو شخص رات بھر ستارہ شناسی میں مصروف رہتا ہوگا۔ یقیناً دن کے ۹ بجے تک تو سوتا ہی ہوگا اور نو بجے کونسا سورج نکلا کرتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ سات بجے حد ہوگئی۔ میں نے کہا، نیند تو غالب کو بھی نہیں آتی تھی ان کے بارے میں آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

ڈاکٹر حنان نے بیڑی سلگائی۔ ڈاکٹر حنان ہمیشہ بیڑی ہی پیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے وہ چیز جو بار بار بجھ جایا کرے پینے میں بہتر ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے

ہیں کہ میں بیڑی اس لئے پیتا ہوں کہ اس کا دھواں دوسروں کو زیادہ تکلیف پہنچاتا ہے اور میرے لئے بہت کم نقصان دہ ہے۔ ڈاکٹر حنان جب بھی کوئی اہم نکتہ بیان کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ایک بیڑی ضرور سلگا لیتے ہیں (دیا سلائی وہ ہمیشہ دوسروں کی استعمال کرتے ہیں)۔ بیڑی سلگا کر بولے۔ بھئی تمہارا شاعر میری سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ کیا شعر ہے ان کا۔

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں

میں نے کہا۔ جس کے شانوں پر تیری زلفیں پریشاں ہو گئیں۔ بولے یہ نیند سے دماغ کا کیا تعلق ہے۔ میں آج تک نہیں سمجھا کہ اس شعر میں "دماغ" کا ذکر کیوں کیا گیا۔ پھر بیڑی کا ایک کش لے کر اور دھواں راست میرے منہ پر چھوڑتے ہوئے گہر افشاں ہوئے۔ میں جتنا بھی اس شعر پر غور کرتا ہوں اتنے ہی اس کے کمزور پہلو نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ دونوں شانوں پر زلفیں کیسے پریشان ہو سکتی ہیں؟ یہ اسٹائل میری سمجھ میں نہیں آتا۔

میں نے پوچھا۔ شعر کا اسٹائل؟

بولے شعر کا نہیں۔ شانوں پر زلفیں پریشان ہونے کا اسٹائل۔

میں نے کہا، اول تو آپ میں معمولی شاعروں کے معمولی شعر سمجھنے کی صلاحیت بھی نہیں ہے۔ اس پر آپ کو شوق ہے کہ دیوان غالب کا ضرور مطالعہ کریں گے۔ آپ سے کہا کس نے ہے کہ آپ غالب پر یہ کرم فرمائیں۔

بولے غالب تمہاری کمزوری ہے۔ پھر بولے نہیں نہیں تمہاری تو کئی کمزوریاں ہیں لیکن غالب ان میں سب سے بڑی ہے۔ میں بھی حجت پر اتر آیا۔ میں نے کہا کیا بڑے غلام علی خاں تمہاری کمزوری نہیں۔ بڑے غلام علی خاں کی بات تو دور رہی ایسے لوگ بھی تمہاری کمزوری ہیں جنہیں سر اور زبان کی ہجے تک نہیں آتی۔

ڈاکٹر حنان نے کچھ غور سے دیکھا۔ جب بھی کوئی بات کانوں کی مدد سے ان کی سمجھ میں نہیں آتی وہ آنکھوں کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہنے والے کو غور سے دیکھنے سے انھیں کوئی خاص فائدہ تو نہیں پہنچتا لیکن نفسیاتی طور پر تھوڑی سی انھیں تسکین ہو جاتی ہے۔ غور سے دیکھنے کے بعد بولے میں سمجھا نہیں۔ میں نے کہا وہ تو تمہاری صورت سے ظاہر ہے کہ تم سمجھے نہیں۔ میں بات کر رہا تھا نیند کی اور تم لے آئے جوش، مومن اور غالب کو بیچ میں۔ یہ کون سی شرافت ہے۔ بولے جانے دو۔ آج صبح اصل میں میں نے مونگ کی کھچڑی کھائی تھی۔ میں نے کہا۔ اے لو۔ اب کھچڑی درمیان میں آگئی۔ فرمایا یہ بھی میری کمزوری ہے میں جس دن بھی مونگ کی کھچڑی کھا لیتا ہوں ٹھیک سے بحث نہیں کر سکتا۔ اور میرے دوست عبدالمتین کو تو تم جانتے ہو۔ انھیں تم کچھ بھی کھلا دو بحث میں کبھی نہیں ہاریں گے۔ ڈاکٹر حنان دن میں ایک مرتبہ ضرور عبدالمتین کا ذکر کریں گے۔ عبدالمتین ان کی چڑ ہیں۔ اس شہر میں صرف عبدالمتین ہیں جن کا ڈاکٹر مقابلہ نہیں کر سکتے۔ عبدالمتین نے آج تک کوئی کام نہیں کیا (یہ ایک لحاظ سے ٹھیک ہی ہوا) ان کی ذہنی لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ کسی اور کو بھی کام کرتا دیکھ نہیں سکتے۔ وہ ہمیشہ ۱۹۴۵ء کی بات کریں گے کہیں گے فلاں صاحب جب ۱۹۴۵ء میں بمبئی آئے تھے تو ان کی حالت یہ تھی اور اب ان کا عالم یہ ہے۔ عبدالمتین کا خیال ہے کہ جو شخص ۱۹۴۵ء میں جیسا تھا۔ ۱۹۷۵ء میں بھی اسے ویسا ہی رہنا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر حنان جو خود شہر کے کئی لوگوں کے لیے مسئلہ بنے ہوئے ہیں ان عبدالمتین کے سامنے چیں بول جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو عبدالمتین کا ذکر کرتے ہوئے ان کے دو تین آنسو بھی نکل آتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ اسی عالم تاسف میں تھے، دور خلا میں دیکھتے ہوئے بولے عبدالمتین کے سلسلے میں میں کوئی بندوبست کرنے والا ہوں۔ میں نے کہا دیکھو ڈاکٹر ایک تو تم مونگ پھلی کی کھچڑی کھا کر آئے ہو اس پر عبدالمتین کو یاد کر رہے ہو۔ ڈاکٹر حنان نے ٹوکا۔ میں نے مونگ کی کھچڑی کہی اور تم اسے مونگ پھلی کی کھچڑی بنائے رہے ہو۔ میں نے کہا ٹھیک ہے یہ بتاؤ، تم ایک نارمل آدمی کے لیے کتنے گھنٹے نیند ضروری سمجھتے ہو۔ ڈاکٹر نے کہا، نیند کی تین قسطیں ہوتی ہیں۔ ابتدائی رات کی نیند، درمیانی رات کی نیند، اور پھر پچھلے پہر کی نیند۔ میں ان تینوں قسطوں کو ضروری سمجھتا ہوں بلکہ رات کی بکھری ثانیہ نیند کے علاوہ دوپہر کی نیند پر بھی میرا ایمان ہے جسے لوگ قیلولہ کہتے ہیں۔ میرے جتنے بھی سرکاری دوست اور ملاقاتی ہیں وہ سب کے سب قیلولے کی اہمیت کے قائل ہیں۔ مجھے کچھ بولنے پر آمادہ دیکھ کر ڈاکٹر حنان نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور یوں فتویٰ صادر کیا کہ قیلولے کے بغیر یہ لوگ گھر واپس نہیں ہوتے۔ انھوں نے دوسری بیڑی سلگائی۔ (میں نے احتیاطاً اپنی کرسی اور پیچھے کھسکا لی) مجھے دھوئیں کی زد سے دور دیکھ کر مجبوراً چھت کی طرف دھواں چھوڑتے ہوئے انھوں نے اپنے آپ سے ہمدردی کے طور پر کہا، ہم موسیقی والوں کو رات کی نیند نصیب ہی نہیں ہے۔ میں نے کہا ڈاکٹر یہ غلط ہے۔ اصل میں تم موسیقی والوں کی وجہ سے دوسروں کو رات کی نیند نصیب نہیں ہوتی۔ بولے اچھا اچھا یہی سہی، لیکن یہ بات تو تم مانو گے کہ عبادت گذار، ریاضت شعار، اہل ریاض، اہل بیاض یہ سب شریف لوگ، رات کی نیند کے بغیر بھی آرام سے رہے ہیں۔ ان سب نے اچھی خاصی عمر پائی ہیں بلکہ ان کی طویل عمروں کی وجہ سے ان کے ورثاء پریشان رہے ہیں اور خود ڈاکٹر بھی جو رات کی نیند کو غذا اور لباس سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ راتوں میں جاگتے رہتے ہیں یا تو مریضوں کی وجہ سے یا نرسوں کی وجہ سے۔

ڈاکٹر حنان کے ساتھ یہ بڑی مشکل ہے کہ جب وہ کسی موضوع سے چپک جاتے ہیں تو بس چپکے ہی رہتے ہیں۔ یا تو نہایت ہی بے ربط باتیں کریں گے یا نہایت ہی خشک ان کے ہاں درمیانی راستہ کوئی چیز نہیں۔ غنیمت کہ اچانک انھیں اس ٹینس کھلاڑی کی یاد آگئی جو ابھی مرد سے عورت بنا ہے۔ بولے اصل میں نیند میں اچاٹ ہوتی ہے۔ صنف کی تبدیلی کی وجہ سے۔ میں نے کہا کیا بات ہو گئی۔ ڈاکٹر حنان مسکرائے۔ ڈاکٹر حنان کی مسکراہٹ تبسم اور قہقہے کے درمیان کی کوئی چیز ہوتی ہے اور بولے اب یہی امریکن کھلاڑی رچرڈ جو ٹینس کا چیمپئن رہا ہے۔ بیٹھے بٹھائے عورت بن گیا۔ ظاہر ہے اب وہ عورتوں ہی سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس کا ادعا درست ہے۔ لیکن بلی جین کنگ جو شاید عورتوں میں ورلڈ نمبر ون ہے، اس کے لئے رضامند نہیں۔ بلی جین کنگ کا بھی

بقیہ صفحہ ۲۹ پر

شارق ادیب
ای / ۱۱۳، امر کالونی، لاجپت نگر، نئی دہلی

دیمک

خشک برساتی نالوں کو عبور کرتی مسافر گاڑی باغوں کے اس مشہور سلسلے میں داخل ہوئی جسے لکھوکھا باغ کہا جاتا۔ باغوں کا یہ سلسلہ بھی عجیب تھا۔ ریل کی لائن کے دونوں جانب دور تک چھوٹے چھوٹے باغ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ ان سب کو ملا کر ہی لکھوکھا باغ کہتے تھے۔ مشہور تھا کہ اس میں پورے ایک لاکھ درخت ہیں۔ باغ کے اس پار وہ چھوٹا سا قصبہ تھا جس کی گلیوں میں اس کے بچپن نے ہمک ہمک کر چلنا سیکھا تھا۔ یہیں اس کے لڑکپن نے جوانی کی دہلیز پر سجدے کیے تھے۔ یہاں کے ہر ذرہ سے اس کی کوئی نہ کوئی شرارت وابستہ تھی۔ یہیں کی مسجد میں اس نے تختی لکھی تھی۔ اور حرف پہچاننا سیکھا تھا۔ اس کی یادوں کی پیٹھ پر مولوی صاحب کی قمچیوں کے نشان کسی مقدس امانت کی طرح آج بھی محفوظ تھے۔

چھوٹے سے پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہی گہرے گہرے سانس لیتی ہوئی گاڑی حرکت میں آگئی۔ اسٹیشن کے باہر آٹھ دس رکشاؤں میں تین چار آدمی بیٹھے تھے۔ ایک طرف بیمار سے یکے کا مریل گھوڑا ٹاپوں سے گرد اور دُم سے مکھیاں اڑا رہا تھا۔ رکشہ والوں کو حیرت زدہ چھوڑ کر اس نے یکے میں اٹیچی رکھی اور جھولتے ہوئے پائیدان پر پیر رکھ کر سوار ہو گیا۔ "ڈیوڑھی چلو" اس نے یکے والے سے نرم مگر سرد آواز میں کہا۔

یکے والے نے اپنی آنکھوں کی گرد صاف کر کے اس کی طرف دیکھا۔ "کہاں سے آئے ہو بھیا، کون ڈیوڑھی جاوے۔"

"چودھریوں کی ڈیوڑھی۔ تیج سنگھ تم مجھے پہچانے نہیں۔ میں اعجاز ہوں اعجاز رسول، چودھری سطوت رسول کا لڑکا۔"

ارے بھیا، بہت دنوں بعد درسن دیے ہو۔ کہاں رہے، کسل تو ہو۔" بوڑھے کوچبان نے اپنے پھیپھڑوں کی ساری قوت صرف کر دی۔

"ہاں کاکا، اب شاید درشن کبھی نہ ہوں۔" اس نے اتنے آہستہ سے کہا کہ تیج سنگھ سن نہ سکے۔

"چلوں کا؟" تیج سنگھ نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا، اور اس کے سر کی جنبش پا کر پٹری پر بیٹھ گیا۔

"مگر بھیا اب اسے ڈیوڑھی کوئی نا کہے۔"

یکہ سڑک پر آگیا، سڑک کے دونوں جانب جہاں کبھی کھیت ہی کھیت تھے، اب جا بجا اینٹوں کے بھٹے نظر آ رہے تھے۔ البتہ سڑک کے پہلے میل پر مور واسے سیّد کا مزار بدستور اپنی جگہ تھا۔ اور سامنے والی مسجد بھی ابھی تک نمازیوں سے خالی تھی۔ اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اکبر پور ابھی تک اسٹیشن سے تین میل دور تھا۔ راستہ بھر تیج سنگھ اسے اپنی دیہاتی زبان میں بتاتا رہا کہ یہ بھٹہ لالہ امیر چند کا ہے، اور وہ والا تھوا اہیر کا۔ سامنے والا ٹیوب ویل خیراتی نے لگوایا ہے، جو اب خیر محمد خاں بن چکا ہے۔

"مگر بھیا سب الٹ پلٹ ہو گیا۔" تیج سنگھ نے یہ جملہ کہتے ہوئے سینے کی ساری ہوا اُگل دی۔

گھوڑے کی مریل ٹاپیں بجتی رہیں، لوہے کی ہال سڑک پر گھستی رہی اور اس کا ذہن تفکرات کی ناہموار پگڈنڈی پر بے لگام گھوڑے کی طرح دوڑتا رہا۔ بڑے چچا کا چار سطری خط ملا تھا۔

"مہاجن کا مطالبہ سر سے اونچا ہو چکا۔ میرے شانے جواب دے چکے۔ ڈیوڑھی کی بوڑھی چھت میں دم نہیں کہ مزید قرض کا بار سنبھال سکے۔ فروخت، بیعنامہ، دخل تمہارے دستخط کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں۔ چند یوم کو آجاؤ تو سبکدوش اور بری الذمّہ ہو کر عازم حج بیت اللہ ہو جاؤں۔"

یہی خط تھا جس نے اسے ایک ہزار میل سے کھینچ بلایا تھا، ورنہ —— چھوٹی حویلی کی قرقی، چچی کی رحلت، ان کی منگنی، بیماری اور پھر...... کتنے حادثے ہو گئے۔ مگر وہ خود کو آمادۂ سفر نہ کر سکا۔ ان کا خیال آتے ہی یاد کے سرکش گھوڑے پھر منہ زوری پر آمادہ ہو گئے۔ اس نے ذہن کو جھٹکا دیا تو نگاہ ننگی کلائی پر جا ٹھہری، جانے کیا وقت ہوا ہوگا۔ اس نے سوچا آٹومیٹک گھڑی تو ریل کے ٹکٹ، اودے ہرے نوٹوں اور بڑے چچا کی ناپ کی شولاپوری میں کب کی تقسیم ہو چکی تھی۔ اس نے یاد کو سرد مزاجی کا چابک رسید کیا۔ تفکرات کو تھپکی دے کر سلایا اور اپنے اکلوتے گرم رنگ کے ٹھنڈے سوٹ کے کوٹ کی جیب میں سگریٹ تلاش کرنے لگا۔

یکہ آبادی میں داخل ہوا تو درگاہ شریف کے سفید دھلے دھلائے مینار نظر آنے لگے۔ دوکانوں کے پٹڑوں پر کھڑے بیٹھے دوکانداروں اور ادھر اُدھر بکھرے ہوئے لوگوں نے نئے آدمی کو حیرت سے دیکھا۔ پندرہ برس میں قصبے میں بہت کچھ بدل کر بھی سب کچھ نہیں بدلا تھا۔ بازار والے اس کے لیے اجنبی تھے مگر بازار شناسا، گلیوں میں چلنے پھرنے والے چہرے بیگانہ تھے مگر گلیوں راستوں اور مکانات، ان سب سے اس کی پرانی جان پہچان تھی نیچے کچے کھنڈر

جیسے ابھی تک اس کے رازدار تھے۔

دمے کے مریض کی طرح ہانپتے ہوئے یکے نے ایک تنگ مگر صاف گلی کے منہ پر جاکر دم لیا۔ اس نے جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر تیج سنگھ کی میلی انگلیوں میں تھما دیا۔ اظہارِ تشکر سے اس کی دونوں ہتھیلیاں مل گئیں۔

"اس دہلیز سے ہمیش مجوری جیادہ ہی ملی، بھیا، تمھو موچودھری کے پوت" اردگرد کی کھڑکیوں، دروازوں سے نظریں بچاتا، آنکھیں چراتا، بھاری قدموں سے وہ آگے بڑھ گیا۔

سامنے ڈیوڑھی تھی۔ زمانے کے نشیب و فراز کے سفر سے تھکی ماندی، سرد وگرم کے بوجھ سے کمر جھکی ہوئی، کبھی کا مغرور دروازہ کسی خرانٹ بڈھے کی طرح شرمسار کھڑا تھا۔ بھاری کواڑ جو کبھی اس لیے بند نہ ہوئے کہ دربانوں اور پہریداروں کی فوج نے مہلت نہ دی، آج اس لیے بھاڑ سا منہ پھاڑے تک رہے تھے کہ شاید بند ہونے کی صلاحیت کھو چکے تھے۔ جیسے انھیں ڈر ہو کہ اب بند ہوئے تو پھر کبھی کھل نہ سکیں گے اور کھلے تو پیلا برادہ بن کر پیوست خاک ہو جائیں گے۔

اس نے ڈیوڑھی کو اسی احترام سے پھلانگا جیسے بچپن میں درگاہ شریف کی چوکھٹ لانگھا کرتا تھا۔ اندر کے دروازہ میں لٹکی زنجیر کو بڑی احتیاط کے ساتھ بجایا۔ چٹیوں کے گھسٹنے کی آواز کے ساتھ ہی ایک بوڑھے بیزار لہجے نے اس کا—— استقبال کیا۔

"ارے کون آن مرا، نہ دن چین نہ رات آرام، موا ناس پٹیا عید و ہوگا، کتنی بار کہا کہ روٹی لینے دیا جلے آیا کر، اب ہر وقت کہاں سے تھوپ کر رکھوں عمر بھر اس دہلیز کا کھایا۔ سال دو برس سے کمی ہو گئی تو پیٹ پھٹا جائے ہے۔ میں موئی اندھی دھندی چولہا دھونکوں کہ کواڑوں کی اردلی بجاؤں، دو دن سے اعجاز میاں کی آہٹ پہ کان لگائے بیٹھی ہوں، خیر سے آ نہیں چکتے۔"

ہزار ضعف کی ماری ہو، مگر رحیمن بوا کی کراری آواز وہ سینکڑوں آوازوں کے ہجوم میں پہچان سکتا تھا۔ وہ آواز جسے ڈھول کی تھاپ پر سن کر پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ نانا ابا گانے بجانے کے مخالف کیوں تھے۔ اور مولوی رحمت علی نے اسے میراثیوں کے محلے میں دیکھ کر ابا حضور سے کیوں شکایت جڑ دی تھی—— پیروں کی سپڑ سپڑ قریب آگئی۔ ایک کواڑ اتنے زور سے کھلا کہ فرش پر گری دیمک اسے صاف نظر آ گئی۔ آنکھیں چندھیائی ہوئی، کبڑی رحیمن بوا نے اس کا ہیولہ دیکھ کر کہا۔

"کون ہو بھیا، کسے معلوم کر رہے ہو؟"

"رحیمن بوا، میں ہوں" اس کا اتنا کہنا تھا کہ "کون اعجاز میاں" کہہ کر برتنوں کے میل اور توے کی سیاہی سے آلودہ ہاتھ اٹھے۔ اس نے سر جھکا دیا اور سوکھے جھریوں بھرے ہاتھ کے لمس کو بالوں پر محسوس کرتا رہا۔

"خوب آئے میرے لال، چندا، ٹھیک تو رہے"

"میاں تو ادھر ہیں، سینی والے کمرہ میں" اس نے وہیں کھڑے دہنی کے پاس والے ستون سے ٹکا کر اٹیچی رکھ دی۔ رحیمن بوا کی آواز نے اس کا تعاقب کیا۔

"اعجاز میاں پچھلی دفعہ تم جو عینک لائے تھے، کوئی دو مہینہ ہونے آئے اس کے شیشے ٹوٹ گئے۔ اب کل کچہری تو جا ہی رہے ہو، ولایتی شیشے لا دو، میں قسمت کی ماری تو پھٹا ادھڑا سینے سے بھی گئی"

"ہاں، رحیمن بوا لا دوں گا" اس نے جیسے خود کو دلاسہ دیا —— اور بڑے صحن کو پار کر کے دالان سے نکل کر چھوٹے صحن میں آیا اور گھاس کو جوتوں سے مسلتا بڑے کمرے کی طرف بڑھا، کمرہ کا ایک کواڑ بھڑا تھا۔ اندر سے بڑے چچا کی گمبھیر، بھاری، مگر دھیمی آواز آ رہی تھی۔

امیر چند جی، میں آپ سے کتنی بار کہہ چکا، اعجاز میاں کو آ لینے دیجیے پائی پائی بے باق کر دوں گا۔ آپ کا روپیہ ڈیوڑھی پر ہے۔ اس گھر کی دیواریں ابھی کھڑی ہیں۔ اور پوکھر والا چک ابھی بکا نہیں ہے"

سیسہ کی اور مقدار قبول کرنے کو اس کے کان تیار نہ تھے۔ کواڑ کو دھکا دے کر وہ اندر داخل ہو گیا اور بڑے چچا کو سلام کرنا بھول کر دھوتی کرتا واسکٹ پہنے، گلے میں زنجیر ڈالے، ہاتھ میں لال بہی دبائے اس بے ہنگم آدمی کی طرف متوجہ ہو گیا جو سرکنڈوں کے مریل مونڈھے کو دہرا کیے دے رہا تھا۔ اور جسے ابھی ابھی بڑے چچا نے امیر چند جی کہا تھا۔ بڑے چچا جنھوں نے اس کے ہوش میں اس کے جنت مکانی والد کے سوا کسی سے کبھی آپ کہہ کر بات نہ کی تھی۔ سارے باغ گنوا دیئے تھے مگر کمشنر یا کلکٹر کو شکل نہ دکھائی تھی۔ وہی بڑے چچا آج اپنے قصبے کے اس بنیے کو "جی" کہہ کر مخاطب کر رہے تھے جس کی کل دولت ان کے دادا کی عمل داری کی ایک سال کی آمدنی سے بھی کم ہوگی۔ شاید اس لیے کہ جوں جوں زمین اور عزت جاتی گئی تھی۔ انھیں دنیا داری کے انداز اور گفتگو کے آداب خود بخود آتے چلے گئے تھے۔

لالہ! ابھی چودھری حشمت رسول کی ریڑھ کی ہڈی سلامت ہے، میں موجود ہوں اور آ گیا ہوں، ہو سکتا ہے کہ آپ کے خیال کے مطابق اس حویلی میں آپ کے بہی کھاتہ کا بوجھ سہنے کی سکت نہ ہو۔ لیکن میری چیک بک میں کاغذ اور قلم میں سیاہی موجود ہے۔ آپ تشریف لے جائیے۔ دو دن کے اندر اندر آپ کا روپیہ ادا کر دیا جائے گا" اسے خود اپنے لہجے کے کھوکھلے پن کا احساس اور آواز کی کرختگی پر حیرت ہوئی۔ اعجاز رسول عرف اعجاز اختر کی استعاروں میں ڈھلی اور محاوروں کی ڈھلی ڈھلائی زبان بھلا امیر چند جیسے جمع تفریق کرنے والے کی سمجھ میں کیا آتی، مگر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور نہایت چکنی چپڑی آواز میں اس صبر و تحمل کے ساتھ بولا جو صرف بنیے کو ہی میسر آ سکتا ہے۔

"میاں ناراض ہونے کی بات نہیں، ہم مہاجن ہیں، حساب کتاب صاف رکھتے ہیں۔ اور آپ جانو کہ لیے کا پاپ تو دیے ہی سے کٹتا ہے"

"ٹھیک ہے لالہ جی، میرا مطلب یہ نہیں" اب اس نے اپنے ہونٹوں کو مسکراہٹ سے سجا لیا تھا۔ بمبئی سے وہ ایک مصنوعی مسکراہٹ ہی تو مستعار لا سکا تھا۔ "لیکن اس کا خیال رکھیے گا کہ کھاتہ لکھتے آپ ہیں، لیکن پڑھنا میں نے بھی

سکتا ہے۔"

لالہ امیر چند کا موٹا جسم جیسے ہی کمرے سے باہر ہوا، وہ بڑے چچا کے قدموں میں جھک گیا۔ انھوں نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور دیر تک بھینچتے رہے آستین سے آنسو بھی صاف کرتے رہے۔ بہو کی خیریت معلوم کرتے رہے، اور اُن دیکھی بمبئی کے بارے میں رسمی سوالات کرتے رہے۔ بیٹے تم صحیح وقت پر آگئے۔ اب ان ڈیوڑھی کی دیواروں میں دم نہیں کہ قرض خواہوں کے سامنے سینہ سپر رہ سکیں۔ ڈیوڑھی میرے نام ہے، چند کھیتوں کا ایک چک تمھارا باقی ہے، جسے میں نے ادھ بٹائی پر دے رکھا ہے اس کے علاوہ زمین کا ایک قطعہ چنگی کے دفتر کے برابر ہے جو آبادی کے اندر ہے اس لیے کھیتی نہیں ہوسکتی اور اور تعمیر کے لیے پیسہ نہیں اس لیے مکانات نہیں بن سکتے۔"

بڑے چچا نے یہ سب باتیں ایک سانس میں اس طرح کہیں جیسے انھیں اس کے دلاسوں پر ایک لمحہ کو بھی یقین نہ رہا ہو۔ اور جو دھمکیاں اس نے لالہ امیر چند کو دی تھیں ان کا کھوکھلا پن بھی ان سے پوشیدہ نہ ہو۔ بڑے چچا کی رقت آمیز آواز تیر کی طرح ان کی زبان کی کمان سے نکلی اور اس کے دل میں ترازو ہوگئی۔

تمھاری چچی کا گذرنا، اور پھر مسرت زمانی کی جدائی نے میری کمر توڑ دی ہے، اگر جینے کی امید کی کوئی رمق باقی تھی بھی تو وہ بھی اب ختم ہو چکی ہے، اب جیسا سمجھو کرو۔ میں جلد سے جلد اپنے اجداد کی ہڈیوں اور اپنے خاندان کی عزت و ناموس کے اس قبرستان سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ ارادہ ہے کہ زیارت مقدسہ کو جاؤں اور وہیں زندگی کے باقی دن کاٹ دوں، اللہ توفیق دے۔" بڑے چچا خاموش ہوگئے، لیکن اس پر جانے کتنے عالم گذر گئے۔ اس نے کہنا چاہا کہ بڑے چچا ان کا غم کیا آپ ہی کا حصہ ہے۔ ہم سے پوچھیے، ہمارے سینہ میں بائیں طرف پتھر کا ٹکڑا نہیں، آپ کے بڑھاپے کی محبت کا گلشن اُجڑ گیا، لیکن ہماری کتنی دعائیں نیست و نابود ہوگئیں مسرتوں کی کتنی بستیاں بسنے سے پہلے اجڑ گئیں۔ کتنے سودے ہم نے کرنے سے پہلے ہار دیئے۔ جینے کے معنی بدل گئے۔ دن مہینوں میں، مہینے سالوں میں اور سال صدیوں میں ڈھل گئے۔ لیکن چچا حضور ہم اور وہ دونوں مجبور رہے۔ پا بہ جولاں رہے۔ ہماری گردنوں کا طوق وہ زنجیر بنا رہا جسے آپ نے ہمیں پہنایا تھا، اور آپ ہی جنھیں کاٹ سکتے تھے۔ لیکن ہم اور وہ دونوں خاموش رہے۔ اس لیے نہیں کہ ہم زنجیروں کو توڑ کر بھاگ نہ سکتے تھے، بلکہ اس لیے کہ ہم آئین شرافت کے پابند اور اس شان کے اسیر تھے جو جھوٹی تھی۔ لیکن یہ تو ہمیں بعد میں معلوم ہوا۔ اب جب بہت دیر ہو چکی۔ اس نے یہ اور بہت کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی زبان گوشت کا بے جان لوتھڑا بن گئی اور وہ لکنت بھرے لہجے میں بس اتنا کہہ سکا۔

میں ہمیشہ کی طرح آپ کے فرمان کا تابع۔ آپ کی رضا میں راضی اور آپ کی مسرت کا جویا ہوں۔ اس نے سر اٹھایا تو بڑے چچا پرانی ململ کے رومال سے آنسو صاف کر رہے تھے، اس نے محسوس کیا کہ دوسری باتوں کے ساتھ اس نے امیر چند سے یہ بھی جھوٹ کہا تھا کہ چودھری حشمت رسول کی ریڑھ کی ہڈی سلامت ہے۔ بڑے چچا کی کمر میں خم آگیا تھا۔ ان کی مونچھیں جھک گئی تھیں۔ اور وہ آواز جس کی گرج سے لوگوں کا پیشاب خطا ہوتا تھا۔ اب اپنی گونج کھو چکی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر بڑے چچا کے کرتے کے پیوندوں اور پاجامے کے تاگے نکلے پائنچوں کو نہیں دیکھا۔ رحیمن بوا کی بڑبڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔

"تھکے ہارے آئے اور وہاں گھس گئے۔ یہ نہیں کہ منہ ہاتھ دھو لیں ذری ہلکے ہو لیں۔ چلو اعجاز میاں۔ ناشتہ کر لو، چائے پی لو۔"

وہ بڑے چچا کا سہارا بنا ہوا دوہرے دالان میں آیا جہاں چوڑے پایے والے کئی رنگوں کے بانوں سے بنے پلنگ پر رحیمن بوا نے برتنوں کی محفل سجا رکھی تھی۔ بڑے چچا کو سرہانے کی جانب بھیج کر وہ جلدی سے پائنتی پر بیٹھ گیا۔ چھوٹی بڑی چینی کی پرچوں اور تام چینی کی رکابیوں میں کئی طرح کی دیہاتی مٹھائیاں تلے ہوئے انڈے اور دو پیالیوں میں سوئیوں کا شیر رکھا تھا۔ ہر چند کہ چائے دانی کو رحیمن بوا نے پرانے سیاہ دوپٹے سے ڈھک دیا تھا مگر اس کی اتری ہوئی پالش اس کی آنکھوں میں کھپ کر رہ گئی۔ چائے پیتے وقت اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ جب رحیمن بوا نے چائے کی ایک پیالی اسے دے کر دوسری بڑے چچا کی طرف بڑھائی تو انھوں نے اس کا کنڈا نہ پکڑ کر پوری پیالی کو ہاتھ سے پکڑا اور ہاتھ جلنے کے خوف سے جلدی جلدی چائے پینے لگے۔ نمکین چائے کا گرم گھونٹ دیسی کشید کردہ شراب کی طرح اس کے سینے کو چیرتا چلا گیا۔

ناشتے کے ناگوار فرض سے فارغ ہو کر بڑے چچا کے ساتھ باہر نکلنے لگا تو چلتے چلتے رحیمن بوا نے بڑے چچا سے کہا، میاں اپنے چہیتے کو اندر بھیجتے جانا دہاری میں خوبصورت کلغی والا ایک مرغا چینٹیاں چن رہا تھا۔ بڑے چچا نے اسے ڈھکیل کر اندر کر دیا۔ بڑے چچا نے اپنے کندھوں پر پرانی گرم شال ڈال رکھی تھی۔ اس لیے نہیں کہ سردی زیادہ تھی بلکہ اس لیے کہ کرتے کے سوراخوں اور گریبان سے جھانکتی مرزئی کی پردہ پوشی مقصد تھی۔ ان کے ہاتھ میں ایک اساطیری چھڑی تھی جس کی تاریخی اہمیت اور دھندلی مٹتی ہوئی نقاشی کا قصیدہ وہ مسلسل پڑھ رہے تھے، گلی سنسان تھی۔ اس لیے کسی سے علیک سلیک کی نوبت نہیں آئی۔ گلیوں کے جال سے نکل کر پختہ سڑک پر آئے تو بڑے چچا نے اسے بتانا شروع کیا۔ وہ دیکھو انٹر کالج ہے جہاں تم نے آٹھویں تک پڑھا تھا، اس وقت تو یہ مڈل تک ہی تھا، اور سامنے جو لال عمارت ہے نا وہ چنگی کا صدر دفتر ہے۔ ادھر وہ تین منزلہ بلڈنگ کلن گوالے کی ہے۔ ادھر دو تین فرلانگ پیچھے ہماری زمین ہے۔ اور سامنے والا ٹیوب ویل خوبچند کالستھ کا ہے۔

اسے اچانک یاد آگیا کہ اس کے بچپن میں خوبچند نام کا ایک منیم تھا، جسے ابا حضور نے کئی بار خرد برد کے الزام میں برطرف کر کے پھر رکھ لیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آگیا کہ کلن گوالہ چھوٹی حویلی کے پیچھے گھیر میں اس کے گھر کی بھینسوں کا دودھ دوہا کرتا

تھا۔ اسے اور بھی بہت سی باتیں یاد آگئیں۔ اسکول کے پیچھے جہاں آرا مشین لگی ہے۔ وہاں اس کا بیل خانہ تھا۔ اور اسکول کے دائیں طرف جہاں چھپّر میں چائے کی کیتلیاں نظر آرہی ہیں۔ وہاں وہ پختہ دالان نما عمارت تھی جس میں بھاٹک لگا ہوا تھا اور جسے اس کے ابّا اور چچا اصطبل کہتے تھے۔ اور جب اس کا — تعارف بڑے چچا نے کسی سفید پوش سے یہ کہہ کر کرایا کہ یہ میرا بھتیجا ہے اعجاز رسول، اعجاز اختر کے نام سے کہانیاں لکھتا ہے بمبئی سے آیا ہے، میں حج کو جارہا ہوں نا، مجھ سے ملنے چلا آیا۔ تو اسے خیال آیا کہ بڑے چچا بھول گئے کہ حج کو جانے والے بمبئی ہو کر ہی جاتے ہیں۔ اور صرف ان سے ملاقات کے لیے اسے بمبئی سے یہاں آنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی یاد آگیا کہ جس سڑک پر آج اس کا تعارف کرایا جارہا ہے۔ اسی سڑک کے دونوں جانب دور دور تک کھیت، کھلیان، باغات اور سرزمینیں اس کے دادا، باپ اور چچاؤں کی تھیں۔

اسے اپنے قدم زمین میں گڑتے محسوس ہونے لگے۔ اس کو لگا جیسے بڑے چچا کی چھڑی ٹوٹ کر بکھر جائے گی اور وہ بے سہارا رہ جائیں گے۔ ان کی شال ہوا میں اڑ جائے گی۔ اور ان کا پھٹا ہوا کرتا سب کو نظر آجائے گا — یا — کوئی اس سے وقت پوچھ لے گا اور اسے اپنی آستین چڑھا کر، ننگی کلائی دیکھ کر خاموش رہ جانا پڑے گا۔ اس نے بدقت تمام، بہ التجا بڑے چچا سے درخواست کی کہ وہ گھر چلے جائیں۔ وہ جیسے خود اس تکلیف دہ رہبری سے تنگ آچکے تھے فوراً تیار ہوگئے، اور اسے جلد گھر آنے کی تاکید کر کے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ڈیوڑھی کو جانے والی گلیوں کے سلسلے میں مڑ گئے۔

وہ ٹہلتا ہوا ان کھیتوں کی طرف پہنچ گیا، جدھر بڑے چچا نے اشارہ کیا تھا۔ پانچ دس کھیتوں کا ایک چک تھا جس کے گرد تار کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ دو بیل تھکے تھکے قدموں سے ہل کے جوئے کا بوجھ اپنی گردنوں پر اٹھائے کھیت میں چہل قدمی کر رہے تھے، ان کے پیچھے پیچھے سیاہ جلد والا پسینہ میں شرابور گرانڈیل آدمی جیسے گھر جانے کی جلدی میں تھا، وہ قریب گیا تو اس نے گردیں اَٹے انگوچھا باندھے ہوئے، اس سر کو پہچان لیا جس پر اس نے اکثر چپت لگائی تھی — "اوئے نتھوا، تو کہاں؟ مجھے پہچانتا ہے" نتھوا رک گیا۔ بیلوں کو کھڑا کر کے اس کی طرف آیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ غریب الوطنی اور بدلتے ہوئے موسموں نے اس کے چہرے پر اپنے اثرات چھوڑ رکھے تھے۔ اس لیے اسے پہچاننے میں نتھوا کو لمحہ بھر کو دقت ہوئی، لیکن وہ اپنے اس ہم جماعت کو کس طرح بھول سکتا تھا۔ جو زمین داری کے زمانے میں زمیندار کا لڑکا ہو کر بھی نہ صرف اس کے ساتھ کھیلتا تھا بلکہ کھلم کھلا اسے دوست کہتا تھا۔ "ارے، چھوٹے میاں آپ؟" نتھوا نے کہا اور بے اختیار آگے بڑھا، مگر ٹھٹک کر رک گیا،

"کیوں بھئی رک کیوں گئے۔ میں وہی پرانا اعجاج ہوں" یہ کہہ کر وہ نتھوا کے گرد بھرے پسینہ میں لت پت جسم سے لپٹ گیا، اور لپٹتے وقت اپنی جھوٹی شان کے ساتھ ساتھ یہ بھی بھول گیا کہ اب گھر جا کر اسے دیر تک اپنے اکلوتے سوٹ کو جھاڑنا پڑے گا، صاف کرنا پڑے گا۔ دونوں اخلاق و آداب رواج و رسم کی ساری دیواریں لانگھ کر، بچپن کی طرح کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ گئے اور باتیں شروع کر دیں۔ اسکول کی باتیں، قصبہ کی باتیں، کھیتی کی باتیں، دور دراز بمبئی کے قصے اور جانے کیا کچھ۔

شام کو جب وہ دیر سے گھر لوٹا تو خاصا تھک گیا تھا، لیکن اسے بہت سی باتوں کا علم ہو چکا تھا، مثلاً نوٹی فائیڈ ایریا کا چیرمین اس کا علی گڈھ کا کلاس فیلو تھا اور کمیٹی والوں کو بچوں کا پارک بنانے کے لیے قصبہ کے اندر زمین کی ضرورت تھی جو ابھی تک نہیں مل سکی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا پرانا ہم جماعت نتھوا۔ اب ناتھو رام ورما بن گیا تھا، اور ادھ بٹائی پر کھیتی کرتے کرتے ہزاروں کی بات کرنے لگا تھا، لیکن وہ شرافت کے ساتھ بڑے چچا کو فصل کے فصل اتنا حصہ دیتا رہا تھا کہ کم سے کم غلّہ اور ترکاری کے لیے انھیں بازار کا منہ نہیں دیکھنا پڑتا تھا۔

ڈیوڑھی میں قدم رکھا تو رحیمن بوا اس کی ماں کے جہیز کا پرانا لیمپ نکال کر صاف کر کے جلا چکی تھیں اور دوسرے دالان میں جا جم بچھا کر انھوں نے کھانا لگا دیا تھا۔ قریب ہی بردسی میں آگ بھر کر رکھ دی تھی، اسے گرم روٹی کا شوق تھا، یہ بات رحیمن بوا ابھی تک بھولی نہیں تھی۔ اپنی مدد کے لیے انھوں نے محلے کی کسی لڑکی کو بلا لیا تھا، جو گندھا ہوا آٹا لیے تیار بیٹھی تھی۔

وہ بڑے چچا کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ انجانے سبب سے دونوں ایک دوسرے سے نگاہیں چرا رہے تھے۔ دونوں ان باتوں پر شرمندہ تھے جن کے ذمہ دار وہ دونوں ہی نہیں تھے۔ رحیمن بوا کی لائی ہوئی گرم روٹیوں کی پہلی قسط کے ساتھ ہی کھانا شروع ہو گیا۔ اس کے آگے بڑے سے طشت میں نصف مرغ بھنا رکھا تھا، اور ایک گہری قاب میں سالن تھا جس میں باریک سی ہڈی چغلی کھا رہی تھی، اس کی چور نگاہوں نے بڑے چچا کے آگے رکھے ہوئے گہرے پیالے میں پڑے آلوؤں کو دیکھ لیا۔ اس نے بظاہر صرف سعادت مندی سے بھنے مرغ کا بڑا حصہ اٹھا کر بڑے چچا کے آگے کھسکا دیا۔

"بیٹے میں چکنائی سے پرہیز کر رہا ہوں" بڑے چچا نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اسے یقین ہی تو آجائے گا۔

مرغ کے سالن کا پہلا لقمہ منہ میں رکھتے ہی اس کی نظر طویل و عریض صحن کے کونے میں چلی گئی، مٹی کا ڈربہ منہ پھاڑے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ کا لقمہ رکھ کر اس نے بڑے چچا کی چوری چوری دال سے چند نوالے کھائے اور طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے اٹھ گیا۔

بڑے چچا اور وہ دیر تک سر جوڑے بیٹھے رہے، ماضی کا مرثیہ، حال کے شکوے، مستقبل کے شکوک سبھی کچھ، بڑے چچا کہتے رہے وہ سنتا رہا۔ اس نے انھیں نئے دور کی باتیں بتانے اور حقائق سے آگاہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بدلتے ہوئے وقت کی کوئی تصویر انھیں نہیں دکھائی، وقت کے تقاضوں سے انھیں خبردار نہیں کیا۔ اس لیے کہ اسے معلوم تھا کہ ان سب باتوں

کا بڑے چچا کی سمجھ میں آنا اتنا ہی ناممکن تھا جتنی کے ان کی شوکتِ رفتہ اور عظمتِ پارینہ کی واپسی۔ اس لیے اس نے خاموشی اور ہمدردی سے ان کی باتیں سنیں۔ اپنے طور پر انھیں اطمینان دلایا اور ٹھنڈے دل سے انھیں مشورہ دیا کہ جائداد کا قصہ پاک کرنے کے بعد وہ مکہ مکرمہ چلے جائیں۔ اس دوران برتن اٹھاتی ہوئی رحیمن بوا کی بڑبڑاہٹ وہ سنتا رہا تھا۔ باتیں ختم نہیں ہوئیں۔ مگر بڑے چچا باتیں کرتے کرتے تھک گئے تو اسے اکہرے دالان کے اس صاف ستھرے کمرے میں پہنچا گئے جو کبھی "چھوٹی بٹیا" کا کمرہ کہلاتا تھا۔ اور جس میں بھاری نیلا پردہ اب بھی اسی طرح کمرہ کے وسط میں لٹک رہا تھا۔ بھاری دل کے ساتھ وہ کمرہ کے اندر داخل ہوا۔ ہمیشہ کی طرح وہ پردے کے ادھر ہی ٹھہر گیا۔ ان کی یاد جو اس کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ، سب سے بڑا سہارا، اور سب سے بڑا غم تھی، مجسم روپ میں اپنی جان لیوا شکل لیے اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ ہمیشہ کی طرح وہ پردے کے پیچھے موجود ہیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر کہے آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ حالانکہ آپ کو اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ درست ہے کہ میں نے آپ کی خاطر کسی مردانگی کا ثبوت نہیں دیا۔ جرأت مندی کا مظاہرہ نہیں کیا، اور نہ آپ ہی اپنی قوتِ ارادی کا اظہار کر سکیں۔ لیکن مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں، لیکن دیکھیے کہ صرف تیس سال کی عمر میں میری کنپٹیاں سفید ہو چلی ہیں، سر کے بال اُڑنے لگے ہیں، میری آنکھوں کے تمام آنسو خشک ہو چکے ہیں۔ اب کسی بڑی سے بڑی بات پر مجھے رونا نہیں آتا۔ اس لئے نہیں کہ سنگ دل ہوں، شقی القلب ہوں، صابر ہوں یا فولادی اعصاب کا مالک ہوں بلکہ اس لیے کہ میرے آنسوؤں کا ذخیرہ کب کا ختم ہو چکا ہے آپ تو تپ دق کے پروں پر پرواز کر کے چلی گئیں۔ بے شک آپ بازی جیت گئیں، لیکن میں جو ابھی تک سفید بال، گنجا ہوتا سر لیے جی رہا ہوں کیا یہ آسان ہے، کیا یہ موت سے کمتر سزا ہے۔ اسے ایسا لگا جیسے ہمیشہ کی طرح پردے کے پیچھے وہ ہنس رہی ہیں۔ ہلکی ہلکی دبی دبی سی ہنسی، جس کے سُر آج بھی اس کے کانوں میں گھلے ہیں۔ جس کی مٹھاس آج بھی اس کی جوانی کا سرمایہ ہے، جوانی جو آئی نہیں یا آکر کب چلی گئی کہ خبر بھی نہ ہو سکی۔ مگر ہمیشہ کی طرح آج بھی اس نے پردہ ہٹا کر نہیں دیکھا۔ اُن سے باتیں کرتے رات کب دبے پاؤں گذر گئی۔ اور صبح آنکھ مچولی کھیلنے لگی۔ اسے پتہ بھی نہ چلا۔

صبح کو رات کے بچے ہوئے مرغ کے سالن کے ساتھ تر تراتے ہوئے پراٹھوں کا ناشتہ کرتے ہوئے اس نے بڑے چچا کو مختصر مگر مضبوط الفاظ اور دھیمے مگر سرد لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا۔ چنگی کے ساتھ والی زمین کمیٹی کے ہاتھوں فروخت کر دی جائے، اس کی قیمت اتنی مل جائے گی کہ ڈیوڑھی پر لیا ہوا قرضہ ادا ہو جائے، لیکن قرض عدالت کے ذریعہ ادا ہوگا اور امیر چند کے کھاتے چیک کیے جائیں گے۔ کھیتوں والا چک ناتھو رام کو ہی دے دیا جائے کیونکہ زمین اس کی ہوتی ہے جو کھیتی کرتا ہے۔ اس سے اتنی رقم مل جائے گی کہ آپ کے سفرِ حج کے اخراجات بہ آسانی پورے ہو سکیں۔ رہ گئی ڈیوڑھی تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ اسے فروخت نہ کریں؟"

"میں نے تمھیں بلایا ہی اس لیے تھا کہ بیٹا! جس طرح چاہو کرو۔ مگر نتھوا زمین کی قیمت یک مشت کس طرح ادا کرے گا" بڑے چچا نے اس کی تقریر کا اثر قبول کرتے کرتے اپنے شک کا اظہار کر دیا۔

"وہ بینک سے قرض لے لے گا۔ اور اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا" اس نے دلیل پیش کی۔

"مگر بیٹے، تم ابھی بمبئی سے آئے ہو۔ تمھیں اندازہ نہیں غیر کاشت زمین کی قیمت یہاں بہت کم ہے۔ چنگی والی زمین ہزار ڈیڑھ ہزار میں فروخت ہوگی۔ نتھوا سے شاید دس بارہ ہزار تک مل جائیں، اور تنہا ڈیوڑھی پہ ہی پندرہ ہزار سے زائد قرضہ ہو چکا، بھائی صاحب مرحوم کا لیا ہوا قرض اس کے علاوہ ہے حویلی کو نیلام سے بچانے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ اسے امیر چند کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ اب بھی دو چار ہزار شوق میں دے مرے گا۔ منشی تصدق حسین کو میں نے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ تھوڑی دیر میں آتے ہوں گے۔ کاغذات تیار ہوں گے۔ بس تمھیں شاہ گنج کچہری تک چلنا پڑے گا" وہ صرف اتنا ہی سوچ سکا کہ بڑے چچا کیوں کل سیدھے گھر نہیں آئے تھے۔

دھوپ ابھی ڈیوڑھی کی دیواروں سے نیچے بھی نہ اتری تھی کہ مردانے کی طرف کنڈی زور سے بج اٹھی، منشی تصدق حسین آ گئے، وہ اور بڑے چچا جانے کیا کیا مشورے کرتے رہے اس سے جہاں جہاں کہا گیا اس نے دستخط کر دیے۔

چار دن بعد جب بڑے چچا کے روکنے کے باوجود وہ جانے کے تیار ہوا تو اس کے سامان میں ایک ٹرنک اور ایک ٹوکرے کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ٹرنک میں اس کی مرحومہ ماں کے کچھ جوڑے تھے، جنھیں رحیمن بوا نے اب تک سینت کر اس طرح محفوظ رکھا تھا۔ کہ اس کے اجداد نے زمینداری کے کاغذات بھی نہ رکھے ہوں گے۔ ٹوکرے میں ناتھو رام کے لائے ہوئے بیر اور امرود تھے۔ اسٹیشن پر موجود بڑے چچا، منشی تصدق حسین، ناتھو رام اور چند دوسرے لوگوں سے رخصت ہو کر جب اس نے کانپور، آگرہ پسنجر میں قدم رکھا تو گاڑی وسل دے چکی تھی۔ گاڑی جب پلیٹ فارم چھوڑ کر لکھوکھا باغ میں داخل ہونے لگی تو اسٹیشن پر کسی آواز نے اپنے ترکش کا آخری تیر چلا دیا۔

چودھریوں کی ڈیوڑھی لالہ امیر چند نے خرید لی، وہ اس میں ناج کا گودام بنائیں گے اور چکی لگائیں گے۔"

اس نے خاموشی سے سر اندر کر لیا۔ چشمے کو رومال سے صاف کر کے دوبارہ ناک پر جمایا۔ اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو انگلیاں نوٹوں کی گڈی سے جا ٹکرائیں۔ کوارٹر کی پگڑی، سال بھر کا کرایہ، پھٹا ہوا بستر، سب یکے بعد دیگرے اس کے سامنے گھوم گئے۔ اس نے ایک نظر اپنے سوٹ پر بھی ڈالی جو نتھوا سے گلے ملتے وقت خراب ہو گیا تھا۔ پھر اسے بھاری نیلے پردے کا خیال آیا، جو چند دنوں میں اترنے والا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر گاڑی کے ہچکولوں کو محسوس کرنے لگا۔

کشوری منچندہ
۱۰۵ پرتاب گڑھ - جموں، توی

کڈنی وارڈ

زندگی کے اُوبڑ کھابڑ راستوں پہ چلتے ہوئے جب پہلی بار میں ہسپتال میں ایڈمٹ ہوا تو سب سے پہلے جس چیز سے مجھے واسطے پڑا، کڈنی وارڈ کے چکنے فرش پہ رکھا ہوا چھوٹے چھوٹے پہیوں والی لوہے کا وہ پلنگ تھا جس پہ ایک موٹا سا گدا پڑا تھا اور اُس گدے سے ایک سفید سی چادر لپٹی ہوئی تھی جس پر دوائیوں اور نہ جانے کس کس چیز کے مٹیالے اور عجیب عجیب سے داغ پڑے تھے اور یہ داغ ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے کسی اعلیٰ کردار شخص کے اعمال کی سفید براق چادر پر کہیں کہیں گناہوں کے دھبے پڑے ہوں اور ان دھبوں کو چھپانے کے لئے سُرخ سُرخ کمبل ڈال دیئے گئے ہوں لیکن جب میں اس بیڈ پہ لیٹنے لگا تو میرے جسم نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا اور میں بیڈ کے پاس ہی کھڑا فرش پہ چپک سا گیا۔ اس وقت آنے والے لمحات میں زندگی یا موت سے ہمکنار ہونے کے احساس اور گذرے ہوئے زمانے کی خوش گوار یادوں نے میرے ذہن و دل میں اتھل پتھل سی مچادی اور چہرے پہ رنج والم، کرب اور کبھی کبھار ملنے والی خوشی اور مسرت کے سائے لہرانے لگے اور تبھی میرے ہونٹ بے اختیار پھڑپھڑا اُٹھے "آج جو میں دنیا والوں کے ظلم وستم اور بیماری کے بوجھ تلے دبا ہوا تھکے تھکے قدموں سے یہاں آیا ہوں، بہت جلد صحت یاب ہو کر اس تعفن اور گھٹن بھرے ماحول کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دوں گا، پھر میں ہوں گا اور زندگی بھر کی خوشیاں اور مسرتیں ہوں گی جن میں میری ہونے والی بیوی بھی برابر کی شریک ہوگی..."

اور ابھی مشکل سے یہ الفاظ میرے منہ سے نکلے ہی تھے کہ نہ جانے کہاں سے ایک قہقہہ پھوٹ پڑا "قہ۔ قہ۔۔ قہ۔۔۔ ہا۔ ہا۔ ہا" اور جب اس قہقہے کی گونج ذرا کم ہوئی تو ایک تیز سرگوشی میرے کان کے پردوں سے آ ٹکرائی "تم آج ابھی ابھی تو آئے ہو اور ابھی تم نے بیڈ پہ قدم بھی نہیں رکھا کہ تم جانے کی بات بھی سوچنے لگے ہو! ذرا رُک کر" پھر اس میں تمہارا قصور بھی کیا ہے، یہاں ہر آنے والا اسی انداز میں سوچتا ہے مگر اپنے پاؤں پہ چل کر کوئی کوئی ہی واپس جاتا ہے۔ یہاں آکر بہتوں کی زندگی اُن سے روٹھ جاتی ہے اور وہ اُسے منانے کے لئے دوسروں کے کندھوں پہ سوار ہو کر نہ جانے کہاں کہاں بھٹکنے کے لئے چل دیتے ہیں ۔۔ ؟؟"

"تو کیا مجھے بھی دوسروں کے کندھوں پہ سوار ہو کر ہی یہاں سے جانا پڑے گا اور اپنی ہونے والی بیوی کی زلفیں سنوارنے اور شادی شدہ زندگی کا لطف اٹھانے سے پہلے ہی موت کی بے رحم گود میں سما جانا ہوگا؟"

میرے ان الفاظ کی گونج ابھی ختم بھی نہ ہو پائی تھی کہ ایک ہلکا سا طنزیہ قہقہہ میری خود اعتمادی کو مجروح کر گیا اور میں ابھی اس صدمہ سے سنبھل بھی نہ پایا کہ ایک سسکتی ہوئی سرگوشی نے میرے سارے وجود میں سردی کی ایک تیز لہر سی دوڑا دی اور میں کانپ کر رہ گیا "ہونے والی بیوی کی زلفیں سنوارنے اور شادی شدہ زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے کی تمہاری یہ معصوم اور بے ضرر سی خواہش فطرت کے عین مطابق ہے لیکن ذرا اس نوجوان کا خیال تو کرو جس کی شادی کو ابھی سات مہینے ہی ہوئے تھے کہ اُسے اپنی معصوم اور خوب صورت بیوی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر موت کی گود میں سما جانا پڑا ۔۔ اور پھر اٹھارہ سال کی اس نازک اندام اور بھولی بھالی لڑکی کا تصور کرو جس نے کتنے ہی ارمانوں اور تمناؤں سے اس نوجوان کا ہاتھ تھاما تھا لیکن ابھی اُس کے ہاتھوں کی مہندی بھی نہ اُتری تھی کہ وہ ہاتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے ہاتھوں سے نکل گیا اور اس چھوٹی عمر میں ہی اس کے ماتھے پہ کلنک لگ گیا ۔!!!

"اُف! کتنی دکھ بھری کہانی ہے یہ۔ آخر اُسے بیماری کیا تھی جو اس بھری جوانی میں اُس کے لئے موت کا پیغام بن کر پہنچ گئی تھی، وہ کام کیا کرتا تھا اور اس کا نام کیا تھا... ...؟؟ میں یہ سب پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"بیماری ۔ ! بس یہی گردوں کی بیماری تھی اُسے ۔۔ اس کے گردے بیکار ہو کر رہ گئے تھے اور انھوں نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ جہاں تک اس کے کام کا تعلق ہے وہ محکمۂ تعلیم میں ایک کلرک تھا اور اس کا نام اپنے وقت کے عظیم شہنشاہ اشوک دی گریٹ سے مشابہت رکھتا تھا۔ مطلب یہ کہ وہ "اشوک" کے نام سے پکارا جاتا تھا"

"کیسی بھیانک بیماری ہے یہ جو چھوٹے بڑے کسی کا بھی لحاظ نہیں کرتی اور ہر ایک کو موت کے منہ میں دھکیلے جاتی ہے اور وہ اٹھارہ سال کی خوب صورت لڑکی کتنی دکھی ہوگی جس کا شوہر اس بیماری کا شکار ہو گیا ہے اور ہاں شوہر کے نام کی طرح اس کا نام بھی تو بہت خوب صورت ہوگا -!!

اُس لڑکی کے نام سے نہ جانے کیوں مجھے دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی "نام ۔۔؟ ارے بھئی۔ عورت کا نام تو اس کے خاوند سے ہوتا ہے جب کسی عورت کا خاوند مر جاتا ہے تو اس عورت کا نام چاہے کتنا خوب صورت کیوں نہ ہو، گہنا جاتا ہے ———
ویسے اس لڑکی کا نام ہے 'وینا'۔ اور آج اُس وینا کے ہر تار سے "اشوک، اشوک" کے نغمے نکل نکل کر فضائے بسیط میں تڑپ رہے ہیں اور وہ خود صحراؤں میں جلنے والی شمع کی طرح بجھتی جا رہی ہے"

یہ داستانِ غم سننے کے بعد میں نے اپنے کان پھر اُسی پُراسرار سرگوشی کی طرف لگا دیئے۔ لیکن اب کی بار کوئی آواز نہ اُبھری، البتہ بائیں طرف سے کسی عورت کی کراہیں ضرور سنائی دینے لگیں۔ میں چونک کر اس طرف دیکھنے لگا، میں بائیں بیڈ پر

کی ایک جوان لڑکی بیڈ پہ لیٹی ہوئی درد کے مارے تڑپ رہی تھی اور ستائیس اٹھائیس برس کا ایک لمبا تڑنگا نوجوان اور ایک ادھیڑ عمر عورت اسے دلاسہ دے رہے تھے۔ کڈنی وارڈ میں کل چار بیڈ تھے اور ان چار بستروں میں ایک پہ وہ لڑکی، ایک پہ ایک ریٹائرڈ ٹیچر، ایک پہ ایک ادھیڑ عمر لالہ، جس کے سر پہ اس وقت اس کی موٹی تھل تھل للائن جھپی کر رہی تھی اور چوتھا بیڈ میرے سامنے بچھا تھا جس پہ میں اب لیٹنے جا رہا تھا۔ یہ سرسری جائزہ لینے کے بعد میں نے بوٹ اتار کر بیڈ کے نیچے سرکا دیئے اور ایک آہ بھرتے ہوئے بیڈ پہ لیٹ گیا۔ پھر ماحول کی سنجیدگی کے احساس سے بچنے کے لئے اپنی ہونے والی پروین کے حسن و جمال اور اس کے جسم کی رعنائیوں کے تصور میں کھو گیا اور انہیں تصورات میں کھوئے ہوئے نہ جانے کب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

میں ابھی نیند کی مسرت بھری آغوش میں چین کی بانسری بجا رہا تھا کہ اچانک ہی اپنے ماتھے پہ مجھے کسی نرم و نازک ہاتھ کے لمس کا احساس ہونے لگا اور تب اس حسین شخصیت کا دیدار کرنے کے لئے بے اختیار میری آنکھیں کھل گئیں۔ پروین میرے ماتھے پہ اپنا ہاتھ رکھے ہوئے بیڈ کے پاس کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میری آنکھوں میں خوشی کی چمک پیدا ہو گئی اور ہونٹ حرکت میں آ گئے: "پروین تم کتنی اچھی ہو جو مجھے دیکھنے چلی آئی ہو۔ تمہیں یہ تو یاد ہی ہوگا کہ ہماری شادی کو آج صرف دس دن باقی رہ گئے ہیں اور ٹھیک گیارھویں دن ہماری شادی ہو جائے گی۔ تب ہمارے خواب حقیقت میں بدل جائیں گے۔"

"یہ سب تو ضرور ہوگا لیکن پہلے تم ٹھیک تو ہو جاؤ۔ !"

یہ کہتے ہوئے وہ اچھل کر میرے بستر پہ بیٹھ گئی اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ اس کے ایسا کرنے سے میری پلکیں پھر سے بوجھل ہونے لگیں اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میری تمام بیماری ان لانبی لانبی انگلیوں کے پوروں کے لمس سے جدا ہوتی جا رہی ہے۔ اور میں بالکل تندرست اور چاق و چوبند ہوتا جا رہا ہوں اور وہ وقت دور نہیں جب میری امیدوں کی کلیاں چٹک چٹک کر پھول بن جائیں گی اور مجھ سا کوئی خوش نصیب نہ ہوگا۔ پروین ابھی میرے بالوں میں انگلیاں پھیر ہی رہی تھی کہ ایک سینئر ڈاکٹر جونیئر ڈاکٹروں کی فوج لے کر میرا معائنہ کرنے آ گیا اور اس کے پاس آتے ہی پروین بستر سے اتر کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ لگ بھگ آدھ گھنٹہ تک ان کا تختۂ مشق بنے رہنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرے پیٹ میں جو اچانک درد ہونے لگا تھا اس کی وجہ تھی میرے جگر میں معمولی سی خرابی کا پیدا ہو جانا اور اس خرابی کا تقاضا تھا کہ کسی اور وارڈ میں جگہ نہ ہونے پر فی الحال مجھے کڈنی وارڈ میں بھیج دیا جائے۔

ڈاکٹروں کے چلے جانے کے بعد پروین پھر بیڈ پہ بیٹھ گئی اور چہکتے ہوئے بولی۔ بس اتنی سی بات تھی جسے فسانہ کر دیا۔ یہ تو بہت ہی معمولی بیماری ہے اور ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے۔ میرے ماما جی کے لڑکے کو بھی ایک بار ایسی ہی بیماری ہو گئی تھی اور وہ آٹھ دس دن میں ٹھیک ہو گیا تھا۔ ؟ پروین کو اس طرح اطمینان ہو جانے کے بعد ہم کتنی ہی دیر تک آئندہ زندگی کے پروگرام بناتے رہے اور ابھی ہم مستقبل کے خوابوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ سسٹر ہاتھ میں سرنج لئے ہوئے میرے بیڈ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے انجکشن دینے کے بعد سسٹر جب دوسرے مریض کے لئے سوئی بدلنے لگی تو پروین کل پھر آنے کا وعدہ کر کے مسکراتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے وارڈ سے باہر چلی گئی۔ لیکن سسٹر نے جب میری نظروں کو پروین کا تعاقب کرتے ہوئے دیکھا تو اس کے موتیوں کی طرح سپید دانت اس طرح چمک اٹھے جیسے کالی گھٹاؤں میں اچانک ہی بجلی چمک جاتی ہے۔ پھر اسی لمحے وہ کوئل کی طرح میٹھی آواز میں کوک اٹھی "یہ لگتا ہے بہت پیار ہے دونوں میں۔ !" اور پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی وہ دوائیوں کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی موٹے لالہ کے بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔ اور تب اس موٹے لالہ اور ماسٹر جی کو دوائی پلانے کے بعد وہ اس لڑکی کے بیڈ کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ لڑکی اب بھی ہائے ہائے کر رہی تھی اور اس کا ہٹا کٹا شوہر اسٹول پہ بیٹھا ایک فلمی میگزین دیکھ رہا تھا۔ سسٹر نے سرنج نکال کر اس میں دوائی بھری اور اس لڑکی کو انجکشن دینے کے بعد اس کے شوہر سے باتیں کرنے لگی۔ چند منٹ تک اس باتیں کرنے کے بعد وہ ٹرالی کو دھکیلتی ہوئی میرے پاس سے گذری تو میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس لڑکی کے مردہ بچہ پیدا ہونے پر اس کے گردوں نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹروں نے آج سے پندرہ دن پہلے سے ہی اس کے شوہر کو کہہ رکھا تھا کہ وہ اپنا ایک گردہ دے دے تو اس کی بیوی کی جان بچ سکتی ہے۔ پہلے تو وہ اس کے جواب میں آج کل آج کل کرتا رہا تھا لیکن اب تو اس نے صاف جواب دے دیا ہے کہ وہ بیوی کے لئے اپنا گردہ دینے کے لئے تیار نہیں۔

سسٹر کی یہ بات سن کر مجھے اس نوجوان پہ اتنا غصہ آیا کہ میری مٹھیاں بند ہو گئیں اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کہ کتنا خود غرض انسان ہے یہ، جسے اپنی بیوی سے ذرا بھی محبت نہیں اور ایک میں ہوں جو شادی سے پہلے پروین کے لئے ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہوں لیکن اسی لمحے میں مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ میرا اس طرح سوچنا ٹھیک نہیں۔ نہ ہی تو میری اس لڑکی سے کوئی رشتہ داری ہے نہ اس نوجوان سے دشمنی۔ تو پھر مجھے اس طرح غصہ کرنے کا حق ہی کیا ہے اور اس چبھن سے چھٹکارا پانے کے لئے میں سرہانے کے نیچے رکھا ہوا جاسوسی ناول نکال کر پڑھنے لگا۔

سات دن تک تو پروین روزانہ میرے پاس آتی رہی اور طرح طرح سے میرا دل بہلاتی رہی۔ اس کے آنے سے جو مجھے دلی مسرت و سکون حاصل ہوتا تھا اس کی وجہ سے میں بڑی تیزی سے تندرست ہونے لگا۔ میرا درد بالکل جاتا رہا، وزن بڑھ گیا اور چہرے پہ خون جھلکنے لگا۔ تب جسم میں قوت، توانائی اور چستی کا احساس ہونے پر میں ہسپتال سے چھٹی لے کر گھر جانے کی بات سوچنے لگا۔ اس دوران ماسٹر جی صحت یاب ہو کر اپنے پروفیسر بیٹے کے پاس جا چکے تھے اور موٹے لالہ کڈنی کے آپریشن کے ڈر سے آن ریکوئسٹ چھٹی لے کر نو دو گیارہ ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے چلے جانے کے بعد اس وارڈ میں اب صرف دو ہی مریض رہ گئے تھے ایک میں اور ایک وہ لڑکی۔

شام ہو چکی تھی۔ سارا وارڈ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اس وقت نہ ہی تو کسی مریض کا کوئی تیماردار ہی موجود تھا۔ اور نہ ہی کوئی ڈاکٹر یا نرس۔ اس وقت میں پروین کے تصور میں کھویا ہوا خیالوں ہی خیالوں میں اس سے باتیں کر رہا تھا کہ اچانک ہی ایک سسکتی ہوئی آواز نے میرے خیالات کا طلسم توڑ ڈالا۔

"بھائی صاحب! آپ مجھے اپنا ایک گردہ دے دیں تو آپ کی بڑی مہربانی

بقیہ صفحہ ۴۸ پر

زہرہ جبیں

پی ۲۹۱/۱، شنکر نگر، ناگپور

جوتے

"لے اور لے! تڑاخ! تڑاخ! تڑاخ!" بدتمیز بس لڑکیوں ہی کو ستائے جاتے ہیں اور کوئی دوسرا دھندہ ہی نہیں!"

"ارے! ارے! یہ کیا کرتی ہے؟! کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا! بس کر اب تیرے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں!"

"اور پیر بھی پڑ میرے! آوارہ! غنڈہ! لوفر! اب جا کر دماغ ٹھیک ہوئے! سیدھی انگلیوں سے تو گھی ہی نہیں نکلتا! چلو سیدھے سے پیر پڑو اب!"

"ہونہہ! تیرے پیر پڑوں گا میں! حد سے بڑھتی جا رہی ہے! لڑکی کی ذات ہے اس لئے چھوڑ دیا ورنہ مزہ چکھا دیتا! کسی سونی گلی میں تن تنہا ملنا تو تیرا دماغ بھی بالکل ٹھیک کر دوں گا۔ دن میں تارے نظر آنے لگیں گے!"

"اوباش! چار سو بیس! نہ پہنچوا دیا تجھے بڑے گھر تو میرا نام نہیں!"

"پانچ سو چالیس! آٹھ سو ساٹھ! ارے چھوکری زیادہ خوب صورت نہیں ہے اس لئے چھوڑ دیا تجھے اور بڈھی بھی تو ہو گئی ہے! اچھا سدھار اپنے گھر ورنہ مفت میں شامت آجائے گی!"

تو جا کم بخت جہنم میں! شامت آئے تیری اور تیرے دوستوں کی!

"لے جاتا ہوں! تو بھی مع اپنی سہیلوں کے وہیں ملنا تیرا انتظار کروں گا!"

سائیکل سوار پیڈل مارتا ہوا یہ جا وہ جا ہوا ہو گیا اور سہیلہ لال بھبوکا بنی اسے گھورتی رہ گئی۔

"غضب کرتی ہو سہیلہ!" مدحت نے کانپ کر کہا۔ اگر وہ تم کو مار بیٹھتا تو تمہاری کیا عزت رہ جاتی! تمہیں دور ہٹ جانا چاہئے تھا سہیلہ!"

"مدحت تو تو ہمیشہ کی ڈرپوک اور بزدل ہے!" سہیلہ نے روناسا قہقہہ لگایا۔ کیسا مزہ چکھایا ہے۔ بچو ہمیشہ یاد رکھے گا اور کبھی بھول کر بھی کسی لڑکی کو نہ چھیڑے گا!"

"نہیں سہیلہ! لڑکوں کے ساتھ ایسی دلیری نہیں کرنا چاہئے اور ان سے تو ذرا بچ کر ہی رہنا چاہئے تم ہی سوچو اس نے مجھے تو کچھ نہ کہا۔ ان لڑکوں پر زیادہ توجہ دو یا انہیں ذرا ڈ دھمکاؤ تو وہ زیادہ شرارت کرتے ہیں۔

"ہونہہ! تیری طرح میں بھی دبک جاتی کیا؟! تو ذرا دور بھی تھی اور سائیکل نے اس نے میرے سامنے اڑائی تھی۔ چپلیں نہ لگاتی تو اور کیا کرتی؟ تیرے جیسی بزدل لڑکیوں کی وجہ سے ہی تو یہ لوگ اتنے سر چڑھتے ہیں! میرے بس میں ہو تو ایک ایک کا دماغ سیدھا کر کے رکھ دوں اور بھارت کو اس لعنت سے پاک وصاف کر دوں! غضب خدا کا لڑکیوں کا گھر سے نکلنا ہی دشوار ہے!"

سہیلہ کو پھر غصہ آ گیا اور اس کا خوب صورت صحت مند چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنے بھرے بھرے ہونٹ اپنے سفید دانتوں میں دبا لئے۔ لیکن ایک لمحہ کے بعد ہی پھر مسکرانے لگی۔ مدحت بھی ہنس پڑی اور دونوں آگے بڑھیں۔ مدحت تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔

سہیلہ نے کہا۔ مدحت! کیا کوئی ہمارے پیچھے لٹھ لئے دوڑ رہا ہے کہ تم چور کی طرح بھاگنے کی کوشش کر رہی ہو؟؟ بھئی بھئی خراماں خراماں باتیں کرتے چلیں گے۔"

"سن مدحت! تو صرف بزدل ہی نہیں بلکہ نازک اور کمزور بھی ہے۔ میں ہی ایک پھونک مار دوں تو روئی کے گالے کی طرح اڑ جائے! بھئی ایسی بھی نزاکت کس کام کی! ارے وہ پانچ پھولوں میں تلنے کا زمانہ گیا! اس زمانہ میں تو ہر لڑکی کو مضبوط اور صحت مند ہونا چاہئے۔ تندرستی ہزار حسن ہے۔ طاقت، استحکام اور بچاؤ کے لئے بھی ضروری ہے۔ بیرونی دشمن تو کبھی کبھی ہمارے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں لیکن یہ اندرونی ڈاکو اور بھی خطرناک ہوتے ہیں! ہمیں خود اپنا محافظ ہونا چاہئے!"

"یکچر بازی تو کوئی تم سے سن لے!" مدحت نے جھینپی جھینپی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ہم کتنے ہی مضبوط بنیں لیکن رہیں گے کمزور ہی! اور پھر نسوانیت بھی تو کوئی چیز ہے سب ہی عورتیں تو حمیدہ بانو بننے سے رہیں! یہ عقدۂ مشکل جب علامہ اقبال سے حل نہ ہو سکا اور وہ صرف غمناک ہی رہے تو ہم تم سے کیا حل ہو سکتا ہے۔ اور پھر یہ کالج کے لڑکے کرتے ہی کیا ہیں؟؟ کبھی بلو کہہ دیا کبھی منہ چڑا دیا، کبھی فقرہ کس دیا کبھی شعر پڑھ دیا تو کبھی سائیکل ٹکرا دی۔ اور یہ بھی تو سوچو کہ ایسی شرارتوں کے بغیر تو کالج کی زندگی کا کوئی لطف بھی نہیں!"

معلوم ہوتا ہے کہ تجھے خود ان باتوں میں لطف آتا ہے! آخر صرف کالج کے لڑکے ہی تو ایسی شرارتیں نہیں کرتے۔ ہر طرف ہر قسم کے اوباش اور غنڈے گھومتے پھرتے ہیں اور ہر ایک کا یہی وطیرہ ہے اور سچ پوچھو تو بعض کالج کے لڑکے بھی بڑے ذات شریف ہوتے ہیں! ہمیشہ تو یہ ایسی میٹھی میٹھی شریفانہ باتیں نہیں کرتے جیسا کہ تم بتا رہی ہو! بعض تو ایسے ایسے گندے فقرے کستے ہیں اور ایسی رکیک حرکتیں کرتے ہیں کہ خدا کی پناہ! یہی نہیں بلکہ عصمت دری سے بھی نہیں چوکتے! کیا تم نے وہ حادثہ نہیں سنا کہ ایک بڑے شہر میں ایک اسٹوڈنٹ لیڈر نے ایک لڑکی کو اپنے آفس میں ملازمت دینے کے بہانہ سے بلوایا اور پھر وہ لڑکی اپنی عزت واپس لے کر نہ لوٹ سکی! کیا وہ ٹرین کا تہلکہ خیز واقعہ بھول گئیں؟! بھرے ریل کے ڈبے میں طلبا کا گروپ گھس آیا! ٹیچر کو ایک تھپڑ مار کر الگ پھینکا اور لڑکیوں کی عزت کا صفایا کر دیا اور ڈبے کے تمام مسافر تماشہ ہی دیکھتے رہے! مجھے تو جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے، خون کھولنے لگتا ہے! اُفوہ! ایسی حیوانیت اور بربریت!

آج کل لوگ تو بس اپنی ہی جان بچاتے پھرتے ہیں! غیرت اور حمیت کے تو جنازے نکل گئے! یہ ہمارا عقدۂ مشکل اقبال سے نہ حل ہو سکا لیکن انھوں نے ہمیں سند تو عطا کر دی کہ اسے عورت ہی حل کر سکتی ہے!"

"سہیلہ تم تو چھیڑ چھاڑ سے عصمت دری کے معاملہ پر چلی گئیں! ہم تو صرف کالج کے لڑکوں کی شرارتوں پر بحث کر رہے تھے۔ ہوس رانی کا معاملہ تو ایک الگ مسئلہ ہے!"

"کوئی الگ بات نہیں! چھیڑ چھاڑ ہوس رانی کا پہلا قدم ہے! آخر ایسی شرارتوں کی ضرورت کیا ہے؟ کیا لڑکیاں کوئی عجوبہ روزگار ہیں؟! کوئی انوکھا تماشا ہیں کہ لڑکوں کو انہیں دیکھتے ہی گدگدی ہونے لگے؟!"

"اب یہ تو کی بات کہی تو نے سہیلہ! لڑکیاں بے تکے فیشن کرتی ہیں! جسم کی نمائش بھی کرتی ہیں اسی لئے لڑکے انہیں چھیڑتے ہیں!"

"کوئی نہیں! میں نے تو کوئی فیشن نہیں کیا ہے تو اس لڑکے نے مجھے کیوں چھیڑا؟ میرا بھائی یورپ سے واپس آیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مغربی ملکوں میں لڑکے لڑکیاں ساتھ ساتھ گھومتے پھرتے ہیں۔ لڑکیاں ٹراموں میں بسوں میں کام کرتی ہیں۔ لڑکے، بڑے آدمی سب ہی ان کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آتے ہیں! کالجوں میں بھی ایسے تماشے نہیں ہوتے!"

یہی تو ہمارے ان کے معاشرے کا فرق ہے۔ وہاں لڑکے اور لڑکیاں اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ چھیڑ چھاڑ کی ضرورت اور گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ ہمارے ملک میں اگر یہی آزادی لڑکوں اور لڑکیوں کو دیدی جائے تو پھر معاشرہ کی یہ برائی ختم ہو جائے گی؟

تو پھر وہ بچوں والی آزادی شروع ہو جائے گی! یاد رکھنا! ہمیں تو اپنے تہذیب و اخلاق کو قائم رکھتے ہوئے اس برائی کو دور کرنا ہے۔ بس لڑکیوں کو بہادر ہونا چاہیے، تجھے تو معلوم ہے کہ لڑکے مجھ سے کیسے ڈرتے ہیں!"

"خاک ڈرتے ہیں! بس گھوم پھر کے تیرے ہی راستے میں آتے ہیں! اب اس لڑکے نے تجھے ہی کیوں چھیڑا مجھے کیوں کچھ نہ کہا!"

"اسے میری جوتیاں کھانے کی جو خواہش تھی!"

"سہیلہ بہت خوش خوش اپنے گھر میں گھسی۔ اس کی والدہ بیٹھی پڑوسیوں کے ساتھ گپ شپ ہانک رہی تھیں۔

"اماں! آج ایک ذات شریف کی میں نے ایسی خبر لی ہے کہ وہ عمر بھر یاد رکھے گا!" وہ سرخ روئی کے جوش میں اپنی ماں سے لپٹ گئی۔

"چل ہٹ لڑکی! تیرا یہی دھندا ہے! اسے ٹھاٹا! اسے پیٹا۔ کسی کو ڈھکیلا تو کسی کو جوتے لگائے! بھلا یہ بھی کوئی لڑکیوں کے ڈھنگ ہیں۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ ہر جگہ اپنے بھائی کو ساتھ لے جایا کر!" ماں نے خفگی کے ساتھ بیٹی کو دور ہٹا دیا لیکن بڑے فخر اور ناز کے ساتھ اپنی پڑوسنوں پر نظر ڈالی اور داد کی طالب ہوئی۔

"اماں میں تنہا تو نہ تھی! سہیلہ نے بھی بناوٹی غصے سے کہا۔ مدحت جو میرے ساتھ تھی۔

"میری مدحت ایسی دیدہ دلیر نہیں!" مدحت کی والدہ بگڑیں۔ وہ لڑکوں کے منہ بھی نہیں لگتی! بھلا یہ بھی کوئی تعریف کی بات ہوئی کہ لڑکوں سے لڑکیاں کشتی لڑنے کو کھڑی ہو جائیں! چل جا ری مدحت سہیلہ نے تجھے بلایا ہے۔ تو نے آنے میں بہت دیر کر دی میں نے تجھے منع کیا تھا نا کہ اس طرح لڑکوں کے مقابلہ پر نہ جایا کرو! خبردار اب جو گئی ہے!"

"خالہ بی ہم تو اپنے کام سے گئے تھے۔ اب لڑکے ہمارے مقابلہ پر آئیں تو بتائیے ہم کیا کریں!"

"اری مدحت تو ابھی تک گئی نہیں! کھڑی بیکار بکواس سن رہی ہے! ادھر تیرے ابا تیرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ چل جلدی سے گھر دفع ہو!"

"امی! میں تو سہیلہ کو بھی ساتھ لے جاؤں گی!" مدحت نے مچل کر کہا۔

سہیلہ اور اس کی والدہ بے ساختہ ہنس پڑیں۔ پھر دونوں لڑکیاں بھاگ کھڑی ہوئیں۔ مدحت کی والدہ تیوریاں چڑھا کر بگڑیں۔

"واہ واہ بہن خوب اپنی لڑکی کو ڈھالا ہے! ہر طرف لڑکوں کے ساتھ جوتے چٹخاتی پھرتی ہے!

"یوں کہو بہن کہ لڑکوں پر جوتے چٹخاتی ہے! ان کم بخت لڑکوں کے ڈھنگ ہی ویسے ہوتے ہیں! آخر ان کی اصلاح بھی تو ہونا چاہیئے!"

"اب تمہاری یہ لاڈو ہی ساری دنیا کی اصلاح کر ڈالے گی؟!" قوسین کی والدہ بھی بگڑیں "میری قوسین کے خیالات بھی تمہاری بیٹی نے بگاڑ دئے ہیں! وہ بھی بات بات پر چپل سنبھالتی ہے۔ کالج کے لڑکوں پر کیا چھاپ ہے بہن! سارے مردوں کا یہی وطیرہ ہوتا ہے۔ آخر یہ لڑکیاں کس کس کو سدھارتی پھریں گیں؟!"

خدا نہ کرے سارے مرد ایسے ہوں! زینب شاید تمہیں برے مردوں سے ہی واسطہ پڑا ہے!"

انھوں نے ہنس کر زینب پر چوٹ کی لیکن بہن میری لڑکی نے کچھ نہ کچھ اصلاح تو ضرور کی ہے۔ میں تمہیں بتلاؤں؟ ایک مرتبہ دو تین غنڈے شرارت پر تلے ہوئے تھے۔ سہیلہ کی چھیڑ خانی کئے جاتے تھے۔ ایک دن یونیورسٹی لائبریری تک اس کا پیچھا کیا کہ ہمارے ساتھ پکچر چلو شریف لڑکوں کے ساتھ دوستی کرنے میں کیا ہرج ہے۔ سہیلہ نے انہیں یہ کہہ دیا کہ باہر انتظار کرنے کو کہا اور یہ کہ وہ ابھی کتاب لے کر آتی ہے اور ان کے ساتھ پکچر ضرور جائے گی۔ پھر اس نے اندر جا کر اپنے ابا کو فون کر دیا اور انھوں نے باہر سے پہنچ کر وہ جوتے لگائے ہیں کہ سب کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ رپورٹ کرنے چلے تو ان لڑکوں نے بہت ہاتھ جوڑے باپ بیٹی کے پیروں پر گر گئے کہ اب کبھی ایسا نہیں کریں گے! وہ دن اور آج کا دن کہ انھوں نے پھر کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ جہاں کہیں سہیلہ کو دیکھتے ہیں بہت ادب سے سلام کرتے ہیں اور ان کے ابا کو تو دیکھ کر ان کی گردنیں شرم سے جھک جاتی ہیں اور احسان مندی سے بھی! سہیلہ نے ہی انہیں معافی دلوا دی تھی ورنہ وہ تو ایسے معاملات میں بہت سخت ہیں، انہیں تو ایسی غنڈہ گردیوں اور بدمعاشیوں سے سخت نفرت ہے۔ وہ تو سارے بھارت کو ان برائیوں سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں! ہاں اگر عورتیں ہی اس بات کا بیڑا نہ اٹھائیں تو مرد کچھ بھی مدد نہ کریں گے!"

"ٹھیک ہی کہتی ہو بہن!" مدحت کی والدہ نے ہتھیار ڈالدیئے "یہ لوگ ایسی ایسی بدتمیزیاں کرتے ہیں کہ خدا کی پناہ! کلثوم بتا رہی تھی کہ ایک روز وہ اپنی جمیرہ کے ساتھ بس میں کہیں جا رہی تھی۔ چند اسی قسم کے لوگ بھی سوار تھے اور ایک شاعر صاحب بھی

تھے! چہرہ کو دیکھ کر کہنے لگے کہ بس میرا شعر تو یہی ہے۔ دوسروں نے بھی گھورنا اور فقرے بازی شروع کردی۔ انہیں عمیرہ کی والدہ کا بھی لحاظ نہ ہوا۔ جب انھوں نے خوب ڈانٹا کہ تم لوگ ایسا کیوں کرتے ہو کیا تمہاری مائیں اور بہنیں نہیں ہیں۔ جواب دیا کہ فضل وکرم سے وہ تو ہیں پر بیویاں نہیں ہیں! وہ بیچاری اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں اور دوسرے ہی اڈے پر اس بس کو خیرباد کہہ دیا۔"

"یہ لڑکے کیا نہیں کرتے ہیں! لڑکیوں کی طرف سے خود اپنے ہی نام خط لکھ لیتے ہیں اور پھر لڑکیوں کو بلیک میل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان شرارتوں اور بدمعاشیوں کا خاتمہ ہونا ہی چاہیئے! تمہاری لڑکی ٹھیک ہی کرتی ہے۔ آخر ان کی وجہ سے لڑکیاں ہمیشہ قید و بند میں تو نہیں رکھی جاسکتیں!" تو بیبی کی والدہ کو بھی ہار ماننا ہی پڑی اور اسی طرح کی گپ شپ کے بعد وہ اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہوئیں۔

سہیلہ کی والدہ دیر تک متفکر رہیں اور اس معاملہ پر غور کرتی رہیں۔ ایسے واقعات اور حادثات سے انھیں بہت کوفت ہوتی تھی اور جب معاملہ آبرو ریزی تک پہنچ جاتا تو انہیں بہت اذیت ہوتی اور عورتوں کی بے بسی پر ان کے آنسو ٹپک پڑتے اور خاص کر جب کوئی ہم قوم، ہم مذہب یہ فعل بد کرتا تو خیرالبشر کی امت کی اس پستی فطرت اور ذلت و خواری پر انہیں بہت ہی دکھ ہوتا۔ تھوڑی دیر بعد سہیلہ واپس آگئی اور اپنی ماں کی شریک غم ہوگئی۔

میرا بس چلے تو ایک ایک بدچلن کا گلا گھونٹ دوں! ایسی جگہ لے جاکر ماروں کہ جہاں انہیں پانی بھی نصیب نہ ہو! سارے غنڈوں کو کسی اندھیرے میں ڈال دوں، کسی گہرے غار میں ڈھکیل دوں کہ تڑپ تڑپ اور پھڑک پھڑک کر دم توڑ دیں!" یہ تھا سہیلہ کی والدہ کی بے بسی کا اظہار! والدہ کے اس طیش پر سہیلہ ہنس پڑی۔

"اماں آپ تو ان کے لئے کلکتہ کا بلیک ہول چاہتی ہیں! میں تو کہتی ہوں کہ ان کی چندیا پر اتنے جوتے پڑیں کہ ان کے بھیجے ہی نکل پڑیں! بس ان کا یہی ایک علاج ہے!"

ان ماں بیٹی کے دلوں میں جس قدر قوم، ملت اور ملک کا درد تھا، یہ اسی قدر ہنس مکھ، زندہ دل اور ملنسار بھی تھیں: وہ روتے بسورتے بیٹھے رہنے کی قایل نہ تھیں بلکہ عمل ہمت رکھتی تھیں۔ وہ گھوم پھر کر اپنے خیالات کا پرچار کیا کرتیں۔ آخرکار انھوں نے ایک کمیٹی بنائی جس کا نام انجمن سدباب غنڈہ گردی رکھا۔ اخلاق سدھارنے کی بہت سی تجاویز سوچی گئیں اور ان کی ایک طویل فہرست تیار کی گئی۔ سرفہرست سہیلہ نے اپنی تجویز رکھی یعنی جوتے!" اب تو ماں بیٹی بہت مصروف رہنے لگیں۔ سہیلہ کو اپنے کالج، اس کے پروگرام وغیرہ سے بھی اس قدر دلچسپی نہ رہی جس قدر کہ اس زبردست مہم سے تھی۔ پڑھائی اور مطالعہ بھی اب ایک ثانوی چیز ہوگیا تھا۔ عفت خاتون میں بھی کچھ بیٹی سے کم جوش نہ تھا۔ وہ اپنے شوہر کی خدمت گذاری بھی بھول گئیں جسے کہ وہ اپنا فرض اولین سمجھتی تھیں۔ وہ خانہ داری کے فرائض سے بھی غفلت برتنے لگیں۔ انہیں اپنے شوہر سے بات کرنے کی بھی فرصت بہت کم ملتی وہ اکثر راتوں کو بھی، ممبران انجمن کے ساتھ اس ادھیڑبن میں مصروف رہتیں، کبھی میٹنگ ہوتے اور کبھی انجمن کی روداد لکھی جاتیں اور کبھی جلسے ہوتے اور زبردست تقریریں اور بحث مباحث ہوتے۔ اب یہ لوگ اس فکر میں تھیں کہ انجمن کا ایک ماہانہ رسالہ نکالیں تاکہ ان کوششوں اور جدوجہد کو استحکام اور قوت حاصل ہوجائے اور ان کا یہ زبردست کارنامہ تحریری ثبوت اور دستاویز بن جائے۔ اب تو سہیلہ اور عفت خاتون کی مصروفیتیں بام عروج پر تھیں۔

مشتاق احمد اپنی بیٹی کے اس جوش وخروش وسرگرمیوں کی داد دیا کرتے تھے۔

"میری بہادر بیٹی!" وہ بڑے فخر سے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر کہتے۔ "اگر کوئی کام جذبۂ صادق سے کیا جائے تو ضرور کامیابی ہوتی ہے! انشاءاللہ میری بیٹی بھی اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوگی! دنیا سے بدکاروں کا نام ونشان تک مٹ جائے گا! مجھے اپنی اس بے بدل بیٹی پر بہت ناز وفخر ہے!"

سہیلہ کا خون چلّوں بڑھ جاتا لیکن عفت خاتون کا دل بجھنے لگتا تھا کیونکہ اس کا چاہنے والا اور اس کی تعریف میں قصیدہ خوانی کرنے والا سرتاج اس کی ہمت افزائی کے لیے ایک لفظ بھی نہ کہتا تھا۔ سہیلہ کی مدحت سرائی کے بعد کبھی وہ بھی اسے داد طلب نظروں سے دیکھتی تو وہ بے دلی سے بغیر اپنی بیوی پر نظر ڈالے اضافہ کر دیتا۔

"ہاں ہاں اور مجھے اپنی انمول بیوی پر بھی تو فخر ہے!"

لیکن لہجے کی سردمہری اور پیشانی کے بل عفت سے چھپے نہ رہتے۔

"ہونہہ! بیویوں کا کوئی مفید کام کرنا ان میاؤں کو کبھی پسند نہیں آتا! ہاں جب تک ان کے جوتے پوچھتے رہیں تب تک یہ بہت خوش رہتے ہیں! اب ان کے خاطر میں ملک قوم کی اتنی اہم خدمت کو تو نہیں چھوڑ سکتی! گھر کا کام کاج اور ان کی خدمت گذاری مرادن بھی کرسکتی ہے! پہلے اسے کم کام کرنا ہوتا تھا کم تنخواہ تھی۔ اب اسے ڈبل کام کرنا پڑتا ہے تو اس کی تنخواہ بھی ڈبل کردی گئی ہے۔ حضرت کی ساری ضرورتیں تو پوری ہو جاتی ہیں۔ کھانا وغیرہ تو سب بہت اچھا اور وقت پر ملتا ہے بلکہ پہلے سے زیادہ پابندی سے اور پہلے سے بھی زیادہ مزیدار! کیونکہ میں اب اس مرادن کے سر پر دن بھر سوار نہیں رہتی اس لیے اب بہت اچھا کام کرتی ہے۔ خواہ مخواہ کی نخروں کی عادت ہوتی ہے مردوں کو!"

عفت خاتون اسی قسم کی باتیں سوچ سوچ کر اپنا دل بہلا لیتیں اور اپنا دل ٹھنڈا کرلیا کرتی تھیں۔ مشتاق احمد کی طرف ان کی بے پروائی، غفلت شعاری اور بے نیازی بڑھتی گئی۔

ایک روز سہیلہ نے کالج کا ناغہ کیا۔ اپنی والدہ کے ساتھ انجمن کے دفتر گئی دونوں نے کچھ رپورٹیں دیکھیں، کچھ خطوط وغیرہ لکھے، رسالہ کے لئے کچھ مضامین چھانٹے۔ انجمن کے رجسٹروں کی جانچ پڑتال کی، کچھ نئے پروگرام بنائے، اپنے جاسوس مختلف مقامات پر غنڈوں کا پتہ لگانے کے لئے بھیجے، کچھ ملازم پتہ لگاتے ہوئے چار سوبیوں کی مرمت کے لئے یا انہیں پولیس کے حوالے کردینے کے لئے بھیجے۔ پھر سہیلہ نے اپنی والدہ کو دفتر کے کام ختم کرنے کی تاکید کی اور خود اطراف کے محلوں کا دورہ کیا۔ دو تین مشتبہ کرداروں کو پولیس کے حوالے کرنے کے بعد، شاداں وفرحاں، بڑی کامراں گھر لوٹی۔ دوسری طرف سے عفت خاتون بھی پہنچ گئیں۔ اس حسین اتفاق پر دونوں مسکرا پڑیں۔ خلاف معمول گھر کے دروازے بند تھے۔ ایک دو دستک دینے کے بعد سہیلہ نے کہا۔

"اماں مرادن باورچی خانہ میں پڑی سو رہی ہوگی! میں پیچھے جاکر اس کے سر پر دروازہ کھٹکھٹاتی ہوں آپ یہیں ٹھہریئے۔"

وہ دوڑ کر گھر کے عقب میں پہنچی اور بے تحاشا دروازہ پیٹنے کو تھی کہ اندر کی آواز نے اس کے ہاتھوں کو منجمد کردیا۔

"میں کہتی ہوں خبردار جو آگے بڑھا!"

"آخر حرج کیا ہے! تم لوگ کونسی بڑی عزت آبرو والی ہوتی ہو اور تمہیں توبو ہوئے"

"میری عزت آبرو کو تو کیا جانے! دیکھو آگے قدم نہ بڑھانا ورنہ تیری ہی عزت دھری رہ جائے گی!"

"ہونہہ! دو کوڑی کی عورت کا یہ دماغ! ؟ ابھی ٹھیک کئے دیتا ہوں! کدھر جائے گی مجھ سے بچ کر!"

بدمعاش! لوفر! دور ہٹ! نہیں مانتا! اچھا تو یہ لے! چار سو بیس! لے! لے! اپنے جوتے تو ہی کھالے اور لے! (تڑ تڑ! تڑ تڑ!) لے اور اور! کہتا ہے کہ غریب کی عزت ہی نہیں ہوتی! لے اور لے!"

سہیلہ پر جوتے ہی جوتے پڑ گئے! وہ ایک سکتہ کے عالم میں اپنی ماں کے پاس بھاگی!

"اماں! اماں!" وہ بے تحاشا چیخی۔ پھر اس کی آواز گھٹنے لگی اور اس نے اٹک اٹک کر اور سسک سسک کر بمشکل کہا۔

"اماں! ــــ باورچی خانے میں... مرادن... ابا .... ہیں ابا.... مرادن!.... آہ ..... ہاں اماں .... اوہ! ــ اوہ! اور وہ بیہوش ہو کر گر گئی!

جب سہیلہ کو ہوش آیا تو اس نے عفت خاتون کو اپنے اوپر جھکا ہوا پایا۔ وہ اپنے کمرے میں اپنے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ پانی کے چھینٹوں سے اس کا چہرہ اور گریبان تر بتر ہو رہے تھے۔ جب اس کے ہوش کچھ اور بجا ہوئے، اسے کوئی حادثہ یاد آنے لگا۔ پھر اس نے اپنے پیروں پر دو مضبوط اور بھاری ہاتھوں کی گرفت محسوس کی، پھر ایک وسیع جلتی ہوئی پیشانی کا دباؤ اور کھچڑے بالوں کی گدگدی اور پھر اس کے قدموں پر گرم گرم قطروں کا چھڑکاؤ ہونے لگا!

"کیا میرے پیر بھی بے ہوش ہو گئے ہیں ؟!" وہ سوچنے لگی۔

"آہ بیٹی ؟! میری بیٹی! کیا تو مجھے معاف نہ کرے گی ؟! آہ کبھی نہیں معاف کرے گی!" ہاہا! میں اس قابل ہی نہیں!

"اوہ یہ تو ابا ہیں!" وہ اچھل کر بیٹھ گئی۔ اس نے گھبرا کر اپنے پیر اپنے ابا کے چہرے کے نیچے سے نکالے۔ انھوں نے دونو ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانک لیا۔

آہ بیٹی! میں تجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں! میں تیرا گنہ گار ہوں! سیاہ رو! سیاہ دامن!! اور وہ قوی جسم اور نڈر دل، دیو ہیکل آدمی سسک سسک کر رونے لگا۔

سہیلہ کانپ اٹھی۔ تھرتھرانے لگی۔ عفت خاتون نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

سہیلہ نے اچانک اپنے والد کے مضبوط ہاتھوں کو پکڑ کر ان کے چہرہ سے ہٹا دیا اور ان کے سینے سے لپٹ گئی۔

"اوہ! نہ رویئے ابا نہ رویئے! میرے ابا اس طرح نہ رویئے! آپ میرے گنہ گار بالکل نہیں! ہاں آپ مرادن خالہ کے گنہگار ہیں! وہ اگر آپ کو معاف کر دیں تو!"

"گنہ گار میں ہوں بیٹی!" پائنتی سے چمٹی ہوئی مرادن بلک پڑی!! میں نے سرکار کو مارا ہے! جوتے سے مارا ہے! ہائے میرے ہاتھ کیوں نہ ٹوٹ گئے! تم میرے ہاتھوں کو قلم کر دو بیٹی! کئی سالوں سے اس گھر کا نمک کھا رہی ہوں تب بھی!"

"ہاں تو کیا تم اپنی عزت کو قربان کر دیتیں! عفت خاتون نے کہا، تم بہادر ہو! دراصل قصوروار تو میں ہوں اور گنہ گار تو میں ہوں! میری ہی وجہ سے یہ نوبت آئی!"

ضدی عفت خاتون بے اختیار رونے لگیں!

سہیلہ اپنے ابا کے آنسو پونچھ کر اپنی ماں کی طرف پلٹی۔

"آپ گنہ گار ہیں اماں؟ وہ کس طرح ؟!"

"ہاں بیٹی! میں ہی چراغ تلے کا اندھیرا بن گئی تھی!"

"لیکن کس طرح اماں ؟"

عفت خاتون نے سوائے اشک افشانی کے کوئی جواب نہیں دیا اور سہیلہ انہیں حیران نظروں سے دیکھتی رہی اور ایک گتھی کے سلجھانے میں الجھ گئی!

اور ادھر مشتاق احمد نے اپنے پیروں سے لپٹی ہوئی مرادن کو اٹھا کر اپنے گلے سے لگا لیا!

"میری بہن! میری بہن نے مجھے معاف کر دیا ہے!"

وہ ہنس پڑے اور بہتے ہوئے جھرنوں پر آفتاب چمک اٹھا!

قالب مرزاپوری

غفور خاں کی گلی، واسلی گنج، مرزاپور

نازشِ حوّا

وہ سلگتے ہوئے دن اور وہ تپتی ہوئی رات
وہ جھلستا ہوا مزدور کی محنت کا چلن
زخم احساس سے رہ رہ کے ٹپکتا ہوا خون
لاش ناکام تمناؤں کی محتاج کفن
ڈھل گئی ڈھل گئی آئینۂ ماحول کی گرد
مٹ گئی مٹ گئی حالات کے ماتھے کی شکن
مثل خورشید درخشاں ہے مشقت کی جبیں
کارخانوں میں تھرکتے ہیں مشینوں کے بدن
جنبش ابروے پروردۂ آغوشِ شعور
تیرہ بختوں کو اجالے کی خبر دیتی ہے
یعنی اک پیکر انصاف کے ہونٹوں کی ہنسی
دامن کشتۂ امید کو بھر دیتی ہے

نئی کتابیں

کتاب : بچوں کی نظمیں، پہلی بار ۱۹۷۶ء
مصنف : جگن ناتھ آزاد
سائز : ۸/ ۲۲×۱۸
صفحات : ۴۴
طابع : ترقی اُردو بورڈ، ویسٹ بلاک ۸۔ راما کرشنا پورم نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲
قیمت : دو روپے

"بچوں کی نظمیں" میں جگن ناتھ آزاد صاحب کی سولہ نظمیں شامل ہیں۔ یہ نظمیں بچوں کی نفسیات اور ان کی علمی استعداد کو مدِ نظر رکھ کر آسان لفظوں اور ہلکی پھلکی زبان میں کہی گئی ہیں۔ شاعر موصوف نے لفظوں کے موضوعات میں تنوع کا خیال رکھا ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ اچھا سبق دینے والے واقعات اور موضوعات کو بچوں کی جانی پہچانی علامتوں، ذہنی تصویروں اور تخئیلی پیکروں کے امتزاج سے پیش کیا جائے۔ اس کوشش کا افادی پہلو یہ ہے کہ بچہ ان نظموں کو پڑھتے وقت اپنے ذہن پر کسی قسم کا بوجھ محسوس نہیں کرے گا بلکہ ان نظموں میں اپنے ماحول اور اپنی پسندیدہ اشیا کی عکاسی دیکھ کر اور ذکر سُن کر وہ ان نظموں کو یاد کرنے کی کوشش کرے گا جس سے اس کی علمی استعداد اور ادبی ذوق وصلاحیت میں اضافہ ہوگا۔ نظم "تماشے والا" کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

آؤ بچو! دو پیسے میں دنیا بھر کی سیر کرو
نظارے دکھلانے والا
جگ کی سیر کرانے والا
ڈبہ اپنے سر پہ اٹھائے
گلی گلی میں جانے والا
آج تمہارے گھر کے باہر رنگ جمانے آیا
دو پیسے میں دنیا بھر کی سیر کرانے آیا

بچوں کے لیے پڑھنے کا نصیحت آمیز، رنگا رنگ اور دلچسپ مواد مہیا کرتی ہے۔ ان نظموں میں استعمال کی گئی آسان زبان اور ہلکے پھلکے الفاظ کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ "بچوں کی نظمیں" تعلیم بالغان کے نصاب میں بھی شامل کی جاسکتی ہے۔

جگن ناتھ آزاد صاحب ایک سنجیدہ شاعر ہیں لیکن "بچوں کی نظمیں" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بچوں کے لیے بھی اچھی شاعری کرسکتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کتاب کی اشاعت سے اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ وہ حضرت تلوک چند محروم کے صحیح ادبی وارث بھی ہیں جنھوں نے اردو میں بچوں کے ادب کو لافانی نظمیں عطا کیں۔

"بچوں کی نظمیں" کا ٹائٹل دیدہ زیب ہے اور کتاب اعلیٰ درجے کی ہے۔

●

کتاب : چوبیس مشعلیں (اگست ۱۹۷۶ء)
مصنف : ڈاکٹر شوکت بنارسی
صفحات : ۳۲
قیمت : دو روپے
پبلشرز : بال ساہتیہ مندر۔ ۱۳۱۱۔ کٹرہ۔ الہ آباد

"چوبیس مشعلیں" میں ایک چھوٹا سا مخمس "عہد نامہ" (۷ بند) اور اٹھارہ قطعات شامل ہیں۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ ان قطعات میں ہماری وزیراعظم محترمہ اندرا گاندھی اور نوجوان لیڈر سنجے گاندھی کی طرف سے عوامی ترقی اور بہبودی کے لیے دیے گئے ۲۰+۴=۲۴ نکات کا ذکر ہوجائے۔ کتاب کے آغاز اور آخر میں دو دو بند تمہید اور اختتام کے ہیں۔ باقی اکیس بندوں + قطعات میں وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کے دہ سالہ دورِ اقتدار میں اور خاص طور پر ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد ان کی طرف سے اٹھائے گئے ترقی پسند عوامی بہبود کے اقدامات اور ۲۰ نکاتی پروگرام کی تشریح کی گئی ہے۔ یہ تشریح بڑی آسان زبان میں کی گئی ہے تاکہ بڑوں کے علاوہ بچے بھی آسانی سے ان نکات کی غرض وغایت اور اہمیت کو سمجھ لیں۔ اس کوشش میں ڈاکٹر شوکت بنارسی بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ تفہیم کے اس سلسلے میں جو کمی رہ جاتی ہے اسے ہر بند اور ہر قطعے کے ساتھ دی ہوئی وضاحتی تصاویر اور کارٹون پورا کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے قطعات میں خاص طور پر جن سماجی، معاشی اور اقتصادی موضوعات کو چھوا ہے ان میں افلاس کا دور ہونا، جہیز کا اختتام، دفتروں کی بہتر حالت، بے روزگاری کا سدِباب، قیمتوں کی ارزانی، پیڑ لگانے کی اہمیت، ساہوکاروں کے سٹّے کا خاتمہ، فیملی پلاننگ وغیرہ شامل ہیں۔

"چوبیس مشعلیں" ایک موضوعاتی کتاب ہے۔ ملک کے بدلے ہوئے

خوشگوار آیند حالات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے اور بجا طور پر وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کی نذر کی گئی ہے۔

●

کتاب : فردوسِ نظر۔ مجموعۂ کلام ۱۹۴۰ء تا ۱۹۷۳ء
مصنف : شارب لکھنوی

صفحات : ۲۰۰
قیمت : ۴ روپے
پتہ : ۱۸/۳۳۹ ترمنی گنج۔ کاظمین۔ لکھنؤ نمبر۳

شارب لکھنوی کا شمار لکھنؤ کے عصری قصیدہ گویوں میں ہوتا ہے۔ لیکن پیشِ نظر کتاب شارب لکھنوی کے قصائد کا نہیں، بلکہ قطعات، غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ مذہبی شاعری کو چھوڑ کر یہ ان کی ۲۷ سالہ شعر گوئی کا کل سرمایہ ہے جس میں تعداد کے لحاظ سے غزلیں سب سے زیادہ ہیں، پھر نظمیں اور پھر قطعات ہیں۔ قطعات میں نصیحت اور تجربے کی باتیں مترنم اور دلچسپ انداز میں کہی گئی ہیں نظمیں ہلکی پھلکی سی ہیں لیکن جہاں جہاں قصیدے کا رنگ آ گیا ہے وہاں فکر و بیان غلو پیدا ہو گیا ہے۔

"فردوسِ نظر" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شارب لکھنوی کی غزلیں کلاسیکی غزل کی لکھنوی روایت کی حامل ہیں جس میں روزمرّہ محاورہ اور دوسرے لوازمات سے سجی ہوئی زبان سب سے مقدّم ہے۔ شعروں میں پرانے مضامین کو دُہرایا گیا ہے چنانچہ جذباتِ حسرت و یاس، رودادِ غمِ الفت، ذکرِ وصال اور شکوۂ جور و ستم سے ہم ان غزلوں میں جگہ جگہ دو چار ہوتے ہیں ؎

ارے ہائے ری محبت، ارے ہائے رے زمانہ
یہاں منہ سے بات نکلی وہاں بن گیا فسانہ

خدا کے واسطے پوچھو نہ رودادِ غمِ اُلفت
دھڑکتا ہے دلِ بے تاب رُکتی ہے زباں کہتے

لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ شارب لکھنوی کو یہ احساس ہے کہ زندگی کے تقاضے "زلف و رُخ" سے آگے بھی کچھ اور ہیں اور شاعری کرتے وقت زندگی کے حقایق پر بھی نظر رکھنی چاہیے ؎

غزل اب مانگتی ہے کچھ نئے عنوان لے شارب
کہاں تک صرف زلف و رُخ کا افسانہ کہا جائے

چنانچہ "فردوسِ نظر" کی غزلوں، قطعات اور نظموں میں کچھ ایسے شعر بھی مل جاتے ہیں جن میں شارب نے کچھ عصری مسائل کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ زندگی کے تابناک رُخ کی طرف دیکھا ہے اور عمل اور یقین کی بات کی ہے ؎

ہم بھول گئے گھر کو تمنا سے سجا کے
دنیا میں کہیں اور اندھیرا تو نہیں ہے

یہ بات الگ ہے کہ سحر تک نہ رہیں ہم
لیکن یہ یقیں ہے کہ سحر ہو کے رہے گی

اور یہ یقیناً شارب لکھنوی کی شاعری کا ایک خوش آیند پہلو ہے۔

●

کتاب : پہلا پتھر
مصنف : طاہر تلہری
اشاعت : اکتوبر ۱۹۷۶ء۔ پہلی بار
سائز : ۱۶/ ۳۰ × ۲۰
صفحات : ۱۴۴
قیمت : چھ روپے
ناشر : مکتبۂ دین و ادب، ۱۰ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ۔

ہر نیا شعری رجحان شاعر کے ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کے فن میں شعوری یا غیر شعوری طور پر منعکس ہوتا ہے۔ بعض شعراء میں اس رجحان کو قبول کرنے کی فطری صلاحیت ہوتی ہے۔ بعض شعراء اس مقبول رجحان سے وابستہ ہونے کے لیے اپنی شعری صلاحیتوں کو اس نہج پر موڑتے ہیں جو عصری ادب کا خاصہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۰ء کے اردگرد پروان چڑھنے والے جدید شعری رجحان کے وجود کو تسلیم کیے جانے کے بعد بھی یہ دونوں ردِّ عمل سامنے آئے۔ جہاں ایک طرف شعراء کے یہاں طبعی و فطری طور پر یہ رجحان نمایاں ہوا وہاں بعض شعراء نے شعوری کوشش کر کے جدید لب و لہجہ کو اپنایا اور اپنے شعروں ان موضوعات، خیالی پیکروں، علامتوں، بحر و عروض اور ردیف و قافیہ سے کام لیا جو جدیدیت سے مخصوص ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو بنیادی طور پر روایتی شاعری کا مزاج رکھتے تھے لیکن نئے رجحان کی کشش نے انھیں اپنی طرف کھینچا اور انھوں نے اپنی فکر اور اسلوب کو نئے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا۔ طاہر تلہری بھی اسی دوسرے گروہ کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ قدامت اور جدیدیت کے دوراہے پر کھڑے ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری آج کے بہت سے شعراء کی طرح پرانی اور نئی شاعری کا امتزاج بن گئی ہے ؎

شایانِ جرمِ زیست سزا بھی نہ مل سکی
خوشیاں ہیں بے ثبات الم غیر معتبر

کہیں بھی جاؤں مگر ساتھ ساتھ رہتا ہے
ترا خیال بھی میرے بدن کا سایہ ہے

مندرجہ بالا اشعار میں طاہر تلہری نے غزل کی کلاسیکیت سے اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کی ہے لیکن زیادہ کامیاب نہیں ہوئے ہیں اور صرف جدید طرز ادا کو اپنا کر مفاہمت کرلی ہے۔ لیکن یہ صورت ان کے کلام میں ہر جگہ نہیں ہے اور عام طور پر طاہر تلہری اپنے احساسات کو جدید شعری پیکروں میں ڈھالنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ بعض جگہ انھوں نے جدید لفظیات کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے۔

طاہر تلہری ایک سوچنے والے شاعر ہیں اور اپنی سوچ کی شعاعوں کو اپنے شعروں میں منعکس کرکے وہ قاری کے ذہن و دل میں ارتعاش پیدا کردیتے ہیں ؎

میں ایک قیمتی لمحہ ہوں میری قدر کرو
گزر گیا تو کبھی لوٹ کر نہ آؤں گا

بھیڑ میں ہر شخص تنہا ہوگیا
شور و غل نے کتنے سناٹے اگائے

چلچلاتی دھوپ نے ہر رُخ سے جب یلغار کی
آدمی گھبرا کے اپنی ذات میں گم ہوگیا

مصلحت نے سب کو رشتوں میں جکڑ کر رکھ دیا
ورنہ انسانوں کے اس جنگل میں کس کا کون ہے

"پہلا پتھر" میں نظمیں، رباعیات اور قطعات بھی ہیں جن میں پند و نصائح کی باتیں دلچسپ انداز میں کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "پہلا پتھر" طاہر تلہری کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے جس کو پڑھ کر امید بندھتی ہے کہ مستقبل میں اپنی فکر کے مزید تراشتے ہوئے پتھر پیش کرکے وہ قارئینِ ادب کو چونکائیں گے۔ نئی شاعری کو پسند کرنے والے "پہلا پتھر" کے مطالعے سے خوش ہوں گے۔ کتابت اور طباعت مناسب ہے۔

موصولات

کتاب : ضیائے کوکب
مصنف : سنتوش کمار کوکب
طباعت : بار اول، ۱۹۷۳ء
قیمت : ۵ روپے — صفحات : ۱۲۰
ناشر : کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی ۶۔

کتاب : شہنشاہ ایڈیپس (یونانی شاعر سوفوکل کے مشہور المیہ کا منظوم اردو ترجمہ)
مصنف : سمیع الحق لکچرر شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی
طباعت : بار اول ۱۹۷۶ء
قیمت : چھ روپے
ملنے کا پتہ : مظہر پبلشرز، رانچی

(عابد کرمانی)

کتاب : مضامینِ میر
مصنف : میر مشتاق احمد
صفحات : ۱۹۲
قیمت : دس روپے
شائع کردہ : ایشیا پبلی کیشنز، ارونا ہال، اردو بازار، دہلی۔

"مضامینِ میر" میر صاحب کے مختلف موضوعات پر گذشتہ ۲۵ برسوں میں لکھے ۵۵ مضامین کا مجموعہ ہے جو ان کی رنگارنگ، بامقصد اور بھرپور زندگی کا آئینہ دار ہے۔ کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند عزت مآب فخر الدین علی احمد صاحب نے بجا فرمایا ہے کہ "یہ مضامین حب الوطنی کے ایسے جذبے سے سرشار ہو کر لکھے گئے ہیں جو ہمارے اس دور کے ادیبوں کے لیے بہت ضروری ہے۔ ادیب قومی تعمیر میں اپنے قلم کے ذریعہ حصہ لیکر نہ صرف اپنا قومی فرض انجام دیتا ہے بلکہ وہ دوسروں کی بھی تربیت کرتا ہے اور ان کو صحیح راہ دکھاتا ہے۔

میر مشتاق احمد صاحب نے اپنے قلم سے صحیح کام لیا ہے اور نئی نسل کو فرقہ واریت کے ان نقصانات سے خبردار کیا ہے جنھیں وہ اپنی آنکھ سے دیکھ چکے ہیں۔ انھوں نے وہ راہ دکھائی ہے جس میں قوم کی فلاح مضمر ہے۔ وہ خود ایک عملی انسان ہیں اس لیے ان کا قلم حقیقت بیان میں معروف نظر آتا ہے — ضرورت ہے کہ ہمارے دوسرے ادیب ان سے رہنمائی حاصل کریں اور اپنا قلم قومی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے وقف کریں۔"

جنگ آزادی کی جد و جہد میں ہندوستانی عوام اور رہنماؤں کی بے بہا قربانیاں تقسیم ملک کی افسوسناک تباہیاں، سیکولرزم، نیز لسانی، اخلاقی، سماجی، سیاسی اور متنوع موضوعات پر میر صاحب نے بڑے بصیرت افروز مضامین قلم بند کیے ہیں۔ ساتھ ہی جنگ آزادی کے صفِ اول کے مجاہدین اور قومی رہنماؤں کے تذکرے بھی "مضامینِ میر" میں شامل ہیں، جو اردو تذکرہ نویسی کی تاریخ میں اہم باب کا اضافہ کرتے ہیں اور نئی نسل کے لیے فیضان کا سرچشمہ ہیں۔

میر صاحب کا اسلوبِ بیان سادہ اور سلیس ہے لیکن ادب اور علمیت کی چاشنی لیے ہوئے ہے۔ خشک سے خشک موضوع کو بھی بڑے دلپذیر اور مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ جا بجا فارسی اور اردو کے اشعار اس خوبصورتی سے اپنے مضامین میں لاتے ہیں کہ خاص معنی آفرینی کا احساس ہوتا ہے۔

"مضامینِ میر" کے کئی مضامین دلی کی سیاسی اور سماجی کردار اور تاریخ پر اہم دستاویز ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح دلی اور دلی والوں نے نہ صرف ملک کی آزادی کے حصول بلکہ آزادی کے بعد ملکی تعمیر نو کے لیے عظیم قربانیاں دی ہیں جو ناقابلِ فراموش حقیقت ہیں۔

مضامینِ میر کے موضوع، اسلوب، مواد اور افادیت کے پیشِ نظر اسے اسکولوں اور کالجوں کے تعلیمی نصاب میں شامل کرنے کی سفارش کی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ مضامینِ میر سے ہماری نئی نسل کو حب الوطنی اور ملک و قوم کے لیے ایثار کا سبق اور ملکی تعمیر نو کے

لیے حوصلہ اور ترغیب ملے گی۔

(ضیاء الرحمٰن غوثی)

●

کتاب : یادوں کی برات کا خصوصی مطالعہ
مؤلف : صابر کمال ایم۔اے (عثمانیہ)
صفحات : ۲۴۸ ــــ سائز : ۸/ ۲۲ × ۱۸
قیمت : ۱۲ روپے
ملنے کا پتہ : بیت الاعظم، مغل پورہ، حیدرآباد (آندھرا پردیش)

۱۹۷۰ء میں شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کی خود نوشت سوانح حیات "یادوں کی برات" شائع ہوئی تو ہندوپاک کے بہت سے لوگ جوش کی شخصیت وعظمت کے قطب مینار پر حملہ آور ہوئے۔ کسی نے ان کی کتاب کو اغلاط کا پلندہ کہا اور کسی نے اسے جوش خاں کی داستانِ خودستائی بتایا اور کئی طرح کے اعتراضات کیے گئے۔

صابر کمال نے اپنی کتاب "یادوں کی برات کے خصوصی مطالعہ" میں نہ صرف جوش کے تمام مخالفوں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے بلکہ ان کی نہایت ہی لطیف انداز میں کھنچائی بھی کی ہے اور جوش کو شعر و ادب کی دنیا کا "ماہِ کنعاں" یعنی "یوسف پاک داماں" ثابت کرکے پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ جوش نہ صرف ایک عظیم شاعر ہی ہیں بلکہ ایک بلند کردار انسان ہونے کے ساتھ ایک ایسی باضمیر شخصیت بھی ہیں۔

تمام مخالفتوں کے باوجود جوش کی عظمت و وقار کا قطب مینار شعر و ادب کی تاریک فضاؤں میں جگمگا رہا ہے ــــ "یادوں کی برات کے خصوصی مطالعہ" میں ایسے دلچسپ واقعات کو بھی پیش کیا گیا ہے جسے جوش اپنی "یادوں کی برات" میں پیش نہیں کر سکے۔ اس کی ایک بڑی اور اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں جوش کا کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی درج ہے اور ان کے کچھ اہم خطوط بھی ہیں اور بعض تاریخی اور اہم سیاسی و انقلابی نظموں کو پس منظر کے بیان کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ جوش کے بعض ساتھیوں کے چہروں سے بھی ہلکا سا نقاب سرکایا گیا ہے۔ "یادوں کی برات کے مطالعۂ خصوصی" کی اہمیت اس لحاظ سے بھی زیادہ ہے کہ اس کے مؤلف صابر کمال خود ایک ایسے جوان صالح ہیں جنہیں جوش کے خلوت و جلوت کے نظاروں کا شرف بھی حاصل رہا ہے اور خود جوش کے ہم جلیس و مصاحب بھی رہ چکے ہیں۔

کتاب کئی لحاظ سے بے حد اہم ہے۔ ایک تو اس لحاظ سے کہ "جوش فہمی" اور جوش سے بے پناہ عقیدت و محبت کا یہ گلدستہ شعر و ادب کی بارگاہ میں ایک ہندوستانی نوجوان کی طرف سے نذر کیا گیا ہے اور دوسرے اس لیے کہ جوش کی شخصیت کے بارے میں یہ کتاب "حق پرستی" کا پہلا قدم ہے، جو ہندوستان سے ایک ایسے شاعر کے حق و حمایت میں اٹھایا گیا ہے جس نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرکے بیشمار ہندوستانی عشاق کے سینوں کو فگار کیا ہے۔

خان غازی کابلی

●●●

بقیہ کڈنی وارڈ

ہوگی۔ مجھے مرنے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ بھگوان کے لئے مجھے بچا لیں۔!" ایک لمحے تک تو میں اس اپیل کے جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکا، صرف سوچ بھری نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ لیکن جب یہی جملہ دوبارہ میرے کان کے پردوں سے ٹکرایا تو میں بے اختیار اپنے بیڈ پر اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اُس لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں اور اُمید و ناامیدی کے ملے جلے جذبات کے تحت وہ برابر مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر بے اختیار مجھے وہ نوجوان یاد آگیا جس کے گردے خراب ہو گئے تھے اور جو بھری جوانی میں انتقال کر گیا تھا۔ اس نوجوان کا خیال آتے ہی ایثار و قربانی کے اعلیٰ ترین جذبات کچھ اس قدر مجھ پر غالب آگئے کہ میں بے اختیار اپنا ایک گردہ اس لڑکی کو دینے کے لئے تیار ہو گیا اور میرے اس فیصلہ کی اطلاع ملتے ہی کڈنی وارڈ کے انچارج ڈاکٹر جمالی نے آکر مجھے سینے سے لگا لیا اور حوصلہ افزا کلمات سے میرے جذبۂ ایثار کو اور بلند کر دیا۔ دو دن تک ہم دونوں کے خون کے ٹیسٹ اور ایکسرے لئے جاتے رہے پھر تیسرے دن ہمیں اوپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ جب ہمیں وہاں لے جایا جا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ اُس لڑکی کی آنکھوں میں زندگی کی بھرپور چمک اور ہونٹوں پہ امید افزا مسکراہٹ نے میری روح کے اندھیاروں میں ایک عجیب سا نور پھیلا دیا ہے اور میں ایک بہت بڑا کام کرنے جا رہا ہوں اس احساس سے میرا سر اونچا ہو گیا اور دل میں خوشی کے سوتے پھوٹ پڑے۔

اوپریشن کے دوسرے دن کڈنی وارڈ میں جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ پروین میرے بیڈ کے پاس رکھے اسٹول پہ بیٹھی میرا ماتھا سہلا رہی ہے اور اس کے ہونٹوں پہ ایک طنزیہ مسکراہٹ رقص کر رہی ہے۔ اس کی وہ طنزیہ مسکراہٹ ایک برچھی کی طرح میری روح کو کاٹتی چلی گئی اور اس کاٹ کی تکلیف سے نہ چاہتے ہوئے بھی میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے لیکن جب اس نے میری آنکھوں میں نمی دیکھی تو اس کی مسکراہٹ کی کاٹ اور گہری ہو گئی پھر جونہی میں نے اپنی بھیگی آنکھیں اُس کی آنکھوں میں ڈال دیں تو اس کی وہ زہریلی مسکراہٹ اس طرح کافور ہو گئی جس طرح آفتاب کی پہلی کرن کے لمس سے شبنم ہوا ہو جاتی ہے۔ تب اس مسکراہٹ کا زہر لبوں سے رس کر زبان کی نوک پر آگیا اور زبان کے حرکت میں آتے ہی وہ زہر میرے کانوں میں ٹپکنے لگا۔

"مسٹر راجیش! تم آج دوسروں کی نظروں میں بے شک ہیرو بن گئے ہو۔ ہر جگہ تمہاری تعریف ہو رہی ہے۔ ہسپتال کے ڈاکٹر اور دوسرے لوگ بھی تمہاری تعریفیں کرتے نہیں تھکتے لیکن میری نظروں میں اس سب کی کوئی وقعت نہیں۔ میرے لئے تم اب بیکار ہو چکے ہو۔ تمہارے ساتھ شادی کرکے میں شادی شدہ زندگی کا وہ لطف حاصل نہ کر سکوں گی جو میرا حق ہے۔ اس کے علاوہ ایک گردہ رہ جانے کی صورت میں تمہاری زندگی ہر وقت خطرہ میں ہے اس میں خرابی ہو جانے پر تم کسی بھی وقت موت کا شکار ہو سکتے ہو۔ اس لئے اب تم میرے شادی کرنے کی بات بھول ہی جاؤ۔... الوداع!"

●●●●●●●●●●●●●



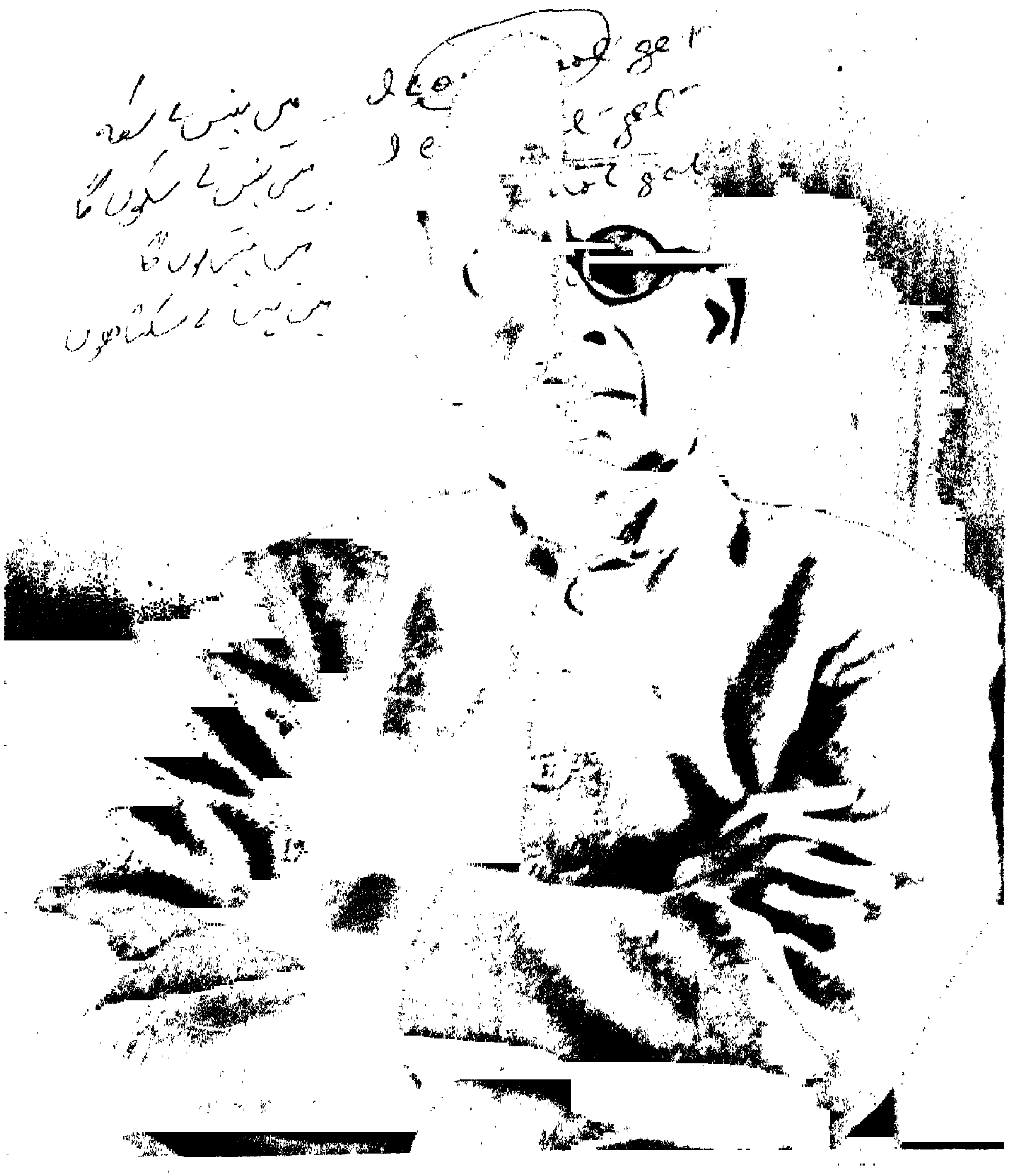
مرزا حمید اللہ بیگ کو سپریم کورٹ کا چیف جسٹس مقرر کیا گیا ہے۔ ۲۹ جنوری ۱۹۷۷ء کو صدر جمہوریہ ہند جناب فخرالدین علی احمد نے انھیں اپنے عہدے کا حلف دلایا۔

۸ فروری ۱۹۷۷ء کو نائب صدر جمہوریہ ہند شری بی، ڈی جتی نے پبلیکیشنز ڈویژن کی پانچ ہزارویں کتاب ابوالکلام آزاد کا اجرا فرمایا۔



تصویر میں نائب صدر جمہوریہ ہند شری بی، ڈی جتی کی داہنی طرف مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات شری ودیا چرن شکلا اور بائیں طرف شری دھرم ویر سنہا نائب وزیر اطلاعات و نشریات کھڑے ہیں۔

Regd. No. D(D)-103



پروفیسر رشید احمد صدیقی [۲۴ دسمبر ۱۸۹۲ء ⁂ ۱۵ جنوری ۱۹۷۷ء]

Vol.35 No.8 AJKAL (MONTHLY) March 1977

Published by the Director, Publications Divn., Patiala House, New Delhi - 110001.
Printed by Skylark Printers, 11355 Id-Gah Road, New Delhi - 110055.

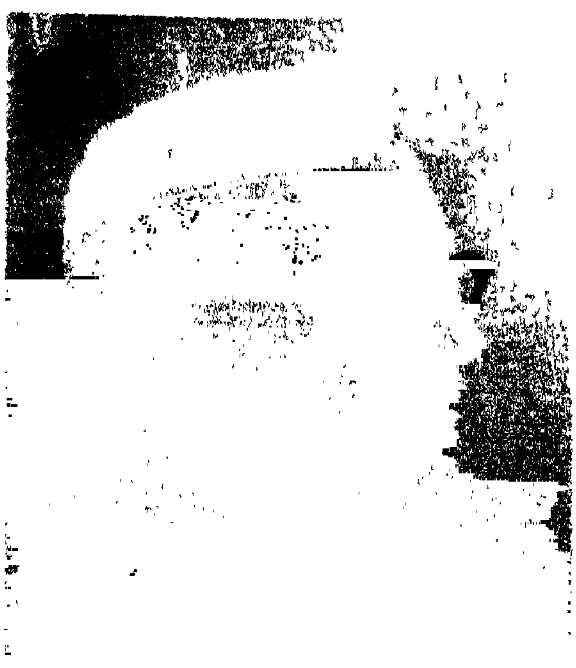




مکان انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ ماہرین اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ مقامی وسائل کو بروئے کار لاکر اچھے اور سستے مکان بنائے جائیں۔ اس مقصد کے لیے نئی دہلی میں "ترقی پذیر ملکوں میں بلڈنگ ریسرچ اور اس کا استعمال" کے عنوان سے ایک سیمینار ہوا جس کا افتتاح ۲۸ فروری ۱۹۷۷ء کو قائم مقام صدر جناب بی۔ ڈی جتی نے کیا۔

اس سال یوم جمہوریہ کے موقع پر صدر جمہوریہ ہند نے متعدد فنکاروں اور ادیبوں کو اعزاز عطا کیا ہے۔ ان میں اردو کے مشہور ادیب و شاعر جناب گوپی ناتھ امن

اور مشہور محقق جناب یوسف حسین خاں کو پدم بھوشن سے نوازا گیا ہے



گوپی ناتھ امن



یوسف حسین خاں

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

آجکل

ایڈیٹر
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۳۵ شمارہ ۹

اپریل ۱۹۷۷ء

چیت بیساکھ شک سمت ۱۸۹۹

ترتیب

شرح چندہ

سالانہ	دس روپیہ	۳ ڈالر	۱/۵۵ پاؤنڈ
دو سالہ	۱۷ روپیہ	۵ ڈالر	۲/۵۵ پاؤنڈ
سہ سالہ	۲۴ روپیہ	۷ ڈالر	۳/۶۰ پاؤنڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	۳۰ سینٹ	۱۵ پنی

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آجکل، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ملاحظات

ریڈ کراس

انسانوں کو دکھوں اور تکلیفوں سے نجات دلانے کے لیے دنیا میں کئی انجمنیں ہیں۔ ان میں سب سے ممتاز انٹرنیشنل ریڈ کراس سوسائٹی ہے، جو ۱۸۶۳ء سے قائم ہے۔ اس کی شاخیں تقریباً ساری دنیا میں ہیں۔ اور بڑا اچھا کام کر رہی ہیں۔ نئی دہلی میں ۹ سے ۱۶ مارچ تک ریڈ کراس کی پہلی ایشیائی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اس موقع پر ایک پیغام میں قائم مقام صدر جمہوریہ ہند شری بی۔ ڈی۔ جتّی نے فرمایا: ریڈ کراس انسانی بھلائی کا کام کرنے والی ایک بین الاقوامی تنظیم ہے جو دکھ اور مصیبت میں مبتلا لوگوں کی نہایت قابل قدر خدمت کر رہی ہے انسان دوستی، ہمدردی اور بے لوث خدمت کا نصب العین قابلِ تعریف ہے۔" وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اپنے پیغام میں کہا ہے کہ انسانی بھلائی کے لیے یہ تنظیم جو کام کر رہی ہے تمام دنیا میں اس کی قدر کی جاتی ہے۔ یہ خدمت اور سچی لگن کی مظہر ہے۔ ہندوستان میں ان کی تنظیم بڑی اچھی ہے اور یہ بڑی مفید خدمت انجام دے رہی ہے۔"

آپ نے مزید کہا: "پہلی ایشیائی علاقائی کانفرنس کے انعقاد سے ایشیا کے وسیع براعظم کے سماجی کارکنوں کو ایک دوسرے کے نزدیک آنے کا موقع ملے گا۔ ایشیا کے اپنے مخصوص مسائل ہیں اور ان کو حل کرنے کے لیے تمام ممالک اپنے تجربے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

ریڈ کراس سوسائٹی ہندوستان میں مختلف قسم کی خدمات انجام دے رہی ہے۔ چند مثالوں سے اس کے کام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بہار میں بصارت سے محروم لوگوں کے علاج کے لیے ایک مرکز ہے۔ دہلی میں بے سہارا افراد کو سلائی کی مشینیں دی گئی ہیں۔ گجرات میں دوا کی ایسی دکانیں کھولی گئی ہیں جہاں دوائیں بغیر کسی منافع کے بیچی جاتی ہیں۔ گوا، دمن، دیو میں امراض جلد کا مرکز کھولا گیا ہے۔ ہریانہ میں اندھوں کے لیے ایک ورکشاپ چلایا جا رہا ہے۔ جذام میں مبتلا جن مریضوں کے بچے صحت مند ہیں ان کا ہماچل میں ایک سنٹر کھولا گیا ہے۔ جسمانی طور سے معذور افراد کی ٹریننگ کے لیے تامل ناڈو میں ایک مرکز ہے۔ لاوارث بچوں کو لوگ متبنّیٰ بنالیں ایسا ایک مرکز مہاراشٹر میں کام کر رہا ہے اس طرح کے سینکڑوں ادارے ہیں جو بڑی خاموشی سے ملک کے طول و عرض میں کام کر رہے ہیں۔ ہندوستان جیسے غریب ملک میں اس ادارے کی سخت ضرورت ہے۔

اردو کا نقصانِ عظیم

ابھی مولانا عبدالماجد دریا بادی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کا غم تازہ ہی تھا کہ اردو کے عظیم افسانہ نگار اور ناول نویس کرشن چندر کا ۸ مارچ ۱۹۷۷ء کو انتقال ہو گیا۔ وہ ایک عرصے سے دل کے عارضے میں مبتلا تھے۔

کرشن چندر اردو کے نہایت عظیم فن کار تھے، ان کی کہانیاں اور ناول اردو ادب کا شاہکار ہیں۔ کردار نگاری اور احساس کی شدت کے ساتھ حسِ مزاح اور تحریر کی شگفتگی نے مل کر انھیں نہایت اعلیٰ درجے کا فنکار بنا دیا تھا۔

کرشن چندر ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد ڈاکٹر گوری شنکر چوپڑہ پونچھ (جموں) میں ملازم تھے۔ آپ نے وہیں سے ہائی اسکول پاس کیا۔ کالج کے زمانے میں ایف۔ سی۔ کالج لاہور کے طالب علم رہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۳۴ء میں ایم۔ اے کیا۔ ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۶ء سے ہوا۔ ۴۳-۱۹۳۹ء تک آل انڈیا ریڈیو سے منسلک رہے۔ ۱۹۴۳ء میں شالیمار پکچرس (پونا) سے منسلک ہو گئے۔ بعد میں وہ اداکارہ دیویکا رانی کی دعوت پر بمبئی چلے گئے اور فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔

انھوں نے سینکڑوں کہانیاں لکھی ہیں جن میں دو فرلانگ لمبی سڑک، زندگی کے موڑ پر، آدھے گھنٹے کا خدا، ان داتا اور مہالکشمی کا پل اور کالو بھنگی ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ ان کا ناول شکست، ڈرامہ "سرائے کے باہر" اور "دروازے کھول دو" بھی اعلا ادب کا شاہکار ہیں۔

نئی دہلی ٹیلی ویژن سے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے مشہور ادیبہ شریمتی عصمت چغتائی نے کہا۔ "اردو کا سب سے روشن چراغ گل ہو گیا ہے۔" ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ انھیں عوام سے بے پناہ پیار تھا۔ اور وہ فلموں سے اس لیے وابستہ ہوئے تھے کیونکہ ان کی دلی خواہش تھی کہ فلموں کے ذریعہ ان کا پیغام لاکھوں انسانوں تک پہنچے۔

انھوں نے ہمیشہ سماج کے پسماندہ طبقوں کی حمایت کی۔ اور ان کی بہترین کہانیاں وہی ہیں جن میں ہندوستان کے غریب اور پسماندہ عوام کی زندگی کی جھلکیاں پیش کی گئی ہیں۔

اردو افسانے کے معیار کو بلند کرنے اور ایک مقبول صنف بنانے میں ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

ان کی کہانیوں کا دنیا کی تقریباً ۳۰ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ انھیں ۱۹۶۶ء میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ اور ۱۹۶۹ء میں پدم بھوشن کا اعزاز دیا گیا تھا۔

کرشن چندر کی موت نہ صرف اردو بلکہ ملک کا نقصانِ عظیم ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۸ پر)

آہ! ہند کا نقصانِ عظیم ۱۳۹۷ھ

منشاء الرحمٰن خاں منشار ۱۱، اسٹارکی ٹاؤن، ناگپور

فخرِ دیں جس نے ہمیں دی ہے وفا کی تعلیم
اس کی رحلت سے ہوئے ہائے دل وجانِ دو نیم

محفل ہند سے وہ صاحبِ کردار اٹھا
ہر کوئی کرتا تھا جس کی تہِ دل سے تعظیم

خدمتِ قوم ہی تا عمر رہا جس کا شعار
اک اسی وصف سے اس کی ہوئی کیا کیا تکریم

جس کے ہر قول میں ہوتا تھا نہاں حسنِ خلوص
تھا عیاں جس کے ہر اک فعل سے حسنِ تنظیم

اس کو بھولیں گے بھلا کیسے گلستاں والے
آکے گذرا ہے گلستاں سے جو مانندِ نسیم

جن سے نظروں میں فزوں ہوتا ہے انساں کا وقار
وہی اوصاف ملے تھے اُسے وقتِ تقسیم

تم سے پوچھے جو کوئی سالِ وفات اے منشار
آہ ! کے ساتھ کہو ، ہند کا نقصانِ عظیم
۶ + ۱۳۹۱ = ۱۳۹۷ھ

برقی موسوی - ۲۵۳ کاچی گوڑہ گڈس، حیدرآباد، ۲۷

فردِ فعّال ، مردِ دانشور — بابصیرت مدبّر و خوش خو
کرد فتح قلوبِ خلق ، از خلق — نیک بشکست سنگ را ، ز سبو
گفت داعیِ مرگ را لبیک — شد رواں از جہاں سُوئے مینو
حرزِ جاں گشت کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ — برزباں لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو
یازدہ فوریہ ، بروز جمعہ — شد روانش پریش چوں خوشبو

عیسوی سالِ رحلتش ای برقی
فخرِ دین، صدرِ ہند رفت - بگو
۱۹۷۷ء

ناوک حمزہ پوری
سونڈھا، ہزاری باغ (بہار)

حسرتا صدرِ ہند فخرالدین — شد ز دارِ فنا بخلدِ مکیں
کرد رحلت ازیں جہاں ہیہات — سیّدِ قوم صدرِ اوج نشیں
فخرِ ہندوستان و فخرِ جہاں — فخرِ آبار و فخرِ ملّت و دیں
ایں چنیں دورۂ دل افتادہ — کہ نیا دردِ تاب جانِ حزیں

گفت ناوک سروش سالِ وفات
صاحبِ رتبہ صدر فخرالدیں
۱۹۷۷

عبداللہ پاشہ راز وانمباڑی
تامل ناڈو

شام کا کوئی گماں تھا نہ تھے شب کے آثار
نہ اندھیرے کا تموّج نہ خزاں کی یلغار
تازگی تھی ابھی باقی ، ابھی پھولوں میں نکھار
دفعتاً کیسے اجالوں کی کماں ٹوٹ گئی
سوچ میں لوگ ابھی ہیں کہ کہاں ٹوٹ گئی

صدرِ جمہوریۂ ہند ہم سے بہت دور گئے
دیکھتے دیکھتے یوں رنج کے بادل چھائے
آنکھیں سب کی ہوئیں نم دل سے بھی شعلے اٹھے
پیکرِ علم و عمل، خلق مجسّم ، ذی جاہ
خادمِ قوم و وطن ، حق نگر و حق آگاہ

مادرِ ہند کا دل چاک ہوا ہے غم سے
عرش کو چھو کے پلٹ آتے ہیں کتنے نالے
غم زدہ درد سے اربابِ وطن ہیں سارے
نازشِ قوم و وطن ہو گیا آخر خاموش
رحمتِ ربِّ دو عالم سے ہوا ہم آغوش

عرش ملسیانی
۴/۳ ایف، ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۹

کرشن چندر

میں مرحوم کو نہایت قریب سے جانتا تھا اور ان سے کئی بار دلّی اور دلّی کے باہر ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ وہ اخلاق و شرافت و شائستگی کے نہایت اعلیٰ نمونہ تھے۔

رسالہ "شاعر" بمبئی نے کرشن چندر نمبر نکالا تو سب سے اچھا پیغام جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق (مرحوم) نے دیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں: "کرشن چندر اردو ادب میں بہت مقبول ہیں۔ ان کا اسلوب خوبصورت اور رومانی ہے وہ نچلے طبقے کے نمائندہ ادیب ہیں۔ واقعی ان کی ہر کہانی سماجی اور معاشی عدم مساوات کے خلاف بغاوت کی آواز ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے عالمی امن اور بین الاقوامی مسائل کو بھی اپنے ادب میں نمایاں جگہ دی ہے۔ وہ سیاسی بے راہ روی اور رجعت پسندوں کے خلاف ایک مجاہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم کشمیر کے لوگ خاص طور پر ان کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنی کہانیوں میں ہندوستان کے اس خطّے کی خوبصورتی، یہاں کے عوام کی زندگی اور ان کی گوناگوں مسائل کو اُبھارا ہے۔"

تقسیم ملک کے بعد انسان سے انسان کی بے رحمی نے کروڑوں لوگوں کو سرحد کی دونوں طرف بے پناہ مصائب کا شکار بنا دیا تھا۔ سب سے المناک بات یہ ہوئی کہ انسان، انسانیت بھول گیا تھا۔ آپس کا اعتماد، بھائی چارہ اور صدیوں کے تعلقات نفرت کی آگ میں جل رہے تھے۔ کرشن چندر نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ آگ کو ٹھنڈا کرنے، انسانیت اور بھائی چارے کا جذبہ پیدا کرنے اور اعتماد بحال کرنے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند کے زمانے میں اردو افسانہ اپنے عہد طفولیت میں تھا۔ کرشن چندر کے زمانے میں اس پر شباب آیا۔

غالباً ۱۹۴۹ء میں ترقی پسندوں کی بہت بڑی کانفرنس بھوپال میں ہوئی اس میں نوجوانوں میں کرشن چندر، علی سردار جعفری، جاں نثار اختر وغیرہ شامل تھے۔ جوش ملیح آبادی دلی سے گئے تھے۔ نوجوانوں میں جوش تھا آزادی مل چکی تھی اور نئی آزادی کا جوش زیادہ ابل رہا تھا۔ وہاں بڑے بڑے فیصلے کیے گئے۔ ایک خاص مگر معمولی سی بات یہ تھی کہ سرکاری رسالوں سے قلمی تعاون نہ کیا جائے۔ اس کی آنچ براہ راست "آج کل" پر بھی پڑنے لگی۔ میں نے جوش صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ اس فیصلے میں سب کے ساتھ شامل تھے۔ وہ فوراً بات بدل گئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ اس کا "آج کل" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب کرشن چندر نے میرے خطوں کی جس میں افسانوں کی درخواست ہوتی تھی کچھ خیال نہ کیا اور جواب تک نہیں دیا تو میں نے شکایت جوش صاحب سے کی۔ مجھے یاد ہے کہ جوش صاحب نے ایک ایسا "ناگفتنی" خط کرشن چندر کو لکھا جس کو میں بھیجنے کی بھی تاب نہیں لا سکا۔ کچھ دنوں بعد کرشن چندر خود ہی دلّی آئے اور ملاقات ہوئی تو جیسے ان کی عادت تھی۔ جوش صاحب کو ایک معافی سے رام کر لیا اور مجھے ہنس کر ٹال دیا۔ یہ تھا اس نیک سیرت انسان کا کردار۔

لکھنے والوں نے لکھا ہے اور شاید ٹھیک ہی ہو کہ وہ ۸۰ زبان جانتے تھے لیکن اس بات کی حیرت سب کو ہوئی ہوگی کہ ڈوگری بھاشا جنم سے بولنے والا بچہ بڑا ہو کر اردو اور ہندی کا ایک عظیم فنکار بن گیا۔ اس کی تصنیفات کی فہرست بہت لمبی ہے۔ کوئی سو کے لگ بھگ تو ہوں گی۔ ان میں کہانی، ناول، ڈرامہ طنزیہ وغیرہ سب کچھ شامل ہے۔ یہ نہیں پتہ چلتا کہ وہ کہانی میں عظیم ہیں یا ڈرامہ میں یا کسی دوسری صنف میں۔ ان کا قلم جب کشمیر کے مناظر کی تصویر کھینچتا ہے تو وہ ایک مصوّر نظر آتے ہیں۔ بلکہ کچھ لوگوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ کرشن چندر مصوری زیادہ کرتے ہیں اور جذبات نگاری کم۔ انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ مادری زبان کے مقابلے میں اکتسابی زبان میں بھی کمال حاصل کیا جا سکتا ہے۔

وہ نہایت معصوم انسان تھے۔ جب کبھی میں نے ان سے کہانی وغیرہ کوئی چیز مانگی تو انھوں نے خط کا جواب فوراً دیا۔ ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ ہمیں معذرت کرنی پڑی۔ مگر انھوں نے کبھی برا نہ مانا اور ہمیں فوراً کوئی دوسری چیز بھیج دی۔

میرے خیال میں کرشن چندر کا سب سے عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو کہانی کو مقبول بنایا۔ اور اپنی کہانیوں کے ذریعے اپنے ہزاروں لاکھوں پڑھنے والوں میں انسان دوستی، ہمدردی، بھائی چارہ، مساوات اور رواداری پیدا کی۔

خواجہ احمد فاروقی
۲۸- کیولری لائنز، یونی ورسٹی کیمپس
دہلی ۷

تاریخ ادب اردو کی تدوین کا مسئلہ

اردو شعر و شاعری میں جتنی خزینہ دار ہے اتنی ہی ادبی تاریخوں سے تہی دامن ہے۔ اب سے پچاس برس پہلے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے انگریزی زبان میں تاریخ ادب اردو لکھی جس کا مرزا محمد عسکری نے اُردو میں ترجمہ بھی کیا۔ ہم نصف صدی تک اس میں کیڑے توڑا لتے رہے لیکن اس سے بہتر کتاب ابھی تک پیش نہیں کر سکے۔ اس لئے کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں ابھی تک وہی انجیل مقدس کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے بعد گراہم بیلی، محمد باقر اور ڈاکٹر اعجاز حسین نے مختصر تاریخیں لکھیں لیکن وہ تشنہ اور ناقص ہیں۔ ان میں پیوند کاری ہے اور زیادہ تر پرانی غلطیوں ہی کو دہرایا ہے۔ سنہ ۱۹۶۴ء میں محمد صادق نے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے انگریزی میں تاریخ ادب اُردو شائع کی۔ اس کے بعض بعض حصے دلکش ہیں اس لئے کہ ان میں خیالات و افکار کی ترجمانی ہے۔ لیکن کتاب میں بہ حیثیت مجموعی نہ تحقیق کی تازہ کاری ہے اور نہ تنقید کی دیدہ وری۔ اس میں واقعات کی بھی غلطیاں ہیں۔ اندراے کی بھی۔ یہ انفرادی کوششیں تھیں۔ علی گڑھ نے ادبی تاریخ کا مشترکہ منصوبہ بنایا لیکن وہ خواب بھی کثرتِ تعبیر سے پریشان ہو گیا۔

میرا خیال یہ ہے کہ ایک مستند تاریخِ ادب اس وقت تک نہیں لکھی جا سکتی جب تک اُردو کا پورا کلاسیکی لٹریچر ہمارے سامنے نہ ہو اور اس کے اہم مخطوطات حواشی اور تعلیقات کے ساتھ شائع نہ کر دیئے جائیں۔ ان بنیادی متون کے بغیر تاریخ اور تہذیب کا مطالعہ ادھورا رہے گا اور ہماری تنقید ریت کی دیوار سے زیادہ کمزور ہوگی۔ ہم حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، حاتم، تفتہ، مہر اور حد یہ ہے کہ سر سید اور ذکاء اللہ کا ذکر تو بہت کرتے ہیں لیکن ان پر مانوگراف یا ان کی ساری کتابیں مطبوعہ یا غیر مطبوعہ ہمارے سامنے نہیں ہیں۔ ایک کتاب کلکتہ میں ہے، دوسری حیدر آباد میں، تیسری رام پور، چوتھی لندن میں۔ سنہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں اُردو کے کتب خانے ورق ورق ہو کر اڑ گئے اور آج تک اس نقصان کی تلافی نہیں ہو سکی۔ بقول اقبال ؎

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں انکو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

عنی روز سیاہِ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اشس روشن کند چشم زلیخا را

ڈاکٹر اشپرنگر نے جو اودھ کے شاہی کتب خانوں کا فہرست نگار ہے، لکھا ہے کہ "ہندوستانی قوم عجیب ہے، شاید ہی کوئی گھرانا ایسا ہو جہاں چند بے مثل مخطوطات مصور یا مذہب نہ ہوں، یہ نادر کتابیں اگر اہل یورپ کے ہاتھ لگیں تو ان کی اکاڈمیاں برس ہا برس تک ریسرچ میں مصروف رہیں۔ لیکن یہ قوم ایسی بد توفیق بھی ہے کہ یہ نایاب مخطوطے بوریوں میں بند ہیں اور دیمک ان کو چاٹ رہی ہے۔" آج بھی ہمارے کتب خانوں کی حالت کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔ بعض جگہ وہ گرد میں اٹے ہوئے اور پھٹے ہوئے اوراق ملیں گے۔ ایک فہرست بھی ایسی نہیں ملے گی جس سے اشپرنگر، بلوم ہارٹ یا اسٹوری کی روح خوش ہو جائے۔

مواد جمع ہونے کے بعد اس کے پڑھنے، جانچنے اور پرکھنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ اُردو نے مخطوطات شناسی، متنی تنقید اور ریسرچ کے آئین و آداب کی تعلیم میں پہل کی ہے لیکن ابھی سے باقی و ما تباب باقی است۔ ابھی اسے بہت سی منزلیں طے کرنا باقی ہیں۔ تاہم یہ بات خوشی کی ہے کہ اس کی نظر بنیادی ضرورتوں پر ہے۔

تاریخ کے سلسلے میں یہ سوال بھی بار بار اٹھتا ہے کہ وہ آرٹ ہے یا سائنس جو لوگ بقول مہدی کے واقعات کی کھتونی مرتب کر لیتے ہیں کیا وہ بھی مورخ کہلانے کے مستحق ہیں؟ واقعات کے ان انباروں کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ یہ تاریخ کے بڑے بڑے ڈیم (DAM) جنگی جہاز یا فلک بوس عمارتوں کا ساز و سامان ہے اس کے پیچھے وہ بصیرت نہیں ہے جو لفظوں کے اندر چھپی ہوئی حقیقت کو پہچان لیتی ہے۔ وہ انتخابی نظر نہیں ہے جو ان ڈھیروں میں سچ کو ڈھونڈ نکالتی ہے۔ یہ ادبی مورخ چیونٹیوں کی طرح وقت کے ڈھیر پر تو بیٹھتے ہیں لیکن ان کی نگاہ چیونٹی سے بھی کم ہے۔

فرض کیجئے کہ ایک شخص کے پاس ایک خاص دن کے تمام اخبار ہیں جو دنیا میں شائع ہوئے اور اس کو یہ بھی اطمینان دلایا گیا ہے کہ ان میں جو رپورٹنگ ہے، وہ لفظاً لفظاً صحیح ہے۔ پھر بھی اس کو اس ڈھیر میں سے واقعات کو انتخاب کرنا پڑے گا اور جہاں انتخاب کا سوال آیا وہاں لامحالہ نقطۂ نظر کا بھی سوال آئے گا۔

سر والٹر ریلے کا ایک واقعہ مشہور ہے اس پر ملکہ الزبتھ اول کا عتاب نازل ہوا اور وہ قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ اس نے بیکاری سے تنگ آکر تاریخ عالم لکھنے کا ارادہ کیا۔ دن بھر کوٹھری میں پڑا ہوا کاغذ سیاہ کرتا رہتا تھا۔ ایک روز دو قیدیوں میں جھگڑا ہوا۔ ایک قیدی بھاگا ہوا ریلے کے پاس آیا اور کہا، آج الف اور ب میں بڑا جھگڑا ہوا اور ب غریب کا سر پھٹ گیا۔ دوسرا قیدی آیا اور اس نے کہا کہ آج الف اور ب میں جھگڑا ہوا ب کی کمر پر اتنے لٹھ مارے ہیں کہ وہ

اب شاید ہی کھڑا ہو سکے۔ تیسرا قیدی آیا اور اس نے کہا کہ آج الف اور ب میں جھگڑا ہوا اور ب کی ٹانگوں پر اتنی لاٹھیاں ماری ہیں کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ سر والا تو اپنا سر پیٹ لیا، اور کہا۔ تینوں چشم دید گواہ ہیں، آج ہی کا واقعہ ہے اور اسی قید خانے کا۔ تینوں کا بیان مختلف ہے۔ ممکن ہے کہ ب کے صرف سر میں چوٹ آئی ہو یا صرف کمر میں یا صرف ٹانگوں میں یا سر میں بھی آئی ہو، کمر میں بھی، اور ٹانگوں میں بھی۔

تاریخ اگر سائنس ہے تو تمام سائنسوں میں سب سے زیادہ غیر سائنسی مضمون ہے۔ کامل معروضیت وہم ہے اور ہم زمان و مکان سے ہٹ کر کسی واقعہ کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔ انسان نے جو پرواز خلا میں کی ہے اس میں اس نے البتہ دنیا کو زمان و مکان سے ہٹ کر دیکھنے کی پہلی کوشش کی ہے لیکن کتنی دیر ؟

ادب کی تاریخ کا تعلق انسان سے اور اس کے معاشرے سے ہے۔ یہ ایٹم کی تاریخ نہیں ہے جس میں اگر آپ نے ایک ایٹم کے بارے میں معلوم کر لیا تو سب ایٹموں کے بارے میں جان لیا۔ اگر ایک شیر یا ہاتھی کے بارے میں معلوم کر لیا تو سب شیروں یا ہاتھیوں کے بارے میں واقفیت ہو گئی۔ انسان اور وہ بھی شاعر اور ادیب انفرادیت کے حامل ہیں۔ اول تو ان کی پوری سائنسی تحلیل ہو نہیں سکتی اور اگر ہو بھی گئی تو ان سے دوسرے انسانوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہو سکتا۔ تاہم ہمیں ادبی تاریخ لکھتے وقت ان تمام سائنسی اور عمرانی علوم کی مدد لینا چاہئے جو بیسویں صدی میں نقطۂ عروج پر پہنچ گئے ہیں۔ خاص طور پر اپنے ماخذوں اور شہادتوں کے جانچنے اور ان کے باہمی تعلق کے سمجھنے میں ان علوم کی مدد بہت مفید ہو گی۔ ان ہی کی مدد سے تاریخی تسلسل کی نشان دہی ممکن ہے۔ ادب کی بنیاد ترقی پذیر انسانیت کے تصور پر قائم ہے۔ اس میں ذاتی غم اور مسرت میں وسیع تر حقائق کا جزو ہیں۔ اس میں نئے تجربات کا لہو ہے اور اس کی نظر سماج کی ہمہ گیر قوتوں پر جمی ہوئی ہے لیکن ادب کا حال اس کہنہ کتاب کا سا بھی نہیں ہے جس کے اول و آخر کے صفحات غائب ہوں۔ نیا ادب، نئی تختی پر نہیں لکھا جاتا۔ اس کی یادوں کی پشت پر زندگی کے ارتقا کی تاریخ ہے اور اس میں ادبی روایات، مذہبی افکار، تمدنی وراثت اور تہذیبی عوامل کی جلوہ گری ہے۔

افسوس کہ ہماری ادبی تاریخیں فہرست نگاری سے آگے نہیں بڑھیں۔ ان میں عہد بہ عہد کے رجحانات کا جائزہ نہیں لیا گیا۔ حقائق کی نئی توجیہہ نہیں کی گئی۔ تاریخ کی تخلیقی رو کو نہیں پہچانا گیا۔ ادبی تخلیقات کو سماجی اقدار کی روشنی میں نہیں دیکھا گیا۔ بعض لکھنے والے تو اپنی تہذیب تصوف اور علمی مزاج سے ناآشنا ہیں وہ یا تو تقریظ لکھتے ہیں یا تنقیص۔ پھر سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ وہ اس مشرق سے ناواقف ہیں جس کے شب و روز میں اس کی تخلیق ہوئی ہے۔

ماضی سے ہمارا تعلق جذباتی قسم کا نہیں ہونا چاہئے۔ روایات کا تسلسل ضروری ہے لیکن اسی کے ساتھ ان پر تنقید اور ان کا انتخاب بھی اہم ہے۔ تلاش و تحقیق، بغیر فکر و نظر کے ممکن نہیں۔ اگر ایک شخص نے اسیری کے زمانے میں غالب کے کپڑوں کی تمام جوئیں گن بھی لیں تو کیا حاصل۔ ان کی عظمت کے گوشے تو وہاں روشن ہوتے ہیں جہاں وہ شخصیت اور گرد و پیش سے گزر کر کائنات کی وسعتوں میں پہنچ جاتے ہیں یا اگر ان کے بعض اشعار میں دوسرے شعرا کی جھلک ہے تو اس سے ان کی شاعرانہ جلالت پر حرف نہیں آتا۔ اس طرح کا مطالعہ ناقص ہو گا۔ اگر ہم اپنی قدیم تہذیب کے ساتھ ساتھ ترکی عجمی روایات کے شناسا نہ ہوں اور ہم کو یہ نہ معلوم ہو کہ اس ایشیائی تہذیب نے ہندوستان کے دامن کو کن گلہائے رنگ رنگ سے بھرا ہے ؎

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

اردو ادب کی تاریخ کے ادوار کی تقسیم بھی غور و فکر کی مستحق ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان کی تاریخ کی فرقہ وارانہ تقسیم کی تھی۔ ہندوؤں کا عہد، مسلمانوں کا عہد، انگریزوں کا عہد۔ اس نے بہت زہر پھیلایا اور فیصلہ یہی ہوا کہ ہندوؤں کا عہد بھی برا، مسلمانوں کا عہد بھی برا۔ انگریزوں کے آنے سے اجالا ہو گیا۔ اور خیر و برکت پھیل گئی۔ ادبی تاریخ متقدمین، متوسطین اور متاخرین میں بٹ گئی۔ بعض ادبی مورخوں کا خیال ہے کہ یہ تقسیم افکار کے لحاظ سے ہونی چاہئے۔ اس میں بہت سی دشواریاں ہیں۔ ہمارے معاشرے میں روایت پرستی اور بے رحم یکسانیت رہی ہے۔ اس لئے میرے خیال میں اس کی تقسیم تاریخی ہو تاکہ طالب علم کو اول و آخر کا صحیح اندازہ ہو سکے اور وہ اس کا مطالعہ ہندوستان کے تہذیبی اور لسانی نقشے میں کر سکے۔ اس وقت عام طالب علم اردو ادب کو ایک طلسمی گنبد سمجھتا ہے۔ نہ اس کا تعلق ہند آریائی خاندان السنہ سے جوڑتا ہے، نہ ہندوستان کے شب و روز سے، نہ ایشیا کے رجحانات سے۔ ہماری ادبی تاریخ کو تخلیقات کا تجزیہ تاریخی پس منظر میں کرنا چاہئے۔ اسی کے ساتھ یہ دیکھنا چاہئے کہ ادیب یا شاعر تاریخی جبریت پر غالب آ سکا ہے یا نہیں اور اس کے کارنامے صحت مند اقدار کے پیدا کرنے میں مدد دیتے ہیں یا نہیں۔ ان کارناموں میں زندہ رہنے والے عناصر کتنے ہیں اور ان کی قدر و قیمت روایت اور تغیر اور خود زندگی کے بے شمار نامیاتی مظاہر کی روشنی میں کیا ہے۔

ادبی تاریخ نہ سائنس ہے، نہ عمرانیات، نہ معاشیات، نہ نفسیات۔ ان علوم سے اسے مدد لینا چاہئے اور بس! سائنس کی نارسائیاں اجتماعی علوم سے کم ہیں لیکن وہ اقدار کی محرم نہیں اور ادبی تاریخ میں اصلی کام اقدار ہی کا ہے۔

عصمت چغتائی

"میلے کا ٹوکرا"

معنفہ ان دنوں گاؤں کا دورہ کر رہی ہیں۔ ہندوستان میں ساڑھے پانچ لاکھ گاؤں ہیں۔ آزادی کے بعد ان کی تعمیر و ترقی کے لیے بہت کچھ کیا گیا ہے اور بہت سے گاؤں میں نئی زندگی کی برکتوں سے فیضیاب ہو رہے ہیں اور نئی چیزوں کے ساتھ ساتھ لوگوں کے خیالات میں بھی تبدیلیاں آئی ہیں۔ مگر صدیوں کے توہمات، اونچ نیچ کا احساس اور رسم و رواج، اب بھی جڑ پکڑے ہوئے ہیں۔ نئے ہندوستانی معاشرے کی تشکیل کی جدوجہد جاری ہے وہ صرف حکومت کی کوششوں سے کامیاب نہیں ہوگی بلکہ اس کے لیے رائے عامہ کو بھی بیدار کرنے کی ضرورت ہے (ایڈیٹر)

بس کیچڑ اچھالتی ہوئی بیچ بازار میں رک گئی۔ چنڈوس آگیا۔ منّی کی اماں نے بانس کی ٹوکری سنبھالی اور پھدک کر سڑک پر کھڑی ہو گئیں۔ میں انھیں علی گڑھ سے اپنے ساتھ لائی ہوں۔ چنڈوس پہلا گاؤں ہے جہاں میں ایک ہفتہ رہنے کے ارادے سے آئی ہوں۔ منّی کی اماں کے سمدھی جو کہ رشتہ میں ان کے بہنوئی بھی لگتے ہیں۔ کاشتکار ہیں میں ان کے ہاں آٹھ دن مہمان رہوں گی۔ بشیر خاں لمبے قد کے دُبلے پتلے پٹھان ہیں۔ کھڑا نقشہ، چوڑی ہڈی نجلے ہوئے تانبے جیسی رنگت تیل پلا ہوا بھاری جوتا، گھٹنوں سے ذرا نیچی سفید تہمد سفید کرتا اور سفید بوجھل سی پگڑی، ٹھیٹ کسان معلوم ہوتے ہیں۔

گھر میں داخل ہوتی ہوں تو بشیر خاں دو اونچے بیل باندھ رہے ہیں۔ پاس دو مرکھنے سے بھینسے ایک گائے اور ایک بھینس بندھی ہے۔ دوسرے کونے میں چودہ بکریاں ایک دوسرے سے جڑی بیٹھی اور کھڑی ہیں۔

گوبر کا ایک بھبکا میرے دماغ میں چڑھ گیا۔ بازار سے ڈھیروں بچے ساتھ لگ لیے تھے سب مجھے چاروں طرف سے گھیرے تماشہ دیکھ رہے تھے میں عجوبہ جانور کی طرح بیلوں اور بھینسوں کے سینگوں سے خائف کھڑی تھی۔

بشیر خاں کی دلہن کوئی پچپن ساٹھ برس کی نہایت میلی، چیچک منہ، داغ بھونڈی سی مگر خوش مزاج ثابت ہوئیں۔ بالکل منّی کی اماں کی سگی بہن ہیں لگتیں۔ انھوں نے جلدی جلدی چولھے میں پھونکیں مار کر دھواں کم کیا اور مجھے ایک ڈگمگاتی ہوئی پلنگڑی پر بٹھایا۔ منّی کی اماں نے تعارف کا دفتر کھول دیا

اور دیکھتے دیکھتے گھر عورتوں اور بچوں سے بھر گیا۔ پڑوس کی عورتیں دیواروں پر چڑھ کر جھانکنے لگیں۔

"کیا نسس بندی کے لیے آئی ہو؟" ایک خرانٹ سی بڑی بی فرمائیں۔

میں نے مری ہوئی آواز میں صفائی پیش کی کہ میرا نسس بندی سے کوئی تعلق نہیں۔ اللہ تمھیں اور توفیق دے۔ میری بلا سے پھلو پھولو مگر اللہ اپنے بچے کی ناک پونچھ دو جو وہ میرے گھٹنے پر لسیڑ رہا ہے۔ پیپوں میں سے باسی ابلے ہوئے چنوں کی باس کا بھبکا اٹھا اور گوبر کی بدبو پر چھا گیا۔ دو ڈ سڑک پر لتا منگیشکر چنگھاڑ رہی تھی۔

"کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے"

مگر میرے دل میں کوئی خیال نہ آسکا۔ دماغ صفا چٹیل میدان کی طرح بنجر پڑا تھا۔

"میں کہانیاں لکھتی ہوں"

میرا رہا سہا اعتبار بھی ختم ہو گیا۔ یہ کیا حماقت کرتی ہوں!

دھوپ مٹی کی ادھڑی ہوئی دیوار پر آخری جھپکی مار کر غائب ہو گئی۔ یا اللہ اب تو کوئی بس بھی واپس نہیں جاتی۔ بھینسے نے ایک لمبی سی پھنکار کھینچی اور دُم جھٹک کر گوبر کی پھوار اڑا دی۔ میرے گرد جمع خلقت میں غیریت کی ایک تازہ لہر دوڑ گئی۔ چمپا دیوی نے دیوار پر سے جھانک میرے وجود پر نئے زاویے سے روشنی ڈالی۔

"ارے اب تو لگائیاں سگرے گاؤں ماں گھومت پھرت ہیں" پھر جانے کیا ہوا منّی کی اماں ایک دم پھنپھنا کر سینہ سپر ہو گئیں اور چومکھی تلوار چلانے لگیں۔

"اے کم بختو جانتو نا ہو گے اپنی اختری بی کی نند ہیں"

اختری بی کی نند! وہی اختری بی مرحومہ جنھوں نے منّی کی اماں بیوہ ہوئیں تو انھیں اپنے پوٹے تلے سمیٹ لیا۔ جمیلہ بی بی اختری بی دونوں ہی جُٹ تھیں۔

"تم گھبراتا نہیں منّی کی اماں سب ٹھیک ہو جاوے گا"

انھوں نے سارے علی گڑھ سے سلائی سمیٹ کر منّی کی اماں کو دی۔ رہنے کو کوٹھری دی۔ منّی کی اماں نے سات بچوں کو سلائی کے سہارے پالا۔ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا۔ اپنی محنت سے بچوں کو پڑھایا لکھایا۔ بیبیوں نے فیسیں معاف کروادیں۔ بیٹے نوکر کرادیے بیٹیوں کی شادیاں نمٹوادیں۔ بڑے لڑکے للّن کو ہوٹل میں نوکری دی۔ چھوٹے کو کیشئین کروادی۔ مجمع گم سم سناٹے میں کھڑا رہ گیا۔

اختری بی کی نند! تب تو میں ان کی اپنی ہوں۔ کوئی عجوبہ جانور نہیں۔

"ان کی میری بہن بھی ہوں" میں نے بڑے فخر سے کہا۔

"سگی؟"

"ہاں سگی"

جیسے مجھے زندگی کا سب سے بڑا اعزاز مل گیا۔ اختری بی کی نند اور اوپر سے

میری بہن ۔ اور کیا چاہیے تھا مجھے ۔ ادیبہ کی ایسی تیسی!

" اے چھورا لپک کے جا ایک گلاس چا تو لے آ گرم گرم " بشیر خاں کی دلہن چہکیں اور بڑے احترام سے مجھے پائنتی سے اٹھا کر پلنگ کے سرہانے بٹھایا گیا ۔ گرم گرم گلاس بھر چائے پی کر میری ساری کلفتیں دور ہو گئیں ۔

مبشر خاں کی بڑی بہو کشوری بیگم ضد کرنے لگیں کہ میں رات ان کے ہاں گذاروں ۔ میں اپنا بستر بوریا اٹھا کر سلیم خاں کے ہاں آ گئی ۔ دو قدم پہ گھر تھا ۔ کچا گھر مگر صاف ستھرا تھا ۔ صرف دو بکریاں بے تکلفی سے صحن میں لدکڑے لگا رہی تھیں ۔

میری آمد اور سلیم خاں کے ہاں مقیم ہونے کی خبر گاؤں میں آگ کی طرح پھیل گئی ۔ بیبیاں زرق برق کپڑے پہن کر آنے لگیں ۔ ہر منڈیر پر عورتیں اور بچے چڑھ کر جھانکنے لگے ۔

دھیمی چال چپکے چپکے اندھیرا اترنے لگا ۔ کہیں غڑاپ سے سورج ڈوب گیا اور در و دیوار گم ہو گئے ۔ لنڈ منڈ نیم کا درخت یتیموں کی طرح سہا ننگے ہاتھ پھیلائے کھڑا رہ گیا ۔ چاروں طرف سے سردی رینگ رینگ کر ہڈیوں میں اترنے لگی ۔

دو دَرے کے ایک کونے میں لکڑیوں اور ارہر کے جھانکڑوں کا ڈھیر تھا ، دوسرے کونے میں چولھا ۔ گاؤں کتنا گندا ہے مگر چولھے کتنے سجے ہوئے ہیں صندلی رنگ کی مٹی سے دیوار اور چولھے روز دوپہر کی روٹی پکا کر پوتے جاتے ہیں ۔ بس گھر میں یہی ایک جگہ صاف ستھری ہوتی ہے ۔ کشوری نے آلو ، بیگن اور گوبھی کے پھول کاٹے ۔ پروین بانو نے مسالہ پیسا اور شکیل دوکان سے مکئی کا آٹا اور تیل بھری کپی لے کر آ گیا ۔ میرے دم میں دم آیا لو بھئی اب روشنی ہو جائے گی کپی جلائی گئی ۔ آدھ انچ کی مرگھلی روشنی سے گھر میں کوئی فرق نہ پڑا مگر چلو دیا تو جل گیا ۔ مجھے کچھ ناامید سا دیکھ کر پروین بانو نے ڈھارس بندھائی کہ ابھی پڑوس میں بجلی جلے گی تو گھر میں خوب روشنی آئے گی ۔

" خالہ بجلی کب جلاؤ گی ؟" اس نے پڑوس کی دیوار کی طرف منہ کر کے آواز لگائی ۔

" ابھی میاں دوکان سے نا آئے " پڑوسن نے ہانک لگائی ۔ پروین کا منہ اتر گیا ۔

مگر اتنے میں کشوری نے چولھا جلا دیا ۔ ایک دم سارا گھر جی اٹھا در و دیوار نظر آنے لگے ۔ ورنہ ایسا لگ رہا تھا جیسے خلا میں بیٹھے ہیں ۔ کتنا عجیب ہوتا ہے کچے گھروں کا اندھیرا ۔

چولھے کے پاس بیٹھ کر میں نے مکئی کی گرم گرم روٹی اور بھاجی کھائی ۔ اور مجھے یقین ہونے لگا کہ گاؤں میں جیا جا سکتا ہے ۔

۷ × ۱۲ فٹ کے کوٹھے میں گھر کا سارا سامان رکھا تھا ایک بڑا سا پلنگ بچھا تھا ۔ پانچ بورے مکئی کے رکھے تھے مگر نہ جانے کیسے ایک پلنگ بیچ میں اڑایا گیا اور میری کھاٹ کے لیے کافی جگہ بچ رہی سلیم خاں میرے لیے کھاٹ ڈھونڈھتے پھر رہے تھے ۔ بڑی تلاش کے بعد وہ لالہ جی کے ہاں سے ایک بالکل نئی کھاٹ لے آئے ۔

جب لحاف کھولا گیا تو میرا جی چاہا جلدی اُسے الٹا کر دوں ۔ فوزیہ نے سرخ اور زرد ریشم کا لحاف بندھوا دیا ۔ حالانکہ میں نے اس سے کتنا کہا تھا کہ پرانا لحاف دینا ۔ بچے لحاف دیکھتے ہی چاروں طرف سے گھیر کر کھڑے ہو گئے ۔ اور مجھے پھر اپنے عجوبہ جانور ہونے کا احساس شدت سے ستانے لگا ۔ پھر ایک عجیب دوری سی پیدا ہو گئی ۔ میں نے بڑی لجاجت سے معذرت کی ۔

بمبئی میں سردی نہیں ہوتی ۔ یہ سوئیٹر ، یہ کوٹ ، یہ گدا اور لحاف سب جمیلہ سے مانگ کر لائی ہوں ! جمیلہ بی بی ، اختری بی کی بہن ! تب تو کوئی بات نہیں انھیں تو سات خون معاف ہیں ۔

پھر سب بچے بڑی بے تکلفی سے لحاف میں گھس کر بیٹھ گئے اور اختری بی مرحومہ کے تذکرے ہونے لگے ۔ افسوس میں اختری بی نہیں تھی ۔ مرحومہ تو قطعی نہیں تھی ۔ نہ جانے گاؤں آکر مجھے کیوں یہ احساس ستا رہا تھا کہ مجھے کوئی نہیں چاہتا ۔ میں کتنی اکیلی ہوں ، کتنی دور ہوں ۔ میں نے اپنی بیٹیوں کے بارے میں سوچنا چاہا وہ بہت دور نظر آئیں ۔ دور بمبئی کی اَن جانی دنیا میں ۔ شاید رام داس آ گیا ہوگا ۔ یا جاوید اور رَہنی نے بلا لیا ہوگا ۔ اور باندرہ میں کسی ریسٹوران میں چینی کھانا کھا رہی ہوں گی ۔ آج میں ان کی کون ہوں ؟ مجھے بے اختیار بمبئی یاد آنے لگا ۔ جگ مگ کرتا بمبئی ۔ وہ جھلملاتا مہارانی کا ہار ۔ ہوٹل اوبرائے شیرٹن کی جگمگاتی لاونج جس میں گیارہ سو بلب روشن ہیں ۔ میں نے ایک دن گنے تھے ۔ وہ اوپری منزل کا سوئمنگ پول اور سامنے حدِ نظر تک پھیلا سمندر ۔ تاج محل کا شامیانہ کھنکتے ہوئے چمچے کانٹے . . . کانٹے . . . میرے آنچل میں الجھ گئے ۔

بکری میری ساری کا آنچل بڑی بے تکلفی سے چبا رہی تھی ۔ میں نے سوچا منع کروں گی تو برا مان جائے گی ۔ مگر شکیلہ نے میرا آنچل چھڑا کر بکری کے ایک دھپ مارا اور وہ کھاٹ کے نیچے گھس گئی ۔

کوٹھے میں تین پلنگ ، ایک پر کشوری اور چار بچے دوسرے پر منّی کی اماں اور پروین بانو ۔ تیسرے پر اکیلی میں اور میرے پلنگ کے نیچے دو بکریاں میں نے بکریوں کا کونا ہتھیا لیا تھا اور وہ ستیہ گرہ کیے بیٹھی تھیں اپنی جگہ بدلنے پر کسی صورت تیار نہیں ہوئیں ۔

اور ساری رات بچے باری باری روتے رہے کشوری انھیں تھپکتی رہی پروین بانو منّی کی اماں کے لاتیں مارتی رہی اور وہ بڑ بڑاتی رہیں اور دونوں بکریاں بار بار ایک دم کھڑی ہونے کی کوشش کرتیں اور ناکامی کی صورت میں صدائے احتجاج بلند کرتیں ۔ پلنگ ایک اتھلے بادیہ کی طرح تھا میرے پیر اور سر اونچائی پر اور بیچ کا دھڑ جھولے میں ۔ میں رات بھر اکڑوں لیٹی رہی ۔ اور ابھی رات کے صرف آٹھ بجے تھے ۔ گاؤں کے کتے تک بھونک بھونک کر سو چکے تھے ۔ عجیب تاریک دم گھوٹ سناٹا تھا ۔ پھر میں بمبئی پہنچ گئی ۔ وہ چھم چھم کرتی ٹرینیں ، گنگناتی سمندر کی موجیں ، سائیں سائیں گذرتے موٹر ۔ ٹاپ ٹاپ ، ٹاپ ۔ کوئی ٹورسٹ وکٹوریہ میں نریمان پوائنٹ کی سیر کو

جارہا ہے۔ ایک دم میں بمبئی سے پھر چنڈوس پہونچ گئی ایک بکری مستقل اپنا کان کھجائے جارہی تھی۔ بار بار اس کا کھر نیچے رکھے ہوئے ٹین کے بکس سے ٹکراتا اور ایسا معلوم ہوتا ڈھول تاشے بج رہے ہیں۔ بچے چونک کر چیں میں کرنے لگتے۔

شکر ہے بکریاں جوان نہیں تھیں ورنہ سینگ کبھی کے میری پیٹھ کے آرپار ہوگئے ہوتے۔ کیا سناٹا تھا۔ پتہ بھی گرتا تو معلوم ہوتا پہاڑ سرک گیا کل آٹھ جیوتھے اس کوٹھے میں۔ آٹھ مختلف سُروں کی سانسیں صاف گنی جاسکتی تھیں ہر سانس کا سُر الگ تھا۔ اگر گھنٹوں خاموشی لیٹ کر سنا جائے تو سانسوں میں بھی تال سُر ہوتے ہیں۔

ایک دم جھپ سے صبح ہوگئی۔

منی کی اماں دوپٹہ تان کر کھڑی ہوگئیں اور میں نے وہیں پلنگ پر کپڑے بدلے۔ نل پر جاکر منہ دھویا۔ لوٹا اٹھایا اور کچی دیوار کے گھروندے میں داخل ہوئی۔

جیسے کسی نے سر پر لٹھ ماردیا۔ میں چکرا کر پلٹی۔ اتنی مختصر سی جگہ میں اتنی غلاظت میں نے کبھی پچھلے جنم میں دیکھی ہوگی۔ بمبئی میں تو فلش ہیں! اُف میں نے گاؤں کے اس بھیانک رخ کے بارے میں تو سوچا ہی نہیں۔ کیسی چوک ہوگئی۔ یہ مجھے بیٹھے بٹھائے سوجھی کیا؟ میں کیا سوچ کر گاؤں دیکھنے دوڑ پڑی کوئی بھلا آدمی ایسی حماقت کرسکتا ہے۔ لوگ دل ہی دل میں میرے اوپر ہنس رہے ہوں گے۔ منی کی اماں نے میری اڑی ہوئی رنگت دیکھی اور تاڑ گئیں۔

"کشوری کی دیورانی اپنے میکے گئی ہوئی ہے اس کا میاں علی گڑھ میں تالوں کا کام کرتا ہے۔ چابی بشیر کی دلھن کے پاس ہے"

تو صاحب میں کشوری کی دیورانی کے ہاں گئی۔

واپسی میں ہر گلی میں عورتیں سر پر غلاظت کے ٹوکرے اٹھائے ٹکراتے ٹکراتے بچیں۔ ٹوکروں میں سوراخ بھی تھے جن میں سے کیچڑ ٹپک کر ان کے گھونگٹ پر بہہ رہی تھی۔ مکھیوں کے بادل ٹوکریوں پر منڈلا رہے تھے۔ دو چار مکھیاں حملہ آور ہوئیں اور میرے چھکے چھوٹ گئے۔

ناشتہ پر گڑ کی چائے اور رات کی بچی مکا کی روٹی بڑے جوش و خروش سے کھائی جارہی تھی۔ میں نے ٹوکری میں سے علی گڑھ کے بسکٹوں کے بنڈل نکال کر دیے۔ یہ ڈوگ بسکٹ کہلاتے ہیں۔ جب انگریز لوگ ہندوستان میں تھے تو اپنے کتوں کو کھلایا کرتے تھے۔ جب چھ پیسے اور دو آنے کا بنڈل ملتا تھا۔ اب دو روپے کا ملتا ہے۔

میرے پہنچنے سے ایک دن پہلے لالہ دنی چند کا دیہانت ہوا تھا۔ لالہ جی کا ہارٹ فیل ہوگیا تھا۔ میں جس گھر میں جاتی ہوں "ہارٹ پھیل" کے تذکرے ہورہے ہیں۔ گاؤں کے اکلوتے اونچے مکان کی تیسری منزل سے انھیں کیسے اتارا گیا لالہ جی بہت موٹے تھے۔ عورتیں ان کے اونچے پیٹ پر سر پٹخ پٹخ کر بین کررہی تھیں۔ گاؤں میں ایسا کوئی فرد نہیں جس کی لالہ جی نے مدد نہ کی ہو۔ دو کوٹھریاں گروی کے برتنوں سے بھری پڑی ہیں۔ پچھلے سال اسی طرح ان کی بیٹی لکشمی "ہاٹ پھیل" سے ختم ہوچکی تھی۔ صرف ایک بیٹا ہریش چندر کریا کرم کرنے کو رہ گیا تھا۔ لالہ جی کی گاؤں میں دو دکانوں کی قطار ہے۔ کئی گاؤں میں زمین ہے۔ سب اونچے اونچے گنوں کے کھیت انہی کے ہیں۔ جب سیلنگ لگی تو بہت سی زمین بٹ گئی۔ کسی کو دو بیگھہ ملی کسی کو چار بیگھہ، مگر کس میں اتنا دم تھا جو کاشت کرتا۔ ہل بیل اور بیج کا سوال، رکھوالی کا دردسر، اس وقت لالہ جی ہی کام آئے۔ انھوں نے ساری زمین سو روپیہ سال پر چھوٹے کسانوں سے لے لیں۔ ان کے پاس بیلوں اور بیج کی کمی نہیں۔ کسان انھیں زمینوں کو لالہ جی کی نگرانی میں کاشت کرنے لگے۔ سو روپیہ سال کے علاوہ روز پانچ سیر مکئی یا جوار ملتی ہے جو دو وقت پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ ساگ تو مفت ہی مل جاتا ہے۔ گنے پلتے ہیں تو گرم گڑ اور رس ملتا ہے غرض عیش ہی عیش ہیں۔ کبھی افسر پوچھ گچھ کے لیے آتے ہیں۔ لالہ جی ان کی بڑی خاطر کیا کرتے تھے۔ ہریش چندر تو دھیان ہی نہیں دیتا۔ زیادہ تر شہر جاتا رہتا ہے اس کی بہو پڑھی لکھی ہے اور دو شالہ اوڑھتی ہے۔

کسی کو لالہ جی سے شکایت نہ تھی کبھی بھول کر بھی کڑوی بات نہ بولے۔ لوگ کہتے ہیں سود خود تھے، تو بھئی کون بنا سود کے روپیہ دے دے گا لالہ تو کبھی تقاضا نہیں کرتے تھے۔ زمین ڈوب جاتی تھی تو اس میں لالہ جی کا کیا قصور تھا۔ یہ تو سب قسمت کی بات ہے۔

سارا گاؤں ارتھی کے ساتھ گیا۔ کیا ہندو کیا مسلمان اور کیا گنتی کے عیسائی۔ چند چھوٹے دل والوں کا خیال تھا لوگ عقیدت کے مارے کم اور لکڑیوں کی گرمی کے لیے زیادہ جمع ہوئے تھے۔ باوجود ڈانٹ پھٹکار کے چھوکرے نہیں ہٹے، اور جب تک لالہ جی پورے بھسم نہ ہوگئے وہیں ڈٹے رہے۔ اتنی موٹی موٹی لکڑیاں کہ چولہے میں ایک لگا دو تو سارا دن جلے۔

اور پکا ایک کلو اصلی گھی، مہکتا ہوا گھر کا تھا یا خالص گھی۔ بیبیاں ہاتھ پھیلا پھیلا کر گھی کی مقدار بتا رہی تھیں۔ ہر نئی تفصیل میں ہاتھوں کا فاصلہ بڑھتا جارہا تھا۔

میں گاؤں کی سب سے چوڑی سڑک پر نکل جاتی ہوں جہاں سے علی گڑھ سے آنے والی بسیں گزر کر آگے دوسرے گاؤں کو جاتی ہیں۔ میرے ساتھ بچے اور مکھیاں چل رہی ہیں۔ سڑک کے کنارے کنکروں کے ڈھیر پڑے ہیں۔ بیچ میں کیچڑ کا ایک لمبا سا تالاب بن گیا ہے یہ کیچڑ گھروں کے پاخانوں سے بہہ کر جمع ہوتی ہیں

"نمسکار"

میں چونک کر دیکھتی ہوں ایک نوجوان شہری لباس میں ایک پرچون کی دکان سے اترتا ہے۔

"نمسکار" میں ٹھٹک کر کہتی ہوں۔ استری کی ہوئی سفید بھک قمیص اور نیلا ٹیریلین کا پتلون پہنے وہ عجیب سا لگ رہا تھا۔ "میرا نام جے پرکاش ہے" وہ بڑی بے تکلفی سے کہتا ہے۔ یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اس نے دکان پر بیٹھے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ گاؤں میں دو اجنبی سے لڑکے کہاں سے آن ٹپکے۔

کشن سشرمیلا ہے اور جے پرکاش بے حد باتونی ہے۔ وہ ایک سانس میں مجھے گاؤں کی کہانی سنا دینا چاہتا ہے۔ میرا سوال پورا نہیں سنتا جواب دینے لگتا ہے۔ پرکاش علی گڑھ میں پڑھتا ہے ہر مہینہ وہ چار دن کے لیے گاؤں ضرور آتا ہے۔ جب ملک کا بٹوارہ ہوا تو کئی بار چنڈوس پر حملہ ہوا۔ مگر گاؤں والوں نے ڈٹ کر غنڈوں کا مقابلہ کیا اور مار بھگایا۔ غنڈے آس پاس کے گاؤں کے اٹھائی گیرے اور بدمعاش تھے۔ گاؤں کی ساری رات چوکیداری ہوتی تھی جب چور اچکے بستیوں پر حملہ کرتے ہیں تو ہندو مسلمان نہیں دیکھتے اندھا دھند سب کے ڈھور ڈنگر ہنکالے جاتے ہیں۔

"چنڈوس میں رفیوجی نہیں بسے؟"

"بسے کیوں نہیں لیکن وہ دکھی ہو کر آئے لوٹ مار کرنے نہیں آئے۔ ہم نے ان کا سواگت کیا، انھیں بسایا، جو زمین انھیں سرکار سے ملی اس کی کاشت میں مدد دی۔ آج وہ ہمارے اپنے ہیں" جے پرکاش بہت اچھی اردو بولتا ہے۔

"ایک بات کہوں آپ برا تو نہیں مانیں گی؟"

"جے پرکاش میں گاؤں والوں سے ملنے آئی ہوں، سمجھنے آئی ہوں وہ جو مجھ سے اتنی دور ہیں ان کے پاس ہونے آئی ہوں۔ اچھا برا ماننے نہیں آئی"

"مسلمانوں کو اپنے کھیتوں سے لگاؤ نہیں"

"بشیر خاں کو بھی اپنے کھیتوں سے لگاؤ نہیں"

"بشیر چاچا کے پرکھے راجپوت تھے" جے پرکاش ہنسا

"تو ان کے بیٹے . . . ."

"ان کا خون پتلا ہو گیا ہے۔ ایک ایک کر کے شہر جا رہے ہیں۔ جب بڈھا مر جائے گا تو زمین بیچ کر شہر چلے جائیں گے"

"شہر کیوں جا رہے ہیں؟"

"یہاں ان کا جی نہیں لگتا۔ شہر میں بڑے ہنگامے ہیں۔ وہاں جا کر رکشا کھینچتے ہیں چپراسی گیری کرتے ہیں۔ یونیورسٹی میں بڑی کھپت ہے"

"تمھیں ہنگامے پسند نہیں"

"ہیں"

"پھر تم بھی شہر جا بسو گے"

"نہیں، ہماری یہاں بہت زمین ہے۔ جب بشیر چاچا کے بیٹے زمین بیچیں گے تو میں خرید لوں گا"

"اور سیلنگ جو لگی ہے"

"ہم پانچ بھائی ہیں تین چاچا ہیں۔ دو جیجا ہیں۔ زمین بٹی ہوئی ہے مگر کھیتی مل جل کر کرتے ہیں"

"زمین خریدنے کے لیے پہلے تمھیں روپیہ کمانا پڑے گا"

"نہیں، میرا سسر خریدے گا"

"کون ہے تمھارا سسر اسی گاؤں میں رہتا ہے"

"ابھی تو کوئی نہیں، مگر کئی جگہ بات چل رہی ہے"

"مگر جہیز لینا تو جرم ہے"

"اپنی بہو کی زمین سے میرا کیا ناطہ، زمین اس کے نام ہوگی"

"تم نئے زمانے کے نوجوان جہیز کی رسم کو زندہ رکھو گے"

"اس میں میرا کیا قصور میری بہنوں کو جہیز دیا گیا۔ تو میں کیوں نہ لوں؟"

"اس کا مطلب ہے جہیز کی رسم ہندوستان سے کبھی ختم نہ ہوگی"

"جہیز کی رسم غریبوں کے لیے ضرور ختم ہو جانی چاہیے مگر میرا سسر تو موٹا آسامی ہوگا۔ وہ اپنی بیٹی کو دے گا تو میں کیوں منع کروں گا۔ میری بہنوں کو جہیز دیا گیا میں نے تو برا نہیں مانا"

لیکن یہ تو سوچو غریب باپ اپنی آتما گروی رکھ کر تمھیں جہیز دے گا۔ تمھیں دکھ نہیں ہوگا؟"

"نہیں ہمارے پتا جی بڑے ہوشیار آدمی ہیں۔ وہ ویسا سسر ڈھونڈھ لائیں گے جس کے پاس بہت پیسہ ہوگا اور مجھے کیوں دکھ ہوگا۔ اس نے وہ روپیہ ادھر ادھر ہی سے مارا ہوگا"

"تم جان بوجھ کر ایسے نیچ آدمی کی بیٹی بیاہ لاؤ گے اسے اپنے بچوں کی ماں بناؤ گے۔ اپنا جیون ساتھی بناؤ گے!"

تھوڑی دیر کے لیے جے پرکاش کے چہرے پر کھسیانا پن کی جھلکی آئی دوسرے لمحے وہ سنبھل گیا اور ہنسنے لگا۔

"اور اگر تمھیں کسی غریب باپ کی لڑکی سے پیار ہو جائے تو کیا کرو گے؟"

"تب تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی" وہ اور ہنسا۔

"میں دعا مانگوں گی کہ تمھارے جیون میں گڑبڑ سے واسطہ پڑ جائے"

باتوں میں پتہ بھی نہ چلا کہ بہت سے لوگ دکان کے پاس جمع ہو گئے ہیں

"نمسکار ڈھون سنگھ جی۔ تیل چاہیے"

"نمسکار"

"کی حال چال ہے جی" جے پرکاش نے بوتل میں تیل بھرتے ہوئے پوچھا وہ ایک دم بنیا بن بیٹھا۔

"سردار جی کچھ بڑبڑائے پیسے دے کر سر جھکائے چل دیے۔

"بہت کہتے ہیں سردار جی نس بندی کرا لو بال بچہ تو ہوتا نہیں پھوکٹ کے روپے مل جائیں گے"

"سردار جی کے اولاد نہیں؟"

"نہیں، سردار جی نے اپنے بھائی کا بیٹا پال لیا ہے مگر وہ ایک دم جانگلی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کچھ گڑبڑ ہے"

"کیسی گڑبڑ"

"پار سال چھورا شہر گیا تو سر منڈا کے آگیا۔ کہا کہ یار دوستوں نے پکڑ کے مونڈ دیا۔ سردار نے بہت مار لگائی۔ پھر بال بڑھ گئے تو نوچندی کا میلہ دیکھنے گیا تو پھر انگریزی بال کٹوا کے آگیا۔ سردار جی نے سر پیٹ لیا"

"پھر بال بڑھ جائیں گے"

"نہیں اب بال نہیں بڑھیں گے"
"کیوں؟"
"چھ مہینے سے اتنے کے اتنے ہیں" وہ شرارت سے مسکرایا۔
"وہ کیسے؟"
"ہم کہتے ہیں سردارنی جھوٹ بولتی ہیں ان کے بھائی کا لڑکا نہیں کسی۔ ۔ ۔ کا لڑکا پکڑ لائے ہیں اور کہتے ہیں۔ بھائی کا لڑکا ہے"
"تم بھی تو لمبے بال نہیں رکھتے"
"میری اور بات ہے۔ میں تو اسی گاؤں میں پیدا ہوا ہوں"
"اور سردار جی پنجاب سے آئے ہیں"
"ہاں"
"کیا ان کا گود لیا ہوا بچہ بہت بُرا ہے"
"پڑھنے لکھنے میں تو بڑا چنٹ ہے۔ پر سکھ نہیں"
"مگر بہت سے سکھوں کو جانتی ہوں جو مونے ہیں"
"مونے سکھ نہیں ہوتے"
"کیا فرق پڑتا ہے"
"بہت فرق پڑتا ہے" وہ بحث پر تُلا ہوا تھا۔
"خیر تمھارے گاؤں میں تو سب مل جُل کر رہتے ہیں"
"نہیں"
"مگر"
"مسلمان ایک طرف رہتے ہیں سب کے گھر جُڑے ہوئے ہیں۔ دیوار سے دیوار ملی ہے۔ ہندو اس طرف رہتے ہیں"
"مگر چمپا دیوی کی دیوار تو بشیر خاں کی دیوار سے ملی ہوئی ہے بلکہ ایک ہی دیوار ہے"
"چمپا تو دھوبن ہے" اس نے حقارت سے کہا۔ سب کا میلا دھوتی ہے۔ اس کی کیا جات؟"
"اور تمھاری دکانوں کے بیچ میں اختر میاں کا کلنک جو ہے"
"وہ دکان تو انھوں نے پہلے سے خرید لی تھی"
"ان پر ذات پات کے بندھن نہیں لاگو ہوتے"
جے پرکاش ہنسنے لگا۔
"جے پرکاش جی دنیا میں دو ذاتیں ہیں، غریب اور امیر"
"جیسے بھگوان نے جو چاہا دے دیا"
بھگوان کے سر کب تک الزام تھوپتے رہو گے۔ نہیں جے پرکاش کچھ شیطانوں نے زمین کا بٹوارہ کیا۔ کچھ لوگوں کے سر پر تاج رکھ دیا اور کچھ کے سر پر میلے کی ٹوکری"
"اور مہتر لوگ کدھر رہتے ہیں؟"
"گاؤں سے باہر"۔
"کس طرف"؟
ادھر سیدھی چلی جائیے۔ کھیت پار کر کے جوہڑ آتا ہے۔ اس سے ذرا آگے چل کر سب مہتروں کی جھونپڑیاں ہیں۔ چائے منگواؤں"؟
"واپسی میں پیوں گی"
میں چل رہی تھی میرے پیچھے گاؤں کے آوارہ چھوکرے اور کتے چل رہے تھے۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو گھبرا کر بھاگ گئے۔ کچھ ڈھیٹ ساتھ چلتے رہے مگر مجھے بھنگیوں کی جھونپڑیوں کی طرف جاتے دیکھ کر ٹھٹک گئے اور دور سے تماشہ دیکھنے لگے۔
بھنگیوں کی جھونپڑیاں مجھے نسبتاً چھوٹی مگر صاف لگیں۔ کئی پکے کوٹھے تھے۔ گاؤں کے مقابلے میں زیادہ پکے کوٹھے تھے۔ گھر میں پاخانے نہیں اس لیے اتنی بدبو اور غلاظت بھی نہیں۔
کچھ عورتیں اناج صاف کر رہی تھیں۔ کچھ اُپلے تھاپ رہی تھیں بھینسیں گائیں اور بکریاں جوہڑ کے کنارے گھاس چر رہی تھیں۔ مجھے کوئی مرد نظر نہ آیا مجھے دیکھ کر عورتیں سہم سی گئیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کیسے شروع کروں کوئی مرد نظر نہیں آرہا تھا۔ مردوں سے بات کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا۔
"تم لوگ گاؤں سے اتنی دور کیوں رہتی ہو" میں نے پوچھا
"عورتیں شرما کر ہنسنے لگیں اور ایک دوسری کی پیٹھ میں گھس گئیں۔
"تمھارے مرد کہاں ہیں"
وہ ناک میلی ساڑھیوں میں دبا کر ہنسنے لگیں جیسے میں نے کوئی نہایت مزے دار بات کہہ دی ہو۔
اتنے میں ایک سوکھا مارا بوڑھا ایک کوٹھری سے نکلا اور اکڑوں بیٹھ کر کھانسنے لگا۔ وہ بڑے انہماک سے سرتال میں کھانس رہا تھا۔ جیسے کوئی نہایت اہم فرض انجام دے رہا ہو گلے سے کھانسی کے لچھے اڈتے رہے۔ وہ کھانستا رہا میں سنتی رہی۔ ایسا لگا صدیوں سے وہ کھانس رہا ہے اور میں سُن رہی ہوں۔ بال بگلے کے پروں کی طرح سفید تھے اور کانوں تک بڑھ آئے تھے پچکے ہوئے گال دھنسی ہوئی کنپٹیاں اور بے دانتوں کا پوپلا منہ۔ اس نے جیسے میلوں دور سے مجھے دیکھا اور سہم کر چوکنا ہو گیا۔ میرے قبیلے کے انسانوں کو دیکھ کر وہ ساری عمر یونہی سہم کر سٹپٹاتا رہا ہوگا۔ اس کے سیاہ سوکھے ہوئے چہرے پر بھکاریوں جیسے آنسو بھری لجاجت چھا گئی "سلام میم صاحب!" اس نے جیسے میلے کی ٹوکری میرے سر پر اوندھا دی۔
جب گوری میم صاحب ہندوستان سے اپنا ٹھاٹ بھان سمیٹ کر چلدی تو کالی میم صاحب نے مورچہ سنبھال لیا۔ اور سیتا رام گورے کالے میل کو اسی فرمانبرداری سے دھوتا رہا جو اسے ورثہ میں ملی تھی۔ سیتا رام! دو مقدس ناموں کے میل سے اس کا نام بنا، مگر کوئی برکت نہ ملی۔ وہ بھنگی پیدا ہوا اور بھنگی ہی موت کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس نے ساری عمر غلاظت ڈھوئی اور آج خود غلاظت کا ڈھیر بنا پڑا تھا جے سیتا رام!

"کاں تے آئی ہو بی بی؟" شکر ہے اس نے پھر مجھے میم صاحب نہ کہا۔
"بمبئی سے"
"جمین کھریدنے آئی ہو" اسے شاید معلوم تھا کہ بمبئی میں کالے دھن والے دور دور کے گاؤں میں زمینیں خرید کر چھپا دیتے ہیں۔
"نہیں"
"بمبئی میں کا دھندا ہے"
"کاغذ قلم کا دھندا چلتا ہے۔ بیٹھ جاؤ سیتا رام جی" میں ایک کھٹیا کھینچ کر بیٹھ گئی۔ سیتا رام کچھ دیر چکر میں کھویا رہا، پھر کچھ اطمینان سا ہو گیا تو چیڑ کے ایک خالی صندوق پر بیٹھ گیا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔
"اچھا جی گام میں کا کرنے کو آئی ہو" وہ وکیلوں جیسی جرح کر رہا تھا۔
"یاں کے ہری جنوں کا حال چال دیکھنے کو آئی ہوں"
"پھن دیکھ کے کا کروگی بی بی؟"
"لکھوں گی"
"پھن؟"
"پھر اخباروں میں چھپے گا"
"پھن"
"پھن؟" میں نے خود سے پوچھا۔ کون اس سڑے بسے بدبودار گاؤں کے لوگوں کی کہانیاں پڑھے گا۔ لوگ جا کے فلم نہ دیکھیں گے جن میں موٹی موٹی گول گپا ہیروئنیں زرق برق لباس پہن کر بھاری بھرکم ہیرو کے ساتھ کدکڑے لگاتی ہیں۔ مجھے تو گاؤں میں کوئی موٹا تازہ نظر نہیں آیا۔ سب ہی کے گال پچکے پیٹ دھنسے، ناک بہتے، ننگے، بھنکتے بچے۔ چیپڑ بھری آنکھوں والے گائے بیل۔ اور انسانیت کے سر پر میلے کا ٹوکرا!

سیتا رام پر پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور وہ ایک نئے سر تال میں کھانسنے لگا۔ وہ دم کھینچ کھینچ کر کھانس رہا تھا جیسے ولایت خاں کومل سر میں میڈ لگا رہے ہوں۔

بازو کی ایک کوٹھری کا دروازہ کھلا اور ایک سجیلا نوجوان خاکی پتلون اور ملٹری کی قمیص پہنے نکلا۔ اس کے پیچھے پھول دار نائیلان کی ساڑھی پہنے اس کی بیوی تھی۔ بیوی کی گود میں ایک بچہ تھا۔ جو نیلی بنیائن لال ٹوپا اور زرد پلاسٹک کے جوتے پہنے تھا۔ یہ پہلے جوتے تھے جو میں نے چند دوس میں کسی بچے کے پیروں میں دیکھے۔ زیادہ تر بچے ننگے پیر تھے یا ربر کی چپلیں پہنے تھے۔
اس جلوس کو دیکھ کر میں بھونچکی رہ گئی۔ وہ ایک پکے کوٹھے سے نکلا تھا۔ اور میری سیدھ میں آ رہا تھا نوجوان نے فوجی قسم کا سلام جھاڑا اور بہو جھک کر میرے پیر دبانے لگی۔ کیونکہ میں اس کے سسر سیتا رام کے پاس چارپائی پر بیٹھی تھی۔ میں اچھوت نہیں تھی۔
چھ سال سے کلکتہ میں کام کرتا ہوں۔ وہاں پھلشں ہے سب کوٹھیوں میں

میرے پاس بارہ کوٹھیاں ہیں" اس نے بڑے غرور سے کہا۔ جیسے وہ ان کوٹھیوں کا مالک ہو۔ چھٹی پر آیا ہوں"
"وہاں تم مہینے میں کتنا کما لیتے ہو؟"
"چار سو کبھی پانچ سو کبھی اس سے بھی زیادہ"
"بستی کے اور مرد کہاں ہیں۔ کیا تمھارے کھیت ہیں"؟
"سب بمبئی کلکتہ دہلی علی گڑھ ہیں"؟
"ہاں یا وہ بوڑھے رہتے ہیں جو شہر سے بیکار ہو کے آ گئے ہیں۔ اور بچے"
"عجیب بستی ہے۔ تم اپنی بیویوں کو کیوں نہیں لے جاتے"
"ایک تو شہروں میں رہنے کو جگہ نہیں ملتی پھر یہاں گھروں کی رکھوالی کون کرے گا۔ لوگ قبضہ کر لیں گے"
"کون لوگ؟"
"دوسرے ہریجن"
"اوہ، اچھا تم خاصا کما لیتے ہو۔ پھر تمھاری عورتیں میلا کیوں اٹھاتی ہیں"
"پھر گاؤں کا میلا کون اٹھائے؟"
"کوئی اٹھائے تمھاری بلا سے"
"نہیں، ہم میلا نہ اٹھائیں تو گاؤں والے ہمیں مار کر بھگا دیں اور یہاں دوسرے بھنگیوں کو بسا لیں۔ ہم اپنے گھر کیسے چھوڑ دیں۔ ایک دن مرنے کے لیے تو ہم یہیں واپس آتے ہیں"
"تو تمھیں زبردستی کام کرنا پڑتا ہے"؟
"زبردستی کا ہے کی یہ کام تو ہمارا پیڑھیوں سے چلتا آ رہا ہے ہم اس سے کیسے نا کر سکتے ہیں"؟
"تو تم لوگ ہمیشہ میلا اٹھاتے رہو گے" لفظ ہمیشہ سے میرا دل ڈوبنے لگا
"جو قسمت میں لکھا ہے وہ تو بھوگنا ہی پڑتا ہے۔ اگلے جنم میں کرموں کی سزا پوری ہو گئی تو کوئی اور کام کریں گے"
"یہاں ان عورتوں کو کیا ملتا ہے"
"گھر پیچھے باجرے یا مکئی کی ایک باسی روٹی"
"ہم نا کھائیں بئے روٹی، گیتن کا کھلایت ہیں" اس کی بہو بولی۔
میں نے للا کے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھ دیا۔ للا نے میرے گھٹنے پر ناک لسیڑ دی۔
"اس کی ناک پونچھو" میں نے بہو کو ڈانٹا۔
بہو نے جھٹ نائیلان کی ساڑھی سے للا کی ناک پونچھ دی۔
تم لوگ میلے کے ٹوکرے سر پر کیوں اٹھاتی ہو" میں نے پوچھا۔
"کا کریں بی بی بھاری ہوت ہیں۔ کمر پہ نا اٹھتے"
"بہوت میلا ہوئے ہے گاؤن ماں۔ مکا بجھڑ کھات ہیں بہوت ٹٹی پھریں ہیں گاؤں بارے" دوسری محترمہ نے لقمہ دیا۔ جو کھڑے کھڑے بچے کو دودھ پلا رہی تھیں۔

"تم لوگ لکڑی کی چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بنوالو ان میں ٹوکری رکھا کرو۔"

بیبیاں گاڑی والی تجویز پر بہت ہنسیں۔

"نا بی بی گاڑی میں میلا کیسے اٹھے گو۔"

سیتا رام نے پوچھا کیا قصہ ہے اور جب انھیں معلوم ہوا میں میلا گاڑیوں میں اٹھوا رہی ہوں تو وہ میری حماقت پر بڑی زور سے ہنسے ان کی ہنسی کھانسی میں ڈوب گئی اور ڈھسکوں کے بھاری ڈول کھینچنے لگے۔

میں جب گاؤں واپس پہنچی تو سارے میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل چکی تھی کہ میں مہتروں کی کھاٹ پر بیٹھ آئی ہوں۔ کشوری اپنے چھوٹے بچے کو نل کے پاس کھڑا کیے دھلا رہی تھی۔ ایک ہاتھ سے پمپ چلا رہی تھی دوسرے ہاتھ سے غلاظت بھیڑ رہی تھی۔ پانی بوند بوند ٹپک رہا تھا۔ پروین نے آکر نل چلایا تب کہیں جاکر وہ بچے کو دھلا پائی۔ اس نے بچے کو وہیں چھوڑ کر گندی زمین پر ہاتھ رگڑ کر پاک کیے۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اب یہ انھیں ہاتھوں سے باجرے کا آٹا مسلے گی۔

میں ناپاک ہو گئی تھی بھنگی کی کھاٹ پر بیٹھ کر آئی تھی۔ مجھے پاک کرنے کے مشورے ہونے لگے۔

"مگر تم بھی تو ابھی بچے کو ہاتھوں سے مل مل کر دھلا رہی تھیں"۔ میں نے کشوری سے کہا۔

"اپنا بچہ ہے، کاؤ اور کا میلا نا ہے" کشوری نے صفائی پیش کی۔

منی کی اماں نے فوراً ایک ایلمونیم کے پیالے میں پانی بھرا۔

"کوئی سونے کا داگینا لاؤ"۔ سونے کا کوئی داگینا نہ ملا۔

"میرے قلم میں سونا لگا ہے"۔ میں نے قلم پیش کیا۔

منی کی اماں نے قلم کا سرا پانی میں ڈبویا کچھ بڑبڑ پڑھا اور میرے اوپر پانی کے چھینٹے ڈالے میں پاک ہو گئی۔

رات کو میرے کہنے پر محلے کی عورتیں جمع ہوئیں۔ کشوری نے ایک کونڈے میں اپلے سلگا دیے۔ اور ڈھول کی کڑیاں کسی گئیں۔ اپلوں کی آگ سے جما ہوا گودا ہڈیوں میں پگھلنے لگا۔ بیویاں سج بن کر نائیلان کے جوڑے پہن کر آئی تھیں۔ آسمان پر بے شمار تارے کھلے ہوئے تھے۔ یہی مِتی تارے کہاں — بیچ میں رکھی آگ سے چہرے دہک اٹھے مگر پیٹھ میں ٹھنڈ کی سلاخیں اترتی رہیں۔

ڈھول بول اٹھا۔ چمپا دیوی کی تھاپ پر تالیاں بجنے لگیں۔ بڑی کھسر پھسر کے بعد شانتی اور اُرملا نے کوئی فلمی گیت شروع کیا۔

بالموا لوٹ کے آ لوٹ کے آ۔

میں نے فوراً صدائے احتجاج بلند کی۔ میں نے فلمی گانے نہیں سنوں گی۔ کوئی گاؤں کے گیت سناؤ۔ میری بدمذاقی پر سب سناٹے میں رہ گئیں۔ اب تو ساری دنیا پر فلمی گیت چھائے ہوئے ہیں۔ گاؤں کے گیت سب بھول گئے وہ بڑی بوڑھیاں مر کھپ گئیں۔ جوان گیتوں کو گایا کرتی تھیں۔ اب تو ریڈیو چل گئے ہیں۔ اور ہر وقت فلمی گیت ہی کانوں میں پڑتے ہیں۔ میں نے کہا چلو فلمی گیت ہی سہی سب ٹکے ادھ کچرے گیت چلے اور پھر ٹھپ ہو گئے۔ میں نے پھر گاؤں کے گیتوں پر زور دیا۔

سیاں تورا ہیجڑا تو بانسری بجائے ئے۔ بشیر کی دلھن نے بھونڈی آواز نکالی اور محفل قہقہوں سے گونج اٹھی۔ بڑی رد و کد کے بعد منی کی اماں کی لرزتی کانپتی آواز اٹھی اور سب ساتھ لگ گئیں۔ میرے آنگن بیچ لمبا پیڑ کھجور کا۔

میں چڑھ دیکھوں کون مسافر آیا ری

میرا بیرن بھیا آیا ری

میری ماں کا جایا آیا ہی۔ میں چڑھ دیکھوں . . . .

باپ کو گھوڑا ماں کو جوڑا بہن کی چندری لایا ری

چھوٹی بہن کی گڑیا بھول آیا سو سو نام دھرایا ری

میرے آنگن بیچ

عجیب اداسی چھا گئی۔ آپ ہی آپ جی بھر آئے۔ بیٹی کو کتنا ہی جہیز دے دو مانگ ختم نہیں ہوتی۔

ایک دم موڈ بدل گیا۔ بھولی بسری باتیں یاد آنے لگیں۔ چمپا دیوی نے ڈھول پھر سے جگایا۔

اماں میرے باوا کو بھیجو کہ ساون آیا

بیٹی تیرا باوا تو بوڑھا ری

اماں میرے بھیا کو بھیجو جی

بیٹی تیرا بھیا تو بالا ری

اماں میرے ماموں کو بھیجو ری کہ ساون آیا

بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری

کوئی نہیں آسکتا اے پیر و مرشد امیر خسرو تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ کوئی نہیں آسکے گا۔ دکھ آئیں گے۔ مگر پیہر سے کوئی اپنا نہیں آسکتا۔ اور صدیوں سے دم گھوٹے نامراد بیٹی میکے کی اور پُر امید آنکھوں سے تک رہی ہے۔

کشوری کے آنگن میں بھیڑ جمع ہے۔ میں اور منی کی اماں چنڈوس سے واپس جا رہے ہیں۔ بشیر کی دلھن نے باجرے کی ٹکیاں اور مونگ پھلیوں کی پوٹلی پکڑا دی ہے۔ رادھا دیوی نے مکا کے دانے ہانڈی میں ریت کے ساتھ بھونے ہیں سلیم خاں نے دو گنے کاٹ کر ساتھ کر دیے۔

اُرملا شرما رہی ہے اس کے ہاتھ میں دو بھوبل میں بھُنی ہوئی شکر قندیاں ہیں جلدی سے میرے کوٹ کی جیب میں گھسیڑ کر بھاگ جاتی ہے۔

میں اتنا کچھ سمیٹ کے لے جا رہی ہوں۔ بدلے میں ان کو کیا دوں! میرا قلم سونے کا نہیں، پیتل کا ہے۔

اماں میرے بھیا کو بھیجو جی —— بیٹی تیرا بھیا تو بالا ری —— یہ بھیا کب جوان ہوگا۔ ساون آتا ہے، چلا جاتا ہے —— کوئی نہیں آتا!

رشید قریشی
۱۶-۹-۳۳۶ ملک پیٹھ قدیم
حیدرآباد

ایک خیال دو شاعر

اردو شاعری کو فارسی شاعری نے سنوارا نکھارا ہے، اسی طرح جیسے کوئی ماہر حسینہ کسی نئی نویلی دلہن کا سنگھار کرتی ہے. یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں کلاسیکی رچاؤ بھی ہے اور جدید دور کی حقیقت پسندی بھی۔

میں نے فارسی اور اردو کے نامور شاعروں کے چند "ہم خیال" اشعار کا انتخاب کیا ہے. میرا مقصد موازنہ نہیں محض یہ دکھانا ہے کہ ایک ہی مضمون کو دو شاعروں نے کس زاویۂ نگاہ سے دیکھا. کس دل سے محسوس کیا اور کس انداز سے بیان کیا۔

یہ دنیا اتنی عمر رسیدہ ہوگئی ہے، انسان اپنی جستجوؤں میں اس قدر کامیاب ہے کہ کوئی راز، راز نہیں رہا. کوئی دھندلکن معمہ نہیں رہی. کوئی مضمون اچھوتا نہیں رہا۔ دو شاعر ایک ہی موضوع پر خیال آرائی کرتے ہیں. کبھی کبھی دونوں کی ذہنی پرواز ایک ہی بلندی کو نشانہ بناتی ہے اور ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے کہ دونوں کا اندازِ بیان بھی لڑ جاتا ہے، لیکن اس توارد سے ان کی عظمت پر حرف نہیں آتا کیونکہ ہزار ہم رنگ سہی دیدہ ور دیکھ ہی لیتے ہیں۔ کہاں شاعر کا دل خون ہوا ہے کہاں اس کے عکس نے رنگ کو گہرا کر دیا ہے۔

حضرت سعدی عشق زدہ بیٹھے ہیں، دوست احباب اطراف جمع ہیں، کوئی سمجھاتا ہے، کوئی سنبھالتا ہے لیکن حضرت سعدی کسی طرح نہیں بہلتے۔ ان کے ہمدرد انہی کو قصور وار ٹھہراتے ہیں کہ بیٹھے بٹھائے اپنا دل کسی کو کیوں دے آئے۔ حضرت سعدی سے رہا نہیں جاتا۔ کہتے ہیں۔

دوستو! دل کو جانا تھا وہ تو گیا — مجھے موردِ الزام ٹھہرانے سے کیا حاصل. ایسا ہی تم کو محاسبہ کرنا ہے تو اس معشوق سے جواب طلب کرو کہ وہ اتنا خوبصورت کیوں ہے۔

دوستان عیب کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی؟

ادھر حضرت میر تقی میر بھی اس عشق کے شکار ہوتے ہیں۔ وہ معشوق سے اپنے عشق کی داد چاہتے ہیں تو معشوق ان کی خبر لیتا ہے کہ کس نے آپ سے عشق کی فرمائش کی تھی۔ یہ آپ کی غلطی ہے جو آپ عشق پر دلیر ہوئے.. اب اس کی سزا بھگتئے اور ہم سے کسی مہربانی کی توقع نہ رکھئے۔

میر صاحب اپنا مقدمہ انصاف پسندوں کے آگے رکھتے ہیں — ہم نے پیار کیا تو اسے جرم قرار دیا جا رہا ہے۔ لیکن وہ خود جو پیار کے قابل ہیں تو اس کے لئے کون جوابدہ ہے؟

پیار کرنے کا جو خوبان ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پوچھیے تم اتنے پیارے کیوں ہوئے

سعدی اور میر دونوں اپنے فن کے استاد ہیں. خیال ایک ہے اور پیشکش دونوں کے پاس معصومانہ اور دلکش ہے۔

عاشق کی آرزو ہوتی ہے معشوق اس کے گھر آئے. معشوق وعدے کرتا ہے لیکن اس کے وعدے کبھی شرمندۂ وفا نہیں ہوتے۔ وعدہ شکنی کے لئے ہر وقت کوئی نہ کوئی عذر نکل آتا ہے اور عاشق پر انتظار کی قیامتیں گزرتی رہتی ہیں۔ آخر ایک دن ایسا آجاتا ہے جب معشوق اپنے وعدہ کی تکمیل پر آمادہ ہو ہی جاتا ہے۔ اور عاشق کے گھر کی طرف چل پڑتا ہے۔ ادھر عاشق کے گھر کو بربادی پوری طرح صاف کر چکی ہے۔

غالب نے عاشق کے گھر کی ویرانی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

اس مضمون کو جوش نے یہ اندازِ بیان بخشا ہے:

اب تک نہ خبر تھی مجھے اجڑے ہوئے گھر کی
وہ آئے تو گھر بے سروساماں نظر آیا

غالب کا عاشق بربادی کی جس منزل میں معشوق کے استقبال کا منتظر ہے، جوش کا عاشق اس منزل سے گزر چکا ہے۔ اپنے بے سروسامان گھر میں وہ معشوق کا تصور باندھے دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھا ہے۔ اچانک معشوق آجاتا ہے اور اس وقت عاشق کو اندازہ ہوتا ہے کہ معشوق کی آؤ بھگت کے لئے شایانِ شان ساز و سامان نہیں۔ اس تمام عرصہ میں محویت کا ایک ایسا دور مسلط تھا جس میں وہ اپنے ویران ماحول سے بے خبر رہا۔

بے سروسامانی کا جو احساس جوش کے عاشق کو تڑپا رہا ہے غالب کا عاشق اس کی شدت سے نا آشنا نظر آتا ہے۔ غالب کے پاس ایک واقعہ — ایک صورتِ حال، ایک نقشہ ہے لیکن جوش نے اس مضمون کو جذبات کی رنگ آمیزی سے زیادہ اثر انگیز اور زیادہ دل نشیں بنا دیا ہے۔

اصغر گونڈوی کے پاس آلامِ روزگار کو آسان بنانے کا یہ نسخہ ہے:

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا　　جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

اس شعر میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں دونوں پیش کناں ہیں۔ عاشق جو غمِ جاناں میں مبتلا ہے، آلامِ روزگار کا نشانہ بھی ہے۔ اس دہری غمزدگی کے مقابلہ میں عاشق کا اسلوب تحمل یہ ہوتا ہے کہ وہ زمانہ کے ہر غم کو غمِ جاناں کی ہمہ گیر شدت کے حوالے کر دیتا ہے دنیاوی مصیبتوں کو برداشت کرنے کے لئے شاعر کا یہ نفسیاتی ردِ عمل ایک ایسی مدافعت کو استوار کرتا ہے جس پر سے زمانہ کا ہر وار اچٹ جاتا ہے۔ اندوہِ حیات سے دوچار ہو کر غمِ جاناں کو تازہ کر لینا زندگی کی تلخ حقیقتوں سے فرار نہیں ہے ان کو جھیلنے کے لئے تربیتِ استعداد ہے۔ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بڑا غم چھوٹے غم کو کھا لیتا ہے۔

اور عرفی کا دعویٰ ہے :

در دلِ ما غمِ دنیا غمِ معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

یہاں عاشق پر دنیا کا غم وارد ہوتا ہے تو اس کے دل میں غمِ معشوق بن جاتا ہے عرفی کے نزدیک غمِ دنیا ایک ناقص شراب ہے جو عاشق کے دل میں آکر پختہ ہوتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ عرفی غمِ دنیا کے ساتھ شاعرانہ برتاؤ کر رہا ہے اور درحقیقت غم کی سختی سے آشنا نہیں، اس کے برعکس اصغر آلامِ روزگار کے شکنجہ میں تڑپتا دکھائی دیتا ہے۔ اور غمِ جاناں کی مشکلکشائی اسے اس گرفت سے چھٹکارا دلاتی ہے۔

اصغر کے پاس تجربہ کا کرب ہے، درد کی کسک ہے اور ایک ایسا درماں ہے جو درد ہی کی طرح اذیت ناک ہے۔

جاں نثار اختر کا شعر ہے۔

میں جب بھی اس کے خیالوں میں کھو سا جاتا ہوں
وہ خود بھی بات کرے تو بُرا لگے ہے مجھے

خیال کی رسائی اس مقام پر ہے جہاں عاشق اپنے محبوب کے پیکر کو محبت کی رنگین فضاؤں میں جلوہ فرما دیکھتا ہے۔ یہ دنیائے حسن و عشق، عاشق کی آرزوؤں سے آباد ہے اور خیال کی کارفرمائی نے ایک ایسا طلسم باندھا ہے، کہ عاشق آب و گل کی حقیقتوں سے بے تعلق ہو کر رہ گیا ہے۔ بارگاہِ حسن آراستہ ہے۔ عشق کی پرستش باریاب ہے۔ رنگ ہے نور ہے، ساز ہے آواز ہے۔

ایسے وقت خود معشوق جب مخاطب ہوتا ہے عاشق کو یہ خلل اندازی ناگوار گزرتی ہے کیونکہ اس آواز سے اس کا ایوانِ تصور لرز جاتا ہے۔ اور وہ اک اجنبی کی میزبانی پر آمادہ نہیں ہوتا۔ دیکھئے خیال کی یہی پرواز نظیری کو کہاں لے گئی ہے۔

بہ دل طرحِ وصالِ جاودانی نقش می بندم
گرم خود دوست می آید بخلوت دشمن است امشب

نظیری تصورِ جاناں میں وصالِ جاودانی کا نقشہ جمائے بیٹھا ہے۔ خلوت میں وصال کا اہتمام ہے اور نشاطِ وصال کی ایسی پُرکیف رات سج رہی ہے کہ خود نظیری کا محبوب بھی آجائے تو رنگ میں بھنگ پڑ جائے۔ جاں نثار اختر اور نظیری دونوں عشق کے ایک ہی مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔

جاں نثار اختر کے بیان میں سادگی ہے لیکن عشق کا واضح تعین نہیں ہے نظیری نے اپنے عشق کی صراحت کے ساتھ شاعرانہ خصوصیات کا بطورِ خاص خیال رکھا ہے۔ جاں نثار اختر کا لہجہ ایک بیباک سچے عاشق کا ہے اور نظیری کا اسلوب ایک سلیقہ مند عاشق کا۔

اس طرح میرے جرم سے نظریں چرا نہ لے
لگتا ہے اک سزا ہے معافی نہیں ہے یہ

جاں نثار اختر کے اس شعر میں مجرم حاضر ہے۔ سزا چاہتا ہے۔ لیکن معشوق انجان ہو جاتا ہے نہ مواخذہ نہ سزا۔ معشوق کی اس بے تعلقی سے عاشق اب اٹھتا ہے۔ معافی کو سزا سمجھتا ہے کیونکہ سزا سے جرم کا حساب بے باق ہو جاتا ہے اور عاشق پھر سے ہنسی خوشی عشق میں مگن ہو جاتا ہے لیکن معشوق کے تیور اس مرتبہ ایسے ہیں کہ عاشق کے جرم کا نوٹس ہی نہیں لیتا۔ قرینہ یہ ہے کہ وہ عاشق کی اصلاح سے مایوس ہو چکا ہے اور سزا کو بیکار سمجھتا ہے۔ اب عاشق جانے اس کا کام جانے۔

ز روزِ حشر چہ غم کز جزا بود ترسم
کہ عذرِ ما نہ پذیرند و جرمِ ما بخشند

عرفی اس دنیا کے کسی منصف کے آگے دادخواہ نہیں ہے۔ حشر ہے، اور وہ منصفِ حشر کے آگے کھڑا ہے۔ اسے بخشائش کا یقین ہے کیونکہ جو اس کا جرم ہے اس کے بارے میں معقول عذر اس کے پاس ہے لیکن اس کو اندیشہ ہے کہ کہیں اس کا عذر رد نہ کر دیا جائے اور صرف شانِ کریمی کے اشہاد کے لئے اس کا جرم معاف کر دیا جائے۔ اس کا مدعا کچھ اس طرح کا ہے کہ یہ میرا جرم ہے یہ میرا عذر ہے۔ قابلِ قبول ہو، قبول کریجئے، ورنہ سزا دیجئے۔ اس کو گوارا نہیں جانچ پڑتال کے بغیر صرف شانِ کریمی کے صدقہ میں اس کو بخش دیا جائے۔

دو بڑے شاعر ایک بلند مضمون کو ادا کرنے کے لئے دو جداگانہ اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ جاں نثار اختر کے شعر میں سزا کا ذکر ہے، اس لئے اس کا شعر زیادہ روشن ہو گیا ہے۔ لیکن عرفی نے اپنے کردار کو خود اعتمادی کے تیور عطا کئے ہیں اور اس طرح اس کا شعر زندہ و پائندہ ہو گیا ہے۔

خورشید احمد جامی اپنے گھر کی پست دیواروں کو مخدوش سمجھتے ہیں۔ کہہ رہے ہیں۔

اور اونچی کر دو یہ دیواریں　　حال گھر کا نہ جان لے دنیا

جامی کو دنیا کی تاک جھانک سے بڑی وحشت ہے اور دنیا کی یہ پرانی عادت کہ اچک اچک کر ہر گھر میں جھانکتی پھرے۔ جامی کو یہ جاسوسی اس وقت خاص طور پہ ناپسند ہوئی جب بے سروسامانی اس کے گھر میں گھس آئی۔ اب وہ جلد سے جلد ان دیواروں کو اور اونچا کر دینا چاہتا ہے کیونکہ اسے اندیشہ ہے کہ دوسرے کی تباہی سے خوش ہونے والی دنیا نے گھر کا حال دیکھ لیا تو چاردیواری کے اندر کی

زیوں حالیاں بازار کی رسوائیاں بن جائیں گی۔

نظیری نے اپنے گھر کا جو نقشہ دکھایا ہے وہ جامی کے گھر سے ملتا جلتا ہے۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ دیواروں کی پستی سے جامی کو ڈر ہے کہ دنیا والے گھر کا حال دیکھ لیں گے۔ اور نظیری کی مصیبت یہ ہے کہ اس کا گھر ہوا کی گزرگاہ پر ہے۔ اور پست دیواروں کی وجہ سے ہوا کے تیز جھونکے اس کے گھر کے چراغ کو بجھا بجھا دیتے ہیں۔

خانۂ ما خاکساران بر سرِ راہ صباست
شب نمی سوزد چراغ از پستیٔ دیوار ما

جامی کے شہر میں احتیاط کی آڑ ہے اور گھر کا حال ظاہر نہیں ہوتا۔ اس پردہ دار نے شعری اثر کی شدت کو بھڑکنے نہیں دیا ہے۔ اس کے خلاف نظیری کا خاکسارانہ انداز اس کے گھر کے اندھیروں کو انتہائی اندوہناک بنا دیتا ہے۔

دونوں شاعروں کی زندگی کا جائزہ لیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جامی کو نظیری کا شعر کہنا چاہیے تھا کیونکہ وہ جامی ہی تھا کہ جو زمانے کے ظلم وستم کا نشانہ بنا اور محبت وناقدری کے بے چراغ اندھیروں میں سرگرداں رہا۔

شہروں میں زندگی کے جلوس کی دھوم دھام ہے۔ گرد وغبار کے بادلوں میں آوازوں کا شور بڑھتا جارہا ہے، جامی اس جلوس کا تماشائی ہے۔

یہ شہر ہیں کہ صداؤں کے گونجتے جنگل
نہ کوئی جسم نہ چہرہ دکھائی دیتا ہے

اور جاں نثار اختر نے دیکھا۔

ہمارے شہر میں بے چہرہ لوگ بستے ہیں
کبھی کبھی کوئی چہرہ دکھائی دیتا ہے

اس بے چہرہ ہجوم کے آگے آئینہ لیجانے کی کوشش میں آئینہ کبھی پاش پاش ہوا اور آئینہ بردار بھی روندے گئے۔

زندگی دردِ سر ہے حاتم   کب ملے گا مجھے پیا میرا

محبت کی منزلِ مراد وصالِ محبوب ہے۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ محبت اگر سچی ہو تو وصالِ محبوب مشکل اور اکثر صورتوں میں ناممکن ہوجاتا ہے۔ ہجر کے صدمے سہتے سہتے محبوب کا تصور ایک خیالی پیکر کو تنہائیوں کا شریک کر دیتا ہے اور حقیقی وصل کے تعلق سے ایسی آرزومندانہ منصوبہ بندی ہونے لگتی ہے کہ وصل تاخیر میں پڑجائے تو فراق دردِ سر بن جائے۔ اس دردِ سر کے زیر اثر زندگی تیرہ وتار ہوجاتی ہے اور صرف آرزو کا ایک چراغ ٹمٹماتا رہتا ہے۔

حاتم انتظار کی اس منزل میں ہیں جہاں سے ابدی خاموشیوں کے غار کا سیاہ دہانہ ان کو صاف نظر آرہا ہے۔ دوسری طرف وہ محبوب کی آمد سے مایوس بھی نہیں ہیں امید وبیم کے اس دوراہے پر حاتم جب سوچتے ہیں کب ملیگا مجھے پیا میرا تو ان کے ناتواں ہونٹ بے آواز لرز کر رہ جاتے ہیں۔ اور دل اپنی کراہتی دھڑکنوں میں اس کو دہرا کر چپ ہوجاتا ہے اس نوبت پر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر وصلِ محبوب میسر بھی ہوجائے تو کیا تکمیل آرزو کی سکت بھی ہوگی؟ یہ بات البتہ یقینی ہے کہ وصال سے لذت یاب ہوں نہ ہوں دردِ سر سے تو چھٹکارا مل جائے گا۔

وصلِ محبوب کے انتظار میں اُدھر حاتم سر تھامے بیٹھے ہیں اِدھر میر صاحب مچل رہے ہیں۔

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

وصل کے لئے تائید ایزدی کو آواز دی جارہی ہے۔ ساتھ ہی وصل کی ساری تقریبات کا طرب انگیز جائزہ بھی لیا جارہا ہے۔ میر صاحب کا جی جو چاہتا ہے اس کی خبر اگر محبوب کو ہوجائے تو وصل سے پہلے وصال کا انتظام ہوجائے۔

حاتم کا شعر کسی از کار رفتہ عاشق یا کسی محبت زدہ خاتون کی آہ ہے۔ اس کے برعکس میر کا شعر کسی منچلے عاشق کی جارحیت کا اعلان ہے۔

اب آیئے غالب اور داغ کی ہم خیالوں پر خیال آرائی کریں۔

غالب بیمار ہیں۔۔ افاقہ کے آثار نہیں، لیکن کوئی اچانک عیادت کو آجاتا ہے۔ اور ان کے چہرہ پر رونق کھل اٹھتی ہے۔ بیماری کو بہانہ سمجھا جاتا ہے اور عیادت کو آنے والے کا پسیجا ہوا دل پھر خشک پتھر بن جاتا ہے۔ مزاج پرسی کے بدلے بے رخی برتی جاتی ہے۔ اور آنے والا تیوری پر بل ڈالے واپس چلا جاتا ہے، غالب کے چہرہ کی رونق پر بیماری کی مردنی دوبارہ مسلط ہوجاتی ہے۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

غالب کے شعر میں ایک نفسیاتی کیفیت کی عکس کشی ہے اور بیماری کی مایوسی کا وہ دلدوز منظر پیش ہوتا ہے جس میں کج ادائی مضمحل دھڑکنوں پر ظلم ڈھاتی ہے

داغ بھی بیمار ہے ان کی عیادت کے لئے بھی کوئی آیا ہے۔

وہ عیادت کو میری آتے ہیں لو اور سنو
آج ہی خوبیٔ تقدیر سے حال اچھا ہے

داغ کا حال غالب سے اچھا ہے جس دن کوئی عیادت کے لئے آیا۔ ان کو افاقہ تھا وہ اپنی بدقسمتی پر کڑھتے ہیں کہ اسی دن طبیعت سنبھلی ہے جس دن کوئی مزاج پرسی کو آیا ہے۔ اب لازمی طور پر عیادت کو آنے والا یہی سمجھے گا کہ بیماری کا ڈھونگ رچا کر اس کی آمد کے لئے راستہ نکالا گیا ہے۔ مصیبت دونوں بیماروں کی ایک ہی ہے لیکن غالب چونکہ درحقیقت بیمار ہیں اور صرف کسی کی آمد سے بحال ہوئے ہیں، ان کی بپتا زیادہ دردانگیز ہے اور اس طرح زیادہ گہری ہمدردیوں کی حقدار ٹھیرتی ہے۔ روانی دونوں کے انداز بیان میں ہے لیکن غالب کی بے ساختگی میں اثر کا وزن زیادہ ہے۔

یہ بھی غالب ہیں حسن پرست اور خلد کی سیر میں مگن۔ ان سے حوروں کے

(بقیہ صفحہ ۴۵ پر)

کشور سلطان
اتیچ ۱۴۸، سروجنی نگر
نئی دلّی۔ ۱۱۰۰۲۲

یہ خانے یہ دائرے

[مضمون نگار نے ایک بڑے اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے
ہمیں امید ہے کہ ہمارے قارئین اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار
کریں گے، اپنی رائے بھیجیے۔ ہم اسے شائع کریں گے ۔ مدیر]

اگر عہد رفتہ کی اُردو شاعری پر نظر ڈالی جائے تو حسن و عشق کے افسانوں اور ہجر و وصال کی ساری حکایتوں کے باوجود عورت کا کوئی وجود نظر نہیں آتا، بس ایک خیالی معشوق ہے جس کا ذکر کبھی صیغۂ مذکر سے ہوتا ہے لیکن اگر اس شاعری کے پورے سمندر کو کبھی کھنگال ڈالیں تو عورت نام کی کوئی شے نہیں ملتی ایسا لگتا ہے کہ ان بے چاروں نے جن کے اعصاب پر عورت سوار تھی کسی حقیقی عورت کو دیکھا تک نہیں یا جو عورت جیتی جاگتی ملی وہ کسی اُس معشوق کے درجہ یا تصور تک نہ پہنچی جو ان کی شاعری کی ہیروئن یا ان کے تخیل کا مرکز تھی۔ یہ عورت ہمیشہ زنان خانوں میں نہاں رہی! اس کا استعمال کچھ خاص ضرورتوں تک محدود تھا، جاگیر حویلی بگھی اور فلٹن کی طرح وہ بھی ایک شے تھی جو آبا و اجداد کی نسل برقرار رکھنے کے لیے مستعمل تھی اور خاندان کی آبرو پر نثار ہونا اس کی معراج تھی۔ جس گھر میں ڈولا جائے اس گھر سے جنازہ ہی نکلتا ہے ــــ کا نعرہ اس کی گھٹی میں ڈالا جاتا اور شوہر تمہارا خدائے مجازی ہے ــــ کا جذبہ اس کے خمیر میں گوندھ دیا جاتا۔

آنکھیں کھولتے ہی اسے بتا دیا جاتا کہ جو رویہ اس کے بھائی کے ساتھ خاندان کا ہے وہ اس کے ساتھ نہیں ہو سکتا کیوں کہ آخرکار وہ لڑکی ہے اور وہ مرد بچہ ہے۔ مرد بچہ پیدائشی طور پر افضل و برتر ہے کیوں کہ قدرت نے اُسے کچھ جسمانی ذمہ داریوں سے مبرّا رکھا ہے۔ گویا فطرت ہی نے اس پر میونسپلٹی کا بِلّا سا ٹھپّہ لگا کر بھیجا ہے اور عورت بے چاری کمزور ہے اس کی ساری زندگی کا انحصار مرد کے اوپر ہے ــــ ماں کی حیثیت میں وہ صرف ایک ایسی بھٹی ہے جو کچھ مادّے کو ڈھال کر نسل انسانی کو آگے چلاتی ہے اور بیوی کے روپ میں وہ ایسی کٹھ پتلی ہے جس کی رضا و رغبت کا مالک اس کا سرتاج ہے وہ اسی کی آنکھوں سے دیکھتی ہے، اسی کے کانوں سے سنتی ہے اور اس کی آواز شوہر کی صدائے بازگشت کے علاوہ ہونا، قانونی، اخلاقی اور مذہبی جرم ہے ــــ!

صدیاں گزر گئیں اس شے پر، جسے عورت کہتے ہیں اور اسے صنف نازک صرف اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کا گھونسہ اتنا زوردار نہیں ہو سکتا جتنا کہ اس کے سرتاج کا ــــ وہ زندگی کے سارے مصائب، سارے مسائل خاموشی اور صبر کے ساتھ برداشت کر لیتی ہے جہاں مرد کی شہ زوری جواب دے جاتی ہے وہاں یہ ناتواں سارے بار کو ایک چپ ہزار چپ میں اٹھا لاتی ہے لیکن مرد کو کبھی یہ سوچنے یا یہ احساس کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی کہ زندگی کا سارا دکھ اور محرومی اس نے ایک شے عورت کے اوپر لاد دیا ہے اور وہ اپنے دوستوں کی محفل میں اپنی مردانگی کا تمغہ سینے پر لگائے اپنے عز و افتخار کے نغمے سنانے میں مصروف

لوگ کہتے ہیں کہ اب زمانہ بدل گیا ہے اور اب عورتوں کو اپنے حقوق کا احساس ہو گیا ہے، وہ جاگ گئی ہیں ــــ بڑے ادب کے ساتھ سوال ہے وہ عورتیں کہاں ہیں ــــ زمانہ کہاں بدلا ہے ــــ جہاں بدلا ہے اس نے زنجیر میں دو چار کڑیاں زیادہ کر دی ہیں کم نہیں کیں ــــ آج کی ایک ایم ایس سی پاس لڑکی (کام کرنے والی) اپنے منگیتر کا نام نہیں لیتی۔ جی نہیں اسے شرم نہیں آتی، بل کہ نام لینے سے بے ادبی ہوتی ہے آخر کو وہ مرد ہیں ــــ! یہ آج کل کی لڑکی ہے، کیمسٹری کی ایم ایس سی ہے۔ اچھے عہدے پر فائز ہے لیکن "آخر کو وہ مرد ہیں" والی ذہنیت آج تک نہیں بدلی ہے۔ وہ ساری زیادتیاں اس خیال سے برداشت کرتی ہے کہ زیادتیاں کرنا مرد کا حق ہے اور انھیں سہنا اس کا پیدائشی فرض ــــ!

میرے یہ کہنے کا مقصد ہرگز نہیں ہے کہ مرد کا احترام نہیں ہونا چاہیے مگر یہ احترام ہر انسان کا حق ہے اور بدقسمتی سے عورتیں بھی آخرکار انسان ہی ہوتی ہیں ــــ آج کی پڑھی لکھی عورت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ شوہر اسے کام کرنے کی اجازت دیتا ہے (یہ اجازت کبھی وہ بیوی سے نہیں لیتا) جی ہاں عورت کو نوکری کرنے کے لیے شوہر کی اجازت چاہیے ــــ کبھی کبھی وہ اس بات پر خوش بھی ہو جاتا ہے کہ اس کی بیوی نے کسی میدان میں نام روشن کیا ہے لیکن یہ تصور کبھی اس کے ذہن میں نہیں آ سکتا کہ اس کی بیوی اس کے نظریات و تصورات کے خلاف بھی سوچ سکتی ہے یا کسی مسئلے پر اسے اختلاف رائے بھی ہو سکتا ہے ــــ جہاں اختلاف رائے ہوا وہیں یہ حقیقت بھیانک ہو جاتی ہے کہ اس کی بیوی کی ایک انفرادی شخصیت ہے جو خود سوچ سکتی ہے (صحیح یا غلط) لیکن اسے خود اپنی رائے قائم کرنے کی آزادی یا اس کا حق نہیں دیا جا سکتا ــــ نہ اس کی رائے کی وجوہ سوچنے کی زحمت کی جاتی ہے۔ صدیوں کا حاکم مرد یہ آزادی آج بھی نہیں دے سکتا ــــ آج کی بھی آئیڈیل عورت وہی ہے جو سارک

زیادتیوں اور محرومیوں کو خاموشی سے برداشت کرتی جاتے اور عمر کے آخری حصے میں جہاں مرد اپنی کچھ رنگینیوں سے تائب ہو کر اس کی طرف ایک نظر التفات ڈال دے وہیں وہ سپر آنچل ڈال کر اس کے قدموں میں جھک جائے ـــــــ یہی ہے اس کے ساری زندگی خاموش جلتے رہنے کا انعام ـــــ لیکن کیا یہ اقدار ایک صحت مند اور متوازن معاشرے کو جنم دے سکتی ہیں ـــــ بدلتے ہوئے زمانے اور حالات کے ساتھ ساتھ نظریات اور تصورات کا بدلنا ضروری ہے۔ کیوں کہ آج بھی جب ہر طرف عورتوں کے حقوق اور ان کے احترام کی بات ہو رہی ہے عموماً مرد ان لڑکیوں سے شادی کرنا پسند کرتے ہیں جو نسبتاً بے وقوف ہوں اور صرف گھریلو زندگی ہی ان کی تمناؤں کی معراج ہو ـــــ ذہین اسمارٹ خود مختار قسم کی لڑکیاں صرف فلرٹ کرنے کے لیے اچھی سمجھی جاتی ہیں اور بے وقوف ان کی زبان میں "سیدھی" اور "سر تا پا من سلامت" قسم کی لڑکیاں شادی کرنے کے لیے ـــــ یہ خانے بنانے اور دوہرے معیار رکھنے والے آج بھی کامیاب سمجھے جاتے ہیں۔ وہ شادی اور بیوی کو ایک خانے میں رکھتے ہیں جس کا وہ اوپری سطح پر احترام بھی کرتے ہیں لیکن صاف گو ذہین اور بے باک لڑکی کو آوارہ سمجھا جاتا ہے وہ ان کے خیال میں کچھ اور نہ سہی تو ذہنی طور پر فلرٹ کرنے کے لیے ہوتی ہے وہ اس کی تلخ و ترش بھی سنتے ہیں اور ہنس کر سنتے ہیں۔ لیکن صرف اس کے منہ پر اس کی کپتی کا لطف لینے کے لیے۔ لیکن ادھر وہ کمرے سے باہر گئی اور ادھر انھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھے ـــــ "ارے بابا کیا غضب کی عورت ہے۔ کم بخت کہیں تو نہیں چوکتی چوٹ کرنے سے۔ زبان تو قینچی کی طرح چلتی ہے۔ کتابیں تو لگتا ہے کہ پڑھتی ہی نہیں رٹتی ہے"۔ (معاف کیجئے گا ہم نے بہت نستعلیق زبان لکھی ہے کیوں کہ وہ زبان نہ ہم میں لکھنے کی جرأت ہے اور نہ شاید آپ میں شائع کرنے کی) یہ بیمار ذہنیت اور دوہرا معیار زندگی ہمارے معاشرے کا گھن ہے جس کا کسی کو احساس بھی نہیں۔ یہ گھن عورتوں کی شخصیت کو کھا رہا ہے ـــــ ان کی ذہنی صلاحیتیں ان کے کردار کے ہزارہا پہلو اس ڈر سے ابھر نہیں پاتے کہ لوگ کیا کہیں گے ـــــ "ہائے لوگ کیا کہیں گے" نے کتنی زندگیاں تباہ کی ہیں اس کے اعداد و شمار بھی نہیں مل سکتے، کتنی صلاحیتوں کو زندہ درگور کر دیا ہے اس کی گنتی بھی نہیں ہو سکتی ـــــ اور مزے کی بات یہ ہے کہ لوگوں کے ڈر کا سارا ٹھیکہ نچلے متوسط طبقے پر ہے، ساری اقدار صرف اسی طبقے کا سرمایہ ہیں۔ امیر طبقے پر کوئی اخلاقی اقدار اس لیے نافذ نہیں ہوتے کہ وہ ہر چیز کو خریدنے اور بیچنے کے عادی ہیں، ہلدی کی گانٹھ ہو یا لڑکی ـــــ ان کے یہاں صرف سودا ہوتا ہے ـــــ ہر چیز کی، ہر انسان کی قیمت ہوتی ہے، غریبوں کے یہاں زندگی اتنی سیدھی سادی ہے کہ بنیادی ضرورتوں کا مسئلہ ہی سب سے بڑا مسئلہ رہتا ہے۔ اب رہ گیا نچلا متوسط طبقہ ـــــ وہ نہ ہیوں میں ہے شیوں میں ـــــ وہ بے چارا صرف اخلاقی اقدار کے سہارے زندہ رہتا ہے لہٰذا اس طبقے کی لڑکی کے پاس اتنے مسائل کا ڈھیر ہوتا ہے کہ وہ کبھی اس بوجھ سے اپنی گردن اٹھا کر خود اپنے لیے سوچنے کی مہلت ہی نہیں پاتی ـــــ دنیا کی ریت رسم و رواج قاعدے قانون، چلن سبھی اسی کے اوپر نافذ ہوتے ہیں۔ پرکھوں کے رواج کا ٹھیکہ اسی نے لے رکھا ہے "مردوں کی کیا بات، وہ تو آزاد ہوتے ہیں، ساری ذمہ داری تو ہماری ہوتی ہے ـــــ" یعنی عورت کی۔ ذمہ داری اس بات کی کہ برسہا برس کی جہالت میں کوئی فرق نہ آئے۔ صدیوں پرانے فرسودہ رواجوں کے برتنے میں کوئی فرق نہ آئے۔ اور لڑکی ذات لڑکی ذات ہی رہے (لڑکی وہ جو لڑکیوں میں گڑیاں کھیلے نہ کہ لڑکوں میں جا کر ڈنڈ پیلے) تو جو مائیں لڑکی کی ذات کا دائرہ گڑیوں ہی تک محدود رکھیں گی ـــــ اس لڑکی کے دائرہ خیال اس کی جرأت و ہمت اور اس کی صلاحیتوں کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ لڑکی اور لڑکے کی نشوونما کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر کے ہمارے معاشرے نے لڑکی کو انسان، جانور اور جائداد ان تینوں کا مرکب بنا دیا ہے۔ وہ ذہنی طور پر اسیر ہے فرسودہ روایات کی۔ غلام ہے سماج کے انتہائی نامعقول ریت رواجوں کی علاج ایک ہی ہے ـــــ تعلیم ـــــ تعلیم۔ اور صرف عورت ہی کی نہیں اس سے پہلے مردوں کی، جو عورت کو محض ایک شے نہ سمجھیں، اسے اپنی ہی طرح کا انسان سمجھیں اس کی شخصیت کا احترام کریں اور اس کی تعلیم و تربیت کا بھی اسی سطح پر اہتمام کریں، اسے اتنی ہی اہمیت دیں جتنی کہ وہ "مرد بچہ" یعنی بیٹے کو دیتے ہیں ـــــ!

بقیہ ملاحظات

تامل ناڈو نمبر

یہ طے کیا گیا ہے کہ مئی اور جون کا مشترک شمارہ تامل ناڈو نمبر ہوگا۔ سو صفحات پر مشتمل اس شمارے کی قیمت دو روپے ہوگی۔ سالانہ خریداروں سے زائد قیمت نہیں لی جائے گی۔

ایجنٹ حضرات اپنی زائد ضروریات سے بزنس منیجر کو جلد آگاہ کر دیں۔

طرحی غزلیں اور افسانے

اس بار ہم نے آٹھ غزلیں پسند کی ہیں جو اسی شمارے میں شامل ہیں۔ اور جن تین افسانوں کا انتخاب کیا ہے ان کے نام بجوکا (سلام بن رزاق)، زہر (اظہر راہی) لہو آستیں کا (شہناز کنول) ہیں۔

آج کل کے بارے میں ہمیں برابر لکھتے رہیے تاکہ آپ کے مفید مشوروں کی روشنی میں ہم اسے بہتر بنا سکیں۔

صغریٰ مہدی
جامعہ نگر، نئی دہلی

سُنا تو ہے

ملک کے مشہور شاعر پریکشت دمولپوری کا آج شام یکایک دل کی حرکت بند ہو جانے سے دیہانت ہو گیا۔ شیلا کے ہاتھ سے قمیص اور سوئی چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ ملک کے مشہور شاعر پریکشت دمولپوری کا دیہانت ہو گیا۔ دیہانت ہو گیا — دماغ بار بار اس جملے کی تکرار کر رہا تھا — حالانکہ ریڈیو پر اب خبریں آ رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ ریڈیو بند کر دے، مگر لگتا تھا جیسے ہاتھ بے جان ہوں۔ تو تم چلے گئے؟ میری دنیا سے تم عرصہ ہوا جا چکے تھے۔ مگر اب تو نے اپنی دنیا بھی چھوڑ دی؟

ریڈیو پر نغمہ آ رہا تھا "شام غم کی قسم آج غمگیں ہیں ہم۔ آج غم گیں ہیں ہم" اس نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو بند کر دیا اور قمیص اٹھا کر سینے لگی۔ شام ہو رہی تھی گلی کوچے میں بچے پتنگ اڑا رہے تھے۔ وہ گئی — اِدھر — اُدھر — وہ مارا! مار لیا۔ دور سڑک پر ٹریفک کا شور ہو رہا تھا۔ پڑوس کے ریڈیو پر وہی نغمہ آ رہا تھا۔ شام غم کی قسم آج غمگیں ہیں ہم آ بھی جا آ بھی جا آج میرے صنم — تو دیال سنگھ نہیں نہیں۔ پریکشت دمولپوری — عجیب بات ہے میں آج بھی تمہارے نئے نام سے تمہیں یاد نہیں کرنا چاہتی۔ تمہارا اپنا نام — جس کا تعلق تمہاری شاعری سے تھا۔ تمہاری شاعری جس نے تمہیں مجھ سے چھین لیا۔ میری سب سے پہلی سوت — اس کے بعد تو میری سوتوں کی گنتی اتنی بڑھی کہ نام بھی یاد نہیں رہے، ان کے۔ سالنی، مسز حسین، زیبا، ملنی اور اب رمتو۔ رمتو بیس سال پہلے ایک مشاعرے میں تم پر عاشق ہوئی تھی۔ اس وقت وہ بتیس سال کی عورت تھی۔ پانچ بچوں کی ماں، ایک عدد بھاری بھرکم شوہر کی بیوی اس دن سے اس نے تمہاری چاہت کی ڈور کو جو پکڑا ہے، تو آج تک تھامے ہوئے ہے۔

دس سال تک تو وہ تم سے چھپ چھپ کر مختلف جگہوں پر ملتی رہی۔ کبھی اپنے گھر پر، کبھی تمہارے گھر پر، کبھی مشاعروں میں کبھی سفر میں۔ اور دس سال سے وہ تمہارے ساتھ تمہارے فلیٹ میں رہ رہی تھی۔ اس نے تمہاری خاطر میاں، بچے، ماں، باپ، عزت و آبرو سب کچھ تج دیا۔ رمتو جو تمہاری سورس آف انسپریشن تھی، تمہاری رفیق تھی۔ دوست تھی۔ تمہارے فن کی قدر دان تھی۔ جو تمہارے لئے جیتی رہی — تم — تم ہو کیا تمہارے حلقے کے سبھی لوگ رمتو کی خوبصورتی، اس کے اخلاق، اس کے ناز و ادا کے دیوانے تھے۔ اور کتنے معترف تھے رمتو کے اس تیاگ و قربانی کے اس ایثار کے، جو اس نے تمہارے لئے کیا تھا — تو جب سے رمتو تمہاری رکھیل یا داشتہ — ارے میں یہ کیا کہہ گئی؟ تم میری ان ہی باتوں سے تو چِڑ جایا کرتے تھے۔ سچ کہتے تھے تم میں واقعی غیر شاعرانہ زبان استعمال کرتی ہوں، ہوں نا جاہل اور گنوار، میں جو تمہاری مداح، ہم خیال، ہم مذاق عورتوں کو تمہاری داشتائیں کہتی۔ تمہاری شاعری کو بکواس، میں تمہارے شعروں پر سر دھننے کے بجائے تم سے روٹی کپڑے اور بچی کے علاج کے لئے پیسے مانگتی تھی۔ ایک میں تھی جو اپنے بھدے انداز بیان اور گنوار پنے سے خوبصورت چیزوں کو بھی بھدا اور بدنما بنا دیتی۔ ایک تم تھے جو بدصورت اور بدنما چیزوں کو خوبصورت و حسین بنا کر پیش کرتے۔ میں تم کو شرابی کہتی۔ اور تم کہتے کہ شراب غموں کو بھلانے کا ایک ذریعہ ہے۔ تم شاعر تھے، حسن پرست، حساس، نازک مزاج، تمہارے دل میں دنیا کا درد تھا۔ اور میں ایک جاہل گنوار بدزبان اور خود غرض عورت تھی جو نہ صرف اپنی بچی، اپنے اور اپنے گھر کے بارے میں سوچتی۔ اور اپنا حق مانگنے کے لئے گالی گلوچ پر بھی اتر آتی۔ میرا اور تمہارا ساتھ کیسے نبھ سکتا تھا۔ چنانچہ نہیں نبھا۔ ہاں تمہارے چند دن کے ساتھ نے مجھے اور جو دیا سو دیا مگر ایک پاگل بچی بھی دے دی۔ جس کی پیدائش کا مقصد صرف یہ تھا کہ پاگل خانے کے رجسٹر میں ایک نام کا اور اضافہ ہو جائے۔ بھگوان کا شکر ہے کہ مینو پاگل ہے۔ میں قدم قدم پر اپنی بچی کے پاگل ہونے پر شکر ادا کرتی رہتی ہوں۔ اس وقت جب نشے میں دھت آ کر تم مجھے پیٹتے تھے، اس وقت محلے میں جب تمہاری بدچلنی کے چرچے ہوتے۔ اس رات جب تم نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا اور آج جب تم پرلوک چلے گئے ہو کتنی خوش قسمت ہے میری بیٹی کہ وہ ان سب باتوں سے بے خبر ہے۔ دنیا میں رہ کر بھی اس کو دکھوں اور ناانصافیوں کا احساس نہیں۔ میں نے زندگی کو گزارنے کے وسیلے تلاش کر لیے اور زندہ ہوں۔ تمہارے بارے میں عرصہ ہوا میں نے سنا تھا کہ تم نے اپنی ایک محبوبہ کے سہارے الادین کے اس چراغ کو پا لیا ہے جو مشکل سے ہی کسی ملتا ہے اور جب مل جاتا ہے تو عزت، شہرت نیک نامی، عیش و آرام سب کچھ مل جاتا ہے۔ تو تم نے اس چراغ کو پا لیا اور اس شہر میں جا بسے جو موڈرن زمانے کا پرستان ہے۔ اور پھر تو تم اتنے مشہور ہوئے کہ تمہاری شاعری کی دھوم مچ گئی۔ تمہاری کتابیں چھپنے لگیں۔ تمہیں

انعامات و اعزازات سے نوازا جانے لگا۔ تمہارے لئے رسالوں کے خاص نمبر نکلنے لگے۔ تمہاری شان میں جو تحریریں لکھی جاتیں یا جو تقریریں ہوتیں، ان میں تمہاری دردمندی، غریب پروری، قناعت و خودداری کے راگ الاپے جاتے اور میرے دل میں شعلے بھڑکنے لگتے۔ دماغ میں لاوا سا پکنے لگتا دل چاہتا کہ لوگوں سے چیخ چیخ کر کہوں کہ ہاں پریکشت جی اتنے رحم دل ہیں انہوں نے اپنی بیوی کو گھر سے نکال دیا ہے۔ ان کی بیٹی پاگل خانے میں پڑی ایڑیاں رگڑ رہی ہے — مگر میں نے نہیں کہا اس لئے کہ دنیا تمہاری تھی۔ میری کون سنتا کون یقین کرتا۔ اور اگر یقین کرتا بھی تو؟ تو؟ شاید یہ بھی تمہاری شہرت کا ایک سبب بن جاتا — مگر اب! اب تو تم مرگئے ہو۔ اب تو مجھے ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ مگر مجھے تمہارے مرنے کی اتنی تکلیف بھی نہیں ہوئی جتنی ایک پھانس کے چبھنے کی ہوتی ہے جب کہ منو اس وقت تمہارے غم میں پاگل ہو رہی ہوگی۔ تمہاری جدائی کے دکھ سے پسی جا رہی ہوگی —" تو کیا واقعی؟

"شیلا ارے شیلا تم اندھیرے میں بیٹھی ہو" اس کی روم پارٹنر رادھا کہہ رہی تھی۔

"شاید اس لئے کہ اندھیرا ساری بدصورتیوں اور بدنمائیوں کو نگل لیتا ہے" شیلا نے اپنے آپ سے کہا۔

"باہر کارخانے کا آدمی تمہیں لینے آیا ہے"

شیلا نے قمیص اٹھائی اور دروازے پر چلی گئی۔

"شیلا تم اچھی تو ہو، کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں" اور وہ چائے بنانے چلی گئی۔

رات کو جب وہ سونے لیٹی تو کاپیاں دیکھتے دیکھتے رادھا بولی —

"ارے ہاں شیلا تو نے سنا بچارے پریکشت جی چل بسے —"

وہ چپ رہی۔

"مجھے بڑا دکھ ہوا۔ مجھے شام سے ان کی وہ نظم یاد آرہی ہے۔

ہم سب بھکاری ہیں
تم بھی، میں بھی، یہ بھی، وہ بھی،
کوئی روٹی مانگے، کوئی پیسہ
کوئی شہرت مانگے، کوئی عزت
میں دیوانہ شاعر مانگوں اوروں کے درد

آہستہ آہستہ بچارے ختم ہوگئے۔ دل نے غموں سے ہار مان لی۔ کتنے اچھے شعر کہتے تھے۔ کیا کوملتا ہوتی ہے ان کی کویتاؤں میں۔ نہ معلوم ان کے شعر پڑھ کر یہ کیوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمارے سارے دکھ اور سارے درد جانتے ہوں کتنا درد، کتنی کسک ہوتی ہے ان کے شعروں میں۔ نہ جانے کن دکھوں سے گزرے ہوں گے بچارے۔ تجھے معلوم ہے شیلا پریکشت جی ایک دفعہ سیر کو جا رہے تھے۔ راستے میں ایک بوڑھا ملا جو سردی میں صرف ایک کرتا پہنے ہوئے تھا۔ بس انہوں نے فوراً اپنا کوٹ اتار کر دے دیا — اور خود سردی کھا کر بیمار ہو گئے۔ ان کی بیوی نے ایک دفعہ ایک انٹرویو میں بڑے مزے کا قصہ سنایا تھا۔ ایک رات ان کی آنکھ کھلی تو دیکھا یہ حضرت بستر سے غائب — یہ بچاری بڑی حیران کہ کہاں چلے گئے۔ جانے کیا کیا شک کرنے لگیں۔ ایک رات انہوں نے جو پریکشت جی کا پیچھا کیا تو کیا دیکھتی ہیں کہ قریب کی چال میں بیٹھے ایک بیمار فقیر کو دوا پلا رہے ہیں۔

بات یہ ہے کہ جب تک انسان اتنا ہمدرد، اتنا حساس نہ ہو، تو شاعر کیسے بن سکتا ہے۔ کیوں شیلا —"

"ہاں سنا تو ہے" شیلا نے کہا اور کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

بقیہ غریبوں کی قانونی امداد

غریبوں کو قانونی امداد دینے کے مسئلے پر تاریخ دستور سازی ہی سے غور کیا جا رہا ہے چنانچہ اس غرض کے لئے ۱۹۵۲ء میں ایک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ جس کی سفارشات کی بنا پر مرکزی حکومت نے جو کوشش کی اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ کسی جانب سے اس تحریک کی حوصلہ افزائی نہیں ہوئی۔ جب بھاگوتی کمیٹی نے سفارشات پیش کیں تو مرکزی حکومت نے ایک اسکیم مرتب کی — گرانٹ دینا منظور کیا تو ریاستی حکومتیں حرکت میں آئیں۔ بالخصوص بار کونسل آف انڈیا نے دلچسپی لی اور لائرس کانفرنس منعقد کی گئی اور اب ہر ریاست میں لائرس فورم بنائے گئے ہیں جو غریبوں کے مقدمات کی مفت پیروی کا انتظام کر رہے ہیں۔ اور ہر ریاست میں اس غرض سے فنڈ جمع کئے گئے ہیں اور عطیہ جات بھی مخیر حضرات سے وصول کئے گئے ہیں۔ غرض ہر شہر اور ہر تعلقہ میں لائرس فورم کا قیام عمل میں آیا ہے جو متحرک اور فعال ہیں۔

۱۹۷۶ء میں عدالتوں کے طریقہ کار کو سہل بنانے کی تجویز کو پارلیمان نے منظور کیا ہے۔ مزید آسانیاں کی تجویز جو پارلیمان میں پیش ہوئی تھی۔ وہ خوش آیند ہے۔ جس میں عدالتی فیس کی معافی احکام کے نقولات کی بلا معاوضہ اجرائی وغیرہ شامل ہے۔ چوں کہ غریبوں میں باعزت زندگی بسر کرنے کا احساس عام ہو گیا ہے۔ زرعی اصلاحات نے غریب کسانوں کی کایا پلٹ دی ہے۔ نیز لاحاصل مقدمات کے علاوہ دولت مندوں میں مقدمہ بازی کا شوق سرد ہو گیا ہے اس لئے عدالتوں پر مقدمات کا جو بوجھ ہے وہ رفتہ رفتہ کم ہوتا جائے گا۔

قانونی امداد کی اسکیم ہر ریاست میں بنائی گئی ہے۔ میری دانست میں باضابطگی پیدا کرنے کے لئے، اس جذبہ کو برقرار رکھنے، وکلاء کے لئے مناسب معاوضہ دینے، غریبوں کو مفت قانونی امداد دینے کے لئے ایک قانون بنایا جائے تاکہ دستور ہند کی دفعہ ۳۹ الف کی حرف بہ حرف تکمیل ہو سکے۔ اس قانون کی وجہ سے کمزور طبقات کو بھرپور قانونی امداد ملے گی۔ اور استحصال کا خطرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔

قیصر جہاں صدیقی
ڈی-۲۳ انصاری نگر، نئی دہلی

نرس بننے میں جھجک کیوں؟

نرسنگ ایک آرٹ بھی ہے اور سائنس بھی۔ آرٹ اس لیے کہ نرس میں ایسی خصوصیات اور جذبہ ہونا چاہیے جس سے وہ مریض کی تیمارداری کرسکے۔ سائنس اس لیے کہ نرسنگ کی صحیح جانکاری کے لیے جسمانی بناوٹ اور اس کی کارکردگی کا علم ہونا چاہیے۔ ہندوستان میں نرسیں ساتویں صدی سے کام کررہی ہیں۔ آیورویدک کے بانی سُشرت نے ڈاکٹر، مریض، دوا اور نرس کو طب کے چار ستون بتائے ہیں۔ آیوروید کے دوسرے بانی چرک نے ایک نرس کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نرس کو دوا بنانے کا علم ہونا چاہیے۔ ذہین ہونا چاہیے۔ مریض کی خدمت کا جذبہ ہونا چاہیے۔ جسمانی اور دماغی طور پر پاک ہونا چاہیے۔ اس زمانے میں نرس کا پیشہ الگ نہیں تھا بلکہ نن اور دائیاں یہ کام کرتی تھیں۔ آج کل کے زمانہ کے نرس کو ایک علیحدہ پیشے کی شکل دینے والی خاتون تھیں۔ "فلورنس نائٹ انگیل" جن کو مادر نرس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ طب کی ترقی کے ساتھ ساتھ نرسنگ کی پڑھائی اور تربیت کی بھی ترقی ہوئی۔ ہندوستان میں نرسنگ کی تعلیم کے لیے پہلا قدم ۱۸۵۴ء میں اٹھایا گیا جب مدراس میں لیٹنگ ان اسپتال میں مڈوائف کی تعلیم کی شروعات ہوئی۔ ۱۸۵۹ء میں بنگال گورنمنٹ نے نرسنگ کی تعلیم کے لیے کلکتہ میں اسکول کھولا اور اس کے کچھ سال کے اندر اندر پورے ملک میں اس قسم کے اسکول کھل گئے۔ جب پہلی جنگ عظیم میں نرسوں کی مانگ بہت تیزی سے بڑھی تو ان کی ٹریننگ کے لیے ایک اور اسکول ۱۹۱۸ء میں "لیڈی ریڈنگ ہیلتھ" اسکول کے نام سے کھولا گیا اور محسوس کیا جانے لگا کہ نرسوں کو مزید ٹریننگ کی ضرورت ہے اور اس طرح سے "پوسٹ سرٹیفکٹ" ٹریننگ کورس کی شروعات ہوئی۔ اس کے لیے ۱۹۴۳ء میں اسکول آف نرسنگ ایڈمنسٹریشن" دلی میں کھولا گیا۔ اسی طرز کے دوسرے کالج کرسچین میڈیکل ویلور اور جنرل اسپتال مدراس میں کھولے گئے۔ ۱۹۴۶ء میں دلی کے نرسنگ ایڈمنسٹریشن اسکول کو کالج آف نرسنگ بنادیا گیا۔ اور اس میں بی، ایس، سی (آنرز) نرسنگ کی ڈگری دلی یونیورسٹی کے تحت دی جانے لگی۔

ہندوستان کی ہیلتھ اسکیم کو ایک جامع شکل دینے کے لیے پہلا قدم ۱۹۴۳ء میں اٹھایا گیا جب انڈیا گورنمنٹ نے سروے اور ڈیولپمنٹ کمیٹی سر جوزف بھور کی صدارت میں بنائی اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ ۱۹۴۶ء میں پیش کی یہ رپورٹ ہماری میڈیکل ہسٹری میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ کمیٹی نے یہ ریکارڈ کیا تھا کہ اس وقت ملک میں طبی سہولتیں بہت غیر تسلی بخش تھیں اور انھوں نے اس کی زیادہ ذمہ داری اس پر ڈالی تھی کہ ملک میں طبی ادارے تو کھول دیے گئے لیکن اس کو چلانے کے لیے تربیت یافتہ کارکن اور سامان کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے بعد پورے ملک کی طبی دیکھ بھال مرکز کی ذمہ داری ہوگئی۔ اور اس طرح سنٹرل کونسل آف ہیلتھ کا اگست ۱۹۵۲ء میں قیام عمل میں آیا۔

ملک کے چوتھے پلان میں ہیلتھ کا نظریہ مرض کے علاج کے بجائے مرض سے بچنے کی تدبیروں پر زور دیا گیا۔

تیسرے پلان کے آغاز کے وقت گورنمنٹ نے ہیلتھ سروے اور پلاننگ سر مدلیار کے صدارت میں بنائی چونکہ تیسرا پلان اس وقت تک تیار ہوچکا تھا۔ اس لیے مدلیار کمیٹی کی سفارشیں اس پلان میں شامل نہ ہوسکیں۔ ۱۹۴۶ء میں بھور کمیٹی کے قیام کے وقت ملک میں ۴۷،۵۲۴ ڈاکٹر اور ۷۰۰۰ نرسیں تھیں۔ اس کے مطابق ۶۳۰۰ آدمی کے لیے ایک ڈاکٹر اور ۴۳۰۰۰ مریضوں کے لیے ایک نرس تھی۔ اس کے مقابلہ میں ۱۹۶۶ء میں ۸۶۰۰۰ ڈاکٹر اور ۴۵۰۰۰ نرسیں ہوگئیں۔ ۱۹۶۵ء تک نرسوں کی ٹریننگ کے لیے ۵۲۳ سینٹر کھولے گئے۔ جس میں ۶۴۶۰ نرسیں ہر سال ٹریننگ پانے لگیں۔ نرسوں کی ٹریننگ کے لیے مختلف کورس ہوتے ہیں — اے گریڈ نرسنگ کورس جس کے داخلہ کے لیے میٹرک یا ہائر سیکنڈری سائنس کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔ یہ تین سال کا کورس ہے۔ دوسرا ہے بی۔ ایس۔ سی (آنرز) نرسنگ کورس جس میں داخلہ کے لیے بھی ہائر سیکنڈری سائنس کے ساتھ ہونا ضروری ہے اور یہ کورس چار سال کا ہوتا ہے نوکری کرنے کے لیے تو اے گریڈ نرسنگ کورس پاس کرنا ضروری ہے لیکن یہی پاس شدہ نرسیں اگر مستقبل کی ترقی کے لیے آگے پڑھنا چاہیں تو بی۔ ایس۔ سی (آنرز) والا کورس بھی مزید دو سال میں پورا کرسکتی ہیں۔ ان ساری ٹریننگ کے دوران نرسوں کو ۵۰ روپیہ سے لے کر ۱۰۰ روپیہ تک ماہوار الاؤنس بھی دیا جاتا ہے۔ ان کی رہائش اور کھانے کا انتظام ٹریننگ کے دوران ہوسٹل میں کیا جاتا ہے۔ یہ ٹریننگ پوری کرلینے کے بعد نرسیں اسپتال میں اسٹاف نرس بنتی ہیں جن کا بیسک گریڈ ۴۲۵-۶۴۰ روپیہ تک ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ نرسنگ سسٹر بن جاتی ہیں۔ ان کی تنخواہ بیسک گریڈ ۴۵۵ روپیہ - ۷۰۰ روپیہ تک ہوتی ہے اور یہ وارڈ کی انچارج ہوتی ہیں۔ اس کے بعد اسسٹنٹ میٹرن ہوتی ہیں ان کا گریڈ ۵۵۰ سے ۷۵۰ روپیہ تک ہوتا ہے ایک بڑے اسپتال میں عموماً ۳ سے ۴ تک اسسٹنٹ میٹرن ہوتی ہیں جو اسپتال

کے الگ الگ وارڈ اور شعبے جیسے جنرل وارڈ، پرائیوٹ وارڈ، اپریشن تھیٹر اور او پی۔ ڈی کی انچارج ہوتی ہیں۔ ان کے ماتحت اسٹاف نرس اور نرسنگ سسٹر کام کرتی ہیں۔ اسٹاف نرس نرسنگ سسٹر اور اسسٹنٹ میٹرن ان سب کے اوپر سب کی انچارج ایک میٹرن ہوتی ہے جس کا گریڈ ۷۰۰ سے لے کر ۱۲۰۰ روپیہ تک ہوتا ہے۔ ۵۰۰ بیڈ سے بڑے اسپتال میں میٹرن کے بجائے اس پوسٹ پر نرسنگ سپرنٹنڈنٹ ہوتی ہے جس کی تنخواہ بھی میٹرن کے برابر یا کچھ زیادہ بھی ہوتی ہے۔ نرسوں کے کام کے اوقات تین شفٹ میں بانٹ دیے گئے ہیں۔

۱۔ پہلی شفٹ صبح سات بجے سے دن کے تین بجے تک۔
۲۔ دوسری شفٹ دوپہر تین بجے سے رات کے ساڑھے نو بجے تک۔
۳۔ تیسری شفٹ رات کے ساڑھے نو بجے سے صبح کے سات بجے تک ہوتی ہے۔

اپنی اس ڈیوٹی کے دوران میں نرسوں کو مندرجہ ذیل کام کرنے پڑتے ہیں۔ اسٹاف نرس کی ڈیوٹی یہ ہے۔

۱۔ ایسے مریضوں کی دیکھ بھال کرنا جو جسمانی طور پر خود اپنا کام کرنے سے معذور ہوں یا کمزوری اور بیماری کی وجہ سے نہ کر سکیں۔ ان کی انفرادی ضروریات کو پورا کرنا۔
۲۔ ۲۴ گھنٹے کے اندر مریض کی جسمانی، دماغی اور جذباتی حالت کی پوری رپورٹ ڈاکٹر کو دینی جس سے مرض کی تشخیص اور علاج میں مدد مل سکے۔
۳۔ علاج اور تشخیص کے دوران ڈاکٹر کو جن آلات اور اوزار کی ضرورت پیش آئے اس کی تیاری کرنا۔
۴۔ مریض کو ڈاکٹر کے بتائے ہوئے طریقہ پر وقت سے دوا دینا۔
۵۔ علاج کے دوران مریض کے رد عمل کو نوٹ کرنا اور اس کے لیے ضروری اقدام کرنا۔
۶۔ مریض کو چھوت لگنے، حادثے اور آگ لگنے کے حادثہ سے بچانے کے لیے صفائی، صاف ہوا کی آمد و رفت اور ماحول کو صاف رکھنے میں مدد کرنا اور اس کام کو کروانا۔
۷۔ مریض کو ہسپتال کے نئے ماحول میں اپنے آپ کو محفوظ اور گھر جیسا محسوس کرنے کے حالات پیدا کرنا۔
۸۔ مریض کو بتانا کہ کس طرح وہ اپنی صحت برقرار رکھ سکتا ہے اور گھر واپس جانے پر کس طرح علاج اور دیکھ بھال جاری رکھنی چاہیے
۹۔ مریض کے افراد اور دوستوں کے ساتھ اچھے اور خوشگوار تعلقات رکھنا۔
۱۰۔ ایسی صلاحیت رکھنا جس سے کسی بھی اَن دیکھے خطرہ کو محسوس کیا جاسکے۔

سسٹر نرس کی ڈیوٹی مندرجہ ذیل ہے:-

یہ ایک وارڈ یا یونٹ کی انچارج ہوتی ہیں ان پر اس وارڈ یا یونٹ کی نرسنگ کی ساری ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ جب یہ ڈیوٹی پر ہوں اس وقت گو مریض کی نرسنگ کی پوری ذمہ داری ان پر ہوتی ہے لیکن جب یہ ڈیوٹی پر نہ بھی ہوں تو یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا انتظام کریں کہ دوسری شفٹ میں بھی نرسنگ کا کام تسلی بخش چلتا رہے۔ یہ میڈیکل کی دوسری ٹیم کے ساتھ مل کر مریض کی دیکھ بھال کا انتظام کرتی ہیں۔ یہ اپنے یونٹ یا وارڈ کی انچارج ہی نہیں بلکہ اس کی ایڈمنسٹریٹر بھی ہوتی ہیں۔ مریض کی دیکھ بھال کی تمام تر ذمہ داری ان پر ہے۔ اسٹاف کے کام کا تعین کرنا اور اس کی دیکھ بھال کرنا کہ جو کام جس کے ذمہ لگایا گیا ہے وہ ٹھیک سے ہو رہا ہے کہ نہیں۔ ڈاکٹر اور نرس کے بیچ میں رابطے کا کام دینا۔

سامان کی وارڈ میں سپلائی کا پورا حساب رکھنا۔ اور دیکھنا کہ وہ سامان ٹھیک سے کام کر رہا ہے یا نہیں۔ اور ان سب ذمہ داریوں کے ساتھ ایک پُرسکون ماحول وارڈ میں قائم رکھنا۔ ان ساری تفصیلات کے بعد احساس ہوتا ہے کہ جب یہ پیشہ اتنا اہم اور باعزت ہے تو اسے ہر طبقہ اور ہندوستان کے ہر علاقے میں اسی طرح فروغ حاصل ہونا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہے۔ آپ ہندوستان کے کسی اسپتال میں جائیں نرسیں آپ کو زیادہ تر ایک ہی علاقے کی نظر آئیں گی غالباً آپ میرا اشارہ سمجھ گئے ہوں گے کہ نرسیں زیادہ تر جنوبی ہندوستان کی ہی نظر آتی ہیں۔ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس کے اعداد و شمار کے مطابق ۸۷ فیصد نرسیں جنوبی ہندوستان (کیرالہ، تامل ناڈو اور آندھرا) سے آتی ہیں اور باقی ۱۳ فیصد شمالی ہندوستان سے آتی ہیں اور ان میں ۸۰ فیصد کرسچن ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں شروع شروع میں جو بھی اسپتال کھولے گئے وہ زیادہ تر مشنری والوں نے کھولے اور اس میں انھیں لوگوں نے داخلہ لیا جو مشنری سے متعلق تھے۔ یا جو مشنری میں کام کرتے تھے۔ ان لوگوں کی پڑھائی فری ہوتی تھی اور بھی کافی سہولت تھی۔ فری پڑھائی کے بعد ان کو فوراً نوکری مل جاتی تھی۔ یہ اسپتال بھی زیادہ تر ساؤتھ میں کھلے اور کرسچن لڑکیوں کی تعداد بھی وہیں زیادہ تھی اس لیے وہاں کی نرسوں کی سب سے بڑی تعداد اسپتال میں آنے لگی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ساؤتھ میں تعلیم بھی زیادہ ہے اور غریبی بھی۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ساؤتھ میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ ہے۔ ایک وجہ کرسچن لڑکیوں کو ان کے ماحول کی طرف سے کافی آزادی ہے۔ اب آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ زیادہ تر اسپتال میں ساؤتھ کی نرسیں ہی کیوں نظر آتی ہیں۔ باقی ۱۳ فی صد جو شمالی ہندوستان سے آتی ہیں ان میں مسلمان لڑکیوں کی تعداد صفر کے برابر ہے۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ نظر آتی ہے کہ ان ۱۳ فیصد لڑکیوں کا اور خصوصاً مسلمان لڑکیوں کا ماحول جنوبی ہند کی کرسچن لڑکیوں سے مختلف رہا ہے ان لوگوں کو شروع سے اتنی سہولت اور ماحول کی اتنی آزادی بھی نہیں تھی۔ اسپتال کے ماحول میں یہ دن رات کی ڈیوٹی ان کے لیے تھوڑا مشکل رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ پیشہ صرف ایک مخصوص خطے کی لڑکیوں کے ساتھ وابستہ ہو کر رہ گیا اور کسی طرح کی برائی یا بدنامی بھی اگر کسی اور وجہ سے بھی ہوتی تو وہ بھی اسی پیشے کے ساتھ وابستہ کر دی گئی۔ یہ

ساری چیزیں رکاوٹ بنتی چلی گئیں۔ اس کے علاوہ پہلے تنخواہ بھی کم تھی نرسوں کی رہائش اور کھانے کا بھی ہر جگہ بہت مناسب انتظام نہ تھا۔ اس لیے لڑکیوں کو اس پیشہ میں اپنے لیے وہ تحفظ کا احساس، سماجی مرتبہ اور عزت نظر نہیں آئی جو ایک ٹیچر، ڈاکٹر، ٹکنیشین یا اور کسی آفس یا محکمہ میں کام کرنے والی لڑکیوں کو حاصل ہے۔ کسی دوسرے پیشہ میں ان کو زیادہ تنخواہ کے ساتھ عزت اور سماجی مرتبہ بھی زیادہ نظر آیا۔ ان حالات میں مسلمان لڑکیوں کے ساتھ شروع سے سب سے زیادہ مجبوریاں رہی ہیں۔ جیسے پردہ۔ گھر کا ماحول اور تعلیم کی کمی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے ہر ایک علاقے، ہر مذہب اور اچھے گھرانوں کی لڑکیاں اس باعزت پیشے سے فائدہ نہ اٹھا سکیں جو ان کی معاشی حالت سدھارنے کے ساتھ ساتھ خدمت خلق کی دعوت بھی دے رہا ہے۔ اس سوائے کسی مجبوری کے وہ اس پیشے میں کم ہی آئیں۔ لیکن اوپر کی تفصیل سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ اب حالات بہت بدل چکے ہیں۔ اب کافی سہولتیں میسّر ہیں۔ ان کا گریڈ بھی بڑھا دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود ابھی تک ہر ایک اسپتال میں نرسوں کی کمی ہے۔ ہر اسپتال میں ان کی ضرورت ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس پیشے میں ابھی بہت گنجائش ہے۔ اس لیے اگر ہندوستان کے ہر علاقے سے لڑکیاں اس کو اپنائیں تو ملک کی اتنی بڑی خدمت کے علاوہ ان کے لیے روزگار کا مسئلہ بھی حل ہوگا۔ جب کہ یہ پیشہ اتنا اہم اور باعزت ہے تو اسے ہر طبقہ کی لڑکیوں کو اپنانا چاہیے۔ اس سلسلے میں عوام کا تعاون بھی چاہیے۔ ہمارے معاشرے میں لوگ نرس کی خدمات کو سراہتے تو بہت ہیں لیکن اس پیشہ میں ان کو وہ بلندی، درجہ اور عزت ابھی تک نہیں دے سکے جس کی وہ مستحق ہیں۔ ایک مریض کے لیے ڈاکٹر کی جتنی ضرورت ہے نرس کی اہمیت اس سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس لیے ان کی خدمت کو بھی بھرپور عزت اور درجہ دیا جائے۔

ہمارے اسپتالوں میں نرسوں کی اس کمی کی وجہ سے مریض اور اس کے تیماردار کو بھی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ہمارا ہندوستان ایک وسیع اور عریض ملک ہے۔ جہاں ہر صوبہ میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں ان حالات میں مریض، نرس اور تیماردار کے درمیان زبان کا مسئلہ آتا ہے اور یہ ایک ایسا اہم مسئلہ ہے جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

گوڑگانواں، دلّی، لکھنؤ وغیرہ کے مریضوں کی زبان جنوبی ہند کی نرسوں کو سمجھنے میں کافی دشواری پیش آتی ہے۔ ہر مریض اتنا پڑھا لکھا نہیں ہوتا ہے کہ وہ اپنی تکلیف اور مسائل انگریزی میں بتائے اس لیے یہ نرسیں مریض کے احساسات اس کی تکلیفوں اور پریشانیوں کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔"

، وہ صرف ڈاکٹر کی ہدایات اور اپنی ڈیوٹی پر عمل کر سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہوسپٹل کوئی تفریح کی جگہ نہیں وہاں تو صرف دکھی اور تکلیف میں مبتلا لوگ ہی آتے ہیں جو ہوسپٹل میں علاج اور دوا کے ساتھ ڈاکٹر اور نرسوں کی طرف سے پوری توجہ اور ہمدردی کے طلبگار ہوتے ہیں جس سے ان کو نفسیاتی طور پر کافی تسلی اور راحت کا احساس ہوتا ہے اور وہ اپنی تکلیف میں کمی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ نرس کا ذرا سا اپنا پن اور ہمدردی مریض کو بہت تسکین دیتی ہے۔ لیکن زبان کے اس مسئلہ کی وجہ سے مریض اور اس کے تیماردار وہ تسلی اور آرام نرس کی طرف سے حاصل نہیں کر پاتے ہیں جو ان کو ملنا چاہیے بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ مریض اور نرس کے درمیان ہمدردانہ جذبات کے بجائے ان میں تلخی اور جھنجھلاہٹ کارفرما نظر آتی ہے۔ اس میں کبھی کبھی مریض کی بھی غلطی ہوتی ہے اسے بھی نرس کی ڈیوٹی اور مشکلات کو سمجھنا چاہیے۔ ان حالات میں اگر اسپتال میں اسی علاقے کی نرسیں بھی ہوں تو یہ پریشانی دور ہو سکتی ہے۔ اس کا حل یہی ہے کہ ہر صوبہ سے ہر زبان اور ہر قوم کی لڑکیاں اس باعزت پیشے کو اپنائیں۔ جب ہر قوم اور ہر زبان جاننے والی لڑکیاں صحیح تناسب سے ہر اسپتال میں آئیں گی تو اس کے بہت خوشگوار نتائج سامنے آئیں گے۔ یہ قدم اٹھانے سے مریضوں کے آرام کے ساتھ ساتھ نرسنگ کے پیشہ کو بھی بہت تقویت اور بڑھاوا ملے گا۔ وہ وقت بھی آئے گا جب نرسنگ کے پیشے کو بھی دوسرے تمام پیشوں کے برابر سمجھنے میں کوئی جھجک پیش نہیں آئے گی۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے معاشرے میں اس کو بھرپور عزت دی جائے، بڑھاوا دیا جائے۔ ان کا حوصلہ بڑھایا جائے۔ مسلمان لڑکیوں کو اس پیشہ میں ضرور آنا چاہیے۔ اور کسی بھی دوسرے پیشے کی طرح اس پیشے میں بھی پوری خود اعتمادی اور بھروسے کے ساتھ آنا چاہیے۔ ایسا کرنے کے بعد ہی اس پیشے میں لڑکیوں کو جن رکاوٹوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا سدّباب کیا جا سکے گا۔ اس سلسلہ میں اسپتال کے عملے۔ عوام اور خود نرسیں سب کا تعاون ضروری ہے۔

ہماری ہندوستانی لڑکیاں شروع سے ہی خدمت گزار، ہمدردی اور محبت کا پیکر رہی ہیں تو پھر اس خدمت میں کیوں پیچھے رہیں۔ محبت اور خدمت کا یہی جذبہ اگر سچی لگن کے ساتھ دکھی اور مریضوں کے زخم کا مرہم بن سکے تو ایک لڑکی صحیح معنوں میں نرس کے روپ میں فرشتۂ رحمت نظر آتی ہے۔ اب یہ پیشہ ملک کے کسی خاص خطّے کی لڑکیوں کے لیے مخصوص نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہر صوبہ اور ہر مذہب کی لڑکیوں کو اسے اپنانا چاہیے جس سے انھیں بھی فائدہ ہو اور مریضوں کو بھی۔



اظہر احمد کمالی

سپرنٹنڈنٹ آف ایجوکیشن، میونسپل بورڈ، سکندر آباد
ضلع بلند شہر (یو پی)

کیا ہوا کل اگر چھاؤں تاروں کی تھی، قافلے جب ہوئے تھے رواں دوستو
فرق کیا پڑ گیا، خیر سے آج بھی، ہے تو یہ دھوپ کا سائباں دوستو

یہ تو مانا کہ گلشن میں ہر موڑ پر، راہ روکے ہوئی تھی خزاں دوستو
آج تک کس کے روکے رکا ہے مگر، رنگ و نکہت کا سیلِ رواں دوستو

صبح و شامِ وطن کی دل آویزیاں، جذب کر لو نگاہوں میں وقتِ سفر
کس کو معلوم ہے دشتِ غربت میں کل، ہو ٹھکانہ ہمارا کہاں دوستو

دل پہ یہ بار سا بے سبب ہی سہی، آشیاں خیریت سے بھی ہوں گے مگر
یہ ہواؤں کے جھونکوں میں شعلے سے کیوں، یہ فضاؤں میں کیسا دھواں دوستو

یا حوادث کے سیلاب سے سیکھ لو، زندگی کا ہنر، زندہ رہنے کا فن
ورنہ پھر ڈھونڈ لو کوئی ایسی زمیں، جس زمیں پر نہ ہو آسماں دوستو

شہرِ انصاف میں قتل بھی ہم ہوئے، اور قاتل بھی ٹھیرائے جاتے ہیں ہم
سوئے مقتل چلے لے کے کاندھوں پہ ہم، آپ اپنی صلیبِ گراں دوستو

حادثے حوصلوں کو بڑھاتے رہے، جوت عزم و عمل کی جگاتے رہے
موت کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑا، آدمی ہے بڑا سخت جاں دوستو

سانس رکنے لگی، جی الجھنے لگا، اب تو آئے کہیں سے ہوائے جنوں
عقل و دانش کی شمعوں نے ماحول میں آج پھیلا دیا ہے دھواں دوستو

ہم تو آوارگانِ رہِ شوق ہیں، عیش و آرام دنیا تعاقب میں ہیں
آؤ راہِ طلب میں مٹاتے چلیں، اپنے قدموں کے سارے نشاں دوستو

اتفاقاً ملے ہیں جو اک موڑ پر، آؤ کچھ عیشِ رفتہ کی باتیں کریں
اس طرح غم کی یہ رات کٹ جائے گی، صبح دم تم کہاں، ہم کہاں دوستو

دو گھڑی کے سکوں کے لیے دربدر، اظہرِ سادہ دل مارا مارا پھرا
تم خدارا تعاقب میں اک سائے کے عمر جانے نہ دو رائگاں دوستو

شاہد میر

شعبۂ نباتات گورنمنٹ کالج،
بانس واڑہ (راجستھان)

ہم سنا بھی چکے قصۂ غم انھیں ختم ہو بھی چکی داستاں دوستو
زیرِ لب پھر بھی کتنے ہی پیغام ہیں جو ہیں محتاجِ شرح و بیاں دوستو

تیز ہواؤں کا طوفان جب بھی اٹھا سبز موسم کی سب رونقیں لے گیا
کتنے اشجار بے خال و خط ہو گئے کتنے جنگل ہوئے بے نشاں دوستو

مجھ سے پوچھو گلوں کی حقیقت ہے کیا مجھ سے پوچھو بہاروں کی قیمت ہے کیا
میرے پیروں سے رستا ہے پیہم لہو خونچکاں ہیں مری انگلیاں دوستو

اس کی محفل میں کیا گل کھلاتے بھلا اس نظر سے نظر کیا ملاتے بھلا
ایک ہی وار میں جب گنوا آئے ہم اپنا سرمایۂ جسم و جاں دوستو

کل تلک جو رہا مرکزِ سرخوشی جس کے سائے میں آباد تھی زندگی
دھوپ کھا کھا کہ اب زرد ہونے لگیں اس شجر کی ہری پتیاں دوستو

تیز تر شمعِ احساس کی لو کرو اور آگے چلو اور آگے بڑھو
گر رکو گے تو بکھرو گے پچھڑ جاؤ گے وقت ہے مثلِ آبِ رواں دوستو

آج پھر گردشِ وقت کے سامنے آرزوؤں نے شاہدؔ جمائے قدم
تند لہروں کے وار آزمانے چلیں کاغذوں کی بنی کشتیاں دوستو

سردار شفیق

تپتی دھرتی ہے، جلتا ہوا آسماں، ذرّہ ذرّہ ہے شعلہ بجاں دوستو
اس گھنے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ لو، جاؤ گے دوپہر میں کہاں دوستو
روح کا گوشہ گوشہ منور کرو، دور کر لو، ضمیروں کی تاریکیاں
میں نے اس بے یقینی کے ماحول میں کھول دی روشنی کی دکاں دوستو
شکوۂ ماندگی کی ضرورت نہیں سوچتے کیا ہو اب آنکھ مل کر اٹھو!
کارواں کے؟ بچھڑ جانے کا خوف ہے اس لیے میں نے دی ہے اذاں دوستو

سحر سعیدی
۱۷-۱۸-۱-۱۔ لوٹی کی مسجد، چیلی پورہ، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

زندگی زخم دل کی مہکتی کلی زندگی حسن غم کا بیاں دوستو
زندگی سوز ہے زندگی ساز ہے زندگی دردِ دل کی زباں دوستو

زندگی آبرو، زندگی آرزو، زندگی جستجو، زندگی رنگ و بو
زندگی آگہی، زندگی بیخودی، زندگی نیم شب کی فغاں دوستو

لوگ آتے رہے بزم سجتی رہی، رقص ہوتا رہا جام چلتے رہے
شمع جلتی رہی دل بھی جلتا رہا یہ ہے اک رات کی داستاں دوستو

دل کے مٹنے پہ آنکھیں مری نم نہیں اپنے لٹنے کا مجھ کو ذرا غم نہیں
دل سے چاہا انھیں دل سے پوجا انھیں پھر کسے فکرِ سود و زیاں دوستو

ابتدائے محبت وہ رعنائیاں، انتہائے محبت یہ رسوائیاں
نغمۂ سازِ دل سوز دل بن گیا، بات پہنچی کہاں سے کہاں دوستو

کوئی کوچہ سہی کوئی محفل سہی کوئی جادہ سہی کوئی منزل سہی
آج بھی جس طرف سے گذرتے ہیں ہم ساتھ رہتی ہیں رسوائیاں دوستو

ایک آواز آتی رہی رات بھر پاس آؤ مرے پاس آؤ سحر
صبح دیکھا تو پہلو میں تصویر تھی اور تصور کی پرچھائیاں دوستو

قاسم پورہ، مئوناتھ بھنجن

آؤ ہم لوگ اک دوسرے کے لیے حسن اور دلکشی کی ضمانت بنیں
تم ہو اک وادیِ لالہ و نسترن اور میں ایک جوئے رواں دوستو
اس بھرے شہر میں ایک بھی آدمی میرے فن کی صداقت سے واقف نہیں
میرے ہاتھوں میں ہے تیشہ ہائے ہنر لاؤ کچھ سنگ بے چہرگاں دوستو
ناموافق ہواؤں سے گھبرائیں کیا، ہم زمانے کے تیوروں سے ڈر جائیں کیا
زندگی کے مصائب کڑی دھوپ ہیں، مقصدِ زندگی سائباں دوستو

مخدوم اشرف
اشرف کلینک ۳۰ ۴۳ سی ایل روڈ
وانم باڑی ۔ ۳

غم سے ہوں گے سبکدوش کیوں اہلِ غم دہر میں ان کا ثانی کہاں دوستو
پھول ان کی طرف ہی اچھالے گئے اور بچھائی گئی کہکشاں دوستو

بوئے گل، جوشِ مے، موجِ رنگِ شفق، شبنمی صبح کے رخ پہ زرّیں کرن
ان کے جلووں کا عالم افق در افق ذکر ہے داستاں داستاں دوستو

میں ہوں صحرا نوردِ تمنا ابھی کتنے کانٹوں نے تلووں کے بوسے لیے
میری راہِ طلب میں عجب کیا اگر مجھ کو ملتے گئے گلستاں دوستو

ہر جہت سے کسی روز دیکھو مجھے اور سمجھو ہر اک زاویے سے کبھی
میں جو سمٹوں تو اک حرفِ نامعتبر، پھیل جاؤں تو اک داستاں دوستو

دیر و کعبہ سہی، بزمِ رنداں سہی، در سہی، آستانِ تصور سہی
مجھ کو ہر گام پر ہے تلاشِ سکوں اب کہیں تو ملے کچھ اماں دوستو

ہے کسی کی نگاہِ کرم کا اثر اشرف خوشنوا سطحِ احساس پر
نطق ہے گل فروشِ بہارِ چمن خامہ ہے ابرِ گوہر فشاں دوستو

قمر الزماں مبارک پوری معرفت جعفر لائبریری مبارکپور، اعظم گڈھ

ذہن رکھتے ہیں تو آتشیں فکر سے ہم رہیں کیسے دامن کشاں دوستو
تپتے سورج کے جب ساتھ رہنے لگے، سر پہ کیا رکھیں ہم سائباں دوستو
آؤ چل کر ہم اپنے خدا سے کوئی مانگ لائیں تماشا گہِ شوق بھی
رقص یک دو نفس کے لیے سی بہت تنگ ہے، وسعتِ دو جہاں دوستو
یہ ہے اک دشتِ بے سایۂ دبے شجر کون سائے کی خیرات دے گا یہاں
وقت کی دھوپ سے بچنے کے واسطے تان لو جسم کا سائباں دوستو
یہ زمیں اٹھ گئی کہ فلک جھک گیا، یا مرا قد ہی پہلے سے کچھ بڑھ گیا
اب چلوں بھی تو کیسے زمیں پر چلوں سر سے چھونے لگا آسماں دوستو
کر کے میرے حوالے غمِ بیکراں، یہ نہ سوچا ابھی میں چھلک جاؤں گا
کوزۂ دل میں رکھتا ہوں، کیا جانو تم؟ سو سمندر کی گہرائیاں دوستو
خوف ہے تم سے اس باخبر دور کا اعتبارِ بصیرت نہ ہو جائے کم
ادھ کھلی کھڑکیوں سے نہ دیکھا کرو، ہے غزل کا افق بیکراں دوستو

طرحی غزلیں

میکش بدایونی
بیت الحبیب۔ بدر باغ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میری واماندگی دیکھ کر تم مجھے چھوڑ کر جا رہے ہو کہاں دوستو
راہ کے پیچ و خم کون بتلائے گا کون منزل کا دے گا نشاں دوستو
صوت یا حرف ہی پر نہیں منحصر ترجمانی کے کچھ اور پہلو بھی ہیں
کوئی سمجھے تو ہے خامشی بھی صدا بے زبانی بھی ہر اک زباں دوستو
کہکشاں پر فلک کا اجارا نہیں، اپنی دھرتی بھی آکاش بن جائے گی
آؤ! ذرّوں کو تابانیاں بخش دیں، اب زمیں پر سجے کہکشاں دوستو
اس کے روندے ہوئے انجم و کہکشاں، اس کی عظمت کا ممکن نہیں ہو بیاں
کوئی ڈھونڈے تو عرشِ بریں پر ملیں آدمی کے قدم کے نشاں دوستو
شل آغوشِ زنداں کا در ہے کھلا، کب سے دار و رسن دے رہے ہیں صدا
حق کی خاطر بہا کر تو دیکھو ذرا خون جاتا نہیں رائگاں دوستو
غم کو اپناؤ، تنہائیاں مانگ لو بھر لو جی بھر کے دامن میں محرومیاں
فطرتِ زیست میں ہے تلوّن بہت جانے پھر ہو نہ ہو مہرباں دوستو
ظرفِ میکش ہے ماضی کی اک داستاں پاسِ آدابِ رندی کسی کو نہیں
آج کیوں میکدہ میں بھلا دی گئیں وہ روایاتِ پیرِ مغاں دوستو

بزمی بھارتی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ایم یو مارکیٹ، علی گڑھ

کس قدر ہیں طربناک و جاں آفریں عزمِ محکم کی رعنائیاں دوستو
پھول اگلتی ہے کہسار کی گود میں تیشۂ کوہکن کی زباں دوستو
پیار کی بات جب پڑی ہے تو پھر امتیازِ من و تو نہ باقی رہے
ایک ہی جام سے آؤ ہم تم پئیں ختم ہو شورشِ این و آں دوستو
صبحِ کاشی کی ضو، بوئے شامِ اودھ، گنگا جمنی پرندے اڑیں ہر طرف
میرے کمرے کی سب کھڑکیاں کھول دو بندشیں اب ہیں دل پر گراں دوستو
زندگی کا بھرا شہر ویراں ہوا، شور و شر ہے نہ آہٹ نہ سرگوشیاں
ایک پل کی یہ جادوگری دیکھیے بات پہنچی کہاں سے کہاں دوستو
وہ نظر آج اٹھ اٹھ کے یوں جھک گئی جیسے شاخِ گلِ تر کی انگڑائیاں
موتیوں کی طرح جھلملانے لگیں دل میں آشاؤں کی تتلیاں دوستو
ہم سمندر کی وہ تہ نشیں ریت ہیں لاکھ طوفاں اٹھے ہم نے جنبش نہ کی
ایک موجِ تلاطم بہا لے گئی فکرِ ناپختہ کی سیپیاں دوستو
بزمِ عرفاں کے ماحولِ تابندہ میں انفرادیتِ دل اجاگر ہوئی
بارِ غم کے لیے ہاتھ خود اٹھ گئے اے خوشا یہ مرا امتحاں دوستو

سلام بن رزاق
۳۸/۴ بی قریش نگر
کرلا، بمبئی ۴۰۰۰۷۰

بجوکا

جانے یہ کیا ہوتا جا رہا ہے۔ دن بدن اسے۔ جیسے کسی نے اس کے ہاتھ پیر باندھ کر کنوئیں میں پھینک دیا ہو۔ اور وہ گہری بہت گہری ڈوبتی چلی جا رہی ہو۔ ایک دم بے سہارا سی۔ وہ چیخنا چاہتی ہے مگر اس کی چیخ خود اسی کے کانوں میں گونج کر رہ جاتی ہے۔ ان بے آواز چیخوں سے اس کے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے ہیں۔ کچھ دنوں سے کسی چیز میں دل نہیں لگتا اس کا۔ جی چاہتا ہے بس چپ چاپ پڑی رہے نہ ہلے نہ ڈلے۔ نہ بولے نہ سنے۔ یہ کیسی اداسی ہے۔ جو دھیرے دھیرے اس کے وجود کے گرد مکڑی کے جالوں کی طرح تنتی جا رہی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اپنے سارے کپڑے پھاڑ ڈالے اور اپنے گرد تنے ان جالوں کو نوچ نوچ کر پھینک دے۔ کیوں ہوتا ہے ایسا؟ کیوں ہو رہا ہے آخر؟

بڑی دیر سے وہ چت لیٹی چپ چاپ چھت کو گھور رہی تھی۔ ٹھیک اس کے سر پر پنکھا گھوں گھوں، کرتا گھوم رہا تھا۔ اگر یہ پنکھا چھت کی کڑی سے نکل جائے تو؟ اس نے دیکھا کہ گھومتے پنکھے سے اس کا کچلا ہوا سر ٹنگا ہے۔ اور خون کے چھینٹے اڑ اڑ کر کے دیواروں کو رنگین بنا رہے ہیں۔

کائیں کائیں ــــ کائیں کائیں

اس نے گردن ترچھی کر کے دیکھا۔ ایک کوا گیلری کی ریلنگ پر بیٹھا چلا رہا تھا۔ وہ غور سے کوے کو دیکھنے لگی۔ کتنے دنوں بعد اسے کوا دکھائی دیا تھا اسے اپنے اندر کسی انجانے گوشے سے کوئی کلا سا پھوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ مگر دوسرے ہی لمحے کوا اڑ چکا تھا۔ اس کے اندر سر اٹھاتی وہ ننھی سی امنگ پانی کے بلبلے کی طرح ٹوٹ کر ہوا ہو گئی۔

دھوپ گیلری کی ریلنگ سے نیچے پھسل گئی تھی۔ باہر چھجے سے لٹکتے گملے میں اکلوتا گلاب کا پھول اب کچھ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس نے سویرے سوچا تھا کہ اسے توڑ کر بالوں میں لگا لے۔ پھر ٹال گئی تھی۔ وہ کیا کرے؟ کچھ بھی تو اچھا نہیں لگتا۔ نہ پہننا، نہ اوڑھنا، نہ بننا نہ سنورنا، حتیٰ کہ پھول لگانا بھی نہیں۔ ایک عجیب دم گھونٹو سی دھند مسلط رہتی ہے۔ ہر وقت ذہن پر ایسی بے نام سی دھند جیسے کریپ پر ہر منظر مزید دھندلاتا چلا جاتا ہے۔ دور کسی مل کا بھونپو چیخا۔ وہ چونک پڑی اس نے کمرے میں دیوار پر لٹکی گھڑی کی طرف دیکھا۔ "او ہو" وقت تو ہو گیا وہ کسمسائی۔

فضا کی گھٹن کچھ اور بڑھ گئی۔ دیواریں سرک سرک کر اسے دبوچ لینے کو بڑھیں چھت نیچے اتر آئی۔ اور چھت میں ٹنگا پنکھا اس کے سر میں گھرگھرانے لگا۔ اُف کتنا ناقابل برداشت ہے یہ سب۔ وہ مر کیوں نہیں جاتی؟ اس نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ اسے اپنے کمرے کا فرش دھیرے دھیرے زمین میں دھنستا ہوا محسوس ہوا کیا وہ یہاں زندہ ہی دفن ہو جائے گی؟ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

آہ، شام قریب آ رہی ہے۔ کسی ڈائن کی طرح دانت نکوستی۔ کتنا ڈرلگتا ہے اسے اب شام سے۔ جیسے شام کا اندھیرا چھتوں پر نہیں اس کے دل پر اترآتا ہو ہر روز۔ کتنی بھیانک ہوتی ہے یہاں کی شامیں۔ بھیانک، بیزارکن اور نڈھال کر دینے والی۔ شام کے ساتھ کیوں یاد آجاتی ہے اسے آج بھی ــــ رمبھاتی گائے، دم اٹھا کر دودھ پیتا بچھڑا، سرخ دوپٹے کی طرح پھولی شفق۔ پیپل پر شور مچاتی چڑیاں، سفید بگلوں کی ڈاریں، گئو دھولی سے دھندلائی پہاڑیاں، کیوں یاد آجاتا ہے یہ سب۔ کاش اسے پچھلا سب کچھ بھول جائے پر کیا اتنا سارا بھول جانا آسان ہے؟ ٹن ٹن، ٹن، ٹن،

اشوک کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ اب اٹھ جانا چاہئے۔ اگر وہ نہیں اٹھی اور اشوک نے اسے اس طرح بستر پر السائے دیکھ لیا تو وہ بہت پریشان ہوگا "کیوں طبیعت تو ٹھیک ہے؟ تمہارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟ چلو ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ پکچر چلوگی؟

کیا مصیبت ہے۔ کیوں چاہتا ہے آخر اشوک اسے اتنا۔ کتنا خیال رکھتا ہے وہ اس کا اس کے سر میں سچ مچ ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے۔ مگر وہ یہ بات اشوک سے نہیں کہے گی۔ ورنہ وہ ترنت دوڑا دوڑا جائے گا اور ڈاکٹر کو بلا لائے گا۔ یا ٹیکسی منگوا کر خود اسے ڈاکٹر کے پاس چلنے پر مجبور کرے گا۔ ہو سکتا ہے اس کا سر دبانے بھی بیٹھ جائے۔ پھر وہ لاکھ روکے نہیں سنے گا۔ اسے یاد ہے وہ کئی بار اس کی معمولی معمولی بیماری پر چھٹی لے کر اس کے پاس بیٹھ چکا ہے۔ اب تو وہ بیمار پڑنے سے ڈرنے لگی ہے۔

وہ تو اسے جھوٹ موٹ بھی ناراض نہیں کرتا۔ اسے یاد نہیں آتا کہ اشوک نے کبھی اسے روٹھنے کا موقع دیا ہو۔ کتنا جی چاہتا ہے اس کا روٹھ جانے کو جب وہ روٹھتی تھی تو گھر میں بابا اور ماں اسے کتنا مناتے تھے۔ اور اسے اس روٹھنے اور منانے میں کتنا لطف آتا تھا۔ مگر اشوک کو تو منانا ہی نہیں آتا۔ وہ اسے روٹھنے کا موقع ہی کب دیتا ہے کہ منانا پڑے وہ تو کبھی اس کی کسی بات کی مخالفت ہی نہیں کرتا۔ وہ کہے ہاں، تو ہاں۔ وہ کہے نا تو نا ــ وہ اسے چھیڑنے کے لئے بات

کو کبھی یوں ہی کہہ دیتی ہے — "آج اسے نیند آرہی ہے۔" تب اس کے بدن پر رینگتا ہوا ہاتھ نروٹھا ہٹ جاتا ہے۔ نہ غصہ نہ پھٹکار۔ نہ نوچ نہ کھسوٹ — بس ایک سپاٹ سی اشباتی تائید۔

"اچھا تو نیند آرہی ہے — سو جاؤ — کل —"

اور پھر تھوڑی دیر بعد کمرے میں خراٹے گونجنے لگتے ہیں بے ہودے خرّاٹے۔ وہ بے حد جھلا جاتی ہے، غصہ، ندامت اور ذلت سے اس کے دل کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔ اس کے جی میں آتا ہے وہ اتنے زور سے چیخ پڑے کہ پاس پڑوس والے جاگ جائیں۔ اشوک گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور وہ اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے اس کا منہ نوچ ڈالے۔ مگر وہ ایسا کچھ بھی نہیں کر پاتی۔ نہ چیختی ہے نہ چلّاتی ہے، نہ اشوک کا منہ نوچتی ہے۔ بس چپ چاپ پڑی رہتی ہے آنکھیں چھت پر گڑائے۔ گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ رات کا سناٹا اس کے کانوں میں چیختا رہتا ہے — چیختا رہتا ہے۔

"شالو——————شا——————لو——————"

ندی کے کنارے سیپیاں اور پتھر چنتے وہ کتنی دور دور نکل جاتی تھی۔ کملا پریشان ہو جاتی اور اسے پکارتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی رہتی۔

"شالو چل گھر چلیں، بہت دیر ہو گئی!"

"ٹھہر نا تھوڑی دیر، کتنا تو مزہ آرہا ہے، تجھے نہیں آتا؟"

"آتا ہے، مگر تو تو ندی کے کنارے آکر جیسے پاگل ہو جاتی ہے۔"

"ہاں رے، مجھے سچی یہاں بہت اچھا لگتا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ اگر میں مچھلی ہوتی۔ ایک چھوٹی سی مچھلی۔ پانی میں کیسا ڈبک ڈبک تیرتی۔ ندی کے اس کنارے سے اس کنارے تک۔"

"اور رات کو کہاں سوتی؟"

"چاند کی کشتی میں۔ رات کو چاند ندی میں نہانے آتا ہے نا۔ میں اس میں بیٹھ جاتی۔ اور رات بھر ندی کی خوب خوب سیر کرتی۔"

"تو تو پاگل ہے —"

کملا بڑی مشکل سے اس کی چوٹی پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اسے واپس گھر لے آتی۔ کبھی کبھی وہ دونوں ندی کے کنارے ریت پر کتنا بھاگتیں۔ ریت کے گولے بنا کر ایک دوسرے کو مارتیں، لوٹیں لگاتیں، ایک دوسرے سے لپٹتیں۔ اٹھتیں اور پھر گر جاتیں۔ ندی کے کنارے اس کا دل ہمیشہ آوارہ پنچھی کی طرح ہوا میں اڑتا رہتا۔ اور اب یہاں —————— اس نے اپنے گرد کھڑی ننگی اور سخت دیواروں پر نظر ڈالی جو چاروں جانب سے اس پر جھکی ہوئی تھیں۔ اسے لگا وہ ایک ممی ہے، ہزاروں برس پرانی مصری ممی اور یہ کمرہ ایک بہت بڑا تابوت — اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اسے اچانک لہلہاتے کھیتوں، اچھلتے جھرنوں اور گنگناتی ندیوں سے اٹھا کر یوں ان تنگ اور کڑی دیواروں میں قید کر دیا جائے گا۔ وہ تو جنگل کا پھول تھی۔ اسے گملے میں کس نے روپ دیا؟ — بے چارے گملے کا گلاب۔ اس نے باہر گملے میں کھلے گلاب کو تاسف آمیز نظروں سے دیکھا۔

اس کے گھر کے سامنے بھی ایک بگیا تھی۔ کیسے کیسے پھول کھلتے تھے اس میں۔ لال، پیلے، اودے گلابی۔ جب وہ پھول توڑنے لگتی تو بھونرے کتنا پریشان کرتے اسے۔ بار بار اس کے کانوں کے پاس گن گن کرتے رہتے۔ کالے کالے بدصورت بھونرے جب سندر سندر پھولوں کے گرد منڈلاتے تو اسے بڑا غصہ آتا۔ اسے بھونروں کی — گن گن — کبھی اچھی نہ لگی۔ شادی کی پہلی رات کو جب اشوک اس کے کان میں پھسپھسایا۔ "تم کتنی سندر ہو" تو اسے جانے کیوں ان بھونروں کی گن گن یاد آگئی تھی۔ وہ پہلی رات کو ہی سمجھ گئی تھی کہ اشوک اسے مر مٹنے کی حد تک چاہتا ہے۔ اس کے ایک اشارے پر وہ جان تک دے سکتا ہے۔ اور اب شادی ہوئے اتنے دن بیت گئے، وہ برابر اس کے کانوں میں گن گن کیے جا رہا ہے۔ کبھی کبھی ہو اس شدید چاہت کے نتیجے میں اسے اپنے آپ سے شرم آنے لگی ہے۔ اسے نہیں چاہیے ایسی چپچپی محبت جو اس کے دل کو سیراب کرنے کی بجائے ہر لمحہ خالی پن سے بھر دیتی ہے۔ وہ کیسے کہے اشوک سے کہ وہ اتنا پیار نہ کرے کہ اسے اس کا یہ چپکو پن قطعی اچھا نہیں لگتا۔ دفتر سے چھوٹ کر وہ چکر گھنی کی طرح گھومتا رہتا ہے اس کے گرد گُن گُن گن۔ شام کو جب وہ گھومنے نکلتے ہیں تو وہ راستے بھر اس کا ہاتھ پکڑے چلتا ہے، موٹروں، رکشوں اور بھیڑ بھڑکّے سے بچا بچا تا۔ جیسے وہ کانچ کی بنی ہے کہ ذرا کسی کا دھکا لگا اور ریزہ ریزہ بکھر جائے گی۔ ایک لمحے کو بھی اس کا ہاتھ نہیں چھوڑتا۔ اسے ایسا لگتا ہے جیسے وہ آج بھی سات آٹھ برس کی شالو منیا ہے اور اس کا بابا اسے گاؤں کا میلہ دکھانے لے جا رہا ہے۔

"بابا مجھے گڑیا دلاؤ نا —"

"دلائیں گے۔"

"بابا! وہ چابی والا بندر —"

"اے کھلونے والے وہ بندر کیسے دیا؟"

"بابا میری انگلی چھوڑ دو نا —"

"نہیں بیٹا، بھیڑ بہت ہے، بھٹک جاؤگی۔"

اس کی کتنی خواہش تھی کہ وہ میلے میں اکیلی گھومتی ہوئی دور تک نکل جائے۔ خوب گھومے بھٹکے اور تھک کر چور ہو جائے۔ مگر وہ اس وقت سچ مچ بہت چھوٹی تھی —— اچانک اس پر جھلاہٹ شروع ہو جاتی۔ اور وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی — اشوک ہاتھ چھوڑ دیتا۔ مگر دوسرے ہی لمحہ اس کا بازو اس کی کمر کے گرد لپٹ جاتا۔ اور وہ بے بسی سے ایک طویل سانس لے کر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتی — وہ اسے سہارا دیئے فٹ پاتھ پر چلتے لوگوں کے دھکوں، مکوں اور سڑک پر دوڑتی سواریوں سے اس طرح بچاتا بچاتا چلتا — جیسے وہ گاؤں میں کبھی کبھی بوڑھی جمنا میا کی لاٹھی پکڑے انھیں راستہ پار کراتی تھی۔ ایسے موقع پر اس کا کتنا جی چاہتا کہ کوئی تیز موٹر کار یا ٹیکسی آئے اور انھیں کچلتی ہوئی نکل جائے۔ یا کوئی چنگھاڑتی ہوئی بس انھیں گیندوں

کی طرح یوں اچھال دے کہ وہ دونوں چھٹک کر ایک دوسرے سے دور، دور، بہت دور جا پڑیں۔

وہ لوگ جب کسی ٹرین یا بس میں سفر کر رہے ہوتے تب بھی اشوک اس سے اس طرح سٹ کر بیٹھتا کہ اس کے پسینے کی بو اس کے نتھنوں سے ٹکراتی رہتی۔ اگر اتفاقاً اسے صرف بیٹھنے کی جگہ مل جاتی اور وہ کھڑا رہتا تو اسے کنکھیوں سے دیکھتی رہتی۔ وہ ایسے موقع پر کتنا مضطرب نظر آتا۔ مضطرب اور قابلِ ترس۔ پھر جیسے ہی کسی اسٹاپ یا اسٹیشن پر اس کے بغل والی سیٹ خالی ہوتی تو وہ لپک کر اس کے پاس آ بیٹھتا۔ اور ایسا ہشاش بشاش دکھائی دیتا جیسے کسی کو اس کا گمشدہ بٹوہ اچانک واپس مل جائے۔ تھیٹر میں بھی وہ اکثر کارنر والی سیٹیں ریزرو کراتا اور اسے کارنر والی سیٹ پر بٹھاتا اور جوں ہی تھیٹر میں اندھیرا ہوتا وہ اس سے اس طرح چپک کر بیٹھتا کہ وہ اس کی گرم گرم سانسیں اپنے کاندھے پر محسوس کرتی اور وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پیار سے سہلاتا رہتا اور اس کا پکچر دیکھنے کا لطف خاک میں ملتا رہتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اشوک کی اس شدید چاہ کے پیچھے اس کی محبت ہے یا اسے دوسرے مردوں سے بچائے رکھنے کی حکمت۔ وہ اس کی غیر موجودگی میں بھی ہر دم یہ محسوس کرتی رہتی کہ وہ قریب ہی کہیں بیٹھا ہزار آنکھوں سے اس کی جانب نگراں ہے۔ آخر یہ کیسا رشتہ ہے۔ جو کسی بیتال کی طرح ہر پل اس کی ہستی کا تعاقب کرتا رہتا ہے۔ یہ کیسا پیار ہے جو ہر موڑ پر بھوت بن کر ڈراتا ہے اسے۔ شادی کو ایک برس بیت گیا مگر اشوک نے اپنے ہوئے پیار میں ذرا بھی ٹھہراؤ نہیں آیا ہے۔ وہ اب روزانہ کی اس بے رس چاہت سے اکتانے لگی ہے۔ مگر اشوک اس روٹین کو اتنی پابندی سے دہراتا ہے جیسے کوئی کند ذہن بچہ اپنا رٹا ہوا سبق یاد کر رہا ہو۔

وہی صبح اٹھنا، نہانا، دھونا، ناشتہ، دفتر، شام کو واپسی۔ رات ہوتے ہی وہ روز کی طرح گھر کے کاموں سے نپٹتی رہتی۔ اور اشوک اس کے آس پاس ہی منڈلاتا رہتا۔ پھر دودھ گرم ہوتا، کپڑے بدلے جاتے۔ بستر پر لیٹ کر کسی رسالے کی ورق گردانی کی جاتی۔ اس بیچ اشوک برابر اسے پرچاتا رہتا دھیرے دھیرے سانسیں تیز ہونے لگتیں۔

پھر وہ اس کے بدن پر دھیمے دھیمے ہاتھ پھیرتا۔ جیسے اس کا بدن ریشم یا مخمل کا دوشالہ ہو۔ ایک سرد لہر اس کی شریانوں میں دوڑنے لگتی اور اپنے شوہر کا ہر لمس اس کے اندر ایک عجیب سی لجلجاہٹ بھرتا چلا جاتا۔ اس لجلجے سمندر میں ڈوبتے اتراتے اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب ٹیبل لیمپ آف ہوا اور کب وہ ایک جانے پہچانے کالے گھنے اندھیرے کے حوالے کر دی گئی۔ چڑھتی گرتی سانسوں کے درمیان جب اس کے ہوش ٹھکانے لگتے تو وہ محسوس کرتی کہ کمرے میں زیرو پاور کا بلب دھندلی دھندلی روشنی پھینک رہا ہے۔ اور فضا ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کی طرح کرب ناک ہو گئی ہے . . . .

تب جانے . . . . کیوں اسے لگتا اس کے چاروں طرف سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور وہ دو گھونٹ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کو ترس رہی ہے۔ پیاس کے مارے اس کے حلق میں کانٹے سے پڑ جاتے۔ ایک عجیب دہشت، پچھتاوے اور کراہیت سے اس کا دل کانپ جاتا اور وہ آنکھیں بند کر کے تکیے میں منہ چھپا لیتی . . . .

. . . . اس کا بدن کسی کٹے درخت کے تنے کی طرح بے جان ہو جاتا۔ اشوک دوبارہ بتی جلاتا۔ گلاس میں رکھا دودھ پیتا۔ دوسرا گلاس اسے پیش کرتا مگر وہ اس قدر تھک چکی ہوتی کہ اٹھ کر دودھ پینا تو کجا آنکھیں کھول کر دیکھنا بھی اسے دوبھر معلوم ہوتا۔ اکثر اس کے حصے کا دودھ یا تو خود اشوک پی جاتا یا سویرے تک جوں کا توں پڑا رہتا۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک سب کچھ ایک دم سوچا سمجھا، بندھا ٹکا، ایک جیسا۔ جیسے گھڑی کی سوئیاں ایک گھیرے میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی رہتی ہیں۔ ٹک ٹک ٹک ٹک۔

وہ بہت اکتا گئی ہے اس سب سے۔ کبھی کبھی تو وہ عجیب و غریب خواب دیکھنے لگتی ہے اس کا شوہر رات گئے بے حد نشے میں گھر لوٹا ہے اور جانے کس بات پر ناراض ہو کر اسے بری طرح پیٹ رہا ہے، پیٹ رہا ہے۔ اس کا بدن لہولہان ہو گیا ہے مگر سب سے زیادہ حیرانی کی بات یہ ہے کہ اتنا پٹنے کے بعد بھی وہ چیخ چلا نہیں رہی ہے، نہ اس کی آنکھ میں آنسو کی ایک بوند ہی ہے اسے اندر سے ایک عجیب سی راحت کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے پک کر ٹیس مارتا پھوڑا اچانک پھٹ جائے اور سارا مواد بہہ نکلے۔ کبھی دیکھتی ہے کہ کوئی ڈاکو اسے گھوڑے پر بٹھائے بھگائے لئے جا رہا ہے۔ اور ایک پرچھائیں سی اس کے پیچھے چیختی چلاتی دھول اڑاتی چلی آ رہی ہے۔ وہ اس پرچھائیں کو فوراً پہچان لیتی ہے۔ وہ اس کا شوہر اشوک ہوتا۔ مگر جانے کیوں اسے اشوک پر ذرا ترس نہیں آتا۔ بلکہ اشوک کی اس بے کسی اور جھنجھلاہٹ کو دیکھ کر اسے بڑی مسرت ہوتی۔ ایک عجیب سی وحشیانہ مسرت۔

مگر یہ سب خواب ہوتے۔ کبھی سوتے کے کبھی جاگتے کے۔ نہ اسے ڈاکو اٹھا کر لے جاتے ہیں نہ اشوک کسی دن نشے میں رات گئے گھر لوٹتا ہے اور روز اپنے وقت پر گھر آتا ہے۔ پھر سب اسی طرح ہونے لگتا ہے جیسا کل ہوا تھا اور اس سے پہلے والے کل ہوا تھا اور اس سے پہلے والے کل . . . . .

"شالو! سنا ہے تیرا پتی شہر کے کسی دفتر میں بابو ہے؟"

"ہاں!"

"تو بڑی بھاگیہ وان ہے ری۔ شہر بیاہ رہی ہے۔ ہم سہیلیوں کو یاد کرے گی کہ نہیں شہر جا کر؟" اور اس کے سینے میں ایک زور کی آندھی اٹھی تھی۔

"شالو، تو کچھ بول نہیں رہی ہے۔ تو نے اپنے ہونے والے پتی کو دیکھا تو ہے نا؟"

"ہاں!"

"کیسا ہے ری؟"

اس سوال کے ساتھ ہی جانے کہاں سے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا تھا اور اسے اڑا کر پیچھے بہت پیچھے ڈھکیل لے گیا تھا۔

دو برس پہلے وہ نویں جماعت میں تھی۔ اسکول کے میدان میں کبڈی کے مقابلے چل رہے تھے۔ آس پاس کے گاؤں سے بہت سے اسکولی لڑکے کبڈی کھیلنے آئے تھے۔ وہ کملا، لتا، پشپا، سب لڑکیاں اسکول کمیٹی کی جانب سے کھلاڑیوں کو ان کی پاریوں کے بعد کھٹ میٹھی گولیاں تقسیم کرنے پر مامور تھیں۔

شاید وہ دھرم پور کی ٹیم کا لیڈر تھا۔ سانولا رنگ، سیتا پھل کی بیجوں جیسی کالی چمکیلی آنکھیں، کسا ہوا کسرتی بدن اور اونچا پورا قد — کبڈی کبڈی کرتا ہوا جب وہ پالے میں داخل ہوتا، ورودھی دل میں کھلبلی سی پڑ جاتی۔ ایک بار تو وہ اپنے آنگن میں اکیلا رہ گیا تھا۔ اس کے سب ساتھی باد ہو چکے تھے۔ جب اس نے ورودھی دل پر چڑھائی کی تو اسے چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ سب کی آنکھیں اسی پر جمی تھیں۔ شالو نے سانس تک روک لی تھی۔ پھر ورودھی دل والے شور کرتے ہوئے ایک دم سے اسے جاپ بیٹھے۔ شالو کی تو ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے دیکھا کہ وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر اچھلا اور ان کے سروں پر سے گزرتا ہوا مدھیہ ریکھا پر آ گرا۔ لوگ حیرت و خوشی سے چیخ پڑے۔ ورودھی دل کے سات کھلاڑی باد ہو چکے تھے۔ اگلے تین منٹ میں کھیل کا فیصلہ ہو گیا۔ وہ آگے بڑھی۔ اس نے سب کھلاڑیوں کی ہاتھ پر ایک ایک گولی رکھی۔ اسے گولی دیتے وقت اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ گولی نیچے گر گئی۔

"او ہو چھا کرنا" کہتے ہوئے اس نے مارے گھبراہٹ کے اس کی ہتھیلی پر ایک ساتھ چار پانچ گولیاں رکھ دیں۔

"اتنی ساری؟ —"

"ہاں کھا لیجئے — آپ کو پیاس لگی ہوگی۔"

"ہاں — پیاس تو لگی ہے۔" کہتے ہوئے اس نے چاروں پانچوں گولیاں ایک ساتھ منہ میں ڈال لیں۔ اور اس کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ وہ بھی ہنس دی تھی۔ پھر شام کے تقسیم انعامات کے جلسے تک وہ اس کے آس پاس ہی منڈلاتی رہی تھی۔ وہ بھی کبھی کبھی اسے دیکھ لیتا تو مسکرا دیتا۔ بس — شام کے جلسے کے بعد کھلاڑیوں کی ٹولیاں اپنے اپنے گاؤں لوٹ گئیں۔ دھرم پور والے بھی چلے گئے — اور وہ بھی — اس کے بعد وہ اسے کبھی دکھائی نہیں دیا۔ مگر اس دن اس سوال کے ساتھ ہی جانے کیوں وہ یاد آ گیا تھا اسے۔ دھوپ میں تانبے کی طرح تمتمایا بدن، بازوؤں کی پھڑکتی مچھلیاں، ہر گھڑی مسکراتے ہونٹ، اور سیتا پھل کے بیجوں جیسی کالی آنکھیں — شادی کے بعد ایک دن اشوک اسے اپنا البم دکھا رہا تھا۔

"یہ دیکھو، یہ میرے بچپن کا فوٹو — میں کتابیں لئے اسکول جا رہا ہوں۔ اس میں پھول سونگھ رہا ہوں۔ مغل نواب کے اسٹائل میں، اس میں گھاس پر لیٹا ہوں، اس میں اپنے دفتر کے ساتھیوں کے ساتھ — اس میں باس کے ساتھ —"

"آپ نے کبھی کبڈی کھیلی ہے؟" وہ اچانک پوچھ لیتی ہے۔

"کبڈی؟"

"میرا مطلب ہے اسکول یا کالج میں کبڈی کھیلتے ہوئے کوئی فوٹو نہیں ہے آپ کا؟"

"کبڈی! بالکل نہیں —" اشوک فخر سے گردن اکڑا کر کہتا ہے۔ "مجھے شروع ہی سے پڑھنے لکھنے کے سوا کھیلنے کودنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم جانتی ہو میں بی۔ اے۔ میں پوری یونی ورسٹی میں اول آیا تھا۔"

وہ ایک دم چپ ہو جاتی ہے۔ اس دن کے بعد سے اسے اشوک کے البم میں کبھی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی۔

شادی کے بعد اشوک اور وہ پہلی دفعہ گاؤں آئے۔ شام کو وہ اسے ندی کے کنارے لے گئی۔

"یہاں میں اور میری سہیلی کملا گھٹنوں سیپیاں چنتی تھیں۔ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں اتر کر مچھلیاں پکڑتی تھیں۔ اور پھر انہیں زیادہ گہرے پانی میں چھوڑ دیتی تھیں۔ اچھا چلئے، آپ مجھے پکڑیئے۔ میں بھاگتی ہوں۔ دیکھیں آپ ریت پر کتنا تیز دوڑ سکتے ہیں۔"

اشوک اسے پکڑنے کے لئے دوڑا تو تھا مگر دس قدم دوڑنے کے بعد ہی ہانپنے لگا اور وہ ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی کھیت کی منڈیر پر پہنچ گئی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اشوک ابھی ندی کے کنارے ہی پر تھا۔ اور کچھ جھک کر تلاش کر رہا تھا شاید دوڑنے میں اس کی عینک گر گئی تھی۔ اس کے سارے جوش پر اوس پڑ گئی —

سامنے بیچ کھیت میں 'بجوکا' کھڑا تھا۔ جانے کیوں اس کے دل میں شدید خواہش اٹھی کہ اشوک کی عینک چھین کر بجوکا کو لگا دے۔ عینک لگائے بجوکا کیسا لگے گا۔؟ بغیر عینک کے اشوک عجیب لگ رہا تھا۔

اسے بجوکا کو دیکھ کر ہمیشہ بڑی ہنسی آتی تھی۔ اور جب بھی وہ کھیت کے پاس سے گزرتی، بجوکا کو ایک آدھ پتھر ضرور مارتی — اسے مزا آتا تھا بجوکا کو پتھر مارنے میں — ویسے جب پہلی دفعہ اس نے بجوکا کو دیکھا تھا تو وہ کچھ ڈر بھی گئی تھی وہ اس وقت بہت چھوٹی تھی۔

"بابا! یہ کپڑے کا آدمی کون ہے؟"

بابا نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ "اری منیا! یہ آدمی نہیں بجوکا ہے۔"

"بجوکا کیا بابا؟"

"بجوکا کھیتوں کی رکھوالی کرتا ہے منیا!"

وہ ہنس دی — "یہ کپڑے کا آدمی کھیتوں کی رکھوالی کیسے کرتا ہے بابا! یہ تو ہلتا ڈلتا بھی نہیں —"

"وہ ہلتا ڈلتا نہیں۔ مگر پرندے اور جانور اس پتلے کو دیکھ کر آدمی سمجھ کر کھیتوں سے دور رہتے ہیں۔"

تب سے جانے کیوں بجوکا کو دیکھتے ہی اس کے من میں اسے پتھر مارنے کی خواہش جاگ اٹھتی۔

(بقیہ صفحہ ۳۲ پر)

اظہر راہی

۲۔ بی ۳۔ یونی ورسٹی کیمپس اجین

زہر

بلند و بالا عمارتوں آسمان سے بات کرتی دھواں اگلتی چمنیوں اور انسانوں کے اس گنجان جنگل میں جسے شہر کہتے ہیں بڑی بھاگ دوڑ کے بعد اسے ملازمت ملی تھی جو ایک مختصر کنبے کی دو وقت کی روٹی کے لئے کافی تھی فی الحال اس سے زیادہ سوچا بھی نہ تھا۔

بیوی اور ایک بچے پر مشتمل خاندان کے لئے مکان ایک دوسرا مرحلہ تھا ان دو مہینوں میں شہر کے ایک گندے ہوٹل کے کمرے میں اس نے ایک صاف ستھرے مکان کا خواب کئی بار دیکھا تھا لیکن اس خواب کی تعبیر پورے دو مہینے گذرنے کے بعد پوری ہوئی۔ شہر کی ایک ایسی بستی میں جہاں نل کا پانی نعمت سے کم نہ تھا مکان مل گیا۔ اس نعمت کو حاصل کرنے کے لئے اس نے کس قدر بھاگ دوڑ کی تھی اس سے وہ واقف تھا یا اس کے چند ساتھی۔ اکثر بیوی کے التجا بھرے خطوط تازیانے کا اور بلّو کا معصوم چہرہ مہمیز کا کام کرتے رہے۔ اب جب ایک پکے فرش اور دیسی کویلو کی چھت کے ساتھ ایک کمرے اور دالان پر مشتمل مکان مل گیا تھا تو وہ اپنے آپ کو اپنی بنائی ہوئی جنت میں پا رہا تھا۔ صفیہ اپنی مختصر گرہستی لئے ہوئے اطلاع پاتے ہی آدھمکی بلّو اپنے بھولے ہوئے پاپا کو دیکھ کر پھولا نہیں سما رہا تھا اور کبھی کمرے اور کبھی دالان میں چہکتا پھر رہا تھا۔

ارشاد احمد نے جب سے بی اے کا امتحان پاس کیا تھا۔ خوابوں کے جزیرے میں اپنے لئے ایک دنیا بسائی تھی اور پھر دھیرے دھیرے وہ خواب بکھرتے گئے۔ خواب و خیال کے جزیرے میں حد نظر تک ریت ہی ریت پھیلتی گئی۔ سمندر کے کھارے پانی نے اس کے منہ کا مزہ کڑوا کر دیا پیاس بجھی تو خیر کیا اور بھڑک گئی اسی وقت شائد گھر والوں کو ترس آگیا اور صفیہ اس کی شریک سفر بن گئی پھر ایک رہرو کا اضافہ ہوا شائد زندگی صدیوں سے اسی طرح اس گیلی مٹی میں اپنی جڑیں پیوست کرتی چلی آرہی ہے اور نہ جانے کب تک یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔

صفیہ مذہبی ماحول کی پروردہ صبر اور شکر کی عادی حرف شکایت لب پر نہ لانے والی ہندوستان کی بہت سی بیٹیوں کی طرح ارشاد کی زندگی کا جزو بن گئی اور بلّو دن بھر کی تھکن بھلانے کے لئے ایک کھلونا۔ تین سال کی عمر میں اس کی توتلی زبان سے نکلے ہوئے چند الفاظ اس کے دل میں توانائی کا احساس پیدا کر دیتے جینے کا عزم اور بڑھ جاتا۔

مکان ایک ایسے محلّے میں ملا تھا جہاں آمد و رفت کے لئے سڑک سے کافی دور پیدل چل کر آنا پڑتا گندی نالیوں کے کنارے صبح سے ہی گھر کے چھوٹے اس اطمینان سے بیٹھے ہوتے جیسے موزیک کے کمرے میں صاحب لوگ کموڈ پر بیٹھتے ہیں یہ گلیاں ان کے کلب بھی تھے اور پارک بھی۔ نہ کسی کو اس پر اعتراض تھا اور نہ کوئی اس سے زیادہ کی آرزو کرتا تھا۔

مکان سے ملحق ایک کمرہ شائد مالک مکان نے کسی کو دے رکھا تھا جو پہلے اس مکان کا حصہ رہا ہوگا اس کا ثبوت ایک دروازہ تھا جو اس کمرے میں کھلتا تھا لیکن جسے کیلوں سے مضبوطی سے بند کر دیا گیا تھا اور لکڑی کی سنوں میں ٹین کے زنگ آلود ٹکڑے لگا کر روشنی کی ہر کرن کو قید کر دیا گیا تھا۔

دن بھر مختصر سامان کو سجانے اور جمانے کا کام جاری رہا اور شام سے ہی چولھے سے دھواں نکلنا شروع ہو گیا وہی دھواں جو زندگی کی علامت اور حرارت ہے۔ گلیوں میں سناٹا ہو گیا کبھی کبھی تھکے تھکے قدموں کی چاپ اس سکوت کو توڑ کر کسی فسردہ دل کی آمد کا اعلان کر دیتی رات گئے جب وہ چاپ بھی دم توڑ گئی تو ملحق کمرے کا دروازہ زوردار آواز سے کھلا آواز اتنی بلند تھی یا شائد ان کے کمرے سے ملحق ہونے کی وجہ سے ان کو ہی اس آواز کا احساس زیادہ ہوا تھا سوتا ہوا بلّو چونک گیا اور پھر کمرے میں جیسے بھونچال آگیا صفیہ خوف زدہ ہو گئی ارشاد خاموش بلا حس و حرکت ان آوازوں کو اس طرح سن رہا تھا جیسے اگر اس کے جسم نے ذرا سی بھی حرکت کی تو اس کمرے کی ہر چیز بحس نحس ہو جائے گی کچھ دیر تک چیزوں کے گرنے پڑنے کی آوازیں آتی رہیں اور پھر پلنگ پر کوئی چیز ایسی بے دردی سے گری کہ اس کی چولیں فریاد کرنے لگیں اور پھر پلنگ سے بے ہنگم اور بے سری آواز میں ایک گیت نشر ہونے لگا۔

گھٹا گھن گھور گھور مور مچائے شور

مورے سجن آجا

کافی دیر تک اس ایک فلمی مصرعہ کا ورد ہوتا رہا اور پھر دوسرا گیت چھڑ گیا۔

آنکھیاں ملا کے جیا بھرما کے چلے نہیں جانا

شائد گانے والے کو بھی دو گیت اور صرف ان کے ٹکڑے ہی یاد تھے کافی دیر تک ایک کے بعد دوسرے گیت کے ٹکڑے کی گردان ہوتی رہی۔

صفیہ اور ارشاد خاموش ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہے۔ پھر اچانک خاموشی ہو گئی اب کمرے سے صرف خراٹوں کی آواز آرہی تھی صفیہ نے سہمے ہوئے انداز میں سر اٹھا کر بلّو کو اپنی باہوں میں بھینچ لیا اور دن بھر کی تھکن اس پر غالب آگئی ارشاد کافی دیر تک خالی الذہن خلا میں کچھ دیکھتا رہا اور دھیرے دھیرے اس کی پلکیں بھی نیند سے بوجھل ہو گئیں۔

صبح پھر وہ سب کچھ شروع ہو گیا جس سے زیست کا کاروبار چلتا ہے رات کا

واقعہ پیشانی پر چند لکیریں چھوڑ گیا تھا دھیرے دھیرے وہ بھی مٹ گئیں۔ اپنا پلاسٹک کا ناشتہ دان لئے جب وہ گھر کی دہلیز پار کرنے لگا تو صفیہ کے چہرے پر خوف کے بادل سے دکھائی دیئے لیکن ارشاد بلّو کو پیار کر کے تیز تیز قدموں گلیوں کے اندھیرے سے باہر نکل آیا ایک پرائیویٹ فرم کی ملازمت میں وقت کی پابندی بہت ضروری ہے اور خاص طور پر ایک نئے کلرک کو اس کا بڑا خیال رکھنا پڑتا ہے چونکہ وہاں ترقی کا زینہ ملازمت کی مدت سے نہیں اپنی صلاحیتوں سے چڑھنا پڑتا ہے اور اپنے کام سے مالک کو مطمئن کرنا پڑتا ہے۔ دن بھر فائلوں اور رجسٹروں کے انبار میں کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ ملا۔

شام کو واپسی پر رات کے واقعہ اور صفیہ کی تنہائی کے احساس نے اس کے قدموں کو تیز کر دیا بلّو ایک غبارہ لئے دروازہ پر منتظر تھا صفیہ بھی کواڑ کی اوٹ سے لگی وقت کے دھیرے دھیرے گذرنے کی شکایت کر رہی تھی راشد کے قدموں کی چاپ سنتے ہی شرارت کے جذبے سے بدحواس ہو کر بلا وجہ چیزوں کو الٹ پلٹ کرنے لگی رات اور رات کے واقعہ کا کوئی شائبہ بھی اس کے چہرے پر نہ تھا راشد نے صفیہ کے چہرے کو پڑھ کر سکون کی سانس لی۔

بلّو نے اپنی توتلی زبان سے غبارہ کی کہانی سنائی کہ کس طرح پڑوس کے کمرے والے انکل نے اسے گنڈیریاں کھلائیں اور غبارہ لے کر دیا اور بہت سا پیار کیا۔

رات پھر پچھلی رات کی کہانی دہرائی گئی اور پھر یہ روز کا ہی معمول بن گیا۔ "گھٹا گھنگھور گھور اور آنکھیاں ملا کے" علاوہ کسی دوسرے گیت کا اضافہ نہ ہو سکا اب تو وہ لوگ دھڑکتے دروازہ کھلنے کے منتظر رہتے گیتوں کے بول سننے کا وقت دس سے گیارہ بجے کے درمیان رہتا اور پھر خاموشی۔

ایک دن گلی کے نکڑ کے پان والے نے پان دیتے ہوئے سوالیہ نظروں سے پوچھا۔

"کیوں بابو جی آپ اسی مکان میں آکر رہے ہیں جس کے ایک کمرے میں شمّو نشیلا رہتا ہے؟"

راشد کو ایک لمحے تو یہ احساس ہوا کہ شمّو کے ساتھ لگے ہوئے دم چھلّے کی وجہ سے اس کی پوزیشن بھی خطرے میں پڑ رہی ہے اور ایسے کسی شخص سے اپنی واقفیت کا اظہار اس کی بھی بدنامی کا سبب ہوگا لیکن کلرک کی فطری سادگی سے اس نے صرف "ہاں" کہنے پر ہی اکتفا کی۔

شمیم اللہ خاں عرف شمّو کارپوریشن کے کچرہ ڈھونے والے ٹرک کا ڈرائیور تھا۔ دن بھر شہر بھر کی غلاظت ڈھونے کے بعد شام کو سرکاری ٹھیکے سے ایک بوتل میں بھری ساری غلاظت اپنے پیٹ میں انڈیل کر اپنے آپ کو دنیا کا سب سے پاک صاف آدمی تصور کیا کرتا تھا وہ برسوں سے اس کوٹھری میں رہ رہا تھا۔ پابندی سے مکان کا کرایہ ادا کرتا اور پابندی سے رات میں اپنے جھلنگے پلنگ پر لیٹ کر تان سین بن جاتا اس کے ہر کام میں پابندی تھی اس محلے والوں کے بقول بوتل سے لے کر اس کے سارے کام کاج میں برسوں سے کوئی ناغہ نہیں ہوا تھا۔

دن اسی طرح گذرتے گئے۔ محلے کی کچھ عورتیں خوش گپیاں کرنے صفیہ کے پاس آنے جانے لگیں گھر سے بھی خطوط آنے لگے جس میں خیر خیریت کے علاوہ اکثر اس بات کا اصرار ہوتا تھا کہ اب تم خدا کے شکر سے اچھی ملازمت سے لگ گئے ہو۔

پہلوٹھی کا لڑکا ہے اس کا جلد سے جلد عقیقہ کر دو یہ بچہ کا صدقہ ہے اور مذہبی فریضہ ہے ضروری نہیں کہ دعوت کا اہتمام کیا جائے صرف بکرے ذبح کر کے گوشت تقسیم کر دو۔ ان خطوط کی بازگشت ہر خط میں موجود ہوتی لیکن ارشاد کے پاس تین ساڑھے تین سو روپیوں میں سے مہینہ کے آخر میں صرف اتنا ہی بچ پاتا کہ بکرا تو دور کی بات ہے گوشت کے بجائے سستی سبزی سے کام نکال پاتا کبھی کچھ پس انداز بھی ہو جاتا تو وہ گھر گرہستی کی کسی ضرورت میں ختم ہو جاتا۔

رمضان کا مہینہ شروع ہونے میں کچھ ہی دن باقی تھے دن بھر کا روزہ اور صرف شام کو یا سحری کے وقت کچھ کھانا۔ اس خیال نے راشد کے دل میں سر ابھارا کہ شاید اس طرح کچھ بچت ہو جائے۔ رمضان کا چاند دیکھتے ہی نماز سے فارغ ہو کر صفیہ نے قرآن شریف جزدان سے اتار لیا اور تلاوت شروع کر دی۔ ادھر شمّو نے اپنے وقت سے کمرے کے دروازے پر لات جمائی اور گانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر تک تو صفیہ کی آواز گھٹی گھٹی رہی اور پھر شاید جذبہ ایمانی نے اس کی آواز میں حرارت پیدا کر دی اس کی آواز بلند ہوتی گئی۔

شمّو نے جیسے اس بات کا احساس نہ تھا کہ رمضان شروع ہو چکے ہیں قرآنی آیتوں کی تلاوت سنی تو اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ اور "پھر گھٹا گھنگھور گھور" نہ رہ کر شفاف چاندنی نکل آئی آواز یک لخت بند ہو گئی۔

رمضان کے پورے مہینہ صفیہ کی تلاوت جاری رہی اور شمّو کے کمرے میں مکمل سکوت رہا۔ تلاوت ختم کر کے قرآن شریف کو چوم کر رکھتے وقت صفیہ کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ آجاتی۔

عید کا چاند دیکھتے ہی محلے میں چہل پہل بڑھ گئی رات گئے تک لوگ جاگ کر صبح کی تیاری کرتے رہے۔ شمّو کے کمرے میں بھی مدھم لالٹین ٹمٹماتی رہی۔ جب راشد بلّو کو دولہا بنائے انگلی پکڑے نماز کے لئے نکلا تو شمّو بھی سفید دھلے لٹھے کے قمیض پاجامے میں ملبوس اونٹ کے کوہان سے مشابہ ٹوپی پہنے سر جھکائے مسجد کی طرف جا رہا تھا۔

راشد کا سر فخر سے تن گیا جیسے اس کی اصلاح میں اس کی بیوی کے علاوہ اس کا بھی حصہ ہو۔ نماز سے واپسی پر صفیہ نے سوئیوں کا ایک پیالہ بھر کر راشد کو دیا اور کہا کہ وہ شمّو کو دیدے اس کے یہاں کون ہے جو اسے آج کے دن سوئیاں کھلائے گا۔ راشد نے مسکراتے ہوئے صفیہ کی طرف دیکھا اور کٹورے کو ایک طشتری سے ڈھانک کر شمّو کے گھر کی زنجیر بجائی۔

شمّو کے گھر شاید کبھی کوئی زنجیر بجانے آیا ہی نہ تھا اس نے حیرت سے دروازہ کھولا اور راشد کو کھڑے دیکھ کر گھبرا گیا لیکن سوئیوں کے پیالے نے اسے اور حیرت زدہ کر دیا شاید اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس طرح گھر پر آکر کسی نے اس طرح کی عزت افزائی کی ہو اس نے کانپتے ہاتھوں سے کٹورہ لیا اور تیزی سے اندر چلا گیا۔

شمّو کے اس عمل سے راشد بھی بوکھلا گیا۔ عید کے موقع پر گھر سے خطوط آئے اور عقیقہ کرنے کے لئے گھر والوں نے پھر تنبیہ کی تھی لیکن مہینہ بھر کی روزہ داری

کے باوجود عید کے اخراجات نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ صفیہ نے خط پڑھتے ہوئے ایک بار راشد کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں۔

رات آئی اور مہینہ بھر کی خاموشی کے بعد بے ہنگم اور بے سری آواز نے پھر گھٹا گھنگھور کی رٹ شروع کر دی۔ صفیہ نے حیرت سے بند دروازے کی طرف دیکھا شکست اور پسپائی کے احساس نے اس کے چہرے پر زردی پھیر دی۔ راشد نے بھی بے زبانی سے اس بات کا اظہار کیا کہ اس آدمی کی اصلاح ناممکن ہے۔

صبح دفتر جانے سے قبل راشد نے دیکھا کہ وہ چینی کا کٹورہ جس میں سوئیاں بھیجی گئی تھیں میلے برتنوں سے دور اوندھا پڑا تھا۔

زندگی پھر اسی ڈھب سے چلنے لگی کلرک کی زندگی میں اتار چڑھاؤ نہیں آتے وہ تو بس ایک صراط مستقیم کی زندگی ہے جس میں نہ کوئی نشیب ہے نہ فراز اور نہ کوئی مرغزار۔ گھر سے خط آتے رہے۔ محلے کے مذہبی لوگ بھی جن کی نظر بکرے کے گوشت پر تھی پہلوٹی کے لڑکے کے عقیقہ کے لئے اصرار کرتے رہے اور نصیحت کرتے رہے کہ اس مذہبی فریضے سے بچہ بہت سی بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے۔

ایک دن ان کا کہنا سچ ہی ہوا۔ جب وہ دفتر سے آیا تو بلو شدید بخار سے بھن رہا تھا صفیہ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں گھر کی دوائیں جتنی دی جا سکتی تھیں دی گئیں لیکن ان کا کوئی اثر نہ ہوا اور بلو پر بخار کی شدت سے بے ہوشی طاری ہو گئی۔ محلے کے ایک ڈاکٹر صاحب کو طلب کیا گیا انھوں نے نمونیا تجویز کیا اور کچھ انجکشن اور دوائیں دے کر چلے گئے۔ بلو کو کوئی افاقہ نہ ہوا۔

رات پھر شمو نے اپنا راگ چھیڑا اس وقت راشد میں جانے کہاں سے طاقت آگئی اور اس نے کڑک دار آواز میں خاموش رہنے کو کہا۔ شمو نے بھی اپنے پڑوسی کی اس قدر زوردار آواز پہلی بار سنی وہ سہم گیا اور آواز بند ہو گئی۔

صبح دروازہ کی زنجیر بجی۔ شمو شہر کے مشہور ڈاکٹر کو لئے موجود تھا۔ راشد نے شمو کو جو ڈاکٹر کا بیگ اٹھائے تھا دیکھا اور پھر فوراً ایک طرف ہٹ گیا شمو مع ڈاکٹر کے اندر چلا آیا۔ ڈاکٹر نے کچھ دوائیں اپنے پاس سے دیں کچھ بازار سے لانے کو کہا۔

جب فیس دینے کا موقع آیا تو ڈاکٹر نے تبلایا کہ وہ فیس تو شمو سے پہلے ہی حاصل کر چکا ہے اس عرصہ میں شمو ڈاکٹر کا پرچہ لے کر دوائیں لینے جا چکا تھا۔ راشد کا سر شرم اور ندامت سے جھکا ہوا تھا بلو تیزی سے اچھا ہونا شروع ہو گیا اور اسی تیزی سے وہ شمو سے بھی مانوس ہوتا گیا۔

صفیہ کو شمو اور بلو کی دوستی بالکل پسند نہ تھی لیکن مجبور تھی۔ بلو آنکھ اوجھل کرتا اس کے پیچھے چلا جاتا اور وہ دیکھتی رہ جاتی اور پھر بلو کے ہاتھوں اور جیبوں میں غبارے اور کھلونے ہوتے اور چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ۔

گھٹا گھن گھور پھر شروع ہو گئی تھی لیکن اب ان پر کوئی خوف اور دہشت بالکل نہ تھی بلکہ بعض اوقات یہ آوازیں نہ آتیں تو تشویش بڑھ جاتی کہ کہیں خدانخواستہ شمو میاں کی طبیعت تو خراب نہیں ہے۔

گھر کے لوگوں کو جب بلو کی علالت کا علم ہوا تو انھوں نے اس کا ذمہ دار راشد ہی کو ٹھہرایا کہ اگر اس نے عقیقہ کر دیا ہوتا تو یہ مصیبت نہ آتی۔

اس صبح جب وہ سو کر اٹھا تو گلیوں میں کچھ غیر معمولی چہل پہل نظر آئی لوگ ادھر سے ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ نکڑ کے پان والے سے پوچھ تاچھ کرنے پر معلوم ہوا کہ رات زہریلی شراب پینے سے سو کے قریب موتیں ہو چکی ہیں شمو کو بھی لوگ ہسپتال لے گئے ہیں صبح وہ اپنے بستر پر بے ہوش پڑا تھا۔ جب ہی راشد کے ذہن میں یہ بات آئی کہ رات شمو کے "گھٹا گھن گھور" میں وہ گرج چمک نہیں جس کا احساس اسے رات کو نہ ہو سکا تھا۔

دھڑکتے دل سے اس نے یہ واقعہ اپنی بیوی کو سنایا اور فوراً اسپتال بھاگا لیکن وہاں مریضوں کو کسی سے ملنے نہیں دیا جا رہا تھا۔ متاثرہ لوگوں کے رشتہ داروں عزیزوں اور دوستوں کی کافی تعداد موجود تھی ان کی آہ و بکا اس سے نہ دیکھی گئی اور جتنی آیتیں اور دعائیں اسے یاد تھیں پڑھتا ہوا بغیر ناشتہ کئے اپنے دفتر چلا گیا۔

شام کو دفتر سے واپسی پر جب اس نے دھڑکتے دل سے اپنی گلی میں قدم رکھا تو کمرے کے سامنے سفید کفن میں ملبوس شمو کی لاش تابوت میں رکھی تھی۔ راشد کے قدم لڑکھڑا گئے زبان خشک ہو گئی دروازے سے لگی صفیہ کی سسکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں بلو بھی خاموش سکتے میں کھڑا تھا۔

پولیس والے پوچھ گچھ کرنے آتے رہے اور کمرے سے اس کا دروازہ ملحق ہونے کی وجہ سے زیادہ تر سوالات کے جوابات اسے دینے پڑتے۔ کچھ بڑے آفیسر بھی آئے انھوں نے راشد سے پوچھا۔

"آپ کی ان کی کوئی رشتہ داری تو نہ تھی؟"

راشد کے اندر کے شریف آدمی نے فوراً جواب دیا۔

"جی نہیں میری ان کی کوئی رشتہ داری نہیں تھی"

آفیسر نے پھر پوچھا "کیا آپ ان کے کسی رشتے دار کو جانتے ہیں؟"

"جی نہیں میں ان کے کسی رشتہ دار سے واقف نہیں۔ جب سے میں اس مکان میں آکر رہا ہوں کسی کو ان کے یہاں کبھی آتے نہیں دیکھا۔

آفیسر نے نہایت شائستہ لہجے میں راشد سے کہا۔

"دیکھئے اگر کسی رشتہ دار کے بارے میں آپ کو معلوم ہو سکے یا کسی کو معلوم ہو تو ہم سے آکر ملے سرکار نے ان کی مالی امداد کے لئے پانچ سو روپیہ دینے کا اعلان کیا ہے۔"

راشد ساکت کھڑا رہا اور وہ آفیسر اپنا فرض پورا کر کے وہاں سے چلا گیا صفیہ خاموشی سے یہ سب کچھ دروازے کی اوٹ سے سن رہی تھی۔

رات ضرور آئی لیکن گھٹا گھن گھور نہ آئی اور نہ کسی نے کسی سے آنکھیں ملائیں وہ دونوں بہت دیر تک جاگتے رہے اور اس آہٹ اس آواز کے منتظر رہے جو معدوم ہو چکی تھی۔

بلو مخملی تخت پر حسین پریوں کے دیس کی سیر میں کھو چکا تھا صفیہ نے کروٹ بدل بلو کو اپنے سے لپٹاتے ہوئے راشد کے ساکت چہرے پر نظر کی۔ راشد نے بھی اپنی نگاہیں خلا سے ہٹا کر صفیہ کے چہرے کو دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے کو تھوڑی دیر تک اجنبی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔

(بقیہ صفحہ ۴۵ پر)

ترقی اردو بورڈ کی تازہ ترین مطبوعات

نام کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
برنارڈشا	عبدالمغنی	۴/-
فن طباعت	بلجیت سنگھ مطیر	۷/۲۵
کھاتہ نویسی اور کھاتہ داری	کیو۔ ایچ فاروقی	۱۲/-
ظہیرالدین محمد بابر	ال ایف رش بروک ولیمز / ڈاکٹر رفعت بلگرامی	۱۲/۲۵
چند عام بیماریاں	حسین فاروقی	۴/۵۰
خالص جیومیٹری اور تحلیلی جیومیٹری	محمد خواجہ محی المنان	۴/-
طبعیات	سدرشن راج د محمد منیرالدین	۶/۶۵
عقلمند مچھیرا	مرتب م۔ ندیم	۲/۲۰
اقبال کی کہانی	جگن ناتھ آزاد	۲/۵۰
دیس دیس کی کہانیاں	اطہر پرویز	۲/۲۵
ایک دن کا بادشاہ الف لیلی کی کہانیاں	اطہر پرویز	۵/۱۵
مشینی گھوڑا	اطہر پرویز	۵/-
ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ	اطہر پرویز	۵/۱۵
فٹ بال کی کہانی	راج نرائن راز	۴/-

بورڈ کی دوسری اہم کتابیں

نام کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
تاریخ فلسفۂ سیاسیات	محمد مجیب	۱۸/-
لسانی مطالعے	گیان چند جین	۱۲/۵۰
تاریخ دستور انگلستان	سید علی حسن	۶/-
زبان اور قواعد	رشید حسن خاں	۱۷/-
تاریخ تعلیم ہند	ایس نوراللہ اور جے پی نائک / مسعود الحق	۲۰/-
ہندوستانی معیشت	الک گھوش / محمد خلیق	۲۷/۲۵
ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں	کنور محمد اشرف / قمرالدین	۱۸/۲۵
جدید ہندوستان میں ذات پات	ایم این سری نواس / شہباز حسین	۱۰/-
حیدر علی	نریندر کرشن سنہا / اقتدار حسین صدیقی	۱۷/-
طبعیات کے بنیادی تصورات	آرتھر بیزر / احمد وکیل جعفری	۲۵/-
ارضیات کے بنیادی تصورات	ڈی او بروچیف / ڈاکٹر ساجد حسین	۲۲/-
انقلاب ۱۸۵۷	پی سی جوشی / ایس ایل گوہر	۱۴/۷۵
اردو املا	رشید حسن خاں	۳۷/-

نام کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
مجموعۂ نغز	مرتب۔ پروفیسر محمود شیرانی	۵۰/-
فرہنگ آصفیہ چار جلدوں میں مکمل سٹ	مولوی سید احمد دہلوی	۱۵۰/-
شہیدان آزادی	ڈاکٹر پی این چوپڑا / بھگوت سنگھ	۲۴/-
خسرو شناسی	مرتبہ: ڈاکٹر ظ انصاری۔ ابوالفیض سحر	۱۷/۵۰
	ڈی لکس	۲۷/-
پچے خف	ڈاکٹر ظ انصاری	۱۱/-
تالستائی	ڈاکٹر محمد یٰسین	۹/۲۵
پوشکن	ڈاکٹر ظ انصاری	۱۲/-
شریمد بھگوت گیتا	حسن الدین احمد	۴/۷۵
ہمارا جسم	اکرام احمد	۳/۲۵
چڑیاں	سلطانہ آصف فیضی	۳/-
چراغ کا سفر	سید محمد ٹونکی	۱/۵۰
سب کے باپو	سلطانہ آصف فیضی	۰/۵۵
ادب کسے کہتے ہیں	اطہر پرویز	۲/-
خط کی کہانی	غلام حیدر	۲/۷۵
پیسے کی کہانی	غلام حیدر	۳/-
حاتم طائی کا قصہ	ڈاکٹر نورالحسن نقوی	۲/۵۰
اچھی چڑیا	شفیع الدین نیّر	۳/-
بچوں کی نظمیں	جگن ناتھ آزاد	۲/-
للی پٹ کا سفر	م۔ ندیم	۲/۲۵
چار درویشوں کا قصہ	ڈاکٹر نورالحسن نقوی	۳/۲۵
بچوں کے نہرو	ایم چلاپتی راؤ / پریم نرائن	۷/۵۰
پنچ تنتر کی کہانیاں	کے شیوکمار / اطہر پرویز (۴ حصوں میں مکمل سٹ)	۲۴/۲۵
مہاگری	ہیم لتا / حفظ الکبیر پرواز	۳/۷۵
سجاتا اور جنگلی ہاتھی	شنکر / ایس ایم شاہنواز	۴/-
بھکاری راجہ	کے شیوکمار / ساحر ہوشیارپوری	۱/۵۰
جانور اور ان کے بچے	این این مجمدار / پرتاب چکرورتی	۲/۲۵
ہری اور دوسرے ہاتھی	شنکر / پریم نرائن	۴/-
ناگ متی	ساوتری / سلمیٰ اجمیری	۳/-
چندر دیو	ہیم لتا / کشور سلطان	۳/-

اپنے آرڈر کے لیے لکھیں | **بیورو فار پروموشن آف اردو** ویسٹ بلاک ۸، آر کے پورم، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۲

عبدالقادر ادیب
۱۰/۶، صالح احمد بلڈنگ
انفینٹری روڈ۔ بنگلور

غریبوں کی قانونی امداد

دو سو سال کی مسلسل غلامی نے ہندوستان کو مردِ بیمار بنا دیا تھا۔ افلاس و فرقہ پرستی ناسور بن گئے تھے۔ نظام جاگیرداری و زمینداری نے غریبوں کے مقدر پر مہر لگا دی تھی۔ وہ کبھی مقدمہ بازی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ چپ چاپ استحصال کو گوارا کرتے رہے۔ شخصی حقوق و شخصی آزادی کا تصور خواب و خیال بن گیا تھا،

آزادی کے بعد جب ہمارا ملک پارلیمانی جمہوریہ بنا تو دستور نے ہر شہری کے ہاتھوں میں شخصی حقوق و شخصی آزادی کے تحفظ کا پروانہ دیدیا۔ حالیہ دستوری ترمیمات نے ملک کی صورت حال بدل دی۔ اب سوشلسٹ سماج کا تصور ٹھوس حقیقت بن گیا ہے۔ یہ نہ صرف دستور کی تمہید میں تبدیلی کا کرشمہ ہے بلکہ دستور ہند میں جگہ جگہ تبدیلی کا معجزانہ اثر ہے جس سوشلسٹ سماج کی تعمیر کی نشاندہی کی گئی ہے چنانچہ دفعہ ۳۹ الف نے غریبوں کو مفت قانونی امداد دینے پر زور دیا ہے جس کی رو سے مرکزی حکومت نے غریبوں کو مفت قانونی امداد کی اسکیم کو زیادہ مؤثر اور کارکرد بنا دیا ہے۔

اس ملک کو افلاس و تنگ دستی کے رنگ سے نجات دلانے کے لئے قانون ساز حکیموں نے دفعہ ۲۱ میں یہ علاج تجویز کیا ہے کہ ہر شہری کے جان و مال کا تحفظ کیا جائے۔ ایک اور مجرب نسخہ دفعہ ۱۵ میں بتایا گیا ہے وہ یہ کہ ہر ریاست کو پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ محض مذہب، نسل، جنس، مقام اور زبان کی بنیاد پر کسی قسم کا امتیازی سلوک نہ کرے، گویا سماجی انصاف کا وہ خوشگوار تصور دیا جس سے سماج میں اونچ نیچ کے فرق کو یکسر ختم کر دیا۔ دفعہ ۴۶ نے پست و مفلس و نادار طبقوں کی فلاح و بہبود پر زور دے کر اشتراکی سماج کی تعمیر کی جانب رہنمائی کی ہے دفعہ ۲۲ کے تحت گرفتار شدہ افراد کو بھی اپنے بچاؤ کا حق دے کر دادرسی کا پورا پورا موقعہ فراہم کرا دیا ہے۔ دفعہ ۳۰ کے تحت ہر شہری کے حقوق کا تحفظ کیا۔ دفعہ ۴۱ میں روزگار کی فراہمی، تعلیم کی سہولتیں، ضعیفوں اور اپاہجوں کی امداد کو لازمی قرار دیا۔ دفعہ ۴۶ میں کمزور اور پس ماندہ طبقات کے مفادات کے تحفظ کی بھرپور ضمانت دی تاکہ کسی عنوان سے ان طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کا استحصال نہ کیا جائے۔

دستور کے تحت رٹ کا جو حق دیا گیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ مظلوموں کو فوری دادرسی ملے اور غریب طبقہ فائدہ اٹھا سکے چونکہ غریبوں کو مفت قانونی امداد کی سہولت نہ ملنے کی وجہ سے خاطر خواہ اس قانون سے مستفید نہ ہو سکے۔ اب صورتحال بدل گئی ہے۔ ملک میں مرکزی حکومت کی توجہ اور بار کونسل آف انڈیا کی خصوصی دلچسپی کی وجہ سے غریبوں کو مفت قانونی امداد دینے کا جذبہ بیدار ہو گیا ہے۔ بالخصوص نوجوان وکلا پیش پیش نظر آتے ہیں۔ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ غریبوں کو مفت قانونی امداد دینے کے سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ مقدمات کی جانچ پڑتال نوجوان وکلا سے کرائی جائے بعد ازاں تجربہ کار وکلا خود ہی عدالتوں میں مقدمات کی پیروی کریں نیز طریقہ کار کا تعین کریں کہ مقدمات کو کس ڈھنگ سے چلایا جائے۔

یہاں لا کمیشن کی چودھویں رپورٹ کا حوالہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ لا کمیشن نے غریبوں کو قانونی امداد دینے پر اس قدر زور دیا ہے کہ مرکزی حکومت کو ریاستوں سے بالآخر مشورہ کرنا پڑا لیکن ریاستی حکومتوں نے فنڈ کی کمی کے باعث اس مسئلے کی جانب توجہ دینے سے مجبوری ظاہر کی۔ حالاں کہ یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ غریبی دور کرنے کے پروگراموں میں یہ بھی ضروری ہے کہ غریبوں کو مقدمہ بازی سے بچایا جائے۔ انھیں مفت قانونی امداد دے کر ان کے شخصی مفادات کا تحفظ کیا جائے ورنہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ کیونکہ اصول قانون اور نظام انصاف کا جو موجودہ تصور ہے اس کی بنیاد مساوی حق پر رکھی گئی ہے اس کے برعکس اگر کوئی شخص غربت و افلاس کی وجہ سے قانون کا سہارا نہ لے سکے اور وہ بے بس ہو جائے، تو یہ انصاف کے نظام کا المیہ ہوگا۔

چنانچہ غریبوں کو مفت قانونی امداد دینے کا احساس پیدا ہو گیا ہے، اس خصوص میں بار کونسل آف انڈیا کی خدمات لائق ستائش ہیں اس نے وکیلوں کے لئے یہ لازمی قرار دیا ہے کہ وہ سال میں کم سے کم تین غریبوں کے مقدمات کی مفت پیروی کریں۔ اس اخلاقی تحریک سے طبقہ وکلا میں خدمت کے جذبہ کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی ہے اس تحریک کا یہ اثر ہوا ہے کہ وکلا بلا معاوضہ غریبوں کے مقدمات کی مفت پیروی کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں۔

عدالتوں کے طریقہ کار میں تبدیلی لانے کے سوال پر غور کیا گیا تاکہ مقدمات کی جلد یکسوئی ہو جائے اور انصاف میں تاخیر نہ ہو۔ بلا تاخیر انصاف ہی جمہوریت کی جان ہے اور عوام کے لئے باعث رحمت ہے، جس سے ہر طبقہ یکساں فیضیاب ہوتا ہے ورنہ انصاف دولت کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ ناانصافی کا تصور اس قدر بھیانک و اذیت ناک ہے کہ سماج کا توازن برقرار نہیں رہ سکتا بالخصوص نادار اور کمزور طبقوں کے لئے زندگی بدترین لعنت بن جاتی ہے — ناانصافی جمہوریت کے مزاج کے منافی ہے۔

(بقیہ صفحہ ۳۰ پر)

عارف سہیل
ذاکر حسین انجینیرنگ کالج
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بیوی

"شادی کرلو، ساری بیماریاں دور ہو جائیں گی۔" ڈاکٹر کی رائے تھی۔

"اب بس کرو شادی ورنہ کوئی لڑکی گھاس نہیں ڈالے گی": دوستوں کا مشورہ تھا۔

"میری امیدوں پہ پانی مت پھیرو، بہو لے آؤ اور مجھے ارمان نکالنے دو": ماں کی خواہش تھی۔

"کوئی حسین سی پری ڈھونڈو اور شادی کرلو، عشق کے سارے خیالی پلاؤ حقیقت بن جائیں گے": دل کی آواز تھی۔

"ہرگز شادی نہ کرنا، ساری خواہشات دھری رہ جائیں گی۔ وہ آٹے دال میں پھنسو گے کہ لکھنا تو لکھنا پڑھنے کا وقت نہ ملے گا۔ سارے شاعرانہ خیالات غیر ملوث زندگی کے نیچے دب کر رہ جائیں گے": عقل کا مشورہ تھا۔

مگر نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے، حماقت ہو ہی گئی، عقل ہر چند ٹوکتی رہی مگر ہم بقیہ سب کے جھانسے میں آگئے اور شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر بات صرف فیصلہ تک ہی رہتی تو خیر کوئی مضائقہ نہ تھا کہ اچھا مشغلہ ہاتھ آیا تھا مگر اصل حماقت یہ ہوئی کہ شادی واقعی ہو گئی جس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔ اور شاید زندگی بھر بھگتیں گے۔ ایسا نہیں کہ ہم کسی زلفِ گرہ گیر کے اسیر تھے، یا کسی نازنین کے عشق میں مبتلا تھے۔ جب وفا نکلی اور ہمارے پلّے کوئی اور بلا پڑ گئی۔ اس کی نوبت تو یوں نہ آپائی کہ ہم آج تک کسی کے عشق میں مبتلا ہی نہیں ہوئے۔ ویسے ہو ضرور سکتے تھے مگر ہمارا ذاتی خیال ہے کہ ہم کچھ زیادہ ہی شریف واقع ہوئے ہیں اور دوسرے کچھ موقع بھی نہ ملا۔ گو کہ اس قابل ہم ضرور تھے کہ لڑکیاں ہم پر جان دیتیں۔ (اور ممکن ہے کچھ نے اس بارے میں سوچا بھی ہو کیونکہ ہم نے اکثر راہ چلتے لڑکیوں کو اپنی طرف گھورتے پایا ہے۔) مگر کسی سے اتنی شناسائی ہی نہ ہونے پائی جو عشق میں تبدیل ہو پاتی۔ اب ظاہر ہے کہ بیچارییاں راہ میں دامن تو پکڑنے سے رہیں۔

بہر حال تو جب ہم نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو اتنی عقلمندی البتہ کی کہ دل کی رائے پر عمل کرنا شروع کیا اور ایک بیوی کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے اور اس میں ایسے محو ہوئے کہ پڑھائی لکھائی سب الماری میں رکھ دی (ہمارا گھر چونکہ نئی طرز کا تھا اس لئے اس میں طاق کا وجود نہ تھا۔) اگر اس ابتدا کو ہی دیکھ کر سنبھل جاتے تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ مگر ہم پر تو وہ جنون سوار تھا کہ دن ہو یا رات سوائے بیوی کے خوابوں کے کچھ اور دکھائی ہی نہ دیتا۔ سارے کالج میں مشہور ہو گیا کہ ہم دیوانگی کی طرف بڑی تیز رفتاری سے گامزن ہیں۔ بیوی کی تلاش نے کام سے بیزاری پیدا کی نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری ملازمت مستقل ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ایک بار پھر عقل نے زور مارا اور ہم نے اعلان کر دیا کہ جب تک ملازمت مستقل نہیں ہو جاتی ہم شادی نہ کریں گے۔ مگر وائے قسمت، اس کا جواب بزرگوں کی طرف سے یہ ملا کہ فقط بیوی کی غیر موجودگی ہی ہمارے آڑے آئی۔ اور یہ طے ہے کہ ہو نہ ہو ہم صرف بیوی کی قسمت سے ہی مستقل ہو پائیں گے۔ ہماری عقل سے اس دلیل کا جواب بن نہ آیا۔ جس کی بنیاد ان عقائد پر تھی جو ہماری بھی گھٹی میں ملائے گئے تھے۔

ہماری تلاش اور دوستوں کی مدد رنگ لائی، بڑی کوششوں کے بعد تین پری صورت دوشیزائیں ڈھونڈلی گئیں اور ان کے گھر کے بارے میں چھان بین شروع ہو گئی۔ ہم نے دور اندیشی سے کام لے کر ہزار بار منع کیا کہ گھر بار سے کیا لینا ہے بس کسی سے بھی بات پکی کر لی جائے۔ مگر کسی نے نہ سنا اور آخر کار اس مصیبت میں پھنسا ہی دیا جسے پچھلے زمانے کے لوگ بر دکھوا کہتے تھے (آج کل کچھ بھی نہیں کہتے بس کر لیتے ہیں) اور جس کے نام ہی سے ہمارے ذہن میں قصائی اور بکرے کی تصویر ابھرتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تینوں ہاتھ سے نکل گئیں۔ پہلی کے والد صاحب ریٹائرڈ جج تھے انھیں ہمارا مستقبل کچھ تاریک نظر آیا۔ دوسرے بزرگوار کی رائے تھی کہ لڑکا قبول صورت نہیں۔ ہماری سمجھ میں آج تک نہ آیا کہ آخر وہ کتنا خوبصورت لڑکا چاہتے تھے۔ کیا ہم سے بھی زیادہ؟ تیسرے والد صاحب کے انکار کا سبب یہ تھا کہ ہم انجنیر ہو کر شاعری کیا کرتے تھے، جو ان کے خیال میں ناکارگی کی نشانی تھی (اور ان کے بارے میں مشہور تھا کہ ڈاکیہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں۔)

ہم نے اب بھی ہمت نہ ہاری اس لئے کہ بیوی کے متعلق ہم نے حسین تصورات کا وہ انبار اکٹھا کر لیا تھا کہ تھکن کا احساس پاس نہ پھٹکتا۔ دوبارہ تلاش سے متعلق ہم سوچ ہی رہے تھے کہ والد صاحب کا حکم بجلی بن کر گرا۔ انھوں نے اپنے نالائق فرزند کے لئے نہایت وفاشعار، نیک، دیندار اور سیدھی سی لڑکی تلاش کر لی تھی۔ جو گو کہ پڑھی زیادہ نہ تھی مگر کھانا پکانا، سینا پرونا خوب جانتی تھی۔ ہم بھی خوب جانتے تھے کہ یہ ساری خصوصیات "صرف ہمیں سنانے کے لئے ہیں۔ ورنہ بات صرف اتنی تھی کہ محترمہ کے والد صاحب اور ہمارے والد بچپن میں ایک ہی لنگوٹی سے کھیلا کرتے تھے۔ مگر کیا کرتے حکم ٹالنے کی ہمت نہ تھی۔ (اب سوچتے ہیں کہ ایک حکم ٹال دیتے تو بڑی بلائیں ٹل گئی ہوتیں۔) بہر حال ماں باپ کے سارے ارمانوں اور دنیا کی ساری روایات کے ساتھ وہ رسم ادا ہو ہی گئی جسے عرفِ عام

میں سفادی کہتے ہیں اور زور پیدا کرنے کے لئے خانہ آبادی بھی ساتھ میں جوڑ دیا جاتا ہے۔

شروع شروع میں جب تک ہماری بیوی دنیا والوں کے خوف سے شرمائی سمائی سی رہیں ہم بھی کافی خوش رہے، مگر جوں ہی غیر ضروری شرم کا روایتی دور ختم ہوا، انہوں نے ہمارے سارے ارمانوں، خواہشات اور تخیلات کا قتل عام شروع کر دیا۔ سوچا تھا کہ شادی سے پہلے عشق کرنے کا تو موقع نہ ملا، اب بیوی سے جی بھر کر عشق کریں گے۔ مگر وہ تو عشق کے نام سے ایسی بدکتیں جیسے ہم نے گناہ کبیرہ کے ارتکاب کا ارادہ ظاہر کیا ہو۔ لاکھ سمجھایا کہ اس عشق میں خطرہ بھی نہیں ہے، خرچ بھی قدرے کم ہوتا ہے اور اللہ اور رسول کی بھی اجازت ہے مگر ان کا ایک ہی جواب تھا کہ عشق چاہے وہ کسی بھی قسم کا ہو، فحاشی کے زمرہ میں آتا ہے لہذا گناہ ہے۔ خیر ہم نے بغیر لفظ عشق کا استعمال کئے بھی کام چلانے کی کوشش کی۔ مگر صاحب ان کی ذہانت بھی قابل داد ہے کہ تمہید سے ہی ہمارا ارادہ تاڑ جاتیں اور وہ حربے استعمال کرتیں کہ عشق کے بھوت کو بھاگتے ہی بنتی۔ سنا تھا عورت اپنی تعریف سن کے پھولے نہیں سماتی مگر یہاں حال یہ ہے کہ ادھر ہم نے ان کی زلفوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے۔ ادھر جواب ملا" خاک اچھے ہیں، چار دن سے بال دھونے کی نوبت نہ آئی۔ کل ریٹھے لیتے آیئے گا آج کل کے صابن تو تمام خشکی پیدا کر دیتے ہیں۔" اب بھلا بتایئے ریٹھے اور صابن جیسے غیر شاعرانہ الفاظ کی موجودگی میں عشق کا موڈ برقرار رہ سکتا ہے؟ ہم نے آنکھوں کو کنول کہا تو معلوم ہوا کہ کل سے دائیں آنکھ میں کھٹک ہے، دوا لائی ہے، اور ہونٹوں کو گلاب کی پنکھڑی سے تشبیہ دی تو حکم ہوا کہ سردی کی شدت سے پھٹ رہے ہیں۔ اس لئے ویسلین چاہئے۔ ان کا کم پڑھا لکھا ہونا بھی ہماری کوششوں کی راہ میں خوب خوب آڑے بلکہ ترچھے بھی آیا۔ ایک مرتبہ ہم ان کی چال کی تعریف کر رہے تھے۔ اور مست خرام کو جنبش شاخ گل سے تشبیہ دے رہے تھے۔ کہ جواب ملا" اور آخر کیسے چلوں، سارا دن تو کام میں کولھو کے بیل کی طرح پلی رہتی ہوں۔ ٹانگیں ٹوٹ نہیں جاتیں یہی بہت ہے۔ تمام رات درد سے ہائے ہائے کرتی ہوں مگر تمہیں اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ طاقت کا کوئی ٹانک ہی لادو۔" آرزؤں کا یہ خون اور اس کے نتیجے میں جیب پر بڑھتا ہوا یہ بار ہم سے برداشت نہ ہو سکا۔ اور ہم نے اپنی عادتیں بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔

اب ہم عشق جتانے کے معاملے میں ذرا محتاط رہنے لگے۔ اور زیادہ تر خاموش ہی رہتے۔ پھر ایک نئی ترکیب ذہن میں آئی۔ سوچا کہ جیب پر بار تو یوں بھی پڑتا ہے اگر کامیاب ہو جائیں تو سودا کچھ مہنگا بھی نہیں۔ آخر آج تک کون کچھ خرچ کئے بغیر عشق کر پایا ہے۔ اس لئے اب کوشش اس بات کی شروع کی کہ وہ کسی طرح روٹھ جائیں۔ اور ہم عشق جتا کر فرمائشیں پوری کر کے منائیں کہ یہ بھی عشق ہی کی ایک شاخ ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برا ماننے کی بات پر برا ماننا انھوں نے سیکھا ہی نہیں۔ ہر چند کوشش کی مگر کیا مجال جو وہ خدا کی بندی ہماری کوششوں سے روٹھ جائے۔ ہاں خود دھوڑ ہوا تو وہ ایسی بات پر روٹھ گئیں کہ منانے کی بجائے ہم تاؤ میں بھرے سارے گھر میں غراتے پھرتے اور وہ ہماری غراہٹ سن کر ہی ٹھیک ہو جاتیں (غالباً اس خیال سے کہ کہیں غرا غرا کر ہم کاٹنے بھی نہ لگیں)۔ ایک اتوار کو ہم صبح ہی سے اس کوشش میں لگے تھے کہ کسی طرح انہیں غصہ دلایا جائے مگر وہ ہر حربہ سے صاف بچ جاتیں۔ ہم نے ان کی ناک کی برائی کی، بولیں" آپ کو شرم نہیں آتی۔ خدا کی بنائی ہوئی چیز کی برائی کرتے ہیں۔" ہم نے کالج کے لڑکیوں کے حسن کی تعریف کی وعظ ہوا" خدا کی مار ان لڑکیوں پر یوں بے پردہ اپنی نمائش کرتی پھرتی ہیں۔ آخر انسان پھر انسان ہے بہک ہی جائے گا۔ مگر آپ ذرا نظریں بچا یا ہی کیجئے۔ غیر عورت کو گھورنا گناہ ہے۔" ہم نے پینترہ بدلا اور ان کے میکے والوں میں کیڑے نکالنا شروع کئے، جواب ملا" خیر برائیوں سے کون بشر بچا ہے مگر آپ کل بھائی صاحب کو خط لکھ دیجئے کہ بال بچوں کو لے کر چند روز کو یہاں آجائیں۔ بہت دن ہو گئے دیکھے ہوئے، آپ سے تو بڑی محبت کرتے ہیں۔" لیجئے سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ اس قدر بے حس بیوی ہم نے خواب میں بھی نہ دیکھی تھی۔ قصہ مختصر ہم نے خود ہی بور ہو کر خاموشی اختیار کر لی۔

بیگم صاحبہ کے شوق بھی اس قدر نرالے ہیں کہ خدا کسی دشمن کی بیوی کو بھی نہ دے۔ مثلاً انھیں کپڑے دھونے کا شوق جنون کی حد تک ہے اور دھوبیوں کی قوم سے سخت نفرت۔ اچھے خاصے صاف ستھرے کپڑوں کو دھو دھو کر میلا کرنے میں ان کو خاص مزہ آتا ہے۔ اور پھر دعوی یہ کہ آج کل کے دھوبی سخت نالائق ہیں لوگوں کی جیب کاٹتے ہیں جب کہ وہ خود نہایت صاف کپڑے دھوتی ہیں۔ اگر کبھی شامت اعمال ہم نے ان کی دستبرد سے بچا کر کوئی قیمتی قمیص بازار میں دھلوالی تو فوز الکبیر شروع ہو گیا" آپ سے اتنی مرتبہ کہا کہ قیمتی کپڑے بازار میں نہ دھلوایا کریں۔ پتہ نہیں کون کون سے پاؤڈر لگا کر کپڑے کو کمزور کر دیتے ہیں اور پھر ملاوجہ چمکانے کے لئے کچھ مسالے لگاتے ہیں۔ جو جلد کو نقصان پہونچاتے ہیں۔ لایئے میں ابھی پھر سے دھو دیتی ہوں۔" اب لاکھ منع کیجئے وہ ایک نہیں سننے والی۔ قمیص ہاتھ سے جھپٹی اور غڑاپ سے بالٹی کے اندر، پھر جب وہ اس کی مٹی پلید کر کے صحت افزا دھلائی کے بعد لاتی ہیں تو کرۂ ارض کا کوئی باشندہ پہچان نہیں سکتا کہ یہ وہی قمیص ہے جسے ہم بازار سے چمچماتی ہوئی لائے تھے۔ اس شوق کا سب سے بڑا فائدہ جو وہ حاصل کرتیں وہ یہ ہے کہ جب بھی انہیں فرصت میں پاکر ہم نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں اور انھیں بہانہ ہاتھ آیا۔" اونہہ آپ کو جو نچلے سوجھے ہیں۔ یہاں ڈھیر سارے کپڑے پڑے ہیں دھونے کو۔" اور یہ جا اور وہ جا۔ ہم نے سراغ لگانے کی بہت کوشش کی کہ ان کے بزرگوں میں کوئی مشا دھوبی تو نہیں گزرے مگر اب تک تو کچھ پتہ نہیں چل پایا ہے۔

غرض یہ کہ کہاں تک گنائیں۔ میری بیوی تو ہر ہر لمحہ میرے ارمانوں پر وہ پانی بلکہ جھاڑو پھیرتی رہی ہیں کہ دل چھلنی اور جگر خون ہو گیا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ انھیں شکایت ہے کہ ہم ذرا یوں ہی سے واقع ہوئے ہیں کہ بیوی کی "دیکھ بھال" بھی ٹھیک سے نہیں کر پاتے۔ اب ہم کیا بتائیں کہ ہم نے انھیں دھوبن سے پری بنانے کی کتنی کوششیں کیں مگر جس کے قسمت ہی میں دھوبن

(بقیہ صفحہ ۴۵ پر)

اظہار اثر
۱۶۴۳ گلی کھاتیان روڈگران دہلی

ہماری زندگی سورج

سورج کی توانائی

توانائی ہم کئی شکلوں میں فطرت سے حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً کوئلہ۔ پٹرول بجلی وغیرہ۔ یہ سب چیزیں ہمیں توانائی دیتی ہیں۔ جس سے فیکٹریاں چلتی ہیں۔ گھروں میں فریج اور ہیٹر چلتے ہیں۔ روشنی ملتی ہے۔ غرضیکہ قدرتی ذخیروں میں پوشیدہ توانائی کو سائنس نے انسان کا غلام بنا دیا ہے اور توانائی کا یہ غلام انسان کی ہر آسائش کا خیال رکھتا ہے۔ لیکن ہر چیز کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ دنیا کی ضرورتیں اس قدر بڑھ چکی ہیں کہ کوئلہ رفتہ رفتہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ پٹرول کے ذخیرے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ اگر دنیا کی آبادی اسی طرح بڑھتی رہی تو اکیسویں صدی کے آخر تک یہ تمام ذخائر ختم ہو جائیں گے۔ اس وقت انسان کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ مستقبل میں جب توانائی حاصل کرنے کے فطرت کے سارے خزانے ختم ہو جائیں گے تو اس وقت کیا ہوگا ــــ ؟

کوئلہ نہ ہوگا تو مختلف کاموں کے لیے حرارت کہاں سے حاصل ہوگی۔ پٹرول نہ ہوگا تو ہوائی جہاز اور موٹریں کس طرح چلیں گی۔ بجلی نہ بنے گی تو فیکٹریاں کس طرح کام کریں گی۔ اور گھروں میں روشنی کیسے ہوگی۔ بجلی بنانے والی ایٹمی بھٹیاں چلانے کے لیے بھی یورانیم کی ضرورت ہوتی ہے اور یورانیم دنیا کا سب سے کمیاب ایندھن ہے۔

پھر دنیا کا کاروبار کیسے چلے گا۔ ؟

لیکن نہیں ابھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ فطرت نے توانائی حاصل کرنے کا ایک اتنا بڑا ذخیرہ ہمیں دے رکھا ہے جو ابھی لاکھوں برسوں ہمیں حرارت اور روشنی دے سکتا ہے۔

اور وہ ذخیرہ ہے سورج ــــ۔

ہمارا سورج ــــ جو ازل سے ہمیں زندگی دیتا چلا آیا ہے۔

سورج ہر سکنڈ میں تقریباً چالیس لاکھ ٹن مادے کو توانائی میں تبدیل کر کے اِدھر اُدھر بکھیر دیتا ہے۔ معمولی اندازے کے مطابق چار لاکھ اناسی ہزار ہارس پاور توانائی ایک مربع میل زمین کے حصے میں آتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سورج جتنی بھی توانائی خارج کرتا ہے اس کا صرف دو اربواں حصہ زمین تک پہنچتا ہے اس میں بھی تیس فیصد توانائی فضا میں بکھر کر جذب ہو جاتی ہے اور سطح زمین تک پہنچ پاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اب دنیا کے تمام سائنسدانوں کی نظریں سورج کی طرف لگی ہیں۔ مستقبل میں جب توانائی دینے والے زمین کے تمام ذخیرے ختم ہو جائیں گے تو سورج ہی ہماری ضرورت کے مطابق توانائی دے سکے گا۔

سوال اب یہ ہے کہ ہم سورج سے توانائی کس طرح حاصل کر سکتے ہیں اور گھروں میں استعمال کر سکتے ہیں؟ آپ نے دیکھا ہوگا کہ آتشی شیشے سے سورج کی کرنوں کو ایک مرکز پر اکٹھا کر کے کاغذ کو جلایا جا سکتا ہے ــــ چنانچہ اسی طریقہ پر ایک چولہا بنایا جا سکتا ہے جس میں محدب شیشوں کے ذریعہ کرنوں کو ایک مرکز پر اکٹھا کر کے آگ کا کام لیا جا سکتا ہے لیکن اس طریق پر توانائی حاصل کرنے میں دو خامیاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب تک سورج ہے یہ چولہا کام کر سکتا ہے۔ سورج چھپنے کے بعد بیکار ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اس طرح ہم اس توانائی کو صرف آگ کی طرح استعمال کر سکتے ہیں۔ بجلی یا پٹرول کی جگہ استعمال نہیں کر سکتے!

سنہ ۵۲-۵۳ء میں نیشنل فزیکل لیبارٹری نے سورج کی حرارت سے کام کرنے والا ایک اسٹوو نما چولہا بنایا تھا جس میں محدب شیشوں کے ذریعہ سورج کی کرنیں ایک مرکز پر ڈالی جاتی تھیں اور آگ پیدا کی جاتی تھی لیکن تکنیکی طور پر کامیاب ہونے کے باوجود یہ چولہا کاروباری اعتبار سے کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عورتیں دھوپ میں چولہا رکھ کر کوئی چیز پکانا پسند نہیں کرتیں۔ حالانکہ اس چولہے میں ایندھن کا خرچ بچ جاتا ہے۔ پھر بھی مقبولِ عام نہ ہو سکا

حال ہی میں ایسا چولہا بنانے کی ایک کوشش حیدرآباد میں بھی کی گئی ہے۔ اس چولہے میں محدب شیشوں کی بجائے چاندی کے چمکدار پترے روشنی کی کرنیں ایک نقطہ پر مرکوز کرنے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ چولہا بانس کی بنی ایک ٹوکری سے بنایا جاتا ہے جس کا قطر سوا میٹر ہوتا ہے۔ اندر چاندی کے پترے لگے ہوتے ہیں۔ تین بانس کی لکڑیاں اور ایک رسّی ہوتی ہے جس سے وہ لکڑیاں ٹوکری سے باندھی جاتی ہیں۔ اسی لیے اس چولہے کا نام "سن باسکٹ" رکھا گیا ہے۔ یہ چولہا ایک جرمن سائنسداں ڈاکٹر ایم وون اوپن (Dr. M. Von Oppen) نے تیار کیا ہے۔ جو حیدرآباد میں ایک بین الاقوامی ادارے کے تحت کام کر رہے ہیں۔ ایک بیان کے مطابق یہ چولہا سو روپے میں مارکٹ میں بک سکتا ہے۔ اس پر چالیس منٹ میں پانی کھولنے لگتا ہے دیکھنا صرف یہ ہے کہ یہ چولہا بھی عوام میں مقبول ہوتا ہے یا نہیں۔

لیکن بات صرف چولہوں کی نہیں ــــ بلکہ سورج کی توانائی کو مختلف شکلوں میں استعمال کرنے کی ہے۔ اور سورج کی توانائی کو ہر جگہ اور ہر طرح استعمال کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم کسی طرح سورج کی حرارت کو براہِ راست بجلی میں تبدیل کر سکیں

اِس توانائی کو بجلی میں تبدیل کر لیا جائے تو اس سے آگ بھی جلائی جا سکتی ہے ، فریج چلا کر برف بھی جمائی جا سکتی ہے۔ موٹریں اور فیکٹریاں بھی چلائی جا سکتی ہیں۔ غرض انسان کی ہر ضرورت پوری ہو سکتی ہے ـــــ۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا کوئی ایسا طریقہ ہے کہ سورج کی توانائی کو براہِ راست بجلی میں بدل دیا جائے؟

اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ واقعی سائنسدانوں نے ایک ایسا طریقہ دریافت کر لیا ہے جس سے سورج کی توانائی براہِ راست بجلی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

فطرت کے بانوے عناصر میں سے ایک عنصر کا نام "سلی کون" ہے۔ سلی کون کے سیل سورج کی توانائی کو براہِ راست برقی رو میں تبدیل کر دیتے ہیں اور یہ توانائی ایک بار بجلی کی شکل میں آ جائے تو اس کو ذخیرہ بنا کر محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت مصنوعی سیاروں میں بجلی حاصل کرنے کے لیے یہی "سلی کون" سیل استعمال کیے جاتے ہیں۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ سلی کون کا ایک سیل اس قدر مہنگا ہے کہ اس سے حاصل کردہ بجلی گھروں یا فیکٹریوں میں استعمال نہیں کی جا سکتی۔ مصنوعی سیاروں میں جو سلی کون سیل لگائے جاتے ہیں ان پر لاکھوں روپیہ خرچ آتا ہے اور وہ صرف اتنی بجلی بنا سکتے ہیں کہ سیارے کے آلات کام کرتے رہیں۔ مصنوعی سیارے میں لگے ہوئے سلی کون سیل ایک گھر کی ضرورت بھی مشکل سے پوری کر سکتے ہیں۔

لہٰذا اب ساری دنیا کے سائنسداں اس کوشش میں مصروف ہیں کہ سورج کی توانائی کو براہِ راست بجلی میں تبدیل کرنے کا کوئی ایسا طریقہ دریافت کریں جو اس قدر سستا ہو کہ آج کے نرخوں کے مطابق شہروں اور دیہاتوں میں بجلی سپلائی کی جا سکے۔

ہندوستانی سائنسداں بھی اس سلسلے میں دنیا کے دوسرے سائنسدانوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ ملک کی مختلف تجربہ گاہوں میں سائنسداں مختلف قسم کے تجربات کر رہے ہیں اور کامیابی کی منزل کے نزدیک ہوتے جا رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم تجربہ پونا یونیورسٹی میں نیوکلر کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کے ایک سائنسدان ڈاکٹر مہیشور شروُن نے کیا ہے۔ انہوں نے پہلی بار ایک ایسا "سولر سیل" بنایا ہے جس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کے ذریعہ بجلی صرف شہروں میں ہی نہیں بلکہ ملک کے ان دور دراز حصّوں میں بھی پہنچائی جا سکے گی جہاں بجلی کے تار اور کھمبے نہ پہنچنے کے باعث ابھی تک بجلی نہ پہنچ سکی ہے ـــــ ایک طرح سے یہ بجلی بغیر تار کی بجلی ہوگی جو سورج کی توانائی سے حاصل کی جائے گی۔

یہ "سولر سیل" بھی سلی کون کی طرح سورج کی حرارت کو براہِ راست بجلی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر مہیشور کے بیان کے مطابق کا بنایا ہوا ایک فوٹو کیمیکل وولٹائک سیل دس مائیکرو ایمپئر کا کرنٹ پیدا کر سکتا ہے۔ اس سیل میں وہ پوٹاشیم آیوڈائڈ استعمال کرتے ہیں جو سورج کی روشنی کو براہِ راست بجلی میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اِس "سولر سیل" کا باہری خول ڈھائی سینٹی میٹر لمبا اور ایک سینٹی میٹر قطر کا نلی کی شکل کا ہوتا ہے۔ جس میں تقریباً بیس ملی لٹر پوٹاشیم آیوڈائڈ بھرا ہوتا ہے اس بیرونی خول کے اندر چینی مٹی کا بنا ایک اور نلی جیسا خول ہوتا ہے جس کا قطر آدھا سینٹی میٹر ہوتا ہے اس کے اندر بھی پوٹاشیم آیوڈائڈ کا محلول بھرا ہوتا ہے جس کو سورج کی براہِ راست کرنوں سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ اور گریفائٹ کی ایک سلاخ اس سیل میں الیکٹروڈ کا کام کرتی ہے۔ اس طرح جب سیل کے بیرونی خول پر سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو اندر کا آیوڈائڈ۔ آیوڈین میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بعد میں یہ آیوڈین بھی آیوڈائڈ "ین" میں تبدیل ہو جاتا ہے اور بجلی کی رو جاری ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ سیل اعشاریہ تین وولٹ بجلی دینے والا یونٹ بن جاتا ہے۔

ایک سال کی مسلسل کوششوں کے بعد اب ڈاکٹر مہیشور اس قابل ہو گئے ہیں کہ اس سیل سے دن رات اور بادلوں میں بھی بجلی حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ سیل "سلی کون" سے بھی بہت سستا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر مہیشور آئندہ اس سیل میں چینی مٹی کے اندرونی ٹیوب کی بجائے کسی جاندار شے کے "ممبرین" یعنی جھلی استعمال کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح یہ سیل زیادہ بہتر طور پر کام کر سکے گا۔

حکومتِ ہند بھی سورج کی توانائی کو بجلی میں تبدیل کرنے کے تجربات پر کافی توجہ دے رہی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مغربی جرمنی کے تعاون سے ہندوستان میں دنیا کا پہلا بجلی گھر لگایا جانے والا ہے جس میں سورج کی حرارت کو بجلی میں تبدیل کیا جائے گا۔

یہ بجلی گھر گاؤں میں بھی آسانی سے لگائے جا سکیں گے۔ پہلا چھوٹا سا بجلی گھر ۱۹۸۱ء کے آخر تک ہندوستان میں انڈین انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنولوجی مدراس میں لگایا جائے گا۔ یہ بجلی گھر دس کلوواٹ بجلی سپلائی کرے گا۔ اس بجلی گھر سے دیہات میں آبپاشی کے پمپ۔ کنویں۔ اور کولڈ اسٹوریج بھی چلائے جا سکیں گے۔

سورج کی توانائی سے کام لینے کے سلسلے میں ہی نئی دہلی کے ایک انجینئر مسٹر جے سی کپور نے ایک روم ہیٹر تیار کیا ہے یہ آلہ دیکھنے میں کالا اور بھدا نظر آتا ہے کیونکہ ابھی یہ تجربات کی منزل میں ہے۔ یہ آلہ کسی کمرے کی کھڑکی میں لگا دیا جاتا ہے تاکہ اس پر سورج کی کرنیں پڑ سکیں۔ یہ کرنوں کو اپنے اندر جذب کر کے رات کو ان کی حرارت آہستہ آہستہ کمرے میں منتقل کرتا رہتا ہے۔ جس سے کمرہ گرم رہتا ہے۔ اس آلہ میں بھی حرارت کیمیکل کے ذریعہ ہی ذخیرہ کی جاتی ہے۔ یہ کُل آلہ ایک مربع میٹر بڑا ہوتا ہے اور حرارت کے پانچ ہزار بی۔ ٹی یونٹ ایک وقت میں اسٹور کر سکتا ہے۔ اس تجرباتی آلے پر کُل چار سو پچاس روپے خرچ آتے ہیں۔

مختصر یہ کہ سورج کی توانائی کو انسان کی آسائشوں کے لیے استعمال کرنے کے قابل بنانے کے لیے پوری دنیا میں جدّوجہد جاری ہے اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب ہر گھر میں سورج کی توانائی بجلی کی شکل میں استعمال کی جائے گی۔

زرعی پیداوار کا نیا ریکارڈ

بھارت غذائی پیداوار کے لحاظ سے خود کفیل ہو گیا ہے جون **1976** سے اناج بالکل درآمد نہیں کیا گیا۔

اناج کی **11** کروڑ **80** لاکھ ٹن پیداوار کا نیا ریکارڈ قائم ہوا ہے

ملک میں اس وقت ایک کروڑ **80** لاکھ ٹن اناج اسٹاک میں ہے۔ پہلے اتنا اسٹاک کبھی نہیں ہوا۔

1976-77 میں خام پٹ سن اور میستا کی پیداوار **65** لاکھ گانٹھوں کی پیداوار کے نشانے سے زیادہ ہونے کی توقع ہے۔ پچھلے سال اس کی پیداوار **58** لاکھ **30** ہزار گانٹھیں ہوئی تھیں۔

بھرپور فصل، اناج کی اطمینان بخش وصولی اور کافی مقدار میں اناج کے اسٹاک کی بدولت ہماری معیشت میں مزید بھاری توسیع کے روشن امکانات پیدا ہو گئے ہیں

لہو آستیں کا

شہناز کنول
۱۴۴۳/۵۵/۷ کنم وانگری
وکھرولی (ایسٹ) بمبئی - ۸۳

زندگی اگر کسی کو دینے کی چیز ہوتی تو میں اب تک دے چکا ہوتا مسلسل تکلیفوں نے مجھے شاید حواس باختہ کر دیا ہے ورنہ دُکھ تو ہر انسان کی زندگی میں کسی نہ کسی شکل میں رہتے ہی ہیں۔

دراصل جو لوگ بچپن سے دُکھ اور تکلیف میں زندگی گزارتے ہیں اُن کے لیے زندگی کی پریشانیاں شاید اتنی اہمیت نہ رکھتی ہوں مگر میرے لیے تو پھانس کا چبھنا بھی دکھ میں شامل تھا۔

مستقل پریشانیوں نے میرے سارے دم خم نکال دیے اور آج اِس تنگ و تاریک کوٹھری میں لاکر ڈال دیا۔ یہاں نہ میرا کوئی ہم درد ہے نہ غم گسار۔ پتا نہیں میں اِس کرم خوردہ دیواروں کی کوٹھری کی قسمت کو چمکا رہا ہوں یا یہ میرے مقدر کو اور تاریک بنا رہی ہے۔ میری نظریں دیوار پر ٹنگے ہوئے ایک بہت پُرانے کلینڈر کی تصویر پر جم کر رہ گئی ہیں۔ اس میں ڈوبتے ہوئے ایک جہاز کو دکھایا گیا ہے۔

دیوالی قریب ہے گلی میں بچے آتش بازی چھوڑ رہے ہیں اچانک کسی بچے نے کوئی بڑا انار چھوڑا۔ فضا کی تاریکی روشنی کے چمکیلے ذرات سے بھر گئی مگر چند لمحوں بعد پھر تاریکی چھا گئی۔ ہماری زندگی میں بھی کبھی خوشی کے انار چھوٹتے ہیں لیکن آنے والی تاریکی سے بے خبر ہم اس لمحاتی مسرت کو پا کر کتنے مست ہو جاتے ہیں اِس دھرتی سے اتنے اونچے اُٹھ جاتے ہیں کہ جب دوبارہ زمین پر آتے ہیں تو دل پھر اسی تصویر کے جہاز کی طرح ڈوبنے لگتا ہے۔

آج صبح اس آفس میں میرا دل زخمی ضرور ہوا مگر پھر سوچتا ہوں کہ اپنے پُرکھوں کے ظلم وستم کا پراشچت ہو گیا۔ اس کے باوجود میں دُکھی کیوں ہوں۔ شاید میرا دُکھ یہ ہے کہ میں زندگی میں اتنی بڑی شکست کھا گیا۔ میرا دُکھ یہ بھی ہے کہ مجھے یہ شکست بذات خود کچھ نے دی۔

یوں تو جاگیرداروں اور زمین داروں کی اولاد ہمیشہ ہی نازنخروں سے پلی بڑھی ہیں مگر میں کچھ زیادہ ہی لاڈ سے پلا۔ میں اپنے ماں باپ کے بڑھاپے کی اولاد تھا، پیروں،

فقیروں، سادھوؤں اور سنتوں کی دعاؤں کا نتیجہ تھا ورنہ وہ دونوں تو مایوس ہو ہی چکے تھے۔ میری پیدائش اُن کے لئے ایک چمتکار تھی، مجھے پاکر وہ بے انتہا خوش تھے اس لیے مجھے جو محبت ملی وہ ضرورت سے زیادہ تھی میری معمولی سی ہٹ ان کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی میں جو مانگتا وہ مل جاتا۔ جو چاہتا وہ ہو جاتا۔

ہوش سنبھالتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے باپ بہت ہی سخت گیر انسان ہیں مگر میری ماں تو ممتا و دیا کا مجسمہ تھی۔ باپ اگر آگ تھے تو ماں موم تھی اسی لیے میرے باپ کے سامنے پہنچتے ہی میری ماں پگھلنے لگتی تھی اور باپ کے ہر فرمان پر سر جھکا دیتی تھی۔ اتنا مجھے یقین ہے کہ انسان پیدائشی طور پر بُرا نہیں ہوتا اس کا ماحول اسے بناتا ہے یا بگاڑتا ہے۔ شاید اسی بنا پر آٹھ دس برس کی عمر تک میں بھی ایک معصوم دل کا مالک تھا۔ وہ واقعہ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے جس نے میرے دن رات بدل کر رکھ دیے۔

وہ دن میری تیرھویں سال گرہ سے شروع ہوا

میری تیرھویں سال گرہ بہت دھوم دھام سے منائی گئی تھی ہمارے خاندان کا دستور تھا کہ بیٹے کی تیرھویں سال گرہ پر باپ ایک مرصع چھڑی بیٹے کے ہاتھ میں دے کر قسم لیتا تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے پُرکھوں کی روایات پر چلے گا۔ یعنی تیرھویں برس میں یہ مان لیا جاتا تھا کہ بیٹا اب اِس قابل ہو چکا ہے کہ باپ کا ہاتھ بٹائے۔

میری اِس سال گرہ پر وہ سب کچھ ہوا جو میری کسی پچھلی سال گرہ پر نہیں ہوا تھا، رت جگا ہوا۔ کسی مشہور رنڈی کا ناچ ہوا، میرے باپ نے اپنے ہاتھوں سے اپنی رعیت کو کھیر پوری اور لڈو بانٹے، اس رات تو نجانے کہاں کہاں سے بڑے بڑے لوگ ہماری حویلی میں آئے۔ بڑے بڑے اچھے اچھے تحفے لے کر۔ وہ ہمارے مہمان بنے، ان کے لیے اسپیشل کھانے پکے اور ان کے لئے شراب بھی ولایتی منگوائی گئی تھی۔

مجھے اور تو کچھ پتا نہیں مگر میں بہت خوش تھا یہ سوچ کر کہ یہ اتنے اچھے اور اتنے قیمتی تحفے میرے لیے آئے ہیں اور یہ سارا مزے کا ہنگامہ میری ذات کو وابستہ ہے اور ان تمام خوشیوں کا مرکز میں ہوں۔ دو تین روز تک خوشی کے خوش گوار بوجھ سے میں دبا رہا، خوشی کا احساس کم نہ ہو پایا تھا کہ تیسرے دن میرے باپ نے اپنے کارندوں کے ساتھ مجھے لگان وصول کرنے کے لئے اس گاؤں میں بھیجا جو ہماری ملکیت میں تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں جاگیر کے کام سے گھر سے باہر جا رہا تھا۔ میری ماں نے میری آرتی آتاری اور میرے ماتھے پر چندن کا تلک لگایا میرے باپ صدر ڈیوڑھی تک مجھے چھوڑنے آئے۔ میں اپنے گھر سے باہر نکلنے کو محض تفریح سمجھ رہا تھا مگر جب اپنے ساتھ چلتے ہوئے ایک کارندے کے ہاتھ ہنٹر دیکھ کر میں نے اُس سے پوچھا "! یہ کس لیے ہے؟" تو اس نے مسکرا کر کہا۔ "کبھی کبھی اس کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے چھوٹے سرکار!" تو میں سوچ میں پڑ گیا اور پھر بعد میں مجھ کو پتا چلا کہ ہمارے کارندے زبان سے نہیں ہنٹر سے بات کرتے ہیں۔

فصل کٹ چکی تھی، میلے کھیتوں کے درمیان تنگ میڈوں پر چلتے ہوئے جب ہم گاؤں میں داخل ہوئے تو سارے کسان اپنا کام چھوڑ کر ہماری طرف دوڑے۔

پسینے میں ڈوبے ہوئے سنولائے ہوئے بدن، دبلے پتلے یہ انسان "چھوٹے سرکار! چھوٹے سرکار!" کہتے ہوئے میرے سامنے جھکتے اور پھر ہاتھ جوڑ کر مجھ کو پرنام کرتے۔ میں کچھ خوشی، تکبر اور شرمندگی و ندامت کے ملے جلے جذبات سے اُن مجبوروں کو جھکتے اور بندگی کا ثبوت دیتے دیکھتا رہا۔ اُن کے چہروں پر میرے لیے ادب و پیار کے تاثرات نمایاں تھے۔ میرا وہ تمام دن کچھ عجیب سے احساسات کے ساتھ گزرا۔ مجھے وہ کسان کبھی بہت قریب سے لگتے اور کبھی بہت دور۔ شام ہوتے ہوتے کارندوں نے لگان وصول کر لیا۔ لیکن روانگی سے کچھ پہلے معلوم ہوا کہ بھولا کسان نے لگان کی ادائگی کے لیے کچھ مہلت چاہی ہے۔ دو کارندے اسے پکڑے ہوئے لائے اس نے میرے پاؤں میں اپنا سر ڈال دیا۔ اس لمحہ بھی میں نے اپنے دل کو اس جہاز کی طرح ڈوبتا ہوا محسوس کیا تھا۔ وہ دُبلا پتلا کم زور سا بوڑھا کسان روتا اور گڑگڑاتا رہا اس کی صرف ایک ہی فریاد تھی کہ وہ لگان ایک مہینے بعد ادا کر دے گا اس نے بتایا کہ وہ گاؤں کے مہاجن کا بھی مقروض ہے۔ سچ پوچھیے تو مجھ کو اس وقت اس پر رحم آنے لگا تھا اور اس غریب کی فریاد کچھ غلط بھی نہیں معلوم ہو رہی تھی لیکن کارندوں کی سخت اور وحشت ناک صورتوں سے میں خود بھی سہم رہا تھا۔ بھولا کے آنسوؤں کی نمی میں نے اپنے پاؤں پر محسوس کی۔ میرے سارے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی میں نے گھبرا کر اپنے قدم پیچھے ہٹا لیے۔ اس نے میرے پاؤں پھر پکڑنا چاہے، میرے پیچھے کھڑے ہوئے کارندے نے اسے للکارا! "پیچھے ہٹ! کیوں سرکار کے پاؤں گندے کر رہا ہے!" دوسرے نے اشارہ کیا کہ میں اسے ٹھوکر مار دوں مگر میں کچھ اتنا سہم سا گیا تھا کہ لپک کر تانگے میں جا بیٹھا اور میں نے اپنے خیال میں اس کشش و پیچ سے اپنے آپ کو بچا لیا۔ اب مجھے صرف انسانی جسم پر ہنٹر پڑنے کی آواز آ رہی تھی۔

اور پھر ہم گھر واپس آ گئے۔ کارندوں نے نجانے میرے باپ سے کیا کہا کہ اگلی ہی صبح کو انھوں نے مجھے باغ میں بلوایا۔ جب میں پہنچا تو وہ کمر پر ہاتھ باندھے خاموش کھڑے تھے۔ میں اُن کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔ چند منٹ گزرے۔ انھوں نے مجھے گھورے دیکھا اور پھر اپنے پیروں میں پڑے ہوئے ایک پتھر پر نظریں جما کر بولے: تم اس پتھر کو اپنی ٹھوکر سے کتنی دُور پھینک سکتے ہو؟" میں نے ایک بار باپ کو دیکھا اور پھر پتھر کو۔ اور پھر ایک زوردار ٹھوکر ماری۔ پتھر کافی دُور جا پڑا۔ میرے باپ کے چہرے پر خوشی سے سرخی آ گئی وہ میری پیٹھ تھپ تھپا کر بولے: اس کے معنی ہیں کہ تم کو ٹھوکر مارنی آتی ہے!"

اور پھر سچ مچ مجھے ٹھوکر مارنی آ گئی۔ میں ہر اس چیز کو ٹھوکر مارتا جس پر میرے باپ کی نظر پڑ جاتی۔ دو تین برس میں میرا دل پتھر کی طرح سخت اور بے حس ہو گیا۔ رحم، حیا، مروت، محبت اور پیار نہ جانے دل کے کس گوشے میں سو گئے۔ دراصل میں تو ان لفظوں کے معنی ہی بھول چکا تھا۔ اب میرے باپ میری طرف سے مطمئن تھے۔

ایک دن ہمارے کارندوں نے آ کر بتایا کہ اس برس بھولا پھر لگان ادا کرنے میں آنا کانی کر رہا ہے۔ مجھے اس کی یہ بات اچھی نہیں لگی جب دوسرے تمام کاشتکار وقت پر اپنا لگان ادا کرتے ہیں تو پھر اس بھولا ہی کے بچے کو کیا ہوتا ہے۔ ہماری زمین پر کھیتی کرتا ہے اور ہمارا ہی حصّہ دیتے ہوئے اس کی جان جاتی ہے۔ اس کے متعلق میں جتنا سوچتا مجھے اتنا ہی غصّہ آتا۔ آخر میں نے حکم دیا کہ بھولا کو گاؤں سے بلوا کر ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔ اگلے ہی دن بھولا اپنے سولہ سترہ برس کے بیٹے لچھو کو لیے ہوئے آ گیا اور میرے سامنے آتے ہی حسبِ سابق میرے قدموں میں اپنی پگڑی رکھ دی اور گڑگڑ کر رونے لگا۔ میں اپنی جگہ پر خاموش بیٹھا رہا، پیچھے ہٹنے کو میرا جی نہ چاہا۔ شاید اس لیے کہ میری اَنا کو تسکین مل رہی تھی۔ لچھو چند منٹ اپنے باپ کو دیکھتا رہا اور پھر مجھ سے بولا: "سرکار! ہم بہت غریب ہیں، آپ ہم پر دَیا کریں، آپ اَن داتا ہیں آپ دَیا نہیں کریں گے تو ہم کیسے زندہ رہیں گے!" گاؤں کے اسکول میں پڑھ کر بہت بولنا آ گیا ہے۔ ہمیں سبق پڑھانے آیا ہے، یہ کہتے ہوئے میں جھنجلاہٹ کے ساتھ اُٹھا میرے تیور دیکھ کر بھولا نے اپنا سر زمین پر رکھ دیا اور پھر میرا ہنٹر لچھو کی پیٹھ پر پڑا۔ میرے دو چار وار کے بعد دُبلا پتلا لچھو زمین پر گر پڑا۔ بیٹے کو پٹتے دیکھ کر بھولا تڑپ اُٹھا اور اپنے بیٹے کو میری مار سے بچانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ اور آخر وہ اپنے بیٹے پر گر پڑا۔ اس نے اپنے بیٹے کو اپنے کمزور و لاغر وجود سے ڈھانپ کر میری مار خود کھانی شروع کر دی۔ اگرچہ ہنٹر کے دو چار وار کے بعد میرا ہاتھ رک گیا مگر میں نے پھر بھی دو چار لاتیں اس کے اور رسید کیں۔

بوڑھا بے حس و حرکت پڑا تھا۔ لچھو زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ وہ سہما ہوا ضرور تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے پیچھے نفرت بھی چمک رہی تھی۔ میں نے اس پر ایک نظر ڈالی اور پھر اس کی نظر کے ٹکراؤ سے بچتا ہوا گھر میں آ گیا۔ میرے باپ سامنے ہی کھڑے تھے۔ میں انھیں دیکھ کر چند لمحے رکا۔ انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکے سے دبایا اور پھر دالان کی طرف بڑھ گئے۔

لیکن میری ماں کی کچھ عجیب حالت تھی۔ اسے غم تھا نہ خوشی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ہزاروں آنسوؤں کا طوفان اُٹھتا ہوا دیکھا۔ میں نے اس دن بھی اس طوفان میں خود کو ڈوبتا ہوا محسوس کیا تھا۔ مگر وہ ٹھاکر خاندان کی تھی، شوہر کی آن پر جان دینے والی۔ اسی لیے وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتی رہی، لرزتی رہی اور مسکراتی رہی۔

کچھ دن بعد پتا چلا کہ بھولا کسان کسی اندرونی چوٹ کی تکلیف برداشت نہ کرتے ہوئے مر گیا۔ اس خبر پر میرے باپ کی ایک زہریلی مسکراہٹ نے میرے رہے سہے خوف اور اندیشے بھی دور کر دیے۔ اور لچھو پھر کبھی گاؤں میں دکھائی نہ دیا۔

میں کسی نہ کسی طرح ساتویں تک پڑھ سکا۔ دراصل میرا کوئی بھی اُستاد میرے باپ کے ڈر سے مجھے سبق یاد نہ کرنے پر تنبیہ نہ کرتا تھا اور میرے باپ کا بھی یہی کہنا تھا کہ زیادہ پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہے، بس زمین داری ہی تو سنبھالنا ہے، نوکری تو نہیں کرنی۔ میرے دوست بھی وہی تھے جو میری برائیوں پر واہ! واہ کرتے تھے۔

میں پچیس برس کا ہوا تو باپ نے دنیا چھوڑ دی۔ اب میں ساری جائیداد کا تنہا مالک تھا۔ میری ماں رو رو کر نجانے میرے باپ کی مکتی کے لیے پرارتھنا کرتی تھی یا اسے میرے مستقبل کے بارے میں اندیشہ تھا۔

پورا سال بھی نہیں گزرا تھا کہ سننے میں آیا کہ زمینداری ختم ہو رہی ہے۔

ایک لمحہ کو تو پاؤں تلے کی زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی، میں باپ کے مرتے ہی گھر کی نقد دولت کو تھوڑے ہی وقت میں پانی کی طرح بہا چکا تھا۔ اتنا دُکھ تو مجھے باپ کی موت کا بھی نہیں ہوا تھا جتنا دُکھ زمینداری ختم ہونے کی خبر نے دیا۔ ہمارا سب سے بڑا سہارا چھینا جا رہا تھا۔ ہم زمیندار لوگ تو کچھ کرنے کے قابل بھی نہیں تھے۔ ارد گرد نظر ڈالی تو میں نے خود کو تنہا پایا۔ نجانے کیسے اور کیوں، اس وقت میں نے سوچا کہ رعیت ہمارا ساتھ دے گی مگر بعد میں پتا چلا کہ میرے تو دوست بھی کسانوں کا اور سرکار کا ساتھ دے رہے تھے میں گھبرا کر اپنی ماں کے پاس پہنچا، وہ حسب معمول پوجا میں معروف تھی میری آنکھوں ہی سے میرا سوال پڑھ کر وہ بولی "بیٹا ظلم کو زوال ہے!" میں جھنجلا کر وہاں سے بھی چلا آیا۔

پہلے دیوان خانے کے ملازموں کی تعداد گھٹی اور پھر گھر والے بھی بوجھ معلوم ہونے لگے۔ میں نے جی پر حکومت کی تھی آج اُن کے ساتھ برابری کا سا برتاؤ کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ آخر دن رات کی پریشانیوں سے گھبرا کر شہر جانے کا ارادہ کیا۔ بس گھر میں ماں کے چند زیور بچے تھے۔ وہ آنکھ بند کر کے پوجا میں لگی رہی اور میں اُس کے زیور چُرا کر شہر آگیا لیکن شہر تو بالکل اجنبی تھا۔ سر چھپانے کو جب ذرا سی بھی جگہ نہ ملی تو زیور بیچ کر یہ کوٹھری کرائے پر لے لی اور جو پیسہ بچا وہ پیٹ کا ایندھن بن گیا۔

یہ سب کچھ چند ہی دن میں ہو گیا۔

اب میں معمولی سی معمولی نوکری کرنے کے لیے تیار تھا۔ فضا میں اڑنے والے روشن ذرات بجھ چکے تھے اور اب چاروں طرف اندھیرا تھا ایک صبح اخبار میں "چپراسی کی ضرورت ہے!" کا اشتہار اندھیرے میں روشنی بن کر چمکا۔ تفصیل پڑھی تو معلوم ہوا کہ شیڈول کاسٹ کے اُمیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔ میں نے اپنا سراپا دیکھا اپنے حلیہ پر، اپنی بے چارگی پر، بے کسی اور جہالت پر نظر ڈالی اور اپنے آپ کو اُن سے بھی کم تر پایا جن کو ترجیح دی جانے والی تھی پھر بھی مجبور تھا اس لیے عرضی دے بیٹھا۔

تین چار روز شدید انتظار رہا، پھر مایوس ہو چلا۔ مگر اچانک ہفتہ شروع ہوتے ہی بلاوا آگیا اور میں انٹرویو کے لیے اس آفس پر پہنچ گیا۔ شیشوں سے بنی عمارت میں وہ آفس تھا۔ میں ڈرتے ڈرتے اندر پہنچا۔ باہر کی تیز دھوپ سے تپتا ہوا اور جلتا ہوا داخل ہوا تو پورے وجود کو ایک لطیف سی ٹھنڈک کا احساس ہوا جیسے کٹے ہوئے جسم پر کسی نے برف کا ٹکڑا رکھ دیا ہو۔ گیلری میں پڑی ہوئی بنچ پر میں بیٹھ گیا۔ جہاں پہلے سے تین چار لڑکے خستہ حال مگر پُر اُمید چہرے لیے ہوئے بیٹھے تھے پہلے ان لڑکوں کو بلایا گیا۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ زندگی میں کسی دفتر کے صاحب کے سامنے جانے کا یہ پہلا موقع تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جانے مجھ سے کیا پوچھا جائے گا۔ آخر میرا نام پکارا گیا۔

میں آہستہ سے اُٹھا۔ دروازے تک پہنچا اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے شٹر کھولا اور اندر نظر پڑتے ہی میں اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ میرے سامنے کچھو بیٹھا تھا۔

میز پر رکھے ہوئے پیپر ویٹ کی صاف اور چمک دار سطح پر کچھو کے باپ بھولا کا چہرہ اُبھرا، مسکراتا ہوا چہرہ۔ جیسے مجھ سے کہہ رہا ہو: "میں نے اپنی پچھلی کئی پشتوں کا بدلہ لے لیا ہے!"

بقیہ ایک خیال دو شاعر

بارے میں پوچھا جاتا ہے تو ان کی کوئی خاص فرمائش نہیں ہوتی۔ اتنی تاکید ضرور کرتے ہیں کہ حوروں سے حصول تسکین ممکن نہ ہو، نہ سہی، یہ تو ہو کہ ان کی صورت دنیا کے محبوب سے ملتی جلتی ہو تاکہ اس طرح نظری آسودگی کی صورت نکل آئے۔

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

داغ اظہارِ خیال میں کچھ زیادہ بیباک ہیں۔ لیکن ان کے انداز میں سنجیدگی کا وہ وقار نہیں ہے جو غالب کی حسن پرستی کا طرۂ امتیاز ہے۔

پکارا دیکھ کر میں حور کی شکل
خداوندا یہ صورت وہ نہیں ہے

داغ محبوب کی ہم شکل حور چاہتے ہیں اور غالب ان حوروں کو بھی قبول کرنے پر آمادہ ہیں جو ان کی محبوبہ سے ملتی جلتی شکلیں رکھتی ہوں۔ مختصر یہ کہ داغ محبوبہ ہی کی شکل ڈھونڈ رہے ہیں اور غالب کا کام مشابہت سے بھی چل رہا ہے۔ داغ کے پیشِ نظر غالب کا شعر رہا ہے اور توقع یہ تھی کہ وہ اس مضمون کو غالب سے بہتر انداز میں ادا کرتے لیکن داغ صرف اپنی شوخی کا رنگ جمانے پر ہی قناعت کر گئے۔

بقیہ ——— بیوی

بنا لکھا ہو اور جو اسے اپنی خوش نصیبی سمجھے اسے ہم تو کیا کوئی بھی پری نہیں بنا سکتا رہے ہم تو ایک حماقت کا مزہ اس صورت میں چکھ رہے ہیں کہ اپنے ہی گھر میں اپنے خوابوں کو چکنا چور ہوتے دیکھتے ہیں مگر اف نہیں کر سکتے۔ لکھنا کب کا چھوڑ دیا، پڑھنے کی فرصت بھی صرف اس وقت مل پاتی ہے جب بیگم صاحبہ میکہ چلی جائیں۔ (آج کل بھی میکہ گئی ہوئی ہیں) ذہن کند ہو کر رہ گیا ہے۔ بس کبھی نہ صرف شرمندۂ تعبیر ہونے والے خواب باقی رہ گئے ہیں۔ جن سے دل بہلا لیتے ہیں۔ ہم خواب دیکھنا چھوڑ نہیں سکتے ہیں۔ اور بیگم تخریب سے باز نہیں آسکتیں۔ ان کی ضد نے ہمیں بھی ضدی بنا دیا، اور اب بقول شاعر ؎

"وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں"

والا معاملہ ہے۔ البتہ جب کبھی کبھی یخ بستہ سانس کے ساتھ یہ الفاظ ہماری زبان سے بے اختیار نکل جاتے ہیں: "اے کاش کہ ہم شادی نہ کرتے" تو ایک عجیب سا سکون حاصل ہوتا ہے۔

بقیہ زہر

صفیہ نے اس تکلیف دہ سکوت کو توڑتے ہوئے سوال کیا۔

اگر ہم رشتہ دار بن جاتے تو ——— ؟"

"تم سوچ رہی ہو شاید اس طرح ہمارا بچہ اُن دیکھی بلاؤں سے محفوظ رہتا۔"

راشد نے بات پوری کی۔

اور پھر دونوں کی سسکیاں دیر تک کمرے کی بوجھل فضا میں گھٹتی رہیں۔

نئی کتابیں

حمید الماس
پہچان کا درد
شالیمار پبلیکیشنز نیا ملک پیٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۳٦
اکتوبر ۱۹۷۴ء
صفحات ۱۲۸
قیمت :- بارہ روپے

پہچان کا درد، حمید الماس کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جس کا آغاز نظموں سے ہوتا ہے۔ نظموں کا اختصار اور جامعیت قاری کے دل پر گہرے نقوش چھوڑتی ہے۔ شاعر کے لہجے میں رچاؤ اور نرمی ہے، احساس کی شدت ہے، بیساختگی ہے، صاف اور شستہ بیان کی کھنک ہے۔ اسلوب کی شیرینی اور حلاوت نے دل پذیر کیفیت پیدا کر دی ہے، مثلاً اعتراف، مناجات، لامکاں، مشورہ، دیوار، ٹی بی، پہچان کا درد، شاید اولیں شاید آخریں اور آخری موڑ ایسی نظمیں ہیں جو قاری کے دل و دماغ پر ایک خاص کیفیت طاری کر دیتی ہیں اس مجموعے کے آخر میں "آخری نظم" تخلیق کی تڑپ اور شاعر کی بیتابیٔ ذہن کی عکاسی کرتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ الماس اپنے ذہنی سفر کی منزل کے لئے بیتاب ہیں اور اس بیتابی کی چنگاری جس شاعر اور فنکار کے دل میں روشن ہوتی ہے وہ اس کے درخشاں مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے۔

وہ غزلوں کے آئینہ خانوں میں بھی نئے آدمی کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ ع

ابھی مہر و ماہ و نجوم ہیں کسی انتظار کی داستاں
ابھی عصرِ نو کی نگاہ کو نئے آدمی کی تلاش ہے

حمید الماس نے غزلوں میں روایتی مضامین سے یکسر دامن نہیں چھڑایا ہے بلکہ اظہار و بیان میں کلاسیکی انداز اختیار کیا ہے جو شاید ان کا بنیادی شاعرانہ مزاج ہے۔ ان غزلوں میں توانا احساس اور رجائیت پائی جاتی ہے، وہ روایتی یاسیت کے شکار نہیں۔ درخشاں مستقبل کے آرزومند ہیں۔

فردا کے جلوہ ہائے درخشاں کی دیر ہے
اب ظلمتوں میں جشنِ چراغاں کی دیر ہے

اپنی دھرتی سے عشق کا اظہار بھی ان کے اشعار میں جابجا ملتا ہے۔

لو دے رہے ہیں داغِ تمنا بہ طرحِ نو — بزمِ وطن میں جشنِ چراغاں کی دیر ہے
طولِ رسن ہو زیبِ گلوئے ستم شعار — اعجازِ خاکِ خونِ شہیداں کی دیر ہے

طلوعِ صبحِ درخشاں پہ بات ٹھہری ہے
قدم قدم پہ اندھیروں کے حادثات سہی

اس مجموعے کا پیش لفظ "حرفے چند" کے عنوان سے جناب فراق گورکھپوری نے لکھا ہے جس میں حمید الماس کی نظموں کا ایک مختصر مگر جامع تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ حسنِ طباعت و کتابت کے اعتبار سے پہچان کا درد ایک اوسط درجے کی کتاب ہے۔

تنہا انصاری مرحوم
خاطرِ احباب (تنہا انصاری مرحوم کے خطوط کا مجموعہ)
مرتبہ :- فدا حسین انصاری
ناشر :- دائرۂ ادب دلنہ، بہ اہتمام ادبی مرکز کراز "کاشانۂ تنہا انصاری (مرحوم)" دلنہ (بارہ مولہ) کشمیر
اپریل ۱۹۷٦ء
صفحات :- ۲۴۰
قیمت :- پندرہ روپے

خاطرِ احباب۔ تنہا انصاری مرحوم کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ وہ کشمیری اردو زبان کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی نشاط انصاری۔ ان کے کشمیری کلام کا مجموعہ "فرات" ۱۹۷۱ء میں اور اردو کلام کا مجموعہ ۱۹۷۲ء شائع کیا۔ انھیں کی اعانت اور احباب کے تعاون سے ان کے خطوط کا مجموعہ ان کے فرزند فدا حسین انصاری نے "خاطرِ احباب" کے نام سے مرتب کیا۔ یہ مجموعہ تنہا کی زندگی کی دل گدازی، حساس فطرت اور احباب سے خلوص و محبت کی عکاسی کرتا ہے۔

تنہا انصاری، بنیادی طور پر شگفتہ مزاج شاعر، کامیاب مقرر، مزاح نگار اور ایک بیباک مکتوب نگار تھے۔ وہ ایک غیور اور خوددار انسان تھے۔ انھیں اپنی خاندانی روایات اور وقار کا بڑا خیال تھا وہ کسی سے اپنی خودی کا سودا نہیں کرتے تھے۔ اور باوجود ناساعد حالات کے انہوں نے وقت اور حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ اور اس لئے ان کے خطوط میں ایک مخصوص بے نیازی اور اس کے ساتھ ہی گداز پایا جاتا ہے، خلوص اور بے تکلفی کی گرمی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے شاعرانہ طرزِ بیان نے نثر میں بھی رنگینی ا

دلکشی بھردی ہے۔ ان کے خطوط موضوع کے اعتبار سے کافی رنگارنگ ہیں۔ کسی خط میں دوست کے بیٹے کے انتقال پر اظہارِ غم ہے تو فلسفیانہ انداز میں صبر و سکون کی تلقین بھی ہے۔

تنہا کے یہ خطوط ہمارے معاشرے کے اس ماحول سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں جس میں طبقاتی، نسلی اور خاندانی امتیازات کے پیمانے سے انسان کو ناپا جاتا ہے اور جو باوجود کوشش کے اس وقت کے پورے معاشرے کا مزاج بنا ہوا ہے۔ وہ اپنے ایک خط میں فدا حسین صاحب کے احساسِ برتری سے بہت کبیدہ خاطر ہوئے ہیں اور ان کی خودی پوری تمکنت سے ابھر کر سامنے آئی ہے۔

خاطرِ احباب کے چند خطوط بہت طویل ہیں جو فن خطوط نگاری کی حدود کو پار کر جاتے ہیں۔ کہیں کہیں خطابت بھی جھلکتی ہے اور کہیں کہیں انشائیے کا رنگ بھی پیدا ہو گیا ہے اس کے باوجود کچھ خطوط ایسے بے تکلف اور بے ساختہ بھی ہیں جن میں قاری کھو جاتا ہے اور کیف حاصل کرتا ہے۔

بہرحال "خاطرِ احباب" ایک ایسا آئینہ ہے جس سے نہ صرف تنہا مرحوم کی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں بلکہ کشمیر کا علمی و ادبی ماحول اور سماجی پس منظر بھی ابھر کر مصور ہو جاتا ہے۔

کتابت و طباعت کے اعتبار سے "خاطرِ احباب" کافی صاف ستھری کتاب ہے اور سرورق بھی دیدہ زیب ہے۔ (شہریار پرواز)

شبنمستان
مصنف :۔ تنہا انصاری
مرتب :۔ نشاط انصاری
قیمت :۔ چار روپے
صفحات :۔ ۲۰۰
ملنے کا پتہ :۔ کاشانۂ تنہا انصاری دلنہ (بارہ مولہ) جموں و کشمیر

ریاستی کلچرل اکاڈمی کی مالی امداد سے شائع کی گئی ہے یہ کتاب وادئ کشمیر کے مشہور شاعر و انشا پرداز مرحوم تنہا انصاری کے مجموعۂ کلام پر مشتمل ہے جسے ان کے چھوٹے بھائی جناب نشاط انصاری نے ان کی موت کے بعد مرتب کیا ہے

نشاط انصاری صاحب نے زیر تبصرہ مجموعہ کلام مرتب کر کے ایک اچھا کام انجام دیا ہے جس سے تنہا مرحوم کا کلام محفوظ ہو گیا ہے۔

ہم ایک ہیں
عرش ملسیانی
صفحات ۲۴۸
قیمت دس روپے
ناشر :۔ پبلیکیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات و نشریات،
پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

قومی یکجہتی کے موضوع پر لکھی گئی زیر تبصرہ کتاب کی ابتدا میں ملکی اتحاد و یکجہتی کے تاریخی اور ثقافتی پس منظر کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد مشترکہ تہذیب اور قومی اتحاد کی مظہر اردو زبان کی ترقی و ترویج میں ہندوستان نے جو خدمات انجام دی ہیں اس کا ذکر نمایاں طور پر کرنے کے ساتھ ساتھ بنگلہ زبان کی ترقی میں مسلمانوں کی خدمات کا ذکر مجملاً کر دیا گیا ہے اسی طرح موسیقی، رقص، مصوری، فن تعمیر، میلوں اور تہواروں میں قومی یکجہتی کے عناصر و عوامل کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

ان کے علاوہ قومی یکجہتی کے مبلغوں اور مصلحوں کے مختصر حالات اور اقوال بھی درج کیے گئے ہیں۔ جس سے کتاب کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ یہ کتاب ایک اہم ضرورت کو بھی پورا کرتی ہے۔

یہ ہندوستان
شیلادھر
قیمت دس روپے
صفحات ۱۹۳
ناشر :۔ پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

اس باتصویر کتاب میں سادہ اور سہل زبان میں بچوں کو ہندوستان کی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ تاریخی معاشی اور سماجی حالات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اور انھیں بڑے دلچسپ انداز میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس ملک کی دنیا میں کیا اہمیت ہے۔

عمدہ کتابت و طباعت اور رنگین تصاویر سے مزین یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے بچوں کے لئے ضرور خریدنا چاہیئے۔

نوابی دربار
مصنف : نواب سید محمد آزاد
مرتب :۔ مشتاق احمد
قیمت :۔ پندرہ روپے
صفحات :۔ ۱۰۸
ناشر :۔ ارشد پبلیکیشنز ۴ استیہ صالح لین کلکتہ

"نوابی دربار" سید محمد آزاد کا طبع زاد ڈراما ہے جنھوں نے بیشمار فرضی ناموں سے، لوفر کلب، سوانح عمری مولانا آزاد، اور خیالاتِ آزاد، ایسی متعدد ادبی تصانیف سے اردو ادب کے خزانے کو مالا مال کیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ خورشید کو پارسی تھیٹر کا پہلا ڈراما قرار دیا گیا لیکن یہ طبع زاد نہیں بلکہ گجراتی سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ لہٰذا نوابی دربار

کو اردو کے اولین ڈراموں میں شامل کیا جاسکتا ہے جن کے مطبوعہ نسخے موجود ہیں، یہ تخلیق مدتوں سے نایاب تھی اور اب جناب مشتاق احمد نے اسے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے اور ساتھ ہی بڑی محنت و کاوش سے سید محمد آزاد کے حالات و کوائف فراہم کر کے اس کی اہمیت و افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

ادبی اقدار
دور آفریدی
قیمت: تین روپے
ناشر: اردو ریسرچ اکاڈمی گھیر عثمان رام پور

"ویرانیاں" "شخصیتیں" اور "نذرِ وطن" کے بعد دور آفریدی صاحب کا زیر تبصرہ مجموعہ منظر عام پر آیا ہے۔ دس مضامین پر مشتمل اس مجموعے کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں لسانیات سے متعلق مضامین "اردو املا اور چند تجاویز" "اردو تلفظ اور کچھ نئی آسار" "اردو اردو رسم خط کی برتری"، دوسرے حصے میں "دیوان غالب بخط غالب چند شبہات" "اور کیا انہوں نے جگر سے اصلاح لی تھی؟" ایسے تحقیقی مضامین — تیسرے حصے میں "اردو شعراء اور جنگِ آزادی" اور چوتھے حصے میں نظام رام پوری مجروح اور راجہ مہدی علی خاں پر تنقیدی مضامین شامل ہیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دور صاحب ادب کی مختلف اصناف سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایسے مضامین مختلف موضوعات سے دلچسپی پیدا کرانے میں مفید ثابت ہوتے ہیں۔

سچے الفاظ
ہمراہ بارہ مولوی
قیمت تین روپے
صفحات ۸۰
ناشر:- ہمراہ بارہمولوی مکان نمبر ۳۹ محلہ سید کریم صاحب،
بارہ مولہ کشمیر

زیر تبصرہ کتاب کے مصنف گورنمنٹ ڈگری کالج بارہ مولہ کشمیر میں کیمسٹری کے لیکچرار ہیں اور شاعری ان کا مشغلہ ہے۔ اور چونکہ ہمراہ صاحب کمسٹری کے لیکچرار ہیں اس لئے ان کی شاعری میں انگریزی الفاظ اور سائنسی اصطلاحوں کا استعمال بہت زیادہ کیا گیا ہے۔ کتابت اور طباعت غنیمت ہے۔

شعر اور شاعر
مرتب: ضیا فتح آبادی
قیمت: پانچ روپے
صفحات ۱۴۰

شعر اور شاعر، بزم سیماب دہلی کی اولین پیشکش ہے اور اس میں بیشتر ان شعراء کا ذکر ہے جو بزم سیماب سے متعلق ہیں یا ان کی کارروائیوں میں شریک رہے ہیں۔ اس تذکرے میں شعراء کا کلام اور ان کی تصاویر کے علاوہ ان کے خود نوشت سوانحی حالات بھی شامل ہیں۔ جس سے اس کتاب کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوا ہے

زیر تبصرہ کتاب میں کئی ایسے مشہور و معروف شعرا بھی شامل ہیں جو دنیائے شعر و ادب میں ایک مقام حاصل کر چکے ہیں اور کئی ایسے ہیں جن کا ابھی کوئی مقام نہیں۔ بہر حال جن شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کے نام ہیں۔ طالب چکوالی، آر، کے سہگل، خزاں چند نسیم، اثر دہلوی، مہتہ درد، کرشن مرادی، سرشار ہوشیارپوری، اوم پرکاش بجاج، کرشن موہن، منظر نسیم، ڈی راج کنول، شباب دہلوی، راجپال اشک، جاں بازپانی پتی، کیلاش چندر ناز، برہم دت چاند، دھرم ویر سیماب آفت گج پوری۔

لکھنؤ کی لسانی خدمات
حامد اللہ ندوی
قیمت بارہ روپے
صفحات ۱۷۶
ناشر: مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر، ایم جی ایم بلڈنگ،
نیتاجی سبھاش روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۲

لکھنؤ اسکول کی لسانی خدمات کا ابھی تک تفصیلی جائزہ نہیں لیا گیا تھا لہٰذا خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے زیر تبصرہ کتاب کے ذریعہ اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔

کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے تمہید میں اردو زبان کی نشوونما اور اس کی عہد بہ عہد ترقی کا جائزہ لیا گیا ہے۔

دوسرے حصے تعارف میں لکھنوی شعراء اُدبا کے مختصر سوانحی حالات اور ان کی لسانی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں تبصرہ میں ذیلی سرخیاں، زبان، لسانیات، صوتیات، رسم خط میں حروف تہجی، قواعد، معانی بیان، بدائع، عروض، لغت، امثال، قدامت پرستی و جدت پسندی، قائم کر کے اس سلسلے میں لکھنوی مصنفین کے کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔

بلاشبہ زیر تبصرہ کتاب ایک قابل تحسین تحقیقی کام ہے اور اس کی اشاعت سے لکھنؤ اسکول اور لسانیات سے متعلق موضوعات پر تحقیق کرنے والوں کو اچھا مواد دستیاب ہو گیا ہے جو مستقبل میں اس سلسلے میں بہت مدد و معاون ثابت ہوگا۔

——— (نند کشور وکرم)



۹ مارچ ۱۹۷۷ء کو قائم مقام صدر جناب بی، ڈی جتی نے نئی دہلی میں
ریڈکراس کی پہلی ایشیائی کانفرنس کا افتتاح کیا۔
(وسط میں) ڈاکٹر کرن سنگھ

Regd.No.D(D)103

Shabbir Khan

Vote for Indira Gandhi
Vote for Indira Gandhi

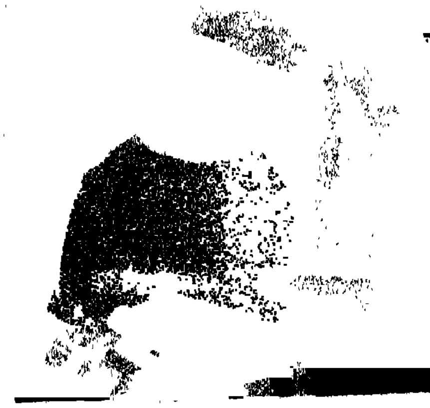


کرشن چندر (۲۳ اگست ۱۹۱۴ء ☼ ۸ مارچ ۱۹۷۷ء)

Vol.35 No.9 AJKAL (MONTHLY) April,1977

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by Skylark Printers, 113^5, Idgah Road, New Delhi-110055.

آجکل



شری چرن سنگھ
وزیر داخلہ



شری جگجیون رام
وزیر دفاع



شری لال کرشن اڈوانی
وزیر اطلاعات و نشریات



شری پرکاش سنگھ بادل
وزیر زراعت و آبپاشی



قائم مقام صدر جمہوریہ ہند شری بی ڈی جتی
شری مرارجی ڈیسائی وزیر اعظم ہند کو حلف دلا رہے ہیں۔



شری ہیم وتی نندن بہوگنا
وزیر کیمیکلز، پٹرولیم اور فرٹیلائزرس



شری سکندر بخت
وزیر مکانات و تعمیرات و آبادکاری

نئی کابینہ کے اراکین



شری شانتی بھوشن
وزیر انصاف، قانون اور کمپنی معاملات

اُردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

آجکل
نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۳ شمارہ ۱۰
مئی ۱۹۷۷ء
بیساکھ جیٹھ شک سمت ۱۸۹۹

شرح چندہ

سالانہ	دس روپیہ	۳ ڈالر ۱/۵۵ پاؤنڈ
دوسالہ	۱۷ روپیہ	۵ ڈالر ۲/۵۵ پاؤنڈ
سہ سالہ	۲۴ روپیہ	۷ ڈالر ۳/۶۰ پاؤنڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	۳۰ سینٹ ۱۵ پنی

ترتیب

سرورق : شاہد انیس

شائع کردہ ۔ ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آجکل (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

ملاحظات

جمہوریت کی جیت

گزشتہ انتخابات میں ہندوستانی عوام نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جمہوری اقدار اب ملک کا مزاج بن چکی ہیں اور کوئی ایسا کام جو ان بنیادی اقدار کی نفی کرتا ہو عوام کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا۔

دنیا میں ایک بار پھر یہ ثابت ہو گیا کہ ہمارا ملک دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے اور یہ کہ پُرامن اور جمہوری طریقے سے حکومت کو بدلا جا سکتا ہے۔ نئی حکومت کو عوام کی جو تائید اور اکثریت حاصل ہوئی ہے وہ اس کی مقبولیت کا ثبوت ہے جنتا پارٹی کی حکومت جن پروگراموں پر عمل کرنا چاہتی ہے اس کی وضاحت وزیر اعظم ہند شری مرارجی ڈیسائی نے اپنی ایک نشری تقریر میں کی ہے۔ تقریر اس شمارے میں شامل ہے۔

حفیظ جالندھری دہلی میں

ابوالاثر حفیظ جالندھری تقریباً ۱۲ سال بعد مارچ ۱۹۷۷ء میں دہلی تشریف لائے تو اردو کے حلقوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ دہلی کی بہت سی ادبی نشستوں میں انھوں نے شرکت کی اور لوگوں کو اپنے دلنواز کلام و ترنم سے (جو اَب بھی جوان ہے) مسرور و محظوظ کیا۔



حفیظ صاحب اردو کے ممتاز اور مقبول شاعر ہیں۔ ان کی نظم "ابھی تو میں جوان ہوں" اس قدر مقبول ہوئی ہے کہ آج بھی جب کہ حفیظ صاحب کی عمر ۷۷ سال ہے۔ تقریباً ہر جگہ ان سے یہ نظم سنانے کی فرمائش کی جاتی ہے۔ ان کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

۱ نغمہ زار ۲ سوز و ساز ۳ تلخابہ شیریں اور ۴ چراغ سحر۔ شاہنامہ اسلام کو حفیظ صاحب کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

ایک ملاقات میں انھوں نے بتایا کہ دلّی ان کا دوسرا گھر ہے۔ ۱۲، ۱۳ سال کی عمر سے وہ دہلی آتے رہے ہیں۔ بچپن میں گھر سے بھاگ کر دہلی آئے تھے۔ دہلی آنے کا شوق انھیں اُردو زبان سیکھنے اور معیاری لب و لہجہ اختیار کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ اُردو کا چسکہ انھیں اپنی نانیہال میں لگا۔ اُردو کی کتابیں اور رسالے خاص طور سے "پیام یار" جس میں صرف غزلیں ہوتی تھیں ان کے ناناکے یہاں آتا تھا۔ اُردو کا شوق انھیں بار بار دہلی کھینچ لاتا تھا۔ راشد الخیری، حسن نظامی اور ناصر نذیر فراق

غزل حفیظ بقلم حفیظ

غزل

[illegible]
مگر حفیظ کو یہ بات کون سمجھائے
وفا کا جوش تو کرتا چلا گیا مدہوش
قدم قدم پہ مجھے درست ہوش میں لائے
مری رگوں کی زباں سے کلام سن کے مرا
بہت سے لوگ مری شعلہ میکدے آئے

بہشت میں بھی ملا ہے مجھے عذاب شدید
یہاں بھی مولوی صاحب ہیں میرے ہمسائے

عذاب قبر سے بدتر سہی حیات حفیظ
یہ جبر ہے تو بہ جز صبر کیا کیا جائے

آجکل کے لئے نذر —— ابو الاثر حفیظ جالندھری
۱۵ راپریل ۱۹۷۷ء
مہمان حضرت نظام الدین —— نئی دہلی

کی ساری کتابیں پڑھیں اور پھر ان مشاہیر سے ملاقات بھی کی۔ چونکہ دہلی میں کوئی عزیز یا رشتہ دار نہیں تھا اس لیے اکثر ایسا ہوتا کہ حفیظ سردی کی راتیں نظام الدین اولیا میں کسی مقبرے میں گزارتے۔ جب ان کی شہرت ہوئی تو پھر ان کے تعلقات مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور آصف علی صاحب سے ہوئے اور وہ ان کے مہمان ہونے لگے۔

حفیظ صاحب بسلسلۂ ملازمت بھی عرصے تک دہلی میں مقیم رہے ہیں۔ دہلی سے انھیں جذباتی وابستگی ہے۔ ان کے خیال میں سارے ایشیا میں دہلی جیسا رنگا رنگ متنوع، باوضع، خلیق اور دلنواز شہر کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اس لیے وہ جب بھی دہلی آتے ہیں انھیں روحانی مسرت ہوتی ہے۔

وہ اردو ادب کو ہندوستانی اور پاکستانی ادب کے خانوں میں باٹنا پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق دونوں جگہ ادیبوں اور شاعروں کے جذبات و محسوسات ایک جیسے ہیں۔ اور وہ یکساں مسائل سے دوچار ہیں۔

حفیظ صاحب نے پاکستان کا قومی ترانہ لکھا ہے۔ انھوں نے تفصیل سے بتایا کہ اس عمل میں انھیں کن مراحل سے گزرنا پڑا۔ ترانہ کمیٹی کے سامنے تقریباً سات سو ترانے پیش ہوئے تھے مگر حفیظ صاحب کا ترانہ منتخب ہوا کیونکہ شعری حسن کے علاوہ اس ترانے کی بڑی دلکش دُھن بھی بن سکتی تھی۔

حفیظ صاحب اپنے پُرانے دوستوں اور مدّاحوں سے مل کر بہت خوش ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ہندوستان اور پاکستان سے زیادہ سے زیادہ فنکار ایک دوسرے ملک میں جائیں تاکہ دوستی اور خیرسگالی کا جذبہ مزید پروان چڑھے۔"

انتقالِ پُرملال

★ پروفیسر سید اختر احمد اختر اورینوی کا ۳۰ مارچ ۱۹۷۷ء کو پٹنہ میں انتقال ہوگیا۔ اختر اورینوی اردو کے مشہور افسانہ نگار، ناقد اور شاعر تھے۔ انھوں نے ایک ناول بھی لکھا تھا مگر ان کا اصل میدان افسانہ نگاری تھا اور ان کا شمار اردو کے صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

بہار میں اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں انھوں نے بڑی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

پروفیسر اختر احمد پٹنہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر تھے اور ادھر کئی برسوں سے بیمار تھے۔ ان کی موت اردو کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

قطعہ تاریخ

افسوس چہکتا ہوا بلبل نہ رہا — رونق گئی گلزارِ ادب کی صد حیف
اختر جو ادب کا اخترِ تاباں تھا — تھا ذہن رسا جس کا لذت جس کی سیف
تنقید بھی، تحقیق بھی، افسانہ بھی — اشعار بھی ہوتے تھے نہایت پُرکیف
فکرِ تاریخ میں تھا افسردہ قلم
آئی یہ صدا غیب سے "حیف اختر حیف"

۱۹۷۷ء

(عطا کاکوی)

★ پروفیسر صدرالدین فضا صدرِ شعبۂ اُردو پٹنہ یونیورسٹی ۳۱ مارچ ۷۷ء کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ صدرالدین صاحب کئی کتابوں کے مصنّف تھے اور شعر و شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔

اختر اورینوی اور صدرالدین ہم عصر تھے اور دونوں ہی پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں شریکِ کار تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے یا جذبۂ رفاقت کہ اختر صاحب کی موت کے دوسرے دن ہی صدرالدین صاحب بھی اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

قطعہ تاریخ

کل ہی اختر کو رو چکے تھے سب — آج یہ صدرِ دین کا غم ہے
زندگی میں رفیق تھے دونو — مرنے پر بھی یہ ربطِ باہم ہے
موت کیسی ہوئی اچانک ہائے — یہ خبر سُن کے غم سے سر خم ہے
مَل رہے ہیں سبھی کفِ افسوس — اور اشکوں سے آنکھ پُرنم ہے
کتنوں کو تو یقیں نہ ہوتا تھا — کتنا گیسوئے اُردو برہم ہے
سرِ افسوس کو جھکا کے عطاؔ
بولا ہاتف "فضا کا ماتم ہے"

۱۳۹۸-۱-۱۳۹۷ء

(عطا کاکوی)

بے روزگاری اور غریبی کا خاتمہ کیا جائے گا

مرارجی ڈیسائی
وزیراعظم ہند

کئی مہینوں سے چھائے ہوئے خوف اور گھبراہٹ کے بادل چھٹ گئے ہیں۔ یہ صورت حال عوام کے ذریعے عوام کے لئے عوامی انقلاب سے ہی ممکن ہو سکی ہے ہماری نظر میں عوام سب سے بالاتر ہیں۔ اسی لیے ہمیں بہت زیادہ اکثریت ملی۔ اِس بات کو دھیان میں رکھکر مجھے اور میرے رُفقائے کار کو کام کرنا ہے۔ چناؤ کے ذریعے عوام نے ہم میں جو اعتماد ظاہر کیا ہے۔ ہمیں خود کو اس اعتماد کا اہل ثابت کرنا ہے ہم کوشش کریں گے کہ ہمارے اُوپر عوام کا یہ اعتماد ہمیشہ قائم رہے۔

عوام نے بہت مشکل وقت میں ہمیں اپنا یقین و اعتماد بخشا۔ ہم جانتے ہیں کہ کتنی بھاری تعداد میں جانی و مالی اور ٹرانسپورٹ کے وسائل ہمارے خلاف استعمال کئے گئے ہیں الیکشن کی تیاری کے لئے چند ہفتے ہی مل سکے لیکن ہم آپ کو اور آپ کی اُن اقدار کو پہچانتے ہیں جن سے آپ کو لگاؤ تھا۔ یہ اقدار پچھلے کچھ برسوں سے ختم کر دی گئی تھیں۔ ہمیں یقین تھا کہ ان روایتی اقدار کو جو ہمیں وراثت میں ملی تھی۔ آپ سے یقیناً پھر سے قائم کریں گے ہمیں اس بات کا یقین تھا کہ آپ میں برائی اور بھلائی کو الگ الگ کرنے کی صلاحیت ہے الیکشن کے نتائج نے آپ لوگوں میں ہمارے اعتماد کو سچ کر دکھایا ہے۔ ایک دوسرے میں یہ باہمی اعتماد بے بہا اثاثہ ہے اور اس کی مدد سے ہم اپنے مستقبل کی ذمہ داریاں نبھا سکیں گے۔ اس طرح جنتا سرکار آپ کے یقین و اعتماد اور ہمت کی علامت ہے اور میں آج رات اس قومی امانت کے ناچیز محافظ کی صورت میں آپ سے مخاطب ہوں۔

ایمرجنسی کے جواز کے لیے ہم سے یہ کہا گیا کہ نظم وضبط اور اقتصادی ترقی کو بڑھانے کے لیے ضروری ہے نیز الکشن سے ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پڑتی ہے اور یہ کہ حزب اختلاف کو سبق سکھانا ضروری ہے انھوں نے کہا کہ حقیقی نظم وضبط خوف کی بنیاد پر نہیں لایا جا سکتا گاندھی جی نے ہمیں از خود نظم وضبط اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اور ہم سب کو اجتماعی طور پر اس بات کا یقین ہے کہ ڈسپلن اور نظم وضبط کو اپنائے بغیر آزادی صحیح معنوں میں آزادی نہیں رہ جاتی۔ کسانوں اور مزدوروں بے روزگاروں اور کمزور طبقے کے عوام کو نظم وضبط کے ساتھ رہنے اور قربانی دینے کے لیے ہم تب تک نہیں کہہ سکتے جب تک حکومت میں سرفہرست لوگ ایمان داری اور سادگی کی مثال نہیں پیش کریں گے۔

ترقی پسند سماج میں آزادی اور روٹی میں تضاد نہیں ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور انھیں کبھی بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے کھوئی ہوئی آزادی واپس لی ہے اور اس کے ذریعے ہمیں ہر شخص کو غریبی اور احتیاج سے نجات دلانی ہے۔

جنتا پارٹی نے دس برسوں میں غریبی ہٹانے کا عزم کیا ہے۔ یہ کام دلی یا ریاستی راجدھانیوں میں بیٹھے مٹھی بھر لوگوں کے ذریعہ انجام نہیں دیا جا سکتا چاہے وہ کتنے ہی عقلمند کیوں نہ ہوں۔ یہ مقصد سیاسی اور اقتصادی قوتوں میں لامرکزیت لاکر اور عوام کا اشتراک عمل حاصل کر کے ہی حاصل ہو سکتا ہے انھوں نے کہا کہ مرکزی نظام پر انحصار رکھنے والی ریاست جمہوریت کے لیے خطرہ ہے۔ ہمیں دیہات کو اقتصادی ترقی کا مرکز بنانا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ غربت اور پسماندگی کو دور کرنے کی تمام کوششیں اس جگہ پر کی جانی چاہئیں جہاں یہ سب سے زیادہ ہے۔ قدیم زمانے سے ہی ہمارے سماج میں گاؤں کو کلیدی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ہمارے دیہات اور وہاں کے رہنے والوں کو یہ محسوس ہونا چاہیے کہ بہتری کی فضا آئی ہے۔ دیہات سے محنت مزدوری اور روزگار کی تلاش میں شہروں کی طرف آنے والے لوگوں کا ذہن بھی بدلنا ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ شہروں کے رہنے والے دیہات میں جاکر کھلی زندگی کا لطف لیں اور دیہی عوام کی خدمت کریں اور اس طرح وہ ملک کی اقتصادی ترقی اور دیہی علاقوں کی خوشحالی میں حصہ لیں جس سے ملک ترقی کی راہ پر آگے بڑھ سکے۔

ہمارے ملک میں عوام کو اگر صحیح سمت میں کام پر لگایا جائے تو وہ قوت اور



وزیراعظم شری مرارجی ڈیسائی
۴ر اپریل ۱۹۷۷ء کو
'آل انڈیا ریڈیو' دہلی سے
قوم کو خطاب کر رہے ہیں

وسیلہ کے روپ میں بیش قیمت اثاثہ ثابت ہوں گے۔ سرکار اس امر کی توثیق کرتی ہے کہ ہر شخص کو کام کرنے کا حق حاصل ہے۔ سرکار اپنی اقتصادی اسکیموں اور ترجیحات کو اس طرح متعین کرے گی جس سے عوام کو زیادہ سے زیادہ روزگار مل سکے۔ پروگراموں چلانے کے لیے ہمارے پاس خوراک کے کافی ذخیرے ہیں گاندھی جی کا انت اودے کا نظریہ محض ایک اخلاقی اصول ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک اقتصادی اور سماجی ضرورت ہے۔ گھریلو اور چھوٹے دھندوں سے لامحدود دولت حاصل ہو سکتی ہے اور مناسب تکنیک لاکھوں لوگوں کی پیداواری صلاحیت کو کام میں لایا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر عوام کی روزمرہ کی ضرورت پوری کی جا سکتی ہے۔ بڑے شہروں بڑی مشینوں اور اعلیٰ سائنس کا اپنا مقام ہے لیکن یہ اولیت اور اہمیت کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ہمیں انصاف پر مبنی نظام بروئے کار لانا ہے نہ کہ ایسا نظام جہاں استحصال ہو۔ ہم ایسے دوہرے سماج کو مزید برداشت نہیں کر سکتے جس کی بنیاد امیری اور غریبی اور شہر و گاؤں پر ہو۔ ہمیں شہر اور دیہات کو الگ الگ تصور نہیں کرنا ہے۔ ان دونوں میں کوئی رقابت نہیں ہے اور یہ دو الگ الگ ثقافتیں نہیں ہیں ہمیں ان کے تئیں مربوط انداز اپنانا ہے اور اس بات کو سامنے رکھنا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں چنانچہ زراعت گھریلو صنعتوں چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں بڑے پیمانے کی صنعتوں، بھاری صنعتوں، تجارت، تاجرانہ سرگرمیوں غرضیکہ کوئی بھی شعبۂ زندگی ہو اس میں اسی مربوط اندازِ نظر کی ضرورت ہے۔ اس کے ذریعے سے ہی ملک گیر پیمانے پر ہمہ جہت ترقی ہو سکتی ہے۔

جمہوریت کی قوت اس کے اداروں اور روایتوں میں مضمر ہے۔ خوش قسمتی سے تاریک ترین دنوں میں ہر شعبۂ حیات کے بہت سے مردوں اور عورتوں نے توہین آمیز نظام کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دیا۔ یہ ہے وہ روایت جس پر ہمیں اپنے اداروں کی تعمیر کرنی ہے اور اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ چند مخصوص مفادات کے لیے پھر کبھی ایسی تباہ کن صورت حال پیش نہ آ سکے۔ آئینی ترامیم، مناسب تشکیل نو اور طریق کار کی تبدیلی ضروری ہوگی۔ خاص طور پر سرکار نشر و اشاعت کے وسائل کو آزادی دے گی اور عدلیہ کی آزادی کا تحفظ کرے گی۔ اس کے ساتھ ہی سبھی سطحوں پر بدعنوانیوں اور اختیارات کے غلط استعمال کے الزامات کی جانچ کے لیے آزاد و خود مختار ادارے کے فوری قیام کی تجویز بھی ہے۔

گزشتہ الیکشن میں مجھے ایک بات نے خاص طور پر متاثر کیا اور وہ نوجوانوں کا رول جو انھوں نے ان انتخابات میں انجام دیا ہے۔ میں نوجوانوں کے اس جوش و خروش اور ان کے اس شدید جذبے کی تعریف کرتا ہوں جو ان میں سماجی زندگی میں مناسب مقام حاصل کرنے کے لیے ہے اگرچہ نوجوانوں کی تعلیم دیگر کاموں پر فوقیت رکھتی ہے تاہم ہمارا فرض ہے کہ انہیں خالی وقت میں قومی خدمت کے کام سونپے جائیں۔ اس سلسلے میں نوجوانوں کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے لیے بامقصد اور تعمیری اندازِ نظر کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر جلد ہی مناسب اسکیمیں وضع کی جا سکیں گی۔ ہمارے منصوبے میں روزگار کی بہت سی اسکیمیں چلائی جائیں گی جن کے ذریعہ انہیں روزگار کے مواقع مل سکیں گے۔

نوجوانوں کی تعلیم ایسی ہونی چاہیے جن سے ان کے کردار کی تعمیر ہو سکے اور اس کے ساتھ ہی وہ بحیثیت مجموعی ملک کی ترقی میں حصہ لے سکیں۔ بنیادی طور پر اس تعلیم کے ذریعے ان میں خود انحصاری اور نظم و ضبط آنا چاہیے اور خوف سے چھٹکارا ملنا چاہیے۔ ہمارے ملک میں دیہی آبادی کا غلبہ ہونے کے باعث یہ ضروری ہے کہ انہیں اس طرح کی تعلیم دی جائے جس سے وہ گاؤں کے مسائل کو سمجھ سکیں اور اپنی ذہانت سے کام لیکر دیہات میں ترقی کے پروگراموں کو بروئے کار لا سکیں۔

قومی ترقی کے اس کام میں استادوں کو اہم رول ادا کرنا ہے۔ یہ افسوسناک بات ہے کہ مختلف اسباب کی بنیاد پر جس کی تفصیل میں اس وقت نہیں جاؤں گا نوجوانوں کی سیرت کی تعمیر میں استادوں کے رول پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا سکی۔ ہماری قومی زندگی میں مختلف تعمیری اثرات کو ترقی کی راہ پر لگانا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے بچپن سے لے کر سن بلوغت تک تعلیم پر دھیان دینا ضروری ہے۔ سرکار اس پہلو پر خاص زور دے رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بھارت میں نوجوانوں کی تعلیم اور بہبود پر خصوصی توجہ دی جانی چاہیے۔

یہ کام اتنا وسیع اور عظیم ہے کہ اس میں سبھی لوگوں کا تعاون ضروری ہے اس سلسلے میں عوام کے درمیان پالیسی بنانے والوں اور پالیسی پر عمل درآمد کی ذمہ داری سنبھالنے والوں کے درمیان تعاون ضروری ہے۔ زندگی کے حق کا دعویٰ کرنا آسان ہے لیکن اس کے لیے کام کرنا بہت مشکل ہے۔ میں اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جبکہ ملک کے سبھی طبقوں کے لوگ اپنی ذمہ داری سمجھیں گے۔ اس لیے ہمارے اقتصادی پروگراموں اور اسکیموں کی کامیابی کی بنیادی شرط یہ ہے کہ جن عظیم ذمہ داریوں کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے ان میں عوام کا منظم طریقے پر اور باقاعدہ صورت میں تعاون ملے۔ ضروری رقوم فراہم کرنے کے لیے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ کمانا ہوگا اور ضرورت سے زیادہ خرچ نہیں کرنا ہوگا اور زیادہ سے زیادہ بچت کرنی ہوگی۔ ان بچتوں کو بنکوں میں رکھنا ہوگا یا انہیں پیداواری کاموں میں لگانا ہوگا یا سرکاری قرض کے لیے کام میں لانا ہوگا صرف اسی طریقے سے ہم اپنے اندرونی وسائل کو فروغ دے سکتے ہیں اور غیر ملکی وسائل کو کم کر سکتے ہیں۔ غیر ملکی زرمبادلہ کا جہاں تک تعلق ہے وہ کچھ عرصہ پہلے کے مقابلے بھی آج زیادہ اچھی حالت میں ہے لیکن ہم اس پر مطمئن نہیں ہو سکتے۔

ہمیں اپنی مالی حالت میں مزید سدھار لانا ہے تاکہ موجودہ صدی کے اختتام سے پہلے فلاحی ریاست کی راہ پر ہم کافی آگے بڑھ سکیں۔ قومی تعمیر نو کی اس عظیم ذمہ داری کو سنبھالنے کے لیے ہمیں عوام کے سبھی طبقوں کا تعاون ضروری ہے۔ میں قانون کی حکومت میں وکلا کے یقین و اعتماد میں شریک ہوں تاہم انہیں خود کو اس طرح منظم کرنا ہے تاکہ وہ ہندوستان کے غریب ترین لوگوں کو قانون سے فائدہ پہنچانے میں مدد دے سکیں اور غریبوں کو کم خرچ پر جلد سے جلد انصاف دلا سکیں۔ عدلیہ کی آزادی کے لیے میرے دل میں یقین و اعتماد کسی سے کم نہیں ہے لیکن ججوں سے میری اپیل ہے کہ انصاف اس طرح کیا جائے کہ عام آدمی اس کی سراہنا کرے۔ تجارت اور صنعتوں میں مصروف لوگوں سے میں کہنا چاہتا ہوں کہ وہ ملکیت کے بارے میں گاندھی جی کی ٹرسٹی شپ کے نظریے کو اپنائیں۔ وہ اپنے کارخانوں کی پیداواری صلاحیت کا پورا استعمال کریں اور ملک

کو خوشحال بنائیں وہ لوگوں کی مجبوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھا کر قیمتیں بڑھانے اور غیر منافع کمانے کا لالچ چھوڑ دیں اور اس کی جگہ پیداوار بڑھائیں جس سے ملک خوشحال ہو اور اقتصادی طور پر مضبوط بن سکے۔

پیداواری کے اس دور میں مزدوروں کو ان کے مناسب حقوق سے کوئی محروم نہیں کر سکتا لیکن مطالبوں کے باعث پیداوار میں کمی کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں ہے ملک کو آگے بڑھانا ہے ایک جگہ رکے نہیں رہنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں حتی المقدور اپنی پیداوار بڑھانی ہے اور ملک کی دولت میں اضافہ کرنا ہے سرکار ایسا کوئی کام نہیں کرے گی جس سے ان کے ساتھ کوئی ناانصافی ہو۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ آزادی کا حق اس ملک کے تمام شہریوں کا فطری حق ہے ہمارا عزم ہے کہ یہ تمام حقوق آئین کے مطابق پھر سے بحال کر دیے جائیں جیسا کہ تقریباً دو برس پہلے تھا۔ ہم اس ضمن میں تمام ضروری اقدامات کے لیے تیار ہیں لیکن میں ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ ان حقوق کے ساتھ کچھ فرائض بھی وابستہ ہیں۔ ان فرائض کا بنیادی پہلو یہ ہے کہ ملک اور آئین روایات کے تئیں وفاداری ہر شہری کا فرض اولین ہے۔ جہاں میں خود قانون کی پیروی میں کسی کے سامنے نہیں جھکتا وہاں میں اس بات پر بھی زور دوں گا کہ ہم میں سے ہر فرد قانون کا احترام کرے۔

میں ان لوگوں کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں جنہیں قانون کی عمل آوری یا حکومت کے کسی اقدام سے ٹھیس پہنچ سکتی ہے لیکن اپنی شکایات کو دور کرانے کا طریقہ تشدد نہیں ہے بلکہ اس کے پرامن اور آئینی ذرائع موجود ہیں۔ گاندھی جی نے ستیہ گرہ کے ہتھیار کا استعمال حکومت کی کسی معمولی غلطی کے خلاف نہیں کیا تھا بلکہ اس وقت کیا تھا جب حکومت زبردست ناانصافی کی مرتکب ہوئی تھی۔ آپ کو چاہیے کہ ان کی زندگی سے سبق لیں اور تشدد کا راستہ اپنانے کے بجائے گاندھی جی کے ستیہ گرہ کا طریقہ اپنائیں اسی طرح میں پولیس کے محکمہ سے اپیل کروں گا کہ امن و قانون برقرار رکھنے کے معاملے میں طاقت کا اس وقت تک استعمال نہ کریں جب تک بالکل ہی ضروری نہ ہو جائے اور اس صورت حال میں بھی کم سے کم طاقت کا استعمال کریں۔ وہ عوام کے خادم ہیں اور تشدد اور جرم کے انسداد کے معاملے میں ان کے آلۂ کار ہیں۔ سرکاری ملازموں کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ انہیں سرکاری خزانے سے تنخواہ اس لیے دی جا رہی ہے کہ وہ دیانت داری اور غیر جانبداری سے عوام کی خدمت کریں، اس لیے نہیں کہ وہ اپنے ذاتی مقاصد کے لیے اپنے عہدے کا استعمال کریں۔ ان کی واحد ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ملک اور عوام کی خدمت کریں۔ انہیں اپنے فرائض کی ادائیگی دیانت داری اور ایمانداری کے ساتھ اور قاعدے قانون کے مطابق کرنا ہے۔

جنتا پارٹی نے جو نشستیں حاصل کی ہیں، ان کی جغرافیائی تقسیم خواہ کسی قسم کی بھی ہو جنوب کے لوگوں کو یہ اندیشہ بالکل نہیں کرنا چاہیے کہ ان کے مفادات کی طرف سے غفلت برتی جائے گی ہماری حکومت ایک قومی حکومت ہے اور کسی علاقے یا آبادی کے حصے کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ محروم ہو گیا ہے مجھے یقین ہے کہ وقت کی رفتار کے ساتھ یہ تمام لوگ یہ محسوس کریں گے کہ ان کے اندیشے بے بنیاد تھے اور ان کی جائز تمنائیں پوری ہوئی ہیں دوسری پارٹیوں کی ریاستی حکومتوں کو بھی مرکزی حکومت کی طرف سے کسی اندیشے میں نہیں پڑنا چاہیے۔ ہم نہ تو دل بدلی کی ہمت افزائی کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی ریاستی حکومتوں کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ پنچایتوں اور میونسپلٹیوں کو زیادہ ذمہ داریاں سونپی جائیں اور جلد ہی ان کے انتخابات کرا کر ان کے نمائندہ کردار کو بحال کیا جائے۔ چھوٹے چھوٹے ضلع اور بلاک کے قیام سے ایڈمنسٹریشن اور ترقیاتی کاموں میں بہتری ہوگی۔ حکومت عوام کی اور عوام کے ذریعے ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اس کا عوام کے لیے ہونا ضروری ہے۔ حکومت میں عوام کی شرکت کے لیے ضروری ہے کہ نچلی سطح پر بھی جمہوریت ہو۔

میں دوسرے ملکوں سے تعلقات کے بارے میں بھی کچھ کہنا چاہوں گا۔ ہم امن میں مکمل طور پر یقین رکھتے ہیں ہم امن کو صرف ایک نعرے کی حیثیت سے نہیں مانتے بلکہ اس سرزمین کے باشندوں اور خود اس سرزمین کے لیے اسے واحد ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ امن برقرار رکھنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ناوابستگی کی پالیسی صحیح معنوں میں اپنائی جائے جس میں نہ تو کسی ملک سے کوئی رعایت کی جائے اور نہ کسی ملک سے کوئی خصوصی محبت ہو نہ ہی کسی سے نفرت، اس کے ساتھ ہی ساتھ دنیا کے معاشی اور سماجی مسائل کے لیے اجتماعی مساعی میں شرکت بھی ہماری خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول ہوں گے۔ ہم پوری دنیا کے ساتھ بھائی چارہ اور رفاقت کے جذبے کے ساتھ اس پالیسی پر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے عمل کریں گے۔ آنے والے کل کی دنیا میں بین الاقوامی رشتوں کی بنیاد سیاست کے بجائے معاشیات اور انسانی ہمدردی ہوگی۔ ہم اس صورت حال میں اپنا صحیح رول اسی وقت ادا کر سکتے ہیں جب ہم خود معاشی طور پر مضبوط ہوں۔

میرے ساتھی ہم وطنو! میں نے اپنی تقریر میں ان اصولوں کی نشاندہی کر دی ہے جو ہمارے خیال میں آپ کے فیصلہ اور ہمارے وعدوں کی بنیاد ہیں۔ ہمیں اس بات کا اچھی طرح احساس ہے کہ اس ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اپوزیشن کو حکمراں پارٹی کی حیثیت سے آزمائش پر رکھا گیا ہے۔ ہمیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ صدیوں کی وراثت کے طور پر ملک کو جو مسائل درپیش ہیں ہم نے انہیں متحدہ طور پر حل کرنے کا وعدہ کیا ہے لیکن بالآخر ہم عوام ہی سے توقع کرتے ہیں کہ انھوں نے ہم پر جو اعتماد کیا ہے۔ اس پر عمل درآمد کے لیے ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ تاریخ میں اکثر یہی ہوتا رہا ہے کہ اس ملک کو اس کا جائز حق نہیں ملا صرف ۳۰ برس پہلے ہی ہمیں اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے کا موقع ملا ہے۔ عوام اس دوران میں ہمیشہ ہماری رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ گزشتہ حکومت سے تنگ آ کر انھوں نے اب ہم پر اعتماد کیا ہے میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ ترقی اور خوشحالی کا جو خاکہ میں نے ابھی پیش کیا ہے اس کے حصول میں ہم ہر ممکن کوشش کریں گے اور ملک کو امن و امان اور خوشحالی کے راستے پر دور تک لے جانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔

تامل ناڈو نمبر

اس خصوصی نمبر کے بعض مضامین بہت تاخیر سے ملے۔ اسی لیے اب یہ طے کیا گیا ہے کہ جون اور جولائی کا مشترکہ شمارہ تامل ناڈو نمبر ہوگا۔ اسی لیے مئی کا عام شمارہ پیش کیا جا رہا ہے۔

احمد حسن
۷۷۵ کرنل گنج الہ آباد

کرشن چندر کے سماجی اور ادبی نظریات

(مضمون نگار نے کرشن چندر پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اپنی تحقیق کے دوران انھوں نے کرشن چندر سے انٹرویو لیا تھا جو ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔)

۱۔ سوال - پلاٹ اور کردار کی تخلیق آپ کس طرح کرتے ہیں؟ کوئی خاص کیفیت طاری ہوتی ہے یا میکانیکی انداز میں کردار اور پلاٹ تخلیق کرتے چلے جاتے ہیں؟

جواب پلاٹ ہو یا کردار ہو، یا جہاں کی ایک رو ہو، ہر تخلیق کا اپنا ایک عمل ہوتا ہے بعض اوقات ایک افسانہ یا ایک نظم یا ایک غزل ایک ہی نشست میں مکمل ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے پیچھے ایک شاعر کے ذہنی اور عملی تجربات کا ایک وسیع سلسلہ ہوتا ہے جو خام مواد کی طرح ذہن کی بھٹی میں پگھلتا رہتا ہے۔ اور کسی خاص موقع پر تخلیق کی صورت میں تپ کر نکلتا ہے۔ یہ عمل چونکہ ادیب کے ذہن میں مکمل ہوتا ہے اس لیے اس کی تمام منزلیں میکانیکی انداز میں کبھی بیان نہیں ہو سکتیں۔ ہاں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی موضوع کو اس بھٹی میں تپائے بغیر محض لکھ دیا جاتا ہے۔ اس رکھے کا نتیجہ بالعموم ایک تیسرے درجے کی تخلیق میں ظاہر ہوتا ہے۔

۲۔ سوال کیا آپ نے نذیر احمد، شرر، سرشار، پریم چند اور رسوا کے ناولوں کا مطالعہ کیا ہے؟ ان کے ناولوں کے کمزور پہلوؤں کو واضح کر دیں تو بہتر ہے۔

جواب شرر کے ناول عموماً بڑے بچکانے سے ہوتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر مذہبی جذبات سے کھیلا گیا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کے ناولوں کا موضوع بھی حالانکہ مذہبی ہے لیکن وہ مذہبی جذبات سے کھیلتے نہیں ہیں، بلکہ اس سے درس و تدریس اور اصلاح کا کام لیتے ہیں۔ سرشار کے یہاں ایک مخصوص ماحول کا نقشہ ملتا ہے۔ لیکن سماجی تجزیہ کہیں نہیں ملتا اور اس کی سمت بھی کسی جگہ پر واضح نہیں ہوتی۔ مرزا رسوا کے یہاں بھی سماجی مقصدیت غائب ہے لیکن ان کے یہاں کردار نگاری اور ایک مخصوص ماحول میں رکھ کر رچی ہوئی کردار نگاری بہت نمایاں اور مضبوط نظر آتی ہے۔ پریم چند کے یہاں بھی اصلاحی رنگ بہت نمایاں ہے۔ انھوں نے اردو ناول کو مدہ کردار بھی دیے ہیں۔ لیکن وہ اپنی اصلاحی کاوشوں میں جس فلسفے سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں اس کی اساس حقیقت سے زیادہ آدرشی تخئیل پر ہے جس میں وقتی طور پر جذبات تو ضرور ابھرتے ہیں لیکن حقیقتیں اپنی جگہ سنگین اور اٹل رہتی ہیں۔ یہ مسئلہ چاہے ہندوستان کے اتحاد کا ہو یا زمیندار اور کسان کی آویزش کا ہو، ان کے اندر جو دھکی چھپی سنگین حقیقتیں ہیں تلخ سماجی مسائل ہیں، اور تاریخی قوتیں بروئے کار ہیں، جب تک انہیں بے نقاب نہیں کیا جاتا اور ان حقیقتوں کو ان کی ننگی شکل میں دیکھ کر ان کا سامنا نہیں کیا جاتا تب تک ادیب اپنے سماجی فرض سے کما حقہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ سچائیوں پر ریشمی غلاف ڈالنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ سچائی کا سامنا کر لیا جائے۔ اصلاح پسندی بالعموم ہر ایک ادب میں اس کام سے گھبرائی ہے۔ اسی لیے اس کی کاوشیں صحیح نیت رکھنے کے باوجود اور قلم میں زور ہونے کے باوجود ایک خاص منزل پر پہنچ کر ناکام ہو جایا کرتی ہیں۔

۳۔ سوال آپ روسی انقلاب سے کس حد تک متاثر ہیں

جواب اپنی نسل کے دوسرے بہت سے ادیبوں کی طرح میں بھی روسی انقلاب سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ اور بیسویں صدی میں اسے انسان کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں اس انقلاب کے بعد ہی ایشیائی اور افریقی آزادی کا تصور ممکن ہو سکا ہے۔ انقلاب فرانس کے بعد یہ دوسرا بڑا انقلاب ہے جس نے ہر ملک میں وہاں کے لوگوں کو اس درجہ متاثر کیا ہے کہ دوست اور دشمن سب اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو گیے۔ انقلاب روس یورپی سرمایہ داری کی پہلی واضح شکست ہے۔

۴۔ سوال ایک اچھا ادیب اور بڑا ناولسٹ مذہبی عصبیت، فرقہ وارانہ ذہنیت اور پارٹی بندی سے بلند تر ہوتا ہے کیا آپ اس اصول کے ہمنوا ہیں

جواب اس قسم کا کوئی کلیہ قائم کرنا بہت مشکل ہے۔ اقبال میرے خیال میں ایک بڑے شاعر تھے۔ لیکن مذہبی عصبیت سے مبرا نہیں، گورکی ایک مخصوص پارٹی کے ہمنوا تھے لیکن اس پر بھی ایک بڑے ادیب تھے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ایک کٹر رومن کیتھولک ہے۔ تلسی داس ایک کٹر ہندو، شولوخوف ایک کٹر کمیونسٹ ہے۔ میں نے ماضی کے سیکڑوں ادیبوں کا اور ان کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ اور موجودہ دور کے ادیبوں کی زندگی کو بھی ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ بطور انسان وہ مجھے بہت اونچے نظر آئے۔ ان کے یہاں بھی وہ پستیاں اور بلندیاں ملتی ہیں جو دوسرے انسانوں میں ملتی ہیں۔ ان کے کردار بھی مجموعۂ اضداد ہیں۔ بیک وقت اچھے بھی ہیں اور برے بھی۔ مذہبی تعصب میں مبتلا ہیں۔ اور کبھی

کبھی ایسی وسعتِ نظر کا ثبوت دیتے ہیں کہ فرشتے بھی شرما جائیں۔ کبھی حد درجے تنگ نظر اور پارٹی باز دکھائی دیتے ہیں اور کبھی تمام مذہبوں اور تمام پارٹیوں سے بلند ہو کر کائنات کا غم اور اس کی مسرت اپنی تخلیق میں سمو لیتے ہیں۔

کسی بڑے ادیب کی تخلیق کو بڑا سمجھنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اسے بڑا انسان بھی سمجھ لیا جائے۔ یہ دونوں باتیں وقتی طور پر مختلف ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ایک ادیب کی زندگی سے اس کے ادب کی محرکات کا اکثر پتہ چل جاتا ہے لیکن اس کے ادب کی عظمت کو اس کی زندگی کی عظمت سے مربوط کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔ جو اکثر نقادوں سے سرزد ہوتی رہتی ہے۔ ذرا بائرن، بالزاک۔ فلابیر، اور ٹالسٹائی کی زندگیوں پر غور فرمائیے تو آپ کو ایک ایک ادیب کی زندگی اور اس کی تخلیق کے تضاد کا فرق سمجھ میں آئے گا۔ ادیب بالعموم زندگی کے دوسرے شعبوں میں ہر انسان کی طرح ہوتا ہے۔ لیکن واقعات اور حالات کے مشاہدے، کردار شناسی اور تخلیقی قوتوں میں دوسرے انسانوں سے اس قدر بڑھا ہوا ہوتا ہے، جس طرح ایک لوہار کے بازو دوسرے انسانوں کے بازؤں کے مقابلے۔۔ میں بہت زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ یہ بہت ہی اچھا ہے اگر ایک ادیب اچھا انسان بھی ہے۔ فرقہ واریت، مذہبی تعصبات اور ناجائز قسم کی گروہ بندیوں سے بچا ہوا ہے لیکن اگر وہ یہ سب کچھ ہے لیکن اپنی شاعری میں یا ادبی تخلیق میں ایک بلند ممتاز مقام رکھتا ہے تو ہم محض اس کی دوسری کمزوریوں کی وجہ سے اسے نیچے گھسیٹنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

۵۔سوال اقبال کی شاعری کے کون سے پہلو آپ کی نظر میں اب تک روشن ہیں؟۔

جواب اقبال کا راستہ نئی شاعری کا راستہ ہے۔ اقبال ادب برائے ادب کے قائل نہیں ہیں۔ اقبال اپنے تاثرات براہِ راست زندگی سے مرتب کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کا انداز اور تفکر ایک مخصوص مذہبی، سیاسی، اور سماجی فلسفۂ حیات کی ترجمانی کرتا ہے جس سے بہت سے لوگوں کو اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ اور مجھ کو بھی ہے۔ لیکن اقبال نے اردو شاعری کو جو نیا لہجہ عطا کیا ہے۔ جس طرح سے اسے ہنگامی موضوعات کا پابند بنایا ہے۔ اور اسے جس فنکاری اور شدتِ احساس سے بیان کیا ہے۔ یہ تمام عناصر ایسے ہیں جن سے نئی نسل کے شاعر اور ادیب ترقی پسند اور غیر ترقی پسند، سبھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

۶۔سوال سُرریلزم کیا ہے۔ آپ نے کونسی انگریزی اور فرانسیسی کتابیں پڑھیں۔ اور ان سے متاثر ہوئے۔ اردو میں اور کن افسانہ نگاروں کے یہاں اس قسم کے افسانے ملتے ہیں جیسے کہ آپ کے یہاں "مثبت اور منفی" ہے۔ اس افسانے کو لکھنے میں آپ کو دوسرے افسانوں سے زیادہ وقت دینا پڑا؟ اس کی سرریلزم زندگی سے مطابقت رکھتی ہے کہ نہیں؟۔

جواب یہ محض ایک تجربہ تھا۔ اور تجربہ بھی اس لیے کیا تھا کہ اردو میں اس بدعت کو روکا جائے۔ مغرب میں چند سالوں تک ـــــــ ادب میں اس تحریک کا زور رہا، جسے شعور کی رَو کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ شعور میں جس طرح کے خیال آتے ہیں اگر وہ بے ربط ہوں اور بظاہر ان کا آپس میں کوئی تعلق نہ ہو تو انہیں قلمبند کر دیا جائے۔ ذہنی بیماریوں کا علاج کرنے والے اپنے مریضوں پر اکثر یہ تکنیک بھی استعمال کرتے ہیں۔ سنا گیا ہے کہ بہت سی ذہنی الجھنوں کو اس طریقۂ کار سے سلجھاتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس طریقۂ کار کو ادب میں برتنے سے پڑھنے والوں کی پریشانی میں اضافہ ہی ہو سکتا ہے۔ ان کا علاج نہیں ہو سکتا۔ شعور کی رو کے مطابق لکھی گئی تخلیقات میں ایک عجیب طرح کا ابہام پایا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس ابہام کے باوجود بھی اس قسم کی تحریروں میں ایک تسلسل بھی مل سکتا ہے جیسا کہ "مثبت اور منفی" میں موجود ہے۔ اگر اس تسلسل کو ڈھونڈھنے میں پڑھنے والا خود کامیاب نہیں ہو سکتا لامحالہ اسے پوری طرح سے سمجھنے کے لیے مصنف سے براہ راست پوچھنا پڑے گا۔ میں اسے ادب کے لیے اچھا نہیں سمجھتا کہ ہر پڑھنے والے کو تخلیق کا مفہوم سمجھنے کے لیے ادیب سے رجوع کرنا پڑے۔ اس کی دوسری مثال میرا دوسرا افسانہ "ناپختہ" ہے۔ اس ناپختہ میں میں نے چند الفاظ کو برتنے کا تجربہ کیا ہے جو اردو کے یا کسی دوسری زبان کے لغت میں موجود نہ ہوں گے جو میرے ذہن نے افسانہ لکھتے وقت خود سے گھڑے تھے۔ لیکن انہیں اس طرح کے فقروں میں لکھ دیا تھا کہ ان کا مفہوم بھی پڑھنے والوں پر فقروں کی ساخت اور ان کے ربط سے واضح ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ اور دوسری قسم کی کوششوں کا ادب میں کوئی مقام نہیں ہو سکتا، ادب کے ضروری عناصر میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بڑی حد تک پڑھنے والوں کی سمجھ میں آ سکے۔ ادب کا مفہوم اگر اس قدر گنجلک اور پیچیدہ ہو کر رہ جائے کہ وہ صرف مصنف کی اپنی سمجھ میں آ سکے تو میں اسے پسند نہ کروں گا۔ مجھ سے پہلے دو ایک افسانہ نگاروں نے اسی قسم کے افسانے لکھ کر اپنی دانست میں اردو افسانہ نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنا چاہا تھا۔ . . . . میں نے یہ دو افسانے لکھ کر لوگوں پر واضح کر دیا کہ اس قسم کے افسانے لکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے بعد یار لوگوں نے اس رمز کو پالیا۔ اور آپ دیکھیں گے کہ "مثبت اور منفی" کے بعد اس قسم کی ادبی تحریر پھر سے دیکھنے کو نہیں ملی۔ کچھ لوگ شعور کی رو کے مطابق اس قسم کے ادب کو سنگیت کے الاپ سے تشبیہ دیتے ہیں جس میں صرف نغمگی پیدا کرنے پر پوری کوشش صرف کی جاتی ہے الفاظ کی کوئی نئی اہمیت نہیں ہوتی۔ بلکہ الفاظ اگر آپ بے معنی بھی استعمال کریں تو الاپ کی خوبصورتی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مگر میں اس کو بھی قابلِ یقین نہیں سمجھتا کیونکہ الاپ بھی ایک مخصوص راگ کے تحت ہوتا ہے۔ اور ہر راگ مخصوص سُروں سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ راگ کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ وہ محض آواز کا بہاؤ نہیں ہوتا موسیقی کا بہاؤ ہوتا ہے جس کے حدود پہلے سے مقرر ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے ادب میں بھی ادیب کو نئے نئے تجربے کرنے کی ایک خاص حد تک آزادی دی جا سکتی ہے۔ اسے لفظی معمّہ بازی کا شکار نہیں بنایا جا سکتا۔ بے معنی الفاظ سے ایک مخصوص آہنگ پیدا کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ مگر اس سے آپ کچھ کہتے نہیں ہیں اور ہر ادیب کے لیے کچھ کہنا ضروری ہوتا ہے۔ یعنی اس کا مخاطب صرف اس کی ذات ہی نہیں ہوتی۔ دوسرے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ ادب ایک ذاتی کارنامہ ہوتے ہوئے بھی ایک سماجی فریضہ ہے۔ میں نے اس افسانے (مثبت اور منفی) کو ایک نشست میں لکھا ہے۔

۷۔سوال آپ ادب برائے ادب کے قائل ہیں یا ادب برائے حیات کے وجوہ بیان کر دیں تو بہتر ہوگا۔

جواب میں ادب برائے حیات کا قائل ہوں۔ میرے نزدیک ادب برائے

ادب کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ہر ادب کسی نہ کسی شکل میں حیات سے متعلق ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی صورت میں وہ زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ ادیب کے شعور، اس کے رجحانات اس کی زندگی کے فلسفے اور اس کی سیاست پر تبصرہ کرتا ہے۔ ادب برائے حیات کے اندر بھی بہت سے نظریے ہیں۔ کچھ لوگ صرف حسن و عشق کی داستان تک ہی ادب کو محدود کر دینا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے صرف ایک فرد کی الجھن اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا آلہ کار بنانا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے صرف سیاسی اور معاشی جنگ زرگری کا نقاش بتاتے ہیں۔ لیکن ادب کسی ایک مخصوص دائرے میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ اس کے تخلیقی اثرات کے گم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے۔ ادب کو زندگی کی طرح وسیع اور ہمہ گیر ہونا چاہیے۔ ادب کو انسانی حیات کے ہر پہلو پر نظر رکھنی چاہیے۔ نہ صرف ہر پہلو بلکہ مختلف پہلوؤں کے اندر جو تسلسل پایا جاتا ہے اس سے بھی آگاہ ہونا چاہیے۔ داخلی اور خارجی دنیائیں اس قدر گندھی ہوئی ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ کرنا سخت غلطی ہوگی۔ اور جو لوگ اس کا ارتکاب کرتے ہیں وہ ادب میں اپنی ذہنی کج روی کا ثبوت دیتے ہیں۔ چاہے وہ سیاست زدہ ہوں، یا جنس زدہ۔ میں نہ صرف ادب برائے حیات کا قائل ہوں بلکہ انسانی حیات کے بارے میں بھی ایک اس طرح کا نظریہ رکھتا ہوں جس میں ادب انسان کی داخلی اور خارجی کیفیات کا حامل ہوتے ہوئے بھی انسان کو آگے بڑھانے، ترقی کرنے، اپنے جسم اور روح کو بلند سے بلند سطح پر لے جانے میں مدد دیتا ہے۔ اس کی ایک منزل میرے خیال میں اشتراکیت ہے۔ لیکن اشتراکیت انسان کی پہلی اور آخری منزل بھی نہیں ہے۔ میں یہ بات ماننے سے قاصر ہوں کہ اشتراکیت کے بعد انسانی ترقی رک جائے گی۔ اور زندگی اور حیات کے بارے میں نئے فلسفے نہ پیدا ہوں گے۔ اور نئی تحریکیں نہ جنم لیں گی۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ادب محض کسی ایک نظریے کا بھی حامل نہیں ہو سکتا۔ مختلف ادیب مختلف طریقوں سے انسانی بہتری اور بہبودی کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اور انہیں اس بات کا پورا حق ہے کہ وہ مکمل آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ میرا اختلاف ان لوگوں سے دوسری طرح کا ہے۔ مجھ کو سب سے شدید اختلاف ان لوگوں سے ہوتا ہے جو ادب کا زندگی سے سلسلہ منقطع کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ خود ان کی تخلیقات ان کے اس دعوے کو جھٹلاتی رہتی ہیں۔ مجھ کو ادب برائے ادب کا دعویٰ نہ صرف غلط معلوم ہوتا ہے بلکہ مضرت رساں بھی۔ یہ چند ایسے دھوکوں کی خوشنما پردہ داری کرتا ہے جن پر سے نقاب اٹھایا جانا بے حد ضروری ہے اور انسانی فلاح و بہبود کی خاطر ادب برائے ادب کی عملی شکل بالعموم یوں ہوتی ہے کہ ادیب اپنی گرد و پیش کی دنیا میں دلچسپی لینے سے احتراز کرے اپنے ملک کے عوامی مسائل سے گریز کرے۔ اپنی قوم کی معاشی، سماجی حالت پر تبصرہ نہ کرے اپنے ماحول پر تنقید نہ کرے۔ اس قسم کے ادب برائے ادب کا نتیجہ حقیقت سے فرار اور سچائی سے گریز اور جد و جہد سے دست برداری کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اس قسم کے فلسفے کو اپنانے والے ادیب بالعموم اپنے لاشعور کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتے ہیں اور اس قسم کی ادب کی تخلیق کرتے ہیں کہ جن میں یا تو جنسی کج روی اور گھناؤنا پن ہوتا ہے یا ذہنی الجھنوں کی معمہ بازی ہوتی ہے۔ جس کا حل خود ادیب کے پاس نہیں ہوتا۔

ادب کی اعلیٰ قدریں بھی وہی ہیں جو انسانی زندگی کی اعلیٰ قدریں ہیں۔ اور ان کو اپنائے بغیر اعلیٰ ادب کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ ایسا میرا یقین ہے۔ اس لیے میں نے گزشتہ چھبیس ستائیس برس سے اپنے آپ کو ترقی پسند تحریک سے وابستہ کر رکھا ہے کیونکہ یہ تحریک گزشتہ چھبیس ستائیس برس میں ہندوستانی عوام کی جد و جہد کے پہلو بہ پہلو اور شانہ بہ شانہ چلی ہے۔ اس نے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آنکھیں چار کی ہیں۔ اس کی تخلیقات نے ہندوستانی عوام کے ذہن کو جھنجھوڑا ہے۔ ان میں قوت عمل، حوصلہ اور امنگ کی روح پھونکی، اور تحریک آزادی کی منزلیں آسان کی ہیں۔ اور ہندوستانی ادب کی مثبت ادبی، اور کلچری قدروں کو آگے بڑھایا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ ترقی پسند تحریک نے قطعی طور پر ہندوستانی ادب کی روایتوں سے انحراف کیا ہے۔ یہ لوگ اپنے بزرگوں کے بیٹے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی روایتوں کے خوبصورت عناصر کو آج کے حالات کی روشنی میں پرکھ کر چن لیا ہے۔ کچھ چیزیں قبول کر لی ہیں۔ کچھ رد کر دی ہیں۔ اور ان میں زندگی کے نئے خیالات سمو کر ہندوستانی عوام کے ہاتھ میں اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے نئے نئے خیالات دیے ہیں۔ ایسا ہونا تو ضروری تھا۔ اگر یہ نہ کرتے تو کوئی اور کرتا۔ محض چند افراد اپنی ادبی کاوشوں سے کسی ایسی تحریک کو ہمہ گیر نہ بنا سکتے تھے۔ اس کا بیج تو ہندوستانی عوام کے دل میں پہلے سے موجود تھا۔ اس لیے جب یہ تحریک چلی تو ہندوستان کی ہر زبان میں لاکھوں چاہنے والے مل گئے۔ ان کا دل بھی اس تحریک کے ساتھ ساتھ دھڑکتا تھا۔ اور ان کے عزائم بھی وہی تھے جو اس تحریک کے تھے۔

ترقی پسند تحریک نے جو یہ ہندوستانی ادب کی بنیادیں رکھی ہیں اور مستقبل میں جو اضافے کیے جائیں گے، ادب کے جو نادر نمونے تخلیق کیے جائیں گے وہ انہیں بنیادوں پر کھڑے کیے جائیں گے۔ ترقی پسند تحریک نے ایک ایسا تاریخی کارنامہ سر انجام دیا ہے جس کی اہمیت آنے والے دور میں اور بھی عیاں ہو جائے گی۔

۸۔ سوال کرشن چندر صاحب قومی اور بین الاقوامی کلچر کے بارے میں آپ کے نظریات کیا ہیں؟

جواب میں ایک مخصوص قومی کلچر کا قائل ہوں۔ لیکن اس شدت سے نہیں کہ دوسرے مخصوص کلچروں کی اہمیت کو بھی نہ سمجھوں۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ اس برصغیر میں ایک سے زیادہ قومیں رہتی ہیں۔ ایک سے زیادہ کلچر ہیں۔ اور فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ تمام قوموں اور ان کے مخصوص کلچروں میں رواداری پیدا کی جائے۔ اور ان کی مخصوص قدروں کا تحفظ ہو۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ کوئی کلچر قومی ہوتے ہوئے بھی اس قدر مطلق اور مجرد نہیں ہوتا کہ اس پر دوسرے کلچروں کے اثرات نہ پڑیں۔ ہر کلچر میں مختلف عناصر پائے جاتے ہیں جن کا اگر تاریخی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی ملک میں کتنی ہی قومیں اور ان کے کلچر ایک دوسرے پر اپنا رنگ چھوڑ جاتے ہیں۔ پھر ہر کلچر قومی ہوتے ہوئے بھی اس درجہ محدود نہیں ہوتا کہ اپنے ملک سے باہر کے اثرات نہ قبول کرے یا ان پر اثر نہ ڈالے۔ کلچر دو طرفہ ٹریفک ہے اس کا ایک رخ قومی ہے دوسرا بین الاقوامی انسان اس کرۂ ارض کے ہر گوشے میں بستا ہے اور مختلف جگہ کے انسانوں کے مختلف کلچروں کی رنگا رنگی سے انسان کو فائدہ ہی پہنچتا ہے نقصان نہیں۔ اپنے کلچر، ملک اور قوم کو بہتر سمجھنا اور دوسری قوم کے کلچر کو کمتر خیال کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔ میری نظر میں یہ گناہ سے کم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ دنیا کے مختلف کلچر اپنی جگہ پر اہم ہیں اور خوبصورت ہیں اور ہمیں سب کی عزت کرنی چاہیے۔ ان کی خوبصورتی کا اعتراف کرنا چاہیے۔ اور اپنے قلم میں اتنی وسعت پیدا کرنی چاہیے کہ ان سے ہم کچھ سیکھ سکیں جس سے ہماری زندگی کی مسرتیں اور بھی گہری ہو جائیں گی۔

ساجدہ زیدی
گل برگ سول لائنز علی گڑھ

مگر وہ شعلہ ابد ہے...

(کرشن چندر کی یاد میں)

یہ کس کے ماتم میں آج
شعر و ادب کا چنچل علم سیہ پوش ہوگیا ہے۔
یہ کون محفل سے اٹھ گیا ہے
کہ قلب احباب مضمحل ہے
چراغِ محفل تھکا ہوا ہے
یہ کون خاموش ہوگیا ہے
کہ نطق و لب سرنگوں ہیں
احساس کے دبستاں اداس ہیں
حسنِ خوابِ فردا بکھر گیا ہے

وہ حرف و معنی کا راز داں
جادۂ عدم کا ہے آج راہی
صدائے دل کا مزاج داں
بے صدا سفر پر نکل گیا ہے
ہوائے جبر و سیاستِ کم نظر کا بے باک نکتہ داں
خاک ہوگیا ہے

مگر اک مشتِ خاک،.... جو ایک جسم خاکی کی خاک ہے
اک جہانِ معنی کی خاک کب ہے
وہ عالمِ رنگ رنگ جو اس وجود میں جذب تھا
یہ اس عالمِ نہانی کی خاک کب ہے
وہ جس میں بوئے خلوص تھی موجزن
یہ اس دل نشیں کہانی کی خاک کب ہے

تمہارے الفاظ کا پگھلتا ہوا ترنم
تمہاری تخئیل کے شفق زار کا تبسم
تمہارے احساس کا تلاطم
تمہاری فکرِ زمانہ پیما
تمہارا آئینِ دردمندی
تمہاری چشمِ نظارہ جو کی
حیات کے خونچکاں مناظر میں تند گردش
وہ گردشِ تند اب کہاں ہے

تمہاری شبنم نژاد آواز میں
وہ سوزِ دروں کی آتش
وہ سازِ ہستی کے نرم نغمے
وہ دل کی مدھم کسک کی لرزش
وہ ذہنِ بیتاب کی اٹل جستجو کی تابش
یہ سب کہاں ہیں

وہ عقل و دانش کے جام میں
آرزو کی معصومیت کا نشہ
وہ ساری انسانیت کے
رمزِ حقائق و بود و باش سے دردِ دل کا رشتہ
وہ درد کی نغمگی
وہ نغموں میں درد و داغِ جگر کی شرکت
وہ سطحِ قرطاس پر
شرارِ نفس سے لکھی ہوئی حکایت
یہ سب کہاں ہیں...
یہیں کہیں ہیں!

میانِ محفل سرود خاموش کی صدا اب بھی گونجتی ہے
ہوا ہے تارِ نفس شکستہ
مگر شرارِ نفس ابھی تک تیرگی کے دامن میں جل رہا ہے

وجود کی انتہا عدم ہے
بقا، فنا ہی کا اک قدم ہے
مگر وہ شعلہ ابد ہے، جس سے
حیات میں گرمیٔ الم ہے —

مخمور سعیدی
ماہنامہ تحریک، انصاری مارکیٹ
دریا گنج دہلی

غزل

بہار لوٹ کبھی آئی تو کیا کہ تو ہی نہ تھا
نظر کو ذوقِ تماشائے رنگ و بو ہی نہ تھا

ہبث کسی سے تھی حسنِ قبول کی امید
ہمیں سلیقۂ اظہارِ آرزو ہی نہ تھا

لگی تھی چپ کہ فضا اجنبی تھی محفل کی
مرے لئے کوئی عنوانِ گفتگو ہی نہ تھا

کسی کو بانٹتے کیا تلخ کامیاں اپنی
کہ انجمن میں کوئی اپنا ہم سبو ہی نہ تھا

پھر اس سفر کا تو لا حاصلی ہی حاصل تھی
قدم کسی کا سرِ راہِ جستجو ہی نہ تھا

اب اس نظر نے بھی آخر یہی گواہی دی
کہ چاکِ دامنِ دل قابلِ رفو ہی نہ تھا

کچھ اور لوگ بھی تھے جو ہمیں عزیز رہے
سبب ہماری اداسی کا ایک تو ہی نہ تھا

خلوصِ عشق پہ گزرے ہیں حادثے تو ہزار
بس ایک سانحۂ خونِ آرزو ہی نہ تھا

سبب کچھ اس کے تغافل کا پوچھتے اس سے
رہا یہ رنج کہ وہ شخص روبرو ہی نہ تھا

تمہاری تیغ پہ چمکے تو سرخرو ہم ہوں !
ہماری آنکھ سے ٹپکا تو وہ لہو ہی نہ تھا ! !

جلا درخت تھی اپنی بھی زندگی مخمورؔ
رگوں میں جس کی کوئی جذبۂ نمو ہی نہ تھا

محسن زیدی
۸۹۷ - نیا محلہ پل بنگش، دہلی ۶

غزل

بے چہرگی کے شہر میں کوئی نشاں نہ مانگ
کچھ اور مانگ، پرتوِ ریگِ رواں نہ مانگ

دشمن سے لڑ مگر مددِ دوستاں نہ مانگ
اک آسمان اور تہِ آسماں نہ مانگ

آثار زندگی کے ملیں گے عدم میں کیا
اس سوختہ زمین سے چنگاریاں نہ مانگ

کشتی کو اپنے حال پہ طوفاں میں چھوڑ دے
موجِ بلا کی فکر نہ کر بادباں نہ مانگ

دشوار راستوں کا سفر مجھ کو سہل ہے
اے ہم سفر مرے لیے آسانیاں نہ مانگ

کب میری مٹھیوں میں تھی رفتار وقت کی
مجھ سے حسابِ حاصلِ عمرِ رواں نہ مانگ

تُف اس کرم پہ مجھ کو ملے جو عدو سے بھیک
میرے لیے نوازشِ نامہرباں نہ مانگ

اس روشنی کی چھوٹ سے جل ہی نہ جائے گھر
جلتا ہوا چراغ سرِ آشیاں نہ مانگ

دونوں جہاں کا غم ہے غمِ دل کہیں جسے
دنیا کا غم بہت ہے غمِ دو جہاں نہ مانگ

ہم یوں ہی دو سروں پہ ہیں اک دوسرے سے دور
اب اور فصل اپنے مرے درمیاں نہ مانگ

محسنؔ خیال کے لیے خانے طلب نہ کر
موجِ رواں کے واسطے پابندیاں نہ مانگ

شمیم حنفی
شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی

انتظار حسین

بھٹکی کوچے سے شہرِ افسوس تک انتظار حسین کے حوالے سے اردو افسانے کے سفر کی ایک انوکھی سمت سامنے آتی ہے۔ منٹو کے بعد انتظار حسین اردو افسانے کا سب سے زیادہ متنازعہ فیہ نام ہے۔ ۷ راپریل ۱۹۷۷ء کو لاہور سے شہرِ دلی میں ان کی اچانک آمد انتظار حسین کے دوستوں اور مداحوں کے لئے اس دن کا شاید سب سے اہم واقعہ تھا۔ ۷ سے ۱۳ ر تک انتظار حسین دلی میں رہے۔ ہندی، اردو اور پنجابی کے ادیبوں سے ان کی ملاقاتیں اور بحثیں ہوتی رہیں۔ ۹ راپریل کی صبح کو شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے انتظار حسین کے اعزاز میں ایک محفل برپا کی۔ یہ مضمون اسی محفل میں پڑھا گیا۔

انتظار حسین میرے لئے ایک نام نہیں، ایک تجربہ ہے۔ ایسا تجربہ جو گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ گئے دن یا بیتے ہوئے لمحے کا واقعہ نہیں بن جاتا بلکہ دل میں یوں جذب ہو جاتا ہے کہ اسے صرف اپنے وجود کے حوالے سے محسوس کیا جا سکے۔ اس تجربے کی نوعیت کیا ہے؟ اس کی حدیں کیا ہیں؟ اس زندگی کو جو مجھے بسر کر رہی ہے اور اس زندگی کو جس کے تماشے میں اپنے آپ کو میں گھرا ہوا پاتا ہوں، اس تجربے نے کیوں اور کس طرح اور کن جہتوں سے متاثر کیا ہے۔ اس حقیقت کا غیر جذباتی اور معروضی تجزیہ میرے لئے ممکن نہیں۔ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ یہ تجربہ مثبت ہے یا منفی، مفید ہے یا مہلک۔ لفظ اور وہ بھی تخلیقی لفظ کا معاملہ ادب پڑھنے والے کے لئے بےحد ذاتی ہوتا ہے، بشرطیکہ پڑھنے والا ایک جذباتی اور جمالیاتی ضرورت کے تحت پڑھے اور کسی ایسے مقصد کا تابع نہ ہو جو اس کے حواس کو یکسو نہ ہونے دے۔ اب اس معاملے کو جو اس درجہ ذاتی بن جائے، اجناس کی خرید یا اشیاء کے انتخاب اور مول تول یا گاہک کی ضرورت اور پسند کے حساب کتاب سے کچھ تو الگ ہونا چاہئے۔ اظہار کا وہ سانچہ اب تک وجود میں نہیں آسکا جو یہ بتا سکے کہ مرجھائی ہوئی بے برگ و بار شاخوں سے نڈھال درخت یا کسی سنجی ایلیے کے اندوہ کی حدو انتہا کیا ہوتی ہے۔ ایک لہورنگ شام کی دہلیز پر حسینؑ کو دیکھ کر انیس بھی بس اتنا کہہ سکے تھے کہ "آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے"۔ یہ "کیا" سوال بھی ہے اور اس کا جواب بھی، ایسا جواب جس میں سوال سے زیادہ الجھن اور بے بسی اور زہرناکی چھپی ہوئی ہے۔ انتظار حسین کے افسانے بھی میں نے کبھی کسی جواب کی توقع کے ساتھ نہیں پڑھے اور نہ ہی اس لئے کہ ان سے کسی تعصب کی تصدیق ہو سکے۔ ان کے مقدمات سے اتفاق و اختلاف کی بحث اسی وجہ سے میرے لئے بے معنی ہے۔

اصل میں سوال جتنے رمز آمیز اور وسیع ہوتے ہیں بیشتر صورتوں میں جواب اتنے ہی دو ٹوک، محدود اور عامیانہ اور وہ جواب جو سوالوں کے مثال پیچیدہ دکھائی دیں، لوٹ کر پھر سوال بن جاتے ہیں۔ انتظار حسین کے افسانے بھی سوالوں کا ایسا ہی سلسلہ ہیں۔ انھوں نے پرانی کہانیوں میں نئے ادب کے اور رفتگاں کی یاد میں نئے عہد کے چند سوالوں کا جواب ڈھونڈا بھی تو اس طرح کہ جواب گھوم پھر کر دوبارہ سوال بن گئے۔ یہ جواب تلقین، تنبیہہ اور جذباتی غلو سے یکسر عاری تھے۔ سینے سے رس رس کر نکلتی ہوئی افسردگی میں ڈوبا ہوا لہجہ اور تیقن سے خالی جواب پڑھنے والے کو نہ تو مرعوب کرتے ہیں نہ اس کی ذہنی قیادت کا ہنگامہ کھڑا کرتے ہیں۔

اب انتظار حسین نے جن سوالوں کو بے جواب چھوڑ دیا، یا جن جوابوں میں پھر سے سوال منتقل کر دیئے ان پر لوگ طرح طرح سے عاید ہوتے ہیں۔ افسانوں کی بات الگ دھری رہ جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ انتظار حسین کی باتوں میں سارا چکر اس نفسیات داں کا چلایا ہوا ہے جس نے نسلی حافظے اور اجتماعی لاشعور کے نام پر فرد کے آشوب کو ایک کلی استعارے یعنی انسان کے تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کا جتن کیا تھا۔ معلوم نہیں واقعہ کیا ہے۔ میں تو اس ضمن

میں انتظار حسین کے افسانوں کی سیر کے بعد بس اتنا سوچا کہ یونگ اگر علمی مسئلہ ہے تو وزیر آغا کے لئے، انتظار حسین کے لئے وہ ایک ادراک ہے۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ انتظار حسین کا آسیب وہ درد ہے جو ان کی شیعیت کے وسیلے سے امام حسینؑ کی شہادت کے واقعے تک جاتا ہے۔ یعنی ایک ذاتی، جذباتی، اور فرقہ وارانہ مسئلہ، حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ یہ کچھ سوچنے والا اس ہمہ جہت استعارے یا ذہنی ماحول کو کیونکر نظرانداز کر دیتا ہے جو تاریخ کے اس وقوعے کی جلد توڑ کر نمودار ہوا ہے اور جس کی لوح پر اسمِ حسینؑ روشن ہے۔ کسی کو یہ شکایت کہ انتظار حسین بس اس ہجرت کے آزار میں مبتلا ہیں جو ۱۹۴۷ء میں گھر چھوڑ کر جانے والوں کو اپنی بے زمینی کے احساس نے بخشا تھا۔ یہ احساس اب ایک مستقل احساسِ زیاں میں منتقل ہو چکا ہے اور انتظار حسین کی سے ہزیمت زدگی اب اس یوٹوپیا کا خواب دیکھ رہی ہے جو بغداد الحمرا اور غرناطہ اور کشمیر اور لاہور اور شاہجہاں آباد کو ایک دھاگے میں پرو سکے۔ یعنی پھر وہی قومی فرقہ بندی کا مسئلہ، اور انتظار حسین ہیں کہ رام لیلا سے کربلا اور مکے تک یا اسلام آباد سے اندرپرستھ تک گھوم پھر آتے ہیں، کہ سفر کے ایک ہی سلسلے میں یہ سارے نام اور مقام آجاتے ہیں۔ کہانیاں لکھنے والے کے لئے جغرافیہ تاریخ سے کم اہم نہیں ہوتا۔

کثرتِ تعبیر کی اس یورش میں مجھے وہ تجربہ گم ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے، جسے میں نے سیاست، تمدن، نفسیات اور سماجی علوم کی بندشوں سے الگ کر کے اس کی تمام سمتوں کے ساتھ قبول کیا ہے، صرف اس سطح پر جس پر اس تجربے نے اظہار پایا ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے یہ تجربہ کہانی بن سکا ہے یا نہیں۔ رہا حقیقت اور کہانی کا فرق و فاصلہ تو اس حقیقت سے شناسائی کے لئے نہ تو انتظار حسین کی ضرورت تھی نہ ادب پڑھنے کی۔ وہ دن ہمارے تہذیبی زوال کی انتہا اور ہماری جذباتی فنا کا دن ہوگا جب حقیقت اور کہانی کا بھید ختم ہو جائے۔

کہانی ہو یا کلیات میر دونوں صرف کھلی آنکھوں سے پڑھنے کی چیز نہیں ہیں۔ پھر آنکھوں کے ساتھ اگر معقولات سے مسلح ذہن کے اسی طور بیدار اور چوکنا رہا تو قدم قدم پر دشواریاں در آئیں گی۔ انمل، انہونی اور بے جوڑ باتیں پریشان کریں گی اور میر صاحب کے اس شعر سے کہ:

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
واں کبھو سرو وگل کے سائے تھے

ہم تک بس اتنی سی اطلاع بہم پہنچ سکے گی کہ فرنگیوں کے تسلط اور شاہانِ تیموریہ کے زوال نے دلی کا نقشہ بدل دیا یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ میر صاحب نے بڑے زبردست صدمے جھیلے۔ مقصود اگر محض یہ کچھ جاننا ہے تو پھر میرابائی کے بھجن کیوں سنے جائیں یا اسپین کے اس جواں مرگ شاعر کے گیت کیوں پڑھے جائیں جسے اندوسکے ایک جواں مرگ شاعر نے اپنا ہم عصر بنا لیا تھا۔ تعقل اور طبعی حقیقتوں کے حصار سے آگے بہت آزادی ہے اور آئے دن اس کھلی ہوئی بے حساب فضا میں عجیب اور انوکھے واقعے رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اس تو ہم میں یقین نہیں تو ادب کے بجائے ان پاک طبیعتوں سے رجوع کرنا چاہیے جنہوں نے زندگی کی ہزار ہا صبحیں کتب خانوں میں شام کر دیں اور عالم یا دانشور کہلائے۔

اپنے کرداروں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے انتظار حسین نے لکھا تھا:

"مشاہدے کا رستہ سیدھا ہے اور آسان ہے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ ہمارے باوا آدم نے چند تکلیفیں اپنی جان کو لگالی تھیں۔ اولاد نے باپ کی تکلیفوں سے فیض اٹھایا مگر اس اولاد میں سے جس نے تخلیقی آدمی بننے کا دعویٰ کیا اس کے سر یہ بوجھ ڈالا گیا کہ وہ اپنے جدِ امجد کی تکلیفوں کو امانت جانے اور ان کے دکھ بھرے تجربوں کو فراموش نہ ہونے دے۔"

یاد دکھ بھرے تجربوں کی ہو یا خوشگوار لمحوں کی ہمیشہ دردانگیز ہوتی ہے کہ بالآخر خالی پن اور محرومی ہی کوکھ سے سر ابھارتی ہے۔ اسے برتنا ہے تو چار و ناچار کچھ حقیقتوں کو حواس اور شعور کی انجمن سے نکال کر ان کے لئے جگہ بنانی ہوگی۔ پس انتظار حسین نے بھی خود کو راستے سے ہٹا کر انواع و اقسام کے کرداروں کی وساطت سے دکھ بھرے تجربوں کی یاد تازہ کی ہے اور تکلیفوں کی امانت ہم تک پہنچائی ہے، اس کردار کے حوالے سے جسے آخری بس میں بیٹھ جانے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ بس تو کسی اور راستے پر جا رہی ہے، اس کی منزل سے پرے۔ اور بس کے تمام مسافروں میں ایک ہی OUT SIDER ہے، اس کردار کے حوالے سے جس کے قبیلے کا ایک ایک آدمی اپنی ہوس کے ہاتھوں خوار ہوتا ہے اور اپنے عمل اور ردِ عمل کی انتہاپسندی کے سبب اس تناسب اور توازن سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جس نے آدم کے بیٹوں اور بندروں کی مابین فصل کی لکیر کھینچ رکھی تھی۔ اس کردار کے حوالے سے جس دکان میں گھڑیاں بند پڑی ہیں اور باہر نجومی لوگوں کو قسمت کا حال بتا رہا ہے، اس کردار کے حوالے سے جس کے یاروں کی ٹولی کا ہر فرد ایک دوسرے کے تئیں مشکوک ہے کہ اعتماد کی ڈور ٹوٹ چکی ہے۔ اس کے کردار کے حوالے سے جسے دکھ ہے کہ ریل چلی تو سفر کا مزہ جاتا رہا۔ اور اب اگر رمز اور ایڈونچر کا مخزن کوئی سفر ہوگا تو وہ جو بے سواری کا ہے اور سب کا مقدر ہے، اس کردار کے حوالے سے جو شہر افسوس میں ہے جس پر کبھی ہنستا ہے اور بستی کے حیران مکینوں کے لئے خبر بن جاتا ہے، اس کردار کے حوالے سے جو بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد سہاگ کر دوستوں میں پہنچتا ہے تو اس کے پاؤں کی خستہ حالی جو تی سوال سے متر الجھ آنکھوں کا جواب بن جاتی ہے، ان کرداروں کے حوالے سے جو ایک دیوار کو چاٹنے کے درپے ہیں اور وہ دیوار ہے کہ روز کی روز پھر سربلند دکھائی دیتی ہے، غرضیکہ بھانت بھانت کے کرداروں نے تجربوں کی یہ امانت جس کے سلسلے گزشتہ سے موجود تک پھیلے ہوئے ہیں ہم تک پہنچائی ہے۔ اب افسانہ نگار دیناد

تو نہیں کہ اتنے سارے کرداروں کا کردار بن جائے یا اتنے بہت سے رنگوں کو ایک اکیلی ذات کے نقطے پر سمیٹ لے۔ ہمارے داستان گو اچھے اور بڑے نیک اور لعین چہروں کی جس بھیڑ سے اپنے قصّوں کا شہر آباد کرتے تھے اگر ان تمام چہروں میں خود کو بانٹ دیتے تو دنیا کے کام کے نہ رہ جاتے۔ پھر رات کس کے کلام کی شیڑھی میڑھی، سیاہ اور روشن پگڈنڈی پر سفر کرتی۔ وہ ہر کردار اور ہر واقعے کا سماں باندھتے تھے، اس ہنرمندی کے ساتھ خود کو بیچ سے غائب کر دیتے کہ سننے والا اپنی استعداد اور توفیق کے مطابق نتائج اخذ کر لیتا۔ انتظار حسین نے بھی کہیں فیصلے صادر نہیں کئے، نہ ان کی سوچ پر پہرے بٹھائے، نہ اپنے کرداروں کے عمل میں اپنے اس زندگی کو مداخلت کا موقع دیا جو ظاہراً حقیقی اور کاروباری ہے۔ اس نوع کی مداخلت افسانے کی پوری فضا کو ایک آن میں درہم برہم کر دیتی ہے۔ انتظار حسین کا سخت ترین نقاد بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ فضا کی تعمیر اور وحدت کے اعتبار سے ان کے افسانے اردو میں بے مثال ہیں۔ لکھتے ہیں :

افسانے میں میرا مسئلہ ظاہر ہونا نہیں ہے، روپوش ہونا ہے۔ پیغمبروں اور لکھنے والوں کا ایک معاملہ سدا سے مشترک چلا آتا ہے۔ پیغمبروں کا اپنی امت سے اور لکھنے والوں کا اپنے قارئین سے رشتہ دوستی کا بھی ہوتا ہے اور دشمنی کا بھی۔ وہ ان کے درمیان رہنا بھی چاہتے ہیں اور ان کی دشمن نظروں سے بچنا بھی چاہتے ہیں۔ میرے قارئین میرے دشمن ہیں۔ میں ان کی آنکھوں، دانتوں پر چڑھنا نہیں چاہتا۔ سو جب افسانہ لکھنے بیٹھتا ہوں تو اپنی ذات کے شہر سے ہجرت کرنے کی سوچتا ہوں۔ افسانہ لکھنا میرے لئے اپنی ذات سے ہجرت کا عمل ہے۔

ہو سکتا ہے کہ بعضوں کے نزدیک یہ محض فریب ہو یا خود کو چھپانے کی یہ کوشش کسی نفسیاتی کمزوری کا جبر ہو یا پھر اپنے تئیں بے اعتمادی کا نتیجہ۔ یوں ادب تو خیر ادب ہے، علومِ عقلیہ کے معاملے میں بھی بے اعتمادی سے زیادہ ہلاکت آفریں وہ خوش اعتمادی ہے جو اپنی نظر یا نظریے سے مبالغہ آمیز محبت اور اپنی آگہی کے خلاصۂ کائنات ہونے پر اصرار کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس قسم کی شدت پسندی نفاخر تک لے جائے یا انفعالیت تک، دونوں صورتوں میں انجام اچھا نہیں ہوتا۔ پھر درد جب دائمی اور گہرا ہو تو اپنے آپ سے ایک معروضی فاصلہ قائم رکھنا اور ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ شخصیت کشی نہیں نہ ادب سے اخراج بشریت کا معاملہ ہے۔ دراصل یہ قصہ ہے اپنے کرداروں کو اپنی زد سے اور قارئین کو بوریت سے بچانے کا۔ میں کسی بھی شخص کے ساتھ، وہ جتنا بھی پرکشش اور قیمتی کیوں نہ ہو، مستقل وقت گزاری کے تصور سے بھی کانپ اٹھتا ہوں۔ خود نوشت سوانح عمریاں مصیبت بن جائیں اگر دوسروں اور مختلف دکھائی دینے والے چہروں اور رنگوں کی شمولیت سے یکسر خالی ہوں۔

یوں مجموعی طور پر انتظار حسین کے افسانوں کی فضا الم آگیں ہے۔ اس فضا کے اضطراب میں تموّج نہیں، تجسّس نہیں، خود رحمانہ تظاہر نہیں، حیرانی کا احساس بھی دبا دبا سا ہے۔ گویا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ تو ہونا ہی تھا۔ اداسی کی ایک نمناک دھند ہے سارے منظر پر محیط۔ چلتے پھرتے لوگ بھی پرچھائیوں کی صورت گزرتے ہیں اور کوئی بھی کیفیت بے حجاب نہیں ہوتی۔ ضبط کے باعث اداسی کا تاثر اور بلیغ ہو جاتا ہے۔ کردار عمل سے زیادہ اپنے ردِ عمل اور جذباتی صورتِ حال میں خود کو نمایاں کرتے ہیں۔ اکثر وہ یا تو باتیں کرتے ہیں یا پھر سوچتے ہیں۔ بولتے رہتے ہیں، سوچتے رہتے ہیں اور اس حقیقت کے باوصف کہ سوچنا بھی کچھ کرنا ہے، یہ کردار عام طور پر نکمے اور ہارے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اب جہاں تک مجرد طریقے سے سوچتے رہنے کا تعلق ہے سارتر صاحب نے بارہا اس بات پر زور دیا ہے کہ اس طرح دنیا تو بدلنے سے رہی۔ یوں تبدیلی کون نہیں چاہتا۔ ان نکمے اور ہارے ہوئے کرداروں کی اداسی کا سبب بھی اسی خواہش کی بے حصولی ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ قصہ گو کرے بھی کیا۔ اس تک جو امانت پہنچی ہے اور جسے وہ اپنے قاری تک پہنچانا چاہتا ہے، اس کے تئیں انصاف کا تقاضہ بھی ہے کہ وہ ان کرداروں کی گردنیں نہ اڑائے، نہ ان کے چہروں پر اپنی خواہش کے مطابق تیار کیے ہوئے خول چڑھائے۔ کاش یہ ممکن ہو سکتا تو پھر شہر شہر افسوس کیوں بنتے۔ اور جب اچھے اور حوصلہ مند لوگوں نے اس "انہونی کو ہونی" میں تبدیل کرنے کی ٹھانی تو ایسے لطیفے سامنے آئے کہ بیرے خطیبوں کی طرح تقریر جھاڑ رہے ہیں اور پریم چند کے کفن کے کردار دل کی بیرو ڈیز سینکتے ہوئے آلو کھانے کے بجائے نہایت فلسفیانہ ذکر و فکر میں مشغول ہیں۔

سوال یہ ہے کہ پھر انتظار حسین سے ہمارا مطالبہ کیا ہو؟ مجھے تو بس اتنا خیال آتا ہے کہ ادب کے اپنے تقاضے بھی کچھ کم نہیں ہوتے اور یہ آزمائش ایسی سہل بھی نہیں کہ لکھنے والے کے سر طرح طرح کے اور عذاب ڈال دیئے جائیں اور اس سے دوسرے کاموں پہ لگنے کی فرمائش بھی کی جائے۔ پھر کیا واقعی اداسی بجائے خود ایک احتجاج یا تبدیلی کی جاں گداز آرزو کا استعارہ اور اپنے عہد کی حرماں نصیبی کے انتہائی اندوہ ناک شعور کا اشاریہ نہیں ہوتی؟ جسم میں درد ہونا بھی اس بات کی علامت ہے کہ اس کے معمولات میں کوئی ناگوار مداخلت ہوئی ہے۔ سو یہ درد بھی ایک طرح کا خاموش احتجاج ہے۔ اب اگر یہ احتجاج واویلا بن جائے تو صورت کیا ہوگی؟ انتظار حسین کا کہنا ہے کہ ان کے کردار خوش و خرم نہ سہی مگر خدا کا شکر ہے کہ وہ اونچی آواز رونے بھی نہیں اور ایسا اس لئے ہے کہ اونچی آواز سے رونے والے لوگوں سے انھیں ابتذال کی بو آتی ہے پاسِ ناموسِ عشق کی خاطر میر صاحب بھی پلکوں تک آئے ہوئے آنسو پی گئے تھے۔ ادب نہ تو آلام کی نمائش ہے نہ گداگری کہ زخم ہتھیلیوں پر رکھ لئے جائیں۔ حد سے بڑھی ہوئی بے حجابی آپ اپنا حجاب بن جاتی ہے کہ دیکھنے والا کسی بھی مانوس منظر کو بس اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ عیاں ڈبھ

بیاں ؟ اور اگر لکھنے والے سے بیان کے اس کے اپنے ڈھب اور وسائل چھین لئے جائیں تو اس کے پاس رہ کیا جاتا ہے اذیت کو اداسی اور خفتے کو سکوت کے آداب سے ہمکنار کرنا بھی ایک فن ہے۔ طاقت کے اظہار کا واحد طریقہ نہ تو پہلوانی اور لکّے بازی ہے نہ ترسیل خیال کا آخری ذریعہ محض لفاظی۔

ہو سکتا ہے کہ کسی خود آگاہ لمحے میں آپ اپنے پسندیدہ لکھنے والے کی ایسی کئی باتیں رد کر دیں جو اس کے خیال کی زمین سے پھوٹتی ہوں۔ خیالات آئے دن مسترد ہوتے رہتے ہیں کہ ایک سے ایک بڑا دانشور اپنے پیش رو پر خطِ تنسیخ کھینچنے کے لئے آموجود ہوتا ہے۔ انتظار حسین کے طرزِ فکر پر مکمل ایمان بھی کوئی معنی نہیں رکھتا کہ ایک ہی عہد میں خیال کے کئی دھارے ایک ساتھ سامنے آ سکتے ہیں۔ متوازی میلانات رکھنے والے افسانہ نگاروں کی صفیں بھی جمی ہوئی ہیں۔ یوں بھی ایک کو ماننے کے لئے دوسرے کی یکسر نفی غیر ضروری ہے۔ بہر نوع یہ مسئلہ اہلِ علم کا ہے، میرا مسئلہ نہ تو انتظار حسین کے عقائد ہیں نہ افکار، نہ ان کے تہذیبی اور ملّی مقاصد۔ میرا مسئلہ تو وہ حدت ہے جو انتظار حسین کے افسانوں میں جذباتی اور نفسیاتی واردات کی ترتیب سے نمود پذیر ہوئی ہے۔ یہ وحدت "گلی کوچے" اور "کنکری" سے "شہر افسوس" تک پھیلی ہوئی ہے اور مجھے روزمرہ کی مانوس اور برتی ہوئی زندگی کی بے رنگی سے نکال کر ایک ایسے لسانی خلکے تک لے جاتی ہے جس میں انتظار حسین نے ایک نئی دیو مالا کا رنگ بھرا ہے۔ زندگی کو اگر بعینہٖ اسی شکل میں دیکھنا ہو جیسی کہ وہ تماشا کو دکھائی دیتی ہے تو پکاسو کا برش چھین جانا چاہیئے تھا کہ نقل مطابق اصل تیار کرنے کا کام کیمرے کی مدد سے صرف دو آنکھیں رکھنے والے بھی کر سکتے ہیں۔ مگر وہ تیسری آنکھ جو دیکھتی ہے اور دکھائی نہیں دیتی، جو دیکھتی بھی ہے اور سوچتی بھی ہے اور جو مختلف حواس کی توانائیوں کو بصارت کے محور پر مجتمع کر لیتی ہے اس کے بغیر نئی دیو مالا ترتیب دینے کا وہ عمل نامتمام رہ جاتا جس کا مظہر انتظار حسین کے افسانے ہیں۔ انتظار حسین نے کہانی کی کہانی، میں شاید اسی سوچنے والی اَن دیکھی آنکھ کو انفرادی بصیرت کی روشنی کے مرکز سے تعبیر کیا ہے۔ یہ روشنی گھُپ اندھیرے میں روزمرہ کے بظاہر پھیکے معمولات میں کہانیاں ڈھونڈ نکالتی ہے اور انھیں ایک ایسا روپ دیتی ہے کہ ان کہانیوں کو پڑھنے کے بعد میں اپنے آپ سے کبھی کبھی اس طرح کا کوئی سوال نہیں پوچھتا کہ "میں اس سے متفق ہوں یا نہیں ؟" ایسے کسی سوال کا تصور بھی میرے لئے مضحکہ خیز ہے۔ انتظار حسین کا دھیما، سرگوشی سے قریب حکائی اسلوب اور کھُل جا سم سم کے جادوئی رمز سے معمور زبان بھی اسی آنکھ کا کرشمہ اور اسی روشنی کا عطیہ ہے لفظوں میں طلسمات کے شہر جھلکائی دیتے ہیں اور جیتے جاگتے اشخاص کی طرح زندہ اور متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ یہ افسانے بیانیہ اور استعاراتی دونوں سطحوں پر ایک سی بے تکلف چال چلتے ہیں۔ ان میں داستانوں کا سحر بھی ہے اور کتھاؤں، حکایات اور شکار ناموں کی دانش بھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس دانش کا سرا صرف اپنے حال سے جڑا ہوا نہیں ہے بلکہ ان دنوں کی خبر بھی لاتا ہے جو کھوئے گئے اور ان کی بھی جنھیں

نازش پرتاپ گڑھی
بیگم وارڈ، پرتاب گڑھ

اطمینان

مرا وجود بھٹکتا رہا اندھیرے میں
مرے وجود سے نزدیک و دور ــــ گرد و پیش
ہزار کرمکِ شب تاب
ہزار انجم و مہتاب
ہزار جامِ شراب
ـــــــ ان گنت کرنیں

ہزار ہا سورج
پگھل کے بہہ گئے
یہ ریگ زار مگر جانے کب کا پیاسا ہے
جانے کتنا پیاسا ہے
کہ ایک اک دھارا
اور ایک اک قطرہ
وجود سے محروم
نمود تک معدوم
شہودِ کارگہہ شیشہ گر نہیں ہے، نہ ہو
نمودِ شوق کا پیغامبر نہیں ہے، نہ ہو
یہ کم نہیں ہے کہ میرا وجود
میرا ہے
اسی طرح سے سلامت
اسی طرح موجود

ابھی پایا جاتا ہے۔ میرا تجربہ یہی وحدت ہے کہ اس میں الفاظ اور جملے اور اشخاص اور تجربے اور وارداتیں اور زمانے سب کے سب یکجان ہو گئے ہیں۔

قصہ گو کے جیتے رہنے کی شرط پر شہرزاد کے دنوں سے ہمارے آپ کے دن تک یہی رہی ہے کہ کہانی کے جال کی بُنت کا سلسلہ قائم رہے اور ہر صبح سوال کی الجھن پر ختم ہو۔ اچھا ہوا کہ انتظار حسین کو اپنے قصہ گو ہونے پر فراغت میسر آئی۔ انھوں نے جواب ڈھونڈے بھی تو ایسے کہ الجھن کا تار نہ ٹوٹے۔ کیا عجب کہ ایسا نہ ہوتا تو یہ سرا بھی ہاتھ سے گیا تھا۔

حفیظ احمد خاں
آل انڈیا ریڈیو، آکاش وانی بھون
نئی دہلی

سدھیشوری دیوی

یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے جب میں آل انڈیا ریڈیو بمبئی میں بحیثیت میوزک پروڈیوسر فرائض انجام دے رہا تھا۔ میرے کمرے میں چند فن کار آئے اور تھوڑی دیر بعد چلے گئے۔ اتفاق سے میری نظر ایک کتاب پر پڑی جو کوئی فن کار چھوڑ گیا تھا۔ وہ اردو کا ایک ناول تھا۔ مجھے یہ فکر ہوئی کہ اس کتاب کا مالک کون تھا۔ اچانک میں نے ایک صفحہ پر اردو میں دستخط دیکھے اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ تحریر سدھیشوری دیوی کی تھی۔ وہ پہلا دن تھا جب مجھے یہ پتہ چلا کہ بنارس کی رہنے والی سدھیشوری دیوی کی مادری زبان اردو ہے۔ میں اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ سدھیشوری دیوی بہ نفس نفیس خود تشریف لے آئیں اور بہت پریشانی سے اس کتاب کے بارے میں دریافت کرنے لگیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ وہ گھبرائیں نہیں وہ کتاب میرے پاس ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ اردو انہوں نے کہاں سیکھی۔ انھوں نے بڑی متانت سے کہا کہ بچپن میں انھیں اردو ہی پڑھائی گئی لیکن ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ہندی کا بھی مطالعہ کیا ہے۔

اس طرح انھیں اردو زبان پر عبور حاصل ہوا اور ساتھ ہی ساتھ اردو ادب سے لگاؤ بھی پیدا ہوا۔ اسی لئے وہ غزل کو بڑی خوش اسلوبی سے ادا کرتی تھیں۔ اور ان کا تلفظ معیاری تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ غزل کی معنویت کو بھی وہ بہت اہمیت دیتی تھیں۔

شمالی ہند میں کلاسیکی موسیقی کے بے شمار مراکز رہے ہیں۔ ان میں بنارس کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ وہ شہر جہاں گنگا کی حسین لہریں موجیں مارتی ہیں، ناقوس کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور جہاں کی صبح اپنی جلو میں سارے جمالیاتی حسن لئے رہتی ہے، یہ ہے وہ نغمہ انگیز اور سحر طراز سرزمین جس نے موسیقی اور رقص کا پیغام ملک کے اندر ہی نہیں بلکہ غیر ممالک میں بھی پہونچایا اور موسیقی اور فلسفہ ذرے ذرے میں جگمگانے لگا۔

اسی مقدس شہر میں ۱۹۰۸ء میں سدھیشوری دیوی کی پیدائش ہوئی۔ آنکھ کھولنے کے ساتھ ہی ان کے کانوں میں سروں کی کھنک نغمگی کا رس گھولنے لگی کیونکہ خاندان کا تقریباً ہر فرد موسیقی کا رسیا تھا۔ اور کچھ افراد نے تو اس فن میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ گو کہ ان کی والدہ کا سایہ بچپن میں ہی سر سے اٹھ گیا لیکن ان کی چچی راجیشوری دیوی نے اس ننھی فن کار کو اپنی سرپرستی میں لیا۔ اور ماں کا پیار اور شفقت دی۔ اسی خاندان کی ایک اور مایۂ ناز ہستی کملیشوری دیوی نے بھی سدھیشوری دیوی کو موسیقی کی ابتدائی تعلیم دی۔ لیکن باقاعدہ طور پر مشہور موسیقار پنڈت سیاجی مشرا نے ان کو موسیقی کے گوناگوں رموز سے آگاہ کرایا۔ شروع میں ان کو خالص کلاسیکی موسیقی کی تعلیم ملی۔ پنڈت سیاجی مشرا نے سب سے پہلے ان کو سروں کے اتار چڑھاؤ کی تعلیم دی جس کو زبان عام میں پلٹے کہتے ہیں۔ علم الحساب پر مبنی یہ پلٹے آواز کی شیرینی کو دوبالا کر دیتے ہیں اور سانس میں استقامت پیدا ہوتی ہے۔ برسوں تک یہ ریاضت جاری رہی اور پھر اس کے بعد سدھیشوری دیوی نے راگوں کے مختلف اقسام ذہن نشین کئے اور وہ نقوش آخیر تک ان کے ذہن پر مرتسم رہے۔



سیاجی مشرا کے انتقال کے بعد سدھیشوری دیوی دیواس کے مشہور فنکار مرحوم استاد رجب علی خاں صاحب کی شاگرد ہو گئیں اور ان سے کچھ نادر بندشیں سیکھنے کا موقع ملا۔ انھیں سے ان کو پیچ دار اور نازک تانوں کی تعلیم بھی ملی۔ اس دور میں ایک النکار تان پر وہ مہینوں مشق کرتی تھیں اور جب تک کہ ان کے استاد کو تسلی نہیں ہوتی تھی ان کو دوسرا سبق نہیں ملتا تھا۔

سدھیشوری دیوی نے لاہور کے استاد عنایت خاں صاحب سے بھی استفادہ کیا۔ اور ان سے خیال اور ٹپہ کی چیزیں حاصل کیں۔ لیکن

دراصل ان کی گائیکی اور اسلوب کو جس استاد نے سنوارا اور بلندیوں تک پہونچایا وہ تھے بنارس کے پنڈت بڑے رام داس جو اپنے زمانے کے مانے ہوئے فنکار تھے اور آج بھی وہاں کے فن کار اور شائقین موسیقی انتہائی ادب اور احترام سے ان کا نام لیتے ہیں۔ ایک بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ موسیقی کے دلدادہ سدھیشوری دیوی کو صرف ٹھمری، دادرا، کجری اور چیتی کی ماہر سمجھتے رہے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ خیال گائیکی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔ اس بات کا ثبوت اس طرح ملتا ہے کہ وہ ہر میوزک کانفرنس محفل اور آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں میں ٹھمری اور دادرے کے ساتھ ساتھ مروج اور غیر مروج راگوں میں خیال کی بندشیں بھی روایتی انداز میں انتہائی فن کارانہ ڈھنگ سے پیش کرتی تھیں

نوابوں اور راجاؤں کی ریاستوں میں جو سرپرستی کلاسیکی موسیقی کو حاصل تھی۔ اس کی مثال ملنا دشوار ہے۔ ایسے مراکز تھے رام پور، جودھ پور، بڑودہ، گوالیار، اندور وغیرہ۔ سدھیشوری دیوی کو تقریباً ہر ریاست میں مدعو کیا جاتا تھا لیکن ان کا کہنا تھا کہ ان کی سب سے زیادہ قدر ریاست رام پور میں ہوئی۔ نواب رضا علی خاں صاحب مرحوم خود بھی ایک اعلیٰ پیمانے کے فن کار تھے۔ ان کو سدھیشوری دیوی کا گانا بے حد پسند تھا۔ اور کمال کی بات تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ان سے ٹھمری دادرا وغیرہ کے بجائے صرف خیال ہی سنا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میری ملاقات رامپور میں مرحوم استاد مشتاق حسین خاں سے ہوئی اور وہ سدھیشوری دیوی کی خیال گائیکی کی بیحد تعریف کرنے لگے۔ ان کے بیان کے مطابق سدھیشوری دیوی کو راگ مالکوس پر جو قدرت حاصل تھی وہ بہت کم فن کاروں کو نصیب تھی۔

قدرت نے سدھیشوری دیوی کو انتہائی شیریں آواز بخشی تھی۔ اس کے علاوہ اس آواز میں زور تھا، گہرائی تھی اور سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جو ارادہ بھی وہ کرتی تھی وہ پورا ہوتا تھا، کبھی نغمے گنجلک نہیں ہوتے۔ خیال کی پیشکش میں وہ راگ کے مزاج کا دھیان رکھتی تھیں۔ اس کے مختلف انگوں (عناصر) کو ایک گلدستہ کی مانند یکجا کرتی تھیں اور تان کی روانی اور تسلسل تو ان کی خصوصیت تھی۔ خیال میں ان کی پسند کے راگ تھے۔ للت، رام کلی، سارنگ، ملتانی، پوریا دھناسری، بہاگ، مالکوس اور اڈانہ۔

ٹھمری میں وہ بولوں کے اندر چھپے ہوئے جذبات کی مصوری کرتی تھیں اور اس کے گوناگوں پہلوؤں کو اجاگر کرتی تھیں۔ اکثر ان کو بھیرویں، پیلو، کھماج اور تلنگ کی ٹھمریاں زیادہ مرغوب تھیں۔ دادرا گانے میں وہ ایک لے کے دائرے کو اچھی طرح برقرار رکھتی تھیں۔ یہ ایک بہت بڑا فن ہے اور آج کا فن کار شاید ہی اس کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر ہے لیکن سدھیشوری دیوی دادرے کی پیشکش میں بولوں اور لے کے پیچیدہ نمونوں کا صحیح امتزاج برقرار رکھتی تھیں۔

ٹھمری میں پورب انگ کا بلند ترین مقام ہے۔ سیدھے سادے جذبات کو سروں کے سانچے میں ڈھالنا اور ایک ماحول پیدا کرنا ان کے لئے انتہائی آسان بات تھی۔ جب بھی وہ ٹھمری گاتیں تو سدھ بدھ بھول جاتی تھیں اور سامعین صدائے تحسین بلند کرتے تھے۔ طبلے اور سارنگی پر سنگت کرنے والے جب مصنوعی طور پر فنی عناصر کو بیچ پر وہ ڈال کر ٹیکنیک کا مظاہرہ کرتے تو سدھیشوری دیوی بیچ میں بول پڑتیں "بیٹا تم لوگ سُر اور لے کے ساتھ کیوں لڑائی کر رہے ہو۔ یہ سوچو تو یہ پورب انگ ہے، پورب انگ ہے"

پٹہ گائیکی میں بنارس کا ایک اپنا مقام ہے۔ کون ہے جو رسولن بائی بڑی موتی بائی اور گرجا دیوی کے نام سے واقف نہیں۔ سدھیشوری دیوی نے بھی اس اسلوب کو بلندیوں تک پہونچا دیا۔ شوری میاں کی ٹپہ بندشوں میں ایک نئی روح بیدار ہو جاتی تھی۔ اور ان کا حسن نکھر جاتا تھا۔ بندش میں پنجابی زبان کے صاف و شفاف بول اس طرح تھرکتے تھے جیسے کسی رقاصہ کے پیر۔ ہر دانہ اپنی جگہ صاف و رنگین اور ہر مجموعہ سُر سراپا نغمگی۔ ٹپہ کو ایک انتہائی محدود صنف مانا گیا ہے لیکن سدھیشوری دیوی اس میں ایک دلکش تنوع پیدا کرتی تھیں اور سات سروں کی دھنک موسیقی کے آسمان پر دلکش رنگ بکھیر دیتی تھی۔

سدھیشوری دیوی کو ان کی موسیقی کی خدمات کے سلسلے میں بہت سے خطابات و انعامات ملے۔ مختلف اداروں نے ان کو تمغے پیش کئے۔ صدر جمہوریہ ہند نے ان کو ۱۹۶۶ء میں پدم شری کے خطاب سے سرفراز فرمایا اور اسی سال سنگیت ناٹک اکاڈمی کی طرف سے ان کو فیلوشپ بھی ملی۔

ملک کے کونے کونے سے ان کو موسیقی کی محفلوں میں مدعو کیا جاتا تھا۔ بالخصوص کلکتہ اور بمبئی کے سامعین نہ صرف ان کو سنتے تھے بلکہ ایک دیوی کی طرح پوجتے تھے۔ اتنی عزت، اتنی شہرت کے باوجود بھی سدھیشوری دیوی میں انکساری تھی۔ وہ انتہائی خوش اخلاق تھیں۔ چہرہ پر ہمیشہ ایک انوکھی مسکراہٹ رقص کرتی تھی جس سے ہر کس و ناکس پہلی ہی ملاقات میں متاثر ہو جاتا تھا۔ شاید یہ حسن اخلاق ہی تھا جس سے وہ ہر دلعزیز ہو گئیں اور انھوں نے مقبولیت دوام حاصل کی۔

سدھیشوری دیوی نے بیشمار شاگرد تیار کئے۔ ان میں اول الذکر ہیں، مدراس کی سپالکشمی جو کرناٹک موسیقی کی ماہر ہوتے ہوئے بھی ٹھمری دادرا میں بھی دسترس رکھتی ہیں۔ وہ مدراس سے بنارس آئیں اور سدھیشوری دیوی کے گھر پر تقریباً تین ماہ رہیں اور ان سے بندشوں کے نادر نگینے حاصل کئے۔

سدھیشوری دیوی کی بڑی صاحبزادی ہیں سانتا دیوی جو اپنی ماں کے نقش قدم پر چل رہی ہیں۔ چھوٹی صاحبزادی ہیں سیتا دیوی جو ستار کی ماہر ہیں لیکن اب گانے پر بھی ریاض کر رہی ہیں اور موسیقی کے میدان میں یہ باہمت

(بقیہ صفحہ ۶۲ پر)

جعفر حسین
بدری ناتھ روڈ لکھنؤ

قدیم لکھنؤ کی طوائفیں

قدیم لکھنؤ میں طوائف کی حیثیت اور اس فرد کا تصور دورِ حاضر کے تخیل سے بہت مختلف تھا۔ فی زمانا ہم اُس عورت کو طوائف کہتے ہیں جو کسب معاش کے لیے جسم فروشی کرتی ہے اور حقیقتاً زنِ بازاری کہلانے کی مستحق ہے۔ قدیم لکھنؤ میں بھی ایسی عورتیں تھیں جو کسب معاش کے لیے جسم فروشی کرتی تھیں لیکن ان کو بالعموم لفظ طوائف سے موسوم نہیں کیا جاتا بلکہ ایسی پیشہ ور عورتوں کے لیے اپنے مخصوص طبقہ کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ نام تھے۔ ایک طبقہ ایسی ہی کسب کرنے والی عورتوں کا تھا جو اپنے گھروں میں درون پردہ رہ کر پیشہ کرتی تھیں۔ ایسی عورتوں کے پیشہ میں کامیابی دلّالوں کی وساطت سے ہوتی تھی۔ جو خود ایک مخصوص طبقہ پر مشتمل تھا اور اسی دلالی کے پیشہ کو اپنا ذریعۂ معاش بنائے ہوئے تھا۔ انہیں دلالوں میں بعض لوگ بہت مشہور تھے۔ ان کی اولاد نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے علوم و فنون میں کمالات بھی حاصل کیے تھے۔ بہر حال ایسی کسبیوں کو جو دلّالوں کی وساطت سے پیشہ کرتی تھیں خانگیوں کے نام سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ ان کے خاندان والے، مرد ہوں یا عورتیں، عام طور سے تماش بینوں سے پردہ کرتے اور اپنا نام تک ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ صرف کسب کرنے والی عورتیں سامنے آتی تھیں اور جسم فروشی کرتی تھیں۔ اُن کا کام تماش بینوں کی خواہش نفس کو آسودگی فراہم کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ یہ طبقہ غالباً اب مفقود ہے۔

زنانِ بازاری میں وہ طبقہ بہت مبتذل سمجھا جاتا تھا جن کو اس زمانہ میں نکاییاں کہتے تھے۔ یہ عورتیں چوک کے قرب و جوار میں، اکبری دروازہ کے قریب، نیز محلہ چاول والی گلی کے بعض بالاخانوں پر بھی آباد تھیں۔ ان کا پیشہ صرف غریب نوجوانوں کی جنسی خواہشات کو تسکین دینا تھا۔ شرفا ان مقامات سے نظر نیچی کیے ہوئے گزر جاتے تھے۔ اُن کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی بیحد معیوب تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس طبقہ کی عورتوں میں بعض بہترین حسن و جمال کی مالک تھیں لیکن پھر بھی کسی رئیس کی منظور نظر نہیں ہو سکیں اور نہ شرفا کبھی ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس زمانہ میں طوائف بازی کا عام چلن تھا اور یہ شوق معیوب نہیں تھا لیکن پھر بھی پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس قماش کی عورتوں پر کبھی کسی رئیس یا شریف نے توجہ مبذول نہیں کی۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو یہ معاملہ صیغۂ راز میں رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ ان عورتوں کو وسط چوک میں سکونت پذیر ہونے کا بھی کبھی موقع نہیں ملا۔

تیسرا طبقہ ان پیشہ ور عورتوں کا تھا جن کو عام طور سے رنڈیاں کہا جاتا تھا۔ ان کا پیشہ عصمت فروشی تھا لیکن یہ عورتیں فنکار بھی تھیں۔ بعض بہت اعلیٰ درجہ کی موسیقار تھیں اور کچھ رقاصہ بھی تھیں۔ ان کے گھر کا رہن سہن شائستہ اور رکھ رکھاؤ میں بھاری بھرکم پن تھا۔ ظاہری طور پر ان کا اخلاق بھی بلند تھا۔ امرا کی محفلوں میں بھی اس طبقہ کی بعض چنندہ عورتوں کو رسوخ حاصل تھا اور اپنے حسن و جمال یا فنکارانہ صلاحیتوں کی بدولت شہرت و امتیاز کی مالک تھیں اور چوک کے ممتاز حلقہ میں سکونت پذیر بھی رہتی تھیں۔ ان کے علاوہ چوک کے اسی حلقہ میں بعض ڈیرہ دار طوائفیں بھی رہا کرتی تھیں جو عزت و وقار کی مالک تھیں اور جن کی بدولت لکھنؤ کی طوائف بازی قابل ذکر قرار پاتی ہے۔ لیکن چوک کی چہل پہل اور تماشائیوں کے نظر و گوش کی اصل ضیافت انھیں طوائفوں کی بدولت تھی جن کو عام طور سے رنڈیاں کہا جاتا تھا۔ شرفا ان پیشہ ور عورتوں کے کوٹھوں پر بلا تکلف چلے جاتے تھے۔ احتیاط ملحوظ رہتی تو پیچھے کے دروازہ سے، جس کا ہر مکان میں ہونا ضروری تھا، داخل ہو جاتے تھے۔ شام کو چوک میں گزرتے ہوئے بعض ممتاز اور مقتدر افراد بھی سر اٹھا کر اوپر رہنے والی سے اشارے اور کبھی کبھی بات بھی کر لیتے تھے کیونکہ اس وقت کوٹھوں کے چھجوں پر یہ رنڈیاں بن سور کر جلوہ افروز رہتی تھیں۔ یہ طریقہ عام تھا کہ لوگ راستہ سامنے کی طرف چلتے مگر نگاہیں بالاخانوں کی طرف لگی رہتی تھیں۔ چنانچہ اسی حالت میں ایک مرتبہ ایک جلیل القدر خانوادہ کے ایک نوجوان اپنے حقیقی چچا سے ٹکرا گیے تھے کیونکہ دونوں کے قدم زمین پر تھے اور نظریں آسمان پر تھیں۔ ایسے حادثے عموماً وسط چوک میں ہوا کرتے تھے جہاں اس زمانہ کے مذاق کے مطابق اوپر اور نیچے دونوں طرف "اچھے لوگوں" کا مجمع رہا کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی طوائفوں یعنی ڈیرہ دار طوائفوں کو جو خصوصیت اور احترام حاصل تھا، اس کی بدولت یہ طبقہ خود اپنی جگہ پر ایک ادارہ بن گیا تھا جس کا وجود غالباً لکھنؤ کے علاوہ اور کہیں نہیں تھا۔

ڈیرہ دار طوائفیں جو حقیقتاً طوائفیں کہلاتی تھیں اور اسی نام سے یاد کیے جانے کی مستحق تھیں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے لیے ممتاز تھیں، بہترین موسیقار اور رقاصہ تھیں، ساتھ ہی ساتھ زینتِ محفل بننے کا اُن میں شعور تھا۔ آداب و شائستگی اور تہذیب و اخلاق میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ روسا و عمائدین کے درباروں میں اُن کو رسوخ حاصل تھا اور ان میں کی بعض مقتدر ترین طوائفوں کو روسا کی محلسراؤں میں بیگمات کے حضور حاضر ہونے کی اجازت بھی تھی۔ اپنے تمام رہن سہن اور عادات و اطوار میں پوری شان شریفانہ تھی۔ یہ طوائفیں کوٹھوں کے چھجوں پر نہیں بیٹھتی تھیں گھروں کے اندر رہتی تھیں اور گھروں کا اندرونی ماحول بجنسہ شرفا کے گھروں کی طرح کا تھا۔ تعلقات اس طرح ہوتے تھے کہ زیادہ تر ایک رئیس یا یکے بعد دیگرے دو تین روسا کی ملازمت میں عمریں گزار

دیتی تھیں لیکن دوستانہ تعلقات ہر ایک کے متعدد رئیسوں سے برقرار رہتے تھے۔ جن سے کبھی کسی نفسانی خواہش کے پورا کرنے کا خیال تک نہیں آتا تھا۔ ایسی مثالیں بکثرت تھیں جن میں ایک سلسلہ ایسا تھا جس کو آج کی دنیا یقین کرنے میں بھی تامل کرے گی۔ راقم الحروف کی دیرینہ کرم فرما جناب مرزا ع ج صاحب اب تک بقید حیات ہیں اور سنجاری ٹولہ میں رہتے ہیں۔ ان کے نانا صاحب مرحوم شہر کے مختار رئیسوں میں تھے، ان کے گہرے دوستانہ تعلقات مشہور طوائف حیدر جان سے تھے۔ یہ تعلقات تخمیناً چالیس پینتالیس برسوں تک برقرار رہے تھے۔ ہر روز کی برابر آمد و رفت اور ایک ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا لیکن کبھی کوئی جنسی تعلق نہیں ہوا۔ جس کی شہادت ہر وہ شخص دیتا تھا جو ان دونوں کا جلیس رہا کرتا تھا۔

ڈیرہ دار طوائفیں گرہست ہوتی تھیں اس لیے ان میں کی ہر فرد چوک میں آباد ہونے کی خواہشمند نہیں تھی۔ ان کی اکثریت پرائیویٹ مکانات میں رہا کرتی تھی چنانچہ اللہ باندی اور بجّا محلہ چاول والی گلی میں رہتی تھیں جہاں ان کے مکانات انھیں کے امام باڑوں کے نام سے اب تک موجود ہیں۔ مغل جان چوک سبزی منڈی میں، حیدر جان پارچہ والی گلی میں، عظیمن چوک سبزی منڈی میں، حسّو امین آباد میں، ٹکّن محلہ مجادلاں میں، مشتری نخاس میں، بڑی جدّن ٹکسال میں اور اسی طرح دوسری طوائفیں مختلف مقامات پر رہا کرتی تھیں لیکن ان سب میں نہ صرف اتحاد بلکہ ایک زبردست نظم و ضبط تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ ننھوا اور بچوا دونوں حقیقی بہنیں ان کی چودھرائن تھیں جن کا حکم ہر معاملہ میں سب کے لیے واجب التعمیل تھا رفتہ رفتہ بہت سی دوسری طوائفیں بھی جو ڈیرے دار نہیں تھیں رقص و موسیقی کے فنون میں کمال حاصل کرکے چودھرائن ہی کی سربراہی میں آگئی تھیں اور ان کے درمیان طبقاتی امتیاز ختم ہونے لگا تھا لیکن رؤسا کی دولت و ثروت پر تیزی کے ساتھ زوال آیا اور قدر دان باقی نہیں رہے لہذا شہر لکھنؤ کی طوائفوں کا سارا طبقہ نیست و نابود ہو گیا۔

ان طوائفوں کو رقص یا موسیقی میں اعلا درجہ کا کمال حاصل تھا اور یہ سب بہترین فنکاروں اور استادوں کی شاگرد تھیں چودھرائن یعنی دونوں بہنیں ملک کے مشہور و معروف رقاص بندادین کی شاگرد تھیں لیکن انھوں نے اس فن میں بدرجہ اتم عروج حاصل کر لیا تھا۔ دونوں بہنیں رقص کے فن میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں بڑی بہن، ننھوا کافی قد آور اور فربہ تھیں، رنگ بیحد گورا تھا۔ اُن میں یہ کمال تھا کہ جب پیشواز پہن کر مجرا کرنے کھڑی ہوتی تھیں تو جسم سمٹ جاتا تھا اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ کوئی پری مائل بہ پرواز ہے۔ چنانچہ مرحوم مہاراجہ محمود آباد نے ان کو ایک بار بھری محفل میں پری کہہ کر خطاب کیا تھا۔ یہ وہ موقع تھا جب ان کے صاحبزادے یعنی مرحوم راجہ کی تقریب کتخدائی میں وہ آئی تھیں اور یہ معلوم نہ تھا کہ ان کو بھی رقص کرنا ہوگا کیونکہ جتنا رطا گئے طلب تھے لیکن مہاراجہ مرحوم کی مخصوص فرمائش پر انھوں نے غالباً گوہر جان کی پیشواز عاریت لے کر پہن لی تھی۔ ان کے مقابلہ میں گوہر جان نحیف الجثہ تھیں۔ لیکن اُس وقت اُن کی پیشواز ننھوا کے بڑے قد اور فربہ جسم پر بالکل درست اور چست معلوم ہوتی تھی۔ ان کی چھوٹی بہن بچوا بھی رقاصہ تھیں لیکن ان کی شہرت بھاؤ بتانے میں زیادہ تھی۔ اس فن میں ان کا کوئی مثل و نظیر نہیں تھا اسی شادی میں بچوا نے مرزا غالب کی غزل گائی تھی اور صرف ایک مصرع " تیرے بزم کرشمہ کوئی میرے دل سے پوچھے"، پچیس مرتبہ گایا اور ہر بار نیا بھاؤ بتایا تھا۔

فن موسیقی میں وہ تمام طوائفیں جن کے نام مذکور ہوئے اور ان کے علاوہ اور بہت سی دوسری مثلاً نظیر جان، ببّن، بنّن، نور جہاں، زہرا، مشتری، کلّن، جدّن وغیرہم بڑی باکمال طوائفیں تھیں ان میں بعض غزل گانے میں راگ اور راگنیوں کے بہترین جوہر دکھاتی تھیں اور حسّو، چودھرائن، بڑی جدن، اور کلّن خصوصیت کے ساتھ مرثیہ خوانی اور نوحہ خوانی میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ یہ طوائفیں اپنے اپنے تعزیوں کے ہمراہ جب مرثیہ اور نوحہ پڑھتی تھیں تو سڑکوں پر راستے بند ہو جاتے تھے، ہجم غفیر لگ جاتے تھے، انھیں بلند پایہ اور گراں قدر طوائفوں میں خورشید بھی تھی جو جلی خورشید کے نام سے مشہور تھی۔ اس نے آخر میں ایک جلیل القدر رئیس اور تعلقدار سے مناکحت کرکے پردہ نشینی اختیار کر لی تھی اور اس کے بعد وہ کبرا بیگم کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ عورت بجد طباع، ذہین اور متعدد فنون میں دستگاہ رکھتی تھی، موسیقی میں پہلی صف کی موسیقار تھی، گھوڑے کی بہترین شہسوار تھی، سائیکل بہت تیز چلاتی تھی اور کنکوا اڑانے میں بھی اس کے مثل و نظیر بہت کم تھے۔ اُس طبقاتی دور میں بھی شرفا و رؤسا اس سے کنکوا لڑانا عار نہیں سمجھتے تھے۔

ان ڈیرے دار طوائفوں کا تمام رہن سہن، ان کے تمام عادات و اطوار اور ان میں ساری تہذیب و شائستگی شریفانہ طرز کی تھی۔ یہ طوائفیں عام طور سے پبلک میں نہیں آتی تھیں۔ ان سے ملاقات کرنے والے جو شرفا اور رؤسا تھے خود ان کے گھروں پر جاتے تھے۔ البتہ رئیسوں کے یہاں جن سے اُن کے رابطے ہوتے تھے، عند الطلب یا خود ہی یہ طوائفیں حاضری دیتی تھیں۔ اس دربار میں بلا تکلف گفتگو ہوتی تھی۔ یہ گفتگو عموماً شعر و سخن یا کسی مخصوص فن سے متعلق ہوتی یا لطائف ظرائف تک محدود رہتی تھی۔ کبھی کسی رئیس کی محفل میں سوقیانہ یا مبتذل گفتگو کی اجازت کسی کو بھی نہیں تھی چہ جائے کہ صنف نازک کی کسی فرد کو ہوتی۔ اپنی مخصوص مرغوب نظر کے لیے بھی مقربین اور دوستوں کی موجودگی میں پوری جسم پوشی کے ساتھ بیٹھنا ضروری تھا۔ چہرہ اور گٹوں تک ہاتھ اور پیر کھلے رکھنے کا دستور تھا باقی تمام جسم ڈھکا رکھنا شائستگی اور تہذیب کا ضروری جزو تھا۔ انھیں رئیسوں کے فیض سے اُن کے کثیر اور رئیسانہ اخراجات پورے ہوتے تھے۔ تقاریب کے علاوہ جو برابر ہوا کرتی تھیں اخلیہ کی صحبتوں میں بھی آئے دن مجرے ہوتے تھے، راتوں کو دیر تک اور بسا اوقات دن کو بھی محفلیں جمی رہتی تھیں جن میں طوائفوں کو کثیر داد و دہش ہوتی تھی اس لیے ان فنکاروں کے لیے بھی رئیسوں کا مزاج داں ہونا اور لکھنؤ کی تہذیب و شائستگی برقرار رکھنا ضروری تھا۔ یہ خوش اطواری نمائشی نہیں تھی بلکہ ان کی زندگی میں اس حد تک سرایت کر گئی تھی کہ ان کے گھروں کا ماحول بھی پاک و پاکیزہ نظر آتا تھا۔ رؤسا و شرفا اخلاق و تہذیب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے بچوں کو ان طوائفوں کے گھروں میں بھیجا کرتے تھے۔ چودھرائن

کا محل شرفاء اور روساء کے لڑکوں کا اچھا خاصا مکتب تھا۔

ان طوائفوں کے گھروں کا انداز قریب قریب یکساں طرز کا تھا۔ صرف اپنے اپنے مالی حالات کے تحت نمائش و آرائش میں کمی یا بیشی ہو جاتی تھی۔ جھاڑ، فانوس، شمعدان، قمقمے اور گل دان وغیرہ سستے یا قیمتی ہر گھروں میں رہتے تھے۔ ملاقات کرنے والوں کے لیے ایک کمرہ یا نشست گاہ علیحدہ رہنا ضروری تھا جس میں صفائی اور دیدہ زیبی کا پورا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ کسی کے یہاں زمین کا فرش ہوتا تھا تو کسی کے یہاں تختوں کے چوکے یا چوکوں پر نشست ہوتی تھی۔ بے انتہا صاف ستھری چاندنی دری پر ہوتی اور اس کے اوپر صدر مقام میں ریشمی یا اونی قالین بچھا ہوتا جس پر سلیقے سے گاؤ تکیے لگے رہتے تھے۔ ایک سمت چمکتا ہوا پاندان رہتا جو بزم آرائی کے لوازمات میں داخل تھا۔ آنے والے صدر مقام پر بیٹھتے اور طوائف قالین کے داہنے یا بائیں طرف بیٹھتی تھی۔ آنے والا اجنبی یا قریب قریب اجنبی ہوتا تو طوائف دور ہی بیٹھنے کو ترجیح دیتی تھی ان ملاقاتوں میں بھی اس کے جسم کا پوری طرح ڈھکا رہنا ضروری تھا۔ ملاقات کے اوقات سہ پہر یا شام کو ہوتے تھے۔ مقررہ وقت کے پہلے ہی نشست گاہ کی صفائی اور طوائف کی جامہ پوشی ہو جانا لازمی تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل تک طوائفیں ساڑیاں نہیں پہنتی تھیں۔ شرفا کے گھروں کی طرح اُن کے یہاں بھی پاجامے، انگیا، کرتی یا شلوکے اور دوپٹے استعمال ہوتے تھے۔ عام طور سے بارہ گز کے کلی دار بڑے پائنچوں کے پاجامے پہنے جاتے تھے۔ پاجاموں کے رنگ کی مناسبت سے کرتیاں اور شلوکے تیار ہوتے تھے۔ جاڑوں میں عموماً مخمل کے شلوکے بنائے جاتے تھے۔ دوپٹے کڑھے ہوئے کامدانی کے کناری دار اوڑھے جاتے تھے۔ جاڑوں میں دلائیاں بھی استعمال ہوتی تھیں جو عام طور سے اودی چھینٹ کی ہوتی تھیں۔ خاص موقعوں پر جامہ واریں بھی نکل آتی تھیں۔ لباس عموماً قیمتی ہوتا تھا۔ زیادہ خوشحال طوائفوں کے یہاں اور زیادہ قیمتی لباس رائج تھا۔ اسی زمانہ میں ایک طوائف بہت قدیم زمانہ کی وضع برقرار رکھے تھی۔ وہ محلہ اچھوتی گلی کے ایک گلی در گلی مکان میں رہتی تھی۔ اُس کا نام بھی خورشید تھا لیکن اُس کو ایجنٹ والی خورشید کہتے تھے۔ یہ طوائف عمر بھر چپکن (قدیم طرز کی اچکن) پہنا کی۔ اچکن کے اوپر دوپٹہ اوڑھتی تھی، بیحد مہذب اور شائستہ تھی۔ ساڑی پہننے کا چلن سب سے پہلے چودھرائن کے گھر سے رائج ہوا تھا۔ چھوٹی چودھرائن یعنی بچوا نے سب سے پہلے اپنے گھر کی ایک مجلس میں ساڑی پہنی تھی۔ اس وقت اس جدت آرائی پر بے حد تمسخر ہوا تھا لیکن چونکہ چودھرائن نے پہنی تھی اس لیے سب طوائفوں میں آہستہ آہستہ ساڑی پہننے کا چلن عام ہو گیا۔

ان طوائفوں میں بعض بہت خوشحال تھیں اور اُن کا طرز زندگی بھی رئیسانہ تھا لیکن یہ تمول اور فارغ البالی اس لیے نہیں تھی کہ وہ حسن و جمال کی مالک تھیں بلکہ اُن کو پسندیدگی اور وابستگی ان کے حسن و اطوار اور تہذیب کی مناسبت سے حاصل ہوتی تھی۔ اس طبقہ نے لکھنؤ کی ثقافت اپنے میں جذب کر لی اور تہذیب و شائستگی کا جتنا بلند مظاہرہ کسی سے ہوتا تھا اتنا ہی اس کو رئیسوں کی نظر میں شرف قبول زیادہ حاصل رہتا تھا۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ان میں بعض حسن و جمال کے اعتبار سے بے حد ناقص تھیں لیکن وہ بڑی بڑی پری جمالوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہر دلعزیز تھیں۔ لکھنؤ کی چھوٹی بڑی روایت اُن کے یہاں موجود تھی اس زمانہ میں شرفاء و روساء کے شہر میں ناموں کے بجائے عرف رائج تھے اور بڑے بڑے رئیس اپنے اپنے عرف سے مشہور تھے۔ یہی حالت ڈیرہ دار طوائفوں کی بھی تھی۔ ان کے نام بہت کم لوگوں کو معلوم تھے لیکن عرف زبان زد تھے۔ مثلاً اچھن بائی کا نام محمدی تھا، ننھوا کا بدر منیر اور بچوا کا نام ماہ منیر تھا مگر یہ اصل نام کبھی پکارے نہیں گیے۔ اسی طرح وہ دور شعر و ادب کا تھا، لکھنؤ کے در و دیوار فکر و فن میں سرشار تھے۔ اس طبقہ کی عورتوں نے بھی موزونی طبع میں اپنے اپنے جوہر دکھائے تھے۔ بذلہ سنج ہر طوائف تھی اور اسی کی نسبت سے اس کی قدردانی ہوتی تھی۔ وہ بات کرنے میں مشاق تھی۔ فی البدیہہ شستہ و شائستہ جملے بولنا، برمحل فقرے چست کرنا اور مناسب حال اشعار پڑھنا، اُن کے شعار میں داخل تھا۔ بعض خود بھی شاعرہ تھیں اور برجستہ مصرعے موزوں کر لیتی تھیں۔ ان تمام واقعات و حالات کو بیان کرنے کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے اس کے علاوہ اکثر و بیشتر معلومات اب یاد بھی نہیں رہیں اس لیے مثالاً دو طوائفوں کے بارے میں مختصر حالات پیش کیے جاتے ہیں۔

انھیں ڈیرہ دار طوائفوں میں ایک نمودار نامدار عورت مشتری تھی۔ جس کے خصوصیات یہ تھے کہ وہ بے حد بدشکل تھی اور کثیر الاولاد تھی لیکن ممتاز طوائفوں کی صفاول میں اُس کو اس لیے مقام حاصل تھا کہ وہ تہذیب و شائستگی میں بلند مرتبہ تھی، بذلہ سنج تھی، شاعرہ تھی اور موسیقاروں میں اُس کا وقار تھا۔ اسی مشتری کا ایک دوسرا واقعہ یاد آ رہا ہے۔ جھوائی ٹولہ میں غالباً حکیم عبدالحکیم مرحوم کی شادی میں یہی طوائف مجرا کر رہی تھی۔ حاضرین میں پٹنہ کے ایک طالب علم جو طلب پڑھنے لکھنؤ آئے تھے شریک بزم تھے۔ یہ صاحبزادے بے حد ذہین اور طباع تھے۔ شاعری سے ذوق تھا اور من چلے بھی تھے۔ اس زمانہ میں ذوق کی غزلیں بہت پسند کی جاتی تھیں موسیقی کا فن بھی شباب پر تھا، غزل میں راگ اور راگنیوں کے تصرف سے موسیقار کے کمال کا امتحان ہوتا تھا۔ اس محفل میں مشتری جو غزل ذوق کی گا رہی تھی اُس کا مطلع تھا ؎

آنکھیں میری تلوؤں سے وہ مل جائے تو اچھا
ہے حسرت پابوس نکل جائے تو اچھا

وہ صاحبزادے پہلا مصرع سنتے ہی دوسرا مصرع پڑھ دیتے تھے۔ یہ حرکت آداب محفل کے خلاف تھی۔ مشتری نے دو مرتبہ برداشت کیا۔ تیسری بار جب اس نے یہ مصرع گایا۔ "بیمار محبت نے لیا تیرے سنبھالا" اور انھوں نے فوراً یہ دوسرا مصرع پڑھ دیا کہ "لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا"، مشتری نے انتہائی متانت و سنجیدگی سے ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ "اب میری کیا ضرورت ہے آپ ہی اس جگہ پر آ جائیے"!

رقص و سرور کی محفلوں میں بڑی بڑی جلیل القدر ہستیاں طوائفوں سے

سر بزم گفتگو کرنا، یا تہذیب و متانت سے مزاح کر لینا عیب نہیں سمجھتی تھیں۔ مجرا ختم کرنے کے بعد طوائفیں معتقدر لوگوں کے قریب آکر ہم کلام ہوتی تھیں اور کوئی انگشت نمائی نہیں کرتا تھا اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آرہا ہے جو ہماری قدیم تہذیب پر روشنی ڈالنے کے لیے ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب لکھنؤ کے مخصوص کلچر کی آخری شمعیں ٹمٹما رہی تھیں۔ گانے والیوں میں اچھن بائی کا مثیل و نظیر کوئی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ حسنو جان یا جو دو چار باقی رہ گئی تھیں۔ زیادہ تر خانہ نشین ہو چکی تھیں، لہذا موسیقی کے دلدادہ اچھی بائی کا گانا سننے کے مشتاق رہتے تھے۔

مختلف قسم کی بذلہ سنجیاں اور داستان سرائیاں رئیسوں کی خلوت گاہوں میں ہر روز ہوا کرتی تھیں۔ میرے محترم دوست مرزا بہادر، مرزا محمد صادق علی خاں مرحوم کے یہاں کی نشستیں جن کا لطف برسوں اور بلا ناغہ ہر روز حاصل ہوا کرتا تھا جب یاد آتی ہیں تو بے ساختہ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں اور پہروں تک دل کی حرکت قابو میں نہیں آتی۔ مرزا بہادر خانوادہ آغائی صاحب کے آخری چشم و چراغ تھے، شہر کے ممتاز اور دریا دل رئیسوں میں تھے، بیحد پرخلوص دوست اور زندہ دل انسان تھے۔ اُن کے یہاں شام کو بلند پایہ طوائف کی حاضری لازمی تھی، نغمہ سرائیاں ہوتی تھیں یا شعروں کی محفل گرم ہوتی تھی، کبھی کبھی ضلع جگت میں گھنٹوں وقت گزر جاتا تھا، بے تکلف دوستوں کا مجمع اور ایک ماہ وش پری پیکر کی سنگت نشاط و طرب کا ترنم، کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا "وقت کے ہاتھوں پہ روشن ہیں ابد کی مشعلیں" بہرحال وہ وقت گزر گیا، وہ محفل اجڑ گئی، وہ بساط پرشکن ہوگئی، نہ وہ محفل رہی، نہ محفل آرا، نہ ویسے جلیس ہیں اور نہ وہ شستہ و شائستہ تذکرے۔ ان کی یاد باقی ہے مگر وہ شمع خاموش کی طرح افسردہ ہے۔ اُن حکایتوں کو بیان کرنے کی نہ دل میں طاقت ہے اور نہ قلم میں یارائی، البتہ مثالاً ایک ایسا واقعہ بیان کیا جاتا ہے جو چودھرائن کے گھر اور میری ذات سے براہ راست متعلق تھا۔

چودھرائن کے گھر سے میرا سلسلہ میری اوائل عمری میں قائم ہو گیا تھا۔ عم محترم فضل حسین خاں مرحوم یعنی برادر مرحوم مرزا جعفر علی خاں اثر کے والد ماجد سے گہرے دوستانہ تعلقات بڑی چودھرائن نہوا سے تھی اور یہ تعلقات ایسے تھے کہ دونوں بہنوں کی آمد و رفت ہمارے گھروں کے اندر تھی، اور دوستانہ تعلقات بیگمات سے بھی تھے۔ اسی طرح میرے ایک دوسرے چچا نواب محمد علی خاں المعروف بہ نواب منے صاحب مرحوم سے چھوٹی چودھرائن بچوا کے بیحد قریبی دوستانہ تعلقات استوار تھے۔ یہ تعلقات اتنے پرخلوص اور دیرینہ تھے کہ چچا صاحب کے انتقال کے وقت ان کا فرق مبارک بچوا کے آغوش میں تھا۔ انھیں تعلقات کی بنا پر میں اور چچا صاحب مرحوم کے صاحبزادے سید حسین شاہ مرحوم، جن کی یاد خون کے آنسو رلاتی ہے۔ اپنے عہد طفلی سے ان کے گھر جاتے تھے۔ بڑی چودھرائن کو ہم لوگ "امی" اور چھوٹی کو "ماما" کہتے تھے۔ یہ دونوں بہنیں ہم لوگوں کو اولاد سے کم نہیں سمجھتی تھیں، اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہم دونوں کی زندگی کا قابل لحاظ حصہ انھیں کے گھر میں بسر ہوا تھا جہاں تہذیب و اخلاق اور شائستگی و شستگی کی تعلیم کے علاوہ ہم لوگوں کو روحانی مسرتیں بھی حاصل ہوا کرتی تھیں۔ بڑی بہن کے کوئی اولاد نہیں تھی، چھوٹی بہن کے صرف ایک لڑکی رشک منیر تھی جو مجھ سے عمر میں چند سال چھوٹی تھی گھر کا چشم و چراغ تھی اور رقص و نغمہ میں اپنی والدہ کی صحیح معنوں میں جانشین تھی۔ رشک منیر کے مزاج میں بلا کی صفائی، نزاکت اور سادگی تھی اُس کو زرق برق پوشاک سے نفرت تھی۔ بیحد سادہ اور صاف ستھرا لباس پہنتی تھی، دن میں دو بار غسل کرنا اور کپڑے بدلنا، علی الصبح سو کر اٹھنا اور معمولات زندگی کو مقررہ وقت پر انجام دینا اس کا شعار تھا۔ جسم میں یا جسم پر کپڑوں میں خوشبو لگانا گوارا نہیں تھا لیکن ہر اتوار کو کپڑوں کی الماری خالی کرکے فرانسیسی سنٹ "امبروز" کی پوری شیشی لکڑی کے پٹروں پر چھڑک دی جاتی تھی۔ وہی خوشبو چھن کر کپڑوں کو بسا دیتی تھی۔ اس نازک مزاجی اور نازک دماغی کے ساتھ مذاق سخن بھی عدیم المثال تھا۔ مرزا غالب کا اردو دیوان حفظ تھا اور ہر موقع و محل سے مناسب شعر پڑھ دینا اس کی عادت میں داخل تھا۔

رشک منیر کے کمرہ میں ایک شام کو ہم چند دوست یکجا تھے جن میں خصوصیت کے ساتھ کلکتہ کے دو دوستوں ہاشم اور ابراہیم صالح جی سیٹھ اور سید محمد عبدالرسول تناگی کے نام قابل ذکر ہیں۔ میرے عزیز ترین دوست شہنشاہ مرحوم بھی موجود تھے بات میں بات چلی اور ہاشم صاحب نے اپنی تجارت کا تذکرہ کرتے لاکھوں اور کروڑوں کی داستان سنائی۔ تناگی صاحب نے جن کا عرف مدی تھا اور جن کو میں اور شہنشاہ مدی بھائی کہتے تھے، اپنا کلام سنانا شروع کیا۔ اسی سلسلہ میں عرفی کے بھی کچھ اشعار سنائے جن کو سن کر شہنشاہ نے کہا کہ یہ تو " در فخر خاندان خود می گوید" کا معاملہ ہے ایسی باتیں اردو زبان میں ہم سب لوگ کر سکتے ہیں اور اسی سلسلہ میں اپنے اسلاف کا ذکر کر ڈالا اور آخری تاجدار اودھ سے اپنے بزرگوں کی وفاداری کے واقعات سنائے۔ شہنشاہ کے بعد جب میری باری آئی تو میں بھی مقام مفاخرت میں جو کچھ بھی کہہ سکتا تھا کہہ گیا۔ میرا تذکرہ بھی سب نے لطف اندوز ہو کر سنا لیکن میرا کلام ختم ہوتے ہی رشک منیر نے صرف ایک شعر پڑھا جس کو سن کر سب سکتے میں آگئے اور مجھے حقیقتاً چکر آگیا۔ وہ شعر یہ تھا۔

ہے ناز مفلساں زر از دست رفتہ پر ہوں گل فروش شوخیٔ داغ کہن ہنوز

یہ شعر سب کے لیے نشتر بدل تھا لیکن میرے حق میں اس کی اذیت بہت جانکاہ تھی۔ کیونکہ میں نے جن اسلاف کا ذکر کیا تھا ان کی کوئی وراثت میرے فیض و نصرت میں نہیں تھی۔ نہ ویسی دولت علم تھی اور نہ اُن کے جاہ و اقتدار کا کوئی شمہ بھر بھی حصہ مجھے حاصل ہو سکا تھا۔ بہرحال یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ یہ شعر ایک عورت کی زبان سے جس کا تعلق طوائفوں کے طبقہ سے تھا پڑھا جانا اور پھر ایسے موقع پر پیش ہونا جو اُس کا بہترین محل تھا۔ ہماری قدیم معاشرہ کی برتری ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔ ایسی تھیں وہ طوائفیں جن پر ہمارے اسلاف گرویدہ تھے۔

آخر میں چودھرائن کے حالات کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کا اقتدار تمام طوائفوں پر قائم تھا اور سب ڈیرہ دار طوائفیں ہر شعبۂ حیات میں انھیں کی تقلید کرنا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ ان کے یہاں شادی بیاہ اور دوسری تقریبات میں ہر ڈیرہ دار و غیر ڈیرہ دار کی شرکت لازمی ہوتی

اور ایسی تقریبات بکثرت ہوا کرتی تھیں اس لیے اس صنف نازک کا ان کے یہاں بڑا بھاری اجتماع ہوا کرتا تھا۔ لیکن ایک ایسا یادگار مجمع بھی ہوا تھا جس کی مثال اس کے پہلے یا بعد کبھی نہیں دیکھی گئی، وہ طوائفیں شدید ملالت کی حالت میں جو پہلے پر سوار ہو کر حاضر ہوئی تھیں۔ یہ واقعہ غالباً ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء کا ہے جب مرکزی ایوان قانون ساز میں طوائفوں کا پیشہ ختم کرنے کی تجویز پیش ہو رہی تھی۔ میرے محترم اور بزرگ لیکن بے تکلف دوست چودھری محمد علی مرحوم تعلقدار کی ایما پر اس بل کے خلاف ایک احتجاجی جلسہ چودھرائن کے زیر صدارت اور انھیں کے مکان میں منعقد ہوا تھا۔ بڑے جوش و خروش سے ایک احتجاجی تجویز منظور ہوئی تھی جس کی تائید میں متعدد طوائفوں نے معرکتہ الآرا تقریریں کی تھیں۔ قطعاً یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اجتماع تعلیم یافتہ ماہرین سیاست کے کسی جلسے سے کسی طرح بھی کم وزن تھا۔ بہرحال تجویز منظور ہوئی اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی خدمت میرے اور چودھری صاحب مرحوم کے سپرد کی گئی۔ اس وقت ہماری یہ کوشش کامیاب بھی ہوئی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے حکومت کے ایک مقتدر نے ہمارا ساتھ بھی دیا تھا۔

چودھرائن اس عالیشان محل سرا میں رہتی تھیں جو وسط چوک میں واقع تھی اور جہاں اب اصغر علی محمد علی کے عطر کی دکان اور ان کا کارخانہ ہے۔ شاہی زمانہ میں یہ محلسرا میرے نانا نواب حکیم شفاء الدولہ بہادر کی املاک تھی جہاں وہ سکونت پذیر تھے۔ غدر کے بعد جب انھوں نے فیض آباد ہجرت فرمائی تو اس تمام جائداد کو ایک سو روپیہ کے بالعوض ایک پرانے رئیس سید اکبر حسین مرحوم کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں یہ املاک اکبر حسین صاحب موصوف سے چودھرائن نے خرید لی تھی۔ اُن کے زمانہ تک یعنی ۱۹۲۶ء تک جبکہ وہ قابض و مالک تھیں محلسرا اپنی اصل حالت میں برقرار رہی تھی۔ اس عالیشان عمارت کا صدر دروازہ چوک کی طرف تھا۔ ایک دروازہ عقب میں تھا اور ایک چور دروازہ پہلو میں تھا۔ محل سرا کے پیچھے والا حصہ خود اپنی جگہ پر ایک وسیع و عریض مکان تھا اور زنان خانہ کہلاتا تھا۔ چودھرائن کے عزیز و اقارب اور متعلقین اسی مکان میں رہتے تھے جن کی تعداد کسی طرح بھی بیس پچیس افراد سے کم نہیں تھی۔ ان اعزا میں اُن کے بھائی، بھانجے، بھتیجے اور ان کے اہل و عیال شامل تھے۔ ان سب کی کفالت اور بچوں کی تعلیم و تربیت دونوں بہنوں یعنی بڑی اور چھوٹی چودھرائن کے ذمے تھی۔ جملہ اخراجات نقد کی صورت میں دیے جاتے تھے، گھرداری کا سارا کاروبار انھیں عزیزوں سے متعلق تھا۔ ہر ہر خاندان کا علیحدہ علیحدہ باورچی خانہ اور اپنا اپنا علیحدہ بندوبست تھا۔

محلسرا کے بیرونی علاقہ میں دونوں بہنیں، جو چودھرائن تھیں۔ اُن کی ایک تیسری بہن اور ایک لڑکی رشک منیر رہا کرتی تھیں۔ یہ ایک مشترک خاندان تھا۔ بعد میں وہ تیسری بہن جس کا نام مہر منیر تھا عین عالم شباب میں انتقال کر گئی تھی اور اس کے بعد باقی ماندہ تین افراد کے نام سے سارا گھر چل رہا تھا۔ اس بیرونی علاقہ میں صدر دروازہ سے آمد و رفت تھی۔ اندر آنے کے لیے چند سیڑھیاں طے کرنا پڑتی تھیں۔ اُس کے بعد صحن تھا۔ سیڑھیوں اور صحن کے دونوں جانب کمرے تھے۔ صدر پھاٹک اور ان کمروں کے بالاخانوں پر بھی متعدد کمرے تھے۔ صدر پھاٹک اور متصل کمروں کے بالاخانے پر جو تین بڑے کمرے تھے ان میں رشک منیر رہتی تھی۔ ایک کمرہ اس کا ڈرائنگ روم تھا جو بے حد سلیقے سے آراستہ و پیراستہ رہتا تھا، زمین کا فرش تھا اور جدید طرز کا فرنیچر بھی لگا رہتا تھا۔ دوسرا کمرہ خوابگاہ اور تیسرا حمام تھا۔ صحن کے آگے تین درجہ کی شہ نشین تھی جس کا تیسرا اور بلند درجہ امام باڑہ تھا۔ شہ نشین کی بالاخانہ پر بھی متعدد کمرے تھے جن میں چھوٹی چودھرائن ماہ منیر رہتی تھیں۔ شہ نشین کے پہلے دونوں درجوں میں تختوں کے چوکے تھے اور ان پر صاف ستھرا فرش ہمہ وقت بچھا رہتا تھا۔ اسی شہ نشین کے دوسرے درجہ میں تختوں کے چوکے پر ایک کونے میں دیوار سے متصل ایک پلنگ بچھا رہتا تھا جس پر بڑی چودھرائن اپنے ڈیل ڈول اور ضعیفی کے باعث زیادہ تر لیٹی رہتیں اور تسبیح پڑھا کرتی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کا اوپر کا ایک پاؤں ہر وقت حرکت میں رہتا تھا۔ جس کے سبب سے کبھی کبھی ان کا پیٹ کھل جاتا تھا۔ شہ نشین کے پہلے درجوں کے درمیان کوئی حجاب حائل نہیں رہتا تھا اس لیے جو شخص کسی سے بھی ملنے آتا اُس سے بڑی چودھرائن سے پہلے ملاقات ہو جاتی تھی۔ خلاف وقت آنے والوں میں ایک صاحب ایسے تھے جن کے بیحد تکلفانہ مراسم بڑی بہن سے تھے۔ موصوف کا مکان مسکونہ قریب ہی تھا اس لیے ان کا جب دل گھبراتا۔ وہ بلاتکلف چلے آتے تھے۔ وہ بھی بوڑھے تھے اور بڑی چودھرائن بھی بوڑھی تھیں۔ دونوں میں بڑی پرلطف باتیں ہوتی تھیں۔ ایک روز وہ دوپہر کو آگئے اور ان کی آواز سن کر چھوٹی چودھرائن بھی کوٹھے سے اتر آئیں۔ بڑی بہن کے پیٹ کا ایک حصہ کھلا ہوا تھا، چھوٹی بہن کو ناگوار ہوا۔ انھوں نے موصوف سے مخاطب ہو کر کہا کہ "تم نہ وقت دیکھو نہ بیوقت، گھر میں گھس آتے ہو" انھوں نے مسکرا کر اور کھلے ہوئے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا کہ "کیا کروں! میں تو اس پیٹ کا عاشق ہوں" بڑی بہن نے فوراً جواب دیا کہ "کیسے عاشق نہ ہوگے، نو مہینے تو اسی پیٹ میں رہ چکے ہو"

شہ نشین کا پہلا درجہ عام نشست گاہ تھی جو صبح اور شام رئیسوں کے دربار کی طرح آباد رہتی تھی۔ حاضرین بزم میں روسا و شرفا اور شعرا کے علاوہ دوست اور احباب جمع رہتے تھے شہر کے ممتاز رئیس ہی نہیں دور جدید کے تعلیم یافتہ مقتدر حضرات بھی آتے تھے۔ بہت لطف سے باتیں ہوتی تھیں۔ ان دونوں بہنوں سے بالخصوص چھوٹی بہن سے بات کرنے میں وہ لذت ملتی تھی جو کہیں اور نہیں نصیب ہوتی تھی۔ دونوں وقت دسترخوان بھی اسی جگہ بچھتا تھا اور پچیس تیس شریک طعام رہتے تھے۔ رات کو کوئی رقص و سرور کا خواہشمند آجاتا تو بالاخانہ پر ایک کمرہ اسی کے لیے مخصوص تھا۔ اخراجات کی بہتات تھی اور آمدنی گھٹتی رہی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جبکہ عمائدین شہر کی دولت و ثروت پر تیزی سے زوال آنا شروع ہو گیا تھا ان کے پیشہ میں سرد بازاری مشکلات پیدا کرتی گئی لیکن وہ

دونوں بہنیں قرض لیتی رہیں مگر خندہ پیشانی کے ساتھ اپنی زندگی وضعداری سے بسر کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ مکان بھی رہن ہوگیا۔ اب انہوں نے کلکتہ کا رخ کیا، جہاں ان کے فن کی شہرت بہت پہلے سے تھی لیکن تقدیر نے ساتھ نہیں دیا۔ اخراجات اور بڑھ گئے، آمدنی میں حسب ضرورت اضافہ نہیں ہوا۔ کھلے ہوئے ہاتھ بند نہیں ہو سکے بڑھے ہوئے حوصلے کم ہونا تو درکنار فضول خرچیاں بھی روکی نہیں جا سکیں چھوٹی بچو دھرائن خصوصیت کے ساتھ بیحد من چلی اور فراخ دل تھیں۔ ان کو سیر و تفریح کا بھی بہت ذوق تھا۔ باہر نکلتی تھیں تو گھر کے نیز دوستوں کے بچے ہمراہ ہوتے تھے گویا کہ ایک چھوٹا سا قافلہ ساتھ رہتا تھا اور بازار سے کوئی نہ کوئی چیز ہر ایک کو خرید کر دینا ان کے لیے فرض تھا۔ اس کے علاوہ دونوں بہنیں ضرورت سے زیادہ متواضع تھیں۔ اُن کے انھیں عادات و اطوار کی وجہ سے کلکتہ کا قیام بھی ان کے حق میں سودمند نہ ہو سکا۔

بچودھرائن کا آمدنی کا پورا پورا اندازہ ان لوگوں کو بھی کبھی نہیں ہو سکا جو ان سے بہت قریب تھے۔ ڈیرہ دار طوائفوں کی ملازمت کے نرخ بالعموم متعین تھے۔ چنانچہ چودھرائن کے گھر کا نرخ بیسویں صدی کے اوائل میں ایک ہزار روپیہ ماہوار تھا جو اس ارزانی کے زمانہ میں وافر رقم تھی لیکن پھر بھی بالائی اخراجات جو بدرجہا زائد ہوتے تھے۔ زیادہ تر پرستاروں ہی کے ذمہ رہتے تھے اور ملازمت کا سلسلہ بھی معقول مدت تک چلتا تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ایسے سلسلے صاحبان دولت کے مفلوک الحال ہو جانے تک برقرار رہتے تھے۔ یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ کاروبار اس خوبصورتی سے چلایا جاتا تھا کہ کبھی کسی کی زبان سے کوئی کلمہ شکایت کا نہیں سنا گیا اور نہ کبھی کسی نے یہ کہا کہ چودھرائن نے ان سے کوئی بڑی یا چھوٹی رقم طلب کی ہو۔ ان دونوں بہنوں اور ان کے گھر کے ماحول میں کچھ ایسا جادو تھا کہ صاحبان حیثیت زر و جواہر تو درکنار اپنا سب کچھ نثار کر دینے پر آمادہ رہتے تھے اور وہ دونوں بہنیں اسی صورت حال سے پورا فائدہ حاصل کر لینے کا ملکہ رکھتی تھیں۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

راقم الحروف اس زمانہ میں کالج کا طالب علم تھا، دسمبر کا مہینہ تھا اور انھیں کے یہاں کلکتہ میں مقیم تھا۔ ایک روز سہ پہر کے وقت ایک عظیم المرتبت رئیس جن کو ان کے ہمراہی مہاراجہ کہتے تھے، چھوٹی چودھرائن سے ملاقات کرنے آئے۔ تھوڑی دیر تک باتیں کرنے کے بعد انھوں نے ہواخوری کے لیے ساتھ چلنے کی فرمائش کی۔ آگے آگے مہاراجہ ان کو اپنے ہمراہ لے چلے اور گھر کے لڑکے پیچھے پیچھے خود چودھرائن کے موٹر میں روانہ ہوئے۔ چورنگی پہنچ کر ایک جواہرات کی دوکان پر جس کا نام غالباً ہملٹن کمپنی تھا سب اترے۔ دوکان میں داخل ہونے ہی مہاراجہ نے خواہش ظاہر کی کہ کچھ مزید لیجیے۔ انھوں نے انکار کیا اور یہ کہا کہ خدا کا دیا ہوا سب کچھ ہے، مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ ساری دوکان گھوم ڈالی گئی، ادھر سے اصرار ادھر سے انکار ہوتا ہے۔ صدر دروازہ پر واپسی ہوئی تو مہاراجہ نے فرمایا کہ آپ نے میرا دل توڑ دیا۔ اگر آپ نے کوئی ایک چیز بھی قبول کر لی ہوتی تو میں بہت شکر گزار ہوتا۔ چودھرائن نے جواب دیا کہ آپ کا یہی حکم ہے





تو میں ایک عدد سر آنکھوں پر رکھے لیتی ہوں اور فی الفور ایک ایسا گلوبند اٹھا لیا جو دوکان کی جان تھی۔ یہ ہیروں کا جڑاؤ نکلس تھا جس کی قیمت ہزاروں روپے تھی۔

اسی قسم کے بیشمار واقعات ان دونوں بہنوں کے بارے میں مشہور تھے کلکتہ کے دوران قیام میں رقص و سرود کا کاروبار بھی کامیابی سے چلتا رہا تھا۔ لیکن لکھنؤ سے قطع تعلق کر لینا ممکن نہ ہو سکا۔ اول تو وہاں کا ماحول ان کے مزاج کے لیے سازگار نہ ہو سکا۔ دوسرے اخراجات بے حد کثیر ہو گیے تھے اور قرض کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا بتیسرے یہ سارا خاندان لکھنؤ میں تھا جن سے وابستگی بہت تھی۔ بعض عزیزوں کی شادیاں بھی کرنا تھیں۔ لہذا واپسی ہوئی اور اس طرح واپسی ہوئی کہ تباہی کا دروازہ کھل گیا۔ اس شہر پر فلاکت منڈلا رہی تھی، تقریبات میں ان سکا قتدار کی طوائفوں کا مجرے کے لیے طلب ہونا ختم ہو چکا تھا جسم فروشی کی لعنت کسی حالت میں گوارا نہیں کی جا سکتی تھی ان حالات میں ایک طرف پیشہ کی آمدنی صفر تھی تو دوسری طرف وضعداریاں اور فضول خرچیاں عادت میں داخل تھیں۔ قرض کے بل بوتے پر کام چلتا رہا۔ رفتہ رفتہ سب زیور فروخت ہو گیے، قیمتی ساڑیاں بھی بک گئیں، قرض کی علت میں مکان بھی نیلام ہو گیا۔ تھر آ ایک بار پھر کلکتہ کا رخ کیا لیکن ہنوز فلاح کی کوئی صورت نہیں نکلی تھی کہ زینک مینر نے جو کمائی کا واحد ذریعہ تھی عالم شباب میں انتقال کیا اس کی میت سرزمین لکھنؤ پر لا کر سپرد خاک کی۔ مختصر یہ کہ صرف چار برسوں کی مدت میں گھر کا یہ حال ہو گیا کہ جائداد منقولہ میں بھی کوئی قیمتی چیز باقی نہیں رہ گئی تھی۔ انتہائی عروج اور بے انتہا تعیش کے بعد تنزل اور نکبت کی مصیبتوں میں مبتلا رہ کر ان دونوں بہنوں نے اقل قلیل وقفہ میں یکے بعد دیگرے انتقال کیا اور لکھنؤ کی خاک کا پیوند ہو گئیں۔ لیکن انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے کنبہ والوں کو اچھی تعلیم و تربیت دے کر اس قابل بنا دیا تھا کہ آج ان کا شمار شریف زادوں میں ہے اور کوئی بھی عسرت میں مبتلا نہیں ہے۔

عطیہ پروین
لال گنج، رائے بریلی

کھول دو دروازہ

"گندی لڑکی"!

بیگم انوار نے ایک زوردار طمانچہ بے بی کے پھول سے داہنے رخسار پر مارا اور کرسی پر بیٹھ کر غصے سے ہانپنے لگیں۔

بے بی کی بادامی آنکھوں میں برسات امنڈ آئی۔ وہ طمانچہ مارے ہوئے رخسار پر ہاتھ رکھے ماں کو تکتی ہوئی سسکیاں لینے لگی۔

"ہزار بار کہا اس غلیظ چھوکری کے ساتھ نہ کھیلا کرو نہیں مانتی"۔ بیگم انوار نے اپنے موتی جیسے دانت پیسے۔ "ابھی ابھی نہلایا کپڑے بدلے بال بنائے تھے آنکھ بچی اور پہنچ گئی وہاں...... خدا معلوم اس گندی بدبودار کوٹھری میں اس سے سانس کیسے لی جاتی ہے...... چھی...... توبہ......" انھوں نے اس غصے کے عالم میں ابکائی بھی لے لی اور نیچے گلے کے بلاؤز کے اندر سے ننھا سا خوبصورت رومال نکال کر اپنی ستواں ناک پر رکھ لیا جیسے اس غلیظ کوٹھری کے تصور ہی سے ان کو بدبو آنے لگی ہو۔

نفاست پسند، اونچے دماغ، اعلیٰ خیالات اور نازک طبع بیگم کی اکلوتی بیٹی سات سالہ بے بی، ان سے خطرناک حد تک مختلف تھی۔

آس پاس کے بنگلوں کے خوبصورت صاف ستھرے بچوں کی سنگت سے زیادہ اس کو اپنے خانساماں کی لڑکی منی کی صحبت پسند تھی۔ سرسبز و حسین لان کے بجائے وہ منی کی نیچی میلی نیم تاریک کوٹھری کے سامنے کوئی ہتھیلی بھر کے زمین کے ٹکڑے پر ٹاٹ کے بوروں کے اوپر چیتھڑوں سے بنی گڈے گڑیاں کھیلا کرتی تھی۔ اینٹوں کا گھر بنا کر ڈالڈا کے پھینکے ہوئے ڈھکن اور رفا سغوبین کی بوتلوں کے برتن بنا کر گھر گھر کھیلنے میں مگن رہا کرتی تھی۔

کتنے قیمتی کھلونے جمع کر رکھے تھے بیگم انوار نے کیسی دلچسپ چیزیں تلاش کر کر کے لاتی تھیں ایک چھوٹا سا کمرہ انھوں نے ان کھلونوں سے سجا رکھا تھا مگر یہ پاگل لڑکی اس کمرے میں ایک منٹ نہ ٹھہرتی ان کھلونوں سے اکتا سی جاتی اور جہاں ماں کی آنکھ بچی نکل بھاگی۔ کہاں جاتی ہیں منی کی کوٹھری میں! عاجز آگئی تھیں بیگم انوار، سمجھاتے بجھاتے بہلاتے پھسلاتے تھک کر آخر اب انھوں نے بے بی کی پٹائی شروع کر دی تھی اگرچہ بعد میں گھنٹوں ان کا دل مسلا کرتا۔ سوئی ہوئی بے بی کو وہ لگاتار پیار کرتے نہ تھکتیں مگر مجبور تھیں وہ اس سختی پر! ان کے خیال میں بے بی کی صحبت خراب ہو رہی تھی کتنی ہی بار انھوں نے خانساماں کو ڈانٹا تھا کہ وہ اپنی لڑکی پر بھی سختی کرے آخر اس کا اور بے بی کا کون سا جوڑ تھا ہاں ہوا کیا؟۔

"خاک کو آسماں سے کیا نسبت"

خانساماں بھی یہ سمجھتا تھا لیکن وہ بھی کیا کرتا۔ منی کو سمجھایا ڈرایا ایک بار مارا پھر بھی وہ باز نہ آئی نہ بے بی!

بیگم انوار کا خون کھول جاتا جب ان کو معلوم ہوتا بے بی پھر منی کے پاس پہنچ گئی ہے۔ وہ طوفان کی طرح جاتیں اینٹوں کے گھروندوں کو لات مار مار کر گرا دیتیں، ڈھکن اور بوتلیں دور اچھال دیتیں گندی چکٹی گڑیوں کو نوچ پھینکتیں اور ڈری سہمی منی کا کان مروڑ کر دور ڈھکیل کر بے بی کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی بنگلے میں لاتیں۔ غصے سے پھنکارتی دانت پیستی اس کے کپڑے اتارتیں ٹب میں بٹھا کر اس کو یوں نہلاتیں جیسے کھرچے ڈال رہی ہوں۔

پھر ڈھیر پاؤڈر چھڑک چھڑک کر گویا اس کے کومل جسم سے چپکی منی کی بدبو دور کرتیں پھر بیرل کریم لگا کر اس کے بال سنوارتیں اور ہزار بار سونگھ سونگھ کر تسلی کرتیں کہ کڑوے تیل میں لسا لس منی کے بالوں کی مہک تو نہیں رہ گئی۔!

پھر غصے کے ابال کو کم کر کے وہ بے بی کو بڑے بڑے لیکچر پلاتیں بے بی وعدہ کرتی۔

"اچھا مما اب میں منی کے ساتھ نہیں کھیلوں گی!"

"نہیں کھیلو گی نا!" بیگم انوار پر اب پیار کا دورہ پڑتا۔ بے بی کو گود میں بٹھا کر اس کے بال اور گال باری باری چومتی ہوئی کہتیں۔ اس گندی میلی لڑکی کے ساتھ کھیلتے تم کو گھن نہیں آتی بے بی"

"پہلے آتی تھی مما......" بے بی معصومیت سے کہتی۔

"اور اب نہیں آتی؟"

"مما مجھے اس پر ترس آتا ہے...... اس کا کوئی ساتھی نہیں ہے جب میں دوسرے بچوں کے ساتھ لان پر کھیلتی ہوں تو وہ آنکھوں میں آنسو لیے ہمیں دیکھا کرتی ہے......"

"دیکھا کرتی ہوگی۔ بیگم انوار منہ بنا کر کہتیں۔ اس کے ساتھ بھلا کون کھیلنا پسند کرے گا۔ کتنی گندی رہتی ہے وہ......

"مما اگر اس کی ماں ہوتی تو اس کو صاف رکھتی......"

"چھوڑو...... یہ گندے لوگ...... بیگم انوار نے کراہیت سے کہا۔ کبھی صاف بھی رہ سکتے ہیں؟۔ اس کی ماں بھی اتنی ہی گندی رہا کرتی تھی......"

پھر وہ موضوع بدل کر ببلی، سالو اور رہیما کی باتیں کرنے لگی تھیں۔ یہ سب صاف ستھرے۔ اور اونچے طبقے کے بچے ان کی صحبت میں رہیں تو کیا کہنے! مگر یہ بے بی وعدہ کرتی اور بھول جاتی: اسکول سے واپس آئی جلدی جلدی دودھ پیا منہ بنا بنا کر پھل کھائے بے زاری سے میوے ٹونگے اور آنکھ بچی: غائب!!!

انوار صاحب کہتے۔

"اتنی سختی مت کرو بیگم سمجھدار ہوگی تو خود منی کے پاس جانا اور اس کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرے گی!"

بیگم پھاڑ کھانے کو دوڑیں۔

"واہ واہ اچھی کہی۔ ابھی اس کی کچی سمجھ ہے جو بات جم گئی سو جم گئی ابھی سے سمجھانا ٹھیک ہے۔۔۔۔"

انور صاحب سن کر چپ ہو رہے اور بیگم دیر تک کھولتی بڑبڑاتی رہیں۔ کئی بار تو ان کے جی میں آیا خانساماں کو نکال باہر کریں نہ رہے بانس نہ بجے بانسری لیکن یہ خیال روکے رہا کہ اس جیسا ایمان دار محنتی اور لذیذ کھانا پکانے والا آدمی ملنا مشکل ہی نہیں محال ہے۔ کئی سال سے وہ بیگم کے ساتھ تھا جتنی تنخواہ شروع میں لیتا تھا وہی لے رہا تھا نہ کوئی نخرہ تھا نہ فرمائش تھی۔ ان کے وسیع و عریض کمپاؤنڈ کے ایک کونے میں پڑا تھا چھ بجے صبح سے لے کر رات کے ۱۱ بجے تک کام کرنا صرف کھانا پکانا انوار صاحب کے جوتوں پر پالش کرنا، ان کے کپڑے دھونا پریس کرنا سودا سلف لانا۔ چپراسی دیر سویرے آئے تو بے بی کو اسکول پہنچانا اور لانا: یہ سب دوسرا کوئی آدمی کب کر سکتا ہے بیگم کی اجازت لے کر وہ اپنا ہاتھ بٹانے کے لیے گاؤں سے اپنی عورت کو بھی لے آیا تھا جس کی گود میں ۲ برس کی کالی کلوٹی موٹی سی بچی بھی تھی۔ یہ بچی شروع میں جتنی بے ضرر تھی اتنی ہی اب خطرناک ثابت ہو رہی تھی۔ دو سال پہلے اس کی ماں چیچک میں مبتلا ہو کر مر گئی تھی۔۔۔۔۔ اور تب ہی سے۔۔۔۔۔ بے بی اس بے ماں کی لڑکی سے بہت زیادہ مانوس ہو گئی تھی۔۔۔۔!!!

بیگم انوار نے کھا جانے والی نظروں سے سسکتی ہوئی بے بی کو دیکھا۔ آج انہوں نے اپنی کچھ فرینڈز کو چائے پر بلایا تھا اور بے بی کو بڑی محنت سے تیار کر کے خود بھی تیار ہو گئی تھیں۔ جب تک وہ ڈائننگ روم میں جا کر ناشتے وغیرہ کا سامان ٹھیک کرتی رہیں۔ بے بی صاحبہ اس گندی لڑکی کے ساتھ زمین پر کوئلے سے لکیریں کھینچ کر اکلا دکلا کھیلتی رہی۔ تلاش کرنے پر ملی۔۔۔ فراک گندا، بال ایسے ناک میں کوئلے کی سیاہی ہاتھوں میں مٹی!!!

"ہائے ہائے پھر وہی گندی لڑکی اور تو۔۔۔۔"، تعلیم یافتہ، فیشن ایبل اور بے حد روشن خیال بیگم نے خالص دیہاتی اور گھریلو عورتوں کی طرح سینے پر دو ہتڑ مارا۔ ارے بے بی میں کسی دن تیرا گلا نہ داب دوں!"

بے بی کو مار کر یک جھک کر اور ہانپ ہانپ کر وہ تھک گئیں تو سر پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگیں کیا ترکیب کی جائے کہ منی اور بے بی کا ساتھ چھوٹ جائے۔

بڑی دیر بعد وہ غوطے سے ابھریں تو یہ دیکھ کر دھک سے رہ گئیں کہ بے بی غائب تھی۔ جس طرح ادھ کچلی ناگن بل کھاتی ہے بالکل اسی طرح بیگم اٹھیں اور باہر آ کر سیدھی خانساماں کی کوٹھری کی طرف چلیں۔ اُن کی مٹھیاں بھنچی تھیں جبڑے کسے تھے اور آنکھوں سے خون سا ابل رہا تھا اپنی بیش قیمت ساڑھی کے خوبصورت بوڈر کے گندے ہو جانے کی پروا کیے بغیر وہ تیز تیز چلتی ہوئی خانساماں کی کوٹھری تک آئیں۔ اندر سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی سسکیاں، ہچکیاں، شکوہ آمیز انداز۔!

"سنوں تو سہی۔۔۔۔ یہ منی کی بچی بے بی کو کونسا سبق پڑھاتی ہے۔۔۔" دانت پیس کر انھوں نے زیر لب کہا اور اپنی شعلہ بار آنکھیں بند دروازے کی چوڑی سی جھری سے لگا دیں۔۔۔!

اندر چھوٹا سا لیمپ دیوار کی کیل میں لٹکا محدود روشنی بکھیر رہا تھا اور اس روشنی کے گھیرے میں زمین پر ایک ٹاٹ کے ٹکڑے کے اوپر دونوں پاؤں پھیلائے ہوئے منی بیٹھی تھی۔ انہوں نے بڑی کوشش کی پر بے بی نظر نہیں آئی وہ شاید اس وقت وہاں نہیں تھی بیگم نے واپس پلٹنا چاہا لیکن ان کے قدم زمین پر جم سے گئے تھے۔ منی کے ہاتھوں میں ایک بڑی سی میلی گندی گڑیا دبی ہوئی تھی۔

وہ اس گڑیا کا آنچل سنوارتی ہوئی باتیں کیے جا رہی تھی۔!

"اماں تم ہم کا چھوڑ کے چلی گیو۔۔۔۔۔ ابا کا کام سے پھرست ناہیں ملت ہے۔ بے بی کہت ہیں مما ای بات پے کھپا ہوت ہیں کی ہم گندے رہت ہیں، ہمرے بالن ما جوواں پڑے ہیں ہمرا کوئی منہ ہات ناہیں دھلات ہے۔۔۔ کے اماں تو بتاؤ تو وہاں ہمرے بیے کر دھت ناہیں ہو؟"

بیگم دم بخود تھیں اور منی۔۔۔ رو رو کر سسک سسک کر گڑیا سے باتیں کیے جا رہی تھی۔

"تم ہم کا نہلاوت دھلاوت رہو اماں کنگھی کا جل کرت رہو ہمرے کپڑے چھانٹت رہو اب ای سب کون کرے۔۔۔۔ بیگم ساب ہم کا گندی لڑکی کہت ہیں یہی کارن بے بیا کا ہمرے ساتھ کھیلن کا روکت ہیں۔۔۔۔ اب جو بے بی ہمرے ساتھ نہ کھیلیں نہ بولیں تو تم ہی بتاؤ ہم کیکا ساتھ ڈھونڈ جیبے۔۔۔۔"

وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔!

بیگم چند لمحوں تک تو ساکت کھڑی رہیں پھر ان کے ہاتھ اٹھے دروازہ کھل گیا! قدم اٹھے اور انھوں نے خود کو کوٹھری کے اندر پایا۔ اس کوٹھری میں جس میں بے بی کا سانس لینا بھی ان کو ناگوار ہوتا تھا پھر انہوں نے اپنے آپ کو منی کے اس قدر قریب پایا کہ اس کے جسم سے اٹھتی بھبھک اور بالوں کی چکٹی بو براہ راست اپنے دل و دماغ میں اترتی محسوس کی۔

منی ان کو اپنے سامنے پا کر ششدر رہ گئی!

خوف زدہ! حیران! ساکت!

اس کے ہاتھوں میں تھمی گڑیا زمین پر گر پڑی۔

"گندی لڑکی! بیگم نے اپنے صاف و شفاف نرم و گداز بازو بڑھائے آ میرے ساتھ میں نہلاؤں گی تجھے۔۔۔۔ بال بھی بناؤں گی۔۔۔۔"

منی منہ کھولے ان کو تکتی ہی رہی تو انھوں نے بڑھ کر اس کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

غلام نبی خیال
روزنامہ اقبال سری نگر
(کشمیر)

غنی کشمیری

سلاطینِ مغلیہ میں سے شاہجہاں کو تخت نشیں ہوتے تین سال گذرے تھے کہ کشمیر کے مطلعِ تاباں سے شیخ یعقوب صرفی اور ملا محسن فانی کے بعد ایک اور روشن ستارہ طلوع ہوا ملک کے اس سپوت نے شہر سری نگر کے ایک گمنام محلہ میں ۱۰۴۰ ہجری مطابق ۱۶۳۰ عیسوی جنم لیا۔ باپ نے بچے کا نام اس مناسبت سے محمد طاہر رکھا کہ اُسے حضرت شیخ حمزہ مخدوم کشمیری کے ایک ہم مجلس بزرگ حضرت خواجہ طاہر رفیقی اشائی سہروردی سے رُوحانی عقیدت تھی۔[1] اور بعد میں یہ اقبال مند بیٹا غنی کشمیری کے نام سے مشہور ہو کر دور و نزدیک کا محبوب شاعر بن گیا۔
غنی کے آبائی قبیلے اشائی کے کشمیر آنے کے بارے میں مختلف آرار کا اظہار کیا گیا ہے۔ بقول سر والٹر لارنس — اس گروہ کے لوگ اصل میں مغل تھے[2]۔ پیر حسن شاہ کا کہنا ہے کہ اشائی قبیلہ خراسان کے ایک گاؤں اشادر سے بھاگ کر کشمیر میں آبسا۔

غنی کے خاندان کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس کے والدین آسودہ حالی اور فارغ البالی کے دن گذارا کرتے تھے۔ غنی کے چھوٹے بھائی محمد زماں نافع سے متعلق دو چار سطریں اس لحاظ سے تذکروں میں پائی جاتی ہیں کہ نافع بھی شاعر تھا۔

ملا شیخ محسن فانی کشمیری مشہور صاحبِ کمال بزرگ اور حضرت یعقوب صرفی کے بھتیجے تھے۔ فانی نے کشمیر میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا تھا اور سینکڑوں طلبار ان سے کسبِ فیض کیا کرتے تھے۔ شہزادہ دارا شکوہ فانی کا خاص قدرداں تھا جس نے اپنے اس محبوب شاعر کو کچھ عرصے تک اپنی صحبت میں رکھا۔ پھر فانی کشمیر کے قاضی القضات قرار پائے لیکن درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخر ۱۰۸۲ھ یعنی ۱۶۷۱ء میں وفات پائی۔ مصرعۂ تاریخ وفات یوں ہے ؎

رفتہ فانی بعالم باقی

صنفِ سخن گوئی میں غنی اور نافع دونوں نے اسی فانی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اس میں اختلافِ رائے موجود ہے کہ دیگر علوم و فنون کے حصول میں بھی فانی ہی غنی کے استاد تھے یا اس نے محض اپنی پُر شوق اور نکتہ شناس ذہنیت کی بدولت ہی سب کچھ سیکھا۔ شمعِ انجمن کے مؤلف کا کہنا ہے۔ "چوں طبع بلند داشت در کتر روزگار حیثیتے شائستہ بہم رسانید و آخر بغواصی بحرِ سخن افتاد و جواہرے کہ بہ نقدِ جاں تواں خرید بیروں آورد"۔ فی الحقیقت اس بات میں استاد کی رہنمائی سے زیادہ شاگرد کی افتادِ طبع ہی کو دخل تھا کہ غنی قلیل عرصے میں ایک بڑا شاعر بن کر آسمانِ شاعری پر چمکا۔ فانی کی صحبت میں سرحلقۂ شاگرداں بنا اور استاد کے لئے یہاں تک باعثِ فخر ہوا کہ بقول مرزا محمد افضل سرخوش "ہرگاہ شیخ را مسئلہ مشکل شدے از وی استفسار نمودے"۔ غنی نے اپنی موزوں مزاجی سے علوم و فنون پر خود قدرت بھی حاصل کرلی اور اس قابل بھی ہوا کہ دوسروں کو سکھایا۔ تحائف الابرار میں درج ہے کہ "نافع آدابِ طریقت از برادرِ خود ملا طاہر غنی حاصل نمود" اور حسن شاہ کھویہامی کا بھی کہنا ہے کہ "برادر ملا طاہر غنی شاگرد ملا محسن فانی بود و از برادرِ خود کسبِ فیوضِ معانی نمود"[3]۔

غنی کے احوالِ حیات قلم بند کرنے میں جس بخل اور بے توجہی سے مورخین اور تذکرہ نگاروں نے کام لیا ہے۔ اس سے بڑا سانحہ فارسی داں طبقے اور خاص کر کشمیریوں کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں لے دے کر گنتی کے چند ایک تذکرہ نگاروں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے جنہوں نے غنی کے حیات و فن کے بارے میں اس قدر قلیل اور بے ترتیب مواد فراہم کرنے پر اکتفا کیا ہے کہ من جملہ ان تمام تذکروں سے بھی غنی کی زندگی کے واضح پہلوؤں یا اہم واقعات کی کوئی نقاب کشائی نہیں ہو پاتی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے غنی کے متعلق ایک دوسرے کے سالم جملے اپنی اپنی تالیفات میں بعینہٖ دُہرائے ہیں۔ مثلاً سرخوش کی یہ عبارت کہ "ملا محمد طاہر غنی صاحبِ طبع عالی بود پایۂ سخن وری را بدرجۂ کمال رسانیدہ از خطۂ کشمیر بلکہ از اقلیم ہند ہم چو او خوش خیالِ نازک بند برنخاستہ و اکثر از معاصرین و متاخرین قایل بخوش کلامی او بودہ اند" — بلگرامی صاحب نے بھی ماثر الکرام میں ہو بہو نقل کی ہے۔ اسی طرح ریاض الشعرار کے مصنف علی قلی والہ داغستانی نے بھی غنی پر دو چار الفاظ تحریر کرنے ہی پر اکتفا کیا ہے۔

غنی جب عمر کے بیسویں سال میں داخل ہوا تو شاعری شروع کی اور گوشۂ گمنامی سے باہر نکل آیا۔ شاید اسی وقت سے محمد طاہر نے غنی تخلص اختیار کیا۔ جس کے حروف کے اعداد سے بھی سال ۱۰۶۰ھ بنتا ہے۔ جیسا کہ سرخوش کا بھی کہنا ہے "غنی تاریخ شعر گفتن و ابتدائے تخلص یافتنِ اوست"۔ غنی نے شاعری شروع کرتے ہی اپنی رفعتِ تخیل اور بلندیٔ طبع کے وہ جوہر دکھائے کہ معاصرین دنگ رہ گئے۔ اس میدان میں اترے ابھی اس جواں سال شاعر کو ایک ہی سال ہوا تھا کہ ۱۰۶۱ھ میں ابو طالب کلیم فوت ہوئے تو غنی نے یہ فہیم و بلیغ اور معنی آفریں قطعہ تخلیق کیا ؎

حیف کز دیوارِ ایں گلشن پرید
طالب آں بلبلِ باغِ نعیم
رفت و آخر خامہ را از دست داد
بے عصائے کرد ایں راہ کلیم

---

[1] کشمیر از جی ایم ڈی صوفی۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۴۹ء۔ ص ۴۶۳
[2] ویلی آف کشمیر۔ کشمیر پبلشرز سری نگر۔
[3] تاریخ حسن جلد چہارم۔ مطبوعہ ۱۹۶۰ء۔ ص ۲۶

اشکِ حسرت چوں نمے ریزد قلم
شد سخن از مردنِ طالب یتیم
ہردم از شورشِ دلِ اہلِ سخن
چوں زبانِ خامہ می گردد دو نیم
عمرہا در یادِ او زیرِ زمیں
خاک بر سر کرد قدسی و سلیم
عاقبت از اشتیاقِ یک دگر
گشتہ اند ایں ہر سہ در یکجا مقیم
گفت تاریخِ وفاتِ او غنیؔ
طورِ معنی بود روشن از کلیم

۱۰۶۱ھ

غنیؔ کا زمانہ سرزمینِ کشمیر میں فارسی علم و ادب کا دورِ زرّیں کہا جاتا ہے۔ شعر و سخن کی محفلیں ہر جگہ منعقد ہوا کرتیں اور اصحابِ اقتدار اور اُمراء کے ہاتھوں شاعروں کی عزت افزائی ہوتی۔ مغل بادشاہوں کو ابتدا ہی سے علم و ادب سے والہانہ لگاؤ تھا۔ ان کے درباروں کو شعرا اور فضلاء نے بار بار رونق بخشی ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ اسی حوصلہ افزائی کی بدولت مغلیہ دور نے وہ عالم و فاضل پیدا کیے جن میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی حیثیت میں معجز نما صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ غنیؔ کے وقت میں بھی شاہجہاں اور اورنگ زیبؔ کی طرف سے جو مغل حکام کشمیر میں متعین ہوئے خوش قسمتی سے اُن سب میں سخن گوئی کا ذوق اور سخن شناسی کا وصف بدرجۂ اتم موجود تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر ہند اور ایران کے بیشتر شعرا کا محبوب مرکز بن گیا اور وادی کے در و دیوار محمد قلی سلیمؔ، عنایت اللہ اسد خان آشناؔ، مولانا ذہنی، اوجی کشمیری، طغرائی مشہدی، مولانا فصیحی، میر الہٰی، مولانا فہمی، محمد صالح ندیم کشمیری، بدیعی، خواجہ ہاشم، قاضی محمد عارف، محمد رفیع منش، غلام رسول استغنا کشمیری، اور ضیاء الدین بدایونی جیسے سخن سنجوں کے شیریں ترانوں سے گونجنے لگے۔ ان شاعروں میں مقامی سخن وروں کے علاوہ باہر کے کچھ ایسے شعراء بھی شامل ہیں جو دربارِ شاہی سے وابستہ رہے اور وقتاً فوقتاً حکامِ کشمیر کے ساتھ ان کی دعوت پر کشمیر آتے۔ ۱۰۴۲ھ یعنی ۱۶۳۲ء میں ظفر خان احسنؔ کشمیر کا سربراہ ہو کر یہاں آیا تو صائبؔ اصفہانی کو بھی اپنے ہمراہ لایا۔ احسنؔ خود بھی شاعر تھا اور شاعروں کا گرویدہ بھی۔ کشمیر کی تعریف اور یہاں کے قدرتی نظاروں سے متعلق اس کا کلام کنول کے پھولوں جھیل ڈل، کنارہ ڈل کے باغات، جھیل مانسبل، زعفران زاروں، آبشاروں اور ایامِ خزاں کی رنگینیوں پر لکھی ہوئی فارسی نظموں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح شاہ جہاں کے ساتھ ملک الشعراء ابو طالب کلیم وارد کشمیر ہوا۔ اور شہنشاہ کی واپسی کے بعد بھی اجازت لے کر اور پنشن پا کر تا دمِ مرگ اسی سرزمین کا ہو رہا۔ مرزا صائبؔ جب کشمیر سے واپس ایران گیا تو اس نے وہاں بھی غنیؔ کے نام کی شہرت سنی۔ دریں اثنا جب اُس کے گوش گذار غنیؔ کا یہ شعر ہوا ؎

موئے میانِ تو شدہ "کرالہ پن"
کرد جدا کاسۂ سرہا ز تن

تو لفظِ "کرالہ پن" کے معنی دریافت کرنے کا اس قدر مشتاق ہوا کہ دوسری بار خود کشمیر آیا اور جب شاعر سے اس لفظ کی تشریح پوچھی تو غنیؔ نے جواب دیا "کرالہ پن نامہ رشتہ ایست کہ کوزہ گراں کاسہ را از چرخ بدو جدا می سازند" صائبؔ نے اس پر بس نہیں کیا بلکہ جب اس نے غنیؔ کا یہ شعر پڑھا ؎

حُسنِ سبزے بخطِ سبز مرا کرد اسیر
دامِ ہمرنگِ زمیں بُود گرفتار شدم

تو سراپا نیاز ہو کر بولا "کاش ایں ہمہ کہ در تمام عمر خود گفتہ ام بغنیؔ می بخشیدند و ایں یک بیت را بمن می کردند"۔ اسی طرح ایک اور دفعہ کا ذکر ہے کہ مرزا صائبؔ کہیں باہر گیا تھا اور اس کی بیاض گھر میں کھلی پڑی تھی۔ ایک شخص اُسے اٹھا کر غنیؔ کے پاس لایا۔ غنیؔ نے دیکھا کہ بیاض میں درج ایک شعر کا مصرعۂ اوّل غائب ہے۔ دوسرا مصرعہ یوں تھا ؏

کہ از لباسِ تو بوئے کباب می آید

غنیؔ نے فی البدیہہ شعر کو اس طرح پورا کر لیا ؎

کُدام سوختہ جاں دست زد بدامانت
کہ از لباسِ تو بوئے کباب می آید

واپسی پر جب صائبؔ نے یہ دیکھا اور اسے پتہ چلا کہ مصرعہ غنیؔ نے لکھا ہے تو خواہش ظاہر کی "کاش کہ صائبؔ دیوانِ یک مصرعہ می نگاشتے تضمینش ملا غنیؔ می کردے" اس کے بعد مرزا صائبؔ غنیؔ کا اس قدر گرویدہ ہوا کہ اپنی ذاتی بیاض میں اُس کے دو سو سے زاید اشعار درج کیے جنہیں پڑھ کے وہ وقتاً فوقتاً محظوظ ہوتا تھا۔

اس عالمِ عقیدت مندی اور قدر شناسی میں بھی غنیؔ نے کسی بادشاہ یا نواب کی تعریف و توصیف میں کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ تاریخِ حسن ولیہ میں مذکور ہے کہ غنیؔ نے ایک بار شاہجہاں کے دربار میں قصیدۂ ثنا خوانی پیش کیا۔ اور ہزاروں روپے انعام میں پائے لیکن یہ واقعہ دراصل محمد علی فرّخیؔ کا ہے جس نے ۱۰۶۱ھ بمطابق ۱۶۵۱ء میں شاہجہاں کی آمدِ کشمیر کے موقع پر جب وہ چوتھی اور آخری بار یہاں آیا، ایک قصیدہ بادشاہ کے حضور میں پیش کیا جس پر اُسے ہزار روپے انعام ملا۔ اور حکمِ شاہی کے بموجب بارہ روپے روزینہ بھی مقرر ہوا۔

شہنشاہِ ہند اورنگ زیبؔ عالمگیر نے غنیؔ کا کلام سُنا تو عش عش کر اٹھا اور شاعر سے ملاقات کا مشتاق ہوا۔ ۱۰۷۹ھ بمطابق ۱۶۶۸ء کے دن تھے۔ کشمیر میں سیف خان کی حکومت تھی۔ گورنر کو شہنشاہ کا حکم ملا کہ غنیؔ کو بہ تکریم و تعظیم دربارِ شاہی میں لایا جائے۔ سیف خان نے جب شاعر کے سامنے بادشاہ کی خواہش کا اظہار کیا

سلہ مراد محمد جان قدسی اور محمد قلی سلیم سے ہے۔ عہدِ شاہجہانی کے یہ دو مشہور شعراء کلیم کے زمانے میں گذرے ہیں اور تینوں سری نگر کے مزار الشعراء واقع درگجن میں دفن ہیں۔ لیکن سنگِ مزار کی نشاندہی آج نہیں ہو سکتی ہے۔

سلہ تذکرۂ شعرا از میر حسین دوست سنبھلی   سٹہ ایضاً
سٹہ نگارستانِ کشمیر کے مؤلف نے ہزار بارہ ہزار کر دیئے ہیں۔

تو جواب ملا "شہنشاہ کو لکھ دو کہ غنی دیوانہ ہو گیا ہے" سیف خان کو تعجب ہوا کہ بھلا ایک صاحبِ ہوش و خرد اور مردِ دانا کو سودائی کیسے کہوں۔ غنی نے اسی لیے کپڑے پھاڑ دیئے اور دیوانوں کی طرح حاکمِ کشمیر کے بھرے دربار سے نکلا جس کے تین دن گزرنے کے بعد ہی دارِ فانی سے رحلت کر گیا۔ غنی کے انتقال کے وقت فانی بقیدِ حیات تھے۔ سرخوش کے استاد محمد علی ماہر نے تاریخ وفات یوں بیان کی ہے

چو داد شش فیض صحبتِ شیخِ کامل محسنِ فانی
غنی سر حلقۂ اصحابِ اُو در نکتہ دانی شد
تہی چوں کرد بزمِ شیخ را گفتند تاریخش
کہ آگاہے شوتے دارِ بقا از دارِ فانی شد

غنی کے مدفن کے بارے میں وثوق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ایک رائے کے مطابق آپ "در مقبرہ ملا محسن فانی آرمیدہ"[۱] مرحوم مولانا حیرت کاملی سے میں نے سنا ہے کہ غنی کا مقبرہ سری نگر کے ایک گمنام محلہ شاعر واری میں ہے۔ یہ محلہ کوہ ماران (ہاری پربت) کے مغرب میں قلعے کی فصیل کے باہر ہی شمالی سمت میں ہے۔ لیکن وہاں بھی کسی ایسی قبرستان کا نشان نہیں مل سکا ہے جسے غنی کا مدفن کہا جا سکے۔ غنی نے شاید اسی لئے زندگی ہی میں پیش گوئی کی تھی ہے

ہم چو آتش روشن از من بود ہر شمعِ مزار
من کہ مُردم کس چراغے بر سرِ خاکم نہ سوخت

غنی کی وفات کے بعد محمد اسلم ماہر نے ۱۱۰۲ھ یعنی ۱۶۹۰ء میں دیوانِ غنی کو نقل کیا۔ اگرچہ اس سے قدیم تر ایک اور نسخے کا بھی پتہ چلا ہے جو ۱۰۸۱ھ بمطابق ۱۶۷۰ء میں لکھا گیا ہے[۲]۔ ماہر کا رقم کردہ نسخۂ دیوان بعد میں غنی کے دو شاگردوں اسلم اور لالہ ملک شہید کے ہاتھوں ترتیب پا کر ۱۲۶۱ھ بمطابق ۱۸۴۵ء میں لکھنؤ کے مصطفائی پریس سے چھپ کر نکلا۔

غنی کشمیری کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ وہ ایک ایسے خداداد کمال کا مالک تھا جس کی بدولت بسیار گوئی کے باوجود ہم غنی کے ایک شعر میں بھی کسی قسم کا سطحی پن یا فن کی ذرہ بھر کوتاہی نہیں پاتے۔ اس کا ایک ایک مصرعہ ادب العالیہ کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اگرچہ فارسی شاعری کا یہ بیش بہا سرمایہ زمانے کی دست برد سے پوری طرح محفوظ نہیں رہ سکا لیکن غنی کے صرف وہی دو ہزار اشعار جو مذکورہ دیوان میں درج ہیں، فارسی زبان کے کسی بھی مجموعۂ غزلیات سے کم پایہ کے نہیں۔ دیوانِ غنی کے علاوہ ایک رزمیہ نظم کا بھی غنی سے تعلق ظاہر کیا جاتا ہے جس میں اورنگ زیب اور اس کے بڑے بھائی دارا شکوہ کی جنگ کا حال بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے اس مثنوی کا مسودہ دیکھنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ اس کا طرزِ بیان غنی سے بالکل جدا ہے اور اس میں جو اشعار شاہجہاں کی مدح میں کہے گئے ہیں اُن کی غنی سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ امکان غالب ہے کہ اس جنگ نامے کا مصنف کوئی اور غنی ہوگا۔ ملا طاہر غنی نہیں ہو سکتا[۳]۔ اللہ اعلم بالصواب!

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے غنی کی شخصیت اس لحاظ سے مغلیہ دور کے تمام شعراء میں ایک مثالی اور انفرادی حیثیت رکھتی ہے کہ اس نے مغل سلطنت کے عظیم الشان دربار کا کوئی اثر نہیں لیا۔ اور نہ ہی اس کی خودداری نے یہ برداشت کیا کہ وہ شاہی انعام و اکرام سے مالا مال ہونے کی خاطر حکامِ وقت کی قصیدہ خوانی کرے۔ اس کے برعکس اس نے خود شناسی اور خدا شناسی کے فلسفہ کو سمجھا اور عمر بھر اگر کسی چیز نے اُسے مرعوب رکھا تو وہ موت کا لاینحل مسئلہ تھا۔ غنی کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کو اپنی ہمتِ بازو اور فقر و غنا پر ہی بھروسہ رکھنا چاہیے تاکہ اس کی گردن اربابِ حل و عقد کی عارضی نوازشوں کے بوجھ سے دبنے نہ پائے اور وہ دین و دنیا کی رُو سے سرخ رُو کہلائے۔ غنی نے اپنی زندگی کو ایک گذرنے والے ہوا کے جھونکے سے زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔ مثال کے طور پر ہے

غافل مشو ز عاقبتِ کارِ خود غنی
دل نہ بخوابِ مرگ کہ دنیا فسانہ ایست
بر روئے زمیں ہیچ کس آسودہ نباشد
گنجے بود آرام کہ زیرِ زمین است
غنی زیرِ زمیں اہلِ فنا را
بود جیشے کہ بر روئے زمیں نیست

غنی نے گوشہ نشینی ہی میں تقریباً اپنی ساری عمر گذار دی ہے۔ اس سلسلے میں یہ روایت مشہور ہے کہ جب وہ اپنے حجرے میں ہوتا تو اسے اندر سے مقفل کر لیتا اور جب باہر جاتا تو دروازہ کھلا چھوڑ کر جاتا۔ کسی نے جب اس کی وجہ پوچھی تو غنی نے جواب دیا کہ مکان کا سرمایہ تو میں خود ہوں لہٰذا کمرے میں ہوتا ہوں تو اسے اندر سے بند کر کے اپنی حفاظت کرتا ہوں اور جب میں ہی کمرے میں نہ رہا تو اسے مقفل کرنے کا کیا فائدہ؟

علامہ اقبال نے اس واقعے کو ایک لطیف پیرائے میں یوں نظم کیا ہے

غنی آں سخن گوئے بلبل صفیر — نوا سنجِ کشمیر مینو نظیر
چو اندر سرا بود دربستہ داشت — چو رفت از سرا تختہ را واگذاشت
یکے گفتش اے شاعرِ دل رسے — عجب دارد از کارِ تو ہر کسے
بہ پاسخ چہ خوش گفت مردِ فقیر — فقیر و با قلیمِ معنی امیر
ز من آنچہ دیدند یاراں رواست — دریں خانہ جز من متاعے کجاست
غنی تا نشیند بہ کاشانہ اش — متاعے گرانے است در خانہ اش
چو آں محفل افروز در خانہ نیست — تہی تر ازیں ہیچ کاشانہ نیست

زمانے نے غنی کی قدر نہ کی اور وہ بھی زمانے سے شکوہ کئے بغیر نہ رہا۔ دراصل اس میں اس کی اپنی افتادِ طبع ہی کو زیادہ دخل تھا۔ ایک طرف اگر اس نے اربابِ

(بقیہ صفحہ ۴۱ پر)

---

۱ یہ جملہ مورخِ کشمیر مفتی سعادت شاہ پاندانی نے تاریخِ اعظمی کے ایک مطبوعہ نسخے میں ذکرِ غنی کے باب میں بطور حاشیہ درج کیا ہے۔

۲ یہ نسخہ کشمیر کلچرل اکاڈمی کے شعبۂ مخطوطات میں محفوظ ہے۔

۳ کشمیر جلد دوم، ص ۴۶۵

سلیمان اطہر جاوید
ایس۔ وی۔ یونیورسٹی تروپتی

تلگو شعر و ادب میں مسلمانوں کا حصہ

کسی زبان کو کسی بھی مذہب یا عقیدہ سے وابستہ کر دینا، ظاہر ہے کوئی معقول بات نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی مذہب کے ماننے والوں میں کسی زبان کے بولنے، لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ ہو۔ لیکن دنیا میں ایسی کوئی زبان نہیں ہے جس کے بولنے والے صرف ایک مذہب کے پیرو ہوں اور نہ کوئی مذہب ایسا ہے جس کے تمام ماننے والے صرف ایک زبان بولتے ہوں ــــ مسلمان ہی کی بات لیجئے! مسلمان دنیا کے سارے ممالک میں کم یا زیادہ موجود ہیں لیکن ہر ملک یا علاقے میں وہاں کی قومی یا علاقائی زبان ہی ان کی مادری زبان ہے۔ اور ان زبانوں اور ادب کی ترویج میں انہوں نے مقدور بھر حصہ ادا کیا ہے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے جائزہ سے بھی واضح ہوگا کہ ہر زبان میں خواہ وہ کشمیری ہو کہ ملایالم، آسامی ہو کہ گجراتی، مسلمان ادیبوں اور شاعروں کی تعداد خاطر خواہ ہے۔ اور ان زبانوں کی اشاعت میں مسلمانوں نے بھی قابل لحاظ حصہ لیا ہے۔

جنوبی ہندوستان دراوڑی زبانوں کا علاقہ ہے اور تلگو ایک اہم دراوڑی زبان ہے جس کا ادب بے حد قدیم اور بے حد عظیم ہے۔ علاؤالدین خلجی کے حملوں کے وقت سے دکن سے مسلمانوں کے ربط ضبط کا آغاز ہو چکا تھا لیکن دکن میں مسلمانوں ....

.... کی پہلی حکومت، بہمنی سلطنت ہے، جس کے سقوط کے بعد دکن میں پانچ سلطنتیں قائم ہوتی ہیں۔ تلگو علاقہ کی نامور سلطنت قطب شاہی ہے جس کے فرماں رواؤں نے دکنی اور تلگو شعر و ادب کی دل کھول کر اور یکساں سرپرستی کی اور خود بھی دکنی کی طرح تلگو میں بھی شعر کہے۔

"تلگو شعر و ادب کی ترقی سے دلچسپی رکھنے اور تلگو شاعروں کی فیاضانہ سرپرستی کرنے میں گولکنڈہ کے تیسرے بادشاہ سلطان ابراہیم قطب شاہ (۱۵۵۰-۱۵۸۱) کا نام سب سے نمایاں ہے۔ سلطان ابراہیم قطب شاہ نے تلگو شعر و ادب اور فنون لطیفہ سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ اس نے تلگو شاعروں کو "درباری شاعروں" کا اعزاز دیا اور انعامات و اکرامات اور مناصب اور جاگیرات سے نوازا۔ ابراہیم ۲۰ سال ہی کی عمر میں بادشاہ بن چکا تھا۔ تخت سنبھالنے سے قبل اُس نے سات سال وجیا نگر میں گزارے جو تلگو ادب کا بہت بڑا مرکز قرار دیا جاتا ہے۔ تلگو عوام اور شاعروں میں ابراہیم قطب شاہ کی مقبولیت کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ تلگو میں اس کو "ملک ابھیرام" سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ادنکی گنگادھر کوی تلگو کا معروف شاعر گزرا ہے جس کو تلگو شاعری کی ایک صنف "پربندھ" نگاری میں ملکہ حاصل تھا۔ اس نے اپنے ایک پربندھ "تاپتی سموارنو پاکھیانم" کو جس میں مہابھارت کے "ارنیا پروا" میں بیان کردہ ساوتری کی چھوٹی بہن تاپتی کی محبت کا قصہ پیش کیا ہے، ۱۵۶۵ء میں ابراہیم قطب شاہ کے نام معنون کیا۔ ابراہیم قطب شاہ نے اس کو نہ صرف انعام و اکرام سے نوازا بلکہ درباری شاعر کا بھی اعزاز دیا۔

کُندُوکُورُو رُدرِیا بھی تلگو شاعری میں اہم مقام رکھتا ہے۔ اس کا کلام شعریت سے بھرپور اور دلکش اسلوب کا حامل ہے۔ یہ خدا ترس شاعر تھا۔ اس کی مشہور منظومات "جنار دنش تاکم" "مُسگر لوا و جامم" اور "نرن کو سو یکھیانم" ہیں۔ ابراہیم قلی قطب شاہ، رُدریا کی شاعری اور علمیت سے بہت زیادہ متاثر تھا چنانچہ اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس نے شاعر کو موضع "چنتالا پالم" کی زمینات عطا کیں۔ ابراہیم قطب شاہ نے اور جن شاعروں کی سرپرستی کی اُن میں ملا ریڈی کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے۔ ملا ریڈی کی مشہور نظم ست چکرورتی ہے۔

متلا اُنتا بھو پالا، ایک چھوٹی سی ریاست کا حکمراں تھا ۱۵۸۰ء سے کچھ قبل اس نے ایک نظم "کاکُتا د جایم" لکھی اور اپنے باپ کے نام معنون کی۔ باپ اور بیٹا دونوں ابراہیم قطب شاہ کے ہم عصر اور گہرے دوست تھے اور ابراہیم قطب شاہ ان کی شعری صلاحیتوں کا قدرداں!

تلگو شاعروں کو اپنے "ملک ابھیرام" سے اس قدر زیادہ عقیدت تھی کہ ابراہیم قطب شاہ کی وفات پر تلگو کا ایک شاعر اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے

"ہے پربھو! اگر تجھے کسی کو اپنے پاس بلانا تھا تو تجھے سینکڑوں بے فیض
حکمراں مل جاتے لیکن تو نے کیا غضب کیا کہ ایک ایسے شخص کو دنیا سے
اٹھا لیا جس کا ثانی تو پیدا نہیں کر سکتا!"

ابراہیم قطب شاہ ہی نے نہیں بلکہ اس دور کے امیروں اور نوابوں نے بھی تلگو شعر و ادب کی ترویج سے دلچسپی لی اور شاعروں اور ادیبوں کو سرفراز کیا۔ پونٹی کانتی تلگانہ کو اس دور کے شاعروں میں انفرادی حیثیت حاصل ہے اس کی مقبول عام نظم "یایاتی چیرترا" ہے جو اس نے سلطان ابراہیم قطب شاہ کے ایک امیر اور اعلیٰ عہدیدار امین خاں کے نام معنون کی۔ امین خاں شعر و ادب کا قدرداں تھا۔ "یایاتی چیرترا" کو تلگو شاعری میں خصوصی مقام دیا جاتا ہے تلگو شاعری کے ناقدوں نے اس کو "خالص تلگو" کی پہلی نظم قرار دیا ہے۔ خالص تلگو سے مراد یہ کہ اس میں سنسکرت یا کسی پراکرت کا لفظ شامل نہیں ہے۔ سادہ اسلوب، روانی اور عام فہم و آسان انداز بیان پونٹی کانتی تلگانہ کے کلام اور بالخصوص اس نظم کی خوبی ہے۔

سلطان ابراہیم قطب شاہ کے بعد سلطان محمد قلی قطب شاہ نہ صرف دکنی اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر گزرا ہے بلکہ دکنی اور تلگو شاعروں اور ادیبوں کی قدردانی میں بھی اس کا مقام اونچا ہے۔ یہ اپنے تلگو دیس کا تو عاشق زار تھا۔ ابراہیم قطب شاہ

کی طرح محمد قلی قطب شاہ نے بھی تلگو کے ایک ممتاز شاعر بٹامٹا کوی کو اپنے درباری شاعر ہونے کا اعزاز دیا تھا۔

محمد قلی قطب شاہ کا تلگو کلام تاحال دستیاب نہیں ہو سکا ہے لیکن تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ اس نے تلگو میں بھی شعر کہے ہیں۔ نیز دکنی ادب اور تہذیب سے اس کی جذباتی وابستگی اور دکنی اردو کے اس کے کلام میں تلگو الفاظ اور لہجہ کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں رکھتے کہ اس نے تلگو میں بھی شاعری کی ہے۔ تلگو میں محمد قلی قطب شاہ کا تخلص "ترکمان" تھا

ادھر دورِ جدید میں ایک اہم نام عمر علی شاہ کا ہے۔ عمر علی شاہ کا سن پیدائش ۱۸۸۵ء ہے ان کو تلگو کے علاوہ اردو اور فارسی پر بھی غیر معمولی قدرت حاصل تھی اور ڈرامہ نگاری سے بھی بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ انہوں نے تلگو میں کئی ڈرامے لکھے جن میں "کرنا پردم" کو عمدہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ منظوم ڈرامہ ہے جس کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ۱۰ سال سے کم عمر ہی میں شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا۔ عمر علی شاہ کو تصوف سے دلچسپی تھی چنانچہ انہوں نے "رباعیاتِ عمر خیام" کا بڑی محنت اور مہارت سے ترجمہ کیا۔ تلگو میں آج تک بھی "رباعیات عمر خیام" کا اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ عمر علی شاہ کا انتقال ۱۹۴۵ء میں ہوا۔

عبدالغفور صاحب آندھرا پردیش کے تعلقہ کھم (موجودہ ضلع کھم) میں پیدا ہوئے تعلیم عربک کالج کرنول میں حاصل کی اور ایک عرصہ تک ضلع پریشد ہائی اسکول چتور میں اردو منشی کی حیثیت سے کام کیا۔ بعد میں عربک کالج میں عربی کے استاد مقرر ہوئے اور یہیں سے وظیفہ پر سبکدوش بھی۔ عبدالغفور کو مذہب سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اور چونکہ عربی و فارسی کے بھی عالم تھے اس لیے انہوں نے مذہب اسلام کے بارے میں تلگو میں کئی کتابیں لکھیں۔ شستہ شگفتہ اور رواں دواں تلگو لکھنے میں ان کو غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔ عبدالغفور صاحب کا اہم ترین کارنامہ تلگو میں قرآن شریف کی تفسیر ہے جس کی وجہ سے اُن کو مفسر قرآن بھی کہا جاتا ہے۔ عبدالغفور صاحب کی کتابوں کی تعداد، جن میں ترجمے بھی شامل ہیں، ۲۵ سے زاید ہے۔ "رسول پربھو چیترہ" (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ) "اسلام ماتا پربھولو" (خلفائے راشدین کے حالاتِ زندگی) اور "مشکوٰۃ شریف" کا ترجمہ اُن کی اہم کتابیں ہیں۔ عبدالغفور صاحب کا انتقال ۱۹۶۹ء میں ہوا۔

الحاج ٹی۔ین۔پیران نظامی یکم جولائی ۱۹۰۱ء کو ضلع اننت پور کے تعلقہ دھرماورم کے موضع تاڈمری میں پیدا ہوئے۔ نظامی صاحب کے والد ولی الدین عرف ہادی صاحب محکمہ پولس میں ملازم تھے۔ نظامی صاحب دس سال ہی کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا یہ اپنے چچا کے پاس چلے آئے جو تعلقہ ہندوپور میں محکمہ طبابت میں ملازم تھے۔ چچا کی سرپرستی میں وہ ساتویں جماعت تک تلگو ذریعہ تعلیم سے پڑھتے رہے۔ پھر گنٹور میں اردو ذریعہ تعلیم سے دسویں جماعت تک تعلیم پائی یہیں انھوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ نظامی صاحب نے اس کے بعد ایم۔ اے۔ تک اعلیٰ تعلیم خانگی طور پر مدراس، عثمانیہ اور سری وینکٹیشورا یونیورسٹیوں سے حاصل کی۔ انہوں نے ملازمت کا آغاز امراپور کے مدرسہ سے کیا جہاں وہ صدر مدرس بھی ہوئے۔ نظامی صاحب ۱۹۶۹ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے اس وقت وہ مدرسہ فوقانیہ اننت پور میں اردو منشی تھے۔

نظامی صاحب کو تلگو ماحول میں رہنے کی وجہ سے تلگو زبان و ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ پھر جلد ہی انہوں نے تلگو میں تحریر و تصنیف کا کام شروع کر دیا۔ مذہب سے دلچسپی کی وجہ سے نظامی صاحب کی سب سے پہلی کتاب نماز کے فضائل کے بارے میں ہے جس کے تاحال دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا آزاد کے "ترجمان القرآن" کے مطالعہ کے بعد نظامی صاحب نے سورۂ فاتحہ اور اس کی تفسیر کا ترجمہ تلگو میں کیا جس کو مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد نے شائع کیا ہے اس کا رسم اجرا سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ اس کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی کے خطباتِ مدراس کا ترجمہ نظامس ٹرسٹ حیدرآباد کی جانب سے شائع کیا گیا ہے۔ آنحضرتؐ کے حالاتِ زندگی دائرۃ المعارف حیدرآباد نے شائع کیے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی نظامی صاحب کی کئی کتابیں ہیں۔ سابق صدر ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کی سوانح حیات کا ترجمہ آزاد انسٹی ٹیوٹ نے شائع کیا ہے۔ "اسلام کے بنیادی اصول" اردو کتاب کی مسلم سوسائٹی نے شائع کی ہے ڈاکٹر اقبال کی "اسرارِ خودی" پر مضامین تلگو انسائیکلوپیڈیا میں شامل ہیں جو تلگو بھاشا سمتی مدراس نے شائع کی ہے۔ "ضلع اننت پور کا جغرافیہ" مدراس ٹکسٹ بک کمیٹی کی منظورہ ہے، نیز خواجہ حسن نظامی کی تصنیف "بیگمات کے آنسو" کا ترجمہ زیرِ طبع ہے۔ ان کے علاوہ ترجمان القرآن کے اور حصے اور حضرت امیر خسرو کی سوانح ان کی غیر مطبوعہ کتابوں کے نام ہیں۔

شیخ داؤد صاحب جولائی ۱۹۱۳ء میں ضلع کڑپہ کے تعلقہ بدول کے موضع بٹول میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد شیخ سلطان معمولی سی کھیتی باڑی کرتے تھے۔ شیخ داؤد صاحب دس سال ہی کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور تلاش معاش میں ادھر ادھر گھومتے ہوئے نیلور آگئے جہاں انہوں نے ٹرنک روڈ پر پان کی دکان کھول لی۔ اردو لکھنے پڑھنے کے علاوہ تھوڑی بہت تلگو سے بھی واقفیت تھی اور کبھی کبھار شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ یہاں تلگو شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے تلگو کا اچھا ماحول ملا اور تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہوا۔ شیخ داؤد نے ساری تعلیم خانگی طور پر حاصل کی۔ ابتدا میں انہوں نے تلگو وِدوان کا امتحان کامیاب کیا اور پھر دیگر درجات کامیاب کیے۔ ویسے انہوں نے جن اساتذہ سے اپنے طور تلگو سیکھی اُن میں آندھرا یونیورسٹی میں ہندی کے لیکچرر جناب رُدری گنٹی وینکٹیشور شرما اور نیلور ہائی اسکول میں تلگو کے پنڈت کا پا سُبرامنیشور اشرما لائقِ ذکر ہیں۔

شعر و شاعری کا ذوق کچھ ایسا رہا کہ پان کی دوکان جلد ہی بند کر دینی پڑی۔ بعد میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسلم میونسپل اسکول (نندیال ضلع کرنول) میں تلگو پنڈت مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں عثمانیہ کالج کرنول میں تقرر ہوا جہاں سے وہ جولائی ۱۹۷۴ء میں وظیفہ پر علیحدہ ہوئے۔ وہ ان دنوں کرنول ہی میں رہتے ہیں۔ انہوں نے نیلور میں شادی کی تھی اُن کی چھ لڑکیاں اور چار لڑکے ہیں۔ دوسرا لڑکا خواجہ محی الدین بھی تلگو میں شعر کہتا ہے۔

شیخ داؤد کو ابتدا میں مذہب سے دلچسپی نہیں تھی لیکن بعد میں وہ گہرے مذہبی آدمی بن گیے۔ ان کی پہلی نظم "سمکرا برنایم" ہے جس میں سرسائی بابا کی کرامتوں کا ذکر ہے۔ اُن کی تصانیف ۲۵ سے زاید ہیں جن میں نثری اور منظوم دونوں شامل ہیں۔ نثری تصانیف میں (۱) محمد گارو جیوی تا چیترا (حیاتِ نبویؐ) (۲) دستگیر سوامی جیوی تا چیترا (سوانح حیات غوث اعظم) (۳) اسلام چیترا (تاریخ اسلام) اور منظوم تصانیف میں (۱) رسولِ پربھو نظم نعت

شریف (۲) داسی پنا اور (۳) چندر بدن مہیار بے حد مقبول ہیں۔

اسی نام کے ایک اور شاعر کڑپہ میں رہتے تھے۔ کڑپہ کے ان شیخ داؤد کا شعری ذوق بے حد اعلیٰ بتایا جاتا ہے۔ تلگو زبان پر ان کی خدمات مسلم تھی۔ ان کے کئی اشعار آج بھی اس علاقے کے لوگوں کو یاد ہیں۔ ان کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ عرصہ ہوا ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

سید نورالله قادری، عثمانیہ کالج کرنول میں چند سال قبل تک عربی کے لکچرر تھے جہاں سے وظیفہ پر علیحدگی کے بعد وہ ان دنوں مدرسہ عربیہ مصباح العلوم میں کام کرتے ہیں نورالله قادری کو فارسی اور اردو میں بھی مہارت حاصل ہے۔ تلگو انھوں نے اوائل عمر میں سیکھ لی تھی تلگو ماحول میں رہنے کی وجہ سے اُن کو اس زبان پر اور دسترس حاصل کرنے کا موقع ملا۔ دراصل اسلامی تعلیمات کو تلگو میں منتقل کرنے کے جذبہ نے اُن کو تلگو میں تحریر و تصنیف پر آمادہ کیا۔ اس وقت تک ان کی ۳۰ کے لگ بھگ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ نورالله قادری کی عمر ۵۸ سال ہے

بُڈّن صاحب، ودنی پنٹہ ضلع کڑپہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم کڑپہ میں اور اعلیٰ تعلیم مدراس میں حاصل کی۔ وہ مدراس لا کالج کے ممتاز طالب علموں میں تھے۔ تلگو زبان و ادب سے ان کو ابتدا سے دلچسپی رہی اور شعر گوئی کا شوق بھی۔ چنانچہ لا کالج مدراس کے کئی ادبی مقابلوں میں انہوں نے انعامات حاصل کیے۔ قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے باوجود بُڈّن صاحب نے چند برسوں تک تجارت کو بطور پیشہ اختیار کیا لیکن شاعرانہ مزاج کے باعث تجارت میں ان کو نقصان ہوا اور پھر جلد ہی انھوں نے وکالت کی طرف توجہ دی۔

بُڈّن صاحب کو اس دور کے تلگو شاعروں میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ اُن کی اہم تصنیف "قطب نامہ" ہے جو گولکنڈہ کے قطب شاہی دور کی منظوم تاریخ ہے۔ قطب نامہ کا سن اشاعت ۱۹۵۵ء ہے۔ یہ میسور یونیورسٹی کے بی۔ اے کے نصاب میں داخل ہے "قطب نامہ" کی ادبی اہمیت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا مقدمہ گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ تلگو کے ممتاز شاعر اور ناول نویس شری وشو ناتھ ستیہ نارائن نے لکھا ہے شری وشوناتھ نے بڈّن صاحب کی شعری صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے لکھا ہے کہ "تلگو میں اس پایہ کے شاعروں کی تعداد کم ہے"۔ "جلال نامہ" بڈّن صاحب کی دوسری قابل ذکر تصنیف ہے جو مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے دور کی منظوم تاریخ ہے۔ گزشتہ سال حیدرآباد میں منعقدہ عالمی تلگو کانفرنس میں تلگو کے دیگر ممتاز ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ بڈّن صاحب کو بھی ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔ بڈّن صاحب کی عمر ۵۵ سال ہے۔

شیخ پاپا ضلع اننت پور میں پیدا ہوئے تلگو ماحول کی وجہ سے تلگو زبان پر جلد ہی قدرت حاصل کر لی اور ودوان کا امتحان بھی کامیاب کر لیا۔ سیاست میں بھی حصہ لیا اور کانگریس پارٹی سے متعلق رہے۔ یہ ان دنوں کنّی میں مقیم ہیں۔ جو ضلع اننت پور میں واقع ہے۔ شیخ پاپا نے چند کتابیں تحریر کی ہیں۔

محمد حسین، ضلع مغربی گوداوری کے موضع دورا سانی پاڑو میں پیدا ہوئے۔ یہ مدرسہ تحتانیہ میں مدرس تھے اور اب وظیفہ پر سبکدوش ہو چکے ہیں۔ تلگو شاعر کی حیثیت سے یہ خوب جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی کئی تصانیف ہیں جن میں "بھکتا چنتا

منی سنگمو" کو بہت شہرت حاصل ہے۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ اردو کی نامور اُستاد اور مشہور ادیبہ ہیں۔ انھوں نے راست تلگو میں تو کچھ نہیں لکھا لیکن ڈاکٹر رامانج راؤ کے اشتراک سے اردو میں تلگو ادب کی تاریخ شائع کر چکی ہیں۔ انھوں نے میاں رنگنا کما کے ناول کا "تاش کے محل" کے عنوان سے ترجمہ بھی کیا ہے جو نیشنل بک ٹرسٹ کی جانب سے شائع کیا جا چکا ہے۔

راقم الحروف نے تلگو زبان و ادب سے دلچسپی کے باعث تلگو شعر و ادب پر کئی تنقیدی مضامین تحریر کیے ہیں جن میں سے "تلگو شاعری کے جدید رجحانات" ماہنامہ شاعر بمبئی میں اور "تلگو ناول نگاری" ماہنامہ "آج کل" دہلی میں اشاعت پا چکے ہیں۔ نیز اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کے ایما پر تاریخ تلگو ادب اور فنون لطیفہ بھی ترتیب دی ہے جس کا مسودہ اکیڈمی کے دفتر میں اشاعت کا منتظر ہے تلگو زبان و ادب پر کئی مضامین کا مجموعہ "تلگو زبان و ادب" مسودہ کی شکل میں تیار ہے۔

محمد قاسم خاں، آندھرا ساہتیہ پریشد حیدرآباد کے معتمد رہے ہیں اس پریشد کی پہلی کانفرنس ۱۹۴۲ء میں حیدرآباد میں ہوئی تھی جس کی صدارت سابق جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے کی تھی۔ محمد قاسم خاں نے اس کانفرنس کی تیاریوں میں نمایاں حصّہ لیا تھا۔ آندھرا ساہتیہ پریشد نے محمد قاسم خاں کی کہانیوں کا مجموعہ بھی شائع کیا ہے جس کو تلگو کے نقادوں نے بہت سراہا ہے۔

ودوان ایس۔ سی۔ حسن اگرچہ شعر گوئی سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں لیکن ایک صحافی کی حیثیت سے زیادہ جانے پہچانے جاتے ہیں۔ یہ تلگو ماہنامہ "پربھودنی" کے مدیر ہیں جو ضلع کڑپہ کے علاقہ پروددو لور سے شائع ہوتا ہے۔ "پربھودنی" میں زیادہ تر مذہبی موضوعات پر مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں لیکن شعر و ادب کے لیے بھی چند صفحات مختص ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ مختصر سہی لیکن کئی سال سے پابندی سے شائع ہو رہا ہے ــــ کچھ عرصہ قبل اننت پور سے بھی ایک اور جریدہ "اسلام سندیشم" شائع ہوتا تھا فی الوقت اس کی اشاعت بند ہو چکی ہے۔

یٰسین کو تلگو کے نئی نسل کے شاعروں میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ ۱۲ر جنوری ۱۹۴۲ء کو ضلع محبوب نگر کے تعلقہ کلواکرتی کے متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کو تلگو کے علاوہ اردو، ہندی، اور انگریزی پر بھی عبور حاصل ہے۔ غلام یٰسین نے ۱۲ سال کی عمر ہی سے شعر کہنا شروع کیا، اور جلد ہی مقبولیت حاصل کر لی۔ انھوں نے اپنے کلام میں ہمیشہ سماجی ناانصافیوں اور اخلاقی برائیوں کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ قومی یک جہتی، علاقائی سالمیت اور ایسے ہی قومی موضوعات پر انہوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ اُن کی منظومات عموماً مختصر ہوتی ہیں "میرا دیش" غلام یٰسین کی مشہور نظم ہے۔

روشن، مسز ایچ۔ خواجہ کا قلمی نام ہے۔ روشن ۱۹۴۷ء میں کرنول میں پیدا ہوئیں۔ ان کی تعلیم پی۔ ایس۔ سی تک ہے۔ تلگو کے نئے افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں میں روشن کا نام اہمیت رکھتا ہے۔ تلگو کے ممتاز جرائد میں اُن کے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں "ودھی و نودم" روشن کا معاشرتی ناول ہے جس میں آج کے معاشرے کے رنج و غم اور خوشی و مسرت کی تصویر کشی کی گئی ہے اس ناول

بقیہ صفحہ ۴۴ پر

آج کل نئی دہلی

بلراج ورما
اے۲۲۵، پنڈارہ روڈ، نئی دہلی

من کی اُداسی کا درپن

چندر پرکاش خوبصورت نام ہے۔ ہے نا۔ یہ کہانی جس چندر پرکاش سے متعلق ہے وہ بھی خاصا خوبصورت آدمی ہے۔ کم از کم کبھی رہا ضرور ہوگا۔ آج اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہے اور اس کے لمبے چوڑے اور کسرتی بدن کے وہ سارے خم گوشت پوست نے بھر دیے ہیں جن کے ہونے سے آدمی چست و چالاک و چابک اور نہ ہونے سے ڈھیلا ڈھالا اور فربہ لگتا ہے۔ پچاس سال بڑی ظالم عمر ہے اپنے سے بڑے یا ہم عمروں کے علاوہ ہر کوئی آپ کو بوڑھا سمجھتا ہے۔ کچھ لوگ جو پچاس سال کو بڑھاپے کی جوانی مانتے ہیں اپنی اس جوان بزرگی کو انجوائے کرتے ہیں مگر کچھ لوگ نہ جانے کیوں دم چھوڑ دیتے ہیں — چندر پرکاش ایسے لوگوں میں سے ہے جو یہ ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتے کہ بہار گزر چکی ہے اور خزاں آبسی ہے۔

چندر پرکاش ایک مقامی کالج میں انگریزی ادبیات کے معلم ہیں۔ لٹریچر پڑھنا پڑھانا تو خیر ان کا پیشہ ہے مگر لٹریچر پڑھنا یا لٹریچر کے بارے میں گفتگو ان کا محبوب مشغلہ ہے وہ لکھتے بھی خوب ہیں۔ تنقیدی مضامین کے علاوہ وہ انگریزی بلینک ورس میں بھی دخل رکھتے ہیں اردو ہندی کے اکثر ادبا اور شعرا ان کے ارد گرد منڈلاتے رہتے ہیں تاکہ وہ ان پر انگریزی میں مضامین لکھیں۔ ہر مقامی انگریزی اخبار اور رسالہ ان کے مضامین چھاپتا ہے اپنے جاننے والے اکثر ادبا اور ان کے فن کے بارے میں چندر پرکاش نے مضامین لکھے ہیں۔ ایسے مضامین سے انھیں کیا ملتا ہے یہ تو وہی جانیں مگر ان ادیبوں سے انھیں بے پناہ عزت اور احترام ملتا ہے ہندی اور اردو کی اکثر کتابوں کی رسم اجرا کے موقعوں پر وہ صف اول میں بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔

پروفیسر چندر پرکاش کو پروفیسر کہلانے کا بہت شوق ہے آپ انھیں پروفیسر کہتے رہیں وہ آپ پر اپنی نظر کرم بنائے رکھیں گے اور اگر آپ ادیب وغیرہ ایسی کوئی شے ہیں تو آج نہیں تو کل ایک نہ ایک دن وہ آپ کے فن اور شخصیت پر ایک آدھ اچھا یا ذرا کم اچھا (وہ بالکل برا کبھی نہیں لکھتے) مضمون ضرور لکھیں گے جو چھپے گا اور جس کی چرچا بھلے ہی کسی اور جگہ نہ ہو کافی ہاؤس میں ضرور ہوگی۔ ہمارے بہت سے بیچارے ادیب کافی ہاؤس میں بطور ادیب پہچانے جانے کو ہی ریکگنیشن سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پروفیسر پرکاش کی اہمیت ان کے نزدیک کسی سرکاری ادبی اکادمی کی سی ہے۔

"میاں تم شادی کر لو ورنہ دیکھ لینا تمہارا بھی وہی حال ہوگا جو ہمارا ہو رہا ہے"

"آپ کا مشورہ بجا ہے پروفیسر صاحب مگر کوئی بدبخت ہو بھی۔" اقبال وحید نے اداس ہو کر کہا۔

"بدبخت کیوں کہتے ہو میاں، نیک بخت کہو۔ تم ایسے ہونہار نوجوان سے شادی کرنے والی اچھے نصیبوں والی ہی کوئی ہوگی۔"

"مگر وہ ہے کہاں پروفیسر صاحب۔"

"اشتہار دو میاں اشتہار۔ عبارت ہم بنائے دیتے ہیں۔ خبر اخبار میں چھپتی نہیں کہ کام بنا۔ ایک چھوڑ درجنوں بھلے لوگ تمہارے لیے رشتے لے آئیں گے۔ ماشاء اللہ تم ایم۔ اے ہو اچھی معقول سرکاری ملازمت ہے تمہاری اور صحت اتنی نہیں بگڑی کہ تمہیں باقاعدہ قسم کا بیمار کہا جا سکے۔

"آپ کا ایسا کون برا حال ہے پروفیسر صاحب جو اس غریب کی شخصی آزادی سلب کرا دینا چاہتے ہیں۔ آپ مزے کرتے ہیں کہیں شادی کر لی ہوتی تو گھر یلو مشکلات نے آپ کو کب کا چوپٹ کر دیا ہوتا۔" انور جمال نے چٹکی لی۔ "اس میں کیا شک ہے" کرتار سنگھ بولے۔ "آپ آج بھی اپنی عمر کے ہندوستانیوں سے اچھے دکھائی دیتے ہیں۔"

ارے بھائی کرتار اب تم سے کیا چھپانا۔ نوجوانی کے وہ دم خم اب کہاں ہیں جن کے نشہ میں چور آدمی مست شیر کی چال چلتا ہے اور زندگی کو خالق کا سب سے بڑا عطیہ سمجھتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے میاں کہ اب ہم محض ایک دو رشتی ہنڈی کی طرح ہیں۔ کبھی ٹانگ میں درد ہے تو کبھی چھاتی میں۔ سر درد کرتا ہے تو خود ہی دبانا پڑتا ہے۔ کوئی بھاگیوان ہوتی میاں تو کیوں ہر روز کافی ہاؤس کے بند ہونے تک یہیں جمے رہتے۔"

پروفیسر چندر پرکاش دلی کے کافی ہاؤس کی جان ہیں۔ کہنے کو تو ہم بھی ایک چھوٹے سے ادیب ہیں اور کبھی کبھار ایک آدھ خاصی اچھی کہانی بھی لکھ لیتے ہیں مگر ہم نے چندر پرکاش کو کبھی اس مسکین نظر سے نہیں دیکھا جس سے ہمارے دوسرے ہم عصر دیکھا کرتے ہیں کیونکہ ان کی معرفت جاودانی ہونے کا اپنا کوئی ارادہ نہیں، کہانی لکھنا ہمارا محبوب مشغلہ ضرور ہے مگر پیشہ نہیں۔

ایک روز ہم کافی ہاؤس میں ذرا جلد پہنچ گئے اور ایک خالی میز دیکھ کر اکیلے ہی بیٹھ گئے وقت کاٹنے کے بارے میں ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ پروفیسر پرکاش نہ جانے کہاں سے اچانک ٹپک پڑے۔

ہیلو شرما جی، انھوں نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور سامنے والی کرسی پر دراز ہو گئے۔

"آپ تو بہت اچھی کہانی لکھ لیتے ہیں شرما جی۔ "فراڈ" واقعی ایک لاجواب کہانی ہے۔" اور پھر انھوں نے ہماری اس کہانی کے بارے میں کہنا شروع کیا اور ہر وہ بات کہہ گئے کہ سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا، بات چونکہ ہماری کہانی کو لے کر ہو رہی تھی لہٰذا ہم انھیں احتراماً سنتے رہے۔ ہماری کہانیوں میں سٹوری لیس کے علاوہ بھی کچھ ہوتا ہے یہ اس روز ہی معلوم ہوا۔ وہ وہ نکتے اور زاویے نکالے پروفیسر صاحب نے اس سیدھی سپاٹ کہانی میں کہ ہشاش بشاش ہوا تھا وہ بڑے جوش سے بھر رہے تھے اور ہم جیسا بھاگ سے سن

رہے تھے ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ہم دونوں کے جاننے والے کئی ایک دوسرے حضرات [illegible] داخل ہو گیے اور بات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

یہ تو رہی تمہید یا پروفیسر چندر پرکاش کی گوناگوں ذات سے مختصر سا تعارف۔ اب ذرا اس قصہ کو بھی سن لیجیے جس کو لے کر ہمیں یہ افسانہ مجبوراً لکھنا پڑ رہا ہے۔

مکان کی تلاش میں ہم نے نئی دلی کے جنوب کی تقریباً ہر کالونی چھان ماری تھی۔ مکان تھے، بہت تھے مگر ہماری ضرورت کے مطابق کہیں بھی کوئی مکان ہمیں نہ ملا تھا۔ میاں بیوی اور چھوٹے بڑے ملا کر چار بچے بچیاں۔ تین کمرے تو ہر صورت میں ہونے ہی چاہییں۔ ایک بچوں کے لیے ایک ہمارے یعنی میاں بیوی کے لیے اور ایک مہمانوں کے لیے جسے مغربی اسٹائل میں ڈرائنگ روم کہا جاتا ہے۔ اگر کہیں کوئی اس قسم کا سیٹ تھا بھی وہ ہماری دسترس (جس کی حد پانچ سو روپیہ ماہانہ تھی) سے باہر تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس نئی کالونی میں کوئی نہ کوئی گھر ہماری ضرورت اور حیثیت کے مطابق ضرور مل جائے گا اور واقعی مل بھی گیا۔ یہ ایک دو منزلہ مکان تھا۔ نیچے مکان مالک رہتا تھا اور اوپر کا حصہ کرایہ کے لیے تھا جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ اس طرح مالک مکان کرایہ دار پر نگرانی کے علاوہ اسے پوری طرح قابو میں بھی رکھ سکتا ہے بوقت ضرورت اوپر والوں کا پانی بند کر سکتا ہے اور پانی آپ جانتے ہیں فی زمانہ بہت بڑا ہتھیار ہے پانی کی ضرورت بڑے بڑے ہنگامے کھڑی کر سکتی ہے۔ نہ معلوم کتنی لڑائیاں پانی کے لیے لڑی گئی ہیں۔

نوکر یا نوکر نما ایک صاحب ہمیں صاحب خانہ کے ڈرائنگ روم سے ملے باہر والے برآمدے میں بٹھا کر نہ جانے کہاں چلا گیا اور ہم میاں بیوی نہ جانے کب تک چپ چاپ بیٹھے مکان مالک کا انتظار کرتے رہے۔ سامنے سینٹرل ٹیبل پر پڑے رنگا رنگ میگزین و رسائل وغیرہ نہ ہوتے تو وقت گزارنا مشکل ہو جاتا، کوئی بیس منٹ بعد وہ حضرت دوبارہ تشریف لائے تو ساتھ میں چائے کی ایک پر تکلف ٹرے بھی تھی جس میں دو پیالی چائے اور دو گلاس ٹھنڈے پانی کے علاوہ ایک پلیٹ تازہ تلے ہوئے آلو کے قتلوں کی بھی تھی۔ "آپ چائے لیجیے پھر آپ کو آپ کا سیٹ بھی دکھا دیں گے۔" آپ کا سیٹ تو گویا مکان مالک تھا ان حضرات نے ہمیں اپنا کرایہ دار چن لیا تھا۔

"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ ہم لوگ تو چائے پی کر ہی آئے ہیں" ہم نے تکلفاً مسکرا کر اس صبح کا پہلا جھوٹ بولا۔

"چائے تو حضرت ایک رسم ہے کوئی غذا تو ہے نہیں جس کی کمی یا زیادتی سے کوئی ایسا فرق پڑ جائے گا۔"

ظاہر تھا کہ اس قسم کا برجستہ جملہ کوئی ایسا شخص جو محض نوکر ہو ادا نہیں کر سکتا تھا ابھی ہم کچھ اسی قسم کا سوچ ہی رہے تھے کہ دوسرا جملہ آیا۔

"علاوہ ازیں باہر بارش بھی تو ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کو ادھر کچھ دیر تو اور رکنا ہی رکنا ہے پھر کیوں نہ ہر کام اطمینان سے کیا جائے۔"

آپ!

جی میرا نام چندر ہے۔ چندر موہن۔ مجھے یار لوگ چندو بھی کہتے ہیں میں فوٹوگرافی کے ایک مقامی سٹوڈیو میں سیلزمین ہوں اور پروفیسر صاحب یعنی صاحب خانہ کا ناتی اور دوست ہوں چونکہ ہم دونوں اس دنیا میں اکیلے ہیں اس لیے میں ہی ان کے ساتھ رہتا ہوں

"اب ہمیں آپ کا سیٹ اور چائے اور تلے ہوئے آلوؤں کی بات سمجھ میں آئی۔"

ہماری بیگم کو ایک نظر دیکھ کر ہی چندر یعنی چندر موہن صاحب نے کم از کم اپنی طرف سے ہمیں کرایہ دار چن لیا تھا۔

"پروفیسر صاحب، میرا مطلب ہے مکان مالک صاحب اس وقت کہاں ہیں؟"

"جی گھر ہی میں ہیں مگر اس وقت ذرا سو رہے ہیں رات کو بہت دیر سے سوتے ہیں اس لیے صبح اٹھتے بھی بڑی دیر سے ہیں چھٹی والے دن تو دس سے پہلے کبھی نہیں اٹھتے تو گیا ہم کہتے کہتے رک گیے کیونکہ اب دس تو بجا ہی چاہتے تھے۔

چائے سے بنٹ کر ہم تینوں اوپر گیے مکان ہر لحاظ سے معقول تھا دو بیڈ روم تھے دو باتھ رسوئی گھر اور ڈرائنگ روم ان کے علاوہ صاف ستھری کھلی چھت اور سارے کا سارا آسمان اور ستارے اور چاند اور سورج اور ہوا جو شہروں میں اتنی نایاب ہوتی ہے۔

ہم نے کرایہ پوچھا تو چندر موہن صاحب نے ہمیں براہ راست مکان مالک سے بات کرنے کا مشورہ دیا پیشتر اس کے کہ ہم کوئی اور بات کرتے پیچھے سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

"چندر شرما جی نے مکان دیکھ لیا ہو تو انھیں نیچے لے آؤ۔"

شرما جی؟ ظاہر تھا کہ مکان مالک یا جن صاحب نے بھی ہمیں پکارا تھا ہمیں جانتے تھے، ہم نے سوالیہ نگاہوں سے چندر کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہے تھے۔

ہم نیچے اتر آئے تو دیکھا کہ پروفیسر چندر پرکاش صاحب حیدرآبادی تہمد باندھے ننگ دھڑنگ کھڑے ہیں۔ ہمیں بیگم کے ساتھ دیکھ کر قدرے جھجکتے ہوئے بولے۔ "ارے چندر تو نے بتایا کیوں نہیں کہ بھابھی بھی ساتھ ہیں۔" وہ بیگم کے لیے بھابھی کا لقب کچھ اس ڈھنگ سے استعمال کر رہے تھے گویا مدتوں سے انہیں اسی طرح مخاطب کرنے کے عادی ہوں۔ ان کے جھجکنے کے ڈھنگ سے البتہ صاف ظاہر تھا کہ انہیں ہماری بیگم کی موجودگی کا علم تھا اور وہ جان بوجھ کر اس طرح آدھے آدم بنے کھڑے تھے۔ غالباً بیگم کو اپنے جسم کی خوبصورتی اور تناسب وغیرہ سے مرعوب کرنے کی غرض سے۔ چندر پرکاش صاحب ویسے تو ایک حسین شخصیت ہیں ہی ان کا جسم بھی خوب تھا پچاس برسوں کے باوجود تنا ہوا چست کسرتی کپڑوں میں تو وہ ایک دم فربہ دکھائی دیتے تھے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اور خود ڈھنگ کے کپڑے پہن کر لوٹنے کو کہہ کر وہ گھر کے اندر چلے گیے اور کوئی دس منٹ بعد لوٹے۔ اس بیچ ہم دونوں نے کمرہ کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا چندر صاحب باہر تشریف لے گیے تھے اب ہم اور بیگم کمرہ میں اکیلے تھے۔

کمرہ کے ایک کونہ میں بڑے بک شیلف کے اوپر کسی بڑی ہی خوبصورت عورت کی تصویر خاصے بڑے قیمتی فریم میں جڑی سارے کمرہ کی فضا میں ایک خاص قسم کا اضافہ کر رہی تھی۔ تصویر میں جانے کیا تھا بار بار ہماری نظریں اسی طرف اٹھ اٹھ جاتی تھیں بالآخر ہم دونوں اٹھ کر اس تصویر کے قریب چلے گیے۔ "ارے"۔ ایک دم ہم دونوں کی زبانوں سے نکلا۔ "یہ کیا!"

یہ تصویر ہماری چہیتی سالی یعنی بیگم کی چھوٹی بہن منو کی تھی۔ منو جو آج کل لندن

میں تھی اور ایک خوبصورت بچے کی ماں تھی۔ منو کو خط لکھنے کا بڑا شوق تھا اور ہر مہینہ اپنی خیر و عافیت سے مطلع کرتی رہتی تھی دونوں بہنیں ایک دوسرے پر جان چھڑکتی تھیں۔ مگر وہ تصویر یہاں کیسے چلی آئی۔ بالکل ویسی ہی ایک تصویر کی کاپی ہماری فیملی البم میں بھی تھی اور ابھی چند روز پہلے ہی ہم نے اس کی تصویر کی دو درجن کاپیوں کا رنگون اسٹوڈیو کو آرڈر دیا تھا۔ یہ تصویریں منو کی سسرال والوں نے طلب کی تھیں۔

بیگم جو ابھی تک نئے مکان کو دیکھ کر بے حد مسرور تھیں یکایک سیریس ہوگئیں۔

پروفیسر صاحب قبلہ لوٹے تو خوب بنے ٹھنے تھے۔ ہمیں بک شیلف کے قریب کھڑا دیکھ کر ایک دم کھل اٹھے کیسی لگی میری سیلکشن ؟

"بہت اچھی،" ہم نے جواب دیا ظاہر ہے کہ آپ جیسے علم و ادب کے ایک کامیاب معلم کے گھر میں اسی قسم کی کتابیں ہونا چاہییں۔ آپ کا شوق قابل ستائش ہے۔" ہم نے جان بوجھ کر عورت کے پورٹریٹ کا ذکر نہ کیا۔

"شکریہ شکریہ" پروفیسر صاحب واقعی بے حد خوش تھے۔

مگر یہ محترمہ ؟ مگر بیگم نے پوچھ ہی لیا۔

"ارے یہ ایک لمبی کہانی ہے بھابی صاحبہ" پروفیسر نے ایک دم جیسے بوکھلا کر کہا۔ ان کے چہرے کے رنگ یکایک بدلنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ایسی عجیب و غریب کیفیت طاری ہوگئی ان کے وجود پر گویا وہ ماضی کے کسی بہت ہی اہم مرحلہ میں یکایک لوٹ گئے ہوں۔ اور ماضی کی کوئی بڑی ہی دکھ بھری یاد انہیں بے پناہ ذہنی کوفت بلکہ اذیت پہنچا رہی ہو۔ بیگم اب ایک دم چپ ہوگئیں تھیں ان کی بہن کا پروفیسر یا کسی بھی غیر مرد سے کبھی اس قسم کا گہرا تعلق رہا تھا۔ یہ انہیں قطعی معلوم نہ تھا اور سب کچھ ایک دم جان لینے کے اشتیاق میں وہ یہ بھی بھول گئی تھیں کہ وہ ہمارے ساتھ مکان دیکھنے کے لیے آئی تھیں۔

پروفیسر نے جو ایک ٹک اس تصویر کو دیکھے جا رہا تھا اور ظاہر تھا کہ وہ اسی میں قطعی طور پر کھو گیا ہے خاصے لمبے وقفہ کے بعد جب ہماری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں نمناک تھیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان میں سے آنسوؤں کی دو مہین مہین ندیاں بھی بہہ نکلیں کافی دیر اسی طرح حیران و ششدر رنجیدہ اور چپ رہنے کے بعد وہ جب گویا ہوئے تو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ زبان سے نہیں دل کے کسی کونہ سے کوئی پرانی بھولی بسری آواز نکالنے کی ناکام سعی کر رہا ہو مگر کوشش کے باوجود بات زبان پر نہ آرہی ہو۔

"مرد کی آنکھوں میں آنسو ہے نہ شرم کی بات ؟"

ہم دونوں میں سے جب کوئی کچھ نہ بولا تو وہ پھر چپ ہوگیا۔

اب ہم لوگ صوفہ پہ آبیٹھے تھے بڑی سیٹ پر ہم دونوں اور پروفیسر چندر پرکاش ہمارے بالمقابل رکھی صوفہ چیئر پر

ہمت اور حوصلے جمع کرکے آخر ہم نے کہا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے ان جانے میں آپ کی کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ یقین جانیے۔ ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ یہ سکیشنی کی تصویر ہے سکیشنی جو میری ہم جماعت تھی۔ پروفیسر نے میری رسمی معذرت کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"مگر یہ تو" بیگم نہ جانے کیا کہتے کہتے سنبھل گئیں۔

"ایک نوجوان عورت کی تصویر ہے۔" پروفیسر نے جیسے بیگم کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا اس بیچ ہم نے بیگم کو چپ رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ خود بھی چپ رہنے ہی میں مصلحت سمجھتے ہوئے ہم نے پروفیسر کی طرف کچھ ایسے انداز سے دیکھا جس کا مطلب تھا۔ آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بخدا ضرور کہیے اس سے آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔

"یہ بیس سال پرانی تصویر ہے بھابی مگر سکیشنی زندہ رہی ہوتی تو بھی میرا ایمان ہے کہ وہ آج ایسی لگتی کم از کم اسے اسی طرح ایسے بنائے رکھنے کے لیے میں اپنی جان تک دے سکتا

اتنا کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے رک گئے۔ ایک عجیب حزین سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر یکایک نمودار ہوئی اور وہ پھر اداس ہوگئے۔ اس اداسی میں بے بسی بھی تھی اور شرمندگی بھی۔.......

"کون مرتا ہے کسی کے پیچھے کسی کے لیے جان دینے کا حوصلہ آج کس میں ہے۔ مرنا بہت مشکل ہے شرما جی۔" اب وہ ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ "آج کل تو ماں بھی اپنے جوان بیٹے کے لیے نہیں مر سکتی ہیں تو ایک...... وہ پھر رک گئے.......

"لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، رومیو جولیٹ پرانے قصے ہیں محبت کی کلاسیکی عہد کی روایات جانے وہ کیسے لوگ تھے ہم تو شرما جی بے حیا لوگ ہیں بے حیا اور طوطا چشم۔ ہم میں سے کون کسی کے لیے مرتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے جان تک دے سکتے ہیں وہ مرگئی۔ میرے سامنے میرے ہاتھوں میں بوند بوند اس کی زندگی بہتی رہی اور میں محض ایک تماشائی کی طرح دیکھا کیا۔ اس کے درد کی کیا شدت رہی ہوگی۔ موم کی طرح پل پل پگھلتی ہوئی بہتی ہوئی زندگی کے درد کا کون اندازہ کر سکتا ہے مگر اپنے آخری لمحات میں بھی وہ اپنے آنچل سے میرے ہی آنسو پونچھتی رہی۔ جیسے میرے آنسو اس کے لیے اپنی موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس کی بجائے اگر کہیں میں مر گیا ہوتا تو وہ کیا کرتی۔ وہی جو میں نے کیا۔ بجانے مجھے کیوں کر یقین ہے کہ وہ میری طرح بے حیا نہ تھی۔ وہ میرے ساتھ ہی جان دے دیتی۔ ایک بار اس نے کہا تھا "تم پرکاش ہو میں تمہاری چھایا ہوں تم ہو اسی سے میں ہوں تمہارے بغیر میرا کوئی وجود نہیں ...." گویا میری ذات ہی اس کی ہستی کا واحد سہارا تھی میں نہ رہتا تو وہ بھی نہ رہتی... عورت بہت مہان ہوتی ہے شرما جی۔ آدمی عورت کی دنیا ہوتا ہے مگر آدمی کی دنیا بہت لمبی چوڑی پھیلی ہوئی دھوپ چھاؤں ہے جس میں عورت ہے تو مگر سب کچھ نہیں۔ کچھ ہے تو بادلوں کے سایوں میں پنپنے والے رنگین شیریں خوابوں کی سی ایک مستی ہے نہ جانے ایسا کیوں ہے نہ جانے یہ سب جانتے بوجھتے بھی لوگ کیوں محبت کرتے ہیں کیوں ایک ساتھ جینے مرنے کے جھوٹے وعدے کرتے ہیں کیچڑ میں پڑے پڑے بھی ستاروں کی طرف جھانکتے جانے کی آدمی کی پرانی عادت ہے۔ یہ عادت کبھی نہیں جائے گی۔ یہ چلی جائے تو زندگی کیسے چلے۔ یہ میٹھا سرسبز جھوٹ ہی تو زندگی کا سہارا ہے اسی پر تو یہ دنیا اور اس کے رشتے ناتے قائم ہیں.........

جھوٹ فریب کی یہ خوبصورت دنیا!".....

"دیکھیے نا وہ نہیں ہے اور میں نے یہ گھر بنوا لیا ہے اسے خوبصورت اور آرام دہ بنانے کی ہر طرح پوری کوشش کی ہے۔ یہ کمرہ سجایا ہے یہ نیا فرنیچر، یہ قیمتی قالین، یہ کتابیں

الماری اسی بات کی تو ضامن ہیں کہ میں زندہ ہوں اور اسی طرح زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ یہ آنسو جو میں اپنے محبوب کی یاد میں کبھی کبھی بہا دیتا ہوں میں سمجھتا ہوں یہ بھی جینے کا ایک حربہ ایک ڈھنگ ایک بہانہ ہے۔ وہ گیت ہے نا...... کبھی کبھی فلمی گیت بھی بڑے باموقع ہوتے ہیں۔

"ہم نے دل کو خوب بنایا۔ دل سے دل کا بھید چھپایا۔"

گیت کے بول گنگنا کر وہ چپ ہو گیے آنکھیں موند کر انھوں نے اپنا سارا جسم صوفہ چیر کی بیک پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔۔ جب دیر تک وہ یوں ہی پڑے رہے تو ہمیں لگا کہ مصلحتاً ہی سہی کچھ نہ کچھ کہنا ہمارے لیے بھی ضروری ہے۔ مگر ہم نے جو کیا وہ بناوٹ نہ تھی ہمارے دل کی آواز تھی۔ آپ نے بھی اچھی صورت، صحت جائداد آمدنی وغیرہ کے باوجود آج تک شادی نہ کی یہی کیا کم ہے۔ مرجانا میرے نزدیک اتنی بڑی قربانی نہیں جتنی درد کو اس طرح دل میں سموئے اور سمیٹے جیے جانے میں ہے میں سمجھتا ہوں اچھا ہی ہوا جو آپ نے کبھی شادی نہ کی سیکشنی سے آپ کی شادی ہو گئی ہوتی تو آپ کے جذبہ عشق میں یہ شدت نہ رہتی۔"

پروفیسر نے آنکھیں کھول کر حیرت سے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ "آپ کیا کہہ رہے ہیں سیکشنی تو میری بیوی تھی۔"

"تو آپ نے شادی بھی کی تھی۔" اب تو بیگم کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور وہ بوکھلا سی گئیں "سیکشنی میرے سکول کے ہیڈ ماسٹر کی چھوٹی بیٹی تھی"

ہم نے دیکھا کہ بیگم کے تنے ہوئے خدّ و خال قدرے ڈھیلے پڑے ہیں اور انھیں قدرے تسلی بھی ہوئی ہے۔ کیونکہ وہ تصویر والی لڑکی کی بڑی بہن تو تھیں مگر ان کے والد کسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر وغیرہ نہ تھے۔ محکمہ جنگلات کے ایک بڑے افسر تھے۔ یہ تو اب ظاہر ہی تھا کہ پوری مشابہت کے باوجود تصویر والی لڑکی منجو تھی سیکشنی تھی۔ کون جانے۔ کہتے ہیں دنیا میں کوئی دو چہرے ایک جیسے نہیں ہوتے سوا جڑواں بہنوں یا بھائیوں کے۔ مگر دنیا کو بنانے والے کے لیے کیا مشکل ہے۔ وہ کچھ کر سکتا ہے ہو سکتا ہے ہماری منجو سیکشنی ہی کا دوسرا جنم ہو۔ ہو کیا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہے۔ پروفیسر کو بتا دیا جائے کہ سیکشنی مری نہیں زندہ ہے اور واقعی آج بھی اسی طرح لگتی ہے جیسے بیس سال پہلے لگتی تھی تو کیا ہو۔ وہ خوشی سے پاگل ہو جائے گا ہو سکتا ہے کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے جس سے منجو کا بنا بنایا سورگ جہنم بن جائے۔ مصلحت اسی میں ہے کہ چپ رہا جائے۔ یہ غم پروفیسر کا نجی اثاثہ ہے گذری ہوئی وہ ساعتیں اب مٹی بن چکی ہیں اب اس مردہ مٹی میں دوسری قسم کی الجھنوں کے جھاڑ بو دیے گیے تو انہیں لہو کی کھاد سے سینچنا ہو گا۔

"اچھا طالب علم ہونے کی وجہ سے میں ہیڈ ماسٹر کا چہیتا شاگرد تھا اور ان کے گھر میں میرا آنا جانا لگا ہی رہتا تھا کبھی ان کی کوئی فائل پہنچانے تو کبھی سکول کے مختلف امتحانات کے رزلٹ کمپولیٹ کرنے میں ان کی مدد کے لیے۔ سیکشنی جس کا کوئی بھائی نہ تھا۔ تب مجھے دادا کہہ کر بلاتی تھی اور خدا گواہ ہے کہ تب میرے من میں بھی اس کے تئیں کوئی ایسا ویسا وچار نہ تھا۔ وہ میرے گورو کی بیٹی تھی اور تقریباً میری ہی ہم عمر۔ اس کا احترام کرنا میں اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کبھی کبھی پڑھائی میں بھی اس کی مدد کیا کرتا تھا۔ خاص کر حساب وغیرہ میں جس میں اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پھر ایک روز اس نے کہا تھا

"حساب خالص مردانہ سبجیکٹ ہے مجھے تو کسی طرح بس پاس کرنا ہے۔" آگے نہیں پڑھو گی۔ میں نے پوچھا تھا۔

"تم کہو گے تو پڑھ لوں گی ورنہ نہیں۔ مجھے نوکری وکری تو کرنا نہیں پھر کیوں ان کتابوں سے ماتھا پچی کی جائے۔"

"میرے کہنے پر ہی کیوں پڑھو گی۔"

"لوگ کیوں پڑھتے ہیں؟

اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے۔

نہیں سورج میں کھڑا ہونے کے لیے اس نے انگریزی کے مشہور محاورے کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

تمہیں سورج میں کھڑا ہونا پسند نہیں۔

سورج کی چھایا میرے لیے زیادہ سکھ دایک ہے۔ اپنے بل بوتے پر کھڑی ہونے کا نہ میرا کوئی ارادہ ہے نہ اس کی سکت ہی مجھ میں ہے میں تو تمہاری چھایا میں جینا چاہتی ہوں یہی دیدی اور پیا چاہتے ہیں۔"

کسی عام لڑکی کے لیے اس طرح کی بات کہہ سکنا کتنا مشکل ہے سیکشنی کے لیے یہ بات اس طرح بغیر الجھے الجھائے کہہ دینا فطری تھا۔

پیار کا یہ پہلا انکار تھا جو بعد میں ایک وشال پہاڑ بن گیا بالآخر ٹوٹ جانے کے لیے کالج میں ہم لوگ اکٹھے داخل ہوئے تھے اور بی۔ اے بھی ہم نے اکٹھے پاس کیا۔ میرے اصرار پر ایم۔ اے میں بھی اس نے داخلہ لے لیا۔ ہم دونوں انگریزی زبان و ادب کے طالب علم تھے اور گھنٹوں اپنے سبجیکٹ کے کسی ایک مضمون کو لے کر ہم بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔ سیکشنی بڑی ذہین لڑکی تھی اور مجھے اکثر لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ جانتی ہے اس کے والد انگریزی زبان کے ماہرین میں سے مانے جاتے تھے اور یہ ظاہر تھا کہ ان کی قربت میں رہ کر سیکشنی کا علم اور لٹریچر سے اس کی واقفیت مجھ سے کہیں زیادہ تھی پھر بھی اس نے میرے برابر نمبر کبھی نہیں لیے تھے۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ جان بوجھ کر وہ میرا مقابلہ نہ کرتی تھی مبادا اس سے میری دل شکنی ہو۔

ایم۔ اے کا آخری سال تھا۔ ایک دن وہ کالج نہ آئی دوسرے دن آئی تو مجھ سے ملے بغیر چپ چاپ چلی گئی۔ پھر اس کا آنا جانا اسی طرح رہنے لگا کبھی آتی کبھی نہ آتی ایک دن میں نے اسے ڈانٹا تو وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو پڑی میں نے پیار سے اس کا ماتھا سہلایا تو معلوم ہوا کہ اسے بخار ہے۔ ماتھا سلگتے ہوئے اپلے کے مانند گرم تھا ظاہر تھا کہ وہ بہت بیمار تھی۔ بے ماں کی بچی کس کو بتاتی اپنے دکھ کی بات۔ اسپرین کھا کے بخار اتر جاتا تو کالج چلی آتی ورنہ گھر پڑی رہتی۔

چند ہی دنوں میں اس کی بیماری جیسے مشتہر ہو گئی ڈاکٹروں نے بیماری کو ٹی بی کا فرسٹ سٹیج قرار دے دیا۔ آج کل تو ٹی بی کوئی ایسی خطرناک بیماری نہیں رہی مگر تب یعنی آج سے بیس سال پہلے یہ موذی بیماری تقریباً مہلک مانی جاتی تھی اور اس سے بچ جانا ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ سننے میں آیا کہ اس کی ماں بھی اسی بیماری سے مری تھی۔

"تو کیا میں بھی مر جاؤں گی؟" ایک بار اس نے ہسپتال کے بیڈ پر لیٹے لیٹے پوچھا تھا۔

"نہیں تم کیوں مروگی۔ ابھی تو ہمیں شادی کرنا ہے۔ تمہیں میرے بچوں کی ماں بننا ہے"

سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم مجھ سے شادی کر لو گے"

"اصلی شادی تو ہماری کب کی ہو چکی ہے اب تو صرف گونا ہونا باقی ہے"

نہ جانے میرے ان بظاہر معمولی الفاظ میں کیا جادو تھا کونسی دوا یا مرہم تھی کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے تندرست ہونا شروع ہو گئی اور چند ہی دنوں میں گھر بھی لوٹ آئی ...... بیماری کی وجہ سے اس کا فائنل نہ ہو سکا تھا اور میں ایم۔ اے پاس کرکے اپنے ہی کالج میں لیکچرار بن گیا تھا۔ ۔۔ نوکری کے پہلے ہی سال گرمیوں کی چھٹیوں سے کوئی ہفتہ بھر پہلے خاندان کے ہر فرد کی مرضی کے خلاف میں نے سکیشنی سے بیاہ کر لیا اور پورے دو مہینے ہم رانی کھیت میں ہنی مون مناتے رہے۔

اتنا پیار کیا میں نے سکیشنی سے اور اتنا پیار دیا اس نے مجھے کہ اس ایک جنم میں تو کیا اگلے دس جنموں تک مجھے کسی دوسری عورت کے پیار ضرورت نہیں رہی۔

پھر ایک دن معلوم ہوا کہ سکیشنی ماں بننے والی ہے یعنی میں باپ بننے والا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں دنیا میں پہلا باپ بننے والا تھا سکیشنی ایسی اپسرا کے بچے کا باپ ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی۔

"ہم نے کچھ جلدی تو نہیں کی" ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔

"جلدی کیسی پورا وقت ہی تو لے رہی ہوں۔ ویسے میں چاہتی ہوں کہ یہ سب جلدی ہو جائے تمہیں نہ ہو مگر مجھے جلدی ہے کون جانے" شاید اسے سب کچھ معلوم تھا........

آپ مانیں گی نہیں بھابھی مگر یہ واقعی سچ ہے کہ سکیشنی جیسی خوبصورت عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ آپ نے ابھی ابھی اس کی تصویر دیکھی ہے یقین مانیے کہ تصویر میں بھی اگرچہ وہ بے پناہ حسین دکھائی دیتی ہے اور یہ تصویر بھی ایک بڑے اچھے فوٹو گرافر کا کارنامہ ہے مگر یہ بھی پورے طور سے میری سکیشنی کی تصویر نہیں، اس کا محض ایک عکس ہے ایک سایہ ہے خدا کی اپنی ہاتھوں سے بنائی ہوئی اس اپسرا اور کیمرہ کے محدود آرٹ کی اس تصویر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کاش! اس کی تصویر بنانے والا کوئی روی ورما ہوتا، کوئی ڈاونچی، کوئی ریمبرانٹ، کوئی مائکل اینجلو ہوتا۔

وہ تصویر جو یہ تصویر یقیناً نہیں ہے آج بھی جب کہ اس کو مرے ہوئے پورے بیس سال ہو چکے ہیں۔ میرے دل میں جوں کی توں محفوظ ہے اور مرتے دم تک اسی طرح رہے گی۔

سچ تو یہ ہے بھابھی کہ اب مر جانے کو جی چاہتا ہے چندر موہن جسے آپ لوگوں نے ابھی ابھی دیکھا ہے میرا دور کا رشتہ دار ہے اس نے بھی سکیشنی کو دیکھ رکھا ہے سکیشنی کے بارے میں میرے دل کی دھڑکنیں سننے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے محض اسی وجہ سے مجھے اسی کی قربت گوارا ہے ورنہ۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

ظاہر تھا کہ میری بیگم کے ذہن میں ایک ساتھ سو سو سوالات ابھر رہے تھے اور ان کے دل و دماغ میں ایک طوفان بپا تھا۔ ہم نے انہیں اشارے سے منع کر دیا تھا ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔ وہ کیا کیا کہہ یا پوچھ بیٹھتیں۔ اچانک پروفیسر کے منہ سے نکل گیا "بھابھی آپ حیران ہوں گی مگر یہ واقعی سچ ہے کہ آپ کے اور میری مرحوم بیوی کے کچھ انگ جیسے ماتھا سر کے بال بھویں آنکھیں ناک اور ہونٹ اتنے ملتے جلتے ہیں ایک دوسرے سے کہ گمان ہوتا کہ آپ دونوں سگی بہنیں ہیں"

بیگم نے جواب نہیں دیا۔ پروفیسر اپنی سکیشنی کا راگ اسی رو میں اور بھی نہ جانے کب تک الاپتا مگر اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز اسے روک لیتی۔

اس نے ٹیلی فون اٹھا لیا۔ تار کے دوسرے سرے پر نہ جانے کون تھا مگر جو تھا اور جو بھی بات وہ کہہ رہا تھا پروفیسر کو غیر معمولی طور پر پریشان کیے جا رہی تھی۔ وہ بہت گھبرا گیا تھا اور بڑی مشکل سے اپنی خفت چھپا رہا تھا دوسری طرف کے سوالوں کی بوچھاڑ کے جواب میں جو الفاظ اس کے منہ سے نکل رہے تھے اس بات کی غماز تھے کہ ہم لوگوں سے وہ بہت کچھ چھپانا چاہتا ہے۔ ان کی ہاں ہوں، سوری، ویری سوری کے علاوہ بالآخر جو الفاظ ہماری سمجھ میں آئے وہ یہ تھے کہ چندر موہن گھر میں نہیں ہیں اور ان کے آتے ہی وہ چیز لوٹا دیں گے جس کو لے کر اتنی جھک جھک ہو رہی تھی۔ آخر میں انھوں نے کہا آپ نے آدمی بھیج ہی دیا ہے تو پھر اس قدر چلانے کی کیا ضرورت تھی"

ریسیور ٹیلی فون کے آلے میں رکھ کر پروفیسر صاحب لوٹے تو بری طرح بوکھلائے ہوئے تھے۔ اپنا ذہنی توازن درست کرنے کی غرض سے انھوں نے سگریٹ سلگا لیا کوئی دو تین منٹ تک وہ کچھ نہ بولے، نہ ہم دونوں میں سے ہی کچھ کہتے بن پڑا۔

ہم سوچ رہے تھے پروفیسر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آدمی کا غم اس کا ذاتی سرمایہ ہوتا ہے جسے وہ بانٹے بھی تو کیسے اور کن لوگوں میں۔ کون کسی دوسرے کا بوجھ اٹھاتا ہے۔

ادھر بیگم سوچ رہی تھیں۔ یہ عورت میری بہن نہیں ہو سکتی مگر دو عورتیں ایک دم ایک جیسی کیسے ہو سکتی ہیں۔ سکیشنی بیس سال پہلے مری تھی۔ منجو جو لگ بھگ اسی عمر کی ہے ہو سکتا ہے سکیشنی ہی کی آتما ہو۔ مجھے پروفیسر کو بتا دینا چاہیے کہ ہو بہو اسی شکل کی ایک دوسری عورت بھی ہے جو میری بہن ہے بیاہتا ہے اور ایک عدد خوبصورت بچے کی ماں ہے....... اگر یہ سن کر پروفیسر کے سر پر کوئی نیا جنون سوار ہو گیا تو کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بہت پیار کرتا ہے۔ اسی صورت کی ایک دوسری زندہ عورت دیکھ کر کون جانے اسے کیا ہو جائے وہ پاگل بھی ہو سکتا ہے اور منجو کو سکیشنی سمجھ کر کوئی ایسی حرکت بھی کر سکتا ہے جس سے منجو کی بنی بنائی گرہستی برباد ہو جائے۔ نہ بابا نہ۔ چپ رہنے ہی میں مصلحت ہے اور یہ بھی طے ہے کہ یہ مکان چاہے کیسا بھی اچھا اور سستا ملتا ہو ہمیں یہاں ہرگز نہیں رہنا، وہ ابھی ابھی کہہ رہا تھا کہ آپ کی صورت میں بھی اپنی مرحوم بیوی کے خد و خال دکھائی دیتے ہیں۔ نہ بابا نہ ایسے

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

وجاہت علی سندیلوی
نصرت منزل سندیلہ

جمود میں نمود

مجھ پر نازل ہونے والی مصیبتوں اور پریشانیوں کی پیدائش کا دن عموماً اتوار ہوتا ہے۔ اس دن کچہری میں اتوار اور گھر پر میں بند ہوتا ہوں۔ اور کسی نئے فتنے کو اپنی ہنگامہ آرائی کا شکار بنانے کے لیے کھونٹے سے بندھے ہوئے جانور سے زیادہ اور کون موزوں ہو سکتا ہے۔

اس دن اتوار ہی تھا اور میں اپنے چند ایسے دوستوں، عزیزوں اور خصوصیت کے ساتھ دشمنوں کے خطوط کا جواب لکھنے کی کوشش کر رہا تھا، جو ایک مدت گذرنے کے بعد بھی اب تک یہ نہیں بھولے تھے کہ انھوں نے کبھی مجھے کوئی خط لکھا تھا چنانچہ یاد دہانی کے تازیانے مجھ پر برابر برسا رہے تھے۔ جن خطوط کا جواب نہ دینے سے محض آخرت خراب ہونے کا اندیشہ تھا ان کے مختتم جواب دے دینا مقابلتاً آسان تھا مثلاً:

"آپ کی انجمن اصلاح بیوگاں کے لیے پچاس روپے دینے کا وعدہ ضرور کیا گیا تھا لیکن کیا عرض کیا جائے کہ پچھلے ماہ ایک بزرگ کے انتقال سے خود اپنے محلے میں چار بیواؤں کا ظہور ہو گیا ہے۔ آپ کی انجمن کو جو روپے دینے والا تھا وہ میں نے ان بیچاریوں کے حوالے کر دیے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ ہمسایوں کا کتنا بڑا حق ہوتا ہے۔ ان قلیل روپوں سے وہ اپنے مرحوم شوہر کا ٹھیک سے سیوم بھی نہیں کر پائیں۔ چالیسویں کے لیے وہ آپ کی انجمن کی توجہ اور امداد کی مستحق ہیں۔ اللہ بس باقی ہوس"

البتہ جن خطوط کا جواب نہ دینے سے اپنی دنیا میں بھونچال آجانے کا قوی امکان تھا ان کے ایسے مصلحت آمیز جواب دینا کہ وہ مخاطب کو محبت آمیز معلوم ہوں ذرا ٹیڑھی کھیر تھا مثلاً:

"آپ کے ۲۷ ماہ حال کو تشریف لانے کی خبر سے بڑی خوشی ہوئی اور خصوصاً اس وجہ سے اور بھی کہ بھابی صاحبہ اور میرے آٹھوں بھتیجے اور بھتیجیاں بھی آپ کے ہمراہ ہوں گے۔ مدت کے بعد میزبانی کی سعادت نصیب ہوتی لیکن میری بدقسمتی کہ برسوں سے میرے محلے اور خصوصاً میری گلی میں ہیضے کی وبا بڑے بھیانک طور سے پھوٹ پڑی ہے ۸۷ گھنٹوں میں ۴۸ ہی موتیں ہو چکی ہیں اور نہیں معلوم کتنے مریض لب دم ہیں۔ میں بھی ترک سکونت کر کے اپنی سسرال جانے والا ہوں بشرط زندگی پھر کبھی آپ سے شرف نیاز حاصل کروں گا۔ تھوڑے لکھے کو بہت جانیے گا۔ یار زندہ صحبت باقی"

میں اسی طرح ہر خط کے مصرع طرح پر جوابی غزلیں تصنیف کر رہا تھا کہ دفعتاً میری نشست گاہ کے دروازے کے پردے کے پاس سے مرغ یا ورکی ایک انتہائی بھیانک اور بے ہنگم بانگ سنائی دی "کیا میں آسکتا ہوں؟" اور قبل اس کے کہ میں اپنے ہوش و حواس کو جو اس دہشت اثر، پٹاخے نما، سوال کو سنتے ہی بھاگ چکے تھے واپس بلانے کی کوشش بھی کر سکتا، اس کے جواب دینے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی، سوال کا پٹاخا داغنے والے صاحب پردے کو اس کی ستلی سے توڑ کر اس کے سمیت کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ پردے میں لپٹے ہوئے صاحب تو نقاب کشائی سے قبل کسی مجسمے کی طرح نہ صرف جامد اور ساکت بلکہ پوشیدہ تھے لیکن ان کا مولا بخش یعنی موٹا بل کھایا ہوا ڈنڈا "پی پی کے تیل اور بھی ڈنڈا خفا ہوا" کی تعبیر بنا ہوا تھا۔

ایک دفعہ تو جی کڑا کر کے سوچا کہ آٹھ اوٹ پہاڑ اوٹ کے مصداق چپکے سے دوسرے دروازے سے نکل بھاگوں لیکن پھر میری جو شامت آئے، میں نے آگے بڑھ کر پردے کے پیچ و خم دور کر کے نقاب کشائی کر دی اور چڑھی تیوری اور بپھری ہوئی داڑھی کے ساتھ حضرت بیباک برآمد ہو گئے۔ وہ بھناتے ہوئے ایک قریبی کرسی پر بیٹھ گئے اور اپنے ڈنڈے کو اپنے سامنے کی میز کے سہارے اس انداز سے کھڑا کر دیا کہ اگر سند نہ رہے تو بھی بوقت ضرورت کام آئے۔

حضرت بے باک شہر کے ایک ادبی اور فلمی رسالے کے غالباً خود ساختہ خصوصی نمائندہ تھے اور ان کے متعلق مشہور تھا کہ انھوں نے مختلف حضرات کے مختلف موضوعات پر انٹرویو شائع کر کے شہر بھر میں ایک ہنگامہ بپا کر رکھا تھا اور ان کی کارگذاری کی وجہ سے ان کے رسالے کی اشاعت ہی کے تناسب سے لپاڈگی اور مارپیٹ کی وارداتیں بتدریج بڑھ رہی تھیں۔

مجھ سے جب انھوں نے اپنی شان نزول کی یہ وضاحت کی کہ وہ ایک ادبی تنازعہ کے سلسلے میں جو ان کے رسالے میں آج کل زیر بحث ہے میرا انٹرویو لینا چاہتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں میری روح قبض کرنا چاہتے ہیں تو میں بہت بھڑکا اور پھڑکا، لیکن مرغ زیر دام کی پرواز ہی کیا؟ ہر طرح سے اپنی حماقت اور جہالت کی بابت انھیں یقین دلانے کی کوشش کی اور اگر ان کا مولا بخش ان کے ساتھ نہ ہوتا تو شاید اپنی خباثت کا کوئی عملی ثبوت بھی پیش کرنے سے نہ چوکتا۔ لیکن وائے مجبوری! انھوں نے ایک بپھرے ہوئے طوفان کی طرح مجھے گھیر لیا اور جب میں انکار کرتے کرتے قریب قریب بے جان ہو چکا تو انھوں نے میرا جبریہ پوسٹ مارٹم یا انٹرویو شروع کر دیا۔

وہ۔ اس وقت ہمارے ادب پر جو جمود طاری ہے اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ کب تک اور کیسے رفع ہو جائے گا؟

میں۔ میں جمود کے وجود ہی کا قائل نہیں ہوں۔

وہ۔ تو آپ جمود کے کوئی مضر اثرات اپنے ادب پر نہیں محسوس کر رہے ہیں

لہذا موجودہ جمود کو آپ ادب کے لیے کوئی مستقل رکاوٹ نہیں سمجھتے بلکہ اس کو محض ایک عارضی اور ہنگامی بحران سمجھتے ہیں" میں تعجب سے منہ پھاڑ کر حضرت بیباک کو گھورنے لگتا ہوں اور وہ اپنی جیب سے ایک بوسیدہ نوٹ بک نکال کر کچھ لکھنے لگتے ہیں۔

وہ ۔ آپ کے خیال میں موجودہ جمود بھی ہمارے ادب کے ارتقا کی زنجیر میں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی یہ ایک وقفہ ہے جس میں ہم اپنے ماضی کا جائزہ لے کر اس کی کوتاہیوں اور کامیابیوں کی روشنی میں اپنے مستقبل کا ایک شاندار منصوبہ بنا رہے ہیں۔"

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اپنی نوٹ بک میں تیزی سے لکھنے لگتے ہیں ۔ میرے پیچ و تاب ہی کے تناسب سے ان کے چہرے پر ایک طمانیت بخش مسکراہٹ ہے ۔

وہ ۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ہمارے ادب کے لیے اس کے موجودہ جمود کو ایک لعنت نہیں بلکہ نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہیں۔"

میں ۔ (اپنے بال نوچتے ہوئے اور دانت پیستے ہوئے) "میں عرض کر چکا ہوں کہ میں جمود کو جانتا بھی نہیں کہ وہ کس کھیت کی مولی ہے اور آپ ادب پر جمود طاری کرنے کے لیے ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ میں جمود کا نہیں نمود کا قائل ہوں۔"

وہ ۔ ہنستے ہوئے،" واہ ! واہ آپ نے کیا باون تولے پاؤ رتی کی بات کہہ دی ہے۔ واقعی انٹرویو لینا بچہ جننے سے کم مشکل کام نہیں ہے ۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے ذہن میں شور و شر پیدا۔ اب آپ سے میں کس مصیبت سے قبولوا پایا ہوں کہ آپ جمود میں نمود دیکھتے ہیں۔ یعنی جمود میں منجمد ہونے کے باوجود آپ ادب کے پیڑ میں نئی کونپلیں، پتیاں اور شاخیں پھوٹتی دیکھ رہے ہیں (ہا ہا ہا قہقہہ لگاتے ہوئے) گویا آپ پتھر کی سپاٹ سل میں رقص بتان آزری ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

میں دیوانہ ہو کر اپنی مٹھیاں کھولتے اور بند کرنے لگا اور وہ مجھ سے بے نیاز اپنی نوٹ بک پر بے تحاشا اپنی پنسل سے لکھتے ہی چلے جاتے ہیں۔

بس اتنا اور پوچھنا رہ گیا ہے کہ آپ جمود میں جو نمود دیکھ رہے ہیں اس کی آپ کیا شاہ راہ اور منزل متعین کرنا چاہتے ہیں"

میں ۔ جو آپ کا جی چاہے تصنیف کر لیجیے

وہ ۔ "بالکل صحیح خیال ہے آپ کا یعنی آپ کے ذہن میں ادب کے مستقبل کے متعلق کافی الجھاؤ اور انتشار یعنی دوسرے الفاظ میں غت ربود ہے"

میں اپنے غصے کو مشکل سے ضبط کیے خاموش رہتا ہوں اور وہ اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھ کر اسے بند کر دیتے ہیں اور اپنا مولا بخش اٹھا کر رخصت ہوتے ہوئے میرے سر پر یہ آخری پتھر پھینکتے ہیں " واقعی آپ تک بندی میں بڑی مہارت رکھتے ہیں ادب پر جمود ہے۔ جمود میں نمود ہے اور نمود میں غت ربود ہے"

قہر درویش بجان درویش کے طور پر میں نے اپنے خطوں کے جو جواب لکھے تھے انھیں چاک کر دیا۔ اب انھیں حضرت بیباک ہی سے لکھانے کا ارادہ ہے۔

دیکھنا بے باک کی جدت کہ میرا بے کہا !
اس نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ہی اتنے شکی مزاج ہیں۔ مجھے جان بوجھ کر اپنے گھر میں طوفان کھڑا نہیں کر لینا۔ کون سا ہم مکان خرید رہے ہیں ہمیں کرایہ پر ہی تو لینا ہے یہ نہیں اور سہی۔

بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ باہر ایک سکوٹر آ کر رکا جس میں چندر صاحب کے علاوہ ایک دوسرے حضرت تھے۔ ان لوگوں کو ایک نظر دیکھ کر پروفیسر گھر کے اندر چلا گیا۔

وہ لوگ جیسے ہی کمرے میں گھسے چندر موہن نے آگے بڑھ کر سکیشنی کی تصویر کو اٹھا لیا۔ یہ رہی آپ کی امانت، داس صاحب بلا وجہ خفا ہو رہے تھے میں تو محض بھائی صاحب کو فریم دکھانے کے لیے لے آیا تھا۔"

نو وارد نے کہا " ابھی پرسوں ہی میں نے اس تصویر کی درجن بھر کاپیاں نکالی ہیں۔ پھر ہماری طرف دیکھ کر وہ قدرے جھجکا

" ارے شرما جی آپ ! یہ آپ کی سالی ہی کی تصویر ہے۔ داس صاحب پریشان تھے کہ آج شام جب آپ تصویریں لینے آئیں گے تو وہ کیا جواب دیں گے بدقسمتی سے نگیٹیو خراب ہو گیا ہے اور کاپیاں اب نکالی نہیں جا سکیں۔"

ہم میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا" میں نے دیکھا کہ بیگم صاحبہ کا غصہ بھی کافور ہو گیا ہے۔ اور وہ بڑے لطیف انداز سے مسکرا رہی ہیں ۔

"چندر موہن نے پوچھا مکان آپ کو کیسا لگا۔"

جواب بیگم نے دیا مکان تو ٹھیک ہے بھائی صاحب مگر اب صاحب خانہ کو اسے یہیں اٹھانے نہ دے گا۔ اتنا کہہ کر ہم باہر نکل آئے راستے میں کافی دور تک چلتے رہنے کے بعد بیگم نے کہا چلو چھٹی ہوئی آپ کو اچھا خاصا پلاٹ مل گیا۔ پھر کچھ دیر رک کر بولیں وہ پرکاش اور چھایا والا مکالمہ آپ کو کیسا لگا۔"

"مکالمے پر ہی کیا موقوف ساری کہانی بڑھیا تھی۔"

" وہ مکالمہ سرت چندر چٹرجی کی مشہور کہانی "پرکاش اور چھایا" کا ہے۔"

بقیہ غنی کشمیری

حل و عقد کی منت اٹھانا اور ان کی قصیدہ گوئی کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھا تو دوسری طرف اس نے " دہر نا امن گشتہ" کی نوحہ خوانی بھی کی۔ اس قسم کے طبعی یا فکری تضاد کی توقع ایک ایسے شاعر سے رکھنا کوئی تعجب کی بات نہیں جو کبھی اپنے حواس کھو دیتا ہے اور کبھی دوسروں کی بے حسی پر خندہ زن نظر آتا ہے۔ کبھی خانہ نشینی ہی کو اپنے لیے سلامتی کا باعث سمجھتا ہے اور کبھی دنیا میں ایک انقلاب کی خواہش کرتا ہے ۔

غنی کے سوانح کی روشنی میں اس کی شخصیت کو پہچاننے سے صاف نظر آتا ہے کہ اس کی ذات اگرچہ مجموعۂ اضداد نہیں تھی لیکن اس کی طبعی امنگوں اور ذہنی افتادوں کی جولانیاں ایسے نقوش ذہن پر کندہ کر دیتی ہیں کہ اُسے ایک بڑے شاعر کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان کا درجہ دینا پڑتا ہے ۔

طرحی غزلیں

مہنگے پرتاب گڈھی

اری گیشن ڈویژن، پرتاب گڈھ (یوپی)

زخموں کے پھول اپنے بدن پر سجائے ہیں
ہم لوگ ہو کے شہرِ نگاراں سے آئے ہیں
ہم کشتۂ وفا بھی ہیں کس آن بان کے
کاندھوں پہ آپ اپنی صلیبیں اٹھائے ہیں
کتنے ہی آذروں کی ہوئیں انگلیاں نگار
جب جا کے پتھروں نے یہ جادو جگائے ہیں
لوگو! اسی اجالے میں ڈھونڈو رہِ حیات
ہم نے چراغ فکر و نظر کے جلائے ہیں
یہ اپنا اپنا حوصلہ، یہ اپنا اپنا ظرف
آئینے ہیں کہ ٹوٹ کے بھی جگمگائے ہیں
اظہارِ شوق حرفِ طلب، عرضِ مدعا
اک آرزوئے دل نے کئی نام پائے ہیں
وہ سوچتا ہے تاج کی تعمیر ہو گئی
لفظوں سے اس نے چند گھروندے بنائے ہیں

مشتاق لکھیم پوری

ایجنسی ہمدرد، لکھیم پور کھیری (یوپی)

لمحے حیات میں کبھی ایسے بھی آئے ہیں
دل میں اٹھا ہے درد تو ہم مسکرائے ہیں
دن بھر کے بعد شب میں جنہیں دیکھتے ہیں آپ
وہ ظلمتیں نہیں ہیں اجالوں کے سائے ہیں
تسخیر کائنات میں معروف ہے جہاں
او وہم روایتوں کو گلے سے لگائے ہیں
پاداش میں گناہوں کی اپنے ازل سے ہم
اس آسماں کا بار زمیں پر اٹھائے ہیں
دنیا کے گوشے گوشے میں ہر راہ گزار پر
ہم نے چراغ امن و محبت جلائے ہیں
زندہ ہیں پھر بھی لگتا ہے دنیا کی بھیڑ میں
ہم اپنی اپنی لاش سروں پر اٹھائے ہیں
اپنی سیاہ بختی پہ مشتاق ہم نے آج
آنکھوں میں آنسوؤں کے ستارے سجائے ہیں

نصیر صحافی

نگلہ مسجد نو محلہ ــــــ آگرہ

اس دورِ پُر فتن نے عجب گل کھلائے ہیں
کاندھوں پہ اپنے اپنا ہی لاشہ اٹھائے ہیں
اب کس جگہ قیام کریں کس طرف چلیں
کس نے رہِ حیات میں کانٹے بچھائے ہیں
موجوں کے اضطراب نے ساحل چھڑا دیا
موجوں کے اضطراب ہی ساحل پہ لائے ہیں
ہر رند مست جھوم اٹھا فرطِ وجد سے
کس نے مئے جمال کے ساغر لنڈھائے ہیں
کیوں محوِ خوابِ ناز نہ اب زندگی رہے
میرے جنوں پہ آپ کی زلفوں کے سائے ہیں
جلوے ہی جلوے اب ہیں نگاہوں کے سامنے
بزمِ تصورات پہ ایسے وہ چھائے ہیں
پھر موسمِ بہارِ الم آ گیا نصیر
پھر غنچہ ہائے زخمِ جگر مسکرائے ہیں

حبیب مغموم

کمرہ ۳۱ سول کورٹ کمپاؤنڈ، کانپور (یوپی)

جب بجھ گئے چراغِ شمس و قمر جلملائے ہیں
میں نے زمیں کے سینے پہ سورج اگائے ہیں
آدابِ آگہی جنہیں بر سوں سکھائے ہیں
اب وہ بھی میرے پاس خدا بن کے آئے ہیں
اب اے شعورِ عشق بتا جائیں ہم کہاں
زلفوں کے پیچ و خم نہ صلیبوں کے سائے ہیں
لپٹی رہی ہے گردِ حوادث کی جسم سے
ہم پھر بھی آئینے کی طرح جگمگائے ہیں
ہم جانتے ہیں خواب بہرحال خواب ہے
لیکن تصورات کی دنیا سجائے ہیں
توڑے ہیں عکس و رنگ کے کتنے ہی آئینے
جب جا کے پتھروں کے اجنتا بنائے ہیں
ہم نے خود اپنے آپ کو مصلوب بھی کیا
آنسو بھی اپنی لاش پہ ہم نے بہائے ہیں

امجد علی غزنوی (وکیل)

سول کورٹ، اعظم گڈھ (یوپی)

دریا بدوش قطرے جو گلشن میں آئے ہیں
فرطِ خوشی سے سبزہ و گل مسکرائے ہیں
دامن میں اپنے دولتِ دیوانگی لئے
بازارِ عقل و ہوش کو ٹھکرا کے آئے ہیں
جب بھی چھڑا ہے معرکۂ خیر و شر تو ہم
دیوانہ وار حق کی حمایت میں آئے ہیں
انساں نے اضطراب میں لوحِ حیات پر
کتنے نقوشِ عقل بنائے مٹائے ہیں
یہ آدمی جو قیدِ زمان و مکان میں ہے
ہم نے اسے نجات کے نکتے بتائے ہیں
بزمِ خرد میں روشنیٔ طبع کے لئے
صد ہا چراغ خونِ جگر سے جلائے ہیں
امجد بہ فیضِ وسعتِ دل ہم نے بارہا
دشمن کے زخمِ دل پہ بھی مرہم لگائے ہیں

اسمٰعیل ذبیح

معرفت سیفی لائبریری رائے جی پورہ سرونج (ایم پی)

جذبے تمام فطرتِ سیماب لائے ہیں
شیشوں کے ساتھ اس لئے پتھر سجائے ہیں
چہرے تو آئینہ نے سبھی کے دکھائے ہیں
عیب و ہنر کسی کے مگر کب بتائے ہیں
ہر سمت ظلمتوں نے ابھارا ہے اپنا سر
ہر گام اس زمین پہ صلیبوں کے سائے ہیں
کیا حوصلہ تھا اپنا کہ جرأت کے باوجود
مقتل میں قاتلوں کو دعا دے کے آئے ہیں
جیسے تھے سانحاتِ طلسمِ سراب کے
وہ راہ پُرخطر ہیں طے کر کے آئے ہیں
گرداب میں خلا کے ہوئی گم نہ روشنی
جب سے تصورات کے سورج اگائے ہیں
ہم کو چمن میں جب نہ ملا چین تو ذبیح
مایوس ہو کے درد کے صحرا بسائے ہیں

عفت آرا
علی گڑھ

سازِ غم

ایک صبح فاطمہ نے جیسے ہی آنگن میں قدم رکھا، امرود کے پیڑ کی الجھی ہوئی ٹہنیوں میں ہرے ہرے پتوں کے درمیان ایک غیر مانوس سرسراہٹ نے اس کی توجہ اپنی جانب منتقل کر لی۔ اُس کے دماغ کی بھول بھلیوں میں بھی اسی طرح چند خیالات پناہ گزیں تھے جن کی گردش نے اس کے ذہنی سکون کو فنا کر دیا تھا۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھی کہ یکسانیت کا خاتمہ ہمیشہ حرکت سے ہی ہوتا ہے کیونکہ یہی زندگی ہے اور بقول برنارڈ شا اس دنیا میں کوئی چیز ابدی نہیں، بغیر تبدیلی کے زندگی بے معنی اور بے مصرف ہے۔ ان تبدیلیوں ہی کی بنا پر انسان کی نشو و نما ہوتی ہے اور وہ پہلے سے بہتر بننے کی سعی کرتا ہے۔ اگر تبدیلی کا یہ سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے تو انسان اپنی پستی کی تاریک وادیوں میں دھنسنے لگتا ہے۔ وہ بظاہر حالات سے سمجھوتا کرنے میں اپنی خیریت سمجھتا ہے لیکن اس وقت غالباً وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے کہ اس کی یکسانیت خود اس کی تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اگر وہ اپنے ذہن پر جمی ہوئی زنگ کی تہوں کو نظر انداز کرتا رہے گا تو اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر لوگ وقت کی دوڑ میں شامل ہونے کے علاوہ ماسے روندتے ہوئے چلے جائیں گے۔ اس کا بے معنی وجود بھٹکتا رہے گا اور وہ خود تنہا اپنی حالت پر نوحہ خواں ہوگا۔

امرود کا وہ پیڑ ایک عرصے سے آنگن کے ایک کونے میں اُگ رہا تھا۔ وہ ننھے سے پودے سے ایک پیڑ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جب تک وہ چھوٹا رہا اس کی دیکھ بھال ہوتی رہی پھر وہ بڑا بھی ہو گیا لیکن کبھی فاطمہ کی توجہ کا مرکز نہ بن سکا۔ خزاں کے موسم میں جب وہ پتوں کی رفاقت سے بھی محروم ہو جاتا تو اندھیری راتوں میں اس کا تنہا وجود کسی خاموش ذمہ دار سپاہی کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہتا اور گزرتے لمحات کا انتظار کرتا رہتا۔

اس کی اپنی زندگی بھی ایک عرصہ سے اسی یکسانیت کی حامل تھی بچپن سے جوانی میں قدم رکھنے کے دوران ناخوشگوار تبدیلیاں یقیناً راہ میں حائل ہوئیں لیکن نہ جانے کیوں وہ تبدیلیاں یا تو اتنی غیر مانوس اور اہم نہیں تھیں یا پھر اُن کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نے اپنے آپ کو کبھی اتنا کمزور، اتنا تنہا اور بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔

فاطمہ نے چند قدم آگے بڑھائے اور احتیاط سے پتوں کو سرکایا پھر ان سے دو پرندے فضا میں پرواز کرنے لگے۔ ان کی نقرئی آوازوں اور پروں کے تیز الٹ پھیر نے اسے چند لمحے کے لیے بدحواس کر دیا۔ پتوں کے گچھے اس کی انگلیوں کی پوروں کو چھوتے ہوئے اس کی گرفت سے آزاد ہو کر ہلنے لگے۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ وہ ان ننھے پناہ گزینوں سے نگاہیں بھی چار نہ کر سکی۔ بس اُن کی ڈری سہمی لیکن شیریں آوازیں اس کے کانوں میں متواتر گونجتی رہیں۔ اس نے اپنے تجسس کو قائم رکھتے ہوئے دوبارہ ہرے ہرے پتوں کی جھالر سرکائی اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے امرود کے پیڑ کی پُر خم ٹہنیوں کے درمیان تنکوں کی آمیزش سے تیار شدہ ایک ڈکری نما نشیمن پایا جس کے عین بیچ میں دو سفید بیضے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے بسا اوقات برف باری کے دوران سفید برف کے گالے کسی گھنے پیڑ کی شاخوں میں اٹکے رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح خیالات کے مبہم دھبے پہلے اس کے ذہن میں اپنا مقام بنانے کے لیے نمودار ہوئے۔ وہ خاموشی سے اُن کی نشو و نما میں مصروف رہی اور وقت گزرتا گیا۔

چند ہی روز میں امرود کے پیڑ کی جانب سے آنے والی آوازوں کے ساز میں اتار چڑھاؤ محسوس ہونے لگا۔ جیسے ساز کبھی ہلکا ہوتا ہے کبھی تیز کبھی کم اور کبھی زیادہ۔ ایسا لگتا تھا کہ کورس میں شامل ہونے والے اب دو سے زیادہ پرندے تھے آوازوں کی اس آمیزش نے ایک مرتبہ پھر اُس کی توجہ اپنی جانب منتقل کر لی۔ وہ تیزی سے امرود کے پیڑ کی جانب بڑھی اور ہرے ہرے پتوں کی جھالر سرکا کر دوبارہ نظارہ کیا۔ چار یاقوت کی طرح سُرخ لیکن بچوں کی طرح معصوم نظریں اس کے اجنبی وجود پر مرکوز ہو گئیں اور پھر پروں کے تیز الٹ پھیر کے ساتھ دو یاقوت غائب ہو گئے باقی دو ننھے پرندے چونچ کھولتے، زبان لپلپاتے یکایک تھم گیے۔ انھوں نے خطرے کو محسوس تو کیا لیکن اُس کی نوعیت جاننے سے قاصر رہے۔

اس کے ذہن کی چار دیواری میں بھی چند خیالات نے مزید خیالات کو جنم دیا تاکہ خیالات کی آمیزش اپنے وجود کا احساس دلا سکے۔ ذہن کی مضبوط حد بندی میں جنم لینے اور نشو و نما پاتے یہ بے ضرر خیالات حال و مستقبل کے تضاد سے ناواقف تھے۔

فاطمہ نے اپنے کمرے میں پڑھتے پڑھتے تھک کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ گلی میں بلیوں کی وحشت ناک چیخیں متواتر بلند ہو رہی تھیں۔ اس کے دل میں انجانے خطرات نے دستک دی اور وہ کمرہ اور پھر برآمدے کو عبور کرتی ہوئی آنگن میں پہنچ گئی۔ ٹارچ کی تیز روشنی میں اس نے نشیمن کا احاطہ کیا اور نہایت احتیاط سے دو چھوٹے پرندوں کو اپنی اوڑھنی میں چھپا لیا۔ بڑے پرندوں نے اس مداخلت پر احتجاج کیا لیکن وہ اُن کی ہی بہبود کا بھی سوال تھا فاطمہ نے بغیر کسی توقف کے اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ الماری کا پٹ کھول کر اس نے اپنے کڑھائی کے سامان رکھنے کی گول رنگین ڈکری نکالی۔ اسے خالی کیا اور ریشمیں تاگوں، روئی کے نرم گالوں اور نکچی ہوئی کترنوں سے ایک نیا نشیمن تیار کیا۔ ننھے پرندوں کو اس میں پناہ گزیں کرنے کے بعد اُسے احتیاط سے الماری کے اُوپر رکھ دیا۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ اُس کے خیالات پختہ ہوتے گیے۔ ذہن کی تاریک سیڑھیوں میں بھی امید کی کرنیں چمکیں اور خیالات اُن سے استفادہ کرتے۔

ہر شام فاطمہ اُن ننھے پناہ گزینوں کو اُن کے نئے نشیمن میں منتقل کرتی اور صبح کی روشنی میں دوبارہ اُن کے پرانے مقام پر پہنچا دیتی۔ اسے امید ہو گئی تھی کہ جلد ہی یہ ننھے تیتری بن کر جاگیں گے اور پھر نشیمن کی حد بندیوں کو عبور کرتے ہوئے یہ اپنا مقام خود بنائیں گے۔ ان کا ایک واضح وجود ہوگا جس کی حفاظت وہ خود کر سکیں گے لیکن کتنا حقیقت پر مبنی تھا یہ احساس

زیست و مرگ کہ جسم ایک ٹوٹا ہوا بیکار قید خانہ ہے جس کی حد بندی کو توڑ کر چھوڑ کر روح اچانک ہمیشہ کے لیے پرواز کر جاتی ہے۔ ایک صبح جیسے ہی اُس نے اپنے پلنگ سے قدم نیچے اُتارا ننھے پرندوں کے بے حس و حرکت منجمد و ساکت جسم زمین پر پڑے فریاد کر رہے تھے کہ ہمارا وجود کیا اتنا ہی بےحقیقت تھا؟ اُس نے کانپتے ہاتھوں کے استر بچھا کر اُن ردلاشوں کو بلند کیا اور نشیمن سے دور زمین کی خشک مٹی کے دامن میں ہمیشہ کے لیے چھپا دیا۔ اُس نے پلٹ کر جب امرود کے پیڑ کی جانب رُخ کیا تو چڑھتے سورج کی سنہری روشنی میں دو بڑے پرندوں کو نشیمن کے گرد تیز تیز گردش کرتے پایا۔ ان کی آوازوں کے ساز میں نمایاں فرق تھا۔ اب ایک بالکل مختلف اجنبی غمگین ساز بج رہا تھا۔ جس کی آواز لمحہ بہ لمحہ تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

خود اس نے اپنے وجود کو ٹٹولا اور ذہن کی بھول بھلیوں میں گردش کرتے اپنے پاکیزہ اور معصوم خیالات کو تلاش کیا۔ اُسے اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے وہ خیالات بھی سسک سسک کر دم توڑ چکے تھے اور وہ اُن کی لاشیں دفنانے کے لیے تیار تھی جس آبدیدگی کی تکمیل کے لیے اس نے اپنی ذہنیت صحافی دی وہ اس کی میراث نہ بن سکا۔ اُسے اس بنا پر قبول نہیں کیا گیا کہ وہ محض اس کا ایک تجربہ تھا جس کے نتیجہ سے وہ مطمئن نہ ہو سکا۔ جب سائنس داں تجربہ کرتا ہے تو وہ مختلف اجزا کا استعمال کرتا ہے۔ تجربہ کے خاتمہ پر اجزا الجزبہ کی طرح رد کر دیے جاتے ہیں۔ تجربوں کا یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہتا ہے جب تک کہ سائنس داں خاطر خواہ حل نہیں نکال لیتا۔ سائنس نام ہی ہے قبول اور رد کا اور ضروری نہیں کہ منظور شدہ چیزیں ہمیشہ قبول ہی کی جائیں وقت کے گزرنے کے ساتھ ایک مرتبہ قبول کی ہوئی چیزیں بھی رد کر دی جاتی ہیں اس لیے کہ بدلتی دُنیا کے ساتھ خیالات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ پھر اُسنے اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے سوچا بہر حال جو بھی زندگی میں تلخ تجربات ہوتے ہیں۔ وقت ان زخموں پر مرہم رکھ دیتا ہے۔

فاطمہ کی بے چینی نشیمن کے گرد چکر لگاتے دو بڑے پرندوں سے کسی طرح مختلف نہ تھی حساس انسان بھی ہے اور چرند و پرند بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ چرند و پرند RATIONAL SOUL کی مصیبت سے آزاد ہیں اور جلد ہی اپنے غم کو بھلا کر دوبارہ زندگی کی دوڑ میں شامل ہو جاتے ہیں اس کے علاوہ بھولی ہوئی یادیں کبھی اُن کے ذہن کے نہاں خانوں پر دستک دے کر انہیں پریشان و مضمحل نہیں کرتیں۔ انسان اپنی عقل پر نازاں ہے لیکن وہی عقل اس کے سکون کو فنا کر دیتی ہے۔

کمرے کے خاموش ماحول میں بیٹھے نہ جانے کیوں فاطمہ کو ورڈز ورتھ کی مشہور نظم ڈیفوڈلس کا خیال آیا۔ لیک ڈسٹرکٹ کی تنہا فضا میں ٹہلتے ہوئے شاعر نہایت غمگین تھا کیونکہ اس کا ذہن خیالات کی آمد و رفت سے محروم تھا۔ خوبصورت پھولوں کے نظارے نے اُس کے ذہن میں حرکت پیدا کی۔ اور اچانک خیالات نے ذہن میں گردش شروع کر دی۔ شاعر اس غیر متوقع عمل سے نہایت مسرور ہوا۔ اُسے ہر شئے شاداں و فرحاں نظر آنے لگی۔ پھر مستقبل میں جب وہ دوبارہ تنہا تھا پھولوں سے متعلق خیالات کے نقوش اُس کے ذہن میں اُبھرے اور اس سے قبل کہ خیالات ذہن کی چہار دیواری سے ٹکرا کر فنا ہو جاتے۔ اُسے احتیاط سے انھیں اشیا میں ڈھال لیا اور نظم کے بے معنی وجود کو خیالات کی پاکیزہ اور انوکھی پوشاک پہنا دی۔ اب ایک، ایک خیال نظم کے گرد لپٹا ہوا اپنے وجود کا اعلان کر رہا ہے۔ فاطمہ نے نظم کا خاکہ تیار کیا لیکن خیالات کا پیرہن تیار ہونے سے قبل ہی ریزہ ریزہ ہو گیا کیونکہ اس کا انتخاب اُس کے ماحول سے یگانگت نہیں رکھتا تھا۔ ورڈز ورتھ کے برعکس اُس کی نظم وجود میں نہ آسکی۔ اُس کا شاہکار بنتے بنتے بگڑ گیا اور پھر مٹ گیا۔

بقیہ: ہندوستانی زبان کی پہلی گرامر

جا سکتا ہے۔ ان تلفظات کو دیکھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے جو تلفظ اپنے قارئین کے لیے پیش کیے ہیں وہ مغربی ہندی کے ہیں۔ کتاب میں درج شدہ افعال کی مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کیٹیلر کا علم ہندوستانی زبان کے بول چال کی زبان تک ہی محدود تھا یا پھر اس نے طرح ملازمین کی آسانی کے لیے صرف بول چال کے عام تلفظ جان بوجھ کر تحریر کیے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک 'ڑ' کی آواز نہ تو دکھنی ہندی میں مروج تھی اور نہ ہی اس کا چلن پٹنائی ہندی میں تھا کیوں کہ کیٹیلر نے ہر جگہ (ڑ) کی جگہ (ر) ہی لکھا ہے۔

اپنی تمام کمیوں کے باوجود کیٹیلر کی یہ گرامر بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اول تو یہ ہندوستانی کی پہلی گرامر ہونے کے ناتے تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ اور اس کے بعد ہندوستانی گرامر نویسی کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دوم یہ کہ اس کتاب کی مدد سے اس زمانے کی مروجہ ہندوستانی زبان کی ایک جامع اور واضح تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے جس کی مدد سے "ہند آریائی ہندی" کی مکمل لسانیاتی روپ ریکھا تیار کی جا سکتی ہے۔

بقیہ: تلگو شعر و ادب میں مسلمانوں کا حصّہ

کو ایمکو پبلیکیشنز مدراس نے شائع کیا ہے۔

قاسم یوسفی استبش چندر گھوش کے قلمی نام سے تلگو کے جدید شاعروں میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ۱۱/ اگست ۱۹۵۲ کو آندھرا پردیش کے ضلع چتور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم چتور میں ہوئی اور ایم۔ اے۔ ایس۔ وی۔ یونی ورسٹی سے اردو میں کیا۔ ابتدائی درجوں میں اردو کے ساتھ تلگو بھی پڑھتے رہے لیکن تلگو میں تحریر و تصنیف کی ترغیب انھیں اپنے ماحول سے ملی۔ قاسم یوسفی افسانے بھی لکھتے ہیں اور شعر بھی۔ کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے بعض افسانوں کا انھوں نے تلگو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ ان کی چند معروف نظموں کے نام "ای روجو" (آج کا دن)، کانتی پشپم (روشنی کا پھول) اور "گلابی رکتم" (گلابی خون) ہیں۔ چتور کی ایک ادبی انجمن "رایل کلا بھارتی" "تلگو کے نئے شاعروں کے کلام کا ایک انتخاب بعنوان "کویتا سنکلانم" شائع کر رہی ہے۔ قاسم یوسفی کی کئی نظمیں اس میں شامل ہیں۔

حارث جن کا پورا نام شیخ محمد حارث ہے یکم مارچ ۱۹۵۴ء کو چتور میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم پائی۔ ذریعہ تعلیم تلگو ہونے کی وجہ سے تلگو زبان پر جلد ہی قدرت حاصل کر لی۔ حارث کا رجحان آزاد شاعری کی طرف ہے۔ "رایل کلا بھارتی" کے زیر اشاعت انتخاب "کویتا سنکلانم" میں حارث کی چند نظمیں شامل ہیں۔ "اوکہ چنکو (ایک بوند) "جیوتم" (زندگی) اور "ہویشم" (نفرت) حارث کی مقبول نظمیں ہیں۔

نئی کتابیں

سازمغرب ۔ مرتبہ حسن الدین احمد
ناشر ۔ ولا اکیڈمی حیدرآباد
قیمت ۔ عام ایڈیشن ۲۰ روپے، ڈی لکس ۹۰ روپے ۔
ملنے کا پتہ ۔ عزیز باغ سلطان پورہ ۔ حیدرآباد

...میں فنی اور علمی کتابوں کے ترجمے نہ ہونے کے برابر ہے ۔ ادبی و شعری ...وں کے ترجمے بھی بہت زیادہ نہیں ہیں اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ترجمے کو دوسرے ...آتے ذہن نئی دشواریوں سے نجات کا ذریعہ تلاش کرنے کی کوشش کی اور غور و فکر میں مبتلا ہوا تو ذہن کے گوشہ میں تباہی اور آسمانی آفات کے ذمہ دار دشمن کا سراپا مہیب شکل وصورت کے روپ میں تصور میں ابھر کر سامنے آیا اور یہی وہ احساس تھا جس کی شدت نے آدمی کو لرزہ براندام کر دیا ۔ زبان لکنت کھانے لگی ۔ بے ربط سے جملے ادا ہونے لگے یہ کیفیت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہی لیکن جب ہوش آیا تو فکر درپیش ہوئی کہ آخر یہ سب کیوں ہوا ۔ شاید یہی وہ لمحہ فکر تھا جب انسان غلطی کر بیٹھا اور اس نے خود کو سمجھا لیا کہ یہی وہ جملے تھے جن کا یہ کرشمہ تھا کہ اسے بھیانک تصور سے نجات ملی ہے ۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ تصور پروان چڑھتا رہا اور بے ربط الفاظ معنیٰ خیز بن گئے ۔ زیر لب ادا کیے جانے لگے ۔ نتیجتاً ماحول اور بھی پراسرار ہوتا چلا گیا جس سے انسان کی کمزور نفسیات اثر قبول کیے بنا نہ رہ سکی اور مریض ہو گئی ۔ آدمی کو الفاظ کے جادو پر یقین ہو چلا ۔ بے جان جملے جان دار ہو گئے اور اس قدر زور آور ہوتے کہ انسانی دماغ پر جادو ٹونے بن کر منڈلانے لگے ۔ صرف یہی نہیں رفتہ رفتہ ذہن کے گوشہ میں آفات و آلام کی ذمہ دار شخصیت بھی اپنا روپ بدلتی رہی کبھی اس نے صنف نازک کا جامہ پہنا تو کبھی سماج کے کریہ المنظر جنم سے اپاہج ۔ پیٹھ پر کوبڑ لیے ہوئے لوگ آئے دن کی دشواریوں اور تکالیف کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے اور نتیجتاً سماج کے باثر حضرات نے ایسے اشخاص کی تلاش شروع کر دی ۔ انسانوں کی بستی میں بھوتوں کی شناخت چڑیلوں کی پہچان کا سلسلہ چل پڑا ۔ قصہ اگر یہیں تمام ہو جاتا تو کوئی بات نہ تھی سماج کی نظر میں آسمانی بلاؤں کے ذمہ داران مجرم حضرات کی سزا کے لیے خود ساختہ عدالتوں نے جنم لیا اور پھر ایسے مظالم ڈھائے گئے کہ توبہ بھلی ۔ یہ

مگر ذرا سوچیے سب کچھ اسی دنیا میں ہوا جسے ہم آپ انسانوں کی دنیا کہتے ہیں ۔ یورپ جو آج اپنی سائنسی کرکے اندر یافتی اور دوسری وجوہات کی بنا پر دنیا کا مہذب ترین ملک کہلاتا ہے اس خطۂ زمین ہے کہ اس پر بھی ہزار ہا افراد اس جرم کی پاداش میں موت کی گھاٹ اتار دیے گئے ہیں کہ وہ غیر معمولی مجموعۂ صلاحیتوں کے حامل تھے ۔ عہد گذشتہ کا مغربی سماج کس قدر توہمات کا شکار تھا اگر اس کا اندازہ کرنا ہے تو VOLTAIRE کی تحریر پڑھیے جو اس نے ان اشخاص کے بارے میں لکھی ہے جو بھوت پریت کے زیر اثر تھے ۔

"اس زمانے میں شاید ایسی کوئی رہائش گاہ رہی ہوگی جہاں بھوتوں کی آمد و رفت کا تصور نہ رہا ہو عورتیں مستقبل کی باتیں جاننے کے لیے پریشاں نہ رہتی ہوں اور افراد بھوتوں کی تلاش میں راتوں میں سرگرداں نہ ہوتے ہوں اور یہ دریافت کہ کس شخص نے بھوتوں سے باتیں کی ہیں دلچسپی اور توجہ کا باعث نہ ہوں"

یہ تو اگلے وقتوں کی باتیں ہوئیں ۔ اس دور میں بھی جس کو ہم بیسویں صدی کہتے ہیں اور جس میں سائنس کا بول بالا ہے ۔ چونکہ کا سبب ... نہیں ہوتی ہے ... بھوت کا سایہ نہیں ہوتا ہے اور ایسی بہتری باتیں معلوم کی جا چکی ہیں لیکن پھر بھی ایسے افراد کی کمی نہیں جو توہمات کا شکار نہ ہوں اور ان لوگوں کے لیے ان دیکھی طاقتیں بھوت پریت ۔ مابعد حسی ادراک ۔ کرشماتی آدمی سکون کا باعث نہ ہوں ۔ دلچسپی کی بات تو یہ ہے کہ ان باتوں کے ماننے والوں میں عام آدمی کا ذکر ہی کیا اچھے پڑھے لکھے سائنسداں اور مفکر بھی ہوتے ہیں جو کہ ان باتوں پر یقین رکھتے ہیں جس کی کوئی سائنسی بنیاد نہیں ہوتی ہے آخر یہ سب کیوں ہے ۔ اس تضاد کا سبب کیا ہے آپ اسے سمجھنے کی کوشش کریں ۔ پڑھا لکھا انسان دیومالائی کہانیوں پر کیوں کر یقین کر لیتا ہے اس کی وجہ دریافت کریں ۔ یہ یقین کیوں کر انسانی ذہن میں جاگزیں ہو جاتا ہے اور اس کے اسباب کیا ہیں یہ ایک بہت اہم سوال ہے ۔ اس سوال کے جواب کے لیے نفسیات کا سہارا لینا پڑے گا ۔ نفسیات کے ماہرین میں ینگ کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے ۔ ینگ نے جہاں نفسیات کے بہتیرے موضوعات پر روشنی ڈالی ہے وہ اس مسئلہ سے متعلق اپنے نظریات کی بنیاد فرائڈ کے نظریات پر رکھتا ہے اور یہ مان کر چلتا ہے کہ ذہن انسانی دو درجات پر مشتمل ہے ایک شعور اور دوسرا تحت الشعور ۔ فرائڈ کے یہاں تحت الشعور جب کہ خاموش تماشائی کے روپ میں خیالات کی تصورات کی آماجگاہ ہوتا ہے وہیں ینگ کے یہاں تحت الشعور بہت جان دار ہے اور اپنے تئیں بذات خود یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ اپنے طرز پر احساسات کو جنم دے سکے اور اس کو شعور پر مرتب کر سکے ۔ اس طرح سے ینگ تحت الشعور کو خاموش تماشائی کا روپ نہ دے کر احساسات کے خالق کا روپ دیتا ہے اور اسے اہل بنا دیتا ہے کہ وہ ایسی نفسی کو جنم دے سکے جس کا انسانی مشاہدہ میں کہیں گزر نہیں ہوتا ہے ۔ ان معلومات کی روشنی میں اگر شعور اور تحت الشعور کی تشریح کی جائے تو بات کچھ اس طرح سامنے آتی ہے ۔ انسانی شعور باہری دنیا کے ردعمل سے جو تاثرات اخذ کرتا ہے ان کی بنیاد پر مقصدیت لیے ہوئے معلومات میں نہ صرف اضافہ کرتا ہے بلکہ انسان کو اس کی فکری صلاحیتوں ۔ تجزیہ کرنے کی اہلیت اور سائنسی نظریات کو بروئے کار لانے کی قوت عطا کرتا ہے اس کے برعکس تحت الشعور

انسان کے اندرون سے ابھر کر آنے والے خاکوں کی رنگ آمیزی کرتا ہے اور ان کی عکاسی کرتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ان خاکوں کے لیے ضروری نہیں ہوتا ہے کہ وہ باہری دنیا کی حقیقتوں سے تال میل کھاتے ہوں۔ ان حقائق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہی وہ SUBJECTIVE (MENTAL ACTIVITY) ہوتی ہے جو کہ خالق بنتی ہے دیو مالائی کہانیوں اور توہمات کی جو کہ دنیا کے مختلف تہذیبوں میں جنم لیتے رہے ہیں اور یہی وہ تحت الشعور ہے جہاں بھوت۔ پریت۔ پریوں کا تصور جنم لیتا ہے۔ جہاں یہ سب کچھ ہے وہیں ایک سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ وہ تہذیبیں جن کا جنم دنیا کے مختلف حصوں اور ادوار میں ہوا ہے ان میں کیوں کر ایک ہی انداز کی دیو مالائی کہانیاں پائی جاتی ہیں۔ ینگ کے خیال میں اس کا سبب افراد کا تحت الشعور بذات خود ہوتا ہے جو کہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی کردار رکھتا ہے اور انسانیت کو ورثہ میں ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو بھی خاکے کسی فرد کے تحت الشعور جنم لیتے ہیں وہ دوسرے انسانوں کے تحت الشعور میں بھی موجود ہوتے ہیں اور دنیا میں مختلف مقامات اور ادوار میں یکساں دیو مالائی کہانیوں کا باعث ہوتے ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ ایک بات اور قابل ذکر ہے وہ یہ کہ ہر آدمی میں اپنے تئیں نفسیاتی توانائی PSYCHIC ENERGY بھی ہوتی ہے جس کو آپ ذہنی توانائی بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ توانائی شعور اور لاشعور میں یکساں طور پر بروئے کار لائی جاتی ہے اور اگر اس پس منظر میں ذہن انسانی کی تاویل کی جائے تو بات کچھ اس طرح سامنے آتی ہے کہ ہمارا آپ کا ذہن مقصدیت لیے ہوئے تجزیہ کرنے والی صلاحیتوں اور وہ تصورات جو کہ پس پردہ اور جذباتی ہوتے ہیں ان کا متوازن امتزاج ہوتا ہے ساتھ ہی ساتھ اول الذکر فکری صلاحیتوں کو جنم دینے کا باعث ہوتی ہیں جب کہ موخر الذکر ادب اور مذہب کی جنم داتا ہوتی ہیں۔ اب ذرا غور کیجئے تو بات سمجھ میں آئے گی کہ وہ لوگ جو نسبتاً جذباتی ہوتے ہیں اور جن میں شعور کے فکری شعبہ میں نفسیاتی توانائی کی قدرے قلت ہوتی ہے شعور میں توازن نہ ہونے کی وجہ سے توہمات کو قبول کرنے کا میلان زیادہ ہوتا ہے۔ فکری صلاحیتوں میں کمی ایسے انسانوں کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ توہمات سے متعلق بلند و بانگ اور کھوکھلے الفاظ کو تسلیم کر لیں خصوصاً وہ باتیں جن کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ حضرات جن کی فکری صلاحیتیں نسبتاً زیادہ اجاگر ہوتی ہیں۔ ان کے تحت الشعور کے جذباتی رجحانات میں پختگی ناپید ہوتی ہے اور چونکہ جذباتی رجحانات بالکل ابتدائی درجات کے ہوتے ہیں اس لیے بحسن خوبی ایسے اشخاص توہمات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر نظروں کے سامنے ایسے اشخاص کے چہرے گھوم جاتے ہیں جو کہ فکری صلاحیتوں کے بدرجہ اتم رکھنے کے باوجود توہمات کا شکار نظر آتے ہیں اور وہ سائنسداں جو کہ اپنے جذباتی رجحانات کو یکسر کچل کر رکھ دیتے ہیں وہ توہمات سے متعلق ان ذرائع میں سکون پاتے ہیں جو کہ جذباتی رجحانات کے حامل ہوتے ہیں۔ جہاں یہ ساری باتیں ہیں وہیں یہ بھی ہے کہ آج کے دور کی ہماہمی اور ہنگامہ آرائی میں جب انسانی ذہن اور اس کا شعور و لاشعور اکتا سا جاتا ہے تو بھی آدمی کو قدرے سکون توہمات اور خبط میں ملتا ہے۔ اس تذکرہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسانی ذہن کے گوشہ میں ایسا عنصر ضرور موجود ہے جو کہ اسے توہمات کو قبول کرنے کے لیے اکساتا رہتا ہے۔ رہا یہ کہ یہ کب اور کیوں کر ہوتا ہے خود اپنی جگہ پر طویل بحث ہے اس سلسلہ میں معمولی سی

بقیہ: ہندوستانی زبان کی پہلی گرامر

جاسکتا ہے۔ ان تلفظات کو دیکھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے جو تلفظ اپنے قارئین کے لیے پیش کیے ہیں وہ مغربی ہندی کے ہیں۔ کتاب میں درج شدہ افعال کی شالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کیٹیلر کا علم ہندوستانی زبان کے بول چال کی زبان تک ہی محدود تھا یا پھر اس نے کمپنی کے ملازمین کی آسانی کے لیے صرف بول چال کے عام تلفظ جان بوجھ کر تحریر کیے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک 'ڑ' کی آواز نہ تو دکھنی ہندی میں مروج تھی اور نہ ہی اس کا چلن پٹنائی ہندی میں تھا کیوں کہ کیٹیلر نے ہر جگہ (ڑ) کی جگہ (ر) ہی لکھا ہے۔

اپنی تمام کمیوں کے باوجود کیٹیلر کی یہ گرامر بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اول تو یہ ہندوستانی کی پہلی گرامر ہونے کے ناتے تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ اور اس کے بعد ہندوستانی گرامر نویسی کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دوم یہ کہ اس کتاب کی مدد سے اس زمانے کی مروجہ ہندوستانی زبان کی ایک جامع اور واضح تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے جس کی مدد سے "ہند آریائی ہندی" کی مکمل لسانیاتی روپ ریکھا تیار کی جاسکتی ہے۔

بقیہ ۔ [illegible]

فن کار اپنی ماں کے نام کو روشن کریں گی۔

سدھیشوری دیوی بھجن گانے میں اس مالک حقیقی کی یاد میں مستغرق ہو جاتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ روحانیت کے بغیر گانے میں کشش اور تاثیر نہیں پیدا ہو سکتی اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہر محفل کا اختتام ایک بھجن سے کرتی تھیں اور سامعین پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔

کچھ عرصہ علیل رہنے کے بعد سدھیشوری دیوی کی وفات ۱۷ مارچ ۱۹۷۷ء کو ہوئی اور اس طرح وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملیں

مثال حاضر ہے۔ آج کے دور میں دشوار زندگی میں انسان جس طرح زندگی کے بکھرے مقامات پر نازک سہارے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے چند ثانیہ ہنس بول کر گزرنا چاہتا ہے اسی طرح سے وہ اپنی جذباتی شخصیت کو جذباتی انداز سے سہارا دینے کی کوشش کرتا ہے یہ کسی قدر توہمات کے مبلغ اور ذریعہ ہوتے ہیں۔ یہاں پر ایک بات واضح کرنا ضروری ہے کہ ان توہمات کے مبلغ حضرات کی معیت میں ہم آپ جو سکون پاتے ہیں وہ وقتی ہوتا ہے اور ان حضرات کا مقصد حیات کچھ اور ہوتا ہے وہ ہمارے آپ کے ذہنوں پر جادو بیانی اور شعبدے سے اپنی شخصیت کا سکہ بٹھاتے ہیں نہ کہ آپ کا بھلا یا سماج کا بھلا کرتے ہیں۔

نئی کتابیں

سازِ مغرب ۔ مرتبہ حسن الدین احمد
ناشر ۔ ولا اکیڈمی حیدرآباد
قیمت ۔ عام ایڈیشن ۲۰ روپے، ڈی لکس ۹۰ روپے۔
ملنے کا پتہ ۔ عزیز باغ سلطان پورہ ۔ حیدرآباد

...میں فنی اور علمی کتابوں کے ترجمے نہ ہونے کے برابر ہے ۔ ادبی و شعری ...بوں کے ترجمے بھی بہت زیادہ نہیں ہیں اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ترجمے کو دوسرے ...جے کی تخلیق سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے ۔ ترجمہ دوسرے درجے کی تخلیق ہو سکتا ہے ...اس کی افادیت و اہمیت کسی بھی اول درجے کی تصنیفی ادب سے زیادہ ہی ہے ۔

"سازِ مغرب" انگریزی کی نظموں کے اردو ترجموں کا مجموعہ ہے ۔ یہ نظمیں مختلف ...مائل و کتب میں بکھری ہوئی تھیں جنھیں یکجا کر دیا گیا ہے ۔ اردو ترجموں کے ساتھ انگریزی ...تن بھی دیا گیا ہے ۔ انگریزی کے ۳۲ شاعروں کی نظمیں اس میں شامل ہیں ۔ اردو کے ...ے ترجمے ہیں ۔ ایک نظم کے ایک سے زائد ترجمے بھی دیے گیے ہیں ۔ گرے کی مشہور "ایلجی" ...ریاں کے چار ترجمے، لانگ فیلو کی نظم " غلام کا خواب " اور ورڈز ورتھ کی نظم "کھوئی ...ئی محبت" کے تین تین ترجمے ہیں ۔ ایک ہی مترجم کے ایک سے زائد ترجموں کو کتاب میں ...دی گئی ہے ۔ امیر چند بہار کے ۸ ترجمے ۔ دھرم سروپ کے ۱۲ ترجمے ۔ اسماعیل میرٹھی کے اور جعفر عباس کے ۳ ترجمے اس مجموعے کی زینت ہیں ۔

دراصل ترجمہ مشکل کام ہے خاص طور پر نظم کا ترجمہ اور بھی زیادہ کٹھن اور دشوار ہے ۔ ...ن مجموعے کے بیشتر مترجموں نے اس کٹھن کام کو بڑی خوبصورتی سے انجام دیا ہے ۔

"سازِ مغرب" اس صنف میں ایک اچھی کوشش ہے ۔ جس کی افادیت و اہمیت مسلم ۔ مگر مرتب کی یہ کاوش زیادہ وقیع بن سکتی تھی اگر صرف کسی ایک شاعر کا کلام ترجمہ کر کے پیش ...آتا ۔ یا ایک عہد کے چند منتخب شاعروں کی نمایندہ نظموں کے ترجموں کو یکجا پیش کر دیا جاتا ۔ ...سے قاری کو ذہن بنانے اور رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ۔ کسی بھی ایک نظم سے شاعر ...شاعرانہ عظمت یا شخصیت کا کوئی اندازہ نہیں ہو پاتا ۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا کام کرنے میں ...ری یہ ہے کہ ایک شاعر کی ایک دو سے زیادہ نظموں کے اردو ترجمے دستیاب نہیں ہیں ۔ مگر ذرا سی محنت و کاوش سے اس دشواری پر قابو پایا جا سکتا ہے انگریزی نظموں کا انتخاب کر کے اردو شعرا اور اہل قلم حضرات سے ترجمے کرائے جا سکتے ہیں ۔ مرتب نے یہ اعلان کیا ہے کہ اس سلسلے کا یہ مجموعہ پہلا حصہ ہے ۔ چند حصے زیر ترتیب ہیں ۔ یہ بڑا کام ہوگا اگر مؤلف ایک مجموعہ اس طرح کی کاوش کے لیے بھی مخصوص کر دیں ۔

(شیخ سلیم احمد)

"برگ و بار" ۔ از کنور لال کنول
ناشر ۔ خمخانۂ ادب، راجوری گارڈن نئی دہلی
قیمت ۔ چھ روپے

کتاب غزلیات، رباعیات، قطعات اور منظومات پر مشتمل ہے ۔ شاعر کی تخلیقات سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف موصوف نے اساتذہ کی چھتر چھایا میں اپنی فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کیا ہے ۔ زبان و بیان کی عام لغزشیں اور طرزِ تحریر کی بے راہ روی ان سے کوسوں دور ہے لیکن امکاناتی روپ میں یہ تحفظ ان کی پروازِ نظر ظہار اور انفرادی رنگ و آہنگ کے لیے سد راہ بن کر رہ گیا ہے ۔

اس مجموعہ کی غزلیات ۔ چھوٹی غزلیں اچھی اور تغزل آمیز ہیں لیکن بہت سی غزلیں طوالت کے باعث اتنی بوجھل ہوگئی ہیں کہ ان کے اچھے شعر بھی نظر کی چوک کا شکار ہو جاتے ہیں ذیل کے شعر ان کی غزلوں میں موجود ہیں جن کا تغزل، بے ساختگی اور تاثر قابل تحسین ہے ۔

میری حیات کا ضامن میری بقا کی دلیل — وہ دل کا درد جو پیہم دکھائی دیتا ہے
دل بے مدعا کیوں پائمال کس مپرسی ہو — محبت کا اگر کچھ مدعا ہے تو محبت ہے
آگہی تو ایک منزل .... ہے — گمرہی کے لیے مقام .... بہت
زندگی کیا ہے طلسم .... آرزو — عشق کیا ہے جرأت بے باک ہے
سانس تو پھر سانس ہے آئے نہ آئے کیا خبر — موت کا اعتبار کر زیست کا اعتبار کیا

رباعیات کے تیور کچھ اور ہی ہیں ۔ موضوعات کی رنگا رنگی سے شاعر کی وسعتِ مشاہدہ اور تجرباتی بوقلمونیت کا ثبوت ملتا ہے ۔ زبان کی سادگی، روانی اور فصاحت کے ہلکے پھلکے نقوش جابجا ملتے ہیں لیکن ابہام، رموز و کنایات کی کمی کے باعث شوخیِ بیان اور سوز و ساز سے بھری پُری شعریت خال خال ہی نظر آتی ہے ۔ جہاں غزل کے پیرائے میں شاعر کے رومانی میلانات اور شعوری سیاق و سباق کی جھلکیاں اس کے تخلیقی چشموں کی تر و تازگی میں معاون نظر آتی ہیں وہاں رباعیات میں نظریات اور مقصدیت کے ہیولے برسرِ کار ہیں لیکن تنوع کے ساتھ معانی آفرینی اور اثر انگیزی کے عناصر اتنے مدھم ہیں کہ کہیں کہیں قاری کو مایوسی کا گمان ہونے لگتا ہے ۔ منظومات سماجی مسائل، قومی رہنماؤں کے جذبۂ عقیدت، عصری تاثرات کو بے ساختہ پیش کرنے کی کوشش ہیں ۔ یہ نظمیں شاعر کی وطن دوستی اور ہندوستانیت کی عکاس تو ہیں لیکن لب و لہجہ کی کم آہنگ نرمی، تصور کی سطحیت اور ہیئت کی یک رنگی کی وجہ سے دیرپا اثرات نہیں چھوڑتیں ۔

رام پرکاش راہی

اردو ہے جس کا نام
مصنف خضا آبانی

قیمت   چھ روپے

نقش کوکن پبلی کیشنز بمبئی ۹

زیر نظر مجموعہ ان لوگوں کے لیے یقیناً دل چسپ ہوگا جو زبان سے متعلق لوگوں کے نام جاننا چاہیں گے۔ ضیا ہانی نعتیں بھی لکھتے ہیں اور نظمیں بھی۔ زیر نظر کتاب ان کی نظم ہے جس میں شاعر نے بغیر کسی تعصب کے ان تمام لوگوں کی فہرست تیار کی ہے جن کو ذرا بھی اس زبان اور اس کے ادب سے دل چسپی ہے۔ یہ کتاب اس اعتبار سے ضرور اہم ہے کہ اس میں ان تمام اشخاص کے نام آتے ہیں جو ادیب ہیں۔ یہاں اس بات کا بھی خیال نہیں رکھا گیا ہے کہ وہ کس پائے کے ادیب ہیں یا کس پائے کے شاعر ہیں۔ بس یہ اردو شاعروں، ادیبوں، مدیروں، ہمدردوں اور لوگوں کی فہرست ہے اور چونکہ اس میں شعوری کوشش کی گئی ہے اس لیے شعری فن برقرار نہیں رہ پاتا۔ اگر وہ تھوڑی محنت اور کرتے اور شعری حسن کی طرف بھی توجہ دیتے تو یقیناً ایک بڑا کام کر جاتے۔

کتابت، طباعت غنیمت ہے۔ قیمت زیادہ ہے۔ ویسے بھی اس قسم کی کتابوں کی قیمت کم ہونی چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ جائے یا کم از کم ان لوگوں تک تو ضرور پہنچ جائے جن کے اسمائے گرامی اس کتاب میں شامل ہیں۔

نام کتاب :- چھیڑ چھاڑ

مصنف :- پرویز یداللہ مہدی

ناشر :- زندہ دلان حیدرآباد

قیمت :- چھ روپے

اردو میں مزاح نگاری کا مطلب شاید یہ سمجھا جاتا ہے کہ لوگ ہنسیں۔ اسی لیے ہر مزاح نگار کی کوشش یہ رہتی ہے کہ وہ لوگوں کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر دے۔ کبھی کبھی اوٹ پٹانگ باتوں سے، کبھی کبھی وہ کسی واقعہ کو دل چسپ بنانے کے چکر میں اتنا پھیلا دیتا ہے کہ اس کی چاشنی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی اور رہی سہی چاشنی بھی غائب ہو جاتی ہے۔

چھیڑ چھاڑ کے نام سے جو تصور ذہن میں ابھرتا ہے اسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ کچھ اچھے جملے اور کچھ طنزیہ نشانے دیکھنے کو ملیں گے مگر پوری کتاب پڑھ جائیے مگر ہنسی نہیں آتی، مسکرانا تو دور کی بات ہے۔

حیدرآباد نے بہت سے مزاح نگاروں کو جنم دیا ہے۔ لیکن مہدی کی طنزیہ باتوں اور ان کی مزاح نگاری میں ابھی پختگی نہیں آئی ہے۔ واقعات کو خواہ مخواہ طول دیتے ہیں۔

وہی پرانے قصے ہیں، میاں بیوی کا مسئلہ، گھر کا مسئلہ دوستوں کا مسئلہ اور ان تمام مسائل کے ذکر میں اکتاہٹ سے کام لیا گیا ہے۔ کہیں کہیں کوئی دل چسپ جملہ نظر آ جاتا ہے جیسے :- "جناب آپ میری ہاں میں ہاں کیوں ملا رہے ہیں"

"جی نہیں میں تو آپ کی ناں میں ہاں ملا رہا ہوں" (عمر بھر کا ساتھ)

لیکن اس تمام مجموعہ کی ٹریجڈی یہی ہے کہ آپ اس مجموعہ کے مضامین کو ایک بار سے زیادہ پڑھنے کی ہمت نہیں کریں گے۔ بہر حال پھر بھی چونکہ یہ پرویز کا پہلا مجموعہ ہے اس لیے آگے ان سے   توقعات رکھی جا سکتی ہیں۔

نام کتاب :- انسانی حقوق کیا ہیں

مصنف :- موریس کرانسٹن

مترجم :- جلیس عابدی

قیمت :- (عام ایڈیشن ۴ روپے

مجلد ۷ ")

ناشر :- پبلی نیشنل اکاڈمی۔ ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج دہلی

زیر نظر کتاب انسانی حقوق کیا ہیں کے طویل اور دل چسپ بحث کے موضوع پر اردو میں   کتاب ہے۔   اس کتاب سے نظریاتی طور پر اختلاف کیا جا سکتا ہے تاہم اس اچھوتے موضوع پر تاریخی حقائق کے پس منظر میں عام قاری کو یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسانی حقوق کتنی مراحل سے گذر کر یہاں تک پہنچے ہیں

ترجمہ خوبصورت، سلیس اور رواں ہے۔ ترجمہ ایک فن ہے اور مترجم جلیس عابدی نے اتنے خشک اور نظریاتی موضوع کو اپنے انداز بیان سے دلچسپ اور گوارہ بنا دیا ہے۔ موضوعاتی کتاب ہونے کے باوجود کتاب اہم ہے اور کتابت چھپائی وغیرہ مناسب ہے اور ضخامت کو دیکھتے ہوئے کتاب کی قیمت زیادہ نہیں ہے

(جعفر عباس)

اردو شاعری کے تین معمار۔

سید اسحاق حسین عابدی

قیمت پانچ روپے

صفحات ۴۶

ناشر بک سنٹر ڈگی روڈ،   علی گڑھ

زیر تبصرہ کتاب میر انیس اور فکر و فن میر کے چند اشعار کا فنی تجزیہ اور "اقبال اور نظریہ پاکستان" پر مشتمل ہے، اول الذکر مضمون مصنف نے زمانۂ طالب علمی میں لکھا تھا۔ جسے نظر ثانی کے بعد کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ دوسرے مضمون میں میر تقی میر کے کچھ اشعار کی تشریح و توضیح کی گئی ہے اور آخر الذکر مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال کسی ایک قوم یا خطہ کی میراث نہیں، بلکہ بنی نوع انسان کے شاعر ہیں۔ یہ مضامین طالب علموں کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔

(ادارہ)



شری پرتاپ چندر چندر
وزیر تعلیم سماجی بھلائی اور کلچر



شری مادھو ڈنڈوتے
وزیر ریلوے



شری موہن دھاریہ
وزیر کامرس سول سپلائز اور کوآپریشن



شری جارج فرنانڈیز
وزیر مواصلات



شری پرشوتم کوشک
وزیر سیاحت و شہری ہوابازی



شری راج نرائن
وزیر صحت و خاندانی بھلائی

شری ایچ۔ ایم پٹیل
وزیر مالیات، خزانہ اور بینکنگ



شری بیجو پٹنائک
وزیر فولاد و کان کنی



شری پی۔ رام چندرن
وزیر توانائی



شری اٹل بہاری باجپئی
وزیر خارجہ



شری رویندر ورما
وزیر محنت اور پارلیمانی امور



شری برج لال ورما
وزیر صنعت

Regd. No. D(D)103



اختر احمد اورینوی
۱۱ اگست ۱۹۱۱ء — ۳۰ مارچ ۱۹۷۷ء

Vol.35 No.10 AJKAL(MCNTHLY) May 1977
Published by the Director, Publications Division, Patiala House,New Delhi-110001
P.i.t.d b.. ..vl.rk Print.r.. 11355 Idg.h R..d, New Delhi-110055.

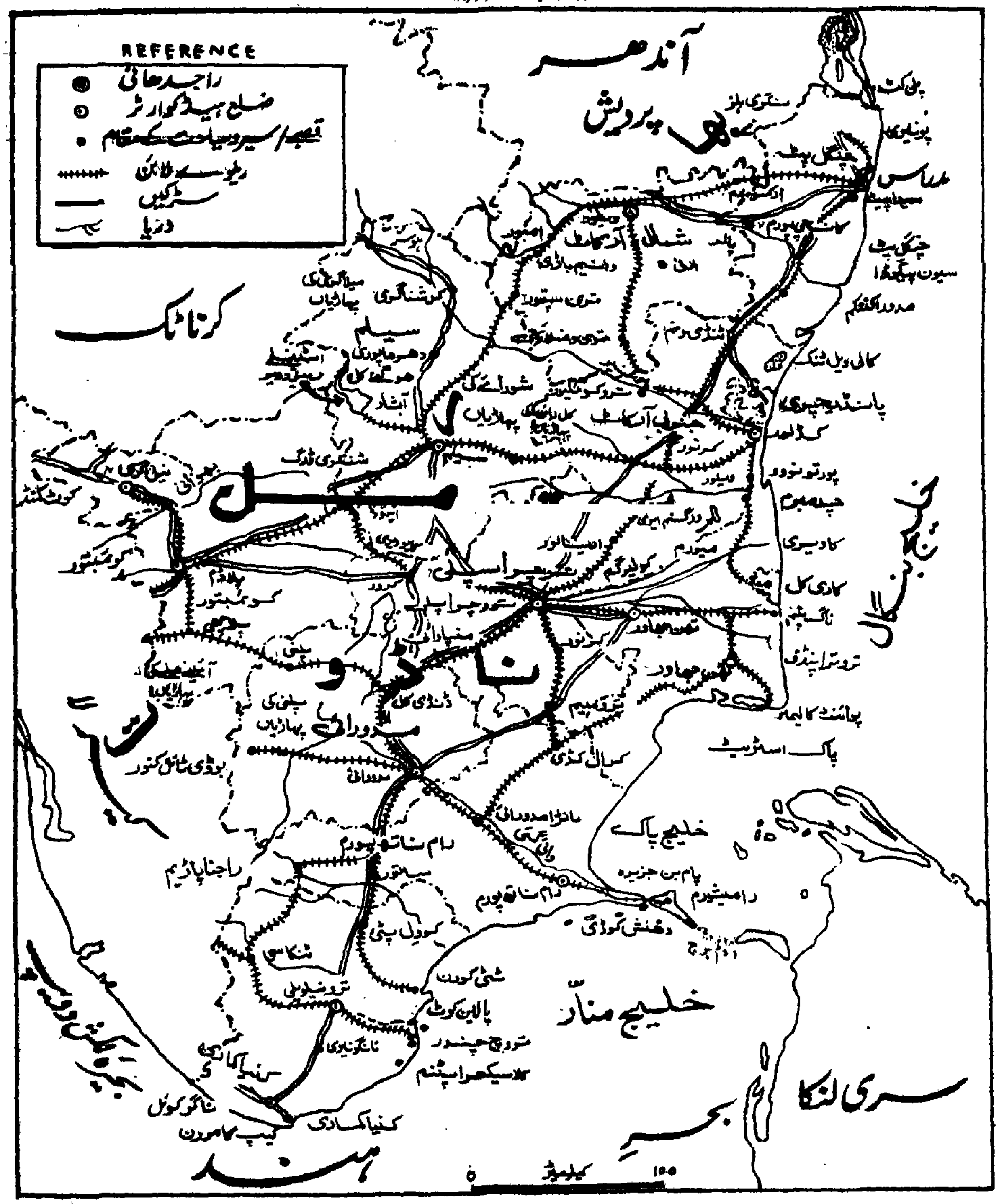
آج کل

جون جولائی ۱۹۷۷

دو روپیہ



تمل ناڈو


REFERENCE
راجدھانی
ضلع ہیڈ کوارٹر
ریلوے لائن
سڑکیں
دریا
آندھرا پردیش
کرناٹک
مدراس
خلیج بنگال
خلیج پاک
خلیج منار
سری لنکا
بحر ہند
کیلومیٹر
۱۰۰

اُردو کا مقبول عام معتبر ماہنامہ

آجکل
نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۳۵ شمارہ ۱۱-۱۲

جون جولائی ۱۹۷۷ء

جیٹھ اساڑھ شراون شک سمہ ۱۸۹۹

شرح چندہ

سالانہ	دس روپیہ	۳ ڈالر	۱/۵۵	پاؤنڈ
دوسالہ	۱۷ روپیہ	۵ ڈالر	۲/۵۵	پاؤنڈ
سہ سالہ	۲۴ روپیہ	۷ ڈالر	۳/۶۰	پاؤنڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	بہ سینٹ	۱۵	پنی

تمل ناڈو نمبر

سرورق، یامنی کرشنامورتی

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آج کل" اُردو، پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ملاحظات

ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ ہر علاقے کی اپنی خصوصیتیں اور روایات ہیں۔ ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ ہم مختلف حصوں کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لائیں۔ اس لئے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ مختلف ریاستوں کے رہنے والے ایک دوسرے کی زبان، کلچر، اور روایات سے واقفیت حاصل کریں۔

اسی جذبے کے تحت یہ طے کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی ہر ریاست کے بارے میں ایک خصوصی نمبر شائع کیا جائے۔ شمالی ہندوستان کے لوگ جنوبی ہندوستان کی روایات کے بارے میں نسبتاً کم واقفیت رکھتے ہیں۔ اس لئے شروعات جنوبی ہندوستان کی تاریخ اور ثقافت سے کی جا رہی ہے اور اس کے نتیجہ میں تمل ناڈو نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اس نمبر کی اشاعت میں تمل ناڈو کے لوگوں سے ہمیں بھرپور تعاون ملا جس کے لئے ہم ان کے شکرگذار ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے مدراس اور شمالی آرکاٹ کے بعض علاقوں کا سفر بھی کیا۔ تمل ناڈو کے لوگوں کے جذبۂ خلوص، اردو سے ان کی بے پناہ محبت اور تعلیمی میدان میں ان کی عملی سرگرمیوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

ایک ہفتے کے قیام کے دوران میں مدراس کے علاوہ آمبور، وانمباڑی عمر آباد، پیرام بٹ، گڑیاتم، ویلور اور میل وشارم گیا۔ ہر جگہ میں نے دیکھا کہ اردو کے ذریعۂ تعلیم کے متعدد اسکول، کالج، مدرسے اور تعلیمی ادارے قائم ہیں۔ عالی شان عمارتیں، آرام دہ ہوسٹل، باصلاحیت اساتذہ اور سب سے بڑھ کر مخلص اور سچی لگن رکھنے والی مجلس منتظمہ جو ان اداروں کو نہایت عمدگی سے چلا رہی ہے، جس کا ثبوت وہ اضافے ہیں جو برابر ان اداروں میں ہو رہے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ وقت کی کمی کے باعث میں دوسرے مراکز جیسے ترچراپلی، سیلم اور کوئمبتور وغیرہ نہ جا سکا۔

کسی بھی علاقے کے اتنے پہلو ہوتے ہیں کہ سب کا احاطہ کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ ہم نے دو شماروں کو اس لئے ملا دیا کہ تمل ناڈو کے مختلف پہلوؤں کو زیادہ سے زیادہ سمیٹا جا سکے۔ اس کے باوجود ہمیں احساس ہے کہ یہ نمبر مکمل نہیں ہے۔ اور کئی اہم پہلو ضرور چھوٹ گئے ہوں گے۔ اس کی بڑی وجہ تو ہماری تنگ دامانی ہے مگر یہ بھی ہے کہ بعض مضامین ہمیں نہ مل سکے۔ بعض مضامین ہم صفحات کی کمی کی وجہ سے شامل نہ کر سکے۔ یہ مضامین اگست کے شمارے میں شامل ہیں۔

یہ نمبر آپ کو کیسا لگا ہمیں ضرور لکھئے خصوصاً جو خامیاں نظر آئیں ان کے بارے میں ضرور مطلع کریں تاکہ جب دوسری ریاستوں کے بارے میں نمبر شائع کئے جائیں تو ان کا ازالہ کیا جا سکے۔ آپ کی رائے ہم شائع کریں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نومبر ۱۹۷۷ء میں اقبال کا صد سالہ جشنِ ولادت منایا جا رہا ہے۔ اقبال صدی کمیٹی اور متعدد اداروں کی طرف سے ملک کے مختلف صوبوں میں کئی تقریبات منعقد ہو چکی ہیں اور آئندہ بھی ہوں گی۔ اس موقع کی مناسبت سے آج کل کا نومبر کا شمارہ اقبال نمبر ہوگا۔ اس شمارے میں اقبال سے متعلق مضامین کے علاوہ متعدد تصویریں بھی شامل ہوں گی۔

اگر کسی صاحب کے پاس اقبال کی کوئی تحریر (خط وغیرہ) یا کوئی نایاب تصویر ہو تو ہمیں ضرور بھیجیں ہم اس کا مناسب معاوضہ ادا کریں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

قلمی معاونین سے گزارش ہے کہ فی الحال ہمیں نظمیں، غزلیں نہ بھیجیں۔ منظومات بہت جمع ہو گئی ہیں۔

خریداری سے متعلق شکایتی خطوط بزنس منیجر کے نام لکھے جائیں۔ ایڈیٹر کے نام خط بھیجنے سے شکایتوں کے ازالے میں تاخیر ہو جاتی ہے۔

"آج کل" خریداروں کو "انڈر سرٹیفکٹ آف پوسٹنگ" بھیجا جاتا ہے اور اس بات کی پوری کوشش کی جاتی ہے کہ وقت پر رسالہ مل جائے۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت ہمیں لکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے متعلقہ ڈاکخانہ کو بھی ضرور لکھئے۔

وی رحمت اللہ
اسلامیہ کالج، وانمباڑی

تملناڈو کی جغرافیائی خصوصیات

تمل ناڈو ہندوستان کی چند خوبصورت ریاستوں میں سے ایک ہے۔ قدرت نے بڑی فیاضی سے اس ریاست کو فطری حسن بخشا ہے۔ جسامت کے لحاظ سے یہ ہندوستان کی گیارہویں ریاست ہے۔ جس کا رقبہ ۱۳۰۰۶۹ مربع کلومیٹر اور آبادی ۴ کروڑ ۱۲ لاکھ ہے۔ جو ہندوستان کی مجموعی آبادی کا ۵/۷ فی صد ہے۔ آبادی کے لحاظ سے اس ریاست کا نمبر ساتواں ہے اور آبادی کا گھنا پن ۳۱۶ فی مربع کلومیٹر ہے۔

موجودہ ریاست تمل ناڈو کا قیام ریاستوں کے تنظیم نو کے قانون ۱۹۵۶ء کے تحت ہوا ہے اور اس کی موجودہ سرحدیں پٹسکر ایوارڈ کے ذریعے متعین کی گئی ہیں۔ پہلے اس ریاست کا نام مدراس تھا مگر دسمبر ۱۹۶۸ء میں موجودہ نام "تمل ناڈو" رکھا گیا۔

تمل ناڈو ہندوستان کے جنوبی سرے پر واقع ہے اور کنیا کماری اس کا آخری سرا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں خلیج بنگال، بحیرۂ عرب اور بحر ہند تینوں ملتے ہیں اور ہندوؤں کی تیرتھ یاترا اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ کاشی کے بعد رامیشورم کی یاترا بھی نہ کر لیں۔

یہ بڑی قدیم ریاست ہے اور اس کے رسوم و رواج اور تہذیبی قدریں ہزاروں برس سے چلی آرہی ہیں۔ ہندوستان کے بڑے قدیم اور فن تعمیر کے لحاظ سے بڑے نادر مندر اس ریاست میں ہیں۔

یہ ریاست پرانے مدراس پریسیڈنسی کا ایک حصہ ہے۔ ۱۹۰۴ء میں مدراس پریسیڈنسی میں تقریباً سارا جنوبی ہندوستان شامل تھا۔

شہر مدراس اس کی راجدھانی ہے۔ جو آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کا چوتھا بڑا شہر ہے۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس شہر کی آبادی ۲۵ لاکھ کے قریب ہے۔ اس ریاست کے دوسرے اہم شہر کوئمبتور، مدورائے سیلم اور تروچراپلی ہیں۔

ریاست تمل ناڈو کے ۱۵ اضلاع ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ضلع	آبادی (۱۹۷۱ کی مردم شماری)	صدر مقام
۱۔ چنگل پٹ	۲۹۰۷۵۹۹	کانچی پورم
۲۔ کوئمبتور	۴۳۷۳۱۷۸	کوئمبتور
۳۔ دھرم پوری	۱۶۷۷۷۷۵	دھرم پوری
۴۔ کنیاکماری	۱۲۲۲۵۴۹	ناگرکوئل
۵۔ مدراس	۲۴۶۹۴۴۹	مدراس
۶۔ مدورائے	۳۹۳۸۱۹۷	مدورائے
۷۔ نیل گری	۴۹۴۰۱۵	اوٹاکمنڈ
۸۔ نارتھ ارکاٹ	۳۷۵۵۷۹۷	ویلور
۹۔ رام ناتھ پورم	۲۸۶۰۲۰۷	مدورائے
۱۰۔ سیلم	۲۹۹۲۷۱۶	سیلم
۱۱۔ ساؤتھ آرکاٹ	۳۶۱۷۷۲۳	کڈالو
۱۲۔ پدوکوٹائی	۹۴۷۳۵۱	پدوکوٹائی
۱۳۔ تروچراپلی	۳۱۱۰۴۲۶	تروچراپلی
۱۴۔ تنجاور	۳۶۳۱۷۷۱	تنجاور
۱۵۔ ترونلویلی	۳۲۰۰۵۱۵	ترونلویلی

یہاں کی آب و ہوا ٹروپیکل ہے۔ اور شمالی ہند کے مقابلے میں موسم کی شدت یہاں کم ہے۔ نہ سردی زیادہ پڑتی ہے اور نہ گرمی۔ زیادہ سے زیادہ درجۂ حرارت ۱۱۰°F (سنٹی گریڈ ۴۳) اور کم سے کم ۶۵°F یا (۲۵ سنٹی گریڈ) ہے۔

اس ریاست میں اچھی بارش ہوتی ہے گو کہ ہر علاقے میں یکساں نہیں ہوتی مثلاً جون سے ستمبر کے مہینوں میں نیلگری، اناملائی اور پالائی کے علاقے میں تقریباً سو سنٹی میٹر اور کبھی کبھار اس سے زیادہ بارش ہو جاتی ہے۔ کوئمبتور، سیلم نارتھ آرکاٹ اور چنگل پٹ کے اضلاع میں ۵۰ سنٹی میٹر کے قریب ہوتی ہے۔ تنجاور اور تروچراپلی میں ۲۵ سے ۳۰ سنٹی میٹر تک ہوتی ہے۔ اس ریاست کو شمال مشرق کی مانسونی ہواؤں سے بھی فائدہ ہوتا ہے۔

دسمبر کے مہینوں میں مدراس، چنگل پٹ اور ساؤتھ آرکاٹ جیسے ساحلی اضلاع میں خوب بارش ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے میدانی علاقوں میں بعض وقت سیلاب بھی آجاتا ہے۔

کوڈائی یار اور پیڑیار ندیوں کے سوا تمل ناڈو کی سبھی ندیاں پچھم سے پورب کی طرف بہتی ہیں اور خلیج بنگال میں گرتی ہیں۔ وگئی اور تمبراپرانی مغربی گھاٹ سے نکلتی ہیں۔ یہاں کی سب سے بڑی ندی کاویری ہے۔ یہ ندی ریاست کرناٹک میں مرکرا کے نزدیک برہم گری کے پہاڑوں سے نکلتی ہے۔ عقیدت مند ہر سال (سنکرانتی کے دن اکتوبر کے مہینے میں) برہم گری کی پہاڑیوں پر چڑھتے ہیں تاکہ کاویری کے منبع کا نظارہ کر سکیں۔ پہاڑوں کی اس چڑھائی میں ایک جگہ ایک پتھر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ٹیپو سلطان جب کورگ کی ایک مہم سے واپس

آرہے تھے تو انہوں نے اس جگہ تھوڑی دیر آرام کیا تھا۔ جب انہوں نے پہاڑی پر چڑھکر اس مقام کو دیکھا تو کاویری کا منبع انہیں بڑا پرکیف اور پرشکوہ نظر آیا۔ اور انہوں نے اپنے سر کو خم کرکے اس عظیم دریا کو سلامی دی اس وقت سے اس پہاڑی کو سلامی کی پہاڑی "کہا جاتا ہے۔ کاویری کا پانی گنگا کی طرح مقدس سمجھا جاتا ہے، لوگ اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ یہ پانی کئی دن تک تازہ اور قابل استعمال رہتا ہے۔

کرناٹک اور تمل ناڈو میں بہت سی لڑکیوں کے نام اس ندی کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔ اس ندی کے ہر موڑ اور کناروں پر واقع مندروں کے بارے میں مختلف کہانیاں مشہور ہیں۔ ان میں سے ایک کہانی خود دریائے کاویری کے آغاز کے بارے میں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کاویری ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ برہما نے یہ لڑکی راجہ کاویرن کو تحفہ کے طور پر دی تھی۔ ایک رشی اگستیہ کو اس لڑکی سے عشق ہوگیا اور اس نے کاویری سے شادی کی خواہش کی۔ کاویری کے باپ نے اس شرط کے ساتھ شادی کردی کہ اگستیہ کبھی کاویری کو اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ ایک زمانے تک رشی اپنے وعدے پر قائم رہا۔ لیکن ایک دن اپنے شاگردوں کو فلسفے کا ایک مشکل نکتہ سمجھانے میں اسے بہت دیر ہوگئی اور کاویری کے دل میں برے برے خیالات آنے لگے اور اس کو اپنی زندگی دوبھر نظر آنے لگی وہ اس تالاب میں کود پڑی جس میں اس کا خاوند روز نہاتا تھا۔ مگر وہ مری نہیں اور تالاب میں نیچے چلی گئی اور زمین کے اندر غائب ہوگئی اور دریائے کاویری کے شکل میں نمودار ہوگئی۔ اور برہم گری کی پہاڑیوں میں بہنے لگی۔ اور اس کی چوٹی کے قریب ایک چشمے کی شکل میں نمودار ہوئی۔

رشی اپنی بیوی کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ ایک دن وہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھا اور چشمے کی شکل میں بہنے والی اپنی بیوی کو پہچان لیا۔ اور اس سے گھر چلنے کی درخواست کی۔ کافی منت و سماجت کے بعد وہ اپنے جسم کا صرف آدھا حصہ لے کر گھر چلنے پر آمادہ ہوئی۔ اس نے کہا کہ آج سے میرا آدھا حصہ دنیا میں تمہاری بیوی کی حیثیت سے رہے گا۔ اور بقیہ حصہ دریائے کاویری کی حیثیت سے مادرِ وطن کی خدمت کرے گا۔ اس نے کورگ کے لوگوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر سال اس جگہ لوگوں کو درشن دیا کرے گی۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ ہر سال اپنا وعدہ پورا کرتی ہے۔

یہ ندی ۷۶۵ کلو میٹر لمبی ہے۔ مختلف علاقوں میں اس کے مختلف نام ہیں۔ اس کی چوڑائی بھی گھٹتی بڑھتی ہے۔ ایک جگہ اس کو اکھنڈ کاویری کہتے ہیں تمل ناڈو میں داخل ہونے سے ذرا پہلے اس کو میگھ تاڈو یا آڈو تھانڈم کاویری کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسی کاویری جس کو بھیڑ بھی آسانی سے پار کرسکتی ہو۔

ہندوستان میں آزادی کے بعد بہت سے دریاؤں پر بند باندھا گیا ہے مگر کاویری پر تعمیر شدہ بند "سدسنگی" تقریباً ۲ ہزار سال پرانا ہے۔ یہ اس طرح ہندوستان کا سب سے قدیم بند ہے۔ اس کی تعمیر ایک چولا راجہ کاویری کل نے کی تھی۔

جب دریائے کاویری میں سیلاب آنے والا ہوتا ہے تو لوگ اس موقع پر جشن مناتے ہیں۔ اور اس موقع پر ایک میلہ لگتا ہے جس کو اٹھارویں کا سیلاب کہا جاتا ہے۔ آڈی (جولائی۔ اگست) مہینے کی اٹھارہویں تاریخ کو لوگ ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوکر دریا کی پوجا کرتے ہیں۔ چراغ جلاتے ہیں اور دریا کو پھل مٹھائی اور پھولوں کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔

کاویری کی طرح پالا ور پونیار بھی بین ریاستی ندیاں ہیں۔ مقامی اہمیت کی ندیوں کے نام ہیں:۔ آرانیار کورتالیار، کوام، گڈی لام، گومکھی، منی مکتا، جنوبی ویلار، شمالی ویلار، اگنیار، وی ایار، چیتار وغیرہ۔

یہاں کی مٹی اپنی زرخیزی اور غیر زرخیزی کے لحاظ سے پانچ قسموں میں بانٹی جاتی ہے اور وہ قسمیں (۱) کرنجی (۲) ملئی (۳) مردم (۴) پالئی اور (۵) نیڈل کہلاتی ہیں۔ اور ہر قسم کی زمین سے ایک نئی تہذیب، ایک نئی طرزِ زندگی وابستہ ہے۔

پہاڑ اور اس سے متصل پہاڑی علاقوں کو کرنجی کہتے ہیں۔ ان علاقوں میں بسنے والوں کو کُرو یا کریتر کہتے ہیں۔ یہاں جنگلی جانور پائے جاتے ہیں کرنجی علاقے کے مشہور درخت صندل، ساگوان اور سال ہیں۔ یہاں چاول اور جوار کی کاشت ہوتی ہے۔ یہاں کا دیوتا مرگن ہوتا ہے۔

جنگل اور اس سے ملی ہوئی زمینوں کو ملئی کہتے ہیں۔ یہاں کے بسنے والے پیشے کے لحاظ سے گوالے یا چرواہے ہوتے ہیں۔ یہاں ہرن، خرگوش جیسے جانور پائے جاتے ہیں۔ یہاں کودرو اور ساوا کی کاشت کی جاتی ہے مویشی پالنا ان لوگوں کا پیشہ ہے۔

اناج پیدا کرنے والا علاقہ مردم کہلاتا ہے۔ یہاں کے بسنے والے لوگ کسان ہوتے ہیں۔ جو بیل بھینس اور گائے پالتے ہیں۔ پیپل، پارس اور بڑ جیسے درخت یہاں پائے جاتے ہیں۔ دھان اس علاقے کی خاص فصل ہے۔ ان کا دیوتا اندرنی ہے۔

ساحلی علاقوں کو نیڈل کہتے ہیں۔ یہاں کے لوگ مچھیرے ہوتے ہیں۔ مچھلیوں کے شکار کے ساتھ ساتھ یہ لوگ نمک بھی بناتے ہیں۔ نیڈل کا دیوتا ورن ہوتا ہے۔

صحرائی علاقہ پالئی کہلاتا ہے۔ یہاں کے لوگ کھیتی نہیں کرسکتے۔ اس لئے کہ زمین اس کے قابل نہیں ہوتی۔ یہ لوگ خانہ بدوش ہوتے ہیں۔ یہ لوگ درگا کی پوجا کرتے ہیں۔

جنگلات

تمل ناڈو کے جنگلات ۲۱۰۷۲ مربع کلو میٹر رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اور اس رقبے کے تقریباً ۱۷۲۶۴ مربع کلو میٹر پر محفوظ جنگلات (Reserved Forest) ہیں۔ اس طرح تملناڈو کی تقریباً ۱۶ فیصد زمین پر جنگلات ہیں۔ ان جنگلوں سے

۱۴٫۳۱ کروڑ روپے سالانہ کی آمدنی ہے۔

تمل ناڈو کے جنگلات میں پائے جانے والے درختوں میں صندل، ساگوان، اینڈوں کی لکڑی، بانس اور یوکلپٹس کے درخت قابل ذکر ہیں۔

صندل کے درخت زیادہ تر کوئمبتور، سیلم اور شمالی آرکاٹ میں پائے جاتے ہیں۔ صندل سے تیل نکالا جاتا ہے اور یہ تیل نکالنے والی فیکٹریاں میسور اور سیلم میں ہیں۔ اور یہ صندل کا تیل یورپ کو برآمد کیا جاتا ہے۔ تروچی، مدورے اور نیل گری کے مقام پر بھی صندل کے درخت اگائے جاتے ہیں۔

فصلیں

تمل ناڈو کی مشہور فصلیں دھان، راگی، باجرہ، جوار اور ساداں ہے۔ ان کے علاوہ یہاں تلہن اور چائے اور کافی کے باغات بھی پائے جاتے ہیں۔

دھان کی فصل کے لئے دھوپ زرخیز مٹی اور پانی وافر مقدار میں ضروری ہے۔ اسی لئے تمل ناڈو کے کاویری ڈیلٹا میں دھان کی کاشت بہت اچھی ہوتی ہے۔ اس ڈیلٹا کے علاقے میں دھان کی کاشت کا اہم علاقہ تنجاور ہے۔ جس کو تملناڈو کا دھان کا بھنڈار بھی کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئمبتور، تروچی، مدورے، ترنل ویلی اور شمالی آرکاٹ میں بھی دھان کی کاشت ہوتی ہے۔ جن علاقوں میں دھان کی کاشت ہوتی ہے وہاں گنے کیلے اور پان کی کاشت بھی کی جاتی ہے۔ تمل ناڈو میں نیلگری اور مدراس کے سوا کم بارش ہونے والے علاقوں میں راگی، باجرہ، مکئی، کی کاشت کی جاتی ہے۔ باجرہ اور ساداں کی کاشت کی جانے والی زمین کا رقبہ ایک حالیہ جائزے کے مطابق ۱۰٫۸ لاکھ ہیکٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ اس سال چاول کی پیداوار کا تخمینہ ۶۱ لاکھ ٹن ہے۔

یہاں کی تجارتی فصلوں میں گنا، روئی، تمباکو اور تلہن قابل ذکر ہیں۔ ۷۶-۱۹۷۵ء میں گنے کی کاشت سے ۲۴ لاکھ ٹن گنا حاصل ہوا تھا۔ گنے کی کاشت تمل ناڈو میں زیادہ تر جنوبی آرکاٹ، شمالی آرکاٹ، کوئمبتور، تروچی مدورے اور تنجاور اضلاع میں کی جاتی ہے۔

روئی کے لئے زیادہ بارش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ۵۰ سنٹی میٹر سے کم بارش ہونے والے علاقوں میں اس کی اچھی کاشت ہو جاتی ہے۔ یہاں تمل ناڈو میں ترنل ویلی، رام ناد پورم، مدورے اور کوئمبتور میں روئی ہوتی ہے۔

تمباکو کی کاشت صرف چکنی مٹی اور پانی کی کثرت والے علاقوں میں ہوتی ہے۔ مثلاً ڈنڈی گل، سویگری، پنگوڑی، اٹرگاپورم میں یہ کثرت سے ہوتی ہے

تلہن جیسے تل، انڈی، مونگ پھلی، کھوپرا، روئی کے بیج اور رائی میں سب سے زیادہ مونگ پھلی کی کاشت کی جاتی ہے۔ ہندوستان کی کل پیداوار کا بڑا حصہ یہاں تمل ناڈو میں پیدا ہوتا ہے۔ مونگ پھلی کی کاشت زیادہ تر جنوبی آرکاٹ، شمالی آرکاٹ، سیلم اور تروچی کے اضلاع میں کی جاتی ہے۔ ناریل کے درخت تمل ناڈو کے تقریباً ہر مقام پر ہوتے ہیں۔ اور اس سال سارے ہندوستان کی دیگر ریاستوں سے اور بالخصوص ریاست کیرالا سے زیادہ ناریل کی پیداوار تمل ناڈو میں ہوئی۔

دالوں کے ساتھ انڈی اور تل کی بھی کاشت کی جاتی ہے۔ یہ رام ناد پورم ترنل ویلی اور شمالی آرکاٹ میں زیادہ ہوتے ہیں۔

چائے کی لال مٹی اور پتھریلی زمین میں کاشت کی جاتی ہے۔ اس کے لئے پانی وافر مقدار میں چاہیئے مگر پانی جڑوں میں ٹھہرنے نہ پائے۔ اسی لئے اس کی کاشت پہاڑ کی ڈھلانوں پر کرتے ہیں۔ نیلگری، کنیا کماری، آنئے ملیے اور کارڈیمم پہاڑیوں کے ڈھلانوں پر اس کی کاشت کی جاتی ہے۔

کافی کی کاشت کے لئے بھی وہی چیزیں ضروری ہیں جو چائے کی کاشت کے لئے ضروری ہیں۔ مگر کافی انھیں مقامات پر اچھی طرح ہوتی ہے جو سطح سمندر سے تقریباً ۹۰۰ میٹر بلند ہو اور اس بلندی کے ساتھ وہاں ہوا بھی کچھ کم ہو۔ کافی شیورائے، آنئے ملیے، اور پلانی پہاڑوں کے ڈھلانوں پر ہوتی ہے۔

معدنیات

معدنیات میں چونے کے پتھر، جپسم ابرق، باکسائٹ لگنائٹ اور لوہا قابل ذکر ہیں۔ تمل ناڈو کی معدنیات کی دولت ہندوستان کی کل معدنیات کا صرف ۱۴ فیصد ہے۔ یہاں پایا جانے والا کچا لوہا ادنیٰ قسم کا ہوتا ہے۔ اس میں لوہا کم اور سلکا زیادہ ہوتا ہے۔ کچا لوہا سیلم میں دستیاب ہوتا ہے۔

جپسم جو سمنٹ اور مصنوعی کھاد کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے، وہ زیادہ تر سیلم، تروچی اور ترنل ویلی، کوئمبتور اور چنگل پٹ کے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔

خواندگی کے لحاظ سے اس ریاست کا نمبر دوسرا ہے۔ خواندگی کا تناسب ۳۹٫۴ فیصد ہے۔ ۷۱-۱۹۶۱ء کے درمیان ہندوستان میں شرح خواندگی میں ۵٫۳۴ فیصد کا اضافہ ہوا ہے مگر تمل ناڈو میں ۸ فیصد (۳۱٫۴ فیصد سے بڑھ کر ۳۹٫۴ فی صد) رہا۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس ریاست میں خواندہ افراد کی تعداد ۱٬۶۱٬۸۹٬۷۱۲ ہے۔

ریاست میں تمل بولنے والوں کی اکثریت ہے۔ ۱۰ فی صد لوگ تلگو بولتے ہیں۔ اردو بولنے والوں کی تعداد ۱٫۵ فی صد ہے۔ کنڑ بولنے والوں کی تعداد ۱ فیصد اور ملیالم بولنے والے کی تعداد ۱٫۹۱ فیصد ہے۔

مدراس قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ اتحاد کے لحاظ سے ایک مثالی ریاست ہے۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق مختلف مذاہب کے ماننے والوں کی تعداد حسب ذیل ہے:

مسلمان: ۲۱ لاکھ ۳ ہزار ۸ سو ۹۹، عیسائی: ۲۳ لاکھ ۶۷ ہزار ۷ سو ۴۹، سکھ: ۴ ہزار ۳ سو ۵۵، بودھ: ایک ہزار ایک سو ۴۸، جین: ۴۱ ہزار ۹۷۔ ہندو ۳٬۶۶٬۷۴٬۱۵۰

طاہر احمد
اسسٹنٹ پروفیسر آف ہسٹری
اسلامیہ کالج، وانمباڑی

تمل ناڈو تاریخ کے آئینے میں

تمل ناڈو کئی ایسے تمدنی و ثقافتی عناصر کا مخزن ہے جو اس کے حدود میں داخل ہو گئے ہیں۔ اور اس سرزمین نے ان بیشتر عناصر کو ان کی اپنی حقیقی صورت میں اپنے تمدن میں سمو کر انہیں خاص طور پر اجاگر کیا ہے۔ ویدک رسومیت آریائی فرقہ بندی کے اصول، مذہبی عقائد، پوجا پاٹ، اور اصنام پرستی کے تصورات جنوبی ہند میں بہ نسبت دوسری جگہوں کے بہت زیادہ مستحکم اور مضبوط ہیں —— یہاں کی ثقافتی تاریخ ہندوستان تک محدود نہیں تھی بلکہ جاوا، سماٹرا، بورنیو، بالی جزیرے، انڈمان، نکوبار، سیام کے علاقے تک بھی اس سے مستفید ہوتے رہے۔ سیلون، کوریا اور ویت نام بھی اس میں شامل ہیں نیز مشرق وسطیٰ اور یورپ کے علاقوں اور سلطنت روما تک اس کی خوش حالی کے چرچے تھے۔

قدیم تہذیب

ماہرینِ ارضیات اور جغرافیہ کی جدید تحقیقات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تمل ناڈو (خصوصاً چنگل پٹ اور شمالی آرکاٹ کے اضلاع) میں قدیم پتھر کی تہذیب پھیلی ہوئی تھی۔ جدید پتھر کے زمانے کی تہذیب جنوبی علاقوں میں پائی گئی ہے، ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے دستی کلہاڑیاں، ہتھوڑی اور لوہے اور دیگر دھاتوں کے بنے ہوئے اوزار ادھیرام پکم اور مدورے وغیرہ مقامات میں کھود نکالے ہیں۔ یہ اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ یہاں دھات کے زمانے کی تہذیب کافی ترقی یافتہ شکل میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ کھدائی بروس فٹ اور کرشنا سوامی کی رہینِ منت ہے۔

سنگم دور دس ہزار قبل مسیح میں عالم وجود میں آیا۔ سنگم کے لفظی معنی "انجمن" یا "بزم" ہیں۔ سنگم دور کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور ۱۰،۰۰۰ ق م تک کا تھا۔ دوسرا دور اس کے بعد کا دور ہے جو ۱۰ ہزار سے ۵۰۰ ق م تک کا ہے۔ اور تیسرا دور ۵۰۰ ق م سے ۵۰۰ بعد مسیح تک پھیلا ہوا تھا اور آخری سنگم ۵۰۰ عیسوی کے بعد کا ہے۔

پہلا اور دوسرا سنگم دور تاریخ کے صفحات پر ناپید ہے مگر تیسرا اپنی تمام آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس دور میں ہر لحاظ سے تمل ناڈو اپنے بامِ عروج پر پہنچ گیا تھا۔ سنگم دور کا سیاسی ڈھانچہ جمہوریت کی اساس پر بنایا گیا تھا۔ بادشاہ تھے مگر مطلق العنان نہ تھے۔ ایک مجلس شوریٰ جسے بڑی انجمن (سپریم کونسل) کہتے تھے بادشاہ کو صلاح و مشورے دیا کرتی تھی۔ اور بادشاہ کوئی قدم اس انجمن کی صلاح کے بغیر نہیں اٹھاتا تھا۔ ان تمام تفصیلات کا تذکرہ تمل کے ادبِ عالیہ میں ملتا ہے جو اس دور کی تخلیق تھی۔ اس زمانے کی معروف تصانیف یہ تھیں۔

(۱) سلپیدی گارم (۲) منی مے گلئی (۳) جیوکا چنتامنی (۴) دیا بودی اور (۵) کنڈلاکیسی —— اس کے علاوہ تمل زبان کی سب سے اعلیٰ تصنیف "ترو کرل" جو ولوور کی تصنیف ہے اسی دور کی تخلیق ہے۔ کرل اس دور کی صحیح عکاسی کرتی ہوئی تصنیف ہے۔

پلوا خاندان

(۲۰۰ سے ۹۰۰ ہجری تک) سنگم دور کے بعد پلوا خاندان کے تذکروں میں ہمیں تمل ناڈو کی تاریخ ملتی ہے۔ پلوا کے متعلق جمہور تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ وہ باہر سے آئے۔ ان راجاؤں کا پایۂ تخت کانچی تھا۔ اس خاندان کے مشہور بادشاہ نرسمہا ورمن اول اور نرسمہا ورمن دوم اور مہندر ورمن ہیں۔ ان کے کارناموں سے تمل تاریخ بھری پڑی ہے۔

پلی کیشن پر فتح اور ہرشا کی شکست نرسمہا ورمن کے عظیم کارنامے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر اس کی علم دوستی اور ادب نوازی قابلِ ستائش ہے۔ اس نے وشنو اور ایشور کے نام کے کئی مندر تعمیر کروائے۔ جو جنوبی ہند کے فنِ تعمیر کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ اسے چٹانوں سے بنائے جانے والے مندروں کا موجد بھی کہا جاتا ہے اس کے دور میں موسیقی، رقص اور فنِ نقاشی کو بہت بڑھاوا ملا۔

نرسمہا ورمن اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلا۔ اس نے پلی کیشن دوم کو فاش شکست دی۔ چونکہ پلی کیشن دوم کا پایۂ تخت واتاپی تھا۔ اس لئے نرسمہا ورمن کا لقب واتاپی کونڈا (واتاپی کا فاتح) پڑ گیا۔ اس کا دوسرا لقب مہا ملّا (عظیم ہیرو) بھی تھا۔ اس نے پڈو کوٹ تولئی اور ترچناپلی میں چٹانوں سے مندر بنائے —— مدراس سے چند میل دور مہا ملا پورم اس کی یادگار ہے جس کا جدید نام مہابلی پورم ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس کی تعریف ہون سیانگ نے کی ہے اور جسے دیکھنے کے لئے آج بھی لوگ آتے ہیں۔

ہیون سیانگ اپنے سفرنامے میں رقمطراز ہے کہ کانچی جنوب میں علوم و فنون کا عظیم الشان مرکز ہے۔ سو خانقاہیں اس کو زینت بخشتی تھیں۔ جہاں دس ہزار طالبانِ علم جمع تھے۔ دٹ سینا جو اپنے زمانے کا منطق دان تھا۔ اس دور کے علم دوستی کا مظہر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مشرقِ بعید کے چند علاقوں پر اس خاندان کی کالونیاں قائم تھیں۔

تنجاور کے چولا

چولا خاندان سب سے طاقتور اور سب سے عظیم مانا گیا ہے اشوک کے کتبات اور سنگم ادب ان کی عظمت میں رطب اللسان ہیں۔ سیلون (لنکا) کی تاریخ "مہاوسا" میں ان بادشاہوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ پلّو کے زوال کے بعد چولاؤں کو فوقیت مل گئی۔

چولا خاندان نویں صدی سے چودہویں صدی تک

چولا حکومت کو چولا منڈل بھی کہتے ہیں۔ یہ دریائے پنّار سے دریائے ولّار تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے پایۂ تخت تنجاور، ترچی، گنگئی کونڈا چولا پورم بالترتیب رہے ہیں۔ اس خاندان کے عظیم بادشاہ راج راجہ اعظم گزرا ہے۔

راج راجہ چولا (۱۰۱۴ — ۹۸۵ء) کے کارنامے تنجاور کے مندر کے کتبات پر کھدے ہوئے ہیں۔ اس نے تقریباً تمام پڑوسی حکومتوں پر چڑھائی کی۔ چیرا راجہ اپنی بحری طاقت کے لئے بہت مشہور تھے اسی کے ہاتھوں مغلوب ہوئے۔ اور اس نے ان کی بحری عظمت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ اس نے پانڈیا بادشاہ کو شکست دی۔ اور اپنا قیدی بنا لیا۔ مدورے کی فتح کے بعد مشرقی چالوکیہ خاندان کا خاتمہ کیا۔ اس نے لنکا پر بھی چڑھائی کی۔ بحیرۂ عرب اور خلیج بنگال کے تقریباً ایک ہزار دو سو جزیرے اس کی حکمرانی میں شامل تھے اس کا بڑا کارنامہ راجہ راجیسورا مندر اور وشنو مندر ہے۔

راجندرا چولا (۱۰۴۴ — ۱۰۱۴ء)

پانڈیا چیرا اور چالوکیہ بادشاہوں کو زیر کرنا راجندرا چولا کے مقدر میں لکھا تھا۔ اس نے اپنی حکومت کی حد شمال میں دریائے گنگا تک پھیلا دی تھی۔ اس نے کلنگا، جنوبی کوسلا اور اڑیسہ کا بہت سا علاقہ فتح کیا۔ اس نے پالا بادشاہ کو بھی شکست دی۔ چونکہ اس نے گنگا تک اپنی سلطنت قائم کر لی تھی اس لئے اس کا لقب گنگئی کونڈا چولا (فاتح گنگا) پڑ گیا۔ اس نے جاوا کے حکمراں پر بھی چڑھائی کی تھی۔ اس کا اپنا پایۂ تخت گنگئی کونڈا چولا پورم تھا۔ جہاں اس نے بہت سے مندر تعمیر کروائے۔ اس شہر کا نظام آب رسانی آپ اپنی مثال تھا۔

تاریخ دان اس خاندان کے بادشاہوں کو تمل ناڈو کا حقیقی معمار مانتے ہیں۔ راجہ راجیسورا مندر اس خاندان کی یادگار ہے۔ اس کی شکل "اہرام" سے ملتی جلتی ہے اور اس کی کئی منزلیں ہیں۔ اس عمارت کا کلس جو پچیس قدم اونچا ہے ایک ہی چٹان سے تراشا گیا ہے جس کا وزن تقریباً ۸۰ ٹن ہے۔

ان کے دور میں وید، پران، دھرم شاستر اور دوسرے علوم بھی پڑھائے جاتے تھے جس کے لئے کئی درس گاہیں قائم کی گئی تھیں۔ انہوں نے شمال میں چین تک مشرق میں جزائر شرق الہند اور مغرب میں مشرق وسطیٰ تک اپنے تاجر بھیجے۔

مدورے کے پانڈیا (۱۳۰۰ سے ۶۰۰ء) یہ وہ بادشاہ تھے جنہوں نے قیصر روم کے دربار میں اپنے سفیر بھیجے؛ جس کا اعتراف رومی تاریخ داں پلینی کرتا ہے۔ پانڈیا خاندان کی ایک شاخ چھ سو بعد مسیح سے ۹۰۰ بعد مسیح تک اور دوسری شاخ ۱۱۹۰ بعد مسیح سے ۱۳۱۰ بعد مسیح تک حکمراں رہی۔ دوسری شاخ کا سب سے مشہور بادشاہ سندر پانڈیا گزرا ہے جس کے دور میں اس خاندان کی حکومت کی عین جوانی تھی۔ اس نے چیرا اور ہوسیلا کو زیر کیا۔ لنکا اس کی عظیم سلطنت کا ایک صوبہ تھا۔ یہ اپنے آپ کو مہاراجہ دھی راجہ راجا پرمیشور کہلانا پسند کرتا تھا۔ چدمبرم کا مندر اور سری رنگم کا مندر اس خاندان کی عظمت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس خاندان کا خاتمہ ملک کافور کے ہاتھوں ہوا۔ جس نے ۱۳۱۰ میں ان پر چڑھائی کی تھی۔ مشہور سیاح مارکو پولو نے بڑے پرخلوص انداز میں اس علاقے کی خوش حالی، بڑائی اور امن کا تذکرہ کیا ہے۔ وصاف جو اس زمانے کا مشہور تاریخ داں تھا وہ بھی پانڈیا خاندان کے نظامِ حکومت اور امن کا تذکرہ کرتا ہے۔

چیرا خاندان

چیرا علاقہ جدید کیرالا کا علاقہ ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق یہ علاقہ تمل چیرا راجاؤں کے ماتحت تھا۔ اس خاندان کا ایک بادشاہ پیرمال سینٹ تھامس کے ہاتھوں عیسائی بن گیا تھا۔ چیرا نے فن تعمیر، نقاشی اور ادب کی سرپرستی کی اور اس زمانے میں ان فنون کے نادر نمونے عالم وجود میں آئے۔

تمل ناڈو اور مسلم دور

ہندپر مسلمانوں کے حملوں کی ابتدا ۷۱۱ عیسوی سے ہوئی جب کہ محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا تھا۔ پھر ۱۰۰۰ عیسوی میں محمود غزنوی کا حملہ بھی ہوا تھا اور محمد غوری نے ۱۱۸۵ء میں حملہ کیا تھا۔ مگر تمل ناڈو ان حملوں سے کسی صورت میں بھی متاثر نہ ہوا۔ ۱۲۹۶ء میں علاء الدین خلجی نے خود تمل ناڈو پر حملہ کیا تھا۔ اس کے بعد سلسلہ وار حملوں کی زد سے تمل ناڈو محفوظ نہ رہ سکا۔ ۱۳۱۰ء میں ملک کافور نے ورنگل فتح کیا۔ ۱۳۱۱ء میں اسی نے دوارا سمندر پر حملہ کیا۔ یہ علاقہ تمل ناڈو کے قریب کا علاقہ تھا۔ اسی سنہ میں تمل ناڈو کے قلب پر حملہ ہوا اور مدورے اس کی زد میں آ گیا۔ یہاں پانڈیا راجاؤں کی حکومت تھی۔ سندر پانڈیا اور ویرا پانڈیا کی بالترتیب شکست کے بعد تمل ناڈو کسی کا نہ رہا۔

۱۳۲۱ء میں خسرو خان کا بیٹا مبارک شاہ تمل ناڈو پر قابض ہو گیا۔ پھر محمد تغلق کے دور میں تمل ناڈو دہلی سلاطین کا ایک صوبہ بن گیا۔ مدورے کے گورنر جلال الدین احسن شاہ کی بغاوت کے بعد مدورے دہلی کی حکومت سے آزاد ہو گیا اور اس طرح ۱۳۲۹ء میں مدورے سلطنت کی بنیاد پڑی۔

یہ حکومت ۱۳۷۸ء تک چلتی رہی اور اس کے مشہور حکمراں جلال الدین احسن شاہ، علاء الدین ادھن جی، غیاث الدین دھنکوئی تھے۔ ادھن جی اور دھنکوئی جیسے القاب ہی اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مقامی بادشاہوں نے مقامی ثقافت کو اپنانے کی کوشش کی تھی۔

۱۳۰۰ء میں وجیا نگر کا راجہ بُکّا اوّل نے مدورے پر حملہ کر دیا اور اس کے بعد یہ ریاست ختم ہو گئی۔ اس کے بعد کا زمانہ جمود کا زمانہ کہا جا سکتا ہے جس میں نہ ثقافت پروان چڑھی اور نہ ادب ترقی کر سکا۔ اور نہ تہذیب ہی ترقیوں کی جانب نگاہ ڈال سکی۔

مشہور تاریخ داں کا قول ہے کہ تمل ناڈو پر ملک کافور کے حملے کے بعد سے تمل تہذیب اور تمل ناڈو بیرونی تہذیب سے پہلو تہی نہیں کر سکا۔ اس کی انفرادیت کا خاتمہ بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے۔

تالی کوٹ کی لڑائی (۱۵۶۵ء) کے بعد وجیانگر کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور نائکوں نے مدورے میں نائک حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اور ان کی حکومت اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء تک چلتی رہی۔ چوں کہ نائک بھی وجیانگر حکمراں خاندان سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا تمل کلچر اور زبان کا احیا ان کے دورِ حکومت میں بھی تشفی بخش نہیں رہا۔ یہ علاقہ ریشہ دوانیوں کا شکار رہا۔

تمل ناڈو اور برطانوی راج

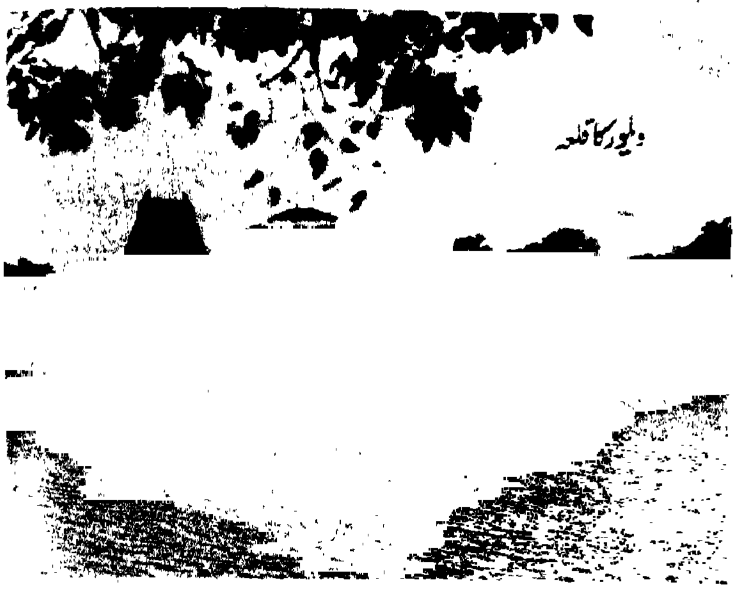
۱۷۴۰ء میں رابرٹ کلائیو کی آمد سے تمل ناڈو پر برطانوی تسلط کا آغاز ہوتا ہے۔ اس عہد میں کرناٹک پر مسلم نوابوں کی حکومت تھی۔ ۱۷۴۶ء سے ۱۷۵۷ء تک تین جنگیں ہوئیں جو تاریخ میں کرناٹک کی جنگوں کے نام سے مشہور ہیں۔ فرانسیسی اور برطانوی گورنروں نے سیاسی بالادستی کی کوششیں کیں۔ کرناٹک کے تاج کے لئے دو امیدوار تھے۔ ایک چندا صاحب اور دوسرے انوارالدین۔

فرانس کے گورنر ڈوپلے نے انوارالدین کو اپنا امیدوار بنایا۔ اور برطانوی گورنر کلائیو نے چندا صاحب کی مدد کی۔ انجام ان جنگوں کا یہ ہوا کہ برطانوی اقتدار کے لئے راہیں نکل آئیں۔ اور چندا صاحب کرناٹک کے نواب بن گئے۔ چندا صاحب نے انگریزوں کو کافی تجارتی مراعات دیں۔ اور اس طرح ان کے اقتدار کا راستہ صاف ہوتا گیا۔

میسور کی حکومت جب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے ہاتھوں آئی تو تمل ناڈو میں ترپاتور تک کا علاقہ سلطنت خداداد کی تحویل میں آگیا۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ وانم باڑی کا ایک حصہ اور دنیدرم بھی سلطنت خداداد میں شامل تھا۔ اس کے علاوہ جو کچھ علاقہ بچ گیا تھا وہ برطانوی گورنروں کے زیر اثر تھا۔ مگر بذاتِ خود ان کے کنٹرول میں نہیں رہا۔ یہاں والاجاہی نوابوں کی ہی حکومت تھی۔

۱۷۶۶ء سے ۱۷۹۲ء تک میسور میں تین جنگیں ہوئی اور اس میں تمل ناڈو کا وہ علاقہ جو سلطنت خداداد کے زیر اثر تھا انگریزوں کے ہاتھوں آگیا۔ کم ہی مدت میں یہ علاقہ انگریزوں کی مکمل تحویل میں آگیا اور "مدراس پریزیڈنسی" بن گیا۔ تمل ناڈو کا نام بدل گیا۔ یہ علاقہ اس طرح تمزگم سے کرناٹک۔ اور کرناٹک سے "مدراس پریزیڈنسی" ہو گیا۔

۱۸۰۶ء میں جنگ آزادی کی داغ بیل تمل ناڈو کے ویلور رجمنٹ نے ڈالی۔ اس رجمنٹ نے اس سن میں ویلور کے قلعہ میں اپنے انگریز افسروں کے خلاف بغاوت کی۔ جسے ویلور میوٹنی کے نام سے تاریخ یاد کرتی ہے یا غدر ویلور بھی کہتے ہیں۔



ویلور کا قلعہ

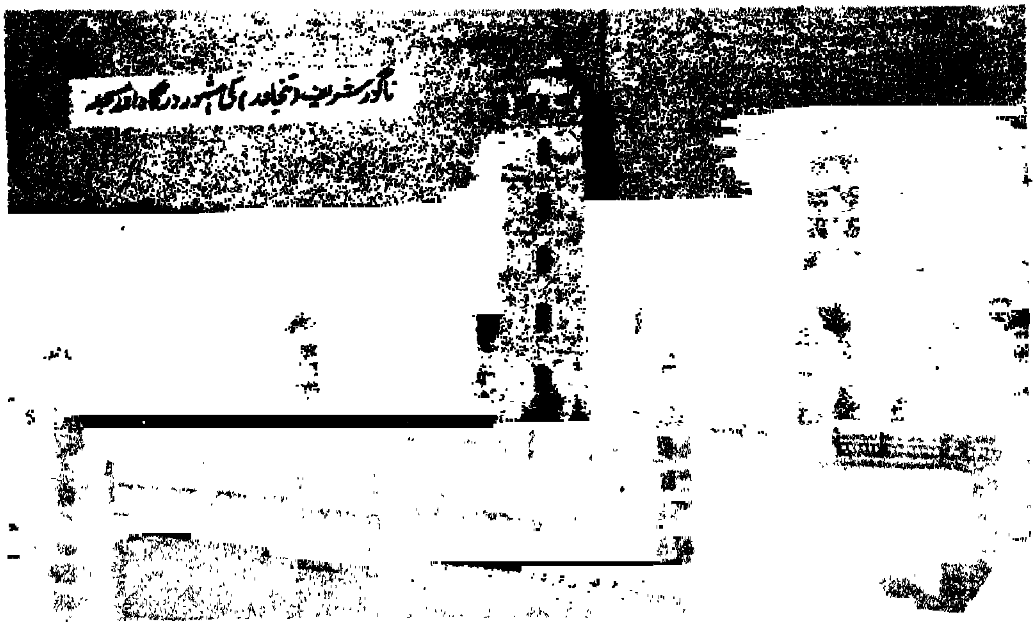
۱۸۵۷ء کی تاریخ تمل ناڈو کے جانبازوں اور شہیدوں سے بھی بھری ہوئی ہے۔ اس کی تفصیلات کا یہ محل نہیں ہے۔ مختصر طریقہ پر کہا جائے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہند کی جنگِ آزادی میں کٹ بومن کی خدمات سنہری الفاظ میں لکھی جا سکتی ہیں۔

اس جدوجہد آزادی میں تمل کے دو مشہور مجاہدین آزادی وی او چدمبرم اور سبرامنیم بھارتی شاعر انقلاب کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ مشہور مجاہدین میں آنجہانی کامراج شامل ہیں۔ آزادی ملی تو تمل ناڈو کے ہی ایک سپوت شری راج گوپال اچاری ہندوستان کے سب سے پہلے گورنر جنرل بنے۔ مشہور فلسفی ڈاکٹر رادھا کرشنن ہندوستان کے صدر رہ چکے ہیں۔

تمل ناڈو ۱۹۵۶ء تک مدراس پریزیڈنسی ہی رہا اور ۵۶ء کے بعد لسانی بنیادوں پر صوبوں میں تقسیم ہوئی تو مدراس پریزیڈنسی مدراس اسٹیٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس موقع پر مدراس علاقہ سے آندھرا کو الگ کر دیا گیا۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۷ء تک تمل ناڈو پر کانگریس پارٹی حکمراں تھی۔ شری کامراج اور شری بھکتاوتسلم بالترتیب وزرائے اعلیٰ رہے۔ ۱۹۶۷ء کے بعد دراوڑ منتر کزگم (D. M. K.) برسرِ اقتدار آئی۔ جس کے وزیر اعلیٰ آنجہانی انادورے رہے۔ ان کی موت کے بعد شری کروناندھی وزیر اعلیٰ بنے۔ ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں بھی ڈی ایم کے کو کامیابی حاصل ہوئی۔

ڈی ایم کے پارٹی میں پھوٹ پڑنے کے بعد پارٹی دو حصوں میں بٹ گئی اور ایم جی رامچندرن نے انا ڈی ایم کے کے نام سے ایک نئی پارٹی قائم کی۔ اور ۱۹۷۶ء میں تمل ناڈو میں صدر راج نافذ کر دیا گیا۔ اب ۱۹۷۷ء کے انتخابات کی گہما گہمی ہے۔





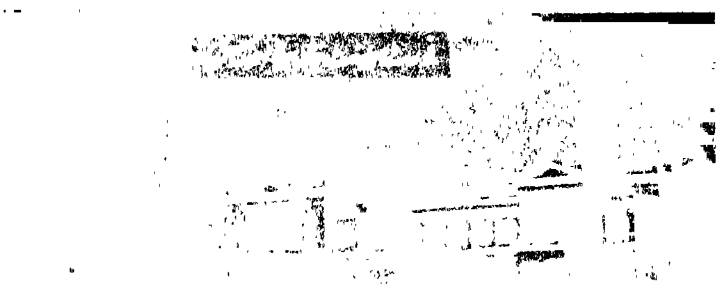
ایس-ایم جیات
تمل ناڈو پبلک سروس کمیشن
مدراس

تمل ناڈو کے قابلِ دید مقامات

تمل بولنے والوں کی اس ریاست کی تاریخ قبل مسیح سے کئی صدیوں پرانی ہے۔ چیرا، چولا اور پانڈیا راجاؤں کی یہ تاریخی دھرتی صدیوں پرانے مندروں اور تہواروں کی سرزمین ہے۔ یہاں زندگی پرسکون اور مطمئن نظر آتی ہے۔ فطرت کی فیاضانہ عطیات کے ساتھ یہاں کی تہذیبی، فنی اور روحانی اقدار کا حسین امتزاج تمل ناڈو کی وہ منفرد خصوصیت ہے جو اسے دوسری ریاستوں سے ممیز و ممتاز رکھتی ہے۔

مدراس وہ شہر ہے جو جدیدیت کے عصری تقاضوں کے باوجود آج بھی اپنا قدیم روایتی رنگ برقرار رکھے ہوئے ہے، ہندوستان کا سب سے بڑا چوتھا شہر ہے اور سیاحوں کے لئے ایک اہم اور قابل دید تفریحی مقام۔ اس کی قدیم بندرگاہوں سے عظیم چولا راجاؤں نے گیارہویں صدی میں ایران، عرب سیلون (سری لنکا) اور چین جیسے بیرونی ممالک سے تجارت کی تھی۔ سولہویں اور سترہویں صدیوں میں اس کی بندرگاہوں سے وجیانگر کے حکمرانوں نے ریشمی کپڑے اور صندل درآمد کئے تھے۔ آج مدراس تمل ناڈو کا پایۂ تخت ہے۔ پھر بھی وہ جنوبی ہند کا داخلی دروازہ کہلاتا ہے۔

فورٹ سینٹ جارج میں انگریزوں کی ایک تجارتی کوٹھی ۱۶۵۳ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس قلعہ کے اندر واقع بارکس میں ان دنوں رابرٹ کلائیو اور لارڈ ولزلی رہا کرتے تھے۔ اس قلعہ کے احاطہ میں واقع سینٹ میری گرجاگھر ہی جنوبی ہند میں واقع ایک قدیم گرجاگھر ہے۔ اسی چرچ میں سنہ ۱۷۵۳ء میں رابرٹ کلائیو کی شادی ہوئی تھی۔ فورٹ سینٹ جارج کے احاطہ میں ایک میوزیم (عجائب گھر) بھی ہے جو تاریخی اعتبار سے بہت ہی اہم ہے۔ یہاں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاریخی دستاویزات اور دیگر تاریخی معلومات کا ایک



قیمتی ذخیرہ محفوظ ہے۔

چیپاک محل نوابان کرناٹک نے اس محل کو سنہ ۱۷۶۸ء میں تعمیر کیا۔ نواب عمدۃ الامراء آخری نواب تھے جو اس محل میں رہائش پذیر تھے۔ سنہ ۱۸۰۱ء میں ان کی وفات کے بعد برطانوی حکومت نے اس محل پر قبضہ کرلیا۔ یہ عظیم الشان محل دو بلاکوں پر مشتمل تھا۔ جنوبی بلاک کا نام خالصہ محل تھا۔ جہاں پر کہ آج کل پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے دفاتر ہیں۔ اور محل کا شمالی بلاک "ہمایوں محل" کہلاتا تھا۔ ہمایوں محل میں ہی دربار سجا کرتا تھا۔ نواب غلام غوث خاں بہادر کی وفات (۱۸۵۵ء) کے بعد نوابی کا خاتمہ ہوگیا۔ اور چیپاک کی ساری زمین اور

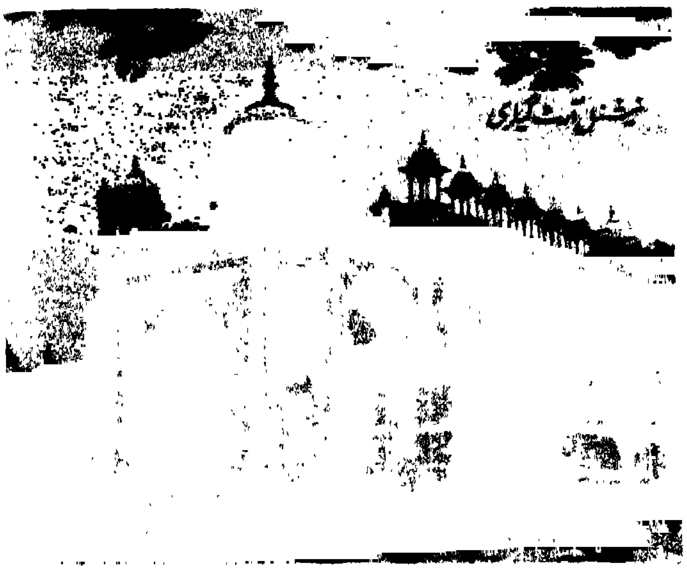


دوسری عمارتوں پر برطانوی حکومت نے قبضہ کرلیا اور ساری کی ساری جائداد فروخت کردی۔

سنہ ۱۸۵۵ء میں جب خاندان نوابانِ کرناٹک کے ممتاز افراد محض پرنس آف آرکاٹ کہلائے جانے کے حقدار گردانے گئے تو انھیں رہائش اور سکونت کے لئے آرکاٹ محل دیا گیا جو آج کل امیر محل کے نام سے مشہور ہے۔

پارتھاسارتھی اور کپالیسور مندر شہر مدراس کے دو عظیم الشان اور قدیم مندر — فن تعمیر کے بہترین اور دیدہ زیب نمونے جو اپنے عہد کے صناعوں کو حیاتِ جاوداں بخشتے ہیں۔ مندروں کے سالانہ تیوہار نہایت ہی شاندار اور اعلیٰ پیمانے پر منائے جاتے ہیں۔ آسمان کی نیلاہٹوں کو چھوتے ہوئے کپالیسور مندر کے کلس اپنی مرصع سازی کے لئے بیحد مشہور ہیں۔ پارتھاسارتھی مندر ایک قدیم اور خوبصورت مندر ہے جس کی تعمیر آٹھویں صدی میں پلو راجاؤں نے کی اور سولہویں صدی میں وجیا نگر حکمرانوں نے جس کی توسیع کی۔ اس مندر میں بھگوان کرشن کی پوجا ہوتی ہے۔

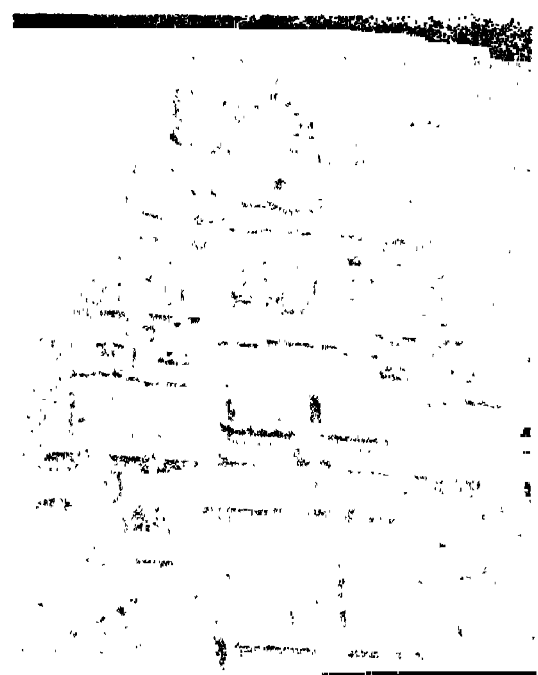
میوزیم یہ عجائب گھر سنہ ۱۸۵۱ء میں قائم کیا گیا۔ یہاں علم نباتات، حیوانات اور دھاتوں کے علم کے ساتھ ساتھ علم آثار قدیمہ اور علم الانسان کے مطالعہ کے لئے اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ عجائب گھر ایک توضیحی اور تشریحی راہ نما کا کام دیتا ہے۔ اسلحات اور آلاتِ حرب کا بھی کافی ذخیرہ ہے جو مختلف تاریخی ادوار کے فنِ حرب کا پتہ دیتے ہیں۔ ماقبل تاریخ اور وسطی



زمانے سے پہلے کے عجیب وغریب اوزار، روزمرہ کی چیزیں اور مختلف حکمراں اور سلاطین کے ادوار کے سکہ جات کا خاص ذخیرہ ہے۔

اس عجائب خانہ سے متصل ایک لائبریری ہے جو اسٹیٹ سنٹرل لائبریری یا کانی مرا پبلک لائبریری کہلاتی ہے۔ یہ ۱۸۹۶ء میں قائم کی گئی۔ یہاں چار قومی کتب خانوں میں ہے جن میں ہند کی ہر مطبوعہ کتاب کی ایک کاپی مفت بھیجی جاتی ہے۔

نیشنل آرٹ گیلری، مدراس ۲۷ نومبر ۱۹۵۱ء کو اس کا افتتاح ہندوستان کے سابق وزیر اعظم آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا جب کہ گورنمنٹ میوزیم کا جشن صد سالہ منایا گیا۔ اس گیلری کے افتتاح کا مقصد یہ تھا کہ جنوبی ہند کے فنونِ مصوری، نقاشی اور دستکاری کی شاہکار تخلیق کے ساتھ ساتھ عصرِ جدید کے شاہکار روغنی پینٹنگس کی نمائندگی بھی ہو۔ آرٹ گیلری میں راجستھانی اور راجپوت تصویریں، کانگڑا، مغل اور دکنی اسکول کے شاہکار روغنی تصویروں کا کافی ذخیرہ موجود ہے وہ مشہور و معروف فن کار جن کے



پارتھاسارتھی مندر، مدراس

لازوال اور لاثانی شاہکار ہیں۔ یہاں عقیدت مندان فن مصوری کے مطمع نظر بنے ہوئے ہیں۔ وہ ہیں روی ورما، دیوی پرساد رائے چودھری، عبدالرحمان چغتائی، بیرپودھ کمار چٹرجی۔ کے سی، ایس، پانیکر، اور جیمنی رائے۔

آرٹ گیلری میں روغنی تصاویر کے ساتھ ساتھ کانسی کے قدیم مجسموں کے شاہکار بھی ہیں۔ ان میں عالمی شہرت کا ترو ویلنگاڈو کا بھگوان نٹیسا کا مجسمہ بھی ہے۔

مامللا پورم (مہابلی پورم) پلو راجاؤں کے عہد کی یاد تازہ کرانے والی ایک تاریخی بندرگاہ ہے جو بیرونی مقامات کے ساتھ تجارت کے لئے ان دنوں مشہور تھی۔ ۱۲۰۰ سال پیشتر بنے ہوئے مندر آج بھی فن سنگتراشی اور



مہابلی پورم میں سنگ تراشی کے نادر نمونے

فن تعمیر کا لاثانی نمونہ ہیں۔ ساحل پر واقع بھگوان شیو اور وشنو کا مندر مرور ایام کے اثر سے بے نیاز آج بھی سیاحوں کو دعوت نظارہ دے رہا ہے۔ وہاں چٹان



سنگ تراشی کے نمونے مہابلی پورم

میں تراشیدہ نو غار ہیں۔ جن میں کرشنا منڈپ اپنی حقیقی ہیئت کے اعتبار سے قابل دید ہے۔ ان غاروں کے جنوب میں ایک واحد چٹان میں تراشیدہ پانچ چھوٹے مندر ہیں۔ جنہیں "پانڈو ارتھ" کہتے ہیں۔ پلو فن کاری اپنی پوری عظمت کے ساتھ یہاں جلوہ گر ہے۔ یہ وہ تفریحی مقام ہے جہاں، اندر تک، انسان کی بنائی ہوئی دنیا میں منتقل نظر آتی ہے۔ یہاں سیاحوں کی سہولت کے لئے ہوٹل اور قیام گاہیں بھی بنی ہوئی ہیں۔

نٹراج مندر (چدمبرم) جنوبی آرکاٹ میں واقع یہ مندر اپنی عالمی شہرت کی بنا پر قابل نظارہ ہے۔ یہ مندر بھگوان نٹراج کی نذر کیا گیا ہے



جو رقص کے دیوتا شیو کے روپ میں وہاں جلوہ افروز ہیں۔ یہ مندر فن سنگ تراشی کا وہ اعجاز ہے جس کی زیارت بھرت ناٹیم رقص کے دلدادگان اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

برہادیسور مندر (تنجاور۔ چولا راجاؤں کا ورثہ) راجہ راج اول کا بنایا یہ مندر سارے ہندوستان میں چولا فن تعمیر اور سنگ تراشی کے لئے مشہور ہے



انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا نے اس مندر کے متعلق لکھا ہے کہ:

"یہ ہندوستان کا عظیم الشان مندر ہے"

مندر کے داخلی دروازے کے بالمقابل نصب کیا "نندی" (شیوجی کی سواری

بیل) کا مجسمہ اپنی جسامت کے اعتبار سے ہندوستان بھر میں دوسرے نمبر پر ہے۔ مندر کے اندرونی حصہ میں زیارت گاہ کے قریب ایک مینار ہے جس کی بلندی ۸۰ر۶۴ میٹر ہے۔ مینار کے اوپری حصے پر ایک کلس ہے جس کے اطراف پُر تکلف انداز میں نقش ونگاری کی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مینار کی تعمیر میں اہرامِ مصر کے ماہرین فن کی تکنیک کا استعمال ہوا ہے۔

نائیک راجاؤں کا محل مدورائی۔ ایک عظیم الشان عمارت جس کی تعمیر



نائیک راجاؤں نے کی۔ یہ محل فن تعمیر اور نقاشی کے لحاظ سے قابل دید ہے۔ یہ کئی عمارتوں کا ایک مرکب ہے۔ جس میں عظیم الشان غلام گردشیں اور وسیع ترین ہال ہیں۔ اس کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر یہ مقام قابل دید ہے۔

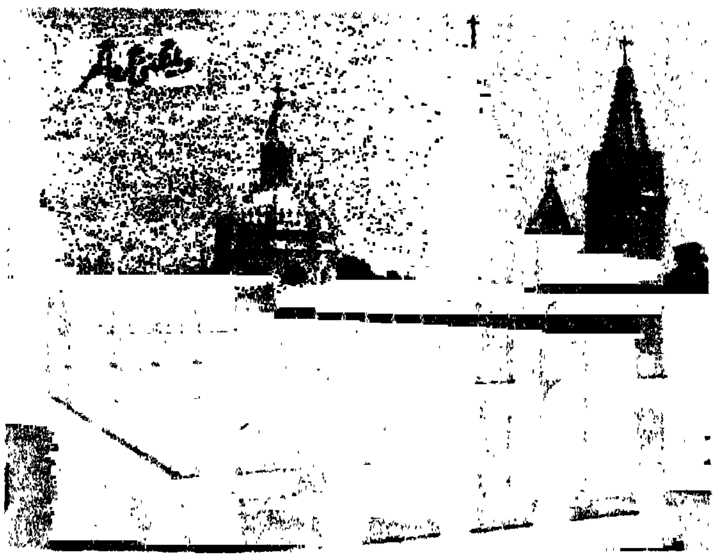
رامیسورم (راما ناتھ پورم ضلع) شمال میں بنارس اور جنوب میں رامیشورم



ہندوؤں کی دو مذہبی زیارت گاہیں ہیں۔ رامیسورم مندر سترہویں صدی میں تعمیر کیا گیا۔ یہ ایک دل نشیں اور پُر تاثر مندر ہے۔ سنگتراشی کا ایک رفیع الشان نمونہ ہے اس کی عظیم الشان غلام گردشیں قابل دید ہیں۔ اس کے مرقع ستون نقاشی ندرتِ فکر، جدت طرز، اور دیدہ ریزی سے بنائے ہوئے نمونوں کے لئے قابل فکر اور حیرت انگیز ہیں۔

کورٹالم آبشار (ترنیلویلی ضلع) اپنے مناظر کی دلکشی اور پانی کی کیمیائی اور اکسیری تاثیر کے باعث یہ آبشار ایک مشہور صحت گاہ اور سیاحوں کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ گرما کے اختتام پر جون سے اکتوبر تک یہاں سیاحوں اور عوام کا ایک جم غفیر لگا رہتا ہے۔

ویلنگنی گرجاگھر تنجاور سے ۱۵۰ کیلومیٹر کی دوری پر واقع یہ مشہور کیتھولک گرجا گھر ہے جو " اور لیڈی آف ہلیتھ " کی نذر ہے۔ تمام عقائد کے لوگ یہاں ہزاروں کی تعداد میں آتے ہیں۔ اور اپنی دلی مرادیں پاتے ہیں۔ یہ ایک مذہبی زیارت گاہ ہے۔

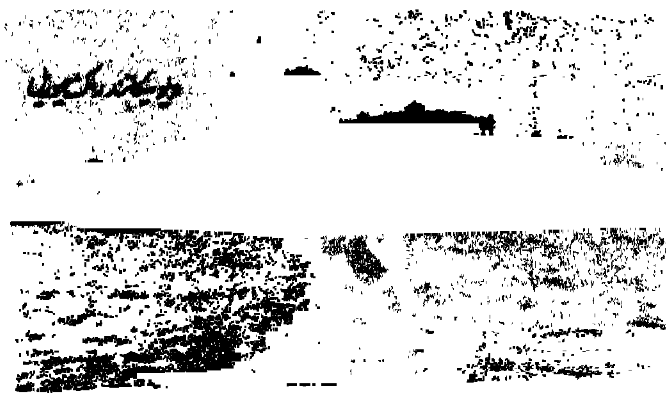


راس کماری — (ایک الہامی اور ملکوتی راس) مہاتما سوامی اور سوامی دویکانندا جیسے بڑے مفکروں کے لئے راس کماری امن اور سکون کی تلاش کی آخری منزل رہی۔ خلیج بنگال، بحیرۂ عرب اور بحر ہند کا سنگم اپنی مناظری خوبصورتی اور دل کشی کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ افق کے پس منظر میں طلوع آفتاب، غروب آفتاب اور طلوع مہتاب کے مناظر اسی ایک تفریح گاہ میں ان کی تمام تر دلکشی اور جامع خوبصورتی کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔

دیوی کماری مندر کنواری دیوی کنیا کماری کے نام پر نذر کیا گیا یہ مندر سیاحوں کے لئے قابل نظارہ مقامات میں سے ہے۔ روایت ہے کہ دیوی پاروتی دیوی کنیا کے روپ میں نفس کشی کی خاطر ریاضت کر رہی تھی۔ تاکہ بھگوان شیو کا ہاتھ تھام سکے۔ یہ مقدس مقام اتحاد اور تقدس کی

نشاندہی کرتا ہے۔

ویویکانند میموریل کنیاکماری مندر کے جنوبی مشرقی حصے میں ساحل سمندر سے کچھ فاصلے پر دو چٹانیں سطح سمندر سے اوپر اٹھی دکھائی دیتی ہیں۔ ان ہی دو چٹانوں میں سے کسی ایک پر سوامی ویویکانند گہرے مراقبے میں بیٹھے تھے اور کنواری دیوی کنیاکماری کے فیض سے ہی سوامی وویکانند مجاہد وطن بن



گئے۔ وہ چٹان وویکانند راک کہلاتی ہے۔ اسی چٹان پر ۱۹۷۰ء میں وویکانند راک میموریل بنائی گئی۔ اس یادگار میں سوامی وویکانند کا مجسمہ نصب کیا گیا ہے۔

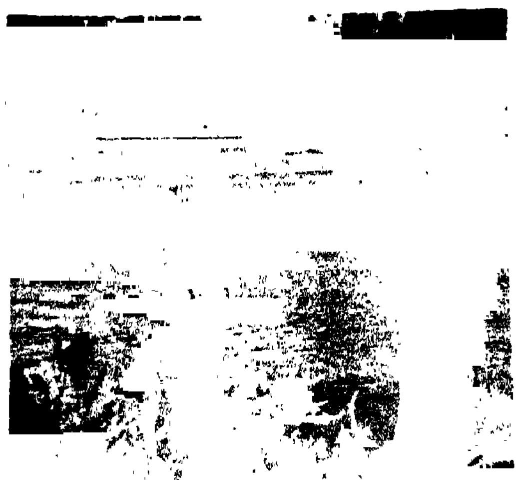
قلعہ ترچناپلی ترچناپلی کے شہر بالکل وسط میں واقع قلعہ سطح زمین سے ۲۷۵ قدم اونچا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں لڑی گئیں کرناٹک کی جنگوں کا محافظ اور شاید یہی تاریخی قلعہ ہے۔ قلعہ کے ایک حصہ میں بھگوان ونایگا (شری گنیش جی) کا مندر ہے جہاں تک پہنچنے کے لئے چٹان میں تراشیدہ



۳۴۴ زینے طے کرنے پڑتے ہیں۔ قلعہ کے احاطہ میں واقع سو ستونوں کا ہال آج بھی تقریبات یا منڈلیوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اسی قلعہ میں واقع دو مندر چھٹی اور ساتویں صدی کے ہیں۔ نیچے مندر کا ایک وسیع تالاب ہے اور اس سے کچھ ہی فاصلے پر وہ مکان ہے جہاں لارڈ کلایو رہا کرتا تھا۔

شری میناکشی مندر (مدورائی ضلع) مستطیل نما یہ مندر جس کی لمبائی تقریباً ۸۴۷ قدم اور چوڑائی ۷۹۲ قدم ہے۔ ہندوستان کے قدیم ترین مندروں میں سے ایک ہے۔ یہ مندر در حقیقت دو چھوٹے مندروں پر مشتمل ہے۔ جنوب میں واقع مندر شری میناکشی کا اور دوسری طرف واقع خود بھگوان سندریشور کا۔ اس مندر میں قابل ذکر مقام ہزاروں ستون والا دربار ہے جس کا ہر مرصع ستون اپنی نقاشی کے لئے آج بھی مشہور ہے۔ بیرونی غلام گردش میں مدورا کے عدیم المثال موسیقی کے ستون ہیں جس کے ہر ستون کے چھونے سے موسیقی کی ایک نئی لے نکلتی ہے۔

اوٹاکمنڈ — پہاڑی تفریح گاہوں کی ملکہ۔ تمل ناڈو کی اہم پہاڑی تفریح گاہ جو پہاڑی تفریح گاہوں کی ملکہ کہلاتی ہے نیلی پہاڑیوں کا یہ سلسلہ اس عظیم سطح مرتفع کا ایک اہم جزو ہے جو مشرقی اور مغربی گھاٹ کے سنگم پر وقوع پذیر ہے۔ ڈوڈابیٹا نیلی پہاڑیوں کی سب سے بلند چوٹی ہے جس کی بلندی



اوٹی جھیل کا ایک منظر

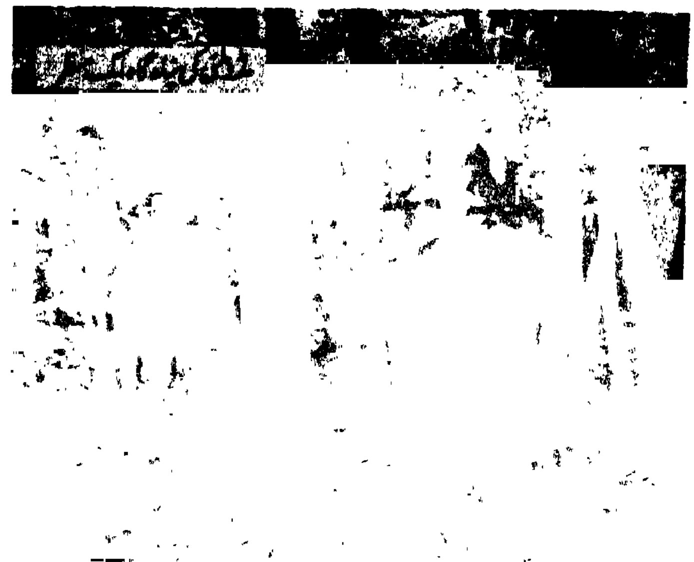
۲۶۳۳ میٹر ہے۔ شاندار اور خوبصورت جھیل بوٹانیکل گارڈن کافی اور چائے کے باغات۔ اوٹی کے دلچسپ اور قابل دید مقامات ہیں۔ چھٹیاں گزارنے کے لئے یہ ایک خطۂ جنت ہے۔ یہ ایک قدرتی شکارگاہ بھی ہے۔

کوڈائی کنال ایک خوبصورت اور دلکش پہاڑی تفریح گاہ جنوب کی شہزادی — اوٹی سے بھی زیادہ قابل نظارہ اور پُرسکون پہاڑی تفریح گاہ۔ فطرت یہاں اپنا بیش بہا سرمایہ دل کھول کر لٹا چکی ہے۔ جنگلات سے بھرے ڈھلوان، عظیم الشان بھاری چٹانیں، مترنم آبشار اور جھرنے، خوبصورت اور دلکش جھیل یہ ایک مقبول عام صحت گاہ ہے۔

ایرکاڈ — جنوب کا نگینہ، ضلع سیلم میں واقع ایک اور پہاڑی تفریح گاہ۔ اس پہاڑی مقام کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ یہاں موسم سرما کی چبھتی

ہونی سردی کا احساس نہیں ہوتا۔ یہاں کا موسم خوشگوار اور فرحت بخش ہوتا ہے اور سال کے کسی بھی موسم میں اس تفریح گاہ کی سیر کی جا سکتی ہے۔

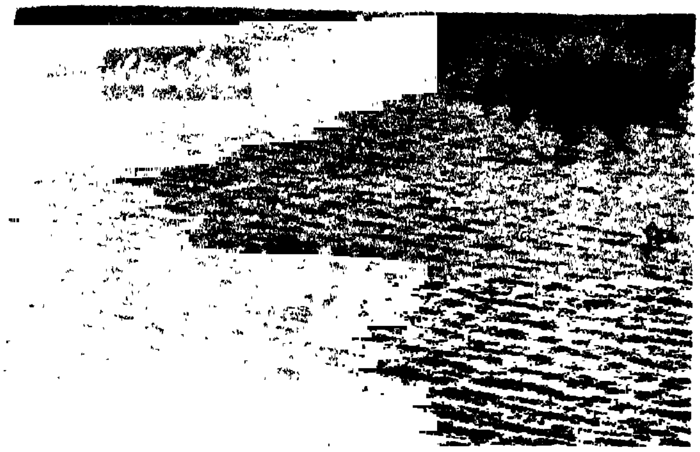
ویدانتا نگل اور مڈوملئی پناہ گاہیں تمل ناڈو کے چند مشہور و معروف پناہ گاہوں میں ویدانتا نگل اور مڈوملئی کی پناہ گاہیں قابل ذکر ہیں۔ ہندوستان بھر میں ویدانتا نگل ہی ایک قابل نظارہ آبی پرندوں کی افزائش نسل کا مرکز ہے۔ آبی پرندوں کی اس پناہ گاہ میں سالانہ بیس سے تیس ہزار



نقل و مکان کرنے والے موسمی پرندے رہائش پذیر ہوتے ہیں اور انڈے دیتے ہیں۔

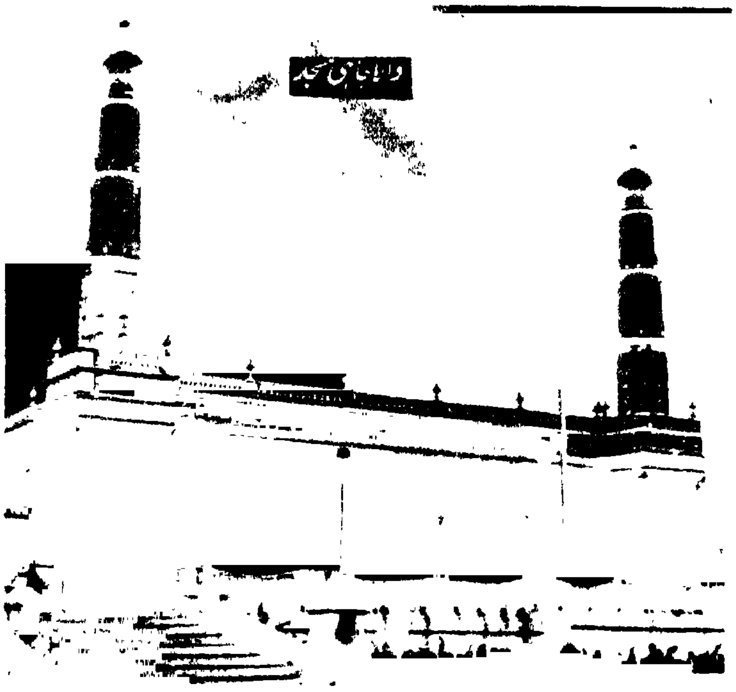
مڈوملئی پناہ گاہ نیلگری میں واقع ہے۔ ہر سال دنیا کے بیرونی ممالک سے کئی سیاح اس پناہ گاہ کی زیارت کو آتے ہیں۔ کئی اقسام کے ہرن، گلہریاں، لنگور، بھینسے اور ہاتھیوں کے علاوہ ایک قابلِ امتیاز اضافہ جو یہاں دیکھنے کو ملتا ہے وہ ہے گوڑ، یہ بیل کی ایک خاص نسل ہے۔ بیرونی ممالک سے کئی حیاتیات داں اس گوڑ کی عادات پر تحقیق کرنے کے لئے یہاں آتے ہیں۔

تمل ناڈو۔ قدیم مندروں اور ہندو تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہوتے کے باوجود یہاں ہر مذہب اور ہر عقیدہ کے لوگ رہتے ہیں۔ اور ان کی عبادت گاہیں موجود ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے کوئی ضلع ایسا نہیں جہاں کہ مساجد اور درگاہیں نہ ہوں۔ ان مساجد میں بعض تاریخی اہمیت کے حامل ہیں اور بعض اپنے فن تعمیر کے لئے مشہور ہیں۔ اولیائے کرام اور رشید ایانِ اسلام اپنے تبلیغی مشن کے سلسلے میں یہاں بھی تشریف فرما ہوئے تھے اور بعضوں نے یہیں پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کے مزارات شریف اور مقابر آج بھی ہزاروں عقیدت مند اور زائرین کے مطمحِ نظر بنے ہوئے ہیں — اولیاء کرام کی زیارت گاہوں میں چند قابل ذکر درگاہیں یہ ہیں :- درگاہ حمید اولیا کا یچی پورم۔ درگاہ طبلِ عالم ترچناپلی۔ درگاہ قادر اولیاء ناگور۔ درگاہ سید موسیٰ



شاہ قادری مدراس۔ ان زیارت گاہوں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ہر مذہب اور ہر عقیدہ کے لوگ بکثرت جوق در جوق آتے ہیں اور اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

مساجد میں مسجد والاجاہی مدراس جو بڑی مسجد کے نام سے مشہور ہے قابل ذکر ہے۔ نوابان کرناٹک کی بنوائی ہوئی یہ مسجد تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں عیدین کی نمازیں ہوتی ہیں۔ اس کے وسیع احاطہ میں میلاد النبیؐ کے جلسے اور غوث پاک کی ولادت کے تذکرے ہوتے ہیں۔ سرکاری مہمان خصوصی



اور مسلم سفیروں کے لئے مدراس میں قیام کے دوران اسی عبادت گاہ میں نماز کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس مسجد سے متصل قبرستان میں کئی عظیم شخصیتیں مدفون ہیں جن میں مولانا بحر العلوم جو فرنگی محل کے علماء میں سے قابلِ ذکر ہیں۔ دیگر اہم ادبی شخصیتوں میں ڈاکٹر عبدالحق جنہیں جنوب کا بابائے اردو کہا جاتا ہے قابل ذکر ہیں۔

غیاث اقبال
گورنمنٹ ٹی ایم کالج
گرہام



تمل ناڈو کی پیش رفت

آزادی کے بعد ہندوستان کی تعمیر نو کا کام شروع ہوا۔ صنعت و حرفت، تجارت و کاروبار، زراعت، گھریلو دستکاریاں، غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے کو بہتر بنانے کی کوششیں کی گئیں اور ان کوششوں کے نتیجے میں ہم نے آگے قدم بڑھائے ہیں۔ پہلے نہایت معمولی معمولی چیزیں انگلینڈ اور دوسرے ملکوں سے درآمد ہوتی تھیں۔ اب ہم نہایت جدید اور عمدہ سامان، آلات، مشینیں اور دوسرے ملکوں کو برآمد کرنے لگے ہیں۔

گذشتہ تیس برسوں میں تمل ناڈو میں جو پیش رفت ہوئی ہے اس کا مختصر جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ریاستوں میں مغربی بنگال اور مہاراشٹر کے بعد تمل ناڈو کا نمبر تیسرا ہے۔ بجلی کی دستیابی، ریاستی حکومتوں کے ذریعہ مختلف سہولتوں کی فراہمی، مدراس بندرگاہ کی سہولت کے ساتھ ساتھ سڑک اور ریل کے ذریعے نقل و حمل کی سہولتوں نے اس ریاست کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے ان کے علاوہ مرکزی حکومت کی فراخ دلانہ امداد نے بھی اس ریاست کو صنعتی لحاظ سے آگے بڑھانے میں اہم حصہ لیا ہے۔ ذیل میں ان کارخانوں کا ذکر کیا گیا ہے جو مرکزی حکومت نے قائم کئے ہیں۔

نیویلی لگنائٹ پروجیکٹ

تقریباً ۲۴ ارب روپے کے سرمایے سے قائم شدہ یہ پروجیکٹ ریاست کے اولین کارخانوں میں سے ایک ہے۔ اس پروجیکٹ کے چار حصے ہیں۔ (۱) کان کنی۔ (۲) بجلی کی فراہمی (۳) کیمیادی کھاد تیار کرنے کا کارخانہ اور گھریلو ایندھن تیار کرنے کا عمل اور کاربونائزیشن پلانٹ۔ لگ بھگ ساٹھ لاکھ ٹن سالانہ لگنائٹ نکالا جاتا ہے جو بجلی پیدا کرنے، کسانوں کے لئے کھاد (یوریا) اور گھریلو ایندھن اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لگنائٹ سے بہت سی ذیلی چیزیں، کول تار، کاربولک ایسڈ، پولی ویلینٹ فنال اور آرتھو کریسول تیار کی جاتی ہیں۔

انٹگرل کوچ فیکٹری

پیرامبور۔ ۲۵ کروڑ کے سرمایے سے قائم اس کارخانے میں لگ بھگ ۱۱ ہزار افراد کام کرتے ہیں۔ اس کارخانے میں ہر قسم کے مسافر گاڑی کے ڈبے تیار کئے جاتے ہیں۔ مشہور اور اہم ایرکنڈیشنڈ مسافر گاڑیوں کے ڈبے اس کارخانے میں تیار ہوتے ہیں۔

مسافر گاڑیوں کے تقریباً ۶ سو ڈبے ہر سال تیار ہوتے ہیں۔ برما، تھائی لینڈ، تائیوان، زمبیا، اور فلپائن وغیرہ میں یہ ڈبے برآمد کئے گئے ہیں۔ سالانہ پیداوار کا تخمینہ ۱۲۴۰ کروڑ روپیہ ہے۔

سرجیکل انسٹرومنٹس پلانٹ، مدراس

۵ کروڑ کی لاگت کے اس کارخانے میں جراحی کے آلات تیار ہوتے ہیں۔ اس کارخانے سے ہر سال ۲½ لاکھ آلات جراحی تیار کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

ہندوستان ٹیلی پرنٹرس لمیٹڈ

لگ بھگ ۱ کروڑ کے سرمایے سے تیار شدہ اس کارخانہ میں ۸½ ہزار ٹیلی پرنٹر ہر سال تیار کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ ملک کے اخباروں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے علاوہ اب یہ ٹیلی پرنٹر دوسرے ملکوں کو بھی برآمد کئے جا رہے ہیں۔ چند پرزوں کے علاوہ باقی سارے پرزے مقامی طور پر تیار ہوتے ہیں۔

ہندوستان فوٹو فلمز مینوفیکچرنگ کمپنی، اوٹاکمنڈ

۱۴ کروڑ کے سرمایے سے قائم اس کارخانے میں سائنس فلمیں اور فوٹو گرافی کی فلمیں تیار ہوتی ہیں۔ فوٹو گرافی کا برومائڈ پیپر بھی تیار ہوتا ہے۔ معالجہ میں استعمال ہونے والی ایکس رے فلمیں بھی تیار کی جاتی ہیں۔

اس کارخانے میں تیار شدہ رنگین فلمیں بہت کامیاب ثابت ہوئی ہیں اور ہماری فلمی صنعت کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں۔

ہائی پریشر بوائلر پلانٹ، تروچراپلی

(سرمایہ تقریباً ۲۶ کروڑ روپے)

یہ کارخانہ بھارت ہیوی الیکٹریکلز لمیٹڈ کے چار کارخانوں میں سے ایک ہے۔ کوئلے سے بجلی تیار کرنے والے کارخانوں کے لئے بھاری دباؤ والے بوائلر اور والو تیار کئے جاتے ہیں۔

ہیوی وہیکلز فیکٹری، آوادی

اس کارخانے میں فوج کے کام آنے والے ٹینک تیار کئے جاتے ہیں۔ پہلا وجنتا ٹینک ۲۹ دسمبر ۱۹۶۵ء کو تیار ہوا تھا۔ ٹینک کے علاوہ فوجی ضرورتوں کی بھاری گاڑیاں بھی بنتی ہیں۔

منالی میں تیل صاف کرنے کا کارخانہ اور مدراس فرٹی لائزرز (کیمیاوی کھاد تیار کرنے والا کارخانہ) مدراس کے نزدیک واقع ہے۔

ریاستی حکومت کے قائم کردہ کارخانے

ریاستی حکومت نے بڑے اور اوسط قسم کے کئی کارخانے کھولے ہیں جس میں لوہے کا کارخانہ ارکونم میں (کاسٹنگ پلانٹ) اور النگولم میں سمنٹ کا کارخانہ قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ریاستی حکومتوں نے وقتاً فوقتاً کئی طرح کے پروجیکٹ شروع کئے ہیں۔

نیلگری اور انا ملائی

میں سنکونا کی کاشت کی جاتی ہے اور کونین تیار کی جاتی ہے۔

مشین سے اینٹ تیار کرنے کا کارخانہ

سقیر و مز سہائی۔ ۷۰ لاکھ روپے کی لاگت کے اس کارخانے میں ۶۶ ہزار اینٹیں روزانہ تیار کی جاتی ہیں۔ اب یہ کارخانہ تمل ناڈو سیرامکس کے زیر انتظام ہے۔

گورنمنٹ ٹی پروجکٹ۔ کونور نیلگری

یہ پروجکٹ برما سے واپس آئے تارکین وطن کو بسانے اور روزگار مہیا کرنے کے لئے شروع کیا گیا ہے۔ اس اسکیم کے تحت نیلگری کے ۱۵۰۰ ہیکٹر رقبے میں چائے کی کاشت کا کام شروع کیا گیا ہے۔

مدراس فرٹیلائزر لمیٹڈ۔ مدراس

امونیا، یوریا اور دوسری کیمیاوی کھاد تیار کرنے کے لئے کھولا گیا ہے۔ سدرن بورکس لمیٹڈ، چنگل پٹ، ۱۵ ہزار ٹن بورکس اور تین ہزار ٹن بورک ایسڈ تیار کرنے کی صلاحیت کا کارخانہ ہے۔

پرائیویٹ سکٹر

مدراس کا صنعتی علاقہ تیل صاف کرنے اور کیمیاوی کھاد تیار کرنے والے کارخانوں کے قیام کی وجہ سے بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اس علاقہ میں ایک بہت بڑا اپٹرو کیمیکلز کمپلکس قائم ہوا ہے۔ سیلم میں جب اسپات کا کارخانہ کھل جائے گا تو سیلم اور میٹور کا پورا علاقہ بہت ترقی کر جائے گا۔ اس علاقے میں اب بھی بہت سی فیکٹریاں قائم ہیں جو کاغذ، کیمیاوی اشیاء، المونیم، پلاسٹک، فائر برکس اور کپڑے تیار کرتی ہیں۔ ترچراپلی میں آرڈی ننس فیکٹری کے علاوہ وناسپتی، الیکٹرک میٹر اور کپڑے کے علاوہ کئی دوسری چیزیں بنتی ہیں۔ ترناویلی ضلع میں سمنٹ، کیلشیم کاربائڈ کاسٹک سوڈا، دھاگہ اور کاغذ تیار کرنے کے کارخانے ہیں۔ پرائیویٹ اور پبلک سکٹر میں جو کارخانے قائم ہیں ان کی مجموعی پیداوار اور تفصیل ذیل کے گوشوارے میں درج ہے۔

موٹر گاڑیاں وغیرہ

۱۔ موٹر گاڑیاں اور ٹریکٹر وغیرہ تیار کرنے والے کارخانوں کی تعداد ۴

۲۔ موٹر گاڑیوں کے معاون پرزے تیار کرنے والے کارخانوں کی تعداد ۳۳

۳۔ ۳۱ مارچ ۱۹۷۴ء تک تمل ناڈو میں موٹر وہیکلز کی تعداد کا گوشوارہ حسب ذیل ہے:-

کاریں :	۴۸۹۳۹
ٹیکسی :	۹۲۲۲
جیپ :	۵۸۳۰
بسیں :	۹۴۳۹
آٹو رکشا :	۳۰۰۶
مال بردار موٹر گاڑیاں :	۲۱۴۶۲
موٹر سائیکل اور اسکوٹر :	۵۲۹۵۶
کل میزان :	۱۵۵۰۹۰

سمنٹ کی صنعت

۱۔ سمنٹ سب سے پہلے ۱۹۰۴ء میں مدراس کے قریب تیار کیا گیا۔ اور اس کے بعد ۱۹۱۴ء میں ایک مستحکم سمنٹ کی صنعت کا قیام عمل میں آیا۔

۲۔ تمل ناڈو میں سمنٹ کی صنعت کے کارخانوں کی تعداد ۷

۳۔ سمنٹ کی صنعت کے کل ۵۰ کارخانے ہیں جن میں آٹھ کارخانے پبلک سیکٹر میں ہیں جن میں سے ایک تمل ناڈو میں ہے۔ اس کا نام ہے۔ "تمل ناڈ سیمنٹس" ۱

۴۔ سمنٹ تیار کرنے والے سب سے بڑے کارخانے ۲

(الف) ڈی انڈین سمنٹ لمیٹڈ مدراس

(ب) ڈالمیا سمنٹ (بھارت) لمٹیڈ، ڈالمیاپورم مدراس

مصنوعی ریشے کی صنعت

تمل ناڈو میں مصنوعی ریشے کے کارخانے کا نام

نائلن کا تار ملا ہوا ریشہ

(الف) دی تمل ناڈو انڈسٹریل ڈولپمنٹ کارپوریشن لمٹیڈ مدراس

۱۰،۲ ملین کلوگرام مصنوعی ریشہ تیار کرنے کے اجازت نامے جاری کئے۔

نائلن ٹائر کورڈ

(الف) شری رام فائبرز لمٹیڈ نئی دہلی (مدراس۔ تمل ناڈو)

۲۱۰۰ ملین کلوگرام مصنوعی ریشہ تیار کرنے کی لائسنس یافتہ صلاحیت۔

کاغذ کی صنعت

(الف) پرائیویٹ سکٹر میں کاغذ اور گتے تیار کرنے والے کل ۵۹ مل ہیں ان میں سے تین مل تمل ناڈو میں ہیں۔

(ب) تمل ناڈو میں رعین کے زمرے کی لگدی تیار کرنے والا ایک مل قائم ہے۔

(پ) تمل ناڈو میں سیشاسائی پیپر اینڈ بورڈ لمیٹڈ، پوسٹ آفس کادیری

ضلع سیلم (فیکٹری کی جائے وقوع: پلی پلایام، ارودٹ) نامی ایک بڑی مل ہے جس میں ۳۵۰۰۰ ٹن کاغذ سالانہ تیار کرنے کی صلاحیت ہے۔

لگدی (ریئن گریڈ)

ساؤتھ انڈیا وزکوز لمیٹڈ، رلیس کورس (کوئمبتور) میں سالانہ ۲۲۵۰۰ ٹن لگدی (ریئن گریڈ) کی تیار ہوتی ہے۔

پیٹروکیمیکلز انڈسٹری

ایرومٹیکس (خوشبودار) نفتہ کو صاف کرکے بنایا جاتا ہے۔ اور یہ ایک اور استعمال نفتہ کا ہے۔ ایرومٹیکس، مصنوعی ریشے کی تیاری، اعلیٰ درجے کی گیسولین وغیرہ تیار کرنے کے کام میں آتا ہے۔

نفتہ پرمبنی نئی صنعتیں: ان صنعتوں کے چار کارخانوں میں سے ایک کارخانہ تمل ناڈو کی راجدھانی مدراس میں ہے۔

پیٹرولیم کی صنعت

(الف) تیل صاف کرنے کے کل نو کارخانے ہیں ان کے علاوہ دو زیر تعمیر ہیں۔ اور بارہویں کارخانے کی تعمیر کا منصوبہ تیار ہو چکا ہے۔ ان میں سے چار کارخانے پرائیویٹ سکٹر میں ہیں۔ اور پانچ پبلک سکٹر میں۔ ان میں سے ایک مدراس میں واقع ہے اور یہ کارخانہ تیل صاف کرنیوالی ایک کمپنی کی ملکیت میں ہے۔

(ب) انڈین آئل کارپوریشن لمیٹڈ نے 'لیوب' کی آمیزش کرنے والا ایک پلانٹ مدراس میں لگایا ہے اور اپنے ایک ڈرم پلانٹ کو بھی مدراس میں ترقی دی ہے۔

(پ) مدراس ریفائنریز لمیٹڈ (رجسٹرڈ آفس اور ریفائنری: منالی مدراس) یہ ریفائنری دسمبر ۱۹۶۵ء میں قائم کی گئی تھی اس نے جون ۱۹۶۹ء میں تیل صاف کرنے کا کام شروع کیا۔ حکومت ہند (اس کے حصص سب سے زیادہ ہیں) نشینل ایرانیئن آئل کمپنی، اور ایم کو انڈیا کا مشترکہ پروجکٹ ہے۔ اور ان تینوں کی مشترکہ کوششوں سے قائم ہوا ہے۔ مدراس ریفائنری اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ وہ خلیج فارس کا ڈیریس خام تیل ۲/۵ ملین ٹن سالانہ صاف کرے گی۔

اس کی مختلف مصنوعات ہیں مثلاً موٹر گیسولین، سپیریئر کیروسین، نفتہ، ہائی اسپیڈ، ڈیزل آئل، لائٹ ڈیزل آئل، جیٹ فیول فرنیس آئل، محلول پیٹرولیم گیس اور سلفر وغیرہ۔

تیل صاف کرنے کی سالانہ صلاحیت: ۲/۵ ملین ٹن
مصنوعات کی پیداوار ۲/۳ ملین ٹن
جو ۱۴۱۹/۷ ملین روپے کی بقدر ہوتی ہے۔

زرعی پیداوار سے متعلق صنعتیں

ناریل کے ریشے کی صنعت ۱۔ ناریل کے ریشے کی صنعت کا مرکز زیادہ تر کیرلا کا ساحلی علاقہ ہے۔ پھر بھی چند برسوں میں وہ دوسری ریاستیں جہاں ناریل کی پیداوار ہوتی ہے انہوں نے بھی اس منافع بخش صنعت میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔ تامل ناڈو میں ناریل کے ریشے سے متعلق مختلف نوعیت کے کارخانے ہیں۔

۱۔ رسی بٹنے والے کارخانے : ۹۲۶
۲۔ ناریل کے ریشے کو بٹنے والے کارخانے: ۱۷
۳۔ ناریل کا ریشہ نکالنے والے کارخانے : ۴
۴۔ ربڑ ملا ہوا ناریل کے ریشے تیار کرنیوالا کارخانہ

۲۔ ہندوستان میں ناریل کے ریشے کی سالانہ پیداوار کا اندازہ ۱۵۵۰۰۰ ٹن ہے جس میں سے ۹۵ فیصد کیرلا میں تیار کیا جاتا ہے اور باقی ماندہ تمل ناڈو اور کرناٹک میں تیار ہوتا ہے۔

کاٹن اور کاٹن ٹیکسٹائل کی صنعت

۱۔ انڈین ایگریکلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا علاقائی کاٹن ریسرچ اسٹیشن کوئمبتور (تمل ناڈو) میں واقع ہے۔ جو کپاس کے پودوں (بریڈنگ) کی نشوونما کے پہلو پر تحقیقی کام کرتا ہے۔

۲۔ یکم جنوری ۱۹۷۴ء کو تمل ناڈو میں ملوں، تنصیب شدہ تکلیوں اور کرگھوں کی تعداد درج ذیل تھی۔

تنصیب شدہ تکلیوں کی تعداد (ہزاروں میں) ۳۱۶/۲۲، ۴ تنصیب شدہ کرگھوں کی تعداد ۱۰۵/۹ ملیں ۲۱۲

۳۔ نیشنل ٹیکسٹائل کارپوریشن لمیٹڈ، حکومت کے ماتحت ادارہ ۱۹۶۸ء میں قائم کیا گیا تھا اور اس کی شاخیں ہر ریاست میں قائم کی گئی تھیں چنانچہ تمل ناڈو میں بھی اس کی ایک شاخ موجود ہے۔

شکر کی صنعت

ہندوستان کی جو ریاستیں سب سے زیادہ گنا پیدا کرتی ہیں ان میں تمل ناڈو بھی ہے۔ ۷۴–۱۹۷۳ء کے دوران اس ریاست میں ۱۴۹/۱ ہزار ہیکٹر زمین میں گنے کی کاشت ہوئی۔

(ب) ۷۴–۱۹۷۳ء کے دوران تمل ناڈو میں شکر بنانے والی ۱۵ فیکٹریاں تھیں۔

(پ) تمل ناڈو میں ۷۳–۱۹۷۲ء میں ۲۳۶۹۹۲ ٹن شکر تیار کی گئی۔ حالیہ برسوں میں شکر کی پیداوار میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔

چائے کے باغات

تمل ناڈو میں بڑے پیمانے پر چائے کی کاشت ہوتی ہے۔ خصوصاً نیلگری کے علاقے کی چائے بہت مشہور ہے۔ تقریباً ۴۰ ہزار ہیکٹر زمین میں چائے کی کاشت ہوتی ہے۔

ریشم سازی کی صنعت

(الف) تمل ناڈو میں کچا ریشم بنانے کی صنعت کوئمبتور اور نیلگری، سیلم، ترونلویلی، اور دھرم پوری میں قائم ہے۔ اس صنعت کے ذریعے تقریباً ۳۶۰۰۰ ہزار افراد کو روزگار ملتا ہے۔

(ب) سنٹرل سلک بورڈ جہاز پر سال کے لدان سے قبل مال کا معائنہ کرتا ہے۔ معائنے کے لئے درکار سہولتیں علاقائی دفاتر کے ذریعہ فراہم کی جاتی ہیں۔ چنانچہ ۱۴۲، اسیٹ مادا اسٹریٹ، مالاپور مدراس میں ایسا ایک علاقائی دفتر موجود ہے۔

(پ) سروس اسٹیشن: ملبیری سکٹر (شہتوت کے درخت پر کیڑے پال کر تیار کی جانے والی سلک) سے سلک ورم سیڈ اسٹیشن، کونور (نیل گری) تمل ناڈو

الائچی: مسالوں کی ملکہ کہلاتی ہے اور زرمبادلہ کمانے کے لحاظ سے کالی مرچ کے بعد الائچی کا دوسرا نمبر ہے۔ تمل ناڈو میں الائچی کی پیداوار لگ بھگ پچاس ہزار ٹن سالانہ ہے۔

کافی کی صنعت

تمل ناڈو کے پہاڑی علاقوں میں بھی کافی کی کاشت ہوتی ہے۔ ملک میں جس قدر رقبہ زمین پر کافی کی کاشت ہوتی ہے اس کے ۱۶ فیصد رقبہ زمین پر تمل ناڈو میں کافی کی کاشت کی جاتی ہے۔ تمل ناڈو میں ۷۱—۱۹۷۰ء سے ۷۴—۱۹۷۳ء کے دوران کافی کے پیداوار کا گوشوارہ:-

سال	اریبکا کافی	روبسٹا کافی	کل میزان ٹن میں
۱۹۷۱—۱۹۷۰ء	۵,۱۵۱	۲,۶۶۸	۷,۸۱۹
۷۲—۱۹۷۱ء	۶,۳۴۹	۱,۴۵۲	۷,۸۰۱
۷۳—۱۹۷۲ء٭	۵,۷۲۰	۱,۰۶۰	۶,۷۸۰
۷۴—۱۹۷۳ء٭	۶,۱۵۰	۲,۰۰۰	۸,۱۵۰

٭ ان تخمینوں پر نظر ثانی باقی ہے

تمباکو کی صنعت

جن ریاستوں میں تمباکو کی کاشت ہوتی ہے ان میں سے تمل ناڈو بھی ہے۔ ۷۳—۱۹۷۱ء کی مدت میں کتنے رقبہ زمین میں تمباکو کی کاشت ہوئی اس کا اندازہ ذیل کے گوشوارے سے کیا جا سکتا ہے:

ہزار ہیکٹروں میں

ریاست کا نام	۷۱-۱۹۷۰ء	۷۲-۱۹۷۱ء	۷۳-۱۹۷۲ء
تمل ناڈو	۱۴,۶	۱۰,۸	۱۲,۵

۱۔ حال ہی میں سگریٹ کی ۶ نئی فیکٹریاں قائم کرنے کے لئے اجازت نامے جاری کئے گئے ہیں اور سگار کی صنعت کا بڑا مرکز تمل ناڈو ہے۔ ملک میں زردہ (کھانے کے تمباکو کی ایک قسم) بنانے والی ۱۹ فیکٹریاں ہیں اور تین نسوار بنانے والی فیکٹریاں ہیں۔

۲۔ پبلک سیکٹر: ہر ریاست کی طرح تمل ناڈو کی اسٹیٹ انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشنوں نے بھی سگریٹ کی فیکٹری قائم کرنے کے لئے اجازت نامہ جاری کیا ہے۔ ہر فیکٹری میں سالانہ ۴۵۰۰ ملین سگریٹ تیار کرنے کی صلاحیت ہوگی

بقیہ تمل ناڈو کے رسومات

گوری کچھ تو کہو، رات کیسے کٹی، باتیں کیا کیا ہوئیں
بول ری بول تیرا وہاں کیا بنا
منہ دکھائی میں کیا چیز لایا بنا
رات کیسے کٹی، باتیں کیا کیا ہوئیں
لال جوڑے میں تو ان کو کیسے لگی
بول ری بول میری چھوئی موئی
رات کیسے کٹی، باتیں کیا کیا ہوئیں

نکاح کے دوسرے یا تیسرے دن ولیمہ کی تقریب ہوتی ہے جس میں دلہن کے تمام اعزا و اقربا شریک ہوتے ہیں۔ اس ضیافت میں انواع و اقسام کے کھانے دسترخوان پر بہت نفاست اور قرینہ سے سجائے جاتے ہیں۔ بریانی بیگن کا بھرتہ، اچار، چٹنی، مرغ مسلم، دالچہ، رائتہ، متنجن۔ مقیم کی روٹیاں فرنی، زردہ، مزعفر، شعلہ، اور کئی حلوے دسترخوان کی زینت بنتے ہیں۔ ولیمہ کے بعد پانچ جمعوں تک ضیافت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ہر جمعہ کو جمعگی کہا جاتا ہے۔ اس دوران کھیر، پورن، گلگلے وغیرہ دولہا کے یہاں بھیجے جاتے ہیں۔

پہلی عید کے موقعہ پر شاندار ضیافت کے ساتھ دولہا کو نذرانہ دیا جاتا ہے۔

ستوالنہ کی رسم حمل کے سات ماہ پر منائی جاتی ہے۔ اس رسم کو گود بھرائی بھی کہتے ہیں۔ دولہا والے اس تقریب میں دولہن کے لئے عمدہ پوشاک بنواتے ہیں۔ اور پرتکلف ضیافت ہوتی ہے۔

بچہ کی پیدائش کے ساتویں دن نام رکھائی اور عقیقہ کی رسمیں ادا ہوتی ہیں۔ لڈو بانٹے جاتے ہیں۔ اور عقیقہ کا گوشت تقسیم کیا جاتا ہے۔

ولادت کے چالیس دن بعد چلہ کی رسم ادا ہوتی ہے۔ نوزائیدہ بچہ کے لئے جھولا، پانگڑہ اور دیگر ضروری سامان اور ماں کے لئے عمدہ پوشاک بنوائی جاتی ہے۔

تمل ناڈو کی رسمات پر ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے لیکن طوالت مضمون کے خوف سے اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

حسن سہروردی
دامن • خواجک ملئے • ترچناپلی

تمل زبان و ادب کا مختصر جائزہ



کسی زبان کا تاریخی جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کی قدامت کا احاطہ کریں۔ جب سوال قدامت کا آتا ہے تو ہندوستانی زبانوں میں تمل اور سنسکرت پر نظریں پڑتی ہیں۔ یہ ہندوستان کی قدیم ترین زبانیں ہیں۔ یہ سوال کہ ان دونوں زبانوں میں اولیت کا درجہ کسے دیا جائے اب تک جواب طلب ہے۔

تمل ناڈو کو دراوڑ ناڈو بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ابتدا میں دراوڑم کے نام سے مشہور تھا۔ رفتہ رفتہ دراوڑم سنا سپھر تمترم سے بدل گیا اور "تمترم" کچھ ہی دنوں میں "تمتر" بن گیا۔ اور یہی نام اس زبان کا بھی قرار پایا۔ آج بھی اہل زبان لفظ تمل کو "تمتر" ل سے نہیں بلکہ ڑ سے لکھتے ہیں۔ اور یہی درست ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ دراوڑ قوم دریائے سندھ کے کنارے بستی تھی اور تہذیبی حیثیت سے اس قوم نے اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔ "موہنجو دارو" اور "ہڑپا" کے کھنڈر آج بھی اس بات کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس قوم کے نقوش میسوپوٹامیا میں بھی ملتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ قوم میسوپوٹامیا سے آکر پہلے پہل سندھ کے کنارے آباد ہوئی۔ جب آریہ قوم نے ہندوستان کا رخ کیا تو سب سے پہلے دراوڑوں نے اس کا استقبال کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بہت جلد ان دونوں قوموں کا اتفاق نفاق میں بدل گیا اور مجبوراً دراوڑم قوم اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جنوب کی طرف آئی۔ اور اسی کو اپنا مستقر بنا لیا۔ چونکہ تہذیبی حیثیت سے یہ بہت بلند ہو چکی تھی۔ اس قوم کے حکمرانوں نے دنیا کے مختلف علاقوں میں اپنے سفیر بھیجے۔ تجارتی تعلقات قائم ہوئے۔ اور اس طرح چند صدیوں کے اندر اندر دنیا کے معتد بہ حصوں کو اس قوم نے متاثر کیا۔ یورپ میں بھی کچھ ایسے نشانات مل جاتے ہیں جو اس قوم کی تہذیبی بلندی کا پتہ دیتے ہیں۔ وسط ایشیا میں یہ قوم اپنی زبان اور تہذیب کے ساتھ آج بھی زندہ و پائندہ ہے —

مثلاً ملیشیا، سنگاپور، برما، ویت نام وغیرہ۔ اس قوم کے تجارتی تعلقات کی نشاندہی وہ الفاظ کرتے ہیں جو قبل مسیح اس زبان میں رائج تھے۔ اور جو یورپ کی زبانوں میں تجارت کے ذریعے داخل ہوئے۔ مثلاً اس زبان کا لفظ "ارسی" • چاول قبل مسیح ۴۲۷ میں بابل میں "اوریزا" (ORYZA) ہوا جہاں کی زبان عبرانی تھی اور یہی لفظ آگے چل کر عربی میں "رز" (RUZ) ہو گیا اور انگریزی میں "رائز" (RICE) سے بدل گیا۔ یہی حال لفظ صندل کا ہے۔ تامل کا "صندنم" آریائی زبانوں میں "صندل" سے بدلا اور انگریزی میں SANDAL ہو گیا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قیمتی موتی تمل ناڈو ہی سے دنیا کے تمام ممالک کو بھیجے جاتے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ "موتو" ہے جو آگے چل کر موتی بن گیا۔ اس زبان کے پھیلاؤ کا اندازہ اس بات سے آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج بھی جنوب مشرق ایشیا کے اکثر ممالک کی زبانوں کی بنیاد اسی پر رکھی گئی ہے۔ مثلاً سری لنکا، ملیشیا، برما، بورنی، سنگاپور وغیرہ اس ضمن میں ماہر لسانیات سنیتی کمار چیٹرجی کا یہ خیال صداقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ "آریہ قوم کے ہندوستان آنے سے پہلے دراوڑ قوم ہندوستان کے پورے شمالی حصے میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ بلوچستان اور بنگال کے علاقے بھی زیر اثر تھے۔ جہاں تک اختلاط کا سوال ہے اس زبان نے اکثر زبانوں کو متاثر تو کیا ہے لیکن اثر پذیر نہیں ہوئی ہے۔ یہ ایک عجیب لسانیاتی نکتہ ہے جو آج تک ماہرین لسانیات کی سمجھ میں نہیں آسکا۔"

رسم الخط

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ کسی بھی زبان کا رسم الخط اپنے طور پر مکمل نہیں کہلایا جا سکتا۔ رسم الخط کی اصلاح کا مسئلہ یوں بھی ہر زبان والوں کے سامنے ہے۔ زبانوں کی تاریخ اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ ہر رسم الخط کو مختلف ادوار میں اصلاح کی منزلوں سے گزرنا پڑا ہے۔ جہاں تک تمل زبان کا تعلق ہے زمانہ قدیم سے لے کر آج تک اس کے رسم الخط میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی۔ شاید اس کا وجود ...۳ سال قبل مسیح تھا۔ تقریباً دو ہزار سال بعد اس میں کچھ ترمیمیں کی گئیں اور اب تک یہ رسم الخط یوں ہی چلا آرہا ہے۔ اب کہیں جاکر اس میں ترمیم کی بات چھڑی ہے۔ شاید بہت جلد اس رسم الخط کو اصلاح کی ایک اور منزل سے گزرنا ہوگا۔ خوبصورتی کے لحاظ سے یہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں خوبصورت ترین رسم الخط ہے۔ اس کا حسن اس کے متوازن ہونے میں مضمر ہے۔ تحریر میں ہر ایک حرف کو علیحدہ لکھتے ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی لکھائی بہت خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔ دو ہزار برسوں میں جس رسم الخط میں ترمیم کی گنجائش نہیں محسوس کی گئی یہ بات خود اس کی بڑائی کی دلیل ہے۔

گنتی

جہاں تک ہندسوں کا سوال ہے اکثریت کا یہ خیال ہے کہ ہندسے عربوں کی ایجاد ہیں۔ مگر لفظ "ہندسہ" خود اس بات کی

تردید کرتا ہے۔ عرب اس کو ہند کی ایجاد بتاتے ہیں۔ اگر یہ ہند کی ایجاد ہے تو اس بات کو بھی ماننا پڑے گا کہ یہ تمل زبان کی دین ہے۔ کیونکہ آج سے تین ہزار سال قبل مسیح جو ہندسے یہاں لکھے جاتے تھے وہ یوں ہیں،

1 — ௧، 2 — ௨، 3 — ௩، 4 — ௪، 5 — ௫، 6 — ௬
7 — ௭، 8 — ௮، 9 — ௯،

یہ ہندسے تمل قوم کے تجارتی عروج کے ضامن ہیں۔ سارے تمل ناڈو پر تین خاندانوں نے حکومت کی۔ پانڈیا۔ چولا۔ چیرا۔ ان حکمرانوں نے اپنی رعایا کو تین طبقوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ سپاہی پیشہ۔ کاشتکار اور تاجر پیشہ۔ یہی وجہ ہے کہ شمال کے مقابلے میں شروع ہی سے یہاں برہمنوں کا رسوخ نہ ہونے کے برابر ہے۔

تمل ادب

جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں تمل زبان تین ہزار سال قبل مسیح وجود میں آئی لیکن سب سے پہلی تصنیف کون سی ہے اس کے متعلق اب تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ دو شعری مجموعے "ایٹوتوگئی" اور "پتو پاٹو" ملے ہیں۔ ان مجموعوں میں مختلف موضوعات پر چھوٹی بڑی نظمیں شامل ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ مختلف احباب کی ذہنی کاوشوں کے نتائج ہیں۔ صحیح معنوں میں تصنیف کا اطلاق "تلکا پتیم" پر ہوتا ہے اس میں زبان کی ابتدا اس کا ارتقاء اور مختلف ادوار میں اس میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ان امور سے متعلق تفصیلی بحث ملتی ہے۔ اس کو ہم تمل زبان کی جامع قواعد کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد جو تصنیف ہمارے لئے آتی ہے وہ "ترو کرل" ہے۔ یہ کتاب محتاج تعارف نہیں۔ اب تک تقریباً ساٹھ زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ (اردو ترجمہ راقم الحروف کا ہے جو ۱۹۶۴ء میں ساہتیہ اکیڈمی سے شائع ہوا ہے) اس میں شک نہیں کہ اگر اس کتاب کو تمل ادب سے الگ کر دیا جائے گا تو ادب تہی مایہ ہو جائے گا — بین الاقوامی ادب میں اخلاقیات پر جو کتابیں ملتی ہیں ہم اس کو سر فہرست رکھ سکتے ہیں۔ اس کے زمانے کا بھی اب تک تعین نہیں ہوا ہے۔ گمان غالب ہے کہ پانچویں صدی عیسوی میں لکھی گئی۔ مصنف کا نام ولور تبلایا جاتا ہے — کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ اخلاقیات ۲۔ سماجیات ۳۔ عشق و محبت

۱۳۳۵ اشعار پر مشتمل یہ مجموعہ ایک صحیفے کا درجہ رکھتا ہے۔ زندگی کا کوئی بھی ایسا چھوٹا یا بڑا مسئلہ نہیں ہے جس میں اس پر اظہار خیال نہ کیا گیا ہو۔ اور وہ بھی اس سلیقے کے ساتھ کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ تمل زبان کی یہی ایک ایسی تصنیف ہے کہ جس کا ترجمہ دنیا کے تقریباً تمام زبانوں میں شائع ہوا ہے۔ اور جس کے بارے میں بے شمار تصانیف اور مضامین دنیا کے مختلف زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔ اور یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ تمل والوں کے نظر میں یہ وید مقدس سے کچھ کم نہیں ہے۔ اس کے بعد جس تصنیف کی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے وہ "سلپدی گارم" ہے۔ یہ تصنیف بین الاقوامی ادب میں اپنا مقام رکھتی ہے۔ عورت کا سب سے بڑا زیور اس کی عصمت ہے۔ اس موضوع پر ایک قصہ اس میں نظم کیا گیا ہے جو اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اس کا مصنف "النگو اڈیگل" بتایا جاتا ہے۔ جو ایک فرماں روا تھا۔ "منی میگالئی" کا مصنف "کتانار" بدھ مت کا پرچارک تھا۔ یہ بھی اسی زمانے میں لکھی گئی۔ اس کے بعد جو جامع تصنیف ملتی ہے وہ ہے "مانلنول" ازدواجی تعلقات کے موضوع پر یہ نویں صدی عیسوی میں لکھی گئی۔ زبان و بیان کے لحاظ سے اس تصنیف کا مقام بہت جلد بلند ہے۔

بھگتی تحریک

اس تحریک سے متاثر ہو کر جو تصانیف لکھی گئیں ان میں "ترونا ؤکرسو" کی "تیوارم" — مانکا دا سگر کی — "ترو واسوگمنی" بے حد مشہور ہیں۔ یہ تصانیف بھی نویں صدی عیسوی کی ہیں۔ تمل کلاسیکی ادب میں جو شاعر قابل احترام سمجھا جاتا ہے وہ کمبن (۱۱۸۰-۱۲۱۷) ہے اس کی اشہور زمانہ تصنیف "راما اوتارم" کا جواب نہیں۔ شاعری اپنے پورے لوازم کے ساتھ اس تصنیف میں جلوہ گر ہے۔ موضوع کی مناسبت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ والمیکی کی رامائن کا ترجمہ ہے جو سراسر غلط ہے۔ کمبن نے رامائن کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔ اور کمبن کی شاعرانہ عظمت آج بھی قائم ہے۔ اور جب تک کہ زبان باقی رہے گی۔ اس کی اہمیت میں کمی نہیں ہوگی کمبن اور ولور دو ایسے شاعر ہیں جن کے بغیر تمل کلاسیکی شاعری کا تصور ناممکن ہے۔

پریاپورانم

یہ بھی اس دور کی ایک اہم تصنیف ہے جس میں تقریباً ۶۳ مختلف شاعروں کی منتخب تخلیقات کو شاعر سیکزر نے جمع کر دیا ہے جن کا تعلق شیومت سے رہا ہے۔ یہ تصنیف بارہویں صدی عیسوی میں کی ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی میں مسلمان حکمرانوں نے دور جنوب کا قصد کیا اور آگے چل کر انگریزوں نے اپنا تسلط جمایا۔ یہ دور تمل کلاسیکی ادب کا دور انحطاط ہے۔ اس دور میں کوئی قابل قدر کام نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکمرانوں کا تعلق ادب سے ٹوٹ گیا۔ اس دور میں بھگتی تحریک کے زیر اثر کئی شاعر ابھرے جن میں تائمانور۔ عمر لوپ اور رمستان صاحب کی تخلیقات زندہ و جاوید ہیں۔

نثری ادب

ہم اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ تمل میں نثر کی ابتدا انگریزوں کے دور حکومت میں ہوئی اور تمل نثری ادب انگریزی نثری ادب کا احسان مند ہے۔ کیونکہ ساتویں اور نویں صدی عیسوی کے لکھے ہوئے جو کتبے اور نگارشات ملتی ہیں ان میں اکثر نثر میں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ چھٹی صدی عیسوی میں تمل نثر کا وجود تھا۔

جدید نثری ادب کے معمار کی حیثیت سے آنند رنگم پلے ہمارے

سامنے آتے ہیں اور سب سے پہلی نثری تصنیف ایک اطالوی مبلغ کانسٹائن بیکی کی ہے۔ جنھوں نے "ویراما منور" کے قلمی نام سے لکھا ہے۔ ان کا زمانہ ۱۷۴۲ — ۱۶۸۵ کا ہے۔ انہوں نے نثری تصنیف میں ایک قصے کو پیش کیا ہے۔ صحیح معنوں میں جدید نثر کی بنیاد ۱۸ ویں صدی کی ابتدا میں پڑی اور دو صدیوں کے اندر اندر نثر نے ادب میں اپنا ایک زبردست مقام بنا لیا تمل کے نثری ادب میں زیادہ نقد الیسیز اور مختصر کہانی پر صرف ہوا ہے۔ ڈرامہ پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ موجودہ دور ناول کا دور سمجھا جاتا ہے۔ تمل ناول کی بنیاد کو مستحکم کرنے والوں میں دو نام قابل ذکر ہیں۔ ۱۔ ویدنا نیگم پلے ۲۔ راجم ایّر۔ ۱۸۹۳ میں تامل کا سب سے پہلا روزنامہ "سودیسا مترن" سبرامنیم ایّر کی ادارت میں نکلا جو آج تک برابر جاری ہے۔

جدید دور

یہ دور اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ سبرامنیم بھارتی (۱۹۲۱ — ۱۸۸۰) سے شروع ہوتا ہے۔ بھارتی نے مختصر سی مدت میں تمل نثر اور نظم دونوں اصناف کو بہت کچھ دیا۔ خصوصیت سے شاعری میں انہوں نے اچھوتے تجربے کئے۔ اس حیثیت سے بھارتی کو جدید تمل شاعری کا پیش رَو کہہ سکتے ہیں۔ بھارتی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ نثر میں صرف انہوں نے ناول نہیں لکھے بلکہ مختصر کہانی، مضامین اور ڈرامہ جیسی صنف بھی ان کی احسان مند ہے۔

دو بڑی جنگوں کے درمیان کی مدت نے تمل کو تین بڑے ادیب عطا کئے۔ ۱۔ ایس۔ وردا چلم (۱۹۴۸ — ۱۹۰۲) ۲۔ ستیا رتنم (۱۹۲۴ — ۱۸۹۱) اور ۳۔ ٹی۔ وی کلیان سندرم (۱۹۵۳ — ۱۸۸۳) وردا چلم "پدومنی پتن" (جدیدیت کا دیوانہ) کے قلمی نام سے مشہور ہیں تقریباً دو سو مختصر کہانیوں کے خالق ہیں۔ ان کی تمام تر تخلیقات میں عصرِ حاضر کے تقریباً تمام مسائل پر اظہارِ خیال ملتا ہے۔ سبرتنم جو "بھارتی داسن" (بھارتی کا غلام) کے قلمی نام سے مشہور ہیں۔ بھارتی کے بعد سب سے بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں بھی عصرِ حاضر کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے کلیان سندرم نے جو ترو ویکا کے قلمی نام سے مشہور ہیں۔ تمل نثر کی ہر صنف کو مالا مال کیا ہے مثلاً الیسیز، صحافت، تاریخ، سیاست وغیرہ۔ ان کی خطابت کی دھاک آج تک بیٹھی ہوئی ہے — خطابت کو انہوں نے ایک نیا موڑ عطا کیا۔

آزادی کے بعد کا ادب

آزادی کے بعد تمل شاعری اور نثر کو جن ادیبوں نے اپنے عروج پر پہنچایا۔ ان میں چند نام قابل ذکر ہیں۔ جو فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ مثلاً راجاجی۔ کلکی کرشنا مورتی، آنا دورائے انگلین۔ وردا راجن۔ یوگی۔ راجہ گوپالن۔ پیچے مورتی۔ موتی جے گاندن۔ سومو۔ تورن۔ ونانیگم پلے۔ جانکی رامن۔ راما مردھم۔ الگر سوامی — جگن نادن۔ کمار سوامی۔ پارتھا سارتی۔ راجم کرشن۔ کرونا ندھی۔ یم۔ مالی چاند لین وغیرہ۔ شاعری میں پروفیسر رحمان۔ راما لنگم پلے۔ کنا داسن وغیرہ۔
مختصر نگاروں میں کلکی کرشنا مورتی۔ انگلین اور جے گاندن انفرادیت کے حامل ہیں۔ کلکی نے اپنے جریدے کے ذریعے کئی ایک اچھے لکھنے والے پیدا کئے۔ یہ خود بھی مشہور ناول نگار گزرے ہیں۔ ان کے کئی ناول ہندوستان کی مختلف زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کی کئی زبانوں میں بھی ان کی تخلیقات کا ترجمہ ہوا ہے۔ انھیں کے ہم عصر وارد اراجن نے تقریباً ۱۵ ناول چھوڑے ہیں۔ ان کے بھی کئی ناول ہندوستانی زبانوں کے علاوہ دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں دونوں کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملے ہیں۔ انگلین اور جے گاندن نے آج کے ادب کو بہت کچھ دیا۔ ایک ناول نگار کی حیثیت سے بھی انگلین کا مقام موجودہ ادب میں بہت بلند ہے اب تک تقریباً ۳۴ ناول لکھ چکے ہیں — ہندوستان کا قابل رشک گیان پیٹھ ایوارڈ ان کے مشہور ناول "چِت رپاوئی" پر ان کو دیا گیا۔ اس ناول کا اردو ترجمہ راقم الحروف نے کیا ہے جس کو نیشنل بک ٹرسٹ نے شائع کیا ہے۔

جے گاندن نوجوانوں میں بہت مقبول ہیں۔ اب تک تقریباً ۳۰۰ کہانیاں اور ۱۰ ناول لکھ چکے ہیں۔ ان کے کچھ ناول فلمائے بھی گئے ہیں۔ ان سے تامل ادب کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ انھیں بھی اکیڈمی ایوارڈ مل چکا ہے۔ جدید شاعری میں پروفیسر رحمن اور کنا داسن کا سکہ چلتا ہے دونوں نوجوان ہیں اور شانہ بشانہ آگے بڑھ رہے ہیں۔ رحمن، کمین اور اقبال سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ کنا داسن، بھارتی اور ٹیگور کے زیرِ اثر ہیں رحمن میں تفکر زیادہ ہے تو کنا داسن میں تخیل۔

اس مختصر مضمون میں تامل زبان و ادب کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ ہم نے صرف چند نہایت اہم ادیبوں اور شاعروں کا تذکرہ کیا ہے۔

ادیب اور شاعر خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے اپنے طور پر ادب کو ہر دور میں مالا مال کرتے رہے ہیں۔ جب تک ان کی تخلیقات باقی رہیں گی ہر دور ان کی عظمت کے آگے سر جھکائے گا۔ تمل ادب کو جو مقام کہ ملنا چاہئے تھا آج تک نہیں ملا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کا تعارف دنیا کے ادب میں خاطر خواہ طور پر نہیں ہوا۔ اب مترجمین کا ایک طبقہ اس کام میں لگ گیا ہے۔ آنے والا دور تمل کے لئے ایک خوش آیند دور ثابت ہوگا۔

آج سے تقریباً ۲۰۰۰ سال قبل تمل شاعر نے کہا تھا "ہر ملک میرا ہے کیونکہ میں ہر ملک کے باشندے کا بھائی ہوں"۔ جس زبان نے یہ تصور دیا ہے اس کی عظمت کا کیا کہنا۔

عظمت [illegible] مدری
صدر شعبہ [illegible] گورنمنٹ آرٹس کالج [illegible]
تمل ناڈو

ترووتور

تروکرل کا منظوم اردو ترجمہ

تروولوور کی مشہور اخلاقی نظم جو تروکرل (مقدس آواز) کے نام سے مشہور ہے تمل زبان کی ایک بلند پایہ کلاسک ہے۔ اس نظم میں کل ایک ہزار تین سو تیس شعر ہیں۔ جو ۱۳۳ ابواب میں منقسم ہیں۔ اور ہر باب میں دس شعر ہیں۔ پہلے چار باب تمہیدی ہیں اور باقی ابواب تین حصوں میں تقسیم ہیں۔ پہلے حصے میں گھریلو زندگی اور انفرادی زندگی میں انسان کے اخلاقی فرائض پر بحث کی گئی ہے۔ کتاب کا یہ حصہ بہت مشہور اور مقبول خاص و عام ہے۔ دوسرا حصہ سیاسیات اور تیسرا محبت سے متعلق ہے۔

تمہیدی چار ابواب گویا چار ستون ہیں۔ جن پر وتور نے اپنی اخلاقی نظم کی عمارت کھڑی کی ہے۔ پہلا باب حمد باری ہے۔ دوسرا باب برسات کی تعریف میں ہے تیسرے باب میں تارک دنیا کی بڑائی اور چوتھے میں نیکی کی عظمت کا بیان ہے۔ ان ابواب سے مصنف کا مقصود یہ ہے کہ جس اخلاقی نظم کی عمارت وہ کھڑی کرنا چاہتے ہیں اس کے بنیادی اصول یہ ہیں۔ خدا پر ایمان ہو۔ زندگی اور مادی اسباب کے تعلق کو سمجھیں۔ روحانیت کو بھی زندگی کی ایک اہم کڑی سمجھیں اور انسان اپنے معاملات میں ہمیشہ نیکی کو پیش نظر رکھے۔ ان بنیادی تصورات کے بغیر انسان عملی زندگی میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہی وتور کے فلسفۂ اخلاق کے بنیادی اصول ہیں۔

تروکرل کی چند خصوصیات

تروکرل کا ہر باب دس شعر پر مشتمل ہے گویا مصنف نے ہر عنوان کے ماتحت دس اہم مسائل چن لئے ہیں جن کو انھوں نے دس کرلوں میں پیش کیا ہے۔ دس شعر کی تخصیص غالباً اس لئے ہے کہ عوام پر عدد کی یکسانیت سے نفسیاتی اثر پیدا کیا جائے اور زبانی یاد رکھنے میں آسانی ہو۔

بحر کے انتخاب میں بھی وتور نے جدت کی ہے۔ انھوں نے عام راستے سے ہٹ کر اپنی نظم کے لئے ایک الگ بحر کا انتخاب کیا ہے جو مختصر ہے اور ایک ماہر فن ہی اس بحر میں طبع آزمائی کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی طویل نظم اس بحر میں نہیں ملتی۔ ہر کرل کے پہلے مصرعہ میں چار ارکان اور دوسرے میں تین ارکان ہیں۔ ان سات ارکان میں بڑے سے بڑے مضمون کو کھپا دینا وتور ہی کا حصہ ہے۔

الفاظ کے انتخاب اور ان کی ترکیب میں وہ کمال ہے کہ کسی لفظ کو اپنے جگہ سے ہٹانا ناممکن ہے۔ اختصار کا وہ عالم کہ سات لفظوں میں معانی کی کائنات سمو دی گئی ہے۔ باوجود اس اختصار کے مفہوم کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ البتہ بعض کرلوں میں بُعدِ زمانی کی وجہ سے معانی کے تعین میں کچھ اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ سلاست، برجستگی اور روانی کا وہ عالم کہ کسی باب کو ایک دو بار پڑھ لیں تو اس کے اکثر اشعار زبان پر چڑھ جاتے ہیں، اور آج بھی کرل کے بہت سے اشعار ضرب المثل بنے ہوئے ہیں۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ اخلاقی نظمیں خشک اور اکتا دینے والی ہوتی ہیں۔ لیکن تروکرل میں یہ بات نہیں ہے۔ باوجود اختصار کے انداز بیان اس قدر شگفتہ اور رنگین ہے کہ کسی باب کو بار بار پڑھنے سے بھی طبیعت نہیں اکتاتی۔ بلکہ جی چاہتا ہے کہ مسلسل پڑھیں اور لطف اٹھائیں۔ تمثیلات اور تشبیہات سیدھی سادھی اور عام فہم ہوتی ہیں۔ جن کی وجہ سے اشعار بے حد دلچسپ ہو گئے ہیں۔ وتور چونکہ انسانی نفسیات کے اچھے نباض ہیں اس لئے جو بات کہتے ہیں وہ اس طرح کہتے ہیں کہ سنتے ہی دل میں اتر جاتی ہے۔

میں نے ترجمہ میں جن باتوں کا لحاظ رکھا ہے وہ یہ ہیں۔ (۱) ترجمہ لفظاً و معنیً اصل سے مطابقت رکھتا ہو۔ یعنی آزاد ترجمہ نہ ہو۔ (۲) ترجمہ شدہ اشعار میں بندش کی چستی اور زورِ بیان تقریباً اسی انداز کا ہو جو اصل کرل میں ہے۔

(۳) جو خوبی اصل کرل میں صوتی اقدار یا کسی خاص محاورہ پر قائم ہے اس کی تلافی جہاں تک ممکن ہو دوسری خوبیوں سے کر دی جائے تاکہ شعر بے جان اور پھیکا بن کے نہ رہ جائے۔ اور ترجمہ اپنی اصل سے مختلف نہ ہو۔ ان تمام باتوں کی تفصیل کے لئے اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں۔ اگر ترجمہ کو اصل سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو ترجمہ کی خوبی خود بخود ظاہر ہو جائے گی (۴) اگر کسی کرل کے مفہوم میں اختلاف پایا گیا ہے تو میں نے ترجیح سے کام لیا ہے۔ اور غیر مرجح معانی کی طرف فٹ نوٹ میں اشارہ کر دیا ہے۔

خدا کی تعریف

۱۔ ابتدا ہے الف سے ابجد کی یوں ازل سے ہے جلوۂ باری
۲ علم بے سود اگر نہ تو پائے رازِ دانائے جزو کل اس سے

۳ پھل پر جو سوار ہے اس کا — مقام ہے پاؤں دیرِ پا ہو جا
۴ آز و نفرت غصے سے جو ہے پاک — اس کے چرنوں میں آفتیں خاشاک
۵ جن کے عالم جو کاٹے گن کے — دو گُنوں سے وہ دور ہے شب کے
۶ پانچ پٹ جس کے جس نے بند کیے — جو چلے اس کی راہ ، دیر ہے
۷ جس کا ساجھی نہیں قدم اس کے — مقام ہے تا نجات ہو عنم سے
۸ جو نہ خیرِ اتم سے پیار کرے — کب وہ بحرِ گُن کو پار کرے
۹ عضو مہمل وہ سر ہے جو نہ جھکے — آٹھ گُن والی ذات کے آگے
۱۰ کب وہ بحرِ جنم کو پار کریں — جو خدا کے قدم کو چھوڑ چلیں

برسات کی تعریف

۱۱ وجہ شادابیٔ زمیں برسات — ہے بجا کہیے اس کو آبِ حیات
۱۲ مینہ غذائے لطیف اگاتا ہے — اور خود بھی غذا سراپا ہے
۱۳ ارض محصورِ بحر ہو کر بھی — مینہ نہ برسے تو بھوک اگلے گی
۱۴ ہل نہ جوتے کبھی کسان اپنا — ختم کر دے جو ابر ، دان اپنا
۱۵ کارِ انساں بگاڑ دے برکھا — اور بگڑی بنا چلے برکھا
۱۶ آنکھ اپنی جو پھیر لے بادل — منہ دکھائے کبھی نہ ہریادل
۱۷ بند اگر فیضِ ابر ہو جائے — آبرو بحر اپنی کھو جائے
۱۸ خشک دامن اگر ہو گردوں کا — دیوتاؤں پہ کب چڑھے پوجا
۱۹ مینہ بنا ، دان ہو ، نہ پوجا ہو — تنگ داماں سرائے دنیا ہو
۲۰ کارِ دنیا چلے نہ بن پانی — مینہ نہ برسے تو منہ کی ہے کھانی

تارکِ دنیا کی بڑائی

۲۱ جو ہیں دنیا میں تارکِ دنیا — رتبہ زیبِ کتاب ہو ان کا
۲۲ گِن سکے سنتوں کے فضائل کیا — مرنے والوں کو جب تو گِن نہ سکا
۲۳ رتبہ راز دارِ دو گیتی ، — دہر میں ضوفشاں ہے نیکوئی
۲۴ جس نے پانچوں کی سرکشی رد کی — وہ ہے تخمِ جہانِ خوش بختی
۲۵ جس نے پانچوں کو مار ڈالا ہے — اس کی قوت کا شاہد اندرا ہے
۲۶ کارِ مشکل بڑوں سے بن جائے — اور چھوٹوں سے کچھ نہ بن آئے

---

۱ لطافت کی طرف اشارہ ہے۔
۲ شب سے مراد جنم کی تاریکی ۔ دو گُنوں سے مراد اگلی اور موجودہ جنم کی برائیاں۔
۳ وہ آٹھ صفات جو پہلی آٹھ کرلوں میں بیان ہوئیں۔ یعنی ازلیت ، علمیت ، لطافت آز و نفرت سے پاک ، جنم سے پاک ، انسانی حواس سے پاک ، لاشریک ، خیرِ اتم
۱ یعنی تحریر میں لانا چاہیے۔ ۲ تارکِ دنیا
۳ اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف جس کی رو سے آسمانوں کے بادشاہ اندر نے ایک جوگی کی بیوی سے بدفعلی کی اور جوگی نے بددعا کی جس کے اثر سے اندر بدشکل ہو گیا
۴ تارکِ دنیا لوگ

۲۷ سر نگوں جگ ، اگر ہوں زیرِ اثر — لمس و شم ، نطق اور سمع و بصر
۲۸ جن کا ہر لفظ ہے اثر میں قوی — شاندار ان کا ہر کلام خفی
۲۹ جن کا نیکی میں ہے مقام اونچا — وہ خفا ہوں تو پھر بچائے خدا
۳۰ اہلِ حق کہیے اہلِ باطن کو — حق کے بندوں سے پیار ہے ان کو

نیکی کی عظمت

۳۱ پائیں دولت بھی اور عزت بھی — بڑھ کے نیکی سے ہے کوئی خوبی!
۳۲ بڑھ کے نیکی سے جب نہیں کچھ بھی — ترکِ نیکی ہے موجبِ خواری
۳۳ جس طرح ہو جہاں بھی ممکن ہو — نیکیوں پر عمل کیجے جاؤ!
۳۴ اصل نیکی صفائی دل ہے — ورنہ لاحاصل اس کا حاصل ہے
۳۵ غصہ و آز و کینہ بدگوئی — ان سے بچیو کہ ہے یہی نیکی!
۳۶ عذر فردا نہ ہو کہ ہر نیکی — مرنے والوں کی زندہ ہے ساتھی
۳۷ ثمرہ نیکی کا ہے عیاں دیکھو — پالکی کے سوار و حمال کو
۳۸ وہ جو ثابت رہے بھلائی میں — سنگ حائل جنم کی وادی میں
۳۹ ہے خوشی وہ جو ابھرے نیکی سے — ورنہ قابل نہیں ستائش کے
۴۰ کرنی جو کچھ ہے وہ تو نیکی ہے — قابلِ ترک ہر برائی ہے

گھریلو زندگی

۴۱ اے گرہستی رکھے تو شام و سحر — تینوں راہوں کے باسیوں کی خبر
۴۲ جوگیوں مفلسوں پہ آنوں کو — اے گرہستی ترا سہارا ہو
۴۳ حق ہے مہمان اور قرابت کا — رفتگاں کا خدا کا اور اپنا
۴۴ تو جو کھائے وہ بانٹ کر کھائے — اور گنہ سے ڈرے تو بیج بڑھے
۴۵ خانہ داری میں الفت اور نیکی — یہ عمل بھی عمل کا ہے پھل بھی
۴۶ ثمرہ نیک جب ملے گھر سے — دوسرے راستوں پہ کون چلے

ھ یعنی وہ کلام جس میں اسرار و حقائق پوشیدہ ہوں۔
ف اس جگہ کرل میں "ال" کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کے دو معنی ہیں۔ آواز اور دکھ ۔ یہاں پہلے معنی کے لحاظ سے ترجمہ ہوا ہے۔ اگر دکھ مراد لیا جائے تو لاحاصل کی جگہ آزار پڑھا جا سکتا ہے
ع یہاں پہلے جنم کی نیکیوں کی طرف اشارہ ہے۔ جو سوار ہے وہ پہلے جنم میں نیک تھا۔ پالکی اٹھانا پہلے جنم کے گناہوں کی سزا۔
۱ حصولِ سعادت کے تین مراتب ، طالبعلمی ، زہد و اتقا اور ترکِ دنیا
۲ اختیار کرنے والے ۳ ارواحِ بزرگان ۴ مرے ہوئے لوگ
۵ نسل ۶ ترکِ دنیا وغیرہ کا راستہ
۷ یہاں "سونے پہ سہاگہ" کرل کے الفاظ نہیں ہیں۔ کرل میں کہا گیا ہے کہ راہب کے برابر ہے۔ میں نے ترجمہ کی خوبی اور زورِ بیان کے لئے تصرف کر لیا ہے۔ اس سے اصل مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۴۷ زندگی نیک جس کے ہو گھر کی — وہ ہے اہلِ سلوک پہ بھاری
۴۸ خانہ داری میں نیک خوش ہو کر — وہ دکھائی سہاگہ سونے پہ
۴۹ نام نیکی ہے خانہ داری کا — ہے جو الزام سے بری اچھا
۵۰ خانگی زندگی میں نام کرے — دیوتاؤں میں تو مقام کرے

بیوی کا کردار

۵۱ خوش وہ پتنی جو لاج ہے گھر کی — یافت سے خرچ کم کرے گھر کی
۵۲ خانگی خوبیاں نہ ہوں جس میں — ایسی عورت کو کم بہا سمجھیں
۵۳ کیا کمی نیک اگر ہے گھر والی — ورنہ دامانِ زندگی خالی
۵۴ یہ ہے عورت کی بے بہا دولت — لازم اس پر تحفظِ عصمت
۵۵ کیا نہ ہوگا پتی پجارن سے — منہ سے نکلے برس تو مینہ برسے
۵۶ پاس ناموس و شوہر و عصمت — یہ ہے دراصل خوبیٔ عورت
۵۷ کیوں رہے قید و بند میں عورت — پاسباں اس کا جذبۂ عصمت
۵۸ اپنے شوہر کو جس نے موہ لیا — دیویوں میں رقم ہو نام اسکا
۵۹ جو ہے بے بہرہ نیک بیوی سے — وہ کبھی سر اٹھا کے چل نہ سکے
۶۰ عفتِ زن متاعِ کامل ہے — نیک اولاد اس کا حاصل ہے

حصولِ اولاد

۶۱ بڑھ کے اولاد ذی شرف سے بھی — ہے کوئی شے جہاں میں پانے کی؟
۶۲ جس کی اولاد نیک ہو جائے — سات جنم کے دکھوں کو دھو جائے
۶۳ سچ ہے اولادِ نیک دولت ہے — اور یہ ان کے عمل کی قسمت ہے
۶۴ جس میں منّوں نے ہاتھ ڈالا ہے — بڑھ کے امرت سے بھی وہ کھانا ہے
۶۵ لمس بچوّں کا جسم کی لذت — میٹھی باتوں سے گوش کو فرحت
۶۶ سنئے تتلاہٹ اپنے بچوّں کی — مرلی میٹھی نہ بانسری میٹھی
۶۷ پلنے اولاد تربیت ایسی — اونچی محفل میں ہو نشست ان کی
۶۸ سمت آبا، پسر کی دانائی — یہ خوش آئند خلقِ عالم بھی
۶۹ دیکھئے ماں کتنی ہے خوش کتنی — سن کے نام آوری کو بیٹے کی
۷۰ تحفہ یہ باپ کو ہے بیٹے کا — سب کہیں "پھل ہے یہ تپسیہ کا"

محبّت

۷۱ بندِ الفت نہ ہوگی تالوں سے — شہرہ ہو جائے بھیگی آنکھوں سے
۷۲ بے غرض یوں ہو راہ الفت کی — ہڈیاں بھی ہوں وقفِ غیر اپنی

۷۳ روح اور جسم کے تعلق کی — ہے کڑی اک شعورِ الفت بھی
۷۴ پیار سے آرزو نکھرتی ہے — دوستی بیکراں ابھرتی ہے
۷۵ لطفِ دنیا بھی اور سعادت بھی — شان دیکھو عطائے الفت کی
۷۶ کیا کہا آسرا ہے نیکوں کا؟ — پیار کی ہے نظر میں کون برا؟
۷۷ بے محبت ہو ختم جس کی شے — کرم بے مغز کو نہ دھوپ لگے
۷۸ پیار بن دل ہے خوار دنیا میں — پھول اور نخل خشک صحرا میں!
۷۹ لے سہارا تو رکنِ باطن کا — کام کیا آئیں ظاہری اعضا،
۸۰ پیار ہے جان ورنہ تن کیا ہے — پوست اور ہڈیوں کا ڈھانچا ہے

مہمان نوازی

۸۱ غایتِ نظمِ خانگی ہے یہی — خوب ہو میہماں کی نگرانی
۸۲ رکھ تو پہلے خیال مہماں کا — لقمہ امرت ہی کیوں نہ ہو تیرا
۸۳ جو کرے آئے دن کی مہمانی — پاس اس کے نہ آئے محتاجی
۸۴ خندہ روئی سے میہمانی کر — دھن کی دیوی سے آشنائی کر
۸۵ جو کھلا کر بچا ہوا کھائے — بوئے بن کھیت اس کا لہرائے
۸۶ ایک کا انتظار ایک ہے آئے — میزباں ایسا میہمانِ خدا
۸۷ میہمانی کی قدر و قیمت کو — میہماں ہی کی قدر سے ناپو
۸۸ قدرِ مہماں کو جو نہ پہچانے — کھو کے دولت وہ خود ہی پچھتائے
۸۹ میہماں دشمنی حماقت ہے — اہلِ دولت کو یہ فلاکت ہے
۹۰ ٹھیس دل کو لگے نہ مہماں کے — سونگھنے سے یہ پھول مرجھائے

شیریں بیانی

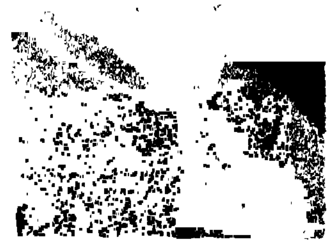
۹۱ بے ریا پُر خلوص اور میٹھی — بات ہوتی ہے اہلِ دانش کی
۹۲ خندہ روئی سے میٹھے میٹھے بول — خاص تحفوں سے بڑھ کر ایسے بول
۹۳ چہرہ ہنستا ہوا نظر میٹھی — بات کر دل سے ہے یہی نیکی
۹۴ میٹھی باتوں سے دل لبھائے جا — رنج و افلاس کو مٹائے جا
۹۵ گہنے ہیں جو ہر آدمیت کے — انکساری و خوش کلامی سے
۹۶ تو سلیقے سے بات کر اچھی — دور سیہ ہو بدی، پھلے نیکی
۹۷ بات میں جب مٹھاس گھل جائے — قدر تیری جہاں پہ کھل جائے
۹۸ بات میٹھی تو زندگی میٹھی — اب کی بھی دوسرے جنم کی بھی
۹۹ خوش کلامی تو بھائے تجھ کو بھی — پھر زباں پہ یہ کیسی بد گوئی
۱۰۰ دیکھنا! بول خوش اثر بھی ہیں — خام کیوں پختہ جب ثمر بھی ہیں

---

۵ یعنی شوہر — ۹ یعنی معصوم
۱۰ یعنی خدائے نیکی سے — ۱۱ طنزیہ انداز بیان ہے۔ کرل میں یہی انداز ہے

۱۳ یعنی محبت۔ اصل کرل میں محبت کا لفظ بھی موجود ہے۔ لیکن ترجمہ میں گنجائش نہ نکلی
۱۴ یعنی رخصت۔ قافیہ کی مناسبت سے یہاں جدا زیادہ موزوں ہے لیکن معنی پیدا کو زیادہ ترجیح دی گئی۔

اگیلن
آل انڈیا ریڈیو مدراس



کانچ کے رشتے

رات کے نو بج چکے تھے لیکن رام لنگم ابھی تک خلافِ معمول گھر نہیں لوٹا تھا۔ کملا کے میکے چلے جانے کے بعد سے اس کی زندگی میں کئی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ ان میں سے سب سے نمایاں یہ تھی کہ اب وہ شام ہونے سے پہلے ہی دفتر سے سیدھا گھر لوٹ آتا تھا۔ میکے جاتے وقت کملا نے اس کی غلط کاریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فہمائش کی تھی۔ اب وہ سختی سے اپنی زندگی کے نئے لائحہ عمل پر کاربند تھا۔ اب وہ رات گئے تک گھر سے باہر نہیں رہتا تھا۔

پہلے رام لنگم کی یہ کمزوری اکثر دونوں کی سنجیدہ بحث و گفتگو کا موضوع بن جاتی تھی۔ کبھی لبوں پر لطیف تبسم بکھیرے، کبھی ماتھے پر شکنیں ڈالے، کبھی واضح برہمی سے اور کبھی آنکھوں میں آنسو بھر کر کملا نے اس کی اس کمزوری کی طرف توجہ دلائی تھی۔ کیا تمہیں اس بدنصیب عورت سے کوئی سروکار نہیں جس کی قسمت تمہارے ہاتھ میں سونپ دی گئی ہے۔ جو دیدہ و دل فرش راہ کئے تمہارے آنے کی منتظر رہتی ہے۔؟ پرنم آنکھوں سے وہ گلہ کرتی۔ کبھی کبھی اس کے دفتر سے گھر لوٹتے ہی اپنے کمرے میں جا گھستی اور اپنے پلنگ پر لیٹ جاتی تاکہ وہ چند لمحے باہر ہی دہلیز پر کھڑا دروازے کی کنڈی کھٹکھٹاتا رہے اور جب وہ محسوس کرتی کہ اس کے شوہر کے ہاتھوں سے ضبط کا دامن چھوٹا جا رہا ہے تو آہستہ سے اٹھتی آنکھیں ملتی اور ایک مشاق اداکارہ کی طرح اپنی آنکھوں میں نیند کی کیفیت پیدا کرتے ہوئے دروازہ کھولتی رام لنگم پر اس رویے کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔

دفتر شام کے ٹھیک پانچ بجے بند ہوتا۔ وہاں سے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا ہوا سیر و تفریح کرتا ہوا اور کچھ تاخیر سے گھر لوٹتا۔

میکے جانے سے پہلے کملا نے رام لنگم کو سمجھایا۔ رات کو دیر سے گھر لوٹ کر شانتا کو بھی زیادہ دیر تک جگائے رکھنا مناسب نہیں۔ میری بات اور تھی۔ تمہیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ تمہاری طرف سے اس لڑکی کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچے۔ وہ دنیا کے چھل فریب سے ناآشنا ہے۔ سادگی پسند ہے اور کبھی کسی بات کی شکایت نہ کرے گی۔ پھر بھی تمہیں چاہیئے کہ تم اپنے عادات و اطوار کو سنوارو۔ اور اس کے ساتھ نیک اور شریفانہ برتاؤ کرو — ہاں!"

کملا کی ہدایات کے ساتھ ہی اب رام لنگم کے دل میں خود اپنی زندگی میں ایک تنظیم پیدا کرنے کی خواہش پیدا ہوئی اور وہ تندہی اور خلوص کے ساتھ اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے لگا۔ اب اس کمرے میں پرانے کپڑے ادھر ادھر بکھرے پڑے نہیں دکھائی دیتے۔ اب وہ اپنے معمولی سے معمولی کام کے لئے بھی دوسروں کو آواز نہ دیتا۔ خود ہی کر لیتا۔ پرانے رسائل اور روزناموں کو سلیقے کے ساتھ کمرے کے ایک مخصوص کونے میں جمع کرتا۔ اب اس کی میز پر ضروری اور غیر ضروری چیزوں کا ایک ذخیرہ نہیں رہتا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر رکھی ہوئی۔ لیکن — آج کی شام اس کی نئی زندگی میں پہلی لغزش سرزد ہو گئی۔ وہ دوستوں کے شدید اصرار پر بادلِ ناخواستہ کوئی انگریزی فلم دیکھنے کے لئے نکل پڑا۔ اس کے گھر لوٹنے تک رات کے دس بج چکے تھے۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر وہ چند لمحوں کے لئے رک گیا۔ پھر اس نے آہستہ سے کنڈی کھٹکھٹائی کچھ جواب نہ پاکر قدرے توقف کے بعد اس نے پھر کنڈی کھٹکھٹائی۔ تھوڑے وقفے کے بعد اس کے کانوں میں کسی کی آہٹ سنائی دی۔ پھر کسی کے کراہنے اور رک رک کر سانس لینے کی آوازیں سنائی دیں۔ لیکن کسی کے قدموں کی چاپ نہیں سنائی دیتی تھی۔ کافی انتظار کے بعد اندر سے دروازے کی چٹخنی اتاری گئی۔ دروازہ کھلا۔ رام لنگم نے جونہی گھر کے اندر قدم رکھا اس کی پریشان نگاہیں بخار کی شدت میں تپتی سامنے کھڑی شانتا پر پڑیں۔ وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ شانتا کا سارا جسم بخار میں بھنا جا رہا تھا۔ اس میں کھڑے رہنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ ہانپتی کراہتی وہ پیچھے کی طرف مڑی اور اپنے وجود کو گھسیٹتے ہوئے ہال کے ایک کونے میں بچھی چٹائی تک لے جا کر اپنے آپ کو چٹائی پر گرا دیا۔ اور اپنے سارے جسم کو شال کے اندر لپیٹ لیا۔ شال کی دبیز تہہ کے نیچے بھی اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اس کی تکلیف سے متاثر ہو کر رام لنگم اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

"یکایک یہ تمہاری کیا حالت ہو گئی شانتا؟ کل دوپہر کو تم بھلی چنگی تھیں!"

وہ رام لنگم کے سوال کا جواب نہ دے سکی۔ صرف معصوم نظروں سے اسے تکتی رہ گئی۔ سانس لینا اس کے لئے مشکل بن گیا تھا۔ بخار کی شدت سے وہ کراہ اٹھی۔ بولنے کی سکت نہ تھی۔

کل دوپہر کو وہ بالکل اچھی تھی۔ رات کا کھانا بھی اس نے پکایا تھا۔

اس نے دیکھا کہ شانتا کے گرم سانسوں میں ہر لمحہ گرمی بڑھتی جا رہی ہے اس کا جسم بخار کی شدت سے تپ رہا ہے۔ شانتا کی جلتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھنے کے بعد اسے بخار کی شدت کا صحیح اندازہ ہوا تھا۔ دوڑتا ہوا وہ اپنے کمرے میں گیا۔ اپنا اونی شال اٹھالایا اور شانتا کے جسم پر ڈال دیا۔ پھر دروازے کے دونوں کواڑ بند کئے اور ڈاکٹر کو بلا لانے کی غرض سے باہر چلا گیا۔ ڈاکٹر آیا۔

معائنہ کیا۔ ایک انجکشن دیا۔ دوا اور خوراک کے متعلق ضروری ہدایات دے کر وہ چلا گیا۔

شانتا چارپائی پر لیٹی رہی۔ آج وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس حالت میں تنہا چھوڑ کر وہ اپنے کمرے میں جاکر آرام کرے۔ وہ وہیں شانتا کے کمرے سے تھوڑی ہی دور پر ایک ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ ہال میں دیوار پر لگی گھڑی نے آدھی رات کے گہرے سکوت کو توڑتے ہوئے بارہ گھنٹے بجائے۔ آواز کی لہریں فضا میں گونج رہی تھیں۔ رام لنگم کی نگاہیں شانتا کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ پسینے کی بوندیں اس کے لبوں اور ابرؤوں پر گلاب کے پھول پر گری ہوئی شبنم کی طرح چمک رہی تھیں۔ شانتا کی گہری نیلی آنکھیں جن پر اب پلکوں کی چلمن پڑی ہوئی تھی اسے ان نرم و نازک کلیوں کی یاد دلانے لگیں جو سبز پتیوں کے درمیان چھپی رہتی ہیں۔ اس کے گھنے ابرؤوں کے نیچے پسینے کی ایک لکیر سی رواں تھی۔

شانتا نے کروٹ بدلی۔ اس کی نیم وا آنکھیں رام لنگم کے چہرے پر پڑیں۔ شال کو اپنے جسم سے اتار کر اس نے پوچھا "ارے آپ اب تک یہیں بیٹھے ہیں؟ کیا آپ نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے؟"

"کھانا کھاؤں گا۔ لیکن اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" رام لنگم نے پوچھا

"اچھی ہے" یہ کہتے ہوئے وہ آہستہ سے اٹھ بیٹھی۔ شاید انجکشن کا فوری اثر تھا۔ بخار کی شدت میں قدرے کمی ہوئی۔ جسم سے پسینہ بھی خارج ہونے لگا تھا۔

"اب دیر نہ کریں، کھانا کھالیں" ساری کے آنچل سے اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے وہ کہنے لگی۔ "اب تک تو ٹھنڈا ہو گیا ہوگا؟"

"تمہارے لئے کیا لاؤں؟ ڈاکٹر کہہ گیا ہے کہ تم سوپ پی سکتی ہو، آش پی سکتی ہو—"

"جی نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے، آپ کھانا کھالیں اور آرام کریں، رات کافی جا چکی ہے۔"

رام لنگم کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا۔ پھر شانتا کے بہت اصرار پر وہ وہاں سے بادلِ ناخواستہ اٹھ کر کھانے کے کمرے میں داخل ہوا۔ دو چار لقمے مشکل سے حلق کے نیچے اتارے اور ہاتھ دھو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ نہ جانے وہ کب تک شانتا کے متعلق سوچتے ہوئے بستر پر جاگتا رہا۔

●

شانتا:

دو سال پہلے ہی اس نے شانتا کو دیکھا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے لئے ایک دن جب وہ دفتر سے گھر لوٹا تو رام لنگم نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی اس کے گھر سے باہر نکل رہی ہے۔ دہلیز پر وہ چند لمحے کے لئے ٹھٹک گیا۔ تاکہ لڑکی باہر نکل جائے اول تو اس نے اس لڑکی پر نگاہِ غلط انداز پھینکی لیکن دوسرے لمحے وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ اس لڑکی کو عالمِ وارفتگی میں دیکھے جا رہا ہے۔ رام لنگم کے لئے یہ غیر معمولی بات تھی۔ اسے اپنی طبیعت کی افتاد پر حیرت ہوئی۔ وہ ان نوجوانوں میں سے نہ تھا جو راہ چلتی عورتوں کو تاکتے جھانکتے ہیں۔ لڑکی شرم و حجاب سے اپنا سر نیچا کئے تیزی سے آگے نکل گئی اور چند ہی لمحوں میں وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ کافر جمال لڑکی بہت دیر تک اس کے ذہن و احساس پر چھائی رہی۔

"یہ لڑکی جو ابھی ابھی گھر سے باہر نکل رہی تھی کون ہے؟" گھر میں داخل ہو کر اس نے کملا سے پوچھا۔

"ہماری پڑوسن ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس کا شوہر کسی بینک میں کام کرتا ہے" کملا نے جواب دیا۔

اس کے بعد وہ نوجوان لڑکی اس گھر میں اکثر آنے جانے لگی — اور پھر اجنبیت اور شرم و حجاب کے پردے اٹھتے گئے۔ اب وہ رام لنگم کی موجودگی میں بھی آنے لگی تھی اور اس سے باتیں بھی کرنے لگی تھی — وہ کبھی کبھی کسی خاص موضوع پر بلا تکلف تبادلۂ خیال بھی کر لیتے تھے۔ اب اس نے شانتا کے متعلق زیادہ سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ جس طرح نیلگوں جھیل کی سطح پر کھلے کنول کو دیکھ کر ایک حسن شناس کے دل میں گدگدی سی ہونے لگتی ہے اسی طرح شانتا کے حسن نے رام لنگم کے دماغ میں بھی ایک ہلکی سی لہر پیدا کر دی تھی — یہ ایک فطری بات تھی۔

●

صبح و شام ہوتی رہی۔ دن گزرتے گئے۔ اس کی بیوی کملا اور شانتا ایک دوسرے کے اتنا قریب آگئیں کہ ایک پل کے لئے بھی بچھڑنا انہیں شاق گزرنے لگا۔ شانتا کے شوہر شنکر اور رام لنگم بھی گہرے دوست بن چکے تھے۔

شنکر ایک زندہ دل انسان تھا۔ وہ زندگی کو ہنسی خوشی کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ چھٹیوں میں وہ اپنی بیوی کو ساتھ لئے گھر سے باہر نکل پڑتا۔ کبھی سنیما گھر، کبھی مندر، کبھی پارک یا قرب و جوار کے علاقوں میں رہنے والے دوستوں کے ہاں چھٹیاں وہ گھر کے باہر ہی گزارا کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں ہم آہنگی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے مطمئن تھے۔

گہرے روابط کی بنا پر روزمرہ کے امور میں دونوں کنبوں کے افراد ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے لگے تھے۔ ایک دوسرے کے کاموں میں معاون ثابت ہوتے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ چاروں ایک ہی کنبہ کے افراد ہوں۔ یا ان میں برسوں کی شناسائی ہو۔

"بیچاری شانتا!" کملا نے ایک دن اپنے شوہر سے کہا۔ "اس کے شوہر کے سوا اس کا اس دنیا میں اور کوئی نہیں، نہ رشتے ناتے کا نہ جان پہچان کا۔ یہی حالت شنکر بیچارے کی بھی ہے۔ ایک گھر میں صرف دو انسان ہیں اور ان کا اتنی بڑی دنیا میں کوئی اپنا سگا نہیں ہے۔ کیا گزرے گی اس کے دل پر!"

"جبھی تو وہ ہمارے ساتھ گھل مل گئے ہیں" رام لنگم نے کہا۔ "انسان

کو ایک ایسی ہستی کی تلاش ہوتی ہے جس پر وہ اپنی محبت اپنا پیار نچھاور کرے اور بدلے میں اُس کا پیار اور اُس کی محبت پائے۔ رشتے دار نہ سہی ایک مخلص دوست ہی سہی۔!"

"شانتا مجھے اپنی جان سے بھی پیاری سہیلی سمجھتی ہے!" کمّا نے فخر کے ساتھ کہا۔

●

ایک شام ـــــ

شنکر جب دفتر سے گھر لوٹا تو اس کے چہرے پر گہری فکر اور تشویش کے آثار تھے۔

"میرا تبادلہ کلکتہ ہوچکا ہے اور مجھے آج ہی یہاں سے جانا پڑے گا" شنکر نے کمال افسردگی سے کہا۔

یہ سن کر شانتا کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔

رام لنگم اور کمّا کے الطاف وعنایات کے تو شنکر اور شانتا ممنون تھے ہی شنکر کے دل میں جاگزیں اُس کنبہ سے وابستہ اعتماد نے اسے ایک اہم فیصلے پر پہنچنے میں مدد دی۔

"کلکتہ پہنچنے کے فوراً بعد میں ایک اچھا گھر تلاش کروں گا اور گھر ملتے ہی شانتا کو بلوالوں گا جب تک شانتا آپ لوگوں کے ساتھ ہی رہے گی۔ اگر تین ہفتے کے اندر مجھے کوئی اچھا سا گھر نہ ملا تو میں نتیجے کی پرواہ کئے بغیر واپس چلا آؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ شانتا کا ہر طرح خیال رکھیں گے"

شنکر اپنی بیوی شانتا کو رام لنگم کے ہاں چھوڑ کر چلا گیا۔

انھیں دنوں کمّا کے گلشنِ حیات میں پہلی کلی چٹکنے والی تھی۔ شانتا نے گھر کا سارا کام کاج اپنے سر لے لیا۔ کمّا کو معمولی سے معمولی کام نہ کرنے دیتی ـــ اسے آرام کرنے کی ہدایت کرتی۔ کچھ دنوں کے بعد شانتا پر سارا گھر چھوڑ کر کمّا میکے چلی گئی۔

"اپنی گود بھرتے ہی مجھے خبر کرنا نہ بھولنا! اور ہاں زچگی کے دس دن بعد فوراً چلی آنا۔ تم نہ ہوگی تو میرا دل ایک پل نہ لگے گا"

شانتا کی آواز رندھ گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے پیالے چھلک پڑے تھے۔

●

کمّا کے چلے جانے کے بعد شانتا کی ذمے داریاں اور بڑھ گئی تھیں۔ گھر کی دیکھ بھال اور کام کاج کے ساتھ ساتھ رام لنگم کی دیکھ بھال بھی اب اسی کو کرنی پڑتی تھی۔

اب ــــ!

شانتا رام لنگم ہی کے گھر میں رہنے لگی ہے اور اس کے ساتھ اس کے حسن کی تجلی بھی۔! ـــ گھر میں ایک تنہائی کا احساس بھی اجاگر ہونے لگا تھا۔ رام لنگم اب زیادہ تر گھر ہی پر رہنے لگا تھا۔ شانتا اور رام لنگم۔

شانتا کے محشر بداماں اور فتنہ ساماں حسن نے رام لنگم کے دل میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔ جس طرح مقناطیس لوہے کے ذرات کو اپنی فطری کشش سے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اسی طرح شانتا اپنی کہربائی کشش سے رام لنگم کو اپنی طرف کھینچنے لگی۔ شانتا کسی گہری ندی کی طرح خاموش اور پرسکون تھی۔

کمّا کے میکے سے خبر آئی کہ لڑکا پیدا ہوا ہے۔ رام لنگم فوراً سسرال پہنچا اور گھر لوٹ کر شانتا سے کہنے لگا "ہو بہو ماں کی تصویر ہے!" وہ بیحد خوش نظر آرہا تھا۔ شانتا کے چہرے پر بھی مسرت کی کرنیں جگمگا اٹھیں۔

"ہاں شانتا! سبھی تمہیں پوچھنے لگے۔ کمّا پوچھنے لگی میں تمہیں بھی اپنے ساتھ کیوں نہ لیتا آیا۔ تم گھر میں اکیلی کیسے رہ سکو گی۔ اور وہ بچے! پریشان کردیا ہوگا شیطانوں نے۔ سب کے زبان پر بس ایک سوال ـ "شانتا کو بھی ساتھ کیوں نہ لیتے آئے؟" شانتا کے چہرے پر اس نے اپنی نظریں جمادیں ـــ شانتا میں وہ کون سی خوبی ہے جس سے وہ سب کے دل و دماغ پر چھا گئی ہے۔ لوگوں کو پہلی ہی ملاقات میں اپنا گرویدہ بنا لینا معجزہ نمائی نہیں ہے تو اور کیا ہے۔؟

اپنی تعریف کے چرچے سن کر شانتا کا سینہ مسرتوں سے پھولنے لگا۔ دوسرے لمحے اس کے لبوں سے ایک دبی سی آہ نکل گئی۔ کیوں؟ اس سوال کا جواب صرف شانتا کے پاس تھا۔

کیا اسے اپنے قریبی رشتے داروں کی کمی کا خیال آنے لگا تھا؟ کیا اس کے دل پر بہت دور ملازمت کرتے ہوئے اپنے شوہر کا خیال کچوکے لگانے لگا تھا؟ کیا وہ سوچ رہی تھی کہ کب تک وہ اپنی زندگی کے دن اسی طرح تنہا گذارے گی؟

●

بخار کا اثر شانتا پر کئی دنوں تک رہا۔ بخار چڑھتا اور اترتا رہا ـــ رام لنگم نے دفتر سے چھٹی لے لی تھی اور وہ گھر ہی پر رہنے لگا تھا۔

"میں دو تین دن میں اچھی ہو جاؤں گی۔ آپ میری وجہ سے دفتر سے غیر حاضر نہ ہوئیے" شانتا نے کئی بار کہا۔ لیکن رام لنگم نے ایک نہ مانی۔ اپنی زندگی میں پہلی بار اس نے کچن میں قدم رکھا اور شانتا کے لئے اپنے ہاتھوں سے کافی تیار کی۔ چولہا جلانے کے لئے اس نے لکڑیوں پر بہت سا مٹی کا تیل انڈیل دیا تھا۔ اور کئی دیا سلائیاں جلادی تھیں۔ چولھے سے اٹھتے دھوئیں سے اُس کی آنکھیں لال ہو جاتیں اور ان سے پانی بہنے لگتا۔ کھانسی کا ایک دورہ بھی پڑ جاتا۔ رام لنگم کی ان باتوں کا وہ دلچسپی سے مطالعہ کررہی تھی۔ ان باتوں میں شانتا کو ایک ناتجربہ کار لیکن ایک پرخلوص انسان کا جذبۂ خدمت نظر آیا۔ اس کے لبوں پر ایک ہلکا سا تبسم آگیا۔ ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے! بستر پر لیٹی وہ رام لنگم اور اُس کے خلوص کو دیکھتی اور بے حد متاثر ہوتی رہی۔

پانچ دن کے بعد شانتا کا بخار اتر گیا۔ پھر بھی رام لنگم مصر تھا کہ وہ

[illegible] کرنے میں پوری احتیاط برتتے۔ شانتا کے لاکھ منع کرنے پر بھی وہ گھر کے [illegible]وں میں اس کا ہاتھ بٹاتا۔ شام کو دفتر سے سیدھا گھر چلا آتا۔

●

ایک صبح اپنی میز پر رکھے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑا اپنے الجھے بالوں کی ایک سرکش لٹ کو سلجھانے میں مصروف تھا۔ کئی کوششوں کے باوجود بال اس کی مرضی کے مطابق نہیں جم پا رہے تھے۔ جھنجھلا کر اس نے کنگھا پٹک دیا۔ اس کے ساتھ ہی بالوں کی ایک لٹ اس کی پیشانی پر لہرانے لگی۔ جبھی جھاڑو لگانے کے لئے شانتا کمرے میں داخل ہوئی۔ شانتا کی آمد سے بے خبر رام لنگم بال سنوارنے میں منہمک تھا۔ شانتا نے میز کے قریب رام لنگم کی قمیص کا ایک بٹن گرا پایا۔ اس نے بٹن اٹھا لیا۔ اور اسے میز پر رکھتے ہوئے ایک ثانئے کے لئے اس کی نگاہیں آئینے میں منعکس رام لنگم کے چہرے کے پرکشش نقوش میں کھو گئیں۔ ان نقوش میں شانتا کو ایک دلکشی اور جاذبیت محسوس ہونے لگی۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ آئینے کی شفاف سطح سے خود کو اس کا سایہ بھی اسی کو دیکھ رہا ہے۔

اپنی اس غیر شعوری حرکت پر دونوں ہنس پڑے۔ شانتا کے چہرے پر شفق کی رنگینی چھا گئی تھی۔ نگاہیں نیچی کئے وہ اسی لمحے چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔

اور ——

رام لنگم آئینے کے اس خالی حصے کو دیکھنے لگا جہاں ایک لمحہ پہلے ایک حسین سایہ لہرایا تھا اور اب جہاں ایک خلا پیدا ہو چکا تھا۔ اس کی نگاہیں آئینے پر جم گئیں۔ آئینے کی سطح پر اس کے چہرے کے نقوش واضح طور پر نمایاں تھے۔ ان نقوش کی خوبصورتی اور دلکشی کا احساس اسے پہلی بار ہوا۔ وہ ابھی جوان ہے! یہ احساس اس کے ذہن میں بیدار ہوا۔ وہ ابھی جوان ہے۔ جوان ہی نہیں خوبرو اور صحت مند بھی۔ اس کے اس احساس کو جذبۂ خود بیں نے تقویت بخشی۔ آئینے نے غیر ارادی طور پر اس کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کی جسے وہ یکسر بھلا چکا تھا۔

اس دن دفتر کے کاموں میں اس کا دل ذرا بھی نہ لگا۔ اس کے دل و دماغ پر شانتا کے حسین چہرے کے دلکش نقوش چھائے ہوئے تھے۔ وہ نقوش جنہیں دیکھ کر آئینہ بھی مسکرا اٹھا تھا۔ اس کی خوبصورتی کالی آنکھیں اس کے سامنے گھوم رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں کی گہرائی کا تصور کرتا تو ایک کپکپی سی اس پر طاری ہو جاتی۔ خیالات کے امڈتے سیلاب کو وہ روک نہ سکا۔

شام کو دفتر سے گھر لوٹ کر وہ سیدھا اس آئینے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ اس نے نہ کپڑے تبدیل کئے اور نہ منہ ہاتھ ہی دھویا۔ پیشانی پر سے پسینے کی بوندوں کو تولیے سے پونچھا اور وہیں ایک کرسی پر کوئی رسالہ ہاتھ میں لئے بیٹھ گیا اور سرسری طور پر ورق گردانی کرتا رہا۔ کسی کہانی کا درمیانی حصہ پیشِ نظر تھا۔ کہانی کار نے کسی شاعر کی نظم کا ایک بند بھی کہانی میں شامل کر لیا تھا وہ اسے باواز بلند پڑھنے لگا ——

"تمہارے حسن نے میرے ہوش و حواس گم کر دیئے ہیں، اس شرابِ کہنہ کی طرح جو دو آتشہ کا اثر رکھتی ہے!"

نظم کے اس بند کو وہ جوں جوں دہراتا اس پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی۔ یہاں تک کہ اسے اپنی آواز کی بازگشت اپنے دل کے نہاں خانے میں سنائی دینے لگی۔

شانتا کمرے میں داخل ہوئی تو آہٹ سن کر وہ پیچھے کی طرف مڑا۔ اس کے ہاتھ میں کافی کا گلاس تھا۔ وہ سر جھکائے نظریں نیچی کئے اس کے قریب پہنچی اور گلاس اس کے آگے بڑھایا۔ نہ جانے کس کے ہاتھ میں یکایک رعشہ سا پیدا ہو چلا تھا المونیم کا گلاس ایک آواز کے ساتھ نیچے گر پڑا اور اس کے ساتھ ہی کافی کے چند دھبے دونوں کے کپڑوں پر پڑ گئے۔

کافی کے دھبوں کو فوراً ہی پانی سے صاف کر دینا چاہئے۔ ورنہ وہ چھٹتے نہیں۔ اس خیال سے نیچے گرے ہوئے گلاس کو اٹھا کر شانتا کمرے سے باہر جانے لگی۔

"شانتا!" —— رام لنگم غیر شعوری طور پر پکار اٹھا۔ اس کی آواز میں ارتعاش تھا۔

"جی!" شانتا نے ایک دلکش ادا کے ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھا۔

رام لنگم کے پاس شانتا کے سوال کا کوئی تشفی بخش جواب نہ تھا اپنی اس غیر ارادی حرکت پر اسے ایک ہلکی سی پریشانی کا احساس ہوا لیکن بہت جلد اس نے اپنی اضطراری حالت پر قابو پا لیا۔

"میں یہ کہنا چاہتا تھا" اس نے آہستہ سے کہا "کہ میرے لئے دوبارہ کافی لانے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے حصے کی کافی میں پی لوں۔ یہ مجھے پسند نہیں۔ میں کسی ہوٹل میں پی لوں گا۔"

"ہوٹل میں کیوں —— یہاں گھر میں ابھی کئی گلاس کافی ہے۔"

دوسرے لمحے وہ کافی کا دوسرا گلاس لے کر آ گئی۔ غالباً وہی کافی جو اس نے اپنے لئے رکھ چھوڑی تھی۔ کافی کا ذائقہ بتا رہا تھا کہ اس میں دودھ اور شکر کی مقدار میں نمایاں کمی ہے —— آج ہی رام لنگم پر یہ راز آشکار ہوا کہ اتنے دنوں سے شانتا اپنے لئے ایسی ہی کافی تیار کرتی ہے تاکہ دودھ اور شکر زیادہ خرچ نہ ہو جائے۔

●

رات نے دن کے رخ پر تاریکی کی دبیز چادر ڈال رکھی تھی۔ فہم اور ادراک پر نیند کی کیفیت طاری تھی۔ آسمان پر ماہتاب اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ کائنات پر پُر اسرار خیالات کا ایک سنہرا جال بکھیر کر احساسات میں شدت اور کیف و مستی پیدا کرنے والی خاموش کرنوں کا جال!"

رام لنگم کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ کمرے کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ ان سے ہو کر کمرے میں

آتی ہوئی در رشنی کی چاندنی ٹھنڈک اور کیف و سرور سے تہی دامن تھی۔ آج چاندنی آگ برسانے لگی تھی۔ آج چاندنی میں سورج کی تمازت سے بھی زیادہ حدت اور حرارت تھی۔ ہوا تھم گئی تھی۔ کمرے میں پھیلے ہوئے گہرے سکوت نے اس کے اندر ایک عجیب واضح اور پریشان کن شوق کو ابھار کر دیا تھا۔ وقت اپنی رفتار بھول کر رینگنے لگا تھا۔ رام لنگم اپنے بستر پر اٹھ بیٹھا۔ پورے چاند کی روشنی میں اس نے دیکھا گھڑی کی سوئیاں زبان بے زبانی سے آدھی رات گذرنے کا اعلان کر رہی ہیں۔ اس نے اپنے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر اس کی نظریں مقابل کے کمرے پر جم گئیں۔

کمرہ تاریک تھا۔ کمرے میں چاندنی نہیں آسکتی تھی۔ دیوار پر آویزاں ایک چھوٹے سے ٹمٹماتے لیمپ کی مدھم روشنی جگنو کی چمک کی طرح ایک محدود دائرے میں جگمگا رہی تھی۔ کمرے کی تاریکی ویسی ہی تھی۔ اس کمرے کے ایک کونے میں شانتا ایک کھردری چٹائی پر نیند سے ہمکنار تھی۔ لیکن اس کا حسن فتنہ ساماں اپنی تمامتر رعنائیوں کے ساتھ بیدار تھا۔

رام لنگم پلنگ سے نیچے اترا۔ آہستہ سے خواب خرامی کے مریض کی طرح چلتا ہوا شانتا کے کمرے میں داخل ہوا۔ شانتا کے بستر کے قریب دیوار سے کچھ ہی فاصلے پر ایک بڑی الماری کھڑی تھی۔ جوں جوں وہ الماری کی طرف آگے بڑھتا محسوس ہوتا، ایک غیر مرئی چھری اس کے حلق کو تیزی سے چھیدے چلی جا رہی ہے۔ کسی نہ کسی طرح وہ الماری تک پہنچ ہی گیا۔ اب بستر الماری سے کچھ ہی دوری پر تھا۔ رام لنگم نے محسوس کیا کہ اس کے آگے کی طرف کے بڑھتے ہوئے قدم کے ساتھ ہی چھری اس کے دل میں پیوست ہو جائے گی اور دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے!

کھٹن ـــ!

المونیم کا ایک گلاس جس میں تھوڑا پانی تھا۔ اس کے پیر کی ٹکر سے آواز کے ساتھ گر پڑا۔ بہتا ہوا پانی اس کے قدموں کو چھونے لگا۔ وہ چونک پڑا اور دوڑ کر بڑی الماری کی آڑ میں چھپ گیا۔

شانتا نیند سے جاگ پڑی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ گلاس کے لڑھکنے کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی شانتا کے کانوں میں نہایت آہستگی سے سنائی دی تھی۔ اس نے گلاس کو غور سے دیکھا۔ جھک کر زمین پر گرے ہوئے پانی کو دیکھا چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور آہستہ سے بستر پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے الماری کی آڑ میں کھڑے چھپے رام لنگم کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ دہلیز پر رک کر اس نے رام لنگم کے کمرے کی طرف دیکھا۔ اس کے پلنگ پر نگاہیں دوڑائیں۔ پلنگ خالی تھا۔ کمرے میں در آئی چاندنی اس خلا کو اور بھی نمایاں کر رہی تھی۔

چند لمحوں کے لئے وہ دہلیز سے لگ کر مبہوت سی کھڑی رہی۔ اس نے دیکھا۔ باہر سے داخل ہوتی ہوئی چاندنی کی کرن میں ایک عجیب پیکر تشکیل پا چکا تھا اس کی نگاہیں پھر رام لنگم کے خالی پلنگ پر جم کے رہ گئیں ـــ اتنی رات گئے وہ کہاں جا سکتا ہے؟

رام لنگم اونچی الماری کی آڑ سے آگے نکل آیا اور شانتا کی طرف بڑھنے لگا۔ قدموں کی آہٹ پا کر وہ پلٹی۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اجلی سی چاندنی میں ایک لمحے کے لئے دونوں کی نظروں نے ایک دوسرے کی نگاہوں میں پناہیں ڈھونڈ لیں۔

دوسرے لمحے شانتا نے اپنی نظریں نیچی کر لیں ـــ رات کی سلگتی تنہائی میں دونوں اسی طرح چند لمحوں کے لئے ایک دوسرے کے سامنے چپ چاپ ایک دوسرے کا راستہ روکے کھڑے رہے۔ ماحول پر ایک سحر طاری ہو چکا تھا۔ یکایک چاند کی ایک شوخ کرن نے اس کمرے میں پھیلی تاریکی کو چھیڑ دیا چھت کے کسی روزن سے چاند کی ایک کرن کمرے میں اتر آئی اور بجلی کی ایک لکیر کی طرح شانتا کے سینے پر تھرک اٹھی۔ شانتا نے اپنے سینے پر نظریں ڈالیں اور شرما کر اپنے جسم کو چھوئی موئی کی طرح سکیڑنے لگی۔ رام لنگم کی نظروں نے بھی شرارت کی۔ دونوں کی رگ و پے میں ایک برقی رو سی دوڑنے لگی۔ دونوں کسی فطری جذبے کی حدت کے تحت ابلنے لگے ـــ شانتا پر ایک کپکپی سی طاری ہوئی اس کے ساتھ ہی اس کے سینے پر لہراتی چاندنی کی کرن بھی کانپ اٹھی۔ اس کرن کی لرزش میں شانتا کی نگاہیں اس کے سینے پر لٹکتے زرد دھاگے سے بندھے شعلے کی طرح چمکتے سونے کے اس آویزے پر پڑی جو اس کے شوہر سے وابستہ مقدس رشتہ کی ضمانت تھا۔ منگلم۔ منگل سوتر! اس کے سہاگ کا زیور۔ سونے کا آویزہ۔ اس پر جگمگاتی صاف و شفاف نور کی ایک پاک کرن! ـــ اور وہ چاند جس نے اپنی ایک کرن کو کمرے میں پھینکا۔ چاند کی کرن شانتا کے لئے تازیانے سے کم نہ تھی۔ شانتا کو جیسے کسی غیبی قوت نے جھنجھوڑ دیا تھا۔ جھٹ سے وہ بازو کی طرف ہٹ گئی ـــ رام لنگم چپ چاپ اس کے قریب سے گزرتا ہوا سیدھا اپنے کمرے میں داخل ہوا اور اپنے آپ کو بستر پر گرا دیا۔

شانتا نے اس آویزے کو اپنے کانپتے ہاتھوں سے اٹھا کر نہایت ہی عقیدت مندی سے اپنی آنکھوں سے لگایا اور بوجھل قدموں سے اپنے بستر تک پہنچ کر اپنے آپ کو بستر پر گرا دیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔

●

نئی صبح کا سورج طلوع ہوا۔ تاریکی چھٹ گئی۔ رام لنگم پر جیسے اب بھی وارفتگی کا تاثر باقی تھا۔ وہ بدحواس سا نظر آرہا تھا۔ اس کے برعکس شانتا مطمئن اور پرسکون تھی۔ جیسے اس کی زندگی میں کوئی حادثہ پیش ہی نہ آیا ہو حسب معمول وہ رام لنگم کے لئے کافی لے آئی۔

"کیا آج کافی نہیں پینے کا ارادہ ہے؟" شانتا نے پوچھا

جواب میں رام لنگم نے آگے بڑھ کر کافی کا گلاس اٹھا لیا اور ایک گھونٹ بھی نہ لے پایا تھا کہ اس کے کانوں میں اپنے مکان کے سامنے تانگہ رکنے کی آواز سنائی دی۔ دوسرے لمحے کنا اپنے ہاتھوں میں ایک ننھا سا بچہ سنبھالے

(بقیہ ص۔۔ پر)

[illegible] دادی بہت دیر سے سب کے ساتھ بس کے اندر کھڑی تھیں۔ سب کے اترنے کے بعد اپنی بھوری رنگ کی اٹیچی اٹھا کر نیچے اتریں تو ایک ساتھ کئی آوازوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔

"دادی ماں! صرف چھ پیسے دے دو۔ تھیلی میں اٹھا کر لے چلوں گا۔"

"دادی ماں! سواری چاہئے؟"

"گماشتہ ایر ہی کے مکان پر جائیں گی نا؟ آیئے گاڑی پر سوار ہو جایئے!"

دادی ماں نے ایک بار انھیں گھیرے کھڑے لڑکوں اور گاڑی بانوں کی طرف استفہامیہ نگاہیں ڈالیں پھر میٹھی ہنسی کے ساتھ بولیں۔ "مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ میرا راستہ چھوڑ دو میں پیدل ہی چلی جاؤں گی۔ تم سب نے میرے گھر کا پتہ بھی جان رکھا ہے۔ اچھا میں ہر مہینہ جو یہاں آیا کرتی ہوں۔ لیکن مجھے کبھی گاڑی پر سوار ہوتے دیکھا ہے؟"

دادی ماں بھیڑ سے نکل آئیں۔ گھونگھٹ کو ذرا آگے کھینچ کر کمر پر رکھی تھیلی کے بوجھ سے ایک طرف جھکی سی چلچلاتی دھوپ میں آگ سی جلتی دھول پر قدم جمائے بھاری بھاری قدموں سے چلنے لگیں۔ ان کی عمر لگ بھگ ستر سال کی ہوگی پھر بھی بہت کم بوڑھی معلوم ہوتی تھیں۔ ہاں زیادہ عمر ہو جانے سے ان کی سانسیں پھولنے لگی تھیں۔ اس تھکن کا احساس گھر پہنچنے پر ہی ہوگا۔

دادی ماں کے خیال میں کل کے بچے سبھی رکشہ پر، گاڑی میں، سائیکل پر، اڑتے اڑتے جا رہے ہیں۔ دھوپ اور برسات بیچارے انسان پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ دادی ماں دل ہی دل میں مسکرائیں۔ دھوپ اور برسات کی کیا پروا! ان کی زندگی میں دکھ کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ زندگی کی اس دشوار گذار راہ پر نہایت اطمینان اور تحمل سے چلنے کی عادی ہو جانے والی دادی ماں کو اس دھوپ کی کیا پروا؟

سڑک کے کنارے نیم کا ایک گھنا سایہ دار درخت کھڑا تھا۔ دادی ماں کچھ دیر کے لئے اس کے نیچے کھڑی ہو گئیں۔ دھوپ سچ مچ بہت ہی تیز تھی۔ تپتی ہوئی دوپہر میں ٹھنڈی چھاؤں بکھیرتے ہوئے نیم کے درخت کے نیچے کھڑی وہ بڑھیا مشینوں کے سوا کسی اور پر بھروسہ نہ کرنے والی اس بیسویں صدی میں پچھلی نسل کا نشان بنی اپنے قدموں کے بھروسے کھڑی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں نیم کے پتے ہل اٹھے۔

"تیجے مہادیو!" بھگوان کا شکریہ ادا کرتی ہوئی دادی ماں ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہونے لگیں۔

دادی ماں کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔ اس عمر میں جب بھی وہ ہنستی تھیں تو ان کے دانتوں کی خوبصورتی دیکھنے والوں کو محو حیرت بنا دیتی تھی۔ ٹھوڑی کے ذرا اوپر دائیں طرف چھوٹا سا خوبصورت تل، بڑھیا کو دیکھ کر کوئی بھی یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جوانی میں یہ کتنی خوبصورت رہی ہوگی! دادی ماں نے آنچل اٹھا کر ہاتھ منہ کا پسینہ پونچھ لیا۔ وہ پھر چل پڑیں۔ کچھ ہی دوری کے بعد ندی کے پل پر بچھے کنکر کے فرش پر وہ دھیمی چال سے چلنے لگیں۔ پل کے ایک طرف

آج اور کل

• ہیم کانتہ

نائی ویلایدھم ہاتھ میں ٹین کا ڈبہ لئے اس ڈر سے کہ کہیں دادی ماں کو چھوت نہ لگ جائے سارا بدن سمیٹے کھڑا تھا دادی کو دیکھتے ہی دونوں ہاتھ اٹھا کر اس نے نمسکار کیا۔

"دادی ماں! آپ نیولی سے آرہی ہیں؟" نہایت ہی احترام سے ویلایدھم نے پوچھا۔

"کون؟ ویلایدھم! کیوں رے تیری پتنی کا کیا حال ہے؟" دادی ماں نے مشفقانہ سوال کیا۔

"ہاں لڑکا ہوا ہے ماں جی!"

"سکھی رہو۔ سب بھگوان کی مرضی ہے۔ یہ تیسرا ہے نا؟"

"ہاں! دادی ماں!" ویلایدھم خوشی سے پھولا جا رہا تھا۔

"تو واقعی خوش قسمت ہے۔ لیکن یاد رکھ! کسی طرح ان کو پڑھا لکھا دینا، سمجھا؟"

ویلایدھم اپنی چوٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرایا۔

دادی ماں بولیں۔ "ارے بدھو! ہنس کیوں رہا ہے؟ زمانہ بدلتا جا رہا ہے۔ تیرے باپ نے اور تو نے ہاتھ میں صندوقچی لئے گھومتے گھومتے اپنی زندگی بتا دی۔ لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔ سب لوگ اب بال کٹوانے کے لئے سیلون چلے جاتے ہیں۔ تجھ سے بال کٹوانے کے لئے تو مجھ جیسی بوڑھی بیوائیں ہی اب باقی رہ گئی ہیں۔ زمانہ کے ساتھ انسان کو بھی بدلنا چاہئے۔ سمجھا میری بات؟"

دادی ہنس پڑیں اور ویلایدھم جیسے اپنے ہونٹوں پر ہنسی کو چپکائے کھڑا تھا۔

"لے جلتی دھوپ میں اسے کھاتا جا" تھیلی میں سے ککڑیاں نکال کر دادی ماں نے دیتے ہوئے کہا۔ "بس میں خریدی تھیں۔ بچوں کا خیال آیا، چار آنے کی لے لیں!"

ویلایدھم نے پھر ہاتھ جوڑے۔ اس وقت تک وہ وہیں کھڑا رہا جب تک دادی ماں آگے نہیں چلی گئیں۔

دادی گوری اماں چدمبرم میں پیدا ہوئیں۔ عمر کے دسویں سال میں ان کی شادی ہو گئی تھی۔ کڈلور میں وہ ایک معزز خاندان کی بہو بنی تھیں ابھی زندگی کی صرف سولہ بہاریں دیکھی تھیں کہ بیوہ ہو گئیں۔ اس کے بعد لتنے سالوں سے وہ اپنے بیٹے اور پوتی کے گھر کو چھوڑ کر کہیں نہ گئیں۔

گوری دادی کی پوتی گیتا شادی کے دس ہی مہینوں کے بعد اپنی مانگ

سے سہاگ کا سیندور پونچھ کر بیوگی کے دکھ کا بوجھ لئے روتی ہوئی جب ان کی گود میں آگری اور ان کی آنچل میں منہ چھپا کر رونے لگی تب گوڑی دادی نے اس کے جانگسل غم کو اپنی زندگی کا سب سے بھاری دکھ اور اپنی زندگی کی آخری چوٹ سمجھ کر اسے اپنی گود میں لے لیا تھا۔ اپنی چھایا میں، اپنے پیار میں، اپنے آنسوؤں میں اور اپنی ممتا کی آغوش میں لے لینا ہی انہوں نے اپنا فرض سمجھا تھا۔ اب وہ گیتا کو اپنی پوتی سمجھ کر پیار کرتی رہی تھیں۔ لیکن جس دن مانگ کا سیندور پونچھ کر ماں کے گھر لوٹ آئی تھی اسی دن سے اپنے بیٹے پر جان نچھاور کرنے والی اس بڑھیا نے اپنی محبت کے مرکز کو بدل دیا تھا۔ وہ مرکز اب اس کا بیٹا نہیں اس کی پوتی گیتا تھی۔

گوڑی دادی نے گیتا کو اپنے بیٹے جیون کی جیتی جاگتی مورتی کے روپ میں دیکھا تھا۔ ہاں! گوڑی دادی نے اپنے کو پھر گیتا میں دیکھا تھا۔

گوڑی دادی کا بیٹا گنیش ائر بیوہ بیٹی کے مستقبل کے بارے میں سوچتے سوچتے تھک گیا تھا۔ میٹرک تک پڑھی اپنی بیٹی کو ٹیچرس ٹریننگ میں بھرتی کرانے کی تجویز بہت ہی جھجکتے ہوئے اس نے دادی ماں کے سامنے پیش کی۔ اس پر دادی ماں نے اپنی رضامندی ہی نہیں دی، اس کی بہت تعریف بھی کی۔ گنیش ائر متحیر رہ گیا۔ جیسے وہ اپنی ماں کو سمجھ نہ پایا ہو۔ دادی ماں دل ہی دل میں خوش ہوئی تھیں کہ ان کی پوتی خوش نصیب ہے کہ بیسویں صدی میں پیدا ہوئی ہے۔

ٹریننگ کے بعد گیتا کئی سال تک کڈللور میں کام کرتی رہی۔ جب اس کا تبادلہ نو آباد شہر نیویلی میں ہوا تو گنیش ائر شش و پنج میں پڑ گیا کہ وہ کیا کرے لیکن دادی ماں نے کہہ دیا کہ "فکر نہ کرو میں گیتا کے ساتھ رہوں گی!"

ڈھلتی عمر میں بیٹے اور خاندان کو چھوڑ کر پوتی کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئیں اس کی بھی وجہ تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی چہیتی پوتی جس کی عمر ابھی تیس سال کی بھی نہیں ہوئی ہے بیوگی کی گہری تاریکی میں دھنس جائے۔

چھٹی کے دنوں میں دادی ماں اور پوتی دونوں نیویلی سے آتی رہیں۔ ہفتہ یا اتوار کو دادی اماں اکیلی چلی آتی تھیں۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی۔ نائی ویلایدھم یا اس کے باپ کے سوا کسی اور کے استرے کے سامنے وہ اپنا سر جھکانے کے عادی نہیں تھی۔ راستے میں ویلایدھم نے انھیں دیکھ لیا تھا دادی ماں جانتی تھیں کہ وہ کل سویرے مندوقچی لے کر ضرور آجائے گا۔

تک سنگ ایک میل کی مسافت کو آدھے گھنٹے میں طے کر کے جب وہ گھر پہنچیں تو دیکھا کہ گنیش ائر اخبار منہ پر ڈالے آرام کرسی پر لیٹا اونگھ رہا ہے۔ اس کے قریب ان کی بہو پاروتی اماں ناک کی نوک پر عینک رکھے چھاج پر پڑی چنے کی دال چن رہی تھی۔ بغل میں پن کا ڈبہ کھلا رکھا تھا۔ باہر کے برآمدے میں دھوپ سے بچنے کے لئے ٹٹیاں لگی تھیں۔ ان کی چھ سالہ پوتی جانو چاروں طرف بکھرے پڑے کھلونوں کے درمیان بیٹھی اپنے آپ بولتی گنگناتی کھیل رہی تھی۔ دادی ماں کی موجودگی پر کسی کا دھیان نہیں گیا تو انھیں لوہے کے چھڑوں والے دروازے کی زنجیر کو ہلانا پڑا۔ ہلکی سی آواز پر جانو نے مڑ کر دیکھا۔ منہ سے مسرت اور حیرت سے ملی جلی آواز نکلی "دادی اماں" — اس کی آنکھیں اور بھی بڑی ہو گئیں۔

"دروازہ کھولو!"

دادی ماں کی آواز کان تک پہنچنے کے پہلے ہی جانو چلاتی ہوئی اندر کی طرف دوڑی — "اماں، اماں! دادی آگئیں!" — دروازہ کھولے بغیر ان کی آمد کی خبر دیتی ہوئی اچھلتی کودتی پوتی کو دیکھ کر دادی ماں مسکرائیں۔

گنیش ائر نے چہرے پر پڑے اخبار کو ہٹا کر آنکھیں کھولیں۔ بچی کے چیخ دیکار سے اچانک نیند کے ٹوٹ جانے سے اس کی لال لال آنکھیں ادھر ادھر پھرنے لگیں۔ وہ اٹھ بیٹھا۔

"کیوں ری شیطان! گلا پھاڑ کر چلاتی کیوں ہے؟" — بچی پر بگڑتی ہوئی پاروتی دروازہ کھولنے کو دوڑی آئی — "آئیے ماں جی! اتنی دھوپ میں پیدل چلی آئیں؟ گاڑی نہیں لی؟"

"گھر اتنا قریب جو ہے۔ گاڑی کیوں لیتی؟ وہ مانگے گا دس آنے نہیں تو آٹھ آنے!"

اندر آتی ماں کو دیکھتے ہی گنیش ائر آرام کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پتنی سے بولا۔ "پاروتی! ماں دھوپ میں آئی ہیں ان کے لئے مٹھا لے آؤ۔"

"ہوں، تم تو گہری نیند میں تھے۔ اچھا بیٹا تھوڑی دیر سو لو!"

بیٹے کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے آرام کرسی کے پاس رکھی ہوئی بنچ پر دادی ماں نے کمر پر کی تھیلی کو اتار کر رکھ دیا۔ آنگن میں جا کر ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھویا ایک لوٹا پانی اپنے منڈے ہوئے سر پر بھی ڈال لیا اور پھر آنچل سے منہ ہاتھ پونچھتے ہوئے طاق پر رکھی بھبھوت کو اٹھا کر "ہے بھگوان، جے شمبھو جے مہادیوا" کہتے ہوئے ماتھے پر تلک لگایا۔

یہ آرام کرسی دادی اماں کا تخت تھا۔ ان کی غیر حاضری میں ہی گھر کے دوسرے لوگ اس پر بیٹھتے تھے۔ ہاتھ منہ دھو کر دادی ماں آرام کرسی پر آ بیٹھیں۔ گنیش ائر پاس ہی ایک کرسی کھینچ کر آ بیٹھا اور ہاتھ سے دادی ماں کو پنکھا جھلنے لگا۔ جانو جھٹ سے دادی ماں کی گود میں آ بیٹھی جیسے اسی موقع کی تاک میں تھی۔ گنیش ائر نے پیچھے سے جانو کو گدگدایا۔ "اٹھو، دادی ماں دھوپ میں آئی ہیں، انھیں مت ستاؤ۔"

"پروا نہیں بیٹا! اسے یہیں بیٹھی رہنے دو۔ آجا میری بچی!"

دادی ماں نے جانو کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

دادی جانو کو گود میں سنبھالے بنچ پر رکھی تھیلی سے ککڑیاں نکال کر زمین پر رکھنے لگیں۔ جانو کے ہاتھ میں ایک ککڑی دی۔ تھیلی میں جو ساڑی تہہ کر کے رکھ لی تھی اسے الگنی پر ڈالنے کے لئے الگ رکھ دیا۔ پھر تھیلی نیچے انڈیل دی۔ اب اس میں سے چنے نیچے گرے۔ تقریباً تین سیر ہوں گے۔ ایک لفافہ بھی گرا۔

"مینا اور ابی کہاں ہیں؟" — چاروں طرف نظریں دوڑاتی ہوئی دادی ماں نے لفافہ بیٹے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا — "لو، گیتا نے یہ تمہارے ہاتھ میں دینے کو کہا ہے۔"

گنیش ائر دل میں ڈرتا رہا کہ ماں کہیں یہ نہ پوچھ بیٹھے کہ بیس سال کی سیانی

[illegible] کو اس کے چھوٹے بھائی اجے کے ساتھ میٹنی شو میں بھیجنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ اسی لئے بالکل ہلکی آواز میں بولا۔

"مینا کا پڑھا ہوا ایک ناول سینما بن کر آیا ہے۔ دونوں شیطانوں نے تو میری ناک میں دم ہی کر دیا۔ میٹنی شو ہے یہی سوچ کر انہیں بھیجا ہے۔"

"اوہو! قسط وار جو ناول اخبار میں آیا تھا وہی ناول ہے نا؟ میں نے بھی دیکھا تھا۔" دادی ماں نے اخبار اور مصنف کا نام بتا کر پوچھا کہ یہ فلم وہی ہے کیا۔ پھر بولیں: "اتنی سی بات پر بچوں کو شیطان کیوں کہتے ہو۔ تم اور میں کچھ بھی نہ جانتے ہوں کہ آج کے فلمی ستارے کون کون ہیں لیکن بیٹا! یہ جان رکھو کہ ہمارے گھر کے بچے بہت اچھے ہیں۔"

لمحہ بھر چپ رہ کر دادی ماں نے پوچھا — "خط میں کیا لکھا ہے اس نے؟ میرے پوچھنے پر کہا تھا پتا جی بتا دیں گے۔"

لفافہ کھول کر عینک چڑھا کر ایک صفحہ کے اس خط کے الفاظ پر نظریں دوڑاتے ہوئے گنیش ائیر کے ہاتھ کانپنے لگے۔ سارا چہرہ پسینے سے تر ہو گیا۔ ہونٹ کانپ اٹھے پورا خط پڑھنے کے بعد خالی نظروں سے سامنے کی دیوار پر لگی گیتا کی شادی کی تصویر کو وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کا چہرہ ایکدم اس کے قلبی جذبات کا آئینہ بن گیا کرسی کا دستہ پکڑ کر ماں کی طرف پتھرائی آنکھوں سے اس نے دیکھا۔ خط ہاتھ سے پھسل کر فرش پر گر گیا۔

"ہائے بھگوان! یہ کیا؟" — دادی ماں کا دل دھک سے رہ گیا۔ فرش پر گرے ہوئے خط کو اٹھا کر روشنی میں لے جا کر پڑھنے لگیں۔ ابھی تک وہ عینک کے بغیر ہی پڑھ سکتی تھیں۔ لکھا تھا:

پیارے پتا جی! اماں اور دادی ماں کو پرنام!

چھ مہینے تک سوچنے کے بعد یہ خط سچے دل سے لکھ رہی ہوں، اس خط کے بعد شاید ہمارے درمیان خط و کتابت بند ہو جائے۔ ہمارا رشتہ بھی ٹوٹ جائے یہ سب جانتے ہوئے بھی لکھ رہی ہوں۔ اپنے ساتھ کام کرنے والے ہندی ماسٹر شری رام چندرن کے ساتھ اگلے اتوار کو سول میرج کرنے کا میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میں بیوہ ہوں۔ پچھلے چھ مہینے سے میں سوچ رہی ہوں کہ یہ پاپ ہے یا میں نے صحیح قدم اٹھایا ہے۔ بہت سوچنے کے بعد ہی میں اس فیصلہ پر پہنچی ہوں۔ دل میں مچلتے جذبات کو یکدم سرد کر کے بیوگی سے وابستہ فرائض کا تمام تر احترام کرنے میں اپنے آپ کو ناقابل پاکر دنیا کو دکھانے کے لئے اپنی شخصیت پر ایک جھوٹا نقاب ڈالے رہنا، یہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ آج میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ بہت صحیح فیصلہ ہے۔ یہ میں سچے دل سے محسوس کرتی ہوں میرا یہ فیصلہ میری حالت اور نئے زمانہ کے تقاضوں کے پیش نظر مجھے بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس فیصلہ پر مجھے کوئی ذہنی کوفت نہیں ہو رہی ہے نہ آپ سے معافی ہی مانگنے کی ضرورت ہی محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ بات میرے دل کو کچوکے لگا رہی ہے کہ اب شاید مجھے آپ لوگوں کے پیار اور شفقت سے محروم ہو جانا پڑے گا۔ پھر بھی ایک نئی زندگی اور نئی روشنی سے میں وابستہ رہوں گی یہی خیال میرا حوصلہ بندھا رہا ہے۔ میں انہیں جانتی کہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ کس کا دل کتنا بدل گیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ میرے اس فیصلہ سے متفق ہوں۔ ابھی ایک ہفتہ کا وقت ہے۔ اگر آپ متفق ہوں تو میرے لئے بہت بڑی خوش نصیبی ہوگی۔ نہیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی گیتا مر گئی! ہاں! میرا یہ فیصلہ میرے ذاتی مفاد سے وابستہ ہے۔ دادی ماں کے سوا اور کس نے میرے لئے کچھ کیا ہے اور کیوں میں کسی سے تیاگ کی امید کروں؟

آپ کی چہیتی گیتا۔

"بیٹا، یہ سب کیا ہو گیا ہے؟" — دادی ماں کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔ وہ بھونچکی سی پتھر کی مورتی کی طرح بیٹھی رہیں۔

"ہمارے لئے وہ مر گئی!" — کھوکھلی آواز میں گنیش ائیر بول اٹھا دادی ماں سناٹے میں آگئیں۔

گیتا نے پہلی بار ماں کی صلاح و مشورہ اور اجازت کے بغیر اتنا اہم فیصلہ کیا تھا۔ دادی ماں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ انھوں نے اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر پوچھا — "یہ کیا کہہ رہے ہو بیٹا؟"

"اور کیا کہوں ماں! جس گھرانہ میں تم جیسی دیوی کا جنم ہوا اسی گھرانہ میں ..... ہائے ایشور!" گنیش ائر درد اور غم سے تلملا اٹھا۔

"میرا زمانہ کچھ اور تھا بیٹا!" یکایک یہ الفاظ دادی ماں کے منہ سے نکل گئے۔ اسی لمحہ اتنے لمبے زمانہ کے بعد دادی ماں کو یکایک ایک سچائی کا علم ہوا۔ انھوں نے سوچا میرا بیٹا میری بات سننے کے لئے منتظر کھڑا ہے۔ صرف ماں کی محبت سے نہیں بلکہ اس لئے کہ میں ایک زمانہ کی نمائندہ ہوں۔ ایک نشان ہوں۔ وہ زمانہ رسم و رواج کا زمانہ تھا۔ شاستر کے اصولوں پر چلنے والے قدامت پسند خاندان میں میرا جنم ہوا۔ بیٹا یہی چاہتا تھا کہ اس کا خاندان بھی اسی اصل کی پیروی کرے۔ یہ سوچتی ہوئی بڑھیا چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اپنے بیٹے کے سنگین فیصلہ پر اپنی چہیتی پوتی گیتا کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتی ہوئی دادی ماں کچھ بھی نہیں کہہ پائیں پاروتی نے بھی خط اٹھا کر پڑھا — وہ بلکتی ہوئی کہنے لگی — "اری کلموہی میرے سر پر آگ لگا دی تو نے!"

دادی ماں نے اپنی جبلی مستقل مزاجی کے ساتھ اس خط کو ہاتھ میں لے کر آخری فقروں پر نظر ڈالی — میرا یہ فیصلہ میرے ذاتی مفاد سے وابستہ ہے۔ دادی ماں کے سوا اور کس نے میرے لئے کچھ کیا ہے؟ اور کیوں میں کسی سے تیاگ کی امید کروں؟ — دادی ماں کے دل میں یہ الفاظ تیر کی طرح پیوست ہو گئے۔ انھوں نے اپنے ہونٹ کاٹ لئے۔ ان الفاظ کا مفہوم کوئی سمجھے نہ سمجھے گا، صرف دادی ماں ہی سمجھ سکتی ہیں۔ عمر کی اٹھارہویں سال میں گیتا بیوہ ہو گئی تھی۔ بالوں

میں پھول سجانا، ماتھے پر تلک لگانا اس نے چھوڑ دیا لیکن اس کے ماں اور باپ کس کو بھولے تھے؟ گیتا کی یہی قسمت ہے۔ اس کی بدبختی ہے۔ یہ سمجھ کر اس بیچاری کی ناگفتہ بہ حالت اور اس کے بے انتہا دکھ کو سبھی بھلا بیٹھے تھے۔ گیتا کے پیدا ہونے کے بعد بھی پاروتی پتھر ماں بنی تھی۔ امبی اور جانو کو اس نے جنم دیا تھا۔ زندہ رہنے کی خواہش کو لئے جینے والوں کا رد عمل یہی ہے۔ یہی زندگی ہے۔ لیکن؟ گیتا سے بھی کم عمر میں آج سے پچاس سال پہلے کے سماج میں بیوگی کی بے رحم اور ظالم آگ میں جو جلی سی لٹی سی رہ گئی تھیں۔ جنھوں نے اپنے دل کے رنگین تصورات اور ماضی کی حسین یادوں کو یکایک نکال پھینکا تھا، اپنے دل کی امنگوں اور ارمانوں کو بے رحمی کے ساتھ کچل دیا تھا وہ گوڑی دادی آج اپنی پوتی کے دل کے والہانہ جذبہ کو سمجھے بغیر کیسے رہتیں؟ اسی لئے تو دادی ماں گنیش ائر اور پاروتی کی طرح گیت کو بڑھاوا نہ دے سکیں۔ کسی کو بھی گالیاں دینا دھتکارنا ان کا کام نہ تھا۔ وہ تو نفرت بھی نہ کر سکتی تھیں۔ حالاں کہ ان کا دل درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

شام کو مینا اور امبی میٹنی شو سے لوٹے۔ دہلیز پر پاؤں رکھتے ہی امبی کی نظریں آرام کرسی پر لیٹی دادی ماں پر پڑیں۔ امبی یکایک رک گیا۔ اور پیچھے کی طرف مڑ کر اس نے مینا سے کہا۔ "دادی ہیں ری!"

"ہاں! اندر ہیں یا ہال میں؟" مینا کے قدم آگے نہ بڑھے۔

"اپنے سنگھاسن پر براجمان ہیں! سو رہی ہیں!"

مینا نے شانے پر جھولتے آنچل کو اٹھا کر سیدھا کیا اور تہہ لگا کر سمیٹ لیا۔ پھر آنچل سے کھلی پشت کو اچھی طرح ڈھانپ کر کمر میں اڑس لیا۔ ایک بار اپنی طرف دیکھ لیا کہ سب ٹھیک ہے یا نہیں۔ اس کے بعد سر جھکائے گھر میں آئی۔ اندر آنے پر معلوم ہوا کہ دادی ماں سو نہیں رہیں۔ اس کے پتا ایک طرف کرسی پر منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ ماں آنچل سے منہ ڈھانپ کر سسکتی ہوئی ایک طرف پڑی تھی۔ یہ دیکھ کر امبی اور مینا حیران سے رہ گئے۔ گھر میں نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟

جانو ہنستی ہوئی دوڑی آئی —— "دیکھو! دادی ککڑیاں لائی ہیں!"

آواز سن کر دادی ماں نے مڑ کر دیکھا۔ مینا کھڑی تھی۔

سامنے کھڑی مینا کو آنکھ بھر کر دیکھنے کے بعد دادی ماں یہ سوچنے کے لئے مجبور ہو گئیں کہ بیٹے نے گیتا کو مری ہوئی کیوں سمجھ لیا۔ پاروتی نے مشتعل ہو کر اسے بڑھاوا کیوں دی؟ بیٹے اور بہو کے غصے میں جو بے انصافی تھی وہ انھیں صاف دکھائی دی۔

مینا نے خط اٹھا کر پڑھا۔ دادی ماں نے اسے منع کرنا چاہا۔ پھر سوچا پڑھ لے تو اچھا ہی ہے۔ ان کی نظریں مینا کے چہرہ پر جمی رہیں۔ مینا کے چہرے پر نفرت کی لکیریں ابھر آئیں۔ "ہائے ری بے شرم!" اس کے پیچھے کھڑے ہو کر امبی بھی خط پڑھ رہا تھا۔ اور ایسی رونی صورت بنا رکھی تھی جیسے تلخ گھونٹ حلق کے نیچے اتار رہا ہو۔

گھر میں گہرا سناٹا چھایا تھا۔ اس طرح سب ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ رہے تھے جیسے گھر میں پلیگ کا چوہا نظر آگیا ہو! سب کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس دن رات کو گوڑی دادی نے کچھ نہیں کھایا۔ اپنی آرام کرسی سے اٹھی بھی نہیں۔ بیٹے اور بہو پوتے اور پوتی کو پھٹی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی دل ہی دل میں گیتا کے بارے میں سوچتی ہوئی پڑی تھیں۔ ان کے خیالات نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتے رہے تھے۔

پو پھٹنے کے پہلے ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔ جب ان کی آنکھیں کھلیں "مایا" کا دروازہ کھل چکا تھا۔ دروازے کے قریب لوہے کے چھڑوں کے پاس صندوقچی لئے نائی ویلا یدھم کھڑا تھا۔

ساری باتیں خواب بن جاتیں تو کتنا اچھا ہوتا —— دادی ماں نے سوچا لیکن میز پر پڑا ہوا وہ خط بتا رہا تھا کہ نہیں یہ خواب نہیں یہ سچ ہے۔ دادی ماں نے جھک کر خط کو ہاتھ میں اٹھایا اور پورا خط پھر ایک بار ایک ہی سانس میں پڑھ گئیں۔

گنیش ائر کمرے میں آیا اور غم میں گھلتی ہوئی ماں کو دیکھ کر دل جوئی کرنے کی غرض سے بولا "ماں! دروازے پر ویلا یدھم کھڑا ہے۔ اٹھو غسل کر لو۔ سمجھ لو کہ گیتا مر گئی!"

دادی ماں آگ بگولا ہو گئیں۔ "بند کرو اپنی زبان!" —— وہ تن کر کھڑی ہو گئیں —— "صبح صبح کیسی منحوس بات منہ سے نکالتے ہو بیٹا؟ ایسا کیا ہو گیا ہے کہ اسے مرنے کے لئے کہتے ہو؟" دادی ماں اپنے غصے پر قابو نہ پا سکیں۔ ان کا سارا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ چہرہ سرخ ہو گیا پھر وہ سسک سسک کر رو پڑیں۔ اور روتی ہی رہیں۔ کچھ دیر بعد اپنی سرخ سرخ آنکھیں کھول کر انھوں نے زور سے پوچھا۔ "کون سا پاپ کر دیا گیتا نے؟"

ماں کو مشتعل دیکھ کر گنیش ائر ہکا بکا رہ گیا، وہ بھی چلا اٹھا۔ "کون سا پاپ؟ ماں! یہ تم پوچھ رہی ہو؟ پاگل ہو گئی ہو کیا؟"

دوسرے لمحہ دادی ماں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اپنی فطری مستقل مزاجی کے ساتھ بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ خاموش کھڑی رہیں جیسے کچھ سوچ رہی ہوں ان کا بیٹا آج پہلی بار ان سے تن کر بول رہا تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد دھیمی لیکن پُر استقلال آواز میں بولیں —— "ہاں بیٹا! یہ پاگل ہو گئی ہوں لیکن میرا یہ پاگل پن آج کا نہیں ہے یہ میرا بہت دنوں پرانا روگ ہے۔ اس کا علاج نہیں۔ میرا پاگل پن تو میرے ساتھ ہی جائے گا۔ لیکن گیتا کا پاگل پن یکایک ظاہر ہو گیا ہے۔ اس کے لئے کسے دوش دیتے ہو؟ اس نے تو صاف کہہ دیا ہے نا کہ میرا فیصلہ میری نظر میں بالکل درست ہے!"

گنیش ائر نے بیچ میں ٹوکا —— "صاف کہہ دینے سے اس کا فیصلہ درست ہو جائے گا کیا؟"

"وہ تو کہتی ہے اس کا فیصلہ اس کی نظر میں بالکل درست ہے، کہو تم کیا کہتے ہو؟" دادی ماں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"چڑیل کہیں کی! اتنے باعزت خاندان کا نام مٹی میں ملا دیا۔ اسی لئے کہتا

ہوں ماں سمجھ لو کہ وہ پاپن مر گئی ـــــ ہمارے اصولوں کی بے حرمتی کی ہے اس چڑیل نے ــ گنیش پر جھپٹا ـ

دادی ماں نے پل بھر اپنے سامنے کھڑے بیٹے کو اس طرح دیکھا جیسے کسی اجنبی آدمی کو دیکھ رہی ہوں ۔ پھر ایک مغموم ہنسی کے ساتھ بولیں ـــ " ہمارے اصول ! ـــ ہاں ! ان اصولوں نے میری کیا گت بنائی ہے ۔ یہ جانتے ہو ؟ تم کیسے جانتے ؟ تم تو اس وقت دودھ پیتے بچے تھے ۔ میری عمر اس وقت پندرہ سال کی تھی ۔ تم اس وقت میری صورت دیکھتے تو خوفزدہ ہو کر چلا اٹھتے ۔ جیسے میں کوئی بھوت پریت ہوں ۔ بچہ ماں کا دودھ پینے سے ڈرتا تھا ۔ میری ایسی بھیانک صورت بنا کر لوگوں نے مجھے گھر کے ایک کونے میں بٹھا دیا تھا ۔ تم نے اپنی بیٹی کی ویسی درگت کیوں نہ بنائی ؟ کہو ، کیوں نہ وہ سب کچھ کیا تو نے ـــــ ؟ دادی ماں کی آنکھوں سے آنسو کی دھارا بہہ رہی تھی ۔ کچھ دیر چپ رہ کر بولیں ـــ " تمہارے اصولوں نے اسے رنگین ساریاں پہننے کی اجازت دی تھی کیا ؟ بال سنوار کر جوڑا بنا کر اسکول جانے کو کہا تھا کیا ؟ اپنا پیٹ بھرنے کی خاطر خود اسے کمانے پر مجبور کیا تھا ؟ تم نے ان سب باتوں کے لئے میری اجازت مانگی تو میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا ۔ میں نے کیوں منع نہیں کیا تھا ۔ یہ جانتے ہو ؟ سوچا تھا کہ زمانہ بدل رہا ہے انسان کو بھی بدلنا چاہیئے " ۔ دادی ماں لمبی آہ بھرتی ہوئی بولیں ـــــ " میرے لئے تم تھے گھر بار تھا ، دولت تھی ۔ پھر زمانہ بھی اسی طرح کا تھا ۔ آج گیتا جو کر بیٹھی ہے اس کا تصور تک اس زمانہ میں نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ لیکن آج دنیا بدل گئی ہے ۔ زمانہ بدل گیا ہے ۔ بیٹے تمہارا حال میں جانتی ہوں ۔ مجھ سے کوئی بات چھپی نہیں ہے ۔ تم بال بچے والے ہو ۔ کل ان کی بھی شادی ہوگی ۔ یہ سب میں جانتی ہوں لیکن اب بتاؤ کیا تمہارے اصول گیتا کو نئی زندگی دے سکیں گے ؟ گنیش ! مجھے معاف کر دے بیٹا ! مجھے اپنی وہ بٹیا چاہیئے ۔ مجھے اپنی گیتا چاہیئے ۔ میری زندگی میں اور کیا رکھا ہے ؟ میرے اصول میرے ساتھ رہیں گے ۔ میرے جسم کے ساتھ جل بھن کر وہ خاک ہو جائیں گے ۔ تم لوگ سکھی رہو ۔ میں چلی جاؤں اس کے پاس ۔ میں گیتا کے پاس چلی جاؤں گی سوچ کر دیکھو ، تمہارا دل مان جائے تو اچھا ، نہیں تو بیٹا سمجھ لینا گیتا کے ساتھ میں بھی مر گئی ! اچھا میں چلی ! "

دادی ماں نے الگنی سے اپنی ساری اتار تھیلی میں رکھ لی ۔

" ماں ! ـــ ماں !! "

ہاتھ جوڑتے ہوئے گنیش سسک سسک کر رونے لگا ۔

" کیوں روتے ہو بیٹا ؟ خوب سوچ سمجھ کر میں اس فیصلہ پر پہنچی ہوں ۔ آخر وہ بھی ہماری ہی بیٹی ہے نا ؟ " ـــــ دادی ماں کا گلا بھر آیا ۔ بہو کی طرف دیکھ کر بولیں ـــ " پاروتی ! ہوشیاری سے گھر بار سنبھالنا ۔ گنیش کا بھی خیال رکھنا ۔ ! "

دادی ماں نے سب سے رخصتی لی ۔

" گیتا کے پاس مجھے ابھی جانا ہے ۔ ! " ـــ کہتے ہوئے دروازے کی طرف گھومیں تو دیکھا کہ نائی ویلایدھم دروازہ پر کھڑا ہے ۔

" تو چا ، مجھے ابھی اسی وقت نیوپلی جانا ہے ! "

پچیس پیسے اس کے ہاتھ پر رکھ کر دادی ماں نے اسے واپس کر دیا ۔

آئندہ سے اس کی ضرورت ہی کیا ہے ؟ ہوں ! دنیا ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے میں کیا ایک نائی کو بھی نہیں بدل سکتی ۔ ؟ دل ہی دل میں سوچتی اور ہنستی ہوئی دادی ماں نے تھیلی اٹھائی ۔ آنگن پار کرتے ہوئے ایک بار مڑ کر دیکھا اور پھر باہر چلی گئیں ۔

صبح کی ہلکی دھوپ میں دھول میں پیروں کو جماتی ہوئی ہلتی ڈولتی جو بوڑھی دادی آرہی ہیں وہ ایسی معلوم ہو رہی ہیں جیسے برق رفتاری سے دھول اڑا کر آتے ہوئے نئے زمانہ کا خیر مقدم کرنے کے مقصد سے گذرے ہوئے زمانہ کا نشان بنی دادی ماں نہایت اطمینان سے دھیرے دھیرے قدم بڑھا رہی ہیں ۔ !

ہاں ! یہ آج اور کل کا سنگم ہے !

دو زمانوں کا سنگم !!

بقیہ تملناڈو میں اردو کے موجودہ ممتاز شعراء

ہے ۔ اہل ثروت و سربرآوردہ شخصیتوں نے اردو کے چراغ کو روشن رکھا ہے ۔ کیرلا ، کوئمبتور سے تقریباً ۸ کلومیٹر پر واقع ہے ۔

مولانا سید عبدالقادر نویدی اگرچہ سیتگرم کے ہیں جسے ابوالجلال ندوی نے بلگرام کہا تھا لیکن اردو کے تعلق سے آپ کی جدوجہد کوئمبتور میں جاری ہے ۔ نویدی ۱۷ ۱۹ء کو سیتگرم میں پیدا ہوئے ۔ پھر جامعہ دارالسلام عمرآباد میں درس نظامی سے فراغت حاصل کی ۔ مدراس یونیورسٹی سے درجۂ اول میں منشی فاضل کا امتحان پاس پاس کیا ۔ ۱۹۷۶ء تک سٹی میونسپل ہائی اسکول کوئمبتور میں اردو منشی کی حیثیت سے کام کرتے رہے ۔ کئی سال ایس ۔ ایس ۔ ایل سی اردو فارسی اور عربی کے ممتحن بھی رہے ۔ غزل سے خاص نسبت ہے ۔

جب نظر آتے ہیں وہ رہ کر حجاب اندر حجاب
کیوں کریں تکلیف پردے سے نکلنے کے لئے

راہ پر کچھ دلِ گمراہ کو لانا ہے مجھے
رفتہ رفتہ اسے دیوانہ بنانا ہے مجھے

شیوۂ ضبطِ جنوں راس رہا ہے ہم کو
سر سودا زدہ منت کشِ دیوار نہ تھا

بات ہی کیا ہے اگر بات بنائے نہ بنے
آگ لگ جائے جہاں آگ لگائے نہ بنے

اے نویدی کس کی سیمابی نظر مجھ پر پڑی
دل مرا مضطر ہے سینے سے نکلنے کے لئے

تمل ناڈو کے شعرا کا یہ جائزہ تشنۂ تکمیل ہی سہی لیکن اس آئینے میں جو مختلف عکس ، رنگ اور خطوط نظر آتے ہیں ۔ ان سے اتنا اندازہ مشکل نہیں ہے کہ اردو ادب میں تمل ناڈو کے ارباب قلم کا مقام متعین نہ کر کے اردو کے مؤرخوں نے کتنی بڑی غلطی کی ۔

دستکاریاں

تمل ناڈو کی حسین خطۂ ارض میں رہنے والے فن کار اپنے تخیل اور فن کاری کے امتزاج سے ایسی ایسی خوبصورت چیزیں بناتے ہیں کہ یہ اشیائے حسن ابدی مسرت کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ انہوں نے صدیوں پرانی اپنی کلا کو باقی رکھا ہے۔ اور ان کی کلاکاری کا سب سے عمدہ اظہار مندروں میں ہوا ہے جو مندر تمل ناڈو کی زندگی کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ ان مندروں کی تزئین و آرائش اور مندروں سے متعلق تہواروں اور میلوں کے موقعوں پر طرح طرح کی چیزیں بنانے کے لئے ہزاروں کلاکاروں کی ضرورت تھی۔ اسی لئے یہاں کی تمام پرانی کلائیں نہ صرف باقی رہیں بلکہ پروان چڑھتی رہیں۔

یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ تمل فن کاروں کا کمالِ فن سب سے زیادہ مورتیوں کی تیاری میں نمایاں ہوا ہے۔ دھات کی بنی ہوئی یہ مورتیاں خصوصاً نٹ راج کی مورتی دنیا کے سبھی کلا پریمیوں کو موہت کرتی ہے۔ مہابلی پورم اور دوسری جگہوں میں مجسمہ سازی کے جو مرکز قائم کئے گئے ہیں اس سے اس فن کو کافی بڑھاوا ملا ہے۔ ان مورتیوں کا تقدس ان کی مختلف مدرائیں اور اعضا کا تناسب قابلِ دید ہوتا ہے۔

تانبا اور رانگ کے مرکب سے یہاں بڑی خوبصورت چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ گھریلو استعمال کے برتن، گلدان اور کئی طرح کی چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ بچیار کوئل سوامی ملائی اور کوٹار میں تیار ہونے والے لیمپ بڑے دیدہ زیب ہوتے ہیں۔

چولاؤں کی راجدھانی تنجاوُر میں منقش چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ یہاں کی تیار کردہ پلیٹ، کٹورے، تانبا اور پیتل کے بنے ہوئے پاؤڈر بکس جس میں ہندو دیومالا کے مناظر چاندی سے بنے ہوئے ہوتے ہیں، بہت مشہور ہیں۔

مدورائے کا لکڑی کی کندہ کاری کا کام بڑا دل فریب ہوتا ہے۔ میناکشی مندر کے کلیانا محل (مدورائے) اور بہت سے دوسرے مندروں کے رتھوں میں لکڑی پر کندہ کاری کا بڑا نازک اور خوبصورت کام بنا ہوا ہے۔ آج کل دیومالائی مناظر کی کندہ کاری کا کام محدود پیمانے پر ہوتا ہے اور عام قسم کے نقش و نگار زیادہ بنتے ہیں۔ مدورائے اور وردھ نگر کے ٹیبل اور تپائی کندہ کاری کے بڑے عمدہ نمونے ہیں۔

مجسمہ سازی یا پتھروں کو کاٹ کر انسانی اشکال یا دیوی دیوتاؤں کی شبیہیں بنانے کا فن یہاں بڑا قدیم ہے۔ یہاں کا ہر مندر ایک نغمہ ہے جس کی تشکیل میں یہ مجسمے گویا ——— کئی راگ راگنیاں ہیں۔ ہر شکل، تناسب موزونیت اور تاثرات کے لحاظ سے خود ایک مکمل شئے ہے۔ ان مجسموں کی چھوٹی چھوٹی مورتیاں اسی ناپ اور طریقے سے بنتی ہیں جو قدیم کتابوں میں درج ہیں۔

جنوبی ہندوستان کا ایک مخصوص فن، تنجاوُر، ترچراپلی اور مدورائے کا ٹین کو کھرچ کر ابھرواں کام بنانا ہے۔ مندروں، جانوروں، پھولوں اور مورتیوں کی شبیہیں بنائی جاتی ہیں۔

تمل ناڈو کی ایک عوامی دستکاری تاڑ کے پتوں سے مختلف اشیاء کی تیاری ہے، روزمرہ کی ضرورت کی بہت سے دلکش چیزیں ان پتوں سے بنائی جاتی ہیں۔ منا پڈ، رام ناتھ پورم، ناگور اور متھرا میں بنے ہوئے ہینڈ بیگ، پھولوں کے لئے باسکٹ، لیمپ شیڈ اور کھلونے بڑے خوبصورت اور دلکش رنگوں میں ہوتے ہیں۔

چمڑے کی بھی بہت سی چیزیں بنتی ہیں۔ خصوصاً ہینڈ بیگ بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ سانپ کی کھالوں کے پاؤڈر کیس، سلیپر اور جانوروں کے بچوں کی کھالوں کے کھلونے بھی بڑے خوبصورت ہوتے ہیں۔ بید کی بھی چیزیں بنتی ہیں۔ بید کے صوفے، کرسیاں، تپائیاں، اور والاجاہ پیٹ اور آنئے کرن چیڑا میں بنی ہوئی ٹوکریاں اور طشت بڑی خوبصورت کاریگری کا نمونہ ہیں۔

کورائی گھاس کی ہاتھ کی بنی ہوئی چٹائیاں تمل ناڈو کا خاص تحفہ ہیں خوبصورت ڈیزائن اور رنگوں کی چٹائیاں دست کاری کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ترونلویلی ضلع میں پتامڈائی کی چٹائیاں سب سے عمدہ ہوتی ہیں۔ یہ چٹائیاں دیواروں پر لگانے، زمین پر بچھانے یا چادر کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ سگریٹ کیس، ہینڈ بیگ اور دوسری مغربی چیزیں بھی بڑی خوبصورت ہوتی ہیں۔

مختلف چیزوں سے مختلف علاقوں میں بڑے رنگا رنگ اور حسین کھلونے بنتے ہیں۔ جنوبی آرکاٹ میں جانوروں اور چڑیوں کے بڑے بڑے سائز کے کھلونے۔ مدورائے میں پیتل اور چاندی کے سانپ اور چھپکلی اور ملواڈام کے چمڑے کے کھلونے مدراس کے بنے ہوئے کانچ کے کھلونے قابلِ ذکر ہیں ——— گنیڈی (مدراس) پیپر ماشی کی بنی ہوئی گڑیاں بڑی مشہور ہیں۔ کتھاکلی اور بھارت ناٹیم کی مدرا والی گڑیاں بڑی مقبول ہیں۔

نذیر محمد
سکریٹری انجمن ترقیٔ اردو
مدراس

جنگِ آزادی میں تمل ناڈو کا حصّہ

تمل ناڈو نے ملک کی جنگِ آزادی میں دوسری ریاستوں کے دوش بدوش حصہ لیا۔ اس کی سرزمین سے ایسے سپوت پیدا ہوئے جو مجاہدین کی فوج میں پیش پیش رہے اور اپنے قابلِ فخر اور لائقِ تحسین کارناموں کی بدولت نہ صرف ملک بھر میں مشہور ہوئے بلکہ بعد میں چل کر بین الاقوامی شہرت کے مالک بھی بنے۔ تمل ناڈو کی تاریخِ جنگِ آزادی دراصل ملک کی تاریخ ہے۔ جو تحریک شمال میں جاری ہوتی تھی۔ اس کی برقی لہر کنیا کماری اور بحیرۂ ہند تک پہونچ جاتی تھی۔ اگر ان تمام واقعات کو تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن سکتی ہے۔ یہاں نہایت اختصار کے ساتھ چند اہم تاریخی واقعات پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمل ناڈو میں جدوجہد آزادی کی تحریک کیسے شروع ہوئی۔ کن شخصیتوں نے حصہ لیا۔ اخبارات کا کیا رول رہا۔ ادیبوں اور شاعروں نے کیا کردار ادا کیا۔

ملک میں بڑھتے ہوئے بیرونی تسلط کے خلاف غم وغصہ کی چنگاری دبی ہوئی تھی۔ جب کبھی موقعہ ملتا یہ چنگاری شعلے کی صورت اختیار کرلیتی۔ سب سے پہلے انگریزوں کے تسلط کے خلاف جنھوں نے قدم اٹھایا وہ نواب عمدۃ الامرا تھے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ۱۷۹۲ء میں بیرونی مسلم سلاطین اور اسوقت کی انگریز دشمن طاقتوں سے برطانوی سامراجیت کو ختم کرنے کے بارے میں خط وکتابت کی۔ جب اس کا علم انگریزوں کو ہوا تو انہوں نے ۱۸۰۱ء میں نواب عمدۃ الامرا کی وفات پر مرحوم کو اور ان کے والد نواب والاجاہ کو انگریزوں کا دشمن قرار دیتے ہوئے کرناٹک سلطنت کا جانشین نواب عمدۃ الامرا کے بیٹے کے بجائے نواب والاجاہ کے دوسرے پوتے اعظم الدولہ کو بنایا اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی۔

۱۷۹۸ء میں بمقام "پانچالن کرچی" ضلع ترنلویلی ایک مجاہد کٹابمن نے انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ جسکے نتیجہ میں ۱۶ اکتوبر ۱۷۹۹ء کو اسے پھانسی دے دی گئی۔ آزادی کی تحریک قریب قریب ترچناپلی تک پہونچ گئی تھی۔ اس میں حصہ لینے والے "سیوا گنگا" کے دو بھائیوں کو جو مردو بھائیوں کے نام سے مشہور تھے۔ ۱۸۰۱ء میں پھانسی دے دی گئی۔ ۱۸۰۶ء میں ویلور ضلع شمالی آرکاٹ میں ہندوستانی سپاہیوں نے نئے حکمرانوں کے نئے قوانین کے خلاف اور اسی اثنا میں ٹیپو سلطان شہید کے فرزندوں کی ویلور جیل میں نظر بندی کے خلاف بیزاری اور نفرت کا اظہار بغاوت کی صورت میں کردیا۔ تین دن کے اندر یہ بغاوت فرو کردی گئی۔

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی کے بعد جس میں وطن پرستوں کو ناکامی ہوئی انگریزوں کی گرفت بہت ہی سخت ہوگئی۔ ہندوستانیوں پر بے حد ظلم کیا جانے لگا اور آزادی کی تحریک کو بڑی سختی اور سنگ دلی سے دبا دیا گیا لیکن جو آگ ہندوستانیوں کے سینوں میں سلگ رہی تھی وہ بجھنے نہ پائی چنانچہ ۱۸۷۸ء میں شری جی سبرامنیم آئیر، آرنگایا نائیڈو نے آزادی کی تحریک کو پھر سے ابھارا۔ ۱۸۸۵ء میں آنند اسرو نے بحیثیت نمائندہ جنوبی ہند بمبئی میں منعقدہ کانگریس کانفرنس میں شرکت کی۔ ۱۹۲۰ء میں ناگپور کانگریس کانفرنس کی بھی صدارت کی آزادی کے پیغام کو عام کرنے کے لئے انھوں نے ایک روزنامہ "ویجنتی" کا اجراء کیا۔

۱۸۸۷ء میں کانگریس کا تیسرا سالانہ اجلاس مدراس میں ہوا۔ جس کی صدارت جناب بدرالدین طیب جی نے کی تھی۔ مدراس سے جن مندوبین نے شرکت کی تھی ان میں ٹی مادھوراؤ، سبرامنیم ائیر، رنگیا نائیڈو، سبھاپتی مدالیار، ایس اے سوا ناتھ ایر، پی سوما سندرم چیٹی، ارڈے نارٹن، اور اے اوپوم شامل تھے۔

کانگریس کا دوسرا سالانہ اجلاس ۱۸۹۴ء میں مدراس میں ہوا تھا جس کی صدارت مسٹر الفرڈ ویب نے کی تھی۔ ۱۹۰۸ء کے سالانہ اجلاس کی صدارت راس بہاری بوس اور ۱۹۱۴ء کے اجلاس کی صدارت بھوپیندر ناتھ بسو نے اور ۱۹۲۷ء کے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر انصاری نے کی تھی۔

بیسوی صدی کے آغاز میں تحریک زور پکڑتی گئی۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں تمل ناڈو کے قابلِ فخر سپوتوں شری سی سبرامنی بھارتی، شری وی او چدمبرم پلے اور شری سبرامنیم سیوا نے نمایاں حصہ لیا۔ شری بھارتی نے اخبار "سودیسا مترن" کے ذریعہ جس کے وہ نائب مدیر تھے گھر گھر آزادی کا پیغام پہونچایا۔ ان کی قومی نظمیں جذبۂ آزادی کو برانگیختہ کرنے میں بڑی معاون ثابت ہوئیں۔ ۱۹۰۶ء میں چدمبرم نے ترونلویلی شہر میں دیش کی آزادی کی خاطر ایک سوسائٹی قائم کی۔ انہوں نے "ٹوٹی کورن" کے ایک مسلم وطن پرست فقیر محمد کے ایما پر اسی شہر میں ایک دیسی جہاز رانی کی کمپنی قائم کی۔ اس کمپنی کے قیام کا مقصد یہی تھا کہ انگریزی حکومت کی بحری تجارت کو جس کے بہانے وہ ملک پر قابض ہوگئے تھے مفلوج کردیا جائے۔ اس اقدام پر انگریزی حکومت نے انھیں گرفتار کرکے جیل بھجوادیا۔ قومی شاعر بھارتی کے ساتھ جن لوگوں

نے گاؤں گاؤں گھوم کر آزادی کی جدوجہد کے لئے عوام کو جھنجھوڑا تھا۔ ان میں شری وانچی آیر، شری پرلی شنمگا سندرم پلے اور شری وی وی ایس آئیر، قابل ذکر ہیں۔ شری وانچی آیر نے اپنی سرگرمیوں کی پاداش میں سات سال جیل کی سزا بھگتی۔ ۱۷ رجون ۱۹۱۱ء کو اس دلیر وطن پرست نے ترونلویلی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر آس کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔ شری پرلی شنمگا سندرم پلے نے پہلی مرتبہ تمل ناڈو میں "وندے ماترم" کا نعرہ بلند کیا اور یہ سارے تمل ناڈو میں اس قدر مقبول ہوا کہ شری پلے کو عوام وندے ماترم پلے کے نام سے پکارنے لگے۔ شری وی وی آئر نے اس زمانے میں بیرونی ممالک سے پانڈیچری کے ساحل پر جو اس وقت فرانس کے زیر حکومت تھا جنگی ہتھیار درآمد کرنا شروع کیا تاکہ دہشت انگیزی اور گوریلا قسم کی کاروائی سے انگریزوں کو تنگ کیا جاسکے۔

۱۹۱۷ء میں ڈاکٹر مسز اینی بینٹ نے "ہوم رول" تحریک شروع کی۔ اس کی پرزور تائید شری کے باشیم آئنگار اور شری سی پی آر سوامی آئیر نے کی۔ اس تحریک کو مقبول عام بنانے کے لئے مسز اینی بینٹ نے پہلی مرتبہ تمل ناڈو سے انگریزی رسالے "نیو انڈیا" اور "کامن ویل" جاری کئے۔

۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک کی پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج نے وعدہ کیا تھا کہ ترکی جو اس وقت جرمنی کا حلیف تھا اگر جنگ میں ہار جائے تو برطانیہ اس سے نرمی کا سلوک کرے گا۔ جنگ کے بعد برطانیہ نے وعدہ خلافی کی جس کی وجہ سے مسلمان انگریزوں سے بددل ہوگئے ترکی کی خلافت کی حمایت میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا محمد شوکت علی کی زیر سرکردگی خلافت تحریک کا آغاز ہوا۔ مدراس میں ۱۹۱۸ء میں نواب عبدالقادر مرحوم نے یہ تحریک شروع کی۔ ترچناپلی کی مجلس علماء کے صدر مولوی سید مرتضیٰ صاحب نے جو بعد میں سنٹرل ایم ایل اے ہوئے اس میں زبردست حصہ لیا یعقوب حسن سیٹھ صاحب نے جو اس وقت کونسل کے رکن تھے انگریزوں کے خلاف عام جلسوں میں تقریریں کیں اور کونسل کی رکنیت سے دستبردار ہوگئے مدراس خلافت کمیٹی کے صدر تمل ناڈو کے ایک رئیس مخیر تاجر نواب سی عبدالحکیم تھے۔ انہوں نے دل کھول کر اس تحریک کی مالی اعانت کی۔ مدراس کے ایک اور قومی شاعر، آتش بیاں مقرر اور انشاء پرداز عبدالمجید شرر آلندوری نے جو اردو روزنامہ "قومی رپورٹ" کے مدیر تھے۔ اس ہلچل کی زبردست تائید کی۔ حکومت کے خلاف اشتعال انگیز تقریر کرنے کی پاداش میں انہیں سزائے قید دی گئی۔

۱۹۱۹ء رولٹ ایکٹ کے خلاف ملک بھر میں احتجاج ہوا۔ اسی زمانے میں جلیان والا باغ کا حادثہ بھی وقوع پذیر ہوا۔ ہندوستانی عوام بہت مشتعل ہوگئے گاندھی جی کی قیادت میں اگست ۱۹۲۰ء میں برطانوی نام نہاد اصلاحات کے خلاف احتجاج کے طور پر عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی۔ اگست ۲۰ء میں مہاتما گاندھی، علی برادران کے ساتھ مدراس آئے، مہاتما گاندھی ۱۹۲۱ء میں دوبارہ آئے۔ ہندو اور مسلمان دونوں نے متحد ہوکر عدم تعاون اور خلافت تحریک بڑے زور و شور سے چلائی۔ ۱۹۲۱ء میں تمل ناڈو میں بہت سے آزادی کے متوالوں نے شراب کی دوکانوں اور بیرونی کپڑوں کی دوکانوں کے روبرو ستیہ گرہ کیا۔ اور گرفتار ہوئے۔ ان تمام کو سزائے قید دی گئی۔ مالابار میں جو اس وقت مدراس صوبہ کا حصہ تھا۔ یعقوب حسن سیٹھ صاحب نے اپنی شعلہ بیانی سے کام لیا۔ ۱۹۲۱ء میں وہاں موپلا بغاوت برپا ہوئی جس کے نتیجہ میں بہت سے مسلمان مارے گئے۔ سیٹھ صاحب کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس وقت شرر آلندوری نے چند اشعار اخبار قومی رپورٹ میں سیٹھ صاحب کی گرفتاری کے تعلق سے لکھے تھے وہ ہدیۂ ناظرین ہیں۔

ابھی سورج نہیں ڈوبا ابھی دن ہے ابھی روز
آنکھ والے ابھی اے حضرت من اور بھی ہیں
سر کٹانے کے لئے راہ خدا میں ہر دم
ملک میں قوم میں یعقوب حسن اور بھی ہیں

مدراس کے اردو روزنامہ آزاد ہند میں انہی دنوں ایک نظم شائع کی گئی جس کو انگریزی حکومت نے قابل تعزیر سمجھا، اخبار سے ضمانت طلب کی۔ ضمانت نہ دینے پر اخبار بند ہوگیا۔ اس اخبار کے مدیر مولانا محمد عبداللطیف فاروقی صاحب کو اس جرم کی پاداش میں چھ ماہ قید کی سزا دی گئی اور ان کا خاندانی وظیفہ بھی بند کردیا گیا۔ قارئین کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ مولانا اب بھی بفضل تعالیٰ بقید حیات ہیں اور اخبار "مسلمان" مدراس کے واحد اردو روزنامہ کے اعزازی مدیر ہیں۔ حال ہی میں حکومت ہند نے ان کی قربانیوں کے صلہ میں انہیں "تامر پتر" اور ماہانہ دو سو روپیہ کا وظیفہ عطا کیا۔ ۱۹۲۰ء میں مدراس میں آل انڈیا خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ تمل ناڈو کی ایک مشہور شخصیت شری راجگوپال آچاری اور مسلمانوں کے رہنما جناب عبدالحمید صاحب دونوں نے مل کر جنوبی ہند کا دورہ کیا اور کانگریس کے عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں کو فروغ دیا۔ تمل ناڈو کے اس پرآشوب دور میں مشہور وطن پرست شری ایس سرنیواسا آئنگار نے کانگریس کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی اور یہاں کے انتخابات میں حصہ لے کر کامیاب ہوئے۔

بیسویں صدی کے اس ہنگامی زمانے میں تمل ناڈو کے ایک اور نامور عوامی رہنما شری کے کامراج نے جدوجہد آزادی میں حصہ لیا۔ آپ نے اپنی زندگی کے تین ہزار دن چھ مرتبہ جیل میں کاٹے۔

۱۹۲۳ء میں ناگپور پرچم ستیہ گرہ کی تحریک شروع ہوئی۔ تمل ناڈو سے بہت سے ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس میں حصہ لیا اور جیل کی سزائیں بھگتیں۔ ترپور کمارن نے لاٹھیوں کے زد و کوب کی تاب نہ لاکر کانگریسی پرچم ہاتھ میں تھامے ہوئے اپنی جان دیدی۔ ۱۹۲۷ء میں کل ہند کانگریس کا اجلاس مدراس میں منعقد ہوا اسکی صدارت ڈاکٹر انصاری نے کی۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کی آزادی کو نصب العین قرار دیا گیا۔ اسی سال مدراس کی مشہور شاہراہ ماؤنٹ روڈ کے ایک چوراہے پر موجود جنرل نیل کا جس نے آزادی

کی پہلی جنگ ۱۸۵۷ء کو دبانے میں اہم پارٹ ادا کیا تھا۔ مجسمہ ہٹانے کے سلسلے میں ستیہ گرہ شروع ہوا۔ اس میں بہت سے جاں نثارانِ وطن نے حصہ لیا، اور سزائے قید پائی۔

۱۹۲۸ء میں جب سائمن کمیشن برطانیہ سے آیا تھا تو اس کا بائیکاٹ کیا گیا تھا۔ اس کمیشن کے خلاف مدراس میں بھی زبردست مظاہرے ہوئے۔ مظاہرین پر پولیس نے گولیاں چلائیں جن سے ایک نئے مسلم دولہا مقام واردات ہی پر شہید ہو گئے۔ عوام کے جذبات بہت مشتعل ہو گئے۔ اس وقت کے ایک مقامی اردو شاعر نے ایک مرثیہ شہادت پر لکھا جو زبان زد خاص و عام رہا۔ اس کا پہلا شعر تھا ؎

دیکھو بادشاہ کا لاشہ چلا ہے
مار گولی کی کھا کر مرا ہے

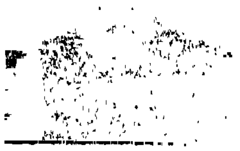
مارچ ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ تمل ناڈو میں یہ تحریک بڑے زور و شور سے چلائی گئی۔ نمک بنانے کا ستیہ گرہ بھی شروع ہوا۔ شراب کی دوکان اور بیرونی ممالک کے کپڑوں کی دوکانوں کے روبرو بھی ستیہ گرہ کیا گیا۔ ۱۹۳۲ء تک بڑی شد و مد کے ساتھ ہنگامے ہوتے رہے بہت سے گرفتار کئے گئے اور جیل بھیجے گئے۔ ان احتجاجی مظاہروں میں نمایاں حصہ لینے والوں میں شری سی راج گوپال اچاریہ، شری ایس ستیہ مورتی سردار ویدارتنم پلے، شری ٹی کے چدمبرانار، شری وی وی راسوامی نائیکر اور شری کامراج، مولانا صاحب مدورے والے، ان کے عقیدت مند اور ایک تمل مسلم شاعر شیخ تمبی قابل ذکر ہیں۔ شری ایس ستیہ مورتی ایک قابل وکیل اور شعلہ بیان مقرر تھے ان کی شعلہ بیانی سے خواہ وہ ایوان کے اندر ہو یا باہر انگریز سرکار بہت خائف رہتی تھی۔ تمل ناڈو کے ایک مقام "ویدارنیم" پر نمک بنانے کی مہم میں شری راج گوپال آچاریہ اور سردار ویدارتنم پلے نے جو حصہ لیا اور جسمانی اذیتیں برداشت کیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔

۱۹۳۹ء میں جب دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو کانگریسی وزارتیں ہندوستان کو اپنی مرضی کے خلاف جنگ میں شامل کرنے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مستعفی ہو گئیں۔ تمل ناڈو کی کانگریسی وزارت بھی مستعفی ہو گئی اور جنگ کے خلاف تحریک میں لوگوں نے حصہ لیا۔ ۱۹۴۱ء تک انفرادی طور پر ستیہ گرہ کرتے ہوئے بہت سے گرفتار ہوئے۔ ستمبر ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک بہت زور سے شروع ہوئی۔ حکومت کو بہت پریشان کیا گیا اور باوجود سختی سے اس تحریک کو دبانے کی کوشش کے بہت سے حصہ لے کر گرفتار ہوئے۔ تمل ناڈو کانگریس کے صدر جناب ویلور عبیداللہ صاحب جو راجہ جی کے قریبی دوست بھی تھے گرفتار ہونے والوں میں شامل تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر ۱۹۴۵ء کے بعد تمام رہنما رہا کر دیئے گئے۔ آزادی کی یہ جدوجہد بالآخر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو کامیاب ہوئی جبکہ ہندوستان مکمل طور پر انگریزی تسلط سے آزاد ہو گیا۔

اخبارات اور جریدے

جن اخبارات اور جریدوں نے جنگ آزادی کے دوران جنم لیا اور اس میں بھرپور حصہ لیا۔ ان کا یہاں اختصار کے ساتھ تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ ترودی کلیانا سندرانا نے "دیس بھکتی" نامی رسالہ جاری کیا۔ جب اس کی اشاعت ممنوع قرار دی گئی تو انہوں نے ایک ہفتہ وار جریدہ "نوا سکتی" کا اجرا کیا۔ اس کے علاوہ ان کی بہت سی تصانیف بھی جن سے آزادی کی تحریک کو قوت پہونچی تھی منظر عام پر آئیں ڈاکٹر ورد اراجلو نائیڈو نے "تمل ناڈو" اخبار اور ایک ہفتہ وار "پرپنجامترن" جاری کیا۔ انہی دنوں تیلگو زبان میں "آندھر پرچا" اور انگریزی زبان میں "انڈین ایکسپریس" بھی شائع کئے گئے۔ شری سی راجگوپال اچاریہ نے انگریزی ماہنامہ "ینگ انڈیا" کی جسکو مہاتما گاندھی نے جاری کیا تھا ادارت کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیئے۔ شری بھکتا وتسلم جو بعد میں تمل ناڈو کے وزیر اعلیٰ بنے۔ "بھارت دیوی" نامی رسالہ جاری کیا۔ شری ایم سری نواسا آئینگار روزنامہ "دی انڈیا" کے مدیر رہے۔ شری جی سبرامنیم آئیر جنھیں جنوبی ہند کی صحافت کا بابا کہا جاتا ہے یکم ستمبر ۱۸۷۸ء کو انگریزی روزنامہ "دی ہندو" جاری کیا۔ مدراس اسٹانڈرڈ نامی ایک انگریزی رسالہ بھی اپنی ادارت میں شائع کیا۔ ۱۸۸۲ء میں تمل اخبار "سودیسمترن" بھی جاری کرنے کا سہرا انھیں کے سر رہا۔

اردو اخبارات جو آزادی کی جدوجہد میں پیش پیش رہے وہ "قومی رپورٹ" "آزاد ہند" اور "مسلمان" ہیں۔ قومی رپورٹ کے مدیر مولانا عبدالمجید شرر الندوی تھے جو قومی شاعر ہونے کے علاوہ ایک آتش بیان مقرر بھی تھے۔ "آزاد ہند"



مولانا
عبداللطیف فاروقی

جنگ آزادی کے سپاہی
جنھیں حکومت کی طرف سے
تامر پتر اور وظیفہ دیا گیا ہے

کے مدیر مولانا محمد عبداللطیف فاروقی صاحب تھے جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اخبار "مسلمان"، جس کا افتتاح ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر انصاری نے کیا تھا آج تک جاری ہے اور اس کی ادارت کے فرائض گذشتہ ۴۰ برس سے مولانا فاروقی صاحب انجام دے رہے ہیں۔

رؤف نیاز
۴۔۴۴، ۱۵۱ اسٹریٹ، قادرپیٹ
وانمباڑی

تمل ناڈو کے رسومات

جغرافیائی اعتبار سے اگرچہ کہ ہندوستان ایک ملک ہے، لیکن مختلف مذاہب، زبانوں اور تہذیبوں کی وجہ سے کئی ملکوں کا مجموعہ نظر آتا ہے۔ اس برصغیر میں دنیا کے تمام بڑے مذاہب کے ماننے والے موجود ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ و روایات صدیوں پرانی ہے۔ انہی روایات و تہذیب نے یہاں کے باشندوں کو نسل، قوم، رنگ، مذہب اور زبان کے اختلاف کے باوجود ایک خاص روحانی، ذہنی اور نفسیاتی زنجیر میں جکڑ دیا ہے۔ مورخین نے اسی بنیادی خوبی کی وجہ سے اس نیم براعظم کو UNITY IN DIVERSITY یعنی کثرت میں وحدت کے نام سے موسوم کیا۔ یہ سرزمین جہاں متعدد مذاہب کا مرکز ہے، وہاں بیشمار رسم و رواج کا بھی گہوارہ ہے۔ ان رسومات میں کہیں دلکشی تو کہیں پاکیزگی اور تقدیس کی خوشبو بھی مہکتی ہے۔ شادی ایک ایسی تقریب ہے جو بغیر رسومات کے ادا نہیں ہوتی۔ دنیا کے ہر حصہ میں شادی کا تصور، شادی کی تقریب اور شادی کے دلچسپ رسم و رواج موجود ہیں۔ ہندوستان بھی رسم و رواج کے سلسلے میں کسی اور ملک سے پیچھے نہیں۔ جنم جنم سے وضع داری، اخلاص، میل ملاپ اور بھائی چارگی اس ملک کا شیوہ رہی ہے۔ اسی اخلاص و رواداری نے ایک ایسی مشترکہ تہذیب کو جنم دیا ہے جس نے کم و بیش تمام ہندوستانی مراسم کو زنجیر کی کسی نہ کسی کڑی سے منسلک کر رکھا ہے۔ تمل ناڈو کی مسلم رسومات میں مرہٹہ اور راج پوتی رسم و رواج کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ہر تقریب اپنی رعنائیوں میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

تمل ناڈو کی کچھ تقریبات اور ان سے متعلق چند رسومات کا خاکہ حسب ذیل ہے۔

پھول پہننا

لڑکی کے بلوغت پانے پر جو رسم ادا کی جاتی ہے اس کو دکنی زبان میں پھول پہننا کہتے ہیں۔ اس موقعہ پر رشتہ دار اور اقربا میوہ جات اور مٹھائیوں کے خوانوں کے علاوہ اخروٹ پستہ اور بادام کے خوان جن پر چاندی کے ورق لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ قرینے سے سجا کر لڑکی کے گھر لے جاتے ہیں۔ اس تقریب کے اعزاز میں لڑکی والے ایک پرتکلف ضیافت کا اہتمام کرتے ہیں۔ جس کے اختتام پر لڑکی کو عمدہ پوشاک پہنا کر پھولوں کی بدھی، چوٹی اور ہار پہنائے جاتے ہیں۔

ختنہ

ختنہ کی تقریب میں گوٹہ، کناری اور دھنک سے آراستہ لال کرتا لڑکے کو پہنایا جاتا ہے اور لال کمبہ ڈالے ہوئے گھوڑے پر لڑکے کو بیٹھا کر اس کے ہاتھ کس لئے جاتے ہیں۔ لڑکا بزرگوں کی ہدایت پر دین دین کہتا ہے اور اسی عالم میں خلیفہ اپنا کام سرانجام دے جاتا ہے۔ اکیس دن کچا انڈا اور خالص گھی نہار منہ لڑکے کو پلایا جاتا ہے۔ غسل صحت کے بعد گل پوشی کی رسم ہوتی ہے۔ ٹوپی، شیروانی اور پائجامہ جو زردوزی کے بہترین نمونے ہوتے ہیں، لڑکے کو پہنائے جاتے ہیں۔ اس موقعہ پر شاندار ضیافت کا اہتمام ہوتا ہے۔

منگنی

منگنا، منگنی، قول بیڑا، شکرانہ، وہ مترادف الفاظ ہیں جو نسبت کے ہم معنی ہیں۔ مستورات کا وہ طبقہ جنھیں مڈاوتنی (مشاطہ) کہا جاتا ہے، شادی بیاہ کے سلسلے میں اہم رول ادا کرتا ہے انہی کی وساطت سے کنوارے لڑکے لڑکیوں کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ اور یہ کار خیر اکثر انہی کی وساطت سے سرانجام پاتا ہے لڑکے والوں کا لڑکی کے گھر میٹھا کھا لینا اظہار پسندیدگی کی علامت ہے۔ طرفین کی باہمی منظوری کے بعد کسی مقررہ تاریخ پر لڑکے والے مہندی کی پٹی، انگوٹھی یا کوئی گہنا پرتکلف خوانوں کے ساتھ لیکر لڑکی کے گھر پہنچتے ہیں۔ ضیافتی کاروائی کے بعد طرفین کے بزرگ شادی کی تاریخ اور دیگر معاملات طے کر لیتے ہیں۔ دولہا چوں کہ اس تقریب میں اکثر شامل نہیں ہوتا، بڑی بڑی سینیوں میں کھانے سجا کر بھیج دیئے جاتے ہیں۔

شادی

شادی بیاہ میں آرائش و زیبائش کو ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے ہر خطہ میں ضروری سمجھا گیا ہے۔ اس ضمن میں تمل ناڈو کے زیورات، پارچہ جات اور ملبوسات کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ گہنے جو گلے میں پہنے جاتے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں تلسی مالا، اوسی مالا۔ موہن مالا۔ گھنوالا، کاسن مالا، اول ہار، آمنی ہار، گلاب ہار، پھول ہار، چندن ہار، کانی ہار، گلسر، گج، لچھا، سرڑ، اڈی گے، ٹیکہ، گلوبند، بے قرار، جگنی، وغیرہ ۔ جھومر، جھمکا، بندے، پتہ ڈنڈی، سراسری، بالی سموسہ، بجڑا، لورنج، بالی، کمبل، ماٹل، نکی، لولاک کان کے زیورات ہیں ناک کے گہنوں میں سیپلی، بیسر، نتھ، بلاخ اور مٹو بہت زیادہ مروج ہیں۔ کمر میں کمر بند اور سروج ڈالا جاتا ہے۔ لاکڑی، چاند تارہ، کھبہ اور بخندہ سر میں استعمال ہونے والے گہنے ہیں۔ ہاتھوں میں انگوٹھی، گلس، سنگڑی کنگن، گوٹ اور مہندی پہنائی جاتی ہے۔ پاؤں میں اکثر چاندی کے زیورات

پہنائے جاتے ہیں۔ جن کو چھلہ، جھانجن، پائجن، پازیب، توڑے، دوے لنگا، مُرک، جھنجھنی کی پٹی اور پازیب کہا جاتا ہے۔ پارچہ جات و ملبوسات میں میں سوسی گلبدن، چنڈی، تافتہ، زربفت، اطلس، کم خواب، مشجر، کسمہ، ریشمی اور بنارسی جنگلہ دار ساڑیوں کا رواج ہے۔ ایک رات کی دلہن، چولی، کرتہ، لہنگا، داونی اور اوڑھنی پر کلابت، گوٹہ، نکی، کناری بادلہ، دھنک اور آریہ کی کشیدہ کاری اور زردوزی کے سنہرے گل بوٹے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ اور دیگر رسومات اکثر نیک شگون دیکھ کر انجام پاتی ہیں۔ مستورات میں مہینوں کے نام مخصوص انداز میں بولے جاتے ہیں۔ ان ناموں کی مدد سے وہ نیک و بدشگونوں کا پتہ چلا لیتی ہیں۔ مہینوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

محرم (محرم) صفر (تیرہ تیزی) ربیع الاول (بارہ وفات) ربیع الثانی (دستگیر) جمادی الاول (مدار) جمادی الثانی (قادر) رجب (رجب) شعبان (شعبان) رمضان (رمضان) شوال (دودھ) ذی قعدہ (بندہ نواز) ذی الحجہ (بقرعید) ان مہینوں کے اکثر نام اولیائے کرام کی سال گرہ و عرس سے تعلق رکھتے ہیں۔ صفر اور ربیع الاول سرورِ کائنات کی بیماری اور وفات سے منسلک ہے۔ محرم اور صفر میں کوئی تقریب نہیں کی جاتی۔ ان مہینوں میں اکثر اوقات صدقے دیئے جاتے ہیں۔ ربیع الاول کے ابتدائی بارہ دنوں کے بعد تقاریبی سلسلے شروع کئے جاتے ہیں۔

تقریب شادی کی پہلی رسم 'منجھا' ہے۔ دلہن کو ہفتہ یا عشرہ پہلے کمرے میں بٹھا دیا جاتا ہے اور اس کو سب کے سامنے نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس دوران وہ نہایت ہی سادہ لباس میں ہوتی ہے اور گہنوں کی بجائے صرف اس کی کلائیوں میں چند کانچ کی سبز چوڑیاں ہوتی ہیں۔ ہر رات چکسہ اور ملوٹ (ہلدی و ابٹن) لگائے جاتے ہیں۔ جن میں کچھ عناصر ایسے ہوتے ہیں جن سے صباحت و ملاحت میں اضافہ ہوتا ہے اور چہرہ نکھرتا ہے۔ اسی طرح دولہا کو بھی کم از کم دو چار دن اس رسم کا پابند رہنا پڑتا ہے۔ چور ہلدی اور ساؤ ہلدی کی رسومات شادی کے دو دن پہلے منائی جاتی ہیں۔ ملوٹ لگانے کے بعد چاول یا گیہوں کا ملیدہ حاضرین میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ نکاح سے پہلے کی رات نہایت اہم ہوتی ہے۔ اس رات بہت ساری رسومات یکے بعد دیگرے ادا کی جاتی ہیں۔ دنیا بھر کے ہنگامے اس رات بپا ہوتے ہیں۔ منڈوے اور مکانوں میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ کلس کے گھڑے، جن پر نقش و نگار ہوتا ہے، سرپوش اڑھا کر مٹی پر جما دئے جاتے ہیں۔ دھان اور مونگ اس مٹی پر چھڑک کر پانی دیا جاتا ہے۔ پانچ جمعہ تک روزانہ پانی دینے کے بعد موڑ نکل آئیں تو اس کو بہت نیک شگون خیال کیا جاتا ہے۔ تیل کی رسم میں دولہا والے دلہن کے گھر اور دلہن والے دولہا کے گھر کٹورے میں تیل لے جاتے ہیں اور دائیں جانب سے چڑھاوے کے طور پر چڑھاتے ہیں۔ کچھ گھنٹوں بعد بائیں طرف سے اتارنے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں یہ کہنا ضروری ہے کہ دولہن کے گھر جب دولہا والے پہنچتے ہیں تو ان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ ورق کے لال منقش کپڑے فرش پر بچھا دیئے جاتے ہیں۔ اور سمدھنیں جب اس پر سے گزرتی ہیں تو سر پر ایک لال چادر جسے "آسمان گیری" کہتے ہیں، سہاگنیں تھامے ہوئے سمدھنوں کے ہمراہ چلتی ہیں۔ اس موقعہ پر چوبہ اور دودھ سے سمدھنوں کی خاطر تواضع کی جاتی ہے دلہن کے جہیز میں دیئے جانے والے تمام ساز و سامان اور اشیائے خورد و نوش سینیوں میں سجا کر دولہا کے گھر بھیجی جاتی ہیں۔ متمول طبقہ میں طوائفوں کے مجرے ہوتے ہیں۔ میراثنیں اور ہجڑے بھی اس موقعہ گانے کے لئے بلائے جاتے ہیں۔ لیکن اب یہ رسم تقریباً مفقود ہو چکی ہے۔

چوک پرونے کی رسم تمل ناڈو میں کافی اہمیت رکھتی ہے۔ فرش پر لال کپڑا جس کا حاشیہ نکی سے آراستہ ہوتا ہے، بچھا دیا جاتا ہے۔ پانچ سہاگنیں چوک کے دوہے گاتے ہوئے رنگین چاولوں سے نقش و نگار بناتی جاتی ہیں اس کپڑے کے بیچ میں چوکی پر دلہن کو بٹھا دیا جاتا ہے اور گانوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

ان دوہوں کا ایک مخصوص ترنم ہے، جس میں گذشتہ تین سو سالوں سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس ترنم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کوئی اور گیت یا دوہے گائے نہیں جا سکتے۔ یہ راگ چوک پرونے کی رسم میں نہایت بھلی لگتی ہے۔ دکنی زبان کی لطافت بھی اپنے اندر ایک والہانہ انداز رکھتی ہے۔ اس زبان کے بول کو سمجھنا کسی حد تک مشکل ضرور ہے لیکن سمجھ میں آجائے تو لطافت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔

دوہے حسب ذیل ہیں :-

بسم اللہ کر کو بات کاڑیوں شادی کی
آمین بولو بہناں مبارک جوڑے کی
آرس میری بی بی نوتڑ بیٹھ چاندو
نخرے کے نو میریاں سہرے تلے مانگ
آرس میری بی بی پھوندو پھوندو روتی
نو سنو گھر کا کھانا ڈلے ڈلے کھاتی

یہ گانے جب نقطۂ عروج پر پہنچتے ہیں تو طرفین میں باقاعدہ نوک جھونک شروع ہو جاتی ہے۔ اور ایک دوسرے کو ان دوہوں میں مذاق کا موضوع بنایا جاتا ہے۔ نوک جھونک میں گائے جانے والے دوہوں کی ایک جھلک ملاحظہ فرمایئے۔

مرد بولیا مسل کا کوٹ، ساس بولی سبل کا کوٹ
نڑند بولی سبل کا کوٹ لہولہان، ادکھلی کا کوٹ چٹنی چٹنی

غرضیکہ ساری رات اس قسم کی چھیڑ چھاڑ میں بیت جاتی ہے۔ شب گشت کا رواج بہت عام ہے۔ دولہا گھوڑا یا موٹر پر سوار ہو کر شہنائی، بینڈ باجے کے ہمراہ گلی کوچوں سے گزرتا ہے۔ صبح کی نماز سے پہلے قرآن شریف، مصلے

چھتری اور دیگر غسل کے لوازمات چاول اور دال کے ہمراہ دولہا کے گھر روانہ کیا جاتا ہے۔ اصلاح سازی کے بعد دولہا غسل کے لئے پہنچتا ہے۔ خالہ یا قریبی شادی شدہ بہنیں باری باری درود شریف پڑھ کر دولہا کے سر پر پانی ڈالتی ہیں۔ غسل کے بعد چہرے کو ڈھانپ کر آسمان گیری کے سایے تلے دوہے گاتے ہوئے، دولہا کو اس کمرے میں لے جایا جاتا ہے، جہاں قرآن شریف اور مصلیٰ رکھا ہوا ہوتا ہے۔ دو رکعت نفل کے بعد دولہا سورۂ یوسف کی تلاوت کرتا ہے۔ مہمانوں کو ناشتے میں قورمہ، پراٹھا، میٹھی سویاں شیرمال وغیرہ چنے جاتے ہیں۔ دولہا جب براتیوں کے ساتھ گھر سے نکلتا ہے، تو اس کو لازمًا دو چار قدم قبلہ رو کر ہو کر چلنا پڑتا ہے اور وہ پھر اپنی منزل کی طرف مڑ جاتا ہے۔ سفید شیروانی۔ سروال اور کلغی دار پگڑی عمومًا نوشہ کا لباس ہوتے ہیں۔ سہرا، کنٹھا، بدھی اور طرّہ عام طور پر پھولوں سے بنائے جانے والے سامانِ زیبائش ہیں۔ خطبۂ نکاح اور ایجاب و قبول کے اختتام پر دفتر میں وکیل و گواہ کے نام اور دستخط اور رقم مہر درج کئے جاتے ہیں۔ جس کے نیچے دولہا اپنے دستخط ثبت کرتا ہے۔ مہر کی رقم تمام مقامات پر مساوی نہیں ہوتی۔ بعض خاندانوں میں ایک ہزار زرِ خالص سکۂ رائج الوقت مہر ہوتی ہے لیکن عام طور پر شہر مدراس اور اس کے مضافات میں پندرہ کم چھ سو (۵۸۵) ویلور اور وشارم کے قرب و جوار میں ۴۶۵/- آمبور میں ۵۰۴/- اور وانمباڑی میں ۶۲۴/- رکھنے کا رواج ہے، نکاح کے بعد بادام، مصری کھجور وغیرہ اچھالے جاتے ہیں۔ تہنیت اور "نلنگ" (نذرانہ یا تحفہ) اس موقعہ پر دولہا کو پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد شرکا کی ضیافت کی جاتی ہے۔

دولہا کے جانب کی کوئی بوڑھی سہاگن، کالی پوت، یا منگل سوتر چار سہاگنوں کے گلے سے لگا کر دلہن کے گلے میں باندھ دیتی ہیں۔ کالی پوت کا گلے میں ہونا بیاہتا عورت کی نشانی ہے۔ گہنوں کے علاوہ شادی کا سرخ جوڑا اور ایک قسم کی لال اوڑھنی جو "سے زر" کہلاتی ہے۔ دولہا کی جانب سے دلہن کو پہنائے جاتے ہیں۔ نیز دولہا کی جانب سے سہرا، کنٹھا بدھی، گجرے اور دیگر آرائشی سامان بھیجا جاتا ہے۔ نکاح کے بعد دولہا جب دلہن کے گھر آتا ہے تو "دھنگانہ" کی رسم ادا ہوتی ہے۔ دھینگا مشتی اس رسم کا خاصہ ہے۔ اس کو دھنگانہ کی رسم کہا جاتا ہے۔ سالے اور دیگر قریبی نوجوان رشتہ دار مسل تھامے دہلیز پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ داخلہ کے لئے بڑی جدوجہد ہوتی ہے لیکن سالے اور دیگر اقربا نیوتا یعنی نیگ کی وصولی کے بغیر دولہا کو اندر داخل ہونے نہیں دیتے۔ نیوتا کی ادائیگی کے بعد پروانۂ راہ داری نصیب ہوتا ہے۔ اس کے بعد رسم سلامی کی ابتدا ہوتی ہے۔ مستورات اور مردوں کے درمیان پردے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ دولہا کو مسند پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ اور ساس کی سلامی سے اس رسم کا آغاز ہوتا ہے۔ ساس کی سلامی میں عمومًا دوشالہ، گھڑی، انگوٹھی، اشرفی، پین سیٹ اور سونے کے بٹن وغیرہ دیئے جاتے ہیں۔ یکے بعد دیگرے دیگر اقربا و رشتہ دار اپنی جانب سے کچھ نہ کچھ تحفے پیش کرتے ہیں۔ ہر تحفہ پر دولہا کو سلام عرض کرنا پڑتا ہے اسی کو سلامی کی رسم کہا جاتا ہے۔ اس کے اختتام پر ایک خالی طبق جس میں کچھ نہیں ہوتا، دولہا کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور سلام کے لئے کہا جاتا ہے اور جب وہ سلام کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے تو سب کے سب ہنس پڑتے ہیں اور دولہا کھسیانہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

کنگن کی رسم میں رنگین پانی سے طشت بھر دیا جاتا ہے اور دولہا دلہن کے ہاتھوں میں بندھے ہوئے کنگن اتار کر لیموں کے ساتھ اس طشت میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ پان کے سبز پتے بھی اس طشت کی زینت بنتے ہیں۔ کوئی قریبی رشتہ دار سہاگن دولہا اور دلہن کے ہاتھ طشت کے پانی میں ڈبو کر کنگن، لیموں اور پان کے پتوں کو دونوں کے ہاتھ میں تھما دیتی ہے۔ اس رسم کے پس منظر میں باہمی رفاقت کا عنصر کارفرما ہوتا ہے۔

رسم جلوہ بھی اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتی ہے۔ دولہا دلہن کے درمیان ایک لال چادر باندھ دی جاتی ہے۔ جب تک دولہا اپنی زبان سے

شرع کا پردہ توڑ دوں گا شہ پری کو دیکھوں گا

نہیں کہتا، پردہ ہٹایا نہیں جاتا۔ پردہ کشائی کے بعد دولہا دلہن کے درمیان ایک آئینہ رکھ دیا جاتا ہے۔ جس میں دولہن کا چہرہ صاف طور پر دکھائی نہیں دیتا دولہن کیسی ہے؟ گلے میں کتنے گہنے ہیں؟ ناک میں کیا ہے؟ اس قسم کے سوالات کی بوچھاڑ ہوتی ہے۔ اس رسم نیم منہ دکھائی میں دولہا بھی مزاحیہ انداز میں جواب دیتا ہے۔ پوچھا جاتا ہے "رس میٹھی ہے کہ مصری؟ دولہا کہتا ہے " دلہن کے چہرے کو قریب کر دچاٹ کرتا ہوں : غرضیکہ اس قسم کے چھیڑ چھاڑ سے ساری محفل لطف اندوز ہوتی ہے۔ شیرمال یا مٹھائی دلہن کے ہاتھ پر رکھ کر دولہا کے منہ تک لے جایا جاتا ہے۔ دولہا منہ کھول بھی نہیں پاتا کہ دلہن کا ہاتھ گھسیٹ لیا جاتا ہے۔ دل لگی، چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق اس رسم کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ اس اثنا میں دلہن کے خاندان کا بزرگ دلہن کا ہاتھ دولہا کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ دولہا اپنے باہنوں میں دولہن کو سمیٹ کر موٹر، بگھی، گاڑی جو کچھ بھی سواری ہوتی ہے، دولہن کے ساتھ سوار ہو جاتا ہے دولہن جب دولہا کے گھر پہنچتی ہے تو پھر دونوں ایک اور رسم سے دوچار ہوتے ہیں۔ جسے "رسمِ رخصتی" کہتے ہیں۔ یہ رسم تقریب شادی کے سلسلہ کی آخری کڑی ہوتی ہے۔ دولہا جب دلہن کے ساتھ اپنے گھر پہنچتا ہے تو رنگین پانی سے دونوں کے پاؤں دھلوائے جاتے ہیں اور کالی مرغی دونوں پر سے وار کے صدقہ دیا جاتا ہے۔ دولہن چونکہ نئی نویلی ہوتی ہے اس سے میکے سے ایک ہمجولی بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے تاکہ دلہن اپنی ضروریات کو اس پر ظاہر کر سکے۔ دوسرے دن دلہن جب واپس میکے پہنچتی ہے تو اس کی سہیلیاں گیت کے بہانے شب وصل کا ماجرا پوچھتی ہیں۔ گیت کے بول یہ ہیں :-

(بقیہ صفحہ ۱۵ پر)

رکمنی دیوی انڈیل
مدراس

تمل ناڈو کے رقص



بھرت ناٹیم بھرت ناٹیم ہندوستان کا ایک مشہور ناچ ہے۔ اسے یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ مشہور فن کار بھرت نے جو روایات قائم کی تھیں۔ وہ اس طریقۂ رقص میں نسبتاً اپنی خالص شکل میں موجود ہیں۔ تاہم آج ہم جو کچھ اس کا مطلب سمجھتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔ اس سے صرف وہ رقص مراد ہے جو بھرت نے ترتیب دیئے۔ لفظ بھرت کے تین ٹکڑے ہیں۔ بھ۔ بھاو کے لئے ر راگ اور ت تال کے لئے۔ ہندوستانی کلاسیکی رقص انھیں تین اجزا سے مرکب ہے۔ دوسرے الفاظ میں گویا یہ رشی (بھرت) خود مجسم رقص تھے۔ اس لئے رقص میں بھرت کی روح کو جلوہ گر ہونا چاہئے۔

سدر جنوبی ہندوستان میں ایک یا دو رقاصاؤں کا ناچ جو کنسرٹ سے مشابہ کہا جاتا ہے۔ ۲۰ برس پہلے تک سدر کہا جاتا تھا۔ دیو داسیاں تمام مبارک موقعوں پر سدر رقص مندروں اور محلوں کے علاوہ لوگوں کے مکانوں پر بھی کرتی تھیں۔ جنوبی ہند میں ایک ایسی روایت قائم ہوگئی تھی کہ کوئی بھی مبارک یا خوشی کا موقع ہو موسیقی یا سدر کے بغیر نامکمل سمجھا جاتا تھا۔ بدقسمتی سے بعد کے زمانے میں سدر کے فن کاروں میں نفسانیت آگئی، جس کی وجہ سے یہ فن تقریباً معدوم ہوگیا۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ دیو داسیوں نے رقص کی تکنیک اور اصلی رنگ دونوں کو بہت حد تک محفوظ رکھا۔ وہ دیوتاؤں کو ارپن کر دی جاتی تھیں۔ اور یہ نذر محض رسمی نہ ہوتی تھی۔ بلکہ دیو داسیاں حقیقتاً یہ سمجھتی ہیں کہ وہ دیوتاؤں کی خدمت کے لئے وقف کر دی گئی ہیں۔ اس لئے جب وہ مندر میں کسی تہوار یا پوجا کے موقع پر رقص کرتیں تو مجسمۂ پرستش بن جاتی تھیں۔ اس مالکِ کل کی بارگاہ میں اپنے فن کا نذرانہ پیش کرنا جس کے پیچھے کوئی اور مقصد نہ ہوتا تھا بڑی خوشی و مسرت کا باعث ہوتا تھا۔

سدر کی موجودہ روایات، "پونیا" "چینیا" وادی ویلو اور سوانندم جیسے فن کاروں کی قائم کی ہوئی ہیں۔ انیسویں صدی کے یہ کلاکار سارا بھومی، مہاراجہ تنجور کے دربار سے وابستہ تھے۔ یہ کلاسیکی موسیقی کے بھی ماہر تھے۔ اور متھوسوامی دکشیتر کے چیلے تھے مگر کلاسیکی رقاص کی حیثیت سے انھوں نے زیادہ شہرت پائی ہے۔ ناچ سکھانے والے استاد جنوبی ہندوستان میں ناٹونار کہلاتے ہیں۔ ایک مثالی ناٹونار کو رقص اور موسیقی کے شاستروں کا گیان ہونا چاہئے۔ ساتھ ہی اسے رقص ترتیب دینے اور رقص و سرود کی محفلوں کی سیادت کرنے، رقص سکھانے اور خود گانے کے قابل ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ اسے دوسروں کو سکھانے کے لئے خود رقص بھی کرنا چاہئے۔ پونیا، چینیا، وادی ویلو اور سیوانندم ان ساری باتوں پر قادر تھے۔ ہر استاد کے لئے شاگرد اس کے فخر و مباہات کا باعث ہوتے ہیں۔ اور گزشتہ سو برسوں میں جنھوں نے شہرت پائی ان میں تری داس پیانم پڈوکوٹا آمالو اور کنکشما خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سبھی تنجور کے رہنے والے تھے اور ان میں سے ہر ایک اپنے فن میں لاثانی تھا۔

بھرت ناٹیم کے ایک حصے کی حیثیت سے تمثیلی رقص (ڈانس۔ ڈراما) بھی پروان چڑھا۔ یہ تمثیلیں سدر سے مختلف تھیں کیونکہ سدر میں ایک ہی کلاکار ابھی نئے (اداکاری) کے ذریعے مختلف کرداروں کا رول ادا کرتا تھا۔ یہ تمثیلی رقص تہوار کے موقعوں پر صرف مندروں میں ہوتے تھے۔ اس میں تقریباً مرد ہی حصہ لیتے تھے۔ یہ مرد رقاص بھاگ اوتار کہلاتے تھے۔ تنجور کے آس پاس کے ملٹ، سولا، منگلم، اوتھوکاڈو اور دوسرے دیہات اپنے تمثیلی رقصوں کے لئے مشہور تھے۔

کچی پڑی کے تمثیلی رقصوں نے اپنا ایک علیحدہ رنگ اختیار کر لیا۔ کچی پڑی کرشنا ضلع میں برہمنوں کا ایک گاؤں ہے۔ یہاں کے باشندوں میں سے مرد اپنی زندگی کو رقص و موسیقی کے شاستروں کے مطالعہ کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔

تامل ناڈو کا کروبخی تمثیلی رقص بھی قابل ذکر ہے۔ جس میں ہیرو مندر کا دیوتا

اور ہیروئنیں خاص رقاصہ ہوتی ہے۔ یہ رقاصہ اس انسانی روح کی نمائندگی کرتی ہے جو خدا کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ کرونجی کی ساری کہانیاں تقریباً یکساں ہوتی ہیں۔ کتھا کلی مالابار کا تمثیلی رقص ہے اس کے ابتدائی نقوش بھرت کے ناٹیہ شاستر میں ملتے ہیں۔ مگر بعد میں اس نے اپنی ایک انفرادی شکل اختیار کرلی۔ اس کے علاوہ مالابار میں بھرت ناٹیم کا ایک ایسا طریقہ رائج ہے جو اس سے مماثل ہے اور موہنی اٹم کہلاتا ہے۔ گو یہ مشہور رقص ہے مگر ماہرین کی رائے میں اس میں بھرت ناٹیم کی تکنیک اور اس کا بھرپور حسن موجود نہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بھرت کا فن سارے جنوبی ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے۔ ہر گلی کوچے اور گاؤں کے لوگ ان کے گانوں سے واقف تھے۔ اور ان رقصوں کو دیکھنے کے لئے بھیڑ جمع ہوجاتی تھی۔ بھرت کا فن عوام میں بھی مقبول ہوا۔ اور گلیوں میں ہونے والے ڈراموں اور عام رقصوں پر بھی اس کا اثر پڑا۔ کٹھ پتلی کا تماشہ کرنے والوں نے بھی جو بما لٹم کہلاتے ہیں ان کی نقل کی۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ تمام لوگ خواہ وہ ترتیب دینے والے ہوں یا پیش کرنے والے یا تماشہ دکھانے والے سبھی رقص و موسیقی کے فنی لوازم اور معنی و مقصد سے واقف ہوتے تھے۔

موسیقی کے لئے سنسکرت لفظ سنگیتم میں ناٹ (رقص) بھی شامل ہے نرتم ونرتم، ویدیم یعنی ناچنا، گانا اور بجانا ان تینوں کا مرکب سنگیتم کہلاتا ہے۔ پرانے زمانے کے موسیقار رقص میں بھی دخل رکھتے تھے۔ جو مشہور تھے انہوں نے ناچ سیکھا بھی تھا تاکہ وہ اپنی موسیقی میں بھاؤ کے اظہار کو زیادہ بہتر بنا سکیں۔

نرت، بھرتیہ اور ناٹیہ، بھرت ناٹیم کے تین اجزا ہیں۔ نرت صرف ناچ ہے۔ اس کے لئے تال اور سُر ضروری ہے۔ موسیقی کے بغیر بھی ناچا جاسکتا ہے۔ اعضاء کی حرکتوں اور اشاروں سے مختلف جذبات و کیفیات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ الاریپو اس کی ایک اچھی مثال ہے اس میں صرف ڈھول استعمال کیا جاتا ہے۔

بھرت ناٹیم میں الاریپو سب سے پہلے پیش کیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ناچنے والا یا ناچنے والی اپنے جسم کو سب سے بزرگ و برتر ہستی کی نذر کرتی ہے تاکہ اس کی فنکارانہ صلاحیتیں باقی رہیں اور اس طرح وہ اس کی خدمت کرتی رہے۔

نرت میں جذبات کا اظہار اشاروں اور کنایوں سے کیا جاتا ہے۔ زبان سے نہیں۔ اس رقص کا مقصد آنند یا خوشی حاصل کرنا ہے۔

ترونم میں ڈھول ایک خاص تال پر بجایا جاتا ہے۔ قدموں کی حرکت کو اڈاؤ کہا جاتا ہے جس طرح کسی شعر میں ایک ایک لفظ اہم ہوتا ہے۔ اسی طرح رقص کرنے والے کے ہر قدم کی ہر حرکت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ یہی موزونیت رقص کی دلآویزی کا باعث ہوتی ہے۔

ورنم ترونم کے پہلے اور بعد میں کوئی گانا یا رقص پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک خاص ترتیب کو ورنم کہتے ہیں مگر یہ گانا گاکر نہیں بلکہ بھاؤ کے ذریعے ادا کیا جاتا ہے اس لئے ابھی نئے (اداکاری) بھی ضروری ہے۔

بھاؤ کا اظہار ابھی نئے یا اداکاری کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ ابھی نئے کی چار قسمیں ہیں۔ شاستروں نے جسم کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے انھیں انگ پرتیہ انگ اور اپانگ کا نام دیا ہے۔ ان کے مختلف حرکات پر مشتمل رقص کو آنگک ابھی نئے کہا جاتا ہے۔ ہاتھوں اور انگلیوں کا استعمال بہت اہم ہے کیوں کہ ان ہی کے ذریعے سے ناظرین کو کہانی کا مطلب بخوبی سمجھایا جاسکتا ہے۔ ہاتھ کے ان اشاروں کا نام ہستں ہے جسے غلطی سے مدرا کہتے ہیں۔

ابھی نئے کی دوسری قسم واچک ہے۔ اس میں خاموش اداکاری نہیں ہوتی بلکہ اشعار اور گانے کے ساتھ ابھی نئے کیا جاتا ہے۔ واچک میں سازندوں کی سنگت اور رقاص یا رقاصہ کا گانا دونوں لازمی ہیں۔ شاستروں کے مطابق رقاص یا رقاصہ کو گانا ضرور چاہیئے۔ اس قاعدے کی پیروی بھرت ناٹیم اور کتھا کلی کو چھوڑ کر جنوبی ہندوستان کے دوسرے تمام تمثیلی رقصوں میں کی جاتی ہے۔

کسی پارٹ کی مناسبت سے میک اپ، لباس اور زیورات پہننا آہاریہ کہلاتا ہے۔ یہ ابھی نئے کی تیسری قسم ہے۔ کتھا کلی میں چونکہ آہاریہ اور چہرے کے تاثرات کے اظہار پر زور دیا ہے اس لئے گانے کی گنجائش نہیں ہے۔

ابھی نئے کی چوتھی اسکیم ساتوک ہے اور یہی رقص کا اصلی جوہر ہے۔ کیوں کہ اس کا تعلق رقص کرنے والے کے دل سے ہوتا ہے۔ یہ فن کاری تربیت سے نہیں بلکہ ذہانت سے حاصل ہوتی ہے اور اس سے سچی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ ہر رقاص یا اداکار کو اپنے پارٹ میں جان ڈال دینی چاہیئے اور خود کو اس کے ساتھ بالکل ہم آہنگ کردینا چاہیئے کیوں کہ صرف اسی طرح دیکھنے والوں کو خوشی و مسرت حاصل ہوگی۔

ساتوک بھاؤ کو سمجھنا انسانوں کی نفسیات اور جذبات کو سمجھنا ہے۔ اس طرح محض اشاروں، کنایوں اور جسم کے مختلف انداز کے ذریعہ سکون بے ہوشی، دہشت و خوف، پسینے پسینے ہونا، لڑکھڑاتی ہوئی آواز نکالنا کانپنا رونا، رنگ بدلنا اور بہت سی دوسری کیفیات کا اظہار کیا جاتا ہے جس کا تعلق انسان کے بنیادی جذبات سے ہے۔ شاستروں کے مطابق ساتوک ابھی نئے میں ان ساری باتوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ بظاہر اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام جذبات کا منبع و سرچشمہ وہ اعلیٰ و ارفع ہستی ہے جو نگاہوں سے مستور ہے۔ ادنیٰ و حقیر انسان اس ذاتِ اعلیٰ کو پانے کے لئے بھٹکتا ہے اور پھر اپنی کوششوں سے اسے پالیتا ہے۔ یہ وصال سکون و قرار کا باعث ہوتا ہے۔ یہ تلاش و جستجو اور پھر حصول محبت ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ اس لئے اس جذبے کا اظہار نائیکی اور نائیکا بھاؤں کے ذریعے کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور اس طرح رقص ایک ایسی مقدس اور پاکیزہ چیز بن جاتا ہے جس سے روح کی تطہیر ہوتی رہتی ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

کاوش بدری
۲ طاہر صاحب اسٹریٹ، مدراس

تمل ناڈو میں اردو کی ادبی تاریخ

ہمارا بھارت دیس قدیم وجدید زبانوں کا ایک حسین سنگم ہے۔ اس کی سدابہار تہذیب اور کلچر اپنی رنگا رنگی کے باوصف ایک ہی روح اور ایک ہی وحدتِ فکر کی حامل ہے۔ ادبیاتِ عالم میں حالانکہ بیشتر زبانوں کے ادب کو خاص مقام حاصل ہے۔ مگر ان میں اردو زبان دنیا کی ایک لازوال ادبی زبان اور قومی وحدت کی عظیم علامت کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے۔ اس زبان کو اس بلندی پر پہونچانے میں کسی ایک مرکز یا صوبے کا ہاتھ نہیں ہے۔ ہندوستان کی ہر ریاست نے اردو زبان کو اپنا خونِ جگر بخشا ہے۔ مگر اس کی شہ رگ کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ارضِ دکن ہی کا خون جگر نصیب ہوا۔

شاعری یا نثر چاہے ہزاروں برس پرانی ہو، اگر وہ موثر، مترنم اور متحرک ہے اور اس سے جمالیاتی تسکین اور فکری توانائی حاصل ہوتی ہے تو ہمیشہ محفوظ ہے۔ فن دراصل انفرادی تجربات وجذبات، اجتماعی تہذیب وکلچر کا حسین سنگم ہی نہیں بلکہ ماضی، حال اور مستقبل کی روح ہوتا ہے۔ محض روحِ عصری نہیں ہوتا۔ فن اگر ان سب کی آبرو ہے تو آبرو کے لئے زمانے کی قید کیسی؟ جذبۂ شعر وادب کی ازلی وحدت کو قدیم وجدید کے ناقص خانوں میں بانٹ کر رکھ دینا دلیل کم نظری ہے۔ اردو کا سچا اور اچھا فن کار کہیں بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ اردو کے اہم مرکزوں ہی میں جنم لے۔ اس کا وجود جغرافیائی حدود سے ماورا اور اس کا دامن صوبائی تعصب سے پاک ہوتا ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ متعدد ریاستوں میں اہلِ زبان سے کہیں بڑھ چڑھ کر اعلیٰ ادب ان حضرات نے پیش کیا ہے۔ جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ "شاعری بقول رشید احمد صدیقی مرحوم دنیا کی مادری زبان ہوتی ہے۔ اور وہ قدیم یا جدید نہیں ہوتی، اچھی یا بری ہوتی ہے۔"

شمالی ہند سے ادبی مراسم

اردو زبان کے بیشتر مشاہیر اس غلط فہمی کے شکار ہیں کہ تمل ناڈو کی سرزمین بڑی سنگلاخ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ "دیارِ سنگ" ہے مگر یہاں کے بتوں کے ہونٹوں پر کسی شاعر کا ذیلی شعر ہوتا ہے ؎

ایک پتھر جو دستِ یار میں ہے　　پھول بننے کے انتظار میں ہے

ہندوستان کے مشاہیر کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہاں کے اربابِ علم وفن نے ہر دور میں اس سرزمین کو رشکِ ارم بنایا ہے مگر وقت کے فاصلے نے انھیں اپنے اسلاف کے کارناموں سے اس قدر دور کر دیا کہ آج بھی بیشتر نقاد اور محقق حیرت سے پوچھتے ہیں کہ مدراس میں بھی اردو ہے؟ آج سے ایک سو سال پیشتر شاد عظیم آبادی، حالی، شبلی، اقبال، ذکاءاللہ، عبدالحلیم شرر، ڈپٹی نذیر احمد، عزیز لکھنوی، محشر لکھنوی وغیرہم ایسی غلط فہمی کے شکار نہیں تھے۔ ان حضرات نے تمل ناڈو کے بیشتر اہلِ زبان کی ادبی استعداد کا اعتراف کیا ہے۔ مگر انھیں تعجب ضرور ہوتا تھا کہ مدراس میں شمالی ہند سے زیادہ اردو زبان وادب کا معیار کیسے بلند ہو گیا۔ ذیل میں مولانا شاطر مدراسی کی شعری تصنیف "قصیدۂ عشق" مطبوعہ ۱۹۰۴ء پر متذکرہ بالا اساتذۂ فن کے خطوط کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ یہ خطوط تمام کے تمام مولانا شاطر کے نام موصول ہوئے تھے۔ یہ تمام خطوط قصیدۂ اعجاز عشق میں مندرج ہیں۔

۱۔ "میں کذب بیانی کو قریب کفر جانتا ہوں، میرے دل پر تو آپ کے شعروں کا ایسا ہی اثر ہوا اور خاص کر کے مدراس میں رہ کر ایسے فصیح شعروں کے کہنے پر سخت تعجب ہوا۔ واقعی یوں ہے کہ خاندانی اثر نے آپ کی زبان پر ایسا عمل کیا ہے کہ شاید وہ لوگ بھی جن کو اہلِ زبان ہونے کا دعویٰ ہے تقریراً جو کچھ ہو ورنہ تحریراً وہ بھی نظم میں ایسی زبان مشکل سے لائیں گے۔" (خان بہادر مولانا مولوی سید علی محمد شاد عظیم آبادی ۱۹۰۴–۹–۱۳)

۲۔ "نہایت تعجب ہوا کہ احاطۂ مدراس میں ایسی صاف اور فصیح اردو، ایسی پاکیزہ نظم ونثر اور ایسا لطیف اور فصیح مذاق کیونکر پیدا ہوا اور کہاں سے آیا؟ آپ کے اشعار میں یقیناً وہ چیز پاتا ہوں جو ترقی کر کے کمالِ شاعری کے درجہ تک پہونچ سکتی ہے۔ بلا مبالغہ وبلا تصنع آپ کے بعض شعروں کو دیکھ کر رشک ہوتا ہے کہ کیوں یہ پیرایۂ بیان ہمارے ہاتھ نہ لگا۔" . . . .

(سعدیٔ ہندوستان شمس العلماء مولانا مولوی الطاف حسین حالی پانی پت)

(۱۹۰۴–۱۱–۱۱)

۳۔ "اس قصیدے کا کچھ حصہ "مخزن" میں شائع ہو چکا ہے اور پنجاب میں عموماً پسندیدگی اور وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ہمارے ایک کرم فرما جالندھر میں ہیں سنا ہے کہ وہ اس کو نہایت پسند کرتے اور اس کے اشعار کو انہوں نے اتنی دفعہ پڑھا ہے کہ اب ان کو وہ تمام حصہ جو مخزن میں شائع ہو چکا ہے ازبر یاد ہے۔ اکثر اشعار نہایت بلند پایہ اور معنی خیز ہیں۔ بندشیں صاف اور

ستھری ہیں اور اشعار کا اندرونی درد مصنف کے چوٹ کھائے ہوئے دل کو نہایت نمایاں کرکے دکھا رہا ہے۔ آپ کا اسلوب بیان واقعی نرالا ہے اور آپ کی صفائی زبان آپ کے ہم وطنوں کے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ آپ اصل میں ہندوستان کے رہنے والے ہوں گے۔ مگر یہ معلوم کرکے کہ آپ کی پرورش بچپن سے مدراس میں ہوئی، مجھے تعجب ہوا۔" (ڈاکٹر سر محمد اقبال ۱۹۰۵ — ۲ — ۲۲)

۴۔ "کوئی علم باقی نہیں رہا جس کا ذکر اشعار میں اس طرح نہیں آیا کہ وہ آپ کے ماہر ہونے پر دلالت نہیں کرتا ہے۔ جیسے آپ عالی نسب ہیں کہ کم آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ پشتہا پشت سے نجیب الطرفین چلے آتے ہیں۔ ایسے ہی آپ جامع العلوم بھی ہیں کہ علوم ظاہری و باطنی سے واقف ہیں۔ گو آپ مدراس میں رہتے ہیں مگر تعجب ہے کہ زبان دانی میں دلی اور لکھنؤ کے زبان داں اساتذہ سے کم نہیں۔"

(شمس العلماء مولانا مولوی خان بہادر ذکاء اللہ صاحب دہلوی ۱۹۰۸ — ۳ — ۱۶)

۵۔ "میں نہیں خیال کرتا کہ ارضِ مدراس سے ایسا سخن سنج پیدا ہو سکے گا۔ آپ کا یہ قصیدہ ثابت کر رہا ہے کہ اردو زبان کو کوئی خاص خصوصیت شمالی ہند کے ساتھ نہیں اگرچہ وہاں اس کی نشوونما ہوئی۔ مگر اس نے ہندوستان میں ہر حصہ میں لوگوں کو قریب قریب یکساں طور پر غزل سرا بنا دیا..... آپ کے ہندا اور فلسفیانہ مضامین خاصی توجہ کے محتاج ہیں۔ اور سچ یہ ہے کہ ایسی دقیق اور معنی خیز نظمیں اردو میں کم ہیں"

... (مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی — حیدرآباد)

(۱۹۰۸ — ۸ — ۲۱)

۶۔ "ایسا کلام ہندوستانیوں کے لئے بھی مشکل ہے اور مدراسیوں کے لئے محال تھا" (ڈپٹی نذیر احمد دہلوی ۱۹۰۸ — ۷ — ۲۳)

۷۔ "..... میں بھی اس صنعت سخن سے کسی قدر ممارست رکھتا ہوں اور ایک عرصہ سے اس میدان کے یکہ تازوں کا جوہر شناس ہوں لیکن آپ کے انداز کلام سے قصیدہ گوئی کی معراج ثابت ہو گئی۔ اب اس سے آگے ترقی کا کوئی درجہ نہیں۔"

(مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی۔ لکھنؤ۔ ۱۹۰۸ — ۱۰ — ۳۰)

۸۔ "ہر شعر میں علوم قدیمہ و جدیدہ کے مسائل اس آسانی سے بھر دیئے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور سب پر طرہ یہ کہ باوجود مدراسی ہونے کے زبان کو دہلی و لکھنؤ کی زبان سے ملا دیا ہے۔ کیا محنت کی اور کیا جانفشانی سبحان اللہ، سبحان اللہ!"

(جناب مولوی سید کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی ۱۹۰۸ — ۱۰ — ۱۶، لکھنؤ)

۹۔ "..... میں نہایت مسرور ہوا کہ اہل مدراس نے شعر میں کس قدر ترقی کی ہے۔ مضامین فلسفہ کو بڑے لطف سے نظم کرتے ہیں جو ہر شاعر کا کام نہیں۔ مجھے رشک آتا ہے میں نے کیوں نہ کہا۔" (جناب مولوی سید حیدر علی صاحب طباطبائی نظم لکھنوی (حیدرآباد ۱۹۰۵ — ۱۰ — ۳۰)

مذکورہ گرامی آراء کے علاوہ مولانا شبلی، اکبر الٰہ آبادی، ظہیر دہلوی، کوکب ذکاء اللہ، وحیدالدین سلیم، سید حسین بلگرامی، عزیز جنگ ولا ناظر (سابق وزیر لداغ) اور پروفیسر مولوی سید عبدالغفور شہباز بھوپالی وغیرہ کے خطوط کو طوالت کے خوف سے مندرج نہ کر سکا۔ آخر میں راقم الحروف کے نام ترقی پسند شاعر و ادیب جناب سجاد ظہیر کے ایک طویل خط کا اقتباس ملاحظہ ہو، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان و ادب کے معمار اردو کی شاندار ادبی تاریخ سے کس قدر ناواقف ہیں۔ (حالانکہ قدیم دور میں سودا سے لے کر غالب تک اور جدید دور میں داغ سے لے کر فراق تک نے تمل ناڈو کے بیشتر ادیبوں اور شعروں کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے۔)

"میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ جنوبی ہند کے اردو ادب اور ادیبوں کی جانب ہم شمالی ہندوالوں نے کم ملکہ نہیں کے برابر توجہ کی ہے سچی بات یہ ہے کہ دکن اور حد سے حد میسور سے آگے اردو کے وجود کے متعلق ہم کو کچھ خبر ہی نہ تھی۔ اس میں کچھ ہماری اور کچھ آپ کی غفلت بھی شامل ہے۔" (سجاد ظہیر ۵۶ — ۹ — ۲۷)

شمالی ہند کے ساتھ تمل ناڈو کے ادبی مراسم تقریباً دو سو سال پرانے ہیں یہاں کے بیشتر مشاہیر ارباب قلم کے نام شمالی ہند کے شعراء و ادباء نے مراسلت کی ہے۔ سودا اور باقر آگاہ ویلوری، مرزا غالب، حبیب اللہ ذکا، اور شریف مدراسی، اقبال، شاطر مدراسی اور فرحت ترچناپلی، یگانہ چنگیزی، مولانا ناطق اور مولانا شاکر نائطی، نوح ناروی اور آسی ترپاتوری، نفیس بنگلوری اور جلیل مانک پوری، داغ دہلوی، اور شاکر وانمباڑی، وحشت کلکتوی اور منموہن مدراسی، امیر مینائی، سعد مدراسی، اور رابعہ برکات انور، ضامن علی جلال اور ایمان گوپاموی وغیرہم کے درمیان جو ادبی خط و کتابت رہی ہے اس کی داستان بہت طویل ہے۔ آزادی کے بعد تو شمال و جنوب کے فرق کو تملناڈ والوں نے کبھی ادبی طور پر محسوس ہی نہیں کیا۔ اگر اس موضوع پر کھل کر لکھا جائے اور ان تمام نایاب خطوط کو یکجا کر کے کتابی صورت میں پیش کیا جائے تو بہت بڑی تاریخی اور ادبی خدمت سرانجام ہوگی۔ راقم الحروف کے پاس ایسے بے حساب خطوط محفوظ ہیں۔ ادبی مراسلت، تبادلۂ خیال اور تبادلۂ ادب کے باوجود شمال کے موجودہ مشاہیر کو تمل ناڈو میں اردو کی رفتار ترقی سے متعلق یہاں اردو کے وجود سے متعلق خبر کیوں نہیں ملتی؟ .... زیر نظر مضمون اسی غلط فہمی کے ازالہ کے لئے سپرد قرطاس ہے۔

تذکرے اور اہم کتب

تمل ناڈو کی تین سو سالہ ادبی تاریخ کا سرسری جائزہ چالیس پچاس صفحات میں پیش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ تقریباً بیس سال سے راقم الحروف اور جناب راز امتیاز یہاں کی تاریخ ادب اردو مرتب کرنے کے لئے سرگرداں ہیں۔ اس سلسلے میں مواد کی فراہمی کا سوال آیا

تو ہم نے تقریباً دو سال تک شب و روز شہروں شہروں قریوں قریوں کی لائبریریوں کی خاک چھاننے اور قبرستانوں میں بہتیرے شعراء و ادبا کے سنگ لحد پر کندہ تاریخ وفات نوٹ کرنے میں جتنی محنت کی ہے اور بزرگوں سے مل کر قدیم حالات جاننے کی جو سعی کی ہے اس کی روداد بھی بڑی طویل ہے۔ یہ تاریخ زیر تدوین ہے اور عنقریب شائع ہو جائے گی۔

اردو شعراء کی تذکرہ نویسی بارھویں صدی ہجری کے اواخر میں شروع ہوئی۔ اس دور میں تقریباً اسّی سے زیادہ تذکرے لکھے گئے لیکن ان سب تذکروں کی ابتدا اس عہد سے ہوئی ہے جب کہ دارالسلطنت دہلی میں ریختہ گوئی کی شروعات ہوئی تھی۔ مگر اس عہد سے پہلے جو شعراء سرزمین کرناٹک (قدیم تمل ناڈو) میں گذرے ہیں۔ ان کی لسانی اور ادبی تاریخ نظر انداز کر دی گئی۔ اس زیادتی یا تاریخی بھول یا لغزش کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم شعرائے تمل ناڈو کے حالات پردۂ گمنامی میں روپوش ہو گئے اور یہاں کی تاریخ اردو و فارسی کا شاندار دور قدیم سرا پردۂ خفا میں مستور ہو کر رہ گیا۔ مگر تمل ناڈو کے چند اکابرین فن نے تمل ناڈو کی ادبی تاریخ کو مندرجہ ذیل تذکروں اور کتابوں میں محفوظ کر دیا ہے۔ ہندوستان کی ریاستوں میں شاید ہی کسی ایک ریاست کے ادیبوں، شاعروں اور علماء پر اتنے ضخیم فارسی اور اردو تذکرے شائع ہوئے ہوں گے جتنے تمل ناڈو میں آج سے تقریباً سو دو سال پہلے شائع ہوئے۔ ذیل کے بیشتر تذکرے اور اہم کتب راقم الحروف کی نظر سے گذر چکے ہیں۔

(۱) مرزا علی خاں لطف مدراسی کا تذکرۂ شعرائے ریختہ گویاں جو ۱۲۲۱ھ سے پہلے لکھا گیا۔ (۲) غلام علی موسوی رضا المخاطب بہ حکیم باقر حسین خاں رائق آرکاٹی کا تذکرہ "گلدستۂ کرناٹک" مطبوعہ ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء (تذکرۂ گلدستۂ کرناٹک تاریخ تصنیف ہے اور "گلدستۂ زیبائے کرناٹک" تاریخ اشاعت ہے) (۳) امیر الہند نواب غلام غوث خان بہادر اعظم مدراسی والیٔ کرناٹک کا تذکرہ "صبح وطن" مطبوعہ ۱۲۴۲ھ جسکے بارے میں اشپرنگر مصنف Persian and Hindustani Manuscripts of Oudh Libraries کا بیان ہے کہ یہ رائق کے گلدستۂ کرناٹک کا خلاصہ ہے (۴) مولوی محمد قدرت اللہ قدرت گوپاموی ثم مدراسی کا تذکرۂ "نتائج الافکار" مطبوعہ ۱۸۴۳ء (۵) مولوی محمد مہدی واصف مدراسی کا "تذکرۂ معدن الجواہر" مطبوعہ ۱۸۴۲ء (۶) سید مرتضیٰ بینش مدراسی کا تذکرہ "اشارات بینش" مطبوعہ ۱۸۴۲ء (۷) ایڈورڈ بالفور کا "تذکرۂ گلدستۂ سخن" (بزبان اردو) مطبوعہ ۱۸۵۰ء (یہ تذکرہ فارسی اور اردو کے مشاہیر شعرائے جنوبی و شمالی ہند ہے، جس طرح کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے دارالترجمہ کی وجہ سے ڈاکٹر گل کرائسٹ کا نام مشہور ہے اسی طرح مدراس میں علمی و ادبی، ثقافتی اور طبی خدمات کے تحت ایڈورڈ بالفور کا نام یاد رہے گا۔) (۸) نواب غلام غوث خاں اعظم کا دوسرا معرکۃ الآراء تذکرۂ "گلزار اعظم" مطبوعہ ۱۸۵۶ء (۹) مولوی محمد مہدی واصف مدراسی کا دوسرا تذکرہ "حدیقۃ المرام" مطبوعہ ۱۸۶۲ء (بزبان عربی) (۱۰) حکیم غلام دستگیر خاں لائق مدراسی (تاریخ ولادت ۱۸۱۸ء تاریخ وفات ۱۸۶۰ء) کا تذکرۂ "معاصر الشعراء" جو غالباً ۱۸۶۰ء سے پہلے لکھا گیا (۱۱) مولانا صفی الثنی کی "تاریخ آرکاٹ" (۱۲) مولانا مرتضیٰ کا تذکرہ "حالات آرکاٹ" (۱۳) مولانا غلام حسین رعنا کا تذکرہ "قیصر والاجاہی" (۱۴) مولوی محمد منور حسین منور بہادر گوہر مدراسی کا "تذکرۂ سخنوران بلند فکر" مطبوعہ ۱۳۳۷ھ (جلد اول) اور جلد دوم مطبوعہ ۱۹۳۷ء (۱۵) نصیر الدین ہاشمی مدراسی ثم حیدرآبادی کا تذکرہ "مدراس میں اردو" مطبوعہ ۱۹۳۸ء (۱۶) پروفیسر حسرت سہروردی ترچناپلی کا "تذکرۂ شعرائے قدیم نطہر نگر (ترچی)" مطبوعہ ۱۹۵۹ء (۱۷) پروفیسر مولانا محمد یوسف کوکن، کاوش بدری، حسرت سہروردی وغیرہم کا ایڈٹ کردہ "تذکرۂ رنگ برنگ" مطبوعہ ۱۹۵۹ء (جس میں تمل ناڈو کے چند نمائندہ شعراء کا منتخب کلام مع حالات درج ہے) (۱۸) پروفیسر حسرت سہروردی کا تحقیقی مضمون "تمل ناڈو میں اردو کا ارتقاء" (۱۹۶۰ء—۱۹۴۵ء) جو مدراس یونیورسٹی سے ایم لٹ کی ڈگری کے سلسلہ میں پیش کی گئی۔ (۱۹) پروفیسر افضل العلماء، استادی حافظ محمد یوسف کوکن عمری (صدر شعبۂ اردو، عربی فارسی مدراس یونیورسٹی) و ہمشیرزادہ مولانا شاکر نائطی مرحوم کا معرکۃ الآراء تذکرہ (ARABIC AND PERSIAN IN CARNATIC) مطبوعہ ۱۹۷۴ء جس میں اردو کے بیشمار شعراء کے حالات بھی درج ہیں۔ مذکورہ بالا تذکروں کے علاوہ اور بھی تذکرے شائع ہوئے ہیں جن کی تلاش جاری ہے مذکورہ تذکروں کے علاوہ تمل ناڈو کی ادبی تاریخ کا نچوڑ بے شمار کتابوں میں پیش کیا گیا ہے۔ ذیل میں ان میں سے چند اہم کتابیں قابل ذکر ہیں۔

(۱) سید برہان خان ہانڈی ترچناپلوی کی "تزک والاجاہی" (۲) مولوی غلام عبدالقادر ناظر مدراسی کا سفرنامہ "بہار اعظم جاہی" (۳) خورشید الملک افتخار الدولہ محمد ناصر خاں بہادر صمصام جنگ کی "سوانحات ممتاز" (۴) مولانا باقر آگاہ ویلوری کی نثری تصانیف جس میں یہاں کی ادبی رفتار کی جھلک ہے۔ (۵) حضرت شمس اللہ قادری ویلوری ثم حیدرآبادی کی "اردوئے قدیم" (۶) عظیم مورخ محمود خاں محمود بنگلوری کی "تاریخ جنوبی ہند" (۷) عزیز جنگ بہادر کی "تاریخ نوائط" وغیرہ ان کتابوں کی تاریخ اشاعت عہد بہ عہد مندرج ہیں۔ عبدالقادر سروری، محی الدین قادری زور، ڈاکٹر عبدالحق مدراسی، سخاوت مرزا، پروفیسر محبوب پاشا محبوب، حضرت دانش فرازی، ممتاز مدراسی، حضرت محوی صدیقی لکھنوی، حضرت ضیا فتح آبادی، مولانا ابوالجلال ندوی، حضرت حکیم آسی ترپاقد ، میکش مدراسی، مولانا عبداللطیف فاروقی مدراسی، ڈاکٹر ذاکرہ غوث صاحبہ راقم الحروف اور راز امتیاز وغیرہم نے چیدہ چیدہ مضامین میں یہاں کے قدیم و جدید شعراء پر روشنی ڈالی ہے۔

مذکورہ کتابوں، تذکروں، مضامین کا ایک حد تک مطالعہ کئے بغیر تمل ناڈو میں اردو زبان و ادب کی ابتدا اور اس کے ارتقا کا جائزہ ناممکن ہے۔ ممکن ہے مجھ سے کوتاہیاں بھی ہوئی ہوں اور اس مختصر جائزے میں چند اہم ترین نام چھوٹ بھی گئے ہوں۔ مگر جہاں تک تاریخ ادب کا تعلق ہے میں نے بڑی حد تک مذکورہ کتابوں اور دوسری کتابوں سے گزر کر مستند تاریخوں کو درج

کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر ان تاریخوں اور مندرجات میں کوئی لغزش ہوئی ہے تو محققین ادب مجھے معاف فرما کر میری صحیح رہنمائی فرمائیں تاکہ دوسرے ایڈیشن یا دوسرے مضمون میں اس کی تلافی ہو سکے۔

مخطوطات

مذکورہ تصانیف کے علاوہ مولانا محمد غوث شرف الملک مرحوم کے اہلِ خاندان (جو بہ مقام مدراس "دیوان صاحب باغ" میں مقیم ہیں) کے ہاں علوم و فنون کی عربی فارسی اور اردو کتابوں کا ایک بے مثال ذخیرہ موجود ہے۔ اس معزز خاندان میں تقریباً چار سو برس سے تصنیف و تالیف، نقل نویسی، کتابت اور خریداری کے ذریعہ ایسی نادر کتابیں فراہم ہوئی ہیں کہ اس کی نظیر شاید ہی کہیں اور ملے گی۔

گذشتہ پندرہ سال پہلے بعض افراد نے صرف مدراس کے گھروں میں موجود کتابوں کو شمار کرنا شروع کیا تو ۱۷۴۹۲ کتابیں شمار ہوئیں جن میں تملناڈو سے متعلق بے شمار کتابیں موجود تھیں۔ ان میں پندرہ ہزار سے زیادہ کتابیں قلمی حیثیت رکھتی ہیں جو اپنے حسین نقش و نگار، خوشنویسی اور مطلا روشنائی سے دیدہ و دل کو پُرنور کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ ایسی کتابیں جو مختلف علمی موضوعات پر مشتمل ہیں یہاں سینکڑوں کی تعداد میں محفوظ ہیں۔ مذکورہ گھرانے میں بیجاپور کے عادل شاہی اور مدراس کے والاجاہی دور کے فرامین اور خاندانی، سرکاری ریکارڈ کے اتنے نایاب کاغذات ہیں کہ اگر ان کا شمار ہو تو شاید اس کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر جائے۔ ان علمی آثار کے علاوہ مذکورہ خاندان کے پاس قطعوں، سکوں، برتنوں، کپڑوں، مہروں اور دوسری قدیم ترین اشیاء کا بھی وافر ذخیرہ محفوظ ہے جو ایک میوزیم کا سامان فراہم کر سکتا ہے۔

ان مخطوطات، نایاب کتابوں اور تذکروں پر تحقیقی کام کے لئے تمل ناڈو میں اردو اکاڈمی کا قیام ہندوستان کی دوسری ریاستوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ضروری ہے۔ چونکہ یہاں کی ہزارہا کتابیں اور ہزاروں نوشتے یورپ، امریکہ اور انگلستان چلے گئے۔ ہزاروں کتابیں کیڑوں کی نذر ہو گئیں اور تھوڑے بہت جواہر پارے جو رہ گئے ہیں ان کی حفاظت کے لئے اور ان کے نئے ایڈیشن شائع کرنے کے لئے سرکاری امداد کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ حال ہی میں حکومتِ اترپردیش نے ایک لاکھ روپے کی گرانٹ شبلی اکاڈمی کے لئے محض نایاب مخطوطات کے تحفظ کے لئے منظور کر ایا ہے۔ اگر حکومت تمل ناڈو بھی "دیوان صاحب باغ مدراس" اور "مدرسہ لطیفیہ (حضرت مکان ویلور)" اور دیگر لائبریریوں کے نایاب مخطوطات کے تحفظ کے لئے اس قسم کا گرانٹ منظور کرے تو یہاں کی نایاب کتابوں، مخطوطات اور رسائل کا تحفظ ہو سکتا ہے۔

آج سے ایک سو سال پہلے صوبۂ مدراس (تمل ناڈو) کی جغرافیائی حیثیت وسیع و عریض تھی۔ اس زمانے میں یہ ایک بسیط حصہ ملک کہلاتا تھا (۱) کرناٹک (۲) آندھرا (۳) تمل علاقہ (۴) ملیبار (کیرلا) اور (۵) میسور (کرناٹک) وغیرہ سب حیطۂ مدراس میں شامل تھے۔ احاطۂ مدراس کی یہ وسعت دو صدی پہلے کی سیاسی رفتار کا خاص نتیجہ ہے۔ اس مضمون میں تمل ناڈو یا مدراس سے میری مراد صرف اس قدیم حصۂ ملک سے ہے جو مغلیہ عہد میں صوبۂ کرناٹک کے موسوم تھا۔

دراوڑی تہذیب

دراوڑی تہذیب جنوبی ہند میں پروان چڑھی۔ اہلِ نظر کا خیال ہے کہ یہ بجائے خود انسانی نسلوں کے تصادم کی پیداوار تھی۔ ہندوستان کے قدیم ترین باشندے (PROTO-ASTROID) نسل کے لوگ تھے۔ جن کی ناک چپٹی اور ہونٹ بہت موٹے تھے۔ آریاؤں کی آمد سے ہزار ہا برس قبل بحیرۂ روم کے علاقے کی ایک نسل نے ہندوستان کی طرف ہجرت کی۔ مورخین نے پتہ لگایا ہے کہ یہ تورانی النسل تھے جو ہندوستان کے شمالی مغربی درّوں کے راستے سے شمالی ہند میں آ کر آباد ہوئے۔ مگر جب شمال کی آریائی اقوام نے انہیں شمال ہند سے بے دخل کیا تو وہ جنوب میں آ کر بس گئے اور جس طرح شمال میں آریائی قوم نے دراوڑی قوم پر غلبہ حاصل کیا اسی طرح دراوڑی قوم نے جنوب کے قدیم باشندوں کو جنگلوں کی طرف بھگا دیا۔ اور جا بجا سلطنتیں قائم کر لیں۔ بحیرۂ روم سے آنے والی نسل کے لوگ تنگ ناک، لمبوترے سر اور اکہرے بدن کے تھے۔ ان دونوں نسلوں کے انضمام اور ٹکراؤ سے موجودہ دراوڑی نسل نے جنم لیا۔ ہڑپہ کلچر کی تحقیق کے بعد ان دونوں نسلوں کا وجود ثابت ہو چکا ہے بلکہ بعض مورخین اور محققین کا تو یہ خیال ہے کہ ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی زبان قدیم ترین تمل زبان ہی کی ایک صورت ہے۔ بقول وزیر آغا دراوڑی تہذیب دراصل دھرتی پوجا کی علامت ہے۔ آریائی اور دراوڑی کلچر کے اتصال سے فنونِ لطیفہ، رقص، موسیقی، مصوری، نقاشی، مجسمہ سازی، شاعری، رہن سہن کے آداب اور لٹریچر نے جنم لیا ہے۔ جو ہند و پاک کے تہذیب و کلچر کے امتیازی نشانات ہیں۔

بول چال کی زبانیں

ملک کے اس حصہ میں پانچ قدیم ترین زبانیں (۱) تلگو (۲) تمل (۳) کنڑی (۴) ملیالم (۵) اور تلوا بولی جاتی تھی۔ مورخین کا خیال ہے کہ ان پانچ زبانوں سے پہلے بھی کوئی اور زبان موجود تھی۔ اور اسی سے یہ پانچ زبانیں پیدا ہوئیں۔ چونکہ دراوڑی اور آریائی قومیں دونوں ترکستان سے آئی ہوئی تھیں یہ گمان اغلب ہے کہ سنسکرت زبان اور اس دوسری زبان میں جس سے مذکورہ پانچ زبانیں نکلی ہیں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔

اس وقت ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف زبانیں مروج تھیں جن کو پراکرت کہتے تھے اور یہ آریائی قبائل کی زبانیں تھیں۔ چھٹی صدی عیسوی میں جب کہ اسلام کا ظہور ہوا۔ ہندوستان میں بیس سے زیادہ پراکرتیں بولی جاتی تھیں ان کے علاوہ جنوب میں مذکورہ پانچ زبانیں مروج تھیں۔ حالانکہ آریاؤں کی زبان سنسکرت مسیح سے صدیوں پہلے کی ہیں مگر جنوب کی زبانیں پراکرت سنسکرت سے بھی قدیم ہیں اور تورانی النسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ جنوب کی قدیم ترین زبان تمل بتائی جاتی ہے جس کے بارے میں عظیم محقق لسانیات، حضرت

مولانا امانی، پرنسپل منبع الانوار، لال پیٹ (موجودہ جنوبی آرکاٹ) کا بیان ہے کہ تمل زبان عربی سے وجود میں آئی ہے۔ اس بیان کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ تمل زبان میں ہزاروں عربی اور فارسی الفاظ مستعمل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ عرصۂ دراز سے تمل زبان کو عربی رسم الخط میں لکھا جاتا رہا ہے اور آج بھی اس رسم الخط میں مختلف موضوعات پر کتابیں طبع ہوتی رہتی ہیں۔ اس طرز کی زبان کو "عرب تمل" کہا جاتا ہے۔

گروہ بندیاں

سنہ ۱۳۴۷ء میں بہمنی حکومت کی بنیاد پڑی۔ اس دور میں دور دراز سے کئی لوگ آئے اور فائز المرام ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں پورا دکن (کرناٹک)، مختلف اصل و نسل کے باشندوں سے معمور ہو گیا۔ یہ مختلف النسل باشندے کچھ مدت کے بعد مختلف ناموں سے موسوم ہوئے۔ ان میں سے ایک گروہ "دکھنی" کہلاتا ہے۔ دکھنی سے مراد ملک کے وہ لوگ تھے جو شمالی ہند سے اسلامی لشکر کے ساتھ دکن میں آکر بس گئے اور ان کی دو چار پشتیں یہاں بیت گئیں اور اسی وقت سے یہ لوگ اردو زبان بولا کرتے تھے۔

دوسرا گروہ "غریبوں" کے نام سے موسوم تھا۔ غریبوں سے مراد وہ باشندے تھے جو ایران اور ترکستان سے آکر یہاں ملازم ہو گئے تھے۔ ان کی زبان فارسی تھی۔ تیسرا گروہ ان "حبشیوں" کا تھا جو ابی سینیا کے باشندوں پر مشتمل تھا۔ اور یہ لوگ یمن کے راستے سے جنوب میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ "عربی" اور "حبشی" ان کی زبانیں تھیں۔ فارسی بولنے والے غریبوں اور عربی بولنے والے حبشیوں کی بہ نسبت اردو بولنے والے دکھنیوں کی تعداد زیادہ تھی اور سلطنت کے ہر گوشے میں یہ لوگ منتشر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی اور عربی زبانوں کے مقابلے میں دکھنیوں کی زبان "دکھنی" یا اردو کا بہت رواج ہو گیا اور یہ زبان اس سرے سے اس سرے تک بولی اور سمجھی جانے لگی۔

دکھنی لوگ ستم ہائے روزگار اور امتدادِ زمانہ کے باعث فارسی اور عربی زبانوں کو بالکل فراموش کر گئے۔ مذکورہ گروہ غریبوں کی وجہ سے علاقۂ مدراس میں فارسی کو فروغ حاصل ہوا۔ یہاں تصنیف و تالیف اور شاعری کے لئے فارسی کو عربی سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ اور عربی کو صرف دینی علوم تک محدود کر دیا گیا۔

ملیبار (کیرلا) میں عربوں کے مستقل قیام کی وجہ سے عربی زبان کی جڑیں بہت گہری ہوتی چلی گئیں۔ بیرونِ ملک سے آنے والے عرب اور ایرانی مبلغین اور تاجروں کو جنوب میں اپنے تجارتی تعلقات استوار کرنے اور تبلیغِ دین کے سلسلے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ چونکہ یہاں کے لوگ فارسی اور عربی سے بخوبی واقف تھے۔

اردو زبان کا تاریخی پس منظر

اردو زبان کی تعمیر و تشکیل میں رشیوں، منیوں اور اولیائے کرام نے کافی خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی زبانیں سنسکرت عربی و فارسی تھیں۔ جن کی آمیزش سے ایک ایسی ست رنگی بولی نے جنم لیا جو دکھنی کے نام سے مشہور ہوئی۔ مسلمانوں کے تعلقات سواحل کرناٹک کے ساتھ اس وقت سے شروع ہوتے ہیں جب کہ اسلامی فوج شمال کی جانب سے جنوبی ہند نہیں آئی تھی۔ عرب تاجر اور اسلامی مبلغین سمندروں کو پار کر کے کورومنڈل اور ملیبار پر مسلسل آتے رہے اور دور دور تک اپنی تجارت اور اس کے ساتھ اپنے تمدنی اور معاشرتی اثرات پھیلاتے رہے۔

شہرۂ آفاق اسلامی سیاح ابن بطوطہ نے سنہ ۱۳۴۲ء میں جنوبی ہند کی بھی سیاحت کی تھی۔ اس کے سفرنامہ میں ملک کنر، ملیبار اور ٹراونکور کے بہت سے شہروں کا ذکر موجود ہے۔ وہ رقمطراز ہے کہ "یہاں مسلمانوں کی آبادیاں ہیں مسجدیں بنی ہوئی ہیں"۔ ملیبار کی تاریخ دیکھی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہاں کی مسجدیں جن کا ذکر ابن بطوطہ نے کیا ہے پہلی صدی ہجری میں تعمیر ہوئی تھیں جن کو شرف بن مالک اور ان کے بھتیجے مالک بن حبیب نے تعمیر کیا تھا۔ یہ بزرگ عرب کو خیرباد کہہ کر ملیبار میں آباد ہو گئے۔

ولیوں اور رشیوں کی سرپرستی

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ہماری اردو زبان کو بادشاہوں کے درباروں اور وزیروں کی سرپرستی سے پہلے صوفیوں اور مشائخ کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ سچ پوچھئے تو جنگ جو، بہادر اور فاتح سلاطین کی حکومت محض زمین پر تھی۔ مگر صوفیائے کرام، رشیوں منیوں اور پنڈتوں نے کروڑوں خواص و عام کے دلوں پر حکومت کی۔ عظیم مؤرخ محمود خان بنگلوری ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، حبیب النساء بیگم، ڈاکٹر اعجاز حسین اور ڈاکٹر تارا چند نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ جنوبی ہند میں ملک کافور کے حملے سے بہت پہلے حسن اتفاق سے مذہبی تعلیمات شاعری کی صورت میں محفوظ ہو چکی تھی۔ بیشتر اولیائے کرام کی زبان فارسی اور عربی تھی۔

اردو زبان کی یہ خوش نصیبی ہے کہ بعض مقدس ہستیوں نے اس کی سرپرستی فرمائی۔ حضرت گیسو دراز، حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی، حضرت خواجہ مظہر الدین نظہر ولی (ترچناپلی)، وغیرہم نے اشاعتِ اسلام کی خاطر اردو کو گلے لگایا۔ عالم متبحر حضرت نظہر ولی کے بارے میں مولوی محمد مبین صاحب چریاکوٹی نے "جواہر حسن" مطبوعہ سنہ ۱۹۲۳ء میں اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ وہ دکھنی زبان کے شاعر بھی تھے اور ان کی مثنوی "بحر عالم" سے قدیم اردو زبان کا نمونہ کلام بھی پیش کیا ہے جن میں سے ایک شعر ملاحظہ ہو:

بچھایاں مرصع کے کرسی ادھر بندیاں درمیاں پردہ باریک تر

سیاسی پس منظر

ملک کافور نے سنہ ۱۳۱۰ء میں کورومنڈل اور کرناٹک پر حملہ کیا۔ حضرت امیر خسروؒ رقمطراز ہیں کہ ملک کافور نے راجہ بیر کا کنانور ضلع ترچناپلی تک تعاقب کیا۔ اس کے بعد علاء الدین خلجی کے زمانے سے محمد تغلق کے آخیر زمانے تک سلاطین دہلی نے دکن پر متعدد حملے کئے اور ہر مرتبہ لشکر کے ہزاروں آدمی اپنے ساتھ ان علاقوں میں آئے اور جب واپس ہوئے تو اپنے لشکر

کو بغرض انتظام یہاں چھوڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی فوج کے لاکھوں آدمی دکن، ترچی، مدورائی، آرکاٹ اور مدراس وغیرہ میں آباد ہو گئے اور باہمی سنجوگ سے یہاں کے بڑے بڑے شہروں میں دکھنی بولنے والوں کی بستیاں قائم ہو گئیں۔

سلاطینِ خاندانِ بہمنیہ (پایۂ تخت گلبرگہ ۱۳۴۷ء — ۱۵۲۹ء) خاندانِ عادل شاہی (پایۂ تخت بیجاپور ۱۴۸۹ء — ۱۶۸۶ء) خاندان قطب شاہی (پایۂ تخت گولکنڈہ ۱۵۱۲ء — ۱۶۸۷ء) خاندان نظام شاہی (پایۂ تخت احمد نگر ۱۴۹۰ء — ۱۶۳۳ء) خاندان راجگانِ وجیانگر (۱۳۳۶ء — ۱۴۷۹ء) خاندان تلوداروجیانگر (۱۴۹۹ء — ۱۵۷۰ء) تک کی سیاسی جنگوں اور افراتفری سے دکھنی زبان کا پالا پڑا۔

۱۶۹۸ء میں جنجی کا قلعہ جب فتح ہوا تو جنوب کا تمام ملک راس کماری تک مغلیہ سلطنت کے زیرِ اثر آ گیا۔ کل جنوبی ہند کے فتح ہو جانے پر شہنشاہِ عالمگیر اورنگ زیب نے انتظام کی خاطر دکن اور جنوبی ہند کو ذیل کے چھ حصوں میں تقسیم کیا۔

(۱) خاندیس (۲) اورنگ آباد (۳) بیدر (۴) برار (۵) حیدرآباد (۶) بیجاپور

ان میں آخری دو صوبوں یعنی حیدرآباد اور بیجاپور میں بھی ہر ایک کے دو حصے کیے گئے۔ حیدرآباد کے دو حصوں میں ایک حصہ حیدرآباد، کرناٹک بالاگھاٹ اور دوسرا حصہ پائیں گھاٹ کے نام سے مشہور ہوا۔

اس پائیں گھاٹ کے ماتحت وہ تمام ملک تھا جو ساحلِ سمندر سے لگا ہوا جنوب میں تنا دلی تک چلا گیا ہے یعنی اضلاع گنٹور، نلور، چنگل پٹ، مدراس اور آرکاٹ وغیرہ۔ اس کے انتظام کے لئے ایک نائب صوبیدار مقرر ہوا۔ پائیں گھاٹ کے ماتحت ذیلی اضلاع تھے۔

(۱) سیلم (۲) کوئمبتور (۳) شمالی آرکاٹ (۴) ویلور۔ جنوب میں مدورائی تک۔

جس طرح شمالی ہندوستان میں اردو کے تین گڑھ دلی، لکھنؤ اور رام پور تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح تملناڈو میں اردو کے چار گڑھ (۱) ترچناپلی (۲) مدورائی (۳) آرکاٹ (۴) مدراس۔ یہاں کی ادبی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تمل ناڈو میں اردو کے اوّلین شعراء

بہمنی سلطنت اور اس کے زوال پر قائم ہونے والے پانچ سلطنتوں سے جو شعراء اور ادباء وابستہ تھے ان میں کئی ایک کا تعلق کرناٹک سے تھا۔

شیخ نصرت نصرتی کے متعلق اردو کے محققین کا بیان ہے کہ وہ آرکاٹ ہی کا باشندہ تھا حالاں کہ نصرتی کی تاریخ ولادت معلوم نہیں مگر اس کی خود مثنوی "گلشنِ عشق" کے دیباچے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس نے محمد عادل شاہ (۱۶۲۷ء تا ۱۶۵۶ء) کے دربار میں رسائی حاصل کی اور علی عادل شاہ (۱۶۵۶ء تا ۱۶۷۲ء) کے دور میں ملک الشعراء کا خطاب حاصل کیا۔

ابراہیم زبیری نے مضمون آفرینی، زورِ طبع اور بلندیٔ فکر کے پیش نظر نصرتی کو ہم پایۂ خاقانی قرار دیا ہے۔ نصرتی کو مثنوی گو شعراء میں اہم ترین مقام حاصل ہے۔ موصوف کی متعدد مثنویوں میں "گلشنِ عشق" چار ہزار اشعار پر مشتمل ایک شاہکار مثنوی ہے جو منوہر و مدمالتی کی داستان سے مزین ہے۔ یہ مثنوی ۱۶۵۶ء میں مکمل ہوئی تھی۔ عاقل خان رازی نے بھی اسی داستان کو ۱۶۵۵ء میں بزبان فارسی نظم کیا تھا۔ اور اس کا نام "مثنوی مہر و ماہ" رکھا تھا۔ نصرتی کی ایک اور مثنوی "علی نامہ" جو ۱۶۶۵ء میں مکمل ہوئی تھی جو "شاہنامہ دکن" کے نام سے زیادہ مشہور ہوئی۔ مارلے نے اس کا نام "تاریخ عادل شاہ" بھی لکھا ہے۔

ملک الشعراء نصرتی کے فوراً بعد کے شاعر میاں عبدالمومن مومن ہیں۔ موصوف جن پٹن (موجودہ ریاستِ کرناٹک میں بنگلور کے قریب ایک شہر) کے رہنے والے تھے۔ مومن اپنے مذہب مہدویہ کے بانی سید محمد جونپوری کے حالات کو اپنی دکنی مثنوی "اسرار عشق" مرتبہ ۱۶۸۱ء میں منظوم کیا ہے۔ مگر مولوی محمد مبین کیفی چریاکوٹی نے اس کی تاریخ اشاعت ۱۶۵۲ء لکھی ہے جو بعید از قیاس ہے مومن کی اس مثنوی میں ہندی الفاظ کی برت زیادہ ہے۔ مثلاً بہاؤ، اکس، کبھی نگری وغیرہ۔

اس زمانے میں تین ایسے اہم ترین شاعر گزرے ہیں جن کا تخلص اتفاق سے ولی ہے۔ یہ تینوں معاصر ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام ولی رام ہے۔ دوسرا ولی دکنی (ویلوری) اور تیسرا ولی اورنگ آبادی ہے۔

ولی رام دہلی کا باشندہ اور شاہجہاں کے بڑے فرزند شہزادہ محمد دارشکوہ کا میر منشی تھا۔ اس نے راجگانِ سلاطین دہلی کی ایک تاریخ بھی لکھی ہے جس کا نام "راجا ولی" ہے اس وقت جو بھی تذکرے لکھے گئے ان میں کسی بھی دہلی یا شمالی ہندوستان کے کسی ایسے شاعر کا ذکر نہیں ملتا جس نے خالص اردو میں ولی رام سے پہلے شاعری کی ہو۔

دوسرا شاعر ولی دکنی صوبۂ مدراس کے ایک مشہور ضلع ویلور کا باشندہ ہے۔ ولی دکنی ویلوری کا نام سید محمد فیاض ہے۔ موصوف امام کاظم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ تمل ناڈو میں اردو زبان کو تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ دکن کے دوسرے علاقوں کی ہے۔

قطب شاہی دور سے یہاں آہستہ آہستہ اردو کا رواج ہوا اور باقاعدہ یہاں کی شاندار ادبی روایت ولی دکنی ویلوری کے معاصر ولی اورنگ آبادی کے دور سے پہلے ملتی ہے۔

ڈاکٹر شمس اللہ قادری ویلوری نے اپنی تصنیف "تاریخ زبان اردو" میں ہر جگہ سید محمد فیاض ویلوری کو ولی دکنی کے نام ہی سے یاد کیا ہے اور اورنگ آباد کے محمد ولی کو ولی اورنگ آبادی کے نام ہی سے یاد کیا ہے۔ اردو کے بیشتر مورخین نے ولی اورنگ آبادی کو غلطی سے ولی دکنی کے نام سے اتنا مشہور کر دیا ہے جس کی وجہ سے خود "تذکرہ شعرائے دکن اور گل رعنا" کے مصنف نے ولی دکنی (ویلوری)

کی ایک مشہور تصنیف "روضۃ الشہداء" ۱۱۱۸ھ کو ولی اورنگ آبادی کی تصنیفات میں شمار کیا ہے۔ جو غلط ہے۔ ولی اورنگ آبادی کو ولی دکھنی کہنا یا لکھنا ایک بہت بڑی تاریخی لغزش ہے۔ ولی دکھنی ویلوری کی روضۃ الشہداء کو نصیر الدین ہاشمی نے حسین کاشانی کا ترجمہ اور ڈاکٹر شمس اللہ قادری نے ملا حسین کاشفی کا ترجمہ بتایا ہے روضۃ الشہدا نام کی ایک اور تصنیف کے مصنف ملا حسین واعظ ہیں جس کا منظوم ترجمہ نصرتی کے ایک ہم عصر سیوا نے کیا تھا۔ ولی دکھنی ویلوری نے دو ضخیم مثنویاں لکھی ہیں۔ پہلی مثنوی "رتن پدم" ہے جو ہزار اشعار پر مشتمل ۱۱۹ھ مطابق ۱۷۰۷ء میں مکمل ہوئی تھی اس مثنوی میں رتن سین اور پدمنی کا فسانہ مذکور ہے۔ دوسری مثنوی روضۃ الشہدا ہے جس میں واقعاتِ کربلا تحریر ہوتے ہیں۔ ولی دکھنی ویلوری نے چیٹ پیٹ مدراس میں انتقال فرمایا۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے بھی اسی سال انتقال فرمایا تھا۔

ولی اورنگ آبادی کے وطن کے بارے میں مورخین کے متضاد بیانات ہیں مگر ولی اورنگ آبادی نے خود کو اورنگ آبادی یا گجراتی کے بجائے شاعرِ ملکِ دکن لکھا ہے۔ ذیل میں ولی اورنگ آبادی کا شعر ملاحظہ ہو

ولی ایران و توراں میں ہے مشہور اگرچہ شاعرِ ملکِ دکن ہے

ملکِ دکن کا باشندہ ہونے کے باوجود ولی اورنگ آبادی نے اپنے تخلص کے ساتھ کبھی دکھنی نہیں لکھا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اسے اپنے ہمعصر اور ہم پایہ مشہور و معروف شاعر ولی دکھنی ویلوری کے تخلص کے ساتھ وطن کی نسبت کا لحاظ ملحوظ خاطر تھا۔ ابراہیم سایانی نے ولی اورنگ آبادی کے مذکورہ شعر کے مصرعِ ثانی ذیلی انداز میں ترمیم کی ہے جو سراسر غلط ہے۔

وطن گو اس کا گجرات و دکن ہے

حضرت لچھمی نارائن شفیق اور میر تقی میر نے ان کا وطن اورنگ آباد ہی لکھا ہے اور شفیق نے تو شد و مد کے ساتھ ان کے گجراتی ہونے کی تردید کی ہے۔

نوابینِ آرکاٹ کی سرپرستی میں بڑی حد تک فارسی ادب کو اور کسی حد تک اردو ادب کو فروغ حاصل ہوا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ بیشتر فارسی گو شعرا نے اردو میں بھی شاعری کی ہے اور ان کی اردو تصانیف اپنے ہمعصر مشاہیر شعرا کی نثری اور شعری تصانیف سے کم درجہ کی نہیں ہیں۔ حکومتِ اہلِ نوائط، نواب انور الدین خان اور ان کے دو جانشینوں کے دورِ حکومت، نواب عظیم الدولہ اور ان کے دو جانشینوں کے دورِ حکومت، نواب غلام غوث خاں بہادر اعظم کے دورِ حکومت برطانیہ کے دورِ حکومت اور آزادی کے بعد موجودہ دور تک کے سرسری جائزہ کے بعد ہی پتہ چلے گا کہ یہاں کی تین سو سالہ ادبی تاریخ کو لو کس کس دور میں زیادہ تیز ہوئی۔ اور اس کی روشنی کہاں تک پھیلی۔

نائطی دورِ حکومت کے شعرا و ادبا ۱۷۱۰ء تا ۱۷۴۲ء

۱۶۹۶ء میں کرناٹک پر مغلیہ قبضہ ہوا اور نواب سعادت اللہ یہاں کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ موصوف کو بحیثیتِ شاعر فنونِ لطیفہ سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان کے دربار میں شعرا کے کلام پر باقاعدہ جرح و قدح اور تبادلۂ خیال کی بنیاد پڑی۔ ان کی تنقیدی نشستوں میں عزامی، ملا وجہی، اور نصرتی کی شاعری پر کھل کر اظہار رائے ہوتا تھا۔ سعادت اللہ خاں خود بھی ایسے پرگو شاعر تھے کہ ایک مرتبہ بیجاپور کے ایک شاعر عبداللہ ذاکر نے اپنی منظوم درخواست پیش کی تو اس پر نواب موصوف نے اسی بحر میں منظوم احکام صادر کئے۔

ان کے زمانے میں بڑے بڑے علما ذی وقار، مشائخ طریقت، اطبائے حاذق اور فارسی و اردو کے شعرائے نامدار آرکاٹ میں جمع ہو گئے تھے۔ ان شعرا میں مرزا عبدالقادر بیدل کے شاگرد شیخ محمد امین اسرائیلی مصنفِ گلشنِ سعادت و مجمع الانشا، فارسی اور اردو کے جلیل القدر شاعر جسونت رائے منشی مصنف "گلکدۂ عشق" (یہ مثنوی عزامی کی اردو مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال سے ماخوذ ہے) منشی کے سجان نسبت رائے، قزلباش خان امید، ہمدانی تلمیذ مرزا طاہر وحید ایرانی، نواب باقر علی خاں، زین العابدین خان دیوان، شیخ صداقت اللہ، میر مرتضیٰ منزوی، آقا محمد مقیم، اور افضل خاں لذتی دہلوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

لذتی کو مدراس کا حق شہرت بھی حاصل ہے اور اسی طرح متعدد شعرا کو جو بیرونی ممالک سے اور شمالی ہندوستان سے آکر مدراس میں بس گئے۔ لذتی مثنوی "چندر بدن مہیار" کے مصنف ہیں۔ گلدستہ کرناٹک کے مصنف راقم نے اس مثنوی کی بڑی تعریف کی ہے۔ مثنوی چندر بدن مہیار کے قصہ کو جو شہر کدری سے متعلق ہے سب سے پہلے مولانا باقر آگاہ ویلوری نے دکنی زبان میں منظوم کیا تھا۔ اس قصہ کو میر حیدر شاہ دکنی اور آتشی نے بھی منظوم کیا ہے۔ حیدر یا حیدری ایک مرثیہ گو نے بھی اس قصہ کو شعری جامہ پہنایا ہے۔ یہ حیدر شاہ حیدری دکنی نواب شجاع الدولہ کے دورِ حکومت میں دہلی سے بنگال آئے تھے۔ مذکورہ مشہور قصہ کو مستقیم جنگ نامی نے "فردوسِ اعجاز" کے نام سے بھی اور مقیمی آرکاٹی نے ۱۶۰۶ء میں منظوم کیا تھا۔ مقیمی عالمگیری فتوحات کے وقت آرکاٹ میں گزرے ہیں۔ مذکورہ قصہ کو سب سے زیادہ موثر اور دلکش پیرایہ میں وانمباڑی شمالی آرکاٹ کے ایک جلیل القدر صوفی شاعر (ہمعصر و ہم پایۂ داغ دہلوی) مولانا آگنڈو عبدالقادر شاکر وانمباڑی نے منظوم کیا اور یہ مثنوی "گلزارِ شاکر" کے نام سے ۱۸۹۱ء میں مدراس میں طبع ہوئی۔ تمل ناڈو کی کم و بیش دو تین سو مثنویوں میں مولانا شاکر وانمباڑی کی یہ مثنوی ہندوستان کی اہم ترین مثنویوں میں شمار ہوتی ہے۔

حکومتِ اہلِ نائط میں متعدد نامی نثر نگار بھی گزرے ہیں جن میں سید شاہ علی محمد حسینی قادری اور قاضی نظام الدین احمد صغیر قابل ذکر ہیں۔ اس زمانے میں تمل ناڈو کی عام زبان ہندوستانی یا دکھنی، یا ریختہ یا اردو تھی۔ حالانکہ علما و ادبا کی تحریری زبان فارسی تھی۔ مگر وہ بھی اس عام زبان ہندوستانی یا اردو میں اپنی تصانیف مرتب کرنے لگے۔ شمالی ہند میں بہت سے ادیبوں اور شاعروں کو یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی ہے کہ تمل ناڈو میں صرف تمل بولنے والے مسلمان اور ہندو ہی ہوں گے یہ تاریخی حقیقت ہے کہ تمل ناڈو میں دلی سے زیادہ تقریباً آٹھ لاکھ عوام کی مادری زبان خالص اردو ہے۔ یہاں ایک بات دنیائے ادب کو چونکا دینے والی یہ ہے کہ آج سے

تقریباً دو سو سال پہلے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ تمل، سنسکرت، ہندی، اور دیگر مختلف زبان بولنے والے ہندو علما اور پنڈتوں نے بھی فارسی اور اردو میں ادب العالیہ پیش کیا ہے۔ اور ان کی شاعری کا چرچا پورے ہندوستان میں تھا۔ اسی طرح تین سو سال سے تمل بولنے والے مسلمانوں کے خاندان نے فارسی اور اردو کے جلیل القدر شعرا و ادبا کو جنم دیا ہے۔ موجودہ دور میں تمل ناڈو کے بیشتر مشاہیر اردو شعرا کی مادری زبان تمل ہے۔ راقم الحروف بھی اسی کیمپ سے تعلق رکھتا ہے۔ شروع میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اردو زبان میں اچھی شاعری کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کی مادری زبان اردو ہو۔ ایک پنجابی، ایک انگریز اور ایک تمل زبان کا پنڈت اردو کا عظیم شاعر ہو سکتا ہے اور ایسا ہوا بھی ہے۔

مدراس میں فارسی نظم کے ہندو شعرا نے متعدد کتابیں ادبی موضوع اور معاصرانہ تاریخ اور فارسی شاعری پر مشتمل کئی دیوان بھی مرتب کئے ہیں۔ ہندو ادبا و شعرا میں جنہوں نے اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں فارسی زبان و ادب میں جو کافی شہرت حاصل کی ان میں کئی ہندو ادیب اور شاعر بھی ہیں۔ مثلاً جسونت رائے منشی، منشی جگناتھ پرشاد عزت، رائے کاشی پرشاد فدوی، راجہ مکھن لال خرد، تلمیذ مولانا عبدالعلی بحرالعلوم (ساکن مدراس) و مولوی شرف الملک وغیرہم، مکھن لال خرد کے قطعات تاریخ مسجد والاجاہی مدراس کے منبر پر کندہ ہیں۔

جس وقت شمالی ہند اور حیدرآباد میں ہندوستانی یا اردو شاعری کا زور تھا اس وقت کرناٹک یا تمل ناڈو میں فارسی شاعری بامِ عروج پر پہونچ چکی تھی۔ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے سے دلی میں اردو شعر گوئی کا رواج ہوا۔ سب سے پہلے وہاں فارسی شعرا نے اس طرف توجہ کی۔ موسیٰ خان فطرت، مرزا عبدالقادر بیدل، مرزا عبدالغنی قبول وغیرہم جو فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ کبھی کبھی تفریحاً تفننِ طبع کی خاطر ہندوستانی یا اردو میں بھی دو چار شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ کچھ مدت تک یہی کیفیت رہی مگر محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں سنہ [illegible] کے قریب ولی دکنی کا دیوان دلی پہونچا تو اہلِ دلی نے اس کی خوب قدر کی۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں دہلی شعرائے اردو سے معمور ہو گئی۔

انورالدین خاں اور ان کے دو جانشینوں کے دورِ حکومت میں ۱۷۴۳ تا ۱۸۰۱ء

نوابینِ آرکاٹ کی ادبی سرپرستی اس دور میں سلطنتِ مغلیہ کی ادب پروری اور فیاضی کی یاد دلاتی تھی۔ ابتدا ہی سے روسائے آرکاٹ کو علم و فن اور شاعری سے دلچسپی رہی ہے۔ ۱۷۴۳ء میں آصف جاہ اول نے نواب انورالدین خاں کو کرناٹک کا صوبیدار مقرر کیا تھا۔ آمبور (شمالی آرکاٹ) میں موصوف کی شہادت کے بعد ان کے فرزند محمد علی والاجاہ کرناٹک کے خود مختار حکمراں تسلیم کر لئے گئے۔ جس کی توثیق دہلی سلطنت سے بھی عمل میں آئی۔ انورالدین خاں اور ان کے فوراً بعد کے دو جانشینوں کے عہد میں فارسی اور اردو کے باکمال شعرا اور مصنفین گذرے ہیں۔ آج سے تقریباً پونے تین سو برس پہلے خانوادۂ انقلاب ویلور کی چند زندہ جاوید شخصیتوں نے ایسی بے مثال شمع جلائی تھی کہ جس کی روشنی آج بھی اہلِ عالم کے لئے مہبطِ انوار کی حیثیت رکھتی ہے جس کی علمی، ادبی اور دینی خدمات جنوب کے اندر آپ اپنی مثال ہیں۔ جنوب میں علم کی حقیقی لذتوں سے روشناس کرانے والے یہی لوگ ہیں۔ جن کی تحریر و تقریر سے دنیائے جنوب میں علم و ادب کا چرچا ہوا۔ جنوب میں فارسی کے جتنے بھی شاعر گذرے ہیں وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ انوری دور کے حضرت سید شاہ ابوالحسن قربیؔ ویلوری کے شاگرد ہیں۔ قربیؔ ویلوری (سنہ [illegible] تا سنہ [illegible]) اپنے وقت کے بہت بڑے صوفی، عالم باعمل اور عربی فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر اور مصنف تھے موصوف کے دامن تربیت میں حضرت باقر آگاہ ویلوری اور حضرت مولانا عبداللطیف ذوقیؔ جیسے جلیل القدر صوفی شاعر و ادیب تربیت پاکر اپنے دور میں اردو اور فارسی ادب کے ممتاز و مشاہیر شعرا کہلائے۔

قربیؔ اور ان کے شیخ مولانا فخرالدین جھکری نائطی بیجخود دونوں نے مولانا شیخ مخدوم عبدالحق ساوی" المعروف بہ دستگیر صاحب (ساکن مدراس) کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان سے روحانی فیض حاصل کیا۔ تمل ناڈو میں حضرت مولانا شیخ مخدوم عبدالحق ساوی المعروف بہ دستگیر رحمہ، حضرت مولانا عبدالعلی بحرالعلوم، سید شاہ حسین قادری مجرمؔ اور ان کے پوتے اور ہمنام زبدۃ العارفین مرشد مولانا حضرت مولوی سید شاہ حسین صاحب قادری مجرمؔ وغیرہم کی تقدیس و تحریر اور درس و تدریس سے ایک ملکوتی فضا ہمیشہ طاری رہی ہے۔ حضرت قربیؔ ویلوری کی عربی، فارسی اور اردو میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ اشعار ہیں۔ اور تصانیف کی تعداد تیس سے زیادہ ہے۔ تمل ناڈو میں قربیؔ پر بہت کام ہوا ہے۔ پروفیسر سید فضل اللہ مدراسی استاذ شعبۂ اردو، فارسی عربی (ایس وی یونیورسٹی تروپتی) نے لندن میں قربیؔ سے متعلق مخطوطات حاصل کر کے "دیوان قربیؔ" کو ایک مقدمہ کے ساتھ شائع فرمایا جو سنہ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ قربیؔ کے فرزند ذوقیؔ بھی بڑے پایے کے فارسی اور اردو شاعر تھے۔ ذوقیؔ کی زود فکری کے سلسلے میں مولانا باقر آگاہ ویلوری کا بیان ہے کہ "ایک روز حضرت ذوقیؔ نے میرے روبرو سات سو شعر موزوں کئے اور فرمایا کہ ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے ایک دن میں ہزار ہزار شعر کہنے پڑے ہیں" ذوقیؔ کی تصنیفات کی فہرست بہت طویل ہے۔

اسی عہد میں سید محمد موسیٰ واؔلہ خراسانی ثم ترچناپلوی، سید شاہ عبدالقادر مہربانؔ فخریؔ، امین الدین احمد خان بہادر، حکیم عبداللہ خاں دہلوی ثم مدراسی، میر اسمٰعیل خاں ابجدیؔ مدراسی اور مولانا باقر آگاہ ویلوری، مولانا حسین علی افصح، نورالدین محمد انور ولیؔ (موصوف انور بھی تخلص کرتے تھے) نواب محمد علی حسین ماجدؔ (فرزند عمدۃ الامرا بہادر) وغیرہم کی عہد آفریں شخصیتوں نے ایک دور کو متاثر کیا خصوصاً دورِ انوری معاصرانہ چشمکوں کے لحاظ سے بھی بہت دلچسپ ہے۔

۱۷۴۵ء تا ۱۸۰۶ء کے درمیان دکنی یا اردو کہلائے جانے والی زبان کو ادبی تخلیقات کے لئے سب سے پہلے کھل کر استعمال کرنے والے مولانا مولوی باقر آگاہ ویلوری تھے۔ باقر آگاہ ویلوری کو جنوب میں وہی ادبی مقام حاصل ہے جو شمال میں حضرت امیر خسرو کو حاصل ہے۔ آگاہ کی تصنیفات عربی، فارسی اور اردو میں لگ بھگ ڈیڑھ سو سے زیادہ ہیں اور اشعار کی تعداد دو لاکھ سے زاید ہے...

موصوف کی شاعری خالص ہندوستانی فضا رکھتی ہے۔ آج سے دو سو سال پہلے آگاہ نے نظیر اکبر آبادی اور فراق گورکھپوری سے کہیں زیادہ اپنی شاعری میں ہندوستانی عناصر کو تخلیقی حسن کے ساتھ برتا ہے۔ آگاہ کی شاعری میں ہندی الفاظ کی برت اتنی خوبصورتی سے ہوئی ہے کہ شاید ہی اس کی مثال شمالی ہند کے کسی قدیم یا جدید شاعر کے یہاں ملے۔ آگاہ کی "ہشت بہشت" (حجرہ سرور کائناتؐ پر پہلی منظوم تصنیف ہے اس سے پہلے کوئی نہیں لکھی گئی۔) اس کتاب میں ہندی سرخیوں کے ساتھ نو ہزار اشعار ہیں اور اس تصنیف کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر حصہ ہندی کی ذیلی سرخیوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً (۱) من دیپک (۲) من ہرن (۳) مد موہن (۴) جگ سوہن (۵) من درپن (۶) من جیون وغیرہ۔

باقر آگاہ ویلوری کی معاصرانہ چشمکوں کی داستان بڑی طویل ہے۔ موصوف کی مرزا محمد رفیع سودا، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، مولانا عبدالعلی بحرالعلوم لکھنوی اور نواب ماجد سے علمی، ادبی اور مذہبی تکرار، مباحثے، مراسلے بازیاں اور ہجو گوئیاں دورِ انوری کی دلچسپ یادگار ہیں۔ باقر آگاہ ویلوری مثنوی مولانا روم کے پہلے شارح ہیں اور ان کی یہ شرح ۱۷۹۳ء میں مکمل ہوئی تھی۔

دلچسپ ادبی واقعات

نواب والاجاہ کے جو ادبی خطوط اہلِ حجاز کے نام جاتے تھے وہ سب آگاہ ویلوری کے تھے۔ جب آگاہ کا پہلا خط وہاں پہونچا تو مفضل وقت نے آپ کی عربی انشا پردازی کو پسند فرمایا اور نواب والاجاہ کے نام جوابی خط ارسال کرتے ہوئے ان کے محرر آگاہ کی بڑی تعریف کی۔ نواب موصوف اس تعریف سے اس قدر خوش ہوئے کہ اپنے دونوں فرزندوں عمدۃ الامراء اور نواب امیر الامراء کو ایک سونے کے گہوارے کے ساتھ مولانا آگاہ کی خدمت میں روانہ کیا اور دونوں صاحبزادوں سے کہا کہ وہ مولوی آگاہ کو اس میں بٹھا کر جھلائیں۔

نوابین آرکاٹ کی ان گنت فیاضیوں کی ایک سرسری جھلک ملاحظہ ہو کہ انوری دور کے ملک الشعراء میر اسمٰعیل خاں المتخلص بہ ابجدی مدراسی کو نواب والاجاہ نے مثنوی "انور نامہ" لکھنے کے صلہ میں چاندی میں تلوایا۔ ابجدی کی ایک اور مثنوی قصۂ "راغب و مرغوب" ہندو پاک کی معرکۃ الآرا مثنویوں میں ایک اضافہ ہے۔ ابجدی کے والد ملا محمد مصنفِ "تاریخِ فرشتہ" کے بہنوئی تھے۔ ابجدی مدراسی نے فارسی اور عربی کے علاوہ ہندی اور اردو میں بھی بڑی بلیغ شاعری کی ہے۔

نورالدین احمد دل ترچناپلوی (۱۷۴۲ تا ۱۷۹۷ء) جو انور بھی تخلص فرماتے تھے، نلور کی فوجداری پر مامور تھے۔ موصوف نلور (موجودہ آندھرا پردیش کا ایک شہر) کے ایک عامل و نگہا جلم کے قتل کے جرم میں چندر گیری کے قلعے میں قید ہو گئے۔ قید کے زمانے میں تم مہینوں کی تھوڑی سی مدت میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ دل نے نواب والاجاہ کے حضور میں اس مبارک واقعہ کی اطلاع کے ساتھ معافیٔ قصور کی عرضداشت بھی پیش کی۔ اتفاق سے وہ مہینہ رمضان کا تھا۔ نواب صاحب نے حکم صادر فرمایا کہ شاعر موصوف ختم شبینہ سنادیں۔ شاعر موصوف جناب دل نے تعمیل حکم کی۔ والاجاہ پورا قرآن سنکر بہت خوش ہوئے اور موصوف نے دل کو رہا کر کے دوبارہ انھیں نلور کی فوجداری مرحمت فرمائی اور پسر نواب عمدۃ الامراء نے دل کو محمد پور (آرکاٹ) کا نائب صوبہ دار بھی مقرر کیا اور انھیں حشمت جنگ کے خطاب سے بھی سرفراز فرمایا۔

محمد محفوظ خاں محفوظ مدراسی فرزندِ دوم نواب انورالدین خاں بہادر شہید اپنے زمانے کے مشہور عالم و فاضل تھے۔ موصوف کے وفورِ علم کا ایک دلچسپ واقعہ مشہور ہے کہ ایک روز اورنگ آباد میں نواب آصف جاہ والیٔ حیدر آباد (۱۷۲۴ء تا ۱۷۴۸ء) کے دربار میں متعدد علمائے کرام حاضر تھے۔ محفوظ مدراسی بھی اپنے والد کے ساتھ موجود تھے۔ اس وقت اتفاقاً کوئی فقہی مشکل مسئلے کے متعلق استفسار کیا گیا۔ تمام علما جواب شافی دینے سے قاصر رہے۔ محفوظ کے والد نے اپنے فرزند کے اصرار پر بندگان عالی کے حضور میں عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو فدوی زادہ اس مسئلے پر کچھ عرض کرے۔ سب کو حیرت ہوئی کہ جب سب کے سب علما اس مسئلے پر عاجز رہے تو ایک کم عمر طالب علم کیا کہہ سکے گا؟ اجازت ملی تو محفوظ نے بڑی صراحت کے ساتھ تقریر کر کے اس عقدۂ لاینحل کو وا کیا۔ علمائے کرام نے بیحد تعریف کی اور محفوظ کی دینی صلاحیت کا اعتراف کیا۔ نواب آصف جاہ نے محظوظ ہو کر محفوظ مدراسی سے بر سرِ دربار اعلان فرمایا کہ اس وقت جو مانگو عطا کیا جائے گا۔ محفوظ نے برجستہ عرض کیا کہ "دینی خدمات کے مقابلے میں فدوی کو دنیوی فائدہ مدِ نظر نہیں ہے۔ مگر فرمانِ والا کی تعمیل بھی فدوی پر فرض ہے لہٰذا استدعا ہے کہ فدوی کو سرکاری کتب خانے سے جو کتاب پسند کروں عطا فرمادی جائے" یہ بیان سنتے ہی نواب آصف جاہ نے فوراً داروغۂ کتب خانہ کو حکم دیا کہ محفوظ کو دو ہزار کتابیں ان کی پسند کی دے دی جائیں۔

منشی غلام احمدی المتخلص بہ احمدی مدراسی فرزندِ اسد مدراسی کی ذہانت اس بلا کی تھی کہ ایک روز وہ زمانہ طالب علمی میں اپنے والد سے خاقانی کی مثنوی "تحفۃ العراقین" پڑھ رہے تھے کہ نواب فخر الامراء اعظم جاہ بہادر نواب کرناٹک کی شادی کی خبر سنی۔ احمدی نے بے ساختہ مادۂ تاریخ کہا۔ "نکاح فخر الامراء حاضرین" نے یہ فی البدیہہ تاریخ سنی تو دنگ رہ گئے، اس کی اطلاع دربار تک ۱۷۴۲ پہونچ گئی۔ احمدی کو خلعت سے نوازا گیا اور ان کی ادبی و علمی استعداد کی وجہ سے انھیں "اہل بقایائے کرناٹک" کی کچہری میں وقائع نگاری کی خدمت پر مامور کر دیا گیا۔

محمد تاج الدین بہجت مدراسی کی خوش مزاجی کی بڑی شہرت تھی۔ موصوف فارسی اور ہندی کے مانے ہوئے استاد تھے۔ طبیعت اتنی موزوں پائی تھی کہ بات بات پر مصرعِ تاریخ کہہ دیتے تھے۔

بہجت کی بے شمار تصانیف میں "شرح گلستان سعدی" الموسوم بہ "چمنستان" اور "مجمع البحرین" (فنِ عروض و قافیہ) قابلِ ذکر ہیں۔

نوابین آرکاٹ نے کئی شعرا و ادبا کا منہ موتیوں سے بھر دیا تھا۔ اور علماء و فضلاء شعراء و ادبا کو معقول وظائف اور مشاہیروں سے سرفراز فرمایا۔ نواب والاجاہ نے آج سے تقریباً دو سو سال پہلے یعنی ۱۷۹۰ء مطابق ۱۲۰۴ھ میں ملک العلماء مولانا عبدالعلی بحرالعلوم لکھنوی کو "مدرسہ کلاں" (موجودہ مدرسۂ اعظم مدراس) میں درس

وتدریس کے لئے ماہانہ ایک ہزار روپیوں کی تنخواہ مقرر کی تھی اور انھیں جاگیر سے بھی سرفراز فرمایا تھا۔ مولانا بحرالعلوم کی وساطت سے حسین علی افصح مدراسی نے ۱۷۹۵ء نواب عمدۃ الامرا بہادر ممتاز کی خدمت میں ایک قصیدہ پیش کیا۔ جس کا مطلع ہے ؎

ہر ذرۂ ناچیز کو خورشید بنانا — یہ کام تو تیرا ہی ہے ممتازِ زمانہ

اس قصیدے کے صلے میں نواب ممتاز نے افصح کو افصح الشعرا کا خطاب عطا فرمایا۔ اور جاگیر بھی عطا کی۔ افصح نے رائق کے "تذکرہ گلدستۂ کرناٹک" کا خلاصہ بھی مرتب کیا تھا۔ عمدۃ الامرا نواب غلام حسین ممتاز مدراسی فرماں روائے کرناٹک کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں ہے۔ ممتاز کے قلمی دیوان سے مصنفِ "تذکرہ سخنورانِ بلند فکر" نے متعدد اردو اشعار نوٹ کئے ہیں۔ ممتاز اردو کے باکمال شاعر تھے۔ ان کے متعدد خطابات میں عمدۃ الامرا، معین الملک، اسدالدولہ، حسین علی خاں بہادر ذوالفقار جنگ، سپہ سالار وغیرہم قابلِ ذکر ہیں۔

ممتاز نواب والاجاہ کے خلف اکبر تھے۔ عالی گوہر شاہ عالم بادشاہ دہلی کی پیشگاہ سے خطابات مذکورہ بالا کے علاوہ منصب ہفت ہزاری ذات و ہفت ہزار سوار خلعت فاخرہ ملبوسِ خاص مع جیغہ و سرپیچ و ماہی مراتب و پالکی جھالردار عطا ہوئے۔ ممتاز سے متعلق تفصیلی حالات خورشید الملک افتخار الدولہ محمد ناصر خاں بہادر صمصام جنگ کی سیاسی اور تاریخی کتاب "سوانحاتِ ممتاز" میں محفوظ ہیں۔

نواب محمد علی حسین ماجد مدراسی فرزندِ نواب عمدۃ الامرا بہادر عینِ عنفوانِ شباب میں ۱۸۱۰ء میں جبکہ وہ اٹھارہ برس کے تھے رحلت کر گئے۔ خاندانِ انوری میں ماجد جیسا نازک خیال شاعر، عظیم نقاد اور محقق فن دوسرا پیدا نہیں ہوا بلا کی طبیعت پائی تھی۔ مشاہیر شعرا اور باکمال اساتذۂ فن کے چالیس فارسی دیوان شروع سے آخر تک پڑھ کر ان پر باقاعدہ تنقید کی۔ کسی پر اعتراض کیا اور کسی کو اصلاح دی۔ اسی دوران شعر و شاعری کی طرف توجہ ہوگئی اور قصائدِ عرفی، دیوان ناصر علی دیوان اسیر اور چند اساتذۂ قدیم کا کلام مطالعہ فرمایا۔ اور شعر گوئی شروع کردی۔ یہاں تک کہ تھوڑی ہی مدت میں تقریباً چار ہزار اشعار کا ایک دیوان مرتب کرلیا۔ جب اس پر نظرِ ثانی کی تو کچھ اسقام نظر آئے۔ دوستوں کے مشورے سے سارے دیوان کو غرقِ آب کردیا۔ مولانا باقر آگاہ ویلوری کو اپنا کلام دکھاتے اور اصلاح لیتے تھے مگر جب مشقِ سخن حد سے بڑھ گئی تو اپنے آپ سے اتنے مطمئن ہوگئے کہ خود استاد آگاہ کے کلام پر جا بجا اعتراضات کئے۔ ماجد نے کم عمری میں اپنے ہمعصر مشاہیر شعرا سے باقاعدہ ٹکر لی تھی۔ اور اس سلسلے میں اپنے استاد کو بھی نہیں بخشا۔

اس دور میں انور حسین حشمت مدراسی نے ریختہ گوئی میں بڑا نام پیدا کیا۔ موصوف ریختہ میں مستقیم جنگ نامی مدراسی اور فارسی میں مرزا عبدالباقی وفا مدراسی سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ دورِ انوری میں فارسی گو شعرا میں بیشتر نے اردو میں بھی شاعری کی ہے۔ اور اس دور کا ہر شاعر صاحبِ تصنیف گزرا ہے۔ اس دور میں بے شمار مثنویاں لکھی گئیں۔

نواب عظیم الدولہ اور ان کے دو جانشینوں کے عہد میں

۱۸۰۱ء تا ۱۸۳۱ء یہ شاندار دور تذکرہ نویسی، تاریخی اور ادبی کتابوں کی تصنیف و تالیف اور خاص کر مثنوی نگاری میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس عہد میں متعدد کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئیں ۱۷۹۶ء میں محمد ظہیر الدین مرزا علی بخت اظفری کا مدراس میں ورودِ باسعادت اور موصوف کا حسین باغ مدراس میں مستقل قیام سے قلعہ معلّٰی کی ٹکسالی زبان کو یہاں بہت فروغ حاصل ہوا۔ مدراس میں اظفری کی وجہ سے اردو شاعری کے چودہ طبق روشن ہوئے اور کئی فارسی گو شعرا میں اردو شاعری کی طرف توجہ دی۔ اظفری سے متعلق افضل العلما پروفیسر مولانا رحیم احمد فاروقی آزاد مدراسی مرحوم کا مضمون حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو ماہنامہ سفینہ مدراس میں شائع ہوا جس کے مدیر افضل العلما ڈاکٹر ڈاکٹر عبدالحق تھے۔

مذکورہ عہد میں غلام علی موسیٰ رضا المخاطب بہ حکیم باقر حسین رائق آرکاٹی جلیل القدر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ فقید المثال انشاپرداز بھی تھے۔ موصوف کا معرکتہ الآرا نثری کارنامہ "تذکرہ گلدستۂ کرناٹک" کو تمل ناڈو کے اہم ترین تذکروں میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ یہ تذکرہ نایاب ہے۔ البتہ اس کی ایک خوبصورت نقل یا اصل "دیوان صاحب باغ" مدراس میں محفوظ ہے۔ "تذکرۂ گلدستۂ کرناٹک" خود اس کا مادۂ تاریخِ تصنیف ہے اور "گلدستۂ زیبائے کرناٹک" مادۂ تاریخ سالِ اشاعت ہے۔ اس عہد میں ملک الشعرا، غلام اعزاز الدین خاں بہادر مستقیم جنگ نامی مدراسی کا شمار ہندوستان کے عظیم مثنوی گو شعرا میں ہوتا تھا۔ جن کا انتقال ۱۸۲۴ء میں ہوا۔ نامی فارسی اور اردو کے باکمال شاعر تھے۔ عمدۃ الامرا ممتاز نے نامی کو سودا، آبرو، مرزا مظہر جانِ جاناں اور میر سوز پر ترجیح دی ہے نامی صنفِ مثنوی کے شہنشاہ مانے جاتے ہیں۔ جنکی دس ذیلی مثنویاں اتنی وقیع اور جاندار ہیں کہ ریسرچ اسکالروں کی آنکھیں چکا چوند ہو سکتی ہیں۔ نامی کی بے شمار تصانیف اور متعدد مثنویوں میں (۱) مثنوی بہارستانِ عشق ۱۷۹۸ء (قصۂ لیلیٰ مجنون) (۲) مثنوی شیریں خسرو (۳) مثنوی وفات نامۂ نبی موسوم بہ "مدینۃ الالم" (۱۷۹۸ء) (۴) مثنوی داغستانِ کلفت ۱۸۰۵ء (یہ مثنوی موصوف کی دختر طاہرہ کی رحلت پر کہی گئی ہے جو آگ کی زد میں آکر جل گئیں۔ "داغِ طاہرہ آہ" مادۂ تاریخ ہے) (۵) "مثنوی نو بہارِ عشق" ۱۷۹۷ء جسکو حال میں پروفیسر مولانا محمد یوسف کوکن عمری نے مدراس یونیورسٹی سے ۱۹۵۵ء میں مرتب فرما کر یونیورسٹی پریس مدراس سے شائع کیا) (۶) مثنوی بلقیس و سلیماں الموسوم بہ "بوستانِ بہشت" (۱۸۱۰–۱۸۱۱ء) (۷) مثنوی قادر ولی گنج سوالی الموسوم بہ "گنجِ قدرت" ۱۸۱۷ء (۸) مثنوی قصۂ بنارس (۹) مثنوی نظم نامۂ خواب (۱۰) مثنوی فردوسِ اعجاز (قصۂ چندر بدن مہیار) (۱۱) مثنوی ساقی نامہ "الموسوم بہ میخانۂ کیفیت" ۱۸۱۱ء وغیرہم قابلِ ذکر ہیں۔

افسوس اس امر کا ہے کہ شمال میں مثنوی کی تاریخ مرتب کرنے والے محقق اور مثنوی پر پی ایچ ڈی لینے والے ریسرچ اسکالروں نے کرناٹک اور خصوصاً تمل ناڈو کی شہرۂ آفاق مثنویوں کی طرف کبھی دھیان ہی نہیں دیا۔ حالاں کہ یہاں تین چار سو سے زیادہ مطبوعہ مثنویاں موجود ہیں جو گذشتہ تین سو سال میں کہی اور شائع کی گئیں۔

ڈاکٹر گیان چند جیسے محققوں نے یہاں کی قدیم و جدید مثنویوں کو قابل اعتنا سمجھا حالانکہ ۱۹۱۵ء میں یہاں کے ماہر غالبیات حضرت مولانا امانی مدراسی نے مثنوی "گلشن سیرت" ۱۹۱۶ء کی تو اس میں کئی مشاہیر علما، ادبا اور شعرا کی تقاریظ بھی شامل کی ہیں۔ مثلاً مولانا امانی مدراسی کی شعری اور فنی استعداد کا اعتراف کرتے ہوئے مصورِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی اور شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی نے مذکورہ مثنوی پر بہترین خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ راقم الحروف کی مثنوی "قبلہ نما" مطبوعہ ۱۹۶۵ء پر ماہرِ غالبیات حضرت مولانا امتیاز علی عرشی جناب مالک رام، ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جناب آل احمد سرور وغیرہم نے بہت کچھ لکھا ہے۔ تعجب اس بات کا ہے کہ ۱۹۵۰ کے بعد اردو مثنویوں پر کام کرنے والے محققین نے تمل ناڈو کی مذکورہ ان دونوں مثنویوں کا ذکر بھی اپنی کتابوں میں نہیں کیا۔

اس عہد کے مشاہیر شعرا میں نادر مدراسی مصنف "مثنوی رشک قمر و مہ جبیں" مطبوعہ ۱۸۳۱ء، مولانا انور حسین حشمت مدراسی، غلام محی الدین معجز آرکاٹی غلام عبد القادر ناظر مدراسی (مصنف "سفرنامۂ بہار اعظم جاہی" ۱۸۲۲ء) و "شرح بوستان" و "یوسف زلیخا" و "سکندر نامہ") محمد اسلم خاں شایاں آرکاٹی (مصنف مثنوی "گداز دل" و مثنوی "گلدستۂ مناقب" و مثنوی "ظفرنامہ" ۱۸۳۷ء) قاضی القضاۃ مولانا احمد مجتبیٰ خوشدل، قاضی القضاۃ مولانا ارتضیٰ علی خوشنود، سید خیر الدین فایق، مولوی تراب علی نامی، غلام محی الدین شایق مدراسی (مصنف مثنوی رشکِ بہشت) حضرت سید شاہ حسین قادری مجرم مدراسی (جن کا شمار جنوب کے ممتاز صوفی شعرا اور مشائخین میں ہوتا تھا۔) مولوی سیف الدین محمد ناصر مدراسی، سید شاہ قدر عالم مکھن لال خرد مدراسی، منشی جگن ناتھ پرشاد عزت (منشی ایسٹ انڈیا کمپنی) وغیرہم قابلِ ذکر ہیں۔ مذکورہ شعرا میں بیشتر صاحبِ تصنیف ہیں اردو فارسی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی ان حضرات نے لاجواب شاعری کی ہے۔

نواب عظیم الدولہ اور ان کے دو جانشینوں کے اس عہد میں قد آور انشا پرداز اور سحر طراز ادیب بھی گذرے ہیں۔ جن میں سید برہان خاں ہانڈی ترچناپلوی کا مقام بہت بلند ہے۔ موصوف نے حسام الملک بہادر کے حکم سے ایک معرکتہ الآرا کتاب "تزک والاجاہی" (سال تصنیف ۱۷۸۰ء) تصنیف کی۔ موصوف کی دیگر تصانیف میں "مثنوی طوطی نامہ" "نعرۂ حیدری" "انشائے برہانی" اور "منشات بے نظیر" قابل ذکر ہیں۔ ہانڈی کے علاوہ مولوی محمد غوث شرف الملک بہادر، میر حسن علی کرمانی، منشی غلام حسین، اسد علی مودودی، مولوی محمد حسن علی مہدی حسن المتخلص بہ حسن (جن کی استعداد علم نجوم و حساب کی تعریف خود واقف نے اپنے تذکرہ حدیقۃ المرام میں کی ہے۔) حافظ احمد خاں اعظم الملک بہادر وغیرہم کی علمی و ادبی خدمات اتنی مستند اور مسلّم ہیں کہ دراصل انھیں کی جدوجہد سے جنوب میں جدید فارسی و اردو نثر نگاری کی نبیاد پڑی جس کی ریس اس شمال والوں نے بھی کی۔

نواب غلام غوث خان بہادر اعظم کا دور ۱۸۴۲ء تا ۱۸۵۵ء

تقریباً چودہ سال کا یہ شاندار ادبی دور چودہ صدیوں پر سبقت لے جاتا ہے۔ یہ مبالغہ نہیں، سراسر حقیقت ہے کہ اس دور میں تمل ناڈو کی فارسی و اردو شاعری اور نثر کو معراج نصیب ہوئی۔ اور اس دور کے بیشتر شعرا و ادبا اور علما نے نہ صرف ہندوستان گیر شہرت حاصل کی بلکہ ان حضرات کی علمی و ادبی صلاحیت کا اعتراف بیرونی ممالک کے عظیم دانشوروں نے کیا ہے۔

نواب غلام غوث خاں بہادر اعظم کو فنِ شاعری میں سید ابوطیب والا مدراسی نے تلمذ کیا۔ اعظم شاعری میں سید شاہ ناصر علی سرہندی کی تقلید فرماتے تھے۔ والا جاہ کے جانشینوں میں اعظم ایک صاحبِ طرز ادیب، قد آور نقاد، جلیل القدر تذکرہ نگار اور فصیح اللسان شاعر تھے۔ موصوف نے شعر و فن کی جو زرّیں خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان کی مثال دور دور تک نظر نہیں آتی۔ شاعری سے سچی لگن کے باعث اعظم نے مدراس کے شعرائے فارسی گو کے دو تذکرے شائع کئے جو تذکرۂ "صبحِ وطن" اور "تذکرۂ گلزارِ اعظم" کے نام سے شائع ہوئے۔ کرناٹک کی ادبی تاریخ ان دو تذکروں کے بغیر نامکمل رہ جاتی۔ ان تذکروں میں اردو کے شعرا پر بھی اعظم نے روشنی ڈالی ہے۔ اعظم نے اپنے دور کے ممتاز شعرا کو اعلیٰ ملازمتوں سے سرفراز کیا اور ان کی نثری اور شعری تصنیفات کو شائع کرنے کے لئے ایک مطبع بھی قائم کیا۔ اور مختلف علمی و ادبی موضوعات پر متعدد کتابیں شائع کروائیں۔ اعظم کو فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ موصوف کی لازوال یادگاروں میں "مدرسۂ اعظم مدراس" "کتب خانۂ عام اہل اسلام مدراس" "لنگر خانۂ مدراس" اور مکہ معظمہ میں آپ کی بنائی ہوئی رباطیں مشہور ہیں۔ اعظم نے ۱۸۴۴ء میں ایک مجلسِ شعرا "مشاعرۂ گلزارِ اعظم" قائم فرمائی اور افضل الشعرا مولوی محمد حسین شیریں سخن خاں راقم مدراسی کو اس کا میر مجلس مقرر فرمایا۔

مذکورہ مجلس شعرا کی خصوصیت یہ تھی کہ ان مشاعروں میں طرحی غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ جس میں بڑے لائق و فائق ارباب سخن سبھی شامل ہوتے تھے۔ ہر بہترین شعر پر مناسب داد دی جاتی تھی۔ اور قابل گرفت اشعار پر کھل کر اعتراض کرنے کا حق ہر ایک کو حاصل تھا۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ہر اعتراض صاف دلی کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ اور خندہ پیشانی سے سنا جاتا تھا۔ ان مشاعروں میں دو چار حکم بھی مقرر تھے۔ جن کا فیصلہ اٹل ہوتا تھا۔ ان تنقیدی نشستوں میں شرکا کی نظر بے حد دقیق و لطیف ہوتی تھی۔ اور نیز ان کی قابلیت اور مہارت تامہ پر کافی روشنی بھی پڑتی تھی۔ اور ان کے علمی مذاقِ شعری کے فطری جوہر کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ ان عظیم الشان مشاعروں کی دھوم اتنی تھی کہ بیرونی ممالک سے فارسی شعرا بھی کشاں کشاں کھینچ کر مدراس چلے آتے تھے۔ اعظم کے ادبی عہد نے پورے ہندوستان کی ادبی تاریخ کو متاثر کیا ہے۔ ذیل میں چند مشاہیر شعرا کا ذکر قابل توجہ ہے۔

منشی حبیب اللہ ذکا، مدراسی ثم حیدرآبادی نے بحیثیت نقاد و شاعر مرزا غالب سے اپنا ادبی لوہا منوایا تھا۔ بقول بینش طرز بیدل میں ریختہ کہنا خود غالب کے لئے مشکل تھا مگر ذکا مدراسی کو طرز بیدل میں غالب پر فوقیت حاصل تھی۔ جس کا اعتراف

خود مرزا غالب نے کیا ہے۔ ذکاؔ کے شعری و نثری مجموعہ "خاش و خلش" پر غالب کی تقریظ بھی شامل ہے۔ پروردگار نے ذکاؔ کو جدتِ طبع و جودتِ ذہن اس بلا کی عطا فرمائی تھی کہ جو بہ مرتبہ کرامت تھی۔ کم عمری میں ان کی نثر و نظم کو سخن سنجانِ پختہ کار بہ ہزار اعتبار پسند کرتے تھے۔ مضامین عالی اور نازک مضامین کو بڑی چابکدستی سے پیش کرتے تھے اور پیشوایانِ سخن کے ہر اسلوب و آہنگ پر لکھتے تھے۔ نثر میں مرزا عبد القادر بیدل اور نظم میں شاہ ناصر علی کو پسند کرتے تھے اگرچہ ان دو پہلوانانِ سخن کی تقلید ہر باشعور کا کام نہیں لیکن ذکاؔ میں یہ کمال حسن تھا کہ انھوں نے ان دونوں رنگ کو اپنایا اور قدرت حاصل کی۔ بینش رقمطراز ہیں کہ "میں بہ پاسِ شاگردی یہ کہنے میں دریغ نہیں کرتا ہوں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اگر از روئے انصاف دیکھا جائے تو ذکاؔ کی ہمسری فی زمانہ بہت مشکل ہے، وہ نظیر و بے عدیل ہے۔ ذکاؔ نے پہلے بینش مدراسی اور میر مہدی ثاقب مدراسی سے شعری استعداد بہم پہونچائی۔ اور بعد ازاں مرزا غالب کی طرف رجوع ہوئے۔

مرزا غالب نے ذکاؔ کو اپنے شاگرد سے زیادہ اپنا عزیز از جان دوستِ روحانی بلکہ اس سے زیادہ اپنا ہم پلہ شاعر گردانا ہے۔ غالب نے ہندوستان کے فارسی گویوں کی جیسی مٹی خراب کی وہ اظہر من الشمس ہے۔ قتیل اور نور العین واقف میر فطرت کے مرزا بیدل اور ناصر علی سرہندی تک کو نہیں بخشا۔ صاحب برہان قاطع کے اغلاط بیان کئے۔ غالب کے ان اعتراضات کا جواب بڑے بڑے نقادوں نے لکھا۔ اور غالب کے شاگردوں میں منشی حبیب اللہ ذکاؔ مدراسی نے اس کے جواب الجواب لکھ کر اپنے استاد کی ادبی پوزیشن بحال رکھا تو دوسری طرف تمام معترضین کے چھکے چھڑا دیئے۔ غالب کو ذکاؔ کی فارسی دانی اور ادبیت کا بڑا احترام تھا۔ ذکاؔ کی نثری اور شعری استعداد پر غالب کی ذیلی آرار ملاحظہ ہو جو ۱۸۶۱ء میں "خاش و خاش" کے مسودہ موصول ہونے پر غالب نے بے لاگ انداز میں لکھ کر ذکاؔ کے نام ارسال کی تھیں:

"یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں، کسی امیر کا نہیں، کسی شیخ و شیاد کا نہیں۔ یہ ایک دوست روحانی کا ہے اور فقیر اپنے دوست کے کلام کو معترض اصلاح میں بہ نظرِ دشمن دیکھتا ہے۔ پس جب تملق نہیں، مدارا نہیں تو مجھ کو جو نظر آیا ہے بے حیف و میل کہوں گا۔ نثر میں نعمت خاں عالی کے طرز کا احیا کیا ہے، مگر پیرایہ کچھ اس سے بہتر دیا ہے۔ قصائد میں انوری کا چربہ اڑایا ہے۔ مگر طبیعت نے اچھا زور دکھایا ہے۔ غزل میں متاخرین کا انداز عاشقانہ سوز و گداز ہے۔ منشی حبیب اللہ ذکاؔ کا سخنور ہمہ دان یکتا لفظ معنی طرازنہ آفریں صد آفریں ہزار آفریں۔" (غالب ۱۲۷۸ھ)

ذکاؔ اردو کے بھی بلند پایہ شاعر تھے۔ موصوف کی ایک اردو مثنوی جواہرالانشاء مطبوعہ ۱۲۹۶ھ قابل ذکر ہے جو "پند نامۂ ذکاؔ" کے نام سے بھی مشہور ہوئی۔

ذکاؔ کے علاوہ ذیل میں دورِ اعظمی کے ان اساتذۂ فن کو پیش کیا جا رہا ہے جو فارسی کے ساتھ ہندوستانی یا اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔

سید مرتضیٰ بینش مدراسی اپنے زمانے کے مانے ہوئے استاد شاعر تھے۔ بینش کو ثاقب و واصف سے تلمذ حاصل تھا۔ بینش مشاعرۂ اعظم کے روحِ رواں تھے — اور ان سے کئی شعراء نے اکتساب نور کیا۔ منشی حبیب اللہ ذکاؔ سلسلۂ اپنے استاد بینش سے زیادہ اردو زبان و ادب اور فارسی ادب میں شہرت حاصل کی۔ بینش کی تصانیف میں "تذکرۂ اشاراتِ بینش" مطبوعہ ۱۲۸۷ھ قابل ذکر ہے۔ جس میں اس دور کے مشاہیر شعرا مثلاً حبیب اللہ ذکاؔ، راغب، راقم، فنا، حشمت، علی دوست خاں ذہین، مہدی الحسنی ثاقب، ندرت، فائز اور وفا کے قطعاتِ تاریخِ اشاعت شامل ہیں۔ اس دور کا ہر شاعر صاحب تصنیف گزرا ہے۔ حکیم عظیم الدین تحمل لکھنوی ثم مدراسی (غمگین بھی تخلص کرتے تھے)، غلام عبد القادر نائطی ناظر، حسین علی خاں فصیح غلام مرتضیٰ خاں خادم، غلام محی الدین شائق، سید نظام الدین احقر، حکیم محمد قادر علی خاں بیہوش، خان عالم خان فاروقی، محمد حمید الدین طالب، غلام کبریا کامل، (طوطیٔ بنگال) باقر حسین مختار (جنکے مرثیے شمال میں مشہور ہیں) سید کمال الدین کمالی، غلام احمد احمدی، سید فتاح احمد منتظر تلمیذ میر مجروح، انور حسین حشمت، رضا حسین افسر دہلوی، غلام حسین باقی، غلام حسین فدا، شاہ میراں محی الدین قادری واقف وغیرہم قابلِ ذکر ہیں۔

ذیل میں ان شعرا کا ذکر درج ہے جنھوں نے اعظم کے دور میں جنوب کی ادبی تاریخ کی لوؤں کو تیز کیا

۱۔ سید ابو سعید والاؔ (تلمیذ مولانا باقر آگاہ دہلوی) نواب غلام غوث خاں بہادر اعظم کے استاد تھے۔ خطاطی اور تاریخ دانی میں انھیں کمال حاصل تھا۔ پرگو شاعر تھے۔ والاؔ کی تصنیفات میں "مثنوی طرزم" مطبوعہ ۱۲۴۶ھ، مثنوی آیۂ رحمت" اور "شرح قصائدِ عرفی" قابل ذکر ہیں۔ خوشنود نے والاؔ کی تاریخ رحلت "العاقبۃ للمتقین" کہی ہے۔ ۱۲۷۷ھ

۲۔ محمد قدرت اللہ قدرت گوپاموی ثم مدراسی کا سلسلہ حضرت ابوبکر صدیق رضی تک پہونچتا ہے۔ خوشنود سے تلمذ حاصل تھا۔ قدرت نے مشاعرۂ اعظم کے دو حکم میں سے ایک حکم تھے۔ موصوف کی تصنیفات میں شہرۂ آفاق تذکرہ شعرا مسمّٰی بہ تذکرۃ الافکار ۱۲۴۳ھ قابل ذکر ہے۔ جس کا نیا اڈیشن بمبئی سے بھی حال میں شائع ہو چکا ہے۔ قدرت کا مزار احاطہ مسجد والاجاہی مدراس میں موجود ہے۔ موصوف کی مثنوی "گلزار عشرت" جنوب کی معرکۃ الآرا مثنویوں میں سے ایک ہے۔

۳۔ افضل الشعرا مولوی محمد حسین قادری شیریں سخن خاں راقم مدراسی (تلمیذ شائق و والاؔ) نواب غلام محمد غوث خاں بہادر اعظم کے ہم سبق تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تذکرۂ گلزار اعظم کی تالیف میں اعظم نے راقم کو بھی شامل رکھا۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ "تذکرۂ گلزار اعظم" دراصل راقم کی تصنیف ہے۔ مگر جہاں تک تذکرہ نویسی کا تعلق ہے ہر سچے محقق اور تذکرہ نگار کی حیثیت دوران تصنیف و تالیف ایک طالب علم کی سی ہو جاتی ہے۔ اور وہ ہر گوشے اور ہر جہت سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ اور اپنے تذکرہ کی تصنیف و تالیف کے دوران اپنے ہم مذاق یا ہم قلم کو بھی مددگار کی حیثیت سے کبھی شامل کرنا ہی پڑتا ہے۔ غالباً نقل نویس کی حیثیت سے یا رفیق کار کی طرح راقم نے تذکرۂ گلزار اعظم کی تصنیف کے دوران اعظم کا ساتھ دیا ہوگا۔ راقم مشاعرۂ اعظم کے میر مجلس کے علاوہ اعظم کے دوست بھی تھے —

ان حالات میں تذکرۂ گلزارِ اعظم کو راقم کا تذکرہ کہنا سراسر غلط ہے۔ راقم کی طبیعت میں شہرت پسند عناصر کلبلاتے رہتے تھے اور یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ مشاعرۂ اعظم میں کوئی شاعر ان پر سبقت لے جائے۔ منشی حبیب اللہ ذکاؔ کی زبان کی تلوار معرکۂ تقریر میں لکنت کی کثرت سے نیام کے اندر تھی لیکن ان کا توسنِ خامہ میدانِ نگارش میں تند خرام اور ان کی طبیعت کی شوخی کا کمال گاہ گاہ ہجو کی طرف بھی مائل تھا۔ مشاعرۂ اعظم میں ذکاؔ لکنت کی وجہ سے اپنے کلام کو دوسروں سے پڑھوا کر خوب داد حاصل کرتے تھے۔ راقم کو ذکاؔ کی بڑھتی ہوئی شہرت اور اعظم کے دربار، اور مشاعرۂ اعظم میں ذکاؔ کی یہ سربلندی ایک قلم نہیں بھائی۔ لہٰذا راقم نے زک دینے کے لئے ذکاؔ کو مشاعرۂ اعظم میں بزبانِ خود کلام سنانے پر اصرار کیا۔ ذکاؔ نے اس حرکت سے دل برداشتہ ہو کر مدراس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا اور حیدرآباد کی راہ لی اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ آج راقم کو ذکاؔ سے زیادہ یاد کرنے والا کوئی نہیں رہا۔

راقم کی تصنیفات میں "رسالہ میزان الاشعار" قابلِ ذکر ہے۔

۴۔ شہر استاد میران محی الدین قادری واقف مدراسی مشاعرۂ اعظم کے حکم کے علاوہ مدرسۂ اعظم مدراس میں فارسی کی مدرسی پر بھی مامور تھے۔ سید شاہ منصور قادری کے ہاتھ پر بیعت سے پہلے بسمل تخلص بھی کرتے تھے۔ فارسی اور اردو شاعری میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ موصوف کی وجہ سے طلبا میں شعر و شاعری کا چسکا پیدا ہوا۔

۵۔ مولوی محمد مہدی واصف عربی فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی خاصی مہارت رکھتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مدرسہ میں نو وارد انگریزوں کی تعلیم پر مامور تھے۔ ترچناپلی کے ایک بزرگ حضرت سید جام واعظ کے ہاتھ پر موصوف نے بیعت کی تھی۔ بحیثیت تذکرہ نگار آپ کا پایہ بہت بلند ہے۔ موصوف کی عربی فارسی اور اردو تصانیف کی تعداد کثیر ہے ان میں تذکرہ "معدن الجواہر" مطبوعہ ۱۸۴۲ء قابلِ ذکر ہے جس میں انھوں نے بعض شعراء کے کلام پر سخت اعتراضات بھی کئے ہیں۔ نواب اعظم نے ان اعتراضات کا جواب تذکرۂ گلزارِ اعظم میں بڑی تفصیل کے ساتھ دیا ہے؛ معدن الجواہر کے علاوہ مہدی واصف نے ایک اور تذکرۂ شعراء "حدیقۃ المرام" بزبان عربی ۱۸۶۲ء شائع فرمایا۔ موصوف نے تقریباً دوسو سے زیادہ انگریزی کہانیوں کو فارسی میں ترجمہ کیا اور انھیں "حکایاتِ دل پسند" کے نام سے ۱۸۳۷ء میں پیش کیا۔ موصوف کے کارناموں میں فرہنگ "دلیل ساطع" بھی قابلِ ذکر ہے۔ جس میں اردو، ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کو فارسی میں وضاحت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ محکمۂ عالیہ کے مترجم کی حیثیت سے موصوف نے مختلف زبانوں کے ادب کا تقابلی مطالعہ کر کے کئی مستند کتابیں لکھی ہیں۔

۶۔ سید محمد حسین تمنّا ترپاتوری کی وجہ سے ترپاتور اور چتور میں فارسی اور اردو کی بڑی خدمت سرانجام ہوئی۔ موصوف نے ۱۸۵۲ء میں مدرسۂ اعظم مدراس کے فارسی مدرس بھی رہے۔ تمنّا کی معتمد تصانیف میں "مقصود الاحباب" قابلِ ذکر ہے۔

۷۔ خانِ عالم خان بہادر فاروقی عربی فارسی، اردو کے علاوہ ترکی اور انگریزی کے بھی شاعر تھے۔ علمِ ریاضی اور علمِ موسیقی پر خاصی دسترس رکھتے تھے۔

۸۔ حاجی محمد محی الدین حیران داروغہ "مطبخ دادا فقیر محمد کرنول عمدۃ الامراء" تھے۔ انھیں شاعری کے ساتھ ساتھ علمِ موسیقی میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔

۹۔ شاہ محمد روح اللہ بلیغ مدراسی کا سلسلہ چھ واسطوں سے حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ العزیز تک پہونچتا ہے۔ روحانی تربیت میں بھی موصوف نے خاص حصہ لیا تھا۔ فنِ عروض و قافیہ، بیان و بدیع، نجوم و رمل و قانون کے علاوہ خوشنویسی میں بھی بلیغ کو بڑا دخل تھا۔ اپنے والد شاہ محمد نور اللہ نقشبندی خوشنویس سے سلوک میں خرقۂ خلافت پایا۔

۱۰۔ محمد تاج الدین بہجت ہندی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے موصوف کی متعدد تصنیفات میں "مجمع البحرین" (فن عروض و قافیہ) قابلِ ذکر ہے۔

۱۱۔ سید احمد میر مبارک اللہ خاں بہادر راغب بڑے عالی فکر اور روشن خیال شاعر تھے۔ موصوف کی تصنیفات میں مثنوی "ساقی نامہ" اور مثنوی "فراق نامہ" قابلِ ذکر ہیں۔ مذکورہ حضرات کے علاوہ چند اور اساتذہ فن نے یہاں علم و فن کی زبردست خدمت انجام دی۔ مثلاً میر مہدی ثاقب، سید تاج الدین تاج، سید غلام دستگیر دستگیر، حکیم غلام دستگیر خاں لائق (مصنف تذکرہ معاصر الشعراء) رحمت اللہ رسا (برادر منشی حبیب اللہ ذکاؔ) وغیرہم۔ رساؔ اپنے چھوٹے بھائی ذکاؔ سے زیادہ فارسی زبان و ادب کے سحر طراز تھے۔

غیر ملکی شعراء

تمل ناڈو میں فارسی گو ایرانی شعراء اور شمالی ہند کے شعراء کا ایک اچھا خاصا گروہ بس گیا تھا جنھیں مدراس کا حق شہریت بھی حاصل ہے۔ یہاں کے متذکرۂ بالا قدیم تذکروں میں ان بیرونی شعراء کا تفصیلی ذکر باقاعدہ ملتا ہے۔ مگر ۱۹۵۹ء کے بعد یہاں جتنے بھی مضامین لکھے گئے ان میں بیرونی شعراء و ادبا کے ذکر کو گول کر دیا گیا۔ جس کا ردّ عمل یہ ہوا کہ وہ مشاہیر شعراء نہ اپنے دیس کے رہے نہ پردیس کے۔ ملکی اور غیر ملکی کے غلط رویہ نے ہر ریاست کی ادبی سرزمین کو جہنم زار بنا دیا۔ اور بیرونی شعرا و ادبا کے ساتھ جو ادبی حق تلفی ہوئی ہے۔ اس کی داستان بڑی طویل ہے۔ اس ادبی بددیانتی کا نتیجہ اتنا برا ہوتا ہے کہ وہ شعرا جو اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر دوسرے علاقے میں بس جاتے ہیں۔ ان کا ذکر ادبی تذکروں میں درج نہیں ہوتا۔ ایسا ہی ایک المیہ ۱۹۵۹ء میں یہاں بھی حضرت آثم کرنولی کے ساتھ درپیش آیا۔ موصوف اس عہد کے عظیم کلاسکی شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ موصوف نے اپنا وطن کرنول (آندھرا) ۱۹۳۵ء میں ترک کیا۔ گورنمنٹ مسلم ہائی اسکول ویلور میں ۱۹۳۷ء تک معلم دینیات کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اور پھر ۱۹۴۰ء تک گورنمنٹ محمڈن ٹیچرز ٹریننگ سکول آرکاٹ میں مدرسی کی۔ اور ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک مدراس کے کارپوریشن اردو بوائز سکول میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے اور کبھی روزنامہ مسلمان مدراس میں مترجم کی حیثیت سے کام کر کے یہیں پیوند خاک بھی ہوئے۔

تقریباً ۳۰ سال کے طویل قیام کے باوجود موصوف کا کلام راقم الحروف کی پر زور جد وجہد اور سفارش کے باوصف "رنگ برنگ" (مدراس کے نمایندہ شعراء کا انتخاب) مطبوعہ ۱۹۵۹ء میں داخل نہ ہو سکا کیونکہ موصوف کے کلام کو یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ وہ کرنولی ہیں۔ حضرت آثم کرنولی یہاں کے مشاعروں کی روحِ رواں تھے۔ ان کے بغیر کوئی ادبی محفل بارونق ثابت نہیں ہوتی تھی۔ اس واقعے سے متاثر ہو کر آثم نے ایک رباعی کہی تھی۔ جو قارئین کے تفننِ طبع کے لئے ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔

اللہ رے میری وطنیت کا سوال
قسمت نے عطا کی ہے مجھے یہ سولی

کرنول میں ٹھہروں تو کہیں مدراسی
مدراس میں بس جاؤں کہیں کرنولی

اس مضمون میں ان تمام بیرونی شعراء کا سرسری ذکر موجود ہے جو تقریباً چار سو سال سے مدراس آتے رہے اور انھیں یہاں طویل اقامت کی وجہ سے حق شہریت بھی نصیب ہے۔ نوابینِ آرکاٹ کے عہد کے بیرونی شعراء میں سید محمد سخن اصفہانی، مرزا حکیم عبدالباقی الشریف الرضوی وفا بغدادی، شیخ محمد امین اسرائیلی (تلمیذ مرزا عبدالقادر بیدل) عظیم الدین خاں تجمل لکھنوی، محمد عبداللہ خاں آشکار نجیب آبادی، شاہ ولی اللہ طالب حجازی، محمد ظہیر الدین مرزا علی اظفری اظفری دہلوی، مولوی تراب علی نامی خیر آبادی، محمد علی حسن، حسن جون پوری، سید ابوالسعید والا رحمت آبادی، سید عبدالودود نقوی عاشق بنگالی، وغیرہم قابلِ ذکر ہیں جن کی عربی، فارسی اور اردو تصانیف کا تذکرہ طوالت کے پیشِ نظر حذف کیا جا رہا ہے۔

نواب اعظم کے دور میں مذکورہ شعراء کے دوش بدوش ذیل کے نثر نگاروں کی علمی وادبی خدمات نے ادبی تاریخ میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

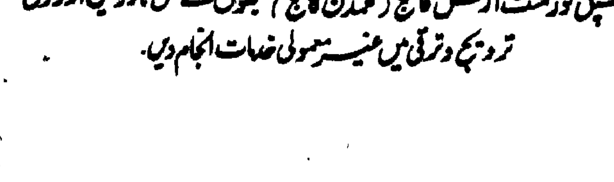
امام العلماء، قاضی القضاۃ مولوی محمد صبغۃ اللہ قاضی بدر الدولہ صدر الصدورِ کرناٹک عربی، فارسی اور اردو کے عظیم انشا پرداز مانے جاتے ہیں۔ خاص کر اردو زبان وادب کی ترویج وترقی واشاعت میں موصوف نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ خواتین میں اردو زبان وادب کا چسکا پیدا کرنے میں موصوف کی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی۔ موصوف کی تقریباً چودہ اردو تصانیف ہیں۔ عربی میں ۲۹ تصانیف (مختلف موضوعات پر) اور فارسی میں ۲۳ سے زیادہ تصانیف ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ "سراج التواریخ" ہے جس کی تصنیف وتالیف کے لئے حکومتِ ہند نے موصوف کو منتخب کیا اور یہ شہرۂ آفاق تصنیف موصوف کی نگرانی میں مکمل ہوئی اور مددگار کی حیثیت سے محمد باقر حسین رائق مولوی محمد علی کلیمی، مولوی محمد صادق، مولوی محمد سعید اسلمی مامور ہوئے ۱۸۳۶ء میں مذکورہ تصنیف کی شروعات ہوئی۔ اس تاریخ کی وجہِ تالیف یہ تھی کہ پارلیمنٹ لندن کے چند ممبروں نے ایک سوالنامہ حکومت بنگال کے نام ارسال کیا تھا۔ کہ وہ ہندوستان کی تاریخ اور وہاں کی اشیاء کے بارے میں تحقیق کر کے جواب لکھیں، حکومتِ بنگال کی نظر ہندوستان کی دیگر ریاستوں سے قطعِ نظر تمل ناڈو پر مرکوز ہوئی۔ اور اس نے اس سوالنامہ کو حکومتِ مدراس کے حوالہ کر دیا اور نواب اعظم خان بہادر سے درخواست کی کہ اس سلسلے میں مدد کریں۔ نواب صاحب نے مذکورہ تاریخ کی تصنیف کے لئے مذکورہ مجلسِ ادبا قائم کی اور مولوی قاضی بدر الدولہ کو اس کا نگراں مقرر فرمایا۔ پروفیسر افضل العلماء مولانا محمد یوسف کوکن اپنے تذکرہ "عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک" میں بر صفحہ ۵۰۰ رقمطراز ہیں کہ دیوان صاحب باغ مدراس میں مذکورہ تاریخ سے متعلق کئی موضوعات پر مشتمل چھوٹے چھوٹے رسائل کی شکل میں تراجم موجود ہیں۔ جن میں یہاں کے دراوڑی دیوی اور دیوتاؤں کے بارے میں بھی تفصیلی ذکر ہے۔ خورشید الملک افتخار الدولہ محمد ناصر خان بہادر صمصام جنگ (ناظرِ دار الانشائے فارسی) نے نواب عظیم جاہ کے حکم کی تعمیل میں عمدۃ الامراء کے دورِ حکومت کے حالات کو قلم بند کیا اور "سوانحات ممتاز" کے نام سے ایک معرکۃ الآرا کتاب پیش کی۔

محمد اولیاء ناطقی محمد حفیظ اللہ خان بہادر حافظ یار جنگ، قاضی ارتضیٰ علی خاں بہادر، سراج العلماء غلام محمد سعید اسلمی، مولوی عبدالوہاب مدار العلماء بہادر، مولوی سید شاہ عبداللطیف (قطب ویلور) اور مولانا عبدالحیٔ وغیرہم عظیم انشا پرداز اور نثر نگار کی حیثیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

مذکورہ چاروں دورِ حکومت کے دوران جتنی نایاب نثری تصانیف شعری مجموعے اور مثنویاں شائع ہوئی ہیں ان کی ایک فہرست ہی مکمل طور پر شائع ہو جائے تو بڑی خدمت ہوگی۔ یہاں گزشتہ چار سو سال کے درمیان ہزاروں شعراء وادبا صاحبِ تصنیف گزرے ہیں۔ ان تمام شعراء کی فہرست راقم الحروف تیار کرنے میں منہمک ہے [1]

ڈاکٹر عبدالحق مرحوم

پرنسپل گورنمنٹ آرٹس کالج (محمڈن کالج) جنھوں نے تمل ناڈو میں اردو کی ترویج وترقی میں غیر معمولی خدمات انجام دیں۔



---

[1] آزادی کے بعد اور جدید دور کے حالات دوسرے مضامین میں شامل کئے گئے ہیں۔

دانش فرازی
خطیب اسٹریٹ، پیریاپیٹ
وانمباڑی

تمل ناڈو میں

اُردو کے موجودہ ممتاز شعراء

مادری زبان کا تعلق بول چال کی زبان سے زیادہ اس زبان سے ہے جو ہمارے فکر و احساس کی زیریں لہروں کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہے۔ شاعری دراصل سانس لیتی ہوئی اس دھرتی کی زبان ہے جس کے آغوش میں نئی قدروں، نئی تبدیلیوں کے توانا عناصر جنم لیتے ہیں۔ شاعری وہی بڑی ہمہ گیر اور دوامی حیثیت کی حامل ہوتی ہے۔ جس نے آفاقیت کے افق کو کئی جہتوں، دشاؤں اور سمتوں سے چھو لیا ہے۔

تمل ناڈو اردو کی جنم بھومی نہیں ہے۔ اس ریاست کی زبان تمل ہے۔ تقریباً دو ہزار سال پہلے تمل زبان کے عظیم آفاقی شاعر ولوور نے اپنا شاہکار دنیا کے سامنے پیش کیا۔ غالباً اس وقت اردو نے آنکھ نہیں کھولی تھی۔ سنگم کے عہد زریں کا کلاسیکی ادب عام فہم نہیں ہے۔ لیکن اس کے برعکس اردو زبان جب تمل ناڈو میں داخل ہوئی تو یہاں کے لوگوں نے مانوس خوشبو محسوس کی۔ گویا اردو زبان نے اسی سرزمین پر جنم لیا۔ اردو زبان براہ راست دلّی اور لکھنؤ سے یہاں نہیں آئی۔ سلاطین دکن کے حملوں اور نوابان و نشیبوں نے تمل کے ایک اجنبی اور غیر مانوس ماحول میں اردو کا چراغ روشن کیا باقر آگاہ ویلوری اور دوسرے متقدمین کی تخلیقات میں دکنی زبان کے عناصر بھرپور انداز میں ملتے ہیں۔ خود باقر آگاہ نے کہا ہے کہ میری زبان اُردو نہیں ہندوستانی ہے۔ فارسی کی پیکر تراشی، صنعت گری اور تصنع سے بے نیاز دکنی زبان کا فطری لہجہ ہندوستانی کے تہذیبی عوامل کا آئینہ دار ہے۔ مولانا بحری کی مثنوی من لگن کا پہلا شعر دکنی مزاج کی افتاد کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ بحری کہتے ہیں۔

اے روپ تمارا تی رتی ہے پربت پربت پتی پتی ہے۔!

تمل ناڈو کے شعراء نے زبان کے تدریجی ارتقاء، تقاضوں، قدروں اور عصری آگہی کے پیش رفت انقلابوں کے پیش نظر رکھنے کے تعلق سے قدر مشترک کے اصول کو اپنایا۔ میں یہاں تاریخی تجزیہ و تحقیق سے قطع نظر اردو کے موجودہ ممتاز شعراء کا اجمالی تعارف پیش کروں گا۔ جن کا ذہنی، ثقافتی اور ادبی تعلق تمل ناڈو کی سرزمین سے ہے۔

مدراس

مرحوم سجاد ظہیر نے کہا تھا کہ میسور سے آگے بھی اردو ہے۔ یہ میرے لئے حیرت انگیز انکشاف ہے۔ لیکن اسی مدراس نے شریف مدراسی، مولانا رحیم احمد فاروقی اور نواب عبدالرحمن خاں شاطر جیسے نغز گو اور بلند پایہ ارباب فن کو پیدا کیا۔ پروفیسر حیدر علی خاں حیدر انھیں اکابرین علم و فن کی روشن یادگار ہیں۔

حیدر علی خاں حیدر

نوابین آرکاٹ سے آپ کا نسبی تعلق ملتا ہے مدراس یونیورسٹی سے ایم، اے۔ بی ٹی کرنے کے بعد پریزیڈنسی کالج مدراس کے اور آرٹس کالج مدراس کے شعبۂ اردو فارسی کے پروفیسر رہے۔ پھر مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو فارسی کے ریڈر مقرر ہوئے۔ مولانا غلام عباس علی عباس اور مولانا رحیم احمد فاروقی سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ سبکدوشی کے بعد اب مدراس یونیورسٹی کی ٹکسٹ بورڈ کمیٹی کے چیرمین ہیں۔ گذشتہ سال آپ کی تخلیقات کا مجموعہ حاصل عمر شائع ہوا۔ مختلف اصناف سخن پر دسترس رکھتے ہیں۔ زندگی اور شاعری دونوں کے متوازی خطوط میں وضع داری کے قائل ہیں۔

ہے تیرا وعدۂ فردا بھی میرا حاصل زیست مجھے نصیب ہے جو لطف انتظار نہ پوچھ
چمن کا ذرہ ذرہ دعوت نظارہ دیتا ہے یہ کس کے پرتو رخ سے نکھار آیا گلستاں پر
یہ دل جو خو گر پست و بلند تھا حیدر وہ ایک ان کے تغافل کی تاب لا نہ سکا
گردوں بھی زد میں آگیا اعجاز دیکھنا ہنگامہ ہائے شوق کی پرواز دیکھنا

محبوب پاشا محبوب مولانا تجمل حسین خاں ایمان گوپاموی کے فرزند ہیں، ایمان بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر ترک وطن کر کے اپنے چچا نواب رفعت الملک بہادر سے ملنے مدراس آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ۲۳ سال کی عمر میں نواب انتظام الملک بہادر کی دختر سے ایمان کی شادی ہوئی جن کے بطن سے محبوب پاشا محبوب نے جنم لیا ایمان کا یہ شعر آج بھی زبان زد خاص و عام ہے۔

خنجر بکف گذر گئے اپنی گلی سے تم کچھ یہ بھی ہے خبر کہ گلے کتنے کٹ گئے!

محبوب پاشا محبوب نے مدراس یونیورسٹی سے ادیب فاضل کیا۔ آرٹس کالج مدراس میں اردو لکچرار کے عہدے پر فائز ہوئے۔ تمل ناڈو کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ صنف غزل سے آپ کی ذہنی وابستگی ایمان کی یاد کو تازہ کرتی ہے۔

کہاں کا نغمۂ بلبل کہاں کا خندۂ گل چمن میں گریۂ شبنم نہیں تو کچھ بھی نہیں
کبھی وبال ہے خلوت میں دل کی دھڑکن بھی کبھی کبھی کوئی ہمدم نہیں تو کچھ بھی نہیں
گری ہے صبح چمن اہل چمن جانتے ہیں شعلۂ عارض گل آتش خاموش نہیں
ہوا مخالف شب تار و بحر طوفاں خیز نظر کے سامنے ساحل ہے دیکھئے کیا ہو
اٹھ گیا سننے والا جب محبوب آپ کس کو غزل سناتے ہیں

شاعر نے لفظ محبوب سے تخلص اور معشوق دونوں کا تصور پیدا کیا ہے۔!

سلاذ امتیاز جواں سال و جواں فکر شاعر، ادیب اور صحافی ہیں، نام حیدر حسین



ہے۔ راز امتیاز کا مطالعہ نہایت وسیع اور
نظر گہری ہے۔ تعلیم کے بعد مدت تک
ایک سرکاری محکمہ سے وابستہ رہے ماحول
کچھ راس نہیں آیا۔ تو اس سے الگ ہو گئے
"ساحل" کے نام سے ایک جریدے کا اجرا
کیا۔ لیکن نامساعد حالات کے دیکھتے دیکھتے
لادے میں اس نے دم توڑ دیا۔
عصری تقاضوں اور جدید حسیت
کے پیش نظر راز کی ذہنی رویے ہمیشہ ایسے انحراف سے کام لیا ہے۔ جو احساس
کی دھیمی آنچ اور شائستگی و متانت کی لو کا حامل ہے۔ اصابت رائے راز کی وہ
طبعی خصوصیت ہے جس سے اختلاف کی بہت کم گنجائش باقی رہتی ہے

آپ کی بے رخی ہوا کا رخ — راز کی زندگی چراغ کی لو
کب تک وہ رکھ رکھاؤ کا رشتہ نہ ٹوٹتا — پتھر تھا ان کے ہاتھ میں شیشہ تھا میرے پاس
آنکھ سے دور ہی ڈوبے تھے سبھی چاند مگر — دل کے ساحل سے کوئی لاش لگی تو ہوگی
اپنی صورت کے تماشائی کہاں سے جوڑیں — ایک ایک آئینہ پتھر ہے کئی برسوں سے
تیری ٹھنڈک مرے کس کام کی اے چاندنی رات — میرے سورج ہی کو دن بھر کہیں سایا نہ ملا

فرحت کیفی۔ "پتہ پتہ بوٹا بوٹا" (ترائیلوں کا مجموعہ) کے خالق نے متبسم چہرے کے
مست رنگ روشنی میں اپنے ذہنی سفر کو جاری رکھا ہے۔ تعلیم کے سلسلے میں یہ ہائی اسکول
کے حدود سے آگے نہیں بڑھے۔ لنز کار رمدراس میں واقع فرحت کیفی کا ٹی اے دواج
سنٹر آجکل شعر و ادب بھی ہے اور سرچشمۂ خلوص و مودت بھی۔ زندگی کی جمالیاتی
قدروں کے احساس نے فرحت کیفی کی آواز کو اختر شیرانی کے لہجے سے ہم آہنگ کیا
ہے۔۔۔!


فرحت کیفی

دھوپ کے آنگن میں دن بتایا شاخ چمن بے برگ جو تھی
سایہ سایہ ڈھونڈا لیکن مل نہ سکی دیوار ہمیں
وہ تھی میرے درد کی بپتا یا تیرے دل کی آواز
تنہائی کے دشت میں گونجی جانی پہچانی آواز
جب وقت کے قدموں کی ادھر چاپ سنی تھی
ہم اپنی ہی آواز کا رس گھول رہے تھے
دھنک سی پھیل گئی ہے تو مئے بھی برسے گی
نشاطِ غم کی قسم اب کہیں سفر نہ کرو
کیوں اندھیروں کے زخم کو فرحت
روشنی میں ٹٹولتے تھے ہم!

راجی صدیقی۔ کا شمار مدراس کے کہنہ مشق شاعروں میں ہوتا ہے۔ آپ نے
حضرت ابوبکر نظمی سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ نظمی اچھے سخنور تھے۔ صالح روایات
کی پاسداری نے نظمی کو جدیدیت کے نئے افق کی طرف دیکھنے کا موقع نہیں دیا۔
شاعری کے تعلق سے راجی صدیقی نے علامہ محوی لکھنوی مرحوم سے بالالتزام استفادہ
کیا۔ راجی صدیقی کے مستقر پر علامہ محوی لکھنوی کی آمد و رفت سے شعر و فن کی
گرہیں کھلتی تھیں۔ راجی کی محبوب صنفِ سخن غزل ہے۔ مدت سے کارپوریشن اسکول
مدراس میں مدرسی کے منصب پر فائز ہیں۔

اہلِ شعور دل کے کانوں سے سن رہے تھے — گو مجھ کو چپ لگی تھی غم میرا بولتا تھا
تو جہیں تھا تو تیری یاد کی بانہیں تھیں دراز — مجھ پہ شاید کبھی تنہائی کا الزام نہ تھا
کھلے ہوئے تھے دفاتر بکھر رہے تھے ورق — وہ ایک رات بہت یاد آ رہی ہے مجھے
شام الم ہمارے ہی حصے میں آئے گی — کیا کم یہی شرف ہے کہ غم آشنا ہیں ہم
میں خرابِ جہاں بھی راجی — اپنا رکھتا تو ہوں بھرم تنہا

سید علیم الدین صبا نویدی
۱۹۴۳ء میں والاجاہ روڈ۔
(امور) میں پیدا ہوئے جدید
حسیت کے تعلق سے تمل ناڈو
کے نمائندہ شاعر ہیں۔ بچپن
ہی سے صبا کا طبعی میلان
شاعری کی طرف رہا۔ مجاز و
اختر شیرانی کی صدائے بازگشت
نے کئی نوجوان شعراء کو رومانیت
کی طرف مائل کیا۔ چنانچہ
صبا نویدی بھی سطحی رومانیت


علیم صبا نویدی

کی حامل ٹیپ بند نظمیں کہتے رہے۔ آج ان نظموں کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ
اے دختر بادہ غرق مئے ناب اولیٰ۔ ۱۹۶۷ء میں جدید شاعری کے افق پر دفعتاً
کوندے کی طرح لپکے۔ کئی آذروں کے درمیان صبا نویدی کی ضرب کلیمی نے ہنگامہ
برپا کر دیا۔ ۱۹۷۵ء میں صبا نویدی نے اپنی جدید غزلوں کا مجموعہ "طرح نو" مرفِ
خاص سے شائع کیا۔ صبا نویدی کا دوسرا تاریخی کارنامہ تذکرۂ تمل ناڈو ہے۔ جو زیرِ
ترتیب ہے۔ جس کے پیچھے صبا کی سعیٔ مسلسل، سرگشتگی، جستجو اور جد و جہد نے
قویٰ کو مضمحل کر دیا ہے۔ صبا نویدی کا لہجہ تجریدِ تقلید کے حدود سے آگے گزر
کر اب ان کا تخلیقی مزاج بن گیا ہے۔

یوں تو سب چہرے مرے اپنے ہی چہرے تھے مگر
مجھ سا تنہا کوئی اس شہر کے لوگوں میں نہ تھا

دھوپ ہی دھوپ تھا صحرا کا سفر ایک طرف
پیڑ بوڑھا تھا مگر پاؤں کی ٹھنڈک نکلا

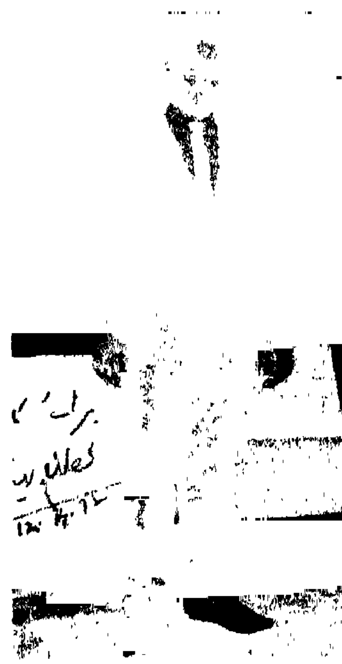
سانسوں میں آگ، لب پہ دھواں، رخ پہ دھند تھی
تم نے یہ کیسے شخص کی تصویر کھینچ لی

مرے وجود کے شعلوں سے کائناتِ غزل
مرا ہی تازہ لہو مستعار لیتی ہے

صبا نویدی عجب دن ہیں اور عجب دھندے — لبادے جھوٹ کے سچائی کی دکان سے ملے

میر حسن علی حسن فیاض ڈاک کے محکمے میں ملازم ہیں۔ حسن فیاض کی شاعری کا میدان وسیع نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی تخلیقات میں رچاؤ اور پختگی کے عناصر ملتے ہیں۔ جدیدیت کو اس جوان فکر شاعر نے تجربہ و خیال کی منطقی اور استدلالی فضا میں قبول کیا ہے۔ نظم اور نثر دونوں پر دسترس حاصل ہے۔

ستے ساتھ میرے کچھ اندھیارے سورج کی گلی سے گذرا میں
احساس کو چھپ کر پل کر اس طرح سے باہر نکلا میں
کچھ سوچ کے رستے دیکھ آیا، کچھ یادوں کی گلیاں گھوم آیا
کچھ اپنے آپ کو پہچانا کچھ اوروں کو پہچانا میں



صلاح الدین پاشا برق

محمد صلاح الدین پاشا برق، بی ایس سی بی ایل مدراس جی ٹی کورٹ میں اسسٹنٹ پبلک پراسیکیوٹر کی حیثیت سے اپنے فرائض کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ تعزیرات کی الجھن۔ مقدموں کی پیروی۔ اور بے حد سرکاری مصروفیات کے باوجود برق کے اندر کا فن کار اپنے تخلیقی عمل کے تلازمے سے بے نیاز نہیں ہے۔ خلیل جبران کے کئی شہ پاروں کا برق نے منظوم ترجمہ کیا ہے۔ طبع زاد چیزیں بھی منظرِ عام پر آ چکی ہے۔

ایک نظم

کس نے جانا، تمہاری کون سی رات
کٹنے والی ہے۔
آندھیوں کے جھکڑ چل رہے ہیں۔
اور موت کا سندیسہ دے رہے ہیں
لیکن
ہمارے اس جہاز کو
صدیوں تک رُکے بغیر چلنا ہے
ہمارا سفر جاری رہے گا
ابد تک ــــ!

سید قاسم نورس خیامی۔ بی اے مدراس کارپوریشن میں ریونیو انسپکٹر ہیں۔ شاعری اور موسیقی دونوں سے طبعی لگاؤ ہے۔ نورس نے ۱۹۶۴ء میں اپنی تخلیقات کا مجموعہ "گیسوئے شب" شائع کیا۔

قصۂ حسرتِ دیدار میں کیا رکھا ہے   دل کی بنیاد ہی جب عشق میں محکم نہ ہوئی
تیز ہے دل کی دھڑکن نورس، بجھ سا گیا ہے سوزِ نفس
پچھلے پہر کے سناٹے میں کوئی غزل خواں آج بھی ہے

محمد یوسف خواہاں۔ کہنہ مشق شاعر ہیں۔ مزاج کی شوریدہ سری نے تخلیقی عمل کی رَو کو ہمیشہ رومانیت کی طرف موڑا ہے۔

نرم پھولوں سے جو چھنتی ہیں سحر کی کرنیں
اٹھ رہا ہے سرِ آفاق اندھیرے کا چلن
کون احساس کی وادی میں چلا آیا ہے
آج جو حد سے سوا ہے مرے دل کی دھڑکن

ویلور

ویلور ضلع شمالی آرکاٹ کا وہ تاریخی شہر ہے جس کے قلعہ کی آہنی فصیل آج بھی نہ جانے کتنے رموز و اسرار کی محافظ ہے۔ یہ شہر سیاست، علم و فن، مذہب اور کئی سماجی قدروں کی آماجگاہ ہے۔ اس نے کئی نامور اہلِ قلم پیدا کیے۔ مولانا، کمالی ویلوری کا شمار جنوب کے اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں اس پیکرِ علم و فن نے مولانا خطیب شاہ عبدالرزاق خلیفۂ قطب ویلور کے یہاں جنم لیا۔ جنوبی ہند کی مشہور درس گاہ باقیات الصالحات میں تعلیم پائی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مشن ہائی اسکول ویلور بحیثیت اردو منشی ۱۹۳۷ء میں آپ کا تقرر ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں اسکول کی طرف سے ایک قافلہ شمالی ہند کی سیاحت کے لئے نکلا تو مولانا بھی ساتھ تھے۔ دلی میں اس قافلے نے شری جواہر لال نہرو سے ملاقات کی۔ مولانا کی طبعی افتاد نے فی البدیہہ ایک قطعہ موزوں کیا اور نہرو جی کی خدمت میں پیش کیا۔

باغِ دہلی پہلے اپنے پیارے مالی کو سلام
پھول پتے پیڑ پودے ڈالی ڈالی کو سلام
دیش میں اپنے ہے پردیسی کمالی ان دنوں
آپ اسے اپنایئے سرکارِ عالی کو سلام

مولانا کمالی کی اس غیر متوقع جرأت نے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو جو اردو زبان سے نابلد تھا محوِ حیرت کر دیا۔ ڈر رہا تھا کہ اس مداخلت بے جا اور جرأت رندانہ کا انجام کہیں روح فرسا نہ ثابت ہو۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس نکلا۔ پنڈت جی نے ہر شعر پر خوب داد دی۔ اور کمالی کو بصد خلوص و محبت سینے سے لگا لیا۔ مولانا وظیفہ یابی کے تقریباً پانچ سال تک دارالعلوم باقیات الصالحات کے مدرس رہے۔ پھر ۱۹۷۱ء سے حضرت مولانا، ابوالسعود احمد مہتمم دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور کی خواہش پر سبیل الرشاد آ گئے۔ اب تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔

مولانا کمالی کی شخصیت سراپا باغ و بہار ہے۔ میں نے آج تک مولانا کے چہرے پر حزن و ملال کا شائبہ بھی نہیں پایا۔ کرب اور سوزِ نہاں کے احساس کو بھی مولانا نے شگفتہ روپ بخشا ہے۔

مانگ سکتے نہ تھے وطن میں بھیک   ہم نے غربت میں نوکری کر لی
انبارِ خشت و سنگ میں جڑیا ہے یار کا   غافل ہے دل سے زائرِ دیر و حرم ابھی
سو بار آ کے پلٹیں بہاریں نہ آپ آئے   تازہ ہے دلفریبیٔ قول و قسم ابھی
صیاد کی نظر میں ہم آزاد ہو گئے   کس کو بتائیں بے پر و بالی نہیں گئی

بدر جمالی بھی ویلور کے ہیں لیکن آج کل بسلسلۂ ملازمت مدراس میں سکونت پذیر ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے تین سال باقیات الصالحات میں گذرے۔ بی ایس سی

بی ٹی کرنے کے بعد مدرسہ اعظم مدراس میں ملازمت اختیار کی۔ اردو اور فارسی زبان پر بڑا عبور حاصل ہے۔ طبیعت کی سیماب صفتی نے مشاعروں سے دور رکھا ہے۔ لیکن یہ کہنہ مشق اور اچھے کہنے والوں میں سے ہیں۔

اک کائنات شوق مرا دل ہے ہو بہو	ارماں، امنگ، حوصلہ، امید آرزو
ایسے بھی غیر جن کا بشر دوستی شعار	ایسے بھی دوست جن میں محبت کی خو نہ بو
اس شان سے ہے قافلۂ زندگی رواں	ہر گام پر ہے اک نئی منزل کی جستجو
تیرے بغیر زیست الم خیز حادثہ	تو ساتھ ہے تو نور، خوشی، حسن رنگ و بو

نثار احمد، فدوی باقوی سنہ ۱۹۲۸ء میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حبیب اللہ ندوی اپنے وقت کے جید عالم، ماہر لسانیات اور مفتی و فقیہہ تھے۔ ان کی باتیں بھی مسجع اور مقفیٰ ہوتی تھیں۔ فدوی نے ابتدائی تعلیم باقیات میں حاصل کی۔ ۱۶ سال ہی سے شعر گوئی کا ذوق پیدا ہوا۔ وہ دور حضرت امانی اور حضرت کمالی کا دور تھا۔ باقیات کے ماحول میں شعر و ادب کی فضا گرم تھی سنہ ۱۹۴۵ء سے سنہ ۱۹۵۳ء تک تجارت کے سلسلے میں ترور (کیرلا) میں آپ کا قیام رہا۔ آج کل باقیات کے نگران اعلیٰ کے منصب پر فائز ہیں۔ مولانا فدوی کا تنقیدی شعور سلجھا ہوا ہے۔ آپ کی نکتہ رسی مسلم ہے۔ "حاصل مطالعہ" جو زیر ترتیب ہے۔ آپ کے تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے "سیارگانِ جنوب" میں مختلف ادبی، علمی اور سماجی شخصیتوں کے خاکے ہیں۔ دارالعلوم باقیات الصالحات جشن صد سالہ کے موقع پر بانی دارالعلوم حضرت عبدالوہاب کی سوانح کو "مجدد جنوب" کے نام سے پیش کیا۔ فدوی کی شعری استعداد اور علمی قابلیت کے شہ پارے منظر عام پر آچکے ہیں۔

رو حیات میں کب اک حیات کا غم ہے
قدم قدم پہ ہیں کائنات کا غم ہے

فکر شاعر کہ ہبط انوار
شعر تر ہے کہ آیتوں کا نزول

دراصل خون تمنا ہے رنگِ لالہ و گل
نظر فریبیٔ نقش و نگار ہے ہم سے

چھوڑ آیا اپنے پیچھے کئی منزلیں جنوں	عقل شکستہ پا ہم منزل میں ہے ابھی

یہ ہے فدوی خلوص ان کا محبت احباب کی	جو اس ناکارہ بندے کو کسی قابل سمجھتے ہیں

وشارم وشارم اس اعتبار سے بھی قابل ذکر ہے کہ یہاں کے معزز اعظم نواب سی عبدالحکیم صاحب کی فیاضی، بے پایاں سخاوت، علم پروری اور رواداری کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہے۔ اسی سرزمین میں سنہ ۱۹۲۵ء میں مولانا نیر ربانی پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول وشارم میں پائی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے آرٹس کالج (محمڈن کالج) میں آپ نے داخلہ لیا۔ نیر ربانی بیک وقت شاعر، ادیب، مقرر اور سیاح بھی ہیں۔ آپ کی سیاحت کا یہ عالم کہ آپ نے چھ مرتبہ حج کیا ہے۔ سنہ ۱۹۶۶ء میں تمام عرب ممالک کا دورہ کیا۔ یورپ، ملیشیا سنگاپور، سری لنکا، فرانس، جرمنی ان تمام بیرونی ممالک کی سیاحت کے باوجود آپ کی وضع داری، روایاتی اوصاف اور اسلامی شائستگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ۱۱ سال اسلامیہ ہائی اسکول میل وشارم کی تدریسی خدمت کے بعد ریاست کرناٹک کی مشہور درس گاہ دارالعلوم سبیل الرشاد میں۔ علم و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ شاعری میں پہلے حضرت شاداں وشاری پھر علامہ محوی سے استفادہ کیا۔

نیر ربانی تنہا ایک ایسی انجمن ہیں کہ جہاں زندہ دلی کے توانا عناصر ہمیشہ سانس لیتے ہیں۔

فروغ حسن کامل سے تجلی کا وہ عالم ہے
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

وہی ہے ولولے دل کے وہی جوشِ جنوں اب تک
نہیں آنکھوں میں آنسو پھر بھی طغیانی نہیں جاتی

زمیں کو چھوڑ کر ہم چاند تک پہنچے تو کیا پہنچے
زمیں والوں کی لیکن تنگ دامانی نہیں جاتی

الٰہی خیر ہو باد بہار کے جھونکے
قفس میں حوصلۂ دل بڑھائے جاتے ہیں

تمہاری بات نیر کون سنتا ہے زمانے میں
خدا کی بات بھی جب ان دنوں مانی نہیں جاتی

بلپچور مولانا اشرف سعودی فاضل دیوبند، شیخ الحدیث و مفتی دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور کا تعلق ایک ایسے خانوادۂ علم و فن سے ہے کہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ایں خانہ تمام آفتاب است۔ مولانا کے نانا حضرت علامہ امانی مرحوم اپنے وقت کے جید عالم، شاعر شیوہ بیان، بالغ نظر نقاد و فقیہہ تھے۔ آپ کے والد حضرت مولانا ابوالسعود احمد شہرۂ آفاق عالم ہیں۔ مولانا اشرف سعودی نے علم و فن کی فضا میں آنکھ کھولی ہے۔ دینی و علمی مصروفیات کے باوجود شعر گوئی کا شستہ ذوق آپ میں موجود ہے! مولانا کی تخلیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اس فن سے آپ کو ایک وہبی نسبت ہے! آپ کی دلآویز نظمیں کئی مقتدر جرائد میں شائع ہو چکی ہیں، غزل میں بھی آپ کا لہجہ عام روش سے ہٹ کر ہے۔

آگے سب اس کے گرد تھا بھائی	وہ کچھ ایسا ہی فرد تھا بھائی
تھا بظاہر وہ کھولتا پانی	جب پڑا تن پہ سرد تھا بھائی
اس نے چاہی تھی بے حجابیٔ عشق	کیا وہ صحرا نورد تھا بھائی

قاری امداد اللہ انجم سعودی اشرف سعودی کے برادر خورد اور سبیل الرشاد کے مدرس ہیں۔ کوالالمپور میں قرأتِ کلام پاک کا جو عالمی مقابلہ ہوا آپ نے بھی اس میں حصہ لیا۔ انجم بہت کم کہتے ہیں لیکن اختصار میں بھی نمائندگی کا عنصر شامل ہوتا ہے۔

عقدۂ ہستی ہے یہاں غور طلب
پھر زمانے کے لئے صاحبِ افکار بنو
کاکلِ شاہدِ باطل کے نہ ہو جاؤ اسیر
بے خطر راہِ صداقت کے نگہدار بنو

آمبور

راقم الحروف کا وطن آمبور ہے۔ اس شہرِ عہد آفریں نے کئی نامور اہلِ قلم تاجر، سیاسی مدبر اور رہنما پیدا کئے۔ میرے دادا بانگی قادر باشاہ بہت بڑے تاجر، چرم اور شہر کے رئیس ہی نہیں نہایت فیاض اور علم پرور تھے۔ آمبور میں " بانگی اسکول " کے نام سے میرے دادا نے ایک درس گاہ کی بنیاد ڈالی۔ لیکن علم و ادب کی روشنی پھیلانے والے کا گھر نااہل فرزندوں کی وجہ سے اندھیرے میں ڈوب گیا۔ میں نے اسی اندھیرے میں سنہ ۱۹۲۶ء میں آنکھ کھولی۔ گھر کا ماحول اردو زبان سے بالکل نابلد اور غیر مانوس تھا۔ نہ جانے وہ کون سے محرکات تھے جنہوں نے مجھے اردو زبان کا شاعر بنایا۔ تقریباً تیس سال سے اس دشت کی سیاحی کا "جنون رست خیز" مجھ پر غالب ہے۔ جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل کیا وہ بھی سعیٔ لاحاصل۔ کچھ لوگ بربنائے خلوص و محبت میری تخلیقات کو پسند کرتے ہیں اسے آگے کچھ نہیں۔ چار منظوم تصانیف منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ کلام کا مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔

دانش فرازی

اب اس امید پہ بیمار مطمئن سا ہے
حریمِ دل میں کوئی چھیڑنے لگا ہے ساز
کیا عدم سے پرے بھی منزل ہے
اے روئے تابناک ذرا روشنی تو دے
تمہارے در سے بچھڑنے کا فیض ہے شاید

پکار لے گی کسی دن تری مسیحائی
کہاں کہاں سے گزر رہا ہوں میں آواز
کس سے پوچھوں کہ قافلے میں خموش
چھایا ہے زندگی پہ فقط کاکلِ سیاہ
مجھے قریب سے پہچاننے لگے ہیں لوگ

کاوش بدری کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ ۱۹۲۹ء میں کاوش آمبور کے ایک متمول خاندان میں پیدا ہوئے۔ آسودگی کے آغوش میں آنکھ کھلی۔ ان کے نانا بانگی حیات باشاہ شہر کے بہت بڑے رئیس، علماء کے قدردان اور غریبوں کے ہمدرد تھے۔ کاوش کے والد ویا عبدالشکور بھی تاجر تھے۔ کاوش کی ساری زندگی اردو زبان کے تعلق سے ایثار و قربانی سے عبارت ہے۔ مدراس ہی سے پہلے فن کاؤسپر ماہنامہ منزل کا اجرا کیا۔ لیکن ناسازگار حالات کی بنا پر جاری نہ رہ سکا۔ کاوش کی آواز منفرد آواز ہے۔ غزل میں کاوش نے انکشافِ ذات کا حق ادا کیا ہے۔ کاوش بدری کی تازہ ترین طویل نظم کاوی یم زیرِ طبع ہے۔ کاوش کا شمار ہندوستان کے صفِ اول کے فن کاروں میں ہوتا ہے۔

وہ شعلگی ابھی شاعر کی نبض میں کم ہے
جو شعلہ سا نفسِ نغمہ گر میں رہتا ہے
شروع ہی سے تعلق رہا ہے اس سے مرا
جہاں بھی گم ہو وہ میری نظر میں رہتا ہے
لہو کہیں بھی اکارت نہیں گیا اپنا
وہ جذب ہو کے ترے سنگِ در میں رہتا ہے
زمانہ تو تاریخ دیتا رہے گا!
زمانے کو ہم داستاں دے رہے ہیں
میں بھی اک شیلف ہوں مجھ میں بھی کتابیں ہیں
گرچہ کاوش ہوں کتب خانہ میں نوکر کی طرح

کاوش بدری



وار

کے محمد نواز، نواز بھی کہنہ مشق شاعر ہیں صالح روایات اور قدیم لہجے کے نگہبان بہت کم کہتے ہیں لیکن جو کچھ بھی کہا ہے وہ ان کی فطری استعداد کی نمائندگی کرتا ہے۔

آرزو کشمکشِ شوق ہجومِ افکار
زندگی کتنی بلاؤں کو لئے آتی ہے
کچھ ترے حسن کا پرتو ہے گل و لالہ پر
کچھ مرے خونِ تمنا کی بھی رعنائی ہے
جب بھی چھایا ہے اندھیرا غمِ ہستی پہ نواز
اک کرن زینۂ گردوں سے اتر آئی ہے

اے۔ ایم۔ یحییٰ برزمی امبوری۔ پہلے شاعر اب سیاسی کارکن کی حیثیت سے زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔

مجھ کو تلاشِ دوست ہے دیر و حرم سے کیا غرض
خندۂ گل سے کیا غرض گریۂ غم سے کیا غرض
دنیا کی خرافات کو دیکھا ہم نے
بدلے ہوئے حالات کو دیکھا ہم نے
دیکھا ہے بہت پھر بھی گماں ہوتا ہے
اک خواب تھا جو رات کو دیکھا ہم نے



یحییٰ برزمی

عمر آباد

عمر آباد آمبور سے غالباً ، کلومیٹر پر واقع ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں یہ چھوٹا سا گاؤں جامعہ دارالسلام کی وجہ سے ساری دنیا میں

شہرت رکھتا ہے۔ جامعہ کے اکابرین علم وفن علامہ شاکر نائطی، مولانا وفا بختیاری اور مولانا عاقل رحمانی نے اپنے سرچشمۂ فیض سے ایک عالم کو سیراب کیا۔ مولانا عاقل رحمانی نے تفسیر طنطاوی کا ترجمہ اسی دارالعلوم میں کیا۔ علامہ شاکر نائطی کو عربی فارسی اور اردو ادب پر رشک کی حد تک دستگاہ حاصل تھی۔ آپ ہی کے فرزند مولانا سالک نائطی ایک نغز گو شاعر، نکتہ داں ادیب ہیں۔ فن ہی نہیں حیات و کائنات کے رشتوں کی تہ داری پر بھی آپ کی نظر گہری ہے۔ آج کل دارالسلام ہی میں بہ حیثیت مدرس فرائض انجام دے رہے ہیں۔ تمل ناڈو کے ممتاز اہل سخن میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

دنیا میں کیا ہے کس کا نظارا کرے کوئی
کیوں اپنے آپ ہی کو نہ دیکھا کرے کوئی

وسعت تو تیز دشت و بیاباں میں بھی نہیں
پھر کیوں نہ اپنے گھر ہی کو صحرا کرے کوئی

ان کی طرح نہ کام کوئی بے رخی سے لے
میری طرح نہ خون تمنا کرے کوئی

سالک نائطی کے چھوٹے بھائی کاظم عزیز علیمی بھی خوش گو شاعر ہیں، ان کی تخلیقات ابھی پورے طور پر منظر عام پر نہیں آئی ہیں۔ علامہ شاکر کے سارے فرزند کسی نہ کسی شعبۂ علم و ادب سے وابستہ ہیں۔

آسماں سر پہ چھا گیا میرے — ڈھونڈتا تھا اک آسرا میں بھی
برق کی طرح وہ کبھی لہرایا — آشیاں کی طرح جلا میں بھی

پرنام بٹ

پرنام بٹ کے نام کے ساتھ ذہن کی سطح پر ایک ایسا چہرہ ابھرتا ہے جسے میں نے کبھی فراموش نہیں کیا۔ اردو زبان و ادب کے تعلق سے اس ہمہ گیر شخصیت کو فراموش کرنا ایک ناقابل تلافی جرم تصور کرتا ہوں وہ ہمہ گیر شخصیت ہے اسمٰعیل رضیؔ کی۔ دارالسلام عمرآباد کے فارغ التحصیل، زبان و بیان پر بھرپور عبور، فکر و احساس کے بلند افق کو چھو لینے والی صلاحیت، ایک خاموش سمندر جس کی تھاہ کا اندازہ آج بھی دشوار ہے۔ جس دور میں اردو شاعری کی نئی کروٹوں کے آثار نظر آرہے تھے، رضیؔ کے یہاں وہ نئی کروٹ، آہنگ کا نیا رس جن سے لہجے کا تنوع پیدا ہو گیا تھا۔ تخلیقات کئی متقدر رسالے میں شائع ہوئیں لیکن آج وہ سب نایاب ہیں۔ رضیؔ کی خلوت نشینی اور تصوف کی کارفرمائی نے انھیں تخلیقی عمل سے دور رکھا ہے۔

نثار بھارتی، رضیؔ کے ہم نوا و ہم مشرب، خوش گو شاعر، شاعری کے حسن و قبح پر گہری نظر رکھنے والا فن کار غم روزگار کے ہاتھوں خاموش ہے۔

سہیل راشد، اسلامیہ ہائی اسکول پرنام بٹ کے اردو منشی، کہنہ مشق شاعر زود گو و کم آمیز ۱۹۴۳ء میں وانمباڑی میں اس وقت پیدا ہوئے نازیوں کی بم باری کے خوف سے سارا مدراس خالی ہو گیا۔ سہیل کا آبائی وطن مدراس ہے۔ ہائی اسکول کی تعلیم ابھی پوری نہیں ہوئی کہ تجارت سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء میں نعت و مناقب پر مشتمل ایک مجموعۂ منزل نما شائع کیا۔ جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل کرنے کے بعد اب مدرسی کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

سہیل راشد میں شعر گوئی کی بھرپور صلاحیت ہے۔ سہیل نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن محبوب صنفِ سخن غزل ہے۔



سہیل راشد

ان سے بھی ضبط ہو نہ سکا وہ بھی رو پڑے
کیا بات تھی حدیث غم جاں گداز میں

قصۂ دل کہا نہیں جاتا
بن کہے بھی رہا نہیں جاتا

ہم ڈھونڈتے ہی رہ گئے نقش قدم مگر
وہ کتنی بار پاس سے ہو کر گذر گئے
اٹھ کے آئے تو عجب کرب کا عالم تھا سہیلؔ
جانے کس بزم میں ہم جنسِ ہنر لیکے چلے

وانمباڑی

علم وفن، ادب، سیاست، سالستگی، رکھ رکھاؤ اور قدر دانی کے اعتبار سے وانمباڑی تمل ناڈو کا لکھنؤ ہے۔ وانمباڑی کی فضا کئی تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی دھاروں کی سنگم ہے۔ ہر دور میں وانمباڑی علم و فضل کا مرکز رہا ہے۔ داغ و امیر کے ہم عصر حضرت عبدالقادر شاکر، خطیب قادر باشاہ جیسے علم و فن کے روشن میناروں نے شمال کے اکابرین سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔



اردو کا چلن ابتدا ہی سے یہاں کے مسلمانوں کا مزاج ہو گیا تھا۔ آج بھی مدراس کے بعد شاعری اور علم و فن کے اعتبار سے اس سرزمین کو فوقیت حاصل ہے۔ بزم نو کے مشاعروں نے ذوقِ سخن کی لو کو اونچا رکھا ہے تو انجمن فروغ ادب کی ٹھوس خدمت تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ تقریباً پچاس شعراء کے اس ادبی مرکز میں کئی اہل کمال موجود ہیں۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ ذوقی اگرچہ بنگلور کے ہیں لیکن انہوں نے وانمباڑی کو وطن ثانی بنا لیا ہے یہیں آپ کے اہل و عیال کی بود و باش ہے۔ آپ کے والد محمد عبدالحفیظ لفٹننٹ تھے۔

ڈاکٹر ذوقی [illegible] میں بنگلور میں پیدا ہوئے، میڈیکل کالج حیدرآباد بمبئی سے ایل۔ سی۔ پی۔ ایس۔ ایل۔ ایم۔ ایس۔ ایف۔ سی۔ پی۔ ایس کے امتحانات میں امتیازی کامیابی

[illegible] سے شاعری کا آغاز ہوا۔ پہلے علامہ محوی صدیقی پھر حضرت ابا [illegible] شوری سے استفادہ کیا۔ سہل الممتنع، تغزل، رعایت لفظی اور لطافتِ احساس آپ کی شاعری کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ اس باغ و بہار اور زندہ دل شخصیت کو غزل نے کچھ اس طرح اسیر کیا ہے کہ وہی آپ کی محبوب صنفِ سخن بن گئی ہے۔

حقیقت زندگی کی کب سمجھ سکتے ہیں دیوانے
جسے اب تک نہ ہم سمجھے نہ تم سمجھے نہ دیوانے

ہے جبیں میری ان کے قدموں پہ
کتنی اونچی یہ خاکساری ہے

غیر فرزانہ سمجھتے ہیں تو سمجھیں لیکن
آپ دیوانہ سمجھتے ہیں تو دیوانہ سہی

کوئی تیرِ نظر اس تک نہ پہنچا   بڑی کمزور تھی قسمت جگر کی
کس قدر تھی مہربانی اس پہ میرے دوست کی
دل کو تنہا پا کے ذوقی داغِ ہجراں رکھ دیا

ڈاکٹر عزیز تمنائی ۱۹۲۶ء ولسور میں پیدا ہوئے۔ وانمباڑی اسلامیہ کالج میں تعلیم پائی۔ پھر مدراس میڈیکل کالج سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر تمنائی کے بڑے بھائی عبدالغفار بھی شاعر تھے۔ رجائی تخلص تھا۔ اس دور کے بلند پایہ جرائد نیرنگ خیال، عالمگیر وغیرہ کا مطالعہ دونوں کے لئے سودمند ثابت ہوا۔ رجائی تو بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر ادب کے تعلق سے اپنے ذہنی سفر کو جاری نہ رکھ سکے، لیکن تمنائی نے آگے بڑھنے کے عزائم، امنگ اور لگن کے سہارے اپنے قدموں کی آہٹوں کو جوان کیا۔



اسلامیہ کالج وانمباڑی کے ایک مشاعرے میں جس کی صدارت مولانا عبدالوہاب بخاری فرما رہے تھے۔ ماہرالقادری بھی مدعو تھے۔ ماہر کے عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا عزیز تمنائی نے مشاعرے میں ایک غزل پڑھی۔ برسرِ محفل ماہر نے تعریف کی۔ غزل کے تیور اس وقت بھی عام روش سے ہٹ کر تھے۔ ن م راشد کے "ماورا" کے مطالعہ نے عزیز تمنائی کی سوچ کے زاویے کو ایک نیا موڑ دیا۔

حلقۂ ارباب ذوق سے گو عملی وابستگی نہ تھی لیکن ذہنی طور پر اس تحریک سے تمنائی ضرور متاثر ہوئے

عزیز تمنائی نے نئے اسالیب کو ہیئت و موضوع کے تناظر میں شعوری اپج کے زیر اثر بنانے کی کوشش کی۔ جس کی وجہ سے انھیں کامیابی بھی نصیب ہوئی ڈاکٹر تمنائی نے ۱۹۶۳ء میں اپنے سانیٹ کا مجموعہ "برگِ نوخیز" شائع کیا۔ جو آگے چل کر کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی شامل ہوا۔

پو پھٹ رہی ہو جیسے سمندر کی گود میں
یوں ڈبڈبائی آنکھوں سے وہ مسکرا گئے

زبوں ہے تنگئ ماحول سے پرِ پرواز
فضا ہو ایسی کہ وسعت کا امتیاز نہ ہو

فیض سے ہے شدتِ غم کا شاید
مسکرانے کا سلیقہ آیا

وقت کی دھند میں راہوں کے سہارے کیلئے
روشنئ لب و رخسار ابھرتی جائے

ٹوٹے زندان تصور کا گراں سناٹا
کوئی آہٹ پسِ دیوار ابھرتی جائے

عبدالرؤف نیاز۔ پیدائش غالباً ۱۹۲۷ء کی ہے۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول، پھر اسلامیہ کالج وانمباڑی سے بی کام کیا۔ خوش حال خاندان کے اس چشم و چراغ کی بے نیازی نے زندگی کے کئی پیچ و خم سلجھائے، لیکن نیاز تو شہرِ غزل ہی کے شہزادے رہے۔ ذہانت و فطانت کا یہ عالم تھا کہ ہر موضوع کی گرہ کھل کھل جائے۔ موسیقی اور شاعری دونوں سے تعلق ہے۔

تلاطم، موج، طوفاں مل گئے ہیں خیرخواہی کو
ہم ان کی خیریت پوچھیں ذرا ساحل تو آجائے

گناہوں میں کہاں تک ہے صداقت آپ کیا سمجھیں
بروزِ حشر دیکھیں گے ذرا عادل تو آجائے

زندگی کتنی قیامت خیز ہے   دسترس سے دور دلآویز ہے
خیر و شر سے ہے نظامِ کائنات   یہ مشیت مصلحت آمیز ہے
میں نیاز بے نوا تو بے نیاز   کس قدر مجبور ہے ناچیز ہے

حکیم مخدوم اشرف۔ اشرف ۱۹۳۳ء مدراس میں پیدا ہوئے، آپ کے والد حکیم محمد عبدالوہاب مشہور حکیم تھے۔ میلاپور مدراس میں مطب کے اوقات مریضوں کا اژدہام رہتا تھا۔ حکمت کے صحیح مصرف کے احساس نے آپ کو ممتاز حکماء کی صف میں لا کھڑا کیا۔ مخدوم اشرف میں بھی موروثی طور پر آپ کے والد کے اوصاف جمع ہو گئے ہیں۔ شاعری کا آغاز ۱۹۶۸ء میں کیا!

مولانا ابر احسنی سے تادمِ واپسیں استفادہ کرتے رہے۔ شعر و حکمت کے اس پیکر نے بہت جلد اپنے ہم عصر شعراء میں مقام حاصل کرلیا۔ وانمباڑی میں آپ کا مطب دارالشفاء کا درجہ رکھتا ہے۔


مخدوم اشرف

زندگی میں نئے ترے ناز اٹھائے ہیں بہت
تو اٹھائے مرا احسان ضروری تو نہیں

بھیڑ چہروں کی ہے ہر گام پہ لیکن اشرف
نظر آئے کوئی انسان ضروری تو نہیں

ہائی پہ داستانِ وفا نا شناس لکھ
پڑھنے نہ پائے کوئی یہاں عمر بھر اسے

اک آسماں کی چھت کے سوا سر پہ کچھ نہیں
کہہ لیجئے گا مصلحتاً آپ گھر اسے

یاد آتے ہو تو محسوس یہ ہوتا ہے مجھے
وقت جیسے کبھی ٹھہرا تھا مرے آنگن میں

فاروق فرحت۔ جواں فکر شاعر ہیں۔ ۱۹۲۹ء میں وانمباڑی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ہائی اسکول تک کی ہے۔ پیشہ تجارت ہونے کی وجہ سے ہمیشہ سرگرم سفر رہتے ہیں۔ فکر سخن کے لئے بہت کم فرصت ملتی ہے۔ لیکن جو کچھ کہتے ہیں فکر و احساس کی تہ داری کے تحت کہتے ہیں۔ آپ کا لہجہ منفرد ہے۔

کیا کیا نہ جانے کھل گئے اسرار کائنات
کیا کیا نہ جانے کہہ گئے دیوانگی میں ہم

اک ترا غم ہمارے لئے خضرِ راہ تھا
گم ہو چکے تھے ورنہ غمِ زندگی میں ہم

ان کی بیگانہ نظر کے پسِ منظر فرحت
ہم کو نازک سی کوئی بات نظر آتی ہے

علم و دانش کے اجالے جسے چمکا نہ سکے
زندگانی وہ سیہ رات نظر آتی ہے

محمد یعقوب اسلم، فارسی کے منشی فاضل، اردو کے ادیب کامل اور انگریزی کے بی۔ اے اسلامیہ ہائی اسکول وانمباڑی میں اردو منشی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ زبان و بیان کے نشیب و فراز پر بڑی نظر رکھتے ہیں۔ شاعری میں نئی قدروں کے بھی قائل ہیں۔ اور روایاتی لہجے کا احترام بھی دل میں ہے۔

سنبھل سکا نہ کسی سے نظامِ گلشن کا
ادھر بہار تھی تنہا ادھر خزاں تنہا

اس کو رنگوں میں سمیٹوں گا مصور کی طرح
میرے ادراک کی سرحد سے وہ باہر تو نہیں

ہو اکے دوش پہ لمحات کی سبک سیری
وہ فاصلہ کہ سمٹ کر بھی دور دور رہا

ملک ضیا ایک خوش گو شاعر ہیں۔ تعلیم ہائی اسکول تک کی ہے۔ ملک ضیا کا جس ماحول سے تعلق ہے اس کے پیشِ نظر ضیا کے یہاں شاعری کے امکانات حیرت انگیز بات ہے۔ ۱۹۵۸ء سے شاعری کی ابتدا ہوئی۔ مشقِ سخن کے ساتھ حضرت راز چاندپوری سے اصلاح کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ زود گوئی میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی صلاحیت ہے۔ وانمباڑی کے ممتاز شعرا میں آپ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ نعت کا ایک مجموعہ "چراغِ حرا" زیرِ ترتیب ہے۔

کوئی سبب تو ہے [illegible] لہو لہو ہے شفق
دھواں دھواں سا دلوں کا دیار رہتا ہے

ملک کی چوٹ ابھری ہے [illegible] یاد کے ساتھ
آنکھ کچھ سوچ کے بھر لیتی ہے تنہا تنہا

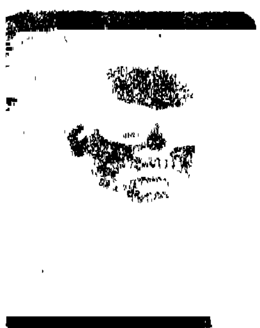
چلو چلو کہ بدلنا ہے نظام حیات
کہ شہر شہر عجب انتشار رہتا ہے

یہ دل بھی وارثِ ہے کعبہ بھی [illegible] ہے
کہ اس میں جلوۂ کونین تک سما ہی گیا

یہ عقدہ ہم پہ کھل نہ سکا آج تک ضیا
کیوں ہے سلگتی دھوپ میں سایا لہو لہو

ملک ضیا

عبداللہ باشہ راز۔ تعلیم بی۔ یو۔ سی۔ وانمباڑی کے خوش گو شعرا میں ہیں۔ ابلاغ کی خوش سلیقگی اور زبان کی لطافت کا شعور رکھتے ہیں۔ حضرت نثار لنگری سے ایک مدت تک اصلاحِ سخن کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ بھی اسی ماحول سے ہیں جس سے ملک ضیا کا تعلق ہے۔ اردو کے تعلق سے دونوں میں خدمت اور ایثار کا جو جذبہ ہے۔ اس نے انھیں آگے بڑھایا ہے۔ راز کی تخلیقات میں جمالیاتی قدروں کے احساس کی دھنک ملتی ہے۔ جذبے کی سلگتی ہوئی آنچ راز کے دل کو چھو کر آگے گزر جاتی ہے۔ وانمباڑی کے قابل ذکر شعرا میں آپ کا بھی شمار ہوتا ہے۔



عبداللہ باشہ راز

جلتا ہے نشیمن تو کچھ غم نہیں جل جائے
اے برق مگر تیری حسرت تو نکل جائے

نہ ہوا کبھی مکمل مرے درد کا فسانہ
کبھی مجھ کو نیند آئی کبھی سو گیا زمانہ

جن کے سائے میں زمانے کو نئی زیست ملی
ان کو آرام کبھی لینے نہیں دیتی دنیا

نکلا خود اپنا سایہ ستمگر مرے لئے
ایسے دن دکھلائے غم روزگار نے

کچھ اور دل میں بڑھ گئی جینے کی آرزو
سنتے ہیں جب سے موت کھڑی ہے سر پہ کھڑی ہوئی

پروفیسر محمد سلیم الدین سلیم ایم، اے ۱۹۳۳ء میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسۂ اعظم میں پائی۔ ۱۹۵۸ء اسلامک ہسٹری میں ایم اے کیا۔ ۱۹۶۰ء سے اسلامیہ کالج وانمباڑی اسلامک ہسٹری کے پروفیسر ہیں۔ شاعری میں جدیدیت اور صالح روایاتی قدروں کے قائل ہیں۔

جب بہار کا دامن دکھائی دیتا ہے
کہ پھول پھول میں گلشن دکھائی دیتا ہے

ابھی ابھی کوئی آیا ہے انتظار کے بعد
بھرا بھرا سا جو آنگن دکھائی دیتا ہے

گرے جو ہم کو کسی طرح سنبھالا جائے
[illegible] ہاتھوں میں پھول کا اچھالا جائے

سلیم الدین سلیم

نور آفاق۔ محمد نور اللہ نام تخلص نور سنہ ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام حکیم محمد حنیف ہے۔ مدرسۂ اعظم وانمباڑی میں مدرس ہیں۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں شاعری کا آغاز ہوا۔ مولانا طرفہ قریشی کے حلقۂ تلامذہ سے وابستہ ہیں۔ غزل کی طرف خاص رجحان ہے۔



آپ کے کلام میں سادگی و پرکاری کا لطیف امتزاج ملتا ہے۔

کیا طے کرے گا ظلمت کی منزل
جو روشنی میں رستہ نہ پائے

افسردہ مجھے ان کا چہرہ نظر آتا ہے
شفاف سا آئینہ دھندلا نظر آتا ہے

خضر کی عمر بخشے خدا آپ کو
یاد کر ہی رہا تھا کہ آپ آ گئے

اکتا نہ جائے زلفِ مسرت سے دل کہیں
اچھا ہے رنج و غم سے بھی وابستگی رہے

سراج زیبائی۔ ابھرتے ہوئے جواں فکر شاعر ہیں۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں وانمباڑی میں پیدا ہوئے۔ سراج زیبائی کی تخلیقات کا مجموعہ "لمحوں کا کرب" شائع ہو گیا ہے جدید حسیت کی سمتوں کی تلاش اور انا کی بازیافت میں ان کا ذہنی سفر جاری ہے فطری صلاحیت کی وجہ سے تمام اصنافِ سخن میں شعر کہتے ہیں۔



افق نے بڑھ کے اجالوں کی بھیک مانگی تھی
میں دل کے داغ خلاؤں میں جب اچھال گیا

سنا تو میں سجودِ شبستاں میں گم رہا
پھیلا سرِ افق تو سحر کی اذاں ہوا

کون کملائے ہوئے پھول کی خوشبو لے گا
تیرے ہونٹوں کے تبسم کی مہک چھو لے گا

میں بھی کٹی پتنگ کی مانند ہوں سراج
چھوڑا ہے جس کو درد کے دھاگوں نے ڈھیل میں

نام سید نثار احمد، تخلص الماس، ابھرتے ہوئے فن کار ہیں۔ اپنی دلآویز غزل اور ترنم کے جذب و کشش سے بڑی سُرعت کے ساتھ شہرت حاصل کی۔ کئی آل انڈیا مشاعروں میں حصہ لے چکے ہیں۔ نثار الماس کے یہاں تخلیقی امکانات روشن ہیں۔ لیکن غمِ روزگار نے انہیں مجبور کر رکھا ہے۔



دل میں چہروں کو چھپائے ہوئے پھرتے ہیں لوگ
بے دھواں اپنی دبی آگ میں جلتے ہیں لوگ

اپنے جسموں میں سمٹنے کی لگن میں اکثر
جانے پھر کتنی دشاؤں میں بکھرتے ہیں لوگ

میرے آنگن کی پگھلتی ہوئی تاریکی میں
شام سے پہلے ہی ڈوب گیا سہما ہوا سورج

شبنمی صبح نے کچھ زخم دیے ہیں ایسے
اپنی ہی آگ میں جلتا ہے سراپا سورج

ایم ایل نثار احمد نثار، شاعری میں سبک روی اور تدریجی سفر کے قائل ہیں۔ بات میں بات پیدا کرنا شیوۂ احسن سہی۔ لیکن خواہی نخواہی کے دائرے میں یہ شیوہ دم توڑ دیتا ہے۔ نثار کے یہاں فاصل جذبے کے اخراج سے پیدا ہونے والی کیفیت ہے۔ سنہ ۱۹۵۳ء سال پیدائش ہے۔ حکومتِ ہند کے محکمۂ انشورنس سے وابستہ ہیں۔ ابتدائی دور میں نایاب وانمباڑی پھر حضرت طرفہ قریشی سے استفادہ کیا۔



نثار احمد نثار

شامِ فرقت وہ مرے دل کے دھڑکنے کی صدا
میں یہ سمجھا تھا کہیں تم نے پکارا ہو گا !

اپنی منزل کا اسے بھی ہے تجسس شاید
قافلہ اب بھی ستاروں کا بھٹک جاتا ہے

یہ خامشی یہ فضا کا جمود بے پایاں
جدھر میں دیکھوں ادھر آسماں دکھائی دے

قاتل کا دور تک نہ کہیں مل سکا سراغ
لیکن قدم قدم پہ لہو کے نشاں ملے

ان کے علاوہ نثار احمد سائل، ظہیر باری اور ندیم خاور بھی ابھرتے ہوئے فن کار ہیں۔

کشنگری

کشنگری دور افتادہ ہی سہی لیکن ایک تاریخی مقام ہے۔ یہاں بھی اردو کے قد آور شاعر ہیں۔ اردو زبان کی ترقی و ترویج اور اشاعت و ارتقا کے سلسلے میں یہاں کے اربابِ قلم نے بڑی جد و جہد کی ہے۔ آج بھی خدمت کا جذبہ دلوں میں موجود ہے



عثمان فہمی

مولانا سید عثمان فہمی تنگرم کے ہیں لیکن ان کی بود و باش تقریباً تیس سال سے کشنگری میں ہے۔ فہمی تنگرم میں سنہ ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ دارالسلام عمر آباد کا نصاب مکمل کر کے سنہ ۱۹۴۵ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔ اسی سال مدراس یونیورسٹی سے منشی فاضل کیا۔ جامعہ کے تعلیمی دور میں علامہ شاکر نائطی کے سرچشمۂ فیض سے

جن لوگوں نے استفادہ کیا ان میں مولانا فہمی بھی ہیں۔ فہمی کہنہ مشق شاعر ہیں۔ زبان کے مزاج اور شعر و فن کے بنیادی تقاضوں کی آگہی رکھتے ہیں۔

بہاروں میں نزاکت کا یہ عالم ہے ارے توبہ
صبا کو نکہتِ گل بھی گراں معلوم ہوتی ہے
دیکھے بغیر بھی تمہیں دیکھا ہے بارہا
تم سے ملے بغیر بھی تم سے ملا ہوں میں
نمودِ صبح کے آثار آتے ہیں نظر فہمی
بہ ہر سو رفتہ رفتہ تیرگی کم ہوتی جاتی ہے



سید عبد الرشید کرشناگری ایک بزرگ شاعر ہیں۔ کہنہ مشقی کی دلیل یہ ہے کہ غزل میں عمرِ رفتہ کے نشانات ملتے ہیں۔

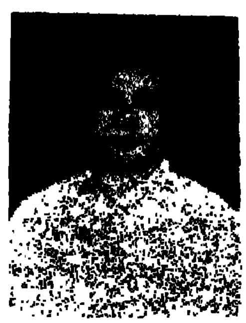
ڈرتا ہوں صبح صبحِ قیامت نہ ہو کہیں
دل پر رہا ہے درد کا سایا تمام رات

دلِ آشفتہ تجھکو کیوں گراں معلوم ہوتی ہے
محبت میں یہ رسوائی کہاں معلوم ہوتی ہے

نام سید یوسف تخلص عاکف۔ ۱۹۱۹ء سالِ پیدائش ہے، پیشہ حکمت عاکف نے شاعری کا آغاز ۱۹۵۰ء میں کیا۔ پروفیسر سید عظمت اللہ سرمدی کے حلقۂ تلامذہ سے وابستہ ہیں۔

جی میں آتا ہے چلے جائیں کہیں دنیا سے دور
ہوش کی دنیا میں رہ کر ہو گئے دیوانہ ہم

منیر رشیدی ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ہائی اسکول تک کی ہے ۱۹۴۷ء میں طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوئی۔ ابتدا میں حضرت فہمی اور پھر ابوالبیان حماد سے استفادہ کیا۔ منیر رشیدی خوش فکر شاعر ہی نہیں کشنگری کی ادبی سرگرمیوں انجمنوں اور اداروں کے روحِ رواں بھی ہیں ۱۹۶۸ء میں آپ کی تخلیقات کا مجموعہ شبستاں شائع ہوا۔



منیر رشیدی

ہم نے مانا یہ اندھیرے ہیں سحر ہونے تک
سوچئے مرحلے کتنے ہیں مگر ہونے تک
اٹھا کے خاک بہ فیضِ بہار گذرے ہیں
تری تلاش میں دیوانہ وار گذرے ہیں
نہ ہوتی چشمِ شوق اپنی خدا جانے کہاں جاتے
یہ جلوے حسن کے، یہ آئینہ خانے کہاں جاتے

فرازِ دار نے جوششِ جنوں کی آبرو رکھ لی
وگرنہ ہم زمانے بھر سے ٹکرانے کہاں جاتے

مختار بدری۔ ایک دمکتا ہوا ستارہ کشنگری کے آسمان پر ابھرا۔ لیکن شعر و فن کی پیاس، ادراکِ ذات کی تمنا اور جستجو نے اس جیالے فن کار کو نہ جانے کتنے خلاؤں میں بھٹکنے پر مجبور کیا۔ آج کل بمبئی کے نگارستانوں کی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ آگے بڑھنے، پھیلنے کے بھرپور امکانات اسی وقت روشن تھے جب اس نے شاعری کے وادیٔ سنگلاخ میں قدم رکھا۔ کشنگری کی ادبی فضا میں مختار کے لہو کی گرمی اب بھی محسوس ہوتی ہے۔ مختار کا کلام میرے پاس نہیں ہے۔ ایک پرانی غزل کے دو شعر پیش کر رہا ہوں۔

آگہیٔ عشق میں تکمیلِ جنوں کی منزل
یہ مرے ہاتھ میں اپنا ہی گریباں تو نہیں
رنج پر رنج، مصیبت پہ مصیبت آئے
ہاں مجھے کچھ گلۂ تنگیٔ داماں تو نہیں

ترچناپلی

پروفیسر حسرت سہروردی جمال محمد کالج ترچی میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔ تامل کے عظیم شاعر ولور کی شاہکار نظم "ترِوکرل" کا ترجمہ آپ نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ تامل کے قد آور فن کاروں کو اردو کے ادبی و علمی حلقوں میں روشناس کرنے کی کوشش قابلِ ستائش ہے۔ ساہتیہ اکاڈمی نے تروکرل کو شائع کیا۔ حسرت خواجہ پہاڑ کے پُرسکون اور خاموش دامن میں اپنی ادبی علمی اور تحقیقی کام میں مصروف رہتے ہیں۔ اردو زبان کے تعلق سے آپ نے مختلف مقامات کا سفر بھی کیا ہے۔

حسرت کی تخلیقات کا مجموعہ "بوئے گل نالۂ دل" مرحوم سجاد ظہیر کے پیش لفظ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

حسرت کی شاعری واردات کی شاعری ہے۔ حسرت شعر و فن کے صحرا میں سبک روی کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ ہر گام پر ایک عجیب دھیما پن کا احساس ہوتا ہے۔

گذرتی ہے جو کشتی پر خبر کیا اہلِ ساحل کو
یہاں طوفاں کی بھی آنکھ پُرنم ہوتی جاتی ہے

حقیقت ہے تمہارا غم بھی لیکن	غمِ دنیا کی بھی اک آبرو ہے
میرے ساغر میں رنگیں مے کے بدلے	مری ہی آرزوؤں کا لہو ہے
ڈرتا ہوں کہیں آگ لگا دیں نہ چمن کو	شعلے جو مرے طوق و سلاسل سے اٹھے ہیں
چلا ہیں وہ بھی حسرت سوئے مقتل	جنہیں اب تک شعورِ غم نہیں ہے

کوئمبتور

کوئمبتور تامل ناڈو کے بڑے شہروں میں کئی خصوصیات کا حامل ہے یہ ایک تجارتی مرکز ہے۔ شہری زندگی کی گہما گہمی، شورش اور ہنگامہ آرائی یہاں بھی موجود ہے۔ کوئمبتور کا ماحول سراپا تامل ہے۔ لیکن یہاں بھی اردو کے خیر خواہوں نے انجمن قائم کی ہے۔ یہاں کل جنوبی ہند مشاعرے بھی ہوتے ہیں۔ عمائدین اور تجار حضرات کے دل میں اردو کے لئے ایک خاص مقام

(بقیہ صفحہ ۲۹ پر)

عابد صفی
شعبۂ اردو مدراس یونیورسٹی
مدراس

تملناڈو میں اردو افسانے کا ارتقا



یہ صحیح ہے کہ تمل ناڈو میں اردو افسانہ نویسی کی تاریخ اتنی قدیم نہیں ہے جتنی کہ شمال میں ہے۔ کیونکہ شمال میں اردو افسانہ کی ابتدا ۱۹۰۸ء میں پریم چند کی کہانیوں سے ہوتی ہے۔ لیکن تمل ناڈو میں ۱۹۲۷ء کے خاتمے تک بھی کسی ایسی ادبی تخلیق کا پتہ نہیں چلتا جسے افسانہ کہا جاسکے۔ "سفینہ" تمل ناڈو کا پہلا مجلہ ہے جس میں مقامی ادیبوں کے افسانے پہلی بار منظرِ عام پر آئے۔ اس کا اجراء جولائی ۱۹۲۸ء میں ہوا تھا۔ یہ تین سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد اگست ۱۹۳۵ء میں "مصنف" کے نام سے عمرآباد (شمالی آرکاٹ) سے ایک مجلہ نکلا۔ یہ کم و بیش سات سال جاری رہا۔ اس کے صفحات پر بھی تمل ناڈو کے کئی افسانہ نگاروں کے نام ابھرے — غرض تمل ناڈو میں اردو افسانہ کی عمر کو ۴۵ اور ۴۸ برسوں کے درمیان رکھا جاسکتا ہے جب کہ شمال میں اس کی عمر ۶۸ سال کی ہوتی ہے — شمال اور جنوب کی افسانوی مدت کا یہ تفاوت کیوں؟ اس کے جواب میں کئی وجوہات پیش کی جاسکتی ہیں۔ جن میں ایک یہ ہے کہ یہاں کے قلم کاروں کو اپنی تخلیقات چھپوانے کے وسائل مہیا نہیں تھے۔ جس کی وجہ سے ادیب یا تو لکھنے کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے یا لکھتے بھی تھے تو ان کے کارنامے پردۂ خفا میں ہی رہ جاتے تھے۔ ایک اور وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہاں ان دنوں شعر و شاعری کا کچھ ایسا چرچا تھا کہ اس کے آگے افسانوی ادب ایک بے وقعت اور بے لطف شئے ہوگیا تھا۔ اس وجہ سے افسانہ کے میدان میں قدم رکھنے کا خیال کسی کو نہ آیا۔ ایک تیسری وجہ یہ ہے کہ اس وقت اردو ادب پر ایسی ہستیوں کی چھاپ تھی جن پر علمی وقار اور سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ لہٰذا انھیں اپنے علمی وقار اور حد سے بڑھی ہوئی سنجیدگی نے صنفِ افسانہ کی طرف جسے وہ بازاری لٹریچر شمار کرتے تھے، توجہ دینے سے باز رکھا۔ بہرحال کچھ ایسی ہی وجوہات تھیں جن کی بنا پر تمل ناڈو میں اردو افسانے بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے قریب تک وجود میں نہ آسکے اور ۱۹۲۸ء میں "سفینہ" نکلا تو اس کے ساتھ ہی افسانہ نگار بھی اپنی تخلیقات کے ساتھ منظرِ عام پر آئے۔

یہ تھی ابتدا تمل ناڈو میں افسانے کی، رہی بات اس کے ارتقاء کی تو یہاں بھی اس کی وہی صورت ملتی ہے جو شمال میں ہے۔ رجحان کے معاملے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہاں کا افسانہ انھیں رجحانات سے گزرا ہے جن سے یہ شمال میں گزرا ہے۔ یعنی پہلے یہ رومانوی تحریک کے اثر میں رہا۔ اس کے بعد "حلقۂ اربابِ ذوق" کے اثر میں آیا۔ پھر ترقی پسند تحریک نے اسے اپنی باہوں میں گھیرا اور جب یہاں سے نکلا تو جدیدیت کی زلفِ پریشاں میں جا پھنسا۔ لیکن — اس کے باوجود آج تمل ناڈو کے افسانہ نگاروں میں بیک وقت مختلف رجحان ملتے ہیں۔ یہ بات عجیب تو ہے لیکن سمجھ میں نہ آنے والی نہیں۔ دراصل تمل ناڈو ان مقامات سے بہت دور رہا ہے — جہاں سے اردو میں یہ تحریکیں اٹھیں — اور یہاں کے ادیبوں نے خود کو جذباتی طور پر ان تحریکوں کے خانوں میں بانٹ لینے کی بجائے اپنی طبیعت کے میلان کی بنیاد پر ان سے رشتہ قائم کیا ہے جس کی وجہ سے یہ تعصب اور تنگ نظری سے بلند ہیں جو ایک دوسرے کی نظر سے گرا دیتی ہے۔ آج یہاں کے کسی مجلے یا رسالے کو کھول کر دیکھئے تو وہاں سبھی مکاتیبِ خیال کے ادیب و شاعر ایک ہی صف میں کھڑے ملیں گے۔ یہ بات میرے خیال میں وہ نیک شگون ہے جس سے ادب بٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی بجائے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے آگے بڑھتا ہے اور باہمی تعاون سے فروغ پاتا اور پروان چڑھتا ہے —! یہ ہے وہ کینواس جس کی سطح پر تمل ناڈو میں اردو افسانہ نگاری کی تاریخ ابھرتی ہے۔

سب سے پہلا افسانہ یہاں کس نے لکھا؟ یہ کہنا ذرا مشکل ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے "سفینہ" سے پہلے کسی ایسے رسالے کا پتہ نہیں چلتا جس میں یہاں کے ادیبوں کے افسانے شائع ہوئے ہوں۔ "سفینہ" کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۲۸ء میں نکلا تھا۔ اس شمارہ میں ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کا ایک مزاحیہ فیچر "میرے ایک قدیم عنایت فرما" کے نام سے شامل ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک بے تکلف دوست کی شخصیت کا خاکہ کھینچا ہے جو سرتاپا ظرافت کا نمونہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس تخلیق کو جو ظرافت کا بہترین نمونہ ہے اگر افسانہ کہا جاسکتا ہے تو اسی کو تمل ناڈو کا پہلا افسانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے اسے افسانہ نہیں کہا جاسکتا تو پھر اردو کے پہلے افسانہ نگار ہونے کا سہرا جناب محمد عبدالجبار بادشاہ (مرحوم) کے سر ہے جن کا ایک افسانہ "ٹارٹارن اور شیر کا شکار" کے نام سے اور مندرجہ ذیل نوٹ کے ساتھ "سفینہ" کے بعد کے ایک شمارے میں شائع ہوا ہے:

"الفانسے ودے ... فرانس کا ایک مشہور افسانہ نویس گذرا ہے ... بتیس سال کی عمر میں اس نے ٹارٹارن کے متعلق ایک نہایت ہی ظریفانہ ناول لکھا ... جس شہر کا اس میں تذکرہ ہے وہ جنوب فرانس میں واقع ہے۔ یہاں کے باشندے سادہ لوح

اور شین بگاڑنے میں مشہور ہیں۔ دودے نے اس عیب کی نہایت ہی لطیف پیرائے میں ہجو کی ہے۔ مندرجہ ذیل قصے کی بنیاد اسی ناول پر رکھی گئی ہے، لیکن جابجا مختلف مضامین بڑھا کر اس کو اپنا لیا گیا ہے۔ کہنے کو تو یہ دودے کے قصے کی تلخیص ہے لیکن فی الواقع اسی رنگ میں ایک نئی چیز ہے۔"

"سفینہ" سہ ماہی تھا۔ یہ غالباً تین سال تک نکلتا رہا۔ اس کے مختلف شماروں میں اس طرح کے کچھ اور افسانے بھی مل جاتے ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے اگرچہ کہ ان کی گنتی برائے نام ہے اور تکنیک کے لحاظ سے بھی یہ غیر معمولی نہیں ہیں۔ لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے یہ تاریخی اہمیت کے حامل ہیں اور افسانوی تاریخ کی اہم کڑی ہیں۔ ان افسانوں کی زبان وہی ہے جو اس دور میں شمال کے افسانوں میں ملتی ہے یا سجاد حیدر یلدرم وغیرہ کے ہاں ملتی ہے۔

۱۹۳۵ء میں عمرآباد (شمالی آرکاٹ) سے مولانا شاکر نائطی کی ادارت میں "مصحف" جلوہ گر ہوا تو افسانہ نگاروں کا گویا ایک کارواں نکل پڑا۔ جن میں ریاض جنیدی، سید موسیٰ کلیم یداللہی، ارشد حیدری، محمد لطف اللہ عدیل، حبیب خاں سرکش، اور خود مدیر رسالہ مولانا شاکر نائطی شامل ہیں۔ "مصحف" نے سات سال کی عمر پائی۔ اس کے ہر شمارہ میں ایک دو افسانے ضرور شامل ہوتے تھے۔ اس طرح سے بھی دیکھا جائے تو اس شائع شدہ افسانوں کی تعداد کافی نکل آتی ہے۔ اس دور کے افسانوں میں کچھ تو رومانوی رنگ کے حامل ہیں (جیسے "مسرت کی قیمت" از سید موسیٰ کلیم یداللہی، "یادِ محبوب" از ارشد حیدری۔ "لذیذ انتقام" از شاکر نائطی) اور کچھ فلسفیانہ مسائل کی بھی گتھیاں سلجھاتے نظر آتے ہیں (جیسے "شہید جستجو" از حبیب خاں سرکش) کہیں اخلاقیات کی بنیاد پر افسانے کے تانے بانے بنے گئے ہیں تو کہیں سماجی برائیوں کو ہدف قلم بنایا گیا ہے (جیسے "کشمکش حیات" از ریاض جنیدی)۔ گویا اس دور کے مصنفوں نے ادب کو فن کے لئے بھی برتا ہے اور زندگی کے لئے بھی! زبان و بیان کے معاملے میں اگلے دور اور اس دور کے افسانوں میں کچھ فرق جملوں کی ساخت آسان ہو گئی ہے۔ ثقیل الفاظ اور عربی مرکبات کا استعمال گھٹ گیا ہے۔ مجموعی طور پر اس دور کے افسانے فنی اور ادبی قدروں کے لحاظ سے پچھلے دور کے افسانوں سے بہتر ہیں۔

"مصحف" بند ہو گیا تو اس کے ساتھ ہی لکھنے والوں پر بھی مہر خموشی لگ گئی۔ اگر کسی نے اس کے بعد لکھا بھی تو اس کی تخلیقات کو منظرِ عام پر آنے کے لئے وسائل نہ ملے جس کی وجہ سے اگلے چھ سات سال تک یہاں کی افسانہ نگاری کی رفتار پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں۔

۱۹۵۰ء کے بعد سرزمین مدراس سے اردو رسائل سالناموں، ماہناموں اور ہفتہ وار کی شکل میں برابر نکلنے لگے جن میں مشعل (تاریخ اجرا جنوری ۱۹۵۱ء) فنکار (۱۹۵۱ء) فانوس خیال (۱۹۵۴ء) منزل (۱۹۵۶ء) پاکیزہ (۱۹۵۷ء) نجمہ (۱۹۵۸ء) طلعت رنگ (۱۹۶۳ء) ساون (۱۹۶۹ء) قلم دوش (۱۹۶۱ء) وغیرہ نے تمل ناڈو میں اردو افسانے کی تاریخ میں اہم رول ادا کیا ہے۔ کبھی کبھی ادبی انجمنوں کے آرگن کے طور پر بھی کچھ نمبر نکل جاتے تھے جن کے ذریعہ خاصی تعداد میں اچھے افسانے منظرِ عام پر آئے۔ ان میں گل نو (۱۹۶۶ء)، روپ رنگ (۱۹۷۴ء) اور فروغ اردو (۱۹۴۶ء) کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

اس درمیان میں کچھ ناول اور افسانوں کے مجموعے بھی زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئے۔ ناولوں میں "ننگا ماحول" (کے آر حسینی، ۱۹۵۹ء) "ہیرو" (رشید مدراسی، ۱۹۶۰ء) اور افسانوں کے مجموعوں میں "تاریخ گل" (ناشر اے جے اردو سیمینار، مدراس)، "برف سی اجلی" (علی اکبر آمبوری، ۱۹۶۵ء) اور روشنی کے بھنور (ناشر تمل ناڈو پبلیکیشنز مدراس ۱۹۶۷ء) کے نام خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں۔

۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۷ء تک کا زمانہ ایسا ہے کہ ایک طرف رومانوی تحریک کا اثر باقی رہا ہے اور دوسری طرف ترقی پسند تحریک تمل ناڈو میں اپنے قدم جماتی نظر آتی ہے۔ اول الذکر رجحان کے حامل افسانے "فانوس خیال" میں ملتے ہیں تو "فنکار" اور "منزل" نے ترقی پسند تحریک سے متاثر افسانوں کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔ "فانوس خیال" میں چھپنے والوں میں ین محمد حبیب اللہ مصباح الزماں، محمد عباس، خورشید حسین نقوی، حبیب اللہ بادشاہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ "فنکار" اور "منزل" میں شائع ہونے والے افسانہ نگاروں میں سید امان اللہ عباسی (مدراس) اور علی اکبر (آمبور) کے نام خاص طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

اس دور نے افسانہ نگاری کے فن کو کافی فروغ دیا ہے لیکن اس دور کے افسانہ نگاروں میں اکثر ایسے ہیں جو کبھی کبھی کسی رسالے کے مطالبے پر یا تفریح طبع کے لئے ایک آدھ افسانہ لکھ لیا کرتے تھے۔ انہوں نے افسانہ نگاری کی صنف کو مستقل طور پر نہیں اپنایا۔

اس دور میں یا اس سے کچھ پہلے کے لکھنے والوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی تخلیقات کو شائع کرانے کی طرف بہت بعد میں توجہ کی۔ ان میں ڈاکٹر عزیز تمنائی اور ڈاکٹر مشتاق علی کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر عزیز تمنائی کا فن "حلقہ ارباب ذوق" کے زیر اثر ہے جب کہ ڈاکٹر مشتاق علی صاحب کا جھکاؤ ادب برائے زندگی کی طرف ہے۔

۱۹۵۷ء کے بعد افسانہ نگاروں کی فہرست میں خاصہ اضافہ ہوا ہے۔ راہی صدیقی، ادیب بھارتی، ایس۔ ایم۔ حیات، امور ربانی، علی اکبر آمبوری رشید احمد فاروقی، نورس خیامی، راز امتیاز، رشید مدراسی، عابد صفی اور مہر طلعت آمبوری کے نام اس دور کے افسانہ نگاروں میں خصوصیت کے ساتھ پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ان میں راہی صدیقی، نورس خیامی اور راز امتیاز کا رجحان شاعری کی طرف زیادہ ہونے کی وجہ سے افسانہ نگاری کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ ادیب بھارتی۔ ایس ایم حیات، علی اکبر آمبوری۔ رشید احمد فاروقی

رشید مدراسی، عابد سفی اور مہر طلعت آمبوری نے افسانہ نگاری کی طرف کافی توجہ کی اور اس فن کو خاصا اونچا اٹھایا ہے۔ ادیب بھارتی اڈیئیل جدیدیت کے علمبردار ہیں۔ ان کے افسانے مختصر اور علامتی ہوتے ہیں۔ "ہلدی" اور "کرن پھول" ان کے اچھے افسانوں میں سے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ کتابت کے مراحل طے کر رہا تھا کہ موصوف کا انتقال ہو گیا۔

یس۔ یم۔ حیات نے اپنے ابتدائی دور میں کافی طبع زاد افسانے لکھے ہیں لیکن بعد میں خود کو دوسری زبانوں کے افسانوں کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ اس لئے ان کا تفصیلی ذکر آخر میں مترجمین کے ساتھ آئے گا۔

رشید احمد فاروقی کے افسانے "شاعر" بمبئی وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں، اور اپنے افسانوں کا تانا بانا بڑی دلکش رومانی فضا میں بنتے ہیں۔ ان کے افسانے "یہ آغاز — یہ انجام" میں ان کے اس رجحان کی اچھی عکاسی ملتی ہے۔

علی اکبر آمبوری نے اردو کے علاوہ ہندی میں بھی لکھا ہے۔ ان کے ابتدائی دور کے افسانوں کا ایک مجموعہ "برف سی اجلی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس کے تمام تر افسانے اخلاقی مضامین پر مبنی تو ہیں مگر وعظ و نصیحت کی خشکی



علی اکبر آمبوری

سے پاک اور دلچسپی سے پُر ہیں۔ پچھلے سات آٹھ برسوں میں آپ نے کافی افسانے لکھے ہیں۔ جو اچھے ہیں۔ اس دور کے افسانوں میں سماجی اور معاشرتی مسائل کو فنی دسترس کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کے افسانے "دو قدم کا فاصلہ" "جادو کا اثر" اور "دراڑیں" پیش کئے جا سکتے ہیں۔

رشید مدراسی نہ صرف تمل ناڈو کے بہترین افسانہ نگار ہیں بلکہ ملک کے اچھے افسانہ نگاروں میں ان کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کے بہت کم افسانے شایع ہوئے ہیں لیکن انھیں چند افسانوں سے انھوں نے ادبی حلقوں میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کر لیا ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے اعلیٰ اقدار کی قدر و منزلت۔ اور انسانی ہمدردی کی ترغیب بڑے ہی انوکھے پیرائے میں ملتی ہے۔ "ٹریولنگ بیگ" (نیا دور) اور "سفید گلاب" ان کے ہی نہیں پورے افسانوی ادب کے شاہکار ہیں۔

راقم الحروف کا شمار بھی تمل ناڈو کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے ابتدا میں ترقی پسندی کا رنگ غالب تھا۔ جس نے مجھ سے "سملج" (۱۹۵۷) اور "صبح کبھی نہ آئے گی" (۱۹۵۸) جیسے افسانے لکھوائے۔ لیکن آگے چل کر موضوعات میں وسعت پیدا ہو گئی۔ جس کا اندازہ "اجالا" (۱۹۷۳) "آشیرواد" (۱۹۷۵) اور "احساس کے آبگینے" کے مطالعے سے بخوبی ہو جائے گا۔ ان میں سماج سے لے کر نفسیات تک کے کئی مسائل دلکش رومانی فضا میں سانس لیتے ملتے ہیں۔

مہر طلعت آمبوری ریاست مدراس کی واحد خاتون افسانہ نگار ہیں جو نہ صرف خواتین کے رسالوں میں اپنا مقام پیدا کر چکی ہیں بلکہ دوسرے معیاری رسالوں میں بھی کثرت سے چھپ چکی ہیں۔ ان کے افسانوں کی فضا بڑی خوبصورت اور انداز بیان بڑا دل فریب ہوتا ہے۔ ان کے افسانے زیادہ تر رومانی ماحول میں سانس لیتے اور سماجی پہلوؤں کے ارد گرد چکر لگاتے ملتے ہیں۔ "نازک رشتہ" ان کے مقبول افسانوں میں سے ہے۔

۱۹۶۰ء سے پہلے کچھ افسانہ نگار ایسے بھی ہیں جن کی رسائی رسائل تک نہ ہو سکی۔ انہوں نے اپنے ذوقِ سخن کی خاطر قلمی رسالے نکالے۔ ان رسالوں میں "آواز" اور "شگوفہ" نے اچھے معیار کا مظاہرہ کیا۔ ان قلمی رسالوں کو کچھ ایسے لکھنے والے بھی ملے تھے جو اگر مشق جاری رکھتے تو آگے چل کر اچھے افسانہ نگار ثابت ہوتے۔ لیکن ان قلمی رسالوں کے ساتھ ہی ان کے قلم نے بھی دم توڑ دیا ان میں تنویر سعیدی اور رشاہد احمد قابل ذکر ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد افسانہ نگاروں کی ایک نئی پود سامنے آئی جن میں ظہیر آفاق، صلاح الدین پاشا برق، علیم الدین صبا نویدی، حسن فیاض، فضل جاوید فیاض حسین، احمد علی اعجاز، متین ہوش، فخر اعجاز، میر مومن علی، جہاں آرا، فاطمہ رئیس، وہاب نازش، سبیل عرفان، نثار احمد ریحان، نذیر احمد مشعل، نکہت اقبال، محمد منیر نیازی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

فضل جاوید نے ظرافت نگاری کو کامیاب طور پر اپنایا۔ "روشنی کے بھنور" (افسانوں کا مجموعہ) میں ان کے تین افسانے شامل ہیں۔ "میں کنوارا ہی رہوں گا" ان کے اچھے افسانوں میں سے ہے۔ جو "گل نو" میں شامل ہے۔

صلاح الدین برق کے افسانے اصلاحی ہونے کے باوجود بے حد دلکش ہوتے ہیں۔ آج کل آپ خلیل جبران کی تخلیقات کا اردو میں ترجمہ کرنے میں منہمک ہیں۔ جس کی وجہ سے افسانہ نگاری کی طرف ان کی توجہ کم ہو گئی ہے۔

علیم صبا نویدی، حسن فیاض، فیاض حسین اور سبیل عرفان کے ہاں جدیدیت کے عناصر ملتے ہیں۔ حسن فیاض اپنے افسانوں کے لئے ہمیشہ مقامی فضا کا انتخاب کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مقامی ماحول اور مقامی تہذیب کے اثرات ان کے افسانوں میں بڑی خوبصورتی سے نکھر آئے ہیں۔ جملوں کا

اختصار اور پلاٹ کا سلجھاؤ بھی ان کے افسانوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ علیم صبا نویدی کے ہاں بھی ان کی شاعری کی طرح افسانوں میں جدید رنگ ملتا ہے۔ علیم کے وہ افسانے جو ان کے ابتدائی دور کی نشانی ہیں اور جو "روشنی کے بھنور" میں بھی شامل ہیں ممکن ہے ہمیں نہ متاثر کر پائیں لیکن ان کے تازہ افسانے ہمارے دل و دماغ پر اچھا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کے ہاں علامت نگاری اچھی ہے۔ لیکن ابہام بہت زیادہ ہے۔ مختصر یہ کہ علیم صبا نویدی، حسن، فیاض، اور سبیل عرفان کے افسانوں میں جدیدیت کا عنصر غالب ہے۔ ان کا قلم اگرچہ ابھی فن ارتقا کی راہیں طے کر رہا ہے لیکن ان کے ہاں علامت نگاری اور ابہام کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ اور موضوعات میں تنوع بھی ہے۔

اردو افسانوی ادب کو دوسری زبانوں کے ترجموں سے مالا مال کرنے میں تمل ناڈو کی خدمات بیش بہا ہیں۔ ایس۔ ایم۔ حیات اور حسرت سہروردی نے اپنے ترجموں سے اردو افسانوی ادب میں اچھا اضافہ کیا ہے۔ ایس، ایم، حیات زیادہ تر تمل، ہندی، بنگالی اور ملیالم زبانوں کے افسانوں کو اردو میں منتقل کرتے ہیں۔ اب تک ان کے پچاس سے زیادہ ترجمے ملک کے بیشتر رسالوں میں جگہ پا چکے ہیں۔ ان میں کچھ ڈائجسٹ بھی ہوتے ہیں۔ اصل افسانے کے لب و لہجہ اور روح دونوں کو یہ اپنے ترجمے میں منتقل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ یہی ان کی انفرادیت ہے۔ دوسری بڑی خوبی ان کے ہاں یہ ملتی ہے کہ زبان بےحد شگفتہ اور شوخ ہوتی ہے — اس قدر شگفتہ اور شوخ کہ ان کے ترجمے ہونے پر بھی ترجمے ہونے کا گمان نہیں ہوتا۔ حسرت سہروردی کا تمل سے ترجمہ کیا ہوا افسانوں کا ایک مجموعہ "تمل افسانے" کے نام سے نیشنل بک ٹرسٹ سے شائع ہوا ہے۔ اردو ادب میں اسے ایک بیش بہا اضافہ کہنا چاہئے کیونکہ اس کے ذریعہ تمل افسانوی ادب کا ایک نمائندہ مجموعہ اردو داں طبقہ کے آگے آ گیا ہے۔ ان کے علاوہ کبھی کبھی انور ربانی اور وہاب نازش کے کئے ہوئے ترجمے بھی مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

تمل ناڈو میں اردو افسانے کے اس مختصر سے جائزہ کے بعد میں چاہتا ہوں کہ یہاں کے ناول نگاروں پر بھی کچھ لکھ جاؤں تاکہ ادب لطیف کے تعلق سے یہ مضمون نامکمل نہ رہ جائے۔

تمل ناڈو نے جہاں اتنے سارے افسانہ نگار پیدا کئے وہاں ناول نگار بہت کم پیدا کئے ہیں، بلکہ اب تک صرف دو کے نام منظر عام پر آ سکے ہیں۔ ایک کے، آر، حسینی، اور دوسرے رشید مدراسی۔

کے، آر، حسینی نے "ننگا ماحول" کے ‍ سے ایک ناول لکھا تھا جسے خود ہی ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔ اس ناول کا موضوع جنسی بے راہ روی اور صنف نازک کی بےبسی ہے۔ ناول اصلاح کی غرض سے لکھا گیا ہے لیکن انداز بیان اتنا رنگین اور عریاں ہو گیا ہے کہ اس کا حاصل صرف جنسی تلذذ رہ جاتا ہے۔ تکنیک، موضوع اور زبان و بیان کے لحاظ سے اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی لیکن تاریخ ناول نگاری میں اس کا ایک مقام بن گیا ہے کہ یہ مدراس یا تمل ناڈو سے شائع ہونے والا پہلا ناول ہے۔

دوسرا ناول رشید مدراسی کا ہے۔ رشید مدراسی افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین ناول نگار بھی ہیں۔ انہوں نے کئی ناول لکھے لیکن صرف ایک یا دو شائع ہو سکے۔ ایک ناول "ہیرو" کے نام سے مشورہ پاکٹ بکس دہلی نے شائع کیا۔ اور دوسرا "ہل اسٹیشن" کے نام سے ادارہ نگارش امرتسر نے خریدا۔ ان کے ناول زبان اور تکنیک کے لحاظ سے اردو کے بہترین ناولوں کی صف میں رکھے جا سکتے ہیں۔

بقیہ کالی کے دھبے

اندر داخل ہوئی۔ بچہ اس نورانی مجسمے کی طرح تھا جو چاندی میں تراشا گیا ہو۔ شانتا دوڑی ہوئی گئی اور بچے کو کملا کے ہاتھوں سے لے لیا۔ پیار سے اسے اچھالنے اور چومنے لگی۔ پھر اس نے ایک دلکش ادا کے ساتھ بچے کو رام لنگم کے قریب لے جا کر پُرمسرت لہجے میں کہا — "پپّو! دیکھا اپنے ڈیڈی کو۔ دیکھئے نا! کتنا پیارا ہے!! آپ کی چہیتی بیوی بھی آئی ہیں!" شانتا کی آواز جوشِ مسرت سے معمور تھی۔ اس کی ادا سرخوشی کا سرچشمہ تھی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد دوسرا تانگہ گھر کے سامنے آ کر رکا اور شنکر ہولڈال اور سوٹ کیس سنبھالے گھر میں داخل ہوا۔ بچے کو سینے سے لگائے شانتا اپنے شوہر کی طرف دوڑی۔

"اوہو ہو ہو ہو۔ دیکھ۔ دیکھ تیرے چاچا آئے ہیں!" وہ بچے کے چہرے پر جھک کر باتیں کرنے لگی۔ "پوچھ ان سے کہ انہوں نے آنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی کیا وہ یہ چاہتے تھے کہ پہلے تو آئے اور وہ بعد میں — اوں — ؟" وہ چہکنے لگی —

گھر میں پھیلی ہوئی سورج کی روشنی نے دیکھا، گھر کے ایک کونے میں نئے ماں باپ اپنے ننھے سے بچے پر اپنی بے پایاں شفقتیں نچھاور کر رہے تھے۔ ان کی مسرتوں کی حد نہ تھی۔ اس بچے نے جنم لے کر جیسے ان دونوں کی محبت کو گہرا بنا دیا تھا۔ اور گھر کے دوسرے کمرے میں شانتا شنکر کی باہوں میں سسک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

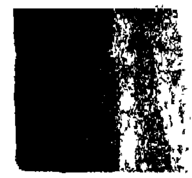
دو دن بعد شنکر اور شانتا کلکتہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

اور —

کالی کے وہ دھبے جو رام لنگم کی دھوتی اور شانتا کی ساری پر پڑے تھے وقت کی رفتار کے ساتھ مٹ گئے۔!!

(مترجم: ایس۔ ایم۔ حیات)

یعقوب اسلم
اسلامیہ ہائی اسکول وانمباڑی



تمل ناڈو کے ممتاز ادیب

تمل ناڈو کی سرزمین اردو زبان وادب کے مراکز سے دور واقع ہونے کے باوجود، اس کی نظم ونثر کے ارتقا، اور ہیئت واسلوب کے جدید اثرات ورجحانات سے یکسر نا آشنا نہیں ہے۔ زبان وادب کی عہد بہ عہد ترقی اور نشوونما میں اس نے جو اثرات مرتب کئے ہیں وہ تاریخ زبان کے انمٹ نقوش ہیں۔ تعلیمی میدان میں اس علاقہ نے ہمیشہ اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے برقرار رکھا ہے اور دولسانی فارمولہ رائج ہونے کے باوجود یہاں کے اُردو داں طلبہ کی اکثریت ایسی ہے جو اُردو زبان کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کرتی ہے۔ بعض لوگ تعلیم کو روزگار کے مسئلہ سے منسلک کرکے اُردو زبان کی اہمیت کو زیادہ محسوس نہیں کرتے لیکن انھیں بھی اُردو کو مادری زبان کی حیثیت سے سیکھنے اور اسے ترقی دینے سے انکار نہیں۔

تمل ناڈو میں، اُردو کتابوں اور اخبارات ورسائل کی اشاعت کے وسیع ذرائع نہیں ہیں۔ یہاں سے کوئی مستقل ماہنامہ یا ہفتہ وار رسالہ شائع نہیں ہوتا۔ یہاں سرکاری طور پر اُردو کی سرپرستی کم ہی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے بولنے والوں ہمدردوں اور معاونوں کا ایک بڑا طبقہ ہمیشہ اُردو کا سرپرست رہا ہے — مختلف انجمنیں اور ادارے اپنی رپورٹیں اور کارگزاریاں اُردو زبان میں شائع کرتے ہیں۔ لیکن یہاں کے ادیبوں، افسانہ نگاروں اور شاعروں کے لئے کوئی اچھا رسالہ یہاں سے شائع نہیں ہوتا اس لئے ان کی تخلیقات اکثر قلمی دستاویزات کے دائرے سے بہت کم باہر نکلتی ہیں۔ جہاں تک شاعروں کا تعلق ہے، مشاعروں میں انھیں کافی دادِ سخن مل جاتی ہے اور مشاعروں میں سامعین کی تعداد کی مناسبت سے ان کی مناسب تشہیر بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن جہاں تک نثر نگاری کا تعلق ہے اس کی ترویج وارتقا کے لئے یہاں مناسب وسائل کی بے انتہا کمی ہے۔

علاوہ ازیں یہاں کے بعض اہم نقاد، نثر نگار اور زبان داں ایسے ہیں جو متصوفانہ اور مذہبی اندازِ فکر کے حامل ہیں اور زبان اور اس سے متعلق مسائل کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی کاوشوں اور ان کے خیالات سے نجی صحبتوں میں تو استفادہ کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی نگارشات اور تحقیقات تک رسائی حاصل کرنا اور انھیں منظرِ عام پر لانا بہت مشکل ہے۔

ان تمام مسائل سے قطع نظر تمل ناڈو کی اردو نثر نگاری کا جائزہ تین مخصوص دائروں کے اندر لیا جا سکتا ہے۔ مذہب، ادب اور درس وتدریس۔

مذہبی مضامین

جنوبی ہند اور خصوصاً تمل ناڈو میں مسلمانوں نے اپنے مذہب اور اس سے متعلق روایات کو ہمیشہ مقدم رکھا ہے۔ اور مذہب جس طرح اپنی صحیح شکل وصورت میں اور پوری پابندیوں کے ساتھ اس سرزمین پر نظر آتا ہے، اس کی مثال کم ملے گی۔ چنانچہ یہاں ایسے لکھنے والوں کی اکثریت موجود ہے، جنھوں نے اسلام، فلسفۂ اسلام اور تاریخ اسلام کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے مولانا صبغۃ اللہ صاحب وفا بختیاری کا نام لیا جا سکتا ہے، جنھوں نے مذہب اور تصوف کے مسائل پر بے شمار مقالے تحریر فرمائے ہیں، مذہب اور تصوف سے متعلق حوالہ جات اور ماخذات کے سلسلہ میں مولانا کی شخصیت انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتی ہے۔ امثالِ قرآنی، عالمگیر ربوبیت، اقسام قرآنی، اسلام اور قربانی آپ کے بلند پایہ مضامین ہیں۔ آپ کی نثر ایک طرف عالمانہ شان اور ٹھوس موضوعات کی حامل ہے تو دوسری طرف زبان کی پختگی اور مشاقی کی شاہد بھی۔ آپ باقیات الصالحات ویلور میں درس دیتے ہیں۔ آپ ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔

ایک اور ممتاز نثر نگار مولانا عبدالسبحان اعظمی ہیں، آپ کے اجداد کا تعلق اگرچہ اتر پردیش کے علاقہ اعظم گڑھ سے ہے، لیکن مولانا کی ساری زندگی عمر آباد میں بسر ہوئی ہے، وہیں آپ نے تعلیم پائی اور وہیں درس وتدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ٹھوس علمی قابلیت کے مالک ہیں، تاریخ اور فلسفہ کے موضوعات پر آپ نے کئی مقالے تحریر فرمائے ہیں۔ مثلاً محمد بن قاسم ہندوستان میں، حقیقت وحی فلاسفہ یورپ کی نظر میں، خالق اور مخلوق کا رشتہ، وغیرہ آپ کی نثر میں متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ساتھ سادگی بھی بے انتہا پائی جاتی ہے۔

مولانا ابوالبیان حماد، اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ عمدہ نثر نویس بھی ہیں۔ آپ کے کئی مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ آپ نے حافظ ابن حجر عسقلانی رح کی کتاب "المنبہات" کو اردو کا جامہ پہنایا ہے جو "تازیانے" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ انداز نگارش نہایت سادہ اور دلکش ہے۔ آپ جامعہ دارالسلام عمر آباد میں تدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مولانا حنیفی باقیات الصالحات ویلور کے استاد ہیں۔ آپ کے اخلاقی اور مذہبی مضامین، مدنی اور دوسرے متعدد رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان مضامین میں، جہاں مذہبی معلومات ہیں وہیں زبان کی صفائی اور دلکشی کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔

مولوی جلال الدین انصر عمری کا تعلق ترپالور کے ایک قصبہ سے ہے۔ انہوں نے کئی کتابیں اور بے شمار مقالے تحریر کیے ہیں۔ جن میں "عورت، اسلامی معاشرہ میں" بڑی اہم تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ کئی اور کتابیں بھی دہلی سے شائع ہو چکی ہیں۔

مولوی اشرف سعودی، بلنجپور کے رہنے والے، باقیات الصالحات ویلور کے فارغ التحصیل ہیں۔ سبیل الرشاد بنگلور میں شیخ الحدیث کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مذہبی مضامین، اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

حافظ راجکوٹی بھی اس سلسلہ کے اچھے لکھنے والوں میں سے ہیں، حال ہی میں نواب سی عبدالحکیم سے متعلق ان کی ایک کتاب "محسن اعظم" شائع ہوئی ہے۔

ادبی مضامین

جہاں تک زبان، اصلاح زبان اور تنقید نگاری کا تعلق ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ تمل ناڈو میں اس سلسلہ کے کچھ نمایاں نام نظر نہیں آتے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہاں اس سلسلہ میں کچھ کام ہی نہیں ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہاں جتنا بھی کام ہوا ہے ٹھوس بنیادوں پر کیا گیا ہے لیکن ابلاغ و ترسیل کے مناسب ذرائع موجود نہ ہونے کی وجہ سے ان کی افادیت کا دائرہ محدود رہا۔

مولانا امانی ویلوری نے "صدائے جرس" اور آئینہ کے عنوانوں سے دو مقالے لکھے، جن میں حضرت امیر مینائی کی بعض اصلاحوں پر بحث کی گئی ہے۔ اور یہ بحثیں نہ صرف مواد کے اعتبار سے بلکہ اسلوب اور طرز ادا کے اعتبار سے بھی کافی دل کشی کا سامان رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ غزل کے اسلوب اور فن پر آپ کے مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ منبع الانوار عربی کالج لال پیٹھ کے پرنسپل ہیں۔

"غزل کا معشوق" مولانا کمالی ویلوری کا شاہکار مقالہ ہے۔ اس میں غزل کے معشوق کی تذکیر اور تانیث سے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ آپ کے دوسرے مضامین بھی بڑی گہرائی کے حامل ہیں۔

پروفیسر محمد یوسف کوکن عمری، مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو فارسی اور عربی کے صدر رہیں۔ آپ جنوبی ہند کے مشہور نائطی خانوادہ کے ایک ممتاز رکن ہیں۔ جامعہ دارالسلام عمرآباد سے فراغت کے بعد آپ نے دارالمصنفین اعظم گڈھ میں تحقیقی تربیت حاصل کی، نوابان آرکاٹ اور تمل ناڈو میں علمی اور ادبی سرگرمیوں سے متعلق آپ کی کئی تحقیقی کتابیں اور مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ "خانوادۂ قاضی بدرالدولہ" آپ کی نہایت اہم تصنیف ہے۔ آپ نے کئی نایاب، اردو فارسی اور عربی مخطوطات بھی تلاش کئے ہیں۔

پروفیسر حیدر علی خاں حیدر حال ہی میں مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی سے وظیفہ یاب ہوئے ہیں، شاعر کے علاوہ عمدہ نثر نویس بھی ہیں۔ افسانہ نویسی اور اردو ادب کی بعض ممتاز شخصیات سے متعلق آپ نے مضامین لکھے ہیں اور تمل ناڈو ٹکسٹ بک سوسائٹی کی مرتب کردہ کئی کتابوں کو اردو کا جامہ عطا کیا ہے۔

سید محمد یوشع اور حمزہ حسینی نے، فارسی اور عربی کے نادر مخطوطات اور اہم شخصیات کے متعلق تحقیقی مقالات تحریر کیے ہیں۔

پروفیسر جلال کنزلوی، اسلامیہ کالج وانمباڑی کے، شعبۂ اردو فارسی اور عربی کے صدر ہیں سنجیدہ مزاجی اور سلجھے ہوئے ذہن کی وجہ سے ان کی نگارشات میں پختگی اور انوکھا پن پایا جاتا ہے۔ "اقبال کا مرد قلندر" عنوان سے آپ کا ایک کتابچہ شائع ہو چکا ہے، جس میں اقبال کے اس محبوب کردار پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ آپ کا شمار تمل ناڈو کے ممتاز شعرا میں بھی کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر عزیز تمنائی، مدراس میں پریکٹس کرتے ہیں۔ وانم باڑی مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے صدر ہیں۔ اپنے سانیٹوں کا مجموعہ "برگ نوخیز" پر انہوں نے جو مقدمہ تحریر کیا ہے وہ سانیٹ کے موضوع پر تقریباً پہلا مضمون ہے۔ جس میں اس صنف سخن کے اسلوب اور ہیئت پر بحث کی گئی ہے جس کا تذکرہ ڈاکٹر عنوان چشتی نے بھی اپنی کتاب "اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے" میں کیا ہے۔

سالک نائطی، علامہ شاکر نائطیؒ کے فرزند ہیں۔ آپ کا مطالعہ کافی وسیع اور متنوع موضوعات پر مشتمل ہے۔ تصوف اور ادب سے متعلق موضوعات پر آپ کے مضامین مقامی اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ صحافت کا بھی اچھا تجربہ ہے۔ جامعہ دارالسلام عمرآباد سے متعلق ہیں۔

غیاث اقبال گورنمنٹ آرٹس کالج گڑیاتم کے شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔ جدید تنقید نگاری کا بڑا اچھا شعور رکھتے ہیں، کرشن چندر کے نسوانی کردار، اردو تدریس کے مسائل، تمل مشاعرے اور تمل کے بعض اہم شعراء کے علاوہ عصمت چغتائی اور ٹھاکر پوچھی پر ان کے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ نوجوان شعراء میں بھی ممتاز ہیں۔

جلال عرفان، اسلامیہ کالج وانمباڑی کے شعبۂ اردو سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے "اصغر کی قنوطیت" سے متعلق مقالہ تحریر کیا ہے ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔



ریاض اقبال بھی اسلامیہ کالج وانمباڑی کے شعبۂ اردو سے تعلق رکھتے ہیں۔ احتشام حسین اور دوسری بعض سربرآوردہ شخصیات سے متعلق ان کے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

دانش فرازی کا تعلق آمبور سے ہے۔ اور آج کل انجمن فروغ ادب وانمباڑی کے صدر کی حیثیت سے اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں کئی مقالات اور شاعروں کے کلام پر تقریظیں انہوں نے لکھی ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے انجمن فروغ ادب کا سوونیر مرتب کیا ہے۔

کاوش بدری نے تنقید نگاری کے ساتھ ساتھ صحافت کے میدان میں بھی بہت کام کیا ہے۔ "منزل" کے نام سے ان کا جاری کردہ ماہنامہ اگرچہ ناسازگار حالات کی وجہ سے زیادہ دنوں تک نہ چل سکا لیکن معیار کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ ترائیلے کے اسلوب اور ہیئت پر انہوں نے ایک مقالہ

تحریر کیا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو سے ان کے چند مقالے نشر ہو چکے ہیں۔

باز امتیاز صحافت کے مرد میدان ہیں۔ ساری زندگی اسی دشت کی سیاحی میں بسر کی۔ کافی دنوں تک مدراس کے "اتحاد" سے وابستہ رہے۔ تقریباً بارہ سال تک روزنامہ سالار بنگلور کے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ اور آج کل مدراس سے ایک ادبی ماہنامہ جاری کرنے کے لئے سرگرداں ہیں۔ ادبی اور تنقیدی میدان میں ان کا اہم مقام ہے۔ خصوصاً زبان پر عاید کردہ پابندیوں کے خلاف انہوں نے مضامین تحریر کیے ہیں۔

پروفیسر حسن سہروردی، جمال محمد کالج ترچناپلی کے صدر شعبہ اردو ہیں۔ آپ کی پہلی تصنیف "تذکرہ شعرائے قدیم نظر نگر" پروفیسر عبدالستار سہروردی کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ آپ نے تمل زبان کی معرکتہ الآرا تصنیف "تروکرل" کا اردو ترجمہ کیا ہے جو ساہتیہ اکیڈمی سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ کے تنقیدی مضامین آج کل، نیا دور، پونم اور کتاب نما میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آج کل اپنے تنقیدی مضامین کی ترتیب میں مصروف ہیں۔

اسی سلسلہ میں محمد حسین شاکر کا نام بھی آتا ہے، جنھوں نے تمل زبان اور اس سے متعلق موضوعات پر اردو میں مضامین تحریر کئے ہیں۔ تمل کے بعض شہ پاروں کو اردو کا جامہ بھی پہنایا ہے۔

فدوی باقوی کا تعلق باقیات الصالحات ویلور سے ہے۔ آپ کا ادبی اور تنقیدی شعور کافی پختہ اور سلجھا ہوا ہے۔ آپ نے "حاصل مطالعہ" کے نام سے زبان و ادب کے مختلف تنقیدی موضوعات پر ایک کتاب مرتب کی ہے — "مجدد جنوب" کے نام سے بانی باقیات الصالحات مولانا عبدالوہابؒ کی سیرت شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ جنوبی ہند کے فارسی گو شعراء کا تذکرہ بھی تقریباً تیار ہے۔

ذاکرہ غوث نے، مولانا باقر آگاہ ویلوری کی اردو تصانیف پر تحقیقی کام کر کے ایم لٹ کا مقالہ تحریر کیا ہے۔ "حیات عبدالحق کی چند جھلکیاں" اور بعض دوسرے مضامین نہایت عمدہ اسلوب میں اور ٹھوس مواد کی بنیادوں پر لکھے گئے ہیں۔

اسمٰعیل رفیقی کا تعلق برنام بٹ سے ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے "تروکرل" کے بعض حصوں کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ جو ماہنامہ ایشیا میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کے بعض تنقیدی مضامین اور انگریزی نظموں کے ترجمے بے مثال ہیں جو مشرقی اور مغربی علوم پر ان کی دسترس کی علامت ہیں۔

محمد زکریا فرید آمبور سے تعلق رکھتے ہیں۔ علمی موضوعات اور تحقیق زبان سے متعلق ان کے مضامین قابل قدر ہیں۔ بعض شخصیات پر بھی مضامین لکھے ہیں۔

عابد صفی کا شمار اگرچہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے تاہم انہوں نے بعض ادبی موضوعات پر مضامین بھی لکھے ہیں۔ اور آج کل تمل ناڈو کے شعرائے اردو کے تذکرے کی ترتیب میں مصروف ہیں۔

ملک العزیز کو صحافت کا بھی اچھا تجربہ ہے۔ انھوں نے صنعت و حرفت سے متعلق اور بعض ادبی موضوعات پر بلند پایہ مضامین لکھے ہیں۔

صلاح الدین برق نے افسانہ نویسی اور مختصر افسانوں کے موضوعات پر مضامین لکھے ہیں جو اس صنف کی اہمیت اور تکنیک پر روشنی ڈالتے ہیں۔

محمد یعقوب اسلم۔ راقم الحروف نے اردو گرامر نامی کتاب لکھی ہے۔ جس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ "صحافت اور اس کا ارتقاء"، "ناول کا موضوع" وغیرہ مضامین "مزاج گرامی"، "مجھے سکون چاہئے" اور "انٹرویو" وغیرہ انشائیے شائع ہو چکے ہیں۔ آج کل ایک کتاب "ابن صفی اور ان کے جاسوسی ناول" کی ترتیب میں مصروف ہوں۔ اور جنوبی ہند کے نظم و نثر کے فن کاروں کا ایک گلدستہ بھی زیر طبع ہے۔

درسی مضامین

تمل ناڈو میں ہائی اسکول کی جماعتوں تک اردو زبان ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے رائج ہے۔ حکومت تمل ناڈو کی جانب سے نصابی کتب تیار کی گئی ہیں۔ اور ان کا اردو ترجمہ بھی شائع کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ کی کافی کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔

تمل ناڈو ٹکسٹ بک سوسائٹی کی کتابیں شائع ہونے سے پہلے، نصاب کی تقریباً تمام کتابیں اے احمد باشاہ ایم اے، مالک کتاب گھر میل وشارم کی نگرانی میں چھپتی تھیں۔ انہوں نے اردو، سائنس، تاریخ، جغرافیہ، تقریباً ہر موضوع پر درسی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی کتابیں انداز نگارش اور اسلوب کے اعتبار سے۔ طلبہ کے معیار کو پیش نظر رکھ کر لکھی جاتی تھیں۔ ابتدائی مدارس سے لے کر ثانوی مدارس کی اونچی جماعت تک کے طلبہ کے لئے انہوں نے درسی کتابیں تیار کی ہیں۔

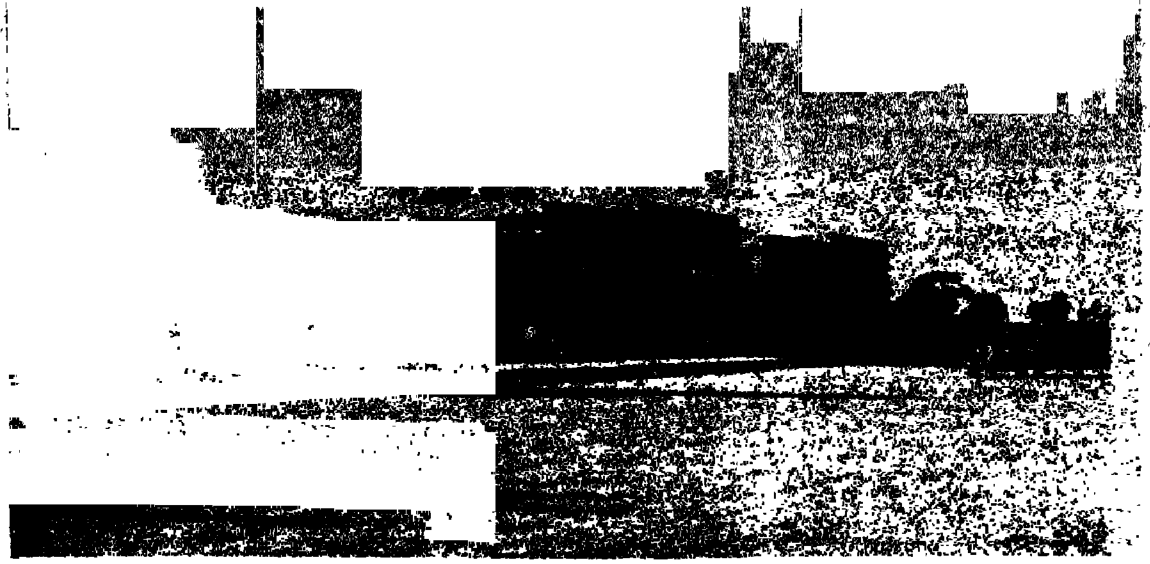
تمل ناڈو میں علم ریاضی سے متعلق اردو میں سب سے پہلے ین یم یحییٰ صاحب نے کتابیں لکھیں۔ اس موضوع پر ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو طلبہ کے معیار اور نصاب کے مطابق لکھی گئیں۔ اور فن کی مناسبت سے زبان بھی نہایت آسان استعمال کی گئی ہے۔ آپ مظہر العلوم ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے عہدہ سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی کی "سیرۃ النبی" کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔



سائنس کے موضوع پر آر سید غوث صاحب غوث نے کتابیں لکھی ہیں۔ "عجائبات سائنس" کے نام سے آپ کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی کتاب کیمسٹری کے موضوع پر ہے اور دوسری کتاب جنرل سائنس کے۔ آپ اردو کے اچھے شاعر بھی ہیں

تاریخ اور جغرافیہ کے موضوع پر کے عبداللطیف نے دو کتابیں "رہنمائے تاریخ و جغرافیہ" کے نام سے لکھی ہیں۔ تاریخ اور جغرافیہ کے وسیع

(بقیہ صفحہ ۸۲ پر)



سوز علی
۲۲، مسجد اسٹریٹ، سید اپیٹ
مدراس

تمل ناڈو میں اردو کی تعلیم

درجہ ابتدائی سے یونیورسٹی تک

تمل ناڈو کی مقامی زبان تمل ہے۔ مگر یہاں ۵ فیصد عوام کی زبان یقینی طور پر اردو ہے۔ یہ آبادی عام طور سے مسلم آبادی ہے۔ اس ریاست میں اردو دان کا اطلاق ان افراد پر بھی ہوتا ہے جو عرصۂ دراز سے تجارتی و معاشی ضرورتوں کی بنا پر تمل ناڈو میں بود و باش اختیار کیا ہے جیسے پنجابی سندھی وغیرہ۔

تمل ناڈو میں بظاہر اردو تعلیم و ترویج کا اچھا خاصا انتظام ہے۔ یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے اردو کی تعلیم کے لئے الگ مدارس (پرائمری مڈل اور ہائر) قائم ہیں۔ ان مدارس کے قیام میں ریاستی حکومت میونسپل پالٹیاں، پنچایت یونین، انجمنیں اور نجی ادارے غرض سبھوں نے حصہ لیا ہے۔ ریاست بھر میں اسکولوں اور کالجوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ نرسری اور پرائمری اسکول تو اتنے نزدیک ہیں کہ بچے پیدل جا سکتے ہیں۔ تقریباً ہر دو کلو میٹر کے نصف قطر میں ایک سکینڈری اسکول ضرور ہوگا۔ اور ہر آٹھ کلو میٹر کے نصف قطر کے مدور کے احاطے کے اندر ایک کالج ضرور ہے۔

پرائمری اور مڈل تعلیم

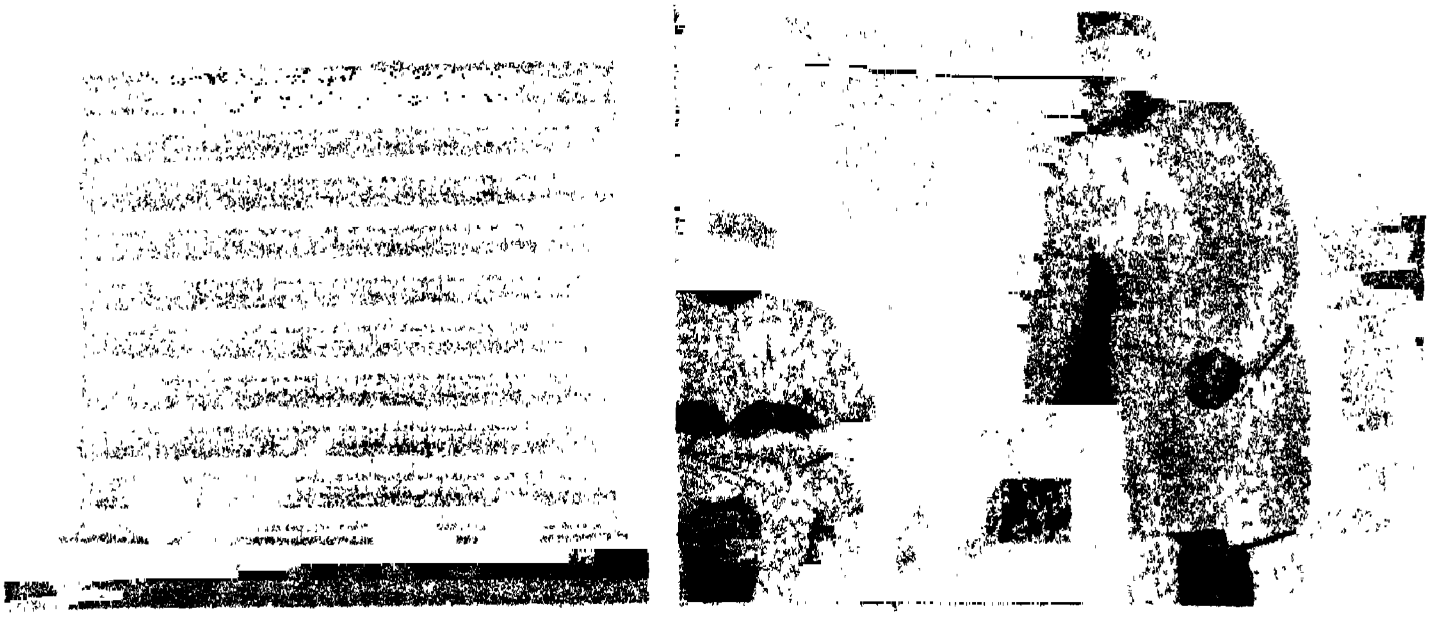
پہلے درجے سے پانچویں درجے تک کے بچے منظور شدہ اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں یا کسی غیر منظور شدہ نجی اداروں کے ماتحت چلائے جانے والے مدرسوں میں ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق تعلیم پانیوالے طلبا اور طالبات کا فیصد کچھ اس طرح ہے۔ طالبات ۴۷ فیصد، طلبا، ۵۲ فیصد۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ جن علاقوں میں نجی ادارے مصروف کار ہیں وہاں طلبا اور طالبات کا معیار تعلیم بہت اونچا ہے اور ان میں حاضری ۹۵ فیصد تک ہے اس کی وجہ یا تو ان مدارس کا قیام ان مقامات میں ہے جہاں اردو تعلیم کے لئے خصوصی مانگ ہے۔ اور والدین کا تعاون ان مدارس کے ساتھ اچھا ہے مگر کئی ایک مقامات میں حاضری بہت غیر اطمینان بخش اور درمیان میں سلسلۂ تعلیم ختم کر دینے والے طلبا کی اکثریت ہے۔ قیاس ہے کہ یہاں والدین کی غریبی اور غیر استحقاق یافتہ طبقہ کی علم سے بے توجہی ہے۔

مذکورہ بالا اسکولوں میں اکثریت ان کی ہے جہاں اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا ہے اگر یہاں اردو میڈیم سکشن نہ بھی ہوں تو کم از کم اردو زبان اول کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ (جہاں تک دینی تعلیم کا سوال ہے تعلیم کے معیار اور طلبا کی تعداد تسلی بخش نہیں۔ ۸ فیصد سے زیادہ بچے دینی تعلیم کی طرف رجوع نہیں ہوتے۔ ان بچوں کو اس تعلیم کے لئے مساجد اور خانقاہوں سے متصل دینی مدرسوں کی طرف رجوع ہونا پڑتا ہے۔ تمل ناڈو میں شروع ہی سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ بچوں میں اخلاقی کردار کی بلندی اور پاکیزگی کے لئے دینی تعلیم کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔)

اردو پرائمری تعلیم کے مسائل اور کم تعداد میں حاضری کے وجوہات یہ ہیں۔
(۱) والدین کی غریبی (۲) تعلیم کی اہمیت سے ناواقفیت (۳) اردو مدارس کی کمی یا فقدان (۴) مخلوط تعلیم کے مدارس میں بچوں کے داخلے سے پس و پیش (۵) غیر سرکاری مدارس کی غیر اطمینان بخش تعلیم (۶) نیم سرکاری مدارس میں اردو سکشنوں کی کمی (۷) طلبا کی کمی کی وجہ سے تدریسی شوق کی کمی۔ (۸) اساتذہ کی جدید طرز تعلیم اور اس کی تکنیک سے ناواقفیت (۹) ٹکسٹ بکس کی نایابی یا کم یابی وغیرہ

اردو دان طبقے کی کثیر آبادی شہر مدراس، ضلع شمالی آرکاٹ، ضلع جنوبی آرکاٹ، ضلع چنگل پیٹھ، سیلم، دھرم پوری، کوئمبتور، ترچی، مدورے



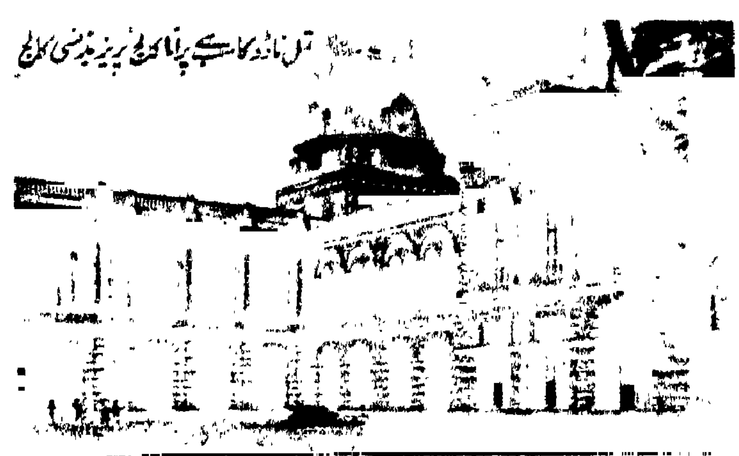
ساؤتھ انڈیا ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیر اہتمام تعلیمی مقاصد کے لئے بنائے جانے والی عمارت جس کا سنگ بنیاد ۱۶ اپریل ۱۹۷۶ء کو صدر جمہوریہ ہند جناب فخر الدین علی احمد نے رکھا تھا۔

اور دیگر اضلاع (بلا شمولیت رام ناڈ ترونیلی ویلی، کنیاکماری) میں پائی جاتی ہے جتنے بھی اردو مدارس ہیں انھیں مقامات میں پائے جاتے ہیں۔ طلبار کی حاضری پہلے کی بہ نسبت اب بہت کم ہوتی جارہی ہے۔

جہاں کہیں اردو پرائمری تعلیم کا انتظام ہے وہاں اکثر مقامات میں اردو سکینڈری تعلیم کا انتظام نہیں ہے۔ ان مقامات میں تمل میڈیم مدارس ضرور ہیں۔ مگر اردو داں طلبا، ان میں کسی طرح داخلہ نہیں لے سکتے۔ پرائمری میں طلبار کو تمل کی تعلیم اگر دی بھی جاتی ہے تو وہ معیاری حیثیت سے بہت معمولی ہے۔ اس کی بنا پر اردو طلبار تمل میڈیم سکینڈری اسکول میں داخل نہیں ہو سکتے۔ نتیجتاً ان کا سلسلۂ تعلیم منقطع ہو جاتا ہے یا انھیں اردو سکینڈری سکول کے لئے دور دراز مقامات کی طرف کوچ کرنا پڑتا ہے۔ غریب والدین کے لئے موخر الذکر صورت دشوار ترین ہوتی ہے۔ سکنڈری تعلیم میں دو لسانی ضابطۂ تعلیم سے بھی طلبار کی تعداد بٹ جاتی ہے۔ اکثریت شروع ہی سے تمل کی طرف مائل ہو جاتی ہے اس وجہ سے بھی تمل مدارس کی بہ نسبت اردو مدارس میں حاضری بہت کم رہتی ہے۔

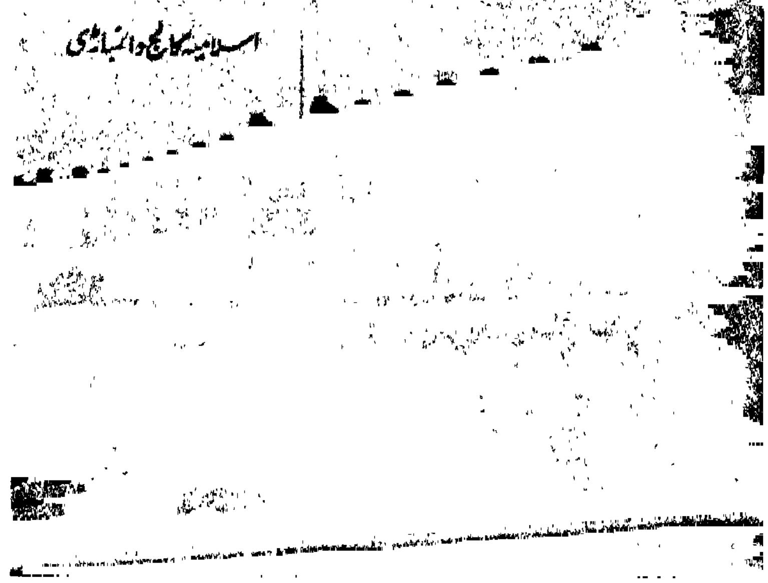
ریاست بھر میں جتنے اردو میڈیم سکول ہیں وہاں کہیں بھی اکیڈمک کورسس کے علاوہ تکنیکی تعلیم کا انتظام نہیں ہے۔ اس سبب سے بھی اردو مدارس پیچھے ہیں۔ معیاری تعلیم کی حیثیت سے ضلع شمالی آرکاٹ کے اردو مدارس بہت اچھی حالت میں ہیں۔ اس کی اہم وجہ ان مقامات میں عوام کی ذہنی بیداری ہے۔ یہاں والدین اور اساتذہ کا اردو مدارس سے اچھا ربط اور ان کے ساتھ پورا تعاون حاصل ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ضلع شمالی آرکاٹ میں عربی، فارسی اور اردو کے پرائمری اور اصلی مدارس کے منتظمین کی اکثریت لبابین پر مشتمل ہے جن کی گھریلو زبان تمل ہے مگر وہ اپنے بچوں اور بچیوں سے صرف اردو ہی میں ہمکلام ہوتے ہیں۔ اور یہ بچے بھی باہم اردو ہی میں بات چیت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت نے ضلع شمالی آرکاٹ کی مقامی زبان اردو کو قرار دیا ہے۔ جنوب بعید کے اضلاع مثلاً رام ناڈ، ترونیلی ویلی اور کنیاکماری کے لبابین حضرات



تمل ناڈو کا سب سے پرانا کالج پریزیڈنسی کالج





اسلامیہ کالج وانمباڑی

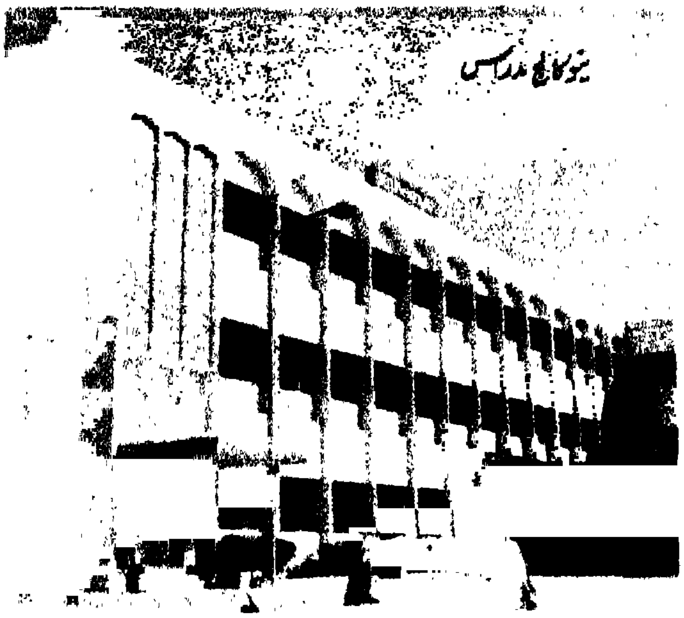
نے تمل کو مادری زبان کی حیثیت سے سیکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں اردو کی بہ نسبت مذہبی اکتساب کے پیش نظر عربی کا چلن عام ہے اور تمل زبان کو عربی رسم الخط میں لکھا کرتے ہیں۔ اور لاتعداد مذہبی تمل کتابیں عربی رسم الخط میں محفوظ ہیں۔

کالج کی تعلیم

پرائمری اور سکنڈری کی طرح کالج کی تعلیم میں طلبا کو زیادہ پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ سرکاری کالجوں کے علاوہ نجی اداروں نے بھی اہم مقامات میں کالج قائم کر لئے ہیں۔ جس تعداد اور شرح میں سکنڈری سے طلبا فارغ ہوتے ہیں۔ ان کے لئے یہ کالج کافی ہوتے ہیں ان طلبا کے لئے داخلہ کا مسئلہ بھی زیادہ پیچیدہ نہیں۔ وہ طلبا جن کی مادری زبان اردو ہے ان کو آسانی سے سرکاری اور نیم سرکاری کالجوں میں داخلہ نہیں ملتا۔ لہٰذا ان طلبا کی اعلیٰ تعلیم کے پیش نظر پورے تمل ناڈو میں اور بالخصوص شمالی آرکاٹ اور شہر مدراس میں نجی کالجوں کا قیام ہوا ہے۔

مدراس یونیورسٹی میں اردو تعلیم کے لئے بحیثیت پارٹ II اردو کو مقام دیا گیا ہے۔ مگر کسی بھی کالج میں بہ حیثیت میجر سبجکٹ اردو بی اے کے نصاب میں شامل نہیں ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو اردو ایم اے کا الحاق مدراس یونیورسٹی سے کبھی کا ہو چکا ہوتا —————— اب چونکہ بہت سے منظور شدہ کالجوں میں اردو بہ حیثیت زبان شامل نصاب ہو چکی ہے۔ اس لئے ایم۔ اے کی کلاسیں شروع ہو سکیں گی۔ مدراس پریسی ڈنسی کالج میں اردو کی تعلیم کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی اس کالج کی تاریخ۔ معلوم نہیں کن وجوہات کی بنا پر یہاں بی اے میں اردو کا خاتمہ کر دیا گیا۔ مگر پارٹ II کی حیثیت سے وہ اب بھی بحال ہے۔

یو جی سی نے ملیالم، کنڑی، تیلگو میں پروفیسر شپ کی منظوری یونیورسٹی کو دی ہے اور تمل اور ہندی میں سنہ ۷۷-۱۹۷۶ء سے ایم اے کورس کے آغاز کی اجازت مل چکی ہے مگر اس طرح کا کوئی مقام اردو کو حاصل نہیں ہوا۔ (معلوم ہوا ہے کہ سال رواں سے اردو میں ریڈر شپ مدراس یونیورسٹی کو مل گئی ہے) مدراس یونیورسٹی میں اردو ایم اے کا الحاق نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے اردو طلبا کو شمال اور آندھرا کی یونیورسٹیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے جس میں انھیں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کئی اداروں کی طرف سے مدراس یونیورسٹی کو اس امر کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔



نیو کالج مدراس

تمل ناڈو کی کل آبادی ۴.۰۵ کروڑ کے لگ بھگ ہے جن میں اردو داں اور غیر اردو داں مسلم مجموعی حیثیت سے ۶ فی صد ہیں۔ تعلیمی عمر کے پرائمری اور مڈل میں داخلہ لینے والے طلبا کی شرح ۹۰ فیصد ہے۔ سکنڈری مدارس میں داخلہ لینے والے طلبا ۳۲ فیصد اور کالج میں داخلہ لینے والے ۵۱ فیصد ہیں۔ پرائمری میں اردو طلبا کی تعداد ۵ فیصد اور سکنڈری میں ۵ فیصد ہے۔ کالج میں اردو طلبا کی شرح ۴.۰۵ فیصد ہے۔

تمل ناڈو کے وہ کالج جہاں اردو زبان کی تعلیم کا انتظام ہے۔

(۱) گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس (۲) گورنمنٹ پریسی ڈنسی کالج مدراس (۳) کوئن میرس کالج (زنانہ) مدراس (۴) آرٹس کالج (زنانہ) مدراس (۵) قائد ملت کالج (زنانہ) مدراس (۶) ایس آئی ای ٹی کالج (زنانہ) مدراس (۷) نیو کالج مدراس (۸) گورنمنٹ آرٹس کالج ویلور (۹) سی عبدالحکیم کالج میل وشارم (۱۰) مظہر العلوم کالج آمبور (۱۱) اسلامیہ کالج وانمباڑی (۱۲) گورنمنٹ کالج گڈیاتم (۱۳) جمال محمد کالج ترچی (۱۴) وقف بورڈ کالج مدورے (۱۵) جامعہ دار السلام عمر آباد (ضلع شمالی آرکاٹ) (۱۶) مدرسہ باقیات الصالحات ویلور (۱۷) مدرسہ لطیفیہ حضرت مکان ویلور وغیرہ۔

یوسف کوکن
شعبۂ عربی و فارسی مدراس یونیورسٹی
مدراس

تملناڈو میں عربی اور فارسی کے نادر مخطوطات

پہلی اور دوسری صدی ہجری ہی میں ملیبار میں اسلام پہنچ چکا تھا۔ اس لئے اس کے اثرات تمل ناڈو کے علاقوں میں بھی محسوس ہونے لگے۔ ۲۳۲ھ مطابق ۸۴۶ء میں مصر کا ایک گروہ محمد خلجی کی سرکردگی میں کنیاکماری کے ساحل پر پہنچا۔ خلقِ قرآن کے مسئلہ میں ان لوگوں میں مامون اور اس کے ہمنواؤں سے اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور جب جبراً اس مسئلہ کو ماننے پر مجبور کیا گیا تو وہ اپنا وطن چھوڑ کر جنوبی ہند چلے آئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت ابوبکرؓ کی اولاد میں تھے مدورے کے چولا بادشاہ جیادیا راج گردھپکرورتی نے ان کی بڑی آؤبھگت کی اور ان کے لئے ایک بڑی جاگیر عطا کی۔ یہ سب کایل پٹنم اور کیلکرے جیسے ساحلی مقامات پر آباد ہوئے۔ آگے چل کر اسی کایل پٹنم کو قاہرہ پٹنم لکھا جانے لگا۔ اور آج بھی جنوبی ہند کی تامل اور عربی تصنیفات میں قاہرہ پٹنم ہی لکھا جا رہا ہے۔ اور اس شہر کے بسنے والے قاہری کہے جاتے ہیں۔ ان کی مادری زبان عربی تھی لیکن آگے چل کر انہوں نے دیسی زبان اختیار کی اور دونوں زبانوں میں اظہار خیال کرنے لگے۔ یہ مذہبی لوگ تھے۔ ظاہر ہے کہ اپنے ساتھ تفسیر و حدیث و فقہ و کلام کی بہت سی کتابیں ساتھ لائے ہوں گے اور انھیں ایسی کتابوں کو جمع کرنے کا شوق رہا ہوگا۔ اب بھی ان کا یہ شوق باقی ہے۔ کایل پٹنم اور کیلکرے وغیرہ میں عربی علوم و فنون کی بہت سی تصنیفات قلمی صورت میں موجود ہیں۔

سلطان علاءالدین خلجی کی فتوحات سے پہلے بہت سے صوفی منش بزرگ یہاں پہنچ چکے تھے۔ ان میں سب سے نمایاں شخصیت شیخ نطھر ولی کی تھی جو ترچناپلی میں مدفون ہیں۔ ان کی تاریخ وفات "نور نور العین" بتائی جاتی ہے جس سے ۴۷۳ھ نکلتی ہے۔ انہوں نے یہاں روحانیت کی تبلیغ کی اور لوگوں کو بہت متاثر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ترک تھے۔ اور حضرت شیخ شہاب الدین ابو حفص عمر بن محمد بن ابی عبداللہ سہروردی کے عقیدت مند تھے۔ ان کی اولاد اب تک سہروردی کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے ساتھ نہ صرف مسلمانوں کو دلی لگاؤ ہے بلکہ ہندو بھی ان کی دل سے عزت اور قدر کرتے ہیں اور ان کے مزار پر اپنی عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔

ان کے بعد شیخ میراں محی الدین عبدالقادر گنج سوائی کا مرتبہ ہے جو مانکپور سے آئے اور شیخ محمد غوث گوالیاری کے شاگرد تھے۔ جنوبی ہند کے مختلف مقامات کا دورہ کیا اور ناگور پہنچے وہاں ۹۷۸ھ میں وفات پائی وہ اسی ساحلی مقام پر مدفون ہیں۔ ان کا مزار ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں قابل احترام سمجھا جاتا ہے۔ ان سے مسلمانوں کو جتنی عقیدت ہے اس سے زیادہ ہندوؤں اور عیسائیوں کو ہے۔ ۱۱ر جمادی الثانی کو ان کا عرس ہوتا ہے تو ہزاروں عقیدت مند یہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کی شان میں عربی فارسی دکھنی اور تمل میں بے شمار قصیدے لکھے گئے ہیں اور اب تک لکھے جا رہے ہیں ان کے ذریعہ نہ صرف عربی و فارسی علوم و فنون کی یہاں ترویج ہوئی بلکہ سلوک اور تصوف پر بہت ساری کتابیں لکھی گئیں۔

محمد بن تغلق کی غلط پالیسی کی وجہ سے بہمنی حکومت نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا تو بہت سے علماء و فضلا بیدر چلے آئے پھر جب بیجاپور میں عادلشاہی حکومت قائم ہوئی تو ایران کے بہت سے ادیب اور شاعر بھی یہاں جمع ہو گئے اور جب اورنگ زیب نے ان سلطنتوں کا خاتمہ کیا تو بیجاپور کے اکثر خاندان جنوب میں منتقل ہو گئے۔

نواب ذوالفقار نصرت جنگ نے قلعۂ جنجی کو فتح کرنے کی کوشش کی. جو جنوبی آرکاٹ کا ایک مضبوط قلعہ تھا۔ اس نے ۱۱۰۹ھ میں اس کو فتح بھی کر لیا تھا۔ مگر پھر یہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ آخر نواب سعادت اللہ خاں نے ۱۱۲۵ھ میں اس کو دوبارہ فتح کیا۔ اور آرکاٹ میں اپنی سلطنت قائم کی تو بیجاپور کے بہت سے خاندان اس طرف آکر آرکاٹ ویلور، پیارم پیٹ آمبور، وامباڑی، ترتپور، چنگل پیٹ، وندواسی، جنجی (جس کا نام اب نصرت گڑھ ہو گیا تھا) بیل پور، وردا چلم، ترچناپلی، مدورے، تنجاور وغیرہ میں آباد ہونے لگے۔ ویلور میں سید شاہ ابوالحسن قربی (۱۱۱۸—۱۱۸۲ھ) کے والد سید شاہ عبداللطیف نقوی آکر آباد ہوئے۔ یہ پورا خاندان اقطاب ویلور کے نام سے مشہور ہے۔ قربی کے فرزند سید شاہ عبداللطیف ذوقی (۱۱۵۱—۱۱۹۴ھ) فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ ایک نشست میں سات سو شعر کہہ ڈالتے تھے۔ انہوں نے اپنے لئے اور اپنے ساتھیوں کے لئے سینکڑوں کتابیں نقل کر ڈالیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے زود نویس تھے۔ ایک رات میں پوری گلستاں نقل کر ڈالی۔ مولانا باقر آگاہ (۱۱۵۸—۱۲۲۰ھ) ان کے محبوب ہمدرد اور ساتھی تھے۔ دونوں کی بیت بازی دن رات چلتی رہتی تھی۔ ان میں سے کوئی ایک مصرعہ کہتا تو دوسرا فوراً گرہ لگا دیتا تھا۔ ذوقی کی تصانیف میں اس کی بہت سی شہادتیں ملتی ہیں۔ آگے چل کر اس خاندان میں ایک اور بزرگ سید شاہ عبداللطیف ثانی ۱۲۰۷ھ میں پیدا ہوئے جنہوں نے ملک العلماء مولوی علاءالدین احمد المتوفی ۱۲۴۲ھ داماد ملا عبدالعلی بحرالعلوم مرحوم سے مدراس میں علم حاصل کیا تھا۔ دو مرتبہ حج ادا کیا۔ انگریزوں

کی مخالفت کا الزام لگا اور چند روز تک انھیں چتور کی جیل میں رکھا گیا۔ ۱۲۰۹ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال کیا۔ جنوبی ہند کے لوگ انھیں "قطب ویلور" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں فصل الخطاب بین الخطاء والصواب، جواہر الحقائق اور جواہر السلوک بڑے پایہ کی کتابیں ہیں۔ ان بزرگوں نے سینکڑوں عربی و فارسی کے قلمی نسخے خریدے اور خود بھی بیسیوں کتابیں نقل کیں۔ مگر آگے چل کر صحیح نگراں کار کے نہ ہونے کی وجہ سے جس کے ہاتھ جو لگا اٹھالے گیا اب صرف چند ہی نسخے دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور میں پائے جاتے ہیں۔

بیجاپور کا ایک اور خاندان نظام الدین احمد کبیر کا خاندان ہے جن کے پوتے نظام الدین احمد صغیر المتوفی ۱۱۸۹ھ کتابوں کو جمع کرنے اور خود بھی ا کرنے کے شائق تھے۔ ان کے شخصی کتب خانہ کی ایک قلمی فہرست ابتک اس خاندان میں محفوظ ہے۔ ہر کتاب کے نیچے بخط خود یا بخط ناصر یا بخط محمد غوث لکھا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں ایسی ہیں جن کو قاضی نظام الدین احمد صغیر اور ان کے بیٹے ناصر الدین محمد المتوفی ۱۲۰۶ھ اور پوتے مولوی محمد غوث شرف الملک بہادر المتوفی ۱۲۳۸ھ نے اپنے ہاتھ سے نقل کر ڈالیں۔ فتح الباری اور عمدۃ القاری کی پوری جلدیں ان تینوں نے نقل کی ہیں۔ اس کی ایک فہرست ہم نے اپنی کتاب "خانوادۂ قاضی بدرالدولہ" میں نقل کی ہے۔ کتابوں کے جمع کرنے اور نقل کرنے کا شوق شرف الملک بہادر کے صاحبزادوں مولوی عبدالوہاب مدار الامراء بہادر المتوفی ۱۲۸۵ھ اور مولوی محمد غوث قاضی بدرالدولہ المتوفی ۱۲۸۰ھ کو بھی رہا ہے مولوی عبدالوہاب اپنی وفات سے تین دن پہلے تک ابن حجر ہیتمی کی کتاب "الجوہر المنظم ونزیادۃ المکرم" نقل کرتے رہے۔ دونوں نے حج ادا کئے اور اس موقع پر باہر سے بہت سی عربی اور فارسی کی کتابیں خرید کر یا نقل کر کے لے آئے۔ پھر ان دونوں کے صاحبزادوں اور ان کی اولاد نے اس ذخیرے میں اور اضافہ کیا۔ قاضی بدرالدولہ کے فرزند ارجمند صدارت خاں بہادر نے سات مرتبہ حج کیا اور ہر مرتبہ بہت سی کتابیں خرید کے یا نقل کر کے لے آئے۔ مولوی مفتی محمود صاحب فرزند قاضی بدرالدولہ صاحب نے بھی سات مرتبہ حج کیا اور کئی مرتبہ شمالی ہند کا سفر کیا اور ہر مرتبہ بہت سی کتابیں لے آئے۔ ادھر مولوی سید محمد اسحٰق طراز ش خان بہادر داماد مولوی عبدالوہاب مدار الامراء بہادر بہت اچھے خطاط تھے۔ انہوں نے بیسیوں کتابیں نقل کر ڈالیں۔ مولوی حسین عطاء اللہ صاحب فرزند قاضی بدرالدولہ بے حد خوش نویس تھے۔ انہوں نے حافظ ابن حجر کی کتاب تقریب التہذیب اس خوبصورتی سے نقل کی ہے کہ آنکھوں سے لگالینے کو جی چاہتا ہے۔ اس خاندان میں خطاطی کی مختلف تختیاں موجود ہیں جن کو سامنے رکھ کر خطاطی کی مشق کی جاتی تھی۔ یہ ساری تفصیل خانوادۂ قاضی بدرالدولہ میں موجود ہے۔

غرض اس خاندان کے مختلف افراد نے عربی اور فارسی کی ضخیم سے ضخیم کتابیں نقل کر ڈالی ہیں۔ آج اس شخصی کتب خانہ میں ساڑھے چودہ ہزار عربی اور فارسی کی قلمی کتابیں ہیں اور بائیس ہزار کے قریب مطبوعہ کتابیں ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس خاندان کے افراد میں کتابوں کے جمع کرنے اور نقل کرنے کا بے پناہ جذبہ موجود تھا۔ کتابوں کے علاوہ نوابان کرناٹک کے سینکڑوں دیدہ زیب پروانے بھی موجود ہیں۔

اس خاندان سے منسلک ایک مشہور کاتب غلام محمد بھی تھے۔ جنہوں نے بیسیوں عمدہ کتابیں نقل کی ہیں جو اس کتب خانہ کی زینت بنی ہوئی ہیں۔

جنوبی ہند کی کتابوں کے ذخیروں کو چھاننے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر ایک نواب کا اپنا ذاتی کتب خانہ ہوتا تھا۔ جس سے اس دور کے علماء و فضلا اور ادبا و شعراء استفادہ کیا کرتے تھے۔ نواب سعادت اللہ خاں اور ان کے بڑے بھائی نواب غلام علی اور پھر غلام علی کے فرزند نواب باقر علی خاں اور پھر نواب سعادت اللہ خان کے بڑے بھائی نواب غلام علی خاں کے فرزند دوست علی اور ان کے فرزند نواب صفدر علی اور ان کے داماد شمس الامراء چندا صاحب کے ذاتی کتب خانے تھے جس سے نہ صرف یہ نواب استفادہ کرتے تھے بلکہ اپنی دولت سے علماء و فضلاء کو بھی لیس استفادہ کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ جب نوائط کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور نواب انور الدین خان گوپاموی نے ۱۱۵۷ھ میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ تو انہوں نے بھی ایک سرکاری کتب خانہ قایم کیا جس کو ان کی شہادت ۱۱۶۳ھ کے بعد ان کے دونوں بیٹوں نواب محفوظ خان بہادر اور نواب محمد علی والاجاہ المتوفی ۱۲۱۰ھ نے بڑی ترقی دی۔ شمال کے ادیب اور شعرا اپنی کتابیں تحفۃً بھیجا کرتے تھے اور انعام پاتے تھے۔ نواب محمد علی والاجاہ کے دو مشہور فرزند تھے۔ ایک نواب عمدۃ الامراء ۱۲۱۶ھ اور دوسرے نواب امیر الامرا المتوفی ۱۲۰۳ھ ان دونوں کے ذاتی کتب خانے تھے۔ مگر اس لحاظ سے جنوبی ہند کی تاریخ میں تاج الامراء المتوفی ۱۲۱۶ھ فرزند نواب عمدۃ الامراء کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ تاج الامراء ایک بدیہہ گو فارسی شاعر اور زبردست ناقد تھے۔ بڑے بڑے شعراء کی غلطیاں بتائی تھیں اور ان میں اصلاح دی تھی۔ افسوس ہے کہ نوجوانی میں ان کی موت نے ان کے بیش بہا ذخیرۂ کتب کو بھی بکھیر دیا۔ آج گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹس لائبریری مدراس کی اکثر کتابیں ایسی ہیں جن پر تاج الامراء کی سرکاری مہر لگی ہوئی ہے۔ فارسی کے بہت سے دواوین ایسے ہیں جو کسی اور جگہ نہیں ملتے۔ مولوی باقر آگاہ نے شیعہ اور سنی تنازعات کے سلسلے میں ۱۲۰۷ھ سے ۱۲۱۶ھ تک چودہ رسائل لکھے ہیں۔ ان میں سینکڑوں کتابوں کے حوالے ہیں جن کو ان سرکاری کتب خانوں میں رکھا گیا تھا آج بعض کتابیں کسی اور جگہ نہیں مل رہی ہیں۔ نوابی دور کے ختم ہونے کے بعد یہ سارے بہترین ذخیرے بکھر گئے۔ صرف کتابوں میں ان کا نام باقی رہ گیا ہے۔

نواب امیر الامراء کے صاحبزادے نواب عظیم الدولہ پوتے نواب اعظم جاہ اور پر پوتے نواب غلام غوث خان بہادر المتوفی ۱۲۷۵ھ کے ذاتی کتب خانے تھے۔ جب قرضہ جات کی ادائیگی کا سوال آیا تو محلوں اور ان کے سازوسامان کے ساتھ ان کی کتابیں بھی نیلام ہو گئیں جس کو جس کا ذوق تھا کوڑی کے دام اٹھالے گیا۔

نواب محمد علی والاجاہ (المتوفی ۱۲۱۰ھ) کے آخری دور میں ایک زبردست ریاضی داں اور نجومی گزرے تھے جن کا نام حافظ احمد خاں بہادر تھا۔ ان کی دو کتابیں اعظم الحساب اور مراۃ العالم بہت مشہور ہیں۔ اہالیان مدراس ان کو ایک مسجد کی بانی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ لیکن یہاں کے اہل علم کو اس کا پتہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ذہین ریاضی داں اور نجومی تھے۔ مدراس کی رصدگاہ میں بیٹھ کر رات میں ستاروں اور سیاروں کی چال کا معائنہ کرتے تھے۔ وہ مولانا عبدالعلی بحر العلوم المتوفی ۱۲۲۵ھ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے نہ صرف اپنی تصنیف کی ہوئی کتابیں نقل کی ہیں بلکہ بحر العلوم کی شرح مثنوی مولانا روم تین جلدوں میں نقل کی ہے۔ پہلی جلد ۱۲۲۵ھ میں لکھی ہے جب کہ بحر العلوم زندہ تھے۔ دوسری دو جلدیں بحر العلوم کی وفات کے دوسرے سال یعنی ۱۲۲۶ھ میں نقل کی ہیں۔ خط بڑا ہی دیدہ زیب اور پیارا ہے۔ بلاشبہ ان کی خوش خطی ان کی خوش طبعی اور خوش مذاقی کی دلیل ہے۔

جنوبی ہند کے لوگ میر حسین علی کرمانی کو ایک مورخ کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ انہوں نے نشان حیدری اور تذکرۃ البلاد والحکام کے نام سے بڑی عمدہ کتابیں لکھی ہیں۔ وہ اپنے دور کے مشہور خطاط بھی تھے۔ انہوں نے اپنی ہی نہیں بلکہ دیگر اہل قلم حضرات کی بہت سی کتابیں نقل کی ہیں۔

غلام محی الدین معجز۔ المتوفی ۱۲۲۹ھ اپنے زمانہ کے بہترین فارسی اور اردو کے شاعر تھے۔ مولوی باقر آگاہ المتوفی ۱۲۲۰ھ اور مرزا علی بخت اظفری المتوفی ۱۲۳۴ھ کے شاگرد تھے۔ معجز کے فرزند مولوی عبدالقادر ناظر المتوفی ۱۲۴۳ھ بہترین خطاط تھے۔ انہوں نے اپنے والد ماجد کے قصائد غزلیں، رباعیات وغیرہ نقل کی ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی کئی کتابیں دیوان صاحب باغ مدراس کے کتب خانے میں پائی جاتی ہیں۔

سراج العلماء مولوی محمد سعید اسلمی المتوفی ۱۲۷۲ھ اپنے دور کے بہترین مصنف تھے۔ انہوں نے ایک زمانہ مکہ اور مدینہ میں گزارا ہے عربی اور فارسی پر عبور تھا۔ حرم کے لوگوں کی استدعا پر حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کی مشہور کتاب تحفۂ اثنا عشریہ کا عربی میں الصولۃ الحیدریہ کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ اسی طرح فقہ شافعی پر فارسی میں مفید الطالبین کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے زکوٰۃ کے ابتدائی ابواب تک پہنچ کر رہ گئے ہیں۔ انہوں نے مواہب الرحمان کے نام سے فارسی میں ایک بسیط تفسیر بھی لکھی ہے۔ آخری دو پاروں کی تفسیر شائع ہو گئی ہے باقی اجزا قلمی صورت میں موجود ہیں۔ اسلامی عقاید پر سبیل النجات کے نام سے ایک بہترین کتاب تحریر کی ہے۔

قاضی ارتضا علی خاں المتوفی ۱۲۷۰ھ اور ان کے شاگرد رشید مولوی محمد حسین تمنا المتوفی ۱۲۷۷ عالم جلیل تھے انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں اور اپنے زمانے کے بہترین کاتبوں سے اپنی کتابیں لکھوائی ہیں۔ مولوی محمد حسین شیریں سخن خاں راقم المتوفی ۱۳۰۳ بھی زبردست ادیب، شاعر اور خطاط تھے۔ مولوی محمد مہدی واصف المتوفی ۱۲۹۰ھ نے بھی کئی کتابیں لکھی اور نقل کی ہیں۔ غرض یہاں نقل کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ ہر ایک خطاطی کا فن سیکھتا تھا۔ خود ہی کتاب کو نقل کرتا تھا اور پھر خود ہی بین السطور یا جدول کے اطراف حواشی اور ہوامش لکھا کرتا تھا۔ ان کتابوں کو بڑی احتیاط سے اٹھاتا تھا۔ رحلوں پر رکھ کر ان کا مطالعہ کرتا تھا اور پھر چھینٹ کے کپڑوں کی جنبیوں اور جزدانوں میں رکھتا تھا۔ آج دیوان صاحب باغ مدراس کی اکثر کتابیں ان جزدانوں میں رکھی ہوئی ہیں۔ حکومت ہند کے کہنے پر گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹس لائبریری مدراس کے کیوریٹر پھر لائبریرین کے ڈائرکٹر نے ان قلمی کتابوں کا معائنہ کیا تو یہ دونوں یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گئے کہ یہاں کے خاندان اہل علم نے ان کتابوں کی بڑی عمدہ حفاظت کی ہے۔ کیڑوں سے بچانے کے لئے جہاں سرکاری اداروں میں اتنا بہت سا روپیہ کیمیکل سیلوں پر صرف کیا جا رہا ہے، ان شخصی کتب خانوں میں صرف نیم کا پتہ ڈال کر جنبیوں اور جزدانوں میں رکھ کر ان قلمی کتابوں کی حفاظت کی جا رہی ہے۔

تمل ناڈو میں عربی اور فارسی کی قلمی کتابوں اور پروانوں، اور دستاویزوں کا سب سے بڑا بیش بہا ذخیرہ دیوان صاحب باغ کے اندر موجود ہے۔

کتب خانہ دیوان صاحب باغ مدراس

۱۔ قرآن مجید۔ مطلا۔ یہ طلاکاری اور زرفشانی کا بہترین نمونہ ہے۔ ہر صفحہ پر چھ سطریں ہیں۔ اوپر اور نیچے کی دو دو سطریں نیلی روشنائی سے اور بیچ کی دو سطریں دھیمی سرخ روشنائی سے لکھی گئی ہیں۔ بیچ کی دو سطریں دوسری چار سطروں کی بہ نسبت ذرا جلی قلم سے لکھی گئی ہیں۔ اطراف کی جدولیں سونے کے پانی سے کھینچی گئی ہیں۔ حیرت ہے کہ تین سو سال سے زیادہ کے گزرنے کے بعد بھی روشنائی کا رنگ پختہ اور چمکدار ہے۔ اس کو زین الدین علی بن میر حبیب نے کشمیر کے امیر الامرا، تربیت خاں کے لئے ۱۰۵۰ھ میں لکھا تھا۔ یہ پتہ نہیں لگتا کہ یہ نسخہ کشمیر سے کس طرح گھومتا ہوا اس کتب خانہ میں پہنچا ہے۔

۲۔ فہرست قرآن۔ یہ قرآن مجید کے الفاظ کی ابجد کے مطابق فہرست ہے جس کو ٹیپو سلطان استعمال کیا کرتے تھے۔ ان کی شہادت کے بعد کوئی مدراس لے آیا۔ اور تاج الامرا کے کتب خانے کی زینت بنا اور جب نواب غلام غوث کی وفات کے بعد ان کی ساری چیزیں ہراج ہوئیں تو اس کو شاید مولوی عبدالوہاب مدار الامرا نے خرید لیا۔

۳۔ احکام اہل الذمہ۔ حافظ ابن قیم المتوفی ۷۵۰ھ نے اس میں اہل ذمہ کے متعلق بڑی عمدہ قانونی بحثیں کی ہیں۔ ساری دنیا میں یہ ایک ہی نسخہ ہے دمشق کی کلیۃ الادب کے پروفیسر ڈاکٹر صبحی صالح نے بڑی محنت کے ساتھ اس کو دو ضخیم جلدوں میں ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۱ء میں دمشق سے شائع کیا ہے۔ اصل نسخہ کی کتابت ۲۱ رجمادی الثانی ۷۶۹ھ کو اتوار کے دن ختم ہوئی ہے۔ غالباً مولوی عبدالوہاب مدار الامرا، اس کو مکہ یا مدینہ سے خرید لائے تھے۔

۴۔ کتاب المصباح المضی فی کتاب النبی العربی الامی۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے زمانہ کے کاتبین وحی کے حالات پر ابن حدیدہ انصاری نے ۷۸۹ ہجری میں کتاب لکھی ہے۔ ڈاکٹر رشاد عبدالمطلب ڈائرکٹر جامعۃ الدول العربیہ قاہرہ کے قول کے مطابق سب سے زیادہ عمدہ اور صحیح نسخہ ہے۔ وہ اس کی فوٹو کاپی لے جانا چاہتے تھے۔ اس کے مالکین نے کہا کہ میکروفلم مشین دیوان صاحب باغ سے آئیں اور اس کے فوٹو لے جائیں۔ مگر اس وقت یہ ممکن نہیں تھا اس لئے وہ بے نیل مرام واپس چلے گئے۔ ڈاکٹر عبدالمعید خان مرحوم نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ میں اس کو ایڈیٹ کروں اور دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہو۔ مگر اس نسخہ کے مالکین سے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے اختلاف کی بنا پر یہ کام نہ ہو سکا۔ اب دوسرے نسخوں کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع کی جا رہی ہے۔

۵۔ الرسالۃ الشرفیہ فی النسب التالیفۃ وکتاب الادواریہ۔ موسیقی کے متعلق ایک بہت ہی عمدہ مطلا نسخہ ہے جس کو سیف الدین عبدالمومن الرماوی البغدادی نے ہرون محمد بن محمد الجوینی کے لئے ہلاکو کے زمانہ میں لکھا ہے اس میں پانچ مقالات ہیں۔ (۱) الکلام علی الصوت ولواحقہ (۲) فی حصر نسب الاعداد (۳) فی اضافات الابعاد (۴) ترتیب الاجناس فی طبقات الاعداد (۵) فی الایقاع ونسب ادوارہ۔ آخر میں مختلف راگوں کے متعلق عربی شعر میں قطعات ہیں۔ کل ۱۴۰ ورق ہیں۔ کتاب مختلف جدولوں سے بھری ہوئی ہے۔ موسیقی کا ایک فن کار ہی اس کو حل کر سکتا ہے۔ جب بغداد کے یوسف ذکریا یونیسکو کی اسکالر شپ پر موسیقی پر ریسرچ کرتے ہوئے مدراس پہنچے تو ان کے لئے یہ نسخہ ڈھونڈ کر نکالا گیا۔ وہ اس کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور کہا کہ دنیا بھر میں یہ تیسرا نسخہ ہے اور سب سے اچھا نسخہ ہے۔ قاہرہ میں جو نسخہ ہے وہ اتنا شکستہ ہے کہ کچھ پڑھا نہیں جاتا۔ وہ یہ وعدہ کرکے اس کے فوٹو لے گئے کہ اس کتب خانہ کی اہمیت پر ایک بہترین نوٹ یونیسکو کو لکھ بھیجیں گے۔ اور چھپائی کے بعد اس کی چند کاپیاں بھی بھیجیں گے لیکن اب تک ان کا یہ وعدہ وفا نہ ہوا۔

۶۔ تحفۃ المجاہدین فی العمل بالمیادین تالیف محقق لاچین الحسامی۔ یہ فنون جنگ اور سپہ گری پر بہت عمدہ کتاب ہے۔ فوجوں کی ترتیب اور جنگوں کے وقت آگے بڑھ کر حملہ کرنے اور پیچھے ہٹنے کے متعلق مختلف جدولیں دی گئی ہیں جس کی روشنائی اب تک پھیکی نہیں پڑی ہے۔ اس کے ساتھ گھوڑوں کے سدھانے اور ان کو جنگ میں لڑانے کے متعلق امیر بدرالدین بن بکتوت الرماح الخازندار کا ایک رسالہ جو ورق ۲۹ ب سے ۴۷ پر ختم ہوا ہے۔ فنون جنگ کا ماہر ہی اس کو ایڈیٹ کرکے شائع کر سکتا ہے۔

۷۔ تحفۃ الاشراف للشیخ جمال الدین المزی الشافعی۔ یہ آٹھویں صدی کے ایک مشہور محدث ہیں۔ یہ بہت ہی ضخیم کتاب ہے۔ اس نسخہ کی مدد سے مولوی عبدالصمد صاحب بھیجڑی اس کتاب کو شائع کر رہے ہیں۔ اب تک اس کی تین جلدیں شائع ہو چکیں۔ باقی جلدیں بھی آئندہ شائع ہوں گی۔

۸۔ غریب الحدیث تالیف ابو عبید قاسم بن سلام۔ ۷۱۲ھ کا لکھا ہوا بہت ہی عمدہ نسخہ یہاں موجود ہے۔ اس نسخہ کی مدد سے یہ کتاب دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد سے چار جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

۹۔ الذخیرہ فی محاسن اہل الجزیرہ تالیف ابوالحسن علی المعروف با بن بسام المتوفی ۵۴۲ھ۔ یہ کتاب اندلس کے محدثین وعلماء پر لکھی گئی ہے۔ کل ۱۴۹ ورق ہیں ۵۱۴ھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔ غالباً مولوی عبدالوہاب بہار الامراء اس کو مکہ یا مدینہ سے ۱۲۶۴ھ میں لائے تھے۔

۱۰۔ الاوائل النبوۃ تالیف حافظ موفق الدین ابوالقاسم اسماعیل بن محمد بن الفضل التیمی۔ اس کو ابوروح محمد بن ابی اسماعیل بن ذر الصالحانی نے ۵۰۸ھ میں نقل کیا ہے۔ حافظ ابونعیم کی کتاب دلائل النبوۃ ہر جگہ مشہور ہے۔ موفق الدین ابوالقاسم کی یہ کتاب اس لائق ہے کہ کوئی اس پر تحقیق وتدقیق کرے اور دنیا والوں کو اس سے روشناس کرائے۔

۱۱۔ مجمل اللغۃ تالیف ابوالحسین احمد بن فارس بن زکریا۔ اس کی صرف دو جلدیں یہاں موجود ہیں۔ ابوالحسن علی بن خلف نے ۵۰۲ھ میں نقل کیا ہے۔ غ سے ی تک کا حصہ نہیں ہے۔

۱۲۔ اقضیۃ الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مما قضٰی فیہ او امر بالقضاء بہ تالیف ابو عبداللہ محمد بن فرج الطلاع ۷۰۸ھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔

۱۳۔ کتاب الایثار بمعرفۃ رواۃ الآثار تالیف حافظ ابن حجر العسقلانی۔ موطا امام محمد کے رواۃ پر تنقید ہے یہ معلوم نہیں کہ اس کے اور نسخے کہیں اور پائے جاتے ہیں۔

۱۴۔ الترغیب والترہیب تالیف حافظ ابن حجر العسقلانی۔ منذری کی کتاب الترغیب والترہیب زیادہ مشہور اور متداول ہے۔ یہ معلوم کرنا ہے کہ اس کے نسخے کسی اور جگہ پائے جاتے ہیں یا نہیں۔

۱۵۔ ارشاد العیال الی اصول المسائل تالیف الشیخ شہاب الدین احمد بن المجدی الشافعی۔ اس میں فلکیات پر جمال الدین ابو عبداللہ الماردینی کی کتاب الدر المنثور فی العمل بربع الدستور کی شرح ہے۔ پہلا اور تیسرا جز موجود ہے اور بیچ کا جز غائب ہے۔

صفحات کی تنگی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ میں دوسرے بہت سی قیمتی کتابوں کے نام دوں۔ سہروردی کے زمانہ حیات میں لکھا ہوا عوارف المعارف کا ایک نسخہ ہے۔ میں نے صرف بیرون ہند کی چند تصنیفات کا ذکر کیا ہے۔ ہندی علماء کی لکھی ہوئی بہت سی کتابیں یہاں موجود ہیں۔ جنوبی ہند کے علماء کی قریب قریب تمام تصنیفات یہاں موجود ہیں۔ مولوی غلام علی آزاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ساتواں عربی کا دیوان موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان علماء کے وارثوں سے ان کی یہ تصنیفات خریدی ہیں۔ یا ان کے آباء واجداد نے کسی کو تحفہ دیا تھا اور ان سے یہ کتابیں خریدی گئی ہیں۔

یہاں کا فارسی کا ذخیرہ اور زیادہ قیمتی ہے۔ کئی مطلا نسخے تصویروں کے ساتھ یہاں موجود ہیں۔ حیدرآباد کا کتب خانہ سعیدیہ مدراس کے اسی کتب خانہ کا

ایک جز ہے۔ مولوی محمد سعید فرزند قاضی بدر الدولہ کو وراثت میں حاصل ہوا۔ خود مولوی محمد سعید نے اور نسخے خریدے اور کچھ نقل بھی کروائے۔ ان میں گلستان سعدی کا ایک مطلا اور باتصویر نسخہ تھا جس کو کسی نے چرا کر بمبئی کے ایک مشہور دولتمند کو تین ہزار روپیوں میں بیچ دیا۔ جب پولیس نے اس کا سراغ لگایا اور اس دولت مند نے اور پانچ ہزار روپیہ اس کے مالکین کو دینا چاہا تو انہوں نے دینے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ یہ خاندانی ورثہ ہے اس سے روپیہ کمانا مقصود نہیں ہے۔

فردوسی، نظامی گنجوی، سعدی، حافظ، مولانا روم، امیر خسرو، جامی، صائب تبریزی، ناصر خسرو، جلال الدین دوانی، ملا حسین واعظ کاشفی، عرفی، بو علی سینا، غزالی وغیرہ کی تصنیفات کے کئی کئی نسخے پائے جاتے ہیں۔ جن میں سے بعض مطلا ہیں۔ چند ایسے بھی ہیں جن کے اندر دیدہ زیب تصویریں بنی ہیں۔ عجائب المخلوقات کے ایک نسخہ میں جانوروں پرندوں درندوں وغیرہ کی بڑی عمدہ تصویریں بنی ہیں۔ طبی تصانیف میں طبیبوں اور ان کی تشخیص اور دوا سازی کے بہت عمدہ نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ ان کو دیکھنے کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلام کی تصویر کشی کے حرام قرار دینے کے باوجود اہل ذوق کاتبوں میں لطیف شعور اور نازک احساسات کی کوئی کمی نہیں تھی۔

گلستاں و بوستاں اور دیوان حافظ کے بہترین مطلا نسخے یہاں موجود ہیں اسی طرح مثنوی مولانا روم کے کئی دیدہ زیب نسخے یہاں پائے جاتے ہیں۔ خمسہ امیر خسرو کا قدیم ترین نسخہ یہاں موجود ہے۔ جس کا ذکر انٹرنیشنل امیر خسرو سیمینار دہلی کی رپورٹ میں کیا گیا ہے۔ کیمیائے سعادت کے کئی عمدہ نسخے یہاں پائے جاتے ہیں۔ اخلاق جلالی، انوار سہیلی، اخلاق ناصری، سیاست نامہ طوسی۔ حدیقہ سنائی کے بہت اچھے نسخے یہاں موجود ہیں۔ اسی طرح جنوبی ہند کے علماء کی تصانیف کا ایک بیش بہا ذخیرہ یہاں موجود ہے جن کی مدد سے میں نے انگریزی میں "عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک ۱۷۱۰ سے ۱۹۶۰ تک" کے نام سے چھ سو صفحوں کی ایک ضخیم کتاب شائع کی ہے۔ اس کو پڑھ کر قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کتب خانہ میں ہمارے علماء کی تصانیف کا کتنا بڑا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ ذخیرہ گزشتہ چار سو برسوں سے جمع ہوتا چلا رہا ہے اور سال بہ سال اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ ساری کتابیں چھینوں اور جزدانوں میں محفوظ کر کے رکھی گئی ہیں۔ اس کی اب تک ایک مکمل فہرست مرتب نہیں ہو سکی ہے۔ ڈاکٹر محمد غوث ایم۔ اے ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی سابق سپرنٹنڈنٹ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد اس ضعیف العمری کے باوجود ان کتابوں کی تنقیح کر رہے ہیں اور ایک مختصر کیٹلاگ تیار کر رہے ہیں۔ اگر ہمارے اہل علم اپنی رضاکارانہ خدمات دیں تو شاید یہ کام بہت جلد تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔

اس کتب خانہ کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں سینکڑوں شاہی پروانے، دستاویزات اور مراسلات و مکتوبات دیدہ زیب کاغذ افشاں پر لکھے ہوئے موجود ہیں۔ دہلی کے انگریز حکمرانوں کے مراسلات ہیں جو فارسی میں ہیں مگر دستخط زعفرانی روشنائی میں انگریزی میں ہیں۔ ان سے کرناٹک کی تاریخ کی مختلف پہلوؤں پر نئی روشنی پڑ سکتی ہے۔ ہم فارسی جانتے ہیں مگر تاریخ داں نہیں ہیں۔ شعبہ تاریخ کے حضرات بن علم تاریخ سے آگاہ ہیں مگر فارسی نہیں جانتے۔ میں نے کئی مرتبہ ان حضرات کو توجہ دلائی تاکہ ہمارے اور ان کے شعبے کے حضرات مل کر کچھ کام کریں۔ مگر اب تک کوئی صورت نکل نہیں سکی ہے۔

گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹس لائبریری مدراس میں بھی چند قابل قدر نسخے موجود ہیں جو ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ اقلیدس پر المقالۃ العاشرۃ بڑا ہی دیدہ زیب ہے۔ فیضی کی مہابھارت فارسی میں بڑی تقطیع پر ہے۔ اس کے ہر حصے کا پہلا صفحہ مطلا ہے۔ جب بشنو مہدی رام، شری پرکاسا اور کے کے شاہ سابق گورنران مدراس اس لائبریری کو دیکھنے آئے تو دوسری زبانوں کی قلمی کتابوں کو چھوڑ کر اس کے ملاحظہ کرنے میں سارا وقت صرف کر دیا۔

ویلور، کاین پٹنم اور کیلکرے اور دوسرے میں بھی بہت سے قدیم نسخے موجود ہیں لیکن ان سب کو ڈھونڈ نکالنا ہے اور ان کا مطالعہ کرنا ہے۔



بقیہ ممتاز ادیب

کیونکہ اس والے مضامین کو ہائی اسکول کے طلبہ کے معیار اور ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے ایک اچھا اقدام کیا ہے۔ اسلامیہ ہائی اسکول کے استاد ہیں۔

اس مختصر جائزہ کے علاوہ بہت سے ایسے لکھنے والے بھی ہیں جنہوں نے ٹکسٹ بک سوسائٹی کی کسی کتاب کا اردو ترجمہ کیا ہے یا جن کے ایک دو مضامین مختلف موضوعات پر مقامی اخبارات و رسائل یا کالجوں اور اسکولوں سے شائع ہونے والے سالانہ رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں جو اپنی جگہ پر کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن ان میں اکثر کسی داخلی کسک یا تحریک کے بغیر وقتی ضرورت کی خاطر لکھے جاتے ہیں۔ بعض ایسے صاحبان قلم بھی ہیں جو مستقل طور پر مضمون نگاری کی طرف توجہ دیں تو بڑے اہم اور قابل قدر شاہکار پیش کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کی اشاعت کے لئے مناسب وسائل تلاش کئے جائیں۔

فدوی باقوی دارالعلوم باقیات الصالحات ویلور ۶۳۲۰۰۴



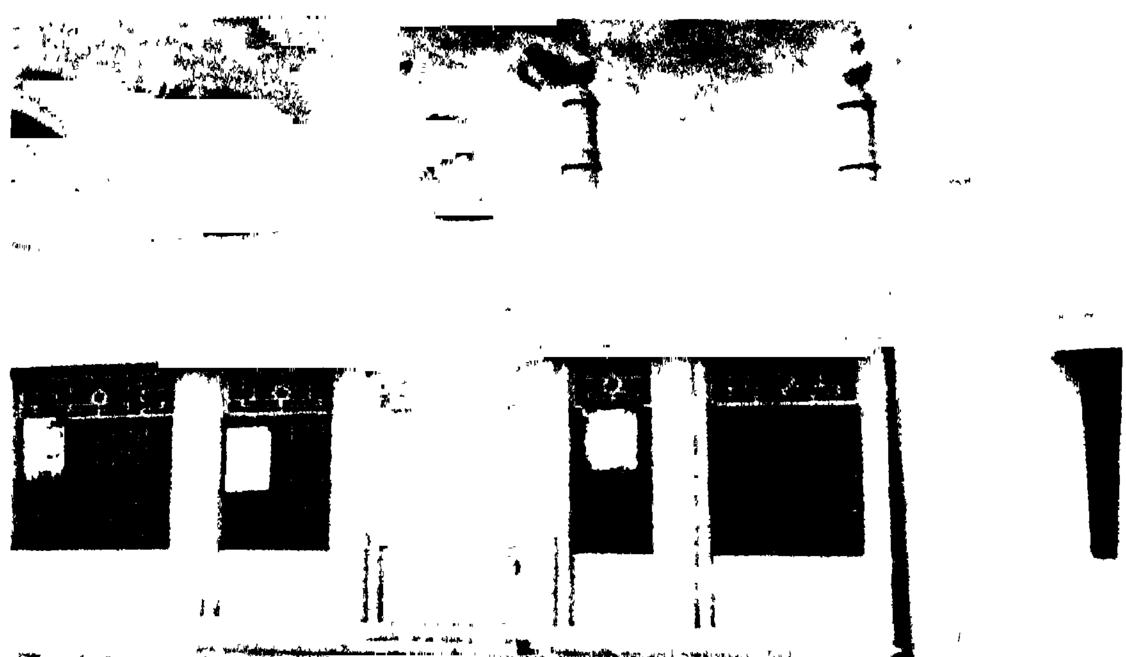
دارالعلوم
باقیات الصالحات
ویلور
کی
عمارت

تملناڈو کے عربی، فارسی اور اردو کے مدارس

سلطنتِ مغلیہ (شمال)، ٹیپو سلطان شہید اور نوابانِ کرناٹک (جنوب) کے زوال کے ساتھ ہی اسلامی تہذیب و تمدن پر ادبار چھانے لگا. علوم دینیہ اور مدارسِ عربیہ روبہ انحطاط ہونے لگے. لیکن اس دورِ ابتلا میں بھی بعض علماء کرام نے ہمت نہ ہاری۔ انہوں نے اس عالم انتشار و کس مپرسی میں از سر نو ذاتی کوششوں اور اہل خیر کی اعانت سے خدمت علوم دین کا آغاز کیا۔ جگہ جگہ عربی، فارسی اور اردو کے مدارس کا انعقاد عمل میں آیا۔

مدرسہ محمدیہ، رائی پیٹھ مدراس

مدرسہ محمدیہ جنوبی ہند کے اردو، فارسی اور عربی کے قدیم مدارس میں سے ایک ہے۔ اور شہر مدراس کا ایک مشہور و معروف علمی مرکز ہے۔ تقریباً اسّی سال



مدرسہ محمدیہ
رائی پیٹھ
مدراس

سے علمی خدمات میں مصروف ہے۔ اس نے بہت سے علماء کو دستار فضیلت عطا کی۔ اس مدرسہ کے روح و رواں حضرت مولانا مولوی مفتی قاضی محمد حبیب اللہ صاحب گورنمنٹ سر قاضی اہل سنت والجماعت مدراس ہیں۔ اور معتمد مولانا حاجی ابواحمد عبداللہ ہیں۔

۲۶ رجب ۱۳۰۹ھ کو اس مدرسے کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے لئے حلیمہ بی بنت قاضی بدر الدولہ نے زمین وقف کی تھی۔ اور دوسرے لوگوں نے بھی ہاتھ بٹایا۔ اس کے کتب خانے میں عربی، فارسی اور اردو کی قدیم کتابوں اور نادر مخطوطات کا ایک ذخیرہ محفوظ ہے۔ جس سے تاریخی و تحقیقی کام کرنے والے حضرات کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مدرسہ جمالیہ، پرمبور مدراس

یہ مدرسہ اپنی جدید وضع و طریق اور بہ لحاظ تعلیم و تدریس اپنی نوعیت خاص کا حامل ہے۔ اس کے بانی جناب حاجی جمال محی الدین صاحب جنوبی ہند کے ایک مشہور و معروف تاجر اور علم پرور تھے۔ انہوں نے ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں اس کی داغ بیل ڈالی۔ اور عربی، فارسی اور اردو میں دینی تعلیم کا اجرا کیا۔ اور اس کے لئے شہر مدراس میں اپنی طرف سے کئی ایک عمارتیں خرید کر وقف فرمائیں۔ جن کی آمدنی سے یہ مدرسہ چلایا جا رہا ہے۔

نصاب جدید ۱۹۲۷ء میں اس مدرسہ کے نصاب میں ترمیم کی گئی اور انگریزی، تمل، حساب، جغرافیہ اور تاریخ وغیرہ کو شامل کیا گیا۔ ۱۹۶۰ء میں جامعہ ازہر (مصر) سے مولانا احمد شہر قادری کو بلایا گیا اور نصاب تعلیم میں مزید ترمیم عمل میں آئی۔ چار سال بعد ان کی جگہ جامعہ ازہر سے دوسرے ایک استاد زاہر زعبی تشریف لائے۔ مذکورہ حضرات کے دور میں اکثر و بیشتر طلبہ نے بعد فراغت مصر اور اسلامیہ یونیورسٹی مدینہ منورہ میں داخلہ لیا اور آج بھی اس کا سلسلہ جاری ہے۔ مؤخر الذکر جامعہ سے ان کا الحاق بھی ہو چکا ہے۔ نیز مدراس یونیورسٹی نے ۱۹۵۷ء میں اسے اپنا ملحقہ مدرسہ تسلیم کر لیا ہے۔ طلبۃ العلوم اس کے امتحانات، افضل العلماء، منشی فاضل وغیرہ میں برابر شریک ہو رہے ہیں۔ اور نمایاں کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔

کتب خانہ مدرسہ کا اپنا کتب خانہ ہے جس میں فی الحال عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور تمل نیز ملیالم اور ہندی کی مختلف ساڑھے سات ہزار کتابیں موجود ہیں اور تدریجاً اضافہ جاری ہے۔

متولی بانی مدرسہ کے بعد ان کے فرزند اکبر الحاج جمال محمد صاحب اس کے متولی بنے۔ آپ کے عہد میں مدرسہ نے کافی ترقی کی۔ آپ کے بڑے فرزند جو اپنے دادا ہی کے نام سے موسوم تھے۔ ۱۹۵۱ء میں متولی بنے۔ آپ کے دور میں عربی ادب کا عروج ہوا اور عربی ہی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا۔ موجودہ متولی عالیجناب حاجی جمال حسین صاحب (وظیفہ یاب جج) ہیں۔ آپ مدرسہ کی اقتصادی ترقی کے لئے رات دن کوشاں ہیں۔ آپ ہی کے زمانے میں کئی ایک عمارتیں تعمیر ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔

ناظم حضرت مولانا عبدالرافع باقوی کے بعد جو فی الحال نظامت کے علاوہ جملہ امور میں مسئول ہیں حضرت مولانا مولوی محمد حسین صاحب باقوی ایم اے سابق پرنسپل اسلامیہ کالج کرنول، کارِ نظامت انجام دے رہے ہیں۔ آپ کے دور میں یہ مدرسہ اپنے تعلیمی معیار میں بہت اونچا ہوتا جا رہا ہے۔

دارالعلوم لطیفیہ، مکان حضرت قطب ویلور

خانوادۂ اقطاب ویلور کا یہ خاص ذاتی مدرسہ ہے جس کے اکابر میں حضرت رکن الدین سید شاہ ابوالحسن قربی ویلوری قدس سرہٗ (۱۱۱۸—۱۱۸۲ھ) حضرت محی الدین سید شاہ عبداللطیف قادری ذوقی قدس سرہٗ (۱۱۵۱—۱۱۹۴ھ) حضرت سید شاہ ابوالحسن قادری محوی قدس سرہٗ (۱۱۸۶—۱۲۴۳ھ) حضرت علامہ باقر آگاہ نور اللہ مرقدہٗ (۱۱۵۸—۱۲۲۰ھ) اعلیٰ حضرت قطب ویلورؒ وغیرہ شامل ہیں۔ جن کے فیوضات علمی ظاہر و باہر ہیں۔

تاسیس دارالعلوم لطیفیہ تقریباً تین صدیوں سے زمانہ کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے برابر ارتقاء کی منزلیں طے کرتا آ رہا ہے۔ ملک کی یہ عظیم و قدیم دینی درسگاہ "ام المدارس لطیفیہ" ۱۱۳۰ھ میں دارالعلوم دیوبند، علی گڑھ تحریک اور ندوۃ العلماء سے تقریباً ڈیڑھ دو صدی بیشتر ہی اپنی ابتدائی صورت میں منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہو کر علمی اور اصلاحی سرگرمیاں شروع کر چکا تھا۔ آج بھی اس کا یہ سلسلہ اپنی خاص روایات کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ (ماخوذ "اللطیف")

کتب خانہ دارالعلوم مذکور کے کتب خانے میں دس ہزار سے زائد عربی، فارسی، اور اردو کی نایاب قدیم کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ خانوادۂ اقطاب ویلور کا خصوصی کتب خانہ بھی ہے جس میں نادر روزگار کتب کا ذخیرہ ہے۔

دائرۃ المعارف طلبۃ العلوم کی اس ہفتہ واری انجمن میں عربی، فارسی اور اردو کی تقریری و تحریری مشقیں ہوتی ہیں اور اس کی طرف سے ایک سالنامہ "اللطیف" ہر سال اشاعت پذیر ہوتا ہے۔

دارالتصنیف والاشاعۃ اس شعبے سے اکابر لطیفیہ کی کئی ایک کتابیں شائع ہوئیں اور ہر سال اس کا سلسلہ جاری ہے۔

تعداد طلبہ و اساتذہ سو طلبۃ العلوم اور آٹھ اساتذۂ کرام پر مشتمل اس دارالعلوم میں شعبۂ حفظ بھی مستقل ہے اور طلبہ کے قیام و طعام کا بلا معاوضہ انتظام ہے۔

سرپرست اس دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰحضرت مولانا مولوی ابوالنعم قطب الدین سید شاہ محمد باقر صاحب قادری سجادہ نشین

مکان قطب ویلور ہیں۔

جامعہ دارالسلام، عمر آباد۔ ضلع شمالی آرکاٹ

علاقہ جنوب کے نامور درسگاہوں میں سے ایک اور اپنی طرز خاص کے لحاظ سے انفرادیت کا حامل یہ جامعہ جس کی شہرت ہند اور بیرون ہند بھی پہنچی ہوئی ہے۔

سنہ بناء اور بانی مدرسہ اس جامعہ کا ۷، دسمبر ۱۹۲۴ء میں یہاں کے ایک معزز خاندان کے مخلص، موحد اور پابند سنت فرد رئیس التجار حضرت کاکا حاجی محمد عمر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ہاتھوں انعقاد عمل میں آیا۔ آگے چل کر آپ نے اپنی وسعت نظر سے ایک کمیٹی ترتیب دی اور مدرسہ کے لئے ایک ضابطہ مقرر فرمایا۔

نصاب تعلیم اس کا نصاب درس نظامی سے الگ ایک جدید طریقے پر تشکیل پایا ہے۔ پورا نصاب نو سال کی مدت کا حامل ہے۔ اول سے ہشتم تک کی جماعتوں میں منقسم ہے، جیسے تفسیر و حدیث کے علاوہ فقہ اصول فقہ، اصول حدیث، ادب، معانی، عقائد، علم النفس، تاریخ، تجوید۔ جغرافیہ اور انگریزی وغیرہ داخل ہیں۔

تعداد طلبۃ العلوم فی الحال دو سو طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ ان کی اقامت اور طعام کا انتظام از جانب جامعہ بلا کسی معاوضہ کیا جاتا ہے

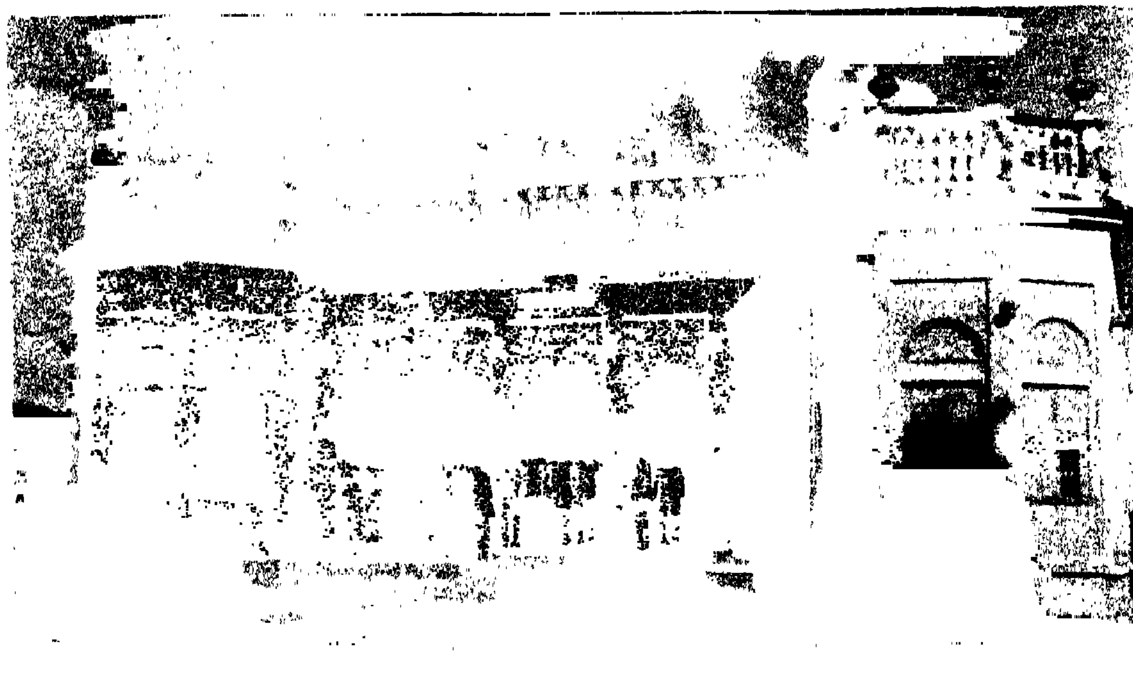
مدراس یونیورسٹی سے الحاق مدراس یونیورسٹی سے جامعہ ملحق ہے یونیورسٹی کے امتحانات السنہ شرقیہ افضل العلماء، منشی فاضل اور ادیب فاضل میں طلبۃ العلوم شریک ہوتے ہیں۔ نوے فیصد بعض اوقات سو فیصد کامیاب رہتے ہیں۔ جامعہ ہذا کو سرکاری گرانٹ بھی ملتی ہے۔

اردو جامعہ کی تعلیمی زبان اردو ہے۔ تمل ناڈو کے اکثر اضلاع میں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ کیرلا سے آنے والے طلبہ بہت جلد ماحول سے متاثر ہو کر اردو بولنے اور سمجھنے لگتے ہیں۔ اس طرح یہ جامعہ بھی اردو کی خاموش خدمات انجام دے رہا ہے۔ طلبۃ العلوم کا سالنامہ "تنویر" ہر سال شائع ہوتا ہے جس میں اعلیٰ مذہبی، ادبی مضامین ہوتے ہیں۔ ایک عرصے تک "مصحف" نے جو ادبی خدمات انجام دیں وہ تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔

کتب خانے جامعہ سے ملحق ایک شاندار کتب خانہ "عمر لائبریری" کے نام سے قائم ہے۔ جس میں اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور تمل کے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ اس کے علاوہ جامعہ کا ایک ذاتی کتب خانہ بھی ہے۔ جس میں عربی و فارسی کتابیں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

معتمد و نائب جامعہ کے موجودہ معتمد محترم الحاج کاکا محمد عمر صاحب ہیں جو بانی جامعہ کے پوتے اور انھیں کے نام سے موسوم ہیں آپ کے برادر خورد مولانا مولوی الحاج کاکا محمد سعید صاحب نائب معتمد اور جامعہ ہی کے فارغ ہیں۔ دونوں ہی انتہائی مخلص سرگرم کار جامعہ کی ترقی اور شاندار مستقبل کے ضامن ہیں۔

ناظم، سابق ناظم جامعہ حضرت مولانا سید امین صاحب کی سبکدوشی کے بعد آپ کے برادر خورد مولانا عبدالکبیر صاحب ناظم جامعہ مقرر کئے گئے اور اس وقت فرائض نظامت آپ ہی کے ذمے ہے۔



جامعہ دارالسلام
عمر آباد
سے ملحق عمر لائبریری
کی عمارت

جشنِ طلائی | اپریل ۱۹۷۷ء میں اس جامعہ کا جشن طلائی منایا گیا جس میں ہندو بیرونِ ہند کے بہت سے علماء و فضلاء نے شرکت کی۔ اس جامعہ کی توسیع کے شاندار منصوبے بنائے گئے ہیں۔

ام المدارس باقیات صالحات ویلور

سن اٹھارہ سو ستاون عیسوی میں اس مدرسہ کا آغاز اس کے بانی رح کے مکان سے ہوا۔ اور پھر یہ چھوٹی درس گاہ سنہ ۱۸۷۳ء میں ویلور کی بڑی مسجد کے دالان میں منتقل ہوئی۔ اور سنہ ۱۹۰۲ء میں موجودہ عمارت کی تکمیل کے ساتھ اس میں منتقل ہوگئی۔ اور بفضلہ تعالیٰ یہ روز بروز ترقی و توسیع پر ہے۔ آج تمل ناڈو ہی نہیں بلکہ علاقہ کیرلا میں کرناٹک، آندھرا، اور سری لنکا کے اکثر و بیشتر مدارس اس کی شاخوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علاقہ جنوب میں حیدرآباد کو چھوڑ کر یہ پہلا مدرسہ ہے۔ جس میں طلبۃ العلوم کے قیام و طعام کا بھی از جانب مدرسہ انتظام عمل میں آیا۔ تقریباً اسی سال پیشتر اس کے بانی رح نے اس کی نگرانی اور اعانت کے لئے باضابطہ قوانین و دستور کے ساتھ رجسٹرڈ کمیٹی تشکیل دی اور مدرسہ کو تحویل کر دیا۔

بانیٔ مدرسہ | اعلیحضرت شمس العلماء مولانا مولوی شاہ عبدالوہاب صاحب قدس سرہ نے اس ام المدارس کی بنا ڈالی اور "باقیات صالحات" نام رکھا۔

نصابِ تعلیم | اس کا نصاب تعلیم علوم متداولہ درس نظامی ہے۔ جس کے ساتھ فارسی، اردو، انگریزی، تمل وغیرہ شامل ہیں — مولوی، عالم کے لئے سات سالہ اور مولوی فاضل کے لئے مزید دو سالہ نصاب مقرر ہے جس کے فارغین کو بالترتیب مولوی عالم اور مولوی فاضل کی سندیں دی جاتی ہیں۔ اردو فارسی کا دو سالہ نصاب اور قرأت و تجوید کا علیحدہ شعبہ قائم ہے۔

انگریزی اور اردو | خصوصی طور پر انگریزی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تمل ناڈو کے ان طلبہ کے لئے جن کی مادری زبان تمل ہے۔ اور اہل کیرلا کے لئے جن کی مادری زبان ملیالم ہے اردو کی اہتمام کے ساتھ تعلیم دی جاتی ہے اور انھیں اردو بولنے، پڑھنے اور سمجھنے کی استعداد بہم پہنچائی جاتی ہے۔ اس کا مفید نتیجہ یہ ہوا کہ کیرلا کے اکثر مکاتب و مدارس میں جس میں غالب اکثریت اس مدرسہ کے فارغین کی ہے اردو پڑھائی جانے لگی۔ اور کیرلا یونیورسٹی نے مدراس یونیورسٹی کا نصاب "ادیب فاضل" اپنے یہاں داخل کر لیا ہے جو اردو کی مقبولیت کی واضح دلیل ہے۔

امتحانات مدراس یونیورسٹی | اس مدرسہ کا مدراس یونیورسٹی سے الحاق کے نتیجے میں امتحانات افضل العلماء (عربی)، منشی فاضل (فارسی) ادیب فاضل (اردو) میں طلبۃ العلوم شریک ہوتے ہیں۔ امتحانات سرکاری سطح پر یونیورسٹی کی جانب سے لئے جاتے ہیں اور کامیاب طلبا کو ڈپلومہ دیا جاتا ہے۔ کالجوں اور ہائی اسکولوں کی ملازمتوں میں لیا جاتا ہے۔ ان امتحانوں میں امتیازی طور پر طلباء کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

فارغین | مولوی عالم، مولوی فاضل کی تکمیل کرتے اور اسناد حاصل کرنے والوں کا سالانہ اوسطاً ایک سو ہے۔

تعدادِ طلبہ | ہر سال ساڑھے تین سو ۳۵۰ طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ ان کے قیام و طعام کا از جانب مدرسہ انتظام کیا جاتا ہے۔

اساتذہ | کل اساتذہ کی تعداد چوبیس ہے اور ذو معین مدرسین ہیں اس سے ملحقہ ایک تحتانیہ مدرسہ بھی قائم ہے جسے سرکاری امداد بھی ملتی ہے اور سرکاری نصاب کے پانچ درجوں پر مشتمل اس اسکول میں تقریباً پونے دو سو افراد تعلیم پاتے ہیں۔

شعبۂ کتابت | مدرسہ ہذا میں خطاطی کا بھی شعبہ قائم ہے جس میں ایک سو سے زائد طلبہ خطاطی سیکھتے ہیں۔

پریس | مدرسہ ہذا کا اپنا ایک پریس بھی ہے جس میں فی الحال دو مشینیں ہیں اور انگریزی اور تمل زبانوں کی طباعت کا کام سرانجام پاتا ہے عربی، اردو اور دوسری زبانوں کی طباعت کے انتظامات کی سعی کی جا رہی ہے۔ امید کہ عنقریب اس کا بھی سامان ہو جائے گا۔

کتب خانہ | اس کے عظیم الشان کتب خانہ میں جنکی ایک ملکی جھلک تصویر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ سولہ ہزار قدیم نایاب عربی، فارسی اور اردو کی کتابیں موجود ہیں۔ جسمیں دوسری زبانوں کی کتابیں بھی محدود تعداد میں شامل ہیں۔

شعبۂ تصنیف و تالیف | مستقل شعبۂ تصنیف و تالیف قائم کیا گیا ہے جس میں ہر سال دو ایک کتابیں شائع کئے جانے کا فی الحال اہتمام کیا گیا ہے۔

انجمنیں | اردو، تمل، ملیالم اور عربی کی تقریری انجمنیں ہر ہفتہ منعقد ہوتی ہیں۔ جس میں طلبہ حصہ لیتے ہیں اور تقریری مشقیں کی جاتی ہیں۔ اس کی اردو انجمن بنام انجمن ترقی اردو کا اور تمل انجمن لجنۃ الارشاد کا سالنامہ ہر سال اشاعت پذیر ہوتا ہے۔ جس میں معیاری سے معیاری مضامین لئے جاتے ہیں۔

جشن صد سالہ | تقریباً تین سال پیشتر اس مدرسہ کا جشن صد سالہ منایا گیا جس کی وجہ سے مفید و کارآمد منصوبے روبعمل ہوئے اور مزید توسیع و ترقی کے منصوبے بنائے گئے۔

جزائر مالدیپ اور سری لنکا کے طلبۃ العلوم کے علاوہ ملک کے مختلف علاقوں منی پور، بہار، آسام وغیرہ کے طلبہ بھی زیر تعلیم ہیں۔

مدرسہ منبع الانوار - لال پیٹ ضلع جنوبی آرکاٹ

اس مدرسہ کو تقریباً ایک سو بیس سال پیشتر یعنی ۱۸۵۷ء مطابق

۱۲۸۲ھ (غدر) میں قائم شدہ مدارس میں سے ایک تبلایا جاتا ہے لیکن اس سے متعلق باضابطہ تفصیلات دیکھنے میں نہیں آئیں۔ بہرحال ادھر کے قدیم مدارس میں اہم شمار کیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں یہ باقاعدہ استادی مدرسہ بنایا گیا۔ مولوی عالم اور مولوی فاضل کے درجات شروع کئے گئے۔

تعداد اساتذہ و طلبہ تقریباً ایک سو اسی طلبہ زیر تعلیم ہیں اور چودہ اساتذہ خدمت تدریس انجام دے رہے ہیں

کتب خانہ مدرسہ مذکور کے کتب خانے میں فی الوقت چار ہزار سے زائد عربی، فارسی، اردو اور تمل کی کتابیں ہیں۔

بانی مدرسہ اس مدرسہ کے بانی حضرت مولانا الحاج احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے بے سروسامانی کی حالت میں داغ بیل ڈالی اور خود بھی بحیثیت مدرس کام کرتے رہے۔

حضرت امانی قدس سرہٗ اکابر باقیات میں سے ایک حضرت العلام مولانا امانی باقوی بھی ہیں۔ جن کی علمی، تحقیقی اور ادبی خدمات محتاج تعارف نہیں۔ آپ نے مدرسہ مذکور کی نشاۃ ثانیہ فرمائی اور اسے تمل ناڈو کے وقیع مدارس میں لا کھڑا کیا۔

مدرسہ مصباح الہدیٰ۔ نیو اسل نیڈرو (تنجاوُر)

مدرسہ مذکور بھی تمل ناڈو کے بڑے مدارس میں شمار کیا جاتا ہے۔

مدرسہ اور بانی اس مدرسہ کا قیام ۹ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء میں حضرت مولانا مولوی عبد الکریم صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ حضرت موصوف نے ابتدا میں بغیر کسی اعانت کے توکل علے اللہ اس مدرسہ کا اجرا کر دیا۔ اور اس وقت اس میں تعلیم پانے والے



مدرسہ مصباح الہدیٰ تنجاور

بیرونی طلبۃ العلوم کا قیام مسجد میں ہوتا تھا اور اہل محلہ اپنے اپنے گھروں میں فرداً فرداً طلبۃ العلوم کے طعام کے کفیل ہوتے تھے۔ لیکن آگے چل کر بانی موصوف نے مدرسہ کے لئے عمارت اور دارالاقامہ وغیرہ کی ضرورت کا لوگوں کو احساس دلایا اور اہل خیر سے استدعا کی اور اس طرح مدرسہ کی عمارت تعمیر ہوئی۔ اور مدرسے کا اپنی خاص عمارت میں ۱۹۱۵ء میں افتتاح عمل میں آیا۔ اور آپ کی حیات تک مدرسہ کی نظامت و اہتمام کی ساری ذمہ داری آپ ہی کے ہاتھوں میں رہی۔

ناظم مدرسہ ناظم مدرسہ مرحوم حضرت مولانا مولوی ین پی محمد ابراہیم صاحب باقوی جن کے عہد میں مدرسہ نے نمایاں ترقی کی اور سند تقسیم کرنے والے مدارس میں شمار ہوا۔ ان کے بعد حضرت مولانا مولوی رحمت اللہ صاحب مصباحی ناظم مقرر ہوئے اور آج مدرسہ انھیں کی سرپرستی میں ترقی کے مراحل طے کر رہا ہے۔

تعداد طلبہ و اساتذہ اس وقت مدرسہ مذکور میں بارہ اساتذہ ہیں اور طلبہ کی تعداد ایک سو بیس ہے۔

جامعۂ انوار العلوم۔ خواجہ نگر۔ ترچراپلی

ترچراپلی تمل ناڈو کا قدیم کئی تاریخی حیثیتوں کا حامل شہر اور ضلع ترچراپلی کا صدر مقام ہے جامعۂ انوار العلوم یہاں کا عربی اور اردو کا دینی مرکز ہے جس سے علوم کی روشنی آج چاروں طرف پھیلتی جا رہی ہے۔ ام المدارس جنوب باقیات صالحات ویلور کے ایک فاضل و قابل فرزند حضرت مولانا مولوی

جامعہ انوار العلوم۔ ترچراپلی



الحاج عبد السلام صاحب باقوی کے ہاتھوں ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۳ء میں اس کی بنا پڑی۔

تعداد طلبہ و اساتذہ ہر سال اس مدرسہ میں تقریباً ایک سو سے زائد طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے اور ان کے قیام و طعام کا مدرسہ کفیل ہوتا ہے۔ کل چودہ اساتذہ کرام بہ شمول شعبہ حفظ و قرات و تجوید خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے تحتانیہ اور شبینہ مدرسے بھی جاری ہیں۔

نصاب تعلیم مولوی عالم کا نصاب سات سالہ ہے۔ اردو فارسی کا دو سالہ مستقل نصاب اختیاری ہے۔ جس میں درس نظامی میں داخل علوم کے علاوہ تاریخ فلسفہ، علم کلام، علم تجوید اور ادبیات بھی

شامل ہیں۔

تعلیمی زبان: عربی، اردو اور تمل ہے۔

کتب خانہ: جامعہ کا کتب خانہ جس میں مختلف علوم وفنون کی کتابیں ہیں اور ان کی مجموعی تعداد دو ہزار سے زائد ہے۔

جمعیۃ الانوار: طلبہ کی انجمن جس میں عربی، فارسی، اردو اور تمل زبانوں میں تقاریر کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اس کے اجلاس ہفتے میں ایک دن بلا ناغہ ہوتے ہیں۔

مدرسہ داؤدیہ۔ پری اگرام۔ ہیروڈ

مدرسہ داؤدیہ اپنے بانی مرحوم اے بی شیخ داؤد صاحب کے نام سے موسوم اور انہیں کی ذاتی وقف شدہ جائداد کا مرہون منت ہے۔ بانی مذکور اپنی بیوی کے معالجے کے سلسلے میں ویلور آتے جاتے رہے وہاں انھیں ام المدارس باقیات صالحات ویلور کے دیکھنے کے کئی ایک مواقع پیش آئے۔ جس سے متاثر ہو کر موصوف نے حضرت مفتی اعظم مولانا شیخ آدم صاحب نور اللہ مرقدہٗ سابق ناظم باقیات ویلور کے دستِ مبارک سے ۱۹۳۱ء میں مدرسہ مذکور کا اجرا کیا۔

تعداد طلبۃ العلوم: امسال مدرسہ میں ستر سے زائد بیرونی طلبۃ العلوم تعلیم پا رہے ہیں۔ جن کا قیام وطعام کا مدرسہ کفیل ہے۔ اور ایک انتہائی قلیل مدت میں تقریباً ساٹھ سے زائد علمائے کرام یہاں سے فارغ ہو کر نکلے۔

مجلسِ عاملہ: بانیٔ مرحوم نے اس مدرسہ کی نگرانی ایک مجلس عاملہ کے ذمہ سپرد کر دی ہے۔ جس میں ایک ثلث علمائے کرام شامل ہیں۔

ناظم مدرسہ: اس مدرسہ کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا الحاج ابو السعود احمد صاحب باقوی بانی ومہتمم دار العلوم سبیل الرشاد بنگلور (کرناٹک) ہیں اور صدر مدرس مولانا مخدوم شاہ باقوی ہیں۔

مدرسہ منبع العلیٰ۔ کوتانلور ضلع تنجاور

قدیم مدارس میں سے ایک ہے اور اس کی ابتدا کا سن ۱۸۹۲ء بتایا جاتا ہے۔

بانیٔ مدرسہ: حضرت مولانا کے پی ایم محمد ابوبکر صاحب مرحوم نے اس کی بنا ڈالی۔

تعداد طلبہ واساتذہ: بیرونی طلبۃ العلوم کی تعداد تقریباً ساٹھ ہے اور سات اساتذہ خدمت تدریس انجام دے رہے ہیں۔

ناظم مدرسہ: مولانا محمد بشیر صاحب کے ذمے نظامت تفویض کی گئی ہے۔

مدرسہ امداد العلوم۔ کوئمبتور

۱۹۶۵ء مورخہ ۲۲ رجون کو قائم شدہ اس مدرسہ کی اٹھان بتلا رہی ہے کہ مستقبل قریب میں یہ مدرسہ اپنے پیش رؤوں کی صف میں شامل ہو جائے گا۔

بانیٔ مدرسہ: ام المدارس باقیات صالحات ویلور ہی کے ایک لائق و فاضل فرزند حضرت مولانا محمد مصطفیٰ صاحب باقوی نے اس مدرسہ کو قائم فرمایا۔

تعداد طلبہ واساتذہ: اس مدرسہ میں امسال تقریباً اسّی سے کچھ زائد طلبہ کا داخلہ ہوا۔ اور ان کے قیام وطعام کا مدرسہ ہی میں انتظام کیا گیا ہے۔ کل نو اساتذۂ کرام منصب درس پر فائز ہیں۔

موجودہ صدر مدرس: حضرت مولانا امان اللہ صاحب علوی اس کے موجودہ صدر مدرس ہیں جن کے ذمہ مدرسہ مذکور کی تعلیمی نگرانی مقرر ہے۔

مدرسہ مظاہر العلوم۔ سیلم

اس مدرسہ کو قائم ہوئے تقریباً بیس سال کا قلیل عرصہ ہوا ہے لیکن یہ مدرسہ روز بروز ترقی کے منازل طے کرتا جا رہا ہے۔

بانیٔ مدرسہ: مولانا شفیق خاں صاحب قاسمی نے دس سال تک اس مدرسہ کو اس شہر کی جامع مسجد میں چلایا۔ پھر اس کی مستقل عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ اور مدرسہ اپنی خاص عمارت میں منتقل ہو گیا۔

تعداد طلبہ واساتذہ: اسی طلبۃ العلوم اور سات اساتذہ پر مشتمل یہ مدرسہ ترقی کی جانب رواں دواں ہے۔

تمل ناڈو کے چند قدیم مدارس

ذیل میں ان قدیم مدارس عربیہ کو پیش کیا جا رہا ہے جو قدیم ہونے کے ساتھ اپنے محدود ومحتاط طریقہ کار کے ساتھ بقامت کہتر بقیمت بہتر کا نمونہ ہیں اور ایک عرصۂ دراز سے برابر خدمت علوم میں منہمک ہیں۔

مدرسہ محضرۃ القادریہ۔ کایل پٹنم ضلع ترنلویلی

کایل یا کایل پٹنم علاقہ معبر کی وہ قدیم بندرگاہ ہے جس سے عرب مسلمانوں کی آمد آمد ہوئی اور ہندوستان میں مسلمانوں کی پہلی نو آبادیوں میں شامل ہے اس مدرسہ کا اجرا ۱۳۱۳ھ ۲۵ شوال میں ہوا۔ اور آج بھی اپنے مخصوص اور محدود انداز میں یہ قائم ہے۔ تقریباً ساٹھ ستر طلبۃ العلوم تعلیم پاتے ہیں۔ اور سات اساتذہ خدمتِ تدریس انجام دیتے ہیں۔

مدرسہ مذکور کے بانی حضرت مولانا سید عبداللہ البخاری البغدادی ہیں جن کا سلسلۂ نسب حضرت محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے

تبلایا جاتا ہے۔

مدرسہ الزاویۃ القاسمیہ کایل پٹنم ضلع ترنلویلی

اس مدرسہ کی بنا ۱۳۰۸ھ تبلایا جاتا ہے۔ اس مدرسہ کی بھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے محدود پیمانے پر خدمتِ علوم دین ایک عرصۂ دراز سے کرتا آرہا ہے۔ فی الوقت یہاں طلبہ تقریباً چالیس اور اساتذہ چار ہیں۔ اور اس کے ناظم مولانا شاہ عبدالحمید صاحب ہیں۔ اس کے بانی مدینہ منورہ سے آئے ہوئے ایک شیخ طریقت مولانا محمد ابراہیم القاسمی قدس سرہ مشہور ہیں۔

مدرسہ ریاض الجنان پیٹے ترنلویلی

قریب قریب ایک صدی کی عمر والا یہ مدرسہ بھی یہاں کے قدیم معتدد مدارس میں سے ایک ہے لیکن بہ لحاظ تعداد طلبۃ العلوم و اساتذہ ترقی و توسیع طلب ہے۔ بایں ہمہ اس مدرسہ سے کئی ایک ذی قدر علماء کرام نکلے اور اپنے علاقہ کی نمایاں خدمات میں پیش پیش رہے۔

اس کے کتب خانے میں بھی عربی کی نایاب قدیم کتابوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔

مدرسہ فیض الباقیات۔ کوتانلور ضلع تنجاور

ایک چھوٹے سے شہر کوتانلور کا یہ دوسرا عربی مدرسہ ہے جس کے بانی کا نام بھی مولانا محمد ابوبکر صاحب باقوی بتلایا جاتا ہے اور اس مدرسہ کا نام اپنے بانی کی مادر علمی "باقیات ویلور" سے تعلق قلبی کا مظہر ہے۔ قدیم ہونے کے باوجود بہ لحاظ تعداد طلبہ و اساتذہ ترقی و توسیع کا محتاج ہے۔

مدرسہ النور المحمدیہ۔ پدوکرئی۔ ضلع تنجاور

یہ مدرسہ بھی تمل ناڈو کے قدیم مدارس میں سے ایک اپنے فیضان علمی کے لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ درس نظامی کے جملہ کتب کی تفہیم زبان تمل ہوتی ہے۔ تمل ناڈو کے قابل قدر علمائے کرام کو اس مدرسہ سے اکتساب علم کا شرف حاصل ہے۔ ۱۳۱۸ھ میں اس کو حضرت مولانا مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم نے قائم فرمایا تھا۔

مدرسہ رحمانیہ کلینور ضلع تنجاور

اس مدرسہ کا قیام بھی ۱۳۳۸ھ کے لگ بھگ عمل میں آیا۔ اس کے بانی جناب ایس اے عبدالحمید صاحب ہیں۔ پچاس سے زائد طلبہ زیر تعلیم ہیں اور آٹھ اساتذہ درس دیتے ہیں۔ اس کے کتب خانے میں تقریباً تین ہزار سے زائد کتابیں ہیں۔

مدرسہ معدن العلوم وانمباڑی ضلع شمالی آرکاٹ

یہاں کے ایک مشہور تاجر پارچہ جناب حاجی عبدالصمد صاحب مرحوم نے اس مدرسہ کی داغ بیل ڈالی۔ اور پہلے پہل مولانا شرف الدین صاحب مرحوم جو تمل ناڈو کے ایک اچھے اور صالح عالم تھے نظامت پر فائز ہوئے۔ بعد میں ایک سابق استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ مولانا شیر علی صاحب کو جو ان دنوں مدراس آئے ہوئے تھے مدرسہ مذکور کے نظامت کی ذمہ داری سونپی گئی۔ یہ مدرسہ بھی یہاں کے قدیم مدارس میں شمار ہوتا ہے اور کئی ایک جید عالم کو اس مدرسہ سے فیضیاب ہونے کا شرف حاصل ہے۔

فی الوقت طلبۃ العلوم کی تعداد ساٹھ ستر اور پانچ اساتذہ تدریسی خدمات پر مامور ہیں۔ اور نظامت مولانا ولی اللہ صاحب کے ذمہ ہے۔

مدرسہ نسواں انجمن خیر خواہِ عام وانمباڑی

اس مدرسہ کا قیام یکم ربیع الاول ۱۳۲۳ھ عمل میں آیا۔ اور افتتاح حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب قدس سرہٗ کے ہاتھوں ہوا۔ پہلی اور بڑی امداد یہاں کے ایک رئیس التجار عالیجناب ٹی امین الدولہ صاحب نے کی۔ سالانہ ایک سو بیس روپے مستقل عطیہ جاری فرمایا۔ اور اپنا ایک نیا مکان اس کے لئے وقف کر دیا۔

تمل ناڈو کے شہر وانمباڑی کے لڑکیوں کا یہ مدرسہ ہندوستان گیر شہرت کا حامل ہے۔ ملک کے اکابر علماء و پیشوا اور رہنمایان ملت نے اسے ہندوستان بھر میں بے مثال مدرسہ قرار دیا۔

اس مدرسہ کے اولین روح رواں حضرت مولانا عبدالمجید صاحب نگنوری ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی اس کے لئے وقف فرما دی۔ تقریباً آٹھ سو طالبات اور کل چھبیس معلمات تدریسی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ اور موجودہ ناظم مولانا عبدالرحمان صاحب باقوی ہیں۔

چند قابل ذکر مدارس

مذکورہ مدارس کے علاوہ تمل ناڈو میں بے شمار چھوٹے چھوٹے معیاری مدارس تقریباً ہر شہر اور ہر مسجد میں قائم ہیں۔ البتہ چند ایسے مدارس تعارف سے رہ گئے ہیں ان کے تعارف کے سلسلے میں معلومات فراہم نہ ہو سکے ان کے صرف ناموں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۱) مدرسہ العروسیہ۔ کیل کرائی (۲) مدرسہ قاسمیہ۔ ساجگری (۳) مدرسہ فیض البرکات۔ میٹ پالیم (۴) مدرسہ حاسم سیلیاپیم (۵) مدرسہ فیاض العلوم (ڈنڈیگل) (۶) مدرسہ نور الاسلام۔ سلیم (۷) مدرسۃ القرآن (۸) مدرسہ زین العلوم تیندادانڈہ (۹) مدرسہ رحمانیہ ادرام پٹنم (۱۰) دار العلوم اتی کڈی وغیرہ وغیرہ۔ جن میں درس نظامی کے کتب متداولہ میں سے بہت ساری پڑھائی جاتی ہیں۔ اور بیرونی طلبۃ العلوم کے قیام و طعام کا بلا معاوضہ انتظام ہوتا ہے۔

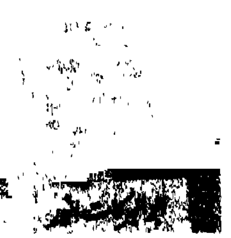
ابوالحسنات
کوچہ معروف عقب مونٹ روڈ مدراس

تملناڈو کی معروف انجمنیں اور ادارے

گیسوئے اردو کو سنوارنے میں مدراس (جس کو اب تمل ناڈو کہا جاتا ہے) کا بھی اہم رول رہا ہے۔ اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس علاقہ میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی اس سطح پر نہ ہو سکی جس سطح پر دوسرے مراکز جیسے دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد میں ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود شہر مدراس اردو کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ اور مختلف ادوار میں یہاں اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے نہایت قابل قدر کام کیا گیا ہے۔

انجمن ترقی اردو (مدراس)

شہر مدراس کا جنوبی علاقہ نوابانِ کرناٹک کے زمانے سے ایک عرصہ دراز تک علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ یہاں اردو اور فارسی کے مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے جن میں شہر کے ممتاز ادیب اور شعراء حصہ لیا کرتے تھے۔ تاریخ داں اصحاب واقف ہیں کہ نواب غوث خاں اعظم والیٔ کرناٹک کے زمانے میں تاریخی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ مولانا نواب سجمل حسین خاں ایمانؔ مرحوم اور جناب بہزادؔ مرحوم کی آپس کی کش مکش نے ان ادبی اور شعری محفلوں کا خاتمہ کر دیا۔ مدراس میں مشاعروں کا سلسلہ ایک مدت تک بند رہا جناب انستؔ صاحب کے آثار منزل عقب مسجد والا جاہی میں ماہانہ طرحی مشاعروں کا پھر آغاز ہوا۔ جناب احمد محی الدین صاحب دلوی شہرتؔ مدیر رسالہ "عروجِ خیال" اس کے مہتمم اور منتظم رہے۔ وہ اپنے رسالہ میں شعرا کا منتخب طرحی کلام شائع کرتے تھے۔ بعد میں اس رسالہ کا نام "معراجِ خیال" رکھا گیا۔ یہ مشاعرے مولانا ایمانؔ کی صدارت میں ہوئے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ شعراء کی باہمی چشمک نے ان کو بھی بند کر کے چھوڑا۔



۱۹۲۶ء میں جب کہ آل انڈیا کانگریس خلافت کانفرنس اور مسلم ایجوکیشنل اسوسی ایشن کے اجلاس مدراس میں منعقد ہوئے تو اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر جناب سید ابوالبرکات انورؔ نے ایک مشاعرہ بمقام "شادی محل" منعقد کیا۔ جس کی صدارت حضرت ایمانؔ نے فرمائی اور جس میں اضلاع کے علاوہ شمالی ہند کے نامور شعراء نے بھی حصہ لیا۔ مولانا ابوالاثر حفیظؔ جالندھری نے بھی شرکت کی۔ اور اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد بھی مشاعرے ہوتے رہے۔ اردو دانوں میں ادبی اور شعری ذوق پیدا کرنے اور مدراس کی سونی محفلوں کو پھر سے آباد کرنے کے لئے جناب مولانا عبداللطیف فاروقی صاحب اور جناب سید ابوالبرکات صاحب انورؔ مرحوم نے ۱۹۴۳ء میں مولانا ایمانؔ صاحب کی صدارت میں انجمن ترقی اردو کی داغ بیل ڈالی۔ مرکزی انجمن سے جو بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کی سرپرستی میں کام کر رہی تھی الحاق کے لئے کئی مرتبہ لکھا گیا مگر وہاں سے کوئی جواب نہ ملا۔ چار و ناچار مدراس کی انجمن کو انجمن ترقی اردو (جنوبی ہند) کے نام سے موسوم کر کے کام جاری رکھا گیا۔ ہر ماہ طرحی انعامی مشاعرے منعقد کئے گئے۔ یہ شاندار اور مقبول مشاعرے عوام میں دلچسپی پیدا کرنے اور ادبی ذوق کو اجاگر کرنے میں بہت ہی مددگار ثابت ہوئے۔ سامعین کی کثیر تعداد سے جب مسجد والا جاہی کی دو کانوں کی چھت کو خطرہ پیدا ہو گیا تو یہ مشاعرے انجمن مفید اہل اسلام لالی ہال مونٹ روڈ میں ہونے لگے۔

مشاعروں سے قبل خاص خاص عنوانات پر مضامین کا انعامی مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ اور ان کی افادیت دیکھ کر قائد ملت محمد اسماعیل مرحوم نے بھی اپنی جانب سے دوسرا انعام بہ صورت ادبی اور علمی کتابیں جاری کروایا۔

۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی اردو کی جانب سے اردو کانفرنس منعقد کی گئی۔ شہر اور اضلاع کے اہل ذوق حضرات نے اس میں کثرت سے شرکت کی۔ کانفرنس کی صدارت مولوی ڈاکٹر محمد عبدالحق مرحوم کرنولی نے کی اور مشاعرے کی صدارت مولانا ظفر علی خاں صاحب ایڈیٹر "زمیندار" لاہور نے فرمائی۔

ناساعد حالات کی وجہ سے انجمن ترقی اردو جمود کا شکار ہو گئی۔ انجمن کا حالیہ دور ۲۶ اپریل ۱۹۷۴ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب مولانا ابوالبرکات مرحوم کی ایما پر موجودہ دفتر (نمبر ۵ کوچہ پچیاچی مدراس ۲) میں ایک جلسہ محبانِ اردو کا طلب کیا گیا اور اس میں انجمن کی تجدید عمل میں آئی۔ جون ۱۹۷۶ء میں کل ہند انجمن ترقی اردو کے صدر جناب آنند نرائن ملا اور آندھرا پردیش انجمن ترقی اردو کے اسسٹنٹ سکریٹری شری سرنیواس لاہوٹی مدراس تشریف لائے تھے اور انہوں نے مرکز سے اس انجمن کا رابطہ قائم کرنے پر زور دیا۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ باوجود انجمن کی کوشش کے مرکز سے کسی قسم کا اقدام الحاق کے سلسلہ میں نہیں کیا گیا اور آج تک مدراس کی انجمن اسی نام سے مصروف خدمت ہے۔

اس انجمن کے احیاء کے بعد ادبی اور شعری محفلیں منعقد ہونے لگیں۔ لیکن انجمن کی توجہ زیادہ تر ان مسائل کی طرف رہی جن سے اردو لسانی اقلیت دوچار رہے۔ چنانچہ ۱۱ مئی ۱۹۷۴ء کو ڈپٹی کمشنر برائے لسانی اقلیتیں

مسٹر نگ آئی۔ اے۔ ایس سے جب وہ مدراس آئے تھے توان سے مل کر اردو بولنے والے طبقہ کے مسائل اور اردو مدارس کی ترقی اور بحالی کے متعلق ایک عرضداشت پیش کی گئی تھی۔ ۷ر جنوری ۱۹۷۵ء کو جب مدراس کے دورہ پر شریمتی نیرہ ڈوگرا کمشنر برائے لسانی اقلیتیں آئی تھیں توان کی خدمت میں بھی اردو بولنے والے طبقہ کے مسائل کی یکسوئی کے لئے ایک عرضداشت پیش کی گئی۔ تمل ناڈو میں اردو اکاڈمی کے قیام پر بھی زور دیا گیا اور ان سے درخواست کی گئی کہ اس سلسلہ میں مناسب اقدام کریں۔

اسلامی تعلیمی انجمن (جنوبی ہند)

مدراس کی ایک مایہ ناز ہستی حاجی یم جمال محمد لاؤنز صاحب نے اس انجمن کی بنیاد ڈالی تھی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ یہاں کے انگریزی مدارس کے مسلمان طالب علموں کے لئے کسی مسلمان فاضل کی خدمات حاصل کی جائیں جو اسلام اور پیغمبر اسلام پر طلبائے انگریزی کے ذوق اور موجودہ رنگ کے مطابق خطبات دے سکے۔ چنانچہ سب سے پہلے ۱۹۲۵ء میں مولانا سید سلیمان ندوی کو مدراس مدعو کیا گیا۔ انہوں نے مدراس کے لالی ہال میں بعد مغرب ہر ہفتہ اور بعض ہفتہ میں دو دو دفعہ اپنے خطبات دیئے یہ جملہ ۸ خطبے اکتوبر ۱۹۲۵ء کے پہلے ہفتہ سے شروع ہوکر نومبر ۱۹۲۵ء کے آخر ہفتہ میں ختم ہوئے۔ سیٹھ حمید حسن صاحب اس مجلس کے ناظم تھے۔ ان کے یہ خطبات "خطبات مدراس" کے نام سے دارالمصنفین اعظم گڈھ سے ۱۹۲۶ میں کتابی شکل میں شائع ہوچکے ہیں۔

مدراس مسلم اسوسی ایشن

اس اسوسی ایشن کی درخواست پر جنوری ۱۹۲۹ء میں علامہ سر محمد اقبال مدراس تشریف لائے اور انہوں نے یہاں چھ تقریریں کیں جن کا اردو ترجمہ "تشکیل جدید الہیات اسلام" کے نام سے ۱۹۵۸ء میں لاہور سے شائع ہوچکا ہے۔

عثمان محمد اسمٰعیل عثمان عبدالحق لیکچر شپ

افضل العلماء، الحاج ڈاکٹر عبدالحق (مرحوم) کرنولی اس سلسلہ کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔ انہی کی ترغیب پر شہر مدراس کی ایک مخیر خاتون لاے قرالنسا بیگم صاحبہ دختر خاں بہادر ڈاکٹر سر محمد عثمان صاحب مرحوم نے اپنے دو مرحوم بھائیوں یعنی عثمان محمد اسماعیل صاحب مرحوم اور عثمان عبدالحق صاحب مرحوم کے نام پر مئی ۱۹۳۶ء میں دس ہزار تین سو روپیوں کی رقم مدراس یونیورسٹی کو پیش کی تاکہ ہر تین سال کے بعد کسی فاضل مقرر کو اسلامی تاریخ و ثقافت سے متعلق کسی ایک خاص موضوع پر کم ازکم پانچ خطبے دینے کی دعوت دی جائے اور مذکورہ بالا موقوفہ رقم سے جو منافع حاصل ہو اس کو بطور معاوضہ فاضل مقرر کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

اس وقف کے تحت سب سے پہلے ۱۹۴۰ء میں سر آرتھر پوپ کو دعوت دی گئی تھی جنہوں نے "اسلامی آرٹ اور فن تعمیر" پر انگریزی میں بہت مفید اور پر مغز تقریریں کیں اس کے بعد ۵۱۔۱۹۵۰ء میں ڈاکٹر ہادی حسن صاحب مرحوم نے ہند میں مغلیہ دور کی شاعری، اور ۵۴۔۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے دور وسطیٰ میں مسلمانان ہند کی ثقافت پر لیکچر دیئے تھے جو بہت پسند کیے گئے اور شائع کئے گئے۔ پھر ۱۹۵۸ء میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی (مرحوم) کو مدعو کیا گیا تھا۔ جنہوں نے ڈاکٹر سعید الحق صاحب کی صدارت میں ۲۱ تا ۲۵ جنوری "قرآنی سیرت نبوی" کے موضوع پر اردو میں پانچ خطبے دیئے تھے۔ مسلم ایجوکیشنل اسوسی ایشن آف سدرن انڈیا کی جانب سے ۱۹۶۴ء میں یہ خطبات کتابی شکل میں شائع ہوچکے ہیں۔

اس کے بعد اس وقف کے تحت دو اور مقررین کی تقریریں ہوچکی ہیں ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب (حیدرآبادی) نے ۱۹۶۰ء میں ۲۷ر فروری تا ۵ر مارچ "اسلامی ثقافت کے اصول" پر انگریزی میں چھ تقریریں کیں۔ جو شائع ہوچکی ہیں۔ پھر ۹ تا ۱۲ ستمبر ۱۹۶۳ء مولانا سید عبدالوہاب بخاری صاحب نے قرآن مجید، حدیث، فقہ، کلام، تصوف اور موجودہ دور کے تقاضوں کے متعلق انگریزی میں پانچ لیکچر دیئے۔ دارالتصنیف مدراس ۱۴ کے زیراہتمام۔ یہ تقاریر ۱۹۶۶ء میں شائع ہوچکی ہیں۔

اسلامک سوسائٹی آف انڈیا (مدراس)

۱۹۷۰ء میں اس سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا صدر دفتر ین۔ یسی۔ سی، بوس روڈ جارج ٹاون میں واقع ہے۔ جناب کے کے محی الدین اس کے سکریٹری ہیں۔ ۳۰ اور ۳۱ مئی ۱۹۷۰ء کو عبدالشکور آڈیٹوریم میں اس سوسائٹی کے زیراہتمام ایک سیمینار منعقد ہوا جس کی صدارت پی عبدالواحد نے فرمائی۔ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، سید اوصاف علی، ڈاکٹر عالم خوندمیری، قاضی سجاد حسین، حکیم عبدالحمید صاحب اور کئی ممتاز شخصیتوں نے اس سیمینار میں شرکت فرمائی۔ بعدازیں جناب عبدالماجد دریاآبادی اور جناب سعید احمد اکبرآبادی اس سوسائٹی کی درخواست پر مدراس تشریف لائے اور عبدالشکور آڈیٹوریم میں عوام کو مخاطب کیا۔

جسٹس بشیر احمد سعید اس سوسائٹی کے موجودہ صدر ہیں۔

کتاب گھر (میل وشارم)

یہ اشاعتی ادارہ ۱۹۵۲ء میں جمیل آباد مقام میل وشارم (ضلع شمالی آرکاٹ) میں قائم ہوا۔ جناب اے احمد بادشاہ یم اے اس کے مالک ہیں۔ تملناڈو ٹیکسٹ بک کمیٹی نے کتاب گھر کی چالیس درسی کتابوں کو منظور کرلیا ہے۔ کتابیں سرکاری نصاب میں شامل ہیں۔ ان کتابوں کو دوسرے صوبہ جات نے بھی پسند کیا ہے اور اپنے یہاں کے مدارس میں ان کو رائج کیا ہے۔

آندھرا پردیش، کرناٹک اور کیرل میں کتاب گھر کی شائع کردہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ اس ادارہ نے اب تک ہزاروں کی تعداد میں اردو کی درسی اور دوسرے مضامین کی کتابیں شائع کی ہیں۔

سنہ [illegible] میں علامہ محوی صدیقی لکھنوی کی زیر سرپرستی انجمن ترقی اردو کی شاخ یہاں قائم ہوئی۔ اے احمد بادشاہ انجمن کے سکریٹری ہیں۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں اس کا الحاق مرکزی انجمن سے ہوا۔ انجمن کے تحت یہاں کئی جلسے اور مشاعرے منعقد ہوئے۔ محوی صدیقی کے زیر نگرانی سنہ ۱۹۵۱ء میں ماہنامہ "معیار ادب" اور "الارشاد" جاری ہوئے۔ اس کے بعد محمد زکریا صاحب کی ادارت میں ماہنامہ "گلستان" جاری ہوا۔ اس کے جملہ گیارہ شمارے شائع ہوئے اس کے بعد محمد عمر فاروق نے ایک ماہنامہ "باغ و بہار" جاری کیا۔ حال میں جناب حافظ رابچوٹی کی لکھی ہوئی کتاب "مخبر اعظم" کا اجرا ہوا۔ جس میں نواب سی عبدالحکیم کے حالات اور ادبی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

انجمن ترقی اردو (ویلور)

سنہ ۱۹۳۴ء سے یہاں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم ہے۔ اس کے زیر اہتمام ایک سالنامہ "صفیر" شائع ہوتا ہے۔ اس انجمن کے زیر اہتمام شعر و سخن کی محفلیں اور ادبی جلسے ہوتے رہتے ہیں۔

مجلسِ مصنفین (مدراس)

سنہ ۱۹۶۰ء میں مجلس مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بانیوں میں کاوش بدری، راز امتیاز، آثم کرنولی اور گلاب مدراسی وغیرہ ہیں۔ مجلس کے زیر اہتمام کئی ادبی نشستیں ہوئیں۔ ادب کے نئے اور پرانے رجحانات پر تبادلۂ خیالات کا آغاز اس مجلس سے ہوا۔

مطبوعات مجلس مصنفین:۔ سر دھا نجلی۔ کاوش بدری

۲۔ مثنوی مبتدنما۔ کاوش بدری (۱۹۶۵ء) ۳۔ گیسوئے شب۔ نورین خیامی

۴۔ پتہ پتہ بوٹہ بوٹہ۔ فرحت کیفی (۱۹۶۵ء)

انجمن ترقی پسند مصنفین اردو (تملناڈو)

جنوبی ہند کا یہ ایک اہم ادارہ ہے جو اردو ادب کی ترویج کے لئے شب و روز مصروف خدمت ہے تملناڈو کے ممتاز ادیب اور شعراء اس انجمن سے منسلک ہیں۔ یہ سراسر ناانصافی ہوگی اگر اس سلسلہ میں تملناڈو کے ممتاز شاعر جناب عبدالرزاق کاوش صاحب کی خدمت کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ جن کی انتھک کوششوں کی وجہ سے یہ انجمن پروان چڑھی۔ دراصل آپ اس انجمن کے روحِ رواں ہیں۔ ان کے علاوہ دانش فرازی، راز امتیاز، فرحت کیفی، حسرت سہروردی، صلاح الدین برق۔ علیم صبا نویدی، فدوی باقوی، امیر حسن اس انجمن کے کارگزاروں میں سے ہیں۔

اے، جے اردو سیمینار

یہ ادارہ جناب اے زین العابدین صاحب مرحوم کی یادگار کو پائندہ بنانے کی غرض سے قائم کیا گیا۔ مدراس کے نوجوانوں کی ایک باہمت ٹولی نے جناب سید عبدالوہاب بخاری کی سرپرستی میں اس ادارہ کی نشو و نما کے لئے جان توڑ کوشش کی اور ۲۶ اپریل سنہ ۱۹۵۱ء کو ڈاکٹر لوکرشنا راؤ جو اس وقت مدراس کے وزیر تعلیم و عمل تھے۔ اس ادارہ کا افتتاح کیا۔

اس سمینار کے اغراض و مقاصد یہ ہیں:۔

(۱) جنوبی ہند میں اردو ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنا۔

(۲) اردو زبان کی ترقی و ترویج کے ذرائع پیدا کرنا۔

(۳) ان لوگوں کے لئے اردو زبان سیکھنے کے مواقع پیدا کرنا جنکی زبان اردو نہ ہو اور جو اردو سیکھنا چاہتے ہوں۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے ایک لائبریری کا انعقاد عمل میں آیا۔ ابتدا میں اس لائبریری میں ۴۰۰ کتابیں تھیں اور آج اسکی تعداد ۴ ہزار ہو چکی ہے سائنس۔ فلسفہ۔ تاریخ، سوانحات غرض سب اصناف علم سے متعلق کتابیں موجود ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین جو اس وقت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے۔ سمینار میں تشریف لائے تو انہوں نے سمینار کی کارگزاریوں میں دلچسپی لی تھی۔ ذاکر صاحب نے کتاب الرائے میں اپنے تاثرات قلم بند کئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:۔

"چند اردو داں احباب کے ساتھ مجھے اردو سیمینار مدراس کے دیکھنے کا موقع ملا۔ جس خاموشی اور سلیقہ کے ساتھ یہ کام شروع کیا گیا ہے اس سے دلی خوشی ہوئی۔ ایک مخلص ہونہار صاحب ثروت نوجوان نے اپنے والد مرحوم و مغفور کی یادگار کے طور پر اس سمینار کے لئے جو مکان دیا ہے وہ بھی اس کے کام کے لئے نہایت موزوں و مناسب ہے۔ بہت سے اراکین سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ مجھے سمینار کی سادی فضا بہت پسند آئی۔ دعا کرتا ہوں کہ کارکنوں کو اپنی کوششوں میں پوری کامیابی نصیب ہو۔ اس کام سے تعلق ان کے لئے بڑی سعادت ہے۔ اس لئے کہ میرے خیال میں اردو کی خدمت ہندوستان کی اہم خدمتوں میں سے ہے۔ ہندوستانی زندگی کی گوناگوں کثرت میں کسی تمدنی کوشش نے وحدت کا اتنا سامان بہم نہیں پہونچایا ہے جتنا کہ اردو نے اردو کی روح۔ میل ملاپ سمجھنے سمجھانے۔ دل سے دل کو راہ نکالنے۔ وسعت قلب اور رواداری کی روح ہے۔ یہی روح ہماری قومی زندگی کے فروغ کی ضمانت ہے۔"

سمینار ہال کے لئے جناب زین العابدین کے فرزند جناب اے جلال الدین نے ایک پختہ عمارت نمبرا کوچہ بیارشن ونکٹا چلا ائیر (محفوظ خاں باغ) مدراس وقف کر دی ہے۔ اس عمارت کے اوپر کا ہال لائبریری اور سمینار کی کارروائیوں کے لئے مخصوص ہے۔ ۱۵ اپریل سنہ ۱۹۵۴ء کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اس کا افتتاح فرمایا۔ اس موقع پر حیدرآباد کے دو مشہور ادیب ڈاکٹر

محی الدین زور اور پروفیسر عبدالقادر سروری بھی تشریف فرما تھے۔

سمینار کی جانب سے سالانہ انٹر کالجیٹ تقریری مقابلے منعقد ہوتے ہیں جس میں صوبہ تملناڈو کے علاوہ دیگر مقامات جیسے کہ دہلی۔ آگرہ کے طلباء بھی شرکت کرتے ہیں۔

سمینار کی جانب سے ایک رسالہ "فانوس خیال" ۱۹۵۴ء سے نکلتا رہا۔ یہ رسالہ جنوب اور بالخصوص اہل مدراس کے ادبی ذوق کو نکھارنے میں کامیاب ثابت ہوا۔ چند برسوں سے "فانوس خیال" تو چل نہیں رہا ہے لیکن اس کے بجائے سمینار نے اپنے سالانہ مشاعروں کی روداد ایک سوونیر کی شکل میں شائع کر رہی ہے۔

سمینار کی ادبی دلچسپی کا ثبوت تو ان کے سالانہ کل ہند مشاعرے ہیں جو ان کے زیر اہتمام منعقد کئے جاتے ہیں۔ ان مشاعروں میں ملک کے مایہ ناز شعراء اپنے کلام سے سامعین کا دل موہ لیتے ہیں۔ سمینار کا پہلا سالانہ مشاعرہ یکم مئی ۱۹۵۴ء کو ٹاؤن ہال میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر مولانا عبدالحق مرحوم نے فرمائی تھی۔

۲۷ مارچ ۱۹۷۶ء کو حالڈرس تھیٹر میں سمینار کے اٹھارہویں سالانہ مشاعرہ کے موقع پر "جشن حیدر" منایا گیا۔ جس میں جناب حیدر علی خاں حیدر پروفیسر فارسی مدراس یونیورسٹی کی شاعرانہ صلاحیتوں کو سراہا گیا۔ خود ان کے مجموعۂ کلام "حاصل عمر" کی اجرائی بھی اس موقع پر عمل میں آئی۔

یہ ادارہ جناب عبدالوہاب بخاری کی سرپرستی اور جناب حبیب اللہ بادشاہ کے تعاون سے اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لئے بے لوث خدمات انجام دے رہا ہے۔

کتب خانہ عام اہل اسلام

یہ کتب خانہ محمڈن پبلک لائبریری کے نام سے مقبول عام ہے۔ ۱۸۶۰ء میں یہ کتب خانہ قائم ہوا۔ اس کتب خانہ میں اردو فارسی، عربی، ترکی اور انگریزی زبان کی ۵ ہزار کتابیں ہیں۔ یہ لائبریری نوابانِ کرناٹک کے تعاون سے قائم ہوئی۔ اس میں کئی نایاب کتابیں ہیں لیکن بہت سی کتابیں جو فہرست میں درج ہیں وہ الماریوں میں نہیں۔ اور جو کتابیں الماریوں میں ہیں وہ فہرست میں درج نہیں ہیں۔ بہتر ہوگا کہ موجودہ کتابوں کی فہرست از سر نو تیار کر کے اس کو شائع کر دیا جائے۔

تمل ناڈو آرکائیوز

اس سے قبل یہ ریکارڈ آفس کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی عمارت ایگمور ریلوے اسٹیشن کے قریب پانتھین روڈ پر واقع ہے۔ یہ جنوب مشرقی ایشیا کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ جہاں جملہ ۶ لاکھ کتابیں اور ساڑھے ۸ لاکھ سرکاری فائلیں ہیں۔ جہاں عربی فارسی اور اردو کی ہزاروں کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور نوابان کرناٹک کے شاہی فرامین اور تاریخی دستاویزات اور سرکاری خطوط کا کافی ذخیرہ ہے۔ تحقیق کی جستجو رکھنے والے

جن میں بیرونی باشندے بھی شامل ہیں۔ اس مرکز کو دیکھنے چلے آتے ہیں۔ مدراس سکریٹریٹ کے افسر اس دفتر سے سالانہ چالیس ہزار سرکاری فائلیں طلب کرتے ہیں۔

اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری

یہ مدراس یونیورسٹی لائبریری کی عمارت کے ایک حصہ میں واقع ہے۔ یہاں بھی اردو کی بڑی نایاب کتابیں موجود ہیں مدراس یونیورسٹی لائبریری میں بھی اردو کی کافی کتابیں ہیں۔

سرسوتی محل لائبریری (تنجاور)

یہ لائبریری ضلع تنجاور میں واقع ہے راجہ سرفوجی جو اس لائبریری کے بانی تھے۔ انھیں دوسری زبانوں کے علاوہ انگریزی فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں بھی کافی عبور تھا۔ اس لائبریری میں تیس ہزار مخطوطات اور یورپی زبانوں کی ۱۵ ہزار کتابیں موجود ہیں۔ عربی فارسی اور اردو کتابوں کا بھی کافی ذخیرہ ہے۔

یہ لائبریری چونکہ ایسے علاقہ میں واقع ہے جہاں زیادہ تر تمل زبان بولی جاتی ہے۔ اس لئے بہت کم لوگ اس لائبریری سے استفادہ حاصل کرتے ہیں اگر یہ کتابیں شہر مدراس منتقل کر دی جائیں تو یہ زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہوں گی۔ چوں کہ یہ راجہ صاحب کا ذاتی کتب خانہ ہے اور اب اس کی نگرانی ایک ٹرسٹ کے ماتحت کی جا رہی ہے اس کی منتقلی دشوار نظر آتی ہے۔

کمال مدراسی

پنجاب اسوسی ایشن تملناڈو

مدراس میں پنجاب اسوسی ایشن کا قیام ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ اس کا ابتدائی مقصد اہل مدراس کی اقتصادی و علمی خدمت کرنا اور ان کی معاشرتی حالت کو بلا امتیازِ مذہب و ملت سدھارنا تھا۔ اس کے بانی کرنل جی۔ ایس گل ہیں۔ چالیس سال قبل کی قائم شدہ یہ غیر فرقہ وارانہ اسوسی ایشن لالہ اندرسین، بلدیو جی، آر ایس ہوٹن، وی۔ پی۔ کپور، ڈی سی۔ ملہوترہ، سردار منوہر سنگھ اور پی۔ این۔ دھون کے تعاون سے برابر ترقی کی راہ پر گامزن رہی۔ ابتدا میں اس کی ایک ہی یونٹ تھی لیکن رفتہ رفتہ اس کے شعبے میں پھیلتے گئے اور آج یہ اسوسی ایشن ۲۳ یونٹوں پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں ہمارے پیش نظر اسوسی ایشن کے وہ شعبے ہیں جن کا اردو شعر و ادب سے تعلق ہے۔

ادبی خدمات — لائبریری اور ریڈنگ روم

علم و ادب کی خدمات اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتیں جب تک کہ ایک عمدہ لائبریری اور ریڈنگ روم کا اہتمام نہ کیا جائے۔ اس اسوسی ایشن نے ان دونوں کا معقول انتظام کیا ہے ہماری مہارانی ودیاوتی دیوی میموریل لائبریری میں مختلف زبانوں کی سیکڑوں کتابیں موجود ہیں۔ جن میں ریفرنس بک بھی شامل ہیں۔ لائبریری میں اردو ادبیات

کی طرف پوری توجہ دی جارہی ہے اور اردو کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا جارہا ہے۔ ہماری فری ریڈنگ روم میں عوام کے لئے اطمینان کے ساتھ مطالعہ کرنے کی سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ ملک کے مشہور و معروف جرائد و رسائل بھی منگوائے جاتے ہیں۔

بک بینک ہمارے یہاں بک بینک کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ جس سے اسکول میں تعلیم پانے والے غریب طالب علم کافی تعداد میں فایدہ اٹھا رہے ہیں۔

ڈرامیٹک کلب اردو خدمات کے سلسلہ میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ پنجاب اسوسی ایشن کی جانب سے ایک ڈرامیٹک کلب قائم کیا گیا ہے۔ اس کلب نے اردو ڈرامہ "شہیدوں کی پکار" پیش کیا تھا جسے آل انڈیا ریڈیو مدراس نے بھی نشر کیا تھا۔ اب پھر پبلک کے اصرار پر یہ ڈرامہ پیش کیا جارہا ہے۔

مشاعرے پنجاب اسوسی ایشن نے جہاں علمی اقتصادی، معاشرتی اداروں کو جنم دیا ہے وہاں اس کا خاص کارنامہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت ہے۔ اس مقصد کے لئے اسوسی ایشن نے مشاعروں کا باقاعدہ سلسلہ جاری رکھا ہے۔ آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے جناب کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب سحر کی زیر سرپرستی آل انڈیا پیمانہ پر پہلا مشاعرہ ہوا اور اس کے بعد ہر سال جشن آزادی و یوم جمہوریہ کے مواقع پر عظیم الشان آل انڈیا مشاعرے منعقد کئے جانے لگے۔ ان مشاعروں میں ملک کے نامی گرامی شعرائے کرام نے شرکت کی ہے جن میں بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں؛

ابر احسنی گنوری، فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی، احسن لکھنوی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، بسمل سعیدی، حیرت بدایونی، شعری بھوپالی، شفا گوالیاری، شکیل بدایونی، پریم دھون، شمسی مینائی، عالم فتح پوری، نازش پرتاب گڑھی، محشر امروہی، کامل شفیقی، انور صابری، بیکل اتساہی، والی آسی، راہی شہابی، ساجد صدیقی، قیصر دہلوی، ہلال سیوہاروی، سلیمان خطیب، دلاور فگار، ناوک حمزہ پوری، ناوک لکھنوی، ساغر لکھنوی، ہلال رامپوری، احمل سلطان پوری، بشیر بدر، نور اندوری، راحت قیصری، نور لکھنوی، مقرب حسین مقرب، آل انڈیا مشاعروں کا یہ سلسلہ بلا انقطاع آج تک جاری ہے۔

شعراء کی حوصلہ افزائی و قدردانی کے لئے ان کے اعزاز میں وقتاً فوقتاً مشاعرے اور جشن منائے گئے۔ بیرونی شعراء میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، شمسی مینائی، راہی شہابی، احمد جمیل افغانی اور مقامی شعراء میں آتم کرونل، نثار نگری، مولانا ابوالبرکات انور، کمال مدراسی، اور پروفیسر سرمدی کو ادبی خدمات کے صلہ میں گورنر تملناڈو نے اپنے دست مبارک سے کیسہ زر عطا کیا۔

ہمارے آیندہ پروگرام میں غریب اور طلباء کے لئے اسکالرشپ اور بالغوں کے لئے اردو تعلیم کا انتظام بھی شامل ہے۔ ہم مولوی نثار نگری، پروفیسر سرمدی صاحب پروفیسر محبوب پاشا صاحب اور پروفیسر عابد صفی صاحب کے شکر گذار ہیں کہ جو اردو کی ترویج و اشاعت اور تزئین و تعمیر میں اپنے گراں قدر مشوروں سے ہمیں نوازتے رہے۔

تمل ناڈو نے تعلیم کے میدان میں نمایاں ترقی کی ہے اس ریاست میں مختلف تعلیمی اداروں کی تعداد ۷۴-۱۹۷۳ء میں حسب ذیل تھی۔

۱۔ ابتدائی اسکول (لوور)	۲۶،۷۲۶
۲۔ ابتدائی اسکول (ہائر) بشمول مڈل اسکول	۵۷۷۳
۳۔ انڈین ہائی اسکول	۲۷۱۷
۴۔ میٹریکولیشن اسکول	۲۴-
۵۔ سنٹرل اسکول	۹
۶۔ اینگلو انڈین ہائی اسکول	۲۰
۷۔ سنٹرل بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن سے الحاق رکھنے والے اسکول	۲۴
۸۔ میڈیکل کالج	۱۰
۹۔ ایگریکلچرل کالج	۳
۱۰۔ وٹرنری کالج	۱
۱۱۔ انجینرنگ کالج	۱۲
۱۲۔ پولی ٹیکنک	۳۵
۱۳۔ ٹکنیکل، آرٹس اور انڈسٹریل اسکول	۱۰۷
۱۴۔ یونیورسٹیاں	۳

عارفہ رضیہ
۲۹۸ — نیوٹاؤن — وانمباڑی
مدراس

تمل ناڈو کے کھانے

تمل ادب میں اور بالخصوص سنگم عہد کے ادب میں جہاں جہاں تمل کھانوں کا تذکرہ ہے اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے اکثر کھانوں میں گوشت بحیثیت غذا شامل تھا۔ تمل شاعر وینکٹ آتن گھی میں تلے ہوئے ایک پرندے کے گوشت کا تذکرہ کرتا ہے جو کافی مرغوب غذا کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اسی طرح کبی لر (ریڑانا لور) نے بکری کے گوشت کے ساتھ ملے ہوئے چاول کا تذکرہ کیا ہے اسے دوسرے الفاظ میں بریانی کہہ سکتے ہیں۔ جو عوام و خواص میں مشہور ہے۔ مچھلی بھی تمل کھانوں میں اہمیت رکھتی ہے۔ "کیچوا اور ارال مچھلی کو ملا کر پکانے" کا تذکرہ بسی راندیاد کے ہاں ملتا ہے۔ "املی کے کھٹے میں ملائے ہوئے چاول اور ہرن کے گوشت" کا تذکرہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ گوشت یہاں کے دسترخوان کا ایک اہم حصہ تھا۔ گوشت اور مچھلی کے ان تذکروں کے علاوہ سبزیوں اور بغیر گوشت کے کھانے بھی تیار کئے جاتے ہیں۔

بغیر گوشت کے بنائے جانے والے چند کھانوں کا تذکرہ بھی سنگم ادب میں ملتا ہے۔ "دہی کا سالن بگھار کے ساتھ" جس کا تذکرہ کوڈلور کیژار نے "کرنتوگئی" نامی کتاب میں کیا ہے، بہت لذیذ ہوتا ہے۔ دھان کو ابال کر اوکھلی میں کچل لیتے ہیں۔ دھان کے اوپر کا چھلکا نکال کر ان چپٹے اور ابلے ہوئے چاولوں میں تیل میں تل کر مرچ کا پاؤڈر اور تھوڑا سا نمک چھڑک کر استعمال کرتے ہیں۔ اس کا تذکرہ کنرین نے کیا ہے۔ اسی طرح چاول سے بنے مرمروں کے ساتھ گڑ کا قوام ملاتے ہیں اور مونگ پھلی کے بھنے ہوئے دانے اس میں شامل کر لیتے ہیں۔ اس کا تذکرہ کوپر نچوڑن نے کیا ہے۔ یہ آج بھی تمل تہواروں کے موقعوں پر بکثرت بنائے جاتے ہیں اور بانٹے جاتے ہیں۔ ان تذکروں کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور پُر از معلومات بھی۔

آج کل تمل کھانے گوشت اور مچھلی سے کم اور سبزیوں کی آمیزش سے زیادہ تیار کئے جاتے ہیں اس کی وجوہ تفصیل طلب ہیں۔ لہٰذا ان کا ذکر یہاں بے محل ہے۔ گیہوں کے استعمال کا تذکرہ کسی شاعر کے ہاں موجود نہیں۔ صرف چاول ہی کا تذکرہ دستیاب ہے۔ تاہم آج کل تمل ناڈو میں گیہوں کا بھی کثرت سے استعمال ہونے لگا ہے۔

چاول سے اڈلی، دوسے (توسے + دسی = پسیجے + بنلیے) ایڈیا پم بنائے جاتے ہیں۔ دوسے توسے پر اور اڈلی، ایڈیاپم بھاپ میں تیار ہوتی ہے۔ چند مقبول کھانوں کی ترکیب درج ذیل ہے۔

سامبار

(تمل ناڈو کا سدابہار سالن) سامبار کے نام سے مشہور ہے۔

ضروری اشیاء اور مقدار تور کی دال ۱۲۵ گرام، پیاز ۲ عدد، ٹماٹر ۴ عدد ہلدی کا پاؤڈر چائے کا چمچہ بھر، سرخ مرچ کا پاؤڈر چائے کے دو چمچے بھر، لہسن کی جوے دس عدد، املی اور نمک حسب ذائقہ، ہرے دھنیے کی چند پتیاں، کوئی ایک ترکاری ۲۵۰ گرام، ہینگ اور کالی مرچ کے دانے پیس کر برابر برابر مقدار میں ڈالیں۔ بگھار کے لیے مونگ پھلی کا تیل یا تل کا تیل ایک چمچہ بھر لے لیں، زیرہ، رائی اور تراشی ہوئی پیاز کے چند لچھے اور کری پتہ حسب منشا مقدار میں لے لیجئے۔

پکانے کا طریقہ: پہلے دال کو اچھی طرح دھولیں اور ہلدی اور ہینگ ڈال کر خوب پکالیں اتنا پکالیں کہ دال اچھی طرح گل جائے البتہ یہ خاص خیال رکھیں کہ پانی بالکل نہ سوکھے۔ پھر اس کو اتار کر دال کا ابلا ہوا پانی نتھار لیں جب سارا پانی نتھار لیں تو دال میں تھوڑا سا نمک ڈال کر اسے خوب گھونٹ لیں پھر املی کا گاڑھا رس اس میں ملادیں۔ اس کے بعد دال کے ابلے ہوئے پانی میں ترکاری پیاز اور ٹماٹر کے تیلے پتلے قتلے کاٹ کر ڈالدیں اور سرخ مرچ اور دھنیے کا پاؤڈر ملاکر خوب پکالیں جب یہ پانی ترکاری کے ساتھ اچھی طرح پک جائے تو اتارلیں۔ گھونٹی ہوئی دال اور اس ترکاری کو ایک برتن میں ملاکر رکھ لیں دوسرا برتن چولھے کی دھیمی آنچ پر رکھیں اور تیل کو پہلے گرم کرکے سرخ کریں اور بگھار کی تمام چیزیں جیسے سرسوں میتھی پیاز کے ٹکڑے ترتیب وار علیحدہ علیحدہ ڈال کر تل لیں یہاں تک کہ یہ سب چیزیں سرخ ہو جائیں جب بگھار تیار ہو جائے اور اس سے سوندھی سوندھی خوشبو آنے لگے تو وہ سالن جو ادھر کچا رکھا ہوا ہے اس کو اس میں انڈیل کر خوب جوش دینے کے بعد اتارلیں۔ یاد رہے کہ بگھارنے یا سالن پکنے کے دوران میں داغ نہ لگنے پائے۔ چولھے سے اتارنے سے پہلے ہرے دھنیے کی چند پتیاں اور کری پتہ ڈال دیجئے۔ لیجئے "سامبار" تیار ہوگیا۔

رسم

پکانے کا بالکل آسان طریقہ: ۱۰۰ گرام ارہر کی دال کے ابلے ہوئے پانی کو اوپر سے نتھار لیں۔ پھر اس میں کچھ زیرہ، لہسن کے تین جوے، کالی مرچ ۴ دانے اور بہت تھوڑی سی ہینگ، نمک، اور سرخ مرچ کا پاؤڈر ملاکر سل پر باریک باریک پیس لیں، چار ٹماٹر، ہرے دھنیے کی چند پتیاں، اور بہت کم مقدار میں املی لے کر گاڑھا رس تیار کر لیں۔ ہرے دھنیے کی پتیوں کو باریک باریک کاٹ

لیں پھر اس پانی میں یہ سب مسالہ ملا کر خوب جوشش دے لیں تاکہ مسالے کی کچی بو زائل ہو جائے اور اس سے سوندھی خوشبو آنے لگے۔ پھر اس کو اتار لیں اور ایک دوسرے برتن میں چمچہ بھر تیل ڈالنے کے بعد صرف رائی اور کری پتہ ڈال کر تل لیں اور اس سالن کو اس برتن میں انڈیل دیں جس میں بگھار تیار کیا ہے اور فوراً ہی اسے چولھے سے اتار لیں رسم تیار ہو گیا۔ اتنا مزے دار ہوتا ہے کہ صرف اس کی خوشبو ہی سے بھوک بڑھ جاتی ہے۔ یہ صحت کے لئے بہت مفید ہے۔ عموماً اس کو کھانے کے بعد لوگ یوں ہی پیتے ہیں۔

لیموں کا کھانا

تمل میں "چترانم" یا اسے "الیمچم پلم سادم" بھی کہتے ہیں۔

ضروری اشیاء اور ان کی مقدار: کچے چاول ۲۵۰ گرام، لیموں ۲ عدد، تل کا تیل یا خالص گھی ۵۰ ملی گرام، ۵ ہری مرچیں کاٹ لیں، ہلدی کا پاؤڈر ایک چمچہ، کاجو ۱۰ عدد، اُڑد کی دال ایک چمچہ، چنے کی دال ایک چمچہ، مونگ پھلی کے بیج ایک چمچہ، تل آدھا چمچہ، رائی اور کری پتہ حسب منشا، نمک حسب ذائقہ۔

بنانے کا طریقہ:۔ پہلے چاول کو دو تین بار دھو لیں اور پھر پکا لیں۔ (یاد رہے کہ پکنے کے بعد چاول کا دانہ الگ الگ رہے) یعنی اسے زیادہ نہ گلنے دیں اور جب چاول پک جائیں تو ایک کھلے برتن میں ڈال کر ٹھنڈا کر لیں۔ مناسب مقدار میں مونگ پھلی کے بیج، کاجو، تل اور رائی کو بھون کر پہلے ہی الگ رکھ لیں۔ اب ان بھنی ہوئی چیزوں کو بغیر پانی کے سل پر سوکھی اور باریک باریک پیس لیں۔ اس کے بعد کڑھائی میں تل کا تیل ڈال کر خوب گرم کر لیں اور حسب منشا کاجو، رائی، کالی مرچ اور دالوں کو سرخ مرچ، کری پتہ اور مذکورہ چیزوں کو ترتیب وار ڈالتے جائیں اور ان سب چیزوں کو تل لیں۔ بگھارتے وقت آنچ بالکل دھیمی رکھیں تاکہ بگھار بالکل جل نہ جائے۔ جب بگھار تیار ہو جائے تو کڑھائی کو نیچے اتار لیں۔ نیچے اتارتے ہی فوراً سرخ مرچ کا پاؤڈر اور ہلدی کا پاؤڈر حسب مقدار ڈال کر خفیف سا تل لیجئے اب ان لیموؤں کو کاٹ کر رس نکال لیں اور اس میں تھوڑا سا نمک ڈال کر اس کڑھائی میں ڈال لیں۔ چولھے پر رکھ کر صرف پانچ منٹ پکائیں۔ جب یہ پک جائے تو اس کے بعد کھانے کے برتن میں انڈیل لیجئے۔ اور اسے خوب ملایئے تاکہ تمام مسالہ اس میں مل جائے۔ لیجئے "لیموں کا کھانا" الیمچم پلم سادم تیار ہے۔ اگر چاہیں تو انڈے ابال کر اس میں ملا دیجئے یا ماش کی دال کے لذیذ بڑے بنا کر کھانے کے ساتھ کھایئے دیکھئے کھانا کتنا مزے دار ہو گیا۔ آپ اگر صرف سبزی پسند کرتے ہیں تو انڈے مت ملایئے۔ لیکن اس کے بغیر بھی یہ کھانا لذیذ ہی رہے گا۔

ناریل کا کھانا

ضروری اشیاء اور مقدار:۔ چاول آدھا کلو، ناریل کا دودھ ایک لیٹر یا دو عدد ناریل، گھی ۲۰۰ گرام، ہرا دھنیا اور پودینہ، ادرک تراشی ہوئی، پیاز ایک عدد، نمک پسند کے مطابق، الائچی ۲ عدد، لونگ ۱ عدد، دار چینی پسند کے مطابق۔

پکانے کا طریقہ:۔ پہلے چاول دھو لیں اس کے بعد انہیں الگ رکھ دیں۔ ایک پیتل کی پتیلی یا المونیم کا برتن جس میں آدھا کلو چاول پک سکے چولھے کی دھیمی آنچ پر رکھ کر پہلے گھی گرم کر لیجئے جب گھی اچھا خاصہ گرم ہو جائے پیاز اور ادرک اور لہسن سرخ کر لیں۔ ترتیب وار پیاز، ہرا دھنیا، پودینہ، لونگ، دار چینی سب ملا کر اچھی طرح تلیں اتنا کہ اس سے سوندھی خوشبو آنے لگے۔ اب ناریل کا دودھ نکال کر رکھ لیں (ناریل کو باریک پیس کر گرم پانی لیں یہی ناریل کا دودھ نکالنے کا طریقہ ہے) جب بگھار اچھی طرح تیار ہو جائے اس کے بعد ناریل کا دودھ اس میں ڈال کر اس وقت تک پکائیں جب تک کہ جوش نہ آ جائے اس کے بعد ان چاولوں کو اس میں انڈیل دیں۔ چاول اور دودھ ملا کر خوب پک جانے چاہئیں۔ چاول کی کنی دیکھنے کے بعد چولھے کی آنچ نکال دیں۔ کف گیر سے چاولوں کو خوب چلاتے رہے تاکہ داغ نہ لگے۔ جب کھانا پک جائے تو ایک کپڑے کو بھگو کر پتیلی کو چاروں طرف سے لپیٹ کر ڈھانپ [illegible] آگ خوب تیز ہو تو ۵ منٹ کے بعد پتیلی اتار لیں ورنہ ۱۰ منٹ کے بعد اتاری جا سکتی ہے۔

ہدایت:۔ اگر کھانا رنگین چاہئے تو زعفران کا پاؤڈر ایک چمچہ دودھ میں ملا کر اس کھانے کو دم کرتے وقت چھڑک دیں یا چاول کے ساتھ چٹکی رنگ کا پاؤڈر ڈال دیں۔

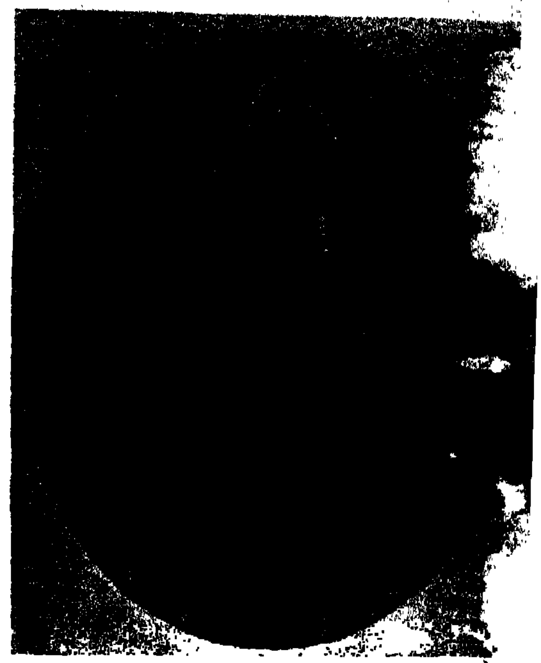
ناریل کے کھانے کے ساتھ گوشت کا قورمہ بھی استعمال کر سکتے ہیں یا [illegible] کی کھٹی چٹنی بھی۔ قورمہ بناتے وقت پانی کی بجائے ناریل کا دودھ بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

شکر کا پونگل

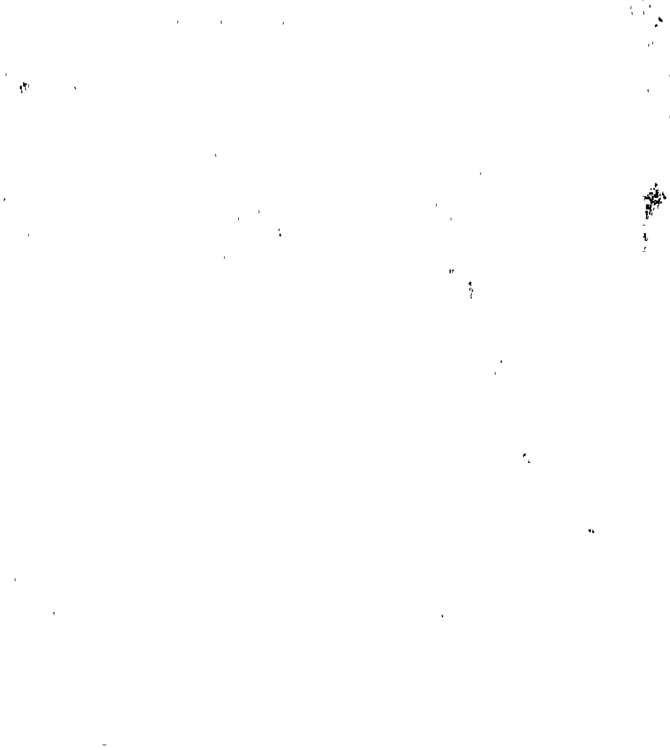
ضروری اشیاء اور مقدار:۔ نئے چاول ۲۵۰ [illegible] شکر آدھا کلو یا گڑ آدھا کلو، مغزیات حسب ضرورت، کاجو، بادام، منقہ ہر ایک کو باریک باریک کاٹ کر تراش لیجئے۔ خالص گھی دو چمچہ، زعفرانی رنگ عرق گلاب دو قطرے۔

بنانے کا طریقہ:۔ پہلے چاول کو دھو لیں گھی میں تمام مغزیات سرخ کر لیں اس کے بعد پانی چاول پکانے کے حساب سے انداز [illegible] اور پکایا جائے۔ جب چاول پک جائے اور گل جائیں تو "دم" پر، چاولوں کے دم ہونے کے بعد شکر ڈال کر انہیں خوب پکائیں، آنچ دھیمی شکر اچھی طرح مل جائے تو عرق گلاب ڈال کر ٹھنڈا ہونے دیجئے۔ اس کے بعد شکر کا پونگل کھایئے دیکھئے کتنا مزے دار اور لذیذ ہے یہ!





نواب والا جاہ عمدۃ الملک محمد علی انوالدین خان
جن کی ذاتی سرپرستی اور جن کے جانشینوں کی علم دوستی
نے تمل ناڈو میں اردو کو فروغ دیا۔



مشہور انقلابی شاعر سبرامنیم بھارتی جن کے شعلہ بار
نغموں نے دلوں کو تڑپایا اور روح کو گرمایا۔ ان کی
انقلابی نظمیں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی



مشہور مدبر اور سیاست داں اور آزاد ہندوستان کے
پہلے گورنر جنرل راج گوپال اچاری جنہوں نے ملک کو
آزاد کرانے میں بے مثال خدمات انجام دیں۔



سی۔ وی۔ رامن
مشہور سائنس داں۔ جنہیں نوبل انعام ملا۔

